ترتیب

اُردو کی پہلی کہانی

۱ ۔ رانی کیتکی — انشاء اللہ خاں انشاء ، ۹

طویل مختصر داستانوں کا دور

۲ ۔ طوطا کہانی — حیدر بخش حیدری ، ۲۵
۳ ۔ آرائشِ محفل — حیدر بخش حیدری ، ۲۹
۴ ۔ باغ و بہار — میر امن دہلوی ، ۴۱
۵ ۔ بیتال پچیسی — مظہر علی ولا و للو لال ، ۵۸
۶ ۔ سنگھاسن بتیسی — کاظم علی جوان و للو لال ، ۶۰
۷ ۔ انشائے نو رتن — محمد بخش مہجور ، ۶۵
۸ ۔ فسانۂ عجائب — رجب علی بیگ سرور ، ۶۹
۹ ۔ الف لیلہ — حسن علی خاں کشمیری، جعفر علی خاں و شدید الدین خاں ، ۷۴

ناولوں کا دور

۱۰ ۔ بھروسا — ڈپٹی نذیر احمد ، ۹۴
۱۱ ۔ جامِ سرشار — رتن ناتھ سرشار ، ۱۰۲
۱۲ ۔ دل دنیا — شرر لکھنوی ، ۱۱۸
۱۳ ۔ شریف زادہ — مرزا محمد ہادی رسوا ، ۱۲۱
۱۴ ۔ بھنور کی دلہن — راشد الخیری ، ۱۳۱

ترجموں کا دور

۱۵ ۔ تولہ بھر ریڈیم — ظفر علی خاں ، [illegible]
۱۶ ۔ نجم السحر — عنایت ، [illegible]
۱۷ ۔ شاعر کی وصیت — حمید ، ۱۵۸
۱۸ ۔ بتا — [illegible] ، ۱۷۲
۱۹ ۔ کیڈور کا مصور — [illegible] ، ۱۷۸
۲۰ ۔ بلی کے بچے — قرۃ العین حیدر ، ۱۸۷
۲۱ ۔ مصور کا راز — خدیجہ مستور ، ۲۱۴
۲۲ ۔ دلہن کی پوشاک — شفیق الرحمٰن ، ۲۱۸
۲۳ ۔ ہڈیوں کا پنجر — سہیل عظیم آبادی ، ۲۳۵

افسانوی مضامین کا دور

۲۴ - شہزادے کا بازار میں گمشتنا — خواجہ حسن نظامی ، ۱۹۴
۲۵ - اوکھلے کی سیر — آغا حیدر حسن ، ۱۹۷
۲۶ - جہان آباد — ناصر نذیر فراق ، ۲۰۱
۲۷ - دربارِ دہلی کی کنکوا بازی — عشرت لکھنوی ، ۲۰۶
۲۸ - زود پشیماں — چودھری افضل حق ، ۲۰۹
۲۹ - ریاکار — فلک پیما ، ۲۱۷
۳۰ - پربت کی بیٹی — چراغ حسن حسرت ، ۲۲۰
۳۱ - حاجی بغلول لاہور میں — اشرف صبوحی ، ۲۲۷

اُردو افسانہ

پہلا دور

۳۲ - خارستان و گلستان — سجاد حیدر یلدرم ، ۲۳۲
۳۳ - طوقِ آدم — سلطان حیدر جوش ، ۲۴۶
۳۴ - کیوپڈ و سائیکی — نیاز فتحپوری ، ۲۵۳
۳۵ - سمن پوش — مجنوں گورکھپوری ، ۲۷۴
۳۶ - بھینٹ — ل۔ احمد ، ۲۸۳
۳۷ - تیسری جنس — محمد علی ردولوی ، ۲۸۹

دُوسرا دور

۳۸ - کفن — پریم چند ، ۲۹۶
۳۹ جاں نثار — سدرشن ، ۳۰۲
۴۰ - چینی کی انگوٹھی — عظیم بیگ چغتائی ، ۳۰۸
۴۱ - پریم کی چوڑیاں — اعظم کریوی ، ۳۱۵
۴۲ - اندھا دیوتا — حکیم احمد شجاع ، ۳۲۲
۴۳ - تین پیسے کی چھوکری — قاضی عبد الغفار ،
۴۴ - میلہ گھومنی — علی عباس حسینی ،
۴۵ - ڈالی کا جوگ — حامد اللہ افسر
عاشق بٹالوی ، ۳۴۵
فیاض محمود ، ۳۵۴
امتیاز علی تاج ، ۳۶۲
عابد علی عابد ، ۳۷۱
پروفیسر مجیب ، ۳۸۰
شوکت تھانوی ، ۳۹۲
[illegible] ، ۴۰۳
[illegible] ، ۴۰۸
[illegible] ، ۳۸۹
[illegible] ، ۳۹۷

48 [illegible] — عبد الرزاق ملیح آبادی
49 [illegible] — خواجہ منظور حسین
50 کیمیاگر — مسعود احمد
51 [illegible] — جلیل قدوائی
52 [illegible] — حامد علی خان
53 نیا مریض — فضل حق قریشی
54 سازو — [illegible]
55 درد کی تیرگی — [illegible]

۵۶ - بنتِ قمر — صادق الخیری، ۴۲۲
۵۷ - لکھ داتا — شیر محمد اختر، ۴۳۲
۵۸ - رسیلا — مسز عبدالقادر، ۴۳۵
۵۹ - سنبھالا — صالحہ عابد حسین، ۴۴۹

تیسرا دور
(انگارے کے افسانے)

۶۰ - نیند نہیں آتی — سجاد ظہیر، ۴۶۲
۶۱ - مہاوٹوں کی ایک رات — احمد علی، ۴۶۷
۶۲ - دلّی کی سیر — رشید جہاں، ۴۷۱
۶۳ - جواں مردی — محمودالظفر، ۴۷۳

چوتھا دور

۶۴ - زندگی کے موڑ پر — کرشن چندر، ۴۷۸
۶۵ - نیا قانون — سعادت حسن منٹو، ۵۰۱
۶۶ - گرہن — راجندر سنگھ بیدی، ۵۰۸
۶۷ - چوتھی کا جوڑا — عصمت چغتائی، ۵۱۴
۶۸ - ہماری گلی — احمد علی، ۵۲۳
۶۹ - آنندی — غلام عباس، ۵۳۲
۷۰ - پرمیشر سنگھ — احمد ندیم قاسمی، ۵۴۱
۷۱ - آپا — ممتاز مفتی، ۵۵۳
۷۲ - زعفران کے پھول — خواجہ احمد عباس، ۵۶۱
۷۳ - مجھے جانے دو — اختر حسین رائے پوری، ۵۶۹
۷۴ - حجاموں کی یونین — ملک راج آنند، ۵۷۴
۷۵ - نئی مصیبتیں — رشید جہاں، ۵۸۱
۷۶ - حرامجادی — حسن عسکری، ۵۸۵
۷۷ - زرین تاج — عزیز احمد، ۵۹۶
۷۸ - آخری کوشش — حیات اللہ انصاری، ۶۰۹
۷۹ - بینگن کا پودا — اوپندر ناتھ اشک، ۶۲۶
۸۰ - لال دھرتی — دیوندر ستیارتھی، ۶۳۰
۸۱ - کلیاں اور کانٹے — اختر اورینوی،
۸۲ - جگا — بلونت سنگھ، ۶۵۸
۸۳ - بھاو — ہاجرہ مسرور، ۶۷۲
۸۴ - خون — انور، ۶۷۸
۸۵ - جلاوطن — قرۃ العین حیدر، ۶۸۷
۸۶ - بینوں نے چلّے بابلا سے چلّے وسے — خدیجہ مستور، ۷۱۴
۸۷ - جینی — شفیق الرحمٰن، ۷۱۸
۸۸ - الاؤ — سہیل عظیم آبادی، ۷۳۵

۸۹ - آئینہ — ممتاز شیریں ، ۷۴۵
۹۰ - زرد چہرے — ابراہیم جلیس ، ۷۵۹
۹۱ - سردار جسونت سنگھ — قدرت اللہ شہاب ، ۷۶۵
۹۲ - ٹوٹ گیا اک تارا — تسنیم سلیم چھتاری ، ۷۷۳
۹۳ - سمندر اور تین کہرے — مدھوسودن ، ۷۹۲
۹۴ - کلوا — سید رفیق حسین ، ۸۰۸
۹۵ - سرگذشت — ابوالفضل صدیقی ، ۸۱۵
۹۶ - جہاں میں رہتا ہوں — مہندر ناتھ ، ۸۳۰
۹۷ - آب حیات — راماننداساگر ، ۸۴۲
۹۸ - باجی ولایت — آغا بابر ، ۸۵۰
۹۹ - آنکھ مچولی — شکیلہ اختر ، ۸۵۹
۱۰۰ - اب اور تب — ہنس راج رہبر ، ۸۶۴
۱۰۱ - روپ چند — صدیقہ بیگم سیوہاروی ، ۸۷۰
۱۰۲ - تجاوز — عبدالرحمٰن چغتائی ، ۸۷۶

پانچواں دور

۱۰۳ - گڈریا — اشفاق احمد ، ۸۸۴
۱۰۴ - راون کے دیس میں — اے حمید ، ۹۰۹
۱۰۵ - تیسرا آدمی — شوکت صدیقی ، ۹۲۲
۱۰۶ - اجودھیا — انتظار حسین ، ۹۳۸
۱۰۷ - سمجھوتہ — پرکاش پنڈت ، ۹۴۵
۱۰۸ - چاند بجھ گیا — سرلا دیوی ، ۹۵۳
۱۰۹ - موم کی مریم — جیلانی بانو ، ۹۵۷
۱۱۰ - لڑھکتی چٹان — انور عظیم ، ۹۶۶

مقالات

۱۱۱ - داستان سے افسانے تک — سید وقار عظیم ، ۹۸۰
۱۱۲ - مختصر افسانے کا فن — عبادت بریلوی ، ۹۹۳
۱۱۳ - مغربی افسانہ کا اثر اُردو افسانہ پر — ممتاز شیریں ، ۱۰۰۵
۱۱۴ - اُردو افسانے کا مستقبل — محمد حسن عسکری ، ۱۰۲۲
۱۱۵ - اُردو افسانے میں روایت اور تجربے — (مذاکرہ) ۱۰۲۷

محمد طفیل پرنٹر پبلشر ایڈیٹر نے اشرف پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغ اُردو لاہور سے شائع کیا

نیاز فتحپوری

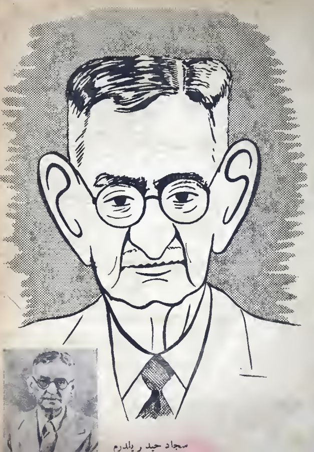

سجاد حیدر یلدرم

پریم چند

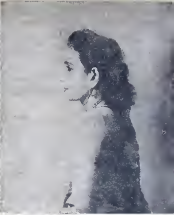

حجاب امتیاز علی

چودھری محمد علی
(ردولوی)

طلوع

کھاتے پیتے گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ جو بے حد ذہین، موٹا تازہ اور ساتھ ہی بڑا باتونی تھا۔ وہ اپنی توتلی زبان میں جب باتیں کرنے پر اُتر آتا تو چُپ ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ اس کی وہ تمام اکھڑی اکھڑی اور سلسلہ در سلسلہ باتیں آج بھی سب کو یاد آتی ہیں۔

مگر ٹریجڈی یہ کہ شروع ہی سے اس بچے کو اپنی ماں کا دودھ نصیب نہ ہوا۔

جب یہ بچہ کچھ بڑا ہوا اور اس کا شعور بھی کچھ کچھ پختہ ہونے لگا تو اسے اپنے تمدن اور اپنی معاشرت سے بے حد اُنسیت پیدا ہوئی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اُس نے قدرے سنبھل کر اپنے مسائل کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اب اس کی باتوں میں وہ پہلی سی یاوہ گوئی نہ رہی، قدرے اختصار کے ساتھ ایک ٹھہراؤ تھا، ایک تسلسل تھا اور ایک نقطۂ نظر تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ مطمئن نہ تھا۔

اِسی بے منزلی میں اس نے، اپنے مُلک سے دُور، مغرب کے بچوں سے یارانہ گانٹھا۔ کیونکہ وہ اس سے زندگی میں کئی قدم آگے تھے۔ یہاں بیٹھے ہی بیٹھے اُس نے انھیں اپنا ذہنی امام تصور کر لیا اور اس کی باتوں کو اپنے الفاظ میں دُہرا دُہرا کر بہت کچھ سیکھا۔

مغربی بچوں کی دیکھا دیکھی جب اُس نے اُسی انداز میں یہاں زندہ رہنا چاہا۔ تو اپنی چال بھی بھول گیا۔ نہ اُن بچوں والی کوئی بات پیدا ہو سکی اور نہ اپنی ہی انفرادیت باقی رہی۔ یہی وجہ ہوئی کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا، کہہ نہ سکا۔ کچھ بوکھلا سا گیا۔ بعضوں کو اِسکی یہی بوکھلاہٹ بڑی عزیز ہے۔

تذبذب کی یہ کیفیت اُس پر زیادہ عرصہ طاری نہ رہی۔ وہ بچے جن سے وہ بہت زیادہ مرعوب تھا اور جن سے واقعی اس نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ ان سے بھی اسے آنکھیں چار کرنے کی ہمت پیدا ہوئی۔ اور اس کا یہ گھمنڈ کچھ زیادہ غلط بھی نہ تھا۔

آپ کو سُنکر حیرت ہوگی کہ وہ بچہ جو بعد میں بالغ ہو کر جوان بھی ہوا آج نڈھال پڑا زندگی کے دن گذار رہا ہے۔

یہ کہانی اُردو افسانے کی تھی۔

محمد طفیل

پرچے کی ترتیب اور افسانوں کے چناؤ میں کرشن چندر، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، وقار عظیم، احتشام حسین، عبادت بریلوی اور محمد حسن عسکری کے مشورے بھی شامل رہے ہیں۔

اس پرچے کی ترتیب کے بارے میں مختصراً یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جن جن راہوں سے گذر کر اردو افسانے نے موجودہ شکل پائی اس کا دور بہ دور یہ ایک تفصیلی ڈھانچہ ہے۔

نظریاتی اختلاف کے باوجود میں نے کسی بھی افسانہ نگار کو نظرانداز کرنے کی کوشش نہیں کی ہے، نہ ہی کسی کے فنی اعتبار سے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ اپنے ذمہ لیا ہے، ہو سکتا ہے کہ پڑھے لکھوں کا ایک طبقہ میری اس قدر فراخ دلی کو عیب کا درجہ دے دے لیکن میں اپنی جگہ مطمئن ہوں۔ اس لئے کہ کسی صنفِ ادب کے انتخاب میں جو مرتب کے فرائض ہونے چاہئیں ان سے (شاید) پوری طرح عہدہ برآ ہوا ہوں۔

رہا افسانوں کے انتخاب کا قصہ، وہ تو ہے ہی اپنی اپنی پسند کا معاملہ، لیکن میری پسند میں مشہور افسانہ نگاروں اور نامور نقادوں کی پسند بھی شامل ہے۔

افسانہ نگاروں اور نقادانِ کرام کے تعاون کے ساتھ پبلشرز دوستوں میں خصوصیت کے ساتھ مکتبہ اردو، مکتبہ جدید، نیا ادارہ کا بھی شکر گذار ہوں، ورنہ یہ نمبر اتنی جامعیت کے ساتھ پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔

نقوش کے ٹائیٹل ایشیا کے نامور مصور عبدالرحمٰن چغتائی کی اعجاز کاریوں کے شاہکار ہیں۔ ادارہ نقوش کو ان کی اشاعت پر فخر ہے۔
اسکیچ اور کتابوں کے چھوٹے چھوٹے ٹائیٹل نوجوان آرٹسٹ حاؔلی کے فن کے آئینہ دار ہیں۔

(مرتب)

اردو کی پہلی کہانی

رانی کیتکی

انشاءاللہ خاں انشاؔ

(۱)

داستانوں کا دور

کرتے تھے اور جو تنک تیوری چڑھی دیکھتے تھے تو بہت ڈرتے تھے۔ کیا ہوا جو اب وے بڑھ گئے اور اونچے پر چڑھ گئے۔ جن کے مانتے ہم بائیں پاؤں کے انگوٹھے سے ٹیکا لگاویں وہ مہاراجوں کا راجہ ہو جائے، کس کا منہ جو یہ بات ہمارے منہ پر لائے۔ بامھن نے جل بھن کے کہا اگلے بھی اسی بچار میں تھے اور بھری سبھا میں یہی کہتے تھے۔ ہم میں اون میں کچھ گوت کا تو میل نہیں ہے۔ پھر کنور کی ہٹ سے کچھ ہماری نہیں چلی، نہیں تو ایسی اوچھی بات کب ہمارے منہ سے نکلتی؟ یہ سنتے ہی مہاراج نے بامھن کے سر پر پھولوں کی چھڑی پھینک ماری اور کہا جو بامھن کے بھتیا کا دھڑکا نہ ہوتا تو تجھ کو ابھی چکی میں دلوا ڈالتا۔ اس کو لے جاؤ اور ایک اندھیری کوٹھری میں موند رکھو۔ جو اس بامھن پر بیتی سو سب کنور اودے بھان کے ماں باپ نے سنتے ہی لڑن کی ٹھان اپنے ٹھاٹھ باندھ کر دل بادل جیسے گھرآتے ہیں چڑھ آیا۔ جب دونوں مہاراجوں میں لڑائی ہونے لگی رانی کیتکی ساون بھادوں کے روپ رونے لگی اور دونوں کے جی پہ یہ آگئی۔ یہ کیسی چاہت ہے جس میں لہو برسنے لگا اور اچھی باتوں کو ترسنے لگا۔ کنور نے چپکے سے یہ کہہ بھیجا "اب میرا کلیجا ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے دونوں مہاراجوں کو آپس میں لڑنے دو۔ کسی ڈول سے جو ہو سکے تو تم مجھے اپنے پاس بلا لو، ہم تم دونوں مل کے کسی اور دیس کو نکل چلیں، جو ہونی ہو سو ہو۔ سر رہتا ہے جاتا جائے۔" ایک مالن جس کو پھول کلی کر سب پکارتے تھے اون نے اوس کنور کی چھٹی کسی پھول کی پنکھڑی میں لپیٹ سپیٹ کے رانی کیتکی تک پہنچا دی۔ رانی نے اوس چھٹی سے آنکھیں اپنی ملیں اور مالن کو ایک تھال بھر کے موتی دیے اور چھٹی کی پیٹھ پر اپنے منہ کی پیک سے یہ لکھا "اے میرے جی کے گاہک جو تو مجھے بوٹی بوٹی کر چیل کوے کو دے ڈالے تو بھی میری آنکھوں کو چین کلیجہ میں سکھ ہووے، پر یہ بات بھاگ چلنے[1] کی اچھی نہیں، ڈول سے بیٹا بیٹی کے باہر ہے جی تجھ سے پیار نہیں ایک تو کیا جو کہ دڑ جی جاتے رہیں پر بھاگنے کی کوئی بات ہمیں رچتی نہیں۔" یہ چھٹی پیک بھری جو کنور تک جا پہنچتی ہے وہ کئی ایک سینے کے ہیرے موتی پکھراج کے کھرا کچھ بھرے ہوئے تھال نچھاور کر کے لٹا دیتا ہے اور چھٹی سے اس کی بیکل[2] چوگنی پچگنی ہو جاتی ہے اور اس چھٹی کو اپنے گورے ڈنڈ پر باندھ لیتا ہے۔

(آنا جوگی مہندر گر کا کیلاس پہاڑ سے اور ہرن ہرنی کر ڈالنا
کنور اودے بھان اور اس کے ماں باپ کا)

جگت پر کاس اپنے گرو کو جو کیلاس پہاڑ پر رہتا تھا، یوں لکھ بھیجتا ہے "کچھ ہماری سہائے کیجیے[3] مہا کٹھن ہم بپتا ماروں کو پڑی ہے، راجہ سورج بھان کو اب یہاں تک باؤ بہک نے لیا ہے جو انھوں نے ہم سے مہاراجوں سے ناتے کا ڈول کیا ہے۔ کیلاس پہاڑ ایک ڈال چاندی کا ہے، اوس پر راجہ جگت پر کاس کا گرو جس کو اندرلوک کے لوگ سب مہندر گر کہتے تھے۔ دھیان گیان میں کوئی نوے لاکھ اتیتوں[4] کے ساتھ ٹھاکر کے بھجن میں دن رات رہا کرتا تھا۔ سونا روپا تانبے رانگے کا بنانا تو کیا اور گٹکا منہ میں لے کے اڑنا ور ے رہے، اس کی اور باتیں اس اس ڈھب کی دھیان میں تھیں جو کچھ کہنے سننے سے باہر ہیں۔ مینہ سونے روپے کا برسا دینا اور جس روپ میں چاہنا ہو جانا سب کچھ اس کے آگے ایک کھیل تھا اور گانے میں جہادیو جی چھوٹ سب اوس کے آگے کان پکڑتے تھے۔ سرسوتی جس کو ہندو کہتے ہیں آدشکتی، اون نے بھی اسی سے کچھ گنگنانا سیکھا تھا۔ اس کے سامنے چھ راگ چھتیس راگنیاں آٹھ پہر روپ بندھوں کا سا دھرے ہوئے اس کی سیوا میں ہاتھ لے کھڑی رہتی ہیں۔ وہاں اتیتوں کو یہ کہہ کر پکارتے تھے بھیروگر، بھیبھاس گر، ہنڈولگر، میگھ ناتھ کدار ناتھ دیپک داس، جوتی سروپ، سارنگ روپ اور اتیتنیاں[5] اس ڈھب سے کہلاتی تھیں، گوجری، توڑی، اساوری، گوری، مالسری بلاول، جب چاہتا تھا ادھر میں سنگاسن پر بیٹھ اوڑ لے پھرتا تھا اور نوے لاکھ اتیت گٹکے اپنے اپنے منہ لیے ہوئے گیروے بستر[6] پہنے جٹا بکھیرے اس کے

[1] (ن) تو اچھی۔ [2] (ن) جتنی اس کی بیکل تھی۔ [3] مدد۔ [4] فقیروں، درویشوں۔
[5] (ن) اتیتنیں۔ [6] لباس۔

ساتھ ہوتے تھے۔ جس گھڑی راجہ جگت پرکاس کی چھٹی ایک بھگوڑے[1] پہنچتا ہے جوگی مہندر گرہ ایک چنگھاڑ مار کر دل بادلوں کو تھلکا دیتا ہے۔ باگھمبر پر بیٹھ بھبوت اپنے منہ کو مل کچھ کچھ پڑھنت کرتا ہوا باو کے گھوڑے کی پیٹھ پر لاگا اور سب اتیت مرگ چھالوں پر بیٹھے ہوئے گٹکے منہ میں لئے ہوئے بول اوٹھے، "گورکھ جاگا" ایک آنکھ کی جھپک میں وہاں آن پہنچتا ہے جہاں دونوں مہاراجوں میں لڑائی ہو رہی تھی۔ پہلے تو ایک کالی آندھی آئی پھر اولے برسے پھر ایک بڑی آندھی آئی کسی کو اپنی سدھ بدھ نہ رہی ہاتھی گھوڑے اور جتنے لوگ اور بھیڑ بھاڑ راجہ سورج بھان کی تھی کچھ نہ سمجھا گیا کدھر گئی اور انھیں کون اٹھالے گیا اور راجہ جگت پرکاس کے لوگوں پر اور رانی کیتکی جی کے لوگوں پر کیوڑے کی بوندوں کی ننھی ننھی پھوار سی پڑنے لگی۔ جب یہ سب کچھ ہوچکا تو گرو جی نے اپنے اتیتوں سے کہہ دیا اودے بھان سورج بھان، لچھمی باس ان تینوں کو ہرن ہرنی بنا کے کسی بن چھوڑ دو اور جو ان کے ساتھی ہوں ان سبھوں کو توڑ پھوڑ دو۔ جیسا کچھ گرو جی نے کہا جھٹ پٹ وہی کیا۔ بپت کا مارا کنور اودے بھان جی اور اس کا باپ مہاراجہ سورج بھان اور اس کی ماں مہارانی لچھمی باس ہرن ہرنی بن بن کی ہری ہری گھاس کئی برس تک چگتے رہے اور اوس بھیڑ بھڑکے کا تو کچھ تھل بیڑا نہ ملا جو کدھر گئی اور کہاں تھی۔ یہاں کی یہاں ہی رہنے دو۔ آگے سنو اب رانی کیتکی کی بات۔ اور مہاراجہ جگت پرکاس کی سہتی[2] ان کے گھر کا گھر گرو جی کے پاؤں پر گرا اور سب نے سر جھکا کر کہا مہاراج یہ آپ نے بڑا کام کیا ہم سب کو رکھ لیا جو آپ آج آنہ پہنچتے تو کیا رہا تھا، سب نے مرمٹنے کی ٹھان لی تھی، ان پاپیوں سے کچھ نہ چلے گی یہ جان لی تھی۔ راج پاٹ سب ہمارا اب نچھاور کر کے جس کو جا ہے دے ڈالئے ہم سب کو اتیت بنا کے اپنے ساتھ لیجئے۔ راج ہم سے نہیں تھمتا، سورج بھان کے ہاتھ سے آپ نے بچایا اب کوئی ان کا چچا چندر بھان چڑھ آویگا تو کیونکر بچنا ہوگا، اپنے آپ میں تو سکت نہیں پھر ایسی راجہ کا پھٹے منہ، ہم کہاں تک آپ کو ستایا کریں گے۔ یہ سن کے جوگی مہندر گرہ نے کہا تم سب ہمارے بیٹا بیٹی ہو۔ آنندیں کرو دندناؤ سکھ چین سے رہو، ایسا وہ کون ہے جو تمھیں آنکھ بھر اور ڈھب سے دیکھ سکے۔ یہ بگھمبر[3] اور یہ بھبوت ہم نے تمھیں دیا آگے جو کچھ ایسی کا ڑ[4] پڑے تو اس بگھمبر میں سے ایک رونگٹا توڑ کر آگ دھر کے پھونک دیجو، یہ رونگٹا پھونکنے نہ پاویگا جو ہم آن پہنچیں گے۔ رہا بھبوت سو اس لئے ہے جو کوئی چاہے جب اسے انجن کرے وہ سب کچھ دیکھ لے اور اسے کوئی نہ دیکھے، جو چاہے کرے۔ گرو مہندر گر جن کے پانوں پوجئے اور دھن مہاراج کہئے ان سے تو کچھ چھپاؤ نہیں، مہاراجہ جگت پرکاس ان کو مورچھل کرتے ہوئے رانیوں کے پاس لے گئے۔ سونے روپے کے پھول ہیرے موتی گود بھر بھر سب نچھاور کئے اور ماتھے رگڑے۔ انھوں نے سب کی پیٹھیں ٹھونکیں۔ رانی کیتکی نے بھی ڈنڈوت کی پر جی ہی جی میں بہت سی گرو جی کو گالیاں دیں۔ گرو جی سات دن سات راتیں یہاں رہ کے راجہ جگت پرکاس کو سنگھاسن میں بٹھا کر اپنے اس بگھمبر پر اسی ڈول سے کیلاس پہاڑ پر آ دھمکے۔ راجہ جگت پرکاس اپنے اگلے ڈھب سے راج کرنے لگے۔

(رانی کیتکی کا مدن بان کے آگے رونا پچھلی باتوں کا

دھیان کر کے ہاتھ جی سے دھونا اپنی بولی کی دھن میں)

رانی کو بہت سی بے کلی تھی   کب سوجھتی[5] وہ بری بھلی تھی

چپکے چپکے کراہتی تھی   جینا اپنا نہ چاہتی تھی

کہتی تھی کبھی ارے مدن بان   ہے آٹھ پہر مجھے وہی دھیان

---

[1] بھاگا ہوا۔ پناہ گزیں۔ [2] سیت۔ [3] (ن) باگھمبر۔ شیر کی کھال۔ [4] سختی، مشکل۔

[5] (ن) سوجھتی۔ [6] (ن) کچھ۔

یاں پاس کسے بھلا کسے بھوکھ　　دیکھوں ہوں وہی ہرے ہرے روکھ
ٹپکے کا ڈر ہے اب یہ کبھی　　چاہت کا گھر ہے اب یہ کبھی
امرویوں میں ان کا وہ اترنا　　وہ رات کا سائیں سائیں کرنا
اور چپکے سے اٹھ کے میرا جانا　　اور تیری[۱] وہ چاہ کا جتانا
ان کی وہ اتار انگوٹھی لینی　　اور اپنی انگوٹھی ان کو دینی
آنکھوں میں سما میری وہ پھر رہی ہے　　جی کا جو روپ تھا وہی ہے
کیوں کر انہیں بھولوں کیا کروں میں　　ماں باپ سے کب تلک ڈروں میں
اب میں نے سنا ہے اے مدن بان　　بن بن کے ہرن ہوئے ہیں بے جان
چرتے ہوں گے ہری ہری دوب　　کچھ تو بھی پہنچ سوچ میں ڈوب
میں اپنی گئی ہوں چوکڑی بھول　　مت مجھ کو سونگھا یہ ڈھنڈ[۲] ہے پھول
پھولوں کو اٹھا کے یہاں سے لے جا　　سو ٹکڑے ہوا میرا کلیجا
بکھرے جی کو نہ کر اکٹھا　　ایک گھاس کا لا کے رکھ مجھے گٹھا[۳]
ہریالی اسی کی دیکھ لوں میں　　کچھ اور تو تجھ کو کیا کہوں میں
ان آنکھوں میں ہے بھڑک ہرن کی　　پلکیں ہوئیں جیسی گھاس بن کی
جب دیکھئے ڈبڈبا رہی ہیں　　اوسیں آنسو کی چھا رہی ہیں

یہ بات جو جی میں گڑ گئی ہے
ایک اوس سی مجھ پہ پڑ گئی ہے

اسی ڈول سے جب اکیلی ہوتی تھی تب مدن بان کے ساتھ ایسے ہی موتی پروتی تھی ——

(بھبوت مانگنا رانی کیتکی کا اپنی ماں رانی کام لتا سے آنکھ مچول کھیلنے کے لئے اور روٹھ رہنا اور راجہ جگت پرکاس کا بلانا اور پیار سے کچھ کچھ کہنا اور وہ بھبوت دینا۔)

ایک رات رانی کیتکی نے اپنی ماں کام لتا سے بہلاوے میں ڈال کے یہ پوچھا گرو گسائیں جھندر گر نے جو بھبوت بابا کو دیا تھا وہ کہاں رکھا ہوا ہے اور اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس کی ماں نے کہا میں تیری واری تو کیوں پوچھتی ہے۔ رانی کیتکی کہنے لگی آنکھ مچول کھیلنے کے لئے چاہتی ہوں، جب اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلوں اور چور بنوں تو کوئی مجھ کو پکڑ نہ سکے۔ رانی کام لتا نے کہا وہ کھیلنے کے لئے نہیں ہے، ایسے لٹکے کسی برے دن کے سنبھال لینے کو ڈال رکھتے ہیں۔ کیا جانے کوئی گھڑی کیسی ہے ایسی نہیں۔ رانی کیتکی اپنی ماں کی اس بات سے اپنا منہ تھتھا کے اٹھ گئی اور دن بھر بن کھائے پئے پڑی رہی مہاراج نے جو بلایا تو کہا مجھے رچ نہیں۔ تب رانی کام لتا بول اٹھیں، اجی کچھ تم نے سنا بھی، بیٹی تمہاری آنکھ مچول کھیلنے کے لئے وہ بھبوت گرو جی کا دیا ہوا مانگتی تھی، میں نے نہ دیا اور کہا لڑکی یہ لڑکپن کی باتیں اچھی نہیں، کسی برے دن کے لئے گرو جی دے گئے ہیں۔ اسی پہ مجھ سے روٹھی ہے، بہتیر بہلاتی

---

۱ (ن) تیرا۔ ۲ شوخ رنگ کے پھول۔ ۳ اشتہا

بیٹھی رہتی ہوں۔ مانتی نہیں۔ مہاراج نے کہا بھبوت تو کیا مجھے تو اپنا جی بھی اس سے پیارا نہیں۔ اس کی ایک گھڑی بھر کے بہل جانے پر ایک جی تو کیا جو لاکھ جی ہوں تو دے ڈالئے۔ رانی کیتکی کو ڈبیا میں سے تھوڑا سا بھبوت دیا۔ کئی دن تک آنکھ مچولی اپنے ماں باپ کے سامنے سہیلیوں کے ساتھ کھیلتی، سب کو ہنساتی رہتی، جو سو سو تھال موتیوں کے نچھاور ہوا کئے کیا کہوں ایک چہل تھی جو کہئے تو کروڑوں پوتھیوں میں جیوں کے تیوں نہ آسکے۔

(رانی کیتکی کا چاہت سے بیکل ہو اپھرنا اور مدن بان
کا ساتھ دینے سے نہیں کرنا۔)

ایک رات رانی کیتکی اسی دھیان میں اپنی مدن بان سے کہہ اٹھی اب میں نگوڑی لاج سے کٹ کرتی ہوں تو میرا ساتھ دے۔ مدن بان نے کہا کیوں کر، رانی کیتکی نے وہ بھبوت کا لینا اسے جتایا[۱] اور یہ سب سنایا سب یہ آنکھ مچولی کی چھلیں میں نے اسی دن کے لئے کر رکھیں تھیں۔ مدن بان کہنے لگی میرا کلیجہ تھرتھرانے لگتا ہے[۲] یہ ماناتم اپنی آنکھوں میں اس بھبوت کا انجن کر لوگی اور میرے بھی لگا دو گی تو ہمیں تمہیں کوئی نہ دیکھے گا اور ہم تم سب کو دیکھیں گے۔ پر ایسے ہم کہاں سے جی چلے ہیں جو بن لئے ساتھ جوبن ساتھ بن بن بھٹکا کریں اور ہرنوں کے سینگوں میں دونوں ہاتھ ڈال کے لٹکا کریں اور جس کے لئے یہ سب کچھ ہے سو وہ کہاں اور ہو وے تو کیا جانئے جو یہ رانی کیتکی جی اور یہ مدن بان نگوڑی نچی کسوٹی ان کی سہیلی ہے چولھے اور بھاڑ میں جائے۔ چاہت جس کے لئے ماں باپ راج پاٹ سکھ نیند لاج کو چھوڑ کر ندی کے کچھاڑوں میں پھرنا پڑے سو بھی بے ڈول جو وہ اپنی روپ میں ہوتے تو بھلا تھوڑا بہت کچھ آسرا تھا۔ نہ جی یہ ہم سے نہ ہو سکے گا، مہاراج جگت پرکاس اور مہارانی کام لتا کا ہم جان بوجھ کر گھر اجاڑیں اور ہرکا کے ان کی بیٹی جو اکلوتی لاڈلی ہے اس کو لے جاویں اور جہاں تہاں اسے بھٹکا بناس تی کھلاویں اور اپنے چونڈے کو ہلاویں۔ اے جی اس دن تمہیں یہ بوجھ نہ آئی تھی جب تمہارے اور اس کے ماں باپ میں لڑائی ہو رہی تھی اس نے اس مالن کے ہاتھ تمہیں لکھ بھیجا تھا بھاگ چلیں تب تو اپنی منہ کی پیک سے اس کی چٹھی کی پیٹھ پر جو لکھا تھا سو کیا بھول گئی۔ تب تو وہ تاؤ بھاؤ دکھایا تھا اب جو وہ کنور اودے بھان اور ان کے ماں باپ تینوں جنے بن بن کے ہرن ہرنی بنے ہوئے کیا جانئے کدھر ہوں گے ان کی دھیان پر وہ کر بیٹھی جو کسی نے تمہارے گھرانے بھر میں نہیں کی۔ اس بات پر ماٹی ڈال دو نہیں تو پچھتاؤ گی اور اپنا کیا پاؤ گی۔ مجھ سے تو کچھ نہ ہو سکے گا۔ تمہاری کچھ اچھی بات ہوتی ہو تو جیتے جی میرے منہ سے نہ نکلتی پر یہ بات میرے پیٹ میں نہیں پچ سکتی۔ تم ابھی الھڑ ہو تم نے کچھ دیکھا نہیں جو اسی بات پر تمہیں سچ مچ ڈھلتا دیکھوں گی تو تمہارے ماں باپ سے کہہ کر وہ بھبوت جو وہ نگوڑا بھوت مچھندر کا پوت اودھو تیشے گیا ہے ہاتھ مروڑ وا کے چھنوا لوں گی۔ رانی کیتکی نے یہ رکھائیاں مدن بان کی سن کر ہنس کے ٹال دیا اور کہا جس کا جی ہاتھ میں نہ ہو وہ ایسی ایسی لاکھوں سوچتی ہے[۳] پر کہنے اور کرنے سے بہت سا پھیر ہے، یہ بھلا کوئی اندھیرا ہے، جو ماں باپ کو چھوڑ ہرنوں کے پیچھے پڑی دوڑتی پھروں۔ پر ارے تو بڑی باولی چڑیا ہے جو تو نے یہ بات ٹھیک ٹھاک کر جان لی اور مجھ سے لڑنے لگی۔

(رانی کیتکی کا بھبوت آنکھوں میں لگا کر گھر سے باہر نکل جانا
اور سب چھوٹے بڑوں کا تلملانا)

دس پندرہ دن پیچھے ایک رات رانی کیتکی بن کہے مدن بان کے وہ بھبوت آنکھوں میں لگا کر باہر نکل گئی۔ اور کچھ کہنے میں نہیں آتا جو ماں باپ پر ہوئی۔ یہ بات ٹھہرا دی گئی جی نے کچھ سمجھ کر رانی کیتکی کو اپنے پاس بلا لیا ہو گا مہاراجہ جگت پرکاس اور مہارانی کام لتا راج پاٹ سب

---

۱ (ن) چتایا۔ ۲ (ن) ہیں۔ ۳ (ن) تجھ سے ایسی لاکھوں سوکھتی ہے۔
۴ (ن) پیچھے دوڑتی کر چھال مارتی۔

کچھ اس بروگ[1] میں جھوڑ جھاڑ ایک پہاڑ کی چوٹی پر جا بیٹھے اور کسی کو اپنے لوگوں میں سے راج تھامنے کے لئے چھوڑ گئے[2]۔ تب مدن بان نے وہ سب باتیں کھولیاں۔ رانی کیتکی کے ماں باپ نے یہ کہا اری مدن بان جو تو بھی اس کے ساتھ ہوتی[3] تو کچھ ہمارا جی ٹھہرتا۔ اب جو وہ تجھے لے جائیں تو، تو کچھ ہچر مچر نہ کیجیو، ان کے ساتھ ہو لیجیو، جتنا بھبوت ہے تو اپنے پاس رکھ، ہم کیا اس راکھ کو چولہے میں ڈالیں گے۔ گرو جی نے تو دونوں راجوں کا کھوج کھو دیا، کنور اودے بھان اور اس کے ماں باپ دونوں بے ٹھکانے[4] ہیں اور جگت پرکاس اور کام لتا کو یوں تلپٹ کیا۔ بھبوت نہ ہوتا تو یہ باتیں کاہے کو سامنے آتیں۔ مدن بان بھی ان کے ڈھونڈھنے کو نکلی، انجن لگائے ہوئے، رانی کیتکی کہتی ہوئی چلی جاتی تھی۔ بہت دنوں پیچھے کہیں رانی کیتکی بھی ہرنوں کی ڈاروں میں اودے بھان، اودے بھان، چنگھاڑتی ہوئی آنکلی۔ جو ایک نے ایک کو تاڑ کر یوں پکارا، اپنی اپنی آنکھیں دھو ڈالو، ایک ڈبرے پر بیٹھ کر دونوں کی مٹ بھیڑ ہوئی، گلے مل کے ایسی روئیاں جو پہاڑوں میں کوک سی پڑ گئی۔

دوہا اپنی بولی کا

چھا گئی ٹھنڈی سانس جھاڑوں میں
پڑ گئی کوک سی پہاڑوں میں

دونوں جنیاں ایک ٹیلے پر اچھی سی چھاؤں تاڑ کے آ بیٹھیاں اپنی اپنی باتیں دہرانے لگیں۔

(بات چیت رانی کیتکی کی مدن بان سے)

رانی کیتکی نے اپنی بیتی سب کہی اور مدن بان وہی اگلا جھینکنا جھینکا کی اور ان کے ماں باپ نے ان کے لئے جو جوگ سادھا اور جو بروگ لیا تھا سب کہا۔ جب مدن بان یہ سب کہہ چکی تو پھر ہنسنے لگی۔ رانی کیتکی یہ دوہا لگی پڑھنے۔

ہم نہیں ہنسنے کو رُکتے جس کا جی چاہے ہنسے
ہے وہی اپنی کہاوت آ پھنسے جی آ پھنسے
اب تو اپنے پیچھے سارا جھگڑا جھانٹا لگ گیا
پاؤں کا کیا ڈھونڈھتی ہے جی میں کانٹا لگ گیا

مدن بان کچھ رانی کیتکی کے آنسو پونچھنے سے چلی۔ ان نے یہ بات ٹھہرائی جو تم کہیں ٹھہرو تو میں تمہارے اجڑے ہوئے ماں باپ کو چپ چاپ یہیں لے آؤں اور انہیں سے یہ بات ٹھہراؤں۔ گسائیں مہندر گر جس کے یہ سب کرتوت ہیں وہ بھی انہیں دونوں اجڑے ہوؤں کی مٹھی میں ہے۔ اب بھی جو میرا کہا تمہارے دھیان چڑھے تو گئے ہوئے دن پھر پھر سکتے ہیں، پر تمہاری کچھ بھاوے نہیں، ہم کیا پڑے بکتے ہیں۔ میں اس پر بیڑا اٹھاتی ہوں۔ بہت دنوں میں رانی کیتکی نے اس پر اچھا کہا اور مدن بان کو اپنے ماں باپ کے پاس بھیجا اور چٹھی اپنے ہاتھ سے لکھ بھیجی جو آپ سے کچھ ہو سکے تو اس جوگی سے یہ ٹھہرا کے آویں۔

(مہاراج اور مہارانی کے پاس مدن بان کا پھر آنا اور چت چاہی بات کا سنانا۔)

مدن بان رانی کیتکی کو چھوڑ کر راجہ جگت پرکاس اور رانی کام لتا جس پہاڑ پر بیٹھے ہوئے تھے وہاں جھٹ سے آدیس[5] کر کے آ کھڑی ہوتی ہے اور کہتی ہے لیجئے آپ کا گھر نئے سر سے بسا اور اچھے دن آئے رانی کیتکی کا ایک بال بھی بیکا نہ ہوا، انہیں کے ہاتھ کی یہ چٹھی لائی ہوں آپ

---

[1] جدائی۔ [2] دن گئے۔ [3] دن تو ایک سے دو بھلی تھی۔ [4] بے ٹھکانے۔ [5] جوگیوں کا سلام۔

پڑھ لیجئے آگے سو چاہے سو کیجئے۔ مہاراج نے اسی بگھمبر میں سے ایک رونگٹا توڑ کر آگ پر دھر دیا۔ بات کی بات میں گسائیں مہندر گر آ پہنچے اور جو کچھ یہ نیا سانگ جوگی اور جوگن کا آیا تھا آنکھوں دیکھا۔ سب کو چھاتی سے لگایا اور کہا بگھمبر اسی لئے میں سونپ گیا تھا جو تم پر کچھ ہووے تو اس کا ایک رونگٹا پھونک دیجیو۔ تمہارے گھر کی یہ گت ہو گئی اب تک تم کیا کر رہے تھے اور کن نیندوں سو رہے تھے۔ پر تم کیا کرو وہ کھلاڑی جو روپ چاہے سو دکھاوے، اور جو ناچ چاہے سو نچاوے، بھبوت لڑکی کو کیا دینا تھا۔ ہرن ہرنی اودے بھان اور سورج بھان اس کے باپ کو اور بچھی جاس کو میں نے کیا تھا، میرے آگے ان تینوں کو جیسے کا تیسا کرنا کچھ بڑی بات نہ تھی۔ اچھا، ہونی سو ہوئی، اب چلو اٹھو اپنے راج پر براجو اور بیاہ کا ٹھاٹھ کرو۔ اب تم اپنی بیٹی کو سمیٹو، کنور اودے بھان کو میں نے اپنا بیٹا کیا اور اس کو لے کے میں بیاہنے چڑھوں گا۔ مہاراج یہ سنتے ہی اپنے راج کی گدی پر آ بیٹھے اور اسی گھڑی کہہ دیا سارے چھتوں اور کوٹھوں کو گوٹے سے منڈھو اور سونے روپے کے ورق سب جھاڑ اور پہاڑوں پر باندھ دو اور پیڑوں میں موتی کی لڑیاں گوندھو اور کہہ دو چالیس دن چالیس رات تک جس گھر ناچ آٹھ پہر نہ رہے گا اس گھر والے سے میں روٹھا رہوں گا اور جانوں گا یہ میرے دکھ سکھ کا ساتھی نہیں۔ چھ مہینے جد[1] کوئی چلنے والا کہیں نہ ٹھہرے اور رات دن چلا جائے اس ہیر پھیر میں وہ راج سب کہیں تھا یہی ڈول ہو گیا۔

(جانا مہاراج اور مہارانی اور گسائیں مہندر گر
کا رانی کیتکی کے لینے کے لئے۔)

پھر گروجی اور مہاراج اور مہارانی، مدن بان کے ساتھ وہاں آ پہنچے جہاں رانی کیتکی چپ چاپ سن کھینچے بیٹھی تھی۔ گروجی نے رانی کیتکی کو اپنے گود میں لے کے کنور اودے بھان کا چڑھاوا چڑھا دیا اور کہا تم اپنے ماں باپ کے ساتھ اپنے گھر سدھارو، اب میں لینے بیٹے کنور اودے بھان کو لئے آتا ہوں۔ گروجی گسائیں جن کو ڈنڈوت ہے سو تو یوں سدھارتے ہیں آگے جو ہو گی سو کہنے میں آوے گی، یہاں کی یہ دھوم دھام اور پھیلاوا دھیان کیجئے۔ مہاراجہ جگت پرکاس نے اپنے سارے دیس میں کہا یہ پکار دیں جو یہ نہ کرے گا اس کی بری گت ہو گی۔ گاؤں میں آمنے سامنے ترپولئے بنا بنا کے سوہے[2] کپڑے ان پر لگا دو اور گوٹ دھنک کی اور گوکھرو روپہلی سنہری اور کرنیں اور ڈانک ٹاٹک ٹک رکھو اور جتنے بڑ پیپل کے پرانے پرانے پیڑ جہاں جہاں ہوں ان پر گوٹوں کے پھولوں کے سہرے ہرے بھرے ایسے جس میں سر سے لگا جڑ تک ان کی ٹھنک اور جھلک پہنچے باندھ دو۔ پودوں نے رنگ کے سوہے جوڑے پہنے، سو پاؤں ڈالیوں نے توڑے پہنے۔ بوٹی بوٹی نے پھول پھل کے گہنے، جو بہت نہ تھے تو تھوڑے تھوڑے پہنے، جتنے ڈہڈہے اور ہریاول میں لہلہے پات تھے اپنے اپنے ہاتھوں میں پہچی مہندی کی جاوٹ سجاوٹ کے ساتھ جتنی سماوٹ میں سما سکی کر لی اور جہاں تک نول[3] بیاہی دلہن ننھی ننھی پھلیوں کے اور سہاگنیں نئی نئی کلیوں کے جوڑے پنکھڑیوں کے پہنے ہوئی تھیں، سب نے اپنی اپنی گود سہاگ پیار کے پھولوں اور پھلوں سے بھر لی اور تین برس کا پیسا جو لوگ دیا کرتے تھے اس راجہ کے راج بھر میں جس جس ڈھب سے ہو سکا کھیتی باڑی کر کے، ہل جوت کے اور کپڑا لتا بیچ کھوچ کے، سو سب ان کو چھوڑ دیا۔ اپنے گھر دن میں بناؤ کے ٹھاٹھ کریں۔ اور جتنے راج بھر میں کوئیں تھے کھنڈسالوں کی کھنڈ ساری ان میں انڈیلی گئیں اور سارے جنگلوں میں اور پہاڑ تلیوں میں لالٹینوں کی بہار جھم جھماہٹ راتوں کو دکھائی دینے لگی، اور جتنی جھیلیں تھیں ان سب میں کسم اور ٹیسو اور ہار سنگار پڑ گیا اور کیسری بھی تھوڑی تھوڑی گھولنے میں آ گئی اور پھننگ سے لگا جڑ تک جتنے جھاڑ جھنکاڑوں میں پتے اور پتوں کے بندھے چھوٹے تھے ان میں روپہلے سنہرے ڈانک گوند لگا کے چپکا دئے۔ اور کہہ دیا گیا جو سہی پگڑی اور سوہے باگے بن کوئی کسی ڈول روپ سے نہ پھرے چلے اور جتنے گویے، نچویے[4]، بھانڈ بھگتیے، ڈھاڑی، رہس دھاری اور سنگیت ناچتے ہوئے ہوں سب کو کہہ دیا، جن جن گاؤں میں جہاں جہاں ہوں

۱۔ جب۔ ۲۔ لال۔ ۳۔ نئی۔ ۴۔ (ن) نچنئے۔

اپنے اپنے ٹھکانوں سے نکل کر اچھے اچھے بچھونے بچھا کر گاتے بجاتے دھومیں مچاتے ناچتے کودتے رہا کریں۔

(ڈھونڈھنا گوسائیں مہندر گر کا کنور اودے بھان
اور اس کے ماں باپ کو اور نہ پانا اور بہت تلملانا
اور راجہ اندر کا اس کی چٹھی پڑھ کے آنا)

یہاں کی بات اور چہلیں جو کچھ ہیں سو یہیں رہنے دو اب آگے یہ سنو۔ جوگی مہندر گر اور اس کے نوے لاکھ اتیتوں نے سارے بن کے بن چھان مارے کہیں کنور اودے بھان اور اس کے ماں باپ کا ٹھکانا نہ لگا۔ تب ان نے راجہ اندر کو چٹھی لکھ بھیجی۔ اس چٹھی میں یہ لکھا ہوا تھا۔
تینوں جنوں کو میں نے ہرن اور ہرنی کر ڈالا تھا۔ اب ان کو ڈھونڈھتا پھرتا ہوں کہیں نہیں ملتے اور میری جتنی سکت تھی اپنے سے کر چکا ہوں اور اب میرے منہ سے نکلا کنور اودے بھان میرا بیٹا اور میں اس کا باپ سسرال میں سب بیاہ کے ٹھاٹھ ہو رہے ہیں اب مجھ پر بپت[1] گاڑھی ہے جو تم سے ہو سکے سو کرو۔ راجہ اندر گرو مہندر گر کے دیکھنے کو سب اندراسن سمیت آن پہنچا[2] اور کہا جیسا آپ کا بیٹا ویسا میرا بیٹا۔ آپ کے ساتھ میں سارے اندر لوک کو سمیٹ کے کنور اودے بھان کو بیاہنے چڑھوں گا۔ گسائیں مہندر گر نے راجہ اندر سے کہا ہماری آپ کی ایک ہی بات ہے پر کچھ ایسی سوجھائیے جس میں وہ اودے بھان ہاتھ آویں یہاں جتنے گوتے اور گائن ہیں ان سب کو ساتھ لے کے ہم اور آپ سارے بنوں میں پھریں کہیں نہ کہیں ٹھکانا لگ جائے گا۔

(ہرن اور ہرنیوں کے کھیل کا بگڑنا اور نئے سر
سے کنور اودے بھان کا روپ پکڑنا)

ایک رات راجہ اندر اور گسائیں مہندر گر نکھری ہوئی چاندنی میں بیٹھے راگ سن رہے تھے کروڑوں ہرن آس پاس ان[3] کے راگ کے دھیان میں چوکڑی بھولے سر جھکائے کھڑے تھے۔ اس میں راجہ اندر نے کہا کہ سب ہرنوں پر پڑھ کے میری سکت گرو کے بھگت پھر ومنتر ایسری[4] باچا، ایک ایک چھینٹ پانی کا دو۔ کیا جانے وہ پانی کیا تھا پانی کے چھینٹے کے ساتھ ہی کنور اودے بھان اور ان کے ماں باپ تینوں جنے ہرنوں کا روپ چھوڑ کر جیسے تھے ویسے ہو جاتے ہیں۔ مہندر گر اور راجہ اندر ان تینوں کو گلے لگاتے ہیں اور پاس اپنے بڑی آؤ بھگت سے بٹھاتے ہیں اور وہی پانی کا گھڑا اپنے لوگوں کو دے کر وہاں پہنچوا[5] دیتے ہیں جہاں سر منڈواتے ہی اولے پڑے تھے۔ راجہ اندر کے لوگ جو پانی کے چھینٹے وہی ایسری باچ پڑھ کے دیتے ہیں جو جو مرے تھے سب اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور جو جو ادھ موئے ہیں کے بھاگ بچے تھے سب سمٹ آتے ہیں۔ راجہ اندر اور مہندر گر کنور اودے بھان اور راجہ سورج بھان اور رانی لچھمی باس کو لے کر ایک اڑن کھٹولے پر بیٹھ کر بڑی دھوم دھام سے ان کے[6] اپنے راج پر بیٹھا کر بیاہ کے ٹھاٹھ کرتے ہیں۔ پسیریوں ہیرے موتی ان سب پر نچھاور ہوتے ہیں۔ راجہ سورج بھان اور اودے بھان اور ان کی ماں رانی لچھمی باس چت چاہی آس پا کر پھولے اپنے آپ میں نہیں سماتے اور سارے اپنے راج کو یہی کہتے جاتے ہیں جو[7] زرے بھونرے کے منہ کھول دو اور جس جس کو جو جو اکت[8] سوجھے بول دو۔ آج کے دن سے اور کون سا دن ہوگا ہماری آنکھوں کی پتلیوں کا جس سے چین ہے۔ اس لاڈلے اکلوتے کا بیاہ اور ہم تینوں کا ہرنوں کے روپ سے نکل کر پھر راج پر بیٹھنا پہلے تو یہ چاہیے جن جن کی بیٹیاں بن بیاہیاں کنواریاں بالیاں ہوں ان سب کو اتنا کر دو کہ جو اپنی جس جس چاؤ چوچلے سے چاہیں اپنی گڑیاں سنوار کے اٹھا دیں اور جب تک جیتی رہیں ہمارے یہاں سے کھایا پکایا کریں اور سب راج بھر کی بیٹیاں سدا سہاگنیں بنی رہیں اور سوہے

---

[1] مشکل۔ [2] اندر کا تخت۔ اندر کا اکھاڑا۔ [3] (ن) ویسا۔ [4] (ن) آن۔ [5] (ن) ایسرو باچ۔
[6] (ن) پہنچا۔ [7] (ن) کو۔ [8] کھنے۔ تہہ خانے۔ [9] مشکل۔

رانے[1] چھت کبھی کوئی کچھ نہ پہنا کریں اور سونے روپے کے گوادھ گنگا جمنی سب گھروں میں لگ جائیں، سب کونوں کے ماتھوں پر کیسر اور چندن کے ٹیکے لگے ہوں اور جتنے پہاڑ ہمارے دیس میں ہوں اتنے ہی روپے سونے کے پہاڑ آمنے سامنے کھڑے ہو جائیں اور سب ڈانگوں[2] کی چوٹیاں موتیوں کی مانگ سے بن مانگے بھر جائیں اور پھولوں کے گہنے اور بندن واروں سے سب جھاڑ پہاڑ لدے پھندے رہیں اور اس راج سے لگا اس راج تک ادھر میں چھت سے باندھ دو چپا چپا کہیں نہ رہے جہاں بھیڑ بھڑکا دھوم دھڑکا نہ ہونا چاہیے۔ پھول اتنے بہت سارے کھنڈ جائیں جو ندیاں جیسی سچ مچ پھول کی بہتیاں ہیں یہ سمجھا جائے۔ اور یہ ڈول کر دو جدھر سے دولہا کو بیاہنے چڑھیں سب لاڑلی اور ہیرے اور پکھراج کی ادھر ادھر کنول کی ٹٹیاں بن جائیں اور کیاریاں سی ہو جائیں جن کے بیچوں بیچ سے ہو نکلیں اور کوئی ڈانگ اور پہاڑتلی کا اتار چڑھاؤ ایسا دکھائی نہ دے جس کی گود پھولوں اور پھول پھلوں سے بھری پھولی نہ ہو۔

(راجہ اندر کا ٹھاٹھ کرنا اودے بھان کے بیاہنے کیلئے)

راجہ اندر نے کہہ دیا وہ رنڈیاں چلبلیاں جو اپنے مدھ میں اڑ چلیاں ہیں ان سے کہہ دو سولہ سنگار، بال بال گج موتی پرو، اپنے اپنے اچرج اور اچنبھے کے اڑن کھٹولوں کے اس راج سے اس راج تک ادھر میں چھت سی باندھ دو، پر کچھ ایسے روپ سے اڑ چلو جو اڑن کھٹولوں کی کیاریاں اور پھلواریاں سی سیکڑوں کوس تک ہو جائیں اور اوپر ہی اوپر مردنگ، بین، جلترنگ، منہ چنگ، گھونگرو، تبلے، گھنٹ تال اور سیکڑوں اس ڈھب کے انوکھے باجے بجتے آئیں اور ان کیاریوں کے بیچ میں ہیرے پکھراج ان بندھے موتیوں کے جھاڑ اور لال ٹینوں کی بھیڑ بھاڑ کی جھم جھماہٹ دکھائی دے اور انہیں لال ٹینوں میں سے ہتھ پھول، پھلجھڑیاں، جاہی، جوہیاں، کدم، گیندا، چنبیلی اس ڈھب سے چھوٹنے لگیں دیکھنوں کی چھاتیوں کے کواڑ کھل جائیں اور پٹاخے جو اچھل اچھل کے پھوٹیں ان میں سے ہنستی سپاری اور بولتے بکھیرتے ڈھل ڈھل پڑیں اور جب تم سب کو ہنسی آوے تو چاہیے اس ہنسی کے ساتھ موتی کی لڑیاں جھڑیں جو سب کے سب ان کو چن چن کے راجے ہو جائیں ڈومنیوں کے روپ میں سارنگیاں چھیڑ چھیڑ سوہلے گاؤ، دونوں ہاتھ ہلاؤ، انگلیاں نچاؤ، جو کسی نے نہ سنے ہوں وہ تاؤ بھاؤ آؤ جاؤ راؤ چاؤ دکھاؤ۔ ٹھڈیاں گنگناؤ، ناک بھویں تان تان بھاؤ بتاؤ، کوئی چھوٹ کر نہ رہ جاؤ۔ ایسا بھاؤ جو لاکھوں برس میں ہوتا ہے، جو جو راجہ اندر نے اپنے منہ سے نکالا تھا آنکھ کے جھپک کے ساتھ وہی ہونے لگا اور جو کچھ ان دونوں مہاراجوں نے ادھر ادھر کہہ دیا تھا سب کچھ اسی روپ سے ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ جس بیاہنے کی یہ کچھ پھیلاوٹ اور جماوٹ اور رچاوٹ اوپر تلے اس جمگھٹے کے ساتھ ہو کہ اس کا اور کچھ پھیلاوا کیا کچھ ہوگا، یہ دھیان کر لو۔

(ٹھاٹھ گسائیں مہندر گر کا)

جب کنور اودے بھان اس روپ سے بیاہنے چڑھے اور وہ بامھن جو اندھیری کوٹھری میں موندا ہوا تھا اس کو بھی ساتھ لے لیا اور بہت سے ہاتھ جوڑے اور کہا بامھن دیوتا ہمارے کہنے سننے پر نہ جاؤ، تمہاری جو ریت ہوتی چلی آئی ہے بتاتے چلو۔ ایک اڑن کھٹولے پر وہ بھی ریت بتانے کو ساتھ ہوا۔ راجہ اندر اور گسائیں مہندر گر ایراوت[3] ہاتھی پر جھومتے جھامتے دیکھتے بھالتے سارا اکھاڑا لئے چلے جاتے تھے۔ راجہ سورج بھان دولہے کے گھوڑے کے ساتھ مالا جپتا ہوا پیدل تھا۔ اتنے میں ایک سناٹا ہوا، سب گھبرا گئے۔ اس سناٹے میں سے وہ جو جوگی کے نوے لاکھ، تیرتھ بنے تھے سب کے سب جوگی بنے ہوئے موتیوں کی لڑیوں کی سیلی گلوں میں ڈالے، گاتیاں اسی ڈھب کی باندھے، مرگ چھالوں اور بگھمبروں پر آ بیٹھے، انھوں[4] کے جیوں میں جتنی امنگیں چھا رہی تھیں وہ چوگنی پچگنی ہو گئیں، سکھپال اور چنڈولوں پر اور رتھوں پر جتنی رانیاں مہارانی لچھمی داس کے پیچھے چلی آتی تھیں سب کو گدگدیاں سی ہونے لگیں۔ اسی میں کہیں بھرتری کا سانگ آیا،

---

[1] مرصع۔ [2] پہاڑ کی چوٹی۔ [3] اندر کے ہاتھی کا نام۔ [4] (ان) لوگوں۔

کہیں جوگی بنے پال آ گھڑے ہوئے، کہیں مہادیو جی اور پاربتی جی دکھائی پڑے، کہیں گورکھ جاگے، کہیں مچھندر ناتھ جاگے، کہیں مچھ، کچھ، براہ، نرسنگھ ہوئے، کہیں پرسرام کہیں باون روپ کہیں ہرناکس اور نرسنگھ، کہیں رام لچھمن سیتا سامنے آئے، کہیں راون اور لنکا کا بکھیڑا سارے کا سارا دکھائی دینے لگا، کہیں کنھیا جی کا جنم اشٹمی ہونا اور باسدیو کا گوکل لے جانا اور ان کا اس روپ سے بڑھ چلنا اور گائیں چرانی اور مرلی بجانی اور گوپیوں سے دھومیں مچانی اور رادھکا کا بس کر لینا، کہیں بنسی بٹ، چیر گھاٹ، بندرابن، کریل کی کنج بندرابن سیوا کنج برسانے میں رہنا اور اس کنھیا سے جو جو کچھ ہوا تھا سب کا سب جیوں کا تیوں آنکھوں میں آنا اور دوارکا میں جانا اور وہیں سونے کے گھر بنانا اور پھر برج کو نہ آنا اور سولہ سو گوپیوں کا تلملانا سامنے آ گیا۔ ان گوپیوں میں سے اودھو کا ہاتھ پکڑ کر ایک گوپی کے اس کہنے نے سب کو رلا دیا جو اس ڈھب سے بول کے روندھے ہوئے جی کو کھولتی تھی۔

کبت

جب چھاڑ کریل کی کنجن کون ہری دوارکا جیو ماں جا بسے
کلدھوت[1] کے دھام بنائے گھنے مہراجن کے مہاراج بھئے
تج مور مکٹ اور کامریا[2] کچھ اور ہی ناتے جوڑ لئے
دھرے روپ نئے کئے نیہ نئے اور گیاں چرائبو بھول گئے

اچھا بنا گھاٹوں کا

جتنے گھاٹ دونوں راج کی ندیوں میں تھے پکی چاندی کے تھکے سے ہو کر لوگوں کو ہکا بکا کر رہے تھے۔ نواڑے، بھولئے، بجرے، لچکے، مورپنکھی، سونا مکھی، سیام سندر، رام سندر، اور جتنی ڈھب کی ناویں تھیں سنہرے روپہلے سجی سجائی کسی کسائی سو سو لچکیں کھاتیاں آتیاں جاتیاں لہراتیاں پڑی پھرتیاں تھیں۔ ان سب پر یہی گویئے، کنچنیاں، رام جنیاں، ڈومنیاں، کھچا کھچ بھری اپنے اپنے کرتب میں ناچتی گاتی بجاتی، کودتی پھاندتی، دھومیں مچاتیاں، انگڑائیاں جمائیاں، انگلیاں نچاتیاں اور ڈھلی پڑتیاں تھیں اور کوئی ناؤ ایسی نہ تھی جو سونے روپے کے پتروں سے منڈھی ہوئی اور اساوری[3] سے ڈھکی ہوئی نہ ہو اور بہت سی ناؤوں پر ہنڈولے بھی اسی ڈھب کے، ان پر گائنیں بیٹھی جھولتی ہوئیں سوہلے، گھاٹے اور باگیسری کانھڑے میں گا رہی تھیں۔ دل بادل ایسے نواڑوں کے سب جھیلوں میں بھی چھا رہے تھے۔

(آ پہنچنا کنور اودے بھان کا بیاہنے کے ٹھاٹھ کے
ساتھ دلہن کی ڈیوڑھی پر)

اس دھوم دھام کے ساتھ کنور اودے بھان سہرا باندھے جب دلہن کے گھر تک آن پہنچا اور جو ریتیں ان کے گھرانے میں ہوتی چلی آتیاں تھیں ہونے لگیاں، مدن بان رانی کیتکی سے ٹھٹھولی کر کے بولی۔ "اب سکھ سمیٹے بھر بھر جھولی، سر نیوڑائے کیا بیٹھی ہو۔ آؤ نہ ٹک ہم تم مل کے جھروکوں سے انھیں جھانکیں۔" رانی کیتکی نے کہا۔ "ارے ایسی نچی باتیں ہم سے نہ کر، ایسی ہمیں کیا پڑی جو اس گھڑی ایسی کودی جھیل کر ریل پیل میں اٹھیں[4] اور نیل چھلیل میں بھری ہوئی ان کے جھانکنے کو جا کھڑی ہوں۔" مدن بان اس رکھائی کو اڑن گھائی کے انتیوں میں کر بولی۔ وہ ہے اپنی بولی میں۔

---

[1] (ن) کل دھوت۔ [2] (یعنی کملی)۔ [3] ریشمی کپڑا۔ [4] (ن) اس اٹھن

دوہا

یوں تو دیکھو واچھڑے جی واچھڑے جی واچھڑے
ہم سے اب آنے لگی ہیں آپ یوں بھرے کڑے
چھان مارے بن کے بن تھے آپ نے جن کے لئے
وہ ہرن جو بن کے مدہ بھی ہیں بینے وولہ کھڑے
تم نہ جاؤ دیکھنے کو جو انھیں، کچھ بات ہے
جب نکتے اس وھیان میں ہیں ان کو سب چھوٹے بڑے
ہے کہاوت "جی کو بھا دے یوں ہی پر منڈیا ہلائے"
لے چلیں گے آپ کو ہم ہیں اسی دھن پہ اڑے
سانس ٹھنڈی بھر کے رانی کیتکی بولی کہ سچ
سب تو اچھا کچھ ہوا پر اب بکھیڑے میں پڑے

(واری پھیری ہونا مدن بان کا رانی کیتکی پر اور
اس کی باس کا سونگھنا اور اینڈے پن سے اونگھنا)

اس گھڑی کچھ مدن بان کو رانی کیتکی کے مانگھے کا جوڑا اور پھینا پھیناپن اور انگھڑیوں کا لجانا اور کھبرا کھبرا جانا بھلا لگ گیا تو رانی کیتکی کی باس سونگھنے لگی اور اپنی آنکھوں کو ایسا کر لیا جیسے کوئی کسی کو اونگھنی لگتی ہے سر سے لگا پاؤں تک واری پھیری ہو کے تلوے سہلانے لگی، رانی کیتکی جھٹ سے دھیمے سے ہنس کے لپکے کے ساتھ اٹھی۔ مدن بان بولی میرے ہاتھ کے تلوے سے وہ ہی پاؤں کا چھالا دکھ گیا ہوگا جو ہرنوں کی ڈھونڈ ڈھونڈھ میں پڑ گیا تھا۔ ایسی دکھتی چٹکی کی چوٹ سے مسوس کر رانی کیتکی نے کہا کانٹا اڑا تو اڑا اور چھالا پڑا تو پڑا پر نگوڑی تو کیوں میرا پھپھولا ہوئی۔

(سراہنا رانی کیتکی کے جوبن کا)

رانی کیتکی کا بھلا لگنا لکھنے پڑھنے سے باہر ہے۔ وہ دونوں بھوؤں کی کھچاوٹ اور پتلیوں میں لاج کی سماوٹ اور نکیلی پلکوں کی رونداہٹ اور ہنسی کی لگاوٹ، دنتڑیوں میں مسیوں کی روداہٹ اور اتنی سی رکاوٹ سے ناک اور تیوری چڑھا لینا اور سہیلیوں کو گالیاں دینا اور چل نکلنا اور ہرنیوں[۱] کے روپ سے کر چھالیں[۲] مار پرے اچھلنا کچھ کہنے میں نہیں آتا۔

(سراہنا کنور جی کے جوبن کا)

کنور اودے بھان کے اچھے پن میں کچھ چل نکلنا کسی سے ہو نہ سکے۔ ہائے رے! ان کی اوبھار کے دنوں کا سہاناپن اور چال ڈھال کا اچھن پچھن، اٹھتی ہوئی کونپل کی پھبن اور مکھڑے کا گدرایا ہوا جوبن جیسے بڑے تڑکے ہرے بھرے پہاڑوں کی گود سے سورج کی کرن نکل آتی ہے، یہی روپ تھا ان کی بھیگتی مسوں سے رس کا ٹپکا پڑتا اور اپنی پرچھائیں دیکھ کر اکڑتا جہاں تہاں چھاؤں تھا اس کا ڈول ٹھیک ٹھاک[۳] ان کے پانوں تلے جیسے دھوپ تھی۔

(دولہا اودے بھان کا منڈ کا سن پہننا)

۱؎ رن، ہرنوں۔ ۲؎ کودنا اچھلنا۔ ۳؎ حسن۔

دولہا اودے بھان سنگھاسن پر بیٹھا، اور ادھر راجہ اندر اور جوگی مہندر گر جم گئے۔ دولہا کا باپ اپنے بیٹے کے پیچھے مالا لئے کچھ کچھ گنگنانے لگا اور ناچ لگا ہونے اور ادھر میں جو اوڑن کھٹولے اندر کے اکھاڑے کے تھے سب کے سب اسی روپ سے چھت باندھے ہوئے ٹھہر گئے۔ دونوں مہارانیاں سمدھنیں آپس میں ملیاں جلیاں اور دیکھنے دکھانے کو کوٹھوں پر چندن کے کواڑوں کی آڑ تلوں میں آ بیٹھیاں۔ سوانگ سنگیت بھنڈ تال رہس ہونے لگا۔ جتنے راگ اور راگنیاں تھیں ایمن کلیان، جھنجھوٹی، کانڑا، کھماچ، سوہنی، پرج، بہاگ، سورٹھ، کالنگڑا، بھیرویں، کھٹ، للت، بھیروں، روپ پکڑے ہوئے سچ مچ کے جیسے گانے والے ہوتے ہیں، اسی روپ سے اپنے اپنے سمے پر گانے لگے اور گانے لگیاں۔ اس ناچ کا جو تاؤ بھاؤ راؤ چاؤ کے ساتھ ہوا کس کا منہ جو کہہ سکے۔ جتنے وہاں کے سکھ چین کے گھر تھے، مادھو بلاس، رس دھام، کشن نواس، مچھی بھون، چند بھون سب کے سب لپے پتے سے اور سچے موتیوں کی جھالریں اپنی اپنی گانٹھ میں سمیٹے ہوئے ایک بھیس کے ساتھ متوالوں کے روپ سے جھوم جھوم جھومتے والوں کے منہ چوم رہے تھے۔ بیچوں بیچ ان سب گھروں کے ایک آرسی دھام بنایا تھا جس کی چھت اور کواڑ اور آنگن میں آرسی چھٹ لکڑی اینٹ پتھر کی پٹ ایک انگلی کے پورے برابر نہ تھی۔ چاندنی کا جوڑا پہنے ہوئے چودھویں رات جب گھڑی چھ ایک رہ گئی، تب رانی کیتکی سی دلہن کو اسی آرسی بھون میں بیٹھا کر دولہا کو بلا بھیجا۔ کنور اودے بھان کنہیا بنا ہوا سر پر مکٹ دھرے سہرا باندھے اسی تڑاوے اور جمگھٹ کے ساتھ چاند سا مکھڑا لئے جا پہنچا۔ جس جس ڈھب سے بامھن اور پنڈت کہتے گئے اور جو جو مہاراجوں میں ریتیں چلی آتیاں تھیں اسی ڈول سے اسی روپ سے بھنوری گٹھ جوڑا سب کچھ ہو لیا۔

دوہے اپنی بولی کے

اب اودے بھان اور رانی کیتکی دونوں ملے
آس کے جو پھول کمہلائے ہوئے تھے پھر کھلے
چین ہوتا ہی نہ تھا جس ایک کو اس ایک بن
رہنے سہنے سو لگے آپس میں اپنے رات دن
اے کھلاڑی یہ بہت تھا کچھ نہیں تھوڑا ہوا
آن کر آپس میں جو دونوں کا گٹھ جوڑا ہوا
چاہ کے ڈوبے ہوئے اے میرے داتا سب تریں
دن پھرے جیسے انہوں کے ویسے اپنے دن پھریں

وے اوڑن کھٹولے والیاں جو ادھر میں چھت باندھے ہوئے ٹھہر رہی تھیں بھر بھر جھولیاں اور مٹھیاں ہیرے اور موتیوں سے نچھاور کرنے کے لئے اتر آئیاں اور اوڑن کھٹولے جوں کے توں ادھر میں چھت باندھے ہوئے کھڑے رہے۔ دولہا دلہن پر سے ساتوں وار ہی پھیرے ہوتے ہی پس پس گیاں اور ان سبھوں کو ایک جھپکی سی لگ گئی۔ راجہ اندر نے دلہن کی منہ دکھائی میں ایک ہیرے کا اکڈال چھپر کھٹ اور ایک پیڑھی پکھراج کی دی اور ایک پارجات کا پودا جس سے جو مانگئے سو ہی ملے، دلہن کے سامنے لگا دیا اور ایک کام دھین گائے کی بچھیا بھی اس کے نیچے باندھ دی اور اکیس لونڈیاں انہیں اوڑن کھٹولے والیوں سے چن کے اچھی سے اچھی ستھری گاتی بجاتیاں، سیتی پروتیاں، سگھڑ سے سگھڑ سونپیں؛ اور انہیں کہہ دیا "رانی کیتکی چھٹ ان کے دولہا سے کچھ بات چیت نہ رکھیو، تمہارے کان پہلے سے مروڑے دیتا ہوں۔"

۱۔ ہنسی، دل لگی۔ ۲۔ (ن) پلیٹے۔ ۳۔ (ن) حجام۔ ۴۔ آئینہ خانہ۔ ۵۔ (ن) چاندنی۔
۶۔ نمود و نمائش۔

نہیں تو سب کی سب پتھر کی مورتیں بن جاؤ گی اور اپنا کیا آپ پاؤ گی۔ اور گسائیں مہندر گر جی نے باون تولے پاؤ رتی جو سنتے ہیں اس کے ایکیس منکے آگے رکھ کے کہا " یہ بھی ایک کھیل ہے جب چاہیے تو بہت سا تانبا گلا کے ایک اتنی سی اس کی چھینٹ دیجیے گا کنچن ہو جائے گا" اور جوگی نے یہ سبھوں سے کہہ دیا جو لوگ ان کے بیاہ میں جاگے ہیں ان کے گھروں میں چالیس دن رات سونے کی مینہ بوں کے روپ میں من برسیں اور جب تک جئیں کسی بات کو پھر نہ ترسیں۔ نولاکھ ننانوے گائیں سونے روپے کی سنگھوٹیوں کی، جڑاؤ گہنا پہنے ہوئے، گھنگرو، جھنجھناتیاں، ہامعنوں کو دان ہوئیں اور سات برس کا پیسا سارے راج کو چھوڑ دیا۔ بائیس سے ہاتھی اور چھتیس سے اونٹ لدے ہوئے روپوں کے لٹا دیئے۔ کوئی اس بھیڑ بھاڑ میں دونوں راج کا۔ اپنے والا ایسا نہ رہا جس کو گھوڑا جوڑا، روپوں کا توڑا اور سونے کی جڑاؤ کٹوروں کی جوڑی نہ ملی ہو اور مدن بان چھٹ دولہ دلہن پاس کسی کا ہوا نہ تھا جو بن بلائے چلی جائے، بن بلائے دوڑی آئے تو وہی آئے اور ہنسا دے تو وہی ہنسائے۔ رانی کیتکی کے چھیڑنے کو ان کے کنور اودے بھان کو کنور کنور جی کہہ کے پکارتی تھی اور اسی بات کو سو سو روپے سنوارتی تھی۔

دوہے اپنی بولی کے

گھر بسا جس رات انھوں کا تب مدن بان اس گھڑی
کہہ گئی دولہ دلہن کو ایسی سو باتیں کڑی
باس پا کر کیوڑے کی کیتکی کا جی کھلا
سچ ہے ان دونوں جنوں کو اب کسی کی کیا پڑی
کیا نہ آئی لاج کچھ اپنے پرائے کی اجی
تھی ابھی اس بات کی ایسی ابھی کیا ہڑبڑی
(دلہن نے اپنے گھونگٹ سے کہا)
جی میں آتا ہے تیرے ہونٹوں کو مل ڈالوں ابھی
بل بے اے رنڈی ترے دانتوں کی مسی کی دھڑی

حیدر بخش حیدری

طوطا کہانی

(سنہ ۱۸۰۱ء)

ستیسویں داستان۔ عاشق ہونا ایک بادشاہ کا روم کی شہزادی پر اور حکم قتل دینا اس کے لڑکے کا۔

ایک بادشاہ روم کی بادشاہت کے قریب رہتا تھا۔ اتفاقاً ایک دن اس کے وزیر نے کہا "اے جہاں پناہ! روم کا بادشاہ ایک خوبصورت لڑکی رکھتا ہے کہ۔ ؎

عجب طرح کا نور ہے جاں فزا
کہ مہ جس کے ہر روبرو تھک رہا

اگر وہ بیٹی اپنی جناب عالم پناہ کو بیاہ دے تو کیا خوب"۔ بادشاہ نے اس سخن وزیر کے کو نہایت پسند کیا اور ایک ایلچی کے ساتھ مع سوغات اس لڑکی کی طلب کا پیغام روم کے بادشاہ کو بھیجا۔ جس وقت نامہ بر نے یہ پیغام اس بادشاہ سے کہا تو بادشاہ سن کر ایلچی پر خفا ہوا اور کہنے لگا "اے نامہ بر تیرے بادشاہ نے مجھ کو کیا سمجھا جو اس ڈھب کا پیغام بھیجا۔ اگر میں اپنی بات پہ آتا ہوں تو اس کی سلطنت خاک میں ملاتا ہوں۔ تجھے کیا کہوں۔ چل دُور ہو، سامنے سے۔ بہتر یہی ہے۔ کہ پھر ادھر منہ نہ کرنا خبردار۔ خیر اسی میں ہے"۔ وہ بیچارا اس کی خفگی سے تھرا گیا۔ اور وہاں سے نا امید پھرا۔ میر حسن۔

اسے غصہ دیکھ وہ ڈر گیا
کہے تو کہ جیتے ہی جی مر گیا

غرضیکہ پچھلے پاؤں بھاگ کر اپنے بادشاہ کے پاس آیا اور وہاں کی واردات بیان کی یہ بات بادشاہ کو نہایت ناگوار معلوم ہوئی۔ اسی گھڑی فوج قاہرہ اپنے ساتھ لے کر چڑھ گیا۔ اور اس کے ملک کو آن کی آن میں تاخت و تاراج کیا۔ جب وہ تنگ آیا۔ ناچار اپنی لڑکی بیاہ دی۔

غرض وہ بادشاہ اس شہزادی کو ہمراہ لے کر اپنے شہر کو گیا۔ اور اس سے عیش و عشرت کرنے لگا۔ بعد کئی دنوں کے شہزادی اپنے بیٹے کی جدائی سے جو کہ پہلے خاوند سے تھا۔ اور جسے نانا کے پاس چھوڑ آئی تھی بے قراری ہوئی۔ اور روئی۔

° آخر اس کے بعد یہ بات اپنے جی میں ٹھیرائی کہ کسی بہانہ سے اس کو اپنے پاس بلوائیے۔ اس خیال میں رہتی تھی کہ اتنے میں بادشاہ نے اپنا ایک نہایت بیش قیمت ڈبہ کہ جواہر سے بھرا ہوا تھا دیا۔ تب بادشاہ سے کہنے لگی کہ آپ نے سنا ہوگا کہ میرے باپ کے پاس ایک ایسا غلام عقلمند ہے کہ جواہر کی خوب شناخت کرتا ہے اور اچھا برا بتا دیتا ہے۔ بادشاہ نے کہا "اگر اس غلام کو تیرے باپ سے مانگوں تو وہ مجھے دے یا نہ دے؟"

° اس نے کہا کہ باباجان نے اس کو بچپن سے فرزند کی طرح پرورش کیا ہے۔ اگر تم اس کی تمنا رکھتے ہو اور اسے بلوانا منظور ہے تو ایک سوداگر میں اپنی طرف سے بھیجوں اور کچھ اپنی نشانی بھی دوں اور بہتری کا امیدوار اس لڑکے کو کر دوں۔ تو شاید وہ انکار نہ کریں۔ بادشاہ نے ایک سوداگر کو اس سبب سے تجارت کے لئے روم کی طرف بھیجا۔ جس وقت وہ تاجر بموجب بادشاہ کے فرمان کے اپنا مال و اسباب لے کر روم کی طرف چلا۔ اس وقت شاہزادی بادشاہ سے چھپ کر سوداگر سے بولی "اے سوداگر وہ لڑکا غلام نہیں۔ بلکہ میرا بیٹا ہے۔ اور ایک خط میرا دینا اور بادشاہ روم سے یہ پیغام کہو کہ وہ لڑکے کی جدائی سے نہایت مغموم ہے۔ یہاں سے غلام کے نام کے ساتھ اس کو بھیجا دیجئے جب وہ تیرے ساتھ آوے۔ تجو ہی لے آئیو مگر یہ پردہ نہ کھولیو۔"

آخر کار وہ سوداگر گیا۔ اور کتنے دنوں کے بعد اس لڑکے کو لے آیا۔ اور بادشاہ کے حوالہ کیا۔ بادشاہ نے جو اس لڑکے کو خوبصورت اور ہنرمند پایا۔ تو نہایت خوش ہوا اور اس تاجر کو ایک خلعت عمدہ بخشا۔ اور اس غلام کو اپنے پاس رکھا۔ اور ماں اس کو روبرو سے دیکھ لیتی۔ اور سلام و پیام کے ساتھ اپنا جی خوش کرتی۔

اتفاقاً ایک دن بادشاہ شکار کھیلنے گیا۔ شہزادی نے فرصت پا کر اس لڑکے کو محل میں بلوایا اور اپنے گلے لگایا۔ اور اس کا سر منہ چوما۔ اور گذشتہ جدائی کا غم اس سے کہا۔

یہ خبر پہرہ داروں نے اسی گھڑی بادشاہ کو پہنچائی کہ آج شہزادی نے جہاں پناہ کے پیچھے اس غلام کو محل میں طلب کیا۔ اور اپنے برابر بٹھایا ہے۔ یہ خبر وحشت اثر سنتے ہی بادشاہ نہایت آزردہ ہوا۔ اور کہنے لگا۔ ایسی عورت سے ڈریئے۔ کہ یہ ڈیوڑھی پر دیوار بناتی ہے۔ کیسا مکر کر کے اپنے یار کو روم سے بلایا ہے۔ اللہ رے۔ کلیجہ! پھر آپ جلد شکار گاہ سے محل میں داخل ہوا۔ اور کرسیِ جواہر نگار پر متفکر ہو کر بیٹھ گیا۔ اس حالت میں شاہزادی نے بادشاہ کو دیکھا تو دریافت کیا۔ کہ آج مزاجِ مبارک ناساز معلوم ہوتا ہے۔ کیا سبب ہے؟

تب بادشاہ نے کہا "کیا خوب تم اپنے معشوق کو روم سے بلوا کہ ہم بستر ہو اور مجھ سے بیوفائی کرو۔ کیا شوخی اور بے شرمی ہے" جانتا تھا کہ اسے ہلاک کرتا پر عاشق معشوق کو کب مار سکے۔ پھر اپنے جی میں کہنے لگا۔ کہ بی بی کے بدلے غلام کو مارے۔

یہ ٹھیرا کر ایک جلاد کو اشارہ کیا۔ اور کہا کہ اسی گھڑی اس کے سر کو جدا کیا جائے۔ یہ سنتے ہی اس لڑکے کو جلاد نے پکڑا اور قتل گاہ میں بٹھا کر پوچھا کہ اے اجل گرفتہ تو یہ نہ جانتا تھا کہ یہ بادشاہ کی بیگم ہے۔ اس سے دوستی کرونگا تو کیونکر بچوں گا۔ اور تیرا قدم کیونکر بڑھا جو تو محلِ شاہی میں گیا۔ اس نے کہا کہ تو ایسی بات نہ کر۔ وہ میری سگی ماں ہے۔ جب میرا باپ مرا تو اس نے اسے اپنا شوہر کیا۔ اور مارے شرم کے احوال اس سے نہ کہا۔ میں جھوٹ نہ کہونگا۔ مار دیا چھوڑ دو۔ بیت:۔

قابو میں ہوں میں تیرے گو اب بچا تو بچ رکیا
خنجر تلے کسی نے اک دم لیا تو کیا

اس بات کو سنتے ہی جلاد کو رحم آیا اور اس کے قتل کا ارادہ نہ کیا۔ اور اپنے جی میں کہنے لگا کہ اگر یہ بات بادشاہ پر کھلی کہ یہ اس کا بیٹا ہے۔ اور شہزادے کی خاطر اس نے اس لڑکے کو مجھ سے طلب کیا۔ اور میں اس کو اس کے پاس جیتا نہ پہنچاؤں گا۔ تو میں بھی اسی طرح

دوسرے کے ہاتھ سے مارا جاؤنگا۔ اس اندیشہ کو دل میں جگہ دے کہ بادشاہ سے عرض کی "جہاں پناہ اس کشتی کو وہاں جا کر ڈبوؤنگا جہاں پانی کا نام بھی نہ ہو"۔

غرض اس بہانہ سے وہ اس کو بادشاہ سے لے کر اپنے گھر گیا۔ اور چھپا رکھا۔ اور بعد دو دن کے بادشاہ کی جناب میں آ کر عرض کی "عالم پناہ! سلامت اس کا سر قدم مبارک پر نثار ہوا"۔ بارے اس بات کے سنتے ہی تھوڑی سی آتشِ غضب بادشاہ کی ٹھنڈی ہوئی مگر شہزادی کو اضطرار اٹھ گیا۔ اور اس کی کر گہ ہیں اور بھی محبت کی آگ بھڑک اٹھی۔ میر حسن۔

کلیجہ پکڑ وہ تو بس رہ گئی
کلی کی طرح سے بکس رہ گئی

بے اختیار وہ رو کر اپنے جی میں کہنے لگی کہ یہ کیا ہوا۔ ادھر بیٹا جدا ہوا ادھر خاوند چھوٹا۔ قضائے کار ایک دن ایک بڑھیا نے جو اس کے محل میں رہتی تھی اس سے پوچھا کہ اے بی بی اس جوانی پر یہ غم کس کا کھائی ہے جو اس طرح سے آٹھ آٹھ آنسو روتی ہے اور منہ ڈھانکے آٹھوں پہر مسند پر پڑی رہتی ہے؟۔ تب شاہزادی نے سارا احوال اس سے کہا کہ یہ ماجرا مجھ پر گزرا ہے۔ یہ سن کر اس نے عرض کی: "اے شہزادی تو خاطر جمع رکھ۔ میں ایک بہانہ سے تیرے بادشاہ کو تجھ پر مہربان کر دوں گی۔ اور محل میں لے آؤں گی"۔ شہزادی نے کہا "اے مادر مہربان! اگر اس درد کی دوا کریگی۔ تو میں تیرے دامن اور جیب کو جواہرات سے بھر دوں گی"۔

آخر کار ایک دن اس پیر زال نے بادشاہ کو تنہا دیکھ کر پوچھا "اے شہنشاہ! میں تجھے اور دنوں سے کچھ آجکل متفکر دیکھتی ہوں۔ میں واری جاؤں خیر تو ہے"! بیت

تجھے خوش رکھے میرا پروردگار
تیری اس جوانی پہ بڑھیا نثار

بادشاہ نے کہا۔ کہ اے اماں نیک بخت میں وہ درد بے درماں رکھتا ہوں۔ کہ جس کا بیان نہیں کر سکتا۔ چنانچہ وہ درد یہ ہے۔ کہ شاہزادی نے روم سے اس غلام کو بلایا۔ کہ جس پر وہ عاشق تھی۔ اور میں نے اسے قتل کیا۔ پر شاہزادی کو مار نہیں سکتا۔ کیونکہ خدا جانے یہ بات جھوٹ ہے یا سچ ہے۔ اور وہ میری معشوقہ ہے۔ اگر بے تقصیر مار ڈالوں۔ اور پھر جھوٹ نکلے۔ تو بدنامی ہو۔ اور جی کی بے قراری اس کے علاوہ ہو۔ یہ عقدہ باعث دل بستگی کا ہے۔

یہ بات سنتے ہی وہ پیر زال کہنے لگی۔ کہ بادشاہ سلامت! تم اس بات کا کچھ فکر مت کرو۔ میرے پاس ایک تعویذ ہے۔ کہ اس کو جس کسی کی چھاتی پہ رکھ دے۔ وہ اپنے دل کا سب احوال خود بخود کہہ دے سو وہ نقش میں تمہیں لکھ دیتی ہوں۔ تم اس کے سینہ پہ دھر دیجیو۔ اس کے جی میں جو ہوگا۔ سو سب حال آپ سے کہہ دے گی۔

بادشاہ نے کہا: "وہ تعویذ جلد لا"۔ بڑھیا نے اسی وقت وہ تعویذ بادشاہ کو لا دیا۔ اور آپ شہزادی کے پاس جا کر کہا۔ کہ آج تو سرِ شام سے جھوٹ موٹ سو رہیو۔ بلکہ جس وقت بادشاہ تیری چھاتی پہ تعویذ رکھے۔ تو اس وقت سوتوں کی طرح سے جو تیرا احوال ٹھیک ٹھیک ہو سو وہ بخوبی کہہ دیجیو۔ حاصل کلام جب پہر رات گزر گئی۔ بادشاہ نے اس وقت نقش کو شہزادی کے سینے پہ جو رکھا وہیں اس نے اپنے پہلے خاوند کا حال اور اس کے لڑکے کا احوال یک بیک کہہ دیا۔ بادشاہ نے جو یہ بات سنی اسے جگا کر نہایت مہربانی کی۔ اور سینے سے لگا کر شہزادی سے کہا۔ کہ جانی! کس واسطے یہ راز مجھ سے چھپا ہی نہ کہا۔ وہ گھبرا کر بولی۔ میں نے کونسی بات چھپائی ہے۔ بادشاہ نے کہا۔ وہ تیرا سگا بیٹا تو نے غلام کیوں بنایا"؟

تب اس نے آنکھیں نیچی کر کے عرض کی۔ کہ مجھ کو شرم معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ کہنی یہ سنتے ہی بادشاہ نے اُسی گھڑی جلاد کو بلا کر کہا۔ کہ بہت جلد اس لڑکے کو میرے پاس لے آؤ۔ اور اگر مار ڈالا ہے تو اس کی قبر کہاں ہے۔ بتلا؟ اس نے کہا۔ کہ جہاں پناہ! میں نے اسے تا حال نہیں مارا ہے۔ وہ خدا کے فضل سے جیتا جاگتا ہے۔ اور موجود ہے۔ یہ سنتے ہی بادشاہ نہایت خوش ہوا۔ اور اُسی وقت لڑکے کو بلا کر اس کی والدہ کے حوالہ کیا۔ اور اس نامبینے لڑکے کو گود میں لے کر درگاہِ الٰہی میں سجدۂ شکر ادا کیا۔

حیدر بخش حیدری

آرائشِ محفل

(سنہ ۱۸۰۱ء)

(حاتم کا کوہِ ندا کی خبر لانا)

صبح کو حاتم نے حمام کیا، کپڑے پہنے حسن بانو کی ڈیوڑھی پر آیا۔ چوبداروں نے خبر کی کہ حاتم آتا ہے۔ اس نے پردے کے اندر بلایا اور ایک کرسی پر بٹھا کر کہا۔ اے حاتم سننے میں یوں آیا ہے کہ ایک پہاڑ سے ندا آتی ہے اس لئے اس کا نام کوہِ ندا رکھا ہے اب خبر لا کہ وہ آواز کرنے والا کون ہے اور پہاڑ کے اوپر کیا اسرار ہے۔ حاتم یہ سن کر وہاں سے رخصت ہوا اور کارواں سرا میں منیر شامی سے کہا کہ اب کوہِ ندا کی خبر لینے جاتا ہوں۔ اگر زندگی نے وفا کی تو اس بات کی تحقیق کر کے پھر تجھ سے ملتا ہوں ورنہ مرضی خدا کی۔ تم کسی بات کا خطرہ نہ کرنا۔ غرض حاتم نے دو چار باتیں نصیحت آمیز منیر شامی سے کہہ کر جنگل کی راہ لی۔ جس بستی میں جاتا ان سے پوچھتا کہ اے عزیز اگر تم میں سے کوئی کوہِ ندا کی راہ سے واقف ہے تو مجھے بتا دے۔ یہ بات سن کر لوگ حیران ہوتے اور کہتے کہ اتنی عمر ہوئی ہم نے نام بھی نہیں سنا۔ جانفرو بن دیکھے راہ طے کرتا چلا جاتا تھا۔ ایک مہینے کے بعد کسی شہر کے نواح میں جا پہنچا۔ کیا دیکھتا ہے کہ مرد و زن اس شہر کے صحرا میں جمع ہوتے ہیں۔ یہ انہیں کی طرف چلا۔ انہوں نے جو دیکھا کہ ایک شخص چلا آتا ہے وہ سب کے سب اس کی طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے۔ مرحبا خوب آیا تو کہاں تھا، ہم تیرے منتظر ہیں۔ حاتم آگے گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک دسترخوان پر طرح طرح کے کھانے چنے ہیں اور ایک جنازے کے گرد بہت سے لوگ بیٹھے ہیں۔ حیران ہو کر پوچھنے لگا کہ اس مُردے کو کیوں نہیں گاڑتے اور اس قدر کیوں روتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہماری قوم کی یہ رسم ہے کہ کوئی شخص کیا امیر کیا غریب مر جائے ہم اس کے جنازے کو جنگل میں لے آتے ہیں اور کھانے بہت سے ستھرے پکا کر ایک دسترخوان پر چُن کے مسافر کی راہ دیکھتے ہیں۔ اگر کوئی مسافر اس عرصے میں آیا مُردے کو گاڑ دیتے ہیں اور کھانا مسافر کو کھلا دیتے ہیں۔ سات روز ہوئے یہ مُردہ اسی طرح پڑا ہے کوئی اب تک نہیں آیا۔ ہم عجیب مصیبت میں گرفتار تھے کہ ہر روز کھانا شام کے وقت عورتوں کو بھیج دیتے تھے اور آپ یوں ہی پڑے رہتے تھے۔ الحمدللہ سات روز کے بعد تیری صورت دیکھی اب دفن کریں گے۔ حاتم نے کہا اگر مہینہ بھر تک کوئی مسافر یہاں نہ آوے تو اس مُردے کا کیا حال ہو اور تم کس صورت سے جیو۔ انہوں نے کہا ساتویں روز مسافر بالضرور آتا ہے۔ اگر پندرہ روز تک نہ آئے تو تمام دن روزہ رکھ کر شام کے وقت پانی پئیں اور ایک مُردہ ایک ماہ تک نہیں سڑتا۔ حاتم نے کہا اگر اس سے زیادہ مدت گزرے اس وقت کیا کرو گے۔ وہ بولے ایسا ہو تو مُردے کو دفن کریں اور تمام

مرد و زن چھ ماہ تک روزہ رکھیں۔ شام کو توبہ کریں اور روزہ افطار کریں اور بہت سی خیرات کریں۔ تب اپنے کام میں مشغول ہوں۔ یہ سن کر حاتم حیران ہوا اور انہوں نے اس مردے کو تہ خانہ میں اتار کر فرش بچھا کر اس پر رکھا اور طرح طرح کے کھانے اور خوشبو کی بتیاں روشن کر کے سات بار اس کے گرد پھر کر قدمبوس ہو کر باہر نکل آئے اور دسترخوان پر جا بیٹھے۔ پھر حاتم سے کہا "اے مسافر پہلے کھانے میں تو ہاتھ ڈال اور پیٹ بھر کھا۔ یہ قبول ہو اور تیری توجہ سے ہم بھی روزہ کھولیں۔" یہ سن کر حاتم کھانے لگا اور سب بھی شریکِ طعام ہوئے۔ اس کے بعد جو بچا ہر ایک نے اپنے اپنے گھر بھجوا دیا اور ان کی عورتوں نے کھا لیا۔ پھر نہائے اور کپڑے پاکیزہ پہن کر چلے اور حاتم سے کہا "اے جوان اگر تیرا جی چاہے تو چند روز اور ہمارے گھر مہمان رہ۔" حاتم نے کہا "بہت بہتر۔ تمہاری خاطر اور دو چار روز رہ سکتا ہوں۔"

غرض وہ اس کو شہر میں لے گئے اور ایک مکان ستھرا سا اس کے رہنے کو خالی کر دیا اور خورد و نوش کے لوازم خوبصورت لونڈیوں سمیت بھجوا دیئے۔ اس نے اپنے دل میں کہا کہ یہاں کی عجیب رسم ہے۔ اگر میں ان کاموں سے فراغت پاؤں اور خدا میرا مطلب پورا کرے تو میں بھی اپنے شہر میں جا کر اسی طرح مہمانداری کروں اور وہ عورتیں آرزومند تھیں کہ اس جوان کا جی ہم میں سے جس کو چاہے اس سے بشوق تمام ملے اور شرابِ وصل خوب پیئے لیکن حاتم نے کسی طرف خواہش کی نظر سے بھی نہیں دیکھا۔ جب سات روز گذر گئے تب ان عورتوں نے اپنے سرداروں سے حاتم کی نیک ذاتی اور نیک نیتی کی خبر دی۔ حاکم شہر نے اس کو روبرو بلوایا اور عزت و حرمت سے مسند پر بٹھایا اور کہا کہ اگر شہر میں بود و باش اختیار کرو تو عین مہربانی ہے اور میں بھی اپنی بیٹی تیری خدمت میں دوں۔ حاتم نے کہا کہ مجھ کو ایک ضروری کام درپیش ہے اس سبب سے ناچار ہوں نہیں تو رہتا۔ یہ سن کر اس نے کہا کہ اگر ہم بھی اس کام سے مطلع ہوں تو تیری رفاقت کریں۔

حاتم نے التماس کیا کہ میں نہیں چاہتا کہ کوئی میرے ساتھ تکلیف کھینچے۔ وہ بولا کہ اے جوان اگر ساتھ نہیں لیتا تو اتنا کہہ دے کہ وہ ایسا کام کیا ہے؟ حاتم نے کہا کہ ایک عورت حسن بانو نامی سات سوال رکھتی ہے جو کوئی اس کا بخوبی جواب دے وہ اپنا نکاح اس کے ساتھ کرے۔ چاہیئے ہے کہ شہزادہ منیر شامی اس پر عاشق ہوا ہے، نہ جدائی کی طاقت رکھتا ہے نہ وصال کی قدرت، اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اس کے سوال پورے کرے مگر اس کے فراق میں جنگل میں روتا پھرتا ہے۔ اتفاقاً ایک دن مجھ سے ملاقات ہوئی میں نے جو اس کو بحالِ تباہ آہیں بھرتا دیکھا نہایت غمگین ہوا بلکہ رو دیا۔ آخر کار میں تاب نہ لا سکا برائے خدا اس کے لئے مسافرت اختیار کی۔ خدا کے فضل سے اس کے چار سوال پورے کر چکا ہوں۔ اب پانچویں سوال کی باری ہے اور وہ یہ ہے کہ کوہِ ندا کی خبر لانا چاہئے اس تلاش میں چھ ماہ گذر گئے۔ جس سے پوچھتا ہوں کوئی نہیں بتاتا۔ اگر تجھ کو خبر ہو تو بتا۔"

یہ بات سن کر اس ویرینہ سال نے کہا "میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ دکھن کی طرف طلسمات ہے اور بائیں طرف شہر عالیشان آباد ہے وہاں آج تک کسی نے مردہ نہیں دیکھا نہ قبر دیکھی اور نہ کوئی کسی کو روتا ہے۔" یہ ماجرا سن کر حاتم نے کہا "مجھے اس سمت جانا ہے۔" وہ بولا "اے عزیز مستی ہوئی راہ کیسے طے کر سکتا ہے؟" حاتم نے کہا "جو مجھے یہاں لایا ہے وہ وہاں بھی پہنچائے گا۔" اس سخن کو سن کر اس ویرینہ سال نے بہت سا زر و جواہر اس کے سامنے رکھ دیا۔ حاتم نے اس میں سے خرچ راہ کے موافق لیا اور باقی فقیروں کو دے کر اسی طرف کا راستہ لیا۔ ایک مدت کے بعد ایک شہر کے قریب جا پہنچا اور اس کے گرد و پیش کوئی قبر نہ دیکھی، جانا کہ وہ شہر یہی ہے۔ اندر گیا وہاں کے رہنے والوں نے پوچھا کہ اے جوان تو کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا۔ حاتم نے کہا شاہ آباد سے آیا ہوں اور کوہِ ندا کو جاؤں گا۔ انہوں نے کہا کوہِ ندا کا راستہ یہاں سے بہت دور ہے تو نہ جا سکے گا۔ اس نے جواب دیا کہ جو مجھ کو یہاں لایا ہے وہ کریم کارساز وہاں بھی پہنچائے گا۔ پھر انہوں نے کہا کہ آج کی رات یہیں رہ جا، ہمارا دال دلیا قبول کر۔ حاتم یہ بات سن کر ٹھہر گیا۔ وہاں ایک آدمی کئی دنوں سے بیمار تھا اس کے وارثوں نے لوگ جمع کر کے اسے ذبح کر کے آپس میں گوشت بانٹ لیا اور اس شخص نے جس نے حاتم کو مہمان رکھا تھا اپنا حصہ پکا کر پانی کا ایک کوزہ دو چار روٹیاں حاتم کے پاس

شام کے وقت لے آیا اور کہنے لگا کہ اے مسافر اس کو کھا۔ حاتم کھاتے ہی کہنے لگا کہ میں نے کبھی ایسا گوشت نہیں کھایا۔ اس نے کہا البتہ تو نے جانوروں کا گوشت کھایا ہوگا۔ لیکن یہ آدمی کا ہے ایسا نہ کھایا ہوگا۔ حاتم نے کہا کہ تم آدم خور ہو تم سے ڈرنا چاہئے۔ شاید کسی مسافر کو تم نے مارا ہوگا اس کا گوشت کھانا چاہتے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا یہی قاعدہ ہے کہ جو مسافر بھولا بھٹکا یہاں آنکلتا ہے تم اس کو ذبح کر کے گوشت بانٹ کر کھا لیتے ہو۔ وہ بولا "اے مسافر توبہ کر۔ خدا سے ڈر۔ مسافروں کو مار کر ہم نہیں کھاتے۔" حاتم نے کہا یہ تو طرفہ ماجرا ہے کہ آپ ہی تو کہتا ہے کہ گوشت آدمی کا ہے۔ پس کوئی ہم جنس کو ذبح کر کے نہیں کھاتا مگر غیر کو۔" اس شخص نے جواب دیا "تو غلط سمجھا ہے ہمارے ملک کی یہ رسم ہے کہ جو کوئی بیمار پڑتا ہے اس کے قبیلے کے لوگ اس کو ذبح کر کے آپس میں گوشت کے حصے کر لیتے ہیں۔ چنانچہ اس سبب سے سارے شہر میں اپنی موت سے کوئی نہیں مرتا اور نہ قبر بنتی ہے۔" اس ماجرے کو سن کر حاتم نے کہا "لعنت خدا کی تمہاری ایسی رسم پر اور تمہارے شہر پر۔ خدائے کریم اکثر بیماروں کو اچھا کرتا ہے اور اکثر اچھوں کو مار ڈالتا ہے۔ پس جو بیمار ہو تم اس کو ذبح کر کے کھا جاؤ۔ یہ فعل کس قوم میں درست ہے۔ یہ کیا ظلم ہے۔ اس حرکت سے سب کے سب گنہگار ہوتے ہیں اور ہزاروں خون تمہاری گردن پر ہوتے ہیں۔ تمہارا دیکھنا روا نہیں۔" یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا اور جنگل کی راہ لی۔ دور جا کر کیا دیکھتا ہے کہ ایک شیر مارے بھوک کے زمین پر تڑپ رہا ہے۔ یہ حالت دریافت کر کے اس نے ہرن کو شکار کیا اور شیر کے آگے ڈال دیا۔ اس نے بخوبی تمام پیٹ بھر کر کھایا اور سجدۂ شکر ادا کر کے جنگل کی راہ لی اور حاتم نے بھی کچھ کباب کر کے کھائے۔ ایک ہرا نے تالاب پر جا کر پانی پیا اور درگاہِ الٰہی میں سجدۂ شکر ادا کر کے آگے کا راستہ لیا۔ جب کسی جنگل میں میوہ و دانہ پاتا اسی طرح شکار کر کے گوشت کھاتا۔

چند روز کے بعد ایک آبادی نظر آئی اس کی طرف چلا۔ جب قریب پہنچا کیا دیکھتا ہے کہ بہت سے لوگ میدان میں آگ جلا کر اس کے گرد کھڑے ہیں۔ اس نے بڑھ کر پوچھا کہ اے یارو یہ کون سا ملک ہے اور تم کون ہو۔ اس جگہ اتنی لکڑی جمع کر کے آگ کیوں جلائی ہے؟ انہوں نے کہا اے فقیر تو اپنی راہ لے۔ تجھے اس کے دریافت کرنے سے کیا حاصل۔ یہاں کچھ رسوائی نہیں ہوتی جو ہم تجھے کہہ دیں۔ ہماری قوم سے جو ایک شخص مر گیا ہے اس کی جورو اس کے ساتھ جلتی ہے۔ حاتم نے کہا اے یارو تم اس مردے کو زمین میں کیوں نہیں گاڑ دیتے اور اس عورت کو جیتے جی کیوں جلاتے ہو۔ انہوں نے کہا اے عزیز معلوم ہوا کہ تو یہاں کا رہنے والا نہیں۔ یہ ملک ہندوستان ہے یہاں کی یہی رسم ہے۔ حاتم نے کہا یہ رسم نہایت بد ہے۔ یہ کہہ کر وہاں سے رخصت ہوا اور کسی گاؤں میں جا پہنچا۔ ایک شخص سے پانی مانگا۔ وہ ایک کٹورہ دودھ کا اور ایک میٹھے پانی کا لایا اور کہا ان دونوں میں سے جسے جی چاہے اسے پی لے۔ حاتم نے دونوں پیالے پیئے۔ پھر کہا اے مسافر اس وقت میرے گھر میں اچھے خوشبودار باسمتی کے چاول پکے ہیں بلکہ تیار دھرے ہیں۔ اگر تو کہے تو وہ بھی لے آؤں اس کے ساتھ کھانا نہایت مزہ پائے گا۔ حاتم بولا کہ نیکی کا پوچھنا کیا ہے۔ دل میں اس کی ہمت پر آفرین کہنے لگا۔

غرض وہ ہندو ایک تھالی میں مٹھائی اور ایک میں چاول لے آیا۔ حاتم نے بخوبی کھایا اور رات کی رات اسی گاؤں میں بسر کی۔ صبح ہوتے ہی اس ہندو کی جورو نے آ کر رسوئی کی تیاری کی اور کہا کچھ اس میں سے کھاؤ اور دو چار دن یہیں رہو تا کہ راہ ماندگی دور ہو۔ یہ بات سن کر حاتم نے ان سے کہا کہ ہمت آفرین ہے۔ یہ بات سن کر انہوں نے نہایت عجز و نیاز سے کہا "ہم سے تمہاری خدمت کب ہوئی یہ کھانا معمولی لڑکوں کا موجود تھا وہی ہم بے تکلف لے آئے ہیں۔ اگر دو تین روز یہاں رہو تو البتہ ہم اپنے مقدور کے موافق کچھ خدمت بجا لائیں گے۔" حاتم کے واسطے ایک پلنگ تکلف سے بچھایا اور اس کے آگے فرش بھی صاف ستھرا کر دیا۔ پھر اقسام اقسام کے کھانے پکوا کر اس کے سامنے رکھ دیئے اور کہا اس میں سے کچھ نوش جان فرمائیے زہے احسان و مہربانی ہے۔ حاتم نے ایسے کھانے کبھی نہ کھائے تھے ان کو کھا کر بہت محظوظ ہوا اور بہت تحسین و آفرین کر کے کہنے لگا کہ یہ ہندوستان عجب گلستان ہے مگر یہاں کی رسم بد ہے کہ زندہ عورتوں کو موئے خصم کے ساتھ جلاتے ہیں۔ اس کو

سن کر انہوں نے کہا چونکہ زن و شوہر باہم الفت رکھتے ہیں۔ تب کہ آپس میں عاشق و معشوق ہوتے ہیں۔ اس لئے جب کہ خاوند مرے اور جورو جیتی رہے۔ ہم بزور نہیں جلاتے وہ اپنی خوشی سے آپ جلتی ہے۔

اتفاقاً وہاں کا رئیس بیمار ہو کر دو چار ہی دن میں مر گیا۔ اس کی چار جورو تھیں اور پہلی بیوی کے ایک لڑکا بھی تھا۔ جب اس کی ارتھی بنا کر چلے تب وہ چاروں کمخواب کے لہنگے پہن کر لال تاش کی ساریاں باندھ کر گہنے پاتے سے آراستہ ہو کر پھولوں کے ہار گلے میں ڈال کر بالوں کو بکھیر کر ساتھ ہو لیں۔ قبیلے والے لوگ ان کے پاؤں پر گر پڑے کہ تم بھری پری ہو۔ تم کو جلنا مناسب نہیں۔ انہوں نے کسی کا کہنا نہ مانا۔ تب حاتم ان کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ اے پریزادو تمہیں شرم نہیں آتی جو اپنے گھر سے نکل کر نامحرموں میں آتی ہو اور ایک مُردے کے ساتھ جلا چاہتی ہو۔ وہ ہنس کر کہنے لگیں کہ اے جوان تجھے ہمیں دیکھنے سے حیا نہیں آتی۔ ہم تو مُردے ہیں ہم کو تیرے پردے کی خبر نہیں۔ کیونکہ وہ کونسا دن تھا جو ہم نے اس مُردے کے ساتھ عیش و آرام کیا تھا۔ اب جو وہ مر گیا ہے تو ہم اس سے جدا ہوں اور جیتی رہیں۔ یہ محبت سے اور مروت سے دور ہے۔ اس کے سوا تمام عمر آتشِ غم میں جلنا پڑے گا۔ اس سے بہتر ہے کہ ہم اس کے ساتھ ہی جل بجھیں جو تمام عمر کے غم سے چھوٹیں گے۔ پرمیشور جانے کیونکر اس بات سے جی ڈرتا ہے کہ کہیں شیطان اپنے مکر سے وسوسہ نہ ڈالے کہ جن کے سبب اپنے ساتھی کو بھول کر کسی طرف بد نظر دیکھیں، اور اس سے اپنی زندگی پر لعنت کی ہے۔ غرض انہوں نے حاتم کا کہنا نہ مانا اور دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتی بھالتی وہاں تک پہنچیں۔ پھر اس مُردے کو چتا میں رکھ کر اور آپ ہنستی ہوئی آئیں کسی نے اس کا سر زانو پر رکھا اور کسی نے پاؤں گود میں لئے۔ یکایک چتا کو آگ لگا دی۔ تب حاتم نے جانا کہ یہ اس آگ سے ڈر کر بھاگ اٹھیں گی۔ یہ گمان غلط ہوا اور ہنسی خوشی اس کے ساتھ جل کر راکھ ہو گئیں۔ حاتم یہ احوال دیکھ کر گھبرایا اور افسوس کرنے لگا جب وہ اپنے اپنے گھروں کو چلے تب حاتم بھی ہندوؤں کے ساتھ آیا۔ اس نے کہا یہ عورتیں اپنی خوشی سے جلتی ہیں۔ کوئی ان پر زبردستی نہیں کرتا اور محبت کی شرط یہی ہے۔ حاتم نے کہا یہ سچ ہے اور وفاداری کا بھی یہی طریقہ ہے۔

غرضیکہ کئی روز کے بعد حاتم نے پھر کہا کہ اے یارو مجھے کوہِ ندا کی طرف جانا ہے رخصت کرو۔ یہ بات سن کر ہندوؤں نے کہا کہ اے جوان کوہِ ندا یہاں سے بہت دور ہے تو نہ پہنچ سکے گا۔ حاتم نے پھر کہا اے عزیز مجھے رخصت کرو۔ یہ کہہ کر گاؤں گاؤں ملک ملک کی سیر کرتا ہوا اُتر کی طرف پہنچا۔ ایک شہر دکھائی دیا جب قریب پہنچا تو دیکھا کہ بہت سے لوگ جمع ہیں اور شور و غل کرتے ہیں۔ اس نے جا کر پوچھا اے یارو شور و غل کا کیا سبب ہے۔ کسی نے کہا ”یہاں کے رئیس کی بیٹی مر گئی ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اس کے خاوند کو اس کے ساتھ جیتا گاڑ دیں۔ وہ اس بات کو قبول نہیں کرتا اسی واسطے یہ شور و غل ہے۔“

حاتم نے کہا ”تمہارا رئیس کہاں ہے؟ مجھے اس کے پاس لے چلو۔ میں اس سے کچھ کہوں گا۔“ یہ بات سن کر وہ اس کو اپنے سردار کے پاس لے گئے۔

حاتم نے ان کو دیکھتے ہی کہا کہ ”اے بزرگ تمہاری کیا رسم ہے جو جیتے کو مُردے کے ساتھ گاڑتے ہو اور اس پر یہ غضب کہ وہ غریب راضی نہیں۔ اس پر زبردستی کرتے ہو اور خدا سے نہیں ڈرتے ہو۔“

سردار نے کہا: ”اے عزیز یہ جوان بھی تیری طرح مسافر اس شہر میں وارد ہوا تھا چند روز یہاں رہ کر میری بیٹی کو چاہنے لگا اور فوراً ہم لوگوں میں مل گیا۔ اس شہر کا دستور ہے کہ جب تک لڑکی یا لڑکا اپنی جوانی پر نہیں آتا تب تک ہم لوگ اپنی رغبت سے نہیں بیاہتے۔ جب تک کہ آپس میں عشق و محبت کی حد سے گزر جائے۔ یہاں تک کہ ہر ایک اپنی خوشی سے اقرار کرے کہ جو کوئی ہم میں سے مر جاوے تو اس کے ساتھ دوسرا گڑے گا۔ تب ہم دونوں کو بیاہ دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ جوان بھی رسم سے آگاہ ہو کر اس لڑکی پر عاشق ہوا تھا جب محبت کامل دیکھی تب اس کے ساتھ دفن کرتے ہیں یہ کیا نا انصاف امر ہے کہ ایک مدت تک اچا چمن گمنا رہا اور اس کے باغ جوانی سے گل مراد لوٹتا رہا۔ اب جو مر گئی تو یہ اپنی خوشی سے اس کے

سمانا نہیں گڑتا۔ اور اپنے اقرار پر ثابت قدم نہیں رہتا تمہیں بتاؤ کس کا قصور ہے ہم زبردستی کسی کو نہیں گاڑتے۔ اگر اس کو باندھ کر قبر میں رکھ دیں تو البتہ غلط ہے۔ تم ہی پوچھو کہ اپنے قول سے یہ کیوں پھرتا ہے۔"

یہ بات سن کر حاتم اس کے پاس گیا اور کہنے لگا "اے جوان! تو کس لئے اپنے کہنے پر عمل نہیں کرتا۔ کب تک جئے گا آخر مرنا ہے بہتر ہے کہ جو کچھ کہا اس پر ثابت قدم رہ۔"

اس نے کہا "اے جوان تو بھی انہیں میں مل گیا۔ اپنے شہر کا دستور کیوں نہیں بیان کرتا؟"

حاتم نے کہا "میں کیا کہوں تو آپ ہی اقرار کر چکا ہے اب پھرنے سے تجھے شرم نہیں آتی؟"

اس نے کہا "یہ مجھ سے کبھی نہ ہوگا جو میں ان کا کہا مانوں اور جیتے جی مُردے کے ساتھ گڑوں۔"

حاتم نے معلوم کیا کہ یہ سب کے سب بے گاڑے نہ رہیں گے اور یہ بھی اپنی خوشی سے نہ گڑے گا۔ اس بات کا لحاظ کر کے اپنی بولی میں کہا "تو خاطر جمع رکھ میں تجھے رات کو نکال لوں گا پر اب ان کے سامنے گڑ۔"

اس نے کہا "میں تیرے نکالنے تک کیونکہ زندہ رہوں گا؟"

حاتم نے تسلی کر کے لوگوں سے کہا "یارو! یہ اجل گرفتہ اپنی بولی میں کہتا ہے کہ ہمارے شہر کا یہ دستور ہے کہ قبر حجرے کے طور پہ بناتے ہیں اگر تم بھی اسی طرح سے بناؤ گے تو میں اپنی خوشی سے گڑوں گا۔" اس سخن کو سن کر وہ کہنے لگے کہ یہ بات حاکم سے تعلق رکھتی ہے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جو وہ کہے گا وہی کریں گے۔

حاتم ان سبھوں کو ان کے حاکم کے پاس لے گیا اور کہنے لگا "خداوندا یہ شخص گڑنے پر راضی نہیں اور کہتا ہے کہ جس طرح میرے ملک میں قبر بنتی ہے اگر اس ڈھب کی قبر بناؤ گے تو میں قبول کر دوں گا۔"

حاکم نے کہا "کس طرح کی بنتی ہے؟"

حاتم نے کہا "حضرت سلامت! کوٹھڑی کی طرح بہت بڑی کہ جس میں دس بیس آدمی اچھی طرح لیٹ جائیں۔"

یہ بات حاتم کی زبان سے سنتے ہی حاکم نے کہا "جس طرح یہ کہے بموجب اس کے کہنے کے کرو۔"

یہ سن کر وہ لوگ پھر آئے اور ایک قبر ایسی ہی بنوائی تب حاتم نے لوگوں کی آنکھ بچا کر اس سے کہا کہ اندیشہ نہ کر، وقت شب تجھے نکال لوں گا۔ وہ اس کلمہ سے راضی ہوا اور لوگوں سے کہنے لگا "اے یارو اب دیر نہ کرو کہ جو تم چاہتے ہو مجھے قبول ہے۔"

آخر انہوں نے ان دونوں کو گاڑ دیا اور ایک پتھر سے اس کے منہ کو بند کر کے مع حاتم شہر کو گئے۔ پھر اس کی مہمانداری کی اور ایک مکان ستھرا سا رہنے کو دیا۔ حاتم پھر رات ہونے کا منتظر تھا کہ کسی طرح اس شخص کو قبر سے باہر نکالے۔ جب رات ہوئی اور گھر والے سو رہے حاتم اپنے بچھونے پر سے اٹھا اور اس گور کی طرف چلا۔ اس ملک کا یہ دستور تھا کہ تین روز تک مردہ کی قبر پر ان کے وارث تمام رات جا کر جاگا کرتے تھے اور فجر آتے تھے... چنانچہ اسی سبب سے حاتم کو قابو نہ چلا۔ چوتھے روز حاتم اس گور پر گیا اور وہ شخص جو اس میں دفن تھا حاتم کو بہت سخت سست کہہ رہا تھا۔ الغرض حاتم نے پکارا وہ نہ بولا۔ جانا کہ شاید مر گیا۔ پھر پکارا کہ اے جوان میں تجھے نکالنے آیا ہوں۔ اس نے جواب نہ دیا۔ حاتم نے پھر پکارا۔ پھر بھی نہ بولا حاتم کو یقین ہو گیا کہ بے شک مر گیا۔ کمال افسوس ہوا اور بے اختیار رونے لگا۔ چوتھی بار بآواز بلند پکارا "اے جوان اگر جیتا ہے تو جواب دے ورنہ میں اپنا وعدہ وفا کر چکا۔ تو قیامت تک یہیں رہے گا۔"

وہ یکایک چونک پڑا اور نابداں کے پاس آ کر کہنے لگا "اے شخص تو کون ہے؟"

حاتم نے جو اس کی آواز سنی سجدۂ شکر بجا لایا اور کہا کہ "میں وہی ہوں جو تجھ سے وعدہ کر گیا تھا۔" یہ کہہ کر خنجر سے قبر کھود کر نکالا اور ایک ساعت کے

کھانا کھلا کر کہا کہ اب یہ دھر تیرا منہ اٹھے چلا جا۔ اس نے کہا کہ میرے پاس خرچ نہیں۔ حاتم نے کئی درہم دے کر رخصت کیا اور اس قبر کو درست کر کے اپنی جگہ پر آ کر سو رہا۔

صبح کو اٹھ کر لوگوں سے کہا کہ کوہ ندا کا راستہ بتاؤ میں جاؤں۔ انہوں نے کہا جاؤ یہاں سے قریب ہے۔ تھوڑے فاصلے پر ایک دوراہا ملے گا اگر داہنی طرف جاؤ گے تو منزلِ مقصود کو پہنچے گا۔ حاتم ان سے رخصت ہوا اور دس روز تک رات دن چلا گیا۔ بعد طے منازل گیارھویں دن اسی دوراہے پر جا پہنچا اور ان کی نصیحت کو بھول کر بائیں طرف جا نکلا حیف ہے کہ جس راہ کو انہوں نے منع کیا تھا اسی پر جا پہنچا اور دو دن کے بعد کیا دیکھتا ہے کہ تمام جانور درندے کیا گزندے بھاگے ہوئے چلے آتے ہیں۔ یہ ایک کونے میں کھڑا ہو کر دیکھنے لگا کہ شاید کوئی درندہ پیچھے پڑا ہے جو اپنا جی چھوڑے گرتے پڑتے چلے آتے ہیں۔ یہ سمجھ کر درخت پر چڑھ گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ بڑے بڑے ہاتھی اور گینڈے بھی گھبرائے ہوئے بے اختیار دوڑے چلے آتے ہیں اور ان کے پیچھے ایک چھوٹا سا جانور مہیب صورت چراغ سی آنکھیں سر پر دم چھتر کئے ہوئے چلا آتا ہے۔

حاتم ڈرا کہ کوئی بلائے عظیم ہے کہ جس کے ڈر سے اتنے بڑے جانور درندے بھاگے چلے آتے ہیں میں عجب کس شمار میں ہوں مستعد ہو کر خنجر نکال لیا۔ اتفاقاً وہ جانور اسی درخت کے نیچے آیا اور آدمی کی بو پاتے ہی غرّا کر اچھلا۔ حاتم نے ایک خنجر ایسا مارا کہ دونوں ہاتھ قلم ہو گئے۔ گر پڑا اور پھر سنبھل کر نہایت غضب سے لپکا۔ حاتم نے پھر اس کے پیٹ میں ایک خنجر مارا کہ انتڑیاں نکل پڑیں۔ زمین پر گر پڑا اور گرتے ہی پیشاب کر کے دم کو اس میں بھگو کر ہلانے لگا۔ جہاں جہاں اس کی بوندیں پڑیں وہاں آگ لگ گئی۔ جب اس درخت کے پاس پہنچی حاتم جست کر کے ایک چشمہ میں جا پڑا اور وہ جانور مر گیا۔ جب وہ آگ بجھ گئی تب حاتم اس پانی سے نکل کر اس درخت کے نیچے آیا اور اس جانور کے دانت جو خنجر کے برابر تیز تھے اکھاڑ لئے اور دم کانوں سمیت کاٹ کر ترکش میں ڈال لئے اور چل نکلا۔

کئی دن کے بعد ایک قلعہ دکھائی دیا اسی طرف متوجہ ہوا۔ جب نزدیک پہنچا تو اس کے کنگرے آسمان سے لگے دیکھے اور بڑی بڑی عمارتیں آئینہ دار اس میں چمک رہی تھیں۔ وہ چوک کا بازار نہایت ستھرا اور صاف آراستہ ہو رہا تھا اور ہر شے دکانوں میں موجود تھی۔ مگر آدمی کا پتہ مفقود یہ دیکھ کر حاتم حیران ہوا اور دل میں کہنے لگا کہ کوئی دیو اس شہر میں آتا ہے کہ جس کے ذریعہ سے یہاں کے لوگ دکانیں چھوڑ کر بھاگے۔ یہ سوچ کر آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ خاص قلعہ شاہی میں پہنچا۔

یہاں بادشاہ اپنے اہل و عیال اور اجناس سمیت رہتا تھا۔ دو چار نوکر بھی باہر دروازے کے دریچوں میں بیٹھے تھے۔ حاتم کو دیکھ کر ایک نے کہا مدت کے بعد ایک مسافر شہر میں آیا ہے۔ دوسرے نے کہا اس کو پکارو کہ ادھر آئے۔ یہ بات سن کر ایک شخص نے پکارا۔ حاتم ایک دریچے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ بادشاہ نے کھڑکی میں سے سر نکال کر کہا کہ "اے جوان تو کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا؟"

حاتم نے کہا کہ یمن کے رہنے والوں میں سے ہوں۔ شاہ آباد سے آیا ہوں۔ کوہ ندا کو جاؤں گا۔

یہ بات سن کر بادشاہ نے کہا: "اے جوان تو راہ بھول گیا جو دائیں طرف سے آیا۔ شاید تیری موت تجھ کو یہاں لائی ہے۔"

حاتم نے کہا: "مرضیٔ حق پر راضی ہوں لیکن اے شخص تو اپنا ماجرا کہہ۔"

اس نے کہا: "میں یہاں کا بادشاہ ہوں اور اس ملک میں چند روز سے ایک بلائے عظیم آتی ہے اس کے سبب سے کیا رعیت کیا سپاہ سب شہر چھوڑ کر چلے گئے اور شہر ویران ہو گیا لیکن وہ بھی بے قصور ہیں کیا کریں کیونکہ کسی کی طاقت نہیں جو عہدہ برآ ہو سکے اور میں اپنی شرم و حیا سے اہل و عیال سمیت قلعہ میں بند ہو گیا۔ طاقت نہیں رکھتا کہ اسے ماروں ناچار ہو کر گوشہ گیری توکل بخدا کی۔" حاتم نے کہا: "اے بادشاہ وہ بلائے ناگہانی کیا کوئی دیو ہے یا کوئی درندہ عظیم ہے کہ کوئی اس کی تھاہ ہی نہیں۔"

بادشاہ نے فرمایا کہ "اس کا مسکن کوہ قاف ہے مگر تھوڑے دنوں سے یہاں اس کا گذر ہونے لگا ہے۔ اسی کے باعث تمام ملک ویران ہو گیا۔

ہر روز اس کا ایک وقت آتا اور دو چار آدمیوں کو کھا کر چلے جاتا۔ آج تک قدم قلعہ میں نہیں آیا۔ اس واسطے ایک خندق عظیم اس کے گرد پانی سے مدام بھری رہتی ہے۔ معلوم نہیں وہ کیا ہے۔"

یہ سن کر حاتم بولا: "اے بادشاہ تجھے مبارک ہو۔ میں نے فلاں جنگل میں اس کو مارا ہے۔ خدا مسبب الاسباب ہے کہ میں کوہِ ندا کی راہ بھول کر یاشیں طرف آنکلا۔" حاتم نے پھر تمام ماجرا اس جانور کا اور اپنا بیان کیا۔ اس بات کو سنتے ہی بادشاہ اپنے قلعہ سے اترا اور حاتم کو اپنے گلے سے لگایا۔ اندر لے گیا۔ بہ عزت تمام مسند پر بٹھا کر انواع اقسام کے کھانے منگوا کر اس کے سامنے چنوائے۔ حاتم نے بخوبی تناول فرمایا اور بادشاہ بھی اس کا شریکِ طعام رہا۔ پھر آپ خاصہ منگوا کر نوش جان کیا اور اس کو بھی کھلایا۔

اس کے بعد بادشاہ نے کہا: "میں کیونکر باور کروں کہ وہ بلا ماری گئی؟"

حاتم نے اس کے دانت اور دم ترکش سے نکال کر دکھلائے بادشاہ ان کے دیکھتے ہی حاتم کے پاؤں پر گر پڑا اور بہت شکر گزاری کی۔ پھر ہر طرف لوگوں کو شقے پروانے بھیجے کہ وہ بلا دفع ہوئی۔ تم بے دھڑک آکر اپنے ملک میں بسو اور بخوبی اوقات بسر کرو۔

چند روز کے بعد حاتم نے رخصت چاہی اور عرض کی کہ ایک رہبر میرے ساتھ کر دو کہ کوہِ ندا کا راستہ بتا دے۔ بادشاہ نے فرمایا: "اے جوان یہ شہر خدا کے فضل سے آباد ہو جائے گا اسے اپنا ہی سمجھو۔ یہیں بود و باش اختیار کرو۔ میں اپنی بیٹی تمہاری خدمت میں دیتا ہوں۔ اس کو قبول کرو۔"

حاتم نے کہا: "جب تک میں بندگانِ خدا کے کاموں سے فراغت نہیں پاتا عیش کو حرام جانتا ہوں۔"

بادشاہ نے یہ کلام سن کر کہا: "آفرین تیری ہمت پر۔" ایک رہبر دے کر رخصت کیا۔ حاتم اس کے ساتھ ہوا۔

تھوڑی دور جا کر وہ کہنے لگا: "اے حاتم! کوہِ ندا کی یہی سیدھی راہ ہے۔" حاتم ادھر متوجہ ہوا۔ پھر ایک شہر میں پہنچا وہاں کے لوگ اس کو حاکم کے پاس لے گئے۔ اس نے اٹھ کر تعظیم کی اور پوچھا کہ اے مسافر تو کہاں سے آیا ہے اور اس شہر سکندر آباد میں کیونکر تشریف لایا ہے۔ اب اپنا آنکھوں دیکھا حال سچ کہہ۔"

حاتم نے کہا: "مجھ کو حسن بانو بن برزخ سوداگر کی بیٹی نے بھیجا ہے کہ تو جا کر کوہِ ندا کی ٹھیک ٹھیک خبر لا۔ حق تو یہ ہے کہ میں نے بہت رنج اٹھائے۔ اب امیدوار اس بات کا ہوں کہ اگر تم اس بھید سے واقف ہو تو عند اللہ کہ وہ عین بندہ نوازی ہے اور مسافر پروری۔ کیونکہ میرے نصیب راست سے مبدل ہو جائیں۔"

رئیس شہر نے کہا: "کوہِ ندا کا ایسا راز نہیں جو سرسری بیان ہو سکے۔ اگر تو چند روز یہاں رہے گا تو معلوم ہو جائے گا۔" حاتم نے کہا بہت اچھا۔ حاکم نے اس کے رہنے کو مکان عالیشان دیا۔ اکثر آپ بھی شریکِ صحبت رہتا۔ ایک روز حاتم بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا کہ ملنے میں کوہِ ندا کا ذکر آگیا تو بیان کرنے لگے۔ جس کے قلعہ کی ہر ایک دیوار آسمان سے باتیں کر رہی ہے اور اس سے خود بخود ایک آواز پیدا ہوتی ہے۔

یہ اسی گفتگو میں تھے کہ ایک آواز پہاڑ کی طرف سے آئی: "یا اخی! یا اخی!" اس مجلس میں سے ایک جوان خوش رو دوڑا۔ لوگوں نے اس کے وارثوں سے جا کر کہا: "فلاں شخص کی کوہِ ندا سے طلب ہوئی ہے۔" وہ اس بات کے سنتے ہی دوڑے دیکھا کہ اس کا تمام منہ سرخ ہو رہا ہے۔ لوگ اس کے گرد ہیں۔ وہ بے اختیار کوہِ ندا کی طرف چلا جاتا تھا۔ یہ حال دیکھ کر حاتم حیران ہو کر پوچھنے لگا اے یارو اس جوان کو کیا ہوا ہے کہ دوڑا جاتا ہے۔ نہ کچھ کہتا ہے نہ سنتا ہے۔ لوگوں نے کہا اس کو کوہِ ندا سے آواز آئی ہے شتابی آ۔ حاتم نے معلوم کیا کہ کس نے بلایا ہے جو دوڑا جاتا ہے اس بات کو سوچ کر اس کو پکڑ لیا اور کہا کہ اے بھائی یہ مروت سے بعید ہے جو تو نہیں بتاتا۔ برائے خدا کہہ دے کہ کس کے بلانے پر ہم سب کو چھوڑے جاتا ہے۔ غرضیکہ حاتم نے ہر ممکن کوشش کی اور سر پٹکا اس نے کچھ جواب نہ دیا اور ہاتھ جھٹک کر بھاگا اور پہاڑ کے نیچے جا پہنچا۔ حاتم بھی جا لپکا۔ وہ نظروں سے پہاڑ پر غائب ہو گیا۔ اس نے ہر چند نظر کو دوڑا کر دیکھا پر کچھ پتہ نہ چلا صرف پتھر ہی پتھر نظر آئے۔ بہت حیران ہوا۔ آخر

سب کے ساتھ شہر میں آیا۔

حاصل یہ ہے کہ ہر شخص اپنے گھر کو آیا پر کوئی اس کے واسطے نہ رو یا بلکہ بہت سا کھانا وغیرہ دیا۔ حاتم نے پوچھا تم میں سے کسی کو معلوم ہے کہ اس پر کیا گذری۔ انہوں نے جواب دیا تو بھی موجود تھا جو تو نے دیکھا۔ یہ سن کر حاتم چپ ہو رہا اور اس جوان کے واسطے آبدیدہ ہو کے کہنے لگا کہ افسوس دنیا یہی ہے۔ انہوں نے کہا اے جوان ہمارے ملک کی یہی رسم ہے۔ اگر ایسا کرے گا تو نکالا جائے گا۔ حاتم کہنے لگا کہ حسن بانو کو کیا جواب دوں گا۔ غرض چھ مہینے حاتم کو اور گذر گئے اور اس عرصہ میں اسی طرح سے پندرہ آدمی پہاڑ کی طرف گئے۔ اتفاقاً ایک شخص حاتم نامی وہاں بھی تھا۔ حاتم میں اور اس میں نہایت دوستی تھی کہ ناگاہ کوہ ندا کے قلعہ سے آواز آئی "یا اخی! یا اخی!" اس بات کے سنتے ہی وہ بے چارہ متوجہ ہوا اور اس کے خویش و اقارب کو خبر پہنچی کہ حاتم بلایا گیا۔ وہاں سب آ کر جمع ہوئے اور اسے گھیر لیا۔ تب حاتم کہنے لگا کہ یہ بھی اسی طرح جائے گا افسوس ہے کہ مجھ کو اس کے ساتھ محبت ہو گئی تھی۔ یہ بھی جدا ہوتا ہے۔ میں اس کو ہرگز نہ چھوڑوں گا اس کا ساتھ دینا مجھ کو ضروری ہے جو ہونی ہو سو ہو۔ کیونکہ یہاں کے لوگوں سے کوہ ندا کا مفصل حال معلوم نہ ہوا۔ یہ بات ٹھہرا کر کمر کس باندھی اور اس کا ہاتھ پکڑ کے پہاڑ کی طرف دوڑا۔ ہر چند کہتا تھا کہ بھائی یہ کیا احوال ہے؟ تجھے کون کھینچے لئے جاتا ہے۔ وہ کچھ جواب نہ دیتا تھا۔ آخر کار جھنجلا کر بولا اے بے مروت یہ کیسی دوستی تھی۔ آخر ہم تو ایک مدت آپس میں رہے تیری زبان کیوں بند ہو گئی۔ سچ کہہ تجھے کون لئے جاتا ہے؟ وہ کچھ جواب نہ دیتا تھا بلکہ حاتم کے ہاتھ سے اپنے آپ کو چھڑانے لگا اور اتنا زور کیا کہ اس کے ہاتھ چھوٹ گئے اور حاتم زمین پر گر پڑا۔ تب وہ چلا اور حاتم اس کے پیچھے چلا گیا اور دونوں آگے پیچھے پہاڑ کے نیچے جا پہنچے۔ حاتم نے اچھل کر زور سے اس کی کمر پکڑ لی۔ ہر چند اس نے چاہا کہ اس کو جدا کرے لیکن جدا نہ ہو سکا۔ اسی طرح دونوں گرتے پڑتے پہاڑ کے اوپر جا پہنچے۔

جونہی قلعہ کے نزدیک گئے ایک کھڑکی دکھائی دی۔ دونوں پٹے پٹلے اس کے اندر چلے گئے۔ لوگوں کی نظروں سے غائب ہوئے وہ ناچار وہاں سے حاتم کا افسوس کرتے ہوئے شہر میں آئے اور حاکم کو خبر پہنچائی کہ مسافر بھی حاتم کے ساتھ اسی پہاڑ پر چلا گیا۔ اس بات کے سنتے ہی حاکم غصہ میں آ کر کہنے لگا کہ نادان آج تک کوئی بے بلائے اس پہاڑ پر نہیں گیا تم نے اس کو کیوں چھوڑا؟ اور کس واسطے جانے دیا؟ یہ پاپ اس غریب کا تمہاری گردن پر ہے۔ انہوں نے عرض کی خداوند ہم نے اس کو بہت سمجھایا کہ وہاں نہ جا مگر ہمارا کہنا نہ مانا اور کہا کہ میرا یار جاتی ہے میں ہرگز اس کو تنہا نہ چھوڑوں گا۔ بلکہ جو مصیبت اس پر پڑے گی میں بھی اس میں شریک ہوں گا۔

غرض حاتم اور وہ جوان ایک میدان وسیع میں پہنچے۔ وہاں ایک سبزہ زار نظر آیا کہ نظر کام نہ کرتی تھی گویا فرش زمردین چاروں طرف بچھا ہے۔ تھوڑی سی زمین اس میں سے خالی تھی۔ وہ جوان اس پر پاؤں رکھنے لگا۔ پاؤں رکھتے ہی چت گر پڑا۔ حاتم نے چاہا کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھائے اتنے میں اس کا منہ زرد ہو گیا۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ ہاتھ پاؤں سخت ہو گئے۔ اس کا یہ حال دیکھ کر حاتم نے اپنے دل میں کہا یہ مر گیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ بے اختیار رونے لگا۔ اس عرصہ میں وہ زمین تڑخ گئی وہ جوان اس میں سما گیا اور وہ جگہ برابر ہو گئی۔

اس ماجرے کو دیکھ کر حاتم نے سجدۂ شکر ادا کیا اور کہا کہ دنیا فانی ہے سب کو مرنا ہے۔ واقعی اب کوہ ندا کا حال کما حقہٗ معلوم ہو گیا۔ بس اب یہاں سے چلئے۔ یہ دھن باندھ کر روانہ ہوا اور تمام دن پھرا مگر اس کھڑکی اور قلعہ کا کھوج نہ پایا۔ خدا جانے کھڑکی کیا ہوئی اور قلعہ کدھر گیا۔ سات روز تک حیران و سرگرداں بے آب و دانہ رہا۔ غرض جینے سے مایوس ہو کر دل میں کہنے لگا کہ اے حاتم تیری یہاں موت آئی ہے جو تو بے بلائے آیا۔ کیونکہ نہ وہ قلعہ نظر آتا ہے نہ وہ پہاڑ نہ وہ شہر۔ اتنے میں ایک دریا کے پاس جا پہنچا۔

کیا دیکھتا ہے کہ وہ بڑے زور شور سے بہ رہا ہے اور کچھ پار نہیں ملتا۔ یہ نہایت متفکر ہوا اور کہنے لگا کہ الٰہی اب اس سے کیونکر پار ہوں۔ تیرے سوا کون ہے جو بیڑا پار کرے۔ اتنے میں ایک ناؤ نظر آئی کہ ادھر ہی چلی آتی ہے۔ اس نے جانا کہ کوئی ملاح لئے چلا آتا ہے۔ جب کنارے آ لگی تو

اس کو دیکھا کہ کوئی ملاح نہیں متعجب ہو کر شکر خدا کا بجا لایا۔ سوار ہوا کیا دیکھتا ہے کہ ایک دسترخوان میں کچھ لپٹا ہوا دھرا ہے۔ بھوکا تو تھا ہی، فوراً ہاتھ بڑھا کر کھولا تو دو روٹیاں اور مچھلی کے کباب گرم ہتے۔ چاہا کہ کھائے، سانھ ہی دھیان آیا کہ شاید ملاح نے اپنے واسطے رکھا ہو۔ اتنے میں ایک مچھلی نے دریا سے سر نکال کر کہا اے حاتم یہ تیرا حق ہے بے اندیشہ کھا۔ یہ کہہ کر غوطہ مار گئی۔ حاتم نے کھا کر پانی پیا اور شکر کیا۔

وہیں ایک آندھی ایسی چلی کہ تین دن میں کشتی کنارے پر جا لگی۔ حاتم اترا اور متوجہ شہر کا ہوا۔ حاتم نے چاہا کہ اگر شہر ملے تو ان کی حقیقت لوگوں سے بیان کرے۔ حتیٰ کہ سات شبانہ روز چلتے چلتے گذر گئے کہیں سُراغ نہ ملا۔ مگر دن چلا جاتا تھا کہ پہاڑ نظر آیا۔ تین دن کے بعد اس کے نیچے جا پہنچا اور جس پتھر کو اٹھا کر دیکھتا ہے اس کے نیچے لہو بہتا ہوا پایا۔ فکر کرنے لگا کہ کس سے پوچھوں کیا ماجرا ہے۔ ناچار پہاڑ پر چڑھ گیا اور بارہ دن کے بعد اس پر جا پہنچا تو ایک میدان کفِ دست دکھائی دیا کہ وہاں کی خاک اور جانور چرندے اور پرندے بیر بہوٹی کی طرح لال ہو رہے ہیں۔ حاتم بھوک پیاس بھول گیا اور قدم بڑھائے چھ کوس تک چلا ہی گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ لہو کا ایک دریا لہریں مار رہا ہے اور اس میں جتنے جانور ہیں ایسے سُرخ ہو رہے ہیں گویا لہو سے بنے ہیں۔ گھبرایا کہ اس دریا سے کیونکر پار ہوں گا۔ ناچار کنارے کنارے چلا۔ کہیں سے تو اترنے کا قابو ملے گا۔ جب بھوک لگتی تو شکار کر کے کھاتا جب پیاس لگتی تو مہرہ منہ میں رکھ لیتا۔ ایک مہینہ اسی طرح گذر گیا۔ یکایک اس جگہ پہنچا جہاں دریائے خون کے سوا زمین تھی نہ درخت نہ چرندے نہ پرندے تھے۔ دل میں کہنے لگا اے حاتم ایک مہینہ تک تو نے یہ رنج سہے کہ پاؤں چلنے سے رہ گئے پر گھاٹ نظر نہ آیا۔ اگر دس برس تک یونہی پھرے گا دریائے خون کے سوا کچھ نہ دیکھے گا۔ خدا کے کارخانہ میں دم مارنا آسان نہیں ہے اور جن چیزوں کو اس نے چھپایا ہے ان کا کھولنا آسان نہیں۔ اگر وہ فضل کرے تو یہاں سے صحیح سلامت منزلِ مقصود پر پہنچا دے ورنہ کچھ تدبیر نہیں ہو سکتی۔

اسی تفکر میں کوئی چیز دریا میں سے نمودار ہوئی حاتم اس کی طرف بغور دیکھنے لگا۔ اتنے میں وہ نزدیک آ گئی۔ دیکھا کہ ایک کشتی ہے۔ حاتم بسم اللہ کہہ کے سوار ہوا۔ پھر ویسی ہی روٹیاں اور کباب بدستور پائے۔ بے تامل انہیں کھا گیا اور خدا کا شکر و حمد بجا لایا۔ جب کشتی منجدھار میں پہنچی زور سے ہوا چلنے لگی اور لہریں مانند شعاع کے بلند ہونے لگیں۔ حاتم ڈرا اور خدا کو یاد کرنے لگا۔ آنکھیں بند کر کے ناؤ میں لیٹ رہا۔ قریب تھا کہ بے حواس ہو جائے اور خوف سے ڈوب جائے۔ غرض سات روز تک اس طرح گذرے آٹھویں روز کشتی کنارے پر لگی۔ حاتم اترا اور کشتی الٹی پھر گئی۔ یہ کنارے کنارے چلنے لگا اور افسوس کرتا تھا کہ یہ راز نہ کھلا کہ یہ کشتی کون لایا اور کباب روٹی کون دھر گیا۔ کئی روز تک اٹھتے بیٹھتے چلا گیا کہ دور سے ایک چیز نمودار ہوئی۔ حاتم حیران ہوا کہ یہ کیا چیز ہے۔ آگے بڑھ کر کیا دیکھتا ہے کہ ایک دریا نہایت شفاف لہریں مار رہا ہے اور ایسا چمکتا ہے کہ کسی نے چاندی گلا کر بہا دی ہے۔ حاتم تشنگی سے جاں بلب تھا کنارہ پر آ بیٹھا اور اس میں بایاں ہاتھ ڈالا۔ جس وقت پانی نکالا تو پانی نہ پایا مگر ہاتھ چاندی کا ہو گیا۔ ہر چند اس کو داہنے ہاتھ سے صاف کیا۔ لیکن وہ اسی طرح پر رہ گیا بلکہ بوجھ ہو گیا۔ حاتم نے کہا یہ عجب دریا ہے اگر غوطہ ماروں تو چاندی کا ہو جاؤں پھر چلنا مشکل ہو جائے۔

حالتِ اضطراب میں چاروں طرف دیکھا کہ ناگہاں اسی طرح ایک کشتی آئی۔ یہ بسم اللہ کہہ کر چڑھ گیا۔ پھر ایک طباق گرما گرم حلوے کا نظر آیا۔ اس نے ہاتھ سے اپنی طرف کھینچ لیا اور خوب کھایا۔ پھر پاؤں پھیلا کر آرام سو رہا۔ کئی دن کے بعد کشتی کنارے پر جا پہنچی۔ حاتم اتر کے آگے بڑھا ہر وقت اپنا ہاتھ دیکھا کرتا تھا۔ چار دن کے بعد ایک پہاڑ نمودار ہوا۔ اس نے جانا کہ یہ نزدیک ہے حالانکہ وہ ایک مہینہ کی راہ پر تھا۔ غرض شکار کرتا ہوا اور کھاتا ہوا چلا جاتا تھا۔ جب وہ تین دن کی راہ پر پہنچا تو سنگریزے رنگ برنگ کے اور طرح طرح کے جواہرات نظر پڑے۔ طمع دامن گیر ہوئی تو کچھ جواہرات جیب میں ڈال لئے، تھوڑی دور چل کر اس سے زیادہ بیش بہا دیکھا۔ اس کو پھینک کر اس کو جیب میں ڈال لیا۔ تھوڑی دور جا کر خیال آیا کہ اگر یہ جواہر شہروں میں پہنچے تو ان کی قیمت کوئی نہ دے سکے گا۔ اسی خیال میں چلا گیا۔ آخر ان کے بوجھ سے تھک کر کسی جگہ بیٹھ گیا اور کچھ لعل اور زمرد الماس بیش قیمت جو سب سے بڑے تھے چن لئے باقی وہیں پھینک دیئے اور پھر راہی ہوا ایک چشمہ پر جا پہنچا۔ اس کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ اپنے

ہاتھ پاؤں دھوئے۔ اتنے میں ایک دم بائیں ہاتھ پر جو نظر پڑی اس کو جیسا تھا ویسا ہی پایا مگر ناخن چاندی کے رہے۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ اس دریا میں ہاتھ چاندی کا ہو گیا تھا، اس چشمہ میں حالت اصلی پر آ گیا اس میں کیا بھید ہے۔ اتنے میں رات ہو گئی۔ اسی جگہ پڑا رہا۔

یکایک دو شخص اس چشمہ پر آ نکلے کہ ان کے سر آدمی کے سے تھے اور ہاتھ پاؤں ہاتھی کے اور ناخن شیر کے۔ رنگ نہایت سیاہ۔ حاتم دیکھ کر ڈرا اور اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ یہ کیا بلا ہے۔ اگر میں بھاگوں تو شرم دامن گیر ہے اور ٹھہروں تو ٹھہر نہیں سکتا۔ دیکھئے کہ تقدیر میں کیا ہے۔ یکایک حاتم نے تیر و کمان اٹھا کر ایک تیر مارا۔ ایک نے ان میں سے پکڑ لیا۔ چاہتا تھا کہ وہ دوسرا تیر مارے انہوں نے فریاد کی اے حاتم طائی تو اپنی جان کے ڈر سے ہمیں مارتا ہے۔ ہم خدا کے بندے ہیں کچھ تجھے ایذا دینے نہیں آئے۔ حاتم تیر و کمان ڈال کر بیٹھ گیا اور دل میں سوچنے لگا کہ ان کو مجھ سے کیا کام ہے جو ادھر آتے ہیں۔ تیر تو انہوں نے درمیان میں ہی پکڑ لیا۔ اگر دوسرا ماروں گا تو کاہے کو کارگر ہوگا۔ اتنے میں وہ نزدیک آ کر کہنے لگے: "اے حاتم تجھ کو شرم نہیں آتی جواہر کی طمع کی؟"

وہ بولا: "میں نے کس کا جواہر لیا؟"

انہوں نے کہا: "تو فلانے جنگل سے جواہر لایا ہے۔ اب تک تیرے پاس موجود ہیں۔"

یہ سن کر حاتم نے جواب دیا کہ "تیرا تو نہیں لایا۔"

وہ بولے کہ "یہ اور خلقت کے واسطے اللہ نے رکھا ہے کہ وہ اپنے کام میں لائیں۔"

حاتم نے کہا: "میں خدا کی صنعت دکھانے کو اٹھا لایا ہوں۔"

یہ سن کر دونوں نے کہا: "اگر سلامت جانا چاہتا ہے تو اس جواہر سے ہاتھ اٹھا۔"

یہ سنتے ہی حاتم نے سب پھینک دیا اور کہا: "تم لے جاؤ۔ حیف ہے کہ میں اس کو بہت دور سے لایا ہوں۔ تم نے بڑا ظلم کیا کہ اس کو مجھ سے لے لیا۔ میں کوئی چرا کر نہیں لایا۔"

انہوں نے کہا: "یہ کیا چلن ہے کہ بے کہے اس قدر مال اٹھا کر روانہ ہو اپنے پاس رکھنا۔ یہ کب روا ہے بلکہ محنت کی گنہگاری دینی پڑتی ہے۔" حاتم یہ سن کر سر جھکا کر چپکا ہو رہا۔ وہ ایک الماس اور ایک زمرد اپنی اپنی قسم میں سے جو بیش بہا تھا اس کو دینے لگے اور کہا تجھے یہی بہت ہے۔ اس نے لے لیا اور کہا اے بندگانِ خدا مجھ کو راہ بتا دو جو میں کسی طرح ملک میں پہنچوں۔ وہ بولے: "اے جوان غنیمت سمجھ جو تو صحیح و سلامت آیا اور جیتا جاگتا چلا کیونکہ اس حد سے آج تک کوئی جان سلامت نہیں لے گیا۔ اس قدر اندیشہ نہ کر کہ عمر بڑی ہے۔ اس کے آگے ایک جواہر کا دریا ملے گا اس کے بعد دریائے آتش آئے گا اگر اس سے صحیح و سالم اتر گیا تو مقرر اپنے ملک میں پہنچے گا۔ مگر کسی چیز کا لالچ نہ کیجیو اسی میں تیری سلامتی ہے۔ خدانخواستہ اگر کسی چیز پر دل دوڑائے گا تو اپنے کیے کی سزا پائے گا۔" یہ کہہ کر وہ پانی میں اتر پڑے اور اس کی نظر سے چھپ گئے۔

حاتم اسی مقام پر تمام رات بیٹھا رہا۔ صبح کو تھوڑی دور چلا تھا کہ ایک دریا دکھائی دیا۔ اس کو دیکھ کر بہت شاد ہوا۔ اس واسطے کہ بہت پیاسا تھا۔ جب اس کے پاس پہنچا اور نگاہ کی تو ہزاروں موتی بیش قیمت پڑے ہیں۔ لیکن ہر ایک انڈے کے برابر تھا۔ ان کی چمک سے آنکھیں جھپکی جاتی تھیں۔ اور قیمت کا ذکر کچھ ٹھکانا نہ تھا۔ حاتم نے لالچ میں آ کر چاہا کہ دس بیس اٹھا لے کہ اتنے میں ان دونوں کی نصیحت یاد آئی۔ ڈر گیا اور اس حرکت سے باز رہا۔ اور اس کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ اس کا پانی دودھ اور شہد کی مانند ہے۔ پیاسا تو تھا ہی خوب پیٹ بھر کر پیا۔ غرض اس سے بخوبی اتر گیا اور آگے بڑھا کہ دور سے ایک روشنی نظر آئی گویا سونے کا ایک تختہ ہوا میں چمک رہا ہے۔ اسی طرف چلا۔

ایک مہینے کے بعد جا پہنچا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک پہاڑ آسمان سے لگا ہوا ہے اور جگمگا رہا ہے۔ یہ اس پر چڑھ گیا۔ وہاں ایک درخت سونے کا پھلا پھولا دیکھا۔ متعجب ہوا۔ تین روز تک اسی پہاڑ پر چلتا رہا۔ ایک میدان نظر پڑا اس کی زمین پر ہزاروں درخت سونے کے چمک رہے تھے۔ حاتم

دیکھ کر حیران ہوا اور صانع کی صنعت دیکھنے لگا اور خدا کا شکر کرنے لگا۔ پھر تھوڑا میوہ توڑ کر کھایا۔ پھر آگے چل کر ایک حوض نظر پڑا۔ اس کا پانی مثل بلور کے صاف تھا۔ اس کے کنارے پر بیٹھا اور دل میں فکر کرنے لگا یہ باغ کس کا ہے۔ کس سے پوچھے۔ اتنے میں کئی پریاں پوشاک اور زیور سے آراستہ جلوہ گر ہوئیں اور حاتم کو دیکھ کر حیرت زدہ ہوئیں۔ ادھر حاتم ان کو دیکھ کر حیرت میں آیا کہ الٰہی یہ کیا حُسن ہے۔ اس وقت ملکہ زرین پوش یاد آئی اور دل میں کہا خدا اسے ملائے۔

القصہ ان سے کہا کہ تم کون ہو اور یہاں کا بادشاہ کون ہے؟ انہوں نے کہا یہ محل پری نوش لب کا ہے۔ اتنے میں وہ آ پہنچی۔ حاتم اس کو دیکھتے ہی بے ہوش ہو کر گر پڑا اور وہ اس کے سرہانے آ کھڑی ہوئی۔ کہنے لگی "اے کوئی ہے۔ جلد آ کر اس کے منہ پر گلاب چھڑک دو"۔ وہیں ایک نازنین دوڑی گئی اور گلاب پاش لے کر اس کے منہ پر چھڑکنے لگی۔ حاتم ہوش میں آیا۔ پھر پری نوش لب ایک تخت مرصع پر جا بیٹھی اور حاتم کو کرسی جواہر نگار پر بٹھا کر پوچھنے لگی "اے جوان سچ کہہ کہاں سے آیا ہے اور کس کام کے ارادہ سے یہاں تک پہنچا ہے اور کدھر جائے گا"۔ حاتم نے اپنا تمام احوال ابتدا سے انتہا تک اس کے سامنے بیان کر کے پوچھا اس مکان کا مالک کون ہے اور اس پہاڑ کا کیا نام ہے۔ پری نوش لب نے کہا کہ "اس پہاڑ کو کوہ زریں کہتے ہیں اور اس مکان کا مالک شاہ پال شاہ ہے اور اس کی بیٹی کا آسیا نام ہے۔ میں اس لڑکی کی ایک خواص ہوں چنانچہ ساتواں روز میری باری کا ہے۔ اس روز میں جلوہ گر ہوتی ہوں اور اس مکان کا کوہ قاف سے تعلق ہے۔ اگرچہ دنیا کی حد میں ہے اور یہ جو دور سے دکھائی دیتا ہے اسی قلعہ کا حصہ ہے"۔ غرض چار روز تک حاتم وہاں رہا اور طعام ہائے خوش گوار سے ملذذ ہوا۔ پانچویں روز کہا کہ یہ جگہ تمہارے رہنے کے قابل نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ یہاں سے تشریف لے جاؤ۔

حاتم اس پری سے رخصت ہو کر پہاڑی پر چلا اور دس روز کے بعد پہاڑی سے اتر کر کسی جنگل میں جا پہنچا۔ وہاں سونے کا سا ایک دریا دکھائی دیا کہ اس کا پانی پگھلے ہوئے سونے کی طرح لہریں لے رہا ہے اور اس کی موجیں آسمان سے ٹکر کھا رہی ہیں۔ یہ دریا دیکھ فکر میں غرق ہو کر اس کے کنارے پر بیٹھ گیا کہ اس سے کیونکر پار اترے۔ [illegible] میں ایک ناؤ طلائی دور سے نظر آئی اور فوراً کنارے پر پہنچی۔ حاتم شکر کر کے اس پر بیٹھ گیا اور وہیں طباق حلوے سے لبالب نظر آیا۔ بھوکا تو تھا ہی کمال رغبت سے کھایا۔ چاہتا تھا کہ دریا میں ہاتھ ڈال کر پانی پیے۔ ڈرا کہ یہاں ہاتھ سونے کا نہ ہو جائے، کھینچ لیا۔ پھر ایک کٹورا [illegible] نکال کر بھرا اور تھوڑا سا حلق میں ٹپکایا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہے کہ کٹورا اور چاروں دانت سونے کے ہو گئے۔ غرض چوتھے دن ایک کنارے پر پہنچا۔ حاتم نے اتر کر دوگانہ شکریہ ادا کیا اور آگے بڑھا۔ سات روز تک چلا گیا وہ عجائبات دیکھے کہ جو نہ سنے تھے۔

آٹھویں روز پتھروں کے میدان میں پہنچا اور ہر ایک پتھر ایسا گرم تھا گویا آگ سے ابھی نکلا ہے۔ مشکل سے چند قدم چلا۔ طاقت نہ رہی بیٹھ گیا۔ گرمی کے سبب سے لب خشک ہو کر بدن جل اٹھا۔ بیقرار ہو کر مہرہ منہ میں رکھ لیا مگر کچھ فائدہ نہ دیکھا۔ نکال کر پھینک دیا۔ مثل ماہی بے آب بیتاب ہو کر بیہوش ہو گیا۔ زبان باہر نکل پڑی۔ قریب مرگ پہنچا۔ اتنے میں وہ دونوں شخص نظر آئے۔ بولا اے یارو! آفریں ہے کہ وقت پر پہنچے۔ [illegible] کس طرح جاؤں، یہ گرمی کس وجہ سے ہے؟ انہوں نے کہا اس سے آگے دریائے آتش ہے یہ گرمی اس کے سبب سے ہے اور راستہ یہی ہے۔ چلا جا۔ خدا کی قدرت سے اپنے ملک کو پہنچ جائے گا۔ راہ بتانا ہمارا کام ہے وہاں یہ ممکن ہے کہ تمہاری آگ ٹھنڈی ہو جائے گی۔ اس نے کہا جو بہتر ہو وہ بہتر ہے۔ احسان سے خالی نہیں۔ تب انہوں نے ایک مہرہ نکال کر حاتم کو دیا اور کہا آگے دریائے آتشیں ہے۔ اگر اس کو منہ میں رکھے گا تو آگ تجھ پر کارگر نہ ہوگی۔ آرام سے چلا جائے گا۔ پر یہ یاد رہے کہ دریا کے پار ہوتے ہی یہ مہرہ پھینک دینا۔ یہ کہہ کر حاتم کی نظر سے غائب ہو گئے۔ وہ رات کی رات وہیں رہا۔ صبح کو اپنے منہ میں مہرہ رکھ کر آگے چلا۔ تین دن کے بعد سامنے سے آگ کے شعلے دکھائی دینے لگے۔ یہ ڈرا اور بسم اللہ کہہ کر آگے بڑھا۔ جب کنارے پر پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ شعلے کی لہریں آسمان تک جاتی ہیں۔ اتنے میں ایک کشتی [illegible] وہ دل میں خدا کی حمد کرنے لگا اور کہا کہ دیدہ دانستہ آپ کو آگ میں ڈالا ہے پر کیا کروں راہ یہی ہے۔ خدا آسان کرے گا۔ جو اس کی رضا ہے اس پر راضی رہنا چاہیے۔ [illegible] کشتی پر جا بیٹھا اور منہ میں مہرہ رکھ لیا۔ اتنے میں ایک طباق کباب سے بھرا ہوا دیکھا۔ اس کو بے اختیار کھینچا اور پیٹ بھر کر کھایا۔ غرض ناؤ چلی جاتی تھی

یہ ڈر کے مارے کبھی آنکھیں نہ کھولتا جو کبھی آنکھیں کھل جاتی تھیں تو جان نکلنے لگتی تھی۔ وہیں آنکھیں بند کر لیتا تھا۔

قصہ کوتاہ ناؤ منجدھار میں پہنچی اور چکر کھانے لگی۔ حاتم کو یقین ہوا کہ اب ڈوبتی ہے۔ خدا کی یاد میں مشغول ہوا اور آنکھوں پر پٹی باندھ کے سر بہ زانو ہو گیا کہ اب نہیں بچتا۔ بارے فضلِ الٰہی سے تین دن کے بعد کشتی کنارے پر جا لگی۔ اتر پڑا۔ آنکھیں جو کھول کر دیکھتا ہے تو نہ وہ دریا ہے نہ وہ کشتی ہے؛ ایک سہانا جنگل نظر آتا ہے۔ مہرہ منہ سے نکال لیا اور آگے چلا۔ تھوڑی راہ طے کی تھی کہ سوادِ زمین سے کسی گاؤں کی طرف جا نکلا اور کھیت پر کھڑا ہو کر کسان سے کہنے لگا کہ نواح کس شہر کا ہے؟ اس نے کچھ جواب نہ دیا اور ٹکٹکی باندھ کر اسے تکنے لگا۔

حاتم بولا کہ اے عزیز تو بہرا ہے کہ نہیں سنتا؟ اس نے عرض کی کہ تیری صورت میں اپنے بادشاہ کی سی جانتا ہوں۔ حاتم یہ سن کر کہنے لگا کہ تو کون ہے اور کہاں جاتا ہے۔ وہ بولا اے جوان یہ ملک یمن ہے اور حاتم شہزادہ ہے کہ اس کا باپ طے نام یہاں کا بادشاہ ہے لیکن شہزادہ کو سات برس ہوئے کہ اس ملک سے نکل گیا ہے۔ ایک مرتبہ اس کی خبر ملکہ زریں پوش سے پہنچی تھی۔ اس سے ہر شخص کو تسکین ہوئی تھی۔ اب تو اس کے ماں باپ اور اقربا کا برا حال ہے کہ ہر ایک پر اپنی زندگی وبال ہے خصوصاً ملکہ زریں پوش کی تو جان پر آبنی ہے۔ دیکھئے اس کی ملاقات ہونے تک جیتے یا جیتے۔ حاتم نے کہا چند روز ہوئے تمہارا شہزادہ مجھے راہ میں ملا تھا۔ وہ خیر و عافیت سے ہے۔ تو یمن میں جا کر سب کی خدمت میں دعا و سلام پہنچا اور کہنا کہ حاتم شاہ آباد کی طرف گیا تھا۔ پھر کہا اے دہقان میں بہت سا پیاسا ہوں تھوڑا سا پانی پلا دے۔ وہ جلدی سے ایک پیالہ دودھ کا اور ایک چھاچھ کا لے آیا۔ حاتم نے نہایت مزے سے پیا اور کہا کہ ہزار شکر ہے کہ مدت کے بعد میں نے اپنے ملک کو دیکھا اور یہ نعمت کھائی۔

پھر اٹھ کر روانہ ہوا اور شاہ آباد کو چلا۔ تھوڑے دنوں میں وہاں جا پہنچا اور حسن بانو کو اپنے آنے کی خبر دی۔ اس نے پردہ کے اندر بلا لیا اور ایک سونے کی کرسی پر بٹھایا۔ کہا اے جوان صد آفرین ہے جو لوٹ آیا۔ بارے کوہ ندا کی خبر کہو اور وہاں کے بھید سے مجھے آگاہ کرو۔ حاتم نے سرے سے قصہ شروع کیا اور آخر تک کہہ سنایا۔ حسن بانو نے کہا سچ کہتا ہے کچھ نشان دکھلا۔ حاتم نے اپنے بائیں ہاتھ کے ناخن دکھلائے اور کہا ایک روز کسی چشمہ آبِ زلال پر پہنچا اور اس کو دھویا یہ اصلی صورت پر آگیا اور دوسری نشانی یہ ہے کہ چار دانت دریائے زریں کے پانی سے سونے کے ہو گئے ہیں۔ اور وہ تینوں رقعیں جواہر کی بھی دکھا دیں۔ تب حسن بانو نے بہت سی آؤ بھگت کی اور کھانا پُر تکلف منگا کر کہا کہ کھائیے حاتم نے کہا اس کو میرے سامنے سے لے جاؤ میں کارواں سرا میں جا کر منیر شامی کے ساتھ کھاؤں گا۔ وہاں سے اٹھ کر کارواں سرا میں آیا اور منیر شامی کے ہمراہ کھانا کھایا اور اپنی سرگذشت مفصل سنائی۔

میر امّن

باغ و بہار

(۱۸۰۳ء)

سیر پہلے درویش کی

اے یاران! میری پیدائش اور وطن بزرگوں کا ملک یمن ہے۔ والد اس عاجز کا ملک التجار خواجہ احمد نام بڑا سوداگر تھا۔ اس وقت میں کوئی مہاجن یا بیوپاری ان کے برابر نہ تھا۔ اکثر شہروں میں کوٹھیاں اور گماشتے خرید و فروخت کے واسطے مقرر تھے اور لاکھوں روپے نقد اور جنس ملک ملک کے گھر میں موجود تھے۔ ان کے یہاں دو بچے پیدا ہوئے، ایک تو یہی فقیر جو کفنی سیلی پہنے ہوئے مرشدوں کے حضور میں حاضر اور بولتا ہے، اور دوسری ایک بہن جس کو قبلہ گاہ نے اپنے جیتے جی ایک شہر کے سوداگر بچے سے بیاہ دیا تھا، وہ اپنے سسرال میں رہتی تھی۔ غرض اتنی دولت اور ایک لڑکا ہو اس کے لاڈ پیار کا کیا ٹھکانا ہے۔ مجھ فقیر نے بڑے چاؤ چوز سے ماں باپ کے سایہ میں پرورش پائی، اور پڑھنا لکھنا، سپاہ گری کا کسب و فن سوداگری کا بہی کھاتا روزنامہ سیکھنے لگا۔ چودہ برس تک نہایت خوشی اور بے فکری میں گذری کچھ دنیا کا اندیشہ دل میں نہ آیا۔ یک بیک ایک ہی سال میں والدین قضائے الٰہی سے مر گئے عجب طرح کا غم ہوا جس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ یک بارگی یتیم ہو گیا۔ کوئی سر پر بڑا بوڑھا نہ رہا۔ اس مصیبت ناگہانی سے رات دن رویا کرتا۔ کھانا پینا سب چھوٹ گیا۔ چالیس دن جوں توں کر کے گذرے۔ چہلم میں اپنے بیگانے چھوٹے بڑے جمع ہوئے۔ جب فاتحہ سے فراغت ہوئی سب نے فقیر کو باپ کی پگڑی بندھوائی اور سمجھایا دنیا میں سب کے ماں باپ مرتے آئے ہیں اور اپنے تئیں بھی ایک روز مرنا ہے پس صبر کرو اپنے گھر کو دیکھو اب باپ کی جگہ تم سردار ہوئے اپنے کاروبار لین دین سے ہوشیار رہو۔ تسلّی دے کر وہ رخصت ہوئے۔ گماشتے کاروباری نوکر چاکر جتنے تھے آن کر حاضر ہوئے۔ نذریں دیں اور بولے کوٹھے نقد و جنس کے اپنی نظر مبارک سے دیکھ لیجئے۔

ایک بارگی جو اس دولت بے انتہا پر نگاہ پڑی آنکھیں کھل گئیں۔ دیوان خانے کی تیاری کو حکم کیا۔ فراشوں نے فرش فروش بچھا کر چھت پردے چلمنیں تکلف کی لگا دیں اور اچھے اچھے خدمتگار دیدار و نوکر رکھے سرکار سے زرق برق کی پوشاکیں بنوا دیں۔ فقیر مسند پر تکیہ لگا بیٹھا۔ ویسے ہی آدمی غنڈے پھانکڑے مفت بر کھانے پینے والے جھوٹے خوشامدی آ کر آشنا ہوئے اور مصاحب بنے ان سے آٹھ پہر صحبت ہونے لگی۔ ہر طرح کی باتیں اور زٹلیں واہی تباہی ادھر ادھر کی کرتے اور کہتے اس جوانی کے عالم میں کیتکی شراب یا گل گلاب کھنچوا، پیئے نازنین معشوقوں کو بلا کر ان کے ساتھ پیجئے اور عیش کیجئے۔

غرض آدمی کا شیطان آدمی ہے۔ ہر دم کے کہنے سُننے سے اپنا بھی مزاج بہک گیا۔ شراب، ناچ اور جوئے کا چرچا شروع ہوا۔ پھر تو یہ نوبت پہنچی کہ سوداگری بھول کر تماش بینی کا اور دینے لینے کا سودا ہوا۔ اپنے نوکر اور رفیقوں نے جب یہ غفلت دیکھی جو جس کے ہاتھ پڑا الگ کیا گویا لوٹ مچا دی۔ کچھ خبر نہ تھی کتنا روپیہ خرچ ہوتا ہے کہاں سے آتا ہے اور کدھر جاتا ہے۔ مال مفت دلِ بے رحم اس دو خرچی کے آگے اگر گنج قارون ہوتا تو بھی وفا نہ کرتا۔ کئی برس کے عرصے میں ایک بارگی یہ حالت ہوئی کہ فقط ٹوپی اور لنگوٹی باقی رہی۔ دوست آشنا جو دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے اور چمچہ بھر خون اپنا ہر بات میں زبان سے نثار کرتے تھے کافور ہو گئے بلکہ راہ باٹ میں اگر کہیں بھینٹ ملاقات ہو جاتی تو آنکھیں چرا کر منہ پھیر لیتے اور نوکر چاکر خدمتگار بھیلے ڈھلیٹ خاص بردار شاگرد پیشہ سب چھوڑ کر کنارے ہوئے کوئی بات کا پوچھنے والا نہ رہا جو کہے یہ کیا تمہارا حال ہوا۔ سوائے غم و افسوس کے کوئی رفیق نہ ٹھہرا۔ اب دمڑی کی ٹھڑیاں میسر نہیں جو چبا کر پانی پیوں۔ دو تین فاقے کڑاکے کے کھینچے تاب بھوک کی نہ لا سکا۔ ناچار بے حیائی کا برقع منہ پر ڈال کر یہ قصد کیا کہ بہن کے پاس چلیے لیکن یہ شرم دل میں آتی تھی کہ قبلہ گاہ کی وفات کے بعد نہ بہن سے کچھ سلوک کیا نہ خالی خط لکھا بلکہ اس نے وہ ایک خط خطوط ماتم پرسی اور اشتیاق کے جو لکھے ان کا جواب بھی اس خوابِ خرگوش میں نہ بھیجا اس شرمندگی سے جی تو نہ چاہتا تھا پر سوائے اس گھر کے اور کوئی ٹھکانا نظر میں نہ ٹھہرا۔ جوں توں پا پیادہ خالی ہاتھ گرتا پڑتا ہزار محنت سے کئی منزل کاٹ کر ہمشیرہ کے شہر میں جا کر اس کے مکان پر پہنچا۔

وہ ماں جائی میرا یہ حال دیکھ کر بلائیں لے اور گلے مل کر بہت روئی۔ تیل، کالے ماش، ٹکے مجھ پر سے صدقے کیے، کہنے لگی "اگرچہ ملاقات سے دل بہت خوش ہوا لیکن بیٹا تیری یہ کیا صورت بنی؟"

اس کا جواب میں کچھ نہ دے سکا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا کر چپکا ہو رہا۔ بہن نے جلدی خاصی پوشاک سلوا کر حمام میں بھیجا۔ نہا دھو کر وہ کپڑے پہنے۔ ایک مکان اپنے پاس بہت اچھا تکلف کا میرے رہنے کو مقرر کیا۔ صبح کو شربت اور لوزیات حلوا سوہن پستہ مغزی ناشتے کو اور تیسرے پہر میوے خشک و تر پھل پھلاری اور رات دن دونوں وقت پلاؤ نان قلیے کباب تحفہ تحفہ مزے دار منگوا کر اپنے روبرو کھلا کر جاتی۔ سب طرح خاطر داری کرتی۔ میں نے ویسی تصدیعوں کے بعد جو یہ آرام پایا خدا کی درگاہ میں ہزار شکر بجا لایا۔ کئی مہینے اس فراغت سے گذرے کہ پاؤں اس خلوت سے باہر نہ رکھا۔

ایک دن وہ بہن جو بجائے والدہ کے میری خاطر رکھتی تھی کہنے لگی "اے بیرن! تو میری آنکھوں کی پتلی اور ماں باپ کی مرئی مٹی کی نشانی ہے۔ تیرے آنے سے میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا جب تجھے دیکھتی ہوں باغ باغ ہوتی ہوں، تو نے مجھے نہال کیا لیکن مردوں کو خدا نے کمانے کے لیے بنایا ہے گھر میں بیٹھا رہنا ان کو لازم نہیں۔ جو مرد نکھٹو ہو کر گھر سیتا ہے اس کو دنیا کے لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں۔ خصوص اس شہر کے آدمی چھوٹے بڑے بے سبب تمہارے رہنے پر کہیں گے اپنے باپ کی دولت دنیا کھو کھا کر بہنوئی کے ٹکڑوں پر آ پڑا۔ یہ نہایت بے غیرتی اور میری تمہاری ہنسائی اور ماں باپ کے نام کو سبب لاج لگنے کا ہے نہیں تو میں اپنے چمڑے کی جوتیاں بنا کر تجھے پہناؤں اور کلیجے میں ڈال رکھوں۔ اب یہ صلاح ہے کہ قصد سفر کا کرو۔ خدا چاہے تو دن پھریں اور اس حیرانی اور مفلسی کے بدلے خاطر جمعی اور خوشی حاصل ہو۔"

یہ بات سُن کر مجھے بھی غیرت آئی اس کی نصیحت پسند کی۔ جواب دیا "اچھا اب تم ماں کی جگہ ہو جو کہو سو کروں۔"

میری مرضی پا کر گھر میں جا کر پچاس توڑے اشرفی کے اصیل اور لونڈیوں کے ہاتھوں میں لوا کر میرے آگے لا رکھے اور بولی "ایک قافلہ سوداگروں کا دمشق کو جاتا ہے تم ان روپوں سے جنس تجارت کی خرید کرو ایک تاجر ایماندار کے حوالے کر کے دستاویز پکی لکھواؤ اور آپ بھی قصد دمشق کا کرو۔ وہاں جب خیریت سے جا پہنچو اپنا مال مع منافع سمجھ لو جو لیجیو یا آپ بیچیو۔"

میں وہ نقدی لے کر بازار میں گیا۔ اسباب سوداگری خرید کر کے ایک بڑے سوداگر کے سپرد کیا۔ نوشت خواند سے خاطر جمع کر لی۔ وہ تاجر دریا کی راہ سے جہاز پر

سوار ہو کر روانہ ہوا اور فقیر نے خشکی کی راہ چلنے کی تیاری کی۔

جب رخصت ہونے لگا بہن نے ایک سراپا بھاری جوڑا اور ایک گھوڑا جڑاؤ ساز سے تواضع کیا اور مٹھائی پکوان ایک خاصدان میں بھر کر ہرنے سے لٹکا دیا اور چھاگل پانی کی شکاربند میں بندھوا دی۔ امام ضامن کا روپیہ میرے بازو پر باندھا، دہی کا ٹیکا ماتھے پر لگا کر آنسو پی کر بولی "سدھارو تمہیں خدا کو سونپا، پیٹھ دکھائے جاتے ہو اسی طرح جلد اپنا منہ دکھائیو۔"

میں نے فاتحہ خیر پڑھ کر کہا "یہ تمہارا بھی اللہ حافظ ہے میں نے قبول کیا۔"

وہاں سے نکل کر گھوڑے پر سوار ہوا اور خدا کے توکل پر بھروسا کر کے دو منزل کی ایک منزل کرتا ہوا دمشق کے پاس جا پہنچا۔ غرض جب شہر کے دروازے پر گیا بہت رات جا چکی تھی، دربان اور نگہبانوں نے دروازہ بند کیا تھا۔ میں نے بہت منت کی کہ مسافر ہوں دور سے دھاوا مارے آتا ہوں اگر کواڑ کھول دو تو شہر میں جا کر دانے گھانس کا آرام پاؤں۔ وہ اندر سے گڑک کر بولے "اس وقت دروازہ کھولنے کا حکم نہیں کیوں اتنی رات گئے تم آئے؟" جب میں نے جواب صاف ان سے سنا شہر پناہ کی دیوار کے تلے گھوڑے پر سے اتر زین پوش بچھا کر بیٹھا۔ جاگنے کی خاطر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔

جس وقت آدھی رات ادھر اور آدھی رات ادھر ہوئی سنسان ہو گیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک صندوق قلعے کی دیوار پر سے نیچے چلا آتا ہے۔ یہ دیکھ کر میں اچنبھے میں ہوا کہ یہ کیا طلسم ہے۔ شاید خدا نے میری حیرانی اور سرگردانی پر رحم کھا کر خزانہ غیب سے عنایت کیا۔ جب وہ صندوق زمین پر ٹھہرا ڈرتے ڈرتے میں پاس گیا۔ دیکھا کہ کاٹھ کا صندوق ہے، لالچ سے اسے کھولا۔ ایک معشوق خوبصورت کامنی سی عورت جس کے دیکھنے سے ہوش جاتا رہے، گھائل لہو میں تر بتر آنکھیں بند کیے کلبلاتی ہے آہستہ آہستہ ہونٹ ہلتے ہیں اور یہ آواز منہ سے نکلتی ہے "اے کم بخت بے وفا اے ظالم پرجفا بدلا اس بھلائی اور محبت کا یہی تھا جو تو نے کیا، بھلا ایک زخم اور بھی لگا میں نے اپنا تیرا انصاف خدا کو سونپا۔" یہ کہہ کر اسی بیہوشی کے عالم میں دوپٹے کا آنچل منہ پہ لے لیا میری طرف دھیان نہ کیا۔

فقیر اس کو دیکھ کر اور یہ بات سن کر سُن ہو گیا۔ جی میں آیا کسی ظالم بے حیا نے کیوں ایسے نازنین صنم کو زخمی کیا۔ کیا اس کے دل میں آیا اور ہاتھ اس پر کیوں چلایا۔ اس کے دل میں تو اب تک محبت باقی ہے جو اس جان کندنی کی حالت میں اس کو یاد کرتی ہے۔ آپ ہی آپ یہ کہہ رہا تھا کہ آواز اس کے کان میں گئی۔ ایک مرتبہ کپڑا منہ سے سرکا کر مجھ کو دیکھا۔ جس وقت اس کی نگاہیں میری نظروں سے لڑیں مجھے غش آنے لگا اور جی سنسانے لگا۔ بزور اپنے تئیں تھانبا۔ جرأت کر کے پوچھا "سچ کہو تم کون ہو اور یہ کیا ماجرا ہے؟ اگر بیان کرو تو میرے دل کو تسلی ہو۔" یہ سن کر اگرچہ طاقت بولنے کی نہ تھی لیکن آہستہ سے کہا "شکر ہے میری حالت زخموں کے مارے یہ کچھ ہو رہی ہے کیا خاک بولوں کوئی دم کی مہمان ہوں۔ جب میری جان نکل جائے تو خدا کے واسطے جواں مردی کر کے مجھ بدبخت کو اسی صندوق میں کسی جگہ گاڑ دیجیو تو میں بھلے بُرے کی زبان سے نجات پاؤں اور تو داخل ثواب ہو۔" اتنا بول کر وہ چپ ہو رہی۔ رات کو مجھ سے کچھ تدبیر نہ ہو سکی وہ صندوق اپنے پاس اٹھا لایا اور گھڑیاں گننے لگا کہ کب اتنی رات تمام ہو تو فجر کو شہر میں جا کر جو کچھ علاج اس کا ہو سکے بمقدور اپنے کروں۔ وہ تھوڑی رات ایسی پہاڑ ہو گئی کہ دل گھبرا گیا۔

بارے خدا خدا کر کے صبح جب نزدیک ہوئی مرغ بولا آدمیوں کی آوازیں آنے لگیں، میں نے فجر کی نماز پڑھ کر صندوق کو خورجین میں کسا۔ جوں ہی دروازہ شہر کا کھلا میں شہر میں داخل ہوا ہر ایک آدمی اور دکاندار سے حویلی کرائے کی تلاش کرنے لگا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک مکان خوش قطع نیا فراغت کا بھاڑے لے کر جا اترا۔ پہلے اس معشوق کو صندوق سے نکال کر روئی کے پہلوں پر ملائم بچھا کر کے ایک گوشے میں لٹایا اور آدمی اعتباری وہاں چھوڑ کر فقیر جراح کی تلاش میں نکلا۔ ہر ایک سے پوچھتا پھرتا تھا کہ اس شہر میں جراح کاریگر کون ہے اور کہاں رہتا ہے۔ ایک شخص نے کہا ایک حجام جراحی کے کسب اور حکیمی کے فن میں یکتا ہے اور اس کام میں نپٹ پکا ہے۔ اگر مُردے کو اس پاس لے جاؤ خدا کے حکم سے ایسی تدبیر کرے کہ ایک بار وہ بھی جی اٹھے

وہ اس محلے میں رہتا ہے اور عیسیٰ نام ہے۔"

میں یہ مژدہ سن کر بے اختیار چلا۔ تلاش کرتے کرتے پتہ سے اس کے دروازے پر پہنچا۔ ایک مرد سفید ریش کو دہلیز پر بیٹھے دیکھا اور کئی آدمی مرہم کی تیاری کے لئے کچھ پیس پاس رہے تھے۔ فقیر نے مارے خوشامد کے ادب سے سلام کیا اور کہا: "میں تمہارا نام اور خوبیاں سن کر آیا ہوں۔ ماجرا یہ ہے کہ میں اپنے ملک سے تجارت کے لئے چلا۔ قبیلہ کو بسبب محبت کے ساتھ لیا۔ جب نزدیک اس شہر کے آیا، تھوڑی سی دور رہا تھا جو شام ہو گئی۔ اَن دیکھے ملک میں رات کو چلنا مناسب نہ جانا۔ میدان میں ایک درخت کے تلے اتر پڑا۔ پچھلے پہر ڈاکہ آیا، جو کچھ مال و اسباب پایا لوٹ لیا۔ گہنے کے لالچ سے اس بی بی کو بھی گھائل کیا۔ مجھ سے کچھ نہ ہو سکا۔ رات جو باقی تھی جوں توں کر کاٹی، فجر ہی شہر میں آن کر ایک مکان کرائے پر لیا، ان کو وہاں رکھ کر میں تمہارے پاس دوڑا آیا ہوں۔ خدا نے تمہیں یہ کمال دیا ہے۔ اس مسافر پر مہربانی کر غریب خانہ پر تشریف لے چلو۔ اس کو دیکھو اگر اس کی زندگی ہوئی تو تمہیں بڑا جس ہوگا اور میں ساری عمر غلامی کروں گا۔"

عیسیٰ جراح بہت رحم دل اور خدا پرست تھا۔ میری غریبی کی باتوں پر ترس کھا کر میرے ساتھ اس حویلی تک آیا۔ زخموں کو دیکھتے ہی میری تسلی کی، بولا کہ خدا کے کرم سے اس بی بی کے زخم چالیس دن میں بھر آویں گے۔ غسل شفا کا کروا دوں گا۔ غرض اس مرد خدا نے سب زخموں کو نیم کے پانی سے دھو کر صاف کیا۔ جو لائق ٹانکوں کے پائے انہیں سیا اور باقی گھاؤں پر اپنے کھیسے سے ایک ڈبیا نکال کر کتنوں میں بتی رکھی اور کتنوں پر پھائے چڑھا کر پٹی سے باندھ دیا اور نہایت شفقت سے کہا: "میں دونوں وقت آیا کروں گا تو خبردار رہیو، ایسی حرکت نہ کرے جو ٹانکے ٹوٹ جائیں۔ مرغ کا شوربا بجائے غذا اس کے حلق میں چوائیو اور اکثر عرق بید مشک گلاب کے ساتھ دیا کیجو جو قوت رہے۔" یہ کہہ کر رخصت چاہی۔ میں نے بہت منت کی اور ہاتھ جوڑ کر کہا: "تمہارے تشفی دینے سے میری بھی زندگی ہوئی نہیں تو سوائے مرنے کے کچھ سوجھتا نہ تھا۔ خدا تمہیں سلامت رکھے۔" عطر و پان دے کر رخصت کیا۔

میں رات دن خدمت میں اس پری کی حاضر رہتا۔ آرام اپنے اوپر حرام کیا۔ خدا کی درگاہ میں روز رو رو اس کے چنگے ہونے کی دعا مانگتا۔ اتفاقاً سوداگر آ پہنچا اور میرا مال امانت میرے حوالے کیا۔ میں نے اسے اونے پونے بیچ ڈالا اور دارو درمن میں خرچ کرنے لگا۔ وہ مرد جراح ہمیشہ آتا جاتا۔ تھوڑے عرصے میں سب زخم بھر کر انگور کر لائے۔ بعد کئی دن کے غسل شفا کا کیا۔ عجب طرح کی خوشی حاصل ہوئی۔ خلعت اور اشرفیاں عیسیٰ جراح کے آگے دھریں اور اس پری کو مکلف فرش بچھا کر مسند پر بٹھایا۔ فقیر غریبوں کو بہت سی خیر خیرات کی۔ اس دن گویا بادشاہت ہفت اقلیم کی اس فقیر کے ہاتھ لگی۔ اور اس پری کا شفا پانے سے ایسا رنگ نکھرا کہ مکھڑا سورج کے مانند چمکنے لگا اور کندن کی طرح دمکنے لگا۔ نظر کی مجال نہ تھی کہ اس کے جمال پر ٹھہرے۔ فقیر بسر و چشم اس کے حکم کا منتظر رہتا۔ جو فرماتی سو بجا لاتا۔ وہ اپنے حسن کے غرور سے سرداری کے دماغ میں جو میری طرف کبھی دیکھتی تو فرماتی: "خبردار اگر تجھے ہماری خاطر منظور ہے تو ہرگز ہماری بات میں دخل نہ ماریو۔ جو ہم کہیں سو بلا عذر کئے جائیو۔ اپنا کسی بات میں دخل نہ کریو نہیں تو پچھتاوے گا۔"

اس کی وضع سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ حق میری خدمت گزاری اور فرمانبرداری کا اسے البتہ منظور ہے۔ فقیر بھی اس کی بے مرضی ایک کام نہ کرتا۔ اس کا فرمانا بسر و چشم بجا لاتا۔ ایک مدت اسی راز و نیاز میں کٹی۔ جو اس نے فرمائش کی وہیں میں نے لا کر حاضر کی۔ اس فقیر کے پاس جو کچھ نقد و جنس اصل نفع کا تھا سب صرف ہوا۔ اس بیگانے ملک میں کون اعتبار کرے جو قرض دام سے کام چلے۔ آخر تکلیف روز مرے کے خرچ کی ہونے لگی۔ اس سے دل بہت گھبرایا۔ فکر سے گھلا ہوتا گیا۔ چہرے کا رنگ کملایا ہو گیا لیکن کس سے کہوں جو کچھ دل پر گزرتی سو گزرتی، قہر درویش بر جان درویش۔ ایک دن اس پری نے اپنے شعور سے دریافت کر کے کہا: "اے فلانے، تیری خدمتوں کا حق ہمارے جی میں نقش کالحجر ہے پر اس کا عوض بالفعل ہم سے نہیں ہو سکتا۔ اگر واسطے خرچ ضروری کے کچھ درکار ہو تو اپنے دل میں اندیشہ نہ کر، ایک ٹکڑا کاغذ اور دوات قلم حاضر کر۔"

میں نے تب معلوم کیا کہ یہ کسی ملک کی بادشاہزادی ہے جو اس دل و دماغ سے گفتگو کرتی ہے۔ فی الفور آگے قلمدان رکھ دیا۔ اس نازنین نے ایک شقہ

دستخط خاص سے لکھ کر میرے حوالے کیا اور کہا: "قلعے کے پاس ترپولیا ہے وہاں اس کوچے میں ایک حویلی بڑی سی ہے اس کے مالک کا نام شیدی بہار ہے تو جا کر اس رقعہ کو اس تلک پہنچا دے۔" فقیر موافق اس کے فرمانے کے اسی نام و نشان پر منزلِ مقصود تک جا پہنچا دربان کی زبانی کیفیت خط کی کہلا بھیجی، وہیں سنتے ہی ایک حبشی جوان خوبصورت ایک پیٹا طرحدار بیچ ہوئے باہر نکل آیا اگرچہ رنگ سانولا تھا پر گویا نمک بھرا ہوا میرے ہاتھ سے خط لے لیا نہ کھولا نہ کچھ پوچھا انہیں قدموں پھر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں گیارہ کشتیاں سربمہر، بغت کے توڑہ پوش پڑے ہوئے غلاموں کے سر پر دھرے باہر آیا۔ کہا اس جوان کے ساتھ جا کر چوگوشے پہنچا دو۔ میں بھی سلام کر کے رخصت ہوا۔ اپنے مکان میں لایا آدمیوں کو دروازے کے باہر سے رخصت کیا وہ کشتیاں امانت حضور میں اس پری کے گذرانیاں۔ دیکھ کر فرمایا: "یہ گیارہ بدری اشرفیوں کی لے اور خرچ میں لا۔ خدا رزاق ہے۔"

فقیر اس نقد کو لے کر ضروریات میں خرچ کرنے لگا۔ اگرچہ خاطر جمع ہوئی دل میں خلش رہی یا الٰہی یہ کیا صورت ہے۔ بغیر پوچھے گچھے اتنا مال نا آشنا صورت اجنبی نے ایک پرزے کاغذ پر میرے حوالے کیا اگر اس پری سے یہ بھید پوچھوں تو اس نے پہلے ہی منع کر رکھا تھا مارے ڈر کے دم نہ مار سکتا تھا۔ بعد آٹھ دن کے وہ معشوقہ مجھ سے مخاطب ہوئی کہ حق تعالیٰ نے آدمی کو انسانیت کا جامہ عنایت کیا ہے کہ نہ پھٹے نہ میلا ہو اگرچہ پرانے کپڑے سے اس کی آدمیت میں فرق نہیں آتا پر ظاہر میں خلق اللہ کی نظروں میں اعتبار نہیں پاتا۔ دو توڑے اشرفی کے ساتھ لے کر چوک کے چوراہے پر یوسف سوداگر کی دکان میں جا اور کچھ رقم جواہر کی بیش قیمت اور دو خلعتیں زرق برق کی مول لے آ۔"

فقیر وہیں سوار ہو کر اس کی دکان پر گیا دیکھا تو ایک جوان شکیل زعفرانی جوڑا پہنے گدی پر بیٹھا ہے اور اس کا یہ عالم ہے کہ ایک عالم دیکھنے کے لئے دکان سے بازار تک کھڑا ہے۔ فقیر کمال شوق سے نزدیک جا کر سلام علیک کر کے بیٹھا اور جو چیز مطلوب تھی طلب کی۔ میری بات چیت اس شہر کے باشندوں کی سی نہ تھی اس جوان نے گرمجوشی سے کہا: "جو صاحب کو چاہئے سب موجود ہے لیکن یہ فرمائیے کس ملک سے آنا ہوا اور اس اجنبی شہر میں آنے کا کیا باعث ہے اگر اس حقیقت سے مطلع کیجئے تو مہربانی سے بعید نہیں۔"

میرے تئیں اپنا احوال ظاہر کرنا منظور نہ تھا۔ کچھ بات بنا کر اور جواہر پوشاک اور قیمت اس کی دے کر رخصت چاہی۔ اس جوان نے روکھے پھیکے ہو کر کہا: "اے صاحب، اگر تم کو ایسی ہی نا آشنائی کرنی تھی تو پہلے دوستی اتنی گرمی سے کرنی کیا ضرور تھی۔ بھلے آدمیوں میں صاحب سلامت کا بڑا پاس ہوتا ہے" یہ بات اس مزے اور انداز سے کہی کہ بے اختیار دل کو بھائی۔ بے مروت ہو کر وہاں سے اٹھنا انسانیت کے مناسب نہ جانا اس کی خاطر پھر بیٹھا اور بولا "تمہارا فرمانا سر آنکھوں پر میں حاضر ہوں۔" اتنے کہنے سے وہ بہت خوش ہوا۔ ہنس کر کہنے لگا: "آج کے دن غریب خانے میں کرم کیجئے تو تمہاری بدولت مجلس خوشی کی سجا کر دو چار گھڑی دل بہلا دیں اور کچھ کھانے پینے کا شغل باہم بیٹھ کر کریں۔"

فقیر نے اس پری کو کبھی اکیلا نہ چھوڑا تھا اس کی تنہائی یاد کر کے چندے چند عذر کئے پر اس جوان نے ہرگز نہ مانا۔ آخر وعدہ ان چیزوں کو پہنچا کر میرے پھر آنے کا لے کر اور قسم کھلا کر رخصت دی۔ میں دکان سے اٹھ کر جواہر اور خلعتیں اس پری کی خدمت میں لایا۔ اس نے قیمت جواہر کی اور حقیقت جوہری کی پوچھی۔ میں نے احوال مول تول کا اور مہمانی کے لئے بضد ہونے کا کہہ سنایا۔ فرمانے لگی "آدمی کو اپنا قول و قرار پورا کرنا واجب ہے۔ ہمیں خدا کی نگہبانی میں چھوڑ کر اپنے وعدہ کو وفا کر ضیافت قبول کرنی سنت رسول اللہ کی ہے۔"

تب میں نے کہا: "میرا دل چاہتا نہیں کہ تمہیں اکیلا چھوڑ کر جاؤں اور حکم یوں ہوتا ہے، ناچار جاتا ہوں جب تلک آؤں گا دل یہیں لگا رہے گا۔" یہ کہہ کر پھر اس جوہری کی دکان پر گیا۔ وہ مونڈھے پر بیٹھا میرا انتظار کھینچ رہا تھا۔ دیکھتے ہی بولا: "آؤ مہربان بڑی راہ دکھلائی۔" وہیں اٹھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور چلا جاتے جاتے ایک باغ میں لے گیا۔ وہ بڑی بہار کا باغ تھا۔ حوض اور نہروں میں فوارے چھوٹتے تھے۔ میوے طرح بطرح کے پھل رہے تھے۔ ہر ایک درخت مارے بوجھ کے جھوم رہے تھے۔ رنگ برنگ کے جانور ان پر بیٹھے چہچہے کر رہے تھے اور ہر مکان عالیشان میں فرش ستھرا بچھا تھا۔ وہاں لب نہر ایک بنگلے میں جا کر بیٹھا۔ ایک دم کے بعد آپ اٹھ کر چلا گیا۔ پھر دوسری پوشاک معقول پہن کر آیا۔ میں نے دیکھ کر کہا: "سبحان اللہ چشم بد دور۔" سن کر مسکرایا اور بولا

"مناسب یہ ہے کہ صاحب بھی اپنا لباس بدل ڈالیں۔" اس کی خاطر میں نے بھی دوسرے کپڑے پہنے۔

اس جوان نے بڑی تیپ تاپ سے طیاری ضیافت کی کی اور سامان خوشی کا جیسا چاہیے تھا موجود کیا اور فقیر سے صحبت بہت گرم کر کے مزے کی باتیں کرنے لگا۔ اتنے میں ساقی صراحی و پیالہ بلور کا لے کر حاضر ہوا اور گزک کئی قسم کی لا کر رکھی۔ نمکدان چن دیے۔ دور شراب کا شروع ہوا۔ جب دو چار جام کی نوبت پہنچی، چار لڑکے امرد صاحب جمال زلفیں کھولے ہوئے مجلس میں گانے بجانے لگے۔ یہ عالم ہوا اور ایسا سماں بندھا کہ اگر تان سین اس گھڑی ہوتا تو اپنی تان بھول جاتا اور بیجو باورا سن کر باؤلا ہو جاتا۔ اس مزے میں یکبارگی وہ جوان آنکھوں میں آنسو بھر لایا، دو چار قطرے بے اختیار نکل پڑے اور فقیر سے بولا: "اب ہمارے تمہارے دوستی جانی ہوئی۔ پس دل کا بھید دوستوں سے چھپانا کسی مذہب میں درست نہیں۔ ایک بات بے تکلف آشنائی کے بھروسے پر کہتا ہوں، اگر حکم ہو تو اپنی معشوقہ کو بلوا کر اس مجلس میں تسلی اپنے دل کی کروں۔ اس کی جدائی سے جی نہیں لگتا۔" یہ بات ایسے اشتیاق سے کہی کہ بغیر دیکھے بھالے فقیر کا دل بھی مشتاق ہوا۔ میں نے کہا: "مجھے تمہاری خوشی درکار ہے، اس سے کیا بہتر ہے۔ دیر نہ کیجیے۔ سچ ہے معشوق بن کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

اس جوان نے چلمن کی طرف اشارت کی، وو ہیں ایک عورت کالی کلوٹی بھتنی سی جس کے دیکھنے سے انسان بے اجل مر جائے جوان کے پاس آ بیٹھی۔ فقیر اس کے دیکھنے سے ڈر گیا۔ دل میں کہا یہی بلا محبوبہ ایسے جوان پری زاد کی ہے جس کی اتنی تعریف اور اشتیاق ظاہر کیا۔ لاحول پڑھ کر چپ ہو رہا۔ اسی عالم میں تین دن رات مجلس شراب اور راگ رنگ کی جمی رہی۔ چوتھی شب کو غلبہ نشہ اور نیند کا ہوا، میں خواب غفلت میں بے اختیار سو گیا۔ جب صبح ہوئی اس جوان نے جگایا۔ کئی پیالے خمار شکنی کے پلا کر اپنی معشوقہ سے کہا: "اب زیادہ تکلیف مہمان کو دینی خوب نہیں۔" دونوں ہاتھ پکڑ کر اٹھے، میں نے رخصت مانگی۔ خوشی بخوشی اجازت دی۔"

تب میں نے جلد اپنے قدیمی کپڑے پہن لیے، اپنے گھر کی راہ لی اور اس پری کی خدمت میں جا حاضر ہوا۔ مگر ایسا اتفاق کبھی نہ ہوا تھا کہ اسے تنہا چھوڑ کر شب باش کہیں اور ہوا ہوں۔ سا اس تین دن کی غیر حاضری سے نہایت خجل ہو کر عذر کیا اور قصہ ضیافت کا اور اس کے نہ رخصت کرنے کا سارا عرض کیا۔ وہ ایک دانا زمانے کی تھی۔ تبسم کر کے بولی: "کیا مضائقہ، اگر دوست کی خاطر رہنا ہوا ہم نے معاف کیا۔ تیری کیا تقصیر ہے؟ جب آدمی کسی کے گھر جاتا ہے تب اس کی مرضی سے پھر آتا ہے۔ لیکن یہ سنت کی مہمانیاں کھا پی کر چپکے ہو رہو گے یا اس کا بدلا بھی اتارو گے؟ اب یہ لازم ہے کہ جا کر اس سوداگر بچے کو اپنے ساتھ لے آؤ اور اس سے دو چند ضیافت کرو، اور اس بات کا کچھ اندیشہ نہیں۔ خدا کے کرم سے ایک دم میں سب لوازمہ تیار ہو جائے گا اور بخوبی مجلس ضیافت کی رونق پائے گی۔"

فقیر موافق حکم کے جوہری کے پاس گیا اور کہا: "تمہارا فرمانا میں نے تو سر آنکھوں سے بجا لایا، اب تم بھی مہربانی کی راہ سے میری عرض قبول کرو۔" اس نے کہا: "جان و دل سے حاضر ہوں۔" تب میں نے کہا: "اگر اس بندے کے گھر تشریف لے چلو، عین غریب نوازی ہے۔"

اس جوان نے بہت عذر و حیلے کیے پر میں نے پنڈ نہ چھوڑا جب تک وہ راضی نہ ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کو اپنے مکان پر لے چلا۔ راہ میں یہی فکر کرتا آتا تھا کہ اگر آج اپنے تئیں مقدور ہوتا تو ایسی تواضع کرتا کہ یہ بھی خوش ہوتا، اور اب میں اسے لیے جاتا ہوں دیکھیے کیا اتفاق ہوتا ہے۔ اسی بیچ میں گھر کے نزدیک پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دروازے پر دھوم دھام ہو رہی ہے، گلیارے میں جھاڑو دے کر چھڑکاؤ کیا ہے، یساول اور عصا بردار کھڑے ہیں۔ میں حیران ہوا لیکن اپنا گھر جان کر قدم اندر رکھا، دیکھا تو تمام حویلی میں فرش تکلف لائق ہر مکان کے جابجا بچھا ہے اور مسندیں لگی ہیں، پاندان، گلاب پاش، عطر دان، پیکدان، چنگیریں، نرگس دان قرینے سے دھری ہیں۔ طاقوں پر رنگترے، کنولے، نارنگیاں، گلابیاں رنگ برنگ کی چنی ہیں۔ ایک طرف رنگ آمیز ابرک کی ٹٹیوں میں چراغاں کی بہار ہے۔ ایک طرف جھاڑ و کنول کے روشن ہیں اور تمام دالان اور شہ نشینوں میں طلائی شمعدانوں پر کافوری شمعیں چڑھی ہیں اور جڑاؤ فانوسیں اوپر دھری ہیں۔ سب آدمی اپنے عہدے پر مستعد ہیں۔ اور باورچی خانے میں دیگیں کھنکھنا رہی ہیں۔ آبدار خانے کی ویسی ہی

طیاری ہے کوری کوری ٹلیاں روپے کی گمر ڈیگیں پر صافیوں سے بندھی اور مجمروں سے ڈھکی رکھی ہیں آگے چوکی پر ڈونگے کٹورے مع تھالی سرپوش دھرے برف کے آبخورے لگ رہے ہیں اور شورے کی صراحیاں ہل رہی ہیں۔ غرض سب اسباب بادشاہانہ موجود ہے اور کنچنیاں بھانڈ بھگیتے کلاونت قوال اچھی پوشاک پہنے ساز کے سُر ملائے حاضر ہیں۔ فقیر نے اس جوان کو لے جاکر مسند پر بٹھایا اور دل میں حیران تھا کہ یا الٰہی اتنے عرصے میں یہ سب تیاری کیونکر ہوئی۔ ہر طرف دیکھتا پھرا لیکن اس پری کا نشان نہ پایا۔ اسی جستجو میں ایک مرتبہ باورچی خانے کی طرف جا نکلا دیکھتا ہوں کہ وہ نازنین ایک مکان میں گلے میں کُرتی پاؤں میں تہ پوشی سر پر رومالی سفید اوڑھے ہوئے سادی خوشنما بن گئی ہے پلٹے ہی ہوئی ہے

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی ۔۔۔ کہ جیسے خوشنما لگتا ہے دیکھو چاند بن گہنے

خبر گیری میں ضیافت کی لگ رہی ہے اور تاکید ہر ایک کھانے کی کر رہی ہے کہ خبردار بامزہ ہو اور آب و نمک جیسا درست ہے اس محنت سے وہ گلاب سا بدن پسینہ پسینہ ہو رہا ہے میں پاس جاکر تصدق ہوا اور اس شعور و لیاقت کو سراہ کر دعائیں دینے لگا۔ وہ یہ خوشامد سُن کر تیوری چڑھا کر بولی یہ آدمی سے ایسے ایسے کام ہوتے ہیں کہ فرشتے کی مجال نہیں۔ میں نے ایسا کیا کیا ہے جو اتنا حیران ہو رہا ہے۔ بس بہت باتیں بنانی مجھے خوش نہیں آتیں بھلا کہہ تو یہ کون آدمیت ہے کہ مہمان کو اکیلا بٹھلا کر اِدھر اُدھر چٹے پھرتے ہو۔ وہ اپنے جی میں کیا کہتا ہوگا جلد جا مجلس میں بیٹھ کر مہمان کی خاطر داری کر اور اس کی معشوقہ کو بھی بلا کر اپنے پاس بٹھلا۔"

فقیر وہیں اس جوان کے پاس گیا اور گرمجوشی کرنے لگا۔ اتنے میں دو غلام صاحب جمال صراحی اور جام جڑاؤ ہاتھ میں لئے روبرو آئے شراب پلانے لگے۔ اس وقت میں نے اس جوان سے کہا "میں سب طرح مخلص اور خادم ہوں بہتر یہ ہے کہ وہ صاحب جمال کہ جس کی طرف دل صاحب کا مائل ہے تشریف لائے تو بڑی بات ہے۔ اگر فرماؤ تو آدمی بلانے کی خاطر جائے۔"

یہ سنتے ہی وہ خوش ہو کر بولا "بہت اچھا اس وقت تم نے میرے دل کی بات کہی۔"

میں نے ایک خوجے کو بھیجا جب آدھی رات گئی وہ چڑیل خاصے چنڈول پر سوار ہو کر بلائے ناگہانی سی آ پہنچی۔ فقیر نے ناچار خاطر سے مہمان کا استقبال کر کے نہایت تپاک سے برابر اس جوان کے لا بٹھایا۔ جوان اسے دیکھتے ہی ایسا خوش ہوا جیسے دنیا کی نعمت ملی وہ کُٹنی بھی اس جوان پری زادے کے گلے لپٹ گئی۔ سچ مچ یہ تماشا ہوا جیسے چودھویں رات کے چاند کو گہن لگتا ہے جتنے مجلس میں آدمی تھے اپنی اپنی انگلیاں دانتوں میں داب نے لگے کہ کیا کوئی بلا اس جوان پر مسلط ہوئی۔ جس کی نگاہ تھی اسی طرف تھی تماشا مجلس کا بھول کر اس کا تماشا دیکھنے لگے۔

ایک شخص کنارے سے بولا "یارو عشق اور عقل میں ضد ہے جو کچھ عقل میں نہ آئے یہ کافر عشق کر دکھائے۔ لیلیٰ کو مجنوں کی آنکھوں سے دیکھئے۔"

سبھوں نے کہا "آمنا یہی بات ہے۔"

یہ فقیر بموجب حکم کے مہمانداری میں حاضر تھا ہر چند جوان ہم نوالہ و ہم پیالہ ہونے کو مجوز ہوتا تھا پر میں ہرگز اس پری کے خوف کے مارے اپنا دل کھانے پینے یا سیر تماشے کی طرف رجوع نہ کرتا تھا اور عذر مہمانداری کا کر کے اس میں شامل نہ ہوتا اسی کیفیت سے تین شبانہ روز گزرے چوتھی رات وہ جوان نہایت جوش سے مجھے بُلا کر کہنے لگا کہ اب ہم بھی رخصت ہوں گے تمہاری خاطر اپنا سب کاروبار چھوڑ چھاڑ کر تین دن سے تمہاری خدمت میں حاضر ہیں تم بھی تو ہمارے پاس ایک دم بیٹھ کر ہمارا دل خوش کرو۔ میں نے اپنے جی میں کہا کہ اگر اس وقت کہنا اس کا نہیں مانتا تو آزردہ ہوگا پس سنئے دوست اور مہمان کی خاطر رکھنی ضرور ہے۔"

تب یہ کہا "صاحب کا حکم بجا لانا منظور ہے کہ الامر فوق الادب۔"

سنتے ہی اس جوان نے پیالہ تواضع کیا اور میں نے پی لیا۔ پھر تو ایسا پیہم دور چلا کر تھوڑی دیر میں سب آدمی مجلس کے کیفی ہو کر بے خبر ہو گئے اور میں بھی بے ہوش ہو گیا۔ جب صبح ہوئی آفتاب دو نیزے بلند ہوا تب میری آنکھ کھلی تو دیکھا میں نے نہ وہ طیاری ہے نہ وہ مجلس نہ وہ پری فقط حویلی خالی

پڑی ہے مگر ایک کونے میں کمبل لپٹا ہوا دھرا ہے۔ اس کو جو کھول کر دیکھا تو وہ جوان اور اس کی رنڈی دونوں سر کٹے پڑے ہیں۔ یہ حالت دیکھتے ہی حواس جاتے رہے۔ عقل کچھ کام نہیں کرتی تھی کہ یہ کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ حیرانی سے ہر طرف تک رہا تھا۔ اتنے میں ایک خواجہ سرا جسے ضیافت کے کام کاج میں دیکھا تھا نظر پڑا، فقیر کو اس کے دیکھنے سے کچھ تسلی ہوئی، احوال اس واردات کا پوچھا۔

اس نے جواب دیا "تجھے اس بات کی تحقیق کرنے سے کیا حاصل جو تو پوچھتا ہے؟"

میں نے بھی اپنے دل میں غور کیا سچ تو کہتا ہے۔ پھر ایک ذرا تامل کر کے میں بولا "خیر نہ کہو بھلا یہ تو بتاؤ وہ معشوقہ کس مکان میں ہے؟"

تب اس نے کہا "البتہ جو میں جانتا ہوں سو کہہ دوں گا لیکن تجھ سا آدمی عقلمند بے مرضی حضور کے دو دن کی دوستی پہ بے محابا بے تکلف ہو کر صحبت مے نوشی کی باہم کرے یہ کیا معنی رکھتا ہے؟"

فقیر اپنی حرکت اور اس کی نصیحت سے بہت نادم ہوا سوائے اس بات کے زبان سے کچھ نہ نکلا کہ "فی الحقیقت اب تو تقصیر ہوئی معاف کیجئے۔" بارے محلی نے مہربان ہو کر اس پری کے مکان کا نشان بتایا اور مجھے رخصت کیا۔ آپ ان دونوں زخمیوں کے گاڑنے دابنے کی فکر میں رہا۔ میں تہمت سے اس فساد کی الگ ہوا اور اشتیاق میں اس پری کے ملنے کے لئے گھبرایا ہوا گرتا پڑتا ڈھونڈھتا شام کے وقت اس کوچے میں اسی پتے پر جا پہنچا اور نزدیک دروازے کے ایک گوشے میں ساری رات تلملاتے کٹی۔ کسی کی آمد و رفت کی آہٹ نہ ملی اور کوئی احوال پرساں نہ ہوا۔ اسی بیکسی کی حالت میں صبح ہو گئی۔ جب سورج نکلا اس مکان کے بالاخانے کی ایک کھڑکی سے وہ ماہ رو میری طرف دیکھنے لگی۔ اس وقت عالم خوشی کا جو مجھ پر گزرا دل ہی جانتا ہے۔ شکر خدا کا کیا۔

اتنے میں ایک خوجے نے میرے پاس آ کر کہا "اسی مسجد میں تو جا کر بیٹھ شاید تیرا مطلب اس جگہ بر آئے اور اپنے دل کی مراد پائے۔"

فقیر اس کے فرمانے سے وہاں سے اٹھ کر اسی مسجد میں جا رہا لیکن آنکھیں دروازے کی طرف لگ رہی تھیں کہ دیکھیے پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ تمام دن جیسے روزہ دار شام ہونے کا انتظار کھینچتا ہے میں نے بھی وہ روز ویسے ہی بیقراری میں کاٹا۔ بارے جس تس طرح سے شام ہوئی اور دن پہاڑ سا چھاتی پر سے ٹلا۔ ایک بارگی وہی خواجہ سرا آیا۔ اس شفیق نے کہ سب راز و نیاز کا محرم تھا نہایت تسلی دی۔ ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے ساتھ لے چلا۔ رفتہ رفتہ ایک باغچے میں مجھے بٹھا کر کہا "یہاں رہو جب تک تمہاری آرزو بر آئے" اور آپ رخصت ہو کر شاید میری حقیقت حضور میں کہنے گیا۔ میں اس باغ کے پھولوں کی بہار، چاندنی کا عالم اور حوض نہروں میں فوارے ساون بھادوں کے اچھلنے کا تماشا دیکھ رہا تھا لیکن جب پھولوں کو دیکھتا تب اس گلبدن کا خیال آتا، جب چاند پر نظر پڑتی تب اس ماہ رو کا مکھڑا یاد کرتا۔ یہ سب بہار اس کے بغیر میری آنکھوں میں خار تھی۔

بارے خدا نے اس کے دل کو مہربان کیا۔ ایک دم کے بعد وہ پری دروازے سے جیسے چودھویں رات کا چاند بناؤ کئے گلے میں پیشواز بادلے کی سنجاف کی موتیوں کا در دامن ٹکا اور سر پر اوڑھنی جس میں آنچل پلو لہر گوکھرو لگا ہوا سر سے پاؤں تک موتیوں میں جڑی روش پر آ کر کھڑی ہوئی۔ اس کے آنے سے ترو تازگی نئے سرے سے اس باغ کو اور اس فقیر کے دل کو ہو گئی۔ ایک دم ادھر ادھر سیر کر کے شہ نشین میں مغرقی مسند پر تکیہ لگا کر بیٹھی۔ میں دوڑ کر پروانے کی طرح جیسے شمع کے گرد پھرتا ہے تصدق ہوا اور غلام کے مانند دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوا۔ اتنے میں وہ خواجہ سرا میری خاطر بطور سفارش کے عرض کرنے لگا۔ میں نے اس محل سے کہا "بندہ گنہگار تقصیر وار ہے جو کچھ سزا میرے لائق ٹھہرے سو ہو۔"

وہ پری از بسکہ ناخوش تھی بد دماغی سے بولی کہ "اب اس کے حق میں یہی بھلا ہے کہ سو توڑے اشرفی کے لیوے، اپنا اسباب درست کر کے وطن کو سدھارے۔" میں یہ بات سنتے ہی کاٹھ کا ہو گیا اور سوکھ گیا کہ اگر کوئی میرے بدن کو کاٹے تو ایک بوند لہو کی نہ نکلے اور تمام دنیا آنکھوں کے آگے اندھیری لگنے لگی اور ایک آہ نامرادی کی بے اختیار جگر سے نکلی آنسو بھی ٹپکنے لگے۔ سوائے خدا کے اس وقت کسی کی توقع نہ رہی۔ مایوس محض ہو کر اتنا بولا "بھلا ٹک اپنے دل میں غور فرمائیے اگر مجھ کم نصیب کو دنیا کا لالچ ہوتا تو اپنا جان و مال حضور میں نہ کھوتا۔ کیا ایک بارگی حق خدمت گزاری اور جاں نثاری کا عالم سے اٹھ گیا جو

مجھ کم بخت پر اتنی بے مہری فرمائی غیر اب میرے تئیں بھی زندگی سے کچھ کام نہیں معشوقوں کی بے وفائی سے بیچارے عاشقِ نیم جاں کا نباہ نہیں ہوتا۔"

یہ سن کر تیکھی ہو تیوری چڑھا کر خفگی سے بولی "یہ چہ خوش آپ ہمارے عاشق ہیں مینڈکی کو بھی زکام ہوا۔ اے بے وقوف اپنے حوصلے سے زیادہ پاؤں نہ بڑھا یہ خیالِ خام ہے چھوٹا منہ بڑی بات بس چپ رہ یہ نکمی بات چیت مت کر اگر کسی اور نے یہ حرکت بے معنی کی ہوتی پروردگار کی سوں اس کی بوٹیاں کٹوا کے چیلوں کو بانٹتی پر کیا کروں تیری خدمت یاد آتی ہے اب اسی میں بھلائی ہے کہ اپنی راہ لے۔ تیری قسمت کا دانہ پانی ہماری سرکار میں یہیں تلک تھا۔"

پھر میں نے روتے بسورتے کہا "اگر میری تقدیر میں یہی لکھا ہے کہ اپنے دل کے مقصد کو نہ پہنچوں اور جنگل پہاڑ میں سر ٹکراتا پھروں تو ناچار ہوں۔"

اس بات سے بھی دق ہو کر کہنے لگی "میرے تئیں یہ بسا ہندے چوچلے اور رمز کی باتیں پسند نہیں آتیں۔ اس اشارے کی گفتگو کے جو لائق ہو اس سے جا کر کہو۔" پھر اسی خفگی کے عالم میں اٹھ کر اپنے دولت خانے کو چلی میں نے بہتیرا سر پٹکا متوجہ نہ ہوئی۔ ناچار میں بھی اس مکان سے مایوس اور ناامید ہو کر نکلا۔

غرض چالیس دن تک یہی نوبت رہی جب شہر کی کوچہ گردی سے اکتاتا جنگل میں نکل جاتا جب وہاں سے گھبراتا پھر شہر کی گلیوں میں دیوانہ سا آتا نہ دن کو کھانا نہ رات کو سوتا جیسے دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا زندگی انسان کی کھانے پینے سے ہے آدمی اناج کا کیڑا ہے طاقت بدن میں مطلق نہ رہی اپاہج ہو کر اسی مسجد کی دیوار کے تلے جا پڑا کہ ایک روز وہی خواجہ سرا جمعے کی نماز پڑھنے آیا میرے پاس سے ہو کر چلا میں یہ شعر ناطاقتی سے پڑھ رہا تھا ؎

اس دردِ دل سے مرت ہو یا دل کو تاب ہو قسمت میں جو لکھا ہے الٰہی شتاب ہو

اگرچہ ظاہر میں صورت میری بالکل تبدیل ہو گئی تھی چہرے کی یہ شکل بن گئی تھی کہ جس نے مجھے پہلے دیکھا تھا وہ بھی نہ پہچان سکتا کہ یہ وہی آدمی ہے لیکن وہ محلی آواز درد کی سن کر متوجہ ہوا میرے تئیں بغور دیکھ کر افسوس کیا اور شفقت سے مخاطب ہوا کہ "تو یہ حالت اپنی پہنچائی۔"

میں نے کہا "اب تو جو ہوا سو ہوا مال سے بھی حاضر تھا جان بھی تصدق کی اس کی خوشی یوں ہوئی تو کیا کروں۔"

یہ سن کر ایک خدمتگار میرے پاس چھوڑ کر مسجد میں گیا نماز اور خطبے سے فراغت کر کے جب باہر نکلا فقیر کو ایک میانے میں ڈال کر اپنے ساتھ خدمت میں اس پری بے پروا کے لے جا کر چق کے باہر بٹھا دیا اگرچہ میری رونق کچھ باقی نہ رہی تھی پر مدت تک شب و روز اس پری کے پاس اتفاق بنے کا ہوا تھا جان بوجھ کر بیگانی ہو کر خواجہ سے پوچھنے لگی "یہ کون ہے؟"

اس مرد آدمی نے کہا "یہ وہی کم بخت بدنصیب ہے جو حضور کی خفگی اور عتاب میں پڑا تھا اسی سبب سے اس کی یہ صورت بنی ہے عشق کی آگ سے جلا جاتا ہے ہر چند آنسوؤں کے پانی سے بجھاتا ہے پر وہ دونی بھڑکتی ہے کچھ فائدہ نہیں ہوتا علاوہ اپنی تقصیر خجالت سے مرا جاتا ہے۔"

پری نے ٹھٹھولی سے فرمایا "کیوں جھوٹ بکتا ہے بہت دن ہوئے اس کی خبر وطن پہنچنے کی مجھے خبرداروں نے دی ہے واللہ اعلم یہ کون ہے اور تو کس کا ذکر کرتا ہے۔"

اس دم خواجہ سرا نے ہاتھ جوڑ کر التماس کیا "اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔"

فرمایا کہ "تیری جان تجھے بخشی۔"

خواجہ بولا "آپ کی ذات قدردان ہے واسطے خدا کے چلون درمیان سے اٹھا پہچان لیجئے اور اس کی بے کسی کی حالت پر رحم کیجئے ناحق شناسی خوب نہیں۔ اب اس کے احوال پر جو کچھ ترس کھائیے بجا ہے اور جانئے ثواب ہے آگے حقِ ادب ہے جو مزاج مبارک میں آوے سو ہی بہتر ہے۔"

اتنے کہنے پر مسکرا کر فرمایا "بھلا کوئی ہو اسے دارالشفا میں رکھو جب بھلا چنگا ہو گا تب اس کے احوال کی پرسش کی جائے گی۔"

خواجہ نے کہا "اگر اپنے دستِ خاص سے گلاب اس پر چھڑکئے اور زبان سے کچھ فرمائیے تو اس کو اپنے جینے کا بھروسہ بندھے ناامیدی بری چیز ہے دنیا بہ امید قائم ہے۔"

اس پر بھی اس پری نے کچھ نہ کہا یہ سوال و جواب سن کر میں بھی اپنے جی سے اکتا رہا تھا نہ حرکت بول اٹھا کہ "اب اس مظلوم کی زندگی کو دل نہیں چاہتا پاؤں تو گور میں لٹکا چکا ہوں ایک روز مرنا ہے اور علاج میرا شاہزادی کے ہاتھ میں ہے کریں یا نہ کریں وہ جانیں۔"

بارے پھر مقلب القلوب نے اس سنگدل کے دل کو نرم کیا مہربان ہو کر فرمایا "جلد بادشاہی حکیموں کو حاضر کرو۔"

وہیں طبیب آ کر جمع ہوئے نبض و قارورہ دیکھ کر بہت غور کیا آخر تشخیص یہ ٹھہرا کہ یہ شخص کہیں عاشق ہوا ہے سوائے وصل معشوق کے اس کا کچھ علاج نہیں جس وقت وہ ملے یہ صحت پاوے جب حکیموں کی زبانی بھی یہی مرض ٹھہرا حکم کیا۔ اس جوان کو حمام میں لے جاؤ، نہلا کر خاصی پوشاک پہنا کر حضور میں لے آؤ۔ وہیں مجھے باہر لے گئے حمام کروا کر اچھی پوشاک پہنا خدمت میں پری کے حاضر کیا۔ تب وہ نازنین تپاک سے بولی "تو نے مجھے بیٹھے بٹھائے ناحق بدنام اور رسوا کیا اب اور کیا چاہتا ہے جو تیرے دل میں ہے صاف صاف بیان کر۔"

فقیر کا اس وقت یہ عالم ہوا کہ شادی مرگ ہو جائے خوشی کے مارے ایسا پھولا کہ جامے میں نہ سماتا تھا اور صورت شکل بدل گئی شکر خدا کا کیا اور اس سے کہا "اس دم ساری حکیمی آپ پر ختم ہوئی کہ مجھ سے مردے کو ایک بات میں زندہ کیا دیکھو تو اس وقت سے اس وقت تک میرے احوال میں کیا فرق ہو گیا۔" یہ کہہ کر تین بار گرد پھرا اور سامنے آ کر کھڑا ہوا — کہا "حضور سے یوں حکم ہوتا ہے کہ جو تیرے جی میں ہو سو کہہ۔"

میں نے کہا کہ بندے کو ہفت اقلیم کی سلطنت سے زیادہ ہے کہ غریب نوازی کر کے اس عاجز کو قبول کیجئے اور اپنی قدم بوسی سے سرفرازی دیجئے۔"

ایک لمحہ تو سن کر غوطے میں گئی پھر کن انکھیوں سے دیکھ کر کہا "بیٹھو تم نے خدمت اور وفاداری ایسی ہی کی ہے جو کچھ کہو سو پھبتی ہے اور اپنے دل پر بھی نقش ہے بہتر ہم نے قبول کیا۔" اسی دن اچھی ساعت اور مجلس میں چپکے چپکے قاضی نے نکاح پڑھ دیا۔ بعد اتنی محنت اور آفت کے خدا نے یہ دن دکھایا کہ میں نے اپنے دل کا مدعا پایا لیکن جیسی دل میں آرزو اس پری سے ہم بستر ہونے کی تھی ویسی جی میں بے کلی اس واردات عجیب کے معلوم کرنے کی تھی کہ آج تک میں کچھ نہ سمجھا کہ یہ پری کون اور وہ حبشی سانولا سجیلا جس نے ایک پرزے کاغذ پر اتنی اشرفیوں کی بدری میرے حوالے کی کون تھا اور طیاری ضیافت کی بادشاہوں کے لائق ایک پہر میں کیونکر ہوئی اور وے دونوں بے گناہ اس مجلس میں کس لئے مارے گئے اور سبب خفگی اور بے مروتی کا باوجود خدمتگزاری اور ناز برداری کے مجھ پر کیا ہوا اور پھر ایک بارگی اس عاجز کو یوں سربلند کیا۔ غرض اسی واسطے بعد رسم رسومات عقد کے آٹھ دن تک باوصف اس اشتیاق کے قصد مباشرت نہ کیا رات کو ساتھ سوتا دن کو یوں ہی اٹھ کھڑا ہوتا۔

ایک دن غسل کے لئے میں نے خواص کو کہا کہ تھوڑا پانی گرم کر دے تو نہاؤں۔

ملکہ مسکرا کر بولی "کس برتے پر تتا پانی؟" میں خاموش ہو رہا لیکن وہ پری میری حرکت سے حیران ہوئی بلکہ چہرے پر آثار خفگی کے نمودار ہوئے۔ یہاں تک کہ ایک روز بولی "تم بھی عجیب آدمی ہو یا اتنے گرم یا ایسے ٹھنڈے اس کو کیا کہتے ہیں۔ اگر تم میں قوت نہ تھی کیوں ایسی کچی ہوس پکائی؟"

تب تو اس وقت میں نے بے دھڑک ہو کر کہا "اے جانی منصفی شرط ہے آدمی کو چاہئے کہ انصاف سے نہ چوکے۔"

بولی "اب کیا انصاف رہ گیا ہے جو کچھ ہونا تھا سو ہو چکا۔"

فقیر نے کہا "واقعی بڑی آرزو اور مراد میری یہی تھی سو مجھے ملی لیکن دل میرا دبدھے میں ہے اور دودلی آدمی کی خاطر پریشان رکھتی ہے اس سے کچھ ہو نہیں سکتا انسانیت سے خارج ہو جاتا ہے میں نے اپنے دل میں یہ قول کیا تھا کہ بعد اس نکاح کے کہ عین دل کی شادی ہے بعضی بعضی باتیں جو خیال میں نہیں آئیں اور نہیں کھلتیں حضور سے پوچھوں گا کہ زبان مبارک سے اس کا بیان سنوں تو جی کو تسکین ہو۔"

اس پری نے چیں بجبیں ہو کر کہا "کیا خوب ابھی سے بھول گئے یاد کرو بارہا ہم نے کہا کہ ہمارے کام میں ہرگز دخل نہ کیجئو اور کسی بات کے معترض نہ ہو جیو خلاف معمول یہ بے ادبی کرنا کیا لازم ہے؟"

فقیرنی ہنس کر کہا: "جیسے اور بے ادبیاں معاف کرنے کا حکم ہے ایک یہ بھی سہی۔" وہ پری نظریں بدل کر تیہے میں آکر آگ بگولا بن گئی اور بولی "اب تو بہت سر پر چڑھتا ہے اپنا کام کر ان باتوں سے تجھے کیا فائدہ ہوگا؟"

میں نے کہا: "دنیا میں اپنے بدن کی شرم سب سے زیادہ ہوتی ہے لیکن ایک دوسرے کا واقف کار ہوتا ہے بس ایسی چیز جل پر روا رکھی تو اور کونسا بھید چھپانے کے لائق ہے؟"

میرے اس رمز کو وہ پری وقوف سے دریافت کر کر کہنے لگی "یہ بات سچ ہے پر جی میں یہ سوچ آتا ہے کہ اگر مجھ نگوڑی کا راز فاش ہو تو بڑی قیامت مچے۔"

میں بولا "یہ کیا مذکور ہے بندے کی طرف سے یہ خیال دل میں نہ لاؤ اور خوشی سے ساری کیفیت جو بیتی ہے فرماؤ ہرگز ہرگز میں دل سے زبان تک نہ لاؤں گا کسو کے کان پڑنا کیا امکان ہے؟"

جب اس نے دیکھا کہ اب سوا کہنے کے اس عزیز سے چھٹکارا نہیں ناچار ہو کر بولی "ان باتوں کے کہنے میں بہت سی خرابیاں ہیں تو خواہ مخواہ درپے ہوا خیر تیری خاطر عزیز ہے اس لئے اپنی سرگذشت بیان کرتی ہوں تجھے اس کا پوشیدہ رکھنا ضرور ہے۔"

غرض بہت سی تاکید کر کر کہنے لگی کہ میں بدبخت ملک دمشق کے سلطان کی بیٹی ہوں اور وہ سلاطینوں سے بڑا بادشاہ ہے سوائے میرے کوئی لڑکا بالا اس کے یہاں نہیں ہوا جس دن سے میں پیدا ہوئی ماں باپ کے سایہ میں ناز و نعمت اور خوشی خرمی سے پلی جب ہوش آیا تب اپنے دل کو خوبصورتوں اور نازنینوں کے ساتھ لگایا چنانچہ ستھری پری زاد ہمجولی امرا زادیاں مصاحبت میں اور اچھی اچھی قبول صورت ہم عمر خواصیں سہیلیاں خدمت میں رہتی تھیں تماشا ناچ اور رنگ کا ہمیشہ دیکھا کرتی دنیا کے واسطے بھلے برے سے کچھ کام نہ تھا اپنی بے فکری کے عالم کو دیکھ کر سوائے خدا کے شکر کے کچھ منہ سے نہ نکلتا تھا۔ اتفاقاً طبیعت خود بخود ایسی بے مزہ ہوئی کہ نہ مصاحبت کسو کی بھاوے نہ مجلس خوشی کی خوش آوے سودائی سا مزاج ہو گیا۔ دل اُداس اور حیران نہ کسو کی صورت اچھی لگے نہ بات کہنے سننے کو جی چاہے میری یہ حالت دیکھ کر دائی دوا چھوچھو انا سب کی سب متفکر ہوئیں اور قدم پر گرنے لگیں یہی خواجہ سرا نمک حلال قدیم سے میرا محرم و ہمراز ہے اس سے کوئی بات مخفی نہیں میری وحشت دیکھ کر بولا "اگر بادشاہزادی تھوڑا سا شربت ورق الخیال کا نوش جان فرمائیں تو اغلب ہے کہ طبیعت بحال ہو جائے اور فرحت مزاج میں آوے۔" اس کے اس طرح کہنے سے مجھے بھی شوق ہوا تب میں نے فرمایا جلد حاضر کر۔ محلی باہر گیا ایک صراحی اسی شربت کی تکلف سے بنا کر برف میں لگا کر لڑکے کے ہاتھ لوا کر آیا میں نے پیا جو کچھ اس کا فائدہ بیان کیا تھا ویسا ہی دیکھا اس وقت اس خدمت کے انعام میں ایک بھاری خلعت خوجے کو عنایت کیا اور حکم کیا کہ ایک صراحی ہمیشہ بلاناغہ اسی وقت حاضر کیا کر۔ اس دن سے یہ مقرر ہوا کہ خواجہ سرا صراحی اسی چھوکرے کے ہاتھ لوا لاوے اور بندی پی جاوے جب اس کا نشہ طلوع ہوتا تو اس کی لہر میں اس لڑکے سے ٹھٹھا مزاح کر کر دل بہلاتی وہ بھی جب ڈھیٹھ ہوا تب اچھی اچھی میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا اور عجیبے کی نقلیں لاتے بلکہ آہ اوہ بھرنے اور سسکیاں لینے لگا صورت تو اس کی طرح دار لائق دیکھنے کے تھی بے اختیار جی چاہنے لگا میں دل کے شوق اور اٹکھیلیوں کے ذوق سے ہر روز انعام بخشش دینے لگی پر وہ کم بخت ویسے کپڑوں سے جیسے ہمیشہ پہنے رہتا تھا حضور میں آتا بلکہ وہ لباس بھی میلا ہو جاتا۔ ایک دن میں نے پوچھا "تجھے سرکار سے اتنا کچھ ملا پر تو نے اپنی صورت ویسی ہی پریشان رکھی۔ کیا سبب ہے تو نے روپے کہاں خرچ کئے یا جمع کر رکھے ہیں؟"

لڑکے نے یہ خاطرداری کی باتیں جو سنیں اور مجھے اپنا احوال پرساں پایا آنسو ڈبڈبا کر کہنے لگا "جو کچھ آپ نے اس غلام کو عنایت کیا سب استاد نے لے لیا مجھے ایک پیسہ نہیں دیا کہاں سے دوسرے کپڑے بناؤں جو پہن کر حضور میں آؤں۔ اس میں میری تقصیر نہیں میں ناچار ہوں۔"

اس غریب کے کہنے پر اس کے مجھے ترس آیا۔ وہیں خواجہ سرا کو فرمایا آج سے اس لڑکے کو اپنی صحبت میں تربیت کر اور لباس اچھا تیار کرا کر

پہنا اور لونڈوں میں بے فائدہ کھیلنے کودنے نہ دے بلکہ اپنی خوشی یوں ہے کہ آداب لائق حضور کی خدمت کے سیکھے اور حاضر رہے۔ خواجہ سرا موافق فرمانے کے بجا لایا اور میری مرضی جو اُدھر دیکھی نہایت اس کی خبرگیری کرنے لگا۔ تھوڑے دنوں میں فراغت اور خوش خرمی کے سبب اس کا رنگ و روغن کچھ کا کچھ ہو گیا اور کینچلی سی ڈال دی۔ میں اپنے دل کو ہر چند سنبھالتی پر اس کافر کی صورت جی میں ایسی کھب گئی تھی یہی جی چاہتا تھا کہ مارے پیار کے اسے کلیجے میں ڈال رکھوں اور اپنی آنکھوں سے ایک پل جدا نہ کروں۔ آخر اس کو مصاحبت میں داخل کیا اور خلعتیں طرح طرح کی اور جواہر رنگ برنگ کے پہنا کر دیکھا کرتی۔ بارے اس کے نزدیک رہنے سے آنکھوں کو تسکین کلیجے کو ٹھنڈک ہوتی۔ ہر دم اس کی خاطرداری کرتی۔ آخر کو میری یہ حالت پہنچی کہ اگر وہ ایک دم کچھ ضروری کام کو میرے سامنے سے جاتا تو چین نہ آتا۔

بعد کئی برس کے وہ بالغ ہوا، مسیں بھیگنے لگیں، چھب تختی درست ہوئی، تب اس کا چرچا باہر درباریوں میں ہونے لگا۔ دربان اور روتیے موٹڑے باربردار یساول چوبدار اس کو محل کے اندر آنے جانے سے منع کرنے لگے۔ آخر اس کا آنا موقوف ہوا۔ مجھے تو اس بغیر کل نہ آتی تھی ایک دم پہاڑ تھا۔
جب یہ احوال ناامیدی کا سنا ایسی بدحواس ہو گئی گویا مجھ پر قیامت ٹوٹی اور یہ حالت ہوئی کہ نہ کچھ کہہ سکتی ہوں اور نہ اس بن رہ سکتی ہوں۔ کچھ بس نہیں چل سکتا الٰہی کیا کروں عجب طرح کا قلق ہوا۔ مارے بے قراری کے اس محلی کو جو میرا بھیدی تھا بلا کر کہا کہ مجھے غور و پرداخت اس لڑکے کی منظور ہے۔ بالفعل صلاح وقت یہ ہے کہ ہزار اشرفی پونجی دے کر چوک کے چوراہے میں دکان جوہری کی کروا دو تو تجارت کر کے اس کے نفع سے اپنی گذران فراغت سے کیا کرے اور میرے محل کے قریب ایک حویلی اچھے نقشے کی رہنے کے لئے ولوا دو۔ لونڈی غلام نوکر چاکر جو ضرور ہوں مول لے کر اور درماہہ مقرر کر کے اس پاس رکھوا دو کہ کسی طرح بے آرام نہ ہو۔ خواجہ سرا نے اس کی بود و باش کی اور جوہری پنے اور تجارت کی سب طیاری کر دی۔ تھوڑے عرصے میں اس کی دکان ایسی چمکی اور رونق ہوئی کہ جو خلعتیں فاخرہ اور جواہر بیش قیمت سرکار میں بادشاہ کی اور امیروں کی درکار یا مطلوب ہوتے اسی کے یہاں بہم پہنچتے۔ آہستہ آہستہ یہ دکان جمی کہ جو تحفہ ہر ایک ملک کا چاہیے وہیں ملے۔ سب جوہریوں کا روزگار اس کے آگے مندا ہو گیا۔ غرض اس شہر میں کوئی برابری اس کی نہ کر سکتا بلکہ کسی ملک میں ویسا کوئی نہ تھا۔ اس نے کاروبار میں تو لاکھوں روپے کمائے پر جدائی اس کی روز بروز نقصان میرے تن بدن کا کرنے لگی۔ کوئی تدبیر ایسی نہ بن آئی کہ اس کو دیکھ کر اپنے دل کی تسلی کروں۔

ایک دن صلاح کی خاطر اسی واقف کار محلی کو بلایا اور کہا کوئی ایسی صورت بن نہیں آتی کہ ذرا اس کی صورت میں دیکھوں اور اپنی جان کو صبر دوں۔ مگر یہ طرح ہے کہ ایک سرنگ اس کی حویلی سے کھدوا کر محل میں ملا دو۔ حکم کرتے ہی کئی دنوں میں نقب طیار ہوئی کہ جب سانجھ ہوتی چپکے ہی وہ خواجہ سرا اس جوان کو اسی راہ سے لے آتا۔ تمام شب شراب کباب عیش و عشرت میں کٹتی۔ میں اس کے ملنے سے آرام پاتی وہ میرے دیکھنے سے خوش ہوتا۔ جب فجر کا تارا نکلتا اور مؤذن اذان دیتا محلی اسی راہ سے اس جوان کو اس کے گھر پہنچا دیتا۔ ان باتوں سے سوائے اس خوجے کے اور دو دائیوں کے جنہوں نے مجھے دودھ پلایا تھا چوتھا آدمی کوئی واقف نہ تھا۔ ایک مدت اسی طرح سے گذری۔

ایک دن کا یہ ذکر ہے کہ موافق معمول کے خواجہ سرا اس کو بلانے گیا دیکھے تو وہ جوان فکرمند سا چپکا بیٹھا ہے۔ محلی نے پوچھا "آج خیر ہے؟ کیوں ایسے دلگیر ہو رہے ہو؟ چلو حضور نے یاد فرمایا ہے۔" اس نے ہرگز کچھ جواب نہ دیا زبان نہ ہلائی۔ خواجہ سرا اپنا سا منہ لے کر اکیلا پھر آیا۔ احوال اس کا عرض کیا۔ میرے تئیں شیطان جو خراب کرے اس پر بھی محبت اس کی دل سے نہ بھولی۔ اگر یہ جانتی کہ یہ عشق اور چاہ ایسے نمک حرام بے وفا کی آخر کو بدنام اور رسوا کرے گی اور ننگ و ناموس سب لٹکانے لگے گا تو اسی دم اس کام سے باز آتی اور توبہ کرتی پھر اس کا نام نہ لیتی نہ اپنا دل اس بے حیا کو دیتی۔ پر ہونا تو یوں تھا اس لئے یہ حرکت بے جا اس کی خاطر میں نہ لائی اور اس کے نہ آنے کو معشوقوں کا چوچلا اور ناز سمجھا۔ اس کا نتیجہ یہ دیکھا کہ اس سرگذشت سے بغیر دیکھے بھالے تو بھی واقف ہوا۔ نہیں تو میں کہاں اور تو کہاں؟ خیر جو ہوا سو ہوا۔ اس خود دماغی پر اس گدھے کی خیال نہ کر دوبارہ خوجے کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ اگر تو اس وقت نہیں آوے گا تو میں کسو ڈھب سے وہیں آتی ہوں لیکن میرے آنے میں بڑی قباحت ہے۔ اگر

یہ راز فاش ہوا تو تیرے حق میں بہت برا ہے ایسا کام نہ کر جس میں سوائے رسوائی کے اور کچھ پھل نہ ملے۔ بہتر یہی ہے جلدی چلا آ نہیں تو مجھے پہنچا جان۔ جب یہ سندیسہ گیا اور اشتیاق بیرا لپٹ دیکھا ٹھنڈی سی صورت بنائے ہوئے ناز نخرے سے آیا جب میرے پاس بیٹھا تب میں نے اس سے پوچھا کہ آج رکاوٹ اور خفگی کا کیا باعث ہے اتنی شوخی اور گستاخی تو نے کبھو نہ کی تھی ہمیشہ بلا عذر حاضر ہوتا تھا۔ تب اس نے کہا کہ میں گمنام غریب حضور کی توجہ سے اور دامن دولت کے باعث اس مقدور کو پہنچا بہت آرام سے زندگی کٹتی ہے آپ کی جان و مال کو دعا کرتا ہوں۔ یہ تقصیر بادشاہزادی کے معاف کرنے کے بھروسے اس گنہگار سے سرزد ہوئی امیدوار عفو کا ہوں۔

میں تو جان و دل سے اسے چاہتی تھی اس کی بناوٹ کی باتوں کو مان لیا اور شرارت پر نظر نہ کی بلکہ پھر دلداری سے پوچھا کیا تجھ کو ایسی مشکل کٹھن پیش آئی جو ایسا متفکر ہو رہا ہے اس کو عرض کر اس کی بھی تدبیر ہو جائے گی۔ غرض اس نے اپنی خاکساری کی راہ سے یہی کہا کہ مجھ کو سب مشکل ہے اور آپ کے روبرو سب آسان ہے۔ آخر اس کے فحوائے کلام اور بت کہاؤ سے یہ کھلا کہ ایک باغ نہایت سرسبز اور عمارت عالی حوض و تالاب کنویں پختہ سمیت غلام کی حویلی کے نزدیک نانت شہر میں بکاؤ ہے اور اس باغ کے ساتھ ایک لونڈی بھی گائن کہ علم موسیقی میں خوب سلیقہ رکھتی ہے لیکن یہ دونوں باہم بکتے ہیں نہ اکیلا باغ جیسے اونٹ کے گلے میں بلی جو کوئی وہ باغ لیوے اس کنیز کی بھی قیمت دلیوے اور تماشا یہ ہے باغ کا مول لاکھ روپے اس باندی کا مول پانچ لاکھ، فدوی سے اتنے روپے بالفعل سرانجام نہیں ہو سکتے۔

میں نے اس کا دل بہت بے اختیار شوق میں اس کی خریداری کے پایا کہ اسی واسطے دل حیران اور خاطر پریشان تھا باوجودیکہ روبرو میرے بیٹھا تھا تب بھی اس کا چہرہ غمگین اور جی اداس تھا مجھے تو خاطرداری اس کی ہر گھڑی اور ہر پل منظور تھی اسی وقت خواجہ سرا کو حکم کیا کہ کل صبح کو قیمت اس باغ کی لونڈی سمیت چکا کر قبالہ باغ کا اور خط کنیزک کا لکھوا کر اس شخص کے حوالے کر دو اور مالک کو زر قیمت خزانہ عامرہ سے دلا دو اس پروانگی کے سنتے ہی وہ آداب بجا لایا اور منہ پر رونق آ گئی۔ ساری رات اسی قاعدے سے جیسے ہمیشہ گذرتی تھی ہنسی خوشی سے رہے فجر ہوتے ہی وہ رخصت ہوا۔ خوجہ نے موافق فرمانے کے اس باغ کو اور لونڈی کو خرید کر دیا۔ پھر وہ جوان ہمیشہ رات کو موافق معمول کے آیا جایا کرتا۔

ایک روز بہار کے موسم میں کہ مکان بھی دلچسپ تھا بدلی گھمنڈ رہی تھی بوندیاں پڑ رہی تھیں بجلی بھی کوند رہی تھی اور ہوا نرم نرم بہتی تھی غرض عجب کیفیت اس دم تھی جو میں رنگ برنگ کے حباب اور گلابیاں طاقوں پر چنی ہوئی نظر پڑیں دل للچایا کہ ایک گھونٹ پی لوں جب دو تین پیالوں کی نوبت پہنچی وہیں خیال اس باغ تو خرید کا گذرا کمال شوق ہوا کہ ایک دم اس عالم میں وہاں کی سیر کرنی چاہیے۔ کم بختی جو آوے اونٹ چڑھے کتا کاٹے اچھی طرح بیٹھے بٹھائے ایک دائی کو ساتھ لے کر سرنگ کی راہ سے اس جوان کے مکان میں گئی وہاں سے باغ کی طرف چلی دیکھا تو ٹھیک اس باغ کی بہار بہشت کی برابری کر رہی ہے۔ قطرے مینہ کے درختوں کے سرسبز پتوں پر جو پڑے ہیں گویا زمرد کی پتریوں پر موتی جڑے ہیں اور سرخی پھولوں کی اس ابر میں ایسی چھپی جیسے شفق پھولی ہے اور نہریں لبالب مانند فرش آئینے کے نظر آتی ہیں اور موجیں لہراتی ہیں غرض اس باغ میں ہر طرف سیر کرتی پھرتی تھی کہ دن ہو چکا سیاہی شام کی نمود ہوئی اتنے میں وہ جوان ایک روش پہ نظر آیا اور مجھے دیکھ بہت ادب اور گرمجوشی سے آگے بڑھ کے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ پر دھر کر بارہ دری کی طرف لے چلا جب میں وہاں گئی تو وہاں کے عالم نے سارے باغ کی کیفیت کو دل سے بھلا دیا۔ یہ روشنی کا ٹھاٹھ تھا جا بجا قمقمے سرو چراغاں کنولی اور فانوس خیال شمع مجلس جیران اور فانوسیں روشن تھیں کہ شب برات باوجود چاندنی اور چراغاں کے اس کے آگے اندھیری لگتی۔ ایک طرف آتش بازی پھلجھڑی، انار، داؤدی، بھچنیا، مرواریدہ، مہتابی، ہوائی، چرخی، ہتھ پھول، جاہی جوہی، پٹاخے، تماشے چھٹتے تھے اس عرصے میں بادل پھٹ گیا اور چاند نکل آیا بعینہ جیسے نافرمانی جوڑا پہنے ہوئے کوئی معشوق نظر آ جاتا ہے بڑی کیفیت ہوئی۔

چاندنی چھٹکتے ہی جوان نے کہا اب چل کر باغ کے بالاخانے پر بیٹھئے میں ایسی احمق ہو گئی تھی کہ جو وہ نگوڑا کہتا سو میں مان لیتی اب یہ ناچ نچایا کہ مجھ کو اوپر لے گیا وہ کوٹھا ایسا بلند تھا کہ تمام شہر کے مکان اور بازار کے چراغاں گویا اس کے پائیں باغ تھے میں جو اس جوان کے گلے میں ہاتھ ڈالے ہوئے

خوشی کے عالم میں بیٹھی تھی اتنے میں ایک رنڈی نہایت بھونڈی سی صورت نہ شکل چولہے میں سے نکل شراب کا شیشہ ہاتھ میں لیے آ پہنچی۔ مجھے اس وقت اس کا آنا نپٹ برا لگا اور اس کی صورت دیکھنے سے دل میں ہول اٹھی۔ تب میں نے گھبرا کر جوان سے پوچھا "یہ طرفہ علت کون ہے تو نے کہاں سے پیدا کی" وہ جوان ہاتھ باندھ کر کہنے لگا "یہ وہی لونڈی ہے جو اس باغ کے ساتھ حضور کی عنایت سے خرید ہوئی" میں نے معلوم کیا کہ اس احمق نے بڑی خواہش سے اس کو قبول کیا شاید اس کا دل اس پر مائل ہے اسی خاطر سے پیچ و تاب کھا کر میں چپکی ہو رہی۔ لیکن دل اسی وقت سے مکدر ہوا اور ناخوشی مزاج پر چھا گئی تس پر قیامت اس ایسے تیسے نے یہ کی کہ ساقی اسی چھنال کو بنایا۔ اس وقت میں لہو پیتی تھی اور جیسے طوطی کوے کے ساتھ ایک پنجرے میں بند کرتا ہے نہ جانے کی فرصت پاتی تھی اور نہ بیٹھنے کو جی چاہتا تھا قصہ مختصر وہ شراب بوند کی بوند تھی جس کے پینے سے آدمی حیوان ہو جاوے دو چار جام پے در پے اسی تیزاب کے جوان کو دیے اور آدھا پیالہ جوان کی منت سے میں نے بھی زہر مار کیا آخر وہ پلشت بے حیا بھی بدمست ہو کر اس مردود سے بیہودہ ادائیں کرنے لگی اور وہ چیلہ بھی نشے میں بے لحاظ ہو چلا اور نامعقول حرکتیں کرنے لگا۔ مجھے یہ غیرت آئی کہ اگر اس وقت زمین پھٹے تو میں سما جاؤں لیکن اس کی دوستی کے باعث یہ بلتی اس پر بھی چپ ہو رہی وہ اصل کا پاجی تھا۔ میرے اس درگزر کرنے کو نہ سمجھا نشے کی لہریں اور بھی دو پیالے چڑھا گیا کہ رہا سہا ہوش جو تھا وہ بھی گم ہوا اور میری طرف سے مطلق ڈرکا جی سے اٹھا دیا .... دونوں میں چوما چاٹی ہونے لگی نہ اس بے وفا میں وفا نہ اس بے حیا میں حیا جیسی روح ویسے فرشتے۔

میری اس وقت یہ حالت تھی جیسے اوسر چوکی ڈومنی گاوے "تال بے تال" اپنے اوپر لعنت کرتی تھی کہ کیوں تو یہاں آئی جس کی یہ سزا پائی۔ آخر کہاں تک سہوں میرے سر سے پاؤں تک آگ لگ گئی اور انگاروں پر لوٹنے لگی۔ اس غصے اور طیش میں یہ کہاوت کہی "بیل نہ کودا کودے گون یہ تماشا دیکھے کون" کڑھتی ہوئی وہاں سے اٹھی وہ شرابی اپنی خرابی دل میں سوچا کہ اگر یہ بادشاہزادی اس وقت ناخوش ہوئی تو کل میرا کیا حال ہوگا اور صبح کو کیا قیامت مچے گی اب بہتر تو اس کا کام تمام کر ڈالوں یہ ارادہ اس غیبانی کی صلاح سے جی میں ٹھہرا کر گلے میں پٹکا ڈال میرے پاؤں آ کر گر پڑا اور پگڑی سر سے اتار کر منت و زاری کرنے لگا میرا دل تو اس پر لٹو ہو رہا تھا جدھر لیے پھرتا تھا پھرتی تھی اور چکی کی طرح میں اس کے اختیار میں تھی جو کہتا تھا سو کرتی تھی جوں توں مجھے بہلا پھسلا کر پھر بٹھایا اور اسی شراب دو آتشہ کے دو چار پیالے بھر بھر آپ بھی پیے اور مجھے بھی دیے ایک تو غصے کے مارے جل بھن کر کباب ہو رہی تھی دوسرے ایسی شراب پی جلد بیہوش ہو گئی کچھ حواس باقی نہ رہے تب اس بے رحم نمک حرام کٹر سنگدل نے تلوار سے مجھے گھائل کیا بلکہ اپنی دانست میں مار چکا۔ اس دم میری آنکھ کھلی تو منہ سے یہی نکلا "خیر جیسا ہم نے کیا ویسا پایا لیکن تو اپنے تئیں اس خون ناحق سے بچائیو

مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر

مرے لہو کو تو دامن سے دھو ہوا سو ہوا

کسی سے یہ بھید ظاہر نہ کیجیو اور ہم نے تجھ سے جان تک بھی دریغ نہ کی۔ پھر اس کو خدا کے حوالے کر کر میرا جی ڈوب گیا مجھے اپنی سدھ بدھ کچھ نہ رہی شاید اس قصائی نے مجھے مردہ خیال کر اس صندوق میں ڈال کر قلعے کی دیوار کے تلے لٹکا دیا سو تو نے دیکھا میں کسو کا برا نہ چاہتی تھی لیکن یہ خرابیاں قسمت میں لکھی تھیں مٹتی نہیں کرم کی ریکھا۔ ان آنکھوں نے سبب یہ کچھ دیکھا اگر خوبصورتوں کے دیکھنے کا دل میں شوق نہ ہوتا تو وہ بدبخت میرے گلے کا طوق نہ ہوتا۔ اللہ نے یہ کام کیا کہ تجھ کو وہاں پہنچا دیا اور تو سبب میرے زندگی کا ہوا۔ اب جی میں آتی ہے کہ یہ رسوائیاں کھینچ کر اپنے تئیں جیتا نہ رکھوں یا کسی کو منہ نہ دکھاؤں پر کیا کروں مرنے کا اختیار اپنے ہاتھ میں نہیں۔ خدا نے مار کر پھر جلایا آگے دیکھیے کیا قسمت میں لکھا ہے۔ ظاہر میں تو تیری دوڑ دھوپ اور خدمت کام آئی جو ایسے زخموں سے شفا پائی تو نے جان و مال سے میری خاطر کی اور جو کچھ اپنی بساط تھی حاضر کی ان دنوں تجھے خرچ سے دو دلا دیکھ کر وہ شقہ شیدی بہار کو جو میرا خزانچی ہے لکھا اس میں یہی مضمون تھا کہ میں خیر و عافیت سے اب فلانے مکان میں ہوں مجھ بد طالع کی خبر والدہ شریفہ کی خدمت میں پہنچا۔ اس نے تیرے ساتھ وہ کشتیاں نقد کی خرچ کی خاطر بھیج دیں اور جب تجھے خلعت اور جواہر خریدنے کو یوسف سوداگر بچے کی دوکان

پر بھیجا تھا مجھے یہ بھروسہ تھا کہ وہ کم حوصلہ ہر ایک سے جلد آشنا ہو بیٹھتا ہے تجھے بھی اجنبی جان کر غالب ہے کہ دوستی کرنے کے لئے اتنا کر توت اور ضیافت تیری کرے گا سو میرا منصوبہ ٹھیک بیٹھا جو کچھ میرے دل میں گزرا تھا اس نے ویسا ہی کیا۔ تو جب اس سے قول و قرار پھر آنے کا کر کے میرے پاس آیا اور مہمانی کی حقیقت اور اس کا بجد ہونا مجھ سے کہا میں دل میں خوش ہوئی کہ جب تو اس کے گھر میں جاکر کھاوے پیوے گا تب اگر تو بھی اس کو مہمانی کی خاطر بلا دے گا تو وہ دوڑا چلا آوے گا۔ اس لئے تجھے جلد رخصت کیا۔

تین دن کے پیچھے جب تو وہاں سے فراغت کر کے آیا اور میرے روبرو عذر غیر حاضری کا شرمندگی سے لایا میں نے تیری تسلی کے لئے فرمایا کچھ مضائقہ نہیں جب اس نے رخصت دی تب تو آیا لیکن بے شرمی خوب نہیں کہ دوسرے کا احسان اپنے سر پر رکھئے اور اس کا بدلہ نہ کیجئے اب تو بھی جاکر اس کی استدعا کر اور اپنے ساتھ ہی ساتھ لے آ۔ جب تو اس کے گھر گیا تب میں نے دیکھا کہ یہاں کچھ اسباب مہمانداری کا تیار نہیں اگر وہ آجاوے تو کیا کروں لیکن یہ فرصت پائی کہ اس ملک میں قدیم سے بادشاہوں کا یہ معمول ہے کہ آٹھ مہینے کاروبار ملکی و مالی کے واسطے ملک گیری میں باہر رہتے ہیں وہ چار مہینے موسم برسات کے قلعۂ مبارک میں جلوس فرماتے ہیں۔

ان دنوں دو چار مہینے سے بادشاہ یعنی ولی نعمت مجھ بدبخت کے بندوبست کی خاطر ملک گیری کو تشریف لے گئے تھے جب تک تو اس جوان کو ساتھ لے کر آوے شیدی بہار نے میرا احوال خدمت میں بادشاہ بیگم کے کہ والدہ مجھ ناپاک کی ہیں عرض کیا پھر میں اپنی تقصیر اور گناہ سے خجل ہو کر ان کے روبرو جا کھڑی ہوئی اور جو سرگزشت تھی سب بیان کی ہر چند انہوں نے میرے غائب ہونے کی کیفیت دوراندیشی اور مہر مادری سے چھپا رکھی تھی کہ خدا جانے اس کا کیا انجام ہو ابھی یہ رسوائی ظاہر کرنی خوب نہیں میرے بدلے میرے عیبوں کو اپنے پیٹ میں رکھ چھوڑا تھا لیکن میری تلاش میں تھیں جب مجھے اس حالت میں دیکھا اور سب ماجرا سنا آنسو بھر لائیں اور فرمایا:

"اے کم بخت ناشدنی تو نے جان بوجھ کے نام و نشان بادشاہت کا سارا کھویا ہزار افسوس اور اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھویا کاش کہ تیرے عوض میں پتھر جنتی تو صبر آتا اب بھی توبہ کر جو قسمت میں تھا سو ہوا اب آگے کیا کرے گی جیوے گی یا مرے گی؟"

میں نے نہایت شرمندگی سے کہا: "مجھ بے حیا کے نصیبوں میں یہی لکھا تھا جو اس بدنامی اور خرابی میں ایسی ایسی آفتوں سے بچ کر جیتی رہوں۔ اس سے مرنا ہی بھلا تھا اگرچہ کلنک کا ٹیکا میرے ماتھے پر لگا پر ایسا کام نہیں کیا جس میں ماں باپ کے نام کو عیب لگے۔ اب یہ بڑا دکھ ہے کہ وے دونوں بے حیا میرے ہاتھ سے بچ جاویں اور آپس میں رنگ رلیاں مناویں اور میں ان کے ہاتھوں سے یہ کچھ دکھ دیکھوں حیف ہے کہ مجھ سے کچھ نہ ہو سکے۔ امیدوار ہوں کہ خانساماں کو پروانگی ہو تو اسباب ضیافت کا بخوبی تمام اس کم بخت کے مکان میں طیار کرے تو میں دعوت کے بہانے سے ان دونوں بدبختوں کو بلا کر ان کے عملوں کی سزا دوں اور اپنا عوض لوں جس طرح اس نے مجھ پر ہاتھ چھوڑا اور گھائل کیا میں بھی ان دونوں کو پرزے پرزے کروں تب میرا کلیجہ ٹھنڈا ہو نہیں تو اس غصے کی آگ میں پھنک رہی ہوں۔ آخر جل بل کر بھوبھل ہو جاؤں گی۔"

یہ سن کر انہوں نے ماماتا کے درد سے مہربان ہو کر میری عیب پوشی کی اور سارا لوازمہ ضیافت کا اسی خواجہ سرا کے ساتھ جو میرا محرم ہے کر دیا سب اپنے اپنے کارخانے میں آکر حاضر ہوئے۔ شام کے وقت تو اس مردے کو لے کر آیا۔ مجھے اس قحبہ باندی کا بھی بلانا منظور تھا چنانچہ پھر تجھ کو تقید کر کر اسے بھی بلوایا۔ جب وہ آئی اور مجلس جمی شراب پی پی کر سب بدمست اور بیہوش ہوئے اور ان کے ساتھ تو بھی کیفی ہو کر مردہ سا پڑا میں نے قلماقنی کو حکم کیا کہ ان دونوں کا سر تلوار سے کاٹ ڈال۔ اس نے وہیں ایک دم میں شمشیر نکال دونوں کے سر کاٹ بدن لال کر دئیے اور تجھ پر غصہ کا یہ باعث تھا کہ میں نے اجازت ضیافت کی دی تھی تو دو دن کی دوستی پہ اعتماد کر کے شریک میخواری کا ہوا البتہ یہ تیری حماقت اپنے تئیں پسند نہ آئی اس واسطے کہ جب تو پی پاکر بیہوش ہوا تب توقع رفاقت کی تجھ سے کیا رہی۔ پر تیری خدمت کے حق ایسے میری گردن پر ہیں کہ جو تجھ سے ایسی حرکت ہوئی ہے تو معاف کرتی ہوں ـــــ لے میں نے اپنی حقیقت ابتدا سے انتہا تک کہہ سنائی اب بھی دل میں کچھ اور ہوس باقی ہے؟"

جیسے میں نے تیری خاطر کر کے تیرے کہنے کو سب طرح قبول کیا تو بھی میرا فرمانا اسی صورت سے عمل میں لا۔ صلاح وقت یہ ہے کہ اب اس شہر میں رہنا میرے اور تیرے حق میں بھلا نہیں آگے تو مختار ہے۔"

یا معبود اللہ شہزادی اتنا فرما کر چپ ہو رہی فقیر تو دل و جان سے اس کے حکم کو سب چیز پر مقدم جانتا تھا اور اس کی محبت کے جال میں پھنسا تھا بولا جو مرضی مبارک میں آوے سو بہتر ہے یہ فدوی بے عذر بجا لاوے گا جب شہزادی نے میرے تئیں فرمانبردار و خدمتگار اپنا پورا سمجھا فرمایا دو گھوڑے چالاک اور جانباز کہ چلنے میں ہوا سے باتیں کریں بادشاہ کے خاص اصطبل سے منگوا کر تیار رکھ۔ میں نے ویسے ہی پری زاد چار گردے کے گھوڑے چن کر زین بندھوا کر منگوائے جب تھوڑی رات باقی رہی بادشاہزادی مردانہ لباس پہن کر اور پانچوں ہتھیار باندھ کر ایک گھوڑے پر سوار ہوئی اور دوسرے مرکب پر میں بھی مسلح ہو کر چڑھ بیٹھا اور ایک طرف کی راہ لی جب شام ہوئی اور چرچا ہونے لگا تب ایک پوکھر کے کنارے پہنچے اتر کر منہ ہاتھ دھو جلدی سے کچھ ناشتہ کر کے پھر سوار ہو کر چلے۔

کبھی ملکہ کچھ کچھ باتیں کرتی اور یوں کہتی کہ ہم نے تیری خاطر شرم و حیا ملک و مال ماں باپ سب چھوڑا ایسا نہ ہو کہ تو بھی اس ظالم بے وفا کی طرح سلوک کرے۔"

کبھو میں کچھ احوال ادھر ادھر کا راہ کٹنے کے لئے کہتا اور اس کا جواب دیتا کہ بادشاہزادی سب آدمی ایک سے نہیں ہوتے اس پاجی کے نطفے میں کچھ خلل ہوگا جو اس سے ایسی حرکت واقع ہوئی اور میں نے جان و مال تم پر تصدق کیا اور تم نے مجھے ہر طرح سرفرازی بخشی اب میں بندہ بغیر داموں کا ہوں میرے چمڑے کی اگر جوتیاں بنوا کر پہنو تو میں آہ نہ کروں جو ایسی ایسی باتیں باہم ہوتی تھیں اور رات دن چلنے سے کام تھا۔ کبھو جو ماندگی کے سبب کہیں اترتے تو جنگل کے چرند و پرند شکار کرتے اور حلال کر کے نمکدان سے نون نکال چقماق سے آگ جھاڑ بھون بھان کر کھا لیتے گھوڑوں کو چھوڑ دیتے۔ وے اپنے منہ سے گھاس پات چر چگ کر اپنا پیٹ بھر لیتے۔

ایک روز ایسے کھٹ دست میدان میں جا نکلے کہ جہاں بستی کا نام نہ تھا اور آدمی کی صورت نہ نظر آتی تھی۔ اس پر بھی بادشاہزادی کی رفاقت کے سبب سے دن عید اور رات شب برات معلوم ہوتی تھی جاتے جاتے اچنت ایک دریا کہ جس کے دیکھنے سے کلیجا پانی ہو راہ میں ملا۔ کنارے پہ کھڑے ہو کر جو دیکھا تو جہاں تلک نگاہ نے کام کیا پانی ہی پانی تھا کچھ نثل بیڑا نہ پایا الٰہی اب اس سمندر سے کیونکر پار اتریں ایک دم اسی سوچ میں کھڑے رہے آخر یہ دل میں لہر آئی کہ ملکہ کو یہیں بٹھا کر میں تلاش میں ناؤ تواڑی کے جاؤں جب تلک اسباب گذارے کا ہاتھ آوے تب تلک وہ نازنین بھی آرام پاوے تب میں نے کہا "اے ملکہ اگر حکم ہو تو گھاٹ باٹ اس دریا کا دیکھوں" فرمانے لگی "میں بہت تھک گئی ہوں اور بھوکی پیاسی ہو رہی ہوں ذرا دم لے لوں جب تئیں تم پار چلنے کی کچھ تدبیر کرو۔"

اس جگہ ایک درخت پیپل کا تھا بڑا چھتر باندھے ہوئے کہ اگر ہزار سوار آئیں تو دھوپ میں اس کے تلے آرام پائیں۔ وہاں اس کو بٹھا کر میں چلا اور چاروں طرف دیکھتا تھا کہ کہیں بھی زمین پر یا دریا میں نشان انسان کا پاؤں بہتیرا سر مارا کہیں نہ پایا آخر مایوس ہو کر وہاں سے پھر آیا تو اس پری کو پیڑ کے نیچے نہ پایا۔ اس وقت کی حالت کیا کہوں کہ حسرت جاتی رہی دیوانہ باؤلا ہو گیا۔ کبھی درخت پر چڑھ جاتا اور ڈال ڈال پات پات پھرتا کبھی ہاتھ پاؤں چھوڑ کر زمین میں گرتا اور اس درخت کی جڑ کے آس پاس تصدق ہوتا۔ کبھی چنگھاڑ مار کر اپنی بے بسی پر روتا اور کبھی پچھم سے پورب کو دوڑا جاتا کبھی اتر سے دکھن کو پھر آتا غرض بہتیری خاک چھانی لیکن اس گوہر نایاب کی نشانی نہ پائی جب میرا کچھ بس نہ چلا تب روتا اور خاک سر پر اڑاتا ہوا تلاش ہر کہیں کرتا ہوا دل میں یہ خیال آیا کہ شاید جن اس پری کو اٹھا کر لے گیا اور مجھے یہ داغ دے گیا یا اس کے ملک سے کوئی اس کے پیچھے لگا چلا آتا تھا اس وقت اکیلا پا کر منا و نا کر پھر شام کی طرف لے ابھرا۔

ایسے خیالوں میں گھبرا کر کپڑے وپڑے پھینک پھانک ننگا منگا فقیر بن کر شام کے ملک میں صبح سے شام تک ڈھونڈھتا پھرتا اور

رات کو کہیں پڑ رہتا سارا جہاں ڈھونڈمارا پر اپنی بادشاہزادی کا نام و نشان کسی سے نہ سُنا نہ سبب غائب ہونے کا معلوم ہوا۔ تب دل میں آیا کہ جب اس جانی کا کچھ پتہ نہ پایا تو اب جینا بھی حیف ہے۔ کسی جنگل میں ایک پہاڑ نظر آیا تب اس پر چڑھ گیا اور ارادہ کیا کہ اپنے تئیں گرا دوں کہ ایک دم میں سر منہ پتھروں سے ٹکراتے ٹکراتے پھوٹ جاوے گا تو ایسی مصیبت سے جی چھوٹ جاوے گا۔ یہ دل میں کہہ کر چاہتا تھا کہ اپنے تئیں گرا دوں پاؤں بھی اٹھا چکے تھے کہ کسی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اتنے میں ہوش آیا کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سوار سبز پوش منہ پر نقاب ڈالے مجھ سے فرماتا ہے کہ کیوں تو اپنے مرنے کا قصد کرتا ہے خدا کے فضل سے ناامید ہونا کفر ہے جب تلک سانس ہے تب تلک آس ہے اب تھوڑے دنوں میں روم کے ملک میں تین درویش تجھ سے ویسے ہی ایسی ہی مصیبت میں پھنسے ہوئے اور ایسے ہی تماشے دیکھے ہوئے تجھ سے ملاقات کریں گے اور وہاں کے بادشاہ کا آزاد بخت نام ہے اس کو بھی ایک بڑی مشکل درپیش ہے جب وہ بھی تم چاروں فقیروں کے ساتھ ملے گا تو ہر ایک کے دل کا مطلب اور مراد جو ہے بخوبی حاصل ہوگی۔

بارے اس فقیر نے اپنے مولیٰ مشکل کشا کی بشارت سے خاطر جمع ہو قسطنطنیہ کا ارادہ کیا۔ راہ میں جو کچھ مصیبتیں قسمت میں لکھی تھیں کھینچتا ہوا اس بادشاہزادی کی ملاقات کے بھروسے خدا کے فضل سے یہاں تک آ پہنچا

مظہر علی ولا و للولال

بیتال پچیسی

(۱۸۰۳ء)

چھٹی کہانی

دھرم پر نام ایک نگر ہے وہاں کا راجہ دھرم شیل اوس کے منتری کا نام اندک اوس نے ایک دن راجہ سے کہا "مہاراج ایک مندر بناؤ اوس میں دیبی کو بٹھا نت پوجا کیجیے کہ اس کا شاستر میں بڑا پن لکھا ہے" تب راجہ ایک مندر بنوا، دیبی دہرا شاستر کی بدھ سے پرچا کرنے لگا اور بن پوجا کے جل بھی نہ پیتا تھا اسی طرح سے جب کتنی ایک مدت گزری تو ایک روز دیوان نے کہا "مہاراج مثل مشہور ہے کہ نپوتے کا گھر سونا مورکھ کا ہردے سونا اور دالدری کا سب کچھ سونا ہے" یہ بات سن راجہ دیبی کے مندر میں جا ہاتھ جوڑ استت کرنے لگا کہ ہے دیبی تجھے برہما بشنو اور اندر اٹھ پہر سیوتے ہیں اور تو نے منی کا سر چنڈ منڈ کھینچ نے دیتوں کو مار پرتھوی کا بھار اوتار لیا ہے اور جہاں تیرے بھگت نپیڑ پیٹ پڑے تہاں تہاں جا تو سہائے ہوئے اور میں اس بکھ تیرے دوارے پر آیا ہوں اب میرے ہی من کی اچھیا پوری کر اتنی استت جب راجہ کر چکا تب دیبی کے مندر سے آواز آئی کہ راجہ میں تجھ سے خوش ہوئی، راجہ نے کہا "مجھ کو پتر دے" دیبی نے کہا راجہ تیرے پتر ہوگا مہابلی اور بڑا دیرتابی "تب تو راجہ نے چندن گشت پھول دھوپ دیپ نیوید سے کر پوجا کی اور اسی طرح سے ہر روز پوجا کرتا تھا. غرض کتنے دنوں کے پیچھے راجہ کے ایک لڑکا پیدا ہوا راجہ نے باجے گاجے سے کٹنب سمیت جاکے دیبی کی پوجا کی اس عرصہ میں ایک دن کا اتفاق ہے کہ کسی نگر سے ایک دھوبی اپنے دوست کو ساتھ لئے اس شہر کی طرف آتا تھا کہ دیبی کا مندر راہ سے نظر آیا اوس نے ڈنڈوت کرنے کا ارادہ کیا اس میں ایک دھوبی کی لڑکی اَتِ سندری آتے سامنے سے اُس نے دیکھی اوسے دیکھ موہت ہُوا اور دیبی کے درشن کو گیا ڈنڈوت کر ہاتھ جوڑ اس نے اپنے من میں کہا ہے دیبی! جو اس سندری سے میرا بیاہ تیرے کرپا سے ہو تو میں اپنا سر تجھے چڑھاؤں" یہ مانتا مان ڈنڈوت کر دوست کو ساتھ لے اپنے نگر کو گیا جب وہاں پہنچا تو اوس کے برہ نے یہ ستایا کہ نیند بھوک پیاس بسر گئی آٹھو پہر اوس کے دھیان میں رہنے لگا یہ بُری حالت اوس کے دوست نے دیکھ اوس کے باپ سے جا سب بیورے وار کہا اوس کا پتا بھی یہ سُن کے بھیک ہو رہا اور اپنے جی میں چنتا کہ کہنے لگا کہ اوس کی دسا دیکھ ایسا معلوم ہوتا ہے جو اوس کنیا سے اوس کی شادی نہ ہوگی تو یہ اپنا پران تیاگ کریگا اس سے بہتر یہ ہے کہ اوس لڑکی سے اوس کا بیاہ کر دیجئے کہ جس سے یہ بچے اتنا بچار کر پتر کے متر کو ساتھ لے اوس گاؤں

میں مہنچ لڑکی کے پتا سے جا کر کہا کہ میں تیرے پاس کچھ مانگنے آیا ہوں جو تو دیوے تو میں کہوں اُس نے کہا کہ میرے پاس وہ چیز ہوگا جو میں دوں گا کہا "تو اپنی لڑکی میرے پتر کو دے" یہ سن کر اوس نے بھی اوس کی بات پرمان کر برہمن کو بلوا دن لگن مہورت ٹھیرا کہ کہا "تم لڑکے کو لے آؤ میں بھی اپنی لڑکی کے ہاتھ پیلے کر دونگا" وہ وہاں سے اوٹھ اپنے گھر آ سامان شادی کا تیار کر بیاہنے کو گیا اور وہاں جا بیاہ کر بیٹے بہو کو لے اپنے گھر پھر آیا اور دونوں آنند سے باہم رہنے لگے پھر کتنے دنوں کے بعد اوس لڑکی کے پتا کے یہاں کچھ سبھ کرم تھا۔ وہاں سے نیوتہ یہاں بھی آیا۔ یہ استری پرش بھی تیار ہو اپنے متر کو ساتھ لے اوس نگر کو چلے جب نگر کے نکٹ پہنچے تو دیبی کا مندر نظر آیا تو اوسے ماتا یاد آئی تب اون نے یہ بات جی میں بچار کر کہا کہ بڑا است بازی اودھر میں ہوں کہ دیبی سے جھوٹ بولا اتنی بات اپنے من میں کہہ اوس دوست سے کہا کہ تم یہاں کھڑے رہو۔ میں دیبی کا درشن کر آؤں اور استری سے کہا تو بھی یہاں ٹھیر یہ کہہ مندر پاس پہنچ کنڈ میں اشنان کر دیبی کے سنمکھ جا کر ہاتھ جوڑ نمسکار کر کھڑگ اوٹھا کر گردن پر مارا کہ سر تن سے جدا ہوا بھوم میں گر پڑا غرض کتنی ایک دیر کے پیچھے اوس کے متر نے بچارا اسے گئے بڑی دیر ہوئی ہے اب تک پھرا نہیں چل کر دیکھا چاہیئے اور اوس کی استری کو کہا "تو یہاں کھڑی رہو میں اسے شتابی سے ڈھونڈ کر لے آتا ہوں" یہ کہہ کر دیبی کے مندر میں گیا دیکھتا کیا ہے کہ دھڑ سے اوس کا سر جدا پڑا ہے یہ حالت وہاں کی دیکھ اپنے من میں کہنے لگا کہ سنسار بہت کٹھن جگہ ہے کوئی یہ نہ سمجھے گا کہ اس نے اپنے ہاتھ سے سر دیبی کو چڑھایا ہے بلکہ یہ کہیں گے کہ اوس کی ناری جوات سندری ہے اوس کے لینے کے لئے مار کر یہ مکر کرتا ہے اس سے یہاں مرنا اوچت ہے پر سنسار میں بدنامی لینی خوب نہیں یہ کہ تالاب میں نہا دیبی کے سامنے آ ہاتھ جوڑ پرنام کر کہا نڈا اوٹھا ایسا گلے میں مارا کہ دھڑ سے منڈ جدا ہو گیا اور وہ استری یہاں اکیلی کھڑی کھڑی اوکتا کر راہ دیکھ دیکھ ذرا اس پر ڈھونڈتی ہوئی دیبی کے مندر میں گئی وہاں جا کر دیکھتی کیا ہے کہ دونوں موے پڑے ہیں پھر ان دونوں کو موا دیکھ اون نے اپنے جی میں بچارا کہ لوگ تو نہ جانیں گے کہ یہ آپ سے دیبی کو بل چڑھے ہیں سب کہیں گے کہ وہ بڑی نشٹ تھی بدکاری کرنے کے لئے دونوں کو مار آئی ہے اس بدنامی سے مرنا اوچت ہے یہ سوچ کنڈ میں غوطہ مار دیبی کے سنمکھ آ سر نوا، ڈنڈوت کر تلوار اوٹھا چاہتی کہ گردن پر مارے کہ دیبی نے سنگھاسن سے اوتر اوس کا ہاتھ آن پکڑا اور کہا "پتری بڑے رنگ میں تجھ سے پرسن ہوئی" تب اون نے کہا "ماتا جو مجھ سے خوش ہوئی ہے تو ان دونوں کو جی دان دے" پھر دیبی نے کہا کہ ان کے دھڑوں سے سر لگا دے اون نے مارے خوشی کے گھبراہٹ میں سر بدل کر لگا دیئے اور دیبی نے امرت لا چھڑکا یہ دونوں جی کر اوٹھ کھڑے ہوئے اور آپس میں جھگڑنے لگے یہ کہے استری میری ہے وہ کہے استری میری ہے اتنی کہہ بیتال بولا کہ "ہے راجہ بکرماجیت ان دونوں میں وہ استری کس کی ہوئی؟" راجہ نے کہا "دھرم شاستر میں اس کا پرمان لکھا ہے کہ ندیوں میں گنگا اوتم ہے اور پربتوں میں سمیر پربت اور برکشوں میں کلپ برکش انگوں میں مستک اوتم ہے اس نیاؤ سے جس کا اوتم انگ ہے اوسی کی استری ہوئی"

کاظم علی جوان و للولال

سنگھاسن بتیسی

(سنہ ۱۸۰۵ء)

(اکیسویں داستان - انرودھوتی پتلی کی زبانی)

مادھو نام ایک برہمن تھا، بڑا گنی، اُس کی تعریف نہیں ہو سکتی جو میں کروں۔ جوگی ہو کر وہ تمام پرتھی میں پھر آیا، کہیں ٹھہر کر رہنے نہ پایا۔ مادھو کام کا اوتار تھا، استری اُسے دیکھتے ہی موہت ہو جاتی تھی۔ وہ سب بدیا پڑھا تھا، اتی چتر تھا، ویسا مرت لوک میں منش کم پیدا ہوتا ہے۔ جس راجہ کی سیوا کرنے جاتا، وہاں دس دن اُس کا آدر ہوتا اور جب وہ اپنا گن پرکاش کرتا، تب وہ راجہ اُسے دیس نکالا دیتا۔ اس طرح سے دیس دیس بھٹکتا ہوا دکھ پاتا کاما نگری میں آن پہنچا۔ کام سین وہاں کا راجہ تھا، اُس کے یہاں کام کندلا ایک پاتر تھی، وہ گویا اُرسبی کا اوتار تھی، بدیا میں اتی چتر تھی۔ وہ راجہ کی سبھا میں نرت[1] کر رہی تھی۔ مادھو بھی اسی راجہ کے دوار پر جا پہنچا۔ دوار پالوں سے کہا کہ راجہ کو ہمارا سماچار کہو کہ آپ کے درشن کو ایک برہمن آیا ہے۔ ڈیوڑھی دار اُس کی بات سُنی اَن سُنی کر گئے۔ وہ ہارا ماندہ وہیں بیٹھ گیا۔ جوں جوں وہاں مردنگ کے آواز اور گانے کے شبد آتے تھے، توں توں یہ سر دھن کر کہتا تھا کہ راجہ بھی مورکھ[3] ہے اور اُس کی سبھا بھی، کہ وہ سب جو بچار نہیں کرتا۔ یہی بات سات دفعہ کہی۔ دوار پال خفا ہو کر برہمن کو دیکھ راجہ کے ڈر سے کچھ تو کہہ نہ سکے، پر راجہ کے سنمکھ جا ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوئے۔ مہاراج نے جو اُن کی طرف دیکھا، اُنھوں نے بنتی کر کہا کہ ایک برہمن بدیسی اور بل دوار پر آ بیٹھا ہے۔ سو یہ کہتا ہے کہ راجہ کی سبھا کے لوگ اتی مورکھ ہیں جو گن بچار نہیں کرتے۔ تب راجہ نے اُن دوار پالوں سے کہا "جا کر اُس سے پوچھو کہ اُن کو مورکھ تو نے کس لئے کہا؟" اُنھوں نے راجہ کی آگیا پائی، پد پرائے برہمن سے پوچھا کہ مہاراج جو نے آگیا کی ہے، ان کی گن میں کیا دوش ہے؟ وہ تم بتاؤ تو ہم تمہاری بات سچ جانیں۔ اس نے کہا کہ بارہ آدمی بجا رہے، چار چار تین طرف میں کھڑے ہوئے مردنگیں بجاتے ہیں۔ تن میں پورب مکھ والے ہیں، ایک مردنگی کا انگوٹھا نہیں ہے، اس سے سُم پر تھاپ ہلکی پڑتی ہے۔ اس سے میں نے سبھا کو کوڑھ کہا ہے، نہ مانو تو تم جا کر دیکھ لو۔ وے دوڑے ہوئے راجہ کے پاس آئے، سب باتیں سنائیں۔ راجہ نے پورب مکھ کے چاروں مردنگیوں کو بلایا۔ ایک ایک کا ہاتھ دیکھا تو اُن میں ایک کا انگوٹھا موم کا بنا ہوا تھا۔ یہ تماشا راجہ دیکھ پرسن ہوا اور اُس برہمن کو بلایا۔ وہ جا کے سنمکھ ہوا۔ راجہ نے ڈنڈوت کی اور اس نے اسیس دی۔ پھر سنشٹاچار کر گدی پر بٹھلایا، جیسے بستر پوشن[4] آپ

---

۱ گانے کا فن - ۲ ناچ - ۳ بے وقوف - ۴ لباس

پہرے تھے ویسے ہی مٹھا برہمن کو پہنائے اور کام کندلا کو بلا منگایا کہ یہ مہاگنی ہے اس کے آگے تم اپنا گن پرکاش کرو جس میں یہ پرسن ہووے۔

کام کندلا راجہ کی آگیا پائی اپنا گن ظاہر کرنے لگی سنگیت نرت کا آرنبھ کیا شیشے رنگ کے بھرے ہوئے سر پہ رکھ منہ سے موتی پروتی ہاتھوں بیٹے اچھالتی ہوئی ناچنے لگی سب ساز سُر ملائے ہوئے ناچتی تھی اس میں پھولوں اور عطر کی خوشبو پاکر ایک بھونرا اُڑ آیا اُس کی کُچ کی بھٹنی پر بیٹھا اور ڈنک مارا اوس کے بدن میں پیڑ ہوئی تب اُس نے بچارا کہ جو کچھ بھی حرکت کرتی ہوں تو تال بھنگ ہوگا اور میرے گُن کی ہنسی ہوگی اتنا جی میں سوچ بھنڈار بدیا کہ سانس روک کچ کی راہ نکالی پون لگتے ہی وہ بھونرا اُڑ گیا مادھو اس گن کو دیکھتے ہی موہت ہوا "دھن ہے تجھے اور تیرے کرتب کو" یہ کہ پرسن ہو کر بستر بھوشن جو راجہ نے دیئے تھے سب اُتار دیئے یہ دیکھ راجہ اور منتری آپس میں کہنے لگے کہ دیکھو اس برہمن نے کیا مورکھتائی کی ہے کہ بیسوا کو کپڑے اور تمام جواہر ایک دن میں بخشدیا یہ قات کا بھکاری ہمارے آگے سخاوت دکھاتا ہے راجہ نے خفا ہو برہمن سے پوچھا کہ اس کے کس گن پر ریجھا وہ میرے آگے بیان کر۔ برہمن نے کہا سن راجہ کوڑھ تو بھی ہے تری سبھا بھی کوڑھ ہے تیری سبھا میں ایسا گن پرکاش کرے اور کوئی گن کا بچار نہ کرے اس کی کچ پر بھونرا آن بیٹھا تھا سو اُس نے اپنی سانس روک کچ کی راہ نکال اُسے اُڑا دیا یہ کام دیکھ میں نے سب کچھ بخشدیا۔"

مادھو نے جب یہ بات کہی تب راجہ لجت ہو رہ گیا اور کچھ راجہ سے بن نہ آیا کہا کہ اسی وقت میرے نگر سے نکل جا جو سنوں گا کہ تو اس نگر میں ہے تو بندھوا کر دریا میں ڈلوا دونگا تب مادھو نے کہا کہ مہاراج مجھ سے ایسا کیا اپرادھ ہوا ہے جو آپ مجھے دیس نکالا دیتے ہیں؟ راجہ نے کہا کہ میں نے جو کچھ تجھے دیا تھا سو تو نے میرے ہی آگے دان کر دیا۔ کیا میرے پاس دینے کو کچھ نہ تھا جو تو نے دیا؟ یہ سن کر مادھو ملین ہو راج سبھا سے نکل باہر جا ایک درخت کے نیچے بیاکل کھڑا ہوا اپنے جی میں کہنے لگا۔ کہ ماتا بیٹے کو کھوٹے اور پتا پیٹر کو بیچے اور راجہ پرجا کو لوٹے تو کوئی سرن کس کی لے پھر کہنے لگا کہ راجہ نے تو مجھے نکالا اب میں کہاں رہوں۔ انیک انیک بھانت کی چنتا کر کام کندلا کا نام لے لے روتا تھا۔

ادھر کام کندلا بھی راجہ سے بہانہ کر بدا ہوئی اور ایک آدمی دوڑایا کہ یہ برہمن جانے نہ پاوے اُسے لے جاکر میرے مکان میں بٹھا دو وہ آدمی گیا اور برہمن کو لے جاکر اُس کے مندر میں بٹھا دیا اُدھر سے یہ بھی ترت جا پہنچی دونوں آپس میں بیٹھ کر پریم کی باتیں کرنے لگے تب اُس برہمن نے کہا کہ مجھے راجہ نے دیس سے نکالا دیا ہے اور تو نے اپنے گھر میں بلا بٹھایا جو یہ بات راجہ سُنے گا۔ تو میرا پران جائیگا تو میں دُکھ سے چھوٹوں گا پر تجھے بھی راجہ ات کشٹ دے گا اس سے ایسی باتیں کرنی اچت نہیں ہے کہ اپنی جان جائے اور جگ ہنسائی ہو پریم جو ہے سو دُکھ کی کھان ہے۔ جس نے پریم کے پھندے میں پاؤں دیا اُس نے کبھی سُکھ نہ پایا۔ یہ باتیں مادھو کی سن کر کام کندلا نے کہا۔ کہ اب تو میں اس پنتھ میں آئی جو کچھ کرے سو بھگوان۔ اتنا کہہ ساز ناچ منگوا اپنی بدیا ظاہر کرنے لگی جتنی بدیا اُسے یاد تھی۔ اتنی سب پرکاش کر چکی تب مادھو نے اُنھیں جنتروں کے ساتھ اپنا بھی گن سب کر دکھایا۔ جب رات تھوڑی سی رہ گئی۔ تب کام کندلا نے کہا کہ تم نے سرم بہت کیا چل کر آرام کیجئے۔ یہ کہہ کر مادھو کو رنگ محل میں لے گئی اور جتنی خوشی کی باتیں تھیں سب کیں جب گجر بجا دونوں کے جی میں رات کی بات یاد آئی سُدھ بُدھ جاتی رہی۔ گھبرا کر مادھو نے کہا سُن سندری رات تو آنند سے نباہی اور اب جو میں یہاں رہونگا تو دونوں کے پران جائیں گے۔ اس لئے کچھ جتن کیجیے جس میں نرودھ ندا آنند سے رہیں ہیں ایک بات جی میں بچاری ہے۔ کہ اب میں یہاں سے جاؤں اور کچھ اُپائے کر کے تجھے بھی یہاں سے لے جاؤں۔ تو اپنا جی مضبوط رکھ میں ضرور آکر تجھ سے ملوں گا۔ یہ کہہ میں تجھے دیکر جاتا ہوں۔ اتنی بات سنتے ہی وہ تو مورچھا کھا کر گر پڑی۔ اور مادھو نے اپنی راہ لی وہاں سے نکل کر بن میں پھرنے لگا مادھونالے

کلم کندلا کرنے لگا۔" ادھر اُسے بھی سکھیوں نے گلاب کا نیر چھڑک کر اُٹھایا جب کچھ ہوش آیا یہ بھی مادھو مادھو پکارنے لگی۔ کھانا پینا تیاگ کیا! بہت سکھیاں سمجھاتی تھیں۔ اُس کے جی میں ایک نہ آتی تھی۔ جوں جوں گلاب چھڑکتیں کپور چندن لالا کر لگاتی تھیں توں توں چوگنی داہ بڑھتی تھی۔ کسی طرح سے سیتل نہ ہوتی تھی۔ جب کوئی مادھو کا نام اور گُن سُناتا تھا تب اُسے ذرا آرام آتا تھا۔

اور ہر مادھو بھی بھٹک بھٹک اپنے من میں بچارنے لگا۔ کہ اب سنسار میں کون ہے جس کے کہے کٹ جائے جو ہمارا دکھ درد دور کرے اس میں یاد آیا کہ سُنتے ہیں۔ راجہ بیر بکرماجیت پر دُکھ نوارن ہے بھلا اُس کے پاس جائیے اور دیکھئے کہ لوگ سچ کہتے ہیں یا جھوٹ یہ بچار کر اُجین نگری کا رستہ لیا وہاں لوگوں سے پوچھا کہ یہاں راجہ سے بھینٹ آمنی کیونکر ہوتی ہے۔ تب اُس نگری کا ایک باسی بولا۔ کہ داوری ندی کے کنارے ایک شیو کا مٹھ ہے اس مٹھ میں راجہ شیو کے درشن کو نت آتا ہے وہاں تو جا جو تیرا منورتھ ہے سو تو کہہ تیری کامنا پوری ہوگی۔ یہ سن کر وہ وہاں گیا۔ اور اُس مٹھ کے دروازے کی چوکھٹ پر لکھا کہ میں بدیسی اَت دکھی برہ سے بیاکل تمہارے نگر میں آیا ہوں یہ سن کر راجہ پر دُکھ نوارن ہے۔ اور جو یہ دُکھ میرا جائے گا تو میں اپنے پران رکھونگا۔ نہیں تو تیسرے دن گوداوری ندی میں پران تیاگ کرونگا۔ یہ مقرر اپنے جی میں ٹھہرائی ہے۔ اس میں تم راجہ ہو۔ اور سدا گو اور برہمن کی رکشا کرتے آئے ہو۔ اور اب بھی کروگے۔ میں نے اپنے من کی بات سب پر کاش کر دی ہے ...... راجہ بیر بکرماجیت کا یہ نیم تھا۔ کہ ان دُکھی دم دُکھی برہ دُکھی درب دُکھی اور کسی طرح کا دُکھی نگر میں آتا۔ راجہ سُنکر جب تک اُس کا دُکھ نہ مٹاتا تب تک اَن جل کا کیا ذکر ہے داتن بھی نہ چبرتا تھا۔

سویرے راجہ جب مہادیو کے درشن کو گیا درشن کر پرنام کرنے لگا۔ راجہ اُونچی درشٹ کر دیکھے تو کوئی اپنے دُکھ کی اوستھا لکھ گیا ہے۔ راجہ مہادیو کو پانچ ڈنڈوت کر مندر میں آیا سب کو آگیا کی مادھو نام برہمن ہمارے نگر میں آیا ہے۔ جو کوئی اُسے ڈھونڈ لادے تو مُنہ مانگا دھن پاوے۔ یہ بات سن لوگ نگر میں ڈھونڈنے نکلے گھاٹ باٹ ٹولہ محلہ باغ باغیچہ سب نگر ڈھونڈ پھرے اور کہیں کھوج کا ٹھکانا اس کا نہ پایا۔ تب راجہ نے ایک ودنی کو بلا کر کہا کہ جو تو اُسے ڈھونڈ لاوے تو مُنہ مانگا دھن پاوے۔ اُس نے کہا مہاراج یہ کیا کٹھن بات ہے میں ابھی جاکر ڈھونڈ لاتی ہوں یہ کہہ اُس نے وہاں سے سیدھی راہ مندر کی لی جہاں اُس میں لکھا تھا جاکر مندر کے پاس بیٹھ رہی۔ شام کے وقت مادھو بھی بھٹکتا آن پہنچا۔ اُس نے اُسے دیکھا جی میں بچارا کہ ہو نہ ہو وہ برہی یہی ہے۔ اس لئے کہ مُنہ پیلا آنسو جاری تن چھین میں ملین ہو رہا ہے یہ ابچار کر رہی تھی کہ وہ برہمن وہاں آ بیٹھا تب اُس نے جا اُس کا ہاتھ پکڑ لیا کہ میں تیرے ڈھونڈنے کے لئے راجہ کی آگیا پاکر آئی ہوں تو اُٹھ میرے ساتھ جلدی چل تیرا منورتھ پورا ہو گا۔ تیرے دُکھ سے راجہ نپٹ دُکھی ہے یہ سُنتے ہی وہ اُس کے ساتھ ہو لیا۔

اُسے لئے ہوئے راجہ کے سنمکھ پہنچکر کہنے لگی مہاراجہ وہی بیوگی ہے جس کے لئے آپنے یہ دُکھ پایا ہے۔ تب راجہ نے اُس برہمن سے پوچھا کہ تو کس کے بیوگ سے ایسا بیاکل ہو رہا ہے میرے آگے کہہ۔ تب اُس نے ایک آہ بھر کر کہا مہاراج کام کندلا کے بیوگ میں میری یہ گت ہوئی ہے وہ راجہ کام سین کے پاس ہے۔ تو دھرم آتما ہے اور میں تیرے پاس آیا ہوں۔ تو مجھے اُس کو دلادے تو جی دان دے۔ یہ سُنتے ہی راجہ ہنس کر بولا کہ سن بیر وہ بیشیا ہے۔ تو تے اُس کے پریم میں سب کرم دھرم چھوڑا یہ تجھی اُچت نہیں۔ مادھو نے کہا مہاراج پریم کا پنتھ نرالا ہے۔ جو پریم کرتے ہیں سوا پنا تن من دھن دھرم کرم سب تُن کرتے ہیں پریم کی اکتھ کہانی ہے۔ مجھ سے کہی نہیں جاتی"۔ راجہ یہ باتیں سن اور اُسے اپنے ساتھ لے مندر میں گیا اور سب رانیوں کو آگیا کی کہ تم سب بناؤ سنگار کر کے آؤ رانیاں سب سنگار کر کے آئیں اور اُس بیر سے راجہ نے کہا کہ جسے تمہاری اچھا ہو اُسے اُن میں سے لو اپنے من کا دُکھ بساروا اور سکھ چین کرو۔ اُس نے جواب دیا کہ

نزدیک ۔ حفاظت ۔

مہاراج آپ کے آگے ست کہوں کہ میری آنکھوں میں وہ لبس رہی ہے اس لئے میری درشٹ میں کچھ نہیں آتا۔ اتار ترشنا[1] سوات کے بوند سے بجھتی ہے اور جل پر اُسے رُچ نہیں ہوتی۔ ایسے پریم کی ڈڑھتا بیر کی دیکھ راجا اپنے من میں بچارا کہ اسے ساتھ لے جا کر کلم کندلا ملا دوں اِس کے بنا اس کے تہرتا نہ ہوگی یہ بات راجا نے بچار بیر سے کہا جو تم اشنان پوجا کر کچھ کھا لو تب تک میں بھی اپنے لوگوں کو بُلا تمہیں ساتھ لے چلوں اور اُسے ملا دوں تم اپنے جی میں کسی بات کی چنتا نہ کرو میں نے تم سے یہ بچن کیا۔

بیر اپنے کھانے پینے میں لگا راجا نے پردھان کو آگیا کی۔ کہ میرے ڈیرے تنگ کے باہر نکلیں چار گھڑی کے بعد کاماگری کی طرف ہمارا کوچ ہے سب لوگوں کو خبر دو اس میں کتنی ایک دیر کے پیچھے راجا تیار ہو کر بیر کو ساتھ لے کر سب ڈیرے میں داخل ہُوا۔ اور جتنے راجا کے نوکر تھے سب رکاب میں حاضر تھے راجا وہاں سے کوچ در کوچ جاتا تھا کتنی ایک منزلوں کے بعد کاماگری سے دس کوس اُدھر ڈیرا کیا۔ اور اس راجا کو پتر لکھا کہ ہم اس لئے آئے ہیں کہ تمہارے یہاں جو کام کندلا پاتر ہے اُسے بھیجدو نہیں تو جدھ[2] کرنے کا ہم سے سامان کرو یہ پتر لکھ ایک دوست کے ہاتھ راجا کے پاس بھیجدیا۔ راجا کو خبر ہوئی کہ ایک دوست راجا بیر بکرماجیت کا خط لے کر آیا ہے۔ یہ سنتے ہی راجا نے اُس کو بلایا۔ اُس نے جوہار کر خط راجا کے ہاتھ دیا راجا نے اُس چٹھی کو بانچ کر کہا" اچھا کہو اپنے راجا سے چلا آویں ہم جدھ کرنے کو تیار ہیں دوست نے راجا سے کہا" مہاراج وہ لڑنے پر تیار ہے" راجا نے بھی اپنے لوگوں پر حکم دیا کہ ہمارا بھی دل تیار ہو۔

پھر راجا کے جی میں آیا کہ جس کے واسطے ہم آئے ہیں اس کی بھی پریت کی پرکشا[3] لینی چاہیئے اس طرح جی میں ٹھہرا بید کا سوانگ بن راجا کاماگری میں گیا لوگوں سے کام کندلا کا مکان پوچھ دوارے پر جا بید حکیم کرتا پکارا آواز سنتے ہی ایک داسی باہر نکل آئی پوچھا کہ تم بید ہو تو ہماری نایکہ کا علاج کرو۔ جو وہ اچھی ہوگی تو تمہیں بہت سے روپے ملیں گے یہ باتیں کر داسی اُسے اپنے ساتھ لے کر کام کندلا کے پاس گئی راجا نے دیکھا کہ نرجیو پڑی ہے راجا نے اُس کی ناڑی دیکھ کر کہا۔ کہ اس کو اور کچھ روگ نہیں پریم کا بیوگ ہے جس سے یہ گت بنی ہے یہ بات سن کندلا نے آنکھیں کھول اُس کی طرف دیکھا اور کہا" اِس کا علاج تمہارے پاس ہو تو کرو تب اُس نے کہا علاج تو تھا پر اس وقت کچھ کہنے میں نہیں آتی تب وہ بولی کہ تمہارے پاس کیا علاج تھا وہ بتاؤ۔ راجا نے کہا، مادھو نام ایک برہمن تھا اُسے ہم نے اجین نگری میں برہ بیوگی ات سوگی دیکھا سو وہ کہیا ہے مر گیا۔ یہ سنتے ہی اس نے بھی ہائے کہہ اپنا پران چھوڑ دیا جتنے داسی داسی اُس کے گھر کے تھے یہ دسا دیکھ کر سر پیٹ پیٹ کر رونے لگے تب راجا نے کہا کہ تم کچھ چنتا اپنے من میں مت کرو اسے مورچھا آگئی ہے۔ کتنی ایک دیر کے بعد شدھ آویگی تم اِس کی چوکسی کرتے رہو۔ میں اپنے گھر سے جا کر اوکھد[4] لاؤں راجا اُلٹا پھر اپنے دل میں آیا اور مادھو کے آگے اُس کے مرنے کی خبر کہی سنتے ہی ایک ہائے کے ساتھ اُس کی بھی جان نکل گئی یہ دیکھ راجا اپنے جی میں پچھتا کر بچار کرنے لگا کہ جس کے واسطے اتنی سینا ساز کر کے پربھوم میں آیا اور اُسے اس طرح سے کھو دیا یہ دو ہتیا میرے اوپر ہوئیں۔ اب اپنا بھی پران رکھنا اُچت نہیں یہ بات اپنے جی میں ٹھہرا چندن بہت سا منگوا چتا بنوا راجا جیتا جلنے کو تیار ہُوا۔ دیوان پردھان نے جتنا منع کیا نہ مانا جو چاہا کہ چتا میں بیٹھ آگ لگا دے کہ بیتال نے آ ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ راجا تو اپنا جی کیوں دیتا ہے تب اُس نے کہا کہ دو آدمی کی جان میں نے کھوئی اب میرا بھی جینا سنسار میں اُچت نہیں اِس بدنامی کے جلنے سے مرنا اُتم ہے۔ بیتال نے کہا راجا میں امرت لاتا ہوں تو دونوں کو جلائیے یہ کہہ جلد بیتال پاتال سے امرت لے آیا اُس برہمن پر چھڑکا وہ جی اُٹھا پھر لے جا کر کام کندلا پر چھڑکا وہ بھی جی اُٹھی اور مادھو بکلانے لگی راجا کی صورت دیکھ کر کہا کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو مجھ سے کہو تب راجا نے کہا ہم بیر بکرماجیت ہیں مادھو کا برہ دور کرنے کے لئے اجین نگری سے یہاں آئے ہیں تو خاطر جمع رکھ تجھے ہم مادھو سے ملا دیں گے۔ یہ سنتے ہی وہ اُٹھ راجا کے پاؤں پر گر پڑی اور کہا کہ یہ تم کیا دان دو گے

[1] پیاس۔ [2] جنگ۔ [3] امتحان۔ [4] دوام۔

اور جیسا تمھارا پرتاپ مُستی مُنی سو درشٹ میں آیا اتنی بات سُن راجہ پھر شکر میں آیا۔ دوسرے دن اتنی فوج لے کامانگری پر چڑھ دیا وہاں کے راجہ سے جُدھ کیا اُس راجہ نے ہار مانی اور قبول کیا کہ ہم کام کندلا کو بھیج دیں گے اور یہ جو ہم نے جُدھ کیا سو آپ کے درشن کے واسطے اور اس لیے کہ کسی طرح ہمارے نگر میں آپ کا چرن پڑے۔ اُسکے راجہ سے ملاقات کرکے وہ راجہ اپنے مندر میں لے گیا بہت بھینٹ آگے دہر کام کندلا کو بلا راجہ کے آگے کھڑی کی اور اس نے بھی مادھو کو بلا کام کندلا کا ہاتھ پکڑ حوالے کیا پھر وہاں سے کوچ کر اپنے نگر میں آئے مادھو کو بہت دھن دولت دے بدا کیا۔

محمد بخش مہجورؔ

نورتن

(سنہ ۱۸۱۴ء)

پھر تر چار عورتیں ایک عورت کے لاشۂ بے سر پہ اوس کے چشم و دندان و لب کا
بیان کرتی تھیں اون میں سے تین عورتوں نے اپنے کہے کا بادشاہ کو نشان دیا اور
اپنا رستہ لیا اور چوتھی عورت بادشاہ کی قید میں رہی اور ایک سال کے بعد جو
کہا تھا وہ کر دکھایا بعد دانائی سے بھاگ کر بادشاہ کو خجلت دی۔

دانایانِ جہاں اور عاقلانِ زمان بالائے کاغذِ فطرت یہ حکایت پُر فراست یوں رقم کرتے ہیں کہ ایک عورت بدخصلت کا سر کسی سردار بلجیا نے کٹوا کے کہیں پوشیدہ دفن کیا اور اوس کے دھڑ کو چار سو بازار شہر غدّار میں پھکوا دیا یہ خبر وحشت اثر جو بادشاہ عالم پناہ کو پہنچی تو کوتوال بدخصال کو ابلاغ حکم کیا کہ اس لاشۂ بے سر کے پاس جو اشخاص آکہ تیغ زبان سے گل کتریں اوسکی خبر بہر روش ہمارے قریب خبرداران صاحب رفتار کے ہاتھ جلد پہنچے۔

الحاصل ایک تجار عالی وقار کی چار بیٹیاں غیرت گلزار ایک رتھ پر سوار چار سوے بازار میں ہو کر نکلیں ایک ازدحام خاص و عام کا وہاں دیکھ کر وہ سبھی نظارہ کنان ہوئیں یہ ماجرا حیرت افزا وحشت انتہا دیکھ کر ایک جادو چشم اون میں سے بول اوٹھی کہ یہ عورت بدخصلت معلوم ہوتی ہے کہ سُرمہ خوب لگاتی ہوگی یہ کلام حیرت القیام دوسری رشک پری سن کر کہنے لگی "واقعی لیکن لالہ و بدخشان بھی افزون سے افزون کھاتی ہوگی" یہ بات عجائب نہایت منکر تیسری خجلت دہ کبک دری جواب دہ ہوئی کہ یہ تیرہ بخت مسّی بھی نہایت اچھی لگاتی ہوگی یہ سخن پرفن اوس کا گوش زد کر کے چوتھی یوں حرف زن ہوئی کہ "اس کمبخت بدبخت نے کیا اور کر نخانا" اشعار

جو ہوتی اسے عقل تو بر ملا | نہ ہوتی گرفتار رنج و بلا
دیا ہے خدا نے جنھیں کچھ شعور | نہیں اون سے ہوتا ہے ایسا قصور

یہ باتیں وہ نیک ذاتیں کہہ کر تو اپنے گھر کو روانہ ہوئیں اور یہ خبر وحشت اثر مخبران صادق اور محرران واثق کی زبانی بادشاہ کو پہنچی کہ فلانے سوداگر پری پیکر کی چار بیٹیاں، غیرت مہر درخشاں، رشک ماہ تاباں اس طرح کا کلام حیرت القیام کر گئی ہیں۔

المطلب بادشاہ عالی جاہ نے اون چاروں کو طلب فرما کر کہا کہ تم اپنے اپنے سخن کا جواب باصواب دو یعنی بے سر عورت کو تم نے کیونکر جانا کہ یہ مسّی اور سرمہ خوب لگاتی ہوگی اور پان بہت کھاتی ہوگی یہ کلام بادشاہ عالی مقام کا گوش زد کر کے ایک جادو نگاہ سحر بیان جواب دہ ہوئی کہ

اس کنیز ناچیز نے کہ شعور بے قصور نے اوس تیرہ بخت کے گزشتہ جادو میں سرمے کی سیاہی دیکھ کے دریافت کیا تھا اور دوسری رشک پری سے جو پوچھا کہ تجھ سرخ فام گل اندام نے کیونکر جانا تھا کہ وہ لالہ رو بہت پان کھاتی ہوگی وہ شعلہ خو جواب دہ ہوئی کہ پیر و مرشد اکثر جا بجا اوس کے ڈوپٹے میں پیک کی افشاں نمایاں تھی اور تیسری خجلت دہ کبک دری سے بادشاہ جمجاہ نے پوچھا کہ تو نے کس طرح دریافت کیا کہ وہ سیاہ بخت مسّی خوب لگاتی ہوگی۔ وہ جواب دہ ہوئی کہ حضرت سلامت اوس کے ڈوپٹے کے آنچل میں جو دھڑی پونچھنے کا نشان بگیان تھا اوس نے میرے گوش ہوش میں خبر دی تھی اور جو تھی فتنی سے جو پوچھا کہ تو جو کہتی تھی کہ کیا اور کر نمانا اوس کے کیا معنی ہیں سچ کہہ نہیں تو تیرا کہا تیرے آگے آئے گا، وہ زبان چالاک سفاک جوابدہ ہوئی کہ خداوند نعمت اگر اوس کو شعور و وقوف ہوتا تو اس بلا میں کیوں گرفتار ہوتی اور عقلمندی اور دانائی کے تو یہ معنی ہیں کہ کرے اور کر دکھائے یہ سخن پرُفن بادشاہ نے اوس کا شکر اون تینوں کو بعد بشاشت رخصت کیا اور اوسے ایک پختہ کوٹھری میں مقید کرکے یوں کہا کہ اے فتنی دیکھیں تو تو کیونکر کر دکھاتی ہے۔ نظم

اگر تجھ میں ہے کچھ فراست کا زور — تو پیدا یہاں کر کوئی اپنا زور
نہیں تو اسی قید میں تیری جان — کروں گا میں برباد اے بدزبان

القصہ اوس زن پرُفن کو مقید کرکے ایک کوزہ آب دو پارچہ نان اپنے ہاتھ سے دینا مقرر کیا اور گاہے یہ سخن بھی پوچھتا کہ کیوں ری فتنی جہان میں کون چیز لذیذ ہے تو وہ جگر کباب بچشم پرُآب جواب دہ ہوتی کہ خداوند نعمت یہاں بے نشان میں رنڈیوں کو مرد نہایت عزیز اور لذیذ ہیں تو بادشاہ جواب دہ ہوتے کہ اے فتنی سب رنڈیوں کو میسر ہوگا لیکن تجھ ناکام تلخ کام کو نہ بہم پہنچے گا وہ کشتۂ یاس بلا وسواس کہتی کہ آپ سچ فرماتے ہیں لیکن اللہ کو سب قدرت ہے چنانچہ کہتے ہیں میر حسن۔ شعر

نہ لاؤ کبھی یاس کی گفتگو
کہ آیا ہے قرآں میں لاتقنطوا

الغرض اوس زن پرُفن نے بہر صورت اپنے دوست نیک سیرت کو یہ پیغام بھیجا کہ اے یار جانی ولے مایۂ زندگانی یہ خانہ خراب جگر کباب اس عذاب منجلاب میں ہے کہ خدا دشمن کو بھی نصیب نہ کرے لیکن میری رہائی اس دانائی سے ہوتی ہے کہ ایک سرنگ بہر رنگ حسب دلخواہ اے رشک ماہ میرے قید خانے سے اور اپنے مکان دلستان تک طیار کر آگے میں سمجھ لوں گی۔ المطلب اوس سوداگر خوش منظر نے ایک سرنگ بیدرنگ خاطر خواہ بنوائی غرض ایک روز وہ غم اندوز اوس سرنگ کی راہ اوس رشک ماہ کے قریب جا کے یہ گفتگو درمیان لائی کہ اے یار دمساز وائے غمخوار ہمراز بالفعل تو کچھ جواہر زواہر تحفۂ نادر بادشاہ عالی جاہ کو نذر گذران اور بعد صفائی آشنائی پیدا کر کے اپنے گھر میں بطریق ضیافت طلب کر پھر جو کچھ ہونا ہوگا ظہور میں آجائے گا الغرض وہ سوداگر پری پیکر یوں ہی عمل میں لایا مگر بادشاہ جمجاہ کو اوس سوداگر خوش منظر سے اس قدر محبت بہم پہنچی کہ اگر اوس کے متاع حسن کو دیدۂ میزان میں ایک روز نہ وزن کرتا تو جنس بے قراری کا نرخ بڑھ جاتا۔ بلکہ سودا پورا ہو جاتا اور آٹھ پہر ہنگامۂ بازار شوق مافوق کا گرم رہتا۔ نظم

غرض ایسی بڑھی دونوں میں الفت — رہتے تھے ہمیشہ بے کدورت
کبھی اوس پاس وہ شہ آپ جاتا — کبھی اپنے بھی گھر اوس کو بلاتا

الحاصل اس عرصے میں اوس زن پرُفن نے اس سوداگر خوش منظر سے خفیہ خفیہ نکاح کر لیا بعد انقضائے چند ایام نیک انجام اوس زہرہ جبین لعبت چین کے ایک طفل رشک مہر درخشاں غیرت ماہ تاباں متولد ہوا لیکن وہ زن اوس طفل کو دائیوں کی آغوش میں دے کر آپ اپنے قید خانے میں آ بیٹھی اور جس وقت بادشاہ دیوان خاص میں رونق افروز ہوتے تو وہ سرنگ کی راہ گھر سے پھر اپنے خانۂ مطلب میں جا کر

زینت بخش ہوتی اس عرصے میں جب چھٹی کا وقت عشرت اندوز جلوہ گر ہوا تو وہ ماہ پیکر اوس سوداگر سے کہنے لگی کہ آج تو بادشاہ عالی جاہ کو مہمان خانے میں بہ ائے ضیافت طلب کرو اور میرے ہاتھ سے لڑکے کے پیدا ہونے کی نذر دلوا دیکھو تو بلبل فطرت سے کیسا طفل حرفت پیدا ہوتا ہے۔ الغرض اوس سوداگر خوش منظر نے بادشاہ عالی جاہ کو اپنے گھر میں بلوا کے اوس زن پرفن کے ہاتھ سے نذر حرفت دلوائی اوس طفل کو بھی آغوش بادشاہ میں دیا اور یہ سخن زبان پر لایا کہ خداوند نعمت اس کنیز ناچیز کی نذر قبول بے عذر دلی ہو لیکن بادشاہ اوس عورت پر فطرت کو دیکھ کر نہایت متعجب ہو کر گرداب حیرت و سکوت میں مستغرق ہو گیا بعد شادری بحر حیرانی ساحل گفتگو سے ہمکنار ہو کے یہ دل میں کہنے لگا کہ یہ تو وہی عورت پر فطرت صاف صاف معلوم ہوتی ہے کہ جس کو میں نے جید مقید کیا ہے۔ شعر

یہ نہیں معلوم کیا اسرار ہے

یا مری ہی عقل کج رفتار ہے

پھر سوچ کر کہنے لگا کہ میں نے تو اوس کو ایسی جا مقید کیا ہے کہ وہاں فرشتے کو بھی دخل نہیں اور اس کے سوا میں وہیں قید خانے میں اوس کو مقید چھوڑ آیا ہوں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس عورت ماہ طلعت کی صورت اوس کی صورت سے نہایت ہم شباہت ہے لیکن یہ بات عجائبات بادشاہ کے دل میں گرہ ہوئی اس خیال کثیر الاختلال میں بادشاہ وہاں سے اوٹھ کر اپنے مکان دلستان میں رونق افروز ہوا اور وہ زن پرفن بھی سرنگ کی راہ سے جھٹ پٹ اپنے قید خانے میں آ بیٹھی اور بادشاہ نے اوس کو جو اسی قید خانے میں دیکھا تو وہیں بیٹھا پایا الغرض وہ زن پرفن بھی فن کرتی رہی کہ جب بادشاہ سوداگر کے پاس جاتا تو آپ بھی سرنگ کی راہ گمراہ سے جا کر مقابلہ کرتی اور جب گھر میں وہ تشریف فرما ہوتا تو اپنے قید خانے میں آ بیٹھتی لیکن بادشاہ اس احوال پر ملال پر نہایت حیران و ششدر رہتا پر سوداگر آئینہ رو کی آشنائی بصفائی تھی جاتی تھی کبھی دل پر غبار نہ آتا تھا۔

الغرض ایک روز اوس زن پرفن نے اپنے سوداگر سے کہا اے عزیز باتمیز آج تو بادشاہ جمجاہ کے پاس بلا وسواس جا کر یہ بات کہنا کہ میری ہمشیر زادی کی شادی کد خدائی کل کی تاریخ مقرر ہے لیکن وہ مکان رشک گلستان اس شہر مینو چہر سے دس منزل کا ہے اور میری طلب کو وہاں سے قاصد مہینے کے قریب ہوا ہے کہ روانہ ہوا مگر نامساعدی وقت سے اوس کمبخت کو ناگاہ راہ میں اس قدر بیماری ہوئی کہ وہ یہاں تک آنے کو دق رہا بارے اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے جو شفا پائی تو مبے ہراس آج میرے پاس آیا ہے سو میں اب اس بات سے نہایت حیران و پریشان ہوں کہ کل کا روز دل افروز شادی کا معین ہے اور مجھ کو خبر فرحت اثر آج پہنچی۔ شعر

کیا کروں آہ سخت حیران ہوں

گر نہ واں جاؤں تو پشیمان ہوں

سوائے خداوند نعمت نیر حشمت میری عروس تجویز کو حنائے اجابت سے یوں رنگین سمجھیے کہ حضور پر نور مجھ جو سانڈنی سو کوس کے دھاوے کی ہے، عنایت و کرامت فرمایئے تو میں وہاں ایک روز میں پہنچ کر مہمانوں کے ہم پہلو ہوں اور اگر خدانخواستہ میرا وہاں جانا نہ ہوگا تو ہمارا یگانگی ہاتھ سے چھٹ جائے گی اے عزیز باتمیز اگر تجھ کو وہ سانڈنی دیگا تو پھر میں اپنے توسن طبع کی چالاکی تجھ کو دکھا دوں گی۔"

المطلب وہ سوداگر عیار حسب ایمائے زن پرفن بادشاہ کے پاس جا کر وہ قصہ پر فریب اور افسانۂ عجیب بیان کرنے لگا بادشاہ نے اوسکی گفتگو پر پاس و حسرت استماع کر کے داروغۂ اشتر خانہ کو طلب فرما کے ارشاد کیا کہ ہماری وہ سانڈنی لیلی نژاد کہ جو سو کوس تک جانے میں پہلو تہی نہیں کرتی اوسکی مہار سوداگر مجنوں شعار کے ہاتھ میں حوالہ کر دے بموجب ارشاد عالی وہ داروغہ ذہن سے خالی وہی سانڈنی جو اوس سوداگر فتنہ گر کو دینے لگا تو اوس کا ساربان پیر ناتوان بصد آہ و فغان کہنے لگا کہ اے داروغہ اگر یہ سانڈنی صبا رفتار رشک بہار کچھ جانے

میں گرفتار ہو جائے گی تو پھر تجھ کو خار حسرت کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا کیونکہ ایسی سانڈنی رشک پری باغ جہان میں دوسری کوئی نہیں ہے غرض وہ داروغہ یہ مصلحت نیک دل میں سمجھ کر کہنے لگا سچ ہے سخن بزرگان راست ست الغرض داروغہ شترخانہ نے اسی کوس کی منزل کی سانڈنی اوس سوداگر بے خبر کو دی اوس سانڈنی خجلت وہ کبک دری پر وہ سوداگر مع زن فتنہ گر اور پسر رشک قمر سوار ہو کر فرار ہو گیا اس عرصے میں بادشاہ عالی جاہ کو دریافت ہوا کہ وہ سوداگر فتنہ گر زن فتنہ افروز سے شطرنج دغا کھیل کر کرامات عیاری سے میری بازی مات کر گیا اور مہرہ ہوش کو چار خانہ ششدر میں زچ کر گیا۔ مثنوی۔

کوئی ایسی نہیں اب سوجھتی چال — جو اوس کا توڑ دوں فرزین بند فی الحال
نہ کوئی گھوڑا ایسا ہے فیل — جو اوس کو مار لوں جا کر بہ تعجیل
پیادہ ہے نہ ایسا کوئی چالاک — کہ اوس تک رخ کرے اپنا وہ سفاک

الغرض وہ شہ شاطر زمان اوس آن داروغہ شترخانہ کو طلب فرما کے کہنے لگا کہ کوئی اور بھی سانڈنی رشک پری ہمارے شترخانہ میں سو کوس کے دھاوے کی ہو تو جلد لا ہم تجھ کو انعام بے بہا دینگے یہ کلام بادشاہ عالی مقام کا سنکر وہ کہنے لگا کہ سچ ہے بڑے بوڑھوں کا کہنا ماننا مصلحت نیک ہے وقت پر کام آرہتا ہے آخر اوس کی بات کام آئی اگر آج یہ سانڈنی اوس کے حوالے کر دی ہوتی تو نہایت پشیمانی کھینچنی پڑتی۔

المدعا وہ سانڈنی چالاک بادشاہ غمناک کے قریب لا کر حاضر کی وہ بادشاہ جمجاہ اوس پر سوار ہو کر مثل صبا فر فر روانہ ہوا اس عرصے میں جب بادشاہ عالی جاہ کی سانڈنی سوداگر اور زن پر فریب کے قریب پہنچی تو ایک بار بادشاہ عالی مقدار نے للکار کر کہا کہ اے زن پرفن اب تو میرے ہاتھ سے جانبر کہاں ہو سکتی ہے یہ سخن دلشکن وہ زن پرفن سن کے کہنے لگی خدا خیر کرے ہماری سانڈنی پیدغا ہے مگر کیا مضائقہ ہم اپنے طعام فطرت کا بادشاہ کو مزا چکھا دیں گے الغرض جب اوس سوداگر اور زن فتنہ گر کی سانڈنی اسی کوس کی منزل پر پہنچی تو یکایک اوس کی طاقت نے پہلو تہی کر کے اوس صحرائے ہولناک میں مقام کیا وہ زن مکار اور سوداگر عیار مع پسر رشک قمر اوس سانڈنی کی نشست پر سے اوتر کے سامنے ایک باغ پر فراغ نما شمل نسیم سبک رو اوس کی طرف روانہ ہو کر دونوں اوس باغ کے دروازے کے ایک ایک پٹ کی اوٹ میں بتدبیر دانائی جھٹ پٹ روپوش ہو گئے۔ اس میں بادشاہ جمجاہ نے جو آکر ملاحظہ فرمایا کہ وہ دونوں ناپاک بیباک اوس باغ میں پوشیدہ ہیں اپنی سانڈنی پر سے اوتر کر باغ کے اندر بے تحاشا یہ کہتا چلا۔ شعر

اب کہاں ہاتھ سے جاتی ہے مردہ ناپاک — ایک ہی ہاتھ میں تلوار کے کرتا ہوں ہلاک

یہ کہتے کہتے وہ بادشاہ تو باغ کے اندر مکانات عجائبات میں ڈھونڈھنے لگا اور یہ دونوں پرفن پٹوں کی اوٹ سے جھٹ پٹ نکل کر بادشاہ کی سانڈنی پر سوار ہو کر وہ زن مکار پکار پکار کر یوں کہنے لگی کہ اے بادشاہ غفلت پناہ کیا اور کر دکھایا" اسے کہتے ہیں۔ مثنوی۔

یہ کہہ کر وہاں سے وہ زن نابکار — بہ شکل ہوا ہو گئی جب فرار
تو دست الم مل کے وہ بادشاہ — لگا کہنے میں بے اجل مر گیا
مرے پاؤں میں اب یہ طاقت کہاں — جو گھر تک پہنچ جاؤں بے خوف جان
غرض بادشہ تو روتا رہا — مگر ہو گئی وہ وہاں سے ہوا
جو مجبور ہوتی نہ وہ باشعور — تو اوس وقت میں قتل ہوتی ضرور

رجب علی بیگ سرور

فسانۂ عجائب

(۱۸۲۴ء)

حکایت پسر مجسٹن بیٹے کا پیدا ہونا سفر کی کیفیت جہاز کی تباہی شہزادی کا ملنا، پھر مفارقت مجسٹن کا ساتھ جانا۔

ایک شخص تھا مجسٹن نام نہایت اہلِ دول، مرفہ حال، صاحب علم و فضل، جامع ہر کمال طبیب اور ادیب بے بدل، سخن سنج، لطیفہ گو بر محل کمالات میں یگانۂ روزگار تجارت میں نامور ہر دیار۔ سو سو جہاز ایک بار تجارت کو جاتا تھا۔ نصیب ایسا تھا مٹی کو چھوتا سونا ہوتا تھا۔ کسی طرح کا حاجت مند مگر فرزند ارجمند نہ تھا شب و روز اسی کا خیال تھا۔ عام فرحت میں یہ ملال تھا۔ خوش قسمتوں کی دعا جلد قبول ہوتی ہے، تمنائے دل حصول ہوتی ہے۔ پچھتر برس کے سن میں اللہ نے بیٹا عنایت کیا حسب دلخواہ۔ صورت میں غیرت ماہ۔ بہت شادواں سرگرم پرورش تھا۔ جب بارہ برس کا ہوا بسبب طبع رسا و تعلیم استادانِ باذکا جمیع علوم اور فنون میں کامل ہوا درس دینے لگا۔ مطب کرنے لگا۔ چودھویں سال باپ سے سفر کی اجازت چاہی کہ تجارت میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہ جائے مجسٹن نے کہا! پنا بھی یہی قصد تھا مگر چندے توقف شرط ہے اس نے عرض کی حضور عمر طبعی کو پہنچے۔ مسن ہیں۔ فدوی کے سیاحت کے دن ہیں۔ چاہتا ہوں کہ آپ کے بقیہ حیات سفر کو جاؤں، جودت طبع دکھاؤں۔ آخر مجسٹن نے دس بارہ جہاز پر متاع و مال پندرہ بیس رفیق قدیم دیانت دار امانت شعار ہمراہ کر رخصت کیا۔ جہاز ایک سمت روانہ ہوئے دو مہینے کے بعد ہوائے جور گردوں سے جہاز تباہ ہو گئے۔ مجسٹن کے بیٹے کا بھی جہاز ڈوبا یاران ہمراہی عالم بقا کو راہی ہوئے۔ یہ ایک تختے پر ڈوبتا اچھلتا بہ چلا۔ حیات مستعار باقی تھی ساتویں دن تختہ کنارے پر لگا۔ اس کو غش سے جو افاقہ ہوا تختے سے اترا اور گھانس کی رسی بنا وہ تختہ پتھر سے اٹکا دیا۔ پھر بہ تلاش آب و دانہ روانہ ہوا۔ چند قدم بڑھا تھا کہ شہر نمودار ہوا آہستہ آہستہ بیٹھتا اٹھتا شہر میں داخل ہوا۔ وہاں عجب سانحہ طرفہ ماجرا نظر آیا۔ دکان ہر ایک کھلی اشرفی روپیہ کا ڈھیر اسباب سب طرح کا موجود، مگر آدمی کا پتہ مفقود اس قرینے سے ثابت ہوا کہ عرصے سے یہ بازار و جس شہر سے خالی ہے۔ شہر کا وارث بے زوالی ہے۔ پھرتا پھرتا قلعہ میں آیا دیکھا باغ سرسبز پر میوہ، بیچ میں بنگلہ، نہ بغت کے نفیس پردے پڑے۔ پردہ اٹھا بنگلے میں آیا۔ پلنگ جواہر نگار گسترہ، اس پر کوئی بشکل مردہ، ڈوپٹہ تانے، نہ کوئی پائنتی نہ سرہانے، پڑا ہے۔ اس نے دوپٹہ سرکایا۔ عورت نے چونک کر سر اٹھایا۔ اس کی صورت دیکھ کر کہا اے عزیز اپنی جوانی پر رحم کر یہ مکان نہیں سیل فنا ہے، تو تازہ آشنا ہے۔ اس لئے درگذر دگرنہ رفت

کا مبتلا ہوگا۔ خدا جانے ایک دم میں کیا ہوگا اس نے کہا ایسا ماجرا کیا ہے۔ بیان تو کر عورت نے کہا تو پہلے اپنے آنے کا حال سنا کیونکر آ پھنسا۔ اُس نے کہا سات دن سے بھوکا پیاسا ہوں جو کچھ کھاؤں تو داستان پریشان سناؤں۔ عورت نے بولی مدت کے بعد کھانے کا نام تیرے منہ سے سنا ہے۔ سو کھانا یہاں کہاں بجز غم کھانے اور پانی سوا اشک بہانے کے، آنسو پینے کا نام ہے۔ اس سے میں جیتی ہوں، اور کھانے کی قسم ہے قسم تک نہیں کھاتی ہوں۔ متحیر ہوں کیونکر جیتی ہوں۔ مگر تنہائی میں ہاں خوف کھا کے روز دن بھرتی ہوں۔ ہر شب کہ شب اولین گور ہے جانکنی رہتی ہے۔ سخت جانی کی بدولت نہیں مرتی ہوں۔

تو اس باغ میں جا اور جس میوے پر رغبت ہو کھا۔ حبشی کے بیٹے نے جا کے میوہ کھایا۔ نہر سے پانی پیا گو نہ رنج فاقہ کشی سے افاقہ ہوا۔ پھر عورت کے پاس آ کے حسب و نسب اپنا اور باعث سفر اور جہاز کی تباہی مفصل سرگزشت سنائی۔ پھر اس کا ماجرا پوچھا وہ بولی اے شخص اس شہر بے چراغ کی میں شہزادی ہوں۔ باپ میرا والی ملک تھا مجھ کو سوائے سیر و شکار کے کسی امر سے سروکار نہ تھا۔ ایک روز لب دریا مصروف تماشا بیٹھی تھی دفعتہً ایک سانپ نمودار ہوا اور میری طرف بڑھا۔ میں نے تیر مارا معلوم نہیں لگا یا خطا کر گیا۔ پھر جو دیکھا تو اژدہائے مہیب بشکل عجیب پھنکارتا ہے۔ میں تو گھوڑے پر چڑھ کر بھاگی۔ جو جو ہمراہ رکاب تھے وہ طعمۂ دہن مار خونخوار ہوئے۔ کہاں تک بیان کروں۔ ساکنان شہر میں بادشاہ انسان سے تا حیوان کوئی نہ بچا۔ فقط میں سخت جان باقی ہوں اور یہ صحبت ہے کہ قریب شام وہ مار خون آشام آ کر اس بنگلے کے نیچے بیٹھتا ہے دو گھڑی کے بعد غائب ہو جاتا ہے مجھ پر جب بھوک پیاس کا غلبہ ہوتا ہے اسی باغ سے میوہ کھا پانی پی لیتی ہوں۔ اس خرابی سے جیتی ہوں کوئی غمخوار بجز ذات پروردگار نہ تھا۔ آج تجھے دیکھا خوف خدا آیا مطلع کر دیا پسر حبشی نے کہا خاطر پریشان جمع رکھ۔ اگر فضل الٰہی شریک حال ہے تو اس آفت سے جلد نجات ہو جائے گی۔ یہ کہہ کر جہاں سانپ کے بیٹھنے کا نشان تھا، وہاں گڑھا کھودا۔ قلعے سے بارود لا کر اس میں بچھائی اور دور تک نقب سی بنائی۔ پھر گھانس بھری اس پر بچھائی۔ شہزادی نے کہا اب وہ آتا ہی ہوگا۔ یہ سُن کہ سر نقب جا پوشیدہ ہو کر بیٹھ رہا کہ دفعتہً وہ افعی پُر زہر خدا کا قہر آیا اور اپنی جگہ پر اس سبز قدم نے فرش زمردیں پایا۔ بہت خوش ہو کر بیٹھا۔ یہ تو تاک میں تھا پتھر سے آگ نکال اُس نقب میں ڈال دی۔ فوراً ایک دھماکا پیدا ہوا۔ وہ ٹکڑا زمین کا مع سانپ آسمان پر پہنچا۔ دونوں نے شکر کا سجدہ بدرگاہ دافع البلیات کیا باہم بے اندیشہ خرم رہنے لگے سات برس تک دونوں ساتھ رہے اس عرصے میں دو لڑکے بھی پیدا ہوئے ایک دن رنج تنہائی کی شہزادی نے شکایت کی کہ اکیلے طبیعت نہیں لگتی۔

کوئی ترکیب ایسی نکالو کہ پھر یہ شہر آباد ہو خاطر غمگین شاد ہو وہ بولا کہ اگر وطن جاؤں اور حبشیوں کو یہاں لاؤں تو یہ بستی بسے عورت نے کہا اکیلی میں کیونکر بسر کروں گی میں بھی ساتھ چلوں گی آخر ش ایک ایک لڑکا دونوں گود میں لے کے چل نکلے قضارا وہاں پہنچے جہاں تختہ بندھا تھا ذہن میں آیا اسی پہ سوار ہو کر اور کہیں تو جا نکلو گے یہ سوچ کر دونوں سوار ہوئے وہ تختہ کھولنے لگا شہزادی بولی مال و اسباب تو اس قدر ہے کہ بیان قاصر ہے مگر ایک ناریل اکسیر سے بھرا ہے دولت وانتہا ہے جو تو اجازت دے تو اُسے لے آؤں۔ مصرع

بود زود طمع ویدہ ہوشمند

حبشی کے بیٹے نے کہا اچھا وہ تختہ کچھ کھلا کچھ بندھا یونہی رہا شہزادی لڑکا لیے اتری اُس کے اترتے ہی ایسی تند ہوا چلی کہ رسی تکان سے ٹوٹ گئی تختہ بہہ چلا ہر چند اس نے ہاتھ پاؤں مارے وہ ساحل مطلب سے کنارے ہوا کنارے پر شہزادی بحال خراب دریا میں وہ بادل کباب یہ نکلا دل سے کہتا تھا دیکھیے مرضی ناخدا نے کشتی بادبان شکستہ کیا ہے یہ حبو نکا ہوائے قوم عاد کا ہے اس سوچ میں تھا کہ ایک جہاز نمودار ہوا اہل جہاز نے دیکھا تختے پہ کوئی جوان گود میں لڑکا نادان لئے بہا جاتا ہے رحم کھا نپسوئی کو دوڑا جہاز پر لیا اتفاق زمانہ مالک جہاز حبشی کا دوست و مسافر تھا اس کو پہچانا بہت تعظیم و تکریم سے پیش آیا دس روز میں جہاز کلکتے میں داخل ہوا جہاز کا حاکم حبشی کی ملاقات کو آیا بچھڑے بیٹے کو باپ

سے ملا پایا جس دن سے جہاز کی تباہی مجبسٹن نے سن پائی تھی غریق لجۂ غم تھا بارے بیٹے کو دیکھ کر سجدہ بدرگاہ باری کیا پر تا گھاتے میں ملا
اور کلمات شکریہ اُس سے کرنے لگا اُس نے کہا بندہ پرور یہ ہے دنیا اسی کا نام ہے جس کا کام جس سے نکلے وہ فخر و سعادت سمجھے بعد چند روز
مجبسٹن نے بیٹے سے روئداد سفر پوچھی اُس نے ابتدا سے انتہا تک سرگذشت سب بیان کی یہ سُنکر سمجھا مشکل پیچ پڑا مگر سہل ہوا یہ جواب
الخیر فی ما وقع خیریت اسی میں تھی جو ہُوا۔

مصرعہ

بر سر فرزند آدم ہرچہ آید بگذرد

بیٹے نے کہا مناسب یہ ہے کہ اب جلد چلئے ایسا ملک مالامال یہ دولت لازوال ہاتھ سے نہ دیجئے مجبسٹن نے کہا خیر ہے یہ بھی ایک فسانہ
تھا جو میں نے سُنا اور خواب تھا جو تو نے دیکھا۔ لا اعلم

ایام وصال و صحبت سیم تناں
در عالم خواب احتلام شد و رفت

اُس نے کہا آپ سا عقلمند ایسا کلمہ فرمائے تو نہایت بعید ہے دنیا میں تین مصر کے ہیں زر، زمین، زن یہ سب سامان جمع ہیں اگر آپ نہ جائیں گے
فدوی تنہا جائے گا۔ مجبسٹن نے کہا افسوس ہم تجھے دانا جانتے تھے الا ہماری نادانی تھی حمق کی مقتضی تمہاری جوانی تھی اے بھائی کوئی نادان سے
نادان عورت کی بات کا دھیان نہیں کرتا یہ باتیں جب تک تھیں جو تم اور وہ باہم تھے وہ مونس تھی تم ہمدم تھے اب خیریت ہے۔ سعدی:۔

زن دوست بود ولے زمانے　　تا جز تو نیافت مہربانے
چوں در بر دیگرے نشیند　　خواہد کہ ترا دگر نہ بیند

مصرعہ

اسپ و زن و شمشیر وفادار کہ دید

ہرچند اُس نے مغز خالی کیا یہ مقدمہ اُس پر حالی کیا وہ بے مغز نہ سمجھا۔

مصحفی

مصحفیؔ سود نصیحت کا نہیں عاشق کو　　میں نہ سمجھوں تو بھلا کیا کوئی سمجھائے مجھے

ناچار مجبسٹن نے کہا تم جب تک ذلت نہ اُٹھاؤ گے اور ہمیں خراب نہ کرو گے اس حرکت بیجا سے باز نہ آؤ گے نہ چین لوگے اُسی دن سامان
سفر درست کیا بہت سے جہاز مع اسباب اور چند مشیر خوش تدبیر ہمراہ لے روانہ ہُوا چند روز میں وہ جزیرہ ملا جہازوں کو لنگر ہُوا مجبسٹن کا بیٹا
اُترا مگر جہاں ویرانہ بوم و غول کا آشیانہ تھا وہاں بستی دیکھی اور جس جگہ بیشہ تھا اُسے ہموار پایا بلندی نظر آئی نہ پستی دیکھی آدمی ہر سمت سرگرم کار و
شہر پناہ تیار اُسے تعجب ہُوا سمجھا کہ میں بھول گیا کسی سے پوچھا اس شہر کا نام کیا ہے حالی ملک کونسا ہے وہ بولا مدت سے یہ ملک بسبب آفت
آسمانی اُجاڑ ہو گیا تھا رعایا برایا بلکہ بادشاہ بھی نہ بچا تھا فقط بادشاہ کی بیٹی باقی تھی اب برس دن سے اُس نے شہر کیا ہے شہر از سر نو آباد ہُوا
نیا طرز ایجاد ہُوا یہاں مفسد ہے نہ ڈنڈی ہے نام اس کا شہزادی فنڈی ہے مجبسٹن نے یہ ماجرا سُنکر بیٹے سے کہا خوش بہت ہوتے ہو گے
اسی سے پھر چلو اُس نے کہا اتنی صعوبت سفر کی اُٹھائی اُس کی صورت بھی نظر نہ آئی دو باتیں کر لوں تو پھر چلوں مجبسٹن نے کہا مصیبت کچھ
نہ تھی جو بات کرنے میں، لہذا اُٹھے گی وہ کب ماننا تھا انھیں لوگوں سے پھر پوچھا شہزادی کبھی سوار بھی ہوتی ہے وہ بولے روز خوشگہ سواری
کا وقت دریافت کر لڑکے کا ہاتھ پکڑ کے سر راہ کھڑا ہوا کہ شہزادی شبدیز کو مہمیز کرتی آ پہنچی یہ پکارا ہم نے ایفائے وعدہ کیا حاضر ہوئے اور
لڑکا بھی فضل الٰہی سے سلامت موجود ہے کیا ارشاد ہوتا ہے اُس نے بیگانہ وار جیسے کسی اجنبی کو کوئی دیکھتا ہے ملاحظہ کیا مگر جواب کچھ نہ دیا چلی گئی

یہ خفیف گھر پھرا مجسٹن نے حال پوچھا بولا ملاقات نہ ہوئی کل پھر جاؤں گا اُس نے کہا صبح کا جانا روز الم شام غم دکھائے گا بہت پچھتائے گا اُس نے دوسرے روز بیٹے کو سکھایا کہ جب سواری قریب آئے گھوڑے سے لپٹ جانا اور یہ زبان پہ لانا کہ دُنیا کا لہو سفید ہو گیا مہر مادری سے محبت پدری میں لطف زیادہ پایا کہ ہمیں ساتھ بآرام تمام لئے پھرتا ہے تم بات بھی نہیں کرتی ہو بلکہ پہچانتی نہیں جب سواری قریب آئی یہ تو بہت جلا تھا اور سمجھ چکا تھا کہ کھیل تو بگڑ گیا کہا شہزادی باگ کو روکو وہ خود تو رکی تھی باگ بھی رُک گئی پھر مجسٹن بولا ۔

مؤلف

یا وہ ایام کہ نفرت تھی زمانے سے تجھے — ہوتی وحشت تھی بہت غیر کے آنے سے تجھے
خوف آتا تھا کہیں آنے سے جانے سے تجھے — مکر تھا یاد خبر تھی نہ بہانے سے تجھے
بے دھڑک غیر سے باتوں کا کبھی طور نہ تھا — ہمیں ہم تھے تری صحبت میں کوئی اور نہ تھا
کبھی چوٹی کی خبر تھی نہ تھا کنگھی کا خیال — بارہا اُلجھے سے رہتے تھے ترے سر کے بال
پان کے لاکھے سے اور مسی سے ہوتا تھا ملال — مجھ کو افسوس یہ آتا ہے کہ گذرا نہیں سال
ایسی کیا بات ترے دل میں سمائی ظالم — دفعتہ سب وہ روش و رسم بھلائی ظالم
تھی لگاوٹ ہی تجھے یاد نہ خلطا سب سے — گرمجوشی کا بھلا کب تھا یہ لپکا سب سے
بیٹھنا کونے میں ہر دم تجھے تنہا سب سے — تجھ کو لگ چلنے کبھی ہم نے نہ دیکھا سب سے
اب تو ٹٹی میں کیا چھید غضب تو نے کیا — کھل گیا سب پہ ترا بھید غضب تو نے کیا
شکر صد شکر ہوئی جلد رہائی تجھ سے — اب تو تا حشر مکدر ہے صفائی تجھ سے
وضع اپنی نہیں کیا کیجئے برائی تجھ سے — نہ ملیں پر جو کہے ساری خدائی تجھ سے
بخدا ملنے سے ہم ہاتھ ترے دھو بیٹھے — خوش رہو تم کہ تمہیں کھول کے دل رو بیٹھے
اب قسم کھاتا ہوں تو دل نہ لگاؤں گا کبھی — ذلت و رنج نہ اس طرح اُٹھاؤں گا کبھی
گر طرحدار بھی اس دہر میں پاؤں گا کبھی — ربط تو کیا ہے نہیں پاس بٹھاؤں گا کبھی
موسم اب دل کے لگانے ہی کا جاتا نہ رہا — ربط کیا خاک کریں ہم وہ زمانا نہ رہا
ہر زباں یاروں کے یہ ذکر رہے گا ہر بار — گو کہ عاشق تھا مگر تھا یہ بڑا غیرت دار
دیکھ بد وضع کیا دیکھئے ایسا انکار — سر ٹپک مر گئے سب پہ نہ ملا وہ زنہار

کرے معشوق کسی سے تو دغا ایسی کرے
پچ کرے بات کی عاشق تو بھلا ایسی کرے

یہ سُن کر وہ شرمندہ ہوئی پھر لڑکا گھوڑے سے لپٹا بیچارہ نادان باتوں کا سود و زیاں کچھ نہ سمجھا جو کچھ باپ نے سکھایا تھا کہنے لگا جب کہہ چکا شہزادی نے تیغچہ قبور سے کھینچ لڑکے پر جھونک دیا وہ وہم سے گر پڑا دایہ اجل نے کنار عاطفت میں اُٹھا لیا اہل قبور سے ملا دیا پھر باگ اُٹھا چل نکلی مجسٹن نے بیٹے کے بہت خاک اُڑائی بیٹے کی لاش باپ کو دکھائی اُس نے کہا کیوں جو ہم نے کہا تھا وہی آگے آیا وہ بدنصیب بولا صبح انتقام ہے جو ہونا ہے ہو جائے گا مجسٹن نے کہا ترا اپنا بھی حال ایسا ہی بنائے گا دم سحر جب وہ چلا مجسٹن کا جی نہ رہ سکا ساتھ ہو لیا جس دم شہزادی کی سواری پاس آئی باگ پکڑ لی ہنوز زبان نہ ہلائی تھی شہزادی نے کہا اے مجسٹن ہم نے سُنا تھا کہ تو مرد جہاندیدہ و سرد و گرم روزگار

چشیدہ و تجربہ رسیدہ ہے مگر افسوس باپ ریش فش تو نے سنا نہیں ۔ ؎ اعلم

زحادثات جہاں بس ہمیں پسند آمد
کہ خوب و زشت و بد و نیک درگذر دیدیم

اس پیرانہ سالی میں تجھ پہ ہزار سانحے گذرے ہوں گے کچھ الم و رنج کا مزا یا فرحت و خوشی کا نشہ باقی ہے اے نادان دنیا میں کس بات کو یاد کیجئے کس کا غم کس سے خاطر شاد کیجئے اگر عقل رسا یا کچھ فہم و ذکا ہو تو دنیا میں کافی ہے یہ بات گزشتہ را صلوات۔

مصحفی

اے مصحفی میں رو ؤں کیا پچھلی صحبتوں کو
بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

یہ کہہ کر گھوڑا پچکارا کہ پھر سلسلہ جنبائی اس امر بے معنی کی موجب مضرت جاننا مجبشن نے بیٹے کو سلام کیا اور نہ کچھ کلام کیا وہ بھی نطفہ ضعیف کا پیدا بوڑھے باپ کا بیٹا تھا محجوب وطن پھر ایسے جی باپ سے آنکھ چار نہ کی۔

الف لیلہ

سوتے جاگتے کی حکایت

الف لیلہ کی داستانیں کئی زبانوں میں ترجمہ ہوئیں اور کئی بار اُردو میں بھی، مختلف اہلِ قلم نے، زبان کے رد و بدل سے پیش کیں۔
پیشِ نظر داستان کی زبان ۱۸۴۴ء کی نہیں، بعد کی معلوم ہوتی ہے۔ ۱۸۴۴ء میں اسے حسن علی خاں کشمیری، جعفر علی شیداؔ اور دین خاں
نے پیش کیا تھا۔

خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں ایک سوداگر نہایت امیر و کبیر تھا۔ اور اس کے ہاں ایک ہی لڑکا تھا جس کا نام ابوالحسن تھا۔ اس سوداگر کے مرنے کے بعد ابوالحسن اس کی تمام املاک کا وارث ہوا۔ مال و دولت لا انتہا تھی۔ جس کو اس نے نہایت بیدردی سے صرف کیا اور اپنے دوستوں کو بھی اس قدر دیا کہ وہ سب مال دار ہو گئے۔ پھر اس تمام روپیہ کو اس نے دو حصّوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصّے سے اس قدر جائداد خریدی۔ کہ جس کی آمدنی اس کے تمام اخراجات کے لئے کفالت کرتی تھی۔ اور دوسرے نقد حصّہ میں سے خرچ کیا کرتا بہت سے دوستوں کا مجمع اس کے اردگرد رہتا۔ دن رات ناچ رنگ مجرے اور شراب خوری اور دیگر عیش و عشرت میں گذارتا یہاں تک کہ وہ تمام روپیہ صرف ہو گیا۔ اور ابوالحسن مفلس بن گیا۔ اس کی مفلسی دیکھ کر اس کے دوستوں نے بھی اس کے گھر آنا جانا بند کر دیا یہاں تک کہ اگر وہ راہ میں مل جاتا۔ تو وہ اس سے منھ پھیر کر نکل جاتے ابوالحسن دوستوں کی بے مروّتی اور بےحمیتی دیکھ کر سخت حیران ہوتا اور اپنے دل میں افسوس کرتا کہ جن لوگوں کے پیچھے میں مفلس و قلاش ہو گیا، ان کے اخلاق و سلوک کا یہ عالم ہے۔

ایک دن ابوالحسن اسی فکر میں تھا کہ اس کی والدہ نے اسے پریشان خاطر دیکھ کر پوچھا کہ بیٹا ابوالحسن آج پریشان کیوں ہو مجھے تو تمہاری بے اعتدالیاں دیکھ کر پہلے ہی یقین تھا۔ کہ تم جلد مفلس ہو جاؤ گے۔ افسوس تم نے اپنا تمام زر و مال نالائق دوستوں کو کھلا دیا۔ جو آج تم سے صاحب سلامت کے بھی روادار نہیں ابوالحسن والدہ کی یہ بات سن کر رو پڑا اور اپنے ان دوستوں کے پاس گیا جن پر اُسے کمال اعتبار اور حسن ظن تھا اور ان سے کچھ مدد کا بصورت قرض طلبگار ہوا لیکن ان سب نے صاف انکار کر دیا غرضیکہ ابوالحسن والدہ کے پاس واپس آیا۔ اور کہا کہ والدہ جو تم نے کہا تھا بجا تھا۔ اب میں عہد کرتا ہوں کہ کسی بغدادی سے دوستی نہ کروں گا۔ پھر کچھ مال و اسباب فروخت کر کے کچھ تھوڑا سا سرمایہ اکٹھا کیا اور نہایت احتیاط سے گھر رکھا۔ اور اپنا یہ دستور ٹھہرا لیا کہ ہر روز ایک نو وارد مسافر کو اپنے ساتھ گھر لے جاتا، اس کو کھانا کھلاتا۔ اور آدھی رات تک اس سے باتیں کرتا اور فجر ہوتے ہی اس کو رخصت کر دیتا۔ اور اس سے کہہ دیتا کہ پھر کبھی میرے گھر نہ آنا غرضیکہ زیادہ ملاقات سے گھبراتا اور یہ دستور بھی اس نے اپنی طبیعت سے مجبور ہونے

کی وجہ سے بنا رکھا تھا۔ کیونکہ وہ عرصہ سے دوسروں کے ساتھ مل کر کھانا کھانے کا عادی تھا۔ اور بلا اس کے نہیں رہ سکتا تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ ابوالحسن کسی نووارد کی تلاش میں بغداد کے پل پر بیٹھا ہوا تھا۔ کہ خلیفہ ہارون الرشید سے ملا۔ خلیفہ نے اپنی ہیئت اور لباس کو بدلا ہوا تھا۔ اور کوئی شخص بھی اس کو پہچان نہ سکتا تھا۔ کیونکہ خلیفہ کی عادت تھی کہ وہ ہر رات اپنا لباس تبدیل کر کے نکلتا تھا۔ تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ رعایا کس حال میں ہے اور حکام شہر اپنے فرائض کی ادائیگی میں تو قاصر نہیں ہیں۔ غرضیکہ اس دن خلیفہ موصل کے ایک سوداگر کے لباس میں تھا۔ اور اس کے ہمراہ ایک غلام تھا۔ ابوالحسن نے جھٹ سلام علیک کر کے کہا۔

" بندہ پرور ایک رات غریب خانہ پر تشریف لا کر تناول ماحضر سے مشکور کریں "

ہارون الرشید نے اس کی دعوت کو قبول کر لیا اور ابوالحسن کے ساتھ اس کے گھر کی جانب چلا: اثنائے راہ میں ابوالحسن نے اپنا دستور ہارون الرشید سے کہا۔ ابوالحسن اس کی بھولی بھالی باتوں پر حیران تھا۔ اور کہتا تھا کہ ضرور اس میں کوئی نہ کوئی راز ہے اسے دریافت کرنا چاہیئے۔ ابوالحسن خلیفہ کو لے کر اپنے مکان پر پہنچا۔ اور نہایت پر تکلف کمرے میں بٹھایا۔ جو ہر طرح کے شیشہ و آلات وغیرہ سے آراستہ تھا۔ پھر خود اپنے ہاتھوں سے دسترخوان بچھایا اور اس پر نہایت پر تکلف کھانا چن دیا۔ دستور عرب کے مطابق دونوں کھانے کو بیٹھے اور کھانے کے دوران میں کسی قسم کی کوئی بات نہ کی ابوالحسن اچھی اچھی چیزیں اٹھا کر اپنے مہمان عزیز کے سامنے رکھتا۔ جب دونوں کھانے سے فارغ ہو چکے تو خلیفہ کے غلام نے دونوں کے ہاتھ دھلائے۔ جب کھانا وغیرہ اٹھا لیا گیا۔ تو ابوالحسن کی والدہ نے نہایت اعلیٰ قسم کی میوہ جات سنہری طشتریوں میں لا کر ان کے سامنے رکھے شام ہونے پر ابوالحسن نے تمام شمعیں روشن کیں اور شیشہ و ساغر و صراحی، اور مے ناب وغیرہ لا کر سامنے رکھ دیئے۔ پھر خلیفہ اور ابوالحسن دونوں شراب نوشی کرتے رہے۔

ابوالحسن نے اپنی والدہ سے کہہ دیا تھا کہ غلام کو خوب اچھی طرح کھانا کھلانا جب ابوالحسن اور خلیفہ دونوں سرور میں آ گئے تو خلیفہ ابوالحسن کی بذلہ سنجیوں سے نہایت خوش ہوا اور اس کا حسب و نسب دریافت کیا! ابوالحسن نے اپنی تمام کیفیت مع دوستوں کی بے وفائی کے بیان کی اور کہا۔

" میں نے عہد کر لیا ہے۔ کہ میں آئندہ اہل بغداد سے کبھی دوستی نہ کروں گا اور نہ ان سے ملوں گا۔ کیونکہ یہ لوگ سخت بے وفا ہیں بلکہ ان کی بجائے ایک نووارد آدمی کو لا کر اس سے دل بہلاؤں گا۔ اور صبح ہی صبح اسے رخصت کر دیا کروں گا۔ جیسا میں نے راستہ میں تم سے ذکر کیا تھا "

خلیفہ نے کہا " بیشک ایسے دوستوں سے نہ ملنا چاہیئے۔ اب تمہارا وقت اچھا گذرتا ہے کہ روز ایک نئے دوست سے دل بہلاتے ہو۔ اور فجر ہونے سے پیشتر اسے رخصت کر دیتے ہو تم بڑے اچھے مزاج کے آدمی ہو۔ مجھے تو تمہاری اس خوش اوقاتی پر رشک آتا ہے "

پھر دونوں دیر تک شراب نوشی اور نہایت خوش کن باتیں کرتے رہے جب رات کچھ زیادہ گذر گئی تو خلیفہ نے کہا۔

" بھائی اب تم بھی آرام کرو اور میں بھی آرام کرتا ہوں، کیونکہ صبح منزل پر چلنا ہے اور میری خواہش ہے کہ میں تمہارے اس حسن سلوک کا عوض بھی کچھ ادا کروں۔ میں بغدادی دوستوں کی طرح نہیں ہوں "

ابوالحسن نے کہا اے میرے عزیز مہمان جو کچھ تم نے کہا میں تمہاری اس جوانمردی پر تمہاری تعریف کرتا ہوں اور تمہارا مشکور ہوں مجھے کسی چیز کی حاجت نہیں جو میں تم سے بیان کروں خدا گواہ ہے مجھے کسی قسم کی ہوس نہیں اور جو تم میرے احسان کے عوض کوئی خدمت کرنا چاہتے ہو تو تمہاری طرف سے یہ کافی بدلہ ہے۔ کہ تم نے میری دعوت قبول کی اور ماحضر تناول کر کے مجھے مشکور کیا۔ اور میں

تو تمہارے غلاموں کی حیثیت بھی نہ رکھتا تھا۔ محض تمہاری بندہ نوازی تھی کہ تم میرے غریب خانہ میں تشریف لائے۔ البتہ ایک امر ایسا ہے۔ جسے میں اپنے لئے تکلیف محسوس کرتا ہوں۔ مگر تم مسافر پردیسی ہو اس لئے تمہارا اس معاملہ سے کوئی دخل نہیں۔ تم جانتے ہو کہ بغداد میں ہزاروں محلے اور گلی کوچے ہیں اور ہر محلہ میں ایک مسجد ہے جس میں ایک مؤذن رہتا ہے جو پانچوں وقت لوگوں کو نماز کے لئے بلاتا ہے اس محلہ کا مؤذن جس میں میں رہتا ہوں نہایت شریر بدباطن اور ریاپسند ہے اور لوگ اس کی مردم آزاری سے نہایت تنگ ہیں اس کے چار دوست یا مشیر ہیں وہ اسی کی طرح مردم آزار ہیں۔ تمام محلہ کے لوگ ان سے نالاں ہیں سب ان سے ڈرتے ہیں اور خاص کر مجھے ان سے شکایت اور تکلیف ہے"۔

خلیفہ نے کہا "تم نے ان کی نسبت کیا علاج تجویز کیا ہے"؟

ابوالحسن نے کہا "علاج کیا؟ خدا سے ڈرتا ہوں کہ فقط ایک دن کے لئے مجھے خلیفہ ہارون الرشید بنا دے"۔

خلیفہ نے کہا "اگر تم ایک دن کے لئے خلیفہ بن جاؤ تو کیا کرو"؟

"جو چار اس کے مشیر ہیں۔ سو سو درے ان کی پیٹھ پر لگواؤں اور چار سو درے صرف اس مؤذن کی پیٹھ پر بطور سزا کے لگوا دوں پھر میرے دل کی حسرت نکلے اور آئندہ دوسروں کو عبرت ہو کہ جو لوگ اپنے ہمسایوں کو تنگ کرتے ہیں ان کی یہی سزا ہے"۔ ابوالحسن نے کہا۔

خلیفہ ابوالحسن کی اس خواہش سے نہایت خوش ہوا اور دل میں ارادہ کیا کہ اس فعل کو اس کے ہاتھوں سے پورا کرائے پھر ابوالحسن سے مخاطب ہوا اور کہا۔

"میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ خدا تمہیں تمہاری خواہش میں کامیاب کرے خدا کی قدرت سے بعید نہیں کہ وہ ایک دن کے لئے تمہیں خلیفہ بنا دے۔ اور یہ بھی بعید نہیں کہ خلیفہ تمہاری لیاقت سے آگاہ ہو کر ایک دن کے لئے تمہیں اپنا قائم مقام بنا دے اور تم اس صورت میں ان مفسدوں کو سزا دے سکو۔ میں تو ایک اجنبی سوداگر ہوں ورنہ جو سزا تم نے تجویز کی ہے میں ضرور انہیں دیتا"۔

ابوالحسن نے کہا "تم میری اس بات پر تمسخر کرتے ہو اگر خلیفہ بھی ان باتوں کو سن لے تو یقیناً تمہاری طرح مجھ پر تمسخر کرے"۔

خلیفہ نے کہا "کیا مجال کہ میں تم جیسے محسن پر جس نے مجھے نہایت مزیدار کھانا کھلایا۔ شراب پلائی۔ ہنسوں یا اسے تمسخر کروں۔ اور یہ بھی یاد رکھو کہ خلیفہ ایسا بیوقوف نہیں کہ تمہارے اس مقصد میں حائل ہو یا اس پر ہنسے یا تمسخر اڑائے اب آدھی شب گذر گئی ہے۔ سونا چاہیئے"۔

ابوالحسن نے کہا "یہ جو تھوڑی سی شراب باقی رہ گئی ہے اسے تم پی کر سو رہو اور ہاں ایک بات کا خیال رہے اور وہ یہ ہے کہ تم صبح جس وقت یہاں سے چلو تو دیوان خانہ کا دروازہ بند کرکے جانا"۔

خلیفہ نے کہا "ہاں اسی طرح کیا جائے گا"۔

پھر ایک گلاس شراب کا پہلے خلیفہ نے آپ پیا اور دوسرا بھر کر اس میں کچھ سفوفِ بیہوشی ملا ابوالحسن کو دیا اور کہا کہ یہ آخری جام میرے ہاتھ سے پی لو۔ ابوالحسن نے فوراً آداب بجا لا کے جامِ شراب پی لیا اور پیتے ہی اس پر آثار بے ہوشی طاری ہوگئے۔ اور پھر وہ غافل ہوگیا۔ پھر خلیفہ نے غلام کو بلایا۔ جو غلام گردش میں کھڑا تھا اور کہا "اس آدمی کو اپنے کندھے پر اٹھا۔ اور اس کے گھر کو اچھی طرح پہچان لے کیونکہ جب میں کہوں گا تو اسے پھر یہیں لا کر چھوڑنا ہوگا"۔ غلام نے کہا "بہتر حضور" اور ابوالحسن کو اپنے کندھے پر اٹھا لیا۔ اور خلیفہ کے ہمراہ محل سرائے شاہی کو چلا۔ خلیفہ اس غلام کو لئے ہوئے اپنی خوابگاہ میں گیا۔ وہاں سب خواجہ سرائے اور لونڈیاں وغیرہ جن کی ڈیوٹی تھی خلیفہ کے تشریف لانے کے انتظار میں تھے۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ اس شخص کو میرے شب خوابی کے کپڑے پہناؤ۔ اور میرے پلنگ پر لٹاؤ۔ اور صبح جس وقت یہ بیدار ہو تو

جس طرح مجھے مخاطب کیا کرتے ہو اسی طرح امیر المؤمنین کے نام سے اسے مخاطب کرو اور اسے میرا قائم مقام جانو۔ پھر خلیفہ نے وزیر جعفر کو بلا کر کہا۔

" صبح ایک اور آدمی ہماری جگہ تخت پر جلوس کریگا اس کو ہمارا قائم مقام سمجھنا۔ اور ہر طرح سے اس کے لئے آداب شاہی جو میرے لئے مخصوص ہیں بجالانا اور جس کسی کو وہ سزا دے اسے سزا دینا اور جسے وہ انعام دلوائے۔ فوراً اسے انعام دینا۔"

پھر مسرور خواجہ سرائے کو بلا کر کہا۔

" جس طرح تو مجھ کو صبح کے وقت نماز کے لئے جگایا کرتا ہے' اس شخص کو بھی ایسے ہی جگانا۔"

غرضیکہ خلیفہ تمام ہدایات جاری کرنے کے بعد دوسرے مکان میں جا کر سو رہا۔ اور صبح ایک ایسی جگہ پر چھپ کر بیٹھا جہاں سے ابوالحسن کی تمام حرکات دیکھ سکے۔ اور اس کو کوئی نہ دیکھے۔ صبح ہو گئی۔ تمام خواصیں، کنیزیں، لونڈیاں اپنی اپنی جگہ پر مؤدبانہ طریق سے کھڑی ہو گئیں۔ اتنے میں مسرور اور خواجہ سرا نے اسفنج کا ایک ٹکڑا سرکہ میں تر کرکے ابوالحسن کی ناک کے پاس لے جا کر سونگھایا۔ ابوالحسن کو سرکہ کی تیزی سے چھینک آگئی۔ اور اس نے چاہا۔ کہ بلغم کو تھوکے کہ ایک کنیز نے بڑھ کر سونے کا اگالدان آگے کر دیا تاکہ قالین پر نہ گرے کیونکہ خلیفہ کو اس سرکہ کے اسفنج سے اٹھاتے تھے۔ ابوالحسن نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور اپنے آپ کو ایک نہایت سجے ہوئے کمرہ میں پایا جس میں کئی قسم کی شمعیں روشن تھیں۔ اور جس کی چھت نہایت خوبصورت تھی پھر اس نے سامنے نہایت ہی حسین و جمیل کنیزوں کو صف بستہ دیکھا۔ بعض کے ہاتھوں میں مورچھل تھے اور بعض سونے کے اگالدان لئے ہوئے تھیں اور بعض کے ہاتھوں میں گانے بجانے کے آلات تھے اور کئی ایک خواجہ سرا لباس زرنگار میں نہایت مؤدبانہ طریق سے کھڑے ہوئے تھے۔ لحاف اور پلنگ پوش پر نگاہ کی تو انہیں بھاری کمخواب کا بنا ہوا پایا۔ جن کے گرد موتیوں کی جھالریں لٹک رہی تھیں۔

ابوالحسن یہ تمام ساز و سامان دیکھ کر نہایت حیران ہوا۔ اور دل میں خیال کیا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ اگر بیداری ہے تو کیا میں واقعی خلیفہ ہوں؟ رات کو اس مہمان سے باتوں باتوں میں خلیفہ ہونے کا ذکر آیا تھا۔ شاید کہیں وہی خیال میرے دماغ میں نہ سمایا ہوا ہو اور اصلیت کچھ بھی نہ ہو۔ اسی خیال میں پھر آنکھیں بند کرکے سونے کا ارادہ کیا کہ ایک خواجہ سرائے نے بڑھ کر کہا۔

" یا امیر المؤمنین۔ یہ سونے کا وقت نہیں ہے۔ نماز کا وقت ہو چکا ہے آفتاب طلوع ہوا چاہتا ہے۔"

ابوالحسن نے یہ سنکر خیال کیا کہ میں سوتا نہیں بلکہ بیدار ہوں سویا ہوا آدمی کسی کی بات کو نہیں سنتا۔ پھر اس نے آنکھیں کھول دیں اور جو چیزیں اسے شمعوں کی روشنی میں نظر آتی تھیں انہیں دن کی روشنی میں دیکھا تو دل میں نہایت خوش ہو کر اٹھ بیٹھا۔ اور اسے یقین ہو گیا کہ واقعی خدا نے مجھے خلیفہ بنا دیا ہے۔

خلیفہ ہارون الرشید یہ تمام حرکات دیکھ دیکھ نہایت خوش ہو رہا تھا۔ اتنے میں ایک نہایت حسین و کمسن کنیز آگے بڑھی اور زمین بوس ہوئی اور گانے والیوں نے بانسلی بجا کر چھوٹے سُر میں سلامی دی شہنائی اور دیگر سازوں کی آوازوں نے ابوالحسن کو اس قدر حیران کر دیا کہ وہ اپنے آپ کو بھول گیا یکایک پھر اس کو خیال آیا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں یا بیداری ہے۔ اس نے پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں پھر جب اس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو مسرور خواجہ سرائے آگے بڑھا اور عرض کیا۔

" یا امیر المؤمنین آج کیا وجہ ہے کہ حضور نے نماز صبح ادا نہیں کی کیا کچھ خداوند کی طبیعت خراب ہے۔ یا یونہی سستی تھی۔ اب بستر سے اُٹھئے۔ اور دربارِ عام کو تشریف لے جائیے اور حکم احکام جاری فرمائیے۔ تمام اراکین دربار حضور کی تشریف آوری کے منتظر ہیں۔"

یہ سنکر تو ابوالحسن کو پختہ یقین ہو گیا کہ میں خلیفہ ہوں۔ اور یہ جو کچھ ہے خواب نہیں۔ بلکہ عین حقیقت ہے۔ پھر ابوالحسن نے یہ خیال

کیا کہ مجھے یہ رتبہ کیسے نصیب ہُوا؟ اور اسی خیال سے مسرور سے کہا "تو یہ باتیں کس سے کر رہا ہے اور کس کو امیرالمومنین کے نام سے مخاطب کرتا ہے کسی اور کے دھوکہ میں تو مجھے امیرالمومنین نہیں کہہ رہا" مسرور نے جواب دیا۔ خداوند! آپ کیا کہہ رہے ہیں، شاید غلام کی آزمائش کرتے ہیں۔ خداوند! کیا امیرالمومنین نہیں اور کیا حضور نائب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں؟ مسرور خانہ زاد جو مدتوں سے حضور کی خدمت کا شرف حاصل کر رہا ہے کس طرح اپنے آقائے نعمت کو بھول سکتا ہے۔ خداوندا عزیب پرور! اپنی نظرِ عنایت رکھیں جو مدت سے غلام پر رہتی آئی ہے۔ کیا خداوند نے رات کوئی خواب پریشان دیکھا ہے جس کے اثر سے اس قسم کی گفتگو فرما رہے ہیں؟"

ابوالحسن مسرور کی اس بات پر بہت ہنسا۔ خلیفہ بھی چاہتا تھا کہ ٹھٹھا مار کر ہنسے۔ لیکن ضبط سے کام لیا تاکہ کہیں ابوالحسن آواز نہ سن لے۔ غرضیکہ ابوالحسن ان حالات کو دیکھ کر دیر تک ہنستا رہا۔ اور پلنگ پر ذرا دیر گستست چھوڑ کر اُٹھ بیٹھا۔ اور پھر ایک خورد سال حبشی بچے کو لے کر کہا۔

"سچ بتا کہ میں کون ہوں؟" اس نے کہا "حضور خلیفہ امیرالمومنین ہیں۔ اور نائب سید المرسلین ہیں"۔

ابوالحسن نے کہا "تو سخت جھوٹا ہے اور اسی وجہ سے تیری صورت ایسی منحوس ہو گئی ہے"۔

پھر ابوالحسن ایک نہایت ہی حسین وجمیل کنیز کی طرف متوجہ ہُوا۔ اور کہا "ادھر آ۔ اور اپنے دانتوں سے ذرا میری انگلی کو کاٹ تاکہ میں دیکھوں کہ میں بیدار ہوں"۔ اس خواص نے سمجھ لیا کہ خلیفہ بھی کہیں پوشیدگی سے اس کو دیکھ رہا ہوگا۔ اس لئے ذرا زور سے ابوالحسن کی انگلی کو کاٹا۔ ابوالحسن درد سے تلملا اُٹھا اور کہا میں واقعی خلیفہ بن گیا ہوں اور یہ امر نہایت حیرت انگیز ہے پھر اس کنیز سے پوچھا "خدا کے لئے سچ سچ بتاؤ۔ کہ میں واقعی امیرالمومنین ہوں اور تمہارا مالک ہوں" اس نے جواب دیا "واقعی ہمارے مالک آپ ہی صاحب ہیں۔ اور ہم آپ کے غلام ہیں" پھر جب ابوالحسن نے اُٹھنے کا ارادہ کیا تو ایک خواجہ سرا نے بڑھ کر ہاتھ تھام لیا۔ اور تمام محل میں آداب وسلام کا شور مچ گیا تمام خواجہ سراؤں اور خواصوں اور کنیزوں نے دعا دی کہ خدا امیرالمومنین کے اس دن کو بخیریت گذارے۔

ابوالحسن حیران تھا اور دل میں کہتا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے کہ کل تک تو میں ابوالحسن تھا۔ اور آج خلیفۃ المومنین بن گیا ہوں میرے وہم وذکر میں یہ معاملہ نہیں بیٹھتا کہ میں کس طرح اس عالی رتبہ پر فائز ہُوا۔

پھر خواجہ سراؤں نے ابوالحسن کو خلیفہ کی پوشاک پہنائی اور دونوں طرف قطاریں باندھ کر کھڑے ہو گئے اور مسرور آگے بڑھا۔ اور ابوالحسن کو دربارِ عام کی طرف لے گیا۔ ابوالحسن دربار میں پہنچ کر تخت کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ تاکہ کوئی بازو تھام کر اسے تخت پر بٹھا دے۔ اتنے میں دو امیر آگے بڑھے اور انھوں نے ابوالحسن کے بازوؤں میں ہاتھ دے کر تخت پر بٹھا دیا بجرد تخت پر بیٹھنے کے چاروں طرف سے ملازموں کی آوازیں آداب وسلام کی بلند ہونے لگیں جسے سُن کر وہ نہایت مسرور ہُوا پھر ابوالحسن نے جب اپنے دائیں بائیں نظر کی تو بڑے بڑے سرداروں کو صف بستہ ایستادہ دیکھا پھر تمام لوگوں کے مقدمات سُننے کی طرف متوجہ ہُوا۔ وزیرِاعظم جعفر بھی سامنے حاضر ہُوا اور پائے تخت کو بوسہ دے کر دعا دی کہ "امیرالمومنین پر ہمیشہ خدا کا سایہ رہے۔ اور آپ لاکھوں برس سلامت رہیں۔ اور دین و دنیا میں مرتبہ بلند ہو۔ دوستوں کو مسرت نصیب اور دشمن ذلیل ہوں"۔ یہ تمام باتیں دیکھ کر ابوالحسن کو یقین ہو گیا۔ کہ میں واقعی خلیفہ ہوں اور جاگتا ہوں۔ یہ عالم خواب نہیں ہے۔ بلا کسی محنت کے خداوند نے مجھے بادشاہ بنا دیا ہے۔ پھر امورِ سلطنت کی سرانجام دہی میں مصروف ہُوا۔ اور وزیرِاعظم سے کہا۔

"تمہیں کچھ عرض کرنا ہے؟"

اس نے کہا "تمام امیر اور عہدہ داران افواج وغیرہ حضور کے سلام کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔ اور باریابی چاہتے ہیں"۔ ابوالحسن نے کہا "دو اُ

دربار عام کا دروازہ کھول دیا جائے اور ان سب کو پیش کیا جائے۔"

غرضیکہ وہ سب حاضر ہوئے اور نہایت مؤدبانہ طریق سے آداب شاہی بجا لائے اور پھر اپنی اپنی جگہ پر خاموش کھڑے ہو گئے۔ پھر وزیر اعظم نے لوگوں کی درخواستیں پیش کیں اور ہر ایک کے مقدمہ کے متعلقہ حالات عرض کرنے لگا اس سے پہلے کہ وزیر ان مقدمات کو پیش کرے۔ ابوالحسن نے حکم دیا کہ کوتوال شہر کو پیش کیا جائے۔ کوتوال شہر حاضر ہوا۔ ابوالحسن نے کہا کہ فلانے محلہ کے امام مسجد اور اس کے مشیر کو درے لگائے جائیں اور پھر انھیں اونٹ پر الٹا سوار کر کے تمام شہر میں تشہیر کیا جائے اور آگے آگے ان کے منادی کرائی جائے۔ کہ یہ سزا اُن لوگوں کی ہے جو اپنے اہل محلہ کو ناحق تنگ کریں اور اُن پر جھوٹی تہمتیں لگائیں۔

غرضیکہ کوتوال شہر نے ابوالحسن کے اس حکم کی تعمیل کی کیونکہ خلیفہ نے بھی کوتوال کو اس پر عمل کرنے کے لئے اشارہ کر دیا تھا۔ یہ لوگ وہ امام مسجد اور اس کے مشیر درحقیقت نہایت شریر تھے اور لوگوں کو اُن سے سخت تکلیف تھی۔ جب کوتوال شہر نے عرض کیا کہ حضور، حکم پر عمل کیا گیا۔ تب ابوالحسن نے وزیر اعظم سے کہا کہ فلانے محلے میں ابوالحسن نامی ایک شخص رہتا تھا اس کی والدہ کو ایک ہزار اشرفیاں پہنچا دی جائیں اور کہا جائے کہ یہ خلیفہ نے تیرے لئے بھیجا ہے۔

وزیر جعفر نے ایک غلام کے ہاتھ ایک تھیلی ایک ہزار اشرفی کی ابوالحسن کی ماں کو پہنچا دی۔ وہ دیکھ کر نہایت خوش ہوئی اور حیران تھی کہ خلیفہ نے ہمارے حال پر کیوں اس قدر مہربانی کی۔ درحقیقت وہ اصلی معاملہ سے بے خبر تھی۔ کہ اس وقت خود اس کا لڑکا خلیفہ بنا ہوا ہے۔

جب تمام امور سے فراغت ہو چکی۔ تو ابوالحسن نے دربار برخاست کر دیا۔ تمام اراکین دربار رخصت ہو گئے اور صرف وزیر اعظم جعفر اور خواجہ سرائے مسرور اور خود ابوالحسن رہ گئے۔ اس وقت ابوالحسن وزیر اور مسرور کی مدد سے تخت سے نیچے اُترا اور محل کی جانب چلا۔ اسی اثنا میں اُسے جائے ضرور کی حاجت ہوئی۔ مہتر نے پائخانہ شاہی کے دروازے کھول دیئے۔ جس میں سفید سنگ مرمر کے فرش بچھے ہوئے تھے اور ایرانی قالین اور نہایت اعلیٰ درجہ کے زر بفت وغیرہ بھی بچھے ہوئے تھے۔ داروغہ جائے ضرور نے ایک سنہری جوتی کا جوڑا ابوالحسن کے سامنے رکھا۔ کیونکہ خلیفہ اسی جوڑے کو پہن کر جائے ضرور میں جایا کرتا تھا۔ ابوالحسن اس بات سے بے خبر تھا اُس نے اس جوڑے کو اُٹھا کر اپنی کشادہ آستینوں میں رکھ لیا۔ وزیر اور مسرور اس کی اس حرکت پر ہنسے لیکن انھوں نے ضبط سے کام لیا اور کہا کہ خداوند اس جوتی کو پہن کر پائخانہ میں جایا کرتے ہیں۔ غرضیکہ ابوالحسن اس جوتی کو پہن کر پائخانہ میں گیا جب وہ اس سے فارغ ہو چکا تو مسرور اُسے کھانا کھانے والے کمرہ میں لے گیا۔ وہاں دسترخوان بچھایا گیا طرح طرح کے لذیذ کھانے چنے گئے اور سازندے گانے کے طائفے بھی حاضر ہوئے ابوالحسن کے کھانے پر بیٹھتے ہی انھوں نے گانا بجانا شروع کر دیا۔

پھر ابوالحسن خیال کرنے لگا کہ میں تمام ان باتوں کو خواب میں دیکھ رہا ہوں یا بیداری میں پھر خیال کیا کہ یہ بیداری میں ہی ہے۔ خواب نہیں ہو سکتا اور میں واقعی خلیفہ بن گیا ہوں ابوالحسن وہاں کی ہر چیز کو دیکھ کر نہایت حیرت زدہ تھا۔ سات عدد نہایت حسین و جمیل لونڈیاں اس کے سامنے گانا گا رہی اور ساز بجا رہی تھیں اور نہایت اعلیٰ درجہ کے جھاڑ فانوس تھے اور سونے کی انگیٹھیوں میں عود سلگایا جا رہا تھا۔ کئی ایک نہایت ہی حسین و جمیل خواصیں جو نہایت نفیس پوشاک پہنے ہوئے تھیں مورچھل ہلا رہی تھیں ابوالحسن تمام اشیا کو دیکھ دیکھ کر نہایت حیران تھا۔ اور بے حد خوش ہو رہا تھا اور اُن سب کو کہتا تھا۔ کہ ایک ایک باری باری مورچھل ہلائے۔ اور باقی میرے ساتھ دسترخوان پر بیٹھی رہیں اور دسترخوان پر اچھی اچھی چیزیں دیکھ نہایت خوش ہو رہا تھا مگر وہ لحاظ سے کھانے میں ہاتھ نہیں ڈالتی تھیں۔ ابوالحسن نے اُن کو کھانے میں شریک کیا اور ہر ایک سے ان کا نام دریافت کیا۔ ایک نے کہا میرا نام مرجان ہے دوسری

نے کہا کہ مرجان لب تیسری نے کہا کہ میرا نام مہتاب ہے چوتھی نے کہا میرا نام خورشید ہے، پانچویں نے کہا میرا نام زہرت ہے چھٹی نے کہا میرا نام فرحت ہے ساتویں نے کہا میرا نام مصری ہے پھر وہ ہر ایک کے نام پر مذاق کرتا رہا اور خلیفہ بھی ایک ساتھ کے مکان میں چھپا ہوا یہ حال دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ جب کنیزوں نے دیکھا کہ ابوالحسن کھانے سے فارغ ہو چکا ہے تو خواجہ سراؤں سے کہا کہ ہاتھ دھلانے کے لئے آفتابہ وغیرہ لایا جائے۔ پھر وہاں سے اُٹھ کر دوسرے کمرہ کو گیا۔ اس کے جاتے ہوئے تمام کمرہ نغمہ و سرود کی آواز سے گونج اُٹھا۔ وہاں جواہر نگار قندیلیں روشن تھیں اور زریں دسترخوان پر طرح طرح کے میوے چنے تھے اور سات عدد نہایت ہی حسین خواصیں ایستادہ تھیں۔ ابوالحسن دسترخوان پر بیٹھا اور اُن کو بھی اپنے ساتھ شامل ہونے کا کہا اور ان سے بھی ان کے نام دریافت کئے جو انھوں نے پہلی خواصوں کی طرح بتلائے پھر ہر ایک کو میوے اُٹھا اُٹھا کر دینے لگا۔ اور کھلاتا گیا۔ پھر اس کمرہ سے اُٹھ کر بارہ دری میں گیا۔ وہاں بھی محفل رقص و سرود آراستہ تھی۔ اور سات عدد نہایت ہی خوبصورت و کمسن کنیزیں اپنے ہاتھوں میں طرح طرح کے پیالے جن میں قسم قسم کے شربت تھے، لئے کھڑی تھیں ابوالحسن کے شربت پیتے ہی انھوں نے گانا بجانا شروع کیا۔ ابوالحسن نے ان کے نام بھی دریافت کئے انھوں نے بھی سابقہ خواصوں کی طرح اپنے نام بتائے ابوالحسن سُنکر نہایت خوش ہُوا۔ اور ہر ایک سے بے تکلفانہ گفتگو کرتا خلیفہ اس کی حرکتوں کو دیکھ دیکھ کر نہایت خوش ہوتا۔

اب ابوالحسن یہاں سے ایک چوتھے کمرہ میں گیا۔ وہ بھی سابقہ کمروں کی طرح ہر ایک شئے سے آراستہ پیراستہ تھا۔ وہاں کافوری شمعیں بلوریں فانوسوں میں جل رہی تھیں اور جو نظارہ اس کمرہ میں تھا۔ وہ کسی دوسرے کمرہ میں نہ دیکھا گیا تھا۔ یہاں بھی کئی ایک طائفے گانے بجانے کے لئے تیار تھے۔ اور ان کی دلفریب ادائیں اور آوازیں بہشت بریں کا نمونہ پیش کر رہی تھیں۔ وہاں سات عدد لونڈیاں اور بھی تھیں جو اپنے ہاتھوں میں طلائی طشتریاں لئے کھڑی تھیں جن میں شراب کے بعد کھانے کا سامان نہایت قرینہ سے لگا ہُوا تھا اور اُسی کمرہ میں ایک جانب ساتھ طلائی صراحیاں شراب سے بھری رکھی تھیں اور ان کے گرد جام بلوریں مع طلائی دستوں کے موجود تھے۔ ابوالحسن نے ان تینوں کمروں میں سوائے پانی کے کچھ نہ پیا۔ کیونکہ شہر بغداد کی رسم تھی۔ کہ تمام بڑے بڑے لوگ رات کو مخفی طور پہ شراب نوشی کرتے تھے اور دن کو اُس سے نہایت پرہیز کرتے تھے۔ جب ابوالحسن چوتھے مکان میں داخل ہُوا۔ تو وہاں بھی سات عدد نہایت خوش رو خواصیں موجود تھیں جن کو دیکھ کر ابوالحسن حیران رہ گیا۔ اور جس قدر وہ پہلے کنیزوں کو دیکھ چکا تھا بہ ان سب سے زیادہ خوبصورت تھیں۔ ابوالحسن انھیں دیکھ کر فریفتہ ہو گیا۔ اور چاہا کہ ان سے گفتگو کرے۔ لیکن سازوں کی آوازیں اس قدر بلند تھیں کہ اُسے کچھ سُنائی نہیں دیتا تھا۔ ابوالحسن نے گانا بجانا بند کرنے کا حکم دیا۔ اور ایک نہایت ہی کمسن اور حسین و جمیل کنیز کو آگے بڑھنے کا حکم دیا جب وہ قریب آئی تو اُس سے پوچھا۔

"تیرا نام کیا ہے" اُس نے کہا "یا امیر المومنین میرا نام سلک مروارید ہے"

ابوالحسن نے کہا "تیرے دانت تو موتیوں سے بھی زیادہ آب و تاب رکھتے ہیں جس نے تیرا یہ نام رکھا ہے اُس نے سخت غلطی کی ہے تیرا نام تو اس سے بہتر ہونا چاہیئے تھا۔ بھلا ایک جام تو شراب کا دے"

اس نے ابوالحسن کو ایک گلاس میں شراب ڈال کر دی وہ پی گیا پھر اُس کنیز نے ایک گلاس ابوالحسن کے حکم سے خود پیا اور پینے سے قبل ایک نہایت دلفریب گیت گایا جس کو سُن کر ابوالحسن نہایت خوش ہُوا۔

پھر ایک دوسری خواص کو بلایا اس سے پوچھا "تیرا نام کیا ہے" اُس نے کہا "میرا نام کوکب الصبح ہے"۔ ابوالحسن نے کہا "تیری آنکھیں تو ستاروں سے بھی زیادہ روشن ہیں یہ نام درست نہیں اس سے بہتر ہونا چاہیئے تھا"

پھر ایک جام اس کے ہاتھ سے بھی پیا۔ پھر ایک تیسری خواص جس کا نام ضوءالنہار تھا۔ اس کی طرف مخاطب ہوا اور اس کے ہاتھ سے بھی ایک جام پیا۔ ابوالحسن نے جب پے در پے کئی جام شرابوں کے پی لئے۔ تو خلیفہ نے سلک مروارید کنیز کو اشارہ کیا کہ ایک جام میں سفوف بیہوشی ملا دے اس نے بموجب حکم خلیفہ نے ایسا ہی کیا اور ایک جام سفوفِ بیہوشی آمیز ابوالحسن کو دیا۔ وہ اس کو بھی نہایت خوشی خوشی نوش کر گیا۔ پھر اس کنیز نے ایک گیت بانسری کے ساتھ گایا۔ اور ابوالحسن سے کہا کہ یہ گیت میں نے آج صبح بنایا ہے! ابوالحسن اُسے سُنکر نہایت خوش ہوا اور حالت نشہ میں وجد کرنے لگا۔ جب اس خواص نے گیت ختم کر دیا۔ تو ابوالحسن نے چاہا کہ اس کی داد دے اور تعریف کرے لیکن سفوفِ بیہوشی اپنا اثر کر چکا تھا۔ تعریف کرنے کی غرض سے نصف منہ اُس نے کھولا ہی تھا کہ بیہوش ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں ڈھیلے ہو گئے۔ اور وہی روزِ اوّل والی کیفیت ہو گئی۔ خلیفہ نے غلام کو حکم دیا کہ اس کے شاہی کپڑے اتار ڈالو اور اس کے اصلی کپڑے اس کو پہنا دو غلام نے حکم کی تعمیل کی۔

پھر خلیفہ نے کہا "اس کو لے جا کر اس کے مکان کے دیوان خانہ میں لٹا دو اور باہر نکلتے وقت دروازہ کھلا چھوڑ دینا"۔ غلام حسب الحکم اس کو اس کے گھر لے گیا۔ اور اس کے بستر پر لٹا دیا اور خود محل کو واپس چلا آیا۔ تاکہ خلیفہ کو اختتام کار کی اطلاع دے پھر خلیفہ نے اپنے مصاحبوں سے کہا کہ ابوالحسن یہ دعا مانگتا تھا کہ خدا اُسے ایک دن کے لئے خلیفہ بنا دے۔ تو وہ اپنے محلّہ کے مؤذن مسجد اور اس کے چار مشیروں کو سزا دے کیونکہ ان کے ہاتھوں اہل محلہ سب کے سب تکلیف میں تھے۔ لہذا میں نے اُسے ایک دن کے لئے خلیفہ بنا کر اس کے ارمان کو پورا کر دیا تو اس نے بموجب اپنی خواہش کے ان کو سزا دی۔

اب ابوالحسن کی سنو کہ جب غلام اس کو اُس کے گھر چھوڑ آیا تو وہ تمام رات بیہوش رہا۔ صبح ہونے پر اُس نے آنکھ کھولی۔ اور اپنے گھر کو دیکھ کر سخت حیران ہوا۔ سلک مروارید کوکب الصبح وغیرہ کنیزوں اور خواجہ سراؤں کے نام لے لے کر آوازیں دیں اور کہا کہ تم کدھر ہو یہاں کیوں نہیں آتے۔ ابوالحسن کی ماں اس کی آواز سُن کر دوڑی ہوئی آئی اور کہا۔

"بیٹا خیر تو ہے کیوں اس طرح کی باتیں کرتے ہو"۔

ابوالحسن نے اپنی ماں کی طرف نہایت غرور سے دیکھا اور کہا "اے اچھی بی بی تو کسے اپنا بیٹا کہتی ہے"؟

اُس نے کہا "کیا تو میرا بیٹا نہیں ہے۔ میں حیران ہوں کہ تم مجھے بھول کیوں گئے"۔

ابوالحسن نے کہا "اے نالائق عورت کچھ ہوش سے بات کر میں ہرگز ہرگز تیرا بیٹا نہیں ہوں۔ تو نہایت جھوٹی ہے۔ ادب سے بات کر میں امیرالمومنین ہوں"۔

اُس کی ماں نے کہا "خاموش رہ ایسی بیہودہ گفتگو نہ کر ورنہ لوگ تجھے ابھی پکڑ کر لے جائیں گے"۔

ابوالحسن نے کہا "میں پاگل نہیں ہوں میرے ہوش و حواس درست ہیں۔ میں فی الحقیقت امیرالمومنین ہوں۔ اور نائب رسولؐ ہوں جو دونوں جہان کا مالک ہے"۔

اس کی ماں نے جواب دیا "معلوم ہوتا ہے کہ تجھ پر کسی جن کا سایہ ہو گیا ہے یا کوئی شیطانی چیز تیرے جسم میں حلول کر گئی ہے" اور کہا "میں درحقیقت تیری ماں ہوں۔ اور تو میرا بیٹا ابوالحسن ہے" اور وہ تمام علامتیں جو ابوالحسن کے ابوالحسن ہونے میں ہو سکتی تھیں بتائیں۔ اور اسکی غلطی کو ثابت کیا اور کہا "دیکھ یہ گھر تیرا ہے۔ یا خلیفہ کا محل ہے اور کیا میں ہمیشہ سے تیرے ساتھ نہیں رہی اور جو کچھ میں نے تجھ سے کہا ہے اس پر غور کر اور اس واہیات گفتگو کو چھوڑ دے یہ مرتبہ نہ تجھے حاصل ہے اور نہ کبھی حاصل ہو گا اور کبھی بھی اس قسم کا سخن زبان پر نہ لانا"۔

ابوالحسن یہ سُنکر کچھ سوچنے لگا اور تھوڑی دیر ٹھہر کر آنکھیں کھولیں اور کہا "اماں جو کچھ تو نے کہا ہے یہ سب سچ ہے۔ اور میں اچھی طرح

جانتا ہوں کہ یہ میرا مکان ہے۔ اور میں ابوالحسن ہوں۔ لیکن میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ باتیں میرے دماغ میں کیونکر پیدا ہو گئی ہیں۔"

اس کی ماں نے خیال کیا کہ اس کو شاید کوئی دماغی بیماری ہو گئی ہے۔ جس کے سبب سے اس قسم کی گفتگو کرتا ہے یہ خیال کر کے وہ کچھ مسکرائی اور کہا "شاید بیٹا تو نے کوئی خواب دیکھا ہے۔"

ابوالحسن نے ذرا پھر کچھ سوچ کے کہا "او نالائق عورت سوچ سمجھ کر بات کر میں ہرگز تیرا بیٹا نہیں ہوں اور نہ تو میری ماں ہے یہ تیری لے اوٹ پٹانگ باتیں ہیں جو تو مجھے اپنا بیٹا بناتی ہے۔ کیا تجھے معلوم نہیں۔ کہ میں امیرالمومنین ہوں۔ اور تمام مسلمانوں کا سردار ہوں۔"

اس کی ماں نے کہا بیٹا خدا کے لئے اپنی زبان بند کر۔ کیا تو نے اس محلہ کے مؤذن اور اس کے چار مشیروں کا نہیں سنا۔ جو اس محلہ کے رہنے والوں کو تکلیف دیتے ہیں۔ کل کوتوال شہر نے ان پانچوں کو گرفتار کر لیا۔ اور سزائے تازیانہ دی۔ اور پھر تشہیر کر کے شہر بدر کر دیا مجھے ڈر ہے کہ کہیں تیرا بھی ایسا ہی حال نہ ہو!"

ابوالحسن کی ماں کو یہ خبر نہ تھی۔ کہ مؤذن وغیرہ کی سزا ابوالحسن ہی کے حکم سے ہوئی تھی۔ اُس نے تو محض ابوالحسن کو ڈرانے کے لئے یہ واقعہ بیان کیا تھا۔ ابوالحسن نے اس قصہ کو سن کر کہا "اے مکار بڑھیا۔ غور سے سن کہ نہ تو میں تیرا بیٹا ہوں۔ اور نہ ابوالحسن ہوں بلکہ امیرالمومنین بادشاہ بحر و بر ہوں۔ اور تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ میں نے ہی کوتوال کو ان لوگوں کی سزا کے لئے حکم دیا تھا۔ اور اُس نے میرے حکم کی تعمیل کی تھی۔ اب تو تیری بات سے بھی میرا امیرالمومنین ہونا ثابت ہوتا ہے۔"

ابوالحسن کی ماں یہ نہ سمجھ سکی کہ ابوالحسن امام مسجد کی سزا وغیرہ کا سن کر اپنے دعوے میں اور مستقل کیوں ہو گیا ہے۔ مگر اُس نے پھر کہا "بیٹا خدا کیلئے عقل کو کام میں لاؤ۔ اور ایسی فضول باتیں نہ کہو۔"

ابوالحسن نے کہا "اے بے حیا خاموش رہ ورنہ ایسی سخت سزا دونگا۔ کہ قیامت تک یاد رہے گی میں نے تجھے ایک دفعہ کہہ دیا کہ میں امیرالمومنین ہوں بھلا تجھے اس بات کے ماننے میں کیوں لیس و پیش ہے۔"

ابوالحسن کی ماں نے سمجھ لیا۔ کہ یہ دیوانہ ہو گیا ہے۔ اور اپنی محبت کی وجہ سے جو اُسے اپنے بیٹے ابوالحسن کے ساتھ تھی۔ اس کی حالت پر رونے لگی۔ لیکن ابوالحسن اس کے رونے پر اور غصہ میں آ گیا۔ اور کہا۔

"اے ملعونہ سچ بتا کہ میں کون ہوں۔"

اس نے نہایت محبت کے لہجہ میں کہا۔

"تو میرا پیارا بیٹا ابوالحسن ہے۔ جس کو میں نے جنا ہے۔ اور پرورش کیا ہے اور دودھ پلایا ہے۔ تو نے غلطی کی کہ اپنے آپ کو خواہ مخواہ امیرالمومنین کہتا ہے۔ بلکہ امیرالمومنین کا لفظ تو خاص ہمارے مہربان بادشاہ خلیفہ ہارون الرشید کے لئے ہے۔ جس کے ہم سب لوگ فرمانبردار اور وہ ہمارا خداوند نعمت ہے۔ اُس نے کل ہی ایک غلام کے ہاتھ ایک ہزار اشرفی کی تھیلی بھیجی ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ایسے امیرالمومنین کے لئے دعائے سلامتی مانگیں۔"

ابوالحسن کو یہ سنکر اپنے امیرالمومنین ہونے کا اور زیادہ یقین ہو گیا۔ پھر اپنی ماں کو مخاطب کر کے کہنے لگا "او مکار اب تک تجھے میرے امیرالمومنین ہونے کا یقین آیا؟" . . . یہ کہہ کر ابوالحسن نے ایک لاٹھی اٹھالی۔ اور اپنی ماں کو زور زور سے مارنے لگا۔ وہ غریب ضعیفہ اس کی اس بے رحمی پر چلانے لگی۔ اور گرد کے تمام لوگ جو اُس کے ہمسایہ تھے شور سن کر اکٹھے ہو گئے اور ابوالحسن کے ہاتھ سے لاٹھی چھین لی اور کہا "تجھے کیا ہو گیا ہے کہ تو اپنی ماں پہ ہاتھ اٹھاتا ہے۔ سعادتمند بیٹوں کا یہ کام نہیں کہ وہ اپنی ماؤں سے ایسا شرمناک سلوک روا رکھیں۔"

ابوالحسن یہ سنکر اور غصہ میں آ گیا اور کہنے لگا "ابوالحسن کون گدھا ہے جس کا یہ نام تم نے مقرر کیا ہے؟"

ابوالحسن کی یہ باتیں سنکر سب حیران ہو گئے۔ اور کہا کیا یہ تیری ماں نہیں ہے۔ اور کیا یہ تیرا گھر نہیں ہے۔ جس میں تو اس وقت کھڑا ہے؟ ابوالحسن اس کے جواب میں کہنے لگا "میں ہرگز ہرگز اس ذلیل اور بے حرمت عورت کو نہیں جانتا۔ اور نہ تمھیں پہچانتا ہوں۔ کہ تم کون ہو اور نہ میں ابوالحسن ہوں۔ بلکہ امیرالمومنین ہوں۔ اگر تم اس بات سے واقف ہو تو میں تم سب کو بتادونگا کہ میں خلیفہ ہوں"

سب ہمسایوں نے اس کو دیوانہ سمجھا۔ اور خیال کیا۔ کہ جس طرح اس نے اپنی ماں کو مارا ہے ہم کو بھی مار یگا۔ اس خیال سے ایک شخص نے دوڑ کر داروغہ پولیس کو خبر کی۔ اور پھر سب آدمیوں نے مل کر ابوالحسن کو پکڑ لیا۔ ابوالحسن نے کوشش کی کہ وہ ان لوگوں کے ہاتھ سے بھاگ جائے مگر نہ بھاگ سکا۔ داروغہ پولیس نے یہ حال دیکھ کر دو ایک ایسے اس زور کے کوڑے لگائے۔ کہ وہ تلملا اٹھا۔ پھر اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی اور پاؤں میں بیڑی ڈال دی اور جیل خانہ کی طرف لے چلا اب تو ابوالحسن کی آنکھیں کھلیں لوگ راستہ میں اُسے گھونسے مارتے تھے۔ کئی آدمیوں نے طمانچے لگائے۔ اور بہت سے لوگوں نے گالیاں دیں۔ گویا کہ ہر وہ فعل اس کے ساتھ کیا۔ جو دیوانوں کے لئے مخصوص ہے۔ جب اُس نے اس طرح ذلت اٹھائی۔ اور مار کھائی۔ تو اُسے معلوم ہوا کہ لوگوں نے مجھے دیوانہ خیال کر کے میرے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے حالانکہ میں ہوش میں ہوں۔ پھر داروغہ اسے جیل خانہ میں لے گیا۔ اور ایک لوہے کے پنجرہ میں بند کیا۔ اور ہر روز اسے باہر نکال کر پچاس کوڑے لگاتا۔ اور پوچھتا کہ اب بھی تو اپنے ہوش و حواس میں آیا ہے۔ یا بدستور اپنے آپ کو امیرالمومنین تصور کرتا ہے۔ دو ہفتہ تک ابوالحسن اسی مصیبت میں گرفتار رہا۔ اور ایک دن داروغہ سے کہا "یہ میری بدقسمتی تھی۔ کہ میں نے اس قدر ذلت اٹھائی۔ اور رسوا ہوا"

ابوالحسن کی ماں ہر روز جیل خانہ میں جاتی۔ اور ابوالحسن کو اس حال میں دیکھ کر روتی۔ پھر جب اس نے دیکھا کہ یہ دن بدن دبلا ہو رہا ہے۔ اور تمام جسم اس کا مجروح ہو رہا ہے۔ تو یہ دیکھنے کے لئے کہ اب بھی اُس کے ہوش و حواس درست ہوئے ہیں یا نہیں۔ امتحاناً اس سے گفتگو کرنے لگی۔ ابوالحسن بھی اب ان تمام واقعات کو جو اُس نے خلیفہ کے محل میں دیکھے تھے۔ بھول گیا تھا۔ اور اُس نے سمجھ لیا کہ سب خواب و خیال تھا۔ اور یہ سوچا۔ کہ اگر یہ خواب نہ ہوتا تو میں بعد بیدار ہونے کے کس طرح اپنے گھر میں ہوتا۔ لیکن حیران تھا کہ موذن وغیرہ کو جو سزا ہوئی۔ اور میری والدہ کو ایک تھیلی اشرفیاں جو ملیں یہ سب کس طرح ظہور پذیر ہوا۔ یہی باتیں ہیں۔ جو میرے شک کا باعث ہیں کہ میں خلیفہ ہوں۔ اب حیران ہوں۔ کہ کس کو خواب سمجھوں اور کس کو نہ سمجھوں۔

ابوالحسن ایک دن انھیں باتوں پر غور کر رہا تھا۔ کہ اس کی ماں اُس سے ملنے کے لئے آئی۔ اور یہ حال اندر کر دیکھ کر رونے لگی۔ ابوالحسن نے ماں کو اسی طریق سے سلام کیا جیسے وہ ہمیشہ کرتا تھا۔ ماں نے پوچھا۔

"بیٹا اب تو تیرے دماغ میں وہ خیال نہیں۔ جس کی وجہ سے تو اس حال کو پہنچا"

ابوالحسن نے کہا "اماں میرا قصور معاف کرو۔ میں واقعی ایک غلط خیال میں مبتلا تھا۔ میں خلیفہ نہیں ہوں۔ ابوالحسن ہوں۔ اور تمھارا بیٹا ہوں"

ابوالحسن کی ماں اس کی یہ باتیں سن کر نہایت خوش ہوئی۔ اور کہا کہ اب میرا بیٹا اچھا ہو گیا ہے۔ پھر وہ ابوالحسن سے مخاطب ہوئی اور کہا "وہ مسافر جو سوداگر تھا۔ اور جو صبح کو دیوان خانے کے دروازے کھلے چھوڑ کر چلا گیا۔ مگر شیطان تھا۔ جس نے تمھیں اس قدر بہکا دیا" ابوالحسن نے کہا "واقعی وہ موصلی سوداگر ایک شیطان تھا۔ جس نے مجھے خراب کیا۔ خدا کا شکر ہے۔ کہ اب میں اچھا ہو گیا ہوں۔ مجھ کو یہاں سے گھر لے چلئے"

پھر ابوالحسن نے داروغہ سے کہا اس نے اُس کی والدہ کے کہنے پر اُسے چھوڑ دیا۔ ابوالحسن اپنے گھر آ گیا۔ اور کتنے روز کے بعد اس کے بدن میں طاقت آئی۔ پھر وہ حسب دستور سابق ایک نیا مہمان ہر روز اپنے گھر لے آتا۔ اور صبح اس کو رخصت کر دیتا ایک دن وہ پھر کسی مہمان

کی تلاش میں جب بغداد کے پل کے قریب گیا۔ تو اتفاقاً اس دن بھی خلیفہ ایک موصلی سوداگر کے بھیس میں گذر رہا تھا۔ ابوالحسن نے اسے دور سے دیکھا تو پہچان لیا کہ یہی وہ سوداگر ہے جس کی وجہ سے میں نے اس قدر مصیبت اُٹھائی۔ اگر یہ میرا مہمان نہ ہوتا۔ تو مجھے اس قدر مصیبت برداشت نہ کرنی پڑتی۔ یہ خیال کر کے وہ ڈرا۔ اور کہا کہ خدا مجھے ایسے منحوس آدمی سے بچائے۔ جب وہ قریب پہنچا تو اس کی طرف سے منہ پھیر کر دریا کو دیکھنے میں مشغول ہو گیا۔ اور اپنی طرز سے یوں ظاہر کیا کہ جیسے اُس نے اس کو دیکھا ہی نہیں۔ ادھر خلیفہ ابوالحسن کی تلاش میں تھا۔ کہ اگر پھر وہ مل جائے تو اُسے محل میں لے جا کر اس کی تمام تکالیف کی تلافی کر دے اور عمر بھر کے لئے مستغنی بنا دے۔ بہرحال خلیفہ نے بھی اُسے پہچان لیا۔ اور قصداً اس کے نزدیک جا کر کھڑا ہو گیا اور چاہا کہ ابوالحسن سے صاحب سلامت کرے لیکن ابوالحسن نے اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اور کہا۔

"مجھے نہ تمہارے سلام اور نہ آداب کی ضرورت ہے۔ اپنی راہ لو۔" خلیفہ نے کہا "کیا تمہیں یاد نہیں۔ کہ میں تمہارا واقف ہوں اور تم نے ہی مجھے ایک مہینہ گذرا ہے۔ اس جگہ سے اپنے گھر لے جا کر نہایت پر تکلف کھانا کھلایا تھا۔" ابوالحسن نے کہا "مجھے یاد نہیں۔ کہ میں نے تمہیں پہلے کبھی دیکھا بھی تھا جاؤ اور اپنا کام کرو۔"

خلیفہ نے خیال کیا کہ شاید یہ اپنے اس عہد کی وجہ سے جو اس نے کیا ہوا ہے کہ سوائے ایک بار کھانا کھلانے کے پھر اس سے بات نہ کرے گا۔ یہ مجھ سے متنفر ہے پھر خلیفہ نے کہا "افسوس کہ تم نے مجھے فراموش کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں اس عرصہ میں کوئی نہایت زبردست صدمہ پہنچا ہے جس کی وجہ سے تم اس قسم کی باتیں کر رہے ہو بخدا اگر تم مجھ سے اپنی تکلیف بیان کرو۔ تو میں حسب دلخواہ تمہاری مدد کروں۔"

ابوالحسن نے کہا "مجھے تم سے کسی مدد کی ضرورت نہیں مجھے تو یہ یاد ہے کہ محض تمہاری وجہ سے میں دیوانہ بنا ہوں۔ خدا کے لئے مجھ سے بات نہ کرو۔ اور اپنی راہ لو۔ میرے پاس سے ہٹ جاؤ۔ اور مجھے نہ ستاؤ۔"

خلیفہ جھٹ ابوالحسن کے گلے لگ گیا اور کہا "یہ ناممکن ہے کہ میں اب تمہیں چھوڑ کر پھر دوسری جگہ جاؤں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں نے تمہیں دیکھا اب پھر مجھے اپنے گھر لے جاؤ اور پہلے کی طرح میری دعوت کرو۔ یہ میری تمنا ہے کہ میں پھر ایک دفعہ تمہارے ساتھ مے نوشی کروں۔"

ابوالحسن نے کہا "مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں پھر ایسے شخص سے ملوں جس کی وجہ سے مجھے اس قدر تکلیف پہنچی ہو۔"

خلیفہ ابوالحسن کے گلے لگ گیا اور کہا "میرے پیارے دوست! خدا کے لئے مجھے بتاؤ۔ کہ وہ کونسی تکلیف ہے جو تمہیں میری وجہ سے پہنچی کیونکہ میری خواہش ہے کہ میں تمہارے دکھ درد میں ہاتھ بٹاؤں اور تمہاری مدد کروں اور اگر مجھ سے کچھ قصور ہوا ہو تو اس کی تلافی کروں۔"

ابوالحسن نے خلیفہ کو اپنے پاس بٹھا لیا اور شروع سے آخر تک تمام رام کہانی جو اس پر گذری تھی کہہ سنائی خلیفہ پہلے بھی ان تمام باتوں کو جانتا تھا۔ ابوالحسن کی زبانی سُن کر خوب ہنسا اور زور سے قہقہہ لگایا ابوالحسن نے کہا۔

اے سوداگر موصلی میں جانتا تھا کہ تو میری داستان غم سُن کر مجھ سے اظہار ہمدردی کرے گا۔ اور اپنے قصور پر نادم ہو کر مجھ سے اُس کی معافی چاہے گا۔ لیکن افسوس ان تمام باتوں کے خلاف تو میری باتوں پر ہنستا ہے اور مجھے بیوقوف بناتا ہے اگر تجھے میری باتوں پر اعتبار نہیں آتا۔ تو میری پیٹھ کو دیکھ کہ اس قدر ضربات کے اس پر نشان ہیں۔"

خلیفہ نے اس کے بدن پر داغ دیکھ کر اظہار افسوس کیا۔ اور اس کو پھر گلے سے لگایا اور کہا "بھائی مجھے تمہارے داغ دیکھ کر نہایت افسوس ہوا ہے لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا اب کیا ہو سکتا ہے خدا کے لئے میرا قصور معاف کر دو۔ اور مجھے اپنے ہمراہ گھر لے چلو۔ اور مجھے کھانا کھلاؤ۔ صبح کو میں دیوان خانہ کا دروازہ بند کر کے چلا جاؤں گا۔"

ابوالحسن اب خلیفہ کو اپنے گھر لے جانے کے لئے مجبور ہو گیا۔ اور آخر الامر دونوں شہر کی جانب چلے اثنائے راہ میں خلیفہ نے ابوالحسن کو

اپنی طرف متوجہ کر کے کہا۔

"دوست تم میرے جیسے ہمدرد اور یک رنگ دوست سے بدگمان نہ ہو جو ہر حال میں تمہاری بہتری اور بھلائی کا خواستگار ہے اور میں اقرار کرتا ہوں۔ کہ ہرگز ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہ کرونگا۔"

ابوالحسن نے کہا" جو تم کہتے ہو سب درست ہے لیکن آئندہ پھر کبھی میری دعوت کی امید نہ رکھنا۔ یہ جتنی تکلیفیں مجھے پہنچیں سب تمہاری وجہ سے تھیں۔"

خلیفہ نے مسکرا کر کہا" بھائی تم بڑے بدگمان ہو باوجود اس قدر معذرت کرنے کے بھی تم مجھ پر بدگمانی کرتے ہو۔"

الغرض اسی طرح باتیں کرتے شام ہونے پر ابوالحسن کے گھر پہنچے ابوالحسن نے اپنی ماں سے طرح طرح کے کھانے پکوائے اور خلیفہ کے آگے رکھے پھر دستر خوان بچھایا۔ اور اس پر میوے وغیرہ رکھے۔ کھانا کھانے کے بعد دونوں شراب نوشی میں مشغول ہوئے خلیفہ اور ابوالحسن نے متواتر کئی گلاس پیئے اور ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے ابوالحسن جب خوب نشہ میں آیا۔ تو خلیفہ نے پوچھا۔

"تم کبھی کسی پر عاشق بھی ہوئے ہو یا نہیں؟"

ابوالحسن نے کہا" میں کبھی کسی پر عاشق نہیں ہوا۔"

پھر خلیفہ نے پوچھا" تمہیں کس چیز سے زیادہ رغبت ہے؟"

ابوالحسن نے کہا" مجھے اچھی شراب پینے اور دوستوں سے خوش گپیاں اڑانے کی بڑی خواہش ہے اور ہاں یہ بھی چاہتا ہوں کہ میری شادی اس حسینہ کے ساتھ ہو۔ جو عالم خواب میں میرے ساتھ شراب پیتی تھی اور بانسلی بجاتی تھی۔ اور خوب مزے مزے کی باتیں کرتی تھی اور میں جانتا ہوں اس خوبی و تعریف کی عورت سوائے شاہی محل کے اور کسی جگہ نہ ملے گی۔"

پھر ابوالحسن نے ایک جام بھر کر خلیفہ کو دیا۔ اور کہا" لو پیو۔ یہ آخری جام ہے۔"

خلیفہ نے لے کر پی لیا۔ پھر خلیفہ نے ایک جام بھر کر اس میں سفوف بے ہوشی ملا کر ابوالحسن کو دیا۔ اور کہا" یہ جام اس بی بی کی یاد میں ہے جسے تم نے خواب میں بانسلی بجاتے ہوئے دیکھا تھا۔"

ابوالحسن نے وہ جام بے ہوشی سے کر پی لیا۔ اور کچھ دیر کے بعد غافل ہو گیا۔ خلیفہ نے غلام کو اشارہ کیا کہ اس کو اٹھا لے اور باحتیاط محل کو لے جا اور خلیفہ ابوالحسن کے مکان کا دروازہ بند کر کے خود بھی ساتھ ہو لیا۔

پھر خلیفہ نے حکم دیا۔ کہ اس کو چوتھی بارہ دری میں لے جا کر میرے پلنگ پر لٹا دو۔ پھر خواجہ سراؤں سے کہا۔ اسے میری پوشاک پہنا دو انھوں نے حکم کی تعمیل کی اور خلیفہ کی شب باشی والی پوشاک اسے پہنا دی۔

خلیفہ صبح ہوتے ہی ابوالحسن کی خوابگاہ کی جانب گیا۔ تاکہ وہاں پہنچ کر تمام باتوں کو دیکھے غرضیکہ جب ابوالحسن صبح کو بیدار ہوا تو اس نے سونے کے اگالدان اور سب ساز و سامان کو دیکھا کہ گانے بجانے والی کنیزیں باقاعدہ کھڑی ہیں اور اپنے سازوں کو ملا کر گا رہی ہیں ابوالحسن یہ حالی دیکھ کر نہایت حیران ہوا اور اپنے ارد گرد خواجہ سراؤں اور خواصوں کو دیکھ کر نہایت متعجب ہوا اور گذشتہ تمام کیفیت اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئی اور کمرہ کو بھی دیکھ کر پہچان لیا کہ یہ وہی کمرہ ہے جس میں ایک دفعہ پہلے بیدار ہوا تھا اور یہ سب ساز و سامان وہی ہے جو پہلے بھی تھا۔

خلیفہ نے گانے بجانے کو موقوف کرا دیا تاکہ وہ اپنے مہمان کی حرکات کو دیکھے اور اس کی باتوں کو سنے سب دیگر قرینہ سے اپنے اپنے مقام پر کھڑے تھے۔ ابوالحسن نے کہا۔

"آج میں پھر اسی خوفناک خواب کو دیکھ رہا ہوں۔ جو میں نے پہلے دیکھا تھا اور اب پھر حسبِ سابق مجھے قفس میں قید ہونے کا وقت آگیا ہے۔ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالی جائیں گی اور میرے پاؤں میں بیڑیاں پہنائی جائیں گی۔ اور پھر کئی دن تک مجھ کو مار پڑے گی۔ بے شک وہ شخص جو کل شام میرے گھر آیا تھا نہایت بدمعاش ہے باوجود اس کے کہ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں دیوان خانہ کا دروازہ بند کر جاؤں گا۔ لیکن اُس نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا اور دیوان خانہ کا دروازہ کھلا چھوڑ کر چلا گیا۔ شیطان کو موقع مل گیا اور وہ اندر آگیا اور اس نے یقیناً میرے دماغ میں حلول کر لیا ہے جو اسی قسم کے خیالات میرے دماغ میں پیدا ہونے شروع ہوئے ہیں جن کی وجہ سے میں اپنے آپ کو خلیفہ خیال کرنے لگا ہوں اللہ مجھے ایسے خیالات فاسدہ سے محفوظ رکھے۔"

یہ کہہ کر ابوالحسن نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دیر تک غور کرتا رہا تھوڑی دیر کے بعد پھر آنکھیں کھولیں اور وہ سب سازو سامان دیکھا اور حیران رہ گیا۔ اور دعا مانگی کہ "خدا تعالیٰ مجھے شیطان کے مکر و فریب سے بچا۔" پھر اپنے دل میں ارادہ کیا۔ کہ بالکل خاموش پڑا رہے شیطان وہ بہر حال خود بخود تھک کر چلا جائے گا لیکن محل کے لوگوں نے اسے اس طرح نہ رہنے دیا۔ راحت جان نامی ایک خواص ابوالحسن کے نزدیک آکر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔

"یا امیر المومنین اب آرام کرنے کا وقت نہیں ہے۔ صبح ہو گئی پھر دن نکل آیا ہے اُٹھئے سب لوگ حضور کا انتظار کر رہے ہیں۔"

ابوالحسن نے کہا "اے شیطان مردود اُٹھ میرے پاس سے دفع ہو جا کیوں مجھے خواہ مخواہ امیر المومنین بناتی ہے۔"

راحت جان نے کہا "آپ درحقیقت امیر المومنین ہیں اور تمام مسلمانوں کے حاکم ہیں اور میں حضور کی ایک ادنیٰ کنیز ہوں شاید آپ نے کوئی خواب بد دیکھا جو اس طرح کی باتیں کرتے ہیں اگر آپ اچھی طرح دیکھیں، تو ضرور آپ کا شک رفع ہو جائے۔ آپ کے حیران ہونے کی وجہ نہیں۔"

غرضیکہ راحت جان کے اس طرح باتیں بنانے پر ابوالحسن اُٹھ بیٹھا۔ اور آنکھیں کھولی کہ پہلے سردار بیٹا اور دیگر کنیزوں کو پہچانا۔ وہ سب پاس آکر کھڑی ہو گئیں۔ اور کہنا شروع کیا۔

"یا امیر المومنین! اُٹھئے دن ہو گیا ہے۔"

ابوالحسن نے آنکھیں کھول کر کہا "میں تو عاجز ابوالحسن ہوں اور اپنے آپ کو خوب جانتا ہوں۔ مجھے امیر المومنین کیوں کہتے ہو؟"

انہوں نے کہا "یا امیر المومنین! ہم تو ابوالحسن کو نہیں جانتے کہ وہ کون ہے آپ کیوں اس کا نام لے رہے ہیں اب پھر خدا کے لئے ایسا نہ کہئے گا کہ میں امیر المومنین نہیں!"

ابوالحسن نے کہا کہ یہ عجب طلسم بازی ہے کہ میں اپنے آپ کو اس بارہ دری میں دیکھتا ہوں جس میں پہلے تھا اور وہی خواب دیکھ رہا ہوں۔ جو پہلے دیکھا تھا۔ پھر ابوالحسن کے دل میں سزا و قید سے ڈر پیدا ہو گیا۔ اور آنکھیں بند کر کے تکیے سے لپٹ گیا راحت نے کہا۔

"یا امیر المومنین آپ بیدار ہو جئے۔ تمام درباری سلام کی خاطر در دولت پر حاضر ہیں۔"

پھر دو نوں خواصوں نے ابوالحسن کے بازو تھام کے اُٹھایا اور بارہ دری کی درمیانی مسند پر بٹھا دیا۔ اور تمام خواصیں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کے رقص کرنے لگیں اور تمام ساز بجنے لگے جب چاروں طرف سے گانے بجانے کا شور اُٹھا تو ابوالحسن دل میں خیال کرنے لگا کہ میں واقعی امیر المومنین ہوں اُس نے چاہا کہ کچھ باتیں کرے لیکن شور و غل میں کچھ سنائی نہ دیا۔ پھر اس نے کوکب الصبح کو اشارہ سے بلایا اور کہا۔

"تو سچ بتا کہ میں کون ہوں۔"

اس نے جواب دیا "یا امیر المومنین! آپ امیر المومنین ہیں اور بھلا آپ ہی بتائیں کہ آپ امیر المومنین نہیں ہیں تو کون ہیں آپ نے کیوں ایسی

جلد ہی اپنے آپ کو بھلا دیا اگر آپ اجازت دیں۔ تو ہم وہ سب باتیں آپ کے سامنے بیان کریں جو آپ نے کی تھیں۔"

کوکب الصبح کی اس تقریر کی تمام خواجہ سراؤں اور خواصوں نے تائید کی اور کہا "حضور آپ اٹھیں اور نماز فجر ادا کریں۔"

ابوالحسن نے کہا "اے شعبدہ سازو۔ اگرچہ تم سب حسین ہو لیکن عقل و فکر سے خالی ہو پہلے میں نے اس خواب کو دیکھ کر نہایت تکل اُٹھائی تھی۔ قید خانہ میں قید کیا گیا تھا اور پچاس تازیانے میری پیٹھ پر پڑتے تھے جن کی وجہ سے میرے بدن کی کھال تک اُتر گئی اور بدن پر سیاہ داغ پڑ گئے۔"

کوکب الصبح نے کہا "یا امیر المومنین یہ سب باتیں آپ نے خواب میں دیکھی ہوں گی حضور تو کل سے یہیں ہیں کہیں نہیں گئے تمام رات بارہ دری میں موجود تھے۔" ابوالحسن نے کہا "بے شک تم سچ کہتی ہو اور دل میں خیال کیا کہ میں جب سے محل میں آیا ہوں۔ کہیں بھی باہر نہیں اور اس امر میں متعجب ہوا کہ آیا میں اس قید خانہ اور مار کی حالت کو سچ جانوں یا اس کو۔ اور ان دونوں میں سے خواب کس کو تصو پھر کہنے لگا "اے خدا میں امیر المومنین ہوں یا ابوالحسن ہوں جو کچھ ہے مجھ پر روشن ہو جائے۔"

پھر ابوالحسن نے اپنا تمام بدن کھول کر دکھایا۔ اور کہا کہ دیکھو کہ ان داغوں میں آج تک درد ہوتا ہے اور یہ ایک روشن دلیل میں ابوالحسن ہوں امیر المومنین نہیں ہوں۔ پھر ایک خواص کو اپنے پاس بلایا۔ اور اس سے کہا "تو میرے کان کو کاٹ تاکہ میں تمیز کر سو رہا ہوں یا جاگتا ہوں۔"

خواص نے اس زور سے کاٹا کہ ابوالحسن تلملا اُٹھا اور درد سے چلا کر شور و غل مچایا۔ اس کے یکبارگی شور کرنے پر خواصوں ساز بجانے شروع کر دیئے۔ اور خواجہ سرا بھی ناچنے لگے۔ ابوالحسن یہ دیکھ کر خود بھی ناچنے لگا اور کودنے لگا اور حالت جوش میں اپنے کپڑے اُتار ڈالے اور صرف ایک پاجامہ رہنے دیا۔ اور خود ناچتا ناچتا تا دوہرا ہو جاتا کہ زمین کے ساتھ اس کا سر لگتا۔ غرضیکہ مسخرہ پن کی کوئی حرکت باقی نہ چھوڑی۔ خلیفہ اس حال کو دیکھ کر بے قرار ہو گیا۔ اور ہنستے ہنستے لوٹ گیا۔ اور بے ساختہ کہنے لگا۔

"اے ابوالحسن خدا کے لئے ان حرکات کو موقوف کر کیا مجھے ہنساتے ہنساتے مار ڈالے گا؟" خلیفہ کی یہ بات سن تمام ساز بجانے نے ساز بند کر دیئے اور ابوالحسن بھی اس وقت اس طرف دیکھنے لگا۔ جہاں سے یہ آواز آتی معلوم ہوئی تھی ابوالحسن نے خلیفہ کو دیکھ کر اور کہا "آنجناب ہی سوداگر موصل بنے ہوئے تھے۔ اور پھر سمجھ گیا کہ یہ بیداری ہے خواب نہیں ہے" اور بادشاہ نے یہ جو کچھ کیا ہے صر اور مذاق کے طور پر کیا ہے۔ پھر خلیفہ سے کہا "سبحان اللہ کہ حضرت ہی سوداگر موصل کے لباس میں تھے اور میری تمام مصیبتوں اور کا باعث ہوئے۔"

خلیفہ نے کہا "اے ابوالحسن بیشک تو سچا ہے اور میں انشاء اللہ تیری تمام تکالیف کی تلافی کروں گا اور تیرے ساتھ وہ سلوک کرو آج تک کسی کے ساتھ نہ کیا ہو۔ پھر خلیفہ نے مسرور سے کہا۔

کہ ابوالحسن کو ایک نہایت عمدہ جوڑا پہناؤ۔ جب ابوالحسن کو پوشاک پہنا دی گئی۔ تو خلیفہ نے اسے گلے لگا لیا اور کہا۔ میں تجھے بھائی سمجھتا ہوں۔ اب جو تو کہے گا وہی کیا جائے گا۔"

ابوالحسن نے کہا "خداوند! میرے ساتھ اس طرح مذاق کرنے میں حضور کو کیا فائدہ تھا؟"

خلیفہ نے اسے قصّے کے سب حال اوّل سے آخر تک کہہ سنایا۔ اور کہا "اب تو خاطر جمع رکھ انشاء اللہ سب باتوں کی تلافی

ابوالحسن نے کہا "خداوند! جو تکلیف جناب کے اس مذاق میں مجھ پر گزری ہے۔ وہ مجھے تمام عمر یاد رہے گی ..... میری ایک آرزو اور وہ یہ ہے کہ مجھے یہاں آنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔"

خلیفہ نے کہا "میں تیری ماں ایک تماشا کو پیدا کرتا ہوں اور تجھے ہر وقت یہاں آنے کی اجازت دیتا ہوں"۔

پھر خلیفہ نے ابوالحسن کو ایک مکان عطا کیا اور ایک ہزار اشرفی نقد دیں اور اس کا ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ پھر جب خلیفہ دربارِ عام کو تشریف لے گئے۔ ابوالحسن اپنے گھر پر آیا اور اپنی ماں سے تمام واقعہ بلاکم وکاست بیان کیا اور کہا کہ جو واقعہ مجھ پر گزرا تھا۔ وہ سب صحیح اور درست تھا۔ اور عین بیداری کی حالت میں تھا۔ خلیفہ نے فی الواقعی مجھے اپنا مصاحب مقرر کیا ہے۔

ابوالحسن اور خلیفہ کا یہ قصہ تمام بغداد میں مشہور ہو گیا اور پھر وہاں سے دوسرے ملکوں تک پہنچ گیا پھر ابوالحسن ہر روز خلیفہ کے پاس رہتا اور اُسے اپنی لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی سے خوش رکھتا ایک دن خلیفہ ابوالحسن کو اپنے ہمراہ زبیدہ خاتون کے محل میں لے گیا۔ اور اس کے تمام قصہ کو بیان کیا جسے وہ سن کر نہایت محظوظ ہوئی۔ پھر ابوالحسن خلیفہ کے ہمراہ زبیدہ کی خدمت میں جایا کرتا ایک دن اثنائے گفتگو میں زبیدہ نے خلیفہ سے کہا۔

"میں چاہتی ہوں کہ نزہت کی شادی ابوالحسن سے کر دی جائے کیونکہ وہ اکثر اس کو دیکھتا رہتا ہے اور نزہت بھی اس امر میں راضی ہے"۔

خلیفہ نے کہا "تو نے یہ بات تو میرے دل کی کہی ہے کیونکہ میں نے بھی ابوالحسن سے وعدہ کیا تھا کہ تجھے ایک نہایت خوبصورت بی بی دوں گا اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے آج ہی دونوں کی شادی کر دینی چاہیئے تاکہ وعدہ وفا ہو جائے"۔

جس قدر خلیفہ ابوالحسن کو چاہتا تھا اسی قدر زبیدہ نزہت سے پیار رکھتی تھی۔ خلیفہ نے ابوالحسن کی شادی نہایت دھوم دھام سے کی اور زبیدہ نے بھی نزہت کو نہایت بیش بہا جہیز دیا۔ اور خلیفہ نے بہت سا سونا موتی نزہت کو عنایت کیا ابوالحسن نزہت کو اس مکان میں لے گیا جو خلیفہ نے اسے پہلے دے رکھا تھا پھر تمام اہلِ محلہ کی نہایت پُرتکلف دعوت بطور ولیمہ کے کی اور کئی روز تک راگ رنگ کی محفل رہی نزہت اور ابوالحسن دونوں آپس میں نہایت پیار و محبت سے رہنے لگے اور آپس میں کبھی جدا نہ ہوتے سوائے ان اوقات کے جس وقت ابوالحسن خلیفہ کی خدمت میں جاتا اور نزہت زبیدہ کی خدمت میں جاتی نزہت نہایت پسندیدہ خصلت والی عورت تھی اور ابوالحسن جان و دل سے اس پر فدا تھا ابوالحسن اور نزہت فطرتاً سخی تھے اس لئے کھانا اچھا کھاتے کپڑے اچھے پہنتے شراب بھی نفیس پیتے اس کے علاوہ جو کوئی مفلس کا خواجہ سرائے یا کنیز وغیرہ ملنے کے لئے آتے تو انہیں بغیر کھانا کھائے نہ جانے دیتے، اور حسب استطاعت بعض کو خلعت اور انعام وغیرہ بھی دیتے علاوہ اس کے گانے بجانے کا بھی شوق رکھتے اور سوائے معمولی کھانوں کے مٹھائیاں وغیرہ بھی کھاتے اور خوب سیر کرتے ایک مدت انہیں اشغال میں گزر گئی اور جس قدر روپیہ پیسہ تھا سب صرف ہو گیا ابوالحسن نے خلیفہ سے عہد کر لیا تھا کہ وہ اب کوئی رقم نہ مانگے گا ادھر نزہت کا زبیدہ سے یہی اقرار تھا۔ اب دونوں بموجب اپنے وعدوں کے کچھ نہ مانگ سکتے تھے۔ ایک دن باورچی نے بھی اپنا بھی حساب وغیرہ دکھایا اور توشہ خانہ والے نے بھی نفیس پوشاکوں کی قیمت طلب کی اور کئی ایک سوداگروں کی رقم بھی واجب الادا تھی جو کچھ ابوالحسن اور نزہت کے پاس تھا وہ سب انہیں کو دے ڈالا۔ لیکن پھر بھی کئی ایک رقوم واجب الادا رہ گئیں اور بسر اوقات میں بھی تنگی درپیش ہوئی۔ اب ابوالحسن نے نزہت سے کہا۔

"اب سوائے مکاری اور فریب کے گذارہ نہیں میں نے ایک تجویز سوچی ہے جس کے باعث ہم دونوں کچھ نہ کچھ روپیہ خلیفہ اور زبیدہ سے لے کر رہیں گے"۔

نزہت نے ابوالحسن سے پوچھا "وہ کونسا حیلہ ہے جو تم نے تجویز کیا ہے"؟

ابوالحسن نے کہا "یہ ہے کہ ہم تم دونوں مریں"۔

نزہت نے کہا "میاں تم مرتے ہو تو مرو میں تو نہ مروں گی"۔ ابوالحسن نے کہا "آخر تم عورت ہو نا کہ مرنے کا نام سن کر گھبرا گئیں۔ لیکن ایسا

مرنے کی کیفیت نہیں تھی کہ وہ مرنا کس قسم کا ہوگا میری مراد مرنے سے درحقیقت مرنا نہیں بلکہ ایک جھوٹ موٹ کا فریب ہوگا۔"

نزہت نے کہا "اگر یہ بات ہے تو بتاؤ میں اس کے لئے تیار ہوں۔"

ابوالحسن نے کہا۔ ..... "میں سیدھا لیٹ جاؤنگا اور اپنے آپ کو مُردہ بنالونگا تم مجھے ایک سفید چادر سے کفنا دینا جیسے کہ میں درحقیقت مرگیا ہوں پھر ایک پگڑی میرے سر پر باندھ دینا اور میرے مرنے کی خبر مشہور کردینا اور اپنے سر کے بال نوچتی ہوئی کپڑے وغیرہ پھاڑ کر زبیدہ کے پاس جانا اور میرے مرنے کا حال بیان کرنا وہ میری تجہیز و تکفین کے لئے تمہیں بہت کچھ دے گی وہ لے کر چلی آنا جب تم آؤگی تو میں اُٹھ کھڑا ہوں گا۔ پھر تم اپنے آپ کو مردہ بنالینا اور میں تمہیں کفن وغیرہ پہنا کر خلیفہ کے پاس جاؤنگا اور تمہیں مردہ بیان کرکے کچھ نہ کچھ وصول کرلونگا۔"

نزہت نے یہ سُن کر کہا "یہ حیلہ اور فریب تو نہایت مزے کا ہے۔ اس صورت میں واقعی بہت کچھ ہمارے ہاتھ لگ جائیگا۔"

پھر ابوالحسن ایک کمرہ میں لیٹ گیا اور نزہت نے اسے کفنا دیا اور وہاں سے روتی پیٹتی محل میں گئی۔ اور زبیدہ سے جاکر ابوالحسن کے مرنے کا حال بیان کیا زبیدہ سُن کر بہت روئی اور محل کے تمام خواصوں نے افسوس کیا رونے دھونے کے بعد نزہت سے زبیدہ نے کہا۔

"وہ بے چارہ تمہاری وجہ سے مرگیا۔ تمہاری ہر روز کی فرمائشوں نے اُسے تنگ کرڈالا تھا۔"

نزہت نے کہا "میں تو اسے دل سے پیار کرتی ہوں۔ میں نے کبھی بھی اس کو تنگ نہ کیا تھا۔"

پھر زبیدہ نے ایک ہزار اشرفی نقد اور ایک جوڑا کمخواب کا نزہت کو دیا اور کہا "اسے اچھی طرح فاتحہ درود میں صرف کرنا۔" نزہت یہ رقم وغیرہ وہاں سے لے کر گھر کو آئی اور اشرفیاں وغیرہ ابوالحسن کو لاکر دیں ابوالحسن دیکھ کر نہایت خوش ہُوا اور پھر اس نے نزہت سے کہا۔

"اب تم جلد اپنے آپ کو مردہ بنالو اور دیکھو کہ میں پھر کیا کام کرتا ہوں۔ اور خلیفہ سے کس طرح رقم وصول کرتا ہوں۔" غرضیکہ نزہت نے اپنے آپ کو مردہ بنالیا ابوالحسن وہاں سے روتا پیٹتا عین دوپہر کے وقت خلیفہ کے سامنے پہنچا خلیفہ نے اسے اس حالت میں دیکھ کر تمام توجہ اس کی طرف پھیری اور پوچھا۔ "ابوالحسن تو کیوں روتا ہے۔"

ابوالحسن نے کہا "خداوند! میری عورت نزہت مرگئی ہے۔"

خلیفہ نے یہ سُنکر بہت افسوس کیا اور خود بھی رویا۔ جعفر اور دیگر اراکین بھی ابوالحسن کو اس حالت میں دیکھ کر رو دیئے خصوصاً خلیفہ کو نزہت کی فوتیدگی سے بہت رنج ہُوا۔ اور پھر ایک ہزار اشرفی اور کمخواب کا تھان دے کر کہا "جاؤ نزہت کی تجہیز و تکفین نہایت اچھی طرح کرو۔" ابوالحسن وہاں سے اشرفیاں وغیرہ لے کر سیدھا گھر آیا۔ اور آکر نزہت کو دکھلائیں۔ نزہت خوش ہو کر اُٹھ بیٹھی۔ اب ادھر کی سُنیئے خلیفہ کو نزہت کے مرنے کا نہایت رنج تھا اور زبیدہ کو ابوالحسن کے مرنے کا داغ تھا۔ خلیفہ نزہت کے مرنے کا افسوس کرنے کے لئے زبیدہ کے محل میں گیا اُسے نہایت مغموم دیکھ کر اُس کی تسلی وغیرہ کی اور کہا۔

"اگرچہ تمہاری کنیز نہایت اچھی اور وفادار تھی لیکن قضائے الٰہی کے آگے کچھ پیش نہیں چلتی۔"

زبیدہ یہ سُنکر حیران ہوئی۔ اور خیال کیا کہ شاید خلیفہ کو کچھ دھوکا ہوگیا ہے جو بجائے ابوالحسن کے مرنے کے نزہت کے مرنے کا نام لیتے ہیں۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

"خداوند! میری کنیز نزہت تو زندہ ہے۔ حضور کا مصاحب ابوالحسن چل بسا ہے۔" خلیفہ حیران ہو کر مسرور سے مخاطب ہُوا "کہ زبیدہ نے جو کہا ہے۔ تم نے سُنا؟"

مسرور نے کہا "مجھے شاہزادی کی عقل پر تعجب ہے۔ کہ ایسا خلاف واقعہ قصہ بیان کیا۔"

خلیفہ نے کہا "تم میرے مصاحب ابوالحسن کے لئے افسردہ ہو۔ وہ تو تندرست ہے۔ اپنی کنیز نزہت کا غم کرو جو مرگئی ہے۔ ابوالحسن ابھی

تھوڑی دیر ہوئی ہے میرے پاس روتا ہوا آیا تھا۔ اور اُس نے نزہت کے مرنے کا حال بیان کیا تھا میں نے اُس کی تجہیز و تکفین کے لئے ایک ہزار اشرفی اور ایک تھان کمخواب کا دے دیا تھا۔ مسرور اس وقت موجود تھا۔ اُس نے ابوالحسن کو خود اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ اگر تمھیں کچھ شبہ ہو تو اُس سے پوچھ لو۔"

زبیدہ نے کہا "تم کو ہر وقت مذاق ہی سوجھتا ہے۔ مرا تو ابوالحسن ہے تم تعزیت میری لونڈی کی کرتے ہو۔ ہمارا تمھارا فرض ہے کہ ابوالحسن کا غم کریں۔"

خلیفہ نے کہا "میں سچ کہتا ہوں۔ مذاق نہیں کرتا میرا مصاحب ابوالحسن جیتا ہے۔"

زبیدہ نے کہا "تم جھوٹ کہتے ہو۔ بلکہ میری بیوہ کنیز زندہ ہے ابھی تھوڑا ہی وقفہ گذرا ہے کہ وہ بے چاری میرے پاس روتی ہوئی آئی تھی۔ اور اُس کی حالت دیکھ کر میں بھی روئی۔ اور دیگر خواصیں بھی روئیں۔ پھر میں نے اسے ایک ہزار اشرفی اور ایک تھان کمخواب کا دیا۔ تاکہ وہ ابوالحسن کی تجہیز و تکفین اچھی طرح کرے اور میں ابھی اس خیال میں تھی۔ تم کو تمھارے مصاحب کے مرنے کی اطلاع کرتی کہ اتنے میں تم خود آ گئے۔"

غرضیکہ اس جھگڑے نے بہت طول کھینچا۔ خلیفہ کہتا۔ کہ ابوالحسن زندہ ہے اور نزہت مر گئی ہے۔ زبیدہ کہتی کہ نہیں۔ نزہت زندہ ہے اور تمھارا ابوالحسن مصاحب مر گیا ہے۔ آخر اس جیص بیص میں خلیفہ کو غصہ آ گیا۔ اور اس نے مسرور سے کہا کہ جلد جا کر دیکھو کہ دونوں میں سے کون مرا ہے۔ اور کون زندہ ہے۔ تاکہ اس جھگڑے کا فیصلہ ہو جائے۔ جب مسرور گیا تو خلیفہ نے کہا "ابھی پتہ چل جاتا ہے۔ کہ کون سچ کہتا ہے۔ اور کون جھوٹ کہتا ہے۔" زبیدہ نے کہا "دیکھنا میں سچی ہوں گی۔" آخر دونوں کی شرط لگ گئی۔ کیونکہ دونوں کو اپنے سچے ہونے کا یقین تھا۔ خلیفہ نے کہا "اگر میں جھوٹا ہوا۔ تو تمھیں فلاں باغ دے دونگا۔ اگر تم جھوٹی ہوئیں تو تمھارا فلاں محل لے لونگا۔" زبیدہ بھی اس شرط پر راضی ہو گئی۔ اور دونوں مسرور کا انتظار کرنے لگے۔ ادھر ابوالحسن بھی سمجھتا تھا کہ اس معاملہ میں زبیدہ اور خلیفہ کی ضرور تکرار ہو گی۔ اس لئے اس نے بھی آگے کا انتظام سوچ رکھا تھا۔ اور اپنی بی بی نزہت سے اسی بارے میں مشورہ کر رہا تھا۔ اتنے میں کھڑکی سے جو جھانک کر دیکھا تو مسرور کو آتے ہوئے پایا اور اپنی بیوی نزہت سے کہا "تم جلد پھر اپنے کو مردہ بنا لو۔"

وہ ابوالحسن کے کہتے پر کفن پہن کر لیٹ گئی اتنے میں مسرور مکان میں داخل ہوا۔ اور دیکھا کہ نزہت کی لاش کمرہ میں کفنائی ہوئی رکھی ہے۔ اور ابوالحسن اس کے پاس بیٹھا رو رہا ہے۔ مسرور بھی اس کے ساتھ رو دیا اور دل میں خوش ہوا کہ شکر ہے بادشاہ کی بات سچی ہوئی۔ پھر مسرور نے کپڑا اُٹھا اس کا چہرہ دیکھا اور کہا "بہن نزہت بڑی اچھی تھی۔ لیکن کیا کیا جائے قضا و قدر سے کچھ چارہ نہیں۔ ہم سب کے لئے یہی راستہ ہے اچھا اللہ اس پہ رحم کرے اور تم کو صبر بخشے۔" پھر ابوالحسن سے کہا۔

"بھائی عورتیں بھی عجب ناقص العقل ہیں خواہ مخواہ ناحق بات پر تکرار کر بیٹھتی ہیں اور دوسرے کی بات کو سنتی ہی نہیں۔ باوجود خفضہ ہونے کے زبیدہ یہی کہے جاتی ہے کہ ابوالحسن مر گیا ہے۔ اور نزہت زندہ ہے۔ اور خلیفہ کے ساتھ اس بات پہ تکرار ہو رہی ہے۔"

ابوالحسن نے کہا "خدا خلیفہ کو ہمیشہ ہمارے پر سلامت رکھے۔ انھوں نے میری اس مصیبت میں کمال ہمدردی فرمائی ہے میں خود حاضر ہو کر تمام شک و شبہ کو دور کر دیتا۔ مگر کیا کروں۔ لاش اکیلی نہیں چھوڑ سکتا۔"

مسرور نے کہا "اگر مجھے واپس جانا نہ ہوتا۔ تو میں تمھارے ساتھ تمھارے اس حال میں شریک رہتا۔ لیکن کیا کروں۔ مجھے جلد واپس جانے کا حکم ہے۔" یہ کہہ کر مسرور واپس چلا گیا۔ نزہت اُٹھ بیٹھی۔ اب ابوالحسن نے کہا "دیکھنا کہ ابھی کوئی نہ کوئی زبیدہ کی طرف سے آیا چاہتا ہے۔" نزہت نے اپنا لباس پہن لیا۔ اور پھر دونوں میاں بیوی دروازہ میں بیٹھ کر کسی نئے آنے والے کا انتظار کرنے لگے مسرور جب محل میں داخل ہوا۔ تو نہایت خوش خوش تھا اور اپنے ہاتھوں سے تالیاں بجاتا تھا۔ جس کا یہ مطلب تھا۔ کہ خلیفہ سچا ہے۔ اور شرط جیت گیا ہے۔ زبیدہ نے خفا ہو کر پوچھا۔

"او تریہ سیاہ حبشی۔ سچ بتا کون زندہ ہے اور کون مرا ہے؟"

اس نے کہا "خدا وند نزہت الاوداع مر گئی ہے۔ اور ابوالحسن اُس کے غم میں رو رہا ہے۔"

خلیفہ یہ سُنکر اُچھلا اور ہنسا اور زبیدہ سے کہا کہ اب میں نے فلاں محل جیت لیا ہے۔ پھر مسرور سے کہا کہ وہاں کا تمام واقعہ جو تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے تفصیل وار بیان کرو۔ مسرور نے تمام واقعہ مفصل بیان کیا پھر خلیفہ نے زبیدہ سے کہا۔

"اب بھی تم کو یقین آیا ہے یا نہیں؟" زبیدہ نے کہا یہ غلام کاذب اور منتری ہے میں ہرگز اس کی بات پر یقین نہ کروں گی۔"

مسرور نے بھنّا کر کہا کہ بی بی تمہاری قسم اور خلیفہ کی عمر کی قسم ابوالحسن زندہ ہے اور نزہت الارواح مرگئی ہے زبیدہ اول ہی ہو کر یہی کہتی رہی۔ دیکھو میں ابھی تم سے سمجھتی ہوں۔"

پھر اُس نے اپنی تمام خواصوں کو بلایا۔ وہ سب آئیں۔ اُن سے پوچھا۔ کہ خلیفہ کے تشریف لانے سے پیشتر کون میرے پاس روتا ہوا آیا تھا۔ کنیزوں نے کہا: "نزہت الارواح آئی تھی۔" پھر زبیدہ نے اپنی خزانچی خواص سے کہا کہ تو بھی بتلا۔ کہ میں نے کس کو تجھ سے تھان اور اشرفیاں دلوائی تھیں۔ اس نے جواب دیا "نزہت کو"۔ پھر زبیدہ نے غصّہ میں آکر کہا۔ "او مسرور شریر! تجھے جھوٹ بولنے میں کیا فائدہ ہے۔"

مسرور تو خاموش ہو گیا۔ خلیفہ نے زبیدہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ جس نے عورت کی نسبت ناقص العقل کہا ہے، بالکل درست ہے۔"

زبیدہ نے کہا "بے ادبی معاف مسرور کی آپ سے سازش ہے۔ مجھے بھی اجازت دیں کہ میں کسی اپنے آدمی کو بھیجکر اصل معاملہ کی تحقیق کرلوں۔" خلیفہ نے اجازت دی زبیدہ نے اپنی دایہ کو بلایا۔ جو نہایت ضعیف تھی اور اُس سے کہا کہ "دایہ تو جا کر تحقیق کر کہ نزہت الارواح مری ہے یا ابوالحسن۔ اگر تو آکر سچ سچ بتائے گی تو میں تجھے انعام دوں گی۔"

دایہ وہاں سے رخصت ہو کر ابوالحسن کے گھر کی جانب چلی ابوالحسن نے جب اسے آتے دیکھا تو سمجھ لیا۔ کہ یہ ضرور زبیدہ کی طرف سے آئی ہے فوراً اپنے آپ کو مُردہ بنا لیا۔ اور کفن پہن کر لیٹ گیا۔ نزہت نے اس پر کپڑا ڈال دیا۔ اور اپنے بال نوچ نوچ کر رونے لگی جب دائی اندر داخل ہوئی تو اس نے نزہت الارواح کو روتے ہوئے دیکھا۔ کہ وہ کہہ رہی ہے کہ "پیارے ابوالحسن میں تمہارے بعد اس دُنیا میں رہ کر کیا کروں گی۔ خدا نے مجھے کس مصیبت میں مبتلا کیا دایہ نے دیکھا کہ یہاں تو مسرور کے خلاف واقعہ ہے۔ لعنت ہو اس پر اُس نے خواہ مخواہ کا گھر میں ایک جھگڑا پیدا کر دیا ہے نزہت الارواح نے کہا۔ "اماں جو مسرور نے کہا۔ کاش وہی سچ ہوتا۔ تو میں آج اس دُکھ میں نہ پڑتی اور بیوگی کی مصیبت نہ دیکھتی"۔ یہ کہہ کر رونے لگی۔ اور دائی کو بھی اُس کی حالت دیکھ کر رونا آگیا پھر اس نے ابوالحسن کے مُنہ سے کپڑا اٹھا کر دیکھا۔ اور کہا "اے ابوالحسن خدا تجھ پر رحم کرے" اور نزہت الارواح سے کہا "بیٹی اگرچہ میں چاہتی ہوں۔ کہ تیرے رنج میں شریک رہوں۔ لیکن کیا کروں۔ مجھے جلد واپس جانا ہے زبیدہ خاتون میری منتظر ہو گی اُس نمک حرام مسرور نے اپنی دروغ گوئی سے انھیں آپس میں ناخوش کر رکھا ہے۔" یہ کہکر دایہ محل کو واپس لوٹ گئی۔

اس کے جانے کے بعد ابوالحسن بھی اُٹھ بیٹھا۔ اب دونوں میاں بیوی دروازہ میں بیٹھ کر دیکھنے لگے۔ کہ دیکھئے اب کیا نیا شگوفہ پھوٹتا ہے اس بڑھیا نے جو کچھ دیکھا تھا محل میں جا کر زبیدہ سے بیان کیا۔ زبیدہ نے بڑھیا سے کہا۔ کہ تو یہی سب کچھ خلیفہ کے پاس جا کر بیان کر، اس دایہ نے مسرور سے مخاطب ہو کر بیان کیا۔ "کہ تو نہایت دروغگو ہے۔ جو اپنے آقاؤں کے سامنے جھوٹ بولتا ہے۔ نزہت الارواح تو زندہ ہے۔ اور ابوالحسن مر گیا ہے۔ میں نے اُس کی لاش کو بچشم خود دیکھا ہے اور نزہت اُس کے سرہانے بیٹھی رو رہی ہے۔"

مسرور نے کہا "او چھنالہ تو بڑی مکارہ ہے کہ دن دہاڑے ہماری آنکھوں میں خاک جھونکتی ہے۔ میں ابھی دیکھ کر چلا آرہا ہوں۔ کہ نزہت مرگئی ہے اور ابوالحسن اُس کے سرہانے اس کی ماتم داری کر رہا ہے۔"

بڑھیا نے کہا "یہ مسرور تو بڑا بے حیا ہے اور کس دیدہ دلیری سے جھوٹ بولتا ہے۔ میں خود ابوالحسن کو مرا ہوا دیکھ کر آئی ہوں۔"

مسرور نے کہا کیا تو مجھے فریب دینا چاہتی ہے۔"

زبیدہ نے خلیفہ سے کہا۔ "تم اپنے غلام کی باتیں سن رہے ہو کہ یہ کیسی بک بک کر رہا ہے۔ اور میری دایہ سے گستاخی کلام کر رہا ہے لیکن

تم اسے ذرا بھی منع نہیں کرتے۔" یہ کہہ کر زبیدہ کھسیانی ہو کر رونے لگی۔

خلیفہ یہ تمام تماشہ دیکھ کر خاموش ہو رہا۔ ادھر مسرور، دائی اور دیگر خواصیں سب حیرت زدہ ہو کر چپ ہو گئے کچھ دیر ٹھہر کر خلیفہ نے زبیدہ سے کہا "بی بی اس معاملہ میں ہم سب ایک دوسرے کے سامنے جھوٹے ہیں۔ اور اس طرح اس امر کا فیصلہ ہونا ناممکن ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ ہم سب ابوالحسن کے مکان پر چلیں اور وہاں جا کر اس امر کی تحقیق کریں کہ کون مرا ہے۔ اور کون زندہ ہے۔" سب نے خلیفہ کی اس رائے پر اتفاق کیا اور خلیفہ مع زبیدہ، مسرور، دائی اور دیگر خواصوں کے ابوالحسن کے مکان کی جانب چلا۔ ابوالحسن کا مکان خلیفہ کے محل کے مقابل واقع تھا۔ راستہ میں بھی مسرور اور دائی ایک دوسرے سے بُرا بھلا کہتے رہے۔ حتیٰ کہ ابوالحسن کے مکان کے قریب پہنچ گئے۔ جب ابوالحسن نے ان سب کو آتے دیکھا۔ تو نزہت سے کہا۔

"وہ اب سب کے سب آرہے ہیں۔" نزہت یہ دیکھ کر گھبرا گئی۔ کہ اب ہمارا راز فاش ہو جائے گا۔ لیکن ابوالحسن نے تسلی دی اور کہا "بالکل نہ گھبراؤ۔" پھر ابوالحسن اور نزہت دونوں اپنا اپنا کفن پہن کر اور تھان سے مُنہ ڈھانپ کر کمرہ میں مردہ کی طرح لیٹ گئے۔ جب یہ سب پارٹی مکان میں داخل ہوئی تو انہوں نے ابوالحسن اور نزہت دونوں کو مردہ پایا۔ سب حیران ہو گئے۔ کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ زبیدہ نے کہا "کیسا غضب ہے کہ دونوں ہی چل دیئے پھر خلیفہ اور مسرور وغیرہ سے مخاطب ہو کر کہا" دیکھو تمھاری تکرار اور بار بار آدمی بھیجنے سے میری پیاری کنیز نزہت بھی فوت ہو گئی۔ ایک تو وہ اپنے خاوند کے مر جانے سے غم میں تھی دوسرے تمھارے تجسس نے اسے ہلاک کر دیا۔"

خلیفہ نے زبیدہ سے کہا کہ یہ معاملہ اس طرح پر نہیں بلکہ ابوالحسن نزہت پر عاشق تھا۔ اس کی موت سے یقیناً اس کو صدمہ پہنچا۔ لو وہ بھی مر گیا۔ اب میں شرط جیت گیا۔ اور تم لازمی طور پر ہار گئیں۔ لہٰذا تمھارا محل میرا ہوا۔ زبیدہ نے کہا نہیں تم ہار گئے۔ اور وہ تمھارا باغ میرا ہو گیا۔ کیونکہ ابوالحسن پہلے مرا ہے۔ پھر ان باتوں میں خلیفہ اور زبیدہ کے درمیان تکرار ہونے لگی۔ اور ادھر دائی اور مسرور بھی آپس میں جھگڑنے لگے۔ خلیفہ کچھ سوچنے کے بعد ان دونوں جنازوں کے درمیان میں بیٹھ گیا۔ اور کہنے لگا۔

"میں اقرار کرتا ہوں کہ اسے ابھی ایک ہزار اشرفی دونگا۔ جو مجھے یہ بتائے گا کہ پہلے کون مرا ہے؟"

ابوالحسن نے اپنے تابوت سے آواز دی۔

"پہلے میری موت ہوئی۔ مجھے ہزار اشرفی دیجئے۔" پھر ابوالحسن اُٹھ بیٹھا اور خلیفہ کے قدموں پر گر پڑا۔ ادھر نزہت اُٹھ بیٹھی۔ اور اپنی مالکہ کے قدموں پر گر گئی زبیدہ ڈر گئی۔ کہ مُردے جی کر مجھے اور خلیفہ کو چمٹ گئے ہیں۔ جب زبیدہ کا وہم اور خوف کچھ دُور ہوا تو کہنے لگی کہ اے کمبخت تجھے کیا ہو گیا تھا۔ تیری اس حرکت کی بدولت ہمارا تمام دن لڑنے جھگڑنے میں گذرا اخیر میں نے تیرا قصور معاف کر دیا۔ یہی غنیمت ہے۔ کہ تجھے زندہ و سلامت پایا۔ اسی طرح خلیفہ بھی ابوالحسن کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔ اور خوش ہوا۔ اور ابوالحسن سے کہا نالائق تجھے یہ کیا سوجھی تھی۔ کہ تو نے اس فریب سے مجھے تمام دن جھگڑے میں رکھا۔ اور کئی آدمیوں کو پریشان کیا؟"

ابوالحسن نے کہا "خداوند اب میرا حال بھی سنیئے میں جب مجرد تھا۔ نہایت آرام سے رہتا تھا۔ جب سے میری شادی ہوئی ہے کئی ایک قسم کے مصارف کی وجہ سے مقروض و زیر بار ہو گیا ہوں۔ آپنے اور زبیدہ خاتون نے جو کچھ دیا تھا وہ سب خرچ ہو گیا قرضخواہوں نے سختی سے جب تقاضا کیا تو ہم نے جو کچھ باقیماندہ رہ گیا تھا سب دے ڈالا جب ہمارے پاس کچھ بھی نہ رہا۔ تو ہم نے بہت سی تدبیریں سوچیں اور سوائے حیلہ و فریب کے جو آپنے ملاحظہ فرمایا۔ اور کچھ دماغ میں نہ آیا۔"

خلیفہ ابوالحسن کی صاف بیانی پر نہایت خوش ہوا۔ اور اس کا قصور معاف کر دیا۔ اور پھر ابوالحسن اور اس کی بیوی کو ایک ہزار اشرفی اور عنایت کیں۔ اور پھر ابوالحسن اور نزہت خلیفہ کی مہربانی سے اپنی تمام عمر نہایت اچھی طرح بسر کرتے رہے اور ہمیشہ شاد و خرم رہے۔

ہمارے ساتھ والی کوٹھی میں ایک اچھے خاصے بدصورت سیلونی بیرسٹر کی اچھی خاصی بدصورت بیوی رہتی تھی۔ بیرسٹر صاحب کو خوبصورت عورتوں کی تصویریں جمع کرنے کا بیحد شوق تھا، بھائی جان نے مجھے بتایا کہ اس کے ذاتی البم میں دنیا جہان کی حسین ترین عورتوں کی تصویریں موجود ہیں، اور وہ اس البم کو اپنی بیوی سے چھپا کر رکھتا ہے۔ شام کے وقت دونوں میاں بیوی برآمدے میں آرام کرسیوں پر بیٹھ جاتے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے رہتے۔ وہ بولتے کم اور مسکراتے زیادہ تھے۔ بیگم صاحبہ کو پیانو سیکھنے کا خبط تھا، رات کے کھانے سے فارغ ہو کر بیرسٹر اپنے کمرے میں جا کر ذاتی البم کھول لیتا۔ اور اس کی بیوی پیانو پر جا بیٹھتی، پھر ان کے گھر سے پیانو کے، بھدے، کرخت، بے ڈھنگے اور بے ربط سُر سنائی دینے لگتے۔ جیسے وہ اُن سُروں کو دھکے دے کر گھر سے باہر نکال رہی ہو۔ کسی وقت محسوس ہوتا کہ وہ پیانو بجا نہیں رہی بلکہ اس سے جھگڑ رہی ہے اور جب پیانو کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تو پردوں پر زور سے اُنگلی مار کر پوچھتی ہے: "کیا کہا؟"

کبھی کبھی جی بے اختیار چاہتا کہ اس کے کمرے میں داخل ہو کر، پیانو کے پاس جا کر، زار و قطار رونا شروع کر دوں۔ جب وہ حیران ہو کر وجہ دریافت کرے تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگوں، یہاں تک کہ وہ ڈر کر بھاگ اُٹھے اور میں اطمینان سے آنسو پونچھ کر باہر نکل آؤں۔ وہ ہر رات بلاناغہ گھنٹہ بھر پیانو سے لڑتی اور اس دوران میں اس کا خاوند جی کھول کر اپنے ذاتی البم کا مطالعہ کرتا۔

سامنے والی کوٹھی میں ایک عیسائی انجنیئر کا کنبہ رہتا تھا۔

انجنیئر کی دو لڑکیاں تھیں، ایک کی عمر بارہ سال ہوگی اور دوسری لڑکی سترہ اٹھارہ کے لگ بھگ تھی۔ چھوٹی لڑکی کا رنگ کھلتا ہوا تھا اور آنکھیں بالکل بلّی کی مانند۔ اس کی چال بھی بلّی کی طرح سمٹی سمٹائی اور دبی دبی تھی اور ذرا سی آہٹ پر چونک پڑتی تھی۔ اس کی سیدھی اور چکنی پنڈلیاں بڑی سڈول تھیں۔ اس کے سینے کی گولائیاں ابھی بن رہی تھیں اور ان کی طرف دیکھنے پر کسی وقت یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے قہوہ پینے والی دو پیالیاں قمیص کے اندر اوندھی کر رکھی ہوں۔

بڑی لڑکی کا رنگ زردی مائل گندمی تھا، وہ دبلی پتلی اور بے اختیار لمبی تھی، اس کی بائیں آنکھ ذرا ٹیڑھی تھی اور ناک اس کے قد کا چوتھا حصّہ تھی اس کا نام مس ایملی تھا یہ نام سُن کر مجھے ہمیشہ کھٹی املی کے درخت یاد آجاتے اور منہ میں پانی بھر آتا تھا اس کی آواز تیز تیکھی اور کرخت تھی وہ بولتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے ریل کے انجن کا کوئی پرزہ لیک کر رہا ہے اور تیز بھاپ سیٹی بجاتی خارج ہو رہی ہے، اُسے اپنے مرلی کتے سے بڑا پیار تھا اور وہ ہر شام کوٹھیوں کے درمیان والی سڑک پر اسے ساتھ لئے ٹہلا کرتی تھی۔

چوک میں کسی بدھی بھکشو کی خانقاہ تھی، جہاں ہفتے میں کئی بار میلہ ہوا کرتا، اس روز عورتیں، بچے، مرد، زرد زرد لبادوں والے بھکشو خانقاہ میں جمع ہو کر دن بھر مذہبی گیت گاتے رہتے، یہاں اکثر دیسی عطروں کی تیز خوشبو پھیلی رہتی تھی۔

اس خانقاہ کے عقب میں شہر کے غریب واڑے تھے، لکڑی اور گھاس پھونس سے بنے ہوئے ڈربہ نما مکانوں کے بیچوں بیچ ایک خستہ حال سڑک چلی گئی تھی اس سڑک کا نام ٹمپل روڈ تھا یہاں رات کو عموماً اندھیرا چھایا رہتا، اور مکانوں کے اندر سُرخ سُرخ سبز سبز بتیاں ٹمٹماتی رہتیں، یہاں بجلی کے کھمبے ضرور تھے، مگر بلب کسی ایک پر بھی سلامت نہ تھا۔ ایک جگہ ناریل کے درختوں تلے تاڑی خانہ تھا جہاں صبح و شام مزدور عورتیں اور مرد تاڑی پیتے، شور مچاتے اور لڑتے جھگڑتے رہتے۔ اس جگہ، انہی ڈربہ نما مکانوں میں، چوری چھپے جسم بیچنے والیوں کے دلال رہتے تھے، ٹمپل روڈ دراصل تھی یہ روڈ تھی یہ کسی مندر کی طرف نہیں بلکہ کوٹھی خانوں کی طرف جاتی تھی۔ شام ہوتے ہی جب اندھیرا پھیلنے لگتا تو رنڈیوں کے دلال، تاڑی کے نشے میں مگن، کٹے ہوئے پتنگوں کی طرح ٹمپل روڈ پر منڈلانے لگتے کسی وقت وہ تاڑی کے درختوں تلے یا بجلی کے کھمبوں کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو جاتے اور بیڑی پیتے، اپنی خطرناک چمکیلی آنکھوں سے ہر راہ گیر کو گھورنے لگتے، پھر وہ ایکا ایکی لپکتے اور کسی نہ کسی حاجتمند پر حملہ کر دیتے۔

(۲)

ناولوں کا دور

بھروسا

کلیم شیخ چلّی کے سے منصوبے سوچتا، نیے دوست مرزا کے مکان پر پہنچا۔ ہر چند ابھی کچھ ایسی بہت رات نہیں گئی تھی، لیکن مرزا جیسے نکمّے بے فکرے کبھی کے لمبی تان کر سو چکے تھے۔ کلیم نے جو دروازے پر دستک دی۔ تو جواب ندارد۔ اس مقام پر مرزا کا تھوڑا سا حال لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس شخص کی کیفیت یہ تھی۔ کہ شاید اُس کا نانا دادا بھی تحقیق نہیں ابتدائے عملداری سرکار میں صاحب ریزیڈنٹ کی اردلی کا جمعدار تھا۔ اوّل تو ایسی عالی جاہ سرکار، دوسرے اعتبار منصب، اردلی کا جمعدار، تیسرے اُن دنوں کی بے عنوانی۔ اُس پر خود اُس کی رشوت ستانی۔ بہت کچھ کمایا، یہاں تک کہ اُس کا اعتبار دہلی کے زرداروں میں ہو گیا۔ مرزا کی ماں اوائل عمر میں بیوہ ہو گئی۔ جمعدار نے باوجودیکہ دور کی قرابت تھی، حسبۃً للہ اُس کا تکفّل اپنے ذمے لیا، جمعدار اپنی حیات میں تو اتنا سلوک کرتا رہا کہ مرزا کو یتیمی اور اُس کی ماں کو بیوگی بھول کر بھی یاد نہ آئی ہو گی۔ لیکن جمعدار کے مرنے پر اُس کے بیٹے۔ پوتے۔ نواسے کثرت سے تھے انھوں نے غفلت کی۔ اور اگرچہ جمعدار بہت کچھ وصیت کر مرے تھے۔ مگر اُن کے ورثا نے بہزار وقت محلسرا کے پہلو میں ایک چھوٹا سا قطعہ رہنے کو دیا۔ اور سات روپیہ مہینے کے کرایہ کی دو دکانیں مرزا کے نام کر دیں۔ یہ تو حال تھا کہ مرزا۔ مرزا کی ماں۔ مرزا کی بیوی تین آدمی۔ اور سات روپیہ کی کل کائنات۔ اُس پر مرزا کی شیخی اور نمود۔ یہ مسخرہ چاہتا تھا کہ جمعدار کے بیٹوں کی برابری کرے۔ جن کو صدہا روپیہ کی منفعت ہوتی تھی۔ اگرچہ جمعدار والے اِس کو منہ نہیں لگاتے تھے۔ مگر یہ بے غیرت زبردستی اُن میں گھستا تھا۔ یہ کسی کو بھائی جان۔ کسی کو ماموں جان کسی کو خالو جان بناتا۔ اور وہ لوگ اِس کے ادعائی رشتے ناتوں سے جلتے اور دق ہوتے۔ اونچی حیثیت کے لوگوں میں بیٹھنا اُس کے حق میں اور بھی زبوں تھا۔ اِن کی دیکھا دیکھی اُس نے تمام عادتیں امیرزادوں کی سی اختیار کر رکھی تھیں۔ مگر امیرزادگی نبھتے نبھتے نبھے۔ دوکانیں گرو ہوتی جاتی تھیں۔ ماں بے چاری بہت بکی، مگر کون سنتا تھا۔

مرزا کو جب دیکھو۔ پاؤں میں ڈیڑھ حاشیہ کی جوتی۔ سر پر دُہری بیل کی بھاری کامدار ٹوپی۔ بدن میں ایک چھوڑ دو انگرکھے۔ اوپر شبنم یا ہلکی تن زیب۔ نیچے کوئی طرحدار رسا ڈھاکے کا نینو۔ جاڑا ہوا تو بانات مگر سات روپیہ گز سے کم نہیں۔ خیر یہ تو صبح و شام۔ اور تیسرے پہر کا شانی مخمل کی انصف خانی۔ جس میں حریر کی سنجاف کے علاوہ گنگا جمنی کمخواب کی عمدہ بیل ٹکی ہوتی۔ سُرخ نیفہ کا پائجامہ اگر ڈھیلے پائچوں کا ہوا تو کلی دار۔ اور اس قدر نیچا کہ ٹھوکر کے اشارے سے دو قدم آگے۔ اور اگر تنگ موہری کا ہوا تو نصف ساق تک چوڑیاں۔ اور اوپر جلد بدن کی طرح منڈھا ہوا ریشمی۔ ازار بند گھٹنوں میں لٹکتا ہوا۔ اور اُس میں سبلے تفل کی کنجیوں کا گچھا۔ غرض دیکھو۔ تو مرزا صاحب اس ہیئت کذائی سے چھیلا بنے سر بازار چھم چھم کرتے چلے جا رہے ہیں۔ کلیم سے اور مرزا سے محفلِ مشاعرہ میں تعارف پیدا ہوا۔ شدہ شدہ مرزا صاحب کلیم کے مکان پر تشریف لانے لگے یہاں تک کہ اب چند روز سے تو دونوں میں ایسی گاڑھی چھننے لگی کہ گویا ایک جان دو قالب تھے۔ کلیم کو مرزا کے مکان پر جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا مگر مرزا شام کو تو کبھی کبھی۔ لیکن صبح کو بلا ناغہ آتے۔ اور تمام دن کلیم کے پاس رہتے۔ مرزا نے اپنا حال اصلی کلیم پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کلیم یہی جانتا تھا کہ جمعدار کا سب ترکہ مرزا کو ملا اور جمعدار کی محلسرا کو مرزا کی محلسرا اور جمعدار کے دیوان خانہ کو مرزا کا دیوان خانہ اور جمعدار کے بیٹے پوتوں کے نوکروں کو مرزا کے نوکر سمجھتا تھا۔ اور اسی غلط فہمی میں وہ گھر سے نکلا۔ تو سیدھا جمعدار کی محلسرا کی ڈیوڑھی پر جا موجود ہوا۔ بار بار کے پکارنے اور کنڈی کے کھڑکھڑانے سے دو لونڈیاں چراغ لیے ہوئے اندر سے نکلیں۔ اور ان میں سے ایک نے پوچھا کہ "کون صاحب ہیں؟ کون صاحب ہیں؟ اور اتنی رات گئے کیا کام ہے؟"

کلیم - جاؤ مرزا کو بھیج دو۔

لونڈی - کون مرزا؟

کلیم - مرزا ظاہر دار بیگ جن کا یہ مکان ہے اور کون مرزا۔

لونڈی - یہاں کوئی مرزا ظاہر دار بیگ نہیں ہے۔

اتنا کہہ کر قریب تھا کہ لونڈی کواڑ بند کر لے۔

کلیم - کیوں جی کیا یہ جمعدار صاحب کی محلسرا نہیں ہے؟

لونڈی - ہے کیوں نہیں۔

کلیم - پھر تم نے یہ کیا کہا کہ یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں ہے؟ کیا ظاہر دار بیگ جمعدار کے وارث اور جانشین نہیں ہیں؟

لونڈی - جمعدار کے وارثوں کو خدا سلامت رکھے۔ مرزا ظاہر دار بیگ جمعدار کا وارث بننے والا کون ہے۔؟

دوسری لونڈی - اری کمبخت! یہ کہیں مرزا بانکے کے بیٹے کو نہ پوچھتے ہوں۔ وہ ہر جگہ اپنے تئیں جمعدار کا بیٹا بنایا کرتا ہے۔ (کلیم کی طرف مخاطب ہو کر) کیوں میاں وہی ظاہر دار بیگ نہ جن کی رنگت زرد زرد ہے؟ آنکھیں کرنجی۔ چھوٹا قد۔ دُبلا ڈیل۔ اپنے تئیں بہت بنائے سنوارے رہا کرتے ہیں۔

کلیم - ہاں ہاں! وہی ظاہر دار بیگ۔

لونڈی - تو میاں اس مکان کے پچھواڑے اُپلوں کی ٹال کے برابر ایک چھوٹا سا کچا مکان ہے۔ وہ اُس میں رہتے ہیں۔

کلیم نے وہاں جا آواز دی۔ تو کچھ دیر بعد مرزا صاحب۔ ننگ دھڑنگ جانگیہ پہنے ہوئے باہر تشریف لائے اور کلیم کو دیکھ کر ٹھٹھکے

اوہو یہ آ آپ ہیں! معاف کیجئے۔ میں سمجھا، کوئی اور صاحب ہیں۔ بندہ کو کپڑا پہن کر سونے کی عادت نہیں۔ میں ذرا کپڑے پہن آؤں۔ تو آپ کے ہمرکاب چلوں۔

کلیم۔ چلیئے گا کہاں؟ میں آپ ہی کے پاس تک آیا تھا۔

مرزا۔ پھر اگر کچھ دیر تشریف رکھنا منظور ہو۔ تو میں اندر پردہ کرا دوں۔

کلیم۔ میں آج شب کو آپ ہی کے یہاں رہنے کی نیت سے آیا ہوں۔

مرزا۔ بسم اللہ تو چلئے اِسی مسجد میں تشریف رکھیئے۔ بڑی فضا کی جگہ ہے، میں ابھی آیا۔

کلیم نے جو مسجد میں آکر دیکھا، تو معلوم ہوا کہ ایک نہایت چھوٹی سی مسجد ہے، وہ بھی ویران، وحشت ناک۔ نہ کوئی حافظ ہے، نہ مُلا، نہ طالب علم، نہ مسافر۔ ہزارہا چمگادڑیں اُس میں رہتی ہیں کہ اُن کی تسبیح بے ہنگام سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ فرش پر اِس قدر بیٹ پڑی ہے کہ بجائے خود کھرنجے کا فرش بن گیا ہے۔ مرزا کے انتظار میں کلیم کو چار ناچار اُسی مسجد میں ٹھہرنا پڑا۔ مرزا آئے بھی تو اتنی دیر کہ جب کلیم مایوس ہو چکا تھا۔ قبل اس کے کہ کلیم شکایت کرے۔ مرزا صاحب بطور دفع دخل مُقدّر فرمانے لگے "کہ بندہ کے گھر میں کئی دن سے طبیعت علیل ہے، خفقان کا عارضہ، اختلاج قلب کا روگ ہے۔ اب جو میں آپ کے پاس سے گیا۔ تو اُن کو غشی میں پایا۔ اِس وجہ سے دیر ہوئی۔" پہلے تو یہ فرمائیے کہ اِس وقت بندہ نوازی فرمانے کی کیا وجہ ہے؟

کلیم نے باپ کی طلب، اپنا انکار، بھائی کی التجا، ماں کا اصرار، تمام ماجرا کہہ سنایا۔

مرزا۔ پھر اب کیا اِرادہ ہے؟

کلیم۔ سوائے اس کے کہ اب گھر لوٹ کر جانے کا تو ارادہ نہیں ہے۔ اور جو آپ کی صلاح ہو۔

مرزا۔ خیرِ نیت شب حرام۔ صبح تو ہو۔ آپ بے تکلف اِستراحت فرمائیے، میں جا کر بچھونا وغیرہ بھیجے دیتا ہوں، اور مجھ کو مریضہ کی تیمارداری کے لئے اجازت دیجئے کہ آج اُس کی علالت میں اِشتداد ہے۔

کلیم۔ یہ ماجرا کیا ہے؟ تم تو کہا کرتے تھے کہ ہمارے یہاں دُہری محلسرائیں۔ متعدد دیوان خانے، کئی پائیں باغ ہیں۔ حوض اور حمام اور کٹرے اور گنج اور دوکانیں اور سرائیں ہیں۔ میں جانتا ہوں عمارت کی قسم سے کوئی چیز ایسی نہ ہو گی جس کو تم نے اپنی ملک نہ بنایا ہو۔ یا یہ حال ہے کہ ایک متنفّس کے واسطے ایک شب کے لئے تم کو جگہ میّسر نہیں۔ جو جو حالات تم نے اپنی زبان سے بیان کئے۔ اُن سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ تم جمعدار کے تمام ترکہ پر قابض اور متصرّف ہو۔ لیکن میں اُس تمام جاہ و حشمت کا ایک شمّہ بھی نہیں دیکھتا۔

مرزا۔ آپ کو میری نسبت سخن سازی کا اِحتمال ہونا سخت تعجب کی بات ہے۔ اتنی مدّت مجھ سے آپ سے محبّت رہی۔ مگر افسوس ہے آپ نے میری طبیعت اور عادت کو نہ پہچانا۔ یہ اختلافِ حالت جو آپ دیکھتے ہیں اُس کی ایک وجہ ہے۔ بندہ کو جمعدار صاحب مرحوم و مغفور نے متبنّٰی کیا تھا۔ اور اپنا جانشین کر رہے تھے۔ شہر کے کل روسا اِس سے واقف و آگاہ ہیں۔ اُن کے انتقال کے بعد لوگوں نے اِس میں رخنہ اندازیاں کیں۔ بندہ کو آپ جانتے ہیں کہ بکھیڑے سے کوسوں بھاگتا ہے۔ صحبت ناملائم دیکھ کر کنارہ کش ہو گیا۔ لیکن کسی کو انتظام کا سلیقہ۔ نہ دلبست کا حوصلہ نہیں۔ اُسی روز سے واویلا مچی ہوئی ہے۔ اور اس بات کے مشورے ہو رہے ہیں کہ بندے کو منائے جائیں۔

کلیم ۔ لیکن آپ نے اِس کا تذکرہ بھی نہیں کیا۔

مرزا ۔ اگر میں آپ سے یا کسی سے تذکرہ کرتا۔ تو استقلالِ مزاج سے بے بہرہ اور غیرت وحمیت سے بے نصیب ٹھہرتا۔ اب آپ کو گھر رہنے میں تکلیف ہوتی ہے اجازت دیجئے کہ میں جا کر بچھونا بچھوا دوں اور مریضہ کی تیمارداری کر دوں۔

کلیم ۔ خیر مقام مجبوری ہے۔ لیکن پہلے ایک چراغ تو بھیج دیجئے۔ تاریکی کی وجہ سے طبیعت اور بھی گھبراتی ہے۔

مرزا ۔ چراغ کیا! میں نے تو لیمپ روشن کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن گرمی کے دن ہیں۔ پروانے بہت جمع ہو جائیں گے۔ اور آپ زیادہ پریشان ہو جئے گا۔ اور اس مکان میں ابابیلوں کی کثرت ہے۔ روشنی دیکھ کر گرنی شروع ہوں گی۔ اور آپ کا بیٹھنا دشوار کر دیں گی۔ تھوڑی دیر صبر کیجئے کہ ماہتاب نکلا آتا ہے۔

کلیم جب گھر سے نکلا تو کھانا تیار تھا۔ لیکن وہ اس قدر طیش میں تھا کہ اُس نے کھانے کی مطلق پروانہ کی اور بے کھائے نکل کھڑا ہوا۔ مرزا سے ملنے کے بعد وہ منتظر تھا کہ آخر مرزا خود پوچھیں گے تو کہہ دوں گا۔ مرزا کو ہر چند کھانے کی نسبت پوچھنا ضرور تھا۔ کیونکہ اوّل تو کچھ ایسی رات زیادہ نہیں گئی تھی۔ دوسرے یہ کہ اُس کو معلوم ہو چکا تھا کہ کلیم گھر سے نکلا ہے۔ تیسرے دونوں میں بے تکلفی غایت درجہ کی تھی۔ لیکن مرزا قصداً اُس بات سے متعرض نہ ہوا۔ کلیم بیچارے کا بھوک کے مارے یہ حال کہ مسجد میں آنے سے پہلے اُس کی انتڑیوں نے قل ہو اللہ پڑھنی شروع کر دی تھی۔ جب اُس نے دیکھا کہ مرزا کسی طرح اس پہلو پر نہیں آتا۔ اور عنقریب تمام شب کے واسطے رخصت ہونا چاہتا ہے۔ تو بے چارے نے بے غیرت بن کر خود کہا کہ "سنو یار! میں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔"

مرزا ۔ سچ کہتے ہو؟ نہیں۔ جھوٹ بہکاتے ہو۔

کلیم ۔ تمہارے سر کی قسم میں بھوکا ہوں۔

مرزا ۔ مردِ خدا تو آتے ہی کیوں نہیں کہا۔ اب اِتنی رات گئے کیا ہو سکتا ہے۔ دوکانیں سب بند ہو گئیں اور جو ایک دو کھلی بھی ہیں۔ تو باسی چیزیں رہ گئی ہوں گی۔ جن کے کھانے سے فاقہ بہتر ہے۔ دبی اشتہا کو زیر کرنا بڑی ہمت والوں کا کام ہے۔ ایک تدبیر سمجھ میں آتی ہے۔ کہ جاؤں چھدامی بھڑ بھونجے کے یہاں سے گرم گرم خستہ چنے بھنوا لاؤں۔ بس ایک دھیلے کے چنے تم کو دونوں کو کافی ہوں گے۔ رات کا وقت ہے۔

ابھی کلیم کچھ کہنے بھی نہیں پایا تھا کہ مرزا جلدی سے اُٹھ باہر گئے۔ اور چشم زدن میں چنے بھنوا لائے۔ مگر دھیلے کے کہہ کر گئے تھے۔ یا تو کم کے لائے۔ یا راہ میں دو چار پھنکے لگائے۔ اس واسطے کہ کلیم کے روبرو تین مٹھی چنے سے زیادہ نہ تھے۔

مرزا ۔ یار! ہو تم بڑے خوش قسمت کہ اس وقت بھاڑ مل گیا۔ ذرا واللہ، ہاتھ تو لگاؤ۔ دیکھو تو کیسے مجلس رہے ہیں! اور سوندھی سوندھی خوشبو بھی عجیب ہی دلفریب ہے کہ میں بیان نہیں ہو سکتا۔ تعجب ہے کہ لوگوں نے خس اور مٹی کا عطر نکالا۔ مگر بھنے ہوئے چنوں کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہ ہوا۔ کوئی فن ہو۔ کمال بھی کیا چیز ہے! دیکھئے اتنی تو رات ہو گئی ہے۔ مگر چھدامی کی دکان پر بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ بندے نے تحقیق سُنا ہے کہ حضور والا کے خاصے میں چھدامی کی دوکان کا چنا بلا ناغہ نگ کر جاتا ہے۔ اور واقع میں ذرا آپ غور سے دیکھئے۔ کیا کمال کرتا ہے کہ بھوننے میں چنوں کو سڈول بنا دیتا ہے۔ بھئی تمہیں میرے سر کی قسم! سچ کہنا ایسے خوبصورت خوش قطع سڈول چنے تم نے پہلے بھی کبھی دیکھے تھے۔ دال بنانے میں اس کو یہ کمال حاصل ہے کہ کسی دانہ پر خراش تک نہیں۔ ٹوٹنے پھوٹنے کا کیا مذکور ہے۔ اور دانوں کی رنگت دیکھئے کوئی بسنتی ہے۔ کوئی پستئی۔ غرض دونوں رنگ خوشنما۔ یہاں

صدہا قسم کے نعلے اور بعض زمین سے اگتے ہیں۔ لیکن چنے کی لذت کو کوئی نہیں پاتا۔ آپ نے وہ ایک ظریف کی حکایت سُنی ہے۔

کلیم ۔ فرمائیے ۔

مرزا ۔ چنا ایک مرتبہ حضرت میکائیل کی خدمت میں۔ جن کو ارزاقِ عباد کا اہتمام سپرد ہے۔ فریاد لے کر گیا۔ کہ یا حضرت میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے؟ کہ جوں ہی میں نے زمین سے سر نکالا بنی آدم چلنے لگا۔ ماکولات اور بھی ہیں۔ مگر جیسے جیسے ظلم مجھ پہ ہوتے ہیں کسی پر نہیں ہوتے نشوونما کے ساتھ تو میری قطع و برید ہونے لگتی ہے۔ میری کونپلوں کو توڑ کر آدمی ساگ بناتے ہیں۔ اور مجھے کچے ہی کھا جاتے ہیں۔ جب بار ور ہوا تو خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ آدمی بکری بن کر لاکھوں من بوٹ چر جاتے ہیں۔ اس سے نجات ملی۔ تو بھونے کرنے شروع کئے۔ پکا تو شاخ و برگ۔ بھُس بن کر بیلوں اور بھینسوں کے دوزخِ شکم کا ایندھن ہوا۔ رہا دانہ۔ اس کو چکی میں دلیں۔ گھوڑوں کو کھلائیں۔ بھاڑ میں بھونیں بیسن بنائیں۔ کھولتے ہوئے پانی میں ابالیں۔ گھنگنیاں پکائیں۔ غرض شروع سے آخر تک مجھ پر طرح طرح کی آفتیں نازل رہتی ہیں۔ چنے کا حضرت میکائیل کے دربار میں اس طرح بے باکانہ چڑ چڑ بولنا سن کر حاضرینِ دربار اس قدر ناخوش ہوئے۔ کہ ہر شخص اسے کھانے کو دوڑا۔ چنانچہ یہ ماجرا دیکھ کر چنا بے انتظارِ حکم اخیر رخصت ہوا۔ سو حضرت! یہ چنے ایسے لذت کے بنے ہیں۔ کہ فرشتوں کے دندان آز بھی ان پر تیز ہیں۔ افسوس ہے کہ اس وقت نمک مرچ بہم نہیں پہنچ سکتا، ورنہ میر مدد کے کبابوں میں یہ خستگی اور یہ سوندھا پن کہاں!

غرض مرزا نے اپنی چرب زبانی سے چنوں کو گھی کی تلی دال بنا کر اپنے دوست کلیم کو کھلایا۔ کلیم بھوکا تو تھا ہی۔ اس کو بھی ہمیشہ سے کچھ زیادہ مزے دار معلوم ہوئے۔

مرزا نے گھر جا کر ایک میلی دری اور ایک کثیف سا تکیہ بھیج دیا۔ دو ہی گھڑی میں کلیم کی حالت کا متغیر ہو جانا عبرت کا مقام ہے۔ یا خلوت خانہ اور عشرت منزل میں تھا۔ اب ایک مسجد میں آکر پڑا اور مسجد بھی ایسی۔ جس کا حال مختصر سا ہم نے اوپر بیان کیا۔ گھر کے اکثر ان نعمت کو لات ادھر نکلا تھا۔ تو پہلے ہی وقت چنے چبانے پڑے۔ نہ چراغ نہ چارپائی، نہ بہن نہ بھائی، نہ مونس، نہ غم خوار۔ نہ نوکر، نہ خدمت گار۔ مسجد میں اکیلا ایسا بیٹھا تھا، جیسے قید خانہ میں حاکم کا گنہگار۔ یا قفس میں مرغ نوگرفتار اور کوئی ہوتا تو اس حالت پر نظر کر کے تنبیہہ پکڑتا۔ اپنی حرکت سے توبہ اور اپنے افعال سے استغفار کرتا۔ اور اسی وقت نہیں تو سویرے کچھ دم باپ کے ساتھ نماز صبح میں جا شریک ہوتا۔ لیکن کلیم کو اور ہی مضمون سوجھتے تھے۔ اس نے رات بھر میں، ایک قصیدہ مسجد کی ہجو میں طیار کیا۔ اور ایک مثنوی مرزا کی شان میں۔ صبح ہوتے آنکھ لگ گئی۔ تو نہیں معلوم مرزا یا محلہ کا کوئی عیار۔ ٹوپی۔ جوتی۔ رومال۔ چھڑی۔ تکیہ۔ دری۔ یعنی جو چیز کلیم کے بدن سے منفک اور اس کے جسم سے جدا تھی لے کر چمپت ہوا۔ یوں ہی کلیم بہت دیر کو سو کر اٹھتا تھا اور آج تو ایک خاص وجہ تھی۔ کوئی پہر سوا پہر دن چڑھے جاگا۔ تو دیکھتا کیا ہے کہ فرشِ مسجد پر پڑا ہے اور نیند کی حالت میں جو کروٹیں لی ہیں تو سیروں گرد کا بھبوت اور چمگادڑوں کی بیٹ کا ضماد بدن پر تھپا ہوا ہے۔ حیران ہوا کہ قلبِ ماہیت ہو کر میں بھتنا تو نہیں ہو گیا۔ مرزا کو ادھر دیکھا ادھر دیکھا کہیں پتہ نہیں۔ مسجد تھی ویران اس میں پانی کہاں! صبر کر کے بیٹھ رہا کہ کوئی اللہ کا بندہ ادھر کو آنکلے۔ تو اس کے ہاتھ مرزا کو بلواؤں اور یا منہ ہاتھ دھو کر خود مرزا تک جاؤں۔ اس میں دوپہر ہونے آئی۔ بارے! ایک لڑکا کھیلتا ہوا آ گیا۔ جونہی زینہ پر چڑھا کہ کلیم غرضِ مطلب کے لئے لپکا وہ لڑکا اس کی ہیئت کذائی دیکھ ڈر کر بھاگا۔ خدا جانے اس نے اس کو بھوت سمجھا۔ یا نرا خیال کیا۔ کلیم نے بہتیرا پکارا۔ اس لڑکے نے پیٹھ پھیر کر نہ دیکھا۔ ناچار کلیم نے بہزار مصیبت دوسرے فاقے سے شام پکڑی۔ اور جب اندھیرا ہوا۔ تو الو کی طرح اپنے نشیمن سے نکلا۔ سیدھا مرزا کے مکان پر گیا۔ آواز دی۔ تو یہ جواب ملا کہ وہ بڑے سویرے کے قطب صاحب سدھارے ہیں۔ کلیم نے چاہا کہ اپنا تعارف ظاہر کر کے ممکن ہو۔ تو منہ دھونے

کو پانی مانگے۔ اور مرزا کی پھٹی پرانی جوتی اور ٹوپی۔ تاکہ کسی طرح گلی کوچے میں چلنے کے قابل ہو جائے۔ یہ سوچ کر اُس نے کہا۔ کیوں حضرت! آپ مجھ سے بھی واقف ہیں" اندر سے آواز آئی کہ "ہم تمہاری آواز تو نہیں پہچانتے۔ اپنا نام و نشان بتاؤ تو معلوم ہو۔"

کلیم۔ میرا نام کلیم ہے۔ اور مجھ سے اور مرزا ظاہر دار بیگ سے بہت دوستی ہے۔ بلکہ میں شب کو مرزا صاحب ہی کی وجہ سے مسجد میں تھا۔

گھر والے۔ وہ دری اور تکیہ کہاں ہے۔ جو رات تمہارے سونے کے لئے بھیجا گیا تھا۔

تکیہ اور دری کا نام سن کر تو کلیم بہت چکرایا اور ابھی جواب دینے میں متامل تھا۔ کہ اندر سے آواز آئی "مرزا زبردست بیگ دیکھنا یہ مردوا کہیں چل نہ دے۔ دوڑ کر تکیہ اور دری تو اِس سے لے لو۔" کلیم یہ بات سن کر بھاگا۔ ابھی گلی کے نکڑ تک نہیں پہنچا تھا۔ کہ زبردست نے چور چور کر کے جا لیا۔ ہر چند کلیم نے مرزا ظاہر دار بیگ کے ساتھ اپنے حقوق معرفت ظاہر کیے۔ مگر زبردست کا تھپڑ تھا سر پر۔ اُس نے ایک نہ مانی اور پکڑ کر کوتوالی لے گیا۔

کوتوال نے سرسری طور پر دونوں کا بیان سنا۔ اور کلیم سے اُس کا حسب اور نسب پوچھا۔ ہر چند کلیم اپنا پتہ بتانے میں جھیپتا تھا مگر چار و ناچار اُس کو بتانا پڑا۔ لیکن اُس کی حالتِ ظاہری ایسی ابتر ہو رہی تھی کہ اُس کا سچ بھی جھوٹ معلوم ہوتا تھا۔ کوتوال نے سن کر یہی کہا کہ۔ میاں نصوح جن کو تم اپنا والد بتاتے ہو۔ میں اُن کو خوب جانتا ہوں اور یہ بھی مجھ کو معلوم ہے۔ کہ اُن کے بڑے بیٹے کا یہی نام ہے۔ جو تم نے اپنا بیان کیا۔ محلہ کا پتا گھر کا نشان جو تم نے کہا سب ٹھیک ہے۔ مگر کلیم تو ایک مشہور و معروف آدمی ہے۔ آج شہر میں اُس کی شاعری کی دھوم ہے۔ تمہاری یہ حیثیت کہ ننگے سر ننگے پاؤں۔ بدن پر کچھ دھجی ہوئی۔ مجھ کو باور نہیں ہوتا۔ اچھا اب رات کو کیا ہو سکتا ہے۔ جرم سنگین ہے۔ اِن کو حوالات میں رکھو۔ صبح ہو۔ میں اِن کے والد کو بلواؤں۔ تو اِن کے بیان کی تصدیق ہو۔

کلیم یہ سن کر رو دیا۔ اور کہا میں وہی بدنصیب ہوں جس کی شعر گوئی کا شہرہ آپ نے سنا ہے اور آپ کو یقین نہ ہو۔ تو میں اپنے افکار تازہ آپ کو سناؤں۔ چنانچہ کل سب کو جو کچھ مسجد اور مرزا کی شان میں کہا تھا سنایا۔ اُس پر کوتوال نے اتنی رعایت کی کہ دو سپاہی کلیم کے ساتھ کیے۔ اور اُن کو حکم دیا کہ ان کو میاں نصوح کے پاس لے جاؤ۔ اگر وہ اِن کو اپنا فرزند بتائیں تو چھوڑ دینا۔ ورنہ واپس لا کر حوالات میں قید رکھنا۔

کلیم پر، اِس کیفیت سے باپ کے روبرو آنا، جیسا کچھ شاق گزرا ہوگا۔ ظاہر ہے۔ مگر کیا کر سکتا تھا۔ سپاہی اُس کو کشاں کشاں لے ہی گئے۔ محلہ کی مسجد جس میں نصوح نماز پڑھا کرتا تھا۔ اُس کے گھر سے بہت قریب تھی جس میں ایک شاداب چمن تھا۔ اور چمن کے بیچوں بیچ ایک مرتفع چبوترہ عجیب تفریح کا مقام تھا۔ نصوح بیشتر نماز عشا کے بعد خصوصاً چاندنی راتوں میں اُس چبوترہ پر بیٹھ کر پھول بوٹوں میں خداوند تعالیٰ کی صنعت کا ملاحظہ کیا کرتا تھا۔ اُس کو بیٹھا دیکھ کر دوسرے نمازی بھی جمع ہو جاتے تھے۔ اور نصوح کو وعظ و پند کے طور پر اُن کے ساتھ گفتگو کرنے کا موقع ملتا تھا۔

نصوح اور اُس کے مستعبین مسجد کے چبوترہ پر جمع ہو چلے تھے کہ کوتوالی چبوترے کے سپاہی کلیم کو لئے ہوئے آپہنچے۔ یہ اتفاق منجانب اللہ شاید اِس وجہ سے پیش آیا۔ کہ جو لوگ کلیم کی نظر میں صرف اِس وجہ سے ذلیل تھے کہ وہ اپنے خالق کی پرستش کرتے تھے۔ اُن کے سامنے اُس کی گردن نخوت نیچی ہو۔ اب وہ انھیں فلاکت زدوں اور مردہ شوروں اور بھک منگوں اور ٹکڑ گداؤں کے روبرو اِس حیثیت سے کھڑا تھا کہ منکر نکیر کی طرح دو سپاہی اُس کی گردن پر سوار تھے۔ نہ سر پہ ٹوپی۔ نہ پاؤں میں جوتی۔ دو وقت کے فاقے سے منہ سوکھ کر ذرا سا نکل آیا تھا۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔ ہونٹوں پہ پپڑیاں جم رہی تھیں۔ کپڑوں کا وہ حال تھا کہ ایسے لباس سے ننگا ہوتا۔ تو بہتر تھا۔

جوں نصوح کی نظر بیٹے پر پڑی۔ گویا اک تیر سا کلیجے میں لگ گیا۔ اگر پہلا سا نصوح ہوتا۔ تو نہیں معلوم عورتوں کی طرح دھاڑیں مار کر روتا یا سر پیٹنے لگتا۔ یا دوڑ کر بیٹے کو لپٹ جاتا۔ یا سپاہیوں سے بے پوچھے گچھے دست و گریبان ہو پڑتا۔ خدا جانے اضطراب جاہلانہ میں کیا کرتا۔ مگر اب اُس کی جملہ حرکات و سکنات مُعلّم دینداری کی مطیع اور مؤدّب خدا پرستی کی تابع تھیں۔ اُس نے ایک دم سرد بھر کر انا للّٰہ و انا الیہ راجعون تو کہا اور اُف بھی نہ کی۔ سپاہیوں نے اُس سے کلیم کی نسبت پوچھا تو اُس نے آنکھیں نیچی کر کے کہا کہ "جب حضرت نوحؑ اپنے بیٹے کو ڈوبتے دم تک بیٹا بیٹا پکارتے گئے تو میں اِس کے فرزند ہونے سے کیونکر انکار کر سکتا ہوں" سپاہی تو اِتنا سُن کر رخصت ہوئے اور کلیم کو رفقائے نصوح میں سے کسی نے ہاتھ پکڑ کر اپنے پہلو میں بٹھایا۔

نصوح بیٹے کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ کیوں کلیم! میں نے ایسا کونسا قصور کیا تھا۔ کہ تم کو میری طلعت منحوس تک دیکھنی گوارا نہ ہوئی۔ تم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے۔ کہ شفقت اولاد ماں باپ کی طینت میں مخمّر اور آدم کی جبلت میں داخل ہے۔ وہ شفقت جو اس وقت مجھ کو اِس بات کی محرّک ہوئی کہ میں سپاہیوں کے پنجے سے تمہاری نجات کا باعث ہُوا۔ وہی شفقت مجھ کو اس بات پر بھی مجبور کرتی تھی اور کرتی ہے اور کرے گی کہ میں تم کو ایسی راہ نہ چلنے دوں۔ جو تمہاری ابدی ہلاکت کا باعث اور دائمی تباہی کا موجب ہو۔ میں نے تم سے نہیں کہا۔ کہ میرے لئے کمائی کرو۔ میری آسائش کے واسطے اپنے اوپر تکلیف اُٹھاؤ۔ اگر میں ایسا کہتا بھی۔ تو مجھ کو اُس کا منصب اور حق تھا۔ میں نے جس کمائی کو کہا۔ وہ تمہارے ہی کام آوے گی اور جس محنت کی تم کو تکلیف دی وہ تمہیں کو آرام دے گی۔ اگر کسی بیمار کا طبیب مہربان سے پرہیز کرنا۔ کسی سیّاح کا بدرقہ و خیر خواہ سے گریز کرنا روا ہے۔ تو بیشک تم بھی مجھ سے نفرت رکھ سکتے ہو۔ کیوں کلیم؟ کیا ہمیشہ تمہاری خوشی مجھ کو منظور تمہاری رضا جوئی مجھ کو ملحوظ نہیں رہی اب جو تم نے مجھ کو اپنا دشمن قرار دیا۔ اپنا عدو ٹھہرایا۔ تو دشمنی کا سبب؟ عداوت کا موجب؟

میں نے سُنا ہے کہ تم مجھ کو دیوانہ اور مجنوں اور مختل الحواس تجویز کرتے ہو۔ سو میں اِس تشخیصِ صحیح اور تجویزِ درُست اور اِس فراستِ صائب پر جرح نہیں کرتا۔ میں باؤلا اور سڑی اور پاگل سہی۔ لیکن اگر کوئی باؤلا تمہاری راہ میں کانٹے پڑے دیکھ کر تم کو آگاہ کرے۔ تو کیا اُس کی بات نہ سُننا۔ اُس کی نصیحت کو نہ ماننا۔ اُس کی فریاد کی طرف ملتفت نہ ہونا، شیوۂ دانشمندی ہے؟ پھر تم کو یہ بھی سوچنا چاہیئے تھا اور چاہیے کہ آیا میں اکیلا اِس جنوں میں مبتلا ہوں۔ یا اور بندگانِ خدا بھی میری ہی سی بلکہ میرے ہی سے خیالات رکھتے ہیں کلیم! میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ کہ جتنے بندگانِ دین ہو گذرے ہیں (خدا اُن کی پاکیزہ اور مطہّرہ روحوں پر رحمت کا مینہ نازل کرے) اور جتنے نیک بندے اب موجود ہیں (خدا اُن کی حیات میں برکت دے) کوئی اِس جنوں سے خالی نہیں۔ بلکہ جس کو۔ جتنا یہ جنون زیادہ۔ اُسی قدر برگزیدہ اور خدا رسیدہ زیادہ۔ کیا اِس بات کا اقرار کرنا جنون ہے کہ ہم بندے ہیں اور اُس کا بھی ہم پر کچھ حق ہے جس نے ہم کو پیدا کیا جو ہم کو روزی دیتا ہے۔ جس نے ہماری جانوں کی شادابی اور تازگی کے لئے آبِ شیریں و خوشگوار کی سوتیں زمین میں جاری کر رکھی ہیں۔ اور ہماری روحوں کے انبساط کے لئے ہوا کا ذخیرہ کافی مُہیّا فرما دیا ہے جس کے حکم سے چاند سورج اپنے معمول سے نکلتے اور غروب ہوتے ہیں تاکہ کام کرنے کے لئے دن ہو اور آرام لینے کے لئے رات۔ جس نے دنیا کے قوی ہیکل اور زبردست جانوروں کو ہمارا مطیع و منقاد بنا دیا ہے کہ اُن سے ہم سواری لیتے اُن پر ہم اپنا بوجھ لادتے اُن کے گوشت اور پوست اور دودھ سے مستفید ہوتے ہیں۔ جس نے انسان کو گویائی اور بیان کی قوت عطا کی ہے جس کے ذریعے سے وہ اپنا مافی الضمیر اپنے ابنائے جنس پر ظاہر کر سکتا ہے جس نے انسان ضعیف البنیان کو عقل کی قوت اور دانش کی طاقت دے کر روئے زمین کا بادشاہ اور مخلوقات کا حاکم بنایا ہے۔ جس نے کائنات میں سے ہر موجود کو اُس کی مناسب حالت پر خلق کیا ہے۔ اگر دُنیا کے سارے درخت قلموں میں صرف کر لیے جائیں۔ اور ساتوں سمندر کا پانی سیاہی کی جگہ میں

کام لایا جائے اور پڑھے لکھے لوگ جتنے ابتدائے آفرینش سے اب تک ہو چکے اور اب موجود ہیں اور آیندہ پیدا ہونے والے ہیں۔ سب کے سب مل کر اُس کی تعریف اُس کے اِحسانات ۔ اُس کے اِنعامات روزِ قیامت تک بیٹھے لکھا کریں۔ تو گھِستے گھِستے درخت ہو چکیں۔ سمندر سوکھ جائیں۔ لکھنے والے تھک کر بیٹھ رہیں مگر اُس کے حق واجب کا ایک عشر عشیر بھی ادا نہ ہو۔ کلیم! خدا ایک ایسی بدیہی بات ہے۔ کہ دُنیا میں کوئی اُس کا منکر نہیں۔ اور نہ اُس سے انکار ممکن ہے۔ ہیضہ کی وبا دفع ہوئے برس نہیں گزرے۔ تمہارے دیکھتے دیکھتے کیسے کیسے لوگ ہٹے کٹے۔ توانا۔ اچھے نکھے۔ چلتے پھرتے۔ امیر وغریب۔ عالم وجاہل۔ بھلے برے۔ سبھی طرح کے صدہا ہزارہا۔ ہدفِ تیرِ قضا ہو گئے۔ سدا رہے نام اللہ کا۔ وبا پر کیا منحصر ہے۔ وعدے سے دم زیادہ نہ کم۔ مرنا برحق۔ اچھا پھر مرے پیچھے کیا ہوگا۔ وہی عقیل ہے۔ وہی فہیم۔ وہی زیرک۔ دانشمند، جو اس سوال کا جواب معقول دے۔ جو اِس معمے کو حل کرے۔ جو یہ پہیلی بوجھے۔ کلیم! انسان کی تمام طرح کی خلقت۔ یعنی اس کا وجود عاقل ہونا اِس بات کا مقتضی ہے کہ ضرور اُس سے کوئی بڑی خدمت متعلق۔ اور اُس کے ذمے زیادہ جواب دہی ہے۔ اگر اُس کا صرف یہی کام ہوتا کہ پیٹ بھر لے اور سو رہے اور گرمی سردی سے اپنے تئیں بچائے تو اُس کے لئے زیادہ عقل کی ضرورت نہ تھی۔ جانور اپنے بڑے بڑے جتوں کی پرداخت پر بخوبی قادر ہیں۔ حالانکہ عقل سے بے بہرہ اور دانش سے بے نصیب ہیں۔ پس اِس خدمت اور ذمہ داری کو دریافت کرنا شرطِ انسانیت ہے۔

نصوح کا وعظ سن کر اُس کے ہمراہیوں کے دلوں میں دینداری کے ولولے اور خدا پرستی کے جوش تازہ ہو گئے۔ حاضرین میں کلیم کے سوائے کوئی متنفس نہ تھا۔ کہ جس پر تھوڑی یا بہت رقت طاری نہ ہوئی ہو۔

جامِ سرشار

(پانچواں دور)

شام کے وقت رئیس زادہ گردوں مدار مع مصاحبین بدکردار ولایتی بلیش بہا فٹن پر سوار ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں کھانے چلیں اڑاتے قہقہے لگاتے تھے اور سمند خوش خرام و تیز گام نوخیز معشوقوں کے مزاج کی طرح بل کرتے جاتے تھے، بجلی بھی ان کے مقابل میں گرد تھی چھل بل میں ہرن کی گرمیٔ بازار سرد تھی۔

مجھن نے کہا حضور! خدا چشم زخم حوادث سے بچائے، اس وقت تو واللہ ریل گاڑی کے بھی انجر پنجر ڈھیلے ہو جائیں۔ دونوں گھوڑیاں چوکڑیاں بھرتی جاتی ہیں۔ اوہو ہو ہو۔ اے صلِ علیٰ ابھی پرسوں ہی کا ذکر ہے۔ بڑے حضور کی خواصی میں بندہ بھی بیٹھا تھا۔ بلیش کے جو جنڈیل ہیں۔ کوئی تیس ہزار روپے مہینا طلب پاتے ہیں بس بس حضور ان کی مشکی جوڑی اور دونوں وبلا۔ کوئی پانچ پانچ ہزار کے گھوڑے سامنے سے جوڑی آئی اور ہماری گاڑی کے آگے نکال لے گیا۔ اے حضور یقین مانئے بس پھر تو گھوڑیاں آگ بھبوکا ہو گئیں۔ اور ذوق بھر کہ اس طرح چھٹیں کہ میری مند بل گرتے ہی دو گوری کے پیٹے پر ہو رہی۔ اور کوچ مین کے حواس بلا اجازت خبط۔ ایس کو لاکھ کوئی کرتا ہے مگر تو بہ ہی بھلی۔ کمہ ونڈوں جتنی گئے ایک نہ چلی، جنڈیل کی گاڑی تو منزلوں دور رہ گئی۔ اور انھوں نے جل کے جھٹ پھر دم لیا۔ سو وہ بھی ہزار خرابی۔ خداوندا اس وقت کنوتیاں دیکھنے کے قابل تھیں۔ اللہ ہی جانتا ہے۔ کھائی کا باپ بھی اس وقت سامنے آتا تو یہ پھاند جاتیں۔ اور ہماری گھوڑ پلسی کے بھی ماتھے جاتی مگر حضور اس وقت میاں گھسیٹے نے بھی وہ کام کیا کہ لاٹ صاحب کے کوچوان سے بھی نہ ہو سکتا۔ اور انیلا تو منہ کے بل زمین پر آ رہتا۔ قسم لیس یہ کیفیت تھی کہ جیسے ریل کا انجن ڈبل چال جائے۔

رئیس۔ کیوں جی گھسیٹے تم نے ہم سے یہ واردات بیان ہی نہ کی۔ وہ کون فرنگی تھا۔

گھسیٹے۔ (کوچ میں) حضور کوئی لپٹن تھا۔ کل مجھے رکھائے۔ وہ جو چشمہ لگاتا ہے۔

رئیس۔ پھر تم گاڑی نکال لے گئے تھے۔

گھسیٹے۔ حضور نکال لینا کیسا خدا نے جان بچائی اس دن۔ نہیں تو ہم اپنے حساب کوچ ہی کر چکے تھے۔ جوں جوں روکتا ہوں دونوں

وہ اور بھی تیزی کرتی ہیں۔ فیض آباد کی سڑک تک ناک دم آ گیا۔ ایک بڑھیا کچلتے کچلتے بچی۔

رفیق۔ ہاں اوہ ؟ ارے تو یہ خدا نے بڑی خیر کی وہ منہ بُرے پھنسے تھے۔

چھمن۔ (جھلا کر) بُڑے کیا خاک پھنسے تھے، ہماری سرکار سے صاحب لوگوں سے ناک بڑھا ہُوا ہے۔ واللہ بڑھیا مردار کے چاہے پرچھے پرچھے اُڑ جاتے مگر حضور کے نوکروں پر آنچ نہ آنے پاتی۔

رفیق۔ خدا خدا کر بندے۔ ہونہہ۔ اے تیری قدرت۔ آپ اور ہم کو سکھائیں۔ میں نے تو یہ بات کہی کہ بوڑھی عورت بیچاری مفت میں کچل گئی ہوتی۔

رئیس زادے نے کوچ مین سے کہا کہ میاں گھسیٹے جب جانیں کہ اسی آن کی طرح جوڑی کو تیز کرو گھوڑیاں ہوا ہو جائیں اور بات کرتے وہاں پہنچ جائیں۔ کوچ مین نے انعام کی طمع سے جوڑی کو تیز کیا تو ہوا سے باتیں کرتی چلیں۔ راستے میں جو دیکھتا ہے کہتا ہے بگھی کیا بھونچال ہے۔ آندھی روگ ہے۔ جوڑی زوروں پر تھی۔ چلتے چلتے موڑ پر ایک کمہار برتنوں کی کھانچی لئے ملا۔ کوچ میں نے لاکار سائیسوں نے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلایا۔ ہائیرٹ ہائیٹ آپ ہی جانے والا۔ موڑ پر سے ہٹ جانا آپ ہی کمہار او رے موڑ پر سے ہٹ" کمہار قوت سامعہ سے بے بہرہ اور مارے بوجھ کے پسا جاتا تھا۔ قدم اٹھاتا دو بھر اور گھوڑیاں پکٹ چلی جاتی تھیں۔ موڑ پر پہنچتے ہی کمہار جھپیٹ میں آگیا۔ برتنوں کی کھانچی سر سے گری۔ ذرا دھوں سب برتن چکنا چور ہو گئے۔ چار طرف تماشائیوں کا ہجوم۔ کسی نے کہا ہائے ہائے کمہار بے چارہ مر گیا۔ دوسرا بولا ٹانگ پاش پاش ہو گئی۔ تیسرے نے کہا۔ بد بخت بہرا تھا پکارتے پکارتے جاتے تھے۔ ہٹا کیوں نہیں۔ دو کوس سے تو بگھی کے گھڑگھڑانے کی آواز آتی تھی۔

کمہار کا اٹھنے کا تکنے اُٹھا تو ٹانگ میں خفیف سی چوٹ بتائی۔ ادھر کوچ مین نے کمہار کے گرتے ہی راس جو اُٹھائی تو منڈ باؤں ہو رہا۔ رئیس زادہ با وقار اور صاحبین حماقت شعار پیچھے پھر پھر کے دیکھتے جاتے کہ کوئی گرفتار کرنے والا تو نہیں آتا۔ رئیس زادے کا چہرہ زرد اور رنگ فق ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں پھولے بادِ بتانِ طنازِ بھولے۔ میاں چھمن کانپتے ہیں۔ رفیق کا کلیجہ دھک دھک کر رہا ہے۔ اور کوچ مین کی بس یہ کیفیت تھی کہ ع

کاٹو تو لہو نہیں بدن میں

جب منڈ باؤں پہنچے تو فٹن کو روک کر کوچ میں نے پوچھا حضور کیا حکم ہوتا ہے۔

رئیس۔ یہاں ہوش کس نامعقول کے ٹھکانے ہیں جو تم کو حکم دے۔ اُف بس اب مارے گئے۔ غضب ہی ہو گیا۔ اس کمہار کی تو خبر لاؤ۔

چھمن۔ حضور بھلا اس وقت نازی نازی واردات ہوئی ہے۔ کس کو جان بھاری ہے جو سانپ کے منہ میں اُنگلی دے۔

رفیق۔ جو جائے وہی عزت گنوائے۔

رئیس۔ گھسیٹے : تم جا کے دیکھ آؤ۔

گھسیٹے۔ اور حضور جوڑی کو یہاں کون سنبھالے گا، اس وقت گھوڑیاں بدی ہوئی ہیں۔

رئیس۔ کھول ڈالو اور جاؤ مگر کتے کی چال جاؤ اور بلی کی چال آؤ۔

گھسیٹے۔ وہ کتے بلی کی تو حضور نے ٹھیک کہی مگر مانتے تو غلام کے جائے گی۔ راس تو میرے ہاتھ میں تھی۔ میں جاؤں ذرا سی دم دھر ا جاؤں۔

رئیس ۔ اچھا کسی چاکر کو بھیجو۔

ایک چاکر ۔ نا صاحب ہم کا ساڑھے تین روپے کی نوکریاں بہوت مل رہئیں۔

دوسرا چاکر ۔ ہاں ہجور چاکر ہی تو بھیالتو ہیں۔

رئیس ۔ پھر اب ہونا کیا ہے۔ چودہ چودہ برس کو سب جائیں گے۔ ہم تو قانون وانون جانتے نہیں۔

جمن نے کہا "حضور ایک تدبیر غلام کو سوجھی ہے قربان جاؤں جو کبھی پٹ پڑے۔ پوچھا "وہ کیا؟" کہا "حضور تو یہاں اسی جگہ بستر جما دیں۔ اور غلام تراب علی کو لے کر لپکتا ہوا جائے۔ کسی فرنگی کونسل کے ہاں اور جو رائے وہ دے اسی کے بموجب کارروائی ہو۔ فرمایا "واللہ خوب سوجھی، دیکھو جتنی بات ہو گی اتنی کہیں گے۔ لگی لپٹی سے یہاں نفرت ہے۔ بس اب تم جاؤ۔ تراب علی تم بھی ان کے ساتھ جاؤ۔ تراب علی بولا "حضور اسی دم توپ کے مہرے پر کہیئے چلا جاؤں۔ میں تو نمک پروردہ قدیم ہوں۔ غلام کو عذر کیا چلو بھئی جمن۔

رئیس زادے نے کہا "دیکھو راستے میں کہیں لڑنے بیٹھنا دونوں۔ کہیں باہم گلخپ شکرار جوتی پیزار ہو تو اصل مطلب ہی غت ربود ہو جائے"۔ کہا "اے حضور کیا طاقت اس طرح رہیں جس طرح شیر و شکر۔ اس وقت جان نثاری کا موقع ہے یا گلخپ کا۔ لاحول ولا قوۃ چاہے جان جاتی رہے۔ مگر معاملہ ٹھیک ٹھاک کئے بغیر ملک الموت کو بھی بتتے بتائیں گے۔

میاں جمن اور تراب علی پو قدمے چلے تو راستہ میں یوں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

جمن ۔ کہئے ہیں استاد گھرے۔

تراب علی ۔ اجی ہماری پانچوں گھی میں اور تمہارا سر کڑھائی میں۔

جمن ۔ ایک جگہ بیٹھ کر معاملہ کی باتیں تو کرو۔

تراب علی ۔ اجی تم تو واہی ہو۔ کون بڑا لمبا چوڑا معاملہ ہے۔ چلو چل کے امین آباد والی سانن کی دوکان پر دم لگاؤ۔ پھر ہم سب ٹھیک کر دیں گے۔

جمن ۔ واللہ کیا کہی ہے۔ ارے یار آؤ آج تاڑی پئیں۔

تراب علی ۔ بس اسی کو وحشت کہتے ہیں۔ تاڑی واڑی نہیں۔ چلو کسی وکیل کے ہاں چلیں کوئی حقیقت کا اعلیٰ مقدمہ تو ہے نہیں۔ لاکھ دو لاکھ کی جائداد کا مقدمہ ہے نہیں۔ نہ خون کیا نہ قتل کر کے آئے ہیں۔ ہم تو جانتے ہیں کہ دس پانچ روپے جرمانہ ہو جائیں گے۔ تراب علی نے کہا۔ بس اور کیا۔ بلکہ (بلکہ) اس سے کم۔ بہت جرمانہ ہوا الحمد اللہ آنے ایک روپیہ۔ تدبیر وہ کہ جس سے یاروں کے ہاتھ لگ جائیں۔ اور خوب وارے نیارے ہوں۔

تراب علی ۔ ہم جا کے اس کمہار کی خبر تو لائیں۔

جمن ۔ خدا کرے ضرب شدید آئی ہو۔

تراب علی ۔ ہاں مزہ تو جب ہی ہے ورنہ کیا، مگر ہم اس کو خوب بھرے دیں گے۔ کہ ابے کچھ تو لے مر ابھی موقع ہے۔

جمن ۔ تم الگ بھکاؤ میں الگ پٹی پڑھاؤں۔

تراب علی ۔ اجی ہم تو جانتے ہیں کہ اگر اس مقدمے میں سال سال بھر کے کھانے کو بھی نہ ملا تو کیا۔ جمن نے کہا "لے اور سنو، کیونکہ میاں کی سٹی بھولی ہوئی ہے۔ بہت گھبرائے ہوئے ہیں۔

تراب علی اور میاں جمن باتیں کرتے آہستہ آہستہ قدم دھرتے امین آباد میں دن سے داخل ہوئے۔ اور سیدھے چلے ساقن کی دوکان پر۔

جمن بولے بی ساقن دموں کی خیر۔ اس نے کہا "بلے جلے بھُنے ہوئے ہیں مامے توبے۔ ایک ذری سی بات نہ ہو سکی کمبخت" جمن نے کہا "اللہ جانتا ہے اگر ابنے پر آتا تو یہی دوکان کوٹھی ہو جاتی۔ وہ بولی اونہہ اونہہ۔ جو میری بکری کر جائے شیر کو پچھاڑے ہے" کہا "اچھا اب جس دن چھوٹے حضور خوش ہوں گے اس دن ہم سپتہ ضرور لڑائیں گے" اس نے تنک کر جواب دیا "میں پچے دور جب بادام ہیں گے تو بیل بٹیں گے۔ بے اب تو دم لگواؤ۔ وہ بولی کوڑی نہ پیسہ گئے ڈوئے ہوٹ۔

تراب علی مسکرائے "کوڑی نہ پیسا؟ لے یہ ہی اشرفیاں موجود ہیں۔ ساقن نے کہا منہ دھو آؤ۔ بابا راج بھی کبھی اشرفیاں دیکھی نہیں آنکھوں سے سوائے ڈینگ کے اور کوئی بات نہیں۔

الغرض میاں جمن اور تراب علی دونوں نے چرس کے دم لگائے۔ وہ دھواں دھار کہ سو آسمان کی خبر لائے۔ کرہ زمہریہ کو گرہ تا دیا گئے جب دونوں گرمائے تو دور کی سوجھنے لگی۔

جمن ۔ کہو یار اب کدھر کی سیدھیاں ہیں ۔

تراب علی ۔ بس اب دیا پٹے بھر کے کونسل کے ہاں چلتے ہیں ۔

جمن ۔ پیدل ۔

تراب علی ۔ پیدل نہیں تو کیا تمہارے لئے کسی دھوبی کے ہاں سے گدھا منگواؤں ۔

جمن ۔ تم بھی وہ باتیں کرتے ہو بے تکی کہ گدھوں کو بھی ہنسی آئے۔ ارے میاں ایسے موقعے روز روز تھوڑی ملتے ہیں۔ چلو چل کے بگھی کرایہ کریں مزے سے بیٹھے ہوئے چلیں ۔ کہ دینا جلدی کی غرض سے بگھی کر لی تھی۔ کچھ گرہ سے تھوڑی جائے گا۔ ہے کہ نہیں ؟

تراب علی ۔ اچھا پھر بگھی کرایہ کرو ۔

جمن ۔ وہ کیا اڑ گڑا ہے ارے میاں کوئی بگھی ہے ۔ کونسل تک جائیں گے ۔

گاڑی والا ۔ جلیئے ٹل ہیسٹ کلاس ہے۔ پہلے گھنٹے کے بارہ آنے ۔ پھر چھ آنے گھنٹہ ۔

جمن ۔ جو حساب ہو گا وہ سب دیں گے ۔

تراب علی ۔ جان کیوں گھسکی جاتی ہے ۔ یہ لو بخشش ۔ ایک روپیہ لو ۔ کہہ بابا ۔ پر کھہ لو ۔ ہاں نئے گھن کا ہے ۔ دو وعدہ کا دھویا ۔

گاڑی تیار ہوئی اور میاں جمن اور تراب علی کونسل کے ہاں چلے ۔

تراب علی ۔ اجی کیا کہنا اپنی ایسی تیسی ہیں ۔ چلو کونسل کے ہاں چلیں ۔

جمن ۔ وہ بھی اپنے دل میں ہنسے گا کہ عجیب قطع کے آدمی ہیں۔ کمہار کا پاؤں ذرا پھل گیا ۔ اور چلے وکیل کے پاس ۔

تراب علی ۔ اب کونسل سے تو آپ کچھ کہیے گا نہیں ۔ میں بھگت لوں گا ۔

جمن ۔ بہتر ہے ۔

تراب علی ۔ ذرا تم سُنتے رہنا کس ترکیب سے گفتگو کرتا ہوں ۔ واللہ وہ داؤں پیچ یاد ہیں کہ ماروں چاروں شانے چت ۔ بٹ تو پڑا ہی نہیں ۔ ابھی یہ باروں کے ہتھکنڈے ہیں وہ بائیں ہاتھ کے کرتب ۔

جمن ۔ فرنگی ہیں نہ وہ کونسل ۔

تراب علی۔ وہ۔ اصل فرنگی۔ ولایت زاد خاص الخاص لندن کے۔

جمن۔ لبتے کہاں ہیں ۔؟

تراب علی۔ سلیمان باغ کے سامنے لال جھیل کے پاس کوٹھی ہے۔

جمن۔ چھوٹے حضور اس وقت بڑے بیاکل ہوں گے۔ نہ ہم ہیں نہ تم ہو نہ صاحب اللہ ولہ ہیں۔ بالکل سناٹا اور ہو کا عالم۔ لے بھلا منڈیاؤں کی چھاؤنی میں اس وقت کون ہوگا۔ پرندہ تو پر مارتا نہیں اور ہوا سَن سَن چل رہی ہوگی معاذ اللہ۔

تراب علی۔ ما اللہ بسم اللہ ہی غلط ہوئی۔ سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔

جمن۔ اب دیکھئے بھترے ہیں آتے ہیں یا نہیں۔ ہتّے ہی پر ٹوک دیئے گئے ورنہ پو بارہ تھے۔

تراب علی۔ اب کی یہ پلہ پار ہو جائے تو سمجھئے کہ بیڑا پار ہے۔ ورنہ وہی ملاپن . . . .

العزض گاڑی صاحب کی کوٹھی میں داخل ہوگئی۔ اور تراب علی نے بیرا کو بلایا۔
صاحب کو اطلاع ہوئی بلائے گئے اور سلام کیا۔

تراب علی۔ حضور آج فٹن پر ہمارے مالک جاتے تھے چنانچہ ایک کمہار روپے لینے کے لئے بہانہ کرکے لیٹ رہا۔ اور غل مچایا کہ کچلا کچلا۔ حضور کچلا نہیں۔ کچھ جھوٹ موٹ غل مچا دیا۔ گھوڑیاں جو اس کے غل سے دوڑیں تو ہوا ہو گئیں بس زمین پہ قدم ہی نہیں رکھتی تھیں۔ لاکھ لاکھ سمجھایا۔ غل مچایا۔ للکارا۔ ہائیٹ ہائیٹ کرتے رہے مگر سنتا کون ہے۔ وہاں آخر کار گر پڑا۔

صاحب۔ کیا مرگیا . . . . ہاتھ پاؤں کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ کچھ چوٹ آیا۔

تراب علی۔ سچ تو یوں ہے کہ ہم لوگ گاڑی تیز بڑھا کر چل دیئے تھے۔ خدا جانے اس کی کیا کیفیت ہوئی۔

صاحب۔ ول تم سب پر سو سو روپے جرمانہ۔

تراب علی۔ (مسکرا کر) واہ حضور اچھا فیصلہ کر دیا۔

جمن۔ (تراب علی کے کان میں) اجی صاحب فقط ہنسی میں کہتے ہیں۔

تراب علی۔ ہاں واللہ ! اجی نہیں۔ عجب نامعقول آدمی ہو بھئی یہاں اتنا بڈھے ہوئے۔ صدہا مقدمے لڑائے۔ آپ ہم سے مشیخت کی لیتے ہیں۔ یہ کونسل ہیں۔ پیروکاران کو جرمانے اور سزا سے کیا سروکار۔

تراب علی۔ گاڑی کو گھر پر لے جائیں یا نہیں۔

صاحب۔ بڑبہلے جاؤ۔ پولیس اگر کوچ مین کو ملنگے بھی۔ چالان ہوگا اور روپیہ دو روپیہ جرمانہ بس۔

جمن اور تراب علی نے زمین دوز ہو کر فرشی سلام کیا اور چلے۔ تراب علی اور جمن ایسے لنگوٹیے یار بن گئے گویا دانت کاٹی روٹی تھی۔ یہ ان پہ جان نثار کریں۔ وہ ان کا دم بھریں۔ مگر دونوں گون کے یار دونوں پورے سرے کے کائیاں۔ دنیا بھر کے نیادہ ئیے، چکمہ بازی میں طاق۔ جعل سازی میں شہرہ آفاق۔ سب گنوں پورے انہیں کون کہے لنڈورے۔ العرض دونوں کونسل سے رخصت ہو کر چلے تو راستے میں بگھی پر:

جمن۔ مانتا ہوں استاد تو بھی اپنے فن میں استاد کامل ہے۔

تراب علی۔ میاں ابھی دیکھتے تو جاؤ۔ تم جہرفی ہے۔

جمن۔ یار چنگ پر تو چڑھ گیا مگر یہ بڑی افتاد پڑی۔

تراب علی ۔ بس ہم میں تم میں یہی تو فرق ہے۔ یہاں سمجھنا تو جانتے ہی نہیں اُستاد نے یہ سبق ہی نہیں پڑھایا۔ ع

ہر چہ بادا آباد ما کشتی در آب انداختیم

اور اتنا تو سمجھ یار عزیز کہ وہ بات ہی کیا ہے۔ جس سے ہم سہمنے لگیں۔ اجی یہی نہ کہ گاڑی کے پہیے کے تلے ایک شخص کا پاؤں آ گیا۔ پھر خوف کا کون سا مقام ہے۔ اگر پاؤں کچل بھی جاتا تو کون بات تھی۔ دو روپے نہیں، دس جرمانہ ہوتے۔ دس نہیں بفرض محال سو جرمانہ ہوتے تو کیا یہ بھی کوئی رقم ہے۔

جمن ۔ ارے یار تیرا بہت بڑا پیٹ ہے۔

تراب علی ۔ میاں اپنا تو یہ مقولہ ہے کہ ع

خاک از تودۂ کلاں بردار

جب مارے روپے والے کو۔ غریب کے پلے کیا ہے۔ جو دیگا امیر سے البتہ اینٹھنے کا موقعہ ملتا ہے۔ ہزار دو ہزار کی رقم تکمیشت چیرے تو البتہ بات ہے۔ ورنہ سو دو سو روپے کے لئے جعلسازی کرنا اپنے مذہب کے تو خلاف ہے۔ درخت کا ایک پھل رکھوالے کی چوری سے کھایا۔ تو کیا یہاں جرثومے بھنگی تک چٹ کر جائے تو گھڑ کا تک نہ لے تب تو آدمی ورنہ جانور۔ دیکھئے حضرت ہے کیا کیا جائے کہتا ہوں واللہ وہ سبز باغ دکھاؤں کہ میاں کی آنکھیں کھل جائیں اور ان لونڈوں کو اُلّو بنانا تو بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔ تمہارے ایسے لونڈے میری جیب میں پڑے ہیں۔ اب ایک بات کا خیال ضرور ہے۔ اُستاد کہ چھوٹے حضور کو جتنا ڈرایا جائے اتنا ڈرانا مگر آن بان کے ساتھ یہ نہیں کہ باتوں ہی سے وہ بھڑک جائیں . . . . .

جمن ۔ وہ تو اپنے نزدیک پھانسی پر چڑھ چکے . . . . . مگر میں جاتے ہی وہ بھرتے دونگا کہ بخدا ریشہ خطمی ہو جائیں۔ یہ بھی اتنا صاف صاف بتا دو کہ ہمارے ہتھے کیا چڑھے گا۔ یہاں تو اپنے حلوے مانڈے سے غرض ہے۔ مُردہ چاہے دوزخ میں جائے چاہے بہشت میں۔ ارے یار ایک مکان گروی رکھ دیا ہے۔ کچھ ایسا کرو کہ اس کو چھوڑا سکوں . . . . .

الغرض میاں جمن اور تراب علی اپنے اپنے ادھائی چاول پکاتے باتیں بناتے منڈوا پاؤں پہنچے . . . . . . اتنے میں تراب علی نے پکارا "ارما گھسیٹے" رئیس نے خوش ہو کر کہا "آ گئے؟" "آؤ آؤ" گھسیٹے بولا۔ لپک آئیے۔ تراب علی اور جمن جا پہنچے۔ تراب علی نے کہا "حضور فتح ہے" جمن بولا "خداوند مبارک ہو" رئیس نے پوچھا خوف تو نہیں ہے۔ یہ بتا دو مختصر طور پر کہا "ایک کونسلی کو کہہ دیا ہے۔ حضور خاطر جمع رکھیں۔ خداوند چلنے چلنے گا مچھیاں دور کرنے لگیں . . رئیس زادے نے پوچھا۔ "اس کمہار کا کیا حال ہے۔ کہا "پتلا دھندی میں چوٹ آ گئی۔ پڑا سسک رہا ہے" . . . . . اے خداوند چودہ روپے پیر بخش نیچے والے سے قرض لے کہ جراح کو دے آیا ہوں اس کے پلے کیا ہے دو جوتیاں اور وہ تو چاہتا ہی ہے کہ ٹانگ زخمی رہے۔ جس میں مرکار سے آپ کے نام ڈگری ہو جائے اگر عمر بھر اس کو روٹیاں دیتے جاؤ ہم کونسلی کے ہاں گئے۔ حضور اللہ رے دماغ۔ خدا جانے فغفور چین اپنے کو سمجھتے ہیں یا شہنشاہ روس کا سمجھتے ہیں اُف اُف تیرے دماغ سیدھی بات ہی نہیں کرتے۔ تب تو میں جھلا کر چلا گیا۔ لالہ ہیرا لال اور گھنشی مل کی کوٹھی ۔ ان سے سفیب جی ایک جنجھالئے پہلے تو کہا کہ نواب صاحب یا چھوٹے حضور کے نام سے روپیہ قرض لو تو دیں۔ پھر جب میں نے ڈانٹ بتائی تو دو سو روپیہ دے دیا . . . . . . جمن کو کونسلی کے پاس بٹھا آیا تھا۔ جاتے ہی روپیہ میز پر ڈال دیا اور نوٹ ہاتھ میں دیئے۔ بس پھر کیا تھا۔ روپے کی بھی کیا بڑی چوٹ ہے۔ حضور کل باتیں سُنیں۔ کہنے لگے مقدمہ ذرا پیچیدہ ہے۔ شاید کوئی کہہ دے کہ راس نواب صاحب ہی کے ہاتھ میں تھی مگر سوچ ساچ کر بولے: اچھا ہم سمجھ لیں گے

تراب علی۔ وہ ۔ اصل فرنگی ۔ ولایت زاد خاص الخاص لندن کے ۔

جمن ۔ رہتے کہاں ہیں ۔؟

تراب علی۔ سلیمان باغ کے سامنے لال حویلی کے پاس کوٹھی ہے۔

جمن ۔ چھوٹے حضور اس وقت بڑے بیاکل ہوں گے ۔ نہ ہم ہیں نہ تم ہو نہ مصاحب الدولہ ہیں۔ بالکل سناٹا اور ہو کا عالم ۔ لے بھلا منڈیاؤں کی چھاونی میں اس وقت کون ہوگا ۔ پرندہ تو پر مارتا نہیں اور ہوا لُسن سَن چل رہی ہوگی معاذ اللہ ۔

تراب علی۔ واللہ بسم اللہ ہی غلط ہوئی ۔ سر منڈاتے اولے پڑے ۔

جمن ۔ اب دیکھیئے بھڑے میں آتے ہیں یا نہیں ۔ ہتنے ہی پر ٹوک دیئے گئے ورنہ پو بارہ تھے ۔

تراب علی۔ اب کی یہ پلہ پار ہو جائے تو سمجھئے کہ بیڑا پار ہے ۔ ورنہ وہی ملّا پن . . .

الغرض گاڑی صاحب کی کوٹھی میں داخل ہوگئی۔ اور تراب علی نے بیرا کو بلایا ۔

صاحب کو اطلاع ہوئی بلائے گئے اور سلام کیا ۔

تراب علی۔ حضور آج فٹن پہ ہمارے مالک جاتے تھے چنانچہ ایک کہار روپے لینے کے لئے بہانہ کرکے لیٹ رہا ۔ اور غل مچایا کہ کچلا کچلا۔ حضور کچلا نہیں ۔ کچھ جھوٹ موٹ غل مچا دیا ۔ گھوڑیاں جو اس کے غل سے دوڑیں تو ہوا ہو گئیں بس زمین پہ قدم ہی نہیں رکھتی تھیں۔ لاکھ لاکھ سمجھایا ۔ غل مچایا ۔ للکارا ۔ ہائیٹ ہائیٹ کرتے رہے مگر سنتا کون ہے ۔ وہاں آخر کار گر پڑا ۔

صاحب ۔ کیا مر گیا . . . . . ہاتھ پاؤں کچھ ٹوٹ گیا تھا ۔ کچھ چوٹ آیا ۔

تراب علی۔ سچ تو یوں ہے کہ ہم لوگ گاڑی تیز بڑھا کر چلی دیئے تھے ۔ خدا جانے اس کی کیا کیفیت ہوئی ۔

صاحب ۔ ول تم سب پر سو سو روپے جرمانہ ۔

تراب علی۔ (مسکرا کر) واہ حضور اچھا فیصلہ کر دیا ۔

جمن ۔ (تراب علی کے کان میں) اجی صاحب فقط ہنسی میں کہتے ہیں ۔

تراب علی۔ ہاں واللہ ! اجی نہیں ۔ عجب نا معقول آدمی ہو ۔ بھئی یہاں اتنا بڑے ہوئے ۔ صدہا مقدمے لڑائے ۔ آپ ہم سے سختی کی لیتے ہیں ۔ یہ کونسل ہیں ۔ پیروکاران کو جرمانے اور سزا سے کیا سروکار ۔

تراب علی۔ گاڑی کو گھر پہ لے جائیں یا نہیں ۔

صاحب ۔ بڑبڑ لے جاؤ ۔ پولیس اگر کو جج مین کو مانگے بھیج ۔ چالان ہوگا اور دو پا دو روپا جرمانہ بس ۔

جمن اور تراب علی نے زمین دوز ہو کر فرشی سلام کیا اور چلے ۔ تراب علی اور جمن ایسے لنگوٹیے یار بن گئے گویا دانت کاٹی روٹی تھی ۔ یہ ان پر جان نثار کریں ۔ وہ ان کا دم بھریں ۔ مگر دونوں گون کے یار دونوں پرلے سرے کے کائیاں ۔ دنیا بھر کے نیار ئیے ، چکمہ بازی میں طاق ۔ جعل سازی میں شہرۂ آفاق ۔ سب گُرو ں پورے انہیں کون کہے لنڈورے ۔ الغرض دونوں کونسل سے رخصت ہو کر چلے تو راستے میں لگی پر:

جمن ۔ مانتا ہوں استاد تو بھی اپنے فن میں استاد کامل ہے ۔

تراب علی۔ میاں ابھی دیکھتے تو جاؤ ۔ تم جیرنی ہے ۔

جمن ۔ یار چنگ پر تو چڑھ گیا ۔ مگر یہ بڑی افتاد پڑی ۔

تراب علی ۔ بس ہم میں تم میں یہی تو فرق ہے۔ یہاں سہنا تو جانتے ہی نہیں اُستاد نے یہ سبق ہی نہیں پڑھایا۔ ع

ہرچہ بادا آباد ما کشتی در آب انداختیم

اور اتنا تو سمجھ یار عزیز کہ وہ بات ہی گیا ہے۔ جس سے ہم سہمنے لگیں۔ ابھی یہی نہ کہ گاڑی کے پہیئے کے تلے ایک شخص کا پاؤں آگیا۔ پھر خوف کا کون سا مقام ہے۔ اگر پاؤں کچل بھی جاتا تو کون بات تھی۔ دو روپے نہیں، دس جرمانہ ہوتے۔ دس نہیں بفرض محال سو جرمانہ ہوتے تو کیا یہ بھی کوئی رقم ہے۔

جمن ۔ ارے یار تیرا بہت بڑا پیٹ ہے۔

تراب علی ۔ میاں اپنا تو یہ مقولہ ہے کہ ع

خاک از تودۂ کلاں بردار

جب ہمارے روپے والے کو۔ نوبت کے پتے کیا ہے۔ جو دیگا امیر سے البتہ اینٹھنے کا موقع ملتا ہے۔ ہزار دو ہزار کی رقم تکمیشت چیرے تو البتہ بات ہے۔ ورنہ سو دو سو روپے کے لئے جعلسازی کرنا اپنے مذہب کے تو خلاف ہے۔ درخت کا ایک پھل رکھوالے کی چوری سے کھایا۔ تو کیا یہاں جڑ سے پھنگی تک چٹ کر جائے تو ٹھگ کا رنگ نہ لے تب تو آدمی ورنہ جانور۔ . . . دیکھئے تو حضرت ہے کیا کیا جائے کہتا ہوں واللہ وہ سبز باغ دکھاؤں کہ میاں کی آنکھیں کھل جائیں اور ان لونڈوں کو آکر بنانا تو بائیں ہاتھ کا کرتب ہے . . . تمہارے ایسے لونڈے میری جیب میں پڑے ہیں۔ اب ایک بات کا خیال ضرور ہے۔ اُستاد کہ چھوٹے حضور کو جتنا ڈرایا جائے اتنا ڈرانا مگر آن بان کے ساتھ یہ نہیں کہ باتوں ہی سے وہ بھڑک جائیں ......

جمن ۔ وہ تو اپنے نزدیک پھانسی پر چڑھ چکے . . . . بگڑ میں جاتے ہی وہ بھرتے و دنگا کہ بخدا ریشہ خطمی ہو جائیں۔ یہ بھی اتنا صاف صاف بتا دو کہ ہمارے ہستے کیا چڑھے گا۔ یہاں تو اپنے حلوے مانڈے سے غرض ہے۔ مُردہ چاہے دوزخ میں جائے چاہے بہشت میں۔ ارے یار ایک مکان گروی رکھ دیا ہے۔ کچھ ایسا کرو کہ اس کو چھوڑا سکوں ......

الغرض میاں جمن اور تراب علی اپنے اپنے اڑھائی چاول پکاتے باتیں بناتے منڈیا ؤں پہنچے ...... اتنے میں تراب علی نے پکارا "ارے گھسیٹے"۔ رئیس نے خوش ہو کر کہا "آگئے"۔ "آؤ آؤ" گھسیٹے بولا۔ لیک آئیے۔ تراب علی اور جمن جا پہنچے۔ تراب علی نے کہا "حضور فتح ہے"۔ جمن بولا "خداوند مبارک ہو"۔ رئیس نے پوچھا خوف تو نہیں ہے۔ یہ بتاؤ مختصر طور پر۔ کہا "ایک کونسلی کو کہہ دیا ہے۔ حضور خاطر جمع رکھیں۔ خداوند چلنے چلنے کا مچیاں درد کرنے لگیں . . . . رئیس زادے نے پوچھا "اس کمہار کا کیا حال ہے۔ کہا پنلا ہڈی میں چوٹ آگئی۔ پڑا سسک رہا ہے" ..... اے خداوند چودہ روپے پیر بخش نیچے والے سے قرض لے کہ جراح کو شے آیا ہوں اس کے پلے کیا ہے دو چپاتیاں اور وہ تو چاہتا ہی ہے کہ ٹانگ زخمی رہے۔ جس میں مرکا دست آپ کے نام ڈگری ہو جائے اگر عمر بھر اس کو روٹیاں دیئے جاؤ۔ ہم کونسلی کے ہاں گئے۔ حضور اللہ رے دماغ۔ خدا جانے فغفور چین اپنے کو سمجھتے ہیں یا شہنشاہ روس کا سمجھتے ہیں۔ اُف تیرے دماغ سیدھی بات ہی نہیں کرتے۔ تب تو میں جھلا کر چلا گیا۔ لالہ ہیرا لال اور کھنٹی مل کی کوٹھی۔ ان کے منیب جی ایک جنہیں پہلے تو کہا کہ نواب صاحب یا چھوٹے حضور کے نام سے روپیہ قرض لو تو دیں۔ پھر جب میں نے ڈانٹ بتائی تو وہ سو روپیہ دے دیا ...... جمن کو کونسلی کے پاس بٹھا آیا تھا۔ جاتے ہی روپیہ میز پر ڈال دیا اور نوٹ ہاتھ میں دیئے۔ بس پھر گیا تھا۔ روپے کی بھی کیا بڑی چوٹ ہے۔ حضور کل باتیں سُنیں۔ پہلے تو بہا مقدمہ ذرا پیچیدہ ہے۔ شاید کوئی کہہ دے کہ راس نواب صاحب ہی کے ہاتھ میں تھی۔ مگر سوچ ساچ کر بولے "اچھا ہم سمجھ لیں گے

جاندار تو ہے مقدمہ اور جو ہار گئے تو اپیل میں دیکھ لیں گے۔ حضور کو سلام کہلا بھیجا ہے۔ اور کہا تشفی کر دینا۔ کہ اس میں کچھ ہونا نہیں ہے۔ خفیف مقدمہ ہے، ہزار دو ہزار پر تو البتہ پانی پھر جائے گا۔

رئیس زادہ ۔ واہ جی عزت بچی یہی غنیمت ہے۔ ہزار دو ہزار روپیہ گیا چولہے کی جڑ میں اب تو آبرو پر بن آئی ہے۔

گھسیٹے ۔ بھلا میاں تراب علی۔ ہم پر تو آنچ نہ آئے گی؟

تراب علی۔ کیوں گھبرائے جاتے ہو۔ خواہ مخواہ کے لئے۔

گھسیٹے ۔ ارے صاحب ہم غریب آدمی پانچ چھ روپلے کی اوقات کہیں گھن کی طرح پس نہ جائیں۔

تراب علی ۔ اور آخر ہم کس مرض کی دوا ہیں۔

رئیس زادہ۔ آج تم بڑے کام آئے۔

تراب علی۔ قربان جاؤں پیر و مرشد جہاں حضور کا پسینہ گرے وہاں غلام کا خون گرے۔ اور کیا۔

جھمن ۔ حضور کونسل سے انھوں نے وہ تقریر کی ہے کہ ہوش اُڑا دیئے۔ جو خداوند وہاں ہوتے تو انعام ضرور دیتے۔

. . . . تراب علی نے کہا . . . ”خداوند حضور کی بدولت بہت کچھ پیدا کیا۔ برسوں سے نمک کھا رہے ہیں۔ اسی سرکار کے ساختہ پرداختہ“ ہیں خانہ زاد۔ رگ و ریشہ میں اسی سرکار کا نمک پیوست ہے۔ خدا کرے جاہ و حشم روز بروز ترقی پائے۔ ہر صبح کو دولت آستاں بوسی کو آئے۔ اقبال قدم قدم پہ ساتھ ہو۔ رحمتِ خدا کے ہاتھ میں ہاتھ ہو۔ عزت بڑھے رتبہ بڑھے۔ اور اسی سرکار کی بدولت تراب علی فیل نشین ہو ہاتھی پر چڑھے۔

جھمن ۔ اب چلئے حضور۔

رئیس زادہ۔ اسی فٹن پر۔؟

تراب علی۔ ہاں ہاں حضور اسی فٹن پر۔

رئیس زادہ۔ اب تو اس فٹن پر بندہ سوار نہ ہونے کا۔

تراب علی ۔ فٹن سڑک پر لاؤ میاں گھسیٹے۔ حضور سوار ہوں۔ غلام کا ذمہ ہے۔ ایسی بات ہے۔ بھلا۔

الغرض بعد خرابی بسیار فٹن پر سوار ہو کر ؎

آہستہ خرام بلکہ مخرام   زیر قدمت ہزار جان ست

گھسیٹے ۔ حضور کلیجہ دھڑ دھڑ کر رہا ہے۔

تراب علی۔ اور کیوں جی اگر وہ مر جاتا۔

گھسیٹے ۔ واہ چھوڑ چھاڑ کر فٹن گنگا پار ہو رہتا۔

تراب علی ۔ کیا خوب ان کو بھی شاہی کی باتیں یاد ہیں۔ نادان ہو کون؟ ارے گنگا پار کیا ہے پاگل۔ وہاں بھی سرکار کمپنی بہادر کی عملداری ہے۔

فٹن ذرا تیز چلی اور رئیس زادے نے غل مچایا: ”آہستہ آہستہ آہستہ تیز نہ چلو“ گھوڑیوں نے ذرا کنوتی بدلی اور ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اب چاکروں کو للکار رہے ہیں کہ اُترو پڑو۔ اُترو پڑو۔ ساتھ ساتھ چلو۔ کئی مقام پر خود اُتر پڑے۔ لوگوں کی ناک میں دم۔ تراب علی نے لاکھ سمجھایا۔ میاں جھمن نے دلاسا دیا مگر بے سود۔ ہزار خرابی کہیں فٹن در دولت پر پہنچی اور دروازہ

پہ ایک دفعہ ہی غل مچا کہ آ گئے آ گئے۔ اجی وہ اجی بڑے حضور کو اندر اطلاع کر دیجئے کہ سرکار آ گئے۔

نوبت دربان نے کہا "یہاں کنوؤں میں بانس پڑ گئے۔ بڑے حضور گھبرا اٹھے تھے آج خلاف معمول اتنی دیر کہاں ہوئی۔ جھٹ دوڑ کے دوڑنے محل بھر میں کہرام مچ گیا۔ بارے شکر ہے کہ حضور آ گئے۔ بسم اللہ! رئیس زادہ آ تو پڑا۔ دوا فرخندہ اندر سے دوڑی آئیں۔ جھٹ جھٹ بلائیں لے کر کہا کہ حضور بس جلدی اندر چلئے۔ بیگم صاحب کی آنکھیں روتے روتے دل بیر بہوٹی ہو گئی ہیں۔ اور بڑے حضور بھی بدم ہیں نصیب اعدا۔ یہ اتنی دیر آپ رہے کہاں۔ یہاں محشر بپا، دشمنوں کے کان بہرے، اکہرام سا مچ گیا۔ ہوش اڑے ہوئے تھے سب کے۔ رئیس زادے نے جیسے ہی دہلیز پہ قدم رکھا گھر بھر کی ماما اصیلیں مغلانیاں خوش خوش ہشاش بشاش لپکیں چھوٹے حضور آئے چھوٹے حضور آئے مبارک سلامت کی صدا چرخ ہفتم تک پہنچی۔ بڑی بیگم رئیس زادے کی ماں مہربان کی جان میں جان آئی اور فرط محبت سے لڑکے پر خفا ہوئیں۔

بڑی بیگم۔ اے غضب خدا۔ اتنا بھی خیال نہ رہا کہ بڑھیا کڑھ کڑھ کے اتنی دیر میں مر تو نہ جائے گی۔ بوڑھے باپ کی خدا نہ کرے جان پہ تو نہیں بن آئیگی۔ آخر ش یہ اتنی دیر جو غائب غلہ رہے تو دل میں سمجھے کیا تھے۔ ایک آدھ کی لاش گھر سے نکلوانے کا مقصد تھا شاید بڑھیا ادھر باپ کے پاس۔

بڑے نواب۔ بیٹا اب تک تم کہاں تھے۔

رئیس زادہ۔ قبلہ کہیں نہیں ہوا کھانے گیا ہوا تھا۔

بڑے نواب۔ ابے تو اتنی دیر۔ اتنی دیر میں تو آدمی جھنٹ کے تین چار پھیرے کر آئے۔

رئیس زادہ۔ گرمی کے سبب سے منڈیاؤں نکل گیا تھا۔

بڑے نواب۔ معقول۔ ابے اگر یہی پڑھتے ہی وحشت کی لینے لگے۔ تو ہماری تشفی کے لئے ایک آدمی یہاں دوڑا دیا ہوتا بس پھر چاہے آدھی رات تک نہ آتے۔ ہمارے قلب کی اس وقت عجیب کیفیت تھی۔

رئیس زادہ۔ بہت خوب۔ مگر قبلہ و کعبہ یہ تو بڑی مصیبت ہوئی کہ جہاں کسی دن ذرا دیر ہو گئی اور گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ کنوؤں میں بانس پڑنے لگے۔ اصیلیں مغلانیاں گھر میں، نوکر چاکر مصاحب باہر، غل مچانے لگے۔ اتفاق ہے کسی روز ہوا کھانے صدر نکل گئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ادھر جھمن اور امام الدین خاں مصاحبوں میں یوں چپکے چپکے گفتگو ہونے لگی

امام الدین۔ دونوں ہاتھوں سے لوٹو مگر ہماری بھی فکر رکھنا۔

جھمن۔ تم تو شریک حال ہوتے پہلے پھر اوپر کوئی۔

امام الدین۔ ہاں صاحب تو منڈیاؤں میں ٹھہرے پر سیدھے گھر چلے آئے یا کہیں اور گئے تھے۔

جھمن۔ وہاں نواب کو چھوڑ فٹن پہ ہم اور تراب علی چلے کونسلی کے ہاں۔

امام الدین۔ (ہلکی تکیہ) ارے ستم! یہ تو کہئے بالکل الو کی دم فاختہ ہی ہے۔ بھلا اس میں کونسلی کا کون سا کام تھا۔ اچھے رہے۔ کونسلی کے ہاں گئے بھی تھے۔ یا یونہی فقرہ چست کر دیا۔ ساقن کے ہاں دم لگایا ہوگا۔ اور چھوٹے حضور سے آ کے کہہ دیا ہوگا کہ ہم آئے یہ کہا اور وہ کہا۔ خوب سبز باغ دکھایا ہوگا۔

کہا "تیرے سر کی قسم ساقن کے وہاں بھی گئے تھے۔ مگر وہاں سے پلٹ کر پہنچے کونسلی کے ہاں اس سے تراب علی کی بات چیت ہوئی۔

اس نے کہا ہم ایسے چھوٹے مقدمے ہیں وکالت نہیں کرنا چاہتے۔ مگر اتنا کہے دیتے ہیں کہ کورٹ میں کو جب کوئی تلنگا یا ہوٹن انداز بلانے آئے تو بھیج دینا۔ دو ایک روپیہ جرمانہ کی سزا ہو جائے گی۔ بس یہاں آکر تراب علی نے وہ اڑن گھاٹیاں بنائیں کہ کچھ نہ پوچھیے کہا کہ پیر و مرشد کمہار کا حال دیکھا تو ناٹک میں انتہا کا درد پایا اس نے تو آسمان سر پر اٹھایا ہوا ہے نالش کر دوں گا اور لندن تک لڑوں گا۔ اور بڑے صاحب کے ہاں عرضی دونگا۔ آخر میں نے ایک دو کا اندازہ سے چودہ روپے قرض لے کر اس کے حوالے کر دیئے . . . . . پھر میں کونسل کے پاس گیا۔ وہ اچھی طرح مخاطب نہ ہوا۔ مگر ایک مہاجن کی کوٹھی سے دو سو روپے قرض لئے جب جاکے کونسل کو دیئے۔ اور اس کی رائے لی اور خدا جانے کیا کیا جھوٹ بولے۔ بس یہ سمجھئے کہ جھوٹ کے چھپر اڑا دیئے۔
امام الدین نے کہا چلو رادی چین لکھنا ہے۔ ایک تو یہ بیہودہ دن والا مقدمہ تھا ہی۔ دوسرا اس پر طرہ ہوا۔ اس میں بھی کچھ نہ کچھ سے ہی مریں گے۔

جمن۔ دو سو چودہ تو دودھ پی رہے ہیں۔

اب رات بھیگی تو جھٹ چھٹا کے تراب علی اور میاں جمن اور امام الدین خاں اور نواب صاحب اور ایک انیس صاحب الدولہ بہادر رہ گئے۔

رئیس زادے نے کہا میاں خاں صاحب ہم تو بڑی مصیبت میں پڑ گئے۔ ایک آدمی دب کے مر گیا۔ اب دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ خاں صاحب نے تشفی دی "پیر و مرشد کچھ نہ ہو گا" کہا "نہیں خاں صاحب بڑی بلا سے مقابلہ کرنا ہے"!

تراب علی۔ لاحول ولا قوۃ۔ بلا سے حضور کے دشمنوں کا مقابلہ ہو۔ حضور سے اس مقدمے سے کیا واسطہ۔ غلام تو اپنا اور گھسیٹے کا نام لکھوا آیا۔

رئیس زادہ۔ واللہ؟

تراب علی۔ حضور کے قدموں کی قسم۔

امام الدین۔ تے وہ بات ہی کیا ہے۔ چار پانچ سو روپے کا تو خرچ ہے۔

رئیس زادہ۔ اجی خرچ ہونے کو چاہے ہزار بارہ سو خرچ ہو جائیں۔ مگر عزت پر حرف نہ آئے۔

امام الدین نے کہا کیا مجال۔ جمن بولا کیا حقیقت ہے کسی کی" رئیس زادے نے کہا۔ ابھی دیکھو تو اونٹ کس پہلو بیٹھتا ہے۔ ابھی تو مقدمہ ہی درپیش ہے۔ پھر سمجھا جائے گا۔ ابھی ہم نہ جانے کے "جمن بولا" خداوند! رئیس لوگ عالی ہمت ہوا کرتے ہیں۔ اور حضور تو پشتوں کے رئیس ہیں۔ سارے شہر میں ڈگی پھر جائے گی کہ مقدمہ کر کے پھر تشریف نہ لے گئے۔ چلئے اور ضرور چلئے۔ ایسے ایسے خفیف معاملوں سے تو آپ کو واسطہ ہی نہ رکھنا چاہیئے، چھوٹے نواب پر نئی نئی مصیبت پڑی تھی۔ ایسی افتاد کبھی کاہے کو پڑی تھی۔ مگر مصاحبوں نے پھڑک مٹانا شروع کیا۔ ایک نے کہا حضور اب تو مقدمہ تراب علی اور گھسیٹے کے سر پڑا۔ حضور تو تلوہ نکل گئے۔ اب حضور سے واسطہ ہی کیا رہا۔ وہ اپنے سمجھ لیں گے۔ حضور پر ذرا آنچ نہ آنے پائے گی۔ بلا کو تو ہم لوگوں نے اپنے سر لے لیا۔

تراب علی۔ ہاں روپے کی فکر البتہ کرنی چاہیئے۔ مرے پلے کھن کوڑی بھی نہیں ہے اور بے زر کار روائی معلوم۔

نواب۔ . . کس قدر روپیہ چاہیئے۔

تراب علی۔ حضور کوئی بیس بائیس سو۔ کیوں جی جمن؟

جمن۔ سب ملا کر تین ہزار رکھ لو۔

نواب (مجمن سے) تین ہزار روپیہ لالہ سے لے کر الگ رکھو اور جب تراب علی مانگیں بے دریغ دو۔ اب رات بھی زیادہ آ گئی ہے۔ اور تم لوگوں کو تکان بھی بہت ہوا ہے۔ اب برخاست کل ملاقات ہوگی۔ شب بخیر۔

صبح کو دربان نے آگہ دست بستہ ایک وحشت ناک خبر سُنائی شامت کی صورت مجسم نظر آئی۔ یعنی ایک برق انداز جوان طناز خاکی گھٹنا کالی وردی ڈاٹے، سُرخا سُرخ پگڑی باندھے ایک رومال ہاتھ میں لئے ہوئے آن کھڑا ہوا۔ اور نواب نامدار کو جھک کر سلام کیا۔ نواب صاحب کے حواس غائب ہوش پراں، مصاحب فرحاں و خنداں۔ کوئی وظیفہ خواں سوا کسی کے نادِ علی یا سورۂ جن ورد زبان ہوا۔

نواب۔ اللّٰھم احفظنا من کل البلیات۔

تراب علی۔ کہاں سے آنا ہوا بھئی جوان۔

برق انداز۔ چوکی پر سے آیا ہوں۔

تراب علی۔ کیوں۔

برق انداز۔ وہی جو گاڑی سے کہار کچل گیا تھا، نہ اسی لئے . . . کوچوان کا چالان ہوگا۔ اس کے تئیں ساتھ کر دیں۔

میاں گھسیٹے سے جو چوبدار نے جا کر کہا کہ چلئے سپاہی آیا ہے اور آپ کے چالان کا پیغام لایا ہے تو ہوش غتر بود ہو گئے۔ چہرے پر مُردنی چھائی۔ سمجھے کہ بس قیامت ہی آئی۔ چوبدار کے ہاتھ جوڑے کہ بھئی للّٰہ سپاہی سے اتنا کہہ دے کہ گھسیٹے یہاں نہیں ہے۔ ہیں اسی وقت کی ریل پر سوار ہو کر کانپور چل دونگا۔ گنگا اُس پار۔ چوبدار نے سمجھایا کہ کیسے نادان ہو بھلا بھاگ کے جاؤ گے کہاں۔ اور کیا کہیں توپ لگی ہے۔ گولہ چلتا ہے۔ مورچہ بہ کوئی بیٹھا ہے۔ قضا کے مُنہ میں جاتے ہو۔ آخر ماجرا کیا ہے یہ تو بتاؤ یہی نہ کہ کچھ جُرمانہ ہوگا؟ پھر حضور ٹے دیں گے۔ تم کو کیا فکر ہے۔

گھسیٹے۔ بھئی بُرا سامنا ہے آج . . . .

چوبدار۔ لے ہے بس جاتے ہی پھانسی کا حکم سُنایا جائے گا۔

گھسیٹے۔ اُف بُری ہوگی۔

چوبدار۔ کیا گلا گھونٹ کے کوئی مار ڈالے گا۔

گھسیٹے۔ دیکھئے کیسی گذرتی ہے۔

چوبدار۔ خدا ہی مالک ہے۔ کام تو پھانسی ہی کا کیا ہے۔ چور بے ایمان۔

گھسیٹے۔ ذرا سا ٹھنڈا پانی پلاؤ۔

چوبدار۔ (خدمتگار سے برف کا پانی منگوا کر) لو پیؤ۔

گھسیٹے۔ خدا سلامت رکھے۔ اُف۔

چوبدار۔ یار کہنا مانو۔ اٹھو۔ خدا گواہ ہے۔ جو کچھ بھی ہو۔

گھسیٹے۔ خیر کیا جانے کیا حال ہوگا۔

چوبدار۔ اُلٹے ٹانگے جاؤ گے۔ عدالت کے دروازے پر۔ گھر دکھا کہیں کا۔

گھسیٹے۔ ہاں بھئی بگڑے کا کوئی دوست نہیں۔

چوبدار۔ اب چلتے ہو یا چلنے ہو؟

گھسیٹے۔ ہم تو نہ جائیں گے چاہے ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔

چوبدار۔ تو پھر ہم زبردستی سے چلیں گے۔

ادھر نواب صاحب نے تراب علی کو حکم دیا کہ ابھی دیکھو سپاہی کھڑا ہے۔ کوچ بین کو بلا دو۔ چوبدار بھی مڑ گیا جا کے۔ تراب علی لپکے ہوئے میاں گھسیٹے کے پاس گئے۔ "ارے میاں گھسیٹے ہوت۔ چلو سپاہی آیا ہے بیٹھے کیا کرتے ہو۔" چوبدار نے کہا۔ اجی وہ تو .... اس وقت جانے کیا واہی تباہی بک رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بس اب پھانسی ہوئی۔ بچوں کی طرح مچل رہے ہیں۔ ...

میاں گھسیٹے افتاں و خیزاں چوبدار اور تراب علی کے ساتھ ڈر تے ڈرتے بہزاد مزاجی چلے۔ جب نواب زادہ نامدار کے حضور میں پیش کئے گئے تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

نواب۔ تم بالکل نادان ہو۔

گھسیٹے۔ آپ کے دربار میں جو دانا ہو اسی کو حضور میری عوض بھیج دیں۔

نواب۔ واہ۔ بڑے بزدل ہو۔

گھسیٹے۔ حضور یہ جھمن تو ڈنڈ پیل ہیں۔ انھیں کو بھیج دیجئے۔

جھمن۔ میں کہوں گا کہ مجھے تو بگھی ہی نہیں ہانکنا آتی۔

گھسیٹے۔ اور میں کہوں گا کہ اسی لئے تو آدمی کھل گیا۔

جھمن۔ گنوار پن کی نہ لو۔ اب چلتے جاؤ۔

گھسیٹے۔ آپ تو شہر کے ہیں پھر آپ ہی میری جگہ پہ تشریف لے جائیں۔

نواب۔ ہم برق انداز سے کہہ دیں گے وہ ایک دو ردل جما کر کشاں کشاں لے جائے گا۔

گھسیٹے نے کہا حضور میرا استیفا (استعفا)۔ تراب علی بولا کہ پھر اس سے کیا بچ جاؤ گے۔ برق انداز نے قہقہہ لگایا، جانو توپ لگی ہے۔" گھسیٹے بولا۔ ہاں بھئی ہنسو ہنسو تم۔ وقت ہی ہم پر ایسا آن پڑا ہے۔ اس فقرے کو کوچ بین نے ایسی بے کسی سے کہا کہ حاضرین و مصاحبین سب نے زور سے قہقہہ لگایا اور گھسیٹے کو خوب ہی بنایا۔

برق انداز نے دق ہو کر پوچھا اب چلو گے یا میں چوکی پہ رپٹ دوں۔ تھوڑی دیر میں صاحب اجلاس پر آجائیں گے ہم پہ خفگی ہوگی۔ نو بج گئے ہیں۔"

گھسیٹے نے پوچھا۔ بھلا نہ چلنے کی بھی کوئی تدبیر ہے۔

برق انداز نے کہا بس تدبیر و بیر یہی ہے کہ تم کو گھدیڑتے لے چلے۔ (نواب صاحب سے) غریب پرور اب ہمیں کیا حکم ہوتا ہے۔ انھیں زبردستی پکڑ لے جائیں گے ہم۔

نواب صاحب نے حکم دیا۔ تراب علی، گھسیٹے کو زبردستی لے جاؤ۔ گھسیٹے نے کہا رسیا ہی بھتیا! یہاں سے کوس بھر پہ میرا گاؤں ہے میں جا کے جورو اور لڑکوں سے تو مل آؤں۔ ان سے تو کہوں کہ میں اب جاتا ہوں (رو کر) ابھی آجاؤنگا۔

برق انداز نے پھر قہقہہ لگایا۔ اخاہ یہ تو جیسے جانے مرے جاتے ہیں۔

میاں گھسیٹے کو تراب علی نے گھسیٹ گھساٹ کر بہزار دقت ایک ڈولی پہ لادا اور باندھ کر لے چلے۔ ...

گھسیٹے ۔ دہائی بڑے صاحب کی۔ دہائی بڑے صاحب کی۔

برق انداز ۔ کیا بیہدہ پڑے ہیں۔

گھسیٹے ۔ یہ سارا فساد تراب علی اور جھمن کمبخت کا ہے۔

جھمن ۔ بس صاف صاف کہہ دینا کہ حضور ہم نے غل مچایا مگر کمہار نے ایک نہ سُنی۔

گھسیٹے ۔ ابھی دیکھئے تو کیسا صاف صاف کہہ دیتا ہوں کہ آپ بھی یاد کریں۔

جھمن ۔ کیا۔ آواز تو نکلے گی نہیں۔ کہنے لگے یاد کرو گے۔ ہونہہ۔

میاں گھسیٹے گھسٹتے ہوئے عدالت کے دروازے تک پہنچے۔ تراب علی نے ایک درخت کے سایہ میں لے جاکر ان کو بٹھایا اور سمجھایا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ کونسل بڑا خرانٹ ہے۔ تم کو بالکل بچا لانا کوئی بڑی کرامات نہیں۔ دو چار روپے جرمانہ ہو جائے بس زیادہ سے زیادہ بتائیں گے۔

گھسیٹے کا دم خفا تھا۔ مبتلائے رنج و بلا تھے۔ لب پر آہ دفغاں تھا کا نوحہ خواں۔

جھمن ۔ میاں گھسیٹے کس سوچ پہ ہو۔

میاں کیا بتائیں کس سوچ میں ہیں۔ . . بھئی ایسا نہ ہو کہ صاحب ہم پر جرمانہ کر دیں۔ اور تم لوگ دل لگی باز تو ہو ہی اپنے اپنے گھر چل دو اور ہمارا مکان گانسا جائے۔ ہم کو نقد روپیہ دے دو کہ صاحب ادھر جرمانہ بولے۔ ادھر تڑ سے چہرہ شاہی گن دیئے۔

تراب علی نے دس روپے گھسیٹے کو دے دیئے۔ گھسیٹے کے ہوش پران کہ خدا خانے آج کس بلا میں مبتلا ہوا ہوں۔ کیا معلوم کمہار کمبخت کی ٹانگ ٹوٹی۔ ہاتھ ٹوٹا، سر پھوٹا۔ کیا آفت نازل ہوئی۔ حاکم کیا حکم سنائے۔ کبھی تراب علی سے باصرار کہتے تھے کہ بھائی جان ہم کو ذرا گھر تو ہو آنے دو۔ معقول! گویا کالے پانی جانے تھے۔ کبھی درخت کے سائے میں بیٹھ کر سوچتے تھے کہ بھاگ جاؤں یا دیوانہ بن جاؤں۔ کروں تو کیا کروں۔

جھمن ۔ رمسکرا کر) شاید وہ کمہار مر گیا۔

تراب علی ۔ نہ جی تم اور ڈرائے دیتے ہو۔

گھسیٹے ۔ ارے میاں! دھر مرے کو کیا مارتے ہو۔

اتنے میں ایک بگھی گاڑی آئی اور صاحب مجسٹریٹ بہادر اس میں سے برآمد ہوئے۔

جھمن ۔ انہیں کے اجلاس پر مقدمہ ہے۔

گھسیٹے ۔ (اُٹھ کر) ہاں بھلا یہ پلٹن کے صاحب تو نہیں ہیں؟

جھمن ۔ یہ کیوں۔ اس کے کیا معنی۔

تراب علی ۔ ابھی انصاف کریں گے۔ ضروری صاحب لوگوں کے مزاج میں انصاف ہوتا ہے۔

گھسیٹے ۔ ارے بھئی یہ سب نقد یہ کے کھیل ہیں۔ دیکھنے والا بچ ہی جاتا ہے . . . . .

اتنے میں چپراسی نے پکارا۔ گھسیٹے کمہار حاضر ہے۔

تراب علی ۔ حاضر ہے۔

جمن - چلو بھیا۔

گھسیٹے - یا خدا یا میرے اللہ مالک میرے بچائیو۔ میرے مولا۔

تراب علی - اب چپکے چپکے چلو۔ اور جو کچھ دعا مانگنی ہو تو دل ہی دل میں مانگو۔ ہَنڑ مچلاتے نہ چلو۔ گھسیٹے آبدیدہ ہو گیا۔ اگر کوئی ذرا چھیڑتا تو رو دیتا۔ چلا نہ قدم اُٹھانا دوبھر ہو گیا۔ پاؤں ڈگمگانے لگے۔ رنگ فق۔ چہرے سے وحشت برسنے لگی چلتے چلتے صاف مجسٹریٹ کی بگھی کی طرف گیا۔ اور کوچ مین سے یوں پوچھنے لگا۔

گھسیٹے - بھائی مالیکم سلام۔

کوچ مین - سلام بھیا۔

گھسیٹے - ہم کو پہچانا۔

کوچ مین - ہاں وہاں نواب صاحب کے ہہاں ہو۔ سمندر جوڑی کی نٹش پہ۔

گھسیٹے - ہاں بھئی۔ ایک مصیبت میں پھنس گئے تھے۔ پہیئے کے تلے ایک کہار کا ہاتھ دب گیا۔

راوی - اس وحشت کے صدقے کہار کا کہارا اور پاؤں کا ہاتھ بنا لیا۔

کوچمین - میاں یہ کار بڑا نازک ہے۔ جمی (ذری) چوکا اور تلوار کی دھار پہ دم آٹھوں گانٹھ کمیت ہے۔ جب جاکے بنے۔

گھسیٹے - تمہارے صاحب کا مجاز کرڑ والا نہیں ہے۔

کوچمین - نہیں کسو سے بولتے چالتے نہیں۔ سیدھے ہیں۔ مگر بنہ ہیں بچارے میم صاحب کبھی کبھی کچھ کہتی بھی ہیں۔ یہ پھر ڈانٹ بولتے تک نہیں۔

گھسیٹے - دیکھیے ہمیں کیا حکم ہوتا ہے۔

کوچمین - اونہہ ہونا کیا ہے۔ روپیہ دو روپیہ جرمانہ اور کیا۔

کانسٹیبل نے للکارا کہ چلو جھٹ پٹ صاحب خفا ہو رہے ہیں۔

تراب علی نے بھی ڈانٹ بتائی۔ کہ اب چلتے ہو یا دکھڑا لے کے بیٹھے ہو۔ خفگی کا لفظ جو سنا تو میاں گھسیٹے کی رہی سہی عقل بھی جاتی رہی۔ بارے بہزار خرابی اجلاس پہ پہنچے تو دونوں ہاتھ باندھ کے چور کی طرح کھڑے ہوئے۔ مگر بدن بھر تھر تھر کانپ رہا ہے اور پھوٹ پھوٹ کے رونا آتا ہے۔

صاحب - تمہارا نام۔

گھسیٹے - حضور بال بچوں والا ہوں۔ دو ننھے ننھے لڑکے ہیں ایک بٹیا پائی ہے۔ اور قبیلہ ہے حضور اور دو مسیاں ہیں۔

صاحب - اوہ - ول - یہ مجرم ہے۔ گھسیٹے - باپ کا نام؟

گھسیٹے - حضور میرا نام کاغذ پہ چڑھا لیں مگر باپ کا نام نہ لکھیں۔ مرے ہوئے مُردے کیوں اکھیڑیئے۔

سررشتہ دار - (شاعر آدمی) مرے ہوئے مُردے نہیں گڑے ہوئے مُردے۔

تراب علی - یہ کوچوانی ہی خوب جانتا ہے۔ منطق نہیں پڑھا ہے۔

صاحب - باپ کا نام گڑا مُردہ۔

راوی - صاحب مجسٹریٹ کا قاعدہ تھا کہ جو کچھ لکھتے تھے اس کو زبان سے بھی ادا کرتے جاتے تھے۔ حضرت نے جو میاں گھسیٹے کے باپ کا نام گڑا مُردہ لکھا تو اجلاس پر حاضرین کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

سررشتہ دار - حضور - ابھی اس نے باپ کا نام نہیں بتایا -

صاحب - وِل تمھارے باپ کا نام کیا ہے -

گھسیٹے - حضور میرے بال بچے بھوکوں مر جائیں گے - (ہاتھ جوڑ کر) حضور میں مر مٹوں گا -

صاحب - یہ پاگل ہے - کون ہے تم کون ہے -

گھسیٹے - حضور پاگل ہوں -

صاحب - اچھا کانسٹیبل اس کو پاگل خانے لے جاؤ - (مسکرا کر) جاؤ پاگل خانے تم -

گھسیٹے - حضور دن بھر گاڑی چلاؤں گا - نوکری بجاؤں گا - رات کو پاگل خانے میں سو رہا کروں گا -

صاحب - (ہنس کر) باپ کا نام -

سررشتہ دار - بتاتا نہیں - نامعقول - گنوار -

گھسیٹے - ہائے گجب - (غضب)

صاحب - باپ کا نام ہائے گجب -

سررشتہ دار - نہیں خداوند -

صاحب - چُپ رہو - باپ کا نام ہائے گجب - دادا کا نام -

گھسیٹے - وہ تو عمر بھر مُرغ لڑایا کئے -

صاحب - دادا کا نام مرغ - وِل عمر کتنا -

گھسیٹے - نصیر الدین حیدر جب گدّی پر بیٹھے تو میں پاؤں پاؤں چلتا تھا -

صاحب - سررشتہ دار - اس کا عمر کتنا -

سررشتہ دار - خداوند ہماری طرح یہ پچپن کے پیٹے میں آگیا -

صاحب - عمر ۵۵ سال - رہنے والا کہاں کا ہے -

گھسیٹے - اجی کس مپرسی ہے -

صاحب - رہنے والا کرسی کا - تم نے گاڑی بے کابو (قابو) چلایا -

گھسیٹے - حضور راس جھمن کے ہاتھ میں تھی -

صاحب - (سُرخ ہو کر) کیا !

سررشتہ دار - ارے مردِ خدا جو ہوا ہو بتا دے - کوئی کھا نہیں جائے گا -

جھمن - بتا دو - بتا دو -

تراب علی - کہہ دو صاف صاف ڈرتے کیوں ہو -

گھسیٹے - تمہیں بڑے باپ کے بیٹے ہو تو کہہ دو کہ راس ہمارے ہاتھ میں تھی -

صاحب - مجرم نے اقبال کیا کہ راس ہمارے ہاتھ میں تھی -

گھسیٹے - حضور گلا پھاڑ پھاڑ کر چلایا کہ ہیٹ ہیٹ - (بہت زور سے) موڑ پہ سے بھاگ کیچل ہٹ - بچ ہٹ - دُھد ہٹ - ایک نہ

ٹنی اور ہم کو پھانسی دلوائی۔
کمھار۔ گوستیاں جب کتے یہ گاڑی آگئی تب پکارے کہ چل ہٹ سرا مجاورے۔ جب پاؤں کچیل گیا تب کمس ہمار گوڑ کاٹ ڈارس۔
گھسیٹے۔ حضور اس سے مجھے لاگ ڈانٹ ہے۔ یہ لئے مرتا ہے۔ حضور میرے بال بچے ننھے ننھے ہیں۔ کمھارن تو بجولے بھدے کھدنے
بنا کے بیچ بھی لے گی۔ میری جورو تو سینا پرونا بھی نہیں جانتی۔
صاحب۔ ہم کو تمھاری جورو سے کچھ مطلب نہیں۔
گھسیٹے۔ تو خدا حضور کو سلامت رکھے۔ مجھ کو تو اس سے مطلب ہے اس بوڑھوتی وقت میں جورو اور اماں سب کچھ وہی ہے۔
صاحب۔ (ہنس کر) تم مسکھری (مسخرا پن) کرتا ہے۔
گھسیٹے۔ مسکھری؟ اے حضور جان پہ بن آئی۔ مسکھری کس کی جورو ہے۔
کمھار۔ گوستیاں ہمارا گوڑ کچل ڈالس ہے۔
صاحب۔ بولو۔ ول تم نے گاڑی تیز کیوں دوڑایا۔
گھسیٹے۔ حضور جھمن نے کہا تھا۔
جھمن۔ ارے چپ بیوقوف بڑا شریر ہے بھئی۔
گھسیٹے۔ حضور۔ میں حضور کی صورت دیکھے ڈرتا ہوں۔
صاحب۔ ول تم ہم کو وولف سمجھتا۔ کیا سمجھتا۔ ہم کو وولف جانتا۔
گھسیٹے۔ میں نہیں سمجھا لوف کیا۔
سرشتہ دار۔ صاحب بہادر فرماتے ہیں کہ کیا تم ہم کو بھیڑیا سمجھتے ہو۔
گھسیٹے۔ اللہ کرے اس کمھار کو بھیڑیا لے جائے۔
صاحب۔ گھسیٹے پر دو روپے جرمانہ۔
الغرض بڑی دیر تک روبکاری رہی۔ اور آخرکار دو روپے میاں گھسیٹے پر جرمانہ ہوئے۔ حضرت نے دو روپے
چپکے سے میز پر رکھے اور مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے چلے۔
تراب علی۔ کہو پھانسی تو نہیں دی گئی۔
جھمن۔ جی چاہتا ہے کہ ایک گدا اور ان پاجی کو۔ ہر بسٹے ہمارا ہی نام لیتا تھا۔ راس بھی جھمن ہی کے ہاتھ میں تھی۔ اور گاڑی بھی جھمن
ہی کے کہنے سے دوڑائی۔ اور کمھار بھی کچلا تو جھمن ہی کے سبب سے۔ اس مردود کی شیطنت تو دیکھیے۔
تراب علی۔ اس تو تو میں میں کو جانے دو۔ مطلب کی دو باتیں سن لو.... گھسیٹے جو کچھ مل رہے تو کیسا۔
گھسیٹے۔ مل رہے؟ مل کیا رہے؟
تراب علی۔ اجی روپیہ مل رہے تو کیسا۔
گھسیٹے۔ ہم سمجھے ہی نہیں۔ روپیہ کیا چھت پھاڑ کے ملے گا۔ کہیں ڈاکا واکا ڈالنے کی نیت تو نہیں ہے۔ لے ہاں کہ پھر کچہری آنا پڑے
اور اب کی بڑا گھر ہی دکھیں بھیتا۔ اب خدا یہاں نہ لائے۔ باپ کا نام بتاؤ۔ دادا کا نام بتاؤ۔ حلف اٹھاؤ....
تراب علی۔ کتنا کوڑھ مغز آدمی ہے۔ ارے میاں اگر نواب سے جھوٹ بول کے روپیہ ملے تو لوگے کہ نہیں۔

جھمن ۔ تم کہنا کہ ایک انگریز کونسل ہماری طرف سے تھا۔ اس نے خوب خوب تقریر کی ۔
تراب علی ۔ اور کہنا کہ کمہار نے بھی ایک ڈبلو کیا تھا ۔
گھسیٹے ۔ اجی ہم کہہ دیں گے ۔ کہ راڈن صاحب اس کی طرف سے تھے ۔
تراب علی ۔ ارے کہیں ایسا غضب بھی نہ کرنا ۔ راڈن تو ولایت گئے ہیں ۔
جھمن ۔ مروا ہی دیا تھا ۔
تراب علی ۔ نہیں جی ۔ وہاں کس کو یہ فکر ہے ۔ کہ راڈن کون ہے اور کیا ۔
گھسیٹے ۔ تو پھر ہم کو کیا دلواؤ گے ۔ ہم پندرہ سے کم نہ لیں گے ۔
تراب علی ۔ (جھمن کے کان میں) اچھا گو کھا پھنسا ۔
جھمن ۔ بھئی پندرہ دیں گے مگر اس شرط سے کہ ایک روپیہ کے یار لوگ دم لگائیں ۔

مولانا عبدالحلیم شرر

دل دینا

عشاق ہر صورتِ زیبا کو دل دے دیتے ہیں۔ شعرا کا دل ہمیشہ کسی کی زلفِ گرہ گیر میں رہا کرتا ہے۔ داستان گو دل دینے اور دل لینے کے افسانے بڑے ذوق و شوق سے سنایا کرتے ہیں۔ ناول نویسوں کا سارا زورِ قلم اس کوشش میں صرف ہوا کہ کیسے کوئی دل دیتا اور کوئی لیتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ دل دینا ایک نہایت ہی آسان مشغلہ سمجھ لیا گیا اور ہمارے عاشق مزاج نوجوان دل ہاتھوں میں لئے پھرنے لگے کہ کوئی اچھی صورت دیکھیں اور حوالے کر دیں۔

مگر افسوس صحیح طور پر نہ آج تک کسی نے دل دیا، نہ کسی نے لیا اور نہ کوئی سمجھا کہ دل دینا کیا چیز ہے اور کیسے دل دیتے ہیں۔ صدہا عاشقوں اور معشوقوں کی داستانیں دلدہی اور دلبری کے دلچسپ نمونے سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن غور کرو تو نہ کسی نے دل دیا نہ کسی نے لیا۔ سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ سچے اور صحیح معنوں میں دل دینے کا کہیں پتہ نہیں۔

لیکن ہاں یورپ کا ایک واقعہ جو قرونِ وسطیٰ میں پیش آیا تھا وہ البتہ دل دینے اور لینے کا سچا معاملہ ہے چونکہ ہمارے عاشقوں اور شاعروں کے کان اس سے ناآشنا ہیں۔ اس لئے ہم اس واقعے کو ان کے سامنے پیش کئے دیتے ہیں کہ لوگ دیکھیں اور سمجھیں کہ دل دینا کیا چیز ہے!

جن دنوں صلیبی لڑائیوں کے معرکے درپیش تھے اور بیت المقدس کو مسلمانوں سے چھیننے کے لئے سارا یورپ اٹھا چلا آتا تھا فرانس میں نواب تھابین کے دربار میں ایک بڑا معزز سردار تھا لارڈ کوسی، جو خوبصورت اور قابل ہونے کے ساتھ اپنے وقت کا بڑا بانکا بھی تصور کیا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں وہاں ایک اور بڑے معزز رئیس تھے لارڈ فائل۔ لارڈ فائل کی نازنین و زہرہ جبین بیوی لیڈی فائل اپنے حسن و جمال اور ناز و انداز کے لحاظ سے سارے ملک میں منتخب تھی اور فرانس کی ساری مہ جبینوں کے حسن کی شمعیں لیڈی فائل کے آفتابِ رخسار کے سامنے ماند تھیں۔ دونوں کی خوبیوں نے شہرت کے

دکھایا کہ لارڈ کرسی اور لیڈی فائل ایک دوسرے پر فریفتہ ہو گئے اور ناجائز الفت نے دونوں کے دلوں میں عشق کی شمعیں روشن کر دیں۔ لارڈ فائل بیوی کے اس شرمناک عشق سے ناواقف نہ تھا۔ ہر طرح کی روک تھام کرتا مگر کچھ زور نہ چلتا۔

اسی اثناء میں نواب شانپین تیار ہوا کہ ارضِ مقدس میں جا کر مسلمانوں کے مقابلے میں جہاد کرے۔ جو مجاہدین فرانس اس کے ہمراہ روانہ ہونے والے تھے ان کے زمرے میں لارڈ کرسی نے بھی اپنا نام لکھوا دیا۔ اپنے اس ارادہ کی اطلاع جب اس نے لیڈی فائل کو کی تو معشوقۂ دل نواز کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ روئی اور رُلایا۔ مگر آخر ضبط سے کام لیا۔ دل میں کہا "یہ اچھا ہے۔ لارڈ کرسی کے چند روز باہر رہنے سے لارڈ فائل کی آتشِ رقابت ٹھنڈی پڑ جائے گی اور شاید ان کی بدگمانیاں دور ہو جائیں"

اس کے بعد ہنسی خوشی عاشقِ دلدادہ کو گلے لگا کے رخصت کیا اور کہا لو یہ ہماری الفت و محبت کی یادگاریں ساتھ لیتے جاؤ اور ان کو ہمیشہ اپنے دل سے لگائے رکھنا۔ یہ یادگاریں چند انگوٹھیاں تھیں، کچھ جواہرات تھے اور سب سے زیادہ قیمتی ایک نازک ڈوری تھی جس کو لیڈی فائل نے اپنی سنہری زلفوں کے بالوں کو ریشم کے دھاگے میں گوندھ کے بنایا تھا اور اس کے دونوں سروں پر دو بڑے بڑے موتی گھنڈیوں کی وضع میں لگے ہوئے تھے۔ ان دنوں یورپ کے بانکوں اور فرنگی سرداروں کی رسم تھی کہ اپنے فرغل کو ایک خوبصورت ڈوری سے خود میں اٹکا لیا کرتے، اسی مقصد کے لئے لیڈی فائل نے یہ ڈوری خود اپنے ہاتھ سے بنا کے اپنے عاشق کو دی۔ الغرض بصد حسرت و اندوہ عاشق و معشوق جدا ہوئے اور لارڈ کرسی نے شانپین کے رکاب کے ہمراہ ارضِ مقدس فلسطین کی راہ لی۔

یہ ۵۸۶ھ کا زمانہ تھا جبکہ فلسطین کے مشہور ساحلی شہر عکہ کا مشہور محاصرہ قائم تھا۔ شہر کے اندر مسلمان تھے۔ لاکھوں فرنگیوں کی خلقت جنگیہ چاروں طرف سے یورشیں کر رہی تھی اور ان محاصرہ کرنے والوں کو سلطان صلاح الدین اعظم خشکی کی طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ خوں ریزیوں کا سلسلہ جاری تھا اور مسیحی کسی طرح شہر پر قابو نہ پا سکتے تھے۔

لارڈ کرسی نے مجاہدینِ فرنگ کے ساتھ ساحلِ فلسطین پر قدم رکھا تو وہ بھی زور شور سے دھاوے کرنے لگا اور ایک دن ایسے جوش و خروش سے دھاوا کیا کہ تیروں، پتھروں اور آتش بازی کے قنقوں کو ڈھال پر لیتا ہوا عکہ کی شہر پناہ کے نیچے جا پہنچا اور سیڑھی لگا کے اوپر چڑھنے لگا۔ فصیل کے اوپر سر نکالا ہی تھا کہ کسی مسلمان نے تلوار کا ایسا زبردست ہاتھ مارا کہ کاری زخم کھا کے نیچے آ رہا اور لوگ فوراً خیمے میں اٹھا لے گئے۔

خیمے میں لیٹ کے لارڈ کرسی نے خیال کیا کہ اب میری زندگی کے چند ہی لمحے باقی ہیں۔ ساتھ ہی محبوبۂ جاں نواز یاد آئی اور ارادہ کیا کہ زندگی کے ان باقی ماندہ لمحوں کو اسی کی یاد میں صرف کرے۔ چنانچہ لیڈی فائل کے نام ایک عاشقانہ خط لکھا اور اپنے ایک قدیم وفادار و جاں نثار ملازم کو دے کر کہا "میرے مرنے کے بعد تم فرانس میں جانا اور اس خط کو میری دلدار مہ جبین کے ہاتھ میں دے دینا۔ اس کے ساتھ یہ تمام چیزیں بھی جو اس نے مجھے یادگارِ محبت کے طریقے سے دی تھیں اسے واپس کر دینا۔ اس کے علاوہ جب میں مر چکوں تو سینہ چاک کر کے میرا دل نکالنا اور اس کو تیل میں ڈال دینا کہ سڑنے نہ پائے، اور اس کو بھی لے جا کے اسی آفتِ جاں کی نظر کر دینا۔"

یہ وصیتیں کر کے لارڈ کرسی مر گیا اور وفادار ملازم نے ان پر پورا عمل کیا۔ سفر کر کے فرانس میں پہنچا اور لارڈ فائل کے قصر کے قریب جا کر پھاٹک کے سامنے جنگل میں چھپ رہا کہ لارڈ فائل کہیں باہر جائے تو قلعہ میں داخل ہو کر اپنے آنجہانی آقا کی امانتیں اس کی محبوبہ کے حوالے کرے۔ اسی انتظار میں کھڑا تھا کہ لارڈ فائل کی نظر پڑ گئی۔ دیکھتے ہی پہچان گیا کہ لارڈ کرسی کا ملازم ہے اور اپنے آقا کا کوئی پیام لے کر میری بیوی کے پاس آیا ہے۔ غیظ و غضب کے ساتھ اس کے سر پر جا پہنچا اور کہا "سچ سچ بتا یہاں کس لئے آیا ہے، ورنہ تیری جان کی خیر نہیں۔" ملازم نے قسمیں کھا کر کہا "میرے مالک تو ارضِ مقدس میں مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ اب پیام دینے والا کون ہے؟" لارڈ فائل کو اس کا یقین نہ آیا۔ سمجھا کہ فضول باتیں بنا رہا ہے۔ تلوار میان سے کھینچ کر اس کے سر پر بلند کی اور ڈپٹ کے کہا "سچ بتا ورنہ سرزمین پر پڑا لوٹتا ہوگا۔" خادم سہم گیا، ہوش و حواس جاتے رہے اور جان کے خوف سے

ساری باتیں قبول دیں۔ جو چیزیں ساتھ لایا تھا اس کے سامنے رکھ دیں اور لارڈ کوسی کا خط بھی اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

خط پڑھ کر لارڈ فائل کے غصے کی انتہا نہ تھی اور جوشِ غضب میں ارادہ کیا کہ بیوی سے ایک نئے طریقے کا انتقام لے۔ فوراً قصر میں آ کر اپنے باورچی کو بلایا اور وہ لارڈ کوسی کا دل اس کے ہاتھ میں دے کر کہا اس کو اور گوشت میں ملا کر بہت اچھے نفیس کباب پکاؤ۔ کباب لیڈی فائل کی نہایت ہی مرغوب غذا تھی۔ جیسے ہی پک کر آ گئے لارڈ فائل نے میز پر بیٹھ کر ان کو بیوی کے سامنے پیش کیا اور کہا "تمہارے شوق کے مطابق ان کو بڑے اہتمام سے پکوایا ہے۔" بیوی نے ان کبابوں کو بڑے شوق سے لیا، مزے لے لے کر کھایا اور جب کھا چکی تو میاں نے ایک زہرخند کے ساتھ پوچھا: "کیسے پکے ہیں؟" جواب ملا کہ بہت اچھے پکے ہیں اور مجھے بہت مزا آیا۔ کہا "ہاں مزا آنے کی چیز ہی تھی۔ تمہارے مرغوب ہونے ہی کے خیال سے میں نے اُسے کو بڑی کوشش سے تیار کرایا۔ اور تمہیں پسند کیوں نہ آتا؟ یہ خاص لارڈ کوسی کا دل تھا جس کی قدر تم سے زیادہ کون کرے گا؟" لیڈی فائل کو اس کا یقین نہ آیا مگر جب میاں نے ساری سرگذشت من و عن بیان کر دی اور بیری کے دیئے ہوئے یادگارِ محبت کے تحفوں کے ساتھ لارڈ کوسی کا خط بھی نکال کر سامنے رکھ دیا تو کانپ گئی اور یقین آیا کہ شوہر نے جو کچھ کہا سچ ہے۔

اس کے خون شدہ دکھے دل پر یاس و نامرادی کا ہجوم ہوا مگر ضبط کیا اور استقلال کے تیوروں سے بولی: "ہاں سچ کہتے ہو۔ یہ دل میرا محبوب تھا۔ کیونکہ یہ محبت کرنے کے قابل دل تھا اور کبھی اس سے زیادہ شریف دل نہیں دیکھا گیا تھا اور میں نے چونکہ ایسا اچھا اور شریف گوشت کھایا ہے اور میرا معدہ ایک ایسے بہترین اور قیمتی دل کا مقبرہ بن گیا ہے لہٰذا اب میں کوئی اس سے کم درجے کی چیز نہ کھاؤں گی نہ اس اچھے دل کو کسی ذلیل چیز سے آلودہ کر کے ناپاک کروں گی۔" یہ کہتے کہتے پُرحسرت زبان رُک گئی۔ اُٹھ کر اپنے کمرے میں گئی اور اندر سے دروازہ بند کر کے بیٹھ رہی۔ دوستوں، عزیزوں، ملازموں اور خود شوہر نے لاکھ کہا اور قسمیں دلائیں مگر دروازہ نہ کھولا۔ یہاں تک کہ اسی رنج میں فاقے کرتے کرتے چوتھے روز ملکِ عدم کی راہ لی۔

مرزا محمد ہادی رسوا

شریف زادہ

مرزا عابد حسین حسب اودھ کے ایک ضلع میں پہلے پہل ملازم ہو کے گئے، سرائے میں اُترے۔ صاحب کی ملاقات کی۔ کار سرکاری سپرد ہوا۔ اس عرصے میں اُس بستی کے بہت سے لوگ ان کو پہچاننے لگے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ چھوٹی بستیوں میں بہ نسبت بڑے شہروں کے بہت جلد شہرت ہو جاتی ہے۔ وہ ایک صاحب شریف صورت اس بستی کے رہنے والے جو اپنے ذاتی منافع کے باب میں بڑے خوش فکر اور دُور اندیش ہوتے ہیں۔ اُن سے سرائے میں آ کے ملے۔ ایسے لوگوں کو خواہ مخواہ فکریں رہتی ہیں کہ فلاں عہدے پہ کون شخص مقرر ہوا۔ کس کی تبدیلی ہوئی۔ کس کی ترقی ہوئی۔ کس کا تنزل ہوا۔ غرضکہ یہ لوگ زندہ گزٹ ہوتے ہیں اور لطف یہ کہ نہ کہیں نوکر نہ چاکر۔ نہ کوئی ذاتی معاملہ نہ مقدمہ مگر ان باتوں سے بڑے بڑے مطلب نکال لیتے ہیں۔ حکام رسی سابل عملہ سے حسب حیثیت رسم و راہ۔ یہ خاص اوصاف ہیں جو منجملہ فضائل سمجھے جاتے ہیں۔

مرزا صاحب سے جو لوگ آ کے ملے اُن میں سے ایک صاحب فدوی میاں خاندانی رئیس اس بستی کے تھے۔ مگر یہ شرف انقلاب روزگار یا مرور تی غفلت اور اسراف یا خود اُن کی اولوالعزمی یا شرکا و کے تنازع قانونی یا کارندوں کی چالاکی کی وجہ سے اب صرف اضافی رہ گیا تھا۔ اگرچہ زمانہ سابق میں اُن کے بزرگ زمیندار تھے۔ مگر اب صرف بڑائے نام ایک موضع کا نمبر آپ کے نام سے رہ گیا تھا۔ اگرچہ اُس پر بھی تصرف مالکانہ ان کے ایک کارندہ مسمی شیورتن کا تھا۔ جو کہ درحقیقت اسی گھر کا ساختہ پرداختہ تھا مگر اب خود ان سے بدرجہا متمول اور ان کی کل موروثی جائداد کا اصلی مالک تھا۔ مگر بلحاظ اخلاق ظاہری جو کہ اکثر کسی مصلحت پر مبنی ہوتا ہے وہ ابھی تک ان سے بمراعات پیش آتا تھا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ موضع بھی جہاں کا وہ اصلی باشندہ تھا اُسی کے یہ برائے نام نمبردار تھے۔ تحصیل وصول شیورتن کے پاس تھی۔ مگر رعایا ابھی تک انھیں کا رعب و داب مانتی تھی۔ آسامیوں سے دبا کے کبھی کبھی کچھ انھیں بھی وصول ہو جایا کرتا تھا۔ ایک اور وجہ شیورتن کی ان سے دبنے کی یہ تھی کہ شیورتن ایک چھوٹے درجہ کا آدمی تھا اور بستی کے لوگ بسبب ان کی قدیمی ریاست کے ان کو مانتے تھے اور اسی خصوصیت کے لحاظ سے حکام اور اہل عملہ تک ان کی رسائی بسہولت ہو سکتی تھی۔ شیورتن کو ان سے بہت مدد ملتی تھی۔ اس لیے کہ اکثر مقدمات ہیں سعی۔ سفارش۔ کہنا۔ سننا جو کچھ ہوتا تھا وہ انھیں کے ذریعے سے ہوتا تھا۔ یہ دوا دوش اور تملق و چاپلوسی جو اکثر موقعوں پہ کرنا پڑتی تھی اُس کا تمام فائدہ شیورتن کو حاصل ہوتا تھا۔ آپ کا فقط صرف۔

اس قدر تھا کہ لوگ یہ سمجھیں کہ فدوی علاقہ دار ہے اور فدوی کے قبضے میں ابھی کل مواضع ہیں اور شیبو رتن صرف ایک کارندہ ہے۔ صرف اسقدر نفاخر کے تحفظ کے واسطے آپ ہر طرح کی مشقتیں اور صعوبتیں گوارا کرتے تھے۔ بستی میں جس قدر مکانات آپ کے بزرگوں کے بنے وہ اب شیبو رتن کے قبضے میں تھے اور اُن میں اکثر اہل عملہ رہا کرتے تھے۔ اُس کا کرایہ شیبو رتن ماہ بماہ وصول کر لیتا تھا۔ از بسکہ کرایہ لینا آپ اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ لہٰذا اگر کبھی اس کا ذکر کسی موقع پر آیا تو آپ اُس سے تحاشی فرماتے تھے اور شیبو رتن کو غائبانہ کلمات نا ملائم سے یاد فرماتے۔

اسم مبارک آپ کا فدا علی تھا۔ مگر اس نام سے لوگ بہت کم واقف تھے۔ لوگ آپ کو اکثر فدوی میاں کے نام سے جانتے تھے۔ آپ کا خود یہ بیان تھا کہ فدوی تخلص ہے۔ مگر اصل وجہ یہ تھی کہ ابتدائے سال میں آپ اس لفظ کو اپنی نسبت بہت استعمال فرماتے تھے۔ مثلاً "فدوی حاضر ہوا تھا"۔ "اور فدوی غائب ہوا"۔ "اور عرض فدوی کی یہ ہے"۔ "اور فدوی آپ کا قدیمی نیاز مند ہے"۔ اس لفظ کے کثرت استعمال کی وجہ سے لوگوں نے آپ کا نام فدوی میاں رکھ لیا۔ پہلے غائبانہ اور پھر بالمشافہ اسی اسم سے موسوم ہو گئے۔ آپ نے مصلحتاً یہی تخلص اپنا قرار دے لیا۔ کیونکہ آپ کے تخلص کی (جواب کسی کو یاد بھی نہ تھا) شہرت نہ ہونے پائی کہ یہ لقب مشہور ہو گیا۔ ایسی حالت میں اُس تخلص کو بٹہ لگاتے ہیں ڈال کر دم نقد یہ تخلص اختیار کر لینا عین مصلحت تھی۔

مرزا عابد حسین کے تقرر کی خبر ضلع میں اُن کے آنے سے پہلے آپ کو مل گئی تھی۔ جس دن آپ تشریف لائے اُس کے دُوسرے ہی دن آپ سرا میں پہنچ گئے۔ پھر ملاقات کر لینا کتنی بڑی بات تھی۔

مرزا صاحب چار بجے کے بعد سرا میں آ کے ابھی بیٹھے ہی تھے کہ آپ نازل ہوئے اور بھٹیاری سے دریافت کر کے بے تکلف مرزا صاحب کے پاس چلے آئے۔

فدوی:۔ فدوی آداب عرض کرتا ہے۔

مرزا صاحب: تسلیم۔

مرزا صاحب بہت دیر آشنا تھے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وضع تہذیب کے پابند نہ ہوں۔ جب ایک شریف صورت اس طرح تعارف کرے تو اس سے بے رُخی کریں۔

آئیے تشریف لائیے۔

اُس وقت اتفاق سے بھٹیارہ اُس طرف کسی ضرورت سے آنکلا۔ اُس نے کہا "فدوی میاں سلام" اسی طرح کئی شخصوں نے آپ کو سلام کیا۔ جیسے نام بتلانے کی ضرورت ہی نہ ہوئی۔ مرزا صاحب کو معلوم ہو گیا کہ آپ اس لقب سے ملقب ہیں۔ اس پر بھی مرزا صاحب نے ازراہ احتیاط اسم مبارک دریافت کیا۔

فدوی میاں:۔ بس یہی "فدوی"

مرزا صاحب:۔ (کسی قدر تعجب سے) درست!

فدوی میاں:۔ جی ہاں۔ در اصل حقیقت یہ ہے کہ نام تو میرا فدا علی ہے مگر فدوی تخلص ہے۔ یہی زبان زدِ ہر خاص و عام ہو گیا

مرزا صاحب:۔ بہت مبارک!

فدوی میاں:۔ آپ کی تشریف آوری کی خوشخبری سن کر میں بہت مشتاق تھا کہ آپ سے ملوں اس لئے کہ یہاں حکام اور اہل عملہ میں کوئی صاحب ایسے نہیں ہیں جو فدوی کو نہ جانتے ہوں۔

مرزا صاحب:۔ میں جانتا ہوں کہ اکثر صاحبوں کو اس قسم کا شوق ہوتا ہے۔

فدوی میاں: ۔ جی ہاں شوق کیا۔ ایک لت سی ہے۔ آپ جانئے یار باشی ہیں تو وہ مزا ہے کہ جہاں اس کا چسکا پڑا پھر نہیں چھوٹتا۔

مرزا صاحب: ۔ صحیح ہے جس کو جس بات کا شوق ہو جائے اگر اُس میں تضیعِ اوقات بھی ہو۔ مگر انسان سے بمشکل ترک ہو سکتا ہے۔

مرزا صاحب کے ان بلیغ فقروں کا مطلب یا تو فدوی میاں سمجھے ہی نہیں یا سوچ بوجھ کے تجاہل عارفانہ فرمایا۔ اس لئے کہ مرزا صاحب تو کچھ ایسے گھُرّے تھے بھی نہیں۔ آپ تو ایسے ایسے حکام اور اہلکاروں سے رل چکے تھے جو رکھائی میں شہرۂ آفاق [illegible] اور فدوی کو اس بات کا فخر تھا۔ مرزا صاحب کیا چیز تھے۔ جمیس صاحب جو بے ہودہ ملاقاتوں سے اس قدر متنفر اور ہار ب تھے کہ جو کوئی بلا وجہ ان کی ملاقات کو جاتا تھا ڈنڈا لے کے پیچھے دوڑتے تھے۔ اُن سے بھی فدوی میاں رل چکے تھے اور جب تک وہ اس ضلع میں رہے برابر ہر دوشنبہ کو سلام کے لئے جایا کئے۔ علیٰ ہذا القیاس ڈپٹی تہور حسین خاں صاحب جنہوں نے اپنے بنگلے پر تختی لکھ کے لگا دی تھی کہ کوئی میری ملاقات کو نہ آئے۔ وہاں بھی فدوی پہنچ گئے اور آخر اس قدر رسم بہم پہنچایا کہ اُن کا پیچوان پیا۔ اُن کے خاصدان سے پان کھایا۔

فدوی میاں: ۔ (مرزا عابد حسین سے) یہاں سرا میں تو آپ کو تکلیف ہوگی۔

مرزا صاحب: ۔ جی ہاں۔ ابھی کل تو آیا ہوں۔ مکان تلاش کر کے اُٹھ جاؤں گا۔

فدوی میاں: ۔ فدوی کے مکانات لا تعد و لاتحصیٰ ہیں۔ خالی پڑے ہیں۔ جو پسند آئے اُس میں اُٹھ چلئے۔

مرزا صاحب: ۔ (کسی قدر تامل کے بعد) کس کرائے کے مکانات ہوں گے۔

فدوی میاں: ۔ (مسکرا کے) آپ کو معلوم نہیں دیہات میں اس بات کا عیب ہے۔

مرزا صاحب: ۔ مگر میں اس کو معیوب سمجھتا ہوں کہ بلا کرایہ کسی کے مکان میں رہوں۔

فدوی میاں: ۔ مگر جب کسی غیر کا مکان ہو نہ۔ مرزا صاحب اس کا جواب دینے ہی کو تھے کہ میرے آپ کے کب کی شناسائی ہے مگر اسی اثنا میں ان سے ایک اللہ صاحب ملنے کو آ گئے۔

پنڈت جانکی پرشاد صاحب ان کے ہم مکتب دوست جو اس ضلع میں تھانہ دار تھے، مرزا صاحب اُن سے مخاطب ہو گئے۔ فدوی میاں سے ان سے حسب معمول بے تکلفی کی ملاقات تھی۔ بلکہ کچھ مذاق بھی فیمابین ہوتا تھا۔ مکان کا تذکرہ پنڈت صاحب کے سامنے بھی ہوا۔ پنڈت صاحب نے بھی یہی کہا کہ فدوی کے کئی مکان خالی ہیں کوئی ان میں سے پسند کر کے اُٹھ جائیے۔ ایک عہدہ دار پولیس کے کہنے سے مرزا عابد حسین کو یہ تو اطمینان ہوا کہ فدوی میاں قابل اعتماد شخص ہیں۔ مگر۔

مرزا صاحب: ۔ مگر آپ فرماتے ہیں کہ میں کرایہ نہ دوں گا۔

پنڈت صاحب: ۔ اچھا اُٹھ جائیے۔ حساب دوستاں در دل والا معاملہ ہو جائے گا۔

مرزا صاحب اس معمے کو نہ سمجھے۔ مگر چپ ہو رہے۔ اس اثنا میں فدوی میاں کسی ضرورت سے اُٹھ گئے۔

پنڈت صاحب نے اصل حقیقت مرزا صاحب کے ذہن نشین کر دی۔ معلوم ہوا کہ مکان کا اصل مالک شیو رتن ہے وہ آپ کے گھر کا کارندہ تھا۔ اس لئے آپ اُس کو مال مملوک سمجھ کے اپنا مال سمجھتے ہیں۔

مرزا عابد حسین: ۔ مگر یہ تو کہئے۔ یہ حضرت میرے اوقات میں تو ہارج نہ ہوں گے کیونکہ آپ جانتے ہیں میں اس قسم کی ملاقاتوں سے گھبراتا ہوں۔

پنڈت صاحب: ۔ کچھ ایسے ہارج نہ ہوں گے۔ مکان میرے دیکھے ہوئے ہیں۔ اُن میں سے بڑا مکان جو آج کل خالی ہے اُس میں پہلے تحصیلدار صاحب رہتے تھے۔ آپ کی قسمت سے اُن کی تبدیلی ہو گئی۔ فوراً لے لیجئے نہیں تو کوئی نہ کوئی لے لے گا اور آپ کو افسوس ہوگا۔ ان کے ہارج ہونے کی یہ صورت ہے کہ اس قسم کے لوگ جو بہت لوگوں سے ملتے رہتے ہیں اور کسی قدر مزاج شناس ہو جاتے ہیں۔ وہ آئیں گے ضرور خواہ

اُن کے مکان میں رہیئے خواہ نہ رہیئے۔ مگر جب آپ منہ نہ لگائیں گے دو چار منٹ ٹھہر کے چلے جایا کریں گے۔ آپ کا ہرج ہی کیا ہوگا۔ دوسرے ایک فائدہ بھی ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جس چیز کی ضرورت ہو (مسکرا کے) خواہ کیسی ہی ضرورت کیوں نہ ہو یہ مہیا کر دیتے ہیں۔ اور لطف یہ کہ بہ کفایت "مرزا صاحب" پنڈت جی کے اس موقع پر مسکرانے سے کسی قدر بدظن ہو گئے تھے۔ مگر پنڈت جی نے اپنی تقریر کو اس طرح جاری کیا۔

پنڈت جی: مثلاً اب فی الحال تو آپ کو گھوڑے کی ضرورت ہوگی۔ وہ آپ کی معرفت بہت جلد اور کفایت سے مل سکے گا۔ ماہواری غلہ۔ گڑ۔ گھی غرض جس شے کی ضرورت ہوگی۔ ان کی معرفت مل جایا کرے گی۔ اسباب ضروری مثل پلنگ۔ میز کرسیاں۔ دریاں۔ برتن باسن یہ سب انھیں سے منگوا لیجئے گا۔

مرزا صاحب: مگر ان سب کا معاوضہ کیا دینا ہوگا۔

پنڈت صاحب: کوئی معاوضہ نہیں صرف وہی چند منٹ ہرج اوقات جو اُن کے آنے سے ہوگا۔ باقی اگر کچھ کمیشن وغیرہ لیتے ہوں تو اس کا علم نہیں

مرزا صاحب: اچھا اگر کمیشن لے کے عمدہ شے بہم پہنچا دیتے ہیں تو یہ کچھ ایسا معیوب نہیں۔

پنڈت صاحب: ہاں بس یہی سمجھ لیجئے۔ میرا جہاں تک خیال ہے آپ کو ان کی ذات سے کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا۔ ممکن ہے کہ کچھ فائدہ ہو جائے۔

مرزا صاحب: باہم فائدہ رسانی تمدن کا اصل اصول ہے۔ اس کا میں منکر نہیں ہوں۔ مگر وہ معاملات جن میں طرفین سے غیر کافی معاوضہ پر کوئی شے ایک سے دوسرے کی طرف منتقل کی جائے یا کوئی کام کیا جائے ہیں اُس کو ناجائز سمجھتا ہوں۔

پنڈت جی: یہ دقیق منطق تو میری فہم سے باہر ہے۔ میرے کہنے کا خلاصہ یہ ہے کہ مکان لے لیجئے پھر جس طرح چاہئے اُن سے معاملت رکھئے گا۔

مرزا عابد حسین: پنڈت صاحب اصل امر تو یہ ہے کہ ایسے شخص کی معرفت مکان لینا بھی کسی قدر مسلک احتیاط سے دور ہے۔ مگر آپ فرماتے ہیں کہ اور کوئی مکان نہیں مل سکتا اور اصل معاملہ ایک شخص ثالث سے ہے کہ جس کا نام آپ نے لیا تھا۔

پنڈت جی: شیو رتن۔

مرزا صاحب: شیو رتن سے۔ لہٰذا مکان لئے لیتا ہوں۔ مگر ان کے اس عجیب اخلاق کی وجہ سے مجھے خواہ مخواہ ایک قسم کا تعلق خاطر ہو گیا۔ لکھنؤ جو کہ میرا اصل وطن ہے۔ وہاں کے عامیانہ اطوار و اوضاع سے مجھے نفرت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ باہر جا کے ایسے لوگوں سے دور رہوں گا مگر یہاں بھی وہی سامنا ہوا۔

پنڈت جی: جی ہاں کیا کیا جائے "با ہمیں مردماں بباید ساخت" اس کے بعد پنڈت جی رخصت ہونے کو تھے کہ فدوی میاں پھر نازل ہو گئے اور آتے ہی کہا۔

فدوی میاں: پھر مکان دیکھ لیجئے۔ مرزا صاحب نے پھر ذرا تامل کیا۔ مگر پنڈت جی بھی فدوی کے ہم زبان ہو گئے۔ لہٰذا مرزا صاحب بھی اُٹھ کھڑے ہوئے پنڈت جی کی ٹمٹم سرا میں موجود تھی۔ مرزا صاحب اور پنڈت جی داہنے بائیں اور عقب میں فدوی میاں اور ایک حوالدار جو پنڈت جی کے ساتھ تھا بیٹھ لئے۔ گاڑی روانہ ہوئی۔ راستہ میں فدوی میاں اور حوالدار میں بڑے تپاک سے باتیں ہوتی جاتی تھیں۔ جس قدر حوالدار پنڈت جی کی ہمراہی کی وجہ سے لحاظ کرتا تھا۔ اُسی قدر فدوی میاں بیباک تھے۔

اثنائے راہ میں بلا مبالغہ سو دو سو آدمیوں نے فدوی میاں کو سلام کیا ہوگا۔

فدوی میاں سلام! فدوی میاں سلام! یہ صدائیں دس دس بارہ بارہ قدم کے فاصلے سے سنائی دیتی تھیں۔

سلاموں کی ترتیب یہ تھی کہ جو ملا اُس نے پہلے تھانہ دار صاحب کو سلام کیا۔ ماتھے پر ہاتھ رکھ کے اور بہت مودبانہ جھک کے۔ یہ اول درجے کا سلام تھا۔ دوسرے درجے کا سلام مرزا صاحب کو کیا مگر وہ بھی بلا صورت وصدا۔ تیسرا سلام۔ ان لفظوں کے ساتھ حوالدار صاحب سلام۔ بالخیر یہ

ہاتھا بھی تک رہتا تھا۔ چوتھا سلام آواز بلند کے ساتھ فدوی میاں سلام!

فدوی میاں کا جواب بھی خصوصیت کے ساتھ ہوتا تھا۔ بجیا سلام۔ مٹھو سلام۔

اس درمیان میں کئی دیہاتی رنڈیوں نے بھی سلام کیا۔ فدوی میاں ہر ایک کا نام لے کے جواب دیتے تھے۔ بجیاجان سلام۔ رسولن سلام۔

ہر سلام کے بعد فدوی میاں مزاج پرسی کو بھی واجب سمجھتے تھے اور وہ ہر شخص کے ساتھ طرز پرسش میں جدت ہوتی تھی۔

گاڑی اس مکان تک پہنچی جسے دیکھنا منظور تھا۔ واقعی مکان قابل رہنے کے تھا۔ زنانہ مکان پختہ دو منزلہ باہر بیٹھنے کا مکان جسے قصباتی زبان میں بیٹھکہ (بہ تشدید قاف) کہتے ہیں۔ نہایت ہی معقول۔ اور اس کے سامنے بڑا سا احاطہ تھا۔ اس میں ایک طرف کچھ کھپریلیں تھیں۔ گاڑی گھوڑے اور سائیس۔ خدمتگار وغیرہ کے رہنے کے لئے اور جا بجا کچھ درخت مختلف قسم کے لگے ہوئے تھے۔ مگر بہت ہی بے ڈھنگے پن سے۔ کچھ بیلا چنبیلی کے گھنڈ۔ کچھ مہندی کی روشیں۔ بانس کا پھاٹک لگا ہوا تھا۔ غرضکہ مکان مرزا صاحب کے پسند آیا۔ شیو رتن بھی اس موقع پر پہنچ گیا تھا۔ ایک سیاہ فام سا آدمی۔ دھوتی بندھی ہوئی۔ اودی چھینٹ کی مرزئی پہنے۔ اسی چھینٹ کی دوہری ٹوپی۔ پاؤں میں چمڑ ودھا جوتا۔ گلے میں ایک بٹوا پڑا ہوا۔ یہ آپکا دوہاری لباس تھا کیونکہ اس وقت آپ بلاواسطہ کچہری سے تشریف لائے تھے۔ تھانہ دار صاحب اور مرزا صاحب کے آنے کی خبر سن کے دوڑے چلے آئے۔ شیو رتن سے کرائے کے بارے میں گفتگو ہوئی اس موقع پہ فدوی میاں درآئل گئے۔

سات روپے ماہوار پہ وہ مکان لے لیا گیا اور اسی شب کو مرزا صاحب کا اسباب سفر وہاں آ گیا۔

دو پلنگ۔ تین کرسیاں۔ فدوی میاں کی سرکار سے بلا طلب بھیج دی گئیں۔ اور طرعاً و کرہاً مرزا صاحب کو رکھنا پڑیں۔

دریاں اور قالین مرزا صاحب کے ہمراہ تھے۔ کھانا پکانے کے برتن بھی کافی موجود تھے۔ مکان کی صفائی اور مختصر سامان کی آراستگی میں فدوی میاں کی دخل در معقولات ہوتی رہی۔ ایسے لوگ جو ہر کسی کام میں خواہ مخواہ دخیل ہو جاتے ہیں۔ ان میں ایک خاص وصف ہوتا ہے جسے کسر نفس کے سوا اور کیا کہا جائے۔ یعنی اس قسم کے لوگوں کو دوسروں کی اختلاف رائے سے چنداں ملال بھی نہیں۔ اگرچہ وہ اختلاف بُرے تیوروں سے کیا جائے مثلاً۔ اگر ان کی یہ رائے ہوئی کہ دری اس طرح بچھانا چاہئے اور پلنگ یوں لگانا چاہئے۔ اور میز کا رُخ یوں رہے اور دیوار گیریں کا وہ موقع ہے اور دوسرے شخص کی آسائش کا یہ اہتمام کر رہے ہیں۔ ان میں سے ہر تجویز کو بلا دلیل بایں الفاظ کہ کے "صاحب آپ نہیں جانتے" مسترد کر دیا۔ یا ہر ایک میں ترمیم کر دی۔ تو اُن کو نہ کچھ خفت ہوگی نہ ملال۔ ایسے ہی ہمارے سادہ دل رئیس موضع سہجن پور۔ فدوی میاں صاحب تھے۔

جب گھر کی صفائی اور آراستگی سے فراغت ہوئی اور ہر چیز اپنے اپنے موقع سے لگا دی گئی۔ فدوی میاں نے یہ فرمایا۔

لیجئے اوڈریٹر صاحب آپ کا مکان سج سجا گیا۔ اب اور جس چیز کی ضرورت ہو۔ وہ بھی حاضر کر دی جائے۔ کیونکہ خدا کے فضل سے سب کچھ ممکن ہے۔ فقط آپ کے اشارے کی دیر ہے ......

مرزا صاحب:- آپ کی عنایت کافی ہے۔ یہ سامان بھی میری ضرورتوں سے زیادہ ہے اور جو کچھ ضرورت ہوگی عرض کر دیا جائے گا یہ آخری جملہ مرزا صاحب نے اس خیال سے کہا تھا کہ تھانہ دار صاحب نے پہلے ہی کہا تھا کہ گھوڑا فدوی میاں کی کوشش سے بہت جلد اور کفایت سے مل جائیگا مگر فدوی میاں کو سلسلۂ کلام کو طول دینے کا شوق تھا۔

فدوی میاں:- لے تو فرما دیجئے نا کہ اُس کی ابھی سے فکر کی جائے۔ مرزا کے پاس اتفاق سے روپیہ نہ تھا۔ ان کو یہ خیال ہوا کہ ابھی کہنا کیا ضرور ہے پہلے روپے کی لنکہ ہو جائے تو دیکھا جائے گا۔

مرزا صاحب:- عرض کر دوں گا۔

فدوی میاں :۔ تو آپ فرماتے کیوں نہیں اور چارپائیوں کی ضرورت ہو تو بھجوادی جائیں۔ چینی کے برتن۔ پتیلیاں۔ لوٹے۔ گھڑے۔ مٹکے غرضکہ جس طرح لڑکے کے یہاں بھجواتے ہیں۔ یہ ایک ایک چیز کا نام لئے جاتے تھے اور مرزا نہیں نہیں کئے جاتے تھے۔ ان کی سخاوت اور صفاہت پہ اگر کوئی اور ہوتا تو کھل کھلا کے ہنس دیتا۔ مگر مرزا بہت ہی مہذب اور متین آدمی تھے اس پر بھی متبسم ہو گئے۔ مرزا صاحب کے تبسم سے فدوی میاں لغو آئے

۶ ۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

کچھ اور ہی سمجھتے تھے۔ مزاج کے سادے بے تکلف فرمانے لگے۔

فدوی میاں :۔ اچھا تو پھر اس میں تکلف کیا ہے۔ کوئی پٹریا بلادیجائے کیونکہ اس میں ہرج کیا ہے۔ آپ نوجوان آدمی ہیں اور پھر لکھنؤ کے رہنے والے مرزا کے کان اس قسم کی گفتگو سے آشنا نہ تھے۔ یہ ایک خشک آدمی تھے۔

مرزا صاحب :۔ جناب آپ نے میرے اخلاق کا غلط اندازہ کیا۔ میں اس قسم کے مذاق کا آدمی نہیں۔ آپ کی خواہ مخواہ عنایتوں کا میں مجبوراً ممنون ہوں۔ آئندہ مجھ کو ایسے مذاق سے معاف رکھیئے گا۔

فدوی میاں :۔ (بظاہر جھینپ کے اور خجالت زدہ صورت بنا کے دو تین طمانچے زور زور سے اپنے گالوں پر لگا کے اور دونوں کان مروڑ کے) توبہ! توبہ! اخطا ہوئی۔ معاف کیجئے گا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ آپ مولوی آدمی ہیں۔

مرزا صاحب :۔ نہیں آپ کا کچھ قصور نہیں۔ یہ اس زمانے کی تہذیب کا قصور ہے۔ شاید آپ کو اسی طرح کے لوگوں سے زیادہ ملنے کا اتفاق ہوا ہوگا جو بیہودہ دل لگی مذاق یا چوسر۔ گنجفہ وغیرہ میں اپنے اوقات کو ضائع کیا کرتے ہیں۔ اگر چہ میں مولوی نہیں۔ مگر طالب علم ضرور ہوں۔

مرزا اپنی نیک نفسی سے فدوی میاں کی اس بات کو دل لگی سمجھے تھے۔ حالانکہ فدوی میاں کا مافی الضمیر حقیقت کا مشعر تھا۔ نہ مجاز کا۔ کیونکہ آپکی ذات والا صفات سے یہ فیض اکثر ملازم پیشہ لوگوں کو پہنچتا رہتا تھا۔ تاہم اپنی نیک نیتی سے کہہ سکتے ہیں۔ کہ اس میں کوئی منفعت ذاتی از قسم زر فدوی کو نہ تھی بلکہ ان کا مذاق طبیعت اسی قسم کا واقع ہوا تھا۔ ضلع کی کون سی پتریا ایسی تھی جو آپ کی ممنون منت اور مطیع فرمان نہ ہو۔ ایک تو اس لئے کہ زمانۂ ثروت میں آپ نے بالتخصیص اس فرقے کے ساتھ بہت سلوک کیا تھا۔ اکثر باغات اور اراضی آپ کی عطیہ رنڈیوں کے قبضے میں موجود تھیں۔ چار ہی دن کا ذکر ہو چھوٹے صاحبزادے چھٹن میاں کی تقریب ختنہ میں دس بیگہ زمین بی دفاتن کو۔ بیس درخت آم کے مع اراضی بی رسولن کو دئے تھے۔ اسی تقریب میں موضع سیہن پور رہن ہوا تھا۔ یہ سب اوصاف فدوی میاں کے مرزا صاحب کو معلوم ہوتے رہے اور اسی قدر تنفر ان کے اخلاق سے بڑھتا گیا۔

اگر چہ گھوڑے کی خرید میں فدوی میاں کی رائے شریک رہی۔ اور اسی طرح اور معاملات میں خواہی نہ خواہی ان کا دخل رہا۔ لیکن مرزا ہر امر میں حتی الامکان ان سے دُور بھاگتے تھے۔ لیکن فدوی میاں کی وضع داری سے بعید تھا کہ آپ مرزا صاحب کے پاس جانا ترک کرتے۔ بلکہ ان کو ایک طرح کی محبت مرزا سے ہو گئی تھی اور کچھ ایسا اخلاقی دباؤ پڑ گیا تھا کہ ان سے کسی قدر ڈرتے تھے۔

فدوی میاں کو کئی مرتبہ مرزا کے سامنے اپنے منہ پہ طمانچے مارنے اور کان مروڑنے کا اتفاق ہوا۔ اس لئے کہ یہ موقع پہ بول اُٹھتے تھے۔ اور جو امر مرزا کی شان کے خلاف ہوتا تھا۔ اُس بیان کو ڈانٹتے رہتے تھے۔ مثلاً

فدوی میاں کو یہ مسئلہ مرزا کی ذات سے تحقیق ہوا کہ وہ چیز جو عموماً بالائی آمدنی کہلاتی ہے اُس کا لینا بالکل حرام ہے۔

فدوی میاں صوم صلوٰۃ کی پابندی اور ناجائز کھانے پینے کی چیزوں سے اجتناب کرنے کو مولویت اور زہد و ورع خیال کرتے تھے۔ ناجائز طریقوں سے اکتساب منفعت کرنے کو یہ گناہ ہی نہ جانتے تھے بلکہ حرام سمجھتے تھے۔

مرزا عابد حسین سے ان کو یہ بھی معلوم ہوا کہ شادی بیاہ میں ناچ رنگ یا عید۔ بقر عید مجرا دیکھنا یا بغیر مجرا دیکھے پتریوں کو انعام دینا گناہ ہے فدوی میاں کو مرزا عابد حسین کی صحبت سے اکثر ایسے امور معلوم ہوئے جن کو یہ نیکی سمجھتے تھے مگر درحقیقت وہ بدی تھے۔ رفتہ رفتہ فدوی میاں کو مرزا صاحب سے وہ اعتقاد

ہوگیا جو مقلد کو اپنے مجتہد سے یا مُرید کو اپنے پیر سے ہونا چاہئے۔ مگر فدوی میاں کی عادتیں اس حد تک خراب ہو چکی تھیں کہ اُن کی اصلاح محال تھی۔ بد عملی کی خوشامد بے جا سعی و سفارش۔ جھوٹ بولنا۔ جھوٹی قسمیں کھانا۔ فحش اور بے تکا مذاق۔ ماتحتوں کو رنڈیوں کا دربار۔ جھوٹے مقدموں کی اطاعت۔ بدمعاشوں کی حمایت۔ اور اسی قسم کے لاکھوں معائب ان میں موجود تھے۔ مگر ان سب معائب کے ساتھ ایک وصف بھی تھا وہ یہ کہ خاندانی شرافت نفس کی۔ بے طمع ان میں نہ تھی۔ اگرچہ اس وصف کے ساتھ ایک عیب بھی تھا یعنی اسراف جس کو لوگ جہالت سے اولوالعزمی کہتے ہیں۔ مرزا صاحب ان کے اس وصف کو پہچان گئے تھے۔ مرزا کا خیال تھا کہ ان کی یہ عادتیں کسی حد تک ترک ہو سکتی ہیں۔ بشرطیکہ کسی خاص اخلاقی قوت سے ان کے نفس پر اثر ڈالا جائے۔ مرزا نے تجویز کیا کہ مذہبی جوش اگر آپ کی طبیعت میں پیدا کر دیا جائے تو ممکن ہے کہ ان کی اولوالعزمی ان کو اُس طرف متوجہ کر دے۔

فدوی میاں کے دو لڑکے تھے۔ ایک نثار علی جس کا سن چودہ برس کا تھا۔ دوسرا احمد حسن جس کا سن سات آٹھ برس کا تھا۔

نثار علی آوارگی کی حد تک پہنچ گیا۔ مگر ایک خاص صفت جو قصبات اور دیہات کے لڑکوں میں پائی جاتی ہے۔ یعنی شرم۔ اگرچہ وہ حد اعتدال سے کسی قدر زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن وہی ان کی درستی کا باعث ہوئی۔

فدوی میاں اپنے لڑکوں کی تعلیم سے غافل نہ تھے۔ ایک مولوی صاحب برسوں سے دروازے پہ نوکر تھے۔ مگر لڑکا گلستان کا باب اول پڑھتا تھا کئی سال ہو چکے تھے مگر اُس کے ختم ہونے کی نوبت نہ آئی تھی۔ اور چھوٹا بغدادی قاعدہ سامنے لئے بیٹھا رہتا تھا۔ مرزا صاحب نے رفتہ رفتہ فدوی میاں کے معاملات خانگی میں دخل دینا شروع کیا۔ اور جس قدر مرزا صاحب اُن کے معاملات میں دخیل ہوتے جاتے تھے۔ فدوی میاں اپنی ذمہ داریاں مرزا کے سپرد کرتے جاتے تھے۔ نوبت بہ اینجا رسید کہ فدوی میاں کا ہر کام مرزا نے اپنے ذمہ لے لیا۔ فدوی میاں کی وہ اس طرح محافظت اور نگرانی کرتے تھے جو نابالغ یا مجنون کے ولی کو کرنا چاہئے۔ اور فدوی میاں روز اول سے کچھ ایسا باؤ مرزا صاحب کا مان گئے تھے کہ بغیر ان کی صوابدید کے کوئی کام نہ ہوتا تھا۔ جس قدر مرزا صاحب فدوی میاں پر توجہ کرتے جاتے تھے۔ شیورتن کو مرزا صاحب سے خوف پیدا ہوتا جاتا تھا۔ مرزا صاحب کو فدوی میاں اور شیورتن کے معاملات میں کچھ گنجلک اور غبن معلوم ہوئی اور درحقیقت ایسا ہی تھا۔ مرزا صاحب خود فرماتے ہیں کہ یہ راز مجھ پر شیورتن کی چشم و ابرو سے ظاہر ہو گیا تھا۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے شیورتن کی نگاہیں فدوی میاں کے سامنے جھینپی سی معلوم ہوتی تھیں۔ اس سے مجھے معلوم ہو گیا کہ اُس نے کسی قسم کی چالاکی ان کے معاملات میں ضرور کی ہے۔ اور وہ فدوی میاں سے کسی قدر دبتا بھی تھا۔ اس سے اور بھی یقین ہو گیا تھا کہ ابھی تک اُس کی چالاکی کا تدارک فدوی میاں کے اختیار میں ہے۔

فدوی میاں کا اہل عملہ کے پاس دوڑ دوڑ کے جانا اس سے بھی مجھے ایک قسم کا شبہ سا پیدا ہوتا تھا کہ شاید فدوی میاں اُن معاملات کے تدارک کی فکر میں ہیں۔ مگر ان کی بے پروائی نے اس شبہ کو رفع کر دیا تھا۔

مرزا صاحب فدوی میاں کو خفیف العقل سمجھتے تھے۔ اس لئے اپنے خیالات کو اُن سے ظاہر کرنے میں انہیں تامل تھا۔ اس لئے کہ شاید وہ اس راز کو ظاہر کر دیں کہ مرزا کو ان کے معاملات کی درستی کی غیر معمولی فکر ہے۔ ان اُمور پر نظر کر کے مرزا نے خفیہ تحقیقات کرنا شروع کی۔ شیورتن ایک بڈھا آدمی تھا۔ وہ فدوی میاں کے والد کے زمانے میں ان کے کسی موضع کا ضلعدار تھا۔ جس زمانے میں فدوی میاں کے والد شیخ قربان محمد صاحب نے انتقال کیا۔ فدوی میاں جن کا اصلی نام شیخ فدا علی تھا بہت ہی کم سن تھے۔ تولیت جائداد کی ان کے ماموں شیخ احمد کے سپرد ہوئی تھی۔ شیخ احمد ایک مشہور جعلیہ تھا۔ شیخ احمد کی تولیت کے زمانے میں بھی شیورتن کارکن رہا۔ بعد تحقیقات کے معلوم ہوا کہ شیخ احمد اور شیورتن کی سازش سے اس معاملے میں کوئی جعل ہوا ہے۔ مگر یہ پتہ نہ لگتا تھا کہ کیونکر اور کیا جعل ہوا ہے۔ مرزا کا خود بیان ہے کہ اس مقدمے کی تحقیقات کا مجھے ایسا شوق ہو گیا تھا کہ راتوں کو نیند نہ آتی تھی۔ ذرا ذرا سی باتوں کو علمی مشاہدات کے طور پر جانچتا اور پرتالتا تھا۔ شیورتن کے تمام حرکات و سکنات پر شب و روز میری نظر رہتی تھی۔ اگرچہ اُس سے مہینہ میں شاید ہی دو ایک مرتبہ میرے اُن کے ملاقات ہوتی تھی۔ وہ بھی چند منٹ کے لئے۔ مگر میرا خیال ہر وقت اُس کے ساتھ

رہتا تھا۔ فدوی میاں اگرچہ بہت ہی سفیہ اور خفیف الحرکات آدمی تھے۔ مگر اپنی آبائی جائداد کو اپنے والد کے ایک ادنیٰ ملازم کے قبضے میں دیکھ کر ایک قسم کی حسرت جو اُس کے بشرے پر ظاہر ہوتی تھی اُس پر مجھے کمال تاسف ہوتا تھا اور جب سے میں یہ سمجھ گیا تھا کہ اس مقدمے میں شیورتن نے یقیناً جعل کیا ہے اُس وقت سے میرا بس نہ تھا کہ اُس کو علاقے سے بیدخل کر کے فدوی میاں کو اُس کی جگہ قابض کرا دوں۔ مگر میرا کوئی اختیار نہ تھا۔ ظاہرا یہ امر محال معلوم ہوتا تھا اور سب سے زیادہ اہم ان خیالات کی رازداری تھی۔ اس لئے کہ افشائے راز میں ناکامیابی کا اندیشہ ایک طرف۔ شماتت کا خیال دوسری طرف دامنگیر حال تھا۔ آخر بڑی مشکل سے بعض واقعات کا پتہ لگا۔ پھر تو پیچ در پیچ مشکلیں آسان ہونے لگیں۔ اور برسوں کی اُلجھی ہوئی گتھیاں سلجھ گئیں۔

معلوم ہوا کہ شیخ قربان علی فدوی میاں کے والد نے لکھنؤ میں وفات پائی تھی۔ بسبب وفات مرض وبائی مشہور تھا۔ شیخ فدا علی کی والدہ اپنے شوہر کے سامنے مر چکی تھیں۔ شیخ احمد ان کا سوتیلا بھائی تھا۔

شیخ قربان علی کے لکھنؤ جانے کا سبب ایک مقدمہ اپیل تھا۔ مقدمہ کی روئداد یہ تھی کہ کسی راجپوت مسمیٰ ماندھاتا نے بندوبست کے زمانے میں شیخ قربان علی کے علاقے پہ دعویٰ کیا تھا۔ سرسری مقدمہ حاکم بندوبست نے خارج کر دیا۔ اُس نے نمبری نالش کی۔ وہ بھی خارج ہوئی۔ پھر اُس نے اپیل کی۔ اپیل بھی خارج ہوئی۔ پھر اُس نے اپیل ثانی کی۔ یہاں وہ تمام لوگوں کے خلاف امید جیت گیا۔ جس دن عدالت العالیہ سے مقدمہ اُس کے حق میں فیصلہ ہوا۔ وہی دن شیخ قربان علی کی وفات کا تھا۔ بلکہ اکثر لوگوں کو یہ گمان ہوا کہ شیخ خودکشی کر کے مر گئے۔ اپیل سے جیتنے کے بعد چاہئے تھا کہ قابض جائداد ماندھاتا یا اُس کے وارث ہوتے مگر بخلاف اس کے قابض جائداد شیخ احمد اور شیورتن ہوئے۔ شیخ احمد لاوارث مر گیا۔ اُس کے بعد شیورتن بلا مزاحمت احدے اور بے مشارکت غیرے تمام علاقے پہ قابض اور متصرف رہا۔ فدوی میاں کے ساتھ اُس کا سلوک اس طرح کا ہے جیسے کسی نمک حلال قدیم نوکر کو جو کبھی وقت میں ملازم تھا اپنے آقا زادہ کے ساتھ ہونا چاہئے بجواب مفلس ہو۔ مگر اس سلوک میں ظاہرداری کسی طرح کھل جاتی تھی۔ جائداد پدری سے ایک بسوہ زمین شیخ فدا علی کو نہیں ملی موضع سمبھن پور جس کا نمبر اب تک اُس کے پاس ہے اور جو شیورتن کے پاس کئی سال پیشتر رہن ہو چکا ہے وہ موضع ان کی والدہ کا تھا۔ کُل جائداد کا مالک بالفعل شیورتن تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ حتیٰ کہ مکانات بھی اُس کے نام رہن ہیں۔ مگر وہ بطور مایحتاج شیخ فدا علی کو گذارہ دیتا ہے۔ اور موضع سمبھن پور کے اسامیوں سے جو کچھ چھین جھپٹ کے وصول ہو جاتا ہے وہ گویا بالائی آمدنی ہمارے عنایت فرما شیخ فدا علی صاحب کی ہے۔ مرزا کو یہ واقعات جو اوپر بیان ہوئے کئی برس کی تحقیق کے بعد معلوم ہوئے۔ یہ تو ان پہ ظاہر ہو گیا تھا کہ اس معاملے میں کسی قسم کی چالاکی ہوئی ہے۔ رہا یہ امر کہ وہ قابل تدارک ہے یا نہیں۔ اسکا فیصلہ تفصیلی حالات کے معلوم ہونے کے بعد ہو سکتا ہے۔ منہ سے کوئی بات نکالنا .... ایک تو اس مقدمے کے لئے مضر تھا۔ جس کا سبب اوپر بیان ہوا اور مرزا کا استقلال بھی اسی کا مقتضی تھا کہ جب تک کوئی صورت یقینی کامیابی کی نہ پیدا ہو ایسی باتوں کا منہ سے نکالنا سفاہت پہ محمول کیا جائے گا۔ ان کا یہ منصوبہ تھا۔ کیا خوب ہو۔ اگر میں اس معاملے کا پورا پتہ لگا کے اور تدارک کی کافی تدبیر کر کے اس کو زبان سے نکالوں۔ پانچ برس تک اس معاملے سے مرزا کو تعلق خاطر رہا۔ فدوی میاں تو روز ہی مرزا کے پاس موجود رہتے تھے اور شیورتن بھی کبھی کبھی آ نکلتا تھا۔ مگر دونوں کو ان کے کسی اشارے کنایے سے یہ نہ ثابت ہوا کہ وہ ان کے حق میں کیا کرنے والے ہیں۔ اس اثنا میں کئی بار ان کو لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا جوڈیشل کے محافظ خانے میں دن دن بھر بیٹھ کر کُل مقدمہ کی روئداد سے انھوں نے واقفیت حاصل کر لی۔

جب تحقیقات کامل کر چکے تو اس راز کو ایک خاص مطلب کے لئے راقم الحروف (مرزا رسوا) پہ ظاہر کیا۔ اور بعض امور مجھ کو تعلیم کئے جن کا حال ناظرین کو آئندہ بیان سے معلوم ہو جائے گا۔ اس مطلب کے لئے مجھ کو مرزا کے پاس ضلع ...... جانا پڑا۔ اتوار کا دن تھا۔ مرزا دیوان خانہ (بیٹھکہ) میں تشریف رکھتے ہیں۔ فدوی میاں اور مجھ سے مذاق کی باتیں ہو رہی ہیں کہ مرزا نے اپنے اردلی کے چپراسی کو بلا کے کہا۔ شیورتن کو بلا لاؤ۔ شاید اس سے پہلے مرزا نے کسی موقع پہ شیورتن کو یاد نہ کیا ہوگا۔ میں تو اس معاملے سے واقف تھا۔ مگر فدوی میاں کو البتہ تعجب ہوا ہوگا۔ کہ آج شیورتن خلاف معمول کیوں بلایا جاتا ہے۔

شیورتن حسب الطلب سامنے آکے کھڑا ہوا۔ مرزا نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا۔ مرزا نے اُس سے چند معمولی غیر ضروری باتیں کر کے مجھ سے مخاطب ہو کے پوچھا۔

مرزا:۔ ہاں تو ولایت علی خاں مر گیا۔

میں نہیں بیان کر سکتا کہ اس نام کے سُننے کے بعد شیورتن کے دل پر کیا گذری اور اُس کے چشم و ابرو سے کس قسم کے آثار پائے گئے۔

میں:۔ جی ہاں مر گیا۔ اُس کو مرے ہوئے دو مہینے ہوئے ہوں گے۔

مرزا:۔ آپ جانتے ہیں یہ کون شخص تھا؟

رسوا:۔ میں خوب جانتا ہوں۔ کٹاری ٹولے کے متصل وہ گلی جو کو لکوں کی طرف جاتی ہے۔ نیم کے درخت کے سامنے۔

مرزا:۔ آپ خوب جانتے ہوں۔ مگر آپ نے سُنا ہوگا کس بُری گت سے مرا ہے۔

رسوا:۔ جی ہاں بندگانِ خدا کی حق تلفی کا یہی انجام ہوتا ہے۔

مرزا:۔ سُنتے ہیں لاوارث تھا۔ مرنے کے بعد کُل اسباب پولیس میں اُٹھ گیا ہوگا اور یقین ہے کہ پولیس ہی نے اُسے دفن کیا ہو۔

رسوا:۔ جی ہاں یہی ہوا۔ اور ہونا ہی کیا تھا۔

مرزا:۔ اور وہ تکیہ جو اُس کے سرہانے رہتا تھا۔

رسوا:۔ اُس کا حال پھر عرض کروں گا۔

اس گفتگو کے بعد ہم اور مرزا اِدھر اُدھر کا ذکر کرنے لگے۔ شیورتن کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ وہ ابھی اٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ مرزا نے گاڑی کسوانے کا حکم دیا۔ مرزا صاحب اور میں دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے ——— مرزا صاحب نے فدوی میاں کا ہاتھ پکڑ لیا۔ گاڑی پر سوار ہوئے راستہ میں سوائے اس جملہ کے جو مجھ سے مخاطب ہو کے کہا تھا،

"کیوں دیکھا آپ نے ہم نہ کہتے تھے" جس کا میں نے یہ جواب عرض کیا تھا۔ جی ہاں آپ کا خیال بہت صحیح تھا، اور کوئی گفتگو اس مقدمہ کی نہیں ہوئی۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ شیورتن رات ہی کو لکھنؤ گیا۔

اس واقعے سے ہمارے خیالات اور پختہ ہو گئے۔ کئی دن کے بعد لکھنؤ سے واپس آیا۔

مرزا کا متوکل شکرم میں شیورتن کے ساتھ ساتھ تھا۔ شکرم لکھنؤ پہنچی۔ متوکل ساتھ تھا شیورتن امین آباد کی سرا میں اُترا۔ وہاں تھوڑی دیر ٹھہر کے چوک کی طرف روانہ ہوا۔ گول دروازے کے قریب بان والی گلی کی طرف سے ولایت علی خاں کے مکان پر پہنچا۔ جس دُکان میں ولایت علی خاں رہتا تھا۔ وہاں اب شوالہ بن گیا ہے۔ شیورتن وہاں کے دکانداروں سے کچھ پتہ دریافت کر کے اُس چھتہ کی طرف چلا۔ جہاں تیرہ و تاریک گلیاں بہت دُور تک چلی گئی ہیں۔ اُس کے بعد ایک نالہ ملتا ہے پھر ایک ٹیکرا سا ملا۔ اس پر گیا۔ وہاں ایک شخص کو آواز دی وہ گھر سے نکلا۔ دونوں میں کچھ باتیں ہوئیں۔ ولایت علی خاں کو مرے ہوئے دوسرا مہینہ تھا۔ یہ ٹھیک پولیس کی معرفت دفن ہوا تھا مگر تکیہ کا پتہ نہ ملا۔ اس کے بعد متوکل اور شیورتن دونوں امین آباد کی سرا میں آگئے۔ اُس نے حلوائی کی دُکان سے پوریاں لے کے کھائیں۔ متوکل نے بھی اُسی حلوائی سے پوریاں لیں۔ اُس کے بعد شیورتن نظیر آباد کی طرف چلا۔ اس کے بعد اُس نے دو دن تک کچہریوں کی خاک چھانی۔ آخر مایوس ہو کر۔ . . . . . . ضلع کو واپس چلا۔ متوکل اُس سے ایک دن پہلے ہمارے پاس پہنچ گیا تھا۔

وہ تکیہ جس میں شیورتن کی جان تھی ہمارے قبضے میں کئی مہینے پیشتر آچکا تھا۔ اُس میں چند کاغذات تھے اور وہ کاغذات سب فدوی میاں کے علاقے کے متعلق تھے۔

اب ہم اس جعلسازی کو کھولے دیتے ہیں۔ اصل واقعہ یہ ہوا کہ مانڈھاتا عدالت العالیہ سے مقدمہ ہار گیا تھا۔ جیسی کہ توقع تھی۔ مگر اُسی کے دوسرے یا تیسرے دن شیخ قربان علی نے بعارضۂ فصلی بخار انتقال کیا جیسا کہ ظاہراً ثابت ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ شیو رتن اور شیخ احمد جو شیخ مرحوم کے ہمراہ تھے، ان دونوں نے سازش کر کے شیخ کو کچھ کھلا پلا دیا ہو۔ مگر اس قدر عرصے کی بات تھی۔ اس کا ثبوت دشوار بلکہ محال ہے۔ علاقے کے باب میں یہ چالاکی کی گئی کہ اصلی فیصلہ محافظ خانہ سے اڑوا کے اور بجائے اُس کے ایک فیصلہ بحق مانڈھاتا ولایت علی خاں کی معرفت بنوا لیا گیا۔ پھر مانڈھاتا اور شیخ احمد اور شیو رتن میں کچھ ایسا سمجھوتا ہو گیا کہ مانڈھاتا کچھ رقم معتدبہ لے کے علیحدہ ہو گیا۔ اور اُس سے ایک رہن نامہ بنام شیو رتن ہو گیا۔ شیخ احمد کے نام رہن نامہ ہوتا مگر اُس کی حیثیت اس لائق نہ تھی۔ اور شیو رتن شیخ قربان احمد کے زمانہ ہی میں لین دین کرتا تھا اور بڑا روپیہ والا مشہور تھا۔ اصل فیصلہ عدالت جو ولایت علی خاں کو بطور نمونہ کے دیا گیا تھا وہ اس نے دبا رکھا۔ اور اُس کے ذریعے سے وہ شیو رتن کو وقتاً فوقتاً دبا کر کچھ لے لیا کرتا تھا۔

آخر میں ولایت علی خاں نابینا ہو گیا تھا۔ جب وہ خرچ سے تنگ ہوتا تو ایک خط دباؤ ڈالنے کے لئے شیو رتن کو لکھ بھیجتا۔ وہ کچھ نہ کچھ بھیج دیا کرتا تھا۔ مگر قلیل مقدار۔ اس لئے کہ شیو رتن خوب جانتا تھا کہ ولایت علی وہ کاغذات پولیس یا عدالت میں داخل نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ وہ خود مجرم ہے مگر پھر بھی احتیاطاً کچھ دے نکلتا تھا۔ جب مرزا اس مقدمے کی تحقیقات میں مصروف ہوئے۔ ایک دن شیو رتن کے نام کا ایک پوسٹ کارڈ مرزا کی ڈاک کے ساتھ چلا آیا۔ اس پوسٹ کارڈ میں اگرچہ کوئی امر تفصیلی طور سے نہ لکھا تھا مگر ولایت علی خاں کو مرزا اچھی طرح جانتے تھے ولایت علی خاں کا نام پوسٹ کارڈ پر دیکھتے ہی گویا تمام مقدمہ کا پتہ چل گیا۔

پوسٹ کارڈ کا مضمون یہ تھا کہ شیو رتن کو معلوم ہو کہ ہمارا آخری وقت ہے۔ کچھ ہماری مدد کرنا چاہئے۔ کاغذات ہم سے لے لو۔ اور جو کچھ تم سے ہو سکے ہم کو دے دینا۔ ورنہ مرتا کیا نہ کرتا۔

اس پوسٹ کارڈ کو مرزا نے دبا رکھا۔ اور ایک متوکل شیو رتن کی طرف سے ولایت علی خاں کے پاس گیا۔ اور پچاس روپے دے کے وہ کاغذات اُس سے حاصل کر لئے۔ اس کے چند ہی روز بعد ولایت علی واصل جہنم ہوا۔ واقعی بہت بُری طرح سے مرا جیسے بے ایمانوں کا ایسا ہی انجام ہونا چاہئے

ان واقعات کے مفصل ذکر کے بعد اب اس کے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ شیو رتن کس قدر سہولت کے ساتھ تمام جائداد سے دست بردار ہونے پر راضی ہو گیا ہو گا۔ باہمی فیصلہ کر لینا مناسب وقت تھا۔ اس لئے کہ اگرچہ جعل کا ثبوت قطعی ہاتھ آ گیا تھا اور شیو رتن واقعی مجرم تھا۔ اسلئے وہ بہت ہی خائف تھا۔ مگر بہت عرصے کی بات ہے۔ اس لئے مرزا کی احتیاط اسی کی مقتضی ہوئی کہ یہ مقدمہ عدالت تک نہ جائے اور شیو رتن بھی یہی چاہتا تھا —— لہٰذا شیو رتن نے کل جائداد کا بیعنامہ فدوی میاں کے نام کر کے صرف ایک موضع اپنے نام چھڑا لیا اور اس فیصلے کے چند ہی روز کے بعد تیرتھ کو چلا گیا جہاں سے اس وقت تک واپس نہیں آیا۔

اب فدوی میاں کا حال نہ پوچھئے، پورے رئیس بن گئے۔ مگر مرزا کو ابھی تک اُسی طرح مانے جاتے ہیں۔ اور کوئی کام بغیر ان کی صلاح مشورے کے نہیں کرتے۔

راشد الخیری

بھنور کی دلہن

بادشاہی باغ جس نے صاحبقران ثانی جیسے جلیل القدر شہنشاہ سے لیکر بیچارے بہادر شاہ تک کے جلوس اپنی آنکھ سے دیکھے تھے۔ خواتین مغلیہ کے قدم اپنے سر آنکھوں پر رکھے۔ دلی سے چار میل شاہدرہ اسٹیشن کے قریب واقع ہے متواتر پانچ ساڑھے پانچ صدی تک بادشاہی باغ نے جو عیش کئے ہیں اس کی نظیر پردۂ دنیا پر مشکل سے ملے گی برسات کے موسم میں باغ کا اندھیری حصہ ایک طلسم کدہ تھا آم اور جامن کے گنجان درخت زمین میں اس طرح گھل رہے تھے کہ مالی اور باغبان تو درکنار بہتر سے بہتر صناع دنگ رہتے تھے ڈھائی تین فرسنگ درختوں کی یہ دورویہ قطار اس طور پر چھائی ہوئی تھی کہ چھاجوں پانی پڑ جائے مگر ایک قطرہ زمین تک نہ پہنچے۔ اندھیری حصہ کی مشرقی سمت پر جمنا لہریں لیتی تھی ساون بھادوں کی اکثر راتیں اور بیشتر دن مغل بادشاہوں نے اس باغ میں بسر کئے۔ جب اودی اور سیاہ گھٹائیں آسمان پر چھا جاتی تھیں بجلی کوندتی تھی بادل گرجتا تھا تو یہ سیر کے رسیا جھولوں کا لطف اٹھاتے تھے۔ گنگا جمنی ڈوریوں میں وہ پہلی سنہری پٹریاں پڑ جاتی تھیں۔ قلعۂ معلی کی یہ لال لال سبز جوڑے پہن پینگیں چڑھاتی تھیں اور جھولنے والیوں کی جھنبیری آوازیں زمین سے اٹھ کر کوئل کی کوک اور پپیہے کی صدا سے ٹکراتی تھیں۔

آج باغ کی کل کائنات چند درخت ایک ٹوٹی ہوئی محلسرا اور شکستہ دیواریں ہیں۔ بیگم پسند کنواں تو زندہ ہے مگر کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا جہاں آدمیوں کی کثرت سے تل دھرنے کو جگہ نہ تھی وہاں اب دن دہاڑے گیدڑ پھرتے ہیں۔ وسط باغ میں فیروز خاں تاتاری بلوچ کی جھونپڑی ہے جو ان درختوں کی رکھوالی کرتا ہے اور اپنی جوان لڑکی فیروزہ کو لئے ہوئے زندگی کے دن پورے کر رہا ہے۔

۲

شمع آفتاب جھلملا کر دم توڑ رہی تھی روزِ روشن کا جنازہ دفن کے قریب تھا اور بادشاہی باغ کے درخت جو قبروں میں پاؤں لٹکائے کھڑے تھے اپنے دورِ شباب کا مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ پتوں کی موسیقی اور پرندوں کا نغمہ شام کا گجر بجا رہا تھا کہ فیروزہ اپنے میلے دوپٹے کے بائیں آنچل کو کندھے پر ڈالتی ہوئی جھونپڑی سے باہر نکلی اس کی کٹیا مصنوعی دنیا کے جھگڑے ٹنٹے تکلفات اور ان سامانوں سے جو امیر زندگی کا جز

ہو گئے ہیں پاک تھی مگر اطمینان کی ایک خاموش مسرت گھاس پھونس کے اس ڈھیر پر برس رہی تھی۔ شباب کا یہ مجسمہ جس پر حسن قربان ہو رہا تھا۔ زندگی کے تمام آلام و افکار سے صاف تھا وہ جوانی کے جذبات سے قطعی ناآشنا تھی۔ مگر ایک نامعلوم طاقت اس کے دل میں کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔ لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ کیا!

۳

حسین علی زمیندار کا لڑکا احسن صبح سے جمنا کے کنارے شکار کھیل رہا تھا۔ قازوں اور مرغابیوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے ذکر چکا کہ دوست احباب آٹھ دس آدمی اور پانچ چھ بندوقیں ہمراہ تھیں احسن اپنی کامیابی پر خوش اور مصاحب نشانہ کی داد دینے میں سرگرم تھے وہ دولت کے نشہ میں جھوم رہا تھا۔ اور کتاب عمر کا ہر ورق بتا رہا تھا کہ ناکامی کا وجود اس دنیا میں صرف مفلسوں کے واسطے ہے دوپہر کا دسترخوان انواع و اقسام کی نعمتوں سے لبریز تھا کچھ بہشتی کچھ بھنگنیں کچھ کو مار کچھ چمار بجو رہے کہ پیٹ بھر رہے تھے۔ اُن کلیوں کی طرح جن کے شگفتہ ہوتے ہی شہد کی مکھیاں اور بھنورے ہر وقت بھنبھناتے رہتے ہوں جنہوں نے کبھی بھول کر بھی گلچیں کی صورت نہ دیکھی ہو احسن کے دولتمند کان خوشامد سے بھرے ہوئے تھے جوانی کی رعونت رگ رگ میں موجود تھی، اس پر دولت کی افراط دن عید تھا رات شب برات۔ زمیندار گاؤں کا خدا ہوتا ہے آسامیاں رعیت نہیں بندے ہوتے ہیں ان کی دولت ان کا گھر ان کی عزت ان کا مال و متاع ملکیت ہوتا ہے زمیندار کی۔

احسن نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی اور ان ہی خیالات میں پرورش پائی۔ سچ پوچھو تو باپ کی زندگی ہی میں گاؤں کا بادشاہ بن چکا تھا اکلوتا بچہ تھا۔ کس کی مجال تھی کہ اس کا حکم ٹالے۔ ابھی پندرہ دن بھی نہ ہوئے تھے کہ اس نے محض اپنے حکم سے ایک دھوبی کا مکان اپنے دار و غنہ کو دلوا دیا۔

۴

شام ہونے لگی تو احسن نے منہ ہاتھ دھویا۔ شکاری لباس تبدیل کیا۔ چارپائی اور ایک مصاحب سے کہا "میر صاحب، جینٹ صاحب شکار کو گئے اور خاک نہ ملا۔ منجھلے میاں تین دن حیران رہے اور چڑیا کا بچہ نہ لائے۔ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ یہ لوگ خالی ہاتھ کس طرح آتے ہیں۔ ہم کو تو ہمیشہ اتنا ملتا ہے کہ ڈھویا نہ جائے۔ یہ دیکھئے۔ پرے کے پرے لگے ہوئے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ میرا فیر آج تک خالی ہی نہیں گیا۔"

میر صاحب :۔ سرکار آپ کی بات آپ کے ساتھ ہے حضور کا تو امادہ ہی شکار کے واسطے ملک الموت ہے ساری دنیا کہہ رہی ہے کہ اس وقت ہندوستان میں دو شخص ہیں ایک نواب حیدر آباد اور ایک حضور جن کا نشانہ خطا ہی نہیں ہو سکتا۔

احسن :۔ مجھے تو انگریزوں پر تعجب ہے کہ وہ بھی میرے نشانہ کی تعریف کرتے ہیں۔

میر صاحب :۔ جی ہاں کلکٹر صاحب کے خانساماں نے مجھ سے خود کہا کہ صاحب تعریف کرتے تھے۔

احسن :۔ یہ لوگ اصل میں چیترے کے قدر دان ہیں پچھلے موقعہ پر صاحب کے ساتھ میں نے بھی کئی فیر کئے یہ اتفاق تھا کہ سب خالی گئے مگر صاحب نے چیترا بہت پسند کیا۔

میر صاحب :۔ حضور یہ تو حکومت ہی پیترے کی کرتے ہیں۔ یہ جو دن رات قواعد پریڈ ہوتی ہے یہ ہے کیا؟ بس چیترا۔

احسن :۔ میر صاحب! ہاں وہ دھوبی کا کیا ہوا۔

میر صاحب :۔ بھلا حضور کے حکم کو کوئی ٹال سکتا ہے۔ رعیت کی کیا مجال ہے کہ اُف کر سکے۔

احسن :- یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ مکان دھوبی ہی کا تھا۔ مگر اُس کے اکڑنے پر مجھے غصہ آ گیا۔

میر صاحب :- حضور نے اس کو بہت اچھی سزا دی اب ایک درخت کے نیچے بال بچوں کو لے کر پڑا ہے بس عمر بھر کو ٹھیک ہو گیا۔

احسن :- ان کمینوں کو اسی طرح درست کرنا چاہئے۔

میر صاحب :- آؤ ذرا بادشاہی باغ کی سیر کریں۔

۵

آسمان کی بساط اور زمین کا دامن دونوں آفتاب و ماہتاب کے ظاہری اثرات سے پاک تھے درختوں کے قہقہے فضائے آسمانی میں گونج رہے تھے۔ جھٹ پٹا وقت تھا۔ ہلکی ہوا سبز پتیوں کو گدگدا رہی تھی۔ جامن کی خاموش پھلنگ پہ بیٹھا ہوا ایک طائر شاہی باغ کے انقلاب کا مرثیہ پڑھ رہا تھا۔ رات چودھویں تھی اور کائنات کی آنکھیں تمر چاند ہم کے واسطے آسمان پہ لگی ہوئی تھیں کہ شاہی باغ کی کٹیا سے زمینی چاند برآمد ہوا۔ حسن کی مجسم تصویر فیروزہ اپنی جھونپڑی سے باہر نکلی چاروں طرف دیکھا۔ بادشاہ پسند کنوئیں پہ آ کر پانی بھرا اور پانی کے دو گھڑے لے کر کیاری میں آئی۔ رنگ برنگ کے پھول کھل رہے تھے اور ہوا نے باغ کو معطر کر رکھا تھا چمبیلی کے درختوں میں پانی دیا جوہی اور موتیا کو ٹھیک کیا۔ گلاب کے پاس پہنچی تو دیکھا کہ ایک شاخ کے دو پھول ہوا میں جھوم جھوم کر گلے مل رہے ہیں۔ فیروزہ ابھی اس جذبہ سے جو اس سلسلے میں کام کر رہا تھا قطعاً ناآشنا تھی مگر فطرت نے پھولوں کی اس حرکت پر اس کے قلب میں ایک آگ لگا دی وہ جھک گئی ہوا کا جھونکا ندر سے آیا پھولوں نے ایک دوسرے کے منہ چومے اور اس کے ساتھ ہی ان دونوں کو آنکھ سے لگانے میں باغ کا ایک تیسرا پھول فیروزہ شریک ہو گئی وہ یہ سب کچھ کر رہی تھی مگر بے خبر تھی کہ کیوں اور ناواقف تھی کہ کیا!

فیروزہ کی خاموش انگلیاں پھولوں سے کھیل رہی تھیں وہ کبھی پھولوں کو ہونٹوں سے لگاتی کبھی سر پہ رکھتی اور پھر چھوڑ دیتی۔ پھول ہوا کے دریا میں تیرتے اور وہ اُن سے لپٹ جاتی اُس کا حُسن تصنع سے پاک تھا۔ اس کی آنکھیں سرمہ اور کاجل سے صاف تھیں اس کا چہرہ پاؤڈر سے اس کا لباس لونڈر سے اُس کے ہاتھ چوڑیوں سے اس کا سینہ زیور سے ہزاروں کوس دُور تھا۔ لیکن وہ اس پہ بھی ایک مجموعہ تھی ان خوبیوں کا جن پہ قدرت خود فخر کر رہی تھی سیاہ اور گھنگھر والے بال حسین چہرہ کی کروٹوں میں آ پڑے تھے اور اس کو مطلق خبر نہ تھی کہ وہ کہاں ہے۔ اور کیا کر رہی ہے۔ پھولوں کی نازک پنکھڑیاں اپنی کامیابی پہ نہال تھیں۔ آم کا درخت سر پہ چھایا ہوا تھا کہ بلبل کے نالۂ رقابت نے اس کو چونکا دیا۔ پریشان بال درست کئے سامنے دیکھتی ہے تو ایک نوجوان گم سُم ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے۔ تاتاری خون رنگ لایا خیر نظریں دیکھتے ہی آنکھیں غصہ سے سُرخ ہو گئیں مگر خون کا یہ دَورہ طیش غضب میں بجھا ہوا ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ ایک متضاد جذبہ نے یہ بھڑکتی ہوئی آگ ٹھنڈی کی۔ بلند آنکھیں نیچی ہو گئیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ شوق نے نیچی نگاہیں پھر بلند کیں اور آناً فاناً یہ تین مختلف کیفیتیں فیروزہ کے قلب پہ گذر گئیں۔ جذبۂ غیض جل بجھ کر تلاش سے بدلا۔ تلاش نے شوق کی ہیئت اختیار کی اور آخری طاقت جس نے دوبارہ آنکھیں جھکوا دیں نسوانیت تھی۔ یہ سب کچھ ہوا، اور ہو چکا، مگر فیروزہ اب تک یہ نہ سمجھ سکی کہ کیا ہوا!

۶

"تم لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں تین روز سے مچھلی کی طرح تڑپ رہا ہوں یہ تمام عمر میں پہلا اتفاق ہے کہ مجھ کو اس قسم کی تکلیف ہوئی تم سب فضول باتیں کر رہے ہو اور اتنا نہیں ہوتا کہ اس کو یہاں تک لاؤ۔ وہ عورت نہیں حُور ہے جو بادشاہی باغ کی جنت میں رہتی ہے۔ ایک ہیرا ہے جو گلاب کی کیاری میں چمک رہا تھا۔ ایک چاند ہے جو باغ میں اُتر آیا تھا تم لوگ نمک حرام ہو اور باتیں بنانے کے سوا کچھ نہیں جانتے :- (احسن)

"غریب پرور اس بدنصیب فیروزہ خاں کے سر پہ تو قضا سوار ہے کہ نمک حرام نے بل بھر آخر اُجڈ گنوار ہے۔ اکڑ گیا اس نے یہ نہ سوچا کہ گھاڑہ اور کچا مرکاہ۔ اس کے سر پہ موت کھیل رہی ہے۔ اس کی ہستی کیا ہے کہ دم مار سکے اپنی اصلیت کو نہیں دیکھتا فقط حضور کے حکم کی دیر ہے ہم تو فیروز کو جان سے مار ڈالیں" (ایک مصاحب)

"مگر وہ لڑکی بہت خوش ہے بی مغلانی کہہ رہی تھیں کہ مجھ کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئی پٹھان تو بگڑتا رہا اور وہ ہنستی رہی" (دوسرا مصاحب)

بھئی بہت ٹھیک۔ (۱)

بے شک۔ (۲)

بے شک بے شک (۳)

بس پتہ چل گیا۔ (۴)

"ہاں یہ کون کہہ رہا تھا کہ بڑے سرکار حکم دیں تو اسی وقت کام ہو جائے" (پہلا)

"اور اس میں کلام ہی کیا ہے" (دوسرا)

"سرکار نے بلوایا تھا اس نے انکار کر دیا" (تیسرا)

"یہ تو حد ہو گئی" (چوتھا)

۷

احسن اور اس کے مصاحبوں نے ہر ممکن کوشش سے کام لیا منت خوشامد کی زبردستی کی، ڈرایا دھمکایا سمجھایا بجھایا مگر فیروزہ کا دل نہ پگھلا سکے۔ بلوچ تھا تو ایک ٹانگ کا آدمی لیکن غیرتمند قوم کا جمی فروزہ وہ کھری کھری سنائیں کہ سب منہ تکتے رہ گئے فیروزہ صبح کیوقت ایک ہندو رتھیں کے جمنا پار روزانہ ڈالی لیکر جاتی تھی اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ گھنٹوں پہلے کنارہ دریا پر آبیٹھتا۔ اور فیروزہ کی صورت دیکھ لیتا اس نامعلوم کیفیت سے جو اندر ہی اندر فیروزہ کو زیر وزبر کر رہی تھی اب پردہ اُٹھنے لگا۔ اور وہ اتنا سمجھ گئی کہ جس بے باکی سے میری آنکھیں آج کائنات کی ہر شئے کا مطالعہ کرتی تھیں احسن کی طرف جانے میں اس بے باکی کے ساتھ کوئی اور چیز بھی شامل ہے جو رفتہ رفتہ رنگ بدل رہی ہے۔ کبھی حیا دامنگیر ہوتی ہے کبھی شوق کبھی تعجب اور کبھی تلاش ایک مہینہ سے زیادہ اسی طرح گزر گیا اور اب فیروزہ کا معصوم قلب محبت کی اس منزل پہ پہنچ چکا تھا کہ وہ جب علی الصبح اُٹھتے ہی رائے صاحب کے ہاں جانے کی تیاری کرتی تو ادائیگی فرض کے ساتھ ہی احسن کو دیکھنے کی بھی ایک مسرت پاتی جون کا ٹھیک آخری مہینہ تھا گرمی شدت سے پڑ رہی تھی جمنا پایاب ہو گئی تھی اور پاٹ بہت مختصر ایک روز جب فیروزہ بیچ دریا میں تھی اس کا پاؤں اُٹھا اور گر گیا۔ رنگ برنگ کے پھول اور پودینہ کی سبز پتیاں پانی میں تیرنے لگیں۔ شلجم۔ چقندر اور بینگن ڈوب گئے احسن ایک چٹان پہ بیٹھا یہ دیکھ رہا تھا فیروزہ کے گرتے ہی وہ بیتاب ہو گیا دوڑ کو دوڑا اور ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا۔

صبح کا وقت تھا جنگل اور دریا سنسان اور چند آبی پرندوں یا آبی جانوروں کے سوا ان چاہنے والوں کا تماشہ کسی اور آنکھ نے نہ دیکھا۔ احسن بہتے ہوئے پھول پکڑ پکڑ کر لایا ڈوبی ہوئی ترکاریاں ٹٹول ٹٹول کر نکالیں اور وہیں کھڑے کھڑے ڈالی سجائی۔ فیروزہ کا دل چاہتا تھا کہ وہ محسن کا شکریہ ادا کرے۔ مگر بہت سی طاقتیں ایسی غالب تھیں کہ وہ کہہ تو کچھ نہ سکی مگر اتنا ضرور ہوا کہ چلتے وقت اس کی آنکھوں نے مسکرا کر احسن کو دیکھا اور اس مسکراہٹ میں بہت کچھ پنہاں تھا۔

۸

دریا کی لہریں جنہوں نے فیروزہ کے گرنے پر قہقہے لگائے خاموش تھیں اس صبح کو جب مدریہ دل سے ناآشنا حسینہ خاموش کھڑی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی اور احسن کی صورت نظر نہ آئی تھی آج اس کو معلوم ہو گیا کہ دل جن گتھیوں کو سلجھا رہا تھا جذبات جن سانپوں سے کھیل رہے تھے اور خواہشیں جس تخیل میں ڈوب رہی تھیں اس کی کیا حقیقت ہے اور احسن کا انتظار اور ناکامی یہ معنی رکھتا ہے کہ۔

"اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی"

اسی حالت میں پارہ گئی اور مارا مارا واپس آئی تو پھر سناٹا تھا۔ دیر تک کھڑی رہی مایوس ہوئی تو باغ پہنچی دن تڑپ تڑپ کر اور رات کروٹیں لے لے کر ختم کی ابھی آفتاب طلوع ہی ہوا تھا کہ باہر نکلی پھول توڑے ترکاری اکٹھی کی اور ڈالی سجا کر دریا پہ آئی۔

۹

پرندوں کا نغمہ فضائے آسمانی میں گونج رہا تھا۔ جمادات کی نیند ختم کر چکی تھی اور لہریں چاندی میں ڈھلی ہوئی بہہ رہی تھیں۔ کہ فیروزہ کی منتظر آنکھوں نے احسن کی صورت دیکھی مگر انتظار و اشتیاق غصہ سے بدلا اس کی رسیلی آنکھوں میں بلوچی حرارت پیدا ہو گئی۔ تیوری پہ بل پڑ گئے اور اس نے نفرت کے ساتھ منہ پھیر لیا۔

آج پہلا روز تھا کہ احسن اس کے قریب پہنچا۔ ہر چند ہمت کی کہ اس کے قدموں کو ہاتھ لگائے اس کے ہاتھوں کو آنکھوں سے ملے، مگر یہ تمام جذبات جو رفتار کے ساتھ ترقی کر رہے تھے قریب پہنچتے ہی فنا ہو گئے۔ اور اتنی ہمت بھی نہ رہی کہ اس کے سوا کچھ کہہ سکتا۔

"کل پاؤں کا دورہ زنجیر بن کر پاؤں میں پڑ گیا"

فیروزہ نے یہ الفاظ خاموشی سے سنے اور اتنا کہہ کر پانی میں اتر گئی۔

"میں تو اس باپ کی بیٹی ہوں جو صرف ایک پاؤں سے دنیا کا مقابلہ کر رہا ہے۔"

۱۰

"اس سے پہلے کہ میں آپ کی درخواست کا جواب دوں میں آپ کی اس جھونپڑی میں تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں، افسوس ہے کہ اس گھاس پھوس کے سوا یہاں آپ کے بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں۔ میں نے آپ کا ارشاد سنا اس کے جواب میں عرض ہے کہ آپ مجھ کو اس خیال سے نہ دیکھئے جو جھوٹی شرافت، فانی دولت اور رغنا ماست نے آپ کے دماغ میں پیدا کیا۔ میں بہادر درجی قوم بلوچ کا ایک فرد ہوں لیکن میں ہندوستان میں بھیک مانگنے نہیں آیا میں گھوڑوں کی تجارت کے واسطے آیا۔ میری بیوی میرے ساتھ تھی گھوڑے سے گر کر میری ٹانگ ٹوٹی لیکن وطن کی واپسی میں یہ حارج نہ تھی فیروزہ میری پیاری بچی یہیں پیدا ہوئی۔ مگر میری واپسی وطن میں اس کا وجود بھی رخنہ انداز نہ ہو سکتا تھا۔ مجھے جس چیز نے ہندوستان میں روکا وہ اس فیروزہ کی ماں اور میری عزیز بیوی کی یہ سامنے والی قبر ہے جس کی میں پرستش کر رہا ہوں میں اس باغ اور باغیچہ کا رکھوالی نہیں میں ان ہڈیوں کا نگہبانی کر رہا ہوں جن کی عصمت کا میں مالک تھا۔ ہم بہادر جنگجو ہیں لیکن دغا باز نہیں تم دولت مند لوگ تم ہندوستان کے مسلمان تم رئیس اور امیر ہمارے مقابلے میں کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ تم نے عورت کی مٹی پلید کی اور اس کے ساتھ وہ سلوک کیا جس کے خیال سے انسانیت لرزتی ہے تمہارا ایمان یہ ہے کہ جھوٹے وعدوں اور غلط امیدوں سے ایک معصوم عورت کو نکاح میں لاؤ اور جب تمہاری بدولت تمہارے منظور کے نفیس و

تمہارے کچھ بچوں کو دودھ پلا کر یا اکار میں گھل گھلا کر صورت سے بے صورت ہو جائے تو تم اس کو اُدھر ہی چھوڑ کر دوسری عصمت کو تاکو اور اسلام کی آڑ میں مزے اڑاؤ مجھے معلوم ہے کہ خود آنجناب کی تین بیویاں موجود ہیں آپ کو حق نہیں کہ کسی معقول آدمی سے اس قسم کی درخواست کریں۔ مجھے معاف کیجئے۔ میری رائے میں آپ سے زیادہ جفا شعار مشکل سے ہوگا۔ افسوس یہ ہے کہ آپ کے ان افعال پہ آپ کی سوسائٹی یا برادری آپ کا کنبہ یا قوم خوش ہے اور اس لئے وہ بھی آپ سے کم سنگ دل نہیں ضرورت تھی کہ مسلمان آپ کو دونوں ہاتھوں سے سلام کرتے۔ اور اگر ان میں ایمان ہوتا تو آپ کی صورت نہ دیکھتے آپ لڑکوں کے قریب جنگل کے وسط میں باغوں کے مابین نہروں کے کنارے ہماری خانہ بدوش قوم کی ہم فقیروں کی ٹوٹی ہوئی جھونپڑیوں میں جہاں عصمت کے جواہرات جگمگاتے ہیں اس صنف نازک کے وہ قدرداں دیکھیں گے جن پہ آسمانی فرشتے مرحبا کہتے ہیں ہم نے اس پھول کی جو عورت کی حیثیت میں قدرت نے ہم کو عطا کیا سچی قدر کی اور سر آنکھوں پہ رکھا۔ ہمارے پھٹے ہوئے کپڑوں اور ٹوٹی راؤٹیوں میں مسرت کے وہ خزانے دمک رہے ہیں جن کا عشر عشیر بھی تمہارے قالینوں اور غالیچوں محلوں اور دو محلوں میں موجود نہیں۔

کثرت ازدواج کے مسئلہ کو ہم تم سے بہتر سمجھتے ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ گو میں حافظ نہیں مگر آپ سے اور اس تمام جماعت سے جو آپ کے ہمراہ ہے بہتر اور زیادہ قرآن اور حدیث مجھے یاد ہے لیکن آپ نے تو اس سلسلہ میں اسلام کو اُلٹی چھری سے ذبح کیا۔ نص کے خلاف میں کیا، کوئی مسلمان نہیں جا سکتا مگر فروعات میں ہم کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہر ضرورت خواہ وہ کسی عنوان کے تحت میں ہو حالات کے اعتبار سے مکمل ہونی چاہیے۔ شکم پروری جس کی ضد خودکشی ہوگی انسان کی بہترین عبادت ہے اس کی تکمیل کسی وقت جنگلی پھلوں پہاڑی جانوروں سے ہو رہی تھی مگر آج گو مقصود وہی ہے لیکن حالات نے سامان بدل دیا اور غذا بالکل مختلف ہو گئی ہیں پھر کہتا ہوں کہ نص کی مخالفت کفر ہے لیکن نص کو دھوکا دینا کفر سے بھی زیادہ ہے قرون اولیٰ کی ضرورتیں اور تھیں اس وقت کے حالات اور تھے۔ میں نے آپ حضرات کو اور بالخصوص آنجناب کو کبھی سر منڈاتے ہوئے تہمد باندھے ہوئے کھجوروں سے پیٹ بھرتے ہوئے اور پتھر ڈھوتے ہوئے نہیں دیکھا ہاں آپ کے نکاحوں کی خبریں میرے کانوں میں برابر پہنچتی رہیں آپ ہم کو اقوام جرائم پیشہ میں شمار کرتے ہیں مگر گریبان میں منہ ڈالئے اور فرمائیے آپ سے زیادہ عادی مجرم کون ہو سکتا ہے۔ کہ شب و روز آپ بدبخت عورت پہ سوکنیں لا رہے ہیں۔ آپ خوش ہیں۔ آپ کی ستم گر سوسائٹی آپ کی ہاں میں ہاں ملا رہی ہے! اس باغ میں میری حیثیت محافظ کی ہے کہ میں ان پھلوں کو اور میووں کو پرندوں اور جانوروں سے محفوظ رکھوں یہ ہی میرا رزق اور میری زندگی کا سہارا ہے یہ سامنے دیکھیے میری غلیل اور گوپیا اسی مرض کی دوا ہیں مگر شام کے وقت جب اندھیرے کی چادر اس چار دیواری پہ پھیلتی ہے اور قدرت آفتاب جہانتاب کی رونق فنا کرتی ہے اس وقت طوطے کا ایک جوڑا اس اونچی ٹہنی پہ آکر بیٹھتا ہے میری کیریوں کے گرنے کی آواز ان کی آمد کا غلغلہ بلند کرتی ہے میرے ہاتھ گوپیا اٹھاتے ہیں لیکن میری آنکھیں جب یہ دیکھتی ہیں کہ فضائے آزادی میں مٹھی بھر پھل کا یہ جوڑا زندگی کا لطف اٹھا رہا ہے۔ اور ہوا کے جھونکے اس کی سچی محبت پہ قربان ہو رہے ہیں تو میرے ہاتھ رک جاتے ہیں میرا دل کانپ جاتا ہے اور اب مجھے ایک دوسرا سماں دکھائی دیتا ہے میں دیکھتا ہوں کہ محبت کے انتہائی جذبے سے مغلوب ہو کر نر مادہ سے لپٹ گیا اس نے اپنا سرخ چہرہ چمکدار منہ مادہ کے پروں میں رکھ دیا، مادہ اس کے پاکیزہ جذبے کے استقبال کو آگے بڑھی منہ سے منہ ملایا اور ان کے گلوں سے موسیقی کی وہ صدائیں بلند ہوئیں۔ جن پہ کائنات نثار ہو تو میرا گوپیا گر پڑتا ہے غلیل ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے اور میں از سر تا پا اس محبت میں محو ہو جاتا ہوں۔ مجھ کو دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دینے والا سماں آپ کے ایک اشارے ہی ختم ہو سے۔ اور آپ کے ایک [illegible] نرم نوڑتے ہوئے نیچے آپڑتے ہیں۔

دور ہو جائیے آپ میرے سامنے سے اس لئے کہ آپ کافر کہیں گے، چلے جائیے یہاں سے اس واسطے کہ مشرک فرمائیں گے، مگر آپ مجبور ہیں اور قطعاً محروم اس دولت سے جس سے میرا دل مالامال ہے۔

میری زندگی اور زندگی کا نصب العین یہ ہے:

اتنا کہہ کر بلوچ کھڑا ہوا بیوی کی قبر پر سجدہ میں گرا اس کی خاک آنکھوں پر رکھی اور کہا "دنیا آپ کے واسطے پڑی ہوئی ہے بہتر سے بہتر اور امیر سے امیر اور حسین سے حسین لڑکیاں موجود ہیں مجھے معاف فرمائیے اور آئندہ ادھر کا رُخ نہ کیجئے گا۔"

وہی جمنا کا کنارہ ہے اور صبح صادق کا سہانا وقت۔ فیروزہ اپنی ڈالی ہاتھ میں لئے خاموش کھڑی ہے۔ احسن کچھ کہہ رہا ہے۔ اور آنکھ سے زار و قطار آنسوؤں کی لڑیاں جھڑ رہی ہیں وہ اپنی داستانِ غم ختم کر چکا تو فیروزہ مسکرائی اور کہا "میرے باپ نے جو کچھ کہا وہ تم لوگوں کو کتنا ہی ناگوار ہو لیکن اس کا حرف حرف صحیح تھا میں اُن کی مرضی یا اجازت کے خلاف ہرگز نکاح کے واسطے تیار نہیں اس لئے تم کو اس سے قطعاً مایوس ہو جانا چاہیئے۔

تم نے اپنی محبت میرے سامنے پیش کی یہ میرا فرض انسانیت ہے کہ میں اس کا جواب محبت سے دُوں اس لئے جس زبان سے یہ لفظ ادا ہو رہے ہیں کہ میں اپنے باپ کی مرضی کے خلاف یا اجازت کے بغیر نکاح نہ کروں گی اسی سے یہ وعدہ بھی کرتی ہوں کہ اگر تمہارا دل محبت کے اسی مرکز پر قائم رہا تو میں کسی دوسرے شخص سے بھی نکاح نہ کروں گی۔ یہ میرا قطعی فیصلہ ہے۔ میں نے باپ کے ارشاد کی بھی تعمیل کر دی اور محبت کا بھی جواب دے دیا۔" اتنا کہہ کر فیروزہ اپنی ڈالی لئے آگے بڑھی اور احسن منہ تکتا رہ گیا۔

۱۲

آج صبح کے وقت بادشاہی باغ جہاں دو آدمیوں کے سوا کوئی نہ ہوتا تھا سینکڑوں آدمیوں سے بھرا ہوا ہے۔ کچھ پولیس کے لوگ ہیں کچھ ہسپتال کے اور زخمی فیروز ایک چارپائی پر اس طرح پڑا ہے کہ اس .... کے کپڑے خون میں تر بتر ہیں۔ کوتوال اور تھانہ دار اسکے اظہار لکھ رہے تھے کہ اس کی حالت بگڑی اور اُس نے طیش میں آ کر کوتوال سے کہا۔

"دو سوتے آدمی پر حملہ کرنا بہادر کا کام نہیں، ہمت تھی تو میرے سامنے آ کر مقابلہ کیا ہوتا، چھری کا قریب قریب تمام حصہ میرے پیٹ میں گھسا اور رات تک خون بند نہیں ہوا مگر مجھے اپنی موت کی مطلق پرواہ نہیں قلق یہ ہے کہ اس وقت میری قوم کا کوئی بچہ تک موجود نہیں جس کو وصیت کرتا۔"

فیروز نے یہ کہہ کر اپنی بچی کو پاس بلایا اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا "میں دُنیا سے رخصت ہوتا ہوں اور تجھ کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ دعا کرتا ہوں کہ خدا تجھ کو ہندوستان کے مسلمانوں کے فریب سے محفوظ رکھے۔ افسوس ہے کہ بلوچ قوم کا کوئی متنفس اس واقعہ سے باخبر نہیں جو ان سیدوں کو کافی سزا دیتا۔ میں قدرت کے قانون اور فطرت نسوانی کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ دنیا بہت جلد بے گناہ باپ کے قتل کو تیرے دل سے محو کر دے گی مگر تجھ کو وصیت کرتا ہوں کہ لباسِ عروسی تیرے جسم پر اس وقت تک حرام ہے جب تک تو میرے خون کا بدلہ احسن سے نہ لے لے۔"

یہ کہہ کر فیروز نے کلمہ طیبہ پڑھا۔ اور دنیا سے رخصت ہوا۔

۱۳

باپ کے دفن کے بعد فیروزہ باغ سے اُٹھ کر برابر کے گاؤں میں چلی گئی۔ آٹھ دن میں گاڑھے کا تھان تیار کرتی اور ہر منگل کو شام کے وقت شہر میں جا کر بیچ آتی۔ شہر اور گاؤں میں دریا حائل تھا یہ سات کا نوٹ تھا وہ پیسہ دے کر ناؤ میں بیٹھتی اور پار چلی جاتی اور دو پیسہ دے کر لوٹ آتی۔

احسن کی حالت روز بروز ردی ہو رہی تھی اُس نے اس کے عزیزوں اور مصاحبوں نے ہر ممکن کوشش سے کام لیا، ہر قسم کا لالچ دیا، مگر سب بے سُود تھا اب احسن کے واسطے صرف یہ ایک صورت تھی کہ وہ تڑپ تڑپ کر ہفتہ گذارے اور منگل کو کنارے پر آ جائے۔ کچھ روز اسی طرح گذرے بیتاب بڑی مصیبت یہ ہوئی کہ فیروزہ نے اس سے بات چیت ترک کر دی وہ ہر چند سب کچھ کہتا مگر وہ جواب نہ دیتی مجبوراً احسن نے ایک ناؤ تیار کی اور اس اُمید پہ ہر منگل کو دریا پہ موجود رہا کہ شاید وہ وقت بھی آ جائے جب فیروزہ کو پار پہنچانے میں میری خدمات کام آئیں لیکن یہ موقع بھی کبھی نہ ہوئی۔

۱۴

بارش نے شاہدرے کے قرب وجوار میں قیامت بپا کر رکھی تھی جمنا پوری طغیانی پر تھی اور بیسیوں گاؤں اس کی بھینٹ چڑھ چکے تھے ریلوے لائن اکثر جگہ سے بیکار ہو گئی۔ پل نصف سے زیادہ پانی میں ڈوب گیا اور ہر طرف سے الامان والحفیظ کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں خدا معلوم کتنے آدمی اور جانور دریا میں بہہ گئے۔ گائیں بھینسیں بھیڑ بکریاں تنکوں کی طرح بہاؤ میں جا رہی تھیں۔ ستمبر کی چھٹی تاریخ کی شام کو وہ بارش ہو رہی تھی جس کے خوف سے ہزارہا بندگان خدا بھرے گھر چھوڑ چھاڑ جنگلوں میں بھاگ گئے جمنا کے دونوں پاٹ ایک ہو گئے تھے اور پانی پل کے اوپر بہہ رہا تھا۔

بادل گرج رہا تھا بجلی چمک رہی تھی اور بارش لمحہ بہ لمحہ تیز ہو رہی تھی۔ احسن ایک درخت کے نیچے خاموش بیٹھا چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ کہ اس کے کان میں یہ آواز پہنچی:-

"احسن کیا تم مجھ کو پار پہنچا سکتے ہو؟"

اس آواز نے احسن کو چونکا دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو فیروزہ بناؤ سنگار کئے سامنے کھڑی ہے۔ یہ پہلا روز تھا کہ احسن نے فیروزہ کو کار استہ دیکھا وہ قریب پہنچا اور کہا۔

"مجھے تعمیل میں عذر نہیں، ناؤ موجود ہے مگر اس وقت دریا میں قدم رکھنا موت کے منہ میں جانا ہے!"

"وہ میں بھی جانتی ہوں مگر میں نے تم ان کا وعدہ آج ہی کا کیا ہے۔"

احسن:- ایک تم ان کے بدلے ہزار اور لاکھ تھانوں کی قیمت قربان کرنے کو حاضر ہوں مگر اس وقت پار جانا مصلحت نہیں۔

فیروزہ:- مجھے آپ سے قیمت لینے کا کوئی حق نہیں میں وعدہ کر چکی ہوں اور پورا کروں گی۔

احسن:- اگر یہ حالت ہے تو میں قربان ہونے کو اور تعمیل کرنے کو تیار ہوں۔

فیروزہ:- "بسم اللہ"

فیروزہ ناؤ میں بیٹھ گئی۔ احسن نے رستے کھولے۔ ناؤ کھینی شروع کی۔ پانی غضب ڈھا رہا تھا آناً فاناً ناؤ بھنور میں پہنچ کر ہچکولے کھانے لگی۔ احسن کے ہاتھ سے بلیاں چھوٹ گئیں وہ فیروزہ کے قریب آیا اور کہا "بس ناؤ ڈوب رہی ہے" فیروزہ مسکرائی۔ اس نے گلاب کا ایک پھول احسن کے سر پر رکھا "یہ وہ رسم ہے جو بلوچوں میں نکاح کے وقت دلہن کو ادا کرنی پڑتی ہے۔ تمہاری محبت کے جواب میں میں نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اب موت سر پر ہے۔ میں نے باپ کی وصیت بھی پوری کر دی۔ احسن اس بھنور میں ہمارا نکاح ہے!"

یہ کہہ کر فیروزہ نے اپنے ہاتھ احسن کے گلے میں ڈال دیئے اور ناؤ جمنا میں ڈوب گئی۔

---

(۳)

ترجموں کا دور

مولانا ظفر علی خان

تولہ بھر ریڈیم

کچھ دن ہوئے لندن کے چند بے فکروں نے ایک جگہ جمع ہو کر یہ سوچنا شروع کیا کہ تفریح و دلچسپی کا ایسا کون سا مشغلہ ہو سکتا ہے کہ وقت بھی بڑے مزے میں گذرے اور گرہ سے بھی خرچ نہ ہو۔ یہ لوگ انگریزی سوسائٹی کا خلاصہ اور انگلستان کی شرافت کا عطر تھے۔ ان میں سے کوئی ڈیوک تھا کوئی بیرن۔ کوئی پارلیمنٹ کا ممبر تھا اور کوئی فوجی افسر۔ سب کے سب مجرد تھے اور اس آزادی کے صدقے ہیں جس کے لحاظ سے انگلستان کے مرد و عورت زبان زد خاص و عام ہیں۔ سبھی طرح کے گلچھرے اڑا چکے تھے۔ کوئی ایسی ہوس نہ تھی جو انہوں نے پوری نہ کی ہو اور کوئی ایسا پاپڑ نہ تھا جو انہوں نے بیلا نہ ہو۔ زندگی کا لطف خاص طور پر حاصل کرنے کے لئے اب انہیں کسی ایسے مشغلہ کی ضرورت تھی جو بڑا ہی انوکھا ہو۔

سوچتے سوچتے آخر ایک کی طبیعت لڑ گئی اور اس نے یہ تجویز پیش کی کہ ہم لوگ ایک انجمن نقب زنی قائم کریں جس کی رکنیت کی فیس یہ ہو کہ ہر رکن سال میں ایک دفعہ لندن کا کوئی گھر جسے صدر انجمن صاحب تجویز کریں لپھوڑا کرے۔ اس تجویز پر سب نے بہ اشتیاق تمام صاد کیا اور ایک باقاعدہ انجمن نقب زنی قائم ہو گئی جس کے ارکان کی تعداد ایک محرکِ تحریک کی بنا پر الف لیلیٰ کے مشہور علی بابا اور چالیس چوروں والے قصّہ کی مناسبت سے چالیس تھی۔

ایک دن جب بعض ضروری امور پر غور کرنے کے لئے اس انجمن کا باقاعدہ اجلاس ہوا تو صدر انجمن نے پہلے تو بلا کسی تمہید کے حاضرین سے یہ کہا کہ ریڈیم جیسی نایاب چیز بہ مقدار کثیر موجود ہو گئی۔ اور اس کے بعد جیب میں سے ایک اخبار نکال کر حسب ذیل عبارت پڑھنی شروع کی:

"کچھ عرصہ ہوا کہ آدھ سیر ریڈیم کی قیمت اٹھ لاکھ چھیانوے ہزار پاؤنڈ یا ایک کروڑ چوبیس لاکھ چالیس ہزار روپیہ تو بتائی گئی تھی۔ جن جن لوگوں کے پاس اس نادر الوجود عنصر کی کوئی مقدار بہ غرضِ فروخت موجود ہو انہیں یہ مشورہ دیتے ہیں کہ جہاں تک جلد ممکن ہو اسے علیحدہ کر ڈالیں کیونکہ پروفیسر بلتھ نے اس عنصر کے بمقدار کثیر بہم پہنچانے کا ایک حیرت انگیز طریقہ دریافت کر لیا ہے۔ چنانچہ اس طریقہ کے مطابق پروفیسر موصوف نے تولہ بھر ریڈیم جس کی قیمت بازار کے بھاؤ سے تین لاکھ چونسٹھ ہزار روپے ہوتی ہے، تیار کر لی ہے اور چند خاص خاص ماہرین علم کیمیا نے پروفیسر بلتھ کے کارخانہ میں جا کر اس کی اصلیت کے متعلق اپنی تشفی کر لی ہے۔

"معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانہ جلد آنے والا ہے جب ریڈیم نظری دنیا سے عملی دنیا میں آ جائے گی اور اس کا شمار قدرت کی بڑی قوتوں میں ہونے لگے گا چونکہ اس عجیب و غریب عنصر کے چھوٹے سے ٹکڑے میں اتنی تاثیر موجود ہے کہ ایک متوسط الحال شخص کے آتش دان کو دو ہزار سال تک کوئلہ کی احتیاج سے مستغنی رکھ سکے۔ لہٰذا ظاہر ہے شہروں میں دھوئیں کی وجہ سے آج کل جو تکلیف ہوتی ہے وہ بالکل جاتی رہے گی۔ دخانی جہازوں کو کوئلہ کی کانوں کے بیکار ہونے کی وجہ سے کوئی دس لاکھ مزدوروں کو معاش کی کوئی دوسری شکل نکالنی پڑے گی۔"

ایک ارکن: ہوگا تو بڑے مزے کا زمانہ۔

دوسرا رکن: لیکن اسے ہماری آج کی کارروائی سے کیا تعلق؟

صدر انجمن: مجھے بات پوری تو کر لینے دی ہوتی۔ اس کے بعد ٹوکا ہوتا۔

دوسرا رکن: ارشاد ہو۔ ہم ہمہ تن گوش ہیں۔

صدر انجمن: ہمارے سیکرٹری صاحب نے جو سالانہ رپورٹ پیش کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میجر جیرلڈ براؤن کا چندہ بابت سال گذشتہ ابھی تک وصول نہیں ہوا۔ لہٰذا میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ میجر براؤن یہ تولہ بھر ریڈیم مالیتی تین لاکھ چونسٹھ ہزار روپیہ پروفیسر بلیتھ کے مکان سے لا کر انجمن کے اجلاس آئندہ میں پیش کریں۔ اگرچہ ساتھ ہی میں یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ اس معزز انجمن کی رکنیت کی شان اس سے بہت اونچی ہے کہ تین لاکھ چونسٹھ ہزار روپیہ جیسی ہیچ میرز رقم اس کے برقرار رکھنے کا کافی معاوضہ ہو سکے۔

اس فیصلہ کی تعمیل کے خیال سے گذشتہ ماہ اپریل کی پہلی تاریخ کو آدھی رات کے وقت میجر جیرلڈ براؤن پروفیسر بلیتھ کے مکان واقع لڈگیٹ سرکس کے پچھواڑے کی دیوار پھاند کر مکان کے اندر داخل ہو گئے، میجر صاحب کا طرزِ عمل وہی تھا جو ایک معمولی چور کا ہوتا ہے۔ آپ کھڑکی توڑ کر کمرہ میں گھسے، یہ کمرہ پروفیسر کا معمل یا دارالتجربہ تھا۔ چونکہ چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ لہٰذا میجر براؤن نے جیب میں سے ایک چھوٹی سی برقی لالٹین نکال کر روشنی کی اور ہر طرف نگاہ ڈالی۔ سامنے ایک دروازہ نظر آیا۔ ایک چٹخنی کھول کر وہ آگے بڑھا۔ کچھ دور جا کر داہنے ہاتھ کی طرف ایک دروازہ اور دیکھا جس کے پٹ بالکل کھلے تھے۔ دروازہ میں سے اسے جو کچھ نظر آیا وہ اسے محوِ حیرت و استعجاب کرنے کے لئے کافی تھا۔ کمرہ کے وسط میں میز پر ایک چمکدار چیز رکھی ہوئی تھی جو مقابل والی دیوار پر کوئی ایک فٹ مربع جگہ اس چمکدار چیز کے عکس کی وجہ سے نورانی ہو رہی تھی۔ یہ ریڈیم تھا۔ میجر کو تعجب ہوا کہ پروفیسر نے ایسی بیش بہا چیز کو کیوں اس طرح سے کھلا چھوڑ دیا۔ یہ ظاہر تھا کہ پروفیسر نے سائنس دانوں کے دکھانے کے لئے اسے یہاں رکھا تھا لیکن تین لاکھ چونسٹھ ہزار کا مال کھلے کمرہ میں میز پر رکھ دینا ایسی لغویت تھی جس کا ارتکاب پروفیسر کے سوا کوئی دوسرا کرتا تو اول درجہ کا پاگل سمجھا جاتا۔ لیکن یہ ایسا وقت نہ تھا کہ میجر براؤن پروفیسر کے قوائے ذہنی کی صحت و عدم صحت پر کھڑا ہوا غور کیا کرتا۔ چنانچہ وہ میز کی طرف بڑھا لیکن دہلیز کے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ دروازے کے پٹ بڑے زور سے بند ہو گئے۔ میجر حیران ہوا کہ دروازہ کیسے بند ہوا۔ کیونکہ نہ ہوا تھی نہ کوئی شخص موجود تھا جس نے دروازہ بند کیا ہو۔ کچھ دیر تک محوِ حیرت رہنے کے بعد وہ دروازہ کی طرف بڑھا کہ پٹ پھر کھول دے اور گھنڈی گھما کر کھینچا لیکن معلوم ہوا کہ دروازہ مقفل ہے۔ اس نے گھنڈی کو ہر طرف گھمانا دبانا شروع کیا مگر بے سود۔ چٹخنیوں کو ٹٹولا کہ بند ہونے کے دھماکے سے نیچے والی چٹخنی تو کہیں گر نہ گئی ہو لیکن چٹخنی جوں کی توں چڑھی ہوئی تھی۔ اس نے دروازہ کو پھر اچھی طرح سے دیکھنا شروع کیا۔ سوا اس گھنڈی کے جسے وہ ہر طرف گھما چکا تھا اور اس چٹخنی کے جسے وہ دیکھ چکا تھا کہ چڑھی ہوئی ہے اور کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے دروازہ بند ہو سکتا۔ نہ کنجی کا سوراخ تھا نہ حلقے تھے جن سے معلوم ہو کہ دروازہ مقفل ہے۔ میجر نے خیال کیا کہ ضرور ہے کہ کمرہ سے نکلنے کا کوئی دوسرا رستہ ہو۔ اس خیال سے اس نے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ مگر کوئی کھڑکی یا دروازہ یا روشندان نظر نہ آیا۔

تب تو میجر بہت ہی سٹپٹایا اور دل میں کہنے لگا "بُرے پھنسے! خدا ہی ہے جو یہاں سے رہائی دے اور یہ سب میری بے وقوفی ہے۔ مجھے چاہئے تھا کہ دروازے کی طرف سے اطمینان کر لیتا تب اندر گھستا۔ افسوس کہ مجھ جیسا آدمی جو شاہی گارد کا میجر ہو اور پارلیمنٹ کا ممبر ہو وہ معمولی چوروں کی طرح

اقدامِ نقب زنی میں چالان کیا جائے۔

اس خیال سے اس کا دماغ چکرانے لگا اور بدن میں رعشہ پڑ گیا۔ اس پر اسے اور غصہ آیا اور دل میں سوچنے لگا کہ میں اس سے زیادہ خطروں میں مبتلا ہو چکا ہوں لیکن کبھی مجھے ایسی گھبراہٹ نہ ہوئی جیسی اس وقت ہے۔ وہ انہی خیالات میں مستغرق تھا کہ دفعتہً گھنٹی بجی جسے سنتے ہی وہ چونک پڑا۔ پیچھے پھر کے دیکھا تو کمرہ کے کونے میں ٹیلیفون لگا ہوا پایا جس کی گھنٹی بج رہی تھی اس سے اس کے رہے سہے اوسان اور جاتے رہے۔ جب گھنٹی بجنی موقوف ہی نہ ہوئی تو مجبوراً ٹیلیفون کے پاس گیا اور کان لگا کر سننے لگا۔ آواز آئی "کون ہو؟" میجر نے کچھ جواب نہ دیا۔ دوبارہ آواز آئی "کون ہے؟" میجر پھر بھی چپ ہی رہا۔

آواز: اگر جواب نہ دو گے تو ابھی پولیس کے سپاہی کو بلا کر تمہیں گرفتار کرا دیا جائے گا۔

میجر: (یہ دیکھ کر کہ اگر جواب نہ دیا تو پولیس کا سپاہی آ کر حقیقت میں ہتھکڑی ڈال دے گا) کہو کیا کہتے ہو؟

آواز: خوب! کہو کیسے ہو؟

میجر: بڑے مزے میں ہوں۔ کیا آپ ڈاکٹر ہیں؟

آواز: تمہارا نام کیا ہے؟

میجر: (یہ خیال کر کے کہ صحیح نام بتانا ٹھیک نہیں) رچرڈ مارکھم۔

آواز: آپ کی عمر کتنی ہے؟

میجر: (یہ یقین کر کے کہ یہ ضرور کوئی بیمہ کمپنی کا ڈاکٹر ہے جو اسے پروفیسر بلتھ کا نائب سمجھ کر یہ باتیں پوچھ رہا ہے) میری عمر تو جو کچھ ہے وہ ہے مگر یہ تو فرمائیے کہ یہ آدھی رات کے وقت آپ کو اپنی معلومات میں اس اضافہ کی کیا ضرورت ہے؟

آواز: (میجر کے سوال پر مطلق التفات نہ کر کے) آپ کی عمر؟ جلدی کیجئے۔

میجر: پینتیس سال۔ (اپنے دل میں) ایسے آڑے وقت میں سچ کے سوا چارہ نہیں۔

آواز: رچرڈ مارکھم۔ عمر پینتیس سال۔ پیشہ؟

میجر: سپہ گری۔

آواز: بہت ٹھیک۔ رچرڈ مارکھم۔ عمر پینتیس سال۔ پیشہ سپہ گری۔ ابھی تک ملازمت میں ہیں یا پنشن ملتی ہے؟

میجر: پنشن پاتا ہوں۔

آواز: اچھا تو سنئے۔ رچرڈ مارکھم عمر پینتیس سال۔ پیشہ سپہ گری۔ حال پنشن یاب مگر آپ کس درجہ بے وقوف ہیں کہ ریڈیم کے ایک ٹکڑے کی خاطر اپنے پیشہ کو دھبہ لگاتے ہیں اور پنشن سے ہاتھ دھوتے ہیں۔

میجر: (شرمندہ اور متحیر ہو کر) کیا کہا؟

آواز: میں نے یہ عرض کیا کہ ریڈیم کے ایک ٹکڑے کی خاطر آپ اپنی پنشن کے پیچھے کیوں پڑے ہیں؟

میجر: میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم بک کیا رہے ہو؟

آواز: بہت اچھا۔ میں کوشش کروں گا کہ زیادہ وضاحت سے کام لوں۔ جناب والا آپ چور ہیں۔ آپ کا خیال شریف ہیں؟ آپ ریڈیم چرانے گئے تھے لیکن پروفیسر بلتھ کے مکان میں بند ہو گئے۔

میجر: (گھبرا کر) ایسے تو ہے کون؟

آواز: پروفیسر بلتھ!

میجر: لعنت بر کارِ شیطاں۔

پروفیسر: نہیں جناب بر کارِ پروفیسر کہئے۔

میجر: آپ کہاں سے بات کر رہے ہیں؟

پروفیسر: میں برآمدہ کے پہلو والے کمرہ میں ہوں۔ میں جس جگہ کھڑا ہوں وہاں سے آپ کے کمرہ کا دروازہ نظر آتا ہے اور یہ بھی کہ میرے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول ہے۔

میجر: آپ چاہتے کیا ہیں؟

پروفیسر: میری منشا کا انحصار آپ کے طرزِ عمل پر ہے۔

میجر: وہ کیسے؟

پروفیسر: وہ ایسے کہ آپ چاہیں تو آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے اور چاہیں تو مجھے سائنس کے اکتشافات میں مدد دیں۔ کہئے کیا صلاح ہے؟

میجر: یہ سائنس کے اکتشافات کیا بلا ہوتے ہیں؟

پروفیسر: آپ ایک بارہ فٹ مربع کمرہ میں مقید ہیں جس میں ایک تولہ بھر ریڈیم رکھا ہوا ہے۔

میجر: اچھا پھر!

پروفیسر: پھر یہ کہ آپ دنیا میں پہلے آدمی ہیں جو اتنی قلیل الحجم جگہ میں اتنے کثیر المقدار ریڈیم کے ساتھ بند ہوئے اس لئے آپ کے محسوسات سائنٹیفک دنیا میں بہت گراں بہا سمجھے جائیں گے اس لئے اگر آپ اس وقت تک جب تک آپ کے ہوش و حواس بجا رہیں اپنے محسوسات سے مجھے بذریعہ ٹیلیفون اطلاع دیتے رہنے کا وعدہ کریں تو خیر ورنہ ابھی پولیس کو بلاتا ہوں۔ ان دونوں میں سے آپ کون سی بات پسند کرتے ہیں؟

میجر: آپ کی توجہات کہ آپ نے یہ معاملہ میری رائے پر چھوڑا۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے محسوسات بیان کر کے آپ کے علم میں اضافہ کروں۔

پروفیسر: جناب رچرڈ مارکھم صاحب میں آپ کا نہایت ہی شکر گذار ہوں لیکن آپ کو پہلے سے متنبہ کئے دیتا ہوں کہ آپ کو جسمانی تکلیف بہت کچھ برداشت کرنی پڑے گی۔ میرا تجربہ کئی گھنٹے سے پہلے ختم نہ ہوگا اور چاہے آپ کو کتنی ہی تکلیف محسوس کیوں نہ ہو نا ممکن ہے کہ دورانِ تجربہ میں کمرہ کھول کر آپ کو نکل جانے دوں۔ کہئے آپ راضی ہیں یا پولیس .....

میجر: (جلدی سے بات کاٹ کر) میں تو کہہ چکا کہ پولیس کے مقابلہ میں مجھے آپ کی سائنس زیادہ عزیز ہے۔

پروفیسر: نہایت مہربانی۔ ہاں یہ تو فرمایئے آپ کا قلب کیسا ہے؟

میجر: نہایت زبردست۔ گھنٹہ کی طرح آواز دیتا ہے۔

پروفیسر: نہایت ہی خوب۔ اس قسم کے تجربہ کے لئے دل چاہئے بھی ایسا ہی۔

میجر: (دل میں) یا اللہ! بُرے پھنسے۔ (پروفیسر سے مخاطب ہو کر) آپ کو مجھ سے کچھ اور پوچھنا ہے؟

پروفیسر: بہت کچھ۔ گھڑی ہے؟

میجر: ہاں ہے۔

پروفیسر: آپ صحیح نبض بتا سکتے ہیں؟

میجر: بے شک!

پروفیسر: سبحان اللہ! آپ تو موتیوں میں تولنے کے قابل ہیں۔ میں نہایت ہی ممنون ہوں کہ آپ نے آدھی رات کو غریب خانہ میں قدم رنجہ فرمایا۔ اس کمرہ میں آپ کو بند ہوئے ۱۵ منٹ ۳۰ سیکنڈ ہو چکے ہیں۔ اب بتایئے آپ کی نبض کی رفتار کیا ہے؟

میجر: نہتر!

پروفیسر: نہایت مہربانی۔ کیا آپ مقیاس الحرارت کا استعمال جانتے ہیں؟

میجر: بیشک!

پروفیسر: بہت خوب ٹیلیفون کے ڈھکنے پر کاغذ کے پاس ایک نلکی رکھی ہے اس میں سے مقیاس الحرارت نکال لیجئے اور نہایت احتیاط سے بتایئے کہ پارہ کس درجہ پر ہے؟

میجر: ستانوے۔

پروفیسر: نہایت مہربانی۔ بہت بہت شکریہ مجھے خیال نہیں تھا کہ فوج میں ایسے سمجھدار لوگ بھی ہوتے ہیں۔ اخبار بھی لوگوں کو کس قدر دھوکا دیتے ہیں کہ اس کے خلاف ظاہر کرتے ہیں۔ اب آپ مقیاس الحرارت کو دو منٹ تک اپنی زبان کے نیچے رکھئے اور اس کے بعد مجھے بتایئے کہ پارہ کتنے درجہ اوپر چڑھا۔

میجر: دو منٹ کے بعد ننانوے۔

پروفیسر: بہت بہت مہربانی۔ آپ رسالہ میں تھے یا پیدل میں؟

میجر: رسالہ میں۔

پروفیسر: رسالہ میں، بہت بہت مہربانی۔ آپ کی شادی ہو چکی ہے؟

میجر: نہیں۔

پروفیسر: تب تو کیا ہی کہنے ہیں۔ آپ کو دردِ سر کی شکایت تو نہیں؟

میجر: ابھی تک تو نہ تھی لیکن آپ کے مسلسل سوالات کی عنایت سے تھوڑی دیر میں ضرور ہو جائے گی۔

پروفیسر: آپ مہربانی فرما کر صرف علامات ہی بتائے جایئے تشخیص کا کام اس خاکسار کے سپرد کر دیجئے۔ آپ کے قلب کی حرکت کی کیا کیفیت ہے؟

میجر: خوب زور سے دھڑک رہا ہے۔

پروفیسر: ابھی کیا آگے چل کر دیکھئے گا کہ کیسا دھڑکتا ہے تنفس کیسا ہے؟

میجر: دم گھٹا جاتا ہے۔ اگر آپ مجھے تازہ ہوا کھانے کے لئے ایک منٹ کو باہر جانے دیں تو بڑی عنایت ہو گی۔

پروفیسر: نہ حضرت تازہ ہوا کو ابھی اپنے تنفس سے زیر بار فرمانے کا خیال دل میں نہ لایئے۔ تجربہ ختم ہونے سے پہلے آپ کا باہر تشریف لانا ناممکنات میں سے ہے۔ فوج والوں کے ذی ہوش ہونے کے متعلق جو رائے میں نے قائم کی تھی عجب نہیں کہ آگے چل کر وہ غلط ثابت ہو۔ کوئی عقلمند شخص دوران تجربہ میں اس قسم کی خواہش کا اظہار نہیں کر سکتا۔ اچھا بالفعل کچھ دیر کے لئے میں اپنے سوالات ملتوی کرتا ہوں۔ تھوڑی دیر میں میں پھر گھنٹی بجاؤں گا۔ اگر آپ کو مجھ سے کچھ ارشاد کرنا ہو تو میں یہیں حاضر ہوں۔ اس عرصہ میں آپ تھوڑی سی چہل قدمی کر کے تازہ دم ہو جائیں گے۔

میجر ٹیلیفون کے پاس سے ہٹ گیا۔ کمرہ کی ہوا بہت ہلکی ہو گئی تھی۔ ریڈیم کی شعاعیں زیادہ تیز اور چمکدار ہو چلی تھیں۔ جب وہ اس کی طرف بڑھا تو اسے ایک فوری بے چینی محسوس ہوئی۔ جس طرح دہکتی ہوئی آگ کے سامنے جسم کو برہنہ کرنے سے جلن معلوم ہوتی ہے اسی طرح اسے ریڈیم کی طرف بڑھتے وقت ایسا معلوم ہوا کہ اس کے جسم کے سامنے کا حصہ آگ میں جھلس گیا ہے۔ سانس بھی رک رک کر آنے لگی۔ دردِ سر بھی معلوم ہونے لگا۔ وہ فوراً پیچھے ہٹ کر دیوار کے ایک کونے میں جا کھڑا ہوا۔ ریڈیم سے علیحدہ جا کھڑے ہونے سے ان علامتوں کی سختی کم ہو گئی۔ اتنے میں گھنٹی پھر بجی اور پروفیسر کی آواز آئی،

"مناسب ہو گا کہ میں آپ کو متنبہ کر دوں کہ اگر آپ ریڈیم کو ضائع کرنے کی کوشش کریں گے تو اس سے کچھ فائدہ نہ ہو گا۔ اگر آپ نے ریڈیم

کے ٹکڑے کو توڑ دیا یا پگھلا ڈالا تو اور بھی مضر ہوگا۔ کیونکہ اس حالت میں اس کے ذرات منتشر ہو کر آپ کے جسم میں نفوذ کر جائیں گے۔ اس وقت جو کیفیت آپ کو محسوس ہوگی وہ نہایت ہی دلچسپ ہوگی۔ بشرطیکہ آپ اس کا تجربہ کرنا چاہیں لیکن نتیجہ کا ذمہ دار میں نہ ہوں گا۔ بہرحال اتنا میں آپ کو سمجھائے دیتا ہوں کہ آپ اس نئے زبردست عنصرے اس حالت میں کسی طرح بچ نہیں سکتے جبکہ آپ اس کے ساتھ ایک کمرہ میں بند ہیں۔ خصوصاً جبکہ وہ کمرہ صرف بارہ فیٹ مربع ہے۔"

بیچارے میجر نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ ٹیلیفون کے تار کے دوسرے سرے پر پروفیسر رابرٹ بلیقہ فیلو آف دی رائل سوسائٹی، ڈاکٹر آف سائنس کھڑے تھے جن کی تحقیقات و انکشافات نے علمی دنیا میں ہلچل ڈال دی تھی۔ عام طور پر پروفیسر نہایت متین اور سنجیدہ شخص تھا اور اپنے اندرونی جذبات کو کبھی شکل سے ظاہر نہ ہونے دیتا تھا۔ اس کے دوست کہا کرتے تھے کہ پروفیسر کے چہرہ پر سوائے اس حالت کے جبکہ وہ کوئی تجربہ کامیابی کے ساتھ کر رہا ہو خوشی کے آثار اور کبھی نہیں پائے جاتے۔ یہ قول بالکل صحیح تھا کیونکہ اس وقت وہ رچرڈ مارکھم سابق ملازم رسالہ شاہی و حال مقید کمرہ، پروفیسر موصوف کے بیان کردہ تجربوں کو (جسے انہوں نے قلم بند کر لیا تھا) پڑھ پڑھ کر باغ باغ ہوئے جاتے تھے۔ ہنستے تھے اور خوش ہوتے تھے کہ سائنس کی دنیا میں کس قدر اضافہ ہوا، اور جوشِ مسرت میں پھر پڑھتے تھے:

"نبض کی رفتار ۳ء حرارت غریزی ۹۹۔ قلب کی حرکت بے قاعدہ۔ نہایت ہی عمدہ نتائج ہیں: سانس رک رک کر آتی ہے۔ یہ بھی قرین قیاس ہے۔ کیونکہ اسے مقید ہوئے ۱۴ منٹ گذر چکے۔ جسم مضبوط ہے اسی لئے ابھی تک کچھ زیادہ محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن اب تھوڑی دیر میں دیکھنا کیا ہوتا ہے جناب رچرڈ مارکھم۔ آج تو آپ بے طرح پھنسے۔ اگر آپ مجرم نہ ہوتے تو میں آپ کو اس بلا میں پھنساتے ہوئے جھجکتا لیکن بحالت موجودہ تو آپ کو اس سائنس کی راہ میں ضرور ہی یہ مصیبت جھیلنی چاہئے۔ اگر آج کا تجربہ آپ کے ذہن عالی سے اتر نہ گیا تو عمر بھر پھر چوری نہ کیجئے گا۔

"حقیقت میں یہ بات عجائبات قدرت سے ہے کہ عقل ہمیشہ مادہ پر غالب آتی ہے۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ رچرڈ مارکھم جیسا قوی ہیکل اور زبردست آدمی مجھ جیسے ضعیف و نحیف شخص کے ایک اشارہ سے برابر والے کمرہ میں اس طرح بند ہو جائے جس طرح چوہا چوہے دان میں بند ہو جاتا ہے میں نے اپنی تحقیقات کا اشتہار اخباروں میں دے کر اپنی کمال دانشمندی کا ثبوت دیا۔ آج کل جتنے جرائم پیشہ لوگ ہیں سب اخبار پڑھتے ہیں۔ میرا یہ خیال صحیح تھا کہ اس اشتہار پر ضرور کسی چور کی نظر پڑے گی۔ اس کے بعد میں نے ریڈیم کو کمرہ کے وسط میں رکھ دیا اور مقابل والی دیوار پر سلفائڈ آف زنک مل دیا تاکہ چور کو ریڈیم ڈھونڈنے میں ذرا بھی وقت نہ ہو۔ ایک ایسی دہلیز کا تیار کرنا جس پر سے گذرتے ہی دروازہ کھٹ سے بند ہو جائے میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بس اب اس کا انتظار تھا کہ چور آئے اور جال میں پھنسے، جو ہو کر رہا۔"

اس وقت گھنٹی بجی۔ پروفیسر فوراً آرام کرسی پر سے اٹھا اور ٹیلیفون کے پاس جا کر کہنے لگا:

"رچرڈ مارکھم صاحب! کیا آپ کی بے چینی بڑھنے لگی؟ فرمائیے کیا ارشاد ہے؟"

میجر: کیا تم خداوند یسوع مسیح کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہو؟

پروفیسر: کہتے تو ایسا ہی ہیں۔ مگر اس سوال سے آپ کا مطلب؟

میجر: جو شخص مسیح پر ایمان رکھتا ہو اور بہشت میں جانے کا آرزومند ہو کیا وہ ایسی حرکات کا مرتکب ہو سکتا ہے کہ مجھے اس کمرہ میں بند کر کے دوزخ کی آگ کا ایک ٹکڑا میرے سامنے رکھ دے؟ کیا تم نہیں جانتے کہ میں اس آگ میں کباب ہوا جا رہا ہوں اس کا زہر میرے جسم میں پھیل رہا ہے۔ اس کے انجرے میرا دم گھونٹ رہے ہیں۔ اس کا اثر میرے دماغ پر چھایا جا رہا ہے۔ اگر تم عیسائی ہو تو کمرہ کھول دو اور مجھے باہر نکلنے دو۔

پروفیسر: یہ آپ اپنے دماغ کو بے فائدہ تکلیف کیوں دے رہے ہیں۔ آپ کا کوئی حق نہیں ہے کہ تجربہ ختم ہونے سے پہلے باہر نکلنے کا نام لیں چونکہ آپ چور ہیں اس لئے آپ کو قرار واقعی سزا بھگتنی چاہئے، اور آپ تو فوج میں ملازم رہ چکے ہیں۔ بیسیوں لڑائیاں لڑی ہوں گی۔ خون کے نالے بہتے دیکھے ہوں

کے مینہ برستے دیکھے ہوں گے۔ تھوڑی دیر کے لئے سمجھ لیجئے کہ وہی ہنگامہ برپا ہے۔ آپ نہیں سمجھ سکتے کہ آپ کی تھوڑی دیر کی تکلیف سے بنی نوعِ انسان کو کس قدر فائدہ پہنچے گا۔ میں آپ کی اس تکلیف کا حال نمک مرچ لگا کر برٹش میڈیکل جرنل میں شائع کر دوں گا اور مجھے یقین کامل ہے کہ آپ کے خویش واقارب جب اسے پڑھیں گے تو آپ کی ذات پر فخر کریں گے۔

میجر: میں خویش واقارب سب کو پانی دے چکا ہوں اور اگر کوئی ہوتا بھی تو تیری اس بکواس کو نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ دروازہ کھولتا ہے تو کھول نہیں تو میں کوئی ایسی بات کر گذروں گا کہ تو عمر بھر پچھتائے گا۔

پروفیسر: حضرت اس کی طرف سے اطمینان رکھئے۔ کمرہ میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کی طرف سے خدشہ ہو۔ ریڈیم ہے سو اس کے توڑنے سے آپ کی جان پر ہی بن جائے گی۔ رہا ٹیلیفون اس کے ضائع کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بیرونی دنیا سے جو رہا سہا تعلق آپ کا ہے وہ بھی منقطع ہو جائے گا۔ آپ ہمت کیوں ہارے جاتے ہیں۔ کلکتہ کے بلیک ہول والے واقعہ کا ذکر تو آپ نے پڑھا ہی ہوگا۔ ان بے چاروں کی حالت تو آپ سے زیادہ خراب تھی۔

میجر: تیری اور تیرے بلیک ہول کی ایسی تیسی۔ رہ تو جا ملعون، خبیث، پاجی۔ اگر جیتا بچا تو تیری ہڈیاں چُور چُور نہ کر دی ہوں تو نام نہیں۔

پروفیسر: جنابِ عالی! آپ اس قدر گرم کیوں ہوتے ہیں۔ مزاج درست رکھئے۔ کمرہ میں چہل قدمی کیجئے۔ انشاء اللہ طبیعت جلد بحال ہو جائے گی۔ ہاں تھرمامیٹر ذرا زبان کے نیچے رکھ کر مجھے بتائیے کہ پارہ کتنے درجہ پر ہے۔ سائنس کی کچھ نہ کچھ خدمت بجا لاتے رہئے۔ بیکار رہنا ٹھیک نہیں دول میں) بچا تو اب تو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا ہوگا۔ اگر پانچ سنٹی گرام کلورائڈ سے ۸ چوہے تین دن میں مرجاتے ہیں تو ایک تولہ ریڈیم برومائڈ ایک مضبوط آدمی کو کتنی دیر میں بیہوش کر سکے گا۔ ارلعبہ متناسبہ کا یہ سوال کئی دن سے حل طلب تھا اب وہ وقت آ گیا کہ کوئی شخص اس کو حل کرے اور وہ شخص پروفیسر بلقند ہوگا۔

کچھ دیر میں گھنٹی بجی اور آواز آئی:

میجر: حرارت غریزی ۱۰۲ نبض ۱۰۰۔ ابے او پاپی پروفیسر خدا کے لئے اب تو مجھ پر رحم کر۔ اگر مسیح کی خاطر نہیں تو کم از کم اس خیال سے چھوڑ دے کہ تو بھی بال بچوں والا ہے۔

پروفیسر: (میجر کی بات سنی اَن سُنی کر کے) نبض ۱۰۰ اغلباً ناہموار ہوگی۔

میجر: اپنی ہی کہے جاتا ہے میری ایک نہیں سنتا۔

پروفیسر: ریچرڈ مارکھم صاحب از براہِ خدا انصاف کیجئے کہ تبرقرزداد مجھ میں آپ میں ہوا تھا اس کے لحاظ سے آیا یہ مناسب ہے کہ ایسی حالت میں جبکہ تجربہ سے خاطر خواہ نتائج مستنبط ہو رہے ہیں آپ اپنی رہائی کے لئے زور دیں اور تجربہ کو آخر تک پہنچانے سے پہلو تہی کریں۔ اگر علمی دنیا پر احسان نہیں کرنا چاہتے تو کم از کم ایفائے عہد ہی کے خیال سے اپنی بات پر قائم رہئے۔ ہاں تو کیا آپ کی نبض ناہموار ہے؟

میجر: ہاں ہے تو لیکن میرے ہاتھ بھی کھجلا رہے ہیں کہ تیری چاند گنجی کر دیں۔ پروفیسر بلقند یاد رکھ اگر آج میرا دم نکل گیا تو خبیث بن کر تجھے اور تیرے گھر بھر کو پانچویں پشت تک کھا جاؤں گا۔ دیکھ لینا تو پاگل ہو کر بھونک بھونک کر کتے کی موت مرے گا۔

گالیاں سن کر پروفیسر ٹیلیفون سے ہٹ گیا اور اپنی مختصر سی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگا:

"ادنیٰ درجہ کے اراذل والفاظ کی خاص خصوصیت ہے کہ سخن کے وقت گندہ دہان ہو جاتے ہیں۔ مجھ پر خواہ کیسا ہی وقت کیوں نہ آ پڑے ممکن کیا کہ پایۂ تہذیب اور درجۂ ثقاہت سے گرا ہوا کوئی لفظ میری زبان سے ادا ہو۔ شرافت خاندانی اور اعلیٰ تعلیم کے یہی تو جوہر ہیں لیکن ریچرڈ مارکھم نے میرے استفسارات کا جواب جس تشفی بخش طریقہ سے دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم اچھی پائی ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ آخر میں

شرافتِ خاندانی بازی سے جاتی ہے۔"

یہ کہہ کر پروفیسر نے بڑے فخر سے پھر اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ کچھ دیر گزرنے کے بعد پروفیسر نے اس خیال سے کہ اس کے قیدی کی حالت ضرور متغیر ہونی شروع ہوئی ہوگی۔ گھنٹی بجائی لیکن کچھ جواب نہ ملا۔ پروفیسر نے دل میں کہا کہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ایک ۳۵ سال کا جوان سپاہی ایسی جلدی میں بے ہوش ہوگیا ہو۔ ضرور ہے کہ وہ کمرہ میں چہل قدمی کر رہا ہو۔ یہ سوچ کر اس نے پھر گھنٹی بجائی۔ اس دفعہ آہستہ سے جواب آیا جسے سُن کر پروفیسر نے کہا:

"جناب آپ نے جواب کیوں نہ دیا؟"

میجر: جیسے ہی تیرے باپ کا نوکر ہوں۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر تو میرے ہاتھ آجائے تو تجھے کن عذابوں سے ماروں۔ اب سُنتا ہے کہ نہیں؟ اس آگ کو دیکھتے دیکھتے میری آنکھیں پھوٹ چلیں۔ اب تو میری روح تحلیل ہوئی جاتی ہے۔ اب مجھے پولیس وولیس کی کوئی پروا نہیں۔ تیرا جی چاہے تجھے گرفتار کرا دے۔

پروفیسر: جنابِ عالی آپ کی گفتگو پایۂ ثقاہت اور درجۂ تہذیب سے گری ہوئی ہے مجھے آپ کے اس اشتعالِ طبع پر رہ رہ کر تعجب ہوتا ہے۔ آپ جیسا جوان اور بچوں کی طرح بگڑے اور بڈھوں کی طرح چڑے۔ اب تو میں پولیس کو بلانے سے رہا۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ یہ تجربہ ختم تک پہنچا دیں گے اور ایفائے وعدہ آپ کا فرض ہے۔ اب کہئے نبض کی رفتار کیا ہے؟

میجر: ایک سو بیس ہے۔ گھڑی کی طرح ٹک ٹک چل رہی ہے اور کوئی تعجب نہیں اگر آگے چل کر گھنٹے کی طرح ٹن ٹن کرنے لگے۔

پروفیسر: اہت نہ ہاریئے۔ آپ کے ہاتھوں کی رنگت نیلی ہے؟

میجر: نیلی تو نہیں سبز ہے۔

پروفیسر: سبز نا ممکن ہے۔

میجر: ممکن ہے کہ حقیقت میں نیلی ہو کیونکہ میری نگاہ خراب ہے رنگوں میں امتیاز نہیں کر سکتا۔

پروفیسر: سپاہی ہو کر آپ کی بصارت ایسی ضعیف ہو سخت تعجب ہے۔ شاید آپ کے ہاتھ میلے ہوں گے۔ اس وجہ سے نیلاہٹ میں ہریالی معلوم ہوتی ہوگی۔ آپ کی انگلیوں میں درد تو نہیں ہوتا؟

میجر: صرف ہاتھ بلکہ پاؤں کی انگلیوں میں ٹیسیں اٹھ رہی ہیں۔

پروفیسر: مرحبا اور حرارتِ عزیزی؟

میجر: ۱۰۴۔ ارے میں گرمی کے مارے بُھنتا جاتا ہوں۔ کیا تو نے مجھے ماہی ڈالنے کی ٹھانی ہے؟

پروفیسر: ابھی کل سوا گھنٹہ ہوا ہے اس پر یہ شور بپا کر دیا کہ الاماں ابھی تو تجربہ کی ابتدا ہی ہے۔ یہ کہہ کر پروفیسر برآمدہ میں ٹہلنے اور اپنے دل سے باتیں کرنے لگا:

"کاش ڈاکٹر بیہ نہای موجود ہوتا تو میں ثابت کر کے اس سے منوا لیتا کہ اس کی یہ رائے بالکل غلط ہے کہ ریڈیم کے اثر سے خون کے کارپسل آکسیجن سے خالی ہو کر بیہوشی کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ میں علمی دنیا کے سامنے اب یہ اصول پیش کر سکوں گا کہ ریڈیم کے فعل سے اعصاب متاثر ہوتے ہیں اور معمولی بخار ہو جاتا ہے۔ کثر بیہ بیوقوف ہے اپنی بات پہ اڑا رہا۔ اب اسے میری بات ماننی پڑے گی۔"

اتنے میں پھر گھنٹی بجی اور میجر کی آواز آئی:

"پروفیسر بلتہ اچھی بات نہیں اگر تو نے فوراً دروازہ نہ کھول دیا تو میں یہ ریڈیم نگل جاؤں گا اور تو تاپتا رہ جائے گا۔ ریڈیم نگل لینے سے میری حالت اس سے تو خراب ہونے سے رہی جیسی اس وقت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جس قدر جلد ہیراوم نگل جائے اچھا ہے۔"

پروفیسر: آپ احمق نہ بنئے جو تکلیف آپ کو اس وقت ہو رہی ہے، اس میں بہت زیادتی ہو جائے گی۔

میجر: کچھ پروا نہیں ہیں......

پروفیسر ٹیلیفون بند کر کے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا اور دل میں کہنے لگا:

"اس شخص نے تو مجھے مایوس کر دیا۔ خدا ہی ہے جو تجربہ حسبِ مراد ختم ہو۔ یہ شخص تو جلدی ہمت ہار گیا۔ آخر رذیل ہے نا۔ محض گوشت و خون کا تودہ کیا کر سکتا ہے جب تک شرافت و علم نہ ہو۔"

کچھ دیر کے بعد پروفیسر نے پھر گھنٹی بجائی لیکن اس دفعہ جو جوابات اسے ملے ان سے معلوم ہوا کہ قیدی کا دماغ چل گیا۔ جو آوازیں پروفیسر کے کان میں رُک رُک کر آئیں وہ یہ تھیں:

"بلتھ کے سر پہ بلی ناچی۔ او سوار گھوڑا دوڑائے کدھر جاتا ہے۔ برف گر رہی ہے۔ بلتھ پیاپا بنا ہوا سڑک پر لڑھک رہا ہے۔"

پروفیسر: مارکھم صاحب! خدا کے واسطے حواس بجا رکھئے۔ مجھے ابھی بہت دیر تک تجربہ کرنا ہے۔ آپ کے اختلاطِ حواس سے میرا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔

میجر: ہا ہا ہا! او ہو ہو ہو۔ سوار، تلواریں کھینچ کر بڑھو اور دشمن کو کاٹ دو۔ برجاپانی اور روسی گلے مل رہے ہیں۔ شاباش میرے بہادرو۔ گھر کو پلٹ چلو...... واہ رے میں! تلوار سے ایک سارجنٹ میجر کے دو ٹکڑے کر دیئے۔

اس کے بعد ٹیلیفون میں قہقہوں کی آوازیں آنے لگیں جنہیں سُن کر پروفیسر نہایت افسردہ ہوا۔ تجربہ کے اس طرح رُک جانے سے اس کی خوشی خاک میں مل گئی۔ کچھ دیر کے بعد اس نے گھنٹی بجائی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے تھوڑی دیر بعد پھر گھنٹی بجائی لیکن جواب نہ ملا۔ آخر پروفیسر نے غمزدہ آواز میں کہا:

"اب تو دروازہ کھولنا ہی چاہئے۔ یہ شخص بیہوش پڑا ہوا ہے اور اس حالت میں اگر دیر تک ریڈیم کی شعاعوں کے سامنے رہا تو ممکن ہے کہ نتیجہ اچھا نہ ہو۔"

یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھولا۔ کمرہ میں اندھیرا تھا۔ پروفیسر سخت متعجب ہوا اور دل میں کہنے لگا:

"میرا ریڈیم کہاں غائب ہو گیا؟ کہیں حقیقت میں نکل ہی تو نہیں گیا؟" آگے بڑھ کر اس نے چاہا کہ بٹن دبائے تاکہ کمرہ میں بجلی کی روشنی ہو جائے اس نے قدم اندر رکھا ہی تھا کہ دروازہ بڑے زور سے بند ہو گیا۔ پروفیسر نے کمرہ روشن کر کے چاروں طرف نظر ڈالی مگر نہ قیدی تھا نہ ریڈیم۔ اس وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور آواز آئی:

"کیا جناب اندر تشریف رکھتے ہیں؟"

پروفیسر: (محوِ استعجاب ہو کر) مارکھم تم ہو؟

میجر: جناب والا! ہاں خاکسار حاضر ہے۔ آپ کی عمر کیا ہے؟

پروفیسر: تمہارا سر ہے۔

میجر: جناب پروفیسر صاحب برہم نہ ہوجئے۔ آپ کی حرارتِ غریزی کتنے درجہ ہے؟ مقیاس الحرارت ٹیلیفون کے پاس ہے۔ براہ کرم زبان کے نیچے لگائیے اور جیب سے گھڑی نکال کر نبض کی رفتار بھی بتائیے۔

پروفیسر: نابکار۔ ملعون۔ بےچور۔ بدمعاش! تو ہمارا مذاق اڑاتا ہے؟

میجر: جنابِ عالی! آپ کی گفتگو پایۂ ثقاہت اور درجۂ تہذیب سے گری ہوئی ہے۔

پروفیسر: ابے او پاجی سنتا ہے کہ نہیں اگر تو نے فوراً دروازہ نہ کھول دیا تو میں تجھے پولیس کے حوالہ کر دوں گا۔
مینجر: جناب عالی پولیس یہاں کہاں۔ سوائے اس خاکسار کے اور یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔
پروفیسر: ابے تو نے میرا ریڈیم کیا کیا؟
مینجر: جناب والا! ریڈیم نہایت حفاظت سے میری جیب میں رکھا ہوا ہے۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے اس کے حالات خوب اچھی طرح پڑھ لئے تھے۔ ایک سیسہ کی چھوٹی سی ڈبیا جس کے اندر سیسہ ہی کی ایک اور ڈبیا بند تھی اور دونوں فصل میں پارہ بھرا ہوا تھا میں اپنے ساتھ لیتا آیا تھا۔ جب آپ نے مجھے مقید فرمایا ہے تو اس کے کچھ دیر بعد میں نے ریڈیم کو اس ڈبیا میں بند کر دیا تھا۔ اس ڈبیا کے باہر نہ اس کی شعاعیں نکل سکتی ہیں نہ حرارت اثر کر سکتی ہے۔ میرا وقت آپ سے باتیں کرنے میں نہایت عمدہ طور پر صرف ہوا۔ میں جناب کو یقین دلاتا ہوں کہ جناب کی خوشگوار باتیں مجھے عمر بھر نہ بھولیں گی۔
پروفیسر: مار کھم تو اول درجہ کا چھٹا ہوا بدمعاش، بے ایمان اور گستاخ ہے۔ مجھے جلد حراست سے نکال ورنہ.....
مینجر: جناب عالی ناراض نہ ہوجیئے۔ آپ نہیں سمجھ سکتے کہ آپ کی تھوڑی دیر کی تکلیف سے بنی نوع انسان کو کس قدر فائدہ پہنچے گا۔ برٹش میڈیکل جرنل میں آپ کا جو مضمون طبع ہوگا میں اسے ضرور پڑھوں گا اور اس کی تردید میں ایک حرف بھی زبان سے نہ نکالوں گا۔ اگرچہ میری نبض کی رفتار ہمارے نہیں بڑھنے پائی اور حرارت غریزی ننانوے درجہ سے زیادہ نہ ہوئی۔ اگر میں آپ سے شرف مکالمت حاصل کرنے کی بجائے ریڈیم کو فوراً ڈبیا میں بند کر لیتا تو اتنا بھی نہ ہوتا۔ لیکن جناب سے ایک فروگذاشت ضرور ہوئی کہ دروازہ کھولتے وقت جناب نے یہ خیال نہ فرمایا کہ جس بوتل کا آپ کاگ کھول رہے ہیں اس میں اڑ جانے والا جوہر بند ہے۔ براہ کرم کلکتے کے بلیک ہول کا تصور اپنے ذہن عالی میں رکھیے اور مجھے اوداع کہنے کی اجازت دیجئے۔ خدا حافظ!

(ترجمہ)

مولوی عنایت اللہ دہلوی

نجم السحر

شہزادۂ کوش اور سردار رعمیس کی لڑائی

آج کل طیبی کے شہر میں دور دور کے نوجوان رئیس اور امیر زادے بڑی بڑی ریاستوں کے مالک فرعون کے مہمان ہیں۔ ان میں ہر ایک بادشاہ کی بیٹی نیطرطیہ سے عقد کی امید میں آیا ہے۔ یہ شہزادی وہی ہے جو نجم السحر، قرصِ خورشید، جمالِ حاسر، دختِ عمون کے خطابوں سے مشہور ہے۔ جلسوں اور ضیافتوں کا سلسلہ ایک مہینے سے جاری ہے۔ ہر ضیافت میں ان معزز مہمانوں میں سے صرف ایک مہمان خصوصیت کے ساتھ مدعو کیا جاتا ہے اور نیطرطیہ ملکۂ مصر وہاں موجود ہوتی ہے۔

ہر ضیافت کے ختم ہونے پر فرعون اور اس کے مشیرانِ سلطنت ملکہ کے پاس آتے ہیں اور دریافت کرتے ہیں کہ جس مہمان کو آج خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا اس سے آپ اپنا عقد کرنا پسند کرتی ہیں یا نہیں۔ نیطرطیہ ہوشیار ہے۔ کسی کی نسبت صاف جواب نہیں دیتی اور اس طرح امیدواروں کی فہرست سے نام کٹتے چلے جاتے ہیں۔

نیطرطیہ حکم دیتی ہے کہ وہ تحریر جس میں اس کی والدہ احورہ کا خواب درج ہے ہیکل عمون سے طلب کر کے اس کے سامنے پڑھی جائے۔ جس وقت یہ تحریر پڑھی جاتی ہے تو اس جملہ پر کہ اس کا عقد صرف ایسے شخص سے ہو سکتا ہے جو شاہی خاندان سے ہو، سب کو توجہ دلاتی ہے اور کہتی ہے کہ اب تک جس قدر امیدوار ضیافتوں میں اس کے سامنے پیش ہوئے چونکہ ان میں کوئی کسی شاہی خاندان کی یادگار نہ تھا اس لئے وہ ربِ عمون کے حکم کے خلاف کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔

مہمانوں میں بعض بڑے بڑے بادشاہوں کے ایلچی تھے۔ یہ بادشاہ اپنی سلطنتیں چھوڑ کر مصر میں نہ آ سکتے تھے اس لئے انہوں نے اپنے سفیر شادی کا پیغام دے کر بھیجے تھے۔ ان کی نسبت نیطرطیہ نے جواب دیا کہ جب میں نے ان میں سے کسی کو دیکھا ہی نہیں ہے تو کیسے کسی کو قبول کر لوں۔ جب تک وہ دربارِ مصر میں حاضر نہ ہوں میں ان کے پیغام کا کوئی جواب نہیں دے سکتی۔

آخر کار کم ہوتے ہوتے صرف ایک مہمان رہ گیا جس سے ملکہ واقف تھی۔ خود بادشاہِ مصر اور اس کے ندیموں کی مرضی تھی کہ اس مہمان سے نیطرطیہ کی شادی ہو جائے۔ یہ مہمان ولایتِ کوش کا شہزادہ اماثل نامی تھا۔ اس کے پیرانہ سال باپ کا تخت گاہ نباطہ کا شہر تھا جو طیبی سے جنوب میں واقع تھا جس ملک

ہیں یہ شہر تھا اس کی شکل ایک جزیرہ کی سی ہو گئی تھی۔ کیونکہ دریائے نیل نے اس کو تینوں سمتوں سے گھیر رکھا تھا۔ مشہور تھا کہ مصر کے بعد نباطہ اس وقت تمام دنیا میں سب سے زیادہ زرخیز و شاداب خطہ ہے اور سونا وہاں اس کثرت سے ہوتا تھا کہ تانبے اور لوہے سے بھی ارزاں سمجھا جاتا تھا۔ علاوہ اس کے جواہرات کی کانیں بھی وہاں بہت تھیں اور غلہ بکثرت پیدا ہوتا تھا۔

بہت قدیم زمانہ میں فراعنہ کا ایک خاندان جس کی اصل اسی شہر نباطہ سے تھی مصر کا بھی مالک رہ چکا تھا لیکن ایک مدت گذرنے کے بعد مصر کے لوگوں نے اس خاندان کو اس بنا پر کہ اس کی اصل ایک غیر ملک سے ہے اور وہ ذہبیہ کی رسم و رواج مصر میں جاری کرنا چاہتا ہے سلطنت مصر سے معزول کر دیا اور ایک فرمان بھی اس مضمون کا شائع کر دیا کہ اس نباطی خاندان کے کسی شخص کے سر پر کبھی مصر کا تاج نہ رکھا جائے۔ اسی معزول فرعونی خاندان کا سب سے آخری اور صحیح النسب رکن نیطرطیہ کے ساتھ بچپن کا کھیلا ہوا رگمیس تھا۔

مصر کے لوگوں نے گو اس خاندان کو معزول کر دیا تھا لیکن دل میں ہمیشہ افسوس ہی کرتے رہے کیونکہ اس معزولی کے بعد نباطہ کا زرخیز ملک سلطنت مصر کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ جب مصر سے یہ خاندان معزول ہوا تو نباطہ کے لوگوں نے مصر کی حکومت سے اپنے تئیں آزاد کرا لیا اور اس پرانے شاہی خاندان سے بھی بے تعلق ہو کر ایک نئے خاندان کو نباطہ کی سلطنت سپرد کر دی۔ اس نئے خاندان کا وارث اب اماثل شہزادہ کوش تھا جس کا ذکر اوپر ہوا۔

اہلِ مصر کو اس کھوئی ہوئی دولت کا پھر خیال آیا اور انھوں نے سوچا کہ اگر ملکہ نیطرطیبہ کا عقد شہزادہ اماثل سے ہو جائے تو نباطہ کا ملک پھر سلطنت مصر کے قبضہ میں آ سکتا ہے۔ چنانچہ جب سے نیطرطیبہ پیدا ہوئی تھی، اس وقت سے تمام وزراء اور ہواخواہانِ دولت یہاں تک کہ خود فرعون بھی اسی فکر میں رہا کرتا تھا۔ فرعون کو اس کا افسوس تھا کہ صرف لڑکی رکھتا ہے اگر لڑکا بھی ہوتا تو مصر قدیم کے رواج کے مطابق بھائی بہن کا عقد کر کے سلطنت کو اپنے ہی خاندان میں قائم کر دیتا۔ بہر کیف جس وقت نیطرطیبہ کا جشن تاجپوشی ہوا تو خفیہ خط و کتابت کر کے شہزادہ اماثل کو اس موقع پر مدعو کیا گیا اور اس سے کہا گیا کہ اگر طیبی میں مستقل طور پر سکونت رکھنے کی شرط منظور ہے تو نیطرطیبہ کا اس سے عقد کر دیا جائے گا۔ یہ سچ ہے کہ اور لوگ بھی ملکہ سے شادی کا پیغام دے کر فرعون کے ہاں مہمان ہوئے تھے لیکن وہ خوب جانتے تھے کہ ہم سب بساطِ شطرنج پر پیادے ہیں، بادشاہ اور فرزین کوئی اور ہی ہے۔

غرض جس شہزادہ کی نسبت تصفیہ ہو چکا تھا کہ ملکہ نیطرطیبہ کو اپنے دامِ محبت میں اسیر کرے وہ اماثل تھا۔ نیطرطیبہ کو اس کا علم تھا۔ اشتی اس کو پہلے سب باتوں سے آگاہ کر چکی تھی اور یہی وجہ ہوئی تھی کہ اماثل کے اندیشہ اور رگمیس کے عشق سے مجبور ہو کر اس نے عمون کو آسمان سے بلوا کر اپنی قسمت کا حال پوچھنا چاہا تھا اور اس طرح حالت بے قراری میں عمون کی جناب میں بے ادبی کی مرتکب ہوئی تھی۔ لیکن فرعون نے اماثل کا ذکر ابھی تک نیطرطیبہ سے نہیں کیا تھا اور نیطرطیبہ نے ابھی تک اس شہزادے سے ملاقات کی تھی۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ملکہ کے جشن تاجپوشی کے وقت اماثل بھیس بدل کر اسے دیکھنے آیا تھا کیونکہ اس کا قول تھا کہ ایک ملکہ نہیں ہزار ملکہ ہوں اگر میری پسند کی چیز نہ نکلی تو میں ہرگز شادی نہیں کروں گا۔ بہر کیف اس موقع پر ضروری ہوا کہ وہ شادی سے پہلے نیطرطیبہ کو دیکھ کر پسند کر لے۔

اب چونکہ ملکہ مصر کو اس کی پوری جوانی اور حسن کی شان میں دیکھا تو اماثل نے اپنا اطمینان ظاہر کیا۔ کہنے کو فقط اطمینان تھا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ گرم ملک کا آدمی تھا، ملکہ کے حسن نے اس کے خون میں ایک آگ لگا دی اور اب سوائے اس کے کوئی آرزو نہ رہی کہ نیطرطیبہ اس کی ملکہ بنے۔

قصہ مختصر یہ طے پایا کہ شہزادہ اماثل اپنی آئندہ عروس نیطرطیبہ سے ملاقات کرے۔ چنانچہ شب کو ایک ضیافت غیر معمولی ساز و سامان کے ساتھ ایک بڑے عالیشان اور پُرفضا باغ میں قرار پائی۔ اس باغ میں ہزارہا مشعلیں روشن کی گئیں اور ہر طرف میزیں بچھا کر ان پر پُرتکلف اور خوش ذائقہ کھانے چنے گئے۔ نیطرطیبہ[1] آئی مگر اپنے بشرہ سے یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ اس ضیافت کی غرض اسے معلوم ہے۔ ہر طرف تکلفات دیکھ کر فرعون سے پوچھنے لگی "بابا جان! وہ کون سا مہمان ہے جس کے لئے اس درجہ اہتمام ہوا ہے۔ وہ انسان ہے یا کوئی دیوتا؟"

---

[1] ملکہ نیطرطیبہ کی دعا۔

فرعون نے جواب دیا "بیٹی! یہ مہمان کوش کا شہزادہ ہے۔ اس کی رعایا بھی اسے اسی طرح خدا مانتی ہے جیسے ہماری رعایا ہم کو خدا سمجھتی ہے۔ یہ شہزادہ اس وقت اپنے ملک کا ولی عہد ہے لیکن جب وہ تخت پر بیٹھے گا تو دنیا کے سب سے بڑے بادشاہوں میں اس کا شمار ہوگا۔"

نیطرطیہ نے کہا "بابا جان! آپ نے کوش کا نام لیا۔ اس ملک پر تو اس زمانے میں ہم بادشاہی کرتے تھے۔"

فرعون نے ایک آہِ سرد بھر کر کہا "بیٹی! ایک زمانہ میں یہ ملک ہمارا تھا۔ بلکہ یہ کہو کہ کوش کے بادشاہ مصر پر بھی بادشاہی کرتے تھے لیکن میرے پردادا کے باپ کو جس وقت مصر کا ملک ملا تو اس وقت جو خاندان کوش پر مسلط تھا اس کو زوال ہو گیا اور اب اس خاندان میں صرف تین آدمی باقی ہیں۔ ایک مرنیس، ہیکل عمون کی فوج کا سردار، دوسرے اس کی بیوی آشنی جو ساحرہ ہونے کے علاوہ اب عمون کی کاہنہ بھی ہے اور تیسرا نوجوان رمیس تمہارا وہ شریک بھائی جو ہماری فوج میں ملازم ہے اور جو کسی زمانے میں تمہارے ساتھ کھیلا کرتا تھا اور تمہیں یاد ہوگا کہ تالاب والے مگرمچھ سے اس نے تمہاری جان بچائی تھی۔"

نیطرطیہ نے کہا "بابا جان خوب یاد ہے لیکن اگر یہی بات تھی تو پھر آج مرنیس کوش کا بادشاہ کیوں نہیں ہے؟"

فرعون نے جواب دیا "اس لئے نہیں ہے کہ نباطہ کے لوگوں نے ایک دوسرے خاندان کو کوش کا بادشاہ بنا لیا تھا اور اس خاندان کا وارث اب اماثل ہے۔"

نیطرطیہ نے کہا "تو پھر یہ فرمائیے کہ اگر خون اور نسل کوئی چیز ہے تو یہ اماثل ایک غیر مستحق اور غاصب خاندان کا آدمی ہوا۔"

فرعون نے کہا "اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر آج مرنیس ہماری جگہ مصر میں فرعون ہوتا۔ بیٹی یہ باتیں منہ سے نکالنے کی نہیں ہیں۔"

نیطرطیہ نے اس کا کچھ جواب نہ دیا اور جب باغ میں باپ کے قریب تخت پر بیٹھنے لگی تو بہت بے پروائی سے پوچھا "کیا یہ کوش کا شہزادہ بھی ان لوگوں میں ہے جو مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟"

فرعون نے کہا "ظاہر ہے اس کے سوا اور کیا خواہش رکھ سکتا ہے۔ کیا تمہیں اس کا علم نہیں؟ دیکھو ان کے ساتھ مہربانی اور اخلاق سے پیش آنا۔ کیونکہ یہ طے پا چکا ہے کہ تمہاری شادی اس سے کی جائے گی۔ بس خاموش رہو۔ جواب کی ضرورت نہیں، شہزادہ آ رہا ہے۔"

فرعون کے اتنا کہتے ہی باجے اور تاشوں کی آواز باغ کے دوسرے سرے سے آنی شروع ہوئی اور آدمیوں کا ایک گروہ زرق برق لباس پہنے نظر آیا۔ ان میں کوئی ہاتھی دانت کا قرنا اور کوئی پیتل کے بڑے بڑے جھانج اور کوئی ڈھول جن پر مقیش کے غلاف چڑھے تھے بجاتا تھا۔ یہ سب قریب آ کر کھڑے ہو گئے اور اپنے باجے اور طبل بدستور بجاتے رہے۔ ان کے پیچھے پیچھے بیس حبشی جوانوں کا ایک دستہ تھا جو چوڑے پھلوں کے برچھے اور کندھوں پر گینڈے کی کھال کی ڈھالیں جن پر طرح طرح کا کام بنا ہوا تھا لئے تھے۔ سب قبائیں پہنے تھے اور سروں پر چیتے کی کھال کی ٹوپیاں تھیں۔ ان سب کے بعد کوش کا شہزادہ آیا۔ یہ ایک بہت مضبوط، لمبے قد، چوڑے چکلے سینے کا جوان آدمی تھا۔ چہرے کا نقشہ موٹا اور بھدا تھا، اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں جن میں پتلیاں ہر وقت پھرتی تھیں۔ لباس بہت پرتکلف تھا اور خالص سونے کے توڑے اور ہار موتی موتی لڑیوں کے جن کے قبضے اور قفل جواہرات کے تھے۔ بہت سے گلے میں پڑے تھے اور سر کی اونچی ٹوپی میں سیمرغ کا ایک بہت بڑا سفید پر لگا تھا۔ پیچھے پیچھے چند خادم تھے جو مورچھل جھلتے تھے اور عبا کے لمبے لمبے دامن وہ نہایت کریہہ منظر سیاہ قوم کے بونے اٹھائے ہوئے تھے۔ یہ پوری عمر کے آدمی تھے مگر ان کا قد آٹھ برس کے بچے سے زیادہ نہ تھا۔

شہزادہ ابھی کچھ فاصلہ پر تھا نیطرطیہ نے ایک نظر دیکھتے ہی اس کی طبیعت کا اندازہ کر لیا اور اس درجہ اسے نفرت پیدا ہوئی کہ کبھی کسی چیز سے نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بعد شہزادی کی نگاہ بلند شہ نشین سے جہاں تخت پر بیٹھی جلوس کرتی تھی شہزادہ اماثل کے سر کے اوپر سے گزرتی ہوئی ایک جگہ پر جمی اور یہاں شہزادہ اماثل کے پیچھے مصری سپاہ کا ایک بڑا خوبرو نوجوان افسر کھڑا تھا۔ نہایت سادے لباس پر فولاد کی زرہ پہنے تھا۔

کمر میں سنہرے قبضہ والی تلوار جو فرعون نے دی تھی، لٹک رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ رعمیس کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہی رعمیس جو نیطرطیبہ کا دودھ شریک بھائی اور بچپن میں ساتھ کھیلا ہوا لڑکا تھا اور جس سے اب جوانی میں ملکہ کو عشق تھا۔ اس شریف و دراز قامت جوان کا سیاہ فام شہزادہ کوش سے مقابلہ کر کے نیطرطیبہ کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح سرخ ہو گیا۔ فرعون نے نیطرطیبہ کی یہ کیفیت دیکھی مگر اور درباریوں کی طرح وہ بھی یہ سمجھا کہ چہرہ پر رنگ کا تغیر محض اس وجہ سے ہے کہ نیطرطیبہ نے آج پہلی ہی مرتبہ شہزادہ اماثل کو دیکھا ہے جو اس کا نوشہ بننے والا ہے۔

نیطرطیبہ کو اس وقت یہ حیرت تھی کہ رعمیس شہزادہ اماثل کے پیچھے ایک خدمتگار کی طرح کیوں کھڑا ہے۔ وہ کون بشر ہے جس نے رعمیس کو بھرے دربار میں ایک خادم کی حیثیت سے حاضر رہنے کا حکم دیا ہے۔ سمجھ گئی کہ بادشاہ کے حکم سے ایسا نہیں ہوا ہے۔ کیونکہ بادشاہ کو ان باتوں کی کیا خبر ہو سکتی تھی۔ بہر کار روائی کسی وزیر یا دربار کے ملازم کی ہے جس نے رشوت لے کر شہزادہ کوش کو خوش کرنے کے لئے یہ حرکت کی ہے۔ رعمیس ایک قدیم تر خاندان شاہی کا رکن ہے اور انصاف سے دیکھا جائے تو اس وقت اس کو نہ صرف کوش کا بلکہ مصر کا بھی بادشاہ ہونا چاہئے تھا۔ پس رعمیس کو ذلیل کرنے کے لئے اس موقع پر اس کو اماثل کا خدمتگار بنایا گیا ہے۔

علاوہ اس کے لوگوں کو یہ بات معلوم تھی کہ ملکہ اس رعمیس پر نظرِ الفت رکھتی ہے اور اس کی ماں کا دودھ بھی اس نے پیا ہے اس لئے ملکہ کی نگاہ میں رعمیس کو ذلیل کرنے کے لئے یہ حکم ہوا ہے کہ اماثل کے جلو میں رعمیس ایک معمولی سپاہی کی طرح اس کی جان کا محافظ ملازم بن کر ساتھ رہے۔

نیطرطیبہ نے یہ معمہ ایک آن میں حل کر لیا اور فوراً دل ہی دل میں خدائے عمون کے سامنے اس کی قسم کھائی کہ جن لوگوں نے رعمیس کو ذلیل و خوار کرنے کے لئے یہ حرکت کی ہے ان سے کبھی نہ کبھی سخت بدلہ لوں گی۔ نیطرطیبہ اپنی اس قسم کو کبھی نہ بھولی۔

اب شہزادہ اماثل نے شہ نشین پر پہنچ کر فرعون اور ملکہ کو تعظیم دی اور دونوں کے جواب کا منتظر ہوا۔ فرعون نے چند منتخب اور برمحل جملے اماثل کے خیر مقدم میں کہے اور جس قدر القاب و آداب وہ رکھتا تھا ان سب کو بیان کر کے اس سے خطاب کیا اور تقریر میں ان تعلقات کی طرف بھی اشارہ کیا جنہوں نے سلطنت مصر اور کوش کو قدیم زمانہ میں متحد و وابستہ کر رکھا تھا اور امید ظاہر کی کہ وہی دیرینہ تعلقات ان دونوں سلطنتوں میں اب اور بھی زیادہ قرابت پیدا کر دیں گے۔

فرعون نے اپنی گفتگو ختم کرتے ہی نیطرطیبہ کی طرف دیکھا۔ ملکہ مصر ہونے کی وجہ سے اس کو بھی اس موقع پر کچھ کہنا ضروری تھا۔ چنانچہ ایک تقریر پہلے سے لکھ کر شہزادی کو پیش کر دی گئی تھی اور اس وقت وہ کاغذ اس کے سامنے تھا۔ ملکہ کو یہ بھی یاد تھا کہ اس کو پڑھ کر سنانا ہے لیکن اس نے نہ اس کاغذ کو اٹھایا اور نہ اس کو پڑھا بلکہ منہ پھیر کر ایک خواص کو حکم دیا "ہماری الماس کی پنکھیا حاضر کرو۔"

اماثل نے کچھ دیر انتظار کیا کہ ملکہ کچھ کہے گی لیکن جب اس کو خاموش اور بے توجہ پایا تو اپنا جواب شروع کر دیا جسے ازبر کر رکھا تھا۔ پہلا ہی فقرہ اس جواب کا یہ تھا کہ "جس طرح بارانِ رحمت صحرا میں پھول کھلا دیتا ہے اسی طرح ملکہ نیطرطیبہ کے شیریں الفاظ نے اس کے دل کو اس وقت ایک گلزار بنا دیا ہے۔" لیکن واقعہ یہ تھا کہ نیطرطیبہ کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا تھا۔ اب جو ملکہ نے اپنی پنکھیا کی اوٹ سے دور نگاہ کی تو رعمیس کے چہرے پر ایک تبسم دیکھا اور دربار کے چند معززین بھی اماثل کے بے محل فقرے پر بے اختیار ہنس پڑے۔ لیکن فوراً ہنسی چھپانے کو سر نیچے کر لئے۔

اماثل کوئی جملہ غصہ کا منہ ہی منہ میں کہہ کر اپنے ملازموں کی طرف متوجہ ہوا اور حکم دیا کہ جو تحائف ہم ساتھ لائے ہیں وہ پیش کئے جائیں۔ ملازموں نے فوراً تحائف حاضر کئے، ان میں نہایت نادر صنعت کے خوبصورت سونے کے ظروف، تیروں اور ہاتھیوں کی نہایت وزنی خالص سونے کی مورتیاں، عود روشن کرنے کے مرصع برتن تھے۔ شہزادے نے یہ نادر چیزیں اپنی طرف سے اور اپنے بادشاہِ کوش کی طرف سے پیش کیں اور بہت ہی غرور اور نخوت کے لہجہ میں کہا کہ "ان چیزوں کا شمار ہمارے ملک میں بہت معمولی چیزوں میں ہے۔ ایسے ہی اور بہت سے تحائف میں اپنے ساتھ لانے والا تھا مگر خواہ مخواہ وزن بڑھانے کے خیال سے نہیں لایا۔"

فرعون نے اماثل کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ مصر بھی مفلس ملک نہیں ہے۔ چنانچہ کل آپ کو اس کا ثبوت مل جائے گا۔ اس کے بعد شہزادے نے ملکہ نیطرطیہ کو خاص طور پر چند تحائف اپنی طرف سے پیش کئے۔ ان میں مرصع گلوبند جس میں الماس، یاقوت اور زمرد جڑے ہوئے تھے، اور قیمتی موتیوں کے ہار تھے اور ان کے علاوہ ایک بے نظیر صنعت کا خوبصورت چنگ تھا جس پر سونے کے تار کھچے ہوئے تھے اور جس کی مجموعی شکل ایک نہایت خوش رو عورت کی سی بنائی گئی تھی۔ یہ تحفہ شہزادے نے نیطرطیہ کو اس خیال سے نذر میں پیش کیا کہ موسیقی کے ساز بجانے اور خوش گلوئی میں ملکۂ مصر کا ہمسر کوئی نہ تھا۔ اور یہ کمال رب عمون کے خاص عطیات میں سے تھا جو اس حسین ملکہ کو ملے تھے۔ اس عجیب و غریب چنگ کے ساتھ شہزادے نے دو حبشی لونڈیاں بھی پیش کیں۔ یہ نہایت قیمتی زیور پہنے تھیں اور مشہور تھا کہ نباطہ کے ملک میں ان سے بہتر گانے والا نہ تھا۔

فرعون نے ان تحفوں کو ملاحظہ کر کے بیٹی سے کہا کہ موتیوں کے ہاروں میں سے کوئی اچھا سا ہار اپنے گلے میں ڈال لو۔ نیطرطیہ نے عذر کیا کہ میں اس وقت سپید لباس پر کاسنی رنگ کے پھول پہنے ہوں۔ ان ہاروں کا رنگ اس لباس پر نہیں کھلے گا۔ غرض نیطرطیہ نے کوئی ہار اپنے گلے میں نہ ڈالا اور بجائے اس کے شہزادۂ کوش کا شکریہ بہت پُر تکلف الفاظ میں جن میں سرد مہری شامل تھی ادا کیا اور تمام تحفوں پر ایک نظر ڈال کر آشتی سے کہا کہ ان سب چیزوں کو ہٹا کر ایک طرف رکھ دیا جائے کیونکہ خوشبوئیں جو ان چیزوں پر چھڑکی گئی ہیں ان سے دماغ پریشان ہوا جاتا ہے۔ جب تحفے وہاں سے ہٹائے جانے لگے تو ملکہ نے بہت بے اعتنائی سے کہا کہ وہ چنگ البتہ جہاں رکھا ہے وہیں رہنے دیا جائے۔ ضیافت جو بہت ہی نامبارک ساعت میں شروع ہوئی تھی، جاری رہی اور اماثل نے قبرص کی شیریں شراب کثرت سے پینی شروع کر دی۔ رعمیس کو جو اس کی کرسی کے پیچھے کھڑا تھا، بار بار حکم ہوتا تھا کہ جام شراب خالی نہ رہنے پائے۔ معلوم نہیں یہ فرمائش محض اس وجہ سے تھی کہ رعمیس اس کے پاس کھڑا تھا یا نیت یہ تھی کہ اسے حکم دے کر اس مجمع میں اسے ذلیل کیا جائے۔ نیطرطیہ کو اس کا مطلق علم نہ تھا کہ اماثل رعمیس سے کیا خدمت لے رہا ہے۔ مگر رعمیس کو سوائے حکم برداری کے کوئی چارہ نہ تھا۔ گو بھرے دربار میں شراب کے پیالے بھر بھر کر دوسرے کو دینے ایسے شخص کا کام نہ تھا جو مصر میں توس اور نواب کا خطاب رکھتا ہو اور فرعون کی محافظ فوج کا خصوصی سردار ہو۔

جس وقت خواصیں زرق برق لباس اور سونے کے چوڑے ہاتھوں میں پہنے، دستر خوان اٹھانے کو آئیں تو بڑے بڑے بھان متی دربار میں حاضر ہوئے اور انہوں نے عجیب و غریب تماشے دکھائے۔ ایک تماشہ یہ دکھایا کہ ایک بڑے خوبصورت اونچے ظرف کے منہ سے ملکہ نیطرطیہ کی تصویر برآمد ہوئی جس کی پیشانی پر ایک چمکتا ستارہ اور سر پر تاجِ شاہی رکھا تھا۔

اب ان بازیگروں نے جس طرح ملکہ نیطرطیہ کی تصویر ظرف سے نکالی تھی اسی طرح شہزادۂ کوش کی تصویر بھی نکالنی چاہی لیکن خاتون آشتی جو جادو میں ان کی بھی استاد تھی ملکہ کی کرسی کے پیچھے کھڑی یہ تماشا دیکھ رہی تھی اس نے فوراً اپنے جادو کے زور سے ان بازیگروں کو غلطی میں ڈال دیا۔

چنانچہ ظرف کے منہ سے بجائے شہزادہ کی تصویر کے جس کا نام لے کر یہ بازیگر زور زور سے کہتے تھے کہ "اے تصویر نکل" ایک بندر کی صورت برآمد ہوئی جس کے سر پر تاج رکھا تھا اور تاج میں سیمرغ کا ایک بہت بڑا پر لگا تھا۔ بندر کی صورت بھی ایسی تھی جو شہزادہ اماثل سے بہت ملتی جلتی تھی۔ اب یہ بندر کی شکل مٹکے کے منہ پر بیٹھی گھگھیاں باندھ باندھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ کچھ دیر تک یہی کیفیت رہی۔ پھر دفعتاً مٹکے کے منہ سے نیچے گر کر غائب ہو گئی۔ اس تماشے کو دیکھ کر بعض لوگ ہنسے اور بعض چپ رہے لیکن فرعون کی پیشانی پر بل آ گئے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آیا یہ حرکت کسی انسان کی پیش بندی کا نتیجہ ہے یا خداؤں کی طرف سے کوئی نحس علامت ظاہر ہوئی ہے۔ چنانچہ پریشان ہو کر اماثل کی طرف دیکھنے لگا لیکن اماثل کثرت سے شراب پی کر نیطرطیہ کی صورت دیکھنے میں ایسا مصروف تھا کہ اس کو کسی بات کا بھی ہوش نہ تھا۔ اماثل کی نظر نیطرطیہ کی طرف تھی اور نیطرطیہ اس طرح اونچی نگاہ کئے ہوئے تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی چیز کو دیکھ رہی ہے۔ بازیگروں نے جب دیکھا کہ ان کا کام بگڑ گیا تو وہ جان کے خوف سے بھاگے اور حیرت میں تھے کہ وہ کون ساحر یا دیوتا تھا جس نے آ کر ان کے تماشے کی صورت بدل دی۔

جب بھان متی اور بازی گر اٹھ کر بھاگے تو ناچنے والیوں کا طائفہ آیا۔ اماثل کوش کا شہزادہ نیطرطیہ کی طرف اسی طرح نظر جمائے دیکھ رہا تھا کہ ملکہ گھبرائی

جاتی تھی۔ آخر کار اس نے ہاتھ کے اشارے سے حکم دیا کہ حبش کی جو گانے والیاں تحفہ میں پیش ہوئی ہیں ان کو بلایا جائے۔ سنا ہے کہ وہ بہت ہی خوش آواز ہیں۔ عورتیں فوراً ہی اپنے اپنے ساز لے کر حاضر ہوئیں اور بہت خوبی سے گانے بجانے لگیں۔ جب ان کا گانا ختم ہوا تو نیطر طیبہ نے کہا "ہم تمہارا گانا سن کر بہت خوش ہوئے۔ اور اس کا انعام یہ دیا جاتا ہے کہ آج سے تم دونوں آزاد ہو۔ اگر ہمارے پائے تخت طیبی ہیں تم لوگ سکونت اختیار کرو تو کبھی کبھی دربار میں حاضر ہو کر گانا سنانے کی خدمت پر تم کو مامور کرتے ہیں۔"

اتنا سن کر وہ دونوں گانے والیاں پیشانی زمین پر رکھ کر ملکہ کو ہزاروں دعائیں دینے لگیں۔ کیونکہ وہ سمجھتی تھیں کہ غلامی سے نجات پا کر وہ اپنے فن سے بہت دھن دولت کما لیں گی۔ حاضرینِ دربار نے جب ان کے گانے کی تعریف ملکہ کے منہ سے سنی تو اپنے گلوں سے قیمتی ہار اور ہاتھوں سے جواہرات کی انگوٹھیاں اتار اتار کر ان گانے والیوں کی طرف پھینکیں اور تھوڑی سی دیر میں ان عورتوں نے جو اب تک لونڈیوں کی حیثیت رکھتی تھیں، اتنی دولت پیدا کر لی کہ اس سے پہلے ان کے خواب و خیال میں بھی نہ آ سکتی تھی لیکن اماثل کو نیطر طیبہ کی اس بات پر کہ ان لونڈیوں کو آزاد کر دیا، غصہ آیا اور وہ کہنے لگا:

"کوئی اور ہوتا تو اس نادر تحفے کو کہ دنیا کی بہترین گانے والیاں پیش کی گئی ہیں کبھی اپنے سے جدا نہ کرتا۔"

یہ فقرہ سن کر نیطر طیبہ نے پہلی مرتبہ اماثل سے مخاطب ہو کر کہا "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان خوش آواز عورتوں سے بہتر گانے والیاں دنیا میں نہیں ہیں؟ آپ کے اس خیال سے جرأت ہوتی ہے کہ جو کچھ تھوڑا بہت مجھے آتا ہے سناؤں تا کہ مجھے معلوم ہو کہ دنیا کی بہترین گانے والیوں سے میں کس بات میں کم ہوں۔"

اتنا کہنے کے بعد نیطر طیبہ نے چنگ اٹھایا۔ تاروں کو الماس کی مضراب سے چھیڑا اور کھرج کی کھونٹیوں کو مروڑ کر سُر ملائے اور اس مصروفیت میں اپنی نگاہیں شہزادے کی طرف متوجہ رکھیں۔ یہ نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ ہماری شکل کوئی دوسرا صاحبِ کمال ہو تو بتائیے۔"

فرعون نے یہ کیفیت دیکھ کر کہا "نورِ چشم! یہ نہایت سبک حرکت ہو گی کہ تم ملکۂ مصر ہو کر مجمع عام میں گانا سنانے بیٹھو۔"

نیطر طیبہ نے جواب دیا "بابا جان! اس میں کوئی بات خفیف ہونے کی نہیں ہے۔ آج ہم بادشاہِ کورش کے فرزند اور ولی عہد کی تعظیم و تکریم کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ فرعون اس کی خاطر و مدارات میں مصروف ہے۔ فرعون کی بیٹی اس کے تحائف قبول کر چکی ہے۔ جملہ اعیانِ دولت اس کی خدمت میں گرد و پیش حاضر ہیں۔" اتنا کہہ کر نیطر طیبہ کچھ رکی، مگر پھر بہت صاف آواز میں کہا "اور ایک شخص جو شرافتِ نسب کے اعتبار سے شہزادہ اماثل سے بھی قدیم تر خاندانِ شاہی کا رکن ہے، اس کو بادہ بردار بنا کر شہزادہ کے پیچھے ایک خدمتگار کی طرح کھڑا کیا گیا ہے اس کے بزرگوں نے ایک زمانے میں وہ سلطنت قائم کی تھی جس پر شہزادۂ کورش کا باپ آج مسلط ہے۔" یہ کہہ کر اس نے رگمیس کی طرف اشارہ کیا جو اماثل کے قریب جامِ شراب لئے ایک ادنیٰ نوکر کی طرح حاضر تھا۔ ملکہ نے پھر کہنا شروع کیا "جب یہ کیفیت ہو تو پھر ملکۂ مصر ایسے مہمان کو خوش کرنے کے لئے جو تکلیف بھی گوارا کرے وہ محلِ اعتراض نہیں، میرے پاس تو کوئی اور تحفہ ہی سوائے اپنی خوش گلوئی کے پیش کرنے کو نہیں ہے۔"

اس دلیرانہ اور صاف تقریر پر سب دم بخود رہ گئے۔ ہر شخص اس گفتگو کا مطلب سمجھ گیا اور ملکہ نیطر طیبہ نجم السحر اپنے تخت سے اٹھی اور چنگ کو اپنے نوخیز سینے سے لگا کر اس پر جھکی۔ سر پر مصر کا تاج تھا جس میں سونے کا سانپ اس طرح پھن اٹھائے تھا کہ اب کسی کو ڈسا۔ ملکہ نے چنگ بجانا شروع کیا۔ انگلیوں میں اس غضب کا جادو بھرا تھا کہ ایک آن میں حاضرین کو سوائے چنگ کی آواز کے اور کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔ شروع میں آواز ہلکی اور کمزور تھی پھر بتدریج اس کی لگاوٹ اور گونج بڑھتی گئی یہاں تک کہ سریلی صدائیں تمام فضا میں گونجنے لگیں۔ جب راگ پوری قوت پر آیا تو آواز ملائی۔ کبھی لحنِ لطیف و شیریں میں اور کبھی نوائے مستانہ و نالہ بار میں اس طرح محو ترنم ہوئی کہ آسمان کے ستارے بھی متوجہ معلوم ہونے لگے اور زمین سے نغمہ بلند ہو کر ماہ و انجم کے دلوں پر نشتر کا کام کرنے لگا۔

ملکہ نے جو کچھ گایا تھا وہ عشق و محبت کی ایک داستان تھی جس کا مضمون صرف اتنا تھا کہ دیبہ حامر کے بت خانے کی ایک بڑی عالی مرتبہ نوجوان کاہنہ کو ایک غریب خلّاط سے عشق ہو گیا ہے اور یہ مرد بھی اس کی محبت میں دیوانہ ہے ——— لیکن دونوں کی حالت میں الف! تفاوت ہے کہ وہ

شادی نہیں کر سکتے۔ رفتہ رفتہ عاشق پر محبت کا ایسا جنون سوار ہوتا ہے کہ رات کے وقت لڑکی بن کر کھانا ہوا معشوقہ کی تلاش میں بت خانے کے حرم میں داخل ہوتا ہے کہ کسی طرح اس کی صورت دیکھنی نصیب ہو جائے۔ ربۃ حامر اس کی یہ جسارت دیکھ کر اس قدر برہم ہوتی ہے کہ فوراً اسے ہلاک کر دیتی ہے۔ اتفاق سے اسی وقت وہ نوجوان کاہنہ بھی حرم میں یہ دعا مانگنے آتی ہے کہ کسی طرح ضبطِ عشق کی قوت اس میں پیدا ہو جائے۔ چلتے چلتے یکایک عاشق بے جان کی لاش سے ٹھوکر کھا کر فوراً اس کی صورت پہچان لیتی ہے اور عاشق کو مُردہ دیکھ کر خود بھی وہیں جان دے دیتی ہے۔ ربۃ حامر جو عشق کی دیوی تھی اس منظرِ حسرت ناک کو نہ دیکھ سکی، دل میں رحم آیا۔ مُردہ عاشق و معشوق کو دوبارہ زندگی بخشی مگر یہ منظور نہ کیا کہ وہ اس دنیا میں رہیں، فوراً ان کو تحتِ الثریٰ میں بھیج دیا جہاں یہ دونوں موت کی نیند سے بیدار ہو کر بغل گیر ہوتے ہیں اور اب تک نہایت خوش و خرم دوسرے عالم میں زندہ ہیں۔

اس پرانے قصے کو سب لوگ بار بار سن چکے تھے مگر گانے میں، وہ بھی اس خوش الحانی کے ساتھ کسی نے نہ سُنا تھا۔ جس وقت ملکہ کی صاف ستھری پیاری آواز ہلکی موجوں کی طرح ہوا میں حرکت کرتی ہوئی سامعین کے سروں پر سے گذری تو ان کو صاف نظر آنے لگا کہ عاشق زار خوف سے لرزاں مگر امید کی دست گیری سے بت خانے کے حرم میں قدم رکھتا ہے اور ربۃ حامر عاشق کی اس بے ادبی پر غضب ناک ہو کر کس طرح اس کو چشم زدن میں ہلاک کر کے سرد کر دیتی ہے۔ اس نغمے نے تصویر کھینچ دی کہ کس طرح خوبصورت کاہنہ ہاتھ میں چراغ لئے عاشق بے جان کو دیکھتے ہی گر کر اس کے ماتم میں اپنی جان کھو دیتی ہے اور اب چنگ کی نوائے روح پرور کو سنتے سنتے سامعین کی آنکھوں میں یہ نقشہ بندھتا ہے کہ فرشتے آسمان سے اتر کر عاشق و معشوق کی لاشوں کو کندھوں پر اٹھائے دنیا کی سرحدوں سے گذر رہے ہیں۔

چنگ کی دلآویز صدائیں نہایت تیزی سے یکایک بلند ہوئیں۔ سننے والوں کو معلوم ہوتا تھا کہ عشق و محبت کے مقدر سے ان کی آنکھوں کے سامنے بہشت بریں کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ سب کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھیں اور چشمِ تصور نے دیکھا کہ عاشق و معشوق موت کی نیند سے جاگے ہیں اور ایک فوری تحیر کے مٹتے ہی فرطِ مسرت سے ایک دوسرے کو لپٹ گئے ہیں کہ اتنے میں نور کی ایک شعاع گلگوں نے ان دونوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ اور اس پردۂ نور سے اب عشق کی ماتی کاہنہ نے خدا کی تعریف شروع کی ہے۔ اس نوائے جاں فزا نے سب پر ایک محویت طاری کر دی۔ اس حالت میں کچھ دیر کے بعد ملکہ کی آواز رفتہ رفتہ نحیف و ناتواں ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ اس روحانی عالم کی فضائے ساکت میں اس کی آخری صدائے بازگشت بھی معدوم ہو گئی۔ مغنیہ نے نغمہ بند کیا۔ چنگ جس کے تار ابھی تک لرز رہے تھے ایک طرف رکھ دیا اور خود خستہ حال ہو کر ہاتھ پاؤں پر لرزہ تختِ زرنگار کی پشت سے سہارا لے کر آرام کرنے لگی۔ زردمہتاب سے چہرہ پر پیلگوں آنکھیں ستاروں کی طرح روشن تھیں۔ کل دربار سکوت کے عالم میں تھا۔ نغمہ کا اثر سننے والوں کے دلوں پر ابھی تک باقی تھا۔ نہ کوئی لب ہلا سکتا تھا، نہ کسی میں تابِ جنبش تھی۔ سب جانتے تھے کہ نیطرطیہ رب عمون کی لختِ جگر ہے جو گاتا اس وقت سُنا وہ ملکہ کا نہیں ہے بلکہ عرش کی کوئی دیوی آ کر اپنا نغمہ سُنا گئی ہے۔

اہلِ دربار اس طرح بیٹھے تھے کہ گویا عالمِ خواب ان پر طاری ہے۔ لیکن ان کی نگاہیں ملکہ کے زرد چہرے اور روشن آنکھوں کی طرف جمی تھیں۔ اماثل بھی ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے ٹکٹکی باندھے اسی طرف دیکھ رہا ہے۔ شراب اور عشق دونوں کے نشے میں چور ہے۔ لیکن جن خوبصورت آنکھوں کی طرف دیکھ رہا ہے وہ کسی اور طرف متوجہ ہیں اور اماثل سے ایسی بے پروا ہیں گویا وہ انسان نہیں پتھروں کا ایک ڈھیر ہے۔ ملکہ کی شعاعِ نظر نے اس سے گذر کر کسی اور ہی کو اپنا ہدف بنا رکھا تھا۔

اماثل نے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ملکہ کی نظر کس طرف ہے، گردن پھیری، فوراً معلوم ہو گیا کہ جو نوجوان افسر اس کی بادہ برداری کی خدمت پر حاضر ہے ملکہ کی نظر اسی کی طرف ہے اور یہ افسر وہی ہے جس کی نسبت ملکہ کہہ چکی ہے کہ نسل و خاندان کے اعتبار سے وہ اماثل سے زیادہ شریف اور قدیم ہے اور اس کے بزرگ ایک زمانے میں اس سلطنت کے مالک تھے جس پر آج اماثل کا باپ حکمران ہے۔ اماثل کو یہ بھی معلوم ہوا کہ رئیس بھی ملکہ کی طرف اسی طرح دیکھ رہا ہے کہ گویا کسی سحر اور افسوں نے اس بات پر مجبور کر رکھا ہے۔ رئیس کے چہرے پر جو کیفیت اس وقت تھی وہ ایسی تھی کہ اماثل جیسے

شرابی اور خونخوار حبشی نے بھی اسے پہچان لیا۔

رعمیس سونے کا ساغر بادۂ سُرخ سے لبریز ہاتھ میں لئے اماثل کے قریب کھڑا تھا۔ اماثل نے اپنی کرسی دفعتاً اس طرح کھسکائی کہ اس کی پشت ساغر میں لگی۔ ساغر رعمیس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس طرح چھوٹا کہ سُرخ شراب شہزادے کے لباس پر گری اور وہ سر سے پاؤں تک خون میں رنگا ہوا معلوم ہونے لگا۔ یہ دیکھتے ہی، اماثل جھلا کر کرسی پر سے اٹھا اور کہنے لگا:

"اے کتّوں کی نسل کے غلام زادے! مادۂ خنزیر کے خوک صورت بھائی! کیا بادشاہوں کی خدمت میں حاضر رہنے کا یہی طریقہ ہے؟" یہ کہہ کر رعمیس کے منہ پر ایک طمانچہ مارا اور اس کو قتل کرنے کے لئے تلوار سونت لی۔

رعمیس بھی کمر میں تلوار باندھے تھا اور یہ تلوار وہی سونے کے قبضہ والی تھی جس پر مگرمچھ کی شکل بنی ہوئی تھی اور جو فرعون نے اسے انعام میں دی تھی۔ اور جسے دیکھ کر ساحرہ آشتی نے کہا تھا کہ اس پر کسی بادشاہ کے خون کی بوندیں نظر آتی ہیں۔ اس توہین پر رعمیس دیوانہ ہو گیا اور اس نے بھی فوراً تلوار کھینچ لی۔ اماثل نے وار کیا۔ رعمیس اس سے پہلے ہی شہ نشین سے کود کر نیچے کھلی جگہ میں آ گیا جو ناچ کے لئے مخصوص کی گئی تھی۔ اماثل بس کمینا مرد اور بزدل کہتا ہوا خود بھی نیچے آیا اور اب دربار کے اس عالیشان کمرے میں نغمہ و سرود کی جگہ فولاد سے فولاد ٹکرانے کی آوازیں گونجنے لگیں۔

حاضرینِ دربار خوف و حیرت سے فرعون کی طرف دیکھنے لگے اور منتظر ہوئے کہ دیکھئے بادشاہ کیا حکم دیتا ہے۔ لیکن فرعون اس خوفناک منظر کو دیکھ کر یا تو غش کھا گیا یا تخت کی پشت سے کمر کو سہارا دیے کر آنکھیں بند کئے اس طرح بیٹھا کہ گویا سو گیا۔ جب بادشاہ کی یہ کیفیت سب نے دیکھی تو لوگ ملکہ کی طرف متوجہ ہوئے کہ شاید وہ کوئی حکم دے لیکن وہ بھی خاموش رہی۔ لب سے لب جڑا تھا اور حیرت میں تھی کہ دیکھئے کیا انجام ہوتا ہے۔

رعمیس کو اس وقت کسی بات کا ہوش نہ تھا، بجز اس کے کہ اہلِ سیف اور شاہانِ سلف کی یادگار ہو کر وہ ایک بدخو سیاہ رو حبشی کے ہاتھ سے طمانچہ کھانا کیونکر گوارا کر سکتا ہے۔ رعمیس کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی اور اب اس کی آنکھوں نے لبوں میں خون اُتر آیا تھا ایک بار خفی نگہ میں نیفرطیبہ کی خوبصورت آنکھوں کو دیکھا کہ فتح و فیروزمندی کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ ملکہ کی نگاہ دیکھتے ہی رعمیس نے اماثل کی گردن پر جھپٹ کر ایسا وار کیا جیسے جنگل کا شیر جست کر کے شکار پر اپنا چنگل چلائے۔ لیکن ہاتھ گردن سے اونچا پڑا اور اماثل کے تاج کا ایک پر کٹ کر اڑتا ہوا زمین پر گرا۔ اماثل بھی تلوار کا دھنی تھا اور اس وقت طاقت بھی اسی میں حالتِ جنون کی سی پیدا ہو گئی تھی اور تلوار بھی اس کی رعمیس کی تلوار سے زیادہ لمبی تھی۔ اماثل کا وار رعمیس کی زرہ نے روکا اور وہ پیچھے ہٹا۔ اماثل کی دوسری ضرب رعمیس کے شانہ پر پڑی اور شانہ سے اچٹ کر گھٹنے پر آئی۔ اماثل نے تیسرا وار کیا جس سے رعمیس کی ران پر زخم پہنچا اور خون بہنے لگا۔ یہ دیکھ کر رعمیس کے دستۂ فوج کا ایک سپاہی للکارا تاکہ اپنے افسر کی ہمت بڑھائے۔ اس پر اماثل سے اس کے حبشی سردار چیخ چیخ کرنے لگے کہ اس دشمن سؤر کا گلا کاٹ دیجئے۔

رعمیس زخم کھا کر ہوشیار ہوا۔ جھک کر ایک دفعہ دشمن پر جھپٹا۔ تلوار کا ایک ہاتھ لگایا۔ وار ٹھیک پڑا تھا لیکن اماثل کی زرہ نے لمبے لبے کار ثابت کیا۔ رعمیس نے پھر جوش میں آ کر ایک ہاتھ مارا اور اب اماثل کا خون بہتے ہوئے سب نے دیکھا۔ اماثل نے بھی وار کیا۔ رعمیس جھک گیا اور وار خالی گیا اور اسی حالت میں یک لخت اچھل کر پوری طاقت سے دشمن کے سینے میں اپنی تلوار بھونک دی، اس طرح کہ اس کی نوک پشت سے باہر نکل آئی۔ ایک لمحہ کے لئے اماثل کھڑا رہا۔ پھر دفعتہً زمین پر گرا اور گرتے ہی ٹھنڈا ہو گیا۔

اتنا دیکھتے ہی حبش کے فوجی سردار ہاتھوں میں برچھے تول تول کر اپنے شہزادے کے خون کا بدلہ لینے رعمیس کی طرف بڑھے۔ رعمیس مجبور ہوا، دوڑ کر اپنے دستۂ فوج میں چلا گیا۔ حبشی فوراً اس دستہ پر ٹوٹ پڑے اور اب شدت سے ہنگامۂ قتل برپا ہوا۔ حبش کے سپاہیوں اور فرعون کے فوجیوں میں باپ دادا کے وقت سے جانی دشمنی چلی آتی تھی۔ فریقین میں کوئی بیچ بچاؤ کرانے والا نہ تھا۔ فوج محافظ کے سرداروں کے سوا باقی اہلِ دربار میں کوئی مسلح نہ تھا۔ خوں ریزی سخت ہوئی۔ حبش والوں کا اب کوئی سردار نہ تھا اور رعمیس کے ساتھ اس وقت طیبی کے مشہور جنگ آزما موجود تھے۔

آخر کار حبشیوں میں کوئی کاری زخم کھا کر یہاں گرا کوئی وہاں، آخر میں صرف تین آدمی زندہ بچے اور انہوں نے ہتھیار پھینک کر امان طلب کی۔ اب رعمیس کی سمجھ میں آیا کہ اس نے کیا کیا۔ سر جھکائے خون آلودہ تلوار ہاتھ میں لئے شہ نشین کی سیڑھیوں پر چڑھا اور تخت فرعون کے سامنے زمین بوس ہو کر عرض کیا:

مستاہا! میں نے اپنی بے عزتی اور دولت مصر کی توہین کا انتقام لیا۔ اب میرے قتل کا حکم ہو۔"

لیکن بادشاہ نے کچھ جواب نہ دیا۔ کیونکہ اس پر ابھی تک غشی کی حالت طاری تھی۔ یہ دیکھ کر رعمیس ملکہ نیطرطیبہ سے مخاطب ہو کر عرض کرنے لگا۔

"ملکہ عالم! میرے قتل کا حکم صادر فرمائیں۔"

نیطرطیبہ اس وقت تک پتھر کی مورت بنی یہ کل حالات دیکھتی رہی تھی۔ رعمیس کی درخواست سن کر قالب بے جان میں کچھ جان آئی۔ شروع سے جس بات کا خوف تھا وہ دور ہوا اب کون اس کو اس کالے حبشی سے شادی کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ رعمیس نے تو اس کا کام ہی تمام کر دیا' سامنے شاہی لباس میں اس کا مردہ جسم پڑا تھا اور گرد اس کے حبشی سرداروں کی لاشیں جیسے جنگل میں درخت کٹے پڑے ہوں' کچھ بھی نہیں۔ مقتضائے بشریت یہی تھا کہ نیطرطیبہ ایک مصیبت سے نجات پانے پر رعمیس کو دل میں دعائیں دینے لگی۔

(ترجمہ)

خواجہ منظور حسین

بپتا

شام کا جھٹپٹا، گیلی برف کے بڑے بڑے گالے بازار کے لیمپوں کے جو ابھی جلائے گئے ہیں، ارد گرد دھیمی رفتار سے گھوم رہے ہیں، چھتوں، گھوڑوں کی پیٹھ پر، بازوؤں پر، ٹوپیوں پر برف کی نرم تہ جمی ہوئی ہے۔ گاڑی بان ایونا، بھوت کی طرح سفید براق، کوچ بکس پر بے حس و حرکت گٹھڑی بنا بیٹھا ہے۔ بس زیادہ سے زیادہ جھکنا انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر برف کے تودے کے تودے اس پر آ پڑیں تب بھی انہیں جھٹکنا ضروری نہیں سمجھے گا۔ اس کی سوکھی سہمی گھوڑی بھی، سفید و ساکت ہے۔ اس کے سکوت جسم کے پیچ و خم اور بانس کی سی سیدھی ٹانگوں کو دیکھ کر اس پر ٹکے کی مٹھائی کے گھوڑے کا شبہ ہوتا ہے۔ شاید کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ جس غریب کو ہل بکھرے، ان دیہاتی مناظر سے جو اس کی آنکھوں میں بسے ہوتے ہیں، زبردستی چھڑا کر اس جنجال میں پھنسا دیا جائے جہاں ڈراؤنی روشنیاں، غل غپاڑہ، لوگوں کی لگاتار ان تھک دوڑ دھوپ ہو، وہ سوچ میں کیسے نہ پڑے۔

ایونا اور اس کی گھوڑی کو ایک جگہ سے ہلے بہت دیر ہو گئی تھی۔ دوپہر سے پہلے نکلے تھے اور اب تک ایک سواری نہیں ملی۔ شہر پر شام کی تاریکی چھا رہی ہے، بازار کے لیمپوں کی دھندلی روشنی تیز ہو رہی ہے اور سڑک کا شور و شغب بڑھ رہا ہے۔

"وائی برگ اسکایا کے لئے گاڑی!" ایونا کے کان میں آواز آتی ہے: "گاڑی!"

ایونا چونک پڑتا ہے اور اپنی برف سے ڈھکی ہوئی پلکوں میں سے ایک افسر کو دیکھتا ہے جو بڑا فوجی کوٹ پہنے کھڑا ہے "وائی برگ اسکایا کو!"

افسر پھر کہتا ہے: "سو رہے ہو؟ وائی برگ اسکایا کو!"

افسر کی بات سمجھ کر ایونا باگ کو جھٹکا دیتا ہے۔ برف کے ٹکڑے گھوڑی کی پیٹھ اور رپٹھوں پر سے ہوا میں اڑتے ہیں۔ افسر گاڑی میں بیٹھ جاتا ہے۔ گاڑی بان گھوڑے کو للکارتا ہے، بطخ کی طرح گردن آگے کو نکالتا ہے، اپنی جگہ پر اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے حالانکہ اس کی ضرورت نہیں ہے مگر عادت کے مطابق چابک چٹخاتا ہے۔ گھوڑی گردن آگے کو نکالتی ہے، اپنی بانس کی سی ٹانگیں سکیڑتی ہے اور بادل ناخواستہ چلنے لگتی ہے۔

تاریکی کے انبار میں سے جو اس کے سامنے ادھر سے ادھر گردش کر رہا ہے۔ ایونا کے کان میں چیخوں کی آواز آتی ہے: "شیطان کہاں گھسا چلا آتا ہے، کدھر چلا پڑتا ہے۔ د — دائیں کو چل!"

"تمہیں چلانا نہیں آتا۔ دائیں کو چلاؤ" افسر بگڑ کر کہتا ہے۔

ایک کوچوان جو کسی کی ذاتی گاڑی چلا رہا ہے، اسے جھڑکتا ہے۔ سڑک پار کرتے ہوئے ایک راہگیر کے شانے گھوڑی کی ناک سے رگڑ کھاتے ہیں وہ اس کی طرف غصہ کی نظروں سے دیکھتا ہے اور اپنی آستین جھٹکتا ہے۔ ایونا کبس پر اس طرح پہلو بدلتا ہے جیسے کانٹوں پر ہے۔ کہنیاں ہلاتا ہے اور چاروں طرف مبہوت ہو کر کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے کہ کہاں ہوں اور یہاں ہوں کیوں ہوں۔

"یہ سب لوگ کتنے بدمعاش ہیں" افسر ازراہ تمسخر کہتا ہے۔ "پوری کوشش کرتے ہیں کہ تمہارے راستے میں حائل ہوں یا گھوڑی کے پاؤں سے کچلے جائیں۔ ضرور جان بوجھ کر یہ شرارت کرتے ہیں۔"

ایونا اپنی سواری کی طرف دیکھتا ہے اور اپنے ہونٹ ہلاتا ہے۔ بظاہر کچھ کہنا چاہتا ہے مگر سوائے سوں سوں کے منہ سے کچھ نہیں نکلتا۔

"کیا کہا؟" افسر پوچھتا ہے۔

ایونا کھسیانا ہو کر مسکراتا ہے اور گلے پر زور ڈال کر روکھی آواز سے بمشکل یہ لفظ ادا کرتا ہے۔ "میرا لڑکا...... میرا لڑکا اس ہفتے گذر گیا حضور؟"

"ہوں! کیا شکایت تھی؟"

ایونا پوری طرح سواری کی طرف پلٹ کر کہتا ہے:

"خدا جانے بخار ہو گا۔ تین دن ہسپتال میں پڑا رہا۔ اس کے بعد گذر گیا۔ جو خدا کی مرضی۔"

"شیطان مڑ کر دیکھ!" اندھیرے سے آواز آتی ہے۔ "کتے باؤلا ہو گیا ہے؟ آنکھیں کھول کر دیکھ، کدھر چلا جا رہا ہے؟"

"چلے چلو، چلے چلو۔" افسر کہتا ہے۔ "اس رفتار سے کل تک بھی نہیں پہنچ سکتے، تیز چلو۔"

گاڑی بان پھر گردن آگے کو نکالتا ہے۔ اپنی جگہ اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ چابک گھماتا ہے، کئی بار پھر کر افسر کی طرف دیکھتا ہے۔ افسر نے آنکھیں میچ لی ہیں اور بات چیت کرنا نہیں چاہتا۔

وائی برگ اسکایا پر سواری کو اتار کر ایونا ایک قہوہ خانے کے پاس گاڑی کھڑی کرتا ہے اور پھر سکڑ کر کبس پر بیٹھ جاتا ہے۔ ایک گھنٹہ گذرتا ہے، پھر دوسرا......

تین نوجوان دو کشیدہ قامت اور دبلے پتلے، ایک پستہ قد اور کبڑا ایک دوسرے پر فقرے کستے، اپنے برساتی جوتے پہنے، کھٹ کھٹ کرتے ہوئے اس طرف آتے ہیں۔

"گاڑی بان! پولیس کے پل کو چلو" کبڑا جھوجری آواز میں چلاتا ہے۔ "تینوں کے بیس کوپک۔" ایونا باگ کھینچتا ہے اور گھوڑی کو للکارتا ہے۔ اصل کرایہ بیس کوپک سے زیادہ ہوتا ہے مگر اسے اس کا خیال نہیں، ایک روبل ہو یا پانچ کوپک، اس کی پروا نہیں، بس سواری مل جائے۔

تینوں آدمی ایک دوسرے کو دھکیلتے، بدزبانی کرتے گاڑی کی طرف آتے ہیں اور تینوں یہ کوشش کرتے ہیں کہ ایک ساتھ بیٹھ جائیں۔ تصفیہ طلب سوال یہ ہے کہ کون سے دو بیٹھیں اور کون کھڑا رہے۔ لمبے چوڑے بحث مباحثے، تو تو میں میں، گالی گلوچ کے بعد یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ کبڑا کھڑا رہے کیونکہ وہ سب سے مختصر ہے۔

"چلو!" کبڑا کھڑا ہو کر کہتا ہے۔ ایونا کی پیٹھ پر اس کا سانس محسوس ہوتا ہے۔ "فر فٹ ہو جاؤ دوست! تمہاری ٹوپی عجیب و غریب ہے۔ اس سے رذی ٹوپی سارے پیٹر برگ میں ڈھونڈے نہیں ملے گی۔"

"ہی ہی ہی ہی ہی!" ایونا ہنستا ہے۔ "بس گذارے کے لائق ہے۔"

"خیر جناب گذارے کے لائق، ذرا تیز چلئے۔ تمام راستے اسی چال سے چلوگے۔ کیوں؟ دوں تان کر ایک چٹاخا؟"

"میرا سر پھٹا جاتا ہے۔" کشیدہ قامت نوجوانوں میں سے ایک کہتا ہے۔ "دوکا سوف کے ہاں کل ماسکا اور میں مل کر برانڈی کی چار بوتلیں اڑا گئے۔"

"سمجھ میں نہیں آتا تم اتنی بکواس کیوں کرتے ہو؟" دوسرا کشیدہ قامت نوجوان خفا ہو کر کہتا ہے۔ "وحشیوں کی طرح جھوٹ بکتے ہو۔"

"اپنی جان کی قسم سچ کہتا ہوں۔"

"یہ ایسا ہی ہے جیسے یہ کہنا کہ جوں کھانستی ہے۔"

"ہی ہی۔" ایونا ہنستا ہے۔ "صاحب لوگ مذاق کرتے ہیں۔"

"مردود!" کبڑا غصے میں آ کر چیختا ہے، چلاتا ہے۔ "ملعون، نہیں، گاڑی یوں چلائی جاتی ہے؟ چلانے کا یہ طریقہ ہے؟ لگا ایک چابک، کم بخت کی چابک سے خبر لے۔"

ایونا کو اپنے پیچھے کبڑے کے ہلنے جلنے اور کانپتی ہوئی آواز کا احساس ہوتا ہے۔ وہ سنتا ہے کہ مجھے گالیاں دی جا رہی ہیں۔ لوگوں کو دیکھتا ہے اور تنہائی کا بوجھ اس کے دل پر سے ہلکا ہو جاتا ہے۔ کبڑا اسے برا بھلا کہتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے لمبے دار گرم گرم فقروں سے اس کے گلے میں پھندا پڑ جاتا ہے اور کھانسی اس کی زبان بند کر دیتی ہے۔ اس کے کشیدہ قامت رفیق نادیزدا پتروونا ایک عورت کا ذکر چھیڑتے ہیں۔ ایونا ایک طرف دیکھتا ہے تھوڑی دیر انتظار کر کے جب وہ باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتے ہیں تو پھر مڑ کر دیکھتا ہے اور کہتا ہے:

"اس ہفتے میرا لڑکا گزر گیا۔"

"سب کو ایک نہ ایک دن مرنا ہے۔" کبڑا ٹھنڈا سانس کھینچتا ہے اور کھانس کر ہونٹ پونچھتا ہے۔ "خیر تیز چلاؤ تیز، یار مجھ سے یہ چیونٹی کی چال نہیں دیکھی جاتی، نہ معلوم کب پہنچائے گا۔"

"ذرا اس کی ہمت بڑھاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لگاؤ گردن پر ایک ہاتھ۔"

"ملعون! سنتا ہے، مزا چکھا دوں گا۔ تم لوگوں کا لحاظ کرنے سے پیدل چلنا اچھا۔ بھتنے سنتا ہے، یا جو کچھ ہم لوگ کہہ رہے ہیں تیری جوتی کی نوک سے؟"

ایونا کی پیٹھ پر تھپڑ پڑتا ہے جس کا تڑاخا اسے چوٹ سے زیادہ سنائی دیتا ہے۔

"ہی ہی!" وہ ہنستا ہے۔ "صاحب لوگ مذاق کرتے ہیں خدا آپ صاحبان کو سلامت رکھے۔"

"گاڑی بان تمہاری شادی ہو چکی ہے؟" ایک کشیدہ قامت نوجوان پوچھتا ہے۔

"میری؟ ہی ہی! صاحب لوگ مذاق کرتے ہیں۔ اب گیلی مٹی ہی میری دلہن بنے گی ۔ ۔ ۔ ہو ہو یعنی خیر ۔ ۔ ۔ ذرا سوچو میرا بیٹا چل بسا اور میں بیٹھا کیسا موجود ہوں۔ عجیب معاملہ ہے۔ موت اٹکل پچو بے خبر گھس آتی ہے۔ میرے پاس آنے کے بجائے میرے لڑکے کو آ دبوچا۔"

ایونا مڑ کر انہیں اپنے بیٹے کی موت کا حال سناتا ہے۔ مگر یہاں پہنچ کر کبڑا ہلکی سی آہ بھر کر کہتا ہے: "شکر ہے منزل مقصود پر آ پہنچے۔" اپنے بیس کوپک دے کر ایونا دیر تک ان اوباشوں کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ وہ ایک اندھیرے پھاٹک میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ایونا کے لئے پھر وہی تنہائی، وہی ہو کا عالم چھا جاتا ہے۔ جو صدمہ گھڑی بھر کو ہلکا ہو گیا تھا، وہ پھر ابھر آتا ہے اور اس کے دل پر انتہائی شدت سے ٹوٹتا ہے۔ اس کی نظروں سے غم و اندوہ ٹپکتا ہے۔ وہ بے چین نگاہوں سے سڑک کے دونوں طرف لوگوں کی ریل پیل پر نظریں دوڑاتا ہے۔ کیا اس ہزاروں کے مجمع میں کوئی اللہ کا بندہ ایسا نہیں جو اس کی دکھ بھری کہانی سنے؟ لوگ اس سے، اس کے غم سے غافل گزرتے چلے جاتے ہیں۔ ۔ ۔ اس کا غم بے انتہا سخت، اندازے سے باہر ہے اگر اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور اس کا غم اس میں سے پھوٹ پڑے تو وہ تمام دنیا میں سیلاب کی طرح پھیل جائے۔ پھر بھی وہ کسی کو نظر نہیں آتا۔ اس نے ایک ایسے حقیر خول میں چھپنے کو جگہ نکالی ہے کہ دن کے وقت چراغ لے کر ڈھونڈو تب بھی نہ دکھائی دے۔

ایونا کی نظر ایک دربان پر پڑتی ہے جس کے ہاتھ میں ایک پلندہ ہے۔ وہ اس سے بات چیت کرنے کی ٹھانتا ہے۔

"ابھی کیا وقت ہوگا؟"

"دس بجا چاہتے ہیں...... یہاں کیوں کھڑے ہو آگے بڑھو!"

ایونا چند قدم آگے بڑھ جاتا ہے، اتنا جھکتا ہے کہ دوہرا ہو جاتا ہے اور اپنے غم میں ڈوب جاتا ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ لوگوں سے کسی قسم کی امید رکھنا بے فائدہ ہے۔ پانچ منٹ نہیں گذرتے کہ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ سر اس طرح ہلاتا ہے جیسے سخت درد میں مبتلا ہے اور باگ کھینچتا ہے۔ اب اس سے تکلیف نہیں سہی جاتی۔

"واپس اصطبل کو" اپنے دل میں کہتا ہے۔ "اصطبل کو"

گھوڑی اس کے خیالات کو تاڑ کر دلکی چلنے لگتی ہے۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد ایونا ایک غلیظ بڑے آتشدان کے پاس بیٹھا ہے۔ آتشدان پر، فرش پر، بنچوں پر لوگ پڑے خراٹے لے رہے ہیں۔ ہوا بڑی بسی ہوئی اور کثیف ہے۔ ایونا سونے والوں کی طرف آتا ہے۔ اپنا بدن کھجاتا ہے اور افسوس کرتا ہے کہ ناحق اتنے سویرے گھر واپس آیا۔ مزدوری سے دانے کے دام بھی نہیں نکلیں گے۔" سوچتا ہے "یہی وجہ ہے کہ میں اتنا غمگین ہوں۔ جو اپنا کام ٹھکانے سے کرتا ہے، جسے پیٹ بھر کر کھانے کو میسر ہے جس کے گھوڑے کو پیٹ بھر دانا ملتا ہے وہ ہمیشہ چین سے رہتا ہے۔"

ایک کونے میں سے ایک نوعمر گاڑی بان اٹھتا ہے، کچھ سوتے کچھ جاگتے کھنکھارتا ہے اور پانی کی بالٹی کا رخ کرتا ہے۔

"کچھ پیو گے؟" ایونا پوچھتا ہے۔

"معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"خدا راس لائے۔ بھئی دیکھو میرا بیٹا گذر گیا...... سنتے ہو؟ اس ہفتے ہسپتال میں..... عجیب معاملہ ہے۔"

ایونا دیکھتا ہے کہ اس کے لفظوں کا اثر کیا ہوا۔ مگر کچھ نظر نہیں آتا۔ نوجوان اپنا منہ لپیٹ کر سو جاتا ہے۔ بڈھا آہ بھرتا ہے اور اپنا بدن کھجاتا ہے..... جس طرح نوجوان کو پانی کی پیاس لگی اسی طرح وہ بات چیت کا پیاسا ہے۔ اس کے لڑکے کو مرے عنقریب ہفتہ بھر ہو جائے گا اور اب تک اسے کسی سے کھل کر باتیں کرنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ اس بارے میں ٹھکانے سے جی بھر کر باتیں کرنا چاہتا ہے۔ وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ میرا بیٹا کس طرح بیمار پڑا۔ اس نے کیا کیا تکلیفیں اٹھائیں، مرتے دم کیا کہا، کیونکر مرا...... وہ چاہتا ہے کہ جنازے کا حال سنائے اور بتائے کہ کیونکر اپنے لڑکے کے کپڑے لینے ہسپتال گیا۔ اس کی لڑکی انیسیا دیہات میں رہتی ہے..... وہ چاہتا ہے کہ اس کا بھی ذکر کرے..... ہاں اب اسے بہت کچھ کہنا سننا ہے۔ جس سے وہ باتیں کرے اسے چاہیے کہ ٹھنڈی آہیں بھرے، تعجب کا اظہار کرے اور اس کے سوگ میں شریک ہو..... اگر عورتیں بات کرنے کو مل جائیں اور بھی اچھا ہو۔ گو وہ بے وقوف ہوتی ہیں اور بات شروع نہیں ہوتی کہ بسورنے لگتی ہیں—— "چلیں، گھوڑی کو ایک نظر دیکھ آئیں؟" ایونا سوچتا ہے "سونے کے لیے بہت وقت پڑا ہے نیند کہیں نہیں گئی۔"

کوٹ پہن کر گھوڑی کے تھان میں داخل ہوتا ہے، اسے دانے چارے موسم کا خیال آتا ہے..... تنہائی میں وہ اپنے لڑکے کا خیال نہیں کر سکتا ہے..... کسی اور سے اس کا ذکر کر سکتا ہے..... مگر اس کا خیال کرنا اور تصور باندھنا، یہ اذیت اس کی برداشت سے باہر ہے......

"دانہ چار رہی ہو؟" اپنی گھوڑی کی روشن آنکھیں دیکھ کر پوچھتا ہے۔ "اچھا جگالی کیے جاؤ..... کیے جاؤ..... دانے کے لیے کافی مزدوری نہیں ملی تو نہ سہی، گھاس کھا کر رہیں گے...... ہاں میری عمر اب گاڑی چلانے کی نہیں رہی، اب میرا نہیں میرے لڑکے کا کام سنبھالنے کا وقت تھا..... وہ پورا گاڑی بان تھا..... اسے کچھ دن اور جینا تھا۔" ایونا تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو جاتا ہے پھر کہتا ہے "بیٹی بات یہ ہے..... کزما ایونچ چل بسا..... مجھ سے رخصت ہو گیا۔ بلا وجہ اچانک جان دے دی..... اچھا یوں سمجھو کہ تمہارا ایک بچھیرا ہے اور تم اس ننھے سے بچھیرے کی ماں ہو..... اور یکایک وہ بچھیرا مر جائے..... تو تمہیں اس کا رنج ہوگا کہ نہیں؟"

گھوڑی منہ چلاتی ہے سنتی ہے اور اپنے مالک کے ہاتھوں پر سانس لیتی ہے، ایونا کا دل بھر آتا ہے اور وہ اس کے سامنے اپنا دل چیر کر رکھ دیتا ہے۔

(ترجمہ)

منصور احمد

کیڈور کا مصوّر

لڑکے کی آنکھیں ان بیریوں کے قلوب کی طرح سیاہ تھیں جن کا ایک انبار وہ اٹھائے ہوئے تھا، اور وہ مشتاقانہ اس سوار پر جمی ہوئی تھیں جو اپنے گھوڑے کو شاہراہ پر اڑائے لئے جا رہا تھا۔

اس نے کہا: "کیٹرینا ذرا دیکھنا! یہ شخص شہر کو جا رہا ہے، حیرت انگیز شہر کو۔"

کیٹرینا نے اپنے بھائی کی طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ اس کی بات نہیں سمجھی۔ اس سڑک پر جو ان کے گاؤں سے جنوب کی طرف جاتی تھی، بہت سے قصبے آباد تھے جنہیں یہ پہاڑی لڑکی کافی بڑا سمجھتی تھی۔ لیکن اس نے اپنے بھائی کی طرح انہیں حیرت انگیز کبھی خیال نہ کیا تھا۔

لڑکی نے کہا: "حیرت انگیز شہر؟ ٹیزیانو! حیرت انگیز شہر کہاں ہے؟"

اس نے متعجب ہو کر کہا: "کیوں تمہیں معلوم نہیں؟ اور کیا سینٹ مارک کے عظیم الشان شہر وینس کے علاوہ بھی کسی شہر کو حیرت انگیز کہا جا سکتا ہے؟"

مگر وینس کے نام نے سیاہ چشم کیٹرینا پر کچھ زیادہ اثر نہ کیا۔ وہ عمر میں اپنے بھائی سے بڑی تھی اور اس کی طرح موہوم باتوں کے خواب نہ دیکھا کرتی تھی۔ اس نے سُنا تھا شہر میں اکثر خوفناک واقعات رونما ہو جایا کرتے ہیں اور بعض اوقات لوگوں کو وہاں فاقے بھی کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے برعکس اس پہاڑی علاقہ میں کھانے پینے کا سامان کافی سے زیادہ تھا اور اگرچہ کوئی بھی یہاں اتنا امیر نہ تھا جس کے قبضے میں خوبصورت محلات اور پر تکلف ساز و سامان ہو، لیکن بہت غریب بھی کوئی نہ تھا۔ اس نے اپنے کندھوں کو ذرا سا سکیڑ کر جواب دیا: "وینس! میں نہیں جانتی تم کیوں اسے حیرت انگیز کہتے ہو۔ گریزیانو بولا! بہت دفعہ وہاں گیا ہے مگر وہ کہتا ہے کہ اس میں ہمارے کیڈور سے آدھا حُسن بھی نہیں ہے۔ نہ وہاں پہاڑ ہیں اور نہ مرغزار جہاں پھول کھلتے ہیں۔ ٹیزیانو! کیا تم یہاں سے تنگ آ گئے ہو؟"

"آہ! نہیں! یہ نہیں! لیکن شہر میں مصوّر رہتے ہیں اور اگر میں وہاں جا سکوں تو ان کے فن کا مطالعہ کروں اور بعض ایسی تصویریں بناؤں جن کی آرزو میرے دل ہی میں ہے۔"

کیٹرینا ایک عملی دیہاتی لڑکی تھی جس کا خیال تھا کہ اگر کسی کے پاس کھانے اور پینے کے لئے کافی ہو تو اسے مطمئن ہو جانا چاہئے۔ اسی لئے جب وہ بولی تو اس کا لہجہ ملامت آمیز تھا اور ذرا تیز بھی۔

"یہ جو تم ہر وقت مصوری کی باتیں کرتے رہتے ہو اور ان چیزوں کو دیکھنے کے لئے بیتاب رہتے ہو جنہیں اور کوئی بھی نہیں دیکھتا تو لوگ کہتے ہیں کہ جب تک تم یہ دن رات کے خواب دیکھنے نہ چھوڑ دو گے تم کوئی کام نہیں کر سکو گے۔ اسی لئے والد تمہیں لوئگی بروچی کے پاس شاگرد کرانے کا دھیان کر رہے ہیں۔ کم از کم وہ تمہیں اپنے فن میں ماہر تو بنا سکتا ہے اور یہ تمہارے لئے ہر وقت وینس کے متعلق سوچتے رہنے سے بدرجہا بہتر ہوگا۔"

ٹیزیانو نے اپنے سر کو جنبش دی لیکن زبان سے کچھ نہ کہا۔ اسے اپنے مقصد کے سامنے کسی دوسری بات کی ذرا بھی پروا نہ تھی۔ اکثر راتوں کو جب گھر کے سب لوگ سو جاتے وہ اپنے بستر میں جاگ جاگ کر سوچا کرتا کہ کس طرح وہ اپنے باپ کو اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ اسے مصوری کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے شہر جانے کی اجازت دے دے۔ گاؤں میں سب جانتے تھے کہ وہ تختوں، پتھروں اور ہر اس چیز پر جو اس کے سامنے آجاتی، تصویریں بنانے میں گھنٹوں صرف کر دیا کرتا ہے، اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ گاؤں کا نیک دل پادری اس کے کام کی تعریف کیا کرتا ہے۔ لیکن اس کی ان کے نزدیک کچھ زیادہ اہمیت نہ تھی۔ کیڈور کے دوسرے لڑکے بھی اسی طرح تصویریں بناتے تھے اور انہیں کوئی پوچھتا نہ تھا۔ آخر اسے کیوں شہر بھیجا جائے؟ صرف اس لئے کہ وہ ایک پہاڑ کا نقشہ خیال سے اتار سکتا ہے، یا جنگل کی تصویر کسی حد تک بنا لیتا ہے؟ ان کی اس بے توجہی کی وجہ یہ تھی کہ وہ کسی طرح بھی انہیں یہ سمجھانے میں کامیاب نہ ہوتا تھا کہ رنگ وہی چیز ہے جس نے اس کی روح میں ایک آگ لگا رکھی ہے اور مرمے کے قلم سے اس کا اظہار ناممکن ہے۔

نیچے سڑک پر ایک سیٹی کی آواز سنائی دی اور کیٹرینا نے دیکھا کہ اس کا بھائی فرانسسکو انہیں جلد اپنے پاس بلا رہا ہے۔

کیٹرینا نے کہا: "وہ شاید ہار گوندھنے کے لئے تیار ہو چکے ہیں۔"

اس کے بعد دونوں گاؤں کی سرائے کی طرف دوڑ پڑے۔

کوہستان اطالیہ میں یہ جون کا روشن اور معطر مہینہ تھا۔ جب ڈولومی کی زرخیز وادی کے ٹیلے اور میدان رنگا رنگ پھولوں کا ایک گلدستہ بن جاتے ہیں کل پھولوں کا میلہ آ رہا تھا۔ اسی لئے آج انہوں نے پھول چننے میں کئی گھنٹے گذار دیئے تھے اور اب کہ غروب ہوتا ہوا آفتاب چوٹیوں کو ارغوانی رنگ دے رہا تھا وہ اپنی تاخت و تاراج کو لے کر واپس جا رہے تھے تاکہ اس سے اپنے عیش و مسرت کی تیاری میں مدد لیں۔

ذرا سی دیر میں وہ اپنے نوخیز ساتھیوں سے جا ملے۔ سب نے ... اور کل کے کھیلوں کے متعلق تجویزیں سوچنے لگے۔ کیڈور کا گاؤں ان دنوں ذرائع آمد و رفت کی کمی کے باعث دنیا سے بہت دور تھا اور جب کبھی کوئی تیوہار آتا تھا تو وہاں کے باشندے اپنے سیدھے سادے کھیلوں میں اتنے ہی خوش ہوتے تھے جتنے کہ وینس کے رہنے والے اپنے نئے نئے تماشوں کو دیکھ کر لطف اندوز ہوں، ہر طرف سے گیتوں اور قہقہوں کی آوازیں آتی تھیں اور مشتاق سامعین کے لئے جھوٹی سچی دلچسپ باتیں کہی جاتی تھیں۔

ایک لڑکی نے جس کی زبان اس کی چالاک انگلیوں سے بھی تیز چلتی تھی، کہا: "کچھ تم نے سنا، چکی والے کا لڑکا سالو ٹیر سنگ تراشی کا فن سیکھنے کے لئے وینس جا رہا ہے۔ جب سے اس کا باپ امیر ہو گیا ہے، اس نے اس سے اپنا کاروبار کرانے کا خیال چھوڑ دیا ہے۔ پہلے تو سالوٹیر نے اس طرف دھیان ہی نہ کیا لیکن جب اسے بتایا گیا کہ ایک سنگتراش کسی بہت بڑے نواب کا مقرب بھی ہو سکتا ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔ اگر وہ ایک بڑا آدمی بن گیا اور ایک نفیس مکان میں رہنے لگا تو یہ کیسی شاندار بات ہوگی۔ پھر ہم کہا کریں گے، ہاں ہاں وہ ہمارے ہی گاؤں کا آدمی ہے۔"

سیبستیانو جس کا چچا برگیمو میں کسی وکیل کا منشی تھا اور جو شہر کی باتوں سے دوسرے بچوں کی نسبت زیادہ واقف تھا، بولا: "میں تو نہیں سمجھتا کہ اسے سنگتراشی کا کچھ شوق ہو۔ میرے خیال میں مشاق بننے کے لئے امیر باپ کے علاوہ کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہے۔"

باقی لڑکی نے اپنے سر کو ہلایا پھر بولی یہ سچ ہے! مگر روپیہ بھی نہ ہو اور استاد بھی نہ ملے تو بتاؤ کوئی کیسے کچھ کر سکتا ہے؟"

کیٹرینا نے کہا "یہ سو اب اگر ٹیزیانو نے مصوری سیکھنے کے لئے شہر جانے کا نام لیا تو میں اس سے کہہ دوں گی کہ والدا تنے امیر نہیں ہیں کہ تمہارا خرچ برداشت کر سکیں اس لئے بہتر یہی ہو گا کہ تم لوگی سے مرچی کا کام سیکھنے کا خیال نہ کرو۔"

اس پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے اور کسی نے کہا "ٹیزیانو! اس نے تو کبھی کسی سے ایک دفعہ اصلاح نہیں لی۔ وہ تو بنیاد اٹھائے بغیر قلعے کے برج بنانے شروع کر دیتا ہے۔"

ٹیزیانو کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ یہ سچ تھا کہ اسے کبھی استاد میسر نہ آیا لیکن اسے یقین تھا کہ اگر اسے موقع دیا جائے تو وہ اپنے آپ کو اس قابل ثابت کر دے گا کہ اس کے لئے ایک استاد کی خدمات حاصل کی جائیں۔

اس نے دل میں سوچا "کاش مجھے کچھ رنگ مل جائیں! ممکن ہے پھر یہ لوگ مجھے وہمی نہ سمجھیں، کیونکہ مجھے یقین ہے کہ میں ان سے ایک اعلیٰ درجہ کی تصویر بنا سکوں گا اور پھر شاید میں اپنے مقصد کے حصول کے لئے مدد بھی پا سکوں۔"

لیکن رنگ کمیاب اور بیش قیمت تھے اور گو اس کا باپ ایک آسودہ حال شخص تھا، تاہم وہ ایک ایسے لڑکے کے لئے رنگ خرید کر اپنا روپیہ ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا جسے کبھی ان کا استعمال نہ سکھایا گیا ہو۔

دوسرے دن نوخیز مصور کو راستے کے پتھروں پر کچھ داغ نظر آئے جو پھولوں کے روندے جانے سے وہاں پڑ گئے تھے۔ یہ داغ ایسے صاف اور روشن تھے جیسے کسی مصور نے انہیں بڑی احتیاط سے بنایا ہو۔ ان کو دیکھ کر اسے ایک خیال سوجھا۔ اس نے یہ خیال کسی پر ظاہر نہ کیا۔ وہ اس میں اتنا محو تھا کہ سبزہ زار پر رنگ برنگ کے لباس پہن کر رقص کرنے والے دیہاتی بھی اسے اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے اور جیسے ہی اسے موقع ملا وہ چپکے سے ان میں سے نکل کر پھولوں کے کھیتوں کی طرف چل دیا۔

کیٹرینا نے اسے جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ حیران تھی کہ اس مسرت و انبساط کے مجمع میں سے کون سی چیز اسے لے جا رہی ہے۔ جب اس کی حیرت تفریح کی خواہش سے بڑھ گئی تو وہ بھی اس کے پیچھے روانہ ہو گئی۔ جب وہ اس کے پاس پہنچی تو وہ ایک ایسی پہاڑی پر کھڑا تھا جسے پھولوں نے روشن کر رکھا تھا۔

وہ بولی "ٹیزیانو! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

لڑکے نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شک جھلک رہا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ گو میری بہن کو میری بلند پروازیوں پر اعتراض ہے پھر بھی وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور میرے راز کو فاش نہیں کرے گی۔

اس نے جواب دیا "میں ایک رنگین تصویر بنا رہا ہوں۔"

ایک لمحے کے لئے وہ کھڑی اسے دیکھا کی۔ پھر یہ سوچ کر کہ وہ اسے بہکا رہا ہے، کہنے لگی "یہ ہاں کیوں نہیں، رنگوں کے بغیر!"

لیکن اس کا متین چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ مذاق نہیں کر رہا ہے۔

اس کی آنکھیں ایک عجیب روشنی سے چمک رہی تھیں۔ جب اس نے کہا "میں رنگوں کی جگہ پھولوں کا استعمال کروں گا۔ دیکھو ان میں سب رنگ موجود ہیں اور مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ یہ کام میں لائے جا سکتے ہیں میں نے ان کے نشان راستے کے پتھروں پر دیکھے ہیں۔"

کیٹرینا اپنے بھائی کی طرح موہوم خیالات میں کھو نہیں جایا کرتی تھی اور کہیں رنگ کے ایک دھبے کو دیکھ کر اسے تصویریں نظر نہیں آیا کرتی تھیں۔ لیکن اس نے سمجھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے، ناممکن نہیں ہے۔ کیونکہ اس نے خود بھی ——— پتھروں پر رنگ کے نشانات دیکھے تھے۔ اب اسے یہ بھی خیال آیا کہ اس کا بھائی ضرور ایک ہوشیار اور زیرک لڑکا ہے۔ کیونکہ عام لڑکوں کو یہ بات ذرا بھی نہیں سوجھی اور اس نے سوچا کہ شاید اس کی وینس جانے کی خواہش کوئی بے سروپا خیال نہیں ہے۔ اگر چکی والے کے بیٹے سالویٹر کے لئے سنگتراش بن جانا ایک شاندار بات ہو سکتی ہے تو کیا ٹیزیانو کا ایک

مصور بن جانا شاندار تر نہیں؟ اور کیا کیٹرینا اس پر فخر نہیں کر سکتا؟ پادری کو اس نے اکثر کہتے سُنا تھا کہ کوئی کام ایسا نہیں جس کی دھن انسان کو لگی ہو اور پھر اسے صبر، حوصلے اور استقلال سے کیا جائے اور ناکامی ہو۔ اور یہ کہ خدا ہمیشہ ان کو ملتی ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں چنانچہ اس نے ٹیزیانو کو مدد دینے کا فیصلہ کر لیا خواہ وہ اسی قدر کیوں نہ ہو کہ اس کے راز کی حفاظت کی جائے اور اس کے کام کے لئے ضروریات مہیا کی جائیں۔ سو مہکتے ہوئے غلطوں میں سے وہ رنگ رنگ کے پھول اکٹھے کرتے پھرے۔ سُرخ، گلابی، نیلے، ارغوانی جیسے کوہستان کی شفق کا رنگ ہوتا ہے اور پیلے اور سنہری جیسے وہ اپنے تصور میں دیکھا کرتے تھے۔ پھر وہ اس پرانے پتھر کے بنے ہوئے مکان کی طرف اٹھ بھاگے جو ان کے باپ کی ملکیت تھا۔ یہ بالکل خالی رہتا تھا۔ ان کے اپنے گھر والے لوگ بھی یہاں شاذ و نادر ہی آیا کرتے تھے اور گاؤں کے رہنے والے تو اس میں کبھی داخل ہی نہ ہوتے تھے۔ اور یہیں ہر دست اندازی سے محفوظ ہو کر اسے وہ تصویر بنانی تھی جس کے متعلق دونوں بہن بھائیوں کو امید تھی کہ وہ اسے وینس لے جانے کا ایک ذریعہ ثابت ہوگی۔

کیٹرینا پاس رہ کر تصویر کو بنتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی لیکن ٹیزیانو کو اس پر اعتراض تھا۔ اس نے کہا "جب تک یہ ختم نہ ہو لے میں نہیں چاہتا کہ تم بھی اسے دیکھو۔ کیونکہ اوّل اوّل اس کی شکل تصویر جیسی نہیں ہوگی۔"

چنانچہ وہ اسے کوئلے کے ایک ٹکڑے سے خاکہ بناتے ہوئے چھوڑ کر چلی گئی۔

کئی دن تک لوگوں سے چھپ چھپا کر وہ اس مکان میں جاتا رہا اور پھولوں کے رنگوں سے تصویریں بناتا رہا۔ کیٹرینا پرندوں کی طرح اڑتی ہوئی گلزاروں میں جاتی اور پھر ادھر اُدھر نگاہ ڈال کر کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا، اس کھڑکی میں سے پھول اپنے بھائی کے حوالے کر دیتی جس کے قریب بیٹھ کر وہ کام کر رہا تھا اور اگرچہ پھول کی ہر پتی تصویر پر صرف ایک ننھا سا دھبہ بنا کر خشک ہو جاتی اور اگرچہ ٹیزیانو ایک ملہم غیبی کی سی تیزی کے ساتھ تصویر پر رنگوں کو پھیلاتا جاتا لیکن اسے ایک مرتبہ بھی پھولوں کے انتظار میں ہاتھ روکنا نہ پڑا۔

تصویر اس کے سحر آسا قلم کے نیچے بتدریج نمایاں ہوتی گئی اور اس نے اور کیٹرینا نے اپنے راز کی خوب پاسداری کی۔ صرف ڈھوروں کے گلے جو بھٹکتی ہوئی چراگاہوں میں چرتے ہوئے کبھی کبھی اس سنسان مکان تک جا پہنچتے۔ چنانچہ کسی کو بھی علم نہ ہو سکا کہ یہاں وہ لڑکا مصروف کار ہے جو اٹلی کے نام کو چار چاند لگا دے گا۔ گاؤں کے لوگوں کو خواب و خیال بھی نہ تھا کہ یہ پھول جو کیٹرینا چن رہی ہے، ایک غیر فانی کام میں استعمال ہو رہے ہیں۔

ایک شام جب سورج پہاڑ کی چوٹیوں کے پیچھے غائب ہو رہا تھا اور گھروں کو واپس جاتے ہوئے گڈریوں کی خوشی سے لبریز آوازیں بلندیوں سے نیچے گونج رہی تھیں، ٹیزیانو نے اس مکان کے دروازے سے باہر قدم رکھا اور بہن کو اپنے پاس بُلا کر کہا۔

"کیٹرینا! تصویر ختم ہوگئی اور یہ میری بہترین تصویر ہے۔"

وہ خوشی سے اچھلتی ہوئی اندر گئی۔ لیکن جب وہ تصویر کے سامنے جا کر کھڑی ہوئی تو مسرت اس کے چہرے سے رخصت ہوگئی اور وہ احترام آمیز لہجے میں بولی "او ٹیزیانو! یہ تو مقدس مریم کی تصویر ہے۔"

اس نے کہا "ہاں مریم اور بچے کی۔ اور ایک میری طرح کا لڑکا تحفہ پیش کر رہا ہے۔ کیٹرینا یہی تصویر میرے دل میں تھی۔"

چند لمحوں کے لئے وہ تصویر کے حسن میں ایسی محو ہوئی کہ اسے اور کوئی بات یاد نہ رہی۔ پھر یہ خیال کر کے کہ گاؤں والوں کے لئے اس حیرت انگیز کارنامے کا علم اس کے بھائی کے حق میں کیسے کیسے شاندار نتائج پیدا کرے گا۔ وہ اس خبر کو پھیلانے کی خاطر باہر نکلی۔

اور جب وہ لوگی کے گھر کے پاس سے جلد جلد گذر رہی تھی اس نے کہا "آؤ دیکھو! ٹیزیانو نے ہمارے پُرانے مکان کی دیوار پر مقدس مریم کی تصویر رنگوں سے بنائی ہے۔"

کوئی خبر جب دیہاتیوں کی زبانوں پر چڑھ جاتی ہے تو بہت جلد مشہور ہو جاتی ہے۔ چنانچہ تھوڑی دیر میں لوگوں کا ایک مجمع اس مکان کے دروازے پر پہنچ گیا جہاں ٹیزیانو ان کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا باپ جو تمام دن پہاڑوں میں شکار کرتا پھرا تھا، اب گھر واپس آ رہا تھا۔ جب اس نے لوگوں کو

اس جگہ جمع ہوتے دیکھا تو حیران ہوکر وہ بھی اسی طرف چل کھڑا ہوا مگر اس کے پہنچنے تک ہجوم اس قدر بڑھ چکا تھا کہ تصویر اس کو نظر نہ آئی۔

ہر طرف سے یہی آوازیں آ رہی تھیں "اس نے یہ تصویر کیسے بنائی! — اس نے یہ رنگ کہاں سے لئے؟" اور ہر شخص میں اتنا جوش بھرا ہوا تھا کہ اس کے باپ کو یہ بھی معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ وہ کیوں یہاں جمع ہو رہے ہیں۔ پھر اس نے ٹیزیانو کی آواز سنی "میں نے اس تصویر کو پھولوں کے رس سے بنایا ہے۔ کیٹرینا ان کو جمع کرتی رہی اور میں کام کرتا رہا۔"

ہر طرف سے تعریف کا اظہار ہونے لگا اور گاؤں کے پیشوا نیک دل پادری نے پُراحترام انداز سے کہا "یہ پھولوں کے رس سے! مقدس ٹیزیانو کو دیکھو۔"

انٹونیو وسیلی سکتے کے عالم میں کھڑا دیکھ رہا تھا کیونکہ جو کچھ وہ سن رہا تھا اس پر اسے یقین نہ آتا تھا۔ ایک دیہاتی سے جو پاس ہی کھڑا تھا اس نے پوچھا "کیا میں پاگل ہو گیا ہوں یا پادری نے سچ مچ میرے بیٹے کو مقدس کہا ہے؟"

اس نے جواب دیا "نہیں تم پاگل نہیں ہو"

اور جب انہوں نے سارا ماجرا اس سے کہہ سنایا اور ہجوم نے اسے راستہ دیا کہ وہ بھی تصویر کو دیکھ سکے، تو وہ حیران رہ گیا۔

چکی والے کا لڑکا سالو ٹیر سنگ تراشی سیکھنے گیا یا نہیں یہ کوئی نہیں جانتا لیکن ٹیزیانو گیا اور کیڈور کا یہ لڑکا بعد میں وینس کا عجوبہ بنا۔ وہاں بیلینی کی استادانہ اصلاح نے اس کی رہنمائی کی اور ان مرقعوں کو جو اس سے قبل تقریباً اسی سال تک معروف کار رہے تھے، اس نے خوب چلایا اور ان سے وہ تصویریں بنائیں جن کے شگفتہ رنگوں کی نظیر پھر کبھی نہ مل سکی۔ اس نے اپنے وطن کے لوگوں پر ثابت کر دیا کہ خیال پرستی کچھ بری چیز نہیں کیونکہ خیال پرستی کے ساتھ جب محنت مل جاتی ہے تو اس سے حیرت انگیز باتیں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

جب گاؤں کے لوگ اس عالی پایہ مجسمہ کے پاس آ کر کھڑے ہوتے ہیں جس کا رُخ پھولوں کے ان کھیتوں کی طرف ہے جن میں کیٹرینا اپنے بھائی کے لئے رنگ رنگ کے پھول توڑ کر لاتی تھی، تو وہ اس کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں "دیکھو! مقدس ٹیزیانو کو دیکھو!"

(ترجمہ)

جلیل قدوائی

بلّی کے بچّے

صبح سورج کی کرنیں خواب گاہ کی شیشہ دار کھڑکیوں سے چھن کر کمرے کے اندر اور بستر پر آ رہی ہیں۔ وہاں ایک چھ سال کا لڑکا جس کے بال برابر سے ترشے ہوئے ہیں، اور بٹن کی سی ناک ہے اور اس کی بہن نینا ایک چھوٹی، بھولے گالوں والی، گھونگھریالے بالوں والی، چار سال کی لڑکی سو کر اُٹھے ہیں اور بستر پر پڑے پڑے چارپائی کی جالی سے ایک دوسرے کو گھور رہے ہیں۔

"اُٹھو۔ او۔ او۔ لڑکو۔ ان کی انّا انہیں دیکھ کر کہتی ہے۔ اچھے لڑکے کب کے ناشتہ کر چکے اور تمہاری آنکھ نہیں کھلنے آتی۔"

سورج کی کرنیں کھیلیں، دیواروں اور دانا کے سایہ کے دامنوں پر کھیلتی اور تھرکتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے بچوں کو اپنے کھیل میں شریک کرنے کی دعوت دے رہی ہیں۔ مگر بچے اس دعوت کو رد کر رہے ہیں۔ وہ سو کے اُٹھے ہیں تو ان کا مزاج بگڑا ہے اور تیوریاں چڑھی ہیں۔ نینا انگڑائی لیتی ہے اور انا سے کہتی ہے۔

"نا... ہم شتہ...... بوار ناشتہ!"

دانیا اپنی آنکھیں چڑھاتا ہے اور شور کرنے کے لئے کوئی بہانہ ڈھونڈتا ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں نلملانا اور منہ کھولنا شروع کر دیا ہے لیکن اسی وقت ماں کی آواز ڈرائنگ روم سے سنائی دیتی ہے۔ بلی کو دودھ دینا نہ بھول جانا اس نے بچے دئے ہیں۔

لڑکوں کے بگڑے ہوئے چہرے پھر اصلی حالت پر آ جاتے ہیں۔ اور وہ ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھتے ہیں، پھر دونوں ایکدم چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ اپنے بستر سے باہر نکل آتے ہیں۔ اور اپنے شور و بکا سے فضا میں جھنکار پیدا کرتے ننگے پیر دوڑتے، رات کا لبادہ پہنے باورچی خانہ پہنچتے ہیں۔

باورچی خانہ میں ایک تپائی کے نیچے ایک چھوٹا ڈبہ رکھا ہے۔ جس میں استفن آگ جلانے کے لئے کوئلے لاتا تھا۔ بلی اس ڈبے میں سے جھانک رہی ہے۔ اس کے اُترے ہوئے چہرے پر ناتوانی ہے۔ اس کی سبز آنکھوں سے جن کے گرد تنگ و تاریک حلقے ہیں۔ کمزور شفقت میں ڈوبی ہوئی نظریں نکل رہی ہیں......

"وہ میاؤں کرنا چاہتی ہے اور اپنا منہ کھولتی ہے لیکن اس کے حلق سے صرف ایک ناتواں، ہلکی، بے صدا سانس نکلتی ہے۔ بلی کے بچے رگل بل گل بل کر رہے ہیں۔ ان کے کلبلانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

دونوں لڑکے ڈبے کے سامنے اینڈی کے بل کودتے ہیں اور اپنی سانس روکے بالکل بے حرکت بلی کو دیکھتے ہیں ...... وہ متحیر اور خوش ہیں اور ماتا کے بجنے ڈانٹنے کی آوازوں کو نہیں سنتے۔ دونوں کی آنکھیں بے انتہا سچی خوشی سے چمک رہی ہیں۔

بچوں کی تعلیم اور زندگی سدھارنے میں پالتو جانوروں کا بھی کتنا زیادہ حصہ ہے۔ اس کو مشکل سے محسوس کیا جاتا ہے۔ ہم میں سے کون طاقتور اور بھاری کتوں، سست ادھیڑی کتیوں، پنجرے میں محبوس چڑیوں، کم عقل مگر جوشیلی مرغیوں، حلیم، نیک دل، بوڑھی بلیوں کو نہیں یاد کرتا۔ جنہوں نے اگر ہم نے کھیل میں ان کی دُم پہ پَیر رکھ دیئے ہیں اور انہیں تکلیف پہنچائی ہے، ہمیں معاف کر دیا! بلکہ میں تو بعض وقت فی الواقع یہ سمجھتا ہوں کہ وہ صبر، رحم، شفقت، وفاداری اور اخلاص جو ان پالتو جانوروں میں ہوتا ہے، بچوں کے ذہن پر کبھی بڈھے فلسفی یا ماؤں اور استادوں کی تربیت اور تعلیم سے کہیں زیادہ مضبوط و دیرپا اثر ڈالتا ہے۔

"کیسے ننھے ننھے ہیں۔" نینا اپنی آنکھیں اچنبھے میں خوب کھول کر ہنستی ہوئی کہتی ہے۔ "جیسے چوہے ہوں۔"

ایک، دو، تین۔" دانیا گنتا ہے۔ "تین بچے ہیں۔ اچھا تو ایک تمہارا، ایک میرا اور ایک کٹی کے لئے بھی۔

"ہائیں، ہائیں۔ ماں کہتی ہے ہائیں ......

بلی کے بچوں کو خوب اچھی طرح دیکھ کے دونوں لڑکے انہیں بلی کے نیچے سے اٹھا لیتے ہیں۔ اور اپنے ہاتھوں میں انہیں ملنا شروع کرتے ہیں۔ اور پھر اس سے بھی نہ مطمئن ہو کر انہیں اپنے فراک کے لبادہ کے دامنوں میں رکھ لیتے ہیں۔ اور دوسرے کمروں میں دوڑ کر جاتے ہیں۔

"امی! بلی نے بچے دیئے۔" وہ چلاتے ہیں۔

امی ڈرائنگ روم میں کسی اجنبی سے باتیں کر رہی ہیں۔ لڑکوں کے بغیر منہ دھوئے بغیر صاف کپڑے پہنے رات کے لبادے کے دامن اٹھائے دیکھ کر وہ گھبراتی ہے۔ اور انہیں خفگی کی نظروں سے دیکھتی ہے۔

"دامن گراؤ، بدتمیز کہیں کے۔" وہ کہتی ہے۔ "کمرے سے باہر جاؤ۔ نہیں تو پیٹے جاؤ گے۔" لیکن لڑکے نہ ماں کی خفگی کی پروا کرتے ہیں نہ اجنبی کی موجودگی کی۔ وہ بلی کے بچوں کو تپائی پر رکھ دیتے ہیں۔ اور اپنے شور سے کان پھاڑے ڈالتے ہیں۔ بلی ان کے چاروں طرف رحم کی طالب نظروں سے میاؤں کرتی ہے۔ جب تھوڑی دیر بعد لڑکے کپڑے بدلنے کے لئے۔ منہ دھونے کے لئے یا ناشتہ کرنے کے لئے بلائے جاتے ہیں، ان کی خواہش ہوتی ہے کہ کسی طرح یہ غیر دلچسپ فرائض جلد ختم ہوں کہ وہ بلی کے بچوں کے پاس پھر بھاگ کر جائیں

ان کے روزانہ کے کھیل اور دلچسپیوں کا پروگرام بالکل بالائے طاق ہے۔ بلی کے بچوں نے دنیا میں آ کر ہر کام کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ اور ان کی سب سے بڑی دلچسپی کا باعث ہوئے ہیں۔ اگر نینا یا دانیا کو چالیس پونڈ مٹھائی یا دس ہزار کا چیک فی بچہ دیا جاتا تو وہ بغیر پس و پیش کے ایسے سودے کو رد کر دیتے۔ باوجود ناما اور باورچن کی سخت تاکید کے لڑکے مصر ہیں کہ باورچی خانہ میں کھانا کھانے کے وقت بلی کے ڈبے کے پاس بیٹھے رہیں۔ ان کے چہروں سے شوق اور جستجو اور انہماک ظاہر ہوتا ہے وہ بچوں کے حال کے لئے اتنے فکرمند نہیں، جتنا ان کے مستقبل کے لئے۔ وہ طے کرتے ہیں کہ ان میں سے ایک بچہ تو گھر میں اپنی بڈھی ماں کی خبرگیری کے لئے رہے گا اور دوسرا ان کے گرمی کے مکان میں بھیج دیا جائے گا۔ اور تیسرا مودی خانہ میں رہے گا۔ جہاں چوہے اتنی کثرت سے ہیں۔

"مگر وہ ہماری طرف دیکھتے کیوں نہیں ہیں۔" نینا کو تعجب ہوتا ہے۔ "ان کی آنکھیں بھکاریوں کی طرح اندھی ہیں۔"

دانیا کو بھی یہی تشویش ہے۔ وہ ایک بچہ کی آنکھ کھولنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور دیر تک اس کے پپوٹوں کو پھولتا اور ہوا دیتا ہے

لیکن اس کی کوشش بے کار جاتی ہے۔ اور اس پر بھی دونوں بہت متحیر ہوتے ہیں کہ بچے جو گوشت یا دودھ انہیں دیا جاتا ہے، اسے لینے سے انکار کرتے ہیں۔ ماں کے سامنے جو چیز رکھی جاتی ہے، وہ ان کی ماں کھا لیتی ہے۔

"اچھا ان کے لئے گھر بنائیں"۔ وانیا رائے دیتا ہے۔ "یہ تینوں علیحدہ علیحدہ گھر میں رہیں گے۔ اور بلی ان سے ملنے آیا کرے گی......"

دفتی کی ٹوپی کے ڈبے باورچی خانے کے مختلف کونوں میں رکھ دئے جاتے ہیں۔ اور بچے ان میں بٹھائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ تقسیم ناکام ثابت ہوتی ہے۔ بلی اب بھی رحم کی طالب اور محبت بھری نظروں سے سب ڈبوں کے گرد جاتی ہے۔ اور اپنے بچوں کو پہلی جگہ لے آتی ہے۔

"بلی ان کی ماں ہے"۔ وانیا نے کہا۔ "لیکن ان کا باپ کون ہے؟"

"ہاں ان کا باپ کون ہے؟" نینا دہراتی ہے۔

"کوئی ان کا باپ ضرور ہونا چاہئے"۔

وانیا اور نینا دیر تک سوچتے رہتے ہیں۔ کہ ان کا باپ کیسے ہونا چاہئے۔ اور آخر میں ان کی نظر انتخاب ایک گہرے رنگ کے گھوڑے پر پڑتی ہے۔ جس کے دُم نہیں ہے۔ اور جو زینہ کے نیچے کباڑ خانے میں دوسرے ٹوٹے پھوٹے کھلونوں کے ڈھیر میں پڑا ہے۔ وہ وہاں سے اسے باورچی خانہ میں گھسیٹ کر لاتے ہیں۔ اور اسے ڈبے کے پاس کھڑا کرتے ہیں۔

"سنتے ہو" وہ اس سے تاکید کرتے ہیں۔ "یہاں کھڑے رہو اور دیکھو کہ بچے کوئی بدتمیزی تو نہیں کرتے"۔

یہ سب بڑی سنجیدگی سے کیا جاتا ہے۔ وانیا اور نینا، سوا بچوں کے ڈبوں کے کسی اور دنیا کے وجود سے انکار کرتے ہیں۔ ان کی خوشی کی کوئی حد نہیں ہے۔ لیکن انہیں تکلیف دہ اور رنجیدہ لمحوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔

کھانے سے پہلے وانیا اپنے باپ کے مطالعہ کے کمرے میں خواب آلودہ نظروں سے میز کو دیکھ رہا ہے۔ لیمپ کے نزدیک چھپے ہوئے نوٹ پیپر پہ ایک بلی کا بچہ رینگ رہا ہے۔ وانیا اس کی حرکات کو خوب غور سے دیکھ رہا ہے۔ اور اس کے منہ میں پہلے ایک پنسل پھر دیا سلائی دے رہا ہے۔ ایک دم جیسے زمین کو پھاڑ کے نہ معلوم کہاں سے اس کا باپ میز کے پاس نمودار ہوتا ہے۔

"یہ کیا ہے؟" وانیا ایک غصہ کی آواز میں سنتا ہے۔

"...... یہ ابا جان بلی کا بچہ ہے......"

"مار تو نہیں کھاؤ گے۔ دیکھو۔ تم نے کیا کیا۔ میرا تمام کاغذ خراب کر ڈالا!"

وانیا کے استعجاب کی حد نہیں رہتی جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کا باپ اس شوق میں کوئی حصہ نہیں لیتا جو وانیا کو بچے کے ساتھ ہے اور بجائے خوش ہونے کے وہ وانیا کے کان کھینچتا ہے اور چلاتا ہے۔

"استغفر! اس شریر کو یہاں سے لے جاؤ"۔

کھانے پہ دوسرا منظر پیش ہوتا ہے...... دوسرے دَور کے درمیان ایک تیز میاؤں کی آواز دفعتہً سنائی دیتی ہے۔ وہ اس آواز کا مخرج تلاش کرتے ہیں۔ اور نینا کے کپڑوں میں ایک بلی کا بچہ چھپا پاتے ہیں۔

"نینا بس میز پہ سے اٹھ جاؤ"۔ اس کا باپ خفا ہو کر کہتا ہے۔ "بچوں کو موری میں پھینکوا دونگا۔ میں ان گندی چیزوں کو گھر میں نہیں رکھونگا"

وانیا اور نینا خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ موری میں پڑے سے پڑے بچوں کی موت علاوہ بے رحمی کے بلی اور گھوڑے کو جو انکا صدمہ پہنچا ہے بچوں کے ڈبوں کو سونا کر جائے گی۔ ان کے مستقبل کے ارادوں پہ پانی پھیر دے گی۔ وہ روشن مستقبل جب کہ ایک بچہ ماں کے آرام کیلئے اس کے پاس رہے گا، دوسرا دیہات پہ رہے گا۔ اور تیسرا کوٹھڑی میں چوہے پکڑے گا۔ لڑکے رونے لگتے ہیں اور خوشامد کرتے ہیں۔

کہ بچوں کی جانیں بخش دی جائیں۔ ان کا باپ مان لیتا ہے۔ مگر اس شرط پہ کہ وہ دونوں باورچی خانہ میں نہ جائیں۔ اور بچوں کو : چھوئیں۔

کھانے کے بعد دانیا اور رنبینا کمرے کمرے ایک بے کلی اور اداسی کے ساتھ پھرتے ہیں۔ باورچی خانہ جانے کی ممانعت نے انہیں بے دل کر دیا ہے۔ وہ مٹھائی نہیں لیتے۔ منہ پھلائے ہوتے ہیں۔ اور ماں سے بگڑے ہوتے ہیں۔ جب ان کا چچا پطرو شام کو آتا ہے وہ اُسے علیحدہ لے جا کر اس سے اپنے باپ کی شکایت کرتے ہیں کہ وہ بچوں کو نالی میں پھنکوائے دیتے تھے۔

"چچا جان امی سے کہہ دو کہ بلی کے بچوں کو ہمارے کمرے میں منگا دیں۔" لڑکے چچا سے خوشامد کرتے ہیں۔ "کہہ دو۔ کہہ دو۔"

"ہاں' ہاں اچھا" چچا جان انہیں چمکار کر کہتے ہیں "اچھا"۔

چچا پطرو شا کبھی اکیلے نہیں آتے۔ ان کے ساتھ ان کا نیرو ایک بڑا سیاہ کتا بھی جس کے کان جھکے ہوتے ہیں اور جس کی لکڑی کی طرح سخت دم ہے، آ تا ہے۔ کتا خاموش، غمگین اور اپنے وقار کو لئے رہتا ہے۔ وہ لڑکوں کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ بلکہ جب ان کی طرف سے گزرتا ہے تو ان کے دم مارے جاتا ہے۔ جیسے وہ کاٹھ کی کرسیاں ہوں۔ لڑکے اس سے بڑی نفرت کرتے ہیں۔ لیکن وقتی ضرورتیں جذبات پہ غالب آتی ہیں۔

"منوبینیا" دانیا اپنی آنکھیں خوب پھیلا کر کہتا ہے۔ "نیرو کو ان کا باپ بنا دو۔ گھوڑے کو نہیں۔ گھوڑا بے جان ہے۔ اور نیرو جاندار ہیں۔ سمجھے؟"

پوری شام وہ اس وقت کا انتظار کرتے ہیں جب ابا جان تاش کھیلنے بیٹھیں گے اور نیرو کو بغیر کسی کے دیکھے ہوئے باورچی خانے لیجانا ممکن ہوگا۔ . . . . آخر کار ابا جان تاش کھیلنے بیٹھ جاتے ہیں۔ امی سماوار گرم کرتی ہے۔ اور لڑکوں کو نہیں دیکھ رہی ہے۔

وہ مبارک وقت آ جاتا ہے۔

"آؤ" دانیا پیچھے سے نیتا کے کان میں کہتا ہے۔

لیکن اس وقت اسٹفن اندر آتا ہے اور خبر سناتا ہے۔

"بیگم صاحبہ۔ نیرو نے بچے کھا لئے"۔

"سچ کہتا ہوں اُس نے کھا لئے . . . . . نوکر ہنستا ہے۔ "وہ ڈبوں کے پاس گیا اور ہڑپ کر گیا"۔

لڑکے منتظر ہیں کہ گھر بھر بدحواس ہو جائیگا۔ اور بدمعاش نیرو کو سزا ملے گی۔ لیکن سب اطمینان سے اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہتے ہیں۔ اور اس بیہودہ کتے کی بھوک پہ صرف حیرت ظاہر کرتے ہیں سامی اور ابا جان ہنستے ہیں۔ نیرو میز کے پاس چکر لگاتا ہے۔ دم ہلاتا ہے اور اپنے ہونٹ مزے سے چاٹتا ہے . . . . . . بلی ہی ایک ہے جسے چین نہیں ہے۔ اپنی دُم ہوا میں اٹھائے وہ کمرے کمرے بھٹکتی ہے۔ اور لوگوں کو شبہ کی نظر سے دیکھتی ہے اور درد سے کراہتی ہے۔

"لڑکو! نو بج چکے۔ امی کہتی ہے اب سونے کا وقت ہے"۔

دانیا اور رنبینا بستر پہ جاتے ہیں۔ آنسو گراتے ہیں۔ اور بڑی دیر تک بیچارہ اور زخم خوردہ بلی اور بے رحم و بدتمیز نیرو کے حال پہ جسے کوئی سزا نہیں دی گئی۔ کفِ افسوس ملتے ہیں۔

(ترجمہ)

حامد علی خان

مصوّر کا راز

چند سال گذرے میں نے چارلسٹن سے نیویارک جانے کے لئے ڈاک کے ایک جہاز میں اپنے لئے جگہ محفوظ کرائی۔ جہاز کے کپتان کا نام ہارڈی تھا۔ موسم کی مساعدت کی صورت میں جہاز پندرھویں جون کو روانہ ہونے والا تھا۔ تاریخِ روانگی سے ایک دن قبل میں اپنے سفر کے متعلق بعض انتظامات کے لئے جہاز پر گیا۔

مجھے معلوم ہوا کہ جہاز پر کثیر التعداد مسافر جانے والے تھے جس میں خواتین کی تعداد معمول سے خاصی زیادہ تھی۔ مسافروں کی فہرست پر نظر ڈالی تو میں نے دیکھا کہ ان میں سے کئی میرے شناسا تھے۔ دوسرے ناموں میں مجھے کارنیلیس وائٹ کا نام بھی نظر پڑا جسے دیکھ کر میں بہت خوش ہوا۔ یہ ایک نوجوان مصوّر تھا جس سے میری بہت پُرخلوص دوستی تھی۔ کالج میں ہم دونوں نے ایک ساتھ تعلیم پائی تھی اور ایک دوسرے کی صحبت میں گھڑیاں گذار چکے تھے۔ وہ غیر معمولی دل و دماغ کا مالک تھا۔ اس قسم کے لوگ بالعموم انسانی صحبت سے متنفر، ذکی الحس اور جوشیلے ہوتے ہیں۔ یہی حالت کارنیلیس وائٹ کی تھی لیکن ان صفات کے ساتھ ہی اس کے سینے میں ایک انتہا درجہ کا وفاشعار اور محبت بھرا دل تھا۔

میں نے دیکھا کہ جہاز کے تین کمروں پر اس کے نام کی تختی آویزاں تھی۔ مسافروں کی فہرست پر دوبارہ نظر ڈالنے سے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی اور دو بہنیں بھی اس کے ساتھ جارہی تھیں۔ جہاز کے کمرے زیادہ تنگ نہ تھے اور ہر کمرے میں سونے کے لئے اوپر تلے دو دو خواب گاہیں تھیں جن میں سے ہر ایک پر بمشکل صرف ایک آدمی سو سکتا تھا۔ لیکن میں یہ نہ سمجھ سکا کہ ان چار نفوس کے لئے تین کمرے کیوں مخصوص کئے گئے تھے۔ اس وقت میری دماغی کیفیت کچھ اس قسم کی ہو رہی تھی جس میں انسان غیر متعلق باتیں معلوم کرنے کے لئے ضرورت سے زیادہ متجسس بن جاتا ہے اور میں بہ ندامت اقرار کرتا ہوں کہ اس وقت میں زائد کمرے کے متعلق طرح طرح کے لغو اور احمقانہ قیاسات دوڑانے میں مصروف ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ سے مجھے کوئی سروکار نہ تھا مگر اس کے باوجود میں اس معمّے کو حل کرنے میں نہایت سرگرمی سے منہمک ہو گیا۔ آخر میں ایک نتیجہ پر پہنچا اور مجھے حیرت ہونے لگی کہ میں نے یہ بات پہلے کیوں نہ سمجھی۔ تیسرا کمرہ غالباً کسی ملازم کے لئے تھا میں نے دل ہی دل میں کہا میں بھی عجیب احمق ہوں کہ اتنی کھلی ہوئی بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ اس کے بعد میں نے پھر ناموں کی فہرست پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ کوئی ملازم ان کے ساتھ نہ جارہا تھا۔ ہاں یہ درست ہے کہ پہلے وہ کسی ملازم کو

ساتھ لے جانے کا ارادہ رکھتے تھے کیونکہ فہرست میں "بمعیت ملازم" کے الفاظ پہلے لکھے گئے تھے۔ پھر میں نے دل میں کہا غالباً یہ کمرہ زائد سامان رکھنے کے لئے محفوظ رکھا گیا ہے۔ کوئی ایسی چیز ہوگی جسے بغرض حفاظت وہ اپنی تحویل میں رکھنا چاہتا ہے۔ ہاں میں سمجھ گیا۔ یہ کوئی تصویر ہوگی اور غالباً وہی جس کی بابت کے متعلق وہ اطالوی یہودی نکولینو سے بات چیت کرتا رہا تھا۔ اس خیال نے میرا اطمینان کرا دیا اور اس وقت کے لئے میں اپنے تجسس سے کنارہ کش ہو گیا۔

وائٹ کی دونوں بہنوں کو تو میں جانتا تھا وہ دونوں بہت ذہین اور زندہ دل لڑکیاں تھیں۔ البتہ اس کی بیوی سے مجھے واقفیت نہ تھی جسے نو دلہن وہ نیا نیا بیاہ لایا تھا۔ میرے سامنے بھی وہ اپنی بیوی کا ذکر کئی مرتبہ اپنے مخصوص پرجوش انداز میں کر چکا تھا۔ وہ اس کے حیرت انگیز حسن، اس کی ذہانت اور اس کی شائستگی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس کا تعارف حاصل کرنے کے لئے بیتابی سے منتظر تھا۔

جس دن میں جہاز پر گیا (چودہ جون کو) اسی دن وائٹ اور اس کے ہمراہی بھی جہاز پر آنے والے تھے۔ یہ بات مجھے کپتان سے معلوم ہوئی اور میں نے دلہن سے متعارف ہونے کی امید میں اپنے مجوزہ وقت سے ایک گھنٹہ زائد جہاز پر گذار دیا۔ آخر معذرت کا ایک رقعہ پہنچا کہ مسز وائٹ کی طبیعت کچھ ناساز ہے اور وہ کل روانگی کے وقت سے پہلے جہاز پر نہ آسکیں گی۔

دوسرے دن صبح اپنے ہوٹل سے نکل کر میں بندرگاہ کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں کپتان ہارڈی سے میری مڈبھیڑ ہو گئی اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ "بعض وجوہ کی بنا پر (ایک مہمل لیکن آسان بہانہ) میں نے جہاز کی روانگی ایک دو دن کے لئے ملتوی کر دی ہے۔ تیاری مکمل ہونے پر میں آپ کو اطلاع دے دوں گا۔" یہ بات مجھے عجیب معلوم ہوئی۔ اس لئے کہ اس دن تیز جنوبی ہوا چل رہی تھی جو ہمارے سفر کے لئے ہر طرح سازگار تھی۔ لیکن چونکہ میرے متواتر اصرار کے باوجود "بعض وجوہ" کے چہرے سے نقاب نہ اٹھ سکا اس لئے میں مجبوراً واپس چلا آیا اور صبر کے ساتھ جہاز کی روانگی کی اطلاع کا انتظار کرنے لگا۔

پورا ایک ہفتہ گذر گیا لیکن مجھے کوئی خبر نہ ملی۔ آخر سخت انتظار کے بعد اطلاع آئی اور میں فوراً جہاز پر پہنچا۔ جہاز مسافروں سے لدا ہوا تھا۔ ہر طرف اس گہما گہمی اور چہل پہل کے آثار نمایاں تھے جو جہاز کے روانہ ہونے کے وقت نظر آیا کرتی ہے۔ وائٹ اور اس کے ہمراہی میرے پہنچنے کے دس منٹ بعد آئے۔ میں نے دونوں بہنوں، دلہن اور مصور پر نظر ڈالی۔ آخر الذکر کے چہرے سے اس وقت سخت بیزاری اور بے دلی کی کیفیت نمایاں ہو رہی تھی۔ یہ اس کی فطرت کا خاصہ تھا اس لئے میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ اس نے اپنی بیوی سے میرا تعارف بھی خود نہ کرایا بلکہ یہ فرض مجبوراً اس کی بہن میرین کو ادا کرنا پڑا جو ایک بہت خوش اخلاق اور ذہین لڑکی ہے۔ مسز وائٹ کے چہرے پر گہرا نقاب پڑا ہوا تھا اور جب اس نے میرا آداب قبول کرتے ہوئے اخلاقاً اپنا نقاب اٹھایا تو مجھے سخت تعجب ہوا۔ یہ تعجب اور بھی زیادہ ہوتا اگر مجھے تجربہ سے یہ بات معلوم نہ ہو چکی ہوتی کہ میرے مصور دوست کے پرجوش بیانات اس وقت بہت زیادہ قابلِ اعتماد نہیں ہوتے جب وہ عورت کے حسن کی تعریف کر رہا ہو۔ مجھے خوب معلوم تھا کہ جب کبھی گفتگو کا موضوع حسن ہو تو میرے دوست کا دماغ خالص مثالی حسن کی جنتوں میں پہنچ جایا کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسز وائٹ کو میں نے شکل و صورت کے لحاظ سے بالکل سیدھی سادی عورت پایا، بلکہ شاید بدصورت کا لفظ بھی اس پر صادق آسکتا تھا۔ ہاں اس کے لباس سے بلاشبہ غیر معمولی سلیقہ نمایاں ہو رہا تھا۔ پھر میں نے خیال کیا کہ میرے دوست کو غالباً دل و دماغ کی مقابلتہً زیادہ پائیدار خوبیوں نے مسحور کیا ہے۔ مختصر گفتگو کے بعد مسز وائٹ اپنے شوہر کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

میرا پرانا تجسس پھر مجھ پر غلبہ پانے لگا۔ کسی ملازم کی ہم سفری کا تو شائبہ تک نہ رہا تھا اس لئے میں زائد سامان کا انتظار کرنے لگا۔ آخر کچھ دیر کے بعد بندرگاہ پر ایک گاڑی آکر رکی جس میں صنوبر کا ایک مستطیل صندوق رکھا تھا۔ اسی کا انتظار تھا۔ اس کے پہنچنے پر جہاز نے فوراً لنگر اٹھا لیا اور تھوڑی ہی دیر میں ہم بندرگاہ سے نکل کر سمندر میں پہنچ گئے۔

یہ مستطیل صندوق جس کا میں نے ذکر کیا ہے طول میں چھ فٹ اور عرض میں ڈھائی فٹ تھا۔ میں نے اسے بہت غور سے دیکھا اس لئے میں اس کی ٹھیک ٹھیک پیمائش بتا سکتا ہوں۔ بلاشبہ اس صندوق کی ہیئت انوکھی تھی اور اس کو دیکھتے ہی مجھے اپنے قیاس کی صحت پر فخر ہوا۔ اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ

مصورانہ زائد سامان ضرور ایک یا زیادہ تصاویر پر مشتمل ہوگا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ تصویر کے متعلق ہفتوں نکولینو سے گفتگو کرتا رہا ہے۔ صندوق کی صورت دیکھ کر میرا یہ گمان غالب تھا کہ اس میں لیونارڈو کی مشہور تصویر "عشائے ربانی"؎ کی نقل ہے۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اسی تصویر (عشائے ربانی) کی ایک اور نقل فلارنس کے ایک مشہور مصور کے ہاتھ کی بنی ہوئی نکولینو کے پاس پہلے بھی موجود ہے۔ بس مجھے اپنے موجودہ قیاس کی صحت میں بھی کوئی شبہ نہ رہا اور میں اپنی دقیقہ رسی کا خیال کرکے بہ طمانیت زیر لب متبسم ہوا۔ وائٹ نے غالباً اب تک اپنی تصویروں کے متعلق کوئی راز مجھ سے نہ چھپایا تھا لیکن اب وہ مجھ سے کنیا رہا تھا اور میری آنکھوں میں دھول جھونک کر ایک نفیس تصویر کو مجھ سے بالا بالا نیویارک پہنچانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ چنانچہ میں نے بھی چپکے چپکے اسے جی بھر کر ستانے اور دق کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ایک بات اب بھی میرے لئے بہت پریشانی کا باعث بن رہی تھی۔ وہ یہ کہ مستطیل صندوق زائد کمرے میں نہ رکھا گیا بلکہ وائٹ نے اسے اپنے کمرے میں رکھوا لیا۔ صندوق کمرے کی تقریباً تمام سطح پر چھا گیا اور مجھے یقین تھا کہ مصور اور اس کی بیوی کے لئے بہت کچھ باعث تکلیف بن رہا ہوگا۔ بالخصوص اس لئے کہ قیر یا بس روغن سے اس صندوق پر بڑے بڑے حروف لکھے گئے تھے اس سے نہایت تیز اور ناگوار بلکہ میرے نزدیک ایک حد تک کریہہ بو پیدا ہو رہی تھی۔ ڈھکنے پر یہ الفاظ لکھے گئے تھے: "مسز ایڈیلیڈ کرٹس، البینی، نیویارک۔ بہ تحویل مسٹر کرنیلیس وائٹ۔ یہ جانب اوپر، بہ احتیاط اٹھایا جائے۔"

مجھے یہ معلوم تھا کہ مسز ایڈیلیڈ کرٹس مصور کی بیوی کی والدہ ہیں۔ لیکن میرے نزدیک یہ پتہ وغیرہ محض ایک فریب تھا جو خاص طور پر میرے لئے کھیلا گیا تھا۔ اس لئے مجھے پورا یقین تھا کہ اس صندوق اور اس کی اشیا کا آخری ٹھکانا نیویارک میں میرے دوست کے تصویر خانے کے سوا اور کوئی نہیں۔

اگرچہ ہوا جہاز کی روانگی کے بعد ہی مخالف سمت اختیار کر چکی تھی مگر پہلے دو چار دن تک موسم اچھا رہا۔ تمام مسافر خوش تھے اور اپنے وقت کا بہت سا حصہ ایک دوسرے سے ملنے جلنے اور باتیں کرنے میں گذارتے تھے۔ البتہ وائٹ اور اس کی بہنوں کا طرز عمل بالکل مختلف تھا۔ وائٹ کی حالت تو تعجب کے قابل نہ تھی اگرچہ وہ بھی معمول سے زیادہ ترش رو بلکہ اندوہ گیں نظر آتا تھا۔ لیکن اس کی بہنوں کی روش بہت تعجب انگیز تھی کیونکہ باوجود میرے اصرار کے وہ دوسرے مسافروں سے دلچسپی نہ لیتی تھیں اور انہوں نے بھی سفر کا زیادہ حصہ اپنے کمروں کی تنہائی میں گذارا۔

مسز وائٹ کا طرز عمل بالکل مختلف تھا۔ وہ خوب باتیں کرتی تھی اور جہاز کی خواتین سے بہت جلد گھل مل گئی۔ بلکہ میں یہ دیکھ کر سخت متعجب ہوا کہ اسے مردوں سے لگاوٹ کرنے میں بھی کسی قسم کا باک نہ تھا۔ اس نے ہم سب کو بہت محظوظ کیا۔ میں نے "محظوظ کیا" کہا ہے، اس لئے کہ اس سے زیادہ موزوں لفظ مجھے نہیں ملتا۔ مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ مسز وائٹ دوسروں سے مل کر ہنسنے کے بجائے ان کو اپنے آپ پر ہنساتی تھی۔ مرد اس کے متعلق کچھ نہ کہتے تھے لیکن عورتوں نے فیصلہ کر دیا کہ وہ ایک سیدھی سادی، نیک دل، تربیت یافتہ اور بے انتہا گنوار عورت ہے۔ مجھے حیرت تھی کہ وائٹ کس بات پر گرا ہے۔ اس عقدے کا عام حل دولت ہو سکتا تھا لیکن یہ بھی صحیح نہ تھا کیونکہ وائٹ نے مجھ سے خود کہا تھا کہ "مجھے اس شادی سے کسی قسم کا مالی فائدہ نہیں پہنچا، نہ اس کی توقع ہے۔ میں نے خاص محبت کے لئے شادی کی ہے اور میری بیوی کی غیر معمولی خوبیوں کے مقابلہ میں میری محبت ایک بالکل حقیر معاوضہ ہے۔" یہ الفاظ یاد کرکے میری عقل چکرا گئی۔ مجھے خیال آیا کہ شاید میرے دوست کے ہوش و حواس معطل ہو چکے ہیں۔ بھلا مجھے اور کیا خیال آتا؟ اس جیسا نفیس مزاج، اس جیسا ذکی الفہم، اس جیسا بلند خیال جس کی نگاہیں عیب کو بھانپنے اور حسن کو پہچاننے میں مہارت تامہ رکھتی تھیں، اس عورت کو اپنی زندگی کا مالک بنا چکا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اس کی بہت گرویدہ معلوم ہوتی تھی بالخصوص اس کی غیر موجودگی میں وہ اپنی محبت کا اظہار اور بھی زیادہ کرتی تھی۔ وہ بار بار اس قسم کی باتیں کہہ کر دوسروں کی تضحیک کا ہدف بنتی کہ "میرے پیارے شوہر وائٹ نے فلاں موقع پر چنال کہا اور فلاں موقع پر چنیں۔" لفظ شوہر اسی کے انداز بیان کے مطابق اسے ہر وقت نوک زبان رہتا تھا۔ اسی اثنا میں تمام اہل جہاز نے یہ محسوس کیا کہ وائٹ

؎ ایک مشہور تصویر جس میں حضرت مسیحؑ آخری مرتبہ اپنے حواریوں کے ساتھ ایک لمبی میز پر مصروف طعام نظر آتے ہیں۔

اپنی بیوی کی صحبت سے عمداً گریزاں رہتا تھا وہ زیادہ اپنے کمرے میں تنہا بند رہتا تھا بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہر وقت اپنے کمرے ہی میں رہتا تھا اور اس کی بیوی کو پوری آزادی حاصل تھی کہ حسبِ منشا جہاز کے مسافروں کی مجالس میں اپنا دل بہلاتی رہے۔

جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ بیچارہ مصور قسمت کے کسی ان بوجھے پھیر میں آ کر یا فریب انگیز جذبات کی کسی جنونی کیفیت کا شکار ہو کر اپنے سے ہر طرح ادنیٰ درجہ کی عورت سے نادانستہ طور پر وابستہ ہو گیا ہے اور اس قسم کی وابستگی کا قدرتی نتیجہ صریح اور قطعی نفرت کی صورت میں ظاہر ہو چکا ہے مجھے اس کی حالت سخت قابلِ رحم معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود میں "عشاءِ ربانی" کے معاملہ میں اس کی خاموشی کو پوری طرح قابلِ معافی نہ سمجھ سکتا تھا اور اس کے لئے میں اس سے بدلہ لینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ ایک دن وہ جہاز کے عرشے پر آیا میں نے اپنی عادت کے مطابق اس کا بازو تھام کر ادھر ادھر چکر لگانے شروع کئے۔ اس کی افسردہ دلی جسے میں ان حالات میں بالکل بجا سمجھتا تھا) ذرا بھی کم نہ ہوتی تھی۔ اس نے بہت سخت کوشش سے ایک آدھ بات کی۔ وہ اپنے خیالات میں کھویا ہوا سا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اس سے ہنسی مذاق کی کچھ باتیں کیں اور اس نے بے دلی سے مسکرانے کی کوشش بھی کی لیکن جب میں نے اس کی بیوی کا خیال کیا تو اس بیچارے پر سخت رحم آیا اور مجھے تعجب ہوا کہ وہ مسکراہٹ کے یہ مبہم آثار بھی کیونکر اپنے چہرے سے ظاہر کر سکا ہے۔ لیکن پھر بھی میں نے آخر کار چبھتے گھر تک پہنچانے کا ارادہ کیا اور فیصلہ کیا کہ مستطیل صندوق کے متعلق مرموز اشارات و کنایات کا ایک سلسلہ شروع کروں گا تاکہ وہ سمجھ جائے کہ میں بالکل اس کی اس پر لطف فریب کاری کا شکار نہیں ہو گیا۔ پہلے میں نے پردے پردے میں اس پر وار کرنے شروع کئے۔ چنانچہ میں نے "اس صندوق کی عجیب و غریب ہیئت" کا ذکر کیا۔ اس کے ساتھ ہی میں عیارانہ ہنسی ہنسا اور پھر شرارت سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میں نے داہنے ہاتھ کی انگلی سے اس کی پسلی کو چھوا گویا مجھے سب کچھ معلوم ہے۔

میرے اس بے ضرر سادہ مذاق پر واٹمنٹ کی جو کیفیت ہوئی وہ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بالکل پاگل ہو چکا ہے۔ پہلے وہ اس طرح ٹکٹکی لگا کر میری طرف دیکھنے لگا گویا وہ میرے مذاق کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس کے بعد بظاہر میرے مذاق کا صحیح مفہوم بتدریج اس کے دماغ پر روشن ہونے لگا اور اسی نسبت سے اس کی آنکھوں کے ڈھیلے کٹوریوں میں سے نکل کر باہر آنے لگے۔ اس کے بعد اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور پھر خوفناک طور پر زرد۔ پھر اس نے ایک زور کا قہقہہ مارا۔ گویا میرے مذاق سے وہ بہت خوش ہوا ہے۔ لیکن یہ قہقہہ بلند سے بلند تر ہوتا گیا اور غالباً دس منٹ تک قہقہوں کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر وہ جہاز کے فرش پر زور سے چت گر گیا۔ جب میں اسے اٹھانے کے لئے دوڑ کر پہنچا تو وہ بظاہر بالکل مردہ ہو چکا تھا۔

میں مدد کے لئے چلایا اور سخت جد و جہد کے بعد ہم اسے آپے میں لائے۔ ہوش آنے پر بھی وہ کچھ دیر تک خفقانی باتیں کرتا رہا۔ آخر فصد کھول کر ہم نے اس کا لہو لیا اور اسے بستر پر ڈال دیا۔ دوسرے دن اس کی جسمانی صحت اچھی نظر آتی تھی۔ البتہ اس کی دماغی کیفیت کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کپتان کے حسبِ ہدایت میں اس کے بعد اس سے بالکل الگ تھلگ رہا۔ اس کے ہوش و حواس کے تعطل کے متعلق کپتان مجھ سے پوری طرح متفق تھا لیکن اس نے مجھے جہاز کے دوسرے مسافروں کے سامنے اس قسم کا ذکر کرنے سے محترز رہنے کی تاکید کر دی۔

اس واقعہ کے بعد جلد جلد متعدد ایسے حالات پیش آئے جنہوں نے میرے تجسس کو اور بھی بڑھا دیا۔ بات یہ ہے کہ مجھے زیادہ مقدار میں سبز چائے پینے سے بے خوابی کی شکایت ہو گئی اور دو راتیں تو میں نے تقریباً آنکھوں میں گذار دیں۔ میرے کمرے کا ایک دروازہ کھانے کے بڑے کمرے میں کھلتا تھا۔ واٹمنٹ کے تینوں کمرے اس بڑے کمرے کے پیچھے تھے جنہیں ایک ہلکا پھلکا دروازہ بڑے کمرے سے جدا کرتا تھا۔ یہ دروازہ رات کو بھی کبھی مقفل نہ کیا جاتا تھا۔ چونکہ ہوا مسلسل جہاز کے مخالف ہی۔ ہی اور رہتی بھی خوب تیز اس لئے جہاز کا ایک پہلو ہوا کی سمت مخالف میں خاصا دبا رہتا۔ چنانچہ جب کبھی جہاز کا سیدھا پہلو ہوا کے بہاؤ کے مقابل ہوتا وہ ہلکا پھلکا دروازہ خود بخود کھل جاتا اور اسی طرح کھلا رہتا کیونکہ کوئی شخص اٹھ کر اسے بند کرنے کی تکلیف گوارا نہ کرتا تھا۔ اب میرا کمرہ ایسے مقام پر تھا کہ جب اس طرف کا دروازہ کھلا ہوتا اور یہ گرمی کی وجہ سے میں ہمیشہ کھلا رکھتا تھا) تو ہلکے پھلکے کھلے دروازے میں سے مجھے

جہاز کے اس حصے کی بھی جھلک نظر آجاتی تھی جہاں وائٹ کے کمرے واقع تھے۔ جو دو راتیں میں نے بیداری کی حالت میں گذاریں ان میں میری توجہ ایک نئی بات کی طرف منعطف ہوئی۔ وہ یہ کہ رات کے تقریباً گیارہ بجے مسز وائٹ اپنے شوہر کے کمرے سے نکل کر باحتیاط زائد الگ کمرے میں چلی جاتی جہاں رات کا باقی حصہ گذارتی اور علی الصباح وائٹ کے بلانے پر وہ پھر اس کمرے میں چلی آتی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ دونوں فی الحقیقت جدا ہو چکے ہیں اور یہ علیحدہ کمرے ان کی مستقل علیحدگی اور طلاق کا پیش خیمہ ہیں۔ اس طرح آخر کار زائد کمرے کا راز بھی کھل گیا۔

ایک اور واقعے نے بھی مجھے متوجہ کیا۔ میرے مذکورہ دو رتجگوں میں مسز وائٹ کے الگ کمرے میں جانے کے بعد اس کے شوہر کے کمرے سے مجھے دھیمی دھیمی دبی دبی سی آہٹ سنائی دیتی۔ کچھ دیر تک اس آہٹ کو بغور سننے کے بعد میں اس کی اصلیت سمجھ گیا۔ یہ مصور کی چوری چوری مستطیل صندوق کھولنے کی آواز تھی جو اس کے ہتوڑے وغیرہ سے پیدا ہوتی تھی۔ ہتوڑے کا سر اس نے آواز کو دبانے کے لئے غالباً کسی نرم اونی یا سوتی چیز میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس طرح مجھے اپنے قیاسات پر اتنا اعتماد ہو گیا گویا میں ٹھیک ٹھیک بتا سکتا ہوں کہ کس وقت وہ صندوق کا ڈھکنا علیحدہ کر چکتا ہے، کس وقت اسے اٹھاتا ہے اور کس وقت پلنگ پر رکھتا ہے۔ آخری بات مجھے اس طرح معلوم ہوتی کہ جب لکڑی کا ڈھکنا پلنگ کے چوبی کناروں سے مس کرتا تو خفیف سی آواز نکلتی۔ فرش پر صندوق کا ڈھکنا رکھنے کے لئے بالکل گنجائش نہ تھی اس لئے وہ بہ احتیاط تمام اسے پلنگ ہی پر رکھتا تھا۔ اس کے بعد اس کے کمرے میں سکوتِ مزار چھا جاتا اور گجر تک یہی حالت رہتی۔ البتہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ بعض وقت مجھے دھوکا سا ہوتا کہ میرے کان سسکیوں کی آواز سن رہے ہیں لیکن یہ بھی اتنی دبی ہوئی ہوتی کہ میں اسے محض اپنے واہمۂ خلاق کا کرشمہ قرار دے سکتا تھا۔ میں نے کہا کہ یہ آواز سسکیوں اور آہوں سے مشابہ تھی لیکن دراصل یہ اتنی موہوم تھی کہ میں سمجھتا تھا کہ میرے کان بج کر مجھے دھوکے میں ڈالتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ وائٹ کو اس کا مصورانہ ذوق اشتیاق مالا یطاق بن کر صندوق کھولنے اور بیش بہا تصویر کے نظارے سے بھوکی نگاہوں کی تسکین کا سامان فراہم کرنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ پھر بھلا اس میں رونے دھونے کی کیا بات تھی؟ پس میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کپتان ہارڈی کی سبز چائے کے صدقے میں یہ فریبِ سماعت میری اپنی ہی پریشان دماغی کا نتیجہ ہے۔ مذکورہ بالا ہر دو راتوں میں میں نے آہٹ ہی سے واضح طور پر معلوم کر لیا کہ وائٹ صبح کے قریب صندوق پر ڈھکنا رکھ کر اپنے بے آواز ہتوڑے سے پہلے ہی سوراخوں میں دوبارہ کیلیں لگا دیتا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے دن کے لباس میں کمرے سے باہر نکلتا اور جا کر مسز وائٹ کو اس کے کمرے سے بلا لاتا۔

جہاز کے سفر کا ساتواں دن تھا کہ جنوب مغرب سے تند ہوا کا ایک خوفناک طوفان اٹھا۔ ہم ایک حد تک اس کے لئے تیار تھے کیونکہ عناصر پہلے ہی دھمکیاں دے رہے تھے۔ ہر چیز اپنے ٹھکانے لگا دی گئی اور جب ہوا رفتہ رفتہ زیادہ تیز ہوگئی تو ہم نے بادبان لپیٹ کر نیچے کر دئے۔ ۴۸ گھنٹے تک ہم اسی طرح بہ حفاظت جاتے رہے لیکن اس کے بعد غضب کا طوفانی جھکڑ چلنے لگا جس نے پچھلے بادبان کے پرخچے اڑا دئے۔ اب جہاز میں پے بہ پے پانی کی کئی موجیں آنی شروع ہوئیں جن کی وجہ سے جہاز کا مطبخ اور عرشے کے کٹہرے کا بایاں حصہ سارا گر گیا اس کے ساتھ ہی تین آدمیوں کی جانیں بھی ضائع ہو گئیں۔ ابھی ہم اس صدمے سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ سامنے کے بادبان کی بھی دھجیاں اڑ گئیں۔ اس کے بعد ہم نے ایک چھوٹا سا مضبوط طوفانی بادبان لگایا جس نے چند گھنٹوں تک بہت اچھا کام دیا۔

ہوا کا وہی زور شور تھا اور اس کے تھمنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ جہاز کے مستول وغیرہ زیادہ پائدار ثابت نہ ہوئے اور ان پر ہوا کی شدت کا بہت اثر پڑا۔ طوفان کے تیسرے دن پچھلا مستول ہوا کے ایک زوردار ریلے کے ساتھ جہاز کے ایک پہلو پر آرہا اور جہاز بری طرح ڈگمگانے لگا۔ متواتر ایک گھنٹے کی جدوجہد کے بعد ہم اس مستول سے خلاصی پانے میں کامیاب ہوئے لیکن اس وقت نجار دہانۂ جہاز کی طرف آیا جس نے اطلاع دی کہ جہاز کے زیریں حصے میں چار بالشت پانی جمع ہو چکا ہے۔ مصیبت پر مصیبت یہ پڑی کہ جہاز کے آب کش درست حالت میں نہ تھے بلکہ تقریباً بے کار ہو چکے تھے۔

اب ہر طرف سخت بدحواسی اور ناامیدی پھیل گئی۔ لیکن اس کے باوجود ہم نے جہاز کا بار ہلکا کرنے کے لئے سامان سمندر میں پھینکنا شروع کیا اور باقیماندہ دو مستول بھی کاٹ کر پھینک دئے۔ آب کش اب بھی کوئی کام نہ دے سکے۔ بلکہ اس اثنا میں پانی اور بھی سرعت کے ساتھ رسنا شروع ہو گیا۔

غروبِ آفتاب کے وقت طوفان کی شدت کچھ کم ہوئی اور ہمیں کچھ موہوم سی امید ہوئی کہ شاید ہم کشتی ہی کی مدد سے اپنی جانیں بچا سکیں گے۔ رات کے آٹھ بجے بادل کھل گئے اور چودھویں رات کا چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمکنے لگا۔ یہ ہمیں اپنے لئے ایک اچھا شگون معلوم ہوا۔ چنانچہ ہمارے پژمردہ دلوں میں نامعلوم طور پر مسرت جھلکنے لگی۔

سخت جدوجہد کے بعد ہم نے کوئی حادثہ پیش آئے بغیر بڑی کشتی سمندر میں اتاری جس میں تمام ملاح اور اکثر مسافر سوار کئے گئے۔ یہ لوگ فوراً روانہ ہو گئے اور تین دن کی جانکاہ تگ و دو کے بعد ایک محفوظ مقام پر پہنچ گئے۔

اب کپتان کے علاوہ چودہ مسافر جہاز میں تھے جو دوسرے والی چھوٹی کشتی کے بھروسے پر زندگی کی بازی لگائے بیٹھے تھے۔ اس کو ہم نے بآسانی سمندر میں اتار لیا۔ اس میں کپتان اور اس کی بیوی، وائٹ اور اس کے متعلقین؛ ایک فوجی افسر کی بیوی اور چار بچے اور میں مع ایک حبشی ملازم کے سوار ہوا۔ کشتی کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ چند ضروری اوزار اور کھانے پینے کا کچھ سامان رکھنے کے بعد اس میں تل دھرنے کی جگہ نہ بچی تھی اور کوئی دوسری چیز بچانے کا کسی کے دل میں بھی خیال نہ آ سکتا تھا۔ پھر آپ جانئے ہم سب کی حیرت کی کیا انتہا رہی ہو گی جب کشتی جہاز سے دس بیس ہاتھ کے فاصلے پر پہنچی اور وائٹ نے دفعۃً کشتی میں کھڑے ہو کر نہایت اطمینان سے کپتان سے مطالبہ کیا کہ میرا مستطیل صندوق لانے کے لئے کشتی واپس لے جائی جائے۔

کپتان نے قدرا ترش لہجے میں جواب دیا "مسٹر وائٹ بیٹھ جائیے، اگر آپ بالکل بے حرکت اور خاموش نہ بیٹھے رہیں گے تو کشتی کو الٹ کر ہم سب کو ڈبو دیں گے۔ کیونکہ کشتی بوجھ سے پہلے ہی دب رہی ہے اور پانی اس کے کناروں تک پہنچ رہا ہے۔"

وائٹ نے اسی طرح کھڑے کھڑے بلند آواز سے کہا "صندوق! مسٹر ہارڈی، میرا صندوق! آپ میری درخواست کو کس طرح رد کر سکتے ہیں۔ مجھے آپ سے یہ توقع نہیں، اس کا بوجھ تو بالکل برائے نام ہے۔ وہ تو بالکل ہلکا پھلکا ہے۔ آپ کو اپنی والدہ مرحومہ کی قسم، آپ کو خدا کی محبت کا واسطہ، اپنی نجات کی امید کے صدقے میں میری درخواست کو نہ ٹھکرایئے اور صندوق لانے کے لئے واپس چلئے۔"

اس کی یہ درد بھری التجائیں سن کر کپتان کا دل بظاہر کچھ دیر کے لئے پسیج گیا لیکن جلد ہی اس نے پھر وہی ترش روئی اختیار کر کے جواب دیا "مسٹر وائٹ آپ دیوانے ہیں۔ میں آپ کی درخواست پر کوئی توجہ نہیں کر سکتا۔ بیٹھ جایئے میں کہتا ہوں۔ آپ کشتی کو الٹ کر سب کو ڈبو دیں گے ـــــــ ٹھہریئے ـــــــ پکڑو اسے روکو ـــــــ وہ چھلانگ لگا رہا ہے، وہ! مجھے یہی اندیشہ تھا ـــــــ بس گیا۔"

ابھی یہ الفاظ کپتان کے لبوں ہی پر تھے کہ وائٹ نے فی الحقیقت چھلانگ لگا دی اور چونکہ شکستہ جہاز کی اوٹ میں ہوا کا زور کم تھا وہ فوق الانسانی ہمت کے ساتھ جہاز سے لٹکے ہوئے ایک رسے کو پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ طرفۃ العین میں وہ عرشۂ جہاز پر نظر آیا اور پھر دیوانہ وار نیچے اپنے کمرے کی طرف اتر گیا۔

اس اثنا میں موجیں ہماری کشتی کو جہاز کی اوٹ سے نکال کر دور لے گئی تھیں اور اب ہم ہیبت ناک سمندر کی طوفان خیز موجوں کا بازیچہ بنے ہوئے تھے۔ ہم نے واپس جانے کی پوری کوشش کی لیکن دہشت ناک طوفانی ہوا کے سامنے ہماری کشتی ایک تنکے سے زیادہ وقعت نہ رکھتی تھی۔ ہم کو یقین ہو گیا کہ قضا نے بد انجام مصور کی موت کے پروانے پر مہر لگا دی ہے۔

ہم بسرعت تمام دور دور ہو رہے تھے مگر ہم نے دیکھا کہ جہاز کے بغلی زینہ میں دیوانہ شخص جہاں تک ہم کہہ سکتے تھے، نمودار ہوا۔ وہ ایک دیوزاد کی قوت کے ساتھ پورا صندوق کا صندوق گھسیٹتا ہوا زینے پر چڑھ رہا تھا۔ ہم اس کی طرف فرطِ حیرت سے بغور دیکھ رہے تھے کہ اس نے تین انچ موٹا ایک رسہ پہلے جلدی سے صندوق کے گرد لپیٹا اور پھر جلد جلد اس کو کئی چکر اپنی کمر کے گرد دئیے۔ اس کے بعد دفعۃً صندوق اور اس سے بندھا ہوا آدمی دونوں سمندر میں تھے اور چشم زدن میں دونوں ہمیشہ کے لئے سمندر کی تہ میں غائب ہو گئے۔

فرطِ تأسف سے کچھ دیر کے لئے ہمارے چپو رک گئے اور ہماری آنکھیں اس جگہ پر جم گئیں۔ اس کے بعد ہم روانہ ہو گئے۔ ایک گھنٹے تک ہم بالکل چپ چاپ رہے۔ اس کے بعد میں نے خاموشی کا سلسلہ توڑنے کی جرأت کی "کپتان صاحب! آپ نے دیکھا وہ دونوں کس طرح دفعۃً ڈوب گئے کیا

آپ کے خیال میں یہ عجیب بات نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ جب وہ اپنا جسم صندوق سے باندھ کر سمندر میں کودا تو مجھے اس کی زندگی کی خفیف سی امید ہو گئی تھی۔"

کپتان نے کہا "یقیناً وہ گولی کی طرح تہ کی طرف گئے ہیں مگر نمک کے گھل جانے کے بعد وہ پھر ابھریں گے۔"

میں نے حیران ہو کر کہا "نمک کیا معنی؟"

کپتان نے متوفی کے پس ماندہ عزیزوں کی طرف دیکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کہا کہ کسی مناسب موقع پر پھر یہ باتیں ہوں گی۔

ہزار قسم کی صعوبتیں جھیل کر چار دن کے بعد آخر ہم بمشکل اپنی جانیں بچانے میں کامیاب ہوئے اور ایک مشہور جزیرے تک پہنچے لیکن ہم سب نیم جان ہو رہے تھے۔ جزیرے کے باشندے ہم سے ہمدردانہ طور پر پیش آئے اور وہاں پورا ایک ہفتہ گذارنے کے بعد ہم ایک جہاز میں نیویارک کو روانہ ہو گئے۔ جہاز کو غرقاب ہوئے ایک مہینہ گذر چکا تھا۔ ایک دن اتفاقاً ایک تفریح گاہ میں کپتان ہارڈی سے میری ملاقات ہو گئی۔ جہاز کی تباہی اور بالخصوص بیچارے وائٹ کا المناک انجام قدرتاً ہمارا موضوع گفتگو بنا اور اس سلسلے میں مجھے حسب ذیل واقعات معلوم ہوئے:

مصور نے اپنے لئے، اپنی بیوی کے لئے، دو بہنوں کے لئے اور ایک ملازم کے لئے جگہ محفوظ کرائی تھی۔ اس کی بیوی جیسا کہ وہ خود کہتا تھا، بے انتہا حسین، بے انتہا سلیقہ مند اور بے انتہا مہذب تھی۔ جون کی چودھویں کی صبح کو، جس دن میں جہاز پر گیا، یہ خاتون دفعتہً علیل ہو کر جاں بحق ہو گئی۔ نوجوان شوہر غم سے دیوانہ ہو گیا۔ لیکن ناگوار وجوہ سے نیویارک کے سفر کا التوا اس کے لئے کسی طرح ممکن نہ تھا۔ وہ اپنی محبوب بیوی کی لاش اس کی ماں کے پاس پہنچانا ضروری سمجھتا تھا۔ لیکن ایک مشہور عام وہم جہاز میں لاش کو علانیہ طور پر لے جانے سے مانع آتا تھا کیونکہ غالباً تو سے فی صدی مسافر ایک لاش کی ہم سفری پر ترک سفر کو ترجیح دیتے۔

اس مشکل کا حل کپتان ہارڈی نے یہ تجویز کیا کہ لاش کو خوشبودار مسالہ لگا کر کثیر المقدار نمک کے ساتھ ایک بڑے صندوق میں بند کر کے تجارتی سامان کی طرح جہاز پر پہنچایا جائے۔ مسز وائٹ کی وفات کو پردۂ راز میں رکھا گیا اور چونکہ مصور اپنی بیوی کے لئے جہاز میں جگہ محفوظ کرا چکا تھا اس لئے ضروری ہوا کہ کوئی دوسری عورت اس کے نام سے جہاز میں سفر کرنے کے لئے آمادہ کی جائے۔ متوفی خاتون کی خادمہ بلا دقت اس فرض کی بجا آوری پر رضامند کر لی گئی۔ زائد کمرہ جو مصور کی بیوی کی زندگی میں اس خادمہ کے لئے مخصوص کیا گیا تھا، بحال رہا۔ بناوٹی بیوی ہر شب اس کمرے میں سوتی تھی۔ دن بھر وہ لوگوں کو دکھانے کے لئے اپنے معذور کے مطابق بہ تصنع اپنی مرحوم مخدومہ بنی رہتی جس سے جہاز کے مسافروں میں سے کوئی بھی روشناس نہ تھا۔ اس بات کے متعلق کپتان اور مصور پوری طرح اطمینان کر چکے تھے۔ میری اپنی غلط فہمیوں کا ماخذ قدرتاً میری بے حد غیر محتاط، بے حد متجسس اور بے حد ذکی الحس طبیعت تھی۔ لیکن اب ایک مدت سے رات کی نیند میں کبھی آرام سے نہیں سویا۔ ایک آفت زدہ چہرے کا ہولناک تصور ہر وقت میری آنکھوں میں پھر تا رہتا ہے اور ایک جنونی قہقہے کی وحشت ناک آواز ہر وقت میرے کانوں میں گونجتی رہتی ہے۔

(ترجمہ)

فضل حق قریشی

دلہن کی پوشاک

میں نے اپنی زندگی میں بہت سے مکان دیکھے ہیں۔ چھوٹے بڑے، جدید وضع کے اور قدیم وضع کے، پختہ، سنگین اور چوبی...... لیکن ایک مکان کی یاد بہت واضح طور پر میرے دل میں باقی ہے۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ مکان نہیں بلکہ ایک جھونپڑا تھا۔ وہ تین کھڑکیوں والی ایک منزلہ عمارت تھی اور ایک ضعیف کوزہ پشت کے مانند جس کی کمر پہ ایک ٹوپی رکھی ہو ——— عجیب و غریب معلوم ہوتی تھی۔ اس کی استر کاری کی دیواریں، ٹائل کی چھتیں اور خستہ حال دودکش پر سرسبز بیلیں اس طرح چھائی ہوئی تھیں گویا مکان کاہی کے سمندر میں ڈوب گیا ہے۔

شہتوت، لیکیا اور چنار کے درخت جو گھر والوں کے آباؤ اجداد نے لگائے تھے، اس قدر گھنے ہو گئے تھے کہ مکان بالکل روپوش ہو گیا تھا۔ وسیع صحن دو سرسبز چمنوں کی قطار میں تھا۔ وہ دراصل ایک سڑک کا حصہ تھا۔ لیکن اس راستے پہ کوئی گاڑی وغیرہ نہیں چلتی تھی۔ اور شاذ و نادر ہی کوئی شخص اس راہ سے گزرتا دکھائی دیتا تھا۔

اس مختصر مکان کے دروازے ہمیشہ بند رہتے۔ اس کے اندر رہنے والے دھوپ کی مطلق پروا نہ کرتے، اور نہ صاف روشنی سے مستفید ہوتے۔ کھڑکیاں بھی کبھی نہ کھلتیں۔ کیونکہ وہ تازہ ہوا حاصل کرنے کے متمنی نہیں تھے۔

ان لوگوں میں قدرت پرستی کے جذبات مطلق نہیں ہوتے جو عموماً لیکیا، چنار اور شہتوت کے درختوں کے درمیان زندگی بسر کرتے ہیں صرف موسم سرما میں سفر کرنے والے سیاحوں کو خدا نے وہ آنکھیں عطا کی ہیں جو شاطر قدرت کی دلچسپیوں سے کامل طور پر لطف اندوز ہو سکتی ہیں باقی نوع انسان ان حسین نظاروں کے وجود سے غافل رہ کر قعر ذلت میں پڑی رہتی ہے۔

لوگ عموماً اس چیز کی قدر نہیں کرتے جو نہایت افراط سے پائی جاتی ہے۔ مثل مشہور ہے "جو چیز ہم آسانی سے حاصل کر سکیں اسے جمع کرنے کی ضرورت نہیں"۔ اور نہ صرف یہ بلکہ ہم اس کی طرف راغب بھی نہیں ہوتے۔ یہ چھوٹا سا مکان سبز درختوں کی فردوس میں واقع ہے جس کے اندر چہچہانے والے پرندوں نے گھونسلے بنا رکھے ہیں۔ لیکن مکان کا اندرونی نقشہ ناقابل بیان ہے۔ موسم گرما میں بند رہنے کے باعث اندرونی حصہ مثل تنور اور سرما میں آتشکدہ حمام کی طرح گرم۔ جس میں نہ ہوا کی رمق ہوتی ہے نہ روشنی کا شائبہ۔

عرصہ دراز ہوا کہ میں کاروباری سلسلہ میں اس چھوٹے مکان کے اندر پہلی مرتبہ داخل ہوا۔ میں کرنل کا جو مالک مکان تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ایک پیغام لے کر اس کے بیوی بچوں کے پاس گیا تھا۔ مجھے وہ پہلی ملاقات بہت واضح طور پہ یاد ہے اس کو فراموش کر دینا میرے لئے ناممکن ہے۔

ذرا اپنے تصورات سے کام لے کر غور کیجئے کہ ایک کمزور اور پستہ قد عورت ۔ ۔ ۔ ۔ جس نے اپنی زندگی کی چالیس منزلیں طے کر لی ہیں۔ خوف و اضطراب کی حالت میں آپ پہ نظر جمائے ہوئے ہے۔ جب کہ آپ ملاقاتی کمرے میں داخل ہو چکے ہیں۔ آپ ایک اجنبی ہیں۔ ایک ملاقاتی اور سب سے زیادہ یہ کہ ایک نوجوان مرد۔ بس یہ احساس اس غریب عورت کو خوف زدہ اور پریشان حال کر دینے کے لئے کافی ہے خواہ آپ کے ہاتھ میں کوئی خنجر، کلہاڑی یا پستول وغیرہ نہ ہو۔ اور آپ نہایت خندہ پیشانی سے ملیں۔ پھر بھی آپ کو مخدوش سمجھا جائے گا۔

"مجھے کس شخص سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہے؟"

پستہ قد خاتون نے ہکلاتی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔ میں نے خود ہی اپنا تعارف کرا دیا اور اپنے جانے کی غرض و غایت بھی بیان کر دی اس کا خوف و اضطراب فوراً ایک خوشی کی چیخ میں تبدیل ہو گیا۔ اور اس نے اپنی نظر اٹھا کر چھت کی طرف دیکھا۔ اس کی آواز تمام کمرے میں گونج گئی۔ اور صدائے بازگشت کی طرح صدر دالان سے ملاقاتی کمرے اور ملاقاتی کمرے سے باورچی خانے میں اور باورچی خانے سے گودام میں گونجتی ہوئی سنائی دی۔ غرض تھوڑی دیر میں وہ آواز مختلف سروں میں تمام مکان کے اندر پھیل گئی۔

پانچ منٹ بعد میں بیٹھک کے اندر ایک بڑی اور نرم آرام کرسی پہ لیٹا ہوا اس آواز کو سن رہا تھا جو اس وقت تمام سڑک پہ گونج رہی تھی۔

فضا میں مچھر مارنے کے سفوف اور تازہ چمڑے کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ اور اسی کھال کا بنا ہوا ایک جوتا رومال میں لپٹا قریب کی کرسی پہ رکھا تھا۔ کھڑکیوں میں گلدستے سجے تھے۔ اور ململ کے پردے آویزاں تھے۔ جن پہ بے حد مکھیاں چمٹی ہوئی تھیں۔ دیواروں پہ پادریوں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں جن کو وارنش اور تیل وغیرہ سے بنایا گیا تھا۔ ان میں سے بعض کے شیشے کناروں کے قریب سے شکستہ ہو گئے تھے۔ پادریوں کے بعد چوکھٹوں میں خاندان کے بزرگوں کی قطار تھی۔ جن کے چہرے بادیہ گرد قبائل کے طرز پہ زرد رنگ ہو گئے تھے۔ میز پہ ایک انگشتانہ، پیچک اور ایک نصف بنی ہوئی جراب رکھی تھی۔ میز کا غذ کے کترے ہوئے چند خاکے کالی نیم آستینوں کے ساتھ لپٹے فرش پہ پڑے تھے۔ ملحقہ کمرے میں دو گھبرائی ہوئی پریشان ضعیف عورتیں جلدی جلدی اسی جیسے کاغذ کے خاکے اور درزیوں کے استعمال میں آنے والی کھریا مٹی کے ٹکڑے فرش سے اٹھا رہی تھیں۔

"جناب آپ ہمیں معاف فرمائیں" پستہ قد خاتون نے کہا۔ ہمارے مکان میں بہت زیادہ بدنظمی رہتی ہے۔ دوران گفتگو میں خاتون نے اپنی نگاہیں ایک حالت کشمکش میں دوسرے کمرے کی طرف ڈالیں جہاں اس وقت تک کاغذ کے خاکے میز پہ سے چنے جا رہے تھے۔ دروازے کے کواڑ بھی کسی قدر پریشان معلوم ہوتے تھے۔ کیونکہ وہ ایک یا دو انچ کے قریب کھلے اور پھر فوراً بند ہو گئے۔

"آخر کیا بات ہے؟" پستہ قد خاتون نے دروازے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

دوسرے کمرے میں سے ایک دلکش نسوانی لہجے میں کسی نے جواب دیا۔ لیکن میں اس زبان کو سمجھنے سے قاصر تھا کیونکہ وہ یا تو جرمن تھی یا فرانسیسی۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ ایک دراز قد چھریرے بدن کی خوبصورت لڑکی جس کی عمر تقریباً انیس سال ہو گی، میری نظر کے سامنے تھی۔ وہ باریک ململ میں ملبوس گلٹ کی ایک پیٹی اپنی کمر میں باندھے ہوئے تھی جس کے اندر مجھے اچھی طرح یاد ہے . . . سیب کا ایک نازک سا پنکھا لٹک رہا تھا۔

اُس نے اندر داخل ہو کر خوش اخلاقی سے سلام کیا۔ اور اس احساس کے ساتھ ہی کہ ایک غیر مرد کمرے میں موجود ہے اس کا چہرہ موسم بہار کی شفق کی مانند سُرخ ہو گیا۔ سب سے پہلے اس کی لمبی ناک جس پر چیچک کے ننھے ننھے داغ تھے، سُرخی میں تبدیل ہوئی اس کے بعد اس کی آنکھوں اور پیشانی میں چمک کی ایک لہر دوڑ گئی۔

"یہ میری لڑکی ہے"۔ خاتون نے تعارف کراتے ہوئے کہا ۔" اور مریم یہ نوجوان اس غرض سے آئے ہیں۔ . . . . " وغیرہ وغیرہ میرا بھی تعارف ہو گیا۔ میری نظر کاغذی خاکوں کے انبار پر دوبارہ پڑی۔ اور یہ دیکھ کر دونوں ماں بیٹیوں نے اپنی نگاہیں نیچی کر لیں۔

"ہمارے مکان کے قریب ایک میلہ ہوتا ہے"۔ خاتون نے کہا۔" ہم اپنی ضروریات کی چیزیں میلے میں سے خرید لیتے ہیں۔ ہمارا تمام سال سینے پرونے میں گزر جاتا ہے۔ اور یہاں تک کہ میلے کا دوبارہ سر پر آجاتا ہے۔ ہمارے پاس کبھی کوئی غیر تیار شدہ چیز باقی نہیں بچتی۔ میرے خاوند کی تنخواہ کافی نہیں ہے۔ اس لئے ہم کو فضول خرچی سے احتراز کرنا پڑتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم اپنی تمام چیزیں خود تیار کر لیتے ہیں۔

"لیکن سوال یہ ہے کہ اتنی ساری چیزیں کون استعمال کرے گا؟ کیا آپ دونوں کے علاوہ اس مکان میں کوئی اور بھی رہتا ہے؟"

"خوب! کیا آپ کا خیال ہے کہ ہم ان کو پہن لیتے ہیں۔ ہم ان چیزوں کو استعمال نہیں کرتے کیونکہ یہ جہیز کی چیزیں ہیں"۔

"ہیں — امی جان آپ کیا فرما رہی ہیں"۔ حسین لڑکی نے محجوب ہو کر کہا۔ اور شرم سے اس کا چہرہ دوبارہ سُرخ ہو گیا۔" ہمارے ملاقاتی کو یقین ہو جائے گا کہ آپ سچ کہہ رہی ہیں۔ حالانکہ میں شادی کے لئے رضامند نہیں ہوں۔ اور نہ کبھی ہو سکتی ہوں"۔

اس نے یہ جملہ ادا کیا۔ لیکن لفظ شادی پر اس کی آنکھوں میں ایک برقی لہر دوڑ گئی۔

چائے، بسکٹ، مکھن اور مربہ وغیرہ منگایا گیا۔ رس بھری اور بالائی بھی ان کے ساتھ تھی۔ سات بجے رات کو ہم نے کھانا کھایا۔ جو چھ مختلف قسم کا تھا۔ میں نے دوران طعام میں جمائی لینے کی ایک اونچی آواز سنی جو دوسرے کمرے سے آرہی تھی۔ میں نے حیرت سے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ ایسی جمائی کی آواز تھی جو ایک انسان کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔

"یہ میرا دیور یوسف سمیع ہے"۔ خاتون نے میرے تعجب کو رفع کرنے کی غرض سے کہا۔" وہ گذشتہ سال سے ہمارے ساتھ مقیم ہے۔ جناب معاف فرمائیں وہ . . . . جمو ماً ہر اجنبی کے سامنے آتا ہوا شرماتا ہے۔ اس کا ارادہ کسی خانقاہ میں داخل ہو جانے کا ہے۔ ملازمت کے زمانے میں افسروں نے غیر منصفانہ طور پر اس کے ساتھ برتاؤ کیا تھا اس وجہ سے اس کے دماغ میں فتور آگیا ہے"۔

کھانے سے فارغ ہو کر خاتون نے ایک خلعت دکھایا جس کو یوسف سمیع نے گرجا میں پیش کرنے کے لئے اپنے ہاتھ سے تیار کیا تھا۔ مریم نے تھوڑی دیر کے لئے حیا کو خیر باد کہہ دیا۔ اور مجھے ایک تمباکو دانی دکھائی جس پر وہ اپنے باپ کے لئے نقش و نگار بنا رہی تھی۔ جب میں نے کسی قدر چرب زبانی سے کام لیتے ہوئے اس کی کاریگری کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور خوب تعریف کی تو اس کا پیارا چہرہ خوشی سے تمتما اُٹھا۔ اُس نے اپنی ماں کے کان میں کچھ کہا۔ فوراً اس کا رنگ بھی سُرخ ہو گیا۔ اور مجھ سے سامان رکھنے کے کمرے میں چلنے کی درخواست کی میں نے دیکھا کہ وہاں پانچ عدد بڑے اور بہت سارے چھوٹے ٹرنک رکھے ہوئے ہیں۔

"یہ میری بیٹی کا جہیز ہے . . . ." اس کی ماں نے میرے کان میں کہا۔" یہ سب ہم نے خود تیار کیا ہے"۔

اس سامان کو اچھی طرح دیکھ لینے کے بعد اپنے مہمان نواز میزبانوں سے رخصت کی اجازت طلب کی انہوں نے مجھ سے وعدہ لے لیا کہ ان سے پھر کسی روز آکر ملوں گا۔ اور اکثر ملاقات کرتا رہوں گا۔

اتفاق کی بات ہے کہ میں اپنا وعدہ وفا کرنے میں کامیاب رہا۔

اپنی پہلی ملاقات کے سات سال بعد میں دوبارہ اس چھوٹے سے قصبہ میں گیا۔ کیونکہ مجھے ایک مقدمے میں گواہی دینی تھی جس کی کارروائی اسی جگہ ہو رہی تھی۔

جونہی میں اندر داخل ہوا۔ وہی مسابقہ آواز ...... جو پہلی ملاقات کے وقت تمام کمروں میں گونجی تھی ...... دوبارہ سنائی دی انہوں نے فوراً مجھ کو پہچان لیا۔ میری پہلی ملاقات ان کی زندگی میں ایک حادثہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اور جب حوادث تعداد میں بہت کم ہوں تو ان کو عرصۂ دراز تک یاد رکھا جا سکتا ہے۔ میں ملاقاتی کمرے میں گیا۔ خاتون فرش پہ بیٹھی ہوئی ایک نیلے کپڑے کو تراش رہی تھی۔ اس عرصہ میں وہ کسی قدر طاقتور ہو گئی تھی۔ لیکن پیرانہ سالی کے باعث اس کا سر بگلے کے پروں کی طرح سفید ہو گیا تھا۔ اس کی بیٹی ایک پلنگ پہ بیٹھی ہوئی کوئی چیز کاٹ رہی تھی۔ فضا میں اسی سفوف کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے دیکھا کہ پچھلی دفعہ کی طرح کاغذی خاکے زمین پہ پھیلے ہوئے تھے۔ اور ٹوٹے شیشوں کی تصویریں دیوار پہ لٹک رہی تھیں لیکن پھر بھی میں نے ایک تبدیلی محسوس کی۔ پادری کی شبیہ کے قریب کرنل کی تصویر آویزاں تھی۔ اور گھر کی تمام عورتیں ماتمی لباس پہنے کرنل کو انتقال کئے ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ اور حال ہی میں وہ ترقی کر کے جرنیل کے اعلیٰ عہدے پر مامور ہوا تھا۔

ایام رفتہ کی یاد دلوں میں تازہ ہو گئی۔

بیوہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار جاری تھا۔ "ہمیں ایک انقلاب عظیم برداشت کرنا پڑا ہے۔" اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "اور تم کو معلوم ہو گا کہ میرا خاوند مر چکا ہے۔ اب اس دنیا میں ہم تنہا رہ گئے ہیں۔ اور کوئی یار و مددگار بھی نہیں ہے۔ یوسف سمیع زندہ ہے لیکن میں اس کے متعلق کچھ اچھی خبر نہیں سنا سکتی۔ اس کو بادہ نوشی کے باعث خانقاہ میں داخل ہونے کی بھی اجازت نہیں ملی۔ وہ ناکامیابی کے غم کو دور کرنے کے لئے اب اور بھی زیادہ پیتا ہے۔ ...... میں عدالت میں ایک دعویٰ دائر کرنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ وہ کئی دفعہ میرے ٹرنک کا قفل توڑ کر مریم کا جہیز لے گیا۔ اور فقیروں میں کپڑے وغیرہ تقسیم کر دیئے۔ اس نے یہ حرکت کئی بار کی ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو میری مریم کے جہیز میں ایک چیز بھی باقی نہ رہے گی۔"

"اماں جان آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔" مریم نے کسی قدر شرماتے ہوئے کہا۔ "ہمارے ملاقاتی کو یقین ہو جائے گا کہ میری شادی ہونے والی ہے۔ حالانکہ میں کوئی رشتہ قائم کرنا نہیں چاہتی۔"

مریم نے اپنی نظر چھت کی طرف اٹھائی اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا۔

ایک گنجے سر والی مردانہ شکل، بھورا کوٹ اور جوتوں کی جگہ جرابیں پہنے ہوئے دکھائی دی۔ جو چوہے کی طرح راستہ پہ کودتی ہوئی سامنے آئی اور غائب ہو گئی۔ میں نے کہا۔

"میرے خیال میں یہ یوسف سمیع ہے۔"

میں نے ماں بیٹی پر نظر ڈالی وہ دونوں کافی ضعیف العمر معلوم ہوتی تھیں۔ اور ان کے چہروں میں غیر معمولی تبدیلی ہو گئی تھی۔ ماں کے بال ...... سفید ہو گئے تھے۔ لیکن لڑکی اس قدر زرد اور پژمردہ معلوم ہوتی تھی گویا وہ اپنی ماں کی چھوٹی بہن ہے۔ اور ان کی عمر میں پانچ سال سے زیادہ فرق نہیں۔

"میں نے عدالت میں دعویٰ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔" خاتون نے وہی بات دوبارہ کہی۔ گویا ابھی تک اس امر کا تذکرہ مجھ سے نہیں کیا گیا تھا۔ "میرا مطلب دعویٰ دائر کرنے سے ہے۔ ہم جو چیز تیار کرتے ہیں۔ یوسف سمیع اس پہ ہاتھ صاف کر دیتا ہے۔ اور اپنی روح کو

ثواب پہنچانے کی غرض سے غربا میں تقسیم کر دیتا ہے۔ میری مریم ہر چیز سے محروم ہوتی جا رہی ہے "۔

مریم کے چہرے پہ بدستور سُرخی کی لہر نمودار ہوئی۔ لیکن اس دفعہ اُس نے کوئی لفظ زبان سے نہیں نکالا۔

"ہم کو نئے سرے سے اس کی تیاری کرنی ہے۔ کیونکہ اب اس دنیا میں ہم تنہا رہ گئے ہیں"۔

"اب اس دنیا میں ہم تنہا رہ گئے ہیں"۔ مریم نے بھی انہی الفاظ کو دہرایا۔

ایک سال کا عرصہ ہوا کہ قسمت تیسری بار مجھے پھر وہاں لے گئی اس مختصر ملاقات کے کمرے میں جاتے ہوئے میں نے بڑھیا خاتون کو دیکھا جو سیاہ ماتمی کپڑوں میں ملبوس ایک پلنگ پہ بیٹھی سینے پرونے میں مشغول تھی۔ اس کے قریب ہی ایک ٹھنگنا معمر آدمی بیٹھا تھا۔ وہ بھورا کوٹ اور جوتوں کی جگہ چمڑے کی جرابیں پہنے ہوئے تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اچھلا اور کمرے کے باہر بھاگ گیا۔

میرا استقبال کرنے کی غرض سے بڑھیا خاتون مسکرائی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دریافت کیا "آپ کیا بنا رہی ہیں"؟

"یہ دلھن کی پوشاک ہے۔ اس کو تیار کرنے کے بعد میں گرجا کے پادری کو دے آؤں گی تاکہ حفاظت سے رہے۔ ورنہ یوسف میسح اس کو بھی چرا لے گا۔ اب میں ہر چیز تیار کر کے پادری کے سپرد کر دیتی ہوں"۔ اس نے آخری فقرہ نہایت آہستہ سے کہا۔

پھر اس نے اپنی بیٹی کی تصویر پہ نگاہ ڈالی جو چوکھٹے میں لگی ہوئی سامنے کی میز پہ رکھی تھی۔ اور ایک آہ سرد کھینچ کر کہا۔

"اب میں اس دنیا میں تنہا رہ گئی ہوں"۔

مریم کہاں ہے؟ میں نے دریافت کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ مجھ میں ہمت نہ تھی کہ اس غم نصیب ماں سے ایسا سوال کروں۔ جبکہ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے ماتم میں سیاہ لباس پہنے بیٹھی ہے اور اس کی شادی کی پوشاک تیار کر رہی ہے۔

میں کافی دیر تک کمرے میں رہا اور تصورات کی دنیا میں مریم کے حسین نقوش اپنی لوح قلب پہ اُجاگر کرتا رہا۔ مجھے نہ تو اس کی نغمہ زا آواز سنائی دی اور نہ طاؤس صفت رفتار کی چاپ۔

میں اصل بات کو اچھی طرح سمجھ سکا تھا۔ میں نے اپنے دل کی گہرائی میں ایک شدید قسم کا درد سا محسوس کیا ...... اس درد کی لذت ابھی تک باقی ہے۔ اور ننگا ہوں میں "دلھن کی پوشاک" پھر رہی ہے۔ جس کو ماں اس وقت سی رہی تھی جب کہ بیٹی کا کفن بھی میلا ہو چکا ہوگا۔

تیرتھ رام فیروزپوری

ہڈیوں کا پنجر

(۱)

جب میں درسی کتابیں پڑھ چکا تو میرے باپ نے مجھ کو فن طبابت سکھانا چاہا اور اس کام کے لئے ایک عالم بید کو استاد مقرر کیا۔ میرا نیا استاد صرف دیسی طبابت ہی میں ماہر نہ تھا۔ بلکہ ڈاکٹری بھی جانتا تھا۔ اور اس نے انسانی جسم کی بناوٹ سمجھانے کی غرض سے میرے لئے ایک انسان کا ڈھانچہ یعنی ہڈیوں کا پنجر منگا دیا تھا۔ جو اس کمرہ میں جہاں میں پڑھتا تھا رکھا گیا۔ عام لوگ جانتے ہیں کہ مُردہ خصوصاً ہڈیوں کے ڈھانچہ سے کمسن بچوں کو جب وہ اکیلے ہوں کس قدر خوف آتا ہے۔ قدرتاً مجھ کو بھی ڈر لگتا تھا۔ اور شروع شروع میں مَیں کبھی اس کمرہ میں تنہا نہ جاتا تھا۔ اور اگر کبھی کسی ضرورت کی وجہ سے جانا بھی پڑتا تو اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتا تھا ایک اور طالب علم بھی سبق میں میرا شریک تھا۔ جو بہت نڈر تھا۔ وہ کبھی اس ڈھانچہ سے خوف نہ کھاتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ اس مشت استخوان کی بساط ہی کیا ہے جس سے کسی زندہ آدمی کو تکلیف پہنچ سکے؟ ابھی ہڈیاں ہیں۔ چند روز بعد خاک ہو جائیں گی۔ مگر میں نے اس بارہ میں کبھی اس سے اتفاق نہ کیا اور ہمیشہ کہتا رہا۔ کہ گو روح ان ہڈیوں سے جدا ہو گئی ہے۔ تاہم جب تک یہ موجود ہیں وہ وقتاً فوقتاً آ کر اپنے پرانے مکان کو دیکھا کرتی ہے۔ میرا یہ خیال بظاہر عجیب اور ناممکن معلوم ہوتا ہے اور کبھی کسی نے یہ دیکھا نہیں ہوگا۔ کہ روح پھر اپنی ہڈیوں میں واپس آ گئی ہو لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ میرا خیال درست تھا اور درست نکلا۔

(۲)

چند دن کا ذکر ہے کہ ایک رات خانگی ضروریات کی وجہ سے مجھے اس کمرہ میں سونا پڑا۔ چونکہ میرے لئے یہ نئی جگہ تھی۔ اس لئے نیند نہ آئی اور میں بڑی دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ یہاں تک کہ پاس کے گرجا نے بارہ بجا دیئے۔ لیمپ جو میرے کمرہ میں روشن تھا۔ مدھم ہونا شروع ہوا اور پھر آہستہ آہستہ گل ہو گیا۔ اس وقت مجھے اس روشنی کی نسبت خیال آیا کہ ایک لحظہ پیشتر وہ روشنی تھی مگر اب ہمیشہ کے لئے تاریکی میں جدا ہو گئی ہے۔ دنیا میں انسانی زندگی کا بھی یہی حال ہے۔ جو کبھی رات کو کبھی دن کو ابدی زندگی میں جا ملتی ہے۔

رفتہ رفتہ میرا خیال ہڈیوں کے ڈھانچہ کی طرف منتقل ہونا شروع ہُوا۔ میں دل میں سوچ رہا تھا کہ خدا جانے یہ ہڈیاں اپنی زندگی میں کیا کچھ نہ ہوں گی۔ یکایک مجھے ایسا محسوس ہُوا۔ گویا کوئی متحرک چیز میرے پلنگ کے اِدھر اُدھر تاریکی میں پھر رہی ہے۔ پھر لمبی سانسوں کی آواز جیسے کوئی غمزدہ شخص سانس لیتا ہے۔ میرے کانوں میں پڑی اور پیروں کی آہٹ بھی آئی۔ مگر میں نے خیال کیا یہ میرا وہم ہے اور بدخوابی کی وجہ سے خیالی آوازیں آ رہی ہیں۔ مگر پاؤں کی آواز پھر آئی۔ اس پر میں نے رفع شک کی خاطر زور سے کہا "کون ہے؟"

یہ سُنکر وہ نامعلوم شکل میرے پلنگ کے نزدیک آئی اور بولی "میں ہوں۔ میں اپنی ہڈیوں کو دیکھنے آئی ہوں"

میں نے خیال کیا میرا کوئی واقف مجھ سے ہنسی کر رہا ہے۔ اس لئے کہا "یہ کونسا موقعہ ہڈیوں کے دیکھنے کا ہے۔ اصل مدعا کہو"

آواز آئی "مجھے وقت بےوقت سے کیا غرض۔ میری چیز ہے۔ میں جس وقت چاہوں اسے دیکھ سکتی ہوں۔ آہ! کیا تم نہیں دیکھتے۔ وہ وہ میری پسلیاں ہیں۔ جن میں مدتوں میرا دل رہا ہے۔ میں پورے ۲۶ سال اس آشیانہ میں مقیم رہی ہوں۔ جس کو اب تم ہڈیوں کا ڈھانچہ کہتے ہو۔ اگر میں اپنے پرانے گھر کو دیکھنے چلی آئی۔ تو اس میں تمہارا کیا ہرج ہُوا؟"

میں ڈر گیا۔ اور روح کو ٹالنے کے لئے کہا "اچھا تم جاؤ۔ اپنی ہڈیاں دیکھ لو۔ مجھے نیند آتی ہے۔ میں سوتا ہوں"

میں نے دل میں ارادہ کر لیا کہ جس وقت وہ یہاں سے ہٹی۔ میں فوراً بھاگ کر باہر چلا جاؤں گا۔ لیکن وہ ٹلنے والی آسامی نہ تھی اور کہنے لگی۔ "کیا تم یہاں تنہا سوتے ہو؟ اچھا آؤ کچھ باتیں کریں"

اس کا اصرار میرے لئے آفت ناگہانی سے کم نہ تھا۔ موت کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا مگر چاروناچار جواب دیا "اچھا تو بیٹھ جاؤ اور کوئی مزے دار بات سُناؤ"

آواز آئی "تو سُنو۔ ۲۵ سال گزرے ہیں کہ میں بھی تمہاری طرح انسان تھی اور انسانوں میں بیٹھ کر گفتگو کیا کرتی تھی۔ لیکن اب مرگھٹ کے ویرانہ میں پھرتی رہتی ہوں۔ آج میری خواہش ہے کہ میں پھر اس قدر عرصہ دراز کے بعد انسانوں سے باتیں کر دں۔ میں خوش ہوں کہ تم نے بھی میری باتیں سُننے پر رضامندی ظاہر کی ہے۔ کیوں تم باتیں سُننا چاہتے ہو یا نہیں؟"

یہ کہہ کر وہ اور آگے کی طرف آئی اور مجھے معلوم ہُوا کہ کوئی شخص میری پائنتی پر بیٹھ گیا ہے اور اس سے پہلے کہ میں کوئی لفظ زبان سے نکالوں۔ اس نے اپنا قصہ سُنانا شروع کیا۔

اب کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے حوصلہ کر کے کہا "اچھا کوئی عمدہ کہانی سُناؤ"

(۳)

وہ بولی "اے صاحب۔ جب میں انسانی جامہ میں تھی۔ تو صرف ایک شخص سے ڈرا کرتی تھی۔ اور وہ شخص میرے حق میں گویا موت کا فرشتہ تھا وہ میرا خاوند تھا۔ جس طرح ایک شخص مچھلی کو کانٹا لگا کر پانی سے باہر نکال لاتا ہو۔ یہ شخص مجھ کو میرے والدین کے گھر سے لے آیا تھا۔ اور وہاں مجھ کو جانے نہیں دیتا تھا۔ شکر ہے کہ اس کا کام جلد تمام ہو گیا۔ یعنی شادی کے دوسرے مہینہ ہی وہ دنیا سے چل بسا میں نے لوگوں کی دیکھا دیکھی نالہ و شیون کیا۔ لیکن دل میں بہت خوش تھی۔ کہ کوئی کانٹا نکل گیا۔ اب مجھ کو اپنے والدین سے ملنے کی اجازت مل جائے گی۔ اور میں اپنی پرانی سہیلیوں سے جن کے ساتھ میں کھیلا کرتی تھی۔ ملوں گی۔ لیکن ابھی مجھ کو میکے جانے کی اجازت نہ ہوئی تھی کہ ایک دن میرا خسر گھر میں آیا اور میرا چہرہ غور سے دیکھ کر اپنی اہلیہ سے کہنے لگا۔ مجھ کو قیافہ سے یہ لڑکی ڈائن معلوم ہوتی ہے۔ اپنے خسر کے الفاظ اب تک مجھ کو یاد ہیں۔ اور میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ اس کے چند دن بعد مجھ کو اپنے باپ کے گھر چلے جانے کی اجازت مل گئی باپ کے گھر پہنچ جانے پر مجھ کو جو خوشی حاصل ہوئی وہ احاطہ بیان سے باہر ہے۔ میں وہاں ہنسی خوشی رہنے اور اپنی جوانی کے

ون گذارنے لگی۔ میں نے ان دنوں بارہا اپنی نسبت لوگوں سے سُنا۔ کہ میں خوبصورت نازنین ہوں مگر تم کہو تمھاری کیا رائے ہے؟"

میں نے کہا" میں نے تمھیں زندگی کی حالت میں دیکھا نہیں۔ میں کیسے رائے دے سکتا ہوں۔ جو کچھ تم نے کہا۔ درست ہوگا"

وہ بولی" میں کس طرح یقین دلاؤں کہ ان دو خانوں میں دو سرمگیں آنکھیں دیکھنے والوں پر بجلیاں گراتی تھیں! افسوس تم میرے اصلی تبسم کا اندازہ ان ہڈیوں کے کھلے منہ سے نہیں لگا سکتے۔ ان ہڈیوں کے گرد جو خوبصورتی تھی۔ اب اس کا نام تک نہیں ہے۔ میری زندگی کے ایام میں کوئی لائق سے لائق ڈاکٹر بھی گمان نہ کر سکتا تھا کہ میری ہڈیاں تشریح جسم انسانی کے کام آئیں گی۔ مجھے وہ دن یاد ہیں۔ جب میں چلا کرتی تھی۔ تو نور کی شعاعیں میرے بال بال سے نکل کر ہر سمت کو منور کیا کرتی تھیں۔ میں اپنے بازوؤں کو گھنٹوں دیکھا کرتی تھی۔ آہ! یہ وہ بازو تھے۔ کہ جس کو میں نے دکھائے اپنا فریفتہ کیا۔ شاید سہیلا کو بھی ایسے گول اور سڈول بازو نصیب نہ ہوئے ہوں گے۔ میری چھوٹی نازک انگلیاں پنجہ مرجان کو شرماتی تھیں۔ افسوس۔ میرے اس برہنہ ڈھانچہ نے تمھیں میرے حسن وجمال کی نسبت غلط رائے قائم کرنے کا موقعہ دیا۔ تم مجھ کو ایام شباب میں دیکھتے۔ تو آنکھوں سے نیند اُڑ جاتی اور علم تشریح کا سودا دماغ سے حرفِ غلط کی طرح محو ہو جاتا"

میں نے جواب دیا" یقین جانو تمھاری اس گفتگو سے بھی طب کے سارے معلومات میرے دماغ سے خارج ہو گئے ہیں۔ اور تمھاری دلکش خوبصورتی میرے دل میں نقش ہو گئی۔ اچھا آگے کہو"

اس نے سلسلہ کلام جاری رکھ کر کہا" میرے بھائی نے فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ شادی نہ کروں گا۔ اس لئے گھر میں صرف میں ہی ایک عورت تھی۔ میں شام کو اپنے باغ میں سایہ دار درختوں کے نیچے بیٹھتی۔ تو ستارے مجھ کو گھورا کرتے۔ اور ٹھنڈی ہوا جب میرے پاس سے گذرتی تو میرے ساتھ اٹھکیلیاں کرتی تھی۔ میں اپنے حسن کے غرور میں بارہا سوچا کرتی کہ جس زمین پر میرا قدم پڑتا ہے۔ اگر اس میں محسوس کرنے کی قوت ہوتی۔ تو خوشی سے پھولی نہ سماتی۔ کبھی کہتی کہ دنیا کے سارے عاشق مزاج نوجوان گھاس کے بھیس میں میرے قدموں پر غلطاں پڑے ہیں۔ اب یہ تمام خیالات بار بار مجھ کو پریشان کرتے ہیں کہ آہ! کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ میرے بھائی کا ایک دوست ستیش کمار تھا۔ جس نے میڈیکل کالج سے ڈاکٹری کی سند حاصل کی تھی۔ وہ ہمارا بھی خانگی ڈاکٹر تھا۔ گو اس نے مجھ کو نہیں دیکھا۔ مگر میں نے ایک روز اس کو دیکھ لیا۔ اور مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ اس کی خوبصورتی نے مجھ پر خاص اثر کیا۔ میرا بھائی عجیب قسم کا شخص تھا۔ وہ زمانہ کے سرد و گرم سے بالکل ناآشنا تھا۔ اور کبھی گھر کے کاموں میں دخل نہ دیتا تھا۔ وہ زیادہ تر خاموشی پسند تھا اور تنہائی میں رہتا تھا۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ وہ دنیا سے کنارہ کش ہو کر گوشہ نشین ہو گیا اور عارفانہ زندگی بسر کرنے لگا۔ ہاں تو وہ نوجوان ستیش کمار اکثر ہمارے گھر آتا تھا۔ اور وہی ایک نوجوان تھا جس کو اپنے گھر کے مردوں کے سوا مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ جب میں باغ میں تنہا ہوتی۔ اور پھولوں سے لدے ہوئے درختوں کے نیچے ملکہ کی طرح بیٹھتی تو ستیش کمار کا خیال اور بھی میرے دل میں چٹکیاں لیتا لیکن۔ تم کس فکر میں ہو۔ تمھارے دل میں کیا گزر رہا ہے؟"

میں نے آہ سرد بھر کر جواب دیا" میں یہ خیال کر رہا ہوں کہ کاش میں ہی ستیش کمار ہوتا"

وہ ہنس کر بولی" اچھا پہلے میری کہانی سُن لو۔ پھر عشق بازی کر لینا۔ ایک دن بارش ہو رہی تھی۔ مجھے قدرے بخار تھا کہ ڈاکٹر یعنی میرا پیارا ستیش کمار مجھے دیکھنے آیا یہ پہلا موقعہ تھا کہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بالمقابل دیکھا۔ اور دیکھتے ہی ڈاکٹر کو سکتہ سا ہو گیا۔ اگرچہ میرے بھائی کی موجودگی نے اس کو ہوش سنبھالنے پر مجبور کیا۔ وہ میری طرف اشارہ کر کے بولا۔ میں ان کی نبض دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے آہستہ سے اپنا بازو دو شالہ سے باہر نکالا۔ ڈاکٹر نے میری نبض پر ہاتھ رکھا۔ میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ کہ کسی ڈاکٹر نے معمولی بخار

کی تشخیص میں اس قدر تامل کیا ہو۔ اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں سخت جد و جہد کے بعد اس نے میرے بخار کا اندازہ لگایا۔ لیکن میرا بخار دیکھتے دیکھتے ہی بذات خود بیمار ہو گئے۔ کیوں تم اس بات کو مانتے ہو یا نہیں؟

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا "ہاں بالکل مانتا ہوں۔ آدمی کی حالت میں تغیر پیدا ہونا کیا مشکل ہے۔"

وہ بولی "چند روز امتحان کرنے سے معلوم ہوا۔ کہ میرے دل میں ڈاکٹر کے سوا اور کسی نوجوان کا خیال تک نہیں۔ میرا معمول تھا۔ کہ شام کے وقت بسنتی رنگ کی ساری پہن کر اپنے بالوں میں کنگھی کر کے پھولوں کا ہار گلے میں ڈال کر شیشہ ہاتھ میں لے۔ باغ میں چلی جاتی اور پہروں دیکھا کرتی۔ کیا شیشہ دیکھنا معیوب ہے؟"

میں نے گھبرا کر جواب دیا "نہیں تو!"

اس نے سلسلہ حکایت کو جاری رکھ کر کہا "شیشہ دیکھ کر میں محسوس کرتی تھی۔ گویا میری دو زندگیاں ہو گئی ہیں۔ یعنی میں خود ہی ستیش کمار بن جاتی اور خود ہی اپنے عکس کو معشوق سمجھ کر اس پہ تن من دل نثار کیا کرتی۔ یہ میری بڑی مرغوب تفریح تھی۔ اور میں گھنٹوں اس میں گزار دیا کرتی تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ دوپہر کو پلنگ پہ بستر بچھا کر سوئی۔ اور ایک بازو کو بستر پہ لاپرواہی سے پھینک دیا۔ ذرا آنکھ جھپکی۔ تو خواب میں دیکھا۔ کہ ستیش کمار آیا اور میرے ہاتھ کو بوسہ دے کر چلا گیا ...... بس اب میں کہانی ختم کرتی ہوں تمہیں تو نیند آ رہی ہے!"

میری دلچسپی بہت بڑھ چکی تھی۔ اس لئے میں نے منت کے لہجہ میں کہا "نہیں تم کہے جاؤ۔ میرا شوق بڑھتا جاتا ہے۔"

وہ کہنے لگی "اچھا تو سنو۔ تھوڑے دنوں میں ستیش کمار کا کاروبار بہت بڑھ گیا۔ اور اس نے ہمارے مکان کے نچلے حصہ میں اپنا مطب کھول لیا۔ جب اس کو مریضوں سے فرصت ہوتی تو میں اس کے پاس جا بیٹھتی۔ اور ہنسی ہنسی ٹھٹھے میں مختلف دواؤں کے نام پوچھتی رہتی۔ اس طرح مجھے کئی ایسی دوائیں بھی معلوم ہو گئیں۔ جو زہر قاتل تھیں۔ ستیش کمار جو کچھ میں اس سے دریافت کرتی۔ بڑی محبت اور متانت سے بتایا کرتا۔ اس طرح ایک طویل عرصہ گزر گیا۔ اور میں نے محسوس کرنا شروع کیا۔ کہ ڈاکٹر مفقود الحواس رہتا ہے۔ اور جب کبھی میں اس کے سامنے جاتی ہوں۔ تو اس کے چہرہ پہ مردنی چھا جاتی ہے لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ معلوم نہ ہوئی۔ ایک دن ڈاکٹر نے میرے بھائی سے گاڑی مانگی۔ میں پاس بیٹھی تھی۔ میں نے بھائی سے پوچھا۔ ڈاکٹر اس وقت رات میں کہاں جائیگا؟ میرے بھائی نے جواب دیا بیاہ ہونے کو۔ میں نے اصرار کیا کہ مجھ کو ضرور بتاؤ وہ کہاں جا رہا ہے۔ بھائی نے کہا وہ شادی کرنے جاتا ہے۔ یہ سنکر مجھ پر غشی سی طاری ہو گئی۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور بھائی سے پھر پوچھا۔ کیا سچ مچ وہ شادی کرنے جاتا ہے۔ یا مذاق کرتے ہو؟ اس نے جواب دیا درست ہے۔ آج ڈاکٹر دلہن لائے گا۔

میں نہیں بتا سکتی۔ مجھے یہ بات کس قدر شاق گزری۔ میں نے اپنے دل سے بار بار پوچھا۔ کہ ڈاکٹر نے کیوں مجھ سے یہ بات پوشیدہ رکھی؟ کیا میں اس کو روکتی۔ کہ شادی مت کرو۔ ان مردوں کی بات کا کچھ اعتبار نہیں۔

سہ پہر کو ڈاکٹر مریضوں کو دیکھ کر مطب میں آیا۔ اور میں نے پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب کیا یہ درست ہے کہ آج آپ کی شادی ہے؟ یہ کہہ کر میں بہت ہنسی۔ اور ڈاکٹر یہ دیکھ کر کہ میں اس کو ہنسی میں اڑا رہی ہوں نہ صرف شرمندہ ہوا۔ بلکہ کچھ متفکر سا ہو گیا۔ پھر میں نے یکایک پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب جب آپ کی شادی ہو جائے گی تو کیا آپ پھر بھی لوگوں کی نبض دیکھا کریں گے؟ آپ تو ڈاکٹر ہیں۔ اور ڈاکٹروں کی نسبت مشہور ہے وہ جسم کے تمام اعضا کا حال جانتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ آپ ڈاکٹر ہو کر کسی کے دل کا پتہ نہیں لگا سکتے۔ کہ وہ کس حالت میں ہے۔ حالانکہ دل بھی جسم کا ایک حصہ ہے۔

میرے الفاظ ڈاکٹر کے دل میں تیر کی طرح لگے۔ مگر وہ خاموش رہا"

(۴)

لگن کی مہورت بڑی رات گئے مقرر ہوئی تھی۔ اور برات کو دیر سے جانا تھا اس لئے ڈاکٹر اور میرا بھائی حسب معمول شراب پینے بیٹھ گئے اس شغل میں ان کو بہت دیر ہو گئی۔ گیارہ بجنے کو تھے کہ میں ان کے پاس گئی۔ اور کہا۔ ڈاکٹر صاحب گیارہ بجنے والے ہیں۔ آپ کو شادی کے لئے تیار ہونا چاہیئے۔ وہ کسی قدر سرگرد میں ہو گیا تھا بولا۔ ابھی جاتا ہوں۔ پھر وہ میرے بھائی کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گیا اور میں نے موقعہ پاکر زہر کی پڑیا جو میں نے وعدہ بھر کو ڈاکٹر کی غیر حاضری میں اس کے صندوق سے نکالی تھی شراب کے گلاس میں جو ڈاکٹر کے سامنے رکھا ہوا تھا۔ ڈال دی۔ چند منٹ بعد ڈاکٹر نے اپنا گلاس ختم کیا اور دولہا بننے کو چلا گیا۔ میرا بھائی بھی اس کے ہمراہ روانہ ہوا۔

میں بالائی کمرہ میں گئی۔ اور اپنا نیا بنارسی ڈوپٹہ اوڑھا۔ ماتھے پر سیندور لگایا اور پوری سہاگن بن کر باغ میں نکلی۔ جہاں روز شام کو بیٹھا کرتی تھی۔ اس وقت چاندنی چٹکی ہوئی تھی ہوا میں خنکی تھی اور چنبیلی کی خوشبو نے باغ کو مہکا دیا تھا۔ اب میں نے پڑیا کی باقیماندہ دوا نکالی اور منہ میں ڈال کر چلو بھر پانی پی لیا۔ تھوڑی دیر میں میرے سر میں چکر آنے لگا اور آنکھوں میں غنودگی چھا گئی چاند کی چاندنی مدھم ہونے لگی اور زمین و آسمان بدل بدلتے میرا گھر جہاں میں نے اس قدر عمر گذاری تھی؛ رفتہ رفتہ غائب ہوتے معلوم ہوئے۔ اور میں میٹھی نیند سو گئی۔

ڈیڑھ سال کے بعد خواب راحت سے چونکی تو میں نے دیکھا کہ تین لڑکے میری ہڈیوں سے علم تشریح سیکھ رہے ہیں اور ایک استاد میری چھاتی کی طرف بید سے اشارہ کرکے لڑکوں کو مختلف ہڈیوں کے نام بتا رہا ہے اور کہتا ہے۔ یہاں دل رہتا ہے جو شادی و غم کے وقت دھڑکا کرتا ہے اور یہ وہ جگہ ہے جہاں اٹھتی جوانی کے وقت شگوفے نکلتے ہیں۔

"اچھا اب میری کہانی ختم ہے اور رخصت ہوتی ہوں"

(ترجمہ)

عبدالرزاق ملیح آبادی

شاعر کی وصیت

مولانا کا کوئی ترجمہ ہمیں بروقت نہ مل سکا۔ اس مجبوری کی بنا پر اسے یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ فہرست میں مولانا کو اپنے مرتبے کے اعتبار سے جگہ دی گئی ہے۔ (مرتب)

"اوگسٹ نیلیوف" نام کا ایک نوجوان رومی شاعر پیرس میں مقیم تھا۔ بیوی اور بچے بھی رکھتا تھا۔ موجودہ عالمگیر تنگ دستی نے اس پر بھی رزق کے دروازے بند کر دیئے تھے۔ سب ہی جتن کئے، سب ہی سے دعا مانگی مگر کسی نے کوئی مدد نہ کی۔ آخر نا امید ہو کر اور مصائب سے گھبرا کر اس نے خودکشی کر لی۔ اس کی لاش کے پاس ذیل کا وصیت نامہ ملا۔ جس کے شائع ہوتے ہی فرانس میں ایک ہل چل پڑ گئی۔ اب دنیا کو معلوم ہوا کہ یہ مرنے والا کتنا بڑا انسان تھا۔ مگر اس وقت جبکہ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

میں اپنی کہانی دل کی گہرائیوں سے لکھ رہا ہوں۔ اس لئے میری کہانی بالکل سچی ہے۔ کیونکہ دل کی گہرائیوں میں نیکی اور پاکی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح شروع کروں، زندگی کا جامہ جن رنگ برنگ تاروں سے بُنا گیا ہے۔ ان میں کس تار کو پہلے چھوؤں، میرے سامنے سفید تار بھی ہیں، سرخ بھی نیلے بھی، سیاہ بھی۔ اور ایسے تار بھی ہیں جن کا کوئی رنگ نہیں۔ گویا کسی جادو کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ مضبوط تار بھی ہیں اور کمزور بھی۔ ایسے کمزور کہ چھوتے ہی ہاتھ میں ٹوٹ جاتے ہیں۔ ان تمام بوقلموں تاروں سے زندگی نے اپنا جامہ تیار کیا ہے۔

میرے دل میں ایسی خوشیاں ہیں۔ جن کی کوئی حد نہیں۔ بہار کی خوشبوں جیسی جبکہ ہر چیز نباتات حیوان، انسان سب تر و تازہ ہو جاتے ہیں۔ بلکہ میری خوشیاں محبت کی خوشبوں سے بھی زیادہ بڑی اور مالا مال ہیں۔ میری خوشیاں موسیقی کے ساحرانہ نغموں سے لبریز اور مست ہیں۔ میں ان کا رقص اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ وہ اس درجے محسوس ہیں، کہ میں انہیں اپنے ہاتھ سے چھو سکتا ہوں۔

اور میرے دل میں غم کے طوفان اُمڈتے ہیں۔ ایسے غم جو جوانوں، بہادروں اور عروسوں کی موت کے غم سے بھی زیادہ وزنی ہیں۔ اُن کی آگ کبھی نہیں بجھتی۔ آنسوؤں کا سیلاب کبھی نہیں رک سکتا۔ حتیٰ کہ آنکھیں روتے روتے سفید ہو جاتی ہیں۔

میرے دل میں آرزوئیں ہیں بے حد و حساب۔ ایسی آرزوئیں جن کی انتہا نہ آنکھ دیکھ سکتی ہے، نہ عقل سمجھ سکتی ہے۔ خیال نے انہیں پیدا کیا ہے۔ مگر اب خود خیال بھی ان کے سامنے حیران و درماندہ ہے۔ دماغ انہیں دیکھ کر سناٹے میں آجاتا ہے۔ وہ سوچنے لگتا ہے کیا یہ ممکن ہے۔ پھر عشق کرو

ناجز پر لوکہہ دیتا ہے۔ نہیں۔ ناممکن بالکل ناممکن۔

میرے دل میں ناامیدیاں ہیں۔ سیاہ اور کڑوی ناامیدیاں۔ وہ اس طرح باہم لپٹی ہوئی بل کھایا کرتی ہیں گویا ہندوستانی اژدہے ہے جو ہاتھی پر جھپٹتا ہے اور جیتے آدمی نگل جاتا ہے۔ گھٹا ٹوپ اندھیری رات میں اندھے ہو جانے والے کی ناامیدی اور تپتے ہوئے بیابان میں گم ہو جانے والے گونگے بہرے کی ناامیدی سے بھی زیادہ تاریک اور الم ناک ناامیدیاں میرے سینے میں اپنے ہیبت ناک پھن اٹھائے بیٹھی ہیں۔

میرے دل میں خوف ہیں۔ زندگی سے خوف اور موت سے خوف۔ تندرستی سے خوف اور بیماری سے خوف۔ مفلسی سے خوف اور تونگری سے خوف۔ جو جانتا ہوں اس سے خوف۔ اور جو نہیں دیکھتا اس سے خوف۔ محبت سے خوف اور عداوت سے خوف۔ دوست سے خوف اور دشمن سے خوف وفاداری سے خوف اور بے وفائی سے خوف۔ اپنے ہوش و بیداری سے خوف۔ اور اپنی مدہوشی اور نیند سے خوف۔

میرے دل میں نیکی ہے۔ بغیر کسی دلیل کے نیکی۔ عقل و منطق کو اس میں ذرا دخل نہیں۔ گویا آسمان سے یہ نیکی اُتر کر میرے دل میں سما گئی ہے۔ لیکن میں اُسے محسوس کرتا ہوں پوری طرح محسوس کرتا ہوں۔ وہ مجھ میں شجاعت و ہمت پیدا کرتی اور ایک بہت ہی پرانے اجاڑ پیڑ کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کی جڑیں زمین سے اُکھل دی ہیں اور جس کی شاخیں تری سے خالی ہو چکی ہیں۔ تمام پتے پیلے پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن کہیں کہیں سبزی دکھائی دیتی ہے۔ وہ عجیب و کمیاب سبزی جو خزاں کے آخر میں بوڑھے درختوں ہی کا حصہ ہے۔ باغبان نے جس کی پوری عمر اس پیڑ کے چھانٹنے میں بیت چکی ہے۔ جو اپنی قناعت و بوسیدگی میں کسی دیوتا کا اُجڑا ہوا مندر معلوم ہوتا ہے۔ ایسے دیوتا کا جو اپنے پجاریوں کی دعائیں نہ قبول کر سکنے کی وجہ سے بھاگ چکا ہو۔ ہاں اسی ڈھانوے درخت کا نام خرانٹ۔ مالی نے اپنے مرتعش ہاتھ سے بھدّے حرفوں میں لکھ دیا ہے۔ "صبر"

یہ سب بوجھ میں اپنے دل میں اٹھائے ہوں۔ اور شہر میں پھرتا ہوں۔ دوست دشمن سب سے ملتا ہوں۔ ہنستا بولتا ہوں۔ شادی غمی میں شریک ہوتا ہوں۔ ہر سوال کا جواب دیتا ہوں ہر شخص کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتا ہوں۔ ان کی ہنسی پر ہنستا اور اُن کے غم پر کڑھتا ہوں۔ گویا انہیں میں سے ایک ہوں!

لیکن ان سب کے باوجود میرا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ بہت زور سے دھڑکن اٹھتی ہے۔ مجھے شبہ ہونے لگتا ہے کہ یہ میرا دل نہیں بلکہ بجلی کا پنکھا ہے جسے پوری قوت کے ساتھ کھول دیا گیا ہے۔ تب میں اسے اس طرح بغور دیکھنے لگتا ہوں۔ گویا وہ میرے سینے میں نہیں۔ کسی اور کے سینے میں ہے۔ پھر تعجب سے چلا اٹھتا ہوں۔ اس عجیب آلے کی اتنی تیز گردش۔ کتنی مدت تک جاری رہ سکتی ہے؛ صانع اوّل نے بلاشک اس کے بنانے میں کمال کر دکھایا ہے۔ مگر وہ کب اتنی سخت حرکت کو برداشت کر سکے گا۔ کیا وہ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ نہیں ہو جائے گا۔ ہر مشین کو کچھ دیر سستانے کو چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن یہ کیا ہے۔ اس مشین کے لئے ایک لحظہ بھی آرام کا نہیں؟ اس کے لئے وہ روغن کہاں ہے جو فولاد کو فولاد سے ملنے پر نرم کر دیتا ہے۔ زہر کے تمام انبار کہاں چلے جاتے ہیں۔ غموں اور مصیبتوں کا وہ زہر جو آنکھ، ناک، کان، زبان، دماغ کے راستے میرے اندر ہر وقت اترتا رہتا ہے۔ یہ چھوٹی سی مشین جو میرے سینے میں اتنی مدت سے چل رہی ہے۔ کیونکر اس تمام زہر کو خارج کرتی ہوگی؟ وہ کون ہوشیار انجینئر ہے جو اس بے حساب زہر کے مورچے سے مشین کو صاف کرتا ہوگا؟

میری کہانی! کیا میں اسے شروع سے لکھ دوں۔ اس وقت سے لکھوں جب پہلی مرتبہ میں نے زندگی کے معنی سمجھے اور یہ بوجھ اپنے کاندھے پر اٹھایا۔ یا اس آخری گھڑی سے شروع کروں جب میں زندگی کو سلام کے ساتھ رخصت کرنا اور اس کا بوجھ اتار پھینکنا چاہتا ہوں۔ اپنے اس کاندھے سے اتار پھینکنا چاہتا ہوں جو بوجھل گاڑی میں جُتے ہوئے گھوڑے کے کاندھے کی طرح بن چکا ہے۔ جسے تسموں نے زخمی کر ڈالا ہے۔ اور جب وہ گاڑی میں زور لگاتا ہے۔ زخم گہرا ہوتا جاتا ہے۔ مگر کوئی آنکھ اُسے دیکھتی نہیں۔ کیونکہ انہیں تسموں کے اندر وہ چھپا ہوتا ہے۔ جنہوں نے اسے پیدا کیا اور اتنا گہرا کر دیا ہے۔

میرا قصہ انسانیت کو بدنام کرنے والا۔ بے نقاب کرنے والا، اس کی تمام آلائشیں کھول دینے والا۔ اور اسے خود اس کی نظر میں ذلیل کر ڈالنے والا قصہ ہے۔ انسانیت ان عورتوں کی طرح ہے۔ جو عالیشان محلوں اور مسرت آمیز نعروں کی گونج میں بچوں کو دودھ پلانے کے لئے ان کی ماؤں سے لیتی ہیں۔ اور تاریک کمین گاہوں میں بیٹھ کر انہیں مار ڈالتی ہیں۔ یہ مجرم عورتیں پاگل ہوتی ہیں۔ مگر معصوم بچوں کے قتل کا شوق انہیں صرف اتنی دیر کے لئے بہت ذہین بنا دیتا ہے۔ جتنی دیر بچے حاصل کرنے کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ وہ بڑی ہوشیاری سے اچھے کپڑے پہن کر جاتی ہیں۔ اور میٹھی میٹھی باتیں بنا کر ماؤں کی گودیں خالی کرا لیتی ہیں۔ ٹھیک یہی حال مکار، دغاباز، جھوٹی، بدبخت، پاگل انسانیت کا بھی ہے۔ وہ اپنی خواہشوں کی کنیز اور نفس کی پجاری ہوتی ہے۔ وہ انسانیت وہ اصل بدصورت، بداخلاق چڑیل ہے جو اپنی مدہوشی کی وجہ سے اپنے افعال سے بے خبر اور جنون و جہالت کی وجہ سے اپنی زندگی کے معنی سے ناواقف ہے۔ بدترین ماں ہے۔ یہ ہماری دنیا جس کے دل میں ماں کا نام کو نہیں۔

میں اس دنیا اور انسانیت کے کس جھوٹ سے اپنا قصہ شروع کروں؟ کیونکہ میں اس کے تمام جھوٹوں کا شکار بن چکا ہوں۔ یہ دیکھو میرے تمام بچے بیمار پڑے ہیں۔ اور تکلیف کی شدت سے کراہ رہے ہیں۔ کسی کی آنکھیں دکھ رہی ہیں۔ کوئی گلیٹوں کے ورم میں مبتلا ہے۔ کوئی پیدائشی لنجا ہے۔ نہ کوئی غذا اُسے قوت دیتی ہے۔ نہ کوئی دوا فائدہ پہنچاتی ہے۔

میری بیوی اس طرح روتی پیٹتی پھرتی ہے گویا اسے پھانسی کا حکم مل چکا ہے اور جلاد سامنے کھڑے ہیں۔ اسے روپے کی، آرام کی، کھلی ہوا کی، لمبے سفر کی ضرورت ہے۔ خدا سے رحم کی طالب ہے۔ حالانکہ نہ کبھی رحم سے آشنا ہوئی نہ کسی پر رحم کھا چکی ہے۔ میرے لئے سب سے زیادہ ناقابلِ برداشت مصیبت یہ ہے کہ وہ بکتی رہتی ہے۔ اور میری کوئی بات سننا نہیں چاہتی۔ عقل کل ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ حالانکہ کچھ نہیں سمجھتی۔ ان مصیبتوں سے روتی اور فریاد کرتی ہے۔ جو اس نے اپنی بے وقوفی، نیک نیتی سے خود ہی پیدا کر دی ہیں۔ نیک نیتی کا ذکر یہاں خوب موقع سے آیا۔ کیونکہ انگریزوں کی مثل ہے۔ "جہنم کا راستہ نیک نیتی نے تیار کیا ہے"!

اے شخص انصاف کر، اس سے بڑھ کر تیرے لئے سوہانِ روح اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایسی مشکل سامنے آجائے جس کا کوئی حل تجھ سے ممکن نہیں ہے۔ ایسی خرابی جس کی درستگی اختیار سے باہر ہے۔ ایسی بیماری جس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ ایسی تنگی جسے دور کرنا تیرے بس میں نہیں۔ خصوصاً جب کہ یہ مشکل، خرابی، بیماری، تنگی اس وجہ سے پیدا ہوئی ہو کہ تیرا لڑکا جسے بیماری نے ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا دیا ہے۔ جس کی آواز بھوک سے غترا گئی ہے وہ گھسٹ کر تیری طرف بڑھنا چاہتا ہے۔ اپنے ننھے ننھے لاغر ہاتھ پھیلاتا ہے۔ اپنی کملائی آنکھوں سے تجھے ہزاروں امیدوں کے ساتھ دیکھتا ہے اور اپنی غم ناک آواز میں روٹی کا ٹکڑا بس ایک ٹکڑا مانگتا ہے۔ مگر تو اسے یہ ٹکڑا بھی نہیں دے سکتا۔ تو اس معصوم کے سامنے بے حس و حرکت اس طرح بیٹھا ہے جیسے کوئی بت کسی مندر میں رکھا ہو۔ ٹکر ٹکر اپنے لختِ جگر کو دیکھتا ہے۔ بولنے کا ارادہ بھی کرتا ہے۔ بڑھ کر اُسے سینے سے بھی لگا لینا چاہتا ہے۔ مگر تیرا تمام جسم اس طرح ہو جاتا ہے جیسے سُن ہے یا فالج کا مارا ہوا۔

یہ دیکھو دنوں پر دن اور ہفتوں پر ہفتے ایک ہی حالت اور ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے گزرتے چلے جاتے ہیں۔ کون رنگ، گھماسیالا رنگ۔ غم و حسرت کا رنگ۔ گویا یہ زندگی جس کا ہم شکار ہوتے ہیں موسیقی رکھتی ہے۔ وہ موسیقی جو صرف قبروں کے درمیان مترنم ہوتی ہے۔ جس کے راگ غم اٹھاتے اور مایوسی پیدا کرتے ہیں۔ گویا شوپنہار نے اپنی قاتل ناامیدی میں۔ بہتوں نے اپنے مہلک غم میں۔ چیکوسکی نے اپنی درد انگیز حیرانی میں ایک ہی سُر الاپا تھا۔ ایسا سُر جو ہر مرتبہ دل کی ایک رگ کو کاٹتا اور روح کے ایک تار کو توڑ ڈالتا ہے۔

یہ دیکھو قرضخواہ، ابدی حقوق کے مالک دروازے پر کھڑے ہیں اور اپنے حق مانگ رہے ہیں۔ گویا انہوں نے باہم مشورہ کر کے طے کر لیا ہے کہ ایک ساتھ اور ایک ہی جگہ مطالبہ کریں گے۔ قرض دیتے وقت یہ لوگ جتنے ہنس مکھ، ملنسار، خوش اخلاق تھے۔ اب قرض واپس لیتے وقت اتنے ہی کرخت بے مروت، بداخلاق بن گئے ہیں

اُنہوں نے گویا فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنی دکانوں پر میری آدھ بگت بھول جائیں گے اور خود میرے دروازے پر میری توہین میں باہم بازی لے جائیں گے۔ میں اُن کی نگاہ میں ایسا مقروض ہوں جو وعدہ خلاف ہے۔ وہ مقروض جس سے زمانے نے بے وفائی کی ہے۔ ان میں کسی ایک آدمی کو بھی میں نے ایسا نہیں دیکھا جو اس اندیشے سے ڈرتا ہو کہ کل شاید اس کی حالت بھی میری جیسی ہو جائے۔ معلوم ہوتا ہے عارضی دولت انسان کو زمانے کی گردش سے بے خبر کر دیتی اور تونگری ظلم و تکبر کا مادہ پیدا کر دیتی ہے۔ شاید اپنی قوت اور دولت بڑھ دسہ آدمی کو اس وہم میں مبتلا کر دیتا ہے کہ فقر و فاقہ کی مصیبت اس کے لئے بنی ہی نہیں۔ میں اپنی غربت و مصیبت پر بھی ان لوگوں کے لئے عذر تلاش کرتا ہوں۔ مگر وہ اپنی تونگری و بے فکری پر بھی میرا کوئی عذر قبول نہیں کرتے۔ بلکہ شب و روز ہر لحظہ اپنے قرض کا مطالبہ جاری رکھتے ہیں۔ اب ان قرضخواہوں کی وجہ سے میری حالت جنرل وِلنگٹن کی سی ہوگئی ہے۔

"واٹرلو" کے معرکے سے ذرا پہلے بار بار چلا اٹھتا تھا۔ رات یا بلوچر۔ اُسی طرح میں بھی بار بار اپنے دل میں پکارتا ہوں۔ الٰہی رات یا دولت۔

لیکن بعض قرضخواہ چمگادڑوں کی طرح رات کو بھی میرے گھر پر منڈلایا کرتے اور بار بار دستک دیا کرتے ہیں۔

جب رات بھیگ جاتی ہے اور ہر طرف سناٹا چھا جاتا ہے تو میں کسی ایسے آنے والے کا انتظار شروع کرتا ہوں۔ جو پرانے زمانے میں ناگہاں نمودار ہو کر دولت و مسرت سے مالا مال کر دیا کرتا تھا۔ ہر لحظہ مجھے گمان گزرتا ہے جیسے کسی پکارنے والے کی آواز یا دستک سُن رہا ہوں۔ فوراً اپنی سانس روک کر اور کان کھڑے کر کے آہٹ لیتا ہوں۔ مگر وائے افسوس! دروازے پر سناٹے کے سوا کچھ نہیں سنتا۔ میری رات اسی طرح بیت جاتی ہے جس طرح تمہارے لازوال شاعر الفرڈ دی موسیہ نے کہا ہے:۔

Jui Sonne ? peronne !

O! Solitude! O! Pauvrete

کون دستک دے رہا ہے! کوئی نہیں! اُف تنہائی! اُف غربت "

(ترجمہ)

---

(۷)

افسانوی مضامین کا دور

خواجہ حسن نظامی

شہزادے کا بازار میں گھسٹنا

(۱)

غدر سے ایک برس پہلے کا ذکر ہے دہلی سے باہر جنگل میں چند شہزادے شکار کھیلتے پھرتے تھے اور بے پرواہی سے چھوٹی چھوٹی چڑیوں، فاختاؤں کو جو دوپہر کی دھوپ سے بچنے کے لئے درختوں کی ہری ہری ٹہنیوں پر بیٹھی خدا کی یاد کی تسبیحیاں پڑھ رہی تھیں، غلّے مار رہے تھے کہ سامنے سے ایک گدڑی پوش فقیر آن نکلا اور اس نے نہایت ادب سے شہزادوں کو سلام عرض کیا "میاں صاحبزادو! ان بے زبان جانوروں کو کیوں ستاتے ہو، انہوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ ان کے بھی جان ہے۔ یہ بھی تمہاری طرح دکھ اور تکلیف کی خبر رکھتے ہیں۔ مگر بے بس ہیں اور منہ سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ تم بادشاہ کی اولاد ہو بادشاہوں کو اپنے ملک کے رہنے والوں سے محبت اور مہربانی برتنی چاہئے۔ یہ جانور بھی ملک میں رہتے ہیں ان کے ساتھ بھی رحم اور انصاف برتا جائے تو شان بادشاہی سے دور نہیں۔" بڑے شہزادے نے جس کی عمر ۱۸ برس کی تھی شرما کر غلیل ہاتھ سے رکھ دی۔ مگر چھوٹے مرزا نصیر الملک بگڑ کر بولے "جا رے جا، دو ٹکے کا آدمی ہم کو نصیحت کرنے نکلا ہے۔ تو کون ہوتا ہے ہم کو سمجھانے والا، سیر و شکار سب کرتے ہیں ہم سے کون سا گناہ ہو گیا؟" فقیر بولا "صاحب عالم ناراض نہ ہوں، شکار ایسے جانور کا کرنا چاہئے کہ ایک جان جائے تو دس پانچ جانوں کا پیٹ تو بھرے، ان ننھی ننھی چڑیوں کے مارنے سے کیا نتیجہ؟ بیس بھی مارو گے تب بھی ایک آدمی شکم سیر نہ ہو سکے گا۔" نصیر مرزا فقیر کے دوبارہ بولنے سے آگ بگولا ہو گئے اور ایک غلّہ غلیل میں رکھ کر فقیر کے گھٹنے میں اس زور سے مارا کہ بے چارہ منہ کے بل گر پڑا اور بے اختیار اس کی زبان سے نکلا کہ "ہائے ٹانگ توڑ ڈالی۔" فقیر کے گرتے ہی شہزادے گھوڑوں پر سوار ہو کر قلعے کی طرف چلے گئے اور فقیر گھسٹتا ہوا سامنے کے قبرستان کی طرف چلنے لگا۔ گھسٹتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا "وہ تخت کیونکر آباد رہے گا جس کے وارث ایسے سفاک ظالم ہیں۔ لڑکے تو نے میری ٹانگ توڑی خدا تیری بھی ٹانگیں توڑے اور تجھ کو بھی اسی طرح گھسٹنا نصیب ہو!"

(۲)

توپیں گرج رہی تھیں۔ گولے برس رہے تھے زمین پر چاروں طرف لاشوں کے ڈھیر نظر آتے تھے، شہر دہلی ویران اور سنسان ہوتا جاتا تھا کہ لال قلعے سے پھر وہی چند شہزادے گھوڑوں پر سوار ہو کر بدحواسی کے عالم میں بھاگتے ہوئے نظر آئے اور پہاڑ گنج کی طرف جانے لگے۔ دوسری طرف بیس پچیس گورے سپاہی، دھاوے کرتے چلے آتے تھے انہوں نے ان نوعمر سواروں پر یک لخت بندوقوں کی باڑ ماری۔ گولیوں نے گھوڑوں اور سواروں کو چھلنی کر دیا اور

یہ سب شہزادے فرشِ خاک پر گر کر خون میں تڑپنے لگے۔ گورے جب قریب آئے تو دیکھا کہ دو شہزادے جاں بحق ہو چکے ہیں۔ مگر ایک سانس لے رہا ہے۔ ایک سپاہی نے اس زندہ شہزادے کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تو معلوم ہوا کہ اس کے کہیں زخم نہیں آیا۔ گھوڑے کے گرنے سے معمولی کھرنچیں آ گئی تھیں اور دہشت کے سبب غشی طاری ہو گئی تھی۔ صحیح سالم دیکھ کر گھوڑے کی باگ ڈور سے شہزادے کے ہاتھ باندھ دئے گئے اور حراست میں کر کے دو سپاہیوں کے ہاتھ کیمپ میں بھجوا دیا گیا۔ کیمپ پہاڑی پر تھا جہاں گوروں کے علاوہ کالوں کی فوج بھی تھی۔ جب بڑے صاحب کو معلوم ہوا کہ یہ بادشاہ کا پوتا نصیر الملک ہے تو وہ بہت خوش ہوئے اور حکم دیا کہ اس کو حفاظت سے رکھا جائے۔

(۳)

باغیوں کی فوجیں شکست کھا کر بھاگنے لگیں۔ اور انگریزی لشکر یلغار کرتا ہوا شہر میں گھسنے لگا۔ بہادر شاہ ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار ہو گئے تیموری بزم کا چراغ جھلملا کر گل ہو گیا اور جنگل شریف زادیوں کے برہنہ سروں اور کھلے چہروں سے آباد ہو گیا۔ باپ بچوں کے سامنے ذبح ہونے لگے۔ اور مائیں اپنے جوان بیٹوں کو خاک و خون میں لوٹتا دیکھ کر چیخیں مارنے لگیں۔

اس دار و گیر میں پہاڑی کے کیمپ میں میرزا نصیر الملک رسی سے بندھے بیٹھے تھے کہ ایک پٹھان سپاہی دوڑا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ جائیے میں نے آپ کی رہائی کی اجازت صاحب سے حاصل کر لی۔ جلدی بھاگ جاؤ ایسا نہ ہو کسی دوسری بلا میں پھنس جاؤ۔

مرزا بے چارے پیدل چلنا کیا جانیں، حیران تھے کہ کیا کریں۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا پٹھان کا شکریہ ادا کر کے نکلے اور جنگل کی طرف ہو لئے۔ چل رہے تھے مگر یہ خبر نہ تھی کہ کہاں جاتے ہیں۔ ایک میل چلے ہوں گے کہ پیروں میں چھالے پڑ گئے، زبان خشک ہو گئی۔ حلق میں کانٹے پڑنے لگے۔ تھک کر ایک درخت کے سایہ میں گر پڑے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر آسمان کی طرف دیکھا کہ الٰہی یہ کیا غضب ہم پر ٹوٹا۔ ہم کہاں جائیں کدھر ہمارا ٹھکانا ہے۔ اوپر نگاہ اٹھانے سے درخت پر نظر گئی۔ دیکھا فاختہ کا ایک گھونسلا بنا ہوا ہے اور وہ آرام سے اپنے انڈوں پر بیٹھی ہے۔ اس کی آزادی و آسائش پر شہزادے کو بڑا رشک آیا اور کہنے لگے کہ فاختہ! مجھ سے تو لاکھ درجے بہتر ہے کہ آرام سے اپنے گھونسلے میں بے فکر بیٹھی ہے میرے لئے تو آج زمین و آسمان میں کہیں جگہ نہیں۔

تھوڑی دور ایک بستی نظر آتی تھی۔ ہمت کر کے وہاں جانے کا ارادہ کیا۔ اگرچہ پاؤں کے چھالے چلنے نہ دیتے تھے۔ مگر افتاں و خیزاں گرتے پڑتے وہاں پہنچے تو عجیب سماں نظر آیا۔

ایک درخت کے نیچے سینکڑوں گنوار جمع تھے۔ اور چبوترہ پر ایک تیرہ سال کی معصوم لڑکی بیٹھی تھی جس کے چہرہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ کان لہو لہان ہو رہے تھے۔ اور دہقانی اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ جونہی مرزا کی نگاہ اس بچی پر پڑی اور اس بے چاری نے مرزا کو دیکھا دونوں کی چیخیں نکل گئیں۔ بھائی بہن کو اور بہن بھائی کو چمٹ کر رونے لگے۔ میرزا نصیر الملک کی یہ چھوٹی بہن اپنی والدہ کے ساتھ رتھ میں سوار ہو کر قلعہ سے قطب صاحب چلی گئی تھیں۔ میرزا کو گمان بھی نہ تھا کہ وہ اس آفت میں مبتلا ہو گی۔ پوچھا ملکہ تم یہاں کہاں؟ وہ کہہ بولی آغا جی گوجروں نے ہم کو لوٹ لیا۔ نوکروں کو مار ڈالا۔ اماں جان کو دوسرے گاؤں والے لے گئے اور مجھ کو یہ یہاں لے آئے۔ میری بالیاں انہوں نے نوچ لیں۔ اور دیکھو انہوں نے میرے طمانچے ہی طمانچے مارے ہیں۔" اتنا کہہ کر لڑکی کی ہچکی بندھ گئی۔ اور پھر کوئی لفظ اس کی زبان سے نہ نکلا۔

بے کس شہزادہ نے اپنی غریب بہن کو دلاسا دیا اور ان گنواروں سے عاجزی کرنے لگا کہ اس کو چھوڑ دو۔ گوجر بگڑ کر بولے ارے جا، آیا بڑا اب جا ورنہ ایک گنڈاسا ایسا ماریں گے کہ گردن کٹ جائے گی۔ اس کو ہم دوسرے گاؤں سے لائے ہیں ملا دام دے جا اور لے جا۔ مرزا نے کہا کہ چودھری! میں دام کہاں سے دوں۔ میں تو خود تم سے روٹی کا ٹکڑا مانگنے کے قابل ہوں۔ دیکھو ذرا رحم کرو۔ کل تم ہماری رعیت تھے اور ہم بادشاہ کہلاتے تھے۔ آج آنکھیں نہ پھیرو۔ خدا کسی کا وقت نہ بگاڑے اگر ہمارے دن پھر گئے تو مالا مال کر دیں گے۔ یہ سن کر گنوار بہت ہنسے اور کہنے لگے ابھی آپ بادشاہ سلامت ہیں، تب تو ہم تم کو فرنگیوں کے ہاتھ بیچیں گے۔ اور یہ چھوکری تو اب ہمارے گاؤں کی ٹہل کیا کرے گی۔ جھاڑو دے گی، ڈھوروں کے آگے چارہ ڈالے گی۔ گوبر

اٹھائے گی۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سامنے سے انگریزی فوج آگئی اور گاؤں والوں کو گھیر لیا۔ اور چودھریوں کو اور ان دونوں شہزادے شہزادی کو پکڑ کر دہلی لے گئی۔

(۴)

چاندنی چوک کے بازار میں پھانسیاں گڑی ہوئی تھیں۔ اور جس کو انگریز افسر کہہ دیتے کہ یہ قابلِ دار ہے اس کو پھانسی مل جاتی تھی۔ ہر روز سینکڑوں آدمی دار پر لٹکائے جاتے، گولیوں سے اڑائے جاتے اور تلوار سے ذبح ہوتے تھے۔ ہر طرف اس خونریزی سے تہلکہ تھا۔ میرزا نظام الملک اور اُن کی ننھی بہن بھی بڑے صاحب کے سامنے پیش ہوئے۔ اور صاحب نے ان دونوں کو خردسال دیکھ کر بے قصور سمجھا اور چھوڑ دیا۔ دونوں نجات پا کر ایک سوداگر کے ہاں نوکر ہو گئے۔ لڑکی سوداگر کے بچے کو کھلاتی تھی۔ اور نصیر الملک بازار کا سودا سلف کرتے تھے۔ چند روز کے بعد لڑکی تو ہیضہ میں مبتلا ہو کر مر گئی۔ اور میرزا کچھ دن ادھر ادھر نوکریاں چاکریاں کرتے رہے۔ آخر سرکار نے ان کی پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی اور نوکری کے وبال سے سبکدوشی ہو گئی۔

(۵)

ایک برس کا ذکر ہے۔ دہلی کے بازار چتلی قبر۔ کمرہ بنگش وغیرہ میں ایک پیر مرد جن کا چہرہ چنگیزی نسل کا پتہ دیتا تھا کولہوں کے بل گھسٹتے پھرا کرتے تھے۔ ان کے پاؤں شاید فالج سے بے کار ہو گئے تھے اس لئے ہاتھوں کو ٹیک کر کولہوں کو گھسیٹتے ہوئے راستہ چلتے تھے۔ ان کے گلے میں ایک جھولی ہوتی تھی۔ دو قدم چلتے اور راہ گیروں کو حیرت سے دیکھتے۔ گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی محتاجی ظاہر کر کے بھیک مانگتے تھے۔ جن لوگوں کو ان کا حال معلوم تھا ترس کھا کر جھولی میں کچھ ڈال دیتے تھے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ ان کا نام میرزا نصیر الملک ہے اور یہ بہادر شاہ کے پوتے ہیں۔ سرکاری پنشن قرضہ میں برباد کر دی اور اب خاموش گداگری پر گزارہ ہے۔ مجھ کو ان کے حال سے بڑی عبرت ہوتی تھی۔ اور جب ان کا ابتدائی قصہ جو کچھ خود ان کی زبانی اور کچھ دوسرے شہزادوں کی زبانی سنا تھا یاد آتا تو دل ہل جاتا تھا کہ اس فقیر کا کہنا پورا ہوا۔ جس کی ٹانگ میں انہوں نے غلہ مارا تھا۔ شہزادہ صاحب کا بازار میں گھسٹتے پھرنا سخت سے سخت دل کو موم کر دیتا تھا اور خدا کے خوف سے جی کانپ جاتا تھا۔ اب ان شہزادہ صاحب کا انتقال ہو گیا۔

آغا حیدر حسن دہلوی

اودکھلے کی سیر

اللہ محمد کے چھیتے، صاحب عالم نے محلسرائے میں آنا شروع کر دیا۔ کیا ایک پر ایک ہے منقلب القلوب کی تسبیح۔ اب اس کی سند نہیں کہ ساون سوکھے جائیں۔ سیل ہونی چاہئے اور وہ بھی اودکھلے کی۔ باغ تو اپنے ہی ہیں۔ جب چاہا چلیں گے اور آج کل جھڑاں ناسپاتیاں ہی ہوں گی یا امرود اور بیبو قطب صاحب پھر کبھی سہی۔ شرف النساء یہ تمہارا ورس سُن کون رہا ہے کہ دماغ اپنی جگہ سے جاتا ہے۔ تم اپنا سن دیکھو اور یہ چونچ بہو بیگم یہ خوب رہی کہ بڑھیا حال سے گئی احوال سے گئی کیا اب دل کے خیال سے بھی جائے۔ رابعہ خانم نے کہا۔ دلہن بیگم اللہ جانے رُت ذرا ایسی ہی ہو رہی ہے۔ بھلا اس چار دیواری میں کیا مزا۔ یہ قہقہہ دیواریں اور یہ دریا انگنائی اس پہ اس کالی گھٹا کی چھت سنے تو پورا محل بھونرا بنا دیا ہے' اللہ جانے وحشت ہونے لگی۔ آپ ذرا سا بڑی سرکار کے سامنے ذکر چھیڑ دیں۔ وہ کبھی انکار نہ کریں گی—— آبادی خانم سارا انتظام کر لیں گی اور انتظام کیا آخر اللہ رکھو سیر سوا سیر کا پکنا ہی ہے یہاں نہ پکا وہیں سہی۔ یہاں نہ کھایا وہاں کھا لیا۔ جو وہاں کی بھٹڑ میں پکنا رہند صنادو بھر ہو جائے گا تو سب یہاں سے ہی پکا پکایا ساتھ لے لیا جائے گا۔ کوئلوں کی بوریاں اور انگیٹھیاں رکھ لیں گے۔ بیسن' مصالحہ' گھی' کڑھائیاں لے لیں گے تو اب رہا کیا۔ یوں چٹکی بجاتے میں سب ہو جائے گا۔ پرسوں جمعہ ہے۔ مرد سب نماز کر جائیں گے وہاں کوئی جم جم ہوگا۔ صاحب عالم ساتھ ہوں گے تو کوئی کھٹکا نہیں رہ وچو بدا کافی ہیں۔ دونوں بڈھوں کو لے لیں گے۔ لال خان اور محب اللہ خان ہیں بھی خوش دل۔ اس مرنے عبداللہ خان کو نہ لیجئے گا۔ نگوڑا بڑا زشت رو ہے۔ اور ولایت بیگ بھی نا جانگو ہے۔ ابجک کمبخت کا ہمیشہ تیوری پر ہی بل رہتے ہیں۔ صبح ہی صبح صورت دیکھ لو تو سارے دن کھانے کی خیر سلّا ہی قرمانیے تو جا کے عرض کیا آؤں بڑی سرکار سے۔ انکار تو کسی ترلوں کریں گی ہی نہیں۔ اللہ انہیں سوا سو سال سلامت رکھے وہ بھی اُداس سی رہتی ہیں۔ جب سے مغلی بیگم اصل خیر سے سدھاری ہیں۔ جی بہل جائے گا اچھا بی' جاؤ' توبہ ہے تم لوگوں نے میرا دماغ چاٹ لیا۔ خوب دل ہیں دھپٹ جھپٹ بلائیں لے کر) صدقہ گئی زندہ دلی اسی کا نام ہے۔ مُردہ دلوں کا کیا خاک جینا اور اللہ ہماری مرے گرانے والی سرکار کو قیامت تو ٹھی رکھے یہ کہہ جھپ جھپ جا' صدر دالان میں بیگم صاحبہ کو بہو کا پیام سُنا دیا۔ وہ کہنے لگیں کہ سچ مچ دلہن بیگم کا سیر کو جی چاہا۔ اس پر کیچہ جان نے کہا کہ یہ سر سفید دھوپ میں نہیں ہوا۔ انہیں بٹر چُٹنیوں کا اشغلا اٹھایا معلوم ہوتا ہے۔ دلہن بیوی نے کبھی نہ کہا ہوگا۔ دلہن بیگم یہ انہیں لنکا لیریوں کی پٹی

پڑھائی ہے۔ ہاں دواجی، کیا ہے، بچے ہیں، کوئی ہرج نہیں۔ کہہ دو چلیں گے جمعہ کو۔ مگر اتنا کرنا کہ ایک آنکھ انتظام دیکھ لینا۔ میں ابھی آتون جی سے کہہ دیتی ہوں وہ باہر داروغہ جی کو کہلوا دیں گی اور بڑی داروغن کو میں حکم دیے دیتی ہوں وہ سب سامان مہیا کر دیں گی۔ چلے گی ساری محلسرائے۔ عمدہ کے طائفے کو بلوا لو پیا اس کی بیٹی منور آئے اور کسا نقلیں بھی ہوں گی ہوا خوری کو جا رہے ہیں۔ فرنگی کی نقل ضرور کرے۔ ڈرتے نہیں، باہر نقلیں نہیں ہوں گی کالے صاحب سے بنگلے کی اجازت منگوالی ہے۔ جاؤ سب تیاریاں کرو۔ مجھے نفل پڑھ لینے دو ابھی تسبیاں بھی باقی ہیں۔ سارے محل میں ایک اودھم مچ گئی سب نے مہندیاں لگائیں جن کی مہندیاں پھیکی ہو گئی تھیں انہوں نے اور رچائیں۔ سرخ سبز جوڑے پہنے لال سبز ڈانک کے لاکھی جوتے پہنے سب بن سنور گئیں کل سامان لیس ہو گیا۔ اندھیرے منہ سب اٹھ کے تیار ہو گئے۔ بیڑے کے دربان پھاٹک کے باہر ہوئے، زنانہ پہرہ بیڑے میں آ گیا۔ عنابی روغن کا گھٹا ٹوپ انگریز کی ولایت کا بنا۔ دروازوں کی مٹھیاں گنگا جمنی ولایتی چار تیلیا۔ کمیت گھوڑے جتے۔ ہاتھی کے بچے، اونچائی میں ٹوپ اوڑھے فرنگی سے بھی دو مٹھی نکلتے۔ ان کا ساز و یراق گنگا جمنی، کلغی میں سارس کے گچھے، اوپر سبز رنگے لگے۔ بڑی سرکار بہو بیگم، صاحب عالم اور بچے اس میں بیٹھے۔ پانوں کی ڈبیا کا گسنا، چپاگل اور نخالی جوڑ کٹورا ساتھ رہا۔ کیجا جان بھی اسی میں ٹھنسیں۔ پیچھے گاڑیوں اور پالکی گاڑیوں میں خاندان والیاں اور معزز مصاحبیں بیٹھیں۔ رتھوں میں سر چڑھی مغلانیاں اور اصیلیں، بہلیوں، مجھولیوں میں خوگیر کی بھرتی۔ ٹھیلوں چھکڑوں پر سامان لد کر پہلے ہی روانہ ہو گیا تھا۔ کوچبانوں نے مجرا عرض کرایا۔ روانگی کا حکم چاہا۔ ادھر کہاروں اور اُدھر انہوں نے بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا کہا اور کچھ پڑھ دائیں بائیں دم کر ذرا باگ تان کے ڈھیلی کی کہ لگے گھوڑے پوئیں منہ لینے اور ہوا سے باتیں کرنے۔ سائیسوں کی کرتیاں لال بانات کی اور اس کے گھٹنے لال سبز بلبوٹے کی منڈیلیں سروں پر سفید چوریاں ہاتھوں میں ہٹو بچو کا شور مچاتے۔ کوچوانوں کی لال بانات کے گول پروے کی وردیاں، کلابتونی ساز لگے، سفید سیدھے پاجامے، سفید پگڑیاں، کالی گرگابیاں روہیلی مورٹے بکل لگے، ایک خاص وضع سے بیٹھے، سفید دستانے سے باگوں کو پکڑے۔ ایک ہاتھ سے کبھی کبھی چابک کا تڑاخا ہوا میں اڑاتے گھوڑے طرارے بھرتے آناً فاناً میں چھ سات کوس کی منزل ایک سانس میں کر آ پہنچے۔ ابھی عملہ والیاں سلطان جی میں آدھے رستے میں ستا رہی تھیں۔ غنیمت ہے کہ پیش خدمتوں کو رات کو ہی روانہ کر دیا تھا ورنہ کیسی کام کی تکلیف ہوتی۔ بنگلہ کی اجازت صاحب کلاں سے مل گئی تھی۔ فراشوں نے دریاں بچھا، چاندنیوں کا فرش کر مسند تکیہ لگا دیئے۔ اشراق کی نماز پڑھ کے خاصے کی سواریاں نکلی تھیں۔ اوکھلے پہنچ کر چاشت کی نماز پڑھی بچے چمنوں میں کھیلنے کودنے پھر رہے تھے مگر حکم تھا نگاہ کے روبرو رہیں، آنکھ سے اوجھل نہ ہونے پائیں کرتے ہیں سیج گاڑیاں اور پالکی گاڑیاں آ پہنچیں اور چرخ چوں چرخ چوں کرتی بہلیاں اور ہلاجلا کرتی رتھیں بھی آ گئیں۔ ماما اصیلیں، لونڈیاں، باندیاں اپنی پنڈلیاں سہلاتی اور پاؤں جھٹکتی اتریں کہ اتنی دیر میں تشش کے بیٹھنے سے آدھے دھڑ سن ہو گئے تھے۔ بعض بچاریوں کو تو سواریوں میں جگہ نہ ملی تو منہ لپٹی خانہ حمائیوں کی گودوں میں چڑھ بیٹھیں۔ پرانے شیشموں اور پیپل، بڑوں کے موٹے موٹے مضبوط گدوں میں اور کہیں آموں کے موٹے تنوں میں جھولے پڑ گئے تھے۔ دس بارہ جھولے تھے۔ جمنا کا کنارا اوکھلا پرانا گاؤں بڑے مرسی خان نواب محب الدولہ غلام رسول خان کی جاگیر میں۔ خانپور سنگپڑہ، کنڈلا کے گاؤں بھی اسی جاگیر میں شامل تھے ان کے بیٹے نواب ولاور الملک دلیر الدولہ محمد علی خان فیروز جنگ کا زمانہ تھا کہ ۱۸۲۴ء میں کمپنی بہادر نے جاگیروں کی ضبطی کے احکام صادر کئے اور یہ علاقہ ضبط ہو گیا۔ بڑی مہر کا ان کی پوتی اور نواب نصیر الملک انتشام الدولہ علی محمد خان رخصت جنگ کی بیٹی ہیں۔ سن ستاون میں ان کے باوا کو اور خاندان کے سترہ مردوں کو پرانی عیدگاہ میں باڑھ مار کر کھیتے میں ڈال دیا۔ نوشاد اوکھلے کا نمبردار تھا۔ سن کر دوڑتا آیا، مجرا عرض کرایا اور روپیہ نذر گذرانے اور دعوت دی۔ بیگم صاحبہ وسیع الاخلاق اور قدیم الخدمتوں کی قدردان قبول کیا اور آنے کا وعدہ کیا۔ وہ خوشی خوشی چلا گیا اور وہاں سے کچھ گھیرے کام کاج کو بھجوا دیئے۔ ہرے ہرے دودھیا بھٹے، ایک کوری ہنڈیا میں گاڑھی گاڑھی چھاچھ، جھنگ میں بیڑا شکر اور کھس سے چپڑی مشکرے کی بکی مکئی اور بجھڑکی روٹیاں بھجوائیں۔ چولائی کی بھجیا بھی آئی۔ یہ سب چیزیں خاصے پر پہنچی گئیں۔ من سکھیا اس کی جورو لکڑی ٹیکتی، بہوؤں بیٹیوں کو ساتھ لئے آئی۔ جھروی کے لہنگے باندھنو کی چندریاں، بہوؤں کے گھونگھٹ،

شاہ عالمی روپوں کے چاندی کے گھنے بج گونج کی طرح لدی۔ بڑھیا کے ہاتھ میں، شاہی میں پچھیلیاں تھیں تو اب بھی خولی کڑے پڑے لگے پر جگمگی پڑی جوڑے کی چمپا کلیاں۔ ادھوڑی کے کمر ستڑے جو پرست کی ٹکڑیاں اور چرمی جھنجے پٹے، وہ ر اتار ننگے پاؤں سامنے آئی۔ پاؤں کی بھروڑں بیٹیوں کو پاؤں پڑوایا۔ اپنی پرانی مالکانی کو دیکھ دھارم دھار رونے لگی اور اگلے پچھلے زمانوں کے ذکر کرنے لگی۔ لونڈیاں باندیاں آئیں ان کے برساتی رنگین جوڑے خواص پورے کی دروغن نے بڑے سلیقے سے پہنوائے تھے جو رنگ جس کے چہرے اور مزاج پر کھلتا تھا وہی پہنایا اندر سبھا کا رنگ خوب گھٹا ہوا تھا اور نقشہ تھا کھڑا کھڑا، اس کو گلناری جوڑا پہنایا۔ نرگس ہمیشہ کی روگن تھی، رنگ تھا یا طنابی مرچ نقشہ پھدا پھدا، اس کو شوخ فیروزی پہنایا۔ صورت ہی بے بدل ہو گئی۔ اچھی طرح دار معلوم ہونے لگی۔ اسی پتیا پھری ناک میں فیروزے کی کیل جو پہنائی تو خاصی اونچی اونچی معلوم ہونے لگی۔ شام برن کا اس ترلا رنگ، تیکھا نقشہ، شفتی جوڑا پہن اروا نظر آنے لگی۔ مبارک قدم کا بسپی رنگ تھا، اس پہ نافرمانی جوڑا خوب پھبا۔ کبھی سرخ سفید تھی، سبز دوپٹہ کھائے جاتا تھا۔ کلچہ گلگو تھنا سی، رنگ گیہواں، اس پر شنگرفی خوب کھلا۔ غرض دروغن کو خوب شاباشی ملی عمدہ اور اس کی بیٹی پر پایا اور پورا طائفہ خوب بن سنور کر آیا تھا۔ حبیبے کی جازت ملی سب نے جھرنا اور لہک لہک کے گانا شروع کیا مولسری کی چھتر گھنیری چھاؤں میں تین کل کے پتھر رکھ کر چولھا بنایا۔ کڑھاؤ چڑھا اور چھپرکریوں کے لئے خرچی کا پکوان تلا جانا شروع ہوا۔ انگیٹھیوں پر کڑھائیاں چڑھیں۔ خاصے کا پکوان تلنا شروع ہوا۔ گرم گرم اترتا جاتا ہے اور بھجواتے جاتے ہیں۔ عمدہ اور پریا نے کیا پنچم کے سروں میں ملہار گایا ہے کہ کوئل کرکتے کرکتے چپ ہو گئی اور پپیہا سناٹے میں آگیا۔ ٹیڑی کی رٹ رکی جھونٹے وہ لمبے لمبے لیتے کہ درختوں کے ٹہنے چڑچڑ کرنے لگے۔ شہر کی طرف سے وہ کالی گھٹا اندھیری دے کر اٹھی کہ جمعہ مسجد کے مینار اور سفید گنبد اس میں اور بھی براق سے نظر آنے لگے۔ پھر بگلے جو پھٹر پیپل کے ٹھنٹ پر بیٹھے تھے فضا میں اڑے، پر جو کھلے تو رام بگلے معلوم ہونے لگے اور اس گھٹا ٹوپ اندھیری میں ان کی ہوا میں قطار تھی یا کیٹی راون کی گود سے مچلتی ستونتی سیتا نے اپنی موتی مالا پھینکی تھی جو کسی راچھس کے بل سے بچ ادھر ہی میں رہ گئی تھی موروں نے وہ مست ہو کے جھنکار لی ہے کہ میگھ راگ مجسم آگئے۔ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے بجی پہ تختوں کا بند باندھا ہے کوئی کوس بھر کا پاٹ ہو گا۔ تختوں پر سے پانی کی چادر چھٹتی۔ جگہ جگہ قرینے سلیقے سے چمن بندی مرغزار، جو یہاں سے نہریں نکالی گئی ہیں ان کے پیالک فولادی سرخ روغن چڑھے، ان کی درزوں میں سے پانی ایک خاص قسم کی آوازیں نکالتا گرتا چلا جاتا چھوٹے چھوٹے پل مختلف چمن بند حصوں کو ملاتے، نہروں کے دونوں کناروں پہ بڑے بڑے سایہ دار درخت ایک سے ایک ملا۔ ٹھنڈی گھپا ہوا۔ صاحب عالم اور دلہن بیگم چوخی دار چھڑیں لے کر نوکروں سے ذرا اوٹ میں بیٹھے مچھلی کا شکار کر رہے ہیں۔ دلہن بیگم پہ ساس کا تقیہ ہے کہ ماما اصیلوں لونڈیوں میں خلا ملا کرنے سے خفت بھی ہوتی ہے اور سرکاری موجودگی ان کی بے تکلفی اور مزے میں کھنڈت ڈال دے گی اس لئے ایک رسمی طرح دے دی گئی ہے اور وہ سب آسمان سر پر اٹھائے ہیں۔ بہو بیگم کا دل چاہتا تھا کہ ہم سن سہیلیوں کو دعوت دے کے بلائے اور ساتھ لائے۔ بڑے افسوس کی لڑکیاں۔ ان کے رتبوں پہ صاحبزادی لکھا، بڑی سرکار کو پسند نہ آیا۔ کہا کہ اگر ملازم پیشوں کی لڑکیاں صاحبزادی ہوئیں تو جو صاحبزادیاں ہیں وہ کیا شہزادیاں ہو جائیں گی؟ اور پھر جو شہزادیاں ہیں ان کو کیا لکھا جائے؟ ان کے لئے دختر لکھنا کافی ہے۔ بہو بیگم ان میل جول کی نزاکت کے الجھاوؤں سے گھبراتی تھیں۔ خاندان کی مرجاوا کے خلاف کیا نہ جاتا۔ ان قدیم روایات کا باقی رکھنا جزو ایمان۔ اس لئے نہ کسی سے ملنا نہ جلنا۔ آپ بھلے اپنا گھر بھلا۔ آج کل کی بیویاں شاید تحقیراً گھرگھسنی کہیں، لیکن وہ تو اس استہزاء کو سمجھ بھی نہ سکتی کیونکہ گھر ہوتا ہی ہے گھسے رہنے کے لئے۔ موٹی موٹی بوندیں جمنا کے پانی میں پڑیں اور پڑ کر اچھلیں۔ سفید سفید بلبلے بنے اور پھوٹے۔ جلدی سے پرخچی پر ڈور دونوں میاں بیوی چڑھا، چھڑیں سنبھالتے بنگلے کی طرف بھاگے۔ لونڈیاں باندیاں، ساری محل والیاں اسی طرح جھولوں پر لگی رہیں وہ موسلا دھار بارش ہوئی کہ ترجل ہی آیا۔ جن کے جوڑے پڑیا کے رنگ کے تھے وہ لٹتے گئے۔ بھیگ کے رنگ چھوٹ کے عجیب ان کی ہیئت بن گئی اور جن کے

کسم کی زمین پر تھے وہ ایسے بکے کہ پانی کا کچھ اثر نہ ہوا آخر مغرب کی نماز کے بعد گھر لوٹے۔ لوٹتے میں دوسرے رستے سے چلے بلطان جی اور پرانے قلعہ کی دیوار بن رہی تھی۔ گاڑیاں روڑیوں اور بجھوا پتھروں میں نہ چل سکیں۔ گھوڑے اٹرے گھبرا کے سب اتر پڑے اور کوئی پاؤ کوس پیدل چلنا پڑا۔ مگر وہ پاؤ کوس کیا تھا رستم کے ہفت خواں تھے۔ "لیجیو" "پکڑیو" "جانے نہ پائے" وہ چلا کی آوازیں بھی آنے لگیں اور بڑے بڑے منڈاسے باندھے گنوار لٹھ لئے لوٹتے آتے بھی دکھائی دینے لگے —— بہو بیگم جو گھبرائیں، سارا زیور محل میں بڑھا کر آئی تھیں، بے خیالی میں ہیرا تماش کے توڑے پاؤں میں پڑے رہ گئے جلدی سے اتار وہیں سڑک پر گھبراہٹ میں ڈال دیے۔ توشہ خانے کی داروغن کو خیال آیا۔ وہ اسفندیار بن کر ہیں گو پیچھے اکیلی گئیں اور اٹھا کر لے آئیں برسوں ان کی جرأت کے فسانے ہوتے رہے۔ اس گھبراہٹ اور افراتفری میں جو عجیب عجیب اور خفیف حرکتیں ہوئیں وہ آج تک اس محفل میں نقلِ محفل ہیں۔ اللہ حافظ!

سیّد ناصر نذیر فراقؔ دہلوی

جہان آباد

جواب کاہے کو تھا لاجواب تھی دہلی
مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دہلی

ایک روز امیر تیمور صاحبِ قِرآن اپنے مرکب پر سوار دارالسلطنت بخارا کی گلی کوچوں میں چکّر لگا رہا تھا۔ جمعدار رکاب تھامے ساتھ تھا اور امیر پوچھتا جاتا تھا کہ اس گلی کا کیا نام ہے؟ اس کوچہ کو کیا کہتے ہیں، یہ کون سا محلّہ ہے۔ جمعدار جواب دیتا تھا۔ یہ پستہ شکن محلّہ ہے۔ یہ گلی مراجیل کی کہلاتی ہے۔ یہ کوچہ روشن آباد ہے۔ چلتے چلتے ایک تنگ کوچہ میں پہنچا اور اس نے یہ دیکھا کہ بانسوں کے پھاٹک کے آگے چند نوجوان ایک دری کے فرش کو چاروں طرف سے پکڑے جھاڑ رہے ہیں اور دھول اُڑ رہی ہے۔ امیر نے پوچھا "جمعدار یہ کیا جگہ ہے؟" جمعدار نے کہا "حضور یہ کوچہ حضرت سیّد خواجہ بہاؤالدین نقشبند کا ہے۔ یہ بانسوں کے پھاٹک والی آپ کی خانقاہ ہے۔ اس میں آپ تشریف فرما ہیں۔ مرید خانقاہ کی شطرنجی کو جھاڑ رہے ہیں۔" امیر کو دیکھ کر نوجوانوں نے شطرنجی جھاڑنے سے اپنا ہاتھ روک لئے تھے اور امیر ان لوگوں کے پاس پہنچ گیا تھا۔

امیر: (نوجوانوں سے) تم ہمارا اصلاً لحاظ نہ کرو۔ شطرنجی بدستور جھاڑے جاؤ۔

آپ جانتے ہیں مرید اور طالب علم الھڑ ہوتے ہیں۔ نوجوانوں نے دری کو اس زور سے پٹخارا کہ دھول کے مارے امیر کا ساز و یراق اور امیر کا چہرہ تاج اُگھوٹا وغیرہ سب اٹ گئے۔ امیر نے اڑتی ہوئی دھول کو دونوں ہاتھوں سے اپنے منہ پر مل کر کہا "غبار المدینۃ شفاء" اور گھوڑے کو مہمیز کیا اور یہ جا وہ جا۔

مریدوں نے خانقاہ میں آکر امیر کا سارا حال حضرت کی خدمت میں عرض کیا۔ حضرت خواجہ سیّد بہاؤالدین نقشبند نے کہا۔ لڑکو! کیا کہتے ہو کہ امیر تیمور ہماری درگاہ کی خاک منہ پر مل گیا۔ یوں نہیں کہتے کہ امیر اپنی عاقبت سنوار گیا۔ الٰہی اس ترک بچہ نے جس طرح تیرے رسول ؐ کی زبان کا ادب کیا ہے اسی طرح اس کے بدلے میں اس کا نام شرق سے غرب تک شمال سے جنوب تک روشن کر دے۔ اس کی اولاد در اولاد کو پشتوں تک سلطنت بخش دے۔ چنانچہ امیر تیمور سے میراں شاہ سلطان ابوسعید میرزا سلطان محمد میرزا عمر شیخ میرزا۔ بابر۔ ہمایوں۔ اکبر۔ جہانگیر۔ شاہجہان تک

گیارھویں سلطنت تھی۔

شاہجہان کو تعمیر کا دلی شوق تھا۔ نئی دلّی بسانے کی تدبیر شروع کی۔ لال قلعہ اور اس کی اندرونی عمارتیں اور جامع مسجد اور نئے شہر کے نقشے بنوائے گئے شہنشاہ نقشوں میں بذاتِ خاص اصلاح دیتے تھے۔ میر عمارت نے ہر مکان ہر محل کی لاگت کا تخمینہ تیار کیا اور ملکوں ملکوں سے سنگِ مرمر، سنگِ سرخ، سنگِ سیاہ، سنگِ باسی اور ہزار ہزار قسم کا مصالحہ اور سامان آنے لگا۔ میر عمارت نے چونیا اینٹ کا پیمانہ ایک ٹھیکیدار کو دے کر کہا۔ ایسی اینٹ تیار کرو۔ مگر اینٹ کچی نہ رہے، لاکھوری ہو۔ بادشاہی کام ہے، دھیان سے کرنا۔ ٹھیکیدار نے کہا۔ پیشگی نقد دلوائیے۔ میر عمارت نے لاکھ روپے کی چٹھی لکھ دی۔ خزانہ سے فوراً روپیہ بٹ گیا اور ٹھیکیدار کام میں مشغول ہو گیا۔ اینٹوں کا پزاوہ چڑھ گیا۔ کچھ مدت بعد میر عمارت کے پاس ٹھیکیدار بسورتا ہوا آیا اور کہنے لگا "میں تو برباد ہو گیا۔ پزاووں کی آنچ تیز ہو گئی۔ اینٹوں کا کھنگر بن کر رہ گیا۔ بادشاہ اس بندہ کا زن بچہ کولھو میں پلوا دے گا۔ اس لئے میں بھاگتا ہوں۔ دیکھئے یہ کھنگر ہے۔"

میر عمارت: "گھبرانے کی کیا بات ہے؟"

اور قلم اٹھا کر اس نے ایک عرضی لکھ کر بادشاہ کے حضور میں بھیجی کہ لال قلعہ اور جو شاہی عمارتیں دریا کے کنارے بنائی جائیں گی ان کی بنیادوں میں بجائے سنگِ خارہ کے کھنگر بھرا جائے گا۔ کیونکہ کھنگر پانی کو خوب جذب کرتا ہے اور بنیاد مضبوط رہتی ہے اور بنیاد کی مضبوطی کے ساتھ اوپر کی عمارت کا مضبوط ہونا شرط ہے۔ کھنگر کا نمونہ ملاحظہ کے لئے بھیجتا ہوں۔ لاگت اس پر دوگنی آتی ہے، منظوری دی جائے۔

جواب آیا کہ کھنگر کا بنوانا مناسب ہے۔ دوگنی لاگت منظور دِ مابدولت ہے۔

میر عمارت نے ٹھیکیدار سے کہا۔ "ایک لاکھ پہلے کھنگر کے نقصان کا لو اور اب لاکھ کے بدلے دو لاکھ لیتے رہو اور کھنگر پکاتے رہو۔"

میر عمارت کی یہ عنایت اور بادشاہ کی یہ پرورش دیکھ کر ٹھیکیدار خوش ہو گیا اور دل سے کام کرنے لگا۔ جب لال قلعہ کی نیو رکھنے لگے تو بڑے بڑے لوہے کے کڑھاؤ اور تانبہ کی ناندوں میں چربی کھولائی جاتی تھی اور پھلکیوں کی طرح اس میں کوری اینٹیں ڈالی جاتی تھیں اور اینٹیں جب خوب چربی پی لیتی تھیں تو نکال کر ٹھنڈی کی جاتی تھیں اور گچ کے ساتھ بنیاد میں رکھی جاتی تھیں۔ گچ میں سفیدی نارنول کے پتھر کی ماش کا آٹا، مردار سنگ، گوڑ، السی کا تیل، سن منزمن ڈال کر بیل گری کا پانی چھان کر بہا دیا جاتا تھا۔ یہ ادنیٰ قسم کا مصالحہ تھا اور بڑھیا مصالحوں کی تفصیل کے لئے دفتر درکار ہیں۔ سفیدی جو در و دیوار پر لگا کر گھوٹی جاتی تھی وہ احمد آباد۔ گجرات کے ایڈر نام پہاڑ کی کان سے آتی تھی۔ اس سفیدی کا یہ خاصہ تھا کہ جب اس کی گھٹائی کی جاتی تھی تو بلا مبالغہ چمک دمک میں جلبی آئینہ بن جاتی تھی اور اس کے اندر آنکھوں کا سرمہ دکھائی دیتا تھا۔ دو سو برس تک آبدار رہتی تھی۔ لال قلعہ اور اس کے اندرونی مکان، قصر ایوان بن رہے تھے۔ تختِ طاؤس کے لئے جواہر تراشے جاتے تھے۔ جنگل میں منگل تھا۔ ہزاروں مزدور معمار کاریگر خیموں میں، چھولداریوں میں، جھونپڑیوں میں پڑے تھے۔ دور دور کے پہاڑوں سے چھکڑوں میں پتھر لدے چلے آتے تھے۔ ایک چھکڑے میں سو سو پچاس پچاس بیل جوتے جاتے تھے۔ سنگتراشوں کی چھینیوں اور ٹانکیوں کی دھڑا دھڑ سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ہر سو قدم کے فاصلہ پر ایک خیمہ خزانہ کا بپا تھا۔ ایک ہندو خزانچی اور تین محرر۔ دس سپاہی روپیہ کی حفاظت کے لئے حاضر رہتے تھے۔ روپیہ، اٹھنیاں، چونیاں، دونیاں پیسے اور کوڑیاں رکھی رہتی تھیں۔ کام امانی میں زیادہ اور ٹھیکہ میں کم ہوتا تھا۔ شام کے چار بجے روزانہ چٹھہ بٹ جاتا تھا۔ غریبوں کا پیسہ واجب الادا مل جاتا تھا۔ لال قلعہ کے لاہوری دروازہ سے شہر کے فرضی لاہوری دروازہ تک اردو بازار ٹاٹیوں اور جھونپڑیوں کی دوکانوں میں لگا دیا گیا تھا جس میں جو، گیہوں، جوار، باجرہ کے آٹے سے لے کر قسم قسم کی جنس، کپڑا، تنکاری، کابل و کشمیر کے میوے تک ملتے تھے۔ آگرہ سے حکم پر حکم چلا آتا تھا کہ اردو بازار میں ہر شے کی دوکانیں اضافہ ہوتی رہیں تاکہ غیر ملکوں کے کاریگر جو اپنا دیس چھوڑ کر پردیسی بنے ہیں، تکلیف نہ پائیں اور اپنے وطن کی اشیاء اور نعمتیں انہیں میسر ہوں۔ شہر کا نقشہ بنا کر اس کے حصہ حصہ کر دئے گئے اور شاہجہان نے ان حصوں کو اپنی اولاد پر بانٹ دیا تھا اور فرما دیا تھا کہ لاگت

بسبب خزانہ سے ملے گی۔ اپنے اپنے حصہ میں عمدہ عمدہ مکانات اور محل بنوالو تاکہ نیا شہر اچھی اچھی عمارتوں سے آراستہ ہو کر آبادی کی صورت پکڑے۔ چنانچہ دکن کا حصہ اورنگ زیب کے اہتمام سے زیبائش پانے لگا۔ کشمیری دروازہ کے قطعہ کو دارا شکوہ نے فلک شکوہ قصر و ایوان سے سنوارا۔ چاندنی چوک کے ٹکڑے کو جہاں آرا بیگم کے غلام نے جو ناتواں تخلص کرتا تھا باغ اور گلشن اور حماموں سے رشکِ فردوس بنایا۔ نٹوں کا کوچہ اسی ناتواں کی یادگار ہے۔

جامع مسجد کی تعمیر نواب سعد اللہ خان وزیر کو سپرد تھی اور اس کی نیویں بھری گئی تھیں۔ وہ انجینئر جس کی سپردگی میں جامع مسجد کا نقشہ تھا یکایک مع نقشہ کے غائب ہو گیا اور مسجد کی تعمیر کا کام ابنڈ ہو کر رہ گیا۔ اس امر کی خبر پا کر شہنشاہ ناخوش ہوئے۔ حکم صادر ہوا کہ جو شخص اس کافر منش مسلمان کو جس نے خانۂ خدا کی تیاری میں روڑا اٹکایا ہے پکڑ کر لائے گا تو اسے اس قدر انعام دیا جائے گا۔ مگر وہ خدا کا بندہ ایسا الوپ ہوا کہ تین برس تک کسی نے اس کی جھلک بھی نہ پائی۔ تین سال بعد وہ یکایک دربارِ شاہی میں حاضر ہو گیا۔ حضورِ والا نے فرمایا "کم بخت یہ حرکت کیا تھی؟" اس نے ہاتھ باندھ کر کہا "یہ جامع مسجد کی عمارت بہت بھاری ہو گی۔ نئی بنیاد پر ایسی اونچی عمارت کا بیجانا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ برسات کا پانی نیو میں مرتا اور اس کے در و دیوار نیچے کھسکتے اور ڈاٹیں، کمانیں، محرابیں جھک جاتیں۔ سرکار کے لاکھوں روپے پر پانی پھر جاتا اور میری آبرو کے ساتھ ساتھ جان بھی جاتی۔ نیک نیتی اور مصلحت سے فدوی روپوش ہو گیا تھا۔ تین برساتیں کھا کر نیو لوہا لاٹ ہو گئی ہے۔ اب جو کچھ عمارت کھڑی ہو گی صدیوں تک کھڑی رہے گی۔ حضور کو اختیار ہے کہ فدوی کی جاں بخشی ہو یا سزا دی جائے۔"

بادشاہ نے انجینئر کے عذر کو غور سے سُن کر اس کی خطا معاف فرمائی اور خلعت سے سرفراز کیا اور جامع مسجد نواب سعد اللہ خاں صاحب کے اہتمام سے تیار ہونے لگی۔ جو نواب صاحب کو قولنج ہوا اور وہ جنت کو سدھارے۔ بہر حال جامع مسجد اور لال قلعہ اور شہر بن گیا۔ حضورِ والا نے دیوانِ خاص میں تختِ طاؤسی پر جلوہ افروز ہو کر جشنِ ماہتابی منایا اور ایک فرمان جاری فرمایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ فخر البلاد جہان آباد عرف شاہجہاں آباد میں جبر علیا آباد کی گئی ہے۔ اس میں خوش حال کم اور اہلِ حاجت زیادہ ہیں۔ پھر ان میں کاروباری ہیں، مزدور ہیں، بیمار ہیں، عورتیں ہیں پردہ نشین جو برقعہ اوڑھ کر بھی باہر نہیں نکلتی ہیں اور بغیر سودے سلف کے کام نہیں چلتا ہے۔ اس واسطے میں حکم دیتا ہوں کہ ترکاری فروش، گوشت فروش، میوہ فروش، پارچہ فروش، کسبیرہ، گندمی، تانبے کے برتن فروش، موچی، مٹی کے مٹکے، ٹھلیاں، صراحیاں بیچنے والے، اوپلے ایندھن بیچنے والے، سادہ کار، چاندی سونے کے زیور بیچنے والے، حلوائی، بساطی اپنے اپنے سامان خوانچوں میں لگا کر، گٹھڑیوں میں کندھے پر رکھ کر، بہنگیوں میں کہاروں کے کندھے پر لاد کر گلی گلی، کوچہ کوچہ، محلہ محلہ پھریں اور اپنی اپنی جنس کا نام لے کر آواز لگائیں۔ بزاز کہے "نینو، لٹھا، ڈوریہ، ململ" مچھلی والا "مچھلی دریاؤ کی، لو مچھ" کمہٹ بنے برتن، لوہار اپنے اپنے پیشہ کا نام لے کر پکاریں۔ یہاں تک کہ موری دھانے والے پکار کر کہیں "مہری دھلوا لیجئے" تاکہ گھر بیٹھے اہلِ حاجت کی ضرورت رفع ہو جائے۔ چونکہ اس حکمِ تازہ کی تعمیل مشکل ہے پیشہ ور کریں گے اس لئے کوتوالی کے برق انداز لوگوں کے ساتھ رہیں اور شہر میں گشت کرواتیں تاکہ گاہک اور سودا بیچنے والے اس طور کے لین دین کے عادی ہو جائیں اور بیچنے والوں کو نفع ہو اور مول لینے والوں کو بازار جانا نہ پڑے اور ہر قسم کی چیزیں اپنے دروازہ پر لے لیں۔ جیسی نیت ویسی برکت۔ شاہجہان بادشاہ کی یہ تدبیر ایسی راست آئی کہ آج اس اُجڑے دیار میں لینے والی بی بی کا سارا جہیز اپنے گھر کے دروازہ پر کواڑ کی آڑ میں کھڑی ہو کر مول لے لیتی ہے۔ شاہجہان کے بعد سلطنت درجہ بدرجہ منتقل ہوتی ہوئی محمد شاہ رنگیلے تک پہنچی اور لال قلعہ کا دیوانِ خاص عیش و نشاط کے سامانوں سے فردوسِ بریں بن گیا۔ معتمد الملک سید ہاشم علوی خاں حکیم رنگینیٔ ذوق کے مددگار رہتے۔ ان کے حکم سے شتر خانہ بادشاہی میں گرمی، جاڑا، برسات دو سو اونٹ بدمست رکھے جاتے تھے اور ان کے کانوں کے پیچھے کی مستی دوا کے کام میں آتی تھی۔ میر شکار جنگلی کبوتروں کے بیس انڈے تازہ بتازہ اور بارہ انڈے چڑیا کے پیش کرتا تھا۔ کیونکہ دونوں چیزیں مقوی ہیں۔ شراب پانی کی طرح لنڈھائی جاتی تھی۔ ایک رات محمد شاہ نشہ کے سرور میں اس درگاہ کے اندر مع جوتیوں کے گھس گئے جس میں حضور رسالت پناہ اور بزرگوں کے تبرکات امیر تیمور کے عہد سے جمع کئے گئے تھے۔ یہ درگاہ لال قلعہ میں ہی تھی۔ اس بے ادبی اور گستاخی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کا زوال شروع ہوا۔ نادر شاہ آیا اور لال قلعہ کو لوٹ

شاہجہان آباد کو اجاڑ کر چل دیا اور بقول مومن ؎

حسنِ روز افزوں پہ غرّہ کس لئے اے ماہ رو
یونہی گھٹتا جائے گا جتنا کہ بڑھتا جائے گا

مغلیہ سلطنت گھٹتے گھٹتے اور سکڑتے سکڑتے لال قلعہ کی چار دیواری میں سمٹ کر رہ گئی۔ دانایانِ فرنگ کی تدبیر و شمشیر سے کوئی راجہ کوئی حاکم، کوئی رئیس، کوئی نواب عہدہ برآنہ ہو سکا۔ شاہ عالم بادشاہ نے فرنگیوں کو بیٹا بنایا۔ ان کی دی ہوئی پنشن کو اللہ آمین کر کے قبول کر لیا۔ کیونکہ مرتا کیا نہ کرتا۔ جان بھی لاکھوں پائے۔ ایک شاہ عالم بادشاہ کے دل میں فرنگیوں نے گھر نہیں کر لیا تھا۔ بلکہ ہندوستانی عموماً انہیں اچھا جاننے لگے تھے اور ان کی سپاہ اور شاہزادہ اور تنخواہ کی بچہ بچہ کی زبان پر تعریف تھی۔ یعنی فرنگیوں کی فوج جرّار ہوتی ہے۔ دس ہزار پہ ایک ہزار بھاری ہوتی ہے۔ شاہراہ یعنی کلکتہ سے جہاں تک ان کی حکومت پہنچتی ہے پکی سڑک اور سڑک کے ساتھ ساتھ ریل اور ڈاک بھی اوڑی چلی جاتی ہے اور تین تین دن میں خط ہر ملک کے اس سرے سے اس سرے تک پہنچا دیتی ہے۔ تنخواہ کی تعریف یہ ہے کہ جسے نوکر رکھتے ہیں اس کا درماہہ یا طلب یا وظیفہ بے قیل و قال بے چون و چرا پہلی کی پہلی کو دیتے ہیں۔ راجہ مہاراجہ نوابوں اور بادشاہوں کی سرکار سے نوکر کی تنخواہ تین تین برس نہیں ملتی تھی اور نوکر کا گھرانہ فاقہ کر کے برباد ہو جاتا تھا۔

(۲)

ابو نصر معین الدین اکبر ثانی جب بیٹے کی منت پوری کرنے اور پھول والوں کی سیر منانے مہرولی حاضر ہوئے تھے تو عجب سماں تھا۔ برکھا رت، ساون کا مہینہ، بادشاہی خیمے مخملی بانانی اطلسی سبز سرخ زرد ریشمی کلابتونی سونی طنابوں سے جکڑے ہوئے کھڑے تھے۔ ان کے سنہری کلس اور شمسے سورج میں چمک رہے تھے اوپر نیلا آسمان نیچے زمین پر سبزہ کا فرش اور خیموں کا سلسلہ اور جا بجا پانی میں ان کا عکس طلسمات کا عالم پیدا کر رہا تھا۔ بادشاہی خیمہ سے لے کر حضرت قطب صاحب بندہ نواز کی درگاہ شریف تک جہاں مستورات جا سکتی ہیں۔ دو رویہ قنات کھڑی تھی کیونکہ ملکۂ دوراں میرزا جہانگیر کو لے کر منت ادا کرنے کے لئے درگاہ میں حاضر ہوں گی۔ تیاری تو صبح سے ہو رہی تھی مگر دن کے تین بجے ظلِ سبحانی نے کہا پنکھا چڑھانے کا وقت آ گیا۔ بس ملکۂ دوراں نے پچاس خوان اندر سے اندرسہ کی گولیوں اور پھینیوں کے آراستہ کئے ایک چاندی کی کشتی میں سونے کا پنکھا جس میں پنّہ، پکھراج، نیلم، یاقوت اور ہیرے موتی جڑے ہوئے تھے جس کی بالشت بھر نیچی جھالر کو بیگم نے جوہی کی کلیوں سے خود گوندھا تھا۔ مرزا جہانگیر کو دولہا بنا کر سہرا پھولوں کا بدھی، طرہ عطر میں بسا کر اس کے سر پہ بندھوا کر وہ کشتی صاحب عالم کے سر پر بسم اللہ کہہ کر بیگم نے رکھی اور بادشاہزادہ کی بلائیں لے کر کہا "اماں میرا منہ نہ تھا کہ تو فرنگیوں کے چنگل سے نکل کر شاہجہان آباد آئے اور میں تجھے دیکھوں یہ سب حضرت کا صدقہ ہے۔ جانِ من منت کی کشتی سنبھال کر اور سرِ ادب نیاز سے جھکا کر درگاہ کو چلو۔ آؤ۔ غلاف شریف کی سینی بادشاہ نے اپنے سر پہ اور صندل دان عطر دان بیگم نے اپنے سر پہ اور مٹھائی کے خوان بادشاہزادوں نے اپنے سروں پہ رکھ کر سب نے مل جل کر آستانۂ پاک کی راہ لی۔ بیگمیں بادشاہزادیاں نگوڑا جوڑے پہنے تھیں۔ گوکھرو کے جال کے سلمہ ستارہ کلابتون کے تمامی، زری بوٹی، زربفت کمخواب زری گاچھ اطلس دلدائی، بابر نیٹ بنارس گجرات سورت احمد آباد شریف لاہور کے شاہی کارخانوں، ریشمی اور زرین کپڑوں کے لباس پہن کر آراستہ ہو رہی تھیں۔ لاکھوں روپیہ کا جڑاؤ گہنا ہاتھ گلے میں تھا۔ پور پور ناخنوں کی مہندی رچی ہوئی تھی، ڈھیلے پائنچوں کو دو دو لونڈیاں اٹھائے چلتی تھیں تو دو باندیاں پیچھے دوپٹہ کو سنبھالے چلتی تھیں۔ آگے آگے روشن چوکی اور نفیری بجانے والیاں سب عورتیں تھیں بیگموں کے جھانجن چوڑیوں اور پازیب کی جھنکار سے زندہ اور مردوں کے دل کانپتے تھے۔ قنات در قنات یہ سب درگاہ شریف میں پہنچے۔ باجے گاجے سب آستانے کے باہر ہی تھما دئے گئے۔ ملکۂ جہاں اور سب عورتیں فرخ سیر والی جالیوں تک پہنچ کر رک گئیں۔ اگرچہ ساری درگاہ کا زنانہ ہو رہا تھا مگر عورتوں کے لئے ہمیشہ سے یہی حدِ ادب ہے۔ بادشاہ اور مرزا صاحب اور سب مرد مزار شریف پر گئے اور پہلے غلاف پھر صندل

پڑھایا اور اوپر سے عطر لگایا۔ پنج آیت پڑھی گئی۔ شیرینی تقسیم ہوئی۔ نقد نذرانہ جھری میں بھر دیا گیا۔ بادشاہزادوں کو قدم بوس کرایا اور سب حاجی دعا کرکے قنات کے اندر پلٹ کر سراپردہ شاہی میں داخل ہوئے۔ رات کے کھانے کے بعد محلسرا میں ناچ گانا ہونے لگا۔ صحن میں کئی گھڑے تھے۔ نئر بادشاہزادیاں جھولے میں بیٹھیں اور گائنیں انہیں جھلانے اور یہ غزل گانے لگیں :-

میری دل کی کُنجی میری جان جھولا　　میری آرزو میرا ارمان جھولا

پھول والوں کی سیر سے فارغ ہو کر بادشاہ شاہجہان آباد تشریف لائے اور جشن کا حکم دیا اور فرمایا کہ جشن سے پندرہ دن پہلے تورہ بندی کی جائے یہ رسم دلی سے مٹ گئی اور نئی تائی نے تورہ کا نام بھی کم سنا ہے اس لئے فقیر (فراق) تورہ کے معنی عرض کرتا ہے۔ تورہ ترکی زبان میں قانون یا آئین کو کہتے ہیں۔ اِس واسطے دلی میں محاورہ بنا " شرع تورہ " یعنی شریعت اور قانون دونوں ایک بات۔ مگر عورتیں اپنی بول چال میں طنز کے طور پر تورہ غرور اور غصے کے معنے میں استعمال کرتی ہیں مثلاً " اللہ رے عورت ترا تورہ " بوا یہ اپنا تورہ کسی اور کو دکھانا۔ تورہ بیٹی۔

دوسرے ترکی زبان میں تورہ کے معنی کھانے کے خوان کے ہیں اور توران میں اس کھانے کے خوانوں کو کہتے ہیں جو شادی بیاہ سے کچھ دن پہلے بطور حصہ بخرہ کے بھائی بندوں عزیزوں دوستوں کے گھر بھجوائے جاتے ہیں۔ مغل بادشاہ ہندوستان میں فرمانروا ہوئے توران کے ساتھ تورہ چنگیزی بھی آیا۔ بیاہ شادی سے دو ہفتہ پہلے تورہ بن گئے نام بنام "تاکہ عین تاریخ پر تقریب میں ہڑ بڑ نہ ہو اور عزیزوں کو شکایت کا موقع نہ ملے کہ ہم بھوکے رہے یا دسترخوان پر نہ بٹھایا یا ہم دسترخوان پر بیٹھے تو تھے مگر فلاں کھانا فلاں شے ہمارے آگے نہ تھی، ہماری توہین کی گئی۔ اس لئے تورہ کے کھانوں کی فہرست لکھ کر کنبہ خاندان میں بھیج دی جاتی تھی۔ اس کے مطابق لینے والے تورہ لے لیں۔ ایک گھر کے دس تورہ ہیں تو وہ دس تورہ ایک دن میں لے سکتے ہیں اور دل چاہے تو دس دن میں لے لیں۔ پھر تورہ کی قیمت بھی تشخیص کر دی جاتی تھی۔ چاہے لینے والے نقد لے لیں۔ ایک منشی مع دوات قلم کے اور پانچ خادموں کے توروں کے ساتھ ہو لیتا۔ ایک تھیلی روپیہ کی بھی اس کے ہمراہ ہوتی تھی، اس کے ذمہ پچاس تورہ ایک دن میں تقسیم کے لئے ہوتے۔ رسید لے لیتا تھا اور تورہ دے دیتا تھا۔ جو نقد لینا چاہتا اسے نقد دیتا تھا۔ ہر تورہ ایک کہاری کی بہنگی میں ہوتا تھا۔ تورہ جو اعلیٰ قسم کا ہوتا اس کی قیمت پانچ روپیہ ہوتی تھی۔ تورہ کا کھانا مٹی کے برتنوں میں عموماً ہوتا تھا۔ تورہ کے کھانوں کی تفصیل یہ تھی۔ ایک لکڑی کے خوان میں سب سے نیچے :

(۱) باقر خانیاں ڈھائی سیر پختہ کی دو عدد (۲) قورمہ کے دو پیالے، ہر پیالہ میں کم سے کم آدھ سیر قورمہ (۳) کباب شامی پانچ عدد (۴) بریانی دو طباق (۵) متنجن دو طباق (۶) فیرنی دو پیالہ۔ ہر پیالہ میں آدھ سیر (۷) مربہ آم وغیرہ کا ایک پیالی میں (۸) اچار کسی قسم کا ایک پیالی (۹) دہی آدھ سیر ایک پیالہ میں (۱۰) گاؤزبان دو عدد (۱۱) گاؤ دیدہ دو عدد (۱۲) نان تنوری یعنی آبی روٹی دو سیر کی چار عدد۔

یہ سب کھانے مانڈوں سے ڈھکے ہوتے تھے۔ مانڈہ اس باریک اور روغنی چپاتی کا نام ہے جو شب برات کو پکتی ہیں۔

ایک مثل بھی مانڈوں کے متعلق مشہور ہے۔ مُردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں، انہیں اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے۔

یہ معمولی تورہ ہے ورنہ بادشاہوں کے تورہ ہزار نعمتوں کے سونے چاندی اور چینی کے برتنوں میں بھی ہوتے تھے۔ اس رسم کو بادشاہوں سے دلی والوں نے بھی سیکھ لیا تھا اور شہر میں بھی تورہ بندی ہوتی تھی۔ مگر غدر ۱۸۵۷ء کے کچھ دن بعد سے موقوف ہے۔ اب تو پارٹی کی گرما گرمی ہے۔

عشرت لکھنوی

دربارِ دھلی کی کنکوابازی

لکھنؤ میں یہ خبر گرم ہوئی کہ دہلی میں بادشاہ کا دربار ہوگا۔ بادشاہ سلامت تخت پر جلوس فرمائیں گے۔ تمام ہندوستان کے راجہ مہاراجہ پیشوائی کو آئنے لگے۔ تمام ہندوستان میں اس بات کی خوشی تھی کہ شہنشاہ ایڈورڈ معظم دہلی میں رونق افروز ہوں گے۔

لوگ اس تماشہ کو دیکھنے کے واسطے دور دور سے آرہے تھے۔ ہرفن کے اہلِ کمال جمع ہو رہے تھے۔ فوجیں جنگ کا نمونہ دکھانے کے واسطے بلائی گئیں۔ مرغ باز، تیتر باز، بٹیر باز، سب تمام بلائے گئے۔ نیلاک صاحب ڈپٹی کمشنر نے لکھنؤ میں سید آغا حسین صاحب کو لکھنؤ کے کنکوابازوں میں انتخاب کیا اور بلا کر کہا کہ کچھ آپ نے سنا بھی ہے، دہلی میں دربار ہونے والا ہے۔ تمام دنیا کے لوگ جمع ہو رہے ہیں۔ تمام بازیوں کے کھلاڑی شاہی مہمان ہوں گے۔ آپ اپنے فن میں یکتا ہیں۔ ہم آپ کو چٹھی دیں گے آپ شاہی خیمے میں شاہی مہمان ہوں گے۔ اس سے بڑھ کر آپ کی عزت نہیں ہو سکتی۔

آغا صاحب سوچنے لگے کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ دوست احباب سے مشورہ لیا۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ آغا صاحب ایسا اچھا موقع آپ کو عمر بھر نصیب نہیں ہو سکتا۔ ایک تو ہندوستان بھر میں عزت دوسرے امید بہبودی یعنی اگر بادشاہ کو آپ کی کنکوابازی پسند آ گئی تو کچھ جاگیر گورنمنٹ سے انعام میں مل جائے گی۔ عمر بھر چین سے کٹے گا۔ یا کم سے کم تنخواہ بیش بہا تا حیات مقرر ہو جائے گی۔ سب سے عزت کی بات یہ ہے کہ خود ڈپٹی کمشنر آپ کو اپنی طرف سے بھیجتے ہیں۔ شاہی خیموں میں آپ فروکش ہوں گے اور شاہی مہمان تصور کئے جائیں گے اور پھر سیر بھی ایسی دیکھنے میں آئے گی جس کے واسطے لوگ ہزاروں روپے خرچ کر کے تمنا رکھتے ہیں کہ دہلی میں قدم رکھنے کی جگہ مل جائے۔ لوگ تو اسی حسرت میں رہتے ہیں۔ یہ دن کس کو نصیب ہوتا ہے۔ نواب بنے صاحب نے فرمایا "ہم آپ کے ساتھ چلیں گے۔ آپ کو کسی بات کی تکلیف نہ ہوگی۔ لاٹ صاحب سے انگریزی میں گفتگو کر کے ایک خیمہ ڈلوا لیں گے۔ اسی میں ہم آپ سب رہیں گے۔" منجھو صاحب سوز خوان نے کہا: "آپ کچھ اندیشہ نہ کیجیے ہم آپ کے ساتھ چلیں گے، آپ ڈپٹی کمشنر سے جا کر چٹھی تو لکھوا لائیے۔"

آخر بے چارے آغا صاحب سب کی اشتعالک سے ڈپٹی کمشنر کے پاس گئے۔ چٹھی لکھوا کر لائے۔ اچھے کاریگروں سے عمدہ کنکوے بنوائے۔ مانجھا سنتوایا، ایک ڈیڑھ تاوے پر "ویلکم" بنوا کر کہا یہ بادشاہ کے خیمے میں گراویں گے۔ کنکوؤں کو کسا، کنّے باندھے، چرخیوں پر سادی اور مانجھا چڑھا کر

ان پر خلاف اطلس کے چڑھاتے۔ پوشاکیں نفیس بنوا کر بکسوں میں رکھیں اور بہت سی امیدیں، بہت سے ارمان لے کر ہمراہ نواب بنے صاحب، منجو صاحب سوز خواں دہلی کا ٹکٹ لے کر سوار ہوئے، دیکھا تو پرانی دہلی کھچا کھچ آدمیوں سے بھری ہے اور نئی دہلی جہاں شاہی خیموں کا جنگل ہے، فوجی پہرے موجود ہیں۔ آدمیوں کو رستہ نہیں ملتا۔ میدانِ حشر معلوم ہوتا ہے کوئی کسی کی نہیں سنتا۔ بہت مشکل سے بنے صاحب اور ہم خیموں تک پہنچے۔ وہاں کمیٹی کو ڈپٹی کمشنر کا خط دکھایا انہوں نے بہت عزت کی۔ ایک خیمہ آغا حسن صاحب کو دیا اور اس پر گوروں کا پہرہ مقرر کر دیا۔ یہ مقام شہر سے بہت دور تھا۔ اب آغا صاحب کو کھانے کی فکر ہوئی۔ یہ سمجھے تھے شاہی مہمان ہیں، کھانے کے خوان آتے ہوں گے مگر جب کھانے کو کسی نے نہ پوچھا تو یہ خیال ہوا کہ کسی ہوٹل سے کھانا منگوایا جائے مگر یہاں سرکاری خیموں میں ہوٹلوں کا ذکر کیا۔ کھانے کی بو باس پر گوروں کا پہرہ تھا اور کارونیشن ہوٹل شہر سے دو کوس کے فاصلے پر تھا۔ آخر ہم سب لوگ خیمہ چھوڑ کر ہوٹل میں مقیم ہوئے مگر دن بھر خیموں میں رہتے ہیں۔ سرکاری کمیٹی نے حکم دیا کہ آغا صاحب آج کنکوا اڑائیں۔ دہلی کے نامی کنکوا باز ان سے کنکوا لڑائیں گے۔ آغا صاحب نے چاہا کہ پہلا کنکوا اڑھا کہ بادشاہی محل میں ڈھا دیں تاکہ بادشاہ کے ملاحظہ سے گذرے کیونکہ اس پر ''ویلکم'' لکھا ہوا تھا۔ مگر ہوا مخالف تھی، مجبور ہو کر خاموش رہے اور اس ناکامی پر سخت تعجب کیا۔

سہ پہر کو آغا صاحب نے کنکوا اڑایا۔ دہلی والوں نے بھی کنکوا اڑایا، شام تک کنکوا اڑایا کئے اور بارہ پیچ زائد ہوئے۔ شام کو کمیٹی میں بلائے گئے۔ وہاں مسٹر داس صاحب سیکرٹری کمیٹی نے کہا کہ آج آپ کے بارہ پیچ زیادہ ہوئے مگر دہلی کے لوگوں نے ہم سے کہا کہ یہ دہلی کے اچھے کنکوا باز نہیں تھے، اور انہوں نے درخواست کی ہے کہ پھر ایک دن ہم کو دیا جائے تاکہ ہم اچھے اچھے لوگوں کو پیش کریں جو کنکوا بازی میں اچھی مہارت رکھتے ہیں۔ اس لئے آپ کل پھر کنکوا لڑائیے۔

دوسرے دن پھر دہلی والوں سے لڑے، ۲۰ پیچ زائد ہوئے۔ شام کو پھر کمیٹی میں گئے تو سیکرٹری صاحب نے کہا: ''آج تو آپ کے بیس پیچ زائد رہے۔'' اور سب لوگوں نے آغا صاحب کی تعریف کی اور کہا کل آپ میرٹھ والوں سے کنکوا لڑائیے۔

تیسرے روز آغا صاحب نے ——— میرٹھ والوں سے کنکوا لڑایا اور ان سے بھی ۵۲ پیچ زائد رہے۔ کمیٹی نے شام کو آغا صاحب کو بلا کر کہا کہ سارا دربار آپ کی تعریف کرتا ہے کہ آپ سے بہتر کنکوا لڑانے والا کسی شہر میں نہیں ہے۔ آج آپ کے ۵۲ پیچ زائد رہے۔

آغا صاحب کی خوشی کو کچھ نہ پوچھئے۔ ہاتھوں دل بڑھ گیا اور کہنے لگے اب تو ضرور کوئی علاقہ سرکار سے ملے گا اور زندگی بھر عیش کریں گے۔

چوتھے روز بریلی والوں نے کنکوا لڑایا اور وہاں بھی آغا صاحب کو کامیابی ہوئی اور شام تک ۲۲ پیچ کاٹے۔

پانچواں کنکوا الجھایا اور برابر کاٹتے رہے۔ بتیس پیچ کاٹے۔ شام کو پھر دربار میں بلائے گئے اور لاٹ صاحب کی میم صاحب نے اور بڑے جلیل القدر انگریزوں نے آغا صاحب کی تعریف کی اور کہا تمام ہندوستان میں آپ سے بڑھ کر کوئی کنکوا نہیں لڑا سکتا۔ ہر طرف سے تعریف ہو رہی تھی اور آغا صاحب دل میں خوش تھے کہ آج بادشاہ کی طرف سے کسی بڑے انعام کا اعلان لاٹ صاحب کریں گے۔ سب انگریزوں نے ان سے ہاتھ ملایا۔ اتنے میں میم صاحب نے آغا صاحب کو ایک کرسی پر کھڑا کیا اور ایک روپے سے بڑا نکل کا بنا ہوا ایک تمغہ سینہ پر آویزاں کیا اور سب لوگوں نے چیرز دیئے اور سرکاری فرمان بھی نہایت خوشی سے پیش کیا۔

یہ دیکھ کر آغا صاحب تو جیتے جی مر گئے، ضبط نہ ہو سکا، آخر بے اختیار ہو کر بول اٹھے۔

''میم صاحب ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہم بادشاہ کے دربار میں آئے ہیں اور پانچ سو روپیہ ہمارا صرف ہو چکا۔ خیال تھا کہ بادشاہ کی طرف سے ہماری پنشن مقرر کی جائے گی یا کوئی علاقہ انعام میں عطا ہو گا کہ بقیہ عمر عیش و آرام سے کٹے گی۔ آپ نے اس سب خدمت کے بدلے ایک روپیہ ہمارے سینے سے لٹکا دیا اور ایک کاغذ ہم کو دیا۔ اسے ہم لے کر کیا کریں گے؟ ہمارے کس کام کا؟ یہ تو ہمارے درد کا علاج نہیں ہے؟''

یم صاحبہ نے کہا کہ آغا صاحب یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ یہ تو بڑی عزت کی چیز آپ کو دی جاتی ہے جو فوجی افسروں کو جنگ کی کامیابی پر بادشاہ دیتے ہیں اسی کے سبب سے آپ ہر ایک دربار میں جا سکتے ہیں اور ہر سرکاری جلسہ میں آپ کو جگہ دی جا سکتی ہے۔ ہر فوجی افسر کے پاس یہی تمغہ ہوتا ہے جس سے اس کی عزت کی جاتی ہے۔ یہ بہت عزت کی چیز ہے آپ کو بادشاہ کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ آپ کو اتنی بڑی عزت عطا ہوئی اور شاہی فرمان کے کاغذ میں آپ کو کامیابی کی مبارک باد دی گئی ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ بادشاہ نے آپ کی بہت قدر کی۔"

آغا صاحب کا چہرہ اتر گیا اور بادل ناخواستہ اپنے اوپر ہزاروں نفرین کہتے ہوئے گھر واپس آئے اور کہنے لگے:

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل
کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

کہنے لگے کہ کنکوا تو ہزاروں جگہ لڑانے گئے مگر یہ سوختی کبھی نہیں ہوئی۔ اور اس کے بعد کنکوا بازی سے توبہ کر لی۔

چودھری افضل حق

زُود پشیمان

ریاض شاداب پہاڑی کی چوٹی پر بیٹھا تھا۔ بہار خوشی کے جھولے میں جھول رہی تھی۔ اس خوشگوار موسم میں شگفتہ رو نوجوان سوچ میں پڑا فضا کو کیوں تاکتا ہے ؟

"میری زندگی کا مصرف کیا ہے ؟" ریاض نے آہستہ سے کہا "عیش و آرام، شہرت، جاہ طلبی، دنیا کا سیم و زر ان سب چیزوں کی کمی نہیں۔ باوجود اس کے چند دن سے طبیعت میں بے اطمینانی بڑھ رہی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ان چیزوں سے اب مجھے کوئی خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ کیا مجھے خوشی کے اور ذریعہ کی تلاش میں نکلنا چاہئے۔ یہ خوشی بھی کیا ہے جس کے لئے میں مارا مارا پھروں۔ میں نے اپنی خوشیوں کے لئے بیسیوں کا آرام حرام کر دیا۔ شہرت اور جاہ طلبی کی بھاگ دوڑ میں کئی ایک سے بازی لے گیا۔ اور انہیں ناکامیوں کی حسرت ناک زندگی بسر کرنے کے لئے چھوڑ گیا۔ کیا گوشۂ تنہائی اختیار کر دوں۔ کیونکہ وہ بھی خوشی اور اطمینان حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ اگر گوشۂ تنہائی میں بیٹھوں، اطمینان تو نصیب ہو جائے گا۔ مگر زندگی کی افادیت گھٹ جائے گی۔ پس میری عقل کا فتویٰ تو یہی ہے کہ ایسی فائدہ بخش زندگی بسر کروں جس میں میری ذات کو دو روٹی سے زیادہ دخل نہ ہو۔"

وہ اٹھ کر محل میں آگیا۔ ڈیوڑھی پر ملازمین نے جھک کر سلام کیا۔ وہ اندر داخل ہو گیا۔

خوبصورت نسیمہ راحت بخش اور آرام دہ مخملیں کاؤچ پر بیٹھی تھی۔ گویا مخمل پر رنگین ریشم کا ڈھیر پڑا تھا۔ وہ زندگی کے حسین تصورات میں کھوئی ہوئی تھی۔ ریاض نے شادی کے بعد نسیمہ کی نازبرداری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ ان کی متاہل زندگی میں دن عید اور رات شب برات ہو کر گزرتی تھی۔ ریاض حسب معمول مسکراتا گھر میں داخل ہوا۔ نسیمہ کے بیٹے گھر بھر میں گلزار کھل گیا۔ ریاض نسیمہ کے قریب کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ گل و بلبل محبت کی سرگوشیوں میں معروف ہو گئے۔ نسیمہ نے تین سال کی بچی کی طرف جو پاس ہی لیٹی ہوئی تھی۔ آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اب ہم پر خدا نے زندگی کی بھاری ذمہ داری ڈال دی ہے۔ ابھی سے اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا چاہئے۔ اور ساتھ ہی ساتھ آج ہی ہونہار بر وا پر نظر رکھنا ہوگی۔ اللہ کرے کوئی اچھا بَر مل جائے۔

ریاض نے کہا: "اس کی کیا تشویش ہے۔ ہماری ڈیوڑھی کے دربان کے سات سالہ لڑکے کو علم و دولت سے مالا مال کیا جائے وہ اس بچی کے لئے ہر طرح موزوں ہو سکتا ہے۔"

نسیمہ اس طرح تڑپ اٹھی گویا ہزار بچھوؤں نے کاٹ کھایا ہو۔ قریب تھا کہ وہ ریاض کو کچھ اُلٹی سیدھی سُناتی اس کی طبعی شرافت بروئے کار آئی۔ اور اس نے ضبط سے کام لیا۔ پھر خیال آیا کہ میں نے شاید بات سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ اس لئے دوبارہ پوچھا کہ "میں آپ کی بات کو نہیں سمجھ سکی ہوں"۔

ریاض نے کہا "بات تو تم نے ٹھیک سُنی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ مزاج کو گراں گذری ہے"۔

نسیمہ ۔ تو کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ اپنی بچی کو در وازے کے دربان کی کنیز بنانے پر آمادہ ہیں؟

ریاض ۔ اگر تم میری کنیز ہو تو تمہاری بچی کو بھی کسی کی کنیز بننے کے سوائے چارہ نہیں۔ مگر پیاری نسیمہ یہ تو بتاؤ کہ طبیعت میں اعتراض کیا ہے؟

نسیمہ ۔ موری کی اینٹ چوبارہ کو کیسے لگے۔ رذیل شریف کا ناطہ کیا؟

ریاض ۔ رذیل شریف کا معیار کیا ہے۔ اگر میں کسی وجہ سے دولتِ دنیا کھو بیٹھوں۔ کیا رذیل ہو جاؤں گا

نسیمہ ۔ آج آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ ماں باپ اولاد کی ترقی اور آرام کی سبیلیں سوچتے ہیں یا انہیں جہنم میں جھونکنے کی تدبیر کرتے ہیں۔ کیا میری بچی کا خاوند دوسروں کے در کی دربانی کرے گا۔ اور میری بچی غیروں کے برتن صاف کر کے اپنا پیٹ پالے گی؟

ریاض ۔ اگر ہم، جو بزعمِ خود بڑے بنے بیٹھے ہیں دولت سے محروم ہو جائیں، ہمیں بھی ہاتھ ہلا کر گزر اوقات کرنی پڑے گی۔ لیکن چھوڑو اس بحث کو میں تو یہ کہتا ہوں، دولت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم اس امر پر قادر ہو کہ دربان کے لڑکے کو زیورِ علم و اخلاق سے آراستہ کرو۔ تمہارا داماد تمہاری لڑکی کا غلام بن کر رہے گا۔

نسیمہ ۔ تو میں کفو اور خاندان کا خیال چھوڑ دوں؟

ریاض ۔ ہم سب اولادِ آدم ہیں۔ رشتہ انسانوں میں کرو حیوانوں میں نہ کرو۔

نسیمہ خاموش ہو گئی مگر ماتھے کے تیور نہ اُترے۔

ریاض نے رات کے کھانے پر سب ملازمین کو دعوت دی کہ میرے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔ شاگرد پیشہ لوگوں کو بے حد پریشانی تھی۔ اُمرائکے آداب غربا کی معاشرت سے جدا تھے۔ ڈر تھا کہ کوئی حرکت رئیس کے ناگوارِ خاطر نہ ہو۔ بہرحال رات کو لجاتے شرماتے، سمٹتے سمٹاتے سب آئے۔ کوئی تھوکو کے توچل۔ کوئی تھو تھو کو کیسے تو آ گئے ہو۔ رئیس کی دعوت کیا تھی۔ داورِ محشر کا سامنا تھا۔ غریب مہمان ہر چند نئے کپڑے بدل کر آئے۔ لیکن وہ خود اپنی نگاہ میں حقیر تھے۔ اس وقت کپڑے ان پر تنگ تھے وہ کپڑوں سے تنگ تھے۔

ریاض خود اٹھا۔ ایک ایک کو اخلاق سے ہمراہ لایا، اور زمین پر بچھے مکلف دسترخوان پر سب کو بٹھایا۔ رئیس سامنے بیٹھا تھا۔ غریب مہمانوں کی حرکات عروسِ نو کی طرح محجوب تھیں۔ وہ لقمہ اٹھاتے اور ساتھ ساتھ آنکھ چُرا چُرا کر رئیس کی طرف بھی دیکھتے جاتے تھے کہ کہیں وہ تو ان کو نہیں دیکھتا۔ مبادا اس کو ان کے خورد و نوش کے طور طریقے ناپسند ہوں۔ اور وہ بے ہودہ اور بے عقل تصور کئے جائیں۔

ریاض ان کی کیفیتِ قلب اور بے چینی کو سمجھتا تھا۔ انسان اور انسان میں اس مغائرت کا ذمہ دار وہ اپنے آپ کو خیال کرتا تھا، اور ساتھ ہی اعلیٰ سوسائٹی کو مطعون کرنے سے اسے دریغ نہ تھا۔ جس نے غریب امیر میں آدابِ معاشرت کی خلیج حائل کر دی۔ جب تک اخوت و مساوات کی بنیاد پر تہذیب و سیاست کی تعمیر نہ ہوگی۔ تب تک انسان مختلف درجوں میں بٹے رہیں گے۔ نسیمہ نے جب سنا کہ ریاض شاگرد پیشہ لوگوں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھا ہے تو وہ غصہ کی دیوی بن کر اندر آنگن میں پھرنے لگی۔ اس کا چہرہ لال اور آنکھیں غصہ سے سُرخ تھیں۔ اس نے رات کو سونا چاہا مگر غصہ سے نیند نہ آئی۔ ریاض نے ادنیٰ لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا لیا۔ نسیمہ کی نظر میں وہ خود اچھوت ہو گیا۔ صبح اٹھی اور لڑکی کو لے کر چپکے سے موٹر میں بیٹھ میکے چلی گئی۔

ریاض کو محبوب بیوی کی مفارقت شاق گزری۔ لیکن اس کے چپکے سے چلے جانے کا بھی صدمہ تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ نسیمہ عورت ہے۔ بیرا عمل اگر اس کے خلاف مزاج ہو تو اس کو احتجاج کرنے کا حق ہے۔ اس لئے چند دن اور صبر کر دوں۔

نسیمہ کے بغیر گھر کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ چند دن میں ریاض کا چہرہ اُتر گیا۔ مفارقت کی بیماری نے غلبہ پالیا۔ ایک ہفتہ تو جوں توں کر کے کاٹا۔ ہفتہ کے بعد سسرال میں گیا کہ نسیمہ کو منالائے۔ کسی شیطان نے نسیمہ کو ورغلایا کہ اکڑی رہنا جب تک دو چار بار لینے نہ آئیں نہ جانا۔ ورنہ امور خانہ داری میں وہ اسی طرح خود رائی کریں گے۔ بدی کے سرچشمہ کو ابھی بند کر لو، ورنہ سیلِ حوادث میں خود بہنا پڑے گا۔ ریاض نے ہر چند منایا کہ گھر چلو۔ نسیمہ نے سُوکی ایک کہہ دی کہ میں نہیں جا سکتی۔ مرد کا آخری کارگر ہتھیار بھی اس نے آزما دیکھا۔ یعنی ریاض نے یہ بھی کہا کہ میں کئی روز سے بیمار ہوں۔ باوجود اس کے نسیمہ نے کہا میں چھ ماہ سے پہلے نہیں آسکتی۔ بیمار خاوند درماندہ مسافر کی طرح شکستہ خاطر ہو کر چلا آیا۔ نسیمہ کو اپنے حسن کی تاثیر پر اعتماد تھا کہ وہ ہزار بار آئے گا اور لاکھ بار مجھے منائے گا۔ ریاض کے خیالات میں پہلے ہی انقلاب آچکا تھا محبت کا بندھن اب کمزور ہو گیا۔ نسیمہ کے خلاف توقع فیصلے نے اس کا دل توڑ دیا۔ یہ وہ وقت تھا، جب انسان زندگی کے بہت سے خوشگوار اور ناخوش گوار فیصلے کر بیٹھتا ہے۔ ریاض نے تازہ رجحانات کی روشنی میں اپنے کمزور عزم کو پختہ کر لیا کہ دو روٹی کے سوا مجھے دنیا میں اور کیا چاہئے۔ پندرہ گاؤں کا پرگنہ میرے کس کام کا۔ خدا کی زمین پر لوگ ہل جوتتے ہیں اور گاڑھے پسینے کی کمائی مجھے دیتے ہیں۔ خود بعض اوقات نان و نفقہ سے بھی محروم رہتے ہیں۔ لیکن میری تن پروری اور عیش کے لئے سامان مہیا کرتے ہیں۔ آخر کسان کا خون کب تک چوسوں!

اب اس کے چہرے پر متانت بڑھ رہی تھی۔ اپنے ملازموں اور کسانوں سے اس کا سلوک ہمدردانہ ہی نہ تھا بلکہ مساویانہ تھا۔ وہ خود بڑھ کر سب کو سلام کرتا تھا۔ باورچی خانہ کے تکلفات ختم ہو گئے تھے۔ وہ ملازموں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتا تھا۔ وہ پہلے شاہانہ ٹھاٹھ سے اپنے تعلقہ داری کے گاؤں میں جاتا تھا۔ اب اکیلا موٹر پر گھومتا ہے۔ اور ان کی فلاکت کو دیکھ کر کانپ اُٹھتا ہے۔

فصل نکلنے کا موسم آگیا۔ ریاض کے مختار بڑے سرگرم ہیں۔ رئیس کے حسن سلوک نے ان میں کام کی طاقت بڑھا دی ہے۔ وہ اب کسی کسان پر رحم کرنا نہیں چاہتے۔ قرضے کی ساری رقوم کو اسی فصل پر وصول کر کے ریاض کے قدموں میں ڈھیر کرنا چاہتے ہیں۔ اچانک ریاض نے حکم دے دیا کہ زرِ قرضہ صرف اُسی کسان سے وصول کیا جائے جس کے گھر میں سال کا غلّہ اور چھ جوڑے کے حساب سے ہر ایک کے پاس کپڑے ہوں۔ ایک ہل کے پیچھے پانچ روپیہ کا ماہانہ خرچ، ایک بچے کے لئے تعلیم کے اخراجات ماہوار نکال کر جو بچ رہے وہ قرضہ میں وصول کر و۔

سب مختار اس انوکھے حکم پر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے، اور کہا "سرکار! اس طرح تو کچی کوڑی وصول ہونے کی نہیں۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ ریاست کے تمام حقوق ضائع ہو جائیں گے۔ آپ کے خزانہ میں کوئی دمڑی داخل نہ ہوگی۔"

ریاض نے کہا "میں بھی اسی کشمکش میں مبتلا ہوں کہ ریاست کے حقوق سے دست بردار ہو جاؤں یا انسانیت کے حقوق سے۔ مجھے اگر فکر ہے تو لڑکی کی تعلیم کی۔"

سب نے کہا "بے شک حضور! اس پر لاکھوں اٹھیں گے۔ تعلیم کے بعد شادی کا سامان بھی آج ہی ہونا چاہئے۔ اس کے لئے بھی لاکھوں اُٹھیں گے۔"

ریاض نے مُسکرا کر کہا "جب ایک لڑکی کی تعلیم اور شادی پر لاکھوں اُٹھیں گے تو جن کسانوں کے ہاں دو دو چار چار بچے ہیں ان کا اس دنیا میں کوئی حق ہے یا نہیں۔ اس لئے جاؤ میرے حکم کے مطابق دیکھ بھال کر آؤ کہ ان کم از کم اخراجات کے بعد کسی کے پاس کچھ بچتا بھی ہے یا نہیں۔"

سب نے کہا "جانے کی کیا ضرورت ہے۔ ایسا کوئی کسان نہیں ہے جو رات دن جان مار کر بھی یہ سامان مہیا کرے۔ پھر بچانے کا سوال ہی کہاں رہا۔ بس ہماری نوکری ختم ہوئی۔ رئیس جانے یا کسان!"

ریاض: "اگر تم ان حالات میں یہاں رہنا پسند کرو تو خیر، ورنہ تمہارے سپرد دوسرا کام کر دوں گا۔ تم اپنے تجربہ کی بنا پر کسانوں کو بہترین مشورے دو۔

کوئی جھگڑا اُٹھے تو نپٹاؤ۔ کسی کا جانور بیمار ہو تو سلوتری کو دکھاؤ۔ بچوں کی تعلیم کی نگرانی کرو۔ غرض تم کسانوں کی تکلیفوں کے دور کرنے کا عہد باندھو تو تمہاری مقدور بھر خدمت کروں گا۔ تمہیں عمر بھر نظم و نسق کا تجربہ ہے۔ میں پانچ لاکھ روپیہ تمہارے سپرد کر دوں گا، اور پانچ برس تجربہ کر کے دیکھوں گا کہ تم نے ریاست میں کیا ترقی دکھائی ہے۔ تمہیں ہمت اور تدبیر سے کام کرنے کا موقع ہے۔ اس روپیہ کو کسانوں کی اقتصادی اور تعلیمی ترقی کے لئے خرچ کرو۔ پانچ برس کی محنت سے اس پرگنہ کو ریاستوں کے لئے قابلِ رشک بنا دو؟

ریاست کے دہقانوں نے جب رئیس کے ان پاکیزہ خیالات کو سُنا تو لٹو ہو گئے۔ ان کی اپنی ہمت میں اضافہ ہو گیا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ان بازوؤں میں اور بل آ گیا ہے۔ مختاروں نے گاؤں اور اہلِ دیہہ کی ترقی کی راہیں سوچنا شروع کیں۔ ایسا معلوم ہوا کہ ریاست میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی ہے۔

ریاض نے روپیہ مختاروں کے سپرد کر دیا اور کہا کہ میں بھی پانچ سال کے لئے مختلف مقامات کی سیر کو جا رہا ہوں۔ امید ہے کہ میری واپسی پر تمہاری محنت اور تدبیر نے پرگنے کو رشکِ جنت بنا دیا ہو گا۔

نسیمہ کو اس انتظام اور ریاض کے جانے کی خبر ہوئی تو دل مسوس کر رہ گئی۔ ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ رنگ متغیر ہوا۔ سوچا یہ تھا کہ وہ آئیں گے۔ آج نہیں تو کل ساتھ چلی جاؤں گی۔ ان کا کیا قصور؟ مجھ نصیبوں جلی نے کیا قیامت ڈھائی۔ وہ بیمار تھے اور منت پذیر تھے۔ میں نے کس دیدہ دلیری سے ان کو جواب دیا۔ اور وہ کس طرح اپنا سا منہ لے کر چلے گئے تو مجھے شکوہ کیا۔ مجھے بھی کہیں ڈوب مرنا چاہیئے۔ اس غم میں نڈھال سی ہو کر پڑ رہی۔ نسیمہ کے والدین کو علم ہوا تو انہوں نے ڈھارس بندھائی کہ اس گھر میں کیا کمی ہے جو تمہیں کسی بات کا غم ہو۔ یہاں رزق دولت کی کمی ہو تو کوئی غم کھائے۔

نسیمہ کو باوجود ڈھارس بندھانے کے غم کھا رہا تھا۔ ایسے کم گو اور نیک طبیعت خاوند کے ساتھ کسی ذلیل عورت نے بھی وہ غیر شریفانہ سلوک نہ کیا ہو گا جس سلوک کی میں مرتکب ہو چکی ہوں۔ مگر اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔

ریاض ریاست سے جا کر شہر میں آباد ہوا۔ وہ مزدور کی حیثیت سے بسر اوقات کرنے لگا۔ مزدور شہر کے جس متعفن حصہ میں رہتے تھے، وہی ریاض کا مسکن تھا۔ غریبوں کے گلی کوچے نسیم صبح اور سورج کی کرنوں کی مداخلت سے محروم تھے، اور مزدوروں کے بچے بچیاں دنیا کی آسائشوں اور خوشیوں سے ناآشنا تھیں۔ اس نے ایک دن ایک بوڑھی عورت کو گرمی میں سر پر بوجھ اٹھائے دیکھا۔ عورت بوجھ کے نیچے دبی جا رہی تھی۔ اس نے عورت کا بوجھ سر پہ اٹھا لیا۔ منزلِ مقصود دور تھی۔ بوجھ اس کی برداشت سے بھی زیادہ تھا۔ ہچکی جھنگی پڑنے لگی۔ وہ ہانپتا جا رہا تھا۔ کپڑے پسینے سے شرابور ہو گئے تھے۔ وہ بوجھ سر سے گرا دینا چاہتا تھا مگر خودی نے ہٹ نیا ہے بڑ زور دیا۔ کچھ اور دور چل کر آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آنے لگا۔ زبان تالو سے لگ گئی۔ لب خشک ہو گئے۔ اس وقت کو ملامت کرنے لگا جس وقت رحم کے تقاضے سے اس نے بڑھیا کا بوجھ اپنے سر پہ اٹھا لیا تھا۔

بوڑھی عورت نے کہا "بس اب گھر آ گیا ہے"۔ ریاض اس نوید جانفزا سے گویا تازہ ہو گیا۔ اس کے ڈگمگاتے ہوئے قدم سنبھل گئے۔ اور ایک اطمینان کی سانس لی، کہ اچھا ہوا خدا نے اس عورت کے سامنے ذلیل نہ کیا۔ ورنہ کہتی کہ اچھے جوان بچے ہو کہ مجھ بوڑھی کے برابر بھی بوجھ نہ اٹھایا گیا۔

وہ عورت ایک تاریک کوٹھڑی کی زنجیر کھول کر داخل ہوئی اور کہا "لے آ میرے بچے!" ریاض نے بوجھ سر سے گرا دیا۔ خود بھی کھڑے ہونے کی تاب نہ رہی۔ وہیں فرشِ زمین پہ بیٹھ گیا۔ اس کا بند بند دکھتا تھا۔ کائی جمے ہوئے کچے گھڑے سے مٹی کے آبخورے میں پانی پیا اور خدا کا شکر کیا۔ اسے مزدور کی زندگی کا احساس ہو گیا۔ عورت نے بتایا "بیٹا! تم نے میرے دو پیسے بچا دئے۔ کسی مزدور سے اٹھواتی تو دو دھیلے دینا پڑتی۔ جیتے رہو۔"

اُدھ آنے کے لئے مزدور کو یہ مصیبت کا پہاڑ اٹھانا پڑتا ہے۔ ریاض نے عالمِ تصور میں اپنی گزشتہ زندگی پر نفرین کی کہ کس بے دردی سے وہ روپیہ لٹاتا رہا۔ حالانکہ پائی پائی ملک کے مزدور کا حق تھا۔ دھیلے کے لئے ایک طرف انسان یہ مصیبت اٹھاتا ہے، دوسری طرف ایک

شخص روپے کو پانی کی طرح بہاتا ہے۔ لیکن ریاض نے دل میں کہا افلاس کا سمندر ہر طرف ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ انسانیت اس میں غوطے کھا رہی ہے اس ہیجان میں بے کس تنکا ہوں۔ میرے سہارے پر انسانیت ڈوبنے سے نہیں بچ سکتی۔

دنیا کا کوئی ایسا مذہب نہیں جس نے غریب اور مزدور کی امداد کو ذریعۂ نجات قرار نہ دیا ہو۔ مذہب اور اہلِ مذہب موجود ہیں۔ لیکن غریب اور مزدور مصیبت کے اتھاہ سمندر میں ڈبکیاں لے رہے ہیں۔ اسی لئے تو شاید سوویٹ روس مذہب کے دعوئ غریب نوازی کا قائل نہیں۔ اور وہ غریب کو امیر کے خلاف صف آراء دیکھنا چاہتا ہے۔ امیر اور غریب میں اس اقتصادی بُعد کا لازمی نتیجہ جماعتی جنگ ہے۔ بیشتر مذاہب کا اخوت اور مساوات کا دعویٰ ہے۔ لیکن اس مذہب کے پیرو بھی اپنی صداقت کی مناسب مثال قائم نہ کر سکے۔

ریاض اپنے بے مثال ایثار سے مطلئن تھا۔ اس نے دل ہی فیصلہ کیا۔ کہ میں بقیہ عمر امرا کی تربیت میں گزار دوں گا تاکہ وہ غرباء کی دستگیری میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھیں۔ اور اپنے اخراجات کو کم کرکے کسانوں اور مزدوروں کی ترقی اور فلاح کے لئے روپیہ صرف کریں۔ اس نے مسجد میں جاکر یہی وعظ کیا جو بہت موثر ثابت ہوا۔ ملک بھر میں گھوما۔ اُمرا کے پاس پہنچا۔ کون کہے کہ غریب کی مدد نہ ہونی چاہیئے۔ وہ اپنی سعی سے بہت مطمئن تھا۔ اسے امید تھی کہ میں اپنی عمر میں ملک میں وہ نتائج پیدا کر سکوں گا جو چودہ سو سال قبل سرورِ عرب نے کئے جانے کا حکم دیا تھا۔ اور جس پر اب سوویٹ روس کا ممتاز مطلق لینن عمل کر رہا ہے۔

پانچ برس گزر گئے۔ ریاض نے مناسب سمجھا کہ وہ ریاست کی ترقی کا جائزہ لے۔ چنانچہ وہ ریاست میں اچانک واپس آگیا۔ پرگنے میں عجیب انقلاب تھا۔ کسانوں کی حالت بالکل بدل چکی تھی۔ ان کی صحت اور صفائی قابلِ دید تھی۔ آئے دن کی مالی پریشانیوں سے انہیں نجات مل چکی تھی۔ بچے مدرسے میں شوق سے جاتے تھے۔ انسان اور حیوان کے لئے ہسپتال تھے۔ صبح اور شام کے لئے سامانِ تفریح موجود تھا۔ ہر گاؤں میں ایک چھوٹا سا سنیما گھر۔ بھاگ دوڑ کے لئے کھلا صاف میدان۔ نہانے دھونے کے لئے صاف ستھرے حوض۔ پرگنہ نمونۂ جنت بن گیا تھا۔ سب ریاض کے سر کو دعائیں دیتے تھے۔ ریاض نے یہ نقشہ دیکھ کر سجدۂ شکر ادا کیا۔ مختاروں کی ہمت کی داد دی اور کہا۔ "میں یہاں ٹھہر کر تمہارے کام میں مداخلت کرنا نہیں چاہتا۔ میں تم سے بڑھ کر اور کیا کرتا۔"

ریاض اطمینان بخش انتظام سے خوش ہی نہ تھا بلکہ اس کو اپنا حیرت انگیز ایثار سمجھتا تھا۔ یکایک اس کے اطمینانِ قلب پر لڑکی کی اچانک بیماری اور آناً فاناً موت نے بجلی گرادی۔ وہ سر پر پاؤں رکھ کر سسرال کے گھر گیا۔ وہاں کہرام مچا ہوا تھا۔ ہر ایک ریاض کی لاپرواہی کا شاکی تھا۔ بعض اسے ننگِ اسلاف کہتے تھے۔ جو اولاد اور جائداد سے لاپرواہ تھا۔ ریاض "ہر چہ برمی مولا از ہمہ اولیٰ" کہہ کر خاموش تھا۔ لڑکی کے صدمہ نے گو طبیعت پر گہرا اثر کیا۔ تاہم اپنی زندگی کے کارنامہ پر اُسے فخر تھا۔ ریاست کے کسانوں میں خوشگوار انقلاب کے خیال نے اُسے پھر اطمینان کی دولت بخش دی اور بدستور زیردستوں کی امداد میں منہمک ہوگیا۔

ریاض نے سُنا "سکلات والا" مشہور سوشلسٹ ممبر پارلیمنٹ آیا ہے۔ جی چاہا کہ اسے اپنے پرگنہ کا ملاحظہ کرائے۔ اس نے جاکر ممبر موصوف کو مل کر ریاست کے حالات بتا کر اس امر پر آمادہ کر لیا کہ حالات کو بچشم خود دیکھے۔

مسٹر سکلات والا مزدوروں کے حال میں ایک رئیس کو دیکھ کر خوش ہوگیا اور کہا کہ ہندوستان میں سوشلسٹوں کا ایک نیا گروہ پیدا ہوا ہے۔ جو آٹھ آنے کے کھدر کے کپڑوں میں بسر اوقات کرتا ہے۔ دو پیسے کی گاندھی ٹوپی، آگرے کے اُلٹے کھرل کی طرح سر پر رکھ کر پانچ ہزار کی موٹر میں چڑھا ہوتا ہے۔ وہ دس روپے کا روزانہ پیٹرول جلاتا ہے۔ شاہانہ کوٹھیوں میں رہتا ہے۔ دوستوں کو ٹھاٹھ سے دعوتیں دیتا ہے۔ لیکن ملازموں کی تنخواہ دبا لیتا ہے۔ بہت سے نکمے کارکن اسے سچ مچ کا لینن سمجھ کر یا تہذیبِ مغربی کا حامل جان کر اس کے پیچھے لگے پھرتے ہیں۔ یہ ریاکار سرمایہ داروں کا نیا بہروپ ہے۔ میں ان بہروپیوں سے سخت متنفر ہوں۔ اُنھوں نے ظاہر میں تبدیلی کرلی ہے لیکن ان کا دل تبدیل نہیں ہوا۔ وہ اندر سے اب بھی سرمایہ دار ہیں۔ صرف لوگوں کی نگاہ میں معزز بننے کے لئے اُنھوں نے یہ روپ دھار لیا ہے۔

"مسٹر ریاض! سکلات والا نے بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہا "میں تم سے خوش ہوں۔ تم سچے سوشلسٹ ہو۔ تم نے اپنے ملک کے ادنیٰ مزدور کی آمدنی کے مطابق اپنا خرچ گھٹا لیا ہے۔ تم ہی سچے مسلمان ہو۔ عرب کے اولوالعزم پیغمبرؐ نے پیٹ بھر کر کھانا نہ کھایا۔ کیوں؟ کیا انہیں میسر نہ تھا؟ اگر تن آسانی اور شکم پروری پیشِ نظر ہوتی تو یثرب وبطحا کا رئیس اور مسلمانوں کے دل کا حکمران جو آرام چاہتا کرتا۔ لیکن سچا سردار فوج کا ادنیٰ سپاہی ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کو راحت پہنچانے کے لئے خود تکلیف اٹھاتا ہے۔ اس لئے مسٹر ریاض میں تمہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ کیونکہ تم نے سچے انقلاب کو قبول کر لیا ہے۔"

ریاض نے اپنی بیوی سے اَن بَن کی داستان بھی کہہ سنائی کہ کس طرح ڈیوڑھی کے دربان کے لڑکے کے رشتے کے ذکر سے ناراض ہو کر وہ میکے چلی گئی۔ مسٹر سکلات والا نے ریاض کو گلے لگا لیا اور کہا "خاندانی تعصب، نسل اور خون کا امتیاز بھی بنی نوع انسان کو مختلف حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ یہ انسانیت کے لئے بدترین فتنہ ہے۔ سرمایہ اور کفو کا امتیاز ہی سامانِ غرور ہے۔ اور انسانیت تب ہی آسودہ ہوگی جب دونوں کا نشان دنیا سے اٹھ جائے گا۔ رسولِ عربیؐ نے اپنے غلام زیدؓ سے بہن کا نکاح کر کے آدھی دنیا میں نسلی تعصبات کا خاتمہ کر دیا پھر زیدؓ کو سرداران قریش کی سرداری دے کر دشمن کے مقابلہ میں بھیجا۔ تاکہ اخوت و مساوات کا اصول زبانوں پر نہ رہے دل میں بھی سما جائے۔ عرب کے بعض لوگوں نے ناک بھوں چڑھائی۔ علی ظرف زیدؓ کی شہادت کے بعد اس کے بیٹے اسامہؓ کو دنیا کو تسخیر کرنے والے سرداروں کا سردار اسی لئے بنایا گیا تاکہ نسلی تعصب کا ذلیل جذبہ اگر کسی کے دل میں موجود ہے تو وہ بھی کچلا جائے۔"

سکلات والا نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا "ریاض! مجھے اسلامی تاریخ کا وہ واقعہ، پہلی خلافت کا وہ زریں زمانہ رہ رہ کر یاد آتا ہے جب غلام زیدؓ کا بیٹا ۱۸ سالہ معصوم اور ناتجربہ کار، دُنیا کو فتح کرنے والے جرنیلوں کا سردار بنا کر بھیجا گیا۔ اور خود خلیفۂ اول نوجوان اسامہؓ کی رکاب تھامے شہر سے نکلا۔ علیؓ، خالدؓ اور وقاصؓ جیسے جرنیل اسامہؓ کے احترام میں گردنیں جھکائے ساتھ ہو لئے۔

اسامہؓ نے خلافت پناہ کو کہا کہ یا مجھے پیدل چلنے دیجئے یا آپ بھی سوار ہو جائیے۔ یاد ہے باعظمت حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کیا کہا۔ کہا تو یہ کہ "میرے آقا کے نامزد کئے ہوئے سردار! میں تیری برابری کیسے کر سکتا ہوں۔ نہ میں سوار ہو سکتا ہوں نہ تو پیدل ہو سکتا ہے۔ اس کے حکم سے تو اور میں دونوں مجبور ہیں۔"

ریاض! مجھے تو اس واقعہ کی یاد تڑپا دیتی ہے جب تم نے اپنی بیوی کو یہ مشورہ دیا۔ اس وقت تیرے اندر سچے مسلمان کی روح موجود تھی۔"

ریاض ــــ مسٹر سکلات والا کی حوصلہ افزائی سے مسرور تھا آنکھوں میں ہٹا کر اسے پرگنہ میں لے گیا۔ حالات کو دیکھ کر سکلات والا کی بھی آنکھیں کھل گئیں۔ ریاض کو داد دیتے دیتے اس کے ہونٹ خشک ہو گئے۔ ریاض بھی خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ یک بیک سکلات والا نے دریافت کیا کہ "آپ نے اراضیات کا حقِ مالکانہ کسانوں کو دے دیا ہے؟" ریاض نے جواب دیا کہ "نہیں۔"

سکلات والا نے ریاض کی طرف دیکھا اور بے تکلف ہو کر کہا کہ "تمہاری روح میں بدترین شیطان گھسا بیٹھا ہے۔ نفس تمہیں دھوکا دے رہا ہے۔ اور تم دنیا کو دھوکا دے رہے ہو۔ بہت سے ریاکار اپنی شہرت کے لئے دنیا کی بدترین سختیاں جھیلتے ہیں مگر ان کی ریاضت نیکی نہیں۔ تمہاری یہ غریب نوازی ایک دن کسانوں کے لئے بدترین لعنت ثابت ہوگی۔ جب تم مر جاؤ گے۔ تمہارا وارث ان کسانوں کی ساری خوشیاں بدستور اپنی ذات پر قربان کرے گا۔ اور یہ لوگ پہلے سے زیادہ بدحال ہو جائیں گے۔ تمہارا عارضی کرم ان پر مستقل ظلم بن جائے گا۔ کیا تم مالکانہ حقوق سے دست بردار ہو کر اس جائیداد کو وقف نہیں کر سکتے تاکہ کسانوں کو بلا وجہ بے دخل نہ کیا جا سکے؟"

ریاض نے کچھ دیر سوچا۔ اس کا رنگ زرد ہونا شروع ہو گیا۔ سکلات والا نے سمجھ لیا کہ وہ زمین کی وراثت سے محروم ہونا نہیں چاہتا۔

سکلات والا نے کہا "ریاض! تم اپنی بیوی کو گھر لاؤ جو نہ نسلی مفاد ترک کرنے پر آمادہ ہے، نہ اقتصادی حقوق سے دست بردار ہونا چاہتی ہے۔ معاف کرنا۔ تم اور تمہاری بیوی میں ایک ہی روح جاری وساری ہے۔ میرا لہجہ کرخت ضرور ہے مگر میرا دل و دماغ بہت صاف ہے۔ تم اور تمہاری بیوی دونوں مفادِ عامہ کے خلاف امتیازی زندگی بسر کرنا چاہتے ہو۔ لیکن تمہاری بیوی زیادہ نیک ہے۔ کیونکہ اس نے تمہاری طرح ریاکاری کا جامہ نہیں پہنا۔ لو مسٹر ریاض رخصت! بھلائی اور دنیا کے دل دونوں کی طلب نہ کرو۔"

سکلات والا یہ کہہ کر بلا ہاتھ ملائے چلا گیا۔ ریاض دم بخود رہ گیا۔ اس کا دماغ سکلات والا کے کلام کی صحت کو قبول کرتا تھا۔ مگر دل اس پر عمل کرنے کے لئے آمادہ نہ تھا۔ دماغ اور دل کے عدم تعاون سے طبیعت عجب کشمکش میں مبتلا ہوگئی۔ رات دن کسی فیصلہ پر پہنچنے کی کوشش اور ناکامی سے اسے کم خوابی کا دورہ شروع ہوگیا۔ دل کڑا کر کے آنکھیں بند کرتا تھا۔ سکلات والا کے الفاظ کانوں میں گونجتے تھے کہ تم اور تمہاری بیوی دونوں مفادِ عامہ کے خلاف امتیازی زندگی بسر کرنا چاہتے ہو۔ وہ نیکی کا عزم کر کے سونا چاہتا تھا۔ تو دل پکار اٹھتا تھا کہ عارضی طور سے حکومت سے دست بردار ہونا اور حقیقی طاقت کا مالک رہنا شہرت کو چار چاند لگاتا ہے۔ لیکن ریاست کے حقوق مستقل طور پر ضائع کر کے عام آدمیوں میں شمار ہونا ناقابلِ قبول امر ہے۔ دماغ خیالات کے تصادم سے پراگندہ اور دل مضمحل تھا۔ ہر وقت وہ اپنے دل سے باتیں کرنے میں مصروف رہتا تھا۔ کبھی وہ کہتا کہ میں مفادِ عامہ کے خلاف امتیازی زندگی بسر کرنے کو حرام سمجھتا ہوں۔ پھر پکار اٹھتا کہ نہیں میں امتیازی زندگی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ میں کس طرح حقوق ریاست سے ہمیشہ کے لئے دست بردار ہو جاؤں۔ علاوہ ازیں لڑکی کی موت کا صدمہ بھی دل سے نہ گیا تھا۔ دل اور دماغ کی اس کیفیت نے وہم کی صورت اختیار کی۔ خیالات کے ایک مرکز پر نہ رہنے سے وہ رات دن پریشان اور حیران رہنے لگا۔ کم خوابی بے خوابی میں بدل گئی۔ پریشانی اور حیرانی نے چہرے پر وحشت کے آثار نمایاں کر دئے۔ بڑا عزم لے کر اٹھنا اور پھر قوتِ فیصلہ کو جواب دے دینا ناقابلِ برداشت اذیت ہے۔ بالآخر وہم نے بڑھ کر دیوانگی تک نوبت پہنچا دی۔ ہم عصر رئیس اسی تاک میں تھے۔ انہوں نے سرکار دربار تک نوبت پہنچائی کہ ریاض کا انتظام ریاست دیوانگی پر مبنی ہے۔ اسی سبب رئیسوں کا انتظام ریاست بگڑتا ہے۔ رعایا دلیر ہوگئی ہے۔ غریب امراء کے منہ آنے لگے ہیں۔ اس شکایتی ٹولہ میں اس کا خسر پیش پیش تھا۔ حکامِ بالادست کو بھی ریاض کی غریب نوازی کی ادا ناپسند تھی۔ اس شکایت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاض کی ریاست کا انتظام براہِ راست حکومت کی نگرانی میں آگیا۔ اور ایک افسر ریاست کے انتظام کے لئے مقرر ہوا۔

سرکار کے مقرر کردہ افسر نے آ کر دیکھا کہ خزانہ خالی ہے۔ سب مختاروں کو بلا کر لتاڑا کہ تم نے رئیس اور ریاست دونوں کو برباد کر دیا۔ غضب خدا کا ایسی زرخیز ریاست اور خزانہ خالی۔ کسانوں کے گھروں میں ہُن برستا ہے اور رئیس کے ایوان میں خاک اڑتی ہے۔ سابقہ بقائے اور قرضے وصول کرو اور آئندہ حسبِ سابق ریاست کا حصہ کسانوں سے حاصل کر کے داخل کرو۔"

جب کسانوں نے اس حکم کو سنا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ ایک تو کھایا ہوا اُگلنا پڑا۔ علاوہ ازیں افلاس بھیانک صورت میں سامنے آگیا۔ غریبوں کے دلوں سے ہوک اٹھی۔ کچھ "قہرِ درویش بر جانِ درویش" کے مصداق آہ بھر کر بیٹھ گئے۔ کچھ ناقابلِ برداشت حالات کے پیشِ نظر مرنے مارنے پر آمادہ ہوگئے۔ پشت پر طاقت ہو تو مخالفت کو مرعوب کیا جا سکتا ہے۔ بے زور کسان کا اللہ والی تھا۔ جس نے سر اٹھایا، پولیس کا نادر شاہی ڈنڈا سر پر پڑا۔ محکوم در محکوم کسان میں قوتِ برداشت باقی نہ رہی۔ بعض پُرجوش لوگ ریاست سے ہجرت کر گئے۔ باقی حسبِ سابق خونِ جگر پی کر کھیتوں میں کام کرنے کے لئے مجبور ہوگئے۔ دنیا جو اُن کے لئے بہشت بن گئی تھی۔ اب وہ دوزخ میں تبدیل ہوگئی۔ ریاست کے خزانہ میں پندرہ لاکھ روپیہ وصول ہو کر داخل ہوا۔ کسان کے بیوی بچے پھر چیتھڑوں میں دکھائی دینے لگے۔ البتہ سرکار کا مقرر کردہ ایک کامیاب منتظم سمجھا جانے لگا۔ جس کا عہدہ اور تنخواہ بڑھا دی گئی۔ کسانوں کی ساری خوشحالی سمٹ کر دیوانے رئیس کے خزانہ میں آگئی۔

ریاض کا معالجہ برابر جاری تھا۔ طبیعت تین سال کے بعد آہستہ آہستہ بحال ہونا شروع ہوگئی۔ دو سال تک علاج اور جاری رہا۔ خدا نے شفائے کلی دی۔ ریاض نے صحت یاب ہو کر پہلا کام یہ کیا کہ بیوی کے پاس جا کر معذرت طلب کی اور کہا "نیکی، اخوت اور مساوات کا وہم بھی اب دور ہوگیا ہے۔ گھر چلو تاکہ آرام چین کی زندگی بسر کریں۔" نسیمہ جسے ریاض سے سچی محبت تو تھی مگر اس کی اخوت اور مساوات کی نئی اُپج سے نفرت تھی باغ باغ ہوگئی۔

نسیمہ نے کہا "نیکی کرو مگر اتنی کہ اپنے خاندانی مفاد پر ضرب لگے۔ امیر و غریب خدا نے بنائے ہیں۔ اگر وہ چاہتا سب کو برابر بناتا۔"

ریاض نے ہنس کر کہا "وعظ نہ کہو بیوی! نہ میں اتنی نیکی کروں گا نہ اُتنی۔ میرا تو سرے سے اعتقاد ہی بدل گیا ہے۔ رؤسا کو نیکی راس نہیں آسکتی۔ خصوصاً غریب کا درد دل میں رکھ کر خدا سے اپنی عافیت چاہنا وہم ہے۔ نیکی کے عزم کے ساتھ ابتلا اور امتحان کا سلسلہ شروع ہونا لازمی ہے۔ اُمراء اور رؤسا کا اس میں پُورا اترنا ممکن نہیں۔

"پیاری نسیمہ! اگر کوئی امیر اور رئیس نیکی کا عزم کرے۔ پہلے تو اس کی بیوی ناراض ہو کر میکے چلی جاتی ہے۔ پھر اولاد سے محروم ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی بیوی بچوں کا صدمہ برداشت بھی کر لے تو بھی ایثار کی وہ صورت اختیار نہیں کر سکتا جو نیکی کی تکمیل کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے میں نے نیکی کے خیال سے توبہ کر لی ہے۔ یہ ہمدردی بھی غربا کو بھلی لگتی ہے۔ آؤ ہم تم چین سے بسر کریں اور مسیح کے اس قول کو بھول جائیں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکہ میں سے گزرنا ممکن ہے لیکن اُمراء کا بہشت میں داخل ہونا ممکن نہیں۔ اس لئے نسیمہ کیوں نہ جہنم کے وہم کو چھوڑ کر اسی دنیا میں جنت کے مزے لوٹیں"

ریاض نے پختہ کار سرمایہ دار کی طرح بسر اوقات شروع کر دی۔ اب ریاض اور نسیمہ کی زندگی ان دل کش نغموں کی طرح آسودہ تھی۔ جو صبح بہار کی خوشبو سے بسی ہوئی ہواؤں میں پھیلے ہوئے ہوں۔ ریاست کے کسانوں کے گاڑھے پسینہ کی کمائی سامان عیش و راحت میں صرف ہوتی تھی۔ ساز و سرود اور سنہرے ساغروں نے محل کی ساری فضا کو رنگین کر دیا تھا۔ لیکن مسرت ناآشنا کسان اور ان کے بچے افلاس کی دردناک مصیبت میں پڑے کراہ رہے تھے۔ ریاض نے ان کی چیخوں کو نہ سننے کے لئے عیش و نشاط کی روئی کانوں میں دے رکھی تھی۔ اور ان کا حال نہ دیکھنے کے لئے غفلت کی پٹی آنکھوں پر باندھ لی تھی۔

ریاکار

ریاکار کو موٹے موٹے دل، جگر، جلا دینے والے لفظوں میں بُرا بھلا کہہ دینا آسان ہے۔ ظہیر فاریابی نے لکھا ہے کہ جس زاہد سے ریا کی بُو آئے اسے اس کے بوریے کا کفن پہنا کر آگ میں ڈال دو۔

آج کل پاکیزہ زندگی کے زبانی شیدائی پاکستان میں بکثرت ہیں اس لئے ہر محفل میں ریاکار کی مٹی پلید ہوتی رہتی ہے۔ جس طرح مسجدوں کی رونق ریاکاروں کے طفیل سے ہے اسی طرح مجلسوں میں ریاکار کے ذکرِ خیر سے چہل پہل رہتی ہے۔ ریاکار کے اس احسان کا اعتراف نہ کرنا انصاف کا خون کرنا ہے۔ بزرگانِ دین انسانی مجبوریوں اور کمزوریوں سے آگاہ تھے۔ ریا کے معاملے میں اولیاؤں نے ہمیشہ قابلِ تعریف تحمّل اور فراخدلی کو مدِّ نظر رکھا ہے۔ ایک صوفی نے تو انتہا کر دی۔ لکھا ہے کہ اللہ میاں نے ایک بزرگ سے کہا کہ اگر تمہارا پردہ فاش کر دیا جائے تو تم بتاؤ کہ تمہارا دُنیا میں کیا حال ہو؟ اس بزرگ نے بلا تامّل جواب دیا کہ اللہ میاں اگر تمہاری بخشش و عفوِ گناہ کا صحیح حال ظاہر کر دوں تو آپ فرمائیے پھر عبادت کون کریگا؟ اس پر بارگاہِ الٰہی سے ارشاد ہُوا کہ ہم بھی خاموش رہیں گے تم بھی خاموش رہو۔

یہ اس لئے گوش گذار ہے کہ پاکیزگی کے مدعی خلوص کی حمایت میں شور مچانا چاہے مچالیں مگر یہ شور بھی اشتہاری ہے اور ریا سے خالی نہیں۔

ریاکار کے متعلق یہ تو ہر ایک کو معلوم ہے کہ ریاکار کے سجدے سے زمین چلّا اُٹھتی ہے کہ مجھے خراب کر دیا۔ یہ بھی سب کو علم ہے کہ حافظ شیرازی میٹھے میٹھے لفظوں میں ہدایت کر گئے کہ شراب پیو، رندی کرو مگر ریاکار کی طرح قرآن کو دامِ تزویر نہ بناؤ۔ ملّا عراقی اور حافظ شیرازی کا مطلب یہ تھا کہ دکھلاوے کی عبادت کی مذمت کریں مگر صوفیائے کرام ہمیشہ یہی تلقین فرماتے رہے کہ چشم پوشی اختیار کرو۔ عیب جوئی کے کنوئیں میں مت گرو۔ مگر دُنیا ہے کہ عیب جوئی سے باز نہیں آتی اور ریاکار ہے کہ دکھلاوے کے سجدوں سے نہیں چوکتا۔ صرف سجدے نہیں بلکہ جبہ و عمامہ کی ترتیب سے اپنے آپ کو پارسائی کا سالار اعظم ظاہر کرتا ہے۔ اس سج دھج کے شوق کی وجہ یہ ہے کہ زاہد ریاکار کو علم ہے کہ عوام ظاہر پرست ہیں یہ جانتے ہی نہیں کہ اصل عبادت صرف خدمتِ خلق ہے۔ وہ مخلوقِ خدا سے اپنی خدمت کروانا چاہتا ہے۔ کیونکہ اس کی زندگی ذاتی منفعت کے لئے وقف ہے۔ ریاکار یہ سمجھتے ہوئے کہ اس کے گرد و پیش والے مرکر تو اس کے کام ہرگز نہ آئیں گے اسی زندگی میں پارسائی کا جال پھیلا کر اپنا الو سیدھا کرتا

کرتا ہے۔ اس زندگی میں عزت، آرام آسائش کا خواہاں ہے اور اس کا ہر فعل اس امر کا گواہ ہے کہ

عاقبت کی خبر خدا جانے　　اب تو آرام سے گذرتی ہے

کیا یہ کتنا غلط ہے کہ اگر لوگ دھوکا کھاتے ہیں تو قصور لوگوں کا ہے؟ کیوں؟ ان میں اتنی عقل نہیں، اتنی تمیز نہیں کہ نمود کی نمازوں، رسمی عبادتوں سے متاثر ہو کر ریاکار کو ہیش پیش نہ ہونے دیں۔ اگر کسی کا خیال ہے کہ ریاکار بھولے پن سے ریاکاری کرتا ہے تو یہ خیال غلط ہے۔
شروع شروع میں ریاکار دانستہ ریاکاری کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ خود احمق نہیں ہوتا لوگوں کو احمق بناتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ جوں جوں ریاکاری کامیاب ہوتی ہے یہ خصلت عادت بن جاتی ہے۔ اور گو عوام بھانپ جائیں ریاکار اپنی چالوں سے باز نہیں آتا۔ اور کیوں باز آئے؟ نفع کا سودا اور وہ بھی عبادت کے روپ میں۔ چپڑی اور دو دو۔ ریاکار اتنا زیاں کار نہیں کہ آرام، عزت، دولت کو ٹھکرا دے۔
ایک ریاکار حضرت کسی موقع پر بے تکلف صاف گو دوستوں کے قابو چڑھ گئے۔ دوستوں نے صلواتیں سنائیں۔ ریا کی کمائی میں سے حصہ بخرا طلب کیا۔ بنے کی باتیں کہیں۔ افغانستان سے جو رقم آئی اس کا ذکر چھیڑا۔ ریاستوں سے امداد کی تفصیل اور وجہ پوچھی۔ ریاکار صاحب کب دبنے والے تھے۔ جواب میں فرمانے لگے تم بے وقوف سب حاسد ہو مجھے مولا کریم اپنے خزانۂ غیب سے وظیفے عطا کرتا ہے۔ میرا روزانہ ورد ہے ؎

اے کریمے کہ از خزانۂ غیب　　گبر و ترسا وظیفہ خور داری
دوستاں را کجا کنی محروم　　تو کہ با دشمناں نظر داری

یہ ورد کرتا ہوں۔ دعا کی برکت سے دعوت نامے آتے ہیں، دولت آتی ہے، عزت میں ترقی ہوتی ہے۔ تم یونہی جلتے ہو۔ میری طرح ورد کرو، تعریفی خط لکھو، مناسب موقع پر بڑے آدمیوں کی کامیابی کی دعا بعد نمازِ جمعہ ہزاروں آدمیوں سے کرا لو اور اس دعا کرانے سے پہلے اور بعد میں اپنے ممدوح کو باخبر رکھو۔ پھر دیکھو کس طرح شہرت اور دولت کی بارش ہوتی ہے۔ ریاکار حضرت اپنے فن کی گتھیاں اور باریکیاں بیان کرنے کو تھے کہ ایک منہ پھٹ بول اٹھا "اے ابلہ فریب! لوگوں کو دھوکا دے کر موٹا ہو جائے گا تو خدا کو کیا جواب دے گا؟"
اس پر ریاکار حضرت بہت بگڑے۔ جوش میں آکر کہنے لگے کہ "تم سب کے سب ملحد ہو۔ نامسلمان ہو۔ تمہارا خدا پر ایمان نہیں ہے۔ کیا تمہاری یہ مرضی ہے کہ میں اُس جلّ شانہٗ کے ایک فرشتے کو معطل کر دوں۔ کارسازِ حقیقی نے میرے دونوں کندھوں پر ایک ایک فرشتہ معیّن کر رکھا ہے۔ دائیں کندھے والا نیکیاں لکھتا ہے۔ بائیں کندھے والا میری لغو حرکتوں کا محرر ہے۔ اگر میں لغو حرکتیں، ابلہ فریبی اور نمائشی عبادت نہ کروں تو بائیں کندھے والا فرشتہ بے کار ہو جائے۔ تم میرے عیب دیکھتے ہو۔ یہ نہیں دیکھتے کہ جو کچھ کماتا ہوں اس سے دس غریب کنبے پالتا ہوں۔ تم تو بتاؤ کہ تمہارے ہاں کتنے غریب نوکر ہیں؟ تم جیسے مسلمانوں نے زکوٰۃ جیسے فریضے کو متروک کر رکھا ہے۔ میں محنت سے زکوٰۃ اور صدقۂ عید الفطر جمع کرتا ہوں، جو جمع کرتا ہوں اس میں سے آدھی رقم یتیم خانوں میں بھجواتا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ یتیم خانے کے انتظام میں اپنے آدمی رکھوانے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر تم بتاؤ کہ تم نے عملی کام کیا کیا؟ نہ کسی یتیم خانے میں تم مدد دو، نہ کسی دینی کتاب کے چھپوانے اور فروخت میں دلچسپی لو، تم مجھ سے کہیں زیادہ ملعون ہو۔ میں تو صرف ریاکار ہوں۔ تم بے کار ہو اور بے کار، ریاکار سے کہیں بدتر ہے!"
اب آپ ایک اور منکسر مزاج ریاکار کی داستان سنیئے! یہ حضرت اپنے آپ کو عاجز، گنہگار، کمترین خلائق بیان کرنے میں بڑے حاتم تھے۔ بات بات پہ جھکتی تھی اور یہ پہلے فرما دیتے تھے کہ مجھ نالائق سے کیا ہو گا۔ جب ان کی بہت خوشامد کی جاتی تو فرماتے اچھا آپ کا ارشاد ہے تو بسر و چشم حاضر ہوں۔ چنانچہ یہ جملے دہراتے ہوئے وہ بصد شوق ہر ایسے کام میں شامل ہو جاتے جس میں چندے کی ضرورت ہو۔ ہوتے ہوتے کچھ متمول ہو گئے مگر انکسار پہلے سے دگنا تگنا۔ عام چرچا ہوا کہ یہ شخص اپنے کام میں محنت کرتا ہے۔ قومی کاموں میں دن رات ایک کر دیتا ہے۔ نہایت ہمدرد و مفید انسان

ہے ۔ آں حضرت کے جو دو ایک رازداں تھے انھوں نے ایک دن ذرا سخت گوشمالی کی اور کہہ دیا کہ اب تو اس فریب سے توبہ کرو۔ فرمانے لگے کہ مجھے تم ریاکار کہتے ہو۔ مجھ سا بدکار دُنیا میں کوئی نہیں مگر تم لوگ بے سمجھ ہو۔ یہ دُنیا میں نے نہیں بنائی ۔ اس کے طریقے میرے ایجاد کردہ نہیں مجھے صرف یہ علم ہے اور صحیح علم ہے جیسا کہ حضرت امیر خسروؒ فرما گئے کہ :۔

"عشق ، افلاس اور مسلمانی کا فری سے سو درجہ بدتر ہیں ۔ اس کافری سے ڈرتا ہوا افلاس سے بچنا چاہتا تھا۔ سو خدائے بزرگ کی بخشش سے افلاس دُور ہوا عشق حاصل ہوا۔ ایک مسکین خاتون کی دلجوئی کرتا ہوں ۔ اب جو تمہارا جی چاہے کہو اور کرو۔ مجھ عاجز کا خدا وہی ہے!"

زہد فروشی کی ان دو مثالوں سے سُننے والوں کو ریاکار کا نقطۂ نگاہ واضح ہو گیا ہوگا۔ مگر جو اصحاب اپنے خصوصی حلقوں میں اقبال کر لیتے ہیں کہ وہ ریا کی کمائی کھاتے ہیں وہ دو باتوں کا جواب چاہتے ہیں ۔ اوّل یہ کہ وہ کونسا خدائی فوجدار ہے جسے علم ہے کہ ہمارے سب سجدے، سب نمازیں، سب دعائیں ہمیشہ محض ریا ہیں ؟ کیا ہم بھُولے سے بعض دفعہ خلوص کے سجدے نہیں کرتے ۔ وہ کون ہے جس کی ہر نماز میں حضورِ قلب کا نور ہے ؟ ایک خلوص کا سجدہ ، ایک سچے دل کی توبہ ہفت سالہ گناہوں کو دُور کرنے پر قادر ہے ۔ سوائے ذاتِ باری کے کسے معلوم ہے کہ ہم مردود ہیں ۔ ہم بُرے سہی مگر ہر ایک کو تو علم نہیں کہ ہم ہر وقت ریاکار ہیں ۔ بہت لوگ ہیں جو ہماری مثال سے نیک تو ہو جاتے ہیں ریاکار نہیں بن سکتے ! کیا اس مثال کا قائم کرنا قابلِ قدر نہیں ؟ زاہد ریاکار کو اسفل السافلین شوق سے کہیئے مگر ریاکار اور دنیا دار میں فرق کیا ہے؟ صرف یہی کہ دنیا دار دکانوں ، بنکوں ، کارخانوں کے ذریعے سے لوٹتا ہے اور ہم زُہد کو ذریعۂ تجارت بناتے ہیں ۔ ان کا راس المال روپیہ ہے ہمارا راس المال عبادت ۔ ہر دُنیا دار کامیاب نہیں ہوتا۔ ہر ریاکار کی دکان بھی نہیں چلتی ۔ ہم میں اور ان میں فرق کیوں کیا جاتا ہے ؟ روپیہ کی سیڑھی کو عبادت کے زینہ پر کیوں ترجیح دی جاتی ہے ؟ کیوں لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ ریاکاری معاشی پیداوار ہے ؟ شخصی تخلیق نہیں ۔ اگر ریاکار مردود ہے تو وہ جماعت جس کے وہ جزو ہیں مردود تر ہے ۔

ریاکار کا دوسرا سوال بہت ٹیڑھا ہے ۔ پوچھتا ہے ۔ ایمان سے کہو

" کون ہے جو ریاکار نہیں ؟"

غیب کا علم تو خدا کو ہے مگر جہان تک دیکھنے میں آیا ہے شہروں میں ایک سے ایک بڑھ کر ریاکار ہے !

چراغ حسن حسرت

پربت کی بیٹی

ستی جس کا چہرہ چاند کا سا تھا۔ شو جی[1] کی استری اور دکش جی[2] کی بیٹی تھی وہ اپنے پتی کے ساتھ کیلاش[3] پربت پر رہتی تھی۔ جہاں سورج کی کرنیں دیوداروں کے پیڑوں تلے جھولا جھولتی ہیں اور سپید بادل ننھے بچوں کی طرح کھیلتے پھرتے ہیں۔ پر یہ دکھ اُسے گھلائے ڈالتا تھا کہ اُس کے پتا دکش جی رات دِن شو جی کی نندیا کرتے رہتے تھے۔ کبھی اُنھیں بھکاری اور کنگال کہتے۔ کبھی بیٹی کو بھکارن کہہ کے اُس بچاری کا جی دکھاتے۔ ایک دن انھوں نے ستی کو ایسے ایسے طعنے دیئے کہ اُس جانثار نے آگ میں کود کے جان دے دی۔

ستی اپنے جی سے گئی۔ پر اُس کی یاد شو جی کے جی سے نہ جا سکی۔ اُنھیں آٹھوں پہر اُسی کا دھیان لگا رہتا۔ اور جدھر نظر اُٹھتی ستی کی سندر مورت کے سوا اور کچھ دکھائی نہ دیتا۔

ہاتھ کی اُمٹ لکیروں میں جو کچھ لکھا ہے وہ ضرور ہو کے رہتا ہے ستی کے نصیبے میں یہی لکھا تھا کہ وہ پربتوں کے راجہ ہماچل کے ہاں جنم لے کے پھر شو جی کی استری بنے اور کیلاش کی اندھیری گپھاؤں میں اُجالا کرے اور یہ بات پوری ہو کے رہی۔

اس جنم میں اُس کا نام اُما تھا۔ اور لوگ اُسے پاربتی یعنی پربت کی بیٹی بھی کہتے تھے۔ اس کا چمپئی بدن ہماچل کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں

---

1. شو جی ہندوؤں کے تین بڑے دیوتاؤں میں ایک ہیں۔ ویدوں میں ان کا نام رودر ہے۔ اُپنشدوں اور پرانوں میں انھیں شو شنکر، مہیشور اور مہادیو کہا گیا ہے۔ عام طور پر انھیں فنا اور ہلاکت کی قوت سمجھا جاتا ہے۔ پر ہندو فلسفیوں کے نزدیک شو جی کی ذات زندگی اور موت حیات اور فنا دونوں کا سرچشمہ ہے پرانوں میں اُن کی جو تصویر کھینچی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُن کے پانچ چہرے اور چار بازو اور تین آنکھیں ہیں اور تیسری آنکھ ماتھے کے درمیان ہے۔

2. دکش جی جو برہما کے بیٹے ہیں دیوتاؤں میں بڑے اونچے سمجھے جاتے ہیں مہابھارت میں لکھا ہے کہ برہما کے داہنے انگوٹھے سے پیدا ہوئے اور ان کی استری نے بائیں انگوٹھے سے جنم لیا۔ دکش جی کی تیرہ بیٹیاں کشپ رشی کو بیاہی گئی تھیں۔ بہت سے دیوتا۔ انسان اور حیوان اُنھیں سے پیدا ہوئے۔

3. کیلاش جو شو جی کا استھان ہے۔ ہمالیہ کے اُس حصّے کا نام ہے جو مان سرور سے اُتّر کی طرف ہے۔

کی طرح چمکتا تھا۔ جن پر پیلی پیلی دھوپ اپنا سنہری رنگ پھیر دیتی ہے۔ اُس کی کمر انگور کی بیل کی طرح پتلی اور لچکیلی تھی اور آنکھیں مانسرور[۱] سی نیلی اور گہری۔ جب وہ کیلاش کی برف بھری چوٹیوں پر نظر ڈالتی۔ تو اُس کے ہونٹوں سے جو شہدانہ کی طرح لال تھے۔ ایک سرد آہ نکل جاتی۔ اس وقت اُس کی آنکھیں لمبی اور گھنی پلکوں کی چھاؤں میں اس طرح بے چین معلوم ہوتیں جیسے مانسرور کا پانی گھنے پیڑوں کے سائے تلے تیز ہواؤں میں جھکولے کھا رہا ہو۔

وہ پربت کی بیٹی تھی اور پربت کی گود میں کھیل کے پلی تھی۔ پیڑوں سے ڈھکی ہوئی گھاٹی۔ پہاڑ کا ڈھلوان، گہرا کھڈ اور اونچی کگر اُس کے لیے گھر آنگن تھے۔ اور سارس اور نیلے بگلے اور مرغابیاں پتھریلی چٹانوں میں گھونسلا بنانے والے باز اور سہمی ہوئی آنکھوں والی ہرنیاں اُس کے بچپن کے ساتھی۔ گرمیوں کی رُت میں جب برف پگھلتی۔ خوبانی کی کلیاں کھلتیں اور اُجلی اُجلی پن چادریں سپید سپید پتھروں پر سر پٹکنے لگتیں۔ تو وہ اونچے سروں میں شوجی کی مہما کے گیت گاتی اور لہراتی ہوئی ندیاں، گنگناتے ہوئے چشمے سنگت کرتے۔ کبھی اُسے کوئی ہرن کسی پیڑ تلے چوکڑیاں بھرتا نظر آجاتا۔ تو وہ اُس کے پیچھے دوڑ پڑتی۔ راستے میں اُسے کوئی چشمہ مل جاتا۔ تو وہ ہرن کو بھول کے اُس میں اپنا روپ دیکھنے لگتی۔ پھر وہ ایکا ایکی مسکرا اُٹھتی۔ اور اُس کی مسکراہٹ پھولوں کی مسکراہٹ میں یوں گھل مل جاتی، کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

پھر جب تیز اور سرد ہوا سرو کے پتوں میں سے سرسراتی ہوئی گزرتی اور اس کا ایک جھونکا آ کے گالوں کو تھپ تھپاتا۔ اُس کے بالوں کو کندھے پر بکھیر دیتا۔ تو وہ جان لیتی کہ جاڑا آ گیا۔ پر وہ برف اور آندھی کہر اور دُھند سے ڈرتی نہیں تھی۔ کیونکہ وہ پربت کی بیٹی تھی اور پربت[۲] کی بیٹی کو کون ڈرا سکتا ہے۔ وہ چاہتی۔ تو اپنی گرم گرم سانس سے برف کو پگھلا دیتی۔ بادلوں کو ہوا میں یوں اچھال دیتی کہ ان کا کوئی اتا پتہ نہ ملتا۔ اور جاڑے کی تیز ہوا تو اُسے اپنی سانس کی طرح جانی پہچانی معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ کیلاش کی چوٹیوں کو چھو کے آتی تھی۔

کھلی ہوا اور پینی دھوپ میں نیلے آسمان کے سائے تلے اُس کے جوبن کی جوت یونہی بڑھتی گئی۔ پر جوں جوں اُس کا روپ نکھرتا جاتا تھا۔ اُس کے دل میں چاہت کی آگ زیادہ تیز ہوتی جاتی تھی۔ اب اُس میں اگلی سی اچپلاہٹ نام کو نہ رہی تھی۔ وہ کچھ کھوئی کھوئی اور اُداس اُداس نظر آتی تھی۔ اور کبھی کبھی تو اُسے ایسی چپ لگ جاتی کہ جنگل کے پکھیرو جنھوں نے اُسے مسکراتے، قہقہے لگاتے اور سورج کی کرن کی طرح سرد اور اندھیری گپھاؤں کو جگمگاتے دیکھا تھا۔ حیران ہو ہو کر ایک دوسرے سے پوچھتے "پربت کی بیٹی کو کیا ہو گیا ہے؟"

اُس کے جی کو شیو بھگوان نے کچھ ایسی چیٹک لگا دی تھی کہ وہ رات دن اُنھی کے نام کی سمرن کرتی رہتی۔ وہ لمبے لمبے برت رکھتی۔ پیاس کے دکھ سہتی۔ بھگوان کے سامنے بیل کے پتوں۔ جنگلی بیروں اور آنسوؤں کی لڑیوں کے چڑھاوے چڑھاتی۔ پر شوجی کے من میں تو ستی بسی ہوئی تھی۔ اُنھوں نے اُما کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ وہ کبھی کبھی اُس کے پاؤں کی چاپ سے اتنا جان لیتے تھے کہ ہماچل کی بیٹی پوجا کرنے آئی ہے۔ پر انھیں یہ معلوم نہیں تھا۔ کہ پربتوں کے راجہ کی بیٹی کیسی ہے؟

یہ دیکھ کر دیوتا سناٹے میں آ گئے۔ ایک دوسرے سے کہنے لگے۔ کوئی ایسی تدبیر ہونی چاہیئے کہ مہادیو ستی کو بھول کے اُما کو

۱۔ ہمالیہ کی ایک مشہور جھیل جس کا ذکر سنسکرت کی کتابوں میں بکثرت آیا ہے۔ اس جھیل سے کوئی دریا نہیں نکلتا۔ ہاں دریائے ستلج کا منبع مانسرور کے قریب ہے۔

۲۔ پاربتی یا پربت کی بیٹی کوئی فانی انسان نہیں۔ بلکہ شوجی کی شکتی ہے۔ اُس کے دو روپ ہیں۔ اپنے پہلے روپ میں وہ گوری بستی، اُما، پاربتی اور ہماوتی ہے اور دوسرے روپ میں کالی درگا اور چنڈکا۔ پہلے روپ میں وہ حسن کی مورت ہے اور دوسرے میں تباہی کی دیوی۔ اسے مہادیوی۔ مہامایا۔ بھیروی اور بھوانی بھی کہتے ہیں۔

چاہنے لگیں۔ کیونکہ برہما[1] جی کہہ چکے ہیں کہ جب شوجی پاربتی سے بیاہ کر یں گے تو اُن کے ہاں ایک لڑکا[2] پیدا ہوگا جو سنسار کو راکششوں[3] کے ظلم سے چھڑائے گا۔ اس لئے جب تک آتما سے مہادیو کا بیاہ نہیں ہوتا، دھرتی پہ یونہی پاپ کا اندھیرا چھایا رہے گا۔

آخر دیوتاؤں کے راجہ اندر[4] نے لکشمی[5] کے بیٹے مدن[6] کو بلا بھیجا جو پریم کا دیوتا ہے۔ اور جس کے زہریلے بانوں سے انسان تو انسان دیوتا بھی نہیں بچ سکتے۔ اور کہنے لگے ہم سب یہ چاہتے ہیں کہ مہادیو کسی طرح آتما کو چاہنے لگیں۔ اگر تم سے اتنا بھی نہ ہو سکے تو تمہارے بان جو پریم کے بس میں بجھے ہوئے ہیں اور کس کام آئیں گے۔

شو کا نام سن کے مدن کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اور اُس کی استری رتی ایسے کانپنے لگی۔ جیسے مینہ کی بوچھاڑ میں چمپا کی پنکھڑی کانپ رہی ہو۔ مدن کو مہادیو پہ تیر چلانے کا ہواؤ تو نہیں پڑتا تھا پہ جب اندر نے کہا "گھبراتے کیوں ہو۔ رُتوں کا راجہ بسنت[7] جس کی سانس میں کلیوں کی باس ہے۔ تمہارے ساتھ ہوگا" تو مدن کی ٹوٹی ہوئی ہمت بندھ گئی اور وہ کمان کو کندھے پہ ڈال۔ رتی کو ساتھ لے کیلاش کی طرف چلا۔ آگے آگے بسنت پھول بکھیرتا جا رہا تھا اور پیچھے پیچھے یہ دونوں جنے چلے آ رہے تھے۔

اُس سمے سارے جنگل اور بن سنسان تھے۔ پربت کچھ اس ڈول سناٹے میں تھا۔ جیسے اُما کا دُکھ اُس سے دیکھا نہیں جاتا۔ کالی نیلی۔ ملگجی، اور سپید چٹانیں اس طرح سوچ رہی تھیں۔ جیسے اُن کے دل پہ کوئی بڑا بوجھ ہو۔ ہوا رُکی ہوئی تھی۔ بن جاوروں کا شور مدھم پڑ گیا تھا۔ پکھیرو گھونسلوں میں دبکے ہوئے تھے۔ چشمے اور تال آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے پہلو میں کسک دبائے سر نہوڑائے کھڑے تھے ہاں کبھی کبھی ہوا سسکیاں بھرنے لگتی۔ تو یہ خیال ہوتا کہ اب یہ آنسو پربت کے گالوں پر پھوٹ بہیں گے۔

پر جب پانچ تیروں والا دیوتا[8] مدن اپنی استری رتی کو لے کے کیلاش کے بنوں میں پہنچا تو ایسا معلوم ہونے لگا۔ کہ دو چنچل کرنیں پربت

۱۔ برہما دُنیا کا خالق ہے۔ اُسے پرجاپتی بھی کہتے ہیں۔ رامائن میں لکھا ہے کہ پہلے ہر طرف پانی پھیلا ہوا تھا۔ اُس میں سے دھرتی اُبھری اور برہما جی نمودار ہوئے۔

۲۔ شو اور پاربتی کے لڑکے کا نام کارتکیہ ہے۔ اسے سکند اور کمار بھی کہتے ہیں۔ وہ دیوتاؤں کا سنیاپتی (سپہ سالار) اور جنگ کا دیوتا ہے۔

۳۔ ایک مخلوق کا نام ہے۔ راون جو رام چندر جی کے ہاتھوں مارا گیا۔ راکششوں کا ہی سردار تھا۔ رامائن میں لکھا ہے کہ جب ہنومان جی لنکا گئے تو انھوں نے وہاں ہر قسم کے راکشش دیکھے۔ ان میں سے کچھ خوبصورت تھے۔ کچھ بد صورت۔ کچھ موٹے کچھ دُبلے پتلے۔ کچھ لمبے کچھ بونے۔ بعض کے سر ہاتھیوں جیسے تھے۔ بعض کے سانپوں کے مانند۔ اس زمانے کے عالموں کا خیال ہے کہ راکشش وہ لوگ تھے جو آریاؤں کے آنے سے پہلے ہندوستان میں آباد تھے۔ آریاؤں نے انھیں دکن کی طرف دھکیل کے ملک پر قبضہ کر لیا۔

۴۔ اندر آکاش کا دیوتا اور دیوتاؤں کا راجہ ہے وہ مینہ برساتا اور فصلیں اُگاتا ہے۔ بجلی کا کڑکا (رعد) اندر دھنک (قوس قزح) اس کے ہتھیار ہیں۔ سورگ کا راج بھی اسی کے قبضے میں ہے۔ ایراوت اُس کے ہاتھی کا نام ہے اور اندرانی اس کی بیوی ہے۔ اندر آریوں کا پرانا دیوتا ہے۔ ویدوں میں اس کا ذکر جگہ جگہ آیا ہے۔

۵۔ لکشمی دولت کی دیوی ہے اسے شری بھی کہتے ہیں۔ پرانوں میں لکھا ہے کہ جب دیوتاؤں نے سمندر کو بلو کے اس میں سے امرت نکالا تو لکشمی ہاتھ میں کنول کا پھول لئے سمندر کے جھاگ سے نمودار ہوئی۔ ہری بنس میں جو سنسکرت کی ایک مشہور نظم ہے۔ کام دیو کو لکشمی کا بیٹا بھی کہا گیا ہے۔

۶۔ بسنت بہار کا دیوتا ہے جو مدن کا دوست سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اکثر خواہشیں اسی موسم میں پیدا ہوتی ہیں۔

۷۔ مدن کے پانچ تیر پانچ پھول ہیں۔ وہ آم کی پتلی ٹہنیوں سے اپنی کمان بناتا ہے مدھ مکھیاں کمان کی تانت کا کام دیتی ہیں۔ یونانی دیومالا میں ایروس یعنی کیوپڈ محبت کا دیوتا ہے۔ یوں تو وہ بھی تیر کمان سے دلوں کا شکار کرتا پھرتا ہے۔ لیکن اس کی آنکھیں نہیں۔

کی گود میں مچل رہی ہیں، جن کی جوت سے اندھیرے جنگلوں میں اجالا سا ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس طرح دمک اُٹھیں۔ جیسے اُن کے سینوں میں آگ دہک رہی ہے۔ پپیہا الکی چشموں کا پانی ہلکورے لینے لگا ندیاں شور مچانے اور لال اور سپید پتھروں پہ سر پٹکنے لگیں۔ ہری ہری دُوب کے فرش پہ پھولوں اور کلیوں کے ڈھیر لگ گئے۔ اور ہوا اُن کی خوشبو سے مہک اُٹھی۔ شنتار کی ٹہنیاں ہتو بانی کے پیڑ میں پھنسیں۔ انار کی کلیاں انگور کے پتوں میں کھچڑی ہو گئیں۔ چنبیلی کی ڈالیاں لچکنے کے ساتھ اُٹھیں اور آپس میں مل گئیں۔ عشق پیچہ بادام کی ٹہنیوں سے لپٹ گیا۔ اور انگور نے اپنی نازک باہیں چنار کے گلے میں ڈال دیں۔ کنول کی سپید کلیاں ندی کے پانی میں اپنا روپ دیکھنے لگیں۔ بھونروں کے جھنڈ گونجنے لگے۔ پکھیرو سرک کے ایک دوسرے کے پاس آ گئے۔ اور اُن کی کوک سے دلوں میں ہوک سی اُٹھنے لگی۔

مدن نے دُور سے دیکھا کہ درختوں کے جھرمٹ میں دیودار کا ایک پرانا پیڑ ہے جس کی ٹھنڈی چھاؤں سے دل میں ٹھنڈک پڑتی ہے۔ پیڑ تلے مرگ چھالا ہے اور مرگ چھالا سے کچھ دُور ہٹ کے کیشیپ[1] کا بیٹا نندی سنتری کی طرح پہرہ دے رہا ہے۔

مدن نے کندھے سے کمان اُتاری۔ پرندے چہکارے بھرنے لگے کیلاش کی گپھاؤں میں جو تپسوی مدتوں سے بیٹھے تپسیا کر رہے تھے اُن کا بھی من ڈول گیا۔ ایکا ایکی نندی نے کہا "چپ" اور بن پر سناٹا چھا گیا۔ پرندوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ ہوا نے سانس روک لیا۔ مدھ مکھیاں گنگنانے گنگنانے ٹھٹھک گئیں۔ پھر مدن کو دیودار کے پیڑ تلے شو کی جھلک سی نظر آئی۔ گورا رنگ اور اُس پر بھبوت کا بانا۔ جیسے راکھ میں آگ چمک رہی ہو۔ گلے میں کھوپڑیوں کی مالا بازوؤں سے ناگ لپٹے ہوئے۔ گورے ماتھے پر ہلکی لکیر جیسے کسی پنچھی کے پنکھ چشمے کے بہتے ہوئے پانی سے چھو کر اُس پر سلوٹ سی ڈال گئے ہوں۔

مدن سمجھ گیا۔ یہ مہادیو کی تیسری آنکھ ہے۔ جس میں سارے سنسار کو بھسم کر ڈالنے کی شکتی ہے یہ اگر کھل گئی تو اس سے کوئی نہ بچ سکے گا۔ یہ سوچ کے اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ مڑا اور بسنت اور رتی کو پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے جھاڑیوں میں دبک گیا۔

وہ پریم پتی۔ جگت جیت مدن۔ جس نے نہ جانے کتنے مردوں اور عورتوں کو پریم کے بندھنوں میں جکڑ رکھا تھا۔ وہ کام کا دیوتا، جو بھگوان کے من میں سب سے پہلے پیدا ہوا۔ وہ بِدوں کا شکاری جس کے بانوں نے اَن گنت سینوں کو چھید ڈالا تھا۔ آج سہما ہوا تھا اُس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں موتیوں کی طرح ڈھلک رہی تھیں۔ اور سانس پپیہا کی طرح چل رہا تھا۔

بسنت نے کہا۔ کوئی آ رہا ہے۔ رتی کہنے لگی سچ مچ کوئی آ رہا ہے پر یہ کون ہے جو مہادیو کے استھان میں یوں بے دھڑک چلا آ رہا ہے۔ یہ کوئی دیوتا ہے یا کوئی تپسوی جس نے تپسیا کے بل سے تینوں لوکوں[2] کو جیت لیا ہے۔ نہیں یہ تو ایک سندر استری ہے۔ جس کے روپ میں سورج کی جوت اور جس کے جوبن میں کنول کی پھبن ہے یہ کسی گندھرو[3] کی کنیا ہے جو بادلوں پہ پاؤں رکھتی دھنک سے چنچل رنگوں کو روندتی ابھی ابھی آکاش سے اتری ہے یا سورگ کی اپسرا[4] ہے۔ ۔۔۔ کے گورے گورے پاؤں تلے پربت کا دل مارے خوشی کے دھڑک رہا ہے۔ نہیں یہ نہ تو کسی گندھرو کی کنیا ہے۔ نہ سورگ کی ۔۔۔ یہ پربتوں کے راجہ ہماچل کی بیٹی اُما ہے۔ جو شردھا کے بل اور

---

[1] کیشیپ رشی سات مشہور رشیوں میں ایک ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ برہما کے پوتے تھے۔ وایو پوران میں لکھا ہے کہ شو جی کا بیل نندی اُن کا بیٹا ہے۔ لیکن صرف ایک نندی ہی پر موقوف نہیں۔ بہت سے دیوتا اُن کی اولاد میں سے ہیں۔ کیشیپ رشی دکش جی کی تیرہ بیٹیوں سے بیاہے گئے تھے جن میں سب سے بڑی کا نام ادیتی تھا۔ ادیتی سے کئی دوسرے دیوتا پیدا ہوئے اور باقی سے دوسری مخلوق نے جنم لیا۔

[2] تین دنیائیں۔ دھرتی سورگ (بہشت) اور پاتال۔ مگر ہندوؤں کی بعض کتابوں میں سات اور بعض میں آٹھ لوکوں کا ذکر آیا ہے۔

[3] گندھرو۔ ایک آسمانی مخلوق کا نام ہے جو دیوتاؤں کو گا بجا کے رجھاتی ہے۔ اسی لئے موسیقی کو گندھرو ودیا بھی کہتے ہیں۔

[4] گندھرو کی استری۔ سورگ کی ایک حسین مخلوق۔ حور۔

بھگتی کی شکتی سے وہاں پہنچی ہے۔ جہاں دیوتا بھی پاؤں نہیں رکھ سکتے۔

اُما مہادیو کے سامنے پہنچ کے ڈنڈوت کو جھکی۔ تو اُس کے بالوں کی ایک لٹ کھل کے اُس کے تمتماتے ہوئے گالوں پہ آ رہی۔ مدن نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کمان میں تیر جوڑا۔ شوجی نے مسکرا کے آنکھیں کھول دیں۔

کتنے لال ہیں۔ اِس کنیا کے ہونٹ۔ لال اور رس بھرے۔

یہ خیال شوجی کے من میں لَو کی طرح لپک اُٹھا۔ اُنھوں نے پہلی بار پربت کی بیٹی کو آنکھ بھر کے دیکھا تھا۔

پھر وہ ننھی سی لَو کانپی اور کانپ کے بجھ گئی "میرے جی میں یہ بات کہاں سے آئی۔ کیسے آئی۔ میرے من نے اسے جنم نہیں دیا یہ تو کہیں باہر سے آئی ہے۔ چپکے چپکے، دبے پاؤں چوروں کی طرح لال اور رس بھرے ہونٹ، یہ بات میرے من میں کس نے ڈال دی — کون ایسا ہے —؟"

یہ سوچتے سوچتے اُن کی بھویں تن گئیں اور پھر ایکا ایکی انھوں نے اپنی تیسری آنکھ کھول دی۔ وہی آنکھ جس میں تمام سنسار کو جلا ڈالنے کی طاقت ہے۔

لال لال شعلے لچکیلی زبانیں نکالے ہوئے بڑھے۔ اور دلوں کے شکاری کو جو جھاڑیوں کی اوٹ میں کمان کا چلّہ چڑھائے گھات لگائے بیٹھا تھا۔ جلا کر راکھ کر ڈالا۔ رتی نے اپنی آنسو بھری آنکھیں اُٹھائیں۔ مرگ چھالا سونا پڑا تھا۔ شوجی کہیں نہیں تھے۔ ہاں اُما پھولوں بھری ڈالی کی طرح سر نہوڑائے کھڑی تھی۔ اُس کا جوڑا اب پوری طرح کھل گیا تھا۔ اور لمبے لمبے بال اُس کے پاؤں میں لوٹ رہے تھے۔

(۲)

جب اُما نے دیکھا کہ اُس کا روپ اور جوبن شوجی کے من سے ستی کی یاد کو نہیں مٹا سکا۔ تو اُس نے سارا گہنا اُتار ڈالا۔ ست لڑے ہار کو یوں نوچ کے پھینک دیا کہ اُس کی رگڑ سے چندن کا لیپ آپ ہی آپ اُتر گیا۔ کان کے بندوں کو غصّہ میں یوں نوچا کہ کان لہولہان ہو گئے۔ پھولوں کے جھومروں کو پاؤں تلے روند ڈالا اور ریشم کا سُوہا جوڑا جس میں سونے کے تار گندے ہوئے تھے، اُتار کے درختوں کی بھوری چھال سے اپنا بدن ڈھانک لیا۔ اور گھر بار چھوڑ ایک سنسان جنگل میں جو آبادی سے دُور راہ باٹ سے کٹا ہوا تھا کٹیا بنا کے رہنے لگی۔

پر اس برن میں بھی اُس کے روپ کی چمک دمک کم نہیں ہوئی تھی۔ اور بھوری چھال کے جوڑے میں اُس کا نکھرا ہوا جوبن یوں جھلکتا دکھائی دیتا تھا۔ جیسے پچھلے پہر کے دھندلکے میں پَو پھٹ رہی ہو کیونکہ کنول کا پھول کائی میں گھرا ہوا بھی بھلا معلوم ہوتا ہے اور بھونرا اُس کے ہونٹوں کا رس پینے کے لئے اُس کے گرد منڈلاتا رہتا ہے۔

پچھلے پہر وہ ندی پہ جا کے اشنان کرتی۔ اور لوٹتے وقت پودوں کو پانی دینے کے لئے گگری بھر لاتی۔ جب بھوک بہت ستاتی۔ تو پھل پھلاری اور پیڑوں کی جڑیں کھا کے گزارہ کر لیتی۔ اور رات کے سمے اپنی نازک بانہہ کو تکیہ بنا کے پتھریلی زمین پر پڑ رہتی۔ جنگل کے پنچھی پکھیرو اُسے اچھی طرح جانتے تھے۔ اور ہرن ہرنیاں اُس سے یوں ہل گئی تھیں۔ جیسے وہ بھی کوئی ہرنی ہے جو راستہ بھول کے اس طرف آ نکلی ہے۔

آہستہ آہستہ اُسے بھوک پیاس بھی بسر گئی۔ پہاڑ سی راتیں آنکھوں میں کٹنے لگیں اور نیند اس کی آنکھوں کو یوں چھوڑ کے چلی گئی کہ پھر اُس کا کوئی اتا پتا نہ ملا۔ اب تو اُس کا یہ حال ہوا کہ جو تھوڑا بہت وقت ان دھندوں میں خرچ ہو جاتا۔ وہ بھی تپسیا ہی میں کٹنے لگا۔ اس

کا جسم جو نئی کھلی ہوئی کلی کی طرح نرم اور تازہ تھا۔ کملا گیا۔ مالا پھیرتے پھیرتے انگلیوں پر گٹے پڑ گئے۔ پر اس کے جپ تپ میں کوئی فرق نہ آیا۔

اُما کو یونہی تپسیا کرتے مدتیں بیت گئیں۔ ایک دن وہ کٹیا کے دروازے پر کھڑی تھی۔ کہ ایک برہمن جو شاید راستہ بھول کے ادھر آنکلا تھا۔ کٹیا کے پاس سے گزرا۔ اور اُما کو دیکھ کے رُک گیا۔

اُما نے برہمن دیوتا کے پاؤں دھلائے۔ اُن کی پوجا کی۔ اور پھل پھلاری اُن کے سامنے رکھ کر چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔

برہمن پہلے تو ٹکٹکی لگائے اُس کے منہ کو تکتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔ اے کنول کے سے نینوں والی میں دیکھتا ہوں۔ کہ ہرن تجھ سے بہت ہلے ہوئے ہیں۔ وہ کشا[1] گھاس کے تنکے تیرے ہاتھوں سے چھینے لئے جاتے ہیں۔ اور تو بھی ان ہرنوں اور ہرنیوں میں بہت خوش معلوم ہوتی ہے۔ پر سندری ایک بات پوچھوں۔ بُرا تو نہ مانے گی۔ تو اس سنسان بن میں کیوں اپنی جوانی گنوا رہی ہے۔ تجھے تو اس چاند ایسے چہرے سے کسی راجہ کے محل کو اُجالنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ یہ چھال کے کپڑے بڑھاپے کا سنگار ہیں۔ ایسی تپسیا تو ہم ایسے بوڑھوں کا کام ہے جو زندگی سے نراش ہو چکے ہوں۔ میری سُنے تو اس جنگل کو چھوڑ کے اپنے گھر چلی جا۔ یہاں تیری رسیلی جوانی کی بہار دیکھنے والا کون ہے؟ اچھا میں سمجھ گیا۔ تیری ٹھنڈی سانس نے تیرے دل کا بھید کھول دیا۔ تو نے کسی کی چاہت میں یہ دھیج بنا رکھی ہے۔ پر دھرتی پر کون ایسا ہے۔ جسے تو چاہے اور وہ تیرے قدموں پر نہ آگرے۔ اُس کے سینے میں دل کی جگہ پتھر کی سِل ہو گی۔ کہ وہ تیرے اُداس چہرے، الجھے بکھرے بالوں، اور آنسو بھری آنکھوں کو دیکھتا ہے اور اس کا جی نہیں پسیجتا۔ نہ تیرے ہاتھوں میں مہندی ہے نہ تیری آنکھوں میں کاجل۔ تیرے کان بُندوں سے خالی ہیں۔ اور تیرے سینے کو جسے ہاروں سے ڈھکا ہونا چاہیئے تھا۔ سورج کی تیز کرنیں جُھلس رہی ہیں۔ وہ کون ہے جو یہ سب کچھ دیکھتا ہے اور اسے تیری حالت پر ترس نہیں آتا۔

مجھے تو کوئی ایسا برہمن سمجھ نہ کہ جو صرف باتیں کرنا جانتا ہے پر اُسے تپ کی کرواں کیتا۔ میں نے بھی تپسیا کی ہے۔ مجھ میں بھی اتنی شکتی ہے کہ اگر چاہوں تو تیرے پریتم کو تجھ سے مِلا دوں۔ اس لئے مجھ سے اپنا بھید مت چھپا۔ اور صاف صاف بتا دے کہ کس کی چاہت تیرے جی کا گاہک ہوئی ہے۔

اُما بولی "برہمن دیوتا۔ میں شو بھگوان کے سوا اور کسی کو نہیں چاہتی"۔

برہمن ٹھٹھا مار کے ہنسا۔ اُس کی ہنسی میں بادل کی گڑگڑاہٹ تھی اور اُس کے اُجلے اُجلے دانت بجلی کی طرح چمک رہے تھے۔ شو! میں شو کو جانتا ہوں۔ پر اُس کے پاس کیا رکھا ہے کہ تجھ ایسی دیوی اُس کی چاہ میں اپنا جوبن گنوائے۔ شو تو بھکاری ہے بھکاری۔ اُسے تو پہننے کو کپڑا بھی نہیں جڑتا[2] اور میں نے تو یہ بھی سُنا ہے کہ وہ گیت جوڑنے والے شاعروں کی طرح سپنے دیکھتا رہتا ہے۔

اُما ٹھنڈی سانس بھر کے کہنے لگی۔ دیوتاؤں کے ڈھنگ نیارے ہیں اُن کی باتوں کو ہم تم نہیں سمجھ سکتے۔ تم شو کو بھکاری کہتے ہو پر دیوتاؤں کا راجا اندر اُسے ڈنڈوت کرتا ہے۔ اور برہما جس نے سارے سنسار کو پیدا کیا۔ اُس کی مہما کے گیت گاتا ہے۔

برہمن بولا "میری سُنو تو ——"

اُما کی بھنویں تن گئیں اور وہ کڑک کے بولی "چُپ! میں اور کچھ سُننا نہیں چاہتی"۔

---

[1] ایک قسم کی گھاس جو پوجا کے کام آتی ہے۔

[2] شوجی کا لباس شیر یا ہاتھی کی کھال بتایا گیا ہے اُن کے سر پر بالوں کا جوڑا ہے جو سنکھ کی طرح کا معلوم ہوتا ہے۔ گلے میں کھوپڑیوں کی مالا ہے اور بازوؤں سے سانپ لپٹے ہوئے ہیں۔

پر ایکا ایکی اُسے ایسا معلوم ہُوا کہ اُس کے پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور وہ یُوں رُک گئی جیسے پتھر ہلی چٹان کا ایک ٹکڑا کسی چنچل ندی میں ٹوٹ کے آ پڑے اور اُس کا راستہ روک لے۔ کیونکہ برہمن کی جگہ مہادیو کھڑے مسکرا رہے تھے۔

اُما اپنے رُوپ اور جوانی سے شِو کے من کو لبھا سکی۔ پر اُس کا تپ وشوا ناتھ[1] کو اُس کے دوار سے لے آیا۔

پھر وہ پانچ پتھروں والا دیوتا بھی جی اُٹھا۔ جو مردوں اور عورتوں کو پریم کے بندھنوں میں جکڑتا ہے۔ اور جس نے اپنے زہریلے بانوں سے اَن گنت سینے چھید ڈالے ہیں۔

جب آموں پر بور آتا ہے اور اُس پر بھونروں کے جھنڈ گونجنے لگتے ہیں۔ تو وہ اَن بے کھٹکے دلوں کا شکار کرتا پھرتا ہے۔ پر جب سے اس نے شِو جی پر تیر چلانے کا ہاؤ کیا ہے، وہ کسی کو نظر نہیں آتا۔

---

[1] وشوا ناتھ بھی شِو جی کا نام ہے۔ جس کے معنی سب کا مالک ہیں۔

اشرف صبوحی

حاجی بغلول لاہور میں

کیا نام کہ بسم اللہ الرحیم۔ معاف فرمایئے گا حضرات اور حاضرات الرحمٰن کہنا تو ہم بھول ہی گئے۔ کیا کریں سب سے پہلے ہمارے جدامجد نے گیہوں کھا کر چوک کھائی تھی، ہم بھی اگر بھول چوک نہ کھائیں تو ان کی اولاد ہونے کا دعویٰ کس منہ سے کریں۔ دوسری بات یہ بھی بھول جایئے کہ ہم مولوی ہیں ہم تو حاجی ہیں حاجی۔ ہمارا نام نامی اس طرح ہے۔ حاجی بلیغ العلیٰ ابن حاجی بدرالدجیٰ کی مدنی ثم لکھنوی، ثم بدایونی، ثم دہلوی۔ یہ ثمّ ہمارے عرب کی بول چال ہے۔ آپ حضرات کو اس ترکیب کے استعمال کا کوئی حق نہیں۔ البتہ اس کے بالمقابل آپ ثُمَّ لکھ سکتے ہیں۔ جیسے سید محمد بدایونی، ثم مہ بریلوی۔ یا ایہا الناس! کیا نام کہ آپ میں سے جو حضرات تنو کے بیٹے میں ہیں۔ وہ تو جانتے ہیں کہ ہم سید سجاد حسین ایڈیٹر "اودھ پنچ" کے دستِ راست و دستِ چپ تھے۔ جس طرح ایک مخلص مومن کی تعریف میں یہ حدیثِ قدسی ہے کہ میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہم بھی اس سید زادے کا دماغ بن گئے تھے جس سے وہ سوچتا تھا۔ ہاتھ بن گئے تھے جس سے وہ لکھتا تھا۔ الغرض سوتے جاگتے۔ اٹھتے بیٹھتے ہمارا ہی تخیل اس پر سوار تھا۔ کیا نام کہ وہ غریب جلدی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ ہم نے بھی اس کے ماتم میں قیصر باغ کے جلسے یک قلم موقوف کر دئے۔ تخاس کا پھیرا لگانا چھوڑ دیا۔ امام باڑہ سے منہ موڑ کر گومتی کے کنارے دھونی رما کر بیٹھ گئے۔ کیا نام کہ بارہ اور بارہ چوبیس برس کے بعد ایک اور سید زادے میاں محفوظ علی بدایونی ہمیں زبردستی بدایوں لے آئے۔ وہاں لا کر بے چارے نے زور تو بہت لگایا کہ ہماری طبیعت کی جولانیاں بڑھیں۔ مگر جناب توبہ کیجئے

لکھنؤ بھی چھٹ گیا وہ عشق بھی باقی نماند

آں قدح شکست وہاں ساقی نماند

آخر مجبور ہو کر بدایونی ہمیں دلی لے آئے اور اجمل خاں کے مطب میں لے جانے کی بجائے "ہمدرد" کے دفتر میں بند کر دیا۔ یہاں علی برادران سے ہمارا تعارف کرایا گیا۔ انہوں نے ہر طرح ہماری خاطر مدارات کی۔ طبیعت سنبھلتے سنبھلتے سنبھل گئی۔ اور پھر وہی ہنسی، دل لگی، اچیل، تفریح، پھکڑ بازی جو ہماری عادتِ ثانیہ تھی، عود کر آئی۔ اور ہم دوبارہ دنیا کے چار کھونٹ مشہور ہو گئے۔ چند سال بعد ہمدرد بند اور علی برادران جیل میں نظر بند۔ کیا نام کہ اس قید و بند کے زمانے میں ہمیں مناسب معلوم ہوا کہ ہم بھی اپنی آنکھوں میں شام و سحر بند کر لیں اور حبسِ دم سے کام لیں۔ یاد نہیں کتنے سال سوتے

رہے اور جب اصحابِ کہف کی طرح بیدار ہوئے تو دنیا کا نقشہ ہی بدل چکا تھا ے

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

دفعتاً "لے کے رہیں گے پاکستان" کے نعرے ہر چھوٹے بڑے کی زبان سے سننے میں آئے۔ وہ جو کہتے ہیں زبانِ خلق نقارۂ خدا۔ بس خدا نے پاکستان بنوا دیا۔ ہمارا پاکستان دیکھنے کا شوق جب حد سے بڑھ گیا تو کیا نام ہم آنکھوں میں سرمۂ سلیمانی لگا بغیر پاسپورٹ کے لاہور میں آ وارد ہوئے بنیام کی فکر دامن گیر تھی اور ہم سڑک کے درمیان کے وسط میں چل رہے تھے۔ سامنے ایک چوک آیا اور پیچھے سے تانگے والے نے آواز دی "بچ موڑ توں"۔ خیر صاحب ہم ایک طرف کو ہو گئے۔ آگے بڑھے تو بڑے ہسپتال کے قریب کئی فوٹوگرافر بیٹھے تھے۔ ایک صاحب نے جھٹ کیمرہ سنبھالا۔ ہم نے ٹوک کر کہا "تصویر نہیں اتروانی ہے"۔ وہ بولا "مجھے تو اتارنی ہے۔ قسم ہے ہزاروں کاپیاں ہاتھوں ہاتھ بک جائیں گی"۔ اس پر ایک اور صاحب نے جیب سے فیتہ نکال کر سر ناپتے ہوئے فرمایا۔ بھائیو! جس کے سر کا دور چودہ انچ ہو اس پر پچیس گز کا عمامہ بھی بندھا ہو اور وہ اس طرح آگے کو جھکے ہوں جیسے خس پوش سائبان۔ ناک کا بانسہ حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا ہو اور نتھنے ایسے ہوں جیسے تہ خانے کے روشندان۔ اوپر کا لب چھوٹا نیچے کا بڑا مع زنخداں آگے کو اُبھرا ہوا۔ ٹانگیں چھوٹی اور موٹی۔ اس پر ایک ٹانگ میں لنگ بھی ہو، منہ پر چھتر شاہی ڈاڑھی۔ ایک عدد جریب زیتونی ہاتھ میں لے کر جب ایسا شخص یوقدمی چال چلے تو کون ایسا بے ذوق ہوگا جو ایسی تصویر کا گاہک نہ ہو۔ ایک اور صاحب ہنس کر فرمانے لگے اس تصویر کے نیچے یہ بھی لکھ دیا جائے "ڈارون کی تحقیق کا نچوڑ۔ یعنی افریقہ کا بندر"۔ اس پر کیا نام کہ ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔ جن صاحب نے یہ پھبتی کسی تھی وہ نزلہ حار کا شکار تھے۔ ان کی آنکھ، ناک اور منہ سے پانی جاری تھا۔ کیا نام کہ ہم نے کہا صاحب زادے ارادی۔ چناب، جہلم کی روانی تو دکھا چکے اب ستلج اور بیاس کے دہانے بھی کھول دو۔ اور اگر یوں نہ کھلیں تو شورے کی مدد سے کھل جائیں گے۔ اور ساتھ ہی تمہاری آنکھیں بھی کھلیں گی اور پہچان لوگے کہ افریقہ کا بندر تمہارا بزرگ حاجی بغلول ہے۔ کیا نام کہ یہ سنتے ہی وہ جھینپ گئے اور یہ صدا لگاتے ہوئے ایک طرف کو چل دئے ے

عزیزِ حق تعالیٰ کبریا ہے شرف بغلول کو جس نے دیا ہے

پھر ہم نے فوٹوگرافر سے کہا ہم حاجی ہیں، ہماری تصویر کھینچ کر شیطان کا آدھا عذاب تمہیں اٹھانا پڑے گا۔ مسافروں سے ٹھٹھا مخول نہ کرو اور کسی سرائے کا راستہ بتا دو۔ وہ بولا یہ رہی سامنے رتن چند کی سرائے۔ ہم نے وہاں جا کر ایک شخص سے پوچھا یہاں ٹھہرنے کا کیا لیا جاتا ہے، اس نے جواب دیا بڑے میاں! اس سرائے میں بھینسیں ٹھہرتی ہیں، آدمیوں کے لئے بازاروں میں ہوٹل ہیں۔ یکایک ایک چھیبے والے نے آواز دی بگو گوشے لو۔ ہم خود گوشۂ عافیت کی تلاش میں تھے۔ بگو گوشے والے کے پاس کھڑے ہو گئے۔ خوش قسمتی سے اس وقت ایک واقف کار نظر پڑ گئے۔ "اور حاجی صاحب ابھی زندہ ہو؟" یہ کہہ کر بغل گیر ہو گئے اور اپنے مکان میں لے آئے۔ اور ان ہی کی وساطت سے کچھ ادبی انجمنوں اور مخصوص مشاغل کی صحبتوں میں شریک ہونے کا موقع ملا۔

کیا نام کہ ایک روز انجمن اخوان الادب کے مشاعرے میں شریک ہوئے۔ حاضرین نے پرجوش طریقے پر ہمارا خیر مقدم کیا اور اصرار کیا کہ ہم مختصر سی تقریر بھی کریں اور اپنا کلام بھی سنائیں۔ چنانچہ ہم نے کھڑے ہو کر کہا بھائیو! آپ کی بغلول نوازی کا شکریہ۔ اور دو دو عیدیں منانے پر مبارک باد۔ کیا نام کہ چیڑی اور دو دو۔ ایسا قوانز تو ہم نے اپنی صد سالہ عمر میں کہیں نہیں دیکھا۔ ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر کسی کو ۲۰ تاریخ کے بعد ہی سے چاند نظر آنے لگے اور ایک دو کی بجائے آپ تین تین عیدیں منانے لگیں۔ اے پاکستانی بھائیو! کیا نام کہ نمازِ عیدین سے مقصد اجتماعِ ملت ہے۔ مگر میں نے دیکھا ہے کہ عموماً ہر مسجد اور ہر عید گاہ میں یہاں نمازِ عید ہوتی ہے دس بیس آدمی اکٹھے ہوئے اور کسی سبزہ زار پر کھڑے ہو کر نمازِ عید ادا کر لی چاہے بڑا اجتماع اس سے چند قدم کے فاصلے پر ہی کیوں نہ ہو۔ پھر صفوں کی ترتیب بھی نہیں۔ صف سے ہٹ کر جہاں سایہ دیکھا وہیں کھڑے ہو گئے۔ کیا نام کہ آپ ہمارے کہنے کا بُرا نہ مانیں۔ ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ آپ کا ملک بہت غریب ہے لیکن یہاں کاروں اور کوٹھیوں کی کثرت دیکھ کر یقین تو نہیں آتا۔ اگر واقعی ملک غریب ہے تو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپ کے ملک میں کوئی احمق نہیں بستا۔ کیا یہ کہاوت آپ نے نہیں سُنی۔ "چو احمق در جہاں باقیست مفلس در نمی ماند۔"

لیجئے حضرات ہمیں اتنا ہی کہنا تھا۔ عقلمند را اشارہ کافیست۔ اب خاص رنگ میں چند شعر ملاحظہ فرمائیے۔ عرض کیا ہے۔

ہوئے بچ کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ ور گڑھیا — وہیں رہتے مثلِ مینڈک وہیں غائیں غائیں کرتے
ہمیں کیا سمجھ کے تو نے دھتکارا اپنے در سے — کوئی کوّے تھے کہ چھت پر تری کائیں کائیں کرتے
تری بات کا ستمگر نہ جواب بن پڑا کچھ — یونہی وقت ہم نے ٹالا فقط آئیں بائیں کرتے
یہ جریب اپنی موٹی کوئی قمچی ہوتی یا رب! — تو اسے گھما گھما کر ابھی سائیں سائیں کرتے

سامعین کو یہ اشعار بہت پسند آئے اور تحسین و آفرین کا وہ شور بلند ہوا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ ہم نے یہ رنگ دیکھا تو اپنی جریب ٹیکتی سنبھالے ہوئے ڈائس سے اُترے اور گھر روانہ ہوئے۔

اس مشاعرے کو ابھی دو روز بھی نہیں گزرے تھے کہ پاکستان کے رسائل و جرائد کے مدیران کی جو کانفرنس ہو رہی تھی اس کی طرف سے دعوت نامہ موصول ہوا کہ مقبرہ جہانگیر میں چار بجے تشریف لائیے۔ آپ فرمائیں گے کہ آپ کا کیا علاقہ؟ تو کیا نام ہم کسی زمانے میں "بعیر الاخبار" کے ایڈیٹر رہ چکے تھے اس لئے یہ تقریب عمل میں آئی۔ چنانچہ ہم وقت مقررہ پر مقبرہ پہنچ گئے۔ یہاں ہمارا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ اور چاندی کی تھالی میں ایک ایڈریس بھی پیش کیا گیا۔ اس کا مضمون آپ بھی سن لیجئے۔

بخدمت عالی متعالی حضرت حاجی بلغ ابن حاجی بدرالدجیٰ کی مدنی ثم لکھنوی دام قبضۂ۔ زندہ باد و پائندہ باد! ہم سب آپ کی تشریف آوری پر ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہیں۔ اس وقت اس برادری میں آپ کی شخصیت بابا آدم سے کم نہیں۔ آپ نے بعیر الاخبار اس وقت نکالا تھا جب حرف ہینڈ پریس تھے۔ کاغذ اور دیگر سامان طباعت بھی کمیاب تھا، اور ذوقِ اخبار بینی بھی اتنا عام نہ تھا جتنا آج کل ہے۔ آپ کی ہمت کو آفرین ہے کہ سخت مشکلات کے باوجود آپ نے اپنا مشن جاری رکھا خدا ہمیں بھی آپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین

ہم نے اس کا جواب دیا:۔

"ایہا الحاضرین والحاضرات! (آوازیں "یہاں کوئی مسماۃ نہیں") ہم نے کہا کیا نام کہ "آپ کا یہ دخل در معقول و نامعقول ہمیں پسند نہیں۔ حاضرات تو آپ کی بائیں بغل میں پھڑک رہی ہیں، ذرا کو لھا مٹکانے کی دیر ہے اس طرح گرنے لگیں کہ جس طرح موسمِ خزاں میں پتے درختوں سے گرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم عمل حاضرات کے ماہر بھی تو ہیں۔ دیکھئے شروع کرتے ہیں "یا قاضی الحاجات۔ حاضرین کو بنادے حاضرات یا قوی قادر حاضرات کو کر حاضر۔"

اتنا کہنا تھا کہ چند خواتین جو تفریح کے لئے آئی تھیں ہماری تقریر سننے کے لئے وہاں کھڑی ہو گئیں۔ لوگوں کے دلوں میں ہماری ولایت کا سکہ بیٹھ گیا۔ سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے ہم نے کہا۔

"کیا نام کہ آپ نے جن مخلصانہ، دوستانہ، بزرگانہ اور بچگانہ قسم و نوع کے جذبات کا اظہار فرمایا ہے وہ میرے لئے مایۂ شتر اعرابی ہے۔ لاحول ولا بھولا صاحب وہ میرے لئے مایۂ ناز ہے۔ اور مرحوم بعیر الاخبار کا ذکر کر کے تو ؏
اک تیر میرے دل پہ مارا کہ ہائے ہائے
کیا نام کہ بعیر عربی میں اونٹ کو کہتے ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی تو اس

دوسٹ اخبار کی بھی کوئی کل سیدھی نہ تھی۔ جب پرچہ چھاپنے کا وقت آتا تو پریس مین ندارد کبھی کاتب غائب غلہ تو کبھی سنگ ساز فقروالی اللہ۔ غرض پریس کے عملے نے "البعیر" کی چولیں تک ہلادیں۔ ہمارا کاتب بڑا تیز رقم تھا۔ اس نے زود نویسی میں نامۂ اعمال لکھنے والے فرشتوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ جب جلی لکھتا تو یہ معلوم ہوتا گویا ہاتھی دوڑ رہے ہیں اور خفی لکھتا تو دال اور چاول پر قرآنی سورتیں لکھنے والوں کو بھی پرے بٹھا دیتا۔ غلطیاں درست کرتا تو یہ معلوم ہوتا کہ لاکھوں جوؤں کا خون بہہ رہا ہے۔ اگر چیپیاں لگاتا تو ساری کاپی سانپ کی کینچلی معلوم ہوتی۔ بس کیا نام کہ ہمارا ہی جامہ تھا کہ یہ بارِ امانت جسے پہاڑ اور جنگل نہ اٹھا سکے ہم نے اپنی اکیلی لنگڑی ٹانگ پر اٹھالیا ؎

تجھ ہی سے اٹھیں تیری یہ خواریاں ‏ ‏ ‏ ‏ نہ بھائی ہماری تو طاقت نہیں

آپ نے ایڈریس میں کہا ہے کہ اب پہلے کی نسبت طباعت و کتابت میں آسانیاں ہیں، خدا کرے ایسا ہی ہو۔ "ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد۔"

اتنا کہہ کر ہم بیٹھ گئے اور چائے کا دور شروع ہوگیا۔ پھر ہمارا تعارف مختلف اشخاص سے کرایا گیا۔ آپ "شہناقی" کے ایڈیٹر ہیں۔ آپ کی نغمہ نوازی پر سارا پاکستان جھوم اٹھتا ہے۔ آپ "سنگ و خشت" کے ایڈیٹر ہیں۔ بڑی سنگین قسم کی اردو لکھتے ہیں۔

پھر اخباری رپورٹر ہمارے گرد جمع ہوگئے اور سوالات کی بوچھاڑ شروع کردی: "کیا آپ ہندوستان واپس جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟" ہم نے جواب دیا کیا نام کہ جب کوئی پھل آخر ہونے لگتا ہے۔ اور بازار میں کم کم دکھائی دیتا ہے تو پھل والے آواز لگاتے ہیں کہ "خریدا دو! میوہ چلا وطن کو۔" تو میری بہار بھی ختم ہورہی ہے۔ میرا وطن عرب ہے۔ لہٰذا براہ کراچی عرب جا رہا ہوں۔

"چھیڑ چھاڑ" کے نمایندہ نے سوال کیا "آپ نے اپنی عمر میں کبھی رومان بھی لڑایا ہے؟" ہم نے کہا "میاں صاحبزادے رومان لڑانا بیسویں صدی کی پیداوار معلوم ہوتا ہے۔ میں نے تو بٹیریں لڑائی ہیں۔ ہاں خوب یاد آیا۔ ایک مرتبہ ذرا تعلقِ خاطر ہوگیا تھا، وہ بھی ایک دوشیزہ سے جس کا نام مرادی تھا۔ مگر افسوس کہ نامرادی پلّے بندھی۔" انہی صاحب نے فرمائش کی کہ مرادی کے متعلق جو اشعار یاد ہوں وہ سناؤں۔ میں نے یہ کہہ کر لاکھ ٹالنا چاہا کہ میرے نجی معاملات سے آپ کو کیا غرض۔ مگر وہ نہیں مانے۔ مجبوراً دو شعر سنانے پڑے۔ آپ بھی سن لیجئے ؎

یاروں کو کیوں یہ واقعہ اک کھیل ہوگیا ‏ ‏ ‏ ‏ کیا امتحانِ عشق میں میں فیل ہوگیا
تن ہوگیا ہے سوکھ کے کانٹا ببول کا ‏ ‏ ‏ ‏ اپنے تو حق میں عشق امر بیل ہوگیا

ساری مجلس قہقہوں سے گونج اٹھی۔ اور یہ صحبت جو ہمیشہ یاد رہے گی۔ ختم ہوگئی۔ اللہ بس باقی ہوس۔

(۵)

اُردو افسانہ

پہلا دور

سجاد حیدر یلدرم

خارستان و گلستان

گلستان

آج سے دس ہزار برس قبل کا ماجرا ہے۔ بحرِ ہند میں ایک جزیرہ تھا جو اب ناپید ہے۔ چاندنی رات تھی، سطحِ آب پر سکونِ مطلق طاری تھا، اور اس سکون پر چاند اپنی شعاعیں ڈال رہا تھا۔ فضا میں خاموشی، بے پایاں سمندر، ڈراؤنی تنہائی، وحشت انگیز سکوت، کوئی صدا نہیں، کوئی اثرِ حیات نہیں۔ ایک غیر محدود، مگر روشن تنہائی، ایک عشر سکون! یہ عالم ہے۔ چاند خاموشی کے ساتھ گویا سوچ رہا ہے، موجیں بھی سوچ رہی ہیں، چاند کی کرنوں کے سیلان سے بچا ہوا سایہ سوچ رہا ہے، بادلوں کے منتشر ٹکڑے سوچ رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہوا، اس خاموشی کا بھید چپکے چپکے سمندر کے کان میں کہنا چاہتی ہے اور نہیں کہہ سکتی، سمندر کا سینہ سانس لینے کی کوشش کرنا چاہتا ہے، تمام موجودات ہیں گویا ایک کروٹ لینے کی خواہش معلوم ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بے پایاں سُستی اور سکوت میں اگر کہیں سے ذرا سی صدا بھی آ جائے تو دنیا ہنس پڑے گی، اُچھل پڑے گی۔

نسرین نوش جزیرے کے دامن میں، سمندر کے ریت پر ایک سرد زریں کی طرح جو زمین پر گر پڑا ہو لیٹی ہوئی تھی، کہ موجوں میں کچھ حرکت پیدا ہوئی، اور وہ نسرین نوش کے عریاں جسم، چاند جیسے عریاں جسم پر، گردن پر، بالوں میں سے گذرنے لگیں۔ ادھر سلسبیل قمر اس کے بدن پر پڑ رہی تھی، اُدھر چھوٹی چھوٹی موجیں ایک دوسرے کو ہٹاتی آتی تھیں اور اُس سیمیں تن کے کبھی بالوں میں سے گذرتی تھیں، کبھی اُس کے گورے بازوؤں سے لپٹتی تھیں، کبھی اُس کے بلوریں سینہ سے ملاطبت کرتی تھیں، کبھی اُس کے ارغوانی پاؤں کو سہلاتی تھیں، اور اس کے بوسے لے کر آگے چلی جاتی تھیں، اور پھر لوٹ کر آتی تھیں اور قعرِ بحر سے موتی لا لا کر اُس کے پاؤں پر نثار کر کے نہایت تعظیم اور احترام کے ساتھ واپس جاتی تھیں۔

نسرین نوش ایک پُرلطف تھکن سے، ایک بے ہوش نشے سے آہستہ آہستہ بیدار ہوئی، اس کے چاروں طرف جو پریاں ایک ہالہ بنائے کھڑی تھیں، اُن پر نظر ڈالی، اور اپنے لعل لبوں سے برق تبسم گرا کے کہا، "میری پیٹھ ملو" اس پر چند خادمہ تعمیلِ حکم میں مصروف ہوئیں،

اور اس کے بعد چند اور پریاں جو ریشمی تولیہ، چادر وغیرہ لئے کھڑی تھیں، انھوں نے اُس کے بازوؤں، سینے، اور پاؤں کو پونچھنا اور بالوں کو سکھانا شروع کیا۔ نسرین نوش اس شاہراہ زریں کو جو چاند نے اس تک بنا رکھی تھی دیکھنے اور موجوں کی ارگن کو سننے لگی۔

اتنے میں ایک قسم کی چھوٹی پریاں، صدف بحر کی بنی ہوئی نفیریاں، اور دف اور سارنگی اور ستار غرضکہ پورا ساز لئے ہوئے، نسرین نوش کے گرد اُڑنے اور ستار بجانے لگیں۔ نسرین نوش اُٹھ کھڑی ہوئی اور ماہتاب کی طرف ہاتھ بڑھا کے، اس رات کے لئے اُسے "خدا حافظ" کہا اور اپنی سہیلیوں کے کبھی کندھوں پر ہاتھ رکھ کے، کبھی ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کے پھولوں سے چھپے ہوئے راستے پر نسیم کی طرح خرام ناز سے چلنا شروع کیا۔

اس وقت پھول جھک جھک کے سے سلام کرتے تھے، اور ایک دوسرے سے مل کر گویا تالیاں بجاتے، بنفشہ اُس کے پاؤں چومنے اور روندے جانے کی تمنا سے راستہ میں آپڑتا تھا۔ نسرین نوش پانچ منٹ تک چلی ہوگی کہ ایک کاشانۂ بلوریں داخل ہوئی۔

چاند کا عکس اس محل کی کل دیواروں، اور صحن کے فوارے پر پڑتا تھا، اور اس فوارہ سے ایک زمزمہ روح نواز پیدا ہو رہا تھا۔ حوض کے کنارے لیموں، نارنگی، ترنج کے پودے پھولوں سے لدے ہوئے دماغ کو فرحت دے رہے تھے۔ یہ سب ایک دستر خوان پر بیٹھ گئیں: زبرجد کے طباقوں میں طرح طرح کے کھانے اور میوے لائے گئے، خربوزے، انار، انگور، سیب، شکار کے گوشت، مچھلیاں۔ لائی گئیں۔ لالے کے پیالوں میں، شراب، شربت، گلاب پئے گئے۔

حوض کے دوسری طرف، ناچنے والیوں، گانے والیوں نے ایک حلقہ باندھا اور رباب، مزمار، بربط، ستار پر نسرین نوش کی حسن و ادا کی تعریف میں قصیدے، غزلیں، ٹھمریاں گانی شروع کیں، گانا بھی وہ گانا جو ایک جوئے رواں کی طرح مسلسل تھا۔

ادھر سہیلیوں نے چھیڑ خانی شروع کی، رفتہ رفتہ لالوں، اور پھولوں کو پھینک کے لڑائی شروع ہوئی، اور تھوڑی دیر میں پھولوں سے زخم کھا کھا کے پریاں گرنے لگیں۔

لذیذ شراب کے نشہ سے، نسرین نوش ہنسی ہوئی ایک سہیلی کی گود میں گر پڑی، اور اپنے ہونٹ چوس چوس کر نظر اس طرح دور دور ڈالنے لگی۔ گویا عالم خیال میں ہے۔ سہیلیاں، اپنی مالکہ کے ہاتھ چوم چوم کے، اس کی بالوں کی خوشبو سے دماغ معطر کر کر شراب کا ایک ایک گھونٹ پیتی تھیں۔

نشہ کا خمار چڑھنا شروع ہوا تھا کہ ناچنے والیوں کو پھر حکم ہوا :

سازپر پریوں کا ایک خاص ناچ، ایک رقیق، نازک، نورانی ناچ ناچا گیا۔

وہ گلابی، چمپئی، دھانی ریشمی ساڑھیاں جو پریوں کے سڈول جسموں سے لپٹی ہوئی تھیں، وہ اس ناچ کے چکروں میں مل کر طرح طرح کے نئے رنگ پیدا کرتی تھیں، پریاں تیتری کی ہلکی پرواز کی طرح ادھر سے ادھر، اُدھر سے ادھر ٹھمک ٹھمک کے آتی جاتی تھیں، کبھی وہ ایک دوسرے سے ملیں کبھی علیحدہ ہو جائیں۔ کبھی دو کے درمیان میں سے تیسری گذر جائے کبھی حلقہ بندھ جائے کبھی ٹوٹ جائے۔ اس ملنے جدا ہونے چکر کھانے سے رنگ اور نور کا انحلال اور اجتماع ایسا مختلف ہوتا جیسے ہشت پہلو شیشے میں سے آفتاب کی کرنیں گذر رہی ہوں۔ ان پریوں کا تھرک تھرک کے ملنا، ... جانا، شانوں کا ہلنا، بالوں کا بحر سنبل کی طرح لہرانا، نازک گردنوں کا لچکے کھانا، جھک جھک کے دُہرا ہو جانا، یہ سب باتیں ایسی دلفریب گتوں سے جو ساز سے پریاں بجا رہی تھیں، مل کر ایک ایسا نشہ آور منظر پیش کرتی تھیں کہ کان موسیقی اور رقص میں تمیز نہیں کر سکتے تھے اور آنکھ نہیں بتا سکتی تھی کہ آیا موسیقی رقص کر رہی ہے یا رقص

نغمہ ساز ہے، کیا ہو رہا ہے۔

نسرین نوش ان تمام تموجاتِ رقص و آہنگ کو، ایک سہیلی، صبیح خنداں کے زانو پر سر رکھے ہوئے ایک بے پرواہ، لااُبالیانہ نگاہ سے دیکھ رہی تھی، اور ایسا نظر آتا تھا کہ وہ ان چیزوں کی طرف زیادہ ملتفت نہیں، کیونکہ اُس کی نگاہ کسی دُور نقطہ پر گڑی ہوئی تھی۔

یہ ٹیپ ٹاپ، یہ ناچ گانا، وہ رات دن دیکھتی تھی، اِس لئے اُس کی رُوحِ خفتہ کو جگانے یا اُس کی دل میں حرکت پیدا کرنے کے لئے یہ کافی نہ تھے۔

اس رات محل میں داخل ہونے کو اس کا دل نہ چاہا۔ اس کی طبیعت میں چاند کو دیکھ دیکھ کر یہ اُمنگ پیدا ہوتی تھی، کہ اُس کے عریاں جسم سے جا کر لپٹ جائے۔ وہ اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ سہیلیوں نے، اس کی طبیعت ... نے کے لئے لطیفے، کہاوتیں، بوجھ پہیلیاں کہنی شروع کیں، کہ چاند اور سورج میں کیسی دوستی ہے، شہد کی مکھیاں، پھولوں سے کیا کہا کرتی ہیں، بھونرا، چنبیلی کے کان میں کیا بھنبھنایا کرتا ہے یہاں تک کہ آہستہ آہستہ اُن نورانی آنکھوں میں نیند آنی شروع ہوئی، اس کے نرم جسم کو سہلا سہلا کے، اُس کے دماغ کو تھپکا تھپکا کر، ہلکے بادلوں کے نیچے بھاگتے ہوئے چاند کو پیشِ نظر کر کر کے غرضیکہ عجب عجب دھوکے دے دے کے، نیند اُسکی آنکھوں میں چپکے سے آگئی اور اُن گھنی پلکوں کو ملا دیا۔

نسرین نوش کا نیند میں جانا تھا، کہ ناچ بند کر دیا گیا لطیفے پہیلیاں ختم ہو گئیں۔ نہ صرف یہ بلکہ فوارے بند ہو گئے، وہ عندلیب جو پنجرے میں بند بیٹھی گا رہی تھی، چُپ ہو گئی، ہوا کی سنسناہٹ بند ہو گئی، تاکہ نسرین نوش آرام سے سوئے۔ تمام رامشگر پریاں، سہیلیاں، دبے پاؤں علیحدہ ہو گئیں، گھونگھر و آہستہ آہستہ اُتار ڈالے گئے، اتنے میں سفید بازوؤں والی چھوٹی چھوٹی پریاں حلقہ باندھ کے آئیں، اور نسرین نوش کے گرد اُڑنے لگیں، اُن کے پروں سے کوئی آواز نہ نکلتی تھی۔ یہ پریاں نسرین نوش کی نگہبان تھیں۔

دو تین منٹ کے بعد ایک بُڑھیا درختوں میں سے نکل کے جریب ٹیکتی ہوئی آہستہ آہستہ نسرین نوش کے پاس آئی اور نسرین نوش کے بدن پر جو چادر ڈال دی گئی تھی، اُسے چہرے پر سے ہٹا کر، غور سے دیکھنے لگی۔ اُس کے سوکھے چہرے پر آثار اطمینان ظاہر ہوئے۔ اور "الحمد للہ" کہہ کے جیسی آئی تھی ویسی ہی غائب ہو گئی۔

یہ نسرین نوش کی ماں تھی۔ اپنی لڑکی کو نہایت احتیاط اور بدگمانی سے رکھتی تھی، اور اس طرح ہر شام کو آ کر تحقیقات کرتی تھی۔ یہ معمّر عورت سوچا کرتی تھی کہ میرے بالوں کو سفید کرنے والے، میرے دانتوں کو گرانے والے، میرے چہرے کو خراب کرنے والے یہ مرد ہی تو ہیں، ان کے ظلم ہی تو ہیں، اپنی اولاد کو میں ان مصیبتوں سے بچاؤں گی۔ اسی لئے میں اس لڑکی کو اس جزیرے میں لائی ہوں۔ اُسے کھیل تماشے، دل بہلاوے، ہنسی، دل لگی، آرائش و نمائش سب کچھ دوں گی، لیکن مرد کیا شے ہے، یہ نہ جاننے دوں گی۔ وہ خلافت جس کا نام مرد ہے، اُسے اس کے قریب نہ آنے دوں گی، لیکن اگر ڈر ہے تو اتنا کہ مجھے اطلاع ہوئے بغیر اس جزیرے میں کوئی مرد آ جائے، بہرحال اس وقت تو میری کل تدبیریں مکمل ہیں اور میرے دل کو اطمینان ہے۔

ماہتاب دھیما ہو ہو کے، غائب ہو گیا۔ مگر نسرین نوش کے جسمِ نازک کو طلوعِ آفتاب کے سپرد کر تا گیا۔ سفید بازوؤں والی نگہبان پریاں، ہٹ گئیں، اور ان کی بجائے، سہیلیاں، اور گانے والیاں آ گئیں، جنہوں نے نرم و نازک آواز سے اُسے جگانے کے لئے پیاری پیاری راگنیاں گانا شروع کیں۔ تھوڑی دیر میں، نسرین نوش نے اپنی مخمور آنکھیں کھول دیں، اور انگڑائیاں لیتی ہوئی، اور اپنے پریشان بالوں کو سنوارتی ہوئی اُٹھ بیٹھی۔ پھر ایک صاف شفاف نہر کے کنارے، نیلوفر کے پھولوں کی ایک چوکی پر جا کر بیٹھ گئی، پریاں

بھی آکر اُس کے گرد جمع ہو گئیں۔

مشاطہ پریوں نے نسرین نوش کا سنگار کیا۔ نسرین نوش نہر کے صاف پانی میں اپنے عکسِ جمال کو دیکھ رہی تھی۔ تیتریاں رنگ دوسرے کا پیچھا کرتی ہوئی اُڑ رہی تھیں، نہر کی روانی سے نرم صدا پیدا ہو رہی تھی، سہیلیوں نے پھر ہنسی کی باتیں شروع کیں، جن کو سُن سُن کر وہ پیارے باریک ہونٹ تبسم میں کھُل کھُل جاتے تھے۔

سہیلیوں اور خادمہ پریوں کے نام، گل چکاں، زہرہ جبیں، نازآفریں، موجِ نور، بعضوں کے نام پھولوں پر مثلاً نیلوفر، سوسن وغیرہ، بعضوں کے پرندوں کے اوپر، مثلاً طاؤس خرام، کبک ادا وغیرہ وغیرہ تھے، اور ان سب کے نام اور عنوان کے مناسب ان کا لباس تھا۔ سنگار کے بعد، اس صبح کے لئے ایک خاص رنگ کا لباس پہن کر، نسرین نوش نیلوفر کے پتوں کی کشتی میں بیٹھ کر سہیلیوں کے ساتھ تھوڑی دور تک نہر میں گئی، پھر یہ سب کنارے پر پہنچیں، جہاں بلور اور پھولوں کی ایک بگھی تیار کھڑی تھی، اس بگھی میں دو مادہ سیمرغ جتی ہوئی تھیں، اور اس انتظار میں کہ ان کی مالکہ بگھی پر سوار ہو گی، آمادہ روانگی کھڑی تھیں، جوئے رواں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نسرین نوش گاڑی میں سوار ہوئی، اور جوئے رواں کو اپنے پاس بٹھا کر "دیارِ گل" کو چلنے کا حکم دیا۔ اس حکم کے سنتے ہی، چند چھوٹی چھوٹی پریوں نے، جو چھوٹے چھوٹے بگل لئے کھڑی تھیں، کوچ کا بگل بجایا، اور اس تزک و احتشام کے ساتھ سواری روانہ ہوئی، سامنے طاؤس، کبوتر، قمریاں، طوطی، ناچتے، ہوا میں اُڑان بھرتے، گاتے چہچہاتے اور طرح طرح کے تماشے کرتے جاتے تھے۔

سڑک پر پھول کی پتیاں، گلال، اور چاندی کے ذرّے بکھرے ہوئے تھے، جو پہیوں کے چلنے سے اُڑ اُڑ کر، گاڑی کے بلوریں پہیوں میں، پرندوں کے پروں میں جم جاتے تھے، اور اس سارے قافلے پر قوسِ قزح کا رنگ پیدا ہو جاتا تھا۔

آفتاب، اُفق سے اپنے نورانی بازوؤں کو سنوارتا ہوا، کچھ اونچا ہوا تھا کہ یہ قافلہ اس بلادہ شعر و خیال میں جسے نسرین نوش نے "دیارِ گل" کا نام دیا تھا پہنچا۔ بہار کی وادی حقیقتاً وادیٔ گل تھی۔ نسرین نوش کی تشریف آوری کی خوشی میں، تمام غنچے ایک دم کھل گئے، اور ان کی خوشبو نکل نکل کے، اُس کے جسم کو، کندھوں کو، چہرے کو احاطہ کر کے چومنے لگی، نسرین نوش گاڑی سے اُتری، اتنے میں سہیلیاں، ذاکرانیاں، ساز ندے وغیرہ بھی پہنچ گئے۔

اب نسرین نوش نے اس زمان و مکان لطافت میں آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا، سہیلیاں، تعظیم اور خراد کے انداز سے اس کے ساتھ چل رہی تھیں۔ اور پنچہ درخت بھی اس ملکۂ ملاحت کے سامنے جھک جھک کر اس کی خدمت میں پھول پیش کش کرتے تھے اور نسرین نوش اُن پھولوں کو اپنے اُن پیارے ہاتھوں سے (جن میں اور پھولوں میں صرف اس قدر فرق تھا، کہ یہ پھولوں سے زیادہ خوبصورت تھے) چھو چھو کر سہیلیوں کو ایک عظمت آمیز تبسم غمزہ سے حکم کرتی تھی کہ "انھیں توڑ دو"۔ زہرہ جبیں گل چکاں کی گود ان پھولوں سے بھر گئی۔ ان پھولوں کا ایک تاج بنایا گیا جسے نسرین نوش نے پہنا، غرضکہ اس طرح، نسیم صبح کے ساتھ، اور نسیم صبح کی مانند سب آہستہ آہستہ چل کر ایک ٹیلے پر پہنچیں، جو مطلع آفتاب کے مقابل تھا، نسرین نوش کھڑی ہو کر آفتاب کی طرف جھکی اور پھر سیدھی ہو گئی، ازاں بعد اپنے ہاتھ کو چوم کر گویا سورج کو ایک بوسہ بھیجا۔ یہ ایک آئین آفتاب پرستی تھا۔ اس بوسہ کے بھیجتے ہی، سہیلیاں ہنس ہنس کے، دوڑ دوڑ کے ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کے، بالوں میں پھول لگا لگا کے، ہاتھوں میں پھولوں کے گچھے ہلا ہلا کے، نازک گردن کو بل دے دے کر، آنکھوں کو شرارت سے پھرا پھرا کے، نسرین نوش کے گرد حلقہ بنانے لگیں۔ پھر کھڑی ہو کر آفتاب کی شان میں گانے گانے لگیں۔ پھر ان سب نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر، کبھی ہوا میں اُڑ کر، کبھی زمین پر پاؤں مار کے آفتاب کے لئے ایک مستانہ ناچ ناچا، اور ایک دربار گانا گایا۔ اس گھما گھمی رقص و آہنگ کی لطافت میں درخت بھی جھوم جھوم کے، نسیم آہستہ آہستہ چل کے شریک ہوئی۔ پھول، درخت، ہوا، سب حالتِ وجد میں آ گئے۔

نسرین نوش اس نشۂ شعر کی کیفیت سے لذّت یاب معلوم ہوتی تھی اور اس آئینِ آفتاب پرستی میں دل سے شریک تھی۔ اخیر میں اس کو ختم کیا لیکن پھر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے ختم کرنے پر پورا پورا دل سے راضی نہیں تھیں، کیونکہ آئین ختم ہوتے ہی، درختوں کی شاخوں میں پھولوں کے بنے ہوئے جھولے ڈلے، اور اُڑ اُڑ کے ایک جھولے سے دوسرے جھولے پر جانا، جھولنا، ہنسنا اور کودنا اچھلنا شروع کیا! ایک مدت تک اس طریقہ سے وقت گزرا۔

آخر کار نسرین نوش پھر گاڑی پر سوار ہوئی، اور اُسی انتظام کے ساتھ واپس ہو کر کاشانۂ بلّور میں جو دسترخوان کھانوں سے حاضر تھا اُس پر مع سہیلیوں کے بیٹھی۔

غرضکہ دن اس طرح گزرتے تھے۔ اکثر نسرین نوش صبح کے کھانے کے بعد قیلولہ کرتی تھی، اور تیسرے پہر کو شکار کے لئے نکلتی تھی۔ نازک پیارے ہاتھوں میں تیر کمان لے کر کبھی کبھی مشق تیر اندازی کرتی تھی۔ کبھی غروبِ آفتاب کے قریب ساحلِ بحر پر غسل کے لئے جاتی تھی۔ اور تیر اندازی کے بعد تھکن اتارنے کے لئے، گلاب یا بنفشہ کا اُبٹنا مل کے، سمندر میں نہاتی تھی، رات کو سہیلیوں کو بلا کے گانا، پہیلیاں کہانی وغیرہ سے دل بہلاتی تھی۔ کبھی کوئی بحث شروع ہو جاتی، اور یہ نرم نرم مکالمہ کبھی پُر حدت ہو جاتا، گویا ایک منبع شفاف سے پانی گر رہا ہے، کبھی تیز اور بلند قہقہہ کی آواز آتی، گویا ساز زور سے بجا، کبھی آہستہ آہستہ باتیں ہوتے ہوتے خاموشی طاری ہو جاتی، گویا بادِ نسیم پھولوں میں ہلکے ہلکے چل کے رُک گئی۔ چاندنی رات ہوتی تو ایک دو سہیلیاں ساتھ لے کر سیر کو نکل جاتی، اس وقت نسرین نوش کا چلنا، اس نہر کے پانی کی مانند ہوتا تھا جو بلوری زمین پر بہہ رہی ہو۔ اور جس کے پانی کو معطر نسیم جنبش دے رہی ہو، جس کے کنارے پھول کھلے ہوں اور بلبلیں اُڑ رہی ہوں۔

نسرین نوش پانچ برس کی تھی جب اس جزیرہ میں پہلے پہل آئی۔ تیرہ برس سے اسی طرح، خوشبوؤں میں، آرام میں، ناز و نعم میں، بے فکریوں میں، لاڈ اور پیار میں زندگی بسر کر رہی ہے، اور مجہول غیر مجسم خیالات میں مستغرق رہ کر، دن ہنسی کے ساتھ، اور رات متبسم خواب میں گزارتی ہے۔

لیکن ایک صبح خلافِ معمول اُس کے دل میں ایک جلن محسوس ہوئی۔ اُٹھی، کاشانۂ بلّور کے قریب جو نہر بہتی تھی اُس تک گئی، اور نہر کے اندر جا کر لیٹ گئی اور دیر تک اُس میں بے حرکت پڑی رہی۔ پھر نکل کے اور بدن کو سُکھا کے، سفید ریشمی بستر پر جا لیٹی۔

نسرین نوش پر ایک سخت نیند غالب ہوئی، اور وہ شام تک سوتی رہی یہاں تک کہ سورج ڈھلا، سورج کی شعاعیں اس پر آکر پڑیں اور وہ جاگی۔ اس وقت اُس کی طبیعت ایک ایسی شے چاہتی تھی، ایک ایسے مبہم وجود کی آرزو کر رہی تھی جو اس کے بازوؤں کو پکڑ لے، کمر کو سنبھالے، اس کے جسم کو اُٹھالے۔ ایک غیر معنی تمنا اس کے دل میں پیدا ہو رہی تھی، اور اس کا دل چاہتا تھا کہ ایک ذات، ایک وجود ہے، جو اس پر قادر ہو، جو اس پر حاوی ہو۔

اُس نے دیکھا کہ اُس کے پاس ایک سفید براق ہنس پھر رہا ہے۔ اُسے ہی اُس نے گود میں لے لیا، اور اُس کے سفید سینے کو اپنے دھڑکتے ہوئے سینے سے لگا لیا۔ اور اُس کی گردن کو اپنی گردن سے ملا دیا۔ اور اپنی تمام قوت سے اُسے بھینچنا شروع کیا۔ اور اس طرح پرند کے نرم پروں میں، اپنی آنکھوں کو کچھ کھولے، کچھ بند کئے، بدن کو جھکائے دیر تک بے حرکت پڑی رہی۔

نسرین نوش، ان خوشبوؤں سے، ان رنگوں سے، ان پھولوں سے، ان کھیل تماشوں سے، اُکتا گئی تھی اور ان سے چھٹکارا چاہتی تھی۔

اب پھولوں کا اس پر نثار ہونا، اس کی روح کو مشغول نہ کرتا تھا۔ ناچنے والیوں کے ناچ اور عشوے اور غمزے اس کے دل کو نہ بہلاتے

ننھے ہسیلیوں کا اُس کے بدن کو ملنا، اُسے آرام نہ دیتا تھا۔ وہ ایک شئے تلاش کرتی تھی جسے وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کیا ہوگی کیا نہ ہوگی، ایک مبہم چیز چاہتی تھی جو اُسے دُکھ دے، اُس کے دل میں درد پیدا کرے، احساس پیدا کرے، اُسے مسل ڈالے۔ ایک ایسی پُر قوت، پُر جرأت شئے کہ باوجود اُس کے حسن و جمال کے، باوجود اس کے کہ وہ جزیرے کی ملکہ تھی، اُس سے نہ دبے، اُس کے رعب میں نہ آئے، بلکہ اُسے پکڑے، اُسے مارے، ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔

خارستان

تاڑ، برگد، سال، چیڑ اور ببول وغیرہ درختوں کے ایک اصلی اور قدیم جنگل میں سوکھے پتوں پر درندوں کے چلنے کی آواز، بیچ جنگل سے سے اُٹھنے والی آندھی کے شور سے مل کر، سمندر کے خروش سے باتیں کر رہی تھی، ہر زندہ شئے، اس فریاد کار ظلمت میں، تدارکِ غذا، و گذرانِ زمان کے لئے کبھی شیرانہ جرأت سے کام لیتی تھی، اور کبھی ایک بودی جھجک سے کانپ اُٹھتی تھی۔

ساحل کے قریب جہاں جنگل ختم ہوتا ہے، ایک تنہا موقع پر، ایک چٹان کے کنارے ایک مرد، غمگین، بے حرکت، حائل ہیں شام کے وقت شام کے ستارہ پر نظر گاڑے ہوئے ہے۔ چہرہ کی سُرخی اس بات کا ثبوت دے رہی ہے کہ رگوں میں پُرصحت خون دوڑ رہا ہے۔ کندھوں تک لٹکے ہوئے بال گھنے اور چمکدار ہیں اور بتا رہے ہیں کہ جسم کا نشوونما جوش پر ہے۔

اس مرد نے انگڑائی لی، اور دُور سے ایک شیر کی گرج کو مُسکرا کے سُننا شروع کیا...... . . . .

آریاؤں، اور ہندوستان کے قدیمی باشندوں کے قدیمی باشندوں سے بھی پہلے، ایک قبیلہ ہندوستان سے ہجرت کر کے لنکا کے جزیرے میں جا بسا تھا۔ اس قبیلہ کی بے تاب طبیعت نے ایک خاندان کو مجبور کیا، کہ جزیرہ سرندیپ سے نقلِ مکان کر کے، اللہ توکل کسی نئے مقام کی تلاش میں نکل پڑے۔ کچھ لنکا میں زندگی کی دشواریاں کچھ قدیم انسان کی سیماب دار طبیعت، الغرض کہ یہ سرندیپ میں بھی نہ ٹھہرے، چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں سوار ہو کر اپنے تئیں بحرِ ناپیدا کنار کے سپرد کر دیا۔ سمندر کے طوفانوں نے بہت سی کشتیوں کو غرق کر ڈالا، صرف ایک کشتی جس میں رئیسِ قافلہ کا بیٹا خارا، اور سات آدمی اور تھے، جزیرۃ العرب کے جنوب غرب میں ایک خالی جزیرہ کے کنارے آ لگی۔ عورتیں کچھ تو سمندر میں ڈوب چکی تھیں، دو ایک جو بچی تھیں وہ مصائبِ سفر سے جانبر نہ ہوئیں۔ خارا کی عمر اس وقت چار برس کی تھی۔ ان سات آدمیوں نے جو اس جزیرہ تک پہنچے تھے، اُس قسمت کی ضد پر جس نے اُنھیں اس جزیرے میں لا پھنسایا تھا، اور گذشتہ پُرلطف زندگی کی یادگار کے طور پر اس بچے کو نہایت چاؤ اور پیار سے پالا۔ کشتی میں جس قدر آلات و اسلحہ تھے، یہ لوگ انھیں لے کر نکلے تھے، اور سب سے پہلا کام جو انھوں نے کیا وہ یہ تھا کہ خارا کی حفاظت کے لئے زیرِ زمیں غار نما ایک گھر بنایا اور ایسا انتظام کیا کہ اس میں بھیڑیا، چیتا وغیرہ کوئی درندہ نہ گھس سکے۔ ان سات آدمیوں میں سے ایک آدمی ہر وقت خارا کی حفاظت کے لئے رہتا تھا، باقی صید و شکار کو نکل جاتے، شکار کا گوشت، اور بکریوں کا دودھ لا کر، اس بچے کو پالتے تھے۔ خارا نے پہلی بات جو سیکھی وہ اپنے تئیں درندہ حیوانوں سے بچانے کے لئے ان کا مقابلہ کرنا تھی۔ ابھی جزیرہ میں آئے چھ ہی مہینے ہوئے تھے کہ ایک دن خارا کے محافظ کو بڑی مسرت کا دن نصیب ہوا یعنی غار کے سامنے سے ایک چڑیا اُڑ کر جا رہی تھی، خارا نے ایک پتھر کھینچ کے مارا، جس سے چڑیا زخمی ہو کر زمین پر آ پڑی۔ اس واقعہ پر بڑا جنگل میں منگل کیا گیا، اور ان ساتوں آدمیوں نے مل کر اپنے رئیس زادے کی شان میں گانے گائے۔

اب خارا ہر شئے کو جس پر اُس کا بس چلتا، توڑتا، پھوڑتا، مارتا، اُکھاڑتا تھا، کسی چڑیا کا گھونسلا ہاتھ لگ جاتا تو اُسے توڑتا، انڈے

کو بھوڑتا، بچوں کا گلا مروڑتا تھا۔

ایک دن (کئی سال کے بعد) خارا نے پہلی دفعہ ایک بارہ سنگھا شکار کیا، ایک بڑا پتھر اس کے سر پہ مارا جس کی ضرب سے بارہ سنگھا گر پڑا، خارا اُسے کھینچ کھینچ کر غار تک لایا، اور اپنے ساتھیوں کو فخر کی ادا سے دکھایا۔ اُس دن ساتھیوں نے پھر عید منائی اور خوشیاں کیں۔ اس بارہ سنگھے کے سر کو غار کے منہ پہ لٹکایا۔ خارا نے اس کی کھال سے جسے اُس نے خود صاف کیا اور سکھایا تھا، اپنے لئے ایک لباس بنایا۔ یہاں ہر طرف کانٹے، ہر طرف پتھر تھے اور پتھریلی زمین، اُونچی چٹانیں، خوفناک گھاٹیاں، اس جزیرے کی اجزائے ترکیبہ تھیں۔ جب کبھی آندھی اُٹھتی تو جزیرے کے اُونچے اور تناور درختوں میں سائیں سائیں کر کے شور مچاتی۔ کسی دن آندھی کی شدت سے درخت ایک دوسرے سے ٹکراکر، پتھر اُڑ اُڑ کر طغیانی انگیز سمندر میں گرتے تھے، اور جزیرے کے درندوں کا شور، سمندر کے پرندوں کی چیخوں سے مل کر ایک محشر ہیجان پیدا کرتا تھا۔ اس وقت اس گوشۂ عافیت یعنی خارا کے غار میں ایک عمیق خوف طاری ہوتا تھا۔ خارا اور اُس کے ساتھی، ایک دوسرے سے ملے ہوئے، ناامیدی، نفرین، اور ڈر کے ساتھ اس وحشی غلغلہ کو سنتے تھے اور کانپتے تھے۔

کسی رات موسلا دھار مینہ پڑتا، اور پانی ریلا کرتا ہوا، اس غار تک آتا، بجلی چمک چمک کے، تڑپ تڑپ کے، بادل گرج گرج کے اس جزیرے کو گھیر لیتے، قدرت کے اس شور و شغب میں، شیر کی ڈکار، ہاتھی کی چنگھاڑ، اور درندوں کی چیخ پکار قیامت برپا کر دیتی تھی، کبھی جزیرہ کی ایک طرف کوہ آتش فشاں آگ اُگلتا، اور اپنے چاروں طرف ہر زندہ شئے کو جھلسا دیتا تھا۔

ہر طرف کانٹے، ہر طرف پتھر تھے۔ یہ سات آدمی تدارکِ معیشت کے لئے صبح نکلتے تھے اور شام کو واپس آتے تھے، مگر اس طرح کہ کانٹوں سے پاؤں زخم کھائے ہوئے، ہاتھ چھدے ہوئے، چہرے چھلے ہوئے، غار میں بیٹھ کر اُن زخموں کو دھوتے، لیکن اس وقت ان زخموں کو دھونے، اور چہرے اور ہاتھوں کو روغن ملنے کے لئے، عورت کے ہاتھ کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ اس ضرورت کو محسوس کر کے، ان میں کا ایک بڈھا آدمی، غار کے سامنے کے ایک پتھر پر بیٹھ جاتا اور سفید لٹوں کو ہلا ہلا کے، اور زخمی سینہ کو کھول کے، سمندر کی پرشور اور ظالم موجوں کی طرف گھورتا تاتا، اور قسمت پر لعنت بھیجتا۔

خارا اس آفتاب کے تلے، اس کٹھن پتھریلی زمین پر، ان درندے حیوانوں میں پلا تھا، اس کے ہاتھ سینکڑوں مرتبہ چھل چکے تھے، سینہ پہ ہزاروں مرتبہ کھرچیں لگی تھیں، چہرہ تمتما کے تانبہ ہو گیا تھا۔

غرضکہ ہر طرف کانٹے۔ ہر طرف پتھر تھے، کبھی اُس کے خون کا جوش اُسے آدھی رات کو خواب سے بیدار کر کے باہر لے جاتا، اور ایک سائر فی المنام شاعر کی طرح جو فضائے نامتناہی کی سیر کر رہا ہو، خارا بھی ایک چٹان پر بیٹھ کر خیالات میں غرق ہو جاتا، یہ ظاہر ہے کہ خیالات اس جزیرے اور خارا کی کل زندگی کی مناسبت سے پُر حدت ہوتے تھے، لیکن یہ عجیب بات تھی کہ کبھی کبھی، نرم و نازک خیالات ایک سفید چھوٹی چڑیا کی طرح اس کے دماغ کے سامنے اُڑتے نظر آتے تھے، اور کبھی اس کی سیاہ آنکھوں کے سامنے اس طرح مجسم ہوتے تھے جیسے ہوا چل رہی ہو اور درختوں کا متحرک سایہ کانپ رہا ہو۔

خارا کی عمر اس وقت بیس برس کی تھی، حسیات کا ہجوم تھا اور راتیں اکثر وہ کسی پہاڑی پر درختوں میں گزارتا۔

ایک شام کو غار میں آیا اور بستر پہ جا پڑا، تین دن تک بخار میں بیہوش پڑا رہا۔ اس بخار کی حالت میں اس کی پیاس بجھانے کے لئے اور سوکھے ہونٹوں کو تر کرنے کے لئے، اُس کے ساتھی اُسے جگا کر پانی دینا چاہتے تھے مگر وہ نہیں جاگتا تھا۔ اس وقت وہ بڈھا اپنے سوکھے ہاتھوں کو جس میں رگیں اُبھری ہوئی نظر آتی تھیں اُٹھا اُٹھا کے کہتا: "آہ! ایک عورت! ایک عورت" اور پھر خارا

کی تیمارداری کرتا۔ آخر خارا نے آنکھیں کھولیں اور اس کی حالت بہتر ہونی شروع ہوئی، تاہم نقاہت باقی تھی، ایک شام، یہ ہمراہی خارا کے بستر کے گرد بیٹھے ہوئے تھے، کہ بڈھے نے ایک پرانا راگ جسے وہ مجھول نہیں گیا تھا، گنگنانا شروع کیا:۔

"جینا تو ایک نیند ہے پیارے، پریم ہے اُس کا سپنا"

خارا نے پوچھا:۔

"جینا کیا چیز ہے؟"

بڈھے نے جواب دیا "پریم"

"پریم کیا ہے؟"

"عورت"

اس طرح خارا سوال، اور بڈھا توضیح کرتا تھا۔ غرضکہ نوجوان کو معلوم ہُوا کہ زندگی میں کانٹے اور پتھر ہی نہیں ہیں، بلکہ پھول اور خوشبو بھی ہیں، چیرنا، پھاڑنا ہی نہیں، بلکہ ملنا اور گلے لگانا بھی ہے۔

اس کے بعد یہ نوجوان اپنے ہمراہیوں سے اکثر علیحدہ رہتا، اور اکثر سوچا کرتا، دن میں اسے اکثر کوئی نہ دیکھ سکتا تھا۔ کسی تنہا جگہ پر نکل جاتا، اور وہاں ایک مرمر کے ٹکڑے کو لے کر، بڈھے کی بیان کی ہوئی تصویر کے موافق ایک مورت بنانا شروع کرتا، جس کی پوری شکل اس کے خیال خانہ دماغ میں پھرتی ہوتی تھی۔ پہلے سر بنایا، پھر سینہ تراشا، پھر ہاتھ نکالے۔ اس جزیرے کی چٹانوں میں اور سمندر کے کنارے فیروزہ، الماس، لعل، یاقوت وغیرہ چمکدار اور رنگین پتھروں کی بہت کثرت تھی۔ خارا نے اُنھیں جمع کرکے، اس کی مُورت کی آنکھیں سفید اور سیاہ الماس سے، دانت موتی سے ہونٹ لعل و یاقوت سے بنائے۔ ایک برس کامل اس شغل میں، بڑی حرص اور بڑے شوق سے مشغول رہا۔ ایک دن ہمراہیوں نے آکر اسے دیکھا اور بہت تعجب کیا، لیکن بڈھا ہنسا اور کہنے لگا: "اچھی ہے مگر حقیقت سے بہت دور ہے،" تاہم خارا کے لئے یہ مورت ایک بدیعہ خیالی تھی۔ اس نوجوان نے اپنے حسیات کی تمام قوت اس مرمر میں صرف کی تھی۔ صبح سے شام تک نظر اس مورت پر گاڑے رہتا اور اس درجہ مستغرق ہوتا کہ ہمراہی کھانے کے وقت آکر اسے جبراً وہاں سے لے جاتے، اور اس وقت بھی خارا مورت کی طرف ہاتھ بڑھاتا اور پُرشوق نظریں اس پر ڈالتا۔

اس طرح مہینے گذر گئے۔ خارا، پتھر اور سلیں جمع کرتا تھا، اور اپنے خواب، اور خیالوں کی تصویریں ان پتھروں سے بنانا چاہتا تھا لیکن اُسے خوف تھا تو صرف اس بات کا کہ بڈھے کے اعتراض اور استہزا سے یہ بچیں گی یا نہیں کبھی کبھی ایک مورت بناتا، وہ ٹھیک نہ ہوتی، اُسے توڑ دیتا، دوسری شروع کرتا۔ کبھی دوڑا دوڑا، بڈھے کے پاس آتا اور اس سے سوال کرتا: "پھر بتاؤ، عورت کیا ہوتی ہے، کیسی ہوتی ہے؟" بڈھا دور بادلوں پر اپنی نظر گاڑکر، اس کے سوال کا جواب دیتا، اور کہتا "عورت! عورت آدھا میوہ، آدھا پھول ہے" پھر چپ ہو جاتا اور رونے لگتا، خارا گھنٹوں اس بڈھے کی آنکھوں پر سوالی کی نظر ڈالے ہوئے، اس کی باتوں کو سنتا تھا اور سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ بڈھا اُٹھ کر، خارا کو لے کر، جنگل میں ایک طرف جاتا، اور کسی تاڑ کے نیچے دو جڑانے، اپنی گردن ایک دوسرے سے ملائے کھڑے ہوتے انھیں دکھاتا اور کہتا: "دیکھتے ہو، سمجھتے ہو؟ بس!"

خارا کچھ نہ سمجھتا، اور پھر سوالی آمیز نظروں سے بڈھے کے چہرے کو دیکھتا، خارا نے کئی مورتیں تراشیں، اس میں وہ بغیر اُستاد کے محض اپنی طبیعت کے زور سے ماہر ہو گیا، بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اُس نے خود ہی یہ فن ایجاد کیا۔ اس کی حاصلِ عمر، یہ مورتیں تھیں، اور وہ ان سے بیحد محبت کرتا تھا، محبت ہی نہیں پرستش کرتا تھا۔ یہ مقام گویا، اس کا معبد تھا۔ مبارزۂ حیات سے تنگ کر، یہاں آتا، اور گھنٹوں بہت

نظروں سے ان مورتوں کو دیکھا کرتا، اور سوچا کرتا کاش یہ مورتیں سمندر پار کی حقیقت سے خبردار کریں، اور بتائیں کہ اس پُرطوفان سمندر کے اُس طرف، ان مورتوں جیسی زندہ مخلوق ہے کہ نہیں۔ کبھی اپنے خیالات کے تخیل کرنے سے عاجز ہو جاتا، تو غصہ میں آ کے، ایک سباعانہ وحشت سے، کسی مورت کو توڑ ڈالتا پھر رنج کرتا اور جنگل کھڑا ہوتا، اور جو جانور ملتا، اُسے بعنوانِ انتقام مار ڈالتا۔

رات کا وقت تھا، گھنے درختوں میں، خارا چیتے کی کھال بچھائے بیٹھا تھا کہ اتنے میں پاؤں کی خفیف آہٹ سنائی دی، تھوڑی دیر میں آہٹ زیادہ واضح ہوئی۔ اُس نے سر پھرایا تو دیکھا کہ ایک بارہ سنگھا آ رہا ہے، اتنے میں ایک لومڑی نکلی، بارہ سنگھے نے اپنے سینگوں پر لومڑی کو اُٹھا کے پھینک دیا۔ یہ بارہ سنگھے کی شوخی، اور کلیل تھی۔ لیکن یہ شوخی اور کلیل بہت دیر تک نہ رہی کیونکہ ایک تیندوا بارہ سنگھے پر لپکا، بارہ سنگھے نے اپنی جان بچانے کے لئے بھاگنا شروع کیا۔ خارا، نہایت شوق سے اس گیر و دار اور بھاگ دوڑ کو دیکھ رہا تھا۔ بارہ سنگھا اپنی تمام قوت سے دوڑ رہا تھا، یہاں تک کہ تھک کر اس کی رفتار میں سستی معلوم ہوئی، پسینہ میں شرابور ہو گیا اور ہانپنے لگا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود اُسے اپنی جان کی سلامتی کی اُمید نہ رہی تھی۔ پندرہ منٹ کے اندر، تیندوا بارہ سنگھے تک پہنچ گیا اور اُسے دبوچ لیا۔ خارا تعجب کر رہا تھا کہ بارہ سنگھا بہت جلد مغلوب ہو گیا، اور اس کا دل چاہتا تھا کہ بارہ سنگھے کو کسی طرح مدد پہنچائے کہ اتنے میں ایک گرج سنائی دی اور ایک بڑا سایہ جھپٹتا نظر آیا، سر پھرایا تو گیا دیکھتا ہے کہ یکہ تازِ میدانِ شجاعت، بادشاہِ بیابانِ وحشت یعنی شیر چلا آ رہا ہے۔

شیر نے، تیندوے اور بارہ سنگھے پر، ایک پُر غیظ و غضب نظر ڈالی، اور پھر ایک پُرہول ڈکار کے ساتھ چھلانگ مارتا نظر آیا، تیندوا پہلے تو باوجود اپنی تھکن اور ضعف کے، ہرچہ بادا باد آمادۂ مقاومت معلوم ہوتا تھا، لیکن شیر کی زہرہ ریز گرج نے جو اُس نے اپنی تمام قوت سے کی تھی، تیندوے کے حواس باختہ کر دیئے، اور وہ محجوب اور منفعل، کانپتا ہوا، اپنا شکار، اور اپنی نخوت شیر کے لئے چھوڑ گیا۔ تھوڑی دیر تو تیندوے نے آثارِ غصہ ظاہر کئے تھے اور اُس کی طرف گھور کے دیکھا تھا، لیکن شیر کی آتش ریز آنکھوں سے کون آنکھیں ملا سکتا تھا۔ ان آنکھوں کا دوچار ہونا تھا، اور گرج کا نکلنا تھا کہ تیندوے نے ہار مان لی۔ شیر نے، بارہ سنگھے کے جسم پر اپنے پنجے گاڑ کر، اُسے ٹکڑے کرنا شروع کئے۔ خارا جو اس سے پہلے بارہ سنگھے اور تیندوے کی کشمکش بے پروائی اور بغیر خوف کے دیکھ رہا تھا، اب ذرا سنبھل بیٹھا۔ اُس کے دل میں خوف اب بھی نہ تھا، لیکن ذرا احتیاط سے بیٹھا ہوا تھا۔

اب شیر لپ لپ کر کے خون پی رہا ہے، ہڈیوں کو چبا رہا ہے۔ اور جھوم رہا ہے۔ غلبہ اور کامیابی کے نشہ میں، اپنی دُم دائیں اور بائیں مار رہا ہے۔ اور اس پُرلطف ضیافت کو کھاتے وقت، مزے میں آ کر کبھی اپنا سر اٹھا کے اُوپر کو دیکھتا ہے۔

ایک دفعہ اُس نے اپنی دُم اُٹھا کے، اور اپنے اگلے پاؤں، بارہ سنگھے کے مُردہ جسم سے ہٹا کے نظرِ تفتیش سے اِدھر اُدھر دیکھا، اور پھر اُس کے سر اور اُن ہڈیوں کو جن پر ابھی گوشت باقی تھا، چبانے کے لئے وہاں سے گھسیٹ کر لے جانا شروع کیا، اتنے میں شیر کی نظر خارا پر پڑی، اور اس زورِ خونخوار طاقتور مخلوق کی آنکھیں، اس جزیرے کے جوان انسان سے دوچار ہوئیں۔ آدھ گھنٹہ پہلے خارا اس احتشام مجسم یعنی شیر کو، اس کی ہیبت اور طاقت سے متأثر ہو کر دیکھ رہا تھا، اور اس غالب مغرور کی دل میں عزت کر رہا تھا۔ لیکن اس وقت جبکہ شیر اس کے سامنے تھا، اس وقت ایک قدرتی جوش مقابلہ سے وہ اس کی طرف بڑھا، شیر بھی جاتے جاتے رُک گیا، اور شاخوں اور پتوں کو اپنے پاؤں کے نیچے دباتا، توڑتا، اور کھڑ بڑ کرتا ہوا خارا کی طرف چلا۔ غرضکہ لڑائی کی ٹھن گئی، اور خارا نے شیر کے بائیں طرف سے اُس پر حملہ کرنے کی ٹھہرا لی۔

شیر نے سر اُٹھا کر پھر اُسے دیکھا، اور اس پر کودنے والا ہی تھا کہ خارا نے ایک سیکنڈ رائگاں نہ کر کے، کمان کو پوری طاقت سے کھینچ تیر چھوڑا۔ تیر ایک ہوا چاک سرسراہٹ سے اُس کی طرف گیا اور گردن میں گھس گیا۔ اس کے ساتھ ہی خارا نے اپنی ڈھال سنبھال کے

اور ایک ہولناک "ہاؤ" کا نعرہ مار کے بائیں طرف پھرتی سے پھر کر، اپنا گرز شیر کی گدی میں جو چھلانگ مار کر اس پہ چھا گیا تھا، مار۔ پھرتی اور طاقت خارا کے جسم میں بچپن سے ایسے مشاغل میں رہنے کی وجہ سے ہم جیسے آدمیوں کی نہ تھی۔ پس اس نے ادھر اپنی تمام قوت بازو سے گرز مارا، اور اُدھر اپنی کمر سے برچھی نکال کے، اب مارے غصے کے دیوانہ شیر کے پیٹ میں پوری گھسیڑ دی، اس دفعہ، اس درندہ جانور نے پیچ کھا کے، خارا کے بائیں بازو کو پکڑنا چاہا، لیکن اس کے منہ میں خارا کی ڈھال جو وہ بائیں ہاتھ میں لئے ہوئے تھا آ گئی، اور شیر نے شدت غضب اور درد میں اسی کو چبانا شروع کیا، لیکن اس عرصہ میں بیحد خون شیر کے جسم سے نکل چکا تھا، اور اس پر ضعف طاری ہونا شروع ہو گیا تھا۔ خارا نے ایک دفعہ پھر پہلے کی طرح نعرہ مار کے، اور پہلی جیسی قوت سے برچھی کو گھسا دیا، آخر کار، شیر اپنی غرور جنسی کے باوجود، زمین پہ آ رہا۔ لیکن نوجوان نے اس گرنے کو اور اس مغلوبیت کو حیلہ تصور کیا، اور برچھیوں پہ برچھیوں کھوا کرتا رہا۔

مگر اب شیر کی زرد، بے نور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، پنجے پھیلے تھے، منہ بتیر نفس کے کشادہ تھا جس میں سے اس کے بڑے دانت باہر نکلے ہوئے تھے، جو خون سے سرخ ہو رہے تھے۔ یہ وہی شیر تھا جس کی مہیب آواز اندھیری راتوں میں ہر جاندار کو کنپا رہی تھی، وہی شیر اب اس کے پاؤں کے تلے مسکین حالت میں پڑا ہوا تھا۔ یہ خیال خارا کے دل میں گذرا، تو اس کا سینہ ایک مسرور غرور جلاوت سے اُبھرا، اور وہ ایک خود کام نمائش کے ساتھ، اپنی تیر و کمان، ڈھال، برچھی اور گرز کو ایک جگہ رکھ کے نہایت فخر کی ادا سے شیر پہ بیٹھ گیا، اور متخیل اور متفکر نظروں سے مشرق میں آہستہ آہستہ اُبھرتے ہوئے نور پاش ماہتاب کو دیکھنے لگا۔

رات کی سیاہ پلکیں کھلنے کے بعد، صبح کا رنگین نور، آسمان میں اِدھر اُدھر سنہری تیر پھینک رہا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ تیر تیز اور پرحدت ہونے شروع ہوئے۔ اور نوجوان کی آنکھیں صبح کے وقت، اور موقع اور گذشتہ واقع کی یاد سے پرنور، اور اس کا دل، دور سے دکھائی دینے والے سمندر کے شور کو سن سن کر، ذوقِ حیات سے متلذذ ہو رہا تھا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہے کہ نہایت پھڑپھڑاہٹ کے ساتھ، رنگوں میں لپٹی ہوئی ایک شے، صبح کے ایک مجسم ٹکڑے کی طرح، ہوا میں تیرتی ہوئی، خارا سے کچھ دور زمین پر آ رہی۔ تھوڑی دیر میں، وہاں پہلے تو مشکوک اور مبہم اور پھر عیاں اور واضح ایک شکل لطیف پیدا ہوئی۔

خارا کا رفیق بڈھا، جب کبھی نہایت تھک جاتا، یا کسی اضطراب میں ہوتا، یا اور کسی تکلیف سے بیتاب ہو کر، "عورت..... عورت، عورت" کہہ کے آہیں بھرا کرتا تھا اور خارا پوچھتا تو بیان کرتا کہ وہ کیا شے ہے۔ غرضکہ یہ نازک شے، اس بڈھے کی بیان کی ہوئی چیز سے بہت ملتی تھی۔ اور (اس مورت سے، جسے اس نے بڈھے کی تعریف کے مطابق، پتھر سے تراش کے بنائی تھی) بہت مشابہ تھی۔ اس کو دیکھ کر نوجوان کا دل ایک عجیب پرشوق رقت سے کانپنے لگا۔ اور اس نے اس کی طرف اپنے ہاتھ بڑھا دیئے۔ اور سوچنے لگا کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں؟ اس کا دل چاہتا تھا کہ دوڑ کے اس سے جا ملے، اُسے پکڑے۔ لیکن اس سے شیر کی طرح لڑائی نہیں لڑنا چاہتا تھا، بلکہ یہ چاہتا تھا کہ یہ شکار جو اس قدر رنگوں میں، اس قدر محبت آمیز احتشام، اور ایسی نرماہٹ کے ساتھ زمین پہ آیا ہے، اس شکار کو آہستہ آہستہ جا کے نہایت ہلکے سے چھوئے، اور اسے خوف نہ دلائے، بلکہ پھسلا پھسلا کے، چمکار چمکار کے پکڑے۔ سوچا کیا میں ایسا کر سکتا ہوں؟ اور یہ سوچ کے، سب آلات حرب ایک طرف رکھ دیئے، اور دبے پاؤں اس کی طرف چلنا شروع کیا۔ دو قدم نہ رکھے ہوں گے کہ جیسے نسیم کسی چھوٹے پودے کو ہلاتی ہے، یہ خیال دلفریب بھی جنبش کھا کے بادلوں کی طرف ہٹنے اور خارا سے دور ہونے لگا۔ اور ایک منٹ کے بعد، زمین پہ چٹانوں کے ٹکڑوں اور پتھر کے روڑوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

عمر میں یہ پہلی دفعہ تھی کہ خارا رو دیا۔ خارا کو نہایت رنجیدہ حالت میں واپس آیا اور اپنے ساتھیوں کو ساری سرگذشت سنائی۔ ساتھیوں میں سے بعض کہنے لگے "یہ خیال تھا" اور بعضوں نے کہا: "نہیں، تم نے خواب دیکھا ہے"۔

شیرازہ

ہر طرف کانٹے، ہر طرف پتھر تھے۔ اب خارا سوچا کرتا تھا کہ کیا ان پتھروں اور کانٹوں سے رہائی ممکن ہے کہ نہیں، کیا اُس زخم کا جو اُس کے دل میں ہے کوئی علاج ہے کہ نہیں۔ دوسرے اُفقوں کو کشف کرنے، نئے شکار، شکار کرنے، اس کے قعرِ جان میں جو خالی ایک کونا محسوس ہوتا تھا، اسے بھرنے اُس کے دل میں جو ایک نامعلوم کمی تھی اُسے پُورا کرنے کی آرزو، اُسے پاگل کئے ہوئے تھی۔

وہ بیمار نہ تھا۔ کھانا پہلے کی طرح کھاتا ہے، بھوک کھل کے لگتی ہے، درندوں کا شکار پہلی طاقت و قوت سے کرتا ہے، زندہ رہنے کی خواہش قائم ہے، ہر لڑائی اور مقابلہ میں جیتنے کی خواہش باقی ہے۔ پھر یہ ہر جگہ اور ہر وقت جو کمی اُسے محسوس ہوتی ہے یہ کیوں؟ یہ کس لئے؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا، اُسے سمجھنا چاہتا ہے؟ لیکن اپنے ساتھیوں سے اس کا ذکر نہیں کرتا۔

جب یہ لوگ جزیرہ میں آئے تھے، اُس وقت سے اس وقت تک یہاں سے چھٹکارا پانے کے خواب تو بہت دیکھے، لیکن سمندر میں پہلی دفعہ مصیبت اُٹھانے کے بعد کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ پھر اُس طوفان خیز، بے رحم، کس ناشناس موجوں کو اپنی جان سپرد کر دے، پس سوائے اس کے کہ اس شکستہ کشتی کی تقلید میں جو انھیں اس جزیرے تک لے آئی تھی، ایک کشتی بنائیں، اس خانہ ویران قافلے نے اور کچھ نہ کیا۔ ہاں کبھی کبھی ساحل کے قریب خارا کو لے کر وہ ایک کشتی چلا کے مچھلیاں پکڑ لایا کرتے تھے۔

ایک رات جبکہ چاندنی کھلی ہوئی تھی، اور جزیرے میں خاموشی طاری تھی، خارا آلاتِ حرب، اور بہت سا خورد و نوش کا سامان لے کے، جزیرہ خارستان کو "خدا حافظ" کہہ، کشتی میں بیٹھ سمندر سے مقابلہ کے لئے چپکے سے نکل کھڑا ہوا۔

اور اپنے دل میں کہنے لگا "موت؟ آخر کیوں؟ کس لئے؟ کوئی وجہ نہیں، ہرچہ بادا باد، اس یکساں زندگی سے تو نجات ملے گی" یہ کہہ کے کبھی کشتی کھیتا، کبھی چھوڑ دیتا کہ کشتی اپنے آپ چلے۔ پو پھٹتے ہی اُس کی آنکھوں کو جو رات کی بے خوابی سے بے تاب، اور مخمور تھیں، دُور بہت، بہت دُور ایک نقطہ سا نظر آیا۔ اور خارا نے یہ اُمید کر کے کہ شاید یہ وہی ارضِ موعود ہے جس کے لئے اس کا دل و جان بیتاب ہے، خوشی خوشی کشتی کو اس کی طرف لے جانا شروع کیا، اور شام تک اپنی پوری کوشش اس میں صرف کرتا رہا، وہ اس قدر محو تھا کہ اُسے نہ معلوم ہُوا کہ تھکن کیا چیز ہے، نیند کیا شے ہے، بلکہ اپنے آپ اس کی طبیعت نے ایک گانا بنایا جسے وہ شوق سے گاتا رہا۔

سُنتا ہوں نگری نیکی ہے، اور سُندر ہے سنسار
"ناؤ تو چلیو پار، نیّا تو لگیو پار"

رات آدھی گذر چکی ہوگی، کہ یکایک۔ ایک بلبل کی نرم و نازک و شیریں آواز جسے عمر بھر میں اُس نے کبھی نہ سُنا تھا اُس کے کانوں میں آئی ایسی آواز کے نشہ سے مست ہو کر اُس نے کشتی چلانی بند کر دی، اور بے حس و حرکت بیٹھ کر اُسے سُننا شروع کیا۔ زمردیں ٹیلوں سے، بوئے گل، اور نوائے بلبل نسیم کے جھونکوں کے ساتھ ساحل تک آرہی تھی اور مستی اور خوشی پھیلا رہی تھی۔

اگرچہ چاندنی رات تھی، لیکن آسمان پر بادل ہونے کی وجہ سے، چاروں طرف کی چیزیں صاف نظر نہ آتی تھیں۔ خارا اس خفیف تاریکی میں، اس غیر معمولی حالت میں، اس راحت روح نغمہ و خوشبو کو بچّوں کی طرح ہمک کے لینا چاہتا تھا، لیکن ان سب سے مست ہو کر۔ آنکھیں اور ہونٹ کھولے، اسے بیچ کو ڈالے کشتی میں پڑا تھا۔ اس کے کان جو درندے حیوانوں کی بھولی آوازوں سے آشنا تھے، اب بلبل کا ترانہ سن رہے تھے، اس کا جسم جو کانٹوں اور پتھروں سے چھدا، اور چھلا رہتا تھا، پھولوں کی خوشبوئیں اُس جسم کو آ آ کر لپٹ رہی تھیں۔ اور اس پر ایک پُرلطف اور اشتیاق انگیز سستی طاری ہو رہی تھی۔ خارا اس قدر دلشاد تھا اور ایسا لطف اُٹھا رہا تھا کہ اس خوف سے کہ اس میں خلل نہ پڑ جائے،

کشتی میں ذرا نہ ہلتا تھا۔

جس وقت صبح ہوئی، اور گرد و نہ گلگونہ آفتاب، اپنے مطلع انتشار سے نکل کر آہستہ آہستہ اوپر کو بڑھا، اس وقت درختوں کے سبز پتے اور رنگ رنگ کے پھول چمک اُٹھے، اور پتوں پر قطرات شبنم موتی بن گئے۔ خارا اس سے بے خبر کہ کہاں آیا ہوں، اور اس سے غافل کہ کیا دیکھ رہا ہوں، متحیر نظریں چاروں طرف ڈال رہا تھا۔ اتنے میں درختوں کے پیچھے سے ایک گرد باد اُٹھی، اور قہقہہ اور زمزمہ کے ساتھ خارا کی طرف بڑھتی نظر آئی۔

نوجوان خارا، جو اب تک نہیں جانتا تھا کہ ڈر کیا چیز ہے، اس وقت ایک خلجان اور گھبراہٹ سے کانپنے لگا، اور ہر احتمال کے مقابلہ کے لئے تیاری کرنے لگا۔

یہ صرصر رنگ و سحاب، آہستہ آہستہ خارا جہاں کھڑا تھا، اُس سے کچھ فاصلہ پر سمندر کے کنارے آکر رُک گئی، اور جب خاک چھٹی، تو اس میں سے ایک جسم منور ظاہر ہوا۔ خارا پہلی نظر میں نہ سمجھ سکا کہ آیا آفتاب زمین پر اُتر آیا ہے، یا میں آسمان پر ہوں۔ یہ سمجھے بغیر کہ کیا کرنا چاہیئے، وہ اپنی کشتی سے نکلا، اور حسب معمول، "اُسی ہاؤ" کے ساتھ اُس نے اُس پر حملہ کیا، کہ یکایک ایک تیر نے سامنے سے آکر خارا کو زخمی کر دیا۔

نسرین نوش اپنا دل بہلانے کے لئے، اکثر اپنی ماں سے اجازت لے کر شکار کو نکلا کرتی تھی، اس صبح کو، اپنی سہیلیاں پیچھے چھوڑ کر وہ بہت آگے نکل گئی تھی، اور آخر کار تھک کر ساحل تک شکار اور غسل کے لئے آئی تھی۔

خارا جیسے مجہول، اور غیر معلوم شکار کو دیکھ کر، اُس نے فوراً اس پر تیر چھوڑا تھا جس سے یہ شکار زخمی تو ہوا، لیکن نسرین نوش نے دیکھا کہ زخم کھا کے وہ اس کی طرف جھپٹا، اور قبل اس کے کہ دوسرا تیر چھوڑے، اُس نے اپنے تئیں شکار کی آغوش میں پایا، اور شکار و شکار کرنے والی کی نظریں، ایک آتش ریز حرارت کے ساتھ ایک دوسرے سے ملیں۔ نسرین نوش سمجھتی تھی خارا کوئی نیا شکار ہے، خارا سمجھتا تھا نسرین نوش کوئی شکار کرنے والی چڑیا ہے۔ مگر نہ معلوم کیا بات تھی، اور کیا سبب تھا، ان کی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ کیوں اُن کی نظروں میں ایک دوسرے کے لئے کشش تھی۔ دونوں کے دلوں میں گھبراہٹ تھی، جانے کیسے، خارا کی فریاد سے نسرین نوش، اور نسرین نوش کی پرملتجیانہ مسکراہٹ سے خارا نے سمجھ لیا کہ ہم ہم جنس ہیں۔ نسرین نوش کا نرم ریشمیں لباس بارہ سنگھے کی کھال کے کپڑوں میں جسے خارا پہنے ہوئے تھا پھنس گیا، دونوں نے اُسے چھڑانا چاہا، مگر دیکھتے کیا ہیں، کہ ایک کا ہاتھ، دوسرے کے ہاتھ میں ہے، اور ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کو محبت سے دبا رہا ہے۔

خارا نے اپنے اُوپر جو نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ تیر کے زخم سے خون نکل رہا ہے، کچھ اس تردد سے کچھ نہ معلوم کیوں، خارا نے اپنے کل ہتھیار زمین پر ڈال دیئے۔ نسرین نوش کے ہاتھ سے بھی حیرت کی وجہ سے تیر گر پڑے۔ اب ان دونوں میں اپنے آپ، ایک بے تکلف، بے مراسم، مگر اسرار انگیز آمیزش نہانی پیدا ہو گئی۔ نسرین نوش اس سے پوچھ رہی تھی: "تو کیا ہے؟ کہاں سے آیا ہے" اور خارا اشاروں سے کہہ رہا تھا: "دور سے آیا ہوں، کانٹوں سے، پتھروں سے آ رہا ہوں"۔ ہاتھوں کے ملنے سے، نوجوان خارا کے جسم میں ایک عجیب برقی حرارت سرایت کر گئی تھی، جس کی وجہ سے وہ کانپ رہا تھا۔ ادھر خون نکلنے کی وجہ سے، اس کے چہرہ کا رنگ اُڑا جا رہا تھا۔

نسرین نوش نے آہستہ آہستہ تیر، خارا کے پہلو سے نکالا۔ خون کو اپنے کپڑے سے پونچھا، اور زخم دھویا، پھر جا کے قریب سے چند پتے لا کے زخم پر باندھے۔ انہیں باندھتے وقت، نسرین نوش جو خارا پر جھکی تو ایک مرتبہ پھر اُن دونوں کی نظریں، نظر بن گئیں۔ ان دونوں کی روحیں، ایک مبہم شوق کے ساتھ، ایک دوسرے سے ملیں، اور اس دفعہ دونوں کی آنکھوں میں سے ایک جاں فروز چمک، ایک دل سوز چنگاری نکلی، موجیں ساحل کی طرف کیسے آتی ہیں؟ آفتاب، کائنات پر کس طرح روشنی ڈالتا ہے؟ شہد کی مکھی کس طرح پھولوں کی طرف جاتی ہے؟

بس بالکل اسی طرح، ان دو بیگانہ روح آشنا کے ہونٹ، ایک قدرتی کشش، ایک قدرتی شوق کے ساتھ، ایک دوسرے سے ملے۔ یہ جزیرہ وگو، بے انتہا خوبصورت تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ ایک گراں خواب میں سو رہا ہے، اور ہمیشہ سے کسی چیز کا انتظار ہے۔ ان دونوں کا ایک دوسرے کا بوسہ لینا تھا، کہ جزیرے کے پرندے، چہچہا کر اُڑنے لگے، تمام کلیاں، ایک دم کھل گئیں، ایک گرم آہنگ و رنگ، ایک زمزمہ جوش و خروش نے کل جزیرے کو گھیر لیا۔ اس وقت دونوں، (خارا و نسرین نوش) مدہوش و بے خبر پڑے ہوئے تھے۔ خارا کو ایک ایسی خوشی حاصل ہو رہی تھی، جو اس نے تمام عمر میں اب تک محسوس نہیں کی تھی۔ اور اس نشہ کی لذت سے، اس کی آنکھوں کی پتلیاں چھپی رہی تھیں، آغوش کھلی ہوئی تھی، سینہ سانس کی وجہ سے اُبھر رہا تھا اور دل ایک ننھی چڑیا کی اُڑان کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔

پہلے نسرین نوش ہوش میں آئی تو دیکھا کہ اس کے ہونٹوں پہ، جہاں خارا نے بوسہ لیا تھا ایک پھول کھلا ہوا تھا، یہ کیا؟ اس نے سوچا تو یاد آیا کہ ایک مرتبہ، جب وہ سو نہیں رہی تھی، بلکہ آنکھیں بند کئے تھی، اور اس کی ماں حسب معمول اُسے دیکھنے آئی تھی، تو اس نے کہا تھا: "خدا نہ کرے، مجھے خبر ہوئے بغیر، یہاں کوئی مرد آئے، لیکن اگر آیا تو مجھے معلوم ہو جائے گا، کیونکہ اگر اس نے میری بیٹی کا بوسہ لیا، تو بوسہ کی جگہ پھول کھلیں گے اور اس سے مجھے پتہ لگ جائے گا۔" ماں کی یہ تقریر جب نسرین نوش کو یاد آئی، تو وہ گھبرائی، ایں یہ تو مرد ہے! یہ وہ چیز ہے جس سے میری ماں مجھے بچانا چاہتی تھی، اب کیا کروں؟ یہ تو بڑا غضب ہو گیا۔ بڑی بُرائی ہوئی، مگر بُرائی کہتے وقت دل کہتا تھا: "اگر بُرائی ہے، تو شیریں اور پُر لطف بُرائی ہے۔"

اب نسرین نوش ہزار طرح سے خارا کو سمجھانا چاہتی ہے، کہ ماں آئے گی تو تجھ پہ بہت خفا ہو گی، جا، جہاں سے آیا ہے، وہاں بھاگ جا لیکن خارا، نہ سمجھتا تھا، نہ سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ آخر عاجز ہو کر نسرین نوش رونے لگی، اور آنسو اُس کے سُرخ رخساروں سے ڈھلک کے زمین پر گرنے لگے۔ یہ آنسو گرتے ہی، موتی بن جاتے تھے۔

خارا اس رونے سے بھی کچھ نہ سمجھا، بلکہ پہلی لذت کا جو اثر دماغ میں بسا ہوا تھا، اس سے متاثر ہو کر، پہلے جوش و اشتیاق کے ساتھ نسرین نوش کو آغوش میں لے کر، اُن رونے والی، آنسوؤں سے تر آنکھوں کو چومنے لگا۔ اور جب نسرین نوش نے اپنے ہاتھوں سے، اُسے اپنے پاس سے ہٹانا چاہا، تو خارا نے، ہاتھوں ہی کو پکڑ کے چومنا شروع کر دیا۔

نسرین نوش، اس وحشی مگر فسوں کار، سودا زدہ مرد کی آغوش سے چھٹکارا پانے کی کوشش کر رہی تھی، کہ دور سے، اُس کی ماں آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ ماں، جو مرد کو سب سے بڑی مصیبت خیال کرتی تھی، وہ ماں، جو رات دن اسی دُھن میں رہتی تھی کہ مرد کا گذر اس جزیرے میں نہ ہو، اب مرد کے رو برو تھی، اس کشمکش میں، اور نیز اپنی ماں کو آتا دیکھ کر، نسرین نوش، گھبراہٹ اور خوف کی وجہ سے بیہوش ہو گئی۔ خارا نہیں جانتا تھا، کہ بیہوش ہونا کیا چیز ہے، اس لئے اُس نے اس بے ہوشی کو ایک ادائے تسلیمیت خیال کیا، اور نسرین نوش کے پریشان اور بکھرے ہوئے بالوں سے لے کر، پاؤں تک لگاتار بوسے لینے شروع کر دیئے اور سر سے پاؤں تک جہاں جہاں بوسے لئے تھے، وہاں پھول کھل گئے، یہاں تک کہ نسرین نوش کے جسم پہ کوئی جگہ خالی باقی نہ تھی جہاں پھول نہ کھلے ہوں۔ نسرین نوش کی ماں کے خارا تک، پہنچتے پہنچتے نسرین نوش ایک گلدستۂ لطیف بن گئی۔

بڑھیا، اپنی محبوبہ اٹھا اٹھا کے، خارا سے، اس جزیرے میں آنے کا سبب پوچھتی تھی، مگر خارا نہ سمجھتا تھا، نہ سمجھنا چاہتا تھا بس اپنے ہاتھوں میں کے گلدستے کو دکھاتا تھا، اور اپنی آغوش میں لے کر بھینچتا تھا، بڑھیا نے خیال کیا کہ "بہتر یہی ہے کہ اسے جزیرے سے نکال دوں، کیونکہ میں اس کا مقابلہ تو کر نہیں سکتی۔" یہ سوچ کے اُس نے اپنی جریب سے اشارہ کیا "جا، اس جزیرے سے نکل جا۔"

خاما فوراً گلدستے کو اپنی گود میں اُٹھا کر، کشتی پر جا بیٹھا۔ نسرین نوش، اب تک بے ہوش تھی۔ اس دفعہ ہوا، اور موجوں نے خاما کی کشتی کی مدد کی، اور وہ بہت جلد، جزیرہ خارستان کو پہنچ گیا۔ جزیرے کے کنارے، اس کے تمام ساتھی، پریشان، مضطرب، منتظر بیٹھے تھے۔ خاما، اپنے مالِ غنیمت، یعنی اس گلدستۂ رنج و راحت کو لے کر کنارہ پہ آیا، تو اس کے تمام ساتھیوں نے جو مدت سے ان پھولوں کی خوشبو سے محروم تھے بہ کمالِ احترام، اس گلدستہ کی خوشبو سے اپنی مشامِ جان معطر کرنا شروع کیا۔ جب خاما نے اپنی سرگزشت سُنائی، تو ساتھیوں نے تحسین اور حیرت بھری نگاہیں اس پہ ڈالیں، اور سب سوچنے لگے کہ زندگی کی بڑی کمی کو پورا کرنے والی، یہ چیز، یہ لازمۂ عمر یعنی یہ عورت کس طرح ہوش میں لائی جائے۔

آخر سب نے کہا کہ بڈھے کے پاس (جو غار میں تھا، ساحل تک نہیں آیا تھا، لے چلنا چاہیئے، وہ کوئی ترکیب بتائے گا۔ بڈھے نے تمام حال کو سُنا، اور خوشی خوشی، اپنے تمام تجربوں سے جو ہندوستان و یورپ میں اُسے حاصل ہوئے تھے، نسرین نوش کو ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ دوائیں دیں، منتر پڑھے، پانی چھڑکا، یہاں تک کہ صبح ہوئی اور آفتابِ عالمتاب، دُنیا کو حرارت اور زندگی دیتا ہوا نمودار ہوا، اور اُس وقت نسرین نوش کے جسم کے پھول، ایک ایک کرکے زمین پہ گر پڑے، اور یہ عورت، اپنے تمام عورت پن، اپنی تمام نسوانیت، اپنی تمام شفقت، اپنی تمام شعریت کے ساتھ، اُٹھ کھڑی ہوئی۔

اب نسرین نوش، اپنے تئیں خاما کے قوی بازوؤں پُرجوش سینے میں پانے سے خوش تھی، اور ایک نسوانی غمزہ کی ادا سے، چاروں طرف دیکھتی تھی، اور ہنستی تھی۔ اس کے ہنستے ہی، اس خشک جزیرے کے پہاڑ اور گھاٹیاں سبز ہو گئیں۔ سیاہ دلخراش کانٹے پھول ہو گئے یا بن گئے۔ اور عورت کی جادو بھری نظر، اور نیم خندہ سحر نے، اس مصیبت زدہ طائفہ کو جو مدت سے شفقت کے لئے ترس رہا تھا، جانِ تازہ بخش دی، اور یہ لوگ اُن عذابوں کو جو اُنھوں نے اُٹھائے تھے، ان کی آن میں بھول گئے۔

ہیرے، موتی، زمرد، لعل، یاقوت، فیروزے وغیرہ جو اس جزیرے میں پڑے ہوئے تھے، اور کوئی اُن کی بات نہ پوچھتا تھا، اب جمع کرکے لائے گئے، اور نسرین نوش کے قدموں پر ڈال دیئے گئے۔ اس حسن و آن کو دیکھ کے بڈھا مارے خوشی کے پھولا نہ سماتا تھا، اور مرحبا ہلا کے کہتا تھا۔

"ہاں! محبت پاش، سودا ریز بال نہ ہوں، جن میں ہیرے لگائے جائیں تو ہیروں کی کیا قدر ہو سکتی ہے اور اگر نازک اُنگلیاں نہ ہوں، تو یاقوتوں سے، زمردوں سے، اور پیاری گوری گردنیں نہ ہوں، تو موتیوں کے وجود سے کیا فائدہ؟"

بڈھا مارے خوشی کے متوالا سا ہو گیا تھا، کچھ چپ ہو جاتا، لیکن ترنگ میں آ کر پھر کہنا شروع کرتا:۔

"عورت، عورت! عورت ایک بیل ہے جو خشک درخت کے گرد لپٹ کے، اُسے تازگی، اُسے زینت بخش دیتی ہے۔ وہ ایک دُھونی ہے کہ محبت کی لپٹ سے مرد کو گھیر لیتی ہے۔ بغیر عورت کے مرد، سخت دل ہو جاتا ہے، اکھل کھرا بن جاتا ہے، یہ عورت کی شفقت و نوازش، یہ اُس کی مسکراہٹ کا ہی اثر ہے کہ مردوں کا سینہ عالی اور رقیق حسیات سے منور ہو جاتا ہے۔"

اب نسرین نوش کو ایک دستِ قوت مل گیا تھا، جو اُسے آغوش میں لے، اور خاما کو ایک دستِ شفقت ہاتھ لگ گیا تھا جو مبادا زندگیات کی اذیتوں کو بھلا دے۔

بڈھا اس جوڑے کو دیکھ کر، وفورِ مسرت سے چپ نہ رہ سکتا، اچھلنے لگتا، پھر کہتا:۔

"عورت میں حسن نہ ہوتا، تو مرد میں جرأت اور عالی حوصلگی نہ ہوتی، مرد میں عالی حوصلگی نہ ہوتی، تو عورت کی خوبصورتی و دلبری رائگاں جاتی!"

اَلْحَمْدُ لِمَنْ قَدْ خَیْرًا دَخَّبَا لَا وَالشُّکْرُ لِمَنْ صَوَّرَ حُسْنًا وَجَمَالًا

سلطان حیدر جوشؔ

طوقِ آدم

آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں رسالہ یا اخبار کے ہاتھ میں آتے ہی سب سے پہلے "ضرورت ہے" والے کالم کو کیوں پڑھتا ہوں اور اس میں اس قدر دلچسپی کیوں لیتا ہوں۔ میں اس کا جواب صرف یہ دے سکتا ہوں کہ اگر آپ میری جگہ پر ہوتے اور آپ کو بھی ایسا ہی تجربہ ہوتا تو آپ بھی ایسا ہی کرتے۔

مجھے اس کے بیان کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ میری کالج کی زندگی ایک عجب آزادی کے ساتھ گذری ہے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کسی امتحان میں امتیاز کے ساتھ کامیاب نہیں ہوا۔ کبھی امتحان دینے کے بعد مجھے اپنی کامیابی کا یقین نتیجہ آنے سے پیشتر نہیں ہوا۔ مجھے کتاب کے نام سے بلا کسی استثنا کے نفرت تھی۔ اگر کبھی اخبار وغیرہ دیکھنے کی خطا مجھ سے سرزد ہوتی تھی تو محض اس خیال سے کہ کسی نئے اشتہار کو معدوم کرسکوں۔ ریاضی سے مجھے اسی قدر لگاؤ تھا جس قدر ایک مسلمان کو ہو سکتا ہے۔ لاجک سے مجھے ایک ناقابل بیان اُلجھن ہوتی تھی اور فلاسفی سے مجھے للہی بغض تھا۔ میں خود تعجب کرتا ہوں جب میں یہ سوچتا ہوں کہ میں نے بی۔ اے کا ڈپلوما کس طرح پا لیا۔

مستقل مزاجی مجھ سے اس طرح کوسوں بھاگتی تھی جس طرح لاحول سے شیطان۔ ہمیشہ ایک ہی چیز کو اچھا کہنا میری رائے میں اول درجہ کی جہالت تھی۔ میں کبھی فٹ بال ٹیم کے ساتھ ٹور پر جاتا تھا اور کبھی روزانہ سب کی استدعا پر بھی روزانہ کھیل میں شریک ہونے سے گھبراتا تھا۔ کالج کی زندگی نے مجھے "سیماب" کا خطاب دلوا دیا تھا۔ اور میں اسی خطاب سے عام طور پر مشہور تھا۔ ایسی طبیعت اور ایسا دل لئے ہوئے میں نے ڈگری لینے کے بعد پیارے کالج کو خدا حافظ کہا۔ ایک بھری دُنیا میری اپنی بے شمار دلچسپیوں کے ساتھ میرے سامنے موجزن تھی۔ اور میں ناتجربہ کار ناواقف حیران۔ اس کے ساحل پر کھڑا سوچتا تھا کہ آنکھیں بند کرکے کود پڑوں یا نہیں۔

یہ اور سُن لیجئے کہ میں اپنے فرسٹ ائیر کے زمانے میں اپنے جونیئر، کم عمر، دوست کے بار بار کہنے پر اس کے ساتھ بمبئی گیا تھا۔ میں کالج میں اسی سال پاس ہو کر شامل ہوا تھا، اور وہ یعنی چرائسٹ انٹرنس میں تھا۔ آپ کو چرائسٹ کے سمجھنے میں دقت ہوگی۔ مگر یہ بھی ایک خطاب سمجھ لیجئے۔ جو اس کو تیسری جماعت کے زمانے میں ملا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ ایک روز اپنی ریڈر کے یاد کرنے میں بآوازِ بلند مشغول تھا اور

"سی۔ ایچ۔ آر۔ آئی۔ ایس۔ ٹی کرائسٹ معنی عیسیٰ" کی رٹ لگا رہا تھا۔ کہ کسی بڑے طالب علم نے سن پایا اور بس اسی روز سے وہ کرائسٹ مشہور ہوگیا۔ اس کے ساتھ مجھے اپنی عمر میں سب سے پہلے بمبئی جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ میں اسی کے یہاں مہمان ہوا۔ اور یہ بھی سمجھنا مشکل نہیں کہ اس کی والدہ اور اس کی نوعمر چھوٹی بہن نے مجھ سے پردہ نہیں کیا۔ بمبئی سے پردہ گویا کہ سر سے سینگ سے زیادہ مفقود ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ وہاں کے لوگ نہایت ترقی یافتہ اور آزاد خیال ہیں۔ میری رائے میں پردہ کیسی سے کیسی معتدل شکل میں بھی ایک نہایت وحشیانہ حرکت ہے...... ممکن ہے کہ آپ اس معاملہ میں میرے ہم خیال نہ ہوں مگر آپ کی کمزوری کا جواب وہ سوائے آپ کے اور کوئی نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ مختصر یہ کہ اس گھر میں جو راحت مجھے اس قلیل زمانے میں ملی ہے اس کو کبھی نہ بھول سکا۔ اور اس گھر والوں کا بے حد خلق اور مہمان نوازی میرے دل و دماغ پر ہمیشہ نقش رہی۔ دماغ پر تو اس وجہ سے کہ اس کے بعد سے کرائسٹ کے والدین کو ہمیشہ خط لکھتا رہا اور وہ انتہائے انسانیت کے ساتھ برابر جواب دیتے رہے اور دل پر اس وجہ سے کہ...... خیر اس کی نسبت آگے چل کر معلوم ہوگا۔

ہاں اس جملۂ معترضہ کو چھوڑیئے۔ میں جب کالج چھوڑا تو اپنا سامان وغیرہ ڈھونے سے فراغت حاصل کرتے ہی مجھے بمبئی کی لو لگی۔ میں نہیں کہہ سکتا کیوں۔ مگر کوئی چیز تھی جو مجھے زبردستی لے گئی۔ میں ایک ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ دن کو گشت لگاتا تھا شام کو سمندر کے کنارے دل و دماغ کو تازہ کرنے جاتا تھا مگر پھر یہ سوچتا تھا کہ آخر میں اس بحر ناپیدا کنار میں کود پڑوں یا نہیں!

کرائسٹ کے والدین مجھے قریب قریب روز ملتے تھے اور قریب قریب روز مجھے اپنے مکان میں اٹھا لے جانے پر مجبور کرتے تھے مگر میں خدا جانے کس کشمکش میں مبتلا تھا۔ میرے دل کو ایک گونہ تسلی بلا ناغہ ہوتی رہتی تھی اور میری آنکھیں اپنا مشغلہ روز کم از کم ایک مرتبہ ضرور پا لیتی تھیں۔ مگر میں پھر بھی یہی سوچتا تھا کہ آخر میں اس تموج جادو فریب میں کود پڑوں یا نہیں۔

ایک ایک معمولی واقعہ بیان کرنا گویا داستان کہنا ہے اور سلسلہ وار گنتا گانا ایک دقیانوسی طریقہ ہے۔ میں بلا تفریق ہر پرانی حرکت سے متنفر، لہٰذا اس قدر سمجھ لیجئے کہ میں بھی آخر کار اس دل فریب بحر ذخار میں کود گیا اور آنکھیں بند کرکے کودا۔ دوسرے سال کے جاڑے میں میں اپنے ڈرائنگ روم میں کرائسٹ کی نوعمر بہن حمیدہ سے جو اس زمانہ اپنی بیوی سے یہ کہہ رہا تھا "کیوں پیاری! آج تو غضب کی سردی ہے۔ بدن کانپا جاتا ہے"

(۲)

میں غالباً کہہ چکا ہوں اور میری ہیئت بھی ہر دیکھنے والے کو بتا سکتی ہے کہ میں مستقل مزاج نہیں ہوں اور نہ خدانخواستہ کسی حالت میں کولھو کا بیل بننے کے لئے تیار ہوں۔ کیونکہ مستقل مزاج اور کولھو کا بیل میری نظر میں ہر لحاظ سے مترادف نظر آتے ہیں۔ جس چیز کو میں آج پسند کرتا ہوں کوئی وجہ نہیں کہ کل بھی اسی کو پسند کروں۔ مجھے اس منطق کے صغرے وکبرے میں حدِ مشترک ہی مفقود نظر آتا ہے، جو شخص مستقل مزاجی کا حامی ہو، وہ بشرطِ فرصت مجھ سے تبادلۂ خیالات کر سکتا ہے۔ خدا جانے یہ بوسیدگی دماغ کا نتیجہ ہے۔ ترقی کے معنی ہی یہ ہیں کہ زمانے کے ساتھ برابر بڑھتے رہنا اور مستقل مزاجی کے معنی یہ ہیں کہ معاف فرمایئے گا۔ تھکے اونٹ کی طرح ایک جگہ ٹھہر جانا۔

در اصل میرا مزاج اور میری طبیعت انگلینڈ کا موسم تھی! کوئی نہیں بتا سکتا کہ کل میری حالت کیا ہوگی۔ میں کس بات میں دلچسپی لوں گا اور کس بات سے نفرت کروں گا۔ میں اس زندگی کا عادی تھا اور میرے لئے اس کو چھوڑنا ایسا ہی تھا جیسے مچھلی کا پانی کو چھوڑنا۔ میں کبھی کسی ایک چیز کا مداح برابر نہیں رہا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ تقلید کی غلطی مجھ سے کبھی سرزد نہیں ہوئی۔ مگر یہ سچ ہے کہ حمیدہ نے میری اس عادت کو اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ وہ میری گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والی طبیعت کو تاڑ گئی تھی۔ اور میں نہیں کہہ سکتا کیونکہ وہ مجھے روز نئے نئے رنگ میں جلوہ گر نظر آتی تھی۔ یہ ایک فیکٹ ہے کہ

وہی ایک پہی چیز تھی جس سے میں کبھی نہیں اُکتایا۔ وہی پہلی صورت تھی جس سے میرا دل کبھی سیر نہیں ہُوا۔ وہ میری طبیعت کے ساتھ روزانہ پلٹ جاتی ہو یا کسی اور طرح میں قطعی نہیں بتا سکتا۔ کہ وہ مجھے چھ مہینے خوش اور مطمئن رکھنے میں کیونکر کامیاب ہوئی۔

اس کی حقیقت اگر میں بلاکم وکاست بیان کروں تو غالباً آپ سمجھیں گے کہ میں اپنی بیوی کو رشک پروین بنانا چاہتا ہوں یا میں خود اس کے پیچھے رشکِ قیس بن گیا ہوں۔ مگر پھر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ قیس عامری؛ در فرہاد ایرانی دونوں میری نظر میں اول درجہ کے مخبوط الحواس تھے۔ میں ایسے عشق کو جہالت سمجھتا ہوں اور سچ یہ ہے کہ یہ آندھی اندھیر۔ جذبۂ عشق میں سوائے حیوانیت کے اور کچھ نہیں۔ شاعروں نے اس کو چار چاند لگانے میں بہت کچھ ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا ہے مگر مرے سے شاعروں ہی کی حقیقت میری نگاہ میں کچھ نہیں۔ میں نفسِ شاعری میں ہی کوئی بات قابلِ ستائش نہیں پاتا۔ شاعری اور دنیا کی اور بہت سی فضولیات سب ایک قطار میں ہیں۔ تضیعِ اوقات کے لئے اب دنیا نے شاعری سے زیادہ دلچسپ مشغلے ایجاد کر لئے ہیں۔ اگر آپ کی رائے اس کے خلاف ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ میں دنیا کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھوں۔ آپ کی یا اور کسی کی آنکھوں سے دیکھوں آپ یقین کیجئے موسیقی اور شاعری میں اگر کچھ اثر مانا جاتا ہے تو میں "واٹر پروف" کی طرح "میوزک پروف" یا "پوئٹری پروف" ہوں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں کسی بات میں شاعری کرنی نہیں چاہتا۔ اس لئے میرا یہ کہنا کہ حمیدہ میرے نقطۂ خیال سے تمام خوبیوں اور حسن دلفریب سے آراستہ نظر آتی تھی۔ کافی سے بھی زیادہ ہے۔ وہ میرے مزاج اور طبیعت کے لئے نہایت موزوں تھی البتہ اس میں صرف ایک عادت تھی جو آخرکار میرے مزاج کے خلاف ثابت ہوئی۔

وہ میرا ہی دل لبھانے کے لئے سہی روز نت نئی صورت ولباس میں جلوہ گر ہوتی تھی۔ یہاں تک تو نہایت اچھا تھا۔ لیکن وہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی چاہتی تھی کہ میں روزانہ اسکی دلفریبی اور حسن کا اعتراف بھی کروں۔ اور یہی غضب تھا میں بار بار اس سے کہہ چکا تھا اس کے سامنے شاعری کر چکا تھا کیونکہ میں ایسے الفاظ کو نظم ہی سمجھتا ہوں کہ وہ سب سے زیادہ حسین سب سے زیادہ دلکش سب سے زیادہ دلفریب، نیچر کی انتہائی صنعت، تہذیب اور زندگی کی نقش آخر ب دغیرہ وغیرہ تھی اور ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ میں ہمیشہ ان الفاظ کو طوطے کی طرح دہرایا کرتا۔ جب کبھی وہ خلوت میں ہوتی ایک شعلہ خودستائی اس میں بھڑک اٹھتا۔ اور اس وقت تک فرو نہ ہوتا جب تک کہ میں عملاً نہیں بلکہ قولاً الفاظ میں اس کی مدح سرائی نہ کرتا۔ میں اس کو نہایت عزیز رکھتا تھا۔ لیکن پھر بھی آپ جانتے ہیں کہ میرا نام ——— کالج کا نام سیماب تھا۔

اس کے علاوہ حمیدہ کو ایک بات سے نفرت بھی تھی۔ وہ کسی عورت کو میری زبان سے خوبصورت سُننا برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ گویا اپنی دلفریبی کی تعریف اور دوسرے کے اپنے ہمسر نہ ہونے کا اقرار۔ یہ دونوں ایسی عادتیں تھیں جو مستقل طور پر اس کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھیں۔ اور میں کسی عادت کے پابند ہونے سے اسی قدر دور تھا جس قدر قطب شمالی، قطب جنوبی سے ہے۔ وہ کسی اور کے حسن کی تعریف سُننا نہیں چاہتی تھی۔ اور مجھے بعض اوقات بلا کسی وجہ کے اس کی دھن لگ جاتی تھی۔ تاہم ایسے لمحے جو ہماری خاموش اور مسرت انگیز زندگی میں باد صرصر کا طوفان کہے جا سکتے ہیں اکثر واقع ہوتے تھے۔ لیکن یہ آندھیاں بلا کسی ظاہری نقصان کے اوپر ہی اوپر اتر جایا کرتی تھیں۔ اور بہت جلد مطلع صاف ہو جاتا تھا۔

ایک روز عین اس وقت جبکہ وہ اپنے ٹائیلٹ سے یا بالفاظِ دیگر کنگھی چوٹی سے فارغ ہو چکی تھی، اور میرے پیچھے کھڑی ہوئی اپنی دلفریبی اور حسنِ بے مثال کا اندازہ بڑے آئینہ میں کر رہی تھی۔ میں ایک تصویر انگریزی میگزین میں دیکھ رہا تھا اور ایک ایکٹرس کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ غالباً وہی شعلۂ خودنمائی اس کے اندر بھڑک اٹھا تھا۔ اور اس نے میرے پاس آکر دیکھا تو مجھے ایک دوسری صورت کے نظارہ میں مشغول پایا۔ ممکن ہے کہ اس سے وہ شعلۂ خودنمائی زیادہ مشتعل ہو گیا ہو۔ لیکن مجھے اس کا مطلق علم نہیں تھا۔ میرے اوپر اس تصویر

کی تعریف کرنے کی خواہش آندھی کی طرح مسلط ہوتی جاتی تھی اور میں نے آخر کار کہا۔

اور کہا "پیاری حمیدہ! دیکھنا یہ ایکٹرس کس قدر خوبصورت ہے!"

"کیا خاک خوبصورت ہے مجھے تو اس میں کوئی خوبصورتی معلوم نہیں ہوتی" اس نے کہا۔

وہ یہ چاہتی تھی کہ کم از کم ایک مرتبہ غرور کے ساتھ اس کو سراپا دیکھ تو لوں اور مجھ پر یہ جن سوار تھا کہ اسے میری ہاں میں ہاں ملانی چاہیئے۔ میں نے تصویر پر نظر جمائے ہوئے پھر کہا "بھلا کیا کہتی ہو؟ اس کی آنکھیں تو دیکھو۔ اس کے بال تو دیکھو؟"

"ہزار حسینوں کی ایک حسین سہی۔ مجھے کیا؟ میں نہیں سمجھ سکتی۔ تم ایسی فضول باتوں میں کیوں اپنا اور میرا دونوں کا سر پھرایا کرتے ہو۔"

"سچ یہ ہے کہ دن کو دن کہنا کوئی گناہ نہیں ہے۔ میں صرف اپنی رائے ظاہر کر رہا تھا۔ اگر تم اس کے خلاف ہو تو یہ تمہاری ذاتی رائے ہے جس میں ممکن ہے کوئی اور وجہ بھی پوشیدہ ہو۔ مگر اختلاف رائے کی وجہ سے ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں اپنی آزاد رائے ظاہر نہ کر سکوں۔ علاوہ سینکڑوں سوالات کو محض تمہاری ناپسندیدگی کی وجہ سے ایک کاک لگی ہوئی بوتل کی طرح اپنے میں بند رکھوں!"

یہ بحث برابر بڑھتی چلی گئی۔ مجھ پہ اور اس پہ دونوں پہ اپنی محبت کے موافق ایک جن سوار تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس مرتبہ یہ آندھی بلا نقصانِ عظیم کے نہیں اُتری۔ حمیدہ نے بات بڑھ جانے پر اپنی ریشمیں نقاب اُٹھائی اور وہ خدا حافظ کہتی ہوئی چلی گئی۔ چند منٹ کے بعد میں نے گاڑی کے باہر جانے کی آواز سُنی اور اس وقت مجھے اپنے ایک پرانے کلاس فیلو کا فقرہ جو وہ تمسخر کے طور پر ہمیشہ کہا کرتا تھا یاد آیا کہ شادی کر اور بربادی لے۔

(۳)

پہلے روز تو میں اپنے اسی خیال میں مستغرق رہا میری نگاہ میں حمیدہ کی یہ دیدہ دلیری ناقابلِ عفو جرم نظر آتی تھی۔ مجھے اپنی حالت پر افسوس بھی تھا۔ افسوس اور بے حد افسوس۔ صرف اس بات کا افسوس کہ میں نے اپنی بیش بہا آزادی کو محض دو فتنہ زا آنکھوں، دو دلکش رخساروں اور چند ایسی ہی دلفریب چیزوں کے عوض کیوں غارت کر دیا۔ میری رائے میں اس وقت "شادی" "زر دادن و دردسر خریدن" سے زیادہ دقیع چیز نظر نہیں آتی تھی۔ میں مرحوم غالب کی رباعی کو لفظ بہ لفظ صحیح سمجھ رہا تھا۔

ہر آدم زن بہ شیطان طوقِ لعنت — سپرد ند از رہِ تکریم و تذلیل
ولیکن در رہِ اسیری طوقِ آدم — گراں تر آمد از طوقِ عزازیل

دوسرے دن میرے خیالات یہ نہیں تھے۔ طبیعت کا غبار رات کے ساتھ ہوا ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ جس کو میں کل پسند کر رہا تھا آج اسی کے لئے بے قرار نہ ہوتا۔ سچ ہے کہ تنہائی کا رفتہ رفتہ پڑنے والا اثر مجھے بے چین کئے دیتا تھا۔ نوکر کا تقاضا تھا کہ فرنیچر خراب ہو رہا ہے۔ مرمت کی ضرورت ہے۔ خادمہ کی عندیہ تھی کہ پہلے برتن دیکھ لئے جائیں وہ بھی ٹوٹ گئے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ محض ایک حمیدہ کے نہ ہونے سے میں اپنے آپ کو کیسی مصیبت میں پاتا تھا۔ میں اور ایسی فضولیات کا حساب و کتاب ناممکن! قطعی ناممکن۔ میں کبھی ان واہیات باتوں کی طرف مشغول نہیں ہوا تھا۔ حمیدہ خدا جانے کس طرح ان سب سے برابر آتی ہو گی۔ مجھے تعجب تھا۔ تاہم اب کیا کیا جائے۔ حمیدہ کو اب واپس آنا چاہیئے۔

مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں گئی۔ کیونکہ کوچوان سے صرف اس قدر پتہ چل سکا تھا کہ وہ قلابہ کے اسٹیشن پر اُتری تھی۔ بفرضِ محال اگر مجھے معلوم بھی ہوتا تو بھی اس کے پیچھے وارنٹ گرفتاری کی طرح ہر جگہ پہنچتا۔ میرے دل و دماغ کے قطعی خلاف تھا۔ خود جا کر خوشامد کرتا! ایک

کو درمیان میں ڈال کر اور زیادہ تشہیر کرنا۔ مجھ سے قطعی ناممکن تھا۔ پھر کیا کیا جائے۔ کچھ کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ حمیدہ کے بغیر اب مجھے زندگی ایک کالا پانی معلوم ہوتی تھی۔

میں سوچتا رہا اور سوچتا رہا۔ مجھے اس سے پہلے سوچنے کا اتفاق بہت کم ہوا تھا۔ کیونکہ سوچنا میرے خیال میں ایک بہت نازیبا بات ہے۔ اس سے انسان کی پیشانی پر جھریاں پڑتی ہیں۔ اس سے طبیعت پر ایک بار معلوم ہوتا ہے۔ اس سے عمر زیادہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس سے آدمی بڈھا ہو جاتا ہے اور ہاں اور کیا نہیں۔ اس سے تمام نقصانات ہی نقصانات ہوتے ہیں۔ بہرحال بندہ مجبور و لاچار۔ سوچنا ہی پڑا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک نئی چیز دماغ میں بجلی کی روشنی کی طرح پرتو افگن ہوئی۔ میں فوراً اٹھا اور ٹوپی سر پر رکھتا ہوا باہر نکل گیا۔

جس قدر عرصہ میں گھڑی کی بڑی سوئی نے ۲۰ منٹ کا فاصلہ طے کیا اسی قدر عرصہ میں میں نے اپنا راستہ ختم کر لیا۔ ۲۰ منٹ کے اختتام پر میں . . . . . . روزانہ اخبار کے آفس میں منیجر سے نہایت تعجیل کے ساتھ کہہ رہا تھا "اچھا تو آپ الفاظ کے حساب سے چارج کریں گے۔ خیر جس طرح آپ چاہیں۔ میں جو عبارت شائع کرانا چاہتا ہوں۔ وہ ابھی لکھے دیتا ہوں آپ ملاحظہ کر لیں۔"

منیجر نے میری عجلت کو تعجب کے ساتھ دیکھتے ہوئے ایک سادہ کاغذ اور قلم دوات میری طرف بڑھایا اور میں نے کھڑے ہی کھڑے میز پر ایک ہاتھ ٹیک کر جھکے ہوئے لکھنا شروع کیا۔

"ضرورت ہے"

ایک چھ مہینے کے شادی شدہ شوہر کو اپنی حسین بیوی کی جو دو روز سے تبدیلیٔ مزاج کی غرض سے کہیں چلی گئی ہے۔ آنکھیں سیاہ۔ رنگ سرخ و سفید۔ بال گھونگھر والے، قد میانہ، عمر ۱۸ سال۔ نام حمیدہ۔ جو شخص مذکورہ بالا کو کسی طرح نمبر ۱۴ منزل نمبر ۱ بائیکلا میں اپنے ساتھ لے آئے گا۔ اس کو دو اشرفیاں بطور معاوضہ محنت نذر کی جائیں گی۔ خط و کتابت کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ مزید حالات بتلائے جا سکتے ہیں۔"

بے چین شوہر۔ عبدالحی سیماب

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ منیجر نے اس اعلان کو پڑھنے کے بعد میری طرف دیکھا اور مسکراہٹ جو غالباً کوشش خودداری کی زنجیروں میں جکڑے جانے کی وجہ سے مسکراہٹ ہی بن کر رہ گئی تھی، ورنہ قہقہہ بننے کے لئے تیار تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بلکہ تمام چہرے پر ظاہر ہوئی۔ میں نے اجرت بلا حجت نقد ادا کی اور خدا حافظ کہتا ہوا باہر تھا۔ میرے باہر نکلتے ہی دو چار کلرکوں اور منیجر کے دل کھول کر ہنسنے کی آواز میرے کان میں آئی۔

میں جانتا تھا کہ حمیدہ روزانہ اخبار کو دیکھتی ہے۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ کل کے پرچے میں وہ اعلان شائع ہو گیا ہے۔ مجھے اس کا بھی یقین تھا کہ حمیدہ ہر جدت پسند بات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے ایسا اعلان ایک روزانہ اخبار میں دیا۔ کیا اور محض اس خیال سے کیا کہ حمیدہ اس کو پڑھے، میری حالت سے آگاہ ہو، جدت آمیز خیال کو پسند کرے اور چلی آئے۔ آج دوسرا دن تھا۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس نے اخبار پڑھا ہی نہ ہو۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ اس نے کل ہی پڑھا ہوگا۔ اور اگر اس نے مان لیجئے کل بھی نہ پڑھا ہو تو آج میں تو کوئی شک ہی نہیں۔ اب دوپہر ڈھل چکی تھی۔ نصف سے زیادہ دن گذر چکا تھا اور میری تشویش بڑھتی جاتی تھی۔

میں اپنے ڈرائنگ روم میں اسی خیال میں غلطاں پیچاں تھا۔ ڈوبا ہوا تھا کہ میرا نوکر کواڑ کھول کر اندر گھسا اور کہنے لگا۔ معصوما ایک

شخص اور ایک نقاب پوش عورت آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" میں فوراً سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو عزیز حمیدہ کا چچا زاد بھائی ہوگا۔ حمیدہ کو لایا ہوگا۔ یا ممکن ہے کسی کو حمیدہ اپنے ساتھ لائی ہو۔ میں نے فوراً اندر آنے کی اجازت دی اور کرسی پر سے کھڑا ہو گیا۔ ایک لمحے کے اندر نہایت سُرعت کے ساتھ مجھے خیال آیا کہ آخر میں کہوں گا کیا۔ دروازہ کھلا اور جاہل شخص جو صورت سے کوئی دکاندار معلوم ہوتا تھا، اندر گھسا اور یہ کہتا ہوا اندر گھسا "حمیدہ حمیدہ! اندر آؤ۔" اس کے پیچھے پیچھے ایک نوجوان عورت جس نے نقاب اُتار ڈالی تھی، اندر آئی۔ اس کا چہرہ اسکی بے باکی، اس کی وضع، اس کی ایک ایک بات بتا رہی تھی کہ وہ نہایت چلتی ہوئی عورت تھی۔ جہاں تک میرا حافظہ اور ادا شناسی کام کرتی ہے میرے خیال میں وہ کوئی بازاری آوارہ گرد عورت تھی۔ لانے والے نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیجئے یہ اب یہاں موجود ہیں، یہ ہم کو ایک جنگل میں ملیں۔ ہم کل سے اخبار پڑھ کر تمام بمبئی ڈھونڈھ ڈالا۔ آج ہم کو ملی تو ہم نے فوراً پکڑ لیا۔ اس نے بہت کچھ شکایت کیا۔ تمہارا بُرائی کرتا ہے۔ خیر ہم جانے یہ جانے۔ یہ خود کہے گا تم سُنے گا، اب ہمارا معاوضہ۔ بس ہم خلاص!"

مجھے تعجب تھا، حیرت تھی پریشانی تھی۔ میری زبان سے نکلا: "تم کہتے کیا ہو؟ یہ عورت کون ہے؟"

وہ "ہم کہتا ہے کہ تم نے اخبار میں لکھا کہ جو کوئی اس کو لائے گا، وہ دو گنی پائے گا۔ ہم کل بارہ گھنٹے تلاش کیا۔ رات بھر اسی خیال میں رہا۔ صبح برابر صبح سے ڈھونڈھ رہا ہے۔ اس کی آنکھیں سیاہ ہیں، رنگ گورا ہے سُرخی نہیں ہے تو وہ اس چار دن کی پریشانی میں جاتا رہا۔ بال گھونگر والا ہے۔ قد بیچ کا ہے۔ عمر کون اس کا سال سے زیادہ بتا سکتا ہے؟ نام اس کا حمیدہ ہے۔ (اس کی طرف) کیوں ہے نا؟"

اس میں شک نہیں کہ اس میں یہ سب باتیں تھیں، مگر آخر اس جہالت کے معنی کیا؟ وہ میری پیاری حمیدہ نہیں تھی۔ نہیں خدا نہ کرے۔ میں نے جواب دیا "مگر یہ میری بیوی نہیں ہے۔"

وہ ۔ (عورت کی طرف) "کیوں یہ کیا بات ہے؟"

عورت "کیا پیارے سیماب! پیارے سیماب۔ اب تم ایسے خفا ہو کہ پہچانتے تک نہیں میں تمہاری بیوی نہیں ہوں؟"

میں "حمیدہ۔ میری طرف تو دیکھو!"

اب تک مجھے استعجاب تھا۔ مگر اس جواب پر وہ استعجاب غصہ سے بدل گیا۔ یہ نالائق عورت اور میری بیوی۔ اس گستاخی کے معنی کیا؟ یہ بدمعاشی، یہ دغابازی، جعلسازی۔ غصہ بڑھ چلا اور میرے منہ سے نکلا۔ گستاخ عورت اس بدتمیزی کے کیا معنی۔ ۔ ۔ ۔ ؟

میں فقرہ بھی ختم نہ کرنے پایا تھا کہ وہی لانے والا شخص بولا "دیکھو سیٹھ۔ بدتمیزی وغیرہ کا وجہ تنہائی میں پوچھو۔ وہ چلا گیا تھا۔ اس کا قصور ہے۔ سب کے سامنے ایسا مت کہو۔ آخر وہ تمہاری بیوی ہے۔"

میں ۔ (نہایت غصہ کے ساتھ) "بدمعاش! یہ پاجی عورت میری بیوی کیوں ہونے لگی۔ ۔ ۔ ۔ "

وہ ۔ "دیکھو سیٹھ۔ ہم پر زبان مت چلاؤ۔ تم جانو تمہارا بیوی جانے۔ ہم سے کچھ مطلب نہیں چاہے تم اسے رکھو چاہے نکالو۔ مگر ہمارا دو گنی ہم کو دو۔ بس۔"

مجھے غصہ تھا پریشانی تھی الجھن تھی۔ سب کچھ تھا۔ قطعی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر میں کیا کروں۔ اتنے ہی میں دروازہ پھر کھلا۔ ایک اور گنوار جاہل ایک عورت کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا اندر گھسا۔ اور میری طرف دیکھ کر بولا "یہ لو۔ یہ حمیدہ موجود ہے۔ میں دو دن سے مارا مارا پھرتا تھا آخر میں نے ایک دکان پر دیکھ پایا اور کھینچتا ہوا لایا۔ آنکھ۔ رنگ، بال۔ قد۔ عمر۔ سب دیکھ لو۔ یہ تمہاری بی بی حمیدہ ہے کہ نہیں۔ اور میرا انعام؟"

اب میرے غصے نے بھی مجھ سے بھاگنا شروع کیا۔ میں ساکت تھا۔ خاموش تھا مبہوت تھا۔

دوسری عورت "پیارے سیماب! کیا اب بھی تم اپنی پیاری حمیدہ سے نہیں بولو گے؟"

پہلی عورت ۔ "تو کون چڑیل ہے جو میرے شوہر کو اپنا شوہر بتاتی ہے ۔؟"
دوسری عورت ۔ "چل پرے ۔ تجھ جیسی مکار میں نے ہزاروں دیکھ ڈالیں ۔ سیماب میرا شوہر ہے یا تیرا ؟"
دونوں لانے والے ۔ (تقریباً ساتھ ہی ساتھ) "بتائیے سیٹھ آپ کا بیوی کون ہے ؟"

"بولو صاحب بولو ۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ۔"

گورنمنٹ کا قانون کہیئے ۔ اپنی پوزیشن کا لحاظ سمجھئے ۔ یکایک حیرت زدہ ہو جانا اس کی وجہ ٹھہرائیے ۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کس خیال نے اس وقت مجھے دست درازی سے روک لیا ۔ میری حالت عجیب تھی ۔ میں حیرت زدہ بھی تھا ۔ اور پریشان بھی ۔ خائف بھی تھا اور غصہ سے لرزاں بھی ۔ میں نے گھنٹی بجائی ۔ ملازم فوراً اندر تھا ۔ میں یہ کہتا ہوا کہ "دیکھو پولیس کو بلاؤ اور ان سب بد معاشوں کو ان کے حوالے کر دو" ڈرائنگ روم سے نکل کر سونے کے کمرے میں چلا گیا ۔ میرا خیال ہے کہ میں جاتے ہی پلنگ پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا ۔

برابر والے کمرے میں سے سب کے باہر جانے کی آواز میرے کان میں آئی ۔ پھر کچھ نکرار نہ ہوا اور تھوڑی دیر میں سناٹا ۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اب میں ڈرائنگ روم میں نہیں جاؤں گا ۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر اسی طرح دس پانچ زبردستی بیوی بننے والیاں ...... میرا سلسلۂ خیال کواڑ کھلنے سے ٹوٹ گیا ۔ میں نے دیکھا تو پیاری حمیدہ ریشمیں نقاب ڈالے ہوئے ایک عجیب شانِ دلربائی کے ساتھ میرے سامنے تھی ...... !

تھوڑی دیر کے بعد جس میں معمولی شکوہ و شکایات کا دفتر ختم ہو چکا تھا ، وہ میری آغوش میں تھی ۔ اس کا شعلۂ خود ستائی پھر بھی بھڑک اٹھا مگر میں اس کے بجھانے کے لئے کئی روز سے تیار تھا ۔ اس وقت اور صرف اسی وقت مجھے معلوم ہوا کہ وہ دونوں بازاری عورتیں اور اوباش آدمی حمیدہ ہی کے اشارہ پر آئے تھے اور عزیزہ نے اس کا انتظام کیا تھا ۔ میری دو اشرفیاں تو بچ گئیں ۔ لیکن حمیدہ کو اس پلاٹ کے تیار کرنے میں دو گنیاں نذر کرنی پڑیں ۔ آہ شریر شوخ ...... پیاری حمیدہ ۔

وہ دن اور آج کا دن دو باتوں میں پورا پورا اعتقاد رکھتا ہوں ، ایک تو یہ کہ اخبار کا "ضرورت ہے" والا کالم قابلِ فروگذاشت چیز نہیں ۔ اور دوسرے یہ کہ مرحوم مرزا نے سچ کہا ہے

ولیکن در د اسیری طوقِ آدم
گراں تر آمد از طوقِ عزازیل

نیاز فتحپوری

کیوپڈ و سائکی

یوں تو، یونان کے عہد زریں کا ذرہ ذرہ بجائے خود اک حسن آباد تھا، لیکن سائکی کے شباب نے حسن رعنائی جمال کا نمونہ پیش کیا وہ حقیقتاً "عورت کی دنیا" میں ایک سحر تھا، اک اعجاز تھا۔

حسن کی نسبت بہترین شاعرانہ تخیلات کے زیر اثر اک ماہر کوئی ایسی تصویر نہیں پیش کر سکتا تھا، جسے سائکی کے حسن عالم افروز سے کوئی نسبت دی جا سکتی، پھر یہ خدا کی شان ہے کہ علاوہ سائکی کے رئیس یونان کی دو بیٹیاں اور بھی تھیں، لیکن جب رات کو شاہی باغ کے صحن اور اس کے تجول میں گھڑی گھڑی بجلی کی سی چمک نمودار ہو ہو کر غائب ہو جاتی، تو سارے شہر کو معلوم ہو جاتا کہ آج سائکی باغ میں نقاب اُلٹ اُلٹ کر پھر رہی ہے۔

اگلارس و کیوپڈس بھی غیر معمولی حسین تھیں، اور اگر قدرت کے پاس اک آخری نقش حسن و شباب (سائکی) اور نہ ہوتا تو اس میں کلام نہیں کہ یہ دونوں بہنیں بھی وہ چیز تھیں، کہ دنیا انھیں کے لئے ترستی، انھیں کے لئے تڑپتی، اس لئے وہ اگر اپنی چھوٹی بہن سے کچھ خوش نہ تھیں تو جائے عجب نہیں تاہم چونکہ ان کی شادی ہونے والی تھی، اس لئے وہ اپنی تسلی، اپنے انتقام کی تسکین اس خیال سے کر لیتی تھیں کہ ہر چند سائکی زیادہ حسین سہی، مگر کم از کم وہ ان لذات سے تو ابھی آشنا نہیں ہو سکتی جن سے ہماری راتیں بہت جلد لبریز ہونے والی ہیں" کیا واقعی سائکی کی زندگی میں کوئی رات نہ تھی"؟ اب رئیس یونان کے پیش نظر صرف یہی اک فکر تھی، جس میں وہ شب و روز مستغرق رہتا، دنیا کے ہر گوشہ سے شادی کے پیغام آئے، خدا جانے کتنے شاہزادوں کی تصویریں مختلف سلطنتوں سے آئیں، اور اگر ہم اس میں ان لوگوں کا بھی شمار کر لیں جو سائکی کی مواصلت کی صرف آرزو اپنے دلوں میں لئے ہوئے تھے اور زبان تک نہیں لا سکتے تھے تو اس پیدا و پنہاں پروانوں کے ہجوم کا کوئی شمار ہو ہی نہیں سکتا لیکن یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہ آتی کہ سائکی کے لئے بر کس طرح منتخب کیا جائے۔

اب سائکی کوئی بچہ تو تھی نہیں کہ اس کو برے بھلے یا اپنی طبیعت کے میلان کی تمیز نہ ہوتی وہ تو اب پوری جوان تھی، اور اس لئے انتخاب شوہر کی حس، جو عورت کی جوانی کی تنہا حس ہے اس میں بدرجہ اتم موجود تھی اول تو بہت سی تصویریں اس کے سامنے پیش ہی نہ کی جاتی تھیں اور جو اسے دکھائی

بھی جاتی تھیں تو سوائے اس کے اور کچھ نہ ہوتا تھا کہ وہ ایک دفعہ تصویر پر نگاہ ڈالنے ہی لانے والے کو نہایت غور سے از سرتا پا دیکھ لیتی ہاں اُسے غرور تھا، اپنے حسن پر ناز تھا۔ بارہا ایسا ہُوا کہ اس نے تصویر کی پشت پر لکھ دیا کہ "اگر یہ انسان ہے تو مجھے انسان کی ضرورت نہیں" مگر اسے کیا خبر تھی کہ وہ اس فقرے سے اپنی آئندہ زندگی کے لئے ایک سچی پیشین گوئی کر رہی تھی۔

وہ خوب جانتی تھی کہ اس کے باپ کو کیا فکر لاحق ہے اور جب اسے معلوم ہو گیا کہ دُنیا کے ہر گوشہ میں اس کے حسن کے پرستار موجود ہیں تو اسکی زندگی میں بڑا پیارا انقلاب پیدا ہو گیا۔

وہ کسی شاعر کی بہترین تصویر اُٹھا لیتی اور جذبات حسن و عشق میں یہاں تک مستغرق ہو جاتی کہ کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی، بارہا ایسا ہوتا کہ جب نقاب دیکھتے دیکھتے اسی حالتِ انہماک میں اس کی نگاہ کسی پھول پر پڑ جاتی، تو وہ خدا جانے کیوں شرما جاتی اور پھر اُٹھ کر ٹہلنے لگتی۔ غرض کہ اس کی تنہائی کی کوئی ایسی گھڑی نہ تھی۔ خلوت کی کوئی ساعت ایسی نہ تھی جسے وہ اپنے حسن سے معمور نہ پاتی ہو، اور اس کا کوئی تخیل ایسا نہ تھا جو شرم و حجاب پر ختم نہ ہوتا ہو، اور چونکہ قریب قریب نصف حصہ اس کے اوقات کا اسی تخیل میں گزرتا تھا یا پھر ایسے کھیلوں میں جن میں وہ خود کسی کو ڈھونڈھتا، یا اپنے تئیں ڈھونڈھا جانا پسند کرتی (یہاں تک کہ بعض دفعہ جب وہ اکیلی ہوتی تو مہندی کی بھول بھلیاں میں گھس جاتی اور آپ اپنی تلاش کرنے لگتی) اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ساگی نصف عورت تھی اور نصف انفعال و جستجو۔

دن گزر گئے، یہاں تک کہ ساگی کا شباب، سُرور سے سُکر، اور سُکر سے سرشاریت کی حد تک پہنچ گیا، لیکن اس وقت تک کوئی فیصلہ انتخابِ شوہر کے متعلق نہ ہو سکا۔

چاندنی رات تھی اور چاندنی بھی موسم بہار کی اور موسم بہار بھی یونان کا، جس کی زمین کے نسبت فرشِ گل کا تخیل ادنیٰ ترین تخیل ہے۔ ساگی اپنے باغ کے ایک کنج میں جو نسبتاً زیادہ تاریک تھا بیٹھی ہوئی تھی۔ اب وہ اپنی زندگی سے جسے وہ صرف ایک طویل دن کہہ سکتی تھی، یہاں تک سیر ہو گئی تھی کہ اکثر تاریک مقامات میں وقت صرف کرنا پسند کرتی تھی، مگر وہ یہ دیکھ کر کیسی گھبراتی کہ ہر تاریکی اس کے لئے روشنی ہے۔ اور اس کی ہمراہ چاندنی، وہ کنج میں فرشِ سبزہ پر بیٹھی ہوئی پنکھڑیوں کے ڈھیر کو ایک ہاتھ سے منتشر کرتی جاتی تھی، اور پتیوں اور نازک شاخوں سے چھن چھن کرنے والی کمزور شعاعوں کو دیکھ دیکھ کر گردن اُٹھائے ہوئے اپنے ہی تصنیف کئے ہوئے شعر آہستہ آہستہ گنگنا رہی تھی، اپنا درد کہہ رہی تھی، شکایتیں کر رہی تھی کہ:

اے چاندنی تو تو آسمان کی ساگی ہے، آسمان ہی میں رہ، دُنیا کو تیری ضرورت نہیں کہ وہ پہلے ہی ایک ساگی سے بیزار ہے، زمین جس میں اب مرد کی جنس پیدا ہونی بند ہو گئی ہے سنسان ہے۔ لیکن۔ نہیں تو مجھے پتا بتا، تو تو روز یہاں کسے ڈھونڈھ جاتی ہے۔ میں بھی تیرا ڈھنگ دیکھوں گی۔ شاید میری راتیں وہیں چھپی ہوں۔ چراغ کی طرف پتنگا بیتابانہ آتا ہے، میں اُسے پکڑ لیتی ہوں اور گھنٹوں دیکھا کرتی ہوں۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ کلی پر بیٹھنے سے پہلے بھونرے کو گرفتار کر لوں۔ تو ہنسے گی کہ میں نے اپنے مکان سے شمعیں اُٹھوا دیں، اپنے باغ سے کلیاں نکلوا دیں، کہ جب شمع نہ ہو گی تو پتنگے کیا کریں گے کلیاں نہ ہوں گی تو بھونرے کہاں جائیں گے، لیکن تجھے یقین دلاتی ہوں کہ اگر رات کو میری اُنگلیوں کے سرے چراغ کی لویں تو دن کو وہ چمپا کی کلیاں ہیں۔ میری گردن جس پر ہرنوں کی گردنیں فدا ہیں، ڈھلی جاتی ہے، میری وہ آنکھ جس پر جنگلی گایوں کی آنکھیں قربان ہیں، رونا چاہتی ہے، میرا وہ چہرہ، جس پر اے چاندنی، ہر نقاب تیرا ہی ایک ٹکڑا نظر آتا ہے، افسردہ ہے کیونکہ دُنیا میں کوئی مصور ایسا نہیں ہے جو میرے بعد میرا یادگارِ حسن باقی رکھے، کوئی شاعر ایسا نہیں جو میری تمناؤں کو لکھ سکے،

اور کوئی مغنّی ایسا نہیں ، جس کے بربط کے تار میری تعریف میں کانپ سکیں ، پھر اے آسمان کی سائگی ، تو ہی بتا کہ ایسا شخص جو نور کی تصویر بنا سکے جو سمندر کو لکھ سکے ، وہ نکہت کو گا سکے کہاں ملے گا ؟"

سائگی جیسی حسین و جمیل تھی ، ویسی ہی لطیف الخیال شاعرہ اور نازک دست مصورہ بھی تھی ، اور اس لئے وہ قدرتاً اس بات کی خواہشمند تھی کہ ویسا ہی حسین ، اسی درجہ کا شاعرانہ مزاج رکھنے والا اور ویسا ہی بے مثل نقاش اس کی زندگی کا ہمدم ہو ۔ وہ دیر تک اپنے بنائے گیت گاتی رہی اور بربط بجاتی رہی ، یہاں تک کہ وہ خستہ سی ہو گئی ، اور اس نے ایک آخری ضرب کے ساتھ جس سے تار کچھ دیر گونجا کئے ۔ بربط کو پھینک دیا ، گویا وہ اس سے بھی بیزار ہو گئی تھی ۔ اُس نے چاندنی میں ایک جمائی لی ، اور پھر انگڑائی لیتی ہوئی وہیں لیٹ گئی وہ اب سونا چاہتی تھی ، یعنی اس کی شرابی آنکھیں جو یوں بھی ہمیشہ نیم خوابی رہتی تھیں اب بالکل سو جانا چاہتی تھیں ۔ ساری فضا سو رہی تھی ، آسمان و زمین سو رہے تھے ، وہ شاہزادی زمین جس پہ چاند کی شعاعیں ایک مسلسل خاموشی کے ساتھ چڑھ اُتر رہی تھیں ، سو رہی تھی ، مگر سکوت خواب تو اس خوش نصیب کنج کا تھا جو بیہوش سائگی کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے سو رہا تھا ۔

آہ ، اس حالت کو بہر گھنٹوں تک دیکھتا رہا !

پایانِ کار چڑیوں کی شیریں نغمہ سنجی شروع ہو گئی ۔ یعنی صبح جاگی ، ہر شاخ پھول ہی پھول ہو گئی یعنی کلیاں جاگ اٹھیں ۔ سائگی اُٹھی اور کنج بھی اپنے تبسم آباد میں جاگ اٹھا ، وہ یہاں حقیقتاً سونے نہیں آئی تھی ۔ اور نہ اس کو یہ گمان تھا کہ وہ اس قدر جلد ، اور دیر تک یہاں سوتی رہے گی لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اس کی نزاکت موسیقی کا بار نہ اٹھا سکی ، جس کے ہر اُتار چڑھاؤ کے ساتھ اُس کا شباب صرف ہوتا تھا ۔ گیت کے بول جن میں اس کے سارے حسیاتِ لطیفہ کی قوت گھٹتی جاتی تھی اس کو بہت جلد خستہ کر دینے والے ثابت ہوتے چنانچہ وہ سو گئی اور انھیں تمناؤں ، ... اور بیزاریوں کو اپنے دماغ میں لئے ہوئے سو گئی ، جن میں اس کے اجزائے روح گھل گھل کر مل رہے تھے ۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس کی پیاری آنکھوں نے بند ہونے پر کیا کیا دیکھا مگر ہاں جب وہ اُٹھی ، تو اس کے اعضا دُکھ رہے تھے ، اس کا سارا بدن خستگی سے چور ہو رہا تھا ، اس کے ہاتھ اُٹھ کر اپنی پیشانی کو چھوا اور پھر اپنے بازوؤں کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر ایک آدھ دفعہ بل دیا اور اپنے منتشر بالوں کو سمیٹتی ہوئی کھڑی ہو گئی اور آہستہ آہستہ کنج سے نکل کر روش پر ہو لی ۔

چھریرا بدن ہو اور نازک کمر ، تو رفتار میں لوچ کا پیدا ہونا ضروری ہے ، لیکن اگر رفتار کی لچک کوئی مستقل چیز ہے اگر سبک خرامی صرف کشیدہ قامتی کی صفت لازم نہیں ، بلکہ ایک جُدا حسن ہے ، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ حسن صرف سائگی کی رفتار کو دیکھ کر سمجھ میں آ سکتا تھا ۔ نغمہ کا کوئی نقش نہیں ، مگر ہوا اس سے معمور ہے ، بھنبھیری اُڑ کر نکل گئی ، مگر اس کی لچک اور سبک پروازی اب بھی نگاہ میں تھرا رہی ہے ۔ سائگی کنجوں میں غائب ہو گئی ، لیکن اس کی رفتار کا ارتعاش اب بھی روح میں ملا ہوا ہے ۔ وہ دبے پاؤں اپنی خوابگاہ میں پہنچی اور اپنی سیج پر گر پڑی ، اس نے سمجھا کہ بدن کا درد ، اعضا کی دکھن عدم آسودگی خواب کی وجہ سے ہے ، اور اس نے چاہا کہ پھر سو جاؤں ، لیکن وہ ابھی کروٹیں ہی لے رہی تھی ، کہ نسرین جو سائگی کی محبوب مطربہ تھی ہاتھ میں اپنا نفیس بربط لئے ہوئے آئی ، اور پائیں کی طرف فرش پر بیٹھ گئی ۔ اس نے بربط کے تار اپنی نازک انگلیوں سے درست کئے اور یہ دیکھ کر کہ شاہزادی کی رات شاید کرب میں گزری ہے ، اور وہ ابھی سونا چاہتی ہے ، اس نے افسون خواب نہایت ہی نرم و شیریں لہجہ میں گانا شروع کیا ۔

"اے نیند آ ، اور گنتی پلکوں کو پھر ملا دے کہ ابھی ان میں کچھ نشہ باقی ہے ، اے نیند آ ، اور انکھڑیوں کو پھر بند کر دے کہ ابھی ان میں کچھ خمار ہے ، والئی یونان کی بیٹی کو افشردۂ انگور کی ضرورت نہیں ۔ اس کا شباب خود شراب ہے ، میں نے چاندنی راتوں میں صحن باغ کے اندر اسے ٹہلتے دیکھا ہے ۔ اور اگر کسی رات وہ مجھ سے چھپ کر چلی گئی ہے تو

بھی جاتی تھیں، تو سوائے اس کے اور کچھ نہ ہوتا تھا کہ وہ ایک دفعہ تصویر پر نگاہ ڈالتے ہی لانے والے کو نہایت غور سے، از سرتاپا دیکھ لیتی۔ ہاں اُسے غرور تھا، اپنے حسن پر ناز تھا۔ بارہا ایسا ہُوا کہ اس نے تصویر کی پشت پر لکھ دیا کہ "اگر یہ انسان ہے تو مجھے انسان کی ضرورت نہیں" مگر اسے کیا خبر تھی کہ وہ اس فقرے سے اپنی آئندہ زندگی کے لئے ایک سچی پیشین گوئی کر رہی تھی۔

وہ خوب جانتی تھی کہ اس کے باپ کو کیا فکر لاحق ہے اور جب اسے معلوم ہو گیا کہ دُنیا کے ہر گوشہ میں اس کے حسن کے پرستار موجود ہیں تو اسکی زندگی میں بڑا بھاری انقلاب پیدا ہو گیا۔

وہ کسی شاعر کی بہترین تصویر اُٹھا لیتی اور جذبات حسن و عشق میں یہاں تک مستغرق ہو جاتی کہ کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی، بارہا ایسا ہوتا کہ جب رُباب دیکھتے دیکھتے اسی حالتِ انہماک میں اس کی نگاہ کسی پھول پر پڑ جاتی، تو وہ خدا جانے کیوں شرما جاتی اور پھر اُٹھ کر ٹہلنے لگتی۔ غرض کہ اس کی تنہائی کی کوئی ایسی گھڑی نہ تھی۔ خلوت کی کوئی ساعت ایسی نہ تھی جسے وہ اپنے حسن سے معمور نہ پاتی ہو، اور اس کا کوئی تخیل ایسا نہ تھا جو شرم و حجاب پر ختم نہ ہوتا ہو، اور چونکہ قریب قریب نصف حصہ اس کے اوقات کا اسی تخیل میں گزرتا تھا یا پھر ایسے کھیلوں میں، جن میں وہ خود کسی کو ڈھونڈھنا نہ چاہے بلکہ ڈھونڈھا جانا پسند کرتی (یہاں تک کہ بعض دفعہ جب وہ اکیلی ہوتی تو جھنڈی کی بھول بھلیاں میں گھس جاتی اور آپ اپنی تلاش کرنے لگتی) اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ساگی نصف عورت تھی اور نصف انفعال و جستجو۔

دن گزر گئے، یہاں تک کہ ساگی کا شباب، غرور سے شک، اور شک سے سرشاریت کی حد تک پہنچ گیا، لیکن اس وقت تک کوئی فیصلہ انتخاب شوہر کے متعلق نہ ہو سکا۔

چاندنی رات تھی اور چاندنی بھی موسم بہار کی اور موسم بہار بھی یونان کا، جس کی زمین کے نسبت فرش گل کا تخیل ادنیٰ ترین تخیل ہے۔ ساگی باغ کے ایک کنج میں جو نسبتاً زیادہ تاریک تھا بیٹھی ہوئی تھی۔ اب وہ اپنی زندگی سے جسے وہ صرف "ایک طویل دن" کہہ سکتی تھی، یہاں تک سیر ہو گئی تھی کہ اکثر تاریک مقامات میں وقت صرف کرنا پسند کرتی تھی، مگر وہ یہ دیکھ کر کیسی گھبراتی کہ ہر تاریکی اس کے لئے روشنی ہے۔ اور اس کی ہر رات چاندنی۔ وہ کنج میں فرش سبزہ پر بیٹھی ہوئی پنکھڑیوں کے ڈھیر کو ایک ہاتھ سے منتشر کرتی جاتی تھی، اور پتیوں اور نازک شاخوں سے چھن چھن کر آنے والی کمزور شعاعوں کو دیکھ دیکھ کر گزرے دن اُٹھائے ہوئے اپنے ہی تصنیف کئے ہوئے شعر آہستہ آہستہ گن گنا رہی تھی، اپنا درد کہہ رہی تھی، اُنکا بھید کہہ رہی تھی کہ :

اے چاندنی تو تو آسمان کی ساگی ہے، آسمان ہی میں رہ، دُنیا کو تیری ضرورت نہیں کہ وہ پہلے ہی ایک ساگی سے بیزار ہے، زمین جس میں اب مرد کی جنس پیدا ہونی بند ہو گئی ہے سنسان ہے۔ لیکن۔ نہیں تو مجھے پتا بتا، تو تو روز یہاں تک ڈھونڈھ جاتی ہے۔ میں بھی تیرا ملک دیکھوں گی۔ شاید میری راتیں وہیں چھپی ہوں۔ چراغ کی طرف پتنگا بنا بانہ آتا ہے، میں اُسے پکڑ لیتی ہوں اور گھنٹوں دیکھا کرتی ہوں۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ کلی پر بیٹھنے سے پہلے بھونرے کو گرفتار کر لوں۔ تو ہنسے گی کہ میں نے اپنے مکان سے شمعیں اُٹھوا دیں، اپنے باغ سے کلیاں نکلوا دیں، کہ جب شمع نہ ہو گی تو پتنگے کیا کریں گے کلیاں نہ ہوں گی تو بھونرے کہاں جائیں گے، لیکن تجھے یقین دلاتی ہوں کہ اگر رات کو میری انگلیوں کے سرے چراغ کی لو ہیں تو دن کو وہ چمپا کی کلیاں ہیں۔ میری گردن جس پر ہرنوں کی گردنیں فدا ہیں، ڈھلی جاتی ہے، میری وہ آنکھ جس پر جنگل گایوں کی آنکھیں قربان ہیں، رونا چاہتی ہے، میرا وہ چہرہ، جس پر اے چاندنی، ہر نقاب تیرا ہی ایک ٹکڑا نظر آتا ہے۔ افسردہ ہے کیونکہ دُنیا میں کوئی مصور ایسا نہیں ہے جو میرے بعد میرا یادگار حسن باقی رکھے، کوئی شاعر ایسا نہیں جو میری تمناؤں کو لکھ سکے۔

اور کوئی مغنی ایسا نہیں جس کے، ربط کے تار میری تعریف میں کانپ سکیں، اے آسمان کی سائکی، تو ہی بتا کہ
ایسا شخص جو نور کی تصویر بنا سکے جو سمندر کو لکھ سکے وہ نکہت کو گا سکے کہاں ملے گا،،

سائکی جیسی حسین و جمیل تھی، ویسی ہی لطیف الخیال شاعرہ اور نازک دست مصورہ بھی تھی، اور اس لئے وہ قدرتاً اس بات کی خواہشمند تھی کہ ویسا ہی حسین، اسی درجہ کا شاعرانہ مزاج رکھنے والا اور ویسا ہی بے مثل نقاش اس کی زندگی کا ہمدم ہو۔ وہ دیر تک اپنے بنائے گیت گاتی رہی اور بربط بجایا کی، یہاں تک کہ وہ خستہ سی ہو گئی اور اس نے ایک آخری ضرب کے ساتھ جس سے تار کچھ دیر گونجا کئے۔ بربط کو پھینک دیا۔ گویا وہ اس سے بھی بیزار ہو گئی تھی۔ اس نے چاندنی میں ایک جمائی لی، اور پھر انگڑائی لیتی ہوئی وہیں لیٹ گئی وہ اب سونا چاہتی تھی، یعنی اس کی شرابی آنکھیں جو یوں بھی ہمیشہ نیم خواب ہی رہتی تھیں، اب بالکل سو جانا چاہتی تھیں ۔ ۔ ۔ ساری فضا سو رہی تھی، آسمان و زمین سو رہے تھے، وہ شاہزادی جس پر چاند کی شعاعیں ایک مستقل خاموشی کے ساتھ چڑھ اُتر رہی تھیں، سو رہی تھی، مگر سکوت خواب تو اس خوش نصیب کنج کا تھا جو بیہوش سائکی کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے سو رہا تھا۔

آہ، اس حالت کو بہم گھنٹوں تک دیکھتا رہا!

بالآخر کار چڑیوں کی شیریں نغمہ سنجی شروع ہو گئی۔ یعنی صبح جاگی، ہر شاخ پھول ہی پھول ہو گئی یعنی کلیاں جاگ اُٹھیں۔ سائکی اُٹھی اور کنج بھی اپنے تبسم آباد میں جاگ اُٹھا، وہ یہاں حقیقتاً سونے نہیں آئی تھی۔ اور نہ اس کو یہ گمان تھا کہ وہ اس قدر جلد اور دیر تک یہاں سوتی رہے گی لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اس کی نزاکت موسیقی کا بار نہ اُٹھا سکی جس کے ہر اُتار چڑھاؤ کے ساتھ اُس کا شباب صرف ہوتا تھا۔ گیت کے بول جن میں اس کے سارے حسیاتِ لطیفہ کی قوت گھٹتی جاتی تھی اس کو بہت جلد خستہ کر دینے والے ثابت ہوئے چنانچہ وہ سو گئی اور اپنی تمناؤں، شکایتوں اور بیزاریوں کو اپنے دماغ میں لئے ہوئے سو گئی، جن میں اس کے اجزائے روح گھل گھل کر مل رہے تھے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس کی پیاری آنکھوں نے بند ہونے پر کیا کیا دیکھا مگر ہاں جب وہ اُٹھی، تو اس کے اعضا دُکھ رہے تھے، اس کا سارا بدن خستگی سے چور ہو رہا تھا، اس کے ہاتھ اُٹھ کر اپنی پیشانی کو چھوا اور پھر اپنے بازوؤں کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر ایک آدھ دفعہ بل دیا اور اپنے منتشر بالوں کو سمیٹتی ہوئی کھڑی ہو گئی اور آہستہ آہستہ کنج سے نکل کر روش پر ہو لی۔

چھریرا بدن ہو اور نازک کر، تو رفتار میں لوچ کا پیدا ہونا ضروری ہے، لیکن اگر رفتار کی لچک کوئی مستقل چیز ہے اگر سبک خرامی صرف کشیدہ قامتی کی صفت لازم نہیں، بلکہ ایک جدا حسن ہے، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ حسن صرف سائکی کی رفتار کو دیکھ کر سمجھ میں آ سکتا تھا۔ نغمہ کا کوئی نقش نہیں، مگر ہوا اس سے معمور ہے، بھنبھیری اُڑ کر نکل گئی، مگر اس کی لچک اور سبک پروازی اب بھی نگاہ میں تھرتھرا رہی ہے۔ سائکی کنجوں میں غائب ہو گئی، لیکن اس کی رفتار کا ارتعاش اب بھی روح میں ملا ہوا ہے۔ وہ دبے پاؤں اپنی خوابگاہ میں پہنچی اور اپنی سیج پر گر پڑی، اس نے سمجھا کہ بدن کا درد، اعضا کی دکھن عدم آسودگیٔ خواب کی وجہ سے ہے، اور اس نے چاہا کہ پھر سو جاؤں، لیکن وہ ابھی کروٹیں ہی لے رہی تھی، کہ فسریون جو سائکی کی محبوب مطربہ تھی ہاتھ میں اپنا زریں بربط لئے ہوئے آئی، اور پائیں کی طرف فرش پر بیٹھ گئی۔ اس نے بربط کے تار اپنی نازک انگلیوں سے درست کئے اور یہ دیکھ کر کہ شاہزادی کی رات شاید کرب میں گزری ہے، اور وہ ابھی سونا چاہتی ہے، اس نے افسون خواب نہایت ہی نرم و شیریں لہجہ میں گانا شروع کیا۔

"اے نیند آ، اور گھنی پلکوں کو پھر ملا دے کہ ابھی ان میں کچھ نشہ باقی ہے اے نیند آ، اور انکھڑیوں کو پھر بند کر دے
کہ ابھی ان میں کچھ خمار ہے، والیٔ یونان کی بیٹی کو افشردۂ انگور کی ضرورت نہیں۔ اس کا شباب خود شراب ہے ہیں
نے چاندنی راتوں میں صحن باغ کے اندر اسے ٹہلتے دیکھا ہے۔ اور اگر کسی رات وہ مجھ سے چھپ کر چلی گئی ہے تو

صبح کو ہیں نے روشوں پر سے اس کے نشانات قدم اپنے ہاتھ سے مٹائے ہیں کہ کوئی اس کی لغزشِ رفتار نہ پہچان لے۔ اے نیند آجا، کہ ابھی سورج کی کرنیں ارغوانی بھی نہیں ہوئیں۔ سائکی کروٹیں لے رہی ہے، اس کا بدن شاید دکھ رہا ہے، رات کی شراب ابھی اچھی طرح آسودہ . . . "

—— "نسرین خاموش۔ افسوں خواب کو ختم کر کہ میرا جی گھبراتا ہے"

اب سائکی اُٹھ بیٹھی تھی اور پیشانی پر ایک نازک سی شکن، ایک ننھی سی موج طور پر، وہ لیٹے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی، آخرکار اس نے چونک کر نسرین کے ہاتھ سے بربط لے لیا، اور یوں ہی بغیر کسی نظام و اصول کے اپنی اُنگلیاں تاروں پر آہستہ آہستہ چلانے لگی۔ نسرین خاموش مؤدب کھڑی ہوئی سائکی کی اس خلاف معمول بدمزگی سے ڈر رہی تھی، یہ حالت اتنی دیر تک قائم رہی کہ آفتاب اچھی طرح نکل آیا اور تمام کنیزیں تعمیل احکام اور ضروریات صبح کے متعلق اپنے اپنے فرائض ادا کرنے حاضر ہو گئیں۔ لیکن سائکی نے ان کو فوراً رخصت کر دیا اور نسرین کو قریب بلا کر اس کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر بولی:-

اے نسرین آج تو ایسی بات اپنے منہ سے نہ نکال۔ جس پر کل تجھے افسوس کرنا پڑے تیرے نغموں نے ہمیشہ میری روح کو مسرت پہنچائی، لیکن اس وقت سے ڈر، جب مجھے ان سے تکلیف پیدا ہونے لگے۔ کچھ ایسی باتیں کر کہ میرے بھولے ہوئے دن میرے سامنے آجائیں، تو مجھے سلانا چاہتی ہے تو میری اُن راتوں کا ذکر نہ کر جن میں دیوانہ وار پھرتی رہتی ہوں، تو تو مجھے وہ یاں سُنا کہ میں اپنی اس زندگی کو بھول جاؤں جس کا بار میرے لئے ناقابل برداشت ہے اور پھر ایک دفعہ بچہ بن جاؤں۔

اگر میری پلکیں نشہ آلود اور میری آنکھیں خمار آگیں ہیں تو کیا؟ اگر یونان کی بیٹی کا شباب عروجِ صہبا ہے تو کیا؟ کیونکہ اُسے خود نہیں معلوم کہ اس میں کیا لذت پنہاں ہے میری زندگی تو اک ایسی صدا ہے، جو صحرا کی وسعت میں گم ہو جائے۔ پھول اگر اپنی نکہت سے آپ فائدہ اُٹھا سکتا ہے، اگر کلی اپنی رعنائی پر خود فریفتہ ہو سکتی ہے تو تو ہزار دفعہ دہی گا۔ جا ابھی گا کی اور نہ اپنے بربط کے تار توڑ ڈال، طربیں آ تار سے، نغموں کو بھول جا، اور اپنا ساز کسی کونہ میں پھینک کر آ، اور میرے ساتھ کراہ "

قبل اس کے کہ سائکی اپنی گفتگو ختم کرتی، وہی دونوں کنیزیں جن کو سب سے پہلے حکم دیا گیا تھا آئیں اور سائکی نسرین کو مبہوت و متحیر چھوڑ کر اُن کے ساتھ چل دی۔

سائکی غسل سے فارغ ہو کر حمام سے نکلی اور نگاہ کی طرح فوراً آئینہ خانہ میں داخل ہو گئی۔ آج اس کی سترھویں سالگرہ تھی اور اسے حسب رواج دربار میں شریک ہونا تھا۔ ملک کے تمام شعرا، شاہزادے، سفیر مغنی سبھی موجود تھے۔ اور دربار میں سائکی کی آمد کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ شام کو سائکی کتان کی آسمانی رنگ کی چادر میں اپنا بدن چھپائے اور اسی رنگ کا ہلکا نقاب اپنے چہرہ پر ڈالے ہوئے برآمد ہوئی۔

سب گردنیں جھکا کر کھڑے ہو گئے اور سائکی اپنی جگہ پر جو بہت مرتفع تھی کنیزوں کے حلقہ میں بیٹھ گئی۔

اس کے بعد رسم نذر شروع ہوئی۔ ہر شخص جو پڑھتا تھا اس کے ایک ہاتھ میں ہار ہوتے تھے اور دوسرے میں وہ چیز جو نذر کے لئے مخصوص تھی۔ پہلے اس کے قدموں پر پھولوں کو ڈالی دیتا تھا اور پھر نذر پیش کرتا تھا، چنانچہ تھوڑی دیر میں سائکی کے پیروں پر موسم بہار کی بہترین پیداوار اور صناعتِ انسانی کے نازک و لطیف ترین ہدایا کا انبار لگ گیا۔ شعرا نے اپنے قصائد شروع کئے مغنیوں نے اپنے ساز درست کئے یہاں تک کہ اختتام دربار کا وقت قریب آ گیا، جس کے لئے ہر دل تڑپ رہا تھا۔ اور جس ایک لمحہ کے لئے یہ سارے تکلفاتِ تمہیدی برداشت کئے گئے تھے۔

یہ دستور تھا کہ جب دربار سالگرہ ختم ہو جاتا، تو ان ہدایا کی پذیرائی میں ساگی کو ایک لمحہ کے لئے اپنے چہرہ سے نقاب اُلٹ دینا پڑتی تھی، اور غالباً اسی برق پاش رسم کا یہ اثر تھا کہ تمام عالم میں ساگی کی غائبانہ پرستش ہو رہی تھی اور ساری دُنیا اس جلوۂ حرماں کے لئے بے تاب نظر آتی تھی۔

سنتا ہے کہ جس وقت ساگی پورے بارہ برس کی ہو گئی اور اوّل اوّل دربار میں نقاب پوش ہو کر آئی تو اس قدر ہجوم نہ تھا لیکن اس کے بعد جب اس کے بے نقاب ہونے کی خبر منتشر ہوئی تو ہر سال لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ جب پانزدہ سالہ ساگی کی سالگرہ ہوئی تو تمام اقطاعِ عالم میں اس کے حسن کی آگ مشتعل ہو چکی تھی، اور اس سال جبکہ اس کا شباب پورے سترہ سال کا تھا اتنا کثیر ہجوم ہوا کہ شاید سرزمین یونان نے اس سے قبل اتنے پروانوں کا ہجوم کبھی نہ دیکھا ہوگا، غرضکہ وہ ساعت آئی، جب ساگی کو بے نقاب ہونا تھا، یوں تو جب تک وہ وقت نہیں آیا تھا ہر شخص ایک مستقل اضطراب ایک نمایاں بے چینی بنا ہوا تھا، لیکن جب وہ وقت آیا اور نقیبوں نے اس ساعت کا اعلان کیا تو اتنے بڑے مجمع میں کوئی حرکت، کوئی صدا، اثر حیات کا پتہ دینے والی نہ تھی، لب باہم وصل ہو کر رہ گئے تھے، اور آنکھوں نے جھپکنا ترک کر دیا تھا۔

آخرکار ساگی اُٹھی اور اپنی بلوریں نازک اُنگلیوں سے نقاب کے دونوں سرے ایک جھٹکے سے سر کے اوپر کر لئے اور اپنے سحرِ حسن سے سب کو کم از کم ایک گھنٹہ کے لئے پتھر کا بنا کے چل دی۔

(۲)

اگر وینس (زہرہ) کو اپنے حسن و جمال پہ ناز تھا، تو بے جا نہ تھا کیونکہ سارا جہان اور تمام آسمان والے اس بات کو مان چکے تھے کہ وینس سا حسین ہونا، گویا خدا ہونا ہے اور معلوم نہیں یونان والوں کو یہ آسمانی عقیدہ کس طرح معلوم ہو گیا کہ انھوں نے بھی وینس کو دیوی مان کر اس کی پرستش شروع کر دی، بت تراشوں نے اس کے مجسمے تیار کئے مصوروں نے اس کی تصویریں بنائیں شعرا نے اس کے حسن کی تعریف میں قصائد کہے اور مغنیوں نے اس کے ترانہ ہائے جمال سے دُنیا کو مبہوت و متحیّر کرنا چاہا، مگر یہ پرستارانِ حسن (خدا یونان والوں کی روحوں کو خوش رکھے) کچھ اس سے بھی زیادہ وسیع جذبات رکھتے تھے اور اس لئے آخرکار انھیں منہ کے بل اس کے سامنے گر کر کہنا پڑا کہ "اے ملکۂ حسن تیرے مجسمے باوصف اس کے کہ ملک کے بہترین نقاشوں کے دماغوں نے اپنی بہت سی راتیں ان کی طیاری میں جاگ کر کاٹ دی ہیں، نادرست ہیں، ہمارے قصائد جن میں حسن کی نسبت لطیف ترین تخیلات کو پیش نظر رکھ کر تیری تعریف کی گئی ہے، نامکمل ہیں اور ہمارے راگ جن کو ہم اپنے بہترین سازوں کے ذریعہ سے اک ترانۂ عبودیت کی صورت میں تیرے آستانۂ جمال تک پہنچانا چاہتے ہیں، کمزور و ناقص ہیں، پھر اے تو کہ حسن سے بھی بلند کوئی چیز ہے مانے تو وہ کہ ہمارے خیال کی پرواز تیرے سامنے ایک مرغ پرشکستہ سے زیادہ نہیں ہمیں یہ نہ بتا کہ تو کیا ہے بلکہ ہمیں یہ دکھا کہ تو کیسی ہے!" —— یہ تھے دُنیا کے خیالات وینس کے حسن کی نسبت اور یہ تھا اک عام بے چینی و وارفتگی کا حال۔

وہ زہرہ جو آج سے ہزاروں سال پیشتر یونانیوں کے سامنے جو تسماں میں چمکتی تھی، آج بھی شاید اسی انداز سے درخشاں ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ وہ اسے حسن کی دیوی سمجھتے تھے، اور ہم ایک کرہ غیر آباد یقین کرتے ہیں سو یہ ہو سکتا ہے کہ کسی زمانہ میں وہ آباد رہا ہو، اور وینس وہاں کی ملکہ ہو، اور اگر نہیں ہو سکتا تو بھی ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ اُس وقت اس ملک کی حکمراں ایک حسین و جمیل عورت تھی، اگرچہ چند طبقہ انسان سے نہ تھی، مگر طبقۂ انسان میں اس کا ذکر ضرور تھا اور اس نے آسمان میں وہی زمانہ پایا تھا، جو ساگی نے زمین میں۔

اسی زمانہ میں ایک دن کا واقعہ ہے (ہم دن کہتے ہیں، مگر ہمیں نہیں معلوم کہ اُس ملک میں دن رات کا کوئی مفہوم تھا بھی یا نہیں) بہرحال

ایک جزوِ زمانہ کا واقعہ ہے، وینس اپنے کاشانۂ بلور میں بیٹھی ہوئی کنیزوں کا تماشۂ غسل دیکھ رہی تھی اور نہایت مسرور تھی، ایک بلوریں حوض جس کی تہہ اور دیواریں صیقل کئے ہوئے آئینہ کی تھیں نہایت شفاف پانی سے لبریز تھا اور ان میں کنیز پریاں برہنہ نہا رہی، اور آپس میں کھیل رہی تھیں چونکہ وینس خود سمندر کے کف سے پیدا ہوئی تھی اس لئے وہ فطرتاً عریانی پسند تھی اور اس کے محبوب ترین مشاغل میں سے ایک مشغلہ یہ بھی تھا، غرضکہ وہ اپنی نوجوان کنیزوں کی اسی جد وجہد کا تماشۂ نہایت انہماک سے دیکھ رہی تھی کہ ایک کنیز نے باہر سے آ کر کسی کے آنے کی اطلاع دی اور وہ اُٹھ کر چلی گئی۔

اروڈٹس، وینس کے ملک کی مشہور سیّاحہ اور شہرت کی دیوی، جو اس سے قبل کئی بار کرۂ ارض کا سفر کر چکی تھی اور وینس کے بہت مقرب درباریوں میں تھی، وینس سے ملنے آئی تھی، وینس پہنچی اور نہایت تپاک سے پذیرائی کر کے اس کی نئی سیاحت دُنیا کے متعلق پوچھنے لگی لیکن اس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ "اے وینس، میرے حالاتِ سیاحت کے تمام جزئیات سے آگاہ ہونے کی خواہش نہ کر، کیونکہ ممکن ہے کوئی بات اس میں تیرے لئے اضمحلال و افسردگی کا باعث ہو۔"

وینس نے نہایت متحیر ہو کر پوچھا "اے اروڈٹس آخر وہ کونسی بات اب کے دیکھ آئی ہے جو مجھے تکلیف پہنچانے والی ہوگی، مجھے یقین ہے کہ تو نے کرۂ ارض کے اُن ذلیل باشندوں میں، جن کو ہوا نہ سنبھالے تو منہ کے بل زمین پر گر پڑیں، کوئی بات ایسی نہ پائی ہوگی، جس کو سُن کر وینس جلے، کیا تو نے اس سے قبل وہاں کے حالات مجھ سے نہیں کہے اور کیا میں یہ سُنکر ہنستے ہنستے بیتاب نہیں ہوگئی کہ انسان اپنے جسم کو جانوروں کی طرح ناخن سے کھجاتا ہے تو اس کے جسم پر مٹی کی لکیریں بن جاتی ہیں۔ اے اروڈٹس کہہ اور نہایت آزادی سے کہہ، جو کچھ تو نے دیکھا ہے، میں دیکھتی ہوں کہ آج تو اپنی ملکہ سے خلافِ معمول کچھ مذاق کرنا چاہتی ہے۔"

اروڈٹس جو تمام دیویوں میں نہایت سنجیدہ و متین دیوی تھی، یہ سُنکر کچھ چیں بر جبیں ہوئی اور بولی "اے وینس مانا کہ کرۂ ارض کثیف ہے اور اُس کے بسنے والے، جن کی ساخت مٹی سے ہوئی ہے ذلیل ہیں، لیکن اسے کیا کیجائے کہ اسی کرہ میں ایک جگہ یونان بھی ہے، جس کا ذکر میں تجھ سے نہیں کرنا چاہتی تھی، لیکن جب تُو نہیں مانتی اور سمجھتی ہے کہ میں مذاق کر رہی ہوں تو سُن میں بتاتی ہوں کہ والئِ یونان کی چھوٹی بیٹی جس کا نام سائکی ہے، ایسی حسین ہے کہ اگر اس کی خاکِ پا مل جائے تو وینس کو چاہیئے کہ اس کا غازہ بنائے اور فخر کرے، کل اس کی سالگرہ کا دن تھا اور میں اس تقریب میں اتفاق سے پہنچ گئی تھی، لیکن اے وینس یقین کر کہ میں جو اس وقت اتنی دیر سے وینس کو بے نقاب دیکھ رہی ہوں، اور اس سے قبل ہزاروں بار دیکھ چکی ہوں، اُس ایک لمحہ کی تاب نہیں لا سکی، جب سائکی نے اپنا نقاب چہرہ سے جدا کیا۔ اے وینس میں افسوس کرتی ہوں اور رشک کرتی ہوں کہ کیوں نہ انسان ہوئی کہ اس کی معیت کی آرزو تو اپنے دل میں پیدا کر سکتی۔"

وینس جس کے نزدیک اس سے قبل کبھی اس امر کا امکان بھی نہ تھا کہ کوئی اس کے برابر حسین ہو سکتا ہے، یہ سُنکر کہ ایک عورت اور وہ بھی کرۂ ارض کی، اس سے زیادہ حسین ہے، چونک پڑی اور اُس کے غرورِ حسن کو اس بیان سے ایسا صدمہ پہنچا کہ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ سخت فکرمند ہو کر خاموش ہو گئی، لیکن کچھ سوچ کر بولی۔

"اے اروڈٹس ٹھہر، میں ابھی طلسمی آئینہ منگا کر سائکی کی تصویر دیکھتی ہوں، اور اگر وہ ایسی نہ ہوئی جیسی تو ظاہر کرتی ہے، تو یہ سمجھ رکھ کہ وینس جس طرح حسنِ خدمات پر انعامات کی بارش کر سکتی ہے، اسی طرح وہ یہ بھی جانتی ہے کہ گستاخی اور جھوٹ کی بدترین سزا کیا ہے۔"

اس نے اروڈٹس کو رخصت کیا، اور کنیزوں سے طلسم بند آئینہ منگوا کر اپنے سامنے ایک بلوریں میز پر رکھوایا۔ اور سب کو علیٰحدہ کر کے تنہا اس کے روبرو آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئی، یہ آئینہ دیکھنے کا طریقہ تھا کوئی پندرہ منٹ تک وہ اسی طرح سر جھکائے اور آنکھیں بند کئے بیٹھی رہی، لیکن اس کے حیرت و استعجاب کی کوئی انتہا نہ تھی جب اُس نے آنکھیں کھول کر آئینہ کو ایک ایسی تصویر پیش کرتے ہوئے دیکھا، جو حقیقتاً وینس کے

وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ اس کی نگاہیں کانپ کر گر پڑیں آئینہ ہاتھ سے چھوٹ پڑا اور عجب مضطربانہ انداز سے اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

کامل دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ اور وینس کا اضطراب کسی طرح کم ہونے میں نہ آتا تھا کہ دفعتاً ایک تدبیر اس کے ذہن میں آئی۔ "اور نسبتاً بیتابی میں کچھ کمی پیدا ہوئی" بیشک میں سائکی کے حسن کا قیام نہیں دیکھ سکتی، پھر مجھے وہ چیز تلاش کرنی چاہیئے جو اس کے حسن کو جلد از جلد زائل کر دے اور اس کی رعنائیوں کو تباہ و برباد۔ اس کو جلد سے جلد درسِ عشق دینا چاہیئے۔ اور عشق بھی نہایت شدید، سخت ناکام و مایوس" یہ کہتی ہوئی وہ اٹھی اور اپنے باغ کی طرف نہایت تیزی سے چل دی۔

کیوپڈ، وینس کا بیٹا شانہ پر کمان اور ترکش میں تیر لئے، اپنے پردار بازوؤں کو سمیٹے، روشوں پر ٹہل رہا تھا اور پھول توڑ توڑ کر ڈھیر لگا رہا تھا کہ ان پر مشق تیر اندازی کرے (ہر چند اس وقت بھی ہمیں اس کی صورت ایک پردار معصوم بچہ ہی کی شکل میں دکھائی جاتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس وقت یہ واقعہ پیش آیا، اس کا عنفوان شباب تھا اور اس لئے اس کی ناوک اندازیوں کی کوئی انتہا نہ تھی) وینس آہستہ آہستہ اس کے پاس پہنچی، اور بیٹے کا منہ چوم کر کہنے لگی "اے کیوپڈ میں نے سُنا ہے کہ جب تو تیر و کمان لے کر باہر نکلتا ہے تو ملک کی جوان لڑکیاں تیرے ہاتھ جوڑتی ہیں کہ پیارے کیوپڈ، جی چاہے ہمارے دلوں کو اپنے تیروں سے چھلنی کر دے، لیکن خدا کے لئے پیروں میں زنجیرِ محبت نہ ڈال، کیا واقعی تیرے تیروں کے زخم زنجیرِ محبت سے زیادہ آسان ہیں، کیا میں دیکھ سکتی ہوں کہ تو ان تیروں سے کیونکر وہ زنجیر طیار کرتا ہے، کرۂ زمین میں رئیس یونان کی چھوٹی بیٹی سائکی تیری قائل نہیں، جا، اور اس کو بتا کہ وینس کا بیٹا کیسا تیر انداز و غرور شکن ہے"

کیوپڈ یہ سُن کر پھڑک گیا، نئے شکار کا حال معلوم کر کے اس کی چٹکیاں بے چین ہو گئیں۔ کمان شانہ سے اُتر کر ہاتھ میں آ گئی اور تیر ترکش سے نکل کر کمان میں۔ اس کے پروں کی شکنیں کھلیں، اور دفعتاً نگاہ سے غائب ہو گیا۔

(۳)

سائکی کی رسم سالگرہ، جس نے اس کے شباب میں ایک سال کا اور اضافۂ قیامت کیا، ختم ہو گئی اور سارا عالم پھر ایک سال تک اس ثمرہ عریاں کے انتظار میں تڑپنے کے لئے چھوڑ دیا گیا، جس کو دیکھنے کی تمنائیں اس وجہ شدید تھیں کہ اگر ساری دُنیا سے اس وسعت کا کوئی عوض چاہا جاتا اور واقعی وہ عوض مل بھی لیا جاتا تو سائکی کے بے نقاب چہرہ اور نگاہ بے محابا کے سامنے خاکستر حیات کا ایک ڈھیر ہوتا اور پھر وہ تمام عمر کے لئے اپنے نقاب سے بے نیاز ہو جاتی۔ لیکن اس کا حسن معلوم ہوتا ہے کہ حیات کو رفتہ رفتہ دُنیا سے اُٹھانا چاہتا تھا۔ اور روحوں کو بتدریج گھلا گھلا کر فنا کرنے کا خواہشمند تھا۔ دُنیا سے اب یہ خیال اُٹھتا جاتا تھا کہ سائکی واقعی نوع انسان سے ہے اور یہ خواہش کہ کم از کم ایک ہی رات، ایک ہی ساعت، ایک ہی لمحہ، اس کے حسن و شباب میں فنا ہونے کے لئے بستر آ جائے، آہ یہ خواہش تو ایسی خواہش تھی، جو اب کفر میں داخل تھی، کیونکہ اس کا حسن لوگوں کے دلوں میں اب ایک عجیب و غریب عظمت کی صورت اختیار کر چکا تھا، اور اس سے محبت کرنے کا مفہوم سوائے اس کے اور کچھ نہ رہ گیا تھا کہ دُنیا اس کی پرستش کرنے لگے، عالم اسے پوجنے لگے، سائکی کا نام لیا جائے، تو لوگ سجدوں میں گر پڑیں اور جب اس کا واسطہ دلایا جائے تو ظالم سے ظالم قزاق اپنا ہاتھ روک لے اور خونخوار سے خونخوار قاتل کی تلوار جہاں تک اُٹھ چکی ہے وہیں تک اُٹھ کر رہ جائے اور دُنیا میں صرف وہی عہد و پیماں قابلِ اعتبار سمجھا جائے، جو سائکی کی قسم سے شروع کیا گیا ہو، غرضکہ رئیس یونان کو پورا یقین تھا کہ اب سائکی کی شادی کسی طرح نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر کوئی شخص منتخب بھی کیا جاتا تو یہ خبر اس کو کیونکر پہنچائی جاتی کہ وہ سائکی کا شوہر ہونے والا ہے۔ اول تو کوئی شخص ایسا نظر ہی نہ آتا تھا جو حقیقتاً اس بات کا اہل ہوتا کہ سائکی اس کے آغوش میں سپرد کر دی جائے۔ اور اگر کوئی ہوتا بھی تو یہ بالکل یقینی امر تھا کہ سائکی کے حسن کی برداشت اس کے امکان سے باہر ہے، بہرحال اس سترھویں سالگرہ کی تقریب میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ شاید کوئی انتخاب ہو سکے گا، لیکن افسوس ہے

کہ اس میں بھی کوئی کامیابی کی صورت نظر نہ آئی۔

• سالگرہ کے ٹھیک دوسرے دن شام کو سانگی اپنے باغ میں حوض پر بیٹھی ہوئی رنگین مچھلیوں کی بیقراری کا تماشہ دیکھ رہی تھی، وہ شاید چند لمحوں کے لئے اس بات کو بھول گئی تھی کہ وہ وہی سانگی ہے جس کی ناکامیاب رسم سالگرہ ابھی دو دن ہوئے ختم ہوئی ہے اور وہ اس سال بھی اپنے شباب کو خلوت وتجرد ہی میں کاٹنے کے لئے مجبور ہے اور نہ دربار سے واپس آنے کے بعد ایک دن تک اس کی افسردگی کا یہ عالم رہا کہ دُنیا کی تمام چیزیں اسے بے معنی نظر آتی تھیں اور مسرت کا وجود بالکل مفقود۔ وہ سمجھتی تھی کہ عورت ہونا اور ذرا حسین ہونا، ایک ایسا قہر ہے، جس کا علاج اس دُنیا میں ممکن نہیں اس نے کھانا نہیں کھایا۔ کیونکہ غذا بقائے حیات کے لئے ہے اور وہ سمجھتی تھی کہ شاید عورت کا شباب عورت کی حیات سے جُدا کوئی چیز ہے، بالوں میں شانہ کرتے کرتے جی اُلجھا تو اُٹھ بیٹھی کہ آخر کیوں؟ آئینہ دیکھا تو منہ پھیر لیا کہ آہ سانگی جہاں کہیں بھی ہے مغموم و نامراد ہے، پھولوں کے ہار یوں ہی رکھے رکھے سوکھ گئے اور اس نے نہیں پہنے، کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ شاید گجروں کو کوئی اپنے لئے نہیں پہنتا۔ ہار اس لئے گردن میں نہیں ہوتے کہ ان کی نگہت کو صرف ہوا اُڑائے لئے پھرے اس سے یہ مقصود نہیں کہ وہ ایک افسردہ سینے پر پڑے پڑے سوکھ جائیں۔ بلکہ شاید ان سے یہ مدعا ہے کہ کوئی دوسرا ان کی نگہت سے بیقرار ہونے والا ہو، اور ان کی جنبش ایک دھڑکتے ہوئے دل کی جانب سے اسے بے قراری کا جواب دے، ورنہ یوں تو ناکام سینہ ایک مزار ہے، اور مزار پر چڑھائے ہوئے پھول کیا، اس نے گانے میں بھی دلچسپی نہ لی، کیونکہ وہ لحنوں میں کچھ نقصان محسوس کرتی تھی سازوں کی نسبت اسے یہ گمان تھا کہ شاید ان کے تاروں میں کسی خاص تار کی کمی ہو گئی ہے، اور پھر سب سے زیادہ یہ کہ اگر موسیقی لذت ہے تو خدایا یہ کیسی لذت ہے کہ سینہ پھٹا جاتا ہے، اگر گانا سکون ہے، تو یارب یہ کیسا سکون ہے جو دل کو بیقرار کئے دیتا ہے۔

غرضیکہ اس نے اپنے سارے محبوب مشاغل ترک کر دیئے کیونکہ ان میں سے کوئی اس کے حسیّات شباب کا جواب دینے والا نہ تھا، وہ راحتوں اور عشرتوں سے بیزار ہو گئی تھی، وہ اپنی گوری گوری کلائیاں دیکھتی تھی اور چاہتی تھی کہ کوئی مضبوط ہاتھ انھیں پکڑ لے اور پھر نہ چھوڑے اور اپنی نازک کمر، وہ ایک مٹھی میں بھر کے آجانے والی پتلی کمر چاہتی تھی کہ کوئی اس کو دُکھائے اور دُکھتے جائے، وہ خواہشمند تھی کہ اس کی نزاکت و دوشیزگی کا کوئی دشمن مل جائے اور اسے تکلیفیں پہنچائے۔ اب اس کا وہ غرورِ حسن باقی نہ رہا تھا کہ شاہزادوں کی تصویریں دیکھ کر منہ پھیر لیتی تھی، اب تو وہ باغ میں طاؤس کو بھی مستی کے عالم میں رقص کرتے دیکھتی تھی تو بے اختیار اس سے لپٹ جانا چاہتی تھی، اور ہنس کو بھی گردن اُٹھائے، اُبھرا ہوا سینہ نکالے پانی میں دیکھتی تھی، تو وہ چاہتی تھی کہ بھی بانہیں کھول کر اپنی آغوش میں لے لے اور اس کی ڈھالی گردن پر اپنی زبردستی گردن ڈال دے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کی اوائل تمکنت نے معاملہ کی صورت کو اس قدر اہم بنا دیا تھا کہ اب چارہ کار اس کے سوا اور کوئی نہ تھا کہ وہ ایک دیوی کی سی زندگی بسر کرے۔ لیکن آہ کون جانتا ہے کہ ایک دیوی، جس کو دُنیا معصوم جانتی ہے، اس وقت کن کن گناہوں کی آرزو اپنے دل میں لئے ہوئے تھی۔

بہرحال وہ اس وقت حوض پر بیٹھی ہوئی تھی، اور نسبتاً کچھ مسرور نظر آتی تھی، کنیزیں پھولوں کے پنکھے لئے اسے ہوا پہنچا رہی تھیں۔ اور سامنے دوسرے کنارے پر نسرین حسب معمول اپنا سر دیئے ہوئے کچھ گنگنا رہی تھی، کہ سانگی یکبارگی چونک پڑی اور نسرین کی طرف خطاب کر کے بولی کہ "نسرین، یہ تو کیا گنگنائی، پھر کہہ، ذرا آواز سے کہہ، سانولے ادر گا کہ مجھے کچھ لطف آیا، نسرین جو سانگی کی افسردگی سے بہت متفکر تھی، خوش ہو گئی، اور اس نے نہایت ہی شیریں لہجہ میں گانا شروع کیا:-

وہ دن جب میں ایک معموم خلوت خانہ میں منہ لپیٹے پڑی رہتی تھی، گئے، وہ راتیں جب سنسان کنجوں میں تنہا
پڑی کراہا کرتی تھی گذر گئیں، اب تو جی چاہتا ہے کہ نقاب میرے چہرہ سے جُدا ہو اور پھر چاروں طرف کی چاندنی

ہمت کہ ایک بار نظر آئے، جسے آرزو ہ تھیں کہ میرا آفتاب سا چہرہ انہیں دیکھنا نصیب نہ ہوتا تھا، شاید یہ افسردہ تھی کہ میری زلفوں کی بھینی بھینی خوشبو سے وہ عرصہ سے محروم تھیں، راتیں کبیدہ تھیں کہ میرے نیلوں نے انہیں عرصہ سے روشن نہیں کیا تھا، لیکن اب اے صبح، اپنا دامن پھیلا اور کرنوں کو جمع کرلے کہ میں آج پھر بے نقاب پھر رہی ہوں، اے شام اپنے تئیں خوب بسا لے کہ آج میرے بال پھر تیرے اندر کھلے ہوئے ہیں، اور اے رات بیدار ہو جا کہ آج میری نازک انگلیوں میں پھر تاروں کی لرزش سے گدگدی سی پیدا ہو رہی ہے، میری آنکھیں اگر جادو ہیں تو وہ جادو ہی رہیں گی، انہیں مسحور ہونا نہیں آتا، میرا حسن اگر دیوتا ہے تو ہمیشہ اس کی پرستش ہی کی جائے گی، وہ خود کسی کا پرستار کیوں ہو۔ دنیا اگر میرے لئے تڑپ رہی ہے تو تڑپے، میں کسی کے لئے کیوں تڑپوں، میری رعنائی ایک مستقل استغنا ہے، اور سارے عالم کی حیات اس کے ایک جلوۂ گریزپا کا ادنیٰ خراج ہے"

سائکی یہ کہتے کہتے جوش میں آگئی اور ایک شاہانہ انداز سے کھڑی ہو کر ٹہلنے لگی، سیاہ ریشمی چادر جو اس کی رانوں سے لپٹی ہوئی کمر کی نزاکت کو اور بھی نمایاں کر رہی تھی سرک کر نیچے گر گئی تھی، ڈھلک گئی، شانے کھل گئے، بازو گردن سینہ کی عریاں سپیدی سے مل گئی، سیاہ ریشمی بال پیٹھ پر گھوم گھوم کر چھلے بن گئے، ابرو کی تن گئیں، مست آنکھیں اور متوالی بن گئیں، شباب بھی وقت تھا اور یہی عالم کہ کیوپڈ اپنا تیر و کمان سنبھالے کنجوں میں سے نکلا اور اس ارادہ سے نکلا کہ آج اپنا ترکش سائکی پر خالی کر دیگا، لیکن نشانہ کو پیش نظر رکھنے کے لئے، کیوپڈ نے سائکی کو نگاہ بھر کے دیکھا ہی تھا کہ تیر چلہ سے چھوٹ گیا، کمان ہاتھ سے گر پڑی، چلہ اتر گیا اور کیوپڈ غش کھا کر زمین پر گر پڑا۔

آہ، کاش کوئی سائکی سے اس وقت جا کہ کہدیتا کہ جس محبت کی اس کو جستجو تھی وہ خود اس کی آرزو مند ہے، جس عشق کی اسے تمنا تھی وہ اب خود اس کا تمنائی ہے صیاد خود اس کا مجروح ہے، عشق خود اس کا دیوانہ ہے اور تیر آپ اس کی نگاہ کا زخمی۔

اے کیوپڈ تو نے لاکھوں دلوں پہ تیر چلائے ہوں گے، خدا معلوم کتنے سینے تو نے مجروح کئے ہوں گے، لیکن وہ تیر جو حسن کے ترکش میں پنہاں ہیں وہ پیکاں، جنہیں صرف اک حسین دوشیزہ ہی کی نیم باز آنکھیں چلا سکتی ہیں تیری ناوک اندازیوں سے کہیں زیادہ تباہ کن ہیں۔

جا، تیرا تیر، اب صرف شہپر ہے بازو سے جدا، تیری کمان صرف اک جنازہ ہے بے مزہ جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ فرشتوں نے صحائف میں لکھ لیا، حوروں نے اپنے کاشانوں میں سن لیا کہ وینس کا بیٹا آج سائکی کے باغ میں بیہوش پڑا ہے۔

وینس کو یقین تھا، اور وینس کیا جو بھی کیوپڈ کی بے پناہ ناوک اندازیوں کا حال سن چکا ہے وہ بھی یقین کرے گا کہ ایک سائکی کیا اگر اس جیسی ہزار ہوں تو وہ چٹکی کی صرف ایک جنبش سے سب کے دلوں کو چھلنی کر سکتا ہے، مگر فطرت کے پاس اک تیر اور تھا، اک ناوک اور تھا، جو کیوپڈ کے تیروں کی طرح بدنام تو نہ تھا، مگر ان سے زیادہ کارگر تھا، اور جس وقت سائکی اس عالم میں آئی تو وہ ناوک اس کی نشیلی آنکھوں میں نگاہ بنا کر رکھ دیا گیا، کیوپڈ کو تو جراحت پہنچانے کے لئے قصد و ارادہ کی ضرورت تھی، اہتمام و انصرام درکار تھا کہ کمان میں تیر رکھے پھر چلہ کھینچ کر چٹکی ڈھیلی کرے، لیکن سائکی کی مست آنکھوں کو یہ ہوش کہاں، نہ وہ کسی قصد کو جانتی تھیں، اور نہ کسی اہتمام کو، وہ نہ کسی ارادہ سے واقف تھیں اور نہ کسی انصرام سے، ایک بار پلک سے پلک جدا ہوئی اور تیروں کی بارش شروع ہو گئی۔

غرضکہ کیوپڈ سائکی کے باغ سے زخمی ہو کر پھرا اور ایسا زخمی کہ اگر ہم چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ اس کا دل پاش پاش تھا، اور اس کی روح یکسر جراحت کدہ۔

وہ باغ میں ٹہل رہا تھا اور نہایت انہماک کی حالت میں اپنے اضطراب و بیقراری کا لطف اٹھا رہا تھا کہ وینس آئی اور حسب معمول

اس کو اس درجہ مغموم و افسردہ دیکھ کر متحیر رہ گئی۔ وہ ایک لمحہ کیلئے بھی یہ نہ سمجھ سکتی تھی کہ کیوپڈ کسی مہم سے ناکام و نامراد واپس آسکتا ہے۔ چہ جائیکہ اس کا مضمحل ہو کر لوٹنا، وہ کچھ سمجھی، اور سمجھ کر ٹھٹکی اور پھر آگے بڑھی، بڑھی اور ایک خاص انداز میں بولی "اے کیوپڈ مجھے اپنا ترکش دکھا کہ میں اسے خالی دیکھ کر خوش ہوں اور مجھ سے شکایت کر کہ آج تو تیر چلاتے چلاتے چٹکیاں دکھ گئیں، ہاں، ہاں، سمجھی ہوں شاید اب تو افسوس کرتا ہوگا کہ کیوں سائکی کو زخمی کیا، وہ ایسی ہی حسین ہے، اور اے کیوپڈ یہی وجہ تھی جس نے اس کی تباہی و بربادی کو لازم کر دیا تھا۔ اے کیوپڈ بول، جلدی کہہ کہ وہ دیوانہ وار دیواروں سے سر ٹکرا رہی ہے یا وادیوں میں کہیں خراب و خستہ پھر رہی ہے"

کیوپڈ، سائکی کی نسبت تباہی و خستگی کا ذکر نہ سن سکا اور بے قرار ہو کر بول اٹھا۔

"ہاں میرا ترکش بھی خالی ہے اور چٹکیاں بھی دکھتی ہیں، کیا تیرے فرمان سے قاصر رہنے کے لئے یہ عذر کافی نہیں ہیں، میں سائکی کے مجروح ہونے پہ افسوس نہیں کرتا، کیونکہ وہ مجروح نہیں ہے اور اگر کہیں وادیوں میں پریشان پھر رہی ہے یا دیواروں سے سر ٹکرا رہی ہے تو وہ تنہا نہیں ہوگی، کیوپڈ نے اپنی کمان توڑ ڈالی، تیروں کو پھینک دیا اور اب اس کی زندگی صرف یہی ہے کہ وہ سائکی کے درد و مصیبت میں اپنے تئیں مٹا دے اے وینس مجھے ملامت نہ کر، کیونکہ وہ فن تیر اندازی میں مجھ سے زیادہ مشاق نکلی اور مجھ پہ تاسف بھی نہ کر کیونکہ ساری عمر میں آج ہی تو یہ معلوم ہوا ہے کہ تیر چلانے سے تیر کھانے میں زیادہ مزہ ہے، آہ اگر مجھے یہ رشک نہ ہوتا کہ زمانہ اس تیر کو دیکھ لے گا تو میں اس کو اس حال میں کہ وہ میرے خون کے بہترین قطرات سے رنگین ہوتا، اولمپس واٹلس کی چوٹیوں پر نصب کر دیتا اور زمین کی اس بے مثل یادگار کی پرستش سارے آسمان والوں سے کراتا مگر نہیں وہ پہلو میں ہے اور وہیں رہے گا خواہ اس کے نکالنے کی کوشش میں جیوپیٹر میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کیوں نہ کر ڈالے"

غالباً اس کے اظہار کی ضرورت نہیں کہ وینس پہ کیوپڈ کی اس تقریر کا کیا اثر ہوا، وہ انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں وہاں سے چلی گئی، اور سب سے پہلا حکم جو اس نے واپس آ کر دیا یہ تھا کہ "سامان سفر درست کیا جائے"

پریاں نہایت عجلت کے ساتھ اہتمام و تیاری میں مصروف ہو گئیں اور دربار کی کنواریاں وینس کے جلو میں چلنے کے لئے آمادہ، پردار گھوڑے جن کا ساز و یراق جواہرات کا تھا اور جن کی دُم و ایال میں نہایت آبدار موتی گندھے ہوئے تھے، وینس کے زریں رتھ میں لگائے گئے اور معزز زہرہ جبیں کنیزوں، کنواریوں اور پریوں کے دھندلے بادلوں کی طرح جو سما پہ چھا گئیں اور پھر تھوڑی دیر بعد آفتاب کی روشنی میں تحلیل ہو کر فنا۔

(۴)

سارا یونان آج چراغاں ہو رہا تھا۔ اور یونان کا ہر ہر گھر بزم رقص و سرود ———— ایک سیلاب مسرت تھا، کہ ہر پیشانی اس میں غرق نظر آتی تھی۔ ایک طوفان نشاط تھا کہ ہر دل اس میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا تھا، ہر گلی کوچہ میں زر و سیم کی بارش ہو رہی تھی، شاہی انعامات کا سلسلہ برابر جاری تھا اور نہیں کہا جا سکتا کہ دنیا کے کسی جشن میں ایک بادشاہ کے دست کرم نے اس سے زیادہ وسیع حصہ لیا ہو۔ آگسٹس والی یونان کا عہد سلطنت نہ صرف اس وجہ سے عہد زریں سمجھا جاتا ہے کہ وہ بے انتہا سیر چشم و فیاض تھا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس سے زیادہ رعایا کا خیر خواہ بادشاہ یونان کی تاریخ میں اور کوئی دوسرا نظر نہیں آتا، وہ بہانہ تلاش کیا کرتا تھا کہ میں کس طرح رعایا کو زیر بار احسان کروں اور اس سے بہتر موقع اس کے لئے اپنا حوصلہ نکالنے کا اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی دو حسین بیٹیوں کی شادیاں کر رہا تھا، سارا دربار زر اندود تھا اور دربار کی ہر ہر چیز جواہر نگار۔

یونان کے تمام امرا جمع تھے اور پایۂ تخت کی ہر حسین لڑکی شاہی مہمان تھی، اگلاس و کیوپڈس سائکی کی دونوں بہنیں سر سے پاؤں تک

جواہرات میں غرق دو لہن بنی بیٹھی تھیں اور ان کے خوش نصیب شوہر ان کے پہلوؤں میں مست و سرشار۔ ملک کی بہترین موسیقی سازوں سے نکل رہی تھی، اور یونان کی لطیف ترین شراب بلوری و الماسی گلاسوں میں چھلک رہی تھی۔

ٹھیک یہی وقت تھا اور جشن طرب کا یہی عالم کہ دربار کے ایوان کا ایک دروازہ کھلا اور کوئی چیز اندر آ کر روشنی میں مل گئی اور بادشاہ چیخ مار کر تخت سے نیچے گر پڑا۔

نشے ہرن ہو گئے، مسرتیں منغص ہو گئیں، سکون کی جگہ اضطراب نے لے لی، اطمینان پر سراسیمگی نے قبضہ کر لیا، اور ہر شخص بادشاہ کی طرف دوڑ پڑا، وہ بُری طرح تڑپ رہا تھا، آنکھیں شدت درد سے اُبل پڑی تھیں، اور کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا بات ہے، ملکہ چیخ کر بادشاہ سے لپٹ گئی، کہ یہ خدایا یہ کیا ہوا؟ اس کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا، مگر ہاں ایک وینس، جو لوگوں کی نگاہ سے غائب گویا یہ کہتی ہوئی چل دی کہ "یہ ابتدا ہے، انتقام کی۔ سائکی، وینس کے بیٹے کو بے قرار کر کے زندہ رہے، ناممکن ہے"۔

آن واحد میں سارے یونان کو معلوم ہو گیا کہ بادشاہ کسی سخت مرض میں مبتلا ہے لوگ دوڑ پڑے، ماہرین طب نے اپنی ساری تدبیریں ختم کر دیں، شیوخ معابد دعائیں مانگتے مانگتے تھک گئے لیکن درد میں کسی قسم کی تخفیف نہ ہوئی اور اس لئے پایان کار تمام اراکین و عقلائے سلطنت کی یہ رائے ہوئی کہ سنگ مقدس سے چارہ جوئی کی جائے اور جو ہدایات اس کی ہوں ان پر عمل کیا جائے۔

جس عہد کا یہ واقعہ ہے اس وقت یہ دستور تھا کہ جب کوئی سخت مصیبت پیش آتی تھی اور کوئی انسانی تدبیر کارگر نہ ہوتی تھی تو دیوتاؤں کی روحوں سے التجا کی جاتی تھی، اور اس عرض و التجا کے لئے ایک خاص مقام مقرر تھا، یہاں ایک پتھر نصب تھا جسے سنگِ مقدس کہتے تھے اس عرض کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ پتھر پر ایک تحریر نظر آ جاتی تھی جو نہ صرف اس مصیبت کی حقیقت سے آگاہ کرتی بلکہ دفعِ بلا کی تدبیر بھی ظاہر کرتی تھی، چنانچہ اس وقت صعب میں، جبکہ بادشاہ کی تکلیف ہر لمحہ بڑھ رہی تھی اور کسی طرح اسے آرام ہوتا نظر نہ آتا تھا، سوائے اس کے اور کیا چارہ تھا کہ سنگِ مقدس سے مدد چاہی جائے۔ چنانچہ اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے ملکہ، امرائے دربار، اراکین سلطنت اور اپنی دونوں دلہن بیٹیوں کے ساتھ روانہ ہو گئی، اور سائکی کو بادشاہ کی تیمارداری کے لئے چھوڑ دیا۔

سب وہاں پہنچے اور جلدی جلدی وہ تمام مراسم عبودیت ادا کئے گئے، جن کا ادا کرنا ضروری تھا، مگر آہ کسے خبر تھی کہ وینس کے ہاتھ نے اس سنگ مقدس پر ایسا سخت فیصلہ لکھ دیا ہے، جس کے دیکھنے اور سننے کے لئے نہایت سنگین دل کی ضرورت ہے۔

جب دعائیں اور التجائیں ختم ہو گئیں تو ملکہ دھڑکتا ہوا دل لیکر بڑھی اور اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس پردہ کو ہٹایا، جو سنگِ مقدس پر پڑا ہوا تھا۔ اس تحریر کا مفہوم یہ تھا۔

"رئیس یونان بیمار ہے، لیکن اس کی بیماری کا علاج انسانی قوت سے باہر ہے، سارے عالم کے طبیبوں کو بلاؤ، لیکن وہ نہ بتا سکیں گے کہ یہ بیماری کیا ہے۔ ساری دُنیا کے اختر شناس جمع کرو، لیکن وہ یہ کہہ سکیں گے کہ یہ کیا بلا ہے کیونکہ وہ کوئی مرض نہیں جسے طبیب پہچان سکے، وہ کسی ستارہ کا اثر نہیں جسے نجومی دُور کر سکے۔ وہ ایک قہر ہے جو بہشت کے مالک اور دیوتاؤں کے سردار جیوپیٹر نے اس پر نازل کیا ہے، یہ اس کا غصہ ہے کہ اگر اس سے جلد پناہ نہ مانگی گئی، تو سارا یونان بہت جلد تباہ ہو جائے گا، اگر یونان کی ملکہ، یونان کے امرأ، یونان کی رعایا اپنے بادشاہ کی صحت اور آئندہ امن و سکون کے آرزومند ہیں تو ان کو چاہیئے کہ شہزادی سائکی کو کوہ الوند کی سب سے اونچی چوٹی پر لے جائیں اور شاہ بلوط میں باندھ کر چلے آئیں۔ جیوپیٹر اس قربانی کو کسی عفریت کے [illegible] قبول کرے گا،

اور بادشاہ فوراً صحیح و تندرست ہو جائے گا، اور اگر یہ قربانی دو دن کے اندر نہ کی گئی تو پھر ہزار ساگی کی قربانیاں بھی اس مصیبت کو دُور نہ کر سکیں گی۔"

ملکہ غش کھا کر گر پڑی، امراً متحیر رہ گئے، کنیزوں نے اپنا سر پیٹ لیا مگر اس غمگین جماعت میں؛ اس حلقۂ ماتم میں دو روحیں ایسی بھی تھیں جن کی حقیقی مسرت کا یہ آج پہلا دن تھا، اور جن کے لئے اس ظالم منجم کی یہ ظالم تجویز ایک شعر سے زیادہ پُر لطف ایک نغمہ صباحی سے زیادہ مسرت بخش تھی۔

اگلا دس و کیو پڈس نے اپنی ماں کو اُٹھایا اور ہوش میں لا کر جلد واپس چلنے پہ اصرار کرتی ہوئی بولیں "اے ماں اُٹھ، خدا جانے بادشاہ کا کیا حال ہو گا۔ ہر چند جیو پیٹر کا فیصلہ نہایت شدید و ظالم ہے، لیکن اس کا غصہ اس سے زیادہ بے پناہ و بے رحم ثابت ہو گا۔ اگر سنگِ مقدس کی تجویز پہ عمل نہ کیا گیا۔"

بہر حال ملکہ کسی نہ کسی طرح واپس آئی، لیکن اک ایسے روح فرسا غم کا بوجھ اپنے دل میں لئے ہوئے کہ اگر خود اسے اپنی جان کی قربانی کرنی پڑتی، تو وہ نہایت خوشی سے اس کے مقابلہ میں برداشت کر لیتی، مگر نہیں فطرت اس وقت اس کے نسوانی فرائض کا امتحان لے رہی تھی۔ سخت المناک آزمائش میں ڈالنا چاہتی تھی، شوہر اس کا دل تھا اور بیٹی اس کی جان اور اس لئے کوئی قوت اس امر کے فیصلہ میں مدد نہیں دے سکتی تھی کہ وہ دل کو جان پر قربان کرے، یا جان کو دل پر۔ وہ خوب سمجھتی تھی کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو ہاتھ سے دینا ناگزیر ہے، مگر کس کو دے اور کس کو لگائے رکھے، یہ ایک ایسی کشاکش تھی جس سے نکلنا آسان نہ تھا۔

وہ محل واپس آئی تو بادشاہ کے کرب میں اس نے اضافہ پایا، لیکن جب اس نے ساگی کو باپ کے پاس سخت حالت فسردگی میں بیٹھا پایا۔ تو وہ "ہائے ساگی" کہہ کر زمین پر گر پڑی۔ اور بیہوش ہو گئی، ہمیں خبر نہیں کہ وہ کب تک اس عالم میں رہی، اور کن کن شدائد کا مقابلہ اس نے کیا، مگر ہاں، جس وقت صبح کو اس کی آنکھ کھلی تو چہرہ کا رنگ بالکل اُڑا ہوا تھا، آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے تھے اور ضعف و نقاہت کا وہ عالم تھا کہ کسی کے سہارے سے اُٹھنا بھی دشوار تھا۔ اس نے آنکھ کھولتے ہی چاروں طرف دیکھا اور یہ یقین کرنا چاہا کہ جو کچھ گزرا یہ سب خواب تھا، مگر جب اس نے کئی بار اپنی آنکھوں کو کھولا اور بند کیا تو اسے سمجھنا پڑا کہ یہ سب حقیقت و واقعہ ہے اور ویسا ہی جگر خراش ہے جیسا اس نے اپنے پندار میں بحالت خواب وحشی پایا تھا۔

نہ صرف امرأ دربار و اراکین سلطنت، بلکہ سارا یونان سراسیمہ تھا کہ دیکھئے ملکہ کس نتیجہ پر پہنچتی ہے، بعض کا خیال تھا کہ ایسا عادل بادشاہ، ایسا سخی و رحیم حکمران پھر یونان کو نصیب نہ ہو گا، اس لئے جس قدر گراں قیمت پر بھی اس کی زندگی واپس مل سکے ارزاں ہے، لیکن بعض کی تمنا یہ تھی کہ جو کچھ ہو ساگی زندہ رہے، کیونکہ بادشاہ تو ضعیف ہے اور بہر حال یونان کو ایک نہ ایک دن اس کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنا ہے لیکن ساگی جس نے ابھی اپنی زندگی کی صرف تیرہ بہاریں دیکھی ہیں اور جس کی ذات ساری زمین کے لئے مایۂ ناز ہے، اور روز روز پیدا ہونے کی چیز نہیں۔

اسی حالت منتظرہ میں دفعتاً بادشاہ کی خواب گاہ سے سخت چیخ کی آواز آئی اور معلوم ہُوا کہ بادشاہ دم توڑ رہا ہے۔ ملکہ نے دفعتاً آنکھیں کھول دیں۔ اور اس سکوت کے دُور کرنے کے لئے جو اس وقت سارے دربار پر چھایا ہُوا تھا، اس امر کا فیصلہ کرنے کے لئے جس کے سُننے کے واسطے یونان کا ہر متنفس ہمہ تن گوش بنا ہُوا تھا وہ اُٹھی اس عزم کو اپنے خط و خال ہی لئے ہوئے، اس عجیب و غریب استقلال سے اپنے اندرونی اضطراب کو چھپائے ہوئے، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ شاید وہ اپنے تاثرات سے جنگ کر کے کوئی فتح حاصل کر چکی ہے، اور اب جو کچھ وہ کرنا چاہتی ہے اس پر افسوس کرنے کے لئے تیار نہیں۔

اس نے سمجھ لیا تھا کہ سائکی بھی مثل میرے بادشاہ کی مملوکہ ہے اور اس لئے مجھے کوئی حق نہیں کہ ایک مالک کو اپنی مملوک سے لطف اُٹھانے دوں، اگر سائکی کو ہاتھ سے دے دینے کے بعد بادشاہ اپنی زندگی حاصل کرے گا تو اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہوگی جیسے کوئی شخص اپنی محبوب ترین چیز دے کر کسی مصیبت سے نجات حاصل کرے۔

جب وہ اس تاویل سے اپنی تسلی کر چکی تو اپنے مریض شوہر کے بستر علالت پر گئی اور سب کے سامنے سائکی کو مخاطب کر کے بولی کہ "اے بیٹی تیار ہو جا، ابھی تجھے اجازت دے کر اپنے فرض سے سبکدوش ہوتی ہوں اور اس کی تعمیل کر کے اپنے فرض کو ادا کر، اے سائکی ہر چند مجھے یقین ہے کہ تیرے بعد میں زیادہ نہ جی سکوں گی۔ لیکن اگر مجھے اپنی ہی جان دینی پڑتی تو کیا مجھے پس و پیش کرنا چاہیئے تھا، پھر تیرا چلا جانا بھی تو میرا اپنی ہی جان کا چلا جانا ہے۔ اے میرے جگر کے ٹکڑے دیکھ، اپنی کمزوری سے اس وقت میرے ارادوں کو کمزور نہ کر دینا۔ تو زیادہ پریشان نہ ہو، کیونکہ تیری ماں بھی بہت جلد تجھ سے آملے گی اور پھر کبھی جدا نہ کرنے کے لئے تجھے اپنی آغوش میں لے لیگی۔"

اب ملکہ کی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ اُمنڈ کر آنے لگے اور اس کی آواز کانپنے لگی۔ یہاں تک کہ اس کی ہچکی بندھ گئی اور مجبوراً آنکھ پر رومال رکھ کر اسے بات کا اشارہ کرنا پڑا کہ "بس اب سائکی کو لے جاؤ اور دیر نہ کرو۔"

ہم نہیں کہہ سکتے کہ سائکی نے اوّل اوّل اس خبر کو کہ وہ قربان گاہ پر چڑھائی جائے گی، کس طرح سنا اور اس حالتِ انتظار کو جب تک ملکہ نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا کیونکر کاٹا مگر ہاں یہ ایک واقعہ ہے کہ جب اس کی نسبت ایک قطعی رائے قائم کر لی گئی، اور اسے پہاڑ پر لے جانے کی تیاریاں ہونے لگیں، تو وہ بالکل مُردہ سی تھی، اور اس کے قوٰی نے بالکل جواب دے دیا تھا۔

موت سے ڈرنا بالکل فطری امر ہے، اس لئے سائکی کیونکر مستثنیٰ ہو سکتی تھی، لیکن اس میں کلام نہیں کہ جس غم نے اسے گونگا بنا دیا، جس صدمہ نے اس کی آنکھوں سے آنسو جذب کر لئے وہ صرف یہ تھا کہ "میری جدائی کو ماں، کیونکر برداشت کر سکے گی"؟ اس نے اپنے ہاتھ پاؤں ڈال دیئے۔ بدن ڈھیلا کر دیا۔ اور اس طرح گویا اس نے اجازت دے دی کہ اس جسم کو جہاں جی چاہے لے جاؤ۔

الکلادس وکیوپڈس نے جلدی جلدی سارا انتظام روانگی کا کیا اور غریب سائکی کا زندہ جنازہ ایک گاڑی پر ڈال کر کوہ الوند کی طرف چل دیئے۔

سوگوار ماں، جس کی حالت دیکھ دیکھ کر لوگوں کے کلیجے پھٹے جاتے تھے ساتھ ساتھ تھی؛ ایک ہجوم تھا جو پروانہ وار اس شمع مُردہ کو گھیرے ہوئے تھا، سارے شہر میں ایک کہرام برپا تھا، اور ہر گھر میں نالہ و ماتم۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو خونبار نہ ہو، اور کوئی دل نہ تھا جو بیقرار نہ ہو۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت ساری کائنات پلٹ دی جانے کو ہے، اور آسمان ٹوٹ پڑنے کو ہے۔

ایک گھنٹہ میں یہ جماعت اس چوٹی پر پہنچ گئی جہاں سائکی کی قربانی پیش کی جانے والی تھی اور جلدی جلدی اسے شاہ بلوط کے اس درخت سے باندھ دیا جو سب سے زیادہ نمایاں وہاں کے درختوں میں تھا۔

اب اس کی نازک کلائیاں جو ایک ایک چوڑی کا بار بھی برداشت نہ کر سکتی تھیں پس پشت رسی سے باندھ دی گئی تھیں اور وہ کمر جس کی نزاکت کی پیمائش کے لئے ڈیڑھ بالشت بھی زیادہ تھا درخت کے زبردست تنے سے کس دی گئی تھی، اس کی وہی ریشمی چادر جسے وہ نصف باندھتی اور نصف اوڑھتی تھی اس کے جسم پر تھی، پس وہ نقاب جو ۵ سال سے اس کے چاند سے مکھڑے کو اپنی آغوش میں چھپائے ہوئے تھا اب جدا تھا کیونکہ یہ بھی رسم تھی کہ جس کی قربانی کی جائے اس کا سر و چہرہ برہنہ کر دیا جائے۔

سائکی کا یہاں تک لایا جانا، اس کی کمر اور کلائیوں کو باندھ کر درخت سے کس دیا جانا، یہ سب [illegible] جس وقت اس کی ماں نے بیٹی کا [illegible] بوسہ اس کی پیشانی کا لیا تو سائکی کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور چونکہ وہ اب [illegible]

وہ قدموں پر نہ گر سکتی تھی، (کیونکہ وہ درخت سے کس دی گئی تھی) وہ کچھ کہہ نہ سکتی تھی (کیونکہ اس کے حلق و زبان خشک تھے) اس لئے اس کی وہ ساری التجائیں، وہ ساری لجاجتیں جو دیگر اعضا سے کی جا سکتی تھیں اب صرف اس کی آنکھوں میں کھنچکر آگئی تھیں، اور اس لئے عالم یاس میں اس کی آنکھوں کا ماں سے رحم طلب کرنا، حقیقتاً ایک ایسا دل ہلا دینے والا منظر تھا جس کی تاب بھلا غریب ماں کیا لا سکتی تھی، وہ بیہوش ہو کر گر پڑی، لوگوں نے اسے اٹھایا اور سائگی کو یوں ہی تنہا پہاڑ کی چوٹی پر چھوڑ کر چل دیئے۔

مگر آہ، وہ سائگی کا کیسا منظر تھا، کسمسا کر اک آخری نگاہ مایوسی کے ساتھ دیکھنا اور اس وقت تک اپنی نڈھال گردن موڑ موڑ کر دیکھتے رہنا، جب تک سب لوگ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئے (کہ شاید اب بھی کوئی رحم کرے) ایسا دردناک نظارہ تھا کہ شاید اگر وینس خود موجود ہوتی تو وہ بھی آنسو بہاتی، مگر آہ، نہ وینس وہاں تھی کہ اسی کو کچھ رحم آتا۔ اور نہ ماں وہاں موجود تھی کہ پھر ایک بار چیخ کر اپنی بیٹی کو کلیجے سے لگا لیتی۔ صرف ایک سنسان پہاڑ کی چوٹی تھی اور وحشت ناک جنگل کی خاموشی جس کی ساکن و وسیع فضا میں سائگی کی نگاہ واپس گم اور وہ خود ایک طرف گردن ڈال کر بے ہوش۔

(۵)

"اے خواب کی ملکہ، اے نیند کی دیوی جا اور اس کی آنکھوں کو اک شیریں سکون بھر دے، اور تو بھی اے نسیم کی دیوی اٹھ اور اس کی کمر اور کلائی کے بند جدا کر دے، کیونکہ فانی نوع انسان میں ایسا ساحر و دلدوز حسن میں نے کبھی نہیں دیکھا جلدی کر کیونکہ میرا دل اس کی محبت میں تڑپ رہا ہے" کیوپڈ کی اس التجا کو ان دیویوں نے سنا اور دفعتاً کوہ الوند کی اس خوفناک چوٹی پہ پہنچ گئیں، جہاں اک شاہ بلوط کے تنے سے یہ چاند طلوع ہو رہا تھا۔

شاخوں میں جنبش شروع ہوئی۔ پتیاں ہلنے لگیں اور رفتہ رفتہ ایک لطیف و نکہت بیز ہوا نے سارے پہاڑ کو معطر کر دیا۔ سائگی کے دماغ کا اس نعطر سے متاثر ہونا تھا کہ اس کی آنکھیں جھپک گئیں اور اس کا سونا تھا کہ باد نسیم نے درخت سے جدا کر کے اپنے ہاتھوں پہ سنبھال کر فرش پر لٹا دیا۔

سائگی بے خبر پڑی سو رہی تھی، چادر اس کے سر و سینہ سے جدا تھی اور اسے یہ ہوش نہ تھا کہ ایک حریص آنکھ اسے دیکھ رہی ہے اس لئے اپنا عریاں حصۂ جسم چھپا کر اسے سمٹ جانا چاہیئے، اس کے بال ہوا سے اڑ اڑ کر اس کی پیشانی اور چہرہ پہ آرہے تھے اور اسے کچھ خبر نہ تھی کہ ایک غیر شخص اس منظر سے لطف اٹھا رہا ہے، اس لئے اپنے بال درست کر کے چہرہ پہ نقاب ڈال لینا چاہیئے۔

کیوپڈ نے اس سے قبل جب سائگی کو باغ میں دیکھا تو وہ بے نقاب ضرور تھی، مگر محو خواب نہ تھی، لیکن اسے کیا خبر تھی کہ جب حسن سو جاتا ہے تو کیا ہو جاتا ہے اور جب لباس بے ترتیب اور بال برہم ہو جاتے ہیں تو ایک عورت کیا قیامت ہو جاتی ہے۔

کیوپڈ خاموش و متحیر کھڑا دیکھ رہا تھا اور تباہ ہو رہا تھا، اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ سائگی کی کھلی ہوئی بلوریں گردن کو دیکھا کرے یا صرف اس کے عریاں سیمیں سینہ کو، اس کے یاقوتی ہونٹوں پر جان دے یا اس کی کشادہ پیشانی پر۔ اس کی فہم اس امر کا فیصلہ کرنے سے قاصر تھی کہ سائگی کی سیاہ خمدار ابروؤں سے محبت کرے یا اس کی متوالی آنکھ سے، وہ متحیر تھا کہ اس کی نازک کمر پہ اپنے تئیں تباہ کرے یا اس کی کشیدہ قامتی کے انتہائی تناسب پر۔ وہ دیر تک اسی عالم حیرت و استعجاب میں کھڑا رہا، اور آخر کار یہ فیصلہ کر کے کہ سائگی کا رتبہ اس سے بہت زیادہ بلند ہے کہ کوئی شخص اپنے تئیں اس سے محبت کرنے کا اہل سمجھے وہ اس کے قدموں پر گر پڑا اس کے رنگین تلوؤں پر ایک طویل بوسہ دے کر یہ کہتا ہوا اٹھ بیٹھا کہ :-

"اے سائکی میں تجھ سے محبت نہیں کروں گا، تجھ سے پیار نہیں کروں گا، تجھ سے عشق نہیں کرونگا کیونکہ یہ بھی ایک ناقص طریقہ اظہارِ جذبات کا ہے، میں تیری عظمت کروں گا، تجھے پوجوں گا، تجھ سے ڈروں گا، ایک ایسا ڈر اپنے دل میں لئے ہوئے جو کبھی جیوپیٹر کی طرف سے بھی مجھے پیدا نہیں ہوا، تجھے دیکھوں گا اور کانپا کروں گا، بدن کی اس کپکپی کے ساتھ جو کبھی میرے اوپر طاری نہیں ہوئی ہے مجھے ایک ملکہ، نہیں، ایک دیوی، آہ، یہ بھی نہیں بلکہ خدا جانے کیا سمجھوں گا، اور اگر تو نے اجازت دی تو اپنے تئیں تیرا ایک خادم، ایک ادنیٰ پرستار، آہ یہ بھی نہیں بلکہ ایک غریب فقیر، اک ذلیل گدا، ایک خوار بھکاری، اور اس سے زیادہ حقیر وہ کچھ سمجھوں گا، جسے میں الفاظ میں ظاہر نہیں کر سکتا۔"

مارفیس وزفر نے سائکی کو اٹھایا اور اپنے پروں پر رکھ کر شاداب کوہ اولمپس کی اس کنج میں لے گئیں جہاں کیوپڈ نے خاص طور پر ایک قصر سائکی کے لئے تیار کرایا تھا، وہ اک برج میں جو اس قصر کا بہترین حصہ تھا لٹا دی گئی اور مارفیس اپنی نیند اس کی آنکھوں سے لے کر زفر کے ساتھ غائب ہو گئی۔

سائکی اپنی آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی اور سخت متحیر ہوئی جب اس نے اپنے تئیں اک طلائی برج میں جواہر کار فرش پر پایا، اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں کہ شاید یہ کوئی دلکش خواب ہے اور پھر کھول دیں کہ کاش خواب نہ ہو، مگر بے صبر کیوپڈ سے زیادہ ضبط نہ ہو سکا۔ اور اک شیریں آواز سائکی کے کانوں میں آئی کہ "یہ خواب نہیں حقیقت ہے" اور اسی کے ساتھ چہرہ پر نقاب ڈالے ہوئے، نسوانی کی بوچھاروں میں حسین کیوپڈ یہ کہتا ہوا نکل آیا کہ "متعجب نہ ہو، تیرا غلام تیرے سامنے حاضر ہے، اسے کوئی حکم دے شاہانہ لب و لہجہ کے ساتھ کچھ کرنے کو کہہ، کیونکہ تیری خدمت اس کی زندگی ہے، اگر تو نفرت نہ کرے تو میں کہوں کہ وہ عفریت میں ہی ہوں جس کے لئے تیری قربانی چڑھائی گئی تھی، اور اگر تو خفا نہ ہو تو وہ عفریت تیری تمام خواہشاتِ قلب مہیا کر دے۔"

سائکی کو سمجھایا گیا تھا کہ جب اس کی قربانی پیش کی جائے گی تو ایک بدصورت، مردم خوار عفریت اس کا شوہر بنے گا، لیکن وہ تو اپنے سامنے ایک حسین نوجوان کو دیکھ رہی تھی اور ہر چند وہ نقاب پوش تھا لیکن اعضا کا تناسب، اس کا کندنی رنگ جو نقاب سے چھپا نہ تھا، کہے دیتا تھا کہ اس نقاب کے نیچے ایک نہایت ہی خوبصورت اور پر شباب چہرہ چھپا ہوا ہے۔

اس کے وہ تمام حسیات جو یونان میں مردہ ہو چکے تھے، دفعتاً زندہ ہو کر پھر اس کے خون میں دوڑنے لگے، اس کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا، انفعال سے بھیگ گیا یعنی گلاب پر پھر وہی شبنم آ گئی جس سے اس کا حسن اور چمکنے لگتا تھا۔ وہ آخر کار اپنی تمنا سے مغلوب ہو کر اٹھ بیٹھی اور کیوپڈ کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولی کہ "اگر تو ہی میرا شوہر ہے تو پھر یہ حجاب کیوں؟ یہ نقاب کیسا؟ تجھے کیا حق حاصل ہے کہ ان آنکھوں کو مجھ سے چھپائے رکھے۔ جن میں مجھے اپنے جذبات، اپنی تمناؤں کی وسعت کو پڑھنا ہے، وہ جیسی بھی ہیں میری ہیں، میں ان سے محبت کرنا سیکھوں گی گو انھیں مجھ سے محبت نہ ہو، میں اپنے بہترین ہدایائے عشق ان کے سامنے پیش کروں گی، خواہ وہ کتنی ہی مجھ سے بیزار ہو جائیں" یہ کہتے ہوئے سائکی نے اس کا نقاب نوچنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ کیوپڈ نے اس کی کلائیاں پکڑ لیں اور نہایت ہی نرم و پر لجاجت لہجہ میں بولا کہ:-

"اے سائکی میں تیرا ادنیٰ غلام ہوں تو مجھے جو چاہے سمجھ لیکن مجھے اس بات پر مجبور نہ کر، جس کو میں اگر کر ڈالوں تو پھر تجھے کو افسوس کرنا پڑے، اگر تو مجھ پر صرف اس لئے رحم کر سکتی ہے کہ صرف نقاب کا جدا کرنا ہی اک ایسا کام ہے جس کے متعلق وہ تیرا فرمان ماننے کے لئے

نیاز نہیں، تو تو رحم کر، ورنہ اے سائکی پھر میں تجھ سے چھوٹ جاؤں گا اور مر جاؤں گا!"

سائکی کچھ تو اس تقریر سے متاثر ہو کر اور کچھ اس کے مردانہ گرم ہاتھوں میں اپنی نازک کلائیوں کو پاکر رک گئی۔ ٹھہر گئی، اور ایسا محسوس کرنے لگی، گویا اس کے ہاتھ ڈھیلے ہیں، اس کے بدن میں سکت نہیں ہے اور وہ بے اختیار اس کی طرف کھنچی جا رہی ہے آخر کار اس نے اپنے سارے بدن کا بوجھ کیوپڈ پر ڈال دیا، اپنے تئیں اس کی آغوش میں سونپ دیا اور اس نامعلوم لذت سے مست و سرشار ہو کر جو اس سے قبل اسے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی، اور جس کے لئے وہ اک جستجوئے مبہم بنی ہوئی تھی، آنکھیں پلٹ کر کیوپڈ کی گود میں بے حس ہو کر گر پڑی۔

ہر چند، ملک، وطن، ماں باپ کو اس طرح یکایک چھوڑنے کا رنج، ایسا معمولی رنج نہیں جسے ایک عورت اور عورت بھی ایسی حساس، ایسی لطیف الخیال اور ایسی نازک طبع جلد فراموش کر سکے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک عورت اپنے شباب کے عالم میں اگر کوئی حقیقی اور سچی حس رکھتی ہے تو وہ وہی ہے جس کا تعلق صرف اس کے شباب سے ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں وہ دیگر مشاغلِ حیات میں بھی منہمک ہو، مختلف اسباب تفریح سے بھی گہری دلچسپی کا اظہار کرے، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنی ذات سے وابستہ ہونے والے اور تمام تعلقات کے ساتھ بکمال خوبیت و استغراق ہو جائے، لیکن اس کے سامنے اس کے حسن کا ذکر کر دو۔ جس سے اس کا شباب براہ راست متاثر ہو، پھر یہ ممکن نہیں کہ وہ دنیا بھر کی تمام باتیں چھوڑ کر اس طرف متوجہ نہ ہو جائے۔ یہ عورت کی فطرت ہے کہ وہ اپنے حسن و شباب کے متعلق جس قدر دوسروں کی رائے زنی سے خوش ہوتی ہے، اتنی وہ خود آئینہ دیکھ کر بھی کبھی مسرور نہیں ہوتی، حالانکہ وہ گھنٹوں اس کے سامنے گیسو سنوار سنوار کر مزے لیا کرتی ہے، وہ چاہتی ہے کہ اس کی جوانی میں جوانی ہی کا ذکر ہو، اور کوئی گفتگو اس کے سامنے نہ ہو۔

ہم نے مانا کہ سائکی کو اپنی ماں سے بہت زیادہ اُلفت تھی، اپنے باپ پر جان دیتی تھی (اور اس نے دے ہی دی) اپنے وطن کی شیدا تھی، لیکن یہ اُلفت، یہ جاں نثاری یہ قربانی اسی وقت تک تھی جب تک کوئی اس کا چاہنے والا نہ تھا، لیکن جب اس نے اپنے سامنے کیوپڈ ایسا حسین نوجوان دیکھا، اور اس کی وارفتگی، اس کی افتادگی، اور اس کی پرستاری اپنی آنکھوں سے دیکھ لی، کانوں سے سُن لی اور ہاتھوں سے چھو لی، تو وہ اپنے سارے افکار بھول گئی، سارے غم طے کر گئی، کیونکہ اب کوہ اولمپس کی وسیع خلوت میں سوائے اک حیاتِ معاشقہ کے اسے اور کوئی چیز نظر نہ آتی تھی اور وہ کچھ نہ سمجھ سکتی تھی مگر یہ کہ وہ اپنے بارِ شباب سے خستہ ہو کر جس کی خستگی کو وہ کم از کم تین چار سال سے برداشت کرتی چلی آتی تھی، آنکھ بند کر کے کیوپڈ کی محبت بھری آغوش میں گر پڑے، اس نے سمجھ لیا کہ وہ نوجوان ہے، حسین ہے، اس لئے اس نے مطلق پروا نہیں کی، اگر کیوپڈ کا چہرہ بے نقاب نہ تھا، اس نے جان لیا کہ وہ اس سے محبت کرنے کے لئے آمادہ ہے، اس لئے کون اور کیا کے جھگڑوں میں اپنے لطف کو خراب کرنا حماقت ہے۔

کیوپڈ کی خود کیا حالت تھی، وہ سائکی کے نرم و نازک جسم کو اپنے جسم سے متصل پاکر کیا سوچ رہا تھا؟ غالباً یہ سوال جواب طلب نہیں۔ کبھی وہ سائکی کی آنکھیں چومتا تھا اور کبھی لب، کبھی اس کے سینے سے آنکھیں ملتا تھا اور کبھی گردن سے۔ غرضیکہ وہ بالکل دیوانہ سا تھا، مجنوں تھا اور اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیونکر وہ سائکی سے بہرہ آسودہ ہو سکتا ہے یہاں تک کہ اس نے سائکی کے پر ظلم ہونٹوں پر اپنے لب رکھ دیئے اور وہ بھی مست ہو کر اپنے تئیں بھول گیا، اور اس کی آغوش میں بیہوش ہو کر پڑ رہا۔

(۶)

ابتدائے آفرینش سے لے کر اس وقت تک کوہ اولمپس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کسی آبادی کو اپنے دامن میں جگہ دی ہو کیونکہ

اس کی بلند چوٹیاں نہ صرف اس وجہ سے کہ خداوند جیوپیٹر کی تخت گاہ تھیں، بلکہ اس وجہ سے بھی کہ ان کو آباد کرنا بہت مشکل تھا، ہمیشہ سنسان اور ویران رہیں۔ ناقابلِ پیمائش عمیق غاروں کی تاریک وسعت، نہایت ہولناک سیاہ پانی کے عمیق سمندر کی اس وقت میں روانی، بڑے بڑے درختوں سے پیدا ہونے والا ہوا کا مہیب سناٹا، خوفناک درندوں کی گرج کی آواز بازگشت، بڑے بڑے کانٹوں والی جھاڑیوں کا ایک غیر متناہی سلسلہ، اور اسی طرح کی اور بہت سی ڈراؤنی چیزیں اور جسم میں لرزہ پیدا کر دینے والے مناظر کا مجموعہ یہ تھا کہ اولمپس جہاں کیوپڈ نے سائکی کے ساتھ رہنا پسند کیا، اور یہ انتخاب اس نے اپنی کمسنی اور ناتجربہ کاری ہی کے لحاظ سے کیا تھا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جب وینس کو خبر ہو جائے گی، تو وہ کوئی تدبیر سائکی کی ہلاکت کی نہ اٹھا رکھے گی۔ پھر وہ کہاں جاتا؟ کوہِ اولمپس ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں کسی کی رسائی نہ تھی اور وہ اپنی زندگی سائکی کے ساتھ امن و سکون کی حالت میں بسر کر سکتا تھا۔ کیونکہ جب جیوپیٹر کو کوئی عذاب نازل کرنا ہوتا تھا تو وہ اسی پہاڑ کی چوٹی پر اتر آتا تھا، وہ عذاب نازل کرتا تھا، چنانچہ اس سے قبل بارہا کوہِ اولمپس کی چوٹی سے جیوپیٹر کا غصہ آگ بن کر نکلا اور دور دور آبادیوں کو تباہ و برباد کر گیا، پھر ایسی جگہ جو آسمان کے دیوتاؤں میں سب سے بڑے دیوتا کے غصہ کرنے کی جگہ ہو کون جا سکتا تھا، مگر چونکہ کیوپڈ، جیوپیٹر کا محبوب ترین بیٹا تھا، اور اپنے فرائض کے لحاظ سے نہایت اہم مانا جاتا تھا اس لئے وہ وہاں پہنچ سکا، اور اپنے ساتھ رہنے والی مخصوص دیویوں، مارفیس اور زیفر کو بھی اپنے ساتھ لا سکا۔

اس زریں قصر کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، جو اس نے سائکی کے خوش کرنے کے لئے تیار کیا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کیوپڈ سے مواصلت کی مسرت ایک ایسی مسرت سائکی کے لئے تھی کہ ایک ہفتہ تک تو اسے یہ ہوش بھی نہ ہوا کہ وہ ہے کہاں۔ مگر پورے ایک ہفتہ تک اس برجِ طلائی کی خلوت میں بند رہنے کے بعد وہ وقت آیا کہ سائکی کو اپنی نئی زندگی پر کچھ غور کرنا پڑا، اور اسے یہ معلوم ہوا کہ اب کیوپڈ اس سے زیادہ مسلسل وقت نہیں دے سکتا، کیونکہ انہیں آٹھ دس دن میں کیوپڈ کے معطل بیٹھ جانے سے کرۂ ارض میں کج خلقی، بے رحمی، اور درندگی بہت پھیل گئی تھی اور اس لئے ضرورت تھی کہ وہ اپنا تیر و کمان سنبھال کر نہایت سرگرمی کے ساتھ اس کمی کو پورا کرے، لیکن سوال یہ تھا کہ جب تک وہ نہ آئے گا سائکی کیونکر اپنا وقت بسر کرے گی، کن مشاغل میں اپنے تئیں لگائے رکھے گی؟ اس کا جواب ذرا دشوار تھا، مگر آخر سائکی نے کچھ دیر تک سوچنے کے بعد کیوپڈ سے التجا کی کہ وہ حوالیٔ قصر میں اُن تمام اسبابِ تفریح کو مہیا کر دے، جن کی وہ اپنے زمانۂ دوشیزگی میں عادی تھی۔

کیوپڈ نے دو گلدستے اٹھا کر زمین پر دے مارے جو خود تو غائب ہو گئے، لیکن بجائے ان کے دو حسین فرشتے جن کے پروں میں الماس ٹنکے ہوئے تھے اور جن کی عمریں ۱۴-۱۴ سال سے زیادہ نہ تھیں نکل کر سائکی کے سامنے کھڑے ہو گئے، کیوپڈ نے ان سے کہا کہ جاؤ اور قبل اس کے کہ ملکہ سائکی دروازہ تک پہنچے، تمام حوالیٔ قصر کو ان مناظر سے آباد کر دو جو والیٔ یونان کے محل سے متعلق ہیں۔ ان کو رخصت کر کے کیوپڈ نے جتنے گلدستے وہاں رکھے تھے سب کو فرش زمین پر ٹپکنا شروع کیا، یہاں تک کہ چشم زدن میں سارا قصر حسین پریوں سے بھر گیا اور سائکی اب بہت سارے پیش خدمتوں سے گھر گئی، ان کے ہاتھوں میں مختلف قسم کے ساز تھے، جن کے تاروں سے ارتعاش کے وقت عجیب مسکر خوشبو پیدا ہوتی تھی، سائکی اس زمانۂ قیام میں اس نوع کے عجائب و غرائب سے اس درجہ آشنا ہو گئی تھی کہ اسے زیادہ حیرت نہیں ہوئی اور کیوپڈ کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر پریوں کے حلقہ میں قصر سے باہر نکلی، لیکن اس کی نگاہ دروازہ سے باہر نکل کر پہنچی ہی تھی کہ وہ ششدر و متحیر ہو گئی کہ شاہِ یونان کا باغ مع اپنی تمام روشوں، نہروں، تختوں، فواروں، درختوں اور حوضوں کے کیونکر یہاں منتقل ہو سکا، وہ اپنے اس باغ اور اس باغ میں کچھ فرق نہ پاتی تھی سوائے اس کے کہ وہاں بلور کے ٹکڑے روشوں پر بچھے ہوئے تھے اور یہاں ہیرے جواہرات، الماس تھے، وہاں حوض سنگ مرمر بلور کے تھے اور یہاں شفاف طلا اور صیقل کی ہوئی چاندی کے، وہاں وہ اپنی دوشیزگی کی بے مزہ زندگی بسر کرتی تھی اور یہاں وہ کیوپڈ کے ساتھ

مست و سرشار تھی۔

سائکی خوش خوش اس باغ میں داخل ہوئی اور ٹہلتے ٹہلتے ہر چیز کو دیکھتی ہوئی پھولوں کو سونگھتی ہوئی کیوپڈ کو لے کر ایک کنج کے اندر چلی گئی اور ساری پریاں باہر مؤدب کھڑی رہیں۔

شام ہو گئی تھی۔ چاند نکل آیا تھا۔ اس لئے پھر سائکی وہاں سے نہیں نکلی اور وہ رات قصداً اس نے کیوپڈ کے ساتھ اس کنج میں بسر کرنا چاہی کیونکہ جب وہ یونان میں تھی تو یہی کنج تھا جہاں اس نے پوری ایک طویل رات نہایت کرب میں گزاری تھی۔

(۷)

کچھ زمانہ اسی انداز سے گزرا کہ کیوپڈ دو چار دن کے لئے باہر چلا جاتا اور پھر اک نیا شوق، نیا جوش لے کر واپس آتا اور سائکی کے پاس رہتا۔ ہر چند سائکی بھی اس کی عادی بننا چاہتی تھی اور کیوپڈ کی غیبت میں انتظار کی گھڑیاں، مختلف مشاغل تفریح میں کاٹتی تھی۔ لیکن وہ کیوپڈ کی اس گھڑی گھڑی کی مفارقت سے بعض اوقات بہت دل گرفتہ و مضمحل ہو جاتی اور وہ اپنے کنجوں، پھولوں اور پریوں سے بیزار، اب وہ چاہتی تھی کہ کوئی اسی کا ہمجنس مل جائے اور اس سے اپنی موجودہ کامرانی کی داد لے۔ وہ ان پریوں سے صرف اشارہ سے کام لیتی تھی، کیونکہ کام کرنے والی پریاں بات نہیں کر سکتیں اور شاید کیوپڈ نے کسی مصلحت کی بنا پر ایسی کنیزیں مہیا نہیں کی، جن سے سائکی گفتگو کر سکتی۔ غرضکہ جب کیوپڈ چلا جاتا تھا تو وہ سخت متوحش ہو جاتی اور باوصف اس کے کہ کنیزوں کی ایک کثیر تعداد اس کی جلو میں ہوتی، وہ ان بے زبان متحرک تصویروں سے گھبرا کر یہی سمجھتی کہ "میں تو اب بھی ویسی ہی اکیلی اور تنہا ہوں۔"

جس وقت تک عورت اپنی محبت میں کامیاب نہیں ہوتی، اس وقت تک تو اس کی زندگی ایک کلی کی سی خلوت آرمیدہ زندگی ہے، وہ نہ کہیں جانا پسند کرتی ہے اور نہ کسی سے بات کرنا۔ لیکن جب وہ اپنی محبت میں کامیاب ہو جاتی ہے، جب اس کی حیات معاشقہ اک عملی صورت اختیار کر لیتی ہے تو وہ پھر اگر تنہا بھی ہے تو بجائے خود اک انجمن ہے اور خلوت سے سخت بیزار، جب تک اس کی محبت کا کوئی جواب دینے والا نہیں، لیکن جب کوئی ایسا شخص اُسے مل جاتا ہے اور اس کی جوانی کی لذتوں کو اس کے لئے قابل فہم بنا دیتا ہے، تو پھر عورت اپنی مسرت کے بار کو برداشت نہیں کر سکتی اور وہ اپنی ہی جنس کا کوئی فرد اپنے پاس چاہتی ہے۔ جس سے وہ اپنی لذتوں کا اظہار کرے یعنی جس طرح وہ اپنی ناکام زندگی میں دوسروں پر رشک کیا کرتی تھی اسی طرح اپنے مسرور و شاد کام زمانہ میں یہ چاہتی ہے کہ کوئی دوسرا بھی اس پر رشک کرے، اس لئے سائکی بعض وقت گھبرا اُٹھتی کہ کوئی اور نہیں تو کم از کم اس کی بہنیں، انگلارس و کیوپڈس ہی آکے دیکھیں اور اس کی خوش قسمتی پر رشک کریں۔

ایک دن جبکہ کیوپڈ خلافِ معمول کئی دن کے بعد آیا، تو سائکی مچل گئی، کہ میں تو اپنی بہنوں کو دیکھوں گی، اور اگر میں وہاں نہیں جا سکتی تو انہیں کو یہاں بلواؤں گی، یا تو وہ اس کے پاس سے ہٹانہ کرے یا پھر کیوپڈس و انگلارس ہی کو بلوا دے کہ چند دن انھیں کے ساتھ بسر ہوں۔

کیوپڈ خاموشی سے سائکی کی ضد دوں کو دیکھتا اور سنتا رہا اور جب وہ کہہ چکی تو اس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ "اے سائکی میرے لئے اس سے زیادہ مسرت بخش امر اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ تیرے احکام کی تعمیل میں اپنی ساری قوتوں کو صرف کر دوں، لیکن میں ڈرتا ہوں کہ ان کا آنا میری مسرتوں کو منغص نہ کر دے، یہ بالکل ممکن ہے کہ ان کے آنے سے تیری بعض ضدیں پھر از سرِ نو زندہ ہو جائیں اور وہی خدشات سامنے آ جائیں جن کے خیال سے میں کانپنے لگتا ہوں، شاید وہ تیرے دل میں کوئی جستجو پیدا کر دیں اور یہی ایک چیز ہے جو میں تیرے دل میں دیکھنا پسند نہیں کرتا، اے سائکی اب بھی سوچ اور مجھے ان کے بلانے پر مجبور نہ کر۔"

مگر سائکی جسے اپنی محبت پر پورا اعتماد تھا اور جو کیوپڈ کے خلاف مزاج کسی بات کا کرنا اپنے لئے بالکل ناممکن خیال کرتی تھی، اپنی ضد پر قائم رہی اور کیوپڈ کو بادلِ ناخواستہ ماننا پڑا۔

اس نے مارفیس و زفر کو بلایا، اور اگلاریس و کیوپڈس کے بلانے کا حکم دیا، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی تاکید کر دی کہ اُن کو کسی طرح یہ نہ معلوم ہو کہ کس کے اشارہ اور حکم سے وہ طلب کی جاتی ہیں۔

"میں ان راتوں پر رشک نہیں کرتی جو تیری معیت میں مجھ پر گزر جاتی ہیں، کیونکہ جب تک تو میرے پہلو میں ہے صرف میرا ہے، لیکن ہاں میں اُن راتوں سے ضرور جلتی ہوں جو اِدھر مجھ پر اور اُدھر تجھ پر تنہا گزرتی ہیں، کیونکہ اس وقت میں ایسا محسوس کرتی ہوں کہ تیری معیت صرف انھیں کے ساتھ ہے، لیکن جب تو مجھ سے دور ہو تو یہ نہ سمجھ کہ میں تجھ سے جدا ہوں، کیونکہ میں تو صرف ایک آرزو ہوں اور آرزو بھی صرف تجھے چاہنے کی، تجھ سے محبت کرنے کی۔ پھر اگر تو مجھ سے علیٰحدہ ہو کر میری یاد اس طرح کرتا ہے جیسے کسی دور کی چیز کا خیال کیا جاتا ہے تو غلطی ہے کیونکہ وہ آرزو تو تیرے ساتھ ہے۔ پھر یہ تخیل کیسا؟ دیکھ تو اپنے مشاغل کے دوران میں ایک دفعہ چونک کر کچھ سوچنے لگتا ہے، خاموش ہو جاتا ہے، وہ سکوت وہ فکر میں ہی تو ہوں جو تیری نگاہوں کو تیرے کام سے تیرے دل کو تیرے فرائض سے ہٹا لیتی ہوں، تو رات کو کسی دور دراز زمین میں سوتے سوتے چونک پڑتا ہے، گھنٹوں جاگ کر کروٹیں لیا کرتا ہے، یاد رکھ کہ وہ بیداری اور کروٹ خود سائکی ہے جو تیری آنکھوں میں آجاتی ہے، اور تیرے پہلو سے لپٹ جاتی ہے لوگ کہتے ہیں محبت بری ہے، مگر میں دیکھتی ہوں کہ میرے زخمی کرنے کے لئے کوئی خاص تیر تھا جو کیوپڈ نے چلایا۔"

کیوپڈ کے جسم میں اس فقرہ سے ایک لرزش پیدا ہوئی لیکن اپنا اضطراب چھپانے کے لئے بول اٹھا کہ "اے سائکی، کیوپڈ نے کیا چلایا یہ کہو کہ میں نے چلایا؟"

سائکی بولی ہاں سچ ہے، تمھیں نے چلایا، تو کیا تم کیوپڈ ہو؟ نہیں تم کیوپڈ نہیں ہو سکتے کیونکہ میں نے سنا ہے وہ خود کسی سے محبت نہیں کرتا، اس کے دل میں ذرا رحم نہیں ہے، اس کا سینہ گدازِ عشق سے خالی ہے، وہ سفاک ہے اور تم تو مجھ سے محبت کرتے ہو، مجھے چاہتے ہو۔"

کیوپڈ "ہاں میں کیوپڈ نہیں ہوں، مگر یہ خیال کہ کیوپڈ کو کسی سے محبت نہیں ہو سکتی، شاید درست نہ ہو، کیونکہ بہت سی باتیں غلط مشہور ہو جاتی ہیں۔"

یہاں یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ مارفیس اور زفر، سائکی کی بہنوں کو ہاتھوں پر لئے ہوئے آئیں اور جگا کر غائب ہو گئیں۔ سائکی اپنی بہنوں کو لے کر قصر میں گئی اور ایک ایک چیز وہاں کی دکھائی پھر وہاں سے باغ میں لائی اور فخر کے ساتھ ہر ہر کنج کی سیر کرائی، دل میں تو وہ اور جلیں کہ سائکی ابھی تک نہ صرف زندہ ہے بلکہ ایسی شاہانہ زندگی بسر کر رہی لیکن ظاہر میں انھوں نے سائکی کو مبارکباد دی اور پوچھا کہ "یہ نمود جواہر یہ سامانِ نشاط کہاں سے آیا؟"

سائکی نے جواب دیا کہ "مجھے یہ نہیں معلوم کہ کہاں سے آیا اور وہ کون ہے، جس نے مہیا کیا؟" انھوں نے نہایت حیرت سے کہا "تو کیا اس وقت تک تیرے شوہر نے اپنا نام بھی تجھے نہیں بتایا؟"

"آہ میں اس کا نام نہیں جان سکتی، اس کی ممانعت ہے۔"

" مگر بہن، تُو نے اس کا چہرہ تو ضرور دیکھا ہوگا، کیا بہت خوبصورت ہے ؟"

" نہیں، میں نے اس کی صورت تو نہیں دیکھی کیونکہ وہ ہمیشہ نقاب ڈالے رہتا ہے ۔"

" ہاں ہاں جب میں سو جاتی ہوں تو خواب اور میری خیند یں اس کے حسین چہرہ سے جگمگا اُٹھتی ہیں ۔"

بہنیں بولیں " اے لڑکی تجھے فریب دیا گیا، کیونکہ یہ وہی عفریت ہے جو کسی دن تجھے کھا لے گا ۔" سائکی نے کہا " نہیں وہ عفریت تو ہرگز نہیں ہو سکتا ۔" مگر دونوں بہنوں نے پھر بھی کہا اور اس قدر اصرار کے ساتھ اس کے عفریت ہونے کا یقین دلایا کہ سائکی بھی کچھ متفکر سی ہوگئی۔ اس تفکر سے انھوں نے اور فائدہ اُٹھایا اور آخر کار اسے مجبور کر دیا کہ اِبھی جائے اور نقاب اُلٹ کر اس کا چہرہ دیکھے ۔

رات ہو گئی تھی، کیوپڈ اپنی خواب گاہ میں بیہوش پڑا سو رہا تھا، سائکی آہستہ آہستہ گئی اور ڈرتے ڈرتے اس کے چہرہ سے نقاب اُلٹ دیا، مگر بجائے اس کے کہ وہ عفریت کی ڈراؤنی شکل دیکھتی اس نے ایک نہایت ہی حسین و جمیل شکل دیکھی اور اسی ایک لمحہ میں سائکی کی محبت نے خدا جانے کتنے مدارج ادھر طے کر لئے ۔

کیوپڈ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا اور برہم ہو کر بولا کہ " اے بیوقوف سائکی یہ تُو نے کیا کیا، کیا تو یہ نہ جانتی تھی کہ میں اک قوتِ غیر فانی ہوں اور کیا میں نے تجھ سے یہ بات بارہا نہیں کہی کہ کوئی انسان میرے چہرہ کو دیکھ کر زندہ نہیں رہ سکتا ۔" یہ کہہ کر اس نے باہر نکل جانا چاہا، لیکن بدقسمت سائکی نے اپنی ملتجی نگاہوں سے کیوپڈ کو دیکھ کر اپنے ہاتھ بڑھائے کہ کسی طرح وہ لوٹ آئے اور اس کی خطا کو معاف کر دے۔ ہر چند کہ کیوپڈ، سائکی کی اس ادا سے بے انتہا متاثر ہوا اور بے اختیار اس کا جی چاہا کہ اس سے لپٹ جائے، لیکن وہ رُک گیا، کیونکہ اب ایسا کرنے سے اس کی غیر فانی روح اس سے چھین لی جاتی۔ اس لئے کیوپڈ فوراً ایک بادل ہو کے اور سائکی کے درمیان حائل کر کے غائب ہو گیا اور سائکی بیہوش ہو کر گر پڑی ۔

کیا خبر وہ کتنے عرصہ تک بیہوش رہی، لیکن ہاں، جب اس کی آنکھ کھلی تو نہ وہ قصر تھا، نہ وہ اس کی مکلف خوابگاہ، نہ وہاں باغ تھا، نہ کوئی کنیز، وہی وحشت ناک کوہ اولمپس کی چوٹی تھی جہاں وہ پہلی دفعہ قربانی کے لئے لائی گئی تھی، اور وہی شاہ بلوط سامنے تھا جس کے تنے سے وہ کبھی کس کے باندھ دی گئی تھی، پہلے تو وہ یہ سمجھی کہ میں کوئی وحشت ناک خواب دیکھ رہی ہوں لیکن تھوڑی دیر کے بعد اسے یقین کر لینا پڑا کہ خواب نہیں ہے، بلکہ خواب تو وہی تھا جس میں اس نے پُرلطف زندگی بسر کی، مگر ایسا خواب، ایسا طویل خواب نہیں ہو سکتا، تو پھر کیا تھا! آہ، وہ اس حقیقت پر زیادہ غور کرنے کی طاقت اپنے میں نہ پاتی تھی، وہ بالکل مبہوت تھی، دیوانہ پن اس کے چہرہ سے برس رہا تھا اور وہ فوراً مر جانا چاہتی تھی ۔

(۸)

سائکی دیوانہ وار پہاڑ پر پھر رہی تھی، پاؤں کانٹوں سے مجروح تھے، اور سارا بدن چوٹوں سے داغدار، کراہتی تھی، اور روتی تھی، چیختی تھی اور گر گر پڑتی تھی، لیکن وینس کی برہمی کا وہی عالم تھا، اس نے آدمیوں کو حکم دیا کہ سائکی کو پکڑ کے سامنے لائیں اور خود یہ حکم دے کر جیوپیٹر کے پاس چلی گئی۔ جیوپیٹر اس کا شوہر اولین تھا اور یہ کسی زمانہ میں اس کی محبوب ترین بیوی رہ چکی تھی، اس لئے اس نے بعض خاص تدابیر پر عمل کیا اور اپنے پندار میں ایسی حسین بن کر بیٹھ گئی کہ سائکی کا حسن اس سے شرما جائے گا، مگر جب وقت سائکی لائی گئی، تو وینس یہ دیکھ کر کہ اس حالت خستگی میں بھی سائکی کے حسن کا وہ عالم ہے کہ وہ باوصف تمام تدابیر حسن افروز کے بھی مقابلہ نہیں کر سکتی، عرق عرق ہو گئی اور یہ عزم کر لیا کہ سائکی کو مار ڈالنا چاہیئے، لیکن جیوپیٹر نے رات کو وینس کے خواب میں آکر اس کا خیال بدل دیا اور سائکی کی جان بخشی کی یہ شرط قرار دی گئی کہ وہ دیوی پرسیفونی

کا طلسمی صندوق دے آئے جس میں طلائے حسن بند ہے ۔

سائکی اپنی قسمت کا فیصلہ سن کر کانپ اُٹھی، کیونکہ اس کے نسبت مشہور تھا کہ وہ کرہ ہیڈیس کے سب کے نیچے اور عمیق غار میں محفوظ ہے اور کسی کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکتی، لیکن ایک آواز اس کے کانوں میں آئی جسے سوائے اس کے اور کسی نے نہیں سنا کہ "گھبرا نہیں، تیرا محافظ تیرے ساتھ ہے۔" یہ محبت بھری آواز اُسے کچھ آشنا سی معلوم ہوتی اور وہ اس شرط کے پورا کرنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئی۔ راہ میں سنے دشوار گذار پہاڑی راستوں کی پروا کی اور نہ درندوں کی، نہ اس نے کانٹوں کا خیال کیا اور نہ مہیب غاروں کا، کیونکہ ایک روشنی تھی، ایک محبت پاش جھلک تھی جو اس کے آگے آگے تھی، اور اُسے ان مصائب میں تسکین دیتی جاتی تھی، راستے میں درندے اسے ملے، مگر وہ اس کے حسن سے مسحور ہو گئے، فنا طلسم در بار راہ میں آئے، لیکن وہ بھی خشک ہو گئے، غرضکہ وہ کسی نہ کسی طرح پیاسرپائن کے دربار تک پہنچی اور طلسمی صندوق اس سے حاصل کیا، سائکی خوش خوش واپس آئی اور وہ صندوق وینس کے سامنے لا کر ڈال دیا، اس امید پر کہ شاید وہ زمانہ پھر واپس آ جائے جس کے لئے وہ تڑپ رہی تھی، لیکن وینس، سائکی کے اس عزم و استقلال سے اور زیادہ جلی اور بد عہدی پر آمادہ ہو گئی۔ جیوپیٹر اس پر راضی نہ ہوا اور وینس کو حکم دیا کہ سائکی کو چھوڑ دے کیونکہ جب اس کے پاس طلسمی صندوق آ گیا ہے تو اسے کسی کے حسن سے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں، آخرکار اسے راضی ہونا پڑا اور سائکی کو جیوپیٹر نے خاص اپنی شراب ابدیت منگا کر پلا دی جس سے وہ بھی غیر فانی ہو کر آسمانی مخلوق میں مل گئی ۔

(۹)

کیوپڈ و سائکی پھر اسی کوہ اولمپس پر چلے گئے اور سائکی کی پھر وہی زندگی شروع ہو گئی جس زندگی کا خواب وہ ایک دفعہ دیکھ چکی تھی، اس کے بعد کیوپڈ نے اپنے چہرہ پر نقاب نہیں ڈالا۔ مگر ہاں اس وقت جب اسے انسانوں کی نگاہ سے چھپ کر ان پر تیر عشق چلانا مقصود ہوتا تھا۔

مجنوں گورکھپوری

سمن پوش

"شہیدِ زخمِ شمشیرِ تغافل اجرہا دارد"

ناہید سے میرا تعارف لکھنؤ میں ہوا جب کہ میں نے پہلی بار اس کی تصویر اپنے ایک عزیز دوست ناصری کے کمرے میں دیکھی تھی، ناصری کو فن نقاشی سے خاص شغف تھا جو جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ کوئی دلکش تصویر اس کی نظر سے گزر جاتی پھر ناممکن تھا کہ وہ اس کو کسی نہ کسی ذریعہ سے حاصل کر کے اس کی نقل نہ اتارتا۔ اس کو اس فن میں کافی مہارت ہو گئی تھی، اور مبصرین کی نگاہ میں وہ ایک ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ میں نے یہ جاننا چاہا کہ یہ کس کی تصویر ہے۔ اور اس کا نام کیا ہے۔ مگر خود ناصری کو اس کا کوئی علم نہ تھا۔ وہ ایک مشہور دوکان سے خرید کر لایا تھا۔ اس سے مجھ کو معلوم ہوا کہ وہ ہندوستان کے ایک ماہرِ فن کی صنعت تھی۔ مصور کے نام کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میں اس پیکرِ جمال میں محو ہو گیا جو صفحۂ قرطاس سے مجھ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک خاموش مگر بلیغ تبسم تھا۔ چنبیلی کا ایک ہار اس کے سینے پر لٹک رہا تھا۔ انداز سے وہ ایکٹرس معلوم ہوتی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ کہ اس کو میں پہلے سے جانتا ہوں۔ اس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی کشش تھی۔ جس نے میری آنکھوں کو مبہوت کر لیا، گویا وہ کہہ رہی تھی "ٹھہر جا اور آغاز سے انجام تک میری داستان سن لو۔" اس کے رخسار گلابی تھے، بکھرے ہوئے بال اس کے نیم برہنہ سینے سے کھیل رہے تھے، اور میں خواب میں تھا یا واقعی ہوا میں چنبیلی کی مہک پھیلی ہوئی تھی؟ میں اپنے عالمِ محویت سے چونکا۔ ایک لرزش خفی میرے تمام اعصاب میں دوڑ گئی۔ میں وہاں سے رخصت ہونا چاہتا تھا۔ کہ ناصری جو اپنا سامانِ نقاشی لینے دوسرے کمرہ میں چلا گیا تھا۔ واپس آ گیا اور ناہید کی تصویر سامنے رکھ کر اس کا خاکہ کھینچنے لگا۔ میں رک گیا۔ ناصری کا قلم اپنی قدرت دکھا رہا تھا۔ میں غور سے مطالعہ کر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا۔ کہ تصویر میں ایک ناقابلِ بیان چیز ہے۔ جس کو کاغذ پر بجنسہٖ ظاہر کر دینا ناصری کا حصہ نہیں۔ البتہ جس صناع کا نام مجھے بتایا گیا تھا، وہ اس باب میں کامیاب ہوا تھا۔ اگر یہ واقعی اس کی صنعت تھی جس کا نہ مجھ کو اس وقت یقین تھا۔ نہ اب ہے میں ناصری کے مکان سے خاموش روانہ ہو گیا۔ باہر برآمدہ میں پہنچ کر پیچھے دیکھا تو وہی دلفریب اور جاذبِ نظر صورت سامنے تھی۔ جو مجھ کو پکارتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ مسکراہٹ جس میں تاثرات کی ایک دنیا پوشیدہ تھی، میرے حواس میں خلل پیدا ہو رہا تھا۔ عجیب عجیب خیالات ذہن میں آ رہے تھے۔ آخر کار خود اپنے توہمات سے خائف ہو کر برآمدہ سے نیچے اتر آیا۔ اور اپنی اقامت گاہ کی طرف چلا۔ میں قیصر باغ کی طرف سے جا رہا تھا، یکایک میرے قلب کی

حرکت خوفناک طریقہ پر تیز ہوگئی، میں حیران ہو کر جہاں تھا وہیں رک گیا، مجسمہ کے پاس بنچ پر بیٹھا ہوا کون پڑھ رہا تھا؟ وہی سفید پوش عورت یہاں بھی سرنگوں بیٹھی تھی! اس کی گلے میں وہی چنبیلی کا ہار تھا۔ جس کے ساتھ وہ بلا ارادہ شغل کر رہی تھی۔ رعشہ براندام میں اس کی جانب بڑھا، میرے قدموں کی آہٹ سے وہ چونکی اور اس کی خمار آگیں آنکھوں نے ایک المناک تبسم کے ساتھ میری طرف دیکھا، باوجود دماغ کی پریشانی کے میں نے اس قدر جائزہ لے لیا کہ اس کا چہرہ زرد تھا، جسم کی ساخت نازک تھی، رنگت میں صباحت تھی۔ دوش تک وہ عریاں تھی، اس کی بلوری گردن دیکھنے والے کی آنکھوں میں تازگی پیدا کر رہی تھی، ہوا کے ہلکے جھونکے اس کی شبنمی ساری میں شکن پر شکن ڈال رہے تھے، اور وہ ان کو برابر کرتی جا رہی تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا، راستہ چلنے والوں میں سے کوئی اور بھی اس زہرہ آدمی کو دیکھ رہا تھا یا نہیں؟ لیکن کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں تھا۔ مجھے حیرت ہوئی اس لئے ہوئی کہ یہ کوئی ایسی صورت نہ تھی جو بغیر اپنا خراج لئے ہوئے کسی کو گزر جانے دیتی۔ میں کانپنے لگا، کیا اس کو میرے علاوہ کوئی اور نہیں دیکھ رہا تھا؟ کیا میرے مرکزی نظام عصبی میں کوئی اختلال رونما ہو چلا تھا؟ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ میں نے نفسیات، عضویات اور دیگر علوم جدیدہ کا غائر مطالعہ کیا ہے۔ جس نے مجھ کو مضحکہ بنا کر چھوڑ دیا ہے۔

اس منظر سے مجھ پر وہ ہیبت طاری ہوئی کہ میں بے ساختہ چلا اٹھا۔ پھر دیکھا تو نشست خالی تھی۔ وہ عجیب الخلقت عورت وہاں سے جا چکی تھی۔ اور چنبیلی کی شامہ نواز مہک بھی اپنے ساتھ لیتی گئی تھی۔ میں رگ رگ میں تکان محسوس کر رہا تھا۔ جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا قیصر باغ سے باہر نکلا، اور ایک تانگہ پر بیٹھ کر فرنچ ہوٹل میں کسی نہ کسی صورت سے پہنچ گیا۔ جہاں میں چند اپنے احباب کے ساتھ مقیم تھا۔ اپنی داستان اگر بیان کرتا مضحکہ کا نشانہ بنتا، لہٰذا میں نے اس تصویر کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا۔ جس کو ناسری کے "نگار خانہ" میں دیکھ آیا تھا۔ اور جس کی اثر آفرینیوں نے اس حد تک مجھ کو بے قابو کر دیا تھا۔ میرے احباب کی صحت میں بندگی نام تھا۔ صرف شاد کیشی کا، ہمارے بیشتر اوقات خوش باشیوں میں گزر جاتے۔ سیر و تفریح کی لذتوں اور مختلف دلچسپیوں نے "سمن پوش نازنین" کا تصور میرے ذہن سے مٹا دیا۔ اور اگر کبھی اس کی یاد تازہ ہو جاتی تو میں اس سے پہلو بچا جاتا۔ اس طرح دس بارہ روز گزر گئے۔

ایک روز ہم سب کو معلوم ہوا کہ الفریڈ تھیٹر آیا ہے۔ بالاتفاق یہ طے پایا کہ پہلی رات کا کھیل ضرور دیکھنا چاہیے، چنانچہ اس کا انتظام کیا گیا۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں تھیٹر دیکھ رہا تھا، مگر نہ تو تماشہ کی غائت کی طرف دھیان تھا، نہ اس پر تنقید کرنے کا ہوش، میں بس ایک چیز دیکھ رہا تھا، یعنی وہی عورت چنبیلی کا ہار زیب گلو کئے ہوئے۔ ارکسٹرا میں بیٹھی ہوئی تھی، اور محویت کے ساتھ مجھ کو دیکھ رہی تھی، وہ تنہا تھی، اس کے لباس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اپنے دوست کو مخاطب کر کے کہا "اس کو دیکھتے ہو جو سامنے شبنمی ساری زیب تن کئے ہوئے بیٹھی ہے؟ وہی جس کے گلے میں ہار ہے۔"

میرے دوست نے نگاہ اٹھائی۔ اور سر ہلا کر جواب دیا "نہیں تو! کہاں بیٹھی ہے؟"

"بالکل سامنے" میں نے کسی قدر متحیر ہو کر پھر کہا: "آرکسٹرا میں دیکھو وہ ہم کو دیکھ رہی ہے۔"

میرا مخاطب تعجب سے مجھ کو دیکھنے لگا "خواب تو نہیں دیکھ رہے ہو؟ آرکسٹرا میں کوئی عورت نہیں ہے۔" اس نے مجھ سے کہا۔

"کوئی عورت نہیں!" اب مجھے ہوش آیا۔ میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "شاید مجھ کو مغالطہ ہوا" اور فوراً بحث بدل دیا۔ جب تک میں تھیٹر ہال میں تھا میرے احباب سمجھ رہے تھے کہ تماشہ دیکھنے میں معروف ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی نظر اس جگہ سے ہٹا ہی نہیں سکتا تھا۔ جہاں وہ اس متانت اور خاموشی کے ساتھ بیٹھی دردمند نگاہوں سے میری قوتوں کو سلب کر رہی تھی، آج اس کے سامانِ آرائش میں ایک چیز کا اضافہ نظر آ رہا تھا۔ یعنی ایک خوب صورت پنکھا جس کو کبھی کبھی جنبش دے دیتی تھی۔ رہ رہ کر اسی پر مسرت انداز سے مسکراتی جس میں پوشیدہ تو بہت کچھ تھا لیکن جو اپنے راز کو افشا نہ ہونے دیتا تھا۔ جب تماشہ ختم ہوا، اور سب چلنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ تو وہ بھی اٹھی۔ اور ساری کا آنچل ایک معصومانہ ادا سے سنبھالتی ہوئی۔ ہجوم میں غائب ہو گئی، چند لمحوں کے بعد میں نے شاہراہ پر پھر اس کی جھلک دیکھی، اس کا جسم اس قدر نازک تھا، وہ اس قدر کم عمر اور ناآزمودہ کار

معلوم ہوتی تھی کہ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ میں ڈر رہا تھا کہ لوگوں کے اس طوفان میں کہیں اس کو کوئی صدمہ نہ پہنچ جائے۔" کیا یہ کوئی روح ہے جس کو کسی خاص غرض سے از سرِ نو اس دنیا کا قالب عطا کیا گیا ہے یا محض میرا واہمہ ہے جو مجھے پریشان کر رہا ہے۔" میں اپنے دل سے سوال کر رہا تھا۔ لیکن اس کی صورت اس قدر غمگین اور آزردہ ہے کہ میرا دل اس کے لئے دکھ رہا ہے۔ خواہ وہ خواب ہی کی مخلوق کیوں نہ ہو۔"

اسی کشمکش میں مبتلا اپنے دوستوں کے ساتھ مجمع کو پھاڑتا ہوا جا رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے چھو کر مجھے چونکا دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک نازک ہاتھ میرے شانہ پر تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گیا۔ آج میرے ذہن میں ایک تغیر رونما ہوا۔ یعنی میری دہشت دور ہو گئی اور مجھے خیال ہو گیا کہ یہ دلکش ہستی خیالی ہو یا مادی، عالمِ ارواح سے تعلق رکھتی ہو یا عالمِ اجسام سے، کسی نہ کسی غرض سے میرا تعاقب کر رہی ہے۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اب اس کو دیکھ کر ڈروں گا نہیں بلکہ ہمت کے ساتھ واقعات کا ترتیب وار مطالعہ کروں گا اور مجھے اطمینان تھا کہ اگر استقلال سے کام لیا تو حقیقت کو ضرور بے نقاب کر سکوں گا۔

لکھنؤ میں پندرہ روز اور قیام رہا لیکن "سمن پوش" اس دوران میں پھر نظر نہ آئی۔ البتہ ناصری کے ساتھ جا کر میں نے اسکی تصویر کی ایک کاپی خرید لی جو میرے لئے ایک خاص اہمیت رکھنے لگی تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ تصویر کو اصل سے کوئی مناسبت نہیں اور اس سے ناہید کی رعنائیوں اور دلربائیوں کا صحیح اندازہ کرنا محال تھا۔ اس کے بعد میں بارہ بنکی چلا آیا اور اپنی روزانہ مصروفیتوں میں ناہید کو پھر بھول گیا۔ میں نے اسی سال بی۔ اے کیا تھا اور اس دورِ تعطیل سے گذر رہا تھا جس سے سکول اور کالج کا زمانہ ختم کر کے کم و بیش ہر شخص کو گذرنا ہوتا ہے۔ یعنی ابھی یہ فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ مجھے کرنا کیا ہے۔

میرے ایک چچا کی لڑکی سائرہ ضلع سیتاپور کے ایک باوقار رئیس عبدالعلی کے لڑکے شمیم سے بیاہی ہوئی تھی۔ شمیم نے بھی اسی سال ایم۔ ایس۔ سی کیا تھا اور چونکہ سرمایہ دار تھے اور کسبِ معاش کی فکر سے بے نیاز اس لئے ان کا ارادہ تھا کہ اپنی زمینداری کا انتظام کریں گے۔

ایک دن میری ماں کے نام سائرہ کی تحریر آئی جس سے معلوم ہوا کہ عبدالعلی صاحب نے حال ہی میں ایک نیا گاؤں مع ایک عالی شان عمارت کے خریدا ہے اور ان لوگوں کی خواہش ہے کہ ہم سب ان کی مسرتوں میں شرکت کریں۔ سائرہ کا اصرار تھا کہ کم از کم میں ضرور اپنی کیفیتوں سے اس کے لطف میں اضافہ کروں ورنہ وہ مجھے کبھی نہ معاف کرے گی۔ میں کہہ نہیں سکتا سائرہ کو میری مصاحبت میں کیا لطف ہو سکتا تھا جبکہ اکثر احباب کا خیال ہے کہ میری ہنسی مصنوعی ہوا کرتی ہے اور فی الحقیقت میرا خمیر المناکیوں سے ہوا ہے یہ اور بات ہے کہ میں ہر قسم کی صحبت میں شریک ہو جایا کرتا ہوں، بہرحال سائرہ کو میری طرف سے حسنِ ظن تھا جو غلو کی حد تک پہنچا ہوا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ زندگی کے بیشتر فرحناک لمحے میری معیت میں گذریں۔ مجھے عذر ہی کیا ہو سکتا تھا، وقت کاٹنے کے لئے کوئی بہانہ تلاش کر رہا تھا میں نے فوراً سامان درست کر لیا، میری ماں البتہ چند اسباب کی بنا پر نہ جا سکیں۔

"جمال منزل" واقعی نہایت خوبصورت اور شاندار عمارت تھی جو ایک وسیع احاطہ سے گھری ہوئی تھی۔ شمیم کی گاڑی نے جس وقت مجھے پیش گاہ میں لا کر اتارا تو میں اس کی شوکت سے مرعوب ہو گیا جس نے ایسے دیہات میں اس "فردوسِ ارضی" کو اپنے لئے تعمیر کرایا ہو گا۔ اس میں ذوقِ سلیم اور حسنِ لطیف کہاں تک رچا ہو گا۔ اس کے علاوہ "جمال منزل" سے اس کے اصل مالک کی مالی استطاعت کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا تھا۔ چونکہ میں شام کو پہنچا تھا اس لئے احاطہ اور باغ کی سیر صبح تک ملتوی رکھی گئی۔

عبدالعلی اور ان کی بیوی نے نہایت خلوص سے میرا خیر مقدم کیا۔ شمیم ضرورت سے زیادہ ہنس رہا تھا اور پھر بھی ان کو میری نظر نہیں آتی تھی۔ سائرہ نے سنجیدگی اور متانت سے اپنی خوشی کا اظہار کیا جیسا کہ اس کا دستور تھا۔ الغرض میرے آنے سے ہر شخص اپنی اپنی جگہ کافی مسرور تھا۔

جب ہم رات کے کھانے پر بیٹھے تو ہماری گفتگو کا موضوع وہی گاؤں اور مکان تھا اور اس میں شک نہیں کہ موضوع دلچسپ ثابت ہوا۔۔۔

شمیم نے کہا: "تم اس مکان پر اس حیثیت سے غور کرو کہ جس بدنصیب نے اس کو حوصلوں کے ساتھ تعمیر کرایا تھا وہ مصنف تھا، شاعر تھا، نقاش تھا اور آج بیس برس سے زیادہ عرصہ گذرا ہے کہ اس نے خودکشی کرکے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ تم اس کا نام جاننے کے لئے بے تاب ہو گئے۔ اس کا نام "جمال الدین" تھا۔"

"جمال الدین!" میں چونک پڑا۔ میں نے اس کے کچھ منتشر اشعار کا مطالعہ کیا تھا اور اس کا ایک ڈراما "جذبات محبت" بھی پڑھا تھا جس کا مجھ پر گہرا اثر ہوا تھا، مگر یہ نہ جانتا تھا کہ وہ نقاش بھی ہے اور نہ یہ خبر تھی کہ اس نے اپنے ہاتھوں اپنی جان دی۔

ساترہ غور سے مجھے دیکھ رہی تھی، اور خوب واقف تھی کہ میرے اعصاب کتنے سریع الحس اور اثر پذیر ہیں۔ اس نے شمیم سے ناپسندیدگی کے لہجہ میں کہا: "آپ نے برا کیا۔ سہیل بھائی کے لئے تمام رات کروٹیں بدلتے رہنے اور سر دُھننے کا سامان فراہم کر دیا۔ یہ وہ سفر سے ماندہ و خستہ پہنچے آ رہے ہیں۔ آپ نے ان کو راحتِ شب سے بھی محروم کر دیا۔"

میں نے مسکرا کر کہا: "نہیں نہیں! قصہ سننے کے لائق ہے۔ ہاں تو شمیم! یہ نہیں معلوم کہ ہمارا شاعر نقاش اپنی زندگی سے بیزار کیوں ہو گیا؟"

"میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا، سنا ہے اس کو اپنی بیوی سے بے انتہا محبت تھی جس کو کسی نے واللہ اعلم کیوں قتل کر دیا۔ جمال الدین اس صدمہ کو زیادہ برداشت نہ کر سکا اور غالباً سال ڈیڑھ سال کے بعد اس نے بھی اپنا عنصری جامہ اتار پھینکا۔ شاعر یوں بھی ہیجانی اور اپنے دل کے غلام ہوتے ہیں اور ان کا کسی رَو میں خودکشی کر لینا کوئی حیرت انگیز بات نہیں۔"

شروع سے آخر تک شمیم کے لہجہ سے تمسخر و استہزاء پایا جاتا تھا، میں یہ سوچ رہا تھا کہ انسان اس قدر بھی بے حس ہوتا ہے۔ میں نے جواب دیا "شمیم! تمہاری گفتگو نے مجھے تو بہت دکھ پہنچایا لیکن تم سے اس کے سوا امید ہی کیا ہو سکتی تھی، یہ کوئی تمہارا اپنا خیال نہیں، یہ مرض عالمگیر ہے جو ساری دنیا میں وبا کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ جو انسانیت اور الوہیت دونوں کو کائنات سے مفقود کر رہا ہے۔ لیکن تمہارے ذہن میں تو شاید ان الفاظ کے کوئی معنی بھی نہ ہوں۔ تم جو دل کو ایک پارۂ گوشت سمجھتے ہو جو پمپ کا کام دیتا ہے، تم جو انسان کو ایک آلہ سمجھتے ہو، بتاؤ تم نے اتنی عمر ضائع کرکے کون سی نئی بات حاصل کی؟

اینکہ دل نام کردۂ بہ مجاز
رو بہ پیشِ سگاں کہ انداز

شاید ہر شخص جو انسانوں اور حیوانوں کو متواتر چیرتا ہے اور کچھ دنوں تک برابر مشاہدہ کرتا رہے اس قدر جان سکتا ہے کہ دل صنوبری شکل کا ایک ٹکڑا ہے جو غلافِ قلب (PERICARDIUM) میں ملفوف ہے اور جس کا کام خون کو اندر کھینچنا اور باہر پھینکنا ہے مگر تم کو کیا کہوں بڑے سے بڑا فلسفی اور بڑے سے بڑا حکیم انہی خود فریبیوں میں مبتلا ہے۔ وہ عقل کی رہنمائی میں چلتا ہے اور وجدانیت و بداہت کو پیچھے چھوڑتا جاتا ہے کارلائل نے اسی لئے ایسے لوگوں کا نام "منطق تراش (LOGIC CHOPPERS)" رکھا ہے اسی لئے کسی چیز کی بابت کوئی قطعی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ عقل کی افراط نے اس کی ربوبیت چھین لی اور اس کے ارتقاء کا سدِ باب ہو گیا، وہ اپنا نصب العین بھول گیا بلکہ اپنی اصلیت بھی اس کو یاد نہ رہی۔ بیدل نے ہم کو بہت صائب رائے اس بارے میں دی ہے:

ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش

خیریت یہ ہے کہ دنیا میں چند ایسے نفوس ہمیشہ رہے جو کبھی کبھی حقیقت کی جھلک دیکھ لیا کرتے ہیں اور جو ہم کو اپنے آغاز و انجام سے آگاہ کیے رہتے ہیں، ورنہ آج میمتھ کی طرح یہ مخلوق بھی صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی جو 'انسان' کہلاتی ہے۔"

میرے ہیجان کا دورہ شروع ہو گیا۔ میں انسان کا "جہلِ مرکب" نہیں برداشت کر سکتا۔ یہ بیماری شاید انسان کے علاوہ کسی دوسرے جاندار میں

نہیں پائی جاتی کہ وہ اپنی جہالت کو علم سمجھنے کی کوشش کرنا چاہتا ہے اور اپنی اس دانستہ فریب کاری پر ناز کرتا ہے۔

شمیم بے کیف ہونے لگا تھا۔ میرا مباحثہ اکثر تلخ ہوا کرتا ہے اس لئے جہاں سوئی سے کام لینا چاہئے وہاں میں نیزوں اور بھالوں کے وار کرنے لگتا ہوں۔ سننے والے میری صحبت سے لطف اٹھاتے ہیں مگر میرا مقابل ہمیشہ مجھ سے متنفر ہو جایا کرتا ہے، چنانچہ میرے چاہنے والوں سے وہ لوگ تعداد میں زیادہ ہیں جو میری طرف سے اپنے دلوں میں غبار لئے ہوتے ہیں۔ شمیم نے میری رگوں میں چنگاریاں بھر دی تھیں اور میں آگ برسانے لگا تھا جس کا سلسلہ نہ جانے کہاں ختم ہوتا اگر ان کی والدہ درمیان میں نہ بول دی ہوتیں کہ "اچھا! اب بے کار بحث کو جانے دو، ایک لطیفہ اور سنو! گانے والوں میں مشہور ہے کہ "جمال منزل" روحوں کا مسکن ہے اور میرا خیال ہے کہ بیچنے والوں نے اسی وہم سے اس کو جلد ابھی کیا تھا، مگر ہم لوگوں پر اس قسم کے جاہلانہ معتقدات کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔"

میں نے اپنے دل میں کہا: "نہ جانے گانے والے جاہل ہیں یا آپ۔" شمیم سے پھر نہ رہا گیا اور مجھ پر حملہ کر ہی بیٹھے، انھوں نے کہا: "مگر اب مجھے اطمینان ہے کہ میرے گھر میں ایک ایسا محقق موجود ہے جو ہم کو اصلیت سے خبردار کر سکے گا۔"

"غلط خیال ہے" میں نے جواب دیا۔ "میری تحقیق و تدقیق سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت تم میں نہیں ہے، اگر کوئی راز مجھ پر منکشف بھی ہوگا تو میں اس کو تم سے مخفی رکھوں گا۔"

رات زیادہ جا چکی تھی ہم ایک دوسرے کو "شب بخیر" کہہ کر اپنی اپنی خواب گاہ کو رخصت ہوئے۔ چلتے ہوئے سائرہ نے کہا: "آپ کا چہرہ ٹھنڈا ہو گیا ہے، دیکھئے سونا نصیب ہوتا ہے یا نہیں، خدا کے لئے آج کے مبحث پر زیادہ تبصرہ نہ کیجئے گا۔"

میں نے ہنس کر جواب دیا: "سائرہ! بچوں کی سی باتیں نہ کرو۔" اور آ کر اپنے بستر پر لیٹ رہا، نیند کی کوئی علامت میری آنکھوں میں نہ تھی۔ میں دو بجے رات تک پڑھتا رہا، گرمی کی سہانی رت تھی، پچھلے پہر ہوا میں ایک سکون بخش خنکی پیدا ہوئی تو میری آنکھ لگ گئی۔ لیکن پانچ ہی بجے کسی کے قدموں کی آہٹ سے جاگ گیا۔ دیکھا تو شمیم تھے، میں اٹھ بیٹھا۔ شمیم نے کہا: "ہوا خوشگوار ہے چلو باغ میں تفریح کر آئیں، یا رات کی کبیدگی ہنوز باقی ہے؟"

"کہیں سائرہ نے رات بھر تمہارے کان تو گرم نہیں کئے؟" میں نے پوچھا۔

شمیم ہنس دیئے اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے: "تم شاید رات بھر سوئے نہیں؟ اچھا چلو ہوا کسل دور کر دے گی۔"

"ہاں! اس وقت کی سیر ضرور روح میں بالیدگی پیدا کرے گی۔" یہ کہہ کر میں شمیم کے ساتھ ہو لیا۔

باغ کو میں نے امیدوں سے زیادہ دلکش اور فرحناک پایا۔ احاطہ کے وسط میں ایک خوبصورت تالاب تھا، قسم قسم کے درخت اور مختلف رنگ و بو کے پھول روشوں کے کنارے علوئے تخیل کا نمونہ بنے ہوئے تھے۔ ہر چند کہ قرائن سے ظاہر ہوتا تھا کہ مدت سے ان کی پرداخت کرنے والا کوئی نہیں تالاب کے چاروں طرف چنبیلی کی کیاریاں تھیں جن سے فضا مہک رہی تھی۔ مجھے بے اختیار اپنی "سمن پوش" یاد آ گئی۔ تھوڑی دیر کے لئے میں پھر عالم خیال میں گم ہو گیا۔ شمیم نے یہ دیکھ کر پوچھا: "کیا سوچ رہے ہو؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

شمیم نے کہا: "اب آؤ میں تم کو جمال الدین کی بیوی کی قبر دکھاؤں۔" میں سراپا اشتیاق بن کر شمیم کے ساتھ آگے بڑھا۔ چنبیلی کی ایک کیاری میں ایک پختہ قبر تھی جس کی شکستگی کہہ رہی تھی کہ اب ایسا بھی کوئی نہیں جو اس کی مرمت کرانے کی زحمت گوارا کرے، لوح ٹوٹ کر علیحدہ زمین میں پیوست تھی اس پر گھاس اگ آئی تھی۔ اس سے پیشتر شمیم یا کسی اور کی نگاہ بھی اس پر نہیں پڑی تھی، میں نے بڑھ کر اس کو صاف کیا تو اس پر ناہید لکھا ہوا پایا۔ شمیم نے

میرا ایماء پا کر ایک خدمت گار کو بلایا جس نے لوح کو زمین سے باہر نکالا، دوسری طرف بھی کچھ کتبہ نظر آیا۔ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ کوئی فارسی شعر ہے، مگر باوجود سعی بسیار کے صحیح پڑھا نہ جا سکا۔ اس لیے کہ وہ حصہ تقریباً ایک بالشت زمین کے اندر تھا، اور زمانہ کی رگڑ نے نقوش کو کافی منتشر کر دیا تھا۔ میری رگ رگ بے چین ہو رہی تھی کہ کسی طور سے اس کتبہ کو پڑھ لوں، لیکن کچھ بس نہ چلا۔ شعر بھی کوئی ایسا نہ تھا جو عام طور پر مشہور ہوتا، تاکہ قیاس سے پڑھ لیا جاتا، آخر کار مایوس لوٹنا پڑا۔

یہاں عبد العلی صاحب ساحرہ وغیرہ کے ساتھ چائے پر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ آج کی گفتگو کا مرکز "ناہید کا مزار" رہا۔ مجھے رہ رہ کر اسی کتبہ کا خیال آتا تھا جس نے مجھے تاریکی میں رکھ چھوڑا تھا۔ سارا دن ہارمونیم، فونو گراف، تاش اور دیگر مشاغل میں ضائع ہوا۔ میں چاہتا تھا کچھ لکھوں، مگر یہاں اس کی کوشش کرنا بت پرستوں کے شہر میں نماز کے لئے جہاد کرنے سے کم نہ تھا۔ شام کو تمیم نے گاڑی تیار کرائی اور مجھے لے کر ہوا کھانے نکل گئے مختصر یہ کہ مجھے اس قدر موقع نہ ملا کہ ایک بار پھر ناہید کی قبر پر جاتا اور لوح کے کتبہ پر نظر ثانی کرتا۔ جب کھانے کے بعد اپنے بستر پر گیا تو کسی قدر سکون میسر ہوا۔ دل بہلانے کی غرض سے گھنٹوں مثنوی مولانا روم دیکھتا رہا۔

نیند کے آثار اس دن بھی غائب تھے، رات کا سناٹا بڑھ رہا تھا۔ میرا مطالعہ بدستور جاری تھا، کبھی کبھی کتاب بند کر کے کچھ سوچنے لگتا تھا۔ تقریباً ایک بجے بستر سے اٹھا اور سامنے کے کمرہ سے سگرٹ لے کر واپس ہو رہا تھا کہ مجھے چار پانچ گز کے فاصلے پر ایک عورت کی شکل دکھائی دی جو دیکھتے دیکھتے میرے مقابل تھی۔ یہ کون؟ وہی "سمن پوش!" اس وقت میں نے حیرت کو اعصاب پر قابو پانے دیا کہ ہراس کو۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میں اپنے حواس قائم رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ میری نگاہیں اس کی نگاہوں سے جس وقت ملیں تو اس نے ہاتھ سے کچھ اشارہ کیا گویا مجھ سے کسی بات کی التجا کر رہی ہے۔

"تم یہاں کس لئے آئی ہو؟" میں نے آہستگی سے پوچھا۔ "اور میرا تعاقب کیوں کر رہی ہو؟"

اسی طرح اس نے پھر اپنے ہاتھ کو حرکت دی اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اس لئے کہ آپ کو مجھ سے ہمدردی ہے۔"

"کیا تم سکون سے محروم ہو؟"

"یک قلم۔" یہ کہتے کہتے اس کا دم پھولنے لگا جیسے تشنج کا دورہ پڑ رہا ہو۔ میں گھبرا سا گیا تاہم سلسلے کو منقطع نہ ہونے دیا۔

"اچھا تو بتاؤ مجھ سے کیا چاہتی ہو؟" میں اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔

اس نے اپنی ہیجانی آنکھیں اوپر اٹھا دیں جو نم آلود تھیں۔ "میرے لئے دعا کیجئے، جب سے میں مری ہوں کسی نے میرے لئے دعا نہیں کی بیس برس سے کسی نے مجھ پر ترس نہیں کھایا۔" اس نے کچھ ایسے لہجہ میں کہا کہ میرا جی بھر آیا۔

"تمہاری موت کا سبب کیا ہوا تھا؟" میں نے سوال کیا۔

اب سمن پوش، قریب کی ایک کرسی پر بیٹھ گئی، اس نے ایک غمگین انداز سے مسکراتے ہوئے اپنے سینہ سے ہار ہٹایا اور میں نے دیکھا کہ اس جگہ اس کے کپڑے پر خون کے گہرے دھبے تھے۔ اس نے دھبوں کی طرف اشارہ کیا اور پھر ان کو اپنے ہار سے چھپا لیا۔ میں سمجھ گیا۔

"قتل؟" میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

"کسی کو اس کا صحیح علم نہیں۔" اس نے کہا۔ "آپ میرا پورا افسانہ حیات سننا چاہتے ہیں تو سنئے! میں وہی ناہید ہوں جس کا مدفن آپ نے اس احاطہ میں دیکھا ہے۔"

"ہاں! ...."

"تم کو کس نے قتل کیا اور کیوں؟" میں نے بات کاٹ کر پھر پوچھا۔ میرے اعصاب پھر بے قابو ہو چلے تھے، میں سب کچھ اسی ایک منٹ میں جان لینا چاہتا تھا۔ خود ناہید کے بشرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک اندرونی کرب سے بے بس ہو رہی ہے، گویا اپنی داستان کو دہرانا اس کے لئے

بڑی آزمائش کا کام تھا۔

"ذرا صبر کیجیے تو میں کوشش کر کے اپنی زندگی کے واقعات آپ سے بیان کر دوں" اس نے کہا۔ "میرا قاتل میرا شوہر ہے لیکن اس سے یہ حرکت ایک زبردست غلط فہمی میں سرزد ہوئی تھی۔ اس کو دھوکا ہوا جس کا مرتے دم تک اس کو علم نہ ہو سکا۔ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔ ایسی محبت جس کی مثال اس دور مادیات میں کم ملے گی۔ مبالغہ نہ سمجھیے۔ وہ مجھ کو پوجتا تھا......

آپ خاموش سُننے جائیے۔ میرے لئے وہ اپنے عزیزوں سے کنارہ کش ہو گیا اور اس ویرانہ کو آباد کر کے بیٹھ گیا۔ وہ کہا کرتا تھا 'میرے دونوں جہان تیری آنکھیں ہیں۔' "جمال منزل" اس نے میرے لئے بنوائی تھی اور میں اپنی تو یہ سمجھتی تھی کہ زمین، آسمان، چاند، سورج، دن رات سب اس کی تجلیاں ہیں۔ مجھے یقین تھا اور اب بھی ہے کہ مجھے زندگی اس کے طفیل ملی ہے۔ اگر انسانی دنیا کی تمام زبانیں میرے جذبات کو معرضِ اظہار میں لانے کی متفقہ کوشش کریں تو عہدہ برآ نہیں ہو سکتیں۔"

ناہید کی زبان میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ وہ دم لینے کے واسطے رُک گئی، میں بے خودی کی حالت میں اس کو دیکھ رہا تھا۔

"میں پارسی تھی یعنی "آتش پرست"۔" اس نے آخری الفاظ پر زور دیتے ہوئے پھر بیان کرنا شروع کر دیا۔ "اور ایکٹنگ میرا ذریعۂ معاش۔ لیکن اگرچہ مردوں کا ساتھ شب و روز رہتا تھا، مجھے کسی سے بھی اُنس نہ ہوا تھا۔ جمال نے مجھے ایک نئی لذت سے آشنا کیا۔ اس کو مجھ سے محبت پیدا ہو گئی۔ اس کے ایک ایک لفظ، اس کی ایک ایک ادا سے خلوص و صداقت کی بُو آتی تھی۔ میں بھی اس کو دیوانوں کی طرح چاہنے لگی۔ اس کی ہستی مجھ کو دنیا سے نرالی نظر آتی۔ اس کی ہنسی میں ہمیشہ دُکھ بھرا ہوتا تھا۔ اس کی آواز میں پپیہے کی سی دلدوز تاثیر تھی، سوز و گداز اس کے خمیر میں تھا۔ وہ سراپا تصویرِ درد تھا۔ میرا میلان ٹریجیڈی کی طرف تھا اس لئے جمال نے مجھے آسانی سے جیت لیا۔"

وہ پھر ایک مرتبہ زبان تر کرنے کو رُکی، میں نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ ترتیب وار اپنا سارا قصہ بیان کر جائے لہٰذا خاموش منتظر رہا۔

"میں آپ کے آرام میں مخل تو نہیں ہوں؟" اس نے نہ جانے کس خیال سے پوچھا، اس کا چہرہ اس کے وارداتِ قلب کا آئینہ بن رہا تھا۔

"بالکل نہیں! میں اس گھڑی کا مشتاق تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"میں سمجھتی تھی کہ آپ میری غم خواری کریں گے۔" اس نے مسترحمانہ لہجہ میں کہا۔ "ورنہ آپ کا تعاقب نہ کرتی۔"

"ہاں تو ہماری محبت خوش آئند ثابت ہوئی۔ جمال نے مخالفتوں اور انگشت نمائیوں سے بے پروا ہو کر مجھ سے شادی کر لی اور ہم دونوں نے دنیا کے ہنگاموں سے دور اس جنگل میں ایک جنت بسائی۔ دونوں کی زندگی ایک مسلسل لمحہ مسرت تھی۔ جمال نے اپنی ساری دولت میرے لئے وقف کر دی۔ وہ متمول آدمی تھا۔ ادبیات اور مصوری سے اس کو انہماک تھا۔ مصوری کا وہ ماہر ہو چلا تھا۔ اس نے میری تصویریں کھینچیں اور ان میں سے اکثر کی پبلک میں نمائش بھی کی جن سے اس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ یہ چنبیلی کی کیاریاں میری محنتوں کا نتیجہ ہیں۔ شام کو جب ہم باغ میں گلگشت کرنے ہوتے تو وہ پھول توڑ توڑ کر مجھے دیتا۔ میں ہار گوندھ کر خود پہنتی اور اس کو پہناتی۔ اسی طرح دو سال گذر گئے۔ یکایک زمانے نے ایسی گردش کی کہ بات کی بات میں ہمارے خواب کا طلسم ٹوٹ گیا۔ جمال مجھ کو بے نقاب رکھتا تھا۔ میں نہ صرف اس کے رشتہ داروں اور دوستوں کے سامنے، بلکہ عام مجمع میں بھی اس کے ساتھ بے پردہ رہتی تھی۔ جمال نے اگرچہ تنہائی اختیار کر لی تھی، تاہم کبھی کبھی اس کے احباب اس سے ملنے آ جایا کرتے تھے اور وہ ان سے مل کر خوش ہوتا تھا۔ اس کے رشتہ داروں میں فیروز جو اس کا شبیہ مشہور تھا، ہم کو دیکھنے اکثر آتا تھا اور ہفتوں ٹھہر رہا کرتا تھا۔ فیروز کی طبیعت مبتذل اور عامیانہ تھی، اس کی نفسانیت کی داستانیں اکثر سُنی گئی تھیں مگر جمال اس کی ہوسناکیوں سے واقف نہ تھا۔ وہ معلوم نہیں کیوں فیروز کی قدر کرتا تھا۔ شاعر یا صناع انسان کو بحیثیت مجموعی کتنا ہی صحیح کیوں نہ سمجھ لے لیکن جہاں افراد سے سابقہ پڑتا ہے، وہ اکثر دھوکا کھا جاتا ہے۔ فیروز کی نگاہیں مجھے گراں گذرتی تھیں، اس کی مسکراہٹ مجھے ناگوار ہوتی تھی۔ میں نے متعدد بار چاہا کہ جمال کو ہوشیار کر دوں مگر پھر یہ خیال ہوا کہ بیکار بدمزگی پیدا کرنا غلطی ہے۔

مجھے اپنی اخلاقی قوت پر اس درجہ غرور تھا کہ میں سمجھتی تھی فیروز مجھ سے مذاق کرنے کی بھی ہمت نہ کرے گا، اور چونکہ وہ عموماً میرے سامنے مہذب اور شائستہ رہا کرتا تھا اس لئے اور بھی مطمئن تھی اور جمال کو بھی مجھ پر اعتماد تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ فیروز ہمارا مہمان تھا۔ جمال کو کسی اشد ضرورت سے سیتاپور جانا پڑا، رات کو آٹھ بجے جبکہ اس کی واپسی کا وقت تھا میں اس کمرے میں جو آپ کے کمرے کے متصل ہے، بیٹھی کچھ دھیمی آواز میں گا رہی تھی، دفعتہً مجھ کو کمرہ تاریک ہوتا معلوم ہوا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو فیروز تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "یہ روشنی گم کیوں کر دی؟" میں سوال ختم کرنے نہ پائی تھی کہ میرا بازو اس کی آہنی گرفت میں تھا اور وہ مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ بعض ساعتیں ہوتی ہیں جو کمزور سے کمزور دل میں خوفناک مجرمانہ جسارت پیدا کر دیتی ہے۔ میں نے اپنے تمام جسم کی قوت صرف کر کے ایک بار اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا مگر کم بخت پر بہیمیت کا دیو مسلط تھا۔ دوسرے منٹ میں میں اس کی تنگ آغوش میں تھی۔ میں نے ابھی تک کسی نوکر کو اس لئے نہیں بلایا تھا کہ ان میں اس واقعہ کے متعلق خواہ مخواہ سرگوشیاں ہوں گی۔ اب میں نے ایک بار پھر فیروز کے مہلک پنجوں سے آزاد ہو کر خادمہ کو آواز دی اس کے آنے میں تاخیر ہوئی فیروز پھر میری سمت بڑھا، لیکن اتنے میں جمال نے مجھے پکارا۔ فیروز کمرے سے باہر نکل گیا اور میں جمال کے پاس دوڑی میرا ارادہ تھا کہ اس سے بے کم و کاست سب ماجرا کہہ کر فیروز کو اسی وقت نکلوا دوں گی، مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے مجھے فیروز کی آغوش میں دیکھ لیا تھا اور اپنی رائے قائم کر چکا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت اس نے یہ دیکھا اسی وقت میں نے اپنے کو فیروز کی گرفت سے چھڑا لیا تھا۔ جمال اُف! اُف! کرتا ہوا اپنے سٹڈی میں ٹہل رہا تھا۔ میں نے اس کو کبھی غضبناک نہیں دیکھا تھا اس کی آنکھیں خون کی مانند سرخ ہو رہی تھیں۔ صورت جوشِ غضب میں مسخ ہو گئی تھی۔ میں کمرے میں داخل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اس نے مجروح شیر کی طرح میری کلائی پکڑ لی اور کہا "دغاباز! تیری زندگی کا ایک ایک پل اب میری روح کو ناپاک کر رہا ہے۔" مجھ میں پندار ایسا تھا کہ "دغاباز" خطاب پا جانے کے بعد میں نے اپنی برأت کے لئے ایک حرف بھی نہ کہا اور وہ کچھ ایسے عالم میں تھا کہ اگر میں کچھ کہتی بھی تو وہ مجھے جھوٹا سمجھتا۔ جمال بے انتہا مغلوب الجذبات اور ذکی الحس واقع ہوا تھا۔ اس کے عضلات پھڑک رہے تھے، اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس نے ایک نگاہ میری اس نامکمل تصویر پر ڈالی جس کے لئے وہ ان دنوں بڑی محنت کر رہا تھا اور میز کی دراز سے پیش قبض نکال کر میرے سینے میں اتار دیا۔ یہ سب ایسی غیر متوقع سرعت کے ساتھ ہوا کہ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ "تباہی کا شیطان" فیروز پانچ منٹ کے اندر مجھ کو میری جنت سے محروم کر گیا۔ اس کے بعد ہر چند کہ جمال پر کوئی الزام نہ آیا اور مشہور یہ ہو گیا کہ مجھے کسی دشمن نے قتل کر دیا ہے لیکن اس کی زندگی اس قدر المناک ہو گئی کہ چھ مہینے کے بعد اگر اس نے خودکشی نہ کر لی ہوتی تو وہ جا کر قتل کا اقبال کر لیتا۔"

ناہید کے آنسو گرنے لگے۔ میں تڑپ گیا، چاہتا تھا کہ اس کے آنسو پونچھوں لیکن اس نے ہاتھ کے اشارہ سے منع کر دیا اور پھر سلسلہ یوں شروع کیا:

"آپ جمال کو خونخوار اور وحشی کہیں گے۔ مگر میرا ایمان یہ ہے کہ اس کو میرے ساتھ شدید قسم کی محبت تھی۔ یہ محبت کی انتہا تھی کہ اس نے محبت کے فنا ہو جانے کے ڈر سے مجھے ہمیشہ کے لئے کھو دیا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ اس نے شیکسپیئر کے مشہور ڈراما "اتھیلو" کا ترجمہ کر کے سنایا تھا۔ میں گمنٹون "ڈسڈیمونا" پر رشک کرتی رہی۔ میں نے جمال سے کہا تھا کہ 'کاش! مجھے اس کا پارٹ ہی کرنا نصیب ہوتا!' اس پر اس نے مجھے بہت پیار کیا تھا۔ آہ!"

ناہید تھک گئی تھی لیکن اب اس کے چہرے سے آسودگی ٹپک رہی تھی۔ صبح کی سپیدی نمودار ہو چلی تھی۔ وہ رخصت ہونے کے لئے اٹھی چلتے چلتے اس نے کہا "ہاں! ایک بات بھول گئی۔ جمال نے ایک ظلم مجھ پر کیا ہے کہ مجھے مار کر اسے تسکین نہ ہوئی تو اس نے میرے مزار کی لوح پر یہ شعر کندہ کرا دیا ؎

وفا آموختی از ما بکارِ دیگراں کردی
ربودی گوہرے از ما نثارِ دیگراں کردی

اس کو آخر وقت تک مغالطہ رہا۔ اب آپ اس شعر کو رٹا کر یہ شعر کندہ کرا دیجئے۔

من کہ جز با تو نہ پرداختہ ام　　گہ بجو سوختہ ام ساختہ ام

بس مجھے اطمینان کلی میسر ہو جائے گا اور میں سکون کی سانس لے سکوں گی۔ آپ کو پھر کبھی تکلیف نہ دوں گی۔ ہاں! اگر آپ کا جی چاہے تو جا کر اس بیش قبض کو بھی دیکھ لیجئے جس نے دو ہستیوں کو ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا اور جو "اسٹڈیو" میں ابھی تک ایک بوسیدہ صندوق میں پڑا ہوا ہے"!
یہ کہہ کر ناہید نے الوداع کہا۔ میں نے سمت مزار تک اس کو جاتے دیکھا جہاں وہ نگاہ سے غائب ہو گئی۔

میں ہاتھ منہ دھو کر چائے کے وقت سے پہلے ہی سائرہ سے تنہائی میں ملا۔ اس کو لے کر سیدھا اس کمرے میں گیا جو جمال کا "اسٹڈیو" رہ چکا تھا۔ سب سے پہلے میری نگاہ جس چیز پر ٹھہری، وہ ایک شکستہ صندوق تھا۔ اس میں کرم خوردہ کاغذات کا ایک انبار تھا جس کے درمیان مجھے وہ بیش قبض ملا جو باوجود زنگ آلود ہونے کے اپنی خون آشامی کا اقرار آپ کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے سائرہ سے کہا "اس گھر میں جتنے افراد ہیں ان میں ایک تم ایسی ہو جس کے سامنے میں اپنے مشاہدات بیان کر سکتا ہوں۔ اس لئے کہ تم مجھ کو کبھی دیوانہ یا فاترالعقل نہیں سمجھو گی"۔

میں نے سائرہ کو حقیقت سے آگاہ کیا تو وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگی۔ وہ مجھ کو جھوٹا تو سمجھ نہیں سکتی تھی اور ایسی باتوں کو آسانی سے صحیح مان لینا بھی کوئی معمولی کام نہیں۔ سائرہ نے عبدالعلی اور شمیم وغیرہ سے اس کا تذکرہ کیا اور بہت اصرار کے ساتھ کہا کہ مزار کی لوح پر وہ دوسرا شعر کندہ کرایا جائے جو ناہید مجھے بتا گئی تھی لیکن اس کا جواب وہی ملا جس کی مجھے امید تھی۔ یعنی میرے ساتھ ساتھ اس کا بھی خوب مضحکہ اڑایا گیا۔

مجھ کو افسوس ضرور ہے کہ ناہید کی آخری خواہش پوری نہ کر سکا مگر میرے امکان میں جو کچھ تھا وہ کیا اور اب بھی اس سے غافل نہیں ہوں۔ میں اس کے لئے برابر دعائیں کرتا رہتا ہوں۔ کیونکہ میرا دعائی اعتقاد ہے کہ روحوں کے تعلقات اس دنیا سے کبھی منقطع نہیں ہوتے۔

یہ واقعہ مدتوں میرے غور و فکر کا موضوع رہا ہے۔ میں سوچتا ہوں اور کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتا۔ محبت بھی کیا معمہ ہے کوئی ایسا دماغ آج تک پیدا نہ ہوا جو اس طلسم کو توڑ سکتا۔ منطق اپنے اصول، موضوع اور علوم متعارفہ لئے ہوئے بیٹھا رہ جاتا تھا اور ہم دیکھ لیتے تھے کہ "ضدین" کا اجتماع اور "نقیضین" کا تطابق نہ صرف ممکن ہے بلکہ ہستی کا اصل راز ہے۔ ہم اس گتھی کو کل، اسپنسر یا سینا اور فارابی کی مدد سے نہیں سلجھا سکتے۔ اب آخر میں علمائے نفسیات اور ماہرین عصبیات کو بھی اصل واقعہ کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے کامل یقین ہے کہ وہ اس کو خواب یا التباس نظر بتا کر غیر ذمہ دارانہ طور پر اپنے فرض سے سبکدوشی حاصل کر لیں گے لیکن دوسری طرف مجھے یہ بھی اطمینان ہے کہ خود ان کو اپنی اس رائے پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ وہ خود فریبیوں کے ذریعے سے اپنے اس کرب و اضطراب کو دور کرنا چاہتے ہیں جو تشکیک کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ کیسی مسرت کی بات ہے کہ علم انسانی کی تنگ مائیگی کا پردہ اب فاش ہو رہا ہے۔

افسانہ کو ختم کرتے ہوئے میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ ناہید کی جو تصویر ناصری کے پاس تھی وہ اس مشہور مصور کی صناعی نہیں ہے جس کا نام مجھے بتایا گیا۔ بلکہ جمال کی سحر طرازی ہے جس کا علم میرے سوا کسی کو نہیں۔

ل۔ احمد

بھینٹ

"بھائی آگ تو ترت ٹھنڈی ہووے نا ہے۔ اور آج بنئے نے کھورا کی روک دی ہے۔ اب جتن کیا؟"
بوڑھے مزدور نے بات شروع کی۔

"بابا! کہاں تو بھینٹ لے گی جبھی ٹھنڈی پڑے گی!" ایک مزدور بولا۔

"ہاں، کہاں مجور کا پالن بھی کرے ہے اور وہ کا کال بھی ہے۔ ندی کے سمان اُن داتا بھی ہے اور نگل جانے والا اجگر بھی!" ایک گیانی مزدور نے سمجھایا۔

"وس دنا کی تنکھا بیت گئی!" ایک ضرورت کا مارا بولا۔

"بیتی سو بیت گئی، آگے کی کہو!" بوڑھے نے توجہ دلائی۔

"باباکہی سُن کائے کی۔ باہر بھی مرن بھیتر بھی مرن —— مجوری کائے چھوڑیں!" کان مالک کا ایک گرگا بولا۔

"یا بنیا اتنی جانوں کو موت کے جبڑے میں دے دیوے ہے —— دو چار دنا اور صبر کیتا!" ایک صلح پسند نے رائے ظاہر کی۔

"کیوں بھائی آگ جھینا لگی رہے تو وہ کیسے کہلائے جائے۔ اور پھر یادے کس سے؟" ایک معاملہ فہم مزدور نے کہا۔

"ایسے سمے کہاں مالک کو کھدائی دے چہیئے۔ کھطرے میں کہاں جانوں رکھنے کی مناہی ہے —— مالک ہمنیجر اپنے سوارتھ کے لئے دکھادیں ہیں۔ کہ کھطرہ ناہے۔" ایک اشتراکی خیال والے مزدور نے اپنی معلومات کا ثبوت دیا۔

"سمجھ کی بات کہو بھائی۔ مالکوں پہ مجوروں کا کیا جور!" ایک مایوس تقدیر کے مارے نے دخل دیا۔

"جور کون نا ہے؟ آندولن کرو تو مرکار بھی چیتے" وہ اشتراکی بولا۔

"اور کمیٹی کرنسلوں کے ممبر کون وناکام آویں گے؟" ایک جان کار نے اپنی عقلمندی کا اظہار کیا۔

"ممبر بچارے تو گھنی بھوں بھوں کرلیں ہیں، پہ اِن کا بس کیا ہے؟" ایک دوسرے جان کار نے حقیقت سے پردہ ہٹایا۔

"بھتا تو ماریں ہیں!" اس مایوس نے غصے کے لہجے میں کہا۔

اس پنچایت میں ہر پہلو سے نظر ڈال کر صورت حال کو سمجھا گیا۔ مزدور آگ سے ڈرتے ہیں تو بھوکا مرنا ہی پڑے گا۔ بنیا تیل چاول بند کر کے اتنے مزدوروں کو موت کے منہ میں دھکیل رہا ہے تو اس سے جواب طلب کون کرے؟ مزدوروں کی بھوک اور فاقے کی فکر مالکوں کی جوتی کرے! گورنمنٹ دباؤ سے ہی جیت سکتی ہے۔ وہ ہندوستانیوں کو روٹی دینے تھوڑے ہی آئی ہے! ممبر بھتا مانگتے ہیں تو گلا پھاڑ پھاڑ کر اسے حلال بھی کر لیتے ہیں! یہ ساری باتیں ہوئیں مگر بات جہاں تھی وہیں رہی! مزدور اگر جلتی کان میں نہ اتریں تو کھائیں کہاں سے؟

"تو بھائیو اب پد کیسے بیٹھے؟" بوڑھے نے پنچائت سے پوچھا۔

"بس سویرے کھان میں اترو چلو۔ بچے بوڑھے بھات بنا کر پہنچیں گے تو نا!" کان مالک کا ایجنٹ بھر بولا۔

"بولو بھائیو؟ یا ئی جتن ہے نا؟" بوڑھے نے پنچایت کی رائے لی۔

"ہاں!" "اور کیا!" "ہاں ہاں!" مختلف آوازیں اٹھیں۔

چھوٹے ناگپور کا پہاڑی علاقہ کوئلے کی سرزمین ہے۔ جہاں سینکڑوں کانیں چل رہی اور ہندوستان بھر کے مل، فیکٹریاں، انجن اور ریلیں چلا رہی ہیں۔ راجہ، نوابوں کے محلوں کو روشن اور ٹھنڈا کرنے کے لئے، پیسے والوں کی دولت بڑھانے کے لئے ان کانوں کے اندر ہزارہا مزدور کا لیا ساں بنے کدال پھاوڑا چلاتے رہتے ہیں —— سینکڑوں فٹ زمین کے تلے دن رات پسینہ بہاتے رہتے ہیں۔ کانوں کے قریب ہی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں ہوتی ہیں۔ جن کے اندر نہ تو آدمی سیدھا کھڑا ہو سکتا ہے اور نہ اس میں ایک چارپائی بچھ سکتی ہے۔ مگر مزدور کا ایک کنبہ اس میں زندگی بسر کرتا ہے۔

کان میں آگ لگ اٹھی تھی اور مزدوروں نے جان کے خوف سے کام بند کر دیا تھا۔ منیجر نے بہت کوشش کی اور یقین دلانا چاہا کہ آگ بڑھنے کا خطرہ نہیں، مگر مزدور راضی نہ ہوئے۔ دس روز گذر گئے مگر آگ ٹھنڈی نہ ہوئی۔ کان کے مالکوں کا ہزاروں لاکھوں کا نقصان ہو رہا تھا۔ اور منیجر کی بدنامی تھی۔ مگر مزدور جلتی کان میں کام کرنا نہ چاہتے تھے۔ منیجر نے بقال کو بلا کر حکم دے دیا۔ کہ مزدوروں کو ادھار خوراک نہ دے۔ چنانچہ مزدور جب مودی کے پاس سودا لینے گئے تو اس نے بھوکے آدمیوں کو آٹا دال دینے سے انکار کر دیا۔ اس سے تمام مزدوروں میں ہلچل پڑ گئی اور پنچایت بیٹھی کہ اب کیا ہو؟

پنچایت کے سامنے سوال کی دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں۔ جان کے خوف سے کام چھوڑا، اب کام بند کر دینا جان پر بنا دینا چاہتا ہے! دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ جان بچانا ہے تو جان کو خطرے میں ڈالو!

یہ صورت حال غریبوں ہی کے سامنے آ سکتی ہے، جن کی فریاد نہ انسان سنتا ہے اور نہ خدا کے ہاں سے داد ملتی ہے! اب چونکہ جان دونوں طرح خطرے میں تھی۔ اس لئے ان مزدوروں کے سامنے یہ مصلحت آنا ہی تھی کہ بچوں اور اندھے دھندوں کو مٹھی بھر بھات اس وقت تک پہنچتے رہنا چاہیئے جب تک کان کسی کو نگل نہ لے!

ان مزدوروں میں ایک جھونرا بھی تھا۔ جس نے کام بند ہونے سے چند ہی دن پہلے بدری سے بیاہ کیا تھا۔ بدری کو جھونرا کی جان کا ڈر تھا اس لئے وہ اس کے ساتھ پنچایت میں بھی آئی تھی کہ فیصلہ سنے۔ پنچایت کا یہ فیصلہ کہ مزدوروں کو کان میں اترنا ہے جھونرا کی ان آنکھوں میں جو جوانی کے ولولوں کا گھر اور پریم مدھ کا مٹکا تھیں ایک ایسی نظر پیدا ہو گئی جسے "تن بہ تقدیر" کی نظر کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ اسے بدری سے پیار پریم تھا اور اسے فاقہ گوارا نہ ہو سکتا تھا۔ مگر پنچایت کا فیصلہ سن کر بدری کا دل بیٹھ سا ہو گیا۔

بدری کو کان سے دلی نفرت تھی۔ کان اس کے باپ کو کھا چکی تھی، بھائی کو نگل گئی تھی۔ اور اب پتی کو بھی بھسم کرنا چاہتی تھی! اس لئے بدری کی نفرت کوئی اچنبھے کی بات بھی نہ تھی۔ بلکہ اچنبھا اس پر ہو سکتا تھا کہ اس کی یہ نفرت کوئی عملی صورت کیوں نہ اختیار کر سکی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ بدری اپنی نفرت کو عملی صورت دیتی تو ساتھ ہی فاقے کو بلاوا بھی دیتی۔

بدری کی عمر کا تو سترھواں ہی برس تھا اور شادی ہوئے چند ہی روز گذرے تھے، مگر اچانک شوہر کی جان جوکھوں میں پڑ جانا ایک ایسی تحریک تھی، جس نے اس کی روائتی شرم اور نا تجربہ کاری کی کم عقلی کے باوجود اس کے اندر تحفظ کی جبلت کو پوری طرح جگا دیا تھا ـــــ عورت کی جرأت کو ابھار دیا تھا! اس کے اندر سوچنے سمجھنے کی چٹیک پیدا کر دی تھی!

پنچایت میں پہنچکر یہ دونوں کنارے ہی بیٹھ گئے۔ بدری کو اچانک محسوس ہوا کہ اس کے پیچھے کوئی آکر بیٹھا ہے۔ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا، مگر بدری کی چھٹی حس نے بتا دیا کہ وہ کرما ہے۔

کرما آس پاس کے علاقے میں بڑا چھیلا اور سب سے منچلا جوان مشہور تھا۔ وہ آزاد تھا اور نڈر۔ دنیا جن باتوں پر ایمان رکھتی ہے، یہ نیم وحشی مزدور ان باتوں کا مذاق اڑاتا تھا۔ دنیا جن چیزوں سے ڈرتی ہے، یہ بھجر کا مزدور ان کو انگوٹھا دکھاتا تھا ـــــ غرض وہ کسی کھلی ہا دشکی طاقت اور بل کو دھیان میں نہ لاتا تھا۔ اس کا یہ ناستکی ڈھنگ لوگوں کو ناپسند تھا۔ لیکن لوگ اس پر بھروسہ کر لیتے تھے! دلوں میں اس کی عزت کرتے تھے!

کرما نے دس برس کی عمر سے کان میں کام کرنا شروع کیا۔ اور پورے پندرہ برس لوگوں کو یہ دیکھتے ہو گئے تھے کہ بیسیوں حادثے پیش آئے۔ مگر کرما ہمیشہ بال بال بچ گیا۔ ہر موقعے پر اس نے پرماتما کا منہ چڑایا اور کبھی بال بیکا نہ ہوا! لوگوں کو اس پر اچنبھا بھی بڑا تھا۔

پنچایت میں کرما چپ بیٹھا رہا۔ وہ بات کرتا ہی بہت کم تھا۔ بنئے کی طرف سے اس کے دل میں بڑا غصہ تھا۔ یہ لالچی بنیا اتنی جانوں کو موت کے گڑھے میں دھکیل رہا ہے ـــــ کان بھینٹ ضرور دے گی! کرما بنئے کو قتل کر دینا چاہتا تھا۔ لیکن یہ مزدور تو کان میں اترنے کا فیصلہ کر رہے ہیں! یہ اگر کام پر گئے تو وہ سب سے پہلے جائے گا۔!

بدری کو جب فاقوں سے سابقہ پڑا، تب سے اسے اس شکتی پر جسے پرماتما کہا جاتا ہے خود بھی شک ہو گیا تھا۔ اگرچہ وہ اپنے اس شک کو پاپ سمجھتی تھی۔ اور اس وجہ سے دل میں ڈر بھی تھا۔

اس شکتی پر کرما کو بھی اعتراض تھا، مگر وہ اس کا اظہار کھلے بندوں کرتا تھا۔ اور اس کے دل میں ڈر بالکل نہ تھا۔ بدری جب کرما کے منہ سے ایسی باتیں سنتی تو ایک طرح کی شانتی تو محسوس کرتی، مگر کرما پر کسی آفت آجانے کا یقین بھی رکھتی تھی۔ جب بھی کرما اس کے سامنے آتا، وہ خیال کرتی کہ اب کرما پر بجلی گرنے ہی والی ہے! وہ جس طرح اپنے خیالوں کو پاپ سمجھتی تھی، اس طرح کرما کی باتوں کو بھی پاپ کہہ لیتی تھی۔ کرما کی باتوں کو پاپ کہہ کر شاید وہ اپنے وچاروں کے پاپ کو دھونا چاہتی تھی! دنیا میں ایسے لوگ بہت ہیں جو اپنے گناہوں کو دوسروں کے وضو کی دھوون میں بہا دیتے ہیں۔

پنچایت سے اٹھتے اٹھتے بدری نے منہ ہی منہ میں پرارتھنا کی۔

" بھگوان! کھان میں سے جھونرا جیتا نکل آئے!"

کرما نے اس کی بہت دھیمی آواز کی کھنک سن لی اور زور کا ٹھٹھا مارا۔ اس کا یہ ٹھٹھا بدری کو نرم ہنسی کی طرح محسوس ہوا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ کرما کا یہ ٹھٹھا اور کسی نے نہیں سنا۔ وہ صرف اسی کے سننے کے لئے تھا!

جھونرا نے پوچھا "یہ کیا کہہ رہی ہے؟"

" کچھ نا ——— آگ بھڑکتی ہو، تو کھان میں مت آتر یو" بدری نے جھونزا کی آستین پکڑ کر کہا۔

" کام پہ نہ جاؤں تو نئی دلھنیا بھات کیسے پلسے"؟

" ہم اور کہیں پرم جائیں گے" بدری نے جواب دیا۔

" پردیس؟" جھونزا نے سوال کیا۔

" ہاں محنت مجوری ہر جگہ ملے ہے" بدری بولی۔

اپنی پیاری بیوی کے منہ سے اُمیدوں کے خلاف، جگوں کے چلن کے مخالف بات سُن کر جھونزا کو ایک دھکا سا لگا۔ جھونزا نے بتایا :-

" بدری، ہمارے مات پتا تو کہیں نا ہے تھے"!

" ہاں، وہ تو کہیں نا گئے" بدری نے شرمندہ ہو کر اقرار کیا۔

درخت کی آڑ میں سے پھر وہی قہقہہ سُنائی دیا، جو پہاڑی علاقے کے سناٹے پر چھا گیا۔ کرما پھر سامنے کھڑا تھا۔ مگر بجلی نہ پہلے کبھی گری تھی نہ اس وقت گری۔ مگر یہ ڈر بدری کے دل میں اس وقت بھی تھا۔

کان کے منیجر کو منٹ منٹ کی خبر پہنچتی تھی۔ پیسے والے کی دُور بلا! پنچایت کے فیصلے کی خبر اسی وقت پہنچ گئی۔ اس کے انتظار میں اُسے نیند نہ آ رہی تھی۔ اب وہ پاؤں پھیلا کر سوئیگا۔ مزدور موت کے منہ میں جائیں گے۔ اور اس کی نیک نامی ہو گی!

بہت سویرے کام پہ پہنچنے کی سیٹی بجنے لگی اور جھونپڑوں سے لے کر کان کے دہانے تک مزدوروں کی لنگار لگ گئی۔ لیکن دہانے پہ پہنچ کر سارے مزدور اکٹھا ہوتے گئے۔ حالانکہ بجلی کا جھولا انھیں کان میں لے جانے کے لئے تیار تھا۔ لیکن کوئی مزدور اس پر سوار نہیں ہوا۔ پیٹ کی مار موت کے منہ میں لئے جا رہی ہے۔ مگر بچاؤ کی جبلت پاؤں پکڑے ہوئے ہے!

جھونزا کے ساتھ ساتھ بدری بھی موجود تھی۔ جھونزا کا دامن پکڑے کھڑی تھی۔ بدری کی آنکھیں چاروں طرف کسی کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔ دُور سے کرما آتا دکھائی دیا تو بدری کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔ وہ سب سے پیچھا پہنچا اور بھیڑ کو چیرتا ہوا جھولے پر جا چڑھا۔ اس کے پیچھے بدری نے جھونزا کو بھی سوار کرا دیا۔ پھر تو سب جانے لگے۔

جھولا جب نیچے اُترنے لگا تو کرما نے بدری کے چکنے گالوں پر آنسو ڈھلکتے دیکھے۔ کرما شاید ان آنسوؤں کی زبان سمجھتا تھا :-

" پریم ہے تو میرے پتی کا دھیان رکھنا"!

دن بھر میں بدری نے کان کے دہانے تک کئی چکر کاٹ ڈالے۔ ڈرتی ڈرتی جاتی اور جب وہاں کسی ہلچل کے آثار نہ دیکھتی تو مطمئن ہو کر پلٹ آتی۔ شام کو چھٹی کی سیٹی بجی تو بدری دہانے پہ پہنچ چکی تھی۔ کرما اور جھونزا پہلے ہی جھولے سے اُترے۔ بدری کا چہرہ کلی کی طرح کھل گیا۔ کرما نے اپنا مستقل ٹھٹھا پھر لگایا۔ بدری بھی اس کے ٹھٹھے کا مطلب سمجھتی تھی :-

" تجھے پریم شکتی پہ بھروسا نہیں ——— سنبھال اپنے پتی کو"!

جھولے سے اُتر اُتر کر مزدور مودی کی دکان پہ پہنچے۔ تیل، چاول لے کر خوشی خوشی گھر جانے لگے۔ بدری نے بھی سودا لیا اور جھونزا کے ساتھ جھونپڑی میں پہنچی۔ کھانا پکایا اور پھر ٹاٹ بچھا کر دونوں سو گئے۔ بدری کو فوراً نیند آ گئی۔ مگر جھونزا کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بدری کے، کرما کے، اور کان کے دھیان میں جاگتا رہا۔ ایکا ایکی بدری چونک پڑی۔

" کیا ہوا؟" جھونزا نے پوچھا۔

"ڈراؤنا سپنا دیکھا!" بدری نے جواب میں بتایا۔

"کیا سپنا؟"

"کچھونا!"

"اچھا سوجا ــــــ تنکی کے دنا بجار ساتھ چلیو۔ تجھے وہ نیلا کنٹھا دلا دوں گا۔ جو اُس دن کرما کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔ نیلے موتیوں پر تیرا من بڑا للچایا تھا۔"

"وہ کنٹھا بڑا سندر تھا!" بدری نے اٹھلاتی ہوئی آواز میں کہا۔

دونوں سو گئے اور حسب معمول منہ اندھیرے سیٹی بجی۔ سارے مزدور کان میں پھر آتے گئے۔ کرما سب سے پہلے پہنچ گیا تھا، مگر جھولے کے پاس کھڑا رہا۔ بدری اور جھونرا سب سے پیچھے پہنچے۔ جھونرا نے جھولے کی طرف بڑھتے ہوئے کرما سے پوچھا۔

"آج کام نہ کریگا؟"

"آج تو جرور کرنے!" کرما نے جواب دیا اور سوچتا ہوا جھولے پر چڑھ گیا۔

بدری کھڑی دیکھتی رہی۔ اُس وقت کرما نے کوئی ٹھٹھا نہ لگایا۔ وہ بس بدری کی طرف دیکھتا ہوا کان میں اُتر گیا۔ بدری گھر کو پلٹ گئی۔

رات میں کام کرنے والے واپس آچکے تھے۔ بدری وہاں سے گذری تو ان مزدوروں کی باتیں سُنیں جو جھونپڑیوں کے سامنے درختوں کی چھاؤں لیٹے بیٹھے بیڑی پی پلا رہے تھے۔

"بھائی رات آگ کا بڑا جور رہا۔ کہاں بھینٹ جرور لے گی!" ایک بولا۔

"میں نے کرما کو جتا تو دیا ہے ــــــ"

"اونہو نہہ! کرما سب جانے ہے ــــــ کرما اور کہاں تو مرتے ہیں!"

یہ سُن کر بدری دل میں خوش ہوئی۔ کرما کے متعلق اس کا بھی خیال کچھ ایسا ہی تھا۔

دوپہر نہ ہونے پائی تھی۔ کہ خطرے کی سیٹی بجنے لگی۔ مزدوروں کی بستی میں ہلچل پڑ گئی۔ بوڑھے، بچے، عورت، مرد نکل نکل کر کان کے دہانے پر جمع ہونے لگے۔ ہائے والے کا شور مچ گیا۔ سخت افراتفری پڑی ہوئی تھی۔

سیٹی کی آواز کے ساتھ بدری کی جان سی نکل گئی۔ وہ جہاں تھی، بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ ایک سناٹا تھا اور دُنیا تیزی سے گھومے جا رہی تھی۔ سب طرف بھگدڑ اور ہنگامہ تھا۔ لیکن بدری کے دل میں سناٹا اور بے صبری تھی۔

اس حالت میں وہ نہ معلوم کتنی دیر بیٹھی رہی۔ اچانک جھونپڑی کے باہر کسی کی چاپ سُنائی دی اور اس چاپ کی آواز نے بدری کو ایک دُنیا سے دوسری دُنیا میں پہنچا دیا۔ بدری کے منہ سے بے ارادہ نکلا۔

"کرما!"

اس کے جواب میں جھونرا جھونپڑی میں داخل ہوا۔

"کرما نہیں، میں ہوں!"

"کرما کہاں ہے؟"

"کرما؟ وہ تو مر گیا!"

" مر گیا؟ نہیں، کرما نہیں مریگا!"

" جلتے جلتے سرنگ پھوٹ گئی اور آگ پھیلی تو سارے میں دُھواں بھر گیا۔ میں بھاگا —— کچھ نا کدھر سے کرما میرے پیچھے پیچھے تھا۔ دُھوئیں سے مجھے مرچھا آگیا تو کرما اُٹھا کر دوسری سرنگ میں لے گیا۔ وہاں دھواں نا تھا۔ پر وہ بھی بہت دھواں کھا گیا تھا۔ بےہوش ہو گیا ڈاکٹر آیا تو دوا دارو سے میں تو اچھا ہو گیا۔ پر کرما —— کرما مر گیا!"

" نہیں، کرما نہیں مریگا!" بدری نے چیخ کر کہا۔

" کرما کے کھیسے سے یا کنٹھا نکلا تھا۔ تیرے کارن لایا ہوگا —— کرما کو تیرے ساتھ پریم تھا!"

بدری نے جھپٹ کر وہ کنٹھا جھونرا کے ہاتھ سے لے لیا۔ اور کنٹھے سے باتیں کرنے لگی۔

" پریم کی مالا! کرما مر گیا؟ نہیں، کرما نہیں مریگا!"

میرے ایک عزیز ریلوے میں ڈاکٹر ہیں۔ میں ان سے ملنے بکارو گیا تھا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ریلوے کی کوئلے کی کانیں ہیں۔ وہ ہسپتال گئے تھے۔ اور میں بنگلے کے برآمدے میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ ایک آواز نے مجھے متوجہ کر لیا:-

" کرما مر گیا؟ کرما نہیں مریگا!"

میں نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو ایک خستہ حال جوان عورت بار بار یہی کہہ رہی تھی۔ پھر ڈاکٹر صاحب کے چوکیدار نے خموش محبت کی خموش قربانی کی یہ عجیب و غریب داستان سُنائی۔

چودھری محمد علی ردولوی

تیسری جنس

مدی کا اصلی نام احمدی خانم ہے۔ تحصیلدار صاحب پیار سے مدی مدی کہتے تھے۔ وہی مشہور ہو گیا۔ مدی کا رنگ بنگال میں سو دو سو میں اور ہمارے صوبہ میں ہزار دو ہزار میں ایک تھا۔ جس طرح فیروزے کا رنگ مختلف روشنیوں میں بدلا کرتا ہے اسی طرح مدی کا رنگ تھا۔ تھی تو کھلتی ہوئی سانولی رنگت جس کو سبزہ کہتے ہیں۔ مگر مختلف رنگ کے دوپٹوں یا ساڑھیوں کے ساتھ مختلف رنگ پیدا ہوتا تھا۔ کسی رنگ کے ساتھ دمک اٹھتا تھا۔ کسی رنگ کے ساتھ تمتماہٹ پیدا کرتا تھا۔ بعض اوقات جلد کی زردی میں سبزی ایسی جھلکتی تھی کہ دل چاہتا تھا۔ دیکھا ہی کرے۔ شمع کی روشنی میں مدی کی رنگت غضب ہی ڈھاتی تھی۔ کبھی آپ نے دوسرے درجے کے مدقوق کو دیکھا ہے۔ اگر بیماری سے قطع نظر کیجئے تو رنگت کی نزاکت ویسے ہی تھی۔ آنکھیں بڑی نہ تھیں۔ مگر جب نگاہ نیچے سے اوپر کرتی تھی تو واہ واہ معلوم ہوتا تھا مندر کا دروازہ کھل گیا۔ دیبی جی کے درشن ہو گئے۔ مسکراہٹ میں نہ شوخی نہ شرارت، نہ ہونٹ کی شرم، نہ لبھاوٹ کی کوشش۔ لکڑی لوہے کے قلم کو کیسے موقلم کر دوں کہ آپ کے سامنے وہ مسکراہٹ آجائے۔

بس یہ سمجھ لیجئے کہ خدا نے جیسی مسکراہٹ اس کے لئے تجویز کی تھی وہی تھی۔ مدی اپنی طرف سے اس میں کوئی اضافہ نہیں کرتی تھی۔ اس کے کسی انداز میں بناوٹ نہ تھی۔ ہاتھ پاؤں، قد، چہرے کے اعضا سب چھوٹے چھوٹے مگر واہ رے تناسب۔ آواز ہنسی، چال ڈھال ہر چیز ویسی ہی۔ میں مدی سے بہت بے تکلف ہوں۔ مگر عشاق میں کبھی نہ تھا۔ اور جہاں تک میں جانتا ہوں کوئی اور بھی نہیں سنا گیا۔ ایسی خوبصورت عورت بلا مرد کی حفاظت کے زندگی بسر کرے اور عشاق نہ ہوں۔ بڑے تعجب کی بات ہے۔ مگر واقعہ ہے۔ ایک میں نے کہا مدی اگر ہم جادوگر ہوتے تو جادو کے زور سے تم کو تتلی بنا کر ایک چھوٹی سی ڈبیا میں بند کر کے اپنی پگڑی میں رکھ لیتے اس فن شریف سے واقف کار حضرات جانتے ہیں کہ جو حربہ میں نے استعمال کیا تھا وہ کم خالی جانے والا تھا۔ مگر اس کے بھی جواب میں وہی بے تکلف مسکراہٹ کی ڈھال جو تلوار کا منہ توڑ دے۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں!

اکثر خیال گذرتا ہے کہ یہ استغنا تحصیلدار مرحوم کی سفید داڑھی کے سایہ میں پرورش پانے کا اثر ہے مگر پھر عقل کہتی تھی کہ جوشِ حیات نے نہ معلوم کتنی سفید داڑھیوں میں پھونکا ڈالا ہے۔ وہ سفید داڑھی قبر میں بھی پہنچ گئی اس کا اثر کہاں سے آیا۔ بہرحال قصہ سنتے جائیے اور رفتہ رفتہ رائے قائم کرتے جائیے۔ مدی کے ہر انداز میں نسوانیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ایک بات البتہ تھی۔ جو گو عورتوں میں بھی ہوتی ہے۔ مگر ہم ایسے بورژوا لوگ اس کو مردوں ہی سے منسوب کرتے ہیں یعنی اپنے ہم طبقہ عورتوں میں اور اسی طبقے کے مردوں میں مدی حکومت خوب کر لیتی تھیں۔ ہر شخص عورت ہو کہ مرد ان کا تابع فرمان رہتا تھا۔ اور ان کے اشارے پر چلنے کو تیار۔ اب شروع سے قصہ سنئے۔ تحصیلدار صاحب کا نام کیا کیجئے گا جان کر مرحوم بڑے اچھے آدمی تھے۔ مگر بے عیب خدا کی ذات۔ کچھ خاص خاص کمزوریاں کہی جاتی تھیں۔ پرانی وضع کے لوگ تھے۔ بڑی شان سے تحصیلداری کی۔ لاکھوں کمائے اور ہزاروں اُڑائے، مگر اولاد نہ ہونے کی وجہ سے ان کی زندگی کچھ بے مرکز سی ہو گئی تھی۔ بی بی بہت دن ہوئے مر چکی تھی۔ کوئی قریب کا عزیز بھی نہ تھا۔ صرف ایک نوکر تھا وہی سیاہ سپید کا مالک تھا۔ تنخواہ اسی کے ہاتھ آتی تھی اور جب پنشن ہوئی تو پنشن کا بھی وہی حق دار ٹھیرا۔ میاں کے کپڑے اور کھانا بھی میاں حسن علی ہی پسند کرتے تھے۔ حسن علی کسی کام کو بازار گئے۔ دو تھان رادھا نگری ڈوریئے کے لئے چلے آتے ہیں۔ میاں کے کرتے بنیں گے مگر میاں کو اس وقت خبر ہوئی کہ جب درزی قطع کرنے لگا۔

"ارے میاں حسن علی یہ ڈوریہ کیا لائے ہو؟"

حسن علی: "آپ کے کرتوں کے لئے۔ ڈوریہ وضعدار ہے۔ سلنے پر اور کھلے گا۔"

"کھلے گا تو مگر کرتے تو میرے پاس تھے۔ ابھی اس دن شربتی لے آئے۔ آج ڈوریہ لئے چلے آتے ہیں آخر پوچھ تو لیا ہوتا۔"

"پوچھ کے کیا کرتا۔ آپ یہی تو کہتے کہ وہ پہنے دو گھر میں ایک چیز ہو گئی۔ برسات کا زمانہ ہے۔ دھوبی دیر میں آیا کرے گا۔ دو جوڑے فاضل اچھے ہوتے ہیں۔"

خیر بھئی!"

تحصیلدار کھانے پر بیٹھے ہیں۔ "میاں حسن علی آج کل بازار میں مچھلی نہیں آتی۔"

"آتی تو ہے مگر گرمیوں کی وجہ سے میں نے نہیں منگوائی۔ اس فصل میں مچھلی نقصان کرتی ہے صبح کو مرغ پک جائے گا۔" تحصیلدار صاحب پر حسن علی کی شخصیت ایسی غالب آئی تھی کہ جو بات وہ پسند کرتے تھے۔ تحصیلدار سمجھتے تھے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ اسی وجہ سے غیر ذمہ دار لوگ دونوں کا ذکر کر کے مسکراتے تھے۔ اور آپس میں آنکھیں مارتے تھے۔ میاں حسن علی کا استرے سے صفاچٹ چہرہ اور تحصیلدار صاحب کی بھبوت داڑھی پر چہ میگوئیاں ہوتی تھیں۔ داڑھی مونچھوں کا صفایا صرف انگریزی داں حضرات کا حق ہے۔ اگر حسن علی ایسے اپنی چال چھوڑ کر ہنس کی چال چلیں گے۔ تو اللہ ہی نے کہا ہے۔ لوگ کوئی نہ کوئی نئی نکالیں گے۔

بہرحال اصلیت کی خبر خدا کو ہے۔ ہم تو جو کچھ بھی دیکھتے تھے۔ وہ یہ تھا۔ کہ تحصیلدار کا ہمدرد دنیا جہان میں حسن علی کے علاوہ کوئی نہ تھا حسن علی کو بھی اس سے اچھا آقا اگر چراغ لے کے ڈھونڈتے تو نہ ملتا۔

اللہ میاں نے دو جنسیں بنائی تھیں۔ عورت اور مرد۔ یورپ کے ڈاکٹروں نے تحقیقات کر کے ایک اور جنس ایجاد کی ہے جو اپنے ہی جنس کی طرف راغب ہو۔ اس جنس میں عورتیں بھی شامل ہیں اور مرد بھی۔ اب نہ معلوم تحصیلدار اور حسن علی اس تیسری جنس میں سے تھے یا ویسے ہی تھے جیسے ہم آپ یا ان کو کچھ اول بدل ہوتی۔ اس کو نہ ہم جانتے ہیں نہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ جانیں اور ان کا کام۔ بظاہر ان دونوں کے افعال سے دوسروں کی سماجی زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس لئے ہم کو کھوج کی کوئی ضرورت بھی نہیں معلوم ہوتی۔ تحصیلدار صاحب بھاری بھرکم آدمی تھے۔ اولاد نہ ہونے کا دکھڑا کیا روتے مگر اولاد کی تمنا اس بات سے ظاہر ہوتی تھی کہ جب کھانا کھاتے۔ تو حسن علی احمدی کو بلوا

بیٹھتے تھے کہ دسترخوان پر بیٹھ جائے۔ اسی وجہ سے کھانا تنہائی میں کھانے لگے تھے۔ نوکر کی لڑکی کو دسترخوان پر کھلانے کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کے علاوہ اگر سب کے سامنے کھلاتے تو صاحبِ اولاد نہ ہونے کا رنج اور بچوں کی تمنا لوگوں پر کھل جاتی۔ بی احمدی خانم عرف مدی بیگم کا سن چار برس کا رہا ہوگا۔ دسترخوان پر شور بگرانا۔ لقمہ ڈبونے میں دال کا پورا پیالہ گھنگول دینا بچوں کا شیوہ ہے۔ اور نفیس لوگ اسی وجہ سے بچوں کو الگ کھلاتے ہیں۔ گو کہتے یہی ہیں کہ جوانوں والا کھانا بچوں کو نقصان کرتا ہے۔ مگر تحصیلدار صاحب کو اس میں لطف آتا تھا۔ ادھر دسترخوان پر بیٹھے اور ادھر بی مدی کی طلب ہوئی۔ رفتہ رفتہ مدی خود وقت پہچان گئیں۔ تھوڑے دنوں میں مدی تحصیلدار صاحب ہی کے یہاں رہنے لگتیں۔ یا تو گھر میں ایک طرف چھوٹا بھیا اور بیچ میں حسن علی کی بی بی تھیں یا ان کی پلنگڑی الگ بنی۔ صاف چادر لگائی گئی۔ چھوٹے چھوٹے تکیے بنوا لئے گئے۔ تحصیلدار صاحب کے پاس ان کی بھی پلنگڑی بچھنے لگی۔ جوتے پہننے رہنے کی تقید ہوئی کہ بچھونا میلا نہ ہو۔ لڑکی تھی پیدائشی سلیقہ مند۔ ایک بار سے دوسری یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ پانچ چھ ہی برس کے سن میں ایسا سلیقہ آگیا کہ آدھی بی بی معلوم ہوتی تھیں۔ تحصیلدار صاحب کے پان خود بناتی تھی۔ دس گیارہ برس کے سن میں جنس تلوانا۔ کھانا پکوانا۔ سب کچھ مدی کے ہاتھ ہو گیا تھا۔ دن جاتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ چودھویں برس مدی کا شباب دمک اٹھا۔ دیکھنے والوں کا دل چاہتا کہ دیکھا ہی کریں۔ مدی بھی جب بال بنانے کھڑی ہوتی تھیں تو آئینہ کے ساتھ خود بھی متحیر رہ جاتی تھیں۔ اب ماں کو شادی کی فکر ہوئی۔ تحصیلدار صاحب کو کہا گیا۔ انہوں نے کہا جلدی کیا ہے ہو جائے گی۔ مگر لڑکی حسن علی کے بھتیجے کو بچپن ہی سے مانگی تھی۔ ادھر سے بھی اصرار ہوا کہ جوان لڑکی کا امیروں کے گھر میں رہنا اچھا نہیں۔ بھتیجے صاحب شادی ہو گئی۔ تحصیلدار صاحب نے خود تو اپنے گھر سے شادی نہیں کی مگر جہیز وغیرہ خوب سا دیا۔ چوتھی چالے کے بعد پھر وہی تحصیلدار صاحب کے یہاں کا رہنا۔ مدی کے دولہا بھی تحصیلدار ہی صاحب کے یہاں آتے تھے۔ مدی سسرال کم جاتی تھی۔ گئیں بھی تو کھڑی سواری۔ بہت رہیں تو ایک رات نہیں تو اسی دن واپس آگئیں۔ سسرال والے جاہل، شوہر بھی الف کے نام لٹھا نہیں جانتے۔ گو مدی بھی بغدادی قاعدہ اور عم کے سیپارے کے آگے نہیں پڑھی تھیں۔ مگر پھر بھی پڑھے لکھے ہوئے کی پالی ہوئی تھی۔ عمر بھر امیری کا رخانہ دیکھا تھا۔ مدی کا دل سسرال میں کم لگتا تھا۔ کمسنی میں بیاہ کا تجربہ کچھ اچنبھے میں ڈالے تھا۔ شادی کے بعد اگر عورت پنتوا پنے کی آب نہیں رہ جاتی تو سہاگ کی رونق چہرہ چمکا دیتی ہے۔ مگر احمدی کے چہرہ نہ اسی بات کا پتہ چلتا تھا نہ اسی کا۔ میاں بیوی کے برتاؤ کا حال دو چار دن میں کیا کھلتا۔ مگر کسی خاص خوشی یا اطمینان کا انداز اس میں بھی نہیں دکھائی دیتا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں یہ بھی نہ رہ گیا اور کھلم کھلا ناخوشی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ شوہر صاحب کچھ دبے دبے سے تھے۔ تحصیلدار صاحب کے یہاں اگر وہ بھی اپنی شوہریت کا برتہ و رجہ برت نہیں سکتے تھے۔ خود اپنی ہیچ میرزی اور بی بی کی بلندی ان کی نظر میں کھٹکتی تھی۔ ضرورتیں مجبور کرتی تھیں۔ نئی نئی بی بی کچھ روپیہ پیسہ بھی ہاتھ آجاتا تھا۔ اس لئے چپ تھے، ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ مدی جو سو کر اٹھیں تو ایک جھمکا غائب۔ بستر پر ادھر ادھر دیکھا۔ دلائی جھاڑی۔ پائنتی جھک کے دیکھا۔ گھر میں ادھر ادھر تلاش کیا مگر کہیں نہ ملا۔ نہ معلوم کیا سمجھ کر چپ ہو گئیں۔ دوپہر کے قریب ماں سے ذکر کیا۔ ماں نے شور مچا دیا۔ تحصیلدار صاحب تک خبر ہوئی۔ انھوں نے سنتے ہی کہہ دیا کہ یہ حرکت سوائے مدی کے دولہا کے اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی کہا کہ اس کے جوا کھیلنے کی خبر بھی مجھ تک پہنچ چکی ہے۔ بھتیجے صاحب شوہر بھی روٹھ گئے۔ دو چار دن کے بعد رخصتی کا اصرار ہوا۔ مگر جھمکے والی بات پکڑ کر مدی کے ماں باپ نے انکار کر دیا۔ ایک روز مدی کے شوہر نے حسن علی کے گھر آکر بہت سخت سست سنایا۔ اور غصہ میں یہ بھی کہا کہ حرام زادی کو جھونٹے پکڑ کر گھسیٹا نہ لے جاؤں تب ہی کہنا۔ اس وقت تک مدی نے کسی کی جنبہ داری نہیں کی تھی۔ لیکن اب وہ بھی فرنٹ ہو گئی۔ اور ایسی فرنٹ ہوئی کہ مرتے دم تک پھر منہ نہ دیکھا۔ حسن علی نے بھی خیال کیا۔ داماد ممکن ہے کچھ شہدہ پن ہی کر بیٹھے اس لئے مدی کا پورے طور سے تحصیلدار ہی صاحب کے یہاں رہنا اچھا ہے۔ شوہر صاحب ہمیشہ کے لئے معطل کر دیئے گئے۔

جب سے مدی کی شادی ہو گئی تھی۔ تحصیلدار صاحب کچھ چپ سے رہتے تھے۔ اس واقعہ کے بعد وہ بھی بحال ہو گئے۔ مدی کے شوہر نے اپنی

سفاہت سے یہ بھی کہا کہ تحصیلدار صاحب نے اس سے آشنائی کر رکھی ہے۔ مگر اس کو کون باور کرتا۔ حسن علی والی بات پر تو لوگ ہنسی مذاق بھی کرتے تھے۔ مگر اس بات کو کسی نے جھوٹوں بھی یقین نہ کیا۔ البتہ تحصیلدار صاحب تجربہ کار آدمی تھے۔ انھوں نے موت زندگی کا خیال کر کے مدی کے لئے علیحدہ گھر اور کچھ بود و باش کا انتظام کرنا شروع کیا۔ اس واقعہ کے دوسرے سال کے اندر تحصیلدار صاحب کا انتقال ہو گیا۔ تحصیلدار صاحب مرحوم کے یا تو کوئی نہیں تھا یا یکبارگی نہ معلوم کتنے وارث پیدا ہو گئے۔ اور آپس میں مقدمہ بازی شروع ہو گئی۔ بی مدی نے بھاری پتھر چوم کے چھوڑا۔ اٹھ کر اپنے گھر چلی آئیں۔ تخت، چارپائیوں، الماریوں پر نہ ان کا حق تھا نہ انھوں نے دعویٰ کیا۔ نقد جو کچھ تحصیلدار صاحب ان کو دے گئے ہوں وہ کون لے سکتا تھا۔ ہاتھ ناک گلے میں جو کچھ تھا وہ ان کا تھا ہی۔ مدی نے حسن علی کی صلاح سے یہ طریق اختیار کیا کہ اپنی طبقے سے اونچی ہو کر رہنا پسند نہ کیا بلکہ جس حیثیت کے لوگ ان کے ماں باپ تھے اسی برادری میں رہیں۔ البتہ روپیہ پیسہ اور سلیقہ ہونے کی وجہ سے اپنے طبقے میں یوں ہیں جیسے مالی کی نگاہ میں سب پھولوں میں گلاب کا پھول ہوتا ہے۔

تحصیلدار صاحب کے سال ہی بھر بعد طاعون بڑے زوروں کا پڑا۔ اس میں میاں حسن علی اور ان کی بی بی بھی چل بسیں۔ اب صرف بی مدی اور اُن کا چھوٹا بھائی رہ گئے۔

اس وقت تک مدی نے جو کچھ اچھا بُرا کیا ہو گا اُس کی ذمہ داری صرف ان کے اُوپر نہ تھی۔ کیونکہ ہر معاملہ میں تحصیلدار مرحوم اور اس سے کم درجہ تک ان کے باپ کی رائے شامل رہتی تھی۔ اس کے بعد جو کچھ پیش آیا۔ وہ البتہ ان کے دل و دماغ کا نتیجہ تھا۔ مدی کا برتاؤ ہر شخص سے عمدہ تھا۔ کوئی شاکی نہ تھا بلکہ اڑوس پڑوس کی عورتیں ہر وقت ان کے گھر میں موجود رہتی تھیں۔ ان سے بھی جو ہو سکتا تھا آنے جانے والیوں کے ساتھ سلوک کرتی تھیں۔ گھر میں کپڑا سینے کی مشین تھی۔ دن بھر لوگوں کے کپڑے مفت سیا کرتی تھی۔ کسی کو اگر روپے دو روپے کی ضرورت ہوتی وہ بھی قرض کے نام سے دے دیتے۔ جس کسی کا کہیں ٹھکانا نہ لگے وہ مدی کے یہاں چلا آتے۔ روٹی اپنی پکائے وال بی مدی سے لے لے۔ پان پتا بھی بی مدی کے پاندان سے کھاتے۔ اسی زمانہ میں ایک عورت نہ معلوم کہاں کی باہر سے آئی۔ اس کو بھی مدی نے رکھ لیا۔ عورت سلیقہ مند تھی۔ اپنا بار بھی ان پر نہیں ڈالتی تھی۔ بلکہ پیسے دو پیسے کا سلوک خود ہی کر دیتی تھی۔ کچھ انگوٹھیاں، کچھ کنگھیاں، لیس، صابون وغیرہ بیچتی تھیں۔ صبح ہوتی اور برقع اوڑھ کر نکل گئیں۔ دوپہر کو آئیں۔ کھانا کھایا، آرام کیا، اس کے بعد پھر نکل گئیں۔ شام کو لوٹیں۔ یہ مسماۃ آئی تھیں تو یہ کہہ کر کہ دو چار دن میں سودا کر کے دوسری جگہ چلی جائیں گی۔ مگر مدی سے کچھ ایسی پرکت ملی کہ گھر کی طرح رہنے لگیں۔ محبت و یگانگی کی وہ پینگیں بڑھیں۔ کہ سگی بہنیں مات تھیں۔ صورت شکل کی تو معمولی تھیں مگر قد کشیدہ تھا۔ جب برقع اوڑھ کر راستہ چلتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ مرد بھیس بدلے ہوئے چلا آتا ہے۔ چال ڈھال قد کے علاوہ بھی کچھ اور باتیں مردوں کی ایسی تھیں۔ مثلاً ہاتھ پاؤں کے دیکھتے سینہ کم تھا۔ کمر، کولھے، پاؤں کی چوڑی چوڑی ایڑیاں بھی عورتوں کی ایسی نہ تھیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں یہ ہو گیا کہ دن کو ویسا ہی مجمع رہتا تھا مگر رات کو دوسری عورتیں کم رہنے لگیں۔ عجب منہ نہیں پایا تو پرائے گھر میں کیسے ٹھہرتیں۔ پہلے تو عورتوں میں سرگوشیاں ہوئیں پھر محلے میں ہر شخص اسی کا ذکر کرنے لگا۔ مگر مدی اور اس عورت نے بجائے تردید کرنے کے ایک آزادانہ بے پروائی کا انداز اختیار کر لیا۔ اس عورت نے کہا ہم لوگ کسی کی بہو بیٹی ہیں یا ہم سے نکاح کرنا ہے جو ہر شخص کے آگے قسمیں کھاتے قرآن اٹھاتے پھریں۔ دنیا اپنی راہ ہم اپنی راہ۔ مدی نے کہا اگر ہمارے کوئی والی وارث ہوتا تو کسی کی مجال پڑی تھی کہ ایسی بات کہتا۔ زمانہ گزرتا گیا اور لوگوں کا شک یقین سے بدلتا گیا۔ قاعدہ ہے کہ پنچ برادری سے اگر دب جاؤ تو وہ اور دباتے ہیں۔ اگر مقابلہ پر تیار ہو جاؤ تو لوگ اپنی نیکی کی وجہ سے اکثر معاف بھی کر دیتے ہیں۔ یہی حال ان دونوں کا ہوا کہ نہ کسی نے پوچھ گچھ کی نہ انھوں نے انکار کی زحمت اٹھائی۔

لکھنے والے کو اغلام مساحقے کے ذکر میں کوئی مزا نہیں آتا۔ مگر اسی کے ساتھ ان چیزوں کا ذکر کرنے سے ڈرتا بھی نہیں۔ اگر یہ چیزیں دنیا میں ہوتی ہیں تو چپ رہنے سے ان میں اصلاح نہ ہو گی۔ نہ یہ طے ہو سکے گا کہ کہاں تک یہ چیزیں فطری ہیں۔ اور کہاں تک اسباب زمانہ سے پیش آتی ہیں

کسی جولاہے کے پاؤں میں تیر لگا تھا۔ خون بہتا جاتا تھا۔ مگر دعائیں مانگ رہا تھا کہ اللہ کرے جھوٹ ہو۔

ہمارے قصبے کے لوگ دراصل ہیولاک ایلس اور فرائڈ نہیں پڑھے ہیں۔ اس وجہ سے مجبوراً ہمیں ان مسائل پر بحث کرنا پڑی۔

ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ عورت میں کچھ جزو مرد کا ہوتا ہے اور ہر مرد میں کچھ جزو عورت کا۔ جو جزو غالب ہوتا ہے۔ اسی طرح کے خیالات اور افعال ہوتے ہیں۔ مردانہ قسم کی عورتیں اور زنانہ قسم کے مرد ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ ممکن ہے بعض ان میں ایسے ہوں جو کو فطرتاً اپنے ہی جنس سے تعلقات اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر اس میں بھی کلام نہیں کہ اسباب زمانہ سے بھی لوگ اس راہ لگ جاتے ہیں۔ بجائے اصلاح کی کوشش کے ہر معاملے میں بھی رائے قائم کرنا کہ یہ قدرتی تقاضا سے ہے اور اس لئے اصلاح کی ضرورت نہیں ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ البتہ ایسے فعل کی جس میں سماج کا کوئی نقصان نہ ہوتا ہو تو قانونی سزا ہونی چاہئے یا نہیں یہ دوسرا مسئلہ ہے۔

اچھا اب قصہ سنئے۔ مدی اور اس عورت سے دو سال دوستی رہی۔ اس کے بعد لڑائی ہو گئی۔ کس بات پر بگاڑ ہو گیا یہ کسی کو معلوم نہیں وہ عورت جس راہ آئی تھی۔ اسی راہ چلی گئی۔ بی مدی اجڑی پچھڑی رنڈاپا کھینے لگیں۔ جو شندہ پابندہ۔ تھوڑے دنوں کے بعد ایک اور ہم جنس مل گئیں اس کے بعد اور بھی ملاکیں مگر ؎

نہ بے وفائی کا ڈر تھا نہ غم جدائی کا
مزا میں کہوں آغاز آشنائی کا

وہ پہلی سی بات پھر نہ نصیب ہوئی۔ اب روپیہ پیسہ بھی کم رہ گیا تھا اسی لئے آمدنی بڑھانے کی بھی فکر دامن گیر ہوئی۔ بی مدی نے تھیلا کے آگے ہاتھ بڑھایا نہ پھر سے شادی کی ہوس کی۔ بلکہ خود کام کرنے پر تیار ہو گئیں۔ پراٹھے کباب بنانا شروع کئے، جاڑوں کی فصل میں انڈے اور گاجر کا حلوا بنانے لگیں۔ کچھ عورتوں کی ضروریات کا بساط خانہ بھی منگوا لیا۔ چکن کروشیا کا بھی ڈھیر ڈالا بیچنے والوں کی کمی نہ تھی۔ ارد گرد کی لڑکیاں اور عورتیں سودا بیچ لاتی تھیں۔ اور حق المحنت سے زیادہ حصہ پاتی تھیں۔ بی مدی کو سوداگری کا سب سے بڑا گر نہیں یاد تھا۔ یعنی جو آدمی بہت سے کام ساتھ ہی کرتا ہے وہ کوئی کام نہیں کر سکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خرچ آمدنی سے زیادہ ہی رہا۔ یہاں تک کہ مکان بھی گروی رکھنا پڑا۔

روپیہ جانے کے بعد توقیر میں بھی فرق آجاتا ہے۔ مگر اس کی شائستگی اور رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ پھر بھی لوگوں کی نظر میں ہلکی نہ ہوئی۔ کپڑے اب بھی سلیقہ کے پہنتی تھی۔ گاڑھا یہ وہ کبھی نہیں تھا۔ آج بھی سڑک پر ماری ماری نہیں پھرتی تھی۔ تنخواہ والے نوکر کبھی نہیں رکھتے۔ آج بھی کام کاج کرنے والے آسانی سے مل جاتے تھے۔ مگر اقبال مندی میں گھن بہت دنوں سے لگ چکا تھا۔ اس لئے چہرے کی آب رخصت ہو چکی تھی۔ زمانہ بدل جانے سے مزاج میں بھی فرق آگیا تھا۔ ایک دن ان کے گھر میں کئی عورتیں جمع تھیں کسی نے کہا "فلاں مرد کی عورت کس گنتی شمار میں ہے" بی مدی بول اٹھیں۔ "سچ کہتی ہو بہن" ایسی بات ان کے منہ سے کبھی نہیں سنی گئی تھی۔ یہ سن کر بعض نے دوسروں کو اشارہ کیا۔ بعض نے اتفاق کیا۔ دو ایک ایسی بھی تھیں جو مدی کا منہ تعجب سے دیکھنے لگیں۔ یہ وہ تھیں جنہوں نے مدی کے منہ سے مرد کا نام بلا ناک بھوں چڑھائے عمر میں نہیں سنا تھا۔

زمانہ گذرتا گیا۔ مگر بی مدی کے دن نہ پھرنا تھے نہ پھرے۔ کچھ دنوں بعد ایک شاہ صاحب آئے۔ بہت مرجع خلائق تھے۔ عقیدتمندوں کا ہجوم ہر وقت لگا رہتا تھا۔ بی مدی بھی دو تین بار کباب پراٹھے کی نذر نیاز پیش کر چکی تھیں۔ اتنے میں خبر اڑی کہ شاہ صاحب حج کو جائیں گے ہمیشہ مرغ پلاؤ توکل پر کھایا کئے۔ اب حج بھی توکل پر کریں گے جس دن شاہ صاحب چلے لوگوں نے دیکھا مدی بھی دامن سے لگی چلی جا رہی ہیں۔ اور لوگوں سے کہا سنا معاف کرا رہی ہیں۔ جو کچھ بچی کھچی پونجی تھی وہ بیچ کر نقد کر لیا۔ باقی کے لئے شاہ صاحب

کی ذات اور توکل کا توشہ کافی تھیا۔ حج سے واپسی پر وطن نہیں آئیں۔ بلکہ شاہ صاحب ہی کے قدموں سے لگی رہیں۔ شاہ صاحب اپنے وقت کے حلیم باعور تھے۔ جی چاہے الگنی پر ڈال دیجئے۔ چاہے چادر کی طرح کاندھے پر لٹکا لیجئے۔ مدی میں جوانی کی کنی گننے میں اب بھی دیر تھی۔ مگر شاہ صاحب کو دیکھ کر خواب میں بھی آشنائی کا خیال نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اگر غور کیجئے۔ تو پیر بھی ایک طرح کا شوہر ہی ہوتا ہے۔ جس پر مرید اسی طرح تکیہ کرتا ہے جیسے عورت مرد پر۔

---

(٦)

اُردو افسانہ

دُوسرا دور

پریم چند

کفن

(۱)

جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور اندر بیٹے کی نوجوان بیوی بدھیا دردِ زہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی اور رہ رہ کر اس کے منہ سے ایسی دل خراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے۔ جاڑوں کی رات تھی، فضا سناٹے میں غرق، سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا تھا۔

گھیسو نے کہا "معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہو گیا۔ جا دیکھ تو آ۔"

مادھو دردناک لہجے میں بولا "مرنا ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔ دیکھ کر کیا آؤں؟"

"تو بڑا بے درد ہے بے! سال بھر جس کے ساتھ جندگانی کا سکھ بھوگا اسی کے ساتھ اتنی بے وفائی؟"

"تو مجھ سے تو اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا۔"

چماروں کا کنبہ تھا اور سارے گاؤں میں بدنام۔ گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین دن آرام۔ مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹہ بھر کام کرتا تو گھنٹہ بھر چلم پیتا۔ اس لئے انہیں کوئی رکھتا ہی نہ تھا۔ گھر میں مٹھی بھر اناج موجود ہو تو ان کے لئے کام کرنے کی قسم تھی۔ جب دو ایک، فاقے ہو جاتے تو گھیسو درختوں پر چڑھ کر لکڑیاں توڑ لاتا اور مادھو بازار میں بیچ آتا اور جب تک وہ پیسے رہتے دونوں اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے۔ جب فاقے کی نوبت آ جاتی تو پھر لکڑیاں توڑتے یا کوئی مزدوری تلاش کرتے۔ گاؤں میں کام کی کمی نہ تھی۔ کاشتکاروں کا گاؤں تھا۔ محنتی آدمی کے لئے پچاس کام تھے۔ مگر ان دونوں کو لوگ اسی وقت بلاتے جب دو آدمیوں سے ایک کا کام پا کر بھی قناعت کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا۔ کاش دونوں سادھو ہوتے تو انہیں قناعت اور توکل کے لئے ضبطِ نفس کی مطلق ضرورت نہ ہوتی۔ یہ ان کی خلقی صفت تھی۔ عجب زندگی تھی ان کی! گھر میں مٹی کے دو چار برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں۔ پھٹے چیتھڑوں سے اپنی عریانی کو ڈھانکے ہوئے دنیا کے فکروں سے آزاد، قرض سے لدے ہوئے۔ گالیاں بھی کھاتے تھے مگر کوئی غم نہیں۔ مسکین اتنے کہ وصولی کی مطلق امید نہ ہونے پر بھی لوگ انہیں کچھ نہ کچھ قرض دے دیتے تھے۔ مٹر یا آلو کی فصل میں کھیتوں سے مٹر یا آلو اکھاڑ لاتے اور بھون بھون کر کھاتے یا دس پانچ اوکھ

توڑ لاتے اور راتوں کو چوستے۔ گھیسو نے اسی زاہدانہ انداز سے ساٹھ سال کی عمر کاٹ دی اور مادھو بھی سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقش قدم پر چل رہا تھا بلکہ اس کا نام اور بھی روشن کر رہا تھا۔ اس وقت بھی دونوں الاؤ کے سامنے بیٹھے آلو بھون رہے تھے جو کسی کے کھیت سے کھود لائے تھے۔ گھیسو کی بیوی کا تو مدت ہوئی انتقال ہو گیا تھا، مادھو کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی۔ جب سے یہ عورت آئی تھی اس نے اس خاندان میں تمدن کی بنیاد ڈالی تھی۔ پسائی کر کے، گھاس چھیل کر وہ سیر بھر آٹے کا انتظام بھی کر لیتی تھی اور ان دونوں بے غیرتوں کا دوزخ بھرتی رہتی تھی۔ جب سے وہ آئی یہ دونوں اور بھی آرام طلب اور آلسی ہو گئے تھے بلکہ کچھ اکڑنے بھی لگے تھے۔ کوئی کام کرنے کو بلاتا تو بے نیازی کی شان سے دوگنی مزدوری مانگتے۔ وہی عورت آج صبح سے دردزہ سے مر رہی تھی اور یہ دونوں شاید اسی انتظار میں تھے کہ یہ مر جائے تو آرام سے سوئیں۔

گھیسو نے آلو نکال کر چھیلتے ہوئے کہا ”جا کر دیکھ تو کیا حالت ہے اس کی۔ چڑیل کا پھساد ہوگا اور کیا۔ یہاں تو اوجھا بھی ایک روپیہ مانگتا ہے، کس کے گھر سے آئے؟“

مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا، بولا ”مجھے وہاں ڈر لگتا ہے۔“

”ڈر کس بات کا ہے، میں تو یہاں ہوں ہی۔“

”تو تم ہی جا کر دیکھو نا۔“

”میری عورت جب مری تھی تو میں تین دن اس کے پاس سے ہلا بھی نہیں اور پھر مجھ سے لجائے گی کہ نہیں۔ کبھی اس کا منہ نہیں دیکھا، آج اس کا اگھڑا ہوا بدن دیکھوں۔ اسے تن کی سدھ بھی تو نہ ہوگی۔ مجھے دیکھ لے گی تو کھل کر ہاتھ پاؤں بھی نہ پٹک سکے گی۔“

”میں سوچتا ہوں کوئی بال بچہ ہو گیا تو کیا ہوگا۔ سونٹھ، گڑ، تیل کچھ بھی تو نہیں ہے گھر میں۔“

”سب کچھ آ جائے گا۔ بھگوان بچہ دیں تو۔ جو لوگ ابھی ایک پیسہ نہیں دے رہے ہیں وہی تب بلا کر دیں گے۔ میرے نو لڑکے ہوئے، گھر میں کبھی کچھ نہ تھا مگر اسی طرح ہر بار کام چل گیا۔“

جس سماج میں رات دن کام کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی اور کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے کہیں زیادہ فارغ البال تھے، وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ ہم تو کہیں گے گھیسو کسانوں کے مقابلے میں زیادہ باریک بین تھا اور کسانوں کی تہی دماغ جمعیت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی فتنہ پرداز جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ ہاں اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ شاطروں کے آئین وادب کی پابندی بھی کرتا۔ اس لئے جہاں اس کی جماعت کے اور لوگ گاؤں کے سرغنہ اور مکھیا بنے ہوئے تھے اس پر سارا گاؤں انگشت نمائی کرتا تھا۔ پھر بھی اسے یہ تسکین تو تھی ہی کہ اگر وہ خستہ حال ہے تو کم از کم اسے کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بے جا فائدہ تو نہیں اٹھاتے۔

دونوں آلو نکال نکال کر جلتے جلتے کھانے لگے۔ کل سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اتنا صبر نہ تھا کہ انہیں ٹھنڈا ہو جانے دیں۔ کئی بار دونوں کی زبانیں جل گئیں۔ چھل جانے پر آلو کا بیرونی حصہ تو بہت زیادہ گرم نہ معلوم ہوتا لیکن دانتوں کے تلے پڑتے ہی اندر کا حصہ زبان اور حلق اور تالو کو جلا دیتا تھا اور اس انگارے کو منہ میں رکھنے سے زیادہ خیریت اسی میں تھی کہ وہ اندر پہنچ جائے۔ وہاں اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے کافی سامان تھا۔ اس لئے دونوں جلد جلد نگل جاتے۔ حالانکہ اس کوشش میں ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔

گھیسو کو اس وقت ٹھاکر کی برات یاد آئی جس میں بیس سال پہلے وہ گیا تھا۔ اس دعوت میں اسے جو سیری نصیب ہوئی تھی وہ اس کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ تھی اور آج بھی اس کی یاد تازہ تھی۔ بولا ”وہ بھوج نہیں بھولتا۔ تب سے پھر اس طرح کا کھانا اور بھر پیٹ نہیں ملا۔ لڑکی والوں نے سب کو پوڑیاں کھلائی تھیں، سب کو۔ چھوٹے بڑے سب نے پوڑیاں کھائیں اور اصلی گھی کی۔ چٹنی، رائتہ، تین طرح کے سوکھے ساگ، ایک رسے دار ترکاری،

دہی، چٹنی، مٹھائی۔ اب کیا بتاؤں کہ اس بھوج میں کتنا سواد ملا۔ کوئی روک نہیں تھی۔ جو چیز چاہو مانگو اور جتنا چاہو کھاؤ۔ لوگوں نے تو ایسا کھایا، ایسا کھایا کہ کسی سے پانی نہ پیا گیا۔ مگر پروسنے والے ہیں کہ سامنے گرم گرم گول گول مہکتی کچوریاں ڈالے دیتے ہیں۔ منع کرتے ہیں کہ نہیں چاہیے، پتل کو ہاتھ سے روکے ہوئے ہیں مگر وہ ہیں کہ دیئے جاتے ہیں اور جب سب نے منہ دھو لیا تو ایک ایک بیڑا پان بھی ملا۔ مگر مجھے پان لینے کی کہاں سُدھ تھی؟ کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ چٹ پٹ کر جا کر اپنے کمبل پر لیٹ گیا۔ ایسا دریا دل تھا وہ ٹھاکر!"

مادھو نے ان تکلفات کا مزہ لیتے ہوئے کہا: "اب ہمیں کوئی ایسا بھوج کھلاتا۔"

"اب کوئی کیا کھلائے گا۔ وہ زمانہ دوسرا تھا۔ اب تو سب کو کفایت سوجھتی ہے۔ سادی بیاہ میں مت خرچ کرو، کریا کرم میں مت خرچ کرو۔ پوچھو گریبوں کا مال بٹور بٹور کر کہاں رکھو گے! مگر بٹورنے میں تو کمی نہیں ہے، ہاں خرچ میں کفایت سوجھتی ہے۔"

"تم نے ایک بیس پوریاں کھائی ہوں گی۔"

"بیس سے جیادہ کھائی تھیں۔"

"میں پچاس کھا جاتا۔"

"پچاس سے کم میں نے بھی نہ کھائی ہوں گی۔ اچھا پٹھا تھا۔ تو اس کا آدھا بھی نہیں ہے۔"

آلو کھا کر دونوں نے پانی پیا اور وہیں الاؤ کے سامنے اپنی دھوتیاں اوڑھ کر پاؤں پیٹ میں ڈالے سو رہے جیسے دو بڑے اژدر گینڈلیاں مارے پڑے ہوں۔ اور بدھیا ابھی تک کراہ رہی تھی۔

(۲)

صبح کو مادھو نے کوٹھڑی میں جا کر دیکھا تو اس کی بیوی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس کے منہ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں، پتھرائی ہوئی آنکھیں اوپر ٹنگی ہوئی تھیں۔ سارا جسم خاک میں لت پت ہو رہا تھا اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا تھا۔

مادھو بھاگا ہوا گھیسو کے پاس آیا۔ پھر دونوں زور زور سے ہائے ہائے کرنے اور چھاتی پیٹنے لگے۔ پڑوس والوں نے یہ آہ و زاری سُنی تو دوڑے ہوئے آئے اور رسم قدیم کے مطابق غم زدوں کی تشفی کرنے لگے۔

مگر زیادہ رونے دھونے کا موقع نہ تھا۔ کفن کی اور لکڑی کی فکر کرنی تھی۔ گھر میں تو پیسہ اسی طرح غائب تھا جیسے چیل کے گھونسلے میں ماس۔

باپ بیٹے روتے ہوئے گاؤں کے زمیندار کے پاس گئے۔ وہ ان دونوں کی صورت سے نفرت کرتے تھے۔ کئی بار انہیں اپنے ہاتھوں پیٹ چکے تھے، چوری کی علت میں، وعدہ پر کام پر نہ آنے کی علت میں۔ پوچھا: "کیا ہے بے گھیسوا۔ روتا کیوں ہے؟ اب تو تیری صورت ہی نظر نہیں آتی۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ تم اس گاؤں میں رہنا نہیں چاہتے۔"

گھیسوا نے زمین پر سر رکھ کر، آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا: "سرکار بڑی بپت میں ہوں، مادھو کی گھر والی رات گزر گئی۔ دن بھر تڑپتی رہی سرکار۔ آدھی رات تک ہم دونوں اس کے سرہانے بیٹھے رہے۔ دوا دارو جو کچھ ہو سکا سب کیا۔ مگر وہ ہمیں دگا دے گئی۔ اب کوئی ایک روٹی دینے والا نہیں رہا مالک، تباہ ہو گئے، گھر اُجڑ گیا۔ آپ کا گلام ہوں، اب آپ کے سوا اس کی مٹی کون پار لگائے گا، ہمارے ہاتھ میں تو جو کچھ تھا وہ سب دوا دارو میں اُٹھ گیا، سرکار ہی کی دیا ہو گی تو اس کی مٹی اُٹھے گی، آپ کے سوا اور کس کے دوار پر جاؤں؟"

زمیندار صاحب رحم دل آدمی تھے مگر گھیسو پر رحم کرنا کالے کمبل پر رنگ چڑھانا تھا۔ جی میں تو آیا کہہ دیں: "چل دور ہو یہاں سے لاش گھر میں رکھ کر یوں تو بلانے سے بھی نہیں آتا۔ آج جب غرض پڑی تو آ کر خوشامد کر رہا ہے۔ حرام خور کہیں کا بدمعاش۔" مگر یہ غصہ یا انتقام کا موقعہ نہیں تھا طوعاً و کرہاً

دو روپے نکال کر پھینک دیے مگر تسلی کا ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکلا۔ اس کی طرف تاکا تک نہیں، گویا سر کا بوجھ اتارا ہو۔

جب زمیندار صاحب نے دو روپے دیے تو گاؤں کے بنیے مہاجنوں کو انکار کی جرأت کیونکر ہوتی۔ گھیسو زمیندار کے نام کا ڈھنڈورا پیٹنا جانتا تھا۔ کسی نے دو آنے دیے، کسی نے چار آنے، ایک گھنٹے میں گھیسو کے پاس پانچ روپے کی معقول رقم جمع ہو گئی۔ کسی نے غلہ دے دیا اور کسی نے لکڑی، اور دوپہر کو گھیسو اور مادھو بازار سے کفن لانے چلے۔ اِدھر لوگ بانس وانس کاٹنے لگے۔

گاؤں کی رقیق القلب عورتیں لاش کو آ آ کر دیکھتی تھیں اور اس کی بے بسی پر دو بوند آنسو گرا کر چلی جاتی تھیں۔

(۳)

بازار میں پہنچ کر گھیسو بولا "لکڑی تو اسے جلانے بھر کو مل گئی ہے، کیوں مادھو!"

مادھو بولا "ہاں لکڑی تو بہت ہے اب کفن چاہیے۔"

"تو کوئی ہلکا سا کفن لے لیں۔"

"ہاں اور کیا۔ لاش اٹھتے اٹھتے رات ہو جائے گی، رات کو کفن کون دیکھتا ہے؟"

"کیسا برا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے اسے مرنے پر نیا کفن چاہیے۔"

"کفن لاش کے ساتھ جل ہی تو جاتا ہے۔"

"اور کیا رکھا ہے۔ یہی پانچ روپے ملتے تو کچھ دوا دارو کرتے۔"

دونوں ایک دوسرے کے دل کا ماجرا معنوی طور پر سمجھ رہے تھے۔ بازار میں اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ دونوں اتفاق سے یا عمداً ایک شراب خانے کے سامنے آ پہنچے اور گویا کسی طے شدہ فیصلے کے مطابق اندر گئے۔ وہاں ذرا دیر تک دونوں تذبذب کی حالت میں کھڑے رہے، پھر گھیسو نے ایک بوتل شراب لی، کچھ گزک، اور دونوں برآمدہ میں بیٹھ کر پینے لگے۔

کئی کجیاں پیہم پینے کے بعد دونوں سرور میں آ گئے۔

گھیسو بولا "کفن لگانے سے کیا ملتا۔ آخر جل ہی تو جاتا۔ کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا۔"

مادھو آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔ گویا فرشتوں کو اپنی معصومیت کا یقین دلا رہا ہو۔ "دنیا کا دستور ہے۔ یہیں لوگ باہمنوں کو ہزاروں روپے کیوں دے دیتے ہیں، کون دیکھتا ہے پرلوک میں ملتا ہے یا نہیں۔"

"بڑے آدمیوں کے پاس دھن ہے پھونکیں۔ ہمارے پاس پھونکنے کو کیا ہے؟"

"لیکن لوگوں کو جواب کیا دو گے؟ لوگ پوچھیں گے نہیں کفن کہاں ہے؟"

گھیسو ہنسا "کہہ دیں گے روپے کمر سے کھسک گئے۔ بہت ڈھونڈا ملے نہیں۔"

مادھو بھی ہنسا، اس غیر متوقع خوش نصیبی پر، قدرت کو اس طرح شکست دینے پر بولا "بڑی اچھی تھی بچاری۔ مری بھی تو خوب کھلا پلا کر۔"

آدھی بوتل سے زیادہ ختم ہو گئی۔ گھیسو نے دو سیر پوریاں منگوائیں۔ گوشت اور سالن اور چٹ پٹی کلیجیاں اور تلی ہوئی مچھلیاں۔ شراب خانے کے سامنے ہی دوکان تھی۔ مادھو لپک کر دو پتلوں میں ساری چیزیں لے آیا۔ پورے ڈیڑھ روپے خرچ ہو گئے۔ صرف تھوڑے سے پیسے بچ رہے۔

دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے ہوئے پوریاں کھا رہے تھے جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اڑا رہا ہو۔ نہ جواب دہی کا خوف تھا نہ بدنامی کی فکر۔ ضعف کے ان مراحل کو انہوں نے بہت پہلے طے کر لیا تھا۔ گھیسو فلسفیانہ انداز سے بولا "ہماری آتما پرسن ہو رہی ہے تو کیا اسے پن نہ ہوگا؟"

مادھو نے فرقِ عقیدت جھکا کر تصدیق کی "ضرور سے ضرور ہوگا۔ بھگوان تم انتر جامی (علیم) ہو۔ اسے بیکنٹھ لے جانا۔ ہم دونوں ہردے سے اسے دعا دے رہے ہیں۔ آج جو بھوجن ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا۔"

ایک لمحہ کے بعد مادھو کے دل میں ایک تشویش پیدا ہوئی "کیوں دادا ہم لوگ بھی تو ایک نہ ایک دن وہاں جائیں گے ہی؟"

گھیسو نے اس طفلانہ سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ مادھو کی طرف پُرملامت انداز سے دیکھا۔

"جو وہاں ہم لوگوں سے وہ پوچھے گی کہ تم نے ہمیں کفن کیوں نہیں دیا تو کیا کہو گے؟"

"کہیں گے تمہارا سر!"

"پوچھے گی تو ضرور!"

"تو کیسے جانتا ہے اسے کفن نہ ملے گا۔ تو مجھے ایسا گدھا سمجھتا ہے۔ میں ساٹھ سال دنیا میں کیا گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اس کو کفن ملے گا اور اس سے بہت اچھا ملے گا جو ہم دیتے۔"

مادھو کو یقین نہ آیا۔ بولا "کون دے گا؟ روپے تو تم نے چٹ کر دئے۔"

گھیسو تیز ہو گیا۔ "میں کہتا ہوں اسے کفن ملے گا تو مانتا کیوں نہیں؟"

"کون دے گا بتاتے کیوں نہیں؟"

"وہی لوگ دیں گے جنہوں نے اب کی دیا۔ ہاں وہ روپے ہمارے ہاتھ نہ آئیں گے اور اگر کسی طرح آ جائیں تو پھر ہم اسی طرح یہاں بیٹھے پئیں گے اور کفن تیسری بار ملے گا۔"

جوں جوں اندھیرا بڑھتا تھا اور ستاروں کی چمک تیز ہوتی تھی مے خانے کی رونق بھی بڑھتی جاتی تھی۔ کوئی گاتا تھا، کوئی بہکتا تھا، کوئی اپنے رفیق کے گلے لپٹا جاتا تھا، کوئی اپنے دوست کے منہ میں ساغر لگائے دیتا تھا۔ وہاں کی فضا میں سرور تھا، ہوا میں نشہ، کتنے تو چُلّو میں الّو ہو جاتے ہیں۔ یہاں آتے تھے صرف خود فراموشی کا مزہ لینے کے لئے۔ شراب سے زیادہ یہاں کی ہوا سے مسرور ہوتے تھے۔ زیست کی بلا یہاں کھینچ لاتی تھی اور کچھ دیر کے لئے وہ بھول جاتے تھے کہ وہ زندہ ہیں یا مردہ ہیں، یا زندہ در گور ہیں۔

اور یہ دونوں باپ بیٹے اب بھی مزے لے لے کر چسکیاں لے رہے تھے۔ سب کی نگاہیں ان کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں دونوں۔ پوری بوتل بیچ میں ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر مادھو نے بچی ہوئی پوریوں کا پتل اٹھا کر ایک بھکاری کو دے دیا جو کھڑا ان کی طرف گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور دینے کے غرور، ولولہ اور مسرت کا اپنی زندگی میں پہلی بار احساس کیا۔

گھیسو نے کہا "لے جا۔ خوب کھا اور اسیر باد دے۔ جس کی کمائی ہے وہ تو مر گئی، مگر تیرا اسیر باد اسے ضرور پہنچ جائے گا۔ روئیں روئیں سے اسیر باد دے۔ بڑی گاڑھی کمائی کے پیسے ہیں۔"

مادھو نے پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہا "بیکنٹھ میں جائے گی دادا، بیکنٹھ کی رانی بنے گی۔"

گھیسو کھڑا ہو گیا اور جیسے مسرت کی لہروں میں تیرتا ہوا بولا "ہاں بیٹا بیکنٹھ میں جائے گی۔ کسی کو ستایا نہیں، کسی کو دبایا نہیں، مرتے وقت ہماری زندگی کی سب سے بڑی لالسا پوری کر گئی۔ وہ نہ بیکنٹھ میں جائے گی تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں گے جو غریبوں کو دونوں ہاتھ سے لوٹتے ہیں اور اپنے پاپ کو دھونے کے لئے گنگا میں جاتے ہیں اور مندروں میں جل چڑھاتے ہیں؟"

یہ خوش اعتقادی کا رنگ بھی بدلا۔ تلون نشہ کی خاصیت ہے۔ یاس اور غم کا دورہ ہوا، مادھو بولا "مگر دادا بچاری نے زندگی میں بڑا دکھ بھوگا۔

مری بھی کتنا دُکھ جھیل کر۔" وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔

گھسیو نے سمجھایا "یہ کیوں روتا ہے بیٹا۔ خوش ہو کہ وہ مایا جال سے مکت ہو گئی، جنجال سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلدی مایا موہ کے بندھن توڑ دیئے۔"

اور دونوں وہیں کھڑے ہو کر گانے لگے:

ٹھگنی کیوں نیناں جھمکاوے ٹھگنی

سارا مے خانہ محو تماشا تھا اور یہ دونوں مے کش محویت کے عالم میں گائے جاتے تھے۔ پھر دونوں ناچنے لگے۔ اچھلے بھی، کودے بھی، گرے بھی، مٹکے بھی، بھاؤ بھی بتلائے اور آخر نشہ سے بدمست ہو کر وہیں گر پڑے۔

سدرشن

جاں نثار

دیوالی کی رات تھی، زمین آسمان بنی ہوئی تھی۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی۔ چراغوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ جیسے آسمان کے تاروں کا تماشہ نہیں مگر یہی چاندنی (؟) رات ہے۔ جب ہزاروں حریص ہاتھ خیالی ثروت کی آرزو میں اپنا اثاثہ لُٹا بیٹھتے ہیں۔ اور پھر اپنی حماقت پر بیٹھے روتے ہیں انسان محنت نہیں کرنا چاہتا مگر اس کے شیریں پھل کھانا چاہتا ہے۔ امید عقل کو دھوکا دے جاتی ہے۔ پورن چند بھی اسی امید سے مسحور ہو چکا ہے وہ دن رات جوا کھیلتا رہتا تھا۔ اور دیوالی کے قریب آکر تو اُسے کھانے پینے کی سُدھ نہ رہتی تھی۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ کبھی نہ کبھی دن نصیبہ چمک اُٹھیگا۔ امید ہر بار یاس کی صورت اختیار کرتی تھی۔ مگر پورن چند حوصلہ نہ ہارتا تھا۔ اور قسمت کے بساط پر برابر پانسہ پھینکتا جاتا تھا۔ وہ ایک دفتر میں خزانچی تھا۔ دیوالی قریب آئی۔ تو دفتر سے غیر حاضر رہنے لگا۔ مگر مہینے کے آخری دنوں میں دفتر جانا ضروری ہو گیا۔ عملہ کی تنخواہوں کا بل تیار کرنا تھا۔ حُسنِ اتفاق سے دیوالی یکم نومبر کو تھی۔ ۳۱۔ اکتوبر کو تنخواہوں کا روپیہ آیا۔ مگر پورے چار بجے کلرک گھر جا چکے تھے۔ تنخواہ اُس دن تقسیم نہ ہو سکی۔ لیکن پورن چند نے تنخواہ اسی وقت لے لی اور خوش خوش گھر چلا۔ دیوالی کی رات کا سامان مہیا ہو گیا تھا۔ رات کو جب لکشمی پوجا ہو چکی تو وہ دیپ مالا دیکھنے کے بہانے گھر سے چلا۔ اور جوئے خانہ میں جا پہنچا۔ بدقسمتی پہلے ہی انتظار کر رہی تھی جاتے ہی سب کچھ ہار گیا۔ اب اس کی حالت اُس پرندہ سے مشابہ تھی جو مصروفِ پرواز ہونے سے پہلے ہی پر قینچ ہو چکا ہو۔ اس وقت اس کی بے بسی کیسی دلخراش ہوتی ہے۔ وہ اُڑنا چاہتا ہے۔ مگر اپنے کترے ہوئے پروں کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھرتا ہے۔ اور تڑپ کر رہ جاتا ہے۔ پورن چند کو ایسا معلوم ہوا گویا دیوالی کی رات کے ساتھ ہی اس کی خوش نصیبی بھی رخصت ہو رہی ہے۔ چاروں طرف نگاہ دوڑائی مگر کہیں سے روپیہ ملنے کی صورت نظر نہ آئی۔ یکایک اُس کے دل میں ایک خیال نے سر اٹھایا امید سامنے کھڑی دکھائی دی .... عملہ کی تنخواہوں کے روپے دفتر میں موجود تھے اور وہ خزانچی تھا۔

پورن چند پر غشہ سا چھا گیا۔ وہ بدحواسی کے عالم میں دفتر کی طرف روانہ ہوا۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ چراغوں کی بہار میں خزاں کے پہلو نمودار ہو رہے تھے۔ بازاروں کی رونق کم ہو رہی تھی۔ مگر پورن چند کی آنکھیں اِن طرف سے بند تھیں۔ وہ اس طرح بھاگتا ہوا جا رہا تھا جیسے

کسی عزیز ہمسایہ کے بیٹے کو ڈاکٹر کو بلانے جا رہا ہو۔ دفتر میں پہنچا تو چوکیدار دکھائی دیا۔ پورن چند کا ارادہ متزلزل ہو گیا۔ چوکیدار نے پوچھا "کون ہے؟"

"میں ہوں گنگادین! کہو کیا حال ہے؟"

گنگادین نے آواز سے فوراً پہچان لیا اور آگے بڑھ کر بولا "آئیے بابو صاحب۔ بجار میں تو خوب رونق رہی ہے۔ آپ یہاں کیسے آ گئے؟"

پورن چند کا دل دھڑک رہا تھا۔ مگر زبان پہ پورا پورا قابو تھا ہنس کر بولا "کچھ کاغذ بھول گیا ہوں۔ ذرا دروازہ کھول دے۔"

گنگادین نے فوراً تعمیل کی۔ اگر کوئی اور ہوتا۔ تو شاید وہ انکار کر دیتا۔ مگر پورن چند خزانچی تھا۔ اُس سے کچھ عذر نہیں کیا۔ بعض دفعہ پیشگی کی ضرورت آ بنتی تھی۔ پورن چند کمرے میں پہنچا۔ اور روشنی کر کے میز کے سامنے ہو بیٹھا اس وقت اس کی عقل اس طرح بیتاب تھی۔ جیسے کبوتر شکرے کے پنجے میں پھنس گیا ہو۔ بار بار خیال آتا تھا۔ کہ یہ قدم تباہی کی طرف لے جانے والا ہے مگر اس تاریکی میں امید کا دلفریب چہرہ بھی کبھی کبھی نظر آ جاتا تھا آخر پورن چند پر امید کا جادو چل گیا۔ اُس نے تجوری کھول کر چار سو کے نوٹ جیب میں ڈال لئے۔ اور کمرہ بند کر کے باہر نکل آیا۔ اس وقت اُسے ایسا معلوم ہوا کہ کامیابی کا ایک مرحلہ طے ہو چکا ہے۔ حالانکہ اُس کا ہر قدم اُسے سرزمین کامرانی سے دور لئے جا رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر اُسی جوئے خانہ میں تھا۔ جہاں قسمتیں برباد ہوتی ہیں اور تباہی ہنستی ہے۔ اُمید اُسے راستہ دکھا رہی تھی۔ مگر بدقسمتی اوٹ میں کھڑی مسکراتی تھی۔ پورن چند نے پھر داؤ لگائے اور پھر سب کچھ ہار گیا۔ اب چاروں طرف تاریکی تھی۔ لیکن اس تاریکی سے زیادہ خوفناک وہ سپیدۂ سحر تھی۔ جو آہستہ آہستہ نزدیک سرک رہی تھی۔ اس سپیدی سے پورن چند اتنا خائف تھا کہ اس کے تصور سے ہی اُس کی رُوح کانپ جاتی تھی سوچتا تھا۔ کیا کوئی ایسی ترکیب نہیں ہو سکتی کہ کل صبح کا سُورج ہی طلوع نہ ہو۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ پورن چند گھر پہنچا اس وقت اس کے پاؤں ایسے لڑکھڑا رہے تھے جیسے شراب پی رکھی ہو۔ اس کا باپ رائے صاحب سرجن مل امیر آدمی تھا۔ مگر اس کی امارت سے زیادہ مشہور اس کے بخل کے قصے تھے۔ پورن چند کو کئی بار خیال آیا کہ چل کر ان کے سامنے ساری بات ظاہر کر دُوں تو یقیناً وہ مجھے چار سو روپیہ دینے سے انکار نہ کریں گے۔ مگر پھر سوچا۔ کہ یہ نہیں ہوگا۔ اگر ایسے نصیب ہوتے تو وہ مجھے کوئی کارخانہ نہ کھول دیتے۔ ناحق ذلیل ہونے سے کیا حاصل؟ کوئی اور طریقہ سوچنا چاہئے اب اُسے عقل آ گئی تھی، امید کوئی دھوکا نہ دے سکی۔ اُس نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ مگر صبح ہوئی تو اُس کا چہرہ قدرے بحال ہو چکا تھا ایک گناہ پہ پردہ ڈالنے کے لئے نئے گناہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس وقت اس کا خیال اپنے نوکر رونق کی طرف تھا۔

(۲)

رائے صاحب کے تین نوکر تھے۔ ان میں رونق سب سے پرانا تھا۔ اُس نے اپنی زندگی کا بہت سا حصہ رائے صاحب ہی کی خدمت گزاری میں صرف کیا تھا۔ اس لئے رائے صاحب اُسے سخت سُست نہ کہتے تھے۔ رونق کو بات چیت کرنے کا سلیقہ نہ تھا۔ بولتا تو ایسا معلوم ہوتا گویا ڈانٹ رہا ہے۔ کام کرنے سے بھی جہاں تک ہو سکتا کترا جاتا تھا۔ ان دُوسرے ملازموں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے میں بہت ہوشیار تھا۔ اور اس کام کو ایسی مستعدی سے سرانجام دیتا کہ ملازم بلبلا اُٹھتے تھے۔ رونق کی اس مستعدی کے خلاف رائے صاحب کے پاس اکثر اپیلیں دائر ہوتی رہتی تھیں مگر رائے صاحب رونق کے فیصلوں کو اکثر بحال ہی رکھتے تھے۔ اس سے رونق کا چہرہ شگفتہ ہو جاتا تھا۔ اکڑ کر کہتا "تمہی کہو میرا تم نے کیا بگاڑ لیا؟"

مگر رونق میں کوئی بات ہو نہ ہو۔ یہ بات ضرور تھی کہ وہ مالک کے لئے جان تک نثار کرنے کو تیار رہتا تھا رائے صاحب کو اس پر روپے پیسے کے معاملات میں کامل طور پر اعتماد تھا۔ ان کو اس امر کا یقین ہو گیا تھا کہ رونق مر تو مر جائیگا۔ مگر ایک پائی کی بے ایمانی بھی نہیں کرے گا۔ کئی مواقع ایسے آئے جب رونق چاہتا تو سیکڑوں روپے بالا بالا اُڑا سکتا تھا۔ ترغیب نے سنہری جال بچھائے مگر رونق نے اپنی طبیعت کو ڈانواڈول

نہیں ہونے دیا۔ وہ پرائے روپے کو مٹی کے برابر سمجھتا تھا۔ رونق کی اس خوبی نے اس کے تمام عیوب پر پردہ ڈال دیا تھا۔

(۴۳)

دیوالی کے دوسرے دن صبح کے وقت رونق اپنے کمرے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا اور آنکھیں بند کئے کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ اتنے میں پورن چند بھاگا بھاگا اندر آیا اور بولا "رونق مجھے بچالو"۔

آواز میں حسرت تھی، الفاظ میں گھبراہٹ، رونق کے ہاتھ سے حقہ چھوٹ گیا۔ اُسے پورن چند سے انتہا درجہ کی الفت تھی۔ اُس نے اُسے گودیوں میں کھلایا تھا۔ وہ رات کے وقت عموماً بے سُدھ پڑا سوتا رہتا تھا۔ مگر جب کبھی پورن چند بیمار ہو جاتا تو ساری ساری رات اُس کے سرہانے بیٹھ کر کاٹ دیتا تھا۔ کئی آدمیوں نے اُسے زیادہ تنخواہ پر اپنے ہاں لے جانا چاہا مگر پورن چند کے خیال سے اُس نے سب جگہ انکار کر دیا۔ اور اُسی جگہ پڑا رہا۔ اس کا کوئی بچہ نہ تھا۔ مگر وہ پورن چند سے پدرانہ شفقت رکھتا تھا۔ جس طرح جنگل کے درخت کو پانی دینے والا اُس درخت کی شاخوں اور ٹہنیوں سے محبت کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح رونق پورن چند اور اس کے مستقبل سے محبت کرنے لگا تھا۔ جب اُسے عمر میں بڑھتے دیکھتا تو اس پر روحانی سرور سا چھا جاتا تھا۔ گویا وہ اس کا نوکر نہیں بلکہ باپ تھا۔ جب وہ کبھی تنہائی میں بیٹھتا۔ تو پورن چند ہی کے متعلق سوچتا رہتا تھا۔ وہ اس وقت بھی اسی کے خیال میں محو تھا۔ سوچتا یہ تھا کہ رائے صاحب جلد اس کا بیاہ کیوں نہیں کر دیتے۔ رائے صاحب کی دور اندیشیاں اُس کے نزدیک بخل سے کم نہ تھیں۔ اچانک پورن چند کو کمرے میں آتے دیکھ کر اس کا دل دہل گیا۔ گھبرا کر بولا "کیوں سرکار! معاملہ کیا ہے؟"

(۴۴)

یہ کہتے کہتے اس نے کونے میں پڑی ہوئی لاٹھی اُٹھائی اور اس طرح تیار ہو گیا۔ جیسے پورن چند کے تعاقب میں کوئی خوفناک ڈاکو آ رہا ہو۔ پورن چند کے غمگین چہرے پر ایک لمحہ کے لئے ہنسی نمودار ہوئی۔ جیسے رات کو آسمان میں جگنو چمک جاتا ہے۔ اُس نے آہ سرد بھری اور کہا "رونق لاٹھی رکھ دو اس کی ضرورت نہیں"۔

رونق کے سینہ سے بوجھ اتر گیا۔ لاٹھی رکھتے ہوئے بولا "تو سرکار ایسی کیا آفت آئی ہے۔ جو مُنہ سوکھ گیا ہے"۔

پورن چند نے چاروں طرف اس طرح دیکھا جیسے چور چوری کرنے سے پہلے دیکھتا ہے۔ انتہائے فکر نے اُس کے ہوش و حواس باختہ کر دئیے تھے۔ اس کو اندیشہ تھا۔ کہ کہیں کوئی مجھے دیکھ نہ لے۔ آہستہ سے بولا "میرے سر پر سچ مچ آفت ہی آ گئی ہے تم چاہو تو مجھے بچا سکتے ہو کہو۔ میرا ایک کام کرو گے؟"

رونق نے سینہ پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا "حضور حکم دیں تو (میں) بھاڑ میں کود پڑے"۔

پورن چند کا چہرہ منور ہو گیا۔ تاریکیٔ یاس میں شعاعِ امید چمک گئی تھی۔ اُس نے جیب سے ایک ہار نکالا۔ اور رونق کے ہاتھ میں دے کر کہا "یہ بازار لے جاؤ اور بیچ آؤ۔ مجھے ابھی روپے کی ضرورت ہے"۔

رونق پر بجلی سی گر پڑی۔ ہار دیکھ کر وہ اس طرح سہم گیا۔ جیسے کسی سانپ نے سونگھ لیا ہو۔ اُس کی زبان بند ہو گئی دماغ میں ہزاروں خیالات سما گئے وہ رہ رہ کے سوچتا تھا کہ پورن چند کو ایسی کیا ضرورت آ پڑی ہے۔ جو ہار بیچنے کی نوبت آئی ہے۔ اور پھر وہ غریب آدمی نہیں۔ رائے صاحب چاہیں تو آدھا شہر خرید سکتے ہیں۔ اُن کو زیور فروخت کرانے کی کیا ضرورت ہے۔ رونق سمجھ گیا کہ پورن چند یہ کام رائے صاحب سے چھپا کر کر رہا ہے۔ اس کی وجہ نہ سمجھ سکا۔ بحرِ خیالات میں بہت دیر تک غوطے کھانے کے باوجود اُسے ساحل نہ مل سکا۔ اُس نے عجیب انداز سے

پورن چند کی طرف دیکھا۔ نگاہوں میں دل رکھا ہوا تھا۔ پورن چند اُسے تذبذب میں پڑے ہوئے دیکھ کر پھر گھبرا گیا۔ شعاعِ امید آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

رونق نے پوچھا۔ "سرکار! معاملہ کیا ہے اتنی جرءت کیا بن گئی۔ جو ہار بیچ ہو؟"

پورن چند کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور ہار جیب میں ڈال کر واپس چلنے لگا۔ اس وقت اس کا چہرہ حسرت و یاس کی زندہ تصویر تھا۔ رونق کے کلیجے پر سانپ لوٹ گیا۔ پیچھے دوڑ کر بولا "سرکار تم کو کتنے روپے کی ضرورت ہے؟"

سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ پورن چند نے پھر اُمید کے لہجہ میں جواب دیا "چار سو کی۔"

"روپیہ کب چاہیئے؟"

"ابھی"

رونق کے پاس چھ سو کے قریب روپیہ موجود تھا۔ یہ روپیہ اُس نے کئی سالوں میں جمع کیا تھا۔ وہ ساری تنخواہ گھر نہیں بھیج دیا کرتا تھا۔ تین چار روپے ماہوار بچا رکھتا تھا۔ یہ روپے اُس نے اپنی کوٹھڑی کے ایک کونے میں دبا رکھے تھے۔ رونق نے سوچا کہ ہار لے کر بازار میں کہاں بیچتا پھروں گا۔ اپنے پاس سے روپے دے دوں تو کیا حرج ہے۔ پورن چند کوئی اس طرح ہمیشہ تھوڑے ہی تنگدست رہے گا۔ جب اُس کے ہاتھ چار پیسے آئیں گے تو اُس سے اپنا روپیہ واپس لے کر ہار لوٹا دوں گا۔ اس وقت اُس کا کام چل جائیگا۔ یہ سوچ کر اُس نے پورن چند کے ہاتھ سے ہار لے لیا اور کہا۔ "اچھا سرکار! تمرا کام کر دیں گے۔"

پورن چند کی جان میں جان آ گئی۔ اُس کو ایسا معلوم ہوا۔ گویا رونق اُس کا نوکر نہیں بلکہ فرشتۂ رحمت ہے۔

(۵)

تھوڑی دیر کے بعد رونق نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور زمین کھودنے لگا۔ اس وقت اُس کا دل سینہ میں زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اُس نے چوری نہیں کی تھی۔ بدنیتی نہیں کی تھی۔ مگر پھر بھی اُس کا کلیجہ کانپ رہا تھا۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ پورن چند کا کام ہو جائے اور اُسکو رائے صاحب کے سامنے اپنے گناہ کا اعتراف نہ کرنا پڑے۔ وہ ہر چند کہ جاہل اَن پڑھ تھا۔ تاہم اُسے یہ یقین ہو گیا تھا کہ اگر پورن چند کا یہ قصور جس کے بارے میں وہ تاحال تاریکی میں تھا، رائے صاحب کے سامنے ظاہر ہو گیا۔ تو پورن چند کا مستقبل خراب ہو جائے گا اس خیال سے اس کا خون خشک ہوا جاتا تھا۔ . . . . اُس نے جلدی جلدی زمین کھود کر روپیہ گن کر نکالا اور زمین پھر سے ہموار کر دی۔ اس وقت اس کے چہرے پر پھر وہی بے فکری و اطمینان کا رنگ ہویدا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد پورن چند امید و بیم کی صورت بنا ہوا آیا۔ اور ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "رونق۔"

رونق حقہ پی رہا تھا۔ اُس نے زبان سے کوئی جواب نہ دیا مگر ہاتھ سے اپنے سرہانے کی طرف اشارہ کر دیا۔ پورن چند نے روپیہ دیکھا تو تنِ مُردہ میں جان آ گئی۔ رونق کی طرف احسانمندی کے انداز سے دیکھتے ہوئے چلا گیا۔

یکایک رونق چونک پڑا۔ جیسے کسی کی کوئی قیمتی شے گم ہو جاتی ہے۔ وہ زمین کھودتے وقت ہار دبانا بھول گیا تھا۔ وہ تیر کی طرح تیزی سے اپنی چارپائی کے سرہانے پہنچا۔ ہار وہیں پڑا تھا۔ سوچنے لگا اب اسے رات کو دبانا چاہیئے۔ دن میں کسی کو شبہ بھی ہو گیا۔ تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ یہ فیصلہ کر کے اُس نے ہار کمر کے گرد لپیٹ لیا اور کام میں مصروف ہو گیا۔ مگر طبیعت میں سارے دن انتشار رہا۔

رات ہو گئی تھی رونق نے دروازہ بند کیا اور زمین کھودنے لگا۔ مگر ہاتھوں میں سکت نہ تھی دل اس طرح دھڑک رہا تھا جیسے کوئی سپاہی

گرفتار کرنے کو آرہا ہو۔ جسم پر سوں کے مریض کے مانند شل ہو رہا تھا۔ یہ ہونے والے واقعات کا پیش خیمہ تھا۔ پر رونق اس سے بے خبر اپنے کام میں مصروف تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں نہ چلتے تھے۔ مگر وہ زمین کھودرہا تھا۔ یکایک کسی نے دروازے پر ہاتھ مارا۔ رونق کے ہوش اڑ گئے۔ گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور سننے لگا کہ کیا یہ میرا وہم ہی تو نہیں دروازے پر پھر کسی نے ہاتھ مارا۔ رونق کے چہرے پر پسینہ کے قطرے نمودار ہو گئے۔ سردی کے دن تھے، مگر اس کا دم گھٹا جا رہا تھا تاہم اس نے حوصلے سے پوچھا "ایس وقت کون ہے؟

"دروازہ کھول دے"۔

رونق کا چہرہ فق ہو گیا یہ رائے صاحب کی آواز تھی۔ جو حالت بکری کی شیر کی دھاڑ سن کر ہوتی ہے وہی حالت اس آواز کو سن کر رونق کی ہوئی اُسے اپنی رسوائی آنکھوں کے سامنے ناچتی ہوئی دکھائی دی۔ اُس نے بولنا چاہا۔ مگر گلے سے آواز نہ نکل سکی۔ رائے صاحب نے کڑک کر کہا۔ "دروازہ کھول دے"۔

رونق نے لپک کر ہار بستر کے نیچے چھپا دیا۔ ٹمٹماتا ہوا دیا بجھا دیا۔ اور دروازہ کھول دیا۔ اُس وقت اُس کے پاؤں من من کے بھاری ہو رہے تھے۔ رائے صاحب نے اندر آتے ہی کہا۔ "دیا کیا ہوا؟"

رونق نے جواب دیا۔ "سرکار بجھ گئے دیو"۔

"ابھی تو جل رہا تھا۔ بجھ گئے کیسے دیو؟ فوراً روشن کرو"۔

رونق کے اندیشے مادی صورت اختیار کر رہے تھے۔ حیل وحجت کرنے لگا وہ چاہتا تھا کہ یہ وقت ٹل جائے۔ تو بعد میں سیکڑوں بہانے تراشے جا سکتے ہیں۔ وقت اخفائے جرم کے لئے بہترین امداد ہے۔ مگر رائے صاحب نے اس کی مہلت نہ دی۔ جیب سے دیا سلائی نکال کر خود چراغ جلایا۔ اور زمین کی طرف دیکھ کر بولے "یہ تو کیا کر رہا تھا؟"

رونق نے ہاتھ باندھ کر جواب دیا۔ "سرکار جو مہینہ ملتا ہے۔ اُس سے بچا بچا کر کسی بکت کے لئے مٹی یہاں کچھ داب دیا کرتا ہوں۔

"مگر آج کیا دابنے لگا تھا ابھی تو تنخواہ بھی نہیں ملی"۔

جھوٹی زبان بند ہو گئی۔ رونق رائے صاحب کا منہ دیکھنے لگا۔ رائے صاحب نے آگے بڑھ کر زمین سے مٹی ہٹائی اور روپوں کی پوٹلی دیکھی پھر بستر ہلایا۔ ان کا خیال تھا۔ کہ شاید رونق نے جوا کھیلا ہے کیونکہ اُس سے اور کسی بے ایمانی کی انہیں مطلق توقع نہ تھی۔ مگر انہیں یہ دیکھ کر کیسی حیرت ہوئی کہ رونق کے بستر کے نیچے ہار پڑا تھا۔ وہ اُسے دیکھ کر سر سے پاؤں تک کانپ اُٹھے۔ اگر کوئی دوسرا شخص یہ فعل کرتا۔ تو رائے صاحب ممکن ہے درگذر کر جاتے۔ مگر رونق کو اس حالت میں دیکھ کر اُن کا خون جوش مارنے لگا۔ انھوں نے نہایت نرمی سے جو سخت غصے سے بھی خوفناک ہوتی ہے پوچھا "یہ ہار کیسے اُٹھایا؟ یہ تو ابھی چند ہی دن ہوئے خریدا تھا"۔

رونق میں خواہ لاکھوں عیب تھے۔ مگر وہ چور نہ تھا۔ اس صفت کے لئے رائے صاحب اکثر اس کی تعریف کیا کرتے تھے۔ اس وقت اسکی وہ نام نیک نامی خاک میں ملنے کو تھی۔ رونق نے سوچا۔ اب تمام واقعہ صاف صاف کہہ دینا چاہیے۔ پورن چند آخر رائے صاحب کا بیٹا ہے اُسے کھا تو نہ جائیں گے۔ یہ سوچ کر اُس نے حوصلہ مندی کے انداز سے سر اُٹھایا اور ہاتھ باندھ کر جواب دیا سرکار! معاملہ یہ ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔۔

اتنے میں اس کی نگاہ پورن چند پر پڑی۔ وہ اس طرح کانپ رہا تھا۔ جیسے کسی کو بخار چڑھ رہا ہو۔ اُس نے ایک عجیب انداز سے رونق کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔ رونق کو ایسا معلوم ہوا۔ جیسے پورن چند نے اُسے کہا ہے آخر تم کمینہ نکلے۔ میں نے تم پر اعتبار کیا تھا۔ مگر تم اس کے ناقابل ثابت ہوئے۔ کاش میں یہ پہلے سے سوچتا تو اس وقت رسوا نہ ہوتا۔

جس طرح ہوا کا رُخ بدلنے سے پتنگ کا رُخ بدل جاتا ہے۔ اُسی طرح اس نگاہ سے رونق کا ارادہ تبدیل ہو گیا۔ اُس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ خود

بدنام ہو نگا مگر پورن پر حرف نہ آنے دونگا۔ یہ سوچ کر اُس نے رائے صاحب سے کہا "سرکار، معاملہ یہ ہے کہ مجھی نے چوری کی ہے"۔

رائے صاحب اُس کی چارپائی پر بیٹھ گئے اس وقت اُس کو ایسا افسوس ہوا گویا ہزاروں کا نقصان ہو گیا ہے مگر پورن چند دل ہی دل میں اس پر عش عش کر رہا تھا۔ دنیا میں ایسے آدمیوں کی کمی نہیں جو اپنی غرض کے لئے دن رات جھوٹ بولتے رہتے ہیں۔ مگر دوسروں کے لئے جھوٹ بولنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

رائے صاحب نے تھوڑی دیر سکوت کیا اور پھر کہا "تم صبح ہونے سے پہلے پہلے میرے مکان سے نکل جاؤ۔ بس یہی تمہاری سزا ہے"۔ رونقی اور پورن چند دونوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

(۶)

اس کے ایک سال بعد رائے صاحب سرجن مل کا انتقال ہو گیا۔ اب سارے روپے پیسے کا پورن چند ہی مالک تھا۔ اُس نے کریا کرم سے فارغ ہو کر رونقی کے نام چار سو روپیہ کا منی آرڈر بھجوایا۔ اور ساتھ ہی خط لکھا کہ تم فوراً میرے پاس آ جاؤ۔ مگر ایک ہفتہ کے بعد منی آرڈر واپس آ گیا۔ ساتھ اُس کے بھائی کا خط آیا۔ جس میں لکھا تھا۔ کہ اُسے مرے ہوئے ایک سال گزر گیا ہے۔ وہ جب آپ کے یہاں سے آیا تو ہمیشہ اُداس رہا۔ یہی اُداسی اس کے چہرے سے دم واپسیں تک نہیں گئی ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اُسے کوئی روگ ہے۔ مگر کیا روگ ہے؟ یہ کسی کو معلوم نہیں ہو سکا۔

پورن چند پر اس خط کا ایسا اثر ہوا کہ کئی دن تک روتا رہا۔ اب اُس نے جُوا کھیلنا ترک کر دیا ہے۔ اور رونق کے نام پہ ایک دھرم سالہ بنوا دی ہے اور اس میں اس کی قد آدم تصویر رکھی ہے۔ لوگ اُس کی حماقت پہ ہنستے ہیں مگر وہ سمجھتا ہے کہ یہ سب کچھ رونقی کی جان نثاری کے مقابلے میں اتنی وقعت بھی نہیں رکھتا۔ جتنی ذرہ آفتاب کے مقابلہ میں۔

عظیم بیگ چغتائی

چینی کی انگوٹھی

(۱)

انگوٹھیاں طرح طرح کی ہوتی ہیں۔ ان سب میں سونے اور چاندی کی زیادہ مشہور ہیں۔ پھر بعض انگوٹھیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کا انگلی میں ڈالنا وبالِ جان ہو کر "انگوٹھی کی مصیبت" ہو جاتا ہے۔ مگر یہاں میرا مطلب ایک عجیب و غریب "چینی کی انگوٹھی" سے ہے۔

ایک بڑے ضروری کام سے میں لکھنؤ سے بھی آگے جا رہا تھا۔ ایک دن لکھنؤ ٹھہرنا تھا۔ گویا یہ کہیے کہ فی الحال لکھنؤ جا رہا تھا۔ ٹونڈلہ کے اسٹیشن پر اپنا اسباب کا نپور والی گاڑی میں رکھ کر اسٹیشن پر ٹہلنے لگا۔ کیونکہ ابھی گاڑی میں کافی وقت تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے ریفرشمنٹ روم کو سونگھنے لگا، جالی میں سے اندر جھانکا۔ کچھ شبہ سا ہوا۔ غور سے جو جھانک کر دیکھا تو بھائی شنذری! واللہ کس شان سے پتلون کی جیب میں ایک ہاتھ ڈالے کھڑے تھے۔ سامنے میز پر "لبالب" "نہیں بلکہ لدا لد" بھری ہوئی ایک کشتی رکھی تھی۔ جس میں کیک، پیسٹریاں، چاکلیٹ، توس مکھن، انڈے وغیرہ اور نہ معلوم کیا کیا بلائیں درج نہیں۔ علاوہ چلیئے کے۔ بس کھانے کو بیٹھنا ہی چاہتے تھے کہ بیٹھتے بیٹھتے کچھ پیروی سنتِ رسول کا پاس یا پھر یہ کہ ابھی ابھی اپنی ناک مروڑی تھی، کچھ بھی ہو لپک کر ہاتھ دھونے کے لئے برابر والے کمرے میں نل پر پہنچے۔ اور ادھر لپک کر میں ان کی جگہ۔۔

بھائی شنذری کے آنے کی آہٹ سن کر میں نے گردن نیچی کر لی۔ میں نے کیک کھانا شروع کیا تھا۔ اور لمحہ بھر ہی میں آدھے پر پہنچ گیا تھا۔ دیسے گو "شارٹ ہینڈ" تو میں نے نہیں سیکھا لیکن کھانے میں مجھ اللہ کافی سے زیادہ "زود نویس" ہوں۔ بھائی شنذری اُدھر سے بھوک پہ دھار رکھے ہوئے آئے اور مجھے گردن جھکائے "محوِ خدمت" دیکھ کر بولے: "اے تم کہاں!"

میں منہ چلا رہا تھا تیزی سے! اور چونکہ بہ نسبت پلیٹ میں کیک رکھا رہنے کے ضروری خیال کرتا تھا کہ میرے پیٹ میں رہے۔ لہذا اپنے رخساروں کے لحاظ سے کچھ کچھ حضرت ڈارون کے مسئلۂ ارتقا کی جیتی جاگتی تصویر ورنہ تفسیر بنا بیٹھا تھا۔ لہذا بولتا کیا خاک۔

"کہاں جا رہے ہو؟" کہہ کر بھائی شنذری بھی کھانے پر پل پڑے۔ کیونکہ یہ موقع علیک سلیک کا بالکل نہ تھا۔ اور پھر علاوہ اس کے بھائی شنذری ویسے بھی ایک قلفی کی برف والے کا مٹکا لوٹنے میں نمایاں حصہ کالج میں لے چکے تھے۔ جس نے شکایت کرنے کے لئے اِدھر اُدھر

بھاگنے یا غل مچانے کی بجائے کہ ہائے مجھے لڑکوں نے لوٹ لیا، یہ کیا تھا کہ خود بھی اپنی ہی قلفیاں لوٹنے لگا۔ وہ جنا اور لڑکے ہارے۔ کیونکہ اس نے اپنے ماہر ہاتھوں سے قلفیاں کھول کھول کر چابک دستی سے ہتھیلیوں میں پلٹ پلٹ کر تیزی سے برف کھانا شروع کر دی تھی کہ جو کچھ بھی اپنے پیٹ میں پہنچ جائے بہتر ہے۔

جب کیک اور عمدہ قسم کی مٹھائیاں ختم ہو چکیں اور گویا گھوڑ دوڑ ختم ہو لی اور محض روکھی سوکھی چیزیں رہ گئیں تب کہیں جا کر نیا وئے خیال ممکن ہوا۔ اب مجھے بھی اطمینان تھا اور انھیں بھی۔

"کہاں جا رہے ہو یار؟" بھائی تنذری نے پوچھا۔

"اور تم کہاں جا رہے ہو؟" میں نے جواب دیا۔

"پہلے تم بتاؤ!" بھائی تنذری نے چائے کی پیالی سے کھیلتے ہوئے کہا۔

میں نے بھائی تنذری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوکھے منہ سے کہا۔

"ذرا ٹونڈلے تک آیا تھا۔"

"جھوٹے ہو" بھائی تنذری نے چائے کی پیالی کو منہ پر سے ہٹا کر کہا "میں خود ٹونڈلے تک آیا تھا۔" پھر اپنا منہ چائے کی پیالی سے ڈھک لیا۔ ہم دونوں جھوٹ بولے۔ کیوں؟ شاید اس لئے کہ دوسرا کہے کہ میں کرایہ دوں گا۔ میرے ساتھ چلو۔ پھر لطف یہ کہ دونوں کو معلوم تھا کہ جھوٹ بولا جاتا ہے۔

"کہاں بیٹھے ہو؟" میں نے بے جستگی سے پوچھا۔

"سیکنڈ کلاس میں" بھائی تنذری کے منہ سے نکل گیا۔ اور پھر اپنی غلطی محسوس کر کے اسی چائے کی پیالی سے، جس سے کھیل رہے تھے جھنک کر کہا "بے ایمان کہیں کا۔"

یہ کہہ کر اپنی حماقت پر ہنسنے ہی والے تھے کہ زور سے سیٹی بجی۔ گاڑی چھوٹنے کی اس نامعقول سیٹی کو سن کر ہم دونوں گویا ایک دم سے جاگ اُٹھے اور بھاگے ہم دونوں مگر بھائی تنذری مع چائے کی پیالی کے جس کا کنڈا کھیلتے کھیلتے اب انھیں پتہ چلا کہ انگلی میں پھنسا ہوا ہے۔ ادھر ہوٹل والے نے دیکھا کہ مسافر پیالی پار کئے جاتا ہے تو الگ پکارا کہ "لینا"!

ایک وقت میں بھائی تنذری کے ذمے اب دو کام تھے۔ ایک تو اپنی انگلی دیکھ کر چائے کی پیالی کا پھنسا ہوا کنڈا نکالنا اور دوسرے بے تحاشا سر پر پیر رکھ کر بھاگنا کہ گاڑی نہ چھوٹ جائے۔ نتیجہ اس کا ناظرین خود معلوم کر سکتے ہیں سوائے اس کے اور کیا ممکن تھا کہ کسی عجیب و غریب طریقے سے انگلی میں چائے کی پیالی کا صرف کنڈا ہی کنڈا رہ جائے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ قبل اس کے کہ میں عرض کروں کہ کس طرح ایسا ہوا۔ ضروری ہے کہ یہ بھی عرض کر دوں کہ نہ تو کوئی ریلوے ریگولیشن ایسا ہے کہ دو بدحواس بیک وقت پلیٹ فارم پر جمع نہ ہونے پائیں اور نہ پھر یہ کسی قاعدے یا بائی لاز کی رو سے ممنوع ہے کہ ریلوے پلیٹ فارم پر کوئی بدحواس خوانچہ پھاندنے کی کامیاب یا ناکام کوشش نہ کرے۔ پھر ویسے بھی بدحواسی جرم تو نہیں۔ چنانچہ ادھر سے میرا شیرِ بیشۂ حماقت تنذری چلا ہے اور ادھر سے ایک اور صاحب زور شور سے ایک خوانچہ پھاند کر ریل چھوٹنے کی گھبراہٹ میں چلے۔ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے ان دونوں کا ریلوے کی اصطلاح میں "میل" ہوا جیسے دو گاڑیوں کا ہوتا ہے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ تحقیق کے ساتھ نہیں عرض کر سکتا کہ انھوں نے تاک کر اپنی ناک بھائی تنذری کے ہاتھ میں پھنسی ہوئی پیالی پر ماری تھی یا پھر بھائی تنذری ہی نے ایک اندازِ قادرانہ کے ساتھ خود ان کی ناک پر پیالی کا وار کیا تھا۔ کچھ بھی ہو دونوں گر کر اُٹھے "اندھا ہے بے"۔ بھائی تنذری کے منہ سے نکلا۔ چشم زدن میں دونوں اٹھ کر سامنے والے ہی انٹر کلاس میں چلتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں

کہ میں ان دونوں حضرات سے دو سیکنڈ پہلے پہنچا تھا اور مجھے دیکھ کر ہی بھائی شنذری اپنا سیکنڈ کلاس چھوڑ کر جلدی میں اوپر آ گئے تھے۔ ہوٹل کے خانساماں کو مبلغ ایک روپیہ کلدار چائے کی پیالی کی قیمت یا جرمانہ پیش کیا۔ اب بھائی شنذری نے اپنے کلمہ کی انگلی کو دیکھا۔ جس میں چائے کی پیالی کا کنڈہ ہی کنڈہ پھنسا رہ گیا تھا۔ کھڑکی میں ہاتھ مار کر وہ توڑنے لگے کہ میں نے یونہی بغیر کسی وجہ کے ہاتھ روک کر کہا: "یار اسے مت توڑو، ایک روپے کا ہے مجھے نکال دو۔"

(۲)

قبل اس کے کہ میں اپنا قصّہ بیان کروں، ضروری ہے کہ کچھ "چانٹے" یا "تھپڑ" کی اقسام و ماہیت پر بحث کر دوں۔ پنجاب سے لیکر دکن تک اگر ہاتھ کو کبھی کے گال پر مارا جائے یا گال کسی کے ہاتھ پر مارا جائے تو کہا جاتا ہے۔ کہ چانٹا مارا یا چانٹا پڑا۔ لفظ "چانٹا"، بہت عام ہے۔ تھپڑ بھی عام ہے لیکن ان دو الفاظ کے ہم معنی جتنے لفظ یو۔ پی اور نیز دوسرے مقامات پر رائج ہیں ان کی "تلفظی"، "سائیکالوجی" پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ جہاں چانٹے کے لاتعداد اقسام ہو سکتے ہیں۔ وہاں عوام نے مناسبت سے علیٰحدہ علیٰحدہ نام بھی رکھ لئے ہیں۔ چانٹا وہ ہے جو غصّہ میں کسی کے گال پر "عرض" کیا جائے۔ اس کے تلفظ ہی میں انگریزی اصطلاح "آنو مٹو پیا" مضمر ہے۔ یعنی لازمی ہے کہ چانٹا آواز کے ساتھ سرزد ہو۔ ایک پٹاخے کی آواز کا مفہوم لئے ہوئے ہے تھپڑ اس کا ہم معنی اور ہم مطلب لفظ کسی طرح نہیں۔ کیونکہ تھپڑ میں لازمی طور پر چٹاخے کی آواز مفقود ہے، وہ آواز جس کا تعلق محض انگلیوں ہی سے ممکن ہے۔ تھپڑ میں بدقسمت گال پر علاوہ ہاتھ کی انگلیوں کے کچھ حصّہ ہتھیلی کا بھی پڑتا ہے جو آواز کی لطافت کھو دیتا ہے بلکہ ضرب البتہ بھاری پڑتی ہے۔ انگلیوں کے نشان گال پر ایک تھپڑ میں پڑنا لازمی نہیں۔ لہٰذا آپ نے دیکھا کہ تھپڑ اور چانٹے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ چانٹے کا ہم معنی لفظ طمانچہ ہے۔ مگر اس میں بھی وہ تیزی نہیں جو چانٹے میں ہے۔ پھر طمانچہ برابر والوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ عموماً بڑوں کی طرف سے چھوٹوں کے لئے مخصوص ہے۔ تھپڑ کو بعض لوگوں نے لپڑ بھی کہا ہے۔ یہ لفظ غیر فصیح ہے۔ مگر کیا کیا جائے جہاں مجبوری یہ ہو کہ ایک طرف گال کسی موٹے آدمی کا ہو تو ہاتھ بھی مولانا شوکت علی کا۔ چربی کے وجود نے اس میں سستی پیدا کر دی ہے۔ غرض اسی قسم کے اور بہت سے الفاظ ہیں چنانچہ انہی الفاظ میں سے ایک نہایت عامیانہ لفظ "زناٹہ" ہے۔ یو۔ پی سے اتر کر شاید بھوپال کی طرف بولا جاتا ہے۔ اس بھوپالی زناٹے میں برق رفتاری اور انتہائی تیزی و تندی اس قدر زیادہ موجود ہے کہ بیان سے باہر۔ دراصل یہ چانٹا ہے۔ ایک بے حد تیز قسم کا۔ بوجہ اپنی رفتار کی تیزی اور زناٹے کے، چانٹے اور طمانچے کی مخصوص چٹخدار آواز پر اس کی تیزی کا زناٹا غالب آ جاتا ہے۔ گو ویسے چانٹا ہونے کی وجہ سے اس میں چانٹے کی مخصوص آواز ضرور موجود ہے اور وہ بھی بدرجۂ اتم۔ لہٰذا "زناٹا" وہ چانٹا ہے۔ جس میں ایک چانٹے کی تمام خطرناک طاقتیں موجود ہیں اور برق رفتاری اس کے علاوہ۔ اس مختصر تمہید کے بعد میں اپنا قصہ شروع کرتا ہوں۔

عموماً مسافروں کا قاعدہ ہے کہ سفر کی گڑبڑ میں بڑی ضروری چیزیں ساتھ لینا بھول جاتے ہیں۔ جیسے ناشتہ دان، لوٹا، عقل، اخلاق، تہذیب وغیرہ وغیرہ۔ بعض لوگ قصداً بھی اسباب کے بکھیڑوں کی وجہ سے سامان ضرور بات لے کر ہی نہیں چلتے۔ چنانچہ یہی بھائی شنذری کا اصول ہے۔ کہ عموماً عقل، اخلاق، اور تہذیب وغیرہ قسم کی تمام چیزیں قصداً سفر کی طوالت کی وجہ سے گھر پر ہی چھوڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ اس سفر میں بھی یہی معاملہ تھا۔

وہ مضبوط الاعضا حضرت جن سے بھائی شنذری کی ٹکر ہوئی تھی ایک پیڈی کی پوری سیٹ پر دراز تھے۔ اور منہ پر اخبار تھا۔ چھوٹا ڈبہ تھا جگہ بالکل نہ تھی۔ اور دوسرے مسافروں کے آرام سے یہ بے نیازی اور غفلت بھائی شنذری کو بے حد ناگوار گذری۔ چنانچہ بھائی شنذری

نے کہا۔

"اخبار پھر پڑھئے گا ذرا اُٹھ کر بیٹھئے۔"

انھوں نے اخبار کو منہ سے ہٹایا اور جواب میں اپنی ٹانگیں سکیڑ لیں تاکہ ہم لوگ وہاں بیٹھ جائیں۔ اور پھر اخبار منہ پہ۔ بھائی شندری کو بھلا یہ رعونت کب گوارا۔ ان کے ہاتھ سے جھٹ اخبار چھین کر ڈانٹا۔

"آپ آدمی ہیں۔۔۔۔۔۔"

وہ تڑپ کر اُٹھے۔ اخبار کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے انھوں نے کہا "یہ کیا بدتمیزی!" اور بھائی شندری نے اخبار اُونچا کر کے کہا۔

"یادداشت!"

"ادھر لائیے اخبار" یہ بڑھ کر انھوں نے ڈپٹ کر کہا "بدتمیز کہیں کے" غضب ناک ہو کر انھوں نے پھر کہا۔ اس کے جواب میں بھائی شندری نے ان کا چھ آنے کا ٹائمز آف انڈیا ریل کے باہر پھینک دیا۔

ادھر بھائی شندری نے اخبار پھینکا اور اُدھر انھوں نے جل بھن کر کباب ہو کر ایک اسّی نمبر کا زناٹا اس زور سے بھائی شندری کے گال پر عرض کیا ہے کہ باوجود ریل کی گھڑگھڑاہٹ اور زنزناہٹ کے زناٹے کے زناٹے اور تڑاخے سے ڈبہ گونج گیا۔ بھائی شندری کا منہ چرخے کی طرح گھوم گیا اور بانکا فیلٹ ہیٹ وہ گرا۔ بھائی شندری نے سنبھلتے ہی ایک دو تین ہاتھ تابڑ توڑ ان کے دیئے۔ انھوں نے حملہ کر روک کر بقول کسے "الجھادے" سے ہاتھ نکال کر ایک زناٹا بھائی شندری کے اور دیا۔ کوئی پچھتر نمبر کا۔ مگر اب میں بھی اپنے عزیز دوست کی امداد پر آ پہنچا تھا مگر تین گھونسوں میں سے ایک تو اوپر والی بنچ پر پڑا تھا۔ دو غنیم کے لگے تھے۔ اس دوران میں علاوہ ان دو زناٹوں کے طرفین سے دس بیس ہاتھ چل چکے تھے۔ یہ سب کچھ چشم زدن میں ہو گیا۔ اور ہم دونوں قطعی دشمن پر بھاری پڑتے کہ "ہیں ہیں" کر کے دو تین مسافروں نے قابو میں کیا۔ اس کے بعد سخت کلامی کے مدارج طے ہونے لگے۔ اور کس مشکل سے لوگوں نے شیروں کو قابو میں کیا ہے کہ بیان سے باہر۔ ہم دونوں دشمن کا کچھ نہ بگاڑ سکے تھے۔ کیونکہ صورت حال میں ایسے موقع پر لتا کہ جدل میں اچھی طرح شرکت ہی نہ کر سکا تھا۔ اب اس جنگ کے نتیجہ پر غور کیجئے۔ چائے کی پیالی کے کنڈے کی دھار دار نگر سے دشمن کے بائیں ہاتھ کی پشت پر زخم کاری لگا تھا۔ علاوہ اس زخم کے دشمن پہ کوئی وار ہی سالم نہ آترا۔ یا تو کلائی پہ رُک گئے یا اوچھے پڑے۔ مگر ادھر بھائی شندری کے گال پر زناٹوں کے نشان کس صفائی سے موجود تھے کہ کان تک گواہی دے رہا تھا۔ اصطلاحاً یہ مار پیٹ تھی۔ مگر دراصل "پیٹ"، کیونکہ غور کیا تو اس نتیجہ پر پہنچنا پڑا کہ بھائی شندری پٹے ہیں۔ کیا میرے شیر نے بھائی شندری کے چانٹے دیئے ہیں کہ ہنسی کو روکنا مشکل تھا۔ ہم دونوں اب دوسری بنچ پہ بیٹھ گئے اور باتیں کرنا شروع کیں۔ اس شان سے بھائی شندری نے سگار نکال کر سلگایا ہے کہ جیسے ان کو پٹنے سے نہ کبھی علاقہ رہا۔ اور نہ ہے۔ "اس کو آگے چل کر ٹھونکیں گے" بھائی شندری نے مجھ سے رازدارانہ لہجے میں چپکے سے کہا۔

"قطعی" میں نے کہا اور غور کرنے لگا کہ اس کو آگے چل کر ٹھونکیں گے۔ اس جملہ کا مفہوم کہیں یہ تو نہیں ہے کہ اس سے آگے چل کر پھر پٹیں گے کیونکہ یہ نالائق شخص نہ صرف تگڑا تھا بلکہ قطعی طور پر ہم دونوں سے اچھی طرح نبٹ لینے کی طاقت رکھتا تھا۔ مگر چاہتا میں بھی یہی تھا کہ اس موذی کو کسی طرح آگے چل کر موقع دیکھ کر ماریں۔

اب ہم دونوں میں باتیں شروع ہوئیں۔ بھائی شندری کو میں ان کے سیکنڈ کلاس میں بھلا کیوں جانے دیتا۔ اور پھر شاید وہ خود بھی نہ گئے غرض اب باتیں شروع ہوئیں اور سچ سچ حال ایک دوسرے کو بتانا پڑا۔ بھائی شندری لکھنؤ جا رہے تھے۔ اور وہاں سے ایک دوسری جگہ اپنے ایک "بڑے گہرے" دوست سے ملنے۔

"یہ کون دوست ہیں تمہارے؟"

"ایک ہیں" بھائی تشنذری نے جواب دیا۔

"کون ہیں آخر؟ کیا نام ہے ان کا کچھ تو بتاؤ"

"دوست تو کیا ہیں" بھائی تشنذری بولے "ایک اُلّو تو پھنسا ہے عجیب احمق ہے"

"کون ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"محض ذرا سی ملاقات پر یا تعارف پر خط پہ خط، ملاقات کا شوق تقاضے پہ تقاضا، ناک میں دم کر دیا ہے یار میرے لئے، مجبوراً وعدہ کرنا پڑا کہ بھئی لکھنؤ آئے تو تم سے بھی ملیں گے۔ چلو نا یار تم بھی چلو" مجھ سے بھائی تشنذری نے زور دے کر کہا "چلو نا تم بھی"

(وہ حضرت جن کی ہم سے جنگ ہوئی تھی غور سے ہماری باتیں سن رہے تھے۔ اور گھورتے ہوئے پاخانہ گئے)۔

میں نے کہا "یار پہلے یہ بتاؤ کہ ہے وہ کون، کیا نام ہے، کیا کرتے ہیں، تم سے کب ملاقات ہوئی"

بھائی تشنذری نے سارا حال بتایا، نام بتایا، زمیندار ہیں۔ شکار کے بے حد شوقین ہیں، ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ غائبانہ تعارف ہے۔ اور وہ بھی ایک بندوق کی خرید و فروخت کے سلسلہ میں۔ اور پھر ایک دوسرے کے بڑے گہرے دوست ہیں"

"پھر تم نے اُسے بیوقوف اور احمق کیوں کہا؟" میں نے بھائی تشنذری سے پوچھا۔ اور ادھر وہ حضرت پاخانہ سے واپس آ کر بھائی تشنذری کے مضروب گال پر اپنی انگلیوں کے نشان غور سے دیکھنے لگے۔ مجھ سے آنکھیں چار ہوئیں اور اپنی کارگزاری کو دیکھ کر مسکرائے۔ واقعی بھائی تشنذری کے سخت زناٹے انھوں نے رسید کئے تھے۔ تشنذری بھائی نے ان کی مسکراہٹ اور وجہ مسکراہٹ کو معلوم کر لیا اور جل بھن کر کباب ہی تو ہو گئے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ ان کی طرف دیکھ کر کہا جیسے کہ کھا جائیں گے ان کو۔ پھر ہم دونوں باتیں کرنے لگے اور بھائی تشنذری نے اس سلسلہ میں کہا۔

"مجھے دراصل ایسے لوگوں سے سخت نفرت ہے کہ خواہ مخواہ دوستی کا ڈھنڈورا پیٹتے جاتے ہیں"

میں نے کہا "یار پہلی مرتبہ ملے گا تو خاطر بے حد کرے گا"

"جب ہی تو کہتے ہیں نا کہ چلو تم بھی۔ ایسا اُلّو کم پھنستا ہے۔ خوب پلچ پلچ کر کھائیں گے۔ کہ یاد ہی کرے کہ آیا تھا کوئی"

"کرایہ داخل کر دو" میں نے کہا۔

بھائی تشنذری راضی ہو گئے۔ اور ہم دونوں نے طے کر لیا کہ ساتھ چلیں گے۔ اور اس احمق کے یہاں نہایت بے تکلفی سے ڈٹ ڈٹ کر کھائیں گے۔

(۳)

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض کاریگر ایک چھوٹی سی ہتھوڑی اور کیل لئے اسٹیشنوں پر گھومتے پھرتے ہیں۔ اور وہ آنے کے پیسے لیکر آپ کا نام وہیں کا وہیں برتن پر کھود دیتے ہیں۔ ایسا ہی ایک کاریگر ہمارے ڈبے میں آیا۔ ریل رکنے پر ایک اسٹیشن پر لگا ایک صاحب کے لوٹے پر نام کھودنے یہاں بھیڑ لگ گئی۔ کس صفائی سے خط نستعلیق میں نام کھودتا تھا۔ بیحد پسند آیا خصوصاً بھائی تشنذری کو۔ ان کے پاس لوٹا نہ تھا۔ میرا لوٹا لے کر کہنے لگے اس پر نام کھدوائیں گے۔ میں اس بد ذوقی کا سخت مخالف مگر بھائی تشنذری نہ مانے اور نام کھدوانے لگے۔ نام کھدوا کر لوٹا تو ایک کنارے رکھا اور لگے ہم دونوں اسٹیشن پر ٹہلنے۔

قبل اس کے کہ میں بیان کروں کہ پھر کیا ہوا۔ ضروری خیال کرتا ہوں کہ اپنے اور بھائی تشنذری کے بارے میں ایک بات عرض کر دوں۔ ہم دونوں

علیگڈھ کالج کے تعلیمیافتہ بھائی تندری تعلیم ختم کر چکے تھے۔ اور مجھے ابھی ایک سال اور پڑھنا تھا۔ ہم دونوں کے مبارز ضعف ۔ کے بارے میں بے حد ملبار واقع ہوئے تھے، اور ہیں۔ چنانچہ کبھی بے کلی ہے ہم دونوں نے دیکھا ہے کہ تیسرے درجہ کے زنانہ ڈبے سے ایک دیہاتی نے اپنی گردن ایک طرف کو نکال کر جھکا رکھی ہے۔ اور ایک ہاتھ میں لوٹا لیے پانی والے کو پکار رہی ہے۔ ہم تسلیم ہے کہ ہم اس کو دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے۔ نہ کسی اور وجہ سے بلکہ شاید اس کے معصوم اور بھولے چہرے پر مظلومیت اور افسردگی دیکھ کر، وہ پانی مانگ رہی تھی اور کوئی نہ سنتا تھا۔ ہم دونوں چونکہ بالکل قریب سے گذرے اور بھائی تندری تو بالکل ہی قریب سے، لہذا اس نے اپنا ہاتھ اور سب کچھ ڈبے کے اندر کر لیا واپس تیزی سے لوٹتے میں ہم دونوں نے ایک دبی ہوئی آواز میں سنا: "چلینی کی انگوٹھی" مڑ کر دیکھا تو وہی لڑکی تھی۔ دانت اور چھوٹی سی لڑکی سے اس نے یہ الفاظ کہے تھے جو بھائی تندری کی طرف انگلی اٹھائے ہوئے تھی۔ شاید اس کے جواب میں یہ کہا ہوگا: "یہ چلینی کی انگوٹھی" یا جائے دیہاتی کا کندہ بدستور بھائی تندری کے داہنے ہاتھ کی کلمہ کی انگلی میں پڑا ہوا تھا جس سے وہ برابر باتیں کرتے میں چلنے جاتے تھے۔

گرمی کی تپش سے ہر جاندار کو پانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، اور خصوصاً سفر میں۔ بمتواتر تین اسٹیشنوں پر ہم دونوں نے اس غریب لڑکی کو پانی کیلئے لوٹے کو جھنڈی کی طرح ہلاتے دیکھا۔ اور اگر اس ہندوستان پر یہ چلینی کا دائرہ اتنا وسیع ہوتا کہ غیر جنس کی طرف دیکھنا بھی مذہباً گناہ ہو تو ہم کبھی کا اس کو پانی دے چکے ہوتے۔ دو ایک اسٹیشن بعد ہمیں اس کا خیال بھی نہ رہا کہ ایک عجیب معاملہ پیش آیا۔

بھائی تندری سیکنڈ کلاس کے مسافر کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور ہمیں سوڈا برف پینا پیا ہتے تھے۔ بلکہ لطف تو دیکھئے میرے حرج پر اس نے تجویز کی کہ برف خرید کر شربت بنالیا جائے، چنانچہ گاڑی میں سے برف لیا۔ اور پانی لوٹتے ہیں کہ واپس آ رہا تھا کہ پھر اسی دیہاتن خوبصورت چہرے والی لڑکی کو اسی طرح لوٹا لٹکائے پانی کے لئے پکارتے سنا۔ میں بالکل ہی قریب آ گیا تھا۔ اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ ریل نے سیٹی دی اور کہتے کی ہی تھی کہ میں نے لڑکی کے ہاتھ سے اس کا لوٹا لیکر اس پھرتی سے اپنا لوٹا دے دیا کہ آپ سے لیتے ہی بن پڑا۔ جیل اس کے کہ وہ جو نیا دوا معلوم کر سکے کہ کیا ہو گیا۔ دوڑ کر خالی لوٹا لئے میں اپنے ڈبے میں چڑھ گیا۔ بھائی تندری نے مجھے یہ کرتے دیکھ ہی لیا تھا میری اخلاقی جرأت کی تعریف ہی میں کی جگہ میرے پیچھے پڑ گئے اور مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں مجھے بھی تو کسی موذی سے نہیں بدلوائیں گے۔

ہم نے غلطی کی جو اگلے اسٹیشن پر ہی اپنا لوٹا واپس نہ لے لیا۔ کیونکہ اس کے بعد کے اسٹیشن پر گاڑی بہت دیر رکی اور تیسرے اسٹیشن پر زنانے ڈبے کی طرف جانے کی ہمت نہ پڑی۔ اس کے بعد جو دیکھا تو زنانہ درجے میں لڑکی نظر نہ آئی۔ نہ معلوم کون تھی۔ کہاں، کب اور کدھر اتر گئی مگر میرا لوٹا اس کے پاس تھا اور اس کا لوٹا میرے پاس۔

(۴)

کانپور کے اسٹیشن پر ہم لوگوں کو اس کی فکر ہوئی کہ دشمن کو کس طرح مار ہیں مگر کوئی صورت ممکن نہ ہو سکی۔ وہ بھی لکھنؤ جا رہا تھا لہذا طے کیا کہ لکھنؤ پہ ماریں گے۔

لکھنؤ بھی دور نہ تھا زیادہ حصہ سفر بھائی تندری نے میرے ہی ساتھ طے کیا تھا۔ ویسے بھی کبھی کبھی ان کے ساتھ سیکنڈ کلاس میں جا بیٹھتا تھا۔ لکھنؤ کا اسٹیشن جب قریب آیا تو بھائی تندری نے مشورہ دیا کہ دشمن کو مارو۔ چنانچہ وہ قریب ہی گیا۔ میں اسباب وغیرہ لیکر لکھنؤ کے اسٹیشن پر نیچے سے نکل گیا۔ اور بھائی تندری اُدھر دشمن کی طرف اسی لوٹے سے مسلح ہو کر پہنچے۔ موقع بھی خوب ملا۔ وہ لڑکا اپنے ٹرنک کا کنڈا دیکھ رہا تھا کہ سر پر ٹرنک لادنے اور ہٹے سے اس کے کہ سلے پر بھائی تندری نے لوٹے کی ٹونٹی پکڑ کر وہ یا کس کر دیا، بالکل "گرینڈ" کی طرح اور پھر جو سرپٹ بھاگے تو تیزی تو دیکھئے! میرے پاس سے نکل گئے اور مجھے بد حواسی میں دیکھا تک نہیں۔ جب ہم نے آدھا ہی نگھرا کر کہا کہ "چلو جلدی جاگ" کیونکہ خوب جانتے تھے کہ اگر کہیں پکڑ پایا اس نے تو بے طرح گندی کرے گا مگر پھر اس موذی کا پتہ نہ چلا۔

لکھنؤ میں ہم دونوں دو دن ساتھ رہے۔ پھر بھائی تنذری اور ہم دونوں بارہ بنکی چلے - ان دوست سے ملنے۔ گاڑی جو بارہ بنکی کے پلیٹ فارم پہ داخل ہوئی ہے تو ہم دونوں سر نکالے ہی بیٹھے تھے۔ وہ موذی کھڑا نظر پڑا - اور ہم دونوں سے آنکھیں چار ہوئیں۔ بھائی تنذری نے غصے سے گردن نیچی کر لی اور میں نے بھی: "اب یہ قطعی ٹھونکے گا؟" میں نے بھائی تنذری سے کہا۔

"اس کی ایسی تیسی" بھائی تنذری نے کہا - اور کچھ سوچ میں پڑ گئے۔

اِدھر میں نے کہا "قلی" اور اُدھر وہ موذی آ پہنچا۔ بھائی تنذری نے ڈنڈے کا گرز بنا کر اپنے کو مسلح دکھایا۔

"سر پھوڑ دوں گا" بھائی تنذری نے ڈنڈا چمکا کر کہا۔

مگر وہ نامعلوم کس گڑبڑ میں تھا۔ گھونسہ دکھا کر تیزی سے چلتا بنا۔ اسباب اُترا کہ ہم دونوں اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ کیونکہ بھائی تنذری نے اپنی آمد کا تار دے دیا تھا۔ اور اُمید پختہ تھی کہ ان کے دوست لینے آئیں گے۔ انتظار کر رہے تھے کہ پھر آیا وہ موذی۔

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟" اس نے اب گویا بھائی تنذری کو ٹھونکنے کی تمہید اُٹھائی۔

"جہنم سے" بھائی تنذری نے ڈنڈا تان کر کہا "سر پھوڑ دونگا"

"جانتے ہو کہاں ہو" اس نے کہا "بل کے دھوکے میں نہ رہنا - یہ بارہ بنکی ہے۔ ساری صاحب بہادری نکال دوں گا"

یہ کہکر شکر ہے کہ وہ چلتا بنا۔ اور اس سے کہیں زیادہ خطرناک الفاظ ہم دونوں نے اس کے لئے استعمال کئے تھے۔

"تار ملا نہ ہوگا" بھائی تنذری نے کہا۔ قلی سے اسباب اُٹھوا کر باہر نکلے تانگہ کیا۔ اپنے دوست کا نام اور مفصل پتہ بتایا کہ لے چلو وہاں۔ تانگہ ایک گلی کے کنارے پہ آ کر رُکا اور ہم دونوں اس خیال سے کہ مکان کا پتہ لگا لیں تو تانگہ اِدھر لائیں۔ اُتر کر اندازے سے ایک مکان پہ پہنچے۔ وہاں کھٹکھٹایا ایک صاحب سے معلوم ہوا کہ دو مکان چھوڑ کر تیسرے پہ دریافت کیجئے۔ وہاں پہنچے، ایک بڑا سا عالی شان پھاٹک تھا۔ اندر پہنچے، ملازم سے پوچھا۔ معلوم ہوا کہ اندر ہیں۔ ملازم نے بلوایا اور کہا بیٹھئے۔

آپ یقین مانئے کہ اندر سے وہی موذی چلا آتا ہے۔ اور نکلتے ہی وہ سامنے والے کمرے میں چلا گیا۔

وہ روشنی میں تھا اور ہم اندھیرے میں تھے۔

"یہ تو وہی ہے" گھبرا کر بھائی تنذری نے کہا اور نوکر سے اتنا پوچھا: "کیا یہی ہیں"۔ اور جیسے ہی اس نے کہا "ہاں" بھائی تنذری نے کہا "یار بھاگو"

ہم دونوں سر پہ پیر دھر کر جو بھاگے تو تانگہ پہ آ کر دم لیا اور سیدھے وہاں سے اسٹیشن۔ ساڑھے نو بجے کی گاڑی سے واپس لکھنؤ اور قبل اس کے کہ گھر واپس پہنچیں بھائی تنذری نے لکھنؤ ہی سے معذرت کا خط لکھ دیا کہ افسوس ہیں حسب وعدہ حاضر نہیں ہو سکا۔

الحمد اللہ کہ اب تک ان نادیدہ دوست سے بھائی تنذری کے تعلقاتِ دوستی اسی طرح قائم ہیں۔ اور واقعی بڑی گہری دوستی دونوں میں چلی آ رہی ہے۔

اعظم کریوی

پریم کی چوڑیاں

(۱)

نور پور گنگا جی کے کنارے الٰہ آباد کے ضلع میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ پنڈت گردھاری لال اس گاؤں کے زمیندار تھے۔ راما شنکر ان کا اکلوتا لڑکا تھا۔ کھیتی باڑی میں بڑی برکت تھی۔ گھر میں غلہ کا انبار لگا رہتا تھا۔ کسی بات کی کمی نہ تھی۔ پنڈت رام لال کا لڑکا رام جیاون ذات کا برہمن تھا۔ کسی زمانہ میں اس کے خاندان میں بھی لکشمی دیوی کا راج تھا۔ لیکن غدر میں اس کا خاندان تباہ ہوگیا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو وہ یتیم تھا۔ پنڈت گردھاری لال نے اس کی پرورش کی اور بڑے ہونے پر اپنے یہاں پیادوں میں نوکر رکھ لیا۔ رام جیاون بڑا کسرتی پہلوان تھا۔ گو اس کی عمر ۴۰ سال سے کچھ زیادہ ہوگئی تھی پھر بھی نور پور کا تو کیا ذکر آس پاس کے گاؤں میں بھی اس کی جوڑ کا کوئی دوسرا پہلوان نہ تھا۔ پنڈت گردھاری لال کے یہاں چار روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی، ہر فصل پر دس بارہ من اناج مل جاتا تھا۔ گھر میں ایک اچھی ذات کی گائے تھی اس کے لئے بھوسہ آسامیوں سے مل جاتا تھا۔ جب پنڈت رام جیاون اکھاڑے میں ڈنڈ پیل کر صبح کو اپنی گائے کا تازہ دودھ پی کر لمبی پگڑی باندھے ہوئے اور الٰہ آبادی موٹی لاٹھی کندھے پر رکھ کر گاؤں میں آسامیوں سے لگان وصول کرنے چلتے تو رعب چھا جاتا۔ جو کام کسی اور پیادہ سے نہ ہوتا تو اُسے رام جیاون مہراج کے سپرد کیا جاتا۔ گھر میں اُن کی بیوی دُرگا اور ایک لڑکی پریم پیاری کے سوا اور کوئی نہ تھا۔

راما شنکر اور پریم پیاری میں ایک سال کی چھوٹائی بڑائی تھی۔ راما شنکر کی پیدائش کے ایک سال کے بعد رام جیاون مہراج کے گھر میں لڑکی پیدا ہوئی۔ راما شنکر کی ماں تلسی نے لڑکی کا نام پریم پیاری رکھا۔ گاؤں میں ایسے نام کم رکھے جاتے ہیں لیکن زمینداروں کا نام رکھا ہوا کیسے بدلتا۔ پھر بھی پریم پیاری کو لوگ پیار میں پریما کہنے لگے۔

راما شنکر اور پریما بچپن ہی سے ایک جگہ اُٹھے بیٹھے۔ کھیلے کودے اور گرو جی کے یہاں ایک ساتھ پڑھے۔ بھلا ان میں محبت کیوں نہ ہوتی صبح کے وقت خاک دھول میں لت پت ہو کر گھروندے بنانا دونوں کا ایک نہایت پُر لطف کھیل تھا۔ نور پور کے پُر فضا میدان میں گنگا جی کے کنارے گڑیوں کا میلہ لگتا۔ گڑیاں اپنے سسرال جاتیں۔ پریما ہاتھ پاؤں میں مہندی رچاتی، اپنی گڑیوں کو گہنے کپڑے سے سجا کر بدا کرتی۔ گنگا جی کے کنارے جاتی تو راما بھی ساتھ جاتا۔ اور جب پریما اپنی خوبصورت گڑیوں کو پانی میں پھینکتی تو راما اپنی خوش رنگ نیم کی چھڑی سے پریما کی گڑیوں کو پیٹتا اور خوب خوش ہوتا۔ بارہا ایسا ہوا کہ کھیل ہی کھیل میں دونوں میں لڑائی ہوتی۔ کوسا کاٹا، مارا پیٹا اور پھر تھوڑی دیر میں ملاپ ہوگیا۔ پریما کے روٹھنے پر راما اس کی دلجوئی کرتا اور جب راما بگڑتا تو پریما اس کو

سمانیتی اسی طرح ہنسی خوشی میں بچپن کا کھیل ختم ہو گیا اور دونوں نے بہار عمر کے سہانے سبزہ زار میں قدم رکھا۔ پنڈت گردھاری لال کے ایک چچیرے بھائی گلزاری لال [illegible] میں وکیل تھے، انہیں کے پاس راما کو انگریزی پڑھنے کے لئے بھیج دیا گیا۔ الٰہ آباد جانے سے پہلے جب راما پریما سے ملا تو پریما نے کہا "راما دیکھو الٰہ آباد جا کر مجھے بھول نہ جانا۔"

"پریما تیرا کتنا خیال ہے۔ بھلا میں تجھے بھول سکتا ہوں۔ میں جب الٰہ آباد سے آؤں گا تو تیرے لئے بڑی اچھی اچھی چیزیں لاؤں گا۔"

"الٰہ آباد سے کب آؤ گے؟"

"مہینہ میں ایک مرتبہ ضرور آؤں گا۔"

جب راما رخصت ہونے لگا تو اس نے دیکھا کہ پریما کی کنول کی سی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں۔ اس نے کہا "پریما تو روتی کیوں ہے؟" پریما نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے جلدی سے اپنے آنچل سے آنسو پونچھ ڈالے اور بغیر کچھ کہے سنے اپنے گھر کے اندر بھاگ گئی۔

(۲)

راما جب نورپور ایسے چھوٹے گاؤں سے نکل کر الٰہ آباد ایسے بڑے شہر میں پہنچا تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اپنے چچا کی عالی شان کوٹھی دیکھ کر راما کی نظر میں اپنے نورپور والے کچے مکان کی کوئی وقعت نہ رہ گئی۔ اس کا الٰہ آباد میں اتنا جی لگا کہ وہ عرصہ تک نورپور نہ گیا۔ اپنے نئے دوستوں سے مل کر وہ پریما کو بھول گیا۔ اس کے چچا نے اس کے لئے کوٹ پتلون اور انگریزی جوتا منگوا دیا۔ وہ فٹن پر سوار ہو کر شام کو خسرو باغ کی سیر کرتا۔ ادھر تو راما شہر کی دلچسپیوں میں یہ دیہاتی زندگی محو کئے تھا اور ادھر نورپور میں پریما اس کی یاد میں تڑپتی رہتی تھی۔ وہ روز شام کی ڈھلتی چھاؤں میں اپنے گھر کے سامنے چبوترہ پر بیٹھ کر راما کی راہ دیکھا کرتی۔ بسنت اور ہولی کے جھمیلوں سے جو قدرتی راگ پیدا ہوتا وہ ایک لمحہ بھر کے لئے بھی اس کو مسرور نہ کر سکتا۔ برسات کے موسم میں جب کالی کالی گھٹائیں سر پر ہوتیں، بجلی چمکتی، بادل گرجتا، مور چنگھاڑتے، جھینگر الاپتے تو راما کی یاد میں پریما کی آنکھیں ساون بھادوں کی طرح جھڑیاں لگاتیں۔

خدا خدا کر کے گرمیوں کی چھٹیوں میں پورے ایک سال کے بعد راما الٰہ آباد سے واپس ہوا۔ جس وقت وہ گاؤں میں پہنچا دن ڈوب رہا تھا اور بھینسیں چراگاہ سے واپس ہو رہی تھیں، سورج دیوتا کی سنہری شعاعوں میں گائیں رنگی ہوئی ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے گنگا جی میں چمکتے ہوئے تارے۔ گوالے "برہا" گاتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ کہیں کہیں پر چھوٹے چھوٹے بچے مٹی میں کھیل رہے تھے۔ گاؤں کی بہوویں گھڑے لئے گنگا جی سے پانی بھرنے جا رہی تھیں، ان میں سے ایک شوخ اور چنچل عورت نے گھونگھٹ کی اوٹ سے راما کو دیکھ کر اپنی ایک سہیلی سے کہا "ارے! دیکھ تو یہ کون کرشن کا بچہ آ گیا ہے۔" اس کی سہیلی نے غور سے راما کو دیکھ کر کہا "یہ تو راما ہے، کیا تو نہیں جانتی یہ ہمارے زمیندار کا لڑکا ہے۔" "ارے یہ وہی راما ہے جو دھوتی کرتہ پہنے گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کھیلتا پھرتا تھا۔ میں نے بالکل نہیں پہچانا تھا۔ اور پہچانتی کیسے، آج تو یہ انگریزی کپڑے پہن کر آیا ہے۔"

دیہاتی زندگی میں ایک برادرانہ اُنس ہوتا ہے جو شہری زندگی میں نہیں پایا جاتا۔ گاؤں کے چھوٹے بڑے، امیر و غریب سب اسی رشتہ میں بندھے رہتے ہیں۔ چنانچہ راما کے آنے کی خبر پا کر جگدیو لوہار، چھلی بنیا، رمضان جولاہا، جگرو دھوبی، کالکا کاچھی، ادھین اہیر، رام جیاون مہراج وغیرہ راما کو دیکھنے آئے اور دعا دے کر چلے گئے۔

گاؤں میں پہنچ کر راما کو پریما یاد آئی۔ رات تو کسی طرح سے اس نے بسر کی لیکن صبح اٹھتے ہی وہ اس کے مکان پہنچا۔ رام جیون گنگا اشنان کرنے گئے ہوئے تھے۔ درگا دھان کوٹ رہی تھی۔ راما نے کہا "موسی! پرنام۔"

"کون، راما! جیتے رہو بیٹا، بھگوان انہیں بنائے رکھیں۔ آؤ آؤ اچھے تو رہے۔" یہ کہتی ہوئی درگا نے آواز دی "پریما! ارے او پریما! دیکھ تیرے راما بابو آئے ہیں۔ ان کو بیٹھنے کے لئے کچھ آسن تو دے۔" پریما چولہے کے پاس دودھ گرم کر رہی تھی۔ ماں کی آواز سن کر وہ جلدی سے اٹھی اور ایک کھٹولا لا کر بچھا دیا۔ راما کو خیال تھا کہ پریما سامنے آتے ہی خوب گھل مل کر باتیں کرے گی اس سے الٰہ آباد کا حال پوچھے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ پریما بدن چرائے آنکھیں نیچے کئے

بوئے آئی اور کھٹولہ بچھا کر پھر چوکے میں واپس چلی گئی۔ راما نے درگا سے کہا "موسی! پریما بھاگ کیوں گئی مجھ سے باتیں کیوں نہیں کرتی؟"

درگا نے چلا کر کہا "پریما کہاں چلی گئی، ذرا ایک گلاس دودھ اور ملائی تو ڈال کر بھیا کو کھلا دے (ہنس کر) پریما نری جنگلی ہے۔ تم کو جو اتنے برس کے بعد دیکھا تو سامنے آتے ہوئے شرماتی ہے۔ دیہاتی لڑکیاں بڑی ناسمجھ ہوتی ہیں راما!"

"موسی میں بھی تو دیہاتی ہوں!"

"بھیا تمہاری اور بات ہے۔ تم راما اور پریما کا مقابلہ ہی کیا، تم پڑھے لکھے ہو لیکن پریما تو بالکل گنوار ہے بس وہی تمہارے ساتھ گرو جی سے کچھ ہندی کتابیں پڑھی تھیں کیا اتنے ہی سے وہ سمجھ دار ہو گئی۔ نہیں بھیا نہیں وہ بڑی جاہل ہے دیکھو نہ کئی مرتبہ پکار چکی ہوں لیکن ابھی تک دودھ لے کر نہیں آئی۔"

راما نے اٹھ کر کہا "اچھا تو موسی میں خود ہی اس کے پاس جاتا ہوں۔ دیکھوں تو وہ مجھ سے کیوں نہیں بولتی ہے۔" یہ کہتا ہوا راما چوکے میں گھسا اور درگا ہنس ہنس کر لوٹ گئی "ہاں بھیا ہاں تو ضرور پریما کو ٹھیک بنائے گا۔" یہ کہتے ہوئے درگا نے پھر اپنا موسل اٹھایا اور دھان کوٹنے لگی۔

جب راما چوکے میں پہنچا تو دیکھا کہ پریما ایک گلاس میں دودھ لئے ہوئے سر جھکائے چپ چاپ کھڑی ہے۔ راما نے ہنس کر کہا "اوہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا مجھے پہچانتی ہی نہیں، کہو اچھی تو رہیں۔" پریما نے دودھ سے بھرا ہوا گلاس اور ایک لٹیا میں جل بھر کر راما کے سامنے رکھ دیا اور پھر دیوار کا سہارا لے کر ایک طرف کو چپ چاپ کھڑی ہو گئی لیکن کن انکھیوں سے راما کو دیکھتی جاتی تھی۔ راما نے کہا "نہ نہ پریما اس طرح سے کام نہیں چلے گا۔ جب تک تم نہ بولو گی میں تمہارے یہاں کوئی چیز نہ کھاؤں گا۔" تھوڑی دیر انتظار کر کے جب راما نے دیکھا کہ اس کا بھی کوئی جواب پریما نے نہیں دیا تو اس نے اداس ہو کر کہا "اچھا پریما نہ بولو جب تم میری بات کا جواب نہیں دیتیں تو میں اب جاتا ہوں۔" یہ کہتا ہوا راما اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت لجاتی ہوئی پریما نے ایک عجیب انداز سے کسمسا کر دھیمی آواز میں کہا "ہائے راما، تم تو نہ جانے کیا کہتے ہو۔"

راما کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ پریما کی آواز نے اس کا غنچۂ دل کھلا دیا۔ اب اس نے دودھ پی لیا اور ہنستا ہوا چوکے سے باہر نکل کر کہنے لگا "موسی آخر کار میں نے پریما سے بات چیت کر ہی لی۔ اس کی ضد میں نے توڑ دی۔" درگا نے خوش ہو کر کہا "وہ تمہارے ساتھ بچپن سے کھیلتی آئی ہے، کہاں تک شرما سکتی ہے۔"

گھر سے باہر نکلتے ہوئے راما نے کہا "اوہو میں ایک بات بھول ہی گیا موسی یہ دیکھو پریما کے لئے ایک جوڑا چوڑیوں کا لایا ہوں، پریما کو دے دینا۔" چوڑیوں کو دیکھ کر درگا بہت خوش ہوئی۔ چوڑیاں تھیں تو کانچ کی لیکن اس قسم کی قیمتی اور خوبصورت چوڑیاں اس وقت تک گاؤں میں کسی کو نصیب نہ ہوئی تھیں۔ درگا کے بلانے پر پریما چوکے سے باہر نکلی "دیکھ راما تیرے لئے کتنی خوبصورت چوڑیاں لایا ہے۔" یہ کہتے ہوئے درگا نے چوڑیاں پریما کی طرف بڑھائیں۔ پریما نے ہانپتے ہوئے ہاتھوں سے ان کو لیا اور دزدیدہ نگاہوں سے راما کی طرف دیکھا زبان سے تو اس نے کچھ نہ کہا لیکن شرمیلی آنکھوں سے سوال کیا "کیوں جی! یہ چوڑیاں کانچ کی ہیں یا پریم کی؟" راما نے بھی اس کا مطلب سمجھ لیا اور اشاروں میں جواب دیا "یہ پریم کی چوڑیاں ہیں۔"

(۴)

آسمان نے کروٹ لی، زمین نے موسم پلٹے اور دیکھتے ہی دیکھتے پانچ برس گزر گئے۔ اس دوران میں پنڈت گردھاری لال اور مہاراج رام جیاون بیکنٹھ سدھارے۔ اب ایک وجیہہ تجیم و شحیم جوان تھا۔ اس کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور اس نے اپنی زمینداری کا کام سنبھالا۔ لین دین بھی کھاتہ اس کے ہاتھ میں آیا تو اس کے مزاج میں رعونت پیدا ہو گئی۔ سب نشوں سے زیادہ تیز، زیادہ قاتل ثروت کا نشہ ہے۔ راما اس نشہ میں بے خود ہو گیا اور اپنے کاروبار میں اتنا منہمک ہوا کہ وہ بچپن کی محبت کو، پریما کے پریم کو رام جیاون مہاراج کی وضعداری کو بالکل بھول گیا اس نے ایک دن بھی بھولے سے بھی خبر نہ لی کہ یتیم پریما اور دکھیا درگا کی کیسی گزر رہی ہے۔

رام جیاون مہاراج کے کوئی جائداد تو تھی نہیں جس سے درگا کی چین سے بسر ہوتی، مہاراج کے مرنے پر دس بیس روپے گھر میں تھے بھی وہ اٹھیں کی کریا کرم میں ختم ہو گئے صرف ایک گائے گھر میں تھی، ماں بیٹی کی زندگی کا اب ایک یہی سہارا تھا۔ اس کا دودھ بیچ کر ان کی بسر اوقات ہوتی۔ کبھی کبھی فاقے بھی کرنا پڑتے

اسی حالت میں ایک دن درگا نے پریما سے کہا "جی میں آتا ہے کہ اپنی مصیبت کا حال راما بابو سے جا کر کہوں، کیا وہ ایسی حالت میں ہماری مدد نہ کریں گے؟"

پریما نے اداس ہو کر جواب دیا "نہیں اماں ان کے پاس جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ——— کیوں؟ جب ان کو خود خیال نہیں ہے تو ہمارے کہنے سے کیا ہوگا۔" "ایک دن کہہ کر تو دیکھوں مجھے تو پوری امید ہے کہ وہ ہماری غریبی پر رحم کریں گے، کیا تیرے باپ کا بھی ان کو کچھ خیال نہ ہوگا۔" مہاراج کا ذکر کرتے ہوئے دونوں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ تھوڑی دیر تک دونوں خوب جی بھر کے روئیں۔ جب کچھ جی ہلکا ہوا تو درگا نے کہا "بیٹی تو سچ کہتی ہے میں کسی کے پاس نہ جاؤں گی۔ جب ان کے جیتے جی میں نے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے تو اب ان کے مرنے پر بھیک مانگ کر ان کی آتما کو دکھ نہ پہنچاؤں گی۔"

اس کے بعد پھر دونوں میں اس قسم کی باتیں کبھی نہیں ہوئیں۔ ایک مرتبہ راما کی ماں تلسی نے درگا کو اناج بھیجا بھی لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا۔

سال بھر تک جس طرح بھی ہو سکا درگا نے دن کاٹے۔ پھٹے پرانے کپڑوں کو سی کر کسی طرح کام چلایا۔ لیکن برسات میں ایک نئی مصیبت آئی۔ ان کا گھر چھایا نہ گیا تھا۔ برسات میں کئی دن تک موسلا دھار پانی برسا تو اس کے مکان کا ایک حصہ گر پڑا۔ گائے وہاں بندھی ہوئی تھی دب کر مر گئی۔ اس نئی مصیبت نے ان پریشانیوں میں اور اضافہ کر دیا۔ گھر میں دو چار چاندی کے جو زیور بچے وہ بھی بک گئے، پریما نے راما کی دی ہوئی چوڑیاں ایک کپڑے میں باندھ کر پٹاری میں رکھ دی تھیں۔ راما کی یہی ایک یادگار تھی۔ پریما نے سوچا کہ اگر وہ ان کو پہنے رہے گی تو ٹوٹ جائیں گی۔ فکرِ معاش بڑی بُری بلا ہے۔ درگا اب کھیتوں اور چراگاہوں سے گوبر اٹھا لاتی پریما اُپلے تھاپتی اور درگا گاؤں میں بیچ آتی۔ کبھی گوبر نہ ملتا تو اور مصیبت ہوتی۔ کبھی کوئی اُپلے چرا لے جاتا تو فاقے کرنے پڑتے۔ دنیا کا بھی عجیب حال ہے۔ کوئی ہنس رہا ہے، کوئی رو رہا ہے۔ کسی کا گھر بھرا ہوا ہے کھانے والے نہیں کوئی رو رو کر زندگی کاٹتا ہے لیکن کوئی اس کا پرسانِ حال نہیں۔

(۴)

راما کی بیسویں سالگرہ کا دن تھا، دروازہ پر مردوں کا اور گھر میں عورتوں کا ہجوم تھا۔ ایک طرف گھی کی اور دوسری طرف تیل کی پوریاں پک رہی تھیں۔ گھی کی معزز موٹے برہمنوں کے لئے تیل کی فاقہ کش نیچوں کے لئے۔ راما کا گھر سوندھی سوندھی بُو کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ عورتیں سہانے گیت گا رہی تھیں۔ بچے خوش ہو ہو کر دوڑتے پھر رہے تھے۔ مالن پھولوں کا گجرا کیلے کی شاخیں لائی، کمہار ننھے ننھے چراغ لائے اور ہانڈیاں دے گئے۔ باری سرسبز ڈھاک کے پتل اور دونے دے گئے۔ کہار نے آکر کلسے میں پانی بھرا، بڑھئی نے راما کے لئے نئی پیڑھی بنائی۔ نائن نے آنگن لیپا اور چوک بنائی۔ راما جب نہا دھو کر اپنے نئے کپڑے پہن کر تیار ہو گیا تو ایک پنڈت جی کھڑاؤں کھٹ پٹ کرتے براجمان ہوئے۔ راما کو پیڑھی پر کھڑا کر کے اشلوک پڑھا، ایک کچا دھاگا سر سے پاؤں تک ناپ کر بیسویں گرہ لگائی۔ تِل ملا ہوا کچا دودھ پلایا ماتھے پر تلک لگا کر گلے میں پھولوں کا ہار ڈال کر آشیرباد دی۔ پنڈت جی بھلا چوک سے خالی ہاتھ کیسے اُٹھتے۔ ان کا پیٹ بہت بڑا اور خوب پھولا ہوا تھا۔ تلسی نے بھی اس موقع پر پنڈت جی کو خوب "دچھنا" دی اور پنڈت جی ہنسی خوشی گھر سے رخصت ہوئے۔ ان کے بعد نائی، دھوبی، بھاٹ، کہار، مالی وغیرہ کی باری آئی اور ان کو بھی انعام سے خوش کر دیا گیا۔ غرض اس دن نور پور میں سوائے درگا اور پریما کے کوئی اور راما کی چشمِ عنایت سے محروم نہ رہا۔

ادھر تو جشن کا یہ سامان تھا اور ادھر غریب درگا کے یہاں فاقہ تھا۔ کیونکہ ثروت کے نشہ میں سرشار زمیندار اپنے اس غریب آسامی کو نیوتہ دینا بھول گیا تھا۔ شام کو جب سب لوگ کھا پی کر چلے گئے تو اتفاقاً پریما کی یاد آئی اور اس نے اپنی ماں سے جا کر پوچھا "ماں جی کیا رام جیاون مہاراج کے یہاں سے کوئی نہیں آیا تھا؟"

"نہیں تو۔ کیا تم نے اُن کو نیوتہ نہیں دیا تھا؟"

"کیا وہ بغیر نیوتہ کے نہیں آ سکتی تھیں۔ وہ ہمارے آسامی ہیں؟"

"آسامی ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ مہاراج کے گھر کی اکڑ تو سارے گاؤں میں مشہور ہے۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے میں نے دو من اناج بھیجا تھا لیکن درگا نے واپس کر دیا۔ وہ عورت اپنے کو نہ جانے کیا سمجھتی ہے۔ جب تک مہاراج زندہ رہے ان کا آنا جانا رہا۔ ان کے مرتے ہی اس نے میرے

یہاں آنا چھوڑ دیا۔ بھلا بغیر فیتہ وہ ہمارے یہاں کیوں آنے لگی؟"

راما چپ چاپ اپنی ماں کی باتیں سنتا رہا اس کے بعد بولا "خیر درگا نہیں آئی تو اس سے ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوا مجھے ایک تھالی میں کچھ سیدھا دے دو میں اس کو جاکر دے آؤں؟"

تلسی نے کہا "جب تمہاری یہی مرضی ہے تو میں کل سیدھا کسی کے ہاتھ بھجوا دوں گی۔ تمہارے جانے کی وہاں کیا ضرورت ہے۔ لوگ سُنیں گے تو کیا کہیں گے تم خود سیدھا لے کر جاؤ گے تو درگا کے اور مزاج بڑھ جائیں گے۔"

لیکن راما نے ماں کا کہنا نہ مانا۔ اس وقت اس کے سامنے اس کا گزرا ہوا زمانہ تھا۔ پریما کی بچپن کی بے لوث محبت اس کے دل میں چٹکیاں لے رہی تھی۔ اُس نے تلسی سے سیدھے کی تھالی منگوائی اور اسی وقت درگا کے دروازہ پر پہنچ کر آواز دی۔ درگا نے دروازہ کھول کر کہا "کون؟"

راما نے جواب دیا "میں ہوں راما!"——

"ہمارے دھن بھاگ آئیے اندر آئیے۔ کیسے آج اس طرف مالک کیسے بھول کر آ گئے؟"

راما کے دل پر چوٹ سی لگی، اس نے شرمندہ ہو کر کہا "ایشور جانتا ہے کہ گھر کے کاروبار میں ایسا پھنسا رہتا ہوں کہ کسی وقت فرصت ہی نہیں ملتی؟"

اس کا کچھ جواب نہ دے کر درگا نے پریما کو آواز دی "بیٹی ذرا دیا جلا دے مالک اندھیرے میں کھڑے ہیں؟" پریما ایک طرف کونے میں میلی کچیلی دھوتی اوڑھے پڑی تھی۔ آج اس کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ ماں کی آواز سن کر وہ اٹھی اور آہستہ سے کہا "ماں جی ڈبّے میں تیل نہیں ہے؟"

اس کی آواز میں حسرت بھری تھی۔ گو پریما کو راما نے نہ دیکھا لیکن اس کی آواز سُن لی اور کہا "دیا جلانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے میں اب جا رہا ہوں۔ ماں جی نے تمہارے لئے اس تھالی میں کچھ بھیجا ہے؟" یہ کہہ کر راما نے تھالی بڑھائی لیکن درگا پیچھے ہٹ گئی اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا——

"مالک ہم اس کے بھوکے نہیں ہیں؟"

یہ روکھا جواب سن کر راما سناٹے میں آ گیا۔ غریبوں میں بھی خودداری کا مادّہ ہوتا ہے یہ اس کو معلوم نہ تھا۔ ایک غریب برہمنی نے اس کو ذلیل کیا اس کا اُس کو سخت صدمہ ہوا۔ اور وہ سیدھے کی تھالی لے کر درگا کے گھر سے نکل کر اپنے گھر واپس آ گیا۔ راما کے جانے کے بعد پریما نے اپنی ماں سے کہا "معلوم ہوتا ہے بابو جی ناراض ہو گئے ہیں؟" درگا نے جواب دیا "بھگوان راضی رہیں کسی کی ناراضگی کی کچھ پروا نہیں؟"

(۵)

پریما اب انیسویں سال میں تھی اس کی جوانی کا چاند بڑی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ حسن و رعنائی کی تمام خوبیاں قدرت نے فیاضی سے پریما کو عطا کی تھیں۔ اس کے انداز میں بھولا پن آواز میں نغمہ کی دل فریبی، آنکھوں میں حیا اور خیالات میں پاکیزگی تھی لیکن ان سب خوبیوں کے ہوتے ہوئے بھی اب تک اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ غریب کی جوانی جاڑوں کی چاندنی تھی، کوئی قدردان نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک غریب برہمن کی لڑکی تھی۔ "دان دہیز" دینے کے لئے درگا کے پاس کچھ نہ تھا۔ جوان جہان لڑکی کو دیکھ دیکھ کر اس کے گلے میں پانی نہ اترتا تھا۔ دو چار جگہ اس نے نسبت کا پیام بھی دیا لیکن کوئی دو سو سے کم دان لینے پر راضی نہ ہوا۔ دو سو روپیہ تو بہت ہوتے ہیں، گھر میں اتنے ٹھیکرے بھی نہ رہے ہوں گے۔ درگا گاؤں میں جس طرف نکلتی لوگ اس کو سنا سنا کر کہتے جوان لڑکی گھر میں بٹھا رکھی ہے بیاہ نہیں کرتی نہ جانے کیا ارادہ ہے۔ درگا لوگوں کے طعنے سُن کر شرم کے مارے پانی پانی ہو جاتی اس لئے گاؤں میں اُپلے بیچنا بند کر دئے۔ ایک دوسرے گاؤں میں اُپلے جاکر بیچنے لگی۔ وہاں بھی کچھ دنوں بعد لوگوں نے درگا کو دق کرنا شروع کر دیا۔ بے چاری کی جان بڑی مصیبت میں تھی۔ کبھی سوچتی گنگا جی میں ڈوب کر اپنی جان دے دے لیکن جب پریما کا خیال آتا تو اپنے ارادہ سے باز آ جاتی۔ اب درگا دن رات اسی فکر میں رنجیدہ رہنے لگی۔ بسا اوقات وہ پریما پر بھی خواہ مخواہ خفا ہو جاتی۔ ذرا سی بات پر جھڑک دیتی۔ اس پر اگر پریما رونے لگتی تو خود بھی اس کے ساتھ روتی ایک دوسرے کے دل کا حال جانتی تھی لیکن زبان پر نہ لا سکتی تھی۔ اس طرح دن گذر رہے تھے۔ ایک دن درگا کی ایک سہیلی گورا اس سے ملنے آئی تو اس نے

کہا: چچی پریا کا بیاہ کب کروگی؟ لڑکی بہت سیانی ہوگئی ہے اس کو کنواری بٹھا رکھنا بڑی شرم کی بات ہے۔ گاؤں بھر میں تمہاری بڑی بدنامی ہو رہی ہے۔"

درگا نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا: "بہن کیا بتاؤں بہت تلاش کرنے پر بھی اب تک کوئی بر ہی نہیں ملا۔"

گورا۔ یہ تو مجھے بھی معلوم ہے لیکن خاموش رہنے سے تو کام نہ چلے گا میرے خیال میں تم کو اب دیری نہیں کرنی چاہیئے۔

درگا۔ بہن تمہیں پریا کو کہیں ٹھکانے لگا دو بڑی کرپا ہوگی۔

گورا نے کہا: "اچھا میں دیکھوں گی۔" یہ کہہ کر گورا چلی گئی۔ دو چار دن بعد وہ پھر آئی، اس نے آتے ہی درگا سے کہا: "چچی مٹھائی کھلاؤ میں نے پریا کے لئے بر ڈھونڈھ لیا ہے۔" درگا نے خوش ہو کر کہا "کہاں؟"——

گورا۔ مہاراج بنسی دھر کو تو جانتی ہو۔

درگا۔ وہی نا جو امرچھ میں رہتے ہیں۔

گورا۔ ہاں ہاں وہی۔

درگا۔ ان کی تو عمر بہت زیادہ ہے وہ اب شادی کیوں کر رہے ہیں؟

گورا۔ عمر ضرور زیادہ ہے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ وہ مرد ہیں ان کی عمر کا کون خیال کرتا ہے۔ ان کی جتنی عمر ہے اس عمر میں تو بہت سے لوگ بیاہ کرتے ہیں۔ دوسری بُرا نہ مانو تو کہوں تمہاری لڑکی بھی بہت سیانی ہے۔ بر بالکل چھوکرا ہونے سے بھی تو کام نہیں چلے گا۔ میرا کہنا مانو تم اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ بڑے امیر ہیں۔ بیس پچیس بیگھے موروثی کاشتکاری ہے۔ تالاب، باغ سب ہی کچھ تو ہے۔ اور سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ وہ کچھ "دان" دہیز بھی نہ لیں گے۔ کہو منظور ہے کہ نہیں؟

درگا بنسی دھر کے ساتھ پریا کا بیاہ کرنے کے لئے کبھی راضی نہ ہوتی لیکن جب اس نے سُنا کہ "دان" دہیز بھی نہ دینا پڑے گا تو وہ مجبوراً راضی ہوگئی۔

گورا۔ ایک بات اور ہے وہ یہ کہ کل کچھ عورتیں مہاراج بنسی دھر کے یہاں سے پریا کو دیکھنے آئیں گی۔

درگا۔ بہن ایسا تو میرے یہاں کبھی نہیں ہوا۔ میرا ایک کھاگیں ہے۔ وہاں جب تک بیاہ نہیں ہو لیتا سسرال والے لڑکی کو نہیں دیکھ سکتے۔

گورا۔ خیر تم ایک کام کرو کل سویرے پریا کو نہلا کر صاف کپڑے پہنا دینا اور جب سے جب عورتیں میرے یہاں آئیں گی میں کسی بہانے سے پریا کو اپنے گھر بلا لے جاؤں گی۔ اس طرح وہ پریا کو دیکھ لیں گی۔ اس میں کوئی ہرج نہ ہوگا۔" درگا نے خوش ہو کر کہا "ہاں یہ ترکیب تو ٹھیک ہے۔"

"اچھا تو اب میں جاتی ہوں۔" یہ کہہ کر گورا اپنے گھر چلی گئی۔ درگا آج بہت خوش تھی اس نے اپنی پٹاری کھول کر ایک پھٹی پرانی دھوتی اور شلوکا نکال کر دھویا اور اس کی مرمت کر دی۔ صبح گورا سے یہ سب باتیں ہوئیں اور شام تک گاؤں بھر میں اس کی خبر ہوگئی۔ جس کسی نے بھی سُنا کہ درگا اپنی پھول سی لڑکی کا بیاہ بوڑھے کھوسٹ بنسی دھر سے کرنے والی ہے۔ اس نے افسوس کیا لیکن درگا نے کسی کے کہنے سننے کی کچھ پروا نہ کی۔ اُس کو اس کے سوائے کچھ خیال ہی نہ تھا کہ جس طرح بھی ہو پریا کا بیاہ ہو جائے اور "دان" دہیز نہ دینا پڑے۔ بدنامی ہوگی تو کیا اپنے فرض سے سبکدوش تو ہو جائے گی۔ پریا سے بھی کوئی بات چھپی نہ رہی۔ سب کچھ جان بوجھ کر بھی وہ کہہ ہی کیا سکتی تھی، وہ دردِ سر کا بہانہ کر کے شام سے لیٹ رہی اور چپکے چپکے ساری رات آنسو بہاتی رہی۔

(٦)

صبح کاذب کا وقت تھا چاند دھندلی دھندلی روشنی ڈال رہا تھا۔ درگا نے پریا کو بلا کر کہا: "بٹیا جلدی سے اٹھ اور گنگا مائی میں اشنان کر آ۔ لے یہ شلوکا اور دھوتی اس کو نہا کر پہن لینا۔ ہاں خوب یاد آیا ذرا ٹھہر جاؤ۔" درگا نے اپنی پٹاری کھولی اور اس میں سے لاکھ کی موٹی کانچ کی چوڑیاں نکالیں اور بولی "تیرے بدن پر کوئی زیور نہیں ہے میں اب تجھے بنوا دوں گی۔ آج تو یہ چوڑیاں پہن لے یہ بھی بہت خوبصورت اور قیمتی ہیں۔" پریا اب تک خاموش سر جھکائے بیٹھی تھی، چوڑیوں کو دیکھ کر گھبرا کر چلا اٹھی: "نہیں ماں نہیں میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں میں ان چوڑیوں کو نہیں پہنوں گی۔" درگا نے ڈانٹ کر کہا "پہنے گی کیسے نہیں۔ بس تجھ میں یہی تو ایک بڑا عیب

ہے کو پہنانا نہیں بنتی۔ یہ کہہ کر درگا نے زبردستی چوڑیاں پہنا دیں۔ پریما کو نہانے کے لئے بھیج کر آپ کسی دوسرے کام میں لگ گئی۔ آج ہی امرچھ سے جو میں جا کر ۔ کھینے آئیں گی۔ درگا کو جلدی تھی جس قدر جلد ممکن ہو پریما نہا دھو کر فارغ ہو جائے۔ پریما جب گھر سے نکلی تو اس وقت بھی اندھیرا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کچھ سوچتی ہوئی دریا کے کنارے پہنچی۔ ستاروں کی مدھم روشنی کے عکس سے دریا کا بعض بعض حصہ سانپ کی کینچلی کی طرح جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ تمام دنیا سنسان تھی۔ دریا کے کنارے پریما نے دھوتی اور شلوکا ایک طرف پھینک دیا گنگا مائی کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور بولی " ماتا! میں سنے کون سا پاپ کیا ہے جو سب کی آنکھوں میں کانٹا بن رہی ہوں۔ کیا میرے لئے دنیا میں کہیں ٹھکانا نہیں ہے جو تیری ماں مجھے آگ میں جھونکنے کے لئے تیار ہو گئی۔ ماتا! میرے دل میں جس کی محبت بچپن سے تھی وہی بیگانہ ہو گیا تو اب دنیا میں مجھے کسی سے کچھ امید نہیں ہے۔

ماتا! کیا تم بتا سکتی ہو کہ راما نے مجھے کیوں بھلا دیا۔ ماتا! تم جواب کیوں نہیں دیتی ہو۔ اچھا میں سمجھ گئی۔ تم کہتی ہو کہ ان کا نام جپو لیکن میں تو ان کا نام آج سے نہیں بلکہ بالے پن سے جپتی رہی ہوں جب بھی وہ میرے نہیں ہوئے۔ ماں! میں دھرتی ماتا کی چھاتی کا بوجھ ہو رہی ہوں تم اس دکھیا کو اپنی گود میں چھپا لو میں تمہارے سرن میں آتی ہوں۔ پریما کی فریاد سن کر چاند کی نظر گئی ہوئی کرنیں بادلوں پر لوٹنے لگیں اور گنگا مائی کی لہریں اپنا سر پٹکنے لگیں۔ پریما آگے بڑھی پھر کچھ سوچ کر رکی اور اپنے ہاتھوں سے چوڑیاں اتار ڈالیں اور یہ کہہ کر کہ میں تو پریم کی چوڑیاں پہنے ہوئے ہوں ان کانچ کی چوڑیوں کی ضرورت نہیں۔ ان کو توڑ کر ایک طرف زمین پر پھینک دیا۔ جن چوڑیوں کو وہ کبھی اپنی جان و دل سے بھی زیادہ عزیز سمجھتی تھی انہیں چوڑیوں کو آج اس نے خود اپنے ہاتھوں سے توڑ ڈالا اور پانی میں ایک قدم بڑھایا ٹھیک اسی وقت کسی کی آواز سنائی دی۔۔۔۔

"پریما! پریما! ٹھہرو۔ مجھ سے غلطی ہوئی مجھ سے بھول ہوئی تم مجھے معاف کر دو۔ تم میری غلطی کی سزا تمہارا جو جی چاہے دے سکتی ہو۔ لیکن جو کچھ تم کرنے جا رہی ہو یہ سزا میرے لئے ناقابلِ برداشت ہو گی۔ پریما زور اور طاقت سے کانچ کی چوڑیاں توڑی جا سکتی ہیں لیکن پریم کا بندھن پریم کی چوڑیوں کا تعلق کبھی تو ٹوٹنے والا نہیں۔ اس کے توڑنے کی طاقت نہ تم میں ہے، اور نہ مجھ میں ہے۔ پریما جو میں نہیں کر سکا اس کو تم بھی نہیں کر سکتیں" یہ راما کی آواز تھی جو اتفاقاً اس وقت گنگا اشنان کرنے کے لئے وہاں آگیا تھا۔ اس نے پریما کی فریاد سنی۔ پریما کا خوبصورت چہرہ دیکھا پریم کی چوڑیاں توڑتے اور ان کو پھینکتے دیکھا اس نے آگے بڑھ کر ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کو اٹھا لیا۔ ثابت و جنے رہیں جن کی اس نے کبھی کچھ قدر نہ کی تھی معمولی کانچ کی چوڑیاں آج ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اس کے دل پہ تیر و نشتر کا کام کر گئیں۔ دل کی گہرائیوں میں خوابیدہ محبت نے ایک کروٹ لی۔ بچپن کی محبت نے زور مارا اور قبل اس کے کہ پریما اپنی چاند سی صورت کو گنگا مائی کی لہروں میں چھپائے راما نے پھرتی کے ساتھ آگے بڑھ کر پریما کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر پانی سے باہر نکال لیا۔ جس طرح ہوا کے جھونکے سے درخت کا ایک ایک پتہ کانپنے لگتا ہے اسی طرح راما نے جب پریما کی بانہہ پکڑی تو جوشِ محبت سے پریما کا ایک ایک عضو کانپ اٹھا اور وہ راما کے قدموں میں جھک گئی۔ محبت کے آنسو دونوں کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ اس وقت بادِ سحر مستی سے جھومنے لگی تارے صاف ہو گئے اور صبح ہو گئی۔ رنج و غم کا کہیں نشان بھی نہ رہا۔

کچھ دنوں کے بعد اچھی ساعت میں راما نے پریما کے ساتھ بڑی دھوم دھام کے ساتھ بیاہ کیا۔ درگا اس مبارک شادی کے بعد بھی کئی سال تک زندہ رہی لیکن اس وضع دار اور آن پر مرنے والی عورت نے اپنی جھونپڑی چھوڑ کر داماد کے یہاں رہنا کبھی گوارا نہ کیا۔

حکیم احمد شجاع

اندھا دیوتا

(۱)

اسلم دہلی کے ایک مشہور اور دولت مند سوداگر کا بیٹا تھا۔ اس کے باپ نے اپنے بزرگوں سے کوئی دولت ورثے میں نہیں پائی تھی۔ جو کچھ کمایا، اپنے دست و بازو کی ہمت اور دماغ کی ذہانت کی بدولت۔ جو کچھ بچایا اپنی ان تھک کوششوں اور کفایت شعاریوں کے باعث۔ اسلم کی ماں جوان عمر ہی میں داغ مفارقت دے گئی تھی۔ اس وقت اسلم بچہ تھا۔ اُس کے باپ نے اپنی نیک دل اور حسرت نصیب بیوی کی یاد نہ بھلانے اور اسلم کو سوتیلی ماں کی زیادتیوں سے بچانے کی غرض سے پھر شادی نہ کی۔

اسلم ایم اے کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد قانون پڑھنے کے لئے لاہور کے لا کالج میں داخل ہو گیا۔ وہ پہلے امتحان میں کامیاب ہوا ہی تھا کہ اس کے والد یک لخت بیمار ہو گئے اور اس مہلک مرض سے جانبر نہ ہو سکے۔ اسلم کو اپنے باپ کی ناگہاں موت کا بے انتہا صدمہ ہوا۔ اس لئے نہیں کہ وہ اسے بے سرو سامان چھوڑ کر چل بسے تھے۔ حساب کتاب کی جانچ پڑتال کے بعد اس پر اپنے باپ کی کفایت شعار زندگی کی حقیقت روشن ہوئی۔ منیجر کے پاس پچھتر ہزار روپیہ کے نقد پونڈ تھے۔ ساڑھے تین لاکھ روپے مختلف بنکوں میں جمع تھے اور قریب قریب دو لاکھ روپے کی مالیت کا سامان اس کے تجارت خانوں میں موجود تھا۔ شہر میں دس عظیم الشان مکان اور انگریزی آبادی میں بارہ بنگلے تھے۔ جہاں تک زندگی کی آسائشوں کا تعلق تھا۔ ان میں کوئی کمی نہ تھی۔ روپیہ پیسہ ضرورت سے زیادہ تھا۔ اور وسائل آمد مستقل۔ اسلم کو باپ کی موت کا صدمہ اس لئے ہوا کہ اس دنیا میں ان کے سوا اس کا کوئی اور رشتہ دار نہ تھا۔ اس کی ماں ایک غریب گھرانے کی یتیم اور لاوارث لڑکی تھی اور اس کے باپ کے تمام قریبی رشتہ دار یکے بعد دیگرے راہی عالم بقا ہو چکے تھے۔ اب اس بھری دنیا میں وہ اپنی دولت اور لیاقت کے باوجود بالکل اکیلا تھا۔ شکل و صورت، وضع قطع، عادات اور خیالات کے لحاظ سے اسلم ایک قابل رشک انسان تھا۔ جس طرف جاتا، لوگوں کی انگلیاں اٹھ جاتیں۔ اس کے ڈھیلے ڈھالے انگریزی وضع کے کپڑے۔ اس کے دراز لمبے بال، اس کی مستانہ چال میں ایک حسین ادا پیدا کر دیتے تھے۔ اس کے سرخ و سفید چہرے پر اس کی بڑی بڑی۔ روشن آنکھیں اور چھوٹی چھوٹی سیاہ

مونچھیں بہت زیب دیتی تھیں۔ اگرچہ اس کے لبوں پہ ایک غیر فانی، مسکراہٹ ہمیشہ ایک کھلے ہوئے چمن کی بہار کا پتہ دیتی تھی۔ مگر اس کے کشادہ سینے کی تہوں کے نیچے ایک یاس انگیز اور حسرت مند دل تھا۔ اسلم دولت اور عزت کی موجودگی میں بھی خوش نہ تھا۔ اُس کے دوست اس سے ملنے آتے۔ وہ وہاں کی خاطر تواضع میں کوئی بخل نہ روا رکھتا ——— مگر اس کا ہر دوست یہی محسوس کرتا چلا جاتا کہ اسلم خوش نہیں۔ آخر اس کے دوستوں میں خصوصاً اور واقفوں میں عموماً اس بات کا چرچا ہونے لگا کہ اسلم کا دل کسی غیر معمولی غم کے بارگراں سے دبا رہتا ہے۔

باپ کی موجودگی اسلم کے لئے ایک طلسم تھا۔ جو اُن کی وفات کے ساتھ ہی ٹوٹ گیا۔ تھوڑے دنوں بعد ہی اُس نے اپنی زندگی میں کچھ کمی محسوس کی اور اس کو اپنا گھر کچھ خالی خالی سا نظر آنے لگا۔ نوکر، چاکر، منیم، منشی سب ہی موجود تھے، مگر ان میں ایسا کوئی نہ تھا جس کو وہ اپنے دل کی بات بتاتا۔ جس کا خیال اس کو کام کرنے کے وقت یا آرام کی ساعتوں میں بے چین کر دیتا۔

اسلم فطری طور پر فلسفی مزاج تھا۔ اس پہ چار پانچ سال کی فلسفے کی تعلیم اور دن رات کی محنت نے اس فلسفیت کو ایک خاص روش عمل بخش دی تھی۔ اور وہ بڑی کامیابی سے ہر عقدے کا حل سوچ لیتا تھا۔ اس نے اس اضطراب اور زندگی کی نعمتوں کے باوجود اس خلا کے احساس کا تجزیہ کیا اور پھر اس عقدے کو حل کر لیا۔

اس نے محسوس کیا کہ اس کو ایک رفیق حیات کی ضرورت ہے جو اس کی خوشی سے خوش ہو اور اس کے غم سے مغموم۔ جو اس کی خوابیدہ طاقتوں کو بیدار کرے۔ اس کے منجمد دل کو محبت کی آگ سے گداز کرے۔ اور خود اس محبت کا آئینہ بن کر اس کی زندگی کو ایک میٹھے لطف سے مسرور کر دے۔ ظاہر تھا کہ ایک عورت کے سوا اس کے دل کو ان کیف آور مسرتوں سے کوئی چیز سرشار نہیں کر سکتی تھی .... مگر .... آہ یہ ایک بہت ٹیڑھا سوال تھا۔ کیا اسلم چار برس سے اس سوال کے بلاخیز گرداب میں چکر نہیں کھا رہا تھا۔ اس نے کتنی شادیوں کا عبرتناک انجام دیکھا، اور ان سے سبق حاصل کیا۔ کتنی کتابیں غلط؟ ازدواج کے متعلق پڑھیں۔ اور ان کو آہ و سرد بھر بھر کر ختم کیا۔ یہی سوال اسلم کے لئے زندگی اور موت کا سوال تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی دولت، اس کا حُسن، اس کی وجاہت، حسین سے حسین صورت خرید سکتی ہے۔ مگر اُسے یہ بھی علم تھا کہ یہ تمام دولت محبت کی ایک جھلک بھی نہیں خرید سکتی۔ وہ حُسنِ صورت اور شرافتِ طبع کو صرف محبت کے زیور سمجھتا تھا اس کے نزدیک حقیقی حُسن محبت میں تھا۔ صورت اور سیرت کی خوبیاں محبت کے بغیر ایسی تھیں، جیسے ایک پتھر کے حسین بت کو آراستہ کر دیا جائے۔ یا ایک خوبصورت اور نیک سیرت عورت کے جسم سے اس کا دل نکال لیا جائے۔

چار برس سے وہ اسی تلاش میں تھا۔ ایک بار بمبئی گیا۔ اور وہاں مختلف عورتوں کے چہروں میں اس محبت کو تلاش کرنا چاہا۔ ہاں محبت کے متعلق اسلم کا نظریہ یہ بھی تھا کہ یہ جذبہ بالکل فوریٔ اضطراری اور بے اختیاری ہے۔ اور ایک ہی نظر میں پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ محبت کہ جو آہستہ آہستہ ترقی کے مدارج طے کرے۔ یا جو صرف اس لئے معرضِ وجود میں آ جائے کہ ایک انسان کسی دوسرے انسان کی زندگی کیلئے ضروری اور مفید ہے۔ محبت نہیں، پسند ہے۔ لوگ محبت اور پسند میں اسی طرح تمیز نہیں کرتے۔ جس طرح دوستی اور رفاقت میں، یا پرستش اور عزت میں۔

اسی طرح وہ جہاں جہاں جا سکا، گیا۔ جس جس چہرے تک اُس کی رسائی ہو سکتی تھی، وہ پہنچا۔ کیونکہ صحبت یا گفتگو ان میں سے کسی چیز سے اُسے واسطہ نہیں تھا۔ وہ محبت کو پہلی نظر کی تیز شعاعوں میں ڈھونڈتا تھا۔ مگر وہ ہمیشہ اپنے دل کو اسی کیفیت بارہ میں دیکھ کر سر جھکا لیتا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آتیں۔ اور پھر ایک گہری اور ٹھنڈی آہ بھر کر سگریٹ پینے لگ جاتا۔

سگریٹ اُس نے اسی دن سے پینا شروع کیا تھا۔ جس دن سے یہ اُمنگ اُس کے دل میں پیدا ہوئی تھی۔ آرزو سے ناکام اپنی حسرت کبھی اور داغ ناتمام سے مٹانا چاہتی تھی۔ سگریٹ اس مصروفیت کے لئے بہت اچھا بہانہ تھا۔ اس لئے اب جب کہ اس کے دل کی حسرت پوری ہوتی دکھائی نہ دیتی تھی اس کو اپنا دل بہلانے کے لئے سگریٹ ہی ایک دلکش کھلونا نظر آتا تھا۔ وہ اب اپنا بہت سا وقت سگریٹ پینے ہی میں صرف کرتا تھا۔ کسی خاص نشے کی مجبوری یا عادت کے تقاضے سے نہیں۔ بلکہ محض اس طرح جس طرح ایک معصوم بچہ کسی دلکش کھلونے سے کھیلتا رہتا ہے۔

اب اس آرزو کے شعلے اُسے دن بھر بے قرار رکھتے تھے۔ وہ رات بھر اپنی آئندہ صبح کا دستور العمل تیار کرتا رہتا تھا۔ مگر ہر صبح اس کی ناکامی کی قبر پہ آنسو بہا کر پردۂ عدم میں چھپ جاتی تھی۔

اس کے دوست، جن سے اسے کبھی محبت نہ تھی۔ اب اُسے بُرے معلوم ہوتے تھے۔ عیش و آرام ایک شریک کی شرکت کے بغیر ڈراؤنا نظر آتا تھا۔ زندگی بے معنی معلوم ہوتی تھی۔ آئینہ شاید اس کا سب سے زیادہ مہلک دشمن تھا۔ جب وہ اپنی صورت آئینے میں دیکھتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ خود ہی اپنا منہ چڑا رہا ہے۔

ایک شب اُس کا دل سیاہ رات کی طرح بے چراغ تھا۔ امید کا ٹمٹماتا ہوا چراغ ہر رمنہ کی مایوسیوں نے بجھا دیا تھا۔ اور وہ اپنی آئندہ زندگی کے لئے ایک دستور العمل سوچ رہا تھا۔ مگر ہر دستور العمل تاریک تھا۔ بیکار تھا......... آخر اس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ وہ اپنی زندگی کے جہاز کو ڈوبنے سے قبل بچانے کی کوشش کرے گا۔ اس سے پیشتر کہ محبت کے امکان کی اُمید کو وہ ہمیشہ کے لئے دل سے مٹا دے اس کے لئے ایک دفعہ سب سے بڑا موقع تلاش کرے گا۔ اس کے دل کی وہی کیفیت تھی۔ جو ایک ایسے بوڑھے دولت مند کے دل کی ہوتی ہے جو اپنی عمر بھر کی کمائی کے لئے ایک جائز وارث کی نہ پوری ہونے والی تمنا سے زندگی کو حرارت دیتا رہتا ہے۔

اسلم نے تہیہ کر لیا کہ وہ یورپ کا ایک دورہ کرے گا۔ کسی تعلیمی یا تجارتی غرض سے نہیں۔ بلکہ صرف محبت کی تلاش میں اُس زندہ متحرک بت کی تلاش میں، جو اس سے محبت کر سکے اور اس کی پرستش کے قابل ہو۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اُس کے وطن میں حسن اور محبت کے نظارے منظر عام پر میسر نہیں آ سکتے۔ اس ملک کی بہترین دولت مقفل گھروں اور تہ در تہ پردوں میں چھپی ہوئی ہے۔

یورپ میں شاید، حسن اپنی بیباک کیفیت۔ بے حجابی میں اُس کے منجمد دل کو پگھلا دے۔ اس کی بے قرار آنکھیں، شاید وہاں اس خیالی آرزو کی چلتی پھرتی تصویر دیکھ پائیں.........

وہ یورپ گیا، اور اُس نے تین برس تک یورپ کے کونے کونے کی خاک چھان ماری۔ لیکن شاہد آرزو، کسی سراب خیالی کے نظر فریب ھیولوں کی طرح اور دُور ہوتا چلا گیا۔ اسلم کی پیاس بھی اس تعاقب اور گرم روی سے، اس شوق اور حسرت کی تلخ کامی اور تپش سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔

وہ واپس آیا۔ مگر اب اسلم وہ اسلم نہ تھا۔ وفور درد کے اس احساس کش اثر کی طرح جو کسی بیمار کو آرام اور درد دونوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اس ناکامی تمنا نے اس کو آرام اور تکلیف، محبت اور نفرت، زندگی اور موت کے خطروں سے آزاد کر دیا تھا۔

اب وہ اس دنیا کی مادیت کا قائل تھا۔ اور اپنے آپ کو اپنی ذات میں فنا کر دینا چاہتا تھا۔ اُس نے اب شہر سے دُور ایک خوش نما بنگلہ بنایا بہترین سامان آرائش سے سجایا۔ مگر زیادہ تر اُس کا وقت کتب خانے میں گزرتا تھا، جسے اس نے ہر نایاب اور قابل دید کتاب سے آراستہ

کر سکا تھا۔ ہاں اُس کے بنگلے میں کوئی تصویر نہ تھی۔ وہ تصویروں سے ڈرتا تھا۔ کیونکہ وہ زندہ انسانوں کی تصویریں ہوتی ہیں۔ خوبصورت عورتوں کی تصویریں ہوتی ہیں۔ ان عورتوں کی جن میں سے کوئی بھی .... آہ .... اس کے لئے .... نہ تھی ......

۲۱

ایک دن شام کو اسلم اپنے کتب خانے میں آرام کرسی پر بیٹھا غور کر رہا تھا کہ شاید کسی چیز کو کبھی نہ بھولنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اسے بھلا دینے کی کوشش کی جائے۔ کیونکہ وہ خیال جس کو بھلانے کے لئے وہ اس قدر محنت، دولت اور وقت صرف کر رہا تھا، روز بروز، ساعت بساعت زیادہ تیزی کے ساتھ اس کے دل نشین ہو رہا تھا۔

وہ آج صبح ہی سے اپنے کتب خانے میں تھا، اور ایک ایسے قمار باز کی طرح، جو روزانہ کی ہار سے مایوس ہو کر اپنی تمام باقیماندہ دولت ایک ہی بازی پر لگانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اس نے آج یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ آج شام سے پہلے پہلے دریافت کرے گا کہ محبت کی کوئی ہستی بھی ہے کہ نہیں۔

کتابیں جو مضمون، زبان اور طرز نگارش کے اعتبار سے ایک دوسری سے مختلف تھیں، چاروں طرف کھلی پڑی تھیں۔ وہ کبھی ایک کے ورق الٹتا، کبھی دوسری کو اٹھا کر دیکھتا۔ کبھی ان سے باتیں کرتا اور پھر خود ہی ہنس دیتا۔ یہ معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی نادانی پر ہنس رہا ہے، یا ان کتابوں کی ناکامی پر۔ وہ گویا ایک شرابی تھا۔ جو اردگرد کی تمام چیزوں کو مدہوش سمجھتا ہے، اور ان سے بیجا دست درازی کرنے لگتا ہے۔

اب اس کی شفاف پیشانی پر غصے کی جھلک دکھائی دی۔ اس کی آنکھوں میں کسی اندرونی صدمے سے آنسو بھر آئے۔ اس نے زور سے وہ کتاب جو اس کے ہاتھ میں تھی، زمین پر پٹک دی۔ اور چلا اٹھا۔ "سب جھوٹ، سب دھوکا ہے۔ یہ صرف انسان کو بیوقوف بنانے کی تدبیریں ہیں"

اس کے داہنے ہاتھ کی دو انگلیوں میں ایک سگریٹ جل رہا تھا اور وہ اس کی موجودگی کے اثرات سے بالکل بے خبر تھا۔ وہ اٹھا۔ اس کے چہرے سے تھکن، اس کی آنکھوں سے مایوسی، اور اس کی حرکات سے بے چینی ظاہر تھی۔ اب اس نے کمرے میں ٹہلنا شروع کیا۔ معلوم ہوتا تھا اس کا دماغ بھی اس کے جسم کی طرح متحرک اور مصروف ہے۔

اس نے ایک اور سگریٹ جلایا، اور دیا سلائی کی جگہ سگریٹ پھینک کر دیا سلائی منہ سے لگالی، پھر اس نے خود ہی حرکت کو سمجھنے کی کوشش کی پھر وہ ہنسا۔ اب وہ بڑی متانت اور سنجیدگی سے دیوار میں نظریں گاڑے کچھ سوچ رہا تھا۔ اور اپنے خیالات کو خود ہی سننے کے لئے الفاظ میں منتقل کر رہا تھا۔

"بس اس طرح جس طرح میں نے یہ جلتا ہوا سگریٹ پھینک کر ایک بجھی ہوئی بیکار دیا سلائی اپنے منہ سے لگالی تھی، لوگ اس مفید اور کارآمد دنیا کے مشاغل چھوڑ کر ایک بے معنی خیال، ایک بے حقیقت ہستی کی فکر میں مستغرق رہتے ہیں .... محبت نہ صرف ایک بے معنی لفظ ہے بلکہ جھوٹ ہے۔ جیسے انسان عاشق ہوتا ہے۔ ایک فریب ہے۔ جس میں بیکار لوگ اپنے آپ کو مبتلا کر لیتے ہیں۔ ایک مرض ہے۔ جو وقتاً فوقتاً کمزور دماغوں کو لاحق ہو جاتا ہے ...."

آہ غریب اسلم! شاید تجھے معلوم نہیں کہ محبت کی مخالفت ہی سب سے بڑی علامت ہے۔ اور شاید اس وقت جب تو اس شدت سے اس کی ہستی کا انکار کر تا چلا جاتا ہے۔ محبت کا تیرانداز دیوتا تیرے دل کو للچائی ہوئی نگاہوں سے تاک رہا ہے۔

وہ جھکی جھکی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ وہ دماغ کو کسی اور خیال میں مصروف کرنا چاہتا تھا مگر اس کوشش کی ناکامی اس کی آنکھوں سے

اضطرار سے ظاہر تھی۔ یک لخت اُس نے ایک جست بھری۔ میز کے قریب آیا۔ اور گھنٹی پہ زور سے ہاتھ مارا........ ۔اس کے چہرے پر اب تسکین تھی، گویا اُس نے کوئی بڑا عقدہ حل کر لیا تھا۔

ایک معتبر صورت ملازم داخل ہُوا، اور "سرکار" کہہ کر چپ چاپ کھڑا ہو گیا، اسلم نے کچھ نہ سُنا۔ اور پھر بہت زور سے گھنٹی پہ ہاتھ مارا۔ وہ ایک بچے کی طرح اپنے خیال سے کھیل رہا تھا۔ ملازم نے ذرا آگے بڑھ کر، اور ذرا بلند آواز سے یاد دلایا۔

"میں حاضر ہوں سرکار!"

اسلم نے اس کی طرف دیکھے بغیر گاڑی تیار کرنے کا حکم دیا۔ اور ابھی ملازم دو قدم ہی چلا ہوگا کہ وہ زور سے چلایا "جلدی بہت جلدی"

اب وہ ایک لمحے کے لئے بھی اس کمرے میں نہیں ٹھہرنا چاہتا تھا۔ اس آواز نے ملازم کے اعصاب پہ ایک برقی اثر پیدا کیا، اور وہ بھاگا .... ابھی دو منٹ بھی نہ گذرے ہوں گے کہ اسلم بالکل بے قرار ہو گیا ——— وہ حیران تھا کہ کیا گاڑی تیار کرنے کے لئے دو مکمل دنوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے ——— وہ وقت کا ناقابل برداشت بوجھ محسوس کر رہا تھا۔ اسے آج وقت آہستہ آہستہ رینگتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ وہ بے صبری سے باہر نکلا اور گاڑی کو اپنے دروازے کے سامنے نہ دیکھ کر آج پہلی مرتبہ سائیس کو اس کے کام کی اہمیت، اور اپنے وقت کی قیمت بتانے کے لئے اصطبل کی طرف چلا ——— وہ صرف وقت کو صرف کرنا چاہتا تھا ———

اصطبل کے دروازے پہ پہنچ کر اسے بڑی حیرت ہوئی، اس کو توقع تھی کہ وہ سائیس کو حقہ پیتے ہوئے، ملازم کو باتیں کرتے ہوئے اور گھوڑے کو ابھی تھان پہ بندھے ہوئے پائے گا۔ مگر وہاں معاملہ بالکل برعکس تھا ——— سب ملازم غیر معمولی دلچسپی اور تیزی سے گاڑی تیار کرنے میں مصروف تھے ——— سائیس کی لڑکی دُھنیا بھی ایک جھاڑن سے گاڑی صاف کر رہی تھی ———

وہ اپنے حکم کی تعمیل کو ایک عملی شکل میں منتقل دیکھ کر خوش ہُوا، اُسے اپنے لفظ کی اہمیت کا احساس ہُوا۔ خدا کے اتنے بندے اس کا حکم ماننے کیلئے اپنی تمام قوتیں صرف کر رہے تھے، وہ دو چار قدم آگے بڑھ گیا، اب اس کی آنکھیں صرف ایک حرکت کو اپنی آنکھوں کے محدود حلقوں میں جذب کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس کا دماغ صرف ایک حرکت کو سمجھنے میں مستغرق تھا، یہ حرکت ایک نازک سانولے، چاندی کے کنگن والے ہاتھ کی تھی ——— جو گاڑی کو صاف کرنے میں مصروف تھا، دھنیا، کی پشت اسلم کی طرف تھی، ———

وہ صرف ایک بلند، سڈول، اور صحت مند جسم کے حسن کو دیکھ رہا تھا اور صرف اس سانولے ہاتھ کو جو برابر اِدھر اُدھر حرکت کر رہا تھا.......

اسلم کا پاؤں ایک اینٹ سے جو راستہ میں پڑی تھی ٹکرا۔ ایک آہٹ پیدا ہوئی، اور وہ سب لوگ جو گاڑی تیار کر رہے تھے۔ اِدھر متوجہ ہو گئے........

مگر اسلم کچھ نہ دیکھ سکا۔ اس کی آنکھوں نے پہلے کسی دُور دراز پہاڑ پہ چمکنے والی بجلی کی چمک دیکھی۔ پھر ایک برسات کی چڑھی ہوئی ندی کی روانی دیکھی۔ اور پھر اس کے لئے دنیا تاریک ہو گئی۔

دُھنیا اپنے آقا کو دیکھتے ہی شرما چکی تھی، اور جھاڑن پھینک کر تیزی سے اپنی کوٹھڑی کی طرف دوڑ کر غائب ہو چکی تھی ———

اسلم کچھ سمجھ نہ سکا، سائیس گاڑی دروازے پہ لایا۔ اسلم چپ چاپ سوار ہو گیا، سائیس حکم کا منتظر تھا۔ اسلم ذرا گھبرا کر چونکا اور "چلو" کہہ کر پھر خاموش ہو گیا۔ گاڑی چلی، اسلم نے ایک جذبۂ بے اختیار سے مڑ کر اصطبل کی طرف دیکھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ کوئی قیمتی چیز

گھور بیٹھا ہے۔ یا اس گلی میں جس کا نام اسلم ہے، کیسی اہم تبدیلی واقع ہوگئی ہے۔ وہ اس تصویر کو ایک بار پھر دیکھنا چاہتا تھا۔ جو اس کے ذہن میں موجود تھی۔ مگر اس کی آنکھوں کے سامنے نہ تھی۔

ابھی گاڑی نے مشکل سے کوئی دس گز کا فاصلہ طے کیا ہوگا۔ کہ اسلم نے سائیس کو واپس ہونے کا حکم دیا۔ خیر یہ چالاک اور تندرست گھوڑا اس قدر جلدی مڑنے پر بھڑکا، بوڑھے سائیس نے اپنے کمزور ہاتھوں کی طاقت کے اظہار کے لئے گھوڑے کو ایک چابک رسید کیا۔ گھوڑا ایک ایسے غیور اور باحمیت شخص کی طرح جو اپنی بے بسی کی حالت میں ذرا سی سُبکی کو اپنی انتہائی ذلت سمجھ کر بگڑ جاتا ہے، بگڑا اور اس نے تین چار ایسی چوکڑیاں بھریں کہ گاڑی اصطبل کے دروازے کے سامنے آ کر اُلٹ گئی۔ سائیس نے گرتے ہی ایک چیخ ماری۔ گاڑی کے اُلٹنے کی آواز، گھوڑے کی تڑپ کا شور اور سائیس کی چیخ سُن کر نوکر چاکر اصطبل اور کوٹھی سے بھاگے، ان میں دھنیا بھی تھی۔

سائیس کو کوئی چوٹ نہ آئی۔ مگر اسلم گاڑی سے کوئی سات آٹھ قدم پرے گر کر بے ہوش ہو چکا تھا۔ ہمدردی اور غمگساری کے اُس فطری تقاضے سے مجبور ہو کر جو عورت کو مرد کے لئے ایک لازوال نعمت بنا دیتا ہے۔ دھنیا اسلم کی طرف دوڑی اور پھر کچھ سمجھ کر پلٹی، وہ ساتھ ہی کے نل سے پانی کا ایک چلو بھر کر لائی اور اس سے پیشتر کہ مرد نوکروں کا وہ متحیر اور ششدر ہجوم غفیر کچھ کر سکتا۔ ایک عورت نے اپنے انہیں نازک سانولے اور چاندی کے کنگنوں والے ہاتھوں سے اسلم کے چہرے پر پانی کے دو چھینٹے دئے۔

اسلم نے ذرا تڑپ کر آنکھیں جھپکیں، اور پھر وہ ٹکٹکی لگا کر اس عورت کو جو اب اپنی پوری شان بے حجابی سے اس کے سامنے تھی، دیکھنے لگا، دھنیا نے پانی کے بے شمار قطروں کو جو موتیوں کی طرح اسلم کے چہرے پہ ڈھلک رہے تھے اپنے آنچل سے صاف کر دیا۔

دھنیا سائیس کی بیٹی تھی، مگر عورت تھی، عورت اپنے فرض کی ادائیگی میں وقت، موقع اور محل کی تلاش نہیں کرتی، جس طرح محض قدرت کی طرف سے کسی خاص جڑی بوٹی میں اکسیر کا اثر ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح عورت کے ہاتھ میں مسیحائی اثر ہے۔ اس کا ذرا سا اشارہ، اس کا ہلکا سا سہارا برسوں کی تکلیف اور مدتوں کے آلام کو زائل کر دینے کے لئے کافی ہے۔ دُکھے ہوئے دلوں کی تسکین، برباد گھروں کی آبادی، قدرتی بیماریوں کا قدرتی علاج صرف عورت ہے۔

وہ اپنا فرض ادا کر چکنے کے بعد چلی، اسلم کی پُرنم نگاہیں، جن میں احسان مندی اور شکر گزاری موجزن تھی، ایک کمزور اور تھکے ہوئے گداگر مند بھکاری کی طرح اس کے پیچھے پیچھے جا رہی تھیں ....

اور اسلم کی آنکھوں سے دُور اس کی عظمت و منزلت سے بے پروا ایک اندھا دیوتا اس کے دل پر تیر اندازی کی مشق کر رہا تھا۔

(۳)

آج اسلم اپنی کوٹھی کے ہشت پہلو کمرے میں ایک خوبصورت اور آرام دہ صوفے پر رنگین اور ریشمیں تکیوں کے سہارے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر سکون تھا، وہ سکون جو کسی لمبی اور خوفناک بیماری کے بعد چہرے پر ظاہر ہوتا ہے۔ وہ سکون جو ایک خوفناک طوفان کے بعد سمندر کی سطح پر نمایاں ہو جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا ہر عضو آرام اور اطمینان کے مزے لے رہا ہے۔ یہ ہشت پہلو کمرہ کوٹھی کا سب سے زیادہ شاندار اور آراستہ کمرہ تھا۔ مگر اسلم آج دوسری ہی مرتبہ اس کمرے میں آیا تھا۔ ہاں اس کمرے کی ایک ہی کمی، جو ہر قسم کی تصویروں کی غیر موجودگی سے، ہر دیکھنے والے کو محسوس ہوا کرتی تھی، پوری کر دی گئی تھی۔ اب تصویریں ایک انتقامی دلولے کے ساتھ ہر دوسری آرائش کو پس پشت

ڈالی تھیں۔ ان تصویروں کو اسلم نے عجیب و غریب شوق سے خریدا تھا۔ کہ شاید یہی ایک کام اس کی زندگی کا منشا و مقصد ہے۔ آج وہ اس مقصد کی تکمیل پر خوش ہو رہا تھا۔ ان تصویروں کو دیکھ کر اپنے حسنِ مذاق کی خود ہی داد دے رہا تھا۔

اس کے سامنے دیوار پر ایک بہت بڑی رنگین تصویر آویزاں تھی۔ یہ انسانی دستکاری کا بہترین نمونہ تھی، اس کے نیچے روشن حروف میں "فتح حسن" لکھا تھا۔ یہ تصویر ایک حسین عورت کی تھی، جو متکبرانہ انداز سے ایک خوش نما درخت کی ڈال کے ساتھ جھکی ہوئی کھڑی تھی۔ درخت کے ارد گرد خوبصورت پرندے تھے۔ جو بظاہر اس حسین عورت کے قدموں پر تڑپ تڑپ کر جان دینے ہی کو مائل زندگی تصور کئے ہوئے تھے۔ ادھر ادھر کے گھنے جنگلوں سے وحشی درندے پرستارانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سامنے کے روشن دان سے کبھی کبھی ایک عجیب پُراسرار روشنی اس تصویر پر منعکس ہو جاتی تھی۔ جس سے اس بے جان تصویر میں زندگی کی حرارت پیدا ہو ہو کر رہ جاتی تھی۔

کمرے کے داہنی کونے میں ایک ہاتھی دانت کی مرصّع اور خوش وضع تپائی پر ایک نوجوان لڑکی کا مجسمہ رکھا تھا، جو ابھی ابھی خواب نوشیں سے بیدار ہو کر انگڑائی لے رہی تھی، دونوں بازوں ایک ذرا پیچھے کی طرف جھکے ہوئے سر کے اوپر اس خوبصورت مجسمے کا محراب بن گئی تھیں۔ کھلے ہوئے سیاہ اور لمبے بالوں نے اس کے چہرے کے ایک حصے کو چھپا رکھا تھا، اس کے حاشیے پر اسی طرح روشن حروف میں "فتنۂ بیدار" لکھا تھا۔

اسلم کے بائیں پہلو کے قریب ایک آبنوس کے خوب صورت مگر بڑے پشتیبان کے سہارے ایک اور تصویر رکھی تھی جو "بارگاہِ عشق" کے نام سے موسوم تھی۔ اس میں عشق کا دیوتا، حور پیکر پری جمالوں کے حلقہ در بار میں گھرا ہوا تھا۔ ایک خوبصورت مگر پُرکشش حسین لڑکی کو زنجیروں میں مقید کئے اس کے حضور لا رہے تھے۔ جسے دیکھ کر وہ اپنے پھولوں کے ترکش سے ایک تیر نکال کر ایک چھوٹی سی پھولوں کی کمان میں جوڑ رہا تھا۔

اسلم ان سب تصویروں کو ایسے دیکھ رہا تھا، گویا وہ کسی بیہوش کرنے والی شراب کے دریا ہیں، اور اس کی پیاسی آنکھیں تہیہ کر چکی ہیں کہ آج ان دریاؤں کو سکھا دیا جائے گا۔ مگر وہ کبھی کبھی گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگ جاتا۔ کیونکہ جس تصویر کو بھی وہ دیکھتا تھا، اس کی شکل و صورت میں آہستہ آہستہ تغیر رونما ہونا شروع ہو جاتا تھا، اور کچھ مدت کے بعد اس کی آنکھوں کو اس تصویر کے پس منظر پر "دھنیا" کے سوا اور کسی کی صورت نظر نہ آتی تھی۔

کئی روز سے اس کی یہی حالت تھی، یعنی اس وقت سے جب اُس نے دھنیا کو پہلی دفعہ دیکھا تھا، اس وقت کا ایک ایک دن اور اس دن کا ایک ایک ساعت اُس کے لئے ایک مسرت مجسم، ایک سرور لازوال بن گئی تھی۔ جس چیز کی تلاش میں وہ مارا مارا پھرتا تھا اُسے مل گئی تھی، اب ہر ایک شے اُس کے لئے معنی رکھتی تھی، اب اس کی زندگی ایک مقصد کے لئے وقف ہو گئی تھی، اب اُس نے عورت کی پیدائش کا راز معلوم کر لیا تھا۔

پچھلے ہفتے کے سات دن اس کے لئے سات برس ہو گئے تھے، ان سات دنوں میں دھنیا کے متعلق کوئی سات ہزار تجویزیں اُس کے ذہن میں آئیں، سب سے پہلے اس کے دماغ میں وہی خیال آیا، جو ہر معمولی مرد کے دماغ میں ایک خوبصورت عورت کو دیکھ کر آتا ہے۔ اس نے اس پر ایک بے زبان حیوان کی طرح ملکیت کا قبضہ حاصل کرنے کی تجویز کی، اس کی قیمت لگائی، مگر ہر قیمت اس کا حُسن خریدنے کے لئے کم نظر آتی تھی۔ پھر اُس نے اس خیال کو ناپاک، نادیدا اور بالکل عامیانہ خیال سمجھ کر ترک کر دیا۔ پھر اُس نے شادی کرنے کی تجویز کی۔ مگر ———

دھنیا کے مذہب کا تعصب، دھنیا کی قوم کی عصبیت، دھنیا کی ذات کی دیوار اس کے ارادے اور اس ارادے کی تکمیل کے درمیان حائل تھی، وہ جانتا تھا کہ دھنیا کی غریب اور محنت کش برادری کسی قسم کے بیرونی دخل کو اپنی انتہائی ذلت تصور کرتی ہے۔ وہ اپنے مقدمات کو عدالت کے دروازوں تک لے جانے سے احتراز کرتی ہے۔ اس وقت اُسے محسوس ہوا کہ انسان نے انسانی حقوق کو پامال کرنے کے لئے کس شدید بہیمانہ طریق سے کام لیا ہے۔ وہ گھبرا گیا، مگر اُس نے ایک پوری رات کی نہ ختم ہونے والی گھڑیوں میں ٹہل ٹہل کر یہ مسئلہ بھی حل کر لیا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ عام انسانوں اور ان کے قاعدوں سے ایک بہتر روش اختیار کرے گا۔ اس کی روح تکلیفیں برداشت کر کر کے جسمانی آلائشوں سے

پاک ہو چکی تھی، وہ سوچ رہا تھا اور اپنے کمرے کی ساکن اور خاموش دیوار کو سمجھا رہا تھا۔ "جس چیز سے محبت کی جائے۔ وہ یقیناً خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ ہر خوبصورت چیز کو مقدس سمجھنا چاہیئے، مقدس بتوں کی عزت کی جاتی ہے، پرستش کی جاتی ہے۔ مقدس چیزوں کو لوگ ہاتھ نہیں لگاتے دُور سے دیکھتے ہیں.......... شاید ان کو آنکھوں سے دیکھنا بھی خلاف ادب ہے، عاشق و معشوق میں بُعدِ مکانی ضروری ہے تاکہ وہ روحانی ارتباط، وہ برقی تسلسل جو اجسام کے وصال میں ناممکن ہے۔ قائم ہو سکے، چھونے سے مقدس اشیاء کی پاکیزگی فنا ہو جاتی ہے.......... ان کے اسرار ظاہر ہو جاتے ہیں۔ محبت مقام پرستش کی ایک منزل ہے۔ مقدس اشیاء سے مادی مفاد کی امید درست نہیں۔ کیا ایک مفید اور کار آمد چیز سے بھی کوئی شریف اور خوش مذاق انسان محبت کر سکتا ہے؟.......... تعجب ہے لوگ ان عورتوں کو جن سے وہ محبت کرتے ہیں، اپنی بیویاں بنانا چاہتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ بڑے زور سے ہنسا، لوگوں کی جہالت پر، اس عام خیال کی بے ہودگی پر، اور پھر اپنی کامیابی پہ خوش ہوا، وہ اپنی بند آنکھوں میں ایک نئی دنیا کی وسعتیں دیکھ رہا تھا۔

اس واقعے کے بعد دو تین روز اور گزر گئے۔ آج وہ اتنا خوش تھا، کہ اُسے اپنی مسرت پر خود حیرت ہو رہی تھی، اور اس لئے وہ آج ارادۃً اس کمرے میں اپنی خوشی کو خود محسوس کرنے کے لئے بیٹھا تھا۔

اس نے خلاف معمول ملازم کو آواز دی، وہ زبان سے ہمیشہ بہت کم کام لیا کرتا تھا۔ ملازم حاضر ہوا، تو اُس نے دھنیا کے باپ کو بلانے کا حکم دیا۔ ملازم حیران ہوا، کہ آج سائیس کو اس کے اپنے نام کی بجائے اس رشتے سے کیوں یاد کیا گیا ہے۔ لیکن وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں سوچ سکتا تھا۔ وہ ایک شریف گھرانے کا مؤدب ملازم تھا ———

دھنیا کا باپ آیا۔ اسلم نے اپنی جھکی ہوئی گردن اُٹھائی، اس کی آنکھوں میں دو بڑے بڑے آنسو روشن تھے۔ اس کے زرد اور پُراطمینان چہرے پر سُرخی کی ایک رَو دَوڑ رہی تھی، اور وہ اپنے گالوں کی گرمی اپنے ذہن میں محسوس کر رہا تھا۔

اُس نے کچھ رُک رُک کر، کچھ سوچ سوچ کر آخر کار کہا۔

"تم نے.......... دھنیا کی.......... ا.......... ہم)..........شادی اب تک کیوں نہیں کی؟".........

سائیس اس خلاف توقع تفتیش سے گھبرایا، اور ہاتھ جوڑ کر عرض کی "حضور کوئی دو چار پیسے ہو جائیں۔ تو شادی بھی کر دی جائے گی.. منگنی تو ہو چکی ہے۔"

اسلم کے دل میں ایک غیر محدود مسرت کا طوفان اُٹھا، وہ دھنیا کے اس عظیم الشان احسان کا بدلہ اُتار سکتا تھا۔ ایک لڑکی کو ایک کامیاب اور بامراد عورت بنانے کے رستے میں صرف سونے چاندی کے چند سکے حائل تھے ——— اس نے ذرا جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔

"دیکھو رام علی، تمہاری بیٹی نے ہماری جان بچائی ہے۔ وہ صرف اس کام کو کرنے کے لئے جسے وہ کرنا چاہتا تھا، ایک بہانے کی تلاش میں تھا، وہ خوب جانتا تھا کہ پانی کے دو چھینٹے دینے کے سوا دھنیا نے اور کچھ بھی نہیں کیا تھا ———

"اس احسان کا بدلہ ادا کرنا ناممکن نہیں"

بیچارہ سائیس کچھ نہ سمجھا، اس نے صرف اتنا ہی کہا۔

"وہ آپ کی لونڈی ہے۔"

اسلم یہ جواب سننے کے لیے تیار نہ تھا، وہ جلدی میں خدا جانے کیا کیا کہہ گیا:

"وہ لونڈی نہیں ملکہ ہے، وہ عورت ہے۔ وہ مرد کی قسمت ہے۔ وہ نیکی کی دیوی ہے۔ وہ احسان کی مجسم تصویر ہے ——

تم نے کیا کہا لونڈی ہے ...... تم نے گناہ کیا ہے۔ توبہ کرو، وہ عورت ہے۔ وہ ماں ہو سکتی ہے۔ وہ بہن ہو سکتی ہے، وہ بیٹی ہو سکتی ہے۔ وہ بیوی ہو سکتی ہے۔ مگر لونڈی کبھی نہیں ہو سکتی ...... تم اس کے باپ ہو اس لیے میں تمہیں معاف کرتا ہوں"

اسلم کے دل کی حرارت کو کون سمجھ سکتا تھا۔ جس چیز کو محسوس کرنے کے لیے اس نے اپنی عمر کی بہترین ساعتیں بیکار صرف کی تھیں، جس جذبے کی زندہ تصویر دیکھنے کے لیے اس کے دن کا آرام اور رات کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ اسے اس نے دُھنیا کے ہاتھ کی ایک حرکت میں دیکھ لیا تھا، اس کی ایک نظر میں محسوس کر لیا تھا۔

دُھنیا اس کے لیے صرف ایک پرستش کے قابل چیز تھی۔ وہ اپنے دل ہی دل میں کچھ فیصلہ کر چکا تھا، اور جس کام کے لیے وہ اپنے آپ کو تیار کر چکا تھا اب اسے کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا، اور ایک لفافہ نکالا، اس میں بینک کی ایک کتاب اور ایک مکان کا قبالہ تھا۔ اس نے ایک ایسے عقیدت مند پجاری کی طرح جو پھولوں کا ایک حقیر ہار اپنے دیوتا کے قدموں پر نچھاور کرتا ہے، کانپتے ہوئے ہاتھوں سے یہ لفافہ بوڑھے سائیں کی طرف بڑھایا، اور کہا "لو، یہ میری طرف سے دُھنیا کو دے دو، یاد رکھو، یہ اس کے احسان کا عوض نہیں، وہ کبھی ادا نہیں ہو سکتا، نہ میں ادا کرنا چاہتا ہوں، اس کے نام پچاس ہزار روپیہ بینک میں جمع کرا دیے گئے ہیں، یہ اس کے حساب کی کتاب ہے، یہ اس سامنے والی کوٹھی کا قبالہ ہے۔ آج سے وہ کوٹھی میری نہیں، دُھنیا کی ہے"۔

سائیں مبہوت تھا، اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے، وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، اس کا دماغ اس کے کانوں کے خلاف بغاوت کر رہا تھا۔ اس نے سنبھل کر کچھ کہنے کی کوشش کی۔ مگر اس سے پیشتر کہ وہ منہ سے کوئی لفظ نکال سکتا، اسلم نے ذرا دور سے چلا کر کہا "ایک لفظ نہیں، ایک حرف نہیں، میں شکریہ نہیں چاہتا، جاؤ"۔

سائیں ایک بے جان مگر متحرک بت کی طرح دروازے کی طرف حرکت کر رہا تھا، وہ نظروں سے غائب ہو گیا۔ اسلم ایک پرکیف انداز سے اٹھا، اس کے چہرے پر آسمانی نور کی ایک جھلک تھی، اس کے لبوں پر تبسم تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں، اور اس کو وہ اطمینان قلب، وہ روحانی تسکین، وہ جسمانی آرام میسر تھا، جو صرف ایک نیک دل انسان کو ایک نیک کام کی تکمیل کے بعد ہی میسر آ سکتا ہے۔

قاضی عبدالغفار

تین پیسے کی چھوکری

(۱)

آج سے پندرہ سو برس پہلے!

بائی زنطہ کے شاہی سرکس میں، بادشاہ کے وحشی جانوروں کا داروغہ ایک بوڑھا شخص تھا، بہت بوڑھا، مگر اپنے کام میں بہت ہوشیار، اُس نے اپنے بڑھاپے کا سہارا ایک بارہ سالہ چھوکری کو بنا لیا تھا۔ جس کو نہ معلوم وہ کہاں سے لایا تھا۔ وہ نہ اُس کی بیٹی تھی نہ پوتی نہ رشتہ دار نہ اُس کی ہم وطن، لیکن اس نے منہ بولی بیٹی بنا لیا تھا اور بیٹی ہی کی طرح چاہتا تھا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ اس چھوکری کی قوم کیا ہے۔ اُس کا مذہب کیا ہے اور وہ کس طرح کے پاس پہنچی

بائی زنطہ کے عظیم الشان دارالسلطنت میں شہنشاہ جسٹینین کا پرچم اقبال بلند تھا۔ اُس زمانہ کی تہذیب اور بائی زنطی مخلوق کا تمدن بخصوصاً امراء اور عمائدین کی معاشرت یونان اور روما کی قدیم تہذیب سے بھی دس پانچ قدم آگے تھی۔

شہنشاہ اور اُس کے امراء و اراکین سلطنت کے اسباب تفریح و تعیش میں سے ایک یہ سرکس بھی تھا۔ جس میں ہزاروں قسم کے وحشی اور جنگلی جانور پالے جاتے تھے۔ ۱۲ برس کی چھوکری کو دنیا میں کوئی کام نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ سرکس کے درندوں میں صبح سے شام تک کھیلتی رہتی۔ وہ حسین بھی تھی اور شوخ بھی۔ اور دل اُس کا ایسا ہی بے خوف تھا جیسا کہ وحشی درندوں کا۔ اُسے معلوم ہی نہ تھا کہ خوف کس چیز کا نام ہے۔ وہ شیروں کی ایال پکڑ کر لٹک جاتی تھی اور دوپہر کو کھیلتے کھیلتے اکثر ہاتھی کے پیٹ کے نیچے لیٹ کر سو جاتی تھی۔ اُس کی دُنیا میں اُس کے رفیق اور دوست ہاتھی اور ریچھ ہی تھے۔

دن بھر بڈھا سرکس کے جانوروں کی خدمت میں مصروف رہتا اور چھوکری اپنے کھیل میں، شام کو چھوکری سرکس سے تو چلی گئی۔ لیکن گھر نہ پہنچی۔ رات بڈھا اُس کا انتظار کرتا رہا۔ رات بھر وہ غائب رہی صبح کو وہ ہنستی جھومتی گھر آئی، اور بڈھے کے ہاتھ پر تین چمکتی ہوئی اشرفیاں رکھ دیں! یہ اُس کے حسن کا پہلا

سودا تھا! یہ اُس کی جوانی کا پہلا منافع تھا! گزری ہوئی شام اور موجودہ صبح کے درمیان، گذشتہ شب کی تاریکی میں بڑھیے کی چھوکری عورت بن گئی!

ماتوں کو غائب رہنے کا سلسلہ جاری رہا اور سرکس کے درندوں کے ساتھ جو کھیل کو وہ ہوا کرتا تھا۔ وہ اب دُوسری قسم کے حیوانوں کے ساتھ کھیلا جانے لگا! یہ آغاز تھا ملکۂ بازنطہ کی حکومت کا!

تھیوڈورا کی جوانی اب ہر طرف سے آنکھوں، نظروں اور دلوں کو کھینچ رہی تھی۔ وہ شاہی سرکس میں ناچا کرتی تھی اور بائی زنطہ کے ہزاروں نظر باز شام کو اُس کے حُسن کی خاطر سرکس میں جمع ہوا کرتے تھے۔ شاہی دربار کے رُکنِ رکین بشب جیلیس نے تو ایک دن تھیوڈورا کو ناچتے ہوئے دیکھ کر بے اختیار کہہ دیا۔

"گھانس کا یہ پھُدکتا ہوا کیڑا کسی دن سارے بائی زنطہ میں اُچھلیگا ——— دیکھنا!"

لیکن اُس وقت بشب کو بھی خبر نہ تھی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے! ستم ظریف قدرت اس ناچنے والی کو نہ معلوم کہاں سے کہاں تک اچھالنے والی تھی!

تھیوڈورا سرکس کے نظر بازوں سے تھک گئی۔ ایک ہی کھیل کا بار بار کھیلنا اس کو کبھی نہ بھاتا تھا۔ اب وہ منظرِ عام پر تھرکنے کی بجائے مخصوص خلوتوں میں ایک بلند نشین حُسن فروش بن بیٹھی۔ حُسن فروشی اُس عہد کی تہذیب میں کوئی ایسی معیوب بات نہ تھی بلکہ حُسن و ہوس کے یہ کھیل تماشے تو بائی زنطی تہذیب کے جزو لازمی تھے۔ امراء طوائفوں کی نگہ التفات کو سرمایۂ افتخار سمجھتے تھے اور عوام کی زندگی ان رنگین تتلیوں کے بغیر بے رنگ ہو جاتی تھی۔ حسین تھیوڈورا اپنی دوکانِ حُسن کھولتے ہی دلوں کی مالک، آنکھوں کا تارا، کلیجوں کی ٹھنڈک اور گھروں کا چراغ بن گئی۔ اُمراء اُس کے اشارۂ ابرو کا انتظار کرتے۔ اُن کی شوخ آشام تلواریں اُس کے قدموں میں پڑی ٹھوکریں کھایا کرتیں! اہلِ علم اور اہلِ مذہب بھی اُس دیوی کے استھان پہ سر جھکاتے تھے اور سرکس کی ناچنے والی چھوکری بائی زنطہ کی حُسن پرست دنیا میں ایک "ملکۂ عالم" تھی کہ اس کا سکّہ ہر طرف جاری تھا!

نوجوان شہنشاہ جسٹینین بارہا اُس کو تھیٹر میں ناچتے، باغوں میں اٹھکیلیاں کرتے اور باسفورس کے ساحل پر ایک ہجوم عاشقاں کے ساتھ چہل پہل کرتے دیکھ چکا تھا۔ اُس کے دل میں خلش تھی۔ تیر اپنے نشانہ پر بیٹھ چکا تھا۔

ایک شب شہنشاہ نے اپنے محافظ دستہ کے کپتان کو موتیوں کا ایک بیش قیمت ہار دے کر تھیوڈورا کے گھر بھیجا اور پیام دیا کہ وہ شاہی خلوت میں آجائے۔ آدھی رات کے قریب شاہی کپتان تھیوڈورا کے دروازے پر آیا۔ اُس وقت تھیوڈورا کی خلوت میں اس کا کوئی چاہنے والا موجود تھا۔ اُس نے کپتان کو گھر کے اندر نہ بلایا۔ بلکہ خود دروازے پر آگئی۔ شہنشاہ کا پیام سُن کر اُس نے کہا:۔

"شہنشاہ کی یاد فرمائی کا بہت بہت شکریہ، مگر یہ ہار واپس لے جائیے۔ میں بکاؤ نہیں ہوں، شہنشاہ سے کہہ دیجئے کہ اس ہار سے کسی دُوسری حسین چھوکری کا حُسن خریدیں ——— میری قیمت اس ہار سے بہت زیادہ ہے!"

اب وہ رئیسوں کی بجائے ایک عظیم الشان سلطنت کے شیرازۂ باہمی سے بے خوف ہو کر کھیل رہی تھی!!

اُسی شب پھر ایک شاہی مصاحب، شہنشاہ کا پیام محبت سے عاشقانہ اکرام و الطاف کے بہت سے وعدے لے کر آیا۔ تھیوڈورا نے دوسرا پانسہ پھینکا:۔

"شہنشاہ سے کہہ دیجئے اگر وہ اس کنیز کے طالب ہیں تو اُس کے سیہ خانہ پہ تکلیف فرمائیں"

بائی زنطہ کے شہنشاہ سے، جس کی خاکِ پا بادشاہ ہوں، وہ گردن کشوں کی سجدہ گاہ تھی۔ یہ گستاخانہ سوال و جواب، موت سے کھیلنا تھا مگر تھیوڈورا نے بہت بڑی بازی لگائی تھی ———

شب کی آخری ساعتوں میں بالآخر شہنشاہ خود اُس کے دروازے پر آیا۔ جس وقت وہ اندر داخل ہوا تو اُس نے دیکھا کہ تھیوڈورا ایک صلیب کے سامنے جھکی ہوئی عبادت میں مشغول ہے! بہت دیر بعد اُس نے اس طرح کہ وہ گویا کسی دُوسرے عالم میں ہے نظر اُٹھا کر شہنشاہ کی طرف دیکھا

"تم ہی تھوڈورا ہو؟" شہنشاہ نے سوال کیا

"ہاں حضور! میرا نام تھوڈورا ہے۔ میں شہنشاہ کے سرکس میں ناچا کرتی تھی۔"

"تم وہی ہو۔ جس کو ہر ملّاح تین پیسے میں خرید لیا کرتا ہے؟" شہنشاہ کے تیور بگڑے ہوئے تھے :

تھوڈورا نے کہا۔

"جی ہاں! میں وہی ہوں!"

"پھر تم شہنشاہ کی خلوت میں آنے سے کیوں انکار کرتی ہو؟" اب جسٹینین کا غصّہ تیز ہوتا جاتا تھا۔

"حضور!" تھوڈورا نے دست بستہ عرض کیا۔ "ملّاح کے پاس میں اس لئے جاتی ہوں کہ اُس کی جیب میں تین ہی پیسے ہوتے ہیں اور وہ سب میں لے لیتی ہوں۔ وُہ تین پیسے دے کر اپنا سارا سرمایہ مجھے دے ڈالتا ہے۔"

"تو کیا تم اپنے چاہنے والوں سے جو کچھ اُن کے پاس ہو، سب ہی لے لیتی ہو؟"

"ہاں حضور! میں یہی کرتی ہوں اور یہی میری قیمت ہے!"

"تو پھر تم مجھ سے کیا مانگتی ہو۔"

"آپ کا تاج و تخت! اے بائی زنطہ کے شہنشاہ!"

اس طرح چند روز بعد یہ "تین پیسے کی چھوکری" شہنشاہ بائی زنطہ کی مشہورِ عالم ملکہ تھوڈورا بن کر اُس زمانہ کی سب سے بڑی اور عظیم الشان سلطنت کے سیاہ و سفید کی مالک بنی!

وہ اپنا حُسن بیچتے بیچتے ملکۂ عالم بنی اور ملکۂ عالم بن کر جب اُس کو حُسن فروشی کی ضرورت نہ رہی تو اُس نے بائی زنطہ کے خوبرو جوانوں کی جوانی خریدنا شروع کر دی۔ اُس کی ہوس پرستی کی داستانیں اُسی قدر مشہور ہیں جس قدر اُس کا حُسن!

(۲)

مسیح کی پیدائش کے پانچ سو برس بعد!

بائی زنطہ کے دارالسلطنت میں

شہنشاہ جسٹینین اور اُس کی عیش پرست ملکہ تھوڈورا کا زمانہ

بائی زنطہ کی شاہراہ پر تماشائیوں کا ہجوم ہے۔ شہنشاہ اور ملکۂ عالم کی رعایا سڑک کے دونوں طرف ہزاروں کی تعداد میں جمع ہے۔ یہ وہ سڑک ہے جو شاہی محل سے ایا صوفیہ کو جاتی ہے۔ دو رویہ سپاہی کھڑے ہیں۔ سپاہیوں کے عقب میں اہل شہر، امراء و رؤسا سب ملکۂ عالم کی سواری کے منتظر ہیں۔ ہفتہ میں ایک دفعہ ملکہ تھوڈورا۔ ایا صوفیہ میں عبادت کرنے جایا کرتی ہیں۔ یہ جلوس قابل دید ہوتا ہے۔ ملکۂ عالم کے شاندار جلوس کو دیکھنے والے گھنٹوں پہلے سے سڑکوں پر جمع ہوتے ہیں اور دارالسلطنت میں ہفتہ کا یہ ایک دن گویا ایک عام یوم تعطیل ہوتا ہے ——— وہ ملکۂ عالم کی عبادت کا دن ہے!!

دیگر یا کے محافظ دستہ کا ہراول، سُرخ وردیاں پہنے، شاندار گھوڑوں پر سوار، آہستہ آہستہ چلا آتا ہے۔ سواروں کی وردیاں اور ان کے چمکتے ہوئے اسلحہ دھوپ میں اس قدر چمک رہے ہیں کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں ——— اس دستہ کے پیچھے ایک مرصّع تختِ رواں ہے اور اُس تختِ رواں پر ایک مطلّا شامیانہ کے نیچے ملکۂ عالم تشریف رکھتی ہیں۔ تختِ رواں کے سامنے امراء اور اراکین سلطنت کی نوجوان اور حسین لڑکیاں ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے لئے ہوئے اور آٹھ چھوکریاں ہاتھوں میں چاندی کی گھنٹیاں لئے ہوئے چل رہی ہیں۔ چاندی کی گھنٹیاں تھوڑے تھوڑے وقفہ

کے بعد بجائی جاتی ہیں۔ تختِ رواں کے سامنے شاہی منصب دار قرمزی رنگ کا لمبا کپڑا بچھاتے ہوئے آتے ہیں اور ملکہ کی سواری جب اُس کپڑے پر گزر جاتی ہے تو اُس کو لپیٹ لیتے ہیں۔ منصب داروں کی جماعتیں یہ خدمت انجام دیتی آتی ہیں تاکہ ملکۂ عالم کے تختِ رواں کا سایہ ناپاک زمین پر نہ پڑنے پائے۔ تختِ رواں، جواہرات اور سونے چاندی کی مینا کاری کا ایک عجیب و غریب نمونہ ہے۔ اُس کی چمک میں سورج کی شعاعوں نے گویا آگ لگادی ہے ——

اس طرح بائی زنطہ کی ملکہ، دو رویہ خلائق کے سلاموں کا جواب سر کے اشارے سے دیتی ہوئی مسیح کی درگاہ میں جارہی ہے ——!

سلطنت کے دیہاتی علاقہ کا رہنے والا ایک خوبصورت نوجوان استیفن جو چند روز ہوئے دارالسلطنت کی سیر کرنے آیا تھا۔ اس وقت ایک کنوئیں کی دیوار پر کھڑا ہوا شاہی جلوس کا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ اُس کے قریب اُس کا ایک شہری دوست کھڑا ہے۔ سواری قریب آگئی۔ دفعتہً ملکۂ عالم کی نظر اُس دیہاتی نوجوان پر پڑی مگر وہ نہ سمجھا۔ وُہ سمجھا کہ یہ غلط انداز نظر برسرِ راہ تھی۔ مگر وہ خوش تھا کہ آج اُس نے ملکۂ عالم کو اچھی طرح دیکھ لیا۔ بادشاہوں کو دیدارِ عقیدت مند رعایا کے دلوں کو پھول کی طرح کھلا دیتا ہے!

استیفن بیچارے نے اپنی عمر میں پہلے کبھی شاہانہ طنطنہ کا یہ مظاہرہ کب دیکھا تھا! وہ اس نظارہ میں محو تھا کہ ملکہ کی سواری بالکل اُس کے سامنے آگئی —— ایک لمحہ کے ہزارویں حصّہ میں اُس نے یہ محسوس کیا کہ گویا اُس کی نظر ملکۂ عالم کی نظر سے ملی۔ گھبرا کر اُس نے نظریں نیچی کرلیں —— اتنی ہی دیر میں سواری آگے نکل گئی۔ استیفن کا دل دھڑک رہا تھا اُس کو پسینہ آگیا تھا۔

شاہی سواری کے پیچھے پیچھے ایک منصب دار چاندی کے پھول لٹاتا ہوا جارہا تھا غریب امید بڑھ بڑھ کر ان پھولوں کو لوٹ رہے تھے۔ جس کے ہاتھ ایک پھول آگیا۔ اُسکو گویا بڑی سعادت نصیب ہوئی۔ منصبدار جب بڑھتے بڑھتے استیفن کے قریب پہنچا تو اُس نے اپنا ہاتھ لوگوں کے اوپر سے استیفن کی طرف بڑھایا۔ اُس کے ہاتھ میں چاندی کے پھول اور ایک تازہ گلاب تھا۔ استیفن نے —— جیسے کوئی مخمور ہو یا عالمِ خواب میں —— ہاتھ بڑھا کر گلاب لے لیا، وہ چاہتا تھا کہ کچھ کہے، شکریہ ادا کرے —— لیکن اتنی ہی دیر میں منصبدار بہت آگے نکل چکا تھا!

سواری بادِ بہاری گزر گئی۔ مجمع منتشر ہو رہا ہے۔ استیفن گلاب کا سُرخ پھول ہاتھ میں لئے جارہا ہے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر شاہی منصبدار خاص طور پر اُس کی طرف کیوں مائل ہوا۔ ہزارہا آدمیوں کے مجمع میں گلاب کا پھول تنہا اسی کو کیوں دیا گیا ——؟

گلاب بہت بڑا اور بہت خوبصورت تھا۔ وُہ اس قسم کا پھول تھا۔ جس کے چند ہی درخت شاہی باغیچے میں تھے اور شاہی باغیچہ کے علاوہ کہیں نہ تھے۔ یہ گلاب بائی زنطہ میں شاہی محل کے علاوہ کہیں میسر نہ آسکتا تھا۔ مجمع سے باہر نکل کر استیفن نے اچھی طرح اُس پھول کو دیکھا۔ اُس کی پتیوں کے نیچے ایک پرزہ بندھا ہوا تھا۔ اُس پرزہ پر سُرخ رنگ سے یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:-

"شاہی محل کے جنوبی دروازے پر —— آج دس بجے —— یہ پھول لیکر آؤ —— اس پھول سے تمہاری قسمت کا دروازہ کھُلے گا"

استیفن ششدر تھا۔ وُہ کچھ بھی نہ جانتا تھا۔ کچھ نہ سمجھ سکتا تھا کہ اس واقعہ کے معنی کیا ہیں وُہ کیوں محل کے دروازے پر جائے۔ اُس کی قسمت کا دروازہ کیونکر کھُل سکے گا۔ اُس کا دل کہتا تھا:-

"جانا چاہیئے، اگر یہ شاہی اکرام و الطاف کا اشارہ ہے تو تیری قسمت جاگ جائے گی۔ کیا معلوم تو شاہی دربار میں منصبدار بنا دیا جائے۔ کیا معلوم تو کیا ہو جائے —— جانا چاہیئے"

عقل کہتی تھی:-

"کوئی دھوکا، کوئی فریب تو نہیں، بھلا کہاں ملکۂ عالم، کہاں تو غریب دہقانی! منصبدار نے تیرے گنوار پن کا مذاق نہ اڑایا ہو یا کسی دشمن نے تجھے دھوکہ دے کر نہ بلایا ہو"

عقل اور دل کا جھگڑا ختم نہ ہوتا تھا۔ لیکن قدم دل کے زیرِ فرمان تھے۔ عقل کا زور ان پر نہ چل سکا۔ وقت مقررہ سے کچھ پہلے استیفن کے قدم بے اختیار شاہی محل کی طرف بڑھنے لگے۔ کبھی اپنے دل سے، کبھی اپنی عقل سے الجھتا ہوا وہ چلا جا رہا تھا ——————

دل کہتا :-

"تیرا انتظار کیا جا رہا ہے، قدم بڑھا۔"

عقل کہتی :-

"تو بیوقوف ہے، ذرا اور انتظار، دیوانے! سپاہیوں اور دربانوں کی ٹھوکریں کھائے گا۔"

جوانی کا خون گرم تھا۔ دل کی حرکت تیز تھی۔ چہرہ پر سرخی جھلک رہی تھی۔ پیشانی پر پسینہ کے قطرات تھے۔ اس طرح استیفن شاہی محل کے دروازہ پر پہنچا اُس کو یہ خبر نہ تھی کہ دروازہ مغربی ہے یا مشرقی! وہ بڑھتا چلا گیا!

شاہی محافظ فوج کا ایک دستہ بڑے دروازہ میں داخل ہو رہا تھا۔ اُس کے قدموں کی آواز اور تلواروں کی چمک استیفن کو اپنے ساتھ کھینچے ہوئے اندر لے گئی۔ وہ محل کے پہلے برآمدہ میں داخل ہوا۔ جہاں شاہی دربان مسلح کھڑے تھے۔ ایک قوی الجثہ حبشی بارگاہ کے مرا پردے کے پاس ایک برہنہ تیغ ہاتھ میں لئے کھڑا ہوا تھا۔ استیفن نے آگے بڑھ کر سُرخ گلاب اُس کے سامنے پیش کیا ——— اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے!

دربان مسکرایا۔ "بیوقوف آدمی! مجھے کوئی حسین چھوکری سمجھا ہے تو نے؟ گدھا!"

استیفن کے بدن میں ان تحقیر آمیز الفاظ نے آگ لگا دی۔ وہ بے اختیار ہو گیا۔ اسے خبر نہ تھی کہ کس طرح اُس نے دربان کے سیاہ تاب گال پر ایک چانٹا مارا ——— سارے برآمدہ میں شور مچ گیا۔ محافظ دستہ کے سپاہیوں نے اپنی تلواروں کے قبضوں سے مار مار کر استیفن کو فرش پر گرا دیا۔ چند منٹ میں اُس کا خاتمہ ہو جاتا۔ مگر ہنگامہ کی آواز سُن کر دربانوں کا داروغہ کمرہ سے نکل آیا۔ اُس کو دیکھ کر سپاہیوں نے ہاتھ روکا۔

"اسے تو کون ہے دہقانی؟" داروغہ نے کہا

استیفن جھنجھلایا ہوا اُٹھا۔ اُس کا گلاب، زمین پر گر گیا تھا۔ اُس کی چند پتیاں منتشر ہو چکی تھیں جھک کر اُس نے گلاب کو زمین سے اُٹھا لیا اور اُٹھا کر داروغہ کے سامنے پیش کر دیا۔

"ہاں! سُرخ گلاب کو دیکھ کر داروغہ مسکرایا۔ بے وقوف آدمی! اس پھول کو لے کر یہاں کیوں آئے؟"

پھر اُس نے مجمع کی طرف دیکھ کر سپاہیوں کو جھڑکا :-

"جاؤ! اپنا کام کرو، کیا کچھ تماشہ بنایا ہے؟" جب سپاہی ہٹ گئے تو اُس نے استیفن کے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کر دبی زبان سے کہا :-

"یہ حماقت کی تم نے! اس پھول کو لے کر یہاں گھس پڑے۔ نہیں جہاں یہ پھول لے کر جانا چاہئے۔ یہ وہ جگہ نہیں۔"

یہ کہہ کر استیفن کو وہ اپنے ساتھ ایک دوسرے دروازہ پہ لے گیا اور وہاں کے چوبدار کو آواز دے کر کہا

"لو یہ ایک بے وقوف پھول والا آیا ہے۔ اس کو اندر پہنچاؤ۔ یہ آدمی ہماری طرف کا نہیں ہے۔ تمہاری طرف کا ہے۔"

ملکہ کے چوبدار نے پھول پہ نظر کی اور استیفن کو پیچھے آنے کا اشارہ کر کے ملکہ کے محل کے دروازے میں داخل ہو گیا۔

آراستہ اور خوبصورت برآمدوں اور کمروں سے گزر کر ——— آگے آگے چوبدار اور اُس کے پیچھے استیفن ——— دونوں ایک پُر فضا باغیچہ میں داخل ہوئے۔ جس کے وسط میں ایک فوارہ جاری تھا۔ اس کے پانی کی سطح پر سینکڑوں رنگین پھول تیر رہے تھے۔ باغیچہ سے گزر کر ملکۂ عالم کی خاص محلسرا تھی۔ محلسرا کے برآمدوں میں نوعمر اور خوبصورت لڑکے، زرق برق لباس پہنے ہوئے، حسین مامائیں اور باندیاں، خوفناک شکل کے خواجہ سرا اور حبشی غلام جن کے سروں پہ زرد پگڑیاں بندھی ہوئی تھیں، کچھ بیٹھے، کچھ لیٹے، کچھ ٹہل رہے تھے۔ کچھ چھوکریاں قدم بڑھائے اِدھر سے اُدھر جا رہی تھیں استیفن

کی دہقانی وضع اور پھر اُس کے ہاتھ میں سُرخ گلاب کے پھُول کو جس نے دیکھا، وہ مُنہ پھیر کر مسکرا دیا۔ شاہی خواصیں اپنے ہاتھ کے پنکھوں کی آڑ میں ایک دوسرے کو اشارے کر رہی تھیں اور کم عمر لڑکے مُنہ پہ ہاتھ رکھ کر اپنی ہنسی روک رہے تھے۔

استیفن کو اپنے گرد و پیش ان حرکات کی کچھ خبر نہ تھی۔ وُہ چوبدار کے پیچھے پیچھے پردہ اُٹھا کر شاہی محلسرا کے خاص کمروں میں داخل ہُوا۔

ایک مزیّن کمرہ کے ایک گوشے میں ریشم کے قرمزی پردوں کی آڑ میں، بڑے بڑے گدوں اور تکیوں پہ ملکہ تھیوڈورا آرام فرما رہی تھیں۔ ایک رنگین فوارہ کمرے کے وسط میں جاری تھا چھوٹی میزوں پر تازہ پھولوں کی ڈھیریاں رکھی ہوئی تھیں۔ جن کی مہک سے تمام کمرہ معطر تھا۔

کچھ ایسی ہلکی روشنی ارشیمیں پردوں میں سے چھن چھن کر کمرہ میں آ رہی تھی جیسی کہ رات کے ختم ہونے اور دن کے شروع ہونے کے وقت ہوتی ہے ——— وہ سب جنت کا ایک تخیل تھا۔ جس کو استیفن نے آج اپنی عمر میں پہلی دفعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ——— ریشم کے پردوں کی آڑ سے اس دھندلی روشنی میں، ملکہ نے اشارہ کیا، کمرہ کے سکون کامل میں، ارغوانی قالینوں پہ استیفن کے قدموں کی آواز گم تھی۔ وُہ ادب کے ساتھ آگے بڑھا اور اُس نے ملکہ تھیوڈورا کا آغوشِ محبت اپنے لیے کھُلا ہُوا پایا!

"تمہارے جانے کا وقت آ گیا!" نظریں نیچی کیے ہوئے ملکہ نے فرمایا۔

استیفن کے جسم میں ایک عجیب لرزش، ایک عجیب سنسناہٹ تھی جو آج سے پہلے اُس نے کبھی محسوس نہ کی تھی۔

وہ ابھی تک ملکہ کے آغوش کی مستیوں سے مخمور تھا! ——— اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔ جب اُس نے کہا:-

"کیا پھر کبھی ملاقات نصیب ہو گی؟"

ملکہ مسکرائی! استیفن اپنے سوال کے جواب کا منتظر تھا کہ یکایک وہی خواجہ سرا جو اس کو اندر لایا تھا۔ کمرہ میں داخل ہُوا۔ استیفن چونکا۔ اُس کو محبت کی خلوت میں خواجہ سرا کی یہ درماندانہ ی ناگوار گذری۔ گویا یہ سیاہ فام حبشی اس کی اس نئی محبت کے راز کو فاش کیے دیتا ہے! لیکن ملکہ سے اپنے سوال کا جواب نہ پا کر وہ یک گونہ مایوس ہُوا اور سر جھکائے دروازے کی طرف ہٹنے لگا۔ ملکہ کے ہونٹ ہلتے دیکھ کر وہ پھر ذرا رُکا۔

"استیفن کل پھر آؤ!"

ملکہ کے شیریں لبوں سے یہ شیریں پیامِ الفت کس قدر رُوح پرور اور دل نواز معلوم ہُوا۔

اُس دھندلی روشنی میں ملکہ ——— نہ جانے کس طرح ——— اس کمرے سے جا چکی تھی۔ استیفن نے اس کو جاتے نہ دیکھا لیکن اس کی جگہ خالی تھی اور استیفن "وعدۂ فردا" کی مسرتوں سے جھومتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔

اس کے اور دروازے کے درمیان چند قدم باقی تھے کہ ایک حبشی غلام کی نوکدار چھُری اس کی پشت پہ چمکی اور چشم زدن میں اس کی پشت کی طرف سے سینہ کے پار ہو گئی۔ وہ صرف ایک ہچکی لے کر دروازے کے سامنے فرش پر اوندھا گر گیا۔

غلام نے چند لمحے اپنی چھُری کو اُس کے گرم جسم میں آرام لینے دیا۔ اس کے بعد اس کے خون آلود پھل کو باہر کھینچ لیا۔ استیفن کے سر کے لمبے بالوں سے اُس حبشی نے اپنی چھُری کا خون صاف کیا۔ پھر لاش کی ٹانگ پکڑ کر اُس کو کھینچتا ہُوا کمرہ کے باہر لے گیا۔

اُس کمرے کے فرش پہ، جہاں استیفن نے ایک لمحہ کے لیے تھیوڈورا کے آغوش میں محبت کی ایک بازی لگائی تھی۔ سُرخ گلاب کی پتیاں بکھری ہوئی رہ گئیں اور اُن پتیوں میں سے ایک پہ استیفن کی جوانی کے گرم خون کا صرف ایک قطرہ جما ہُوا رہ گیا۔

اسی شام کو جب چند ملاح اپنی کشتیاں ساحل کی طرف لا رہے تھے، شاہی محل کے چور دروازے سے باسفورس کے پانی میں ایک سربند تھیلا جو خون آلود تھا پھینکا گیا! ملاحوں نے دیکھا اور اپنے چپّو تیزی سے چلانے لگے۔ اُن کیلئے اس قسم کے تھیلے کوئی نئی چیز نہ تھے۔ ہر روز صبح و شام وہ دیکھا کرتے تھے کہ شاہی محل سے باسفورس کی بھوکی مچھلیوں کی یہ مخصوص غذا پانی میں پھینکی جاتی ہے۔ انکو یہ بھی معلوم تھا، اور باقی دنیا میں کسی کو معلوم نہ تھا کہ جس دن ملکۂ عالم حُسن کی دعوت کے بعد باسفورس کی مچھلیوں کیلئے اپنے حسن کے دسترخوان سے تازہ غذا بہم پہنچا کرتی ہیں

علی عباس حسینی

میلہ گھومنی

کانوں کی سُنی نہیں کہتا، آنکھوں کی دیکھی کہتا ہوں۔ کسی بدیسی واقعہ کا بیان نہیں، اپنے ہی دیس کی داستان ہے۔ گاؤں گھر کی بات ہے۔ جھوٹ سچ کا الزام جس کے سر پر جی چاہے رکھئے۔ مجھے کہانی کہنا ہے اور آپ کو سُننا:

دو بھائی تھے چنو منو نام، کہلاتے تھے جُلاہے۔ گھر نانہال جولاہے ٹولی میں تھا اور ددھیال سید واڑے میں۔ ماں، پرجا کی طرح میر صاحب کے ہاں کام کرنے آتی تھی۔ ان کے چھوٹے بھائی صاحب نے اس سے کچھ اور کام بھی لئے اور نتیجے میں ہاتھ آئے چنو منو۔ وہ تو یادگاریں چھوڑ کر جنت سدھارے اور خمیازہ بھگتا بڑے میر صاحب نے۔ انہوں نے بی جولاہن کو ایک کچا مکان عطا کیا اور چنو منو کی پرورش کے لئے کچھ روپے دیئے۔ وہ دونوں پلے اور بڑھے، اچھے ہاتھ پاؤں نکالے، چنو ذرا سنجیدہ تھا، ہوش سنبھالتے ہی میر صاحب کے کارندوں میں ملازم ہوا اور بہت جلد میر صاحب کا مصاحب بنا۔ منو لا اُبالی تھا، اہیروں کے ساتھ اکھاڑوں میں کشتی لڑا اور نام کے لئے کھیتی باڑی کرنے لگا۔

لیکن دونوں جوان ہوتے ہی اعصاب کا شکار ہوئے۔ خون کی گرمیاں وراثت اور ماحول سے ملی تھیں۔ دونوں جنسیات کے میدان میں بڑے بڑے معرکے سر کرنے لگے۔ شدہ شدہ میر صاحب کے کانوں تک ان کارناموں کی داستانیں پہنچیں۔ انہوں نے چنو کو جولاہوں کی ایک لڑکی سے بیاہ کر باندھ دیا۔ مگر منو چھُٹے سانڈ کی طرح مختلف کھیت چرتا رہا۔ اس کی ہنگامہ آرائیوں کا غلغلہ دور تک پہنچا۔ بالآخر میر صاحب کے پاس اہیر ٹولی، چمار ٹولی، جولاہے ٹولی ہر سمت اور ہر محلے سے فریاد کی صدائیں پہنچنے لگیں۔ انہوں نے عاجز آکر ایک دن اس کی ماں کو بلوا بھیجا۔ وہ جب گھونگھٹ لگائے، لجاتی جھجکتی ان کی بیوی کے پلنگ کے پاس زمین پر آکر بیٹھی تو میر صاحب نے منو کی شکایت کی اور کہا۔ اس لونڈے کو روکو ورنہ ہاتھ پاؤں ٹوٹیں گے۔

اس نے آہستہ سے کہا:

"تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ آپ ہی چنو کی طرح اسے بھی کسی ناند سے لگا دیجئے۔"

میر صاحب بڑی سوچ میں پڑ گئے۔ یہ نئی قسم کا قلمی پودا کسی مناسب ہی تھالے میں لگایا جا سکتا تھا۔ ہر زمین تو اس کو قبول نہیں کر سکتی

اور وہاں اس کے کارناموں کی شہرت نے ہر جگہ شوریت پیدا کر دی تھی۔ وہ زنان خانے سے سوچتے ہوئے باہر چلے آئے اور برابر سوچتے رہے۔

اتفاق سے انہی دنوں ڈوری کے میلے سے واپس ہونے والوں کے ساتھ ایک نامعلوم قبیلے کی عورت گاؤں میں آئی اور ایک دن میر صاحب کے ہاں نوکری کی تلاش کے بہانے پہنچی۔ سیدانی بی نے شکل صورت دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ وہ ان کے گھر میں ملازم کی حیثیت سے رہنے والی عورت نہیں۔ پوچھ گچھ سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ وہ گاؤں کے درزی کے ساتھ میلے سے آئی ہے اور اس کے ہاں ٹکی ہوئی ہے۔ سیدانی بی ان درزی کی حرکات سن چکی تھیں۔ جب سے اس کی درزن سدھاری تھی اس نے میلوں سے نئی نئی عورتوں کا لانا اور گاؤں کی نسوانی آبادی میں اضافہ کرنا اپنا وطیرہ بنا لیا تھا۔ پھر بھی سیدانی بی کے رنگیلا نہ مزاج نے صاف صاف انکار کی اجازت نہ دی۔ انہوں نے کہا:

"اچھا گھر میں رہو اور کام کرو۔ دو چار دن میں تمہارے لئے کوئی بندوبست کروں گی۔"

اُدھر مردانے میں میر صاحب کو ان کے ہم جلیسوں نے نو وارد کی خبر دی۔ ایک صاحب نے جو ذرا ظریف بھی تھے ان کی تاریخ یوں بیان کی:

"راویانِ صادق کا قول ہے کہ اصل اس کی بنجارن ہے۔ وہ بنجارن سے ٹھکرائن بنی، ٹھکرائن سے پٹھانی، پٹھانی سے کبڑن، کبڑن سے درزن اور اب درزن سے سیدانی بننے کے ارادے رکھتی ہے۔"

ایک صاحب نے پوچھا "اور اس کے بعد؟"

وہ دونوں شانے اٹھا کر اور دونوں ہاتھ پھیلا کر بولے "خدا ہی جانے! شاید اس کے بعد فرشتوں سے آنکھ لڑائے گی۔"

میر صاحب جب گھر آئے تو بیوی نے ان محترمہ کے آنے کی خبر دی۔ بہت جز بز ہوئے۔ اس بیرت کی عورت اور شرفا کے گھر میں۔ وہ نیک قدم خود بھی کسی کام کے سلسلے میں سامنے آ گئیں۔ میر صاحب بل کھانے لگے۔ نوکری کرنے آئی تھی۔ اگر انکار کرتے ہیں اور گھر سے نکال دیتے ہیں تو اسے معصیت کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔ پیٹ کے لئے انسان کیا کچھ نہیں کرتے ہیں۔ اگر اپنے ہاں بسا دیتے ہیں تو گھر میں ماشاء اللہ کئی چھوٹے میر صاحبان ہیں۔ کہیں چھنو کی نسل اور نہ بڑھے۔ ان ناموں کی یاد سے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا اور وہ مسکرا کر بیوی سے سرگوشی کرنے لگے۔ پھر منو کی ماں کو بلا کر انہوں نے اسے نادر شاہی حکم دے دیا کہ "ہم نے منو کی نسبت طے کر دی۔ اس سے کہہ دو کل اس کا عقد ہو گا۔"

بیچاری جولاہن کو چون و چرا کی مجال نہ تھی۔ وہ "بہت اچھا" کہہ کے ہونے والی بہو پر ایک نظر ڈالنے چلی گئی۔ وہ بھی رشتے سے بالکل بے خبر تھی اس لئے بہت کھل کے باتیں ہوئیں۔ جولاہن اس کے طور طریقے سے زیادہ مطمئن تو نہ ہوئی لیکن جانتی تھی میر صاحب کی خوشنودی اسی میں ہے۔ اختلاف کا یارا نہیں۔ رہنے کا ٹھکانا انہی کا دیا ہے، اچھو کی نوکری انہی کی عطا کردہ ہے اور منو کی جوت میں کیبت بھی انہی کے ہیں۔ پھر لالچ بھی تھا، اپنی خوشی سے شادی کریں گے تو سارا خرچ بھی خود ہی اٹھائیں گے۔ غرض گھر آئی اور رات کو منو کو میر صاحب کا فیصلہ سنا دیا۔ وہ اسے درزی ہی کے گھر باوج کی حیثیت سے دیکھ کر پسند کر چکا تھا، جلدی سے راضی ہو گیا۔

دوسرے دن مولوی صاحب بلائے گئے۔ منو کو نئی دھوتی، نیا کرتا میر صاحب نے پہنوایا۔ دلہن کو شاہانہ جوڑا اور چند چاندی کے زیورات ان کی بیوی نے پہنائے اور عقد ہو گیا۔ پھر میر صاحب اور ان کی بیوی نے رونمائی کے نام سے دس روپے منو کی ماں کو دے اور دلہن کو اس کے ہاں رخصت کر دیا۔

وہ بیتتے گئے، دن بیتتے گئے، مہینے بیت گئے۔ ایک سال ہونے کو آیا مگر منو اور اس کی دلہن کی کوئی شکایت سننے میں نہ آئی۔ میر صاحب کو اطمینان سا ہو چلا کہ نسخہ کارگر ہوا اور اعصاب کے دو بیمار ایک ہی چٹکلے میں اچھے ہو گئے —— کہ دفعتاً ایک دن بی جولاہن فریادی بن کر پہنچیں۔ معلوم ہوا منو نے مارا ہے۔ پوچھ گچھ سے کھلا کہ چھ مہینے سے اسے نشے کا شوق ہے اور جس طرح وہ نشہ بیوی پر آزماتا ہے اسی طرح غصہ ماں پر۔ کل رات میں تو اس نے مارا ہی نہیں بلکہ اسے ایک کوٹھڑی میں بے آب و دانہ بند رکھا۔ اب چھوٹی ہے تو فریاد لے کر آئی ہے۔ میر صاحب کے اس سوال پر کہ پہلے ہی کیوں نہ بتایا کہ فوری تدارک ہو، شاید بُری عادت چھٹنے پاتی، جولاہن سوائے "ماماتا" کے اور کیا جواب دے سکتی تھی۔ انہوں نے حکم دے دیا: "آج سے یہیں رہو۔ گھر جانے کی ضرورت نہیں۔"

مگر میر صاحب کو منو کی فکر ہو گئی۔ خون اگر گندی نالی میں بہہ کر تو بدل جاتا ہے اور نہ پھٹ کر سپید ہو جاتا ہے۔ اس لئے اسے بلا بھیجا اور حد سے زیادہ خفا ہوئے اور یہاں تک کہہ دیا کہ "اگر پھر سنا کہ تو نے تاڑی پی تو درخت سے بندھوا کر اتنا پٹواؤں گا کہ چمڑا ادھڑ جائے گا۔" ساتھ ہی پاسی کے پاس مخصوص کارندہ بھیج کر کہلا بھیجا کہ "اب اگر منو کو ایک قطرہ بھی پینے کو ملا تو تاڑی خانہ پھنکوا دوں گا۔" غرض منو کی پورے طور پر بندش کر دی گئی —— اور تاڑی بند ہو گئی —— نشے کا انجکشن ممنوع قرار دے دیا گیا۔

مگر جونک اپنا کام کرتی رہی —— اور تاڑی بند ہونے کے چھ ماہ بعد وہ آنکھیں مانگنے لگا۔ بالکل زرد، سوکھا ہوا آم بن گیا اور کھانسی بخار کا شکار رہا۔ جب میر صاحب کو خبر ملی کہ عیادت کے بہانے یاروں کی نشستیں ہونے لگیں —— اور منو کی بہو نے نینوں کے بان چلانا شروع کر دیئے تو انہوں نے بی جولاہن کو کچھ روپے دے کر گھر بھیجا اور بیٹے کے علاج اور بہو کی نگرانی کی تاکید کی۔

لیکن یہ نگرانی وہاں اسی طرح ناگوار گزری جس طرح چوروں کو پولیس کی نگرانی کھلتی ہے۔ دو چار ہی دن انگیز کرنے کے بعد زبان کی چھری تیز ہونے لگی۔ ساس بھی کس سے کم تھیں۔ انہوں نے کلہ بہ کلہ جواب دینا شروع کر دیا۔ ایک دن تو نوبت ہاتھا پائی تک پہنچی۔ جوانی اور بڑھاپے کا مقابلہ کیا تھا۔ بہو ساس کے سینے پر سوار ہو گئی۔ منو پلنگ سے جھپٹ کے اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا ماں کو بچانے پہنچا۔ بیوی نے سینے پر دولتی ماری کہ وہ بلبلا کے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دونوں لڑنا بھول کر اس کی تیمارداری میں مشغول رہیں۔ لیکن بلغم کے ساتھ تھوڑا تھوڑا خون بھی آنے لگا اور وہ ایک ہفتہ بعد گھر سے اٹھ کر قبر میں چلا گیا۔

اب رونا دھونا شروع ہوا۔ بین ہونے لگے اور ساس بہو میں اسی پر مقابلہ تھا کہ دیکھیں سوگ کون زیادہ مناتا ہے۔ پانچ روز تو اس طوفان میں وہ طغیانی رہی کہ میر صاحب کو خود آ کر سمجھانا پڑا۔ لیکن آہستہ آہستہ سیلابِ غم گھٹنا شروع ہوا اور ساس بہو کو ایک دوسرے سے چھٹکارا پانے اور رشتۂ قرابت ٹوٹ جانے کی غیر شعوری طور پر خوشی ہونے لگی کہ دفعتاً چنو کی بیوی قبل از وقت مرا ہوا بچہ جن کر دیور کے پاس چلی گئی۔ بی جولاہن کو چار چھوٹے چھوٹے پوتے پوتیوں کو سنبھالنا پڑا اور منو کی بیوہ کو عدت کے احکام بھول جانے کے مواقع ملنے لگے۔

ایسے ہی ایک موقع سے چنو غم بھلانے اور جی بہلانے دیورانی کے پاس آ بیٹھا۔ خاطر تواضع ہوئی اور باتوں کا سلسلہ چھڑ گیا۔ دردِ دل بیان ہوئے، تنہائیوں کا ذکر چھڑا اور اس کے دور کرنے کے ذرائع پر غور ہوا۔ بالآخر ایک شب امتحان کی قرار پائی۔ جب اس کی صبح کامرانی سے ہوئی تو چنو نے ماں سے اصرار کیا کہ اس رشتے کو عقد کے ذریعے مستحکم بنا دے۔

وہ بیٹے کو لے کر مولوی صاحب کے پاس پہنچیں۔ وہ دیہات میں رہنے کی وجہ سے شرع کی کتابیں اب تک نہ سمجھے تھے۔ انہوں نے امتحان اور اس کے نتائج سے واقف ہوتے ہی کان پر ہاتھ رکھا اور نکاح کے ممنوع ہونے کا فتویٰ فوراً صادر فرما دیا۔ بڑی بی دیر تک ایک دکھیا کی طرح بحثتی رہیں، پر جب مولوی صاحب اپنے فیصلے سے نہ ٹلے تو جل کر بیٹے سے بولیں: "چل آ، اے گھر چل۔ مانگ میں میرے سامنے سیندور بھر دینا۔ وہ اب تیری بیوی ہے، میں خوش، میرا خدا خوش!" —— چنو نے ماں کا کہنا کیا۔ مانگ میں سیندور کی چٹکی ڈال دیا اور

اپنے چاروں بچوں سمیت اسی گھر میں منتقل ہوگیا۔

ایک مہینہ بیتا، دو بیتے، تین مہینے بیتے مگر چوتھے مہینے چنو کی کمر میں اچک آگئی۔ اکڑنا، بورنا، تن کے چلنا چھوٹ گیا۔ وہ اب ذرا جھک کے چلنے لگا۔ ہمسایہ صاحبان میں سے ایک صاحب طبیب تھے، ان کو دکھایا۔ انہوں نے معجونیں اور گولیاں کھلانا شروع کیں۔ دواؤں کے زور پر کچھ دن اور چلا۔ بدقسمتی سے حکیم صاحب ایک ریاست میں ملازم ہو کر چلے گئے۔ بس اچنو کی کمر کچی لکڑی کی طرح بوجھ پڑنے سے جھک گئی۔ ساتھیوں نے افیون کی صلاح دی۔ شروع میں تو کافی فرق آیا مگر افیون کی خشکی نے دلوچا اور بی چنیا بیگم ماشتی پی دودھ، گھی، ملائی اور یہ چیزیں چار روپے کی ملاتی ہیں کہاں نصیب، وہ لگا کھیسے نکال کے ہاتھ پھیلانے اور بیٹیں کمانے۔ مگر اس پر بھی جو کچھ ملتا تھا وہ نہ ملتا اور افیون کی لت پڑ ہی چکی تھی وہ چھوٹتی نہیں۔ اس نے آہستہ آہستہ دل و جگر کو چھلنی کیا اور چنو خان کو اختلاج کے دورے پڑنے لگے اور سوکھی کھانسی آنے لگی۔

ایک دن جنوری کے مہینے میں جب بوندا باندی ہو رہی تھی اور اولے پڑنے ہی والے تھے کہ چنو کو اختلاج شروع ہوگیا۔ ڈیوڑھی پر کسی کام کے سلسلے میں حاضر تھا۔ وہیں برتن چھوڑ چھاڑ گھر کی طرف بھاگا۔ راستے ہی میں کوندا لپکا اور جان پڑا اسی کے سر پر بجلی گری۔ منہ کے بل زمین پر آ رہا۔ سنبھل کر اٹھا مگر دل کا یہ حال تھا کہ منہ سے نکلا پڑتا تھا۔ بے ساختہ "ارے ماں! ارے ماں!" چیختا ہوا دوڑا۔ راستہ سجھائی نہ دیتا تھا۔ دم گھٹتا جا رہا تھا مگر پاؤں پہیے کی طرح لڑھک رہے تھے۔ گھر کی دہلیز میں قدم رکھا ہی تھا کہ دوسرا کڑاکا ہوا۔ وہ ٹھوکر کھاتا سنبھلتا پھسلتا، لڑکھڑاتا دالان والے پلنگ پر جا کر بحری کے پنجے سے چھوٹے ہوئے کبوتر کی طرح بے دم ہو کر گر پڑا اور اسی طرح اس کا ہر عضو پھڑکنے لگا۔ بیوی "ارے کیا ہو گیا لوگو!" کہتی ہوئی دوڑی۔ چنو نے بایاں پہلو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے کہا:

"اب میرے بعد تم کو کون خوش رکھے گا؟" اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔

چنو کی فاتحہ کے تیسرے دن اس کی خوش نہ ہونے والی بیوہ گاؤں کے ایک جوان کسان کے ساتھ کمبھ کا سید گھومنے الٰہ آباد چلی گئی۔

حامد اللہ افسر

ڈالی کا جوگ

گنگا کے کنارے موضع ارتسٹی کے مشرقی حصّہ میں جامن اور فالسے کے درختوں میں چھپا ہوا ڈالی کا غریب گھر تھا۔ سفید مٹی سے پُتی ہوئی کچی اینٹوں کی چھوٹی چھوٹی دیواریں عارفانہ سکون و اطمینان کے ساتھ پھونس کے چھپر کو اپنے سروں پر خاموش لئے کھڑی تھیں، صاف و شفاف چبوترے سے صحن کو محصور کرلینے والی نیچی اور خوشنما دیواروں نے ڈالی کی پرورش گاہ کو تمام بستی سے علیحدہ کر دیا تھا صحن کے مغربی پہلو میں کھڑی کا گھنا درخت تھا جس کے پتے ہوا کے ترنّم سے تالیاں بجا بجا کر ڈالی کے ننھے دل کو ہمیشہ بہلاتے رہے ہیں گھر کے چاروں طرف سرسبز و شاداب کھیت تھے جن کی گود میں ڈالی نے پرورش پائی تھی ۔

شام کا وقت تھا اور تمام دن کی مسافت طے کرنے کے بعد آفتاب اپنی سنہری خوابگاہ میں آرام کرنے کے لئے جا رہا تھا۔
زمین اور آسمان تاریکی کی گہرائیوں میں غرق تھے، پہاڑوں کی بلندیاں اور میدانوں کی پستیاں ایک سطح میں ہوگئی تھیں اور نیلی کملی والا آج کالی کملی اوڑھے ہوئے تھا اندھیری رات سکون و خاموشی کا جامہ پہنے ہوئے تھی۔ مٹی کا چھوٹا سا ٹمٹماتا ہوا چراغ اپنی دھندلی اور افسردہ روشنی میں ڈالی کے غمزدہ چہرہ کو تک رہا تھا نمبردار کیلاش کی پُراسرار گمشدگی نے ایک معصوم اور بھولی بیٹی کو اس کے عزیز ترین باپ سے جُدا کر دیا تھا ۔

کاش وہ اس سنسان اور ڈراؤنی رات کے پہلے حصّے میں پکے ہوئے بھرے گیہوں کی رکھوالی کو نہ جاتا۔ کہتے ہیں کہ لٹیروں کا گروہ مسلح تھا اور کوئی نہ جس وقت کھیت کی ڈوری پر سے کود کر بھاگا ہے تو بد نصیب نمبردار ان کے قبضہ میں آ چکا تھا۔

نعش کا پتہ نہیں ملتا ہمدرد دل تسلی دینے سینوں سے لگانے کے لئے بے چین ہیں۔ کاش نصیب اتنا موقع مل جاتا کہ اپنے عزیز باپ سے ملاقات پر کسی قسم کی مصیبت آنے سے پہلے وہ اپنی جان نثار کر دیتے خون کے چھینٹے بھی کہیں نظر نہیں آتے ہاں کھیت کے قریب والی ریت کی مٹی ضرور اُدھر اُدھر کو بکھری ہوئی ہے جس سے زور آزمائی اور دست و گریبان ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

رات کا ڈیڑھ پہر گذر چکا تھا لیکن ڈالی اپنے گمشدہ باپ کو صبر و تحمل کے دشوار گذار راستوں میں تلاش کر رہی تھی۔

(۲)

اِس غم انگیز سانحہ کے بعد زمین مع اپنے غیر محدود تغیرات کے چھ مرتبہ آفتاب کے گِرد چکر کاٹ چکی ہے کاتک کا مہینہ شروع ہونے والا ہے صبح کا وقت ہے نسیم اِدھر اُدھر کھیلتی پھرتی ہے۔ اس کے خوشگوار اور دل بھانے والے جھونکے موسمِ سرما کے ابتدائی زمانہ کا عکس لئے ہوئے ہیں۔

اوتنتی سے چند میل کے فاصلے پر ہمالہ کی نازک رس چوٹیوں سے آنے والی گنگا کے اُس پار پھونس کی ایک چھوٹی سی جھونپڑی زاہدانہ انداز سے خاموش کھڑی ہے، ہلکی شربتی ساری پہنے ہوئے ایک دوشیزہ جوگن اٹکھیلیاں کرنے والے چھوٹے چھوٹے پودوں میں پانی دے رہی ہے۔ بیلے اور چنبیلی کی خوشنما کلیاں اس کے مقدس اور سنجیدہ چہرہ کو دیکھ دیکھ کر مسکرائے دیتی ہیں، سورج جو کچھ دیر پہلے سے صنعتِ نازک کے اس پاکباز سنیاسی کو خاموشی کے ساتھ مشرقی پردوں سے منہ نکال کر جھانک رہا تھا اب آہستگی سے اُوپر اُٹھ آیا ہے کیونکہ اُس نے اندازہ کر لیا ہے کہ ماہتاب کی للچائی ہوئی آنکھیں کھلنے سے پہلے وہ بلا شرکتِ غیرے اس متبرک اور دلچسپ نظارے سے لطف اندوز ہو سکے گا۔

جوگن اپنی پھونس کی کُٹی میں بیٹھی ہے جسے اُس نے خود اپنے ننھے اور نازک ہاتھوں سے آٹھ شبانہ روز کی محنت میں بنا کر کھڑا کیا ہے۔ دو تصویریں اُس کی آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں کے سامنے ہیں۔ وہ زاہدانہ صبر و استقلال کے ساتھ تخیل کی وسیع گہرائیوں سے نکلنا چاہتی ہے مگر مجبور ہے۔

(۳)

"دانی! آخر میرے بچپن کے خواب کی تعبیر نکل آئی۔ مجھے مقدس دیوی نے پسند کر لیا پاک خدا مجھ پر مہربان ہے۔ تو گناہوں سے بری ہے اور تیرے زہد و اتقا کی قسم کھائی جاتی ہے۔

تو جوگن کے بھیس میں کیسی پیاری معلوم ہوتی ہے گویا خدائے بزرگ و برتر خود تیرے جسمانی مندر میں جلوہ افروز ہے۔ تو شبنم سے دھلے ہوئے اُس پھول کی مانند پاکیزہ اور دلفریب ہے جو دیوتاؤں پر چڑھانے کے لئے لایا جاتا ہے۔

اُٹھ پیاری ڈالی اُٹھ اور اپنے ہاتھوں سے مجھے برکت دے میں اب بھی وہی دانی ہوں جو اب سے چند سال پیشتر تھا۔ اُس وقت تو میرے لئے ایک حسن کی دیوی تھی مگر اب"

"دانی۔ بس بس۔ جسے میں نے بُھلا دیا ہے اسے اب پھر یاد نہ دلاؤ۔ میں دُنیا کو چھوڑ چکی۔ وہ غم و اندوہ کا مسکن ہے۔ میں یہاں آزاد ہوں تم مجھے آزاد رہنے دو۔"

"اور محبت کا وہ عالیشان محل جس کی تعمیر دونوں نے مل کر کی ہے اور جو رُوح افزا وعدوں سے مزین کیا گیا ہے کیا آج بے گناہ۔ اُس کے سر پر گرا دیا جائے گا؟"

"نہیں دانی نہیں۔ میں تمہاری محبت کی قدر کرتی ہوں۔ میں تمہیں بھولی نہیں ہوں۔ مگر ہاں اب میں مجاز کے شور و شر سے نکل کر حقیقت کے سکون و اطمینان میں آگئی ہوں"

"ایک سچے پرستار کے محبت بھرے پہلو میں تقدس اور پاکیزگی پر دھبہ آنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی"

"لیکن دانی جوگن کی جھولی ہے وہ بیچ کیسے اور کیسے کی ہو سکتی ہے"

"ڈالی۔ شاید تم بھول گئیں۔ تمہارے پتاجی مجھ پر مہربانی کی نظر رکھتے تھے۔ کیا تم اُن کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرنا پسند کرو گی؟"

"پتاجی کی مرضی ہرگز نہ تھی کہ تمہارے ساتھ میری شادی ہو، اُنھوں نے مجھے ہدایت کی تھی کہ تمہاری طرف اِس نظر سے نہ دیکھوں۔"

"دانی۔ کیا تمہیں وہ دن یاد نہیں جب میں کئی ہفتہ متواتر مغموم اور افسردہ خاطر رہی ہوں تم مجھ سے میرے تفکرات کا سبب پوچھتے تھے اور میں ٹال جاتی تھی۔"

"ڈالی مجھ پر رحم کرو!"

"میں اپنے پیارے پتا کی مرضی کے خلاف کچھ نہ کروں گی۔"

"ڈالی۔ میں تیرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ایسی پاکیزہ زندگی بسر کرتے مجھے ایک بے گناہ کا خون اپنی گردن پر نہ لے، دونوں وقت ملتے ہیں۔ مبارک فال ہے، دیکھ ایسے سہانے اور متبرک وقت میری درخواست رد نہ کر۔"

"دانی۔ میں مجبور ہوں۔"

سورج اپنے طلائی زیور کو دُنیا کی آنکھوں سے چھپانے کی کوشش میں تھا، اُفق پر بادل منڈلا رہے تھے اور مالن محبت کے جذبات کو اپنے سینہ میں دبا رہی تھی۔

دانی اب بہت دُور نکل گیا ہے، یاس اُس کی ساتھی ہے، مایوسی اس کی غمخوار ہے اور موت اس کی رہنما۔

(۴)

ایک روز صبح کی دھندلی روشنی میں جوگن مقدس گنگا کے پانی میں کھڑی ہوئی ستارۂ سحری کی طرف نظر جمائے ہوئے اپنے پاکیزہ گرد میں بھجن گا رہی تھی، گنگا کے مشرقی پہلو پر آسمان میں زعفرانی رنگ کی شگفتگی ظاہر ہوئی، تاریکی کھلتی ہوئی کلی کے بالائی نقاب کی طرح ہٹ گئی اور صبح ایک چکے پھول کی مانند آسمانی جھیل میں شگفتہ ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جوگن کے ہر حرف پر صبح کا جادو ٹوٹ رہا ہے۔ چاند اور ستارے مغرب میں غرق ہو رہے ہیں، سورج مشرق میں طلوع ہو رہا ہے اور اس طرح دُنیا کا منظر اس کی سحر انگنی سے تغیرات کے زیر اثر ہے۔

اشنان کے بعد وہ خوبصورت اور باکمال ہستی دریا سے باہر آئی اس کے ریشمی بالوں کی جٹا سے پانی ٹپک رہا تھا اور نو زائیدہ سورج کی ہلکی ہلکی شعاعیں اُس کے جسم پر منعکس تھیں۔

ایک غصّہ سے بھری ہوئی آواز اُس کے کانوں میں آئی، ڈالی صاف نہ سمجھی، پھر وہی آواز سُنائی دی "ٹھہر او مکار جوگن ٹھہر۔"

ایک قوی ہیکل انسان ہاتھ میں ننگی تلوار لئے نمودار ہوا، ڈالی کے دماغ میں غصہ اور حیرت کا طوفان بجوش زن تھا، آنے والا قریب ہوا۔ ڈالی نے اس شکل اور جسم کو ضرور کہیں دیکھا ہے، اُس کے کان بھی اس آواز سے مانوس ہیں، ڈالی کے دل میں عجیب طرح کے جذبات کا ہجوم تھا۔ انتہائی ضبط اور تحمل کے بعد اُس نے بولنے کی جرات کی "ہیں۔"

"ہاں تو تو ڈاکوؤں اور لٹیروں کو پناہ دیتی ہے، میں نے اس خطہ کو ان تباہ کُن ہستیوں سے پاک کر دیا ہے، ایک دانی باقی ہے، سو وہ تیری پناہ میں دیکھا گیا ہے، مجھے اُس کا پتہ دے ورنہ اپنی جان سے ہاتھ دھو لے۔"

ڈالی ایک بار پھر خیال کی وسیع اور غیر محدود گہرائیوں میں غرق ہو گئی۔

بالکل میرے عزیز پتا کی آواز ہے، وہی چہرہ ہے، وہی قد ہے۔ مگر اُن کی داڑھی نہ تھی، تصور مجھے دھوکا نہ دے، میں خواب میں ہوں،

تخیل نے ایک پیاری شبیہ بنا کر میرے سامنے کھڑی کر دی ہے۔ آہ ظالم لٹیرے، اگر، دانی اور لٹیرا! خدایا!

" جوگن بولی، مجھے اُس نامراد دانی کا پتہ لے جس نے میرے قتل کی سازش کی تھی اور اس طرح میری عزیز بیٹی اور میرے مال ومتاع پر قبضہ کرنا چاہا تھا، میں اُس کے خون سے اپنی پیاری ڈالی کے بیاہ کا جوڑا ——"

" پتاجی! پتاجی! تمھاری بیٹی"

" کون؟ ڈالی! ...... ڈالی! ..... جوگن! ....."

دریا کا پانی جوش میں اُچھل اُچھل کر کنارے والی زمین کو بوسہ دے رہا تھا، سرو اور کیلے کے درخت خاموش کھڑے دیکھ رہے تھے اور ایک مدت کا بچھڑا ہوا باپ اپنی پیاری اور پاکیزہ بیٹی کو اپنے قدموں سے اُٹھا کر سینہ سے لگا رہا تھا۔

عاشق بٹالوی

زندگی

صبح چند مہمان آجانے کی وجہ سے تمام دن اُن کی خاطر مدارات میں صرف ہوگیا۔ عصر کے قریب میں بمشکل مطالعہ کے لیے وقت نکال سکا اور شام تک پڑھتا رہا۔ اسی ضمن میں سہ پہری کی ہواخوری بھی ضائع ہوگئی۔ جب چراغ روشن ہوئے تو کتابوں سے دل برداشتہ ہوکر صحیفۂ فطرت کا مطالعہ کرنے یا یونہی چہل قدمی کے لیے، میں مکان کی چاردیواری سے باہر نکلا۔ ابھی دس قدم بھی نہ گیا ہوں گا کہ کسی نے آہستہ سے میرے پیچھے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ مڑ کے دیکھا تو ایک دُبلا پتلا چھریرے قد کا آدمی میلی سی اچکن پہنے کھڑا تھا۔ گہری شام کے غلیظ دھندلکے میں اُسے پہچاننے میں مجھے کچھ دقت ہوئی۔ لیکن جب اُس نے مانوس اور شیریں آواز میں، اور یقیناً وہ آواز دنیا میں صرف ایک ہی شخص کی ہوسکتی تھی، میرا نام لے کر پکارا تو میں حیرت سے "اصغر" کہہ کر بے تحاشا اُس سے لپٹ گیا۔ معانقہ ختم ہوا۔ تو سب سے پہلے میں نے اُس کی ظاہری وضع قطع پر لب کشائی کی، جس کی وجہ سے وہ بالکل اجنبی ہو رہا تھا۔ پرانے بے تکلفانہ انداز میں اُس کی کمر پر زور سے تھپکی دیتے ہوئے میں نے کہا۔ "خیریت تو ہے؟ تم نے یہ حالت کیا بنا رکھی ہے؟ اگر تم نہ بولتے تو شاید میں تمہیں پہچان بھی نہ سکتا۔"

اُس نے رُکتے رُکتے کہا۔ "میں ملتان سے آرہا ہوں، راستے میں میرا کپڑوں کا بکس چوری ہوگیا۔"

ہمدردی کی بجائے میرے مُنہ سے بے اختیار قہقہہ نکل گیا، پھر ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے میں نے کہا۔ "واللہ دوست بھی عجیب ستم ظریف واقع ہوئی ہے تمہارے کپڑوں کے بکس کا گم ہو جانا اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایسا ہی افسوسناک سانحہ ہے، بلکہ اس سے بھی شدید، جیسا کسی مصور، نقاش یا سنگ تراش کی اختراعات فائقہ اور عمر بھر کی عرق ریزی سے جمع کیے ہوئے نوادر کا کھو یا جانا۔ یقیناً اس حادثے سے صنعت اور فنون لطیفہ کی دُنیا کو بہت نقصان پہنچے گا۔ کہو یہ واقعہ کیونکر پیش آیا؟"

اُس نے کہا۔ "بندۂ خدا مذاق پھر کرلینا۔ پہلے یہ تو پوچھ کہ میں آیا کیوں ہوں۔ میرے قیام و طعام کا بندوبست کرو۔ میں تمہارے یہاں ٹھہرونگا۔"

"بسم اللہ۔ آئیے۔"

میں سیدھا اُسے اپنے مکان میں لے گیا۔ جب ہم اطمینان سے آرام کرسیوں پر دراز ہوگئے۔ اور لیمپ کی روشنی اُس کے چہرے پر پڑی، تو میں نے دیکھا کہ اصغر بہت زرد اور نحیف ہو رہا ہے۔ اگرچہ اُس نے مخصوص انداز میں اپنی تنگی ٹوپی کو نہایت لاابالیانہ طریق سے اُتار کر میز پر پھینک دیا۔ اور زیرلب گنگنانے

لگا۔ لیکن اُس کی ہیئتِ مجموعی سے صاف پتہ چل رہا تھا۔ کہ وہ غیبے کی کوشش کر رہا ہے۔ دراصل آج کا اصغر اُس اصغر سے جسے میں جانتا تھا کوئی نسبت نہ رکھتا تھا۔ اُداس منحنی سا چہرہ، معمولی ادنیٰ درجے کے لباس میں ملبّس آنکھوں میں کھویا پن اور کہاں وہ چاق، چوبند، خوش طبع، انگریزی معاشرت کا دلدادہ اصغر جو اپنی سحر کار شخصیت اور ندرتِ کلام سے حاضرین کو مبہوت کر دینے کے علاوہ لطیف بذلہ سنجیوں اور فلک شگاف قہقہوں سے بزم کی بزم کو کشتِ زعفران بنا دیتا تھا۔ اُس کا حُسنِ مذاق مسلّم اور اُس کی رائے خصوصاً پوشاک اور آرائش کے معاملات میں ہمیشہ ہمارے حلقۂ احباب میں سند کے طور پر پیش کی جاتی تھی۔

چند لمحے خاموشی میں گذر گئے۔ تو میں نے کہا۔ "ہاں، تو تم نے بتایا نہیں وہ بکس کیسے گُم ہو گیا؟"

"ارے بھائی کوئی بات ہو تو کہوں۔ سراسر میری ہی غلطی تھی۔ میں ملتان سے چلا تو بہت سراسیمگی اور ذہنی انتشار کے عالم میں تھا۔ یہ اچکن کھونٹی پر لٹک رہی تھی۔ اُسی پریشانی میں جلدی سے اُتار کر پہن لی، اور باقی تمام کپڑے اور چند کتابیں ٹرنک میں بند کر لیں۔ ریل میں بیٹھا تو بھی وہ اُدھیڑ بُن طاری رہی اور میں اُس ڈبے کے باقی مسافروں کا بخوبی جائزہ بھی نہ لے سکا۔ بعد ازاں میں نے محسوس کیا کہ وہاں دو شخص ایسے موجود تھے۔ جو اپنی حرکات سے بہت مشکوک چلن کے معلوم ہوتے تھے۔ راستے میں اتفاق سے میری آنکھ لگ گئی۔ اور خانیوال اسٹیشن پر جاگا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ٹرنک غائب۔ کمرے میں میرے سوا اور کوئی مسافر نہ تھا۔ میں نے گارڈ، اسٹیشن ماسٹر اور پولیس کے افسر کو فوراً اطلاع کی۔ وہ کہنے لگے کہ اپنا سفر منقطع کر کے وہیں ٹھہر جاؤں تاکہ ان کو تلاش و تفتیش میں سہولت ہو۔ مگر میں نے سوچا مضیٰ ما مضیٰ، قسمت اچھی ہوئی تو بکس بھی مل جائے گا۔ ورنہ جان تو باقی ہے۔ اُن کو ضروری ہدایات دے کر میں چلا آیا۔ اگر یہ نقصان بعض اور حالات کے ماتحت ہوتا تو شاید میں بالکل ہی محسوس نہ کرتا مگر جیسا مبہم پروگرام اب میرے پیشِ نظر ہے اور جس قسم کی غیر مستقل زندگی سے میں دوچار ہونے والا ہوں۔ وہاں لباس ایسی اہم چیز کی عدم موجودگی سے ضرور رنج ہو گا۔"

میں نے ایک لمبا سانس لیا اور کہا۔ "اصغر ہم ہندوستان میں کتنی جلدی بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ میری مراد جذباتی بڑھاپے سے ہے۔ تم اور ذہنی انتشار کے عالم میں گھر سے چلو اور پھر تمام سفر ایک اُدھیڑ بُن میں گزار دو۔ خدا کی قسم میں باور نہیں کر سکتا۔ مگر جب دیکھتا ہوں کہ یہ بڑھاپا ہر لحظہ ہم پر شدت سے وار کر رہا ہے اور بہت کم لوگ ہیں جو اپنے اندر قوتِ مدافعت رکھتے ہیں تو میرے لئے حیرت کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ اور تمہاری گذشتہ زندگی سراسر ایک نقلی معلوم ہوتی ہے۔"

"نقلی؟" اصغر جھک کر اُٹھ بیٹھا۔ "تم دیکھو گے کہ میں اصول سے سرِ مو انحراف نہیں کرتا۔ باقی رہا یہ کہ میں خاص احوال میں کیوں سراسیمہ ہُوا تو عرض ہے کہ میں نے اس بات کا تو کبھی دعوےٰ نہیں کیا کہ میرے اعصاب فولاد اور قلب و دماغ پتھر کے ہیں۔ ہر ذی حیات شعوری یا غیر شعوری طور پر زندگی کی ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ اور منجملہ اُن بالا از شمار نفوس کے ایک میں بھی ہوں جسے اسرارِ حیات کو سمجھ لینے کا دعوےٰ تو نہیں ہاں جس نے بزعمِ خود ایک ایسا راز جان لیا ہے۔ جس سے زندگی کی غایت پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی روشنی میں میں نے اپنے لئے چند اصول وضع کر لئے ہیں۔ جو میری رہبری کر رہے ہیں۔ تم ان باتوں پر ہنستے ہو۔ لیکن ایسی ہنسی میں پہلے کئی مرتبہ دیکھ چکا ہوں تم مجھے نور کو تاریکی اور تاریکی کو نور کہنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ لاریب مجھ میں بہت سی خامیاں ہیں جن کو رفع کرنے کے لئے میں ہمیشہ جد و جہد میں مصروف رہتا ہوں۔ آخر انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں کہ گردشِ مدام سے گھبرا نہ جاؤں۔ ہر چند کہ جانتا ہوں یہ گھبراہٹ سراسر بے سُود اور تکمیلِ حیات میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ لیکن میرے عمل کو کوتاہی سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ زرّیں اصول جس کی حقانیت اور صداقت پر مجھے دو اور دو چار والا اعتقاد ہے اپنے اندر کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ تم ایسے، ہم کہتے ہو۔ لیکن خدارا مجھے بتاؤ ہماری زندگی میں کوئی ایسی چیز مادی یا غیر مادی، بھی ہے جس کی بنیاد وہم نہ ہو، عزیز دوست، انسان کے تمام اعمال و معیار اعتباری ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو کامیابی پر آپے

سے باہر ہو جاتے اور ناکامی پر گریہ وزاری کرنے کے کیا معنی؟ تم بیرے ہی کہنے سے اس اصول کو جسے میں صداقت اور تم وہم سے تعبیر کرتے ہو ایک مرتبہ تو اپنی زندگی میں جاری وساری ہو جانے کا موقع دو۔ پھر دیکھو کہ حجابات یک قلم اُٹھ جاتے ہیں یا نہیں؛ علت ومعلول کی اس دنیا میں جہاں جاندار اور بے جان سبھی ایک غیر مختتم سلسلے میں منسلک ہیں۔ اسباب ونتائج کی طبعی کڑی سے کیونکر آزاد ہو سکتا ہوں۔ باقی انسانوں کی طرح میں بھی حسب منشاء نتائج اخذ کرنے کے لئے اسباب پر قدرت حاصل کرنے کا متمنی ہوں مگر بسا اوقات ناکامی سے واسطہ پڑتا ہے۔

ناکامی ہماری طبائع پر کیونکر اثرانداز ہوتی ہے۔ بس یہیں سے میرے تمہارے راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں؛

ابھی خدا معلوم وہ اس کے بعد کیا کچھ کہہ جاتا کہ میں نے دفعتاً ایک قہقہہ لگا کر اُسے خاموش کر دیا۔

میں نے کہا سبحان اللہ کیا کہنے ہیں آپ کی لسانی کے۔ آئینہ لاؤں حضور کے سامنے کہ آپ کو اپنے اصول کی حقانیت پر ایمان آ جائے۔ ذرا اس چہرے کو دیکھو جس میں خون زندگی کا قطرہ تک نہیں آتا۔ اپنی جھریوں سے اٹی ہوئی پیشانی دیکھو۔ رخساروں سے زردی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے دیکھو۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے جسم کی ہڈیاں گن لو۔ ایک جھلکتی ہوئی نگاہ اپنے لباس پر بھی ڈال لو کہ یہ اُس شخص کا لباس ہے جو زیادہ عرصہ نہیں گزرا ذوق جمال وآرائش لباس کے معاملہ میں مجتہد کا درجہ رکھتا تھا۔ اور پھر مجھے بتاؤ کہ اگر غیر فانی شباب اسی کا نام ہے تو تنگیٔ شباب کی اصطلاح کس پر عائد ہوتی ہے؛

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اصغر کے متعلق قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کروں تاکہ یہ گفتگو پیش منظر کی روشنی میں زیادہ دلچسپ اور واضح ہو سکے۔ یہ کہنا کہ اصغر میرا دوست تھا چنداں قابل التفات بات نہیں کیونکہ طالب علمی کا زمانہ تو ہر شخص پر دوستی کا ملمع چڑھا دیتا ہے اصغر اور میں چار سال ایک ہی کالج اور ایک ہی ہوسٹل میں رہے جن میں سے ایک سال کے لئے میں اور وہ "ہم کمرہ" بھی تھے۔ اصغر کے حقیقی بہن بھائی کوئی نہ تھا۔ اور والد کے ساتھ بھی اس کے تعلقات کشیدہ نہ تھے۔ تو بہت زیادہ خوشگوار بھی نہ تھے علاوہ ازیں وہ اس کے تعلیمی اخراجات کے کفیل ہو رہے تھے۔ ان ہی وجوہ سے اصغر کی صرف اپنی زندگی اس کی تمام تر توجہات اور دلچسپیوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ چھٹیوں میں بھی وہ بہت کم مکان پر جاتا تھا کبھی میرے ہاں کبھی آپ کے یونہی فرصت کا وقت گزار لیتا یا اگر جیب گرم ہوئی تو ہندوستان کے مختلف شہروں کا چکر لگاتا اس کا محبوب مشغلہ تھا حالات کی اس نامساعد روش نے جو یقیناً مجھ ایسے ذکی الحس انسان کے لئے بے حد تکلیف دہ اور ضرر رساں ثابت ہوتی، اصغر کی طبیعت میں ایک خاص قسم کی بے نیازی اور قوت ارادی پیدا کر دی۔

سماج میں فرد کی حیثیت سے انسان پر بہت سے ایسے فرائض بھی عائد ہوتے ہیں جن کو اس کے طبعی رجحان اور حقیقی ذوق کے ساتھ چنداں تعلق نہیں ہوتا۔ والدین کی خدمت، دوستوں کی مروت، بیوی بچوں کی الجھن، بھائی بہنوں کی محبت، تعلقات کی ایسی سینکڑوں زنجیروں نے ہمیں سماج کے مختلف شعبوں سے اس طرح باندھ کر رکھا ہے کہ انفرادی زندگی کا کوئی مفہوم ہی نہیں رہا۔ دراصل انسانی زندگی ایسے ہی خونی رشتوں اور جذباتی تعلقات کے مجموعہ کا نام ہے۔ ان بندھنوں سے جیتے جی آزاد ہونا محالات سے ہے لیکن ہم ایسی زندگی کا تصور ضرور کر سکتے ہیں۔ اور اُس کا قیام بھی ممکن ہے۔ جہاں انسان محض اپنے لئے زندہ رہتا تھا۔ ایسا قائم بالذات شخص جو لعن وتشنیع کے وعدے سے بے نیاز اپنی ہر ممکن الحصول خواہش کی تکمیل کے لئے آمادہ کار ہو جائے۔ جس کے لئے کل کائنات سمٹ سمٹا کر اس کی اپنی زندگی میں محدود ہو گئی ہو جس کی آرزوئیں رسمیات عہد کے دباؤ اور جس کے ارادے خندۂ استہزا کے خوف سے یکسر آزاد ہوں بلاشبہ اپنی زندگی میں ایک خاص لذت رکھتا ہے۔ بعض دنیادار شاید اس حالت کو آوارگی سے تعبیر کریں لیکن سچ پوچھئے تو ہر جذبہ اپنی آخری منزل میں بے عنان ہو کر آوارگی ہی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ آج سے کئی سال قبل جب میں اوّل اوّل اصغر سے ملا تو اُس کی اسی قسم کی آزادی وبے عنانی نے مجھے بھونچکا سا کر دیا۔ کہاں کالج کا ایک مبتدی اور کہاں یہ باغیانہ طبیعت۔ ذہانت کے لحاظ سے وہ اپنے ہم جماعت طلبہ میں بہت کم حریف رکھتا تھا۔ لیکن چونکہ اُس نے اوقات بہت بے ڈھنگے طریق سے تقسیم کر رکھے تھے اسی لئے

بعض دفعہ وہ کئی کئی ہفتے کسی کتاب کو نہ چھوتا۔ پڑھنے پہ آتا تو زاہدِ شب زندہ دار کی طرح رات کو آنکھ جھپکنا بھی حرام سمجھتا تھا۔ میں کبھی اُس سے کہے لا اُبالی پن پر لب کُشا ہوتا تو وہ یہی جواب دیتا تھا کہ "میں طالب علمانہ شہرت حاصل کرنے کا خواہاں نہیں ہوں۔ کہ کتابوں میں سر کھپانا مقصودِ زندگی قرار دے لوں۔ کتب بینی جو مشاہدے کی صلاحیت سلب کر لے ایک ذہنی بیماری ہے۔ میرے لئے تو اسی قدر مطالعہ کافی ہے۔ جس سے امتحان میں کامیابی حاصل ہو سکے"! اور پھر عالمِ سرخوشی میں یہ شعر پڑھ دیتا۔

مومن بہشت و عشقِ حقیقی نہیں نصیب

ہم کو تو رنج ہو جو صنم جاوداں نہ ہو!

دو سال کے بعد جب اتفاق سے میری اور اُس کی رہائش ایک ہی کمرے میں ہو گئی تو اُس کے حالات و اطوار زیادہ وضاحت کے ساتھ مجھ پر عیاں ہونے لگے۔ اُس کا معمول تھا۔ کہ سرِ شام کھانا کھا کے نکل جاتا اور رات کے گیارہ بجے واپس آتا۔ حالانکہ قواعد کی رو سے کوئی طالب علم نو بجے کے بعد اپنے کمرے سے باہر نہیں رہ سکتا تھا۔ خوش قسمتی سے دارالاقامہ کے مہتمم بہت با مذاق اور زندہ دل تھے۔ انہوں نے جب بھی سرزنش کی۔ اصغر نے ہنس کر جواب دیا۔ "حضرت! نوعِ انسان پر ایک ہی قسم کے قوانین عائد کرنا دانشمندی نہیں۔ بعض کو قدرت مستثنیات کے لئے پیدا کرتی ہے۔ بندہ بھی انہیں میں سے ہے"!

اُس کی صحبت یقیناً افزائشِ مسرت کا موجب تھی مگر جب وہ آدھی رات کو آکر سوتوں کو جگاتا اور دروازہ کھٹکھٹا کر میرے آرام میں بے طرح مخل ہوتا تو طبیعت جھنجھلا اُٹھتی تھی، اور پھر ایک روز کی بات ہو تو مضائقہ نہیں۔ اُس کا تو مہینے میں تیس دن وطیرہ یہی تھا۔ ایک رات وہ خلافِ معمول بہت دیر سے آیا۔ شاید دو بجے ہوں گے۔ صبح ہوئی تو میں نے سامان باندھنا شروع کر دیا۔ بڑی بیتابی سے پوچھنے لگا: "خیر ہے۔ کہاں کا ارادہ ہے"؟

میں چلانے لگا: "تمہارے ساتھ رہ کر میں اپنی صحت خراب کرنا نہیں چاہتا۔ غضب خدا کا دن بھر تو کالج کی بک بک میں صرف ہو جاتا ہے۔ رات کو آرام کا وقت تم یوں برباد کر دیتے ہو۔ اگر ایسی ہی آوارگی دماغ میں سما گئی ہے تو کالج کو خیرباد کہہ دو۔ تم ایسے جہاں گردوں کے لئے خدا کی زمین تنگ نہیں ہے"۔

وہ بستر سے اُچھل کر مجھ سے آ لپٹا: "دوست خفا ہو گئے! سچ پوچھو تو تمہارے ہی بھروسے پر یوں بے فکری سے گزر رہی ہے۔ ورنہ مجھ ایسے سیلانی کو ہوسٹل کی قید و بند میں رہنے کا سلیقہ کب تھا۔ یار تم بھی کسی کٹھ ملا سے کم نہیں۔ کئی بار میں نے کہا کہ کتابی کیڑا بننا ہی طالب علمی کی غایت نہیں ہے۔ انسان تو عمر بھر طالب علم رہتا ہے اور حصولِ علم کی سیکڑوں راہیں دنیا میں کھلی ہیں۔ لیکن تم ہو کہ کالج کے کمرے اور درسی کتابوں کے گنبد سے نکلنا ہی نہیں چاہتے۔ خدا کے لئے کوئیں کا مینڈک نہ بنو۔ ذرا چلو پھرو۔ دنیا جہان کی سیر کرو۔ زندگی کا مختلف پہلوؤں سے نظارہ کرو۔ حواس کو آزاد چھوڑ دو۔ پھر دیکھو کہ نفسیات کا علم کتابوں کے مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے یا ذاتی تجربات سے"!

اصغر سخت کثیر الاحباب تھا۔ لیکن دوستی کے متعلق اس کا نظریہ بھی عجیب تھا۔ وہ کہتا تھا: "مجھے ان لوگوں پر ہنسی آتی ہے جو دوستی کو لازمۂ حیات تصور کرتے ہیں۔ چودھویں صدی کی شعلہ آشام دوستیاں پانی کے بلبلے اور آنکھ کے اشارے سے جلد فنا ہو جاتی ہیں۔ پھر ایسی ناپائیدار چیز کو ہم کیونکر روح کی غذا بنا سکتے ہیں۔ وہ لوگ جو دوستوں کی صحبت کے بغیر زندگی گزارنے کی اہلیت نہیں رکھتے خطرناک فریبِ نفس میں مبتلا ہیں۔ تم نے بہت سے فریب خوردہ اشخاص کو دیکھا ہو گا۔ جو گزشتہ صحبتوں کی یاد میں آٹھ آٹھ آنسو روتے اور ایامِ رفتہ کو یاد کر کے آہیں بھرنے کے عادی ہیں۔ یہ بےچارے اُسی قماش کے بزرگ ہیں جو بسر اوقات کے لئے دوستی کو دو وقت کی روٹی کی طرح ضروری سمجھتے ہیں۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ اپنی وفا کیشیوں اور جاں سپاریوں کے عوض میں دوسروں سے بھی تسلیم و وفا کی توقع رکھتے ہیں۔

ناداں نہیں سمجھتے کہ اس تغیر پذیر عالم ارضی میں اکثریت ان کی ہے جو نہیں جانتے وفا کیا ہے۔ بھائی! سچ جانو میں تو شطرنج اور ٹینس کی طرح دوستی کو بھی وقتِ فرصت گزارنے کا ایک کھیل سمجھتا ہوں جب کام سے طبیعت اکتائی دو گھڑی کے لئے کسی دوست کو جا پکڑا جس طرح شطرنج نہ کھیلنے کے باوجود تمام عمر خوش رہ سکتا ہوں۔ اسی طرح دوستوں سے قطع تعلق کر لینے پر بھی میری زندگی میں ملال پیدا نہیں ہو سکتا۔"

اصغر صرف لباس کے معاملے میں محتاط تھا۔ کچھ تو مزاج طبعاً خوش پوشی کی طرف راغب تھا اور کچھ اس کا خیال تھا کہ دنیا کو صرف لباس کے ذریعے سے دھوکا دیا جا سکتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ "میں بڑے بڑے جہاں دیدہ لوگوں سے ملا ہوں جو بزعم خود علم و فضل کے مجسمے بنے بیٹھے ہیں۔ اور جن کا خیال ہے کہ انہیں زندگی کے نشیب و فراز اور حیاتِ انسانی کی باریکیوں سے کامل آگاہی حاصل ہے۔ لیکن کوئی ملاقات ایسی نہ تھی جس کے اختتام پر میں نے اُن کی سادہ لوحی پہ قہقہے نہ لگائے ہوں۔ تمدنِ جدید کے مطابق شاندار لباس زیبِ تن ہو اور واقعاتِ عالم پر فصاحت کے ساتھ گفتگو کرنے کا ڈھنگ آتا ہو تو دنیا کو اُلّو بنا لینا بڑی بات نہیں۔"

ایک دفعہ تو اس نے غضب ہی کر دیا۔ بڑے دن کی تعطیلات سے قبل کالج کا سالانہ ڈنر تھا جس میں شرکت کے لئے اُس نے بڑے ٹھاٹھ کا سوٹ سلوایا تھا۔ ڈنر کے روز جب اُس نے اپنے کپڑوں کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ نئے سوٹ کے ساتھ پہننے کو کوئی حسبِ پسند نکٹائی نہ تھی۔ ادھر مہینے کا اخیر تھا۔ اور اُس کی جیب خالی ہو چکی تھی اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ فلسفے کی درسی کتاب (جسے اس نے ابھی چند روز ہوئے بازار سے خریدا تھا) ایک کتب فروش کے ہاں نصف قیمت پر فروخت کر دی۔ اور بازار سے نئی نکٹائی خرید لایا۔

اپنی خصوصیات کی بوقلمونی کے لحاظ سے اصغر ایک اچنبا تھا۔ ہمیشہ مقروض رہتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر کارکنانِ قضا و قدر نے کبھی حکومتِ پنجاب کی کرسیٔ وزارت مجھے بخشی تو پانچ ہزار روپیہ مشاہرہ پانے کے باوجود میں تھوڑا بہت مقروض ضرور رہوں گا۔ جن لوگوں کو اُس سے زیادہ واقفیت نہ تھی وہ اُسے ایک سطحی نگاہ رکھنے والا شخص تصور کرتے تھے۔ جسے حالاتِ دنیا کا بغور مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ چونکہ کسی شے کو اہمیت دینے کا عادی نہ تھا۔ اس لئے بعض سنجیدہ مزاج لوگوں کو بھی اس سے شکایت تھی۔ لیکن در اصل اصغر کو دنیا والوں کی کمزوریاں اور تعلّیاں دیکھ دیکھ کر زہرخند ہونے کی عادت ہو گئی تھی۔ عیب و صواب کی کوئی راہ نہ تھی جس پر وہ گامزن نہ رہ چکا تھا اور نیکی بدی کا شاید ہی کوئی گوشہ ہو گا جس کو اُس نے پامال نہ کیا ہو۔ میں اُس کی دقتِ نظر کا ہمیشہ معترف رہا ہوں۔ بے خبری اور جہالت کو مسرت کا ضامن قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن وہ اُن چند در چند نفوس میں سے تھا جو سوچتے ہیں اور پھر مسرور رہتے ہیں۔ اصغر یقیناً ایک رجائی تھا لیکن اُس کی رجائیت جہالت پر مبنی نہ تھی۔ اُس نے زمانے کا سرد و گرم چکھا۔ خار دار جھاڑیوں میں الجھ کر دامن کو تار تار کر دیا۔ پھولوں کے تختوں میں سے نسیمِ سحری بن کر گزرا اور پھر اس نتیجے پر پہنچا کہ اپنی نگاہ میں رنگینی داخل کر لو اور کل کائنات قوسِ قزح کی طرح نظر فریب ہو جائے گی۔ طبیعت میں استغناء پیدا کر لو تو جھونپڑوں میں محلوں کے عیش اٹھاؤ گے۔

ایک روز ہم سب بیٹھے تھے ہمارا دوست وحید بھی تھا۔ وحید تھا تو بہت ذہین لیکن اُس کی ذہانت اُس کے لئے وبال بن گئی تھی۔ اُس کا تخیل طوفان زدہ جہاز کی طرح ہمیشہ پریشان و مضطرب رہتا تھا۔ کچھ شاعر، کچھ وہمی، اقتدے مریض اور اُس پر طرہ یہ کہ محبت کا زخم خوردہ۔ وہ اکثر عزلت نشینی کو پسند کرتا اور عہدِ ماضی کی نوحہ خوانی میں مصروف رہتا تھا۔ یا پھر مستقبل کے خواب دیکھ دیکھ کر حال کو اور زیادہ افسردہ بنا دیتا تھا۔ وہ اصغر کو ہری چگ کے نام سے پکارتا تھا۔ اور اصغر صاحب تھے کہ اس نام کی موزونیت پر لوٹ پوٹ ہوئے جاتے تھے۔ اصغر نے اس روز وحید کو مخاطب کر کے دیر تک سلسلۂ کلام جاری رکھا اور سچ پوچھئے تو ہماری معلومات میں دل خوش کن اضافہ کیا۔ وہ کہنے لگا "دیکھو بھائی وحید اگر چندے تمہاری یہی حالت رہی تو قیس کی دیوانگی اور فرہاد کی کوہ کنی کو دنیا یقیناً فراموش کر دے گی۔ اور تم اُن کے جانشین کی حیثیت سے مسندِ تاریخ پر رونق افروز نظر آؤ گے۔ اگر بقائے دوام کے خواہشمند ہو یا شہیدانِ عشق کی فہرست میں نام لکھانا چاہتے ہو تو تمہارا یہ طریقِ عمل بہت موزوں ہے لیکن اگر زندہ رہنا اور زندگی

کی حلاوتوں سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہو تو خدا کے لئے اُس نیک بخت کو بھلا دو۔ زندہ قوموں کا عشق بھی حیات افروز ہوتا ہے لیکن ہمارے ہاں عشق اور تپ دق ہم معنی الفاظ ہیں۔ اور پھر اس ملک میں رہ کر عاشق بننا تو فطرت کے خلاف جنگ کرنا ہے۔ میں سنتا ہوں کہ تمہاری محبوبہ ہندوستان کے جذبات کش طریقِ انتخاب کے ماتحت کسی اور کے حوالے کر دی گئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو تم کیوں ہمالیہ سے ٹکرا کر سر کو لہولہان کر رہے ہو۔ محبت تو جذبات کی انتہائی کمزوری کا نام ہے اور ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ہر دعوے دار اپنی محبت کو بے لوث ظاہر کرتا ہے۔ جہاں خون کا جوش زیادہ ہُوا۔ محبت کے جراثیم پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ میں حیران ہوں کہ اس "غلام آباد" میں اور مصائب کیا کم ہیں کہ عشق کا روگ ایزاد کر دیا جائے سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہم میں زندگی بسر کرنے کی صلاحیت نہیں۔ بات بات پر آنکھوں کو آنسوؤں سے ڈبڈبا لینا، ہر وقت ٹھنڈی آہیں بھرنا، دُنیا کو دھوکے کی ٹٹی کہنا، ہر ہنسنے والے کو خدا سے باغی اور قہقہہ لگانے والے کو گنہگار خیال کرنا یہاں دینداری میں داخل ہے تم گردن جھکا کر، آنکھیں بند کر کے چُپ چاپ گزر رہے ہو۔ درحالیکہ چھوٹی چھوٹی چیزیں، معمولی معمولی واقعات جن کے اندر مسرت و شادمانی کے لازوال خزانے موجود ہیں، تمہیں زبانِ حال سے پکار پکار کر اپنی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ کوئی بسترِ علالت پر کراہ رہا ہے اور کوئی فکرِ فردا و غمِ ماضی میں جان گھلا رہا ہے۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ ہم ابھی تک بحرِ حیات کی موجوں کے تھپیڑے کھا رہے ہیں۔ کوئی نہیں چاہتا کہ سطح کے نیچے جا کر دیکھے کہ کیسے کیسے گراں قدر دفینے اور نادر جواہر کے عظیم الشان انبار مدفون ہیں۔ کامیاب زندگی کا راز یہی ہے کہ زندگی کو اہمیت نہ دو۔ زندگی تو سرد و معطر ہوا کا جھونکا ہے جو سن سے گزر جاتا ہے اور تم اس جانفزا نسیم کو مقید کرنے کی فکر میں ہو۔ یہ جھونکے اسی طرح آتے اور گزرتے جائیں گے تمہارا فرض بس اتنا ہے کہ اُن کی عطر بیزی سے اپنے دل و دماغ کو مسرور بناؤ اور چلتے جاؤ۔ کائنات کی وسعت بے پایاں کو دیکھو جس میں اس دنیا جیسی ہزاروں دنیائیں آباد ہیں۔ اور پھر اُن دنیاؤں میں جاندار مخلوق بھری پڑی ہے۔ اس بے شمار جاندار آبادی کا نقشہ چشمِ تخیل کے سامنے لاؤ۔ اور سوچو کہ ارض و سما کے درمیان اور اس پہنائے عظیم کے اندر ایک تمہاری ہستی بھی ہے جو فنا کے غارِ عمیق کے کنارے کھڑی بادِ مخالف کی تُندیوں سے ہر گھڑی کپکپا رہی ہے۔ تمہاری تو حقیقت ہی کچھ نہیں۔ اجل کا ادنےٰ سا اشارہ تمہیں ملیامیٹ کر سکتا ہے۔ سہ روزہ زندگی کی ناپائداری پر غور کرو کہ کل صبح تمہیں اپنے بستر پر سے صحیح و سالم اُٹھنے کا یقین بھی نہیں اور پھر آلام و تفکرات کے اُس لامتناہی سلسلہ پر غور کرو جس نے تم پر خواب و خور حرام کر کے رات کی نیند اور دن کا چین چھین رکھا ہے کیا اوہام و ترددات تمہاری کم فہمی کی دلیل نہیں؟ دماغ کو برتو اور سوچو کہ تمہاری کل پریشانیاں کیا اس نقطہ پر نہیں آ ٹھہرتیں کہ تمہیں پیٹ بھر کر کھانا اور تن ڈھانکنے کو کپڑا درکار ہے؟ اور پھر خدارا مجھے بتاؤ کہ کیا تم نے کبھی کسی کو فاقوں مرتے یا شارع عام پر برہنہ جسم پھرتے دیکھا ہے؟ یقین جانو کہ ہر شخص قوتِ لایموت کے مطابق کھا رہا ہے اور منظرِ عام پر برہنہ پھرنے والے کو خود حکومت لباس مہیا کر دیتی ہے۔ پھر تم کیوں خیالی ہموم و غموم سے مرے جا رہے ہو؟ اگر ریشم کی قمیص نہیں تو نہ سہی گاڑھے کا کرتہ پہن لیں گے۔ ولایتی ساخت کا پمپ میسر نہیں تو ملا سے دیسی جوتا اس سے زیادہ مضبوط اور آرام دہ ہے۔ عزیز دوست دنیا کو ایک اسٹیج تصور کرو اور ہر مرد و زن کو ایکٹر۔ تفریح و تفنن اور رنج و حرماں کے کل مظاہر درحقیقت کامیڈی اور ٹریجیڈی کے کھیل ہیں۔ جن سے متاثر ہونا قرینِ قیاس نہیں۔ ہر واقعہ کو ایک بے غرض اور غیر جانبدار تماشائی کی حیثیت سے ملاحظہ کرو۔ لیکن اس دوران میں اپنے احساس کو واقعہ کی نوعیت سے آلودہ نہ ہونے دو۔ اِس عالمِ متغیر میں جس کی کسی شے کو ثبات نہیں اور جہاں ہر گزرنے والا لمحہ ایک نئی زندگی کی آفرینش کا پیغام دے جاتا ہے زمانے کی نیرنگیوں اور انقلاباتِ دہر سے اثر پذیر ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ تمہیں اپنے دل و دماغ پر قابو نہیں۔ واقعاتِ عالم کا تماشا کرتے وقت ایک سائنسدان کی طرح اپنے حسیات کو بالکل علیحدہ رکھو ورنہ یہاں گریہ و زاری کی تو بے صدا نذانی ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ ہندوستان میں ہم اس قدر جلد بوڑھے کیوں ہو جاتے ہیں۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم زندگی کو خیر

معمول اہمیت دینے کے علاوہ اس میں کوئی جدت پیدا نہیں کرتے۔ پیدائش سے موت تک ہم ایک ہی ماحول میں رہتے ہیں۔ وہیں پرورش پائی، وہیں بڑھے اور وہیں مرگئے۔ کسی چیز سے پوری طرح بہجت اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اُس کے مختلف پہلوؤں سے تمام امکانی حظ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ طالب علم اگر صبح سے شام تک کتابوں میں سر کھپائے اور کھیل کو دحرام کرلے تو مطالعہ کا مقصد فوت ہوگیا۔ وکیل اگر گھر سے کچہری اور کچہری سے گھر تک ہی زندگی محدود کرلے یا ایک طبیب اگر دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کرکے امراض کی تشخیص اور مریضوں کے معائنے تک ہی اپنے آپ کو وقف کردے تو اُس نے زندگی کا صرف ایک پہلو دیکھا ہے اور باقی پہلوؤں کے لئے وہ اندھا ہے۔ ایک ہی قسم کے ذائقہ سے طبیعت جلد سیر ہو جاتی ہے۔ مصروفیتوں میں رد و بدل کرتے رہو گے۔ تو دنیا کی چیزیں زیادہ خوبصورت اور جاذب توجہ ثابت ہوں گی۔ کبھی "فقیروں کا بھیس" بنا کر "تماشائے اہلِ کرم" دیکھو تو کبھی اہلِ کرم بن کر فقیروں کا تماشا دیکھو۔

بی اے تک ہم اکٹھے رہے اس کے بعد میں ایم اے میں آگیا اور اصغر گھر بے کار بیٹھا رہا۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ زندگی کا ایک کاروی کے نقطۂ نگاہ سے مطالعہ کرے گا۔ لیکن بعد ازاں معلوم ہوا کہ اُس کے والد اُسے تعلیم دینے کے حامی نہ تھے۔ اس لئے اصغر کو مجبوراً لاہور کی جاں بخش درس گاہوں سے محروم رہنا پڑا۔ ایک سال گزر گیا اور اگلے برس اصغر نے لا کالج میں داخل ہو کر سب دوستوں کو حیران کر دیا۔ کہاں اصغر اور کہاں قانون کی کٹھن منزل لیکن شاید اس نے اپنی آبلہ پائی کا یہی علاج سوچا تھا کہ وکالت کی وادیٔ پُرخار کے کانٹوں کی پیاس بجھائی جائے۔ ہم جانتے تھے کہ اس بیل کا منڈھے چڑھنا مشکل ہے۔ سال بھر اصغر قانون کی ضخیم اور خشک کتابوں کا پلندا اٹھائے دو میل کا فاصلہ طے کرکے ہر روز صبح آٹھ بجے کالج پہنچتا رہا۔ اُس کی باقی زندگی اُنہی دیرینہ خصوصیات کی حامل تھی۔ جدت کا وہ اب بھی متلاشی تھا اور شاید لا کالج میں داخل ہونا بھی حصولِ جدت کی ایک سعی تھی۔ مگر اُس کی ذہانت قانون کی حریف نہ ہو سکی۔ یہاں تو وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو دنیا کو صرف دو اور دو چار سے تعبیر کریں امتحان میں ناکامی کی خبر اس کو ایک انگریزی روزنامہ کے ذریعہ سے ملتان میں ملی۔ اُس کے والد جو پہلے ہی سے اُسے ایک ناگوار فرض اور غیر ضروری بار سمجھے بیٹھے تھے۔ یہ خبر سنتے ہی برس پڑے اور لگی لپٹی رکھے بغیر صاف صاف انہوں نے کہہ دیا۔ کہ "میرے مکان سے نکل جاؤ۔ میں عمر بھر کا اندوختہ تمہاری فضول خرچیوں اور تماش بینیوں پر لٹانا نہیں چاہتا"۔

یہ حالت تھی جب اصغر صاحب نیچے دروں و نیچے بروں کی صورت بنائے افسردہ و مضمحل میرے پاس آئے جب ہم کھانا کھا چکے تو میں نے پوچھا "اب کہاں کا ارادہ ہے؟"

"میں بمبئی جا رہا ہوں"

"بمبئی؛ وہاں کیا کرو گے؟"

وہ کہنے لگا "تم حیران کس بات پر ہوتے ہو؟ میں تمہاری طرح آئی سی ایس کے خواب تو دیکھ ہی نہیں رہا کہ اس سے کم کسی چیز پر میری تسلی نہ ہو گی تمہیں معلوم ہے کہ ذاتی وجاہت و حشمت کے قائم کردہ معیار میں میں تمہارا ہم خیال نہیں ہوں۔ میں تو صرف جان و جسم کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا ایک انسان کے لئے ضروری سمجھتا ہوں اور یہ چیزیں میں ہر حال اور ہر جگہ اپنے لئے بآسانی پیدا کر سکتا ہوں۔ اس لئے میرے لئے لاہور، کراچی، لکھنؤ، بمبئی یا لندن سب برابر ہیں"۔

چند روپے اُس کے پاس تھے کچھ اُس نے مجھ سے لئے اور حضرت دوسرے روز بمبئی روانہ ہو گئے۔ اس واقعہ کو اڑھائی سال گزر گئے۔ ہم بظاہر ایک دوسرے کے لئے مرچکے تھے۔ کیونکہ نہ اُس نے مجھے کبھی خط لکھا اور نہ مجھے اس کا پتہ معلوم تھا۔ اس دوران میں میرے پرانے ہم مکتب دوست، آدم اسمٰعیل کی شادی کی تقریب آئی۔ آدم اسمٰعیل بمبئی کے رہنے والے تھے۔ اور وہیں اُن کا کاروبار تھا۔ ان کے سخت اصرار پر مجھے بھی

اس تقریبِ سعید میں شریک ہونے کے لئے بمبئی جانا پڑا۔ جب شادی کی گہما گہمی سے فراغت ہو چکی تو آدم صاحب نے اپنے خاص دوستوں کو ایک شام تاج محل ہوٹل میں دعوت دینے کا اہتمام کیا۔ تاج محل کی وسیع اور شاندار عمارت کے ایک پُر تکلف کمرے میں بیٹھے ہم سامانِ اکل و شرب کا انتظار کر رہے تھے کہ ہوٹل کا ملازم رکابیاں اُٹھائے کمرے میں داخل ہُوا۔ اُس نے دہلیز کے اُس طرف قدم رکھا ہی تھا کہ میری اُس کی نظریں چار ہوئیں۔ مجھے اپنی آنکھوں پر شک ہونے لگا۔ میں سمجھا کہ عالمِ خواب ہے اور جو کچھ دیکھ رہا ہوں اُس کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ آنے والے شخص نے بھی میری طرف دیکھا اور سوائے ایک خفیف تبسم کے اُس کے چہرے پر حیرت و استعجاب کی کوئی علامت نہ تھی۔ یہ اصغر تھا جو ہوٹل کے ملازم کی مخصوص وردی پہنے ہمارے لئے میز پر کھانا چُن رہا تھا۔ جب وہ دوسری مرتبہ کمرے میں داخل ہُوا تو میں نے بے اختیار اُس کا بازو پکڑ لیا اور چلایا "اصغر تم کہاں؟"

اُس نے تحمل سے جواب دیا "یہ مصروفیت کا وقت ہے۔ پہلے کھانے سے فارغ ہو لیجئے۔ پھر باتیں کریں گے۔"

میرے ساتھی حیران تھے کہ کیا معاملہ ہے۔ میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ کھانے کے بعد مفصل گفتگو ہو گی۔ جب ہم ہوٹل سے رخصت ہونے لگے تو اصغر چند منٹ کے لئے میرے پاس آیا اور کہنے لگا "ابھی کام ختم نہیں ہُوا ورنہ میں آپ کے ہمراہ چلتا۔ یہ بتاؤ ٹھہرے کہاں ہو؟ میں کل صبح آؤں گا۔" میں نے اپنی قیام گاہ کا پتہ دیا اور منت درخواست کی کہ خدا کے لئے اپنی اوّلین فرصت میں ضرور پہنچنا۔

دوسرے روز میں ابھی ناشتے سے فارغ نہ ہُوا تھا کہ اصغر کے آنے کی اطلاع ہوئی۔ ہلکے خاکی رنگ کا سوٹ، بیش قیمت انگریزی ٹوپی اور نہایت اعلیٰ بوٹ پہنے اصغر صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ میرے میزبان جو اب تک اصغر کے حالات و اطوار سے بے خبر تھے۔ اس قلب ماہیت کو دیکھ کر حیران ہو گئے۔ اصغر نے اندر قدم رکھتے ہی ایک بلند بانگ قہقہہ لگایا اور آدابِ مجلس کو بالائے طاق رکھ کر وحشیوں کی طرح مجھ سے لپٹ گیا۔ میں بار بار اُس کے کپڑوں کی طرف دیکھ رہا تھا، اور سخت متعجب تھا کہ اِس طرفہ معجون شخص کا خمیر کس مٹی سے بنا ہے۔ رات ایک ہوٹل کا خدمت گار تھا اور اب ہائیکورٹ کے وکیل سے کم شان کا مالک نہیں۔ میں نے پُوچھا "تم نے بہروپ بھرنے کا پیشہ کب سے اختیار کیا ہے۔ کیا بمبئی میں شروع سے یہی کام کر رہے ہو؟ کیسی شرمناک بات ہے کہ یونیورسٹی کا فارغ التحصیل اور تم سا زیرک و خوش فہم شخص، یوں ذلیل و خوار ہو۔"

اُس نے کہا "اگر تم نے زجر و توبیخ کی پُرانی عادت ترک نہیں کی تو الحمدللہ میں بھی اپنی دیرینہ خصوصیات پر بدستور کاربند ہوں۔ میں تم سے ہمیشہ کہا کرتا تھا۔ کہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب ایکٹر۔ تم میرے قول کو متانت کے خلاف سمجھ کر ناقابلِ عمل خیال کرتے تھے۔ اب تو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو کہ میں کس انداز سے اس اصول سے اپنی عملی زندگی میں جاری و ساری کر چکا ہوں۔ بھائی سچ جانو میں تم سے زیادہ مسرور و مطمئن ہوں۔ غمِ دُنیا و فکرِ عاقبت سے آزاد ہوں۔ اچھا کھانا، اچھا پہننا، بمبئی ایسے شہر میں فطرتِ انسانی کا مطالعہ، اور مجھے کیا چاہیئے؟ آزادی کا یہ عالم ہے کہ ڈھائی سال کی مدت میں بیسیوں پاپڑ بیل چکا ہوں۔ مدرسی اور اخبار نویسی میں نے کی۔ سنگر مشین کا ایجنٹ میں رہا۔ سینما اور تھیٹر کی ملازمت کا مزا میں نے چکھا۔ ٹرام میں نوکری میں نے کی۔ غرض کہ جہاں طبیعت ذرا اکتائی اور حواس پر بڑھاپے کے آثار نمودار ہونے لگے میں فوراً اپنی مصروفیت کی نوعیت میں تبدیلی پیدا کر لیتا ہوں اور زندگی پھر تر و تازہ ہو جاتی ہے۔ میری صحت دیکھو، قابلِ رشک ہے یا نہیں؟"

اصغر کی صحت واقعی بے نظیر تھی۔ گوشت اور خون کی کثرت، اس پر اُس کا ورزشی جسم، پہلوان معلوم ہو رہا تھا۔

آج کل یہ کام ہے کہ دن کو یہاں کے ایک رئیس کے خورد سال بچے کو پڑھاتا ہوں۔ معقول مشاہرہ لینے کے علاوہ رہنا بھی انہی کے مکان پر ہوں۔ اور شام کو تاج محل ہوٹل پچھلے دنوں جرمنی کی ایک مشہور تجارتی کمپنی کے گماشتے سے میری ملاقات ہو گئی تھی وہ اپنے کاروبار کے

سلسلہ میں مجھے جرمنی لے جانے پر رضامند ہے۔ شرائط ابھی طے نہیں ہوئیں۔ ممکن ہے چند ماہ تک جرمنی چلا جاؤں اور یوں یورپ جانے کی پرانی آرزو بر آئے ۔"

مجھے بمبئی سے واپس آئے سال بھر سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔ آدم اسمٰعیل اور اصغر کی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ چنانچہ آدم کے خط سے معلوم ہوا کہ اصغر جرمنی روانہ ہو گیا ہے۔

سیّد فیاض محمود

لاری میں

منور ایک سادہ سا آدمی ہے۔ میرا اس کا تعارف تین سال ہوئے ایک دوست کے ہاں چائے کے موقع پر ہوا تھا۔ اس کے بعد اتفاق ایسا ہوا کہ کسی نہ کسی جگہ ہماری ملاقات ہوتی رہی اور اب دو سال سے کچھ زیادہ ہی عرصہ ہوا کہ میری اس کی خاصی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ اکثر میرے ہاں آجاتا اور ہماری لمبی چوڑی گفتگوؤں کا سلسلہ جاری ہو جاتا۔ دیکھنے میں منور میانہ قد اور سانولی رنگت کا نوجوان ہے۔ اس کی عمر غالباً ۲۳-۲۴ سال کے درمیان ہوگی۔ کچھ عرصہ ہوا۔ وہ "جنگلات" میں ملازم ہو گیا ہے۔ وہ خوش پوش ہے اور چونکہ اس کا جسم سیدھا اور ورزشی ہے۔ اس لئے وہ جامہ زیب بھی ہے۔ چلتے ہوئے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کپڑے مانگے کے ہیں۔ شکل و شباہت میں اگرچہ کوئی خاص نقش قابلِ ذکر نہیں۔ مگر بحیثیت مجموعی خوش شکل ہی معلوم ہوتا ہے۔ مگر دو ایک چیزیں اس کی البتہ ضرور جاذبِ نظر ہیں۔ ایک تو اس کے بال اور دوسرا تبسم۔ بال اس کے گھنگھریالے نہیں مگر دو ایک خم اُن میں قدرتی طور پر اس طرح قائم ہو جاتے ہیں کہ دیکھنے والے پر اچھا اثر ڈالتے ہیں۔ پھر اس کی آنکھیں اتنی شرمیلی ہیں۔ جیسے کسی لڑکی کی ہوں۔ ان سے فقط یہی اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی میں اس کے تجربات علمی اور تخیلی ہی ہیں۔ یوں اچھا پڑھا لکھا شخص ہے۔ اور خصوصیت سے اقتصادی اور سیاسی مسائل سے اسے بہت انہماک ہے۔ اکثر انہی مضامین کی کتابیں پڑھتا ہے۔ اور اس کی گفتگو ان ہی مسائل کے مختلف پہلوؤں کے متعلق ہوتی ہے۔

ہماری باتوں میں اگرچہ سماجی زندگی کے کئی ایک پہلو موضوع بنے ہیں مگر نسوانی موضوع پر ہم نے بہت کم تبادلہ خیالات کیا ہوگا۔ کیونکہ منور اگرچہ اپنے خیالات میں کافی حد تک جدید بلکہ انقلاب پسند ہے۔ مگر عورتوں کے معاملہ میں وہ شرمیلا ضرور ہے۔ اس لئے اس نے اگرچہ معاشرتی اور متعلقہ امور پر کئی دفعہ بحث کی ہوگی۔ لیکن اپنے ذاتی خیالات یا محسوسات یا تجربات کی بابت اس نے مجھے بہت کم بتایا ہے۔ کبھی کبھی بر سبیلِ تذکرہ اگر ذاتی معاملات پر ذکر چھڑ جاتا تو وہ ٹک ٹک کے شرما شرما کے تھوڑا بہت اپنی بابت اور کسی واقعہ کے متعلق کچھ بتاتا۔ جس سے میں نے یہ اندازہ کیا کہ اسے کسی سے کبھی محبت ہوئی بھی ہوگی تو بے زبان گہری قلبی، بلا اظہار اور اس لئے پُرحسرت بھی بے اثر۔ اور چونکہ میری عادت نہیں کہ دوسروں کے راز کریدتا رہوں۔ اور اس کی شخصیت باوجود اس حجاب کے بھی کافی دلچسپ ہے۔ اور چونکہ دورِ حاضرہ کے عمرانی اور سیاسی معاملات میں اس کی رائے قابلِ وقعت اور اس کی معلومات وسیع ہیں۔ اور اس کے خیالات اور تجاویز بہت دلچسپ ہوتی ہیں۔ اور چونکہ ذاتی طور پر بھی وہ ایک دل پسند طبیعت کا مالک ہے۔ اس لئے ہمارے تعلقات بہت خوشگوار ہیں۔

یہ کہانی اس کے متعلق ہے۔ مگر نہ اتنی کہ اس کے جان پہچان والے اسے پڑھ کر مذاق کرتے پھریں۔ اور پھر اس واقعہ کو اب ایک سال ہونے کو ہے۔ اور یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ خود منور اسے بھول گیا ہے۔ مگر چونکہ میں نے اس سے بھی کہہ دیا تھا کہ میں . . . . اسے کسی نہ کسی دن لکھ دوں گا۔ اس لئے میں امید کرتا ہوں کہ وہ اب اس واقعہ کے اعادہ سے ناراض نہیں ہوگا۔

ایک دن غالباً فروری کے مہینے میں منور شام کے وقت مجھ سے ملنے آیا۔ ہمیں ملے دو ہفتے سے زیادہ ہو گئے تھے اس لئے اس کا آنا باعث مسرت تھا اور میں نے بہت اشتیاق سے اس کا خیر مقدم کیا۔ مگر میں نے دیکھا کہ اس کا انداز کچھ بشاش نہیں ہے۔ بلکہ اگر پژمردہ نہیں تو خاموش اور غیر معمولی طور پر متین ضرور ہے۔ میں نے کہا خیر تو ہے؟ کیسے لگا نہیں بات تو کوئی نہیں ہونی چاہئے۔ مگر طبیعت پریشان ضرور ہے۔ چونکہ عادتاً وہ قدرے راست گو واقع ہوا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ ضرور کوئی وجہ ہے۔ چنانچہ میں نے کہا اتنے دن کہاں رہے؟ بس ایک دن ہو گئے تمہیں دیکھا نہیں۔ کہنے لگا یہیں تھا۔ کچھ دنوں سے لئے گوجرانوالہ ایک کام کو گیا تھا۔ میں نے یہ تو نہ پوچھا کہ کام کیا تھا۔ مگر مجھے محسوس ہوا کہ گوجرانوالہ کا لفظ ادا کرنے میں اس کا لہجہ عجیب سا تھا۔ کم از کم فرق ضرور تھا۔ جیسے کوئی بات اس لفظ کے ادا کرنے میں مانع ہو۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ میرا شک درست تھا یا نہیں مگر اس کی آواز میں دھاس کے علاوہ کچھ تلخی کی آمیزش بھی تھی۔ بہرحال میں نے اس سے گوجرانوالہ کے متعلق مطلقاً کچھ نہ پوچھا۔ محض ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ مگر وہ معمول کے خلاف کچھ باتیں کر کے چپ ہو جاتا۔ وہ ایک دفعہ جب وہ میرے سلسلۂ کلام کو جاری کرنے پر بھی چپ رہا تو میں نے اس سے بہت زور سے پوچھا کہ بھئی کیا ہو گیا ہے۔ کوئی وجہ ضرور ہے جو اتنے ملول ہو۔ کوئی واقعہ پیش آیا ہے؟ تو مجھے بتاؤ شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔ اور اگر میں کچھ نہیں بھی کر سکتا تو کہہ ڈالو شاید تمہارا دل ہی ہلکا ہو جائے۔ اس پر اس نے مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا مگر میں جان گیا کہ اس کی آنکھیں تکتی ہوئی ہیں اور اس کی نگاہ لاابالی ہے۔ آخر کار تھک کر میں نے ذرا سختی سے پوچھا کہ بھئی کیوں گھلے جا رہے ہو ذرا ہمیں بھی بتاؤ۔ جب بہت اصرار کیا تو اس نے یہ واقعہ سنایا۔

"تمہیں یاد ہوگا ابھی کچھ منٹ ہوئے میں نے تجھ سے گوجرانوالہ کا ذکر کیا تھا۔ مجھے وہاں ایک کام تھا۔ واپسی پر گاڑی واڑی کا تو مجھے وقت یاد نہیں تھا میں لاریوں کے اڈے پر چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ کسی بس سروس کی لاری بس دو منٹ میں چلنے والی ہے۔ مگر شاید جانتے ہو بس سروسوں کی لاریاں دور دور مقاموں کے درمیان چلتی ہیں۔ یہ لاری لاہور اور سیالکوٹ کے درمیان چلتی تھی۔ چنانچہ جب میں ٹکٹ لے کر بیٹھنے لگا تو دیکھا کہ اگلی نشست تو رکی ہوئی تھی ہی، درمیانی درجہ یا حصہ بھی کسی ہندو خاندان سے اٹا پڑا تھا۔ غالباً کسی برات پر جانے والی مستورات تھیں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ سب نشستیں پُر ہوں گی چنانچہ میں جو اندر داخل ہونے لگا تو ایک لڑکا جو انہیں میں سے تھا بولا "صاحب یہاں سب مستورات بیٹھی ہیں۔ اگر آپ پیچھے بیٹھ جائیں تو نوازش ہوگی۔" میں نے خیال کیا کہ شاید سارا درجہ ہی محفوظ کرا رکھا ہوگا۔ مگر میں لاری میں اب تک کبھی پچھلے حصہ میں نہیں بیٹھا۔ کچھ مجھے تامل ہوا مگر ڈرائیور کہنے لگا 'صاحب بیٹھنا ہے تو بیٹھئے گاڑی چلنے والی ہے۔' چنانچہ طوعاً و کرہاً میں پچھلے حصہ میں داخل ہو گیا۔ ٹکٹ بھی لے چکا تھا۔ یہ بھی خیال تھا کہ جانے دوسری لاری کب چلے اور پھر پچھلے حصہ کی دائیں جانب کی وہ نشست جو بالکل درمیانی حصہ کے ساتھ لگتی تھی خالی تھی۔ یا کم از کم وہاں ایک مسافر بیٹھ سکتا تھا۔ چنانچہ میں اسی نشست کی طرف لپکا اور بیٹھ گیا۔ اب جو اطمینان سے نظر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا تو معلوم ہوا کہ نشست بھی کوئی بری نہ تھی۔ میرے دائیں طرف برات والیاں بیٹھی تھیں اور خوش قسمتی سے ان میں سے جن کی پشت میری طرف تھی ان میں ایک وہ لڑکا تھا۔ ایک اس کے ساتھ پانچ ایک برس کی پیاری سی چھوٹی بچی تھی اور ایک بوڑھی عورت اور ایک اور لڑکی جس کی عمر کوئی سات ایک برس کی ہوگی۔ البتہ جو نشستیں اب میرے مقابل تھیں —— مقابل ہی سمجھو نا، کیونکہ میں تقریباً انہیں کی طرف رخ کر کے بیٹھا تھا یعنی بیٹھا تو آڑا تھا مگر میں اُنہیں بآسانی دیکھ سکتا تھا اور وہ سب میری طرف دیکھ سکتی تھیں۔ اگر چاہتیں یعنی کہ۔

میں پہلے شاید کہہ چکا ہوں کہ یہ خواتین کسی برات میں جا رہی تھیں۔ اور جب اس پر اس امر کا خیال کیا جائے کہ وہ ہندو عورتیں تھیں تو تم اندازہ کر سکتے ہو کہ لباس کے لحاظ سے تو وہ سب کی سب جگمگا رہی ہوں گی اور خصوصیت سے ایک تو شاید تازہ شادی شدہ تھی یا کم از کم اسے ایک سال سے زیادہ تو ہرگز نہیں ہوا ہوگا۔ کیونکہ ایک تو اس کے کپڑے ہی سب سے اچھے تھے اور پھر زیور کے لحاظ سے بھی وہ سب سے ممتاز تھی۔ اور یوں تو گویا تم جاؤ

میرے لئے تو اس کے سوا وہاں گویا اور کوئی تھا ہی نہیں۔ میں نے وہ ایک نظر میں سب کو دیکھ لیا۔ اور پھر ان کو بھی جن کی پشت میری طرف تھی۔ لڑکے کی پشت میری طرف تھی اسی لئے اس طرف سے تو تسلی تھی۔ اس کے ساتھ کی سواری وہ ننھی منی سی لڑکی تھی۔ جانتے ہو اتنی عمر کا بچہ کبھی نچلا نہیں بیٹھ سکتا۔ چنانچہ سب سے پہلے جس نے میری توجہ اپنی طرف منعطف کرائی وہ یہی لڑکی تھی جسے بار بار وہ جو سامنے کی نشست پر کونے میں بیٹھی تھی یہ کہہ کے چپ کراتی تھی "ارے چاند تو آرام سے تو بیٹھ"۔ چاند رانی معلوم ہوا اس چھوٹی سی سرخ گالوں والی شوخ لڑکی کا نام تھا کرتی وہ کیا تھی؛ یہ پوچھو وہ کرتی کیا تھی! کبھی اٹھتی کبھی بیٹھتی اور ہر وقت اپنی چھوٹی سی ریشمی اوڑھنی کو اپنے سر کے گرد لپیٹنے میں مشغول رہتی۔ پھر ایک جیب میں سے جو کافی پھولی ہوئی تھی ایک بڑا سا ریشمی رومال نکال کر چوسنے والی مٹھائی کی ایک گولی نکالتی۔ رومال کو پھر جیب میں ٹھونستی اور مٹھائی کو منہ میں ڈال کے اپنے دوپٹہ کو جو اس اثنا میں ضرور سر پر سے اڑ گیا ہوتا سنبھالنے لگ جاتی۔ یا اپنی جگہ کھڑے ہو کر پچھلے حصہ کی طرف منہ کر کے ہم سب کی طرف ایک ایک نظر غور سے دیکھ کر پیچھے کی کھڑکی سے سڑک اور ہٹتے ہوئے درختوں کو دیکھتی رہتی۔ مگر ایک منٹ سے زیادہ نہیں۔ اس کا دہن چھوٹا سا تھا، اور جب وہ پیچھے دیکھتی تو منہ میں گولی ہونے کے باعث اس کے ہونٹ ضرور ملے ہوئے ہوتے۔ منہ بس ایک ننھی سی گلاب کی کلی معلوم ہوتا اور چونکہ توجہ اس کی یا سڑک کی طرف یا کسی اور چیز کی طرف مرکوز رہتی۔ اسی لئے چہرہ جو عام طور پر جب اس کا رخ اپنی ماں یا ماموں یا ممانی کی طرف ہوتا شوخی اور شرارت، اور ہنسی اور خوشی سے چمکتا ہوتا۔ اس قدر متین نظر آتا کہ میں نے موٹر کے چلنے کے پانچ منٹ کے اندر اندر اس سے واقفیت پیدا کر لی اور وہ اس طرح کہ جب وہ ہماری طرف دیکھ رہی تھی تو میں نے آہستہ سے ایک انگلی سے اس کے بائیں گال کو سہلا دیا۔ پہلے تو وہ ایسا کرنے پر وہ ایک دفعہ شرما کر اور تھوڑا بہت غصہ کر کے فوراً ہی منہ دوسری طرف کر لیتی مگر اس کے ایسا کرنے پر بھی اسے دوپٹہ درست کرنے کی ضرورت پیش آتی تو میں موقعہ پا کر اس کے داہنے گال کو جواب میرے نزدیک نہ ہوتا سہلا دیتا۔ اس پر وہ اتنا الجھ جاتی کہ دوہری ہو کر گول مول ہو جاتی، مگر نچلا بیٹھنا اس کے لئے ناممکن تھا۔ وہ مجھے بھول کر اور میرے چمکارنے یا گدگدانے کو بھول کر اپنی ماں سے یا اپنی ممانی سے جو بالکل اس کے سامنے بیٹھی تھی سوال و جواب میں مشغول ہو جاتی۔

میں نے چاند کے متعلق اتنی لمبی تمہید اس لئے دی ہے کہ دراصل میرے اس واقعہ یا سانحہ کی روح اگر چاند نہ تھی تو وسیلہ ضرور تھی۔ اس کے بائیں طرف جو بوڑھی عورت بیٹھی تھی وہ اتنی کم سخن تھی کہ مجھے یاد نہیں اس نے ایک دفعہ بھی کچھ کہا ہو۔ اگرچہ کچھ نہ کچھ تو وہ بولی ہو گی۔ چاند کے سامنے والی نشست پر جو تین فرد تھے ان میں سے معلوم ہوا کہ جو عورت لڑکے کے سامنے بیٹھی تھی وہ چاند کی نانی تھی۔ پھر چاند کے سامنے اس کی ممانی اور پھر اس کی ماں جس کی گود میں دودھ پیتا بچہ تھا۔ یہ معلوم نہیں کہ وہ برات سے واپس جا رہی تھیں یا برات کو جا رہی تھیں۔ غالباً کسی شادی سے واپس آ رہی تھیں۔

چاند سے چھیڑ چھاڑ شروع کرنے سے پہلے ہی میں نے اس کے سامنے بیٹھنے والی کو نظر بھر کر دیکھ لیا تھا۔ اور جو میں نے دیکھ لیا تھا وہ یہ کہ اس کی عمر بیس اکیس سے بمشکل زیادہ ہو گی۔ گول چہرہ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ گلابی ہونٹ۔ چھوٹی سی خوش قطع ناک اور چھوٹے چھوٹے مگر خوب جڑے ہوئے سفید دانت جو اکثر جھلکتے ہی رہتے تھے۔ باقی رہے کپڑے سو ان کا عالم یہ تھا کہ گلابی رنگ کا بنارسی دوپٹہ تھا اور آتشی گلابی کمخواب کا سوٹ اور کامدانی کرگابی۔ قمیض پر ہلکے زرد رنگ کا اونی سویٹر کوٹ اور زیور؛ زیور کا ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ کڑے بھی تھے اور چوڑیاں بھی اور گھڑی پہنچی بھی جس میں اوم بنا ہوا تھا۔ اور جسے شاید نفیسیاں بھی کہتے ہیں۔ اور گلے میں ہار اور نیکلس۔ ہاتھوں میں انگوٹھیاں، کانوں میں لمبے لمبے بندے۔ دوپٹے کے اوپر جوگیا رنگ کی چادر۔ لباس سے ہی ظاہر ہوتا تھا کہ شادی کو بہت عرصہ نہیں ہوا۔ اور یہ بھی کہ کسی امیر گھرانے کی بہو ہے۔

جو چیز اس کی ہر وقت سامنے رہتی ہے وہ اس کی مسکراہٹ ہے۔ ہر وقت اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکا سا تبسم کھیلتا رہتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ ہونٹ بنے ہی مسکراہٹ کے لئے ہیں۔ اور پھر اسی کی مسکراہٹ کے لئے۔ تم نے بہت سی خوبصورت لڑکیوں کو مسکراتے دیکھا ہو گا۔ اچھا بہت سی کو نہیں تو کچھ تو ضرور دیکھی ہوں گی۔ اور شاید ہر لڑکی ہی جوان ہو کر مسکرا سکتی ہے یا کم از کم عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے۔ مگر دراصل یہ خیال غلط

ہے۔ اور لوگوں کی بے وقوفی نہیں تو ناتجربہ کاری پر مبنی ہے۔ ورنہ میری بھی چوبیس سال کی عمر ہے۔ میں بھی تو ایسی مسکراہٹ کبھی دیکھتا! تبسّم کیا تھا حسن کا رقص تھا، نشہ تھا، نشہ ... یقین جانو جب اس مسکراہٹ سے اس نے مجھے دیکھا تو میں دو تین سیکنڈ سے زیادہ اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھ سکا، اور اس کی آنکھیں! اللہ! ...... آنکھیں! وہ اتھاہ گہرائیاں! ان میں جھجک بالکل نہ تھی۔ ان میں اطمینان، سکون، غرور، احساسِ حسن تھا اور ظاہر تھا کہ وہ جانتی تھی کہ ان میں جاذبیت ہے اور میرا ان کے سامنے جھک جانا یا مجھے اس کے حسن کا اعتراف کرنا لازمی تھا۔ بے باکی، خود اعتمادی، میں تمہیں کیا بتاؤں! میں تو نہ دیکھ سکا۔ یقین جانو میں تو شرما گیا۔

"پہلے تو میں نے سرسری طور پر محسوس کیا تھا کہ وہ خوبصورت ہے مگر چونکہ لاری ابھی چلی ہی تھی میں نے زیادہ عجلت نہ کی اور اس کے درجے کی باقی عورتوں کو اچھی طرح دیکھا کیا اور ان کی باتیں سنتا گیا مگر اس کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع نہ آیا تھا۔ دوسرے چاندرانی ہی مجھے اپنی طرف مشغول رکھنے میں کافی تھی۔ ایسی پیاری اور سرخ و سپید اور شوخ کہ پہلے پانچ منٹ تو جیسا میں نے کہا ہے میں اسی میں مشغول رہا۔ ایک دفعہ جو وہ گول مول ننھی منی سمٹی اپنے آپ کو دوپٹہ میں لپیٹتی جا رہی تھی اور میں کبھی یہاں کبھی وہاں انگلی سے گدگدا رہا تھا تو میری نظر اٹھ کر اس کی ماں پر جا پڑی۔ اتفاق سے وہ بھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اور مسکرا بھی رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں سے جو میری نظر اٹھ کر اس کی آنکھوں میں گڑ گئی تو میں کچھ دیر کے لئے چاندرانی اور لاری اور دیہات اور سب کچھ بھول گیا۔ معلوم نہیں میں ایک منٹ دیکھتا رہتا تو کیا ہو جاتا۔ میں تو پانچ سیکنڈ سے زیادہ نہیں دیکھ سکا ہوں گا۔ مگر تمہیں کیا بتاؤں کہ ان آنکھوں میں کیا دیکھا۔ شاعر تو پیٹتے رہتے ہیں۔ شرمائی ہوئی باحیا کنواری نظر کو۔ میں کہتا ہوں ان آنکھوں کو کیا دیکھنا آئے جو شرم و حیا سے آپ ہی بند ہوئی جاتی ہوں۔ آنکھیں تو وہ تھیں! میں کبھی نہیں بتا سکتا کہ ان آنکھوں کا یقین، ان کی بے حجابی، ان کی گویا "معلومیت" جیسے کہ مرد عورت کا فرق اجنبی اور غیر محرم کی غیریت، سب پردے فضول ہیں۔ اور دیکھنے والی آنکھ کے سامنے سب پردے عریاں ہیں۔ یقین کرو مجھے تو اپنی نظر سے شرم آگئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ گویا اسے معلوم ہے کہ میری نظر کیا کہہ رہی ہے، کس چیز کی خواہش کر سکتی، کون سی چیز اسے مل سکتی ہے، مرد عورتوں کو کس نظر سے اور کس لئے دیکھتے ہیں اور ان سے کس چیز کے طالب ہوتے ہیں .... اور ستم یہ تھا کہ اس جاننے والی نظر کے باوجود ابھی اس کی آنکھیں ایک جوان لڑکی کی آنکھیں تھیں۔ اور اس کی مسکراہٹ میں شباب کا تمام نشہ موجود تھا۔"

یہ کہہ کر بے چارہ منوّر اٹھ کھڑا ہوا اور بے چینی سے دو قدم ادھر اور دو قدم ادھر پھرا۔ پھر جیسے یک دم چونک کر بیٹھ گیا اور ایک کمزور سی مسکراہٹ سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں خوب غور سے اس کی کہانی سن رہا تھا۔ میں جانتا تھا جتنا حساس وہ ہے۔ اور مجھے اس کے احساسات کے ساتھ ہمدردی بھی تھی۔ اگرچہ چونکہ اس سے قبل اس نے کبھی اپنی جذباتی زندگی سے مجھے اچھی طرح روشناس نہیں کیا تھا میں حیران ضرور ہوا کہ یہ خاموش سا شرمیلی آنکھوں والا نوجوان جس چیز سے اتنا متاثر ہو گیا ہے وہ اتنی جاذب تھی بھی یا نہیں؟ مگر منوّر پھر شروع ہو گیا تھا۔

"میں نے تو اپنی آنکھیں نیچی کر لیں مگر نہ جانے وہ مجھے کتنا عرصہ دیکھتی رہی، یا شاید اس نے دوبارہ دیکھنا شروع کر دیا ہو کیونکہ جب کچھ دیر بعد میں نے پھر اس کی طرف دیکھا تو وہ پھر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اب کی دفعہ میں نے اس کی آنکھوں میں نہ دیکھا بلکہ میں اس کے ہونٹوں، اس کے چہرے، اس کے ہاتھوں کی طرف جن میں سے ایک میں رومال پکڑا ہوا تھا، دیکھتا رہا۔ کلائیوں پر اس نے نگینیاں پہن رکھی تھیں۔ نگینوں کی طرف میں اس لئے بھی غور سے دیکھتا رہا کہ میں اول اول یہ نہ معلوم کر سکا کہ ان کے درمیان سرخ سے جو نقوش بنے ہوئے ہیں وہ کیا ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ وہ اوم ہے۔ مگر اس کے بعد پھر جو میں نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں پھر میری جانب دیکھ رہی تھیں۔ میں نے قدرے بے چینی سے اپنے بائیں طرف دیکھا کہ شاید وہ کسی اور کی طرف دیکھ رہی ہو۔ مگر نہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ پلکوں سے آدھی ڈھکی ہوئی آنکھیں جن کی چمک اور نظر اور عشق اور وثوق پلکوں میں سے چھن چھن کر مجھ تک پہنچ رہا تھا میری طرف ہی جھکی ہوئی ہیں اور وہ نگاہیں میرے جسم دماغ اور دل سے گزر کر میری تمام حسیات کو بے نقاب کر کے کمال آسانی اور اطمینان اور سلطنت سے ایک کتاب کی طرح پڑھ رہی ہیں۔ شاید

یہ سب کچھ اس ترتیب سے مجھے اسی وقت نہ سوجھا ہو مگر یہ احساس اسی وقت کا ہے۔ شاید بعد میں میں نے سوچ اور فکر میں ان احساسات کو ترتیب دے دیا ہو۔ کیونکہ اب تو مجھے یاد یہی آتا ہے کہ وہ نظریں گویا بہت ہی حلیم نظریں تھیں۔

اس کے کافی عرصہ بعد یعنی تقریباً دس منٹ تک۔ اس نے میری طرف نہیں دیکھا۔ مطلقاً نہیں۔ مگر اس اثنا میں چاند رانی سے بہت بے تکلف ہو گیا تھا۔ اب وہ میرے گدگدانے یا ہاتھ لگانے سے اتنی ممتنی نہ تھی۔ بلکہ اگرچہ بظاہر میری توجہ اور چھیڑ چھاڑ سے اب تک ناپسندیدگی یا حجاب کا اظہار کرتی تھی مگر مجھے معلوم تھا کہ اس نے گویا مجھے قبول کر لیا ہے۔ اور وہ بھی نہایت غیر جانب داری سے اپنی توجہ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے افراد کی طرف رکھتی تھی اور آدھی یا میری طرف یا ان اطراف اور اشیا کی طرف جن سے میں اس تک پہنچ سکوں۔ لطف یہ تھا جیسا کہ میں کہہ رہا ہوں جب کبھی میں اسے چھیڑتا یا گدگداتا یا اس کے گال یا بالوں کو سہلاتا تو وہ منہ ایسا ہی بناتی تھی جیسے کہ میرا ایسا کرنا اسے ناپسند ہے۔ اور اگر میں دو منٹ تک بھی اس کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا لیتا تو وہ اس اجتناب کو محسوس کر لیتی اور کنکھیوں سے میری طرف دیکھ لیتی اور یا لاری کے پچھلے حصہ کی طرف منہ کر کے اپنی نشست پر کھڑی ہو جاتی اور بغیر ادھر ادھر دیکھنے کے سیدھی پیچھے ہٹتی ہوئی سڑک یا اس پر گزرتے ہوئے لوگوں یا چھکڑوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہتی۔ مگر دراصل مجھے معلوم ہوتا کہ اسے انتظار اس بات کا تھا کہ کب میں اس سے پھر کھیلوں۔

ان دو کے علاوہ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں چاند کی والدہ بھی اس کی ممانی کے دائیں طرف بیٹھی تھی۔ اور جب میں چاند کی طرف نہ دیکھتا اور جب میں اس کی ممانی کی طرف نہ دیکھ سکتا تو چاند کی ماں کی طرف دیکھتا رہتا۔ مجھے یاد ہے کہ اس ڈیڑھ یا دو گھنٹوں کے سفر میں ایک گھنٹہ سے زیادہ میں چاند کی والدہ کی طرف دیکھتا رہا ہوں یا اس کی باتوں کو سنتا رہا ہوں۔ مگر میں مانتا ہوں کہ بعض عورتوں میں نہ دیکھتے ہوئے دیکھنے کا ملکہ بھی کامل طور پر موجود ہوتا ہے۔ کیونکہ اس عورت کو اچھی طرح معلوم ہو گا کہ میں اس کی طرف دیکھ رہا ہوں اور اس کی باتوں کو غور سے سن رہا ہوں۔ مگر اس نے ایک مرتبہ بھی دانستہ طور پر میری طرف نہیں دیکھا۔ اب شاید تمہیں یہ خیال ہو کہ اتنی مدت تک ایک عورت کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہنا بدتمیزی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ واقعی یہ آداب کے خلاف ہے۔ اور شاید تم جانتے ہو کہ میں ایسی حرکت عام طور پر کرنے کے ناقابل ہوں۔ بلکہ اگر کہیں میرا گزر ایسے گلی کوچے سے ہو جائے جہاں عورتیں بیٹھی ہوں یا موجود ہوں تو میرے لئے وہ بیس پچیس قدم مصیبت بن جاتے ہیں۔ اور میں نے آج تک کبھی اچھی طرح نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ مگر یہاں بات جو میری بہت معاون تھی وہ یہ تھی کہ اس عورت نے گویا میری طرف نہ دیکھنے کا عہد کر رکھا تھا۔ شاید چھیلتی ہوئی نظر مجھ پر سے پڑ کر گزر گئی ہو گی کیونکہ آخر میں تو چاند رانی کے عین پیچھے اور اسی سمت میں بیٹھا تھا اور وہ کونے میں ترچھی تقریباً میری طرف رخ کئے بیٹھی تھی اور اس لئے بھی کہ وہ تمام وقت ہی چاند کی ممانی اور نانی اور چوتھی عورت جو چاند کے ساتھ بیٹھی تھی اس سے تیز تیز لہجہ میں باتیں کرتی رہی۔ یہی باتیں جن سے رفتہ رفتہ ان سب کا رشتہ آپس میں معلوم ہوا وہ یہ تھیں:۔

دوسروں سے وہ کہہ رہی "ہائے ہائے یہ کیا طریقہ ہوا، پورن کی ماں نے شام دیوی کے بیاہ پہ مجھے دو لڈو اور تھوڑے سے مرمرے بھیجے تو کس کے ہاتھ، اپنی چھوٹی کانتی کے ہاتھ۔ میں نے کہا میں تو لیتی نہیں۔ میں تو نہیں لیتی۔ بھیجا تو دوسرے دن اور آپ تو نہ آسکی۔ بھیجا تو بالشت بھر کی لڑکی کے ہاتھ۔ میں نے کہا میں کیوں لوں، برابر کی شریک ہے میں کیوں نیچی ہوں۔ دو لڈو اور مٹھی مٹھائی! اور کانتی کے ہاتھ میں نے تو کہہ ہی دیا تھا کہ رے جا مار اپنی ماتا کے سر پر کہ چاند کے پتاجی بیٹھے تھے۔ کہنے لگے تم تو ناحق ناراض ہوتی ہو تمہیں وہ خود دینے نہیں آئی تو تمہارے ہاں کچھ ہو گا تو تم بھی دو جانا تم بھی چاند کے ہاتھ بھیج دینا۔ میں نے کہا کہ اچھا میں بھی چاند کے ہاتھ ہی بھیجوں گی (اور دودھ پیتے بچے کو ہاتھ لگا کے) میں بھی کاکا جی کے ہاتھ ہی بھیجوں گی۔ میں نے کہا چاند کے پتاجی سے میں چاند کے ہاتھ بھی کیوں بھیجوں گی، میں بھی نوکر کے ہاتھ بھیجوں گی۔ یہ بھی کیا طریقہ ہوا! پورن کی ماں کو تو لین دین اور بھاجی کا کوئی طریقہ آتا ہی نہیں۔ مٹھائی بھیجی بھی تو چکی سی اور کانتی کے ہاتھ۔ میں بھی نوکر کے ہاتھ ہی بھیجوں گی۔"

جس تیزی سے اور اشاروں اور اعضاء اور نقوش کی حرکت کی مدد سے اس نے یہ سب کچھ کہا وہ میرے لئے اتنا دلچسپ خاکہ میں تو بہوت ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس لئے بھی کہ زیادہ دفعہ چاند کی ممانی کی طرف دیکھنا بھی مخدوش تھا۔

اب چاند کی ماں اپنی ماں یعنی چاند کی نانی سے کہہ رہی تھی "آپ سے میں نے کئی دفعہ کہا آپ لاہور آئیں تو میں آپ کو قلعہ دکھاؤں۔ میں چڑیا گھر دکھاؤں میں انار کلی دکھاؤں۔ میں سنیما دکھاؤں۔ آپ تو آتی ہی نہیں۔ اب چلی ہیں تو ہم کل سب چلیں گے۔ تین تانگے لیں گے۔ تین۔ دو میں تو ہم سب آ سکیں گے۔ سویرے کھانا کھا کر دس بجے گھر سے نکلیں۔ سارا دن سیر کریں گے۔ شام کو آپ کو نہر بھی دکھائیں گے اب تو سردیوں میں وہاں رونق نہیں ہوتی۔ گرمیوں میں تو شام کو وہاں میلہ لگا رہتا ہے۔" "ابھی وہ یہیں تک پہنچی تھی کہ وہ لڑکا بولا" تو بہن جی ماتا جی نے تو کبھی شالا مار بھی نہیں دیکھا ہوگا اور سنیما بھی۔ تو آج کل "تماشا" جیسی فلم آئی ہوئی ہے۔ ماتا جی نے تو کبھی سنیما دیکھا ہی نہیں۔ افسوس ہے میرا تو امتحان قریب ہے ورنہ میں بھی ساتھ رہتا۔ مگر آپ تو ساتھ ہوں گی۔ انہیں سنیما تو دکھائیے اور بھائی جی بھی تو شام کو دفتر سے آ جائیں گے" اس پر ان کی والدہ نے کہا "میں تو لاہور آتی اس لئے نہیں آتی کہ ٹھہروں کہاں۔ اب منوہر کی بہو ہو گئی ہے اب آ جایا کروں گی۔"

معلوم ہوا منوہر چاند کی ممانی کا خاوند ہے۔ تم جانتے ہو نا یہ ہندو لوگ اپنی لڑکیوں کے ہاں نہیں رہتے۔ اور نہ ان کے ہاں کا کھاتے ہیں شاید پانی بھی نہیں پیتے۔ اسی لئے غالباً اس لڑکے اور ہاں معلوم ہوا اس لڑکے کا نام مراری تھا، اسی لئے اس مراری کی ماں چاند کی ماں کے ہاں نہیں اترتی۔ مجھے اس دفعہ معلوم ہوا کہ وہ منوہر کے ہاں جا رہی تھی۔

ایسی ویسی ہی باتیں ہوتی رہیں مگر مجھے ابھی تک اس کا نام نہ معلوم ہوا اور نہ یہ کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔ اس سے یہ مطلب نہ لے لینا کہ ان کا پتہ معلوم کرنے سے میرا کوئی مدعا تھا۔ مگر جانتے ہو مجھے لحظہ بہ لحظہ یہ امر شاق گزر رہا تھا کہ اب لاہور آ جائے گا اور یہ اتر کر چلے جائیں گے۔ اور میں خود بھی لاری چھوڑ دوں گا۔ اور پھر شاید ہم کبھی نہ مل سکیں گے۔ مگر باوجود اس کے اس کا نام جاننے کے لئے میرے اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ میں بار بار اس کی طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اور چونکہ میں نے اس اثنا میں پانچ چھ مرتبہ گھڑی کو بھی دیکھا۔ شاید وہ سمجھ گئی ہوگی کیونکہ اب کی بار جو اس نے مجھے دیکھا تو اس کی مسکراہٹ میں شوخی کے علاوہ میرے اضطراب کا علم ضرور تھا۔ یہ میں نہیں بتا سکتا کہ یہ مجھے کیسے معلوم ہو گیا۔ اگر تم میری جگہ ہوتے تو تم بھی اس کی آنکھوں اور اس کے تبسم کو سمجھ لیتے۔ اس کا یہ احساس تو شاید تم نہ سمجھ سکتے (اس پر میں مسکرایا) مگر ایسا صاف جذبہ تو اس کا ذکی الحس بشرہ صاف ظاہر کر رہا تھا۔ کم از کم اس کی پُر معنی نگاہ سے مجھے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ضرور میری بے چینی کی وجہ کو پہچان رہی ہے۔ اب لاہور غالباً بیس میل رہ گیا تھا۔ اور مجھے ہر منٹ یہی خیال ہو رہا تھا کہ ہم اب لاہور پہنچے کہ اب۔ حالانکہ لاری کم از کم بیتالیس منٹ لیتی۔ مگر میں سوچتا کہ یوں گھنٹہ کیا ہوتا ہے۔ یہ تو ابھی ختم ہو جائے گا۔ اور پھر اس کی پتلی پتلی گلابی مومیا رنگ کی انگلیاں اور ان میں سبز اور نیلے نگوں کی انگوٹھیاں، اور اس کی کلائیوں کی نفیس یاں کہاں چلی جائیں گی۔ مجھے زیور اس سے پہلے لگتا ہی بُرا تھا۔ اور جب کبھی میں ان عورتوں کو دیکھتا جو زیوروں سے لدی ہوئی ہوتیں تو مجھے سخت نفرت ہوتی۔ اور اب مجھے یہ خیال ہی نہ تھا کہ اس نے زیور بھی پہن رکھے ہیں کہ نہیں البتہ اس کی کلائیوں پر وہ گھڑی پہنچیاں اس قدر اچھی معلوم ہوتی تھیں کہ جب میں اس کے چہرے کی طرف نہ دیکھ رہا ہوتا تو اس کے ہاتھوں یا کلائیوں یا ان پہنچیوں کی طرف دیکھتا ہوتا، اور خوش قسمتی سے اسے کسی طرح معلوم ہو گیا کہ اس کے ہاتھ اور اس کی کلائیاں مجھے اچھی لگتی ہیں۔ کیونکہ یا تو عام طور پر اس کے ہاتھ اس کی چادر کے اندر ہوتے کیونکہ ہوا میں سردی ضرور تھی اور یا اب شاید ہی وہ ایک آدھ بار چھپائے گئے ہوں گے بلکہ عام طور پر وہ دونوں یا کم از کم ایک تو کہنی کے سہارے گھٹنوں پر ٹیکے ہوئے چہرہ تھامنے میں مصروف رہتے۔ شاید اس کے پاؤں کے نیچے کوئی سوٹ کیس ہوگا۔ کیونکہ اس کے گھٹنے اٹھے ہوئے تھے اس لئے اس کی کہنیوں کو ٹکنے کے لئے جگہ بھی موجود تھی۔ یوں ہمیشہ پتلی پتلی گلابی ناخنوں والی انگلیاں دونوں گالوں کو حمائل کئے ہوئے وہ چاندانی سے مٹوں تک باتوں میں مصروف رہتی اور کیا باتیں ہوتیں —

اس پر منوہر نے ایک ٹھنڈا سانس لیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ بھئی یہ تو میں سمجھ گیا کہ وہ ماہ طلعت ضرور ہی تمہارے جذبات سے متاثر ہو رہی ہوگی، اور ہوگی بھی اسی قابل کہ تم والہانہ طور پر اُسے دیکھتے رہتے، اور کاش کہ تمہارا سفر لمبا ہوتا، یا تمہاری لاری ہی راستہ میں فیل ہو جاتی تاکہ تمہیں ایک آدھ گھنٹہ اور مل جاتا۔ مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ خاندان تو ہندو منوہروں کا تھا۔ اور جانتے ہو اپنے اعمال کی پاداش میں مسلمان لڑکیوں کو ہم پردہ کی وجہ سے نہیں دیکھ سکتے۔ اور

ہندو لڑکیاں ہیں مسلمان سمجھ کر نہیں دیکھتیں۔ تمہیں وہ کس طرح دیکھتی رہی اور تمہارے دیکھنے کو وہ کیسے برداشت کرتی رہی۔ نہ بے پروائی کی تیوری چڑھائی نہ آنکھوں سے شعلہ باری کی اور نہ تمہاری طرف سے منہ ہی پھیرا اور نہ نشست ہی تبدیل کی؟ یہ میں نہیں سمجھ سکا۔"

مونو نے کہا "ٹھیک کہتے ہو۔ ہماری ملعون زندگی سے بدتر اور کیا زندگی ہو سکتی ہے۔ ہندوستان میں تو لڑکیوں کا مردوں کی طرف دیکھنا بھی گناہ ہے زندگی کا لطف خاک آئے۔ اس سے تو اخریقہ ہی میں پیدا ہوتے! ہم سے تو حبشی ہی اچھی زندگی بسر کرتے ہوں گے۔ اتنی قیدیں، اتنی رکاوٹیں۔ احساس کو بیدار کرنے کے لئے ہزاروں لاکھوں چیزیں موجود ہیں اور دل کی تسلی کے لئے ایک بھی نہیں! مگر کیا کریں؟ ۔۔۔ اور ہاں تم پوچھ رہے تھے کہ میری طرف اس نے دیکھا کیوں؟ میں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ کچھ لمحوں کے لئے میرا ستارہ کسی منحوس برج سے نکل کر اکیلا گشت لگا رہا ہوگا۔ اور کیا بتاؤں؟ اور ہندو مسلمان کے متعلق تو جواب آسان ہے۔ کہ میں سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اور میرے سر پہ ہیٹ تھا۔ شکل سے نہ ہندو لگتا ہوں نہ مسلمان، یا دونوں ہی۔ اور شاید اسے یہ خیال ہی نہ آیا ہو۔ کیونکہ آخر اسے بھی تو معلوم ہوگا کہ یہ ڈیڑھ دو گھنٹہ کا سفر ہے پھر وہ کہاں اور میں کہاں، اور اگر اسے نہ بھی آیا ہو تو مجھے ہر لحظہ یہی خیال آ آ کر گھبرا رہا تھا۔"

مگر میرے لئے سوائے اس کے کہ چاند رانی سے چھیڑ چھاڑ یا پیار میں مشغول رہوں اور اس کی ممانی کی طرف دیکھ لوں اور کیا تھا۔ چنانچہ اب چاند رانی نے بھی میرے قرب کو تسلیم کر لیا تھا اور اپنے گدگدانے کو میرا حق مان لیا تھا۔ مگر اس وقت چاند رانی میرے بہت کام آئی۔ خدا اسے جوان ہونے پر بھی اتنی کامنی اور من موہنی رکھے جتنی پیاری وہ پانچ برس کی عمر میں تھی۔ میری خوش قسمتی کہ اس کی ممانی اب اس سے یہ باتیں کر رہی تھی "چاندجی اپنے ماموں کے گھر چلوگی۔ تمہیں پتہ ہے اپنے ماموں کے گھر کا؟" چاندجی چپ تھی اور مگن گر موٹی موٹی آنکھوں سے اپنی ممانی کو نہایت عبادت مندانہ انداز سے حد درجہ کے پیار سے دیکھنا اگر جواب ہو سکتا ہے تو چاندجی اپنی ممانی سے خوب باتیں کر رہی تھی۔ ظاہر تھا کہ چاند رانی کو اگر کسی سے پیار تھا تو اپنی ممانی سے اور ممانی کے منہ پر جو مسکراہٹ تھی اس میں اتنا پیار اور اتنی ملائمت تھی کہ مجھے تو چاند رانی ہی سے ایک لمحہ کے لئے حسد ہو گیا۔ مگر چاند رانی سے جو باتیں ہو رہی تھیں وہ میرے لئے اس قدر دلچسپ تھیں کہ مجھے اور کسی چیز کا دھیان ایک سیکنڈ سے زیادہ عرصہ تک نہیں رہ سکتا تھا۔ چاند رانی سے پوچھا جا رہا تھا "چاندجی تم اپنے ماموں جان کے گھر آؤ گی نا؟ کہاں ہے تمہارے ماموں جان کا گھر؟ پنج محل روڈ پر۔ جانتی ہو کہاں ہے پنج محل روڈ؟ تم تو لاہور کی رہنے والی ہو۔ تم نے تو لاہور کی خوب سیر کی ہوگی۔ چاندجی ہمارے ہاں آؤ گی نا۔ ہم اور تم سیر کو چلیں گے۔ ہم اور تم چڑیا گھر چلیں گے، لارنس باغ چلیں گے اور خوب سیر کریں گے۔ تم پنج محل روڈ پر آنا۔ تمہارے گھر سے دور تو نہیں۔ اپنی ماتاجی کو ساتھ لے کے آنا۔ ہم سب سیر کو چلیں گے۔ ہم تو لارنس باغ میں شام کو سیر کیا کرتے ہیں، تم نہیں کیا کرتیں۔ ہائے سیر نہیں جایا کرتیں۔ چاندجی تم ہمارے پاس آ جاؤ۔ ہم تمہیں ماتاجی سے لے لیں گے۔ ہم تمہیں اپنے پاس رکھیں گے۔ ہم روز شام کو سیر کو جایا کریں گے۔ ہم موٹر پر جایا کریں گے موٹر پہ سیر کرو گی نا۔ ہم تمہیں موٹر پر سیر کرائیں گے۔ ہم گرمیوں میں نہر پہ جایا کریں گے۔ تم بھی آؤ گی نا؟" چاند رانی تو کھل کھل کر ہنس رہی تھی، اور اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنی ممانی سے لپٹی جا رہی تھی۔ مگر ایک منٹ کے بعد ممانی جان نے نگاہ اٹھا کر پھر میری طرف دیکھا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر! کیا نظر تھی! ایسا محسوس ہوا کہ میرا دل اس نگاہ کی گرمی محسوس کر رہا ہے۔ اور اب بھی اس کی آنکھوں میں وہی پُر معنی چمک تھی۔

میں نے سوچا کہ یہ تو پتہ چل گیا کہ وہ رہتی کہاں ہے مگر اس سے فائدہ؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں پھر اسے دیکھ سکوں، اور وہ بیاہی بھی ہوئی ہے اس کا تو خاوند بھی ہے۔ اور خاوند سے اسے ضرور پیار رہا ہوگا۔ ابھی تو شادی کو زیادہ عرصہ ہوئے نہیں معلوم ہوتا۔ ایک نہیں تو ڈیڑھ سال ہوا ہوگا۔ اور میں مسافر، اجنبی اور ڈیڑھ دو گھنٹے کا سفر۔ اور میں کون اور میرے لئے کس کی دلچسپی، کس کا شوق۔ بکواس۔ اسی ادھیڑبن میں میرا چہرہ اداس سا ہو گیا ہوگا، اور میں نے چاند رانی کو چھیڑنا چھوڑ کر اس کی طرف پانچ منٹ تک دیکھا بھی نہیں تھا۔ پھر چاندجی نے اپنی جگہ کھڑے ہو کر میری طرف منہ کر کے دوپٹہ لیتے لیتے دوپٹے کو اس طرح جھٹکا دیا کہ میرے ہیٹ پر آ لگا۔ ہیٹ ٹیڑھا ہو گیا۔ میں نے ہیٹ اتار کر اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا اور اس وقت سوچا کہ اور سب کچھ تو نظر کا دھوکا ہوگا، مگر چاند رانی تو واقعی ایک پیاری سی لڑکی تھی۔ اور وہ تو کم از کم سچائی سے آرزومند تھی کہ میں اس سے کھیلوں۔ مان لیا کہ وہ مجھے لاہور پہنچنے پر پانچ منٹ

کے اندر اندر بھول جائے گی مگر اس وقت تو وہ حقیقی طور پر مجھ سے کھیلنے کے لئے مشتاق تھی۔ اور پھر وہ تھی اتنی پیاری سی۔ چنانچہ میں نے اس کی طرف پانچ منٹ تک نہ دیکھا۔

اب اپنے آپ پر لعنت بھیجتا ہوں کہ وہ پانچ منٹ بھی کیوں ضائع کئے۔ دیکھتا رہتا تو کیا تھا۔ اسے کیا پتہ تھا کہ میں کیوں اُداس ہوں یا میرا جی کیا چاہتا ہے۔ مگر خیر دو تین میل تک میں نے اسے نہ دیکھا۔ پھر جو دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوا کہ وہ مجھے متجسس نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ معلوم نہیں وہ کیا جاننا چاہتی تھی۔ مگر اس کی نگاہ بالکل غیر مضطرب اور پرسکون تھی، جیسے کوئی حادثہ اسے گھبرا نہیں سکتا۔ واللہ مجھے معلوم نہ تھا کہ دنیا میں ایسی آنکھیں بھی ہو سکتی ہیں۔ کیا صاف اور بے ہراس نگاہ تھی، یہ تو کبھی میرے قیاس میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ اسے میرے ساتھ کچھ دلچسپی پیدا ہونے کا امکان بھی ہے۔ اور آخر تم جانتے ہو لاری میں ڈیڑھ گھنٹے کا سفر فقط ایک سو منٹ ہوں گے اور کیا ہے۔ اس سے کچھ توقع کرنا حماقت تھی۔ مگر میرا دل چاہتا تھا کہ ایسی نظر اتنی تیز اور پُر معنی لاابالی نہ ہو۔ مجھے شک پڑتا تھا کہ اسے میری گھبراہٹ اور میرے اشتیاق سے لطف آرہا ہے۔ مگر پھر اس کی مسکراہٹ کو دیکھتا تھا تو اس میں کوئی تُرشی نہ تھی، اور وہ ایسی ملائم اور میٹھی اور رحیم تھی ...... شاید!

یہ کہہ کر مسعود پھر ایک دو منٹ کے لئے چپ ہو گیا۔ میں نے بھی اس "شاید" کی تشریح اس سے نہ پوچھی چاہی۔ پھر وہ ذرا مدھم آواز میں بولنے لگا ——

"اس کے بعد میں کسی خیال میں مستغرق تھا کہ مجھے اس کی آواز نے چونکا دیا، اور میں نے دیکھا کہ وہ چاند کی ماں سے کہہ رہی تھی: "آپ نے ہی تو اس دن مجھ سے کہا تھا کہ شانتی تو یہیں بیٹھ میں کھانا کھلا کے تجھے اندر بلاتی ہوں: اور جب میں تھک کر آپ کا انتظار کر کے اندر چلی گئی تو آپ ناراض ہو گئیں اور ابتک آپ نہیں بھولیں۔"

"تم تو پہلے ہی چاہتی تھیں کہ باہر بیٹھو۔" یہ چاند کی ماں نے کہا مگر ترش لہجہ میں۔ "اور میں نے تو تمہیں باہر بھی کھلے منہ بیٹھے دیکھا تھا۔ میرے دیور جیٹھ سامنے ہی گزر رہے تھے۔ وہ بھی کیا کہتے ہوں گے کہ کل کی دلہن اور ننگے منہ۔ میری سسرال تھی۔ میرا خیال کیا ہوتا۔ مگر وہ تو آج کل کی پڑھی لکھی لڑکیاں ہوتی ہی ایسی ہیں۔"

"مگر میں کہاں اندر جاتی تھی، آپ ہی نے کہا تھا شانتی یہاں بیٹھ میں وہیں بیٹھی رہی۔ اور بھی میرے پاس بہتیری تھیں کسی نے بھی برا نہیں مانا، اور گھونگھٹ نکالتے سے تو مجھے بہت گھبراہٹ ہوتی ہے۔ اور نکالتی تو باقی سب مجھے کہا دیتیں، شانتی یہ کیا؟ اور شانتی یہ کیوں؟ اندر بیٹھی تھی تو کسی نے کہا شانتی باہر آ کے بیٹھ۔ تو ابھی دلہن ہے۔ باہر نکل کے مہمانوں میں بیٹھ۔ صحن میں رونق ہو۔ تو شانتی باہر جا بیٹھی پر سب ایک ایک کر کے شانتی کے پاس سے اٹھ بھی گئیں تو شانتی وہاں کیا کرتی؟ اور گھونگھٹ تو میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مجھ سے نکالا نہیں جاتا۔"

"بس تم تو آزاد ہو، تمہاری مرضی ہے۔ میں نے تو یہی کہا تھا کہ اندر میرے دیور جیٹھ بیٹھے ہیں، اٹھ جائیں تو تم آجانا۔"

"تو بہن جی، وہ تو میرے پاس ہی کوئی نہ بیٹھا رہا اور آپ بھی نہ آئیں۔ پڑا پا گھر۔ میں گھڑی بن کے کیا کرتی۔ اور مجھے خیال تھا کہ سب اٹھ گئے ہوں گے۔"

"یہی تو میں کہتی ہوں، میری سسرال کی بات تھی، سب کہتے ہوں گے کہ ان کی دلہن مسال ابھی ہوا نہیں سب کے سامنے منہ کھلے پھرتی تھی۔ اور ہر چ تو کوئی نہ تھا۔"

"تو بہن جی مجھے کیا پتہ تھا کہ ابھی تک اندر کوئی بیٹھا ہے یا پھر باہر ہی آپ کسی کو میرے پاس بھیج دیتیں۔ آپ کرتی ہیں زبردستی ہیں۔ اور آپ نے یہ بات ایک دفعہ نہیں کی، کئی دفعہ کی ہے۔ ہم تو کبھی اتنی دور تک بات کو نہیں کھینچتے۔ آپ کی عادت ہی کچھ ایسی ہے۔"

"تو بہن تو کون سی کم ہے۔ تو بھی تو ایسی نہیں کہ . . . ."

وہاں چاند کی نانی بیچ میں آگئی اور اس نے کہا "اچھا اچھا جانے دو، شانتی تو ہی جانے دے، ساوتری (یہ چاند کی ماں) چھوڑ ابھی کر بات کو، کیا بُری عادت ہے تیری! اب لاہور تو آنے کو ہو گا۔ شام ہو چلی ہے۔ یہ موٹر ہمیں گھر تک پہنچا آئے گی یا کہیں اور چھوڑ دے گی؟" ہماری نے کہا "ماتا جی یہ تو چنگی خانے کے اڈہ کی لاری ہے۔ یہ ہمیں سٹیشن پر ہی چھوڑ دے گی۔ وہاں سے ہمیں ٹانگہ لینا پڑے گا۔" اس پر ساوتری نے جو اتنے میں شانتی سے اپنی چپقلش شاید بھول بھی چکی تھی کہا "یہ ہمیں شاہ عالمی کے اڈے پر پہنچا دے تو اچھا ہے وہاں ٹانگے ہمیں کرشن نگر تک مل جائیں گے۔ نہیں تو یہ لاری ہی ہمیں کرشن نگر تک پہنچا دے۔"

میں نے کہا "یہ کرشن نگر کہاں ہے؟"

منو نے کہا "معلوم نہیں یہیں کہیں ہوگا عجیب عجیب سے نام لوگوں نے رکھ لیے ہیں۔ اچھرے وچھرے کی طرف ہوگا یا کسی اور طرف۔ ہماری بلا جانے۔ میں تو تمہیں بتاتا ہوں جو میں نے سُنا۔ اب شاید لاہور پانچ چھ میل رہ گیا تھا۔ اگرچہ شاہدرہ ابھی نہیں آیا تھا۔ شام پڑ رہی تھی۔ میں لاہور کی نزدیکی سے بہت گھبرا گیا۔ مگر جانتے ہو کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ نام تو اس نے مجھے اپنا بتا دیا تھا۔ مگر شاید اس کا یہ مطلب نہ ہو۔ پھر سوائے اس کے کہ میں اس کے چہرے یا آنکھوں یا ہونٹوں یا اس کے ہاتھوں کو دیکھتا رہوں اور کیا کر سکتا تھا۔ روشنی ابھی اتنی تھی کہ میں سب کچھ باآسانی دیکھ سکوں۔ ہاتھوں کا اس کے رنگ تھا کہ غضب۔ ہاتھ کیا تھے موتیا کے پھول تھے۔ ایسا لطیف رنگ۔ ایسی نرم جلد! محسوس ہوتا تھا کہ ہاتھ لگانے سے ان پر داغ پڑ جائے گا۔ میں نے کہا اس کی نندیا ساس یا کوئی دیکھتا ہے تو دیکھے۔ باقی پندرہ منٹ تو میں سوائے اس کے دیکھنے کے اور کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ مگر دیکھنے سے کیا سیری ہو سکتی ہے۔ اور آنکھوں کی بھوک کا، احساس دوسرے کو ہو بھی جائے تو اس سے کیا ہوتا ہے! مگر میں دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی چاند رانی پر بھی نظر ڈال دیتا۔ مگر اس سے کھیلنے کو زیادہ جی نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو اب منتظر رہتی کہ کب میں گُد گداؤں مگر میں کئی کئی منٹ اس کی طرف دیکھ بھی نہ سکتا؛"

اب مجھے اس کا نام بھی معلوم تھا۔ اور یہ بھی کہ وہ کہاں رہتی ہے۔ مگر یہ کہ میں پھر کبھی اسے دیکھ سکوں گا۔ یہ خیال مجھے بہت بے چین کر دیتا۔ مگر میرا خیال ہے کہ میں اس کے چہرے میں اتنا منہمک تھا۔ اور لاہور پہنچنے کے ڈر سے اتنا مضطرب ہو رہا تھا کہ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ تمام باتیں یعنی اسے پھر نہ دیکھنے کا ڈر..... اور اسے دیکھنے کا گمان اور ایسے ویسے اندیشے مجھے سوجھ بھی رہے تھے کہ نہیں۔ مجھے یہ بھی وثوق سے یاد نہیں کہ کیا میرا اس وقت واقعی خیال تھا کہ اس نے اپنا نام اور پتہ دانستہ طور پر بتایا ہے، شاید یہ محض میرے دماغ کی آفرینش تھی۔ یا شاید اس کی نگاہوں کا کچھ مطلب تھا! یا وہ مجھے اب ہر دو یا تین منٹ کے بعد ٹکٹکی باندھ کر کیوں دیکھ لیتی تھی۔ یا اب آنکھوں میں وہ بے پروائی اور غرور کیوں نہیں تھا۔ یا کیا واقعی اس کی نظر میں کچھ بے چینی موجود تھی یا اس کی مسکراہٹ اب کیوں غائب ہو گئی تھی۔ یا اب اس کے ہاتھ کیوں رومال کو لپیٹنے، مروڑنے، کسنے اور کھولنے میں مشغول تھے یا اب وہ کیوں نظریں ملا کر آنکھ جھکا لیتی تھی، افسوس ہے ان سوالوں کا جواب شاید مجھے تا حشر نہیں مل سکے گا۔

"مجھے اب اس بات کا افسوس بھی ہے کہ چاند رانی سے بھی کیوں کھیلتا رہا۔ میں ساری راہ اُسے ہی کیوں نہ دیکھتا رہا۔ آخر میں اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ نہ بولنے کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ مگر اُن کے ایک ایک خط سے اُن کے خفیف سے جھکاؤ سے کتنی ملائمت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"لاہور آ گیا۔ ہم اڈے پر پہنچ گئے۔ اور لاری کھڑی ہو گئی۔ اس وقت سب مسافر اترنے میں مشغول۔ ان کے حصے میں دونوں طرف کی کھڑکیاں کھلی تھیں۔ وہ چونکہ بیچ میں بیٹھی تھی۔ شاید اس لئے وہ سب سے آخر میں اتری۔ میں بھی اپنی کھڑکی سے دور تھا۔ میں بھی بیٹھا رہا۔ اترتی دفعہ بھی اس نے مجھے خاص اپنی نظر سے دیکھا۔ کاش وہ اترتی دفعہ ہی مجھے اُس نظر سے نہ دیکھتی! پھر بھی میں شاید اسے کبھی بھول جاتا؛"

میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا وہ کبھی بیچ محل روڈ پر نہیں گیا۔ یا کیا وہ اسے کبھی لارنس باغ میں نہیں دکھائی دی۔ مگر اس کی نظر کی اُف... دگی کو دیکھ کر مجھے یہ پوچھنا بے سود ہی معلوم ہوا۔

امتیاز علی تاج

"۔۔۔ کہ عالم دوبارہ نیست"

فراعنۂ مصر کے محل کا دستور تھا کہ ضیافتوں کے بعد جب مہمانوں کی میگساری اور بیباکی اعتدال کی حدود سے تجاوز کرنے لگتی تو معبد شہر کا پروہت ممی کی وضع پر تراشی ہوئی دیوتا آسیرس کی لکڑی کی مورت خدام کے کندھوں پر اٹھوا کر ایوانِ نشاط میں داخل ہوتا اور اس وقت جبکہ خدام مورت کو اُٹھائے مخمور فرعون کے بدمست مہمانوں میں گھم گھتم کر گھوم رہے ہوتے، تو پکار پکار کہتا "انجامِ ہستی کو دیکھو۔ اور ان ترغیبات سے احتراز کرو۔ جو تمہارے حواس کو فریب میں لا کر تمہیں بھلا دیتی ہیں۔ کہ موت کا سرد ہاتھ ایک روز حیات ناپائیدار کی آنکھیں بند کر دیگا۔"

موت کی چیرہ دستی کا بھیانک نتیجہ آنکھوں کے سامنے آجانے سے منادی کی آواز منفسوم کے گھڑیال کی گونج معلوم ہوتی۔ جسے سن کر دست درازوں کے بازو ڈھیلے پڑجاتے اور مے آشاموں کے ہاتھ پیالوں کو نہ سنبھال سکتے اور ایک لمحہ کے اندر اندر محفل پر مدہوشی اور خود فراموشی کے بجائے عبرت کا خیال آفریں سکوت طاری ہو جاتا۔

لیکن یہ صدیوں کا پرانا دستور جسے زمانۂ قدیم کے کسی معلم اخلاق نے وضع کیا تھا۔ اور جس سے اخلاقِ عام کے محافظ، پروہت اور پجاری اعتدال و احتیاط کی درس آموزی کیا کرتے تھے۔ ایک ہی رات کے اندر ایک نوجوان فرعون کے ہاتھوں اپنے معانی کی تعبیر میں یوں منقلب ہوا کہ مؤرخ اور فطرت انسانی کے طالب کے لئے یکساں طور پر استعجاب انگیز ہے۔

وہ رات بلا رسروپ دلیوی بسط کے تہوار کی آخری ہنگامہ خیز رات تھی۔

مصر کی وسیع مملکت سے ستر ہزار زائر خشکی کی راہ اور کشتیوں میں سوار ہو کر کھڑتالیں اور مرلیاں بجاتے اور گیت گاتے کئی روز پیشتر بیوبسطس کے شہر میں پہنچ چکے تھے۔ جواں سال فرعون اور اس کے پروہتوں نے پوجا کی تمام خفی و جلی رسمیں ادا کر لی تھیں۔ دیوی کا چولا اور اس کا منڈل جس پر ایک سنہرا بنا تھا، بدلا جا چکا تھا۔ فرعون نے معطر تیسپ و دائیں ہاتھ کی چھنگلیا سے دیوی کی کانسے کی مورت پر مل دیا تھا۔ قربان گاہ پر سیاہ و سفید رنگ کے ہزاروں بیلوں کی قربانیاں چڑھ چکی تھیں۔ اور ان کے سران دعاؤں کے بعد کہ فرد اور قوم

اور شہر اور مملکت کی بلائیں ان پر سے ٹل جائیں، نیل میں غرق کئے جا چکے تھے۔ دیوی کے حضور میں شہد اور شراب اور کشمش اور کیسر کے چڑھاوے چڑھ چکے تھے۔ بوبسطس کے ایک ایک بازار میں عوام کا بحر مواج جلاجل اور مجیرے بجا بجا کر سارے دن بھجن گاتا اور دیوی کی جے کے نعرے لگاتا رہا تھا۔ اور اب تمام رسوم ادا کر چکنے کے بعد مرد اور عورتیں اور بوڑھے اور بچے ادائے فرض کی فراغت کے ساتھ اپنے آپ کو طرب و نشاط کے اس عام میلان کے سپرد کر چکے تھے جس کے تند و پر شور سیلاب کے ریلے سارے اژدحام کو بہائے لئے جا رہے تھے۔ اور بہار کی اس جذبات انگیز رات میں تاباں و فروزاں مندروں کی منقش دیواروں کے باہر جا بجا مشعلیں گھماتے اور جھانجیں اور الغوزے بجاتے عریاں گیتوں اور ولولہ انگیز ناچوں میں کھوئے ہوئے تھے۔

بلاد سروب دیوی بسطہ کے تہوار کی آخری ہنگامہ خیز رات میں ضیافت کے بعد نوجوان فرعون کا ایوان نشاط مملکت مصر کے تمام قابل ذکر لوگوں سے بٹا پڑا تھا۔ اور اگرچہ اژدحام کے ہنگاموں سے علیحدہ اور جدا تھا لیکن نہ اتنی دور کہ بیرونی وارفتگیاں محسوس ہوئے بغیر رہ سکیں۔

نوجوان فرعون کا ایوانِ نشاط عشرت و تجمل کا ایک نادر و یگانہ خواب تھا جسے معمار اور نجار اور مصور اور سنگتراش کی متفقہ معجزانہ کاوشوں نے زندگی بخش دی تھی۔ عظمت و نزہت میں اہرام کھڑے کرنے والوں کی اولاد کے شایانِ شان طول و عرض میں اس قدر وافر کہ ایک اژدہام کی معیت اس میں ناچیز نظر آتی تھی۔ اس کی وسعت اپنے اندر ایک شور قیامت کو گم کر سکتی تھی۔ مطلّے و مصفّی فرش پر منقش اور رنگین دیواروں کے ساتھ ساتھ استرکاری کے ستونوں کی ایک دنیا آباد۔ جن کے پائے، اور سر قدیم صناعی، رنگ آمیزی کا ایک فردوس تھے۔ اور ان کے درمیان جا بجا دیوی بسطہ کے عظیم الجثہ مجسمے وقار اور تمکنت میں ترشے ہوئے کھڑے تھے۔ ایوان کی وسعت کے برابر نیچی نیچی اور چوڑی چکلی بے شمار سیڑھیاں دو ایسے ہی دوسرے وسیع تختوں کی رہنمائی کرتی تھیں۔ گرانڈیل حد شاخوں کی مختلف الالوان روشنیوں میں انسانی صناعی کا یہ حیرتناک مظہر جس میں رنگ و آہنگ کی موجوں پر خوشبوئیں ہلکورے لے رہی تھیں، اپنی تابانی و درخشانی سے ہوش ربائی کر رہا تھا۔

رنگدار پایوں کے ہزاروں گدیلے اور تخت اور کرسیاں بچھی تھیں۔ جن پر نوجوان فرعون کے مہمان ضیافت کے بعد رنگ رلیوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے بیٹھے تھے۔ نیل کی مچھلیوں اور بطوں اور جنوبی جنگلوں کے غزالوں اور گایوں کے کبابوں کے ساتھ مہمانوں کو کرنب بھی کھلایا گیا تھا کہ ان کی پیاس بھڑک اٹھے اور وہ اسے وادیٔ نیل کے انگوروں کی لال اور سفید شرابیں سے بجھا سکیں۔

تنومند ہاتھوں نے قدم بڑھا رکھے تھے۔ اور گوری ساقنیں زمرد کا مینا لئے فراخ حوصلگی سے انھیں لبالب بھر رہی اور خالی مینا ساتھ کی سیہ فام کنیزوں کے سپرد کرتی جا رہی تھیں۔ جام ہونٹوں پر سرنگوں تھے اور منہ پونچھنے والے خادموں کے رومال ہٹا ہٹا کر ہل من مزید کی صدائیں بلند کی جا رہی تھیں۔

ایوان کے مختلف حصوں میں مختلف تفریحیں جاری تھیں۔ نچلے تختے میں مزامیر کے غل کے ساتھ نٹ اور بازیگر اور شعبدہ باز اور مسخرے اپنے اپنے کمال فن کر نظارہ افروز کر رہے تھے۔ کئی کئی چرمی گیندیں آگے پیچھے اچھال کر واپسی میں باری باری لپکی اور پھر اچھالی جا رہی تھیں۔ رنگین دائروں والی لکڑی کے اندرونی دائرے میں خنجروں سے نشانہ لگایا جا رہا تھا۔ دو دو مرد اور عورتیں دریں پر ٹانگیں پھیلا کر برابر برابر بیٹھے تھے۔ اور ایک دوسرے کی بانہوں میں باہیں ڈال کر بغیر زمین کا سہارا لئے کھڑے ہو رہے تھے۔ مسخرے اور بونے اپنی چست پھبتیوں اور مضحکہ خیز حرکتوں پر قہقہے وصول کر رہے تھے۔

دوسرا تختہ خوش آواز سازندوں اور نامور مغنیوں کے راگوں سے سماعت کے لئے ایک خوش آیند وارفتگی کا سامان مہیا کر رہا تھا۔

طنبور اور سرود اور نے بجانے والی حبشنیں فضا کو کیف و مستی کی جنت بنا رہی تھیں اور مغنیوں کی گلے بازیاں متاعِ ہوش کی غارتگری میں مصروف تھیں۔ نازنینیں اپنے سبک بربط سینے سے لگائے اور گھٹنوں پر اُٹھائے اپنی نازک انگلیوں سے ان کے تاروں کو ہلاتی اور اپنے گیتوں اور تبسموں سے مخملیاں گراتی مہمانوں کے درمیان سے گذر رہی تھیں جن کے ذہن عشرت کی مدہوشی میں جیسے سُن تھے۔

تیسرے تختے کے پرلے کنارے ایک جڑاؤ تخت پر جس کے پایوں کو شیروں کے بڑے سر بنا کر مزین کیا گیا تھا، نوجوان فرعون فاخرانہ تجمل میں بیٹھا تھا۔ شباب کے اوّلین مراحل میں اور نا کتخدا۔ اس کی مسیں بھیگ چکی تھیں۔ اور خط بننا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے نفیس ترین کتان کی ایک لمبی اور دودھ سی سفید عبا پہن رکھی تھی۔ جس کی آستینیں چست تھیں۔ اور جس کے دامن پر سنہرے بیلوں کی زرتار وطاءسے مصر کا شاہی نشان بنا رکھا تھا۔ زری کے ایک کمربند سے جس نے عبا کو خوش مذاقی سے چنٹیں دے رکھی تھیں، سامنے کی طرف باریک چمڑے کی ایک مثلث آویزاں تھی جس پر شوخ رنگ میں لہریے کے نقش بنے ہوئے تھے۔ سر پر مصنوعی بال تھے۔ جن پر کنول کے شگفتہ پھولوں کا شبک سا تاج رکھا تھا۔ گردن میں ہیروں کا ایک ہار دھک رہا تھا۔ اور بازوؤں، کلائیوں اور انگلیوں میں سونے کے وٹے موٹے بازو بند، پہنچیاں اور انگشتریاں جن پر نایاب پتھروں سے گبرجھو اور بچھو اور تصویری خط کے حروف بنے ہوئے تھے۔

قدِ آدم بربط جن کے سروں پر ارواحِ خبیثہ کے اژدھے چہرے تراشے ہوئے تھے، ایک مناسب فاصلہ پر کھڑے تھے اور مزاج شناس سازندوں کی مشاق انگلیاں انھیں ایسے سلیقہ سے ہولے ہولے بجا رہی تھیں کہ رقاصہ لڑکیوں کے لطیف رقص کے ساتھ مل کر وہ تھکے ہوئے دماغ پر خوش آیند غنودگی طاری کر سکیں۔ خوشبوؤں اور روشنیوں میں کھوئے ہوئے نشاط پر اس تیسرے تختے میں ہیبت سے رنگا ہوا ایک سکون مسلط تھا جس نے ہر قسم کے تجاوز و فراغت کو عنان گیر۔ اور تمام حرکات اور آوازوں کو منضبط کر رکھا تھا۔ پروہت کے نزدیک عشرت کا یہی تصوّر تھا جو تہوار کی رات میں ایک نیک فرعون کے شایانِ شان قرار دیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی ضعیف پیشانی پر اطمینان و تشفی لئے اس اقتناع آمیز طرب میں دلجمعی سے بیٹھا تھا۔

لیکن نوجوان فرعون بے قرار نظر آ رہا تھا۔

اس کی آنکھوں میں ایک نکان تھی۔ ایک بے کلی۔ جسے تکلیف کی یہ محتاط فضا گھٹانے کے بجائے بڑھاتی چلی جا رہی تھی۔ حرکات میں ایک اکتاہٹ، ایک دل برداشتگی، ماحول کی نوعیت سے سیری۔ اس سارے ماحول میں جو تال مضمر تھی۔ اس سے بے آہنگی۔ وہ بیٹھا ہوا تھا جیسے ایک تلخی کے امتلا میں۔ صرف ادائے فرض کی تسکین کے سہارے۔ اس لئے کہ پروہت وہاں موجود تھا۔ جس نے اس کی طبع آزاد کو ہمیشہ آئین پرستی کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی تھی۔ جس کے نزدیک تربیت کا لب لباب ناجائز جذبات کا انسداد تھا۔ اور جس کی خشک دامانی کے لئے وہ تمام جذبات ناجائز تھے جو فرعون کی مقررہ مذہبی و معاشرتی فرائض سے تعلق نہ رکھتے تھے یعنی جس میں اس کے فرعونی جلال و جبروت میں کوئی عام انسانی خصوصیت جھلک رکھنے کا احتمال کیا جا سکتا تھا۔

وہ بیٹھا ہوا تھا۔ انبجاج کی چبھن سینے میں دبائے۔ اس منضبط عشرت کا صدمہ سینے اور اپنے کشیدہ دل میں پروہت اور رواج کی طرف سے ایک دود آمیز شکوہ لئے۔ دیوی لبسطہ کے تہوار کی یہ آخری ہنگامہ پرور رات جس کی ریل پیل کا شور باہر اور ایوانِ نشاط کے نچلے تختوں سے ایک مدھم گونج بن کر اس تک پہنچ رہا تھا۔ اسے عجیب طرح متاثر کر رہی تھی۔ ایک انوکھی تشنگی تھی جس نے دل سے زبان تک اس کے سینے اور حلق کو خشک کر رکھا تھا۔ شراب میں اس پیاس کے لئے تسکین نہ تھی۔ وہ اتنی گاڑھی معلوم ہوتی تھی کہ حلق جبر سے اس کے لئے کھلتا تھا۔ اس کی بے قرار جوانی کی بڑھی ہوئی حرارت کسی اور تسکین کی تشنہ تھی۔ اس تسکین سے بہت مختلف جو بربط کے

ہلکے ہلکے ہلتے ہوئے تاروں اور رقاصوں کے لطافت سے اُٹھتے ہوئے قدموں میں تھی اور جو اس شبستان کے منضبط و ترتیب اور تہذیب و شائستگی کی جلا میں نظر آ رہی تھی۔ کچھ زیادہ تند، وحشیانہ، خلافِ معمول۔ اپنی نوع میں اس سب سے مختلف جس نے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا۔ کچھ اس سے ہمنوا جو اژدہام کے شور و غل کی مدھم گونج میں تھا۔ لیکن زیادہ بلند، زیادہ شدید، زیادہ بے تکلف، جو اس کی لطف اندوزی کے لئے زیادہ واضح جو وہاں نہ تھا۔ جو گلیوں میں تھا۔ اژدہام کے ان وارفتہ مخلوط ناچوں میں جہاں لباس جذبہ کی فراوانی میں حائل ہونے سے معذور تھا۔ جہاں کی فضا میں صرف بدن سے نکلے ہوئے پسینے کی بُو تھی۔ جہاں جسموں کا باہمی مَس تھا، جہاں شانے بھڑ سکتے تھے۔ جہاں سینہ ہر طرف سے گوشت پوست کے گرم دباؤ میں دب سکتا تھا۔

وِیڈی لبط کے تہوار کی اس آخری ہنگامہ خیز رات کا رنگ رس جو اپنی فراوانی اور بے عنانی میں بے خودی و مستی کا ایک ابلتا ہوا سمندر تھا، اس کے نوجوان خون پر اپنا افسوں پھونک کر اس کو پکار رہا تھا۔ لیکن اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ اپنی روح میں سے اٹھتی ہوئی لبیک کو دبائے چپ چاپ بیٹھا رہے۔ شفقتِ پدری سے بچپن میں محروم ہو جانے کے بعد پروہت نے اسے یوں ہی تربیت دی تھی خیال سے اپنے آپ کو بچانے کی تربیت۔ نفس کی ہر پیداوار کو دیکھے بھالے بغیر خود کچل ڈالنے کی تربیت۔ اور اس نے ہمیشہ پروہت کے کہے پر عمل کرنے اور اپنے نفس کو اپنا سب سے عیار دشمن سمجھنے کی مخلصانہ کوشش کی تھی لیکن آج کی رات ہیں۔ تہوار کی اس ولولہ انگیز رات میں جب ہر طرف نفس ہی کی برات چڑھی ہوئی نظر آ رہی تھی، وہ پروہت کے سکون اور برگشتگی اور اپنے نفس سے ایک حجاب آمیز موانست محسوس کر رہا تھا۔ ایک موانست جو اس رات میں حیرت ناک رفتار سے ترقی کر رہی تھی۔ جو اس کی تمام ہستی سے ساز باز کرتی ہوئی اس پر چھائی چلی جا رہی تھی۔ اور جس کے وزدیدہ تموج کی سرکشی سے اور اپنے ایک دوسرے آپ کی مغلوبیت سے اس کی فطرت کا زیادہ گہرا عمق ایک پوشیدہ مسرت حاصل کر رہا تھا۔

اور جذبات کی اس درہمی برہمی میں ایک نیا اور قوی ارمان اس کے اندر جنم لے رہا تھا۔ جو شاید اپنی نوزائیدگی کی وجہ سے شاید اجنبیت کے باعث اسے بے حد محبوب معلوم ہو رہا تھا۔ جس کی قوت کا اصرار جس کی سرکشی کا دعویٰ باوجود درد آمیز ہونے کے ایک عجیب طرح سرور انگیز تھا۔ جس کی سنسناہٹ وہ چاہتا تھا۔ اس کے خون میں فروزاں تر ہوتی چلی جائے۔ اور جس کی لہریں اسے کسی زیادہ موافق ماحول میں چھوڑ آئیں۔

وہ آنکھیں بند کئے اپنے آپ سے خود مغلوب ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہ بربطوں کے یک لخت تھم جانے سے وہ چونک پڑا۔ اس نے اپنی گرم گرم آنکھوں سے پلکیں ذرا سی اُٹھائیں۔ پچھلا رقص ختم ہو چکا تھا۔ اور ایک نئی رقاصہ اکیلی رقص کرنے کو محفل میں آ چکی تھی۔ خاموشی کی علت نے آہستہ سے اس کے شعور سے مس کیا۔ اور اس نے آنکھیں پھر بند کر لیں۔ لیکن اس میں ایک دامنگیری اس کے ارمان کی حرکت کی تانی ایک دعوت تھی۔ اس کی پلکیں رفتہ رفتہ زیادہ اُٹھتی چلی گئیں۔

روشنی سے دہکتے ہوئے فرش پر ایک نئی رقاصہ جو لبنان کے تپتے ہوئے صحراؤں میں سے لائی گئی تھی، ایک باریک سفید نقاب میں سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی ساکت کھڑی تھی۔ یوں جیسے کسی سنگ تراش کی گرمیٔ جنوں ایک سفید جسامت میں حسنِ متناسب کا خواب جمیل دیکھ رہی ہو۔ تفصیل کھوئی ہوئی۔ لیکن خاکہ کی صفائی اور محتاط اور احتیاط میں کامل گولائیاں عشرت نظر اپنے جمود میں بھی سجیلی حرکات کا تصور ابھارتی ہوئی پیر کا انگوٹھا زمین پر گھٹنے میں خم ایک بازو بدن سے چپٹا ہوا۔ دوسرا جدا جس کے فاصلے اور انگلیوں کے خم میں ایک حرکت تھمی ہوئی۔ گردن میں آگاہی۔ بدن کے تناؤ میں ایک تامل جیسے اپنی بے تکلفی میں شباب کی للکار سُکڑ کر تھم گئی ہو۔

ایک خادم نے جھک کر لمبے نقاب کا دامن زمین پر سے اٹھانا شروع کیا۔ سازوں کے لمبے لمبے تار دھڑکنے لگے۔ ان کی دھڑکن

بن خیال کی مخلوق نے حواس کی دنیا میں جنم لینا شروع کر دیا۔ سحر اگے آفتاب میں پلا ہوا گداز سانولا جسم، تکمیل کے سانچے میں ڈھلے ہوئے اعصاب، جن میں سے زندگی کی گرمی پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھی، سرخ اور سبز منکوں کی ایک مختصر جھالر کے مس سے لرزشیں کھاتی ہوئی، گدرایا ہوا بدن خط و خال پر ایک بے تکلفی۔ ایک نا تراشیدگی۔ غیر واضح ٹھوڑی۔ ہونٹ موٹے، نچلا ہونٹ درمیان سے کسی قدر دبا ہوا۔ اور اوپر کا ہونٹ ابھرا ابھرا۔ سرخ خون سے پُر اور نمناک۔ ناک چھوٹی اور کسی قدر پھیلی ہوئی۔ نتھنے نازک جو کچھ سونگھتے اور کھنچتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ آنکھیں لمبی اور سیاہ جن میں ایک سحر رقیق ہو کر کبھی پلکوں کی چلمن میں چھپتا اور کبھی باہر جھانکتا تھا۔ تنگ پیشانی اور سر پر پھولے ہوئے گھونگھر بالے بال۔

فرعون اسے تک رہا تھا۔ اور اپنی پلکیں پھر گرانا نہ چاہتا تھا۔ وہ اسے عجیب طرح ایک نئی اور تازہ شے معلوم ہو رہی تھی۔ اپنے نوزائیدہ ارمان کی طرح نئی۔ اور تازہ و رامرار سے بھری ہوئی اس ماحول میں جہاں سب کچھ چبا نگلا اور جا نچا پرکھا ہوا تھا ایک مختلف شے اس کے ارمان کی طرح مختلف جو باوجود تخالف کے بے محل نہ تھی۔ جس کا تضاد منظر کو ایک انوکھی طرح نیا بنا رہا تھا۔ جس میں اس وسیع اور رنگین جھپتی ہوئی چار دیواری سے باہر کا پیغام تھا۔ وہاں کا پیغام جہاں سے نعروں اور چیخوں اور قہقہوں اور گیتوں کی گرج آ رہی تھی۔ جہاں اجڈ پنڈلیاں اور زندگی سے بھری ہوئی رانیں متحرک رہی تھیں۔

فرعون کانوں میں سنسناہٹ لئے اس کا ناچ دیکھنے لگا۔ جو اس کے بھرے بھرے اور لچکتے ہوئے بازوؤں کی بیباک حرکات سے شروع ہوا تھا۔ اور جس کا زہر اندر ہی اندر اس کے دھڑ میں لہریں مارتا ہوا دانہ نیچے کو بڑھ رہا اور اس کے تندرست و توانا اعضا میں تند اور البیلی حرکات پیدا کرتا جا رہا تھا۔ حرکات جس میں نہ فرعون کا پاس ادب تھا اور نہ پروہت کا حجاب۔ حرکات جن کا منبع شباب کا جوش مارتا ہوا اور کف اڑاتا ہوا چشمہ تھا۔

فرعون کا انہماک بڑھ رہا تھا۔ رقص جیسے اس پہ کوئی افسوں پھونکتا جاتا۔ اور اس پہ ایک سنسناتی ہوئی معطر غفلت طاری کر رہا تھا ایک غفلت جو اندر سے بیدار اور حیات افروز تھی۔ جس میں وہ سب خیالات کروٹیں لے کر آنکھیں کھول رہے تھے۔ جنھیں اچانک پیدا ہونے پر پروہت کی ہدایت کے مطابق اس نے ہمیشہ کچل ڈالا۔ اور مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ وہ سینے کی گہرائیوں سے زندہ ہو کر اٹھ رہے اور اس کے نوزائیدہ ارمان کے اندر سما سما کر اس ناچ پر جھوم جھوم کر وجد کر رہے تھے۔ اور ان کے وجد میں رقاصہ مانوس معلوم ہوتی جا رہی تھی۔ ایک گریزاں لطافت جو ہمیشہ ٹکڑوں میں اس کے پاس آئی تھی۔ جب وہ دیوی کا چولا بدل رہا تھا۔ تو اسی کی پنڈلی کی ایک جھلک نے اسے سراسیمہ کر دیا تھا۔ جب وہ دیوی کی برہنہ مورت پر لیپ مل رہا تھا تو اس کی ہتھیلی اسی کے مس سے لرز کر تھم گئی تھی۔ جب اس کا قدر ازدحام میں سے گزر رہا تھا تو یہی تھی جس نے بالوں میں سے کہیں اپنا شانہ اور کہیں اپنی پیٹھ کا وقار ننگا کر رکھا تھا۔ جس کی آنکھیں نگاہیں چار ہونے کے بعد منڈیر کے پیچھے چھپ گئی تھیں۔ جس کی آواز نے اس ہجوم کے شور میں سے اس تک پہنچنے کا راستہ بنا لیا تھا۔ جو کہیں اس کے آگے آگے بھاگ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اور کہیں اس کے گذر چکنے کے بعد پیچھے سے اسے پکارتی رہ گئی تھی۔

اب وہ اکٹھی ہو کر کھڑی ناچ رہی تھی۔ ایک ناچ جس کا خروش لمحہ بہ لمحہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جو جسم میں رچ چکنے کے بعد اسے چال میں متحرک کرنے لگا تھا۔ لمبے لمبے قدموں کی البیلی چال میں جس کا تعلق گھٹنوں سے زیادہ کولھوں سے تھا۔ جس میں خلوت کی بیباکی تھی اور جلوت کا احتراز جس میں رزم کی یورش تھی اور بزم کا پس و پیش۔ جس میں سرور انشام قوت کے اچانک دھاوے تھے اور رعنا ضعف کی پسپائیاں۔ نفس کے دروازوں پہ بیباک دستک بھی اور دبی ہوئی آہیں بھی۔

فرعون جلتی ہوئی آنکھوں سے اس گدرائے ہوئے جسم کی حرکات کو دیکھ رہا تھا جس کے مانوس اعضا اس وقت یکجا ہو کر ایک یقینی اور ناقابل

فہم ہستی بن گئے تھے۔ اور اپنی تکمیل سے ایک تسکین پیدا کرنے کی بجائے ایک نئے اور پُراسرار طریق پر اُسے نبرد آزما ہونے کو للکار رہے تھے۔ اس نے رقص پر کھڑے ہو کر کسی حریف کے سامنے اپنی قوت کی سیاست کو ایسا متامل محسوس نہ کیا تھا۔ کسی ہم مقابل کے اسلحہ اور فن نبرد آزمائی کو سمجھنے میں اتنا عاجز نہ رہا تھا لیکن عجز اور تامل کا یہ احساس اسے زیادہ اُکسا رہا تھا۔ اس میں سنسنیوں کے نئے ریلے پیدا کر رہا تھا۔ غلبہ کا منہ زور ارمان اس کی ساری ہستی میں ایک زلزلہ سا لا رہا تھا اور پکار پکار کر اسے کہہ رہا تھا کہ اس حصول میں وہ سب کچھ ہے، جس سے محرومی مرد کی زندگی کو ماتمی بنا سکتی ہے۔ زندگی کا وہ کامل سرور جو ہمیشہ اس کے ہاتھوں سے پھسلتا رہا ہے، جو اس کے بے پناہ ارمان میں دھڑک رہا ہے۔ اس سرکش جسم کو مغلوب کرنے میں ہے۔ اس میں اپنی سخت اُنگلیوں کے فشار سے نیل ڈال دینے میں۔ اسے اپنے آغوش کی حدت سے بے سدھ کر دینے میں اور اس کے بھرے بھرے سانولے بازوؤں میں اپنے سفید دانت گاڑ دینے میں۔

پروہت جبیں جبیں سے اس کی بے کلی کو دیکھ رہا تھا لیکن اپنے میں جرأت نہ پاتا تھا کہ اس رقص کے طغیان کو روک کر فرعون کی سُرخ جلتی ہوئی آنکھوں سے آنکھیں چار کر سکے وہ اُٹھا اور اپنے سلگتے ہوئے غصے کے شعلوں کو دبائے پروہتوں سمیت خاموشی سے رخصت ہو گیا۔

اور رقاصہ کا رقص اپنی تندی اور تعصب اور وحشیانہ خود فراموشی میں ترقی کرتا چلا گیا۔ صحرا کی وہ ارواح خبیثہ جن کی ترغیبات کی مداہنیں بھدے مجسمہ میں محفوظ تھیں، اس کے رقص میں انگڑائیاں لے کر جاگ رہی تھیں اور اس کے انداز میں اپنا شیطانی افسون پوری پوری وضاحت سے پھونک رہی تھیں اس کی آنکھوں میں اس کی خاص نظریں دہک رہی تھیں۔ اور اس کے نتھنوں سے اس کی سانس کی گرم بھاپ نکل رہی تھی۔

فرعون کے اندر خواہشوں کی موجیں عظمت اور بلندی اور غضب ناکی میں بے پناہ بن گئی تھیں۔ اس کی کمر اور اس کی رانوں میں سوئیوں کی طرح چبھتی ہوئی گرم لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اس کی تمام ہستی غلبہ کے ایک پھونک ڈالنے والے ارمان سے بھڑک رہی تھی۔ اس کا فرعونانہ جلال نرم گوشت اور لچکتی ہڈیوں کی اس کمزور ہستی کو جو اپنی ذلیل حرکات اور لبیلے انداز میں اجیت بن بن کر تھرک رہی تھی، اس سے زیادہ سرکش نہ دیکھ سکتا تھا۔ اس کے اعضا نے چیتے کی گھات کا انداز اختیار کر لیا تھا یکلخت وہ ایک شیر کی سُرعت سے لپکا۔ اس کے بازوؤں نے اژدھے کا بل ڈال دیا اور ایک زہریلا ناگ بن کر انتقام کی پوری خونخواری میں رقاصہ کو ہونٹوں پر ڈسنے لگا۔ تمام ستاروں کے تار شدید دھڑکنوں کے ساتھ ٹوٹ کر رہ گئے۔ اور ذرا دیر کو ایک کانپتا ہوا سکوت طاری ہو گیا۔

اور پھر ایوان نشاط کا تیسرا تختہ ہاؤ ہو کے ایک فلک شگاف غل سے گونج اُٹھا جس میں خموں کے منہ کھل گئے۔ قدحوں میں سے شراب اُبل اُبل کر گرنے لگی مینا فرش پر لڑھکتے ہوئے دکھائی دینے لگے، رقاصہ لڑکیوں کی کلائیوں پر پیچ پڑ گئے اور ساقنوں کے دامن تار تار ہو گئے۔

لیکن یہ رنگ رس ابھی پورے طور پر بے قابو نہ ہونے پایا تھا کہ یکلخت کانسے کا ایک گھڑیال بجنا شروع ہوا۔ اور فرعون کے تخت کے پیچھے ایک منقش دروازہ رسم کے تکلف و اہتمام سے کھول دیا گیا۔ چونکی ہوئی نگاہیں اس سمت کو اُٹھیں تو دیکھا کہ غضب آلود پروہت ممی کی وضع پر تراشی ہوئی دیوتا آمیریس کی لکڑی کی مورتی خدام کے کندھوں پر اُٹھوا کر ایوانِ نشاط میں داخل ہو رہا ہے۔

غل گھٹنے لگا اور گھٹتے گھٹتے نابود ہو کر رہ گیا۔ قاتل آمیز سکوت میں جب خدام ممی کو اُٹھائے اُٹھائے نوجوان فرعون کے مہمانوں کے سامنے چپ چاپ تھم تھم کر گھومنے لگے تو پروہت پکار پکار کر کہنے لگا یہ انجام ہستی کو دیکھو اور ان ترغیبات سے احتراز کرو جو تمہارے حواس کو فریب پہ لا کر تمہیں بھلا دیتی ہیں کہ موت کا سرد ہاتھ ایک روز حیات ناپائیدار کی آنکھیں بند کر دے گا۔

پروہت کی آواز جیسے اہرام کے اندر سے گونج گونج کر نکل رہی اور ہڈیوں میں نفوذ کرتی چلی جا رہی تھی۔ مورتی کے سامنے آتے

ہی لرزہ براندام مہمانوں کے رنگ پیلے پڑ گئے اور حلق سوکھ کر رہ گئے۔ ہیبت نے دلوں کو دہلا دیا اور عبرت آفریں خاموشی میں نظروں کے اندر سے استغفار کی بُو پھوٹنے لگی۔

فرعون اپنی بوجھل اور عطر پاش خود فراموشی سے چونک اُٹھا تھا۔ رقاصہ اس کے بازو پہ بے سدھ پڑی تھی۔ وہ اپنے تمام جسم میں ایک پیاسا اور مضروب سا لئے ساکت تھا۔ پروہت کے الفاظ کی گونج اس کے کانوں میں سائیں سائیں کر رہی تھی۔ اور اس گونج میں ایک ہیبت کا سایہ اس کے دل پہ اُترتا آ رہا اور گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

اس کی نظر مورتی پہ پڑی۔ جسے خدام کے کندھے احترام کی آہستگی اور خاموشی میں اُٹھائے لئے آ رہے تھے۔ اس نے خوف اور پیش سے نظریں اُٹھائیں۔ اور آسیرس کی مورتی کو دیکھنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ آسیرس کے ساکت و جامد چہرے میں اس کے اپنے خط و خال اُبھرتے چلے آ رہے ہیں زندگی کی روانی سے منقطع۔ موت کی چیرہ دستی سے مغلوب۔ انجام ہستی کے شدید احساس نے یک لخت اس کے دل کو مٹھی میں لے کر بھینچ ڈالا۔ ایسے چہرے اور اس بے بسی کے ساتھ زندگی کی رنگینیوں اور دلآویزیوں کو الوداع! مقبرے کے دروازے کا خاموش اور مہیب اور درد انگیز راستہ! وہ راستہ جو صرف جاتا ہے اور واپس نہیں آتا۔

اچانک اس کے بازوؤں میں پڑی ہوئی رقاصہ اپنی مدہوش غفلت میں کراہی اور فرعون کی متائل نگاہیں اس کے چہرے پہ جم گئیں۔ اس کے نمناک ہونٹ ایک شیریں آرزو میں کھلے ہوئے تھے۔ اس کے نازک نتھنوں سے ارمانوں کے لمبے لمبے اور رُکتے ہوئے سانس نکل رہے تھے۔ اس کی پھیلی ہوئی پتلیوں میں تشنہ تمنائیں گم تھیں۔ وہ سب کچھ تھا جو یہ مختصر اور عارضی اور اپنی جگہ گاموں میں بھاگتی ہوئی دُنیا اپنے اندر رکھتی ہے۔ اور اس کا خون بجلیوں کی طرح اس کے دماغ میں تڑپ تڑپ کر پوچھنے لگا۔ اس کو تیاگنا، اس سے منہ موڑ لینا! اس سر بستہ مسرت کے دروازے پر سے ترستی ہوئی روح لے کر لوٹ جانا! کیوں؟ آخر کیوں؟ اس لئے کہ اس زندگی کے آگے آخرت کا سفر درپیش ہے کسی روز شاید کل۔ شاید اسی وقت۔ اس لئے کہ جب روح اس سفر میں ہو گی تو یہ جسم اس ممی سے مشابہ ہو جائے گا خشک اور سرد اور بے رنگ اور بے حس۔ ان تمام شیریں ارمانوں سے محروم جو رگوں کے تاروں سے نغمے نکالتے اور اس کے ساتھ لہک کر گاتے ہیں۔ صرف ایک تودہ۔ ایک لوتھڑا۔ ایک ڈھیر۔ جس کی رعنائیاں اور رونقیں۔ جس کی گرمیاں اور بجلیاں جس کے میلان اور ارمان اس نورانی عالم کا تمام حاصل۔ اس حسین دُنیا کی ساری متاعِ عزیز یہیں فنا ہو کر رہ جائے گی۔

اس نے بے قرار ہو کر پروہت پہ نظر ڈالی جس کی ملامت سے اُبلتی ہوئی نظریں اپنے اقتدار کی جراحت اور اپنی بے بسی کے ضعف میں گلا پھاڑ پھاڑ کر اسے فریبی اور دغاباز اور ملعون و مردود قرار دے رہی تھیں۔ مایوسی اور برافروختگی کے شدید اعلان میں وہ نوجوان فرعون کو اپنے تمام وقار اور جلال سے عجیب طرح خالی نظر آ رہا تھا۔ اپنے زہد و اتقا میں خشک اور کم ظرف۔ اپنی ناتجربہ کاری میں ادنیٰ و جاہل۔ جذبات کی بلند آہنگ نمائش سے تکلف و تقدس کی عبا اس کے شانوں پہ سے گر ڈی تھی اور وہ اپنی عریانی میں ایک بازاری انسان بن کر نظر آ رہا تھا۔ جس کی گردن کی رگیں پھول سکتیں اور جس کا منہ غیظ و غضب سے کف آلود ہو سکتا تھا جس میں نہ زندگی کی پیچیدگی کی سمجھ تھی اور نہ موت کے اسرار کی فہم۔ جو محض ایک پیشہ ور تھا اور اپنے پیشہ کے فروغ کے لئے دلوں میں اوہام و وساوس پیدا کر رہا تھا۔

نوجوان فرعون پروہت کا چہرہ دیکھ رہا تھا اور اپنے سرکش اور باغی نفس کو اس کی گرفت سے آزاد محسوس کر رہا تھا۔ اس باغی نفس کو جو رقاصہ کے نرم جسم سے حرارت اور اس کے کانپتے ہوئے تنفس سے نشہ پا رہا اور اپنے طغیان میں مغموم سے جی بھر و آزمانے کا بل حاصل کرتا جا رہا تھا۔

ایک نئی سنسنی نے اسے بے خود کر دیا۔ اس نے یکلخت اپنا ہاتھ اوپر اُٹھایا اور نفس کی سرور انگیز فیروز مندی میں پکار کر بولا: "دیوتا آسیرس کی اس مورتی کو دیکھو اور اس کے پیغام کو سمجھو کہ ہستی انسان کا انجام کیا ہے۔ موت بھاگی آ رہی ہے کہ تمھیں مغلوب کر لے۔ اس مورتی کی طرح تمھیں بے حس بنا دے۔ تمھارے حواس اور بیرونی رعنائیوں کے رشتے کاٹ ڈالے۔ اس سنجوگ سے تمھاری روح میں جو نہانی لرزشیں پیدا ہوتی ہیں، انھیں ہمیشہ کو نھما دے۔ عالم دوبارہ نہیں۔ زندگی مختصر ہے اور اگلا پل غیر یقینی۔ اس لئے ان تمام لذتوں سے اپنے سینے بھر لو۔ جو اس حیاتِ ناپائیدار کا حاصل ہیں۔ اور جو حواس کے دروازے بند ہو جانے پر پھر تمھیں نصیب نہ ہو سکیں گی۔"

ایوانِ نشاط کے ضبط و تاثل میں سے نفس کی تائید کا ایک پُر خروش غل اُٹھا جس میں پروہت کا احتجاج ڈوب کر رہ گیا۔

اور اس کے بعد فراعنۂ مصر کے محل کا دستور بن گیا کہ ضیافتوں کے بعد جب مہمان میگساری کی رنگ رلیوں سے لطف اندوز ہونے لگتے تو ایوانِ نشاط کا مہتمم انھیں عشرت کے انوکھے اور نت نئے احساسات سے لطف اندوزی کی دعوت دینے کو ممی کی وضع پر تراشی ہوئی دیوتا آسیرس کی لکڑی کی مورت خدام کے کندھوں پر اٹھوا کر ایوانِ نشاط میں داخل ہوتا اور اس وقت جبکہ خدام ممی کو اُٹھائے مخمور فرعون اور اس کے بدمست مہمانوں میں گھم گھم کر گھوم رہے ہوتے تو پکار پکار کر کہتا "انجامِ ہستی کو سمجھو اور ان تمام لذتوں سے اپنے سینے بھر لو جو اس حیاتِ ناپائیدار کا حاصل ہیں۔ اور جو حواس کے دروازے بند ہونے کے بعد پھر نصیب نہ ہو سکیں گی۔"

عابد علی عابد

لیلیٰ

ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخ روشنی خیموں کے اس وسیع سلسلہ کو جو ریگستان کے چمکتے ہوئے ذروں پر دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ قرمزی رنگ میں رنگتی ہوئی دو تنومند نوجوانوں کے صحت مند چہروں پر پڑ رہی تھی جو اپنی بندوقوں پر سہارا لیئے باتوں میں مصروف تھے۔

ان میں سے ایک جس کا لباس اس کے جسم پر نہایت ناموزوں اور بھدا معلوم ہوتا تھا، اپنی داڑھی کے چند بالوں پر ہاتھ پھیر کر بولا "یہ غیر معنی احتیاط کچھ معنی رکھتی ہے۔" پھر گویا اپنی منطقی کارروائی کے اس محیر العقول نتیجہ پر پہنچنے کی خوشی میں اپنی تنگ چھاتی کو اُبھار کر جس سے اس کے کوٹ کے دو تین بٹن ٹوٹ جانے کا اندیشہ لاحق ہوتا تھا، اپنے فقرے کو اہمیت دیتے ہوئے کہنے لگا "ہاں ضرور کچھ معنی رکھتی ہے۔"

دُوسرے نے جس کی لانبی لانبی گھنی مونچھیں اور مستقل مزاجی کا ایک خاص انداز اس کی بیوقوفانہ شجاعت کے ثبوت دینے میں ایک نمایاں حصّہ لے رہا تھا کچھ جواب نہیں دیا۔ پہلا شخص اس کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھتا رہا، مگر اس نے زیرلب صرف اس فقرے کے کہنے پر اکتفا کیا "ہاں کچھ نہ کچھ بات تو ضرور ہوگی۔"

دُوسرے نے اس حوصلہ شکن جواب سے کچھ شرمندہ سا ہو کر ایک نیم بلند آواز میں گویا اپنے آپ سے خطاب کرتے ہوئے کہا "بھلا اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

پھر ارادتاً آواز کو بلند کر کے اپنی خودداری کی شکست پر منفعل سا ہو کر دوسرے شخص سے مخاطب ہوا "حیات خاں تم تو کچھ جانتے ہی ہو گے۔" مخاطب نے جو اسی بات کا خواہش مند تھا، اپنی معلومات کی وسعت پر یہ خراج تحسین وصول کر کے اپنی آنکھوں میں رازداری کی ایک مبہم سی چمک مشتعل کی۔ پھر ایک تفاخرانہ لہجہ میں جواب دیا "میں کیا نہیں جانتا؟"

سوال کرنے والے نے حیات خاں کے چہرے کی طرف جس پر کئی گہرے زخموں کے نشان پتہ دیتے تھے، کہ وہ جنگ کے ہیبتناک مناظر کے درمیان اپنی عمر کا ایک معتدبہ حصّہ گزار چکا ہے۔ اور جس کے کرخت نقش و نگار تکالیف کی برداشت کا ایک متحرک ثبوت تھے غور سے دیکھا۔

"پھر کچھ کہو تو۔"

"مرتضےٰ خاں بڑوں کے معاملے میں چھوٹے دخل نہیں دیا کرتے۔"

یہ فقرہ احساس برتری کی اس مخصوص حالت میں کہا گیا تھا۔ گویا مرتضےٰ خاں جیسے صادق دوست کے ذرا سے اکسانے پر وہ اپنے راز کو فاش کر دیگا۔

مرتضےٰ خاں نے مصنوعی اشتیاق سے لبریز آواز میں سوال کیا۔ "کچھ اتا پتا تو دو۔"

حیات خاں نے اپنی ظاہری معلومات کو ایک معنی خیز مسکراہٹ میں تبدیل کر کے دبی آواز سے پوچھا۔ "تم کیا اندازہ لگاتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں۔ یہی تو وجہ ہے کہ تم ابھی تک سپاہی کے درجہ سے نہیں بڑھے مرد خدا فوج میں ترقی کرنے کے لئے مضبوط بازوؤں کے علاوہ عقل کی بھی ضرورت ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے دائیں بازوؤں کے مچھلیوں کی طرف شادماں غرور سے دیکھا اس کا چہرہ خوشی کے ایک ناگہاں سیلاب سے تمتما اٹھا۔ اُسے اس قدر خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ جتنی ایک جرنیل کو گھمسان لڑائی جیتنے پر بھی نہیں ہو سکتی۔ مرتضےٰ خاں نے ایک ادائے تسلیم سے ان نشانوں کو توفق کا ایک اعلیٰ ترین ثبوت سمجھتے ہوئے ان کی طرف رقابت کی ایسی حریص نگاہوں سے دیکھا کہ حیات خاں کے سمند غرور کو مہمیز ہو گئی۔ اس نے اپنی کارروائی کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے تہیہ کر لیا۔ کہ اپنے بچپن کے اس رفیق کو جس سے وہ بلند رتبہ ہونے کے باوجود برابر کا برتاؤ کرتا تھا اپنی معلومات سے فائدہ پہنچا کر رہے گا اس نے اپنی آواز کو اور زیادہ دبا کے اور اپنی آنکھوں میں ایک مبہم اور تاریک جذبہ مشتعل کر کے مرتضےٰ خاں کے کان میں کہا۔ "دیکھتے نہیں ہمارا بہادر سردار کتنا سہما ہوا معلوم ہوتا ہے۔ وہ کبھی موقعہ پر کبھی نہیں گھبرایا۔ مگر ان دنوں اس کے انداز سے بھی پریشانی برستی ہے۔ وہ ذرا سی آہٹ پر چوکنا ہو جاتا ہے اور اپنی تلوار کے قبضے پر ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ رات کو خاص طور پر دو سپاہی اس کے خیمے کے آگے متعین کئے جاتے ہیں اور اس وقت دن کو بھی ہم دو گھنٹے سے اس کے خیمے کے آگے کھڑے گپیں ہانک رہے ہیں۔ ان باتوں سے صرف ایک نتیجہ نکلتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ گویا زیادہ کہنا خلاف مصلحت سمجھتا تھا۔

"کیا نتیجہ نکلتا ہے؟"

حیات خاں نے چاروں طرف دیکھا اور دل کو پورا پورا اطمینان دلا کر کہ آس پاس کوئی نہیں ہے۔ اپنے رفیق کی حماقت پر دل ہی دل میں لعنتیں بھیجتے ہوئے ناراضگی سے کہا۔ "کہ چپ رہو کہیں کوئی سن لے گا تو کھال اُدھڑوا دی جائے گی۔"

مرتضےٰ خاں نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔ اور حیات خاں کی سپاہی منش خصلتوں کو بھڑکانے کے لئے کہا۔ "تم کسی بات سے ڈرتے ہو؟"

حیات خاں نے تیز ہو کر جواب دیا۔ "اچھا تو لو سنو۔ ہمارے سردار کو جان کا خطرہ ہے۔"

"جان کا خطرہ" مرتضےٰ خاں کو اس بات کی امید نہ تھی اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں آنے لگیں اس کی اپنی جان کی نسبت ایسی پیشینگوئی کی جاتی تو وہ پروا بھی نہ کرتا، مگر ان کا سردار ہر دلعزیز سردار جس کے لئے وہ اپنے خون کا آخری قطرہ بہانے کے لئے تیار تھا، اس کی نسبت ایسی خبر سن کر وہ بھونچکا سا ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے دل میں ایک خوفناک مگر مستقل ارادے کے خاکے کو محسوس کیا۔ اور اسی جذبہ کو نشوونما پاتے دیکھ کر اس کا ذہن خوشی سے معمور ہو گیا۔ اس نے اپنے سپاہیانہ انداز میں ایسے سکون سے جس کے بین السطور میں دفناک جذبات کی شورش متحرک تھی۔ پوچھا۔ "اُسے کس طرف سے خطرہ ہے؟"

"ایک عورت کی طرف سے۔"

مرتضےٰ خاں نے صورت حال کو سمجھنے کے لئے اپنے دماغ کو صرف کاوش کر کے ایک نتیجہ پر پہنچتے ہوئے ٹوٹے پھوٹے جملوں میں حقیقت کے سمجھنے کا اظہار کیا۔

"جیمیں ہر آنے جانے والی عورت کی تلاشی لی جاتی تھی۔ ہر ایک طوائف کی نسبت اطمینان کیا جاتا تھا۔"

"ہاں"

مرتضےٰ خاں نے اپنے سردار کے خیمہ کی طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ اندر سے بلند قہقہوں کی آواز آ رہی تھی کبھی کبھی آوارہ ہوا اپنے دوش پر شراب کی ناخوشگوار اور تیز بو کو بھی لے آتی۔ جس سے ثابت ہوتا تھا کہ اندر محفل نشاط گرم ہے۔ اب شام ہو چکی تھی۔ پہاڑی ریگستان کی خوش نما اور شاعرانہ شام جو ہر ایک شے پر کسی مہیب اور مافوق الفطرت پرندے کے سیاہ آبنوسی پروں کی طرح چھا جاتی ہے۔ تاریکی لمحہ بہ لمحہ گہری ہو رہی تھی خیموں میں چراغ روشن ہونے لگے۔ سپاہی جو گرمی کے مارے خیموں میں ایک عارضی اور غیر مطمئن پناہ تلاش کر رہے تھے۔ اب باہر نکل آئے۔ جنگل میں منگل ہو گیا۔ مرتضےٰ خاں اپنے خیالات میں مستغرق تھا کہ اُسے اپنے قریب کئی قدموں کی چاپ سنائی دی اُس نے آنکھیں اُٹھا کر دیکھا تو چند آدمی ایک خوشنما فینس کو اُٹھائے آ رہے تھے۔ جس کا وجود وہاں حیرت انگیز تھا۔ فینس کے آگے چند کم عمر چھوکرے شمعیں ہاتھوں میں لئے ہوئے سبک خرامی سے چلے آ رہے تھے۔

دونوں نے پُراشتیاق نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ فینس خیمے کے قریب آکر ٹھیر گئی۔ ایک چھوکرے نے بڑھ کر حیات خاں کو صحیح طور پر افسر سمجھتے ہوئے نہایت سلیس لہجہ میں خطاب کرتے ہوئے کہا "کیا سردار شیر علی کا خیمہ یہی ہے"

"یہی ہے مگر تم کیا چاہتے ہو؟"

چھوکرے نے فینس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ یہاں کی مشہور طوائف لیلےٰ ہیں، انہیں آج سردار صاحب نے پورے آٹھ بجے طلب فرمایا ہے۔"

"اچھا ٹھہرو۔ میں سردار صاحب کو خبر کرتا ہوں۔"

حیات خاں خیمہ کے اندر گیا۔ اور واپس آکر سیدھا فینس کے قریب جاکر بولا "بی صاحبہ آپ کو تکلیف تو ضرور ہو گی۔ مگر حکم اندکم رسمًا میرا فرض ہے کہ میں آپ کی تلاشی لے لوں۔"

پردوں میں سے ایک سُریلی آواز آئی "کیا وجہ؟"

"سردار صاحب کا حکم۔"

"اچھا میں حاضر ہوں"

حیات خاں نے پردے اُٹھائے۔ وہ حقیقت میں ایک خوبصورت عورت تھی۔ بلند و بالا شاہانہ انداز اور حسب دیکھنے والی ایک ہلکے سے لباس میں ملبوس تھی۔ اُس نے ایسی مسحور کن نگاہوں سے حیات خاں کی طرف دیکھا۔ جس طرح صرف ایک عورت ہی مرد کی طرف دیکھ سکتی ہے

"اچھا اپنا کام شروع کیجئے۔"

"میں آپ سے پھر معافی مانگتا ہوں۔ مگر اس کے بغیر چارہ نہیں۔"

اُس نے اپنے مرمریں ہاتھ اپنی گردن پر رکھ کر حیات خاں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اور کہا "معافی مانگنے کی ضرورت نہیں یہ تو آپ کا فرض ہے۔"

حیات خاں کو ڈر تھا کہ وہ اس کی مدافعت کرے گی۔ اس مغلوبیت کی ادا نے اس کی تمام بدظنی کو دور کرنے کے علاوہ اسے مسحور کر لیا۔ اس نے اپنے تجربہ کار ہاتھوں کی چار پانچ جنبشوں سے اس کے لباس کے تمام سلوٹوں کو ٹٹول کر اطمینان کر کے کہا "جائیے مگر مجھے بھول کر نہ جائیے گا۔"

"آپ نے مجھے بڑی تکلیف سے بچایا ہے۔ میں کبھی آپ کو بھول سکتی ہوں؟"

فینس بالکل خیمہ کے قریب پہنچ گئی تھی۔ کہ لیلےٰ نے اپنا سر پردوں میں سے نکال کر حیات خاں کی طرف دیکھا، جس کی حریص نگاہوں سے اس کے چہرے پر ذلت کی سُرخی دوڑ گئی۔ اور تحکمانہ لہجہ میں کہا۔ "حوالدار صاحب میری ایک پیش خدمت پیچھے آرہی ہے اُسے بے روک ٹوک اندر آنے دینا اس کے پاس میری چند ضروری چیزیں ہیں"۔

حوالدار صاحب نے مسکرا کر جواب دیا "مطمئن رہیئے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا جائیگا"۔

"شکریہ"

لیلےٰ کے رسیلے لبوں پر ایک لمحہ کے لئے فتحمندی کا ایک زہریلا تبسّم کھیلنے لگا۔ مگر ذرا ہی اس کا سر مخمل اور ریشم کے خوش نما زرتار پردوں میں چھپ گیا۔ فینس خیمہ میں داخل ہو گئی۔ مگر حیات خاں اسی طرح مخمور نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

۱

نفیس و لطیف پھولوں کے دھوئیں نے خیمہ کی محدود ہوا میں ایک تیز و تند خوشبو کا اضافہ کر دیا تھا۔ بیش قیمت ایرانی فرش پر جس کی ہر سلوٹ عیش کی دراز دستیوں کا پتہ دیتی تھی۔ شراب کے تازہ داغ موجود تھے۔ جابجا ارباب نشاط اپنے اپنے سازندوں کو ساتھ لئے بیٹھی تھیں۔ کوئی اپنی شمعی انگلیوں سے پاندان کھولنے میں مصروف تھی۔ کوئی کسی خوشگوار لطیفہ پر اپنی آواز کے رسیلے پن کو ایک چھوٹے قہقہہ کے لوچ میں ظاہر کرنا چاہتی تھی۔

لیلےٰ بظاہر دوپٹے کے ایک شکن کو درست کرتے ہوئے مگر حقیقت میں اپنے دھڑکتے ہوئے دل کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔

سب نے سر اُٹھا کر فوارہ کی طرف ایک خاص نگاہ ڈالی اور پھر آنکھیں جھکا لیں۔ لیلیٰ نے بکمال غرور بیٹھ کر اپنے پیش خدمت کو ایسے انداز تحکمانہ اور شان رعونت سے آواز دی اور ایسی دھیمی اور رسیلی آواز میں پانی لانے کے لئے حکم دیا۔ کہ طوائفوں نے حقارت آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ لیکن اب لیلیٰ کا بے پناہ اور سحر ساز حسن ایک ایشیائی لمپ کی لطیف روشنی میں اپنی پوری جبروت اور عریانی میں نمایاں ہو رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں رقابت کی چمک اور چہروں پر انفعال کی سُرخی دوڑ گئی۔ لیلیٰ نے اپنی اس بے باک فتح کو دیکھ کر دل میں طمانیت کی ایک گہری سانس لی۔ مگر بظاہر ایک بے پروائی کے انداز میں آنکھیں جھکا لیں۔ وہ مسرور تھی، کہ وہ اپنے حسن سے اپنی ہم جنسوں تک کو مرعوب کر رہی ہے۔ اور اب اس کیلئے ایک کام باقی تھا۔ مردوں کو بھی اپنے حسن سے مغلوب کرنا۔

یہ تمام محفل گرم تھی۔ لیکن سردار شیر علی کا دل سرد تھا۔ وہ خیمہ کے آخری سرے پر دو مخملی گاؤ تکیوں کے سہارے خاموش اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ ایسی گہری سوچ میں کہ اس کی آنکھیں بغیر کسی شے کا جائزہ لئے ہوئے گویا خیمہ کے پردوں میں سے نکل کر دُور کسی اور منظر میں مصروف تھیں۔ وہ ایک کریہہ المنظر شخص تھا۔ ایک سپاہی منش، خصلت سے میز، جس کے بازو اور طبیعت کئی لڑائیوں میں کام آکر فولاد کی طرح سخت ہو گئے تھے۔ وہ اسی حالت میں تھا کہ ایک تین چار سال کا بچہ خیمہ کا پچھلا پردہ اُٹھا کر داخل ہوا۔ لیکن وہ اس شیطانی ہجوم سے کچھ گھبرا گیا۔ کیونکہ اس نے شیر علی کے دائیں بازو کو اپنی ننھی انگلیوں سے پکڑتے ہوئے توتلی زبان میں کہا۔ "ابا! ابا!" شیر علی اس آواز کو سُن کر اس طرح چونکا جس طرح اچانک کسی شخص کا پاؤں ایک زہریلے سانپ پر جا پڑے اُس نے مڑ کر دیکھا اور اس کی آنکھیں دفعتاً پُر آب ہو گئیں بچے کو گود میں اُٹھا کر وہ اُسے پیار کرنے لگا۔ بچے نے اپنی معصوم نگاہوں سے شیر علی کی طرف پیار سے دیکھنا شروع کیا۔

لیلےٰ جس کا رنگ سُرخ سے زرد اور زرد سے سفید ہو گیا تھا۔ دزدیدہ نگاہوں سے اس منظر کی طرف دیکھ رہی تھی، اور دیکھتی رہی جب تک بچہ شیر علی کی گود سے اُتر کر پھر دوسرے خیمہ میں نہ چلا گیا۔

نفرت کا کڑوا بیج بو رہی تھی۔ وہ غالباً اس کوشش میں تھی کہ مجھے کسی رئیس زادے کے پاس اونے پونے بیچ ڈالے مگر ظاہراً اب اس نے ایسی باتوں کا تذکرہ ہی چھوڑ دیا۔

میں بھی بیکار نہیں تھی، ہمارے یہاں آنے جانے والوں میں ایک غریب نوجوان بھی تھا۔ جس کی شرافت اور محبت اخلاص کے بادلوں میں ستارے کی طرح چمکتی تھی۔ اس کی شریفانہ گفتگو اس کے مہذب اطوار رفتہ رفتہ مجھے ایک نامعلوم کشش سے کھینچنے لگے۔ رفتہ رفتہ میں بالکل بے بس ہو گئی۔ اس کی سیاہ آنکھوں اور خوبصورت چہرے نے مجھے مسحور کر لیا۔ آخر ایک دن مجھے احساس ہوا کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔

دیر کرنا خطرناک ثابت ہوتا۔ ہم نے بہت جلد خفیہ نکاح پڑھوا لیا اور رہیں اپنی ماں کی دُور بین نظروں سے بچ کر بھاگ نکلنے کا موقعہ تلاش کرنے لگی۔ اس کی آنکھیں بلی کی طرح میری ہر حرکت کے ساتھ لگی رہتی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کی مکاری کو ٹھینگہ دے کر نکل جانا آسان نہیں۔ میری چھوٹی سے چھوٹی بات اس کے زیر نظر تھی۔ اس طرح کافی وقت گزر گیا۔ اسی اثناء میں میرے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ میری ماں نے اس پر بہت واویلا مچایا مگر کیا ہو سکتا تھا لڑکا میرے خاوند اسمٰعیل کے سپرد کر دیا گیا۔

عید کی ایک سہانی صبح تھی، اور میں ایک دھانی جوڑا پہنے ہوئے کھڑکی میں بیٹھی تھی، ہمارے دروازہ پر ایک شاندار فٹن آکر رکی اصیل گھوڑے ہانگو ایک ایک غیر معمولی سختی سے سر کو بلند کئے ہوئے نتھنے پھلائے زمین پہ پاؤں مار رہے تھے، گاڑی سے ایک پستہ قد دُبلا پتلا آدمی اترا اور ہمارے کمرے میں چلا آیا۔ میری ماں کچھ عرصہ تک اس کے ساتھ سرگوشیوں میں مصروف رہی پھر میرے قریب آکر تبسم نگا ہوں سے بولی۔ میلے لئے تمہارے لئے ایک جگہ سے پیام آیا ہے تم ذرا دُوسرے کمرے میں چلی جاؤ۔"

میں چپ چاپ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ آنے کو تو میں آ گئی۔ لیکن میرے دل میں گدگدی سی ہونے لگی۔ میں نے دیوار سے کان لگا دیئے۔ لیکن وہ بہت آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے، کبھی کبھی کوئی لفظ سنائی دیتا تھا۔ کئی دفعہ مجھے یہ لفظ سنائی دیئے "بیشمار دولت" "بہت دُور" لیکن میں ان الفاظ میں کسی قسم کا تعلق پیدا کرنے سے قاصر رہی۔ شاید وہ کسی خزانے کا ذکر کر رہا تھا۔ جو بہت دُور تھا یا کسی ناچ مجرے کا ذکر تھا جس میں بے شمار دولت ہاتھ آنے والی تھی، اسی ادھیڑبن میں کھڑے کھڑے میرے گھٹنے تھک گئے۔ پنڈلیوں میں درد ہونے لگا۔ میں واپس آنے کو تھی کہ یکایک میں نے اپنی ماں کو غصے سے بھری ہوئی آواز میں کچھ کہتے ہوئے سُنا۔ میں نے دیوار سے کان لگا دیئے۔ مجھے ایک آواز سنائی دی۔ جو بظاہر میری ماں کی معلوم ہوتی تھی۔

"مجھے منظور نہیں ...."

میں نے اتنے ہی لفظ سُنے۔ پھر یُوں معلوم ہوا گویا کسی نے اُس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ کیونکہ وہ ایک بار چپ ہو گئی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا نو وارد اُسے سمجھا سمجھا کر دھیمی سنجیدہ آواز میں گفتگو کر رہا ہے۔

مجھے پھر اپنی والدہ کی آواز سنائی دی۔ "میں جو ایک دفعہ کہہ چکی ہوں کہ مجھے منظور نہیں"۔

اس کے بعد تھوڑی دیر کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ پھر ایک مردانہ آواز سنائی دی "بہت اچھا"۔

میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا، نو وارد آہستہ آہستہ سیڑھیوں سے اترا اور گاڑی پہ جا کر بیٹھ گیا۔ ایک لمحہ میں کوچوان نے سڑاک سے ہنٹر مارا۔ اور اصیل گھوڑے دھاک دھاک کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ میں بہت عرصہ تک نظر سے غائب ہو جانے والی گاڑی کی طرف دیکھتی رہی۔ میرے دماغ میں بے شمار دولت، بہت دُور، کے فقرے نوکِ نشتر کی طرح چبھ رہے تھے۔ آخرکار میں نے منہ موڑا تو اپنی ماں کو پشت پر پایا۔

میں نے اشتیاق سے پوچھا "اماں کیا بات تھی؟"

اُس نے جواب دیا "کچھ نہیں تمہارے لئے ایک رئیس زادے کا پیغام لے کر آیا تھا۔ مگر میں نے رخصت کر دیا"

زیادہ کرید کر پوچھنے کا کوئی فائدہ بھی نہ تھا۔ میں خاموش رہی۔ عید کی چہل پہل میں یہ بات میرے ذہن سے بالکل نکل گئی۔ اور گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد جب گرم گرم سوئیوں کی پلیٹ میرے سامنے آئی۔ میں نے شکر سے آزاد ہو کر خوب جی بھر کے کھائیں۔ لیکن سوئیاں کھاتے ہی میرا سر چکرانے لگا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ مجھے فوراً دھوکے کا شبہ ہوا۔

میں نے اپنی ماں کی طرف خوفناک نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا "اماں تم نے مجھے کیا کھلایا"

اُس نے جواب نہ دیا۔ خاموش بیٹھی رہی۔ میں اُسے مارنے کے لئے اُٹھی مگر مجھے ایک چکر آیا، اور میں بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑی۔ جب مجھے ہوش آیا۔ میرے بند بند میں درد ہو رہا تھا۔ کمر شدت سے دکھ رہی تھی۔ آنکھوں کے پپوٹے بھاری معلوم ہوتے تھے۔ میرے چاروں طرف تاریکی مسلط تھی۔ میں نے چاروں طرف سہارے کے لئے ہاتھ مارے مگر مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں کسی گہرے کنوئیں میں گری جا رہی ہوں۔ رفتہ رفتہ میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئیں۔ میرے چاروں طرف سیاہ ریشمی پردے تھے۔ میں نے آہستہ سے ایک پردہ اُٹھا کر دیکھا اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ میں ایک اونٹ پر کجاوے میں سوار ہوں اور اسی کے ہچکولوں سے میرا بدن چور چور ہو رہا ہے۔ میں پھر لیٹ گئی۔ میرے ارد گرد گھوڑوں کے سموں کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے تعجب سے پھر پردے اُٹھا کر دیکھے۔ ایک طرف دُبلا پتلا شخص تھا۔ دوسری طرف ایک نہایت تنومند نوجوان آدمی تھا۔ جو ایک مشکی گھوڑے پر سوار تھا"

لیلےٰ یہاں رک گئی۔ پھر شبیر علی کی طرف دیکھ کر بولی کیا "اُن دونوں آدمیوں کے نام بتانے کی ضرورت ہے؟"

شبیر علی نے جواب دیا "ہاں جس تنومند نوجوان کا تم ذکر کر رہی ہو وہ یہیں تھا۔ اور ابھی وہ دُبلا پتلا شخص بھی آ جاتا ہے" یہ کہہ کر شبیر علی نے آواز دی "سہیل خاں"۔

سہیل خاں کمرے میں داخل ہوا۔ اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

لیلےٰ نے اس کی طرف شعلہ بار نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "ہاں یہی ہے" پھر اُس نے اپنا بیان شروع کیا۔

"ایک نہایت لق و دق بیابان سے ہوتے ہوئے ہم آخرکار منزل مقصود تک پہنچ گئے۔ اور مجھے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا"

لیلےٰ نے مرتضےٰ خاں اور حیات خاں کو جو اس تمام بیان سے متاثر ہو کر دل ہی دل میں لیلےٰ کے طرف دار ہو گئے تھے مخاطب کرتے ہوئے، کہا "اسی رات آپ کا سردار میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا داخل ہوا اور میری مسہری پر بیٹھ گیا۔ میں نے نفرت اور حقارت سے منہ پھیر لیا۔ مگر اُس نے میرے منہ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنی طرف پھرایا اور پرزور آواز میں کہا۔ "میری جان محبت انسان کو اندھا کر دیتی ہے"

میں نے سہم کر گردن جھکالی۔

اُس نے پھر کہا "دیکھو میں تمہارے عشق میں دیوانہ ہو رہا ہوں۔ مر رہا ہوں۔ میں نے تمہیں تیس ہزار روپیہ دے کر خریدا ہے۔ سمجھیں میں نے تمہیں ہزاروں مجھ پر رحم کرو۔ اُف اُف میری طرف ان آنکھوں سے نہ دیکھو۔ ان سے آگ برستی ہے"

وہ پھر میری طرف بڑھا مگر میں نے اس کو روک کر کہا "خاموش! تم نہیں جانتے کہ تم ایک بیاہی ہوئی عورت سے گفتگو کر رہے ہو" اس کا رنگ فق ہو گیا، اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "بیاہی ہوئی۔ بیاہی ہوئی یہ تم کیا کہہ رہی ہو"

"ہاں بیاہی ہوئی تمہیں دھوکا دیا گیا۔ تم مسلمان ہو۔ اس پاک رشتہ کی عزت کرو"

تھوڑا عرصہ وہ خاموش بیٹھا میری طرف للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ پھر یکایک بڑھ کر میری طرف آیا اور میری گردن کو دبا کر بولا "بتاؤ

کون شخص ہے میں اُسے قتل کر کے تمہیں اس پاک رشتے سے آزاد کر دوں گا۔"

میرا گلا بند ہو گیا۔ میری آنکھیں باہر نکل آئیں میرے منہ سے ایک چیخ نکلی وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اور نرم آواز میں بولا "اف پیاری میں نے تم پر بہت ظلم کیا۔ اچھا آئندہ سے میں تمہیں کبھی تنگ نہیں کروں گا۔ مگر تمہیں رہنا یہیں پڑے گا۔ جب تک تم یہ نہ بتاؤ گی کہ تمہارا خاوند کون ہے اور کہاں رہتا ہے۔ تمہیں چھٹکارا نصیب نہ ہو گا۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے بعد وہ روزانہ کو میرے پاس آتا رہا۔ وہ مجھے سمجھاتا۔ اس کی آواز جذبات کے وفور سے بھرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ وہ مجھے کہتا "لیلیٰ لیلیٰ تم کسی مجہول الاسم خاوند کے لئے موزوں نہیں ہو تم ایک فوج کی تمام عظمت تمام شوکت تمام سرداری کو اپنے قدموں میں دیکھنا چاہتی ہو تو دیکھو۔" یہ کہہ کر وہ میرے قدموں پہ گر جاتا۔

لیکن میں اسے ٹھکرا دیتی۔ ہاں اس طرح ٹھکرا دیتی۔ جس طرح ایک شہزادی اپنے ذلیل سے ذلیل نوکر کو اپنے حنائی پاؤں کی ایک ہلکی سی ٹھوکر سے ٹھکرا دیتی ہے مگر اب اس کی سفاکی اور خونخواری جاتی رہی۔ وہ ایک وفادار کتے کی طرح میری ٹھوکریں کھا کر میرے پاؤں میں پڑا رہتا۔

لیکن رفتہ رفتہ اس کی سفاک سپاہیانہ اور گہری محبت مجھے متاثر کرنے لگی مگر میں نے اس گنہگار خیال کو کبھی اپنے دل میں جگہ نہ پکڑنے دی۔ میری دلی کوفت دن بدن ترقی پہ تھی۔ میں حیران تھی۔ کہ اسمٰعیل ابھی تک میرا پتہ کیوں نہیں لگا سکا۔ محبت میں تو وہ طاقت ہے کہ پہاڑوں کو پانی کی طرح بہا دے کیا اسمٰعیل تھک کر بیٹھ رہا ہے۔ کیا اس کی محبت عارضی اور جھوٹی تھی۔ میں نے تو اس کے لئے بہت بڑی قربانی کی تھی۔ مگر آہ مرد عورتوں کی قربانیوں کو اپنی مردانگی کا خراج سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی خیالات میں ایک رات میں اپنے وسیع اور شاندار کمرے میں بیٹھی تھی، ہاں اسی طرح بیٹھی تھی، جس طرح کوئی آزاد اور وحشی پرندہ سونے کے ایک خوشنما قفس میں بیٹھا ہو۔ کمرے کی کھڑکیوں میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ ہوا کسی مجروح انسان کی طرح کراہتی ہوئی ریت کے ذروں کو اپنے دوش پہ لئے ہوئے سائیں سائیں کرتی ہوئی گزر رہی تھی۔ ایک لمپ کی مدھم روشنی فضا کی تاریکی کو ڈراتا اور بھیانک بنا رہی تھی۔ میرے دل کا چراغ بھی بجھ چکا تھا۔ اسمٰعیل کے آنے سے مایوس ہو کر میں اضطراب کی گھڑیاں کاٹ رہی تھی۔

یکایک داہنی طرف سے مجھے ایک عجیب سی آواز سنائی دی۔ گویا کوئی لوہے پر ریتی کو رگڑ رہا ہو۔ دھڑکتے ہوئے دل سے میں نے داہنی کھڑکی کی طرف دیکھا مجھے ایک مبہم سی سیاہ شکل دکھائی دی۔ جو کھڑکی کی سلاخ کو ایک ہاتھ سے مضبوط تھامے دوسرے ہاتھ سے سوہان کی مدد سے سلاخ کو کاٹ رہی تھی۔ میں ایک چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئی۔

اُس شخص نے لب پہ انگلی رکھ کر کہا "چپ چپ" آواز کچھ شناسا سی معلوم ہوئی۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لمپ اُٹھا کر سامنے کیا۔ اور روشنی کی ایک چمکتی ہوئی شعاع اسمٰعیل کے مسخ شدہ اور مکروہ چہرے پہ پڑی۔ انتہائی کرب سے بے قرار ہو کر میں نے دوسری چیخ ماری اور لمپ میرے ہاتھ سے گر کر چکنا چور ہو گیا۔ مگر مدھم سی روشنی میں میں نے اسمٰعیل کو کمرے میں کودتے ہوئے دیکھا اس کے ہاتھوں میں ایک چور دی کا لمپ تھا اُس نے وہ لمپ میرے چہرے کی طرف پھرایا اور دانت پیس کر کہا "مردار شور مچا کر آدمیوں کو اُٹھا دینا چاہتی تھی۔"

یہ کہہ کر اُس نے لمپ میز پہ رکھ دیا۔ حیرت انگیز واقعات اس تیزی اور شدت سے عمل میں آ رہے تھے کہ میری زبان بند ہو گئی تھی، رات کا خوفناک وقت اسمٰعیل کا چوروں کی طرح آنا پھر اس کی یہ حیرت انگیز گفتگو خواب کے سے واقعات معلوم ہوتے تھے۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جس پہ اب گہری جھریوں کے نشان تھے۔ کپڑے پھٹے ہوئے اور میلے کچیلے وہ ابھی تک میری طرف غصے کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن عورت کی محبت جلدی فنا نہیں ہوتی۔

میں نے آہستہ سے کہا "اسمٰعیل"

وہ دیوانوں کی طرح ہنسا۔ ہا ہا ہا! .... اسماعیل ہا اسمٰعیل تمہارا پہلا خاوند۔"

میں ڈر گئی۔ میں نے ملتجیانہ کہا۔ "اسمٰعیل تمہیں کیا ہو گیا۔ دیوانے تو نہیں ہو گئے"؟

اُس نے میری طرف گھور کے دیکھا۔ "دیوانہ! ہاں تم سچ کہتی ہو۔ مجھے ایک عورت کی بیوفائی نے دیوانہ کر دیا۔"

میں نے چلا کر جواب دیا۔ "بیوفائی! تم کیسے بیوفائی کا الزام دیتے ہو۔"

اُس نے میری طرف انگلی اُٹھا کر کہا۔ "تم نے۔"

میں نے گردن جھکا لی۔ یہ تھا میری مصیبتوں کا انجام میری کلفتوں کا خاتمہ جس کے لئے میں نے سب کچھ گوارا کیا، وہ یوں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے بیوفائی کا الزام دے رہا تھا، اس ناگن کی طرح جس کے بچوں کو کسی نے کچل دیا ہو۔ میں نے سر اُٹھا کر طعن سے کہا۔ "پھر تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"مجھے امارت کبھی نصیب نہ تھی تم ہمیشہ سے امیر تھیں۔ اب بھی ہو۔ جس سے تم نے اب بیاہ کیا ہے۔ اس کے پاس دولت بے عشرت ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تم ہو۔"

اب اُسے سمجھانا بیکار تھا۔ خدا جانے وہ کن مصیبتوں میں پڑ کر اس حالت تک آ پہنچا تھا۔ کہ اپنی تمام مردانہ غیرت کو چھوڑ کر مجھ سے روپیہ مانگنے آیا تھا اسے پورا یقین تھا کہ میں کسی اور کی بیوی ہو چکی ہوں۔ دنیا کی کوئی طاقت اس کے یقین کو نہ بدل سکتی تھی، یہ سوچ کر میں خاموش ہو رہی

اُس نے پھر کہا۔ "میں جوا کھیل کر آ رہا ہوں، ہار کر آ رہا ہوں۔ تمہیں پانچ ہزار روپیہ دینا ہوگا۔"

میں نے جل کر کہا۔ "میرے پاس ایک پیسہ نہیں ہے۔"

اُس نے میری طرف تیز نگاہوں سے دیکھا۔ "یعنی تم کچھ نہ دو گی۔"

"کچھ نہیں۔"

وہ خاموشی سے کھڑکی کی طرف بڑھا اور نیچے گل محمد کہہ کر آواز دی۔ میں نے تعجب سے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ جہاں اب ایک سیڑھی لگی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ ایک شخص اس سیڑھی سے کھڑکی تک آیا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک پھٹے ہوئے لبادے میں لپٹی ہوئی کوئی شے تھی۔ جو اس نے اسمٰعیل کے ہاتھ میں دے دی۔ وہ اُسے اپنے ہاتھوں پہ لئے ہوئے میری طرف آیا اور اس کا منہ کھول دیا۔

"پہچانتی ہو۔ یہ کون ہے؟ تمہارے چہروں کی مشابہت بیوقوف سے بیوقوف آدمی کو بھی یقین دلا دے گی کہ یہ تمہارا ہی بچہ ہے، اگر تم اپنی ہٹ پہ قائم رہیں تو میں اسے شیر علی کے پاس لے جاؤں گا۔ اور پھر اس کی اور تمہاری زندگی کا خدا حافظ۔"

میرے سینے میں دودھ بہنے لگا۔ "میرا بچہ" کہہ کر میں نے اس کے ہاتھوں سے اپنے دل کے ٹکڑے کو چھیننا چاہا۔ مگر اُس نے مجھے روک دیا۔ اور کہا۔ "بس اب یہ بچہ صرف میرے کام آئے گا۔ بولو کیا جواب دیتی ہو؟"

میرا غرور خاک میں مل گیا۔ میں اس کے سامنے دوزانو ہو کر زار و قطار رونے لگی۔ میں نے ملتجیانہ کہا۔ "اسمٰعیل! اسمٰعیل! رحم کرو۔ میں ابھی تک تمہاری بیوی ہوں۔"

وہ دروازے کی طرف مڑا، اور کھڑکی کی راہ سے نیچے اُتر گیا، میں نے اُسے بہت روکنا چاہا۔ مگر وہ مجھے دھکیل کر نکل گیا۔ میں نے باہر کے دروازے سے کان لگا دیئے۔ دس پندرہ منٹ کے بعد مجھے شیر علی اور اسمٰعیل کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے دروازے کو کھولنا چاہا مگر وہ مقفل تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگرچہ شیر علی مجھ سے محبت کرتا ہے۔ مگر اس کی محبت رقابت کے اس زندہ ثبوت کو کبھی برداشت نہ کر سکے گی۔ وہ ضرور اسمٰعیل اور میرے معصوم بچے کو قتل کر ڈالے گا۔ میں نے کمرے میں ایک مقید شیرنی کی طرح چکر لگانا شروع کر دیئے۔ اور یکایک میں نے

کھڑکی میں سے دیکھا کہ اسمٰعیل اور اس کا ساتھی مکان سے نکلے اور جلد گھنے ہوتے ہوئے صحرا کا رُخ کیا۔ ان کے پیچھے سہیل خاں اور دو ایک اور نوکر مشعلیں لئے ہوئے نکلے۔ مگر یہ دیکھ کر کہ مفرورین بہت دُور نکل گئے ہیں واپس مکان میں داخل ہو گئے۔

تھوڑے عرصے بعد جب مکان میں خاموشی چھا گئی۔ میں خدا کا نام لیکر کھڑکی سے نیچے کود پڑی اور اُٹھ کر اس طرح بھاگی جس طرح کوئی ہرن شکاری کی بندوق کی آواز سُن کر بھاگتا ہے۔

۴

یہ کہہ کر لیلےٰ نے شیر علی کی طرف دیکھا۔ اور بولی "میں اسی اُمید پہ زندہ تھی کہ ایک دن تم سے اپنے معصوم بچّے کا انتقام لوں۔ میں ناکام رہی مگر میری رُوح کو یہ تسلی ہے کہ میں نے اپنی طرف سے کوئی بات اٹھا نہیں رکھی۔"

شیر علی نے اُٹھ کر کہا۔ "صاحبان مجھے اس قصّے کو اختتام تک پہنچانا ہے ......۔ سہیل خاں۔"

سہیل خاں آگے بڑھا۔

"جمیل کو لاؤ۔"

سہیل خاں گیا اور چند لمحوں میں ایک معصوم بچّے کو لے کر آیا۔ شیر علی نے بچّے کو جو اس مجمع سے خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اپنے ہاتھوں پہ لیکر کہا۔ "لیلےٰ یہ ہے تمہارا بچّہ۔ اس رات جس کا تم ذکر کرتی ہو۔ میں نے تمہاری تمام گفتگو سُن لی تھی۔ اور میں نے اسمٰعیل کو مار کر باہر نکال دیا تھا۔ کیونکہ وہ کسی صورت سے تمہارے لائق نہ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ دُوسری صبح تمہیں تمام واقعے کی خبر دوں۔ مگر تم غائب ہو چکی تھیں۔ اب تک میں نے اسے اپنا بچّہ سمجھ کر پالا ہے۔ لو آج تمہاری امانت تمہاری نذر ہے۔"

یہ کہہ کر اُس نے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ لیلےٰ کے بازو کھول دیئے گئے وہ بیتاب ہو کر اپنے بچّے کی طرف بڑھی جو مہر مادری کی کشش سے خود بھی اس طرف کھنچا جاتا تھا، لیلےٰ نے اُسے گود میں اُٹھا کر اس کی پیشانی چوم لی۔ جمیل بے اختیار لیلےٰ کے سینے سے لپٹ گیا اور کہا "اماں"۔

خیمے سے تمام لوگ دبے پاؤں رخصت ہونے لگے وہ محسوس کرتے رہے کہ انہیں اس مقدس اور آسمانی خوشی میں حارج ہونے کا کوئی حق نہیں۔

محمد مجیب

کیمیاگر

یہ قصہ اس زمانہ کا ہے جب مسلمان ہندوستان میں نئے نئے آئے تھے۔ دہلی اور دہلی سے افغانستان کی سرحد تک ان کی حکومت کسی قدر مستحکم ہو گئی تھی۔ مگر دہلی سے مشرق کی طرف انہوں نے چند حملے کئے تھے۔ ہندو قصور نے عام طور پر مسلمانوں کی فتح تسلیم نہیں کی تھی اور نہ ہندوؤں کو یقین تھا کہ مسلمان ہمیشہ کے لئے ہندوستان میں بسنے والے ہیں۔ ابھی تک شیخ اور برہمن نے ایک دوسرے پر لعنت نہیں بھیجی تھی اور اس بے چینی کو دور کرنے کے واسطے جو ایک بدیسی قوم کے ملک پر حاوی ہو جانے سے پھیل گئی تھی اسلام کا یہ مژدہ کافی تھا کہ خدا کے تمام بندے برابر ہیں۔ اس کا گھر سب کا گھر ہے۔ اس کا نیا دین دنیا میں نئی جان پیدا کرنے آیا ہے۔

حکیم مسیح ترکستان سے اپنی بوڑھی ماں کو ساتھ لے کر ہندوستان آئے تھے۔ دہلی پہنچتے ہی انہیں حکم ملا کہ جونپور کی طرف کچھ اور زردار ترکی خاندانوں کے ساتھ ایک بڑے گاؤں میں جس کا نام خالد پور رکھا گیا تھا، مسلمان آبادی کی بنیادیں ڈالیں۔ حکیم مسیح نے حکم کی تعمیل کی اور خالد پور میں جا بسے۔ رفتہ رفتہ دوسرے خاندان بھی آ گئے اور مسلمانوں کی ایک مستقل آبادی ہو گئی۔ حکیم مسیح نے اسلامی دنیا کے تقریباً تمام مشہور طبیبوں کی شاگردی کی تھی اور وہ اپنے فن میں ماہر تھے اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ وہ تھوڑے دنوں میں آس پاس مشہور ہو گئے اور ترکستان میں ان کے خاندان نے جو کچھ کھویا تھا وہ ہندوستان میں انہیں واپس ملنے لگا۔ ان کی ماں نے ایک ترکی رئیس کی بیٹی سے ان کی شادی بھی کرا دی جس سے انہیں شرافت اور سرمایہ داری کا تمغہ مل گیا۔

حکیم مسیح نہایت حسین، خوش مزاج اور شائستہ آدمی تھے۔ دنیا کی مصیبتیں ان کی طبیعت میں ذرا بھی ترشی یا تلخی نہیں پیدا کر سکی تھیں۔ وہ اونچا نیچا دیکھ چکے تھے، خود ہمدردی کی تلاش میں رہ چکے تھے اور اب ہر ایک سے اچھا سلوک کرنے پر تیار رہتے تھے۔ تجربہ نے انہیں انسان کی فطرت کے بھید بتا دیئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ محبت سے بات کرنے کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔ مریض کو دوا سے کتنا فائدہ پہنچتا ہے اور طبیب کے اخلاق سے کتنا۔ ان کا برتاؤ بیماروں اور تیمارداروں کے ساتھ ایسا تھا کہ لوگ محض ان کی توجہ کو کافی سمجھتے تھے لیکن وہ مرض کی تشخیص بھی بہت سمجھ کر کرتے تھے اور دوائیں نہایت احتیاط سے اکثر اپنے سامنے تیار کراتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی ناکامی کی وجہ علاوہ تقدیر کے اور کوئی نہیں سمجھی جاتی تھی۔

لیکن حکیم مسیح باوجود اپنی دلیری اور ہردلعزیزی اور شہرت کے اپنی زندگی سے مطمئن نہ تھے۔ کچھ اپنے وطن کی یاد بے چین کرتی تھی کچھ ہندوستان کی فضا۔

مگر سب سے زیادہ انہیں یہ خیال ستاتا تھا کہ اب وہ یہیں دفن ہوں گے۔ ان کا دل ہر قسم کے تعصب سے پاک تھا، لیکن پھر بھی وہ ہندوؤں کو اپنے جیسا آدمی سمجھتے تھے نہ ہندوستان کو اپنے جیسا ملک۔ ان پر کچھ اثر ان کی بیوی اور ان کی سسرال کا تھا۔ یہ لوگ کسی مجلس کو بغیر اپنے ملک کی یاد میں نوحہ خوانی کئے نہیں برخاست کرتے تھے اور بغیر ہندو قوم اور ہندو مذہب پر لعنت بھیجے کسی مسئلہ پر گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ حکیم مسیح کو ہندوؤں سے اس قدر سابقہ پڑتا تھا اور ہندو ان کی اس قدر عزت، ان سے اتنی محبت کرتے تھے کہ ان کا اپنی سسرال والوں کا ہم خیال ہونا ناممکن تھا۔ لیکن ان لوگوں کے تعصب کا اتنا تو اثر ضرور ہوا کہ حکیم مسیح نہ ہندوؤں میں اس طرح گھل مل سکے جیسے کہ ان کی فطرت کا تقاضا تھا اور نہ ہندوستان کے بہین آسمان کو اپنا وطن بنا سکے عزت اور شہرت حاصل کرنے پر بھی ان کو اس کا ارمان رہ گیا کہ ایک دم بھر کے لئے طبیعت میں وہ سکون پیدا کر سکیں، اپنی زندگی کو مستقل یا اپنے گھر کو گھر سمجھ سکیں۔

یوں ہی دن گذرتے گئے حکیم مسیح کی ماں کا انتقال ہو گیا اور وہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہوئیں جو آبادی کے ساتھ رفتہ رفتہ بڑھ رہا تھا۔ لیکن حکیم مسیح کو کسی طرح سے یقین نہ آسکا کہ ہندوستان میں ان کی نسل نے جڑ پکڑ لی ہے، اور ان کی روحانی بے چینی انہیں پریشان کرتی رہی۔

"کاش! مجھے ایک ایسا کیمیاگر ملتا" انہوں نے اپنی بیوی سے ایک دن کہا "جو میری فطرت میں اس سرزمین سے مناسبت پیدا کر دیتا۔ آخر میں کب تک اپنے آپ کو مسافر یا مہمان سمجھتا رہوں گا؟"

اس کے جواب میں ان کی بیوی نے آنکھیں نکالیں اور طنز سے کہا:

"جب جوانی تھی تو ہمت ہارے بیٹھے رہے۔ اب بڑھاپے میں کیمیاگر کی تلاش ہے۔ جو ارادہ کا کمزور ہو اس کی مدد کرنا قادرِ مطلق کے امکان سے بھی باہر ہے۔"

حکیم مسیح مسکرائے، ایک ٹھنڈی سانس بھری اور خاموش ہو گئے۔

اس گفتگو کے کچھ دن بعد ہی ان کے مطب میں ایک طاعون کا مریض لایا گیا۔ حکیم صاحب نے اس کے لئے تو نسخہ لکھ دیا لیکن اپنے گھر کہلا بھیجا کہ خالد پور میں طاعون کا اندیشہ ہے اور سب کو فوراً سفر کی تیاری کرنا چاہئے۔ ان کے گھر سے دوسرے مسلمان گھرانوں میں خبر پہنچائی گئی، اور ساری بستی میں کھلبلی مچ گئی۔ جب حکیم مسیح کے پاس شام تک اور مریض بھی پہنچے تو انہوں نے یہ اطلاع دی کہ طاعون کا حملہ غالباً شدید ہونے والا ہے۔ تو سب نے اسی رات بستی چھوڑ دینے کا تہیہ کر لیا۔ حکیم مسیح خود خالد پور میں ٹھہرنے کا ارادہ کر چکے تھے اور انہوں نے اپنی بیوی کو اس کی مصلحت سمجھانے کی بہت سی دلیلیں بھی سوچ لی تھیں۔ مگر ان کی بیوی ان سے زیادہ دوراندیش ثابت ہوئیں اور جب وہ مغرب کے قریب گھر کے اندر گئے تو انہوں نے دیکھا تمام لوگ بوکھلائے ہوئے ادھر ادھر پھر رہے ہیں اور ان کی بیوی رو پیٹ رہی ہے۔ پہلے تو ان کو یہ شبہ ہوا کہ شاید گھر میں کوئی طاعون کا شکار رہا ہے مگر جب بڑی دقت سے انہوں نے واقعہ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ انہی کا ماتم ہو رہا ہے۔ ان کی بیوی نے محض اس اندیشہ میں کہ وہ خالد پور چھوڑنے سے انکار کریں گے صرف خود ہی رونا دھونا شروع نہیں کر دیا تھا بلکہ تمام محلہ والوں اور عزیزوں سے ان کی اس حماقت کی شکایت بھی کی تھی، اور ہر ایک کو رو رو کر ان کے ارادہ کی مخالفت پر آمادہ کر لیا تھا۔ حکیم مسیح کھڑے تدبیریں سوچ رہے تھے کہ ان کے خسر اور سالے آ گئے اور انہیں گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ باری باری سے ایک سمجھاتا دوسرا ڈانٹتا تھا اور دونوں اس قدر گھبرائے ہوئے تھے کہ بہت دیر تک حکیم مسیح کو پتہ ہی نہ چلا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ لیکن وہ تو حکیم مسیح کو بات سمجھنے اور جواب سوچنے کا موقع ہی نہ دینا چاہتے تھے اور قبل اس کے کہ حکیم مسیح زبان ہلا سکیں دونوں نے ان کے ہاتھ پکڑ لئے اور خدا اور رسولؐ اور مسلمانوں کی جانوں کی قسمیں دلائیں۔ ان کی جوان بیوی اور ننھے بچوں کی حفاظت کا فرض یاد دلایا اور آخر میں ہندو قوم پر لعنت بھیجی اور کہا کہ یہ اسی قابل ہے کہ طاعون اور ہیضہ میں ہلاک ہو اور کسی مسلمان کو اس کو بچانے کے لئے اپنی جان خطرہ میں نہ ڈالنی چاہئے۔

اب حکیم مسیح سمجھے کہ اس عجیب و غریب تقریر کا مقصد کیا ہے اور انہوں نے جو دلیلیں اپنی بیوی کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے سوچ رکھی تھیں

ان سے کام لینا چاہا مگر ان کے خسر اور سالے نے ان کی ذرا سی خاموشی کو رضامندی قرار دیا اور چلا اٹھے :

"ارے وہ بے چارہ تو کچھ کہتا ہی نہیں۔ وہ خود جانے پر تیار ہے۔"

حکیم مسیح پھر کچھ عذر کرنا چاہتے تھے لیکن ان کی بیوی جو اپنے فریق کو مضبوط پاکر ان کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی تھیں کہنے لگیں :

"آپ لوگوں کے کہہ دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے اطمینان اسی وقت ہوگا جب یہ خود اپنی زبان سے کہہ دیں کہ ہمارے ساتھ چلیں گے۔"

"چلیں گے کیوں نہیں۔" حکیم مسیح کے سالے نے کہا۔ "یہ تم سامان تیار کراؤ۔ وہ اپنی مرضی سے نہ گئے تو ہم زبردستی لے جائیں گے۔"

یہ کہہ کر حکیم مسیح کے سالے نے اندر سفر کی تیاری کا دوبارہ حکم دیا اور حکیم مسیح کا ہاتھ پکڑ کر انہیں باہر لے گئے۔ یہاں انہیں قائل کرنے کے لئے بہت سے مسلمان ہمسایہ موجود تھے۔ بزرگ جن کی حکیم مسیح بہت عزت کرتے تھے، ہم عمر دوست جن کی صحبت کے بغیر ان کا زندہ رہنا دشوار ہوتا۔ یہ لوگ بھی کبھی باری باری سے، کبھی ایک ساتھ تقریریں کرتے رہے مگر حکیم مسیح نے ان کی طرف توجہ نہ کی۔ انہوں نے اپنے دل میں یہ طے کر لیا تھا کہ ان کا خالدپور کے ہندو باشندوں کو اس طرح سے چھوڑ کر چلے جانا ایک شدید اخلاقی جرم ہے جس کا الزام نہ وہ اپنی بیوی پر لگا سکتے ہیں نہ رشتہ داروں پر۔ لیکن انہوں نے اس وقت کی بھی تصویر کھینچی جب خالدپور میں ایک مسلمان باقی نہ رہا ہوگا، ان کے سارے دوست اور عزیز ہندوستان کی وسعت میں غائب ہو گئے ہوں گے۔ وہ طرزِ زندگی جس سے وہ مانوس تھے ناممکن ہو جائے گا۔ وہ خود اگر زندہ رہے تو گھر میں اکیلے بیٹھے دوائیں بناتے رہیں گے اور اگر مر گئے تو اکیلے دفن ہوں گے اور ان کے جنازہ کی نماز تک پڑھنے کے لئے کوئی مسلمان نہ ہوگا۔ خالدپور چھوڑنا ان کے لئے ایک اخلاقی جرم ضرور تھا مگر ایسی زندگی برداشت کرنا کسی جرم کی سزا بھگتنے سے بھی انہیں مشکل معلوم ہوا۔ انہوں نے دل ہی دل میں دعا مانگی کہ انہیں زندگی کے فرائض سے جلد سبکدوش کیا جائے اور سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

جب رات کو مسلمان قافلہ بستی سے نکلا تو حکیم مسیح اس کے ساتھ تھے۔

ان کو امید تھی کہ اپنے ضمیر کو وہ کسی طرح سے سمجھا بجھا کر منا لیں گے۔ لیکن بدقسمتی سے ان کی ساری تدبیریں پلٹ گئیں۔ انہوں نے ہزار کوشش کی کہ گزشتہ زندگی کو بالکل بھول جائیں۔ مگر ان کا تصور قابو سے نکل گیا اور ہر لمحہ ایک نیا صدمہ پہنچانے لگا۔ ذرا کہیں کھٹ کھٹ کی آواز آئی اور انہیں خیال آیا کہ اس وقت معلوم نہیں کتنے لوگ جن کو ابھی اس کی خبر نہیں ملی ہے کہ حکیم مسیح انہیں مصیبت میں چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں ان کے دروازہ کی کنڈی کھٹکھٹا رہے ہوں گے۔ کہیں کوئی بچہ رویا اور انہیں یاد آیا کہ ناگہانی موت کیسی بلا ہوتی ہے۔ خالدپور میں کتنے بچے اس وقت اپنی مردہ ماؤں کے پیار کے لئے تڑپ رہے ہوں گے۔ کتنی مائیں اس وقت ہاتھ مل مل کر کہہ رہی ہوں گی کہ اگر حکیم مسیح چلے نہ گئے ہوتے تو ان کے بچوں کی جان بچا لیتے۔

حکیم مسیح کی آنکھوں میں بار ہا آنسو بھر آئے، سر چکر کھانے لگا لیکن واپس جانے کی ہمت انہیں پھر بھی نہ ہوئی۔

قافلے نے خالدپور سے کوئی دس میل پر جاکر منزل کی۔ حکیم مسیح تھک کر چور ہو گئے تھے لیکن انہیں یقین تھا کہ نیند کسی طرح سے نصیب نہ ہوگی اور ہوا بھی یہی کچھ۔ کچھ دیر تک تو ان پر ایک غفلت سی طاری رہی جس سے ان کی تھکان جاتی رہی لیکن پھر وہ پریشان خواب دیکھنے لگے۔ کبھی وہ پہاڑ کی چوٹی پر سے پھسل کر نیچے گرتے تھے، کبھی گھوڑے پر سوار ایک غار میں پھاند پڑتے تھے جس کی تہ میں خوفناک تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا۔ خواب ہی میں ان کو خیال آیا کہ وہ دہلی جا رہے ہیں۔ ایک تیز آندھی آئی جس میں ان کا گھوڑا کئی مرتبہ زمین پر سے اٹھا۔ اس کے بعد انہوں نے دیکھا کہ وہ ایک وسیع میدان میں کھڑے ہیں۔ ان کے سامنے ایک لمبی پتلی سی سڑک ہے جو دور جاکر کالے بادلوں میں گم ہو جاتی ہے۔ سڑک کے دونوں طرف ایک اونچی منڈیر ہے اور منڈیر کے بعد کھیتوں کا سلسلہ ہے جو کہیں ختم ہی نہیں ہوتا۔ انہوں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور کالی گھٹا کی طرف روانہ ہوئے۔ دہلی کا رخ وہی تھا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد انہیں سامنے سڑک کے کنارے ایک سیاہ نقطہ سا نظر آیا۔ پاس پہنچے تو دیکھا کہ ایک آدمی غالباً سستانے کے لئے

منڈیر پر بیٹھا ہے۔ انہوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور آگے بڑھ گئے مگر کوئی دس قدم چلنے کے بعد ان کا گھوڑا رک گیا اور باوجود چابک بھی اسے اس جگہ سے نہ ہلا سکے۔ وہ واپس جانے پر وہ تیار تھا۔ آگے معلوم ہوتا تھا کہ اسے مُردہ لیجانا بھی مشکل ہوگا۔ حکیم مسیح سمجھے کہ وہ کسی چیز کو دیکھ کر بھڑک گیا ہے اور اس کا مزاج درست کرنے کے لئے وہ تھوڑی دور واپس جانے پر راضی ہو گئے۔ مڑتے وقت ان کی نظر پھر اس مسافر پر پڑی۔ وہ منڈیر پر بیٹھا انہیں تک رہا تھا۔ گھوڑا کسی وجہ سے خود بخود اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور حکیم مسیح نے سوچا کہ کچھ دیر اسی سے باتیں کر لیں۔

گفتگو شروع کرنے سے پہلے حکیم مسیح نے اسے غور سے دیکھا۔ مسافر کا لباس ایک خوشحال ہندو کاریگر کا تھا۔ یعنی نیچے ایک موٹے سوت کی دھوتی، اتنے ہی موٹے کپڑے کی بنڈی اور سر پہ ایک پگڑی جو اس نے اس وقت اتار کر اپنے پاس زمین پر رکھ دی تھی۔ اس کے کندھوں اور پیٹھ پہ ایک موٹی سخت اون کی کملی پڑی ہوئی تھی۔ مسافر کا قد بہت لمبا تھا، سینہ چوڑا، پٹھے تنے اور ابھرے ہوئے جس کی وجہ سے پہلی نظر میں وہ ایک معمولی انسان نہیں بلکہ ایک زندہ فولاد کی ڈھلی ہوئی مورت معلوم ہوتا تھا۔ اس کی داڑھی کے لمبے سیدھے بال، اونچی پتلی ناک چوڑی پیشانی، چہرہ کا نمایاں سکون، سب اسی وہم میں ڈال دیتے تھے کہ اس کا جسم آہنی ہے مگر آنکھوں کو دیکھتے ہی یہ سارا طلسم ٹوٹ جاتا۔ اس کی بڑی بڑی نرگسی آنکھوں میں ایک نرمی، محبت اور ایثار تھا۔ حکیم مسیح پر بھی ان آنکھوں کا اثر ہوا۔ وہ جواب میں مسکرا دئے، اور دیر تک مسافر کے مردانہ حسن کا لطف اٹھاتے رہے۔ آخر کار انہوں نے پوچھا:

"اے آہنی جسم کے مسافر! تو کہاں جا رہا ہے؟"

مسافر نے پہلے سر جھکا لیا، پھر ان سے آنکھ لڑا کر کچھ مایوسی کے لہجہ میں کہا: "خالد پور!"

"مگر وہاں تو طاعون ہے۔"

"ہاں میں اسی لئے جا رہا ہوں۔"

حکیم مسیح کو اس قدر حیرت ہوئی کہ وہ تھوڑی دیر تک کچھ نہ کہہ سکے لیکن مسافر نے انگڑائی سی لی اور انہیں اس خوبصورت مردانہ جسم پہ رحم آیا جو جان بوجھ کر موت کو دعوت دے رہا تھا۔ انہوں نے بڑی حسرت سے مسافر کی طرف دیکھا اور پوچھا:

"اے مسافر! کیا تجھے اپنی جان عزیز نہیں؟"

"مجھے اپنی جان بہت عزیز ہے اور ہمیشہ عزیز رہے گی۔" مسافر نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ "جتنی وہ مجھے عزیز ہے اتنی ہی خدا کو عزیز ہو گی اگر میں نے اس کی راہ میں قربان کر دی۔"

حکیم مسیح پھر چپ ہو گئے۔ مسافر کی صورت سے ظاہر تھا کہ اس کا قول پکا ہے۔ انہیں اپنی کمزوری یاد آئی اور اس بلند ہمت اور پختہ ارادہ پر رشک آیا۔ لیکن انہوں نے سوچا کہ شاید یہ دنیا میں اکیلا ہو اور انتہائی ایثار سے روکنے کے لئے کوئی دنیاوی تعلقات نہ ہوں۔ کچھ وہ اپنا بچاؤ بھی کرنا چاہتے تھے۔

"اے مسافر! کیا دنیا میں تیرے ساتھ محبت کرنے والا کوئی نہیں؟"

"محبت کا جواب محبت ہے۔ میں جہاں جاتا ہوں مجھ سے محبت کرنے والے پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر محبت مجھے کسی بھلائی سے نہیں روک سکتی۔"

آخری جملہ حکیم مسیح کے سینہ میں تیر کی طرح لگا اور وہ بے تاب ہو گئے۔

"اے مسافر! تو آخر کہاں سے آیا ہے؟" انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔

"میں خدا کا بندہ ہوں، کسی ملک کا باشندہ نہیں۔" مسافر نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ "جس ملک میں میرا خدا مجھے پہنچا دے وہی میرا

وطن ہے۔ اسی کی خدمت میرا فرض ہے۔"

"لیکن تیرا مکان تو ضرور کہیں ہوگا؟"

"دنیا میں ہزاروں خدا کے بندے ہیں جن کے پاس مکان، بیوی بچے کچھ نہیں. . . . . . میں جہاں تھکا وہیں بیٹھ جاتا ہوں جہاں نیند آئی وہیں سو جاتا ہوں۔"

"مگر مسافر! تیرے بیوی بچے ہوتے تو تُو کیا کرتا؟"

"عورت کی محبت سے بہتر اور کوئی نعمت خدا نے انسان کو نہیں بخشی ہے۔ میری اگر بیوی ہوتی تو میں سب سے پہلے اس کے قدموں پر گرتا اور اس سے کہتا کہ مجھ میں طاقت نہیں، ہمت نہیں، صرف تیری محبت مجھے سیدھے راستے پر چلا سکتی ہے۔ چل میری رہبری کر، میں تیرے بغیر بالکل مجبور ہوں. . . . . ."

"مگر مسافر! طاعون کا علاج محبت سے کیسے ہو سکتا ہے؟" حکیم مسیح نے مسافر کو ٹوک کر کہا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے کو تیار تھے اور بدن پسینہ سے تر اور ہو گیا۔

"محبت ہر بیماری کا علاج ہے، ہر زخم کا مرہم ہے، محبت زندگی اور موت کا فرق مٹا دیتی ہے، ہر مشکل کو آسان کر دیتی ہے۔ انسان کی محبت میں خدا کی رحمت کی تاثیر ہے۔ تجھے یقین نہ آئے تو تجربہ کر کے دیکھ لے۔"

حکیم مسیح نے سر جھکا لیا اور زار و قطار رونے لگا۔

"حکیم مسیح!" مسافر اچانک بول اٹھا "مسلمان کسی خاص ملک میں پیدا ہونے سے نہیں بنتا۔ اسلام کسی خاص طرزِ معاشرت کا نام نہیں مسلمان بننا چاہتے ہو تو جاؤ، خدا کو سجدہ کرو، دنیا کی مصیبتیں جھیلو، دوسروں کی خدمت کرو، ان پر سے زندگی کا بوجھ ہلکا کرو، تمہارے دل میں ایمان کا خزانہ ہے۔"

حکیم مسیح کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اس قدر روئے تھے کہ تکیہ بھیگ گیا تھا لیکن ان کو اب سرخ سرخ آنکھوں کی پروا تھی نہ تھکے ماندے جسم کی۔ انہوں نے "یا رسول" کا نعرہ مارا۔ پلنگ پر سے اُچک کر دوڑتے ہوئے اصطبل گئے اور ایک گھوڑے پر بغیر زین کے سوار ہو کر خالد پور کی طرف چل دیئے۔

رات کو حکیم مسیح کے جانے کی خبر سن کر خالد پور کی آبادی میں اُدھم مچ گیا۔ کسی میں اتنی ہمت باقی نہ رہ گئی تھی کہ طاعون سے بچنے کی امید کرے اور ہر شخص اپنا ماتم کرنے لگا لیکن سویرے جب حکیم مسیح کی واپسی کی خبر مشہور ہوئی تو ہر ایک کی جان میں جان آ گئی۔ جس نے بھی یہ خبر سنی وہ اپنا دل مضبوط کر کے ان کے مطب میں بھاگا ہوا آیا اور اس نے حکیم مسیح کو دواخانہ کے دروازہ پر بیٹھا پایا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے شرمندگی سے ان کی نظریں نیچی تھیں۔ مگر جس کسی نے چاہا نبض دکھائی اور دوائی۔

اُدھر صبح سویرے جب مسلمان قافلے نے کوچ کی تیاری کی تو معلوم ہوا کہ حکیم مسیح غائب ہیں۔ نوکروں میں سے ایک نے کہا کہ اس نے رات کے تیسرے پہر "یا رسول" کا ایک نعرہ سنا تھا۔ لیکن اس سے زیادہ وہ اور کچھ نہ بتا سکا۔ حکیم مسیح کی بیوی کو جب یہ معلوم ہوا تو فوراً سمجھ گئیں کہ وہ خالد پور واپس بھاگ گئے ہیں۔ وہ بہت روئیں، اپنے دونوں بچوں کو بھائی کے سپرد کیا اور بیوہ کی زندگی سے بچنے کے لئے بیوی کی موت مرنے خالد پور چلیں۔ جب وہ اپنے گھر پہنچیں تو شام ہو چکی تھی۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ حکیم صاحب سویرے سے دواخانہ کے سامنے بیٹھے ہیں نہ پانی پیا ہے، نہ کھانا کھایا ہے، بال پریشان ہیں، آنکھیں سرخ، لیکن مریضوں کا تانتا بندھا ہے اور وہ برابر نبض دیکھ رہے ہیں اور دوائیں دے رہے ہیں۔ انھوں نے نوکر کے ذریعہ سے کچھ کہلا بھیجا۔ مگر نوکر کو حکیم صاحب کے پاس پہنچنے میں زیادہ دیر لگی، اور جب وہ پہنچ گیا تو حکیم صاحب نے

نہ اسے پہچانا نہ اس کی بات سمجھے۔ رات بھر انہوں نے حکیم صاحب کی آمد کا نہایت بے تابی سے انتظار کیا۔ لیکن جب وہ سویرے تک نہیں آئے تو خود باہر پہنچیں۔ وہاں ابھی سے لوگ موجود تھے لیکن انہیں دیکھ کر راستہ چھوڑ دیا اور وہ حکیم صاحب کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئیں۔ حکیم مسیح انہیں آسانی سے پہچان نہ سکے۔ لیکن جب پہچان لیا تو مسکرائے، کچھ سوچا اور کہا:

"لالہ سیتارام کی بیوی بیمار ہیں۔ میں نے دوا بھیج دی ہے لیکن ان کی تیمارداری کے لئے کوئی نہیں۔ اگر آپ وہاں چلی جائیں......"

حکیم مسیح کی بیوی نے شوہر پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ پچھلے دنوں کی تکان کا نام و نشان نہ تھا، آنکھیں اب بھی سرخ تھیں مگر چہرہ سے نور برس رہا تھا۔ کپڑوں پر کچھ مٹی سی لگی رہ گئی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ رات کو زمین پر سوئے ہیں۔ یہ ایک نظر کافی تھی، وہ باہر نکلیں اور راستہ پوچھتے پوچھتے لالہ سیتارام کے گھر پہنچ گئیں......

خالد پور میں دو ماہ تک طاعون کا دور رہا، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بیماروں کا علاج کیا جاتا تھا لیکن بیماری کو روکنے کی تدبیر کوئی نہ تھی۔ لیکن اگر حکیم مسیح نہ ہوتے تو غالباً ساری بستی تباہ ہو جاتی۔ ان کی موجودگی سے وہم اور خوف جو اکثر بیماری سے زیادہ مہلک ثابت ہوتے ہیں لوگوں کے دلوں میں جڑ نہ پکڑ سکے۔ کوئی مریض ایسا نہیں تھا جسے وہ دیکھ نہ سکے ہوں یا جس کی ہمت ان کے اخلاق اور ہمدردی نے دوگونہ نہ کی ہو۔ وہ دن رات مریضوں کو دیکھنے میں اور ان کے لئے دوائیں تیار کرنے میں مشغول رہتے تھے۔ لیکن یہ بھی ان کو تسکین دلانے کے لئے کافی نہ تھا اور وہ چاہتے تھے کہ مردوں کو نہلانے دھلانے اور جلانے کو شہر سے باہر پہنچانے میں مدد دیں لیکن اس کام کے لئے ان کی کبھی ضرورت نہیں ہوئی۔ یہ ان کی بیوی نے اپنے ذمہ لے لیا تھا جس کو وہ علاوہ عورتوں کی تیمارداری اور یتیم بچوں کی دیکھ بھال کے کرتی تھیں۔ اپنی اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے اس زمانے میں وہ اکثر ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہ سکتے۔ مگر بستی والوں کو ان دونوں سے اس قدر محبت ہو گئی تھی کہ حکیم صاحب کو ان کی بیوی کی اور ان کی بیوی کو حکیم صاحب کی خبر ہر وقت پہنچتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ بیماری اور موت کی پریشانیوں میں دوسرے انہیں بھول گئے اور ان کے ضمیر نے ملاپ کے لئے فرائض ترک کرنے کی اجازت نہ دی مگر ان کے دلوں میں خدا پر اس قدر قوی اور زندہ ایمان تھا کہ مایوسی، خود غرضی یا خوف ان کے پاس نہ پھٹکنے پائے اور وقت اور فاصلہ ان کی روحوں کو جدا نہ کر سکا۔

آخر کار طاعون کا زور کم ہوا اور اب وہ حالت ممکن ہونے لگی جسے حکیم مسیح موت کی سزا سے زیادہ تکلیف دہ سمجھتے تھے۔ مریض کم ہو گئے، کام کم ہو گیا اور فرصت کا وقت بڑھا مگر اب حکیم مسیح ہندو آبادی میں گھل مل گئے تھے۔ جو دیوار وہم نے ان کے اور ہندوؤں کے درمیان میں کھڑی کر دی تھی نیست و نابود ہو چکی تھی۔ بغیر کسی کوشش کے حکیم مسیح کا مکان بستی کی زندگی کا مرکز بن گیا تھا۔ ایک درگاہ جہاں حاجت مند مدد کے لئے آتے تھے، ماہرانِ فن قدردانی اور ہمت افزائی کے لئے، مظلوم شکایات کے لئے اور جھگڑالو انصاف کے لئے۔ ان کی شہرت کا ڈھنڈورا دور دور تک پٹ چکا تھا، لوگ دور دور سے ان کے پاس آتے تھے اور دل میں اس کا افسوس واپس لے جاتے تھے کہ حکیم صاحب کافی مشہور نہیں۔ جس نے حکیم مسیح کا نام سنا وہ ان کی بیوی کی شخصیت سے بھی ضرور واقف ہو جاتا تھا۔ ان کے لئے ہر جگہ سے قیمتی تحفے آتے تھے، گھر کا سامان، کپڑے، جواہرات ایسے جو بادشاہوں اور رئیسوں کو بھی نصیب نہیں ہوتے مگر حکیم صاحب اور ان کی بیوی اپنے مکان میں غریبوں کی طرح سے رہتے تھے۔ تجربہ انہیں سکھا چکا تھا کہ دنیا کی اصل نعمت کیا ہے اور تحفوں کو ہمیشہ اسی محبت سے دوسروں کو دے دیتے تھے جس سے وہ ان کی خدمت میں پیش کئے جاتے تھے۔

خالد پور میں کوئی ایسا ذاتی یا عام معاملہ نہ تھا جس کا حکیم مسیح اور ان کی بیوی کو علم نہ ہو، اور نہ کوئی ایسی تقریب تھی جس میں ان کی شرکت لازمی نہ سمجھی جاتی ہو لیکن باوجود اس کے ان کی زندگی کا ایک پہلو تھا جس کا راز سوائے ان کے اور ان کے خدا کے کسی پر ظاہر نہ تھا۔ لوگ انہیں معروف دیکھتے تھے انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ان دونوں کے دل کہیں اور ہیں اور وہ محبت اور پیار کی نظریں جو وہ اوروں پر برساتے ہیں اسی محبت کا دھندلا عکس ہے جس میں ان کی ہستیاں فنا ہو گئی ہیں۔ وہ دونوں بھی جانتے تھے کہ یہ محبت کوئی ہوائی چیز نہیں ہے، خود بخود پیدا نہیں ہوئی اور ہر حالت میں قائم نہیں رہ سکتی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہی ان کی انسانیت کا جوہر ہے اور اگر وہ اس کی قیمت کم نہیں کرنا چاہتے تو انہیں وہ آگ جلاتے رہنا چاہئے جس میں وہ پختہ ہوئی تھی

اس لئے جب حکیم مسیح نے دیکھا کہ طاعون انہیں بہت مصروف نہیں رکھتا تو انہوں نے خالد پور کے باشندوں سے ایک مسجد بنانے کی اجازت مانگی۔ وہ اس پر بہت خوشی سے راضی ہو گئے بلکہ یہ خواہش بھی کی کہ چندہ جمع کر کے ایک عالی شان عمارت بنائی جائے لیکن حکیم مسیح کو یہ منظور نہ ہوا۔ انہوں نے اپنی بیوی کی مدد سے ایک چھوٹی سی کچی مسجد ایک بڑے سایہ دار درخت کے نیچے تیار کر لی جس میں صرف یہ خوبی تھی کہ اسے دو سچے مسلمانوں نے اپنے دین اور اپنی محبت کو پختہ کرنے کے لئے بنایا تھا۔

ہر شام کو مغرب کے وقت حکیم مسیح اپنی بیوی کو ساتھ لے کر اس مسجد میں جایا کرتے تھے اور وہاں کبھی ایک گھنٹہ، کبھی دو کبھی ساری رات گذارتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کی بیوی کو آنے میں ذرا دیر ہو گئی۔ وہ مغرب کی نماز پڑھ چکے تھے' ان کی بیوی پڑھ رہی تھیں۔ حکیم مسیح ان کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے۔ ان کی بیوی نہایت خلوص سے نماز پڑھ رہی تھیں اور اس خلوص سے ان کے چہرہ پر ایسی رونق آگئی تھی کہ حکیم مسیح اپنی نظر نہ ہٹا سکے۔ دیکھتے دیکھتے انہیں یاد آیا کہ انہوں نے اپنی بیوی سے نہ اپنے خواب کا ذکر کیا ہے نہ اس آہنی جسم والے مسافر کا جس نے ان کو خالد پور واپس بھیجا۔ وہ خود اس خواب کے اثر میں ایثار کی مصیبتیں جھیل سکتے تھے' اس بیچاری عورت کو یہ روحانی تقویت بھی میسر نہیں ہوئی مگر اس پر بھی وہ ان سے ایک قدم پیچھے نہیں رہی۔ یہ ہمت سوائے اس محبت کے جو آہنی جسم والے مسافر کی طرح حکیم مسیح بھی دل ہی دل میں اپنی بیوی کے قدموں پر گرے اور اس سے التجا کی کہ اپنی محبت سے ان کی ہمت کو دو گونہ کرے' ان کے فرائض یاد دلاتی رہے اور انہیں ادا کرنے کی قوت بخشے۔

جب ان کی بیوی نے سلام پھیرا تو انہوں نے دیکھا کہ حکیم مسیح کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہیں اور وہ ٹکٹکی لگائے ان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے وجہ پوچھی۔ حکیم مسیح کچھ دیر تک جواب نہ دے سکے۔ پھر اپنے خواب کا سارا قصہ سنایا اور آخر میں کہا:

"تم کو شاید یاد ہو' میں نے ایک مرتبہ اسی وقت شام کو ایک ایسے کیمیاگر کی آرزو کی تھی جو اس ملک کو میرا وطن بنا دے' اس قوم میں مجھے کھپا دے۔ دیکھو اس کیمیاگر نے ہم دونوں کو کیا سے کیا بنا دیا۔"

باتیں کرتے کرتے حکیم مسیح اپنی بیوی کے بالکل پاس پہنچ گئے تھے۔ ان کی بی بی نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا کر چوما' ان کے منہ پر ایک دعا پڑھ کر پھونکی اور پھر دونوں اپنے کیمیاگر کے تصور میں محو ہو گئے۔

اختر انصاری

نازو

میرے شوہر کو مناظرِ قدرت اور ان کی دل پذیر رنگینیوں سے بہت محبت ہے اسی لئے ہم شہر سے بہت کافی فاصلے پر رہتے ہیں۔ ہمارے چھوٹے سے مکان کے گرد ایک چھوٹا سا احاطہ ہے جس میں پھول ہیں، کیاریاں ہیں اور روشیں ہیں لیکن اس احاطے کے باہر عروسِ فطرت دستِ انسانی کی گستاخیوں سے ناآشنا ہے۔ چاند، سورج، مینہ اور شبنم مشاطہ کے فرائض دن رات انجام دیتے ہیں اور اس کے سادہ حسن اور معصوم شباب کو برقرار رکھتے ہیں۔ ہمارا مکان فطرت کی ان شادابیوں میں اس طرح محصور ہے جس طرح ایک آشیانہ درخت کے سرسبز پتوں اور گھنی شاخوں میں گھرا ہوتا ہے۔ مکان سے کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر ریل کی پٹڑی ہے جس پر سے دن رات ریلیں گذرتی ہیں۔

یہ گذرنے والی ریلیں اکثر مجھے نازو کی یاد دلاتی ہیں۔ اس نازو کی جو اپنی بہن کی گود میں پرورش پاکر اپنی بہن کو داغ دے گئی، جو جوان ہوئی اور جوان ہو کر مر گئی۔ جو گلاب کے پھول کی طرح شاداب تھی اور چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن، لیکن جس کی جوانی ان دونوں کی جوانی سے بھی زیادہ مختصر تھی۔

اماں جان کی ناگہانی موت کے وقت نازو صرف تین برس کی تھی۔ میں نے اس کو بڑی محبت اور بڑی محنت سے پالا۔ سارا دن گود میں لئے رہتی اور ساری ساری رات پنگوڑے میں لٹا کر لوریاں دیتی۔ میں اس کو اس قدر پیار کرتی تھی کہ اگر اماں جان بھی زندہ ہوتیں تو شاید نہ کر سکتیں۔ وہ میری محبت بھری گود میں سانس لے کر بڑی ہوئی، جوان ہوئی۔ اس کی جوانی چڑھتی ہوئی آندھی کی طرح آئی۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے کچھ سے کچھ ہو گئی۔ اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ جہان بھر کی تابانیاں اور رونقیں اس میں سمٹ کر آ گئیں۔ اس کے سیاہ بال بے حد لانبے اور گھنے ہو گئے۔ اس کا قد اتنا دراز ہو گیا کہ اگر وہ منہ موڑ کر کھڑی ہوتی تو سچ مچ ایک عورت معلوم ہوتی۔ میں اس اٹھان، اس بالیدگی کو دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھی۔ لیکن آہ! مجھے یہ علم نہ تھا کہ یہ ساری پھبن، یہ تمام رعنائی ایک سراب ہے، ایک دھوکا ہے۔ یہ جوانی جو آندھی کی طرح آئی ہے ایک جھونکے کی مانند گذر جائے گی۔

ہائے وہ کیسی منحوس اور نامراد صبح تھی جب نازو نے مجھ سے کہا تھا "آپا میرے سر میں درد ہے اور کچھ حرارت محسوس ہو رہی ہے"۔ میں نے اس کے چڑھتے ہوئے بخار کو سوءِ ہضم کا نتیجہ سمجھا تھا اور زیادہ توجہ نہ کی تھی۔ اس وقت میں کیا جانتی تھی کہ یہ بخار وہ بخار نہیں ہے جو ایک دن کی دوا کے

بعد اتر جاتا ہے۔ بلکہ وہ بخار ہے جو اکثر و بیشتر موت کا نقیب بن کر آتا ہے۔ ابا جان نے علاج میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ دہلی کے افضل سے افضل طبیب بلوائے اور جب ان کی کوششیں نامشکور رہیں تو باہر والوں سے رجوع کیا۔ لیکن بخار کسی طرح نہ اترا اور بالآخر ایک دن مجھ نامراد کو یقین دلا دیا گیا کہ کوئی ارضی طاقت میری بہن کو موت کے منہ سے نہیں بچا سکتی۔ مجھ سے جتنا رویا گیا میں روئی، جتنا غم کیا گیا کیا، اور جتنی دعائیں مانگی جا سکیں مانگیں مگر طبیبوں کی اس رائے میں تبدیلی نہ ہوئی اور میری ناز کی پالی ہوئی نازو اسی طرح موت سے قریب تر ہوتی چلی گئی۔

نازو بچپن سے ایک بہت خاموش اور کم سخن لڑکی تھی۔ وہ بات کرنا جانتی ہی نہ تھی، صرف رونا جانتی تھی۔ جب تک اس نے ہوش نہیں سنبھالا بات کہنے کی بجائے ہمیشہ آنسو ہی بہائے۔ یعنی اگر کبھی اس کو کسی چیز کی ضرورت ہوتی یا کوئی تکلیف ہوتی تو بجائے اس کے کہ مجھ سے آ کر کہے وہ کسی جگہ تنہائی میں بیٹھ کر رونے لگتی۔ جب بڑی ہو گئی تو یہ رونا تو بہت کم ہو گیا لیکن زبان کی ویسی ہی گونگی رہی۔ چنانچہ اس نے اپنی طویل بیماری کے زمانے میں کبھی زبان سے کچھ نہ کہا۔ دن دن بھر خاموش آنکھیں کھولے پڑی رہتی۔ طبیبوں نے جو اس کی صحت کی طرف سے مایوسی ظاہر کی تھی، اس کی بابت اس سے کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ نادان نہ تھی، سب کچھ جانتی تھی اور اپنی بیماری کی نوعیت سے اچھی طرح واقف تھی۔ ایک دفعہ ——— یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ چلتی پھرتی تھی اور ابھی اتنی کمزور نہیں ہوئی تھی کہ بستر سے بھی نہ اٹھ سکے ——— اس نے اپنے صندوق میں سے ایک قیمتی دوپٹہ نکال کر اوڑھ لیا۔ ایسے دوپٹے عام طور پر کسی تقریب کے سلسلہ میں نکالے جاتے ہیں اور روزانہ استعمال میں نہیں آتے۔ جس خیال کے تحت اس نے یہ دوپٹہ اوڑھا تھا مجھ پر اچھی طرح واضح تھا۔ تاہم میں نے تجاہل سے کام لیا اور جب وہ سامنے آئی تو مصنوعی تعجب کا اظہار کیا۔ لیکن وہ جواب میں بالکل خاموش رہی۔

اس طرح اکثر اس کی باتوں سے یہ ظاہر ہوا کہ وہ اپنے لاعلاج مرض کو پہچانتی ہے اور نتیجہ سے اچھی طرح واقف ہے۔

جب نازو تندرست تھی ——— بیمار نہ پڑی تھی ——— تو اس کے جوان دل میں بہت سی جوان آرزوئیں تھیں۔ بخار میں یہ آرزوؤں کا لہلہاتا ہوا چمن بالکل جھلس کے رہ گیا اور اس کے سارے ذوق و شوق ختم ہو گئے لیکن اس حالت میں بھی دو ارمان اس کے دل میں باقی تھے۔ وہ ریل میں بیٹھنا چاہتی تھی اور زبیدہ آپا کے بیاہ میں شریک ہونے کی آرزومند تھی۔

نازو دہلی میں پیدا ہوئی اور ہوش سنبھالنے کے بعد کبھی دہلی سے باہر نہیں گئی۔ اس لئے اس کو ریل کے سفر کا ارمان تھا۔ جن لوگوں کی رشتہ داری شہر سے باہر ہوتی ہے انہیں ریل کا سفر آئے دن درپیش رہتا ہے۔ لیکن ہمارے تمام عزیز و اقارب دہلی ہی میں تھے۔ صرف نانا ابا کی وجہ سے تھوڑا سا تعلق میرٹھ سے تھا کہ وہ وہاں برسوں سے مقیم تھے چنانچہ جب نازو گود میں تھی تو اماں جان کے ساتھ چند مرتبہ میرٹھ گئی بھی تھی لیکن اس کو اس زمانے کا کچھ ہوش نہ تھا۔ پھر ادھر تو اماں جان کا انتقال ہوا اور ادھر نانا ابا کی آنکھیں بند ہوئیں، یہ تعلق بالکل ختم ہو گیا اور نازو ہوش سنبھالنے کے بعد کبھی دہلی سے باہر نہ جا سکی۔ اس کی دوسری خواہش یہ تھی کہ وہ کسی لڑکی کے بیاہ میں شریک ہو۔ وہ بیاہ کی تمام رسموں کو دیکھنا چاہتی تھی اور اپنے اس شوق کے متعلق اکثر باتیں کیا کرتی تھی۔

بیماری سے کچھ دنوں پہلے اس کو امید ہو گئی تھی کہ اب یہ دونوں خواہشیں بہت جلد پوری ہو جائیں گی۔ میرٹھ میں ہماری خالہ کی لڑکی زبیدہ کا بیاہ ہونے والا تھا۔ خالہ اماں نے ابا جان کو لکھا تھا کہ زبیدہ کی شادی اکتوبر میں ہوگی اور میں سب کو میرٹھ بلاؤں گی۔ وہ دن اور ہفتے گن گن کر کاٹ رہی تھی اور ابھی مارچ ہی کا مہینہ شروع ہوا تھا کہ اس موذی بخار نے اس کو آ لیا۔

پھر بھی میں نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ جب زبیدہ کا بیاہ ہوگا تو میں تجھ کو ساتھ لے کر میرٹھ جاؤں گی اور فی الحقیقت میں اس کو لے جانا چاہتی تھی تاکہ اس کے دل میں یہ ارمان نہ رہ جائے۔ جب بیاہ میں ایک ہفتہ رہ گیا اور خالہ اماں نے بلاوے کا خط لکھا تو میں نے ابا جان سے ذکر کیا اور نازو کو میرٹھ لے جانے کی اجازت مانگی۔ انہوں نے قطعیت کے ساتھ انکار کر دیا۔ مجھے اس کی بالکل امید نہ تھی۔ میں حیران و ششدر رہ گئی۔ تھوڑی دیر کے لئے بدحواس ہو گئی اور پھر جب میں ذرا سنبھلی اور مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ یہ صدمہ نازو کے لئے ناقابلِ برداشت ہوگا تو میں نے اپنی

تمام کوششیں ابا جان کو راضی کرنے کے لئے صرف کر دیں۔ میں روئی بھی، منتیں بھی کیں، اوروں سے سفارشیں بھی کرائیں لیکن ابا جان نے جو ایک دفعہ کہہ دیا تھا وہی کہتے رہے۔

نازو خالہ اماں کے خط کی اطلاع پا کر بہت خوش ہوئی تھی اور اس دن سے دل ہی دل میں امید کر رہی تھی کہ اب بہت جلد میرٹھ کے سفر کی تیاریاں ہوں گی لیکن تین دن گذر گئے اور نہ ابا جان نے اجازت دی اور نہ مجھ میں کسی وقت باوجود کوشش کے اتنی ہمت پیدا ہو سکی کہ میں نازو سے کہہ دیتی کہ پیاری نازو! تمہارے ابا میاں تم کو میرٹھ جانے کی اجازت نہیں دیتے، تم وہاں نہ جاؤ گی۔ آخر چوتھے روز دوپہر کے وقت جب وہ کھانا کھا کر لیٹی تو میں نے جی کڑا کر کے کہا: "نازو! صبح کی ڈاک سے خالہ اماں کا دوسرا خط آیا ہے۔ زبیدہ کی شادی ملتوی ہو گئی ہے۔ غالباً ایک دو مہینے کے بعد ہو گی" نازو نے یہ سن کر نظریں جھکا لیں اور منہ سے کچھ نہ کہا۔ تھوڑی دیر بعد میں اس کی دوا لینے الماری تک گئی۔ جب دوا شیشے میں انڈیل کر لائی تو میں نے دیکھا کہ نازو کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سیلاب جاری ہے۔ یہ آنسو اس کے زرد زرد رخساروں سے ڈھلک کر نیچے گر رہے ہیں اور تکیے کو بھگو رہے ہیں۔

اس واقعہ کو پانچ برس گزر چکے ہیں۔ اب نہ نازو ہے نہ ابا جان ہیں، نہ وطن ہے، نہ وہ گھر ہے جس میں میں نے اپنی زندگی کا عظیم ترین صدمہ برداشت کیا۔

میں ہوں، میرا ویران دل ہے، پردیس ہے اور میرا جنگل میں یہ مکان ہے۔ رات کو جب ہر طرف سناٹے کا عالم ہوتا ہے، آسمان سے تاریکیاں برستی ہیں اور جنگل کی وسیع پہنائیوں سے جھینگروں اور مینڈکوں کے شور کے سوا کوئی آواز نہیں آتی تو ٹھیک ساڑھے نو بجے، ریل اپنی شاندار ہیبت انگیز گڑگڑاہٹ کے ساتھ میرے مکان کے سامنے سے گزر جاتی ہے۔ اس وقت میں ایسا محسوس کرتی ہوں کہ نازو افق کے کسی بعید ترین گوشے سے حسرت و اشتیاق کے ساتھ ریل کو دیکھ رہی ہے اور اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھائے ہوئے ہے لیکن جب ریل اس کے اشتیاق کو پامال کرتی ہوئی، اس کے ارمانوں کو کچلتی ہوئی، سفاکانہ بے التفاتی کے ساتھ نکل جاتی ہے تو اس کے ہاتھ گر پڑتے ہیں۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگتے ہیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔

شوکت تھانوی

دولت خانہ

میں ابھی بستر کی چارپائی کر بستر کا پان کھانے کے لئے بیگم کو پاندان کی طرف متوجہ ہی کر رہا تھا کہ دروازے پر کسی نے دستک دی اور مجبوراً اسی حالت میں باہر آنا پڑا۔ باہر نکل کر دیکھا ریاض کھڑا مسکرا رہا تھا۔ میں نے دوڑ کر لپٹتے ہوئے کہا۔

"ارے ریاض۔ کمال کر دیا تم نے۔ یعنی تم مرے نہیں؟"

بات یہ ہے کہ ہم دونوں ساتھ ساتھ ہندوستان سے پاکستان کے لئے روانہ ہوئے تھے اور جب جالندھر کے قریب ہمارے قافلے پر حملہ ہوا ہے تو اس حملے کے بعد جتنے ساتھی نظر نہ آئے ان سب کے متعلق یہ طے کر لیا تھا کہ شہید ہو چکے ہوں گے بلکہ لاہور پہنچکر اس ریاض کی غائبانہ نماز جنازہ تک میں شریک ہو چکے تھے۔ مگر ریاض زندہ سلامت کھڑا ہوا مزے سے سگریٹ پی رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"اب یہیں کھڑے کھڑے محبت جتا دو گے یا گھر میں بھی لے چلو گے؟"

میں نے گھبرا کر کہا "گھر؟ —— ہاں ٹھیک ہے یہ گھر ہی تو ہے۔ ایک منٹ ٹھہرو۔" اور دروازے کے اندر جھانک کر کہا: "میں نے کہا سنتی ہو۔ ریاض آ گیا ہے ذرا پردہ کر لو۔ اندر ہی بلا لیں۔"

ایک منٹ میں پردہ ہو گیا اور ریاض کو میں نے ڈرائینگ روم میں بلا لیا۔ ریاض نے اندر داخل ہو کر چاروں طرف دہشت سے گھور گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب یعنی بس۔ صرف ایک دروازے کی کوٹھڑی جس میں صرف ایک چارپائی آ سکتی ہے تم اس میں رہتے کس طرح ہو؟ اور یہ جو تم نے بھابی سے پردہ کرنے کو کہا ہے وہ آخر گئیں کہاں اور کس دروازے سے گئیں۔ مجھ کو تو صرف ایک دروازہ نظر آ رہا ہے جس سے میں داخل ہوا ہوں۔"

میں نے کہا: "ہاں دروازہ تو اتفاق سے ایک ہی ہے ——"

ریاض نے ایک اور دروازہ دیکھتے ہوئے کہا: "اچھا یہ ہوگا اندر جانے کا دروازہ۔"

اس کی غلط فہمی رفع کرنے کے لئے عرض کیا: "جی نہیں یہ الماری ہے۔" اور الماری کھول کر ریاض کو دکھا دی جس میں تین تختے لگے ہوئے تھے۔

ریاض نے پاگل ہو جانے کے قریب پہنچتے ہوئے کہا۔ "اے بھائی تو بھابی کہاں سما گئیں؟"

اب میں نے اس معمے کے حل میں دیر کرنا مناسب نہ سمجھا اس لئے کہ میں ریاض کے حالات معلوم کرنے کے لئے بے صبر ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"میاں مبارکباد دو مجھ کو کہ مجھے یہ کوٹھڑی مل گئی ہے اور تم سے کسی فٹ پاتھ پر ملاقات نہیں ہوئی جہاں تمہاری بھابی کو تم سے پردہ بھی نہ کرا سکتا۔ خوش نصیب ہوں میں کہ خانہ بدوش نہ بنا اور شکر ہے اُس پروردگار کا جو خود لامکان ہے مگر مجھے مکان دے دیا۔"

ریاض نے جل کر کہا۔ "عجیب آدمی ہیں آپ یعنی آپ اسے مکان کہہ رہے ہیں!"

نہایت اطمینان سے کہا۔ "ہاں میں نے اپنی ضرورتوں کو اس کوٹھڑی میں سمیٹ لیا ہے۔ ایک بیوی تین بچے اور پانچواں میں خود۔ سب نہایت اطمینان سے اس میں رہتے ہیں یہی میرا ڈرائنگ روم ہے یہی میرا بیڈ روم ہے۔ یہی میرا آفس ہے۔ یہی میری لائبریری ہے۔ یہی کھانے کا کمرہ ہے اور یہی کھانا پکانے کا کمرہ۔" اور پھر میں نے ذرا پکار کر کہا۔ "اے بیگم میں نے کہا کشتی ہو تو ذرا پان بھیجد ینا۔" اس پر ریاض نے پھر اِدھر اُدھر دیکھا کہ یہ آواز آخر کہاں ہو سکتی ہے۔ آخر اس نے واقعی پریشان ہو کر پوچھا۔ "بھابی آخر ہیں کدھر؟"

میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "یہیں ہیں اور کہاں ہوتیں ہے

عفو کیسا جلوۂ رحمت بھی نکلے گا یہیں

ذوقِ عصیاں چاہیئے عرفانِ عصیاں چاہیئے"

ریاض کو غالباً یہ شعر قطعاً پسند نہ آیا۔ اس نے ذرا تلخی سے کہا۔ "یہ آخر معمہ کیا ہے بتاتے کیوں نہیں صاف صاف۔"

میں نے کہا۔ "بھائی میرے کہہ چکا ہوں تم سے بس یہی اتنی سی جگہ ہے اسی میں اپنی تمام ضرورتیں پوری کرنا پڑتی ہیں۔ یہ الماری دیکھ رہے ہو اس کے تینوں تختوں پر تینوں بھتیجے سوتے ہیں تمہارے، رات کو اوپر والے خانے میں بڑا بچہ درمیانی تختے پر منجھلا نیچے چھوٹا جو ابا نے میں پیدا ہوا تھا۔"

ریاض نے حیرت سے کہا۔ "کہاں ہے یعنی اس الماری میں۔ اے بھئی اس میں تو ٹانگیں بھی نہ پھیلاتے ہوں گے یہ بچے۔"

میں نے کہا۔ "ٹانگیں پھیلانا یا سمیٹے رہنا سب عادت پر منحصر ہے۔ اب ان کو ٹانگیں سمیٹ کر سونے کی عادت پڑ گئی ہے اور ان کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی، صبح اٹھنے کے بعد دن بھر ٹانگیں پھیلاتے پھرتے ہیں وہ مثل تو تم نے سنی ہوگی کہ چادر دیکھ کر پیر پھیلائے جاتے ہیں۔ میں نے اس میں بس ذرا سی ترمیم کر دی ہے کہ الماری دیکھ کر پیر پھیلانا میرے بچو!"

ریاض نے ہکا بکا ہو کر کہا۔ "بچے نہ ہوئے اچار کا مرتبان ہو گئے۔ شربت کی بوتلیں ہو گئے کہ الماری میں رکھے جاتے ہیں۔ اور بھابی اس وقت کس الماری میں ہیں؟"

اور یہ کہہ کر وہ ایک دم اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے سے سخت وحشت برس رہی تھی۔ وہ وحشت جو اچانک کرنٹ لگ جانے سے کسی پہ برس سکتی ہے۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ میں خود گھبرا گیا اس کی یہ حالت دیکھ کر اور جلدی سے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

اُس نے سہمے ہوئے انداز سے پلنگ کو گھورتے ہوئے کہا۔ "یہ اچھلا تھا۔ جیسے کسی نے ٹھوکا دیا ہو مجھے۔" اور میں نے ہنس کر کہا۔ "لاحول ولاقوۃ۔ وہ سمجھی ہوں گی کہ میں اُدھر بیٹھا ہوں۔" اور پھر پلنگ کے نیچے ہاتھ ڈال کر خاصدان لے لیا۔ ریاض آنکھیں پھاڑے یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ جیسے اُسے سکتہ ہو گیا ہو۔ جب میں نے خاصدان کھول کر پان اُس کی طرف بڑھائے تو اُس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"تو کیا بھابی پلنگ کے نیچے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "جب کوئی آجاتا ہے وہ پلنگ کے نیچے ہی پردے میں چلی جاتی ہیں۔ کافی اونچا پلنگ ہے اندر اس کے نیچے دری بچھی ہوئی ہے

چاروں طرف چادر لٹک رہی ہے اچھا خاصا محل ہے ۔"

ریاض نے حسرت کے انداز میں کھڑے ہوتے ہوئے کہا "لاحول ولاقوۃ ۔ چلو باہر چلیں یہ کیا بیہودگی ہے کہ ان کے سر پہ سوار بیٹھے ہیں ۔"
بیگم نے پلنگ کے نیچے سے فرمایا "نہیں بھائی صاحب آپ تشریف رکھیے یہ تو خانہ بے تکلف ہے یہاں ان باتوں کا خیال چھوڑ دینا پڑتا ہے ۔"

اور میں نے بھی ریاض کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا "بھیا وہ عادی ہو چکی ہیں آج یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے احباب آخر آتے ہی رہتے ہیں ۔ دوسرے وہ تو نہایت آرام سے بیٹھی ہوں گی اس پلنگ کے نیچے دری ہے چادر ہے ایک گاؤ تکیہ ہے پورے رئیسانہ ٹھاٹھ ہیں جب تک ہم لوگ بیٹھے رہیں گے وہ مزے سے چھالیہ کترتی رہیں گی ۔"

ریاض کی حیرت کسی طرح ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی کہنے لگا "صاحب عجیب عمل زندگی ہے ۔ الماری میں بچے پلنگ کے نیچے بیوی ایک وہ کی قبر نما کوٹھڑی اور اسی میں ساری کائنات !"

میں نے کہا "توبہ کرو ریاض تو بہ کرو ۔ یہ بڑا بول ہے ۔ میں تو خدا اس کوٹھڑی پر ناز کرتا ہوں ۔ اور میرے دوست میری قسمت پر رشک کرتے ہیں کہ مجھے یہ کوٹھڑی مل گئی ہے ۔ وہ جو زندگی بھر گوشۂ عافیت ڈھونڈتے آئے تھے اب پتہ چلا ہے کہ وہ دراصل یہی کوٹھڑی ہے ۔ اب ذرا اس کوٹھڑی کا پروگرام سن لو کہ رات کو جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں تینوں بچے احتیاط سے الماری میں رکھ دیئے جاتے ہیں اور ہم دونوں میاں بیوی اسی پلنگ پر اس طرح لیٹ جاتے ہیں جس طرح جوتے کے ڈبے میں جوتے رکھے جاتے ہیں یعنی ایک کی ایڑی ادھر پنجہ ادھر دوسرے کی ایڑی ادھر پنجہ ادھر ۔ صبح اٹھ کر وہ دیکھو کونے میں ایک انگیٹھی رکھی ہے اس پر بیگم چائے بناتی ہیں اور بڑا بچہ الماری کے اوپر والے خانے سے نکل کر دودھ لے آتا ہے پھر سب مل کر چائے پیتے ہیں اور بچے رات کا بچا ہوا کھا کر اسکول چلے جاتے ہیں صرف چھوٹا بچہ رہ جاتا ہے اس کے بعد بیگم برقع اوڑھ کر اور بچے کو گود میں لے کر شاپنگ کے لئے نکل جاتی ہیں اس لئے کہ ان کا خیال یہ ہے کہ مجھ کو دراصل گوشت کی پہچان ہے نہ میں ترکاری ٹھیک لا سکتا ہوں میں اس موقع کو غنیمت جان کر اس پلنگ کو کھڑا کر دیتا ہوں فرش سمیٹ لیتا ہوں اور سڑک کے نل سے ایک بالٹی پانی لا کر کوٹھڑی کا دروازہ بند کیا اور جھاڑو ہاتھ میں لے کر غسل شروع کر دیا ——"

ریاض نے ٹوکا "جھاڑو ہاتھ میں لے کر غسل ؟"

میں نے کہا "صاحب غسل کا غسل صفائی کی صفائی یعنی اپنی بھی صفائی کوٹھڑی کی بھی صفائی نہاتا جاتا ہوں اور جھاڑو دیتا جاتا ہوں ۔ پھر یہ جو میز تم کو نظر آ رہی ہے نا ۔ یہ بے نقاب ہو جاتی ہے اس کا سامان اٹھا کر الماری میں رکھ دیتا ہوں اور میز پوش ہٹاتا ہوں تو تلے اوپر رکھے ہوئے ٹرنک نمودار ہو جاتے ہیں ان میں سے اوپر والے ٹرنک میں میرے دفتر جانے کے کپڑے ہیں ۔ وہ پہن کر پھر ان ٹرنکوں پر میز پوش ڈال کر اس کو میز بنا دیتا ہوں اور اس کا سامان جوں کا توں اس پر سجا دیتا ہوں ۔ فرش پھر کر دیا جاتا ہے ۔ پلنگ پھر بچھ جاتا ہے اور میں سڑک کے نل سے ایک بالٹی پانی اور لا کر رکھ دیتا ہوں کہ دن میں بیگم کو تکلیف نہ ہو ۔ اس عرصے میں بیگم واپس آجاتی ہیں اور اپنی شاپنگ کے کمالات کا بڑے فخر سے اظہار فرماتی ہیں کہ دیکھو اس کو کہتے ہیں گوشت پھر یہ کہ سارے شہر میں اتنا سستا شاید ہی کہیں ملے اور ٹماٹر تو دیکھو سیب نظر آ رہے ہیں ۔ میں کچھ اخلاقاً اور کچھ اخلاصاً داد دیتا ہوا ان سے رخصت ہو کر دفتر چلا جاتا ہوں ۔ دفتر سے واپسی کا سودا میرے ذمے ہے یعنی صبح کے ناشتے کے لئے بسکٹ ۔ پان ۔ رات کے لئے کچا گوشت ترکاری وغیرہ اس سلسلے میں روز باتیں سننا پڑتی ہیں کہ یہ گوشت آخر کس جانور کا اٹھا لائے ہو اور یہ جو ترکاری لائے ہو یہ اصلی ہے یا بناسپتی ۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ اس قسم کے موقعوں پر اگر آدمی ذرا مسکرانے کا عادی ہو جائے تو بات زیادہ نہیں بڑھتی ورنہ اتنی سی کوٹھڑی میں بات کا بڑھ جانا نہایت خطرناک ہو سکتا ہے ۔ میاں بیوی کی لڑائی تو خیر برحق ہے بشرطیکہ

باقاعدہ میدانِ جنگ بستر ہو۔ ایک کمرہ لڑنے کے لئے ہو۔ دوسرا بیوی کے پھولی سوج کر بیٹھنے کے لئے تیسرا شوہر کے اینٹھ کر پڑ رہنے کے لئے اور چوتھا سہمے ہوئے بچوں کے لئے۔ پھر یہ کہ اس جنگ کے باوجود ملازم کم سے کم کھانا وغیرہ پکاتے رہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام ارمان اس کوٹھڑی میں چونکہ پورے نہیں ہو سکتے لہٰذا مجبوراً صلح صفائی سے کام رکھنا پڑتا ہے۔"

ریاض کو اب کچھ کچھ ہنسی آئی کہنے لگا: "عجیب مسخرے ہیں آپ بھی —"

میں نے کہا: "بھئی کون کافر تم سے مسخرا پن کر رہا ہے۔ میں تو محض اظہارِ واقعہ کر رہا ہوں۔ مگر اُستاد عجیب عجیب فوائد ہیں اس کوٹھڑی کے۔ تم کو معلوم ہے لکھنؤ میں میرا گھر سرائے کی حیثیت رکھتا تھا۔ آئے دن بھانت بھانت کے مہمان تو مستقل قیام کے لئے آتے رہتے تھے پھر مقامی مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا تھا کسی کے لئے چائے بن رہی ہے تو کسی نے کہا چائے نقصان کرتی ہے شربت منگاؤ۔ کوئی بے تکلف دوست ناشتہ مانگ بیٹھا دن بھر اور آدھی آدھی رات تک دربار گرم رہتا تھا۔ مگر جب سے یہ کوٹھڑی ملی ہے اوّل تو کوئی مہمان آیا ہی نہیں اور اگر آ بھی جائے تو اس کوٹھڑی میں رہنے کے بجائے غالباً یہی مناسب سمجھے گا کہ قیام کا انتظام کرنے کے لئے کسی کی جیب کاٹ کر جیل چلا جائے۔ مگر بہت سے مہمان ایسے ہوتے ہیں جن کو ٹھہرانے کے لئے خود جی چاہتا ہے اور پھر کلیجہ مسوس کر رہ جانا پڑتا ہے۔ مثلاً اب تم آ گئے ہو —"

ریاض نے بات کاٹ کر کہا: "بندہ نواز میں تو دو مہینے سے یہاں ہوں اور صرف دو چیزیں تلاش کر رہا ہوں ایک اپنے لئے مکان دوسرے جناب کا دولت خانہ۔"

میں نے کہا: "شکر ہے کہ ایک چیز تو آپ کو مل گئی رہ گیا مکان اس کے متعلق اگر آپ فارسی جانتے ہوتے تو یہ مصرع پڑھتا کہ۔ ع

ایں خیال است و محال است و جنوں

اور فی الحال آپ ہیں کہاں۔"

ریاض نے بیزاری سے کہا: "ہوتا کہاں ہوٹل میں ہوں۔ میرا کیا ہے اکیلی جان نہ جورو نہ بچے۔ پھر بھی آخر ہوٹل میں زندگی بھر تو کوئی رہ نہیں سکتا جی چاہتا ہے کہ اپنا بھی کوئی گھر ہوتا۔"

میں نے کہا: "خیر اپنا گھر تو خدا کے فضل سے پورا پاکستان ہے البتہ یہ کہو کہ ہوٹل کے اخراجات بہت ہوتے ہیں۔"

ریاض نے کہا: "بھیا اپنے کئے کی سزا بھگت رہا ہوں مجھے ایک مکان مل رہا تھا کرایہ زیادہ تھا اور مکانیت کم۔ تین کمرے تھے۔"

میں نے حیرت سے کہا: "ایک نہ دو یکمشت تین کمرے۔ اچھا تو پھر —"

کہنے لگا: "میں نے لینے سے انکار کر دیا اور زیادہ گنجائش کے مکان کی تلاش میں ناکام رہ کر پھر جو گیا اُسی مکان کو لینے تیسرے دن تو معلوم ہوا کہ اب اس میں تین خاندان آباد ہیں۔ اپنا سر پیٹ کر چلا آیا۔ پھر پتہ چلا کہ ایک اور مکان خالی ہے وہاں گیا تو صاحب خانہ نے نہایت بے تکلفی سے پوچھا کہ شادی ہو چکی ہے میں نے کہہ دیا نہیں۔ کہنے لگے کہ اگر میں اپنی لڑکی سے آپ کی شادی کر دوں تو اُسے کہاں لے جا کر رکھیئے گا۔ عرض کیا کہ گھر داماد بن کر رہنے کو تیار ہوں۔ وہ حضرت سخت برہمی سے بولے کہ میں شادی اس لئے تو کرنا چاہتا ہوں کہ لڑکی جائے تو کچھ گنجائش پیدا ہو گھر میں آپ آئے خود بھی یہاں سمانے چلتے پھرتے نظر آئیے۔"

میں نے کہا: "بھئی ریاض صاف بات یہ ہے کہ میں وعدہ تو نہیں کرتا مگر ایک موٹر گیراج خالی نظر آیا تھا۔ کچھ دن ہوئے دیکھو بات کرتا ہوں۔"

ریاض نے ٹوپی پیروں پر رکھنے کے انداز سے کہا: "میرے بھائی اگر وہ مل جائے تو میں بک جاؤں گا تمہارے ہاتھوں تم ابھی چلو میرے ساتھ۔"

لاکھ لاکھ کہا کہ یہ دفتر کا وقت ہے۔ مگر آخر دفتر کے ایک صاحب کو جا کر عرض دینا پڑی اور ریاض کے ساتھ اس موٹر گیراج کی تلاش میں نکل گئے مگر توبہ کیجیے وہاں ایک بزرگ والدین اپنے ایک درجن بچوں کو لئے گیراج کے باہر ہی نظر آئے۔ گیراج پر ٹاٹ کا پردہ پڑا تھا جس کے سوراخوں سے دھواں نکل رہا تھا اور اندر کسی ہانڈی میں مینتھی کا بگھار دیا جا رہا تھا۔

اب ریاض کو بھی مجھ پر شک ہے اور میں شب و روز اس کے لئے مکان اور رشتہ دونوں چیزیں ڈھونڈھ رہا ہوں کہ یا تو مکان مل جائے ورنہ کوئی اُسے گھر داماد بنا لے۔ آج خبر آئی ہے کہ ایک رئیس ہیں ان کے گھوڑے کا انتقال ہو گیا ہے خدا کرے اصطبل ہی مل جائے اور یہ چھینکا ریاض ہی کی قسمت سے ٹوٹا ہو۔

میرزا ادیب

درونِ تیرگی

کمرے کے سب دروازے، کھڑکیاں اور روشندان ایک مدت سے بند پڑے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کمرے کے اندر فضا پر ہر وقت ایک بوجھل، سرد اور بھیانک تاریکی رینگتی رہتی تھی۔ اس گھرے اندھیرے میں نہ تو کبھی سورج کی حیات آفریں شعاعوں نے سانس لینے کی کوشش کی تھی اور نہ کبھی چاند تاروں کی ٹھنڈی روشنی نے اسے چھوا تھا۔ اور نہ اور ہوا کی لہریں بھی کسی وقت اندر آنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ شاید انہیں بھی کمرے کی نحوست آثار منجمد تیرگی سے ڈر لگتا تھا۔

یہ کمرہ زندگی کی تمام مہرزائیوں سے بالکل محروم ہو چکا تھا ـــــ اور اگر اس میں زندگی کا کوئی نشان تھا بھی تو صرف ان ننھے ننھے نظر نہ آنے والے ہزاروں ذرات کی بدولت تھا جو ایک دیوار سے لے کر دوسری دیوار تک فضا میں دن رات سرکتے رہتے تھے۔ ان میں بھی حرکت اس وقت پیدا ہوتی تھی جب کبھی ہوا کی کوئی لہر یا سورج کی کوئی کرن دروازے کے سوراخ یا دیوار کی دراڑ میں سے اندر آ جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ان میں کبھی کسی قسم کا اضطراب یا ہلچل نظر نہیں آتی تھی۔ وہ تاریکی کے جزو بن کر رہ گئے تھے ـــــ ان میں انفرادیت نام کو بھی باقی نہیں رہی تھی۔

یہی ماحول طاری تھا کہ ایک دن اسی تاریک کمرے کے ایک تاریک تر گوشے میں ایک چھوٹا سا ذرہ نڈھال ہو کر زمین کے بالکل قریب پہنچ گیا اور انتہائی مایوسی کے عالم میں بولا:

”توبہ، کس قدر اندھیرا ہے، کہیں بھی روشنی کی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ نہ جانے کب اس سے نجات ملے گی؟“

یہ الفاظ سن کر ایک بڈھے ذرّے نے حقارت انگیز قہقہہ لگایا۔

”خوب! ناچیز ذرّے ہو کر روشنی کی سوچ رہے ہو۔ بیٹا! ہم اندھیرے کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں اس لئے ہمیشہ اندھیرے ہی سے وابستہ رہیں گے۔ ہمارا وجود تاریکی سے الگ نہیں ہے!“

”ہمیں کبھی نجات نہیں ملے گی کبھی اس اندھیرے سے باہر نہیں نکل سکیں گے؟“ ننھا ذرہ بولا۔

”کبھی نہیں ـــــ میری مانو ایسی بیہودہ باتیں نہ سوچا کرو۔ یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ تم ایک حقیر ذرّے ہو؟“

یہ کہہ کر بوڑھے ذرّے نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ننھا ذرّہ سہم کر خاموش ہو گیا۔ کچھ اور پوچھنے کی اس میں ہمت نہیں رہی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ اس نے اپنی ساری زندگی میں صرف ایک ہی دفعہ روشنی دیکھی تھی ——— اور اس وقت اس کا سینہ ایک شدید، تند و تیز ولولے کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ اس کی رگ رگ میں ایک لذت انگیز سنسنی سی دوڑ گئی اور اسے پہلی مرتبہ محسوس ہوا تھا کہ وہ ایک حقیر، بے مایہ وجود نہیں ہے ——— اپنی دنیا میں اس کی کچھ اہمیت بھی ہے ——— وہ کچھ کر بھی سکتا ہے، اس میں کچھ کر سکنے کی ہمت بھی ہے، اس کے سامنے ایک وسیع، ایک روشن دنیا پھیلی ہوئی ہے جس میں وہ پرواز کر سکتا ہے، ناچ سکتا ہے، گا سکتا ہے ——— مگر افسوس اسی وقت ہوا کے ایک جھونکے نے اسے دروازے سے پیچھے دھکیل دیا اور کچھ دیر کے بعد جب اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو اس کے ارد گرد دوبارہ بے کنار اور ہمہ گیر تاریکی چھائی ہوئی تھی اور اس کے جسم کا ہر عضو بری طرح دُکھ رہا تھا۔ اس کے سارے حسین خواب چٹان کی طرح سخت اندھیرے سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گئے تھے اور بظاہر تاریکی سے نکل کر روشن دنیا میں جانے کی کوئی امید باقی نہیں رہی تھی۔ تاہم شدید سے شدید مایوسی بھی اس مشعل کو بجھانے میں کامیاب نہ ہو سکی جو ایک مرتبہ روشنی دیکھنے کے بعد اس کے دل کی گہرائیوں میں جل چکی تھی ——— اسے توقع تھی کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور اندھیرے کی تہوں سے نکل کر باہر کی لامحدود دنیا میں پہنچ جائے گا ——— اور وہ اس وقت سے لے کر اس وقت تک اسی گھڑی کا انتظار کر رہا تھا۔

بوڑھے ذرّے کے تلخ اور ہمت شکن الفاظ نے اس پر گہرا اثر کیا تھا۔ اس لئے وہ اپنے وجود کو سنبھال نہ سکا اور زمین پر گر پڑا۔ چند لمحے خاموشی طاری رہی، وہ بے بس ہو کر، مجروح ہو کر، چپ چاپ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اسی حالت میں یکایک بوڑھے ذرّے نے حسب معمول کرخت لہجے میں کہا:

"تمہارا خیال ہے گھر کی مالکن پھر کبھی یہاں آ جائے گی، اور کمرے کا دروازہ کھول دے گی۔"

ننھے ذرّے نے کوئی جواب نہ دیا۔ دراصل یہ الفاظ اس کے کانوں تک پہنچ ہی نہ سکے تھے۔ اور اگر وہ یہ الفاظ سن بھی لیتا جب بھی کچھ نہ کہہ سکتا۔ مایوسی نے اسے بے دم کر دیا تھا۔

بزرگ ذرّے نے آنکھیں جھپکا کر کہا:

"گھر کی مالکن کبھی نہیں آئے گی، یہ خیال اپنے دماغ سے نکال دو، اس زمانے میں گھر کا کچھ سامان یہاں پڑا تھا اور وہ یہی سامان لینے کے لئے یہاں آ گئی تھی، ورنہ وہ اس متعفن فضا میں کبھی آنے کا ارادہ نہ کرتی۔ سُنا بیٹا! تم سُن نہیں رہے کیا؟"

ننھا ذرّہ خاموش تھا۔

"غائب کہاں ہو گئے ہو؟ ——— اچھا بھئی تمہاری مرضی، میں کیا کہہ سکتا ہوں!" بڈھے ذرّے کی بوڑھی آواز ایک لمحے کے لئے تھرتھرائی اور پھر گہرے اندھیرے میں جذب ہو گئی۔ کچھ دیر گزرنے پر ننھے ذرّے کا شعور بیدار ہونے لگا۔ اسے وہ واقعہ تمام جزئیات کے ساتھ یاد آ گیا جس سے وہ ابھی ابھی دوچار ہوا تھا۔ اس نے بزرگ ذرّے کی آواز نہیں سُنی تھی، تاہم وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے ارد گرد پھیلے ہوئے بزرگ ذرّے کس انداز میں سوچا کرتے ہیں، اور روشنی کی تمنا کو کتنا بیہودہ خیال تصور کرتے ہیں۔

ذرّوں کی دنیا کا یہ سب سے ننھا وجود چند لمحے مسلسل حیرت و مایوسی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ وہ پوری طرح مایوس ہو جانا چاہتا تھا۔ مگر ہو نہیں سکتا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک خلش سی، ایک اضطراب سا موجزن تھا۔ اس خلش اور اضطراب میں روشنی کی آرزو کے علاوہ ایک قسم کا باغیانہ احساس بھی کارفرما تھا۔ اپنے آپ کو وہ اس قدر حقیر نہیں سمجھتا تھا کہ ایک مرتبہ زمین پر گر کر دوبارہ اٹھنے کا نام ہی نہ لے اور روشنی کی تمنا کو ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دے۔

اس سے بہت دور کافی بلندی پر اندھیرے کے سینے میں روشنی کی ایک نہایت مدھم سی ننھی سی لکیر لرز رہی تھی اور یہی لکیر اس کی نظر کا مرکز بن گئی تھی ——— نہ صرف مرکز بن گئی تھی۔ بلکہ اس کے اندر زندگی کی نئی اُمنگ اور نئی ترنگ بھی پیدا کر رہی تھی ——— وہ مایوسی کی سطح سے بلند ہو رہا تھا اور

سوچ رہا تھا ——— "آخر گھر والے اس کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے کھول کیوں نہیں دیتے، انہیں ہم سے کیا دشمنی ہے، وہ ہمیں کیوں اس محدود فضا میں بند کر کے روشنی سے محروم کر رہے ہیں؟"۔

کافی دیر کے بعد وہ گرتا پڑتا اوپر آ گیا۔ اب وہ اپنے سامنے بزرگ ذرّے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بوڑھے سے یہ سوال پوچھنا چاہتا تھا مگر اس خیال سے کہ یہ بڑھا اسے مایوس کرنے کی کوشش کرے گا ——— اسے بولنے کی جرأت نہ ہوئی۔

بزرگ ذرہ اس کا خیال بھانپ گیا اور کہنے لگا:

"میں نے ایک دفعہ کہہ دیا ہے کہ ہم تاریکی کا ایک حقیر حصہ ہیں ——— آخر سوچو روشنی کے ساتھ ہمارا کیا واسطہ ہے! تم بالکل ننھے ہو لیکن نا معلوم اس چیز کے لئے بیتاب ہو جسے کبھی حاصل نہیں کر سکتے۔ میری مانو! اس قسم کی خیال آرائی نہ کیا کرو۔ سُنا تم نے بیٹا!"

ننھا ذرہ اب خاموش نہ رہ سکا۔ جھٹ بول اُٹھا:

"وہ لوگ دروازہ کیوں نہیں کھول دیتے۔ دروازہ کھلے گا تو روشنی خود بخود اندر آ جائے گی؟"

"بہت خوب بھئی!" بزرگ ذرے نے خوفناک قہقہہ لگایا۔ "تم انسان سے یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بیتابی کا خیال کر کے دروازہ کھول دیگا یہ تمہاری بھول ہے۔ تم نے انسان کو سمجھا ہی نہیں ——— اسے ہم حقیر ذرّوں کی کیا پروا ہو سکتی ہے ——— اگر تم نے اس مجنونانہ خواہش کو دماغ سے نہ نکالا تو ایک دن تمہارا دم گھٹ جائے گا اور تم مر جاؤ گے"۔

اس وقت ذرّے کی آنکھوں پر مایوسی کے سائے چھا گئے۔

تاریک فضا اور تاریک ہو گئی، روشنی کی وہ ننھی لکیر بھی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ ذرّے کا دم سچ مچ گھٹنے لگا۔ اس نے اپنے آپ کو ہوا میں چھوڑ دیا ——— اس حالت میں اسے کچھ خبر نہ تھی کہ اس کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے، اور کیا ہونے والا ہے ———

پستی سے لے کر انتہائی بلندی تک چاروں طرف گہری تاریکی مسلط تھی، اس تاریکی میں اس کے بزرگ، اس کے ہم عمر لاکھوں ذرّے اپنی مختصر سی دنیا میں گردش کر رہے تھے۔ آگے بڑھتے تھے، ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے اور پھر نیچے چلے جاتے تھے۔ ان میں کئی ایسے بھی ہوں گے جنہیں روشنی کی تمنا ہو گی، جو وسیع اور روشن دنیا میں پرواز کرنا چاہتے ہوں گے، لیکن اپنے گرد و پیش بے شمار رکاوٹیں دیکھ کر ان کے حوصلے پست ہو جاتے ہوں گے ان کی خواہشیں سسک سسک کر دم توڑ دیتی ہوں گی اور نوجوان ذرہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ راستے کی مشکلات کا مقابلہ کر کے دروازے تک پہنچ جانا بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ اسے یاد آیا کہ ایک دفعہ پہلے بھی اس نے اوپر جانے کی کوشش کی تھی مگر طاقتور ذرّوں نے اس کا راستہ روک لیا تھا ——— وہ ایک بے وقوف اور ضدی بچے کو ہلاکت آفریں تنگ و دو سے بچانا چاہتے تھے ——— کم از کم ان کا نقطۂ نظر یہی تھا اور ان کی باتوں سے بزرگانہ شفقت نمایاں تھی۔

"کیا وہ اسی طرح ختم ہو جائے گا ———" اس نے سوچا اور روشنی کا تصور پوری شدت کے ساتھ اس کے دل میں جاگ اٹھا، اور وہ اپنے اندر ایک نئے ولولے کا ہیجان محسوس کر کے بلندی کی طرف پرواز کرنے لگا۔

ننھی فضاؤں میں گردش کرتے ہوئے ذرّے جب اس سے ٹکراتے تو وہ ایک دم کہیں سے کہیں جا پہنچتا۔ ایک دفعہ تو وہ اسی پستی میں پہنچ گیا جہاں سے نکل کر وہ اوپر اٹھا تھا۔ اگرچہ وہ چند لمحے وہاں ٹھہرا لیکن اس مختصر سے وقفے میں بھی اس کے بزرگوں اور ساتھیوں نے طعن و تشنیع سے اسے پریشان کر دیا۔

ایک بزرگ کہنے لگا،

"دیکھو ایسی بیہودہ حرکت نہ کرو، تم نہیں جانتے کہ ———"

اس سے پہلے کہ بزرگ کا فقرہ مکمل ہو وہ تیزی سے اوپر کے کرتے میں آگیا۔

خوش قسمتی سے ہوا کا ایک جھونکا ادھر آنکلا اور اس جھونکے نے اسے فضا کے اس حصّے میں پہنچا دیا جو کافی بلند تھا اور جہاں وہ پہلے کبھی نہیں پہنچا تھا۔ یہاں پہنچ کر ذرا رک کر اس نے نیچے دیکھا۔ دور اس کے پست ہمت ساتھی کلبلا رہے تھے اور اپنی محدود تاریک دنیا میں بے معنی گردش کر رہے تھے۔ یہاں سے اپنا پہلا مقام اسے اس قدر پست نظر آیا کہ وہ اپنی کامیابی پر حیران رہ گیا ——— مگر حیرت و مسرت کے یہ لمحے بہت جلد ختم ہو گئے۔ کیونکہ اب وہ جن ذرّوں کے درمیان موجود تھا وہ اسے اپنا ساتھی نہیں سمجھتے تھے بلکہ تاریک پستیوں کا باسی کہتے تھے اور اسے اپنے کرے میں آنے کی اجازت دینا پسند نہیں کرتے تھے۔ جب اس نے اپنے ارادے کا اظہار کیا تو اسے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ نئے ساتھی بجائے اس کے کہ اس کی ہمت و عزم بلند پر تحسین کہیں الٹا اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ایک ذرّے نے تو صاف صاف کہہ دیا:

"بھئی! یہ تمہاری خوش قسمتی تھی کہ یہاں تک پہنچ گئے۔ اب فوراً واپس چلے جاؤ۔ تمہارا مقام اسی پستی میں ہے جہاں سے تم آئے ہو۔ اگر ہم میں سے کسی طاقتور وجود سے تمہارا تصادم ہو گیا تو ایک ہی لمحے کے اندر فنا ہو جاؤ گے یا زخمی ہو کر نیچے زمین پر گر پڑو گے اور زمین کے ذرّوں میں جذب ہو کر رہ جاؤ گے، اور پھر کبھی نہیں اٹھ سکو گے!"

باقی ذرّوں نے بھی یہی کوشش کی کہ وہ ایک لمحہ توقف کئے بغیر واپس چلا جائے۔ لیکن وہ تمکانوٹ کے باوجود اوپر جانے لگا۔ یہاں تک کہ ایک نئی بلندی پر پہنچ گیا۔

اس بلندی پر اس کی ملاقات ایک تیز رو مسافر سے ہو گئی۔ یہ ذرّہ بھی اسی کی طرح ایک دور دراز گوشے سے نکل کر بالائی حصّے کی طرف پرواز کر رہا تھا چنانچہ وہ خوشی خوشی اس کا ہم سفر بن گیا۔

ایک دن وہ دونوں ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے کہ یکایک اس کا ساتھی چیخ اٹھا:

"آندھی۔"

"کیا؟" نوجوان ذرّہ آندھی کا مطلب نہیں سمجھتا تھا۔

"باہر آندھی آ رہی ہے۔ یہ شور سن رہے ہو نا!" اس کا ساتھی بولا۔

"مجھے معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔ باہر دیکھو دنیا میں بھی اندھیرا چھا گیا ہے۔ اتنی جلدی رات کیونکر آگئی ہے آج!"

اس کے ہم سفر نے بتایا "آندھی تیز و تند ہوا کو کہتے ہیں۔ اگرچہ کمرے کے سب دروازے بند ہیں، تاہم آندھی کے جھونکے اندر بھی آجائیں گے اور اگر ہم کسی جھونکے کی زد میں آگئے تو وہ نہ جانے ہمیں کہاں پھینک دے اور ——— یہ بھی خبر نہیں کہ ———"

یکایک ادھر اُدھر ایک ہل چل سی مچ گئی ——— ایک طوفان سا برپا ہو گیا۔ چھوٹے ذرّے نے محسوس کیا کہ سب ذرّے مل کر اسے پستیوں کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ خوف سے اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اس کا ننھا سا وجود اس طرح گردش کرنے لگا جیسے کسی طاقتور چیز سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا۔

کافی عرصے کے بعد جب اس کا شعور بیدار ہوا تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک تنکے کے سرے پر چپٹا ہوا ہے اور یہ تنکا دیوار کی طرف جا رہا ہے یہاں تک کہ دیوار کے ساتھ جا لگا ——— فضا میں ابھی تک اندھیرا مسلّط تھا اور لمحہ بہ لمحہ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے ارد گرد جتنے ذرّے موجود تھے وہ سب کے سب تھک کر مضمحل ہو کر سو رہے تھے ——— ایک بڑا مایوس کن خیال اس کے ذہن میں آیا ——— "کیا میری زندگی حرکت اور حرارت سے محروم ہو گئی ہے۔ اور کیا میں اپنا سفر پورا کئے بغیر اسی ناپید اکنار تاریکی کا جزو بن رہا ہوں جس کے بطن سے میں پیدا ہوا تھا ——— کاش میں اس ناکامی سے پیشتر صرف ایک مرتبہ دروازے سے نکل کر روشنی کے سیلاب میں چھلانگ لگا سکتا ——— صرف

ایک مرتبہ اور ـــــ

"روشنی میں جانے کا مزا دیکھ لیا ہے نا!" قریب سے ایک بوڑھی آواز آئی۔

"کیا مطلب؟" اس نے کہنے والے کی طرف مخاطب ہوئے بغیر پوچھا۔

"مطلب کیا ـــــ شکر کرو اس کمرے کے سب دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں ـــــ اگر ایک بھی کھڑکی کھلی رہتی تو ہم میں سے کسی کا وجود بھی سلامت نہ رہتا۔ ہم مٹی کے بوجھ تلے دب کر ختم ہو گئے ہوتے۔ ہمیں بند دروازوں اور کھڑکیوں نے بچا لیا ہے۔"

بات بالکل درست تھی۔ آندھی کا ایک ہلکا سے جھونکا اندر آ سکا تھا اور اس ہلکے سے جھونکے نے ایک ہلچل سی مچا دی تھی، اگر وہ باہر ہوتا یا دروازہ کھلا ہوتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔ وہ مایوس تھا مگر اب کے مایوسی میں کچھ اطمینان بھی تھا۔

وقت چپ چاپ گذرتا رہا اور ایک دن پھر اس نے یکایک بلندی پر ایک روشن نقطہ دیکھ لیا۔ اس کے سینے میں سوئی ہوئی امید جاگ اٹھی۔ "ہائے وہ باہر کی دنیا کس قدر وسیع، کس قدر خوبصورت ہے۔" اس نے آہ بھر کر کہا اور اچانک اسے محسوس ہوا کہ وہ اوپر آ گیا ہے۔ ایک نئے مقام پر۔

"ننھے بھائی کیا کر رہے ہو؟"

اس نے دائیں طرف دیکھا۔ اس کا پہلا ہا ہمت ہم سفر پیار بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ سفر جاری رکھنے کی امنگ از سر نو اس کے اندر پیدا ہو گئی۔

ابھی اس نے کچھ کہا نہیں تھا ـــــ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کہے۔ اتنے میں اس کا ہم سفر بولا:

"مجھے افسوس ہے میں تمہارے ساتھ جا نہیں سکتا۔ دیوار کے ساتھ جالا لٹک رہا ہے، میں اس میں بری طرح پھنس گیا ہوں، نہ جانے کب تک یہاں گرفتار رہوں گا۔ ایک نہ ایک دن کہیں سے ہوا کا جھونکا آئے گا اور مجھے اس قید سے رہائی دلا دے گا۔ جب تک وہ جھونکا نہ آئے میں اس بوجھل غبار سے نہیں نکل سکتا۔"

"کوشش تو کرو!"

"کوشش تو کرتا ہی رہوں گا، تم تنہا روشنی کی تلاش میں نکل جاؤ۔ میں کبھی نہ کبھی آؤں گا ـــــ کبھی نہ کبھی ضرور آؤں گا۔"

"نہیں، جب تک تم ساتھ نہیں چلو گے میں یہیں رہوں گا۔" یہ کہتے ہوئے چھوٹے ذرے کا دل ہمدردی سے لبریز ہو گیا۔

دوسرا ذرہ بولا "اس کا خیال نہ کرو۔ اس وقت فضا کافی پُرسکون ہے تمہیں راستے میں زیادہ تکلیف نہیں ہوگی!" دوسرے ذرے کے لہجے میں عزم اور ارادے کی مضبوطی جھلک رہی تھی۔

اپنے ہم سفر سے محرومی کے احساس نے سینے میں درد کی لہریں دوڑا دیں اور اس کے ذہن میں ایک چبھن سی ہونے لگی۔

"یہیں ٹھہر جاؤں یا روانہ ہو جاؤں ـــــ" وہ سوچنے لگا۔ اس وقت فضا واقعی پُرسکون تھی اور دور بلندی پر تاریکی کی پیشانی سے روشنی کی ایک لہر پھوٹ رہی تھی۔ اس کے قدم بے اختیار اٹھنے لگے۔ اس نے اپنے ساتھی کو آخری بار دیکھا اور اوپر پرواز کرنے لگا۔

وہ تاریک فضا میں گر گر کر اڑتا رہا، اڑ اڑ کر گرتا رہا۔ کبھی طاقتور ذروں سے ٹکرا کر بالکل زمین کے قریب پہنچ جاتا اور کبھی مسلسل تگ و دو سے کسی نئی فضا کو چھونے لگتا۔ نئی فضا کے ذرے اسے حقیر اور اجنبی سمجھ کر ـــــ اپنی دنیا سے نکال دیتے، متکبر ذرے اس کا راستہ روک لیتے۔ اس کا مذاق اڑاتے۔ نہ صرف یہ بلکہ اسے زخمی کر کے نیچے بھی گرا دیتے۔ ہر لحظہ بڑھتی ہوئی مشکلات کو دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو جاتے اس کی ہمت جواب دے جاتی لیکن اس کے دل میں روشنی میں جانے کی جو تمنا بے قرار تھی اس کا شعلہ کسی صورت میں بھی کسی حال میں بھی نہیں بجھتا تھا

یہی وہ شعلہ تھا جس کی حرارت نے اسے ہر لمحہ مصائب کے ہجوم میں بھی سرگرم سفر رکھا، اور جو اسے ہر گھڑی ایک حسین، ایک شاداب دنیا کے خواب دکھا رہا تھا۔ جب کبھی زخمی ہو کر زمین پر گر پڑتا تو یہ رنگین خواب چپکے سے اس کے ذہن میں جھلملا اٹھتا اور وہ اسی حالت میں اپنے مجروح جسم کے ساتھ اوپر اٹھنے کی کوشش کرنے لگتا۔ تاریکی کی دنیا میں اس کا کوئی ہم سفر نہیں تھا، کوئی ہمدرد نہیں تھا، سب کے سب اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ اس کو پاگل تصور کرتے تھے، تاہم وہ تاریکی میں جذب ہونے کے لئے تیار نہیں تھا —— اور نہ اپنے دل سے اپنی عزیز ترین خواہش کو نکال سکتا تھا۔

وہ اڑتا رہا —— بڑھتا رہا، یہاں تک کہ ایک دن اس کی آنکھیں حیرت انگیز مسرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ کثیف اندھیرے کی حدیں ختم ہو رہی تھیں اور اس کی ننھی ننھی آنکھوں کے آگے دور تک روشنی اور تازگی کا ایک وسیع پھیلاؤ سا نظر آ رہا تھا۔ جس میں لاکھوں صحت مند ذرے ناچ رہے تھے۔ اس پھیلاؤ اور اس کے درمیان ابھی تاریکی حائل تھی —— وہ ٹھہر نہ سکا، تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ برابر آگے بڑھتا گیا۔

اب اس پر ایک نیم بیہوشانہ سی کیفیت طاری تھی۔

وہ کہاں ہے، کس دنیا میں پہنچ گیا ہے، کیا وہ سنگین دروازے سے باہر نکل آیا ہے یا ابھی تک اس دم گھٹنے والی تاریک فضا میں اڑ کر طار رہا ہے۔ اسے کچھ سوجھتا نہیں تھا —— کچھ دیر کے بعد وہ اپنے نئے ماحول سے آشنا ہونے لگا —— اس کے چاروں طرف ایک نئی دنیا بکھری ہوئی تھی۔ ایک نئی دنیا جس میں روشنی بھی تھی اور وسعت بھی، جو بڑی شاداب اور بڑی خوبصورت تھی۔ اسے روشن دنیا کے ذرے بڑے ہمدرد نظر آ رہے تھے کیونکہ ان کے صحت مند چہروں پر مایوسی اور افسردگی نہیں تھی بلکہ مسکراہٹ کی سرخی پھیلی ہوئی تھی اور اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اس کا استقبال کر رہے ہیں۔ اپنی کامیابی سے سرشار وہ روشنی کے چشمے میں تیرتا رہا —— یہاں تک کہ تھک گیا —— اچانک ایک دم تاریکی چھا گئی۔

اس نے حیران ہو کر ایک ذرے سے پوچھا،

"روشنی کہاں گئی؟"

ننھے ذرے نے جواب دیا:

"اب شام ہو گئی ہے، کمرے کے باہر وسیع دنیا میں روشنی کا منبع یعنی سورج اپنی کرنوں کو سمیٹ کر رات کے غار میں اتر رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد چاند اور ستارے نکلیں گے —— تھوڑی سی روشنی اندر آ سکے گی —— آہ خوبصورت اور حیات آفریں روشنی تو باہر ہے —— باہر کی لامحدود دنیا میں!"

"میں اسی لامحدود دنیا میں جانا چاہتا ہوں۔" چھوٹا ذرہ بولا اور اس کا دل دھڑکنے لگا۔

"آگے ہوا کے بڑے تیز اور تند تھپیڑے ہیں جو ہمیں پیچھے دھکیل دیتے ہیں، باہر جانا ممکن نہیں۔"

"—— مگر وہ دیکھو باہر جانے کا راستہ تو ہے —— دروازے میں۔" وہ بولا۔

"راستہ ہے، لیکن باہر نکلنا بے حد مشکل ہے۔ وہاں ہوا بہت تیز ہے۔"

"کوئی پروا نہیں —— میں باہر جاؤں گا —— میں باہر کی سنہری اور روشن دنیا میں ضرور جاؤں گا —— ضرور جاؤں گا۔"

اور یہ کہتے ہوئے وہ پھر پرواز کرنے لگا، اوپر ہی اوپر —— بلند سے بلند تر فضا میں!

حجاب امتیاز علی

صنوبر کے سائے

میں جب سے ان پہاڑی علاقوں میں آئی تھی "نہر رودخناک" کی رعنائیوں کا ذکر ہر خاص و عام سے سُنتی تھی، لوگ کہتے اس کے صنوبر کے سایوں سے ڈھنپے ہوئے کناروں پر سہانے خوابوں کی رومان جھلملاتی ہے۔ پہاڑی خانہ بدوشوں کا بیان تھا کہ نامعلوم پہاڑوں کی بلندیوں نے ایک مقام پر آسمان کے نیل میں شگاف کر رکھا ہے۔ اور رودخناک کی نیلی دھار وہیں سے اُترتی اور کوہساروں میں سے ہرتی پھرتی اس وادی میں ایک ندی بن کر آنکلتی ہے۔

بھلا آپ غور کیجئے۔ ان رومانی فقروں کو سُن کر مجھ جیسی سیر و سیاحت کی دلدادہ سے کب نچلا بیٹھا جا سکتا تھا؟

ایک دن میں نے اپنی محبوب سہیلی جسوتی سے مچل کر کہا: "جسوتی! ہمیں یہاں آئے دو ہفتے گزر چکے مگر ہم نے نہر رودخناک کی سیر اب تک نہیں کی۔ تم پسند کرو تو آج شام کشتی کی سیر کو چلیں"

جسوتی کو آپ جانتے ہیں۔ سفید چہرے والی سلیم الطبع لڑکی ہے۔ اس سفر میں مَیں اُسے اپنے ساتھ تقریباً کھینچ کر لائی تھی۔

اُس نے مسکرا کر کہا: "جیسی تمہاری مرضی روحی۔ لیکن پانی سے مجھے ڈر لگتا ہے"

اسی وقت جسوتی کے ایک محبوب حبشی نژاد خانہ زاد نے کہا: "خاتون میں نے سُنا ہے ساحل رودخناک پر ایک بہت مشاق سو سال کا بوڑھا ملاح رہتا ہے اس کی کشتی کبھی لہروں پر نہیں ڈگمگاتی اگر آپ اجازت دیں تو اسی ملاح کی کشتی کرائے پر لے لی جائے"

میں نے بے پروائی سے کہا: "کوئی ملاح اور کوئی کشتی ہو"

جسوتی کہنے لگی: "سو سال کا ملاح خاک کشتی چلاتا ہوگا"

خانہ زاد نے کہا: "خاتون! سُنا ہے وہ ستر سال سے کشتی بانی کرتا ہے۔ اور آج تک اُس کی کشتی کو کوئی حادثہ پیش نہیں آیا"

غرض اسی وقت ہم نے اُسے کشتی کرایہ پر لینے اور شام کی چائے کا انتظام کشتی ہی میں کرنے کے لئے روانہ کر دیا۔

جب ہم دونوں اس مقام پر پہنچے۔ جہاں سے سیاح روحناک کی سیر کے لئے پانی کا سفر شروع کرتے ہیں۔ تو ہم نے دیکھا۔ کہ ایک سرخ اور نیلے رنگ کا مرصع شکارا ہمارے انتظار میں ہے۔ اُس کے موتیوں کے کانپتے ہوئے پردوں میں سے ایرانی قالین پاروں پر رکھے ہوئے خوش وضع اور خوش قطع تکیئے دعوتِ استراحت دے رہے تھے۔

میں نے مسکرا کر حبوتی سے کہا۔ یہ "خلیفۂ بغداد کا محراب تفریح معلوم ہوتا ہے"۔

اندر آرام سے نیم دراز ہونے کے بعد ہم نے مڑ کر کشتی چلانے والے کو دیکھا۔ ایک پیر صد سالہ کشتی کے پہلے سرے پر چپو ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا۔ اُس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر سفید لمبی ڈاڑھی کے بال ہلکی ہلکی ہوا سے کانپ رہے تھے۔ پرانی آنکھوں میں زندگی کی تابانی و درخشانی نہ تھی۔ بلکہ ——— جیسے ایک دھند میں سے ماضی کی حسرت دیدار جھلکتی نظر آ رہی تھی۔

حبشی خانہ زاد نے چاء تیار کر رکھی تھی۔ ہم گرم گرم چائے کے خوشگوار گھونٹ حلق سے اُتار نے دھیرے دھیرے روحناک کی طرف جا رہے تھے۔ جس کے نیل پر غروبِ آفتاب جھل مجل کر شہاب پاشی کر رہا تھا۔

منظر بتدریج وارفتہ سا ہوتا جا رہا تھا۔ ہواؤں میں نکہت بڑھ رہی تھی۔ پانی کی چھوٹی چھوٹی لہروں کی آواز پر شبہ ہوتا تھا۔ جیسے کہیں دور خواب کے جزیرے میں پانی برس رہا ہو، فطرت اپنی بے ساختہ رعنائیوں کا دامن پھیلائے ہمارے سامنے تھی۔ ایک تصویر جس میں ڈھلتے ہوئے سورج کا ہر لمحہ نئے انداز سے رنگین موقلم کی شعبدہ بازیاں دکھا رہا تھا۔ اے اللہ! سچ مچ وہ خواب کی سرزمین تھی۔ رومان کا جزیرہ تھا۔

سیدھے اور تناور صنوبر جیسے دم بخود کھڑے تھے۔ اور ان کے درمیان سے کہیں پھولوں سے ڈھکی ہوئی ڈھلوانیں نظر آتیں۔ کہیں ایک اچھوتے نور میں نہائے ہوئے ہرے ٹیلے، اور کہیں اُفق کے سحاب پاروں میں کھوئے ہوئے کہسار۔

ہم چپ سے تھے۔ مجھے معلوم نہ تھا ہم کتنی دُور نکل گئے۔ اور ہمارے شکارے کو چلتے کتنا وقت ہو گیا۔

یکایک حبشی خانہ زاد کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔

"جناب واپس چلئے۔ آفتاب غروب ہو رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پانی کے راستوں پر ہم بھٹک جائیں"۔

بوڑھے ملاح نے ایسے چہرے سے جس پر مسکراہٹ کا شبہ ہو سکتا تھا کہا۔ "راہ سے بھٹکنا ناممکن ہے۔ میں ساٹھ ستر سال سے ان آبی راستوں کا عادی ہوں"۔

میں ذرا دیر چپ چاپ ملاح کا چہرہ تکتی رہی۔ جس پر زندگی کے گرم و سرد نے طرح طرح کی جھریاں ڈال رکھی تھیں۔ پھر پوچھا۔ "گویا تم قریب قریب ایک صدی سے یہاں رہتے ہو"؟

"جی ہاں"

"تمہارا مکان کہاں ہے"؟

"مکان کہیں نہیں خاتون ——— صنوبر کے ان سایوں تلے پڑ رہتا ہوں ———"

مجھے محسوس ہوا۔ یہ کہتے ہوئے اس کے ضعیف سینے نے اک آہ بھری ہے۔

"صنوبر کے سایوں تلے"؟ میں نے حیران ہو کر کہا۔ "بے پناہ گرمی اور لرزا دینے والی سردی تمہیں زندگی سے بیزار نہیں کرتی۔ اس کا تمہارے پاس کیا علاج ہے"؟

"علاج ؟" اُس نے ایک پھیکی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "میرے پاس پرانی یادیں ہیں۔ جس کے پاس کوئی یاد ہو۔ اس پر کسی موسم کا اثر نہیں ہوتا۔" میری دلچسپی بلکجنت بڑھ گئی۔ "تمہارا ماضی تو افسانوں سے لبریز معلوم ہوتا ہے۔"

مگر بوڑھے نے میری بات کی طرف توجہ نہ دی۔ آپ ہی آپ بڑبڑا رہا تھا۔ "مجھے صنوبر کے سایوں تلے رہنا پسند ہے۔ مجھ پر ان سایوں سے چند گھنٹے کی مفارقت بھی شاق گزرتی ہے۔ جب ہی تو میں شہر میں مزدوری کرنے نہیں جاتا۔ میں ان سایوں تلے کشتی لئے ادھر اُدھر پھرتا رہتا ہوں۔"

"کیا تم ہمیں اس راز سے آگاہ کر سکو گے کہ صنوبر کے سایوں سے تمہیں کیوں عشق ہے؟" میں نے التجا کے لہجہ میں پوچھا۔

"یہ کوئی راز نہیں!" اس نے دم توڑتے ہوئے سورج کے مقابل ایک سیاہ تصویر بن کر کہا۔ "سبھی جانتے ہیں کہ مجھے صنوبر کے سایوں سے کیوں محبت ہے۔ اور کیوں میں اپنی زندگی کے آخری سانس ان کے نیچے ختم کرنا چاہتا ہوں!"

جسوتی اور میں کہنیاں تکیوں پر رکھ کر متوجہ ہو گئیں۔ کشتی بہاؤ پر جا رہی تھی۔ بڈھا چپو ہاتھ میں تھامے بے پروائی سے اپنی کہانی کہہ رہا تھا۔

(۳)

"آج سے ستر سال پہلے کا ذکر ہے۔ کہ دُنیا میری نظروں میں نوجوان تھی۔ زندگی کی ہر ہر کروٹ میں ہزار دن ہی دفعہ بلیاں محسوس ہوتی تھیں۔ میں غریب ملاح نہ تھا۔ ان پہاڑی علاقوں کا ایک خوشحال تاجر تھا۔

بہار کے موسم میں ایک دن شام کے آسمان پر سنہرا چاند ہنس رہا تھا۔ جب میں اسی روحناک کے ساحل پر انھیں صنوبر کے سایوں تلے چہل قدمی کے لئے نکل آیا۔

میری نظر پہاڑی حُسن کے ایک نادر نمونہ پر پڑی۔ . . . . ایک کمسن لڑکی پر جو صنوبر کے سائے تلے ایک سبز پتھر پر بیٹھی ایک ٹوکری بن رہی تھی۔ مجھ سے تفصیل کی رنگینی نہ مانگئے۔ رات کا اندھیرا تو آئے گا۔ سمجھ لیجئے۔ میں خود وہاں نہ آیا تھا۔ مجھے وہ قوت وہاں کھینچ لائی تھی۔ جو ہر نوجوان کے دل کو زندگی کے پھولوں کے درمیان کشاں کشاں لئے پھرتی ہے۔

ہم میں محبت شروع ہو گئی۔ ہم شباب کی ایک رنگین وارفتگی میں باہم محبت کرنے لگے۔ ہم ہر روز انھیں صنوبر کے کانپتے ہوئے سایوں تلے ملتے۔ اور اپنی آرزوئیں ایک دوسرے کے دھڑکتے ہوئے دل سے کہتے۔ بہت جلد ہماری شادی ہو گئی!"

اسی وقت اچانک صنوبر کے درخت پر سے ایک ناشاد بلبل یکایک چلائی۔ بوڑھے نے مُڑ کر اُسے دیکھا اور پھر لرز کر کہا "یہ دیوانہ پرند کیا کہہ رہا ہے؟ یہی نا؟ کہ محبت بہت ظالم چیز ہے!"

جسوتی نے مجھے اور میں نے جسوتی کو چپ چاپ دیکھا۔ اس بوڑھے دل میں یقیناً کبھی شعر کے چشمے اُبلتے رہے تھے۔ بوڑھے نے چند ہاتھ چپو کے چلائے اور ایک آہ بھر کر بولا۔

"شادی کے بعد چھ مہینے نہایت سنہرے گذرے۔ پھر ایک نحس خواب نے ہماری زندگی کا رُخ پلٹا دیا۔

ایک صبح جونہی میری بیوی نے تکئے پر نیند سے آنکھیں کھولیں۔ اداس لہجے میں بولی۔ "میں نے ایک ہولناک خواب دیکھا ہے!"

میری محبت کی نظروں نے اس سے پوچھا "کیا خواب؟"

بیوی نے آہ کھینچ کر کہا "میں نے رات تقدیر کے فرشتے کو دیکھا جو پہاڑوں کی بلندیوں پر اپنے پر ہلا ہلا کر کہہ رہا تھا کہ اگر تم نے رات تک اپنے بالوں میں ایک کاسنی رنگ کا گلاب نہ سنوارا۔ تو تمہارا گھر اُجڑ جائے گا!"

آج سے ستّر سال پہلے دنیا بہت اوہام پرست تھی۔ چنانچہ بیوی کا یہ ہولناک خواب سن کر میرا عشق سہم سا گیا۔

میری پریشانی دیکھ کر بیوی بولی "پر اتنے فکر کی کیا بات؟"

میں نے کہا "فکر کیسے نہ ہو؟ شیوبن ذریں! کیا تجھے نہیں معلوم کہ کاسنی رنگ کا گلاب ان پہاڑی علاقوں میں نایاب ہے؟"

میری بیوی کا چہرہ پیلا پڑ گیا "نایاب؟ پھر کیا کرو گے؟ کاسنی رنگ کا گلاب آج رات تک بالوں میں لگانا ضروری ہے۔ ورنہ ہمارا یہ مسکراتا ہوا گھر تباہ ہو جائے گا۔ فرشتے نے یہی کہا تھا"

نامعلوم اندیشوں سے گھبرا کر وہ رونے لگی۔ میں نے اُس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور وعدہ کیا کہ اطراف کے علاقوں کے تمام بانوں میں شہر کے باغبانوں کو بھیجوں گا اور تاکید کروں گا کہ کسی نہ کسی طرح اُسے دستیاب کر کے کاسنی رنگ کا ایک گلاب لے آئیں۔"

میری بیوی اپنے لمبے لمبے بال کھول کر نہانے کے لئے چشمے پر چلی گئی۔ تاکہ گلاب کے آنے سے پہلے بال سنوار لے۔

میں پریشانی کے عالم میں اُسی وقت کاسنی گلاب کی تلاش میں نکل گیا۔ شہر کے ہر باغبان سے ملا۔ مگر ایک ایک نے کہا کہ اس علاقہ میں کاسنی رنگ کا گلاب کہیں نہیں مل سکتا۔ بیزار اور مایوس ہو کر میں حاکمِ شہر کے باغبان کے ہاں گیا۔ اپنی ضرورت اُس کے آگے کہی۔ وہ بڑا ہی سفاک آدمی تھا۔ سوچ کر بولا "کاسنی گلاب ہمارے باغ میں ہے تو۔ پر اُس کی قیمت چھ اشرفی سے کم نہیں"

میں نے چھ اشرفیاں اُس کی ہتھیلی پہ رکھ دیں۔ اور کاسنی گلاب لے کر خوش خوش گھر پہنچا۔

میری بیوی کاسنی گلاب دیکھ کر باغ باغ ہو گئی اور مسکرا کے بولی "اگر آج میں کاسنی گلاب بالوں میں نہ سنوار سکتی تو جانے ہم پر کیا مصیبت آتی"

میں نے کہا "اسے فوراً بالوں میں لگا لو"

پر نہ جانے اُس نے کس خیال سے کہا "میرے بال گیلے ہیں ابھی" "بعد میں لگا دوں گی۔ جب رات شروع ہو گی تو لگاؤں گی"۔

یہ کہہ کر اُس نے ایک بلوری صراحی میں پانی بھرا۔ اور پھول کو ہاتھ میں دیکھ کر تازہ ہونے کے خیال سے صراحی دریچے میں رکھ دی۔

میں دن بھر گلاب کی سرگردانی میں اپنے کام پر نہ جا سکا تھا۔ دکان پر جا بیٹھا۔ رات کے وقت جب گھر واپس آ رہا تھا۔ تو میرا پرانا دوست حمری مجھے میرے گھر کے قریب ہی مل گیا۔ اُسے میں نے ادھر کئی ہفتوں سے نہ دیکھا تھا۔ خوش ہو کر گلے سے لگا لیا۔

"میں تمہارے ہی ہاں گیا تھا۔ تم نہ ملے تو مایوس ہو کر واپس آ گیا!"

اُس نے یہ جملہ ختم بھی نہ کیا تھا۔ کہ میری نظر اُس کی عبا کے کاج پہ پڑ گئی۔ میرا خون میری رگوں میں جم گیا۔

میں نے یکلخت پوچھا: "حمری یہ کاسنی گلاب تمہیں کہاں سے ملا؟"

حمری طبعاً شوخ تھا۔ ہنس کر بولا "کیوں؟ تمہیں کیونکر فکر پیدا ہوئی؟ میری محبوبہ نے مجھے تحفہ دیا ہے۔ نایاب چیز ہے"

میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور میں لڑکھڑا سا گیا۔ وہ خواب! تقدیر کا فرشتہ! اس کی پیشین گوئی! سب جھوٹ تھا! محض حمری کی عبا کا کاج سجانے کے لئے میری بیوی نے یہ رنگین جھوٹ تراشا تھا۔ ہائے ظالم زندگی! سنگدل زندگی!"

(۴)

میں غصہ میں کانپتا ہوا گھر پہنچا۔

مجھے دیکھتے ہی میری بیوی دوڑی دوڑی آئی۔ اور اشک آلود آنکھوں سے بولی "افسوس! بدبختی دیکھو کہ وہ پھول غائب ہو گیا۔ اے خدا میں اب کیا کروں؟ ہم پر ضرور کوئی مصیبت نازل ہو گی"

"ضرور نازل ہوگی۔" میں نے گرج کر کہا۔ "موت سے زیادہ بڑی مصیبت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ سمجھ لو کہ تمہاری موت آگئی۔"

بیوی حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ مگر اس وقت مجھے اُس کی ایک ایک حرکت سے عیاری جھلکتی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے پھر چیخ کر کہا "تمہاری موت آگئی۔ تقدیر کے فرشتے کی پیشین گوئی کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

وہ متعجب ہو کر بولی "تم کیا کہتے ہو؟ ایسا نہ کہو۔ خدا کے لئے کاسنی گلاب کو ڈھونڈو۔ میں نے اُسے باغ کی دریچی میں تازہ ہوا کے لئے رکھ دیا تھا۔ اندر بال سنوارنے گئی تھی۔ واپس آکر دیکھتی ہوں۔ تو پھول وہاں نہ تھا۔"

اُس کی ان مکارانہ باتوں نے میرے تن بدن میں شعلے بھڑکا دیئے۔ میں نے اُس کے نرم بازوؤں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ اور اس زور سے دیوار پر دھکا دیا۔ کہ ٹکر کھا کر اُس کے سر سے خون کا ایک سُرخ فوارہ پھوٹ نکلا۔

ساتوں رات میں نے اُسے اسی صنوبر کے سائے تلے دفنا دیا جہاں اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

ایک جنون کی بے اختیاری میں میں گھر کی طرف لوٹ رہا تھا۔ کہ اتفاق سے میرا دوست حمزی پھر مجھے ایک گلی کے موڑ پر مل گیا۔ اُسے دیکھتے ہی میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

وہ ہنس کر بولا "تمہاری آنکھیں ایسی سُرخ ہو رہی ہیں جیسے تم خون کر کے آئے ہو۔"

وہ اس طرح باتیں کر رہا تھا گویا میں اُس کے راز سے ناواقف ہوں۔

میں نے لپک کر اس کا گریبان پکڑ لیا اور بولا "بدمعاش! تو سمجھتا ہے کہ میں نے خون نہیں کیا؟ میں اُسے ٹھکانے لگا چکا ہوں۔"

یہ کہہ کر کاسنی رنگ کا گلاب میں نے اُس کی عبا کے کاج سے نوچ کر زمین پر دے مارا، اور اپنے جوتوں کی مجنونانہ حرکت سے مسل ڈالا۔

حمزی آنکھوں میں دہشت لئے میرا چہرہ تک رہا تھا۔ جب میں نے اُس سے کہا کہ میں نے اُس کی محبوبہ کا خاتمہ کر دیا۔ اور اب اس کا کام تمام کر دینے پر آمادہ ہوں۔ تو اُس نے ایک دلدوز چیخ ماری۔ اور کہنے لگا "کوتاہ اندیش اور جلد باز! تو بدبخت ہے یا وہ گلاب تو میں نے سڑک پر سے اُٹھایا تھا۔ میں بازار میں سے گزر رہا تھا کہ گلاب کا پھول دیکھ کر اُٹھا لیا۔ شاید تمہارے ہی دریچے سے نیچے گر پڑا ہو۔"

یہ سُن کر میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ ایک ایسا اندھیرا ——— جس نے آج تک دُنیا کی نیرنگیوں کو مجھ سے اوجھل کر رکھا ہے۔

(۵)

تقدیر کے فرشتے کا کہنا درست نکلا۔ میری بیوی اس رات کاسنی گلاب اپنے بالوں میں نہ سنوار سکی۔ ہمارا گھر میری بے وقوفی اور جلد بازی کے ہاتھوں تباہ ہو گیا۔

آج اس قصے کو ستر سال گزر گئے۔ مگر میں اپنی غلطی پر نادم اس مٹی کی پرستش کر رہا ہوں۔ جس میں ان صنوبر کے سایوں تلے میری محبت دفن ہے۔"

کشتی ساحل سے آ لگی۔

ایم اسلم

نیا مریض

ہَوا ابھی کچھ کچھ تھکی تھکی تھی ندی ابھی جھگمگ سے تھم گئی ہو
ستارے آنکھیں جھپک رہے تھے چاند پھیکا پڑا ہوا تھا
سونے والی کے گیسوؤں کی مہک تھی کمرے میں پھیلی پھیلی
سانس رک رک کے آ رہا تھا سینہ اُٹھا تھا بیٹھتا تھا
وہ خواب میں کہہ رہی تھی ماتم، لٹی لٹی سی جوانیوں کا!
کہ گورے گوشے سے اس کے گالوں پہ ایک آنسو چمک رہا تھا

سائے ڈھل چکے تھے۔ سینی ٹوریم کے دروازے پر ایک کار آ کر رکا۔ ایک جوان لڑکی۔ ایک بھاری بھر کم عورت۔ خادمہ اور ایک نوکر اترے۔ دو تین سوٹ کیس بستر اور کچھ اور سامان بھی ساتھ تھا۔ مزدور ادھر اُدھر سے بھاگ کر آ گئے اور موٹر پر سے اسباب اتارنے لگے۔ لڑکی نے فاختئی رنگ کی ساری پہنی ہوئی تھی۔ پاؤں میں ملے جلے رنگ کی نفیس ہیل کا سینڈل تھا۔ پتلی پتلی گوری گوری کلائیوں میں سونے کی باریک باریک چوڑیاں تھیں۔ بائیں ہاتھ کی کلائی میں سونے کی ایک خوبصورت گھڑی تھی۔ اور سیاہ رنگ کا فیتہ گوری گوری نازک کلائی میں بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ پتلی پتلی انگلیوں میں جڑاؤ انگشتریاں تھیں۔ ناخن کیوٹکس سے سُرخ ہو رہے تھے۔ کانوں میں مرصّع آویزے تھے اور گلے میں خوبصورت لاکٹ۔ چھوٹا سا قد پتلے پتلے نازک ہونٹ۔ نرگسی آنکھیں۔ صراحی دار گردن۔ ریشم ایسے لمبے بال اور ان خوبصورت بالوں میں ہلکی سنہری جھلک۔ بیس بائیس سال عمر۔ لیکن اس عمر میں حسن کا کارواں لُٹا لُٹا معلوم ہوتا تھا۔ شکل و صورت صاف بتلا رہی تھی کہ مریضہ یہی ہے۔

اور اس بھاری بھر کم عورت کی عمر، پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔ لباس بھی صاف ستھرا تھا۔ بدن پر سونے کے دو چار زیور بھی تھے۔ چہرہ گو کچھ بے رونق سا تھا۔ لیکن بڑے ٹھسے کی عورت معلوم ہوتی تھی۔ سینی ٹوریم کے ایک ملازم نے پاس آ کر پوچھا۔

• آپ نے کوئی کمرہ لے رکھا ہے یا علیحدہ انتظام ہے؟"

"ہاں!" بڑھیا نے جواب دیا۔ "علیحدہ مکان کا انتظام ہے۔ موتی رام بانئے کی دوکان کہاں ہے؟"

"یہ دس قدم آگے جا کر بازار کی نکڑ پر ہے۔" ملازم نے کہا۔ "اس کی معرفت مکان لیا ہے آپ نے!"

"ہاں!" بڑھیا نے جواب دیا۔ "اسی کو لکھا تھا۔"

"مکان تو ایسے بھی مل سکتا تھا۔" نوکر نے کہا۔

"خیر!" بڑھیا بولی۔ "پسند کا نہ ہوا تو اور دیکھ لیں گے۔ تم یہاں کام کرتے ہو؟"

"جی ہاں!" ملازم نے جواب دیا۔

"ڈاکٹر کیسا ہے؟" بڑھیا نے پوچھا۔

"بہت اچھا آدمی ہے۔" ملازم نے جواب دیا۔ "پادری ہے۔"

"کس وقت مل سکیں گے؟" بڑھیا نے پوچھا۔

"جب بھی آپ چاہیں۔" ملازم نے کہا۔ "آپ اسباب ٹھکانے سے رکھ لیں پھر ان سے مل لیں۔"

"کھانے پینے کی چیزیں تو مل سکیں گی یہاں؟" بڑھیا نے پوچھا۔

"جی ہاں!" ملازم نے جواب دیا۔ "بازار ہے برابر میں۔ سب کچھ مل جاتا ہے۔ سبزی۔ دودھ۔ مکھن۔ گاؤں والے خود لے آتے ہیں۔"

"اچھا بیٹا جیتے رہو۔" بڑھیا نے مسکرا کر کہا۔ پھر نوکر سے جو ایک پتھر پر بیٹھا باتیں سن رہا تھا۔

"ابے چھدے! موتی رام کے پاس جا اور اس سے کہو کہ بی بی نصیبن آگئی ہیں اور مکان کا پوچھتی ہیں؟"

نوکر بازار کی طرف چلا گیا۔ نصیبن نے لڑکی سے جو ایک بستر پر بیٹھی پہاڑوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پوچھا۔

"انوری! تمھارے چلنے کا انتظام کیا ہوگا۔ چڑھائی نظر آ رہی ہے"۔

"پہلے مکان کا تو پتہ چلے۔" انوری نے کچھ روکھے پن سے جواب دیا۔ "پھر چڑھائی کا بھی دیکھ لیں گے۔"

نصیبن نے نوکرانی سے کہا۔

"ارمی مرادن! اونگھ رہی ہے کیا۔ انوری کو پان تو بنا دے۔"

"مجھے نہیں چاہیئے۔" انوری نے ذرا کھانستے ہوئے کہا۔

اور مرادن مسکرا کر بولی۔

"آج تو انوری بہت تھک گئی۔"

"تو مجھے ہی ایک بنا دے۔" نصیبن نے کہا۔

مرادن پاندان کھول کر پان لگانے لگی۔ انوری نے کلیا میں سے دو ایک الائچیاں اٹھالیں۔ اتنے میں چھدو ایک آدمی کو ساتھ لے کر آگیا۔ اور مزدوروں سے اسباب اٹھانے کو کہا۔ مزدور اسباب اٹھانے لگے۔

"چلو اب تم بھی۔" چھدو بھی ایک ٹوکری اٹھاتے ہوئے بولا۔ "کچھ دور نہیں جانا" اور انوری نے ذرا تیوری چڑھا کر کہا۔

"پہلے یہ تو بتاؤ۔ مکان ہے کہاں۔ کتنی دور ہے۔ چھوٹے منہ سے کچھ کہو گے بھی؟"

"الٰہی خیر!" چھدو کان کو ہاتھ لگا کر بولا۔

اور نصیبن بھی ذرا غصے سے بولی۔

"ابے ابکتا کیوں نہیں۔ کہاں ہے مکان۔ انوری کیسے جاسکے گی؟"

"بی بی!" جھیدو بھی ذرا اکڑ کر بولا "میں دیکھ تھوڑی ہی آیا ہوں۔ یہ آدمی ساتھ آیا ہے بتا دے گا۔"

"کیوں بھیا!" نصیبن نے اس آدمی سے پوچھا "کتنی دور چلنا ہوگا۔"

اس نے چیڑھ کے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف ہاتھ سے بتا کر کہا۔

"ان درختوں کے پاس ہے۔ بہت اچھا مکان ہے۔ کوئی دس ایک منٹ میں پہنچ جائیں گے۔"

"ہم تو پہنچ جائیں گے"، مرادن بولی "لیکن لڑکی کیسے جاسکے گی؟"

"بالکل سیدھا راستہ ہے۔" قلیوں میں سے ایک بولا "معمولی چڑھائی ہے۔"

"چلو!" انوری اُٹھتے ہوئے بولی "وہ موا موتی رام خود کیوں نہ آیا؟"

تو خیر! کچھ اسباب قلیوں نے اُٹھایا۔ کچھ جھیدو نے سنبھالا۔ ایک آدھ چیز مرادن نے پکڑی۔ بی نصیبن نے پاندان لیا اور اس طرح یہ چھوٹا سا قافلہ منزل کی طرف چلا۔

ہسپتال سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پہ ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ ساتھ ساتھ تین کمرے تھے۔ گو کچا مکان ہی تھا۔ لیکن خاصا صاف ستھرا اور ہوادار تھا۔ شمال کی جانب برآمدہ تھا۔ مکان سے کوئی دس ایک قدم کے فاصلے پہ ایک اور کوٹھری تھی۔ یہ باورچی خانے کا کام دے سکتی تھی۔ اور گودام کا بھی۔ برآمدے میں تین چار چارپائیاں رکھی تھیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی سامان نہ تھا۔ شمال کی جانب کہسار کا نظارہ بہت دلفریب تھا۔ پہاڑ کے دامن میں کسانوں کی مہکتی ہوئی ہری بھری کھیتیاں تھیں اور عقب میں چیڑھ کے درخت تھے۔ اور ایک پہاڑی ندی کسی شوخ اور چنچل حسینہ کی طرح اچھلتی کودتی مکان کے پاس سے گزرتی تھی۔ ادھر اُدھر اور بھی چھوٹے چھوٹے مکان تھے۔ یہی سینی ٹوریم تھا۔ اور ان میں مریض رہتے تھے۔

جھیدو اور مرادن نے جلدی سے ایک کمرے میں دری بچھائی اور چارپائی ڈال کر بستر جما دیا۔ انوری لحاف اوڑھ کر لیٹ گئی۔ اور مرادن دبانے لگی۔ نصیبن نے قلیوں سے اسباب ٹھکانے سے رکھوایا پھر انوری کے پاس آئی اور اس کے ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"بیٹی! طبیعت تو اچھی ہے؟"

"اچھی ہوں!" انوری نے جواب دیا۔

مرادن بولی۔

"تم نے جلدی کی۔ ہسپتال سے مریضوں کو اُٹھانے کی کرسی منگوا لی ہوتی۔"

"ٹھیک کہا تم نے" نصیبن بولی "خیال ہی نہ آیا۔ خیر! اب اٹھو تم کچھ کھانے کا کرو۔ پہلے چائے تیار کرو۔ بازار سے دودھ ابھی آتا ہے۔"

مرادن اُٹھ کر باورچی خانے کو چلی گئی۔

سورج پہاڑوں کی اوٹ میں چھپ رہا تھا۔ انوری برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھی تھی۔ وادیوں میں بادل نے چھاؤنی چھائی تھی۔ تاریں کی خوشبو فضا میں پھیل رہی تھی۔ نصیبن نے ڈاکٹر کو بلا بھیجا تھا۔ اور اب اس کا انتظار ہو رہا تھا۔ سورج غروب ہونے سے پہلے ڈاکٹر آیا۔ اس کے ساتھ اس کی میم اور ایک ہندوستانی ڈاکٹر بھی تھا۔ نصیبن اور انوری نے اُٹھ کر سلام کیا۔ جھیدو دو اور کرسیاں اُٹھا لایا۔ ڈاکٹر اور اس کی میم دونوں بیٹھ گئے۔ نصیبن اور دوسرا ڈاکٹر کھڑے رہے۔

ڈاکٹر کی میم نے انوری کی طرف دیکھ کر شوہر سے کہا۔

" ہاؤ ڈیری بیوٹی فل شی اِز ! (لڑکی کتنی خوبصورت ہے)
اور ڈاکٹر نے کہا۔

" بٹ کس سِک !" (لیکن بیمار معلوم ہوتی ہے)۔

ڈاکٹر کے جو بہت اچھی ہندوستانی بولتا تھا۔ پوچھنے پر نصیبن نے بتلایا۔ کہ انوری اس کی اکلوتی بیٹی ہے۔ چار پانچ مہینے سے کھانسی کی شکایت ہے۔ کسی وقت بخار بھی ہو جاتا ہے۔ اور ڈاکٹروں کے مشورے سے بیٹی کو سینی ٹوریم میں علاج کے لئے لائی ہوں۔

ڈاکٹر نے انوری سے پوچھا۔

" بخار کس وقت ہوتا ہے اور کتنا ہوتا ہے ؟"

انوری نے کہا۔ کہ کبھی دوپہر کو ہو جاتا ہے۔ کبھی شام کے وقت ٹمپریچر کبھی سو کبھی ایک سو ایک ہو جاتا ہے۔

" نیند کیسے آتی ہے ؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

" بہت کم !" انوری نے جواب دیا۔ "اور کھانسی بھی رات کے وقت ہی زیادہ پریشان کرتی ہے "

ڈاکٹر مسکرا کر بولا۔

" فکر مت کرو۔ اچھی ہو جاؤ گی۔ کل نو بجے ہسپتال میں معائنہ کرنے کے بعد دوا تجویز کی جائے گی "

نصیبن ہاتھ جوڑ کر بولی۔

" حضور! میری بیٹی اچھی ہو جائے تو عمر بھر لونڈی بن کر رہوں گی "

ڈاکٹر کی میم نے مسکرا کر کہا۔

اچھا ہو جائے گا۔ اس کا شادی ہو گیا ؟"

نصیبن نے کہا کہ ہم ناچ گانے کا کام کرتے ہیں۔ یہی ایک لڑکی زندگی کا سہارا ہے۔

" ہم کو کسی روز ناچ دکھاؤ گی " میم نے انوری سے پوچھا۔

" انوری مسکرانے لگی " نصیبن نے کہا۔

" میری بچی اچھی ہو جائے گی۔ تو ضرور دکھاؤں گی "

انوری کو سینی ٹوریم میں آئے بہت روز ہو چکے تھے۔ باقاعدہ علاج اور پرہیز سے اس کی صحت دن بدن اچھی ہو رہی تھی۔ لیکن وہ ہر وقت کچھ اداس اداس سی رہتی۔ پہاڑوں کے سکوت میں اسے گزرے ہوئے ایام کی یاد بہت ستاتی۔ رامش و رنگ کی مجلسیں، قدر دانوں کی قدر افزائیاں۔ چاہنے والوں کی ناز برداریاں، منتیں۔ خوشامدیں اور بے قراریاں بات بات پر قسم کھانا۔ وفا کے قول و قرار۔ نت نئے تحائف۔ نئی سوغاتیں۔ دلداریاں اور دلنوازیاں، کوئی زیور بنوا کر لا رہا ہے۔ کسی کے ہاں سے ساری آ رہی ہے۔ کوئی سیر کرنے کو موٹر بھیج رہا ہے۔ لیکن ایک انوری ہے جو سب کی ہے اور کسی کی بھی نہیں۔ ایک دل کس کس کو دے ایک جان کس کس کی نذر کرے۔ دین ایمان! صرف روپیہ! روپیہ! جس کی جیب بھاری وہی سب پر بھاری۔

وہ گلابی باغ کی رات! چھٹکی ہوئی چاندنی۔ سیماب کی طرح حوض کا چمکتا ہوا پانی۔ اور رامش و رنگ! وہ نگاہوں کے تیر اور اہل محفل کی بے قراریاں۔ وہ رات! وہ دلفریب رات!

رات کا وقت تھا۔ انوری پلنگ پہ لیٹی ہوئی تھی۔ چھاؤں برآمدے میں لحاف میں بیٹھا خراٹے بھر رہا تھا۔ نصیبن ساتھ کی کوٹھڑی میں سوئی ہوئی

پھنکارے مار رہی تھی۔ اور انوری کے پاس مراد ان فرش پر سوئی ہوئی تھی۔ کمرے کے دونوں کواڑ بند تھے۔ لیکن کھڑکی جس میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ کھلی تھی۔ چاندنی چیڑھ کے درختوں میں سے چھن کر آ رہی تھی۔ ہر طرف خاموشی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اور پہاڑی ندی فراق کی راگنی الاپتی مکان کے پاس سے گزر رہی تھی اور انوری ایک خواب دیکھ رہی تھی۔ ایک حسین خواب۔

شہر کے ایک مشہور سیٹھ کا بیٹا بدری ایک مدت سے انوری پہ جان چھڑکتا تھا۔ مکان پر آتا۔ گانا سنتا اور سو پچاس نذر کئے۔ اور چلا گیا۔ کچھ روز اسی طرح گزر گئے پھر تحائف آنے شروع ہوئے۔ اور وہ بھی بن مانگے کبھی کوئی زیور پیش ہو رہا ہے۔ کبھی کوئی قیمتی ساری نذر ہو رہی ہے۔ کبھی انوری کے لئے قسم قسم کے ملبوسات بن رہے ہیں۔ سہیلیوں کے ساتھ سینما جانا ہو یا کہیں سیر و تفریح کو تو موٹر بھیجا جا رہا ہے۔ کبھی نصیبن آٹے کی بوری منگوا رہی ہے۔ کبھی گھی کا کنستر آ رہا ہے۔ کبھی یہ کبھی وہ! کیا مجال جو ایک روز بھی خالی جائے۔ اور نہیں تو دو چار روپے کا پھل تو کہیں گیا نہیں۔ یہ سب کچھ تو ہے لیکن تخلیہ میں انوری سے بات کرنا کبھی نصیب نہیں ہوتا۔ نصیبن سو عیاروں کی ایک عیار۔ ادھر انوری کو سینکر بات کرنے میں حجاب اور بدری حرف مطلب زبان پر لانے کے لئے بیتاب۔ وقت اسی طرح گزر رہا تھا۔ انوری کے ناچ گانے کی دور دور تک دھوم تھی۔ گلے میں رس اور آواز میں کوئل کا سوز تھا۔ اور وقت کی مشہور گانے والیوں میں شمار ہوتی تھی۔ دور دور سے ناچ گانے کے پیغام آ رہے ہیں۔ مہینے میں دس روز گھر تو بیس روز باہر۔ لیکن سفر کے تمام اخراجات بدری کی جیب سے نکل رہے ہیں۔

اُدھر انوری کہیں سے واپس آئی۔ اُدھر بدری کا نوکر چوپل پل اور گھڑی گھڑی کی خبر رکھتا تھا۔ آیا۔ لیکن جواب کیا لے کر گیا۔

"سیٹھ جی سے ہماری طرف سے ہاتھ جوڑ کر کہنا کہ ابھی تو انوری بہت تھکی ہوئی ہے۔ دو ایک روز بعد تشریف لائیں"

اور اِدھر انوری کسی اور کی آغوش میں بیٹھی مکر اور فریب کے جادو جگا رہی ہے۔

اسی اثنا میں بدری کا باپ مر گیا اور بی نصیبن کے لئے وہی بات ہوئی کہ بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ اب بدری کی مراد بھی بر آئی۔ اور اس خوشی میں بدری نے گلابی باغ میں اپنے دوستوں کو دعوت دی۔ آج انوری کی سج دھج دیکھنے کے قابل تھی۔ اور نصیبن بھی رانی بنی ہوئی تھی۔ شہر کی دو ایک اور بھی گانے والیاں بلائی گئی تھیں۔ جب وہ گا چکیں تو انوری کی باری آئی۔ انوری کے ناچ نے سب کو مسحور کر دیا۔ پھر اس نے کچھ گا کر سنایا۔ آج انوری پر اتنے روپے نچھاور ہوئے کہ نصیبن کی جھولی بھر گئی۔ انوری اور اس کی ماں نصیبن تو شاداں و فرحاں گھر آئیں۔ لیکن دوسری گانے والیاں ایک داغ حسرت لے کر لوٹیں۔

لیکن آج وہی انوری جس پر کبھی یہ مثال صادق آتی تھی۔ کہ یک انار و صد بیمار۔ آج خود بیمار تھی۔ اور چاہنے والوں میں سے کسی ایک کو بھی اس کی خیر خبریت پوچھنے کا خیال نہ آیا۔ نہ کوئی سندیسہ۔ نہ پیام نہ خط۔

انوری سو رہی تھی۔ ہوا بھی شاید کچھ تھکی تھکی سی تھی۔ اور ندی بھی غالباً تھم گئی تھی، ستارے آنکھیں جھپک رہے تھے۔ چاند پھیکا پڑ چکا تھا۔ اور سونے والی کے سنہری رنگت والے خوبصورت بالوں کی جھلک کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ سانس رک رک کر آ رہا تھا۔ اور سینہ ابھرتا اور بیٹھتا معلوم ہوتا تھا۔ شاید انوری خواب میں اپنی اجڑی جوانی کا ماتم کر رہی تھی۔ کیونکہ اس کی پلکوں کے سائے میں آنسو موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

انوری کا وقت عموماً گھر ہی کے سامنے میں گزرتا تھا۔ دھوپ ہوتی تو وہ ندی پر جا بیٹھتی۔ کبھی تنکے اٹھا اٹھا کر پانی میں پھینکتی کبھی کاغذ کی ناؤ بنا کر ندی میں بہاتی اور میٹھے میٹھے گیت گاتی۔ وہ گیت جس کے سننے کو کبھی ایک دنیا بیتاب رہتی تھی۔ لیکن اب اسے دنیا پر کوئی اعتبار نہ تھا۔ وہ اپنے چاہنے والوں کے نام سے بھی بیزار معلوم ہوتی تھی۔ اور تو اور اسے اپنی ماں سے بھی اب نفرت تھی۔ وہ ماں جس کے لالچ اور ہوس نے اسے اس حال پر پہنچا دیا تھا۔ نصیبن کا دین ایمان خدا جو کچھ بھی تھا۔ پیسہ تھا۔ اور لوگوں کی جیب سے پیسہ کھینچنے کے لئے اس کے پاس ایک مقناطیس بھی تھا۔ اور اس مقناطیس کا نام تھا انوری۔ لیکن تابہ کے بالآخر حد سے بڑھی ہوئی بے اعتدالیوں نے اب انوری کو بھی موت

کے گھاٹ پہ لا کھڑا کیا تھا۔

انوری نے تھوڑے ہی دنوں میں گاؤں کی عورتوں سے بھی راہ و رسم پیدا کر لی تھی۔ گاؤں میں بھی دس بارہ گھر تھے۔ انوری جب کسی کے گھر جاتی تو اڑوس پڑوس کی عورتیں بھی آ جاتیں۔ ان عورتوں سے انوری کو باتیں کرنے میں بہت لطف آتا۔ وہ ہنستی تو دوسری عورتیں بھی ہنسنے لگتیں۔ ہر ایک کو یہی تمنا ہوتی کہ وہ کبھی ان کے گھر میں بھی آ جائے۔

ایک روز جو وہ گاؤں میں گئی تو اسی گوالے کے ہاں جو انہیں دودھ دیا کرتا تھا۔ جا بیٹھی۔ دو ایک روز سے دودھ اچھا نہیں آتا تھا اس لئے وہ شکایت کرنے گئی تھی۔ گوالا تو موجود نہ تھا لیکن اس کی بیوی موجود تھی جب انوری نے اس سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ تم دودھ میں پانی ملا کر لاتے ہو۔ تو گوالے کی بیوی نے کہا۔

"بی بی! قسم لے لو جو ہم نے کبھی آج تک دودھ میں ایک قطرہ بھی پانی کا ملایا ہو۔ دودھ تو خدا کا نور ہوتا ہے۔ اتنا ظلم کر کے کسی نے دوزخ مول لینا ہے کیا۔ ایسے کام تو شہر والے ہی کرتے ہیں۔"

"اوہو!" انوری نے ہنسکر پوچھا۔ "تم ہم لوگوں کو بہت برا سمجھتی ہو۔"

"بی بی!" گوالن بولی۔ "خدا نہ کرے تم بری ہو لیکن شہر والے تو سنتی ہوں خدا کو بھی بھولے رہتے ہیں۔ اور ایک ہم لوگ ہیں کہ بس اسی کے سہارے ان جنگلوں میں زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔"

"تمہارا دل یہاں کیسے لگتا ہے؟" انوری نے پوچھا۔

"وطن جو ہوا!" پاس سے ایک اور نے کہا۔ "وطن کسے پیارا نہیں ہوتا۔"

ایک اور نے پوچھا۔

"بی بی! تمہارا بیاہ نہیں ہوا ابھی۔"

"ہو چکا۔" انوری ہنسکر بولی۔ "مدت ہو گئی۔"

"تمہارا شوہر ساتھ ہی آیا ہو گا۔" اس نے پوچھا۔

"نہیں!" انوری نے جواب دیا۔

"کہیں شہر میں ملازم ہو گا۔" ایک اور نے پاس سے کہا۔

انوری نے ہنسکر کہا۔

"مجھے معلوم نہیں۔ چھوڑ دیا میں نے۔"

"چھوڑ دیا؟" ایک دو عورتوں نے تعجب سے پوچھا۔ "طلاق لے لی کیا؟"

"نہیں!" انوری نے ہنسکر کہا۔ "میں نے طلاق دے دی۔"

"بن نہ آئی ہو گی۔" ایک بڑھیا نے کہا۔

ایک اور بولی۔

"تو پھر اور شادی نہیں کرو گی؟"

"کی تھی۔" انوری نے جواب دیا۔ "لیکن اسے بھی چھوڑ دیا۔"

سب عورتیں ہنسنے لگیں۔ گوالن بولی۔

"جب ساتھ نہیں آیا تو چھوڑنا ہی ہوا نا۔"

اور انوری نے ہنس کر کہا۔

"نکال دیا اسے بھی گھر سے۔"

یہ کہہ کر وہ ہنستی ہوئی اُٹھی۔ اور واپس چلی گئی۔

اسی گاؤں میں ایک جوان لڑکا بھی رہتا تھا۔ بیس اکیس کے لگ بھگ عمر ہوگی۔ اس کا نام تھا میر عالم۔ میر عالم گو ایک مفلس بڑھیا کا مفلس بیٹا تھا۔ لیکن قدرت نے اسے مردانہ حسن عطا کرنے میں بخل سے کام نہ لیا تھا۔ میر عالم گاؤں والوں کی گائیں بھینسیں چراتا اور اس کے عوض اسے دونوں وقت کی روٹی مل جاتی اور فصل ہونے پر کچھ اناج۔ انوری جب گاؤں میں آتی تو میر عالم کچے اخروٹ انوری کے لئے توڑ کر لاتا۔ اور وہ بھی اسے کبھی روٹی کبھی چونی دے دیتی۔ کبھی کبھی میر عالم سڑک تک بھی اس کے ساتھ آجاتا۔

ایک روز انوری ندی کے کنارے بیٹھی تھی۔ ہوا چیڑھ کے درختوں میں سنک رہی تھی۔ اور دھوپ پتوں میں سے چھن چھن کر آرہی تھی۔ اتنے میں کہسار کے سکوت میں کہیں دور بنسری کی سُریلی آواز جادو جگانے لگی۔ انوری نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ لیکن بنسری بجانے والا کہیں نظر نہ آیا۔ لیکن آواز بتدریج نزدیک چلی آرہی تھی۔ اچانک انوری نے میر عالم کو دیکھا۔ میر عالم اپنی دھن میں بنسری بجاتا چلا آرہا تھا۔ لیکن جب اس نے انوری کو دیکھا تو بنسری بجانی چھوڑ دی۔ اور اُس کے پاس آکر اپنے پھٹے ہوئے کرتے کی جیب سے ایک بھٹا ہوا بھٹا نکالا اور کہا۔

"یہ لو گرم ہے ابھی۔"

انوری نے مسکرا کر پوچھا۔

"تم کھاؤ۔ اپنے لئے ہی تو لائے ہوگے۔"

"نہیں!" میر عالم نے سادگی سے جواب دیا۔ "تمہارے لئے لایا ہوں۔"

"لیکن اس وقت میرے پاس تو کوئی پیسہ نہیں۔" انوری نے جواب دیا۔

"میں پیسے لینے کو نہیں لایا۔" میر عالم نے جواب دیا۔ "میں بھکاری نہیں۔ محنت کرتا ہوں اور روزی کماتا ہوں۔"

"نہیں! نہیں!" انوری نے کہا "میرا یہ مطلب نہیں۔ لیکن اگر کوئی کسی سے چیز لے تو اس کی قیمت تو دینی چاہیئے۔"

"امیر لوگ یوں ہی کہا کرتے ہیں" میر عالم نے جواب دیا۔

"لیکن میں تو امیر نہیں۔" انوری نے ہنس کر کہا۔

میر عالم کے ایک ہاتھ میں بھٹا تھا۔ دوسرے میں بنسری۔ اس کے چہرے پر جوانی کی رنگت تھی۔ چھوٹی چھوٹی خمدار مونچھیں تھیں۔ داڑھی منڈی ہوئی تھی۔ چوڑا چکلا سینہ تھا۔ لیکن اس مفلسی اور غربت میں بھی اس کی چال میں ایک وقار تھا۔ بات بھی کرتا تو ذرا مسکرا کر۔ انوری نے اس سے بھٹا لے لیا اور دانتوں سے نوچ نوچ کر کھانے لگی۔

"سچ کہتے ہو؟" انوری نے پوچھا۔ "تم میرے ہی لئے بھون کر لائے ہو؟"

"ہاں!" میر عالم نے جواب دیا۔ "تمہارے لئے۔"

لیکن تم نے کیسے جانا کہ میں اس وقت تمہیں ندی پر ملوں گی"۔ انوری نے پوچھا۔

"میں نے کئی بار تمہیں یہاں بیٹھے دیکھا ہے۔" میر عالم نے جواب دیا۔

"چھپ چھپ کر دیکھا کرتے ہو گویا؟" انوری نے ہنس کر کہا۔

"مجھے چھپ کر دیکھنے کی ضرورت ہے۔" میر عالم نے جواب دیا۔

"لیکن؟" انوری نے پھر پوچھا۔ "تم مجھے دیکھا کیوں کرتے تھے؟"

"جو چیز آنکھوں کے سامنے آجائے۔ انسان اسے دیکھ ہی لیتا ہے۔" میر عالم نے جواب دیا۔

انوری بولی۔

"بھٹا تو میں نے کھا لیا۔ لیکن اگر پیٹ میں درد ہوا تو پھر؟"

"ایک بھٹا کھا لینے سے کیا۔" میر عالم نے تعجب سے کہا۔ "مجھے تو جتنے بھی ملیں کھا لیتا ہوں۔"

"تم تگڑے آدمی ہو؟" انوری نے مسکرا کر کہا۔ "میں بیمار ہوں۔ مجھے ڈاکٹر نے ایسی چیزیں کھانے سے منع کر رکھا ہے۔"

"تو پھر تم نے کھایا کیوں؟" میر عالم نے کہا۔

"کوئی اگر محبت سے کچھ دے تو کیسے انکار ہو سکتا ہے؟" انوری نے جواب دیا۔

میر عالم نے کچھ جواب نہ دیا۔ انوری بولی۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"میں ڈر رہا ہوں کہیں تمھیں پیٹ میں درد نہ ہونے لگے۔" میر عالم نے جواب دیا۔

"ڈرو نہیں؟" انوری بولی۔ "جو چیز محبت سے کوئی کھلائے اس سے تکلیف نہیں ہوتی۔ تم بھی تو محبت ہی سے لائے تھے نا؟"

میر عالم صرف مسکرا دیا۔ انوری بولی۔

"تم بنسری تو خوب بجاتے ہو؟"

"تم سنو گی؟" میر عالم نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہاں؟" انوری نے جواب دیا۔ "سنوں گی۔ بجاؤ تو؟"

میر عالم بھی ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اور بنسری بجانے لگا۔ اور انوری پھر کھوئی ہوئی محبت کے خواب دیکھنے لگی۔

میر عالم کو انوری سے باتیں کرنے کا کیوں شوق تھا۔ یہ تو میر عالم کو معلوم ہوگا۔ لیکن انوری کو آج پھر وہی فریبوں کی دنیا آباد کرنے کے سامان نظر آرہے تھے وہ جب سے یہاں آئی تھی ماس کا غنچۂ دل ہمیشہ مرجھایا رہتا۔ کہاں وہ دن کہ ملنے والے سو سو پھیرے ڈال رہے ہیں۔ جگہ جگہ سے بلاوے آرہے ہیں۔ ایک جاتا ہے دوسرا آتا ہے۔ اور کہاں آج یہ حالت کہ دل بہلانے کا کوئی سامان ہی نہیں لیکن قدرت کو شاید اس پہ پھر رحم آگیا تھا۔ جو اس نے دل لگی کے لئے میر عالم کو اس کے پاس بھیج دیا تھا۔ میر عالم جوان تھا۔ خوبصورت تھا۔ اور سادہ لوح تھا۔ تو پھر میر عالم ہی انوری کے لئے کھلونا کیوں نہ بنے۔ جیتا جاگتا۔ چلتا پھرتا۔ ہنستا بولتا کھلونا اور اس نوجوان کے دل میں محبت کی گرمی پیدا کر دینا تو انوری کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔ اور نہیں تو وقت تو اچھا کٹ جائے گا۔

اور ہو سکتا ہے کہ انوری کی بیچارگی اور مایوسی پہ قدرت نے ترس کھا کر اسے سنبھلنے کا ایک موقع دیا ہو۔ اور میر عالم کے ذریعہ اس کا امتحان لینا چاہتی ہو بہرکیف واقعات سے خود بخود روشن ہو جائے گا کہ عورت کی فطرت بدل سکتی ہے یا نہیں۔

تو خیر! انوری نے تھوڑے ہی دنوں میں میر عالم سے تعلقات کچھ اس قدر بڑھا لئے کہ اب وہ اس کا کلمہ پڑھنے لگا۔ جب دیکھو دونوں اکٹھے نظر آتے۔ کبھی انوری کسی درخت کی شاخ پہ بیٹھتی اور میر عالم شاخ کو پکڑ کر جھولا دیتا۔ اور انوری جھولا جھولتی۔ کبھی دونوں بچوں کی طرح آنکھ مچولی کھیلتے۔ کبھی میر عالم بنسری بجاتا اور انوری گاتی۔ کبھی دونوں مل کر جھومر ڈالتے کبھی انوری اسے میٹھے میٹھے گیت یاد کراتی۔ پھر دونوں

مل کر گاتے۔ گائے بھینسیں چرتی چگتیں دور نکل جاتیں۔ اور میر عالم کو خبر تک نہ ہوتی۔

ایک روز دونوں ندی پر بیٹھے تھے۔ انوری نے پوچھا۔

"ماشاءاللہ! تم جوان ہو شادی کیوں نہیں کرتے۔"

"شادی؟" میر عالم نے مسکرا کر کہا۔ "مجھ سے کون شادی کرے گی؟"

"کیوں؟" انوری نے پوچھا۔ "کیا انکار ہو سکتا ہے کسی کو؟"

"میرے پاس رکھا ہی کیا ہے" میر عالم نے جواب دیا۔ "جو کوئی میری جورو بننے پر راضی ہو گی؟"

"لیکن تمہارا دل تو کرتا ہو گا؟" انوری نے مسکرا کر پوچھا۔

"دل کس کا نہیں کرتا؟" میر عالم نے ہنس کر کہا۔

"تو پھر کوئی لڑکی پسند بھی آئی؟" انوری نے پوچھا۔ "کبھی کسی سے محبت بھی کی تم نے؟"

"جب ہمیں ہی کسی کو پسند نہیں، تو میں کسی کو کیوں پسند کروں؟" میر عالم نے ہنس کر کہا۔

"لیکن کسی سے محبت تو ہو گی؟" انوری نے پوچھا۔

"نہیں!" میر عالم نے جواب دیا۔

"میر عالم!" انوری ہنس کر بولی۔ "مسلمان ہو کر جھوٹ بولتے ہو۔ کبھی دل سے بھی پوچھا؟"

"دل سے کیا پوچھنا ہے؟" میر عالم نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "دل کی باتیں تو اُلٹی ہی ہوتی ہیں۔"

"تم میری بات کا جواب دو۔" انوری نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "کبھی کسی سے محبت کی تم نے؟"

"نہیں!" میر عالم نے ہنسکر کہا۔

"سچ کہتے ہو؟" انوری نے پوچھا۔ "کھاؤ تو میرے سر کی قسم۔"

لیکن میر عالم بنسری بجانے لگا۔ سڑک کی جانب سے کبھی کبھی کسی لاری یا موٹر کی آواز سُنائی دینے لگتی۔ کبھی کسی پیڑ پر سے جنگلی کوّے کی بھدّی سی آواز آنے لگتی۔ میر عالم ایک بے خودی سے بنسری بجا رہا تھا۔ اور انوری چھوٹی چھوٹی کنکریاں اُٹھا اُٹھا کر ندی میں پھینک رہی تھی۔ ننھے ننھے گرداب پیدا ہوتے اور مٹ جاتے۔

جانے اس وقت انوری کیا سوچ رہی تھی۔ اس نے میر عالم سے بنسری لے لی۔ اور خود بجانے لگی۔ بھلا اس سے کہاں بجتی تھی۔ میر عالم ہنس کر بولا۔

"بنسری تمہیں بجانی نہیں آتی۔ لیکن نقل خوب اُتارتی ہو۔"

"تم نے کبھی سکھائی ہوتی تو بجانا بھی آ جاتی۔" انوری نے کہا۔ "خیر چھوڑو یہ باتیں تم یہ بتاؤ تمہیں میرے پاس بیٹھنا پسند ہے؟"

"یہ کیا پوچھا تم نے" میر عالم نے ہنس کر کہا۔ "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے بھلا!"

"اچھا!" انوری نے کہا۔ "تم یہ بتاؤ میں خوبصورت ہوں یا نہیں؟"

"بہت!" میر عالم نے ہنسکر کہا۔

"تمہیں پسند ہوں؟" انوری نے پوچھا۔

"بہت!" میر عالم نے پھر ہنسکر کہا۔

"کیوں؟" انوری نے پوچھا۔

"معلوم نہیں!" میر عالم نے مسکرا کر کہا۔

"معلوم کیوں نہیں؟" انوری نے پوچھا۔

"بس!" میر عالم نے کہا "معلوم نہیں!"

"تمہیں مجھ سے محبت ہے؟" انوری نے پوچھا "سچ سچ بتاؤ۔"

"سچ سچ!" میر عالم نے کہا۔

"ہاں!" انوری نے کہا "سچ سچ۔"

"تو کل بتاؤں گا" میر عالم نے جواب دیا۔

"آج کیوں نہیں" انوری نے پوچھا۔

"پوچھ کر بتاؤں گا" میر عالم نے ہنسکر کہا۔

اور انوری نے تعجب سے پوچھا۔

"پوچھ کر۔ کس سے؟"

"دل سے!" میر عالم نے ہنسکر کہا۔

یکا یک انوری کو خیال ہونے لگا کہ جسے وہ بالکل سادہ لوح سمجھتی تھی وہ کچھ ہوشیار بھی ہے۔

ایک روز رات کا وقت تھا۔ اور انوری سو رہی تھی۔ کمرے کی کھڑکی جو جنگل کی طرف کھلتی تھی۔ آدھی کھلی تھی اور آدھی بند چاندنی پتوں سے چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔ اور میر عالم اس وقت ندی کے کنارے بیٹھا بنسری بجا رہا تھا۔ شاید انوری کو کسی مچھر نے کاٹا ہو گا۔ جو اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ ساتھ ہی بنسری کی بھنک کان میں پڑی پہلے تو اس نے جانا کہ شاید وہ خواب دیکھ رہی ہے لیکن یہ خواب نہیں تھا۔ بلکہ ایک حقیقت تھی اور وہ بیدار تھی۔ کچھ دیر تو وہ پلنگ پہ ہی لیٹی رہی پھر کمبل اوڑھ کر چپکے سے گھر سے نکلی اور ندی کے کنارے کنارے چلی۔ چھٹکی ہوئی چاندنی رات کی خاموشی۔ جنگل کا سکوت کائنات سوئی ہوئی۔ ندی کا پانی چمکتا ہوا اور بنسری کی پُر سوز آواز۔ انوری کو آج ایک ایسی کیفیت ایک ایسا لطف اور ایک ایسی خوشی محسوس ہونے لگی جو آج سے پہلے اسے کبھی میسر نہ ہوئی تھی۔ میر عالم خاموش بیٹھا ایک ایسا نغمہ بجا رہا تھا۔ جو دل میں ایک ہیجان پیدا کر رہا تھا اور جوانی کے جذبات کو بیدار کرنے والا تھا۔ جانے کیوں انوری کا دل بھی اس وقت دھڑک رہا تھا۔ وہ کبک کی طرح مست اداؤں کے ساتھ قدم اٹھاتی ہوئی اس کے پاس جا پہنچی۔ لیکن میر عالم کو جیسے خبر تک نہ ہوئی آخر انوری بولی۔

"میر عالم! کب سے یہاں بیٹھے ہو؟"

میر عالم نے ایک چیڑھ کے درخت کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ درخت دیکھتی ہو۔ چاند ابھی اس کے عقب میں تھا۔ جب میں یہاں آیا۔"

"کوئی بھینس جنگل میں کھو گئی تھی کیا۔ جو اس وقت گاؤں سے نکل آئے" انوری نے پوچھا۔

"ہاں!" میر عالم نے جواب دیا "کچھ کھو ہی گیا ہے!"

"کیا؟" انوری نے اس کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے پوچھا "کیا کھو بیٹھے تم؟"

میرے پاس ایک "من" تھا۔ میر عالم نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "دنیا میں یہی میری دولت تھی۔ اور اسی پہ مجھے بھروسہ تھا۔ ایک روز ایک خوبصورت ناگن کہیں سے آنکلی۔ اور چپکے سے میرا "من" مجھ سے چھین کر لے گئی۔"

"ناگن؟" انوری نے ذرا مسکرا کر پوچھا۔

"ہاں!" میر عالم نے جواب دیا۔ "لیکن بڑی خوبصورت!"

"تو تم اس ناگن کو بلانے کے لئے اس وقت بنسری بجا رہے تھے؟" انوری نے پوچھا۔

"ہاں!" میر عالم نے جواب دیا۔

"تو پھر ناگن آئی بھی یا نہیں؟" انوری نے پوچھا۔

میر عالم نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور سر جھکا لیا۔ انوری کچھ دیر اس کی طرف خاموش بیٹھی دیکھتی رہی۔ پھر میر عالم نے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"لیکن تم کیوں آئیں اس وقت؟"

انوری نے میر عالم سے بنسری لے لی۔ اور ہونٹوں سے لگا کر مسکرا مسکرا اس کی طرف دیکھنے لگی۔

میر عالم ہنس کر بولا۔

"سمجھا! بنسری کی آواز نے جگا دیا تمھیں؟"

"ہاں!" انوری نے مسکرا کر کہا۔ "اور اب تمھیں جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔"

"منظور۔" میر عالم نے مسکرا کر کہا۔

"کیا دو گے؟" انوری نے پوچھا۔ "بولو۔"

"پانچ بھنے ہوئے بھٹے!" میر عالم نے ہنس کر کہا۔

انوری بھی ہنسنے لگی۔

"تم نے دل سے مشورہ کر لیا؟" انوری نے پوچھا۔

"ہاں کر لیا!" میر عالم نے جواب دیا۔

"پھر کیا کہا دل نے؟" انوری نے پوچھا۔

"دل نے کہا کہ پوچھنے والا اپنے دل سے پوچھے۔" میر عالم نے ہنس کر جواب دیا۔

"تمھیں تو کچھ نہیں بتایا؟" انوری نے پوچھا۔

"نہیں!" میر عالم نے کہا۔

"میں بتاؤں۔" انوری بولی۔ "تمھارا دل کیا کہہ رہا ہے۔"

"ہاں بتاؤ!" میر عالم نے کہا۔

انوری نے اپنی نازک اور خوبصورت باہیں میر عالم کے گلے میں ڈال دیں اور مسکرا کر بولی۔

"ٹھیک ہے نا؟"

میر عالم مسکرانے لگا۔ انوری بھی مسکرا رہی تھی۔ اور شاید ستارے بھی مسکرا رہے تھے اور ندی کے کنارے جو بوٹے تھے وہ بھی رقص کرنے معلوم

ہوتے تھے۔ چاند ہالے میں چھپ گیا تھا۔

وقت اسی طرح گزر رہا تھا۔ پہاڑ کی آب و ہوا۔ دوا اور پرہیز سے انوری کی کایا پلٹ گئی تھی۔ سردی بھی کچھ پڑنے لگی تھی۔ اور ڈاکٹر نے انوری کو واپس جانے کی اجازت دے دی تھی۔ اور واپسی کا دن بھی مقرر ہو چکا تھا۔ لیکن میر عالم غریب کو ان باتوں کی کچھ خبر نہ تھی۔ دن انوری کے ساتھ گزرتا رات سہانے خواب دیکھتے کٹ جاتی۔ جس روز انوری کو جانا تھا۔ اس رات وہ میر عالم سے جنگل میں ملی۔ رات کافی سرد تھی۔ مطلع آسمان صاف تھا۔ شبنم پڑ رہی تھی۔ ہری ہری گھاس گیلی معلوم ہوتی تھی۔ ستاروں نے اپنی بساط بچھا رکھی تھی۔ اور ندی پر آج اداسیوں کا عالم چھایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ کائنات کا ذرہ ذرہ محوِ خواب تھا۔

"اُف توبہ!" انوری نے میر عالم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ "آج تو بہت سردی ہے۔"

"ہاں" میر عالم نے کہا۔ "اب رات کے وقت باہر مت آیا کرو۔ کہیں ٹھنڈ نہ لگ جائے۔"

"تم یہ کہو۔" انوری بولی۔ "کہ تمہیں جاڑا لگتا ہے۔"

"میرا کیا ہے" میر عالم نے جواب دیا۔ "میں تو ہوں جنگل کا رہنے والا۔ گاؤں ہو یا جنگل میرے لئے برابر ہے۔ جہاں نیند آگئی۔ وہیں سو رہا۔"

"اور میں؟" انوری نے پوچھا۔

"تم پھولوں کی سیج پہ سونے والی پھولوں کی رانی" میر عالم نے مسکرا کر جواب دیا۔

"پھولوں کی رانی! میں؟" انوری نے اس کے سینے کے ساتھ سر لگا کر کہا۔ "اور تم! بن کے راجہ! ٹھیک ہے نا؟"

"جو کچھ تم سمجھو!" میر عالم نے جواب دیا۔

"میر عالم!" انوری نے ہنس کر پوچھا۔ "سچ بتاؤ تمہیں مجھ سے محبت ہے؟"

"یہ اپنے دل سے پوچھو!" میر عالم نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

"تم نہیں بتاؤ گے؟" انوری نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"میں غریب کیا بتاؤں" میر عالم نے ایک آہ بھر کر کہا۔

"تم نے آہ کیوں بھری؟" انوری نے پوچھا۔ "ناراض ہو کچھ؟"

"تم سے؟" میر عالم نے مسکرا کر کہا۔ "تمہارے لئے تو جان بھی حاضر ہے۔"

"میں جان لے کر کیا کروں گی؟" انوری نے مسکرا کر کہا۔ "کچھ اور دو۔"

"دینے کو کچھ ہوتا تو کیا چھپا کر رکھتا" میر عالم نے پھر ایک آہ بھر کر کہا۔

"من کہاں ہے؟" انوری نے پوچھا۔

"من جس کے پاس ہے تمہیں معلوم ہی ہے" میر عالم نے جواب دیا۔

"میں جب تمہارے پاس نہیں ہوتی تو مجھے کبھی یاد بھی کیا کرتے ہو؟" انوری نے پوچھا۔

"یاد آدمی اسے کرتا ہے جو پاس نہ ہو" میر عالم نے جواب دیا۔

"میں بھی تو تمام وقت تمہارے پاس نہیں ہوتی" انوری نے کہا۔

"یہ تو دل کی بات ہے" میر عالم نے جواب دیا۔

"میں تمہارے دل میں رہتی ہوں کیا؟" انوری نے پوچھا۔

"یہ اپنے دل سے پوچھو!" میر عالم نے جواب دیا۔

"چاند کالے کالے بادلوں میں سے اچانک جھانکنے لگا۔ دنیا کا ذرّہ ذرّہ چاندی کی طرح چمکنے لگا۔ میر عالم کا ہاتھ انوری کی کمر میں تھا اور انوری کا خوبصورت سر اس کے سینے پر۔ اچانک کہیں پاس ہی سے اُلّو کی منحوس آواز سنائی دی۔ میر عالم نے درختوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"یہ جب بولے گا نحوست ہی لائے گا۔"

"میر عالم!" انوری نے پوچھا۔ "مجھے کبھی یاد بھی کیا کرو گے؟"

"تو کیا جانے کا ارادہ ہے اب؟" میر عالم نے ذرا تعجب سے پوچھا۔

"جانا تو پڑے ہی گا۔" انوری نے ہنسکر کہا۔

"کہاں؟" میر عالم نے پوچھا۔ "مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی؟"

"تم بھی تو چلے جاتے ہو۔" انوری نے کہا۔

"بس یہی ذرا گاؤں تک۔" میر عالم نے جواب دیا۔

"اور میں بھی بس ذرا گھر تک ہی جاؤں گی۔" انوری نے ہنسکر کہا۔

"کب؟" میر عالم نے پوچھا۔

"اب!" انوری نے ہنسکر جواب دیا۔

میر عالم نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اُٹھا لیا اور ہنسکر کہا۔

"جاؤ تو بھلا۔ کیسے جاتی ہو۔"

دونوں ہنسنے لگے۔

"بہت خوش ہو۔" انوری نے پوچھا۔

"تم جو پاس ہو۔" میر عالم نے جواب دیا۔

"اور جب میں پاس نہیں ہوتی۔" انوری نے پوچھا۔ "پھر بھی خوش رہتے ہو۔"

"کون کہتا ہے تم پاس نہیں ہوتیں۔" میر عالم نے اس کی ٹھوڑی ہلا کر کہا۔ "میں نے تمھیں ایسی جگہ چھپا رکھا ہے۔ کہ اب تم کہیں جا ہی نہیں سکتیں۔"

"کہاں چھپا رکھا ہے؟" انوری نے ہنسکر پوچھا۔

"اوہوں!" میر عالم نے ہنسکر کہا۔ "یہ نہیں بتا سکتا۔"

"اور اگر میں نے بوجھ لیا۔" انوری نے پوچھا۔

"بوجھو!" میر عالم نے کہا۔

انوری نے اس کے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "یہاں۔ ٹھیک ہے نا؟" میر عالم ہنسنے لگا۔ چاند ایک کی عیاری دوسرے کی سادگی دیکھ کر پھر بادلوں میں چھپ گیا۔

آؤ! وہ گیت گائیں!

"کیا؟"

"ہماری گلی آنا" انوری نے کہا۔ "اچھاجی!" میر عالم نے ہنسکر کہا۔
"بہت پسند ہے تمھیں" انوری نے پوچھا۔
"اور تمھیں بھی تو پسند ہے" میر عالم نے پوچھا۔
"ہاں!" انوری نے کہا "تو گاؤ پھر"
دونوں گانے لگے۔

ہماری گلی آنا . . . اچھاجی
ہمیں نہ بھلانا . . . اچھاجی
پہلی محبت کی باتیں . . . اور ہیں جوانی کی راتیں
گاتا ہے پی پی پپیہا . . . ڈولے ہے من کی نیا
ہم تم ہیں دونوں کھویا . . . . . اچھاجی
کشتی کنارے لگانا
ہماری گلی آنا . . . اچھاجی
ہمیں نہ بھلانا . . . . . اچھاجی

جنگل کی فضا گیت سے مسحور معلوم ہوتی تھی۔ میر عالم مکان تک انوری کے ساتھ آیا۔ انوری مسکرا کر بولی۔
"میر عالم مجھے بھول نہ جانا"
میر عالم ہنستا ہوا چلا گیا۔
اگلے روز سورج نکلتے ہی ایک موٹر سینی ٹوریم کے دروازے پر آکر رُکا۔ انوری اور اس کے ساتھ والے سوار ہو کر وطن کو چل دیئے۔ میر عالم جب مویشی لے کر مکان کے پاس سے بنسری بجاتے گزرا تو مکان خالی نظر آیا۔ غریب دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ لیکن اب انوری کہاں تھی۔ ایک مریض اچھا ہو کر چلا گیا تھا۔ اور اس کی جگہ ایک نیا مریض برآمدے میں کھڑا بنسری بجا رہا تھا۔ اور جنگل کی خاموش فضاؤں کو اپنا دُکھڑا سنا رہا تھا۔
سچ ہے عورت کی فطرت نہیں بدلتی۔

صادق الخیری

بنتِ قمر

اب کے موسمِ بہار کس تابانی سے آیا ہے! ہر جگہ سبزہ، ہر طرف پھول، ہر سمت تازگی۔ گویا کائنات کو حیاتِ نو ملی ہے، لیکن یہ ہریالی اور یہ شادابی جاوداں نہیں۔ ایک دن اسے نذرِ خزاں ہونا ہے۔ زندگی کی بہار بھی عارضی ہے، ہماری خوشیاں بھی زوال آمادہ ہیں، مگر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ گلشنِ حیات میں دائمی بہار کیوں نہیں آتی؟ ایسی بہار جو خزاں کو جنم نہ دے، جس کے بطن سے افسردگی پیدا نہ ہو!

میرا دل چاہتا ہے کہ والد کی طرح جنھیں میں بچپن سے ڈیڈی کہتی ہوں، اپنے اہم واقعات باقاعدہ تحریر کروں۔ وہ کہتے ہیں اس سے جی بہلتا ہے اور جو بات زبان پر برملا نہیں آسکتی، وہ نوکِ قلم پر پوشیدہ طور پر آکر دل کی پھانس نکال دیتی ہے، لیکن وہ اپنی ڈائری کسی کو نہیں دکھاتے، مجھ تک کو نہیں، بلکہ ایک دفعہ میں نے ضد کی تو وہ خاموش ہو گئے، اور اس کے بعد پھر کبھی مجھے اصرار کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ کہتے ہیں ڈائری صرف اپنی ذات کے لئے ہوتی ہے، یہ ایک ایسی آپ بیتی ہے جسے کسی غیر کو پڑھنے کا حق نہیں، ڈیڈی یہ بھی کہتے ہیں کہ دوسرے کی ڈائری پڑھنا، لکھنے والے پر ظلم ہے، یہ تو دل کی کتاب ہے اور دل کا حال سوائے خدا کے کسی اور کو جاننا زیب نہیں دیتا۔۔۔ آج میں نے ڈائری لکھنے کا ارادہ کر لیا ہے، اس یقین کے ساتھ کہ جو کچھ اس میں لکھا کروں گی، اسے کوئی دوسرا نہیں پڑھے گا۔

۲۱ر مارچ

یہ ڈائری نہ جانے کب شروع ہوتی، لیکن شام کو ایک عجیب بات شروع ہو گئی، یونیورسٹی کی طالبات لان کے ایک کونے میں جمع تھیں۔ گفتگو کا موضوع بار بار بدل رہا تھا، ادھر ادھر کی باتوں میں بات نکلتی تھی، ہم سب ہنس بول رہے تھے۔ چہلیں ہو رہی تھیں، کبھی ستارہ، کبھی عابدہ اور کبھی احمدی کو نقلِ محفل بنایا جا رہا تھا کہ ناموں کا ذکر چل نکلا۔ عابدہ ایک دفعہ ہی مجھ پر ڈھل گئی، کہنے لگی "چلو میرا نام تو ماں باپ نے غلط رکھا، مگر تم بتاؤ، یہ بنتِ قمر کیونکر ہوا؟" قدسیہ نے میری طرف سے جواب دیا "ان کا نام تو بالکل ٹھیک ہے شکل جو چاند سی پائی ہے، چشم بد دور، ذرا پیچھے ہٹ کے دیکھو، ماہ پارہ ہے یا نہیں؟ یہ ترشے ہونٹ، یہ سنہرے بال، یہ میدہ شہاب رنگ، یہ ماہتاب سا چہرہ ․ ․ ․" مگر میں چپ ہو گئی، دماغ میں بے شمار افکار یک بیک وقت تیزی سے گردش کرنے لگے۔ میں ایک بات اچھی طرح نہیں سمجھ پاتی کہ دوسری سطح ذہن پہ اُبھر آتی تھی۔

. . . . میں اُن سے نہ کہہ سکی کہ ہاں میرا نام بنتِ قمر ہے، میں قمرالزماں کی بیٹی ہوں، ڈیڈی نے یہ نام اس لئے تجویز کیا کہ وہ مجھے صرف اپنے وجود کا حصہ سمجھتے ہیں، وہ مجھے سرتاپا اپنا ہی عکس تصور کرتے ہیں۔ وہ یہ بھول جانا چاہتے ہیں کہ میری رگوں میں ایک ایسی عورت کا بھی خون دوڑتا ہے، جس نے دوسرے مرد کی خاطر، اُن سے بے وفائی کی، یہ عورت میری فرنگی ماں تھی جس نے میرے بڑے چچا کو اپنی زندگی کا ساتھی چنا اور میری ماں ہوتے ہوئے بھی بڑے ابا کی ہو گئی، ڈیڈی نے اس سانحہ کو بہادر انسان کی طرح انگیزا، اور اس کے بعد ان کی تمام توجہات ساری شفقتیں مجھ پر مرکوز ہو گئیں، میں نے جب سے ہوش سنبھالا یہی دیکھا کہ وہ زیادہ تر وقت میری تربیت اور نگہداشت پر صرف کرتے ہیں، میرا بچپن اور لڑکپن، اُن ہی کی آغوش میں پروان چڑھا ہے۔ وہ ہی میرے باپ اور وہی میری ماں ہیں۔ وہ مجھے اتنا چاہتے ہیں کہ انھوں نے میرا نام بھی اپنے نام پر رکھا ہے —— لیکن یہ گھر کے لوگ مجھے کیوں نہیں بتاتے کہ ممی نے کیوں بے وفائی کی؟ کیوں انھوں نے ڈیڈی جیسے نیک دل اور اپنی کھیلتی مالتی بچی کو چھوڑ کر دوسرے آدمی کا گھر بسایا؟

جب وہ ڈیڈی سے علیٰحدہ ہوئیں تو میں بہت چھوٹی تھی، جدائی کے وقت کیا ہوا ہوگا، یہ مجھے خبر نہیں بلکہ جب ان کا انتقال ہوا تو میں سنِ شعور کو پہنچ گئی تھی۔ شاید اس لئے کہ میں الگ رہنے کی عادی تھی مجھے ان کی موت کا کوئی صدمہ نہیں ہوا، لیکن ڈیڈی رنج سے نڈھال ہو گئے، مجھے یاد ہے جس روز ان کے مرنے کی خبر آئی، وہ میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے بہت دیر تک یونہی دیکھا کئے حتیٰ کہ مجھے رونا آگیا، میں اٹھ کر ان کے پاس چلی گئی اور انھوں نے مجھے اپنے گلے سے لگا لیا۔

ہمارا بھرا پرا گھر ہے۔ کنبہ وسیع اور آسودہ حال ہے۔ جب تک ڈیڈی نے مجھے سختی سے منع نہیں کیا، میں رشتے داروں سے اکثر ممی کے متعلق پوچھتی تھی، مگر صرف اتنا معلوم ہوا کہ ڈیڈی کی یہ شادی بھی غلط انتخاب کا نتیجہ تھی۔ پہلی شادی اس لئے ناکام رہی کہ وہ ان کی مرضی کے خلاف والدین نے کی تھی۔ ڈیڈی کو پہلی بیوی ایک آنکھ نہیں بھائی اور انھوں نے ولایت سے آ کر اُسے طلاق دے دی، ولایت میں انھوں نے ممی سے شادی کی اور وہ چند سال بعد انھیں چھوڑ کر بڑے ابا کے پاس چلی گئیں، تو گویا دونوں شادیوں میں انھوں نے ٹھوکر کھائی۔ دوسری ٹھوکر بڑی تکلیف دہ ثابت ہوئی، اس لئے انھوں نے پھر شادی نہیں کی —— لیکن شادی میں ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیا میاں بیوی کا غلط انتخاب زندگی کو اس قدر برباد کر دیتا ہے؟

۱۸ مئی

حمید، جن سے میری نسبت ہوئی ہے مجھے وقتاً فوقتاً خط لکھتے ہیں۔ ان خطوط کو پڑھ کر مجھے افسوس ہوتا ہے۔ پہلے وہ اپنی برتری جتاتے تھے مگر میرے ٹوکنے پر انھوں نے تھوڑے عرصے کے لئے اپنا رویہ بدل لیا. لیکن جب سے وہ پی سی ایس کے امتحان میں شریک ہوئے ہیں، انھوں نے پھر شیخی بگھارنی شروع کر دی ہے۔ ان کے خیالات میں چھچھورپن ہے اور ان کی نظر میں عورت کی کوئی قدر و منزلت نہیں معلوم ہوتی۔ دس پندرہ دن ہوئے میں نے انھیں پھر لکھا کہ آپ یہ نہ بھولئے، عورت بھی انسان ہے اور شریف انسان عزتِ نفس کو ہر چیز پر ترجیح دیتا ہے۔ بس اس بات نے جیسے شتابہ چھوڑ دیا۔ چنانچہ اب کے جو خط آیا ہے اس میں وہ بدتمیزی پر اُتر آئے ہیں اور مجھے بار بار یاد دلاتے ہیں کہ میں عنقریب ان کی بیوی بننے والی ہوں، اس سے مجھے ایسی کوئی بات نہیں لکھنی چاہیئے جو ان کی شان میں گستاخی ہو۔ انھوں نے میرے اس خیال کا بھی مضحکہ اڑایا ہے کہ میں ایم اے میں پولیٹیکل سائنس لوں گی، اور تاکید کی ہے کہ میں اب مزید تعلیم کا سودا اپنے دماغ سے نکال دوں۔ آخر میں انھوں نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں بے حجابی اور بے باکی یکسر ترک کر دوں اور شریفوں کی سی خو بو پیدا کروں تاکہ جب میں ان کے نکاح میں داخل ہوں تو ہر لحاظ سے ان کے لائق بن جاؤں —— اس خط کو پڑھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے میرا دامن پکڑ کر گھسیٹا ہے۔ جی میں آئی اس خط کے پُرزے پُرزے کر دوں اور انھیں لکھ بھیجوں کہ آئندہ آپ مجھے کوئی خط نہ لکھئے. لیکن اس سے ان کا کیا بگڑتا! میں غصے سے

کھڑی کھڑی کانپتی رہی اور جب تک میں نے اس کا جواب نہیں لکھ لیا مجھے قطعی تسلی نہیں ہوئی۔

۴ر جون

میرا خط پڑھ کر حمید آپے سے باہر ہو گیا ہے۔ اس دفعہ اس نے خط میں ایسی باتیں لکھی ہیں جن کی مجھے کبھی توقع نہ تھی۔ کیا وہ اس قدر گرا ہوا ہے جو اس نے مجھے ممی کا طعنہ دیا ہے؟ اس نے لکھا ہے "اتنا مغرور ہونا اچھا نہیں، ایسی بد زبان نہ ہو جاؤ کہ مجھے یہ شبہ ہونے لگے کہ تم اپنی فرجمن ماں کے نقشِ قدم پر چلو گی" یہ اس نے خط نہیں لکھا، میرے دل پر گھونسہ مارا ہے۔ شادی کے بعد تو وہ میری چھاتی پر چڑھ بیٹھے گا، اٹھتے بیٹھتے ممی کے طعنے دے کر مجھے کچوکے دیا کرے گا۔ میری حالت کو کیا ہو گیا ہے؟ رونا چاہتی ہوں تو آنسو نہیں نکلتے، چیخنا چاہتی ہوں تو فریاد حلق میں اٹک جاتی ہے، ضبط کرتی ہوں تو ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ ڈیڈی، اے ڈیڈی! کیا آپ مجھے اس مردود سے بیاہ دیں گے؟ اس خفاش سے، جو ابھی سے مجھے پاؤں کی جوتی سمجھتا ہے! کیا یہ شریف آدمی ہے؟ کیا یہ کبھی مجھے رفیقۂ حیات سمجھے گا؟

۱۴۔ اگست

آج جشنِ پاکستان ہے۔ چاروں طرف خوشیاں ناچ رہی ہیں، میری قوم کو آج کے دن آزادی ملی تھی اور میں بھی آج آزاد ہوئی ہوں شب و روز سوچتے سوچتے، آخر صبح میں نے ڈیڈی کو حمید کے خطوط دکھا دیئے، میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے، اور بیشتر اس سے کہ میں کچھ کہتی ڈیڈی نے نہایت شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "میں یہ منگنی ابھی توڑے دیتا ہوں"

آزادی کتنی حسین بھا نتنے ہے اسے میرا دل سمجھتا ہے۔ سچ کہتی ہوں، کل تک مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ کسی نے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر مجھے کال کوٹھڑی میں دھکیل دیا ہے۔ میری راتیں اندھیری ہو گئیں اور میں سمجھتی تھی کہ اب صبح کبھی نہیں ہو گی۔ مگر ڈیڈی، پیارے ڈیڈی نے میری قید کی بلائیں کاٹ ڈالی ہیں۔ انھوں نے غلامی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے پر ضرب کاری لگا کر، چراغِ نور پاش نصب کیا ہے، ہاں اب وہ سیاہی میری زندگی کے مطلع سے ہمیشہ کے لئے چھٹ گئی ہے میرے سامنے آزادی کا سورج لبِ بام جگمگا رہا ہے۔ آج ۱۴ اگست ہے۔

۲۳ر اکتوبر

یہ سارا ہفتہ بڑا لطیف و پُر کیف گزرا، صبح و شام سیر و تفریح، دن رات خوش کن باتیں، میری عم زاد بہن کے شوہر جنھیں میں بھائی صاحب کہتی ہوں، جب کراچی آتے ہیں تو گویا عید آجاتی ہے وہ بڑے ہنس مکھ اور خوش مزاج ہیں کوئی پینتیس چالیس سال عمر ہو گی۔ مگر صحت مند اور جامہ زیب ایسے ہیں کہ بالکل نوجوان لگتے ہیں، طبیعت ایسی شگفتہ پائی ہے کہ ہر وقت کنول کا کھلا ہوا پھول معلوم ہوتے ہیں سست آدمی سے انھیں چڑ ہے، خود اس قدر چست و چالاک ہیں کہ جوانی کا مرا پا کہیئے ان کی زندگی رواں دواں ہے، ان کی گفتگو نغمہ ریز آبشار ہے، جمود سے انھیں وحشت ہوتی ہے، ان دنوں انھوں نے ہمیں خوب سیر کرائی، چچا زاد اور پھوپھی زاد بہنیں، بھائی، بھاوجیں اور کنبے کے دولھا، وہ سب کو اپنے ساتھ لے کر گئے، کبھی کلفٹن کے ساحل پہ، کبھی ملیر کے باغوں میں، کبھی ہم سینڈز پٹ کی لہروں میں گھنٹوں کھیلتے رہے۔ کبھی ہم نے ہوکس بے کی دلکش شاموں کا لطف اٹھایا، جس دن گھر سے نہیں نکلے، تو ہم نے سینما دیکھا ہندوستانی فلم بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں، ان میں بے حیائی رچتی جا رہی ہے۔ جسے دیکھ کر بعض دفعہ تو سینہ دھڑکنے لگتا ہے۔

اب کے میں نے ایک نئی بات محسوس کی، بہنوں، بھاوجوں یا بھائیوں میں اگر کوئی مجھ سے لڑتا جھگڑتا ہے تو بھائی صاحب فوراً میری حمایت کرتے ہیں، انھوں نے کئی مرتبہ کہا "بھئی بنت، قمر پھول ہے۔ اسے کوئی رنج نہ پہنچایا کرو ورنہ یہ کمھلا جائے گی" اور ایک دفعہ مجھ سے کہنے لگے "اب کے تم مجھے بہت یاد آؤ گی!" بھائی صاحب مجھے بے حد چاہتے ہیں، ان کے پیار میں خلوص اور بزرگی میں حمایت و حفاظت ہے، لیکن ان کی گھریلو زندگی کیوں تابناک نہیں؟ آپا نہ جانے کیسی بیوی ہیں! دل کی اتنی پیاری، پر زبان کی کڑوی، ذرا ذرا

سی بات پر بگڑ جاتی ہیں، اور بھائی صاحب ہر دفعہ مسکرا کر ٹالی دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں بڑا صبر و ضبط ہے لیکن آپا اِن کے سامنے اتنی چڑچڑی کیوں ہو جاتی ہیں؟ کیوں صرف انہی سے بدمزاجی کرتی ہیں؟ باقی سب کے ساتھ باتیں کرتی ہیں تو گویا منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ باجی سے ان کی بڑی دوستی ہے۔ دونوں پرانی سہیلیاں ہیں، دوپہر کو وہ آں سے رازدارانہ باتیں کر رہی تھیں۔ میں نے چپکے چپکے سُنا، کہ بھائی صاحب کو خوبصورت عورتیں بڑی پسند ہیں اسی لئے وہ ان پہ ناکس رکھتی ہیں۔ لیکن انھوں نے یہ نہیں کہا کہ بھائی صاحب آوارہ ہیں، بدچلن ہیں۔

یہ میاں بیوی کا تعلق کیسا ہے؟ چاہے دونوں میں اچھی نبھتی ہو، لیکن اندر سے ٹٹولا جائے تو یہ اس سے نالاں، وہ اس سے ننگی، ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہاں میرے بھوپھی زاد بھائی ہیں، امانت مرزا وہ اپنی بیوی کو خوب چاہتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو وہ اپنی محبت کا اظہار اتنی شد و مد سے کرتے ہیں کہ عجیب سا لگتا ہے، مگر کسی کو اس سے کیا۔ وہ خود تو اپنی بیوی کے پرستار ہیں اور ان کی بیوی آن پر جان چھڑکتی ہیں، دراصل، امانت بھائی مولوی طبیعت کے ہیں، نماز کبھی قضا نہیں کرتے اور سارے شرعی احکام کی باقاعدہ تعمیل کرتے ہیں۔ اگرچہ ابھی ادھیڑ عمر کے ہوں گے مگر ان کا حلیہ دن بدن اسلامی ہوتا چلا جاتا ہے، ماتھے پر سجدوں کا نشان، بھرواں داڑھی، کھڑی ہوئی بیبی اور کثیر الاولاد ——— اللہ میاں کی ساری برکتیں انہیں میسّر ہیں۔ پچھلی دفعہ جب ہم سب کو گئے تو میں ایک دن سمندر میں نہ کہ پانی سے خوب کھیلی تھی، سب ہی ہنسنے بولنے میں مشغول تھے۔ میں نے ایکا ایکی جو نظر اُٹھائی تو امانت بھائی میری پنڈلیوں کو جو پلٹیے سمیٹنے سے کھل گئی تھیں بڑے انہماک سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے کچھ خیال نہ کیا، پھر بھی میں محسوس کرتی ہوں کہ ان کی نظریں مجھ پہ اکثر جمی رہتی ہیں۔ اندوہ مجھے یوں کیوں دیکھنے لگے ہیں ——— مگر نہیں، یہ میرا واہمہ ہوگا۔ وہ بیاہتا ہیں، اور اپنی بیوی پہ فدا ہیں۔

۱۲ر جنوری

اس دوران میں میری کئی نسبتیں آئیں مگر ڈیڈی نے میرے لئے جو رشتہ پسند کیا ہے وہ سب سے اچھا ہوگا۔ ایک دن پھوپھی، چھوٹی چچی سے کہہ رہی تھیں "خدا کرے قمر کے سہرے کے پھول جلدی کھلیں، بھائی بڑے متفکر رہتے ہیں" لیکن ایسی جلدی کی کیا ضرورت ہے؟ ماں باپ کیوں چاہتے ہیں کہ بیٹی جلد ان کے گھر سے چلی جائے؟ اور میرے ڈیڈی تو مجھ کو ٹالنا چاہتے ہیں۔ کیا وہ مجھے اپنے سے علیحدہ کر کے رنجیدہ نہیں ہوں گے؟ اور یہ کون کہہ سکتا ہے کہ میں اپنے دولہا کے پاس چلی جاؤں گی تو وہاں ہمیشہ مسرور و شاداں رہوں گی۔

۶ر فروری

اس وقت میں بڑی مشکل سے، اپنے کو سنبھالے ہوئے یہ سطریں لکھ رہی ہوں، پرسوں . . . میری زندگی میں ایسا طوفان آیا جس نے میرے ہوش و حواس مختل کر دیئے رات کو میں حسب معمول بے فکری کی نیند پڑی سو رہی تھی کہ . . . . ہائے میں کیسے لکھوں! مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے جسم پہ کوئی بے تابی سے ہاتھ پھیر رہا ہے۔ خوف سے میری زبان گنگ ہوگئی، سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں، لیکن میں کشمکش کرتی رہی اور وہ چلتا ہوا ہاتھ، کبھی میری باہوں، کبھی کمر اور کبھی پنڈلیوں کی طرف بڑھتا رہا، ذرا دیر میں میری ہمت واپس آئی تو میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھی ——— یہ بہکا ہوا ہاتھ، یہ بھٹکتا ہوا چہرہ ——— بھائی امانت مرزا کا تھا، مولوی امانت کا، اور وہ دم بہ دم مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ لینے کے لئے مچلے جا رہا تھا۔ میں نے پوری طاقت سے چیخنے کی کوشش کی، مگر کسی نے فوراً میرے کان میں کہا "ایسا نہ کرنا، ایسا نہ کرنا، تم بدنام ہو جاؤ گی ——— تم عورت ہو" میرا دماغ ماؤف ہوگیا میری قوت فیصلہ جواب دے گئی اور وہ مجھے بے حس و حرکت پاکر، اس عفریت نے مجھے ننگا کرنا چاہا، تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے "چھوڑ دے۔ ظالم چھوڑ دے میں تیری بہن ہوں۔ دیکھ برابر کے کمرے میں تیری بیوی جاگ جائے گی . . . . . . خدا کے لئے میرے جسم کو ہاتھ نہ لگا، میری شادی ہونے والی

ہے ۔ میرے کنوار پنے کو بے داغ رہنے دے ۔ میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں" ——— لیکن یہ سب باتیں میری زبان سے نہیں نکلیں اور وہ شیطان اپنی مکروہ صورت ، میرے چہرے کے قریب سے قریب تر لانے کی کوشش کرتا رہا ، پھر دفعتاً میرے کانوں نے سُنا کہ میری بان میں گویائی آگئی ہے اور میری روح چیخ کر فریاد کر رہی ہے " ڈیڈی ! "

اس کی گرفت یکلخت ڈھیلی پڑ گئی اور اس کے گہرے گہرے سانس بھاری ہونے لگے ، میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور میں دم بخود بستر پہ پڑی دیکھتی رہی کہ وہ چوروں کی طرح ، دبے پاؤں ، رُکتا رُکتا ، میرے کمرے سے باہر نکل گیا ۔

۱۰ ر فروری

میں کئی دن سے اپنے کمرے میں الگ تھلگ پڑی ہوں ۔ غصّے ، حیرت اور رنج نے مجھے شل کر دیا ہے ۔ جی میں طرح طرح کی باتیں آتی ہیں ۔ سوچتی ہوں کہ جا کر ڈیڈی یا ممی سے کہہ دوں ، پھر خیال آتا ہے ، اس کا نتیجہ بہت بُرا ہوگا ، نہ جانے ڈیڈی کیا کر گذریں ، اور خود امانت کی بیوی کا کیا حال ہوگا جو اس مغالطے میں مبتلا ہے کہ میرا شوہر عاشق ہے ۔ یہ بات کھل گئی تو صرف انہی کی نہیں ، سارے خاندان کی خوشیاں تباہ ہو جائیں گی ۔ گھر کے کسی فرد پہ ، کسی کو منہ نہیں رہے گا ۔ اندیشہ ہائے دور دراز مجھے کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں ، کم حوصلگی اور مصلحتوں نے میرے لبوں پہ مہر خاموشی لگا دی ہے ، لیکن میں امانت کو ہرگز معاف نہیں کروں گی ، اس نے میری عصمت کی طرف ہاتھ بڑھایا ہے ۔

۱۵ ر فروری

وقت تیزی سے پرواز کر رہا ہے ، آج سو کر اُٹھی تو دل کا بوجھ قدرے ہلکا تھا ، ڈیڈی نے کہا تمھاری طبیعت کئی دن سے سُست ہے ، تم میرا کہا کیوں نہیں مانتیں ؟ آج ڈاکٹر کو ضرور بلوا لو " ان کا کہنا بھی ٹھیک تھا ۔ اگر یونہی منہ لپیٹے لیٹی رہتی تو ان کو ناحق پریشانی ہوتی چنانچہ میں نے روزانہ کا معمول شروع کر دیا ہے ۔

سہ پہر کو کالج سے واپس آئی تو بیچ کے کمرے میں وہ صاحبِ ایمان ، امانت جا نماز پر کھڑا تھا ۔ میرے پاؤں بلا ارادہ رُک گئے ، اور اس نے معاً نیت توڑ کر میری طرف دیکھا میری آنکھوں سے شعلے برسنے لگے اور میں تیزی سے اس کے پاس پہنچی ، تو اس نے چھوٹتے ہی کہا ، " میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں ، بہت دن سے دل کے ارمان دل ہی دبے ہیں ——— " میں غصّے سے بے قابو ہو گئی " فریبی ! شادی شدہ ہو کر ۔ " میری زبان نے آگے ساتھ نہ دیا اور وہ شکل کا مولوی چرب زبانی سے بولا " تم راضی ہو جاؤ تو میں فیروزہ کو چھوڑ دوں گا اور ——— " یہ تو حد ہو گئی ۔ مجھے ایک دھچکا سا لگا ، اور میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا ——— " تو کمینہ ہے " ——— اتنے میں بھابی فیروزہ کی دور سے مسرور لہجے میں آواز آئی " دیکھنا تم جو میرے لئے آج چکن لائے ہو ، وہ واقعی لاجواب ہے "

میرا خیال خود بخود بھابی فیروزہ کی طرف چلا گیا ، جو صحن میں بیٹھی چھپا چھپ چکن کا کرتہ سی رہی تھیں لیکن انھیں نہیں معلوم تھا کہ میری محبت کا دم بھرنے والا شوہر ایک دوسری عورت کی خاطر جس وقت چاہے انھیں طلاق دے کر گھر سے باہر نکال دے گا ۔ اس تصوّر نے میرے غصّے کو فرو کر دیا اور میں نے حیرت سے اس ملعون کی طرف دیکھا ، جو میری خشمناکی اور بے بسی کے ڈر سے ، مصلّے پر بیٹھے بیٹھے رکوع میں چلا گیا تھا ۔

۲۸ ر فروری

وہ جو پنج وقتہ نمازی ، پرہیزگار ، مولوی امانت ہے ، اس کی بزرگی کا بُت زمین پہ اوندھے منہ گر پڑا ہے ، پہلے میں اس کا جس

قدر احترام کرتی تھی اب اتنا ہی اس کو ذلیل سمجھتی ہوں۔ عمر کے تفاوت اور اس کے مذہبی ڈھکوسلے کے سبب پہلے مجھ پر اس کا بڑا رعب تھا، اب میں نڈر ہو گئی ہوں اور اسے بڑی حقارت و نفرت سے دیکھتی ہوں، وہ میری نظروں کو پہچانتا ہے لیکن کچھ نہیں کہتا احتجاج تک نہیں کرتا۔

۱۴ اپریل

کوئٹے سے بھائی صاحب کا خط آیا ہے، ڈیڈی کو اور مجھے بلایا ہے، لکھا ہے یہاں موسم بڑا دلکش ہے، یہاں کی آب و ہوا آپ کے لئے مفید ہو گی، ڈیڈی نے مجھ سے پوچھا "تم چلو گی؟" میں نے کہا "شوق سے چلوں گی" بھائی صاحب مجھے اکثر یاد آتے ہیں، اور آپا کو دیکھے ہوئے بھی بہت دن ہو گئے ہیں۔

۱۵ مئی

سنگلاخ بلوچستان کا سلسلہ دور دور تک پھیلا ہوا ہے، آب و گیاہ علاقہ بڑا بے رونق ہے، راستے میں خشک چٹانیں بدصورت ٹیلے اور بے ہنگم پہاڑیاں دیکھ کر مجھے کوفت ہوئی، مگر جب ہم کوئٹہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ اس عظیم شخیم بھونڈے اور بھدے جسم کے اندر بھی ایک دل ہے، نازک شاداب اور حسین، یہ ایک ایسا نخلستان ہے جہاں شیریں پانی کے چشمے بہتے ہیں جہاں درختوں کی چھاؤں ٹھنڈی ہوتی ہے، جہاں ساری فضا پرسکون اور خیال افروز ہے۔

کوئٹہ ایک چھوٹا سا صاف ستھرا شہر ہے، جہاں امیر امیر ہیں، زیادہ آسودہ حال اور غریب بہت زیادہ فلاکت زدہ ہے، یہاں کانیں ہیں، منڈیاں ہیں، غریبی ہے۔ یہاں مزدوری ہے، چاکری ہے مفلسی ہے۔ سیلانیوں کے لئے عیش ہیں، پھل ہیں اور گوشت کی فراوانی ہے۔ بلوچیوں کے لئے جفاکشی ہے، محرومی ہے اور آمدنی کی نایابی، اتنی کہ وہ مشکل روٹی کو پانی میں بھگو کر کھاتے ہیں، لیکن خدا نے انہیں غیرت سے مالا مال کیا ہے شکستہ پائی اور بوسیدہ حالی کے باوجود، وہ تندرست و توانا ہیں ان میں خون کی کمی نہیں، انہیں طاقت کی دوا نہیں چاہیئے۔ انہیں قدم قدم پر اعتبا خون کی ضرورت نہیں ——— وہ جو یہاں روپیہ کمانے آئے ہیں، مزے سے اپنی خواب گاہوں میں آرام کرتے ہیں، یہ جو بلوچ زادے ہیں مہمانوں کے بھیس میں آنے والوں کی خاطر، خون پسینہ ایک کر کے اپنے گھر کی دولت ان کے قدموں میں ڈال دیتے ہیں اور خود الگ کھڑے ہو جاتے ہیں کہ لے جاؤ، یہ سیم و زر تمہارا ہے۔ اس پر تمہارا ہی حق ہے، تم نے دور سے چل کر جو اسے بیننے آئے ہو! دولت مند ٹھٹھے لگاتا ہے اور غریب بلوچی آسمان کی طرف منہ اٹھا کر دیکھنے لگتا ہے کہ کب تک یہ جہالت کا اندھیرا چھایا رہے گا! کب علم کی روشنی یہاں تک پہنچے گی؟ کب خدا ہمیں، حساس اور ابلیت دے گا کہ ہم اپنی دولت سے خود متمتع ہوں؟

۲۰ مئی

یہاں کتنی قدرتی سیرگاہیں ہیں جہاں انسان بازاروں کی گہما گہمی، درآمد و رفت کے ہنگاموں سے محفوظ ہو کر اپنے تفکرات بھول جاتا ہے، مجھے یہ خاموش مقامات ہمیشہ پسند رہے ہیں، خصوصاً یہ وادی جہاں ہم کل پکنک کے لئے گئے تھے۔ یہ شہر سے چند میل کے فاصلے پر ایک سرسبز تفریح گاہ ہے، یہاں چٹانیں اور پہاڑ اس طرح آگے پیچھے اور دائیں بائیں کھڑے ہیں گویا انہیں کسی خاص مقصد سے ترتیب دیا گیا ہے۔ ہمارا مختصر سا قافلہ جس میں بھائی صاحب، ڈیڈی، آپا، بچے اور ملازم شامل تھے، وادی کے دامن میں جنگل کی طرف خراماں خراماں آگے بڑھتا جاتا اور ہمارا راستہ کبھی کشادہ، کبھی تنگ اور کبھی پھر وسیع ہو جاتا تھا۔ دائیں جانب ایک لمبی گہری نالی تھی جس میں چشمے کا شفاف پانی اچھلتا، اچھلتا، کاٹتا ہوا تیزی سے بہہ رہا تھا، ہم اس آب رواں کا مخرج دیکھ سکتے تھے

کہیں بلندی پر پہاڑیوں میں چھپا ہوگا، لیکن وہ ہم سے بے خبر، اپنی منزل کی طرف مصروفِ سفر تھا، جو بہت دُور نیچے آبادی میں تھی۔ چلتے چلتے بچے تھک جاتے تو کسی کی گود میں آجاتے، آپا کچھ تھک سی گئی تھیں، ڈیڈی بیٹھنے کی جگہ تلاش کر رہے تھے اور بھائی صاحب حسبِ معمول لطیفے سنا سنا کر ہمیں اور آگے بڑھنے پر اُکسا رہے تھے۔ اتنے میں ایک بڑا سا میدان آیا جس کے ایک جانب اُونچی اُونچی پہاڑیوں کے دو سلسلے حبش کے وفادار غلاموں کی طرح کھڑے پہرہ دے رہے تھے، معلوم نہیں ان کے درمیان راستہ قدرتی تھا یا قرنوں پیشتر انسانی ہاتھوں نے پتھر کے سینے کو چیر کر اسے بنایا تھا۔ کیا خبر غیر منقسم ہندوستان کو فتح کرنے والے جانباز سکندر دو ہزار سال پہلے اسی راہ پہ گامزن ہوئے ہوں اور اس وقت ان کے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سے یہ سارا سلسلۂ کوہ گونج اُٹھا ہو۔ جب ہم اس درے سے گذر کر باہر آگئے تو آپا کی ہمت نے جواب دے دیا اور ڈیڈی نے ایک اُونچی سی جگہ کی طرف اشارہ کر کے اعلان کیا کہ یہیں ہمارا ڈیرہ جمے گا۔ دن بھر سب لوگ گھومتے پھرتے رہے، بچے دوڑتے کھیلتے رہے، آپا کھانا کھلا کر فارغ ہوئیں تو بکریاں لے کر بیٹھ گئیں اور ڈیڈی کتب بینی میں مشغول ہو گئے۔ میرا دل اس ماحول سے کسی طرح نہیں بھرتا تھا، دُور دُور تک ہو آنے کے باوجود میری طبیعت یہی چاہتی تھی کہ ابھی اور چلوں، ابھی اور دوڑوں، بھاگوں۔ سب تھک کر ستانے بیٹھ گئے، مگر بھائی صاحب نے میرا برابر ساتھ دیا۔ بلکہ جب میں نے ڈیڈی سے کہا کہ بس سامنے والی پہاڑی کے اُوپر اور ہو آؤں، تو اس وقت بھی انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ چنانچہ جب ہم منزل، منزل چوٹی پر پہنچے تو میرا سانس پھول گیا، بھائی صاحب بھی ہانپنے لگے تھے اس لئے ہم ایک کالی سی عمودی چٹان کی اوٹ میں تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ گئے۔ میلوں پرے نشیب میں کوئٹہ کی چھوٹی سی آبادی سبزے میں گھری ہوئی نظر آرہی تھی، جگہ جگہ پھولوں کے باغات کھڑے لہلہا رہے تھے، دور دراز سے آنے والی ہوا اپنے دوش پر جنگلی پھولوں کی خوشبو اور بلوچستان کی خنکی لئے آرہی تھی۔ ڈھلتے ہوئے سورج کی روشنی میں دُور و نزدیک ایک طلسم سا بندھا تھا اور اس میں گم ہو کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں اسی جگہ کے لئے پیدا ہوئی ہوں، یہ چٹانیں، یہ بلندیاں، یہ خاموشی، یہ پُر سکون مقام، کتنا امن ہے یہاں! کتنی آزادی ہے اس ماحول میں! اور جب میں اپنے خواب سے چونکی تو آپ ہی آپ میرا سر بھائی صاحب کے شانے پر آگیا، وہ بڑی ملائمت سے بولے "کس گہری سوچ میں ہو، واپس نہیں چلو گی؟" میں نے جواب دیا "ذرا اور ٹھہر جائیے میرا دل یہاں سے جانے کو نہیں چاہتا" پھر ہم دونوں قدرت کی بوقلمونیوں اور زندگی کے اُجلے رخوں پر باتیں کرنے لگے، ایسی باتیں جن میں شیرینی اور خلوص تھا، ہمدردی اور ہم خیالی تھی اور جب سورج ارغوانی ہونے لگا تھا تو بھائی صاحب نے مجھے سہارا دے کر اُٹھایا، ان کے کندھے پر سر رکھ کر، ان کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر، ان کے اتنے قریب بیٹھ کر، مجھے بڑی راحت ہوئی۔ افسوس یہ وقت کتنی جلدی گزر گیا۔

۱۵ر جون

آپا کو اللہ نے ایک اور چاند سا بیٹا دیا ہے۔ بالکل چینی گڈا، ہوا لگتا ہے، مسکراتا ہے تو دل باغ باغ ہو جاتا ہے، ہمکتا ہے تو جی چاہتا ہے سینے سے چمٹا لوں۔ بھائی صاحب کے سب بچے پیارے پیارے ہیں مگر یہ سب سے بڑھ گیا، اس کے خد و خال بھائی صاحب کے سے ہیں، اس کی آنکھوں میں ان کی جھلک ہے۔ مجھے ننھے بچے اچھے نہیں لگتے، وہ کلبلاتے ہیں تو مجھے پھریریاں سی آتی ہیں، مگر بھائی صاحب کا یہ ننھا مجھے بہت ہی اچھا لگتا ہے۔ آپ ہی آپ مجھے اس پر پیار آتا ہے، پرسوں ہم لوگ واپس جا رہے ہیں۔ جدائی کے خیال سے میں افسردہ ہو گئی ہوں، کاش یہ ممکن ہوتا کہ میں اسے اپنے ساتھ لے جا سکتی۔

۳ر جولائی

۱۹ر تاریخ کو میری شادی ہے۔ جوں جوں دن قریب آتا جاتا ہے، شوق اور وحشت بڑھتی جاتی ہے۔ خدا جانے الوب کس مزاج کے آدمی ہیں۔ ان کے خیالات کیسے ہیں۔ ان کے رجحانات کیا ہیں اور ہم دونوں کی کیسی نبھے گی؟ میں نے ان کی تصویریں دیکھی ہیں، بڑے وجیہہ معلوم ہوتے ہیں، طبیعت بھلی ہوگی۔ میں کوشش کروں گی کہ ہم جلد ایک دوسرے سے واقف ہو جائیں۔ اگر دونوں ایک دوسرے کا احترام ملحوظ رکھیں۔ تو ہمارا مستقبل ضرور خوش آئند ہوگا۔ لیکن سب ایسا کیوں نہیں کرتے؟ اپنے چاروں طرف لڑتے جھگڑتے جوڑے دیکھتی ہوں، تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر شادیاں ناکام ہیں، میاں بیوی کے جذبات و احساسات میں ہم آہنگی نہیں۔ وہ درگذر، چشم پوشی، اور فراخدلی کو اپنی عادت نہیں بناتے۔

یکم ستمبر

الٰہی یہ کیا ہو گیا؟ شادی کے نام سے مجھ پر یہ کیسا ستم ٹوٹا ہے؟ الوب میں تو سرے سے آدمیت ہی نہیں۔ وہ تو انسان کا نقلی چہرہ لگا کر بیاہنے آیا تھا، وہ سرتاپا ——— حیوان ہے، اور عورت کو صرف عیش و عشرت کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ شروع میں تو میں ہکا بکا رہ گئی اور سوچتی رہی کہ مرد اور عورت کا یہ رشتہ آخر بنا کیوں ہے؟ عورت کو پا کر، مرد کیوں بلند خیالی اور پاکیزگیٔ نفس سے محروم ہو جاتا ہے؟ کیوں تہذیب سے، وہ اشرف المخلوقات نہیں رہتا؟ لیکن سب مرد تو ایسے نہ ہوتے ہوں گے۔ یہ الوب ہی ہے جو صرف میرے جسم کی لذت چاہتا ہے۔ وہ میرے دل میں کبھی نہیں اترتا، میں اس سے بات کرتی ہوں، تو کوئی اثر نہیں لیتا، اسے صرف میرا حسن چاہیے، حسن، اور مجھے یقین ہو گیا ہے کہ جب کچھ عرصے بعد میں بھی دوسری عورتوں کی طرح بھدی اور بے ڈول ہو جاؤں گی، تو وہ مجھ سے بیزار ہو جائے گا، مجھے مجبور و مقہور چھوڑ دے گا۔

الوب ریچھ کی طرح ہے، اس کے سینے، پیٹھ، ہاتھوں بلکہ سارے جسم پر اس قدر بال ہیں کہ دیکھ کر کراہیت ہوتی ہے۔ وہ جب اپنے ہاتھ میری طرف بڑھاتا ہے تو میرے بدن پر سینکڑوں چھپکلیاں رینگ جاتی ہیں اور میرا جی چاہتا ہے کہ کمرے سے نکل بھاگوں اور کہیں روپوش ہو جاؤں؛ لیکن ایسا نہیں ہوتا، میں ہنوز اپنی سسرال میں قید ہوں، میری سہیلیاں بھی یہاں نہیں، جو میرے دل کا حال سن سکیں، جن سے میں پوچھ سکوں "سچ بتاؤ کیا بیوی اسی کو کہتے ہیں؟"

۲ر اکتوبر

میرے کنوارپنے میں شادی کے جو خیل بنائے تھے وہ ڈھے گئے ہیں۔ الوب جنگلی اور اوباش ہے۔ اسے مجھ سے کوئی لگاؤ نہیں، وہ مجھ سے یوں پیش آتا ہے۔ جیسے میں اس کی رفیقۂ حیات نہیں، بس ایک عورت ہوں۔ اس کے دل میں بہت سی عورتیں ہیں، اور جب کسی عورت کا خیال، جسے وہ نہیں پا سکا اسے دیوانہ کر دیتا ہے تو وہ اس کا بدلہ مجھ سے اتارتا ہے، کبھی کبھی تو بے رحمی سے گھسیٹ کر مجھے اپنے سے چمٹا لیتا ہے، میں مزاحمت کرتی ہوں تو اوں فول بک کر دھکا دے دیتا ہے۔ کل میرے بڑی چوٹ لگی اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، میں خیالات میں کھو گئی اور ہوتے ہوتے مجھے بھائی صاحب اور آپا یاد آ گئے، تو میں نے کہا "آپا بھائی صاحب کو کچھ نہ کہو۔ تم نے مرد نہیں دیکھے!!"

۲۰ر اکتوبر

میں بڑی مشکل سے میکے آئی ہوں، یہ میرا اپنا گھر تھا مگر آج یہ مجھے بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ قدم قدم پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں کوئی غیر ہوں۔ مہمانوں کی طرح میری خاطریں ہوتی ہیں اور بار بار مجھے یاد دلایا جاتا ہے کہ میں بہت جلد اپنے گھر واپس چلی جاؤں گی۔ ڈیڈی بھی

جو میرے آنے سے بے حد خوش ہیں۔ موقع دیکھ کر یہی نصیحت کرتے ہیں کہ میرا اصلی گھر میرے شوہر کی دہلیز ہے اور مجھے تمام عمر وہیں رہنا ہوگا۔ جیسے رخصت کے وقت انھوں نے مجھے سمجھایا تھا، اب بھی وہ باتوں باتوں میں یہی دُہراتے ہیں کہ جس شخص سے ایک دفعہ دامن بندھ جائے، ساری زندگی اسی کی ہو کر گذار دینی چاہیئے۔ یہی شرافت کا تقاضا اور نسوانیت کا فرض ہے، مگر وہ مجھے یہ سبق دیتے ہیں؟ جی میں آتا ہے، اُن سے کہہ دوں ڈیڈی! میں بڑی تکلیف میں مبتلا ہوں میرے اور ایوب کے درمیان کوئی ذہنی ہم آہنگی اور مفاہمت نہیں۔ ......

نہیں نہیں یہ میں کبھی نہیں کہہ دوں گی، ان کو اگر شبہ ہو جائے تو ان کا دل ٹوٹ جائے گا، اور کیا خبر، طیش میں آ کر وہ میری ماں کا طعنہ دے دیں، کہ میرے خون میں شوہر پرستی کا جذبہ اور شرافت مفقود ہے، اس لئے مجھے اپنے کردار پر شرافت کی مہندی لگانی پڑیگی۔ ایوب میری اہانت کریگا، اور میں اسے سر آنکھوں پر بٹھاؤں گی، وہ مجھے جلائے گا اور میں مسکراتی رہوں گی۔

۲۵ر اکتوبر

کل رات گئے تار آیا کہ دل کی حرکت اچانک بند ہو جانے سے، ایوب کا انتقال ہو گیا ہے، تھوڑی دیر میں وہاں جانے کے لئے سوار ہو جاؤں گی۔ دُنیا کی رسوم کے مطابق مجھے سوگ کا پیراہن پہننا پڑے گا، لیکن در اصل میں رنجیدہ نہیں ہوں، اس کے یوں دفعتاً مر جانے کا افسوس ضرور ہے۔

۱۳ر مارچ

میں عدت پوری کر کے واپس آ گئی ہوں۔ ڈیڈی ایوب کی موت سے بے حد متاثر ہیں۔ ان کے دل پہ دھاکہ بیٹھ گیا ہے۔ کہتے ہیں، یہ میرے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تمہاری بیوگی دیکھنے کے لئے زندہ رہوں گا۔ ان کو یہ غم کھائے جاتا ہے کہ میرا گھر پھر بسا دیں، مگر میں اب شادی نہیں کروں گی، میرا دل پک گیا ہے۔

امانت مرزا، جو اس عرصے میں اور زیادہ عابد و متقی بن گئے تھے پھر میری طرف گھور گھور کر دیکھنے لگے ہیں۔ ان کو گانے کا بھی شوق ہو گیا ہے اور وقتاً فوقتاً ہجر و فراق کے اشعار آپ ہی آپ گنگناتے رہتے ہیں، مگر میں جانتی ہوں کہ یہ عشقیہ کلام کس لئے ہے؟

۳۱ر مارچ

کوئٹہ سے خط آیا ہے کہ بھائی صاحب سخت علیل ہیں، معمولی سی بیماری نے خطرناک صورت اختیار کر لی ہے، ان کی گھبراہٹ اور کم خوابی نے آپا کو پریشان کر دیا ہے۔ یہ خبر پڑھ کر میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ خدا کرے وہ جلد اچھے ہو جائیں، ان کی آئی کسی اور کو آ جائے: ان کی بجائے امانت مر جائے، میں مر جاؤں!

اگر خدانخواستہ انھیں کچھ ہو گیا تو کیا ہوگا؟ اس تصور سے ہی میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا جاتا ہے۔ میں کسی ایسی دنیا میں چلی جاتی ہوں، جہاں خزاں آ گئی ہے، جہاں ہر طرف حسرت اور اداسی چھائی ہوئی ہے، جہاں گل بوٹے نہیں کھلتے، جہاں سبزہ نہیں لہلہاتا۔ یہ کیسی فضا طاری ہو رہی ہے؟ ایک بھائی صاحب کے نہ ہونے سے، کس نے زندگی کی آرائش نوچ لی ہے، کس نے اس چمن کا سہاگ لوٹ لیا ہے؟ کیوں ایک، صرف ایک شخص کے چلے جانے سے آبشاروں کے نغمے ٹوٹ گئے ہیں، خوشبوؤں کی تابندگی مٹ گئی ہے، زندگی کا بانکپن غروب ہو گیا ہے؟

میں ڈیڈی کے ساتھ کوئٹہ جا رہی ہوں، کل صبح سے پہلے کوئی گاڑی نہیں جاتی، ساری پہاڑ سی رات باقی ہے، ایک ایک پل گذارنا عذاب معلوم ہو رہا ہے ابھی گیارہ ہی بجے ہیں، اتنی دیر سے یہی بج رہا ہے، سوئیاں کیوں تیزی سے نہیں چلتیں، یہ سیاہ شب کیوں جلدی دم نہیں توڑتی؟

صبح ہوتے ہی ہم سوار ہو جائیں گے، خدا کرے گاڑی کہیں لیٹ نہ ہو، پرسوں دوپہر تک کوئٹہ پہنچ جائیں گے اور میں سیدھی بھائی صاحب کے پاس چلی جاؤں گی، فوراً ان کے سرہانے بیٹھ کر ان کا سر اپنی گود میں لے لوں گی اور آہستہ آہستہ سہلاؤں گی، ان سے باتیں کروں گی، برف کی پہاڑیوں پہ جو ہم نے شام گذاری تھی وہ انھیں یاد دلاؤں گی، انھیں سکون آجائے گا، انھیں ضرور نیند آجائے گی . . .

لیکن، لیکن، کوئی میری راہ میں حائل ہو رہا ہے، کہتا ہے ایسا نہیں ہو سکتا، میں ان سے سب کے سامنے گھل مل کر باتیں نہیں کر سکتی، ان کے پاس یوں آزادانہ نہیں بیٹھ سکتی، کوئی میرا دل پکڑ کر بھینچتا ہے، میرے اٹھتے قدم روکتا ہے —— یہ ناصح ٹھیک کہتا ہے۔ یہ میرا نادیدہ ہادی مجھے عرصہ سے سمجھا رہا تھا، مگر میں نے اس کی بات کبھی نہیں مانی، میں یہی کہتی رہی "تو جھوٹا ہے، تو مجھے نہیں سمجھا، میرے دل میں چور نہیں ہے۔ میں بھائی صاحب کو آپا سے چھیننا نہیں چاہتی!" اور وہ مجھے یہ جواب دیتا "تم بیشک سچ کہتی ہو اور میں تمہیں جانتا ہوں، مگر دنیا نہیں جانتی، اسے تمہاری باتوں پہ اعتبار نہیں آئے گا۔ تم جس حد کو توڑ کر آگے جانا چاہتی ہو، وہ بہت سنگین اور بلند ہے، اس سے ٹکراؤ گی تو پاش پاش ہو جاؤ گی!" پہلے میں نے اس کا کہنا نہ مانا، لیکن ابھی ابھی اس نے یہ بات بھی کہی ہے "صرف تم ہی برباد نہیں ہو گی" اس کی لپیٹ میں دوسرے بھی آجائیں گے، تمہاری آپا، ان کا ننھا منا گھرانا تمہارے بھائی صاحب!!

یہ میرے دل نے بھرپور وار کیا ہے، جس سے میں پسپا ہو گئی ہوں۔ مجھ میں بغاوت کی بھی ہمت نہیں رہی، میں کوئٹہ جاؤں گی تو دور ہی دور سے انھیں دیکھوں گی، آنکھیں روئیں گی تو آنچل کی اوٹ میں انھیں بہلا لوں گی، مجھے اپنی قسمت معلوم ہو گئی ہے، میرے لئے موسم خزاں آگیا ہے، میں اب چراغ کشتہ کی مانند خاموش ہو جاؤں گی۔

بشیر محمد اختر

لکھ داتا

"جگ جگ جیو! میرے لکھ داتا!" کتنے پیارے الفاظ تھے۔ لیکن جس زبان سے یہ الفاظ نکلے۔ وہ ایک بدصورت نابینا انسان کی زبان تھی۔ اس کی آواز بھدی اور کرخت تھی۔ لیکن یہ الفاظ میرے کانوں کو کس قدر شیریں معلوم ہو رہے تھے۔ یہ میں ہی جانتا ہوں۔

"جگ جگ جیو، میرے لکھ داتا!" زندگی میں میرا لکھ داتا بن جانا ناممکن تھا۔ یہ میں نے آج تک نہیں سوچا تھا۔ لیکن ایک شخص مجھے لکھ داتا کہہ کر میری زندگی کے لئے دعائیں کر رہا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی۔

واقعی! عجیب بات تھی۔ یہی مال روڈ، یہی لاٹ صاحب کے بنگلہ کا موڑ، یہی پولیس گارڈ کا لمبا سپاہی، یہی موٹریں، میں ان سب کو روز دیکھتا تھا، لیکن آج کا رنگ کچھ اور تھا، مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا میں ہوا میں اُڑا جا رہا ہوں عام لوگوں سے بلند۔

ایک معمولی کلرک کی زندگی ایک مسلسل چکر ہے وہ ایک مشین کی طرح ہر صبح اٹھ کر نہاتا دھوتا ہے۔ ۹ بجے کھانا کھاتا ہے۔ ایک ایسا کھانا جس میں حیاتین کی کم از کم مقدار ہو۔ اس کے بعد تمام دن فائلوں کے انبار میں دبا رہتا ہے۔ فائل کتنا دلچسپ لفظ ہے۔ لیکن جب اس پر سرخ یا سبز لیبل "فوری" (URGENT) یا "آج ہی" (TODAY) لگ کر آجائے۔ تو روح کانپ اٹھتی ہے۔

دفتر کی زندگی سے چار بجے کے بعد رہائی ملی۔ گھر آئے، ذرا دم لیا، سستائے، نہا دھو کر بنے ٹھنے اور زندگی کے اسٹیج پر ایک نیا پارٹ ادا کرنے کے لئے گھومنے نکل پڑے۔ یہ ہے مشین کا چکر ——— میری زندگی۔

آج میں مشین کی حرکت پوری کرنے کے لئے لارنس گارڈن کی طرف جا رہا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ لاٹ صاحب کے بنگلے کی نکڑ پر جا کر ایک نابینا لکڑی کے سہارے کھڑا اور دردناک لہجہ میں چلا چلا کر بھیک مانگ رہا تھا۔

"مرا دا ان بھک منگوں کو گرفتار کیوں نہیں کر لیتی؟" ایک حسین لڑکی نے اپنے ساتھی سے کہا۔ وہ دونوں پاس سے گزر رہے تھے۔

وہ بولا "یہ واقعی ہمارے وطن کے لئے لعنت ہیں" اپنے نزدیک گویا بڑی فلسفیانہ بات کہی۔

پاس سے ایک موٹر تیزی سے گزری اور غبار اُڑاتی ہوئی غائب ہو گئی ——— حسین لڑکی ناک تک رومال بھی نہ لے جا سکی۔ اُس کا غازہ

خراب ہوگیا۔ اُس نے ناک چڑھائی اُس کے ساتھی نے حقارت سے موٹر کی گرد کو دیکھا۔ بیچارا سوچتا ہوگا کہ اگر اس کے پاس بھی موٹر ہوتا تو وہ کیوں غبار آلود ہوجاتے ——— موٹر کی آواز سُن کر فقیر پھر زور زور سے چلانے لگا "پرماتما کے نام پہ بابا۔ اندھے محتاج کو بابا ایک پیسہ ——— آنکھیں بڑی نعمت ہیں بابا ———" لیکن موٹر نے جواب دیا "اے اندھے لے۔ اور دھول آنکھوں میں ڈال لے"، مجھے تو ایسے اندھوں کی کیا پروا ——— ایک سائیکل سوار ——— کسی کالج کا طالب علم معلوم ہوتا تھا ——— سیٹی بجاتا ہوا گزرا۔ سائیکل کی آواز پر فقیر پھر چونکا اور چلانے لگا۔ سائیکل موٹر کی طرح برق رفتار نہ سہی تیز رفتار تو تھی ہی، سیٹی کی مسلسل آواز فضا میں ایک نغمہ پیدا کرتی ہوئی لارنس گارڈن کے دروازے میں غائب ہوگئی ——— سڑک پہ ایک تانگہ آرہا تھا۔ اس میں ایک خان صاحب بیٹھے تھے۔ مونچھوں کا تاؤ اُن کو اور بھی پُر رعب بنا رہا تھا۔ اندھا پھر چلایا ——— لیکن غریب کی پکار کا جواب ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے ——— قہقہہ۔

مجھ سے یہ نہ دیکھا گیا۔ میرے پاس صرف ایک پیسہ تھا۔ ایک پیسہ ——— لیکن اس کی اہمیت میرے نزدیک بہت زیادہ تھی۔ لارنس گارڈن کے باہر بدرو کے پل پہ ایک پنواڑی بیٹھتا ہے۔ مجھے اس سے ایک پان خریدنا تھا۔ تاکہ تکمیل آرائش ہوجائے ——— ایک ایکٹر کی کامیابی کا انحصار اس کے رکھ رکھاؤ پر ہے۔ اور اس کی ذرا سی خامی اداکار کو ناکام رکھتی ہے۔ یہی حال میرا تھا، وہ ایک سوٹ ہے۔ وہ بھی کالج کے زمانے کی یادگار، جنھیں میں گھر ہی میں دھو کر ہر دوسرے تیسرے استری کر لیا کرتا ہوں۔ اور لارنس گارڈن جانے کے لئے استعمال کرتا ہوں، پان کی ہلکی سی سُرخی لبوں کو ذرا "دیدہ زیب" بنا دیتی ہے ——— اب اندھے کی پکار ——— اور میرے سوانگ کی تکمیل کا سوال تھا۔ میرا ہاتھ کئی بار جیب کی طرف گیا۔ لیکن پھر رُکا ——— فقیر کی آواز میرے دل کے اندر ڈوبی جا رہی تھی۔ شاید غریب کی آواز کا غریب پہ زیادہ اثر ہوتا ہے یا غریب کا دل زیادہ کمزور ہوتا ہے ——— میں مغلوب ہو ہی گیا۔ میں نے دل کڑا کر کے پیسہ فقیر کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ——— اپنی ساری پونجی دان کر دی ——— "جُگ جُگ جیو میرے لکھ داتا" ——— مجھے ایسا محسوس ہونے لگا گویا میں کسی اور دُنیا میں ہوں ——— موٹر کی شان، سائیکل سوار کی سیٹی، تانگہ پہ جانے والے کی مونچھوں کا تاؤ، میری نگاہ میں سب ہیچ تھے ——— فقیر کی آواز کی گونج سُن کر حسین لڑکی نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔ گویا انھیں میرے "دان دینے" کا یقین ہی نہ آتا تھا۔ تانگے والے مجھے حقارت سے تک رہے تھے شاید وہ سمجھتے تھے کہ سوٹ پہن کر ہر پیدل چلنے والے کی جیب خالی ہوتی ہے۔ پنواڑی کی حسرت بھری نگاہ مجھ پر پڑ رہی تھی۔ کیونکہ اس کا ایک مستقل گاہک چھن گیا تھا ——— اچانک اُس وقت ایک چھکڑا لارنس باغ سے نکلا، اور مال روڈ کو پار کرنے لگا لاٹ صاحب کے بنگلہ کے سامنے سے گزرا۔ چھکڑا اور موٹر ——— میں نے دل میں موازنہ کیا ——— تہذیب کی ساری داستان۔ چھکڑا موٹر کی ابتدائی شکل ہے، فقیر اور امیر۔ کیا یہ بھی ہندوستان کی تہذیب کی ساری داستان نہ تھی، خونی داستان، صنعت کا ارتقا چھکڑے سے موٹر تیار کرتا ہے۔ لیکن دولت کا ارتقا ——— لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کو فقیر اور محتاج کر دیتا ہے۔ چھکڑے کی سُست رفتاری موٹر کی برق رفتاری میں تبدیل ہوگئی۔ لیکن زر کی ہوس نے "جنت نشان" کو جہنم میں تبدیل کر دیا۔ فقیر کو دیکھنا تک اب نازک طبائع پر ایک بارِ گراں ہے۔ اور سماج پہ ایک دھبہ ——— "لکھ داتا"، میرا دماغ اس لفظ کے گرد گھوم رہا تھا۔ لکھ پتی ہونا بہت بڑی بات ہے لیکن لکھ داتا ہونا۔ لاکھ روپیہ دان کرنا۔ یہ کتنی بڑی بات ہے۔ میں نے لاکھ روپیہ دان کر دیا تھا۔ میری کل کائنات یہی ایک پیسہ تھی۔ یہی میرے لئے لاکھ روپیہ تھا ——— میں باغ کے اندر داخل ہو چکا تھا۔ اور حسبِ معمول "سکندر مونٹ" پہ چڑھنے لگا۔ آج میرا ہر قدم خود بخود بلندی کی طرف اُٹھ رہا تھا۔ میرے کان منتظر تھے کہ میری طرح اور کوئی لکھ داتا اسے خیرات دے اور پکارے کہ میرے لکھ داتا۔ لیکن میرے سوا اور کوئی لکھ داتا نہ بن سکا۔ میں نے ایک بنچ پہ بیٹھے ہوئے باغ کا جائزہ لیا۔ سبزہ زار، قسم قسم کے پھول، شیشے سے زیادہ شفاف سڑکیں، سامنے بینڈ بج رہا تھا۔ وسط باغ میں موٹروں کی قطاریں، کتنا پُرلطف سماں تھا، شام کا دھندلکا، شفق کی سُرخی، خوشگوار موسم، ہر طرف مرد

ہی ہریاول ۔ لیکن میں نے سوچا یہاں آنے والوں میں سے ایک بھی لکھ داتا نہ تھا، حالانکہ اُن کی موٹریں خریدی جاتی ہیں تو ہیوں سے اور۔ ان کے سنٹ اور خوشبودار تیل حاصل کئے جاتے ہیں مزدوروں اور کسانوں کے پسینے سے، اُن کے بڑے بڑے بنگلے، قبریں ہیں، انھیں بیکس انسانوں کی جن سے جانوروں سے بھی زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ مگر جب ان بے زبانوں میں سے کوئی قدرت کی ستم ظریفی کا شکار بن کر محتاج ہو جائے اور دستِ سوال دراز کرے۔ نہیں نہیں بلکہ اپنا حق مانگے، تو یہ قدرت کے چہیتے اسے حقارت سے دیکھ کر گزر جاتے ہیں، ان کی موٹریں اس پر زیادہ دھواں پھینکتی ہیں۔ ان کے تانگوں کے گھوڑے زور سے ہنہناتے ہیں۔ یہ قدرت کا قانون ہے۔ فقیر کی آواز ابھی تک میرے کانوں میں آ رہی تھی، وہ چلا رہا تھا "بابا پرماتما کے نام پہ ایک پیسہ۔ صبح سے بھوکا ہوں بابا۔ آنکھیں بڑی نعمت ہیں ———" پرماتما کے نام پر۔ کیا پرماتما کوئی ایسی چیز ہے، جس کے نام پر صرف ایک پیسہ مانگا جا سکتا ہے۔ پرماتما یا خدا کا یہ تصور کس قدر غلط ہے خدا کو کتنا محدود کر دیا گیا، اس کا نام صرف بھیک مانگنے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے، لیکن پرماتما نے فقیر کو اندھا کیوں کر دیا۔ مالی باغ کو آراستہ پیراستہ کر رہا ہو، ہر طرف عجیب و غریب پھول دکھائی دیتے ہوں، یکایک وہ چند پھولوں کو لے کر مسل دے تو اسے کیا کہیں گے۔ پرماتما نے ایسی مخلوق کو کیوں پیدا کیا، جو اس کے لئے خود باعثِ عار ہیں۔ اور پھر ان کا یوں سسک سسک کر زندگی کے دن کاٹنا خدا کی پناہ، اس کا جذبۂ رحم کہاں چلا جاتا ہے۔ جب ایک غریب آدمی بیمار پڑ جاتا ہے اور اس پر انحصار رکھنے والا ایک کنبہ فاقوں مرنے لگتا ہے ایک کی بیماری کئی اور وں کے لئے پیغامِ قضا بن جاتی ہے، وہ سوکھی روٹی کو ترستے ہیں، اُن کے حلق خشک ہو کر ان میں کانٹے سے چبھنے لگتے ہیں، لیکن عین اس وقت اُن کے پاس کے عالی شان محل ایک انسان اپنے ہوسِ نفس کو پورا کرنے کے لئے دعوتیں دے رہا ہوتا ہے۔ اُس کے کتّے کو ایک وقت کا اتنا راشن مل جاتا ہے جو اس کے ہمسایہ کے ایک غریب کنبہ کے لئے کئی دن کافی ہو سکتا ہے۔

"بنارسی پان بابوجی" ایک پنواڑی میرے سامنے کھڑا مجھ سے پوچھ رہا ہے۔ "نہیں" میں چونک اُٹھا ——۔ ہاں ——— میں آج پان بھی نہ کھا سکا اور ——— فقیر اور میں ——— ہم میں سے کون مالدار تھا ——— جسے فقیر لکھ داتا بتا رہا تھا۔ وہ اب ایک پیسہ کیلئے محتاج تھا۔ اور فقیر ایک پیسہ کا مالک تھا۔ کیا امارت اور فقیری محض اضافی چیز نہیں ؟

مسز عبدالقادر

رسیلا

میں من کوٹ میں ایک برانچ سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ یہ سکول شہر سے باہر کھلی فضا میں ایک نہر کے قریب واقع تھا۔ جس سے تھوڑے فاصلہ پر مست رام کی کٹیا تھی۔ وہ ایک چرسی سادھو تھا جس کے پاس قصبہ کے تمام چرسی جمع ہوا کرتے تھے۔ مست رام زندہ دل ملنسار اور خوددار آدمی تھا۔ اس نے نور کا گلا پایا تھا۔ اس کی آواز میں اتنا رس تھا کہ جانوروں تک کو اپنے دامودری نغموں سے مسحور کر لیتا تھا۔ یہی چیز میری اور اس کی دوستی کا باعث تھی۔

جاڑا ہو یا طوفان رات کے پچھلے پہر راگنی آساگا گویا اس کے فرائض میں داخل تھا۔ چنانچہ پو پھٹنے پر جب وہ اپنی غمگین لے اور پُر سوز آواز سے ٹھمنانی زبان میں اوت نہیں آؤ ناؤ میں پیارے کھیڈن دے دن چار نی ماں ئے الگانا شروع کرتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ سرسوتی دیوی اپنی پوری شانِ ربوبیت کے ساتھ کسی جدید راگنی کی تخلیق میں مصروف ہے۔ یا کوئی فرشتہ آسمان کی انتہائی بلندیوں سے ملکوتی نغمے عالم ناسوت میں بکھیر رہا ہے۔ اس کے گیت میرے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اترجاتے تھے۔ میں اس کے گیتوں کا عاشق تھا اور خصوصاً راگنی آساگا۔ کیونکہ یہ راگنی آسا میری روح کی غذا بن چکی تھی۔ اس لئے میں من کوٹ سے باہر نہ جانا چاہتا تھا۔ جب کبھی تبدیلی کی بھنک میرے کان میں پڑتی تو میں انسپکٹر کی منت و سماجت کر کے پھر یہیں رہ جایا کرتا۔

۲

من کوٹ کہنے کو تو قصبہ تھا۔ مگر اپنی دیرینہ شان و شوکت کے لحاظ سے اچھا خاصا شہر تھا۔ بڑے بڑے بازار، سکول، ہسپتال وغیرہ سب کچھ موجود تھے۔ اگر کچھ کمی تھی تو ریل گاڑی کی۔ کیونکہ ریل گاڑی صرف غازی گھاٹ تک ہی آتی تھی۔ اور باقی چالیس میل کا سفر لاری یا کسی دوسری سواری کے ذریعے طے کرنا پڑتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ من کوٹ دوسرے شہروں کی طرح ترقی نہ کر سکا۔ اور اب تک قصبہ ہی کہلاتا رہا۔ یہاں آبادی زیادہ تر ہندوؤں کی تھی۔ جو چودھری کہلاتے تھے ان کی حویلیاں بہت بڑی اور پرانے وقتوں کی بنی ہوئی قلعہ نما تھیں۔

من کوٹ گو ایک صحرائی علاقے میں واقع تھا۔ مگر شاہجہان کے عہد کی قدیم نہر کے کنارے آباد ہونے کی وجہ سے یہ مقام بہت سرسبز و شاداب تھا۔ اس علاقے میں آم اور کھجور کے درخت کثرت سے تھے۔

نہر کے پاس کوس بھر کے فاصلے پر ٹھکرا نامی ایک گاؤں آباد تھا۔ جس کے ارد گرد من کوٹ کے چودھریوں کی جاگیریں تھیں۔ اور موضع ٹھکرا میں پختہ حویلی صرف ایک ہی تھی جس کا مالک چودھری گوبند رام تھا۔

گوبند رام نہایت بوڑھا آدمی تھا۔ تمام چودھری برادری کا سردار تھا۔ راج دربار میں بھی اس کی عزت تھی۔ اس کی حویلی کے سیاہ زنگ آلودہ اُٹے گذشتہ عظمت اور مٹی ہوئی تہذیب کے گن گاتے ہوئے من کوٹ سے صاف دکھائی دیتے تھے۔

پار جانے کے لئے نہر پر شاہان مغلیہ کے وقت کا پُل بنا ہوا تھا۔ یہ نہر بہت چوڑی اور دریا کا ہم پلہ تھی۔ اس نہر کے کنارے الگ تھلگ میرا اسکول تھا۔

عموماً شام کے وقت مست رام اپنے دو چار سنگی ساتھیوں کو لے کر میرے پاس آیا کرتا تھا۔ جو طرح طرح کی بے سروپا خبریں سناتے اور بے تکی ہانکا کرتے اسی طرح ایک شام کو ہم لوگ اسکول کے احاطہ میں جس کے ایک طرف باغیچہ بھی تھا بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ رات کی رانی کی بھینی بھینی خوشبو سے احاطہ مہک رہا تھا اور مست رام سرور کی حالت میں بیت بولنے لگا۔

اتنے میں اس کا ایک اور چرسی دوست آگیا جسے مست رام نے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مگر وہ کھڑا رہا اور سر کھجلاتے ہوئے کہنے لگا "یار بڑے بیت باز بنے ہوئے بلبل کی طرح چہک رہے ہو کچھ لبسنت کی بھی خبر ہے۔" مست رام بیت کو ادھورا چھوڑ کر حیرت سے پوچھنے لگا "یار کیا بات ہے" اس چرسی نے کہا "سُنا ہے کہ مظفر گڈھ اور غازی گھاٹ میں لوگ دھڑا دھڑ پلیگ سے مر رہے ہیں" میں نے کہا "ہاں اس کے متعلق آج میں نے بھی اخبار میں پڑھا ہے۔"

یہ خبر سُن کر سب سہم گئے۔ "اب کیا ہوگا ماسٹر جی" سب نے پریشانی سے کہا۔ میں نے جواب دیا "خدا رحم کرے۔ اگر زندگی ہے تو کوئی خطرہ نہیں" وہی چرسی کہنے لگا "خدا اب کیا رحم کرے گا۔ دنیا تھوڑے ظلم کر رہی ہے۔ کلجگ ہے ماسٹر جی کلجگ۔ ابھی تھوڑے ہی دن گذرے کہ ایک گائے بیچاری سڑک کے درمیان کہیں جا بیٹھی۔ ادھر سے لاری آرہی تھی۔ تو لاری والے اندھے نے اس کے اوپر لاری چڑھا دی۔ جس سے گائے کی ٹانگ ٹوٹ گئی مگر لاری والے سے کسی نے پوچھا تک نہیں۔

اگلے دن پنڈت کا لڑکا ایک اچھوت عورت بیاہ لایا۔ سُنا ہے کہ وہ کہیں تماشے میں رانی کا روپ بھرا کرتی تھی۔ وہیں اس پر ریجھ گیا اور اسے گھر ڈال لیا۔ ابھی پرسوں کی بات ہے کہ بھولا ناتھ کا ایک جوگی جو کہیں باہر سے آیا تھا۔ شامت کا مارا چودھری متھرا داس کے گھر چلا گیا اور شہری طریقے سے ناواقف ہونے کے باعث اندر جا گھسا۔ کمرے میں اس وقت چودھری متھرا داس کا چھوٹا لڑکا جو نیا نیا ولایت پاس کر کے آیا ہے۔ اپنی میم کے ساتھ بیٹھا رنگ رلیاں منا رہا تھا۔ وہ جوگی کو دیکھتے ہی غیظ و غضب سے دیوانہ ہو گیا۔ اور چور چور کہہ کر جوگی کو پکڑ لیا۔ پھر چمڑے کی چھڑی سے اس قدر پیٹا کہ وہ ادھ موا ہو گیا۔ مگر جوگی نے بھی اسے بڑے سراپ دے گئے۔ رام رام جوگی کا سراپ بھی اٹل ہوتا ہے۔ جوگی کی زبان کالی ہوتی ہے۔ جو تمام کو نشٹ کر دیتی ہے۔" وہ دیر تک نمک مرچ لگا کر اس قسم کی باتیں کرتا رہا۔

جوں جوں دن گذرتے گئے۔ نئی نئی افواہیں اڑتی رہیں۔ جس سے پتہ چلتا تھا کہ پلیگ مظفر گڈھ اور غازی گھاٹ کے علاوہ دیہات میں بھی پھیلنی شروع ہو گئی۔

بیساکھ کے آخری دن تھے۔ صحرائی شفق آلود شام تھی۔ نیم گرم ہوا کے جھونکے بور سے لدے ہوئے آم کی ڈالیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔ کوئل اپنی پُر سوز آواز میں کوکو کا شور مچا رہی تھی۔ میں چبوترے پر چارپائی ڈالے بیٹھا حقہ کے کش لگا رہا تھا کہ اتنے میں مست رام بھی آگیا۔

"کچھ آپ نے بھی سُنا ماسٹر جی" اس نے دکھلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں تو۔ کچھ نئی خبر لائے ہو" میں نے پوچھا۔ مست رام نے کہا "ہاں ماسٹر جی لوگ کہتے ہیں کہ موضع لوہڑی میں ایک ڈنگر تہرے کی عورت کے بچے کی بجائے بلا پیدا ہوئی ہے۔ جو پیدا ہوتے ہی بولنے لگی ہے۔ اس نے اپنے گھر کے لوگوں سے کہا کہ میں نرک کی چڑیل ہوں۔ جو دنیا کو غرق کرنے آئی ہوں۔ پھر وہ سارے گاؤں میں پھری۔ اور بعد ازاں اس نے من کوٹ کا رُخ کیا۔ آہ

اب کوئی دن میں اس شہر پر بھی تباہی آنے والی ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ اپنے گرد و پیش اس طرح دیکھنے لگا۔ گویا اُسے خطرہ تھا کہ کہیں وہ بلا اس کی باتیں نہ سُن لے۔ مجھے اس کی بدحواسی پر بے اختیار ہنسی آگئی۔

"کیوں ماسٹر جی اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے" اس نے کھسیانہ ہو کر کہا۔

میں نے کہا "بھئی مست رام۔ بڑی بوڑھیاں کہا کرتی تھیں کہ پچھلے زمانے میں جب نیلاریوں کا نیل پھوٹ جایا کرتا تھا تو وہ ایسی لایعنی داستانیں جوڑا کرتے تھے" وہ چڑ کر کہنے لگا "واہ! ماسٹر جی سب باتیں تو جھوٹ نہیں ہوتیں۔ پڑھے لکھے لوگوں میں یہی تو خرابی ہے کہ وہ کسی کی بات کو مانتے ہی نہیں۔ مگر ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں آپ سب کچھ دیکھ لیں گے۔ بُرے آثار تو شروع ہو ہی گئے ہیں؟"

میں نے اکتا کر کہا "اچھا جو کچھ دیکھنا ہے بعد میں خود ہی دیکھ لوں گا۔ مگر وہ آثار جو تمہارے سوا کوئی دوسرا نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے بھی دکھا دو" مست رام نے متانت سے کہا "تو کیا آپ نے رات کو کبھی کتوں کا رونا نہیں سنا۔ وہ آج کل ایسی خوفناک آواز سے روتے ہیں کہ سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور گنی لوگوں کا قول ہے کہ رات کو آسمان سے بلائیں اترتی ہیں۔ جنہیں کتا اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھ کر چلاتا ہے؟" مست رام کے کہنے پر فوراً مجھے ایک دن پہلے کا واقعہ یاد آگیا۔ کہ رات کو اتفاقاً میری آنکھ کھلی۔ تو اُس وقت باہر ایک کتا منحوس آواز میں لمبی لمبی چیخیں لگا رہا تھا جس کا میرے دل پر بہت ناگوار اثر ہوا۔ اور پھر تمام رات نیند نہ آئی۔ تاہم میں نے بے پروائی سے کہا "اونہہ یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ کتے ہمیشہ رویا کرتے ہیں۔ یہ بُرے آثار کی کوئی معقول دلیل نہیں" مست رام نے زچ ہو کر کہا۔ "اچھا نہ سہی۔ لیکن یہ تو بتائیے آپ نے آسمان پر کبھی پہلے اتنی سُرخی دیکھی تھی۔ پرانے زمانہ کے لوگ کہا کرتے تھے کہ جب کبھی بے گناہ کو سُولی چڑھایا جاتا تھا تو سُرخ آندھی آتی تھی۔ مگر اب تو آندھی بھی نہیں۔ اور آسمان بلاوجہ خون کبوتر ہو رہا ہے۔ اگر یہ بدشگونیوں کے آثار نہیں تو اور کیا ہیں"؟

ایکدم میری نظر سامنے کی طرف اُٹھی۔ نہ جانے واہمہ کا اثر تھا یا سچ مچ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ لمبا چوڑا صحرا آسمان کی سُرخی سے لہولہان ہو رہا ہے بلکہ نہر کا پانی بھی سُرخ بانات کی چادر کی طرح ہلکورے لیتا اور موجوں کی خونیں سلوٹیں ڈالتا سُست روی سے بہہ رہا ہے۔

یہ منظر دیکھ کر میرا دل لرز گیا۔ تاہم میں نے ایک اونہہ کے ساتھ بات کو ٹال دیا۔

۳

جیٹھ کا آغاز تھا حسب دستور گرمی کا جوش بڑھ رہا تھا۔ دو دن سے میں نے مست رام کو کہیں نہ دیکھا۔ اس لئے سہ پہر کو خود اس کی کٹیا کی طرف گیا۔ اس کی کٹیا ککڑی کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ صحن میں ایک طرف پانی کا چہ بچہ تھا۔ جہاں اُس نے کبوتروں کے لئے لمبی لمبی چھتریاں کھڑی کر رکھی تھیں۔ وہ اس وقت چھتریوں کے درمیان ایک کبوتر کو سینے سے لگائے بیٹھا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ بصد تعظیم کو اُٹھے۔ ایک چرسی نے فوراً کُٹیا سے ایک رنگیلی چارپائی نکال کر بچھا دی۔ میں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا "بھئی مست رام دو دن کہاں غائب رہے"؟ مست رام نے اپنے کبوتر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ماسٹر جی میرا بچہ ٹوٹرو بیمار ہو گیا تھا۔"

میں نے کہا "بچہ ٹوٹرو کون۔ کیا تمہاری مراد اس کبوتر سے ہے۔ جسے چھاتی سے لگائے ہو" اس نے دانت نکالتے ہوئے کہا "ہاں ماسٹر جی یہی میرے بال بچے ہیں۔ ان پر میری جان جاتی ہے۔ یہ خدا کے جی ہیں۔ مجھے ان کی خدمت میں بڑا آنند ملتا ہے"۔

اس کے بعد اُس نے اُٹھ کر کٹیا سے ایک نیا حقہ نکالا اور بھر کر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں حقہ پینے لگا اور اُس نے پاؤں دبانا شروع کئے۔ میں نے کہا "بھئی کئی دن سے کوئی تازہ خبر سننے میں نہیں آئی"۔ مست رام نے کہا "ماسٹر جی آج کل تو چاروں طرف پلیگ کی خبریں ہی پھیل رہی ہیں اور غالباً آج یا کل وہ یہاں بھی پہنچ جائے گی"۔ میں نے ہنس کر کہا "وہ کیسے کیا اُس نے تمہیں پیغام بھیجا ہے"؟ اس کے جواب میں مست رام نے اپنے ایک چرسی دوست

سے کہا۔ "اچھا بھئی دھنی تم خود اپنی زبان سے ماسٹر جی کو وہ واقعہ سناؤ۔"

دھنی لمبی مونچھوں والا شخص تھا۔ جو عام چرسیوں کی طرح مرجھایا ہوا نہ تھا۔ یہ آدمی یکہ چلایا کرتا تھا۔ اس نے پہلے ایک بھربھری سی لی۔ پھر گول مٹول دیدوں کو پھیلا کر کہنے لگا۔ "ماسٹر جی رام رام کچھ نہ پوچھیے۔" پھر کافی دیر سوچنے کے بعد بولا "میں روزانہ رات کے ڈھائی تین بجے موضع دوہرہ سے سواریاں لادتا ہوں اور سورج کی پہلی کرن پھوٹتے ہی من کوٹ پہنچ جاتا ہوں۔ میری سواریوں میں زیادہ تر گوالے اور دھوبی وغیرہ ہوتے ہیں۔ جنہیں صبح سویرے ہی اپنے کام پہ پہنچنا ہوتا ہے۔

چنانچہ گزشتہ رات جب سواریاں لادنے لگا تو ان میں ایک برقعہ والی عورت بھی تھی۔ میں رات کے وقت اکیلی عورت کو سوار کرنے سے ہچکچانے لگا جس پہ وہ عورت منتیں کرنے لگی۔ ان سواریوں میں موضع لوہڑی کا ایک چھٹی رساں بھی تھا۔ جو رخصت گزار کر کسی گاؤں سے واپس آرہا تھا۔ اور صبح اُسے اپنی ڈیوٹی پہ حاضر ہونا تھا۔ اس عورت کی منت سماجت پہ اُس نے کہا "بھئی لے بھی چلو اسے۔ یہ بیچاری اب رات کو کہاں بھٹکتی پھرے گی۔ ہم سب بھلے مانس بیٹھے والے ہیں اسے لے جانے میں کوئی حرج نہیں۔"

چھٹی رساں کے کہنے پر میں نے اُسے سوار کر لیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ من کوٹ جائے گی۔ خیر ہم لوگ وہاں سے روانہ ہوئے۔ لیکن رام جانے گھوڑے کو کیا ہو گیا۔ وہ چند قدم چل کر رک جاتا اور بری طرح ہانپنے لگتا۔ گویا منوں بوجھ کے تلے دبا ہوا ہو۔ آخر میں نے تنگ آکر اس کی لگام پکڑ لی اور قدم قدم اُسے چلانے لگا حتیٰ کہ لگام کھینچتے کھینچتے میرے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے اور گھوڑے کا دہانہ بھی زخمی ہو گیا۔"

یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنے ہاتھ میرے سامنے پھیلا دیئے۔ جن پہ واقعی چھالے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو پھر کیا ہوا؟" دھنی کہنے لگا۔ "اسی طرح میں نے کوئی پانچ کوس کا فاصلہ طے کیا تھا۔ کہ گھوڑا پھر ٹھہر گیا۔ عین اُسی وقت چھٹی رساں نے یکہ سے اُترتے ہوئے کہا کہ میں ذرا پیشاب کر آؤں اور پھر آہستہ سے میرا ہاتھ دبا کر آگے بڑھ گیا۔ اس کا یہ اشارہ پا کر میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔

تھوڑی دُور پر ایک درخت کی اوٹ میں جا کر اُس نے مجھ سے کہا۔ "بھئی اس عورت کو تو سوار کر کے ہم نے بڑی غلطی کی۔ کیونکہ وہ انسان نہیں بلکہ کوئی ہوائی مخلوق ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ کیسے؟" چھٹی رساں کہنے لگا۔ "میں اس کے ساتھ بیٹھا ہوا ہوں۔ وہ کبھی وقت جوان دکھائی دیتی تھی کبھی وقت بوڑھی، کبھی گوری ہو جاتی اور کبھی کالی۔ اس لئے میں نے اسے زیادہ توجہ سے دیکھنا شروع کیا۔ لہٰذا اب معلوم ہوا کہ اس کی داڑھی مونچھیں بھی ہیں ہیں ڈر کر پیشاب کے بہانے نیچے اتر آیا۔"

چھٹی رساں کی بات سن کر میرا رنگ فق ہو گیا۔ مگر وہ بڑا دل گردے والا آدمی تھا۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ ایسے موقع پہ دل چھوڑنا مناسب نہیں اور اس کے بعد وہ پھر یکہ پہ سوار نہ ہوا۔ بلکہ گھوڑا کھینچ کر چلانے میں میری مدد کرتا رہا اور اس کی ہمت و کوشش تھی کہ میرا یکہ پو پھٹتے ہی موضع لوہڑی پہنچ گیا۔ جہاں میں نے اپنی سب سوا۔ یوں سے کہا۔ چونکہ میرا گھوڑا بیمار ہو گیا ہے۔ اور میں آگے نہیں جا سکتا۔ اس لئے کرایہ معاف کرتا ہوں۔

سواریاں اُتر گئیں مگر برقعے والی کہنے لگی۔ "لالہ اور کسی سے خواہ کرایہ نہ لو۔ مجھ سے ضرور لے لو۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے میرے ہاتھ میں ایک نوٹ دے دیا۔ اور قریب کی ایک گلی میں داخل ہو کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اُس کے جانے کے بعد چھٹی رساں نے کہا۔ "بھئی تم پر تو وہ بہت مہربان تھی۔ دکھاؤ تو کتنے کا نوٹ دے گئی ہے؟"

میں نے نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ "ہائیں یہ کیا؟" اُس نے نوٹ کو لالٹین کی روشنی میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ تو معمولی کاغذ ہے۔" میں تعجب سے اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذ پہ جھک گیا۔ چھٹی رساں نے کہا "ٹھہرو بھئی اس پہ تو کچھ لکھا ہوا بھی ہے۔" اور اس کاغذ کو لالٹین کے بالکل قریب لے جا کر پڑھنے لگا۔

کاغذ کا مضمون بہت لرزہ خیز تھا۔ لکھا تھا کہ یہ تم لوگوں کی خوش قسمتی تھی جو تم نے میرے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ میں لاری سے جانا چاہتی تھی۔ مگر تمہارا

یکہ دیکھ کر جی میں آئی کہ اسی پر چڑھ جاؤں۔ جلدی جا پہنچوں گی۔ مگر یہ خیال ہی نہ آیا کہ گھوڑا میرا بوجھ اٹھا سکے گا۔ کیونکہ میں دراصل عورت کے بھیس میں پلیگ تھی لیکن تم لوگ بھی بہادر نکلے۔ جو یکہ کو گھسیٹ گھساٹ کر کوٹھڑی تک لے آئے میں تم لوگوں سے بہت خوش ہوں۔ منٹگمری تو مجھے پہنچنا ہی ہے۔ آج نہ سہی کل سہی تاہم تم لوگوں کی جوانمردی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتی اس کے صلہ میں تم لوگوں کی جان بخشی کرتی ہوں۔

اس مضمون سے ہمارے ہوش اڑ گئے۔ میں نے وہ کاغذ جیب میں رکھا اور فوراً وہاں سے روانہ ہوا۔ تاکہ منٹگمری جا کر یہ کاغذ لوگوں کو دکھاؤں اب میرا گھوڑا ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے فوراً مجھے منٹگمری پہنچا دیا۔ مگر منٹگمری پہنچ کر جب میں نے وہ کاغذ نکالنے کی خاطر جیب میں ہاتھ ڈالا تو جیب خالی تھی۔"

ابھی دھنی اپنا بیان ختم نہ کرنے پایا تھا کہ ہوا کا ایک تیز جھونکا خس و خاشاک اڑاتا ہوا کٹیا کی دیواروں سے ٹکرایا۔ "اوہ۔ کتنی سخت آندھی ہے" مست رام نے نہر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تو سچ مچ خوفناک اور سیاہ آندھی بلائے ناگہانی کی طرح تیزی سے چلی آتی تھی۔ میں بوکھلایا ہوا اسکول کی طرف بھاگا۔ مگر میرے پہنچتے ہی پہنچتے ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔

یہ آندھی کیا تھی خدا کا قہر تھا۔ بڑے بڑے تناور درخت جڑوں سے اکھڑ گئے مکانوں کی منڈیریں اور مزدوروں کے چھپر صاف اڑ گئے آخر کار مطلع بالکل چھٹ گیا تمام رات آندھی بڑے زور شور سے چلتی رہی اور صبح کے قریب بارش کا چھینٹا پڑنے سے اس کا جوش ٹھنڈا ہوا۔

دوسرے دن صبح صبح مست رام میرے پاس آیا اور آتے ہی رات والی آندھی کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ اس آندھی کو پلیگ کا پیش خیمہ تصور کرتا تھا کیونکہ ان دنوں اس کو سوائے پلیگ کا چرچا کرنے کے دوسرا کوئی کام ہی نہ تھا۔ وہ بہت ہراساں تھا۔ میں نے ان توہمات باطلہ سے اس کا خیال ہٹانے کی بہت کوشش کی۔ خیر اسوقت تو وہ کچھ قائل بھی ہو گیا۔ مگر شام کو پھر وہی خبط لئے آدھمکا۔

اس وقت اس کے ساتھ ایک اور چپراسی بھی تھا۔ اس نے آتے ہی کہا۔ "ماسٹر جی مہاراج۔ آج مادھو نے ایک اور تازہ خبر سنائی تھی کیا اسے بھی آپ جھوٹ ہی کہیں گے؟" میں نے کہا۔ "کیسی خبر ہے جلدی بیان کرو۔" مست رام نے جواب دیا۔ "مادھو خود ہی بیان کرے گا۔ اور اسی لئے اسے ساتھ لایا ہوں۔ کیونکہ میری بات کو تو آپ ہنسی میں اڑا دیتے ہیں۔"

مادھو ادھیڑ عمر کا بھٹیارا تھا جس کے سر پر لمبی سی چوٹی اور کانوں میں سونے کے مندرے پڑے تھے۔ اس نے ایک میلی کچیلی دھوتی پہن رکھی تھی اور گلے سے ننگا تھا۔ یہ کچھ نیم پاگل سا آدمی تھا۔ جس کی شکل و شباہت دیکھ کر خواہ مخواہ ہنسی آتی تھی۔ لہذا میں نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔ "سناؤ بھئی مادھو کیا بات ہے"

مست رام نے میری تائید کرتے ہوئے کہا۔ "مگر دیکھو خبردار جھوٹ نہ بولنا" مادھو نے پھٹے پھٹے دیدوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لئے اور سونے کے مندروں کو پکڑ کر کہنے لگا۔ "مہاراج میں اس پوتر سونے کو چھو کر کہتا ہوں کہ کبھی جھوٹ نہ بولونگا۔"

"مست رام نے کہا۔ "اچھا تو پھر بیان کرو۔"

مادھو نے کہا۔ "مہاراج۔ دوپہر کو میں حسب معمول بھٹی کے لئے گھاس پھوس جمع کرنے کی خاطر شہر سے باہر گیا۔ اور قبرستان کے قریب سے گزرنے لگا تو پیچھے دور سے کسی نے مجھے مادھو مادھو کہہ کر پکارا۔ میں نے سمجھا کوئی جان پہچان والا ہوگا۔ کیونکہ سوائے جان پہچان والے کے کوئی کسی کا نام لیکر کیسے پکار سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ تو وہاں کوئی بھی آدمی نہ تھا۔ میں آگے بڑھا تو قریب کے کھیت سے پھر آواز آئی۔

پاس ہی بہری لال کا کھیت تھا میں اس طرف ہو لیا۔ تو کچھ دور چل کر باجرے کے کھیت میں ایک بوڑھیا دکھائی دی۔ جو [illegible] پڑی تھی اس عورت کا چہرہ اتنا ڈراؤنا تھا کہ میں ڈر گیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں سخت پیاسی ہوں۔ جلد کہیں سے پانی لاؤ۔ مارے خوف کے میری

زبان تالو سے لگ گئی اور میں بول نہ سکا۔

میری اس خاموشی پر اسے بہت غصہ آیا اور اُٹھ کر میرے سر پر ایسی چپت رسید کی کہ میں چکرا گیا۔ تو میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "ماتا پانی کہاں سے لاؤں۔ یہاں قریب تو پانی کہیں بھی نہیں۔" اس نے حکم دیا کہ جا کر نہر سے پانی لا۔ میں بہت بہتر کہہ کر واپس ہوا۔

ابھی میں تھوڑی دُور ہی گیا تھا کہ اس نے پیچھے سے اُونچی آواز میں پکار کر کہا "مادھو میرے ساتھ دھوکا نہ کرنا۔ میں چڑیل ہوں اگر تم پانی لیکر نہ آئے تو تمہاری خیر نہیں۔" اُس کے یہ الفاظ تیر کی طرح میرے دل میں اُتر گئے اور خوفزدہ ہو کر ایسا بھاگا کہ گھر پر آ کر دم لیا۔" اس کی یہ مضحکہ خیز داستان سُن کر میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اچھا تو پھر تم پانی لے کر گئے تھے؟" مادھو نے کہا۔ "رام رام پھر وہاں کون جاتا۔" میں نے اُس کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔ "اچھا مٹی کے مادھو اب وہ تمہیں کبھی زندہ نہ چھوڑے گی۔"

میرے اس مذاق سے مادھو زیادہ پریشان ہو گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد کہنے لگا "بھئی مست رام میرے سر میں تو پہلے ہی بہت سخت درد تھا۔ مگر اب تو بدن بھی ٹوٹ رہا ہے۔ مجھے ضرور بخار آئے گا۔ اس لئے مجھے جلد گھر جانا چاہئے۔ اور تم مہربانی کر کے ذرا گھر تک پہنچا دو۔ کیونکہ اکیلا جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ ابھی ماسٹر جی بھی کہہ رہے تھے کہ وہ تمہیں زندہ نہ چھوڑے گی۔"

میں نے اُس کی حالت دیکھ کر تسلی دی اور مست رام بھی سمجھانے لگا۔ لیکن وہ اسی بات پر اڑا رہا کہ مست رام اُسے گھر تک پہنچانے جائے آخر کار اُسے مادھو کے ساتھ جانا پڑا۔

دُوسرے دن صبح سویرے ہی مست رام ہاتھوں میں چلم دبائے ہوئے آ کھڑا ہوا۔ اس کا رنگ اُڑا ہوا تھا اور بہت دلگیر دکھائی دیتا تھا میں نے کہا "کہو بھئی مست رام خیر تو ہے۔ آج صبح صبح کیسے آنا ہوا؟" مست رام نے افسوسناک لہجے میں کہا۔ "ماسٹر جی۔ اب خیر کہاں۔ آج مادھو بھی مر گیا ہے۔" یہ سنکر میں ہکا بکا رہ گیا اور بے اختیاری سے کہا "ہائیں رات کو تو وہ اچھا بھلا تھا۔ اس قدر جلد کیسے مر گیا؟" مست رام نے کہا۔ "ماسٹر جی مر تو وہ اسی وقت گیا تھا۔ جس وقت اس کے سر پر چڑیل نے چپت لگائی تھی۔" میں نے کہا "خیر ان باتوں کو چھوڑو۔ وہ پاگل آدمی تھا واہمہ کا شکار ہو گیا ہو گا۔ مگر تمہیں اس کی موت کا کیسے پتہ لگا؟" مست رام نے کہا "اس نے آخری وقت میں مجھے بلایا تھا۔ صبح منہ اندھیرے ہی اس کا لڑکا آکر مجھے لے گیا۔ لیکن میرے پہنچنے تک وہ ختم ہو چکا تھا۔ آہ اس کا منہ اور سر سوجا ہوا تھا اس کے گلے میں پلیگ پھوٹی تھی۔"

مادھو کی اس اچانک موت سے میں بہت دل برداشتہ ہوا۔ جس کا اثر کئی دنوں تک میرے دل پہ رہا۔ اس عرصہ میں مست رام بھی میرے پاس بہت کم آتا رہا اور اگر آتا بھی تو چپ چاپ بیٹھا رہتا۔ غرضیکہ ہماری محفل پھیکی پڑ گئی۔

جیٹھ بیت چکا تھا۔ ہاڑ شروع ہو گیا۔ اتوار کے دن میں باغیچے کے قریب چارپائی پر لیٹا تھا۔ ہوائیں گنگنا رہی تھیں۔ آم کی پھلدار ڈالوں پر کوئل کوک رہی تھی۔ ڈاکیہ ڈاک لایا جس میں ایک سرکاری لفافہ تھا۔ کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ انسپکٹر صاحب کا حکم نامہ ہے کہ سکول میں لڑکوں کو پلیگ کا ٹیکہ لگوایا جائے۔

اسی وقت مست رام بھی بھولا بھٹکا آ نکلا۔ میں نے اسے یہ خبر سنائی۔ اُس نے کہا "میں بھی نندو تیلی سے ابھی ابھی ایک نئی خبر سُن کر آیا ہوں۔" میں نے کہا "کوئی نیک خبر ہے؟" اُس نے کہا "نندو کہتا تھا کہ پرسوں رات کو چودھری درگا داس کسی اپنے کام کے واسطے تحصیلدار سے ملنے گیا جہاں باتوں باتوں میں اسے بہت دیر ہو گئی۔ نصف شب کے قریب جب وہ واپس آیا۔ تو تحصیل کے نکڑ پہ اُسے ایک عورت ملی۔ جو دہاڑیں مار کر رو رہی تھی۔ اُس کی آواز بہت دردناک تھی۔ اُس نے چودھری سے خیرات مانگی۔ آدھی رات اور سنسان سمے میں اس کی مکروہ آواز کا چودھری پر بہت اثر ہوا۔ اُس نے کچھ نقد عورت کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ مگر عورت نے وہ پیشکش قبول نہ کی۔ اور کہا کہ میں بھوکی ہوں۔ مجھے کھانے کو کچھ دو۔ چودھری نے نرمی سے کہا۔ یہاں میرے پاس کچھ نہیں۔ البتہ اگر میرے ساتھ گھر چلو گی تو ضرور تمہیں پیٹ بھر کر کھانا کھلا دوں گا۔

چودھری کا جواب سُن کر وہ عورت کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ اور پھر بولی نہیں میں تمہارے گھر نہ چلوں گی۔ کیونکہ تم بھلے آدمی ہو۔ بس اتنا کہتے ہی اس کا تدلبا ہونے لگا۔ یہ حالت دیکھ کر چودھری کے اوسان خطا ہو گئے۔ اور بے تحاشا وہاں سے بھاگا۔ اب سنا ہے وہ تگیہ کی تیاری کر رہا ہے۔"

خیر مست رام تھوڑی دیر بعد چلا گیا۔ اُسی دن سہ پہر کو چند آدمی پوری حلوا تقسیم کرتے ہوئے میرے پاس بھی آئے اور دو دو سے انھوں نے مجھے بھی دیئے۔ میں نے پوچھا "یہ کہاں سے آئے ہیں۔" انھوں نے کہا "چودھری درگا داس کے ہاں سے۔" میں نے کہا "کیا تقریب ہے۔" انھوں نے جواب دیا "کہ چودھری جی نے تگیہ رچایا ہے۔" میں نے کہا "کیوں۔" انھوں نے ہنس کر جواب دیا "ان کی مرضی۔" میں لاجواب ہو گیا اور دو نے چپکے سے اُٹھا کر رسویا کے حوالے کر دیئے۔

(۴)

رفتہ رفتہ منٹ گمری بھی پلیگ کی زد میں آ گیا۔ اور وبا نے اس سختی سے حملہ کیا کہ منٹ گمری میں گویا اندھیر مچ گیا۔ موت اتنی ارزاں ہو گئی کہ راستے میں چلتے چلتے انسان گر گر کر مر جاتے۔ اور کوئی ان کو اٹھانے والا تک نہ رہا۔ گھروں کے گھر بیمار پڑے تھے۔ اکثر لوگ بھاگ چکے تھے۔ اور باقی کثرت اموات کی بدولت مُردوں سے بدتر ہو رہے تھے۔ غرضیکہ ہر طرف ہراس اور ابتری پھیلی ہوئی تھی۔

ہمارے سامنے ہی نہر کا پل تھا جس پر سے ہر روز جوق در جوق خلقت بھاگتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ ایک دن میں اور مست رام دونوں بیٹھے ہوئے اس وحشت خیز منظر کو نہایت افسوس سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا "بھلا یہ لوگ بھاگ کر جائیں گے کہاں۔ پلیگ تو چاروں طرف آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔" مست رام نے کہا "یہ لوگ ضرور بچ جائیں گے کیونکہ یہ نگر جا رہے ہیں۔"

میں نے کہا "نگر کو ایسا کونسا تعویذ ہے جو اتنے آدمیوں کے اجتماع کے باوجود پلیگ سے محفوظ رہ سکے۔" مست رام نے کہا "نہیں وہاں پلیگ نہیں جا سکتی۔ ہاں اتنے آدمیوں کے اجتماع سے فساد کا ضرور خطرہ ہے۔" میں نے کہا "آخر وہاں پلیگ کیوں نہیں پھوٹ سکتی۔"

مست رام نے جھوم کر کہا "وہ رسیلے کی نگری ہے ماسٹر جی رسیلے کی۔ جس کا نام سنتے ہی پلیگ رفوچکر ہو جاتی ہے۔" میں نے تعجب سے کہا "رسیلے کی نگری! وہ رسیلا کون ہے؟" مست رام نے کہا "ماسٹر جی رسیلا ایک بھگوان پرش تھا۔ جتی ستی سا۔ گنی آدمی تھا۔ بلوان تھا۔ ایشور کا سیوک تھا۔ ایک وقت میں اُس نے پلیگ کو اپنی قوت بازو سے زیر کیا تھا۔" میں نے اشتیاق سے کہا "وہ کیسے؟" مست رام کہنے لگا "یہ بہت لمبا قصہ ہے جو پھر کسی وقت سناؤں گا۔ اس وقت میرا نشہ ٹوٹ رہا ہے۔ اب جاتا ہوں۔"

آخر کار چند دن کے اندر ہی شہر قریباً خالی ہو گیا۔ سکول پہلے ہی سے بند تھا۔ ہر طرف ویرانی اور سنسنی پھیل رہی تھی۔ ہر طرف دھول چھائی رہتی تھی اور نامعلوم طور پر آہ و بکا کی آوازیں گونجتی محسوس ہوتی تھیں۔ میں انسپکٹر صاحب کے حکم کا منتظر تھا۔ اور دعائیں مانگ رہا تھا کہ جلد رخصت کا حکم ملے تاکہ بستر گول کروں۔

مست رام نے بھی میرے پاس آنا جانا کم کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ ان دنوں بہت ہراساں تھا۔ اور اپنی زندہ دلی قطعی طور پر بھول چکا تھا۔ وہ ان دنوں میں بھی بہت پریشان تھا۔ کیونکہ میرا رسویا بھاگ چکا تھا۔ اور کھانا مجھے اپنے ہاتھ سے تیار کرنا پڑتا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گرمیوں کی لمبی دوپہر جس کو نقل دوپہر کہنا زیادہ موزوں تھا۔ میں نے خود چولہا جھونکا۔ اور کچا پکا کھانا زہر مار کر کے اندر کمرے میں بچھی ہوئی چارپائی پر لیٹ کر پنکھا جھلنے لگا۔ پشت کی طرف کھڑکی تھی جس پر کثرت سے گلو کی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں گو باہر لو کے آتشیں جھونکے بدن کو جھلسا تے تھے۔ مگر گلو کی پتیوں سے چھن کر اندر آنے والی ہوا قدرے ٹھنڈی اور خوشگوار تھی۔ میں اپنے دھیان میں لیٹا تھا کہ باہر سے کسی کے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی۔ جس سے میں چونک اُٹھا اور پلٹ کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔

زبان تالو سے لگ گئی اور میں بول نہ سکا۔

میری اس خاموشی پر اسے بہت غصہ آیا اور اُٹھ کر میرے سر پر ایسی چپت رسید کی کہ میں چکرا گیا۔ تو میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا: "ماتا پانی کہاں سے لاؤں۔ یہاں قریب تو پانی کہیں بھی نہیں"۔ اس نے حکم دیا کہ جا کر نہر سے پانی لا۔ میں بہت بہتر کہہ کر واپس ہوا۔

ابھی میں تھوڑی دُور ہی گیا تھا کہ اس نے پیچھے سے اُونچی آواز میں پکار کر کہا: "مادھو میرے ساتھ دھوکا نہ کرنا۔ میں پلیگ ہوں اگر تم پانی لیکر نہ آئے تو تمہاری خیر نہیں"۔ اُس کے یہ الفاظ تیر کی طرح میرے دل میں اُتر گئے اور خوفزدہ ہو کر ایسا بھاگا کہ گھر پر آ کر دم لیا۔" اس کی یہ مضحکہ خیز داستان سُن کر میں نے ہنستے ہوئے کہا: "اچھا تو پھر تم پانی لے کر گئے تھے؟" مادھو نے کہا۔ "رام رام پھر وہاں کون جاتا"۔ میں نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا: "اچھا مٹی کے مادھو اب وہ تمہیں کبھی زندہ نہ چھوڑے گی"۔

میرے اس مذاق سے مادھو زیادہ پریشان ہو گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد کہنے لگا "بھئی مست رام میرے سر میں تو پہلے ہی بہت سخت درد تھا۔ مگر اب تو بدن بھی ٹوٹ رہا ہے۔ مجھے ضرور بخار آئے گا۔ اس لئے مجھے جلد گھر جانا چاہئے۔ اور تم مہربانی کر کے ذرا گھر تک پہنچا دو۔ کیونکہ اکیلا جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ ابھی ماسٹر جی بھی کہہ رہے تھے کہ وہ تمہیں زندہ نہ چھوڑے گی"۔

میں نے اُس کی حالت دیکھ کر تسلی دی اور مست رام بھی سمجھانے لگا۔ لیکن وہ اسی بات پر اڑا رہا کہ مست رام اُسے گھر تک پہنچانے جائے آخر کار اُسے مادھو کے ساتھ جانا پڑا۔

دُوسرے دن صبح سویرے ہی مست رام ہاتھوں میں چلم دبائے ہوئے آ کھڑا ہوا۔ اس کا رنگ اُڑا ہوا تھا اور بہت دلگیر دکھائی دیتا تھا میں نے کہا "کہو بھئی مست رام خیر تو ہے۔ آج صبح صبح کیسے آنا ہوا"۔ مست رام نے افسوسناک لہجے میں کہا "ماسٹر جی۔ اب خیر کہاں۔ آج مادھو بھی مر گیا ہے"۔ یہ سن کر میں ہکا بکا رہ گیا اور بے اعتباری سے کہا "ہائیں رات کو تو وہ اچھا بھلا تھا۔ اس قدر جلد کیسے مر گیا"۔ مست رام نے کہا۔ "ماسٹر جی مر تو وہ اُسی وقت گیا تھا۔ جس وقت اس کے سر پر پلیگ نے چپت لگائی تھی"۔ میں نے کہا "خیر ان باتوں کو چھوڑو۔ وہ پاگل آدمی تھا واہمہ کا شکار ہو گیا ہو گا۔ مگر تمہیں اس کی موت کا کیسے پتہ لگا"۔ مست رام نے کہا "اس نے آخری وقت میں مجھے بلایا تھا۔ صبح منہ اندھیرے ہی اس کا لڑکا آ کر مجھے لے گیا۔ لیکن میرے پہنچنے تک وہ ختم ہو چکا تھا۔ اُس کا منہ اور سر سُوجا ہوا تھا اس کے گلے میں پلیگ پھوٹی تھی"۔

مادھو کی اس اچانک موت سے میں بہت دل برداشتہ ہوا۔ جس کا اثر کئی دنوں تک میرے دل پہ رہا۔ اس عرصہ میں مست رام بھی میرے پاس بہت کم آتا رہا اور اگر آتا بھی تو چپ چاپ بیٹھا رہتا غرضیکہ ہماری محفل پھیکی پڑ گئی۔

جیٹھ بیت چکا تھا۔ ہاڑ شروع ہو گیا۔ اتوار کے دن میں باغیچے کے قریب چارپائی پر لیٹا تھا۔ ہوائیں گنگنا رہی تھیں۔ آم کی ڈالیوں پر کوئل کوک رہی تھی۔ ڈاکیہ ڈاک لایا جس میں ایک سرکاری لفافہ تھا۔ کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ انسپکٹر صاحب کا حکم نامہ ہے کہ سکول میں لڑکوں کو پلیگ کا ٹیکہ لگوایا جائے۔

اسی وقت مست رام بھی بھولا بھٹکا آ نکلا۔ میں نے اسے یہ خبر سُنائی۔ اُس نے کہا "میں بھی نندو تیلی سے ابھی ابھی ایک نئی خبر سُن کر آیا ہوں"۔ میں نے کہا "کوئی نیک خبر ہے"۔ اُس نے کہا "نندو کہتا تھا کہ پرسوں رات کو چودھری درگا داس کسی اپنے کام کے واسطے تحصیلدار سے ملنے گیا جہاں باتوں باتوں میں اسے بہت دیر ہو گئی۔ نصف شب کے قریب جب وہ واپس آیا۔ تو تحصیل کے نکڑ پہ اُسے ایک عورت ملی۔ جو دھاڑیں مار کر رو رہی تھی۔ اُس کی آواز بہت دردناک تھی۔ اُس نے چودھری سے خیرات مانگی۔ آدھی رات اور سنسان سمے میں اس کی درد بھری آواز کا چودھری پہ بہت اثر ہوا۔ اُس نے کچھ نقد عورت کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔ مگر عورت نے وہ پیشکش قبول نہ کی۔ اور کہا کہ میں بھوکی ہوں۔ مجھے کھانے کو کچھ دو۔ چودھری نے نرمی سے کہا۔ یہاں میرے پاس کچھ نہیں۔ البتہ اگر میرے ساتھ گھر چلو گی تو ضرور تمہیں پیٹ بھر کر کھانا کھلا دوں گا۔

چودھری کا جواب سُن کر وہ عورت کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ اور پھر بولی نہیں میں تمہارے گھر نہ چلوں گی۔ کیونکہ تم پہلے آدمی ہو۔ بس اتنا کہتے ہی اس کا قد لمبا ہونے لگا۔ یہ حالت دیکھ کر چودھری کے اوسان خطا ہو گئے۔ اور بے تحاشا وہاں سے بھاگا۔ اب سنا ہے وہ بیگیہ کی تیاری کر رہا ہے۔"

خیر مست رام تھوڑی دیر بعد چلا گیا۔ اُسی دن سہ پہر کو چند آدمی پوری حلوا تقسیم کرتے ہوئے میرے پاس بھی آئے اور دو دونے انھوں نے مجھے بھی دیئے۔ میں نے پوچھا "یہ کہاں سے آئے ہیں؟" انھوں نے کہا "چودھری دینگا داس کے ہاں سے۔" میں نے کہا "کیا تقریب ہے؟" انھوں نے جواب دیا "کہ چودھری جی نے بیگیہ رچایا ہے۔" میں نے کہا "کیوں؟" انھوں نے ہنس کر جواب دیا "ان کی مرضی۔" میں لاجواب ہو گیا اور دونے چپکے سے اُٹھا کر رسویا کے حوالے کر دیئے۔

(۴)

رفتہ رفتہ من کوٹ بھی پلیگ کی زد میں آ گیا۔ اور وبا نے اس سختی سے حملہ کیا کہ من کوٹ میں گویا اندھیر مچ گیا۔ موت اتنی ارزاں ہو گئی کہ راستے میں چلتے چلتے انسان گر کر مر جاتے۔ اور کوئی ان کو اٹھانے والا تک نہ رہا۔ گھروں کے گھر بیمار پڑے تھے۔ اکثر لوگ بھاگ چکے تھے۔ اور باقی کثرت اموات کی بدولت مُردوں سے بدتر ہو رہے تھے۔ غرضیکہ ہر طرف ہراس اور ابتری پھیلی ہوئی تھی۔

ہمارے سامنے بھی نہر کا پل تھا جس پر سے ہر روز جوق در جوق خلقت بھاگتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ ایک دن میں اور مست رام دونوں بیٹھے ہوئے اس وحشت خیز منظر کو نہایت افسوس سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا "بھلا یہ لوگ بھاگ کر جائیں گے کہاں۔ پلیگ تو چاروں طرف آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔" مست رام نے کہا "یہ لوگ ضرور بچ جائیں گے کیونکہ یہ شکر جا رہے ہیں۔"

میں نے کہا "شکر کون سا اتنا دور ہے جو اتنے آدمیوں کے اجتماع کے باوجود پلیگ سے محفوظ رہ سکے۔" مست رام نے کہا "نہیں وہاں پلیگ نہیں جا سکتی۔ ہاں اتنے آدمیوں کے اجتماع سے فساد کا ضرور خطرہ ہے۔" میں نے کہا "آخر وہاں پلیگ کیوں نہیں پھوٹ سکتی؟"

مست رام نے جھوم کر کہا "وہ رسیلے کی نگری ہے ماسٹر جی رسیلے کی۔ جس کا نام سنتے ہی پلیگ رفو چکر ہو جاتی ہے۔" میں نے تعجب سے کہا "رسیلے کی نگری! وہ رسیلا کون ہے؟" مست رام نے کہا "ماسٹر جی رسیلا ایک بھاگوان پرش تھا۔ جتی ستی سا۔ گنی آدمی تھا۔ بلوان تھا۔ ایشور کا عبد تھا۔ ایک وقت میں اُس نے پلیگ کو اپنی قوت بازو سے زیر کیا تھا۔" میں نے اشتیاق سے کہا "وہ کیسے؟" مست رام کہنے لگا "یہ بہت لمبا قصہ ہے جو پھر کسی وقت سناؤں گا۔ اِس وقت میرا نشہ ٹوٹ رہا ہے۔ اب جاتا ہوں۔"

آخر کار چند دن کے اندر ہی شہر قریباً خالی ہو گیا۔ سکول پہلے ہی سے بند تھا۔ ہر طرف ویرانی اور سنسنی پھیل رہی تھی۔ ہر طرف دھول مچیلا رہتی تھی اور نامعلوم طور پر آہ و بکا کی آوازیں گونجتی محسوس ہوتی تھیں۔ میں انسپکٹر صاحب کے حکم کا منتظر تھا۔ اور دعائیں مانگ رہا تھا کہ جلد رخصت کا حکم ملے تاکہ بستر گول کر دوں۔

مست رام نے بھی میرے پاس آنا جانا کم کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ ان دنوں بہت ہراساں تھا۔ اور اپنی زندہ دلی قطعی طور پر بھول چکا تھا۔ دو دن سے میں بھی بہت پریشان تھا۔ کیونکہ میرا رسویا بھاگ چکا تھا۔ اور کھانا مجھے اپنے ہاتھ سے تیار کرنا پڑتا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گرمیوں کی لمبی دوپہر جس کو قتل دوپہر کہنا زیادہ موزوں تھا۔ میں نے خود چولہا جھونکا۔ اور کچا پکا کھانا زہر مار کر کے اندر کمرے میں بچھی ہوئی چارپائی پر لیٹ کر پنکھا جھلنے لگا پشت کی طرف کھڑکی تھی جس پر کثرت سے گلو کی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں گو باہر لو کے آتشیں جھونکے بدن کو جھلساتے تھے۔ مگر گلو کی پتیوں سے چھن کر اندر آنے والی ہوا قدرے ٹھنڈی اور خوشگوار تھی۔ میں اپنے دھیان میں لیٹا تھا کہ باہر سے کسی کے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی۔ جس سے میں چونک اُٹھا۔ اور پلٹ کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔

اُف خدا بچائے۔ کھڑکی کے باہر مجھے ایک نہایت مکروہ چہرہ دکھائی دیا۔ یہ چہرہ ایک ضعیف عورت کا تھا۔ جس کا رنگ مٹیالا تھا۔ اور منہ پر جا بجا سیاہ دھبے پڑے تھے۔ آنکھیں اُبھری ہوئی اور سُرخ تھیں۔ یہ عورت غصیلی آواز میں خود بخود بڑبڑا رہی تھی۔ میں نے نفرت سے کہا "تم کون ہو؟"

بڑھیا نے اطمینان سے جواب دیا "ہم ہیں۔"

اُس کے بے باکانہ جواب پر گو میں حیران رہ گیا۔ تاہم اُسے جھڑک کر کھڑکی سے ہٹ جانے کو کہا۔ جس پر وہ کھڑکی سے ہٹ گئی۔ اور میں نے فوراً اُٹھ کر کھڑکی بند کر دی۔ لیکن جب واپس چارپائی کی طرف آیا۔ تو اُسے سامنے دروازے پر کھڑا پایا۔

اُس نے ایک بدرنگ سا لہنگا اور چولی پہن رکھی تھی۔ اور سر سے ننگی تھی سر کے بال جو خشک ہو کر جٹاؤں کی شکل میں ایک دوسرے سے اُلجھے ہوئے تھے مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ خاص طور پر بدنما اور غلیظ تھے۔ اُنگلیاں کچھ عجیب طرز کی ٹیڑھی اور ٹوٹی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔

نہ جانے اس بڑھیا کو دیکھ کر کیوں میرے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اور میں نے نرمی اختیار کرتے ہوئے کہا "کیوں مائی کیا چاہتی ہو؟" بڑھیا نے جواب دیا "تمہارا صدقہ۔" میں نے کہا "میرے پاس تو اس وقت کچھ بھی نہیں۔ میرا رسوئیا کل سے بھاگا ہوا ہے۔ خود کھانے سے ناچار ہوں۔" بڑھیا نے خشک لہجہ میں جواب دیا "میں بھی تو ناچار ہوں۔ تمام شہر خالی پڑا ہے۔ اگر کچھ دیدو گے تو تمہارا ہی بھلا ہے۔ لیکن تم لوگ جان تو دیدیتے ہو تاہم اس کی قیمت نہیں دے سکتے۔" بڑھیا کی گفتگو سے میں حیران رہ گیا۔ کیونکہ اس کا انداز گفتگو سر بسر حکیمانہ تھا۔ وہ بجائے التجا کے دھمکی دے رہی تھی۔

میں نے سہمی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو اس کی شکل و صورت میں کچھ ایسی ناپاک اور شیطانی جھلک دکھائی دی۔ جس سے گھبرا کر میں نے کہا "مائی جی یہ کمرہ تمہارے سامنے پڑا ہے۔ جو چاہو لے سکتی ہو۔" بڑھیا آگے بڑھی۔ اور برتنوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ مٹی کے ایک برتن میں تھوڑے سے کالے ماش پڑے تھے۔ جو اس نے لہنگے کے پلو میں باندھ لئے پھر تپائی سے چابیاں اُٹھا کر میرا کیش بکس کھولنے لگی۔ یہ دیکھ کر مجھے روپے لُٹ جانے کا اندیشہ ہوا۔ لیکن روکنے کی ہمت نہ پڑی۔

کیش بکس میں ڈیڑھ سو کے قریب روپیہ تھے۔ مگر اس نے صرف ایک پیسہ اُٹھایا اور باہر نکل گئی۔ میں ہکا بکا ابھی اسی طرح کھڑا تھا۔ اور کیش بکس بھی بدستور میرے سامنے کھلا پڑا تھا۔ کہ عین اسی وقت باہر سے مست رام کی آواز سنائی دی۔ وہ بوکھلایا ہوا اندر داخل ہوا۔ اور بے صبری سے کہنے لگا "کیا وہ یہاں آئی تھی؟" میں نے پوچھا "کون؟" مست رام نے جواب دیا "پلیگ۔" آہ میں نے اس سے سخت کلامی کی۔

مست رام کی زبانی پلیگ کا نام سُن کر میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ میں نے خوفزدہ ہو کر کہا "پلیگ تو نہیں ایک بڑھیا بھکارن آئی تھی۔" اس نے کہا۔ "وہ کہاں ہے؟" میں نے کہا۔ "چلی گئی۔"

"آہ کدھر گئی۔" اس نے بدحواسی سے کہا۔ میں نے لاعلمی ظاہر کی۔ تو اُس نے پوچھا "تم نے اسے کیا دیا؟" اس پر میں نے سارا واقعہ سنایا کہ کس طرح آئی اور کس طرح خیرات لے کر رخصت ہو گئی۔

وہ کف افسوس ملتے ہوئے بولا "بس اب تو اس کے پلیگ ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ دیکھا اُس نے صدقہ میں آپ سے صرف کالے ماش اور تانبے کا پیسہ لیا۔ یہی دو چیزیں تو صدقہ کے لئے مخصوص ہیں۔ اُف اب میری خیر نہیں۔"

میں اس کے بڑھتے ہوئے اضطراب کو دیکھ کر تسلیاں دینے لگا۔ حالانکہ خود میرے دل میں بھی ہول اُٹھ رہا تھا۔ وہ اسی طرح غم و الم میں کھویا ہوا واپس چلا گیا۔ اور میں اُس روز بہت مغموم رہا۔ شام کے قریب میں اُس کی کٹیا کی طرف گیا۔ مگر وہ وہاں نہ ملا۔ وہ وہمی طبیعت کا آدمی تھا۔ اسی لئے مجھے خطرہ تھا کہ وہ کہیں واہمہ کا شکار نہ ہو جائے۔ اسی خیال میں میں نے رات کو بھی بُرے بُرے خواب دیکھے۔ مگر شب کی آخری ساعتوں میں جب مست رام نے گانا شروع کیا (روت نہیں آوتا دیس پیا سے کھیٹ ان دسے دن چار) تو جان میں جان آگئی۔

صبح اشنان سے فارغ ہوکر میں پھر مست رام کی کٹیا کی طرف گیا وہ گھٹنوں پر سر رکھے آنگن میں بیٹھا تھا۔ مجھے دُور سے دیکھتے ہی چلا کر کہنے لگا "ماسٹر جی ادھر مت آنا ابھی میری کٹیا میں ایک مُردہ چوہا پایا گیا ہے۔" میں نے مضطرب ہوکر کہا "تو پھر تم یہاں کیوں بیٹھے ہوئے ہو ادھر میرے مکان پر چلو۔ تمہارا یہاں رہنا اچھا نہیں"۔ اُس نے کہا "اچھا ابھی نہا کر آتا ہوں۔ آپ جائیے۔"

میں سکول میں آکر اس کا انتظار کرنے لگا۔ مگر وہ کہیں غائب رہا۔ آخر شام کو وہ میرے پاس آیا۔ آج اُس نے نئے کپڑے پہنے تھے۔ اسکا چہرہ تمتمارہا تھا۔ آنکھوں کے گلابی ڈورے گویا نشہ کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ اس وقت ایک شکیل جوان دکھائی دیتا تھا۔

وہ آتے ہی پیڑ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اور تھکاوٹ کا اظہار کرنے لگا۔ میں نے کہا "بھئی کہاں رہے۔ میں صبح سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" اس نے کہا "کمیٹی والے کٹیا کی صفائی کرتے آگئے تھے پھر مجھے پکڑ کر کمیٹی لے گئے۔ جہاں انھوں نے تمام دن بٹھائے رکھا اور اب ٹیکہ لگوا کر خلاصی ہوئی ہے۔ ادھر سے آتے ہی آخری سلام کے لئے آپ کے چرنوں میں حاضر ہو گیا ہوں۔"

میں نے تعجب سے کہا "تو تم بھی کہیں جا رہے ہو؟" اُس نے کہا "ہاں سمن جو آچکا ہے۔ اب تو جانا ہی پڑے گا۔" میں نے پُوچھا "کیسا سمن"۔ مست رام نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا "وہی مُردہ چوہا" میں نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا "جانے بھی دو۔ وہم کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے۔ ابھی تمہاری عمر کیا ہے۔ ذرا آئینہ تو دیکھو۔ نئے کپڑے پہن کر کتنے بھلے معلوم ہوتے ہو۔" مست رام نے بدستور غمگین لہجے میں کہا "ہاں اسی کو تو موت کا جوبن کہتے ہیں ورنہ آپ جانتے ہیں کہ میں ایک کریہہ المنظر آدمی ہوں۔ ماسٹر جی مجھے دنیا چھوڑنے کا کچھ غم نہیں صرف اُن بے زبان جانوروں کا خیال ہے۔ جو بیچارے کل تک لاوارث ہو جائیں گے۔" میں نے اکتا کر کہا "اچھا یہ ذکر چھوڑو۔ اس وقت کوئی پھڑکتا ہوا گیت سُناؤ۔"

میرے اصرار پر مست رام نے سوز و گداز سے بھرا ہوا ایک ایسا گیت شروع کیا۔ جو پچھلے زمانے میں دلہن کی رخصت کے وقت گایا جاتا تھا۔ اس کی درد بھری آواز بلند ہوتے ہی فضا میں ایک اُداسی کی لہر دوڑ گئی سماں غمگین اور الوداعی نغمات کے اثر سے ایسا معلوم ہونے لگا۔ گویا ہزاروں بے بس دلہنیں اپنی مسرت بھری آزاد دنیا کھو کر سسرال کے مایوس کُن اور تاریک ماحول میں دھکیلی یا ہزاروں مسافرانِ عدم اپنی رنگین اور دلچسپ زندگیاں فرشتۂ اجل نے جبراً ختم کرلی ہوں (شمشان مجموم کی طرف رواں ہیں۔ مجھ پر بے اختیار رقت طاری ہو گئی اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

کچھ دیر بعد مست رام نے گانا ختم کیا اور اپنی کٹیا میں واپس چلا گیا۔ کیونکہ رات بھر اُسے اپنے کبوتروں سے جدا رہنا گوارا نہ تھا۔ چاندنی رات تھی میں بھی اپنا دل بہلانے کی خاطر نہر پہ چلا گیا۔ اور رات کو دیر سے واپس آیا۔ چبوترے پر چارپائی بچھی ہوئی تھی بستر لگا کر لیٹ گیا۔

آج رات بہت گرم تھی۔ ہوا بند ہونے کی وجہ سے سخت اُمس ہو رہا تھا۔ ساکت و صامت آسمان کے عین درمیان چاند گوہر شب تاب کی طرح چمک رہا تھا۔ جس کی خاموش کرنیں درختوں کی گھنی تاریکیوں کو چیر کر تھکی ماندی شکستہ حال دھرتی کے میلے خاکستری دامن پر روپہلی نقش و نگار بنا رہی تھیں۔

دفعتاً ماحول کچھ ایسا گم سم اور چپ چاپ ہو گیا کہ میرا دل خود بخود کسی نامعلوم دہشت اور پوشیدہ خوف سے دھک دھک کرنے لگا میں حیران تھا کہ اس رُوح فرسا سناٹے میں کونسی ایسی بے چینی اور تلملاہٹ نہاں ہے۔ جسے آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں مگر دل شدت سے محسوس کر رہا ہے۔

نہ جانے اس قیامت خیز رات کے خطرناک لمحوں میں کونسی مخفی قوت کسی کوشش میں مصروف تھی۔ کونسی پراسرار ہستیاں ادھر اُدھر چل پھر رہی تھیں۔ کونسی غائبانہ لاہوتی مخلوق کی آمد پر ایسا ہنگامۂ خاموش برپا تھا۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ وہ ماحول کیوں اتنا مسموم ہو رہا تھا جس کے ناگہانی اثر سے میری حالت دم بدم بگڑ رہی تھی۔

آخر میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور چندو بھنگی کو آواز دی۔ جو چبوترے کے قریب ہی چارپائی پر پڑا تھا۔ میری آواز سنتے ہی وہ فوراً اٹھا اور کہنے لگا "مالک میں تو پہلے ہی سے جاگ رہا ہوں" میں نے کہا۔ "چندو خدا جانے مجھے کیا ہو رہا ہے۔ میرا دل بیٹھا جاتا ہے"۔

چندو میرے قریب کھڑا اپنے ہاتھوں کو زور زور سے مل رہا تھا جیسی کہ اس کی عادت تھی۔ میں نے کراہتے ہوئے پھر اُسے مخاطب کیا۔ اُس نے کہا۔ "مالک میرا بھی یہی حال ہے" میں نے نڈھال ہو کر کہا "تو ایسا کیوں ہو رہا ہے"؟ اُس نے جواب دیا۔ "مالک وجہ تو جانتا ہوں مگر کچھ کہہ نہیں سکتا۔ کیونکہ میں بے علم آدمی ہوں ممکن ہے کہ میرا قیاس غلط ہو"۔

میں نے گھبرا کر کہا "ہاں ہاں وہ وجہ ضرور بتاؤ۔ یہاں علمیت کا سوال نہیں۔ تجربہ علیحدہ چیز ہے" چندو نے ایک طویل سکوت کے بعد کہا "مالک کئی برس گزر گئے۔ میں اس وقت جوان تھا اور میرا باپ بھی زندہ تھا۔ ہم لوگ اپنے گاؤں میں رہتے تھے۔

ہمارے گاؤں کے چودھری کی دُوسرے گاؤں کے چودھری سے سخت دشمنی تھی۔ اور اُسے چوری کا خطرہ تھا۔ لہٰذا اُس نے مجھے چوکیداری پر ملازم رکھا۔ میرا باپ بہت بوڑھا آدمی تھا۔ اور اُسے بےخوابی کی شکایت رہتی تھی۔ اس لئے وہ اکثر رات کو میرے ساتھ چودھری کی حویلی پر چلا آتا تاکہ رات آسانی سے کٹ جائے۔

چنانچہ ایک رات جب ہم دونوں باپ بیٹے آپس میں باتیں کر رہے تھے تو ایسا ہی سماں چھا گیا اور اسی طرح ایک پرہیبت خاموشی اور جانسوز پژمردگی طاری ہوگئی۔ میں بہت ہی خوفزدہ ہوا۔ مگر میرے باپ نے کہا۔ "بیٹا حوصلہ کرو اور بھجن گاؤ۔ کیونکہ اس وقت کوئی پوتر رُوح دنیا سے جا رہی ہے۔ جس کی پیشوائی کے لئے معمولی یم دوتوں کے علاوہ ان کا سردار بھی آیا ہے"۔

غرضکہ ہم دونوں بھجن گانے لگے۔ اور کچھ دیر بعد یہ کیفیت خود بخود زائل ہوگئی آخر صبح معلوم ہوا کہ رات کو قریب ہی کے گھر میں پجاری کی نوجوان اندھی کنیا گزر گئی ہے۔

میں نے متوحش ہو کر کہا "تو کیا اس سے تمہاری مراد یہ ہے کہ یہاں بھی گرد و پیش کوئی موت واقع ہونے والی ہے"؟ "جی ہاں ضرور۔ چندو نے بڑے وثوق سے کہا۔ "اس وقت کوئی پوتر رُوح دنیا سے جا رہی ہے۔ جس کی خاطر خود موت کا فرشتہ یم دوتوں کے پورے لشکر سمیت وارد ہوا ہے۔ یہ اسی کے پروں کی تیکھی جنبش سے مہیب خاموشی۔ اور لرزہ خیز کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔

چندو کی اس گفتگو سے میرے دل کی دھڑکن اور تیز ہوگئی۔ میں فرطِ خوف سے بے حال ہو کر چارپائی پر گر گیا۔ اور کانپتی ہوئی آواز سے کہا "آہ وہ فرشتہ شاید میری ہی رُوح قبض کرنے کو آیا ہے"۔ چندو نے دعائیں دیتے ہوئے کہا۔ "مالک ایسی بات نہ کہو ابھی کوئی دم میں یہ سختی رفع ہو جائے گی۔ آؤ وہی بھجن گائیں۔ جو ایک ایسے ہی وقت میں میں نے اپنے باپ کے ساتھ گائے تھے"۔

غرضکہ اُس نے نہایت عقیدت اور جوش سے بھجن گانا شروع کیا۔ ساتھ میں بھی لڑکھڑاتی زبان اور کمزور آواز میں اس کے ساتھ بھجن گا رہا مگر باوجود اس کے کئی گھنٹوں تک وہ حالت بدستور قائم رہی۔ رات اتنی لمبی ہوگئی کہ ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی بسنت رام بھی آج ایسا خاموش تھا کہ جیسے لگتی آسا چھیڑنا بالکل بھول گیا ہو۔

آخر خدا خدا کر کے یہ کافر رات ختم ہوئی۔ صبح کاذب کی ہلکی ہلکی ہوا کے جھونکے آنے لگے۔ بےحس و حرکت درخت آہستہ آہستہ انگڑائیاں لیتے ہوئے گہری نیند سے جاگے۔ برگ و بار کے مردہ تنوں میں گویا جان سی پڑنے لگی۔ اور ماحول بتدریج سکون پذیر ہونے لگا۔ میرے دماغی انتشار اور دلی ہیجان میں بھی کمی ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ رفتہ رفتہ نیند آگئی۔

آنکھ کھلی تو سورج میرے سر پر چمک رہا تھا۔ جس کی ہر کرن تپی ہوئی سلاخ بن کر جسم کو داغ رہی تھی۔ میں کلبلا کر اٹھ بیٹھا چندو اس وقت اپنے کام سے فارغ ہو کر حقہ پی رہا تھا مجھے بیدار پا کر میرے پاس آگیا۔ اور مزاج پرسی کے بعد حسبِ معمول اپنے ہاتھوں کو زور زور

سے ملنے لگا۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر ہچکچا رہا ہے۔ میں نے اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے کہا۔ "اگر تم کچھ کہنا چاہتے ہو تو بیشک کہہ دو۔" مالک اس نے دھیمی آواز سے کہا۔ "رات کو جو بات میں نے کہی تھی بالکل سچی ثابت ہوئی۔" میں نے اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر کہا۔ "یعنی" اس نے جواب دیا۔ "بیتی رات کو بھلا آدمی دنیا سے رخصت ہو گیا۔" میں نے تعجب سے پوچھا۔ "وہ کون؟" چندو بولا۔ "مست رام۔" میں نے بدحواسی سے چلا کر کہا۔ "کیا مست رام مر گیا؟" "ہاں مالک ابھی اس کی لاش کمیٹی والے اٹھا کر لے گئے ہیں۔" اس نے افسوس سے کہا۔

مست رام کی موت کی خبر ایک زبردست آہنی ہتھوڑے کی ضرب کی طرح میرے دماغ پہ لگی۔ میں دیر تک دھاڑیں مار مار کر روتا رہا۔ اس دن بارہ بجے کی ڈاک میں مجھے انسپکٹر صاحب کا حکم نامہ ملا۔ کہ میں سکول بند کر کے چھٹی پر چلا جاؤں۔ لہٰذا اسی دن میں روتا دھوتا اپنے گھر چلا آیا۔

(۵)

اس واقعہ کے چند ماہ بعد موضع ٹکر جانے کا اتفاق ہوا۔ مجھے مست رام کے وہ الفاظ یاد تھے کہ ٹکر کے قریب رسیلی نگری ہے جس نے پلیگ کو قوت بازو سے زیر کیا تھا۔ رات کو میں چودھری گوبند رام کی حویلی ہی میں ٹھہرا تھا۔ کھانے کے بعد میں نے بوڑھے چودھری سے رسیلے کا قصہ سننے کی خواہش ظاہر کی۔

کاتک کا مہینہ تھا۔ صحرائی گرمی کا جوش کسی حد تک سرد پڑ چکا تھا۔ ہلکی ہلکی معتدل ہوائیں چل رہی تھیں۔ دریچوں سے باہر وسیع و لا محدود صحرا۔ رات کی خاموشی اور تاریک آغوش میں گہری نیند سو رہا تھا۔ تاروں کی کثرت سے آسمان سیاہ و منقش چادر میں لپٹا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ہم دونوں پرانی حویلی کے کوٹھے پہ۔ جس کے کونوں میں کلسوں پہ بڑے بڑے روغنی آبدان نصب تھے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

بوڑھا چودھری گہری سانس لے کر کہنے لگا۔ کسی زمانے میں ہمارے گھر ایک بوڑھا مصری دیوی ناتھ رہتا تھا۔ یہ میرے باپ کے وقت کا بہت نیک۔ اور وفادار ملازم تھا۔ رسیلا اس کے بڑھاپے کی اولاد تھا۔ اس لئے بوڑھا مصرا سے دیکھ دیکھ کر جیتا تھا۔ جب رسیلا نے زندگی کی ساتویں سیڑھی پہ قدم رکھا تو بوڑھا مصر چل بسا اور مرتے وقت اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے گیا۔

بوڑھی مصرانی بہت سمجھ دار عورت تھی۔ اس نے میرے گھر کا کام کاج سنبھال لیا۔ ادھر رسیلے کو میں نے پاٹھ شالہ میں داخل کرا دیا۔ رسیلا بڑا ہونہار اور محنتی لڑکا تھا۔ دوپہر کو جب پاٹھ شالہ سے واپس آتا تو بڑی محبت سے ماں کا ہاتھ بٹاتا۔ بلکہ اس کے علاوہ گھر کے دوسرے کاموں میں بھی نہایت شوق سے حصہ لیتا۔ اور اپنی حسن لیاقت سے وہ بہت جلد گھر بھر میں عزیز ہو گیا۔ رادھا کے سوائے گھر کے تمام افراد اس سے خوش تھے میری اکلوتی بیٹی رادھا اس وقت بارہ سال کی تھی یہ بہت تند اور تلخ مزاج کی لڑکی تھی۔ رسیلے کے ساتھ اسے خدا واسطے کی دشمنی تھی۔ یہ اسے اپنا حریف سمجھتے ہوئے اکثر بلا وجہ ہی اسے پیٹ ڈالتی تھی۔ بوڑھی مصرانی زبان سے تو کچھ نہیں کہتی تھی مگر اس کی غمناک آنکھوں کو دیکھ کر میں رادھا کی سرزنش کئے بغیر نہ رہتا تھا۔ اس لئے رادھا کی عداوت روز بروز بڑھتی گئی۔ اسی طرح دن گزرتے گئے۔ حتیٰ کہ رسیلا چودہ سال کا ہو گیا رادھا اس وقت بیس سال کی تھی۔ اس کی شادی میں نے ایک امیر گھرانے میں کی تھی۔ مگر وہ چوتھے سال ہی ودھوا ہو کر ہمارے گھر واپس آ گئی۔ مگر رسیلا پہلے سے زیادہ جانفشانی سے اس کی خدمت کرنے لگا۔ مگر وہ بدستور اس کی مخالف رہی۔

رفتہ رفتہ رسیلا جوان ہوتا گیا۔ جوان بھی ایسا جس کو دلکش جوان کہنا زیادہ موزوں تھا۔ جس طرف نکل جاتا انگلیاں اٹھنے لگتیں گاؤں کی لڑکیاں اس کی راہ میں آنکھیں بچھاتی تھیں گاؤں کے لڑکے اس کی دوستی پہ فخر کرتے اور بڑے بوڑھے اس کو دعائیں دیتے تھے۔ وہ مردانہ حسن کا بہترین نمونہ تھا۔ اس کی شکل و صورت میں کچھ ایسا شاہانہ پن تھا کہ سادہ لباس میں بھی راجکمار دکھائی دیتا تھا۔ اب میں نے کمائے گھر کے کاموں کے باغات کا انتظام اس کے سپرد کر رکھا تھا۔ جس کے حسن انتظام سے میری آمدنی میں کافی اضافہ ہو گیا۔

بوڑھی مہرانی بیٹے کی سعادت مندی اور قابلیت پر پھولی نہ سماتی تھی۔ اس کی زبردست خواہش تھی کہ بیٹے کا بیاہ کر کے اپنا گھر آباد کرے۔ لہٰذا اُس نے بہت کوشش کر کے ایک اچھے کھاتے پیتے برہمن کی حسین لڑکی کے ساتھ اس کی منگنی کر دی۔ لیکن جب لڑکی والوں نے شگن بھیجا تو رسیلے نے شگن لینے سے صاف انکار کر دیا۔ مہرانی نے بیٹے کو بہت سمجھایا اور منت سماجت بھی کی مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔

بوڑھی مہرانی اپنے فرمانبردار بیٹے کی جسارت اور گستاخی سے بہت آزردہ ہوئی۔ اور روتی ہوئی میرے پاس آئی تاکہ میں رسیلے کو سمجھا بجھا کر شادی پر آمادہ کروں۔ لیکن میں بھی کوشش میں ناکام ہوا۔

اُس نے کہا! "مالک۔ یوں تو آپ کو مجھ پر ہر طرح کا حق حاصل ہے۔ لیکن شادی کے معاملے میں آپ دخل نہ دیں ورنہ میں کہیں بھاگ جاؤں گا۔ کیونکہ میں عورت ذات سے سخت نفرت کرتا ہوں۔" میں نے حیرت سے پوچھا "اس کی وجہ؟" اُس نے جواب دیا "کہ میری مرضی"۔ میں لاجواب ہو گیا۔

رسیلے کی اس ہٹ دھرمی سے اُس کے متعلق گاؤں میں منافرت کی لہر دوڑ گئی گاؤں کی لڑکیاں اسے ذلیل و حقیر تصور کرنے لگیں۔ لوگ اپنے لڑکوں کو اس کے میل جول پر ٹوکنے لگے۔ تاکہ وہ اپنے زہریلے خیالات کہیں ان کے دماغوں میں نہ بھر دے۔

رادھا کو بھی اچھا موقع ہاتھ آ گیا۔ اُس نے اسی بہانے سے رسیلے کو جی بھر کے کوسا۔ بہت بے عزت کیا اور آخر انتہائی نفرت سے اُس کے منہ پر تھوک بھی دیا۔ غرضیکہ رسیلے نے زمانہ کی بدسلوکیوں کو نہایت حوصلے سے برداشت کیا اور اپنے ارادے سے بھی باز نہ آیا۔ بوڑھی مہرانی کو بیٹے کی اس ضد سے بہت صدمہ ہوا اور اسی سال وہ بہو کی آرزو دل میں لئے سرگباش ہو گئی۔

ماں کے مرنے کے بعد رسیلا بالکل خود مختار و آزاد تھا۔ وقت کی رفتار کے ساتھ آہستہ آہستہ گاؤں والوں کا دل بھی اس کی طرف سے صاف ہوتا گیا۔ لوگ اُسے سنت رسیلا کہنے لگے۔ اور اسی حالت میں اُس نے زندگی کی بچپیں منزلیں طے کر لیں۔

اس بات کو چالیس سال کا عرصہ گزر چکا۔ یہی موسم تھا کہ اس علاقے پر پلیگ کا زبردست حملہ ہوا۔ گاؤں کے گاؤں تباہ و برباد ہو گئے اکثر ایسا بھی ہوا کہ گھر کے تمام افراد ایک دم مر گئے۔ ان کے مردے گھروں کے اندر ہی سڑتے رہے اور چوہے درندوں کی طرح ان کو کھاتے بھی رہے۔ بعض اوقات یہ مردہ خور چوہے بھیڑ بکریوں کی طرح غول در غول گلی کوچوں میں پھرتے دکھائی دیتے۔

ان دنوں اکثر ایسی بعید از قیاس اور بے تکی باتیں ظہور پذیر ہوئیں کہ بہت سے آدمی تو دہشت سے ہی مر گئے۔ آخر کار خلقت نے بد حواسی سے گھر چھوڑ کر باہر صحراؤں میں چھپر ڈال لئے۔ ہم لوگ بھی یہ حویلی چھوڑ کر باہر کچی حویلی میں چلے گئے۔ جو سامنے والے باغ میں بنی ہوئی تھی۔ لیکن یہاں آتے ہی رادھا پلیگ میں مبتلا ہو گئی۔

رادھا چونکہ واحد اولاد ہونے کی وجہ سے میرے اندھیرے گھر کا چراغ تھی۔ سب کا سرور اور آنکھوں کا نور تھی اس لئے اس کی بیماری کوئی معمولی بات نہ تھی۔ سارا کنبہ تیمارداری میں مصروف ہو گیا۔ اس موقعہ پر رسیلے نے اس کی اتنی خدمت کی کہ اگر کوئی حقیقی بھائی ہوتا تو وہ بھی شاید نہ کر سکتا۔ وہ دن رات برابر اس کی پٹی سے لگا بیٹھا رہتا۔ اس کی صورت سے وحشت برستی تھی اس کی حالت دیکھ کر مجھے اندیشہ ہونے لگا مبادا بیمار نہ ہو جائے۔

خیر ایک ایک لمحہ گنتے ہوئے رادھا کی بیماری کو چھ دن گزر گئے۔ اور ہمیں اس کی زندگی کی کچھ آس بندھ گئی (کیونکہ عام طور پر یہ مرض آناً فاناً اپنا کام کرتا ہے۔ اور جو مریض کچھ لٹک جاتے۔ وہ یقینی طور پر بچ جاتا ہے) لیکن جونہی ساتویں رات آئی تو رادھا نے پھر درد کے سبب تڑپنا شروع کیا یعنی اس کی دوسری بغل میں ایک اور گلٹی نمودار ہو گئی جس سے اس کی حالت دم بدم بگڑنے لگی۔

رادھا کو دم توڑتے دیکھ کر گھر بھر کے چہروں پر مُردنی چھا گئی۔ میں فرطِ غم سے نڈھال ہو کر گھر سے باہر نکل گیا۔ باغ کے شمالی دامن میں ایک

گھنے کنج کے درمیان ہمارے بزرگوں کے وقت کا ایک پرانا مندر تھا۔ جس میں کرشن بھگوان کی بڑی سی مورتی نصب تھی۔ انسان چاہے کتنا ہی پاپی ہو مصیبت کے وقت ضرور پرماتما کا سہارا لیتا ہے۔ اسی کے چرنوں میں اُسے شکتی اور شانتی نصیب ہوتی ہے۔ لہٰذا میری بھی یہی حالت تھی میں نے بے اختیار مندر کا رُخ کیا۔

پورنماشی کا چاند آسمان پر جگمگا رہا تھا۔ جس کی تیز روشنی میں صحرا کے ذرات اس آب و تاب سے چمک رہے تھے کہ یا ہر ذرہ بذاتِ خود ایک چاند تھا۔ لیکن نصف شب کی ہلکی ہلکی ہواؤں کی فراقیہ گونج سے کائنات میں بجائے رنگینی کے ایک اُداسی اور رقت چھا رہی تھی۔ صحن بیاباں میں چاندنی سے سنورے ہوئے پیڑ خشوع کے ساتھ اس طرح متحرک تھے۔ جیسے پلیگ کے ہاتھوں بے موت مرے ہوئے انسانوں کی روحیں عالمِ ارواح سے آکر اپنے مردہ جسموں کی تلاش میں ادھر اُدھر بھٹک رہی ہوں۔ غرضیکہ اس سنسان اور ہُو کے عالم میں۔ میں بھی ایک روح کی طرح فکر و آلام کو پیچھے چھوڑتا ہوا مندر تک جا پہنچا۔

مندر کی پُر ہول اور گہری خاموشی میں حقیقی مسرت برس رہی تھی میرے دل میں روحانیت کا چشمہ اُبلنے لگا۔ میں فوراً جوشِ عقیدت سے مورتی کے سامنے جھک گیا۔ اور نہایت عاجزی سے رادھا کی سلامتی کے لئے پرارتھنا کرنے لگا۔ درحقیقت من کی صفائی اور آتما کی تسکین کے لئے پرارتھنا سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔

اس طرح جب میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو میں مورتی کی پشت کی جانب سمادھی لگا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد بڑے زور سے مندر کا دروازہ کھلا اور ایک شخص والہانہ جوش سے اندر داخل ہوا۔

آنیوالا رسیلا تھا جو اندر آتے ہی مورتی کے چرنوں میں گر گیا اور گڑگڑا کر بھگوان سے کہنے لگا ”ہے بھگوان میری رادھا کو پلیگ کے خونخوار پنجے سے بچا لے۔ یہ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے اور ذلیل سمجھتی ہے مگر میرا دل اس پر مائل ہے۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ وہ میرے من کی رانی ہے۔ آہ میری بوڑھی ماں میری شادی کی آرزو دل میں لئے ہی دنیا سے رخصت ہو گئی لیکن میں اس کی آرزو پوری نہ کر سکا۔ کیونکہ میں نے اپنی زندگی رادھا کی خدمت کے لئے وقف کر دی تھی۔ آہ آج ظالم پلیگ میری محبت کا وہ خزانہ مجھ سے چھیننے کے درپے ہے۔ جس کی حفاظت پر میں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ آہ آج وہی رادھا جس کا میں پجاری ہوں۔ میرے سامنے دم توڑ رہی ہے۔ بھگوان اگر وہ مر گئی تو میں بھی زندہ نہ رہونگا“ کثرتِ گریہ سے اس کی آواز رُک گئی۔

اس انوکھے انکشاف پر میں ششدر رہ گیا۔ مگر مصلحتاً کونے میں دبکا رہا۔ کچھ وقفے کے بعد اس نے پھر سر اٹھایا۔ اور کہنے لگا ”ہے بھگوان تم تو بالکل خاموش ہو۔ اگر خود میری مدد نہیں کر سکتے تو مجھے ہی موقعہ دو۔ تاکہ میں پلیگ سے زور آزمائی کر کے اُسے شکست دوں۔ اور اس کے پنجے توڑ کر رادھا کو بچا لوں“

عین اسی وقت باہر سے ایک نہایت مکروہ اور کرخت آواز سنائی دی ”کہ اگر مجھے مندر میں داخل ہونے پر قدرت حاصل ہوتی۔ تو تمہیں شیخیاں بگھارنے کا مزہ چکھا دیتی۔ ہاں اتنے بہادر ہو تو باہر آ کر ذرا اپنی طاقت دکھاؤ“ آواز سن کر میرا دل دہل گیا۔ مگر رسیلا جس کی رگوں میں جوانمردی کا خون پورے جوش سے رقص کر رہا تھا۔ بجلی کی سی سرعت سے تڑپ کر اٹھا۔ اور شیرِ نر کی طرح دروازے سے باہر کود گیا۔

یہ سب کچھ آناً فاناً ہو گیا۔ میں اُسے پکڑنے کے لئے اٹھا تو سہی۔ مگر دروازہ پر پہنچ کر میرے پاؤں خود بخود رُک گئے۔ باہر جانے کی ہمت نہ ہوئی اور حواس باختہ وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اتنے میں کہیں دور سے مرغِ سحر کی دھیمی سی دلکش آواز کی صدا خاموشیوں کو چیرتی ہوئی فضا میں تحلیل ہو گئی۔ میں پیغامِ صبح سُن کر ایک دم چونکا۔ اور حوصلہ کر کے باہر نکلا۔ باہر بدستور دحشت برس رہی تھی۔ خشک چاندنی۔ شبنمی ہواؤں سے قدرے نرم پڑ چکی تھی۔ لیلائے شب کے منتشر سیاہ گیسو بتدریج سنورتے اور سمٹتے جا رہے تھے۔ میں ادھر اُدھر رسیلے کو تلاش کرنے لگا۔

یکایک مویشی خانہ کی طرف سے چیخوں کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز نہایت بھیانک اور تڑپتی چیخوں کے مانند تھی۔ میں تیزی سے دوڑتا ہوا اُدھر گیا۔ لیکن مویشی خانہ کے سامنے پہنچ کر مجھے رُکنا پڑا۔ کیونکہ کوئی شخص چیختا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ جسے دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور میں سہم کر درخت کی اوٹ میں چھپ گیا۔ آنے والی ایک نہایت میلی کچیلی اور بے حد کریہہ المنظر بڑھیا تھی۔ جس نے اپنے ہاتھ آگے بڑھا کر لٹکا رکھے تھے۔ گویا ٹوٹے ہوئے ہوں۔ وہ چیختی چلاتی اور بے تحاشا بھاگتی ہوئی میرے قریب سے گزر گئی۔

اس کے دُور چلے جانے پر میں چھپر کی طرف بڑھا۔ تھوڑے ہی فاصلہ پر رسیلا چھپر کی منڈیر کے سہارے نیم دراز تھا۔ اور اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں کس کر چھاتی سے لگا رکھی تھیں۔ میں نے اُسے پکارا مگر اُس نے جواب نہ دیا۔

اُس کی بے ہوشی سے آگاہ ہو کر میں نے اُس کا سر اپنے زانو پہ رکھ لیا اس کی کنپٹیاں سہلائیں اور آہستہ آہستہ اس کی کسی ہوئی مٹھیوں کو کھولا۔ تو کوئی چیز اُس کے ہاتھ سے نکل کر زمین پہ بکھر گئی۔ میں نے تعجب سے اس چیز کو جھک کر دیکھا۔ اُف اُس ہولناک اور ناپاک چیز کو دیکھ کر میرا رواں رواں کانپ گیا۔ خدا معاف کرے وہ تو دس لمبے لمبے ناخون تھے جو کسی درندے کے پنجوں سے تازہ جھڑے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ دہشت اور کراہت سے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میرا بدن پسینے میں تر ہو گیا۔

کافی وقفہ کے بعد میں نے آنکھیں کھولیں۔ رسیلا ابھی تک بدستور بے حس و حرکت پڑا تھا۔ کیونکہ وہ دُوسری دنیا میں پہنچ چکا تھا۔ صبح صادق کی پُر عظمت دھیمی روشنی اور چاندنی کے ڈھلتے سایوں میں ہوائیں موت کا راگ گاتی ہوئی ہچکیاں لے کر چل رہی تھیں۔ بڑ دس کا کنواں نہایت حسرت ناک لَے میں اودت نہیں آؤناں دیس، پیارے کھیڈن دے دن چار، کی راگنی گاتا ہوا اس کی جوانمرگی پر آنسو بہا رہا تھا۔ مگر اُس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے فتح اور کامیابی جھلک رہی تھی۔ کیونکہ وہ بازی جیت چکا تھا۔

رسیلے کی موت کے بعد رادھا کی حالت روز بروز سنبھلتی گئی یعنی رسیلے نے پلیگ کے پنجے توڑ کر اُسے بچا لیا۔ بلکہ بستی میں بھی بہت جلد امن قائم ہو گیا۔ اور پھر اس دن کے بعد کبھی اس گاؤں میں پلیگ نہیں پھوٹی۔ چنانچہ اس پر حسرت واقعہ کی یاد میں اس گاؤں کا نام ٹکڑ پڑ گیا۔ پرانے زمانے کے لوگ اسے رسیلے کی نگری بھی کہتے ہیں۔ ورنہ کسی زمانہ میں یہ گاؤں من کوٹ کا ہی ایک حصّہ تھا جو نیا من کوٹ کہلاتا تھا۔

(۶)

رسیلے کے صبر و استقلال۔ پاکیزہ عشق اور بہادری کی انوکھی داستان سُن کر میں نقش حیرت بن گیا۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ آخری راتوں کا گرد مد چاند گرد و نواح میں اپنی زردکھی پھیکی چاندنی پھیلانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ یک لخت ہوا کا ایک آوارہ جھونکا سوکھے پتوں کی جھانجھ بجاتا ہوا اُٹھا۔ اور بلند ہو کر کھجوروں کی دراز چوٹیوں سے ٹکرایا۔ تو کھجوروں کی سخت اور نوکیلی شاخوں نے زبان بے زبانی سے اودت آؤناں دیس پیارے کھیڈن دے دن چار کا غمگین ترانہ الاپنا شروع کیا۔ تمام صحرا میں ایک پُر درد گونج پیدا ہو گئی عین اُسی وقت کسی صحرا نشین نے بھی یہی راگنی چھیڑ دی۔

چاروں طرف سے پیغام فنا سُن کر دُنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا میرے دل پہ بہت اثر ہوا اور رنجیدہ حالی سے میرا دماغ معطل ہو گیا۔ حتیٰ کہ میں تخیل کی وادی میں داخل ہو کر ایک لاہوتی دنیا میں کھو گیا۔

صالحہ عابد حسین

سنبھالا

سارے گھر میں بھیانک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مریضہ کے کمرے میں کئی ڈاکٹر معائنہ میں مشغول تھے۔ موہنی کا شوہر پرتاب اور اس کا بھائی کمرے کے اندر تھے۔ اس کی بھاوج سرسوتی برآمدے میں ٹہل رہی تھی۔ موہنی کی تیرہ سال کی بچی سوہنی اور سترہ سال کا لڑکا پریم کمرے کے باہر دروازے سے لگے کھڑے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو خوفزدہ نظروں سے دیکھتے اور مایوسی کے اشارے کرتے۔ ان کے چہروں سے رنج و غم کے آثار ظاہر ہو رہے تھے ...... موہنی کا محبوب کتا ہیرا بھی ایک طرف خاموش اور اداس سا بیٹھا تھا۔ گویا وہ بھی آنے والے افسوسناک حادثہ سے سہما ہوا تھا۔

آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھلا اور کرنل شہاب سر جھکائے باہر نکلے۔ ان کے پیچھے نرس اور دو تین اور ڈاکٹر بھی باہر آ گئے۔ پریم اور سوہنی ایک ساتھ دوڑے اور ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سوہنی نے بے قراری سے پوچھا، ڈاکٹر صاحب۔ ڈاکٹر صاحب بتایئے ممی کو ہوش آیا؟ اب وہ کیسی ہیں؟ اچھی ہو جائیں گی نا؟ بولئے ڈاکٹر صاحب ایشور کے لئے کچھ تو کہیئے" پریم نے منہ سے کچھ نہ کہا مگر آنکھوں آنکھوں میں سینکڑوں سوال کر ڈالے۔ ڈاکٹر نے محبت اور افسوس بھری نگاہ سے دونوں بچوں کو دیکھا۔ اور سوہنی کے سر پر ہاتھ پھیر کر صرف اتنا کہا "گھبراؤ نہیں اللہ پر بھروسہ رکھو"

موہن نے بیوی کو اشارہ کیا اور وہ سوہنی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گئی۔ پرتاب نے دوسرے ڈاکٹروں کو فیس دے کر رخصت کیا۔ اور ڈاکٹر شہاب۔ موہن اور پریم چاروں ڈرائینگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ دو تین منٹ تک خاموشی رہی۔ آخر موہن نے اس خاموشی کو توڑا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

موہن۔ ڈاکٹر صاحب آپ نے کیا رائے قائم کی۔ موہنی بچ جائے گی؟

ڈاکٹر۔ مسٹر موہن آپ ان کی حالت دیکھ رہے ہیں۔ آٹھ دن سے بالکل بیہوش ہیں۔ کمزوری حد سے بڑھ گئی ہے۔ طاقت کی دوائیں اور انجکشن سب اب تک بیکار ثابت ہو رہے ہیں۔ ایسی حالت میں کیا کہا جا سکتا ہے؟

پرتاپ۔ ڈاکٹر کیا اب کچھ نہیں ہو سکتا؟

ڈاکٹر - پرتاب اگر تم صاف صاف پوچھتے ہو تو سچ یہ ہے۔ کہ مسز پرتاب کا بچنا اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ لیکن ایک پریم کو دیکھ کر ہی اگر انھیں ہوش آگیا تو دوا ضرور اثر کرے گی۔ ہم اپنی طرف سے کوئی کوشش اُٹھا نہ رکھیں گے (کچھ دیر بعد) پرتاب مجھے تم سے کچھ پرائیویٹ باتیں کرنا ہیں۔

موہن اور پریم اُٹھ کر باہر چلے گئے۔ پرتاب نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

پرتاب - کیوں شہاب کیا واقعی اب میری بیوی نہیں بچ سکتی؟

ڈاکٹر - خدا ہی بڑی طاقت ہے۔ لیکن میرا علم اور تجربہ یہی کہتا ہے کہ اب مسز پرتاب نہیں بچیں گی۔

پرتاب - شہاب یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ کچھ تو کرو۔ آپریشن! کیا آپریشن کرنے سے زندگی کی اُمید ہو سکتی ہے؟

ڈاکٹر - آپریشن بالکل فضول ہے وہ پہلے ہی شدید تکلیف اُٹھا رہی ہیں۔ میں انھیں اور زیادہ تکلیف نہیں دوں گا۔ ان کا دل اس قدر کمزور ہے کہ وہ آپریشن تو بڑی چیز ہے معمولی بات بھی برداشت نہیں کر سکتیں۔

پرتاب - افسوس۔

ڈاکٹر - پرتاب میں صاف صاف کہتا ہوں کہ مسز پرتاب کی بیماری کا سبب تم اور صرف تم ہو۔ اگر وہ مرگئیں تو اُن کا خون تمھاری گردن پر ہوگا

پرتاب - (خفگی سے) شہاب یہ کیا بک رہے ہو؟ میں ان کی بیماری کا سبب کیسے ہو سکتا ہوں۔

ڈاکٹر - مجھ سے باتیں بنانے کی کوشش نہ کرو۔ میں برسوں سے تمھیں اور انھیں جانتا ہوں۔ تمھارا دوست ہوں اور تمھارے خانگی حالات سے پوری طرح واقف۔ مجھے وہ وقت بھی یاد ہے۔ جب تم نے پہلی مرتبہ اس شہر میں قدم رکھا تھا۔ مسز پرتاب اس وقت شاید سترہ یا اٹھارہ سال کی ہوں گی۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ میں انھیں دیکھ کر مبہوت ہو کر رہ گیا تھا۔ کیسا بےمثل حسن تھا۔ اور پھر کتنی نیک اور بھولی طبیعت لیکن تم نے انھیں غلط راہ پر ڈال دیا۔ پہلے انھیں سوسائٹی سے روشناس کرایا۔ ہر اچھی بُری محفل میں زبردستی لے گئے۔ اپنے کم ظرف اور ذلیل طبیعت دوستوں تک سے ان کی ملاقات کرائی۔ اپنی ذاتی اغراض کی وجہ سے تم نے انھیں تباہی کے گڑھے کی طرف دھکیل دیا۔ شراب جیسی مذموم چیز اور مہلک زہر کی انھیں زبردستی لت لگائی۔ ان کے حمل دواؤں سے ضائع کرائے جس کی وجہ سے ان کی صحت اور بھی زیادہ خراب ہوگئی۔ اور پھر خود ہی ان سے آنکھیں پھیر لیں۔ خود بُری صحبت میں پڑ گئے اور ان پر الزام رکھے۔ ان پر بے جا تنقید شروع کر دی اور ہر طرح اُن کے نازک دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ وہ اپنا غم غلط کرنے کے لئے اور بھی زیادہ شراب پینے لگیں اور تم نے بجائے اس کے کہ ان کی اس عادت کو جو خود تمھاری ہی ڈالی ہوئی تھی آہستہ آہستہ چھڑاتے اس کی پروا بھی نہ کی۔ بجائے دلجوئی کے دل آزاری سے کام لیا۔ نتیجہ جو کچھ ہے تمھارے سامنے ہے۔ شراب کی کثرت اور دلی رنج و غم نے ان کی رہی سہی صحت بھی برباد کر دی۔ ان کے قویٰ غیر معمولی طور پر اچھے تھے جو وہ اتنے سال بھی یہ سب جھیل گئیں۔ دوسری عورت دو چار سال بھی زندہ نہ رہ سکتی۔ پرتاب! تم تو اپنی غلطیوں کا کفارہ تو ان کی بیماری میں نے کر دیا، مگر تم خدا کو کیا مُنہ دکھاؤ گے؟

پرتاب سر جھکائے ڈاکٹر کی لعن طعن سُن رہا تھا۔ اس کا چہرہ کبھی سُرخ ہو جاتا اور کبھی زرد۔ آنکھیں غیر معمولی انہماک سے ایک طرف جمی ہوئی تھیں اور گذشتہ بیس سالہ زندگی کے واقعات متحرک تصویروں کی طرح اس کے دماغ کے پردوں پر اُبھر رہے تھے۔

نرم و گداز بستر پر موہنی بے سدھ پڑی ہوئی ہے۔ اس کا سُرخ و سفید رنگ بالکل زرد پڑ گیا ہے۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جو کبھی چشم آہو کو شرماتی تھیں، گہرے گہرے گڈھوں اور سیاہ حلقوں سے گھری ہوئی ہیں، لمبے لمبے سیاہ بال ماتھے اور تکیے پر پریشان ہیں۔ اس کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت

ہاتھ اور پاؤں جو موزونیت میں بے مثل تھے، سب سوج کر ڈبل روٹی کی طرح ہو رہے ہیں اور شیشے کی طرح چمک رہے ہیں۔ چہرے پر بھی ورم ہے۔ باقی تمام جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا ہوا ہے۔ پہلی نظر میں دیکھنے والے کا دل کانپ اٹھتا ہے۔ اور وہ ایک قسم کی وحشت سی محسوس کرتا ہے لیکن ذرا غور سے دیکھنے پر صاف معلوم ہوتا ہے کہ کھال اور ہڈیوں کا یہ پنجر کبھی حسن اور موزونیت کا مکمل نمونہ ہو گا۔ اس کی صورت "آثار پدید است صنادید عجم را" کا عبرت ناک مرقع ہے۔

پریم اور سوہنی ماں کے پلنگ کے پاس تصویر کی طرح خاموش بیٹھے اس کی صورت ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ایک طرف ہمرسہ فی سر جھکائے بیٹھی ہے۔ موہن بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا ہے۔ موہنی کے سرہانے نرس ہاتھ میں انجکشن کی خالی پچکاری لئے کھڑی ہے۔ ڈاکٹر شہاب موہنی کی سوکھی اور زرد کلائی اپنے مضبوط اور طاقت ور ہاتھ میں تھامے نبض پر انگلیاں رکھے اس کی طرف جھکا ہوا کھڑا ہے ——— ایک منٹ ——— دو ——— تین ——— چار ——— پانچ ——— دس ——— بیس ——— منٹ گزر گئے کمرے میں ہر شخص کی نظریں ڈاکٹر کے چہرے پر جمی تھیں۔ آخر ڈاکٹر نے آہستہ سے موہنی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے سے قدرے اطمینان ظاہر ہوتا تھا۔ موہن کی طرف دیکھ کر "مسٹر موہن! مسز پرتاب کی نبض اب بہتر حالت میں ہے کچھ دیر میں انہیں ہوش آجائے گا۔"

سوہنی اور پریم کے چہرے کھل گئے۔ "سچ ڈاکٹر صاحب!"

"ہاں امید تو یہی ہے۔"

بیس مجلس منٹ اور گزر گئے۔ موہنی کی پلکوں میں ہلکی سی جنبش پیدا ہوئی۔ ڈاکٹر نے منہ پر انگلی رکھ کر کمرے کے بے چین لوگوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا آہستہ آہستہ موہنی نے آنکھیں کھولیں اور نحیف نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ بچوں پر جا کر اس کی نظریں جم گئیں۔ لب ہلے ——— بہت خفیف سی جنبش ہوئی ——— کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہا ہے ——— ڈاکٹر نے اپنا کان اس کے لبوں پر لگا دیا "سوہنی . . . پریم . . . . بلاؤ"

ڈاکٹر شہاب نے دونوں بچوں کو، جو اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے دبائے ضبط گریہ کی انتہائی کوشش کر رہے تھے، اشارہ کیا ——— وہ جلدی سے ماں کے قریب آئے۔ موہنی کی آنکھوں سے دو قطرے ادھر ادھر گرے۔ کمزور آواز نکلی "میرے بچے!"

دونوں نے اپنے سر ماں کے سینے پر جھکا دیئے۔ آنکھوں سے دریا امنڈ آیا۔ ماں نے اپنا ہاتھ بڑی کوشش سے اٹھا کر بچوں کے سر پر رکھا۔ کچھ دیر یونہی گزری۔ یکایک موہنی نے نسبتاً بلند آواز سے کہا "پریم ——— موہن بھیا کو ——— تار دے کر ——— بلا دو" موہن بیقرار ہو کر آگے بڑھا اور بہن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "موہنی۔ موہنی۔ میری پیاری بہن۔ میں تمہارے پاس موجود ہوں" اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔ فرط گریہ سے آواز رک گئی۔ موہنی نے بھائی کی طرف نظریں پھیریں۔ چہرے پر کچھ آثار زندگی ہویدا ہوئے رک رک کر بولی "بھیا تم آ گئے ہاں اب میں اطمینان سے مروں گی" ڈاکٹر نے اتنے میں دوسرا انجکشن تیار کر لیا تھا وہ موہنی کے بازو میں لگایا اور سب سے کہا "آپ لوگ باہر جائیے۔ ان کو آرام کرنے دیجئے۔ اب بیہوشی نہ ہو گی بلکہ نیند آئے گی۔" نرس نے پردے گرا دیئے۔ موہنی نے نقاہت سے آنکھیں بند کر لیں۔

باہر نکل کر دونوں بہن بھائی کرنل شہاب سے لپٹ گئے "ڈاکٹر صاحب ڈاکٹر صاحب، ممی اب اچھی ہو گئیں؟ اب کوئی خطرہ تو باقی نہیں؟ ایشور نے ہماری دعائیں سن لیں!" خوشی کے مارے پورے جملے ان کے منہ سے نہیں نکل رہے تھے۔ موہن نے بھی سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر نے اطمینان سے اپنا سر ہلایا "میں سمجھتا ہوں خطرہ اس وقت ٹل گیا ہے" سوہنی نے پریم کا ہاتھ پکڑا "بھیا پاپا کو فون

کرکے خوشخبری سنائیں" دونوں خوشی سے ناچتے ہوئے چلے۔ پیچھے پیچھے موہنی کا کتا ہیرا دم ہلا ہلا کر اظہار خوشی کرتا ہوا جا رہا تھا۔

آج موہنی کی حالت نسبتاً اچھی ہے۔ اس نے سفید کپڑے پہنے ہیں سر گندھوایا ہے اور تکیوں کے سہارے نیم دراز ہے۔ اس کے ملنے والے اور دوست ڈاکٹر کی اجازت سے دو دو منٹ کے لئے اس کے پاس آکر مزاج پرسی کر جاتے ہیں۔ وہ مسکرا کر ان سے دو ایک باتیں کرتی ہے۔ سارا گھر خوش و خرم ہے کہ وہ اب اچھی ہو رہی ہے۔
جب سب ملنے والے جا چکے تو موہنی نے بھائی کو بلا کر کہا "بھیا میرے دونوں بچوں اور بھابی کو بلا لو۔ آج میں تم سب سے دل کھول کر باتیں کروں گی۔" موہن نے ڈاکٹر شہاب کی طرف دیکھا جو ابھی تھوڑی دیر ہوئی اپنی مریضہ کو دیکھنے آئے تھے "ایسا نہ ہو کمزوری ہو جائے" موہنی نے آزردگی سے کہا "کچھ ہو مجھے آج ان سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ معلوم نہیں پھر موقع ملے یا نہ ملے" ڈاکٹر شہاب نے کہا "آپ ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کرتی ہیں۔ اب آپ رو بصحت ہیں مگر آپ کی مکمل صحت کے لئے سب سے لازمی چیز یہ ہے کہ آپ خود ہمت اور پوری قوت ارادی سے کام لے کر دل میں یہ بات بٹھا لیں کہ میں ضرور اچھی ہو کر رہوں گی۔"
موہنی نے ڈاکٹر کی طرف تیز نظروں سے دیکھا "ڈاکٹر صاحب آپ مجھے ——— مریض کو دھوکا دیتے ہیں ——— مجھ سے زیادہ کون یہ جان سکتا ہے کہ میں اچھی ہوں گی یا نہیں ——— یہ صحت نہیں سنبھالا ہے۔ ذرا میری طرف دیکھ کر کہئے۔ کہ میری حالت اچھا ہونے کی ہے؟" ڈاکٹر شہاب نے سر جھکا لیا اور کھڑکی کے پاس جا کر باہر کی طرف دیکھنے لگے۔
موہن، سوہنی، پریم اور سرسوتی کو بلا لایا۔ چند منٹ بعد پرتاب بھی کمرے میں داخل ہوا اور موہنی کی مزاج پرسی کی۔ موہنی نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر بعد موہن سے بولی "تم سب میرے قریب آجاؤ تاکہ میری آواز اچھی طرح سن سکو۔ ڈاکٹر صاحب آپ یہیں رہیئے۔ آپ سے کیا پردہ ہے۔ ہاں سسٹر دنرس، تم کچھ دیر کو باہر چلی جاؤ" نرس باہر چلی گئی۔ باقی سب لوگ آکر موہنی کے پلنگ کے قریب بیٹھ گئے صرف پرتاب ذرا سے ہٹ کر آرام کرسی پہ پڑا کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ ڈاکٹر نے انار کا عرق موہنی کو پلایا اور موہنی آہستہ آہستہ رک رک کر کہنے لگی۔

"جانتے ہو میں نے تم سب لوگوں کو کیا کہنے کو بلایا ہے؟ شاید تم سمجھتے ہو کہ میں کچھ وصیت کروں گی۔ نہیں مجھے کوئی وصیت نہیں کرنی۔ میں تو تم لوگوں کو اپنی درد بھری مصیبت کی کہانی کے چند ورق سناؤں گی۔ دنیا ہمیشہ اس دھوکے میں رہی کہ میں بڑی خوش نصیب ہوں، کیوں؟ اس لئے کہ خوبصورت ہوں۔ بال بچے والی ہوں۔ گھر میں روپیہ پیسہ کی ریل پیل ہے۔ نام، عزت، دولت، اولاد، حسن کیا چیز تھی جو میرے گھر میں نہ تھی۔ ایک غریب گھر کی لڑکی کی خوش قسمتی نے اس کے میاں کو معمولی اوورسیر سے ایک لکھ پتی ٹھیکیدار بنا دیا آخر یہ خوش نصیبی نہیں تو کیا ہے؟ مگر آہ کسی کو کیا معلوم، کوئی کیا جانے کہ اس عزت اور دولت کے حصول کی خاطر ایک کمسن شریف لڑکی کی شرافت کا، اس کی نیکی، اس کے ارمان اور آرزوؤں، اس کی محبت اور سکون قلب، اس کی صحت اور خدا جانے کن کن چیزوں کا خون کیا گیا ہے ——— کاش اے کاش مجھے یہ بناوٹی عزت، یہ منحوس دولت نصیب نہ ہوئی ہوتی کاش میں ہمیشہ ایک غریب اوورسیر کی بیوی رہتی۔ ہائے کیا اچھے دن تھے۔ جب میں نے پہلی مرتبہ اپنی سسرال میں قدم رکھا تھا۔ بھیا آپ کو تو یاد ہوگا اس وقت میری عمر کیا ہو گی؟"
"چودہ یا پندرہ برس کی۔"
"تو بھیا پھر آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ شادی کے بعد تین چار سال میں نے کس قدر خوشی اور اطمینان سے گذارے؟ یہ (پرتاب کی طرف اشارہ کرکے) جو اب میری صورت سے بیزار ہیں، اس وقت پروانہ وار مجھ پہ نثار تھے۔ میری ہر خواہش پوری ہوتی۔ دن رات میری دلداری

اور دلجوئی کی جاتی۔ مجھے ایک دیوی کی طرح پوجا جاتا تھا ——— آہ میں اُس وقت انھیں ایک فرشتہ سمجھتی تھی ——— دُنیا کا بہترین انسان تصوّر کرتی تھی! دیوتا جانتی تھی!!! مجھے یہ خبر نہیں تھی کہ اس ملمع کے نیچے کھوٹی چاندی بھی نہیں، سیاہ لوہے کا ٹکڑا ہے ——— ہائے مجھے کیا معلوم تھا کہ دیوتا کے بھیس میں شیطان ہے!!

پریم اور سوہنی نے حیرت اور خوف سے ماں باپ کو اور پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ سرسوتی نے پرتاب پر جو خاموش سر جھکائے بیٹھا تھا نظر کی نظر ڈالی۔ موہن نے بہن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ملائمت سے کہا "موہنی بہن جانی ذرا اشاروں سے کام لو۔" سرسوتی نے آنسو بھری آنکھیں بھائی کی طرف اُٹھائیں "بھیا سولہ سترہ برس سے میں یہ سب مصیبتیں سہہ رہی ہوں اور کبھی کسی کے سامنے اُف نہیں کی۔ کون سا الزام انھوں نے مجھ پر نہیں لگایا۔ کیا کچھ جسمانی تکلیف اور روحانی اذیت میں نے نہیں اُٹھائی۔ پر اپنا حال لوگوں پہ کھلنے نہ دیا ——— خصوصاً اپنے میکے والوں پہ کبھی اپنے مصائب کا اظہار نہ کیا۔ کیا اب آخری وقت میں بھی تم مجھے دل کی بھڑاس نہ نکالنے دوگے۔ میں نہیں چاہتی کہ ساری دُنیا کی طرح میرے بھائی بھاوج اور میری اولاد بھی مجھے مجرم گنہگار اور پاپا سمجھیں۔ میں گنہگار ضرور ہوں، بہت ہوں مگر اتنی نہیں جتنی دنیا نے اور اس شخص نے مجھے مشہور کر رکھا ہے۔" تھوڑی دیر دم لینے کے بعد پھر اس نے کہنا شروع کیا:۔

"میں سترہ یا اٹھارہ برس کی تھی جب تم پریم بیٹا تم پیدا ہوئے۔ میری اس وقت کی خوشی کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ میں سچ مچ اپنے کو دُنیا کی خوش نصیب ترین عورت سمجھتی تھی۔ تھوڑے دن بعد پرتاب نے نوکری چھوڑ دی۔ ان کا ایک افسر جو اُن پہ بہت مہربان تھا۔ انجنیئر ہو کر اس شہر میں آیا۔ پرتاب کو امید تھی کہ اگر یہاں ٹھیکیداری کی جائے۔ تو انجنیئر صاحب کی عنایت سے خوب چلے گی۔ کچھ روپیہ ہم لوگوں نے کئی سال میں جوڑا تھا، کچھ میرا زیور بیچ کر فراہم کیا۔ افسروں کی سرپرستی سے انھیں حیرت انگیز کامیابی ہوئی اور ہمارے گھر میں دولت کی گنگا بہنے لگی۔ سارا خاندان خوش تھا، دوست احباب خوش تھے، یہ خوش تھے اور خود میں بہت خوش تھی ——— آہ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ خوشی مجھے بہت مہنگی پڑے گی۔ اس پہ عمر بھر خون کے آنسو بہانے پڑیں گے۔ دولت کے ساتھ ساتھ حیثیت بھی بڑھی اور ہم اونچی سوسائٹی میں آنے جانے لگے۔ تعلیم یافتہ مغربیت زدہ عورتوں کے سامنے میں بالکل جاہل گنوار اور بے وقوف معلوم ہوتی تھی۔ مجھے اُن عورتوں کی عادتیں اور طریقے ناپسند تھے۔ دل میں اُن سے نفرت کرتی تھی۔ مگر جب ان کے سامنے جاتی تو اپنے کو کچھ کمتر اور ذلیل سا محسوس کرتی ——— پرتاب نے مجھے انگریزی پڑھانے کا انتظام کیا اور ایک میم خاص اس لئے رکھی کہ مجھے موجودہ تہذیب اور آداب و معاشرت اور "ہائی سوسائٹی" کے "ایٹیکیٹ" کی تعلیم دے۔ بہت جلد یہ سب باتیں میں نے سیکھ لیں۔

ہم لوگ خوب سیر تماشوں میں مصروف رہتے۔ کبھی سینما، کبھی تھیئٹر، کبھی پک نک اور دعوتیں۔ کبھی بال روم میں جا کر تماشا دیکھنا، کبھی کچھ کبھی کچھ۔ اس عرصے میں انھوں نے اپنے خاص خاص دوستوں سے میری ملاقات بھی کرا دی تھی۔ جنھوں نے مجھ سے بڑی عزت اور احترام کا برتاؤ کیا۔ رفتہ رفتہ میں سوسائٹی میں روشناس ہو گئی۔ ہر جگہ میں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی۔ دعوتوں اور تقریبوں میں سب سے پہلے میرا بلاوا آتا ——— ڈراموں میں ہیروئن کا پارٹ مجھے ملتا، پارٹیوں میں مرکز نگاہ میں ہی ہوتی ——— ہر روز کہیں نہ کہیں آنے جانے دعوت وغیرہ کا پروگرام بنایا جاتا۔ میری گھریلو زندگی روز بروز ختم ہونے لگی۔ اور میں اپنے گھر سے بیگانہ ہوتی گئی ——— گھر کا انتظام اور خرچ باورچی اور بیرے وغیرہ کے ہاتھ میں تھا۔ جن عورتوں سے میں نفرت کرتی تھی اب خود بھی ان کے رنگ میں رنگی جا رہی تھی

دو تین سال بعد سوہنی تم پیدا ہوئیں۔ کئی مہینے بیماری کے سبب مجھے بستر پہ پڑا رہنا پڑا۔ اس زمانے میں۔ میں نے محسوس کیا کہ پرتاب میری بیماری سے پریشان نہیں بلکہ بیزار سے ہیں۔ در اصل گذشتہ کئی سال ہر وقت اس قدر مصروفیت اور کھیل تماشوں میں بسر ہوئے تھے۔ کہ مجھے اپنے بارے میں سوچنے یا پرتاب کے طرزِ عمل پر غور کرنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ اب میں نے دیکھا کہ وہ اپنا تقریباً تمام وقت گھر سے باہر گزارتے ہیں۔

بھی زروتی تو خفا ہوتے کہ میری نیند خراب ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنا سونے کا کمرہ الگ کر لیا اور کہا آج کل یہی فیشن ہے کہ میاں بیوی کا بیڈ روم بھی الگ الگ ہو۔ یہ پہلا صدمہ تھا جو مجھے پہنچا مگر میں نے ایک لفظ منہ سے نہیں نکالا۔ بچوں کے لئے آیائیں اور گورنس رکھ دی گئی اور مجھے حکم ملا کہ ان کے کمرے بھی الگ کر دو۔ خیر چند مہینے بعد میں اچھی ہو گئی۔ کچھ دن بعد ایک پارٹی میں چیف انجنیئر صاحب نے مجھے اپنے ہاں مدعو کیا۔ پرتاب کا اصرار تھا کہ ضرور جاؤ بہر حال میں گئی۔ میں اس شخص کی دوستی سے بچنا چاہتی تھی کیونکہ مجھے وہ کچھ اچھا آدمی معلوم نہ ہوتا تھا۔ وہ میری حد سے زیادہ تعریف اور بے حد خاطر مدارات کرتا اور ان کی طرف رخ بھی نہ کرتا۔ یہ چیز مجھے کھٹکتی تھی اور ناگوار گزرتی تھی۔ مگر پرتاب اس کی بہت تعریف کرتے اور اس سے تعلقات بڑھانے پر زور دیتے۔ کیوں؟ تاکہ ان کا فائدہ ہو۔ اور انھیں اور زیادہ بڑے بڑے ٹھیکے ملیں۔ پہلی مرتبہ میرے دل میں پرتاب کی طرف سے نفرت کا جذبہ پیدا ہوا کہ یہ شخص اس قدر بے غیرت اور خود غرض ہے کہ غیر لوگوں سے بیوی کی دوستی کراتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ ان سے اسے کوئی عقیدت ہے یا ان کے اخلاق و عادات سے بہت متاثر ہے بلکہ محض اس لئے کہ وہ اور زیادہ دولت سمیٹ سکے۔ اسے جائز یا ناجائز ہر طریقے سے لاکھوں کے ٹھیکے ملیں۔ خواہ اس کے لئے بیوی کو بدچلن مردوں سے دوستی ہی کیوں نہ کرنی پڑے ـــ"

موہنی نے تھک کر آنکھیں بند کر لیں۔ موتی نے تھوڑا سا انگور کا عرق اسے پلایا۔ اور زائد تکئے ہٹا کر آرام سے لٹا دیا۔

"ان کی دولت روز بروز بڑھنے لگی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ طبیعت بھی بدلتی گئی۔ راتوں کو غائب رہتے۔ مجھ سے بے اعتنائی برتتے۔ مزاج میں بھی سختی آ گئی تھی۔ صرف سوشل موقعوں پر مجھ سے اظہارِ محبت اور خصوصیت ظاہر کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے مجھے ان سے بالکل متنفر کر دیا۔ ڈاکٹر آپ تو جانتے ہیں وہ واقعہ کیا تھا؟ نہیں میں خود بتاتی ہوں! انھوں نے ایک بے تکلف پارٹی میں مجھے جبراً شراب پلائی۔ میں اس کی تفصیل نہیں بتاؤں گی ـــ۔ مجھ میں اتنی طاقت اور برداشت نہیں ـــ انھیں اس زمانے میں کسی بہت بڑے ٹھیکے کی فکر تھی اور انھوں نے اپنے خیال میں چیف انجنیئر کو خوش کرنے کے لئے یہ حرکت کی تھی۔ اس دن سے ہمارے تعلقات اور بھی زیادہ کشیدہ ہو گئے۔ یہ روز بروز آزاد اور لاپروا ہوتے گئے۔ میں نے دو ایک مرتبہ شکایت کی تو مجھے سخت سست کہا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ مجھ پر بہت شرمناک الزام لگایا۔ میں غصے میں آپے سے باہر ہو گئی اور برس پڑی۔ انھوں نے بھی کسر نہیں چھوڑی۔ مارنے تک سے دریغ نہیں کیا۔ اس کے بعد سے مجھے ان کی صورت سے دلی نفرت ہو گئی۔ انھوں نے مجھ پر کڑی نگرانی رکھنا شروع کر دی۔ صرف اس پارٹی اور جلسے میں مجھے جانے کی اجازت تھی جس میں یہ خود بھی جائیں۔ یہی حال تفریح اور سینما وغیرہ کا تھا۔ اگر کبھی ملنے والی عورتوں سے یا عزیزوں سے بھی ملاقات کو جاتی تو دو تین نوکر خفیہ پولیس کی طرح میری نگرانی کے لئے ساتھ رہتے تھے۔ دفتر سے دس مرتبہ فون آتا کہ میں گھر پر ہوں یا نہیں۔ میری ذلت کی انتہا ہو چکی تھی۔ دن رات کی کوفت اور روحانی اذیت نے میری صحت پر برا اثر ڈالا۔ اور اس پر طرہ یہ ہوا، مجھے کہتے بھی لاج آتی ہے ـــ ڈاکٹر صاحب آپ تو جانتے ہی ہیں؟ جب کبھی بچہ ہونے والا ہوتا زبردستی دوائیں پلا کر اور انجکشن لگوا کر اسے ضائع کر دیا جاتا۔ اس طرح پانچ مرتبہ ہوا! صحت اور بھی بدتر ہو گئی۔ شراب کی لت تو یہ لگا ہی چکے تھے۔ اب میں اپنا غم غلط کرنے کو باقاعدہ شراب پینے لگی۔ اگرچہ یہ خود بھی پیتے تھے۔ اور خود ہی اس منحوس شے کو مجھے زبردستی کر کر کے پلایا کرتے تھے، مگر پھر اس کو بھی ملامت اور طعن کرنے لگے۔ میں ضد میں اگر اور زیادہ پیتی۔ مجھے اندر ہی اندر یہ گھن کھائے جاتا تھا کہ اس شخص نے جسے میں اپنا دین، اپنا ایمان، اپنی جان، اپنا دیوتا، اپنا سب کچھ سمجھتی تھی اس نے میری غیرت پر، میری وفاداری پر شک کیا اور مجھ پر اتنا بڑا شرمناک الزام لگایا۔"

موہنی کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ پرتاب جو اب تک بالکل خاموش بیٹھا تھا آگے بڑھا اور موہنی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "موہنی ـــ آج مجھے سچ سچ بتا دو۔ کیا میں غلطی پر تھا اور میری بدگمانی بالکل بے بنیاد تھی ـــ یا اس میں کچھ سچائی بھی تھی؟" موہنی نے بیباکی سے پرتاب کی نظروں کا مقابلہ کیا "میں آخری وقت میں جب کہ پرمیشور کے سامنے جانے کو تیار ہوں ہرگز جھوٹ نہ بولوں گی ـــ قسم

نے مجھ ناسمجھ کم عمر لڑکی کو یہ آزادی کی راہ دکھائی اور اپنی اس ذلیل سوسائٹی سے روشناس کرایا —— میں کچی لکڑی تھی جس طرف جھکایا جھک گئی۔ بیشک میں لوگوں سے ہنستی بولتی تھی۔ مذاق دل لگی کرتی تھی۔ اس میں بھی شک نہیں کہ جب لوگ میرے حسن وجمال کی تعریفیں کرتے تو مجھے سرور سا حاصل ہوتا —— لوگوں کے اشارے کنایوں میں اظہارِ الفت کو میں قہقہوں میں ٹال دیتی۔ میں نے شراب بھی پی —— تمہارے مجبور کرنے پر ڈانس بھی کیا —— لیکن پھر بھی —— میں پاک —— باعصمت ہوں۔ میں جھوٹ نہ بولوں گی۔ چیف انجنیئر مجھ سے اکثر اشارے کنایوں میں اظہارِ الفت کرتا تھا۔ مگر میں مذاق میں اڑا دیتی —— ایک مرتبہ اس نے مجھ سے صاف صاف اظہارِ محبت کیا۔ مگر میں نے اسے ایسی ڈانٹ پلائی —— اتنی غیرت دلائی —— اس قدر شرمندہ کیا کہ وہ رونے لگا۔ مجھ سے معافی مانگی اور تب سے آج تک —— اس نے مجھے اپنی چھوٹی بہن سمجھا اور ہمیشہ محبت اور احترام کا برتاؤ کیا —— بیشک وہ شریف آدمی ہے اور تم۔ . . تم . . نہایت ذلیل —— کم ظرف —— بدباطن —— بدگمان —— جاؤ —— جاؤ۔ ایشور کے لئے یہاں سے چلے جاؤ —— میری آنکھوں کے سامنے سے دفع ہو جاؤ —— تم نے خود بدکاریاں کیں اور اپنی بے گناہ بیوی پر الزام لگائے —— تمام دُنیا میں بدنام کیا —— میرے بچوں کو مجھ سے جُدا کر کے دُور دُور پڑھنے بھیج دیا کہ وہ ماں کی بُری عادتیں سیکھیں گے . . . . . . ان تک کے سامنے مجھے ذلیل کیا —— چلے جاؤ —— یہاں سے چلے جاؤ —— مجھے تم سے نفرت ہے ——"

موہنی کا سر پیچھے کی طرف گر پڑا۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ پریم سر جھکائے بیٹھا رہا۔ سوہنی ہچکیوں سے روتی رہی۔ موہن کا چہرہ رنج اور غصے کو ضبط کرنے کی کوشش میں کبھی سُرخ ہو جاتا کبھی زرد اور کبھی سفید۔ پرتاب تیزی سے باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر شہاب نے نرس کو بلایا دونوں نے مل کر خدا جانے کیا کیا تدبیریں کیں انجکشن دیئے دوائیں مُنہ میں ڈالیں تب کہیں گھنٹہ بھر بعد میں موہنی ہوش میں آئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ پریم اور سوہنی کو اشارے سے قریب بلایا اور گلے سے لگایا۔ اور آہستہ آہستہ کہنے لگی "میرے بچو . . . . تمہاری ماں گنہگار ہے۔ تم اس کی مکتی کے لئے ایشور سے پرارتھنا کرتے رہنا . . . . اور . . . . اس کی ناکام و نامراد زندگی سے سبق لینا۔ دُنیا کی جاہ و منزلت —— عزت اور دولت کی خواہش سے کبھی مغلوب نہ ہونا —— ہمیشہ اپنی ماں اور باپ کی ناکام زندگی کی مثال پیشِ نظر رکھنا۔ سچی خوشی دولت سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ سچی محبت اور اعتبار سے، قناعت اور خدمتِ خلق سے حاصل ہوتی ہے۔" اس کی آواز دھیمی ہوتی جا رہی تھی "دُنیا میں جو بھی گنہگار ہوں —— ایشور سے میرے لئے دعائیں کرتے رہنا —— اور دیکھنا میرے بچوں کا خیال رکھنا —— یہ بھی میری طرح تباہ نہ ہو جائیں" موہن سے ضبط نہ ہو سکا۔ بہن کی پٹی پر سر رکھ کر زار و قطار رونے لگا۔ ڈاکٹر شہاب بہت پریشان، کبھی موہنی کی نبض دیکھتے، کبھی سانس کی رفتار گنتے کبھی انجکشن دیتے اور پاؤں کے پاس گرم پانی کی بوتلیں رکھتے تھے۔ موہنی کا چہرہ لحظہ بہ لحظہ زرد ہوتا جا رہا تھا اور اس پر ایک خود فراموشی کی سی کیفیت طاری تھی . . . اُس نے آنکھیں کھولیں کہ ادھر اُدھر دیکھا، بہت نحیف آواز میں کہا "پرتاب کو بلاؤ —— میں آخری دفعہ انھیں دیکھنا چاہتی ہوں" سوہنی جا کر پرتاب کو بلا لائی۔ اس کی آنکھیں ستوچی ہوئی تھیں اور بال پریشان تھے۔ کمرے میں موت کا سا سکوت چھایا ہوا تھا جو کبھی کبھی سوہنی کی ہچکیوں سے ٹوٹ جاتا تھا۔ پرتاب نے جھک کر اپنا ہاتھ موہنی کے ماتھے پر رکھا —— اس کی آنکھیں بند تھیں ہونٹ ہل رہے تھے —— پرتاب نے اپنا کان اس کے لبوں سے ملا دیا ——

"میں نے —— معاف کیا —— معاف کر دیا —— مجھے اب بھی —— ہاں —— اب بھی ان سے —— محبت —— ہے —— ایشور —— میرے گناہ —— بخش دے —— شاید" پرتاب لڑکھڑا کر زمین پر بیٹھ گیا اور بے تاب ہو کر چیخ اٹھا۔ "موہنی —— میری مظلوم موہنی —— تم بے قصور ہو —— تم بے گناہ ہو —— میں نے تم پر بے جا شک کیا۔ خواہ مخواہ الزام دیا —— میں گنہگار ہوں —— بدکار ہوں —— آہ موہنی تو دیوی ہے . . ." موہنی نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس کی بڑی

بڑی آنکھیں پوری کھلی ہوئی اس وقت بہت بھیانک معلوم ہو رہی تھیں ــــ ان ہی سے موت جھانک رہی تھی! اس نے پرتاب کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں ــــ لبوں پر خفیف سا تبسم نمودار ہوا اور ایک نامعلوم سی آواز منہ سے نکلی "اب میں شانتی سے مروں گی ــــ ایشور ــــ مجھے ــــ معاف ــــ"

ڈاکٹر نے ہلکے سے موہنی کی کھلی ہوئی آنکھیں اپنے ہاتھ سے بند کر دیں۔ جن سے آنسوؤں کے دو قطرے اِدھر اُدھر ٹپک پڑے ــــ ڈاکٹر نے چادر سے موہنی کا منہ ڈھک دیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے ــــ سارا گھر شور و شیون کی آواز سے گونج اُٹھا

نقوش

افسانہ نمبر

سجاد ظہیر کا افسانہ "نیند نہیں آتی" قابلِ اعتراض مواد کی وجہ سے حذف کردیا گیا ہے

ترتیب

جلد دوم

تیسرا دور

(انگارے کے افسانے)

۱- نیند نہیں آتی	سجاد ظہیر ، ۴۶۲
۲- مہاوٹوں کی ایک رات	احمد علی ، ۴۶۷
۳- دلی کی سیر	رشید جہاں ، ۴۷۱
۴- جوانمردی	محمود الظفر ، ۴۷۳

چوتھا دور

۵- زندگی کے موڑ پر	کرشن چندر ، ۴۷۸
۶- نیا قانون	سعادت حسن منٹو ، ۵۰۱
۷- گرہن	راجندر سنگھ بیدی ، ۵۰۸
۸- چوتھی کا جوڑا	عصمت چغتائی ، ۵۱۴
۹- ہماری گلی	احمد علی ، ۵۲۳
۱۰- آنندی	غلام عباس ، ۵۳۲
۱۱- پرمیشر سنگھ	احمد ندیم قاسمی ، ۵۴۱
۱۲- آپا	ممتاز مفتی ، ۵۵۳
۱۳- زعفران کے پھول	خواجہ احمد عباس ، ۵۶۱
۱۴- مجھے جانے دو	اختر حسین رائے پوری ، ۵۶۹
۱۵- حجاموں کی یونین	ملک راج آنند ، ۵۷۴
۱۶- نئی مصیبتیں	رشید جہاں ، ۵۸۱
۱۷- حرامجادی	حسن عسکری ، ۵۸۵
۱۸- زریں تاج	عزیز احمد ، ۵۹۶
۱۹- آخری کوشش	حیات اللہ انصاری ، ۶۰۹

۲۰- بینگن کا پودا	اوپندر ناتھ اشک، ۶۲۶
۲۱- لال دھرتی	دیوندر ستیارتھی، ۶۳۰
۲۲- کلیاں اور کانٹے	اختر اورینوی،
۲۳- جگا	بلونت سنگھ، ۶۵۸
۲۴- بھالو	ہاجرہ مسرور، ۶۷۲
۲۵- خون	انور، ۶۷۸
۲۶- جلا وطن	قرۃ العین حیدر، ۶۸۷
۲۷- بینوں لے چلے بابلا لے چلے وے	خدیجہ مستور، ۷۱۴
۲۸- جینی	شفیق الرحمٰن، ۷۱۸
۲۹- آئینہ	ممتاز شیریں، ۷۴۵
۳۰- زرد چہرے	ابراہیم جلیس، ۷۵۹
۳۱- سردار جسونت سنگھ	قدرت اللہ شہاب، ۷۶۵
۳۲- ٹوٹ گیا اک تارا	تسلیم سلیم چھتاری، ۷۷۳
۳۳- سمندر اور زمین کرے	مادھو سودن، ۷۹۲
۳۴- کلوا	سید رفیق حسین، ۸۰۸
۳۵- سرگذشت	ابوالفضل صدیقی، ۸۱۵
۳۶- جہاں میں رہتا ہوں	مہندر ناتھ، ۸۳۰
۳۷- آب حیات	راماننّد ساگر، ۸۴۲
۳۸- باجی ولایت	آغا بابر، ۸۵۰
۳۹- آنکھ مچولی	شکیلہ اختر، ۸۵۹
۴۰- اب اور تب	ہنس راج رہبر، ۸۶۴
۴۱- روپ چند	صدیقہ بیگم سیوہاروی، ۸۷۰
۴۲- تجاوز	عبدالرحمٰن چغتائی، ۸۷۶

پانچواں دور

۴۳- گڈریا	اشفاق احمد، ۸۸۴
۴۴- راون کے دیس میں	اے حمید، ۹۰۹
۴۵- تیسرا آدمی	شوکت صدیقی، ۹۲۲
۴۶- اجودھیا	انتظار حسین، ۹۳۸
۴۷- سمجھوتہ	پرکاش پنڈت، ۹۴۵
۴۸- چاند بجھ گیا	سرلا دیوی، ۹۵۳
۴۹- موم کی مریم	جیلانی بانو، ۹۵۷
۵۰- لڑھکتی چٹان	انور عظیم، ۹۶۶

مقالات

۵۱- داستان سے افسانے تک	سید وقار عظیم، ۹۸۰
۵۲- مختصر افسانے کا فن	عبادت بریلوی، ۹۹۳
۵۳- مغربی افسانہ کا اثر اُردو افسانہ پر	ممتاز شیریں،
۵۴- اُردو افسانے کا مستقبل	محمد حسن عسکری،
۵۵- اُردو افسانے میں روایت اور تجربے	(مذاکرہ)

احمد علی

مہاوٹوں کی ایک رات

گڑ! گڑ! گڑ ڑ ڑ! الٰہی خیر! معلوم ہوتا ہے کہ آسمان ٹوٹ پڑے گا۔ کہیں چھت تو نہیں گر رہی! گڑ ڑ ڑ ڑ!
اس کے ساتھ ہی ٹوٹے ہوئے کواڑوں کی جھریاں ایک تڑپتی ہوئی روشنی سے چمک اُٹھیں۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے نے ساری عمارت کو ہلا ڈالا۔ شُوشُوشُو ووو! کیا سردی ہے! یخ جمی جاتی ہے، برف جمی جاتی ہے۔ کپکپی ہے کہ سارے جسم کو توڑے ڈالتی ہے۔

ایک چھوٹا سا مکان ۴×۴ فٹ اور اس میں بھی آدھے سے زیادہ میں ایک تنگ دالان اور اس کے پیچھے ایک پتلا سا کمرہ، نیچا اور اندھیرا۔ کوئی فرش تک نہیں۔ کچھ پھٹے پرانے بوریئے اور ٹاٹ زمین پر بچھے ہیں جو گرد اور سیل سے چپ چپ کر رہے ہیں۔ کونوں میں بغچیوں اور گودڑ کا ڈھیر ہے۔ ایک اکیلا کاٹ کا ٹوٹا ہوا صندوق۔ اس پر بھی مٹی کے برتن جو سالہا سال کے استعمال سے کالے ہو گئے ہیں اور ٹوٹتے ٹوٹتے آدھے پونے رہ گئے ہیں۔ ان میں ایک تانبے کی پتیلی بھی ہے۔ کنارے جھڑ چکے ہیں! برسوں سے قلعی تک نہیں ہوئی! گھستے گھستے بلند اجواب دینے کے قریب ہے۔

چھت ہے کہ کڑیاں رہ گئی ہیں۔ اور اس پر بارش! یا اللہ کیا مہاوٹیں اب کے ایسی برسیں گی کہ گویا ان کو پھر برسنا ہی نہیں؟ اب تو روک دو! کہاں جاؤں، کیا کروں؟ اس سے تو موت ہی آ جائے۔ تو نے غریب ہی کیوں بنایا؟ یا اچھے دن ہی نہ دکھائے ہوتے۔ بایہ حالت ہے کہ لیٹنے کو جگہ نہیں۔ چھت چھلنی کی طرح ٹپکے جاتی ہے۔ بیّ کے بچّوں کی طرح سب کونے جھانک لئے۔ لیکن چلیں کہاں؟ میرا تو خیر کچھ نہیں، ان بچّوں نگوڑے ماروں کی مصیبت ہے۔ نہ معلوم سو بھی کیسے گئے ہیں۔ سردی ہے کہ اُف! بوٹی بوٹی کانپی جاتی ہے! اور اس پر ایک لحاف، اور چار جانیں! اے میرے اللہ ذرا تو رحم کر! یا وہ زمانہ تھا کہ محل تھے، نوکر تھے، فرش اور پلنگ تھے۔ آہ وہ میرا کمرہ! ایک چھپر کھٹ سنہری پردوں سے زرق برق، مخمل کی چادریں اور سینبل کے تکیے۔ کیا نرم نرم توشک تھی کہ بیٹھنے سے نیند آ جائے۔ اور لحاف؟ آہ! ریشمیں چھینٹ کا، اور اس پر سچے پٹھے کی گوٹ۔ انائیں، مامائیں کھڑی ہیں۔ بیوی سر دباؤں؟ بیگم پیر دباؤں؟ کوئی تیل ڈال رہی

ہے، کوئی ہاتھ مل رہی ہے۔ گڈ گڈا گڈ گڈا بسنز، اُوپر سے یہ سب چونچلے، ملیدہ ہے کہ کہکشانی کپڑے پہنے سامنے کھڑی ہے ...... سبز شیشوں پہ نیلے اور سُرخ اور نارنجی عکس، بڑے بڑے ہشت پہل جواہرات کے سالبوت ڈبے جگمگ جگمگ کر رہے ہیں۔ دسترخوان پہ چاندی کی طشتریاں، ایک جھلملاہٹ، قورما، پلاؤ، بریانی، متنجن، باقرخانیاں، میٹھے ٹکڑے .. .. ایک باغ درختوں سے گھرا ہوا۔ جن کے کاہی پتیوں پہ تاروں کی چمک شبنم میں اور تارے چمکا رہی ہے۔ واہ! واہ! کیا کیا خوش نما پھل ہیں۔ آم، منہ لال کلیجہ بالی ماں کا بغدادی بچہ۔ سیب کیسے خوبصورت ہیں۔ اندھیرے اندھیرے درختوں میں سُرخ اور گلابی اور پستئی جھلکے ہوتے ہیں، ڈالیوں سمیت جھکے ہوئے ہیں۔ ارے بیر تو دیکھو! کیسے موٹے موٹے اور عنابی ہیں، گنور[1] کے سے ہیں۔ ایک نہر، اندھیری رات میں چاندی کی چادر بچھی ہوئی ہے، شاید دودھ ہے۔ کہیں جنت تو نہیں؟ ایک کشتی بڑی آہستگی سے، بطخوں کی نزاکت سے بہتی ہوئی۔ جلدی آؤ، جلدی بیٹھ جاؤ، بہشت کی سیر کرائیں، کیا بیویاں ہیں، پاک صاف، بلور جیسی گوری؟ اُجلے براق کپڑے، نزاکت ایسی جیسی ہوا کی۔ کشتی بہتے ہوئے چراغ کی طرح پانی پر چلی جا رہی ہے۔ دونوں طرف کھلے کھلے میدان جو ہری ہری دُوب سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ بیچ بیچ میں پھولوں کے رنگین تختے، اور پھلوں کے درخت دکھائی دیتے ہیں۔ جانور چہچہا رہے ہیں، شور مچا رہے ہیں۔ تو کیا یہ جنت ہے؟ کیا ہم جنت میں ہیں؟ ہاں، بہشت، خدا کے نیک اور پیارے بندوں کی جگہ۔ کشتی کچھ چھوٹے چھوٹے سیپ کی طرح چمکدار اور گنبدوں کی طرح گول مکانوں کے سامنے سے گزری۔ کیا خوبصورتی اور کیا چمک ہے! نگاہ تک نہیں ٹھہرتی۔ ٹپکتے تو نہ ہوں گے؟ کیا اِن میں مجھ کو بھی جگہ ملے گی؟ خدا کے نیک اور سچے بندوں کے لئے ہیں، پاک بندوں کے لئے۔ پیٹ میں ایک کھرچن، کلیجہ میں ایک کھچاؤ، انتڑیاں بل کھا رہی ہیں۔ ایسا معلوم ہوا کہ گود میں کسی نے کچھ رکھ دیا۔ یہ ایک موتی کی طرح سفید اور سیب کی طرح بڑا پھل تھا۔ ڈنڈی میں دو ہرے ہرے پتے بھی لگے ہوئے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی ڈال سے توڑا گیا ہو۔ آہا، کیا مزہ ہے! کاش کہ اور ہوتے۔ گود بھری ہوئی تھی۔ کشتی دو پہاڑوں کے بیچ سے گزر رہی تھی۔ ایک موڑ تھا۔ تھوڑی دیر میں جب موڑ ختم ہوا تو یکایک دُور کے ایک اُونچے پہاڑ سے بجلی سے زیادہ تیز روشنی کی لپٹیں آگ کی طرح اُٹھتی ہوئی دکھائی دینے لگیں، آنکھیں چکا چوند ہو کر بند ہو گئیں۔ اندھیرا گھُپ تھا۔ ایک شور کی آواز گرج سے بھی زیادہ تیز آنے لگی۔ صُور پھنک رہا تھا۔ کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ کشتی والی بیویاں اِدھر اُدھر دوڑ رہی تھیں۔ اتنے میں پھر ایک تیز روشنی ہوئی۔ سُورج گر رہا تھا۔ یکایک قریب ہی سے ایک ایسی آواز آئی جیسے کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹ رہا ہو۔ ایک زلزلہ آگیا۔ کشتی اُلٹ گئی، اور سب دریا کے اندر ڈوب رہے تھے ....

گڑڑڑڑ! ٹپ ٹپ کی آواز چاروں طرف سے آرہی تھی۔ اماں! اماں! ابھی کانوں میں سنسناہٹ باقی تھی۔ دل گیند اُچھل رہا تھا۔ کیا ہے بیٹیا، کیا ہے؟ ڈر لگ رہا ہے۔ یہ آواز کاہے کی تھی؟ کچھ نہیں بیٹا گرج ہے۔ تینوں بچے چمٹے ہوئے ایک کونے میں سُکڑے پڑے تھے۔ ٹپکا ان کے لحاف تک پہنچ چکا تھا۔ مریم کی طرف کا کونہ خوب بھیگ گیا تھا۔ بیچاری نے اُٹھ کر بچوں کو اوپر سرکایا۔ اب وہ بالکل دیوار کے برابر پہنچ گئے تھے۔ یا اللہ اگر ٹپکا اسی طرح بڑھتا رہا تو اب کے بھیگنا ہی پڑیگا۔ اماں سردی لگ رہی ہے۔ صدیقہ اُس کے برابر لیٹی ہوئی تھی۔ اُس نے اُس کو چمٹا کے لٹا لیا۔ رُوئی نہیں تو دُوئی ہی سہی۔ اُدھر دونوں لڑکے چمٹے پڑے تھے لپٹے ہوئے، جیسے سانپ درخت سے لپٹ جاتا ہے۔

یا اللہ رحم کر۔ خدا غریبوں کے ساتھ ہوتا ہے، اُن کی مدد کرتا ہے، اُن کی آہ سُن لیتا ہے۔ کیا میں غریب بھی نہیں؟ خدا سُنتا کیوں نہیں؟ ..... کوئی امیر کیوں؟ کوئی غریب کیوں؟ اس کی حکمت ہے۔ اچھی حکمت ہے کوئی جاڑے میں لنڈھیں، بیٹھنے کو

---

[1] دہلی کے قریب ایک قصبہ ہے۔ جہاں کے بیر مشہور ہیں۔

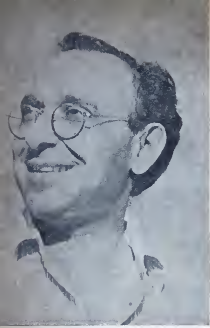

کرشن چندر

راجندر سنگھ بیدی

سعادت حسن منٹو

عصمت چغتائی

قرة العين

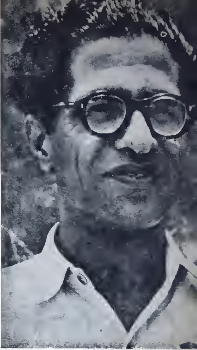

احمد ندیم قاسمی

غلام عباس

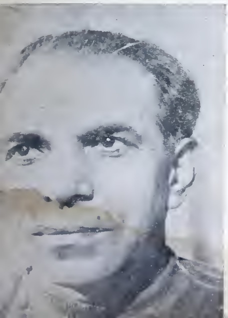

ممتاز مفتی

پلنگ تک نہ ہوں۔ اوڑھنے کو کپڑے تک نہ ہوں۔ سردی کھائیں، بارشیں سہیں، فاقے کریں، اور موت بھی نہ آئے۔ کوئی ہیں کہ لاکھوں والے ہیں، ہر قسم کا سامان ہے، کسی بات کی تکلیف نہیں۔ اگر وہ تھوڑا سا ہم ہی کو دے دیں تو اُن کا کیا جائے گا؟ غریبوں کی جانیں پل جائیں گی۔ لیکن اُن کو کیا پڑی۔ کس کی بکری اور کون ڈالے گھاس۔ ہم کو بنایا کس نے؟ اللہ نے؟ تو پھر ہماری پروا کیوں نہیں کرتا؟ کس لئے بنایا؟ رنج سہنے اور مصیبت اُٹھانے کے لئے؟ ارے کیا انصاف ہے! وہ کیوں امیر ہیں، ہم کیوں نہیں؟ عاقبت میں اس کا بدلہ ملے گا.... ضرورت تو اب ہے، بخار تو اس وقت چڑھا ہوا ہے، اور دوا دس برس بعد ملے گی؟ باز آئے ایسی عاقبت سے جب کی جب بھگت لیتے، اب تو کچھ ہو.. .. اور مذہب ہے کہ وہ بھی یہی سکھاتا ہے، یہی پڑھاتا ہے، پھر کہتے ہیں کہ علم کا خزانہ ہے اور پھر افلاس کا بہانہ ہے" بیوقوفوں کی عقل ہے، آگے بڑھتے ہوؤں کو اوپر چڑھتے ہوؤں کو پیچھے کھینچتا ہے، ترقی کے راستہ میں ایک کاوٹ ہے۔ غریب رہو، غربت ہی میں خدا ملتا ہے۔ ہم نے تو پایا نہیں۔ امیروں سے کیوں نہیں روپیہ دلوا دیتا؟۔ دولت کا کیا ہوگا، صرف اتنا چاہیئے کہ بسر اوقات ہو جائے۔ آخر امیری دولت کا کیا کرتے ہیں؟ تہ خانوں میں پڑی زنگ کھاتی ہے یکسی خرچ کا بھی ٹھیک نہیں جو بے تکے پن سے اُٹھتا ہے، لُٹتا ہے۔ سرکار ہی کچھ کیوں نہیں کرتی؟ اور نہیں تو سب کو برابر روپیہ دلوا دے اور اگر اتنا نہیں تو صرف آدھا ہی ہم کو مل جائے۔ لیکن سرکار کی جوتی کو کیا غرض پڑی جو اپنی جان ہلکان کرے۔ اُس کے تو خزانے پُر ہیں، بیٹھے بٹھلائے روپیہ مل جاتا ہے۔ اُس کو کیا، موت تو ہماری ہے جب پڑے تو جانے، اونٹ جب پہاڑ کے نیچے آتا ہے تو بلبلاتا ہے۔ ابھی تو......

اماں! ہاں بیٹا کیا ہے؟ اماں بھوک لگی ہے۔ **بھوک**! مریم کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی، یا الٰہی کیا کروں! ہائے بیچارے بچے! میاں یہ بھی کوئی بھوک کا وقت ہے؟ بھوک نہ ہوئی دیوانی ہو گئی، سو جاؤ، صبح ہوتے کھانا۔ نہیں اماں میں تو ابھی کھاؤں گا بڑے زور کی بھوک لگی ہے۔ نہیں بیٹا یہ کوئی وقت نہیں، لیٹ جاؤ۔ وہ دیکھو کڑک ہوئی۔ بچہ بیچارہ کڑک کی آواز سنتے ہی سہم کر لیٹ گیا۔ کہاں سے لاؤں؟ کیا کروں؟ بارش نے تو دن بھر نکلنے بھی نہ دیا کہ کسی کے ہاں جاتی اور تھوڑا بہت جو کچھ مل سکتا لا کر سینتی۔ بیچاری فیاض بیگم کے ہاں بھی جانا نہ ہوا، وہ ہی بیچاری بچا کھچا جو کچھ ہوتا ہے برابر دے دیتی ہیں۔ اب جو اگر کل بھی کہیں سے کام نہ ملا تو کیا ہوگا؟ آخر کہاں تک مانگ مانگ کے لاؤں؟ ویسے دیتے بھی لوگ اُکتا جاتے ہوں گے۔

اماں، بھوک لگی ہے۔ دیکھو تو پیٹ خالی پڑا ہے۔ کل دن سے نہیں کھایا اور نیند بالکل نہیں آتی۔ کلیجہ منہ کو آرہا تھا۔ بیچاری آخر کو اُٹھی اور دیئے کی مدھم روشنی میں ٹٹولتی ہوئی صندوق کی طرف گئی کہ اگر کچھ مل جائے تو بچے کو دے۔ آخر تو صرف پانچ برس کی جان ہے! کاش میں نے ان بچوں کو جنا ہی نہ ہوتا، میں تو مر کے کاٹ ہی لیتی، لیکن ان کی تکلیف تو دیکھی نہیں جاتی۔ ایک سوکھی ہوئی روٹی ایک ہنڈیا میں پڑی ہاتھ آگئی۔ اُس کو توڑ کر پانی میں بھگویا اور بچے کے سامنے لا رکھی۔ پیٹ بڑی بری بلا ہے۔ بیچارہ کتے کی طرح جھپٹ گیا، تھوڑی کھانے کے بعد بولا، اماں ذرا سا گڑ ہو تو دے دو۔ مریم پھر کھڑی ہوگئی کہ شاید گڑ کی ڈلی بھی مل جائے۔ اتفاق سے ایک چھوٹی سی ڈلی ہاتھ آگئی۔ بچے نے جو کچھ ہو سکا کھایا۔ دو چار نوالے جو بچے تھے مریم اپنے آپ کو ضبط نہ کر سکی اور تھوڑا تھوڑا کر کے کھا گئی.....

کڑک اور چمک رک چکی تھی۔ بارش بھی کم ہو گئی تھی۔ پھر صدیقہ سے چمٹ کر لیٹ گئی اور اکیلی تھی۔

آہ! کاش کہ وہ ہوتے! آہ وہ ہوتے۔ وہ، وہ، وہ۔ رات کو آئے کچھ نہ کچھ لئے چلے آتے ہیں۔ کیا لائے ہو؟ حلوا سوہن ہے۔ وہ ہی نگوڑا پپڑی کا ہوگا۔ تم جانتے ہو کہ مجھے حبشی حلوہ پسند ہے۔ لو! پھر چیخنے لگیں دیکھا تو ہوتا۔ آہ! وہ جھگڑے اور وہ ملاپ، ساون اور بھادوں کے ملاپ۔ کیا دن تھے۔ اب تو ایک خواب ہیں۔ پھر چاندنی راتوں میں پھول والوں کی سیر۔ آہ! وہ سیجیں۔ کیا مہک تھی دماغ پھٹا جاتا تھا، اور اب تو وہ باسی پھول بھی نہیں، مرجھائے ہوئے پھول بھی نہیں، ہائے کاش وہ ہوتے۔ وہ ٹانگیں، ایک سرسبز درخت

گوشت اور ہڈی اور گودے کا۔ اُس کا رس خون سے زیادہ گرم، اور اُس کی کھال گوشت سے زیادہ نرم۔ ایک تنا سبک اور مضبوط، اور دو ڈالیں، اور دو ڈالیں اور ایک تنا، ایک دوسرے میں پیوند، ایک دوسرے سے چمٹی ہوئی، ایک دوسرے میں ایک دوسرے کی روح، جڑی ہوئی، بل کھائی ہوئی، ایک دوسرے کی جان، اور ایک دوسرے میں ایک تیسری روح کی اُمید، ایک پوری زندگی کا خزانہ؛ ایک لمحہ کا سرمایہ، پُرنیستی میں ہستی کی طاقت۔ آہ! وہ ٹانگیں، وہ ناگ بل کھائے ہوئے اُوس سے بھیگی ہوئی گھاس پر مست پڑے ہیں۔ ایک سوئی کے ناکے میں تاگا اور وہ اُنگلیاں، تیز تیز چلتی ہوئی، سپاٹے بھرتی ہوئی، نرم نرم رونئیں دار مخمل پر گلکاریاں کر رہی ہیں۔ ایک مکڑی اپنی جگہ قائم جالا بُن رہی ہے؛ اُوپر نیچے بل رہی ہے، کچھ خبر نہیں کہ مکھی جال میں پھنس چکی ہے؛ اور لعاب ہے کہ تار بنا جاتا ہے، جال بنا جاتا ہے۔ ایک ڈول کوئیں کی گہرائی میں لٹکا ہوا، نہ تک پہنچا ہوا، اُس کے ملائم ریت کی گرمی محسوس کر رہا ہے؛ پانی کی سطح پر چھوٹے چھوٹے دائرے جو بڑھتے بڑھتے سارے میں پھیل گئے، دیواروں سے ٹکرانے لگے، باہر جانے لگے، اندر واپس آنے لگے، ایک سنسنی اور حرارت سارے میں پھیلا رہے ہیں۔ دو جُڑواں درخت، ایک پیپل اور ایک آم، ایک ہی جڑ میں اُگے ہوئے، ایک ہی تنے سے پیدا، ایک ہی زندگی کے ہمراز تھے کہ اُگ رہے تھے۔ ایک دوسرے کا سہارا، ایک دوسرے کی تسلی، ایک ہی ہوا میں سانس لیتے، ایک ہی سوت کے پانی سے جیتے تھے۔ آہ! وہ جسم۔ اور اب تو پیپل کو بجلی نے جلا ڈالا، جڑ سے مسل ڈالا! مگر آم ہے کہ قسمت کا مارا ابھی تک کھڑا ہے۔ کاش کہ اس پر بجلی گری ہوتی — تنہا۔ اکیلا، مُرجھایا ہوا، پچھڑی کی جان ابھی تک ٹھوکریں کھانے کو زندہ ہے۔ اگر وہ ہوتے...

لحاف میں ایک حرکت، صدیقہ نے ایک کروٹ لی۔

آہ! زمانہ کسی کے بہلائے میں نہیں آتا، کسی کے پھسلائے میں نہیں آتا۔ اور میں ایک اکیلی ہوں، آہ! میں اکیلی ہوں۔ اس سے تو زندگی کا لطف دیکھا ہی نہ ہوتا جو آج یہ تنہائی محسوس نہ ہوتی۔ میرے دل میں کوئی جگہ خالی نہ ہوتی، محبت کی جگہ۔ اُمید بھی کیا جھونٹے جھلاتی ہے۔ کبھی پاس آتی ہے، کبھی دُور جاتی ہے لیکن اُمید کاہے کی؟ اب تو ایک مایوسی ہے کہ سارے میں پھیلی ہوئی ہے، بادلوں کی طرح اُمڈی ہوئی ہے۔ وہ سوت کی رسّی کا جھولا، چار ہم جولیاں، پٹھڑے کے ایک ایک کنارے پر دو دو۔ اور پینگ ہیں کہ درخت کو ہلائے ڈالتے ہیں، گھنگور گھٹاؤں میں گھسے جاتے ہیں۔ جھولا کن نے ڈالو رے آموریاں۔ واہ! نوری اور کشور، بس اتنے ہی پینگ لے سکتی ہو؟ دیکھو میں اور کبری کتنا بڑھاتے ہیں۔ جگر نہ آجائیں جب ہی کہنا۔ . . . پھر ایک ہنسی کا غل، اور پھر ایک قہقہوں کا شور . . . آہ! اب تو زندگی ایک ہوا ہے۔ باغِ ارم اور حوروں کی خوش فعلیاں، پھولوں کے ہار اور اوس کا جھومر۔ نہ وہ بیر کی ڈالی؛ کہاں میرا آشیانہ؟ پھر ایک تپتی ہوئی چٹان، بنجر اور سخت، اور اس کے پہلو سے زندگی۔ لیکن پھر ایک نئی ہستی، پھر ایک نئی آن، من و سلویٰ کے مزے، دودھ کی شیریں نہروں میں نہانا، اور اُن میں کھیلنا۔ پھر دن عید، رات شب برات۔ لیکن آہ! زمانہ کی ایک کروٹ ——— ابلیس اور گیہوں اور زینبی۔ تنہائی، تنہائی، ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا، کاش کہ وہ ہوتے ——— اے آدم! ——— نہ پھر اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں۔ پھر وہی خوشی اور خرمی۔ ایک قیامت بپا ہے نفسی نفسی کا عالم، اسرافیل کا شور، دجال ہے کہ سب کو پھسلا رہا ہے۔ میں تو اُسی کے پاس جاؤں گی، اُمید تو ہے۔ آہ! یہ تنہائی۔ کوئی سر پہ ہاتھ رکھنے والا بھی نہیں۔ نہ تسلی نہ تشفی نہ دلاسا۔ تنہائی، تنہائی۔ رات اندھیری اور بھیانک رات، اسے لادو کوئی جنگل مجھے... جنگل... مجھے... . بانظ..... با ——— زار ——— مُوُدُ۔ اُوجھ.....

رات

رشید جہاں

دِلّی کی سَیر

"اچھی بہن ہمیں بھی تو آنے دو" یہ آواز دالان میں سے آئی، اور ساتھ ہی ایک لڑکی کُرتے کے دامن سے ہاتھ پونچھتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ ملکہ بیگم ہی پہلی تھیں جو اپنی سب ملنے والیوں میں پہلے پہل ریل میں بیٹھی تھیں۔ اور وہ بھی فرید آباد سے چل کر دہلی ایک روز کیلئے آئی تھیں۔ محلہ والیاں تک اُن کی داستانِ سفر سُننے کے لئے موجود تھیں۔ "ارے ہے آنا ہے تو آؤ! میرا مُنہ تو بالکل تھک گیا۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو سینکڑوں ہی بار تو سُنا چکی ہوں۔ یہاں سے ریل میں بیٹھ کر دِلّی پہنچی اور وہاں اُن کے ملنے والے کوئی نگوڑے اسٹیشن ماسٹر مل گئے۔ مجھے اسباب پاس چھوڑ یہ رفو چکر ہوئے اور میں اسباب پر چڑھی برقع میں لپٹی بیٹھی رہی۔ ایک تو کمبخت برقع، دوسرے مردوے۔ مرد تو ویسے ہی خراب ہوتے ہیں، اور اگر کسی عورت کو اس طرح بیٹھے دیکھ لیں تو اور چکّر پر چکّر لگاتے ہیں۔ پان کھانے تک کی نوبت نہ آئی۔ کوئی کمبخت کھانسے، کوئی آوازے کسے، اور میرا ڈر کے مارے دم نکلا جائے۔ اور بھوک وہ غضب کی لگی ہوئی کہ خدا کی پناہ! دِلّی کا اسٹیشن کیا ہے تو قلعہ بھی اتنا بڑا نہ ہوگا۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی اسٹیشن ہی اسٹیشن نظر آتا تھا، اور ریل کی پٹریاں، انجن، اور مال گاڑیاں۔ سب سے زیادہ ڈر مجھے اُن کالے کالے مردوؤں سے لگا جو انجن میں رہتے ہیں۔

"انجن میں کون رہتے ہیں؟" کسی نے بات کاٹ کر پوچھا۔

"کون رہتے ہیں؟ نہ معلوم بُوا کون! نیلے نیلے کپڑے پہنے، کوئی داڑھی والا، کوئی صفاچٹ۔ ایک ہاتھ سے پکڑ کر چلتے انجن میں لٹک جاتے ہیں۔ دیکھنے والوں کا دل سَن سَن کرنے لگتا ہے۔ صاحب اور میم صاحب تو بوا دِلّی اسٹیشن پر اتنے ہوتے ہیں کہ گنے نہیں جاتے۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گِٹ پٹ کرتے چلے جاتے ہیں۔ ہمارے ہندوستانی بھائی لُچی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تکتے رہتے ہیں۔ کمبختوں کی آنکھیں نہیں پھوٹ جاتیں۔ ایک میرے سے کہنے لگا "ذرا مُنہ بھی دکھا دو۔" میں نے فوراً . . ."

"تو تم نے کیا نہیں دکھایا،" کسی نے چھیڑا۔

"اللہ اللہ کرو بُوا۔ میں اِن موؤں کو مُنہ دکھانے گئی تھی۔ دِل تلیوں اچھلنے لگا۔" تیور بدل کر، "سُنتا ہے تو بیچ میں نہ ٹوکو۔" ایک دم

خاموشی چھا گئی۔ ایسی مزیدار باتیں فرید آباد میں کم ہوتی تھیں۔ اور ملکہ کی باتیں سننے تو عورتیں دُور دُور سے آتی تھیں۔ ہاں تو اسوٹے والے ایسے نہیں جیسے ہمارے ہاں ہوتے ہیں۔ صاف صاف خاکی کپڑے اور کوئی سفید، لیکن دھوتیاں کسی کسی کی میلی تھیں۔ ٹوکرے لئے پھرتے ہیں۔ پان بیڑی سگریٹ، دہی بڑے، کھلونا ہے کھلونا، اور مٹھائیاں چلتی ہوئی گاڑیوں میں بند کئے بھاگے پھرتے ہیں۔ ایک گاڑی آکر رُکی۔ وہ شور غل ہوا کہ کانوں کے پردے پھٹے جاتے تھے۔ اِدھر قلیوں کی چیخ پکار اُدھر سوٹے والے کان کھائے جاتے ہیں۔ مسافر ہیں کہ ایک دوسرے پر پلے پڑتے ہیں اور میں بچاری بیچ میں اسباب پر چڑھی ہوئی۔ ہزاروں ہی ٹھوکریں اور دھکے کھائے ہوں گے۔ بھئی جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو، گھبرا گھبرا کر پڑھ رہی تھی۔ خدا خدا کر کے ریل چلی تو مسافر اور قلیوں میں لڑائی شروع ہوئی: "ایک روپیہ لوں گا"، "نہیں دو آنہ ملیں گے"۔ ایک گھنٹہ جھگڑا ہوا۔ اب کہیں اسٹیشن خالی ہوا۔ خالی کیا ہوا اسٹیشن کے شہدے تو جمع ہی رہے۔ کوئی دو گھنٹہ کے بعد یہ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے دکھائی دئیے۔ اور کس لاپرواہی سے کہتے ہیں "بھوک لگی ہو تو کچھ پوریاں وُوریاں لا دوں۔ کھاؤ گی؟ میں تو اُدھر ہوٹل میں کھا آیا۔"

میں نے کہا کہ "خدا کے لئے مجھے میرے گھر پہنچا دو۔ میں باز آئی موئی دلّی کی سیر سے۔ تمھارے ساتھ تو کوئی جنت میں بھی نہ جائے اچھی سیر کرانے لائے تھے" فرید آباد کی گاڑی تیار تھی اس میں مجھے بٹھا اور منہ پھُلا لیا کہ "تمھاری مرضی، سیر نہیں کرنی تو نہ کرو!"

محمود الظفر

جوانمردی

وہ میری بیوی جا رہی۔ مگر اُس کے لبوں پر اُس مسکراہٹ کا نام تک نہیں جیسا کہ لوگوں نے میری تسکینِ قلب کے لئے مجھ سے کہا تھا بس ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ہے۔ اس کی بھیانک صورت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک مہلک بیماری کا شکار ہے اور موت کا خوف اُس پر طاری ہے۔ اُس کی آنکھوں میں میرے لئے اب لطف اور پیار کی جگہ بیگانگی اور نفرت ہے۔ میں مستحق ہی اس کا تھا۔ اِس نفرت کی وجہ، وہ ناتائیدہ بچہ ہے جس کا سر اُس کے کو... کی ہڈیوں میں اب تک پھنسا دکھائی دیتا ہے جس کی وجہ سے اُس کی جان گئی۔ یہ بھلا کیسے خیال ہو سکتا تھا کہ میری بیوی کو مرتے وقت مجھ سے نفرت ہو گی۔ میں نے اُس کو تکلیف اور موت سے بچانے کے لئے کون سی بات اُٹھا رکھی تھی۔ مگر نہیں۔ میں ہی اُسکی موت کا باعث ہُوا، میں نے ہی اُس کو درد اور دُکھ پہنچایا۔ مردوں کی جہالت اور حماقت کی کوئی انتہا نہیں۔ مگر یہ بھی کہنا صحیح نہیں کہ میں جہالت اور حماقت کا شکار تھا۔ ہاں یہ سراسر غلط ہے۔ در اصل میں غرور کے پنجہ میں گرفتار تھا جس کا مجھے اعتراف ہے۔

ہماری شادی ایسی عمر میں ہوئی تھی جب ہم میں ایک دوسرے کے جذبات سمجھنے کی صلاحیت تک نہ تھی۔ لیکن بعد میں جو حادثہ پیش آیا اس کا الزام میں قسمت، یا ایسے حالات پر جن پر مجھے کوئی قابو نہ تھا، نہیں رکھنا چاہتا۔

مجھے اپنی بیوی سے کبھی محبت نہیں ہوئی۔ اور ہوتی بھی تو کیسے؟ ہم دو مختلف دائرہ زندگی میں گردان تھے۔ میری بیوی پرانے زمانے کی تنگ و تاریک گلیوں میں اور میں نئے زمانے کی صاف اور چوڑی چکلی سڑکوں پر۔ لیکن جب میں دوسرے ملکوں میں گیا اور اُس سے کئی برس تک جُدا رہا تو کبھی کبھی میرا دل اُس کے لئے بے چین ہوتا تھا۔ وہ اپنے چھوٹے سے مستحکم پرانے قلعہ میں تھی، اور میں زندگی کی دوا دوش فضول اور بے فیض عشق بازی سے تنگ آ کر کبھی کبھی اُس پاک و باوفا عورت کا خواب دیکھا کرتا تھا جو بلا کسی معاوضہ کے مجھ پر سب کچھ نثار کرنے کے لئے تیار تھی۔ جب میری یہ کیفیت ہوتی تو بیتابی کے ساتھ مجھے اُس سے ملنے کی خواہش ہوتی۔ ایک دفعہ مجھ پر ایسی ہی کیفیت طاری تھی کہ مجھے اُس کا ایک خط ملا۔ میں بے قرار ہو گیا اور فوراً چھ ہزار میل کے فاصلہ سے وطن کی طرف چل پڑا۔ اس نے خط میں لکھا تھا۔ "میں نے ابھی تکیہ کے نیچے سے پھر آپ کا خط نکال کر پڑھا۔ بہت مختصر ہے۔ غالباً آپ اپنے کام میں مشغول ہونگے۔

مگر خیر مجھے اسکی کوئی شکایت نہیں۔ بس آپ کی مجھے خیریت معلوم ہوتی رہے اور آپ اچھے رہیں اور خوش رہیں میرے لئے یہی کافی ہے۔ جب سے میں بیمار ہوں سوائے اس کے کہ آپ کو یاد کروں اور ان عجیب عجیب چیزوں اور نئے نئے لوگوں کا خیال کروں جن سے آپ وہاں ملتے ہوں گے، مجھے اور کام نہیں۔ مجھ سے چلا نہیں جاتا اس وجہ سے پلنگ پر پڑی پڑی طرح طرح کے خیال کیا کرتی ہوں۔ کبھی تو اس میں لطف آتا ہے اور کبھی اس سے سخت تکلیف ہوتی ہے جب لوگ میری صحت کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں اور مجھ سے اظہار ہمدردی کرتے ہیں اور نصیحت کرتے ہیں تو مجھے بڑی کوفت ہوتی ہے۔ یہ لوگ یہ تک نہیں سمجھتے کہ مجھے کیا روگ ہے۔ انھیں صرف اپنی تسکینِ قلب کے لئے میری حالت پر رحم آتا ہے۔ اپنے والدین پر بھی میں بار ہوں۔ وہ اپنے جی میں خیال کرتے ہوں گے کہ باوجود میری شادی ہو جانے کے میں ایسی بدنصیب ہوں کہ اُن کے گلے پڑی ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں ہر وقت اس کوشش میں رہتی ہوں کہ بہت زیادہ مایوسی اور رنج کا اظہار نہ کروں اور میرے والدین ایسی کوشش کرتے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں میری بیماری کی وجہ سے بڑا تردد اور فکر ہے۔ غرض دونوں طرف بناوٹ ہی بناوٹ ہے۔ میں آپ سے کسی بات کی شکایت کرنا نہیں چاہتی اور نہ آپ کے کام میں ہارج ہونا چاہتی ہوں۔ آپ مجھے بھول نہ جائیں اور کبھی کبھی خط لکھ دیا کریں۔ میرے لئے یہی بہت ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تو مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ آپ کا مجھ سے دور ہی رہنا بہتر ہے۔ مجھے ڈر اس بات کا ہے کہ جیسے بیماری کے بعد سے یہاں میں قریب قریب سب سے ناآشنا سی ہو گئی ہوں ویسے ہی میں کہیں آپ کو بھی نہ کھو بیٹھوں۔ دن رات میری بُری حالت دیکھ کر کہیں آپ کا دل بھی میری طرف سے نہ ہٹ جائے۔ وہاں سے تو آپ محض اس کا تصور کر سکتے ہیں۔ اور میں آپ کو اپنا وہ کامل دمساز تصور کر سکتی ہوں جس کی میرے دل کو لگن ہے"!

جب مجھے یہ خط ملا تو مجھ پر عشق و محبت کی ایک لہر سی دوڑ گئی، گو کہ وہ بیمار تھی اور اُسے روگ لگ گیا تھا مگر اُس کو سینے سے لگانا میرا فرض تھا۔ میں یہ ثابت کر دینا چاہتا تھا کہ میری محبت میں کوئی بات حائل نہیں ہو سکتی۔ میں چاہتا تھا کہ اُسے معلوم ہو جائے کہ میں ہی وہ کامل دمساز ہوں جس کی اُسے جستجو تھی۔ میں نے اپنے کو قصور وار اور بُرا قرار دیا اور اُس کو معصوم اور نیک۔ جیسی اُس نے میرے ساتھ خاکساری برتی اور میری خدمتگزاری کی میرا بھی فرض تھا کہ میں اُس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کروں۔ یہ تہیہ کر کے میں اپنا کام چھوڑ کر گھر کی طرف چل کھڑا ہُوا۔

میں ابھی راستہ ہی میں تھا کہ میرے جذبات میں تبدیلیاں ہونے لگیں۔ وہ شروع کا سا پاک جذبہ بالکل غائب ہو گیا۔ اور روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف میرے خیالات دوڑنے لگے، مثلاً روزی کمانے کی میں کون صورت نکالوں گا۔ اپنے دوستوں میں سے کن کن سے ملاقات جاری رکھونگا۔ اپنے سسر اور ساس سے کس طرح ملوں گا۔ ان سے صاف صاف باتیں کروں، یا یہ کہ اُن کی طرف سے بے رخی برتوں۔ وغیرہ وغیرہ۔ صرف اپنی بیوی سے ملنے کی پہلے کی سی تمنّا باقی نہ رہی۔ یہ ہی نہیں بلکہ ذرا اور اسے روزانہ زندگی کے مسئلوں نے میری تمناؤں اور ولولوں کا خاتمہ کر دیا۔ گھر پہنچنے پر یہ مسائل تلخ وہ حقیقتوں سے بدل گئے جن سے گریز ناممکن تھا۔ پرانے زمانے کی جن جن دلفریبیوں کی میں نے اپنے ذہن میں تصویر کھینچی تھی اُن کا کہیں پتہ بھی نہ تھا۔ بجائے اس کے میں نے خود کو ایک تنگ و تاریک گندگی، ظلم اور جہل سے لبریز دُنیا میں بند پایا۔ اسٹیشن پر جو لوگ مجھ سے ملنے آئے اُن میں اکثر بیہودہ، بدمعاش، تنگ نظر اور نالائق قسم کے آدمی تھے۔ اُن سب نے بہت خوشی کے ساتھ میرا استقبال کیا، مجھے ہار پہنایا گیا، مجھ پر فقرے کسے گئے، دو ہی پُرانے ناشائستہ مذاق ہوئے اور دوسروں کی عیب جوئی کی گئی۔ کئی دن تک جلسوں اور دعوتوں کا سلسلہ رہا۔ اس کے بعد کہیں اُن لوگوں سے نجات ملی۔ اس درمیان میں میں اپنی بیوی سے صرف تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے مل سکا۔ لیکن اس کے تیل سے چپکے ہوئے بال، اُس کا لاغر جسم اور زرد چہرہ!

دعوتوں، رقص وسرود کے جلسوں اور ادھر اُدھر بات چیت کے وقت لبی بار بار میری نظر کے سامنے آجاتا تھا۔

جب سب مہمان رخصت ہو گئے تو میں اپنی بیوی کے پاس گیا اور اُس کے قریب پلنگ پہ جا کر بیٹھا۔ وہ ساکت لیٹی رہی اور میری طرف اُس نے نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ میں تھوڑی دیر تک تو اُس کی ہر سانس کے ساتھ اُس کے سینہ کا اُتار چڑھاؤ دیکھتا رہا۔ پھر میں نے اُس کا نحیف ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور کچھ دیر تک ہم دونوں یونہی خاموش بیٹھے رہے۔ پھر میں بولا: "دیکھئے اب تو میں آپ کے پاس آگیا، کچھ باتیں کیجئے، آپ اتنی چپ کیوں ہیں"۔ اُس نے جواب دیا "میں کیا باتیں کروں۔ خیر آپ آگئے"!

میں نے دفعتاً یہ محسوس کیا کہ اس طرح کام نہیں چلنے کا۔ میں نے شروع میں جو تہیہ کیا تھا وہ مجھے یاد آگیا اور میں نے جلدی سے کہا۔ "واہ، آپ کو کہنا تو مجھ سے بہت کچھ ہے۔ اتنے دن جو میں یہاں نہیں رہا تو آپ کیا کرتی رہیں اور کیسی رہیں سب مجھے بتائیے۔ آخر اتنے دن تک آپ نے مجھ سے بات چیت نہیں کی اب اُس کی کسر نکالئے۔ یاد ہے آپ کو۔ آپ نے مجھے ایک دفعہ خط میں لکھا تھا کہ آپ کو ایک ہمدم و دمساز کی جستجو ہے۔ میں ہی وہ شخص ہوں اور اب آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ ہر وقت آپ کے ساتھ رہوں اور کبھی آپ سے جُدا نہ ہوں"۔

مگر میری تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ میری باتوں سے ظاہر تھا کہ رٹے ہوئے سبق کی طرح اوپری ہیں اور اُن سے میری بیوی کی کوئی تسلی نہیں ہوئی۔ کچھ دیر تک مجھے یہ اُمید رہی کہ اُسے اس کا شاید احساس نہیں ہُوا۔ مگر وہ گھبراہٹ اور بے چینی سے میری ٹوپی اُٹھا کر ہاتھوں سے ملنے دلنے لگی اور پھر ایسی گفتگو شروع کی کہ مجھے اپنی ناکامیابی کا یقین ہو گیا۔

اُس نے کہا۔ بھلا میں کیا کہوں؟ یہاں تو جیسے دن ویسی رات۔ لیکن آپ کیوں چپ ہیں؟ آپ کو تو نئے نئے تجربے ہوئے ہوں گے۔ اہم اُمور سے سابقہ پڑا ہوگا۔ آپ مجھ سے اُن سب باتوں کا تذکرہ کیجئے۔ وہاں کی عجیب عجیب چیزیں۔ طرح طرح کی مشینیں۔ قسم قسم کے لوگ، انوکھی زندگی! آپ لکھا کرتے تھے کہ آپ کو اُن سب کے بارے میں مجھے لکھنے کا وقت نہیں۔ لیکن اب تو آپ میرے پاس ہیں۔ اب تو آپ کو وقت ہے"!

یہ اُس نے جان کر میری خود بینی پر حملہ کیا۔ اب مجھے معلوم ہو گیا کہ برسوں کی جُدائی نے ہمارے تعلقات میں مطلقاً کوئی فرق پیدا نہیں کیا۔ ہم پہلے کی طرح اب بھی ایک دوسرے سے ناآشنا تھے اور ایک دریا کے دو مختلف کناروں پہ اجنبی کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔

ہم نے پھر ایک دوسرے کے ساتھ ریاکاری شروع کر دی۔

میں نے کہا۔ ہاں ہاں مجھے تو آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ ہم دونوں مل کر کیا کریں گے، یہ طے کرنا ہے۔ لیکن پہلے آپ جلدی سے اچھی تو ہو جائیے۔ جب آپ اچھی ہو جائیں گی تب ہم اس کے بارے میں گفتگو کریں گے۔ ابھی تو آپ کو خاموشی سے آرام کرنا چاہئیے۔ آپ اپنے دل و دماغ پہ زور نہ ڈالئے۔ میرے آنے کی وجہ سے غالباً آپ کو تکان ہو گئی۔ آپ آرام کیجئے اور زیادہ سوچئے مت۔ اچھا میں اب جاتا ہوں آپ سو جائیے"!

میں نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور وہاں سے اُٹھ کر چلا آیا۔

اس کے بعد نہ تو میں نے اُس سے زیادہ رابطہ بڑھانے کی کوشش کی اور نہ کسی خاص بات پر زیادہ دیر تک گفتگو ہی کی۔ دن میں ایک دو دفعہ اُسے دیکھنے جایا کرتا، دریافت کرتا کہ اُس کی صحت کیسی ہے اور ایسی ہی دو ایک باتیں کر کے چلا آتا اور اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ اتفاق سے میرا کام بھی اِن دنوں کچھ اچھا نہیں چل رہا تھا اور مجھے فرصت کافی تھی۔

رفتہ رفتہ میں پھر اپنے پُرانے دوستوں کی صحبت میں رہنے لگا، اور ان کی لغو اور فضول عادتیں مجھ میں بھی آگئیں۔ تاش، شراب،

اور بے سروپا باتوں کا سلسلہ جاری رہنے لگا۔ ہم اپنے کو موسیقی کا بھی ماہر سمجھتے تھے اور شہر کی نامور گانے والیوں کے سرپرست بن بیٹھے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ میں نے ایک عورت بھی رکھ لی تھی۔ ہم نے بے معنی اور بے مقصد زندگی بسر کرنے کی بہت ترکیبیں نکالی تھیں۔ ہم میں سے جو لوگ غیر ممالک کا سفر کر آئے تھے وہ اپنی جوانمردی اور عاشقی کی داستانیں دوسروں کو سنا سنا کر اُن پر رعب جماتے تھے۔

لیکن مجھے اپنی بیوی سے چھٹکارا پانا ناممکن تھا۔ اُس کی صحت کی خرابی کی وجہ سے میرے پاس مزاج پرسی کے لئے خطوط، اور دوستوں اور رشتہ داروں کا ایک سلسلہ قائم رہتا۔ کوئی مجھے نصیحت کرتا تو کوئی فضیحت، کوئی دلاسا دیتا تو کوئی اظہار ہمدردی کرتا، ان سب باتوں سے میری زندگی عذاب ہوگئی۔ میرے ساس اور سسر کو میری آزادہ روی بہت کھلتی تھی، وہ ڈرتے تھے کہ کہیں میں اُن کی لڑکی کو بالکل چھوڑ نہ دوں۔ اِدھر میری والدہ صبح شام مجھ سے دوسری شادی کر لینے پر مُصر تھیں۔ خاندان میں دو ایسے گروہ بن گئے جنھیں ایک دوسرے سے سخت عداوت تھی۔ دونوں مجھے اپنی طرف کھینچنے کی ہر وقت کوشش کرتے رہتے تھے۔

لیکن باوجود والدہ کے اصرار کے میں دوسری شادی کرنے پر راضی نہیں ہُوا۔ آخر کار لوگوں نے میری مردانگی میں شک کرنا شروع کیا اور طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ اس پر تو مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے یہ تہیہ کر لیا کہ کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیئے۔

میں اپنی سسرال گیا اور وہاں جا کر کہا کہ "آپ کی لڑکی بیمار ویمار کچھ بھی نہیں۔ یہ سب خواہ مخواہ اُسے اپنے یہاں روکنے کے بہانے ہیں۔ میں اُسے اپنے ساتھ لئے جاتا ہوں۔"

اپنی بیوی سے بھی میں نے کہا کہ "آپ بالکل بیمار نہیں۔ کم از کم ایسی بیمار نہیں جیسا یہاں لوگ آپ کو بنانا چاہتے ہیں۔ یہ سب آپ کے والدین کی چال ہے، یہ بات کچھ آپ سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ آپ میرے ساتھ چل کر رہیئے تب پتہ چلے گا کہ آپ کو کیا بیماری ہے؟"

پہلے تو میری صاف گوئی اُس کی کچھ سمجھ میں نہیں آئی مگر تھوڑی بہت تکرار کے بعد وہ میرے ساتھ چلنے پر راضی ہو گئی۔

ہم دونوں نے ایک لمبا سفر کیا۔ اور دُور دُور پہاڑوں پر جا کر رہنے لگے۔ برفستان کی خشک اور تازہ ہوائیں دُور دُور ٹہلنے کے لئے نکل جاتے۔

جب تھوڑے دنوں بعد میری بیوی کی صحت ٹھیک ہو گئی تو میں اُسے لے کر گھر آیا۔ میرے دوستوں اور رشتہ داروں نے جب ہمیں دیکھا تو میرے لئے بڑے فخر کا موقع تھا۔ مگر ان کے دلوں میں شک باقی رہ گیا۔ وہ پُورے ثبوت کے لئے کسی اور چیز کے خواہاں تھے۔ لیکن مجھے اپنی کامیابی کا پُورا یقین تھا۔ ایک مہینے کے بعد دوسرا مہینہ آہستہ آہستہ گزرتا جاتا تھا اور میری بیوی کا پیٹ بڑھتا جاتا تھا۔

میری حالت اُس مالی کی سی تھی جو اپنے لگائے ہوئے درختوں پر کلیوں کو کھلتے ہوئے دیکھ کر باغ باغ ہوتا ہے۔ ہر ہر دن اور ہر لمحہ کے بعد میری کامیابی زیادہ نمایاں ہوتی جاتی۔ لیکن میری بیوی خاموش رہتی۔ میں سمجھتا تھا کہ اس کا سبب غالباً زچگی کی گھبراہٹ اور پریشانی ہے۔ آخر کار اُس کو دردِ زہ شروع ہُوا۔ گھنٹوں تک کرب اور بے چینی کا عالم رہا۔ جسم شدتِ تکلیف سے تڑپ رہا تھا اور کسی پہلو سے چین نہیں تھا۔ دروح تک معلوم ہوتا تھا کہ آہ و فریاد کر رہی ہے۔ لیکن اُس کی ہچکی اور تڑپ، اُس کی آہ و زاری ان سب سے میری جوانمردی کا ثبوت مل رہا تھا۔

معاذ اللہ! میرے کانوں میں ابھی تک اُس کا دردناک کراہنا گونج رہا ہے۔ اور اُس کے بعد چاروں طرف جو خاموشی چھا گئی اور جس نے میری اکڑ اور شان کو خاک میں ملا دیا وہ سماں بھی ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ لیکن اُس کے مرنے کے بعد جب لوگ مجھ سے یہ کہنے آئے کہ مرتے وقت اُس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی تو میرے دل کو کچھ سکون ہو گیا۔

---

(۸)

اُردو افسانہ

چوتھا دور

کرشن چندر

زندگی کے موڑ پر

مسافر

پرکاش وتی کا بیاہ تھا اور سوشیلا اور لیلا بیاہ دیکھنے کی خوشی میں نئے نئے کپڑے سلوا رہی تھیں۔ جارجٹ کی سبز ساڑھی اور زری کا فیتہ، نینون کا بادامی دوپٹہ اور اس کا جھلملاتا ہوا نقرئی کنارہ۔ آنکھ کے نشے کی قمیص اور امرت مٹھن کی شلواریں، عجیب عجیب سے بلاؤز جو دور سے دیکھنے میں ایسے معلوم ہوں گویا صرف چاٹنے والی کو ڈھانپنے کے کام آسکتے ہیں۔ لیکن جب سوشیلا اور لیلا انہیں پہن لیں تو گول گول قطع کئے ہوئے کناروں سے بازو ایسے نکل آئیں جیسے سیب کی شاخیں پھولوں کے بار سے جھک رہی ہوں۔ بچارا پرکاش چند سوشیلا اور لیلا کی طرف دیکھ دیکھ کر سوچتا کہ عورتیں بھی عجیب مصیبت ہیں۔ یہ پیدا ہوں تو مصیبت اور نہ پیدا ہوں تب بھی مصیبت، لیلا نے نئے طلائی آویزے خرید لئے تھے اور سوشیلا نے بلی کے پنجوں کی طرح اپنے ناخن بڑھا لئے تھے اور ہر روز انہیں پالش کیا کرتی اور سوچتی کہ جب سری پور جائیں گے تو لیلا کے طلائی آویزوں کو کون پوچھے گا، ہاں، اس چھوٹے سے قصبے کی سب لڑکیاں اس کے سپید سپید لمبے ناخنوں کو دیکھ کر ضرور حیران ہوں گی، اری یہ کیا ہے؟ دیکھ تو بہن یہ لاہور کا نیا فیشن ہے، کیا تجھے خبر نہیں سوشیلا اب کالج میں پڑھتی ہے، ہاں کالج میں، اور پھر کیسی کیسی عجیب باتیں ہوں گی، خوب لطف آئے گا ان کی باتیں سن کر، او۔ لیلا نے تو جب سے "پریم کی پکار" میں ہیروئن کے کانوں میں نئی وضع کے آویزے دیکھے تھے اس کا دل للچا رہا تھا، اب پرکاش وتی کے بیاہ پر یہ موقع ملا تھا کہ وہ ان طلائی آویزوں کا تقاضا کرتی اور یہ تو سب جانتے ہیں کہ آویزے جتنے لیلا کے کانوں میں بھلے معلوم ہوتے ہیں اور کسی کے کانوں میں نہیں ہوتے اور پھر یہ آویزے بھی تو بہت اچھے تھے۔ لمبے لمبے سے، ایک چھوٹے سے طلائی گنبد کے نیچے ایک اس سے ذرا بڑا طلائی گنبد حتیٰ کہ یہ طلائی گنبد ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے اس کی سپید بلوریں گردن تک پہنچ جاتے تھے، یہ آویزے بالکل ایسے تھے جیسے مندر کے منہ لٹکے ہوئے لہرا رہے ہوں اور جب آئینے کے سامنے وہ گردن ایک طرف جھکا کر مسکرا دیتی تو اس کا ہنسنا، اور طلائی گنبدوں کا جھومنا، اور اس کے گالوں کا شہابی ہو جانا، یہ سب باتیں مل کر اس پر ایک نشہ سا طاری کر دیتیں، اور وہ سوچتی کیا سوشیلا اور اس کے ناخن، اونہہ! ہو اور بات تھی کہ سوشیلا اس کی بہن تھی، بڑی بہن۔ لیکن جب پرکاش چند نے معصوم سے لہجے میں نئے آویزوں کی تعریف کی تو لیلا نے جواب دیا میں کیا کرتی

بھائی جان! میرے پاس کوئی اچھے آویزے ہی نہیں ہیں۔ وہ پہلے تین جوڑے تو بالکل ہی بھدے سے ہیں، کیا میں وہی پہن کر پرکاش کے بیاہ پر جاؤں؟"

اور سوشیلا نے ناخنوں پہ پالش کرتے ہوئے نہایت بھولپن سے کہا "بھائی جان! آپ ہماری استانی مس سہگل کے ناخن دیکھیں تو بالکل حیران رہ جائیں۔ بالکل سپید، بے داغ، سچے موتیوں کی طرح، میرے ناخنوں پر تو ویسی چمک آتی ہی نہیں، اور بھاپاجی[1]! پرکاش کے بیاہ میں ہم یہاں سے بس پر جائیں گے یا ریل پر؟"

پرکاش وتی کے بیاہ سے دو دن پہلے پرکاش چند، لیلا اور سوشیلا لاہور سے روانہ ہوئے۔ پرکاش کی ماں نے اپنے بیٹے کو خرچ کے لئے پچیس روپے دئے۔ پرکاش وتی کے لئے پیلے رنگ کی جارجٹ کی ایک ساڑھی اور دو روپے شگن کے، پھر بولی "دیکھنا جب پرکاش ڈولی میں سوار ہو تو اپنے پاس سے دو روپے شگن کے اور دے دینا، اور ہاں دو روپے لڑکے کو بھی، دولہا کو، اور ــــــ بس کافی ہے"

جب پرکاش اور لیلا اور سوشیلا گھر سے تانگے پر سوار ہوئے تو پرکاش کی ماں نے کہا "دیکھنا بیٹا، ڈولی کے وقت میرا خیال ہے کہ لیں دولہا دلہن دونوں کو ایک ایک روپیہ شگن دے دینا" آخر جب تمہارے بھائی کا بیاہ ہوا تھا تو پرکاش وتی کی ماں نے کون سے خزانے لٹا دیے تھے، یہی ایک ایک روپیہ اس نے دونوں کو دیا تھا" اور کہا "بس کافی ہے، اچھا بیٹا جاؤ اب دیر نہ کرو"

لیکن جب تانگہ بالکل ہی چلنے لگا تو پرکاش کی ماں نے پھر اشارے سے اسے ٹھہرا لیا اور پرکاش کے قریب جا کر سرگوشیانہ انداز میں بولی۔ "سوشیلا کو ننگے سر نہ پھرنے دینا، سری پور پرانی وضع کا شہر ہے، کوئی لاہور نہیں اور یہ عادت تو مجھے بہت ہی بری معلوم ہوتی ہے اور پھر انہیں تینوں کے دوپٹے بھی نہ اوڑھنے دینا، اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے، کنواری لڑکیوں کو بہت ہنسنے بولنے بھی نہیں دینا چاہئے، وہاں تو ہر وقت ڈھولک بجتی ہوگی اسی لئے کہتی ہوں، بیٹا یہ دوآبے کے لوگ بڑے شکّی مزاج ہوتے ہیں، ذرا کسی لڑکی کو ننگے سر دیکھ لیا اور وہیں انگلی اٹھا دی، اور سر اٹھا کر چلنا بھی شریف زادیوں کا دستور نہیں، کم از کم دوآبے کے لوگ اسے پسند نہیں کرتے، نظر نیچی، شرم اپنی اور......"

پرکاش نے گھبرا کر کہا "بہت اچھا ماں، بہت اچھا"

ریل جا چکی تھی اس لئے پرکاش، سوشیلا اور لیلا کو مجبوراً خضر بس کا آسرا لینا پڑا، دوپہر کے وقت خضر بس سروس کی لاری نے انہیں بٹالہ پہنچا دیا، بٹالہ پہنچ کر انہوں نے سری پور جانے والی لاریوں کے اڈے کی تلاش کی اور آخر انہوں نے اسے رابرٹس پارک کے قریب پا لیا۔ یہ ایک بالکل نئی دنیا تھی۔ پرکاش چند سولہ صدی خالص شہری تھا جس کی ساری زندگی لاہور کی گلیوں، سڑکوں اور پارکوں میں چکر کاٹتے اور سیٹیاں بجاتے گزری تھی، یہاں پہنچ کر اس نے کچھ اور ہی نقشہ دیکھا، ایک بڑا سا پیپل کا درخت تھا اور اس کے نیچے تین بوسیدہ لاریاں، دائیں طرف رابرٹس پارک اور اس کے قریب ایک بڑا سا تالاب، تالاب میں پانی نام کو نہ تھا۔ رابرٹس پارک کے درختوں پہ پتوں کا نشان نہ تھا۔ سامنے ایک لق و دق چٹیل میدان تھا۔ کہیں کہیں خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں، اور آک کے پودے اودے اودے پھول آئے ہوئے تھے۔ مٹیالے رنگ کی کچی سڑک پر لاٹھی ٹیک کر چلتا ہوا ایک بوڑھا کسان نظر آ رہا تھا اور کہیں کہیں کھیتوں میں ہل چلے ہوئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اپنے لب کھولے آسمان کی طرف تک رہے ہیں کہ شاید کہیں سے پانی کی ایک بوند گر پڑے، واقعی ایک عجیب دنیا تھی۔ پرکاش نے اپنے ہیٹ کو دائیں طرف اور ترچھا کر لیا اور پھر ہمت سے کام لے کر اس نے ایک لاری میں بیٹھے ہوئے ڈرائیور سے پوچھا "سری پور کو لاری یہاں سے جاتی ہے؟"

ڈرائیور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا ــــ "ہاں جناب، کیا کہا آپ نے؟"

---

[1] وسطی پنجاب میں بڑے بھائی کو "بھاپاجی" کہتے ہیں۔ مقامی رنگ قائم رکھنے کے لئے اس لفظ کو جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے۔

"میں نے کہا سری پور ——"

ڈرائیور نے اپنی آنکھیں ملتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں جناب، یہیں سے۔" پھر فرنٹ سیٹ کو جھاڑتے ہوئے بولا۔ "تشریف رکھئے، ایک روپیہ کرایہ۔"

"کس وقت چلنا ہوگا؟"

"چار بجے، اب کیا وقت ہوگا جناب؟"

"اڑھائی!"

"بہت اچھا، بہت اچھا جناب۔ ابھی تو بہت وقت باقی ہے۔"

درمیانہ خانہ کھول کر پرکاش نے لیلا اور سوشیلا کو بٹھا دیا اور پھر بیٹ اتار کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دیہاتی ڈرائیور کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔

"آپ سری پور جا رہے ہیں؟"

"ہاں!"

"کس کے ہاں؟"

"لالہ خوردی رام کے ہاں!"

"لالہ خوردی رام؟ وہ جن کا ڈپٹی صاحب کے پاس مکان ہے، ڈپٹی محمد حسین کے ساتھ، وہ جن کا لڑکا ابھی چند دن ہوئے چین سے واپس آیا ہے، سنتا ہے وہاں روئی کے کسی کارخانے میں کام کرتا ہے۔ اس کی ہمشیرہ کی شادی آج کل ہونے والی ہے جو......"

"ہاں، ہاں، وہی!"

"میرے خیال میں آپ پہلے تو کبھی سری پور نہیں گئے؟"

"نہیں۔"

"جی ہاں، مجھے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے میں نے آپ کو پہلے وہاں کبھی نہیں دیکھا۔ سری پور ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور ہم کس کو نہیں جانتے! لالہ خوردی رام سے تو میں بہت اچھی طرح واقف ہوں، بڑے نیک آدمی ہیں۔ ان کا گھر ڈپٹی محمد حسین کے گھر کے ساتھ ہے۔ ڈپٹی صاحب بھی بڑے نیک آدمی ہیں، کیا بتاؤں جی، ڈپٹی صاحب کا بڑا لڑکا کیسا خوش شکل اور نیک طینت تھا، طبیعت میں کھوٹ نام کو نہ تھا، پہلوان تھا جی پہلوان، ہمارے سری پور میں کشتی ہوئی، ڈپٹی کمشنر صاحب بھی میلے پر آئے ہوئے تھے، وہاں اس نے کشتی کی اور اللہ بخش کو ہرا دیا۔ اللہ بخش بھی بڑا تگڑا پہلوان ہے مگر ہار گیا جی، کیا بتاؤں جی بڑا اچھا آدمی تھا، ضلعداری کا امیدوار تھا، لیکن وہ بنتے ہوئے بچارے کو کسی نے راتوں رات قتل کر دیا۔ ہمارے ضلعے میں بہت قتل ہوتے ہیں، قتل اور چالان، ابھی پچھلے مہینے میں میرا کوئی سات مرتبہ چالان ہو چکا ہے۔ کیا کریں بابو جی، سڑکیں بالکل کچی ہیں، گاڑیوں کا ستیاناس ہو جاتا ہے، بیلاری میں سے دو سال ہوئے نئی لی تھی، آج آپ اس کی حالت دیکھیں۔ باڈان، پہیے، بریکیں، مڈگارڈ سب خراب ہو گئے ہیں۔ فضلے کی گاڑی اس سے بھی بری حالت میں ہے —— او فضل، او فضل، ابے حرامی، اٹھ ادھر دیکھتا کیا ہے، چل اسٹیشن پر چلیں، سواریاں لے آئیں، دیر ہو رہی ہے سورج چھپا چاہتا ہے۔ آج رات کو میری شاہ جی کے گھر دعوت ہے۔ سواری ملے نہ ملے دعوت پر تو پہنچنا ہی ہے۔"

اتنا کہہ کر رجب علی ڈرائیور فضل دین ڈرائیور کو ساتھ لے کر ریلوے سٹیشن کی طرف سواریاں لینے چلا گیا اور پرکاش چند کو چند لمحوں کے لئے بھونچکا سا چھوڑ گیا۔

ساڑھے چار بجے کے قریب جب لاری چلنے کو ہی تھی تو لالہ گھسیٹا رام سڑک پر ہانپتے ہوئے آتے دکھائی دیئے اور رجب علی کو انجن بند کرنا پڑا۔

پرکاش چند کی طرف دیکھ کر رجب علی نے معذرت کرتے ہوئے کہا: "لالہ جی سری پور کے بڑے ساہوکار ہیں، اور یوں بھی مجھ سے یہ تو نہیں ہو سکتا کہ اپنے قصبے کے کسی آدمی کو یہاں رات بتانے میں دھکے کھانے کے لئے چھوڑ جاؤں، مجبوری ہے، اگرچہ لاری تو اب بھر چکی ہے۔"

لاری واقعی بھر چکی تھی، درمیانے درجے میں جو عورتوں کے لئے تھا، سُوشیلا اور لیلا کے علاوہ آٹھ دیہاتنیں بیٹھی ہوئی تھیں اور سوشیلا اور لیلا کے خوبصورت کپڑوں کی طرف دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی تھیں، یہ حیرانی دبی دبی سی تھی، ان سے پرے تیسرے درجے میں اور لاری کی چھت کے اوپر بھی جاٹ بیٹھے ہوئے تھے۔ چنانچہ جب لالہ گھسیٹا رام لاری کے قریب پہنچے تو رجب علی نے کہا:

"آؤ شاہ جی۔"

"کہاں بیٹھوں؟" لالہ گھسیٹا رام نے کہا۔

رجب علی نے ایک نظر پیچھے کی طرف دوڑائی، پھر آہستہ سے بولا: "یہیں میرے پاس بیٹھ جائیے۔" لالہ گھسیٹا رام رجب علی کے قریب بیٹھ گئے۔ ان کا چہرہ سُرخ تھا اور چیچک کے داغ اس طرح دکھائی دے رہے تھے جیسے راستے کی مٹی پہ بارش کے چند قطرے، دونوں ہاتھوں کی اُنگلیوں پر سونے کی انگوٹھیاں تھیں اور گلے میں دانتوں کو صاف کرنے والا سونے کا خلال، کانوں میں سونے کی بڑی بڑی بالیاں تھیں۔

"بھائی رجب!" لالہ گھسیٹا رام نے آرام کا ایک لمبا سانس لے کر کہا: "میں تو کچہری سے بھاگتا ہوا آیا، اُمید نہ تھی کہ لاری مل جائے گی۔"

رجب علی نے پھر انجن کھولا۔ ایک پولیس کا سپاہی جس کو سری پور جانا تھا ڈرائیور کی کھڑکی کے قریب مڈگارڈ پر کھڑا ہو گیا۔ لاری آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

سُوشیلا اور لیلا بولیں: "بھاپا جی!"

"کیوں؟" پرکاش نے پوچھا۔

"دم گھٹا جا رہا ہے۔"

رجب علی بولا: "بی بی جی! ابھی لاری زور سے چلے گی تو خوب ہوا آئے گی۔"

لالہ گھسیٹا رام نے ایک نظر پرکاش چند پہ ڈالی اور ایک سُوشیلا اور لیلا پہ، پھر بولا: "آپ لالہ خوری رام کے ہاں جا رہے ہوں گے، پرکاش وتی کی شادی ہے نا؟"

"جی!" پرکاش بولا۔

تیسرے درجے میں دو تین جاٹ زور زور سے باتیں کرنے لگے، ایک بولا: "میں نے مرتجو سے کہا تھا کہ گواہی نہ دینا، وہ بنیا بڑا بدمعاش ہے۔"

دوسرا بولا: "مرتجو خود کہاں کا شریف ٹھہرا؟"

تیسرا کہنے لگا: "موجو پھر جاٹ بھائی ہے، لیکن وہ مہاجن ہے، کھتری بھی نہیں۔"

لالہ گھسیٹا رام نے رجب علی سے کہا: "زمانے کو تو جیسے آگ لگ گئی ہے، بھائی بھائی کا دشمن، اب تو بنج بیوپار کا زمانہ نہیں رہا، ابھی میں راستے میں سیٹھ رنگ مل کے لڑکے کو سمجھا رہا تھا کہ جاٹوں کو روپیہ قرض نہ دو، سرکار سب قرضے معاف کرنے پر تُلی ہوئی ہے اور اگر دوسرے بیوپاریوں کو اُدھار دو تو ساتھ ساتھ وصولی بھی کرتے رہو۔ اِدھر اُدھار دیا اُدھر وصولی کے لئے اپنا آدمی بھی دوڑا دیا۔ یہ آج کل کے بیوپار کا قاعدہ ہے۔"

رجب علی آہستہ سے بولا: "کم بخت پیشن کا نام نہیں کرتا۔"

درمیانے درجے میں کالے رنگ کے لہنگے پہنے ہوئے ادھیڑ عمر کی دو للائنیں باتیں کر رہی تھیں: "اس کی تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔ تیرہ سال کی عمر میں ودھوا، ساری عمر مرنے والے کو روئے گی بے چاری کے بھاگ۔ میں نے کریا پر دو ململ کے دوپٹے اور تین روپے نقد بھیج دیے تھے

لیکن کرمن کی ماں تو بڑی کمینی اور بے مروت نکلی ...... "

ایک جاٹ عورت جس کے کانوں میں چاندی کی بڑی بڑی بالیاں پڑی ہوئی تھیں، بار بار اپنے بچے کو بہلانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی، اس کے ساتھ کی عورت تنگ آ کر بولی "بہن اسے چھاتی کیوں نہیں دیتیں؟"

"میں تو چھاتی دیتی ہوں مگر یہ پیتا ہی نہیں۔ شاید اس کے پیٹ میں درد ہے۔ اُرر۔ آ۔ آ۔ اُس۔ ای۔ ای۔ سو جا میرے لال، سو جا۔ ہائے مرجاتو، جان کھائے جاتا ہے۔"

رجب علی گھسیٹا مل کی طرف اٹھ کر بولا "یہ پسٹن کام نہیں کرتا شاید۔" لیکن گھسیٹا مل پرکاش چند کی سیٹ پر جھکا ہوا اونگھ رہا تھا۔

پچھلے درجے میں تحصیل کا ایک چپڑاسی ایک جاٹ سے جھگڑ رہا تھا "مالیہ پچاس فی صدی کم ہو، آبیانہ ہٹا دیا جائے، چوکیدارہ بند ہو جائے تو سرکار کا کام کیسے چلے؟"

جاٹ بولا "پہلے کیسے چلتا تھا جب حاکم کی تنخواہ پانچ روپے ہوتی تھی۔"

"تم سکھا شاہی چاہتے ہو؟"

"نہیں جٹا شاہی۔" ایک اور جاٹ نے جواب دیا۔

ایک کسان عورت دوسری سے کہنے لگی "بچن کی ماں دلدار سنگھ کے ساتھ بھاگ گئی ہے، تم نے سُنا؟"

"اب بچن کا باپ گھوڑا لیے ان کی تلاش میں پھرتا ہے۔"

پرکاش چند کے ذہن میں چوتھی جماعت کی اُردو کی کتاب کا ایک سبق گھومنے لگا۔ دیہاتی اور شہری زندگی کا موازنہ، دیہات کی زندگی کتنی دلکش اور پُر لطف ہوتی ہے، سادہ اور معصوم، پرکاش نے سوچا کاش مجھے اُردو کی چوتھی کتاب کا مصنف کہیں مل جائے تو گلوے سے اس کا سر گردن سے الگ کر دوں۔

سوشیلا اور لیلا نے پکارا "بھائی جان، پانی، دم گھٹا جا رہا ہے۔"

رجب علی بولا "آگے نہر آئے گی، اس کے قریب ہی ایک کنواں ہے، اس کا پانی بہت میٹھا اور ٹھنڈا ہے، کیوں لالہ جی؟"

گھسیٹا رام چونک پڑا "ہاں، جی، ہاں بیٹی، کیا کہتے ہو، اوہ رجب کیا میں سو گیا تھا؟"

"ہم کہاں آ پہنچے ہیں؟"

پرکاش نے چند سنگترے پھلوں کی ٹوکری سے نکال کر سوشیلا اور لیلا کو دئے۔

رجب علی بولا "نہر کے قریب لالہ جی۔"

گھسیٹا رام لبوں پر زبان پھیر کر بولا "اوہ بہت پیاس لگی ہے، کنوئیں پر پانی پئیں گے۔"

رجب علی کہنے لگا "میں بابو جی سے کہہ رہا تھا کہ نہر کے کنوئیں کا پانی بہت ہی میٹھا اور ٹھنڈا ہے۔"

پرکاش چند کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا، حدِ نظر تک خشک سے کھیت، کہیں کہیں کیکر کے جھنڈ، لاری آہستہ آہستہ نیم ریتیلے میدان میں چل رہی تھی، کچی سڑک پہ گرد کا طوفان اٹھ رہا تھا، دھوپ بے حد تیز تھی اور آگ کے شراروں کی طرح زمین پر گرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، آک کے پھول دھوپ میں بالکل مصنوعی معلوم ہوتے تھے پیپل کے ایک بڑے درخت کے نیچے گائیں اور بھینسیں آرام کر رہی تھیں لیکن ان کا رکھوالا وہاں نہ تھا......

یہ ایک گاؤں تھا، سڑک کے اس طرف لاری ایک گندے جوہڑ کے قریب سے گذر رہی تھی، ایک بھینس پانی میں گھس رہی تھی، ایک عورت خاکی رنگ کی قمیص اور کالے رنگ کا لہنگا پہنے پانی بھر رہی تھی، ایک لڑکی، سڈول اور سانولی بانہوں والی نوجوان لڑکی، ڈنڈے سے چند بھیگے ہوئے

کپڑے کوٹ رہی تھی، سڑک کی دوسری طرف ایک بڑا سا بڑ نظر آ رہا تھا جس پر ڈاک کے لئے سُرخ ڈبّہ لٹکا ہوا تھا، درخت کے نیچے ایک ٹوٹا ہوا چھکڑا پڑا تھا، اس پر چار سکھ جاٹ ایک بے حد میلی تاش سے کھیل رہے تھے، پھر وہی میدان تھا، وہی ریتیلی سڑک، وہی تیز دھوپ اور میلوں تک پھیلے ہوئے کھیت۔

پرکاش چند نے سوچا، زندگی نہ دیہاتی ہوتی ہے نہ شہری، بلکہ محض "زندگی" کوئی اس کا کوٹ پکڑ کر کھینچ رہا تھا، پرکاش چند نے مڑ کر دیکھا۔ ایک چھوٹا سا خوبصورت بچہ، اپنی ماں کے کندھے سے لگا ہوا اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کا کوٹ پکڑ رہا تھا، اس کی ماں سیٹ سے سر لگائے سو گئی تھی، وہ اس کا ایک رُخ دیکھ سکتا تھا، ایک جوان جاٹ عورت، گندمی سا رنگ، کان میں سونے کی بالیاں، تیکھے نقش، لمبی لمبی سیاہ پلکوں نے رخساروں پر صف باندھ رکھی تھی۔

بچہ پرکاش چند کو اپنی طرف مڑتے ہوئے دیکھ کر ایک لمحہ کے لئے حیران ہو گیا۔ پھر خود بخود ہنس پڑا اور اس کا کوٹ کھینچتے ہوئے بولا "او تو —— تو —— لی۔"

پرکاش چند نے اسے ایک سنگترہ دیا، اور بچے نے اس کا کوٹ چھوڑ دیا اور گنگنایا "او تو —— لو —— لی —— او۔"

جاٹ عورت بیدار ہو گئی، اس کی آنکھیں کھلتے ہی پرکاش چند کو محسوس ہوا گویا کہیں آسمان پر یکایک دو ستارے روشن ہو گئے ہیں۔ جب ماں نے اپنے بچے کے ہاتھ میں سنگترہ دیکھا تو اس کے خواب آلود چہرے پر اس کے نیم متبسم لب پرکاش چند کو بہت دلفریب معلوم ہوئے۔ اس کے شباب میں اس نے ایک آسودگی اور روشیرگی سی محسوس کی اور اسے خیال آیا کہ دیہاتی زندگی شہری زندگی سے کہیں بہتر ہے۔

لاری چلتے چلتے تھم گئی، ایک بوڑھی عورت ایک چھوٹی سی لڑکی کو ساتھ لئے راستے کے بیچ میں کھڑی تھی، بولی "ہمیں سمری پور جانا ہے۔"

رجب علی بولا "اماں، جگہ تو بالکل نہیں۔"

بوڑھی عورت بولی "بیٹا! میں سہارا لے کر کہیں کھڑی ہو جاؤں گی، ہاں، مگر تو اس میری لڑکی کو کسی کونے میں بٹھا دے۔" رجب علی نے ایک کسان سے کہا کہ وہ لاری کی چھت پر چلا جائے اور بوڑھی عورت کے لئے جگہ خالی کر دے۔ کسان لاری کی چھت پر چلا گیا جہاں پہلے بھی چار پانچ دیہاتی بیٹھے ہوئے تھے، اور جب لاری چلی تو انہوں نے گانا شروع کر دیا۔

او بنتو ——

بنتو دا سر بن ورگا

بنتو دا منہ چن ورگا

بنتو دا لک چیتا را

او بنتو ——

پرکاش نے دل ہی دل میں جاٹ کی شاعری کی تعریف کی۔ بنتو ایک جاٹ کی محبوبہ ہے، لیکن اس کے سر کے بال ایسے ہیں جیسے ایک وسیع جنگل، اس کا چہرہ چاند اور اس کی کمر چیتے کی سی، جاٹ کی شاعری میں اس کے دیہات کے کھلے کھیتوں کی سی وسعت اور سادگی پائی جاتی ہے۔ پرکاش نے چور نگاہوں سے پھر نوجوان عورت کی طرف دیکھا، بچے نے اس کا کوٹ پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھا دئے اور نوجوان عورت کی نگاہیں پرکاش کی نگاہوں سے مل گئیں۔

لاری نہر کے پُل پر سے گزر گئی، آگے جا کر ایک کنواں آیا، وہاں لاری ٹھہر گئی اور مسافر پانی پینے لگے، پرکاش نے چاندی کا سفری گلاس نکالا تو سو شیلا اور دیلا کو پانی پلانے لگا، جب وہ پانی پی چکیں تو نوجوان عورت نے بھی آہستہ سے پانی پینے کی خواہش ظاہر کی، پانی واقعی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔

پرکاش نے دیہاتی عورت کو پانی پلاتے ہوئے محسوس کیا کہ ان میں ایک فطری شائستگی ہوتی ہے' دیہاتی عورتوں میں، لیکن بچہ بڑا شریر تھا۔ اس نے پانی پیتے ہوئے گلاس کے پانی میں اپنے سانس سے بلبلے پیدا کرنے شروع کر دیئے اور اس کی ماں نے آہستہ سے گلاس اس کے ہاتھ سے چھین کر پانی نیچے گرا دیا اور پھر مجوب نگاہوں سے پرکاش کی طرف دیکھ کر گلاس اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

چند میل آگے جا کر نوجوان عورت لاری سے اتر گئی' اسے سامنے کے ایک گاؤں میں جانا تھا۔ لاری سے اترتے ہی اس نے سرسوں کے ساگ کی سبز سبز کونپلوں کا گٹھا اپنے سر پر رکھ لیا اور بچے کو کمر کے خم میں، اس نے ایک نگاہ پرکاش پر ڈالی' گویا کہہ رہی تھی مجھے اچھی طرح دیکھ لو' ہم تم پھر کبھی نہیں ملیں گے' میں اب اپنے گھر جا رہی ہوں' جہاں میرا خاوند اپنی بنتو کا انتظار کر رہا ہے' میں کماد کی فصل کاٹوں گی' گیہوں کی بالیاں الگ کروں گی' اور باجرے کی روٹیاں اور چھاچھ کی لٹلیا لے کر اپنے گھر والے کے پاس کھیتوں میں جاؤں گی' یہی وہ پگڈنڈی ہے جہاں سے میرا اور تمہارا راستہ ہمیشہ کے لئے الگ ہوتا ہے۔

اور پرکاش جو باغیانہ خیالات رکھتا تھا۔ اپنے دل میں کہنے لگا' ٹھیک ہے بنتو' اس میں میرا یا تمہارا کوئی قصور نہیں' یہ سماج کا قصور ہے اس زندگی میں اب کوئی خالص مرد یا عورت نہیں' بھائی' بہن' خاوند' بیوی' بھانجا' بھتیجی' ماموں' پھوپھی اور خالہ ہیں لیکن ایسا کوئی نہیں جو اپنے آپ کو مرد یا عورت کہے۔ کیسی عجیب بات ہے۔

نوجوان عورت آہستہ سے پگڈنڈی پر مڑ گئی' اس کی ہلکے سبز رنگ کی قمیص پر روپہلی کناری دھوپ میں چمک رہی تھی۔

پرکاش نے دل میں کہا خدا حافظ' خدا حافظ اس لئے کہ ہم انسان ہیں۔ لیکن اگر ہم انسان نہ ہوتے بلکہ کبوتر یا چڑیا...... تو...... اور پرکاش کے شاعرانہ تخیل نے دیکھا کہ وہ دونوں کبوتر بن گئے اور اپنے سفید پر پھیلائے ہوئے اڑے جا رہے ہیں۔ نڈر' بے باک' خوش' نہیں وہ چڑیوں کا ایک جوڑا تھے اور ایک دوسرے سے بھاگتے ہوئے' ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے' ایک دوسرے پر جھپٹتے ہوئے اڑے جا رہے تھے' سورج مغرب میں غروب ہو رہا تھا اور کیکروں پہ پیلے پیلے پھول کھلے ہوئے تھے۔ مغربی آسمان پہ شفق کی سرخی تھی اور سطح زمین پر ایک سنہری دھند' کیکر کی تپلی' گھنی اور خاردار ٹہنیوں کے بیچ میں سورج کی کرنوں نے ایک زریں گھونسلا بن دیا تھا۔

بنتو اڑ کر گھونسلے میں جا بیٹھی' پر پھیلائے ہوئے پرکاش کی طرف دیکھنے لگی اور چہکنے لگی "چ - چ - چوں چوں" پرکاش نے اپنی چونچ اس کی چونچ سے ملا دی اور کیکر کے بہت سے پیلے پیلے پھول ان کے پروں پر گر پڑے۔ یکایک رجب علی بولا "یہ پسٹن کام نہیں کرتا۔"

محور

سری پور کا قصبہ دریائے بیاس کے کنارے واقع ہے' یہ قصبہ کسی زمانے میں ایک اچھا خاصا شہر تھا۔ اسے سکھوں کے ایک مقدس گورو نے چند اونچے ٹیلوں پر بسایا تھا لیکن اونچے ٹیلوں پر آہستہ آہستہ دریا کی لہریں چھا گئیں پھر گیہوں کی گندم ہو گئی اور اونچی اونچی حویلیاں کھنڈر بن کر رہ گئیں' وقت' مذہب کا بھی پاس نہیں کرتا۔ چنانچہ سری پور کا مقدس شہر امتداد زمانہ سے ایک معمولی سا قصبہ بن کر رہ گیا۔ ایک چھوٹا سا بازار تھا جہاں اکثر دکانوں پر حقہ گڑگڑایا جا رہا تھا یا تاش کھیلی جا رہی تھی۔ نحیف اور رادھ موئے سے کتے بازار کی نالیوں میں لیٹے ہوئے تھے اور دو تین آوارہ گدھے اپنے لمبے لمبے کان ہلاتے بازار کی رونق دیکھتے ہوئے جا رہے تھے۔ کیونکہ آج بازار میں دو رویہ رنگ برنگ کی جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ یہ جھنڈیاں بازار کے پہلے دروازے سے شروع ہو کر جہاں لاری کا اڈہ تھا' لالہ خودی رام کے گھر تک لگی ہوئی تھیں جو ایک چھوٹی سی جھیل کے قریب واقع تھا' یہ جھیل اس زمانے میں ایک اونچا ٹیلہ تھی۔ اب دریائے بیاس کے پانی سے بھری ہوئی تھی۔ پرکاش چند نے سوچا اس قصبے میں کتنا امن ہے۔ اچھا تو یہ دیہات ہے۔ یہاں تو لوگوں کو

کوئی کام نہیں۔ زندگی کی رفتار کتنی مدھم اور سکون آمیز ہے۔ دریائے بیاس کے پانی کی طرح، یہاں آدمی چاہے دن بھر تاش کھیلے، چاہے چرخہ چلائے، بہر حال چرخہ تاش سے بہتر ہے۔ اس نے دل ہی دل میں گاندھی جی کی فراستِ طبع کی داد دی۔ چند ایک لوگوں نے اسے گھور کر دیکھا، سوشیلا اور لیلا اس کے ساتھ ساتھ لگی چلی آ رہی تھیں۔ ان کے بھڑکیلے لباس جو بازار میں لگی ہوئی جھنڈیوں کی طرح رنگین اور جاذبِ نظر تھے کتنوں ہی کی نظروں کو خیرہ کرتے رہے۔ ایک دکان پر ایک گاڑی بان چھکڑے پر سے بنولے کی بوریاں اتار کر رکھ رہا تھا، وہ انہیں دیکھ کر بنولے کی بوریاں اتارنا بھول گیا، پھر اس کے لبوں پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی اور اس کا چہرہ جیسے کسی الجھن سے فوراً صاف ہو گیا۔ جب سوشیلا، لیلا اور پرکاش چند اس کے قریب سے گذرے تو گاڑیبان بڑے مزے سے گنگنایا۔

اک بنگلہ بنے نیارا ....

اور پھر بنولے کی بوریاں دکان پر پھینکنے لگا، سوشیلا اور لیلا کے چہرے شرم سے گلابی ہو گئے اور پرکاش چند نے سوچا کہ ہندوستانی غریب طبقوں میں بھی شخصی جائداد کی حس کتنی تیز اور شدید ہے۔ اس بنگلے کی ہوس نے ہمیں بزدل، غلام اور خوشامدی بنا دیا ہے۔ ایک ہندوستانی کی جنت تین چیزوں پر مشتمل ہے۔ بیوی، بچہ اور بنگلہ۔ لالہ خوری رام کے مکان کے دروازے پر بینڈ بج رہا تھا۔ پرکاش چند نے لالہ خوری رام کے پاؤں چھوئے اور سوشیلا اور لیلا نے ایک کونے میں سمٹ کر ہاتھ جوڑے۔ لالہ خوری رام کا لڑکا ہیرا بھاگتا اندر سے آیا اور پرکاش چند کے گلے سے لگ گیا۔ وہ دونوں چار سال کے بعد ایک دوسرے سے ملے تھے۔ ہیرا اب پہلے سے لمبا، مضبوط اور جوان ہو گیا تھا، چین کے دور دراز ملک میں رہ کر اس نے دنیا کے بہت سے نشیب و فراز دیکھ لئے تھے۔ اس کے لہجے میں خود داری تھی اور بلند حوصلگی اور خود اعتمادی، جب وہ سری پور سے گیا تھا تو بالکل ایک لڑکا سا تھا، چہرے پر خط بھی نہ آیا تھا اور بالکل کالج کے لڑکوں کی طرح باتیں کیا کرتا تھا اور اب ...... اب پرکاش چند کو افسوس ہوا کہ وہ خود کیوں اتنے عرصے تک لاہور کے کنوئیں کا مینڈک بنا رہا، ماحول کا اثر، تن آسانی یا ایک جبلی کمزوری۔ لالہ خوری رام کے گھر کے اندر پرکاش چند کی خالاؤں، پھوپھیوں، بھانجیوں، بھتیجیوں اور رشتے کی بہنوں کا شمار نہ تھا، انہوں نے سوشیلا اور لیلا کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور پانچ منٹ میں ان کے پاؤں سے سٹریم لائن سینڈلوں سے لے کر کان کے آویزوں تک کو پرکھ کر رکھ دیا۔ بالاتفاق رائے پاس ہوا کہ سوشیلا اور لیلا، دونوں لاہور کی میمیں STREAM LINE ہیں۔ سوشیلا کے لمبے لمبے ناخن دیکھ کر کئی لڑکیوں کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ ناخنوں پر سرخ رنگ کا پالش کیا گیا تھا جس کی یاقوتی چمک کے آگے حنا کی رنگت ماند ہو گئی تھی۔ اری ..... بہن یہ کیا چیز ہے؟ کہاں سے آتی ہے؟ پتہ، پتہ، پتہ! لکھ دو پتہ، لیلا کا چہرہ غصے سے بیر بہوٹی ہوا جا رہا تھا، اس کے طلائی آویزوں کی طرف اب کسی کی توجہ نہیں رہی تھی۔ یہ چڑیلیں چلا چلا کر سوشیلا کے ناخنوں کو سراہ رہی تھیں۔ لیلا کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے مردار بلیاں کہیں کی۔ اگر مجھے پتہ ہوتا ...... آنگن میں چارپائی پر پرکاش اور ہیرا بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ہیرا کی ماں مسکراتی ہوئی ان کی طرف بڑھی اس نے ریشمیں اور پھولدار شلوار پہن رکھی تھی۔ زعفرانی قمیص اور سر پر سنہری کنارے والا سرخ دوپٹہ تھا۔ دونوں ہاتھوں میں دو انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں۔ ہیرا کی ماں نے مسکراتے ہوئے پرکاش کی ماں کا پرکاش وتی کی شادی پر نہ آنے کا شکوہ کیا۔ ہیرا نے بھی جھوٹ موٹ غصے کا اظہار کیا اور پرکاش نے بھی کچھ اس طرح سر جھکا کر شرمساری اور ندامت دکھائی کہ ہر ایک کی عزت رہ گئی اور کسی کی بات بگڑنے نہ پائی۔ کیونکہ اس بات کا تو ہر ایک کو پتہ تھا کہ اگر شادی پر خاندان کے تمام قرابت دار اپنے گھر کے تمام لوگوں کو لے کر چلے آئیں تو جہاں جنگل میں منگل ہو سکتا ہے وہاں منگل ہونے والے جنگل میں آگ بھی لگ سکتی ہے یعنی ایک پوری بارات گھر کے دروازے کے اندر ہوگی اور ایک باہر، اور اگرچہ بعض پرانے خیالات کے لوگوں کے نزدیک لطف کی بات بھی یہی ہے کہ دونوں طرف جو آگ برابر لگی ہوئی، لیکن ہیرا کی ماں ان لوگوں میں سے نہیں تھی، اس لئے جب پرکاش نے معذرت پیش کی کہ آخر گھر میں کسی کا رہنا ضروری تھا تو وہ خوش ہو گئی اور اس کے سر کی بلائیں لے کر وہاں سے چلی گئی۔ پرکاش نے ہیرا سے پوچھا کہ چین کیسا ملک ہے اور ہیرا جواب دینے ہی کو تھا کہ رک گیا، کیونکہ ایک حسین شرمیلی لڑکی جس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں کنوارپنے کی نازک پاکیزگی کانپ رہی تھی، ان کی طرف

جھکتے ہوئے قدموں سے بڑھی چلی آ رہی تھی اور جب وہ بالکل ہی قریب آگئی تو بیر کے لب کانپنے لگے اور لڑکی کے رخسار گلاب کے پھول بن گئے۔ اس نے اپنی آنکھوں کو پلکوں کے پردوں میں چھپا لیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں لسی کے دو گلاس تھام رکھے تھے وہ ان کے قریب آکر کھڑی ہو گئی اور منہ سے کچھ نہ بولی۔ بیر نے آہستہ سے جیسے وہ گلاب کی کسی پتی کو چھو رہا ہو اس کے ہاتھوں سے گلاس لے لئے اور ایک گلاس پرکاش کے ہاتھ میں دے کر دوسرا اپنے منہ تک لے گیا۔ لڑکی اب بھی خاموش تھی۔ لیکن پرکاش نے ایک لمحے کے لئے اس کی پلکیں اٹھتی ہوئی دیکھیں۔ ایک لمحے کے لئے اس نے اس لڑکی کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور پرکاش کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ آہ، یہ دل کی دھڑکن۔ اس نے سوچا "کبھی کبھی کسی خوبصورت چیز کو دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگتا ہے، رکے ہوئے خون میں طوفانی ریلے آجاتے ہیں۔ شاید ابھی حسن کا احساس پوری طرح مرا نہیں" دفتر کی میز نے ابھی اس کی روح کو کچل نہیں دیا تھا۔

کچھ دیر کے بعد پرکاش نے پوچھا "یہ کون تھی؟"

بیر نے کہا "چین بہت اچھا ملک ہے۔"

پرکاش نے کہا "میرا اشارہ اس لڑکی کی طرف تھا جو لسی کے دو گلاس ہمارے لئے لائی تھی۔"

بیر نے کہا "چین کے لوگ افیم کھانے اور چینی کے برتن بنانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کی زندگی....."

پرکاش چارپائی سے اٹھ بیٹھا، کہنے لگا "بھاڑ میں جائے ان کی زندگی۔ ہماری زندگی کب ان سے بہتر ہے اور تم یہاں چینیوں کے داؤں ہم پر آزمانا چاہتے ہو۔ ذرا سنبھل کر چلنا یہ شنگھائی نہیں۔ سری پور ہے چینیوں کا خدا ہمارا خدا نہیں، ہماری زندگیاں چینی کے برتنوں کی طرح خوبصورت نہیں بلکہ مٹی کے برتنوں کی طرح میلی اور ناصاف ہیں لیکن میں کس گدھے سے بات کر رہا ہوں۔ اچھا میں کوٹھے پر چلتا ہوں۔ ذرا پرکاش وتی سے دو میٹھی میٹھی گالیاں سن آؤں۔"

بیر نے کہا "پرکاش وتی سے مل کر باہر بیٹھک میں آجانا۔ تمہیں اپنے چند نئے دوستوں سے ملاؤں گا۔"

پرکاش وتی دوسری منزل پر ایک کمرے کے کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ پرکاش کا خیال تھا کہ وہ بہت سی لڑکیوں میں گھری ہو گی اور اسے دو چار میٹھی میٹھی گالیاں سننے کا موقع کبھی نہیں ملے گا لیکن حسن اتفاق سے وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ پرکاش بہت خوش ہوا، اس نے پرکاش وتی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی حنائی انگلیوں کو زور زور سے مسلنے لگا۔ لیکن پرکاش وتی بولی نہیں۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ سے پرکاش وتی کی ٹھوڑی کو اونچا کیا اور کہنے لگا "شکنتی بہن! تمہارا بھائی تمہیں بدھائی دینے آیا ہے اور تم ہو کہ اپنی آنکھوں میں آنسو روکے بیٹھی ہو۔"

اور پرکاش وتی سچ مچ اپنی آنکھوں میں آنسو روکے بیٹھی تھی۔ یہ بات سنتے ہی وہ ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ پرکاش بولا "تو تو کہتی تھی کہ میں بی۔ اے پاس کر کے نوکری کروں گی یا کہانیاں لکھوں گی اور شاعری کروں گی اب بتا، یہاں تو تجھے کسی نے گیارھویں جماعت سے آگے نہیں پڑھایا اور تو تو شاید فلم ایکٹرس بننا چاہتی تھی، اب وہ اداکاری کے ولولے کہاں گئے؟ تیرے وہ سونے کے تمغے جو تو نے جھاوڑیالہ میں ناچ ناچ کر حاصل کئے تھے اب کہاں ہیں؟"

پرکاش وتی نے رو کر کہا "اسی لئے تم مجھے جلانے آئے ہو۔ کیا میں اب تم سے بھی ہمدردی کی امید نہ رکھوں؟"

پرکاش چپ رہا اور چند لمحوں تک آنسوؤں کی ان ورندیوں کی طرف تکتا رہا جو اپنی روانی میں زندگی کے پورے نہ ہونے والے سپنوں کو بہائے لئے جا رہی تھیں۔ اسے پرکاش وتی سے بہت محبت تھی۔ پرکاش وتی اسے بہنوں کی طرح عزیز تھی، شاید بہنوں سے بھی زیادہ۔ کیونکہ سارے خاندان میں وہی ایک لڑکی تھی جو اس کی طرح ادبی مذاق رکھتی تھی۔ اسے پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ بہت اچھا گاتی تھی اور تیتری کی طرح ناچ سکتی تھی۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ پرکاش وتی کی شادی کسی اچھے آدمی سے ہو اس کی مراد ایسے آدمی سے تھی جسے عام لوگ جوان کہتے ہیں۔ مثلاً ایک خوبصورت طرح دار نوجوان جسے اچھے لباس کا شوق ہو، جو گانے اور ناچنے کا شوقین ہو جو حسن کی قدر کر سکے، پڑھا لکھا ہو اور کبھی کبھی کوئی شعر گنگنا سکے۔ غرض کہ ایک ایسا آدمی

جو ہندوؤں کے متوسط طبقے کی مستورات میں بہ نظر حقارت دیکھا جاتا ہو اور اسے یہ بھی پتہ تھا کہ پرکاش وتی کی بھی یہی مرضی تھی۔ لیکن نہ تو پرکاش وتی میں اپنی مرضی برتنے کی ہمت تھی اور نہ اس کے ماں باپ کا تخیل اس قدر بلند تھا۔ وہ "بے حیا" نہ تھے۔ انہوں نے کبھی سینما تک نہیں دیکھا تھا اور زندگی بھر اپنے بالوں میں آملے کا تیل درجہ اول نہیں لگایا تھا' نہ کبھی ٹیڑھی مانگ نکالی تھی۔ ان کے وقت میں سکولوں میں ناچ اور گانے نہیں سکھائے جاتے تھے بلکہ یوگ باشسشٹ اور استتی باچن پڑھائے جاتے تھے۔ پھر بھی انہوں نے اپنی لڑکی کو گیارھویں تک پڑھایا تھا۔ اسے سری پور کے گاؤں سے دور ایک دوسرے شہر کے مہا ودیالہ میں داخل کرایا تھا۔ لیکن شادی کے معاملہ میں وہ بے حیائی نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے سوچ بچار کر کے اور اچھی طرح دیکھ بھال کر ایک امیر گھرانے کا لڑکا پسند کیا تھا۔ لڑکے کے ماں باپ امرت سر کے مشہور ساہوکار تھے اور تھوک ہلدی بیچتے تھے۔ ہلدی بیچ بیچ کر انہوں نے امرت سر میں لاکھوں کی جائداد بنالی تھی۔ انہوں نے لڑکی کے لئے نہایت اچھا بر ڈھونڈھا تھا۔ کیونکہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ ازدواجی زندگی کی اصلی مسرت چند شعروں پر نہیں بلکہ ہلدی کی بے شمار گانٹھوں پہ قائم ہے۔ عورتوں کا کام پڑھنا لکھنا اور ناچنا نہیں۔ بچے جننا اور برتن مانجھنا ہے۔ زندگی کا اصلی لطف برتن صاف کرنے میں ہے، شعر کہنے میں نہیں۔ خیالی دنیا عملی دنیا سے بہت الگ ہے۔ بے وقوف پرکاش وتی کے آنسوؤں کو دیکھ کر پرکاش کو بہت غصہ آیا۔ کہنے لگا "یہ لاکھوں کی جائداد کی مالک بن رہی ہو اور اب یوں ٹسوے بہا رہی ہو۔ شرم نہیں آتی تمہیں؟"

پرکاش وتی روتے روتے ہنس پڑی۔ کہنے لگی "مجھے اس طرح تنگ کرنے میں تمہیں کیا فائدہ ہے؟ جاؤ ہٹو!"

پرکاش نے کہا "ہم نہیں ہٹیں گے، کوئی بات ہے بھلا یہ بھی؟ یوں آنسو بہا کر ہم پر رعب جمایا جا رہا ہے۔ اے ہلدی بیچنے والے کی ہونے والی بیوی! ہم تم سے ایک بات پوچھنا چاہتے ہیں۔ جواب دو گی؟"

پرکاش وتی نے کہا "تم لاکھ بار پوچھو۔ ہم تب بھی نہیں بتائیں گے۔"

پرکاش نے سنجیدہ ہو کر کہا "دیکھو جب تک تم خود نہ اڑو، اپنے پر نہ پھڑپھڑاؤ یہ زمین تمہیں اڑنے نہ دے گی۔"

پرکاش وتی نے کہا "کوئی پر پھڑپھڑائے بھی تو اڑ کر کہاں جائے؟ یہ بھی تم نے کبھی سوچا ہے!"

اس کی آواز پھر بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔

اور پرکاش چپ ہو گیا۔ لاجواب ہو گیا۔ ہنسی ہنسی میں اس نے پرکاش وتی کے دل کے درد کو پا لیا تھا۔ اسے ہمدردی بھی تھی لیکن یہ بھی خیال تھا کہ اگر پرکاش وتی چاہتی تو اپنی مرضی کا بر ڈھونڈھ سکتی تھی' یا اپنے ماں باپ کو مجبور کر سکتی تھی۔ لیکن پرکاش وتی کے دو بے ساختہ فقروں نے اسے احساس دلا دیا کہ یہ خیال کتنا غلط تھا اور عملی طور پر کس قدر ناممکن' اندھی سماج کے قفس میں پر پھڑپھڑانا بے سود ہے۔ اس سے یہی بہتر ہے کہ مرد ہلدی بیچے اور عورت ہلدی بیچنے والے کی وفادار بیوی بن کر برتن صاف کرے۔ اس نے پرکاش وتی کے آنسو پونچھ ڈالے اور پرکاش وتی نے اس سے کہا کہ اگر تم شادی میں نہ آتے تو شاید میں مر ہی جاتی۔ مجھ میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ اس خوفناک شادی کے تمام مراحل سے ایک انجان اور شرمیلی دلہن کی طرح گذر جاؤں۔ اب تمہارے ہوتے ہوئے میری ہمت بندھ جائے گی۔

پرکاش نے کہا "تم تو جھوٹ بھی اس طرح بولتی ہو کہ بالکل سچ معلوم ہوتا ہے۔" پھر ہنس کر کہنے لگا "آخر ایک دکاندار کی بیوی ہونا؟"

پرکاش وتی نے بھویں اوپر چڑھائیں اور کچھ کہنے ہی کو تھی کہ ایک دبلا پتلا سا لڑکا اندر کمرے میں داخل ہوا، کہنے لگا "پرکاش جی کو سائیں جی کے پتا جی بلاتے ہیں"

پرکاش نے پوچھا "سائیں جی کون ہیں؟"

پرکاش وتی بولی "یہ لڑکا اپنے آپ کو سائیں جی کہتا ہے، پاگل ہے' اس کا باپ پٹواری ہے۔"

پرکاش نے پوچھا "سائیں جی کے پتا جی کہاں ہیں؟"

لڑکے نے کہا: "باہر بیٹھک میں بیر کے پاس بیٹھے ہیں۔"

پرکاش نے کہا: "اچھا تو میں چلتا ہوں۔ اب تم بھی سہیلیوں میں بیٹھو، ہنسو، کھیلو، آخر یہ شادی ہے تمہاری۔"

پرکاش وتی پاؤں کے انگوٹھے سے مٹی کریدنے لگی۔

باہر بیٹھک میں بہت سے آدمی بیٹھے ہوئے تھے اور بیر نے پرکاش کا تعارف سب سے کرایا۔ چونی لال قصبے بھر میں ہاکی کا زبردست کھلاڑی اور بیر کا بچپن کا دوست، لالہ سیتا رام پٹواری، لمبا، دبلا، پتلا، ناک پر عینک اور عینک کے پیچھے دو اداس سی آنکھیں، ایسی آنکھیں جو اکثر پٹواریوں کے پاس نہیں ہوتیں۔ خوش رو متین برجیندر، بیر کا بہنوئی جو ڈاک خانے میں ایک ممتاز عہدے پر ملازم تھا۔ ہر وقت ہنسنے والا لبھا سنگھ قصبے کے سیٹھ کا لڑکا، دھن سیال جس کا باپ بمبئی کے ایک زبردست تاجر کا منیم تھا اور رام لال، منگت رائے، پھیرو، رامو، ڈھیرو اور گاؤں کے وہ تمام معزز آدمی جن کے بغیر کوئی شادی کامیاب نہیں ہو سکتی، جن کی صورتیں منحوس ہوتی ہیں، کپڑے غلیظ اور داڑھیاں الجھی ہوئی، لیکن جن کا دل سونے کا ہوتا ہے اور ہاتھ لوہے کی طرح مضبوط، یہ وہ نیک دل فرشتے ہوتے ہیں جو تین چار سو آدمیوں کی بارات کو چٹکیوں میں بھگتا دیتے ہیں اور جب گھی میں پوریاں تلنے بیٹھتے ہیں تو گھنٹوں بغیر حقے کی مدد کے، تلتے ہی رہتے ہیں اور جب کڑاہیاں مانجھنے پر آ جائیں تو بڑے بڑے جماداری جمیعدوں کو مات کر دیتے ہیں۔ یہ آدمی غریب ہوتے ہیں لیکن شادی کے دنوں میں ان کی سماجی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے ان دنوں وہ چاچا، ماموں، تایا کے معزز القاب سے بلائے جاتے ہیں۔ شادی کے رسم و رواج سے یہ لوگ بہت واقف ہوتے ہیں اور جب عورتیں گھنٹوں جھگڑنے کے بعد بھی یہ فیصلہ نہ کر سکیں کہ جب دولہا آئے تو دروازے کی چوکھٹ پر سرسوں کا تیل ڈالنا چاہیئے یا زعفرانی گھی تو چاچا پھیرو ایک دم پانی کے گلاس میں چند چاول اور زعفران کے تنکے ڈال کر اسے لنڈھا دیں گے۔ یہ لو۔ نہ تیل کا نقصان ہوا اور نہ گھی خراب ہوا، اور رسم بھی پوری ہو گئی۔ انہی باتوں سے تو یہ لوگ شادی بیاہ کے دنوں میں پوجے جاتے ہیں۔

برجیندر نے جس سے بیر کی بڑی بہن بیاہی ہوئی تھی، پرکاش سے پوچھا: "آپ بھاپا جی، لاہور میں کیا کام کرتے ہیں؟"

بھاپا جی! پرکاش نے سوچا۔ یہ صاحب مجھ سے کئی سال بڑے ہوں گے۔ لیکن پھر بھی مجھے بڑا بھائی کہہ کر پکارنے پر مصر ہیں اور ایک انہی پر ہی کیا موقوف ہے...... اور پھر پرکاش کو وہ تمام واقعات اور وہ تمام شادیاں اور دیگر تقاریب یاد آئیں جہاں بہت سے نئے ملنے والوں نے اسے جھٹ بڑا بھائی بنا لیا تھا۔ شاید یہ اس کی گنجی چندیا کا اثر تھا یا اس کے چہرے کی کیفیت کا جس سے ادھیڑ پن ٹپکتا تھا۔ لیکن اس میں اس کا کیا قصور تھا۔ پرانے خیالات کی یاد بہت تلخ تھی جس نے اسے قبل از وقت معمر کر دیا تھا۔ لیکن موجودہ زندگی بھی چنداں خوشگوار نہ تھی، کنبے کا پیٹ بھرنے اور روزی کمانے کے بکھیڑوں نے اس کی روح کو کچل دیا تھا اور اس کے ضمیر اور اس کے اخلاق کو نیم مردہ کر دیا تھا۔ ہاں کبھی کبھی وہ سوئی ہوئی خلش بیدار ہو جاتی تھی اور پھر اس کی ٹیس سے متاثر ہو کر اس کا جی چاہتا کہ وہ کپڑے پھاڑ کر نکل جائے اور چیخ چیخ کر قدرت اور سماج کے وحشیانہ مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے۔ لیکن یہ طوفان ہمیشہ دل کی چار دیواری تک ہی محدود رہتا۔ اس کا اثر صرف اس کی اپنی ذات پر ہی تھا اور جس طرح طوفان ساحل کی دیوار کو توڑ پھوڑ ڈالتا ہے۔ اسی طرح اس کی اندرونی زندگی بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی، اس کی جوانی راکھ کا ایک ڈھیر اور روح ایک ٹھٹھری ہوئی لاش، اس لئے اب جب کوئی اسے بھاپا جی کہہ دیتا تو اسے چنداں حیرت نہ ہوتی اور وہ اپنے دل کی اداسی کو اپنے لبوں کی مسکراہٹ میں چھپا لیتا اور اپنے مخاطب کی شوخ کلامی کی داد دیتا جس نے ایک لمحے میں اسے بڑا بھائی کہہ کر اپنے آپ کو جوان بنا لیا تھا۔

پرکاش نے کہا: "میں کوآپریٹو بنک میں کلرک ہوں۔"

"کیا تنخواہ ملتی ہے؟"

"پچھتر روپے!"

"پچھتر روپے؟" پٹواری نے کہا "تب تو مزے میں ہیں آپ بھائی صاحب!"

"جی! آپ کی عنایت ہے۔"

برتاسنگھ ہنسنے لگا۔ گاؤں کے سیٹھ کا لڑکا ہر وقت ہنستا رہتا تھا۔ پرکاش کو اس کا ہنسنا بہت بُرا لگا لیکن اس ہنسنے میں کوئی بجائی نہ تھی۔ یہ زندگی اور بے فکری کا ایک مسلسل قہقہہ تھا جس میں پرکاش کی پریشانی لگا ہوں کو طنز کے تیر و نشتر چھپے ہوئے نظر آئے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد برتاسنگھ نے ہنستے ہوئے کہا "پٹواری جی! کوئی گیت سنائیے۔"

پرکاش نے پٹواری کی اداس آنکھوں سے پوچھا "کیا تمہیں گیت بھی یاد ہیں؟"

پٹواری نے برتاسنگھ سے کہا "بھئی، اس وقت جی نہیں چاہتا۔"

پرکاش نے پٹواری کی اُداس آنکھوں کی اُداسی کو دیکھ کر کہا "بیشک تمہیں گانا آتا ہے۔ تمہیں کئی گیت یاد ہوں گے، کئی گیت، جو تمہاری اُداسی نے خود بنائے، جو تمہارے دل کے تاروں سے نکلے اور جو کئی جنموں تک تمہاری رُوح کے ویرانے میں گونجتے رہیں گے، لیکن کیا ہوا تمہیں، یہ اُداسی تم نے کہاں سے پائی؟"

پٹواری نے جیسے پرکاش کے دل کی بات سُن لی، کہنے لگا "بھئی آج تو جی نہیں چاہتا۔ سائیں کی حالت ہر روز بگڑ جاتی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔"

چاچا پھیرو نے حقہ آگے کر کے کہا "حقہ پیجئے لالہ جی۔ ذرا دیکھئے اس وقت تو خوب چل رہا ہے۔"

پرکاش نے پوچھا "لالہ جی! سائیں آپ کا لڑکا ہے؟ بڑا عجیب سا لڑکا ہے۔"

"عجیب؟" پٹواری نے آہستہ سے کہا "وہ تو پاگل ہے جی، کیا بتاؤں، اس پر اکثر جنون کی کیفیت طاری رہتی ہے اور اول جلول بکنے لگتا ہے، ہمارے ہاں مسلمان تو اسے فقیر سمجھتے ہیں اور اس کے منہ سے نکلی ہوئی بات کو پتھر کی لکیر، اور قصبے کی سب عورتیں سمجھتی ہیں کہ وہ کوئی بڑا عامل ہے اور ہر مرض کا علاج جانتا ہے اور یہ شیطان بھی جسے چٹکی اٹھا کر دے دیتا ہے ایشور کی مرضی سے وہ بالکل بھلا چنگا ہو جاتا ہے۔"

"سچ؟"

چونی لال نے کہا "ہاں میرا چھوٹا بھائی دس روز بخار میں مبتلا رہا۔ حکیم صاحب نے بہتیری کوشش کی، لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ یہ سائیں گلی میں کھیل رہا تھا میں اسے بلا لایا۔ اس نے دیکھتے ہی کہا "بھائی اچھا ہو جائے گا۔ بھائی ٹھیک ہو جائے گا۔ کوئی فکر نہیں۔ کوئی فکر نہیں ——" اور دوسرے دن میرے چھوٹے بھائی کا بخار اتر گیا۔"

"کمال ہے۔" پرکاش نے حیرانی سے کہا۔

پٹواری نے کہا "یہ مسلمانوں کے گھروں میں جا کر سب کچھ کھا پی آتا ہے۔ اسے ان باتوں کی بالکل تمیز نہیں۔ ڈپٹی صاحب اس سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ جب ڈپٹی صاحب کا لڑکا قتل ہونے کو تھا اس نے انہیں پہلے ہی بتا دیا تھا۔"

"بڑے تعجب کی بات ہے۔" پرکاش نے کہا۔

پٹواری بولا "اس سے پہلے میرے تین لڑکے تھے، وہ سب مر گئے۔ اب یہی بچہ میری آنکھوں کا نور ہے۔ اب میں کسی سے رشوت بھی نہیں لیتا۔ کسی کو بے جا تنگ نہیں کرتا۔ لیکن بھگوان کو نہ جانے کیا منظور ہے۔ پچھلے سال اس کا ایک چھوٹا بھائی پیدا ہوا تھا۔ اس نے ہمیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میرا بھائی آئے گا۔ پھر اس لڑکے کی پیدائش کے چند ماہ بعد اس نے ایک دن اپنی ماں سے کہا کہ آج میرے بھائی کی اچھی طرح حفاظت کرنا۔ اسے

باہر لے کر نہ پھرنا اور نہ اسے کوٹھے پر لے جانا' اس کی ماں نے ایسا ہی کیا۔"

وحن سیال نے بات پوری کرتے ہوئے کہا "ہاں' اسی دن دو چھوٹے چھوٹے لڑکے کوٹھوں پر گر کر مر گئے۔"

پٹواری نے کہا "اور وہ چھوٹا بچہ بیمار ہوا تو ہم نے سائیں سے کئی بار پوچھا لیکن اس کم بخت نے زبان تک نہ کھولی۔ آخری رات' وہ رات مجھے اچھی طرح یاد ہے' سائیں کی ماں سو گئی تھی۔ چھوٹا بچہ بھی اس کی گود میں لیٹا سو ر سائیں بھی اپنی چھوٹی چارپائی پر پڑا سو رہا تھا۔ اس رات مجھے نہ جانے کیوں نیند نہ آئی اور میں بستر پر پڑا بہت دیر تک گنگناتا رہا۔

بزار وکیندا لاچا
مٹی نہ پھرول جوگیا
مٹی نہ ڈول جوگیا
تیرا لبھنا نئیں لال گواچا
مٹی نہ پھرول جوگیا

یکایک سائیں نے چیخ ماری اور اٹھ کر کہنے لگا "لے گئے' لے گئے میرے بھائی کو لے گئے۔" میں گھبرا کر بستر کی طرف گیا جہاں بچہ سویا پڑا تھا۔ ہاتھ لگا کر دیکھا۔ ہائے میرا بچہ مردہ اور بے جان اپنی ماں کی گود میں لیٹا ہو بے خبر سوئی پڑی تھی اور اس کے لال کو رات کے اندھیارے میں یم راج کے دوت اٹھا کر لے گئے تھے.......۔"

شام کے وقت بیر کا بہنوئی برجندر اور پرکاش بیاس کے کنارے سیر کرنے کو گئے۔ ریتلے ٹیلوں پر کہیں کہیں کیکر کے درخت اُگے ہوئے تھے اور ان سے نیچے اتر کر تھے لیکن فصل کاٹی جا چکی تھی' اس لئے بالکل روکھے سوکھے دکھائی دے رہے تھے۔ دریا کے کنارے کہیں کہیں سرکنڈے اُگ رہے تھے اور کہیں کہیں کنڈے کے یاں' مرغابیوں کا ایک جھنڈ مغرب کی طرف پر پھیلائے جا رہا تھا۔ کنارے پر دو تین مچھیرے بندھے ہوئے تھے۔ ہوا رکی ہوئی معلوم ہوں ں اور فضا میں سناٹا تھا۔ کہیں کہیں کوئی پرندہ چیخ اٹھتا اور دریا کی سطح پر دور ایک کشتی چلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ پرکاش نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور حدِ نظر پر اس کی نگاہیں بڑھتے ہوئے اندھیرے میں مل گئیں۔ اس منظر میں کہیں بھی کوئی ایسا نقطہ نہ تھا۔ جسے وہ دلکش یا جاذبِ نظر کہہ سکتا۔ ایک عجیب سی غمناکی ایک عجیب سی ویرانی تھی جسے محسوس کر کے اس کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ پرکاش نے برجندر کی طرف دیکھا لیکن وہ خوش نصیب آدمی اپنے گرد و نواح کے ماحول سے بے خبر اور بے نیاز مزے سے داتن کئے جاتا تھا۔ داتن کرتے کرتے کہنے لگا "بھائی صاحب آپ ذرا بیر کو سمجھائیں نا۔"

"کیوں' کیا بات ہے؟"

"بات یہ ہے کہ لڑکا یوں تو سمجھ دار ہے' کماؤ بھی ہے لیکن روپے کی قدر نہیں کرتا۔"

"وہ کس طرح' میرے خیال میں تو....."

برجندر نے بات کاٹ کر کہا "یہ آپ نہیں جانتے۔ اول تو وہ دوستوں کو بہت کھلاتا پلاتا ہے اور پھر اس شادی ہی تو میں نے دیکھا ہے وہ اندھا دھند روپیہ خرچ کر رہا ہے۔ جہاں دو روپے میں کام ہو سکتا ہے وہاں یہ دس روپے خرچ کر دیتا ہے۔ بھلا اس طرح بھی کبھی گھر کے کام چلتے ہیں اور پھر جب سے یہ چین سے واپس آیا ہے ہر وقت گھر والوں کو جھڑکیاں دیتا رہتا ہے اور کسی بزرگ کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ یہ بات اچھی نہیں۔ کیا ہوا اگر وہ پچاس سو روپیہ مہینہ کما لیتا ہے۔ آخر اس کے ماں باپ ہی نے تو اسے پڑھایا ہے۔ اگر انہیں کا کہنا نہ مانے تو اس سے

بڑھ کر احسان فراموش اور کون ہوگا۔"

"بے شک، بے شک!" پرکاش نے اپنی ناک کھجاتے ہوئے کہا۔

"اب شادی کے معاملے ہی کو لیجئے۔ پرکاش وتی کی شادی نہیں بلکہ اس کی اپنی۔ اس کی ماں چاہتی ہے کہ وہ اب اس کی منگنی کر دے اور اس سال بیاہ بھی دے لیکن اسے دیکھیو یہ مانتا ہی نہیں۔ لالہ لبھا کھال کے ہاں سے ناطہ ملتا ہے۔ لڑکی سیانی ہے، گھر کے کام کاج سے واقف، سوشیل، سمجھدار، سینا پرونا جانتی ہے، خط پڑھ لیتی ہے، ماں باپ، بھائی بہنیں کسی میں کوئی نقص نہیں شریف گھرانا ہے۔ کھتری گھر ہے۔ مجانا خاندان ہے۔ امیر آدمی ہیں۔"

"تو یہ مانتا کیوں نہیں؟"

"کہتا ہے لڑکی کشنگنی ہے، سانولا رنگ ہے، آواز بھاری ہے اور اپنی طرف نگاہ ہی نہیں۔ بڑے یوسف ثانی بنے پھرتے ہیں۔ کہتا ہے میں شہر کی لڑکی لاؤں گا جو دسویں پاس ہو اور شعر و شاعری سے مَس رکھتی ہو۔ سنیما کی تصویروں پر بات چیت کر سکے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ بڑا شریف لڑکا تھا۔ اسے خبر نہیں کہ آج کل زمانہ کیسا ہے۔ شریف گھرانے بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ اب پرکاش وتی کو دیکھو۔ گیارھویں پاس کر کے بھی کیا بنا۔ تعلیم عورتوں کے کس کام کی۔ لڑکی تو وہی ہے جو گھر کا کام کاج اچھی طرح جانتی۔ اب ہم اسے کسی بے کار گریجویٹ کے پلّے باندھ دیتے تو بے چاری کی زندگی تلخ ہو جاتی۔ اس وقت تو اسے ان باتوں کی سمجھ نہیں لیکن بعد میں ہمیں دعائیں دے گی۔ پرکاش وتی تو خیر ایک لڑکی ہے وہ ہمارے کہنے سے باہر نہیں جا سکتی لیکن اب بیر کو کون سمجھائے۔ میں نے سوچا بیر آپ کا کہا مانتا ہے آپ سے کہوں گا۔ آپ اسے سمجھا بجھا کر راہِ راست پر لے آئیں تاکہ گھر برباد نہ ہو۔"

اور پرکاش نے کہا وہ اسے ضرور سمجھانے کی کوشش کرے گا۔ لیکن یہ ایک ذرا مشکل سی بات ہوگی۔ کیونکہ شادی زندگی کا محور ہے، اور پھر بیر تو نگھائی کے کابرے COBRET بھی دیکھ چکا ہے اور شاید اسے قرونِ وسطیٰ کی قسم کی شادی پسند نہ آئے۔ لیکن برجندر نے کہا "یہ نہیں۔ آپ ضرور کوشش کریں، میری خاطر سے۔" اور پرکاش نے کہا "اچھا میں آپ کی خاطر سے ضرور کوشش کروں گا۔ لیکن مجھے امید بہت کم ہے۔" برجندر نے کہا "جی نہیں، یہ آپ کیا کہتے ہیں؟ آپ اگر چاہیں تو اسے سمجھا سکتے ہیں۔" بہت دیر تک اسی طرح کی بے معنی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ صرف برجندر دواتن بکھتے کرتے کبھی کبھی زور سے تھوک دیتا۔ دریا کی سطح پر چلتی ہوئی کشتی اب بالکل کنارے کے قریب آگئی تھی۔ اس میں چند کسان بیٹھے تھے جو پورب کے رہنے والے معلوم ہوتے تھے۔ ان کے بچے اور بیویاں اور لڑکیاں بھی ساتھ تھیں۔ وہ نہایت خاموشی سے بیٹھے تھے، تھکے ہوئے تھے، عورتوں کے چہرے پژمردہ تھے اور کسانوں کی آنکھوں میں چمک نہ تھی اور ان کی نگاہوں کی اوٹ میں ناامیدی جھانک رہی تھی۔ پرکاش نے سوچا یہ میرا خیال ہی ہے، میں ہر جگہ اور ہر مقام پر یوں ہی غم کی تلاش کرتا رہتا ہوں۔ ورنہ دراصل یہ معمولی سے چہرے ہیں، عام کسانوں کے، ان کے دلوں میں طمانیت ہے، صبر ہے، یقین ہے، شاید یہ رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے کا دھوکا ہے کہ مجھے ان کی صورتوں میں یاس کی جھلک نظر آتی ہے۔ شاید یہ میرے ہی دل کا عکس ہے، روح کا پرتو ہے، شام کے سناٹے، پھیکی فضا اور سائیں سائیں کرتی ہوئی ہوا کا اثر ہے۔

کشتی سے اتر کر کسانوں اور ملاحوں میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ ملاح اونچی اونچی آوازمیں گالیاں دینے لگے۔ پرکاش اور برجندر اٹھ کر اس گروہ کے قریب جا پہنچے۔ برجندر نے پوچھا "کیوں جھگڑتے ہو بھئی؟ کیا بات ہے؟"

ایک ملاح نے کہا "شاہ جی! بات یہ ہے کہ ہم ان پوربیوں کو بیاس پار لائے ہیں۔ یہ دوسرے کنارے پر صبح سے بیٹھے تھے اور کوئی انہیں پار نہیں اتارتا تھا۔ کیونکہ یہ پیسے پورے نہیں دیتے تھے۔ کہنے لگے ہم جھاد کے قحط کے مارے ہوئے غریب کسان ہیں۔ ہمارے ڈھور ڈنگر مر گئے ہیں۔ ہم پر دیا کرو۔ ہمیں بیاس پار کرا دو۔ ہم نے کہا اچھا تو سب آدمی ایک ایک پیسہ دے دو۔ ہم تمہیں بیاس پار لے چلتے ہیں۔ اب یہاں آکر یہ

کل پندرہ پیسے دیتے ہیں اور یہ آدمی ہیں پچیس ——— آپ خود گن لیجئے "

کسانوں نے کہا "ہم غریب ہیں، ہم قحط کے مارے ہوئے ہیں، ہم پر دیا کرو "

بچے رونے لگے۔ عورتوں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

ایک ملاح نے کہا "اور ہم کہاں سے کمائیں؟ سارے دن میں بیاس پار کتنے آدمی اترتے ہیں؟ ان چند پیسوں میں مشکل سے گزارا ہوتا ہے۔ ہم نے تمہیں دو دو پیسے فی آدمی چھوڑ دئے۔ اب تم ایک ایک پیسہ بھی نہیں دیتے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟"

پرکاش نے دس پیسے ملاح کی ہتھیلی پر رکھ دئے۔

ایک بوڑھے کسان نے آبدیدہ ہو کر کہا "بھگوان تمہارا بھلا کرے۔ یہ میرا کنبہ ہے۔ میں بھی کبھی مال مویشی والا تھا۔ میرا گھر پکی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ ابھی کل تک میری کھیتیاں لہلہاتی تھیں۔ میرے دوارے پر بھکاری بھیک مانگتے تھے۔ میری بہوئیں اور بیٹیاں آنگن میں گیت گاتی تھیں، آج وہ بین کر رہی ہیں۔ بھگوان ایسی بپتا کبھی نہ دکھائی تھی۔ اب دربدر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ کہیں سر چھپانے کو جگہ نہیں ملتی۔ پیٹ بھر کھانے کو روٹی نہیں ——— ایسا قحط میں نے اپنی ساری عمر میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ بھگوان! یہ کن کھوٹے کرموں کی سزا ہے؟"

برجندر نے کہا "تم ایک دو آدمی ہمارے ساتھ چلو۔ ہم تمہیں آٹا دال نون سب کچھ دیں گے "

بوڑھا کسان بولا "پرماتما تمہارا بھلا کرے "

ایک بوڑھی عورت بولی "اری لٹیا! جا سرکنڈے، گھاس پھوس اور لکڑیاں اکٹھی کر لے۔ اری بترا لحاف اور چٹائیاں چھپرے سے اتار کر ادھر لے آ۔ ارے سارو! کم بخت کدھر بھاگ گیا تو۔ . . . "

لٹیا اٹھی اور سرکنڈوں کے جھنڈ کی طرف چلی۔ وہ ایک سانولے رنگ کی جوان عورت تھی۔ پرکاش نے دیکھا اس کی چولی اور لہنگا جگہ جگہ سے پھٹ رہا تھا اور وہ چلتے چلتے اپنی جوانی کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ لیکن غریبی میں نہ تو غریبی ہی چھپتی ہے اور نہ جوانی. . . . .

دریا سے واپس آ کر پتہ چلا کہ بارات دوسرے دن شام کو سری پور پہنچ جائے گی۔ لڑکے والوں کا نائی آیا تھا اور اب وہ ایک بڑی سی گلابی رنگ کی پگڑی باندھے آنگن میں لکڑی کے تخت پوش پر بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا۔ اس خبر نے گھر والوں کو چونکا سا دیا، بارات آئے گی، یہ بھی سب جانتے تھے، لیکن یہ جانتے ہوئے بھی دل میں ایک واہمہ سا تھا۔ لیکن اب یہ واہمہ دور ہو گیا اور اب اس کی جگہ ایک اضطراب، ایک عجیب قسم کی بے چینی اور عجلت نے لے لی۔ چاچا پھیرو جو قصبے میں حلوائی کی دکان کرتے تھے اور پینتالیس برس گزر جانے پر بھی مجرد تھے۔ دوڑتے ہوئے لاریوں کے اڈے پر گئے تاکہ کل کے لئے بٹالے سے برف منگوانے کا انتظام کریں، مٹھائی منگوائی اور برجندر کو برات گھر کی صفائی کروانے، برات گھر سجانے اور براتیوں کے لئے چارپائیاں بچھوانے کا کام سپرد ہوا۔ گھر میں آئی ہوئی عورتوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور ساڑھیوں اور قمیصوں کے رنگ شوخ تر ہوتے گئے۔ ہیرا اپنے باپ کی چاندی کے دستے والی چھڑی لے کر ادھر ادھر گھومنے اور جھیوروں کو چستی سے کام کرنے کی ہدایت کرنے لگا، بیٹھک میں اب صرف پرکاش، چونی لال اور بوٹا سنگھ رہ گئے۔ پرکاش کھڑکی سے ان عورتوں کی طرف دیکھنے لگا جو گھر کے بڑے دروازے سے اندر آ رہی تھیں یا باہر جا رہی تھیں ریشمیں لباس، سرسراتی ہوئی قمیصیں جن پر سنہری پھول بوٹے بنائے گئے تھے۔ چنریاں جن پر مقیش کے ہر ستارے تھے، پھر بھی کبھی ان میں کوئی خوبصورت چہرہ بھی نظر آ جاتا۔ یوں ہی قصباتی سا حسن، جس میں رعنائی اور موہنی کی بجائے جوانی اور الھڑپن کی آمیزش زیادہ ہوتی۔ یکایک چونی لال اور بوٹا سنگھ نے ایک ساتھ دبی سی چیخ ماری۔ سامنے دو لڑکیاں جا رہی تھیں۔ نینون کے بادامی دوپٹوں میں ان کی چوٹیاں کالی ناگنوں کی طرح بل کھاتی ہوئی تھیں اور ایک کی گردن کے خم میں مدورا کے سندر ٹکے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ پرکاش کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ اسے یہ خیال نہیں رہا تھا کہ کوئی اس کی بہنوں

کو دیکھ کر خوشی سے چیخیں مار سکتا ہے۔ سوشیلا اور لیلا گلی میں چلتے چلتے ٹھٹھک کر رہ گئیں۔ اب مخالف سمت سے دو اور نوجوان اور حسین لڑکیاں آ رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر بوٹا سنگھ کے منہ سے بے اختیار ایک دبی سی چیخ نکل گئی۔ ان دونوں نوجوان لڑکیوں میں سے ایک تو وہی دوشیزہ تھی جس نے بیئر کو اور پرکاش کو لسی پلائی تھی۔ پرکاش نے پوچھا" وہ کون ہے؟"

"وہ کون؟" چونی لال نے پوچھا۔

"وہ جو آسمانی رنگ کی ساڑھی پہنے ہوئے شرما سی رہی ہے اور مسکرا بھی رہی ہے اور . . . "

چونی لال نے کہا "وہ! . . . . . وہ مس اوورسیئر ہے۔" اور یہ کہہ کر چونی لال اور بوٹا سنگھ دونوں ہنسنے لگے۔

"مس اوورسیئر؟"

"ہاں، ہاں!" بوٹا سنگھ نے ہنستے ہوئے کہا "اس کا باپ نہر کے محکمے میں اوورسیئر ہے نا۔"

چونی لال نے بوٹا سنگھ کی طرف دیکھ کر رازدارانہ لہجے میں کہا "میں نے سنا ہے کہ اوورسیئر کی تبدیلی جالندھر ہو گئی ہے اور اب وہ دو تین دن میں یہاں سے چلے جائیں گے . . . . . ."

"سچ مچ؟"

"ہاں! مجھے آج ہی پتہ لگا ہے' ایک بڑے معتبر آدمی سے۔ لیکن یہ بات کسی کو بتانا نہیں۔ اگر اس نے سن لیا تو بس بے چارے پر قیامت گذر جائے گی۔"

"نہیں' نہیں . . . . . . وہ بے چارہ!" اتنا کہہ کر بوٹا سنگھ ہنسنے لگا۔ چونی لال بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گیا۔ پرکاش نے سوچا' یہ لڑکے کیسے بد مذاق اور بے تربیت ہیں' بالکل دیہاتی۔ وہ بیٹھک سے اٹھ کر گھر کے آنگن میں چلا گیا۔ آنگن میں دری بچھ گئی تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ گیس لیمپ لگ گیا تھا اور کم سن لڑکیوں نے ابھی سے ڈھولک بجانی شروع کر رکھی تھی . . . . . .

کتھے گیوں! پردیسیا رے!

ٹھک ٹھک، ٹھک، ٹھک بجتی ہوئی ڈھولک پر ایک لڑکی پیتل کے ایک ٹکڑے سے تال دے رہی تھی' پرکاش نے سوچا ان نادانوں کو پتہ نہیں کہ وہ کیا گا رہی ہیں۔ پردیسی سے پیار کیوں؟ اس نے دیس دیس کے گیت سنے تھے۔ بلّوریں چشموں کے کنارے نیلی آنکھوں والی چرواہنوں کے گیت' اور ڈرائنگ روم میں ارغنون پر گیت' جہاں گلدان میں لمبی لمبی ڈنڈیوں پر نرگس کے پھول جھکے ہوئے تھے۔ گیت جو دوپہر کی تپتی ہوئی اداسی میں گھٹ گئے' جب فضا میں چیل کے چنے کھڑکھڑا رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ گیت . . . . . . لیکن حیرانی کی بات تو یہ تھی کہ عورت کے ہر نغمے میں پردیسی کے لئے پیار موجود تھا۔ یہ پیار کبھی تو مدھم سُروں میں لرزنے لگتا' اور کبھی اس کی گویائی کی حس اتنی شدید ہو جاتی کہ وہ نغمے کے الجھاؤ میں ایک زخمی پرندے کی طرح چیخ اٹھتا۔ لیکن پردیسی کے لئے اس قدر تڑپ کیوں؟ پرکاش نے پوچھا اور اسے خیال آیا کہ یہ نغمہ انسان کی فطرت کا نغمہ تھا۔ وہی نغمہ جس نے دور کی ہر شے کو پیارا بنا دیا تھا' جس نے بچپن میں اسے چاند کی طرف ہاتھ بڑھانے پر مجبور کر دیا تھا اور بڑا ہونے پر اسے بے قرار کر دیا تھا کہ وہ جنگلوں' پہاڑوں اور میدانوں کی خاک چھانے اور قدرت کو اپنا رازدار بنائے۔ یہ وہی انسانی فطرت کا نغمہ تھا جو ابھی تک عورت کی مقدس روح میں بے قرار تھا' یہ اچھا ہے۔ پرکاش نے سوچا کہ غلام ہوتے ہوئے بھی عورت کے دل میں پردیسی کی چاہ موجود ہے کیونکہ عورت زمین کی طرح ہے وہ زندگی کی تخلیق کرتی ہے اور جس دن اس کے دل سے پردیسی کی چاہ اٹھ گئی' انسانیت بھی فنا ہو جائے گی . . . . . .

ٹھک ٹھک ٹھک ٹھک لڑکیوں نے ایک نیا گیت شروع کر دیا تھا۔

اونہوں لکھنا!

اساں پردیسیاں نوں یاد رکھنا

پرکاش نے سوچا ان معصوم لڑکیوں کو پتہ نہیں کہ وہ کیا گا رہی ہیں۔ کسی پردیسی کو یاد رکھنے کے لئے ایک حساس اور درد مند دل چاہئے۔ جوانی کی بے قرار روح، نسائیت اور شباب، اور اس کی نگاہوں میں پگڈنڈی پر چلتی ہوئی عورت کی تصویر کھنچ گئی، جس کے سر پر سرسوں کی سبز کونپلوں کا گٹھا تھا، اور جس کی سبز قمیص پر نقرئی نیتہ چمک رہا تھا۔

اساں پردیسیاں نوں یاد رکھنا

ٹک، ٹک، ٹک، پرکاش کو ایسا معلوم ہوا گویا کوئی اس کے بجتے ہوئے دل پر اسی پتھر کے ٹکڑے سے ضربیں لگا رہا تھا۔ ٹک ٹک، ٹک ٹک، اور وہ سیڑھیوں کی طرف دوسری منزل پر جانے کے لئے مڑا۔ سیڑھیوں کے درمیان اس نے ہیرا اور مس اوورسیئر کو دیکھا جو ایک دوسرے کے قریب کھڑے تھے۔ ہیر کا چہرہ سفید تھا اور مس اوورسیئر کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ پرکاش جلد جلد زینے پر چڑھ گیا۔ ہیر نے آہستہ سے کہا۔ بھائی جان! میں بھی اوپر آ رہا ہوں۔ ابھی ..... دوسری منزل میں ایک بڑے کمرے میں بہت سی لڑکیاں پرکاش وتی کو گھیرے ہوئے تھیں۔ وہ دبے دبے قہقہوں اور میٹھی میٹھی سرگوشیوں کے ساتھ پرکاش وتی کو دولہا بھائی کی آمد کے قصّے سُنا کر چھیڑ رہی تھیں اور اپنی دبی ہوئی جنسی خواہشوں کی ناکام تکمیل کر رہی تھیں۔ پرکاش چند کو کمرے میں آتے دیکھ کر ساری مجلس درہم برہم ہو گئی۔ کئی لڑکیاں کھلکھلا کر ہنستی ہوئی اور ہنسنے کے باوجود بھی شرماتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ اوروں نے جرأت سے کام لے کر اسے اپنے نسوانی مزاح کا نشانہ بنانا چاہا۔ اتنے میں ہیر آ گیا اور آ کر ایک کونے میں پڑی ہوئی چارپائی پر چپ چاپ لیٹ گیا، اس کا چہرہ سپید اور سُتا ہوا تھا اور اس کے بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ شاید اسے ابھی غش آنے کو ہے۔ بہت سی لڑکیوں نے دیکھا اور اندازہ لگایا کہ کوئی غیر معمولی بات ہے اور وہ کمرے سے باہر چلی گئیں۔ پرکاش اور پرکاش وتی دونوں جلد جلد ہیر کے پاس گئے۔ پرکاش وتی نے اپنا ہاتھ ہیر کے ماتھے پر رکھا۔ کہنے لگی: "ماتھا گرم ہے۔"

پرکاش نے پوچھا: "کیا بات ہے ہیر؟"

ہیر نے رکتے رکتے کہا: "اُف ..... کوئی بات نہیں۔ بس دم گھٹا جا رہا ہے۔"

پرکاش نے کہا: "پانی، پانی۔"

پرکاش وتی نے گھبرا کر کہا: "پانی، پانی۔"

باہر کئی لڑکیوں نے چیخ کر کہا: "پانی، پانی۔"

سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔ پانی، پانی۔ ہیر کی ماں دوڑتی ہوئی اوپر آئی اور ایک چھوٹے سے گلاس میں پانی اور گلاب ملا کر لائی۔ ہیر نے تھوڑا سا پانی پیا اور کہا میں اب اچھا ہوں۔ کوئی بات نہیں، لیکن کسی نے اس کی ایک نہ سُنی۔ کوئی ماتھا دبانے لگا۔ کسی نے ہاتھ پکڑ لئے، کسی نے پاؤں، کسی نے کہا کھڑکی بند کر دو، ہوا لگ جائے گی، کسی نے کہا کھڑکی کھول دو، ہوا لگنے دو۔ ایک پھوپھی جان بولیں اسے دودھ میں گرم گھی ملا کر پلاؤ، پلایا گیا۔ دوسری پھوپھی جان بولیں: "اے ہے، کہاں ہے ہیر کی ماں؟ ہیر کی ماں!"

ہیر کی ماں بولیں: "میں تمہارے پاس ہی تو کھڑی ہوں۔"

"اچھا۔ اچھا۔ جا بھاگ کر نیچے سے بادام روغن لا۔"

ہیر کی ماں نچلی منزل سے بادام روغن لانے گئی تو خالہ بھاگونتی اس کے پیچھے دوڑیں: "ار..... ار..... میں کہتی ہوں ہیر کی ماں، اس کے تو ہاتھ پاؤں پھنک رہے ہیں۔ بازار سے کانشی تیل منگواؤ۔ تاکہ پیروں پر اچھی طرح مالش کریں اور گرمی چھٹے۔ اسے گرمی ہے اور کچھ نہیں۔" ہیر نے لاکھ انکار کیا کہ اسے گرمی نہ تھی محض دم گھٹا جا رہا تھا اور اب وہ بھی نہیں گھٹتا تھا اب اسے آرام تھا، لیکن کسی نے اس کی ایک نہ مانی اور وہ اسے آرام سے لیٹے رہنے

کر کہا۔ ناچار ہیر نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

کوئی آدھ گھنٹہ شور و غل کرنے، ہیر کا سر سہلانے اور اس کے پاؤں اور ہاتھوں پر کافی چہل پہل کی، مالش کرنے کے بعد گھر کی عورتوں کی جان میں جان آئی اور وہ اسے چارپائی پر آرام سے سویا ہوا چھوڑ کر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد فوراً ہیر نے آ ... ہوں کر کہا

"ہائے بھاپا جی!"

پرکاش چند نے مسکرا کر پوچھا "چین کیسا ملک ہے؟"

ہیر نے کہا "ہائے میں مر جاؤں گا، اب کیا ہو گا، ان کی تبدیلی ہو گئی ہے۔"

پرکاش چند نے کہا "سنا ہے شنگھائی میں بہت دل پسند کاربے ہیں اور اینگلو چینی عورتیں....."

ہیر نے کہا "میں اس کے بغیر نہیں جی سکتا۔"

پرکاش نے کہا "اور چین کے لوگ چینی کے برتن بنانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔"

ہیر نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا "ہائے بھاپا جی۔ ہائے بھاپا جی۔ اگر تمہیں پتہ ہوتا۔ اگر تمہیں پتہ ہوتا....."

پرکاش نے کہا "مجھے سب پتہ ہے" اور وہ کمرے سے نکل گیا۔

کمرے کے باہر سیڑھیوں کے قریب کونے میں اس نے ایک لڑکی دیکھی۔ اس نے آسمانی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ وہ چپ چاپ کھڑی تھی۔ اس کی ناک سرخ تھی اور آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی۔ پرکاش نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس لڑکی نے اپنا چہرہ ساڑھی کے پلو میں چھپا لیا اور دیوار سے لگی لگی سسکیاں لینے لگی۔

یکایک پرکاش نے سوچا۔ کل پرکاش وتی کی شادی ہے۔

شادی کی رات پرکاش پل بھر کے لئے بھی نہ سو سکا۔ اس نے ہیر کی ماں سے کہہ سن کر چارپائی دوسری منزل میں رکھوا لی تھی تاکہ آرام سے سو سکے۔ ہیر کی ماں نے نہایت چاؤ سے پوچھا تھا "بیٹا شادی نہیں دیکھو گے؟" اور پرکاش نے ہیر کی ماں سے کہا کہ وہ دو تین بجے کے قریب جب بیاہ کی رسمیں ادا کی جائیں گی، چارپائی سے اٹھ کر نیچے آنگن میں چلا آئے گا۔ لیکن اسے تو دو تین بجے تک بھی کسی نے سونے نہ دیا، کوئی آٹھ بجے کے قریب چونی لال، دھن سیال، بوٹا سنگھ ہنستے ہوئے اور آنگن میں پھرتی ہوئی عورتوں کو تاکتے ہوئے اوپر کی منزل میں آ گئے۔

چونی لال نے آتے ہی پرکاش سے کہا "صاحب آپ نے بہت اچھا کیا کہ آج رات کے لئے چارپائی یہاں رکھوا لی۔ اب یہاں ساری رات بیٹھ کر کھڑکی میں سے نیچے آنگن کا تما...

پرکاش نے بُرا سا منہ بنا کر کہا "میں سونا چاہتا ہوں۔"

بوٹا سنگھ ہنسنے لگا "تو... سونے کے لئے آپ نے اچھی جگہ تلاش نہیں کی۔"

دھن سیال نے کہا "آج ہمارے قصبے میں دو شادیاں ہوئیں۔ آج کا دن بہت مبارک ہے۔"

پرکاش نے پوچھا "دوسری شادی کس کے ہاں ہوئی؟"

دھن سیال نے مسکرا کر کہا "اوہ! آپ کو پتہ ہی نہیں؟..... ہاں بہت سے لوگوں کو ابھی پتہ نہیں اور آپ تو نو وارد ٹھہرے۔ کل جب پرکاش وتی کی ڈولی جائے گی تو آپ بھی شاید ڈولی جانے کے ایک دو دن بعد چلے جائیں گے۔ آپ کو ہمارے قصبے کی شادیوں سے کیا دلچسپی؟ ..... لیکن میرے خیال میں آپ کو بتا دینا چاہئے۔ چاچا پھیرو کی شادی ہوئی ہے۔ چاچا پھیرو کو جانتے ہیں نا؟ دُبلے پتلے، لمبے قد کے آدمی"

وہ اس دن بیٹھک میں مختفی رہے تھے۔ نیلی سی مونچھیں، کھچڑی سی داڑھی، رخساروں پر پرچھائیاں۔"

"وہ جو بازار میں حلوائی کی دکان کرتے ہیں؟" پرکاش نے پوچھا۔

"ہاں ہاں، وہی جو مٹھائی بنانے کے علاوہ سوڈا واٹر بھی تیار کرتے ہیں اور تمباکو بھی بیچتے ہیں۔ بچارے مجرّد تھے ابھی تک۔ عمر چالیس برس سے اوپر ہو گئی اور غریبی کی وجہ سے ہماری برادری میں کوئی انہیں رشتہ نہیں دیتا تھا۔

"یہ تو بہت اچھی خبر سنائی تم نے۔ چاچا پھیرو کی شادی، آج کا دن واقعی بہت مبارک ہے۔"

چونی لال، دھن سیال اور بوٹا سنگھ ایک ساتھ ہنس پڑے۔ "ہم ابھی چاچا پھیرو کو مبارک دے کر آ رہے ہیں۔ وہ بہت خوش تھے۔ انہوں نے داڑھی منڈوا دی ہے۔ اگرچہ مونچھیں بدستور میلی ہیں اور ہونٹوں کے کونوں میں گرتی ہیں۔ انہوں نے ہمیں تازہ مٹھائی کھلائی اور کہنے لگے۔ ابھی اس کا ذکر کسی سے نہ کہنا۔ اور ہمیں بھی تو اچانک ہی پتہ چل گیا۔"

پرکاش نے پوچھا "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

چونی لال بولا "ہم دریا پر گئے تھے جہاں حصار کے قحط زدہ لوگ ڈیرے ڈالے پڑے ہیں۔ وہاں بہت شور و غل تھا۔ بچے بلک رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں رو رہی تھیں اور ایک بڑھی عورت اپنے خاوند کو صلواتیں سنا رہی تھی۔ ہائے ری میری لڑیا، میری جوان اور سندر للّیا، پتہ چلا کہ بوڑھے کسان نے دو سو روپے کے عوض لڑیا کو چاچا پھیرو کے حوالے کر دیا تھا۔ پیٹ بڑی بلا ہے اور اب وہ بے وقوف بڑھی عورت اپنے خاوند کو کوس رہی ہے۔ گویا حصار کے قحط کا ذمہ دار اس کا خاوند ہے۔"

بوٹا سنگھ بولا "چاچا پھیرو بہت خوش نظر آتے تھے۔ انہوں نے اپنی دکان میں مٹھائی کے تھالوں کے پیچھے ایک میلی سی چادر لٹکا دی ہے تاکہ پردہ رہے اور آنے جانے والوں کی نظر نہ پڑے۔"

دھن سیال نے کہا "دیکھئے بھائی صاحب! اس کا ذکر کسی سے نہ کیجئے۔ چاچا پھیرو نے کہا ہے" اور اگر انہیں پتہ لگ گیا کہ ہم نے کسی آدمی کو یہ بات بتا دی ہے تو پھیرو ہم سے ساری عمر بات نہیں کریں گے اور نہ اپنی دکان سے ہمیں مٹھائی کھلائیں گے اور قصبے میں ان کے سوا یہاں کوئی دوسرا حلوائی بھی نہیں۔" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔ پھر چونی لال اور بوٹا سنگھ بھی اس کی ہنسی میں شریک ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد چونی لال نے کہا "آؤ بھاپا جی ذرا باراتی گھر میں باراتیوں کے درشن کر لیں اور ان کے قیام و طعام کے متعلق انتظامات کی بھی دیکھ بھال کریں۔ بچارے کل یہاں سے رخصت ہو جائیں گے ...... کہیں کہنے کا موقع نہ ملے کہ سری پور گئے تھے اور وہاں ان کی اچھی طرح خاطر مدارات نہیں ہوئی۔"

باراتیوں کو کھانا کھلا کر کوئی دو ڈھائی گھنٹے کے بعد پرکاش فارغ ہوا اور آتے ہی چارپائی پہ دراز ہو گیا۔ لیکن نیند کہاں، آج شادی کی رات تھی ابھی ابھی ان لوگوں نے دولہا کا منہ دیکھا تھا اور بیر کی ماں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی بلائیں لی تھیں، "سروارنا" کیا تھا اور چاندی کی چونیاں نچھاور کی تھیں۔ عورتوں نے سہاگ کے گیت گائے تھے اور کنواری لڑکیوں کی چھاتیاں زور زور سے دھڑکنے لگی تھیں۔ دولہا کا چہرہ پرکاش نے بھی دیکھا تھا، بالکل ہلدی کی گانٹھ کی طرح تھا، وہی زردی، وہی تلخی، وہی سختی اور سہرے کے زریں تار اور چمپا کی کلیاں بھی اس کے رنگ روپ میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکی تھیں۔ اس کے ساتھ اس کا بڑا بھائی بھی آیا تھا۔ اس کی ناک چپٹی تھی، ہونٹ موٹے اور رخساروں کی ہڈیاں باہر کو نکلی ہوئیں۔ اس کے ہاتھ میں روپوں سے بھری ہوئی لال کپڑے کی ایک تھیلی تھی جسے کہ وہ ادھر ادھر اس طرح گھوم رہا تھا جیسے وہ اس سارے قصبے کا مالک ہو۔ اس کے ساتھ اس کا باپ بھی تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہی چالاکی اور بنیا پن تھا جس کی بدولت وہ ہلدی بیچتے بیچتے لکھ پتی بن گیا تھا۔ ان کے ساتھ ان کے بہت سے رشتہ دار تھے جن کے حلیے ایک دوسرے سے بہت ملتے تھے۔ کیونکہ ہلدی کی جڑ تو آخر ایک ہی ہوتی ہے، گانٹھیں چاہے کتنی ہی بنتی چلی جائیں ...... "ملنی" کی رسم کے "۔ لڑکی والے اور لڑکے والے آپس میں بھینچ بھینچ کر گلے ملے تھے۔ چاندی کے گلاب دانوں میں

پڑا ہوا معطر پانی ایک دوسرے پر چھڑکا گیا تھا۔ جمیروں، بھانڈوں اور میراثیوں نے بدھائی کے ترانے گائے تھے اور گداگروں کے جمِ غفیر نے گلی کے دونوں طرف ناکہ بندی کر لی تھی تاکہ جب فریقین کی طرف سے تانبے کے پیسے نچھاور کئے جائیں تو گلی کی سُرخ اینٹوں پر پیٹ رگڑ رگڑ کر اور گندی موریوں میں ہاتھ ڈال ڈال کر انہیں لُوٹا جا سکے۔ پیسوں کے نچھاور ہوتے ہی چھوٹے بڑے گداگر سب ایک دوسرے پر پل پڑے تھے اور وہ فقیرنی جس کی چھاتی سے ایک سوکھا ہوا بچہ لٹک رہا تھا اور وہ بوڑھی بھکارن جس کے بال بڑ کی شاخوں کی طرح تھے۔ ایک پیسے کے لئے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئی تھیں۔ لڑکا چلانے لگا تھا اور میراثی بدھائی کے گیت گا رہے تھے۔ کیا یہ شادی کی بدھائی تھی؟ یا سماج کے جنازے کا نوحہ یا کسی نے اپنے گھر کو آگ لگائی تھی اور اب بھڑکتے ہوئے شعلوں کو دیکھ کر خوشی سے ناچ رہا تھا...... کوئی پرکاش کے قریب بستر پر بیٹھ گیا۔ پرکاش چونک پڑا۔ یہ پرکاش وتی تھی۔ وہ چپ چاپ آ کر اس کے پاس بیٹھ گئی اور وہ دونوں نیچے آنگن میں کام کرتی ہوئی عورتوں کی طرف دیکھنے لگے۔ آنگن کے بیچ میں کاٹھ کی بیدی کھڑی کی گئی تھی۔ درمیان میں ہون کنڈ تھا۔ کاٹھ کی بیدی مندر کی طرح بنائی گئی۔ ایک چھ پہلو کی عمارت جو اُوپر اٹھ کر ایک تکون کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ اسے پھولوں، کیلے کے پتوں اور زریں تاروں سے سجایا گیا تھا۔ بیدی کی چوٹی پر لکڑی کے سبز رنگ کے طوطے سے لگائے گئے تھے اور آنگن کی دیواروں پر ریشم سے کاڑھی ہوئی سُرخ پھلکاریاں لٹکائی گئی تھیں۔ ان پر آرم کے قطعے اور گائتری اور دیگر متبرک منتر کاڑھے ہوئے تھے۔ آنگن کے آر پار جھنڈیاں لگائی گئی تھیں اور فرش پر لکیروں والی دریاں بچھائی گئی تھیں۔ پرکاش نے پرکاش وتی سے کہا۔ "آج تمہارا بیاہ ہے، دیکھو بیدی کتنی خوبصورت بنائی گئی ہے۔ بالکل مندر سے ملتی جلتی ہے، لیکن پجاری ابھی نہیں آئے اور جب پجاری آ جائیں گے تو تمہیں نئے کپڑے پہن کر ایک دیوداسی کی طرح اپنے مندر کے دیوتا کو رجھانے کے لئے ناچنا ہوگا، اور تم تو بہت اچھا ناچ سکتی ہو، کیوں؟"

پرکاش وتی نے نمناک لہجے میں کہا۔ "نہیں۔ میں آج ذبح کی جاؤں گی..... خبر نہیں، پڑھا کر سکھا کر ہر طرح کے عیش و آرام دے کر بھی ماں باپ کیوں ذبح کر ڈالتے ہیں۔ شاید یہ بھی ایک رسم ہوگی۔ لیکن میں سوچتی ہوں کیا مجھے اسی لئے مہاودیالہ میں داخل کرایا تھا..... میرا جی بھرا ہوا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ چیخیں مار مار کر روؤں...... مجھے تم سے ہمدردی کی امید تھی اور تم ہو کہ جب سے آئے ہو ہر وقت جی جلاتے رہتے ہو۔"

پرکاش نے کہا۔ "بہن پرکاش وتی جی! جی جلانے کو تو ساری عمر پڑی ہے۔ اب اگر ہنس کر بھی تم نے اپنے غم کو نہ چھپایا تو تمہاری شاعری کس کام کی؟"

"بھاڑ میں جائے شاعری۔" پرکاش وتی نے جھلّا کر کہا۔

"وہ تو اب خود بخود چلی جائے گی۔"

پرکاش نے پرکاش وتی کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور پھر اس کی ہتھیلی پر انگلی رکھ کر بولا۔ "تمہاری قسمت یہاں لکھی ہے۔ دیکھو یہ لکیر ظاہر کرتی ہے کہ تم بہت لمبے عرصے تک جیو گی۔ تمہارے دس بچے ہوں گے، اور ایک موٹر کار۔ یہ لکیر تمہاری شاعری کی تھی لیکن یہاں آ کر شاعری کا آبگینہ ہلدی کی ایک گانٹھ سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا۔ یہ لکیر ظاہر کرتی ہے کہ تمہارے خاوند کو تم سے بہت محبت ہوگی۔ یوں بھی تو یہ محبت دس بچوں سے صاف ظاہر ہے لیکن ان کے علاوہ وہ تمہیں ہر سال نئے بھدے زیور اور ریشمیں کپڑوں کے بھاری بھرکم جوڑے سلوا دیا کرے گا۔ شادی کے پانچ سال بعد تم اتنی موٹی ہو جاؤ گی کہ خود تمہاری ماں بھی تمہیں پہچان نہیں سکے گی اور......."

پرکاش وتی نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے جلدی سے کہا۔ "ہٹو بھی۔ ہر وقت بے ہودہ مذاق۔ شرم نہیں آتی تمہیں؟"

پرکاش نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے تیر نشانے پر بیٹھا ہے۔ میں جانتا تھا کہ عورت ایک ہلدی بیچنے والے سے شادی کر کے خوش رہ سکتی ہے لیکن اپنے موٹاپے کا ذکر سُن کر خائف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

یہ آخری رتجگا تھا۔ بیاہ کی رسمیں دو بجے کے بعد ادا کی جاتی تھیں اس لئے قصبے کی سب عورتیں اپنے بہترین لباس اور زیور پہن کر آئی تھیں۔ ڈھولک پر اتنے زور سے ہاتھ پڑتا تھا کہ پرکاش کو اس کی دھب دھب سمع خراش معلوم ہونے لگی۔ ہر ایک عورت اپنے گلے کی پوری قوت سے گا رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں بیچ میں زور سے چلا اٹھتے تھے، ناشتیں شربت پلاتی جاتی تھیں اور دوسری منزل پر پرکاش کے پاس قصبے کے بہت سے نوجوان لڑکے اور لڑکی والوں کے رشتہ دار اکٹھے ہو گئے تھے اور کھڑکیوں میں سے جھانک جھانک کر رتجگے کا نظارہ کر رہے تھے۔ کئی لمبی لمبی داڑھیوں والے بزرگ بھی آ گئے تھے جو حقہ پیتے، بار بار کھانستے اور نوجوانوں کو شرافت کی تلقین کرتے ہوئے اپنی آنکھیں سینکتے جاتے تھے۔ پرکاش نے ان کی آنکھوں میں دبی ہوئی حسرتیں دیکھیں جو اب اپنی قبروں سے باہر جھانک رہی تھیں جنہوں نے آج تک زندگی کو گناہ سمجھا تھا اور اسے ہر جگہ اور ہر مقام پر اپنی طرح کی پوری قوت سے دبانے کی کوشش کی تھی۔ اور سے آج زندگی انتقام لے رہی تھی۔ کیونکہ حِس مر چکی تھی لیکن حرص تیز ہو گئی تھی اور حقہ پینے والے بزرگ اب اس راکھ کے ڈھیر کو کرید رہے تھے جہاں زندگی کی ایک چنگاری بھی باقی نہ رہی تھی —— شاید اگر بات یہیں تک رہ جاتی تو پرکاش کو چنداں افسوس نہ ہوتا لیکن اسے تو رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا ان سفید داڑھیوں والے بزرگوں پر، جن کی جوانیاں مدت سے راکھ ہو چکی تھیں اور جو اب دوسروں کی جوانیاں راکھ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ جنہوں نے اپنی جنسی آلودگیوں پر شرافت کا پردہ ڈال لیا تھا، اور اب سب اس جھوٹی شرافت کے بل بوتے پر اپنے جوان لڑکوں اور پوتوں سے کھوٹے ہوئے لمحوں کا انتقام لے رہے تھے، پرکاش نے سوچا کیسی بے انصافی ہے! ہم لوگ بچپن ہی میں بوڑھے کر دئے جاتے ہیں۔ ساری زندگی روتے گذرتی ہے اور پھر وہی بسورتے ہوئے چہرے لے کر مرگھٹ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس وقت آنگن میں تو لڑکیاں خوب زور زور سے گا رہی تھیں اور قہقہے لگا رہی تھیں۔ پرکاش کو یہ ڈر تھا کہ ابھی کوئی بزرگ صورت آدمی کھڑکی میں سے جھانک کر کہہ دے گا: "لڑکیو! اتنا غل کیوں مچا رکھا ہے؟" اور رتجگے کی سب رونق ماند پڑ جائے گی اور چلاتے ہوئے گلے اس طرح خاموش ہو کر رہ جائیں گے جیسے موت کے سرد اور برفیلے ہاتھ نے انہیں زور سے گھونٹ دیا ہو۔ بے چاری عورتوں کو تو آج ہی مدت کے بعد اپنے دبے ہوئے ارمانوں کو ذرا ڈھیل دینے کا موقع ملا تھا۔ وہ اس وقت فحش، لچر اور بازاری گیت گا کر بہت مسرور ہو رہی تھیں۔ گیت کیا تھے سیدھی سادی جنسی گالیاں تھیں جن میں ماں باپ، بہنوں بھائیوں، بہوؤں اور آشناؤں کے جائز اور ناجائز تعلقات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا تھا۔ وہ عورتیں جنہیں پرکاش شرم و حیا کی پتلیاں سمجھتا تھا اب سب سے اونچی آواز میں سب سے گندے گیت گا رہی تھیں اور ان کے ننگے سر اور لہراتی ہوئی چوٹیاں دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں لیکن ایسے موقعے تو بہت کم آتے ہیں۔ کبھی کبھی ہی تو کوئی شادی ہوتی ہے ورنہ کئی سال گذر جاتے ہیں اور ان عورتوں پر شرم و حیا کا جھوٹا ملمع چڑھا رہتا ہے اور پھر جب وہ بوڑھی مائیں اور ساسیں بن جاتی ہیں تو اپنا سارا غصہ اپنی لڑکیوں اور بہوؤں پر اتارتی ہیں۔ یہ کرو، وہ نہ کرو۔ وہ کرو، یہ نہ کرو۔ اور اس طرح اندھی سماج کا چکر زندگی کی منزل پر سے گذر جاتا ہے۔ برجندر بڑے انہماک سے کھڑکی سے نیچے دیکھ رہا تھا کہ ایک شوخ لڑکی نے اس کی طرف دیکھ کر گایا:

ہائے برجندر وے تیری ماسی
اوہنوں لے گیا اک سنیاسی
ہائے وے اک سنیاسی
ہائے وے اک سنیاسی

دھب، دھب، دھب، دھب

اور بہت سی لڑکیاں اس کی طرف دیکھ کر قہقہے لگانے لگیں اور برجندر شرما کر پیچھے ہٹ گیا۔ ایک بوڑھے بزرگ نے اسے ڈانٹ بتلائی، تم کھڑکی میں کیوں کھڑے تھے۔ اگر گیت سننے کا اتنا ہی شوق ہے تو ادھر چارپائی پر بیٹھ کر آرام سے سنو۔ یہ بھی کیا ڈھنگ ہے۔ اور پرکاش نے سوچا

کہ یہ بھی کیا ڈھنگ ہے کہ برجندر کی ماسی کو لے جائے اک سنیاسی آخر ایک سنیاسی کیوں؟ ایک تُسا ریا چار کیوں نہیں؟ اور پھر اسے خیال آیا کہ ہندستانی سماج میں سنیاسی اور فقیر لوگ خاص عزت کے مالک ہیں۔ خدا کے یہ لاکھوں بندے کھاتے پیتے لوگوں سے بھیک مانگ کر ان کے ضمیر کو تسکین پہنچاتے ہیں۔ عمل اور جوتش سے ان کے مستقبل کو روشن اور دلکش بناتے ہیں، کایا کلپ کرتے ہیں، مکتی دلاتے ہیں اور اولاد سے محروم بیویوں کو بچے عطا کرتے ہیں۔ مبارک ہیں ان کی زندگیاں اور محبت سے لبریز ہیں ان کی روحیں۔ اس لئے ماسی کا "سنیاسی" کے ساتھ بھاگ جانا چنداں تعجب خیز نہ تھا۔ ان فحش گیتوں میں اور عورتوں کی مسرور نگاہوں میں پرکاش کو اپنے تمدن کی ننگی روح جھلکتی ہوئی نظر آئی۔ جس چیز کو ہر بڑے اور چھوٹے فرد نے گناہ کہہ کر دل کے نہاں خانے میں چھپا دیا تھا آج وہی گناہ اُبل کر گانے والیوں کی آنکھوں میں جھلک رہا تھا اور ڈھولک کی تال اور باریک آوازوں کی لرزتی ہوئی لَے میں ظاہر ہو رہا تھا' اور دوسری منزل پر یہ چیزیں ایسے ایسے بزرگ بھی سُن رہے تھے جن کی طویل زندگی کا شاہکار یہ تھا کہ انہوں نے عمر بھر اپنی بیوی اور ماں کے علاوہ اور کسی عورت سے جنس کی بات بھی نہیں کی تھی۔ اسی لئے تو ایک معصوم شاہ وہ بدی کی ایک گانٹھ کے عوض بیچ دی گئی تھی اور کھیتوں کی کھلی فضاؤں میں پلی ہوئی مسندر لڑکیاں' باسی پکوڑوں اور مٹھائیوں کی دکان پر ایک سرسراتے ہوئے میلے پردے کے پیچھے قید کر دی گئی تھی۔ زندگی غیر محدود تھی، عشق تازہ اور شباب زندہ تھا لیکن تمدن بوڑھا اور عقل فرسودہ ہو چکی تھی اور سماج کے نیلام گھر میں اب بھی عورتوں کو کھلے بندوں بیچا جاتا تھا۔ البتہ قانوناً غلامی ممنوع تھی۔ پرکاش نے دل میں کہا کہ وہ ایسی باتیں سوچتا سوچتا پاگل ہو جائے گا۔ بہتر یہ ہے کہ وہ سو جانے کی کوشش کرے، آنکھیں مُوند لے، اپنے پپوٹوں کو نیند سے بوجھل بنا لے اور سرہانے پر سر ٹیک کر سو جائے۔ اب گیت ہلکے ہو رہے تھے ...... دولہا بھائی سہرا باندھے ہوئے تشریف لے آئے تھے ...... پرکاش وتی اور دولہا ہون کنڈ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پنڈت مقدس منتر پڑھ رہے تھے۔ شعلے کچھ کا مزا چکھ کر بلند ہوتے جاتے تھے ...... پنڈت زور زور سے منتر پڑھ رہا تھا ...... پرکاش وتی اور دولہا خوش نما اور ڈبک بیدی کے ادر گرد گھوم رہے تھے۔ ایک ...... دو ...... تین ...... چار ...... پانچ ...... چھ ...... ساتا ......

منزل

جب پرکاش چند نے آنکھ کھولی تو ابھی اندھیرا تھا۔ اگرچہ مشرقی افق پر روشنی کی ایک دھندلی سی لکیر آگئی تھی لیکن آسمان پر ستارے ابھی تک بکھرے ہوئے تھے۔ نیچے آنگن کے فرش پر بیدی کے ارد گرد بہت سی عورتیں سوتی ہوئی تھیں۔ ہون کنڈ میں آگ بُجھ گئی تھی اور بیدی پر لٹکے ہوئے کیلے کے پتے مُرجھا گئے تھے۔ پرکاش نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا۔ اس کے ارد گرد چارپائیوں پر گھر کے بہت سے لوگ سمٹے ہوئے تھے۔ بسو شیلا اور لیلا ڈھولک بجاتے بجاتے تھک کر چُور ہو گئی تھیں۔ بیر کا چہرہ افسردہ تھا اور لب کھلے اور اس سے پرے پرکاش وتی ایک پچرنگی ساڑھی پہنے سو رہی تھی۔ اس کا ایک بازو چارپائی سے نیچے لٹک رہا تھا اور اسی بازو میں ہاتھی دانت کا سیندوری چُوڑا چڑھا ہوا تھا۔ ماتھے پر سُرخ بندی۔ اس کے لب مسکراتے ہوئے معلوم ہوئے۔ پرکاش نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ ہاں وہ اب تک مسکرا رہی تھی۔ نئی سہاگن جو کل ہی بیدی پہ اپنا کنوارپن ڈال چکی تھی اب بھی خواب میں مسکرا رہی تھی۔ پرکاش اس مسکراہٹ کی طنز کی تاب نہ لا سکا۔

وہ آہستہ سے بستر پر سے اٹھ بیٹھا۔ وہ کسی کو جگانا نہ چاہتا تھا۔ وہ ہولے ہولے سیڑھیوں سے نیچے اُتر گیا۔ آنگن کے فرش پر وہ نہایت احتیاط سے گذرا۔ اس کے چاروں طرف لڑکے' لڑکیوں اور عورتوں کے جسم پڑے تھے۔ کسی کے بازو ننگے، کسی کی چھاتیاں، کسی کے بالوں کی لٹیں کھلے ہوئے ہونٹوں کے کناروں پر۔ کسی کی ٹانگیں سکڑی ہوئیں، کسی کی پھیلی ہوئیں، کسی کی سانس میں خراٹے تھے ...... کسی کی آنکھیں نیم وا ...... ان کے درمیان میں، بیدی تھی۔ لیکن سنہری تار اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے، کیلے کے پتے مرجھا گئے تھے اور ہون کنڈ کی آگ بُجھ گئی تھی، شعلوں نے قربانی لے

لی تھی اور ماب خاموش تھے۔ زندہ انسان کھانے والوں نے ایک زندہ روح کو نگل لیا تھا اور ماب مدہوش تھے۔ پرکاش نے آہستہ سے دروازے کے کواڑ کھولے اور باہر چلا گیا۔

وہ قصبے سے باہر کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ آسمان پر ستارے بکھرے ہوئے تھے اور فرشِ زمیں پر شبنم کے لاکھوں قطرے بیدار ہو رہے تھے۔ گم ہوتے ہوئے اندھیرے کی خنکی میں ایک عجیب سی تازگی تھی اور جاگتی ہوئی سحر کے نور میں ایک سبا حسن۔ لکیر اور شبنم کے تنوں پر نمو دکھائی دینے والے مینے ابھی تک ہیں میں کہے جاتے تھے اور کوئی نامعلوم پرندہ کچھ نغمے گنگنا رہا تھا۔ بیر کی جھاڑیوں پر گھاس کے ٹڈے ابھی تک سوئے پڑے تھے اور پتوں کے درمیان گول گول بیروں سے شبنم کے موتی اس طرح لگے ہوئے تھے گویا اودادا کے منہ ٹپکے ہوئے ہوں۔ زمین جیسے لمبے لمبے سانس لے کر بیدار ہو رہی تھی۔ کھیتوں کے کناروں پر اگی ہوئی گھاس میں ہزاروں نیلے پھول اپنی آنکھیں کھولنے لگے۔ پھر دور کہیں اس نے رہٹ کے چلنے کی روں روں سُنی اور پورب میں حدِ افق پر روشنی کی لکیر بڑھتی ہوئی دکھائی دی۔

وہ کھیتوں میں دوڑتا ہوا چلا گیا' اس کے پاجامے کے پائنچے اور پاؤں میں پہنے ہوئے چپل شبنم میں دھوئے گئے۔ لیکن وہ دوڑتا ہی گیا۔ تاریکی کم ہوتی گئی اور اس نے اپنے نتھنوں میں وہ عجیب سی خوشبو محسوس کی جس سے مشرق کی ہوا بوجھل تھی۔ آج اس نے پہلی مرتبہ صبح کو جاگتے دیکھا تھا ورنہ شہر میں رہتے ہوئے تو اس کی آنکھ اس وقت کھلتی تھی جب دھوپ کا پیلا پن کھڑکی کے شیشے سے نکل کر اس کے چہرے پر آجاتا تھا۔ لیکن آج وہ ایک غیر مرئی ہستی سے تعارف حاصل کر رہا تھا اور جب پورب کی ہوا اس کے چہرے پر گزرنے لگی تو اس نے اپنی آنکھوں اور اپنے رخساروں پر صبح کی رانی کی نازک انگلیوں کے لمس کو محسوس کیا' اس کے عطر بیز بالوں کی خوشبو کو سونگھا اور اپنے ہونٹوں پر اس کے شبنمی لبوں کی حلاوت کا مزا چکھا اور خوشی سے بھرپور دوڑتا چلا گیا۔

زمین اسے اپنے پاس بلا رہی تھی۔ میلوں تک پھیلے ہوئے کھیتوں پر مٹی کی سوندھی' لطیف اور پاکیزہ خوشبو ایک ہلکے کہرے کی طرح چھائی تھی۔ آہستہ آہستہ درختوں کے تنوں پر ٹٹلے اور گلہریاں کی دُمیں سرکنے لگیں اور کھیت کے کناروں کی اوٹ میں چھپتے ہوئے خرگوش بھاگنے لگے' دور ایک اونچی مینڈھ پر ایک مورنی کھڑی تھی اور مور اپنے دل کش پروں کے چھتر کو پھیلائے اس کے سامنے ناچ رہا تھا۔ ساری کائنات نغمہ ریز تھی اور زمین اپنے محور پر گھومتی ہوئی ناچ رہی تھی! اس دلکش' دلفریب اور ابدی رقص کے سامنے انسانی زندگیاں' اس کی مسرتیں اور غم کس قدر ہیچ تھے۔ ان کا منبع نامعلوم اور ان کی منزل ناپید…… مور کے چھتر پر مختلف رنگوں کی نازک جھلکیاں بدلتی جاتی تھیں۔ ارغوانی…… آسمانی…… دھانی' خوشیاں…… غم…… زندگیاں…… پرکاش نے سوچا یہ زمین ناچتی جائے گی' یہاں تک کہ انسانی زندگی' اس کی تہذیب' تمدن' اس کے دعاوی باطل راکھ کا ڈھیر ہو جائیں گے۔ زمین چاند کی طرح خاموش اور مغرور ہو جائے گی لیکن پھر بھی یہ زمین ناچتی جائے گی…… ہم کس قدر حقیر ہیں۔ پرکاش نے سوچا' بیر کی پتیوں پر سوئے ہوئے ٹڈوں کی طرح…… یکایک کیکر کے ایک درخت کی چوٹی پر بیٹھا ہوا کوا چیخ اٹھا اور ساری کائنات میں اُجالا ہی اُجالا ہو گیا۔ زمین کا رقص رُک گیا۔ بیبنے کی پیں پیں بند ہو گئی۔ مور اور مورنی مغرب میں آموں کے جھنڈ کی طرف پرواز کر گئے اور پرکاش کھیتوں میں دوڑتا دوڑتا رُک گیا اور کہنے لگا۔ ہائے وہ صبح کی رانی کہاں گئی؟…… وہ رانی جو گم ہوتے ہوئے اندھیرے کے نازک سایوں میں شبنم کے موتی چھلکاتی ہوئی آئی تھی اور بڑھتے ہوئے نور سے شرما کر پھر اسی تاریکی میں گم ہو گئی…… ہائے وہ صبح کی رانی! وہ بہت دیر تک ایک رہٹ پر بیٹھا رہا۔ اس کی روح ہلکی ہو گئی تھی اور دل و دماغ ہر قسم کے خیالات سے گریزاں۔ آم کے درختوں پر چھوٹی چھوٹی سبز کیریاں لٹک رہی تھیں اور ہرے بھرے طوطے ٹیں ٹیں کر رہے تھے۔ بیلوں کے پیچھے بیٹھا ہوا کسان ایک کھلونا معلوم ہو رہا تھا اور بیل رہٹ کے محور کے گرد گھومتے جاتے تھے…… روں…… روں…… روں' اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے جسم کے ہر ذرے سے آواز نکل رہی ہے…… روں…… روں…… روں…… اس بے مطلب اور بے معنی صدا میں اسے ایک نامعلوم سی مسرت محسوس ہونے لگی اور وہ آنکھیں بند کر کے نہاتا گیا اور اسے سنتا گیا…… روں…… روں…… روں…… بے مطلب بے معنی…… منبع نامعلوم…… منزل ناپید…… اب وہ آنکھیں بند کیے ہوئے بھی بیلوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے اس کسان کو دیکھ رہا تھا جو کھلونے کی طرح معلوم ہو رہا تھا اور بیل جو رہٹ کے محور کے گرد گھومتے جاتے تھے…… روں…… روں…… روں……

سعادت حسن منٹو

نیا قانون

منگو کوچوان اپنے اڈّے میں بہت عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا، لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈّے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دُنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے، اُستاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب اُستاد منگو نے اپنی ایک سواری سے اسپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سنی تھی تو اُس نے گاما چودھری کے چوڑے کاندھے پر تھپکی دے کر مدبرانہ انداز میں پیش گوئی کی تھی: "دیکھ لینا چودھری، تھوڑے ہی دنوں میں اسپین کے اندر جنگ چھڑ جائے گی۔"

اور جب گاما چودھری نے اس سے یہ پوچھا تھا کہ اسپین کہاں واقع ہے تو اُستاد منگو نے بڑی متانت سے جواب دیا تھا: "ولایت میں اور کہاں؟"

اسپین میں جنگ چھڑی اور جب ہر شخص کو اس کا پتہ چل گیا تو اسٹیشن کے اڈّے میں جتنے کوچوان حلقہ بنائے حقّہ پی رہے تھے دل ہی دل میں استاد منگو کی بڑائی کا اعتراف کر رہے تھے۔ اور استاد منگو اس وقت مال روڈ کی چمکیلی سطح پر تانگہ چلاتے ہوئے اپنی سواری سے تازہ ہندو مسلم فساد پر تبادلۂ خیال کر رہا تھا۔

اس روز شام کے قریب جب وہ اڈّے میں آیا تو اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتمایا ہوا تھا۔ حقّے کا دور چلتے چلتے جب ہندو مسلم فساد کی بات چھڑی تو استاد منگو نے سر پر سے خاکی پگڑی اتاری اور بغل میں داب کر بڑے مفکرانہ لہجے میں کہا ——

"یہ کسی پیر کی بددعا کا نتیجہ ہے کہ آئے دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں چاقو چھریاں چلتے رہتے ہیں اور میں نے اپنے بڑوں سے سُنا ہے کہ اکبر بادشاہ نے کسی درویش کا دل دکھایا تھا اور اس درویش نے جل کر یہ بددعا دی تھی، جا تیرے ہندوستان میں ہمیشہ فساد ہی ہوتے رہیں گے —— اور دیکھ لو جب سے اکبر بادشاہ کا راج ختم ہوا ہے ہندوستان میں فساد پر فساد ہوتے رہتے ہیں۔" یہ کہہ کر اُس نے ٹھنڈی سانس بھری اور پھر حقّے کا دم لگا کر اپنی بات شروع کی: "یہ کانگریسی ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اگر یہ لوگ ہزار سال بھی سر پٹختے رہیں تو کچھ نہ ہوگا۔ بڑی سے بڑی بات یہ ہوگی کہ انگریز چلا جائے گا اور کوئی اٹلی والا آجائے گا۔ یا وہ روس والا جس کی بابت میں نے سُنا ہے کہ بہت تگڑا آدمی ہے۔ لیکن ہندوستان سدا غلام رہے گا۔ ہاں میں یہ کہنا بھول ہی گیا کہ پیر نے یہ بددعا بھی دی تھی کہ ہندوستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی راج کرتے رہیں گے۔

استاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ اس کے ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں۔ مگر اس کے تنفر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اسے بہت ستایا کرتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے۔ گویا وہ ایک ذلیل کتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے ان کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا۔ جب کبھی وہ گورے کے سرخ و سپید چہرے کو دیکھتا تو اسے متلی سی آجاتی۔ نہ معلوم کیوں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ان کے لال جھریوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے جس کے جسم پر سے اوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو!

جب کسی شرابی گورے سے اس کا جھگڑا ہو جاتا تو سارا دن اس کی طبیعت مکدر رہتی اور وہ شام کو اڈے میں آکر ہل مارکہ سگریٹ پیتا یا حقے کے کش لگاتے ہوئے اس "گورے" کو جی بھر کر سنایا کرتا۔

.... یہ موٹی گالی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ڈھیلی پگڑی سمیت جھٹکا دے کر کہا کرتا تھا۔ "آگ لینے آئے تھے۔ اب گھر کے مالک ہی بن گئے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے۔ یوں رعب گانٹھتے ہیں۔ گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں ..... "

اس پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا جب تک اس کا کوئی ساتھی اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ وہ اپنے سینے کی آگ اُگلتا رہتا۔

"شکل دیکھتے ہو نا تم اُس کی .... جیسے کوڑھ ہو رہا ہے ——— بالکل مردار، ایک دھپے کی مار اور گٹ پٹ گٹ پٹ یوں بک رہا تھا جیسے مار ہی ڈالے گا۔ تیری جان کی قسم۔ پہلے پہل جی میں آئی کہ ملعون کی کھوپڑی کے پُرزے اڑا دوں۔ لیکن اس خیال سے ٹل گیا کہ اس مردود کو مارنا اپنی ہتک ہے".... یہ کہتے کہتے وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو جاتا اور ناک کو خاکی قمیص کی آستین سے صاف کرنے کے بعد پھر بڑبڑانے لگ جاتا ———

"قسم ہے بھگوان کی، ان لاٹ صاحبوں کے ناز اٹھاتے اٹھاتے تنگ آگیا ہوں۔ جب کبھی ان کا منحوس چہرہ دیکھتا ہوں۔ رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون وانون بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے۔ تیری قسم جان میں جان آجائے"۔

اور جب ایک روز استاد منگو نے کچہری سے اپنے تانگے پر دو سواریاں لادیں اور ان کی گفتگو سے اسے پتہ چلا کہ ہندوستان میں جدید آئین کا نفاذ ہونے والا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

دو مارواڑی جو کچہری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے گھر جاتے ہوئے جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے متعلق آپس میں بات چیت کر رہے تھے ———

"سنا ہے کہ پہلی اپریل سے ہندوستان میں نیا قانون چلے گا ——— کیا ہر چیز بدل جائے گی؟"

"ہر چیز تو نہیں بدلے گی مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا اور ہندوستانیوں کو آزادی مل جائے گی"۔

"کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟"

"یہ پوچھنے کی بات ہے کل کسی وکیل سے دریافت کریں گے"۔

ان مارواڑیوں کی بات چیت استاد منگو کے دل میں ناقابل بیان خوشی پیدا کر رہی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو ہمیشہ گالیاں دیتا تھا اور چابک سے بہت بُری طرح پیٹا کرتا تھا مگر اس روز وہ بار بار پیچھے مڑ کر مارواڑیوں کی طرف دیکھتا اور اپنی بڑھی ہوئی مونچھوں کے بال ایک انگلی سے بڑی صفائی کے ساتھ اونچے کر کے گھوڑے کی پیٹھ پر باگیں ڈھیلی کرتے ہوئے بڑے پیار سے کہتا "چل بیٹا، چل ——— ذرا ہوا سے باتیں کر کے دکھا دے"۔

مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اُس نے انارکلی میں دینو حلوائی کی دکان پر آدھ سیر دہی کی لسی پی کر ایک بڑی ڈکار لی، اور مونچھوں کو

مُنہ میں دبا کر ان کو چوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا "ہٹ تیری ایسی کی تیسی!"

شام کو جب وہ اڈے کو لوٹا تو خلافِ معمول اسے وہاں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔ یہ دیکھ کر اس کے سینے میں ایک عجیب و غریب طوفان برپا ہو گیا۔ آج وہ ایک بڑی خبر اپنے دوستوں کو سنانے والا تھا ——— بہت بڑی خبر، اور اس خبر کو اپنے اندر سے باہر نکالنے کے لئے وہ سخت مجبور ہو رہا تھا۔ لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔

آدھ گھنٹے تک وہ چابک بغل میں دبائے اسٹیشن کے اڈے کی آہنی چھت کے نیچے بے قراری کی حالت میں ٹہلتا رہا۔ اس کے دماغ میں بڑے اچھے اچھے خیالات آ رہے تھے۔ نئے قانون کے نفاذ کی خبر نے اس کو ایک نئی دنیا میں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اس نئے قانون کے متعلق جو پہلی اپریل کو ہندوستان میں نافذ ہونے والا تھا، اپنے دماغ کی تمام بتیاں روشن کر کے غور و فکر کر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں مارواڑی کا یہ اندیشہ "کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہو گا؟" بار بار گونج رہا تھا اور اس کے تمام جسم میں مسرت کی ایک لہر دوڑا رہا تھا۔ کئی بار اپنی گھنی مونچھوں کے اندر ہنس کر اس نے مارواڑیوں کو گالی دی "...... غریبوں کی کھٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل ——— نیا قانون ان کے لئے کھولتا ہوا پانی ہو گا۔"

وہ بے حد مسرور تھا۔ خاص کر اس وقت اس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہنچتی۔ جب وہ خیال کرتا کہ گوروں ——— سفید چوہوں (وہ ان کو اسی نام سے یاد کیا کرتا تھا) کی تھوتھنیاں نئے قانون کے آتے ہی بلوں میں ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائیں گی۔

جب نتھو گنجا، پگڑی بغل میں دبائے، اڈے میں داخل ہوا تو استاد منگو بڑھ کر اس سے ملا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے کہنے لگا "لا ہاتھ ادھر ...... ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے ——— تیری اس گنجی کھوپڑی پر بال اُگ آئیں۔"

اور یہ کہہ کر منگو نے بڑے ...... مزے لے لے کر نئے قانون کے متعلق اپنے دوست سے باتیں شروع کر دیں۔ دوران گفتگو میں اس نے کئی مرتبہ نتھو گنجے کے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر کہا "تو دیکھتا رہ، کیا بنتا ہے۔ یہ روس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ ضرور کر کے رہے گا۔"

استاد منگو موجودہ سوویٹ نظام کی اشتراکی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا اور اسے وہاں کے نئے قانون اور دوسری نئی چیزیں بہت پسند تھیں۔ اسی لئے اس نے "روس والے بادشاہ" کو "انڈیا ایکٹ" یعنی جدید آئین کے ساتھ ملا دیا اور پہلی اپریل کو پرانے نظام میں جو نئی تبدیلیاں پیدا ہونے والی تھیں، وہ "انہیں" "روس والے بادشاہ" کے اثر کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

کچھ عرصے سے پشاور اور دیگر شہروں میں سرخ پوشوں کی تحریک جاری تھی۔ استاد منگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں "روس والے بادشاہ" اور پھر نئے قانون کے ساتھ خلط ملط کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے سنتا کہ فلاں شہر میں اتنے بم ساز پکڑے گئے ہیں۔ یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے۔ تو ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا تھا۔

ایک روز اس کے تانگے میں دو بیرسٹر بیٹھے نئے آئین پر بڑے زور سے تنقید کر رہے تھے اور وہ خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ان میں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا ———

"جدید آئین کا دوسرا حصہ فیڈریشن ہے جو میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا۔ ایسی فیڈریشن دنیا کی تاریخ میں آج تک نہ سنی نہ دیکھی گئی ہے۔ سیاسی نظریہ کے اعتبار سے بھی یہ فیڈریشن بالکل غلط ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں!"

ان بیرسٹروں کے درمیان جو گفتگو ہوئی۔ چونکہ اس میں بیشتر الفاظ انگریزی کے تھے۔ اس سے استاد منگو صرف اوپر کے جملے ہی کو کسی قدر سمجھا اور اس نے خیال کیا یہ لوگ ہندوستان میں نئے قانون کی آمد کو برا سمجھتے ہیں۔ اور نہیں چاہتے کہ ان کا وطن آزاد ہو۔ چنانچہ اس خیال کے زیرِ اثر اس نے کئی مرتبہ ان دو بیرسٹروں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھ کر دل ہی دل میں کہا "ٹوڈی بچے!"

جب کبھی وہ کسی کو دبی زبان میں "ٹوڈی بچہ" کہتا تو دل میں یہ محسوس کر کے بڑا خوش ہوتا تھا کہ اس نے اس نام کو صحیح جگہ استعمال کیا ہے اور

یہ کہ وہ شریف آدمی اور ٹوڈی بچے' میں تمیز کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس واقعے کے تیسرے روز وہ گورنمنٹ کالج کے تین طلبا کو اپنے تانگے میں بٹھا کر مزنگ جا رہا تھا کہ اس نے ان تین لڑکوں کو آپس میں یہ باتیں کرتے سُنا —

"نئے آئین نے میری امیدیں بڑھا دی ہیں، اگر ...... صاحب اسمبلی کے ممبر ہو گئے تو کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائے گی۔"

"ویسے بھی بہت سی جگہیں اور نکلیں گی۔ شاید اسی گڑبڑ میں ہمارے ہاتھ بھی کچھ آ جائے۔"

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔"

"وہ بے کار گریجوایٹ جو مارے مارے پھر رہے ہیں ان میں کچھ تو کمی ہو گی۔"

اس گفتگو نے استاد منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور بھی بڑھا دی۔ اور وہ اس کو ایسی "چیز" سمجھنے لگا جو بہت چمکتی ہو۔ "نیا قانون ...!" وہ دن میں کئی بار سوچتا "یعنی کوئی نئی چیز!" اور ہر بار اس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ نیا ساز آ جاتا جو اس نے دو برس ہوئے چودھری خدا بخش سے بڑی اچھی طرح ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔ اس ساز پر جب وہ نیا تھا۔ جگہ جگہ لوہے کی نکل چڑھی ہوئی کیلیں چمکتی تھیں، اور جہاں جہاں پیتل کا کام تھا وہ تو سونے کی طرح دمکتا تھا۔ اس لحاظ سے بھی "نئے قانون" کا درخشاں و تاباں ہونا ضروری تھا۔

پہلی اپریل تک استاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اس کے حق میں بہت کچھ سُنا۔ مگر اس کے متعلق جو تصور وہ اپنے ذہن میں قائم کر چکا تھا بدل نہ سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا۔ اور اس کو یقین تھا کہ اس کی آمد پر جو چیزیں نظر آئیں گی ان سے اس کی آنکھوں کو ضرور ٹھنڈک پہنچے گی۔

آخر کار مارچ کے اکتیس دن ختم ہو گئے اور اپریل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے۔ موسم خلاف معمول سرد تھا اور ہوا میں تازگی تھی۔ پہلی اپریل کو صبح سویرے استاد منگو اٹھا اور اصطبل میں جا کر تانگے میں گھوڑے کو جوتا اور باہر نکل گیا۔ اس کی طبیعت آج غیر معمولی طور پر مسرور تھی ——— وہ نئے قانون کو دیکھنے والا تھا۔

اس نے صبح کے سرد دھندلکے میں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا چکر لگایا مگر اسے ہر چیز پرانی نظر آئی ——— آسمان کی طرح پرانی۔ اس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیا رنگ دیکھنا چاہتی تھیں مگر سوائے اس کلغی کے جو رنگ برنگ کے پروں سے بنی تھی اور اس کے گھوڑے کے سر پر جمی ہوئی تھی، اور سب چیزیں پرانی نظر آتی تھیں۔ یہ نئی کلغی اس نے نئے قانون کی خوشی میں ۳۱ مارچ کو چودھری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنے میں خریدی تھی۔

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز، کالی سڑک اور اس کے آس پاس تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لگائے ہوئے بجلی کے کھمبے، دکانوں کے بورڈ، اس کے گھوڑے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگھرو کی جھنجھناہٹ، بازار میں چلتے پھرتے آدمی ... ان میں سے کون سی چیز نئی تھی؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں۔ لیکن استاد منگو مایوس نہیں تھا۔

"ابھی بہت سویرا ہے۔ دکانیں بھی تو سب کی سب بند ہیں۔" اس خیال سے اسے تسکین تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا۔ "ہائی کورٹ میں نو بجے کے بعد ہی کام شروع ہوتا ہے۔ اب اس سے پہلے نئے قانون کا کیا نظر آئے گا؟"

جب اس کا تانگہ گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہنچا تو کالج کے گھڑیال نے بڑی رعونت سے نو بجائے۔ جو طلبا کالج کے بڑے دروازے سے باہر نکل رہے تھے۔ خوش پوش تھے۔ مگر استاد منگو کو نہ جانے ان کے کپڑے میلے میلے سے کیوں نظر آئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کُن جلوے کا نظارہ کرنے والی تھیں۔

تانگے کو داہنے ہاتھ موڑ کر وہ تھوڑی دیر کے بعد پھر انارکلی میں تھا۔ بازار کی آدھی دکانیں کھل چکی تھیں۔ اور اب لوگوں کی آمد و رفت بھی بڑھ گئی تھی۔ حلوائی کی دکانوں پر گاہکوں کی خوب بھیڑ تھی۔ منہاری والوں کی نمائشی چیزیں شیشے کی الماریوں میں لوگوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں اور بجلی کے تاروں پر کئی کبوتر آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ مگر استاد منگو کے لئے ان تمام چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی —— وہ نئے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

جب استاد منگو کے گھر میں بچہ پیدا ہونے والا تھا تو اس نے چار پانچ مہینے بڑی بے قراری میں گزارے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ بچہ کسی نہ کسی دن ضرور پیدا ہوگا مگر وہ انتظار کی گھڑیاں نہیں کاٹ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے بچے کو صرف ایک نظر دیکھ لے۔ اس کے بعد وہ پیدا ہوتا رہے۔ چنانچہ اسی غیر مغلوب خواہش کے زیرِ اثر اس نے کئی مرتبہ اپنی بیمار بیوی کے پیٹ کو دبا دبا کر اور اس کے اوپر کان رکھ رکھ کر اپنے بچے کے متعلق کچھ جاننا چاہا تھا مگر ناکام رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ انتظار کرتے کرتے اس قدر تنگ آگیا تھا کہ اپنی بیوی پر برس بھی پڑا تھا ——

"تو ہر وقت مردے کی طرح پڑی رہتی ہے۔ اٹھ ذرا چل پھر، تیرے انگ میں تھوڑی سی طاقت تو آئے۔ یوں تختہ بنے رہنے سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ تو سمجھتی ہے کہ اس طرح لیٹے لیٹے بچہ جن دے گی؟"

اُستاد منگو طبعاً بہت جلد باز واقع ہوا تھا۔ وہ ہر سبب کی عملی تشکیل دیکھنے کا نہ صرف خواہش مند تھا بلکہ متجسس تھا۔ اس کی بیوی گنگا وتی اس کی اس قسم کی بے قراریوں کو دیکھ کر عام طور پر یہ کہا کرتی تھی

"ابھی کنواں کھودا نہیں گیا اور تم پیاس سے بے حال ہو رہے ہو۔"

کچھ بھی ہو مگر استاد منگو نئے قانون کے انتظار میں اتنا بے قرار نہیں تھا جتنا کہ اسے اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہئے تھا۔ وہ آج نئے قانون کو دیکھنے کے لئے گھر سے نکلا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے گاندھی یا جواہر لال کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لئے نکلتا تھا۔

لیڈروں کی عظمت کا اندازہ استاد منگو ہمیشہ ان کے جلوس کے ہنگاموں اور ان کے گلے میں ڈالے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے کیا کرتا تھا۔ اگر کوئی لیڈر گیندے کے پھولوں سے لدا ہو تو اُستاد منگو کے نزدیک وہ بڑا آدمی تھا اور اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بھیڑ کے باعث دو تین فساد ہوتے ہوتے رہ جائیں تو اس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا۔ اب نئے قانون کو وہ اپنے ذہن کے اسی ترازو میں تولنا چاہتا تھا

انارکلی سے نکل کر وہ مال روڈ کی چمکیلی سطح پر اپنے تانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا کہ موٹروں کی دکان کے پاس اسے چھاؤنی کی ایک سواری مل گئی۔ کرایہ طے کرنے کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا اور دل میں یہ خیال کیا ——

"چلو یہ بھی اچھا ہوا —— شاید چھاؤنی ہی سے نئے قانون کا کچھ پتہ چل جائے۔"

چھاؤنی پہنچ کر استاد منگو نے سواری کو اس کی منزلِ مقصود پر اُتار دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی آخری دو انگلیوں میں دبا کر سلگایا اور اگلی نشست کے گدے پر بیٹھ گیا —— جب استاد منگو کو کسی سواری کی تلاش نہیں ہوتی تھی یا اُسے کسی بیتے ہوئے واقعے پر غور کرنا ہوتا تو وہ عام طور پر اگلی نشست چھوڑ کر پچھلی نشست پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اپنے گھوڑے کی باگیں داہنے ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا گھوڑا تھوڑا سا ہنہنانے کے بعد بڑی دھیمی چال چلنا شروع کر دیتا تھا۔ گویا اسے کچھ دیر کے لئے بھاگ دوڑ سے چھٹی مل گئی ہے۔

گھوڑے کی چال اور استاد منگو کے دماغ میں خیالات کی آمد بہت سست تھی۔ جس طرح گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا اسی طرح استاد منگو کے ذہن میں نئے قانون کے متعلق نئے قیاسات داخل ہو رہے تھے۔

وہ نئے قانون کی موجودگی میں میونسپل کمیٹی سے تانگوں کے نمبر ملنے کے طریقے پر غور کر رہا تھا اور اس قابلِ غور بات کو آئینِ جدید کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ وہ اس سوچ بچار میں غرق تھا۔ اُسے یوں معلوم ہُوا جیسے کسی سواری نے اسے بلایا ہے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے اسے سڑک کے اس طرف دور بجلی کے کھمبے کے پاس ایک "گورا" کھڑا نظر آیا جو اسے ہاتھ سے بلا رہا تھا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے استاد منگو کو گوروں سے بے حد نفرت تھی۔ جب اس نے اپنے تازہ گاہک کو گورے کی شکل میں دیکھا تو اُس کے دل میں نفرت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ پہلے اس کے جی میں آئی کہ بالکل توجہ نہ دے اور اُس کو چھوڑ کر چلا جائے مگر بعد میں اُس کو خیال آیا "ان کے پیسے چھوڑنا بھی بیوقوفی ہے۔ کلغی پر جو مفت میں ساڑھے چودہ آنے خرچ کر دیئے ہیں۔ ان کی جیب ہی سے وصول کرنے چاہئیں۔ چلو چلتے ہیں۔"

خالی سڑک پر بڑی صفائی سے تانگہ موڑ کر اس نے گھوڑے کو چابک دکھایا اور آنکھ جھپکنے میں وہ بجلی کے کھمبے کے پاس تھا۔ گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ ٹھہرایا اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا ——

"صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے؟"

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا۔ صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھچ گیا اور پاس ہی گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھاری ڈال دی ہے۔ اس کا سارا چہرہ ہنس رہا تھا اور اپنے اندر اس نے اس "گورے" کو سینے کی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔

جب "گورے" نے جو بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہوا کا رخ بچا کر سگریٹ سلگا رہا تھا مڑ کر تانگے کے پائیدان کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک استاد منگو اور اس کی نگاہیں چار ہوئیں اور ایسا معلوم ہُوا کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں سے گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولا بن کر اُوپر کو اڑ گئیں۔

استاد منگو جو اپنے دائیں ہاتھ سے باگ کے بل کھول کر تانگے پر سے نیچے اُترنے والا تھا۔ اپنے سامنے کھڑے "گورے" کو یوں دیکھ رہا تھا گویا وہ اس کے وجود کے ذرے ذرے کو اپنی نگاہوں سے چبا رہا ہے اور گورا کچھ اس طرح اپنی نیلی پتلون پر سے غیر مرئی چیزیں جھاڑ رہا ہے گویا وہ استاد منگو کے اس حملے سے اپنے وجود کے کچھ حصے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

گورے نے سگرٹ کا دھواں نگلتے ہوئے کہا "جانا مانگتا یا پھر گڑبڑ کرے گا؟"

"وہی ہے" یہ الفاظ استاد منگو کے ذہن میں پیدا ہوئے اور اس کی چوڑی چھاتی کے اندر ناچنے لگے۔

"وہی ہے" اُس نے یہ الفاظ اپنے منہ کے اندر ہی اندر دہرائے اور ساتھ ہی اسے پورا یقین ہو گیا کہ وہ گورا جو اس کے سامنے کھڑا تھا وہی ہے جس سے پچھلے برس اس کی جھڑپ ہوئی تھی اور اس خواہ مخواہ کے جھگڑے میں جس کا باعث گورے کے دماغ میں چڑھی ہوئی شراب تھی اُسے طوعاً کرہاً بہت سی باتیں سہنا پڑی تھیں۔ استاد منگو نے گورے کا دماغ درست کر دیا ہوتا بلکہ اس کے پُرزے اڑا دیئے ہوتے مگر وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہو گیا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا نزلہ عام طور پر کوچوانوں ہی پر گرتا ہے۔

اُستاد منگو نے پچھلے برس کی لڑائی اور پہلی اپریل کے نئے قانون پر غور کرتے ہوئے گورے سے کہا "کہاں جانا مانگتا ہے؟"

اُستاد منگو کے لہجے میں چابک ایسی تیزی تھی۔

گورے نے جواب دیا "ہیرا منڈی۔"

"کیا یہ پانچ روپے ہوگا؟" استاد منگو کی مونچھیں تھرتھرائیں۔

یہ سُن کر گورا حیران ہوگیا۔ وہ چلّایا "پانچ روپے۔ کیا تم ——— ؟"

"ہاں ہاں۔ پانچ روپے" یہ کہتے ہوئے اُستاد منگو کا داہنا بالوں بھرا ہاتھ بھنچ کر ایک وزنی گھونسے کی شکل اختیار کر گیا۔ "کیوں جاتے ہو یا بے کار باتیں بناؤ گے؟"

استاد منگو کا لہجہ زیادہ سخت ہوگیا۔

گورا پچھلے برس کے واقعے کو پیشِ نظر رکھ کر استاد منگو کے سینے کی چوڑائی نظر انداز کر چکا تھا۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی پھر کھجلا رہی ہے۔ اس حوصلہ افزا خیال کے زیرِ اثر وہ تانگے کی طرف اکڑ کر بڑھا اور اپنی چھڑی سے استاد منگو کو تانگے پر سے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ بید کی یہ پالش کی ہوئی پتلی چھڑی استاد منگو کی موٹی ران کے ساتھ دو تین مرتبہ چھوئی۔ اس نے کھڑے کھڑے اُوپر سے پست قد گورے کو دیکھا۔ گویا وہ اپنی نگاہوں کے وزن ہی سے اسے پیس ڈالنا چاہتا ہے۔ پھر اس کا گھونسہ کمان میں سے تیر کی طرح سے اُوپر کو اُٹھا اور چشم زدن میں گورے کی ٹھڈی کے نیچے جم گیا۔ دھکا دے کر اس نے گورے کو پرے ہٹایا اور نیچے اُتر کر اُسے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔

ششدر و متحیر گورے نے اِدھر اُدھر سمٹ کر استاد منگو کے وزنی گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ اس کے مخالف پر دیوانگی کی سی حالت طاری ہے اور اس کی آنکھوں میں سے شرارے برس رہے ہیں تو اس نے زور زور سے چلّانا شروع کیا۔ اس چیخ و پکار نے استاد منگو کی بانہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا۔ وہ گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا ———

"پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑ فوں ... پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑ فوں ——— اب ہمارا راج ہے بچّہ؟"

لوگ جمع ہوگئے اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو استاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔ استاد منگو ان دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کی چوڑی چھاتی پھولی ہوئی سانس کی وجہ سے اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا ———

"وہ دن گزر گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے ——— اب نیا قانون ہے میاں ——— نیا قانون!"

اور بے چارا گورا اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بیوقوفوں کی مانند کبھی استاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ہجوم کی طرف۔

استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ "نیا قانون، نیا قانون" چلّاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سُنی۔

"نیا قانون، نیا قانون کیا بک رہے ہو ——— قانون وہی ہے پُرانا!"

اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا!

راجندر سنگھ بیدی

گرہن

رُوپ، شبد، کھشو اور متا ـــــ ہولی نے اساڑھی کے کاشتکاروں کو چار بچے دیے تھے اور پانچواں چند ہی مہینوں میں جننے والی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے پڑنے لگے، گالوں کی ہڈیاں اُبھر آئیں اور گوشت ان میں پچک گیا۔ وہ ہولی جسے پہلے پہل میّا پیار سے چاند رانی کہہ کر پکارا کرتی تھی اور جس کی صحت اور سندرتا کا بیلا حاسد تھا گرے ہوئے پتے کی طرح زرد اور پژمردہ ہو چکی تھی۔

آج رات چاند گرہن تھا۔ سرِ شام چاند گرہن کے زمرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ ہولی کو اجازت نہ تھی کہ وہ کوئی کپڑا پھاڑ سکے ـــــ پیٹ میں بچے کے کان پھٹ جائیں گے، وہ سی نہ سکتی تھی ـــــ منہ سلا بچہ پیدا ہوگا۔ اپنے میکے خط نہ لکھ سکتی تھی ـــــ اس کے ٹیڑھے میڑھے حروف بچے کے چہرے پر لکھے جائیں گے، اور اپنے میکے خط لکھنے کا اسے بہت چاؤ تھا۔

میکے کا نام آتے ہی اس کا تمام جسم ایک نامعلوم جذبے سے کانپ اٹھا۔ وہ میکے تھی تو اسے سسرال کا کتنا چاؤ تھا لیکن اب وہ سسرال سے اتنی سیر ہو چکی تھی کہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اس بات کا اس نے کئی مرتبہ تہیہ بھی کیا لیکن ہر دفعہ ناکام رہی۔ اس کے میکے اساڑھی گاؤں سے پچیس میل کے فاصلے پر تھے۔ سمندر کے کنارے ہر کھیل بندر پر شام کے وقت سٹیمر لانچ مل جاتا تھا اور ساحل کے ساتھ ساتھ ڈیڑھ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد اس کے میکے گاؤں کے بڑے مندر کے زنگ خوردہ کلس دکھائی دینے لگتے۔

آج شام ہونے سے پہلے روٹی، چوکا، برتن کے کام سے فارغ ہونا تھا۔ میّا کہتی تھی گرہن سے پہلے روٹی وغیرہ کھا لینی چاہیئے ورنہ ہر حرکت پیٹ میں بچے کے جسم و تقدیر پر اثر انداز ہوتی ہے۔ گویا وہ بدزیب، فراخ نتھنوں والی ہٹیلی میّا اپنی بہو حمیدہ بانو کے پیٹ سے کسی اکبرِ اعظم کی متوقع ہے۔ چار بچوں، تین مردوں، دو عورتوں، چار بھینسوں پر مشتمل بڑا کنبہ اور اکیلی ہولی ـــــ دوپہر تک تو ہولی برتنوں کا انبار صاف کرتی رہی، پھر جانوروں کے لئے بنولے، کھلی اور چنے بھگونے چلی۔ حتٰی کہ اس کے کولہے درد سے پھٹنے لگے اور بغاوت پسند بچہ پیٹ میں اپنی بے بضاعت مگر ہولی کو تڑپا دینے والی حرکتوں سے احتجاج کرنے لگا۔ ہولی شکست کے احساس سے چوکی پر بیٹھ گئی۔ لیکن وہ بہت دیر تک چوکی یا فرش پر بیٹھنے کے قابل نہ تھی اور پھر میّا کے خیال کے مطابق چوڑی چکی چوکی پر بہت دیر بیٹھنے سے بچے کا سر چپٹا ہو جاتا ہے، مونڈھا پر

تا پچا ہے۔ کبھی کبھی ہولی ہیا اور کاشتھوں کی آنکھ بچا کر کھاٹ پر سیدھی پڑ جاتی اور ایک پُرشکم کتیا کی طرح ٹانگوں کو اچھی طرح سے پھیلا کر جوائی لیتی اور پھر اسی وقت کانپتے ہوئے ہاتھ سے اپنے ننھے سے دوزخ کو سہلانے لگتی۔

یہ خیال کرنے سے کہ وہ سیتل کی بیٹی ہے۔ وہ اپنے آپ کو روک نہ سکتی تھی۔ سیتل سارنگ دیو گرام کا ایک متمول ساہوکار تھا اور سارنگ دیو گرام کے نواح کے بیس گاؤں کے کسان اس سے بیاج پر روپیہ لیتے تھے۔ اس کے باوجود اسے کاشتھوں کے ہاں ذلیل کیا جاتا تھا۔ ہولی کے ساتھ کنوں سے بھی بُرا سلوک ہوتا تھا۔ کاشتھوں کو تو بچے چاہئیں، ہولی جہنم میں جائے۔ گویا سارے گجرات میں یہ کاشتھ ہی کل وہ بہو رُکل کو بڑھانے والی ——— بہو، کا صحیح مطلب سمجھتے تھے۔

ہر سال ڈیڑھ سال کے بعد وہ ایک نیا کیڑا گھر میں رینگتا ہوا دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ اور بچے کی وجہ سے کھایا پیا ہولی کے جسم پر اثر انداز نہیں ہوتا تھا۔ شاید اسے روٹی بھی اسی لئے دی جاتی تھی کہ پیٹ میں بچہ مانگتا ہے اور اسی لئے اسے حمل کے شروع میں چاٹ اور راب چل آزادانہ دئے جاتے تھے۔

" دیور ہے تو وہ الگ پیٹ لیتا ہے۔" ہولی سوچتی تھی " اور ساس کے کوسنے مار پیٹ سے کہیں بُرے ہیں اور بڑے کاشتھ جب ڈانٹنے لگتے ہیں تو پاؤں تلے سے زمین نکل جاتی ہے۔ ان سب کو بھلا میری جان لینے کا کیا حق ہے؟ ...... رسیلا کی تو بات ہی دوسری ہے۔ شاستروں نے اسے پرماتما کا درجہ دیا ہے۔ وہ جس چھری سے مارے اس چھری کا بھلا! ...... لیکن کیا شاستر کسی عورت نے بنائے ہیں؟ اور تیا کی تو بات ہی علیحدہ ہے ——— شاستر کسی عورت نے لکھے ہوتے تو وہ اپنی ہم جنس پر اس سے بھی زیادہ پابندیاں عائد کرتی ...... "

...... راہو اپنے نئے بھیس میں نہایت اطمینان سے امرت پی رہا تھا۔ چاند اور سورج نے وشنو مہاراج کو اس کی اطلاع دی۔ بھگوان نے سدرشن سے راہو کے دو ٹکڑے کر دئیے۔ اس کا سر اور دھڑ دونوں آسمان پر جا کر راہو اور کیتو بن گئے۔ سورج اور چاند دونوں ان کے مقروض ہیں۔ اب وہ ہر سال دو مرتبہ چاند اور سورج سے بدلہ لیتے ہیں اور ہولی سوچتی تھی۔ بھگوان کے کھیل بھی نیارے ہیں...... اور راہو کی شکل کیسی عجیب ہے۔ ایک کالا سا راکشس، شیر پر چڑھا ہوا دیکھ کر کتنا ڈر لگتا ہے۔ رسیلا بھی تو شکل سے راہو ہی دکھائی دیتا ہے۔ منّا کی پیدائش پر ابھی چالیسواں بھی نہ نہائی تھی تو آموجود ہوا ——— کیا میں نے بھی اس کا قرضہ دینا ہے؟

اس وقت ہولی کے کانوں میں ماں بیٹے کے آنے کی بھنک پڑی۔ ہولی نے دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو سنبھالا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور جلدی سے توے کو دھیمی دھیمی آنچ پر رکھ دیا۔ اب اس میں جھکنے کی تاب نہ تھی کہ پھونکیں مار کر آگ جلا سکے۔ اس نے کوشش بھی کی لیکن اس کی آنکھیں پھٹ کر باہر آنے لگیں۔

رسیلا ایک نیا مرمت کیا ہوا چھاج ہاتھ میں لئے اندر داخل ہوا۔ اس نے جلدی سے ہاتھ دھوئے اور منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ اس کے پیچھے تیا آئی اور آتے ہی بولی:

" بہو...... اناج رکھا ہے کیا؟ "

ہولی ڈرتے ڈرتے بولی " ہاں ہاں ...... رکھا ہے ——— نہیں رکھا، یاد آیا، بھول گئی تھی تیا...... "

" تو بیٹھی کر کیا رہی ہے نباب جادی؟ "

ہولی نے رحم جویانہ نگاہوں سے رسیلے کی طرف دیکھا اور بولی " جی! مجھ سے اناج کی بوری ہلائی جاتی ہے کہیں! "

تیا لاجواب ہو گئی۔ ماں دیوں بھی اسے ہولی کی نسبت اس کے پیٹ میں بچے کی زیادہ پرواہ تھی۔ شاید اسی لئے ہولی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی:

" تم نے سُرمہ کیوں لگایا ہے ری؟ ——— رانڈ، جانتی بھی ہے آج گہن ہے۔ بچہ اندھا ہو جائے تو تیرے ایسی بیسوا اسے پالنے چلے گی؟ "

ہولی چپ ہو گئی اور نظریں زمین پر گاڑے ہوئے منہ میں کچھ بڑبڑاتی گئی۔ اور سب ہو جاتے لیکن ماں کی گالی اس کی برداشت سے باہر تھی۔ اسے بڑبڑاتے دیکھ کر میّا اور بھی بکنے جھکنے لگی۔ چابیوں کا گچھا تلاش کرنے لگی۔ ایک میلے شمع دان کے قریب سرسوں کے تیل کا کھرل رکھا ہوا تھا۔ اس میں سے چابیوں کا گچھا نکال کر وہ بھنڈارے کی طرف چلی گئی۔ رسیلے نے ایک پُرہوس نگاہ سے ہولی کی طرف دیکھا۔ اس وقت ہولی اکیلی تھی۔ رسیلے نے آہستہ سے آنچل کو چھوا۔ ہولی نے ڈرتے ڈرتے دامن جھٹک دیا اور اپنے دیور کو آوازیں دینے لگی۔ گویا دوسرے آدمی کی موجودگی چاہتی ہے۔ اس کیفیت میں مرد کو ٹھکرا دینا معمولی بات نہیں ہوتی۔ رسیلا آواز کو چباتے ہوئے بولا:

"میں پوچھتا ہوں بھلا اتنی جلدی کا ہے کی تھی؟"

"جلدی کیسی؟"

رسیلا پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "یہی . . . تم بھی تو کتیا ہو کتیا!"

ہولی سہم کر بولی: "تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

ہولی نے نادانستگی میں رسیلے کو وحشی، بدچلن، ہوس ران سبھی کچھ کہہ دیا۔ چوٹ سیدھی پڑی، رسیلا کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ لاجواب آدمی کا جواب چپت ہوتی ہے اور دوسرے لمحے میں انگلیوں کے نشان ہولی کے گالوں پر دکھائی دینے لگے۔

اس وقت میّا ماش کی ایک ٹوکری اٹھائے ہوئے بھنڈارے کی طرف سے آئی اور بہو سے بدسلوکی کرنے کی وجہ سے بیٹے کو جھڑکنے لگی۔ ہولی کو رسیلے پر تو غصہ نہ آیا۔ البتہ میّا کی اس عادت سے جل بھن گئی ——— "ماں، آپ مارے تو اس سے بھی زیادہ، اور جو بیٹا کچھ کہے تو ہمدردی جتاتی ہے، بڑی آئی ہے . . . . ."

ہولی سوچتی تھی کل رسیلے نے مجھے اس لئے مارا تھا کہ میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اور آج اس لئے مارا ہے کہ میں نے بات کا جواب دے دیا ہے۔ میں جانتی ہوں وہ مجھ سے کیوں ناراض ہے، کیوں گالیاں دیتا ہے، میرے کھانے پکانے، اٹھنے بیٹھنے میں اسے کیوں سلیقہ دکھائی نہیں دیتا . . . . اور میری یہ حالت ہے کہ ناک میں دم آچکا ہے اور مرد عورت کو مصیبت میں مبتلا کر کے آپ الگ ہو جاتے ہیں، یہ مرد . . . . . . !

میّا نے کچھ باسمتی، دالیں اور نمک وغیرہ رسوئی میں بکھیر دیا اور پھر ایک بھیگی ہوئی ترازو میں اسے تولنے لگی۔ ترازو گیلا تھا، میّا بھی دیکھ رہی تھی اور جب باسمتی چاول پلڑے میں چمٹ گئے تو بھو مرتی کرتی جھٹ ہو گئی اور آپ اتنی سگھڑ کہ تیرے دوپٹے سے پلڑا صاف کرنے لگی۔ جب بہت میلا ہو گیا تو دوپٹے کو سر سے اتار کر ہولی کی طرف پھینک دیا اور بولی:

"لے، دھو ڈال۔"

اب ہولی نہیں جانتی بیچاری کہ وہ روٹیاں پکائے یا دوپٹہ دھوئے۔ بولے یا نہ بولے، ہلے یا نہ ہلے، وہ کتیا ہے یا تابع داری! اس نے دوپٹہ دھونے ہی میں مصلحت سمجھی۔ اس وقت چاند گرہن کے زمرہ میں داخل ہونے والا ہی ہوگا۔ بچہ ڈھلے ہوئے کپڑے کی طرح چرمرسا پیدا ہوگا اور اگر ماہ رو اور بدصورت بچے کا بُرا سا چہرہ دیکھ کر اسے کوسا جائے تو اس میں ہولی کا کیا قصور ہے؟ . . . . لیکن قصور اور بے قصوری کی تو بات ہی علیحدہ ہے۔ کیونکہ یہ کوئی سمجھنے کے لئے تیار نہیں کہ اس میں ہولی کا گناہ کیا ہے . . . سب گناہ ہولی کا ہے۔

اسی وقت ہولی کو سارنگ دیو گرام یاد آگیا۔ کس طرح وہ اسوج کے شروع میں دوسری عورتوں کے ساتھ گربا ناچا کرتی تھی، اور بھابی کے سر پر رکھے ہوئے گھڑے کے سوراخوں میں سے روشنی پھوٹ پھوٹ کر دالان کے چاروں کونوں کو منور کر دیا کرتی تھی۔ اس وقت سب عورتیں اپنے خاوند کے ساتھ ہاتھوں سے تالیاں بجایا کرتی تھیں اور گایا کرتی تھیں ———

ماہنڈی[1] تر اوری مالوے   اینو رنگ گیو گجرات رے
ماہنڈی رنگ لاگیو رے

اس وقت وہ ایک اُچھلنے کودنے والی الھڑ چھوکری تھی، ایک بحر و قافیہ سے آزاد نظم، جو چاہتی تھی پورا ہو جاتا تھا۔ گھر میں سب سے چھوٹی تھی۔ نہاب جادی تو نہ تھی اور اس کی سہیلیاں ——— وہ بھی اپنے اپنے قرض خواہوں کے پاس جا چکی ہوں گی۔

…… سارنگ دیو گرام میں گرہن کے موقع پر بھی کھول کر وہاں پن کیا جاتا ہے۔ عورتیں اکٹھی ہو کر تروینی گھاٹ پر اشنان کے لئے چلی جاتی ہیں۔ پھول، ناریل، بتاشے سمندر میں بہاتی ہیں۔ پانی کی ایک اچھال منہ کھولے ہوئے آتی ہے اور سب پھول پتوں کو قبول کر لیتی ہے۔ ماس تیرتھ کے اشنان سے سب مرد و عورتوں کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ ان گناہوں کا جن کا ارتکاب لوگ گذشتہ سال کرتے رہے ہیں۔

اشنان سے سب پاپ دھل جاتے ہیں۔ بدن اور روح پاک ہو جاتی ہے۔ سمندر کی لہر لوگوں کے سب گناہوں کو بہا کر دور، بہت دور، ایک نامعلوم، ناقابلِ عبور، ناقابلِ پیمائش سمندر میں لے جاتی ہے …… ایک سال بعد پھر لوگوں کے بدن گناہوں سے آلودہ ہو جاتے ہیں، پھر گھنا جاتے ہیں، پھر دریا کی ایک لہر آتی ہے اور پھر پاک و صاف۔

جب گرہن شروع ہوتا ہے اور چاند کی نورانی عصمت پر داغ لگ جاتا ہے تو چند لمحات کے لئے چاروں طرف خاموشی اور پھر رام نام کا جاپ شروع ہوتا ہے۔ پھر گھنٹے، ناقوس، سنکھ ایک دم بجنے لگتے ہیں۔ اس شور و غوغا میں اشنان کے بعد سب مرد عورتیں جگمگھٹے کی صورت میں گھنٹے بجاتے گاؤں واپس لوٹتے ہیں۔

گرہن کے دوران میں غریب لوگ بازاروں اور گلی کوچوں میں دوڑتے ہیں۔ لنگڑے بیساکھیاں گھماتے ہوئے اپنی اپنی جھولیاں اور کشکول تھامے پتنگ کے چوہوں کی طرح ایک دوسرے پر گرتے پڑتے بھاگتے چلے جاتے ہیں کیونکہ راہو اور کیتو نے خوبصورت چاند کو اپنی گرفت میں پوری طرح سے جکڑ لیا ہے۔ نرم دل ہندو دان دیتا ہے تاکہ غریب چاند کو چھوڑ دیا جائے اور دان لینے کے لئے بھاگنے والے بھکاری "چھوڑ دو، چھوڑ دو، دان کا وقت ہے ——— چھوڑ دو" کا شور مچاتے ہوئے میلوں کی مسافت طے کر لیتے ہیں۔

چاند گرہن کے زمرہ میں آنے والا ہی تھا۔ ہولی نے بچوں کو بڑے کاکستہ کے پاس چھوڑا۔ ایک میلی کچیلی دھوتی باندھی اور عورتوں کے ساتھ ہر کیول بندر کی طرف اشنان کے لئے چلی۔

اب بیا، رسیلا، جراٹا کا شنبو اور ہولی سب سمندر کی طرف جا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں پھول تھے، گجرے تھے اور آم کے پتے اور بڑی اماں کے ہاتھ میں رودرکش کی مالا کے علاوہ مشک کافور تھا جسے وہ جلا کر پانی کی لہروں پر بہا دینا چاہتی تھی تاکہ مرنے کے بعد سورگ میں اس کا راستہ روشن ہو جائے اور ہولی ڈر رہی تھی ——— کیا اس کے گناہ سمندر کے پانی سے دھل جائیں گے؟

سمندر کے کنارے، گھاٹ سے پون میل کے قریب ایک لانچ کھڑا تھا۔ وہ جگہ ہر کیول بندر کا ایک حصہ تھی۔ بندر کے چھوٹے سے ناہموار ساحل اور ایک مختصر سے ڈاک پر کچھ ٹنڈیل غروبِ آفتاب میں روشنی اور اندھیرے کی کشمکش کے خلاف ننھے ننھے بے بضاعت سے خاکے بنا رہے تھے۔ اور لانچ کے کسی کیبن سے ایک ہلکی سی ٹمٹماتی ہوئی روشنی سیماب وار پانی کی لہروں پر ناچ رہی تھی۔ اس کے بعد ایک بیج کی سی گھومتی ہوئی دکھائی دی۔ چند ایک دھندلے سے سائے ایک اژدہا نما رسّے کو کھینچنے لگے۔ آٹھ بجے سٹیم لانچ کی آخری سیٹی تھی ——— پھر وہ سارنگ دیو گرام کی طرف روانہ ہو گا۔ اگر ہولی اس پر سوار ہو جائے تو پھر ڈیڑھ دو گھنٹے میں وہ چاندنی میں نہاتے ہوئے گویا صدیوں سے آشنا

---

[1] ماہنڈی رحنا، ترماوہ ——— وسطِ ہند میں پیدا ہوتی۔ اس ہی گجرات رنگا ہوا ہے۔ گویا سے حنا کا رنگ چڑھ گیا ہے۔

کلس دکھائی دینے لگیں ...... اور پھر وہی اماں ...... کنوار پن اور گربا ناچ!

ہولی نے ایک نظر سے شبو کی طرف دیکھا۔ شبو حیران تھا کہ اس کی ماں نے اتنی بھیڑ میں جھک کر اس کا منہ کیوں چوما اور ایک گرم گرم قطرہ کہاں سے اس کے گالوں پر آ پڑا۔ اس نے آگے بڑھ کر رسیلے کی انگلی پکڑ لی۔ اب گھاٹ آ چکا تھا جہاں سے مرد اور عورتیں علیحدہ ہوتی تھیں۔ ہمیشہ کے لئے نہیں، فقط چند گھنٹوں کے لئے ...... اسی پانی کی گواہی میں وہ اپنے مردوں سے باندھ دی گئی تھیں۔ پانی میں بھی کیا پُراسرار، بعید الفہم طاقت ہے ــــــ اور دور سے لانچ کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی ہولی تک پہنچ رہی تھی۔

ہولی نے بھاگنا چاہا مگر وہ بھاگ بھی تو نہ سکتی تھی۔ اس نے اپنی ہلکی سی دھوتی کو کس کر باندھا ــــــ دھوتی نیچے کی طرف ڈھلک جاتی تھی ...... آدھ گھنٹے میں وہ لانچ کے سامنے کھڑی تھی۔ لانچ کے سامنے نہیں ــــــ سارنگ دیوگرام کے سامنے ...... وہ کلس، مندر کے گھنٹے، لانچ کی سیٹی، اور ہولی کو یاد آیا کہ اس کے پاس تو ٹکٹ کے لئے بھی پیسے نہیں ہیں۔

وہ کچھ عرصہ تک لانچ کے ایک کونے میں بد حواس ہو کر بیٹھی رہی۔ پونے آٹھ بجے کے قریب ایک ٹنڈیل آیا اور ہولی سے ٹکٹ مانگنے لگا۔ ٹکٹ نہ پانے پر وہ خاموشی سے وہاں سے ٹل گیا۔ کچھ دیر بعد ملازموں کی سرگوشیاں سنائی دینے لگیں ...... پھر اندھیرے میں خفیف سے ہنسنے اور باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کوئی کوئی لفظ ہولی کے کان میں بھی پڑ جاتا ــــــ مرغی ...... روپے ...... چابیاں میرے پاس ہیں ...... پانی زیادہ ہو گا ......

اس کے بعد چند وحشیانہ قہقہے بلند ہوئے اور کچھ دیر بعد تین چار آدمی ہولی کو لانچ کے ایک تاریک کونے کی طرف دھکیلنے لگے۔ اسی وقت آبکاری کا ایک سپاہی لانچ میں وارد ہوا عین جبکہ دنیا ہولی کی آنکھوں میں تاریک ہو رہی تھی ہولی کو امید کی ایک شعاع دکھائی دی۔ وہ سپاہی سارنگ دیوگرام کا ہی ایک چھوکرا تھا اور میکے کے رشتے سے بھائی تھا۔ چھ سال ہوئے وہ بڑی امنگوں کے ساتھ گاؤں سے باہر نکلا تھا اور سابرمتی پھاند کر کسی نامعلوم دیس کو چلا گیا تھا۔ کبھی کبھی مصیبت کے وقت انسان کے حواس بجا ہو جاتے ہیں۔ ہولی نے سپاہی کو آواز سے ہی پہچان لیا اور کچھ دلیری سے بولی:

"کتھو رام!"

کتھو رام نے بھی مقتل کی چھوکری کی آواز پہچان لی۔ بچپن میں وہ اس کے ساتھ کھیلا تھا ــــــ

کتھو رام بولا:

"ہولے!"

ہولی یقین سے معمور مگر بھرائی ہوئی آواز میں بولی "کتھو بھیا ...... مجھے سارنگ دیوگرام پہنچا دو ......"

کتھو رام قریب آیا اور ایک ٹنڈیل کو گھورتے ہوئے بولا:

"سارنگ دیو جاؤ گی ہولے؟" اور پھر سامنے کھڑے ہوئے آدمی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا "تم نے اسے یہاں کیوں رکھا ہے بھائی؟"

ٹنڈیل جو سب سے قریب تھا بولا:

"بچاری کوئی دکھیا ہے۔ اس کے پاس تو ٹکٹ کے پیسے بھی نہیں تھے۔ ہم سوچ رہے تھے کہ ہم اس کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟"

کتھو رام نے ہولی کو ساتھ لیا اور لانچ سے نیچے اتر آیا۔ ڈاک پر قدم رکھتے ہوئے بولا:

"ہولے ...... کیا تم اسارجی سے بھاگ آئی ہو؟"

"ہاں!"

"یہ سر پیچھا جا دیوں کا کام ہے؟ ...... اور جو میں کانستبلوں کو خبر کر دوں تو؟"

ہولی ڈر سے کانپنے لگی۔ وہ نہ تو نباب جاری تھی اور نہ سر پیچھا جا دی۔ اس جگہ اور ایسی حالت میں وہ کنتھورام کو کچھ کہہ بھی تو نہ سکتی تھی۔ وہ اپنی کمزوری کو محسوس کرتی ہوئی خاموشی سے سمندر کی لہروں کے تلاطم کی آوازیں سننے لگی۔ پھر اس کے سامنے لانچ کے رسے ڈھیلے کئے گئے۔ ایک ہلکی سی وسل ہوئی اور ہولے ہولے سارنگ دیوگرام ہولی کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس نے ایک دفعہ پیچھے کی جانب دیکھا۔ لانچ کی ہلکی سی روشنی میں اسے جھاگ کی ایک لمبی سی لکیر لانچ کا پیچھا کرتی ہوئی دکھائی دی۔

کنتھورام بولا "یہ ڈرو نہیں ہولے...... میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔ یہاں سے کچھ دور ناؤ پڑتی ہے۔ پَو پھٹے چلیں گا۔ یوں گھبراؤ نہیں۔ رات کی رات سرائے میں آرام کر لو۔"

کنتھورام ہولی کو سرائے میں لے گیا۔ سرائے کا مالک بڑی حیرت سے کنتھورام اور اس کی ساتھی کو دیکھتا رہا۔ آخر جب وہ نہ رہ سکا تو اس نے کنتھورام سے نہایت آہستہ آواز میں پوچھا "یہ کون ہیں؟"

کنتھورام نے آہستہ سے جواب دیا "میری پتنی ہے۔"

ہولی کی آنکھیں پتھرانے لگیں۔ ایک دفعہ اس نے اپنے پیٹ کو سہارا دیا اور دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ کنتھورام نے سرائے میں ایک کمرہ کرائے پر لیا۔ ہولی نے ڈرتے ڈرتے اس کمرے میں قدم رکھا۔ کچھ دیر بعد کنتھورام آیا تو اس کے منہ سے شراب کی بُو آ رہی تھی......

سمندر کی ایک بڑی بھاری اچھال آئی۔ سب پھول، بتاشے، آم کی ٹہنیاں، گجرے اور جلتا ہوا شنک کا فور بہا کر لے گئی۔ اس کے ساتھ ہی انسان کے مہیب ترین گناہ بھی لپیٹی گئی ——— دور، بہت دور، ایک نامعلوم، ناقابلِ عبور، ناقابلِ پیمائش سمندر کی طرف...... جہاں تاریکی ہی تاریکی تھی...... پھر سنکھ بجنے لگے۔ اس وقت سرائے میں سے کوئی عورت نکل کر بھاگی۔ سرپٹ، بگٹٹ...... وہ گرتی تھی، بھاگتی تھی، پیٹ پکڑ کر بیٹھ جاتی، ہانپتی اور دوڑنے لگتی...... اس وقت آسمان پر چاند پورا گہنا چکا تھا۔ راہو اور کیتو نے جی بھر کر قرضہ وصول کیا تھا......... دو دھندلے سے سائے اس عورت کی مدد کے لئے سراسیمہ ادھر اُدھر دوڑ رہے تھے...... چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور دور ساحل سے ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں ———

وان کا وقت ہے......

چھوڑ دو...... چھوڑ دو...... چھوڑ دو......

ہر پھول پر در سے آواز آئی ———

پکڑ لو...... پکڑ لو...... پکڑ لو......

....

چھوڑ دو...... وان کا وقت ہے...... پکڑ لو...... چھوڑ دو!!

———

عصمت چغتائی

چوتھی کا جوڑا

سہ دری کے چوکے پر آج پھر صاف ستھری جازم بچھی تھی۔ ٹوٹی پھوٹی کھپریل کی جھریوں میں سے دھوپ کے آڑے ترچھے قتلے پورے دالان میں بکھرے ہوئے تھے۔ محلے ٹولے کی عورتیں خاموش اور سہمی ہوئی سی بیٹھی ہوئی تھیں جیسے کوئی بڑی واردات ہونے والی ہو۔ ماؤں نے بچے چھاتیوں سے لگا لیے تھے۔ کبھی کبھی کوئی منحنی سا چڑچڑا بچہ رسد کی کمی کی دہائی دے کر چلا اٹھتا۔

"نائیں نائیں میرے لال!" دبلی پتلی ماں اسے اپنے گھٹنے پر لٹا کر یوں ہلاتی جیسے دھان ملے چاول سوپ میں پھٹک رہی ہو اور بچہ ہنکارے بھر کر خاموش ہو جاتا۔

آج کتنی آس بھری نگاہیں کبریٰ کی ماں کے متفکر چہرے کو تک رہی تھیں۔ چھوٹے عرض کی ٹول کے دو پاٹ تو جوڑ لیے گئے تھے، مگر ابھی سفید گزی کا نشان بیونتنے کی کسی کو ہمت نہ پڑتی تھی۔ کانٹ چھانٹ کے معاملہ میں کبریٰ کی ماں کا مرتبہ بہت اونچا تھا۔ ان کے سوکھے سوکھے ہاتھوں نے نہ جانے کتنے جہیز سنوارے تھے، کتنے چھٹی چھوچھک تیار کیے تھے اور کتنے ہی کفن بیونتے تھے۔ جہاں کہیں محلے میں کپڑا کم پڑ جاتا اور لاکھ جتن پر بھی بیونت نہ بیٹھتی، کبریٰ کی ماں کے پاس کیس لایا جاتا۔ کبریٰ کی ماں کپڑے کی کان نکالتیں، کلف توڑتیں، کبھی تکون بناتیں، کبھی چوکھونٹا کرتیں اور دل ہی دل میں قینچی چلا کر آنکھوں سے ناپ تول کر مسکرا پڑتیں۔

"آستین اور گھیر تو نکل آئے گا، گریبان کے لیے کترن میری بقچی سے لے لو۔" اور مشکل آسان ہو جاتی۔ کپڑا تراش کر وہ کترنوں کی پنڈی بنا کر پکڑا دیتیں۔

پر آج تو سفید گزی کا ٹکڑا بہت ہی چھوٹا تھا اور سب کو یقین تھا کہ آج تو کبریٰ کی ماں کی ناپ تول ہار جائے گی، جبھی تو سب دم سادھے ان کا منہ تک رہی تھیں۔ کبریٰ کی ماں کے پُر استقلال چہرے پر فکر کی کوئی شکل نہ تھی، چار گرہ گزی کے ٹکڑے کو وہ نگاہوں سے بیونت رہی تھیں۔ لال ٹول

کا عکس ان کے نیلگوں زرد چہرے پر شفق کی طرح پھوٹ رہا تھا۔ وہ اُداس اُداس گہری جھریاں اندھیری گھٹاؤں کی طرح ایک دم اُجاگر ہو گئیں جیسے گھنے جنگل میں آگ بھڑک اٹھی ہو، اور انہوں نے مسکرا کر قینچی اٹھا لی۔

محلّہ والیوں کے جمگھٹے سے ایک لمبی اطمینان کی سانس ابھری۔ گود کے بچے بھی ٹھسک دیئے گئے۔ چیل جیسی نگاہوں والی کنواریوں نے لپا لپ سوئی کے ناکوں میں ڈورے پروئے، نئی بیاہی دلہنوں نے انگشتانے پہن لئے، کبریٰ کی ماں کی قینچی چل پڑی تھی۔

سہ دری کے آخری کونے میں پلنگڑی پر حمیدہ پیر لٹکائے ہتھیلی پہ ٹھوڑی رکھے دور کچھ سوچ رہی تھی۔

دوپہر کا کھانا نمٹا کر اسی طرح بی اماں سہ دری کی چوکی پر جا بیٹھتی ہیں اور بقچی کھول کر رنگ برنگے کپڑوں کا جال بکھیر دیا کرتی ہیں۔ کونڈی کے پاس بیٹھی برتن مانجھتی ہوئی کبریٰ کن انکھیوں سے ان لال کپڑوں کو دیکھتی تو ایک سرخ چھپکلی سی اس کے زردی مائل مٹیالے رنگ میں لپک اٹھتی۔ روپہلی کٹوریوں کے جال جب پولے پولے ہاتھوں سے کھول کر اپنے زانوؤں پر پھیلاتیں تو ان کا مرجھایا ہوا چہرہ ایک عجیب ارمان بھری روشنی سے جگمگا اٹھتا۔۔۔۔ گہری صندوقوں جیسی شکنوں پر کٹوریوں کا عکس ننھی ننھی مشعلوں کی طرح جگمگانے لگتا۔ ہر ٹانکے پر زری کا کام ہلتا اور مشعلیں کپکپا اٹھتیں۔

یاد نہیں کب اس کے سمی ... بنے ٹکے تیار ہوئے اور گاڑھے کے بھاری قبر جیسے صندوق کی تہ میں ڈوب گئے۔ کٹوریوں کے جال دھندلا گئے، گنگا جمنی کرنیں ماند پڑ گئیں۔ طولی کے لچھے اداس ہو گئے مگر کبریٰ کی برات نہ آئی۔ جب ایک جوڑا پرانا ہو جاتا تو اسے چالے کا جوڑا کہہ کر سینت دیا جاتا، اور پھر ایک نئے جوڑے کے ساتھ نئی امیدوں کا افتتاح ہو جاتا۔ بڑی چھان بین کے بعد نئی دلہن چھانٹی جاتی۔ سہ دری کے چوکے پر صاف ستھری جاجم بچھتی۔ محلے کی عورتیں ہاتھ میں پاندان اور بغلوں میں بچے دبائے جھانجھیں بجاتی آن پہنچتیں۔

"چھوٹے کپڑے کی گوٹ تو اتر آئے گی، پر بچیوں کا کپڑا نہ نکلے گا۔"

"لو بوا۔ لو اور سنو۔ تو کیا نگوڑی ماری طول کی چولیں پڑیں گی؟" اور پھر سب کے چہرے فکرمند ہو جاتے۔ کبریٰ کی ماں خاموش کیمیاگر کی طرح آنکھوں کے فیتے سے طول و عرض ناپتیں اور بیویاں آپس میں چھوٹے کپڑے کے متعلق کھسر پھسر کر کے قہقہہ لگاتیں۔ ایسے میں کوئی من چلی کوئی سہاگ یا بنا چھیڑ دیتی۔ کوئی اور چار ہاتھ آگے والی سمدھنوں کو گالیاں سنانے لگتی، بیہودہ گندے مذاق اور چہلیں شروع ہو جاتیں۔ ایسے موقعوں پر کنواری بالیوں کو سہ دری سے دور سر ڈھانک کر کھپریل میں بیٹھنے کا حکم دے دیا جاتا اور جب کوئی نیا قہقہہ سہ دری سے ابھرتا تو بے چاریاں ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتیں۔ اللہ! یہ قہقہے انہیں خود کب نصیب ہوں گے۔

اس چہل پہل سے دور کبریٰ شرم کی ماری مچھروں والی کوٹھڑی میں سر جھکائے بیٹھی رہتی۔ اتنے میں کتر بیونت نہایت نازک مرحلے پر پہنچ جاتی۔ کوئی کلی الٹی کٹ جاتی اور اس کے ساتھ بیویوں کی مت بھی کٹ جاتی۔ کبریٰ سہم کر دروازے کی آڑ سے جھانکتی۔

یہی تو مشکل تھی۔ کوئی جوڑا اللہ مارا چین سے نہ سلنے پایا۔ جو کلی الٹی کٹ جائے تو جان لو نائن کی لگائی ہوئی بات میں ضرور کوئی اڑنگا لگے گا، یا تو دولہا کی کوئی داشتہ نکل آئے گی یا اس کی ماں ٹھوس کڑوں کا اڑنگا باندھے گی۔ جو گوٹ میں کان آ جائے تو سمجھ لو یا تو مہر پر بات ٹوٹے گی یا بھرت کے پایوں کے پلنگ پر جھگڑا ہوگا۔ چوتھی کے جوڑے کا شگون بڑا نازک ہوتا ہے۔ بی اماں کی ساری مشاقی اور سگھڑاپا دھرا رہ جاتا۔ نہ جانے عین وقت پر کیا ہو جاتا کہ دھنیا برابر بات اجول پکڑ جاتی۔ بسم اللہ کے زور سے سگھڑ ماں نے جہیز جوڑنا شروع کر دیا تھا۔ ذرا سی کترن بھی بچتی تو تیلے دانی یا شیشی کا غلاف سی کر گوٹ گوکھرو سے سنوار کر رکھ دیتیں۔ لڑکی کا کیا ہے کھیرے ککڑی کی طرح بڑھتی ہے۔ جو برات آ گئی تو یہی سلیقہ کام آئے گا۔

اور جب سے ابا گزرے سلیقہ کا بھی دم پھول گیا۔ حمیدہ کو ایک دم اپنے ابا یاد آ گئے۔ ابا کتنے دبلے پتلے لمبے جیسے محرم کا علم۔ ایک بار جھک جاتے تو سیدھے کھڑے ہونا دشوار تھا۔ صبح ہی صبح اٹھ کر نیم کی مسواک توڑ لیتے اور حمیدہ کو گھٹنے پر بٹھا کر نہ جانے کیا سوچا کرتے۔ پھر سوچتے سوچتے نیم کی مسواک کا کوئی پھونسڑا حلق میں چلا جاتا اور وہ کھانستے ہی چلے جاتے۔ حمیدہ بگڑ کر ان کی گود سے اتر آتی۔ کھانسی کے دھکوں سے یوں

ہل ہل جاتا اسے قطعی پسند نہ تھا۔ اس کے ننھے سے قفسے پر وہ اور ہنستے اور کھانسی سینہ میں بے طرح الجھتی جیسے گردن کٹے کبوتر پھڑپھڑا رہے ہوں۔
پھر بی اماں آکر انہیں سہارا دیتیں۔ پیٹھ پر دھپ دھپ ہاتھ مارتیں۔

"توبہ ہے ایسی بھی کیا ہنسی؟"

اچھو کے دباؤ سے سرخ آنکھیں اوپر اٹھا کر آبا بے کسی سے مسکراتے۔ کھانسی تو رک جاتی مگر وہ دیر تک بیٹھے ہانپا کرتے۔

"کچھ دوا دارو کیوں نہیں کرتے؟ کتنی بار کہا تم سے؟"

"بڑے شفا خانے کا ڈاکٹر کہتا ہے سوئیاں لگواؤ، اور روز تین پاؤ دودھ اور آدھی چھٹانک مکھن۔"

"اے خاک پڑے ان ڈاکٹروں کی صورت پر۔ بھلا ایک تو کھانسی ہے اوپر سے چکنائی، بلغم نہ پیدا کر دے گی۔ حکیم کو دکھاؤ کسی کو۔"

"دکھاؤں گا۔" آبا حقہ گڑگڑاتے اور پھر اچھو لگتا۔

"آگ لگے اس موئے حقے کو۔ اسی نے تو یہ کھانسی لگائی ہے۔ جوان بیٹی کی طرف بھی دیکھتے ہو آنکھ اٹھا کر۔"

اور راب آبا کبریٰ کی جوانی کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھتے۔ کبریٰ جوان تھی، کون کہتا تھا جوان تھی۔ وہ تو جیسے بسم اللہ کے دن سے ہی اپنی جوانی کی آمد کی سناونی سن کر ٹھٹھک کر رہ گئی تھی۔ نہ جانے کیسی جوانی آئی تھی کہ نہ تو اس کی آنکھوں میں کرنیں ناچیں نہ اس کے رخساروں پر زلفیں پریشان ہوئیں، نہ اس کے سینے پر طوفان اٹھے اور نہ کبھی اس نے ساون بھادوں کی گھٹاؤں سے مچل مچل کر پریتم یا ساجن مانگے۔ وہ جھکی جھکی سہمی سہمی جوانی جو نہ جانے کب دبے پاؤں اس پر رینگ آئی، ویسے ہی چپ چاپ نہ جانے کدھر چل دی۔ میٹھا برس نمکین ہوا اور پھر کڑوا ہو گیا۔

آبا ایک دن چوکھٹ پر اوندھے منہ گرے اور انہیں اٹھانے کے لئے کسی حکیم یا ڈاکٹر کا نسخہ نہ آ سکا۔

اور حمیدہ نے میٹھی روٹی کے لئے ضد کرنی چھوڑ دی۔

اور کبریٰ کے پیغام نہ جانے کدھر راستہ بھول گئے۔ جانو کسی کو معلوم ہی نہیں کہ اس ٹاٹ کے پردے کے پیچھے کسی کی جوانی آخری سسکیاں لے رہی ہے اور ایک نئی جوانی سانپ کے پھن کی طرح اٹھ رہی ہے۔

مگر بی اماں کا دستور نہ ٹوٹا۔ وہ اسی طرح روز دوپہر کو سہ دری میں رنگ برنگے کپڑے پھیلا کر گڑیوں کا کھیل کھیلا کرتی ہیں۔

کہیں نہ کہیں سے جوڑ جمع کر کے شبرات کے مہینے میں کریپ کا دوپٹہ ساڑھے سات روپے میں خرید ہی ڈالا۔ بات ہی ایسی تھی کہ بغیر خریدے گزارہ نہ تھا۔ منجھلے ماموں کا تار آیا کہ ان کا بڑا لڑکا راحت پولیس کی ٹریننگ کے سلسلہ میں آ رہا ہے۔ بی اماں کو تو بس جیسے ایک دم گھبراہٹ کا دورہ پڑ گیا۔ جانو چوکھٹ پر برات آن کھڑی ہوئی اور انہوں نے ابھی دلہن کی مانگ کی افشاں بھی نہیں کتری۔ ہول سے تو ان کے چھکے چھوٹ گئے۔ جھٹ اپنی منہ بولی بہن بندو کی ماں کو بلا بھیجا کہ

"بہن میرا مری کا منہ دیکھو جو اسی گھڑی نہ آؤ۔"

اور پھر دونوں میں کھسر پھسر ہوئی۔ بیچ میں ایک نظر دونوں کبریٰ پر بھی ڈال لیتیں جو دالان میں میٹھی چاول پھٹک رہی تھی۔ وہ اس کانا پھوسی کی زبان کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔

اسی وقت بی اماں نے کانوں کی چار ماشہ کی لونگیں اتار کر منہ بولی بہن کے حوالے کیں کہ جیسے تیسے کر کے شام تک تولہ بھر گوکھرو، چھ ماشہ سلمہ ستارا اور پاؤ گز نیفے کے لئے ٹول لا دیں۔ باہر کی طرف والا کمرہ جھاڑ پونچھ کر تیار کیا۔ تھوڑا سا چونا منگا کر کبریٰ نے اپنے ہاتھوں سے کمرہ پوت ڈالا۔ کمرہ تو چٹا ہو گیا مگر اس کی ہتھیلیوں کی کھال اڑ گئی اور جب وہ شام کو مسالہ پیسنے بیٹھی تو چکر کھا کر دوہری ہو گئی۔ ساری رات کروٹیں بدلتے گزری۔ ایک تو ہتھیلیوں کی وجہ سے، دوسرے صبح کی گاڑی سے راحت آ رہے تھے۔

"اللہ! میرے اللہ میاں! اب کے تو میری آپا کا نصیبہ کھل جائے۔ میرے اللہ میں سو رکعت نفل تیری درگاہ میں پڑھوں گی۔" حمیدہ نے فجر کی نماز پڑھ کر دعا مانگی۔

صبح جب راحت بھائی آئے تو کبریٰ پہلے ہی سے مچھروں والی کوٹھڑی میں جا چھپی تھی۔ جب سویّوں اور پراٹھوں کا ناشتہ کر کے بیٹھک میں چلے گئے تو دھیرے دھیرے نئی دُلہن کی طرح پیر رکھتی کبریٰ کوٹھڑی سے نکلی اور جھوٹے برتن اٹھا لیے۔

"لاؤ میں دھو دوں بی آپا۔" حمیدہ نے شرارت سے کہا۔

"نہیں!" وہ شرم سے جھک گئی۔

حمیدہ چھیڑتی رہی، بی اماں مسکراتی رہیں اور کریپ کے دوپٹے میں لپا ٹانکتی رہیں۔

جس راستہ کان کی لونگیں گئی تھیں اسی راستے پھول، پتہ اور چاندی کی پازیب بھی چل دی اور پھر ہاتھوں کی دو دو چوڑیاں بھی جو منجھلے ماموں نے رنڈاپا اتارنے پر دی تھیں۔ روکھی سوکھی خود کھا کر آئے دن راحت کے لیے پراٹھے تلے جاتے، کوفتے، بھنا پلاؤ مہکتے۔ خود سوکھا نوالہ پانی سے اتار کر وہ ہونے والے داماد کو گوشت کے لچھے کھلاتیں۔

"زمانہ بڑا خراب ہے بیٹی۔" وہ حمیدہ کو منہ پھلاتے دیکھ کر کہا کرتیں اور وہ سوچا کرتی، "ہم بھوکے رہ کر داماد کو کھلا رہے ہیں۔ بی آپا صبح سویرے اٹھ کر جادو کی مشین کی طرح جٹ جاتی ہے۔ نہار منہ پانی کا گھونٹ پی کر راحت کے لیے پراٹھے تلتی ہے۔ دودھ اوٹاتی ہے تاکہ موٹی سی ملائی پڑے۔ اس کا بس نہیں تھا کہ وہ اپنی چربی نکال کر ان پراٹھوں میں بھر دے، اور کیوں نہ بھرے، آخر کو وہ ایک دن اس کا اپنا ہو جائے گا۔ جو کچھ کمائے گا اس کی ہتھیلی پر رکھ دے گا۔ پھل دینے والے پودے کو کون نہیں سینچتا؟ پھر جب ایک دن پھول کھلیں گے اور پھلوں سے لدی ہوئی ڈالی جھکے گی تو یہ طعنہ دینے والیوں کے منہ پر کیسا جوتا پڑے گا اور اس خیال ہی سے میری بی آپا کے چہرے پر سہاگ کھل اٹھتا۔ کانوں میں شہنائیاں بجنے لگتیں اور وہ راحت بھائی کے کمرے کو پلکوں سے جھاڑتیں۔ ان کے کپڑوں کو پیار سے تہ کرتیں جیسے وہ کچھ ان سے کہتے ہوں۔ وہ ان کے بدبودار چوہوں جیسے سڑے ہوئے موزے دھوتیں، بساندی بنیان اور ناک سے لتھڑے ہوئے رومال صاف کرتیں۔ ان کے تیل میں چپچپاتے ہوئے تکیے کے غلاف پر سویٹ ڈریم کاڑھتیں، پر معاملہ چاروں کونے چوکس نہیں بیٹھ رہا تھا۔ راحت صبح انڈے پراٹھے ڈٹ کر کھاتا اور شام کو آکر کوفتے کھا کر سو جاتا اور بی اماں کی منہ بولی بہن حکیمانہ انداز میں کھسر پھسر کرتیں۔

"بڑا شرمیلا ہے بے چارہ۔" بی اماں تاویلیں پیش کرتیں۔ "ہاں یہ تو ٹھیک ہے پر بھئی کچھ تو پتہ چلے رنگ ڈھنگ سے، کچھ آنکھوں سے۔"

"اے نوج، خدا نہ کرے میری لونڈیا آنکھیں لڑائے۔ اس کا آنچل بھی نہیں دیکھا ہے کسی نے۔" بی اماں فخر سے کہتیں۔

"اے تو پردہ تڑوانے کو کون کہے ہے۔" بی آپا کے پکے مہاسوں کو دیکھ کر انہیں بی اماں کی دوراندیشی کی داد دینی پڑتی۔

"اے بہن تم تو سچ میں بہت بھولی ہو۔ یہ میں کب کہوں ہوں۔ یہ چھوٹی نگوڑی کون سی بکریہ کو کام آئے گی؟" وہ میری طرف دیکھ کر ہنستیں۔

"اری او نک چڑھی! بہنوئی سے کوئی بات چیت، کوئی ہنسی مذاق، اونہہ، اری چل دیوانی۔"

"اے تو میں کیا کروں خالہ؟"

"راحت میاں سے بات چیت کیوں نہیں کرتی؟"

"بھئی ہمیں تو شرم آتی ہے۔"

"اے ہے وہ تجھے پھاڑ ہی تو کھائے گا۔" بی اماں چڑ کر بولتیں۔

"نہیں تو۔ مگر......" میں لاجواب ہو گئی اور پھر مسکوٹ ہوئی۔ بڑی سوچ بچار کے بعد کھل کے کباب بنائے گئے۔ آج بی آپا بھی کئی بار

مسکرا پڑیں، چپکے سے بولیں:

"دیکھو ہنسنا نہیں، نہیں تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔"

"نہیں ہنسوں گی۔" میں نے وعدہ کیا۔

"کھانا کھا لیجیے۔" میں نے چوکی پر کھانے کی سینی رکھتے ہوئے کہا۔ پھر چوکی کے نیچے رکھے ہوئے لوٹے سے ہاتھ دھوتے وقت میری طرف سر سے پاؤں تک دیکھا تو میں بھاگی وہاں سے۔

میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اللہ توبہ کیا خاص آنکھیں ہیں۔

"جا نگوڑی ماری ابی دیکھ تو سہی، وہ کیسا منہ بناتا ہے۔ اسے سے سارا مزا کرکرا ہو جائے گا"

آپا بی نے ایک بار میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں التجا تھی، دبی ہوئی باتوں کا غبار تھا اور چولھے کے بجھانے جوڑیوں کی مانند اداسی۔ میں سر جھکائے پھر کھمبے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

راحت خاموش کھاتے رہے، میری طرف نہ دیکھا۔ کھلی کے کباب کھاتے دیکھ کر مجھے چاہیے تھا کہ مذاق اڑاؤں، قہقہہ لگاؤں کہ "واہ جی واہ دولھا بھائی! کھلی کے کباب کھا رہے ہو" مگر جانو کسی نے میرا نرخرہ دبوچ لیا ہو۔

بی اماں نے جل کر مجھے واپس بلا لیا اور منہ ہی منہ میں مجھے کوسنے لگیں۔ اب میں ان سے کیا کہتی کہ وہ تو مزے سے کھا رہا ہے کم بخت۔

"راحت بھائی! کوفتے پسند آئے؟" بی اماں کے سکھانے پر میں نے پوچھا۔

جواب ندارد

"بتائیے نا!"

"اری ٹھیک سے جا کر پوچھ۔" بی اماں نے ٹھوکا دیا۔

"آپ نے لا کر دیئے اور ہم نے کھائے، مزیدار ہی ہوں گے۔"

"ارے واہ رے جنگلی۔" بی اماں سے نہ رہا گیا۔

"تمہیں پتہ بھی نہ چلا کیا مزے سے کھلی کے کباب کھا گئے۔"

"کھلی کے؟ ارے تو روز کاہے کے ہوتے ہیں؟ میں تو عادی ہو چلا ہوں کھلی اور بھوسہ کھانے کا۔"

بی اماں کا منہ اتر گیا۔ بی آپا کی جھکی ہوئی پلکیں اوپر نہ اٹھ سکیں، دوسرے روز بی آپا نے روزانہ سے دگنی سلائی کی اور پھر جب شام کو میں کھانا لے کر گئی تو بولے:

"کہئے آج کیا لائی ہیں؟ آج تو لکڑی کے برادے کی باری ہے۔"

"کیا ہمارے ہاں کا کھانا آپ کو پسند نہیں آتا؟" میں نے جل کر کہا۔

"یہ بات نہیں، کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کھلی کے کباب تو کبھی بھوسے کی ترکاری۔"

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ہم سوکھی روٹی کھا کے اسے ہاتھی کی خوراک دیں، گھی ٹپکتے پراٹھے ٹھنسائیں، میری بی آپا کو جوشاندہ نصیب نہیں اور اسے دودھ ملائی نگلوائیں۔ میں بھنا کر چلی آئی۔

بی اماں کی منہ بولی بہن کا نسخہ کام آ گیا اور راحت نے دن کا زیادہ حصہ گھر ہی میں گزارنا شروع کر دیا۔ بی آپا تو چولھے میں جھکی رہتیں، بی اماں چوتھی کے جوڑے سیا کرتیں اور راحت کی غلیظ آنکھیں تیر بن کر میرے دل میں چبھا کرتیں۔ بات بے بات چھیڑنا، کھانا کھلاتے وقت کبھی پانی تو کبھی نمک کے

بہانے سے اور ساتھ ساتھ جملہ بازی ہیں کھسیا کر بی آپا کے پاس جا بیٹھتی۔ جی چاہتا کسی دن صاف کہہ دوں کہ کس کی بکری اور کون ڈالے دانہ گھاس۔ اے بی مجھ سے تمہارا یہ بیل نہ ناتھا جائے گا۔ مگر بی آپا کے اُلجھے ہوئے بالوں پر چولہے کی اُڑتی ہوئی راکھ...... نہیں...... میرا کلیجہ دھک سے ہوگیا۔ میں نے ان کے سفید بال لٹ کے نیچے چھپا دیئے۔ ناس جائے اس کم بخت نزلہ کا بچاری کے بال پکنے شروع ہو گئے۔

راحت نے پھر کسی بہانہ سے مجھے پکارا۔

"اونہہ!" میں جل گئی۔ پر بی آپا نے کٹی ہوئی مرغی کی طرح جو پلٹ کر دیکھا تو مجھے جانا ہی پڑا۔

"آپ ہم سے خفا ہو گئیں؟" راحت نے پانی کا کٹورا لے کر میری کلائی پکڑ لی۔ میرا دم نکل گیا اور بھاگی تو ہاتھ جھٹک کر۔

"کیا کہہ رہے تھے؟" بی آپا نے شرم و حیا سے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ میں چپ چاپ ان کا منہ تکنے لگی۔

"کہہ رہے تھے کس نے پکایا ہے کھانا۔ واہ واہ! جی چاہتا ہے کھاتا ہی چلا جاؤں، پکانے والی کے ہاتھ کھا جاؤں...... اوہ نہیں ...... کھا نہیں لوں بلکہ چوم لوں؟" میں نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا اور بی آپا کا کھردرا ہلدی دھنیا کی بساند میں سڑا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ سے لگا لیا۔ میرے آنسو نکل آئے۔ "یہ ہاتھ" میں نے سوچا جو صبح سے شام تک مسالہ پیستے ہیں، پانی بھرتے ہیں، پیاز کاٹتے ہیں، بستر بچھاتے ہیں، جوتے صاف کرتے ہیں، یہ بے کس غلام صبح سے شام تک جٹے ہی رہتے ہیں۔ ان کی بیگار کب ختم ہوگی۔ کیا ان کا کوئی خریدار نہ آئے گا؟ کیا انہیں کبھی کوئی پیار سے نہ چومے گا؟ کیا ان میں کبھی مہندی نہ رچے گی؟ کیا ان میں کبھی سہاگ کا عطر نہ بسے گا؟ جی چاہا زور سے چیخ پڑوں۔

"اور کیا کہہ رہے تھے؟" بی آپا کے ہاتھ تو اتنے کھردرے تھے پر آواز اتنی رسیلی اور میٹھی تھی کہ اگر راحت کے کان ہوتے تو...... مگر راحت کے نہ کان تھے نہ ناک بس دوزخ جیسا پیٹ تھا۔

"اور کہہ رہے تھے اپنی بی آپا سے کہنا کہ اتنا کام نہ کیا کریں اور جوشاندہ پیا کریں۔"

"چل جھوٹی!"

"ارے واہ جھوٹے ہوں گے آپ کے وہ......"

"اری چپ مردار!" انہوں نے میرا منہ بند کردیا۔

"دیکھ تو سوئٹر بن گیا ہے انہیں دے آ۔ پر دیکھ۔ تجھے میری قسم میرا نام نہ لیجو۔"

"نہیں بی آپا۔ انہیں نہ دو وہ سوئٹر۔ تمہاری ان مٹھی بھر ہڈیوں کو سوئٹر کی کتنی ضرورت ہے؟" میں نے کہنا چاہا پر نہ کہہ سکی۔

"آپا بی! تم خود کیا پہنو گی؟"

"ارے مجھے کیا ضرورت ہے، چولہے کے پاس تو ویسے ہی جھلسن رہتی ہے۔"

سوئٹر دیکھ کر راحت نے اپنی ایک ابرو شرارت سے اوپر تان کر کہا:

"کیا یہ سوئٹر آپ نے بنا ہے؟"

"نہیں تو۔"

"تو بھئی ہم نہیں پہنیں گے۔"

میرا جی چاہا کہ اس کا منہ نوچ لوں۔ کمینے، مٹی کے تودے۔ یہ سوئٹر ان ہاتھوں نے بنا ہے جو جیتے جاگتے غلام ہیں۔ اس کے ایک ایک پھندے میں کسی نصیبوں جلی کے ارمانوں کی گردنیں پھنسی ہوئی ہیں، یہ ان ہاتھوں کا بنا ہوا ہے جو ننھے پنگوڑے جھلانے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ ان کو تھام لو گدھے کہیں کے اور یہ دو پتوار بڑے سے بڑے طوفان کے تھپیڑوں سے تمہاری زندگی کی ناؤ کو بچا کر پار لگا دیں گے۔ یہ ستار کی گت نہ بجا سکیں گے

منی پوری اور بھارت ناٹیم کے مدمانہ رکھا سکیں گے، انہیں پیانو پر رقص کرنا نہیں سکھایا گیا، انہیں پھولوں سے کھیلنا نہیں نصیب ہوا۔ مگر یہ ہاتھ تمہارے جسم پر چربی چڑھانے کے لئے صبح سے شام تک سلائی کرتے ہیں۔ صابن اور سوڈے میں ڈبکیاں لگاتے ہیں، چولہے کی آنچ سہتے ہیں، تمہاری غلاظتیں دھوتے ہیں تاکہ تم اُجلے چٹے بگلا بھگتی کا ڈھونگ رچائے رہو، محنت نے ان میں زخم ڈال دیئے ہیں، ان میں کبھی چوڑیاں نہیں کھنکتی ہیں۔ انہیں کبھی کسی نے پیار سے نہیں تھاما۔

مگر میں چپ رہی۔ بی اماں کہتی ہیں میرا دماغ تو میری نئی نئی سہیلیوں نے خراب کر دیا ہے۔ وہ مجھے کیسی نئی نئی باتیں بتایا کرتی ہیں کیسی ڈراؤنی موت کی باتیں، بھوک اور کال کی باتیں، دھڑکتے ہوئے دل کے ایک دم چپ ہو جانے کی باتیں۔

"یہ سوئٹر تو آپ ہی پہن لیجئے۔ دیکھئے نا آپ کا کرتا کتنا باریک ہے؟"

جنگلی بلی کی طرح میں نے اس کا منہ، ناک، گریبان اور بال نوچ ڈالے اور اپنی پلنگڑی پر جا گری۔ بی آپا نے آخری روٹی ڈال کر جلدی جلدی تسلے میں ہاتھ دھوئے اور آنچل سے پونچھتی میرے پاس آ بیٹھیں۔

"وہ بولے؟" ان سے نہ رہا گیا تو دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

"بی آپا! یہ راحت بھائی بڑے خراب آدمی ہیں" میں نے سوچا میں آج سب کچھ بتا دوں گی۔

"کیوں؟" وہ مسکرائیں۔

"مجھے اچھے نہیں لگتے....... دیکھئے میری ساری چوڑیاں چورہ ہو گئیں۔" میں نے کانپتے ہوئے کہا۔

"بڑے شریر ہیں؟" انھوں نے رومانٹک آواز میں شرما کے کہا۔

"بی آپا...... سُنو بی آپا۔ یہ راحت اچھے آدمی نہیں۔" میں نے سُلگ کر کہا "آج میں بی اماں سے کہہ دوں گی۔"

"کیا ہوا؟" بی اماں نے جانماز بچھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو میری چوڑیاں بی اماں۔"

"راحت نے توڑ ڈالیں؟" بی اماں مسرت سے چہک کر بولیں۔

"ہاں!"

"خوب کیا۔ تو اسے ستاتی بھی تو بہت ہے۔ اے ہے تو دم کاہے کو نکل گیا۔ بڑی موم کی بنی ہوئی ہو کہ ہاتھ لگایا اور پگھل گئیں۔" پھر چمکار کر بولیں "خیر تو بھی چوتھی میں بدلے لیجو، وہ کسر نکالیو کہ یاد ہی کریں میاں جی۔" یہ کہہ کر انہوں نے نیت باندھ لی۔

منہ بولی بہن سے پھر کانفرنس ہوئی اور معاملات کو امید افزا راستے پر گامزن دیکھ کر ازحد خوشنودی سے مسکرایا گیا۔

"اے ہے تو تو بڑی ہی ٹھس ہے۔ اے ہم تو اپنے بہنوئیوں کا خدا کی قسم ناک میں دم کر دیا کرتے تھے۔"

اور وہ مجھے بہنوئیوں سے چھیڑ چھاڑ کے ہتھکنڈے بتانے لگیں کہ کس طرح انہوں نے صرف چھیڑ چھاڑ کے تیر بہدف نسخے سے ان دو میری بہنوں کی شادی کرائی جن کی ناؤ پار لگنے کے سارے موقعے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ ایک تو ان میں سے حکیم جی تھے جہاں بیچارے کو لڑکیاں بالیاں چھیڑتیں، شرمانے لگتے اور شرماتے شرماتے اختلاج کے دورے پڑنے لگتے اور ایک دن ماموں صاحب سے کہہ دیا کہ مجھے غلامی میں لے لیجئے۔ دوسرے وائسرائے کے دفتر میں کلرک تھے جہاں سُنا کہ باہر آئے ہیں لڑکیاں چھیڑنا شروع کر دیتی تھیں کبھی گلوریوں میں مرچیں بھر کے بھیج دیں کبھی سوئیوں میں نمک ڈال کر کھلا دیا۔

اے لو وہ تو روز آنے لگے۔ آندھی آئے پانی آئے کیا مجال جو وہ نہ آئیں۔ آخر ایک دن کہلوا ہی دیا۔ اپنے ایک جان پہچان والے سے کہا

کہ ان کے ہاں شادی کرا دو۔ پوچھا کہ "بیٹی کس سے ؟" تو کہا یہ کسی سے بھی کرا دو۔" اور خدا جھوٹ نہ بلائے تو بڑی بہن کی صورت تھی کہ دیکھو تو جیسے بیچا چلا آتا ہے۔ چھوٹی تو بس سبحان اللہ۔ ایک آنکھ پورب تو دوسری پچھم۔ پندرہ تولے سونا دیا ہے باپ نے اور بڑے صاحب کے دفتر میں نوکری الگ دلائی۔"

"ہاں بھئی جس کے پاس پندرہ تولے سونا ہو اور بڑے صاحب کے دفتر کی نوکری اسے لڑکا ملتے کیا دیر لگتی ہے؟" بی اماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"یہ بات نہیں ہے بہن۔ آج کل کے لڑکوں کا دل بس تھالی کا بیگن ہوتا ہے۔ جدھر جھکا دو اُدھری لڑھک جائے گا۔"

مگر راحت تو بیگن نہیں اچھا خاصا پہاڑ ہے۔ جھکا دینے پر کہیں میں ہی نہ پس جاؤں۔ میں نے سوچا۔ پھر میں نے آپا کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش دہلیز پر بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھیں اور سب کچھ سنتی جا رہی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو زمین کی چھاتی پھاڑ کر اپنے کنوارپنے کی لعنت سمیت اس میں سما جاتیں۔

"کیا میری آپا مرد کی بھوکی ہے؟ نہیں وہ بھوک کے احساس سے پہلے ہی سہم چکی ہے۔ مرد کا تصور اس کے ذہن میں ایک امنگ بن کر نہیں اُبھرا بلکہ روٹی کپڑے کا سوال بن کر اُبھرا ہے۔ وہ ایک بیوہ کی چھاتی کا بوجھ ہے، اس بوجھ کو دھکیلنا ہی ہوگا۔"

مگر اشاروں کنایوں کے باوجود راحت میاں نہ تو خود منہ سے پھوٹے اور نہ ان کے گھر ہی سے پیغام آیا۔ تھک ہار کر بی اماں نے پیروں کی توڑے گروی رکھ کر پیر مشکل کشا کی نیاز دلا ڈالی۔ دوپہر بھر محلہ ٹولے کی لڑکیاں صحن میں اودھم مچاتی رہیں۔ بی آپا شرمائی لجائی مچھروں والی کوٹھڑی میں اپنے خون کی آخری بوندیں، چوسانے کو جا بیٹھیں۔ بی اماں کمزوری میں اپنی چوکی پر بیٹھی چوتھی کے جوڑے میں آخری ٹانکے لگاتی رہیں۔ آج ان کے چہرے پر منزلوں کے نشان تھے۔ آج مشکل کشائی ہوگی، بس آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں، وہ بھی نکل جائیں گی، آج ان کی جھریوں میں پھر مشعلیں تھرتھرا رہی تھیں۔ بی آپا کی سہیلیاں ان کو چھیڑ رہی تھیں اور وہ خون کی بچی کچی بوندوں کو تاؤ میں لا رہی تھیں۔ آج کئی روز سے ان کا بخار نہیں اترا تھا۔ تھکے ہارے دیئے کی طرح ان کا چہرہ ایک بار ٹمٹماتا اور پھر بجھ جاتا۔ اشارے سے انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ اپنا آنچل ہٹا کر نیاز کے ملیدے کی طشتری مجھے تھما دی۔

"اس پر مولوی صاحب نے دم کیا ہے۔" ان کی بخار سے دہکتی ہوئی گرم گرم سانس میرے کان میں لگی۔

طشتری لے کر میں سوچنے لگی۔ مولوی صاحب نے دم کیا ہے۔ یہ مقدس ملیدہ اب راحت کے تندور میں جھونکا جائے گا۔ وہ تندور جو چھ مہینے سے ہمارے خون کے چھینٹوں سے گرم رکھا گیا۔ یہ دم کیا ہوا ملیدہ مراد بر لائے گا۔ میرے کانوں میں شادیانے بجنے لگے۔ میں بھاگی بھاگی کوٹھے سے برات دیکھنے جا رہی ہوں، دولہا کے منہ پر لمبا سا سہرا پڑا ہے جو گھوڑے کی ایالوں کو چوم رہا ہے......

چوتھی کا شہابی جوڑا پہنے پھولوں سے لدی، شرم سے نڈھال، آہستہ آہستہ قدم تولتی بی آپا چلی آ رہی ہیں...... چوتھی کا زرتار جوڑا جھلمل جھلمل کر رہا ہے، بی اماں کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا ہے...... بی آپا کی حیا سے بوجھل نگاہیں ایک بار اوپر اٹھتی ہیں۔ شکریے کا ایک آنسو ڈھلک کر افشاں کے ذروں میں قمقمے کی طرح اُلجھ جاتا ہے۔

"یہ سب تیری ہی محنت کا پھل ہے۔" بی آپا کی خاموشی کہہ رہی ہے...... حمیدہ کا گلا بھر آیا......

"جاؤ نہ میری بہنو" بی آپا نے اسے جگا دیا اور وہ چونک کر اوڑھنی کے آنچل سے آنسو پونچھتی ڈیوڑھی کی طرف بڑھی۔

"یہ...... یہ ملیدہ" اس نے اُچھلتے ہوئے دل کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا...... اس کے پیر لرز رہے تھے جیسے وہ سانپ کی بانبی میں گھس آئی ہو اور پھر پہاڑ کھسکا...... ! اور منہ کھول دیا۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔ مگر دور کہیں بارات کی شہنائیوں نے چیخ لگائی جیسے کوئی ان کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ کانپتے ہاتھوں سے مقدس ملیدہ کا نوالہ بنا کر اس نے راحت کے منہ کی طرف بڑھا دیا۔

ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پہاڑ کی کھوہ میں ڈوبتا چلا گیا...... نیچے تعفن اور تاریکی کے اتھاہ غار کی گہرائیوں میں، اور ایک بڑی سی چٹان نے اس کی چیخ کو گھونٹ دیا۔

نیاز کے ملیدے کی رکابی ہاتھ سے چھوٹ کر لالٹین کے اوپر گری اور لالٹین نے زمین پر گر کر دو چار سسکیاں بھریں اور گل ہو گئی۔ باہر آنگن میں محلے

بہو بیٹیاں مشکل کشا کی شان میں گیت گا رہی تھیں۔

صبح کی گاڑی سے راحت مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوا روانہ ہو گیا۔ اس کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور راسے جلدی تھی۔

اس کے بعد اس گھر میں کبھی انڈے نہ تلے گئے، پراٹھے نہ سکے اور سوئیٹر نہ بنے گئے۔ دق نے جو ایک عرصہ سے بی آپا کی تاک میں بھاگی پیچھے پیچھے آ رہی تھی ایک ہی جست میں انہیں دبوچ لیا اور انہوں نے چپ چاپ اپنا نامراد وجود اس کی آغوش میں سونپ دیا۔

اور پھر اسی سہ دری میں چوکی پر صاف ستھری جا نماز بچھائی گئی۔ محلے کی بہو بیٹیاں جڑیں، کفن کا سفید سفید لٹھا، موت کے آنچل کی طرح بی اماں کے سامنے پھیل گیا۔ تحمل کے بوجھ سے ان کا چہرہ لرز رہا تھا، بائیں ابرو پھڑک رہی تھی، گالوں کی سنسان جھریاں بھائیں بھائیں کر رہی تھیں جیسے ان میں لاکھوں اژدہے پھنکار رہے ہوں۔
لٹھے کی کان نکال کر انہوں نے چوپرتہ کیا، اور ان کے دل میں ان گنت قینچیاں چل گئیں۔ آج ان کے چہرے پر بھیانک سکون اور ہرا بھرا اطمینان تھا جیسے انہیں پکا یقین ہو کہ دوسرے جوڑوں کی طرح یہ چوتھی کا جوڑا سینتا نہ جائے۔
ایک دم سہ دری میں بیٹھی لڑکیاں، بالیاں مینائوں کی طرح چہکنے لگیں۔ حمیدہ ماضی کو دور جھٹک کر ان کے ساتھ جا ملی۔ لال ٹول پر۔۔۔۔ سفید گزی کا نشان! اس کی سرخی میں نہ جانے کتنی معصوم دلہنوں کا سہاگ رچا ہے اور سفیدی میں کتنی نامراد کنواریوں کے کفن کی سفیدی ڈوب کر ابھری ہے اور پھر سب ایک دم خاموش ہو گئے۔ بی اماں نے آخری ٹانکہ بھر کے ڈورا توڑ لیا۔ دو موٹے موٹے آنسو ان کے روئی جیسے نرم گالوں پر دھیرے دھیرے رینگنے لگے۔ ان کے چہرے کی شکنوں میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ نکلیں اور وہ مسکرا دیں، جیسے آج انہیں اطمینان ہو گیا کہ ان کی کبریٰ کا سوہا جوڑا بن کر تیار ہو گیا ہو اور کوئی دم میں شہنائیاں بج اٹھیں گی۔

احمد علی

ہماری گلی

احمد علی کا ایک افسانہ "مہاوٹوں کی ایک رات" اس سے پہلے بھی پیش کیا گیا ہے لیکن وہ افسانہ ان کے فن کی نمائندگی نہیں کرتا۔ پہلے افسانے کی شمولیت سے محض ایک وقتی رجحان کی نشاندہی مقصود ہے۔

(مرتب)

میرا مکان پنڈت کے کوچہ میں تھا۔ میرے کمرے کے دروازے میں دو پٹ تھے۔ نیچے کا حصہ بند کر دینے سے صرف اوپر کا حصہ ایک کھڑکی کی طرح کھلا رہ جاتا تھا۔ یہ کھڑکی پتلی سڑک پر کھلتی تھی۔ سامنے مرزا دودھ والے کی دکان تھی اور میرے دروازہ کے برابر بوٹ پالشے کی اور اس کے برابر عزیز خرادی کی اور آس پاس کمہاروں کی دکانیں، عطار کی دکان، پان والے کی اور دو چار اور دکانیں تھیں۔ مثلاً قصائی کی، بساطی کی، حلوائی کی دکان۔ ہمارے محلے میں سے ہو کر لوگ دوسرے محلوں میں جا سکتے تھے۔ اس لئے سڑک برابر چلا کرتی تھی اور اس طرح کے لوگ راستہ چلنے کے لئے میری کھڑکی کے سامنے سے گذرتے۔ کبھی کوئی سفید پوش گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں چھتری لگائے ہوئے چلا جاتا۔ کبھی شام کو کوئی ولایتی منڈا پہنے، انگریزی ٹوپی لگائے چھڑکاؤ کے پانی سے بچتا ہوا اپنے کپڑوں کو چھینٹوں سے بچاتا، بچوں اور لڑکوں سے کتراتا ہوا ان کے گھوروں پر غراتا اور آنکھیں نکالتا ہوا گذر جاتا۔ کبھی کبھی راہگیر جاہی ذرا کر لڑکوں کو مارنے کے لئے لکڑی یا چھڑی اٹھاتا۔ وہ بھاگ کر لڑکے چلاتے "ٹو بے بے! ٹو ٹو بے"۔ پھر مرزا دودھ والے کی پھرتی ہوئی آواز سنائی دیتی۔

"اے لونڈو! کیا کرتے ہو۔ تم کو گھروں میں کچھ کام نہیں ہے؟" اور اگر کوئی پاس بیٹھا ہوتا تو مرزا اس سے کہنے لگتا "یہ ان کی ماؤں کو تو دیکھو لونڈوں کو چھوڑ رکھا ہے کہ سانڈ بیلوں کی طرح گلیوں میں وہ دلاّ مچایا کریں۔ حرامزادوں کو گولی گلوچ اور رینگا مستی کے علاوہ اور کچھ کام ہی نہیں؟"

اور مرزا کی چھوٹی چھوٹی سرخ آنکھیں چمکنے لگتیں اور وہ اپنی سفید چھوٹی داڑھی پر ایک ہاتھ پھیرتا اور کسی خریدار کی طرف مخاطب ہو جاتا اور کونڈے میں سے دہی یا کڑھاؤ میں سے دودھ نکال کر مٹی کا کلڑا اٹھاتا اور خریدار کی طرف بڑھا دیتا۔

لوگ کہتے ہیں کہ مرزا کی لڑکی آپا شریف خون ہو درہ کرتا ہے اور بچپن ہی میں سبق یاد نہ کرنے پر اس کے باپ نے اس کو گھر سے نکال دیا اور کچھ روز کے ماں باپ کے مرنے کے بعد اس نے دکان کر لی۔ اس کے بعد اکثر اس کے باپ نے اس سے معافی بھی مانگی اور خوشامد بھی کی لیکن مرزا نے شادی کر لی اور دھما نمک کا رسہ نکلا۔ اس کی دوکان کے چھوٹے چھوٹے ملائی کے پیڑے شہر بھر میں مشہور تھے اور اس کا دودھ بہت لذیذ ہوتا تھا۔ رات کو جب کوئی دودھ لینے آتا تو وہ اس کو آبخورے میں ڈالتا۔ دنیا میں خوب اچھالتا۔ یہاں تک کہ اس سے جھاگ نکلنے لگتے۔ پھر کچھ سے ملائی کا ٹکڑا اس صفائی سے توڑتا کہ دودھ بنے

تک نہ پاتا تھا۔ اکثر اس کی بیوی دکان پر بیٹھتی تھی۔ وہ بوڑھی ہو گئی تھی —— اس کے چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں، اس کی کمر جھک گئی تھی اور منہ میں ایک دانت باقی نہ تھا۔ اس کی اونچی پیشانی اور اس کے گورے رنگ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی اچھے گھرانے کی عورت ہے۔

لیکن اب ان کا کاروبار کم ہو گیا تھا۔ کیونکہ ضعیفی کی وجہ سے وہ زیادہ محنت نہ کر سکتے تھے۔ ان کا اکلوتا بیٹا مر چکا تھا اور اب ان کا ہاتھ بٹانے والا کوئی نہ تھا۔ ترکِ موالات کے زمانے میں جب آزادی کا خیال ملک میں ادھر سے اُدھر تک پھیل چکا تھا۔ مرزا کا لڑکا اپنے دوستوں کے ساتھ جلوس میں شریک ہوا۔ گاندھی جی کی جے اور بندے ماترم کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی گھنٹہ گھر پر گوروں کی فوجیں مسلح کھڑی تھیں۔ کپتان پولیس، ڈپٹی کمشنر اور چند اور انگریز کھڑے تھے اور لوگوں کے ہجوم اور قومی غصہ کو پریشانی سے دیکھ رہے تھے۔ لوگ آگے جانا چاہتے تھے لیکن فوجیں ان کو آگے جانے سے روک رہی تھیں۔ لوگوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی اور ڈپٹی کمشنر نے گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ میں بہت لوگ کام آئے اور مرزا کا بیٹا بھی مرنے والوں میں تھا۔ بڑی دیر کے بعد جب لاش لے جانے کی اجازت ملی تو لوگ مرزا کے لڑکے کی لاش کو اس کے گھر لائے۔

ساری دکانیں بند تھیں، اور محلہ میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جاڑوں کی دھوپ مردہ اور سرد معلوم ہوتی تھی۔ نالیوں میں صفائی نہ ہوئی تھی اور ان میں سے سڑاند چھوٹ رہی تھی۔ جب لاش گھر میں آئی تو مرزا اور اس کی بیوی سکتے کے عالم میں رہ گئے۔ ان کو کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ ان کا بیٹا جو ابھی زندہ تھا، ہنس بول رہا تھا، جس نے صبح ہی پیڑے تیار کئے تھے، کڑھاؤ مانجا تھا۔ جو کپڑے بدل کر اپنے کسی دوست سے ملنے گیا تھا اب زندہ نہیں ہے بلکہ مر چکا ہے۔ وہ بار بار خون میں لتھڑی ہوئی لاش کو دیکھتے تھے اور مرزا کی بیوی لاش سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ لوگوں نے اس کو الگ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ایک منٹ کے لئے لاش سے علیحدہ نہ ہوتی تھی، وہ "ہے ہے میرا لال" کہہ کہہ کر روتی تھی اور کبھی کبھی اس کے منہ سے چیخ نکلتی اور وہ چلاتی:

"ان فرنگیوں کو خدا غارت کرے، میرے لال کو مجھ سے چھین لیا۔ خدا کرے کہ یہ غارت ہوں۔"

مرزا پاگلوں کی طرح کبھی گھر کے اندر کبھی باہر بولایا ہوا پھرتا تھا۔ صدیق بیٹھے نے اپنی دکان کھولی تھی اور مرزا جو بال بکھیرے ہوئے اُدھر سے گزرا تو کسی نے آواز دی اور پوچھا "بھائی بڑا افسوس ہوا اور حادثہ کیا پیش آیا؟"

مرزا کی آنکھوں میں ایک آنسو باقی نہ تھا لیکن اس کے سارے چہرے پر کرب کی حالت تھی۔

"تقدیر پھوٹ گئی۔ میرا پلا پلایا لڑکا جاتا رہا۔" یہ کہہ کر مرزا پھر گھر کی طرف چلا گیا۔

گاہک جو کھڑے ہوئے تھے پوچھنے لگے کیا ہوا۔ صدیق نے جھک کر دیکھا۔ اسی وقت ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور سڑک پر گرد و غبار اٹھنے لگا۔ ایک کاغذ کا ٹکڑا ہوا میں اڑا اور کچھ دور اوپر جا کر الٹتا پلٹتا نیچے کی طرف گرنے لگا۔ مرزا کے پٹھے بال ہوا میں اڑ رہے تھے اور وہ گلی میں غائب ہو گیا۔

"بیچارا کیا۔ ترکِ موالات کرنے گیا تھا، گولی لگی اور مر گیا۔ نہ جانے اپنے کام میں دل کیوں نہیں لگاتے۔ سرکار کے خلاف جانے کا یہی نتیجہ ہے۔ تکڑا جوان تھا۔ ان دو دن کے چھوکروں اور کھدر پوشوں کا شکار ہو گیا۔"

یہ کہتے کہتے صدیق نے ایک مٹکے میں کفگیر ڈالا۔ بہت سے مٹکے دیوار میں گڑے ہوئے تھے اور کاک کی طرح معلوم ہوتے تھے کفگیر میں دال نکال کر صدیق نے گاہک کی طرف بڑھائی۔ گاہک جو بے غرضی سے صدیق کی باتیں سن رہا تھا۔ دال کو اپنے کپڑے میں باندھنے لگا۔ یکایک اس کی نگاہ دال پر پڑی اور وہ بولا "میاں باشا، یہ کونسی دال دے رہے ہو۔ میں نے تو ارہر کی مانگی تھی۔ ذرا پھرتی کرو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ بیوی بگڑے گی۔"

گھر میں مرزا کی بیوی اپنا سر دے دے مار رہی تھی اور بین کر کر کے رو رہی تھی اور انگریزوں اور گاندھی کو کوستی تھی۔ یاسمین کی ماں کو جب اس حادثے کی خبر ملی

تو وہ پرسہ کے لئے آئی۔ اس کا جوان لڑکا بھی دیوار کے نیچے دب کر مر گیا تھا اور وہ اس کے ننھے بچوں کو سلائی کر کے پالتی تھی۔ دونوں گلے مل کر خوب روئیں اور مرزا کی بیوی کو ذرا تسلی ہوئی۔۔۔۔۔۔ آخر کار لڑکے کو دفن کرنے لے گئے۔ رات اندھیری تھی اور بے پناہ تاریکی کی طرح سارے محلہ میں پھیلی ہوئی تھی ہوا سرد تھی اور محلہ میں سیلن کی وجہ سے جاڑا زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ لیمپوں کی دھیمی روشنی میں محلہ بھیانک اور ڈراؤنا معلوم ہو رہا تھا اور سڑک پر کوئی جاندار چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ صرف مرزا کی دکان کے اندر رکھی بتیوں کے خرّانے اور کھٹر پٹر کی آواز آ رہی تھی۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد تک اکثر مرزا کی بیوی کے گنگنانے کی آواز آیا کرتی تھی:

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے

لیکن پھر وہ خاموش رہنے لگی اور کام کاج میں مشغول رہتی۔

میرے مکان کی ڈیوڑھی میں ایک پرانا کھجور کا درخت تھا۔ ایک زمانہ میں اس میں پھل لگا کرتے تھے اور شہد کی مکھیاں غذا کی تلاش میں نیچے منڈلاتی تھیں۔ اس کی بڑی ڈالیوں پر اکثر جانور آ کر بیٹھتے اور بھولے بھٹکے کبوتر راتوں کو بسیرا کیا کرتے تھے لیکن اب اس کے پتے جھڑ گئے تھے ڈالیاں گر چکی تھیں اور اس کا تنا سیاہ اور بدہیئت رات کی تاریکی میں اس بانس کی طرح کھڑا رہتا جو کھیتوں میں جانوروں کو ڈرانے کے لئے گاڑ دیا جاتا ہے۔ اب نہ اس پر جانور منڈلاتے تھے نہ شہد کی مکھیاں اس طرف آتی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی کوّا اس کے ٹھنٹھ پر بیٹھ کر کائیں کائیں کرتا اور اپنا گلا پھاڑتا یا کوئی چیل اس پر ذرا دیر کو چلچلاتی اور پھر اڑ جاتی۔ صبح کی بڑھتی ہوئی روشنی میں تنا آسمان پر جھک اٹھتا تھا۔ لیکن شام کو فضا کی بڑھتی تاریکی میں آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا اور رات میں مل جاتا۔ رات کو اکثر گھر میں داخل ہوتے وقت میری نگاہ اس موٹے اور بھیانک تنے پر پڑتی۔ پھر اس کے سامنے اٹھتی ہوئی آسمان پر جاتی۔ تارے چمکتے ہوتے تھے اور ٹھیک اس کے سرے پر بنات النعش کا آخری ستارہ مجھ کو دکھائی دیتا تھا لیکن وہ تنا میری نگاہ اور آسمان کے درمیان حائل ہو جاتا اور میں تاروں کے پھیلاؤ کو نہ دیکھ سکتا۔

محلہ میں اکثر ایک پاگل عورت آیا کرتی تھی کسی نے اس کے بال کاٹ دئے تھے اور اس کا سر اس کے توانا اور بھاری جسم پر ایک اخروٹ کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ خدا ترس لوگ کبھی کبھی اسے کپڑے پہنا دیا کرتے تھے لیکن چند ہی گھنٹوں کے بعد وہ پھر ننگی ہو جاتی تھی۔ یا تو کوئی کپڑوں کو اتار لیتا یا وہ خود ان کو پھاڑ کر پھینک دیتی تھی۔ اس کے منہ سے ہمیشہ رال بہا کرتی اور اس کے ہاتھ ہمیشہ اکڑے ہوئے رہتے۔ وہ اکثر مٹک مٹک کر سڑک پر ناچتی اور ٹھٹھرتی اور گونگوں کی طرح گوں گوں کرتی۔ جیسے ہی وہ محلہ میں داخل ہوتی لڑکوں کا ایک غول اس کے پیچھے پیچھے تالیاں بجاتا اور "پگلی" کہہ کہہ کر پتھر پھینکتا اور منہ چڑاتا۔ عورت "ایں، ایں" کرتی اور کونوں میں چھپتی۔ جب کبھی مرزا کی دکان کے سامنے یہ واقعہ ہوتا تو مرزا لڑکوں پر چیختا۔ "ابے سسروں تمہیں مرنا نہیں ہے! بھاگو یہاں سے دور ہو۔"

لیکن ذرا دیر کے بعد لڑکے پھر جمع ہو جاتے۔

اکثر بڑے آدمی بھی اس سے مذاق کرتے۔ وہ بدصورت ضرور تھی لیکن اس کی عمر زیادہ نہ تھی۔ اس کا پیٹ بڑھا ہوا تھا۔ اکثر منّو جو کھاتے پیتے گھرانے کا لڑکا تھا لیکن اب بدمعاشوں میں مل گیا تھا۔ اس کے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کہتا "کیوں! تیرے بچہ کب ہوگا؟"

اور پگلی ایک درد انگیز وحشیانہ آواز نکالتی اور اپنے ہاتھ آگے بڑھا کے جوڑ دیتی اور بلبلاتے رہتے کسی راہ گیر یا دکاندار سے مخاطب ہو کر سڑک کی طرف اشارہ کرتی۔ اس کی کریہہ آواز میں ایک منت ہوتی تھی، ایک بے کس و بے بس شخص کی وہ التجا جو وہ اپنے حاکم یا اپنے سے زیادہ طاقتور انسان سے کرتا ہے کہ مجھے بخش دو اور بچا لو۔ مگر اور لوگ بھی مذاق کرنے میں شریک ہو جاتے اور زور زور سے قہقہہ لگاتے۔۔۔۔۔۔

ہندوستان میں ہزاروں لوگ ایسے ہیں جن کو سوائے کھانے پینے اور مرجانے کے کسی بات کا احساس نہیں۔ وہ پیدا ہوتے ہیں، بڑھتے ہیں، کمانے لگتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں اور مرجاتے ہیں؛ اس کے علاوہ انھیں دنیا کی کسی بات سے کوئی واسطہ نہیں۔ انسانیت کی بران میں نہیں ہوتی۔ زندگی کی عظمت کا ان کو کوئی احساس نہیں جیسے غلام جو کام کرنے اور مرنے کے علاوہ کوئی دوسری حقیقت ہی نہیں جانتے۔ زندگی کا طلوع اور موت کا غروب ان کے لئے دونوں یکساں ہیں۔ ان کے لئے دن کام کرنے اور راتیں سو رہنے کو بنی ہیں۔ بس یہی ان کی زندگی کی حقیقت ہے —— اور صرف موت ان کو زندگی سے نجات دلا سکتی ہے۔

ایک اور چیز جو ہمارے محلے میں کثرت سے دکھائی دیتی تھی، وہ کتے تھے۔ مرے ہوئے اور فاقہ زدہ۔ اکثر کو کھجلی تھی اور ان کی کھال میں گوشت نظر آتا تھا۔ اپنے بڑے بڑے دانتوں کو نکوس کر وہ اپنے پچھلے کھجاتے رہتے۔ یا قصائی کی دکان کے سامنے ایک ہڈی کے پیچھے ایک دوسرے کو نوچتے اور لہولہان کر دیتے۔ وہ اپنی دُمیں ٹانگوں کے بیچ میں دبائے نالیوں میں سونگھتے دبے دبے پھرتے رہتے اور قصائی کی دکان کے سامنے چھچھڑوں پر جھپٹتے۔ لیکن اکثر جیسے ہی ان کو کوئی گوشت کا ٹکڑا یا ہڈی دکھائی دیتی تو چیلیں اوپر سے جھپٹا مارتیں اور ان کے سامنے سے گوشت کو اٹھا لے جاتیں۔ پھر وہ ایک ایسے آدمی کی طرح جو خفیف ہو گیا ہو اپنی دم دبائے ہوئے سڑک کو سونگھا کرتے یا اپنی جھینپ آپس میں لڑائی لڑ کے اور ایک دوسرے کا خون بہا کر مٹاتے۔

صبح کو بہت سویرے شیرا چنے بیچنے والے کی آواز آتی تھی۔ وہ اپنی جھولی میں گرم گرم تازہ بھنے ہوئے سوندھے سوندھے چنے گلی گلی اور کوچہ کوچہ بیچتا پھرتا تھا۔ اس کی عمر کوئی چالیس سال کے قریب تھی لیکن وہ دبلا اور سوکھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر جھریاں ابھی سے نمایاں ہو گئی تھیں اور اس کی خشخشی داڑھی میں سفید بال آ گئے تھے۔ اس کی آنکھیں ایک بیمار کی آنکھوں کی طرح تھیں جن کے نیچے سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے، اور جن میں بھوک اور غربت و رنج اور مصیبت صاف جھلکتے تھے۔ ان کے ڈھیلوں میں باریک باریک سرخ رگیں دور سے دکھائی دیتی تھیں جیسے یا تو نشے میں یا کئی دنوں کے فاقے اور بخار کے بعد پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کے سر پر ایک کپڑے کی میلی ٹوپی رکھی رہتی تھی۔ گلے میں پھٹی ہوئی قمیض اور اس کی لنگی دھوتی میں سے پتلی پتلی ٹانگیں دکھائی دیتی تھیں۔ عرصہ ہوا وہ ہمارے شہر میں کسی نزدیک کے ضلع سے کام کی تلاش میں آ گیا تھا۔ وہ رات کو ایک مسجد میں پڑ رہتا اور دن بھر شہر کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا لیکن شہروں کی حالت روزگار کے معاملہ میں گاؤں اور قصبوں سے کسی طرح بہتر نہیں! اور شیرا کو کوئی کام نہ ملا۔ مسجد میں میر امان اللہ نماز پڑھنے آیا کرتے تھے۔ شیرا نے ان کو اپنا قصہ سنایا۔ میر صاحب کو اس کی حالت پر ترس آیا اور وہ اسے اپنے گھر لے گئے۔ شیرا نیک اور دیانتدار آدمی تھا۔ کچھ عرصے کے بعد میر صاحب نے اسے پانچ روپے دئے اور کہا:

"ان سے کوئی کام شروع کر دینا اس لئے میں یہ روپے دیتا ہوں۔ جب تمھارے پاس پیسے ہوں تو یہ رقم واپس کر دینا ورنہ کوئی فکر کی بات نہیں۔"

شیرا نے دال اور کابلی چنوں کا خوانچہ لگا لیا۔ کچھ عرصے میں شیرا کو بہت سے محلے والے جان گئے اور اس کا سودا خوب بکنے لگا۔ سال بھر کے اندر ہی اس نے میر صاحب کے روپے واپس کر دئے۔ اپنے بیوی بچوں کو بلا لیا اور ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے لگا اور بہت خوش تھا۔

اسی دوران میں عبدالرشید کو سوامی شردھانند کو قتل کرنے کے جرم میں پھانسی کی سزا کا حکم ہو گیا۔ سارے شہر کے مسلمانوں میں ایک تہلکہ مچا ہوا تھا۔ پھانسی والے روز جیل کے باہر ہزاروں آدمیوں کا ہجوم تھا۔ وہ سب دروازہ توڑ کر اندر گھس جانا چاہتے تھے لیکن جب پولیس نے عبدالرشید کی لاش کو دینے سے انکار کر دیا تو لوگوں کے جوش اور غصے کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا —— کہ کس طرح جیل کو مسمار کر دیں اور اس مرد غازی کی لاش کو ایک شہید کی طرح دفن کریں۔

اس دن شیرا کسی کام سے جامع مسجد کی طرف گیا ہوا تھا۔ آسمان پر غبار چھایا ہوا تھا اور سڑکیں ایک شہر خموشاں کی طرح اجاڑ اور سنسان معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کو کئی ایک بھوک کے کتے پھٹے ہوئے دونے چاٹتے دکھائی دیئے۔ ایک نالی میں ایک مرا ہوا کبوتر پڑا تھا۔ اس کی گردن ایک طرف کو مڑ گئی تھی اس کی ٹانگیں سخت اور نیلی اور الٹی ہوئی تھیں۔ اس کے پر پانی میں بھیگ گئے تھے اور اس کی ایک آنکھ کریہہ معلوم ہو رہی تھی۔ شیرا کھڑا ہو کر اس کو دیکھنے لگا۔ اتنے میں سامنے سڑک کے موڑ سے کلمہ کی آواز زور زور سے آنے لگی۔ لوگ ایک جنازہ لئے چلے آ رہے تھے۔ جوں جوں جنازہ شیرا کی طرف آتا گیا پیچھے بھیڑ اور زیادہ نظر آتی گئی۔ یہاں تک کہ دور دور آدمیوں کے علاوہ کچھ نہ دکھائی دیتا تھا۔ خلقت عبدالرشید کے جنازے کو کسی طرح سے بھاگی تھی۔ شیرا بھی جنازے کی طرف بڑھا اور کندھا دینے میں شریک ہو گیا۔ اتنے ہی سامنے سے پولیس نمودار ہوئی اور انہوں نے جنازہ کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور کئی ایک آدمیوں کو گرفتار کر لیا۔ ان لوگوں میں شیرا بھی تھا۔ اور اس کو اس بلوے میں شرکت کرنے کی بدولت دو سال کی سزا ہو گئی۔

اب وہ قید بھگت چکا تھا۔ لیکن اس کے گاہک اب اس کی آواز سے ناآشنا ہو چکے تھے اور اس کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ وہ دوبارہ خوانچہ لگا سکے۔ کچھ لوگوں نے چندہ کر کے اسے دو روپے دے دیئے اور ان سے شیرا نے پھر کام شروع کیا اور اب چنے بیچتا پھرتا تھا۔ لیکن اب اس کی آواز میں پچھلا کرارا پن باقی نہ رہا تھا اور مصیبت اور تکلیف اس کی ہر پکار میں سنائی دیتی تھی۔ تاہم بچے اس کی آواز سن کر چنے لینے کو دوڑتے تھے اور وہ مٹھی سے نکال نکال کر چنے گنتا اور ان کو دیتا تھا۔

ایک اور شخص جو ہمارے محلے میں ہر روز رات کو آیا کرتا تھا وہ ایک اندھا فقیر تھا۔ اس کا قد بہت چھوٹا تھا اور اس کی کھچڑی داڑھی پر ہمیشہ خاک پڑی رہتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹوٹا ہوا بانس کا ڈنڈا رہتا تھا جسے ٹیک ٹیک کر وہ آگے بڑھتا تھا۔ وہ بالکل حقیر اور ناچیز معلوم ہوتا تھا، جیسے کوڑے کے ڈھیر پر مکھیوں کا غول یا کسی مری ہوئی بلی کا ڈھینچر لیکن اس کی آواز میں وہ مایوسی اور درد تھا جو دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچ دیتا تھا۔ جاڑوں میں اس کی آواز جیسے سارے محلہ میں بے کسی پھیلاتی ہوئی کہیں دور سے آتی۔ میں نے آج تک اس سے زیادہ اثر رکھنے والی آواز نہیں سنی اور ابھی تک وہ میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ بہادر شاہ کی غزل اس کے منہ سے پھر پرانے زمانے کی یاد تازہ کر دیتی تھی جب ہندوستان اپنی ہی بندشوں میں نہیں جکڑا گیا تھا۔ اس کی آواز سے صرف بہادر شاہ کے رنج کا ہی اندازہ نہیں ہوتا تھا بلکہ ہندوستان کی غلامی کا نوحہ سننے میں آتا تھا۔ دور سے اس کی آواز آتی تھی۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے وہ میں ایک مشتِ غبار ہوں

لیکن محلہ کے شرفا اس کو پیسے دینے سے گھبراتے تھے کیونکہ وہ چرس پیتا تھا۔۔۔۔۔۔

ایک روز رات کو میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ گرمیوں کی رات تھی اور کوئی دس بجے کا وقت۔ زیادہ تر دکانیں بند ہو چکی تھیں لیکن کبابی اور مرزا کی دکانیں ابھی تک کھلی ہوئی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف لوگ اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ کچھ تو سو گئے تھے اور کچھ ابھی تک باتیں کر رہے تھے۔ ہوا میں خشکی اور گرمی تھی اور نالیوں میں سے سڑاند پھوٹ رہی تھی۔ مرزا کی دکان کے تختے کے نیچے ایک سیاہ بلی گھات لگائے بیٹھی تھی جیسے کسی شکار کی فکر میں بیٹھی ہو۔ ایک شخص نے ایک آنہ کا دہی بڑے کر کھایا اور آبخورے کو زمین پر ڈال دیا۔ بلی دبے پاؤں تختے کے نیچے سے نکلی اور آبخورے کو چاٹنے لگی۔ اسی وقت میری کھڑکی کے سامنے سے گلو گذری۔ اس کا رنگ سیاہ تھا لیکن شباب نے اس کے چہرے پر ایک رونق اور خوبصورتی پیدا کر دی تھی۔ اس کی چال میں ایک بے باکی اور الھڑپن تھا اور جسم زندگی کے ابھار سے توانا اور سبک تھا۔ وہ مفتی صاحب کے یہاں ملازم تھی جو کہ

بیوی نے اس کو بچپن ہی سے پالا تھا۔ اب وہ بیوہ ہو گئی تھی اور اسے بیوہ ہوئے ابھی تین سال گزر گئے تھے لیکن محلے کے نوجوانوں کی نگاہیں اس کی طرف لگی رہتی تھیں۔

جب وہ گلی کے نکڑ پر پہنچی تو منو نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ کلو جھنجلا کر بولی:

"مرو مشٹنڈا کہیں کا۔ تجھ پر خدا کی سنوار۔ ایک عورت کو اکیلا دیکھ کر ہاتھ لگاتا ہے۔"

منو بولا:

"تیری جوانی پھر کس دن کام آئے گی؟"

"ہٹ دور ہو، موئے میرا ہاتھ چھوڑ۔"

برابر ایک مکان کی چھت پر دو بلیوں کے لڑنے کی آواز آئی۔ اسی وقت کلو نے زور سے جھٹکا دیا اور اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"بھاڑ دو چھٹے، جوانا مرگ سمجھتا ہے مجھ میں دم نہیں۔ اتنا چھٹاؤں گی کہ عمر بھر یاد کرے گا۔"

مرزا جو ایک خریدار کو دودھ دینے کے بعد ذرا دیر کے لئے گھر میں چلا گیا تھا اسی وقت واپس آیا اور کلو کا آخری جملہ اسے سنائی دیا اور وہ بولا:

"کیا بات ہے کلو! کیا ہوا؟"

لیکن کلو بغیر پیچھے مڑے تیزی سے گلی کے اندر داخل ہو گئی۔ عزیز خیراتی جو اپنی دکان کے سامنے سو رہا تھا، شور سے اٹھ گیا۔ منو کو کھڑا دیکھ کر پوچھنے لگا:

"ابے منو کیا بات ہے؟"

منو مایوسی اور غصہ سے بھرا کھڑا تھا۔ اس کا منہ خشک ہو کر سِتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ایک سانپ کی آنکھوں کی طرح زہریلی اور تیز ہو گئی تھیں۔ کوڑے کے ڈھیر پر ایک بلی کی آنکھیں ذرا دیر چمکتی ہوئی دکھائی دیں لیکن پھر غائب ہو گئیں۔ منو نے چھپی ہوئی ناامیدی کی آواز میں جواب دیا:

"کچھ نہیں یار، کلو تھی۔"

"ابے کچھ سودا بھی پٹا؟"

"نہیں میاں ہتھے نہیں چڑھی۔ ہاتھ جھٹک کے بھاگ گئی لیکن سسری جائے گی کہاں؟"

اوپر بلیاں ابھی تک لڑ رہی تھیں۔ وہ ایک بھیانک طریقے سے غرّانے کے بعد زور زور سے چیختی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دوسری کو کھا جائیں گی پھر میاؤں میاؤں کر کے ایک بھاگ نکلی اور بلّا غرّاتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

عزیز خیراتی نے منو کو اپنے پلنگ پر بٹھا لیا اور سرہانے سے بیڑی نکال کر اس کی طرف بڑھائی لیکن منو نے اپنی قمیص کی جیب میں سے ایک چاندی کا سگرٹ کیس نکالا اور عزیز سے کہا:

"میاں تم بھی کیا یاد کرو گے۔ میں تمہیں بڑا بڑھیا سگرٹ پلاتا ہوں۔"

اور ایک سگرٹ نکال کر عزیز کو دیا۔

"ابے یار یہ تو نے کہاں اب کے کس کا مار لایا؟"

"میاں یاروں کے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ جس کو نہ دے مولا، اس کو دے آصف الدولہ۔ اگر اللہ میاں کے بھروسے پر رہتے تو کام چل لیا ہوتا۔"

"میاں ہوش کی لو۔ دس سے ڈرو! دوزخ میں جلو گے، توبہ کرو۔"

"جا یار یہ بھی کیا مُحروموں کی باتیں کرتا ہے۔ میں تو یہ جانتا ہوں کھاؤ پیو اور مزے کرو۔ اس سے زیادہ استاد نے سکھایا ہی نہیں۔ میں تو مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوں اور ٹھسے سے اینٹھتا ہوں۔ کہاں کی دوزخ لگائی۔ اگر ہوئی بھی تو بھگت لیں گے۔ اب کہاں کا روگ پالا۔"

"بس یار بس۔ کیوں خراب باتیں منہ سے نکال رہا ہے۔ سب آگے آگے آجاتا ہے۔ ساری اکڑ دھری رہ جائے گی۔"

"اچھا یار تُو تو اس طرح کی باتیں کرنے لگا۔ میں اب چل رہا۔"

"ذرا سُن تو یار۔ ایک بات مجھے دنوں سے حیران کر رہی ہے۔ قسم کھا بتا دے گا؟"

"اچھا جا کیا یاد رکھے گا۔ اللہ قسم بتا دوں گا۔"

"یہ بتا تو آخر چوری کیوں کرتا ہے؟"

"بھئی اس کی نہیں بدی تھی۔"

"دیکھ قول دے چکا ہے۔"

"اچھا جا تو جیتا میں ہارا۔ جو سچ پوچھو تو بات یہ ہے کہ میں کبھی چوری نہ کرتا۔ تو جانتا ہے میرے رشتہ دار کافی امیر لوگ ہیں۔"

"جبھی تو میں اور بھی حیران ہو رہا ہوں۔"

"میرا ایک بھائی لگتا تھا۔ لونڈا نمکین تھا۔ یہ کوئی دس برس کی بات ہے۔ تو میری کچھ اس سے چل گئی تھی۔ ہم دونوں مدرسے میں ساتھ پڑھتے تھے۔ اس نے ماسٹر سے میری شکایت کر دی اور بینتیں لگوائیں۔ میرے اوپر بھوت سوار ہو گیا۔ میں نے کہا سالے بدلہ نہ لیا ہو تو پیشاب سے مونچھیں منڈوا دوں گا۔ ایک مرتبہ پا کر میں نے سالے کا بستہ چرا لیا۔ اس کے اندر بڑی بڑھیا چیزیں تھیں۔ اس سے شروعات ہوئی۔ پھر ایک مرتبہ مجھے ایک ماموں کا سگریٹ کیس پسند آگیا۔ میں ان سے مانگ تو نہ سکتا تھا لیکن میں نے پار کر دیا۔ اس کے بعد میں نے سوچا کہ ان حرامزادوں کے پاس روپے بھی ہیں اور اچھی اچھی چیزیں بھی۔ کیوں نہ اڑا لیا کروں اور پھر تو میرا ہاتھ خوب صاف ہو گیا۔ یار سچ پوچھو تو یہ لوگ کبھی غریب کو مر کر بھی کوئی چیز نہ دیں۔ ان سے تو بس اسی طرح چیزیں وصول ہو سکتی ہیں۔"

"لیکن اگر کبھی پکڑے گئے تو؟"

"پھر تو نے وہی فضول کی باتیں شروع کر دیں۔ اچھا اب میں چلا نہیں تو گھر میں تو تو میں میں ہو گی۔" یہ کہہ وہ اٹھا اور عزیز کی کمر پہ زور سے لتر مار کر روانہ ہو گیا......

ہمارے محلّہ کی مسجد میں نثار احمد اذان دیا کرتے تھے۔ یہ قوی ہیکل اور مضبوط تھے۔ ان کا رنگ بالکل سیاہ تھا اور ان کی داڑھی مہندی سے سُرخ رہتی تھی۔ ان کا سر تو گنجا تھا لیکن پہلوؤں میں اور گدّی پر ان کے پٹے بال پڑے رہتے تھے۔ ان کے ماتھے پر ٹھیک بیچ میں ایک بڑا سا گٹا پڑ گیا تھا جس کا رنگ راکھ کا سا تھا اور الگ دور سے چمکتا تھا۔ اکثر وہ میری کھڑکی کے سامنے سے کھنکارتے ہوئے گزرتے تھے۔ وہ گاڑھے کا ڈھیلی موریوں کا پاجامہ اور گھٹنے کا کُرتا پہنے رہتے تھے اور ان کے کندھے پر ایک بڑا سُرخ رنگ کا چھپا ہوا رومال پڑا رہتا تھا۔ ان کی آواز میں ایک ایسا کرارا پن اور گرمی کے ساتھ ساتھ نرمی تھی جو انسان کو کم عطا ہوتی ہے۔ ان کی اذان دور دور مشہور تھی اور اس کی آواز بہت دور سے سُنائی دیتی تھی۔ شروع شروع میں ان کی آواز سے اس پکار کی شان ٹپکتی تھی جو مسلمانوں کو نماز کے لئے بُلاتی ہے۔ پر اختتام کے قریب آواز کی جھنکار دہیمی ہوتی اور ان کے چھلے بل کھاتے ہوئے ایک سنّاٹا اور خاموشی پیدا کرتے ہوئے فضا میں کھو جاتے تھے۔ لوگ نثار احمد کو حضرت بلال حبشی کہتے تھے اور اس مقابلہ میں بہت سی باتیں دونوں میں مشترک تھیں۔ ان کی شاندار آواز اور ان کا سیاہ رنگ۔

ایک مرتبہ میں اپنے مکان کی چھت پر اکیلا بیٹھا تھا۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل بچھے ہوئے تھے اور سورج کی روشنی ان کے پیچھے سے چھن رہی تھی اور ان میں سے ہلکی سی پھیکی روشنی نمایاں تھی۔ کیونکہ مطلع صاف نہ تھا اور شہر کا گرد و غبار اور رو دھوں کی چمنیوں کا دھواں فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ شہر کے شور و شغب کی جھنکار مکھیوں کے بھنبھنانے کی طرح آرہی تھی۔ ساری فضا میں ایک دل شکن مایوسی تھی اور وہ تکلیف دہ کیفیت جو ہمارے شہروں کی خاص پہچان بن گئی ہے

جس میں غربت اور غلاظت، زندگی کی حقارت اور بے بسی کا احساس ہوتا ہے۔ گرد و غبار سے میلے اور پھیکے بادلوں میں ایک جنگلی کبوتر اڑتا ہوا گزرا اور ان کے ملگجے رنگوں میں غائب ہو گیا۔ دور سے ملوں کی سیٹیوں اور ریل کے انجنوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شہر کی اونچی چمنیوں اور میناروں سے کبوتر اڑتے تھے یا منڈلا منڈلا کر انہی پر بیٹھ جاتے تھے۔ دور دور جدھر نگاہ دوڑتی تھی گندی اور بدنما میلی کچیلی عمارتیں اور ان کی چھتیں دکھائی دیتی تھیں۔ دور دور جدھر انسان دیکھ سکتا تھا زندگی کی سردمہری اور بے کاری کا احساس ہوتا تھا۔ کہیں کہیں کوئی دومنزلہ مکان بن رہا تھا اور اس کی باڑیں آسمان اور نگاہ کے بیچ سدِ راہ ہوتی تھیں۔ لیکن بانسوں اور بلیوں کے رنگ نگاہ کو تکلیف نہ پہنچاتے تھے اور بادلوں کے رنگوں میں مل کر ہلکے اور مدھم دکھائی دیتے تھے۔ اسی وقت نثار احمد کے کھنکارنے کی آواز آئی اور پھر ان کی اٹھتی سنہری آواز فضا میں پھیل گئی۔ یہ آواز کچھ ایسی مایوس کن لیکن تسکین بخش تھی کہ بری کوفت ایک خاموش رنج سے بدل گئی۔ اس آواز میں کوئی عظمت اور ثبات نہ تھی بلکہ اس سے زندگی کی بے ثباتی کا احساس ہوتا تھا۔ اس بات کا کہ دنیا مردار ہے اور اس کے چاہنے والے کتے، اس بات کا کہ زندگی حقیر اور ناچیز ہے۔ اسی طرح جیسے بادلوں کے چہرے پر گرد اور دھواں اور غبار۔ اپنے موہوم خیالات کا شکار میں اذان کو سنتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اختتام کے قریب آ گئی اور حی علی الصلوٰۃ حی علی الصلوٰۃ کی خاموشی پیدا کرنے والی آواز کانوں میں گونجنے لگی۔ پھر حی علی الفلاح، حی علی الفلاح کی آواز سناٹا چھاتی ہوئی، دنیا کی بے ثباتی کا یقین دلاتی باریک لمبی تان کے دھیمے سُروں میں ہوتی اس آہستگی اور دل بستگی سے ختم ہوئی کہ یہ نہ معلوم ہوتا تھا کہ آواز رک گئی ہے یا ساری دنیا پر خاموشی طاری ہے، ایک گہری خاموشی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ دنیا سے پرے بہت دور ایک اور دنیا ہے جس میں ازل اور ابد دونوں ایک ہیں اور یہ دنیا ہیچ اور موہوم ہے۔ آواز اس طرح فضا میں کھو گئی جس طرح افق پر زمین ختم ہوتی ہے اور آسمان شروع ہو جاتا ہے اور تمیز نہیں ہو سکتی کہ زمین ختم بھی ہو گئی یا ہر جگہ آسمان ہی آسمان ہے۔ اسی طرح آواز اس آہستگی سے رک گئی کہ آواز اور خاموشی میں امتیاز نہ ہو سکتا تھا۔ آواز کانوں میں گونج رہی تھی لیکن یہی شبہ ہوتا تھا کہ صرف خاموشی کانوں میں ہیجان برپا کئے ہوئے ہے۔

اور میں سوچتا رہا کہ یہ اذان ہماری زندگی کی حقیقت کو کس خوبی سے ظاہر کرتی ہے۔ وہی بے بسی اور مایوسی جو ہماری رگ رگ میں پیوست ہو گئی ہے وہی ناامیدی اور خارجی حقیقت کا خوف جو ہم کو ایک داخلی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیتا ہے، اس اذان میں موجود تھے۔ ہم دنیا کو چھوڑ کر ازل اور ابد کے خواب دیکھا کرتے ہیں۔ آدمی کو بھلا کر خدا کی تلاش میں مشغول رہتے ہیں اور ہماری زندگی کی ہر چیز ہم کو اسی بات کی ترغیب دلاتی ہے، ہمارا ہر گیت ہمیں یہی لوریاں سناتا ہے۔ ہمارے پیروں میں بیڑیاں ہیں لیکن ہم ان کی رگڑ کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ وہ ہم کو ایک خارجی حقیقت نہیں معلوم ہوتیں۔ ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہیں، ہمارے گلوں میں طوق ہیں، ہماری زبانوں پر قفل ڈال دیے گئے ہیں لیکن ہم کو کسی بات کا احساس نہیں، ہمارا جسم شل ہو چکا ہے، ہماری روح سو گئی ہے اور ہم اپنی بے بسی پر مگن ہیں اور لاپروائی اور بے حسی کی زندگی گزارتے ہیں حتیٰ کہ موت اپنے پنجے بڑھاتی ہے اور اپنی تاریک آغوش میں دبوچ لیتی ہے۔ ہماری نیک نامی اور بدنامی دونوں برابر ہیں۔ ہماری زندگی اور موت دونوں یکساں ہیں اور اذان کی آواز کی طرح ہم اس طرح زندگی سے موت میں بدل جاتے ہیں کہ کوئی تمیز نہیں کر سکتا ہم کبھی زندہ بھی تھے یا یہ سب وہم و گمان تھا اور ہم موت کے دلارے، ہمیشہ سے اس کی لوریوں سے مخمورِ غفلت کی نیند سویا کرتے تھے۔

ایک رات کو مرزا کی دکان پر تین چار آدمی بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو عزیز تھا، ایک کراچی اور ایک نئے آدمی ادھر جمع ہو گئے تھے۔ ان کے سامنے حقہ رکھا تھا اور وہ باری باری کش کھینچ رہے تھے۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا،

"میں تو یار ہر ایک چیز میں دیس کی شان دیکھ رہا ہوں۔"

اس پر میرے کان کھڑے ہوئے اور میں غور سے سننے لگا۔

اتنے میں ایک گاہک آیا اور اس نے مرزا سے پانچ پیسے کا دودھ مانگا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ مرزا نے ایک آبخورہ اٹھایا اور دودھ نکالنے کے لئے کٹیا دودھ کی طرف بڑھائی۔ اس آغا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، "پرسوں میں چاندنی چوک میں سے جا رہا تھا کہ سامنے سے

ایک بچھیا آ رہی تھی۔ وہیں جنگل ایک بچہ پڑا ہوا تھا۔ گائے بچے کے پاس آن کے رک گئی۔ میں نے سوچا کہ دیکھو اب کیا کرتی ہے۔ وہ تو میں صاحب وِس بچھیا نے اپنے چاروں پیر جوڑ کر ایک قلانچ ماری اور بچے کو صاف لانگ گئی۔ مجھ کو تو وِس جناور کی عقل میں وِس کی شان نظر آ گئی۔"

مرزا کا ایک ہاتھ کڑھاؤ کے پاس تھا، دوسرے میں آبخورہ تھا اور وہ بولنے والے کی طرف گھور رہا تھا۔ عزیز بولا:

"واہ واہ کیا وِس کی شان ہے!"

مرزا نے لٹیا میں دودھ لیا اور ماس کو اچھالنے لگا۔ اتنے میں ایک دوسرا شخص بولا:

"ہاں میاں وِس کی شان کا کیا پوچھ رہے ہو۔ ایک مرتبہ حضرت سلیمانؑ کو حکم ملا کہ محل بناؤ، تو بس صاحب وِنہوں نے تیاریاں شروع کر دیں۔ جناتوں نے آناً فاناً میں بڑے بڑے پتھر اور سلیں لا لا کے جمع کر دیں اور عمارت لگ گئی۔ تم جانتے ہو جناتوں کا کام کتنی پھرتی کا ہوتا ہے۔ آج اتنا کل وِتنا تھوڑے ہی دنوں میں محل آسمان سے باتیں کرنے لگ گیا۔ حضرت سلیمانؑ روز وِس جنگہ جا کے دیکھا کرتے تھے کہ کوئی کام میں سستی تو نہیں کر رہا ہے۔ تو بس صاحب ایک دن محل کھڑا ہو گیا۔ اب صرف وِس کے اندر کی تیلیں اور پتھر صاف کرنے رہ گئے۔ دوسرے روز پھر حضرت سلیمانؑ اپنی لکڑی ٹیک کے کھڑے ہو گئے اور ملبہ باہر پھینکنے کا حکم دے دیا لیکن وِتنے میں وہاں سے کچھ اور ہی حکم آ چکا تھا۔ اب دیکھئے محل کی شان کہ یہاں تو وِس کی صفائی ہو رہی ہے اور وہاں وِس لکڑی میں گھن لگنا شروع ہو گیا لیکن وہ ڈٹے کھڑے رہے۔ یہاں تک کہ گھن لگتے لگتے موٹھ تک پہنچ گیا۔ لیکن وِن کو ذری بھی خبر نہیں ہوئی اور لکڑی راکھ کی طریوں جھڑ گئی اور وِن کا خود کا دم نکل گیا۔ اِدھر تو وِن کا کام تمام ہوا، وِدھر جب جناتوں نے دیکھا کہ جن کا رعاب شاب تھا وہ ہی نہیں رہے تو چمپت بنے۔ لیکن میں تو اس بات پر حیران ہو رہا ہوں کہ اب وِن تیلوں اور پتھروں کو کون صاف کرے گا؟"

عزیز کے ہاتھ میں حقہ کی نلی اس کے منہ کے برابر رکھی ہوئی تھی اور وہ بولنے والے کی طرف گھور رہا تھا۔ مرزا کا ایک ہاتھ جس میں لٹیا تھی اوپر تھا اور آبخورہ والا نیچے، اور وہ قصہ میں محو تھا۔

میں نے زور سے قہقہہ لگایا لیکن پھر سوچ میں پڑ گیا کہ واقعی ان "تیلوں" اور "پتھروں" کو کون صاف کرے گا۔

ہوا کا ایک جھونکا زور سے آیا اور مٹی کے تیل کا لیمپ گل ہو گیا اور سڑک پر اندھیرا تھا۔ اس وقت لوگ مرزا کی دکان سے اٹھ کر روانہ ہونے لگے اور میں بھی گھر کے اندر چلا گیا۔

غلام عباس

آنندی

بلدیہ کا اجلاس زوروں پر تھا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور خلافِ معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہ تھا۔ بلدیہ کے زیرِ بحث مسئلہ یہ تھا کہ زنانِ بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے۔ کیونکہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

بلدیہ کے ایک بھاری بھرکم رکن جو ملک و قوم کے سچے خیرخواہ سمجھے جاتے تھے نہایت فصاحت سے تقریر کر رہے تھے:

"...... اور پھر حضرات آپ یہ بھی خیال فرمائیے کہ ان کا قیام شہر کے ایک ایسے حصے میں ہے جو نہ صرف شہر کے بیچوں بیچ عام گزرگاہ ہے بلکہ شہر کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بھی ہے۔ چنانچہ ہر شریف آدمی کو چار و ناچار اس بازار سے گزرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں شرفا کی پاک دامن بہو بیٹیاں اس بازار کی تجارتی اہمیت کی وجہ سے یہاں آنے اور خرید و فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔ صاحبان! جب یہ شریف زادیاں ان آبرو باختہ نیم عریاں بیسواؤں کے بناؤ سنگار کو دیکھتی ہیں تو قدرتی طور پر ان کے دل میں بھی آرائش و دلربائی کی نئی نئی امنگیں اور ولولے پیدا ہوتے ہیں اور وہ اپنے غریب شوہروں سے طرح طرح کے غازوں، لونڈروں، زرق برق ساریوں اور قیمتی زیوروں کی فرمائشیں کرنے لگتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا پُرمسرت گھر، ان کا راحت کدہ ہمیشہ کے لئے جہنم کا نمونہ بن جاتا ہے۔

"...... اور صاحبان پھر آپ یہ بھی تو خیال فرمائیے کہ نونہالانِ قوم جو درسگاہوں میں تعلیم پا رہے ہیں اور جن کی آئندہ ترقیوں سے قوم کی امیدیں وابستہ ہیں اور قیاس کہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن قوم کی کشتی کو بھنور سے نکالنے کا سہرا ان ہی کے سر بندھے گا، انہیں بھی صبح و شام اسی بازار سے ہو کر آنا جانا پڑتا ہے۔ یہ قحبائیں جو ہر وقت بارہ ابھرن سولہ سنگھار کئے ہر راہرو پر بے حجابانہ نگاہ و مژہ کے تیر و سناں برساتی اور اسے دعوتِ حسن پرستی دیتی ہیں کیا انہیں دیکھ کر ہمارے بھولے بھالے، ناتجربہ کار، جوانی کے نشے میں سرشار، سود و زیاں سے بے پروا نونہالانِ قوم اپنے جذبات و خیالات اور اپنی اعلیٰ سیرت کو معصیت کے مسموم اثرات سے محفوظ رکھ سکتے ہیں؟ صاحبان! کیا ان کا حسنِ زاہد فریب ہمارے نونہالانِ قوم کو جادۂ مستقیم سے بھٹکا کر، ان کے دل میں گناہ کی پراسرار لذتوں کی تشنگی پیدا کر کے ایک بے کلی، ایک اضطراب، ایک ہیجان برپا نہ کر دیتا ہوگا......؟"

اس موقع پر ایک رکنِ بلدیہ جو کسی زمانہ میں مدرّس رہ چکے تھے اور اعداد و شمار سے خاص شغف رکھتے تھے بول اُٹھے :

"صاحبان ! واضح رہے کہ امتحانوں میں ناکام رہنے والے طلبہ کا تناسب پچھلے پانچ سال کی نسبت ڈیوڑھا ہو گیا ہے۔"

ایک رکن نے جو چشمہ لگائے ہوئے تھے اور ایک ہفتہ وار اخبار کے مدیرِ اعزازی تھے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "حضرات ! ہمارے شہر سے روز بروز غیرت، شرافت، مردانگی، نکوکاری و پرہیزگاری اٹھتی جا رہی ہے اور اس کے بجائے بے غیرتی، نامردی، بزدلی، بدمعاشی، چوری اور جعل سازی کا دور دورہ ہوتا جا رہا ہے۔ منشیات کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے۔ قتل و غارت، خودکشی اور دیوالہ نکلنے کی وارداتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس کا سبب محض ان زنانِ بازاری کا ناپاک وجود ہے۔ کیونکہ ہمارے بھولے بھالے شہری ان کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو کر ہوش و خرد کھو بیٹھتے ہیں اور ان کی بارگاہ تک رسائی کی زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز طریق سے زر حاصل کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اس سعی و کوشش میں جامۂ انسانیت سے باہر ہو جاتے اور نہایت قبیح افعال کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ جانِ عزیز ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور یا جیل خانوں میں پڑے سڑتے ہیں۔"

ایک پنشن یافتہ معمّر رکن جو ایک وسیع خاندان کے سرپرست تھے اور دنیا کا سرد و گرم دیکھ چکے تھے اور اب کشمکشِ حیات سے تھک کر باقیماندہ عمر سستانے اور اپنے اہل و عیال کو اپنے سائے میں پنپتا ہوا دیکھنے کے متمنی تھے، تقریر کرنے اٹھے۔ ان کی آواز لرزتی ہوئی اور لہجہ فریاد کا انداز لئے ہوئے تھا۔ بولے :

"صاحبان ! رات رات بھر ان لوگوں کے طبلے کی تھاپ، ان کی گلے بازیاں، ان کے عشاق کی دھینگا مشتی، گالی گلوچ، شور و غل !!! ہو ہو ہو، ہا ہا ہا اس پاس کے رہنے والے شرفا کے کان پک گئے ہیں، ضعیف ہی جان آگئی ہے۔ رات کی نیند حرام ہے تو دن کا چین مفقود۔ علاوہ ازیں ان کے قرب سے ہماری بہو بیٹیوں کے اخلاق پر جو بُرا اثر پڑتا ہے اس کا اندازہ ہر صاحبِ اولاد خود کر سکتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

آخری فقرہ کہتے کہتے ان کی آواز بھرّا گئی اور وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے۔ سب اراکینِ بلدیہ کو ان سے ہمدردی تھی کیونکہ بدقسمتی سے ان کا قدیمی مکان اس بازارِ حسن کے عین وسط میں واقع تھا۔

ان کے بعد ایک رکنِ بلدیہ نے جو پرانی تہذیب کے علمبردار تھے اور آثارِ قدیمہ کو اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے تقریر کرتے ہوئے کہا :

"حضرات ! باہر سے جو سیاح اور ہمارے احباب اس مشہور اور تاریخی شہر کو دیکھنے آتے ہیں جب وہ اس بازار سے گزرتے اور اس کے متعلق استفسار کرتے ہیں تو یقین کیجئے کہ ہم پر گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے۔"

اب صدرِ بلدیہ تقریر کرنے اُٹھے۔ گو قد ٹھگنا اور ہاتھ پاؤں چھوٹے چھوٹے تھے مگر سر بڑا تھا جس کی وجہ سے بُردبار آدمی معلوم ہوتے تھے۔ لہجہ میں حد درجہ متانت تھی۔ بولے "حضرات ! میں اس امر میں قطعی طور پر آپ سے متفق ہوں کہ اس طبقہ کا وجود ہمارے شہر اور ہمارے تہذیب و تمدن کے لئے باعثِ صد عار ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کا تدارک کس طرح کیا جائے۔ اگر ان لوگوں کو مجبور کیا جائے کہ یہ پاپ ذلیل پیشہ چھوڑ دیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ کھائیں گے کہاں سے ؟"

ایک صاحب بول اٹھے "یہ عورتیں شادی کیوں نہیں کر لیتیں ؟"

اس پر ایک طویل فرمائشی قہقہہ پڑا اور ہال کی ماتمی فضا میں یکبارگی شگفتگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ جب اجلاس میں خاموشی ہوئی تو صاحبِ صدر بولے "حضرات ! یہ تجویز بارہا ان لوگوں کے سامنے پیش کی جا چکی ہے۔ اس کا ان کی طرف سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ آسودہ اور عزت دار لوگ خاندانی حرمت و ناموس کے خیال سے انہیں اپنے گھروں میں نہ گھسنے دیں گے، اور مفلس اور نادار طبقہ کے لوگوں کو جو محض ان کی دولت کے لئے ان سے شادی کرنے پر آمادہ ہوں گے، یہ عورتیں خود منہ نہیں لگائیں گی۔"

اس پر ایک صاحب بولے "بلدیہ کو ان کے نجی معاملوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں، بلدیہ کے سامنے تو یہ مسئلہ ہے کہ یہ لوگ چاہے جہنم میں جائیں مگر اس شہر کو خالی کر دیں۔"

صدر نے کہا "صاحبان! یہ بھی آسانی کا کام نہیں، ان کی تعداد دس بیس نہیں سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ اور پھر ان میں سے بہت سی عورتوں کے ذاتی مکانات ہیں۔"

یہ مسئلہ کوئی مہینے بھر تک بلدیہ کے زیر بحث رہا اور بالآخر تمام اراکین کی باتفاق رائے سے یہ امر قرار پایا کہ زنانِ بازاری کے مملوکہ مکانوں کو خرید لینا چاہیئے اور انہیں رہنے کے لئے شہر سے کافی دور کوئی الگ تھلگ علاقہ دے دینا چاہیئے۔ ان عورتوں نے بلدیہ کے اس فیصلہ کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ بعض نے نافرمانی کر کے بھاری جرمانے اور قیدیں تک بھگتیں مگر بلدیہ کی مرضی کے آگے ان کی کوئی پیش نہ چل سکی اور وہ ناچار صبر کر کے رہ گئیں۔

اس کے بعد ایک عرصہ تک ان زنانِ بازاری کے مملوکہ مکانوں کی فہرستیں اور نقشے تیار ہوتے اور مکانوں کے گاہک پیدا کئے جاتے رہے۔ بیشتر مکانوں کو بذریعہ نیلام فروخت کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان عورتوں کو چھ مہینے تک شہر میں اپنے پرانے ہی مکانوں میں رہنے کی اجازت دے دی گئی تاکہ اس عرصے میں وہ نئے علاقہ میں مکان وغیرہ بنوا سکیں۔

ان عورتوں کے لئے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے چھ کوس دور تھا۔ پانچ کوس تک پکی سڑک جاتی تھی اور اس سے آگے کوس بھر کا کچا راستہ تھا۔ کسی زمانہ میں وہاں کوئی بستی ہوگی مگر اب تو کھنڈروں کے سوا کچھ نہ رہا تھا جن میں سانپوں اور چمگادڑوں کے مسکن تھے اور دن دہاڑے الو بولتے تھے۔ اس علاقے کے نواح میں کچے گھروندوں والے کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے۔ مگر کسی کا فاصلہ بھی یہاں سے دو ڈھائی میل سے کم نہ تھا۔ ان گاؤں کے بسنے والے کسان دن کے وقت کھیتی باڑی کرتے یا یونہی پھرتے پھراتے ادھر نکل آتے تو نکل آتے ورنہ عام طور پر اس شہرِ خموشاں میں آدم زاد کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ بعض اوقات روزِ روشن ہی میں گیدڑ اس علاقے میں پھرتے دیکھے گئے تھے۔

پانسو سے کچھ اوپر بیسواؤں میں سے صرف چودہ ایسی تھیں جو اپنے عشاق کی وابستگی یا خود اپنی دل بستگی یا کسی اور وجہ سے شہر کے قریب آزادانہ رہنے پر مجبور تھیں اور اپنے دولت مند چاہنے والوں کی مستقل مالی سرپرستی کے بھروسے بادلِ ناخواستہ اس علاقہ میں رہنے پر آمادہ ہو گئی تھیں۔ ورنہ باقی عورتوں نے سوچ رکھا تھا کہ وہ یا تو اسی شہر کے ہوٹلوں کو اپنا مسکن بنائیں گی یا بظاہر پارسائی کا جامہ پہن کر شہر کے شریف محلوں کے کونوں کھدروں میں جا چھپیں گی۔ یا پھر اس شہر ہی کو چھوڑ کر کہیں اور نکل جائیں گی۔

یہ چودہ بیسوائیں اچھی خاصی مالدار تھیں۔ اس پر شہر میں ان کے جو مملوکہ مکان تھے ان کے دام انہیں اچھے وصول ہو گئے تھے اور اس علاقہ میں زمین کی قیمت برائے نام تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے ملنے والے دل و جان سے ان کی مالی امداد کرنے کے لئے تیار تھے چنانچہ انہوں نے اس علاقے میں جی کھول کر بڑے عالیشان مکان بنوانے کی ٹھان لی۔ ایک اونچی اور ہموار جگہ، جو ٹوٹی پھوٹی قبروں سے ہٹ کر تھی، منتخب کی گئی۔ زمین کے قطعے صاف کرائے گئے اور چابکدست نقشہ نویسوں سے مکانوں کے نقشے بنوائے گئے اور چند ہی روز میں تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔

دن بھر اینٹ، مٹی، چونا، شہتیر، گارڈر اور دوسرا عمارتی سامان لاریوں، چھکڑوں، خچروں، گدھوں اور انسانوں پر لد کر اس بستی میں آتا اور منشی حساب کتاب کی کاپیاں بغلوں میں دبائے انہیں گنتے اور کاپیوں میں درج کرتے۔ میر عمارت معماروں کو کام کے متعلق ہدایات دیتے۔ معمار مزدوروں کو ڈانٹتے ڈپٹتے۔ مزدور ادھر ادھر دوڑتے پھرتے۔ مزدورنیوں کو چلا چلا کر پکارتے اور اپنے ساتھ کام کرنے کے لئے بلاتے۔ غرض سارا دن ایک شور، ایک ہنگامہ رہتا اور سارا دن آس پاس کے گاؤں کے دیہاتی اپنے کھیتوں میں اور دیہاتنیں اپنے گھروں میں ہوا

کے جھونکوں کے ساتھ دور سے آتی ہوئی گھٹ گھٹ کی دھیمی آوازیں سنتی رہتیں۔

اس بستی کے کھنڈروں میں ایک جگہ مسجد کے آثار تھے اور اس کے پاس ہی ایک کنواں تھا جو بند پڑا تھا۔ راج مزدوروں نے کچھ تو پانی حاصل کرنے اور بیٹھ کر سستانے کی غرض سے اور کچھ ثواب کمانے اور اپنے نمازی بھائیوں کی عبادت گزاری کے خیال سے سب سے پہلے اسی کی مرمت کی۔ چونکہ یہ فائدہ بخش اور ثواب کا کام تھا اس لئے کسی نے کچھ اعتراض نہ کیا۔ چنانچہ دو تین روز میں مسجد تیار ہو گئی۔

دن کو بارہ بجے جیسے ہی کھانا کھانے کی چھٹی ہوتی دو ڈھائی سو راج مزدور، میر عمارت، منشی اور ان بیسواؤں کے رشتہ دار یا کارندے جو تعمیر کی نگرانی پر مامور تھے اس مسجد کے آس پاس جمع ہو جاتے اور اچھا خاصا میلہ سا لگ جاتا۔

ایک دن ایک دیہاتی بڑھیا جو پاس کے کسی گاؤں میں رہتی تھی اس بستی کی خبر سن کر آ گئی۔ اس کے ساتھ ایک خوردسال لڑکا تھا۔ دونوں نے مسجد کے قریب ایک درخت کے نیچے گھٹیا سگرٹ بیڑی، چنے اور گڑ کی بنی ہوئی مٹھائیوں کا خوانچہ لگا دیا۔ بڑھیا کو آئے ابھی دو دن بھی نہ گزرے تھے کہ ایک بوڑھا کسان کہیں سے ایک مٹکا اٹھا لایا اور کنوئیں کے پاس اینٹوں کا ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا پیسے کے دو دو شکر کے شربت کے گلاس بیچنے لگا۔ ایک کنجڑے کو جو خبر ہوئی وہ ایک ٹوکرے میں خربوزے بھر کر لے آیا اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس بیٹھ کر ”لے لو خربوزے، شہد سے میٹھے خربوزے“ کی صدا لگانے لگا۔ ایک شخص نے کیا کیا۔ گھر سے سری پائے پکا، دیگچی میں رکھ، خوانچہ میں لگا، تھوڑی سی روٹیاں مٹی کے دو تین پیالے اور ٹین کا ایک گلاس لے کر آ موجود ہوا اور اس بستی کے کارکنوں کو جنگل میں ہنڈیا کا مزا چکھانے لگا۔

ظہر اور عصر کے وقت میر عمارت، معمار اور دوسرے لوگ مزدوروں سے کنوئیں سے پانی نکلوا نکلوا کر وضو کرتے نظر آتے۔ ایک شخص مسجد میں جا کر اذان دیتا۔ پھر ایک کو امام بنایا جاتا اور دوسرے لوگ اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھتے۔ کسی گاؤں کے ایک ملا کے کان میں جو یہ بھنک پڑی کہ فلاں مسجد میں امام کی ضرورت ہے۔ وہ دوسرے ہی دن علی الصباح ایک سبز جزدان میں قرآن شریف، پنج سورہ، رحل اور مسئلے مسائل کے چند چھوٹے چھوٹے رسالے رکھ آ موجود ہوا اور اس مسجد کی امامت باقاعدہ طور پر اسے سونپ دی گئی۔

ہر روز تیسرے پہر گاؤں کا ایک کبابی سر پر اپنے سامان کا ٹوکرا اٹھائے آ جاتا اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس زمین پر چولہا بنا کباب، کلیجی، دل اور گردے سیخوں پر چڑھا بستی والوں کے ہاتھ بیچتا۔ ایک بھٹیاری نے جو یہ حال دیکھا تو اپنے میاں کو ساتھ لے، مسجد کے سامنے میدان میں دھوپ سے بچنے کے لئے پھونس کا ایک چھپر ڈال تنور گرم کرنے لگی۔ کبھی کبھی ایک نوجوان دیہاتی نائی پھٹی پرانی کسبت گلے میں ڈالے جوتی کی ٹھوکروں سے راستے کے روڑوں کو لڑھکاتا ادھر ادھر گشت کرتا دکھائی دے جاتا۔

ان بیسواؤں کے مکانوں کی تعمیر کی نگرانی ان کے رشتہ دار یا کارندے تو کرتے ہی تھے کسی کسی دن وہ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر اپنے عشاق کے ہمراہ خود بھی اپنے اپنے مکانوں کو بنتا دیکھنے آ جاتیں اور غروب آفتاب سے پہلے یہاں سے نہ جاتیں۔ اس موقع پر فقیروں اور فقیرنیوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں نہ جانے کہاں سے آ جاتیں اور جب تک خیرات نہ لے لیتیں اپنی صداؤں سے برابر شور مچاتی رہتیں اور انہیں بات نہ کرنے دیتیں۔ کبھی کبھی شہر کے لفنگے اوباش، بے کار مباش کچھ کیا کر کے مصداق شہر سے پیدل چل کر بیسواؤں کی اس نو آبادی کی سن گن لینے آ جاتے اور اگر اس دن بیسوائیں بھی آئی ہوتیں تو ان کی عید ہو جاتی۔ وہ ان سے [illegible] کرتے۔ دور دور کھڑے ہو کر رنگینی لگاتے رہتے۔ فقرے کستے، بے تکے قہقہے لگاتے، عجیب عجیب شکلیں بناتے اور مجنونانہ حرکتیں کرتے۔ اس روز کبابی کی خوب بکری ہوتی۔

اس علاقے میں جہاں تھوڑے ہی دن پہلے ہو کا عالم تھا اب ہر طرف گہما گہمی اور چہل پہل نظر آنے لگی۔ شروع شروع میں اس علاقے کی ویرانی میں ان بیسواؤں کو یہاں آ کر رہنے کے خیال سے جو وحشت ہوتی تھی وہ [illegible] حد تک جاتی رہی تھی۔ [illegible] خوش خوش اپنے مکانوں کی آرائش اور اپنے مرغوب رنگوں کے متعلق معماروں کو تاکید کیا کرتی تھیں۔

بستی میں ایک جگہ ایک ٹوٹا پھوٹا مزار تھا جو قرائن سے کسی بزرگ کا معلوم ہوتا تھا۔ جب یہ مکان نصف سے زیادہ تعمیر ہو چکے تو ایک دن بستی کے راج مزدوروں نے کیا دیکھا کہ مزار کے پاس سے دھواں اٹھ رہا ہے اور ایک سرخ سرخ آنکھوں والا لمبا تڑنگا مست فقیر لنگوٹ باندھے چار ابرو کا صفایا کرائے اس مزار کے اردگرد پھر رہا اور کنکر پتھر اٹھا اٹھا کر پرے پھینک رہا ہے۔ دوپہر کو وہ فقیر ایک گھڑا لے کر کنوئیں پر آیا، اور پانی بھر بھر کے مزار پہ لے جانے اور اسے دھونے لگا۔ ایک دفعہ جو آیا تو کنوئیں پر وہ تین راج مزدور کھڑے تھے وہ نیم دیوانگی اور نیم فرزانگی کے عالم میں ان سے کہنے لگا "جانتے ہو وہ کس کا مزار ہے؟ کڑک شاہ پیر بادشاہ کا! میرے باپ دادا ان کے مجاور رہتے" اس کے بعد اس نے ہنس ہنس کر اور آنکھوں میں آنسو بھر بھر کے پیر کڑک شاہ کی کچھ جلالی کرامات بھی ان راج مزدوروں سے بیان کیں۔

شام کو یہ فقیر کہیں سے مانگ تانگ کر مٹی کے دو دیئے اور سرسوں کا تیل لے آیا اور پیر کڑک شاہ کی قبر کے سرہانے اور پائنتی چراغ روشن کر دئے۔ رات کو پچھلے پہر کبھی کبھی اس مزار سے "اللہ ہو" کا مست نعرہ سنائی دے جاتا۔

چھ مہینے گزرنے نہ پائے تھے کہ یہ چودہ مکان بن کر تیار ہو گئے۔ یہ سب کے سب دو منزلہ اور قریب قریب ایک ہی وضع کے تھے سات ایک طرف اور سات دوسری طرف۔ بیچ میں چوڑی چکلی سڑک تھی۔ ہر ایک مکان کے نیچے چار چار دکانیں تھیں۔ مکان کی بالائی منزل میں سڑک کے رخ وسیع برآمدہ تھا۔ اس کے آگے بیٹھنے کے لئے کشتی نما شہ نشین بنائی گئی تھی جس کے دونوں سروں پہ یا تو سنگ مرمر کے مور رقص کرتے ہوئے دکھائے گئے تھے اور یا جل پریوں کے مجسمے تراشے گئے تھے جن کا آدھا دھڑ مچھلی کا اور آدھا انسان کا تھا۔ برآمدے کے پیچھے جو بڑا کمرہ بیٹھنے کے لئے تھا اس میں سنگ مرمر کے نازک نازک ستون بنائے گئے تھے۔ دیواروں پر خوش نما پچی کاری کی گئی تھی۔ فرش سبز چمکدار پتھر کا بنایا گیا تھا۔ جب سنگ مرمر کے ستونوں کے عکس اس فرش زمردیں پر پڑتے تو ایسا معلوم ہوتا گویا سفید براق پروں والے راج ہنسوں نے اپنی لمبی لمبی گردنیں جھیل میں ڈبو دی ہیں۔

بدھ کا شبھ دن اس بستی میں آنے کے لئے مقرر کیا گیا۔ اس روز اس بستی کی سب بیسواؤں نے مل کر بہت بھاری نیاز دلوائی بستی کے کھلے میدان میں زمین کو صاف کرا کے شامیانے نصب کر دئے گئے۔ دیگیں کھڑکنے کی آواز اور گوشت اور گھی کی خوشبو بیس بیس کوس سے فقیروں اور کتوں کو کھینچ لائی۔ دوپہر ہوتے ہوتے پیر کڑک شاہ کے مزار کے پاس جہاں لنگر تقسیم کیا جاتا تھا، اس قدر فقیر جمع ہو گئے کہ عید کے روز کسی بڑے شہر کی جامع مسجد کے پاس بھی نہ ہوتے ہوں گے۔ پیر کڑک شاہ کے مزار کو خوب صاف کروایا اور دھلوایا گیا اور اس پر پھولوں کی چادر چڑھائی گئی اور اس مست فقیر کو نیا جوڑا سلوا کر پہنایا گیا جسے اس نے پہنتے ہی پھاڑ ڈالا۔

شام کو شامیانے کے نیچے دودھ سی اُجلی چاندنی کا فرش کر دیا گیا۔ گاؤ تکئے لگا دئے گئے۔ پاندان، پیک دان، یہ پیچوان اور گلاب پاش رکھ دئے گئے اور راگ رنگ کی محفل سجائی گئی۔ دور دور سے بہت سی بیسواؤں کو بلوایا گیا جو ان کی سہیلیاں یا برادری کی تھیں۔ ان کے ساتھ ان کے بہت سے ملنے والے بھی آئے جن کے لئے ایک الگ شامیانے میں کرسیوں کا انتظام کیا گیا اور ان کے سامنے کے رخ چقیں ڈال دی گئیں۔ بے شمار گیسوں کی روشنی سے یہ جگہ بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ ان بیسواؤں کے تنومند سیاہ فام سازندے زربفت اور کمخواب کی شیروانیاں پہنے عطر میں بسے ہوئے پھوئے کانوں میں رکھے اِدھر اُدھر مونچھوں کو تاؤ دیتے پھرتے اور زرق برق لباسوں اور تتلی کے پر سے بھی باریک ساریوں میں ملبوس، غمزوں اور عشوؤں میں بسی ہوئی نازنینیں اٹھکھیلیوں سے چلتیں، رات بھر رقص و سرود کا ہنگامہ برپا رہا اور جنگل میں منگل ہو گیا۔

دو تین دن کے بعد جب اس جشن کی تھکاوٹ اتر گئی تو یہ بیسوائیں ساز و سامان کی فراہمی اور مکانوں کی آرائش میں مصروف ہوئیں۔ جھاڑ،

فانوس، ظروفِ بلوری، قدِ آدم آئینے، نواڑی پلنگ، تصویریں اور قطعات سنہری چوکھٹوں میں جڑے ہوئے لاۓ گئے اور قرینے سے کمروں میں لگا دیئے گئے اور کوئی آٹھ روز میں جا کر یہ مکان مکمل کانٹے سے لیس ہوئے۔ یہ عورتیں دن کا بیشتر حصہ تو استادوں سے رقص و سرود کی تعلیم لینے، غزلیں یاد کرنے، دھنیں بٹھانے، سبق پڑھنے، تختی لکھنے، سینے پرونے، کاڑھنے، گراموفون سننے، استادوں سے تاش اور کیرم کھیلنے ضلع جگت، نوک جھونک سے جی بہلانے یا سونے میں گنواتیں اور تیسرے پہر غسل خانوں میں نہانے جاتیں جہاں ان کے ملازموں نے دستی پمپوں سے پانی نکال نکال کر ٹب بھر رکھے ہوتے۔ اس کے بعد وہ بناؤ سنگار میں مصروف ہو جاتیں۔

جیسے ہی رات کا اندھیرا پھیلتا یہ مکان گیسوں کی روشنی سے جگمگا اٹھتے جو جا بجا سنگِ مرمر کے آدھے کھلے ہوئے کنولوں میں نہایت صفائی سے چھپا دیئے گئے تھے، اور ان مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں کے کواڑوں کے شیشے جو پھول پتیوں کی وضع کے کاٹ کر جڑے گئے تھے ان کی قوسِ قزح کے رنگوں کی سی روشنیاں دور سے جھلمل جھلمل کرتی ہوئی نہایت بھلی معلوم ہوتیں۔ یہ بیسوائیں بناؤ سنگار کئے برآمدوں میں ٹہلتیں، آس پاس والیوں سے باتیں کرتیں، ہنستیں کھلکھلاتیں ـــــــ جب کھڑے کھڑے تھک جاتیں تو اندر کمرے میں چاندنی کے فرش پر گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتیں۔ ان کے سازندے ساز ملاتے رہتے اور یہ چھالیا کترتی رہتیں۔ جب رات ذرا بھیگ جاتی تو ان کے ملنے والے ڈکروں میں شراب کی بوتلیں اور پھل پھلاری لیے اپنے دوستوں کے ساتھ موٹروں یا تانگوں میں بیٹھ کر آتے۔ اس بستی میں ان کے قدم رکھتے ہی ایک خاص گہما گہمی اور چہل پہل ہونے لگتی۔ نغمہ و سرود، ساز کے سُر، رقص کرتی ہوئی نازنینوں کے گھنگروؤں کی آواز قلقلِ مینا میں مل کر ایک عجیب سرور کی سی کیفیت پیدا کر دیتی۔ عیش و مستی کے ان ہنگاموں میں معلوم بھی نہ ہوتا اور رات بیت جاتی۔

ان بیسواؤں کو اس بستی میں آئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ دکانوں کے کرایہ دار پیدا ہو گئے جن کا کرایہ اس بستی کو آباد کرنے کے خیال سے بہت ہی کم رکھا گیا تھا۔ سب سے پہلے جو دکاندار آیا وہ وہی بڑھیا تھی جس نے سب سے پہلے مسجد کے سامنے درخت کے نیچے خوانچہ لگایا تھا۔ دکان کو پُر کرنے کے لئے بڑھیا اور اس کا لڑکا سگرٹوں کے بہت سے خالی ڈبے اٹھا لائے اور انہیں منبر کے طاقوں میں سجا کر رکھ دیا گیا۔ بوتلوں میں رنگ دار پانی بھر دیا گیا تاکہ معلوم ہو شربت کی بوتلیں ہیں۔ بڑھیا نے اپنی بساط کے مطابق کاغذی پھولوں اور سگرٹ کی خالی ڈبیوں سے بنائی ہوئی بیلوں سے دکان کی کچھ آرائش بھی کی۔ بعض ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تصویریں بھی پرانے فلمی رسالوں سے نکال کر گوند سے دیواروں پر چپکا دیں۔ دکان کا اصل مال دو تین قسم کے سگرٹ کے تین تین چار چار پیکٹوں، بیڑی کے آٹھ دس بنڈلوں، دیا سلائی کی نصف درجن ڈبیوں، پانوں کی ایک ڈھولی، پینے کے تمباکو کی تین چار ٹکیوں اور موم بتی کے نصف بنڈل سے زیادہ نہ تھا۔

دوسری دکان میں ایک بنیا، تیسری میں حلوائی اور شیر فروش، چوتھی میں قصائی، پانچویں میں کبابی اور چھٹی میں ایک کنجڑا آ بسے۔ کنجڑا آس پاس کے دیہات سے سستے داموں چار پانچ قسم کی سبزیاں لے آتا اور یہاں خاصے منافع پر بیچ دیتا۔ ایک آدھ ٹوکرا پھلوں کا بھی رکھ لیتا۔ چونکہ دکان خاصی کھلی تھی، ایک پھول والا اس کا ساجھی بن گیا۔ وہ دن بھر پھولوں کے ہار، گجرے اور طرح طرح کے گہنے بناتا رہتا اور شام کو انہیں چنگیر میں ڈال کر ایک ایک مکان پر لے جاتا اور نہ صرف پھول ہی بیچ آتا بلکہ ہر جگہ ایک ایک دو دو گھڑی بیٹھ کے سازندوں سے گپ شپ بھی ہانکتا اور حقے کے دم بھی لگا آتا۔ جس دن تماش بینوں کی کوئی ٹولی اس کی موجودگی ہی میں کوٹھے پر چڑھ آتی اور گانا بجانا شروع ہو جاتا تو وہ سازندوں کے ناک بھوں چڑھانے کے باوجود گھنٹوں اٹھنے کا نام نہ لیتا، مزے سے گانے پر سر دھنتا اور بیوقوفوں کی طرح ایک ایک کی صورت تکتا۔ جس دن رات زیادہ گزر جاتی اور کوئی ہار بچ رہتا تو اسے اپنے گلے میں ڈال لیتا اور بستی کے باہر گلا پھاڑ پھاڑ کر گاتا پھرتا۔

ایک دکان میں ایک بیسوا کا باپ اور بھائی جو درزیوں کا کام جانتے تھے، سینے کی ایک مشین رکھ کر بیٹھ گئے۔ ہوتے ہوتے ایک حجام بھی آ گیا اور اپنے ساتھ ایک رنگریز کو بھی لیتا آیا۔ اس کی دکان کے باہر الگنی پر لٹکے ہوئے طرح طرح کے رنگوں کے لہریا دوپٹے ہوا میں لہراتے ہوئے

آنکھوں کو بہت بھلے معلوم ہونے لگے۔

چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک ٹٹ پونجیے بساطی نے جس کی دکان شہر میں چلتی نہ تھی، بلکہ اسے دکان کا کرایہ نکالنا بھی مشکل ہو جاتا تھا شہر کو خیرباد کہہ کر اس بستی کا رخ کیا۔ یہاں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کے طرح طرح کے ربن، قسم قسم کے پاؤڈر، صابن، کنگھیاں، بٹن، سوئی، دھاگا، لیس، فیتے، خوشبودار تیل، رومال، منجن وغیرہ کی خوب بکری ہونے لگی۔

اس بستی کے رہنے والوں کی سرپرستی اور ان کے مربیانہ سلوک کی وجہ سے اسی طرح دوسرے تیسرے کوئی نہ کوئی ٹٹ پونجیا دکاندار، کوئی بزاز، کوئی پنساری، کوئی نیچہ بند، کوئی نانبائی مندے کی وجہ سے یا شہر کے بڑھے ہوئے کرایہ سے گھبرا کر اس بستی میں آ پناہ لیتا۔

ایک بڑے میاں عطار جو حکمت میں بھی کسی قدر دخل رکھتے تھے ان کا جی شہر کی گنجان آبادی اور حکیموں اور دواخانوں کی افراط سے جو گھبرایا تو وہ اپنے شاگردوں کو ساتھ لے شہر سے اٹھ آئے اور اس بستی میں ایک دکان کرایہ پر لے لی۔ سارا دن بڑے میاں اور ان کے شاگرد دواؤں کے ڈبوں، شربت کی بوتلوں اور مربے، چٹنی، اچار کے مرتبانوں کو الماریوں اور طاقوں میں اپنے اپنے ٹھکانے پر رکھتے رہے۔ ایک طاق میں طب اکبر، قرابادین قادری اور دوسری طبی کتابیں جما کر رکھ دیں۔ کواڑوں کی اندرونی جانب اور دیواروں میں جو جگہ خالی تھی وہاں انہوں نے اپنے خاص الخاص مجربات کے اشتہار سیاہ روشنائی سے جلی لکھ کر اور دفتیوں پر چپکا کر آویزاں کر دیئے۔ ہر روز صبح کو بیسواؤں کے ملازم گلاس لے لے کر آ موجود ہوتے اور شربت بزوری، شربت بنفشہ، شربت انار اور ایسے ہی اور فرحت بخش، روح افزا شربت و عرق، خمیرہ گاؤزبان اور تقویت پہنچانے والے مربے مع ورق ہائے نقرہ لے جاتے۔

جو دکانیں بچ رہیں ان میں بیسواؤں کے بھائی بندوں اور سازندوں نے اپنی چارپائیاں ڈال دیں۔ دن بھر یہ لوگ ان دکانوں میں تاش، چوسر اور شطرنج کھیلتے، بدن پر تیل ملواتے، سبزی گھوٹتے، بٹیروں کی پالیاں کراتے، تیتروں سے "سبحان تیری قدرت" کی رٹ لگواتے اور گھڑا بجا بجا کر گاتے۔

ایک بیسوا کے سازندے نے ایک دکان خالی دیکھ کر اپنے بھائی کو جو ساز بنانا جانتا تھا اس میں لا بٹھایا۔ دکان کی دیواروں کے ساتھ ساتھ کیلیں ٹھونک کر ٹوٹی پھوٹی مرمت طلب سارنگیاں، ستار، طنبورے، دلربا وغیرہ ٹانگ دیئے گئے۔ یہ شخص ستار بجانے میں بھی کمال رکھتا تھا۔ شام کو وہ اپنی دکان میں ستار بجاتا جس کی میٹھی آواز سن کر آس پاس کے دکاندار اپنی دکانوں سے اٹھ اٹھ کر آ جاتے اور دیر تک بت بنے ستار سنتے رہتے۔ اس ستار نواز کا ایک شاگرد تھا جو ریلوے کے دفتر میں کلرک تھا۔ اسے ستار سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جیسے ہی دفتر سے چھٹی ہوتی سیدھا سائیکل اڑاتا ہوا اس بستی کا رخ کرتا اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دکان ہی میں بیٹھ کر مشق کیا کرتا۔ غرض اس ستار نواز کے دم سے بستی میں خاصی رونق رہنے لگی۔

مسجد کے ملا جی جب تک یہ بستی زیر تعمیر رہی رات کو دیہات میں اپنے گھر چلے جاتے رہے۔ مگر اب جبکہ انہیں دونوں وقت مرغن کھانا بافراط پہنچنے لگا تو وہ رات کو بھی یہیں رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ بعض بیسواؤں کے گھروں سے بچے بھی مسجد میں آنے لگے جس سے ملا جی کو روپے پیسے کی آمدنی بھی ہونے لگی۔

ایک شہر شہر گھومنے والی گھٹیا درجہ کی تھیٹریکل کمپنی کو جب زمین کے چڑھتے ہوئے کرایے اور اپنی بے مائیگی کے باعث شہر میں کہیں جگہ نہ ملی تو اس نے اسی بستی کا رخ کیا اور ان بیسواؤں کے مکانوں سے کچھ فاصلہ پر میدان میں تنبو کھڑے کر کے ڈیرے ڈال دئے۔ اس کے ایکٹر اداکاری کے فن سے محض نابلد تھے۔ ان کے ڈریس پھٹے پرانے تھے جن کے بہت سے ستارے جھڑ چکے تھے اور یہ لوگ تماشے بھی بہت پرانے اور دقیانوسی دکھاتے تھے مگر اس کے باوجود یہ کمپنی چل نکلی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹکٹ کے دام بہت کم تھے۔ شہر کے مزدور پیشہ لوگ

کارخانوں میں کام کرنے والے اور غریب غربا جو دن بھر کی کڑی محنت و مشقت کی کسر شور و غل، فقرے بازیوں اور ادنیٰ عیاشیوں سے نکالنا چاہتے تھے پانچ پانچ چھ چھ کی ٹولیاں بنا کر، گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے، ہنستے بولتے، بانسریاں اور الغوزے بجاتے، راہ چلتوں پر آوازے کسے، ہڑبونگ کرتے، شہر سے پیدل چل کر تھیٹر دیکھنے آتے اور لگے ہاتھوں بازارِ حسن کی سیر بھی کر جاتے۔ جب تک ناچ شروع نہ ہوتا تھا ایک مسخرہ تنبو کے باہر ایک اسٹول پر کھڑا کبھی کولہے ہلاتا، کبھی منہ پھیلاتا، کبھی آنکھیں مٹکاتا، عجیب عجیب حیا سوز حرکتیں کرتا جنہیں دیکھ کر یہ لوگ زور زور سے قہقہے لگاتے اور گالیوں کی صورت میں داد دیتے۔

رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی اس بستی میں آنے شروع ہوئے۔ چنانچہ شہر کے بڑے بڑے چوکوں میں تانگے والے صدائیں لگانے لگے "آؤ کوئی نئی بستی کو"۔ شہر سے پانچ کوس تک جو پکی سڑک جاتی تھی اس پر پہنچ کر تانگے والے سواریوں سے انعام حاصل کرنے کے لالچ میں یا ان کی فرمائش پر تانگوں کی دوڑیں کراتے، منہ سے ہارن بجاتے اور جب کوئی تانگہ آگے نکل جاتا تو اس کی سواریاں نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیتیں۔ اس دوڑ میں غریب گھوڑوں کا برا حال ہو جاتا اور ان کے گلے میں پڑے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے بجائے خوشبو کے پسینے کی بدبو آنے لگتی۔

رکشا والے تانگے والوں سے کیوں پیچھے رہتے۔ وہ ان سے کم داموں پر سواریاں بٹھا، طرارے بھرتے اور گھنگھرو بجاتے اس بستی کو جانے لگے۔ علاوہ ازیں ہر ہفتے کی شام کو اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ ایک ایک سائیکل پر دو دو لدے، جوق در جوق اس پُراسرار بازار کی سیر کو آتے جس سے ان کے خیال کے مطابق ان کے بڑوں نے خواہ مخواہ انہیں محروم کر دیا تھا۔

رفتہ رفتہ اس بستی کی شہرت چاروں طرف پھیلنے اور مکانوں اور دکانوں کی مانگ ہونے لگی۔ وہ بیسوائیں جو پہلے اس بستی میں آنے پر تیار نہ ہوتی تھیں، اب اس کی دن دونی رات چوگنی ترقی دیکھ کر اپنی بیوقوفی پر افسوس کرنے لگیں۔ کئی عورتوں نے تو جھٹ زمین خرید کر ان بیسواؤں کے ساتھ ساتھ اسی وضع قطع کے مکان بنوانے شروع کر دیئے۔ علاوہ ازیں شہر کے بعض مہاجنوں نے بھی اس بستی کے آس پاس سستے داموں زمینیں خرید خرید کر کرایہ پر اٹھانے کے لئے چھوٹے چھوٹے کئی مکان بنوا ڈالے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فاحشہ عورتیں جو ہوٹلوں اور شریف محلوں میں روپوش تھیں مور و ملخ کی طرح اپنے نہاں خانوں سے باہر نکل آئیں اور ان مکانوں میں آباد ہو گئیں۔ بعض چھوٹے چھوٹے مکانوں میں اس بستی کے وہ دکاندار آ بسے جو عیال دار تھے اور رات کو دکانوں میں سو نہ سکتے تھے۔

اس بستی میں آبادی تو خاصی ہو گئی تھی مگر ابھی تک بجلی کی روشنی کا انتظام نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ ان بیسواؤں اور بستی کے تمام رہنے والوں کی طرف سے سرکار کے پاس بجلی کے لئے درخواست بھیجی گئی جو تھوڑے دنوں بعد منظور کر لی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ڈاک خانہ بھی کھول دیا گیا۔ ایک بڑے میاں ڈاک خانے کے باہر ایک صندوقچے میں لفافے، کارڈ اور قلم دوات رکھے، بستی کے لوگوں کے خط پتر لکھنے لگے۔

ایک دفعہ بستی میں شرابیوں کی دو ٹولیوں میں فساد ہو گیا جس میں سوڈا واٹر کی بوتلوں، چاقوؤں اور اینٹوں کا آزادانہ استعمال کیا گیا اور کئی لوگ سخت مجروح ہوئے۔ اس پر سرکار کو خیال آیا کہ اس بستی میں ایک تھانہ بھی کھول دینا چاہئے۔

تھیٹریکل کمپنی دو مہینے تک رہی اور اپنی بساط کے مطابق خاصا کما لے گئی۔ اس پر شہر کے ایک سینما کے مالک نے سوچا کہ کیوں نہ اس بستی میں بھی ایک سینما کھول دیا جائے۔ یہ خیال آنے کی دیر تھی کہ اس نے جھٹ ایک موقع کی جگہ چن کر خریدی اور جلد جلد تعمیر کا کام شروع کرا دیا۔ چند ہی مہینوں میں سینما ہال تیار ہو گیا۔ اس کے باہر ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی لگوایا گیا تاکہ تماشائی اگر تماشہ شروع ہونے سے پہلے آ جائیں تو آرام سے اس میں بیٹھ سکیں۔ ان کے ساتھ بستی کے لوگ یوں ہی سستانے یا سیر دیکھنے کی غرض سے آ آ کر بیٹھنے لگے۔ یہ باغیچہ خاصی سیرگاہ بن گیا۔ رفتہ رفتہ سقے کٹورا بجاتے اس باغیچے میں آنے اور لوگوں کی پیاس بجھانے لگے۔ سر کی تیل مالش والے نہایت گھٹیا قسم کے تیز خوشبو والے تیل کی شیشیاں واسکٹ کی جیبوں میں ٹھونسے، کاندھے پر میلا کچیلا تولیہ ڈالے "دل پسند، دل بہار مالش" کی صدا لگاتے، دردِ سر کے مریضوں کو اپنی خدمات پیش کرنے لگے۔

سینما کے مالک نے سینما ہال کی عمارت کی بیرونی جانب دو ایک مکان اور کئی دکانیں بھی بنوائیں۔ مکان میں تو ہوٹل کھل گیا جس میں رات کو قیام کرنے کے لیے کمرے بھی مل سکتے تھے اور دکانوں میں ایک سوڈا واٹر کی فیکٹری والا، ایک فوٹوگرافر، ایک سائیکل کی مرمت والا، ایک لانڈری والا، دو پنواڑی، ایک بوٹ شاپ والا اور ایک ڈاکٹر مع اپنے دواخانہ کے آ رہے۔ ہوتے ہوتے پاس ہی ایک دکان میں کلال خانہ کھلنے کی اجازت مل گئی۔ فوٹوگرافر کی دکان کے باہر ایک کونے میں ایک گھڑی ساز نے آ ڈیرا جمایا اور ہر وقت محدب شیشہ آنکھ پر چڑھائے گھڑیوں کے کل پرزوں میں منہمک و پیچاں رہنے لگا۔

اس کے کچھ ہی دن بعد بستی میں نل، روشنی اور صفائی کے باقاعدہ انتظام کی طرف توجہ کی جانے لگی۔ سرکاری کارندے سرخ جھنڈیاں، جریبیں اور اونچ نیچ دیکھنے والے آلے لے کر آ پہنچے اور ناپ ناپ کر سڑکوں اور گلی کوچوں کی داغ بیل ڈالنے لگے اور بستی کی کچی سڑکوں پر سڑک کوٹنے والا انجن چلنے لگا۔

اس واقعہ کو بیس برس گزر چکے ہیں۔ یہ بستی اب ایک بھرا پرا شہر بن گئی ہے جس کا اپنا ریلوے اسٹیشن بھی ہے اور ٹاؤن ہال بھی، کچہری بھی اور جیل خانہ بھی۔ آبادی ڈھائی لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ شہر میں ایک کالج، دو ہائی اسکول، ایک لڑکوں کے لیے، ایک لڑکیوں کے لیے اور آٹھ پرائمری اسکول ہیں جن میں میونسپلٹی کی طرف سے مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ چھ سینما ہیں اور چار بنک جن میں سے دو دنیا کے بڑے بڑے بنکوں کی شاخیں ہیں۔ شہر سے دو روزانہ، تین ہفتہ وار اور دس ماہانہ رسائل و جرائد شائع ہوتے ہیں۔ ان میں چار ادبی، دو اخلاقی و معاشرتی و مذہبی، ایک صنعتی، ایک طبی، ایک زنانہ اور ایک بچوں کا رسالہ ہے۔ شہر کے مختلف حصوں میں بیس مسجدیں، پندرہ مندر اور دھرم سالے، چھ یتیم خانے، پانچ اناتھ آشرم اور تین بڑے سرکاری ہسپتال ہیں جن میں ایک صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہے۔

شروع شروع میں کئی سال تک یہ شہر اپنے رہنے والوں کی مناسبت سے "حسن آباد" کے نام سے موسوم کیا جاتا رہا۔ مگر بعد میں اسے نامناسب سمجھ کر اس میں تھوڑی سی ترمیم کر دی گئی۔ یعنی بجائے "حسن آباد" کے "محسن آباد" کہلانے لگا۔ مگر یہ نام چل نہ سکا کیونکہ عوام حسن اور محسن میں کچھ امتیاز نہ کرتے تھے۔ آخر بڑی بڑی بوسیدہ کتابوں کی ورق گردانی اور پرانے نوشتوں کی چھان بین کے بعد اس کا اصلی نام دریافت کیا گیا جس سے یہ بستی آج سے سینکڑوں برس قبل اجڑنے سے پہلے موسوم تھی۔ اور وہ نام ہے "آنندی!"

یوں تو سارا شہر بھرا پرا، صاف ستھرا اور خوش نما ہے۔ مگر سب سے خوبصورت، سب سے بارونق اور تجارت کا سب سے بڑا مرکز وہی بازار ہے جس میں زنانِ بازاری رہتی ہیں۔

آنندی کے بلدیہ کا اجلاس زوروں پر ہے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے اور خلافِ معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہیں۔ بلدیہ کے زیرِ بحث مسئلہ یہ ہے کہ زنانِ بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے کیونکہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

ایک فصیح البیان مقرر تقریر کر رہے ہیں۔ "یہ معلوم نہیں وہ کیا مصلحت تھی جس کے زیرِ اثر اس ناپاک طبقے کو ہمارے اس قدیمی اور تاریخی شہر کے عین بیچوں بیچ رہنے کی اجازت دے دی گئی ......"

اس مرتبہ ان عورتوں کے رہنے کے لیے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے بارہ کوس دور تھا۔

احمد ندیم قاسمی

پرمیشر سنگھ

اختر اپنی ماں سے یوں اچانک بچھڑ گیا جیسے بھاگتے ہوئے کسی کی جیب سے روپیہ گر پڑے۔ ابھی تھا اور ابھی غائب۔ ڈھنڈیا مچی مگر بس اس حد تک کہ لٹے پٹے قافلے کے آخری سرے پر ایک ہنگامہ صابن کے جھاگ کی طرح اٹھا اور بیٹھ گیا۔ "کہیں آ ہی رہا ہوگا" کسی نے کہہ دیا "یہ ہزاروں کا تو قافلہ ہے۔" اور اختر کی ماں اس تسلی کی لاٹھی تھامے پاکستان کی طرف چلی آئی تھی۔ "آ ہی رہا ہوگا۔" وہ سوچتی۔ "کوئی تتلی پکڑنے نکل گیا ہوگا اور پھر ماں کو نہ پا کر رویا ہوگا اور پھر ——— پھر اب کہیں آ ہی رہا ہوگا۔ سمجھدار ہے، پانچ سال سے تو کچھ اوپر ہی چلا ہے۔ آ جائے گا۔ وہاں پاکستان میں ذرا ٹھکانے سے بیٹھوں گی تو ڈھونڈ لوں گی ———"

لیکن اختر تو سرحد سے کوئی پندرہ میل ادھر یونہی بس کسی وجہ کے بغیر اتنے بڑے قافلے سے کٹ گیا تھا۔ اپنی ماں کے خیال کے مطابق اس نے تتلی کا تعاقب کیا یا کسی کھیت میں سے گنا توڑنے گیا اور توڑتا رہ گیا۔ بہرحال جب وہ روتا چلاتا ایک طرف بھاگا جا رہا تھا تو چند سکھوں نے اسے گھیر لیا تھا اور اختر نے طیش میں آ کر کہا تھا: "میں نعرۂ تکبیر مار دوں گا ———" اور یہ کہہ کر سہم گیا تھا۔

سب سکھ بے اختیار ہنس پڑے تھے، سوائے ایک سکھ کے جس کا نام پرمیشر سنگھ تھا۔ ڈھیلی ڈھالی پگڑی میں سے اس کے الجھے ہوئے کیس جھانک رہے تھے اور جوڑا تو بالکل ننگا تھا۔ وہ بولا: "ہنسو نہیں یارو۔ اس بچے کو بھی تو اسی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے جس نے تمہیں اور تمہارے بچوں کو پیدا کیا۔"

ایک نوجوان سکھ جس نے اب تک کرپان نکال لی تھی، بولا: "ذرا ٹھہر پرمیشرے! کرپان اپنا دھرم پورا کر لے، پھر ہم اپنے دھرم کی بات کریں گے۔"

"مارو نہیں یارو۔" پرمیشر سنگھ کی آواز میں پکار تھی۔ "اسے مارو نہیں، اتنا ذرا سا تو ہے، اور اسے بھی تو اسی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے جس نے ———"

"پوچھ لیتے ہیں اسی سے۔" ایک اور سکھ بولا۔ پھر اس نے سہمے ہوئے اختر کے پاس جا کر کہا: "بولو، تمہیں کس نے پیدا کیا ——— ؟ خدا نے کہ واہگورو جی نے؟"

اختر نے اس ساری خوشبو کو نگلنے کی کوشش کی جو اس کی زبان کی نوک سے لے کر اس کی ناف تک پھیل چکی تھی۔ آنکھیں جھپک کر اس نے ان آنسوؤں کو گرا دینا چاہا جو ریت کی طرح اس کے پپوٹوں میں کھٹک رہے تھے۔ اس نے پرمیشر سنگھ کو یوں دیکھا جیسے ماں کو دیکھ رہا ہے۔ پھر ہونٹ بھینچ لیے، تھوک نگلا اور بولا "پتہ نہیں!"

"الو او، مُنّو!" کسی نے کہا اور اختر کو گالی دے کر ہنسنے لگا۔

اختر نے ابھی اپنی بات پوری نہیں کی تھی۔ بولا "اماں تو کہتی ہے میں بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا۔"

سب سکھ ہنسنے لگے۔ مگر پرمیشر سنگھ بچوں کی طرح بلبلا کر کچھ یوں رویا کہ دوسرے سکھ بھونچکا سے رہ گئے، اور پرمیشر سنگھ رونی آواز میں جیسے بین کرنے لگا۔ "یہ سب بچے ایک سے ہوتے ہیں یارو۔ میرا کرتارا بھی تو یہی کہتا تھا۔ وہ بھی تو اس کی ماں کو بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا۔"

کرپان میان میں چلی گئی۔ سکھوں نے پرمیشر سنگھ سے الگ تھوڑی دیر کھسر پھسر کی۔ پھر ایک سکھ آگے بڑھا۔ بلکتے ہوئے اختر کو بازو سے پکڑ کر وہ چپ چاپ روتے ہوئے پرمیشر سنگھ کے پاس آیا اور بولا۔ "لے پرمیشرے، سنبھال اسے۔ کیس بڑھا کر اسے اپنا کرتارا بنا لے، لے پکڑ۔"

پرمیشر سنگھ نے اختر کو یوں جھپٹ کر اٹھا لیا کہ اس کی پگڑی کھل گئی اور کیسوں کی لٹیں لٹکنے لگیں۔ اس نے اختر کو پاگلوں کی طرح چوما۔ اسے اپنے سینے سے بھینچا اور پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور مسکا مسکا کر کچھ ایسی باتیں سوچنے لگا جنہوں نے اس کے چہرے کو چمکا دیا۔ پھر اس نے پلٹ کر دوسرے سکھوں کی طرف دیکھا۔ اچانک وہ اختر کو نیچے اتار کر سکھوں کی طرف لپکا۔ مگر ان کے پاس سے گزر کر دور تک بھاگا چلا گیا۔ جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں بندروں کی طرح کودتا اور جھپٹتا رہا اور اس کے کیس اس کی اس ایک جھپٹ کا ساتھ دیتے رہے۔ دوسرے سکھ حیران کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ پھر وہ آیا، ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھے بھاگا ہوا واپس آیا۔ اس کی بھیگی ہوئی داڑھی میں الجھے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور سرخ آنکھوں میں چمک تھی اور وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔

اختر کے پاس آ کر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور بولا "نام کیا ہے تمہارا؟"

"اختر!" اب کے اختر کی آواز بھرائی ہوئی نہیں تھی۔

"اختر بیٹے!" پرمیشر سنگھ نے بڑے پیار سے کہا "ذرا میری انگلیوں میں سے جھانکو تو۔"

اختر ذرا سا جھک گیا۔ پرمیشر سنگھ نے دونوں ہاتھوں میں ذرا سی جھری پیدا کی اور فوراً بند کر لی "یہ آیا!" اختر نے تالی بجا کر اپنے ہاتھوں کو پرمیشر سنگھ کے ہاتھوں کی طرح بند کر لیا اور آنسوؤں میں مسکرا کر بولا "یہ تتلی!"

"لو گے؟" پرمیشر سنگھ نے پوچھا۔

"ہاں!" اختر نے اپنے ہاتھوں کو ملا۔

"تو یہ" پرمیشر سنگھ نے اپنے ہاتھوں کو کھولا۔ اختر نے تتلی کو پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ راستہ پاتے ہی اڑ گئی اور اختر کی انگلیوں کی پوروں پر اپنے پروں کے رنگوں کے ذرے چھوڑ گئی۔ اختر اداس ہو گیا اور پرمیشر سنگھ دوسرے سکھوں کی طرف دیکھ کر بولا "سب بچے ایک سے کیوں ہوتے ہیں یارو؟ کرتارے کی تتلی بھی اڑ جاتی تھی تو وہ یونہی منہ لٹکا لیتا تھا۔"

"پرمیشر سنگھ تو آدھا پاگل ہو گیا ہے۔" نوجوان سکھ نے ناگواری سے کہا اور پھر سارا گروہ واپس جانے لگا۔

پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر بٹھا لیا اور جب اسی طرف چلنے لگا جدھر دوسرے سکھ گئے تھے تو اختر پھڑک پھڑک کر رونے لگا۔ "ہم اماں پاس جائیں گے۔ اماں پاس جائیں گے۔" پرمیشر سنگھ نے ہاتھ اٹھا کر اسے تھپکنے کی کوشش کی مگر اختر نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ پھر جب پرمیشر سنگھ نے یہ کہا کہ "ہاں بیٹے، تمہیں تمہاری اماں پاس ہی لیے چلتا ہوں" تو اختر چپ ہو گیا۔ صرف کبھی کبھی سسک لیتا تھا اور پرمیشر سنگھ کی تھپکیوں کو بڑی ناگواری سے

برداشت کرتا جا رہا تھا۔

پرمیشر سنگھ اسے اپنے گھر میں لے آیا۔ پہلے یہ کسی مسلمان کا گھر تھا۔ لٹا پٹا پرمیشر سنگھ جب ضلع لاہور سے ضلع امرتسر میں آیا تھا تو گاؤں والوں نے یہ مکان الاٹ کر دیا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بیٹی سمیت جب اس چاردیواری میں داخل ہوا تھا تو ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں پتھرا سی گئی تھیں اور وہ بڑی پُراسرار سرگوشی میں بولا تھا "یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔"

گرنتھی جی اور گاؤں کے دوسرے لوگ ہنس پڑے تھے۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی نے انہیں پہلے سے بتا دیا تھا کہ کرتار سنگھ کے بچھڑتے ہی اسے کچھ ہو گیا ہے۔ "جانے کیا ہو گیا ہے اسے!" اس نے کہا تھا۔ "واہگورو جی جھوٹ نہ بلوائیں تو وہاں دلی میں کوئی دس بار تو یہ کرتار سنگھ کو گدھوں کی طرح پیٹ ڈالتا تھا اور جب کرتار سنگھ سے بچھڑا ہے تو میں تو خیر رو دھو لی پر اس کا رونے سے بھی جی ہلکا نہیں ہوا۔ وہاں مجال ہے جو بیٹی امر کور کو میں بھی ذرا غصے سے دیکھ لیتی۔ بیچ ہی آ جاتا تھا، کہتا تھا 'بیٹی کو برا مت کہو۔ بیٹی بڑی مسکین ہوتی ہے۔ یہ تو ایک مسافر ہے بےچاری، ہمارے گھروندے میں سستانے بیٹھ گئی ہے۔ وقت آئے گا تو چلی جائے گی'۔۔۔ اور اب امر کور سے ذرا سا بھی کوئی قصور ہو جائے تو آپے ہی میں نہیں رہتا۔ یہ تک بک دیتا ہے کہ بیٹیاں بیویاں اغوا ہوتی سنی تھیں یارو۔ پر نہیں سنا تھا کہ پانچ چھ برس کے بیٹے بھی اٹھ جاتے ہیں۔"

وہ ایک مہینے سے اس گھر میں مقیم تھا۔ مگر ہر رات اس کا معمول تھا کہ پہلے سوتے میں بے تحاشا کروٹیں بدلتا۔ پھر بڑبڑانے لگتا اور پھر ایک دم اٹھ بیٹھتا اور بڑی ڈری ہوئی سرگوشی میں بیوی سے کہتا "سنتی ہو؟ یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے!" ـــــ بیوی اسے محض "اونہہ!" سے ٹال کر سو جاتی تھی۔ مگر امر کور کو اس سرگوشی کے بعد رات بھر نیند نہ آتی۔ اسے اندھیرے میں بہت سی پرچھائیاں ہر طرف بیٹھی قرآن پڑھتی نظر آتیں اور جب ذرا سی پو پھٹتی تو وہ کانوں میں انگلیاں دے لیتی تھی۔ وہاں ضلع لاہور میں ان کا گھر مسجد کے پڑوس ہی میں تھا اور جب صبح اذان ہوتی تھی تو کیسا مزا آتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے پورب سے پھوٹتا ہوا اجالا گانے لگا ہے۔ پھر جب اس کی پڑوسن پریتم کور کو چند نوجوانوں نے خراب کر کے جیتے جی مرے کی طرح گھورے پر پھینک دیا تھا تو جانے کیا ہوا کہ مؤذن کی آواز میں بھی اسے پریتم کور کی چیخ سنائی دے جاتی تھی، اذان کا تصور تک اسے خوفزدہ کر دیتا تھا اور وہ یہ بھول جاتی تھی کہ اب ان کے پڑوس میں مسجد نہیں ہے۔ یونہی کانوں میں انگلیاں دیے ہوئے وہ سو جاتی اور رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے دن چڑھے تک سوئی رہتی۔ اور پرمیشر سنگھ اس بات پر بگڑ جاتا "ٹھیک ہے، سوئے نہیں تو اور کیا کرے۔ نکمی تو ہوتی ہی ہیں یہ چھوکریاں۔ لڑکا ہوتا تو اب تک جانے کتنے کام کر چکا ہوتا یارو!"

پرمیشر سنگھ آنگن میں داخل ہوا تو آج خلافِ معمول اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس کے کھلے کیس کنگھے سمیت اس کی پیٹھ اور ایک کندھے پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کا ایک ہاتھ اختر کی کمر کو تھپکے جا رہا تھا۔ اس کی بیوی ایک طرف بیٹھی چھاج میں گندم پھٹک رہی تھی۔ اس کے ہاتھ جہاں تھے وہیں رک گئے اور وہ ٹکر ٹکر پرمیشر سنگھ کو دیکھنے لگی۔ پھر وہ چھاج پرے کرتی ہوئی آئی اور بولی: "یہ کون ہے؟"

پرمیشر سنگھ بدستور مسکراتے ہوئے بولا "ڈرو نہیں بے وقوف۔ اس کی عادتیں بالکل کرتارے کی سی ہیں۔ یہ بھی اپنی ماں کو بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا۔ یہ بھی تتلیوں کا عاشق ہے، اس کا نام اختر ہے ـــ"

"اختر!" بیوی کے تیور بدل گئے۔

"تم اسے اختر سنگھ کہہ لینا۔" پرمیشر سنگھ نے وضاحت کی۔ "اور پھر کیسوں کا کیا ہے، دنوں میں بڑھ آتے ہیں۔ کڑا اور کچھیرا پہنا دو۔ پھر کیسوں کے بڑھتے ہی لگ جائے گا۔"

"پر یہ ہے کس کا؟" بیوی نے مزید وضاحت چاہی۔

"کس کا ہے!" پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر سے اتار کر اسے زمین پر کھڑا کر دیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ "واہگورو جی کا ہے، ہمارا اپنا۔"

اور پھر یار و۔ یہ عورت اتنا بھی نہیں دیکھ سکتی کہ اختر کے ماتھے پر جو یہ ذرا سا تِل ہے، یہ کرتارے ہی کا تِل ہے۔ کرتارے کے بھی تو ایک تِل تھا اور یہیں تھا، ذرا بڑا تھا پر ہم اسے یہیں تِل پر ہی تو چومتے تھے اور یہ اختر کے کانوں کی لویں گلاب کے پھولوں کی طرح گلابی ہیں نہ یار و۔ یہ عورت یہ تک نہیں سوچتی کہ کرتارے کے کانوں کی لویں بھی تو ایسی ہی تھیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ذرا موٹی تھیں۔ یہ ذرا پتلی ہیں اور ــــــ؟

اختر اب تک مارے حیرت کے ضبط کئے بیٹھا تھا۔ بلبلا اٹھا "ہم یہاں نہیں رہیں گے ہم اماں پاس جائیں گے، اماں پاس۔"

پرمیشر سنگھ نے اختر کا ہاتھ پکڑ کر اسے بیوی کی طرف بڑھایا: "اری لے یہ اماں پاس جانا چاہتا ہے۔"

"تو جائے۔" بیوی کی آنکھوں میں اور چہرے پر وہی آسیب آ گیا تھا جسے کرتار سنگھ اپنی آنکھوں اور چہرے میں سے نوچ کر باہر کھیتوں میں جھٹک آیا تھا۔ "ڈاکہ ڈالنے گیا تھا سورما، اور اٹھا لایا یہ! ہتھ بھر کا ونڈا۔ ارے کوئی لڑکی ہی اٹھا لاتا تو ہزار نہ سہی ایک دو سو میں تو بک جاتی۔ اس اجڑے گھر کا کھاٹ کھٹولا بن جاتا۔ اور پھر ــــ پچھے ـــ تجھے تو کچھ ہو گیا ہے۔ دیکھتے نہیں یہ لڑکا مسلا ہے! جہاں سے اٹھا لائے ہو وہیں ڈال آؤ اور خبردار جو اس نے میرے چوکے میں پاؤں رکھا۔"

پرمیشر سنگھ نے التجا کی "یہ کرتارے اور اختر کو ایک ہی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے، سمجھیں؟"

"نہیں۔" اب کے بیوی چیخ اٹھی "میں نہیں سمجھی، نہ کچھ سمجھنا چاہتی ہوں۔ میں رات ہی رات جھٹکا کر ڈالوں گی اس کا۔ کاٹ کے پھینک دوں گی۔ اٹھا لایا ہے وہاں سے۔ لے جا اسے! پھینک دے باہر!"

"تمہیں نہ پھینک دوں باہر؟" اب کے پرمیشر سنگھ بگڑ گیا۔ "تمہارا نہ کر ڈالوں جھٹکا؟" وہ بیوی کی طرف بڑھا اور بیوی اپنے سینے کو دو ہتڑوں سے پیٹتی، چیختی، چلاتی بھاگی۔ پڑوس سے امر کور دوڑی آئی۔ اس کے پیچھے گلی کی دوسری عورتیں بھی آ گئیں۔ مرد بھی جمع ہو گئے اور پرمیشر سنگھ کی بیوی پٹنے سے بچ گئی۔ پھر سب نے اسے سمجھایا کہ نیک کام ہے۔ ایک مسلمان کو سکھ بنانا کوئی معمولی کام تو نہیں۔ پرانا زمانہ ہوتا تو اب تک پرمیشر سنگھ گورو مشہور ہو چکا ہوتا۔ بیوی کی ڈھارس بندھی مگر امر کور ایک کونے میں میٹھی گھٹنوں میں سر دیئے روتی رہی۔ اچانک پرمیشر سنگھ کی گرج نے سارے ہجوم کو ہلا دیا "اختر کدھر گیا؟" وہ چنگھاڑا "ارے وہ کدھر گیا ہمارا اختر۔ ارے وہ تم ہی میں سے کسی قصائی کے ہتھے تو نہیں چڑھ گیا یار و۔ اختر! اختر!"

وہ چیختا ہوا مکان کے کونوں کھدروں میں جھانکتا ہوا باہر بھاگ گیا۔ بچے مارے دلچسپی کے اس کے تعاقب میں لپکے۔ عورتیں چھتوں پر چڑھ گئی تھیں اور پرمیشر سنگھ گلیوں میں سے باہر کھیتوں میں نکل گیا تھا۔ "ارے میں تو اسے اماں پاس لے چلتا یار و۔ ارے وہ گیا کہاں۔ اختر! ارے اختر!"

"میں تمہارے پاس نہیں آؤں گا۔" پگڈنڈی کے ایک موڑ پر گیان سنگھ کے گنے کے کھیت کی آڑ سے روتے ہوئے اختر نے پرمیشر سنگھ کو ڈانٹ دیا۔ "تم تو سکھ ہو۔"

"ہاں بیٹے۔ سکھ تو ہوں۔" پرمیشر سنگھ نے جیسے مجبور ہو کر اعترافِ جرم کر لیا۔

"تو پھر ہم نہیں آئیں گے۔" اختر نے پرانے آنسوؤں کو پونچھ کر، نئے آنسوؤں کے لئے راستہ صاف کیا۔

"نہیں آؤ گے؟" پرمیشر سنگھ کا لہجہ اچانک بدل گیا۔

"نہیں!"

"نہیں آؤ گے؟"

"نہیں۔ نہیں۔ نہیں!"

"کیسے نہیں آؤ گے؟" پرمیشر سنگھ نے اختر کو کان سے پکڑا اور پھر نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر اس کے منہ پر چٹاخ سے ایک تھپڑ مار دیا۔

"چلو!" وہ کڑکا۔

اختر یوں سہم گیا جیسے ایک دم اس کا سارا خون نچڑ کر رہ گیا ہے، پھر ایکا ایکی وہ زمین پر گر کر پاؤں پٹخنے اور خاک ... اڑانے اور بلک بلک کر رونے لگا۔ "یہ نہیں چلتا۔ بس نہیں چلتا۔ تم سکھ ہو۔ میں سکھوں کے پاس نہیں جاؤں گا۔ میں اپنی اماں پاس جاؤں گا۔ میں تمہیں مار دوں گا۔"

اور جیسے اب پرمیشر سنگھ کے سہمنے کی باری تھی۔ اس کا بھی سارا خون جیسے نچڑ کر رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ کو دانتوں میں جکڑ لیا۔ اس کے نتھنے پھڑکنے لگے اور پھر اس زور سے رو دیا کہ کھیت کی پرلی مینڈ پر آتے ہوئے چند پڑوسی اور ان کے بچے بھی سہم کر رہ گئے اور رکنا ... گئے۔ پرمیشر سنگھ گھٹنوں کے بل اختر کے سامنے بیٹھ گیا۔ بچوں کی طرح یوں سسک سسک کر رونے لگا کہ اس کا نچلا ہونٹ بھی بچوں کی طرح لٹک آیا اور پھر بچوں کی سی رونی آواز میں بولا "مجھے معاف کر دے اختر۔ مجھے تمہارے خدا کی قسم، میں تمہارا دوست ہوں۔ تم اکیلے یہاں سے جاؤ گے تو تمہیں کوئی مار دے گا پھر تمہاری ماں پاکستان سے آ کر مجھے مارے گی۔ میں خود جا کر تمہیں پاکستان چھوڑ آؤں گا۔ سُنا؟ سن رہے ہو نا؟ پھر وہاں سے اگر تمہیں ایک لڑکا مل جائے نا، کرتارا نام کا، تو تم اسے ادھر اس گاؤں میں چھوڑ جانا، اچھا؟"

"اچھا!" اختر نے الٹے ہاتھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے پرمیشر سنگھ سے سودا کر لیا۔

پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر بٹھا لیا اور چلا، مگر ایک ہی قدم اٹھا کر رک گیا۔ سامنے بہت سے بچے اور چند پڑوسی کھڑے اس کی تمام حرکات دیکھ رہے تھے۔ ادھیڑ عمر کا ایک پڑوسی بولا "یہ روتے کیوں ہو پرمیشرے، کل ایک مہینے کی تو بات ہے۔ ایک مہینے میں اس کے کیس بڑھ آئیں گے تو بالکل کرتارا لگے گا۔"

کچھ کہے بغیر وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ پھر ایک جگہ رک کر اس نے پلٹ کر اپنے پیچھے آنے والے پڑوسیوں کی طرف دیکھا "تم کتنے ظالم لوگ ہو یارو۔ اختر کو کرتارا بناتے ہو۔ اور اگر اُدھر کوئی کرتارے کو اختر بنا لے تو؟ اسے ظالم ہی کہو گے نا؟" پھر اس کی آواز میں گرج آ گئی۔ "یہ بچہ کا مسلمان بنا رہے گا۔ دربار صاحب کی سوں۔ میں کل ہی امرتسر جا کر اس کے انگریزی بال بنوا لاؤں گا۔ تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔ خالصہ ہوں، سینے میں شیر کا دل ہے، مرغی کا نہیں۔"

پرمیشر سنگھ اپنے گھر میں داخل ہو کر ابھی اپنی بیوی اور بیٹی کو اختر کی مدارات کے سلسلے میں احکام ہی دے رہا تھا کہ گاؤں کا گرنتھی سردار سنتوکھ سنگھ اندر آیا اور بولا "پرمیشر سنگھو!"

"جی!" پرمیشر سنگھ نے پلٹ کر دیکھا۔ گرنتھی جی کے پیچھے اس کے سب پڑوسی بھی تھے۔

"دیکھو!" گرنتھی جی نے بڑے دبدبے سے کہا۔ "کل سے یہ لڑکا خالصے کی سی پگڑی باندھے گا، کڑا پہنے گا، دھرم شالہ آئے گا اور اسے پرشاد کھلایا جائے گا۔ اس کے کیسوں کو قینچی نہیں چھوئے گی۔ چھوئی تو کل ہی سے یہ گھر خالی کر دو۔ سمجھے؟"

"جی!" پرمیشر سنگھ نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں!" گرنتھی جی نے آخری ضرب لگائی۔

"ایسا ہی ہو گا گرنتھی جی!" پرمیشر سنگھ کی بیوی بولی "پہلے ہی اسے راتوں کو گھر کے کونے کونے سے کوئی چیز قرآن پڑھتی سنائی دیتی ہے۔ لگتا ہے پہلے جنم میں یہ مسلمان رہ چکا ہے۔ امر کور بیٹی نے تو جب سے یہ سُنا ہے کہ ہمارے گھر میں مُسلا چھوکرا آیا ہے تو بیٹھی رو رہی ہے، کہتی ہے گھر پر کوئی آفت آئے گی۔ پرمیشرے نے آپ کا کہنا نہ مانا تو میں بھی دھرم شالہ میں اپنی آؤں گی اور امر کور بھی۔ پھر یہ پڑا اس چھوکرے کو چاٹے۔ موا نکما۔ واہگورو جی کا بھی لحاظ نہیں۔"

"واہگورو جی کا کون لحاظ نہیں کرتا گدھی!" پرمیشر سنگھ نے گرنتھی جی کی بات کا غصہ بیوی پر نکالا۔ پھر وہ دیر تک زیر لب گالیاں دیتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد وہ اٹھ کر گرنتھی جی کے سامنے آ گیا ــــــ "اچھا جی! اچھا!" اس نے کہا، اور کچھ یوں کہا کہ گرنتھی جی پڑوسیوں کے ساتھ فوراً رخصت ہو گئے۔

چند ہی دنوں میں اختر کو دوسرے سکھ لڑکوں سے پہچاننا مشکل ہو گیا۔ وہی کانوں کی لووں تک کس کر بندھی ہوئی پگڑی، وہی ہاتھ کا کڑا اور وہی کچھیرا۔ صرف جب وہ گھر میں آ کر پگڑی اتارتا تھا تو اس کے غیر سکھ ہونے کا راز کھلتا تھا۔ لیکن اس کے بال بڑی تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی ان بالوں کو چھو کر بہت خوش ہوتی تھی۔ "ذرا ادھر آ امر کورے! یہ دیکھ، کیس بن رہے ہیں۔ پھر ایک دن جوڑا بنے گا۔ کنگھا لگے گا اور اس کا نام رکھا جائے گا کرتار سنگھ۔"

"نہیں ماں!" امر کور وہیں سے جواب دیتی۔ "جیسے واہگورو جی ایک ہیں اور گرنتھ صاحب ایک ہیں اور چاند ایک ہے۔ اسی طرح کرتار بھی ایک ہی ہے۔ میرا ننھا منا بھائی!" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی اور مچل کر کہتی "میں اس کھلونے سے نہیں بہلوں گی ماں۔ میں جانتی ہوں یہ مسلا ہے اور جو کرتارا ہوتا ہے وہ مسلا نہیں ہوتا۔"

"میں کب کہتی ہوں کہ یہ سچ مچ کا کرتارا ہے۔ میرا چاند سا لاڈلا بچہ!" پرمیشر سنگھ کی بیوی بھی رو دیتی۔ دونوں اختر کو اکیلا چھوڑ کر کسی گوشے میں جا بیٹھتیں۔ خوب خوب روتیں، ایک دوسرے کو تسلیاں دیتیں اور پھر زار زار رونے لگتیں۔ وہ اپنے کرتارے کے لئے روتیں۔ اختر چند روز اپنی ماں کے لئے روتا رہا، اب کسی اور بات پر روتا۔ جب پرمیشر سنگھ شرنارتھیوں کی امدادی پنچایت سے کچھ غلہ یا کپڑا لے کر آتا تو اختر بھاگ کر جاتا۔ اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا اور رو رو کر کہتا "میرے سر پر پگڑی باندھ دو پرموں۔ میرے کیس بڑھا دو، مجھے کنگھا خرید دو۔"

پرمیشر سنگھ اسے سینے سے لگا لیتا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہتا "یہ سب ہو جائے گا بچے، سب کچھ ہو جائے گا۔ پر ایک بات نہیں ہو گی وہ بات کبھی نہیں ہو گی۔ وہ نہیں ہو گا مجھ سے ابھی! یہ کیس وس سب بڑھ جائیں گے۔"

اختر اپنی اماں کو اب بہت کم یاد کرتا تھا۔ جب تک پرمیشر سنگھ گھر میں رہتا وہ اس سے چمٹا رہتا اور جب وہ کہیں باہر جاتا تو اختر اس کی بیوی اور امر کور کی طرف یوں دیکھتا رہتا جیسے ان سے صرف ایک پیار کی بھیک مانگ رہا ہو۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی اسے نہلاتی، اس کے کپڑے دھوتی اور پھر اس کے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے رونے لگتی اور روتی رہ جاتی۔ البتہ امر کور نے اختر کی طرف جب بھی دیکھا ناک اچھال دی۔ شروع شروع میں تو اس نے اختر کو ایک دھموکا بھی جڑ دیا تھا۔ مگر جب اختر نے پرمیشر سنگھ سے اس کی شکایت کی تو پرمیشر سنگھ بھڑ گیا اور امر کور کو بڑی ننگی ننگی گالیاں دیتا اس کی طرف یوں بڑھا کہ اگر اس کی بیوی راستے میں اس کے پاؤں نہ پڑ جاتی تو وہ بیٹی کو اٹھا کر دیوار پر سے گلی میں پٹخ دیتا۔ "الو کی پٹھی!" اس روز اس نے کڑک کر کہا تھا "تو سنا تو یہی تھا کہ لڑکیاں اللہ ری دیا پر یہاں یہ مسٹنڈی ہمارے ساتھ لگی چلی آئی اور رہ گیا تو پانچ سال کا لڑکا جسے ابھی اچھی طرح ناک تک پونچھنا نہیں آتا۔ عجب اندھیر ہے یارو!" اس واقعے کے بعد امر کور نے اختر پر ہاتھ تو خیر کبھی نہ اٹھایا مگر اس کی نفرت دوچند تھی۔

ایک روز اختر کو تیز بخار آ گیا۔ پرمیشر سنگھ وید کے پاس چلا گیا اور اس کے جانے کے کچھ دیر بعد اس کی بیوی پڑوسن سے پسی ہوئی سونف مانگنے چلی گئی۔ اختر کو پیاس لگی۔ "پانی" اس نے کہا۔ پھر کچھ دیر کے بعد اس نے لال لال سوجی سوجی آنکھیں کھولیں۔ ادھر ادھر دیکھا اور "پانی" کا لفظ ایک کراہ بن کر اس کے حلق سے نکلا۔ کچھ دیر کے بعد وہ لحاف کو ایک طرف جھٹک کر اٹھ بیٹھا۔ امر کور سامنے دہلیز پر بیٹھی کھجور کے پتوں سے چنگیر بنا رہی تھی۔ "پانی دے!" اختر نے اسے ڈانٹا۔ امر کور نے بھویں سکیڑ کر اسے گھور کر دیکھا اور اپنے کام میں جٹ گئی۔ اب کے اختر چلا دیا "پانی دیتی ہے کہ نہیں۔ پانی دے ورنہ ماروں گا۔" امر کور نے اب کے اس کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ بولی "مار تو سہی۔ تو کرتارا تو نہیں کہ میں تیری مار سہہ لوں گی۔ میں تو تیری بوٹی بوٹی کر ڈالوں۔" اختر بلک کر رو دیا اور آج مدت کے بعد اس نے اپنی ماں کو یاد کیا۔ پھر جب پرمیشر سنگھ دوا لئے ہوا اور اس کی بیوی بھی پسی ہوئی سونف لے کر آ گئی تو اختر نے روتے روتے بری حالت بنا لی تھی اور وہ سسک سسک کر کہہ رہا تھا "ہم تو اب اماں پاس چلیں گے۔ یہ امر کور سکھنی کی بچی تو پانی بھی نہیں پلاتی۔ ہم تو اماں پاس جائیں گے۔" پرمیشر سنگھ نے امر کور کی طرف غصے سے دیکھا۔ وہ رو رہی تھی اور اپنی ماں سے کہہ رہی تھی "بے گیرو پانی پلاؤں؟ کرتارا بھی تو اسی طرح پانی مانگ رہا ہو گا کسی سے کسی کو

اس پر ترس نہ آئے تو ہمیں کیوں ترس آئے اس پر؟ ہاں!"

پرمیشر سنگھ اختر کی طرف بڑھا اور اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "یہ بھی تو تمہاری اماں ہے بیٹے۔"

"نہیں۔" اختر بڑے غصے میں بولا "یہ تو سکھ ہے۔ میری ماں تو پانچ وقت نماز پڑھتی ہے اور بسم اللہ کہہ کر پانی پلاتی ہے۔"

پرمیشر سنگھ کی بیوی جلدی سے ایک پیالہ بھر کر لائی تو اختر نے پیالے کو دیوار پر دے مارا اور چلایا "تمہارے ہاتھ سے نہیں پئیں گے۔ تم تو امر کور شودر کی بچی کی اماں ہو۔ ہم تو پرموں کے ہاتھ سے پئیں گے۔"

"یہ بھی تو اسی سؤر کی بچی کا باپ ہے۔" امر کور نے جل کر کہا۔

"تو ہوا کرے!" اختر بولا "تمہیں اس سے کیا؟"

پرمیشر سنگھ کے چہرے پر عجیب کیفیتیں دھوپ چھاؤں سی پیدا کر گئیں۔ وہ اختر کے مطالبے پر مسکرایا بھی اور رو بھی دیا۔ پھر اس نے اختر کو پانی پلایا اس کے ماتھے کو چوما۔ اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ اسے بستر پر لٹا کر اس کے سر کو دبانے ہولے ہولے کھجا؟ رہا اور کہیں شام کو جا کر اس نے پہلو بدلا۔ اس وقت اختر کا بخار اتر چکا تھا اور وہ بڑے مزے سے سو رہا تھا۔

آج بہت عرصے کے بعد رات کو پرمیشر سنگھ بھڑک اٹھا اور نہایت آہستہ سے بولا "ارے سنتی ہو! سن رہی ہو؟ یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہا ہے۔" بیوی نے پہلے تو پرمیشر سنگھ کی پرانی عادت کہہ کر ٹالنا چاہا۔ پھر ایک دم ہڑبڑا کر اٹھی اور امر کور کی کھاٹ کی طرف ہاتھ بڑھا کر اسے ہولے ہولے سے ہلا کر آہستہ سے بولی "بیٹی!"

"کیا ہے ماں؟" امر کور چونک اٹھی۔

اور ماں نے سرگوشی کی "سنو تو۔ سچ مچ کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔"

یہ ایک ثانیے کا سناٹا بڑا خوفناک تھا۔ امر کور کی چیخ اس سے بھی زیادہ خوفناک تھی اور پھر اختر کی چیخ خوفناک تر تھی۔

"کیا ہوا بیٹا؟" پرمیشر سنگھ تڑپ کر اٹھا اور اختر کی کھاٹ پر جا کر اسے اپنی چھاتی سے بھینچ لیا "ڈر گئے بیٹا؟"

"ہاں!" اختر لحاف میں سے سر نکال کر بولا "کوئی چیز چیخی تھی۔"

"امر کور چیخی تھی۔" پرمیشر سنگھ نے کہا "ہم سب یوں سمجھے جیسے کوئی چیز یہاں قرآن پڑھ رہی ہے۔"

"میں پڑھ رہا تھا!" اختر بولا۔

اب کے بھی امر کور کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

بیوی نے جلدی سے چراغ جلا دیا اور امر کور کی کھاٹ پر بیٹھ کر وہ دونوں اختر کو یوں دیکھنے لگیں جیسے وہ ابھی دھواں بن کر دروازے کی جھریوں میں سے باہر اڑ جائے گا اور باہر سے ایک ڈراؤنی آواز آئے گی "میں جن ہوں۔ میں کل رات پھر آ کر قرآن پڑھوں گا۔"

"کیا پڑھ رہے تھے بھلا؟" پرمیشر سنگھ نے پوچھا۔

"پڑھوں؟" اختر نے پوچھا۔

"ہاں ہاں!" پرمیشر سنگھ نے بڑے شوق سے کہا۔

اور اختر قل ہو اللہ احد پڑھنے لگا۔ کفواً احد پر پہنچ کر اس نے اپنے گریبان میں چھو کی اور پھر پرمیشر سنگھ کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولا "تمہارے سینے پر بھی چھو کر دوں؟"

"ہاں ہاں!" پرمیشر سنگھ نے گریبان کا بٹن کھول دیا اور اختر نے چھو کر دی۔

اب کے امرکور نے بڑی مشکل سے چیخ پر قابو پایا۔

پرمیشر سنگھ بولا "کیا نیند نہیں آتی تھی؟"

"ہاں!" اختر بولا "اماں یاد آگئی۔ اماں کہتی ہے نیند نہ آئے تو تین بار قل ہو اللہ پڑھو، نیند آجائے گی۔ اب آ رہی تھی پر امرکور نے ڈرا دیا۔"

"پھر سے پڑھ کے سو جاؤ۔" پرمیشر سنگھ نے کہا "روز پڑھا کرو، اونچے اونچے پڑھا کرو، اسے بھولنا نہیں ورنہ تمہاری اماں تمہیں مارے گی۔ لو اب سو جاؤ۔" اس نے اختر کو لٹا کر اسے لحاف اوڑھا دیا۔ پھر چراغ بجھانے کے لئے بڑھا تو امرکور پکاری "نہیں نہیں بابا۔ بجھاؤ نہیں۔ ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر لگتا ہے؟" پرمیشر سنگھ نے حیران ہو کر پوچھا "کس سے ڈر لگتا ہے؟"

"جلتا رہے۔ کیا ہے؟" بیوی بولی۔

اور پرمیشر سنگھ دیا بجھا کر ہنس دیا۔ "پگلیاں۔" وہ بولا۔ "گدھیاں۔"

رات کے اندھیرے میں اختر آہستہ آہستہ قل ہو اللہ پڑھتا رہا۔ پھر کچھ دیر کے بعد وہ ذرا ذرا سے خراٹے لینے لگا۔ پرمیشر سنگھ بھی سو گیا اور اس کی بیوی بھی۔ مگر امرکور رات بھر کچی نیند میں "پڑوس" کی مسجد کی اذان سنتی رہی اور ڈرتی رہی۔

اب اختر کے اچھے خاصے کیس بڑھ آئے تھے۔ ننھے سے جوڑے میں کنگھا بھی اٹک جاتا تھا۔ گاؤں والوں کی طرح پرمیشر سنگھ کی بیوی بھی اسے کرتارا کہنے لگی تھی اور اس سے خاصی شفقت سے پیش آتی تھی۔ مگر امرکور اختر کو یوں دیکھتی تھی جیسے وہ کوئی بہروپیا ہے اور ابھی پگڑی اور کیس اتار کر پھینک دے گا اور قل ہو اللہ پڑھتا ہوا غائب ہو جائے گا۔

ایک دن پرمیشر سنگھ بڑی تیزی سے گھر آیا اور ہانپتے ہوئے اپنی بیوی سے پوچھا "وہ کہاں ہے؟"

"کون؟ امرکور؟"

"نہیں۔"

"کرتارا؟"

"نہیں۔" پھر کچھ سوچ کر بولا "ہاں ہاں وہی کرتارا۔"

"باہر کھیلنے گیا ہے۔ گلی میں ہوگا۔"

پرمیشر سنگھ واپس لپکا۔ گلی میں جا کر بھاگنے لگا۔ باہر کھیتوں میں جا کر اس کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ پھر اسے دور گیان سنگھ کے گنے کی فصل کے پاس چند بچے کبڈی کھیلتے نظر آئے۔ کھیت کی اوٹ سے اس نے دیکھا کہ اختر نے ایک لڑکے کو گھٹنوں تلے دبا رکھا ہے۔ لڑکے کے ہونٹوں سے خون پھوٹ رہا ہے مگر کبڈی کبڈی کی رٹ جاری ہے۔ پھر اس لڑکے نے جیسے ہار مان لی اور جب اختر کی گرفت سے چھوٹا تو بولا "کیوں بے کرتارو! تم نے میرے منہ پر گھٹنا کیوں مارا؟"

"اچھا کیا جو مارا۔" اختر اکڑ کر بولا اور بکھرے ہوئے جوڑے کی لٹیں سنبھال کر ان میں کنگھا پھنسانے لگا۔

"تمہارے رسول نے تمہیں یہی سمجھایا ہے؟" لڑکے نے طنز سے پوچھا۔

اختر ایک لمحے کے لئے چکرا گیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا "اور کیا تمہارے گرو نے تمہیں یہی سمجھایا ہے؟"

"مسلا۔" لڑکے نے اسے گالی دی۔

"سکھڑا۔" اختر نے اسے گالی دی۔

سب لڑکے اختر پر ٹوٹ پڑے۔ مگر پریشر سنگھ کی ایک ہی کڑک سے میدان صاف تھا۔ اس نے اختر کی پگڑی باندھی اور اسے ایک طرف لے جاکر بولا: "سنو بیٹے۔ میرے پاس رہو گے کہ اماں کے پاس جاؤ گے؟"

اختر کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ کچھ دیر تک پریشر سنگھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔ پھر مسکرانے لگا اور بولا: "اماں پاس جاؤں گا۔"

"اور میرے پاس نہیں رہو گے؟" پریشر سنگھ کا رنگ یوں سُرخ ہو گیا جیسے وہ رو دے گا۔

"تمہارے پاس بھی رہوں گا۔" اختر نے معمے کا حل پیش کر دیا۔ پریشر سنگھ نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور وہ آنسو جو مایوسی نے آنکھوں میں جمع کئے تھے خوشی کے آنسو بن کر ٹپک پڑے۔ وہ بولا: "دیکھو بیٹے۔ اختر بیٹے۔ اختر بیٹے! آج یہاں فوج آ رہی ہے۔ یہ فوجی تمہیں مجھ سے چھیننے آ رہے ہیں۔ سمجھے؟ کہیں چھپ جاؤ۔ پھر جب وہ چلے جائیں گے نا تو میں تمہیں لے آؤں گا۔"

پریشر سنگھ کو اس وقت دور غبار کا ایک پھیلتا ہوا بگولا دکھائی دیا۔ منڈھ پر چڑھ کر اس نے پھیلتے ہوئے بگولے کو غور سے دیکھا اور اچانک تڑپ کر بولا: "فوجیوں کی لاری آ گئی۔"—— وہ منڈھ پر سے کودا اور گنے کے کھیت کا پورا چکر کاٹ گیا۔ "گیانے! او گیان سنگھا!" وہ چلایا۔ گیان سنگھ فصل کے اندر سے نکل آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں درانتی اور دوسرے میں تھوڑی سی گھاس تھی۔ پریشر سنگھ اسے الگ لے گیا۔ اسے کوئی بات سمجھائی۔ پھر دونوں اختر کی طرف آئے۔ گیان سنگھ نے فصل میں سے ایک گنا توڑ کر درانتی سے اس کے پتے کاٹے اور اسے اختر کے حوالے کر کے بولا: "آؤ بھئی کرتارے۔ تم میرے پاس بیٹھ کر گنا چوسو۔ جب تک یہ فوجی چلے جائیں۔ اچھا خاصا بنا بنایا خالصہ ہتھیانے آئے ہیں۔" اور پریشر سنگھ نے اختر سے جانے کی اجازت مانگی: "جاؤں؟"

اور اختر نے دانتوں میں گنے کا لمبا سا چھلکا پکڑے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔ اجازت پا کر پریشر سنگھ گاؤں کی طرف بھاگ گیا۔ بگولا گاؤں کی طرف بڑھا آ رہا تھا۔

گھر جا کر اس نے بیوی اور بیٹی کو سمجھایا۔ پھر بھاگم بھاگ گرنتھی جی کے پاس گیا۔ ان سے بات کر کے اِدھر اُدھر دوسرے لوگوں کو سمجھاتا پھرا۔ اور جب فوجیوں کی لاری دھرم شالہ سے ادھر کھیت میں رُک گئی تو سب فوجی اور پولیس والے گرنتھی جی کے پاس آئے۔ ان کے ساتھ علاقے کا نمبردار بھی تھا۔ مسلمان لڑکیوں کے بارے میں پوچھ گچھ ہوتی رہی...... گرنتھی جی نے گرنتھ صاحب کی قسم کھا کر کہہ دیا کہ اس گاؤں میں کوئی مسلمان لڑکی نہیں۔ "لڑکے کی بات دوسری ہے۔" کسی نے پریشر سنگھ کے کان میں سرگوشی کی اور آس پاس کے سکھ پریشر سنگھ سمیت زیر لب مسکرانے لگے۔ پھر ایک فوجی افسر نے گاؤں والوں کے سامنے ایک تقریر کی۔ اس نے اس ماںتا پر بڑا زور دیا جو ان ماؤں کے دلوں میں ان دنوں ٹیس بن کر رہ گئی تھی، جن کی بیٹیاں چھین گئی تھیں اور ان بھائیوں اور شوہروں کے پیار کی بڑی دردناک تصویر کھینچی جن کی بہنیں اور بیویاں ان سے ہتھیا لی گئی تھیں۔ "اور مذہب کا کیا ہے دوستو!" اس نے کہا تھا: "دنیا کا ہر مذہب انسان کو انسان بنانا سکھاتا ہے اور تم مذہب کا نام لے کر انسان کو انسان سے چھڑا لیتے ہو، ان کی آبرو پر ناچتے ہو۔ ہم سکھ ہیں، ہم مسلمان ہیں۔ ہم واہگورو جی کے چیلے ہیں۔ ہم رسول کے غلام ہیں۔"

تقریر کے بعد مجمع چھٹنے لگا۔ فوجیوں کے افسر نے گرنتھی جی کا شکریہ ادا کیا، وہاں سے ہاتھ ملایا اور لاری چلی گئی۔

سب سے پہلے گرنتھی جی نے پریشر سنگھ کو بادی۔ پھر دوسرے لوگوں نے پریشر سنگھ کو گھیر لیا اور اسے مبارکبادیں دینے لگے۔ پریشر سنگھ لاری کے آنے سے پہلے حواس باختہ ہو رہا تھا تو اب لاری کے جانے کے بعد ٹھاٹھا سا لگ رہا تھا۔ پھر وہ گاؤں سے نکل کر گیان سنگھ کے کھیت میں آیا۔ اختر کو کندھے پر بٹھا کر گھر لے آیا۔ کھانا کھلانے کے بعد اسے کھاٹ پر لٹا کر کچھ یوں تھپکا کہ اسے نیند آ گئی۔ پریشر سنگھ دیر تک اختر کی کھاٹ پر بیٹھا رہا۔ کبھی کبھی داڑھی کھجاتا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر پھر سے سوچ میں ڈوب جاتا۔ پڑوس کی چھت پر کھیلتا ہوا ایک بچہ اچانک ایڑی پکڑ کر بیٹھ گیا اور زار زار رونے لگا: "ہائے اتنا بڑا کانٹا اتر گیا پورے کا پورا۔" وہ چلایا اور پھر اس کی ماں ننگے سر اوپر بھاگی۔ اسے اٹھا کر گود میں بٹھا لیا؛

پھر نیچے بیٹی کو پکار کر سُوئی منگوائی۔ کانٹا نکالنے کے بعد اسے بے تحاشا چوما اور پھر نیچے جھک کر پکاری "ارے میرا دوپٹہ اوپر پھینک دینا۔ کیسی بے حیائی سے اوپر بھاگی چلی آئی۔"

پرمیشر سنگھ نے کچھ دیر کے بعد چونک کر اپنی بیوی سے پوچھا "منتو! کیا تمہیں کرتارا اب بھی یاد آتا ہے؟"

"لو اور سنو" بیوی بولی اور پھر ایک دم مچل جل رو دی "کرتارا تو میرے کلیجے کا ناسور بن گیا ہے پرمیشرے۔"

کرتارے کا نام سن کر ادھر سے امر کور اٹھ کر آئی اور ماں کے گھٹنے کے پاس بیٹھ کر رونے لگی۔

پرمیشر یوں بدک کر جلدی سے اٹھا جیسے اس نے شیشے کے برتنوں سے بھرا ہوا طشت اچانک زمین پر دے مارا ہے۔

شام کے کھانے کے بعد وہ اختر کو انگلی سے پکڑے باہر دالان میں آیا اور بولا "آج تو دن بھر خوب سوئے ہو بیٹا۔ چلو آج ذرا گھومنے چلتے ہیں۔ چاندنی رات ہے۔"

اختر فوراً مان گیا۔ پرمیشر سنگھ نے اسے ایک کمبل میں لپیٹا اور کندھے پر بٹھا لیا۔ کھیتوں میں آ کر وہ بولا "یہ چاند جو پورب سے نکل رہا ہے نا بیٹے۔ یہ جب ہمارے سر پہ پہنچے گا تو صبح ہو جائے گی۔"

اختر چاند کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ چاند جو یہاں چمک رہا ہے نا یہ وہاں بھی چمک رہا ہوگا، تمہاری اماں کے دیس میں۔"

اب کے اختر نے جھک کر پرمیشر سنگھ کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔

"یہ چاند جب ہمارے سر پہ آئے گا تو وہاں تمہاری اماں کے سر پر بھی ہوگا۔"

اب کے اختر بولا "ہم چاند دیکھ رہے ہیں تو کیا اماں بھی چاند کو دیکھ رہی ہوگی؟"

"ہاں!" پرمیشر سنگھ کی آواز میں گونج تھی "جاؤ گے اماں کے پاس؟"

"ہاں!" اختر بولا "پر تم لے تو جاتے نہیں، تم بہت برے ہو، تم سکھ ہو۔"

پرمیشر سنگھ بولا "نہیں بیٹے، آج تو تمہیں ضرور ہی لے جاؤں گا۔ تمہاری اماں کی چٹھی آئی ہے۔ وہ کہتی ہے میں اختر بیٹے کے لئے اداس ہوں۔"

"میں بھی تو اداس ہوں!" اختر کو جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔

"میں تمہیں تمہاری اماں ہی کے پاس لئے جا رہا ہوں۔"

"سچ؟" اختر پرمیشر سنگھ کے کندھے پر کودنے لگا اور زور زور سے بولنے لگا "ہم اماں پاس جا رہے ہیں۔ پرموں ہمیں اماں پاس لے جائیگا۔ ہم وہاں سے پرموں کو چٹھی لکھیں گے۔"

پرمیشر سنگھ چپ چاپ روئے جا رہا تھا۔ آنسو پونچھ کر اور گلا صاف کر کے اس نے اختر سے پوچھا "گانا سنو گے؟"

"ہاں!"

"پہلے تم قرآن سناؤ۔"

"اچھا!" اور اختر قل ہو اللہ سے پڑھنے لگا۔ کفواً احد پر پہنچ کر اس نے اپنے سینے پر چھو کی اور بولا "لاؤ تمہارے سینے پر بھی چھو کر دوں۔"

رک کر پرمیشر سنگھ نے گریبان کا ایک بٹن کھولا اور اوپر دیکھا۔ اختر نے لٹک کر اس کے سینے پر چھو کر دی اور بولا "اب تم سناؤ۔"

پرمیشر سنگھ نے اختر کو دوسرے کندھے پر بٹھا لیا۔ اسے بچوں کا کوئی گیت یاد نہیں تھا۔ اس لئے اس نے قسم قسم کے گیت گانا شروع کئے۔

اور گگنے بھولے تیز تیز چلنے لگا۔ اختر چپ چاپ سنتا رہا۔

بنتو دا سر بن ورگا جے
بنتو دا منہ چن ورگا جے
بنتو دا لک چیترا جے
لوکو
بنتو دا لک چیترا

"بنتو کون ہے؟" اختر نے پرمیشر سنگھ کو ٹوکا۔

پرمیشر سنگھ ہنسا۔ پھر ذرا سے وقفے کے بعد بولا "میری بیوی ہے نا۔ امر کور کی ماں۔ اس کا نام بھی تو بنتو ہے۔ تمہاری اماں کا نام بھی بنتو ہی ہوگا۔"

"کیوں؟" اختر خفا ہو گیا "وہ کوئی سکھ ہے؟"

پرمیشر سنگھ خاموش ہو گیا۔

چاند بہت بلند ہو گیا تھا۔ رات خاموش تھی۔ کبھی کبھی گنے کے کھیتوں کے آس پاس گیدڑ روتے اور پھر سناٹا چھا جاتا۔ اختر پہلے تو گیدڑوں کی آواز سے ڈرا مگر پرمیشر سنگھ کے سمجھانے سے بہل گیا اور ایک بار خاموشی کے طویل وقفے کے بعد اس نے پرمیشر سنگھ سے پوچھا "اب کیوں نہیں روتے گیدڑ؟" پرمیشر سنگھ ہنس دیا۔ پھر اسے ایک کہانی یاد آ گئی۔ یہ گورو گوبند کی کہانی تھی لیکن اس نے بڑے سلیقے سے سکھوں کے ناموں کو مسلمانوں کے ناموں میں بدل دیا اور اختر "پھر؟ پھر؟" کی رٹ لگاتا رہا اور کہانی ابھی جاری تھی جب اختر ایک دم بولا "ارے چاند تو سر پر آ گیا۔"

پرمیشر سنگھ نے بھی رک کر اوپر دیکھا۔ پھر وہ قریب کے ٹیلے پر چڑھ کر دور دیکھنے لگا اور بولا "تمہاری اماں کا دیس جانے کدھر چلا گیا؟"

وہ کچھ دیر ٹیلے پر کھڑا رہا جب اچانک کہیں بہت دور سے اذان کی آواز آنے لگی اور اختر مارے خوشی کے یوں کودا کہ پرمیشر سنگھ اسے بڑی مشکل سے سنبھال سکا۔ اسے کندھے پر سے اتار کر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور کھڑے ہوئے اختر کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا "جاؤ بیٹے تمہیں تمہاری اماں نے پکارا ہے۔ بس تم اس آواز کی سیدھ میں ——"

"شش!" اختر نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور سرگوشی میں بولا "اذان کے وقت نہیں بولتے!"

"پر میں تو سکھ ہوں بیٹے!" پرمیشر سنگھ بولا۔

"شش!" اب کے اختر نے بگڑ کر اسے گھورا۔

اور پرمیشر سنگھ نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ اس کے ماتھے پر ایک بہت طویل پیار دیا اور اذان ختم ہونے کے بعد آستینوں سے آنکھوں کو رگڑ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا "میں یہاں سے آگے نہیں جاؤں گا۔ بس تم ——"

"کیوں؟ کیوں نہیں جاؤ گے؟" اختر نے پوچھا۔

"تمہاری اماں نے چٹھی میں یہی لکھا ہے کہ اختر اکیلا آئے۔" پرمیشر سنگھ نے اختر کو پھسلایا "بس تم سیدھے چلے جاؤ۔ سامنے ایک گاؤں آئے گا وہاں جا کر اپنا نام بتانا۔ کرتار ——"، اختر، پھر اپنی اماں کا نام بتانا، اپنے گاؤں کا نام بتانا اور دیکھو مجھے ایک چٹھی ضرور لکھنا۔"

"اچھا؟" اختر نے ... وہ کیا۔

"اور ہاں تمہیں کرتار! نام کا کوئی لڑکا ملے نا تو اسے ادھر بھیج دینا۔ اچھا؟"

"اچھا!"

پرمیشر سنگھ نے ایک بار پھر اختر کا ماتھا چوما اور جیسے کچھ نگل کر بولا" جاؤ"

اختر چند قدم چلا مگر پلٹ آیا" تم بھی آجاؤ نا۔"

"نہیں بھئی" پرمیشر سنگھ نے اسے سمجھایا" تمہاری اماں نے چٹھی میں یہ نہیں لکھا۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔" اختر بولا۔

"قرآن کیوں نہیں پڑھتے؟" پرمیشر سنگھ نے مشورہ دیا۔

"اچھا" بات اختر کی سمجھ میں آگئی اور "قل ہو اللہ" کا ورد کرتا ہوا جانے لگا۔

نرم نرم سا افق کے دائرے پر اندھیرے سے لڑ رہی تھی اور ننھا سا اختر دور دھندلی پگڈنڈی پر ایک بے ننگے سکھ جوان کی طرح تیز تیز جا رہا تھا۔ پرمیشر سنگھ اس پر نظریں گاڑے ٹیلے پر بیٹھا رہا اور جب اختر کا نقطہ فضا کا ایک حصہ بن گیا تو وہ وہاں سے اتر آیا۔

اختر ابھی گاؤں کے قریب نہیں پہنچا تھا کہ دو سپاہی لپک کر آئے اور اسے روک کر بولے" کون ہو تم؟"

"اختر!" وہ یوں بولا جیسے ساری دنیا اس کا نام جانتی ہے۔

"اختر!" دونوں سپاہی کبھی اختر کے چہرے کو دیکھتے تھے اور کبھی اس کی سکھوں کی سی پگڑی کو۔ پھر ایک نے آگے بڑھ کر اس کی پگڑی جھٹکے سے اتار لی تو اختر کے کیس کھل کر ادھر اُدھر بکھر گئے۔

اختر نے جھپٹ کر پگڑی چھین لی اور پھر سر کو ایک ہاتھ سے ٹٹولتے ہوئے وہ زمین پر لیٹ گیا اور زور زور سے روتے ہوئے بولا" میرا کنگھا لاؤ تم نے میرا کنگھا لے لیا ہے۔ دے دو ورنہ میں تمہیں مار دوں گا"

ایک دم دونوں سپاہی زمین پر دھب سے گرے اور رائفلوں کو کندھے سے لگا کر جیسے نشانہ باندھنے لگے۔ "ہالٹ!" ایک پکارا اور جیسے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ پھر بڑھتے ہوئے اُجالے میں انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا . . . .

. . . . اور ایک نے فائر کر دیا۔ اختر فائر کی آواز سے دہل کر رہ گیا اور سپاہیوں کو ایک طرف بھاگتا دیکھ کر وہ بھی روتا چلاتا ہوا ان کے پیچھے بھاگا۔

سپاہی جب ایک جگہ جا کر رُکے تو پرمیشر سنگھ اپنی ران پر کس کر پگڑی باندھ چکا تھا۔ مگر خون اس کی پگڑی کی سینکڑوں پرتوں میں سے بھی پھوٹ آیا تھا اور وہ کہہ رہا تھا" مجھے کیوں مارا تم نے؟ میں تو اختر کے کیس کاٹنا بھول گیا تھا۔ میں تو اختر کو اس کا دھرم واپس دینے آیا تھا یارو۔"

دور اختر بھاگا آ رہا تھا اور اس کے کیس ہوا میں اُڑ رہے تھے۔

آپا

جب کبھی بیٹھے بٹھائے مجھے آپا یاد آتی ہے تو میری آنکھوں کے آگے ایک چھوٹا سا بلوری دیا آ جاتا ہے جو مدھم لو سے جل رہا ہو۔

مجھے یاد ہے ایک رات ہم سب چپ چاپ باورچی خانے میں بیٹھے تھے میں آپا اور امی جان کہ چھوٹا بدو بھاگتا ہوا آیا۔ ان دنوں بدو یہی چھ سات سال کا ہوگا۔ کہنے لگا "امی جان! میں بھی بیاہ کروں گا۔"

"اوہ ابھی سے؟" اماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر کہنے لگیں۔ "اچھا بدو تمہارا بیاہ آپا سے کر دیں؟"

"اونہوں!" بدو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

اماں کہنے لگیں "کیوں آپا کو کیا ہے؟"

"ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کریں گے۔" بدو نے آنکھیں چمکاتے ہوئے کہا۔

اماں نے آپا کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور کہنے لگیں "کیوں دیکھو تو آپا کیسی اچھی ہیں؟"

"میں بتاؤں کیسی ہے؟" وہ چلایا۔

"ہاں بتاؤ تو بھلا؟" اماں نے پوچھا۔ بدو نے آنکھیں اٹھا کر چاروں طرف دیکھا جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔ پھر اس کی نگاہ چولہے پر جا رکی چولہے میں اپلے کا ایک جلا ہوا ٹکڑا پڑا تھا۔ بدو نے اس کی طرف اشارہ کیا اور بولا "ایسی!" پھر بجلی کے روشن بلب کی طرف انگلی اٹھا کر چیخنے لگا "اور چھاجو باجی ایسی!" اس بات پر ہم سب بے تحاشا ہنستے رہے اتنے میں تصدق بھائی آ گئے۔ اماں کہنے لگیں "تصدق بدو سے پوچھو تو کہ آپا کیسی ہیں؟" آپا نے تصدق بھائی کو آتے ہوئے دیکھا تو منہ موڑ کر یوں بیٹھ گئی جیسے ہنڈیا پکانے میں منہمک ہو۔

"ہاں تو کیسی ہے آپا بدو؟" وہ بولے۔ "بتاؤں؟" بدو چلایا اور اس نے اپلے کا ٹکڑا اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ غالباً وہ اسے ہاتھ میں لے کر ہمیں دکھانا چاہتا تھا مگر آپا نے جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور انگلی ہلاتے ہوئے بولی "اونہہ!" بدو رونے لگا تو اماں کہنے لگیں "بچے اسے ہاتھ میں نہیں اٹھاتے، اس میں چنگاری ہے۔" ——— "وہ تو جلا ہوا ہے اماں!" بدو نے بسورتے ہوئے کہا۔ اماں بولیں "میرے لال

"تمہیں معلوم نہیں اس کے اندر تو آگ ہے۔ اوپر سے نہیں دکھائی دیتی؟" بدو نے بھولے پن سے پوچھا۔ "کیوں آپا اس میں آگ ہے؟" اس وقت آپا کے منہ پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔ "میں کیا جانوں؟" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی اور پھکنی اٹھا کر جلتی ہوئی آگ میں بے مصرف پھونکیں مارنے لگی۔

اب میں سمجھتی ہوں کہ آپا دل کی گہرائیوں میں جیتی تھی اور وہ گہرائیاں اتنی عمیق تھیں کہ بات ابھرتی بھی تو نکل نہ سکتی۔ اس روز بدو نے کیسے پتے کی بات کہی تھی مگر میں کہا کرتی تھی "آپا تم تو بس بیٹھ رہتی ہو۔" اور وہ مسکرا کر کہتی "پگلی!" اور اپنے کام میں لگ جاتی۔ ویسے تو وہ سارا دن کام میں لگی رہتی تھی۔ ہر کوئی اسے کسی نہ کسی کام کو کہہ دیتا اور ایک ہی وقت میں اسے کئی کام کرنے پڑ جاتے۔ اِدھر بدو چیختا "آپا میرا دلیا۔" اُدھر ابا گھورتے "سجادہ ابھی تک چائے کیوں نہیں بنی؟" بیچ میں اماں بول اٹھتیں "بیٹا دھوبی کب سے باہر کھڑا ہے؟" اور آپا چپ چاپ سارے کاموں سے نپٹ لیتی۔ یہ تو میں خوب جانتی تھی مگر اس کے باوجود جانے کیوں اسے کام کرتے ہوئے دیکھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کام کر رہی ہے یا وہ اتنا کام کرتی ہے۔ مجھے تو بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ بیٹھی ہی رہتی ہے اور اسے اِدھر سے اُدھر گردن موڑنے میں بھی اتنی دیر لگتی ہے اور چلتی ہے تو چلتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ میں نے آپا کو کبھی قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے نہیں سنا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ مسکرا دیا کرتی تھی اور بس۔ البتہ وہ مسکرایا اکثر کرتی۔ جب وہ مسکرائی تو اس کے ہونٹ کھل جاتے اور آنکھیں بھیگ جاتیں۔ ہاں تو میں سمجھتی تھی کہ آپا چپکی بیٹھی ہی رہتی ہے۔ ذرا نہیں ہلتی اور بن چلے ڈھلک کر یہاں سے وہاں پہنچ جاتی ہے جیسے کسی نے اسے دھکیل دیا ہو۔ اس کے برعکس ساحرہ کتنے مزے میں چلتی تھی جیسے دادرے کی تال پر ناچ رہی ہو اور اپنی خالہ زاد بہن ساجو باجی کو چلتے دیکھ کر تو میں کبھی نہ اکتاتی۔ جی چاہتا تھا کہ باجی ہمیشہ میرے پاس رہے اور چلتی چلتی اسی طرح گردن موڑ کر مدھم آواز میں کہے "ہئی جی! کیوں جی؟" اور اس کی کالی کالی آنکھوں کے گوشے مسکرانے لگیں۔ باجی کی بات بات مجھے کتنی پیاری تھی۔

ساحرہ اور ثریا ہمارے پڑوس میں رہتی تھیں۔ دن بھر ان کا مکان ان کے قہقہوں سے گونجتا رہتا جیسے کسی مندر میں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ بس میرا جی چاہتا تھا کہ انہیں کے گھر جا رہوں۔ ہمارے گھر میں رکھا ہی کیا تھا۔ ایک بیٹھ رہنے والی آپا، ایک "یہ کرو۔ وہ کرو" والی اماں اور دن بھر حقے پر گڑگڑ کرنے والے ابا۔

اس روز جب میں نے ابا کو اماں سے کہتے ہوئے سنا۔ سچ تو یہ ہے مجھے بے حد غصہ آیا۔ ابا کہنے لگے "سجادہ کی ماں! معلوم ہوتا ہے ساحرہ کے گھر میں بہت سے برتن ہیں۔"

"کیوں؟" اماں پوچھنے لگیں۔

کہنے لگے "بس تمام دن برتن ہی بجتے رہتے ہیں اور یا قہقہے لگتے ہیں جیسے میلہ لگا ہو۔"

اماں تنک کر بولیں "مجھے کیا معلوم۔ آپ تو بس لوگوں کے گھر کی طرف کان لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔"

ابا کہنے لگے "اوہو! میرا تو یہ مطلب ہے کہ جہاں لڑکی جوان ہوئی برتن بجنے لگے۔ بازار کے اس موڑ تک لوگوں کو خبر ہو جاتی ہے کہ فلاں گھر میں لڑکی جوان ہو چکی ہے۔ مگر دیکھو نا ہماری سجادہ میں یہ بات نہیں۔" میں نے ابا کی بات سنی اور میرا دل کھولنے لگا۔ بڑی آئی ہے سجادہ جی ہاں! اپنی بیٹی جو ہوئی۔ اس وقت میرا جی چاہتا تھا کہ جا کر باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی آپا کا منہ چڑاؤں۔ اسی بات پر میں نے دن بھر کھانا نہ کھایا اور دل ہی دل میں کھولتی رہی۔ ابا جانتے ہی کیا ہیں۔ بس حقہ پیا اور گڑگڑ کر دیا یا زیادہ سے زیادہ کتاب کھول کر بیٹھ گئے اور گٹ مٹ گٹ مٹ کرنے لگے جیسے کوئی بھٹیاری مکئی کے دانے بھون رہی ہو۔ سارے گھر میں لے دے کے صرف تصدق جانی ہی تھے جو دلچسپ باتیں کیا کرتے تھے اور جب ابا گھر پہ نہ ہوتے تو وہ لہاری آواز میں گایا بھی کرتے تھے۔ جانے وہ کون سا شعر تھا ---- ہاں ـ

چپ چپ سے وہ بیٹھے ہیں آنکھوں میں نمی سی ہے　　نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے

آپا انہیں گاتے ہوئے سن کر کسی نہ کسی بات پر مسکرا دیتی اور کوئی بات نہ ہوتی تو وہ بدو کے ہلکا سا تھپڑ مار کر کہتی "بدو رونا" اور پھر آپ ہی من میں مسکراتی رہتی۔

تصدق بھائی میرے پھوپھا کے بیٹے بھائی تھے۔ انہیں ہمارے گھر آئے یہی دو ماہ ہوئے ہوں گے۔ کالج میں پڑھتے تھے۔ پہلے تو وہ بورڈنگ میں رہا کرتے تھے پھر ایک دن جب پھوپھی آئی ہوئی تھی تو باتوں باتوں میں ان کا ذکر چھڑ گیا۔ پھوپھی کہنے لگی بورڈنگ میں کھانے کا انتظام ٹھیک نہیں۔ لڑکا آئے دن بیمار رہتا ہے۔ اماں اس بات پر خوب لڑیں۔ کہنے لگیں اپنا گھر موجود ہے تو بورڈنگ میں پڑے رہنے کا مطلب؟ پھر ان دونوں میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ اماں کی تو عادت ہے کہ اگلی پچھلی تمام باتیں لے بیٹھتی ہیں۔ غرضیکہ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہفتہ کے بعد تصدق بھائی بورڈنگ کو چھوڑ کر ہمارے ہاں آ ٹھہرے۔

تصدق بھائی مجھ سے اور بدو سے بڑی گپیں ہانکا کرتے تھے۔ ان کی باتیں بے حد دلچسپ ہوتیں۔ بدو سے تو وہ دن بھر نہ اکتاتے۔ البتہ آپا سے وہ زیادہ باتیں نہ کرتے۔ کرتے بھی کیسے، جب کبھی وہ آپا کے سامنے جاتے تو آپا کے دوپٹے کا پلو آپ ہی آپ سرک کر نیم گھونگھٹ سا بن جاتا اور آپا کی بھیگی بھیگی آنکھیں جھک جاتیں اور وہ کسی نہ کسی کام میں شدت سے مصروف دکھائی دیتی۔ اب مجھے خیال آتا ہے کہ آپا ان کی باتیں غور سے سنا کرتی تھی گو کہتی کچھ نہ تھی۔ بھائی صاحب بھی بدو سے آپا کے متعلق پوچھتے رہتے لیکن صرف اسی وقت جب وہ دونوں اکیلے ہوتے، پوچھتے "بدو تمہاری آپا کیا کر رہی ہے؟"

"آپا؟" بدو لاپروائی سے دہراتا "بیٹھی ہے ——— بلاؤں؟"

بھائی صاحب گھبرا کر کہتے "نہیں نہیں۔ اچھا بدو، آج تمہیں، یہ دیکھو اس طرف تمہیں دکھائیں۔"

اور جب بدو کا دھیان ادھر ادھر ہو جاتا تو وہ دھیمی آواز میں کہتے "بدا رے یار تم تو مفت کا ڈھنڈورا ہو۔"

بدو چیخ اٹھتا "یہ کیا ہوں میں؟" اس پر وہ میز بجانے لگتے "ڈگمگ ڈگمگ ڈھنڈورا یعنی یہ ڈھنڈورا ہے، دیکھا جیسے ڈھول بھی کہتے ہیں ڈگمگ ڈگمگ سمجھے؟" اور آپا اکثر چلتے چلتے ان کے دروازے پر ٹھہر جاتی اور ان کی باتیں سنتی رہتی اور پھر چولہے کے پاس بیٹھ کر آپ ہی آپ مسکراتی۔ اس وقت اس کے سر سے دوپٹہ سرک جاتا، بالوں کی لٹ پھسل کر گال پر آ گرتی اور وہ بھیگی بھیگی آنکھیں چولہے میں ناچتے ہوئے شعلوں کی طرح جھومتیں۔ آپا کے ہونٹ یوں ہلتے گویا گا رہی ہو مگر الفاظ سنائی نہ دیتے۔ ایسے میں اگر اماں یا ابا باورچی خانے میں آ جاتے تو وہ ٹھٹک کر یوں اپنا دوپٹہ، بال اور آنکھیں سنبھالتی گویا کسی بے تکلف محفل میں کوئی بیگانہ آ گھسا ہو۔

ایک دن میں، آپا اور اماں باہر صحن میں بیٹھی تھیں۔ اس وقت بھائی صاحب اندر اپنے کمرے میں بدو سے باتیں کر رہے تھے۔ میرا خیال ہے بھائی صاحب کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم باہر بیٹھے ہوئے ان کی باتیں سن رہے ہیں۔ بھائی صاحب بدو سے کہہ رہے تھے "میرے یار ہم تم اس سے بیاہ کریں گے جو ہم سے انگریزی میں باتیں کر سکے، کتابیں پڑھ سکے، شطرنج، کیرم اور چڑیا کھیل سکے۔ چڑیا جانتے ہو؟ وہ گول گول پروں والا گیند بلے سے یوں ٹھوں، ٹھں، ٹھز اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ہمیں مزے دار کھانے پکا کر کھلا سکے، سمجھے؟"

بدو بولا "ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کریں گے۔"

"اونہہ!" بھائی صاحب نے کہا۔

بدو چیخنے لگا "میں جانتا ہوں تم آپا سے بیاہ کرو گے۔ ہاں!" اس وقت اماں نے مسکرا کر آپا کی طرف دیکھا۔ مگر آپا اپنے پاؤں کے انگوٹھے کا ناخن توڑنے میں اس قدر مصروف تھی جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔ اندر بھائی صاحب کہہ رہے تھے "واہ! تمہاری آپا فرنی پکاتی ہے تو اس میں پوری طرح شکر بھی نہیں ڈالتی۔ بالکل پھیکی۔ آخ تھو!"

بدّو نے کہا، "ابّا جو کہتے ہیں فرنی میں کم میٹھا ہونا چاہیئے۔"

"تو وہ اپنے ابّا کے لئے پکاتی ہے نا۔ ہمارے لئے تو نہیں!"

"میں کہوں آپا سے؟" بدّو چیخا۔

بھائی چلّائے، "اوہ بگلا۔ ڈھنڈورا۔ تو تمہیں ڈھنڈورا پیٹ کر دکھائیں۔ یہ دیکھو اس طرف ٹنگ ٹنگ۔" بدّو پھر چلّانے لگا، "میں جانتا ہوں تم بینڈ بجا رہے ہو نا؟" ۔۔۔ "ہاں ہاں اسی طرح ڈھنڈورا پٹتا ہے نا۔" بھائی صاحب کہہ رہے تھے۔ "کشتیوں میں، اچھا بدّو تم نے کبھی کشتی لڑی ہے؟ آؤ ہم تم کشتی لڑیں۔ میں ہوا گاما اور تم بدّو پہلوان۔ لو آؤ ۔۔۔ ٹھہرو۔ جب میں تین کہوں" اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے مدھم آواز میں کہا، "ارے یار تمہاری دوستی تو مجھے بہت مہنگی پڑتی ہے۔"

میرا خیال ہے آپا ہنسی نہ روک سکی اس لئے وہ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ میرا تو ہنسی کے مارے دم نکلا جا رہا تھا اور اماں نے اپنے منہ میں دوپٹہ ٹھونس لیا تھا کہ آواز نہ نکلے۔

میں اور آپا دونوں اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ بھائی صاحب آ گئے۔ کہنے لگے "کیا پڑھ رہی ہو جہینا؟" ان کے منہ سے جہینا سن کر مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ حالانکہ مجھے اپنے نام سے بے حد نفرت تھی۔ نور جہاں کیسا پرانا نام ہے۔ بولتے ہی منہ میں باسی روٹی کا مزا آنے لگتا ہے۔ میں تو نور جہاں سن کر یوں محسوس کیا کرتی تھی جیسے کسی تاریخ کی کتاب کے بوسیدہ ورق سے کوئی بوڑھی اماں سونٹا ٹیکتی ہوئی آ رہی ہوں ۔۔۔ مگر بھائی صاحب کو نام بگاڑ کر اسے سنوار دینے میں کمال حاصل تھا۔ ان کے منہ سے جہینا سن کر مجھے اپنے نام سے کوئی شکایت نہ رہتی اور میں محسوس کرتی گویا ایران کی شہزادی ہوں۔ آپا کو وہ سجادہ سے سجدے کہا کرتے تھے مگر وہ تو پرانی بات تھی، جب آپا چھوٹی تھی۔ اب تو بھائی جان اسے سجدے نہ کہتے بلکہ اس کا پورا نام تک لینے سے گھبراتے تھے۔ خیر میں نے جواب دے دیا، "سکول کا کام کر رہی ہوں۔"

پوچھنے لگے "تم نے کوئی برنرڈ شا کی کتاب پڑھی ہے کیا؟"

میں نے کہا، "نہیں!"

انہوں نے میرے اور آپا کے درمیان دیوار پر لٹکی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، "تمہاری آپا نے تو ہارٹ بریک ہاؤس پڑھی ہو گی!" وہ کنکھیوں سے آپا کی طرف دیکھ رہے تھے۔

آپا نے آنکھیں اٹھائے بغیر ہی سر ہلا دیا اور مدھم آواز میں کہا "نہیں!" اور سویٹر بننے میں لگی رہی۔

بھائی جان بولے، "اوہ کیا بتاؤں جہینا کہ وہ کیا چیز ہے، نشہ ہے نشہ، خالص شہد، تم اسے ضرور پڑھو بالکل آسان ہے یعنی امتحان کے بعد ضرور پڑھنا۔ میرے پاس پڑی ہے۔"

میں نے کہا، "ضرور پڑھوں گی۔"

پھر پوچھنے لگے، "میں کہتا ہوں تمہاری آپا نے میٹرک کے بعد پڑھنا چھوڑ کیوں دیا؟"

میں نے چڑ کر کہا، "مجھے کیا معلوم آپ خود ہی پوچھ لیجئے۔" حالانکہ مجھے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ آپا نے کالج میں جانے سے کیوں انکار کیا تھا کہتی تھی میرا تو کالج جانے کو جی نہیں چاہتا۔ وہاں لڑکیوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی نمائش گاہ ہو۔ درسگاہ تو معلوم ہی نہیں ہوتی جیسے مطالعے کے بہانے میلہ لگا ہو ۔۔۔ مجھے آپا کی یہ بات بہت بری لگی تھی۔ میں جانتی تھی کہ وہ گھر میں بیٹھ رہنے کے لئے کالج جانا نہیں چاہتی۔ بڑی آئی، نکتہ چین۔ اس کے علاوہ جب کبھی بھائی جان آپا کی بات کرتے تو میں خواہ مخواہ چڑ جاتی۔ آپا تو بات کا جواب تک نہیں دیتی اور یہ آپا آپا کر رہے ہیں، اور پھر آپا کی بات مجھ سے پوچھنے کا مطلب؟ میں کیا ٹیلیفون تھی؟ خود آپا سے پوچھ لیتے اور آپا ۔۔۔ بیٹھی ہوئی گم سم آپا۔ بھیگی بلّی۔

شام کو ابا کھانے پر بیٹھے جھٹ سے چلا اٹھے "آج فیرنی میں اتنی شکر کیوں ہے؟ قند سے ہونٹ چپکے جاتے ہیں۔ سجادہ! سجادہ بیٹی! کیا کھانڈ اتنی سستی ہو گئی ہے۔ ایک لقمہ نگلنا بھی مشکل ہے۔"

آپا کی بھیگی بھیگی آنکھیں جھوم رہی تھیں۔ حالانکہ جب کبھی ابا جان خفا ہوتے تو آپا کا رنگ زرد پڑ جاتا۔ مگر اس وقت اس کے گال تمتما رہے تھے، کہنے لگی "شاید زیادہ پڑ گئی ہو" یہ کہہ کر وہ تو باورچی خانے میں چلی گئی اور میں دانت پیس رہی تھی۔ شاید۔ کیا خوب۔ شاید۔

اُدھر ابا بدستور بڑبڑا رہے تھے "چار پانچ دن سے دیکھ رہا ہوں کہ فیرنی میں قند بڑھتی جا رہی ہے" صحن سے اماں دوڑی دوڑی آئیں اور آتے ہی ابا پر برس پڑیں جیسے ان کی عادت ہے "آپ تو ناحق بگڑتے ہیں۔ آپ ہلکا میٹھا پسند کرتے ہیں تو کیا باقی لوگ بھی کم کھائیں؟ اللہ رکھے گھر میں جوان لڑکا ہے اس کا تو خیال کرنا چاہیئے۔" ابا کو جان چھڑانی مشکل ہو گئی، کہنے لگے "اوہ یہ بات ہے مجھے بتا دیا ہوتا۔ میں کہتا ہوں سجادہ کی ماں ———" اور وہ دونوں کھسر پھسر کرنے لگے۔

آپا ساحرہ کے گھر جانے کو تیار ہوئی تو میں بڑی حیران ہوئی۔ آپا اس سے ملنا تو کیا بات تک کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ بلکہ اس کے نام پر ہی ناک بھوں چڑھایا کرتی تھی۔ میں نے خیال کیا ضرور کوئی بھید ہے اس بات میں، کبھی کبھار ساحرہ دیوار کے ساتھ چارپائی کھڑی کر کے اس پر چڑھ کر ہماری طرف جھانکتی اور کسی نہ کسی بہانے سلسلۂ گفتگو کو دراز کرنے کی کوشش کرتی تو آپا بڑی بے دلی سے دو ایک باتوں سے اسے ٹال دیتی۔ آپ ہی آپ بول اٹھتی "ابھی تو اتنا کام پڑا ہے اور میں یہاں کھڑی ہوں" یہ کہہ کر وہ باورچی خانے میں جا بیٹھتی۔ خیر اس وقت تو میں چپ چاپ بیٹھی رہی مگر جب آپا لوٹ چکی تو کچھ دیر کے بعد چپکے سے میں بھی ساحرہ کے گھر جا پہنچی۔ باتوں ہی باتوں میں میں نے ذکر چھیڑ دیا "آج آپا آئی تھی؟"

ساحرہ نے ناخن پر پالش لگاتے ہوئے کہا "ہاں کوئی کتاب منگوانے کو کہہ گئی ہے۔ نہ جانے کیا نام ہے اس کا۔ ہاں! ہارٹ بریک ہاؤس!"

آپا اس کتاب کو مجھ سے چھپا کر دراز میں مقفل رکھتی تھی۔ مجھے کیا معلوم نہ تھا رات کو وہ بار بار کبھی میری طرف اور کبھی گھڑی کی طرف دیکھتی رہتی اسے یوں مضطرب دیکھ کر میں دو ایک جھوٹی انگڑائیاں لیتی اور، پھر کتاب بند کر کے رضائی میں یوں پڑ جاتی جیسے مدت سے گہری نیند میں ڈوب چکی ہوں۔ جب اسے یقین ہو جاتا کہ میں سو چکی ہوں تو دراز کھول کر کتاب نکال لیتی اور اسے پڑھنا شروع کر دیتی۔ آخر ایک دن مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے رضائی سے منہ نکال کر پوچھ ہی لیا "آپا یہ ہارٹ بریک ہاؤس کا مطلب کیا ہے۔ دل توڑنے والا گھر؟ اس کے کیا معنی ہوئے؟" آپا پہلے تو ٹھٹک گئی، پھر سنبھل کر اٹھی اور بیٹھ گئی۔ مگر اس نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ میں نے اس کی خاموشی سے جل کر کہا۔
"اس لحاظ سے تو ہمارا گھر بھی ہارٹ بریک ہے۔"

کہنے لگی "میں کیا جانوں؟"

میں نے اسے جلانے کو کہا "ہاں! ہماری آپا بھلا کیا جانے؟" میرا خیال ہے یہ بات ضرور اسے بری لگی۔ کیونکہ اس نے کتاب رکھ دی اور بتی بجھا کر سو گئی۔

ایک دن یوں ہی پھرتے پھراتے میں بھائی جان کے کمرے میں جا نکلی۔ پہلے تو بھائی جان ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر پوچھنے لگے "جہینا اچھا یہ تو بتاؤ کیا تمہاری آپا کو فروٹ سلاد بنانا آتا ہے؟" میں نے کہا "میں کیا جانوں؟ جا کر آپا سے پوچھ لیجئے۔" ہنس کر کہنے لگے "آج کیا کسی سے لڑ کر آئی ہو؟"

"کیوں میں لڑاکا ہوں؟" میں نے کہا۔

بولے "نہیں ابھی تو لڑکی ہو شاید کسی دن لڑکا ہو جاؤ" اس پر میری ہنسی نکل گئی۔ وہ کہنے لگے "دیکھو چھینا مجھے لڑنا بے حد پسند ہے میں تو ایسی لڑکی سے بیاہ کروں گا جو باقاعدہ صبح سے شام تک لڑ سکے، ذرا نہ اکتا سکے" جانے کیوں میں شرما گئی اور بات بدلنے کی خاطر پوچھا "فروٹ سلاد کیا ہوتا ہے بھائی جان؟"

بولے "وہ بھی کچھ ہوتا ہے۔ سفید سفید، لال لال، کالا کالا، نیلا نیلا سا" میں ان کی بات سن کر بہت ہنسی، پھر کہنے لگے "وہ مجھے بے حد پسند ہے یہاں تو چھینا ہم فیرنی کھا کر اکتا گئے" میرا خیال ہے یہ بات آپا نے ضرور سن لی ہوگی۔ کیونکہ اسی شام کو وہ باورچی خانے میں بیٹھی "نعمت خانہ" پڑھ رہی تھی۔ اس دن کے بعد روز بلا ناغہ وہ کھانے پکانے سے فارغ ہو کر فروٹ سلاد بنانے کی مشق کیا کرتی اور ہم میں سے کوئی اس کے پاس چلا جاتا تو جھٹ فروٹ سلاد کی کشتی چھپا دیتی۔ ایک روز آپا کو چھیڑنے کی خاطر میں نے بدّو سے کہا "بدّو بھلا بوجھو تو وہ کشتی جو آپا کے پیچھے پڑی ہے اس میں کیا ہے؟"

بدّو ہاتھ دھو کر آپا کے پیچھے پڑ گیا۔ حتیٰ کہ آپا کو وہ کشتی بدّو کو دینی ہی پڑی۔ پھر میں نے بدّو کو اور بھی چمکا دیا۔ میں نے کہا "بدّو جاؤ ذرا بھائی جان سے پوچھو اس کھانے کا کیا نام ہے —"

بدّو بھائی جان کے کمرے کی طرف جانے لگا تو آپا نے اٹھ کر وہ کشتی اس سے چھین لی اور میری طرف گھور کر دیکھا۔ اس روز پہلی مرتبہ آپا نے مجھے کیوں گھورا تھا؟

اس رات آپا شام ہی سے لیٹ گئی۔ مجھے صاف دکھائی دیتا تھا کہ وہ رضائی میں پڑی رو رہی ہے۔ اس وقت مجھے اپنی بات پر بہت افسوس ہوا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر آپا کے پاؤں پڑ جاؤں اور اسے خوب پیار کروں مگر میں ویسے ہی چپ چاپ بیٹھی رہی اور کتاب کا ایک لفظ تک نہ پڑھ سکی۔

انہی دنوں میری خالہ زاد بہن ساجدہ جسے ہم سب ساجو باجی کہا کرتے تھے، میٹرک کا امتحان دینے کے لئے ہمارے گھر آ ٹھہری۔ ساجو باجی کے آنے پر ہمارے گھر میں رونق ہو گئی۔ ہمارا گھر بھی قہقہوں سے گونج اٹھا۔ ساحرہ اور ثریا چارپائیوں پر کھڑی ہو کر باجی سے باتیں کرتی رہتیں۔ بدّو چھاجو باجی، چھاجو باجی چیختا پھرتا اور کہتا "ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کریں گے۔"

باجی کہتی "پہلے شکل تو دیکھو اپنی، پہلے منہ دھو آؤ۔" پھر وہ بھائی صاحب کی طرف یوں گردن موڑتی کہ کالی کالی آنکھوں کے گوشے مسکرانے لگتے اور وہ پنجم تان میں پوچھتی "ہے نا بھئی جاآن کیوں جی؟"

باجی کے منہ سے "بھئی جاآن" کچھ ایسا بھلا سنائی دیتا کہ میں خوشی سے پھولی نہ سماتی۔ اس کے برعکس جب کبھی آپا "بھائی صاحب" کہتی تو کیسا بھدا معلوم ہوتا۔ گویا وہ واقعی انہیں بھائی کہہ رہی ہو اور پھر "صاحب" جیسے حلق میں کچھ پھنسا ہوا ہو مگر باجی "صاحب" کی جگہ "جاآن" کہہ کر اس سادے سے لفظ میں جان ڈال دیتی تھی۔ "جاآن" کی گونج میں بھائی دب جاتا اور یہ محسوس ہی نہ ہوتا کہ وہ انہیں بھائی کہہ رہی ہے۔ اس کے علاوہ "بھئی جاآن" کہہ کر وہ اپنی کالی کالی چمکدار آنکھوں سے دیکھتی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتی تو سننے والے کو قطعی یہ گمان نہ ہوتا کہ اسے بھائی کہا گیا ہے۔ آپا کے "بھائی صاحب" اور باجی کے "بھئی جاآن" میں کتنا فرق تھا۔

باجی کے آنے پر آپا کا بیٹھ رہنا بالکل بیٹھ رہنا ہی رہ گیا۔ بدّو نے بھائی جان سے کھیلنا چھوڑ دیا۔ وہ باجی کے گرد طواف کرتا رہتا اور باجی بھائی جان سے کبھی شطرنج کبھی کیرم کھیلتی۔

باجی کہتی "بھئی جاآن ایک بورڈ لگے گا" یا بھائی جان باجی کی موجودگی میں بدّو سے کہتے "کیوں میاں بدّو کوئی ہے جو ہم سے شطرنج میں پٹنا چاہتا ہو؟" باجی بول اٹھتی "آپا سے پوچھئے" بھائی جان کہتے "اور تم؟" باجی بھوٹ رٹ کر سوچ میں پڑ جاتی، چہرے پر سنجیدگی پیدا کر لیتی، بھویں

سماتی اور تیوری چڑھا کر کھڑی رہتی پھر کہتی "اونہہ مجھ سے تو آپ ہٹ جاتیں گے"۔ بھائی جان کھلکھلا کر ہنس پڑتے اور کہتے "کل جو پٹی تھیں بھول گئیں کیا؟" وہ جواب دیتی "میں نے کہا چلو بھئی جا آن کا لحاظ کر دو۔ ورنہ دنیا کیا کہے گی کہ مجھ سے ہار گئے"۔ اور پھر یوں ہنستی جیسے گھنگھرو بج رہے ہوں۔

رات کو بھائی جان باورچی خانے میں ہی کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ آپا چپ چاپ چولہے کے سامنے بیٹھی تھی۔ بدو چھاجو باجی چھاجو باجی کہتا ہوا باجی کے دوپٹے کا پلو پکڑے اس کے آس پاس گھوم رہا تھا۔ باجی بھائی جان کو چھیڑ رہی تھی۔ کہتی تھی "بھئی جا آن تو صرف سات سے چھ پھلکے کھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ فیرنی کی پلیٹ مل جائے تو قطعی مضائقہ نہیں۔ کم ہی کیا۔ نہ کھائیں تو ممانی ناراض ہو جاتیں۔ انہیں جو خوش رکھنا ہوا، ہے نا بھئی جا آن؟" ہم سب اس بات پہ خوب ہنسے۔ پھر باجی ادھر اُدھر ٹہلنے لگی اور آپا کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ آپا کے پیچھے فروٹ سلاد کی کشتی پڑی تھی۔ باجی نے ڈھکنا سرکا کر دیکھا اور کشتی کو اٹھا لیا۔ پیشتر اس کے کہ آپا کچھ کہہ سکے باجی وہ کشتی بھائی جان کی طرف لے آئی "لیجئے بھئی جا آن" اس نے آنکھوں میں ہنستے ہوئے کہا "آپ بھی کیا کہیں گے کہ ساجو باجی نے کبھی کچھ کھلایا ہی نہیں"۔

بھائی جان نے دو تین چمچے منہ میں ٹھونس کر کہا "خدا کی قسم بہت اچھا بنا ہے، کس نے بنایا ہے؟" ساجو باجی نے آپا کی طرف انکھیوں سے دیکھا اور ہنستے ہوئے کہا "ساجو باجی نے اور کس نے بھئی جا آن کے لئے"۔ بدو نے آپا کے منہ کی طرف غور سے دیکھا۔ آپا کا منہ لال ہو رہا تھا۔ بدو چلا اٹھا "میں بتاؤں بھائی جان؟" —— آپا نے بڑھ کر بدو کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے گود میں اٹھا کر باہر چلی گئی۔ باجی کے قہقہوں سے کمرہ گونج اٹھا اور بدو کی بات آئی گئی ہو گئی۔ بھائی جان نے باجی کی طرف دیکھا۔ پھر جانے انہیں کیا ہوا۔ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ آنکھیں باجی کے چہرے پہ گڑ گئیں، جانے کیوں میں نے محسوس کیا جیسے کوئی زبردستی مجھے کمرے سے باہر گھسیٹ رہا ہو۔ میں باہر چلی آئی۔ باہر آپا انگنی کے قریب کھڑی تھی۔ اندر بھائی صاحب نے مدھم آواز میں کچھ کہا۔ آپا نے کان سے دوپٹہ سرکا دیا۔ پھر باجی کی آواز آئی "چھوڑئیے چھوڑئیے" اور پھر خاموشی چھا گئی۔

اگلے دن ہم صحن میں بیٹھے تھے۔ اس وقت بھائی جان اپنے کمرے میں پڑھ رہے تھے۔ بدو بھی کہیں اُدھر ہی کھیل رہا تھا۔ باجی حسب معمول بھائی جان کے کمرے میں چلی گئی، کہنے لگی "آج ایک دھنا تا بورڈ کر دکھاؤں۔ کیا رائے ہے آپ کی؟" بھائی جان بولے "واہ یہاں سے لگ لگاؤں تو جانے کہاں جا پڑے"۔ غالباً انہوں نے باجی کی طرف زور سے پیر چلایا ہو گا۔ وہ بناوٹی غصے میں چلائی "واہ آپ تو ہمیشہ پیری سے چھیڑتے ہیں!" بھائی جان معاً بول اٹھے "تو کیا ہاتھ سے ——" "چپ —— خاموش" باجی چیخی۔ اس کے بھاگنے کی آواز آئی۔ ایک منٹ تک تو پکڑ دھکڑ سنائی دی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

اتنے میں کہیں سے بدو بھاگتا ہوا آیا کہنے لگا "آپا! اندر بھائی جان باجی سے کشتی لڑ رہے ہیں۔ چلو دکھاؤں تمہیں۔ چلو بھی" وہ آپا کا بازو پکڑ کر گھسیٹنے لگا۔ آپا کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا اور وہ بت بنی کھڑی تھی۔ بدو نے آپا کو چھوڑ دیا۔ کہنے لگا "جاؤ اماں کہاں ہے؟" اور وہ اماں کے پاس جانے کے لئے دوڑا۔ آپا نے لپک کر اسے گود میں اٹھا لیا "آؤ تمہیں مٹھائی دوں"۔ بدو بسورنے لگا۔ آپا بولیں "آؤ دیکھو تو کیسی اچھی مٹھائی ہے میرے پاس" اور اسے باورچی خانے میں لے گئی۔

اسی شام میں نے اپنی کتابوں کی الماری کھولی تو اس میں آپا کی ہارٹ بریک ہاؤس پڑی تھی۔ شاید آپا نے اسے وہاں رکھ دیا ہو۔ میں حیران ہوئی کہ بات کیا ہے مگر آپا باورچی خانے میں چپ چاپ بیٹھی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس کے پیچھے فروٹ سلاد کی کشتی خالی پڑی تھی۔ البتہ آپا کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔

بھائی تصدق اور باجی کی شادی کے دو سال بعد ہمیں پہلی بار ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ اب باجی وہ باجی نہ تھی۔ اس کے وہ قہقہے بھی

نہ تھے۔ اس کا جسم زرد تھا اور ماتھے پر شکن چڑھی تھی۔ بھائی صاحب بھی چپ چاپ رہتے تھے۔ ایک شام اماں کے علاوہ ہم سب انگیٹھی کے پاس بیٹھے تھے۔ بھائی کہنے لگے "بدو ساجو باجی سے بیاہ کرو گے؟"

"اونہہ!" بدو نے کہا "ہم بیاہ کریں گے ہی نہیں۔"

میں نے پوچھا "بھائی جان یاد ہے جب بدو کہا کرتا تھا "ہم تو چھا جو باجی سے باہ کریں گے" اماں نے پوچھا "آپا سے کیوں نہیں؟" تو کہنے لگا "بتاؤں آپا کیسی ہے؟" پھر چولہے میں جلتے ہوئے اُپلے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا "یہ ایسی!" "اور چھا جو باجی؟" میں نے بدو کی طرح بجلی کے روشن بلب کی طرف انگلی سے اشارہ کیا "یہ ایسی!" عین اسی وقت بجلی بجھ گئی اور کمرے میں انگاروں کی روشنی کے سوا اندھیرا چھا گیا "ہوں یاد ہے!" بھائی جان نے کہا۔ پھر جب باجی کسی کام کے لئے باہر چلی گئی تو بھائی کہنے لگے "نہ جانے اب بجلی کو کیا ہو گیا۔ جلتی بجھتی ہی رہتی ہے۔" آپا چپ چاپ بیٹھی چولہے میں راکھ سے دبی ہوئی چنگاریوں کو کرید رہی تھی۔ بھائی جان نے مغموم سی آواز میں کہا "اُف کتنی سردی ہے؟" پھر اٹھ کر آپا کے قریب چولہے کے سامنے جا بیٹھے اور ان سلگتے ہوئے اپلوں سے ہاتھ سینکنے لگے۔ بولے "ممانی سچ کہتی تھیں کہ ان جلے ہوئے اُپلوں میں آگ دبی ہوتی ہے۔ اوپر سے نہیں دکھائی دیتی۔ کیوں سجدے؟" آپا پرے سرکنے لگی تو چمن سی آواز آئی جیسے کسی دبی ہوئی چنگاری پر پانی کی بوند پڑی ہو۔ بھائی جان منت بھری آواز میں کہنے لگے "اب اس چنگاری کو تو نہ بجھاؤ سجدے دیکھو تو کتنی ٹھنڈ ہے۔"

خواجہ احمد عباس

زعفران کے پھول

آؤ مسافر، یہاں! اس چنار کے سائے میں بیٹھ جاؤ۔ میں ابھی پانی پلاتی ہوں۔ .... وہ نیلی نیلی لمبی سی موٹر ہے نا تمہاری! .... پنکچر ہو گیا ہے! .... کوئی بات نہیں، اندھیرا ہونے سے پہلے سری نگر پہنچ جاؤ گے .... اب میں کریں کی تو بات ہی ہے ...... نہیں بیٹا مجھے پانی کی قیمت نہیں چاہئے۔ اور پھر پیسے لے کر کروں گی بھی کیا۔ میرا ہے ہی کون! ... اکیلی جان ہوں، زمیندار کے کھیت میں کام کرتی ہوں، چشمے سے پانی بھر لاتی ہوں، دھان کوٹ دیتی ہوں، اللہ کا شکر ہے مٹھی بھر چاول تو مل ہی جاتا ہے، پانچ اوپر ساٹھ عمر ہونے کو آئی۔ اور چاہئے ہی کیا ایک بڑھیا کو۔ آج مری کل دوسرا دن ... تم بھی کہتے ہو گے کس بکواسن سے پالا پڑ گیا ہے ... ...

کیا کہا تم نے بیٹا؟ ... نہیں نہیں گل لالہ کا نہیں یہ زعفران کا کھیت ہے ... ٹھیک کہتے ہو زعفران کے پھول سچ مچ کاسنی ہی ہوتے ہیں۔ ابھی آگے جاؤ گے تو دوسرے کھیتوں میں کاسنی پھول ہی پاؤ گے۔ پر یہاں اس سال زعفران کے سرخ پھول ہی کھلے ہیں ... اس کی وجہ کیا ہے؟ ... یہ خدا کی قدرت ہے بیٹا۔ پر تم میدانوں کے رہنے والے آج کل کے نوجوان، خدا اور اس کے کرشموں کو کب مانتے ہو۔ ہم کشمیریوں کو وہمی اور بیوقوف سمجھتے ہو کہ ہم ایسی باتوں میں اعتقاد رکھتے ہیں ... .

اب ان پھولوں کی پوری کہانی سن کر کیا کرو گے؟ ... ابھی تمہاری موٹر ٹھیک ہو جائے گی اور تم چلے جاؤ گے اور کہانی ادھوری رہ جائے گی ... موٹریں تو اس سڑک پر سے گزرتی ہی رہتی ہیں، بیٹا! اپنی دلی کو ٹھہرتی بھی ہیں تو بس دھول کے بادل اڑاتی چلی جاتی ہیں۔ پر یہ زعفران کی کھیتی یوں ہی کھڑی رہے گی، یہاں تک کہ پھول چننے کا وقت آ جائے گا اور یہ لال لال لہو کی بوندوں جیسے شگوفے سکھا کر وسادر کو بھیج دئے جائیں گے، اور نہ جانے ان کی خوشبو کہاں کہاں اور کس کس کے دسترخوانوں پر مہکے گی۔ اور تمہاری طرح کتنے ہی آدمی سوال کریں گے۔ اس زعفران کا رنگ لہو کی طرح سرخ کیوں ہے؟ ... پر کوئی نہ بتا پائے گا۔ کیونکہ اس کی وجہ تو صرف میں ہی جانتی رہوں۔

تم مجھے پاگل سمجھتے ہو نا! ... دیوانی بڑھیا جو نہ جانے کیا کیا بک رہی ہے ... ہے نا! ... پھر بھی اس لال زعفران کا بھید جاننا چاہتے ہو؟ ... یا ابھی تمہاری موٹر کے ٹھیک ہونے میں دیر ہے اور تم اس وقت کو ایک پگلی کی بڑ سن کر ہی کاٹنا چاہتے ہو!

... ... خیر جو بھی ہو۔ سننا چاہتے ہو تو سنو... ...

ہاں تو اس کھیت میں لال زعفران کے پھول تو اسی سال لگے ہیں پہلے یہاں بھی کاسنی پھول ہی لگا کرتے تھے۔ ساری وادی پہ بہار آجاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی نئی نویلی دلھن زعفرانی دوشالہ اوڑھے لیٹی ہے۔ اور خوشبو سے یہ سارا علاقہ مہک اٹھتا۔ سڑک پر موٹریں جو گزرتیں ان کی دھول کے بادلوں میں بھی خوشبو پھیل جاتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ زمین سے آسمان تک ہر چیز زعفران میں بسی ہوئی ہے... ...

تمہاری ہی طرح ایک اور مسافر بھی ایک بار اس کھیت کے پھولوں کو دیکھنے ٹھہر گیا تھا... کئی برس کی بات ہے۔ کوئی بہت ہی سیدھا آدمی معلوم ہوتا تھا، بے چارہ، کھیت میں جا کر پھولوں کے بیچوں بیچ میں کھڑا ہو گیا، اور لگا نتھنے پھلا پھلا کر ناک سے سانس لینے، جیسے پھولوں کو سونگھ رہا ہو بلکہ ان کی خوشبو کو پی رہا ہو۔ پھر آپ سے آپ ہی کہنے لگا۔

"عجیب بات ہے۔ کوئی بھی نہیں آئی؟"

میں نے پوچھا۔

"کون؟ آخر کس کو کھوجتے ہو"

تو جواب ملا

"ہنسی۔ ہنسی نہیں آئی۔ عجیب بات ہے حالانکہ کتابوں میں تو....."

تو بیٹا تب پتہ چلا کہ وہ بے چارہ کتابوں میں یہ پڑھ کر آیا تھا کہ اگر زعفران کے کھیت میں کھڑے ہو کر اس کی خوشبو سونگھو تو آپ سے آپ ہنسی آنے لگتی ہے۔ اتنے میں خدا کا کرنا کیا ہوا کہ سر پہ لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے زعفرانی آگئی۔ میں نے جو اسے یہ بات بتائی تو وہ لگی کھلکھلا کر ہنسنے، اور وہ اجنبی پہلے تو کھسیانا ہو گیا۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ زعفرانی کے قہقہے ختم ہونے ہی میں نہیں آتے تو لگا وہ بھی ہنسنے۔ ان دونوں کو ہنستے دیکھ کر مجھے بھی ہنسی آگئی۔ اور بعد میں اجنبی کہنے لگا کہ دیکھو کتابوں کا لکھا پورا ہوا کیونکہ زعفران کے کھیت میں ہم تینوں ہی کھڑے تھے اور تینوں کا ہنسی کے مارے برا حال تھا۔

... ... میں بھی کہاں سے کہاں پہنچ گئی... بیٹا بڑھاپے میں دماغ قابو میں نہیں رہتا۔ بات کرتے کرتے بہک جاتی ہوں.... ہاں تو زعفرانی... ... کیا کہا... ... زعفرانی کون؟... ... ابھی تو بتا چکی ہوں کہ زعفرانی میری بیٹی تھی... ... نہیں بتایا تھا؟... ... بھول گئی ہوں گی... ... لو دیکھو یاد کا یہ حال ہے بیٹا... ... ہاں تو اس کا نام تو اصل میں نوراں تھا، مگر گاؤں میں سب اسے زعفرانی کہہ کر پکارتے تھے۔ بات یہ ہے کہ بچپن ہی سے اس کی رنگت کچھ پیلی پیلی سی تھی، لڑکپن میں بچوں بچیوں کے ساتھ کدال مچایا کرتی تھی۔ وہ اسے زعفرانی کہہ کر چھیڑا کرتے اور جتنا وہ چڑتی اتنا ہی وہ اور شور مچاتے زعفرانی! زعفرانی!! ... ... تم جانو بچے کسی کی مانتے تھوڑا ہی ہیں... ... ہاں تو جب وہ جوان ہو گئی تو گاؤں کے لڑکے کہنے لگے کہ نوراں جیسی خوبصورت لڑکی تو ہمارے ہاں ایک بھی نہیں ہے، اس کی رنگت تو زعفران کے پھول کی طرح ہے۔ اس کی آنکھیں تو کھلے ہوئے کنول ہیں۔ اور نہ جانے کیا کیا اوندھی سیدھی باتیں، مجھے تو اس میں کوئی خوبصورتی وبصورتی نظر نہیں آتی تھی۔ ایک تو دبلی تھی، جیسے چشمے کے کنارے اگے ہوئے بید۔ بید مجنوں۔ میں کہتی بھلا ایسی لڑکی بچے کیسے جنے گی؟ اور پھر رنگت بالکل پیلی جیسے بیمار ہو۔ دیدے پھٹے ہوئے۔ اوپر سے یہ کہ تمیز نام کو نہیں، نہ چھوٹے کا خیال نہ بڑے کا۔ بس ہر وقت دھما چوکڑی سے مطلب، میں تو ذرا منہ نہیں لگاتی تھی۔ پر تین بھائیوں میں ایک بہن تھی وہ بھی سب سے چھوٹی۔ باپ اور دونوں بڑے بھائیوں نے لاڈ پیار میں بگاڑ رکھا تھا۔ میں سوچتی، ایسی لڑکی سے کون شادی کرے گا۔ پر وہاں تو جس کو دیکھو وہ زعفرانی ہی سے بیاہ کرنے پر تلا ہوا تھا... ... تم لڑکوں کی پسند کا بھی کچھ ٹھیک نہیں بیٹا... ...

ہاں تو پیغام پہ پیغام چاروں طرف سے آرہے تھے۔ یہاں تک کہ ذیلدار نے اپنے لڑکے کا پیغام بھی دے دیا جو شہر کے اسکول میں پڑھ رہا تھا بھلا

ایک معمولی کسان کی بیٹی کو اس سے اچھا کون سا بر مل سکتا تھا؟ ... میں نے سوچا زعفرانی کی قسمت کھل گئی ... پر خدا کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس سال جاڑے کے موسم میں نمونیہ کا بخار ایسا چلا کہ گھر والا اللہ کو پیارا ہو گیا۔ خدا اُسے جنت نصیب کرے، اس کا مرنا تھا کہ ہمارے گھر میں تو آفتوں پر آفتیں آنی شروع ہو گئیں۔ مرنے والے نے مہاجن سے قرضہ لے رکھا تھا۔ اس میں زمین کی قرقی ہو گئی۔ اس پر بھی میری ہمت نہ ٹوٹی۔ تین بیٹے تھے نا۔ میں نے سوچا روپے زمین سے کیا ہوتا ہے میری اصل پونجی تو میری اولاد ہے۔ ہاں ایک زعفرانی کی طرف سے فکر ضرور تھی کہ غریب اور یتیم بچی کو کون بیاہنے گا؟ ... سینکڑوں برسوں سے ہم اس گاؤں میں رہتے چلے آرہے ہیں۔ کبھی فصل اچھی ہوتی ہے کبھی بُری۔ کبھی بارش ہوتی ہے کبھی نہیں۔ کبھی اتنا پانی برستا ہے کہ کھیتیاں بہہ جاتی ہیں کبھی دھوپ میں جل جاتی ہیں۔ کبھی برف میں تباہ ہو جاتی ہیں۔ کبھی ہم اپنی زمین جوتتے ہیں کبھی دوسرے کی۔ قسمت کا اُونچ نیچ تو ہر ایک کے ساتھ لگی ہی رہتی ہے۔ اور بیٹا کبھی کبھی راجہ کے افسر ظلم بھی کرتے ہیں۔ پر راجہ پرجا کا کیا مقابلہ۔ صبر شکر سے زندگی کسی نہ کسی طرح بسر ہوتی جاتی ہے۔ مگر ٹھیک کہتے ہیں کہ یہ کلجگ ہے کلجگ۔ اس میں جو نہ ہو تھوڑا ہے ... کئی برس کی بات ہے ابھی گھر والا زندہ ہی تھا کہ ایک دن میں دھان کوٹ رہی تھی کہ میرا بیٹا دوڑ کر چلاتا ہوا آیا۔

"ماں۔ ماں! شیر کشمیر آئے ہیں، شیر کشمیر"

بس اتنا کہہ یہ جا وہ جا۔ میں چلاتی ہی رہ گئی کہ ارے اگر شیر آیا ہے تو ذیلدار صاحب کو بلا کے بندوق لے کے آویں ... تھوڑی ہی دیر میں کیا دیکھتی ہوں کہ سارے ہی گاؤں والے تو ——— کیا مرد اور کیا عورت اور کیا بچے بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ میں نے سوچا شیر کو پکڑ لیا ہوگا، جبھی تو عورتیں بچے بھی نڈر ہو کر جا رہے ہیں۔ چلو میں بھی تماشہ دیکھوں ...

وہ نقشہ آج تک یاد ہے مجھے۔ گاؤں کے اس سرے پر ... ارے وہ دیکھو ان درختوں کے پیچھے ——— ایک اسکول ہے ——— اب تو مڈل کا ہو گیا ہے۔ پر جب چار جماعتوں ہی کی پڑھائی ہوتی تھی ——— ہاں تو کیا دیکھتی ہوں کہ اسی اسکول کے سامنے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں۔ اور سامنے نہ شیر نہ چیتا، ایک لمبا سا گورا سا آدمی چبوترے پہ کھڑا زور زور سے کچھ کہہ رہا ہے۔ لوجی یہ تھا وہ شیر کشمیر ... میں نے کہا "لو خواہ مخواہ ہی ڈرا دیا۔ شیر تو شیر یہ تو کوئی معمولی درجے کا سرکاری افسر بھی نہیں ہے۔ بھلا افسر کہیں گاڑھے کھدر کے موٹے جھوٹے کپڑے پہنتے ہیں۔ جس طرح سے وہ زور زور سے تقریر کر رہا تھا، اس سے میں سمجھی کہ چائے بیچنے والا ہوگا۔ اب تھوڑی دیر میں کالا اترکھ کے بھونپو والا باجا بجائے گا۔ پھر مفت چائے سب کو بانٹے گا، اسی انتظار میں میں بھی وہاں جا کر کھڑی ہو گئی۔ پر وہ تو کشمیری میں بول رہا تھا۔ اور اگر یہ چائے والا تھا تو اس کی چائے تو بہت ہی گرما گرم اور خطرناک تھی۔ میں نے دو چار بول ہی سُنے تھے کہ ڈر گئی۔ یا اللہ اب ہمارے گاؤں پہ کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور آئے گی۔ وہ باتیں ہی ایسی کر رہا تھا کہ دل دہل جائے۔ ریاست کے اصل مالک راجہ اور اس کے افسر نہیں بلکہ ہم کسان ہیں۔ ہم پر ظلم ہو رہا ہے۔ سب کو مل کر اس کے خلاف آواز اُٹھانی چاہئے۔ آپس میں ایک ہو جانا چاہئے۔ لڑکوں لڑکیوں کو پڑھانا چاہئے۔ پڑھ لکھ کر یہ کشمیری قوم کے لیڈر بنیں گے۔ اور نہ جانے کیا کیا۔ میں نے تو پوری بات سنی بھی نہیں۔ زعفرانی منہ پھاڑے ایک کونے میں بیٹھی تھی۔

میں اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی چلی کہ گھر جا کے اس کے باپ سے ایسا پٹواؤں گی کہ پھر کبھی ہمت نہ پڑے ایسی خطرناک جگہ قدم دھرنے کی۔ پر بھیڑ کے آگے جہاں بڑے بوڑھے بیٹھے ہوئے تھے وہاں کیا دیکھتی ہوں کہ وہ تو خود ہی وہاں بیٹھا بڑے غور سے سُن رہا ہے۔ جل ہی تو گئی میں ...

تم تو جانتے ہی ہو تالاؤ کے بیچ میں ایک پتھر پھینک دو، سارے پانی میں ہل چل مچ جاتی ہے۔ تو بیٹا یہ شیر کشمیر بھی ایسا ہی ایک پتھر تھا جس نے ہمارے گاؤں کے ٹھیرے ہوئے پانی کو ہلا دیا۔ وہ دن اور آج کا دن آرام اور چین، صلح، شانتی کا نام نہیں رہا۔ جس کو دیکھو بے چین۔ جس کو دیکھو اس کی زبان پر شکایت۔ ہر ایک اپنی زندگی سے نالاں، اس کو بدلنے پہ تلا ہوا۔ میں کہتی ارے تمہارے باپ دادا نے بھی تو اپنی عمریں انھیں راجاؤں

مہاراجوں کے افسروں کے ظلم سہتے سہتے رُوکھی سُوکھی کھا کر صبر شکر سے کاٹ دیں، تم ہیں کون سُرخاب کے پر لگے ہیں کہ ساری دنیا کو بدلنے پر تُلے ہُوئے ہو ... ... پر میری کون سنتا ہے، بیٹیا ... ... وہ تھا اس شیر کشمیر نے جادو ہی ایسا کیا تھا ... ... تم میری باتوں سے اکتا گئے نا ! ... ... وہ زعفران کے لال پھولوں کا بھید ! ہاں ۔ ہاں ۔ بیٹیا، اسی کی بات تو کر رہی ہوں۔ تم بھی کیسے ہو گئے۔ یہ کہاں کا جھگڑا لے بیٹھی۔ پر بات یہ ہے کہ نہ تو گاؤں کے بٹیرے، شانت تلاؤ میں اس شیر کشمیر کی تقریر کا وہ پتھر گرتا اور نہ یہ زعفران کے پھول لال ہوتے ... ... یہ کیسے ؟ یہی تو بتا رہی ہوں پر تم بیچ میں ٹوکتے ہی جاتے ہو۔

ہمارے گاؤں میں اس کو گئے ہوئے دو چار مہینے ہوئے ہوں گے کہ خبر آئی کہ شیر کشمیر کو راجہ نے پکڑ لیا اور جیل میں بند کر دیا۔ میں نے کہا چلو اچھا ہوا۔ اب سب اس کی سکھائی پڑھائی باتیں بھول جائیں گے۔ اور وادی میں صبر شکر کے دن پھر لوٹ آئیں گے۔ پر جی اس کی گرفتاری پہ تو اور بھی اس کا چرچا ہونے لگا۔ جس کو دیکھو غصے میں بھرا ہوا ہے کہ ہمارے شیر کشمیر کو پکڑ لیا۔ اب اس سرکار کی خیر نہیں۔ اور ایسی باتیں کرنے والوں میں سب سے آگے آگے میرے لڑکے۔ تھوڑے دنوں میں سنا کہ چھوٹ گیا۔ میں نے سوچا یہ بھی اچھا ہوا نہیں تو یہ لڑکے سرکار کو برا بھلا کہتے رہتے اور ذیلدار یا کوئی سرکاری افسر سن لیتا تو لینے کے دینے پڑ جاتے ... ...

... ... جب تک باپ زندہ رہا تب تک بیٹے کچھ قابو میں رہے اس کا مرنا تھا کہ جس کا جدھر منہ اُٹھا اُدھر چل دیا۔ زمین تو جا ہی رہی تھی بڑا غلام نبی کہنے لگا، میں دوسرے کی زمین پر مزدوری نہیں کروں گا۔ اس سے تو بہتر ہے سری نگر یا گلمرگ میں مسافروں کا سامان اُٹھا کر لے جانے کا کام کروں۔ دو تین روپے روز کما سکتا ہوں۔ میں نے لاکھ سر پٹکا پر وہ ایک نہ مانا۔ جب گیا ہے تو سارے گاؤں کے لڑکوں میں سب سے زیادہ چوڑا چکلا سینہ تھا اس کا۔ چھ مہینے بعد دو چار دن کو جو آیا تو پہچاننا مشکل ہو گیا۔ رنگت زعفرانی سے بھی زیادہ پیلی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ماتھے پر گھاؤ جیسا گہرا گڑھا جہاں بوجھ سنبھالنے کے لئے مزدور پٹا باندھتے ہیں۔ اور رات بھر کھانستا۔ کبھی کبھی تو اتنا کہ ہوش نہ رہتا۔ میں نے کہا یہ کیا حالت ہو گئی تیری۔ کیا بیمار ہے۔ بولا نہیں ماں۔ بوجھ اُٹھانے والوں کے ماتھوں پر ایسا گڑھا تو پڑا ہی رہتا ہے۔ رہی کھانسی تو وہ اس دن تنگ مرگ سے ایک صاحب کا سامان گلمرگ لے جا رہا تھا، بیچ میں بارش آ گئی۔ بھیگنے سے زکام کھانسی ہو گئی ہے ... ... چار دن کے بعد جب وہ تنگ مرگ گیا تو منجھلا خود بھی ساتھ ہو لیا۔ کہنے لگا ماں باپ کا لحاظ ہی نہیں رہا تو یہاں رہنے سے کیا فائدہ۔ فرو دو کو گئے تین چار مہینے ہوئے ہوں گے کہ ذیلدار نے شہر سے آ کر کہا۔ غلام نبی کی ماں اب تمہاری خیر نہیں ہے۔ تمہارا منجھلا بیٹا تو شیخ عبداللہ کی پارٹی میں مل گیا ہے۔ دن میں کشتی چلاتا ہے۔ رات کو مزدوروں کے جلسوں میں جا جا کے تقریریں کرتا ہے۔ میں نے کہا۔ بی میڈ کی کو بھی زکام چڑھا۔ وہ شیر کشمیر تو سنا ماسٹر تھا پہلے۔ اس کسان کے چھوکرے کو دیکھو یہ بھی چلا ہے لیڈری کرنے۔ پر میں نے سب سے کہہ دیا کہ آج سے میرے سامنے اس کا نام نہ لینا۔ نہ وہ میرا بیٹا۔ نہ میں اس کی ماں ... ...

... ... زعفرانی ؟ تو اس کا ذکر کرنا ہی بھول گئی۔ تو بیٹیا اب ہمارے گھر میں رہ ہی گیا تھا کون۔ بس میں۔ زعفرانی اور سب سے چھوٹا لڑکا خضورا۔ زعفرانی اب بیس برس کی بن بیاہی بیٹھی تھی۔ گھر میں پیسے ہوں تو اس کی شادی کی بات چیت کروں۔ اور یہاں اوّل تو آمدنی ہی صفر تھی۔ ادھر سنا۔ سمندر پار ولایت میں لڑائی شروع ہو گئی، تو مہنگائی کا یہ عالم ہوا کہ بس کچھ مت پوچھو۔ میں اور زعفرانی دونوں کام کرتے تھے۔ کبھی کسی کے کھیت پر، کبھی جنگل سے لکڑیاں چن لاتے، کبھی پانی بھرتے، کبھی اُون کاتتے۔ تب جا کے دو وقت چولہا جلتا۔ میں نے کہا، خضورا دس برس کا ہو گیا۔ لاؤ اس کو بھی کام پہ لگا دیں۔ پر زعفرانی بولی نہیں ماں ہم تو خضورا کو مدرسے پڑھنے بھیجیں گے۔ میں نے کہا پاگل ہو گئی ہے۔ پر وہ ایک نہ مانی۔ مجھ سے کہے سنے بغیر اگلے دن سویرے خود اسے لے جا مدرسے میں داخل کرا آئی۔ جوان برابر کی لڑکی۔ اب میں اسے کہوں بھی تو کیا کہوں پھر اس کے بیاہ نہ ہونے کا بھی دکھ تھا۔ اس واسطے میں چپ ہی ہو گئی ... ... مگر میرا ماتھا ضرور ٹھنکا کہ آج اس گھر کا پہلا لڑکا مدرسے گیا ہے

اب نہ جانے کون سی مصیبت آئے گی ... یہ بیٹیا اس لونڈیا پہ تو پڑھائی کا بھوت سوار تھا دن رات بھائی کے پیچھے پڑی رہتی ... مدرسے سے آتا تو کہتی گھر پہ بیٹھ کر پڑھ۔ حساب کے سوال پوچھنے ماسٹر کے ہاں جا۔ یہ کر وہ کر۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ کتابیں گھول کر غلام نبی کو پلا دے ... بس گھر کیا بیری کا پیڑ ہوتا ہے بیٹیا، وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں ... بیس اکیس برس کی لڑکی۔ پھر شکل صورت میں محمود کا بچہ نہیں تھی تو کانی بھینگی چیچک داغ بھی نہیں تھی۔ اور تم جانو آج کل کے لونڈے۔ شہر جا کے سلیما بائسکوپ، ناچ رنگ نہ جانے کیا کیا دیکھ کے کتنے آوارہ ہو گئے ہیں ایک دن زعفرانی لکڑیاں چننے گئی تھی کہ کیا دیکھتی ہوں خالی ہاتھ واپس چلی آ رہی ہے۔ زار و قطار روتے ہوئے۔ میں نے پوچھا کہ کیا ہوا، تو کچھ جواب نہیں دیا اور سے چلی جا رہی ہے۔ ارے کم بخت کچھ کہے گی بھی کیا ہوا۔ کسی نے مارا، گالی دی۔ چوٹ لگ گئی۔ آخر ہوا کیا۔ اسکا جواب سن کر میں تو دنگ رہ گئی۔ بیٹیا بات ہی اس نے ایسی کہی جو کبھی ماں نے اپنی بیٹی کی زبان سے کبھی نہیں سنی ہو گی۔ کہنے لگی۔

"ماں! میرا بیاہ کر دو"۔ اور پھر لگی رونے۔ دس دفعہ پوچھا تب یہ بات کھلی کہ لکڑیاں چن رہی تھی کہ ذیلدار کا لڑکا جو شہر سے آیا ہوا ہے ادھر آن نکلا اور لڑکی کو اکیلا دیکھ کر لگا اول فول بکنے۔ جب زعفرانی نے جھڑکا تو اس کا ہاتھ پکڑ کر بدارادے سے اپنی طرف گھسیٹنے لگا بڑی مصیبت سے ہاتھ چھڑا کر بھاگ آئی تھی بے چاری۔ مگر اس بد معاش کی ہول دل میں تھی — میں ابھی تک پتے کی طرح تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اور رو رہی تھی۔ اور جب ذرا ہچکیاں رکتیں تو یہی کہتی۔

"ماں میرا بیاہ کر دو۔ نہیں تو ایک دن میری عزت مٹی میں مل جائے گی ...

... اب تم ہی بولو بیٹیا، غریب عورت کرے تو کیا کرے۔ جب دمڑی پاس نہ ہو تو کیسے بیاہ رچائے لڑکی کا بیاہ رچائے ... پھر بھی میں نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی کہ کوئی غریب مگر طبیعت کا شریف آدمی مل جائے جو زعفرانی کو بیاہ لے تو یہ فکر تو دور ہو جائے۔ مگر پچاس ساٹھ روپے تو تب بھی چاہئیں۔ زمین زیور یہاں تک کہ میرے اور زعفرانی کے کانوں کے بالے بھی بک چکے تھے۔ اب تو کچھ بھی نہیں تھا جس کے سہارے قرضہ ہی مل جاتا۔ اسی ادھیڑبن میں لگی ہوئی تھی کہ ایک دن ایک آدمی آیا۔ شکل صورت سے بے چارہ قلی معلوم ہوتا تھا۔ وہی ماتھے پر پیٹے کا نشان۔ عمر پتہ نہیں کیا تھی۔ پر پچاس کا معلوم ہوتا تھا۔ کہنے لگا۔

"غلام نبی نے یہ بھیجا ہے۔ میں اس کا دوست ہوں محمود"۔ یہ کہہ کر ایک میلے سے کپڑے کی پوٹلی میرے سامنے رکھ دی۔ کھول کر دیکھا تو نوٹ اور روپے اور کچھ ریزگاری۔ گنے تو پانچ اوپر ساٹھ روپے اور دس آنے ہوئے۔ وہ بولا

"غلام نبی نے کہا تھا کہ ماں سے کہنا۔ اس روپے سے زعفرانی کا بیاہ کر دیں"

میں نے خدا کا شکر کیا کہ بیٹے کے دل میں ماں بہن کا خیال تو آیا۔ پھر محمود کے منہ پہ کچھ عجیب سی حالت دیکھ کر میں نے پوچھا۔

"غلام نبی کا کیا حال ہے؟ وہ نہیں آیا؟"

محمود کے گلے میں آواز پھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ٹھیر ٹھیر کر بولا جیسے بولنا نہ چاہتا ہو۔

"ماں جی! غلام نبی تو چل بسا۔ اُسے دِق ہو گئی تھی"۔ اور بس چپ ہو گیا

... بیٹیا! تم لوگ نہیں سمجھ سکتے کہ بیٹے کی موت کا ماں پہ کیا اثر ہوتا ہے ... ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کلیجے کا ٹکڑا کسی نے کاٹ کر نکال لیا ہو۔ ماں نو مہینے بچے کو پیٹ میں رکھتی ہے نا۔ دو سال دودھ پلاتی ہے۔ بچہ اس کے خون، اس کے گوشت پوست سے بنتا ہے۔ اور پھر وہ بڑا ہو کر غلام نبی کی طرح چوڑے چکلے سینے والا نوجوان ہو جاتا ہے۔ اور پھر گدھے کی طرح صاحب لوگوں کا سامان ڈھوتے ڈھوتے خون کی کھانسی کھانستا ہوا مر جاتا ہے ... اور اس کے ساتھ ماں بھی مر جاتی ہے ... اور سب سے بڑی موت یہ ہوتی ہے کہ وہ پھر بھی زندہ رہتی ہے ... ...

میرا تو جو حال ہوا سو ہوا، زعفرانی پہ بھائی کی موت کا کچھ عجیب ہی اثر ہوا، چھوٹے بھائی کی پڑھائی کی فکر اور بھی پڑ گئی۔ ہر وقت اس کی جان پہ سوار رہتی کہ پڑھ۔ تختی لکھ۔ مدرسے کا کام کر۔ گھڑی بھر کھیلنے کی بھی چھٹی نہ دیتی۔ جیسے اُسے کوئی خاص جلدی ہو کہ سال بھر کی مدرسے کی پڑھائی دو چار ماہ ہی میں پوری ہو جائے۔ نہ جانے کیوں اتنی جلدی تھی اُسے۔ نہ جانے کیوں؟ ... ...

ہاں اور محمدو کے پاس بیٹھ کر زعفرانی نے بھائی کے آخری ایام کا سب حال کرید کرید کر پوچھا۔

"کب اور کیسے بیمار پڑا، علاج ہوا یا نہیں؟ کیا سب سامان ڈھونے والے مزدوروں کو اسی طرح دق ہو جاتی ہے؟"

اور جب محمدو نے کہا۔

"ہاں بہت سوں کو" ۔ تو نہ جانے کیوں زعفرانی نے اس سے پوچھا۔

"تو کیا تم واپس جا کر پھر یہی کام کرنے لگو گے؟ یہاں کیوں نہیں رہ جاتے؟ ... ... نہ جانے کیوں ... ...

... ... میرے کہنے سے محمدو ہمارے ہاں تین دن اور ٹھیرا۔ جس روز وہ جا رہا تھا میں نے اس سے پوچھا

"کیوں محمدو! جب یہ کام اتنا خطرناک ہے تو چھوڑ کیوں نہیں دیتا؟"

وہ بولا

"چھوڑ کر کیا کروں گا، ماں جی؟ اور کوئی کام آتا نہیں ہے۔ اور پھر کوئی آگے ہے نہ پیچھے نہ ماں نہ باپ ... ..."

میں نے جلدی سے پوچھا

"اور بیوی؟"

اُس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"کب کی مر گئی"

پتہ نہیں وہ میرا مطلب سمجھا یا نہیں، پر میں نے کہا۔

"دوسری کیوں نہیں کر لیتے؟"

اس کو تین دن میں میں نے ہنستے تو کیا مسکراتے بھی نہ دیکھا تھا۔ پر اس بات پر اس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک پیدا ہوئی اس کے سوکھے چرطے جیسے چہرے پر ہنسی کی جھریاں پڑ گئیں۔

"مجھ سے کون بیاہ کرے ہے، ماں جی؟"

... ... تو بٹیا یوں زعفرانی کا بیاہ محمدو سے طے پایا۔

... ... کیا کہا! زعفرانی کی رائے؟ بٹیا بھلا شادی بیاہ کیا لڑکیوں کی صلاح سے ہوتے ہیں۔ پر میں نے زعفرانی سے ذکر کیا کہ اگلے چاند کی بیسویں کو محمدو اسے بیاہنے آئے گا۔ تو یہ تو میں نہیں کہوں گی کہ وہ سن کر خوش ہو گئی۔ بھلا شریف لڑکیاں کیا شادی کے ذکر پر خوش ہوا کرتی ہیں ... ... پر اس کے چہرے سے اطمینان ضرور ٹپکتا تھا۔ جیسے اب اس کی کوئی چنتا دور ہو گئی ہے۔

شادی کی چھوٹی موٹی تیاریوں میں دن گزر گئے۔ ہاں بٹیا، آخر ہم غریبوں کو بھی کچھ نہ کچھ تو دینا ہی پڑتا ہے۔ چاہے ایک ہی جوڑا اور دو چاندی کے بالے ہوں۔ جس دن محمدو آنے والا تھا اسی دن میں نے سویرے ہی سے زعفرانی کو اٹھا کر نہلا دھلا کر شادی کا جوڑا پہنا دیا۔ گلابی رنگ کا پیراہن اور اس کے نیچے سبز پھول دار چھینٹ کی شلوار۔ ہم پرانے زمانہ کے کشمیری عورتیں تو بس لمبے لمبے پیراہن ہی پہنا کرتی تھیں۔ مگر اسی شیر کشمیر کے کہنے سے آج کل لڑکیوں نے شلواریں بھی پہننی شروع کر دی ہیں۔ یہاں تک کہ زعفرانی تو مجھے بھی مجبور کرتی تھی کہ ماں شلوار پہنو نہیں تو شیر کشمیر خفا ہو جائیں گے۔ شیر دیسے ڈرے

میری بلا، پر اور عورتیں بھی اب شلوار پہننے لگی تھیں۔ سو میں نے سوچا میں ہی کیوں نکو بنوں۔ سو میں نے بھی سلوا لی ...

اتنا غصہ آیا ہے مجھے اس شیر کشمیر پہ کہ کمبخت کو اگر پکڑا جانا تھا تو کیا اسے وہی دن جڑا تھا جب میری بیٹی کا بیاہ طے پایا تھا۔ یکایک سارے گاؤں میں شور مچ گیا "شیر کشمیر پکڑے گئے۔ شیر کشمیر پکڑے گئے" مجھے کیا پتہ کیوں سرکار نے اسے پکڑا تھا ... میری طرف سے اگر سال کے بارہ مہینے قید رکھا جاتا تو اور بھی اچھا تھا ... پر یہ ضرور سنا کہ اب کے اس نے خود راجہ ہی کو ریاست سے باہر نکالنے کی بات چلائی تھی۔ میں نے کہا اب اس شیر نے شیر ببر کے بھٹ میں پنجہ ڈالا ہے۔ اب یہ زندہ نہیں بچے گا۔ باہر شور کی آواز ہوئی تو میں گلی میں آئی یہ سوچ کر کہ شاید محمد و اور اس کے ساتھی برات لاتے ہوں مگر وہاں تو بچے دھینگا مشتی مچا رہے تھے۔ دو چار لال جھنڈے جن پہ ہل بنا ہوا تھا لئے "شیر کشمیر زندہ باد" "ڈوگرا راج مردہ باد" گھمتے پھر رہے تھے۔ اور ہمارا غفورا چھ اینٹوں کا چبوترہ بنائے سفید کھریا سے دیوار پہ کچھ لکھ رہا تھا۔ اور زور زور سے ہجے پڑھتا جاتا تھا ... "ک ش م ی ر چھ وڑ دو" ... اور زعفرانی دروازے میں کھڑی غفورا کو دیکھ رہی تھی اور اب اس کے چہرے پر اتنی خوشی تھی جیسے اس نے ایک بڑا کام پورا کر لیا ہو۔

... ہاں تو ابھی میں اندر جا کر بیٹھی ہی تھی کہ باہر سے رونے اور چلانے کی آوازیں آئیں۔ میں نے جو دیکھا تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ ایک خاکی رنگ کی موٹر لاری کھڑی تھی، اور اس میں سے سپاہی کود کر، بچوں کو لاٹھیوں سے مار رہے تھے، میں دیوار کی طرف دوڑی، جہاں پل بھر پہلے غفورا کھڑا ہوا کھریا مٹی سے لکھ رہا تھا۔ غفورا اب نہیں تھا۔ ہاں خون کی ایک لکیر زمین پہ کھنچی ہوئی تھی اور اس لکیر کی سیدھ میں جو میں نے دیکھا تو غفورا کو زمین پہ بے ہوش پڑا پایا اس کے سر میں ایک گہرا گھاؤ تھا جس میں سے خون بہہ رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں ابھی تک کھریا کا ٹکڑا تھا ... میں اپنے غفورا کو اٹھا کر اندر لے آئی اور وہاں اپنی بہن کی گود میں اس نے جان دے دی۔ اور بے ہوشی میں بھی آخر وقت تک اس کے ہونٹ انہی حرفوں کو دہراتے رہے۔ جنہیں وہ باہر دیوار پہ لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ک ش م ی اور ابھی ر نہیں کہہ پایا تھا کہ گڑگڑاہٹ کے ساتھ ایک ہچکی آئی اور اس مہینے میں دوسری بار مجھے موت آئی پر نہ آئی ... ...

... اور اس کے بعد کیا ہوا، بیٹا، یہ مجھے ایسا یاد ہے، جیسے کوئی ڈراؤنا خواب ہو جس میں ایک خوفناک بات کا دوسری خوفناک بات سے کوئی تعلق نہ ہو، مگر پھر بھی خوف اور وحشت کا پہاڑ اٹھتا چلا جائے ... ...

... زعفرانی کی آنکھیں جو کبھی کنول سے ہلتی جلتی ہرا کرتی تھیں اس وقت دو دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح تھیں ... ... آنسوؤں کا نام نہیں تھا۔ نہیں تو وہ آگ بجھ جاتی جو اس وقت ان میں سلگ رہی تھی ... ... اور پھر سارے گاؤں والوں کا ایک جلوس۔ مردوں سے آگے عورتیں۔ اور عورتوں میں سب سے آگے زعفرانی۔ وہی اپنی شادی کا جوڑا پہنے ہوئے۔ اور اس کی آنکھوں میں وہی دہکتی ہوئی آگ۔ اور یہ سارا مجمع گاتے ہوئے کھیتوں میں سے ہو کر سڑک کی طرف جاتا ہوا۔ جہاں بالکل اسی جگہ جہاں تمہاری موٹر کھڑی ہے، سپاہیوں کی خاکی لاری کھڑی تھی۔

... بڑی بڑی مونچھوں اور کالی رنگت والے سپاہی اوسان کی بندوقیں جو ٹکٹکی باندھے اس جلوس کی طرف ان عورتوں کی طرف اور زعفرانی کی طرف دیکھ رہی تھیں ... ...

... ایک تڑاخہ دس بارہ تڑاخے۔ سب تتر بتر ہو کر بھاگے۔ اور اس کھیت کے بیچوں بیچ اپنی چھاتی کو سنبھالتی ہوئی زعفرانی نرم مٹی میں اس طرح گری جیسے ماں کی گود میں بچہ آن کر گر پڑے میں ادھر بھاگی۔ پہ جب تک میں پہنچوں، زعفرانی کی چھاتی میں سے خون کی ایک دھار بہتی ہوئی کھیت کی سوکھی مٹی کو سیراب کر رہی تھی ... عورت کی چھاتی اور اس میں سے دودھ کی بجائے خون ... ... خون مٹی میں رل رہا تھا ... ...

اور میری بیٹی میری گود میں جان دے رہی تھی۔ پہ مرتے دم تک اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی، اور نہ جانے کیوں آخری ہچکی سے پہلے اس نے مسکرا کر مجھ سے کہا۔

"میرا بیاہ ہو گیا ماں"

... ... یہیں اسی کھیت میں جہاں تم اب گلِ لالہ کی طرح سُرخ زعفران کے پھول دیکھتے ہو۔

... ... بسنتی بیٹیا! تم نے میری کہانی؟ ... ... پر تم کہاں ہو؟ ... ... چلے گئے نا تم! ... ... میں نہ کہتی تھی کہ ابھی تمہاری موٹر ٹھیک ہو جائے گی اور تم لوگ چلے جاؤ گے اور کہانی نہ سُن پاؤ گے۔

... ... موٹریں تو اس سڑک پر سے گزرتی ہی رہتی ہیں، بٹیا، پل دو پل کو ٹھہرتی بھی ہیں تو پھر دُھول کے بادل اڑاتی چلی جاتی ہیں پر یہ زعفران کی کھیتی یوں ہی کھڑی رہے گی یہاں تک کہ پھول چننے کا وقت آ جائے گا۔ اور یہ لال لال لہو کی بوندوں جیسے شگوفے سکھا کر ودساور کو بھیج دیئے جائیں گے۔ اور نہ جانے ان کی خوشبو کہاں کہاں اور کس کس کے دستر خوانوں پر سے مہکے گی۔ اور تمہاری طرح کتنے ہی آدمی سوال کریں گے کہ "اس زعفران کا رنگ لہو کی طرح لال کیوں ہے؟" ... ... پر کوئی نہ بتا پائے گا۔ کیونکہ اس کی وجہ تو صرف میں ہی جانتی ہوں ... ... "

اختر حسین رائے پوری

مجھے جانے دو

"مجھے جانے دو" اس نے کہا۔ اور جب تک میں اسے روکوں وہ ہاتھ چھڑا کر جا چکی تھی۔ اندھیرے میں اس کی آنکھوں کی ایک جھپک اور دہلیز پر پاؤں کے بچھوے کی ایک جھنک سنائی دی۔ وہ چلی گئی اور میں کوٹھڑی میں اکیلا رہ گیا۔

میں وہاں جانا چاہتا تھا۔ میں اکثر اس مکان کے آگے سے گزرتا تھا اور شام کے وقت کچھ جوان لڑکیوں کو اس کے پھاٹک کے آگے کھڑا پاتا تھا۔ جاڑے کی راتوں میں نیم آستین جمپر پہنے ہوئے یہ چھوکریاں راہ چلتوں کو لبھانے کی تدبیر کیا کرتی تھیں۔ کوئی بھی آنکھوں والا غازے سُرخی میں عصمت کے خون کی جھلک دیکھ سکتا تھا۔ ان کے جسم کا ہر رواں تھرتھرا کر کہہ رہا تھا ——— ہمیں لے لو ——— ایک روپیہ کے بدلے۔

ان میں سے بعض سگریٹ کا دھواں نہایت نزاکت سے کسی رنگیلے کے منہ پر پھونک دیتی تھیں۔ اور کوئی منچلی کسی بدنما مارواڑی کے جوتے پر پان کی پیک تھوک دیتی تھی۔ جب وہ پلٹ کر دیکھتا تو لڑکیاں آنکھ مار کر کھِل کھِلا پڑتی تھیں۔ ان کی ہر ادا زبانِ حال سے کہتی تھی ——— ہمیں لے لو ——— ایک روپیہ کے بدلے۔

ٹرام پر شریف زادیوں اور موٹروں پر امیر زادیوں کے کھیپ کے کھیپ گزرا کرتے تھے۔ ان سستی طوائفوں پر نظر پڑتے ہی وہ توبہ و استغفار کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگتی تھیں۔ یہ بدبخت! نسوانیت کی کلنک۔ خدا غارت کرے، چند ٹکوں کے لئے، شراب کی بوتل یا سگریٹ کی ایک ڈبیہ کے لئے یہ اپنا تن ہر ایرے غیرے کے سپرد کر دیتی ہیں ——— اور ہم! ——— پھر وہ اپنے شوہروں کو یاد کرنے لگتی تھیں جنہوں نے انہیں اونچی حویلیاں، ریشمی ساریاں اور چھ چھ بچے عطا کئے تھے۔

اس مکان سے لگ کر کالی دیوی کا ایک چھوٹا سا مندر تھا۔ یہ کالی کلوٹی اور ننگ دھڑنگ دیوی اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے لیل و نہار کا تماشا دیکھا کرتی تھی۔ شام جب آتی شروع ہوتی اور کم سن لڑکیاں اس کے سامنے ناچنے لگتیں تو مٹی کے چراغوں کی دھندلی جوت میں اس کی شکل زیادہ پُراسرار ہو جاتی۔ معلوم ہوتا کہ عورت کی روح ایک سیاہ کفن اوڑھے ہوئے اپنی قبر سے اٹھی ہے۔ اور ایک آن میں مرد کو فنا کر دے گی۔ جو لوگ درشن کے لئے آتے وہ ہاتھ باندھے ہوئے للچائی ہوئی نظروں سے ان رقاصاؤں کو تاکا کرتے تھے۔ اور جب وہ التفات نہ کرتیں تو یہ زیادہ بے باکی سے ان طوائفوں کو گھورنے لگتے۔ جو پجاری کے ڈر کے مارے سیڑھی کے نیچے سر جھکائے کھڑی رہتی تھیں۔

ان میں سے ایک کا انداز سب سے نرالا تھا۔ اس کے دل میں پوجا کی عظمت کا احساس مطلق نہ تھا۔ وہ سگریٹ پیتے ہوئے اطمینان سے آرتی کا تماشا دیکھتی اور وقتاً فوقتاً کیرتن کے لئے پیروں سے ٹیک دینے لگتی۔ جب کوئی بوڑھا اپنی پھٹی ہوئی آواز سے تال کو بے تال کر دیتا تو وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑتی اور پنواڑی کو پکار کر کہتی ——— "ارے ذرا سی سُرتی تو بنانا"
اور کیرتن کا نغمہ کسی مجروح پرندے کی طرح دیر تک تڑپتا رہتا۔

جب میں نے پہلی مرتبہ اسے دیکھا تو میرا دل آپ ہی آپ مبہوت ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں وہاں سے بھاگتے بھاگتے بھی اس کے قریب پہنچ گیا۔

لیکن اس نے بے پروائی سے مجھے دیکھا اور اپنی ایک سہیلی سے پوچھنے لگی ——— "اری اس حرام زادے سے کتنے اینٹھے؟"

اب میں ہر شام کو اس فٹ پاتھ پر سے گزرنے لگا۔ جب وہ اس مقام پر ہوتی تو ذرا حیرانی سے میری طرف دیکھتی اور پھر کچھ مسکرا کر اپنی ہم چشموں سے باتیں کرنے لگتی تھی۔ کبھی وہ وہاں نہیں بھی ہوتی تھی۔ اور میں سمجھ جاتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ میرے دل پر چوٹ سی لگتی۔ خون کی روانی تیز ہو جاتی اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں آ جاتیں۔ وہ ہٹ کر لیمپ کے کھمبے کا سہارا لئے میں گھنٹوں کھڑا رہتا تھا۔ حتیٰ کہ پیر شل ہو جاتے تھے۔ میں یونہی ٹکٹکی باندھے اس پھاٹک کو تاکا کرتا تھا۔ بہتیرے شریف اس کے اندر سے نکلتے اور دائیں بائیں دیکھ کر لپکتے ہوئے بھیڑ میں گم ہو جاتے تھے۔ لمبی لمبی چوٹیوں اور گھنیری داڑھیوں والے بیسیوں بدمعاش اس چکلہ گھر سے برآمد ہو کر بھیگی بلیوں کی طرح پنجے دبائے بھاگتے نظر آتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے اس سے کیونکر ہم کلام ہونے کی جرأت کی تھی۔

اس روز میں اپنے سب سے پیارے دوست کو قبر میں لٹا کر لوٹا تھا۔ اب دنیا میں کوئی اپنا نہ تھا۔ وہ دق میں گھل گھل کر مر گیا اور میں اس کے علاج کا کوئی انتظام نہ کر سکا۔ جب وہ مر گیا تو ہم نے اسے مٹی کے تودوں کے نیچے دبا دیا۔ جب وہ قبر میں سُلا دیا گیا تو میں نے کلیجہ تھام کر آخری مرتبہ اس کے چہرے کو دیکھا۔ اس پر اب بھی وہی بھولا پن تھا۔ گویا انسان سماج کی قبر میں چاندی کے ڈھیلوں کے نیچے دب گیا۔ اور اس نے مرتے مرتے کہا "میری پیپ تمہارے جسم کو سڑائے گی، میرا خون تمہارے بدن کو تپائے گا، میرے آنسو تمہارے گوشت کو گلائیں گے۔"

میں قبرستان سے لوٹا تو میرے جسم کے اندر کچھ نہ تھا۔ ضمیر کی جگہ کوئی چیز بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ ایک خلا جس میں کاہش کے سوا کچھ نہ تھا۔ شام کے وقت بلا ارادہ میں اسی مکان کے آگے موجود تھا۔ میں نے بنا کچھ کہے ہاتھ پکڑ کر اسے اندر گھسیٹ لیا۔

اس نے مجھے ایک روپیہ دے کر کہا "اس مندر کے پیچھے کی گلی میں ایک کلال کی دکان ہے۔ وہاں سے ایک ادھا خرید لاؤ۔ شراب!"

میں نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ لیکن اس وقت نہ جانے کیا ہو گیا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ ہر وہ کام اچھا ہے جسے دنیا بُرا کہتی ہے۔ پھر میں اس کلال کی دکان میں گھس گیا۔

مٹی کے بڑے بڑے مٹکے جن پر جھاگ کے بادل سمٹ آئے تھے۔ جیسے بھینس کے تھن سے دودھ چمک رہا ہو۔ ان میں مکھیاں اور مکوڑے تیرتے ہوئے، اندر متوالے مل کر گا رہے تھے۔

"ایکشا نمبر دُن کا آآآآ... بھا آآآ... دے نا آآ......"

میں نے جلدی سے ایک ادھا خریدا، اور دونّی کی چاٹ چٹپٹی مسالے دار۔

اس نے منہ لگا کر دیکھتے دیکھتے آدھی بوتل ختم کر دی۔ پھر چپ چاپ ایک سگریٹ سلگایا اور میری گود میں اپنے پاؤں پھیلا کر

ٹوٹی ہوئی آرام کرسی پر دراز ہوگئی۔

یک بیک وہ زور سے ہنسی اور مجھے غور سے دیکھ کر پوچھا "تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

ہوا بند تھی۔ کھڑکی سے آسمان کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نظر آ رہا تھا جس میں دو تین ستارے چنبیلی کے پھولوں کی طرح کھلے ہوئے تھے۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس سوال کا جواب کیا ہو سکتا تھا۔

"بولتے نہیں۔ میں پوچھ رہی ہوں کہ تم یہاں کس غرض سے آئے ہو۔ مجھے اس مرد سے نفرت ہوتی ہے جو عورت کے پاس بیٹھ کر اپنا مدعا زبان سے نہیں بلکہ نگاہ سے ظاہر کیا کرتا ہے، اور اس گھڑی کا منتظر رہتا ہے، جب عورت خود اس سے پوچھے کہ تم کیا چاہتے ہو؟"

اس نے بوتل کی بچی ہوئی شراب اپنے گلے کے نیچے اتار لی۔ سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر باہر دیکھنے لگی میں بدستور چپ تھا۔ خود مجھے بھی نہیں معلوم تھا کہ میں کیوں آیا ہوں اور کیا چاہتا ہوں۔

پھر وہ اٹھ کر کوٹھری میں ٹہلنے لگی۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ آئینہ کے سامنے کھڑی ہوگئی اور اس میں اپنی صورت دیکھنے لگی۔ وہ دوبارہ ہنسی تو مجھے ایسا لگا کہ کوئی مردہ ہنس رہا ہے۔

"یہ میری ہی صورت ہے۔ اگر میں کاجل، غازہ اور لالکھے کو دھو ڈالوں تو کیا رہ جائے ——— وصندلی آنکھیں، پچکے ہوئے گال، سوکھے ہوئے ہونٹ۔ تین سال کے اندر کیا سے کیا ہو گیا۔ میرے جسم کو گھن لگ چکا ہے، میں اندر سے کھوکھلی ہوگئی ہوں۔ مجھے ایسی ایسی بیماریاں لگ گئی ہیں جن کے تصور سے تمہیں وحشت ہوگی اور تم یہاں سے بھاگ جاؤ گے!"

دیر تک وہ کچھ سوچتی رہی۔ اس کا منہ غصہ سے تمتما رہا تھا۔ مجھ پر آنکھیں گاڑ کر وہ کہنے لگی "اور یہ بیماریاں مجھے کہاں سے لگیں، یہ تم جیسے چاہنے والوں کا ہی عطیہ ہے مرد ——— سوزاک اور آتشک کے جراثیم کا باپ!

تم ابھی اس کوچے سے ناواقف ہو۔ تم نہیں جانتے کہ عورت کیا ہے۔ اگر تمہیں اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح معلوم ہوتا کہ وہ مٹی کا ایک کھلونا ہے اور بس۔ تو تم آتے ہی اسے توڑ دیتے۔ یوں حیرت اور ہیبت سے مجھے نہ تاکا کرتے۔ مگر تم ان لوگوں سے اچھے ہو جو درندوں کی طرح دیکھتے ہی ہمارے سینوں پر آتے ہیں۔ ہمیں کتوں کی طرح بھنبھوڑتے ہیں۔ اور جب ہڈیوں میں گودا نہیں رہتا تو ہمارے پلّوں میں دو چار ٹکلیاں باندھ کر چلے جاتے ہیں۔

پھر گھر والی آتی ہے۔ ہماری گرہ سے ایک ایک چھدام نکال کر لے جاتی ہے۔ اور اس کے بدلے ہمیں کھانے کے لئے روٹیاں اور سنگار کے لئے کاجل کی سلائی دے جاتی ہے۔

دن کے اُجالے میں جب تم لوگ ادھر آتے جاتے ہو تو حقارت سے منہ پھیر کر اپنے ساتھیوں سے کہتے ہو یہاں چھنالا ہے۔ ان ٹکلیتی طوائفوں کو عصمت یا عزت کا ذرا پاس نہیں انہیں شہر سے نکال دینا چاہئے۔

مگر رات کے اندھیرے میں تم کشاں کشاں آتے ہو۔ اور ان خرابوں کو آباد کرتے ہو۔ تم اپنا منہ کالا کرکے اپنی حرام کمائی کے چند درم ہمیں دیتے ہو۔ اور پھر اس تجسس میں اپنی حرم سرا کو بھاگتے ہو کہ بیوی تو خیریت سے ہے؟

وہ ہانپنے اور کھانسنے لگی۔ اس کا سانس پھول گیا اور وہ چارپائی پر گر پڑی۔ اس نے در و دیوار کو دیکھا اور آپ ہی آپ کہنے لگی "زیادہ دن نہیں۔ یہ مصائب بہت جلد ختم ہو جائیں گے۔ اب سب کچھ خواب معلوم ہوتا ہے۔

جب میں مر جاؤں اور میری لاش لاوارثوں کے قبرستان میں پھینک دی جائے تو تم علی گڑھی کے مولانا نور الاسلام سے ملنا۔ اس وقت ان کے پاس جانا جب وہ منبر پر بیٹھے جمعہ کا خطبہ سنا رہے ہوں، اور تمہیں شرافت کی قسم کہ وہ اخلاق کی تفسیر بیان کرنے لگیں تو اپنی صف سے

نکل کر کہنا۔ مولانا! میں ایک پردیسی ہوں اور آپ کو یہ پیغام سنانے کلکتہ سے آیا ہوں کہ بداخلاقی اس دنیا سے چل بسی۔ اب آپ ناحق نہ بسورئیے۔ اور جب سب بڈھے اپنی عینکیں کھسکا کر تمہیں گھوریں اور پوچھیں کہ یہ کیا بکتا ہے تو کہنا ہیں آپ کی بیٹی کے جنازہ کا تماشا دیکھ کر آرہا ہوں وہ جسے ایک حرامی بچہ پیدا کرنے کے جرم میں آپ نے گھر سے نکال دیا تھا۔ اسے ایک مردِ مومن نے کچھ دنوں کے لئے اپنے گھر ڈال لیا۔ اور اسی طرح ہاتھوں ہاتھ وہ کلکتہ پہنچ کر طوائف کا پیشہ کرنے لگی۔ آپ کے ہم جنسوں نے تحفہ میں اسے گھناؤنی بیماریاں دیں۔ اور جب وہ مرگئی تو ایک حافظ نے اس کی قبر پہ فاتحہ خوانی کی جب تم یہ کہہ چکو گے تو لوگ تمہیں بہت پیٹیں گے۔ لیکن اپنی محبت کے صدقے میں اتنی تکلیف اٹھالینا۔"

میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہاں سے بھاگ جاؤں مگر پیروں میں جیسے زنجیر پڑگئی۔

وہ پھر کھانسنے لگی۔ جب اس کا جی کچھ سنبھلا تو میں نے دیکھا کہ وہ چپکے چپکے رو رہی ہے۔ "تم لوگ جانوروں پر رحم کھاتے ہو۔ ان پر کوئی تشدد کرتا ہے تو سزائیں دیتے ہو۔ میں نے سیٹھوں کو دیکھا ہے کہ چیونٹیوں کو شکر اور سانڈوں کو پوریاں کھلاتے ہیں ——— مگر عورت! آہ عورت پر اتنا ظلم کیوں کرتے ہو؟

مگر عورتیں بیویاں بن کر طوائفوں سے مردوں کی بہ نسبت زیادہ نفرت کرتی ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ ہمارا وجود ان کے حق میں کتنی بڑی نعمت ہے ہم انہیں زنا بالجبر، اغوا اور علانیہ عصمت دری سے بچاتی ہیں۔

اور خدا! ——— وہ ہماری کیوں نہیں سنتا۔ اگر اس کی جنت میں حوروں کے لئے جگہ ہے تو دنیا کا ایک کونہ ہمیں کیوں نہیں مل سکتا؟"

اب ہوا چل رہی تھی۔ اور تاڑ کے پتے غم ناک آوازیں گرا رہے تھے۔ سڑک پر ٹریموں اور موٹروں کا شور بہت کم ہو گیا تھا۔ البتہ اکے دکے رکشا کی گھنٹی بج اٹھتی تھی۔ بادلوں نے آسمان کے اس ٹکڑے کو گھیر لیا تھا۔ اور ان میں کبھی کبھی بجلی چمک جاتی تھی۔

وہ پھر بولنے لگی "میں نے صرف ایک مرتبہ محبت کی ہے۔ اور اب بھی اس فریب میں مبتلا ہوں کہ وہ سچی محبت تھی۔ یہ فریب کبھی نہ ٹوٹے گا۔ کیونکہ قبل اس کے کہ میں اس کا امتحان لوں وہ مرچکا تھا۔

وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر کس التجا سے مجھے دیکھتا تھا۔ وہی تصور مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ میں نے اپنا مایۂ حیات اسے سونپ دیا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ اس امانت کو لوٹائے وہ پلیگ میں مرگیا۔

اس نے مجھے جو بچہ دیا وہ حرامی تھا۔ کاش ہماری محبت کو اخلاق کی مہر مل جاتی اور میرا بچہ مل جاتا۔"

ان بھولی ہوئی باتوں کی یاد سے اس کا دل بھر آیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کس طرح دلاسا دوں۔ جس ماں کے آگے اس کے بچے کی لاش پڑی ہوئی ہو، اور جس عورت کے آگے اس کے محبوب کا جنازہ، اسے تسلی دینے کا اسلوب کوئی زبان پیدا نہیں کرسکتی۔

"جیسے وہ عدالت کے آگے بیان دے رہی ہو" میری سوتیلی ماں نے اندھیری رات میں اس بچے کی لاش آنگن میں گاڑ دی۔ اپنے بستر پہ لیٹے لیٹے بجلی کی روشنی میں میں نے وہ نظارہ دیکھا اور پھر بے ہوش ہوگئی۔

دو تین روز بعد میرے سوتیلے ماموں نے مجھے گاڑی میں بٹھا کر الٰہ آباد کا ٹکٹ ہاتھ میں تھما دیا۔ یہیں سے میری مصیبت کا آغاز ہے۔

الٰہ آباد ... میرے نسبتی خالو کا مکان .... میری مرضی کے خلاف عصمت دری ..... بدنامی کا ڈر ..... کلکتہ ....

یہ چکلہ گھر ....."

زیرلب وہ ٹوٹے پھوٹے جملے دہراتی رہی اور چند لمحوں کے لئے اس کی آنکھ لگ گئی۔

میں دبے پاؤں اٹھا اور نکل بھاگنے کی نیت سے جوتے پہننے لگا۔ اتنے میں وہ چونک کر اٹھ بیٹھی "کیا تم جا رہے ہو؟" اس نے اداسی

سے پوچھا۔ اب اس کی آواز نرم و نحیف ہو گئی تھی۔

میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اب بھی کچھ نہ کہہ سکا۔

"اچھا تو جاؤ۔ خدا حافظ! اب نہ آنا۔ میں تم سے انتقام نہیں چاہتی۔ اور کوئی ہوتا تو میں بصد شکر یہ زہرِ سوزاک اور آتشک کے چند جراثیم نذر کرتی۔ وہ کسی اور کو دیتا، اور یہ اس کے بچوں کو ورثہ میں ملتے۔ غرض ساری انسانیت ان امراض میں مبتلا ہو جاتی۔ تب شاید سماج کے ٹھیکے داروں کو ہوش آتا کہ اس بلا کی جڑ کہاں ہے۔

مگر بھی کبھی آ کر پوچھ لینا کہ میرے مرنے میں کتنی دیر ہے۔ کوئی کانوں میں کہہ رہا ہے کہ زیادہ دیر نہیں۔

کوئی بھری جوانی میں مرتا ہے تو لوگ افسوس کرتے ہیں کہ کیسا نامراد چلا۔ لیکن مجھے دیکھو کہ زندگی سے موت کے سوا کچھ نہیں مانگتی۔ تم نہیں جانتے کہ ہم آپ اپنی نظر میں کتنی ذلیل ہیں۔ ہمارا ہر لمحہ دوسروں کی خوشنودی میں بسر ہوتا ہے۔ ہم ایسی لونڈیاں ہیں جن کے آقا ہر روز بدلتے ہیں کیوں کس خیال میں گم ہو گئے۔ جاؤ خدا کے لئے چلے جاؤ۔"

لیکن میں نہ جا سکا۔ مجھے اس سے کچھ نہیں لینا تھا۔ پھر میں گرفتارِ نظر پرندے کی طرح اپنی جگہ سے ٹل نہ سکا۔

"میں نہیں جاؤں گا۔" یہ کہہ کر میں نے اپنا سر اس کے آغوش میں رکھ دیا۔ وہ ایک بے جان لاش کی طرح یونہی پڑی رہی۔ اس کے دل کی دھڑکن کو میں صاف سن سکتا تھا۔ اس کی روح کا نوحہ میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔

"تو پھر مجھے جانے دو۔" اس نے کہا ——— اور وہ چلی گئی۔

ملک راج آنند

حجاموں کی یونین

جدید ہندوستان کی تعمیر میں ہمارے گاؤں کے چندو حجام کا بھی بڑا حصّہ تھا۔ ضرورت ہے کہ میں اُس کی تاریخی خدمات کی طرف توجہ دلاؤں، ورنہ ممکن ہے دنیا اُسے فراموش ہی کر دے۔ اس نے ایک عظیم الشان کارنامہ اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ دنیا کو حق شناسی کا ثبوت دینا چاہیئے۔ یہ عجیب و غریب کارنامہ کچھ اس قسم کا ہے کہ شروع میں خود چندو بھی اُس کی پُوری پُوری اہمیت سے واقف نہ تھا۔ اس وقت وہ ہندوستان کے دوسرے بڑے آدمیوں کی طرح اپنی اہمیّت کو بہت زیادہ نہیں خیال کرتا تھا۔ لیکن قدرتاً جو خود پسندی بڑے آدمیوں میں ہوتی ہے۔ وہ اُس میں بھی آ گئی ہے۔ یہ خود پسندی اُسے بُری بھی لگتی تھی۔ اور اسے زیب بھی دیتی تھی۔

میں چندو کو ان دنوں سے جانتا ہوں جب وہ ایک پھٹا ہوا کُرتا پہنا کرتا تھا۔ یہ کرتا پھٹا ہوا بھی کچھ اس طور سے تھا کہ بمشکل اس کا ننگا اور پچھڑا ہوا پیٹ ڈھکتا تھا۔ ہم اکٹھے گاؤں کی گلیوں کی کیچڑ میں کھیلا کرتے تھے۔ کبھی سپاہی بنتے تھے، کبھی دوکاندار اور کبھی کلرک ان کے علاوہ اور بھی کئی کھیل تھے۔ جو ہم نے اپنی تفریح کے لئے ایجاد کئے تھے۔ اس تفریح میں اور کوئی شریک نہیں ہوتا تھا۔ ہاں البتہ ہماری مائیں کبھی کبھی آ کر دیکھ جاتی تھیں۔

چندو مجھ سے کوئی چھ ماہ بڑا ہوگا۔ ساری باتوں میں وہی پیش پیش رہتا تھا۔ میں بھی بخوشی اُس کے نقشِ قدم پہ چلتا رہا۔ چونکہ اُسے بھڑ پکڑنے کا خاص ملکہ تھا۔ وہ بھڑ کی دم کو دبا کر بڑی ہوشیاری سے ڈنک نکال لیتا اور پھر اس کی ننھی ٹانگوں سے تاگا باندھ کر اڑاتا تھا۔ لیکن میں جب کبھی کوئیں کی منڈیر کے چھوٹے چھوٹے گڑھوں پہ سے بھڑ پکڑنے کی کوشش کرتا، تو مجھے ضرور سزا بھگتنا پڑتی۔ بھڑ اکثر میرے گالوں پہ کاٹ لیتی تھی۔

ہم کچھ بڑے ہوئے تو پھر بھی ویسے ہی چندو مجھے دنیا بھر کی خوبیوں کا مجسّمہ معلوم ہوتا تھا۔ اب تو وہ قسم قسم کے کنکوے بھی اُڑا لیتا تھا ان کنکوؤں کا توازن کچھ اس ڈھب کا ہوتا تھا کہ اُنہیں قابو میں رکھنا میرے بس کی بات نہ تھی۔

اسکول کے کام کاج میں وہ مجھ سے پیچھے تھا۔ وہ میری طرح سوال نہیں نکال سکتا تھا وجہ یہ تھی کہ اس کے پتا نے اسے شروع ہی سے آبائی پیشہ سکھا دیا تھا۔ اور لوگوں کی حجامت بنانے کے لئے اُس کو گھر گھر جانا پڑتا تھا۔ اسکول کا کام کرنے کے لئے اس غریب کو وقت ہی کہاں ملتا تھا لیکن اُسے گیت بہت یاد تھے۔ اس فن میں وہ مجھ سے بہت بڑھا ہوا تھا۔ اُسے نہ صرف یہ کہ کتاب کے سارے گیت ازبر یاد تھے۔ بلکہ وہ نثر کے صفحے اس شان سے زبانی سنا دیتا تھا کہ وہ سب گیت ہی معلوم ہوتے تھے۔

امتحان ہوا۔ چندو نے وظیفہ حاصل کیا۔ ماتا جی کو یہ بات ناگوار معلوم ہوئی، کہ اس کو تو اسکول سے کچھ نقد بھی ملے اور میں فیس پاس سے دیکر تعلیم حاصل کروں۔ اب وہ مجھے چندو کے ساتھ کھیلنے سے منع کرتی تھیں۔ کہتی تھیں چندو ایک حجام کا بیٹا ہے اور کمین ذات کا ہے اور یہ بھی کہتی تھیں کہ مجھے اپنی ذات اور مرتبے کو پہچاننا چاہئے۔ میں نے اپنے والدین سے اور کوئی باطنی اوصاف تو حاصل کئے ہوں گے۔ لیکن برتری کا کوئی احساس یقیناً وراثت میں نہیں پایا تھا۔ مجھے تو اس سُرخ نشان سے بھی شرم آتی تھی۔ جو ماتا جی صبح کو میرے ماتھے پر لگایا کرتی تھیں۔ چست اچکن، سفید لٹھے کا پاجامہ، سنہری طلا کا جوتا۔ ریشم کی پگڑی غرض کہ مجھے ایسی کوئی چیز نہ بھاتی تھی۔ چندو جو کپڑے پہنتا تھا۔ کچھ عجیب سے ہوتے تھے ان میں شکن بھی ہوتے تھے اور چکنے چکنے بھی رہتے تھے۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ مجھے بھی حق ہونا چاہئے کہ چندو کی طرح کپڑے پہنوں ——— ایسے کپڑے جو وضع داری سے بے نیاز ہوں۔

چندو بہت کہا کرتا تھا جو اُسے ایک پنشن یافتہ صوبیدار نے دی تھی۔ اُس کی قمیص کے اوپر ایک مخمل کی واسکٹ بھی ہوتی تھی۔ جو سیپ کے بٹنوں سے سجی ہوئی تھی۔ وہ ایک گول نمدے کی بنی ہوئی ٹوپی پہنتا تھا۔ یہ ٹوپی کبھی ہمارے گاؤں کے وکیل لالہ حکم چند جی کے سر کی زینت ہوا کرتی تھی۔

چندو کے پتا پلیگ کی بیماری سے اس دنیا سے سدھار گئے۔ ان کے بعد چندو بالکل آزاد ہو گیا۔ جو جی میں آتا تھا کرتا تھا۔ اسکی آزادی قابل رشک تھی۔ صبح ہی صبح وہ اُونچی ذات کے شرفا کے گھروں میں جا کر ان کے سر اور خط بنایا کرتا تھا۔ پھر خود نہا دھو کر اپنے کپڑے پہن لیتا تھا اتنے میں لالہ حکم چند جی کی گاڑی تیار ہو جاتی تھی۔ اور وہ بھی وکیل صاحب کے ساتھ پائیدان پر بیٹھ کر شہر کو چل دیتا تھا۔ یہ شہر گاؤں سے چھ میل کے فاصلے پر تھا۔

چندو مجھ پر بڑی نوازش کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ مجھے شہر جانے کے بہت کم موقعے ملتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ تین میل تک جوتیاں چٹخاتے خوف خدا دل میں لئے ہوئے جودھیالہ کے مڈل سکول میں پہنچ جاؤں اور کہیں آنا جانا نہیں ہوتا۔ اُس نے پتا کی وفات کے فوراً بعد ہی اسکول کو خیر باد کہہ دیا اور بے رحم اُستادوں کی زد و کوب سے بچ گیا تھا۔ وہ میرے لئے شہر سے رنگ بھرنے والا برش، سنہری روشنائی سفید چاک، پنسل تراش، جس میں دو طرفوں والا پھل لگا ہوتا ہے۔ اور اس قسم کے اور بھی کئی تحفے لایا کرتا تھا۔ وہ مجھے متمدن دنیا کے بازاروں کی مختلف النوع چیزوں کی تفصیل سنایا کرتا تھا۔ اس سے مجھے بے حد خوشی ہوتی تھی۔ واپسی پر اُسے پھر وکیل صاحب کی گاڑی کے پائیدان پر آنا ہوتا تھا۔ اس لئے اُسے کچہری میں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ یہاں پر اکثر وہ صاحب لوگوں، وکیلوں چپراسیوں اور پولیس کے سپاہیوں کو دیکھا کرتا تھا۔ اور ان کی انگریزی وضع قطع کی پوشاک پر دل کھول کر تبصرہ کیا کرتا تھا۔ اُس نے دو ایک مرتبہ مجھ پر یہ خواہش ظاہر کی تھی۔ کہ وہ اپنے گھر کے مٹکے سے کچھ رقم اڑا لے۔ یہ مٹکا گویا ان کا دولت خانہ تھا۔ جہاں چندو کی ماں اُس کی پیشہ وارانہ چابکدستی سے حاصل کی ہوئی مزدوری کو جمع رکھتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس رقم سے کلام خان کا سارا سامان خرید لے یہ کلام خان شہر کے دندان ساز تھے۔ چندو کہا کرتا تھا۔ یہ خانصاحب لوگوں کے منہ میں دانتوں کی قطاریں لگا کر اور مصنوعی آنکھیں جما کر معجزہ ہی تو کر دیتے ہیں۔ کلام خان کا حلیہ اُس نے اس طرح بیان کیا تھا۔ وہ ایک آدمی ہے۔ بالوں میں ایک طرف کو چیر لگاتا ہے۔ مادے سے سخت کی موٹی قمیص پہنتا ہے۔ اس کے اوپر گلے میں ایک ہاتھی دانت کا سا کالر

ہوتا ہے اور اس میں ایک بوٹائی لگ رہی ہوتی ہے۔ ایک سفید رنگ کا کرتا ہوتا ہے۔ نیچے ایک پٹی دار پتلون اور سیاہ رنگ کا پمپ شو، اوپری پوشاک جو وہ کام کرنے کے وقت پہنتا ہے۔ ربڑ کی بنی ہوئی ہے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ یہ جادوگر بڑی مہارت کے ساتھ اپنے چمڑے کے بیگ کو کھولتا ہے اور اپنے چمکدار لوہے کے اوزاروں کو بڑے طمطراق کے ساتھ باہر نکالتا ہے۔ پھر چندو نے اس مسئلے پر میری رائے دریافت کی کہ کیا وہ حجام جس کے پاس پرائمری کی سند بھی موجود ہو۔ اگر کلام خاں کا سا لباس پہن لے تو زیادہ معزز نہیں بن جائے گا؟ اس نے مجھ سے یہ بھی کہا۔ اگرچہ میں نے کچھ زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ لیکن انسان کے جسم کے اوپر جو کیل پھنسی پھوڑے وغیرہ نکل آتے ہیں ان کا علاج تو میں بھی جانتا ہوں۔ میں نے اپنے پتاجی سے سیکھا تھا۔ اور انہوں نے اپنے پتاجی سے یہ تعلیم لی تھی۔

میں نے اس کے اس منصوبے کی تائید کی۔ اور پرجوش انداز میں اس کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ ایک دن وہ صبح ہی صبح ہمارے ہاں آیا۔ اسے دیکھ کر میرے رگ و پے میں جذبات کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اس نے ایک سفید پگڑی باندھی ہوئی تھی۔ ایک ربڑ کا کوٹ زیب بدن تھا اگرچہ یہ کچھ بڑا تھا۔ لیکن تھا بڑے ٹھاٹھ والا۔ پاؤں میں سیاہ رنگ کا ایک پمپ شو تھا، اتنا چمکدار کہ اس میں مجھے اپنا چہرہ صاف صاف دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چمڑے کا بیگ تھا۔ وہ اپنے روزمرہ کے چکر پر نکلا تھا اور مجھے دکھانے آیا تھا کہ وہ اپنے اس نئے ساز و سامان سے کتنا بارعب ہو گیا ہے۔

اُسے دیکھتے ہی بے ساختہ میرے منہ سے نکلا "عجیب! عجیب"!

وہ زمیندار کے گھر کی طرف جس کا خط وہ ہر روز بنایا کرتا تھا، تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا چل دیا۔ میں بھی اس کی داد دیتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اس وقت گلی میں کوئی بھی نہ تھا۔ تنہا میں ہی اس کی شان و شوکت کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر کے لباس میں ملبوس تھا۔ خود شناسی میں محو، گاؤں کی دیواروں کے اوپلوں سے اپنی پوشاک کو بچاتا ہوا۔ اور غلیظ پانی سے ہٹتا ہوا، جو گاؤں کی گلیوں میں اکثر بہتا رہتا ہے۔ چلا جا رہا تھا۔ جیسے ہی کہ ہم زمیندار کے گھر میں داخل ہوئے ہمیں دیوی ہلا۔ یہ زمیندار کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھ کر تالیاں بجائیں اور کہا چندو آیا! چندو آیا! گرجا مشن اسکول کے پادری صاحب کی طرح خوبصورت اور شاندار کپڑے پہنے ہوئے۔

موٹی توند والے زمیندار بیج چند نے اپنا ہاتھ پوتر جینو پہ پھیرتے ہوئے کہا۔ "رام! رام! یہ جینو اس کے کان پر لٹک رہا تھا۔ چونکہ وہ ابھی ابھی نہا کر آیا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی کہنے لگا "سؤر کہیں کا! ہمارے گھر میں گئو ماتا کے چمڑے کا بیگ لئے اور کسی جانور کے، نہ جانے کس جانور کے گودے کا بنا ہوا کوٹ اور منحوس کالا انگریزی جوتا پہنے چلا آ رہا ہے۔ نکل! دور ہو! شیطان کے بچے"۔ تم ہمارے دھرم کو بھرشٹ کرو گے۔ پتا نے آنکھیں بند کیں تو ایسا ہو گیا کہ دنیا میں کسی کا بھی ڈر نہیں؟

چندو کہنے لگا "لیکن جاگیردار صاحب! میں نے تو ایک ڈاکٹر کا لباس پہنا ہوا ہے"۔

"سؤر کہیں کا! نکل یہاں سے! جا اور وہ کپڑے پہن جو ایک نیچ ذات حجام کو زیب دیں۔ اپنے ان نئے نرالے خیالات سے ہاتھ اُٹھا ورنہ ڈنڈوں سے تمہاری تواضع کی جائے گی"۔

چندو نے عرض کی "لیکن لالہ بیج چند جی .....؟"

"چلے جاؤ! چلے جاؤ! نکمے کہیں کے قریب مت آنا ورنہ ہمیں گھر بھر کو گئو کے گوبر سے پوتر کرنا ہو گا"۔

چندو کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ وہاں سے واپس ہو لیا۔ کچھ بدحواس بھی ہو رہا تھا۔ میری طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھ بھی نہ سکا۔ اس کی توہین ایک ایسے شخص کے سامنے ہو رہی تھی جو اسے ایک برگزیدہ ہستی خیال کرتا تھا۔ پھر وہ بڑھتا ہوا اتھا نو رام کی دوکان کی طرف چلا گیا۔ یہ صاحب گاؤں کے ساہوکار تھے اور گلی کے موڑ پر پنساری کی دوکان کرتے ہیں۔

زمیندار کا لڑکا دیوی اپنے پتا کے اس سخت سلوک کو برداشت نہ کر سکا۔ اور شور و شغب کرنے لگا۔ میں اس کو خاموش کرانے کے لئے ٹھہر گیا اس کے بعد جب میں گلی کے موڑ پر آیا تو دیکھا کہ وہ ساہوکار صاحب چنے تولنے کے لئے ہاتھ میں ترازو لئے ہوئے ہیں اور چندو غریب کو بے نقط سنا رہے ہیں " سور تمہیں چاہئے تھا کہ پتا کے مرنے کے بعد اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتے اور اپنی بوڑھی ماں کی خدمت کرتے، نہ یہ کہ کبھی بھانڈ مسخرے کی طرح رنگ رنگ کے سوانگ بھرتے پھرتے۔ ہسپتال کے لوگوں کے سے ناپاک کپڑے پہن کر پھر رہے ہو۔ جاؤ اپنے کپڑے پہن کر آؤ۔ ورنہ میں تم سے خط نہیں بنواؤں گا " ساہوکار صاحب جوش میں یہ لعن طعن کرتے تھے اور اپنے ہاتھ سے چوٹی کی مقدس گانٹھ پر ہاتھ پھیرتے جاتے تھے چندو محبت دل برداشتہ ہو گیا۔ غصے میں آکر میرے پاس سے بھاگ کھڑا ہوا۔ گویا کہ اس سارے افسوسناک حادثے کا میں ہی ذمہ دار تھا۔ مجھے بے حد تشویش تھی۔ میں اس سوچ میں تھا کہ چندو مجھ سے نفرت کرنے لگا ہے۔ اس لئے کہ میں بھی اونچی ذات سے تعلق رکھتا ہوں۔

میں نے پیچھے سے بلند آواز میں کہا " پنڈت پرمانند جی کے پاس جاؤ اور کہو جو کپڑے تم نے پہن رکھے ہیں غلیظ نہیں ہیں "

پرمانند جی کو زمیندار نے بھلا بھیجا تھا کہ فوراً اس ناپاک مسئلے پر بات چیت کر لی جائے میں نے یہی کہا تھا کہ پرمانند جی زمیندار کے گھر سے نکلتے ہی کہنے لگے " اچھا تو تم بھی اس کے ساتھ شامل ہو۔ اسکول کی تعلیم نے آج کل کے لڑکوں کا ستیاناس کر دیا ہے۔ تم یہ لباس پہن لو تو مناسب بھی ہے۔ چونکہ تم بڑے ودوان بننے والے ہو۔ لیکن اس نیچ ذات کے لڑکے کا اس لباس سے کیا واسطہ تھا۔ وہ ہماری ڈاڑھیوں کو ہاتھ لگاتا ہے۔ سروں کو چھوتا ہے اور ہمارے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑتا ہے۔ پرماتما نے پہلے ہی سے اسے ناپاک بنایا ہے اب وہ اور زیادہ ناپاک کیوں بنتا ہے۔ تم اونچی ذات کے ہو برہمن ہو اور وہ نیچ ذات ملیچھ ہے "

چندو نے بھی یہ باتیں سن لی تھیں۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا بھی نہیں۔ غصے میں بھاگتا ہوا چلا گیا۔ ایسے کہ اُسے کوئی اشد ضروری کام آن پڑا ہو۔ میری ماتا مجھے کہہ رہی تھیں۔ بیٹا! اب تمہارے اسکول جانے کا وقت ہے۔ کھانا کھا لو اور اسکول جاؤ۔ ورنہ تمہیں دیر ہو جائے گی موقع تو ٹل ہی گیا تھا۔ چنانچہ وہ بھی مجھے اس حجام لڑکے سے میل ملاپ نہ رکھنے پر لیکچر پلانے لگیں۔

چندو کی شامتِ اعمال نے سارا دن مجھے بے چین رکھا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں رہتا تھا۔ جب میں اسکول سے واپس آیا تو اُسے وہاں سے بلانا چاہا۔ اس کی ماں مشہور زبان دراز عورت تھی۔ چونکہ وہ اونچی ذات کی بہو بیٹیوں سے جا ملتی تھی اور بے تکلفی کے ساتھ کہ وہ شاید آپس میں بھی اس طرح سے نہ ملتی ہوں گی۔ اس سے اُس کو کافی جرأت ہو گئی تھی۔ لیکن مجھ پر وہ ہمیشہ سے مہربان تھی۔ اب کچھ طنز آمیز لہجے میں کہنے لگی۔ کیوں نہ ہو پورے ساٹھ سال کی ذلت اور رسوائی کوئی برداشت کرے تو اُس کے لب و لہجہ میں طنز آ ہی جاتی ہے۔ " ہاں تو تم آ گئے۔ تم یہاں اپنے دوست سے ملنے کے لئے آئے ہو گے۔ اگر تمہاری ماں تمہیں یہاں دیکھ پائیں تو میری آنکھیں پھوڑ دیں کہ میری نگاہیں تمہارے خوبصورت چہرے پر کیوں پڑیں۔ تم ایسے ہی بھولے بھالے ہو جیسے کہ نظر آتے ہو۔ یا کہ تم بھی اپنے بھائی بندوں کی طرح چھپے رستے بگلے بھگت ہو "

میں نے اس سے دریافت کیا " اماں چندو کہاں ہے ؟ "

اب اُس نے قدرے مخلصانہ لہجے میں کہا۔ " بیٹے! میں نہیں جانتی ہوں کہ وہ کدھر کو نکل گیا ہے۔ شہر ہی کی طرف کہیں گیا ہو گا۔ کہتا تھا سڑک پر کچھ آدمیوں نے حجامت بنوائی تھی اور اُن سے کافی پیسے مل گئے تھے۔ اب مجھے معلوم نہیں کہ وہ کس خیال میں ہے۔ کچھ ہی ہو۔ اسے اپنے پتا کے گاہکوں کو ناراض نہیں کرنا چاہئے۔ وہ ابھی بچہ ہی ہے۔ اس کے دل میں عجیب و غریب خیال آتے ہیں۔ ان لوگوں کو چندو پر خفا نہیں ہونا چاہئے۔ بچہ ہی تو ہے۔ میرا خیال ہے تم اس کے ساتھ کھیلنے کے لئے آئے ہو۔ اچھا تو جب وہ آئیگا میں اس سے کہہ دوں گی۔ وہ کہیں سڑک ہی کی طرف گیا ہو گا۔

میں نے کہا " بہت اچھا اماں " اور گھر کو چلا آیا۔

اسی دن شام کو چندو میرے یہاں آیا اور معمول کے مطابق سیٹی بجائی۔ سیٹی ہی ہمارا ایک اشارہ تھا۔ جس کو ہم سگنل سمجھ لیتے تھے اور بڑے بوڑھوں کی لعن طعن سے بچے رہتے تھے چونکہ انہیں ہمارا میل جول ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ چندو نے دیکھتے ہی مجھ سے کہا۔ بازار کی طرف چلے آؤ میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

میں اُس کے پاس پہنچا ہی تھا کہ اُس نے کہنا شروع کیا۔ "تمہیں خبر ہے آج صبح میں نے کچہری کے قریب لوگوں کے سر مونڈ کر اور خط بنا کر ایک روپیہ کما لیا ہے۔ اگر مجھے پچھلے پہر جلدی ہی لالہ جی کی گاڑی پہ واپس نہ آنا ہوتا تو میں اور بھی بہت کچھ کما لیتا۔ اب دیکھو تو میں ان رسم و رواج کے دیوانوں کو کس طرح سبق سکھاتا ہوں۔ میں ستیہ گرہ کرنے والا ہوں۔ میں اب ان کی خدمت گزاری کے لئے ان کے گھروں میں نہیں جاؤں گا۔ لالہ حکم چند جی کے بیٹے سے جو کبھی کبھی جوئے کا داؤ بھی لگاتا ہے۔ جاپانی بائیسکل پانچ روپے کو خرید کر چلانا سیکھ لوں گا۔ اور اس پہ سوار ہو کر شہر جایا کروں گا۔ میں جب اپنی سفید پگڑی باندھ کر اور دوسرے کپڑے پہن کر بائیسکل پہ سوار ہوں گا ——— اور خاص طور سے جب کہ اس دو پہیہ گاڑی کے سامنے بیگ لٹکانے کی ایک کھونٹی بھی ہے ——— تو کہو دوست! بارعب معلوم ہوں گا کہ نہیں؟"

مجھے اس کی رائے سے اتفاق تھا۔ میں نے کہا۔ "ہاں"! میرے جسم میں جذبات کی پھریری سی آگئی۔ اس لئے نہیں کہ سائیکل سوار چندو کی عظمت و شوکت کو خیال میں لا رہا تھا، بلکہ اس لئے کہ اب میری خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔ مجھے خیال تھا کہ اگر چندو نے بائیسکل خرید لیا تو مجھے بھی کبھی کبھار چڑھنے کے لئے دے دیا کرے گا۔ اور اگر یوں نہ ہوا تو سائیکل کی پچھلی کھونٹی پہ یا اُس کے ساتھ آگے بیٹھ کر شہر تو چلا ہی جایا کروں گا۔"

چندو نے بائیسکل کا معاملہ کچھ اس خوبی سے طے کیا کہ مجھے اس قسم کا گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ روپیہ پیسہ وہ بے دریغ خرچ کر دیا کرتا تھا لیکن اس معاملہ کو دیکھ کر مجھے یہ خیال ہوا کہ یہ واقعہ چندو کی تجارتی قابلیت کا اتنا بڑا اظہار ہے جس کا مجھے گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ اس نے رازداری کے طریقے سے مجھ سے کہا۔ "تم دو ایک روز انتظار کرو میں تمہیں کچھ بتاؤں گا۔ تم اتنا ہنسو گے کہ کبھی عمر بھر میں اتنا نہیں ہنسے۔"

"مجھے ابھی بتا دو۔" میں نے بے صبری سے اُسے کہا۔ اس وقت میرے جسم کا ذرہ ذرہ اس کے کارنمایاں کے جوہر کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

اُس نے کہا۔ "نہیں! ابھی انتظار کرو۔ میں سردست تمہیں صرف اشارۃً ہی بتا سکتا ہوں ——— یہ ایک راز ہے۔ جو صرف ایک حجام ہی جان سکتا ہے۔ اب مجھے یہ مشین سیکھنے دو۔ تم اُسے پکڑ لو۔ میں اس پر بیٹھتا ہوں۔ خیال ہے کہ اسے چلا ہی لوں گا۔"

میں نے کہا۔ "لیکن سائیکل سیکھنے کا تو یہ طریقہ نہیں۔ میرے پتا جی نے پچھلے پہیئے کی کھونٹی سے چڑھنا سیکھا تھا اور بھائی نے پہلے کوشش کی تھی کہ پیڈل پہ کھڑا ہو کر اپنے بوجھ کا توازن قائم رکھے۔"

"تمہارے پتا جی تو ایک بھاری ستون ہیں۔ اور تمہارا بھائی لمبی ٹانگوں والا لکیڑا ہے۔"

میں نے کہا۔ "بہتر" اور اس کے سوار ہونے کے لئے بائیسکل تھام لیا۔ میری نگاہیں ابھی بائیسکل کے پالش کی چمک دمک کی دلدادہ رہی تھیں کہ ہینڈل میرے ہاتھوں سے نکل گیا اور چندو سائیکل سمیت دھپ سے دوسری طرف جا گرا۔ ساہوکار کی دکان سے، جہاں کئی کسان زمیندار کے ارد گرد اکٹھے ہوئے تھے، ایک ساتھ فضا میں قہقہے بلند ہوئے۔ ساہوکار نے بھی چیخ کر کہا۔ "کل یگ کے شیطان! خوب سزا پائی۔ چھچھورے کہیں کے ہڈی پسلی توڑ دو اور مرو۔ یوں تو تمہارے ہوش ٹھکانے نہیں آئیں گے۔"

چندو کا سر ندامت سے جھک گیا اور لگا مجھے سخت سست کہنے۔ میرا تو خیال تھا کہ اُسے یہ پریشانی میری وجہ سے ہوئی ہے۔ اس لئے وہ مجھے گردن سے پکڑ کر نیچے گرا لیگا۔ لیکن اُس نے صرف اسی قدر کہا۔ "احمق! تم بڑے ہی نکمے ہو۔" پھر وہ میری طرف دیکھ کر کھسیانی ہنسی ہنسا اور کہا۔ "دیکھ لیں گے! دنیا کس پہ ہنستی ہے۔ مجھ پہ یا ان پہ۔"

میں نے مستعدی سے کہا: "اب کے میں مضبوطی سے پکڑوں گا۔" پھر میں نے گرے ہوئے سائیکل کو اٹھا لیا۔

زمیندار نے کہا: "ہاں! تو ذرا ہوا سیلی۔ ستور کہیں کے۔"

چندو نے مجھ سے کہا: "پروا نہ کرو۔ میں انہیں بتا دوں گا۔" میں نے پورے زور سے سائیکل کو پکڑ لیا۔ اور وہ ہمت کر کے گدی پر بیٹھ گیا اور مجھ سے کہا: "چھوڑ دو۔"

میں نے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ اُس نے دائیں پاؤں کے زور سے پیڈل کو دبایا۔ پہیئے گھومے ہی تھے کہ چندو کا بوجھ ایک طرف کو جا پڑا۔ گرا ہی چاہتا تھا کہ اس کا پاؤں دوسرے پیڈل پہ آ گیا۔ توازن کچھ قائم ہو گیا۔ لیکن جھکاؤ اب کچھ دائیں طرف کو تھا۔ چندو کچھ اس طور سے گدی پہ سے ہلا کہ خوف و ہراس سے دل کانپ اٹھا۔ لمحے بھر کے لئے وہ ایک طرف کو خطرناک طور سے لٹک بھی گیا۔ اس کا ہینڈل ڈگمگا گیا۔ اور وہ لڑکھڑانے لگا اس موقع پہ ہنسی اور طنز کی ملی جلی ہوئی آوازیں دکان سے آتی ہوئی سنائی دیں۔ میرا خیال تھا کہ اگر وہ اب کے اپنے اناڑی پن کی وجہ سے ذلیل نہ بھی ہوا تو یہ شور و غل اسے لے ڈوبے گا۔ لیکن کچھ معجزہ ہی ہوا۔ چندو کے پاؤں ٹھیک ٹھیک پیڈلوں پہ چلنے لگے۔ ہینڈل کو بھی اُس نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ اور اس کو بھی کوئی جنبش نہ ہوئی اور آگے ہی آگے بڑھتا گیا میں اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ میرا گلا "شاباش! شاباش!" کی پرجوش آواز سے پھٹا جاتا تھا۔

ایک میل تک وہ اسی طرح چلا گیا۔ اور واپسی پہ بھی اُس نے ایسا ہی کیا۔

یہ چندو کا ایک نیا کمال تھا۔ اُسے بے حد خوشی حاصل ہوئی۔ میں بھی اُس کی خوشی میں شریک ہونے کا مشتاق تھا۔ لیکن میں دوسرے دن اس سے نہ مل سکا۔ کیونکہ مجھے سیدھے اسکول سے ہی اپنی چچی سے ملنے کے لئے دیر کے بعد جانا پڑا تھا۔

تیسرے دن وہ میرے ہاں آیا اور اُس نے کہا: "کل جس مذاق کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا۔ ابھی ابھی تم پہ ظاہر ہو جائے گا۔" میں فوراً ہی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اس سے پوچھتا جاتا تھا: "بتاؤ وہ ہے کیا؟"

وہ خود گاؤں کے کمہار کے تنور میں چھپ گیا اور کہنے لگا: "دیکھو! ساہوکار کی دکان میں جمگھٹا لگا ہوا ہے۔ اسے تم دیکھتے ہو! پہچانو تو کون کون ہے؟"

میں نے مختلف صورتوں کو پہچاننے کی کوشش کی لمحے بھر کے لئے دماغ کو چکر سا آ گیا۔ میں نے کہا: "مجھے تو صرف کسان نظر آتے ہیں۔ جو زمیندار کا انتظار کر رہے ہیں۔"

اُس نے کہا: "پھر دیکھو! تم تو احمق ہو۔ زمیندار وہیں ہے۔ وہ دیکھو لمبے لمبے جبڑوں والا۔ اُس کے منہ پہ سفید سفید جھاگ لگا ہوا ہے۔ یہ جھاگ نہیں سفید بال ہیں جو حجامت نہ ہونے کی وجہ سے بڑھ آئے ہیں۔" زمیندار اپنی گھنی مونچھوں پہ مہندی لگایا کرتا تھا۔ میں جوں جوں رنگدار مونچھوں اور گردن کے سفید جھاڑی دار بالوں کو دیکھتا تھا۔ حیرانی سی ہوتی تھی۔ دفعتہً میرے منہ سے نکل گیا: "ہاہاہا! بیچارہ شیر کتنا زیادہ بیمار نظر آتا ہے۔"

چندو نے تنبیہہ کے طور سے کہا: "چپ رہو۔ شور نہ کرو۔ ساہوکار کو تو دیکھو۔ کوڑھی نظر آتا ہے۔ اس کی مونچھیں دیکھو۔ تمباکو کے دھوئیں سے زرد ہو رہی ہیں۔ اُنہیں کبھی میں تراشا کرتا تھا۔ اب تم دکان کے پاس جاؤ۔ اور وہاں پہنچ کر کہو: 'اودبلاؤ۔ اودبلاؤ۔' وہ تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتے۔"

میں خیر یہ چندو کا ایک پر جوش چیلا تھا۔ ذرا بھی تو دیر نہ کی۔ میں نے دکان کے پاس پہنچ کر "اودبلاؤ! اودبلاؤ" کہا۔ کسان جو زمیندار کے اردگرد کھڑے تھے۔ ان کے دل گدگدا رہے تھے۔ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ لیکن پاس ادب کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکے۔

ساہوکار نے چلا کر کہا۔ پکڑ لو اس چھوٹے شیطان کو۔ یہ اُس حجام لڑکے چندو کا ساتھی ہے۔

لیکن میں اتنے میں برگد کے درخت پر چڑھ چکا تھا اور وہاں سے مندر کی دیوار پر کود گیا تھا۔ وہاں میں نے پجاری پر بھی فقرے کسے۔

اس حجام لڑکے کی ستیہ گرہ کی افواہ سارے گاؤں میں پھیل گئی اور گھر گھر بڑے بوڑھوں کی بڑھی ہوئی داڑھیوں کا مذاق اڑنے لگا۔ اونچی ذات کے لوگ یہاں تک کہ خود ان بزرگوں کے گھر کے افراد بھی اس اجنبیت پہ ہنس ہنس پڑتے تھے۔ اور ان کی شکل و صورت پہ عجیب و غریب خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ جب تک داڑھی مونچھ کٹتی رہی زمیندار کی جوان بیوی خاموش رہی۔ لیکن اب تو اسے کراہت سی ہو گئی تھی۔ اس کراہت کے دور ہونے کی کوئی صورت نہ تھی۔ چنانچہ اب اُس نے کسی جوانمرد کے ساتھ ہم سفر ہونے کی دھمکی بھی دے دی تھی۔ کیوں نہ ہو آخر وہ اپنے میاں سے بیس برس چھوٹی بھی تو تھی۔

چندو ان دنوں بدستور شہر جاتا رہا اور وہاں خوب خوب ہاتھ رنگے۔ ان دنوں چندو کا کام کاج شہر میں خوب چلا اور اُس نے کافی رقم بچالی۔ اپنے لئے نئے کپڑے اور نئے اوزار بھی خرید لئے اور مجھے بھی کئی تحفے لا کر دئے۔

گاؤں والے یہ دھمکی دیتے تھے۔ کہ اُسے بدعنوانیوں کی وجہ سے جیل بھجوا دیں گے اُس کی ماں کو بھی حکم ملا تھا کہ وہ اُسے ٹھیک راستے پر چلائے ورنہ نقص امن کی پاداش میں اُسے پولیس کے حوالے کرنا پڑے گا۔

لیکن چندو کی ماں نے اپنی عمر میں پہلی مرتبہ خوش حالی کا منہ دیکھا تھا۔ وہ اُن کے متعلق جو کچھ خیال رکھتی تھی۔ صاف صاف اُن کے مُنہ پہ کہدیا اور اتنا صاف کہ اُس سے پہلے کبھی نہیں کہا تھا۔ گاؤں والوں نے سوچا کہ یوں کام نہ چلے گا۔ ویر کا کے حجام کو بُلا لو۔

چندو کو وہ عام طور سے حجامت کے دو پیسے دیا کرتے تھے۔ ویر کا کے حجام کو دو پیسے کے بجائے ایک آنہ پیش کرنا منظور کیا۔

چندو کے ذہن میں نئے نئے تصورات تھے۔ اتنے نئے کہ پہلے اُسے کبھی سجھائی نہ دیتے تھے۔ شہر کے حجام نرنجن داس کی دکان کو دیکھ کر اُسے بھی تجویز سوجھی کہ شروع بازار میں عین شاہراہ پہ اپنے چچیرے بھائی، ڈھونڈو اور حجاموں کو ساتھ ملا کر دکان کھول لے۔

اس کا چچیرا بھائی وہی "ویرکے" کا حجام تھا۔ اور یہ لوگ گاؤں کے ارد گرد کام کیا کرتے تھے۔ ان کے کام کاج کا دائرہ سات میل تک تھا۔ اُس نے اپنی تجویز اپنے چچیرے بھائی ڈھونڈو اور دوسرے حجاموں کو ذات برادری کا عام جلسہ کر کے بتائی دل اور دماغ کی خوبیوں کے ساتھ قدرت نے اُسے فصاحت کا مادہ بھی ودیعت کیا تھا۔ اس نے اپنی لسانی سے حاضرین کو یقین دلا دیا۔ کہ اب وقت آگیا ہے۔ کہ یہ امیر و کبیر حجامت بنوانے کے لئے ہمارے پاس خود چل کر آئیں۔ نہ یہ کہ ہم اپنا ساز و سامان لئے لئے ان کے گھروں کا طواف کریں۔

"چندو برادرس ہیئر کٹنگ اینڈ شیونگ سیلون" نے حقیقت میں دنیا کے لئے ایک راستہ تیار کر دیا۔ اور آج تک ہمارے ملک کے مزدوروں کی کئی سرگرم انجمنیں اسی سیلون کا اتباع کرتی ہیں۔

رشید جہاں

نئی مصیبتیں

"لو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ یہ اون کیا بھاؤ ملا تھا؟" اماں نے بھابی صغرا سے پوچھا۔ جو میری چچازاد بھاوج تھیں اور دو سال ہوئے بیوہ ہو گئیں تھیں۔

"شاید بارہ روپئے پاؤنڈ تھا۔ کیوں نہ اماں جان؟" وہ ساس کے لئے اون کھول کر گولے بنا رہی تھیں۔

"اُف اوں اس سال کتنے مہنگے ہو گئے ہیں۔" صغرا کی جٹھانی عطیہ بولیں "بچوں کے سب جمپر اُدنچے ہو گئے۔ اب مسز رابرٹ کو اون لاکر دیا ہے کہ ان کے سوئٹر بن دے۔ بڑی مشکل ہے۔"

"آپ کو کیا مشکل ہے گی تو بے چاری نرس ——" مجھ میں اور بھابی عطیہ میں بالکل نند بھاوجوں کے تعلقات تھے۔ ایک دوسرے کی کمزوریوں اور برائیوں کو خوب سمجھتے تھے۔ اور موقع پر بغیر چوٹ کئے نہ رہتے تھے۔ بھابی عطیہ کی زندگی میں علاوہ تین بچے پیدا کرنے کے ایک کام اور بھی تھا کہ دو سال میں دو تین جمپر بائیں اور رُن لیں اور پھر اس کا چرچا کریں۔

"کیوں کیا میں نہیں بنتی؟" بھابی عطیہ نے چیخ کر کہا۔ میں جواب دینے کو تھی ہی کہ اماں نے میری طرف گھورا اور زور زور سے باتیں کرنے لگیں تاکہ مجھ کو جواب کا موقع ہی نہ ملے۔ اور بقول صغرا کے میری اور بھابی عطیہ کی شائستہ لڑائی نہ ہو۔ اماں کو صغرا نے بھی مدد دی اور کہنے لگیں: "سچ تو ہے اون بہت مہنگا ہو گیا ہے۔ اور اس سے پہلے کہ اور مہنگا ہو میں بھی اپنے لئے ایک جمپر کا لے آؤں گی۔"

میری چچی اماں یعنی صغرا کی ساس آتش دان کے سامنے اپنی سفید بلی کو گود میں لئے بیٹھی تھیں اور ادھر بلی اونگھ رہی تھی۔ ادھر چچی اماں لیکن نہ معلوم کس طرح صغرا کی بات سن کر اسی طرح آنکھیں بند کئے کئے بولیں۔ "لاؤ گی کہاں سے؟ آج کل لڑائی کے زمانہ میں اون رہتی ہی کہاں ہے جو لے آؤ گی۔"

"ابھی ابھی صبح ہی تو آپ دکان سے لے کر آئی ہیں۔ اور اب کیا دن بھر میں ساری دکانیں خالی ہو گئیں۔" چچا جان بیوی کی بات کو بغیر ٹوکے نہ جانے دیتے تھے۔

رشید جہاں کا اس سے پہلا افسانہ (دلی کی سیر) ایک رجحان کی ترجمانی کرتا ہے اُن کا فن آپ کو اس افسانے میں ملے گا (مرتب)

چچی اماں نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔

"میں نے کب کہا تھا کہ دکانیں خالی ہو گئیں۔"

"تو پھر آپ ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں؟" چچا جان نے کافی بگڑ کر کہا یہ کوئی نیا قصہ نہ تھا۔

جب صغرا سہاگن تھیں تب بھی ساس کی فکر تھیں۔ اور اب تو اور بھی زیادہ۔ ان کے اوپر روپے کا خرچ ہونا چچی اماں کو ہمیشہ سے ناگوار گزرتا تھا۔ اور صغرا چچا جان کی آنکھوں کا تارا تھیں۔ بیٹے کی موت کے بعد تو وہ ان کو بالکل ہاتھوں پر رکھتے تھے۔

"تو کیا میں جھوٹ کہتی ہوں۔ اون کیا اب کوئی خریدنے کی چیز رہ گئی ہے!"

"تو پھر آپ نے کیوں خریدا! .... صغرا کل چلنا میرے ساتھ اور جو پسند آئے لے آنا......"

"ارے ہے ابا جان رہنے بھی دیجئے۔ میں نے تو یوں ہی کہہ دیا تھا۔ اماں جان ٹھیک تو کہہ رہی ہیں۔ لڑائی کا زمانہ ہے۔ ہر چیز مہنگی ہو گئی ہے۔"

چچا جان بڑبڑاتے ہوئے کھانے کے لئے تیار ہونے چلے گئے۔ بس اتنا سمجھ میں آیا: "خیر تم مت لینا۔ مجھ کو تو اون چاہئے .... میں ضرور خریدوں گا......"

"میری تو ہر بات کو اب یہ الٹ دیتے ہیں........ لو میں نے کیا غلط کہا تھا کہ اون اب ناپید ہو گیا ہے۔" چچی اماں نے شکایت بھرے لہجہ میں کہا کہ سننے والے کو ترس آ جائے۔ آج ہی صبح میں، بھابی عطیہ، اماں جان، چچی اماں سب مل کر سو روپے سے زیادہ کا اون لے کر آئے تھے۔

"اون ہی پر کیا ہے۔ ہر چیز اسی طرح اُجڑ گئی ہے۔" میری اماں نے بات کو رفع دفع کرنے کو کہا۔

"جی ہاں، چچی جان ٹھیک ہے اب جارجٹ کے دام ہی دیکھ لیجئے۔ پچھلے سال ہی نے ساڑھے تین روپئے گز بہت اچھی جارجٹ لی تھی۔ وہ اب پانچ روپے گز بھی نصیب نہیں۔ اب اس دفعہ میں نے اتنے تھوڑے کپڑے مسوری میں بنائے، اب پہننے تک کو بھی نہیں ہیں۔"

"کم از کم آٹھ ساڑیاں تھیں۔ ذرا تم اپنی الماری تو ملاحظہ فرماؤ۔"

"نوکروں کی وردیاں ہر سال سو سوا سو میں بن جاتی تھیں۔ ان کو تو عادت ہے اندھا دھند اٹھانے کی۔ نوکروں کا ستیاناس کر دیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس سال رہنے دو۔ ابھی تو اچھی خاصی ہیں تو بگڑ گئے۔ کہ میں نوکروں کو گندا نہیں رکھ سکتا۔ کبھی جو کوئی بات سُن لیں۔" چچی اماں نے پھر شکایت کی۔

"ارے ہے یہ تو ان سب بھائیوں میں عیب ہے کہ صفائی کے نام پہ ہزاروں روپیہ خرچ کر دیتے ہیں۔" اماں نے کہا۔

"ہاں بھلا بی بی آج کل یہ خرچ کہاں چل سکتے ہیں۔ اب گھر میں ایک آدمی ایسا تو ہو سب کیوں ایسے ہو جائیں۔" یہ چوٹ بچاری صغرا پہ ساس نے کی۔ .... ہماری چچی بس اپنے اوپر روپیہ خرچ کرنا فضول خرچی نہ سمجھتی تھیں۔ ساٹھ برس کی عمر ہونے پر بھی بہت شوقین تھیں اور باوجود بے شمار ساڑھیاں ہونے کے صبح ہی وہ نئی ساڑھیاں خریدی تھیں۔ مجھ سے چھیڑے بغیر نہ رہا گیا میں نے کہا۔

"چچی اماں آپ جو نئی ساڑھیاں لائی ہیں وہ کتنے کی ہیں؟"

چچی اماں جن کو ابھی تک چچا جان پر غصہ آ رہا تھا۔ کچھ نہ سمجھیں اور بہت سنجیدگی سے کہنے لگیں "کیا بتاؤں بیٹی کریپ ڈیشین کی قیمت تو روپے گز زیادہ ہو گئی۔ ۲۸ روپے میں وہ ساڑھی ملی۔ لو بھلا اب کوئی کیا کپڑا پہن سکتا ہے۔ اور دوسری تو خیر سودیشی سلک تھا۔ ۱۱ روپے میں سستی ہی مل گئی۔ میں کہتی ہوں کہ آج کل تو وہ برا زمانہ آ گیا ہے۔ کہ نہ کھانے کا ٹھیک رہا ہے اور نہ پہننے کا۔ بڑی مصیبت کے دن ہیں.....

......اور ابھی تو دیکھو کیا کیا ہونے والا ہے......"

"آپ سچ کہتی ہیں اماں جان!" بھابی عطیہ نے ٹھنڈا سانس لے کر دل دکھا دینے والی آواز میں کہا۔ "یہ موئی لڑائی نہ معلوم کیسی ہے۔ کہ کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتی۔ میرا تو سارا آرام وچین اس کمبخت کی نذر ہو گیا ہے......!"

صغرا میری طرف دیکھ کر مسکرائیں اور پھر منہ دوسری طرف کر لیا۔

"کسی چیز کا ٹھیک ہو...... پٹرول کے دام ہیں کہ باوا کے مول اور پھر بھی ناپید، وہ تو کہو کہ تمہارے بھائی جان کے پاس ٹوٹی ہوئی پرانی شکاری موٹر پڑی تھی۔ اس چھکڑے کو پچاس روپے دے کر رجسٹر کروایا تو جا کر دو موٹروں کا تیل چوبیس گیلن نصیب ہوا۔ سچ مچ اس لڑائی میں تو پچھلی سے بھی زیادہ تکلیف اور مصیبت ہے۔" چچی اماں قریب قریب رو دیں۔

ہم نے تو اپنی موٹر بند ہی کر دی ہے۔ مجھ کو تو روز صبح سویرے سیر کرنے کی عادت برسوں سے ہے۔ میری صحت تو جب سے پٹرول کی قلت ہوئی ہے ناس ہی ہو گئی۔" میری اماں نے صاد کی۔

"ہاں بہن تو میں بھی کہتی ہوں کہ یہ پٹرول پہ پابندی سرکار نے کیوں لگا دی۔ اب دام دو روپئے چار آنہ گیلن تھے چلو تین روپے کر دیتی۔ لیکن یہ بارہ اور چودہ گیلن کی قید نہ لگتی جس کے پاس دام ہوتے وہ خریدتا جس کے پاس نہ ہوتے وہ نہ خریدتا" بھابی عطیہ نے اس طرح جل کر کہا۔ جیسے گورنمنٹ کو خاص ان سے دشمنی ہے۔

"پٹرول پہ ہی کیا ہے اس لڑائی کی وجہ سے تو ہر چیز پہ آفت آئی ہوئی ہے لو بھلا سیب پونے دو روپے سیر ہیں۔ کیا سیب بھی یہ نگوڑے سپاہی لے جاتے ہیں؟" میری اماں نے بہت ہی جلی بھنی آواز میں پوچھا۔

"اور انڈے؟" چچی اماں نے کہا "بارہ آنہ درجن تو ہو گئے۔ اور مرغی وہ بھی اب دو دو روپے تک ہو گئی۔ کوئی کھلائے تو کیا کھلائے۔ اور تو اور آج تمہارے سامنے ساری دکانیں دیکھ لیں۔ پرونس (PRUNES) کہیں ملے ہی نہیں، بلا سے، پچھلے مہینے میں بیس روپیہ میں سات سیر کا ٹین مل تو گیا تھا۔ اب وہ بھی نہیں...... فروٹ سلیڈ بغیر پرونس کے بچے تو چکھتے بھی نہیں......"

"جی ہاں گھر والوں کی بڑی مصیبت ہے۔" عطیہ نے ساس کے ساتھ ہمدردی کی۔ "راشد تو برابر یہی کہتا آتا ہے کہ دادی اماں کا خانساماں ہی اچھے چیز اسٹیکس (Chees stakes) بناتا ہے۔ ہمارے خانساماں سے بھی اچھے......"

"لے تو میں کیا کروں دولھن کو کنگ چیز (COOKING CHEES) تو ایسا غائب ہوا ہے کہ اب دکھائی ہی نہیں دیتا۔ میں اسلم کی دکان پہ گئی اور کہا کہ بھئی سونے کے مول ہی دے دو۔ ہمارے بچے کا دل بہت چاہ رہا ہے لیکن وہ کہیں ہو تو دے۔"

"ایک تکلیف ہو تو ذکر کیا جائے۔" اماں نے ہاں میں ہاں ملا دی۔

"لے ہے یہ ساری آگ ایک دم کہاں غائب ہو گئی؟" بھابی عطیہ نے شوں شوں کر کے ایک دم سے کہا۔

"لے سچ تو ہے۔ اس کم بخت ماجدہ نے نہ تو لکڑی پوری ڈالی اور نہ ہیٹر اب تک لگایا۔ ارجمند ذرا اس گھنٹی کا بٹن دبانا...... چار چار تو ہیٹر ہیں اور پھر بھی بیٹھے سردی میں سکڑا کرو۔ بوا آج کل تو کوئلہ بھی دو آنے سے دو دو روپے ہو گیا۔ بجلی ہی سستی رہتی ہے۔ لے لو وہ تو کوئی جواب ہی نہیں دیتا۔"

پھر صغرا سے کہا "ذرا صغرا تم جانا دیکھو تو یہ سب لوگ کہاں غائب ہو گئے تمہاری جٹھانی کو سردی لگ رہی ہے۔"...... صغرا اُن کو چھوڑ کر جلدی سے اٹھیں اور ساتھ ہی میں بھی "بھابی ٹھیرو۔ میں بھی آتی ہوں" کہہ کر ان کے پیچھے بھاگی۔

"دیکھو گرم کپڑے میں...... جانا۔ ٹھنڈ میں نہ جانا" اماں کی آواز میرے کان میں آتی ہی رہی کہ میں اور بھابی برآمدے سے ہو کر باہر آ گئے۔ باہر ہوا اتنی تیز اور ٹھنڈی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ جسم کے آر پار ہو رہی ہے۔ بھابی نے باہر نکل کر "واجد! واجد!" کہہ کر آواز دی۔ اور کوئی جواب نہ پا کر بولیں

"بچارا سردی کے مارے پلنگ میں گھس گیا ہوگا۔ جانتا ہے کہ کھانے میں ابھی آدھا گھنٹہ ہے۔" وہ شاگرد پیشہ کی طرف بڑھیں۔ تھوڑی دُور چل کر نیم کے درخت کے نیچے ایک الاؤ نظر آیا۔ اور ہم شاگرد پیشہ میں جب داخل ہوئے تو وہاں پنچایت جڑی ہوئی تھی۔ مالن مع اپنے تین چار بچّوں کے بیٹھی تھی۔ دھوبن بھی مع اپنی فوج کے جمی ہوئی تھی۔ واجد اور دُوسرے خدمت گار بھی وہاں موجود تھے۔ مہتر بھی ایک کونہ میں بیٹھا چلم پی رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی دھوبن چیخی "اے چھوٹی دولھن ذرا ادھر آنا۔"

چھوٹی دولھن ذرا جھک کر آگ تاپنے لگیں۔ سب مرد نوکر کھڑے ہو گئے۔

"کیوں کیا ہے؟" صغرا نے پوچھا۔

"اے دولھن! یہ لڑائی کب تک چلے گی؟"

"بہت دن...... کیوں؟"

"ہے رام!...... سچّی؟"

"ہاں ہاں سچ ہے۔ ابھی بہت دن چلے گی" صغرا نے لاپروائی سے کہا۔

"ہم لوگ کیسے جئیں گے؟"

"پرسوں تک تو آٹا چھ سیر کا تھا آج تین سیر کا ہے۔"

"تین سیر کا تو گیہوں ہے۔" ایک مزدور نوکر نے اطلاع دی۔

"اے بٹیا سچ بتاؤ۔ یہ بٹیا کب ختم ہوگی؟ ہمرا اور ہمرے بچن کا پیٹ کیسے بھرے گا؟" مالن میری طرف مخاطب ہوئی۔

"چنا بھی تو آٹھ سیر کا ہے!"

"دولھن تم تو ہر بات میں مذاق کرتی ہو۔ سچّی بتاؤ اخبار میں کیا لکھا ہے؟" دھوبن نے بھابی کی طرف بہت سنجیدگی سے دیکھا۔

"ارے بھئی کہہ تو رہی ہوں۔ میرا یقین نہیں تو ان سے پوچھ لو۔" سب نے اُمید بھری نظر میری طرف پھیری۔ جب میں چپ رہی تو دھوبن بولی۔

"دولھن! میاں بولا کہت رہیں کہ نوکرن کی چھٹنی ہوگی؟ کا یہ ٹھیک ہے؟"

"مجھے کیا معلوم۔"

واجد ہیٹر لگانے چلا گیا۔ میں اور بھابی وہیں الاؤ پہ کھڑے باتیں کرتے رہے۔ جب کھانے کی گھنٹی بجی تو ہم گھر کی طرف چلے۔ راستے میں بھابی نے دیکھا کہ میں کچھ گرم کپڑا نہیں پہنے تھی ——————— بولیں "اُف ارجمند تم بھی خدا کی قسم ایک چلتی پھرتی آفت ہو۔ بیمار پڑ گئیں تو ایک اور نئی مصیبت آجائے گی......"

میں ابھی تک نوکروں کے پریشان چہروں میں کھوئی ہوئی تھی۔ بغیر سوچے سمجھے "اور" پہ زور دے کر بولی "یہ اور کی آپ نے خوب کہی!"

بھابی ہنسیں "اور نہیں تو کیا۔ بھابی عطیہ کی جارجٹ ہینگی ہوگئی۔ یہ کم مصیبت ہے۔ تمہاری اماں کی ہوا خوری کم ہوگئی یہ کچھ کم مصیبت ہے۔ اور ہماری ساس بے چاری کی مصیبتوں کا شمار ہی نہیں۔ نہ کوکنگ چیز ہی ملتا ہے اور نہ پروفس...... اور اگر اس پر تمہیں نمونیا ہو گیا؟"

محمد حسن عسکری

حرامجادی

دروازہ کی دھڑ دھڑ اور کواڑ کھولو کی مسلسل اور ضدی چیخیں اس کے دماغ میں اس طرح گونجیں جیسے گہرے تاریک کنوئیں میں ڈول کے گرنے کی طویل، کراہتی ہوئی آواز۔ اس کی پُرخواب اور نیم رضامند آنکھیں آہستہ آہستہ کھلیں لیکن دوسرے لمحہ ہی منہ اندھیرے کے ہلکے ہلکے اجالے میں ملی ہوئی سرمہ جیسی سیاہی اس کے پپوٹوں میں بھرنے لگی اور وہ پھر بند ہو گئیں۔ آنکھوں کے پردے بوجھل کمبلوں کی طرح نیچے لٹک گئے اور ڈیلوں کو دبا دبا کر سلانے لگے۔ لیکن کان آنکھوں کی ہم آہنگی چھوڑ کر جھنجھنا رہے تھے۔ وہ اس سحر خیز حملہ آور کی تازہ یورش کے خلاف اپنے روزن بند کر لینا چاہتے تھے ——اور پھر بھی وہ جھنجھنا رہے تھے۔

امید و بیم کی یہ کشمکش جسے نیند شاید جلد ہی اپنے دھارے میں غرق کر لیتی، زیادہ دیر جاری نہ رہی۔ اب کے تو دروازہ کی چولیں تک ہلی جا رہی تھیں اور آوازیں زیادہ بے صبر، بے تاب، کرخت اور بھرائے ہوئے گلے سے نکل رہی تھیں: "کھولو —— کھولو" یہ آوازیں پتلی، نوک دار تیلیوں کی طرح دماغ میں گھس کر نیند کے پردوں کو تار تار کیے دے رہی تھیں۔ وہ یہ بھی سن رہی تھی کہ پکارنے والا کھولو کے وقفہ کے درمیان آہستہ سے ناخوشگوار ارادوں کا اظہار بھی کر دیتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ کوئی شخص اسے سڑک کے ڈھیلوں کو استعمال کرنے کی ترغیب دے رہا تھا... آخر اس نے آنکھیں پوری کھول ہی دیں اور ہاتھوں کو چارپائی پر جھٹکتے ہوئے کہا: "نصیبن دیکھیو تو کون ہے؟"

یہ اس کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی جب سے وہ اس قصبہ میں مڈوائف ہو کر آئی تھی یہ سب کچھ روز ہوتا تھا —— یہی چیخیں، یہی دھڑ دھڑاہٹ، فرض اور آرام کی یہی تلخ کشمکش، یہی جھلاہٹ اور پسپائی —— سب اسی طرح، اسے صبح ہی اٹھ کر جانا پڑتا تھا اور پھر اس کا سارا دن ان ادانوں کو احتجاجانہ چیختے چلاتے، ہاتھ پاؤں پھینکتے دنیا میں آتے ہوئے دیکھنے میں، کچھ دن آئے ہوؤں کی رفتارِ ترقی کے معائنہ میں اور آمد و رفت کے اندراج کے لئے ٹاؤن ایریا کے دفتر تک بار بار دوڑنے میں گزرتا تھا۔ اسے دوپہر کو کھانا کھانے اور آرام کرنے کا وقت بھی ہزار کھینچ تان کے بعد ملتا تھا، اور وہ بھی یقینی نہ تھا کیونکہ بچے پیدا ہونے میں موقع و محل کا مطلق لحاظ نہیں کرتے، صبح چار بجے، دوپہر کے بارہ بجے، رات کے دو بجے —— بہرحال ہر گھڑی اسے کوہ ندا کی آواز پر لبیک کہنے کے لئے تیار رہنا پڑتا تھا اور بچے کچھ ایسی تیزی سے چلے آ رہے تھے

جیسے پہاڑی ندی میں لڑھکتے ہوئے پتھر، ضبطِ تولید کے پرچے دولت نگر کو شہر سے ملانے والی کچی اور گڑھوں والی سڑک کو طے نہ کر سکتے تھے اور اگر بفرضِ محال وہ رینگتے ہوئے وہاں تک پہنچ بھی جاتے تو یہ یقینی بات تھی کہ قصبے والے انہیں ذرا بھی قابلِ اعتنا نہ سمجھتے۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ بچے خدا کے حکم سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس میں انسان کا کیا دخل۔ ۱۸ سالہ لڑکے، ۵۶ سالہ بڈھے، الھڑ لڑکیاں، ادھیڑ عورتیں، سب کے سب حیرت انگیز تن دہی اور یک جہتی کے ساتھ سڑکوں کی نالیوں میں کھیلنے والے بچوں کی تعداد میں اضافہ کئے چلے جا رہے تھے۔ گویا وہ قومی دفاع کی خاطر کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور ہیں اور پھر وہ بچارے کرتے بھی کیا۔ وہ تو خدا کے حکم سے بے بس تھے۔ غرضیکہ بچے چلے آ رہے تھے۔ کالے بچے، پیلے بچے، پر نچے مرغ کی طرح سرخ بچے اور کبھی کبھی گورے بچے، دُبلے پتلے، ہڈیوں کا ڈھانچہ یا بعض موٹے تازے بچے، مڑے ہوئے بالوں والے چپٹی ناک والے، چھچھوندر کی طرح گلگلے، لکڑی جیسے سخت، ہر رنگ اور ہر قسم کے بچے۔

ایلی نے اپنی دادی سے سُنا تھا کہ ان کے بچپن میں ایک مرتبہ پاؤ پاؤ بھر کے مینڈک برسے تھے۔ وہ کبھی کبھی سوچا کرتی تھی ——— اور اس وقت اسے بے ساختہ ہنسی بھی آ جاتی تھی ——— کہ یہ بچے وہی برسنے والے مینڈک ہیں۔ پاؤ پاؤ بھر کے زرد زرد مینڈک۔

اور اسے انہی زرد مینڈکوں کی بارش کے ہر قطرہ کو برستے ہوئے دیکھنے کے لئے قصبے کی ٹوٹی پھوٹی روڑوں کی سڑکوں، تنگ و تاریک، سیلی ہوئی گلیوں، گرد و غبار، کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں، بھونکتے ہوئے لال پیلے کتوں اور کسانوں کی گاڑیوں اور گھاس والیوں سے ٹھنسے ہوئے بازاروں میں سارا سارا دن گھومنا پڑتا تھا۔ پتلی پتلی سڑکوں پر دونوں طرف ریت کا حاشیہ ضرور بنا ہوتا تھا اور پھر نالیاں تو ٹھیک سڑکوں کے بیچوں بیچ بہتی تھیں جن کی سیاہی کسی گنوارن کے بہے ہوئے کاجل کی طرح سڑک کا کافی حصّہ غصب کئے رہتی تھی۔ صفائی کے بھنگی نالیوں کی گندگی سمیٹ کر سڑک پر پھیلا دیتے تھے جن سے اپنی ساڑھی کو محفوظ رکھنے کے لئے ایلی کو ہلکے ہلکے فیروزی سینڈل کے بجائے اونچی ایڑی والا جوتا پہننا پڑتا تھا۔ مگر اس صورت میں سڑک کے اُبھرے ہوئے لاتعداد کنکر اس کے پیروں کو ڈگمگا دیتے تھے۔ راستہ میں گُلّی ڈنڈا اور کبڈی کھیلنے والے لونڈوں کا لاابالی پن اس کے کپڑوں پر ہر دفعہ اپنا نشان چھوڑ جاتا تھا۔ مگر خیر شکر تھا کہ وہ ہمیشہ اپنی آنکھیں اور دانت سلامت لے آتی تھی اور یہاں کی گرمی! اسے معلوم ہوتا تھا کہ وہ یقیناً پسینہ میں گھل گھل کر ختم ہو جائے گی۔ ان تنگ سڑکوں پر بھی سورج اس تیزی سے چمکتا تھا کہ اس کے بدن پر چنگاریاں ناچنے لگتیں اور اس کی نیلے پھولوں والی چھتری محض ایک بوجھ بن جاتی۔ جب وہ اپنی اونچی ایڑیوں پر لڑکھڑاتی، سنبھلتی، دھوپ میں جلتی جھنجھلاتی سڑکوں پر سے گذرتی تو اسے دور آلھا گانے کی آواز، ڈھول کی کھٹ کھٹ اور درخت کے نیچے تاش کی پارٹیوں کے بلند اور کرخت قہقہے دوپہر کی نیند حرام کر دینے والی بوجھل مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح بیزار کن اور بے ستھرا معلوم ہوتے اور وہ چار مہینے پہلے چھوڑے ہوئے شہر کا خیال کرنے لگتی۔ مگر شہر اس وقت خوابوں کی وہ سرزمین بن جاتا ہے جسے صبح اٹھ کر ہزار کوششوں کے باوجود یاد نہیں کیا جا سکتا اور جس کی لطافت کا یقین دن بھر دل کو بے چین کئے رکھتا ہے۔ اسے کچھ روشنی سی معلوم ہوتی ——— ایک چمک، ایک کشادگی، ایک پہنائی ——— کچھ ہریالی اس کے سامنے تیرتی.... اور وہ پھر اسی تپتی ہوئی کنکروں، نالیوں اور ریت والی سڑک پر لڑکھڑاتی، سنبھلتی چل رہی ہوتی۔ بجلی کے پنکھے والے کمرے کا تصور تک اس تپش اور سوزش کو کم کرنے میں اس کی مدد نہ کرتا تھا۔ لیکن ہاں! جب کبھی وہ خوش قسمتی سے رات کو فارغ ہوتی اور اسے اپنے بستر پر کچھ دیر جاگنے کا موقع مل جاتا تو اس وقت شہر کی زندگی کی تصویریں، سنیما کے پردے کی طرح پوری طرح روشنی اور صفائی کے ساتھ اس کی نظروں کے سامنے گذرنے لگتیں اور وہ جس تصویر کو جتنا دیر چاہتی ٹھہرا لیتی لیکن جب وہ ان تصویروں سے لطف اٹھانے کے درمیان ان مناظر کو یاد کرتی جن سے اسے ہر وقت دوچار ہونا پڑتا تھا تو اس کی خستگی اور بیزاری آہستہ آہستہ عود کر آتی۔ گھر کی دیواریں مع رات کی تاریکیوں کے اس پر جھک پڑتیں۔ دل بھینچنے لگتا، سانس گرم اور دشوار ہو جاتا اور اس کا سر گھمنی کھا کر نیند کی بے ہوشی میں غرق ہو جاتا اور وہ خواب میں دیکھتی کہ وہ پھر اسی شہر کے اسپتال میں پہنچ گئی ہے، نگران در و دیوار سے بجائے رفاقت کے کچھ بیگانگی سی ٹپکتی ہے اور خود اس کے اعضاء منجمد اور ناقابلِ حرکت ہو گئے ہیں اور کوئی نامعلوم خوف اس کے دل پر مسلط۔ وہ صبح تک یہی خواب تین چار مرتبہ دیکھتی،

اور وہ اصل اس کے لئے ان زندگیوں کا تقابل ہونا بھی چاہئے تھا۔ ایسے ہی اثرات پیدا کرنے والا، مانا کہ شہر میں بھی ایسی ہی ملی ہوئی گلیاں، ٹوٹی پھوٹی سڑکیں، گرد و غبار، شور پکار سب موجود تھے اور وہ ان کے وجود سے بے خبر نہ تھی لیکن وہ تو ہوا کی چڑیوں کی طرح ان سب سے بے پروا اور مطمئن تانگے کے گدّوں پر جھولتی ہوئی ان اطراف سے کبھی دسویں پندرھویں نکل جایا کرتی تھی۔ اس کی دنیا تو ان علاقوں سے دور ضلع کے صدر ہسپتال میں تھی۔ کتنی کھلی ہوئی جگہ تھی وہ، اور وہاں کی ہوا کا لطف تو ساری عمر نہ بھول سکے گی۔ اسپتال کی سامنے تارکول کی چوڑی سڑک تھی جس پر دن میں دو مرتبہ جھاڑو دی جاتی تھی اور جو ہمیشہ شیشے کی طرح چمکا کرتی تھی۔ جب وہ اپنی سہیلی ڈینک کے ساتھ اس پر ٹہلنے کے لئے نکلتی تھی تو دور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں اور میدانوں پر سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چہرے اور آنکھوں پر لگ کر دماغ کو ہلکا کر دیتے تھے۔ اس کی ساڑھی پھڑپھڑانے لگتی، اٹھتے پر بالوں کی ایک لٹ سی تیرتی اور اس کی رفتار سبک اور تیز ہو جاتی۔ ایسے وقت باتیں کرنا کتنا خوشگوار اور پُرلطف ہوتا تھا۔ گرد و غبار کا تو یہاں نام بھی نہ تھا۔ مئی جون کے جھکڑ بھی اسپتال کی سفید اور شیشوں والی عمارتوں پر سے سنسناتے ہوئے شہر کی طرف گزرتے چلے جاتے تھے اور بجلی کے پنکھے سے سرد رہنے والے کمرہ میں دوپہر کی سختی اور اُداسی اپنا سایہ تک نہ ڈال سکتی تھی۔ جب وہ پُروقار انداز سے ساڑھی کا پلّہ سنبھالے گزرتی تھی تو اسپتال کے نوکر چاروں طرف سے اسے "میم صاحب" کہہ کر سلام کرنے لگتے تھے۔ گو یہاں بھی اسے سب لوگ میم صاحب ہی کہتے تھے۔ سڑکوں پر جھاڑو دینے والے بھنگی اسے آتے دیکھ کر خم جاتے تھے۔ بلکہ قصبہ کے زمیندار تک اسے "آپ" سے مخاطب کرتے تھے۔ مگر پھر بھی یہاں وہ بات کہاں حاصل ہو سکتی تھی۔ وہ رعب، وہ دبدبہ، وہ مالکانہ احساس۔ وہاں تو اس کی شخصیت اسپتال کا ایک جزو لاینفک تھی۔ اس سفید، سرد اور متین عمارت اور اس کے غیر مرئی مگر اٹل قانونوں اور اصولوں کا ایک زندہ مجسمہ۔ اسپتال کے نشتر کے سامنے آنے کے بعد کوئی شخص احتجاجاً حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اسی طرح اس کی حدود میں داخل ہونے والی ہر چیز کو اس کی مرضی کا پابند ہونا پڑتا تھا۔ جب اس کا مریضوں کے معائنہ کا وقت آتا تھا تو وارڈ میں پہلے ہی سے تیاریاں ہونے لگتی تھیں۔ وہ دو روپے روزانہ کرایہ دینے والیوں تک کو جھڑک دیتی تھی کیونکہ اسے اپنے صاف کمروں میں پان کی پیک تک دیکھنا گوارا نہ تھا۔ وہ بڑی بڑی نازک مزاجوں کو ذرا سی بے احتیاطی اور ہدایات کی خلاف ورزی پر بے طرح ڈانٹتی تھی اور ہمیشہ سب سے تم کہہ کر بولتی تھی۔ مگر یہاں کی عورتیں تو بہت ہی منہ پھٹ تھیں۔ وہ اس سے ہراساں اور خوف زدہ تو ضرور تھیں مگر اسے دوبدو جواب دینے سے نہ چوکتی تھیں۔ تھوڑے دن تک ان پر اپنا اختیار جمانے کی کوشش کرنے کے بعد اب وہ تھک چکی تھی اور ان کی باتوں میں زیادہ دخل نہ دیتی تھی اور صفائی اور سلیقہ کی تو ان عورتوں کو ہوا تک نہ لگی تھی۔ زچہ کو گرمی میں بھی فوراً ایک کمرہ میں بند کر دیا جاتا تھا جس میں جاڑوں کے لحاف بچھونے، چادروں اور دوسری جنسوں کے مٹکے، ٹوٹی ہوئی چارپائیاں، برتن، کوئلوں کا گھڑا، سوت اور روئی کی گٹھریاں، سب الم غلم بھرے ہوتے تھے اور ایک انگیٹھی پر گھٹی چڑھا دی جاتی تھی۔ بعض بعض جگہ تو جلدی جلدی کمرہ میں گوبری ہونے لگتی تھی جو پیروں سے اکھڑ اکھڑ کر فرش کو چلنے کے قابل بھی نہ رہنے دیتی تھی اور جس کی سیلن انگیٹھی کی گرمی سے مل کر سانس لینا دشوار کر دیتی تھی۔ گھر کی سب عورتیں ——— اور وہ کم سے کم چار ہوتی تھیں، اپنے بدبودار کپڑوں سمیت کمرے میں گھس آتی تھیں اور گھبراہٹ میں سارے سامان کو ایسا الٹ پلٹ کر دیتی تھیں کہ ذرا سی کتر تک نہ ملتی تھی۔ اندر کی کھسر پھسر، کھڑ بڑ، کراہوں "یا اللہ، یا اللہ" اور عورتوں کے بار بار کواڑ کھول کر اندر باہر آنے جانے سے گھر کے بچے جاگ جاتے تھے، اور اپنے آپ کو اماں کے قریب نہ پا کر چیخنا شروع کر دیتے تھے اور ان کی بڑی بہنیں چمکار چمکار کر اور تھپک تھپک کر انہیں بہلانے کی کوشش کرتی تھیں "ارے چپ چپ...... دیکھ بھیا آیا ہے..... صبح کو دیکھو..... منّا سا بھیا" مگر صبح کو منّا سا بھیا دیکھ سکنے کی امید انہیں اس وقت تک کوئی تسکین نہ دے سکتی اور ان کی رؤں رؤں دھاڑوں کی شکل میں تبدیل ہو کر کمرہ کے خلفشار میں اور اضافہ کر دیتی۔ یہ تو خیر جو کچھ تھا سو تھا، کثیف بستروں پر لیپ چڑھے ہوئے تکیوں، پسینے میں سڑے ہوئے کپڑوں اور مدتوں سے نہ دھلے ہوئے بالوں کی بدبو سے جسے گرمی اور بھی دو آتشہ کر دیتی تھی، اس کا جی الٹنے لگتا تھا۔ وہ تمام وقت ہر چیز سے دامن بچاتی ہوئی کھڑی کھڑی پھرتی تھی۔ اس کمرہ میں ایک گھنٹہ گزارنا گویا جہنم کے

عذابوں کے لئے تیاری کرنا تھا یہ مانا کہ خود اسے کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ قصبہ کی عورتیں اپنے آپ کو نئے نئے انگریزی تجربوں کے لئے پیش کرنے اور اپنے آپ کو ایک اجنبی اور عیسائی مڈوائف کے، جو ان دیکھے اور مشتبہ آلات سے مسلح تھی، ہاتھوں میں دے دینے کے لئے قطعاً تیار نہ تھیں انہیں تو قصبہ کی پرانی دائی اور بچپن سے ہوئے گھڑے کے ٹھیکروں پر ہی اعتقاد تھا تاہم ان کے مردوں نے ٹاؤن ایریا سے ڈر کر انہیں اس پر راضی کر لیا تھا کہ وہ نئی عیسائی مڈوائف کی کمرے میں موجودگی برداشت کر لیں۔ اس طرح عملی حیثیت سے تو اس کا کام بہت کم ہو گیا تھا۔ لیکن آخر ذمہ داری تو اس کی ہی تھی اور وہی ٹاؤن ایریا کمیٹی کے سامنے ہر برائی بھلائی کے لئے جواب دہ تھی اور اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا ہواؤں سے لڑنا تھا۔ اکثر تو گرفتار لڑکیاں اتنا چیختی چلاتیں اور ہاتھ پیر پھینکتی تھیں کہ انہیں قابو میں کرنا دوبھر ہو جاتا تھا یا پھر ایسی سہم جاتی تھیں کہ وہ ڈر کے مارے ذرا سی حرکت نہ کرتی تھیں۔ تین تین چار چار بچوں کی مائیں تو اور بھی آفت تھیں۔ وہ اپنے تجربوں کے سامنے اس ساڑھی پہن کر باہر گھومنے والی عیسائی عورت کی ہدایتوں کو کوئی وقعت دینے پر تیار نہ تھیں۔ وہ اپنی آنکھوں کے درمیان بھی رک رک کر دائی کو مشورہ دینے لگتی تھیں اور ایلی کو دانتوں سے ہونٹ چبا چبا کر خاموش رہ جانا پڑتا تھا اور دائی تو بھلا اس کی کہاں سننے والی تھی۔ اسے اپنی برتری اور مڈوائف کی نااہلیت کا یقین تو خیر تھا ہی مگر اس کی موجودگی سے اپنی آمدنی پر اثر پڑتا دیکھ کر اس نے ایلی کی ہر بات کی تردید کرنا اپنا فرض بنا لیا تھا۔ گو ایلی نے اس کے طنزیہ جملوں کو پینے کی عادت ڈال لی تھی لیکن اس کا دل کم بخت پتھر کا تھوڑے ہی تھا۔ دائی کے طرز عمل کو دیکھ دیکھ کر دوسری عورتیں بھی دلیر ہو گئی تھیں۔ اس کی طرف توجہ کئے بغیر ہی وہ پلنگ کو گھیر لیتی تھیں اور وہ سب سے پیچھے چھوڑ دی جاتی تھی۔ اب اس کے سوا کیا رہ جاتا تھا کہ وہ جھنجھلا جھنجھلا کر پیر پٹخے اور انہیں پکار پکار کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرے۔

ان سب آزمائشوں سے گزرنے کے بعد اسے ہر بار اندراج کے لئے ٹاؤن ایریا کے دفتر جانا پڑتا تھا۔ اسے دیکھ کر بخشی جی کی آنکھیں چمکنے لگتیں اور ان کے پان میں سنے ہوئے کالے دانت نیم تمسخرانہ انداز میں ان کی چھوٹی داڑھی اور بڑی بڑی مونچھوں سے باہر نکل آتے اور وہ اس کی طرف کرسی کھسکاتے ہوئے کہتے: "کہو میم صاحب! لڑکا کہ لڑکی؟" مونچھوں کے ان گھنے کالے بالوں کی قربت اسے ہراساں کر دیتی اور اسے ایسا معلوم ہونے لگتا جیسے ان بالوں میں یکایک بجلی کی لہر دوڑ جائے گی اور وہ سیدھے ہو کر اس کے چہرے سے آملیں گے۔ وہ نفرت اور خوف سے پیچھے ہٹ جاتی اور بخشی جی سے نظریں بچاتی ہوئی جلد سے جلد اپنا کام ختم کرنے کی کوشش کرتی۔

یہ سارے مرحلے طے کرتی ہوئی وہ عموماً آٹھ نو بجے رات کو تھکی ہاری اپنے گھر پہنچتی تھی۔ جب پیر کہیں سے کہیں پڑ رہے ہوں، سر جھنایا ہوا ہو، جب جسم کا کوئی بھی عضو ایک دوسرے کا ساتھ دینے کو تیار نہ ہو، تو بھلا بھوک کیا خاک لگ سکتی ہے۔ وہ جوتا کھول کر پیر سے کونے میں اچھال دیتی اور کپڑے اسی طرح جھنجھلا جھنجھلا کر اتارتی کہ دوسرے دن نصیبن کو انہیں دھوبی کے یہاں استری کرانے لے جانا پڑتا۔ الٹا سیدھا کھانا حلق سے نیچے اتار کر وہ بستر پر گر پڑتی۔ تکیے پر سر رکھتے ہی دیواریں، پیڑ، ساری دنیا اس کے گرد تیزی سے گھومنے لگتے۔ بھیجا دھڑ دھڑا دھڑ دھڑا کر کھوپڑی میں سے نکل بھاگنے کی کوشش کرتا۔ سر تکیے میں گھسا جاتا مگر تکیہ اسے اوپر اچھالتا معلوم ہوتا۔ بازو شل ہو جاتے۔ ہتھیلیوں میں سیسہ سا بھر جاتا اور ہاتھ اوپر نہ اٹھ سکتے۔ اسی طرح ٹانگیں بھی حرکت سے انکار کر دیتیں اور کمر تو بالکل پتھر بن جاتی۔ وہ اپنے پرانے اسپتال کو یاد کرنا چاہتی، مگر وہ کسی چیز کو بھی پوری طرح یاد نہ کر سکتی ——— کھڑکی کا کواڑ، مریضوں کی آہنی چارپائی کا پایہ، موٹر کے پہیے، نیم کے پیڑ کی چوٹی، پان میں سنے ہوئے کالے دانت اور گھنی سخت مونچھیں، یہ سب باری باری بجلی کے کوندے کی طرح سامنے آتے اور آنکھ جھپکتے میں غائب ہو جاتے وہ کھڑکی کے کواڑ میں ایک کمرہ جوڑنا چاہتی۔ مگر اس میں زیادہ سے زیادہ ایک چٹخنی کا اضافہ کر سکتی بلکہ بعض اوقات آہنی چارپائی کا ایک پایہ تو ایک کھونٹے کی طرح اس کے دماغ میں گڑ جاتا! اور کوشش کے باوجود بھی ٹس سے مس نہ ہوتا، نیم کی چوٹی کو کبھی تنہا حاصل نہ ہو سکتا...... پھر نیم کی ہری ہری چوٹی پر ایک ریت کے حاشیہ والی نالی بہنے لگتی اور کھڑکی کے شیشے پر پان میں سنے ہوئے کالے دانت مسکرانے اور گھنے سخت بالوں والی مونچھیں بیتابی سے

ملتیں...... مختلف شکلیں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو جاتیں اور دماغ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اڑتی، جھگڑتی، ٹکراتی، روندتی، دوڑتی...... سیاہ آسمان پر روشن ان گنت تاروں کے گچھے کے گچھے سوئیوں کی طرح آنکھوں میں گھس گھس کر ناچنے لگتے اور جلتی ہوئی آنکھیں کنپٹیوں کی خواب آور نبض سے آہستہ آہستہ بند ہو جاتیں...... سونے کے بعد تو ان شکلوں کے اور بھی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو جاتے جو باری باری آتے اور اس کے دماغ پر مسلط ہو جانا چاہتے۔ اتنے ہی میں ایک دوسرا آ پہنچتا اور پہلے والے کو دھکے دے کر باہر نکال دیتا۔ ابھی یہ کشمکش ختم بھی نہ ہوتی کہ ایک تیسرا آدھمکتا۔ ان سب کی حریفانہ زور آزمائیاں اسے بار بار چونکا دیتیں اور وہ ہلکی سی کراہ کے ساتھ آنکھیں کھول دیتی...... پھر آنکھوں میں تاروں کے گچھے کے گچھے بھرنے لگتے...... کہیں صبح کے قریب جا کر یہ شکلیں تھکتیں اور اپنی رزم گاہ سے رخصت ہوتیں تبھی ہلکی ہوا بھی چلنی شروع ہو جاتی اور امیلی نیند میں بالکل بیہوش ہو جاتی مگر اس کی نیند پوری ہونے سے پہلے "کواڑ کھولو" کی مسلسل اور ضدی چیخیں اس کے دماغ میں گونجتیں ——— وہی چیخیں، وہی دھڑدھڑاہٹ، فرض اور آرام کی وہی تلخ کشمکش، وہی جھلاہٹ اور پسپائی۔

نصیبن باہر سے لوٹ آئی تھی۔ اسے شیخ صفدر علی کے ہاں بلایا گیا تھا اور پکارنے والے نے بار بار کہا تھا "جلدی ——— بلایا ہے ——— جلدی ———" ہر ایک یہی کہتا ہوا آتا ہے جلدی ——— آخر وہ کیوں جلدی کرے؟ کیا وہ ان کی نوکر ہے؟ یا وہ اسے دولت بخش دیتے ہیں۔ ہونہہ ——— جلدی! وہ نہ پہنچے گی تو کیا سب مر جائیں گے؟ اور پھر وہ کریں گے ہی کیا اسے بلا کر؟ ——— کہتی ہیں چڑیلیں "اسے کیا خاک آتا ہے ———" کیا خاک آتا ہے ——— کچھ نہیں آتا ——— اچھا پھر؟ بیٹھیں اپنے گھر، کون ان کی خوشامد کرنے جاتا ہے ——— کچھ نہیں آتا! جیسے جیسے آلے اس نے دیکھے ہیں ان لوگوں کے تو خواب و خیال میں بھی نہ گذرے ہوں گے ——— چمکدار، تیز، ہاتھی دانت کے دستے والے ——— اور وہ ڈاکٹر کارٹ فیلڈ کے لکچر، وہ نقشے دکھا دکھا کر جسم کے حصوں کو سمجھاتی تھیں ——— کچھ نہیں آتا ——— ہونہہ!

امیلی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ پہلے تو اس کا جی چاہا کہ کہلوا دے وہ جلدی نہیں آسکتی۔ وہ بالکل نہیں آئے گی۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ یہ لوگ محض جاہل ہی تو ہیں۔ ان کے کہنے سے اس کا بگڑتا کیا ہے اور آخر ذمہ داری تو خود اس کی ہی ہے۔ چنانچہ اس نے نصیبن سے کہا "کہہ دو کہ جلدو میں آ رہی ہوں۔" مطمئن ہو کر اس نے کروٹ لے لی۔ سر کو تکیے پر ڈھیلا چھوڑ دیا۔ آنکھیں بند کر لیں، ایک بازو بستر کی ٹھنڈی چادر پر پھیلا دیا، اور ہاتھ چہرے پر رکھ لیا۔ اس نے چاہا کہ دماغ کو بالکل خالی کر لے اور ساکت ہو جائے مگر اس کے دل کی کھٹ کھٹ کانوں میں بج رہی تھی اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد یکایک ایک پتھر سا دماغ میں آکر لگتا تھا "جلدی ———" جس سے اس کے ماتھے اور کنپٹیوں کی نسیں تن جاتی تھیں اور ٹوٹتی ہوئی معلوم ہونے لگتی تھیں۔ اسے جلدی جانا تھا ——— جلدی...... اور اسی بات کے تو وہ ٹاؤن ایریا کمیٹی سے تیس روپے ماہوار پاتی تھی۔ جلدی جانا تھا...... لیکن آخر وہ فرض پر صحت کو تو نہیں قربان کر سکتی تھی۔ کل رات ہی اسے بہت دیر ہو گئی تھی۔ وہ انسان ہی تو تھی نہ کہ مشین ——— اب وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کے سر میں درد ہو رہا ہے، کمر بیٹھی جا رہی ہے، کندھے اور ٹانگیں بے جان ہو گئے ہیں۔ ایسی حالت میں اتنی جلدی اٹھ جانا بہت مضر ہوگا، اور خصوصاً اس قصبہ جیسی آب و ہوا میں جہاں اس کی صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے۔ ابھی آخر چار مہینے میں اسے چار دن بخار آچکا تھا ——— اور پھر وہ وہاں جا کر بنا ہی کیا لے گی، ان لوگوں کو ایسی کیا خاص ضرورت ہے اس کی ——— تھوڑا سا اور سو لینا ہی بہتر ہوگا۔

وہ سو جاتی مگر انگلیوں کے بیچ میں ہو کر صبح کی روشنی آرہی تھی اور اس کی آنکھوں کو بند نہ ہونے دیتی تھی۔ اس نے ہاتھ آنکھوں پر کھسکا لیا اور آنکھیں خوب بھینچ کر بند کر لیں۔ اب اسے جھپکیاں آنا شروع ہو گئیں۔ مگر ہر دفعہ "دودھ لو، دودھ" "ابے او کلو ہوتے" "اٹھ! ہٹ! ابے پڑھنے نہیں جانے گا؟" کی صداؤں اور نصیبن کے لکڑیاں توڑنے اور دیگچیاں اٹھانے کی آوازوں سے وہ چونک پڑتی تھی۔ سونے کی کوشش کرتے کرتے

اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ سر میں درد ہونے لگا اور ماتھا جلنے لگا۔ وہ مایوس ہو کر سیدھی لیٹ گئی اور آنکھوں پر دونوں بازو رکھ لئے۔ اب اس کے اعضاء اور بھی بوجھل اور ناقابلِ حرکت ہو گئے اور وہ ان صداؤں، آوازوں، ان تحکمانہ طلبیوں ——— "جلدی بلایا ہے۔" اس صبح کے چاندنے اس قصبہ پر دانت پیسنے لگی۔ وہ چاہتی تھی کہ کوئی ایسی چادر اوڑھ لے جو اس کو ان صداؤں، آوازوں، ان تحکمانہ طلبیوں۔ "جلدی بلایا ہے۔" اس صبح کے چاندنے، اس قصبے سب سے چھپا لے، جس کے نیچے ان میں سے کسی کی بھی پہنچ نہ ہو، جہاں وہ ان سب سے ——— اپنے آپ سے غافل ہو جائے ——— اپنے کو کھو دے...... اسے محسوس ہوا کہ وہ مضبوط اور مدت کے آشنا بازو اس کے جسم کا حلقہ کئے بھینچ رہے ہیں...... سر کے درد کو گویا یکایک کسی نے پکڑ لیا...... وہ آنکھیں بھی ذرا کچھ دور جھکیں، مسکراتی ہوئی معلوم ہوئیں اور اس نے اپنے آپ کو ان بازوؤں کی گرفت میں چھوڑ دیا...... جسم ہوا کی طرح ہلکا ہو گیا تھا۔ سر ہلکے ہلکے جھکولے کی تا موجوں پر بہا چلا جا رہا تھا۔ سکون تھا، خاموشی تھی اور صرف دل کے مسرت سے دھڑکنے کی آواز آ رہی تھی...... وہ بازو اس کے جسم کو بھینچ رہے تھے۔ وہ مضبوط اور مدت کے آشنا بازو......

اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ صبح کے چاندنے میں چمک آ گئی تھی۔ نعیمن نے چولھے پر دیگچی رکھی۔ بکری والا محلے سے جانے کے لئے بکریاں جمع کر رہا تھا اور کنوئیں کی گراری زور زور سے چل رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اوپر اٹھیں اور ہوا میں کسی چیز کو تلاش کرنے لگیں...... وہ بادامی سائے اترنے لگے۔ آنکھوں کے پردے پھڑکے اور پلکیں آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے مل گئیں ——— گویا وہ ان سایوں کو پھنسا لینا چاہتی ہیں...... سائے کچھ دور پر رُک گئے، وہ ڈگمگائے اور دھندلے ہوتے ہوتے ہوا میں تحلیل ہو گئے...... آنکھیں صبح بے رنگ آسمان کو دیکھ رہی تھیں۔ اس کی گردن ڈھلک گئی اور بازو دونوں طرف گر پڑے...... وہ مدت کے آشنا بازو...... مگر وہ یہاں کہاں!

چند لمحے بے حس پڑے رہنے کے بعد وہ ولیمن کو یاد کرنے لگی۔ لمبے لمبے پیچھے اُلٹے ہوئے بال، چوڑا سینہ، سرخ ڈوروں والی جلد جلد جھپکتی ہوئی آنکھیں، موٹا سا نچلا ہونٹ، کان کی لَو تک کٹی ہوئی قلمیں، سانولے رنگ پر منڈی ہوئی داڑھی کا گہرا نشان، آنکھوں کے نیچے اُبھری ہوئی ہڈیاں اور مضبوط بازو...... دن میں کتنی کتنی مرتبہ اس کے بازو اسے بھینچتے تھے اور ان کے درمیان وہ بالکل بے بس ہو جاتی تھی اور بعض دفعہ تو جھنجھلا پڑتی تھی مگر اس کے جواب میں اس کا پیار اور بڑھ جاتا تھا...... اور اس کے دونوں گالوں پہ وہ گرم اور نم آلود لب سے...... اور دن میں کتنی کتنی مرتبہ اس کے منہ سے شراب کی تیز بدبو تو ضرور آتی تھی۔ مگر وہ کیسے جوش سے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیتا تھا، اور پاگلوں کی طرح اس کے چہرے، ہاتھوں، گردن، سینے سب پر بوسے دے ڈالتا تھا اور پھر قہقہے مار مار کر ہنستا تھا۔ "...... میری جان...... ہا ہا ہا ہا...... اے مِی لی...... ڈی یر...... پیاری پیاری...... ہا ہا ہا ہا ———" اور وہ اس کی کیسی نگہداشت کرتا تھا۔ وہ اس سے اپنے بازوؤں میں پوچھتا "اس مہینے میں کیسی ساڑھی لاؤ گی، میری جان؟...... ہیں؟...... اس سینے پر تو سُرخ کھلے گی! کہو، کیسی رہی؟ ہا ہا ہا ہا ———" اور وہ اسے دوپہر میں تو کبھی نہ نکلنے دیتا تھا۔ اگر اسے ایسے وقت اسپتال سے بلایا جاتا تو وہ کہلوا دیتا کہ مسز ولیمن سو رہی ہیں اور وہ اس کے اٹھنے سے پہلے چائے تیار کرا کے اپنے آپ اس کے قریب میز پر لا رکھتا تھا اور وہ اسے کتنے پیار سے بھینچتا تھا مگر وہ یہاں کہاں! ——— اگر وہ یہاں ہوتا تو وہ اسے اتنے سویرے کہیں نہ جانے دیتا۔ وہ یہاں ہوتا تو وہ خود کہیں نہ جاتی۔ وہ تو ایسے کواڑ پیٹ کر جگانے والے کا سر توڑ دیتا ——— لیکن وہ یہاں ہوتا ——— وہ اس کے پاس ہوتا تو وہ خود یہاں کیوں ہوتی۔

لیکن ——— کچھ دوسری شکلیں ابھریں ——— اچھا ہی ہے کہ وہ اس کے پاس نہیں ہے ——— اس کے بال الجھے ہوئے اور پریشان تھے، اور وہ اس طرح دانتوں سے ہونٹ چبا رہا تھا گویا ان کا قیمہ کر کے رکھ دے گا اور اس نے اسے کیسی بے رحمی سے بید سے پیٹا تھا ہیلے...... اور لے گی...... بڑی بن کے آئی ہے وہاں سے وہ......" اگر میم صاحب شورش کر نہ آ جاتیں تو نہ معلوم وہ ابھی اور کتنا مارتا ——— ایلی اپنے بازوؤں پر نشان ڈھونڈنے لگی ——— ایسے ظالم سے تو چھٹکارا ہی اچھا ——— کیسی خونی آنکھیں، اور آخر میں وہ شراب کتنی

پینے لگا تھا ——— مگر وہ ہوتا تو اسے اتنے سویرے کہیں نہ جانے دیتا ——— مانا کہ وہ روزا کے ساتھ رات کو بڑی دیر ٹہلتا رہتا تھا۔ لیکن ظاہر تو اس کے ساتھ اس کا برتاؤ ویسا ہی رہا تھا ——— اگر وہ خود اتنا نہ بگڑتی اور اسے اٹھتے بیٹھتے طعنے نہ دیتی تو شاید بات یہاں تک نہ پہنچتی ——— وہ اسے کتنے پیار سے بھینچتا تھا ——— لیکن وہ لمبے منہ پر ہڈیاں نکلی ہوئی، سوکھی جیسے لکڑی ہو ——— اور فراک پہننے کا بڑا شوق تھا آپ کو، بڑی میم صاحب بنتی تھیں۔ چار حرف انگریزی کے آ گئے تھے تو زمین پر قدم نہ رکھتی تھی مارے شیخی کے ——— نہ معلوم ایسی کیا چیز لگی ہوئی تھی۔ اس میں جو وہ ایسا لٹو ہو گیا تھا ——— اس نے خواہ مخواہ فکر کی۔ وہ خود اسے تنگ کر چھوڑ دیتا ——— وہ اسے تھوڑے دن یونہی چلنے دیتی تو کیا تھا ——— مگر اس نے کیسی بے رحمی سے اسے مارا تھا ——— ہاں ——— ایک دفعہ مار ہی لیا تو کیا ہو گیا۔ وہ خود بھی شرمندہ معلوم ہوتا تھا اور اس کے سامنے نہ آتا تھا ——— اور اگر ڈینا اسے اتنا نہ بہکاتی تو وہ شاید طلاق بھی نہ لیتی۔ بس وہ اپنا ذرا مزا لینے کو اسے اکساتی رہی ——— یہ اچھی دوستی ہے ——— اب وہ ڈینا سے نہیں بولے گی، اور اگر وہ ملے گی بھی تو وہ منہ پھیر کر دوسری طرف چل دے گی اور جو ڈینا اس سے بولی تو وہ صاف کہہ دے گی کہ وہ دھوکا دینے والوں سے نہیں بولنا چاہتی ——— ڈینا بگڑ جائے گی تو بگڑا کرے۔ اب وہ شہر کے اسپتال سے چلی ہی آئی، اب کوئی روز کا کام کاج تو ہے نہیں کہ بولنا ہی پڑے . . . . .

وہ اسی طرح ڈینا کی مکاری پر پیچ و تاب کھاتی رہتی، اگر نصیبن اسے نہ پکارتی "اجی میم صاحب اٹھو، سورج نکل آیا۔" وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور چاروں طرف دیکھا اب تو واقعی اسے چلنا چاہیئے تھا مگر پھر بھی پلنگ سے نیچے اترنے سے پہلے اس نے کئی مرتبہ انگڑائیاں لیں اور تکیہ پر سر رگڑا۔ وہ منہ دھو کر چائے کے انتظار میں پھر بستر پر آ بیٹھی۔ نصیبن لکڑیوں کو چولہے میں ٹھیک کرتی ہوئی بولی "وہ مُنیا کی ماں کہہ رہی تھیں کہ تمہاری میم صاحب تو عید کا چاند ہو گئیں۔ کبھی آ کے بھی نہیں جھانکتیں . . . . . اجی ہو ہی آؤ ان کی طرف میم صاحب کسی دن، بڑا یاد کریں ہیں تمہیں!"

ہو ہی آئے ان کی طرف ——— کیا کرے وہ جا کر میلے کچیلے پلنگوں پر بیٹھنا پڑتا ہے۔ ٹوٹے ٹاٹ ——— یہاں کی عورتوں سے وہ کیا باتیں کرے؟ بس انہیں تو قصے سناتے جاؤ کہ اس کے بچہ مرا ہوا پیدا ہوا۔ اس کو اتنی تکلیف ہوئی۔ اس کو ایسی بیماری تھی۔ وہ کہاں تک لائے ایسے قصے سنانے کو، اور کوئی بات تو جیسے آتی ہی نہیں انہیں . . . . . . اور پھر یہ لوگ کتنی بدتمیز ہیں۔ سڑے ہوئے کپڑے لے کر سر پر چڑھی جاتی ہیں . . . . . . اسے ان لوگوں کے ہاتھ کا پان کھاتے ہوئے کتنی گھن آتی ہے مگر مجبوراً کھانا ہی پڑتا ہے . . . . . . جب وہ اس سے باتیں کرتی ہیں تو ہلکے ہلکے مسکراتی جاتی ہیں جیسے اس کا مذاق اڑا رہی ہوں . . . . . . کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو اور سارے گھر کو دیکھتی جاتی ہیں گویا وہ چور ہے اور ان کی آنکھ بچتے ہی کوئی چیز اڑا دے گی ——— یہ اس سے سب عورتیں جھجکتی کیوں ہیں؟ کیا وہ ان کی طرح عورت نہیں ہے؟ یا وہ کوئی ہوا ہے ——— عجب بے وقوف ہیں یہ عورتیں ——— اور ہاں جب وہ ان کے ہاں جاتی ہے تو ان کے اشارے سے جوان لڑکیاں جلدی جلدی بھاگ کر کمرے میں چھپ جاتی ہیں۔ وہ اندر سے جھانک جھانک کر اسے دیکھتی ہیں اور اگر کہیں اس کی نظر پڑ جائے تو وہ فوراً ہٹ جاتی ہیں اور اندر سے ہنسنے کی آواز آتی ہے اور اگر انہیں اس کے سامنے آنا ہی پڑ جائے تو وہ بدن چراتی ہوئی اوپر سے نیچے تک خوب دوپٹہ تانے ہوتے آتی ہیں جیسے اس کی نظر ان میں سے کچھ چھین لے گی یا اس کی نگاہ پڑ جانے سے ان میں کوئی گندگی لگ جائے گی ——— ان کی یہ حرکت اسے بالکل ناپسند ہے۔ کیا انہیں اس پر اعتماد نہیں، اور وہ اس پر شک کرتی ہیں ——— ؟ اس سے تو ان کے ہاں نہ جانا ہی اچھا ——— بیٹھیں اپنی لڑکیوں کو لے کے اپنے گھر میں ——— اور وہ گندے بچے، مٹی میں سنے، ناک بہتی، آدھے ننگے، پیٹ نکلا ہوا، وہ سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اسے ایسے غور سے دیکھتے رہتے ہیں، جیسے وہ نیا پکڑا ہوا عجیب و غریب جانور ہے ——— اور جب وہ ان سے بولتی ہے تو وہ سیدھے باہر بھاگ جاتے ہیں ——— وحشی ہیں بالکل، جانور . . . . . بالکل ——— اور یہ خوب ہے کہ اس کے پہنچتے ہی وہاں جھاڑو شروع ہو جاتی ہے۔ مارے گرد کے سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ ذرا خیال نہیں تندرستی کا انہیں، اور کوئی کیوں ان کے ہاں جا کر

بیچاری موہل سے اور ران کے مرد، کتنی شرم آتی ہے اسے ان حرکتوں سے۔ وہ ہمیشہ ڈیوڑھی میں راستہ گھیرے بیٹھے رہتے ہیں اور جب تک وہ بالکل قریب نہ پہنچ جائے نہیں ہٹتے ——— "ارے حقہ ہٹاؤ، حقہ ہٹاؤ" اٹھتے اٹھتے ہی اتنی دیر لگا دیتے ہیں کہ وہ گھبرا جاتی ہے ——— جان کے کرتے ہوں گے یہ ایسی باتیں ——— تاکہ کھڑی رہے وہ تھوڑی دیر وہاں ——— اور جب وہ اندر پہنچ جاتی ہے تو اسے قہقہوں کی آواز آتی ہے۔ عجب بدتمیز ہیں ——— انگریزوں کے ہاں کتنی عزت ہوتی ہے عورتوں کی۔ وہ بڈھے پادری صاحب جو آیا کرتے تھے بہت اچھے آدمی تھے بیچارے، ہر ایک سے کوئی نہ کوئی بات ضرور کرتے تھے، بلکہ اسے تو وہ پہچان گئے تھے ——— سب مل کر جایا کرتے تھے اتوار کو گرجا۔ وہ خود، ڈینا، کٹی، میری، شیلا اور رہاں مرتھی ——— مسز جیمس کا کتنا مذاق اڑاتے تھے سب مل کر۔ سب سے پیچھے چلتی تھیں، چھتری ہاتھ میں لئے ہانپتی ہوئی اور راں میں تھا ہی کیا۔ ہڈیوں کا ڈھانچ تھیں بس ——— اور گرجا سے لوٹتے ہوئے تو اور بھی مزا آتا تھا۔ سب چلتے تھے، آپس میں ہنستے، مذاق کرتے ——— اوہ، شیلا کس قدر ہنسوڑ تھی، کیسے کیسے منہ بناتی تھی۔ جب ہنسنے پر آتی تھی تو رکنے کا نام نہ لیتی تھی ——— مگر یہاں وہ سب باتیں کہاں ——— اب تو جیسے وہ آدمیوں میں رہتی ہی نہیں ——— اور واقعی کیا آدمی ہیں یہاں والے؟ اول تو اسے اتنی فرصت ہی کہاں ملتی ہے۔ ہر وقت پاؤں میں چکّر رہتا ہے، اور پھر ایسوں سے کوئی کیا ملے؟ ——— جیسے جانور ——— نہ کوئی بات کرنے کو، نہ کوئی ذرا ہنسنے بولنے کو، بس آؤ اور پڑھو ——— لے دے کے رہ گئی منصبن، تو اسے اس کے سوا کوئی بات ہی نہیں آتی کہ اس کا بیٹا بھاگ گیا، اس کی اپنے میاں سے لڑائی ہو گئی۔ اس کے یہاں برات بڑی دھوم دھام سے آئی ——— اسے کیا ان باتوں سے ہوا کرے، اس سے مطلب ——— یا بہت ہوا تو اسے خواہ مخواہ ڈراتی رہے گی چوروں کے قصے سنا سنا کر ——— ایک دفعہ اس نے سنایا تھا کہ ایک دوسرے قصبے کی مڈوائف کو کچھ لوگ کیسے بھگا کر لے گئے تھے اور اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا تھا ——— بکتی ہے بھلا کہیں یوں بھی ہوا ہے۔ لیکن اگر کہیں اس کے ساتھ ——— مگر نہیں، بیکار کا ڈر ہے ——— جو یوں ہوا کرے تو لوگ گھر سے نکلنا چھوڑ دیں ——— بھلا دنیا کا کام کیسے چلے ——— پاگل ہے بڑھیا، بھکا دیا ہے کسی نے اسے ——— مگر ایسی جگہ کا کیا اعتبار، نہ معلوم کیا ہو کیا نہ ہو ——— کوئی ساتھ بھی تو نہیں ——— اگر وہ مڈوائف نہ بنتی تو اچھا تھا اور وہ تو خود ٹیچر بننا چاہتی تھی بلکہ پاپا بھی یہی چاہتے تھے مگر ماما ہی کسی طرح راضی نہ ہوئیں ——— کتنے دن ہو گئے پاپا کو بھی مرے ہوئے ——— بارہ سال، کتنا زمانہ گذر گیا اور معلوم ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہو ——— کتنا پیار کرتے تھے وہ اسے ——— روز اسکول پہنچانے جاتے تھے ساتھ ——— کلاس میں اس کی سیٹ میز کے پاس تھی ——— اور وہ انگریزی کے ماسٹر صاحب بہت اچھے آدمی تھے ——— بچارے، چاہے وہ کام کر کے نہ لے جائے، مگر کبھی کچھ نہیں کہتے تھے ——— اور لڑکے تو نہ جانے اسے کیا سمجھتے تھے۔ سارے اسکول میں وہ اکیلی ہی لڑکی تھی نا، سب کے سب ماسٹر صاحب کی نظریں بچا بچا کر اس کی طرف دیکھتے رہتے تھے ——— ارے وہ موٹا کرم چند، بھلا وہ بھی تو اس کی طرف دیکھتا تھا جیسے وہ بڑا خوبصورت سمجھتی تھی اسے ——— اور ہاں وہ عظیم! بڑا بھولا تھا بچارا، سوکھا سا زرد، مگر آنکھیں بڑی بڑی تھیں اس کی۔ دیکھتا تو وہ بھی رہتا تھا اس کی طرف، مگر جب کبھی وہ اسے دیکھ لیتی تھی تو وہ فوراً شرما کر نظریں نیچی کر لیتا تھا اور رومال نکال کر منہ پونچھنے لگتا تھا ——— اور اس دن وہ دل میں کتنا ہنسی تھی۔ اس دن وہ اتفاق سے جلدی آ گئی تھی۔ برآمدے میں دوسری طرف وہ آ رہا تھا، جب وہ قریب آیا تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اس کے پاس پہنچ کر وہ رک گیا اور کچھ کہنے سا لگا، ڈرتے ڈرتے عظیم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر جلدی سے چھوڑ دیا، اسے گھبرایا ہوا دیکھ کر وہ خود کتنا پریشان ہو گیا تھا، اور اس نے بہت گڑگڑا کر کہا تھا "کہیے گا نہیں"۔ وہ کتنے دن اس بات کو یاد کر کے ہنستی رہی تھی ——— کتنا سیدھا تھا واقعی وہ ——— وہ ابھی اسکول ہی میں رہتی تو کتنا مزا رہتا ——— مگر ——— وہ زمانہ تو اب گیا ——— اب تو وہ یہاں دنیا سے الگ پڑی ہے۔ کوئی بات تک کرنے کو نہیں ——— کسی کا

خط بھی تو نہیں آتا۔ وہ روزانہ ڈاکیئے سے پوچھتی ہے کہ اس کا کوئی خط تو نہیں مگر ——— روز جواب وہی "نہیں" ——— اور جو آیا بھی تو بس وہی لمبے بادامی لفافے ——— آن ہز مجسٹیز سروس ——— ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر کی ہدایتیں، یوں کرو اور وہ ں کرو ——— کوئی اس کی ماننے بھی جو وہ یوں کرے ——— خواہ مخواہ کی آفت ——— اور پھر خط آئے بھی کہاں سے؟ ——— اگر امی ہی دلی سے خط بھیج دیا کریں تو کیا ہے ——— مگر وہ تو برسوں بھی خبر نہیں لیتیں ——— ایک دفعہ جانا چاہیئے اسے دلی ——— اچھا شہر ہے ——— کیا چوڑی سڑکیں ہیں ——— اور سینما کس کثرت سے ہیں ——— اور وہ ——— وہ خبر ہے ہی ——— مگر وہ ———

کائیں کائیں، کائیں نے اسے چونکا دیا۔ دھوپ آدھی دیوار تک اتر آئی تھی، کوا زور زور سے چیخ رہا تھا اور وہ بستر پر پیر نیچے لٹکائے بیٹھی تھی۔ اسے جلدی جانا تھا اور اس نے بیکار بیٹھے لیٹے اتنی دیر لگا دی تھی۔ وہ نصیبن پر اپنا غصہ اتارنے لگی کہ اس نے چائے کیوں نہیں لاکر رکھی مگر وہ سمجھ رہی تھی کہ میم صاحب سو رہی ہیں اور واقعی، اس نے خیال کیا۔ اس سے تو وہ اتنی دیر سو ہی لیتی تو اچھا تھا۔ بہرحال اس نے نصیبن سے جلدی چائے لانے کو کہا۔

اس نے دوبارہ منہ دھویا اور الٹی سیدھی چائے پینے کے بعد وہ کپڑے بدلنے چلی۔ ٹرنک کھول کر وہ سوچنے لگی کہ کونسی ساڑھی پہنے ——— سفید، سرخ کناروں والی۔ مگر کیا روز روز ایک ہی رنگ ——— اور پھر سفید ساڑھی میلی کتنی جلدی ہوتی ہے اس کی بہار تو بس ایک دن ہے۔ اگلے دن کام کی نہیں رہتی ——— نیلی ساڑھی نیچے سے جھانک رہی تھی ——— اسے ہی کیوں نہ پہنے؟ ——— مگر اسے نیلی ساڑھی پہنے دیکھ کر تو لوگ اور بھی باؤلے ہو جائیں گے ——— وہ جدھر سے نکلتی ہے سب کے سب اسے گھورنے لگتے ہیں۔ اسے بڑی بری معلوم ہوتی ہے ان کی یہ عادت ——— اور ان زمینداروں کو دیکھو، بڑے شریف بنتے ہیں؟ ——— خیر یہ تو جو کچھ ہے سو ہے، جب وہ آگے بڑھ جاتی ہے تو وہ ہنستے ہیں ——— اور طرح طرح کے آوازے کستے ہیں ——— "کہو یار!" ——— "ابے مجید ذرا ادھر آ" ——— کوئی کھانسنے لگتا ہے کیا وہ سمجھتی نہیں ——— ذرا شہر میں کر کے دیکھئے ایسی باتیں ——— وہ مزا چکھا دیتی انہیں ——— مگر یہاں وہ کیا کرے ——— مجبور ہو جاتی ہے ——— ان کی ہی وجہ سے تو اس نے رنگدار ساڑھیاں چھوڑ دیں اور سفید پہننے لگی، مگر پھر بھی نہیں مانتے ——— اب اگر آج وہ نیلی ساڑھی پہن کر جائے گی تو نہ معلوم کیا کیا کریں گے ——— تو پھر سفید ہی پہن لے ——— مگر روز روز سفید اور کیا، وہ کوئی ان سے ڈرتی ہے۔ ہنستے ہیں تو ہنسا کریں، کوئی اسے کھا تھوڑی لیں گے، بھلا کیا بگاڑ سکتے ہیں وہ اس کا؟ ——— اب وہ پھر رنگدار ساڑھیاں پہنا کرے گی ——— دیکھیں وہ اس کا کیا بناتے ہیں ——— ہنسیں گے تو ضرور ——— مگر اس سے ہوتا ہی کیا ہے ——— آج وہ ضرور نیلی ساڑھی پہنے گی!

نیلی ساڑھی پہن کر اس نے بال بنانے کے لئے آئینہ سامنے رکھا۔ کم خوابی سے اس کی آنکھیں لال اور کچھ سوجی ہوئی سی تھیں۔ وہ ہاتھ میں آئینہ اٹھا کر آنکھوں کو غور سے دیکھنے لگی ——— مگر یہ اس کا رنگ کیوں خراب ہوتا چلا جا رہا تھا اور کھال بھی کھردری ہو چلی تھی۔ جب وہ لڑکی تھی تو اس کے چہرے پر کتنی چمک تھی ——— رنگ سانولا تھا تو کیا، چمکدار تو تھا ——— اس کی آنٹی ہمیشہ ماما سے کہا کرتی تھیں یہ تمہیں بیٹی اچھی ملی ہے ——— مگر اب ———

اس نے آئینہ رکھ دیا اور اپنے جسم کو اوپر سے نیچے تک ایسی حسرت سے دیکھنے لگی جیسے مورا اپنے پیروں کو ——— اس کے بازوؤں کا گوشت لٹک آیا ہے اور ٹھوڑی بھی موٹی ہو گئی ہے اور ہاتھ اب کتنے سخت ہیں۔ بال بھی سوکھے سا کھے اور ہلکے رہ گئے ہیں، اور تیزی تو اس میں بالکل نہیں رہی ہے۔ پہلے وہ کتنا کتنا دوڑتی بھاگتی تھی اور پھر بھی نہ تھکتی تھی۔ مگر اب تو تھوڑی ہی دیر میں اس کی کمر ٹوٹنے لگتی ہے۔ اس نے ایک لمبی سی انگڑائی اور پھر ایک گہرا سانس لیا۔ بے رونق چہرے اور ڈھیلے بازوؤں نے نیلی ساڑھی کا رنگ اڑا دیا تھا اس نے

بال ایسی بے دلی سے بنائے کہ بہت سے تو اِدھر اُدھر اڑتے رہ گئے۔ بال بن چکے تھے مگر وہ برابر آئینے کو تکے جا رہی تھی اور اس کا دماغ سمٹ کر آنکھوں کے پپوٹوں میں آ گیا تھا جن میں ایک ہی جگہ ٹھہرے ٹھہرے مرچیں سی لگنے لگی تھیں۔

جب اس نے آئینہ رکھا تو اسے میز کے کونے پر دیوار کے قریب بائبل رکھی نظر آئی۔ یہ بچپن میں سالگرہ کے موقع پر اس کے پاپا نے اسے دی تھی۔ مدتوں سے اس نے اسے کھولا تک نہ تھا اور وہ گرد سے اٹی پڑی تھی۔ اس کتاب نے اسے پھر پاپا کی یاد دلا دی اور وہ اسے اٹھانے پر مجبور ہو گئی پہلے ہی صفحہ پر اس کا نام لکھا تھا۔ لیکن اب اس کی روشنائی بہت پھیکی پڑ چکی تھی۔ یہ اس نے پانچویں کلاس میں لکھا تھا۔ یہ دیکھ کر اسے ہنسی آ گئی کہ وہ اس وقت کیسے ٹیڑھے میڑھے حرف بنایا کرتی تھی۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ اس زمانہ میں اس کے پاس ہرا قلم تھا۔ اس کا ارادہ ہوا کہ اب کے جب وہ شہر جائے گی تو ایک ہرا قلم ضرور خریدے گی مگر اسے خیال آیا کہ آخر وہ قلم لے کر کرے گی ہی کیا۔ اب اسے کون سا بڑا لکھنا پڑھنا رہتا ہے۔ اس کے پاپا اسے بائبل پڑھنے کی کتنی ہدایت کیا کرتے تھے۔ اسے اپنی بے پروائی پر شرم سی محسوس ہوئی اور وہ بائبل کے ورق الٹنے لگی

——— پیدائش ——— خروج ——— ورق تیزی سے الٹے جانے لگے ——— استثنا ——— روت ——— یرمیاہ ——— جنوتی ——— متی ——— لوقا ——— رسولوں کے اعمال ——— کہاں سے پڑھے ——— آدم ——— نوح ——— طوفان ——— ابراہیم ——— کشتی ——— صلیب ——— مسیح ——— یسوع آ جا آئے ——— گرجا کا گھنٹہ ——— سب مل کر گرجا جاتے تھے، ہنستے، مذاق کرتے ———

آخر وہ فیصلہ نہ کر سکی کہ کون سی جگہ سے پڑھے اور اسے جلدی جانا تھا، اتنا وقت بھی نہیں تھا لیکن اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ اب روز صبح کو بائبل پڑھا کرے گی ورنہ کم سے کم اتوار کو ضرور ——— لیکن دعا تو مانگ ہی لینی چاہئے ——— بہت ہی بری بات ہے ماما کبھی بغیر دعا مانگے نہیں سونے دیتی تھیں ——— اور پھر اس میں وقت بھی کچھ نہیں لگتا، اور لگے بھی تو کیا ہے دنیا کے دھندے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔

اس نے دماغ کو ساکن بنانا چاہا اور آنکھیں بند کر لیں مگر باوجود اس کے آنکھیں بھینٹ پھٹانے سے پہلے تو اس کی ماما اس کی آنکھوں میں گھس آئیں اور پھر پاپا اور ماں کے پیچھے پیچھے گرجا کی سڑک، گھنٹہ اور سب مل کر گرجا جایا کرتے تھے۔ ہنستے، مذاق کرتے۔ اس نے آنکھیں کھول کر سر کو اس طرح جھٹکے دیئے گویا ان سب کو اپنی آنکھوں میں سے جھاڑ رہی ہے ——— آخر دماغ بالکل خالی ہو گیا، اور خاموش۔ صرف کانوں اور سر میں دل کے دھڑکنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ دونوں ہاتھ جوڑ لئے اور دعا کو دہراتی چلی گئی ”اے میرے باپ تو جو آسمان پر ہے تیرا نام پاک مانا جائے تیری بادشاہی آئے۔ تیری مرضی جیسے آسمان پر پوری ہوتی ہے ویسے ہی زمین پر ہو۔ ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے اور ہمارے قصوروں کو معاف کر جیسے ہم بھی اپنے قصوروں کو معاف کرتے ہیں۔ کیونکہ قدرت جلال ابد تک تیرا ہی ہو۔ آمین!“

آنکھیں کھولنے پر اس نے کچھ اطمینان سا محسوس کیا اور مسکرانے کی کوشش کرنے لگی اس نے پھر آئینہ میں جھانکا اور چاہا کہ کسی خاص چیز کے لئے دعا مانگے۔ لیکن کیا چیز؟ کوئی! ——— اس کا تبادلہ شہر میں ہو جائے ——— مگر وہاں اسے پھر وکٹمین کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس سے تو یہ قصبہ ہی بہتر ہے ——— پھر اور کیا؟ ——— وہ ایک کہانی تھی کہ ایک پری نے ایک آدمی سے تین خواہشیں پوری کرنے کا وعدہ کیا تھا ——— پھر آخر کیا؟ ———

اس نے بہت باز و طلے۔ مگر کوئی بات یاد نہ آئی۔ اسے دیر ہو رہی تھی اس لئے اس نے اپنی دعاؤں اور خواہشوں کو چھوڑ دیا اور چھتری اٹھا کر چل پڑی۔

سڑک پر پہنچ کر اس پر محض ایک جلدی پہنچنے کا خیال غالب تھا۔ صبح کی اس تمام کاہلی اور سستی کے بعد اسے اعضا کو حرکت دینے میں فرحت محسوس ہو رہی تھی۔ سورج کی ہلکی سی گرمی، اور چلنے سے اس کے خون کی حرکت تیز ہو گئی تھی اور وہ سڑک کی نالی، ریت کنکروں سب سے بے پروا اپنا راستہ طے کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ اگر اسے اپنی رفتار میں کبھی کچھ سستی معلوم ہوتی تو وہ اور قدم بڑھانے کی کوشش کرتی۔ سڑک پر کھیلنے والے لڑکے ابھی تک

نہ نکلے تھے اس لئے اسے اپنی آنکھ ناک کی حفاظت کی ضرورت نہ تھی۔ جب وہ دیواروں کے سایہ میں سے گذرتی تو اس کے پیر اور بھی تیز اٹھنے لگتے تھے۔

وہ جلدی ہی بازار میں پہنچ گئی۔ شیخ صفدر علی کا مکان اب تھوڑی ہی دور رہ گیا تھا اور اطمینان سا ہو گیا تھا کہ زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ وہ چلی جا رہی تھی کہ اس کی نظر ایک دکاندار پر پڑی۔ وہ اپنے سامنے والے کو آنکھ سے اشارہ کر رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ کیا یہ اسے دیکھ رہا تھا؟ ممکن ہے وہ پہلے سے کسی بات پر ہنس رہے ہوں، اور اسے دیر بھی ہو گئی تھی ——— وہ آگے بڑھی ہی تھی کہ آواز آئی۔ "آج تو آسمان نیلا ہے بھئی...... بڑے دن میں ایسا ہوا ہے آج ..." ——— اس نے چاہا پلٹ کر چھتری رسید کرے اس بدتمیز کے...... چاہے کچھ ہو آج وہ کھڑی ہو جائے اور صاف صاف کہہ دے کہ وہ ان لوگوں کی باتیں اچھی طرح سمجھتی ہے، اور اب وہ زیادہ برداشت نہیں کر سکتی ——— آخر کہاں تک؟ ——— پیر من من بھر کے ہو گئے تھے اور ٹانگیں تھرتھرا رہی تھیں جس سے وہ کئی دفعہ چلتے چلتے ڈگمگا گئی ——— مگر ان آنکھوں نے جو اب ہر طرف سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں اسے رکنے نہ دیا۔ وہ اپنی ساڑھی میں کچھ سکڑ سی گئی۔ اس نے پلّا اچھی طرح سینے پر کھینچ لیا اور سر جھکا کر قدموں کو سڑک پر سے اکھاڑنے لگی......

جب وہ شیخ صفدر علی کے مکان پر پہنچی تو وہ ڈیوڑھی میں کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی وہ کھڑے ہو گئے، اور ایسے شکایت آمیز لہجے میں جیسے اس نے کوئی نایاب موقع ہاتھ سے نکل جانے دیا تھا جس پر شیخ جی کو اس سے ہمدردی تھی، بولے:

"اخاہ میم صاحب! بڑی ہی دیر کر دی تم نے تو!"

"جی...... ہاں...... وہ ذرا دیر ہو گئی" کہتی ہوئی وہ زنانہ کی طرف بڑھی۔ جب وہ دروازہ پر پہنچی تو اس نے دیکھا کہ قصبہ کی پرانی دائی بائیں ہاتھ پر کپڑے اٹھائے اور داہنے ہاتھ میں لوٹا ہلاتی صحن سے گزر رہی ہے، یہ کہتی ہوئی "ذرا دیکھو تو...... ابھی تک نہ نکلی گھر والے سے حرام جادی!"

عزیز احمد

زرّیں تاج

جیپ بہر حال دغا دیتے پر تُلی ہوئی تھی۔ ہر دس دس گز پہ رُک رُک جاتی۔ بچارا موٹا ڈرائیور محنت کرتے کرتے ہانپتے ہانپتے عاجز آچکا تھا۔ ارشد نے حسین چاندنی رات کی طرف دیکھا۔ یہ خوبصورت سڑک، اس پر بکھری ہوئی چاندنی، کناروں پہ یہ اونچے اونچے درخت۔ کتنی محنت سے یہ سڑک تیار ہوئی تھی۔ اور آج جنگ کا پہلا دن تھا۔ بھلا جنگ کو اور جیپ کی اس مسلسل سکرات کو چاندنی رات اور ان حسین درختوں اور اس دوشیزہ سڑک سے کیا بھی واسطہ تھا؟

موٹا ڈرائیور شیخ احمد بڑے کمالات کا آئینہ تھا۔ ایک چھوٹی سی گلی ڈیفنیچ کے سلسلے میں کئی فٹ کھدی ہوئی تھی۔ دور کنارے سے موٹر تو کجا آدمی بھی بڑی مشکل سے جا سکتا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کے ارشد سے پوچھا تھا "سرکار گلی بالکل کھدی ہوئی ہے۔ پھر کیا حکم ہوتا ہے۔ گاڑی کو لے چلوں؟" آج انجن کے پیچھے اس کے ہانپ ہانپ جانے پہ ارشد کو ترس آ رہا تھا اور غصہ بھی۔ دور پہ کوئی بیل گاڑی کھڑ کھڑ کرتی گذر جاتی لیکن ہر طرف سناٹا تھا۔ دور دور کسی آدمی کا سراغ نہیں، کوئی گھر نہیں۔ مذاق تو نہیں تھا۔ آج جنگ کا پہلا دن تھا۔ سب جگہ بلیک آوٹ تھی لیکن چاند نے اپنا ٹھنڈا سا چراغ آسمان پر جلا رکھا تھا۔ اور سوئی ہوئی زمین پہ انسان یا سنہرے خواب دیکھ رہے تھے یا ایک دوسرے کو تباہ کرنے میں اسی روشنی سے مدد لے رہے تھے۔ یہ عجیب طرح کی ٹھنڈی روشنی ہے، چاند کی روشنی جس سے دو طرح کے جنون کی قندیلیں جلتی ہیں جنگ کے جنون کی اور عشق کے جنون کی۔

اتنے میں اوپر سے گھر گھراہٹ کی آواز آئی۔ ارشد نے اپنے دل میں کہا ـــــ امجد بھائی نے آج دعوت کے لئے گیا اچھا دن چنا تھا ... چاندنی میں سڑک کے کنارے کے حسین درخت جیپ کو چھپا نہیں سکتے تھے۔ اور اگر کہیں یہ بدشکل سا کیڑا اوپر سے ہوا باز کو نظر آ گیا تو ... موت آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ اس نے شیخ احمد کو جلدی سے چھپ جانے کے لئے کہا۔ وہیں کہیں جھاڑیوں میں، اور خود تیزی سے سڑک کے کنارے کنارے چاندنی سے بچتا ہوا قد آور درختوں کے سائے میں پناہ لیتا وہ لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا۔ اب دور پہ ...... چشم زدن میں نزدیک ایک تیز نیلا سا ستارا دکھائی دیا، اور پھر سڑک کے بالکل

قریب تقریباً پانچ سو فٹ اوپر اس تیزی سے ہوائی جہاز اُڑتا چلا گیا گویا اس کی ٹوپی کو گراتا ہوا گذر گیا۔ اس کے دل کی دھڑکن ایک منٹ کے لئے رُک گئی۔ جسم نے تھرتھری سی لی۔ جیپ کے قریب ہی ایک شعلہ سا بلند ہوا۔ ایک سُرخ ساگولہ زمین پر پھیلا اور شعلہ بلند ہوا۔ "سرخ شعلہ۔ سرخ پیالہ" اس نے اپنے دل میں کہا۔ ہوائی جہاز نے جیپ کو مشین گن نہیں کیا تھا۔ اسے بعد میں معلوم ہوا کہ ہوائی بیڑے کو شہر یا اس کے اطراف کسی طرح کی بمباری وغیرہ کی سخت مخالفت تھی۔ اب ہوائی جہاز بہت دور جا چکا تھا۔ شہر کی طرف۔ اس نے پلٹ کر شیخ احمد کو پکارا۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ اُلٹے پاؤں وہ جیپ کی طرف واپس ہوا۔ شیخ احمد جھاڑیوں سے نکل کے تھرتھر کانپ رہا تھا۔ اس نے پھر انجن کا رُخ کیا۔ اور اس خوف کے باوجود اس کی ہمت پر ارشد کو تعجب ہوا۔

"میں پیدل چلتا ہوں۔ تم گاڑی کو یہیں چھوڑ دو۔ چلے چلو۔"

"آپ جائیے سرکار۔ میں تو اس گاڑی کا نوکر ہوں اس کو لے کر ہی آؤں گا۔"

اسے پھر تعجب ہوا۔ ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ پھر معلوم ہوئی۔ دیکھ بھال کی اڑان کے بعد اب وہ دوسری طرف سے واپس جا رہا تھا بہت دور پر۔ اور اب بہت اوپر۔ نیلا ستارہ گھڑگھڑاہٹ کی طرح مدھم ہوا پھر غائب ہو گیا۔ دونوں نے پھر بیمار جیپ کی طرف دیکھا اور ارشد نے گبرڈین کے پتلون کی جیبوں میں ہاتھوں کو گرم رکھنے کے ارادے سے گنگنا کے سیٹی بجانے کی کوشش کی۔ مگر فارسی اشعار تھے کہ بادلوں کی طرح امڈتے یاد آتے چلے جاتے تھے۔ اس نے حسین رات کی طرف دیکھا معشوقوں کی طرح، عجمی شاعروں کے معشوقوں کی طرح دل ربا اور خونریز معشوقوں کے رخ زیبا جیسا چاند، ان کی آنکھوں کی طرح چمکتے ستارے۔ ان کی زلفوں کی طرح سیاہ درختوں اور چٹانوں کے سائے۔ ان کی پلکوں کی طرح سڑک کے کنارے کے صف بستہ درخت ان کی حنائی انگلیوں اور سُرخ ہونٹوں کی طرح سرخ سرخ ——— اور اسے جنگ پھر یاد آ گئی اور یہ وہ ہوائی جہاز جو ابھی ابھی گذرا تھا ——— دور پر ایک موٹر گذری۔ اس وقت اور اس رات اس کے سوا کسی اور بیوقوف کی شامت آئی تھی۔ جہاں سے موٹر گذری وہاں چوراہا ضرور ہوگا۔ چوراہا ضرور تھا۔

اس رات کو معشوق کی حنا آلود ہتھیلی اور سرخ ہونٹوں کی طرح سُرخ خونریز کوئی مرئی چیز نہیں تھی۔ ٹینکوں اور توپ خانے کی گھن گرج ابھی سینکڑوں میل دور تھی۔ تیزی سے ہوا پر صرف موت کے آہنی فرشتے آ سکتے تھے اور ان کو دیکھ کر سائرن کی وہ تیز، خون کو منجمد کر دینے والی آواز ایک مسلسل فریاد، ایک مسلسل کراہ۔ وہ جو نعرے لگاتے ہیں، وہ جو دوسروں کی رہنمائی کرتے ہیں، وہ جو دوسروں کی رہنمائی میں پہنچتے ہیں۔ ذرا دیکھ ہی لیں کہ جنگ کیسی ہوتی ہے۔

کیا ہوگا؟ آج صبح سے اس کے ذہن نے تصفیہ کر لیا تھا کہ وہ اس کا جواب نہ دے گا۔ ایک اور چوراہا پر آج دوپہر کو ایک طرف سے تیز بہت تیز ایک فوجی لاری آ رہی تھی، ایک آدمی آر پار جانے والی سڑک سے تیزی سے سائیکل پر چلا آ رہا تھا۔ ارشد نے بڑی حماقت سے اپنے حق میں پیشین گوئی کی "اگر اس فوجی لاری سے یہ سائیکل ٹکرائی تو میں بھی اس جنگ میں ختم ہو جاؤں گا" لیکن سائیکل نہیں ٹکرائی ——— سائیکل سوار فوجی لاری کو جل دے کر نکل گیا۔ آنکھ مچولی میں تھوڑی دیر کے لئے زندگی موت سے جیت گئی۔

آدمی نہ آدم زاد۔ اور ابھی رات کے دس ہی بجے تھے۔ شہر ابھی صرف سات میل دور۔ جیسے طلسم ہوش ربا کا کوئی شہزادہ کسی طلسمی جنگل میں چلا جا رہا ہے ——— حشرات الارض کی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ جھینگروں کی سائیں سائیں کی، اور دور دور کتوں کی۔ ابھی بہت دور تک کوئی مکان نہیں تھا۔ ایک فیکٹری کے چراغ بہت فاصلے پر نظر آ رہے تھے لیکن باہر سے چاندنی کفن کی طرح اسے بھی لپیٹے تھی۔

اور دفعتاً چاندنی اسے بڑی ہی دلکش معلوم ہوئی۔ خواب کی طرح، عشق حقیقی کی طرح، ذرا ذرا سے سلگتے ہوئے جنون یعنی جنون ذی فنون کی طرح۔ اور اسے سڑک پر اپنے جوتوں کی چاپ کچھ عجیب معلوم ہوتی جیسے کوئی اس زندگی میں نہیں کسی اور زندگی میں چل رہا ہے، جیسے وقت کی

طناہیں گر گئی ہیں۔ جیسے وہ ماضی میں یا مستقبل میں چل رہا ہے اور حال معدوم ہے۔ جیسے وہ مردہ ہے . . .

اور اگر کہیں یہ سچ ہو۔ وہ ہوائی جہاز جو اس قدر نیچے سے گزر رہا تھا۔ فرض کرو کہ اس نے "سُرخ پیاز" نہیں گرایا تھا۔ وہ ایک بم تھا۔ جیپ، شیخ احمد اور وہ خود سب مر چکے ہیں، فنا ہو چکے ہیں۔ وہ اس سڑک پر چلا جا رہا ہے۔ کہ اس زندگی اور اُس زندگی میں تسلسل ہے یا یہ محض اسی کی یاد، اسی کا سلسلہ ہے . . . . . .

اور معلوم نہیں یہ کون ہے جو اس کے ساتھ چلا آ رہا ہے۔ برفانی قطب جنوبی کے سیاحوں کا زائد ساتھی - ٹی - ایس - ایلیٹ والا "یہ تیسرا کون ہے" یہ کون ہے جو اس کے ساتھ چلا جا رہا ہے وجود سے عدم، عدم سے وجود کی طرف۔ جیسے ماضی اور حال اور مستقبل کی سرحدیں ہٹ گئی ہوں جیسے . .

یہ قدموں کی چاپ، یہ جوتوں کی چاپ۔ یہ اس کی اپنی رفتار کی نشانی ہے۔ وہ اپنے گھر جا رہا ہے، پیدل، کیونکہ جیپ خراب ہو گئی ہے اور بیچارا شیخ احمد اب بھی اس کے انجن سے گتھا ہوا ہے۔ مگر یہ چاندنی رات اس قدر دلکش، اور حسین اور یہ سڑک، یہ چاندنی رات میں نہائی ہوئی دوشیزہ۔ یہ درختوں کے سائے، یہ کالی کالی زلفیں۔ . . . . .

اور وہ جس کے قدموں کی چاپ سُنائی دے رہی تھی، وہ دوسرا ساتھی، چاندنی رات میں اس ویران حسین سڑک پر اس کا ہم سفر، اس کی ہم سفر . . . . . . اس نے چاند کی طرف دیکھا اور پھر اپنی حسین ساتھی کی طرف۔

"تم نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں زرّیں تاج ہوں"

اس نے بیسیوں زندہ عورتوں سے عشق کیا تھا۔ ہوس آرائی کی تھی، تفریح کی تھی، کشش محسوس کی تھی۔ کبھی ہوس کا خاتمہ عشق پر ہوتا۔ کبھی عشق کا ہوس پر۔ اور ہمیشہ اس کا باعث یہ ہوتا کہ دونوں لاکھ کوشش کرتے یہ دوئی، فنا نہ ہوتی۔ دونوں ایک معاشی عمرانی نظام کی پیداوار ہوتے، اور یہ نظام ان کے راستے میں سنگلاخ مزاحمتیں، کانٹوں کی جھاڑیاں، دیو ہیکل چٹانیں حائل کرتا جاتا۔ جن سے ہوس عشق بن جاتی اور کبھی یہ مزاحمتیں غائب ہو جاتیں تو عشق ہوس ہو جاتا اور پھر ہوس کے بعد تھکن اور پھر عذر و ماندگی لے حسرتِ دلی . . . . اور پھر یہی سلسلہ۔

ایک دن اس نے اکتا کے کہا تھا اب میں کسی ایسی عورت سے محبت کروں گا۔ جسے مرے صدیاں ہو چکی ہوں گی۔ ایک دن انسان ماضی میں سفر کر سکے گا۔ اس دن اس کے ساتھ بھی یہی مسائل پیدا ہوں گے۔ لیکن ابھی تو یہ ممکن نہیں۔

زرّیں تاج کو مرے سو سال کے قریب ہونے کو آئے ہیں۔ اور اس شاعرہ کا کلام پڑھ کے جس نے باب کو دیکھنے سے پہلے اس کی تعریف اور اشتیاق میں دنیا کی دو حسین ترین نظمیں لکھی ہیں۔ اس نے زرّیں تاج کو مخاطب کر کے کہا "ان تمام عورتوں میں جو مر چکی ہیں مجھے سب سے زیادہ تم سے محبت ہوئی ہے۔ اگر کبھی حال ماضی کی طرف جا سکا یا میری روح تمہاری روح کے جمال کا دیدار کر سکی۔ اگر یہ بھی نہ ہو تب بھی وہ دن محض میں، امروزِ خالص میں تم سے مخاطب ہوں گا اور تم سے اپنی اس محبت کا اظہار کروں گا جو عشق سے، ہوس سے، خواہش سے، اور اک سے جواب سے ماورا ہے۔

آج اس چاندنی میں لٹی ہوئی حسین ویران تنہا سڑک پر ایک اجنبی ساحرہ کی طرح وہ اس کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ اس پل صراط پر۔ زندگی سے موت کی طرف . . صدیوں کے آر پار۔ اور پھر اس نے زرّیں تاج کی طرف دیکھا۔ اس نے نقاب اُلٹ دیا تھا، یوں اس کا لباس سیاہ تھا۔ خلجی عورتوں کی طرح۔ ایسا لباس جیسا کہ شاید اس نے محمد علی بادفروش کے ساتھ کجاوے میں پہنا ہوگا۔ اور اس کا چہرہ چاندنی میں جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ یہ موت کی، اگافہ وکی چمک تھی۔ ایک حسین آسیبِ الفت کے چہرے کی چمک۔ جیسے ملکہ گو کا چلن کی ٹنگی ہوئی لاش کا مارکو پولو کے نام یہ پیغام۔

"یہ کہہ دینا کہ میں نے محبت کی اور مرگئی۔ اب میں محبت ہوں اور نہ زندہ ہوں۔ اور چونکہ زندہ ہوں بھول گئی۔ اور چونکہ محبت کرتی ہوں معاف کر دوں گی۔"

تب ارشد نے اس طرح جیسے کوئی سلسلۂ خیال سے چونک پڑتا ہے۔ جیسے کوئی خواب میں خواب سے بیدار ہوتا ہے، جیسے کسی نے ابھی ابھی آنکھ کھولی ہو۔ کہا: "تم ملکۂ کوکاچین ہو۔ تم زرّین تاج ہو۔"

اور اس کی ہم راہ حسینہ ہنسی۔ "کوکاچین نہیں وہ چینی تھی۔ وہ تو صرف عجم بیاہ کر آئی تھی۔ میں زرّین تاج ہوں۔ میں عجم کی نسوانیت ہوں جو صدیوں میں ایک آدھ مرتبہ انگڑائی لے کر اٹھتی ہے، اور مردوں کو ششدر کر دیتی ہے۔ وہ پہلے مجھے دیکھ کر عشق عشق کرتے ہیں پھر محبت کرتے ہیں جس کے معنی زیادہ تر یہ ہوتے ہیں کہ بڑی سے بڑی قیمت لے کر وہ میرا جسم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ شہنشاہ مجھے موتیوں میں تولنا چاہتا ہے۔ فن کار خونِ جگر میں اور مزدور مجھے دیکھے بغیر چپکے سے گذر جاتا ہے اور اگر وہ محبت میں کامیاب نہیں ہوتے تو پھر مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں، اپنی رقیب سمجھ کر۔ اور جب میں مر جاتی ہوں تو سینکڑوں برس میری پرستش کرتے ہیں۔ اب تم نے مجھے پہچانا۔

پھر سائرن کی خوفناک ہسٹریائی چیخ نے فضا میں لہرانا شروع کیا۔ رات نے ایک جھرجھری لی، چاندنی کانپ گئی، سب درختوں اور ان کے سایوں کو فالج مار گیا۔ دور پھر ایک ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ پھر ایک نیلا ستارہ چمکا۔ پھر کتنے جھینگے جھینگروں کے گانے میں خلل نہیں آیا۔ اور ارشد نے بید سے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ زرّین تاج برابر اس کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ موت اور حیات کی درمیانی شاہراہ پر پل صراط پر چاندنی کے برزخ میں۔

دور پر ہوائی جہاز نے پھر سرخ پیاز پھینکے، زمین سے ٹکرا کے پھر سرخ شعلے اٹھے۔ پھر ہوائی جہاز نے شہر کے اطراف ایک چکر لگایا۔

اور وہ چاندنی سے زیادہ خوبصورت تھی، چاندنی سے زیادہ حسین، ایرانی شاعری کی روح کی طرح جمیل، اس کے لب لعلیں چاندنی رات میں چمک رہے تھے۔ سینکڑوں میل دور ٹینکوں سے بچ بچ کا خون بہہ رہا ہوگا، اور بچ بچ کے پناہ گزین خندقوں کے ہاتھ لٹ رہے ہوں گے اور بچ بچ کی عورتیں اپنی عزّت ——— زمانہ امن کا تصور ——— بچانے کے لئے کنوؤں اور باؤلیوں میں گر رہی ہوں گی۔ مگر یہاں تو ابھی تک صرف ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی تھی۔ پل صراط کے اس پار تک جس پر سے گذرتے ہوئے زرّین تاج نے پوچھا: "اپنی کہانی سناؤں؟"

اب ہوائی جہاز جا چکا تھا۔ اب پھر رات کے پرانے محرمِ راز کتے، سانپ اور جھینگر باقی رہ گئے تھے۔ اور انسان کھڑکیوں کے شیشوں پر سیاہ کاغذ لگائے حشرات الارض کی طرح چھپے ہوئے تھے۔

اور چاندنی رات میں زرّین تاج حد سے زیادہ حسین معلوم ہو رہی تھی۔ اپنے آپ سے ارشد نے اس طرح کہا گویا اسے زرّین تاج کے ساتھ ہونے کا یقین نہیں آیا۔ "میں نے دیکھے بغیر تجھ سے محبت کی۔ کاش مرنے سے پہلے ایک بار تجھے دیکھ لیتا۔"

مگر وہ تو اس کے ساتھ پل صراط پر چل رہی تھی۔ چاندنی رات میں۔ اور وہ مسکرائی۔ چاندنی رات میں چاند چمکا اور موتی بکھر گئے۔

اور ارشد نے اس کی طرف نظر بھر کے دیکھا۔ گویا وہ پہلی مرتبہ چاند کو دیکھ رہا تھا۔ اسے نہیں دیکھا۔ مگر کتنی بار دیکھا ہے۔

تب زرّین تاج کا، کالا طلسمی حوروں کا سا لباس چاندنی رات میں یکلخت چمکا۔ جیسے سڑک پر پڑا ہوا شیشے کا ایک ٹکڑا ——— اور اس نے اپنا قصہ سنانا شروع کیا۔

میرا نام سپرا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ میں یونان سے ایران آئی۔ لیکن میرے خون کے ایک ایک قطرے میں عجمیت ہے۔ مجھے ایرانیوں نے شیریں کہا اور مجھ میں ایرانی نسوانیت کی مٹھاس بھر دی۔

میں رومی نژاد تھی، عیسائی تھی، مجھے کسی افسانہ نگار نے ماریس شہنشاہ کی بیٹی قرار دیا۔ کسی نے مہین بانو کی، لیکن میں ایرانیت میں اس قدر کھو گئی کہ نہ مجھے اور نہ کسی اور کو میرے اجنبی ہونے کا احساس تھا۔ مجھے ایران نے شیریں بنایا اور میں نے ایران کو اس کا سب سے پیارا افسانۂ عشق دیا۔

خسرو نے رومیوں سے ہزار عورتیں چھینیں، ہزاروں کو بیوہ کیا۔ اس کے سپاہیوں نے ہزاروں کو بے آبرو کیا۔ یہ اس زمانے کا دستور تھا۔ تمہارے ملک میں اب تک یہی ہوتا ہے۔ میں تاریخ سے گھبراتی ہوں جو اپنے آپ کو نہیں دہراتی۔ مگر اپنی سیہ کاریوں کو ضرور دہراتی ہے۔ اس لئے نظامی گنجوی کے ساتھ ساتھ چلو۔

میں مہین بانو کی تربیت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہوں۔ مجھے شہسواری آتی ہے، شکار کھیلنا آتا ہے، راویوں سے کہانیاں اور نظمیں سننا آتا ہے۔ میں معاملاتِ عشق میں ماہر ہوں، اور اپنی سہیلیوں میں اس طرح دمکتی ہوں جیسے تاروں میں چاند۔ خسرو جس کو اس کے مردانہ حسن کی وجہ سے پرویز کہتے ہیں، میرے حسن و جمال کی تعریف سنتا ہے مجھ پر نادیدہ عاشق ہو جاتا ہے۔ اور مجھے ڈھونڈنے شیرویہ کو بھیجتا ہے۔ گویا شہزادہ "دل" ہے جو "نظر" کو میری تلاش میں روانہ کرتا ہے۔

اور میں شکار کھیل رہی ہوں اپنے تیر مژگاں سے ہرنوں کا شکار، اور اپنی ہرنوں جیسی آنکھوں سے دلوں کا شکار۔ میری سہیلیاں میرے ساتھ ہیں جنہیں مہین بانو نے میری دلجوئی، میرا دل بہلانے اور میری نگرانی کے لئے مقرر کیا ہے۔ شیرویہ آتا ہے۔ دل کا چالاک وزیر، خسرو کا چالاک وزیر، اور پتھر پر اس کی تصویر بنا دیتا ہے، میں مبہوت رہ جاتی ہوں۔ سہیلیاں کہتی ہیں "شیریں۔ شیریں تو خواب دیکھ رہی ہے۔ یہ طلسمات کا جنگل ہے۔" اور ہم سب وہاں سے آگے چلتے ہیں کسی اور جنگل میں جو زلفوں کی طرح تاریک ہے، جس میں صبا تک اچھی طرح شانہ نہیں کر تی۔ اور یہاں مژگاں کو پھر ہرنوں کی نئی ڈار، نئے بسمل، نئے مقتولوں کی تلاش ہوتی ہے۔ مگر وہ چالاک وزیر شیرویہ، بزرگ مہر کا خسر پھر آتا ہے، پھر پتھر پر ایک تصویر بناتا ہے۔ میں پھر محو ہو جاتی ہوں۔ گویا میں خواب میں چل پھر رہی ہوں۔ سہیلیاں پھر تاڑ جاتی ہیں کہ اس نقش کا رنگ گہرا ہو رہا ہے۔ مجھے پھر وہاں سے لے چلتی ہیں۔ ایک اور صحرا اور زلفیں اور ہرنوں جیسی آنکھیں، مژگاں کے اور رسوفار، ابروؤں کی اور کمانیں۔ لیکن شیرویہ پھر آ پہنچتا ہے، اور ایک چٹان پر پھر خسرو کی تصویر بناتا ہے۔ اب میرا دل اپنے قابو میں نہیں رہتا۔ مجھے فارسی شاعری کی ایک روایت کو جنم دینا ہے۔

عشقِ اوّل در دلِ معشوق پیدا میشود

مجھے اس شہر یار سے دل و جان سے محبت ہو جاتی ہے، جس کی یہ تصویر تھی۔ اس مرتبہ مہین بانو کی سکھائی ہوئی سہیلیاں مجھے بہلا نہیں سکتیں۔ جل نہیں دے سکتیں۔ وہ پتھر کا نقش میرے دل پر مرتسم ہو چکا ہے۔ میں چپکے سے ان کو چھوڑ کے نکل بھاگتی ہوں۔ میں شہسوار ہوں۔ یہ صفت میں نے تاتاری معشوقوں سے لی اور ایرانی نازنینوں کو عطا کر دی۔ راستے میں چشمہ ملتا ہے۔ چشمۂ آبِ حیواں، چشمۂ نرگس، چشمۂ آبِ حیات، چشمۂ تسلسلِ حیات۔ یہاں میں گھوڑے پر سے اتر پڑتی ہوں۔ میں کپڑے اتارتی ہوں۔ میں شاعروں کا سراپا بن جاتی ہوں۔ میری سیاہ زلفوں میں راتوں کی تاریکی اور سانپوں کا رنگ ہے، اور یہ زلف حبل المتین بھی ہے۔ میری آنکھیں نرگس ہیں، میری پیشانی چاند، میرے ہونٹ عقیق و لعل اور میرے دانت موتی۔ میرے پستانے اٹھے اور پھر ناز پستان مرے گرہ سانپ سیمیں ہیں جب ٹھہر جاتی ہوں سرو ہوں اور جب چلتی ہوں قیامت۔ یہ کیا غضب ہے۔ کہ تمہارے شاعروں نے میرا سراپا تو یاد رکھا مگر مجھے بھول گئے۔

اور داستانوں کے شہزادوں کی طرح خسرو پرویز بھی اس چشمے پہ نکلتا ہے۔ بہرام کو شکست دینے کے بعد۔ ہمارے افسانے میں کوئی مقام نہیں کوئی رسم نہیں۔ کوئی دیوار نہیں، زمین زیر ہے اور آسمان آسمان ہے۔ خسرو چشمے میں پہلے میرا عکس دیکھتا ہے پھر میری جانفزا عریانی دیکھتا ہے۔

لیکن قبل اس کے کہ وہ مجھ تک پہنچ سکے۔ میں اپنا تن ڈھانک کے، اپنے بادِ پا رہوا پر سوار ہو کے اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہوں مگر اسے اپنی نظروں سے گھائل کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے . . . .

اور وہ شیرویہ کو مہین بانو کے پاس بھیجتا ہے۔ اس کی دال نہیں گلتی۔ مہین بانو مجھے سمجھاتی ہے کہ جو آسانی سے حاصل اور آسانی سے فنا ہو گیا وہ ہوس ہے۔ اور وہ جو مشکل سے حاصل ہوا اور کبھی فنا ہوا کبھی فنا نہیں ہوا، عشق ہے اور وہ جو بڑی مشکل سے حاصل ہو، کبھی فنا نہیں ہوگا طوفان ہے اور وہ مجھے سمجھاتی ہے کہ ایرانی خواتین میں سے وہ جن کا صدیوں میں ایک آدھ بار بروز ہوتا ہے آسانی سے اپنے آپ کو اپنے عاشق کے حوالے نہیں کرتیں۔ عشق کی بجلی ٹھوکروں سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے "جفا" کی ضرورت ہے۔ جس کے بغیر "وفا" پیدا نہیں ہوتی۔ میں یہ سب سنتی ہوں، یہ سب مان لیتی ہوں کیونکہ مجھے تمہاری عجمی شاعری کی روایتوں کی تخلیق کرنی ہے۔ خسرو مجھ تک پہنچنا چاہتا ہے۔ اور میں اسے پہنچنے نہیں دیتی۔ شیرویہ آتا ہے۔ اور ناکام واپس جاتا ہے۔ اب مہین بانو مر چکی ہے۔ اس کی جگہ میں اپنی اقلیم کی ملکہ ہوں۔ خسرو پرویز دیارِ عشق کا شہریار ہے۔ میں دیارِ حسن کی ملکہ ہوں۔ زاری، زر، زور کوئی طاقت مجھے آسانی سے حاصل نہیں کر سکتی۔

اور جب وہ مجھے پا نہیں سکتا تو شکر سے دل بہلانے لگتا ہے۔ تم جانتے ہو یہ شکر کون ہے۔ یہ عورت کا جسم ہے۔ اور میں جو شیریں ہوں عورت کی روح ہوں۔ ایرانی عورت کی۔ شکر حرم میں داخل ہو سکتی ہے۔ میں یا ملکۂ عالم ہو کے رہ سکتی ہوں یا پھر بجھا دی جاتی ہوں۔ خسرو شکر سے دل بہلاتا ہے۔ مگر شکر بھی اسے آسانی سے نہیں ملتی۔ وہ خسرو پرویز کو شراب کے نشے میں بدمست کر دیتی ہے اور ایک بدہیئت کنیز کو اپنی جگہ اس کے پاس بھیج دیتی ہے۔ جسم جسم سب برابر ہیں۔ یہاں تک کہ جب نشہ اترتا ہے تو خسرو پرویز کو غصہ آتا ہے۔ جسم جسم کا فرق اس پر ظاہر ہوتا ہے۔ وہی سہرا والی بات۔ اور بالآخر شکر اسے مل جاتی ہے۔ لیکن میں جو شیریں ہوں۔ مجسم نسوانیت کی روح اس سے اب بھی دور ہوں۔ بہت دور۔ وہ اگر اپنے ملک کا بادشاہ ہے تو میں اپنے دیار کی ملکہ، اور زاری، زر، زور کسی کی مجھ تک پہنچ نہیں۔ زاری البتہ کبھی کبھی میرے کنگرۂ بام سے ٹکرا جاتی ہے۔ مگر میرے سکون، اطمینان میں فرق نہیں آتا۔ میں شیریں ہوں۔ محبت کی روح کوئی خرید نہیں سکتا۔

نظامی نے بڑی بڑی غلطیاں کی ہیں۔ درباری طبع ہوئی شاعری سے اور توقع ہی کیا ہے۔ فرہاد کا قصہ بیچ کا نہیں بعد کا ہے، میں اسے بعد میں بیان کروں گی۔ اب خسرو پرویز میرے دیار میں آنا چاہتا ہے، دیارِ جمال میں۔ اس کی سپاہ، میرے دارالسلطنت میرے قلعے کے اطراف حیران کھڑی ہے۔ وہ خندق کے پاس کھڑا ہے امنت وزاری کر رہا ہے۔ میں ایک جھروکے میں نمودار ہوتی ہوں۔ وہ اندر آنے کی اجازت چاہتا ہے۔ اور یہ اجازت اسے نہیں ملتی۔ وہ حجت کرتا ہے اور میں اس کی ہر حجت کا جواب دیتی ہوں۔ وہ وفا جتاتا ہے میں اسے شکر کے عشق کا طعنہ دیتی ہوں۔ وہ مجھے جفا پر ملامت کرتا ہے۔ میں اسے جفا کے معنی سمجھاتی ہوں اور اسی طرح سوال و جواب ہوتے رہتے ہیں۔ آنکھوں کے جھروکوں سے جو اس خمسہ سے شخصیتوں کی بجلی سے۔ اور بالآخر میں اسے اندر آنے کی اجازت دیتی ہوں تو وہ مجھے مسحور کرنے کے لئے اپنی واردات دل باربد کی زبانی سنواتا ہے، میں نکیسا کی زبانی اس کا جواب سنواتی ہوں۔ روح کی فصیل میں جگہ جگہ شگاف ہیں، جن میں اس کا اندازا ہوا شکر داخل ہو چکا ہے۔ مگر قلب میں کوئی چیز محفوظ ہے۔ ایک زمہریر ہے جسے کوئی گرما نہیں سکتا، پگھلا نہیں سکتا۔

کیونکہ میرا جوہر ایسا تھا کہ اسے کوئی خرید نہیں سکتا۔ خسرو پرویز نے مجھے خرید لیا۔ میری جنس خرید لی، میرا حسن خرید لیا، میری ہوس خرید لی۔ میری نسوانیت خرید لی۔ مگر اب بھی قلب میرا ایک مقام ایسا تھا جہاں وہ پہنچ نہ سکتا تھا۔ "ہزار افسانہ" کے چالیس دروازوں والے قصر کی طرح میں نے ان میں سے انتالیس دروازوں کی کنجیاں اس کے حوالے کر دیں اور چالیسویں دروازے کی کنجی اس کے حوالے کرنا میرے بس کی بات نہ تھی، حالانکہ اس کی محبت، اس کا جسم، اس کی وجاہت جس نے اسے پرویز کا خطاب دلوایا مجھے بہت عزیز تھی۔

یہ چالیسویں کنجی کسی اور کے قبضے میں چلی گئی۔ میں نے نہیں دی۔ خود بخود چلی گئی۔ کیونکہ ان معاملات پر کسی کا اختیار نہیں۔ اور جس شخص

کے پاس یہ کنجی گئی۔ اس کا نام فرہاد تھا۔ وہ ایک مہندس تھا —— اس کا ترجمہ اپنے زمانے کی زبان میں چیف انجنیئر کرنا —— اس زمانے میں دو ہی طبقے تھے۔ ایک امیر اور دوسرا غریب۔ اور مہندس مزدور تھا۔ میں تم سے کیا کہوں۔ میرا فرہاد نظامی کا فرہاد نہیں تھا وہ شیرویہ کی ضد تھا۔ وہ مزدور کا مظہر جمال تھا۔ اس کے اعصاب پتھر توڑتے توڑتے فولاد کی طرح مضبوط ہو گئے تھے۔ اور اس کے چہرے پر عشق کے درد کے ساتھ بھوک کا جلال تھا۔ لیکن پرویز سونے سے اس کی بھوک نہ بجھا سکا۔ وہ اس کے عشق ہی کا ایک حصّہ تھی۔

بقیہ قصّہ تو تم کو معلوم ہے۔ میری زبانی میرے رنج و درد کی کہانی سُن کر تم کیا کرو گے۔ جب دیکھا کہ میں اپنا دل ہار چکی ہوں، تو وہ شہنشاہ جس کے لشکریوں نے لاکھوں کا خون بہایا تھا۔ اپنے آپ میں اتنی جرأت نہ پیدا کر سکا کہ اس مزدور کو قتل کر سکتا۔ شیرویہ کا بھی یہی مشورہ تھا شیر کے ساتھ ایک روباہ ہوا کرتی ہے۔ جس کا مشورہ ہمیشہ یہی ہوا کرتا ہے کہ جو گڑ سے مر سکتا ہے اسے زہر دینے کی ضرورت نہیں۔

اور اس طرح جیسے مدن سینا نے اپنے عاشق سے وعدہ کیا تھا، خسرو نے میری طرف سے وعدہ کر لیا کہ اگر اس نے بے ستون کو کھود دیا تاکہ جوئے شیر پہاڑ کے اس طرف آسکے تو میں اس کے حوالے کر دی جاؤں گی۔ وہ شہنشاہ جس کے حرم میں سیکڑوں عورتیں تھیں اور سینکڑوں عورتیں آسکتی تھیں۔ اس قسم کے لین دین کو عار نہ سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ کام ناممکن بھی تو تھا۔

اور فرہاد وہ "گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب" اپنے تیشے سے پہاڑ کاٹتا رہا۔ وہ پتھر پر میرا نقش بناتا۔ جیسے شیرویہ نے رجھانے کے لئے میری دوشیزگی کے زمانے میں تین بار چٹانوں پر پرویز کا نقش بنایا تھا۔ فرہاد ہر بار میرا نقش بنا کے مایوس ہو جاتا۔ میرے حسن میں ایک بات تھی۔ جو وہ بار بار ان نقوش میں پیدا کرنا چاہتا اور بار بار ہار جاتا وہ پھر سے اس مجسمے کے ٹکڑے کر دیتا اور پھر نئی تصویر کھودتا۔ اور اس طرح پورا پہاڑ کٹ گیا۔

اور تب میرا شہریار شوہر بہت پریشان ہوا۔ اس نے پھر شیرویہ کو بلایا، شطرنج کے موجد کے نانا جان کو۔ اور روباہ نے پھر روباہی کی چال چلی میرے مرنے کی افواہ فرہاد کو پہنچائی —— اور اس کم ہمت مزدور، کم ہمت مہندس نے اسی تیشے سے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالا، جس سے اس نے میرے مجسمے بنائے تھے، بے ستون کو کھودا تھا، مجھے پا لیا تھا۔ تمہارے اس ہندوستانی شاعر نے بہت خوب لکھا تھا۔ میری روح سن کر پھڑک اٹھی۔ وہ مزدور، اپنی بے بسی کی رسوم و قیود کا کس قدر پابند تھا۔ مرجانے کے لئے اسے اسی تیشہ کی ضرورت ہوئی۔ وہ اپنے دل کی حرکت روک کے مرسکتا تھا یا بے موت کے اس طرح مرسکتا تھا کہ اس کی زندگی کے ہر ہر لمحے میں موت کا مزہ ہوتا۔ وہ سقراط کی طرح تہلاب کا جام تلچھٹ تک مزے سے لے کر پی سکتا تھا۔ یہ روپہیہ کی سی موت کتنی بے معنی تھی۔

اور اب زریں تاج یعنی شیریں یعنی عجمی نسوانیت کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک پیدا ہوئی اور اس نے کہا۔ کبھی کبھی مجھے اس کا بھی خیال آتا ہے کہ وہ اسی تیشے سے خسرو پرویز کی سلطنت اُلٹ سکتا تھا مگر افسوس اس کا تیشہ درفشِ کاویانی نہ بن سکا۔

سائرن کی دلدوز چیخ پھر اماں ذرا دیر کے لئے گونج کے خاموش ہو گئی۔

اور پھر زریں تاج نے کہا۔

میرا نام مہرالنسا تھا۔ میں ایرانی تھی اور میرا ریشہ ریشہ ایرانی تھا۔ ماں باپ کے ساتھ میں ہندوستان آئی۔ مغلوں کے دربار میں میرے خاندان کو جگہ ملی اور وہ افسانہ تو تم کو معلوم ہی ہے کہ پائیں باغ میں شہزادہ سلیم دو کبوتر میرے دونوں ہاتھوں میں تھما کے کسی کام سے گیا۔ ایک کبوتر پھڑ پھڑا کر اڑ گیا۔ اس نے واپس آکے مجھ سے ناراض ہو کے پوچھا: "کیسے اُڑ گیا" تو میں نے دوسرا کبوتر بھی چھوڑ دیا۔ اور کہا "یہ ایسے اُڑ گیا!" کہتے ہیں میری یہ ادا شہزادے کے دل میں کھُب گئی اور مجھ پر دل و جان سے عاشق ہو گیا۔ جیسے وہ اس سے پہلے دل و جان سے انارکلی پر عاشق

ہو گیا تھا۔ اور اس سے پہلے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

لیکن مجھے معلوم نہ تھا عشق و محبت کیا چیز ہوتی ہے ۔ ابھی میں دوشیزہ تھی ۔ میری ایمانیت ابھی خوابیدہ تھی ۔ شہنشاہ اکبر البتہ جانتا تھا کہ محبت ذرا خطرناک سی چیز ہوتی ہے ۔ اب اس کے لئے دو صورتیں تھیں کہ یا تو وہ مجھے انار کلی کی طرح دیوار میں چنوا دے یا کسی اور سے میری شادی کرا دے ۔

میں ایسی حسین اور ایسی معصوم تھی کہ شہنشاہ نے مجھے قتل نہیں کیا ۔ ایسا اکثر ہوا ہے کہ کسی نہ کسی شہنشاہ نے کسی نہ کسی نوبہار کو قتل کرا دیا ہو ۔ لیکن میں خوش قسمت تھی ۔ میری شادی ایک بڑے ہی حسین مرد بڑے ہی بہادر آدمی سے کرا دی گئی ۔ اس کی شجاعت کی وجہ سے اسے شیر افگن خاں کا خطاب دیا گیا ۔ اور اپنے شوہر کے آغوش میں مَیں نے پہلی بار محبت کرنا سیکھا ۔

وہ بہادر تھا، جری تھا، اس کے قویٰ مضبوط تھے، اس کا سینہ چوڑا چکلا تھا ۔ اور میں اس کے ساتھ خوش تھی ۔ مجھے اس سے ایسی محبت ہوئی جو کسی اور سے کبھی نہیں ہوئی، نہ ہو سکتی تھی ۔

مگر بادشاہ مرتے ہیں اور ان کی جگہ ان کے بیٹے بادشاہ ہوتے ہیں ۔ اور اپنا انتقام لیتے ہیں ۔ مگر میرے جری اور بہادر شوہر نے تو جہانگیر کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا ۔ کبھی اس کی مخالفت نہیں کی تھی ۔ وہ اس کے باپ کا وفادار تھا اور اس کے مرنے کے بعد اس کا وفادار رہا ۔

اس پر بغاوت کا الزام نہیں لگایا جا سکتا ۔ سرکشی کا الزام نہ لگ سکتا تھا ۔ اس لئے اسے ایک دن جب کہ وہ شکار کھیلنے گیا تھا ۔ دھوکے سے قتل کرا دیا گیا ۔ وہی فرہاد والی بات ۔ وہ جو شیر افگن تھا ۔ شیروں کا شکار کھیلتا تھا شاہانہ روباہی کا شکار ہو گیا ۔

اور میں حرم میں لائی گئی ۔ مہینوں اور برسوں میں حرم میں داخل ہونے سے انکار کرتی رہی ۔ مگر شہنشاہ کو تو بچپن سے مہرالنساء کا وہ کبوتر کو اڑا دینا یاد تھا ۔ اس لئے جوں جوں انکار بڑھتا گیا ۔ میری قیمت بڑھتی گئی ۔

عورت کے خون میں قدرت نے کچھ عجیب کمزوری دی ہے جو جتنا زیادہ تعاقب کرتا ہے، اپنے صیاد سے دور بھاگتے ہیں اس کی قوتِ ارادی اتنی ہی کمزور ہوتی جاتی ہے ۔ جتنے عرصے تک یہ تعاقب جاری رہتا ہے اسی کی مناسبت سے اس کی مزاحمت گھٹتی جاتی ہے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقتول محبوب کے قاتل کو پہلے برداشت اور پھر پیار کرنے لگتی ہے ۔ اس وجہ سے بھی بہت سی عورتیں جو نم لیے اس بر اعظم میں آجکل اغوا کی جاتی ہیں، اپنے ظالم عاشقوں کے چنگل سے چھوٹ کے آنا نہیں چاہتیں ۔ کچھ اسی طرح کی کمزوری مجھ پر بھی طاری ہوتی گئی اور بالآخر میں نے "ہاں" کہہ دیا ۔ اور میں کئی میں سے ایک ۔ کئی بیگموں میں سے ایک ہو کے رہ گئی ۔ اور مجھے "نور محل" کے نام سے سرفراز کیا گیا ۔ ایسی محلات کئی تھیں ۔

محبت، ویسی اس قسم کی محبت جیسی مجھے شیر افگن سے تھی، اب میرے دل میں مر چکی تھی ۔ بالکل مٹ چکی تھی ۔ اس کی جگہ ایک عجیب طنزیہ محبت تھی ۔ مقید طائر کی محبت صیاد کے ساتھ ۔ گھوڑے کی محبت اپنے آقا کے ساتھ ۔ اور اس طنزیہ محبت میں مَیں نے گرد و پیش کا جائزہ لینا چاہا تو اپنے آقا اور شہنشاہ اور نئے شوہر کو موم کا بنا ہوا پایا جس کے ہاتھ میں آہنی گرز دے دیا گیا ہو اور جس نے ہزارہا شیر افگنوں اور ابوالفضلوں کے قتل کی تلافیِ مافات کے طور پر ایک طلائی زنجیر کھلونے کی طرح آویزاں کر رکھی تھی اور اسے زنجیرِ عدل کا خوش نما نام دیا تھا ۔

سلطنت اس نے شراب کے ایک جام کے عوض میرے حوالے کر دی تھی ۔ میں نے بہت سے امرا کو اپنے ساتھ ملا لیا ۔ میں نے اس کی کوشش کی کہ جہانگیر کے بعد میرا نام چلے ۔

ادھر حسن و جمال کے محاذ پر میں نے بہت سی نفاستیں ایجاد کیں ۔ عرقِ گلاب سے غسل کرنے کے اصول دریافت کئے، خوشبوؤں، پشوازوں، زیورات

میں نئی نئی ایجادیں کیں۔ میرے تاج میں ہیرے جگمگاتے تھے۔ انھیں میں سے ایک ہیرا جہانگیر بھی تھا۔

اور عین اس زمانے میں جو میرے عروج کا زمانہ تھا ایک درویش نے میرے شہنشاہ شوہر کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا۔ شیخ احمد سرہندی کے متعلق میں نے جہانگیر کو بہت سمجھایا۔ ان لوگوں میں ایک بڑی آرزو یہ ہوتی ہے کہ بادشاہوں سے اونچے سمجھے جائیں۔ میں نے شہنشاہ سے کہا ابھی تیری سلطنت میں برہمن کفر دوں سے افضل سمجھے جاتے ہیں۔ درویشوں کا عجیب عالم ہوتا ہے۔ اگر تو انھیں قتل کر ڈالے تو دنیا قیامت تک تجھ پہ نفرین بھیجتی رہے گی۔ اور ان کو شہید تصور کر کے ان کے مزار کی زیارت کو آیا کرے گی۔ اس کو اپنے حال پر چھوڑ۔ تجھے ہندوستان کی شہنشاہی میسر ہے۔ اسے دل کی شہنشاہی کرنے دے۔ وہ تیرا کیا بگاڑ رہا ہے؟

لیکن ایک پیالی کے عوض سلطنت میرے ہاتھ بیچ چکنے پر بھی جہانگیر کو طاقت کا گھمنڈ تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اور سر ہندوستان میں اس کا اتنا بلند ہو پایا اس کے آگے نہ جھکے۔ آخر وہی جہانگیر تو تھا جس نے ابوالفضل کو اور میرے شیر افگن خاں کو قتل کرا دیا تھا۔ اس نے دربار کیا اور کھڑکی اتنی نیچی بنائی کہ سر جھکا کے آنا پڑتا۔ شیخ احمد سرہندی بیٹھ کے اس طرح آئے کہ پہلے ان کے پیر دربار میں داخل ہوں۔ اور جو سر خدا کے آگے جھکتا ہے کسی اور کے سامنے نہ جھکے۔

شیخ احمد سرہندی کے بہت سے مرید تھے۔ ان میں مہابت خاں بھی تھا۔ اور ہم لوگ کشمیر میں تھے کہ اس نے ہمارے لئے جال تیار کیا۔ وہاں ڈل جھیل کے کنارے فواروں کے نیچے چراغاں تھا۔ جہاں پناہ کو میں جام بھر بھر کے دیتی جاتی تھی۔ کھلی ہوئی فضا میں، آسمان کے نیچے راجپوت رقاصہ مارواڑی ناچ ناچ رہی تھی۔ تھوڑی ہی دور پہ پہاڑ برف کے تاج پہنے کھڑے تھے جو چنار جہاں پناہ نے نصب کئے تھے۔ ابھی چھوٹے چھوٹے تھے، لیکن بید مجنوں کے جھنڈ جھیل کے کنارے کنارے بہت حسین معلوم ہوتے تھے۔ ہمیں معلوم ہوتا تھا کہ پورا ہندوستان ہمارے قدموں پہ لوٹ رہا تھا۔ اور پیر پنجال کے برف پوش پہاڑوں کے اس پار مہابت خاں ہمارا راستہ روکنے کی تیاری کر رہا تھا۔

اور اس ناہنجار نے اس طرح جہاں پناہ کا اور میرا راستہ روکا جیسے کوئی شطرنج میں شہ دیتا ہے۔ لیکن ادب سے شاہ شطرنج کو پیٹتا نہیں۔ شیخ احمد سرہندی کی درویشی آخر رنگ لائی۔ میں نے بھی اس ناہنجار مہابت خاں کو بہت سمجھایا۔ مگر جہاں پناہ اس کے چنگل میں تھے، سارا ہندوستان انھیں بچانا چاہتا تھا اور نہیں بچا سکتا تھا۔ اور مہابت خاں اگرچہ سپاہی تھا اس کی مجال نہیں تھی کہ اپنے آقا پہ ہاتھ اٹھا سکے۔ میں اب وہ مہرالنسا نہیں تھی جس نے دونوں ہاتھوں سے کبوتر اڑا دیئے تھے۔ میں نے ہندوستان کی سیاسی شطرنج کے سب مہرے چل کے بالآخر بادشاہ کو بچا لیا۔

اور اسی طرح کشمیر سے واپسی میں جہاں پناہ شکار کے لئے ایک پہاڑ کے دامن میں ٹھہرے۔ میں ابھی تک اسی طرح ان کے دل پر ہندوستان پر حکومت کر رہی تھی۔ اب بھی میں شراب کا جام بھر بھر کے دیتی جاتی تھی۔ کہ ایک شکاری پہاڑ سے نیچے گرا۔ اور ہڈی پسلی چورہ چورہ ہو گئی۔ جہاں پناہ کی طبیعت اسی وقت سے خراب ہو گئی۔ میرے ہاتھ سے انھوں نے شراب کا جام پھیر لیا مگر اب یہ نشاط کا جام نہیں تھا علاج کا جام تھا۔ مجھے حیرت تھی یہ وہی آدمی ہے جس نے ابوالفضل کو قتل کرایا، شیر افگن کو شکار کرا دیا جس نے زندہ عورتوں کی کھالیں کھنچوا دیں، جس نے مردوں کو دیواروں میں زندہ چنوا دیا۔ اس وقت ایک معمولی سے قدرتی واقعے سے اتنا متاثر تھا۔

وہ پھر کوئی طاقت جہانگیر کو سنبھال نہ سکی۔ اس کی نبض ڈوبتی ہی گئی، اس کے ساتھ میرے اقبال کا سورج ڈوبتا گیا۔ سلطنت سونے بیٹے کے ہاتھ آئی۔ مہرالنسا تو کبھی کی مر چکی تھی۔ اب نور جہاں بیوہ ہو کر جیتے جی مر گئی۔ وہ جو گلاب کے عرق میں غسل کیا کرتی تھی، جس نے مہابت خاں کا کفر توڑا تھا یہاں تک کہ راوی کے کنارے لاہور کے قریب آرام کرنے کا وقت آ گیا۔

چاندنی اسی طرح درختوں کے سبز رنگوں کو گہرا کر کے فضا میں ٹھنڈی آگ بکھیر رہی تھی۔

زرین تاج خاموش ہوگئی۔

پھر زرین تاج نے کہا۔

میرا نام زرین تاج تھا۔ میں قزوین میں پیدا ہوئی۔ میں اتنی ذہین تھی کہ اس مرد سے جو میرے باپ میں تھا عورت سے صدہا سال کی رقابت سلب ہوگئی۔ اور اس نے مجھے بہت اعلیٰ تعلیم دلائی۔ جیسی ہونہار لڑکوں کو دلائی جاتی ہے۔ حدیث، تفسیر، فقہ، الٰہیات میں نے مردوں کی طرح سیکھا اور مردوں سے زیادہ بہتر میں مناظرہ کرسکتی تھی۔

جب میں پڑھ لکھ چکی تو میری شادی میرے چچا زاد بھائی ملا محمد سے کر دی گئی۔ عربوں میں ابن عم سے عشق مشہور ہے، مجھے اپنے ابن عم سے ہمیشہ چڑ رہتی تھی۔ ملا محمد کو بھی علم و فضل کا بڑا دعویٰ تھا۔ مگر میں اسے چٹکیوں میں اڑاتی تھی۔ میں خود علوم میں اس قدر کامل تھی کہ مجھے کامل تر مرد کی تلاش تھی۔ ایسے مرد کی جو میرے ذہن کی گردن مروڑ سکے۔

پھر جب میں نے محمد علی باب کے حالات سنے تو اسے ایک خفیہ خط لکھا۔ وہ بہت سن رسیدہ تھا اور میں جوان سال تھی۔ لیکن میں اس کے جمال سے بن دیکھے، اس کی طرف کھنچی جاتی تھی۔ ایک طاقت تھی جو اندر ہی اندر مجھ سے کہہ رہی تھی۔ تیری منزل وہی ہے۔ جب باب کا جواب مجھے ملا تو میں بے دیکھے اس پر ایمان لے آئی۔ کچھ روز میں نے اپنی بابیت کو پوشیدہ رکھا اور پوشیدہ طور پر اسے خط لکھتی رہی۔ جب اس کا جواب آتا تو بصیرت کی آنکھ کھل سی جاتی اور جو عورت مجھ میں تھی وہ کہتی تجھے تیرا مقام مل گیا۔

یہاں تک کہ جب باب نے دیکھا کہ علم مناظرہ اور جوشِ بحث میں بڑے بڑے فاضل میرے مقابل ٹھیر نہ سکیں گے تو اس نے مجھے کھلم کھلا تبلیغ کا حکم دے دیا۔ وہ جو آفتابِ بصیرت تھا اس نے مجھے قرۃ العین (آنکھ کی تپلی) کا خطاب دیا۔ دوسرے بابی بھی مجھ سے بحث کرتے کرتے عاجز آجاتے۔ انھوں نے باب سے میری شکایت لکھ کر بھیجی۔ اس پر باب نے طاہرہ کا لقب دیا۔ اس لقب کو میں نے اپنا تخلص بنالیا۔

میں نے اپنے شوہر کو بابیت کے نور سے منور کرنا چاہا۔ وہ میرے خیالات کیا بدل سکتا۔ لیکن میں بھی اس کے دل میں چراغِ نور نہ جلاسکی۔ دراصل یہ مرد کے ذہن اور عورت کے ذہن کی ٹکر تھی۔ ایک عورت جو صدیوں کے بعد پھر ابھری تھی، ایک ایسے مرد سے بیاہی گئی تھی جس کی ذہانت صدیوں کے استعمال سے فرسودہ ہوگئی تھی۔ پھر میرا شوہر شیر افگن نہیں تھا جسے میں ہمیشہ کے لئے دل سے چاہتی وہ خسرو پرویز تھا۔ وہی فاتحانہ ملکیت کا دعویٰ۔ اس لئے کہ نکاح کے چند کلمے پڑھ گئے ہیں اسے سونپ دی گئی۔ میری نس نس میں بغاوت جاگ اٹھی۔ میرے لہو کی بوند بوند میں محمد علی باب کا جگایا ہوا جادو تھا۔ میری آنکھوں نے کبھی باب کو نہیں دیکھا۔ میں کبھی اس سے نہیں ملی۔ لیکن وہ ہر وقت حاضر اور موجود تھا۔ اور اس کی موجودگی سے اس دائمی حضور سے میرے شوہر ملا محمد کی ہستی میری نظروں میں صفر سے کم رہ گئی۔

آخر میرے شوہر نے اپنے والد اور میرے والد سے شکایت کی۔ انھوں نے مجھ پر بہت دباؤ ڈالنا چاہا میں نے کسی کی ایک نہ سنی۔ اپنے باپ سے میں نے کہا کہ میں طاہرہ ہوں۔ باب نے مجھے طاہرہ کا لقب دیا ہے۔ میرا شوہر حق سے منہ چھپاتا ہے۔ اور اس لئے وہ خبیث و مردود ہوگیا ہے۔ طاہرہ کا کسی خبیث سے جنسی تعلق باقی نہیں رہتا اور جنسی تعلق باقی نہ رہنا طلاق کے برابر ہے۔ پھر اپنے والد کو قائل کرنے کے لئے میں نے بحث شروع کر دی کہ کیا مکہ کی جو عورتیں ایمان لے آئی تھیں۔ مگر ان کے شوہر بدستور کافر رہے تھے انھیں رسول اللہ نے بلا طلاق دوسروں سے نکاح میں نہیں دے دیا تھا؟

اس درمیان میں میں باب سے دور تھی۔ میری آنکھیں کبھی روبرو اُس کے کمال کا مشاہدہ نہ کرسکیں۔ میری روح اسے ڈھونڈتی تھی کہ اسے اپنا حال سُنائے اور جب میری روح اس مردِ کامل کے لئے تڑپ رہی تھی۔ عقلِ نسوانی، مردانہ وجدان کی برق کی متلاشی تھی۔ میں نے اپنے

ذہن پر فکر و سخن کے دروازے کھلتے دیکھے۔ وہ مجھ سے دُور تھا اور میری روح اس کے لئے بے تاب تھی۔ وہ کہیں مجھے مل جاتا تو میں کس کس طرح سے اسے حالِ دلِ سناتی۔

گر بتو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو
شرح دہم غمِ ترا نکتہ بہ نکتہ مو بہ مو

تمہارے اقبالؔ نے اس شعر کو پسند نہیں کیا۔ غالبؔ کی عیاشی کو بھی اس نے اپنے جاوید نامے سے نکال باہر کیا۔ لیکن باب کا تصور میری نظروں میں معشوق کا تھا۔ معشوقِ حقیقی کے مظہر کا اور ساتھ ہی ساتھ مکمل مرد کا جس کی روح کائنات کو آغوش میں لئے ہوئی تھی۔

دور دہانِ تنگِ تو، عارضِ عنبریں خطت
غنچہ بہ غنچہ گل بہ گل لالہ بہ لالہ بو بہ بو

یہ زمانہ میرے لئے عجیب و غریب جذب و احساس کا زمانہ تھا۔ یہ عشق کا زمانہ تھا۔ نشاط و فنا کی لہریں یکے بعد دیگرے پیدا ہوتیں، کبھی مجھے بقائے دوام بخشتیں، کبھی لمحہ لمحہ نئی موت نئی لذتِ مرگ عطا کرتیں۔

اس نے مجھے طاہرہ کا خطاب دیا تھا۔ یہی میرا تخلص تھا۔ اور میں نے آبشار گرتے دیکھے۔ الفاظ کے آبشار۔ اور پھر جو میں نے آنکھ کھولی تو ان آبشاروں کی لگام میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے قرآن مجید سے شوکت لی اور متنبیؔ کے ترنم کو قاآنیؔ کے ترنم میں حل کر دیا۔ ایران کی خاک سے ایک ہزار شاعر اُٹھے تھے۔ میں پہلی شاعرہ تھی جو ان ایک ہزار شاعروں سے الگ کھڑی تھی اور میری انگلیوں کے درمیان سے یہ عظیم الشان آبشار گر رہا تھا۔

چہ شود کہ آتشِ حیرتے بزنی بہ قلۂ طورِ دل
فسلکتہ و دککتہ، متدکدکا، متزلزلا

یہ آبشار الفاظ ہی کا نہیں تھا، ایک جہاں سوز عشق کی آگ تھی، سیال آگ جو اس آبشار سے گرتی چلی جا رہی تھی، جس کی تہ میں نیستی کے نہنگ منہ پھاڑے ہوئے تیار تھے کہ مجھے اور دوسروں کو نگل جائیں۔ میں نے اپنی طرح دوسروں کو ان نہنگوں کے فروش لاشنے کی دعوت دی۔ اب آبشار کے گرجتے ہوئے تخت پر وہ جلوہ افروز تھا۔ محمد علی باب۔ اس کے چہرے کا قدس، ظہورِ حق کی بشارت دیتا تھا۔ جس کسی نے اس کا راستہ اختیار کیا وہ تو محنت اور ابتلا سے بچ گیا۔ لیکن جس نے اس سے سرتابی کی تو گویا وہ داورِ محشر کی طرح تختِ قیامت پر متمکن تھا، قہار اور جبار۔ کامل مرد، مجھ کو اور میرے ساتھ ساری کائنات کو سرتابی کے جرم میں فنا کرنے والا۔ قہار اور جبار ہی نہیں تھا۔ اس میں رحم و لطف شہنشاہی کی تمام صفتیں بھی تھیں۔

کسے ار نہ کہ ندا کنم نہ گرفت جبل ولایتم
کنمش بعید ز ساحتم و کشمش بہ قہر بجا ولا
منم آں ظہور مہیمنی، منم آں سفینت بے منی
منم آں سفینۂ ایمنی و لقد ظہرت محلّلا
شہدائے طلعتِ نارِ من، پرید سوئے دیارِ من
سر و جاں کنید نثارِ من کہ منم شہنشہِ کربلا

اور باشوکت، باعظمت، گرجدار آبشار تھا کہ بلندیوں سے گرتا ہی جاتا تھا۔ عرش سے فرش تک۔ جلالی سے جمالی تک۔ اس کی ہر گبیرتی

سے میرے حساس ذہن تک ۔

طیر المہا تکلفت، ورق البہا تصفصفت
دیک الفناء ورقت متجملا متبللا

اس سیلاب، اس آبشار میں میرا شوہر ملا محمد قزوینی خس وخاشاک کی طرح بہ گیا۔ میں اب بڑے انہماک سے بابیت کی تبلیغ کرنے لگی تو جب قزوین میں مزاحمتیں بہت بڑھ گئیں تو میں کربلا چلی گئی۔ تقریروں میں جوش اور سرشار کے عالم میں مَیں اکثر چہرے سے نقاب اُلٹ دیتی۔ لوگ وہ جو مجھ سے بڑی بڑی عالمانہ بحثیں کرتے ہوتے میرے ذہن کے تمام حربوں کے بعد حسن کے اس حربے سے اتنے مسحور ہو جاتے کہ بحث کرنا بھول جاتے۔ یہ وہی زلیخا اور زنان مصر والی ترکیب تھی۔ آخر میں عورت تھی۔ عورت کا آخری حربہ کیوں نہ استعمال کرتی۔

بدر الست کی مصیبت کے مصنف نے اتنا غلط نہیں لکھا کہ میں آہستہ آہستہ پردہ توڑ رہی تھی۔ براؤن سے صبح ازل نے محض میری ہر زہ سرائی میں کہہ دیا ہوگا کہ میں پردے کی پابند تھی۔ لیکن میرا کام تو تمام پابندیاں توڑنا تھا۔ فرہاد کی پابندیاں، شیریں کی پابندیاں یعنی تخلیق جمال کی پابندیاں، اور موضوع جمال کی پابندیاں۔ میں نے باب کی روحانیت کے ساتھ مزدک کی تعلیم کو حل کر دیا۔ میں اپنے ہی محاذ پر لڑتی رہی۔ باقی عورت کے محاذ پر۔ ابھی تک تو وہ جماعت نہیں بنی تھی اور قوام السلطنت نے نہ وزارت کی تھی۔ نہ نکالے گئے تھے۔ لوگ جمال الدین افغانی کا نام ڈھونڈ کے لیتے تھے۔ میری طرح وہ بھی ایک متعصب کافر باغی تھا۔ دونوں نے ناصر الدین شاہ قاچار کو قتل کی تھی۔ اور دونوں کا کام بادشاہوں پرویزوں، جہانگیروں نے تمام کیا۔ وہ مردوں کی جمہوریت کے محاذ پر لڑا، میں روحانی جمہوریت اور عورت کی آزادی کے محاذ پر لڑتی رہی۔ میں مزدک کی ہم خیال تھی کہ کیوں عورت ایک ہی مرد کی پابند بنا دی جائے ممکن ہے کہ اس کا مرد ملا محمد قزوینی جیسا خشک نوجوان ہو۔ نقاب کے شگاف کو میں نے اور زیادہ چاک کر دیا تاکہ عورت کی صورت......... اور اس کے دماغ اچھی طرح پہچانے جاسکیں۔

جب میں کربلا سے نکالی گئی تو بغداد پہنچی۔ وہاں سے نکالی گئی تو کرمان شاہ اور ہمدان ہوتی ہوئی پھر قزوین واپس آگئی۔ اب باب کا اجمال میری ہستی میں اس قدر رس چکا تھا اور اپنے شوہر سے میری نفرت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ بابیوں نے بابیوں کو فتوے دے دیا کہ وہ میرے شوہر ملا محمد اور اس کے باپ ملا تقی کو قتل کر دیں۔

اور اس طرح جیسے تمہارے ملک میں ہوتا ہے ذرا سا اشارہ پاتے ہی انھوں نے میرے خسر کو نہ صرف قتل کیا بلکہ ناک کان کاٹ کے اس کی لاش کو مسخ کر دیا۔ اب سارا قزوین میرا اور تمام بابیوں کا جانی دشمن تھا۔ لوگ مجھے قتل کرنے پر تُلے ہوئے تھے میں نے چھپ چھپا کے خراسان کا رُخ کیا۔ جہاں شاہ ایران کے خلاف بغاوت عروج پر تھی۔

راستے میں مجھے محمد علی بار فروشی ملا محمد علی باب میرے لئے مرد کی روح اور وجدان تھا۔ محمد علی بار فروشی مرد کا ذہن اور جسم۔ اور تم نے بہت سے قصے تو سنے ہوں گے۔ کیونکہ آوارگی کے قصے عورت کی زندگی ہی شروع ہوتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتے۔

سبز درختوں کے گہرے سائے میں زرّیں تاج قدم سے قدم ملائے ارشد کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ اپنی داستان سناتی ہوئی نقاب، اُلٹی ہوئی تھی، اس کا چہرہ چاند کی روشنی میں چاند سے زیادہ بے جان اور ٹھنڈا معلوم ہو رہا تھا۔ ارشد نے اس سے پوچھا "تمہارے اور محمد علی بار فروشی کے درمیان کیا واقعہ پیش آیا۔ کیا سچ مچ اس کے جسم سے تمہارے جسم کو محبت تھی۔ تم جو غائبانہ طور پر تمام عمر محمد علی باب کی روح کی شیدا رہیں۔

وہ مسکرائی۔ چاند کی سی ٹھنڈی مسکراہٹ جس سے پتہ نہیں چلتا کہ اس کرّے پر زندگی کے آثار ہیں یا نہیں۔ اور کہنے لگی: "خدا جانے جب تم نے کسی عورت کے متعلق ایسا کوئی الزام سنا ہے تو کیا تم کبھی یقین سے کہہ سکتے ہو کہ یہ الزام صحیح ہے یا غلط۔ صرف ملزم عورت اور ملزم مرد

جانتے ہیں کہ یہ کتنا صحیح ہے اور کتنا غلط۔ اور کبھی کبھی جو واقعہ پیش آچکا ہے غلط معلوم ہوتا ہے اور جو پیش نہیں آیا ہے صحیح معلوم ہوتا ہے۔
قصہ مختصر یہ کہ میں اس سے بارہا ملی۔ خلوت کی ملاقاتیں۔ باب میرے لئے محض روح تھا۔ ملا محمد محض جسم، محض ہوس۔ محمد علی بار فروشی ان دونوں کے درمیان تھا، ذی روح جسم، جسم کے اندر جان۔ میں اس سے بے حجاب ملتی رہی۔ اگر کوئی ان ملاقاتوں کو ناجائز کہتا ہے، فاسقانہ قرار دیتا ہے، قرار دے لے۔ مجھے ایسے مردکے جسم کی ضرورت تھی جو میری ٹکر کا ہو۔ حسین سے حسین تر۔ کہ میں اپنے آپ کو اس سے بدتر نہ سمجھوں۔ اس کے علاوہ میں عورت تھی۔ عورت کے جسم میں مجھے مرد کے جسم کی ضرورت تھی۔ میں نے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔

یہاں تک کہ قزاقوں نے قافلہ لوٹا اور ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ میں گرفتار ہو کر طہران آئی۔ یہاں میں افواہ اور افسانہ بن گئی۔ شیریں کی طرح، نور جہاں کی طرح۔ لوگوں نے مجھ اسیرِ زنداں کو طہران کی گلیوں میں دیکھا۔ ہارون الرشید کی طرح۔ میری شہرت سن کے ناصر الدین شاہ قاچار جہانگیر بن گیا۔ گویا میں نے روحانیت کا دوسرا کبوتر بھی نور جہاں کی طرح بڑے بھولے پن سے اڑا دیا تھا۔ لیکن میں جو کبھی نور جہاں تھی نور جہاں کی زندگی سے سبق لے چکی تھی۔ میرا شیر افگن محمد علی بار فروشی مجھ سے چھن چکا تھا۔ مگر میں شراب کے ایک پیالے کے عوض کسی شہنشاہ کی سلطنت خریدنا نہ چاہتی تھی۔ جمال الدین افغانی کی طرح اپنے سوتیلے رفیق کی طرح میری زندگی کا مقصد بھی شہنشاہوں کے تختے الٹنا تھا۔ فرہاد کے تیشے کو زمین کی گہرائی میں دفن کرنا تھا۔ ناصر الدین شاہ نے جب مجھے اپنی خاص الخاص ملکہ، اپنی نور جہاں بنانا چاہا تو میں ہنسی۔ ایک شعر جو میں نے بڑی عقیدت سے انکسار و عجز کے عالم میں باب کے لئے لکھا تھا، اب استغنا و طنز کے عالم میں شہنشاہ کو لکھ بھیجا۔

تو و ملک و جاہِ سکندری، من و رسم و راہِ قلندری
اگر آں خوش است تو در خوری، وگر ایں بدست مرا بتر

اور ظاہر ہے کہ اس جرأتِ انکار کی سزا مجھے کیسے نہ ملتی۔ میں بڑی بے دردی سے قتل کی گئی۔ اپنی موت کا مزا اور اس کی تفصیل مجھے یاد نہیں۔ باغ میں کمانت سے میرا گلا گھونٹ دیا گیا۔ یا مجھے کنوئیں میں دھکیل دیا گیا اور کنوئیں کو پتھروں سے پاٹ دیا گیا یا میری زلفیں چاروں طرف سے کاٹ ڈالی گئیں اور باقی بالوں کو خچر کی دم میں باندھ کے گھسیٹتے ہوئے مجھے دار القضاء لے گئے۔ غرض ہم ایرانی بھی تم ہندوستانیوں سے کم وحشی نہیں۔

پھر زور سے سائرن بجا۔ اور دفعتاً رک گیا۔ یہ وہ ہوائی جہاز تھا جو چوری سے لڑائی کا سامان لایا کرتا تھا۔ چند منٹ بعد پھر سائرن کی ولدوز چیخ سنائی دی، اور سکراہٹ کی طرح اکھڑتے ہوئے سانس کی طرح سنائی دیتی رہی۔ وہ ہوائی جہاز دیکھ بھال کی اڑان کرنے کے لئے دور پر دو سبز اور سرخ نقطوں کی طرح پرواز کر رہے تھے۔ قریب ہی گھڑگھڑاہٹ کی آواز آئی۔ سڑک پر۔ یہ اس کی اپنی جیپ تھی۔ بالآخر شیخ احمد اسے اسٹارٹ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

زرین تاج مسکرائی۔ چاند کی پھیکی موہوم مسکراہٹ۔ چاند میں پانی نہیں ہوتا۔ اس لئے زندگی نہیں ہوتی۔ زرین تاج ایک خاص تمدن کی پیداوار تھی۔ اگرچہ وہ اس سے آگے آگے رہی۔ اب اس جیپوں کی دنیا میں اس کا کیا کام تھا۔ وہ جو اعلیٰ ترین فارسی شعر لکھتی تھی۔ اب گویا ایک کاچستانی شہر الاپ رہی تھی۔ تم اونچی سڑک پر جاؤ۔ میں نیچی سڑک سے جاؤں گی۔ وہ راہبر آ چکا تھا۔

وہ تو ماضی کی طرف چلی گئی۔ چاندنی میں غائب ہو گئی۔ اور ارشد نے جیپ میں بیٹھ کے محسوس کیا کہ اس کے لئے مستقبل ابھی بہت بہت بہت دور تھا۔

حیات اللہ انصاری

آخری کوشش

ٹکٹ بابو نے گیٹ پر گھسیٹے کو روک کر کہا:

"ٹکٹ!"

گھسیٹے نے گھگیا کر بابو کی طرف دیکھا۔ انہوں نے ماں کی گالی دے کر اسے پھاٹک کے باہر دھکیل دیا۔ ایسے بھک منگوں کے ساتھ جب وہ بلا ٹکٹ سفر کریں اور کیا ہی کیا جا سکتا ہے؟

گھسیٹے نے اسٹیشن سے باہر نکل کر اطمینان کی سانس لی کہ خدا خدا کر کے سفر ختم ہو گیا۔ راستہ بھر ٹکٹ بابوؤں کی گالیاں سُنیں، ٹھوکریں سہیں، بیسیوں بار ریل سے اتارا گیا۔ ایک اسٹیشن سے دوسرے تک پیدل بھی چلنا پڑا۔ ایک دن کے سفر میں بائیس دن لگے مگر ان باتوں سے کیا؟ کسی نہ کسی طرح اپنے وطن تو پہنچ گئے ——— وطن! پچیس برس کے بعد وطن۔ ہاں پچیس ہی برس تو ہوئے۔ جب میں کلکتہ پہنچا ہوں تو کالی مل کھلی تھی اور اب لوگ کہتے ہیں کہ اس کو کھلے پچیس برس سے زیادہ ہو گئے۔ آگئے وطن۔ ہاں اب فاصلہ ہی کیا ہے۔ اگر یاد غلطی نہیں کرتی ہے تو دو کوس کا کچا راستہ اور ——— دو گھنٹہ کی بات۔

اپنا گھر! اپنے لوگ! وہ نعمتیں جن کا پچیس سال سے مزا نہیں چکھا۔ کلکتہ میں گھر کے نام کو ترس کر رہتی یا دکانوں کے تختے، یا پھر شہر سے میلوں دور ٹیکیدار کی جھونپڑیا۔ جس کی زمین پر اتنے آدمی ہوتے تھے کہ کروٹ لینے بھر کی جگہ نہ ملتی تھی۔ رہے اپنے لوگ، سو وہاں اپنا کون تھا؟ سب غرض کے بندے بے ایمان حرامزادے، ایک وہ سالا تھا بھوندو، اور وہ دوسرا تھا بھورا، اور وہ ڈائن بھنگوی جو خونچے کی ساری آمدنی کھا گئی۔ وہ ملوں کے مزدور ——— بھائی ہیں بھائی ہیں۔ مگر مزدوری کا موقع آیا کہ ہر ایک کو اپنی اپنی پڑ گئی۔ جہاں جاؤ کوئی دوسرا مزدور سفارش لئے موجود یہاں سفارش کرنے والا کون تھا؟ ——— جب جیلر نے آکر مجھے حکم سنایا ہے کہ "تیری میعاد ختم" تو آنکھوں سے نہ جانے کیوں آنسو نکل آئے۔ بس اُسی دم سے گھر کی یاد آئی۔ گھر! کیا چیز ہے!

گھسیٹے کے دل کو یقین تھا کہ پچیس سال کی تھکی ماندی آتما کو گھر پہنچتے ہی سُکھ مل جائے گا، اور گھر اب قریب تھا۔

اسٹیشن سے کچھ دور آکر گھسیٹے بھونچکا سا رہ گیا۔ یہاں کی دنیا ہی اب اور تھی۔ کھیتوں اور باغوں کی جگہ ایک شکر مل کھڑی دھواں اڑا رہی تھی جس کی عمارتیں یہاں سے وہاں تک نظر آتی تھیں، کچی سڑک کی جگہ اب پکی سڑک تھی اور اس کے برابر برابر مل تک ریل کی پٹریاں بچھی ہوئی تھیں۔ سڑک خوب آباد تھی، مزدوروں کے بہت سے چھوٹے چھوٹے غول آجا رہے تھے۔ اتنی دیر میں کئی موٹریں فراٹے بھرتی نکل گئی تھیں۔ ایک مال گاڑی چھک چھک کرتی جا رہی تھی۔ غرضیکہ جغرافیہ اتنا بدل گیا تھا کہ راستہ پہچاننا بس سے باہر تھا لیکن پھر بھی گھسیٹے کا دل اس بات پر راضی نہ ہوا کہ میں اپنے اسٹیشن پر اتر کر، اپنے ہی قصبہ کا راستہ پوچھوں۔ یہ آپ ہی آپ ایک طرف مڑ گیا۔ تھوڑی دور آکر جب شکر مل کی حدیں ختم ہونے لگیں اور ادکھ کے کھیتوں اور باغوں کا سلسلہ آگیا۔ تب اس کے دل نے دھڑک کر کہا میرا راستہ ٹھیک ہے۔

ڈیڑھ کوس چلنے کے بعد اپنے قصبے کے تاڑ دکھائی دینے لگے۔ ذرا اور چل کر شاہی زمانے کی ایک ٹوٹی ہوئی مسجد ملی جس کا ایک مینار تو ناچتی ہوئی بیلوں سے منڈھا اور جنگلی کبوتروں سے آباد تھا اور دوسرا تقریباً مسلمہ زمین پر لیٹا کائی کی مخملیں چادر اوڑھے تھا۔ اس پر نظر پڑنا تھی کہ بچپن کی بہت سی چھوٹی چھوٹی یادیں جو کب کی بھول چکی تھیں، بچپیں برسوں کے بھاری بوجھ کے نیچے سے اکدم پھڑپھڑا کر تڑپ کر نکل آئیں، اور کمسن دیہاتی چھوکریوں کی طرح سامنے اُچکنے کودنے لگیں۔ وہ زمانے آنکھوں کے سامنے پھر گئے جب اس مسجد کے گرد برساتی پانی بھر جاتا اور گاؤں بھر کے لونڈے ننگے اس میں نہاتے تھے۔ اس وقت بھی یہ کھڑا مینار یونہی کھڑا تھا اور لیٹا مینار یونہی لیٹا تھا۔

آگے چل کر برگد کا درخت ملا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ہیرا، بقاتی، بلاقی، چتنو، نیولا، سورج، بلّی اور وہ کنوا سالا کیا نام تھا اس کا، اور کون کون، ساری کی ساری ٹولی جمع ہوتی تھی اور دن دن بھر سپار مار ڈنڈا اڑا کرتا تھا۔ وہ گڑھیا کے اس پار امرود کا باغ تھا۔ اس پر کبھی کبھی ڈنڈا پڑا کرتا تھا۔ لونڈے گھس گئے اور چپکے چپکے کچے پکے امرود نوچ نوچ کر جیبوں میں بھرنے لگے اور رکھوالا ماں بہن کی سناتا دوڑا اور ادھر آناً فاناً میں سب ہوا ہو گئے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ لونڈے امرود کھسوٹ رہے تھے کہ ادھر سے ایک فقیرنی آنکلی جو منمنا منمنا کر گا رہی تھی۔ کچھ لونڈوں کو سوجھی شرارت۔ وہ چڑیل چڑیل چلّا کر بھاگے، پھر کیا تھا سب سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے۔ بلاقی رہ گیا۔ ارے ڈر کے مارے اس کی گھگھی بندھی ہے اور وہ جو لگا ہے فقیرنی کے سامنے ہاتھ جوڑنے......

گھسیٹے یہ یاد کر کے بے اختیار ہنس پڑا۔

سورج دن بھر کا سفر طے کر کے افق کے قریب پہنچ چکا تھا۔ دھوپ میں ملائمت آگئی تھی اور ہوا میں خوش گوار خنکی۔ راستے کے ایک طرف پتاور کے ہرے بھرے جھنڈ تھے، جن کے بیچ بیچ سے بوڑھی سرکیاں سروں کو نکالے جوانوں کی طرح کھڑی ہونے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دوسری طرف آسمان کے کنارے تک کھیتوں اور امرود کے باغوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ بسیرا لینے والی چڑیاؤں اور کوّوں کا شور، کھیتوں سے واپس آنے والے بیلوں کی گھنٹیاں، ہلواہوں کی ہٹ ہٹ، باغوں کے رکھوالوں کی ہو ہو، ان سب سے ہوا اسی طرح بسی ہوئی تھی جیسے پتاوروں کی بھینی بھینی میٹھی میٹھی خوشبو سے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا ایک بہت بڑا گھر ہے جس کے رہنے والے یعنی کھیت، درخت، ہوا، آنے والی صدائیں اور خوشبو سب قریبی رشتہ دار ہیں اور خوشی خوشی مل جل کر رہتے ہیں۔

کسانوں کا ایک جتھا کھیتوں سے واپس آتا ہوا ملا۔ آگے آگے ایک لڑکی پیٹی اوڑھنی سر سے لپیٹے گاتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے پیچھے ہل کو کندھے پر رکھے، بیلوں کو ہنکاتے چھ سات مرد تھے۔ ان لوگوں نے پھٹے حال گھسیٹے کی طرف توجہ نہ کی مگر جیسے ہی گھسیٹے کی ان میں سے ایک شخص سے نگاہ ملی۔ وہ بے اختیار مسکرا دیا جیسے کوئی دور دراز سفر سے آنے والا اپنے عزیزوں کو دیکھ کر مسکرا دیتا ہے۔

ادھر سورج افق کے دامن میں چھپا اور ادھر قصبہ آگیا۔ اس کا نشان ایک اکل کھرا تاڑ تھا جس سے کچھ دور ہٹ کر آم کے دو چار بوڑھے درخت شام کا دھندلکا اوڑھے کسی یاد میں کھوئے کھڑے تھے۔ اس مقام سے ایک بہت رومان بھری یاد منگلو تائی کے کراکٹی اور گھسیٹے کے

پاؤں تھام لئے۔ وہ بلاارادہ کھڑا ہو گیا۔ وہ سامنے کی جھاڑی اور گڑھیا' یہیں دلاری سے چھپ چھپ کر ملتے تھے۔ وہ بھرے جسم کی بھالی بھی دلاری جس کے نہ روٹھنے کا ٹھیک پتہ چلتا تھا اور نہ ملنے کا۔ جب وہاں بیٹھ کر وہ دلاری کا انتظار کرتا تھا تو دل میں کیا کیا نقشے بنتے تھے شہر جاؤں گا' نوکری کروں گا۔ دونوں وقت چنے چباؤں گا مگر روپیہ جوڑ جوڑ کر رکھوں گا۔ پھر جب ڈھائی سو روپیہ ہو جائے گا تو واپس آؤں گا اور ہیرالال کی طرح اکدم سے ایک گوئی بیل لے کر کھیتی شروع کر دوں گا۔ اس وقت دلاری میری کتنی خوشامدیں کرے گی۔ میں تو کم سے کم دو مہینے تک اس سے بات بھی نہ کروں گا۔ بس اس جگہ ٹہلنے آ جایا کروں گا۔ وہ آئے گی ضرور اور وہاں درخت کی جڑ پر بیٹھ کر ڈھیلے پھینکے گی، گنگنائے گی، میری طرف کن انکھیوں سے دیکھ دیکھ کر ہنسے گی —— بڑی چڑیل تھی۔ نہ جانے اب کہاں ہے؟

گھسیٹے درختوں کے اندر گھس کر دیکھنے لگا کہ پرانی گڑھیا اب تک ہے؟ ہاں ہے تو —— اور وہ سامنے جمنی کا درخت بھی ہے جس کی جڑ پر وہ بیٹھتی تھی۔ کیا زمانہ تھا!

گھسیٹے درختوں سے نکل کر سڑک پر آ گیا اور قصبے کے اندر چلا۔ مگر اب اس کی چال دھیمی تھی۔ وہ ان یادوں میں ایسا ڈوب گیا تھا کہ آنکھیں دیکھنا اور کان سننا بھول گئے تھے۔ ایکا ایکی ایک موڑ پر چونک پڑا جیسے کوئی بسری بات اک دم یاد آ گئی ہو۔ یہی جگہ تھی جہاں یہیں ابا نے دو چانٹے مار کر میرے گلے سے شبن میاں کی قمیص کا بٹن نوچ لیا تھا۔ ادھر شبن میاں گھر کے اندر آئے اور ادھر ڈانٹ لگائی "گھسیٹے! گھسیٹے! —— کدھر مر گیا؟" ٹانگیں پھیلا کر دونوں بوٹ میرے منہ کی طرف بڑھا دئے۔ ان کو اتارو' پھر جرابیں اتارو' پھر انگلیوں کو تولئے سے پونچھو' پھر جوتی لا کر پاؤں کے نیچے دھرو —— شبن میاں کی چیزیں دیکھ دیکھ کر جی چاہتا تھا کہ ان میں سے دو ایک ہمارے پاس بھی ہوتیں! ہمارے پاس کیا تھا؟ ایک پھٹا کرتہ پاجامہ پہنے رہتے تھے۔ جب وہ بالکل چیتھڑے ہو جاتا تو خاں صاحب پھر کسی کا پرانا دھرانا جوڑا دے دیتیں۔ "یہ پہاڑ لایا؟" —— "اس کے بدن پر تو کانٹے ہیں" —— "یہ کہاں سے کھونچا لگا یا؟" —— "کمینے کو کبھی تمیز نہ آئے گی۔" ایک بار شبن میاں کے کمرے میں جو گیا تو دیکھتا کیا ہوں کہ قمیص کے کف کے دو بٹن پلنگ پر پڑے چم چم کر رہے ہیں۔ اس وقت کچھ ایسے پیارے معلوم ہوئے کہ میں نے چپکے سے ایک مٹھی میں دبا لیا۔ تھوڑی دیر میں شبن میاں چلانے لگے۔ "ایک بٹن کیا ہوا؟ کون لے گیا؟" میں ستے جی میں کہا میں لایا ہوں۔ پھر کیا کہتے ہو؟ بٹن تو نہ دوں گا چاہے کچھ کرو۔ بلکہ اب تو تمہارے گھر کام بھی نہ کروں گا۔ سب کی آنکھ بچا کر باہر چلا آیا۔ میری قمیص میں آستین کہاں تھی؟ میں نے وہ بٹن گلے میں اس طرح لگایا کہ بٹن اور زنجیر دونوں چیزیں باہر چم چم کریں اور پھر دن بھر بھوکا پیاسا کھیتوں کھیتوں گھومتا رہا۔ جب رات آ گئی تب فکر ہوئی کہ اب کہاں جاؤں گاؤں میں ادھر ادھر پھرتا پھرتا تھا کہ ابا نے جو میری کھوج میں لگے تھے: دیکھ لیا۔ "تو شبن میاں کا سونے کا بٹن لے آیا —— سونے کا بٹن" دو تھپڑ پڑے تھے کہ میں بھاگا۔ سونے کا بٹن! کلکتہ میں چار چار پیسے پتہ ملتا ہے۔ جتنے چاہو لے لو۔

چھپروں اور نیچی نیچی دیواروں پر شام کی سانولی رنگت چھا گئی۔ فضا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی جس سے دل کو عجب سکون ملتا تھا۔ گھروں میں چولہے جل گئے تھے جن کا دھواں اور سرخی چھپروں سے نکل نکل کر بلا کسی گھبراہٹ کے اوپر چڑھ رہے تھے۔ پکارنے اور زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں جو اپنے ساتھ دن بھر کی تکان کو لئے بھاگی جا رہی تھیں۔ دوارے پر لڑکے لڑکیاں اونچا نیچا کھیل رہے تھے اور بے حد شور مچا رہے تھے جیسے بسیرا لیتے وقت جنگلی مینائیں —— ایک گھوڑا دن بھر دوڑ دھوپ کر کے ابھی ابھی تھان پر آیا تھا اور خوشی سے ہنہنا رہا تھا۔

آخر مسجد آ گئی۔ اسی کی بغل سے گھسیٹے کا راستہ جاتا تھا۔ بجلی کے تاروں کا بلب مسجد کے ایک مینارے سے لگا ہوا چمک رہا تھا۔ اسے دیکھ کر گھسیٹے کو ایک بارات یاد آ گئی جو باجے گاجے لئے، مشعلیں جلائے، ایک کمزور سی ناؤ پر چڑھی گنگا کی خونی لہروں کو پار کر کے کنارے

آ اترتی تھی۔

بنیا لو: آ گئی۔ اس کے پار آبادی سے ذرا نکل کر گھر تھا۔ گھسیٹے کا دل امید و بیم سے زور زور سے دھڑکنے لگا اور ساتھ ساتھ خوشی کے مارے آنسو نکل پڑے۔ آنکھوں کے سامنے گھر کی تصویر پھر گئی۔ بڑا سا صاف ستھرا لیپا پوتا چھپر۔ دو بڑی بڑی اناج کی کٹھیاں۔ رات کو نہ معلوم کب سے اٹھ کر اماں کا گھر گھر چکی پیسنا اور وہ اس پر گانا "موری پچھا گل نہ بولے" "دن کو کام کاج کر کے گھر آؤ اور لاکھ چلاؤ" اماں روٹی دے، اماں روٹی دے" اور چلاتے چلاتے تھک جاؤ، روؤ دھو کچھ کرو، اماں اسی طرح پیسے چلی جاتی ہیں۔ جب اس کا جی چاہتا تب اٹھ کر چولھا جلاتی۔ جیا اور شبراتن! اوہ! دونوں کو اماں کتنا مارتی تھی، اور تھیں وہ بھی دونوں بڑی ہی حرامزادی۔ کبھی جو کام کرتیں ——— ادھر ابا کلہاڑی کندھے پر رکھے بکریاں ہانکتا گھر میں گھستا اور ادھر چلانے لگتا۔ ادھر اماں پر غصہ آیا اور جھونٹے پکڑ کر دھوئیں دھوئیں ——— واہ ری اماں! جہاں کسی کا جی خراب ہوا، اس کے جی کو لگ گئی۔ پھر تو یہ ہے کہ "ارے آتیرا سر داب دوں" ——— ادھر آ تجھ پر گجرا اتار دوں" ——— "چاندنی میں بیٹھ کر نہ کھا" ——— "دونوں وقت ملتے نہ چلا" ہر وقت ٹلکا اتار رہی ہے۔ آنے جانے والوں سے پوچھ پوچھ دوا پلا رہی ہے ——— کھانے کی کتنی شوقین تھی۔ کچے پکے، گلے سڑے، کھٹے میٹھے جیسے بھی آم مل جائیں بڑے مزے سے بیٹھ کر سب کھا جاتی تھی۔ کچے پکے امرود، جھربیریاں کیتھے اور کیا کیا سب بہت شوق سے کھاتی تھی مگر بچوں کا کھانا اسے برا نہیں لگتا تھا۔ وہ قصہ جو ہوا تھا کہ اماں کو کہیں سے گڑ کی بھیلی مل گئی۔ اس نے طاق پر رکھ دی، میں ادھر سے آؤں چرا کے ایک ٹکڑا منہ میں رکھ لوں۔ ادھر سے آؤں چرا کے ایک ٹکڑا منہ میں رکھ لوں۔ شام کو ابا نے جو دیکھا تو ذرا سا گڑ تھا وہ لگے ڈکارنے "کون کھا گیا؟" اماں سمجھ گئیں۔ سہولت سے بولیں "چوہا کھا گیا ہو گا" ——— "تو کھا گئی ہے تو۔ کیا چوہے بھی گڑ کھاتے ہیں؟" اماں نے کہا "کیوں؟ کیا ان میں جان نہیں ہے؟" میں نے جی میں کہا کہ دیکھو جب شہر سے کما کر لوٹوں گا تو گڑ کی ایک پاری بھی لاؤں گا۔ تب تو یہی ابا چٹخارے ماریں گے "واہ کیا مزا ہے" جیا اور شبراتن آنکھیں پھیلا پھیلا کر تکیں گی۔ منہ سے پانی چھوٹے گا۔

گھر میں اب کون کون ہو گا؟ ابا! اماں بھلا کیا زندہ ہوں گے۔ ستر اسی برس کون جیتا ہے؟ جیا اور شبراتن کہیں بیاہ دی گئی ہوں گی۔ ہاں فقیرا تو جوان ہو گا۔ بھولے کے تو بیوی بچے ہوں گے اور بکریاں؟ اوہ کلو کے ناتیوں کی بھی ناتنیں ہوں گی۔ کلو زندہ ہو تو پہچانے گی؟ جب بھی کی ہوتی تھی تو میری طرف دیکھ دیکھ کر کیسا میں میں کرتی۔

(۲)

سامنے گھر ہے کہ نہیں؟ بنیا سے باہر آتے ہی گھسیٹے کے دل نے دھڑک کر بڑی بے تابی سے پوچھا ——— وہ جگہ تھی وہ ——— ہاں ——— وہاں کچھ ہے تو ضرور۔

شروع تاریخوں کی اوس کی ماری بیمار چاندنی میں اندھیرے اجالے کا ایک ڈھیر نظر آیا۔ ایک دیوار تھی جس کا آدھا حصہ تو ٹیلے کی طرح ڈھیر تھا۔ آدھا جو کھڑا تھا اس پر ایک ٹوٹا پھوٹا چھپر تھما تھا جس کا پھونس دھواں کھائے ہوئے مکڑی کے جالے کی طرح ہر طرف جھول رہا تھا۔ چھپر کے سامنے کی طرف چوحدی کی جگہ جھاڑ جھنکاڑوں، تاڑ کے پتوں اور کسی سوکھی بیل کا ملا جلا ایک اژدہم تھا جن کے پتلے پتلے ٹیڑھے بیڑھے سائے کیچوؤں اور کنکھجوروں کی طرح زمین پر بچھا رہے تھے۔ گھر اپنے سناٹے میں قبرستان تھا۔ اندر نہ چولھا جل رہا تھا نہ چراغ۔ گھر کی ایک ایک چیز پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ ہم خود ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج ہیں ——— تم کو کیا کھلائیں گے؟

یہی گھر تھا جہاں مسافر کی تھکی ماندی آتما کو چین کی تلاش تھی۔ گھسیٹے کی امیدوں کا چمن جسے وہ بائیس روز سے، پچیس برسوں کے کچلے ارمانوں کے

خون سے سینچ رہا تھا، اکبارگی مرجھا گیا۔ اس کا دل بار بار شک دلاتا کہ یہ گھر خالی ہوگا، وہ لوگ کہیں اور اُٹھ گئے ہوں گے، اور بار بار بکریوں کے موت کی کھراہند اور ناہماں کی سڑاہند جو بوجھل ہوا سے دبی ہوئی گھر کے گرد مقید تھیں، ان بالک کے گھونٹوں کو دھا دیتیں۔ گھسیٹے آدھ گھنٹے تک جہاں کا تہاں کھڑا رہا۔ اس میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اندر جاتا یا کسی کو آواز دیتا۔

دور کہیں پر ایک پلا رو رہا تھا، رفتہ رفتہ اس کی آواز سے ایک طرح کی ڈھارس بندھی اور یہ کھکھارا، جواب نہ ملنے پر پھر کھکھارا۔ بار بار کھکھارنے پر کوئی دبے پاؤں باہر آیا اور رازدارانہ لہجے میں بولا:

"اندر چلی آؤ نا۔"

اس وھمکے سے گھسیٹے کی ہمت اور سکڑ گئی۔ اب کی وہ سہارا لینے کو بیچ بیچ کھکھارا، پھر کہنے لگا:

"کون فقیرا؟"

"ہاں!"

فقیرا ذرا چڑ کر بولا،

"تم کون ہو؟"

"ذرا اِدھر آؤ۔"

فقیرا نکل کر قریب آیا اور بولا،

"تم ہو کون؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"ذرا سُنو تو بھائی، تم فقیرا ہو نا؟"

"ہاں ——— کہہ تو دیا۔"

"تم یہیں رہتے ہو؟"

گھسیٹے کی آواز میں کچھ اتنا پیار تھا کہ فقیرا کا غصہ تو غائب ہو گیا، مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ شخص کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔ دوسری طرف گھسیٹے کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنے کو کیسے پہچنوائے۔ اسے خیال تک نہ آیا تھا کہ اپنے گھر پہنچ کر یہ کام بھی کرنا ہوگا۔ آخر دل کڑا کر کے بولا:

"میں بائیس روز کا سفر کر کے آ رہا ہوں ——— تمہارے پاس!"

اب بھی فقیرا کچھ نہیں سمجھا مگر بلا ارادہ اس کی زبان سے نکل گیا:

"تم اندر آؤ۔"

اندر آ کر گھسیٹے کی ہمت بندھی اور ساتھ ہی راحت پانے کی اُمید بھی بلا وجہ ہرپانے لگی۔ فقیرا نے دیا سلائی کھینچ کر چراغ جلایا۔ چھپر کے نیچے سات بکریاں اور بکریوں کے بچے بندھے تھے۔ انہیں سے شاید گھرانے کی روٹی چلتی تھی۔ ذرا اوھر ہٹ کر زمین پر ایک چھیدا ٹاٹ بچھا تھا جس پر ایک میلی سی چیز جو شاید کبھی رضائی ہو مگر اب چیتھڑا ہو کر گم نام ہو گئی تھی، اوڑھنے کے لیے پڑی تھی۔ گھسیٹے نے ٹاٹ پر بیٹھ کر کپکپاتے چراغ کی دھندلی روشنی میں فقیرا کو غور سے دیکھا۔ دُبلا پتلا، آنکھیں اندر دھنسی ہوئیں اور بے نور چہرے کی کھال جوتے کے چمڑے کی طرح کھردری اور اس پر دونوں طرف دو لمبی لمبی جھریاں، جیسے کچی دیوار پر برکھا کے پانی کی لکیریں۔ بال کھچڑی جن میں سفیدی زیادہ۔ یہ تھا گھسیٹے کا جوان بھائی فقیرا! مصیبت زدہ گھسیٹے دیکھنے میں اس سے زیادہ جوان تھا۔

گھسیٹے اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ کر بولا: "بیٹا تم تو جوانی ہی میں بڑھا گئے!"

فقیرا ٹھنڈی سانس بھر کر بولا:

"جوانی تو کھلائی پلائی سے ٹھہرتی ہے۔"

"سچ ہے بھیا ——— بھورا، بجیا اور شبراتن کہاں ہیں؟"

اب فقیرا ٹھٹکا۔

"پہلے تم بتاؤ کہ تم کون ہو ——— گھسیٹے تو نہیں ہو؟"

"ہاں گھسیٹے ہوں اور کون بائیس دن ٹھوکریں کھا کر آ رہا ہے۔"

بھیا کہہ کر فقیرا اس سے لپٹ گیا۔ گھسیٹے نے بھی بھینچ کر لپٹا لیا اور جیسے کوئی سوتا پھوٹ جائے، اس کے آنسو ڈھل ڈھل بہنے لگے۔ فقیرا بھی رو دیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں روتے رہے۔ پھر فقیرا نے اپنے آنسو پونچھے اور گھسیٹے کو ڈھارس دلائی کہ "اب نہ رو، یہ تو خوشی کی بات ہے کہ تم گھر آ گئے ——— اماں کو دیکھو گے؟"

گھسیٹے کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"اماں! ——— ہے کیا؟"

"ہاں!"

چھپر کے ایک کونے میں چیتھڑوں کا ڈھیر لگا تھا۔ فقیرا اس کی طرف انگلی اٹھا کر بولا:

"وہ پڑی ہے۔"

گھسیٹے محبت اور اشتیاق کے جوش میں اُدھر بھاگا۔

یہاں چیتھڑوں کے انبار میں دفن ایک انسانی پنجر پڑا تھا جس پر مرجھائی ہوئی بدرنگ گندی کھال ڈھیلے کپڑوں کی طرح جھول رہی تھی۔ سر کے بال بیمار بکری کی دم کے نیچے کے بالوں کی طرح میل کچیل میں لتھڑ کر نمدے کی طرح جم گئے تھے۔ آنکھیں دھول بھر سوندھی کوڑیوں کی طرح بے رنگ اپنے ویران حلقوں میں ڈگر ڈگر کر رہی تھیں۔ ان کے کوئے کیچڑ اور آنسوؤں میں لت پت تھے۔ گال کی جگہ ایک پتلی سی کھال رہ گئی تھی جو دانتوں کے غائب ہونے سے کئی تہوں میں ہو کر جبڑوں کے پیچھے آ گئی تھی۔ گال کے اوپر کی ہڈیوں پر کچھ پھولا پن سا تھا، بد گوشت ہو یا ورم! جیسے روتے روتے ورم آ گیا ہو۔ گردن اتنی سوکھ گئی تھی کہ ایک ایک رگ نظر آ رہی تھی۔ ننگے سینے پر چھاتیاں لٹکی رہی تھیں جیسے بھینچی ہوئی اُلٹی بنڈی کی خالی جیبیں۔ چہرے کی ایک ایک جھری سخت گھناؤنی مصیبتوں کی مہر تھی جسے دیکھ کر بے اختیار دھاڑیں مار مار کر رونے کو جی چاہتا تھا۔

فقیرا چراغ لے کر آیا۔ روشنی دیکھتے ہی بڑھیا کچھ بکنے لگی اور داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے جھوٹ موٹ کا نوالہ بنا کر اپنے منہ کی طرف بار بار لے جانے لگی جیسے گونگا کھانا مانگے۔ بڑھیا نہ معلوم کیا کہہ رہی تھی مگر سننے میں صرف یہ آتا تھا "باب ...... باب ...... باب...... باب ...... باب ...... باب......"

اس کی آواز ایسے ویرانی کے مارے گاؤں کی یاد تازہ کرتی تھی جہاں کے رہنے والے آگ سے جل مرے تھے اور اب اس کے کھنڈروں میں دن کو بندر بیٹھتے اور رات کو سیار روتے ہیں۔

فقیرا نے گھسیٹے کی طرف دیکھ کر کہا:

"جب اس کے پاس آؤ یہ اسی طرح کھانا مانگنے لگتی ہے۔ چاہے جتنا کھلاؤ اس کا جی نہیں بھرتا۔ منہ سے نکل نکل پڑتا ہے، پھر بھی مانگے جاتی ہے۔"

آخر گھسیٹے بڑی کوشش سے بولا:

"اماں!"

آواز بتا رہی تھی کہ اس کا دل اندر ہی اندر کراہ رہا تھا۔

فقیرا نے کہا: "نہ وہ سنتی ہے نہ سمجھتی۔ بس کھانے کی بات سمجھتی ہے۔"

بڑھیا کا پوپلا منہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا، بات کی آواز نکل رہی تھی اور انگلیوں کا بنا ہوا نوالہ بار بار منہ کی طرف جا رہا تھا مگر ان حرکتوں پر بھی یقین نہ آتا تھا کہ یہ پنجر زندہ ہے۔

یہ وہی چوڑی چکلی تندرست اماں تھی جو منہ اندھیرے سے دوپہر تک مسلسل چکی پیسا کرتی تھی! جسے دن رات یہی دھن سوار رہتی تھی کہ کسی طرح گھر کی حالت سنبھل جائے، اس نے کیسا کیسا اپنا جی مارا اور ذرا ذرا سی چیز کے لیے کیسا کیسا ترستی رہی!

گھسیٹے کے دل میں ماں کے لئے ترس بھرا پیار اُبل پڑا جو ہاتھ پھیلا پھیلا کر یہ دعا مانگنے لگا کہ اے خدا اس کی مشکل آسان کر اور اب تو اسے ناپاک دنیا سے اٹھا لے۔ اگر اس وقت گھسیٹے کی آنکھیں رو دیتیں تو اسے سکون مل جاتا مگر افسوس آنسوؤں جیسی نعمت کوسوں دور تھی۔

فقیرا کے لئے اس نظارے میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس نے کہا:

"بھیا تم ذرا ہاتھ منہ دھو لو۔ میں کھانے پینے کا کچھ سبیتا کروں۔"

فقیرا بھاگتا ہوا بنیا کے اس پار جوگیوں کے گھر سے آدھ سیر جوار کا آٹا ادھار مانگ لایا اور پھر چولہا جلا کر روٹیاں پکانے بیٹھ گیا۔ گھسیٹے بھی چولھے کے پاس آ بیٹھا اور بولا:

"فنا آٹا! کیا تم نے ابھی نہیں کھایا؟"

"نہیں، آج آٹا ختم ہو گیا تھا تو میں نے کہا کہ ایک رات یوں ہی سہی۔"

"اب کھیتی نہیں ہوتی؟"

"وہ کب کی بند ہو گئی۔ ابا کے مرنے کے بعد بھورے کو جیل ہو گئی۔ میں اکیلا رہ گیا۔ دو برس تک ترکاریاں ورکاریاں بوئیں مگر وہ کہیں بکائیں نہیں۔ لگان تک نہیں ادا ہوا۔"

"بھورے کا۔ ہے ہیں پکڑا گیا؟"

"سونی بھنگی کی ایک بکری بیچ لی تھی۔ پھر جب جیل سے چھوٹ کر یہاں آیا تو اس کی بیوی دوسرے کے گھر بیٹھ چکی تھی۔ یہ فوجداری کرنے پر تیار ہو گیا مگر اس کی طرف سے کوئی کاہے کو کھڑا ہوتا؟ دو مہینے سب کو گالیاں دیتا رہا۔ پھر ایک رات کہنے لگا: 'یہ فقیرا مجھ سے تو اب تیری طرح نہ بھوکوں مرا جائے گا اور نہ اس گاؤں میں رہا جائے گا۔ بلا سے جیل ہو جائے چار دن عیش تو کر لیں گے ——— دوسرے دن منہ اندھیرے کہیں نکل گیا ——— ۔ اِنکے کہنا تھا کہ اب پھر جیل پہنچ گیا ہے۔"

"جمیا اور شبراتن کہاں ہیں؟"

"جمیا حرامزادی کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ شبراتن کا دس کوس پر تکیہ والوں میں بیاہ ہو گیا ہے۔ ایک امرود کا باغ ہے، کسی طرح گذر بسر ہو جاتی ہے مگر کبھی ماں کو نہیں پوچھتی۔"

ذرا دیر خاموشی رہی۔ پھر فقیرا ردٹی کے کناروں کو انگاروں پر سینکتے ہوئے بولا:

"تمہارے جانے کے بعد بھیا وہ وہ آفتیں آئیں۔ سب گھر مٹ گیا۔ وہ بھی کیا 'جاتا'، تنا ابا کہا کرتے تھے کہ "یہ سب تچے پیٹ بھرے

ہیں پیٹ بھرے" سچ کہتے تھے۔ اس زمانے میں تو کوئی رات ایسی نہیں گذری جب چولہا نہ جلا ہو۔"

گھسیٹے لمبی سی ٹھنڈی سانس بھر کر چپ ہو گیا اور لپکتے کوئلوں کی طرف اس طرح تکنے لگا جیسے ان میں پرانے دنوں کو ڈھونڈھ رہا ہو۔

فقیرا نے اس سناٹے کو توڑا:

"کہاں کہاں رہے گھسیٹے؟"

"ہم کلکتہ جا کر ایسے پھنسے کہ خط پتر کو بھی چار پیسے نہ بچے۔ گھر یاد کر کر کے کتنی بار رونا آیا۔ بڑی کٹھن گذری وہاں، ملوں کی خاک چھانی، امیدواری میں کام کیا، بھوت گھر میں روئی ڈھوئی، ہفتوں قبض رہتا تھا، چار سال رکشا چلائی، پھر خونچہ لگایا، ارے فقیرا بڑا کٹھن ہے کلکتہ میں رہنا۔ جس کے دو چار جاننے والے ہوں اور جس کے پاس لینے دینے کو ذرا پیسہ ہو اس کے لئے تو وہاں سب کچھ ہے۔ لیکن ایسے دلیول کو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ وہاں تو روئے رلائی نہیں آتی تھی۔ مرنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔

فقیرا نے لال لال روٹی کپڑے پر رکھ دی اور دونوں ٹکڑے توڑ توڑ کر کھانے لگے۔

فقیرا بولا:

"بھیا ذرا چپکے چپکے کھاؤ۔ اماں سُن لے گی تو چلا چلا کر رات بھر نہ سونے دے گی۔"

گھسیٹے نے شک اور حیرت سے فقیرا کی طرف دیکھا:

"تم تو کہتے ہو وہ بالکل نہیں سنتی؟"

"ہاں، مگر نجانے کیا بات ہے کہ کھانا کھانے کی آواز سُن لیتی ہے اور کھانے کی بُو بھی پا لیتی ہے اور پھر باب، باب کرنے لگتی ہے۔"

گھسیٹے بجھتے انگاروں کی طرف تکنے لگا۔ اس کا حلق اتنا سوکھ گیا کہ منہ کا نوالا بلا پانی کے گھونٹ کے نہ اتار سکا۔

(۳)

گھسیٹے گھر کے دوارے مونڈھوں پر بکری کا سکا ملے، دھوپ میں ننگے بدن بیٹھا، اپنے میلے کرتے کے چلوسے چن رہا تھا۔ کئی روز سے ہاتھوں پیروں اور ہونٹوں کو چٹخا دینے والی سرد ہوا کے تیز جھکڑ چل رہے تھے جن میں سینکڑوں میل کا گرد و غبار بھرا تھا جو ناک اور حلق میں گھس رہا تھا۔ کھیتوں کے پودے اور درخت ہوا کی چوٹ کھا کر جھک جاتے تھے اور بے کسی سے اپنے پتے پھڑپھڑاتے تھے جیسے ہوا سے فریاد کر رہے ہوں کہ اب تو للہ جان چھوڑ دے۔ کھیتوں میں کسان اپنی چادروں کو بدن پر سمیٹے، ہاتھ پاؤں سکیڑے کندھوں کو آگے جھکائے شوشو کر رہے تھے۔ ہر جگہ اتنی اجاڑ اجاڑ تھی اور ہر چیز اتنی دکھ بھری کہ بے اختیار جی گھبرا گھبرا کر کہتا تھا کہ چلو کہیں بھاگ چلیں۔

گھسیٹے دھوپ میں بیٹھا کانپ رہا تھا اور کلکتہ کو یاد کر رہا تھا۔ آنے کے دوسرے ہی دن سے وہ ٹوٹے پھوٹے ویران چھپر، بکریوں کے موت کی کھراہند اور اپنی ماں کی باب، باب سے گھبرا گیا تھا۔ دن بھر بھوک بہلاتا اور بکریاں چراتا اور رات کو بجرے کی روکھی سوکھی روٹی اور کبھی کبھی تو رات کو بھی فاقہ۔ پھر یہاں کی سردی! افوہ! بدن ہے کہ کٹا جاتا ہے۔ اوڑھنے کو کھیا پہننے کو دو آدمیوں کے بیچ میں ایک۔ سب سے بڑی کوفت یہ کہ جوانی کے پچیس سال کلکتہ میں گنوانے کے بعد گھسیٹے کو یہاں کی کسی چیز سے اب لطف نہ آتا تھا۔ چوپال کی باتیں، روکھی پھیکی، گاؤں کی عورتیں بیں نرم اور کچاؤ۔ پھر جس سفید پوش کو دیکھو تھانیدار کی طرح اکڑ دکھاتا ہے اور فقیرا! وہ تو بات بات میں باپ بنتا ہے سب مصیبتوں سے بڑی مصیبت یہ کہ پیسہ کمانے کا کوئی راستہ نہیں دمڑی دمڑی کے لئے فقیرا کی محتاجی۔ ہر بات میں اس کا دست نگر رہنا۔

گھسیٹے چلے مارا مارا تھا اور کلکتہ سے آنے پر پچھتا رہا تھا۔ وہ دکانوں کے تختوں پر رات کاٹنا، وہ سڑکوں پر جو جاڑوں میں برف کی سِل اور گرمیوں میں دہکتا ہوا توا ہوتی تھیں خچر کی طرح رکشا لے کر دوڑنا۔ وہ کبھی کبھی تین تین چار چار فاقے کر لینا اپنے گھر کی اس زندگی سے لاکھ درجہ بہتر تھا۔ وہ کلکتہ کی ایک پیسہ والی سنگل چائے، وہ میٹھے پان کا بیڑا! وہ پیسے کی ۲۵ بیڑیاں! یہ وہ نعمتیں تھیں جن کے لئے یہاں وہ ترس گیا تھا۔

گھسیٹے نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دور تک پھیلے ہوئے سڑک کے کھیتوں کی طرف دیکھا۔ میری زندگی بھی کیا زندگی رہی ہے۔ پندرہ سولہ برس کے سن تک باپ کی اور بھائیوں کی مار کھائی! کھانے پینے کو ترستے رہے، پھر ہمت کر کے کمانے کھانے کے لئے شہر بھاگے، وہاں مہینوں ٹھوکریں کھائیں، کہا چلو کلکتہ چلو، وہاں پہنچتے ہی اچھی سی نوکری مل جائے گی اور سب پاپ کٹ جائے گا، کلکتہ کے پچیس برس! اُفوہ! کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی، رکشا تک چلائی، سیٹھ جی نے کہا کہ گاڑی لینا ہے تو ضمانتی لاؤ۔ میں کسے لاتا؟ جو وہاں کے رہنے والے تھے ایک دوسرے کو جانتے تھے گھر اُسکے گھرانے رہتے تھے۔ ضمانتی لے آتے تھے۔ چھمن بولا دو آنے روز دو تو کلوٹا مہاجن ضمانتی ہو جائے گا۔ دو آنے روز اسے دیئے، پھر بھی سالے سیٹھ نے ٹوٹی پھوٹی گاڑی دی۔ اسے دور ہی سے دیکھ کر لوگ ہٹ جاتے تھے جب سیٹھ سے خوشامد کر کے ایک اچھی سی گاڑی دے دو تو وہ اکڑ کر کہتا تھا کچھ روپیہ جمع کر کے لاؤ نا۔ روپیہ بچتا تو کیسے بچتا؟ آمدنی بھر تو کلوٹا کھا جاتا تھا۔ چار سال دوڑے مگر بے وہی موچی کے موچی۔ بخار جو آیا تو کسی طرح گیا ہی نہیں۔ ہسپتال میں پڑے پڑے مہینوں بیت گئے، اچھے ہوئے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا اب خبردار رکشا نہ چلانا اور نہ زیادہ محنت کا کام کرنا۔ پھر دو روپیہ قرض ادھار کر کے پان سگریٹ، دیا سلائی کا خونچہ لگایا۔ اب جو آتا کہتا سیزر لاؤ، ینگ لاؤ، یہ لاؤ، وہ لاؤ۔ یہاں کیا تھا، کہتے "نہیں ہے صاحب، نہیں ہے حضور" وہ بھی تماشا کچھ دنوں تک رہا۔ نہ بیٹھنے کو اچھی جگہ تھی نہ اچھا سامان تھا۔ اس پر جو کچھ بھی آیا حرامزادی بنگون کھا گئی۔ نہ جانے مجھ سالے کو عورت رکھنے کی کیا پڑی تھی...... لنگوٹی میں پھاگ......

گھسیٹے کو اپنے اوپر سخت غصہ آیا اور اپنے کو خوب گالیاں دینے لگا۔ اتنے میں فقیرا سامنے سے آیا اور آتے ہی کٹھے پن سے بولا:

"پھر تم نے چرا کر دودھ بیچ لیا۔ اب ہمارا تمہارا گذارا نہیں ہو سکتا۔ جہاں جانا ہو چلے جاؤ۔"

گھسیٹے نے جواب دیا "کیسی چوری؟ کچھ پاگل ہو گیا ہے تو؟ روز کا یہی قصہ، روز کا یہی قصہ۔ بڑا آیا ہے گھر سے نکالنے والا۔ جیسے گھر میں میرا حصہ ہی نہیں اور بکریوں میں میرا حصہ ہی نہیں؟"

"گھر میں حصہ، بکریوں میں حصہ، تو حصہ بٹائے گا؟ کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا۔ پچیس سال کلکتہ میں گنوا کر ہماری جان کو آیا ہے، گیا تھا روپیہ کمانے!"

گھسیٹے گرم ہو کر بولا:

"کلکتہ میں کمانا کچھ آسان ہے؟ تو خود تو زندگی بھر قصبہ سے باہر نہیں گیا اور چلا ہے کلکتہ کی کمائی کی باتیں کرنے۔ وہاں وہ کماتا ہے جس کے دس جاننے والے ہوں جو اس کے لئے تکڑم لگائیں۔ وہ کماتا ہے جس کے پاس روپیہ ہو کہ کچھ کھو کر سیکھے۔ کام کچھ دنوں کے بعد آتا ہے کہ آپ ہی آپ؟"

فقیرا نے طعن سے کہا:

"ہاں جو یہاں سے جاتے ہیں روپے کے ڈھیر تو لے کر جاتے ہی ہیں۔ تبھی جو اتنا روپیہ لایا ہے کیسے لایا ہے؟"

اب تو گھسیٹے تلملا گیا۔ وہ سب کچھ سُن سکتا تھا مگر یہ کہ اس نے کلکتہ میں رہ کر کچھ نہیں کیا بالکل ہی نہیں سُن سکتا تھا۔ وہ چلا کر بولا:

"اور تو نے کیا کما لیا ہے؟ چوٹٹا کہیں کا۔ ان بکریوں میں، اس گھر میں کیا میرا حصہ نہیں تھا؟ سب کا سب بیچ کر کھا گیا۔ لا میرا حصہ دے میں آج ہی اس منحوس گاؤں سے جاتا ہوں۔ بے ایمان کہیں کا......"

گھسیٹے سے ہی نہیں پٹتا تھا کہ اپنا سر پھوڑ ڈالے یا جان نکال کر رکھ دے۔ کیا کہے جو فقیرا کو یقین دلا دے کہ کلکتے میں میں نے کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی۔

کچھ یوں ہی تو تو میں میں ہوتی رہی۔ پھر فقیرا بڑبڑاتا ہوا اندر چلا گیا۔ دیر تک وہ اندر سے اور یہ باہر سے بڑبڑاتے رہے۔

یہ قصہ آج کچھ نیا نہیں تھا بلکہ پورے چار مہینے سے یہی ہو رہا تھا۔ روز یہی جھگڑا اٹھتا، روز یہی باتیں ہوتیں اور روز دونوں اسی طرح بڑبڑا بڑبڑا کر چپ ہو جاتے۔

رات جب روکھی روٹی کھا کر گھسیٹے بستر پہ بیٹھ کر حقہ گڑگڑانے لگا تو پھر ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ کلکتہ کی یاد آئی اور وہ سوچنے لگا کہ شاید اب یہیں ہمیشہ کے لئے اس اجاڑ گاؤں ہی میں دفن ہو گیا۔ اب باقی زندگی اسی طرح بتانا ہے۔ کاش ایک بار صرف ایک بار میرے پاس کچھ پیسہ آجاتا جو میں کچھ دنوں اپنی بھٹکی ماندی آتما کو سکھ دے لیتا۔ چالیس برس کی بھٹکی ماندی آتما! میں یہ نہیں کہتا کہ بڑا سا گھر ہو، دروازے بھینس بندھی ہو، کٹھیوں میں اناج بھرا ہو۔ گھر والی ہو جو ساری کے پلّو سے تھالی صاف کرے، اس میں دال بھات لا کر سامنے رکھ دے، اس کے پاؤں میں موٹے موٹے کڑے پڑے ہوں جو بدھی کی طرح آڑے آڑے ایک طرف جھکے ہوں جیسے شرمائی سالی کا سر۔ بس مجھے تو بس اتنا مل جائے کہ اپنا ایک الگ چھپر ہو، دونوں وقت اپنی روکھی سوکھی ہو۔ بس اور سے ہاں اپنے پاس کچھ تو ہو۔ اب کہاں گھر والی کی خواہش اور کہاں بچوں کا ارمان چالیس کا سن ہونے کو آیا......

سن کا خیال آتے ہی دل میں ایک تیز ہوک اٹھی کہ اب دو چار برس جوانی اور ہے پھر اندھیرا پاکھ۔ جانے کب موت آ جائے.....

ایک زبردست امنگ اٹھی کہ جیسے بنے ایک بار اور ہاتھ پاؤں مارو۔ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے فقیرا کو پکارا:

"بھیا فقیرا!"

فقیرا پیار کی پکار سن کر فوراً پاس آگیا۔ جب وہ آرام سے بیٹھ گیا اور حقہ کا ایک دم لے چکا تو گھسیٹے بولا:

"میں یہ کب کہتا ہوں کہ میں کچھ کروں گا ہی نہیں۔ مگر کوئی کام بھی تو ایسا ہو جس سے کچھ ملے۔ ارے بھیا تم کہتے ہو کہ کلکتہ میں میں نے پچیس برس بھاڑ جھونکا، مگر میں کہتا ہوں کہ میں کم سے کم اتنا تو سیکھ ہی گیا ہوں کہ کون کام چل سکتا ہے اور کون نہیں۔ تم کہتے ہو پھیری لگائیں، یہ کریں وہ کریں، سچ کہتا ہوں کہ ان میں کچھ نہیں دھرا ہے۔ پیسے والوں کے سامنے کون اپنا روزگار جما سکتا ہے؟"

گھسیٹے یہ کہہ کر اس طرح خاموش ہو گیا جیسے ابھی بات نہیں ہوئی، پھر فقیرا کی طرف دیکھ کر بولا:

"اگر کچھ مل سکتا ہے تو اسی طرح جیسے ہم کہتے ہیں۔ مگر جو ہم کہتے ہیں ..... وہ تو تم مانتے ہی نہیں ——— اس میں تمہارا بھی بھلا ہمارا بھی بھلا۔ کون جانے گا کہ ہم کیسے کماتے ہیں؟ اور جان بھی گیا تو کیا؟ جب ہمارے پاس پیسہ ہوں گے تو سب ہماری برائی کو بھی اچھائی کہیں گے۔ جگیوں کو دیکھو، ان کے گھر پیسہ برس رہا ہے ہمن۔ کہنے کو ہم شریف اور وہ رذیل۔ مگر کون کس کی خوشامد کرتا ہے؟ ہم ہی ہیں جو آگے دوڑے جاتے ہیں کہ اچھے منگو سیر بھر آٹا اُدھار دے دو، دو لکڑیاں نمک دے دو، ذرا سی تمبا کو دے دو۔ وہ ٹال مٹول بھی کرتے ہیں، دھتکار بھی دیتے ہیں، مگر ہم پھر جاتے ہیں، نہ جائیں تو کریں کیا؟"

فقیرا بیٹھا چپ چاپ سنتا رہا، گھسیٹے دم لے کر پھر کہنے لگا:

"اور ہم تو کہتے ہیں کہ سب ہم کو چھوڑ بھی دیں تو کیا؟ کیا کوئی لڑکا لڑکی بیاہنے کو بیٹھے ہیں ہم؟ ہم دونوں چین سے الگ ہی رہ لیں گے؟"

گھسیٹے نے اک دم سے کچھ یاد کر کے فقیرا کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پھر کہا:

"ہاں تمہارا ساری بیاہ کرنا ہے، روپیہ دیکھ کر سب ہی لڑکی دینے کو راضی ہو جاتے ہیں اور نہیں تو پھر اپنی برادری ہی نہ سہی کسی اور میں سہی۔

ارے ہاں! اس طرح تو کہیں بھی نہیں کہہ سکتے اور پھر یہ اماں کے لئے بھی اچھا ہے۔ جب پیسے ہوں گے تو ان کو بھی خوب کھانے کو ملے گا!

فقیرا اب بھی کچھ نہیں بولا۔ اس سے پہلے بھی گھسیٹے کئی بار یہی باتیں کر چکا تھا مگر تب انہیں سُن کر فقیرا کو غصہ آگیا تھا۔ روپیہ کے لئے کہیں شرافت بیچی جاتی ہے؟ روپیہ ہے کیا؟ ہاتھ کا میل۔ آج آیا تو کل گیا اور شرافت وہ دھن ہے جو پیڑھیوں چلتا ہے اور خرچ نہیں ہوتا۔ شریف پھول کا برتن ہے جتنا بھی کیچڑ میں سوندھ جائے جب بھی مانجھو چم چم کرنے لگتا ہے اور جہاں شرافت گئی پھر آدمی مٹی ہو جاتا ہے مٹی۔ ماما جگیرن کے پاس روپیہ ہے پیسہ ہے، گھر گرہستی ہے، ہم ہی ان کی خوشامد کرتے ہیں وہ نہیں کرتے، ہم ہی ان سے روٹی ادھار مانگتے ہیں وہ نہیں۔ مگر اس سے کیا؟ ہاتھی لاکھ لٹ جائے پھر بھی سوا لاکھ ٹکے گا۔ ابھی ہم اور وہ مکھیا کے گھر جائیں تو ہم تو چبوترے پر بیٹھیں گے اور وہ دور زمین پر۔

فقیرا پانچ برس کا تھا جب گھسیٹے روپیہ کمانے شہر بھاگ گیا تھا، تب سے اس کے دل میں بھی کمانے کی تمنا پیدا ہو گئی تھی لیکن جیسے جیسے دن بیتتے گئے اور گھسیٹے روپیہ کا گٹھڑ لے کر نہیں لوٹا، اس کی خواہش مرتی گئی۔ غریبوں کو کہاں پیسہ ملتا ہے، پیسہ مل جاتا تو کوئی غریب ہی کیوں رہتا؟ اس جیون میں بس یہی ہے کہ اپنا دوزخ پاٹ لو اور موقع ملے تو کسی سے ہنسی دل لگی کر لو اور کیا دھرا ہے؟ بھرے کا حشر دیکھ کر تو رہی سہی آس بھی گہری نیند سو گئی۔ لیکن اب جو گھسیٹے روزانہ شام کو، جب یہ دونوں کام کاج سے فارغ ہو کر بیٹھتے، اس جگنے کا یہ منتر اسی موہنی سے پڑھتا رہا تو رفتہ رفتہ فقیرا کی سوئی ہوئی آس چونکی، انگڑائی لے کر اٹھی اور پر پرزے نکالنے لگی۔ وہی فقیرا جسے کل تک کل کی کوئی فکر نہ تھی، آج جو مایا کے مندر کی راہ سوجھائی دی تو لگا کچھ اور ہی سپنے دیکھنے، ذرا یہ چھپر بدل جاتا، تھوڑی سی بکریاں اور ہو جاتیں اور چار پانچ روپے اکٹھے ہو جاتے پھر ہمارا گھر بس جاتا۔ ارے ہاں اب گھر نہ بسا تو پھر کب بسے گا؟ وہ رمضانی کی بیوہ، آنکھ ملا ڈنڑ کیسا ہنستی ہے اس سے آج کہو تو آج گھر بیٹھ جائے۔ کیسا گدرایا بدن ہے! جیسے پکا آم۔ کیا ٹھمک ٹھمک چلتی ہے! اور کتنی محنتی ہے وہ۔ دود دوہ دیتے، اوپلے وہ تھاپے، وہی وہ ممتے، اکیلی جھوڑوں بانس اٹھا، ٹھا کھیتوں میں ڈالے، کیا عورت ہے! میں نے دیر کی تو کوئی اور اپنے گھر بٹھا لے گا اور پھر میں منہ تکتا رہ جاؤں گا۔

جس دن سے فقیرا کے دل میں یہ خیالات گونجنے لگے، وہ رمضانی کی بیوہ سے کنائی کاٹنے لگا۔ ادھر وہ سامنے دکھائی دیتی اور یہ راہ کترا کر نکل جاتا۔ پندرہ بیس روز یوں ہی کٹ گئے۔ ایک دن یہ لکڑی چیر رہا تھا کہ وہ اکھاڑی پیچھے سے آگئی، اسے بھاگتے نہ بنی، کچھ باتیں ہوئیں، کچھ ہنسی دل لگی ہوئی۔ پھر وہی ہوا جس کا فقیرا کو دھڑکا تھا یعنی اسی دن اس نے گھسیٹے کی بات مان لی۔

(۴)

ابھی پہر رات باقی تھی کہ گھسیٹے نے فقیرا کو جگایا۔ دونوں تاروں کی مدھم روشنی میں اٹھے اور ایک ٹوکرے کو بانس سے لٹکا کر ایک ڈولی سی بنائی اور اس میں خوب سا پیال بھر دیا اور پھر بڑھیا کے پاس گئے گھسیٹے نے ایک ہاتھ گلے میں اور ایک کمر میں ڈال کر اس کو پھول کی طرح اٹھا لیا۔ آنکھ کا کھلنا تھا کہ وہ لگی باب، باب، باب کرکے اشارے سے کھانا مانگنے۔ گھسیٹے نے پہلی بار اسے چھوا تھا۔ اسے ایک عجیب اذیت ہوئی جس سے اس کا چہرہ عجب ہونق ہو گیا۔ ایک طرف تو آنکھوں میں آنسو آرہے تھے اور دوسری طرف بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

گھسیٹے نے اسے لے جا کر آہستہ سے جیسے کوئی شیشہ کا برتن ہو، ٹوکرے میں رکھ دیا اور پھر اسے چیتھڑوں سے چھپا دیا۔ ایک طرف کا بانس فقیرا نے تھاما اور دوسری طرف کا گھسیٹے نے اور دونوں گھر کے باہر چلے۔ بکریاں ان لوگوں کو اس طرح جاتے دیکھ کر

بے کسی سے میں مین کرنے لگیں جیسے یہ لوگ، ان کو ہمیشہ کے لئے بے یار و مددگار چھوڑے جا رہے ہوں۔

جب یہ دونوں رات کے کالے پردوں کی اوٹ میں منہ چھپائے ہوئے گاؤں کے نکڑ پر آگئے تو پو پھٹی اور نسیم اٹھلا اٹھلا کے چلنے لگی۔ یہ خوش تھے کہ چلو ہم نظروں سے بچ کر نکل آئے کہ اچانک ایک طرف سے ایک کسان کندھے پر ہل رکھے نکل پڑا اور پہچان کر پوچھنے لگا:

"کہاں چلے فقیرا؟"

ہوا کا ٹھنڈا جھونکا فقیرا کے کلیجے کو بہاتا نکل گیا۔ اس کے کندھے کا بانس کانپا۔ کسی وجہ سے گھسیٹے گھبرا کر فقیرا کی جگہ خود بول اٹھا:

"شبراتن کا حال خراب ہے۔ اماں کو لئے وہاں جا رہے ہیں۔"

"اماں کو لئے؟" کسان اتنا متاثر ہوا کہ بے اختیار کہہ اٹھا:

"شاباش تم لوگوں کو ــــــ اپنی مہتاری کی اتنی سیوا کرتے ہو!"

شہر کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کا خطبہ شروع ہو چکا تھا، اس وقت فقیرا اور گھسیٹے نے مسجد سے ذرا ہٹ کر ایک گلی میں آکر ڈولی رکھی۔ گھسیٹے نے بڑھیا کو جو کنڈلی مارے ٹوکرے میں سو رہی تھی، اٹھا کر ٹیک لگا کر بٹھا دیا اور پھر اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ کو ٹوکرے میں دو پھیٹے باندھ کر اس پر رکھ دیا۔ یہ احتیاط تھی اس بات کی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بابب باب کہتے وقت ہاتھ بجائے منہ کی طرف آنے کے کانپ کر کسی اور طرف نکل جائے۔ مگر یہ احتیاط فضول تھی۔ کیونکہ دس برس سے اس ہاتھ کا صرف یہی کام رہ گیا تھا کہ منہ کی طرف جا جا کر اشارے سے کھانا مانگا کرے۔ اب سوائے ادھر کے اور کسی طرف جانے کی ہاتھ میں سکت ہی نہ تھی۔

بڑھیا جاگ پڑی مگر وہ ہچکولے کھاتے کھاتے اور رات رہے سے اس وقت تک بابب باب کہتے کہتے اتنی تھک گئی تھی کہ بجائے چلانے اور کھانا مانگنے کے جیسے بٹھائی گئی تھی ویسے ہی بیٹھی رہی۔ یہ تو بڑی رہی، ساری کی کرائی پر پانی پھرا جاتا تھا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے، فوراً گھسیٹے نے لپک کر سامنے کی حلوائی کی دکان سے ایک پیسہ کا جلیبیوں کا شیرا مانگا۔ اس نے تھال پر چمٹی ہوئی کھٹور اور بھنکتی ہوئی مکھیوں کو اڑا کر تھال ایک طرف جھکا دیا اور جتنا شیرا بہہ آیا اسے انگلی سے پونچھ پانچھ کر ایک پتے پر ٹپکا کر گھسیٹے کو تھما دیا۔ اس نے لا کر شیرے کی ایک انگلی بڑھیا کو چٹا دی۔ اس کا چٹانا تھا کہ وہ فوراً بابب باب کر کے اور مانگنے لگی۔

چلو عمل کامیاب رہا۔ بڑھیا کی کوک ہاتھ آگئی۔ گھسیٹے نے پتہ فقیرے کو پکڑا کر ہدایت کی کہ موقع پر بڑھیا کو ایک انگلی چٹا دینا۔ فقیرا زندگی میں تیسری بار شہر آیا تھا۔ یہاں کی گہما گہمی، بھیڑ بھاڑ اور بڑی بڑی دکانوں سے وہ بھونچکا ہو گیا تھا، عقل چندھیا گئی تھی۔ اس کے برخلاف شہر کی ہوا لگتے ہی گھسیٹے کی ہر بات میں خود اعتمادی آگئی تھی۔ گھسیٹے مشتاق پیراک کی طرح تھا جو دریا میں اترتے ہی چہلیں کرنے لگتا ہے اور فقیرا نو سکھئے کی طرح جو پانی دیکھ دیکھ سہما جاتا ہے۔ گھسیٹے فقیرا کو حکم دے رہا تھا اور وہ کل کی طرح اس کے اشاروں پر چل رہا تھا۔

دونوں ڈولی لے کر مسجد کے سامنے آئے۔ خدا کے گھر کے سامنے انسانی کوڑے کا ڈھیر لگا تھا۔ کٹی انگلیوں اور بیٹھی ناک والے کوڑھی، منمنا کر ڈراؤنی آواز میں بولنے والی آتشکی بڑھیاں، چندھے چیچڑے بچے جن کے ہاتھ پاؤں سوکھے اور پیٹ بڑھے ہوئے تھے، جو نہ جانے کیوں مسلسل ریں ریں کر رہے تھے۔ پھیکے، بے حیا دیدوں والی جوان عورتیں جن کے سر پر جوؤں کا جنگل اور بدن پر میل کی کھگل، چیتھڑے، ٹھیکرے، میل، آخور، بلغم، ناک، پیپ، مکھیاں، جراثیم، فریب، جھوٹ اور ان سب کو ڈھانک دینے والی، لوریاں دے دے کر تھپک تھپک کر سلا دینے والی مہا پاپن بے حسی!

ــــــ اس سمندر میں گھسیٹے اور فقیرا نے بھی ماں کی ڈولی لے کر غوطہ مارا۔ میل کچیل ہو، چاہے ذلت ہو، حیوانیت ہو، چاہے انسانیت ہو؟

بابا کے مندر کو یہی راستہ جاتا ہے۔ اس وقت جبکہ سب دروازے بند ہو چکے ہیں۔ اکیلا یہ کھلا ہوا ہے۔ صاف اور سیدھا راستہ "تنہا راستہ ——— پھوٹی آنکھ کا دینا ۔

ڈولی رکھی ہی تھی کہ پاس کے ایک بڈھے فقیر نے ماں کی گالی دے کر کہا:

"ابے ادھر کہاں آیا؟ بھاگ یہاں سے۔"

پھر تو آس پاس کے سب فقیر گالیاں دینے اور غل مچانے لگے۔ کیونکہ ان کی ڈولی دیکھ کر ہر ایک کو اپنی روزی کی پڑ گئی۔ فقیرا کی تو یہ ہنگامہ دیکھ کر جان ہی نکل گئی۔ اس نے جھٹ ڈولی کا ڈنڈا کاندھے پر رکھ کر وہاں سے ٹلنا چاہا مگر گھسیٹے نے دیکھا کہ ان گیدڑ بھبکیوں سے اگر دبا تو پھر اس برادری میں گھس چکا۔ اس نے دو چار ماں بہن کی سُنا کر کہا:

"تمہارے باپ کی زمین ہے۔ چپ رہو ورنہ سب کے سر پھوڑ دوں گا۔"

ڈانٹ سنتے ہی فقیر تو ذرا بڑبڑا کر چپ ہو گئے مگر بڑھیاں اسی طرح کائیں کائیں کرتی رہیں۔ آخر ایک نمازی نے جو جماعت کے لالچ میں دوڑا جا رہا تھا، ان کو ڈانٹا:

"چپ رہو بدنصیبو نماز ہو رہی ہے؟"

نماز کے خیال سے یا ڈانٹ کے ڈر سے کسی نہ کسی وجہ سے خاموشی ہو گئی۔ اگر کوئی بات نہ ہوتی تو بھی خاموشی ہو جاتی کیونکہ اس سے زیادہ احتجاج کرنے کا بوتا ان لوگوں میں تھا ہی نہیں اور دوسرے گھسیٹے بھی اب جگہ پر پورا قبضہ پا چکا تھا۔

ابھی نمازی نکلنا نہیں شروع ہوئے تھے۔ لیکن وہاں کی فضا سے فقیرا ایسا متاثر ہوا کہ اس نے بے سمجھے بوجھے بڑھیا کو ایک انگلی شیرا چٹا دیا۔ شیرا لگتے ہی گراموفون کے ریکارڈ کی طرح وہ بجنے لگی اور مشین کی طرح اس کے جبڑے اور ہاتھ چلنے لگے۔ اسے دیکھ کر ایک دو برس کے بچے نے جسے ایک شخص پھونک ڈلوانے کو لایا تھا، گود میں سہم کر زور سے چیخ ماری اور بسورنے لگا۔ ایک جوان اینگلو انڈین لڑکی ہاتھ میں بٹوا لٹکائے ادھر سے گزر رہی تھی۔ اس نے جو بڑھیا کو دیکھا تو ایک بار سر سے پاؤں تک کانپ گئی جیسے ایسا ہی بھیانک بڑھاپا اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ اس نے بے تحاشا دو پیسے نکال کر بڑھیا کے آگے پھینک دیئے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی بوڑھے کتے کے سامنے تر نوالہ پھینک دیتا ہے کہ وہ ہمیں بھول کر اس میں جٹ جائے۔ پیسے بڑھیا کے سامنے لگے ہوئے چیتھڑوں کے انبار میں ڈوب کر غائب ہو گئے۔ اب گھسیٹے کو اپنی ایک غلطی کا احساس ہوا۔ بھیک کوئی اس کے ہاتھ میں تھوڑی دے گا، دے گا بڑھیا کو۔ اس کے سامنے کوئی چادر ہونی چاہئے جس پر آ کر پیسے گریں۔ گھسیٹے نے جلدی سے اپنا پھٹا انگوچھا بڑھیا کی گود میں پھیلا دیا۔

نماز ختم ہوئی اور نمازی غول کے غول باہر نکلنے لگے۔ فقیروں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ بھوکا ہوں بابا، بھوکا ہوں بابا! ایک نفیری گھگھیانے لگی جیسے کوئی نئی نویلی بیوہ سسکیاں بھرتی ہو۔ ایک تگڑا فقیر حلق پھاڑ پھاڑ آوازیں لگانے لگا "جو صبح دے گا اللہ ہی دے گا" فقیرا بھیڑ بھاڑ دھکم دھکا اور شور ہنگامے سے ایسا بھونچکا ہوا کہ منہ پھیلا کر ایک طرف تکنے لگا اور شیرا چٹانا بھول گیا۔ گھسیٹے نے چلا چلا کر اسے کئی بار حکم دیا مگر جب دیکھا کہ اس کے حواس بالکل غائب ہیں تو جلدی سے پنّہ چھین کر خود ہی چٹا دیا۔ شیرے کا لگنا تھا کہ مشین پھر تیزی سے چلنے لگی۔ مگر پھر بھی لوگ ادھر متوجہ نہیں ہوئے۔ گھسیٹے نے ذرا محسوس کیا کہ کیا کمی ہے۔ پہلے سے اس نے کوئی صدا تو سوچی نہیں تھی۔ جلدی میں اس کے منہ سے نکلا "اللہ ہر آفت سے بچائے" اس صدا کو اس طرح دینے لگا جیسے کوئی والنٹیر "انقلاب زندہ باد" کے کیونکہ دوسری اسے یاد ہی نہ آئی۔ اس کی صدا میں اگر تاثیر تھی تو صرف اتنی کہ لوگ ادھر دیکھ لیتے تھے، دیکھتے ہی بڑھیا پر نگاہ پڑ جاتی تھی یہ دردناک نظارہ دل کو ویرانی اور وحشت سے بھر دیتا تھا جس کی دوا صرف بھیک کے چند پیسے تھے۔ بڑھیا کے سامنے پیسوں کی بارش ہونے لگی۔

اس پاس کے فقیر یا تو خالی ہاتھ یا ایک ایک دو دو پیسے لئے حسرت سے ان دونوں خوش نصیبوں کو تک رہے تھے اور دل ہی دل میں کڑھ رہے تھے کہ ہمارے پاس بھی کوئی ایسی ہی بڑھیا چیز کیوں نہیں ہے۔ گھسیٹے اپنی اتنی کامیابی دیکھ کر خوشی اور غرور سے متوالا ہو گیا اور خوب کڑک کڑک کر صدا لگانے لگا۔ آج زندگی میں پہلا دن تھا کہ جس پیشے میں وہ گھسا تھا اس میں چوٹی پر جگہ ملی تھی۔ حسرت رہی کہ کبھی ایسا ہوتا کہ جس پیشے میں گھسوں اس کا اچھا سامان ہو، اس کا سب اونچ نیچ معلوم ہو مگر آخر آج دونوں نعمتیں میسر آ ہی گئیں۔ میرے پاس جو سامان ہے وہ کسی کے پاس نہیں اور میں صدا بھی کیا خوب لگا رہا ہوں۔ سب خدا کی دین ہے۔ آخر وہ کب تک اپنے بندے کا امتحان لیتا۔ دیکھو پیسے کیسے برس رہے ہیں! تو ہی داتا ہے اور تو ہی جیون کا کھیون ہار ہے مالک۔ اماں زندگی بھر کوشش کر مریں کہ کچھ پیسہ جوڑ کر گھر کی حالت سدھاریں۔ ایک ایک بات کے پیچھے جان دے مریں، مگر کچھ نہ ہوا اور اب ہوا بھی تو کیسی آسانی سے۔ یہ خدا کے کارخانے ہیں۔ حیلے روزی بہانے موت۔

(۵)

سہ پہر کی سنہری دھوپ میں گھسیٹے اور فقیرا ڈولی لئے شہر کے باہر ایک شاہی کھنڈر کے پاس آ گئے۔ دونوں سارا دن ڈولی لادے لادے پھیری لگاتے رہے تھے، تکان سے چور چور تھے مگر پھر بھی آنکھوں میں اطمینان اور خوشی موجیں مار رہی تھی۔ مست تھے، گا رہے تھے اور زور زور سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔

ایک کھنڈر کے سایہ میں ڈولی اتار دی گئی۔ گھسیٹے نے بھیک کی جھولی کھولی۔ اس میں پانچ چھ آدمیوں کے کھانے بھر روٹیوں کے ٹکڑے، دال بھات اور ترکاریاں ملی جلی بھری تھیں۔ ان پر ایک نظر ڈال کر ماں کی گالی دے کر ایک طرف پھینک دیا۔ پھر ذرا اطمینان سے بیٹھ کر ایک پوٹلی کھولی جس میں نفیس بہت سی تیل کی پوریاں، کئی قسم کی ترکاریاں، سیر بھر رنگ برنگی مٹھائی، چٹ پٹے کباب، مرلیاں اور بیڑی کا بنڈل۔ آج کے پھیرے میں پونے دو روپے ملے تھے جس میں سے ڈیڑھ کی یہ سب خریداری تھی اور چار آنے ابھی گھسیٹے کی جیب میں اچھل رہے تھے۔ گھسیٹے نے سب نعمتیں نکال کر سامنے یہاں سے وہاں تک چن دیں۔ سب ملا کر چار آدمیوں بھر کھانا تھا۔ دونوں کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ سامنے نعمتوں کا ڈھیر تھا جو تھا اپنا تھا۔ جس طرح چاہے کھاؤ، جو چاہے پھینکو۔ پہلے دونوں نے مٹھائی کی ایک ایک ڈلی منہ میں ڈالی اور بدحواسی سے اس کو نگل گئے پھر مکھیوں کی طرح مٹھائی پر ٹوٹ پڑے گویا زندگی بھر کی بھوک اسی ایک آن میں بجھا دیں گے۔ پوریوں کی باری آئی، ایک ایک پوری کا ایک ایک نوالہ۔ کس کس کر دو چار دانت مارتے اور پھر غپ سے دو ذرا میں اتار لیتے۔ اس شور سے بڑھیا جو سو رہی تھی جاگ پڑی اور جاگتے ہی کھانا مانگنے لگی۔ اب ان دونوں کو وہ بھی یاد آئی۔ گھسیٹے اس کی طرف پیار سے دیکھ کر ہنسا اور اسے اٹھا کر ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔

"لو آج تم بھی مزے دار چیزیں کھا لو۔ کبھی کاہے کو کھائی ہوں گی؟"

گھسیٹے نے کچھ نکتیاں اس کے منہ میں دے دیں۔ وہ جلدی سے ان کو نگل گئی اور نگلتے ہی بدحواسی سے باب باب کرنے لگی۔ حیرت کی بات یہ کہ وہ کسی نہ کسی طرح ہاتھوں پیروں کو ہلا جلا کر آگے سرک آئی۔ گویا کہ چاہتی تھی ایک جھپٹا مار کر سب کچھ ایک ہی دفعہ اپنے منہ میں بھر لے۔ فقیرا اور گھسیٹے کے لئے شرارت یہ تھی کہ خود کھائیں یا اسے کھلائیں۔ یا ادھر اس کے منہ میں کچھ دیتے اور ادھر وہ نگل کر اور مانگنے لگتی — گھسیٹے جھلا کر بولا:

"تو تم بھی کیا یاد کرو گی؟"

دانت سے کاٹ کر مولی کا ایک ٹکڑا بڑھیا کے منہ میں دے دیا۔ بڑھیا فوراً خوش خوش اسے چبانے لگی۔ مگر چبتا کیا وہ بار بار منہ سے نکل آتا اور وہ پھر کسی نہ کسی طرح کانپتے ہاتھوں سے اسے اندر ٹھیل دیتی۔

دونوں پھر اپنا پیٹ پاٹنے میں جٹ گئے۔ ذرا دیر میں بڑھیا کھانسی۔ اس کے حلق میں ٹکڑا پھنس گیا تھا۔ آنکھیں چڑھ گئیں اور لگی پیچھے جھوم جھوم کر سوں سوں کرنے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب دم نکلا اور تب دم نکلا۔ گھسیٹے اسے مرتے دیکھ کر کھانا بھول گیا اور جلدی سے انگلی ڈال کر اس کے حلق سے ٹکڑا نکال لیا۔ نکلتے ہی بڑھیا نے ایک چیخ ماری جیسے کسی نے اس کا خزانہ لوٹ لیا ہو اور حلق پھاڑ پھاڑ اسے پھر مانگنے لگی۔ اب گھسیٹے نے اسے مشغول رکھنے کو ہاتھ میں ایک رس گلا پکڑا دیا۔ بڑھیا نے اسے اپنی مٹھی میں زور سے دبا لیا اور منہ کی طرف لے چلی۔ مگر ایک تو ہاتھ کانپ رہا تھا اور دوسرے رس گلے کی پکڑ بے تکی تھی، وہ کسی طرح منہ کے اندر نہ جا سکا۔ رس گلا دب رہا تھا اس کا شیرا ٹھوڑی، باچھوں سے ہوتا ہوا گلے پر اور گلے سے چھاتیوں پر بہہ رہا تھا۔ بڑھیا ساری کی ساری میٹھی ہو گئی تھی۔

ماں اور بیٹے کھاتے چلے جاتے تھے۔ نہ یہ تھکتی تھی اور نہ وہ۔ رفتہ رفتہ بیٹوں کا ہاتھ تو سست ہوتا گیا مگر ماں کا باب باب تیزی ہوتا گیا آخر جب گھسیٹے اور فقیرا میں نگلنے کی بالکل سکت نہیں رہی تو دونوں نے بچا کھچا کھانا آگے سے سرکا دیا اور وہیں پڑ کر بیڑیاں پینے لگے۔ بڑھیا چلاتی رہی، چلاتی رہی۔ آخر چلاتے چلاتے تھک کر وہ بھی لڑھک گئی۔

فقیرا بہت خوش تھا۔ اس کے دل میں اب تو یہ خیال تک نہ تھا کہ اگر کہیں کسی کو معلوم ہو گیا تو کیا ہو گا؟ اب اس کے سامنے ایک دنیا تھی جس میں چھپر نیا ہو گیا تھا۔ اس میں ایک طرف لپا پتا چولھا تھا جسے رمضانی کی بیوہ جھکی ہوئی پھونک رہی تھی۔ جب چراغ جلے بکریوں کا ایک ڈھا سا گلہ لئے وہ واپس آتا ہے تو رمضانی کی بیوہ جلدی جلدی گرما گرم سرخ سرخ روٹیاں پکا کر سامنے رکھ دیتی ہے۔ تھالی میں دگھر میں ایک پھول کی تھالی بھی آگئی ہے، ایک طرف بکری کا مسکا بھی ہے۔ . . . . . . فقیرا خوش تھا۔ بہت خوش۔

گھسیٹے کی طبیعت بھی زوروں پر تھی۔ زندگی میں پہلی بار کامیابی ہوئی تھی۔ کامیابی سی کامیابی! پونے دو روپے! اور صرف ایک دن میں! پچاس روپے مہینہ! اوہ! اگر کہیں ہم کلکتہ میں رہتے تو وہاں کتنی آمدنی ہوتی! پھر جب روپیہ ہو تو کلکتہ کی زندگی! سنگل چار، بیڑیاں، تاڑی خانہ، بھنا گوشت، وہ سالی نخریلی رنڈیاں، وہ ان کا مٹک مٹک چلنا، گود میں بل کھا کھا جانا۔ گھسیٹے مسکرانے لگا۔ کچھ دیر تک انہی خیالوں میں ڈوبا رہا۔ پھر ذرا سنجیدہ ہو گیا۔ سوچنے کی بات ہی تھی۔ فقیرا نے سارے گھر پر قبضہ کر لیا ہے، سب بکریاں اپنی کر لی ہیں حصہ لگا تو سسرا اکڑتا ہے۔ جی چاہتا ہے سر پھوڑ دوں سالے کا۔ اب اماں میں بھی حصہ بٹائے گا. . . . . . نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں گھر شے دوں گا، بکریاں دے دوں گا مگر اماں کو نہیں دے سکتا۔ آخر میں بھی تو اس کا لڑکا ہوں اور اب فقیرا کا حق ہی کیا ہے؟ وہ سب کچھ تو لے چکا۔ اتنے دنوں تک اماں بھی اسی کی رہی۔ آخر مجھے بھی تو کچھ ملے۔ اماں کو میں نہیں دے سکتا۔ اگر وہ تکرار کرے گا تو مار دوں گا، سر پھوڑ دوں گا — حرامی سالا فقیرا!"

گھسیٹے سوچ سوچ کر کھولنے لگا۔ فقیرا اتنی دیر میں اونگھ گیا تھا۔ گھسیٹے نے اس کو جھنجھوڑ کر جگایا اور کہا:

"فقیرا سونا بعد کو پہلے حصہ بانٹ لو۔ آج یہ جھگڑا چک جانا چاہئے۔"

"کاہے کا حصہ بانٹ؟"

"ہاں اب تو کہو گے کاہے کا حصہ بانٹ۔ ارے گھر کا، بکریوں کا اور جو کمایا ہے اس کا۔"

فقیرا تلملا کر اٹھ بیٹھا۔

"پھر وہی گھر، پھر وہی بکریاں۔ ہزار بار کہہ دیا کہ ابّا کا بنایا ہوا چھپر پندرہ برس ہوئے جب ہی سڑ گل کر ختم ہو گیا تھا۔ یہ ہیں نے بنوایا ہے۔ اور وہ بکریاں بھی مر کھپ گئیں۔ یہ سب میری پالی ہوئی ہیں۔ چلا ہے حصّہ بانٹ کرنے اور اتنے دنوں تو جو ہماری روٹی توڑتا رہا ہے؟"

فقیرا اب شہر والا فقیرا نہیں تھا۔ شہر سے نکلتے ہی پھر شیر ہو گیا تھا۔

گھسیٹے غصّہ میں مگر سمجھانے کے انداز میں کہنے لگا:

"اچھا چلو گھر تم لے جاؤ اور بکریاں بھی تم ہی لے جاؤ۔ مگر لاؤ ہماری اماں کو ہمیں دے دو۔ اتنے دنوں ان کو اگر تم نے کھلایا ہے تو اب ہم کھلائیں گے۔"

"ہاں اب تو تو کھلائے ہی گا؟ پندرہ برس میں پالتا رہا۔ گو موت صاف کرتا رہا تب اماں کی یاد نہ آئی، اب جو کمائی کے قابل ہو گئی تو اماں تیری ہے۔ ہم تجھے دے دوں؟ مجال ہے تیری کہ تو لے جائے؟"

گھسیٹے پر بھوت سوار ہو گیا اور وہ غصّہ میں ماں کی طرف لپکا جیسے اس کو جیب ہی میں تو رکھ لے گا۔ مگر فقیرا فوراً کود کر سامنے آ گیا اور لگا گھسیٹے کو گالیاں دینے۔ گھسیٹے کا پارا حد سے اونچا ہو گیا اس نے بڑھ کر فقیرا کو زور سے دھکا دیا اور دوڑ کر بڑھیا کو اس طرح ہاتھوں میں دبوچ لیا گویا وہ کوئی گٹھڑی ہے۔ جس طرح بلی چوہے پر جھپٹتی ہے فقیرا بڑھیا پر جھپٹا اور اس کے سر اور کمر میں ہاتھ دے کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔ بڑھیا اس بلی کی طرح جس کا بچہ مر گیا ہو عو عو کر کے حلق پھاڑ پھاڑ رونے لگی۔ مگر ان دونوں کی گالیوں اور غل غپاڑے کے نیچے اس کی آواز دب گئی۔ تھوڑی دیر چھینا جھپٹی ہوئی تھی کہ بڑھیا فقیرا کے ہاتھوں میں آ گئی تھی۔ نہ جانے فقیرا نے زور کر کے چھین لیا یا گھسیٹے نے بڑھیا کے مر جانے کے ڈر سے اسے خود ہی چھوڑ دیا۔ مگر فقیرا جیسے ہی اس کو گالیاں دیتا پیچھے ہٹا ہے گھسیٹے بھوکے بھیڑیے کی طرح اس پر پھاند پڑا۔ وہ شد سے کمر کے قد نیچے گر پڑا اور بڑھیا چیختی قلابازی کھاتی ایک طرف جا پڑی۔ گھسیٹے فقیرا پر چڑھ بیٹھا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹنے لگا۔ فقیرا کا اور تو کوئی بس نہیں چلا وہ نیچے سے اس کے سینے اور منہ پر گھونسے جمانے لگا۔ گھسیٹے جیسے جیسے گھونسے کھاتا ویسے ہی ویسے زور سے گلا دباتا۔ آخر فقیرا کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے، گھسیٹے نے کس کس کر دو جھٹکے اور دیئے۔ فقیرا کی آنکھوں کے ڈھیلے غلولوں کی طرح باہر نکل آئے، منہ بھیانک ہو گیا اور ہاتھ پاؤں بر رہ گئے۔ اب گھسیٹے کا غصّہ اترا اور پتہ چلا کہ میں نے کیا کیا۔ وہ کانپ کر کھڑا ہو گیا اور سکتے کی سی حالت میں فقیرا کو گھورنے لگا۔ اس کا چہرہ رام لیلا کے بیجا کی طرح ہونق ہو گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں گھسیٹے نے اپنے حواس درست کر لئے۔ کلکتہ میں ایسے ایسے کئی قصّے یہ دیکھ چکا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اس کے ساتھیوں میں آپس میں لڑائی ہوئی اور ایک نے دوسرے کو مار ڈالا۔ ڈر کس بات کا؟ فقیروں کے مرنے جینے کی کس کو پروا ہوتی ہے؟ مر گیا—— مر گیا —— ہا —— فقیرا —— ناحق مرا —— مان لیتا میری بات۔ میں نے کیا بُرا کہا تھا کہ اتنے دنوں تک اماں تم نے رکھی ہے اب مجھے دے دو۔ ارے ہاں میں بھی تو کچھ دن زندگی کی بہار دیکھ لوں۔ میرے بھی تو جان ہے۔ مجھے اینٹ پتھر سمجھا تھا، جیسا کیا ویسا بھگتا۔

ہاں اب جلدی سے اماں کو لو اور بھاگو—— پیاری اماں —— کلکتہ، وہاں کی بھیک کا کیا کہنا! اب مزا ملے گا کلکتہ کا۔

گھسیٹے جلدی سے بڑھیا کی طرف مڑا، دیکھا تو وہ آدھی چت آدھی پٹ، مٹی کے چونتھ کی طرح ڈھیر ہے۔ آنکھیں چڑھ گئی ہیں۔ منہ کلھیا کی طرح کھلا ہوا ہے اور اس میں سے رہ رہ کر بلغم اور تھوک میں لتھڑی آدھی جپی آدھی پوری غذا نکل رہی ہے۔ نکتیاں، گلاب جامن، پوری کے بھیگے ہوئے ٹکڑے —— لونڈے کے لونڈے —— زرد زرد چھین۔

گھسیٹے نے بڑھ کر ہاتھ لگایا —— بڑھیا میں کچھ نہیں تھا۔

سورج ڈوب گیا تھا۔ کھنڈر کا ہر کونہ کالی بلاؤں کا بھٹ معلوم ہوتا تھا، پت جھاڑ ہوا کے جھکڑ سینکڑوں میل سے گرد اور درختوں کو تاراج کرتے، مردہ پتوں کو اٹھا اٹھا کر پٹکتے، دہشت ناک سروں میں سائیں سائیں کرتے ایک طرف سے آ رہے تھے اور دوسری طرف بھاگے جا رہے تھے معلوم ہوتا تھا کہ ہر چیز کو اڑا لے جائیں گے گھسیٹے ہکا بکا کھڑا تھا۔ اس کے ایک طرف بھائی کی لاش تھی اور دوسری طرف ماں کی۔ دونوں کے پہلو میں اس کی آخری کوشش کی بھی لاش تھی۔ جب تک ماں زندہ تھی بھیک کا ٹھیکرا تھی مگر مر کر وہ اس کے دل میں سچ مچ ماں بن گئی تھی۔ یہ وہی ماں تھی جو اس کے ہر دکھ پر بیتاب ہو جاتی تھی۔ اس کی ہر خوشی پر اپنی خوشی قربان کر دیتی تھی۔ فقیرا بھی آخر بھائی ہی تھا۔ زندگی کا سہارا۔ اس کی یاد کلکتہ کی بے کسی میں بھٹکے مسافر کا دیا تھی۔ ان دونوں کے مرتے ہی جو رہا سہا دنیا سے رشتہ تھا وہ بھی ٹوٹ گیا۔ سمجھتا تھا کہ اب تو کشتی کنارے لگ چکی ہے۔ پیشہ مل گیا ہے اور اس کا بہتر سے بہتر سامان ہاتھ آ گیا ہے۔ سب کچھ مل گیا تھا مگر ابھی خود اس کے قابل نہیں بنا تھا —— امید کی آخری کرن ڈوب گئی۔ اب زندگی کی اتھاہ مصیبتیں، طوفانی سمندر کی طرح آگے پیچھے، دائیں بائیں، اوپر نیچے ہر طرف تھیں۔ اس کے بھیانک بھنور منہ پھاڑے بڑھ رہے تھے اور پاس تنکے تک کا سہارا نہ تھا۔

گھسیٹے سر جھکائے افق کی طرف چل کھڑا ہوا۔

اوپندر ناتھ اشک

بینگن کا پودا

اگرچہ ماہی رام نے وہ بینگن کا پودا اکھاڑ دیا ہے۔ پھر بھی جب میں ترکاری کے کھیت کی بینڈھ پر سے ہوتا ہوا اپنی کوٹھی کو جاتا ہوں تو میری آنکھوں میں بینگن کا وہ سوکھا ہوا پودا' اور اس پر لٹکتا ہوا مرجھایا پچکا سا زرد بینگن پھر جاتا ہے۔

سردیوں کے مختصر سے دن کو گذرے ہوئے دیر ہو چکی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد جب میں ایک لمبا سا چکر لگا کر نیچے کھادی کی موٹی سی بنیان' اس پر چھوٹا گرم انڈرویر' اس پر موٹے کھدر کی قمیص' اس پر اچکن اور گلوبند اور ان سب کے اوپر اوورکوٹ پہنے' ہاتھ میں چھڑی لئے اپنے لوہے کی ایڑی والے نلکیس کے بوٹوں کی ٹھک ٹھک میں مست' دسمبر کی تیکھی ٹھنڈی ہوا سے بچنے کے لئے کانوں کو اوورکوٹ کے کالروں میں چھپاتا ہوا اپنی کوٹھی کے برآمدے میں داخل ہوا تو وہاں میلی سی چارپائی پر ایک نحیف و ناتواں بوڑھے کو خستہ اور بوسیدہ' اندھیری کالی رات کی طرح کالا لحاف لپیٹے دیکھ کر کچھ ٹھٹک سا گیا۔

"کیوں بھئی کیا بات ہے؟" میں نے اوورکوٹ کی جیبوں میں پڑے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لا کر کہا۔

"کچھ نہیں بابوجی! میں ماہی رام کا آدمی ہوں۔"

"ماہی رام کے ہی سہی۔" میں نے کہا "لیکن اتنی سخت سردی میں تم اس کھلے برآمدے میں کیوں پڑے ہو؟"

"میرے پاس کپڑا ہے بابوجی!"

میں نے چپ چاپ اپنا کمرہ کھولا۔ ٹیبل لیمپ جلتا چھوڑ دیا تھا۔ اگرچہ اوپر کے دونوں روشن دان کھلے تھے پھر بھی کمرہ گرم ہو گیا تھا۔ میرے داخل ہوتے ہی مٹی کے تیل کا گرم تیز بھبکا آیا۔ بارہا میرے دوستوں نے اس طرح لیمپ جلا کر چھوڑ جانے سے منع کیا ہے۔ "شہر کی گندی فضا کو چھوڑ کر اس کھلے ماحول میں رہنے کا فائدہ ہی کیا؟" وہ کہا کرتے ہیں۔ "اگر شہر کی مضر عادتوں کو نہ چھوڑا جائے۔" اور بتایا کرتے ہیں کہ ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق کمرے کو بند کر کے اندر لیمپ جلائے رکھنا نہایت مضر ہے۔ سانس کے راستے گندی ہوا پھیپھڑوں میں داخل ہو جاتی ہے اور پھیپھڑوں پر اس کا دباؤ پڑتا ہے۔ میں بارہا محسوس بھی کرتا ہوں لیکن مجبور ہو جاتا ہوں۔ جب بھی کبھی دروازہ کھول کر بیٹھتا ہوں تیز ہوا کا جھونکا اندر

آتا ہے۔ میرے ہاتھ ٹھنڈے ہو جاتے ہیں اور قلم چلنے سے انکار کر دیتا ہے تو میں اٹھ کر پھر کواڑ بھیڑ دیتا ہوں جیسے سگریٹ پینے والوں کو اس کی کڑوی کسیلی سر چکرا دینے والی بو اچھی لگتی ہے۔ کچھ اس طرح یہ سب کچھ بھی مجھے اچھا معلوم ہونے لگا ہے۔

ہیٹ کو کھونٹی پر لٹکا کر اور مفلر کو سر اور کانوں کے گرد لپیٹ کر کام پر آ بیٹھا۔

بیٹھ تو گیا۔ لیکن میرا دھیان برابر برآمدے ہی کی طرف لگا رہا۔

اس بوڑھے کو میں نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ صبح ہی دیکھا تھا۔ وہ بینگن کے پودے چھانٹ رہا تھا اور "کمیونٹی کچن" سے گھر کو آتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا بھی تھا کہ وہ کیوں ایسا کر رہا ہے۔ اس نے بتایا تھا بینگن کا پودا دوبارہ پھل دیتا ہے۔ ایک بار چھانٹ دیا جائے تو دوبارہ پھلتا پھولتا ہے۔ میں نے ان سوکھے پتوں سے محروم بینگن کے پودوں پر ایک نگاہ ڈالی تھی۔ ایک پودے پر ایک مرجھایا ہوا سوکھا سکڑا پکا زرد بینگن لٹک رہا تھا۔ وہاں سے ہٹ کر میری نظر اس بوڑھے پر جا پڑی تھی۔ اس کی عمر نہ جانے کتنی تھی لیکن وہ بے حد ضعیف دکھائی دیتا تھا۔ حالانکہ سردی سے بچنے کے لئے اس نے کھیس اوڑھ رکھا تھا۔ پھر بھی اس کے لکڑی کے سے پتلے ہاتھ، بانس کی سی ٹانگیں، سوکھا چہرہ اور آنکھوں کے حلقے صاف نظر آتے تھے۔ اس وقت ایک عجیب سا خیال میرے دل میں پیدا ہوا تھا ——— بینگن کا پودا جب سوکھ جاتا ہے تب چھانٹ دینے پر پھر سے پھل نے آتا ہے۔ سہانجنا بھی چھانٹنے پر بڑھتا ہے۔ دنیا میں ایسے درختوں اور پودوں کی کمی نہیں جو چھانٹنے پر پہلے سے زیادہ پھلتے پھولتے ہیں تو پھر انسان کو اس خدائے برتر نے ایسا کیوں نہیں بنایا۔ لیکن وہیں کھڑے کھڑے جیسے مجھ سے کسی نے کہا۔ انسان کی بیل بھی تو امر ہے۔ رُت اس کی قینچی ہے۔ مرد، عورتیں، بچے بوڑھے اس کے پھل، پھول اور شاخیں ہیں ——— جب یہ سوکھ جاتے ہیں یا گل سڑ جاتے ہیں یہ قینچی انہیں کاٹ دیتی ہے اور ان کی جگہ نت نئے ہرے بھرے زندگی سے بھرپور، اچھلتے، کودتے، ناچتے گاتے پھول اور پتے نکلتے ہیں اور زندگی کی امر بیل بڑھتی ہوئی پھولتی پھلتی جھومتی چلی جاتی ہے۔

لیکن یہ بوڑھا یہاں سردی میں آ پڑا ہے۔ کیا اس کا کوئی گھر گھاٹ نہیں؟ اور اپنی اس محویت سے ذرا چونک کر میں نے پوچھا "ارے بھئی تم ہو کون ——— ؟"

"میں جی! ماہی رام کا آدمی ہوں۔"

بوڑھا کچھ جواب دینے والا ہی تھا کہ اسے کھانسی کا دورہ پڑا۔ کئی لمحے لگاتار کھانسنے کے بعد اپنے سانس کو مشکل سے درست کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ وہ رشتہ میں ماہی رام کا کچھ نہیں لگتا۔ وہ اس کا ہم وطن ہے۔ اس کا کنبہ بہت بڑا ہے۔ پانچ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور بیوی ہے۔ دو لڑکیاں ہیں ——— بیاہنے کے قابل ——— اور وہ روزگار کے لئے ماہی رام کے ساتھ آ گیا ہے۔

اس کی آواز میں کچھ ایسا سوز تھا کہ کام کرنا میرے لئے ناممکن ہو گیا۔ میں اتنے کپڑے پہننے کے باوجود پتلون پر کمبل ڈال کر بیٹھا ہوں اور وہ غریب باہر سردی میں پڑا ہے۔ بستر کے نام پہ شاید ایک میلی پھٹی رلائی اس کے پاس ہے۔ اور وہ میلا کالا لحاف بھی برسوں کا پرانا ہے ——— قریب قریب گھل کر میں نے کہا "تو بھائی اندر لیٹ جاؤ۔ باہر تو بڑی سردی ہے۔ برآمدہ دونوں طرف سے کھلا ہے۔ باہر تم کیوں بیٹھے ہو؟"

لیکن اس وقت سیمنٹ کے فرش پر بھاری جوتوں کی آواز سنائی دی اور دوسرے لمحے ماہی رام ——— وہ ٹھیکیدار گوپال داس کا چھ فٹ تین انچ لمبا آدمی دروازہ پر آ کھڑا ہوا۔ بڑی سی پگڑی، اس کے نیچے کالا موٹا کمبل، گھٹنوں تک دھوتی اور پاؤں میں سیر سوا سیر کا جوتا۔ ایک دن چھ مولیوں کے لئے وہ ایک میل تک ایک آدمی کے پیچھے دوڑتا گیا تھا اور اسے پکڑ کر اس نے وہ وہ پٹخنیاں دی تھیں کہ پھر اس نے کبھی ادھر کا رخ نہ کیا تھا۔

"ہم نے اسے خود یہاں سلایا ہے بابو جی!" ماہی رام نے کہا، "نہ جانے کون سالا رات کو کھیتوں میں ڈاکہ ڈالتا ہے۔ دو دن دیکھتے ہو گئے ہیں۔ ایک رات گوبھی کے دس پھول غائب تھے۔ سارے کھیت میں ایسے پھول نہ ملیں گے۔ پرسوں کوئی تمام پکتے ہوئے ٹماٹر اتار کر لے گیا۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمیں کچن کو بھی سپلائی کرنی پڑتی ہے اور پھر دو سو روپیہ کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ وہ سب بھی تو اسی میں سے پیدا کرنا ہے اور پھر مزدوروں کی مزدوری ...."

"لیکن ترکاری پر کون ڈاکہ ڈال جاتا ہے؟" میں نے کہا۔ "یہاں تو کبھی چوری ہوتے سنی نہیں۔ میری کوٹھی سنسان جگہ میں ہے۔ پاس کوئی کوٹھی بھی نہیں۔ لیکن میں تو دروازے کھلے چھوڑ کر گھنٹوں غائب رہتا ہوں۔"

"نہیں بابوجی باہر کا آدمی اتنی سردی میں صرف دس گوبھی کے پھول لینے نہیں آسکتا۔"

"لیکن اس دن مولیاں ....."

"وہ اور بات تھی بابوجی۔ وہ تو کوئی راہ چلتا آدمی تھا۔ جاتے جاتے اکھاڑ کر لے گیا۔ کوئی یہیں کا ہے۔ میں سالے کو ایسا سبق دوں گا کہ عمر بھر کو کان ہو جائیں۔" اور اس کے موٹے موٹے ہونٹ پھیل گئے اور چیچک کا مارا ہوا چہرہ تن گیا۔

"لیکن بھائی اگر جاڑا ہو تو اسے اندر سلا دو۔"

"نہیں بابوجی سردی تو امیروں کو لگتی ہے' اسے تو یونہی محض دکھاوے کے لئے یہاں سلا دیا ہے۔ ورنہ رکھوالی تو میں کروں گا ——— ان مونگروں کے پیچھے بیٹھ کر۔ جونہی یہ سمجھ کر کہ بڈھا سو گیا ہے کوئی آیا کہ میں نے اسے دبوچا۔" اور وہ ہنسا۔

"لیکن اس کے پاس کپڑے ....."

"کافی ہیں بابوجی۔"

اور یہ کہتا ہوا وہ چلا گیا۔ بڈھے کو پھر کھانسی کا دورہ پڑا۔

میں پھر کام میں منہمک ہو گیا۔ لیکن کام مجھ سے ہو نہ سکا۔ میرے سامنے ان دونوں کے مالک کی تصویر کھنچ گئی۔ ٹھیکیدار گوپال داس ——— دھن' دولت' اولاد اور بے فکری کی وجہ سے اس کے گال اس پچاس برس کی عمر میں بھی گلاب کی طرح سرخ تھے ——— اس ہڈیوں میں پیوست ہونے والی سردی میں جب یہ بوڑھا باہر پڑا ہے وہ اپنے گرم لحاف میں لیٹا۔ دہکتی ہوئی انگیٹھی سے گرم اپنے کمرے میں مزے سے گپیں ہانک رہا ہوگا' تاش اور شطرنج میں مشغول ہوگا۔

اور یونہی سوچتے سوچتے میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ کچھ غنودگی سی مجھ پر طاری ہونے لگی۔ کھانا زیادہ کھا گیا تھا۔ کپڑوں کا بوجھ میں نے لاد رکھا تھا۔ اور کمرہ خوب گرم تھا ——— میں اٹھا۔ کچھ ضروری کاغذ اور قلم دوات لے کر سونے کے کمرے میں چھوڑ آیا۔ میں نے سوچا کل سویرے ذرا جلدی اٹھ کر کام کروں گا۔ دفتر کے کمرے میں تالا لگاتے ہوئے میں نے ایک بار پوچھا کہ اگر وہ چاہے تو دفتر کو کھلا چھوڑ دوں۔ لیکن "نہیں نہیں بابوجی میرے پاس کافی کپڑے ہیں۔" اس کا یہ جواب سن کر قفل بند کرکے میں اپنے چھوٹے سے سونے کے کمرے میں چلا گیا۔ بستر بچھا ہوا تھا صرف لحاف پر میں نے کمبل ڈال لیا اور کپڑے بدل کر لیٹ گیا۔

بستر برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ میں نے پاؤں سکیڑ لئے اور پھر انہیں آہستہ آہستہ پھیلایا۔ کئی طرح کے خیالات دماغ میں گھومنے لگے ——— بے ربط ——— بے ترتیب لیکن لحاف کی گرمی سے آنکھیں بوجھل ہو گئیں اور پھر بند۔

سوتے سوتے کبھی ماہی رام' کبھی اس بوڑھے اور کبھی اس کے مالک ٹھیکیدار کی صورتیں میرے سامنے آنے لگیں۔

میں نے دیکھا۔ ماہی رام نے چور پکڑ لیا ہے اور وہ اسے مارتا مارتا پاس کے گاؤں تک لے گیا ہے۔ سب گاؤں والوں کو جمع کرکے اس نے اعلان کیا ہے کہ جو ہماری سبزی چرائے گا اسے ایسی ہی سزا دی جائے گی۔ اتنا کہہ کر وہ پھر چور کو زدوکوب کرنے لگتا ہے۔ چور نہایت دردبھری نگاہوں سے اس کی طرف تکتا ہے اور میں یہ دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کہ وہ چور ٹھیکیدار گوپال داس کے سوا کوئی نہیں۔ وہی گھٹا ہوا سر' وہی پھولے ہوئے گال اور چپٹی ناک۔

میری آنکھ لگ گئی۔ دیکھا پاؤں سے رضائی اتر گئی۔ زیادہ کھا جانے کی وجہ سے سینہ کچھ بھاری ہے اور گلا سوکھا جا رہا ہے۔

میں نے سرہانے رکھے ہوئے لوٹے سے پانی پیا اور پھر لحاف کو اچھی طرح سے اوڑھ کر دونوں طرف سے اسے پاؤں کے نیچے کر کے لیٹ گیا باہر ہوا مکانوں سے ٹکریں مار رہی تھی۔ درخت حتی الامکان اس کا مقابلہ کرتے ہوئے جوش کی شدت سے چنگھاڑ رہے تھے۔ شاں شاں ــــ شاں شاں ــــ اور دور بادل کی گرج اور رعد کی کڑک سنائی دے رہی تھی۔ لیکن گرم ہو کر جسم ڈھیلا پڑ گیا اور میں پھر سو گیا۔

اس بار کیا دیکھتا ہوں کہ زور کی بارش ہو رہی ہے۔ تیز ہوا چلتی ہے، پاؤ پاؤ بھر کے اولے پڑتے ہیں، کیاریوں میں پانی کھڑا ہو جاتا ہے۔ ساری کی ساری سبزی تباہ ہو جاتی ہے۔ صرف اسی مرجھائے ہوئے سکڑے سمٹے پیلے زرد بینگن کا پودا رہ جاتا ہے۔ پھر وہ بینگن میرے سامنے بڑا ہونا شروع ہو جاتا ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ اس کی شکل اس بوڑھے کی سی ہو گئی۔ گھٹنوں کو پاؤں میں لے کر سینے سے لگائے وہ سکڑا سمٹا اپنی لمبی چوٹی کے سہارے لٹک رہا ہے۔ اولے اس کے سر پر لگتے ہیں اور وہ اس بینگن کے پودے کے ساتھ لٹکا ہوا جھولتا ہے۔

پھر میں دیکھتا ہوں کہ وہ بینگن کا پودا ایک بڑا اونچا نہ جانے جامن کا، نہ جانے آم کا درخت بن جاتا ہے۔ لوگوں کی بھیڑ نیچے کھڑی شور مچا رہی ہے

"بوڑھا مر گیا ــــ بوڑھا پھانسی لگا کر مر گیا۔"

پھر میرے کانوں میں صرف "مر گیا، مر گیا" کی آواز آتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاخ ٹوٹ رہی ہے..... کڑ کڑ..... کڑ کڑ.....

میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھا کوئی زور سے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔

جلدی سے گرم جرابیں پہن، سر پر ٹوپی پہن اور کمبل کو اچھی طرح لپیٹ کر میں اٹھا۔ دروازہ کھولا۔ دیکھا تو سیکرٹری صاحب دوسرے کئی اصحاب کے ساتھ کھڑے ہیں۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"رات آپ کے برآمدہ میں بوڑھا مر گیا۔"

میں نے دیکھا۔ اس میلی سی کالی چارپائی پر اپنے ارد گرد وہی میلا کچیلا لحاف لپیٹے بوڑھا جھکا ہوا پڑا ہے۔ اس کا جسم اکڑ گیا ہے اور آنکھیں پھٹی پڑی ہیں۔ اس کا لحاف بھیگ گیا ہے۔ دور دور تک پانی ہی پانی دکھائی دیتا ہے اور برآمدے کا سارا فرش گیلا ہے۔

"میں نے تو رات ہی اس سے کہا تھا کہ دروازہ کھلا......" میں نے کہنا شروع کیا۔

لیکن سیکرٹری صاحب نے میری بات کو کاٹ دیا۔ "میں چائے کے لئے کچن سے دودھ لینے جا رہا تھا" وہ بولے "کہ اسے بارش میں بھیگتے پایا۔ آواز دی لیکن یہ ہلا تک نہیں۔ آ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ رات سردی میں اکڑ گیا ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے ٹھیکیدار کے آدمیوں کو حکم دیا کہ اسے اٹھوا لے نے کا انتظام کیا جائے۔

اس کے دو دن بعد کچن کو جاتے ہوئے اچانک رک کر میں نے ماہی رام سے کہا "خدا کے لئے اس پیلے سے بینگن کے پودے کو اکھاڑ دو۔"

میری آواز میں کچھ ایسی بات تھی کہ ماہی رام حیران میری طرف دیکھنے لگا اور پھر اس نے کہا:

"بہت اچھا سرکار!"

دیویندر ستیارتھی

لال دھرتی

کوئی رنگ مظلوم نگاہوں کی طرح خاموش اور فریادی ہوتا ہے۔ کوئی رنگ خوبصورتی کی طرح کچھ کہتا ہوا اور مدعا و مطلب دکھائی دیتا ہے۔ کوئی رنگ مچلتا ہوا ہمیں کسی ضدی بچے کی یاد دلا جاتا ہے اور کسی کو دیکھ کر غنودگی سی چھا جاتی ہے ...... لاری کے ڈرائیور نے دریا پار کرتے ہوئے کہا "اب ہم آندھرا دیش میں داخل ہو رہے ہیں بابو جی!" میں نے چاروں طرف پھیلی ہوئی سُرخ زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آندھرا دیش کی سُرخ زمین کیا کہہ رہی ہے؟"

آنکھیں موند کر میں نے اپنے دل میں جھانکا۔ وہاں سبز رنگ لہلہا رہا تھا۔ اپنے دماغ سے اس رنگ کا مطلب سمجھنے کی میں نے چنداں ضرورت نہ سمجھی اور آنکھیں کھول کر سُرخ زمین کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ دھیرے دھیرے میں نے محسوس کیا کہ یہ رنگ بہت طاقتور ہے اور میرا اپنا رنگ اس کے سامنے ٹک نہ سکے گا۔

ڈرائیور نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ایسا نظر آتا تھا کہ اس نے سُرخ زمین کے بھید خود اس کی زبانی سن لئے ہیں اور اب اس کیلئے یہ مشکل ہو رہا ہے کہ انھیں چھپا کر رکھ سکے۔

لاری بھاگی جا رہی تھی۔ سُرخ دھول اُڑا اُڑ کر ڈرائیور کے گالوں پہ اپنا رنگ چڑھا چکی تھی۔ میں نے اپنے گالوں پہ ہاتھ پھیرا۔ یہ دھول وہاں بھی آ جمی تھی۔ میں نے سوچا کہ میرے چہرے کی میل خوردہ زمین پر سُرخ رنگ چڑھ گیا ہوگا اور بہت بُرا تو نہ لگتا ہوگا۔

"پہلے یہ سارا ضلع بہار اڑیسہ میں تھا، بابو جی!"

"اور اب؟"

"اب نقشہ بدل گیا ہے، بابو جی!"

"نقشہ بدل گیا ہے؟"

"جی ہاں۔ جب سے اڑیسہ الگ صوبہ بن گیا ہے، اس ضلعے کے تیلگو بولنے والے حصے آندھرا دیش کو مل گئے ہیں!"

"بہت خوب ۔"

"لیکن ہم خوش ہیں، بابوجی، گورنمنٹ نے ابھی تک آندھرا دیش کو الگ صوبہ بنانا منظور نہیں کیا ۔"

"مگر کانگریس تو کبھی کی یہ قرارداد پاس کر چکی ہے کہ زبان کی اہمیت کو قبول کیا جائے۔ ہر بڑی زبان کا اپنا صوبہ ہوتا کہ ہر زبان کے ادب کی پوری پوری پرورش کی جا سکے ہر تمدن اپنے اپنے ماحول میں آزاد ہو کر نشوونما پا سکے۔"

"جی ہاں۔ کانگریس نے یہی کہا ہے کہ آندھرا دیش کا الگ صوبہ بنا دیا جائے مگر گورنمنٹ نہیں مانتی ۔"

"گورنمنٹ کیوں نہیں مانتی؟ مدراس میں تو اب کانگریس منسٹری قائم ہو چکی ہے اور اس کے پردھان شری راج گوپال آچاریہ بڑے زبردست آدمی ہیں۔ وہ یہ کام ضرور کر سکتے ہیں ۔"

"مگر اس کا حکم تو لندن سے آنا چاہیئے، بابوجی!"

"لندن سے؟"

"جی ہاں. . . . اور اگر یہ حکم نہ آیا تو ہم بڑی سے بڑی قربانی دیں گے اپنا لہو بہانے سے بھی گریز نہ کریں گے ۔"

"لہو بہا دو گے اپنا؟ پہلے ہی یہ زمین کیا کم سرخ ہے؟"

ڈرائیور نے ایک بار پھر معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نیا رنگ جھانک رہا تھا۔ وہ نیا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ زمین سرخ تھی۔ کبھی گہرا بادامی رنگ زور پکڑ لیتا۔ پھر یہ سیندوری بن جاتا . . سیندوری رنگ گلناری میں تبدیل ہو جاتا۔ سرخ رنگ مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔ میرے لہو کی روانی تیز ہو چکی تھی۔ کئی بڑے چھوٹے بلوں اور ننھی ننھی پلیوں کو پھاندتے ہوئے لاری بیجے نگرم کے قریب جا پہنچی۔ مندروں کے بڑے بڑے کلس دکھائی دینے لگے۔ اس بھاگم دوڑی میں ہمیں بیجے نگرم اپنی طرف بھاگتا ہوا نظر آ رہا تھا گویا ہماری لاری ساکن تھی۔

قصبے میں داخل ہوتے ہی سڑک ترمینی کی طرح تین طرف دوڑی جاتی تھی۔ دو سڑکوں کے سنگم پر بھیم راؤ کا مکان تھا۔ ڈرائیور انھیں پہچانتا تھا۔ ان کے گھر کے سامنے مجھے اتارتے ہوئے اس نے دوست نواز آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ "آندھرا دیش کی سرخ زمین کیا کہہ رہی ہے؟" میں نے کہا۔ وہ مسکرایا۔ لاری آگے بڑھ گئی۔

میں نے آواز دی بھیم راؤ باہر نکلے۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کے آدمی تھے۔ چہرے پر سیتلا مائی کا آٹوگراف نظر آ رہا تھا — چیچک کے بڑے بڑے داغ! توند کی طرف دھیان گیا تو میں بڑی مشکل سے ہنسی کو روک سکا۔ ہمارے اسکول میں ایسا ہیڈ ماسٹر کبھی رعب قائم نہ رکھ سکتا۔ تعارفی چٹھی کو پڑھتے ہی وہ مجھے اندر لے گئے۔ بولے "آپ نے بہت اچھا کیا کہ اس غریب کے ہاں چلے آئے۔ اس چٹھی کی بھی کچھ ضرورت نہ تھی۔"

"آندھرا دیش کی بہت تعریف سنی تھی" میں نے مسکرا کر کہا۔ "بہت دنوں سے ادھر آنا چاہتا تھا"

"آپ شوق سے رہیئے ۔"

مجھے ایک الگ کمرہ مل گیا۔ فرش پر سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ ننگے پاؤں چلنے سے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا کہ آندھرا دیش کی سرخ زمین میرے پیروں سے چھو رہی ہے، اندر سے کمرے کا دروازہ بند کر کے کبھی کبھی میں قالین پر لیٹ جاتا اور دھیان سے اپنے دل کی دھڑکنیں سننے لگتا۔ اچھا شغل تھا۔ سرخ رنگ کیا کہہ رہا ہے؟ — بار بار یہ سوال زبان تک آیا مگر ہونٹ بند رہے۔

بھیم راؤ کے مکان پر کانگرس کا ترنگا جھنڈا لہرا رہا تھا . . . . . سبز اور سفید اور سرخ . . . . . اس ترنگے جھنڈے کا مفہوم میرے ذہن

میں اجاگر ہوا اٹھتا۔ دل ہی تو تھا، بیچ بیچ میں یہ کہنے لگتا کہ اس جھنڈے کا سُرخ رنگ آندھرا دیش کی ترجمانی کر رہا ہے اور یہ خیال آتے ہی مجھے ایک ناقابلِ بیان مسرت حاصل ہوتی۔ جہاں سفید رنگ ختم ہو کر سُرخ رنگ شروع ہوتا تھا۔ وہیں میری نگاہ جم جاتی اور اس نوجوان لاری ڈرائیور کے الفاظ میرے کانوں میں گونج اُٹھتے: "اب ہم آندھرا دیش میں داخل ہو رہے ہیں، بابو جی"

میرے کمرے میں بڑا مختصر سا فرنیچر تھا۔ ایک طرف ایک ٹاملٹ میز پڑا ہوا تھا۔ دو کرسیاں، ایک تپائی اور ایک طرف ایک تخت جس پر مجھے سونا ہوتا تھا، بستر پر دن کے وقت کھادی کی دودھیا سفید چادر بچھا دی جاتی تھی۔ اب سوچتا ہوں کہ اس ٹاملٹ میز کا گول آئینہ وہاں نہ ہوتا تو وہ چند ہفتے اتنے دلچسپ نہ ہو جاتے۔ میرے جذبات کا رنگ پکی ہوئی اینٹوں کی طرح سُرخ ہو چلا تھا۔ یہ رنگ میرے چہرے پر بھی تھرک اُٹھتا۔ اس کے لئے میں آئینے کا ممنون ہوتا۔

میرے کمرے کی دائیں کھڑکی میدان کی طرف کھلتی تھی۔ وہاں سبز گھاس اُگتی ہوئی نظر آتی۔ پانی نہ ملنے پر یہ گھاس پیلی ہو سکتی تھی سُرخ نہیں۔

دن چڑھتا اور پتہ ہی نہ چلتا کہ کیسے بیت گیا۔ وہ نگر میرے لئے نیا تھا، ہر آنکھ میں کوئی نہ کوئی صدیوں کا جمع شدہ رنگ تھرک اُٹھتا۔ اس سے پہلے کہیں ماضی اور حال کو یوں بغلگیر ہوتے نہ دیکھا تھا۔ رات ختم ہوتی تو صبح سورج کا تمتماتا ہوا تلک لگائے آ حاضر ہوتا اسے دیکھ کر مجھے کرشنا وینی کی پیشانی کا "بوٹو" یاد آ جاتا۔

پیچھے سے آ کر کرشنا وینی میری آنکھیں بند کر لیتی۔ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑتی اور جوں ہی پرے ہٹتی۔ میری آنکھیں اس کی پیشانی کی طرف لپکتیں کم کم کا سرخ "بوٹو" گینڈلی کی بجائے پچاس گینڈلی کا برقی قمقمہ بن کر اس کی پیشانی کو روشن کرتا دکھائی دیتا۔ کوشش کرنے پر بھی میں کبھی اسے ایسی حالت میں نہ دیکھ سکا جبکہ غسل کے بعد یہ "بوٹو" ڈھل کر اُتر چکا ہو۔ پھر میں نے یہ کوشش چھوڑ دی۔ بس ٹھیک ہے یہ قمقمہ ہمیشہ روشن رہے، دن ہو چاہے رات ——— کم کم کا سُرخ بوٹو!

آتی پورنا اور کرشنا وینی دونوں بہنیں تھیں۔ وینی پورنا سے دو سال چھوٹی تھی۔ دونوں گھر پر پڑھتی تھیں۔ بڑی بہن سنگیت کی ابتدائی منزلیں طے کر کے اس کی گہرائیوں میں پہنچ چکی تھی۔ چھوٹی بہن صرف بہن کی دنیا کو دیکھ چھوڑتی تھی۔ اس کا گانا سن لیتی تھی اور اگر اس نغمے نے اس کی نطانت کا کوئی سویا ہوا رنگ جگا دیا تو اس نے تھوڑی بہت تک بندی کر لی۔ نہیں تو کس کی دنیا، کون ان پورنا، وہ اپنی کتابوں میں اُلجھی رہتی۔

بھیم راؤ اپنی بیٹیوں کی تعریف میرے سامنے بھی لے بیٹھتے۔ دونوں کے سُرخ "بوٹو" میرے ذہن میں تیرنے لگتے اور مجھے محسوس ہوتا کہ میرے منہ میں پان کی پیک اور بھی سُرخ ہو گئی ہے۔ میرے جذبات چھالیا کے ننھے باریک ریزے بن جاتے جو پان چباتے وقت بھیس سے دانتوں کی درزوں میں سے گذر جاتے ہیں۔

"یہ تو اپنے آدمی ہیں، بیٹیو!" بھیم راؤ کہتے، "ان سے خوب باتیں کرو، ان کی کہانیاں سنو۔ دلیس دلیس کا پانی پی رکھا ہے انھوں نے ——— ہاں دلیس دلیس کا" اپنی یہ تعریف سن کر میرے ہر مسام کے کان لگ جاتے، ہونٹوں میں ایک عجیب ساتناؤ پیدا ہو جاتا، ذہن میں ایک گدگدی سی ہونے لگتی، یہ آندھرا دیش کی سُرخ زمین کا خلوص تھا، ایک ترقی پسند خلوص!

"یہ کرشنا وینی تو نری گلہری ہے مسٹر راؤ" ایک دن میں نے دونوں بہنوں کی موجودگی میں کہا "اور یہ اچھا ہی ہے"

"خوب! خوب! اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر، ٹکتی تو بیٹھ ہی نہیں سکتی گلہری ہی تو ہے"

کرشنا وینی ہنسی نہیں۔ آخر اس میں گلہری کی کیا بات ہے؟ شاید ہمارے معزز مہمان کے دیش میں کنیائیں نہیں ہوتیں۔ وہ حیا سے سمٹی رہتی

ہوں گی۔ لیکن ویسی ویسی ہی دھرتی دھرتی میں فرق ہوتا ہے نا۔

بھیم راؤ بولے " یہ آندھرا دیش ہے "

انّ پورنا نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا " اور یہاں کی کنیائیں آزاد نظمیں بن گئی ہیں —— "

کرشنا دیبی کی آنکھوں میں ایک بجلی سی چمک گئی۔ بولی "جی ہاں آزاد نظمیں "

اور میں نے محسوس کیا کہ کم از کم کرشنا دیبی ضرور ایک آزاد نظم ہے، نہ بحر کی حاجتمند، نہ قافیے کی پابند۔

انّ پورنا نے اپنے بازو کرشنا دیبی کے بازوؤں پر ڈال دیئے اور بولی " دیبی! چلو آج دشیشری کے ہاں چلیں۔ کل تو آئی تھی ادھر آج اس نے شکل ہی نہیں دکھائی "

کرشنا دیبی نے اپنا چھوٹا سا خوبصورت سر ہلا دیا۔ اور پنکھے کی ڈنڈی کو قالین پر پھیرتے ہوئے بولی " انّ پورنا میں باہر نہیں جا سکتی "

" کیوں نہیں جا سکتی باہر؟ " انّ پورنا نے حیران ہو کر پوچھا۔

دیبی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے انّ پورنا کے گلے میں بازو ڈال دیئے۔ بولی " دی دی —— " اور اس کے بعد اس کے کان میں کچھ کہہ گئی۔

انّ پورنا اچھل پڑی۔ بولی۔

" سچ "

دیبی نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ میرا دل زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑایا۔ دیبی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور غسل خانے کی طرف چل دی۔ انّ پورنا نے تالی بجائی اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ اس وقت صبح کے دس بجے تھے۔ وہ بھی اپنی کھڑاؤں پر گھوم گئی اور سامنے رسوئی کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی جہاں امّاں بیٹھی ہوئی زمین قند چھیل رہی تھی۔

انّ پورنا نے کہا " امّاں —— "

امّاں نے سر ہلا دیا۔ انّ پورنا اس کے قریب پہنچ کر جھک گئی اور اس کے کان میں کچھ کہہ دیا۔ امّاں کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس کے گالوں پر ایک تمتاتی ہوئی سرخی نمودار ہوئی۔ پھر ایک مسکراہٹ ناچتی ہوئی اس کے بوڑھے چپکیلے چہرے پر چوگان کھیلنے لگی۔ امّاں نے چاقو اور زمین قند کو ایک طرف رکھ دیا اور اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ بولی۔

- پھلو گا رو دپنڈت جی !

میرے لئے یہ سب ایک پہیلی سے بڑھ کر تھا۔ میرا خیال تھا کہ بھیم راؤ اس سے کورے ہیں۔ وہ اُٹھ کر اپنی بیوی کے پاس چلے گئے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں ریل گاڑی میں بیٹھا ہوں جو دندناتی ہوئی ایک سرنگ میں سے گذر رہی ہے۔ گھپ اندھیرا چھا گیا ہے ... کوئی عورتوں کی بات ہو گی۔ یہ سوچتے ہی سرنگ ختم ہو گئی۔

کرشنا دیبی نے پہلے کبھی وہ سبز رنگ کی ہلکی گھگھری نہ پہنی تھی۔ گھگھری کا رنگ گہرا سبز تھا اور انگیا کا پھیکا سبز۔ اس کی آنکھوں کی جھیلوں میں بھی سبز رنگ کا عکس پڑ رہا تھا۔ یہ رنگ کیا کہہ رہا ہے۔ یہ سوال مجھے اس سے ضرور کرنا چاہیئے تھا۔ اس کے لہو میں کسی نے سونا پگھلا کر ڈال رکھا تھا؟ یہ سونا ہی تو تھا جو اس کے گالوں پر دمک رہا تھا۔ یہ سونا کیا کہہ رہا تھا؟ مانگ کہاں تھی۔ پوری پوری پگڈنڈی تھی۔ کیا مجال کوئی لٹ پھنس جائے کوئی بال سرک جائے۔ کنگھی چوٹی کا فن جوانی کے ساتھ ساتھ اپنے کمال کو پہنچتا ہے۔ ناک کی سیدھ رکھ کر سر کے بیچوں بیچ مانگ کاڑھنا انّ پورنا کو سرے سے ناپسند تھا۔ مگر نہیں کرشنا دیبی کی سیدھی مانگ انّ پورنا کی ٹیڑھی مانگ سے کہیں سندر لگتی تھی۔ اس وقت دونوں بہنیں میرے قریب بیٹھی ہوتیں تو میں اپنا ووٹ چھوٹی بہن کے حق میں دیتا۔

کوئی ایک گھنٹہ بعد پورے گیارہ بجے اندر سے وینا کے سُر سنائی دینے صرف انّ پورنا ہی کی وینا تو یہ رنگ نہیں جما سکتی تھی معلوم ہوتا تھا کہ محلے بھر کی وینا بجانے والی سہیلیاں سُر میں سُر ملا کر کوئی راگ سادھ رہی ہیں۔ ایسی بھی کیا خوشی تھی ؟

بہت سی عورتیں اور لڑکیاں جن کا ٹھٹھا اور ہنسی مذاق ہوا کو چیرے ڈالتا تھا آخر کس تقریب پہ بلائی گئی تھیں ؟ مجھ سے نہ رہا گیا۔ بائیں کھڑکی کا پردہ ذرا سرکا کر میں نے آنگن کی طرف نظر ڈالی تو کیا دیکھتا ہوں کہ کرشنا وینی سامنے والے کمرے میں پیلی دھوتی پہنے بیٹھی ہے اور آرتی اتاری جا رہی ہے۔ تھال میں کم کم نظر آ رہا تھا۔ لیکن اس میں کوئی چوکھا دیا نہیں جلایا گیا تھا۔ کرشنا وینی نے آنکھیں جھکا رکھی تھیں۔ آخر یہ کیا لاج تھی ؟ یہ کیا، کوئی دیوی بیٹھنے کا اپائے تھا۔

کرشنا وینی کی ماں کو بدھائیاں مل رہی تھیں۔ انّ پورنا کی وینا سب سے زیادہ چہک رہی تھی۔ رنگا رنگ کی ساڑھیاں میرے ذہن میں خلط ملط ہو رہی تھیں۔ ابھی ایک بچی رونے لگی۔ اسے ایک کیلا مل گیا۔ ادھر ایک لڑکی اپنے چھوٹے بھائی کے منہ میں گڑ اور تلوں کا لڈو ڈالنے لگی کہ ایک لڑکا اچک کر اسے چھین لے گیا۔ کچھ پروا نہیں لڈوؤں کی کیا کمی ہے ؟ بھائی خوش رہے، جیتا رہے ...... میری فطرت کے ایک پُر اسرار کونے میں کوئی تان سین جاگ اٹھا جسے انّ پورنا نے اپنے گیت کی لہروں پر اٹھا لیا۔ یہ کیسا گیت تھا ؟ شاید یہ دودھ اور شہد کا گیت تھا۔ دودھ دوہتے وقت جو آواز پیدا ہوتی ہے کچھ ایسی ہی آواز انّ پورنا کی وینا پہ پیدا ہوتی تھی۔

”اب تم گاؤ دشیشری !“

”تم سے اچھا تو نہ گا سکوں گی۔ انّ پورنا ! اچھا بتاؤ کونسا گیت گاؤں ؟“

”وہی جو تم نے اس روز گایا تھا جب وینی کی طرح میں نے پیلی دھوتی پہنی تھی اور اسی طرح اسی آنگن میں ——— برکت والے آنگن میں، عورتیں اور لڑکیاں جمع ہوئی تھیں ——— وہی شہد کی مکھیوں والا گیت“

دشیشری نے گانا شروع کیا۔ آندھرا دیش کی شہد کی مکھیاں کیا کہہ رہی ہیں۔ یہ سوال میرے ذہن کی چار دیواری میں بند رہا۔ وینا کے سُر آگے بڑھتے گئے۔ یہ کوئی معمولی گیت نہ تھا۔ صدیوں کی نسوانیت کا جذبہ برتر رہی تھا۔ ابھی تو دوپہر تھی۔ لیکن ہر عورت اور لڑکی کی پیشانی پر ایک ایک چاند نظر آ رہا تھا۔ کم کم کے سُرخ بوٹو !

کرشنا وینی کی آنکھیں اوپر نہ اٹھیں۔ کیا یہ وہی لڑکی تھی۔ جو اب تک کبھی اپنی چوکڑی نہ بھولی تھی۔ اس کے آویزے ساکن تھے۔ اس کے نگینے چپ تھے۔ لاج اور دوشیزگی پہلے تو کبھی یوں توام بہنوں کے روپ میں نظر نہ آئی تھیں۔ مگر وہ کوئی کبوتری تو نہ تھی جسے پہلی بار انڈے بیٹھنے سے سابقہ پڑا ہو۔

ٹھٹھا اور ہنسی مذاق خاموشی میں بدلتے گئے۔ گیت بھی کافی ہو چکے تھے۔ وینا کے تار تھک گئے تھے۔ کرشنا وینی کی ماں اور بہن نے کم کم کی تھالیاں اٹھا کر ہر کسی کی پیشانی پر پھر سے نئے بوٹو لگا دیئے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ پہلے لگے ہوئے بوٹو ہی جلی کر دیئے گئے ایسا دن تو بہت مبارک تھا۔ ہر کسی کو پان پیش کیا گیا۔ ناریل اور کیلے تقسیم کئے گئے۔ اور یوں سب کو رخصت کیا گیا۔ صدیوں سے یوں ہی ہوتا آیا تھا۔ کم کم کے سُرخ بوٹو ان گنت نسلوں سے قائم رہے تھے۔ ان کا رنگ کبھی پھیکا پڑنے نہیں دیا جائے گا۔

دوسرے روز یہ محفل شام کے قریب جمی۔ پھر تیسرے روز بھی شام ہی کو جم تے دن شام کی بجائے صبح ہی کو یہ رونق شروع ہو گئی۔ اس اثنا میں مجھے پتہ چل چکا تھا کہ کرشنا وینی رجسولا (حائضہ) ہو گئی ہے۔ مجھے حیرت ضرور ہوئی۔ کیونکہ اس سے پہلے ہندوستان میں کوئی ایسی رسم میرے دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔

بھیم راؤ کی باتوں میں مینا کاری کا رنگ پیدا ہو گیا تھا۔ بولے ”ہماری شرم میں آندھرا دیش کوئی دشواش نہیں رکھتا۔ سچ کہتا ہوں مجھے تو

حیرانی ہے یہ سن کر کہ آپ کے ہاں ایسی کوئی رسم منائی نہیں جاتی "

" جی ہاں حیرانی تو ہونی ہی چاہیئے " میں نے بڑھاوا دیا۔

" کتنا فرق ہے دھرتی دھرتی کا "

" یہ تو ظاہر ہے "

" رجسولا ہونے پر گویا کنیا کو قدرت کا آشیرباد ملتا ہے "

" آپ کا مطمح نظر بالکل ٹھیک ہے مسٹر راؤ اور ایسے موقع پر خوشی منانے سے ہرگز نہ چوکنا چاہیئے "

" ہمارے یہ گیت آپ کو کیسے لگتے ہیں "

" یہ سب گیت دینا کے یہ تر آندھرا دیش کے ابدی بول معلوم ہوتے ہیں "

آندھرا دیش کے ابدی بول! ہماری یہ رسم بہت پرانی ہے "

" ضرور پرانی ہو گی "

پہلے روز جب کنیا کو اپنے رجسولا ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح فوراً ماں تک یہ خبر پہنچا دیتی ہے۔ تین دن تک اسے ہلدی کے پانی میں رنگی ہوئی دھوتی پہن کر الگ کمرے میں بیٹھنا ہوتا ہے۔ کوئی اسے چھوئے گا نہیں۔ اس کی آرتی بھی دور ہی سے اتاری جاتی ہے۔

" آرتی میں ہمارے یہاں جتنا ہوا دیا۔ جو کھا دیا نہ بھی ہو تو پروا نہیں۔ ضروری سمجھا جاتا ہے۔ مگر آپ کے ہاں ـــ"

فرق تو ہوتا ہی۔ دھرتی دھرتی کا۔ ہمارے ہاں بس کم کم ہی سب سے ضروری مان لیا گیا ہے آرتی کے لئے "

" سرخ کم کم؟

" کم کم ہمیشہ سرخ ہی ہوتا ہے "

میں نے مسکرا کر آنکھیں جھکا لیں۔ بھیم راؤ نے اپنی بات جاری رکھی۔ کھانے میں بھی رجسولا کو کافی پرہیز کرنا ہوتا ہے۔ سرخ مرچ اور گرم مسالے اس کے لئے منع ہیں۔ میٹھے مٹھائے اسے کھچڑی دودھ اور کچھ پھل مل جاتے ہیں۔ کھائے اور پورا آرام کرے۔ یہ ضروری ہے "

" تین دن کے بعد کیا ہوتا ہے ؟ " میں نے پھر بڑھاوا دیا۔

" کنیا اشنان گھر کے پوتر ہو جایا کرتی ہے اس کی وہ پہلی دھرتی دھوبن کو بطور تحفے کے دے دی جاتی ہے۔ اب وہ ماتا پتا کی حیثیت مطابق نئے وستر پہن کر بیٹھتی ہے اور یہ چوتھی یعنی آخری آرتی اتارتے وقت اس کی پیشانی پر بوٹو لگایا جاتا ہے "

" بوٹو کے لئے کم کم نہ ہو تو آندھرا دیش کا کام ہی نہ چل سکے مسٹر راؤ! "

" کم کم! یہ تو ضروری ہے "

" بلکہ یہ کہیئے کہ آندھرا دیش اور کم کم دونوں ہم معنی الفاظ ہیں "

" بس اب آپ نے ٹھیک سمجھ لی ہے بات "

" میرا رجحان شروع سے سبز رنگ کی طرف رہا ہے، مسٹر راؤ! "

" سبز رنگ کی طرف ؟ لیکن سرخ رنگ نرالی زبان میں بولتا ہے . . . . . کم کم کا پیغام آندھرا دیش صدیوں سے سنتا آیا ہے "

رنگوں کا مطالعہ میں نے بھی کر رکھا ہے، مسٹر راؤ! سبز رنگ، اپنی جگہ ہے بشاشت کا رنگ ہے۔ ہر سبز چیز ہمیں مسکرانے کا اشارہ کرتی

ہے۔ قدرت کو شاید یہی رنگ سب سے زیادہ پسند ہے۔ جب تک دھرتی بنجر نہیں ہو جاتی۔ اس کی کوکھ سے اس رنگ کے کارنامے ہمیشہ ہمارا دھیان کھینچتے رہیں گے۔ کانگریس نے بہت اچھا کیا کہ اپنے جھنڈے پر اس رنگ کو اس کی جگہ دینے کی بات فراموش نہ کی۔ سفید رنگ میرے خیال میں پوترتا (پاکیزگی) کا رنگ ہے۔ ہمارے جھنڈے پر بھی یہ رنگ موجود ہے اور سرخ رنگ؟ میں سمجھتا ہوں یہ خون کا رنگ ہے۔ اچھے تندرست خون کا رنگ ——— تازہ مضبوط زندگی کا رنگ...... سبز، سفید، سرخ۔ خوب رنگ چنے ہیں کانگریس نے یہ جھنڈا بنانے کا کام آندھرا دیش کے سپرد کیا جاتا تو سارے جھنڈے پر کم کم ہی کم کم پھیل جاتا۔"

"لیکن یاد رہے کہ سرخ رنگ کا مفہوم سمجھنے میں آندھرا دیش نے خوب قدم بڑھایا ہے ..... کانگریس کے بائیں بازو نے ادھر جو زور پکڑا ہے۔ وہ بھی ظاہر ہے۔ پچھلے دنوں جب شری سبھاش چندر بوس کانگریس پردھان کے انتخاب میں دوبارہ کھڑے ہوئے تو آندھرا دیش کے ووٹ بہت بھاری تعداد میں انھیں کو ملے تھے۔ حالانکہ ان کے مقابلے پر کھڑے ہونے والے ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیا آندھرا دیش کے اپنے آدمی ہیں مگر آپ جانتے ہیں ان باتوں میں لحاظ داری تو ٹھیک نہیں ہوتی۔ سوشلزم اور ہندوستان کی آزادی ہمارے دو بڑے آدرش ہیں اور آندھرا دیش کو الگ صوبے کا وقار حاصل ہو جائے، اس کے لئے ہم اپنی جانیں لڑانے پر آمادہ ہیں۔"

"پنلو گارو (پنڈت جی!) باہر سے کسی نے آواز دی۔

بھیم راؤ باہر چلے گئے۔ میں کھڑکی میں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ یوں محسوس ہوا کہ کسی کے غیر مرئی ہاتھ میری پیشانی پر کم کم کا بوڈ لگاتے ہیں۔ میں جھٹ وہاں سے ہٹ گیا اور کمرے کو اندر سے بند کر کے میں نے بائیں کھڑکی کا پردہ ہٹاتے ہوئے ایک کونے سے سرکایا۔ سامنے بڑی خوشنما مجلس نظر آ رہی تھی۔ کرشنا دیوی نے ہلکی نیلی انگیا کے ساتھ گہری نیلی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ آویزوں کے نگینے سرمئی تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے ذہن کے نیچے کھچے سبز رنگ نے ان رنگینیوں میں پناہ پالی ہے۔

ان پورنا نے وینا پر ملہار کا راگ شروع کیا۔ اس کی انگلیاں بہت بہک بہک کر چل رہی تھیں۔ مگر اس راگ سے بھی کرشنا دیوی کی آنکھیں اوپر نہ اٹھیں، ان پورنا آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی اور کرشنا دیوی دھرتی کی طرف آنکھیں جھکائے بیٹھی تھی۔ کس نے چھو دیا تھا اپنے غیر مرئی ہاتھ سے اس کنیا کو؟ .... ہر جھبولا تو یوں چھوئی موئی بن کر نہ رہ جاتی ہوگی۔ .. ہلکی نیلی انگیا۔ گہری نیلی ساڑھی اور آویزوں کے سرمئی نگینے! ..... باہر سے تازہ ہوا کا جھونکا آ رہا تھا۔

بہت ہو چکی یہ لاج رانی" ان پورنا بولی "میں بھی ہوئی تھی۔ جھبولا تیری طرح۔ میں نے تو پہلے ہی روز کے بعد مسکرانا شروع کر دیا تھا، اور دائیں بائیں۔ سامنے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔"

"میں تو کبھی نہیں ستاتی کسی کو۔"

کرشنا دیوی کے چہرے پر ہولے ہولے دبی دبی پرانی شوخی آتی گئی۔ اماں نے آگے بڑھ کر کم کم اٹھایا اور اس کے بوڈ کو جلی کر دیا۔

کرشنا دیوی اب کوئی چھوئی موئی نہ تھی۔ ہر چہرے کی طرف اس کی آنکھیں اٹھ جاتی تھیں۔ کالی جھیلوں میں نہ جانے کتنی لہریں تڑک رہی تھیں۔ ..... کرشنا دیوی کے صندلی بازو، جنھیں دیکھ کر تازہ و تازہ رندہ کئے جانے کا گمان ہوتا تھا۔ اوپر اٹھے، اور اس نے سب کو نمسکار کیا۔

سب عورتیں اور لڑکیاں مسکرائیں۔ سب کے سرخ بوڈ تازہ کم کم سے جلی کر دیئے گئے۔ جانے کیا کہہ رہی تھیں۔ کاجل کی لکیریں بھری آنکھیں؟ ...... ہاں بیٹے ——— سبزیاں، جو اپنے سینوں میں سرخ رنگ چھپائے پڑے تھے، کیلے بیٹے۔ ناریل بیٹے۔ سب اٹھ کھڑی ہو گئیں ...... کیا لے کر آئی تھیں یہ ساڑھیاں؟ کیا لے کر سرخ تھی یہ زمین؟ ——— اس کے خط، اس کی قوسیں۔ ہونٹ، گال، آنکھیں، سینے؟ کون فنکار ان کی تخلیق کرتا تھا؟ کون تھا جو زمین کی ہر بیٹی کو ٹھیک وقت پر جھبولا بنا دیتا تھا؟ ...... یہ تو بہت ضروری تھا۔ ان گنت صدیوں

سے ،سبز، سفید اور سُرخ صدیوں سے یہی ہوتا آیا تھا۔

سب عورتیں چلی گئیں۔ سب لڑکیاں بھی تتر بتر ہو کر اپنے اپنے گھر بھاگ گئیں اب صرف کرشنا دیدی اور ان پورنا رہ گئیں، او ز یموئی بیں جا چکی تھی۔

"اچھا پورنا ایک بات بتاؤ گی؟"

"پوچھو پوچھو!"

رحبتبولا ہو کر بھی میں اتنی کمزور نہیں ہوئی۔ بھلا کیسے؟

"کیسے؟ یہی ہوتا آیا ہے بہن شروع دنیا سے، میں کون سی کمزور ہو گئی تھی؟ بلکہ رنگ نکھر جاتا ہے، اس سے . . . . . . پھر ہر مہینے!

ہر مہینے؟

"چپ رہو، کوئی سن لے گا۔"

پھر دونوں بہنیں اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ میں بیٹھے سُرخ قالین پر لیٹ گیا۔ میری روح کی گہرائیوں سے ایک خیال اٹھا، اور باہر سے آنے والی ہوا کے جھونکے سے ٹکرا گیا۔

میرے ذہن میں کانگریس کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ سبز، سفید اور سُرخ ——— اس جھنڈے کی عمر بہت زیادہ تو نہ تھی۔ مگر یہ رنگ تو پرانے تھے۔ ہمالہ کے ہم عمر رنگ، گنگا، برہم پترا اور گوداوری کے ہم عمر رنگ! ہوگا ان رنگوں کا اپنا اپنا مفہوم مگر میں تو اس مفہوم پر لوٹ تھا جو خود ہندوستان نے ان رنگوں کے ساتھ وابستہ کر دیا تھا . . . . اور میری آنکھوں میں وہی لاری پھرنے لگی، جس پر سوار ہو کر میں بھیم راؤ کے مکان تک پہنچا تھا۔ دائیں بائیں آمنے سامنے۔ جہاں تک میرے ذہن کی پہنچ تھی۔ سُرخ زمین لیٹی ہوئی تھی۔ ایک رحبتبولا دنیا کی طرح وہ آدم کر رہی تھی۔ وہ وقت مجھے بہت قریب آتا دکھائی دیا جب اس کی کوکھ ہری ہو گی اور کوئی ایسا آدمی پیدا ہو گا جو بہ آواز بلند پکار اٹھے گا۔ چلوں کی جے۔ اب ایکھیتوں میں غلام نہیں اگیں گے۔ یہ لال دھرتی ہے۔

اختر اورینوی

کلیاں اور کانٹے

وہ تعداد میں نو تھیں۔ گوری، سانولی، اُجلی اور ناگوار، بعض ان میں دلکش کہی جاسکتی تھیں مگر خوبصورت کوئی نہیں۔ سورج اسی طرف سے طلوع ہوتا تھا جس طرف سے وہ اپنی سفید ساریوں میں ملبوس طلوع صبح کے پھول کے ساتھ باکس اور ڈورینڈا کی جھاڑیوں کی اوٹ سے نکل دکھائی دیتی تھیں۔ ہر صبح آٹھ ادھر آتی تھیں اور ایک ٹوٹتے ہوئے تارے کی طرح مشرقی افق کی طرف سفر کر جاتی تھی۔ درجۂ اول کے کوارٹر صحت گاہ کے عام وارڈوں سے قریباً تین فرلانگ پورب کی جانب تھے۔ ان میں سے کسی ایک کی ڈیوٹی اسی طرف ہوتی تھی اور ڈیوٹیاں بدلتی رہتی تھیں، ہر پندرھویں روز۔ عام وارڈ کے بھی دو درجے تھے۔ دوم و سوم۔ درجۂ اول کے کوارٹر تو خاصے بنگلے تھے۔ ان کی اپنی شخصیت تھی۔ وہ اسپتال نہیں مگر معلوم ہوتے تھے۔ ساٹھ روپے ماہوار ان کا کرایہ تھا۔ درجہ دوم کے چالیس روپے ماہانہ تھے۔ ایک مریض کو دو کوٹھریاں مل جاتی تھیں۔ ایک اپنے لئے ایک تیمار دار کے واسطے۔ تیسرے درجے کے معنی تھے ایک وسیع سالانہ چوڑا کرہ۔ ایک کمرے میں آٹھ پلنگ ہوتے تھے اور حب حیات کے لعب و لہو کی رفتار میں زیادہ تیزی ہوجاتی تو سِل و دق کے جراثیم کے چند اور شکار بنالیتے تھے اور کمرے کی آبادی بارہ تیرہ تک پہنچ جاتی تھی۔ درجہ سوم کا کرایہ پچیس روپے ماہوار تھا۔ زندگی۔ موت! زندگی موت کے درمیان بھی انسانیت درجوں میں بٹی ہوئی ہے۔ مگر اسپتال اور قبرستان، ہر جگہ نمبر ایک، نمبر دو اور نمبر تین کی تفریق ہوتی ہے۔ کالوں کا قبرستان، گوروں کا قبرستان، شرفاء کے مدفن اور غریبوں کے گورستان ہر شہر، ہر قصبے اور گاؤں میں پائے جاتے ہیں۔ صحت گاہ، اسی کرہ پر واقع تھا اور اسی کے بنائے ہوئے قانون کا پابند۔

ہم ان دنوں وہیں تھے۔ صحت گاہ کے انتہائی جنوبی طرف تیسرے درجے کے وارڈ ہیں۔ یہاں سے نرسوں کا کوارٹر سامنے نظر آتا تھا۔ لمبے لمبے پلنگ پر پڑے ہوئے مریض درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان نرسوں کی اقامت گاہ کو اس طرح دیکھتے تھے جیسے فٹ پاتھ پر چلتی ہوئی مزدور ماں کے ترستے ہوئے بچے پرستانی دکانوں میں شیشے کی الماریوں کے اندر کھلونے دیکھتے ہیں۔ وہ نو نرسیں ہم سے شناسا تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کی ڈیوٹی ہم لوگوں کے وارڈ میں کبھی نہ کبھی رہ چکی تھی۔ اس کے علاوہ لگتا ہے گوشے کی پارٹیوں اور پکنکوں میں ہم لوگوں کا سا

رہتا تھا۔ ہم سب نرسوں کو اچھی طرح جانتے تھے اور وہ ہمیں۔ ہماری گفتگو کا اکثر حصہ انہی سے متعلق ہوتا تھا۔ ان کی تعریف، ان کی برائیاں، ان کے ناز، ان کی سازشیں، ان کی محبت و نفرت۔ ہم رومان سے تنگ کر بقیہ حقیقت طرازی پر اتر آئے تھے۔ ہمارے گرسنہ جذبات رومانی بیانات کے شربت کو برداشت کرتے کرتے تنگ آ گئے تھے۔ ہمیں مصالحہ دار چٹپٹی چیزوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ ہم میں سے اکثر افراد اس وارڈ میں ایک سال گزار چکے تھے اور چند ایسے بھی تھے، جن کے تین سال ختم ہو گئے تھے۔ امید و ناامیدی کے تین سال، ارمانوں اور محرومیوں کے تین طویل سال۔ ایک دو نو وارد تھے، یہ ڈرے سہمے سہمے "سنجیدہ" اُمل، متردد، بے بس اور یتیم سے نظر آتے تھے چند ہفتوں میں یہ بے جھجک عموماً دور ہو جاتی تھی اور نئے بہت جلد پرانے بن جاتے تھے۔ لیکن ایک دو پرانے بھی ایسے تھے جن کی مستقل مایوسی اور گھبراہٹ کبھی دور نہ ہوتی۔ بہر کیف، موت اور بیماری کے درمیان بھی وارڈ کی مجموعی فضا خوشگوار تھی۔ استراحت کے گھنٹوں کے علاوہ وقتوں میں ہم لوگ کھیلتے تھے، ہنستے تھے، جملہ بازیاں ہوتی تھیں، قہقہے لگتے تھے، نرسوں سے لگاوٹ ہوتی تھی، اصلی اور نقلی آہیں کھینچی جاتی تھیں، سرگوشیاں ہوتی تھیں اور رازداریاں بھی۔ ہم دسوں کا ایک خاندان تھا، ایک مذہب۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ خوش ہوتے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ رنجیدہ۔ وارڈ میں بوڑھے بھی تھے اور جوان بھی، پر سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے تھے کم از کم ایسا نظر آتا تھا۔ ہاں استراحت کے گھنٹوں میں ہماری اجتماعیت ٹوٹ کر بکھر جاتی تھی اور ہم میں سے ہر ایک اپنی دنیا بساتا تھا اور ویران کرتا رہتا تھا۔ رات کے آرام کے علاوہ دن بھر میں تین استراحت کے وقفے ہوتے تھے۔ باضابطہ طور پر نرسیں گھنٹی بجا کر مریضوں کو بار بستر ہو جانے پر مجبور کرتی تھیں۔ یہ بھی ایک علاج تھا۔ نیند اور گفتگو ممنوع۔ زندہ لاش کی طرح پڑے رہیے۔ جہاں تک ممکن ہو کم سے کم کروٹ لیجیے اور کچھ مت سوچیے۔ فکر و تردد ایسے مریض کے لیے مہلک ہے۔

"سوچا مت کیجیے۔ اچھے ہاں ۔۔۔۔۔ں!"

نرسیں بڑے پیار سے کہتیں۔ مگر بھلا کوئی کیسے نہ سوچے؟ ہم اکیلے پلنگ پر پڑے پڑے سوچتے رہتے تھے۔ زندگی کا سوچ، موت کا سوچ، سِل کا سوچ، دِق کا سوچ، آرزوؤں کی لاش، ماضی کا ماتم، مستقبل کا روگ اور سب سے بڑھ کر روح کی وہ مہیب کپکپی جو مادہ کے سہارے سے علیحدگی کے محض تصور سے ہی طاری ہو جاتی ہے۔ جسم! محسوس، ٹھوس، تپاں، متحرک، خودنگر، خوبصورت، اور حقیقت کا اچانک سرد اور بے حس ہو جانا! احساس و ادراک جھٹپٹانے لگتے ہیں۔ فرد کے وجود کا لامعلوم، تاریک، بے پایاں، لامکاں، بے زماں وسعتوں میں تحلیل ہو کے فنا ہو جانا، سوچنے والے دماغ، دھڑکتے ہوئے دل، تیرتے ہوئے خون کا تعطل اور لاعلمی کا لرزہ خیز ناقابلِ تصور پھیلاؤ۔ یہ کائنات کا سب سے المناک سانحہ ہے۔ ہم صحت گاہ کی خاموشیوں میں پھیلتے ہوئے لمحات کو سرکتی، گھٹتی، ڈوبتی ہوئی زندگی کے انجام کو سوچ کر لرز اٹھتے تھے۔ ہم خیالات کے بوجھ کو فضا میں پھینک کر اپنی قمیصوں کے بٹن یا پلنگ کی پٹی کو پکڑ لیتے تھے تاکہ معلوم اور شناسا چیزوں کی ہستی کا ٹھیک پتا چل جائے۔ ہم گاہ تھیٹر کے رام اور پٹی کوٹ کے حاشیے کی تخیل سے چھو کر ورید زندگی کی اوجھل سے پناہ لیتے تھے اور کبھی بے خواب راتوں کی نیند کا جل گھول کر احساس کو افیون دینے کی کوشش کرتے۔ مرجھائے ہوئے پھول کی طرح ہوتے نڈھال ہونے لگتے تو ——

"اوہ۔۔۔۔۔رے۔۔۔۔۔ے! بڑے صاحب سے کہوں گی یہ تو سونے لگے ہیں!"

کی آواز سنائی دیتی اور گال یا پیشانی پر ایک آشنا سی چپت۔ یہ نجات دہندہ آواز سر سے بوجھ اتار دیتی تھی۔ ہماری آنکھیں مسکراتی ہوئی کھل جاتیں۔

"میں تو آپ سے مذاق کر رہا تھا مس صاحب، سوتا کون ہے؟" "اچھے آپ بھی سو جائیے؟" یہ جواب تھا۔ پھر گہری تسکین دہ ردِ عمل۔

وہ روز طلوعِ آفتاب کے بعد کرنوں کی طرح وارڈ میں آتی دکھائی دیتی تھیں۔ پہلے نسائی آوازوں کے گھنگھرو بولنے لگتے تھے۔ ہم چوکنا ہو کر اس طرف دیکھتے۔ 'صحت گاہ' کی ویرانیوں میں یہ روزانہ کا واقعہ بھی کافی اہمیت رکھتا تھا۔ سفید ساریاں، سبز جھاڑیوں سے نکلتیں جیسے بیلے کے پھول کو نرخی کے اخضرین پردے سے نکلتے ہیں۔ بگلوں کا پرا قریب تر ہوتا جاتا اور آوازیں زیادہ واضح۔

پھلواڑی چھوٹی اور دو پھول ہم لوگوں کے وارڈ میں آگرتے۔ ہم دسوں مریض انہیں اپنے دامنِ نظارہ میں لے لیتے۔

جب کسی نرس کی ڈیوٹی درجۂ اوّل کے کوارٹر سے اس وارڈ میں بدلتی تو عموماً وہی ہوتا کہ بجا یا بے جا طور پر کردہ و ناکردہ غلطیوں پر ہم دِل کی سرزنش یوں کی جاتی:

"ہیں اے وارڈ میں بھلی تھی کیسے اچھے مریض ہیں اے وارڈ کے اچھی وسی وارڈ کے مریض تو جان کھا جاتے ہیں۔"

"کیسے اچھے ہیں اے وارڈ والے! اپنے نوکروں سے کام کرا لیتے ہیں بے چارے اور یہ لوگ تو جوتے سیدھے کرواتے ہیں جیسے ہم ان کی لگائی ہوں......" اور کبھی زیادہ ولدوز:

"گھر میں کرتے ہوں یہ ٹھاٹھ! شان دکھلانے آئے ہیں۔ اے وارڈ میں نواب صاحب اپنا منہ تک میلا نہیں کرتے تھے۔"

ہم دسوں مریض مختلف نادیوں سے درجۂ اوّل کے کوارٹر کو معاندانہ دیکھنے لگتے اور کوارٹر کی سُرخ اینٹیں طنزیہ ہنستی ہنستی نظر آتیں۔ معتبر نواب صاحب کی موٹر، ان کا جوان لڑکا، منصف صاحب و مسز راج جی کے بھائی کی توند اور شہوتی چھوٹی چھوٹی آنکھیں، ہسپتال کے سپرنٹنڈنٹ صاحب کا گورا چٹا چالاک و فتنہ کار نورِ نظر، بیمار و تیماردار، غرض درجۂ اوّل کی ساری مخلوق سِل کے کیڑوں کی طرح محسوس ہوتی جو ہمارے پھیپھڑوں کو چھلنی کر رہی ہے۔ ہم ان سب کو اپنے اندر سے نکال کر تھوک دینا چاہتے تھے۔ تھوک دانی کے کاربالک ایسڈ میں فنا ہونے کے لئے۔

اس روز سینے کے گھاؤ زیادہ خلش پیدا کرتے اور ہم میں سے کئی نرس ستمگار کے جسم کا جغرافیہ بیان کر کے دل کی بھڑاس اور چھپے ہوئے جنسی ارمان نکالتے تھے۔

ہمارے دلوں میں بھی چور تھا اور ان کے دلوں میں بھی۔ ہمارے اندر کوئی ٹیڑھی سیدھی رگ ضرور ایسی تھی جو نرسوں کو ذلیل سمجھنے پر اکساتی رہتی تھی اور نرسیں بھی ہر وقت اپنی شخصیت اور پندار کے تحفظ کے لئے تیار رہتی تھیں۔ ان کے تجربے رنگ رنگ کے تھے۔ ماضی کے نہاں خانے میں سینکڑوں مریض، بیسیوں ڈاکٹر اور کمپاؤنڈر چھپے ہوئے تھے۔ نرسوں کے دلوں سے ہو کر ایک تار گذرتا تھا جو ان مریضوں اور ڈاکٹروں کو گوندھے ہوئے ہمیں بھی پروتا چلا جاتا تھا۔

تیسرے درجے میں خلوت کا سکون اور مواقع نہ تھے لیکن اجتماع کا تنوع، ہمدردی اور رونق تھی۔ اے وارڈ کے علاوہ اپر سی وارڈ اور لوئر سی وارڈ کے درمیان بھی رقابتیں تھیں مگر یہ دوسری رقابت ولولہ انگیز اور عمل پرور تھی۔ یہ اپر اور لوئر محض زمین کے نشیب و فراز کا فرق تھا۔ پہاڑی علاقوں میں زمین کا اونچ نیچ بہت ہی نظر نواز ہوتا ہے۔ دونوں سی وارڈ تیسرے درجے کے وارڈ تھے۔ دونوں کا اعتبار اور امکانات برابر تھے لیکن ہمارے وارڈ کا ایک ساری 'صحت گاہ' میں مشہور تھا۔ ہماری لاگ اور لگاؤ بس سمجھئے متحدہ ہی تھی۔

وارڈ کے انتہائی داہنی طرف اٹھارہ سال کے ایک گورے نازک سے لڑکے کا بیڈ تھا۔ اس کے دونوں پھیپھڑوں میں "اے پی" دی جاتی تھی۔ یہ اعجاز صحت گاہ کا معجزہ تھا اور مثالی نمونے کی حیثیت رکھتا تھا۔ مدراسی ڈاکٹر نے اسے حیرت انگیز طور پر سِل کے پنجوں سے چھینا تھا۔ اسے بہت زیادہ آرام کرنے کی ہدایت تھی۔ پھر بھی وہ وارڈ کی دلچسپیوں میں کافی حصہ لیتا تھا۔ وہ نرسوں کا کھلونا تھا۔ نام تھا گوپال "گوپالی" پندرھویں سال میں سینی ٹوریم آیا تھا۔ اس کے ایک جانب ایک مارواڑی تھا، بہت ہی موٹا تازہ۔ تین من اس کا وزن تھا۔ پر یہ قریب ساڑھے تین سال

"صحت گاہ" میں رہ کر بغیر شفایاب ہوئے ہی چلا گیا۔ اس کے دونوں پھیپھڑوں میں بڑے بڑے غار تھے۔ اس کے بعد پر ایک مارواڑی ہی آیا۔ یہ اتنا دُبلا تھا کہ ہم لوگ اسے منگی رام کا بھوت کہتے تھے۔ تیسری ہستی ایک سیاہ رنگ کے مریض کی تھی جو حیاتین کے جنون میں صرف ایک ٹماٹر دن بھر میں کھا جایا کرتا تھا۔ وہ کم سخن مگر زندہ دل تھا۔ یہ حضرت مر مر کے بچے تھے۔ شاید ان کی صورت دیکھ کر ملک الموت بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ چوتھا خود میں تھا۔ "صحت گاہ" میں اپنی شادی کے سوٹ پہن پہن کر حسرتیں نکالنے والا میرا دوسرا ہمسایہ نقی تھا۔ ایک طرف بھائی جان نقی کی سیاہ فامی اور دوسری جانب نقی کا کافوری رنگ، ہم تینوں مل کر اس اشتہار کی تصویر بن جاتے تھے جس کے نیچے لکھا رہتا ہے "اب کالا کوئی نہیں رہے گا"۔ نقی حسین تھا اور بے حد جوان معلوم ہوتا تھا۔ شوخ، چونچال، بیباک اور ہنس مکھ۔ اس کی آمد سے لوئر سی وارڈ کا پلہ گراں ہو گیا تھا۔ پہلے اپر سی وارڈ میں گھوسکی نرسوں کا مرکز ثقل تھا۔ مگر اب ڈیوٹی ختم ہوتے ہی ساری نرسیں اپنے کوارٹر جاتے ہوئے 'لوئر سی' میں چلی آتی تھیں۔ گھڑی دو گھڑی کے لئے کھانے کی میز کے گرد بڑی دل نواز فضا پیدا ہو جاتی تھی۔ چہل سالہ وکیل صاحب کے چست فقرے نرسوں کو بہت بھاتے تھے۔ وارڈ میں دو وکیل صاحبان تھے۔ ایک داڑھی رکھتے اور نقلیں کرتے تھے، دوسرے پیشانی پر چندن کا ٹیکا لگاتے اور نرسوں سے فحش مذاق کرتے تھے۔ جونیئر وکیل صاحب کی تابناک پیشانی پر عبیر کی سُرخ بندی نرسوں کے لئے سرمایۂ تفریح تھی۔ ان دونوں بزرگوں کی تکنیک ایک سی تھی۔ یہ پہلے بے وقوف بن کر اوجھلے سہہ کر اپنا حق جما لیتے تھے اور پھر معصومانہ انداز میں مذاق کا جواب دیتے تھے۔ ان دونوں کا نشانہ بے خطا تھا مگر ایک کی فطرت میں ایمائی طنز زیادہ تھا اور دوسرے میں واقعیت نمایاں۔

نقی کے بائیں پہلو میں ایک نوجوان مصری تھے۔ گورا رنگ جس پر سُرخی کی چھوٹ تھی۔ مصری بہت جذباتی اور رقیق القلب تھے۔ جسمانی طور پر یہ جو بھی رہے ہوں مگر ذہنی طور پر بالکل کنوارے تھے۔ اچھوت کنیا کی طرح۔ مجھے، نقی اور مصری کو ایک پھیپھڑے میں "اے پی" دی جاتی تھی۔ مصری کم مریض تھے۔ "اے پی" کا کورس ختم ہو چکا تھا۔ ان کے مریض پھیپھڑے کو "فرینک نرو" کی جراحت کے ذریعہ معطل کر دیا گیا تھا۔ میں اور مصری میڈیکل کالج کے طالب علم رہ چکے تھے۔

نویں صاحب ایک اڑتالیس سال کے دیسی عیسائی تھے۔ یہ نہایت ہی سعادت مند قسم کے مریض تھے۔ استراحت کے گھنٹوں کے اندر اور اس کے بعد بھی وہ قطعی طور پر لکڑی کے تختے کی طرح چت لیٹے یسوع مسیح سے لو لگائے رہتے تھے۔ کوئی جنبش نہیں، کسی قسم کے آثارِ حیات نہیں۔ وہ جب ضرورتاً چلنے پھرنے پر مجبور ہو جاتے تھے تو یوں چلتے تھے کہ "زیر قدمت ہزار جان است"۔ اصولاً وہ اپنے سل زدہ پھیپھڑوں کو کم سے کم حرکت اور زیادہ سے زیادہ آرام دینا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک گفتگو بھی زیانِ حیات تھی۔ ہر وقت، ہر روز، ہر سال یونہی زندگی گزارتے تھے جیسے سسرال میں نئی دلہن۔ "صحت گاہ" میں انہیں ڈھائی سال ہو چکے تھے۔

دسویں ہستی ایک بنگالی مسلمان لڑکے کی تھی۔ سولہ سترہ سال اس کی عمر ہوگی۔ موٹا گول مٹول سا، گردن ندارد۔ یہ لڑکا غلام ربانی بھی پرتھو بالو کا مرید تھا۔ کم سخن و کم آمیز مگر بسیار خوار و بسیار خواب۔ اسے ہم لوگ "مرغ" کہتے تھے اور پرتھو بالو کو "پطرس ولی"۔ "مرغ" وضو کے علاوہ غسل بھی "بناتا" تھا۔

یہ دسوں مختلف طبائع کے لوگ ایک انوکھی ہمدردی کے ذریعہ ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ تھے۔ نرسوں سے مذاق کے وقت "پطرس ولی" بھی ایک دو مسکراہٹیں ضرور ارزاں کر دیا کرتے تھے۔ ویسے بھی وہ ہمارے رومانوں سے کافی دلچسپی لیا کرتے تھے۔ کیتھرین اور الیشری کی آواز سنتے ہی "مرغ" بھی بانگ دینے لگتا تھا۔

یہ دو نرسیں جانِ سینا ٹوریم تھیں۔ الیشری بیس سال کی صندلی رنگ، دراز قد، چھوٹی مگر مسکراتی ہوئی آنکھوں والی لڑکی تھی۔ وہ چلتی تھی جیسے اسپِ تازی "قدم" چلتا ہے۔ وہ اس کی گردن اور سینے کا "کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردافگنِ عشق" قسم کا خم! الیشری ملنسار و دلنواز

اور جسم سپرد کی تھی۔ وہ نسبیہ خوش خرام کی مثال آزاد و ہمہ گیر تھی۔ ایشری کیتھرن کو کتنا بڑا کہتی تھی۔ کیتھرن پچیس سالہ بھرپور جوان عورت تھی۔ سانولا رنگ، جراحت جتا پر نمک رہتا اس کے پھیلے اور گداز کولھے، اس کی گول کمر، اس کی شمالی ہندی چال، مست ہاتھی کی طرح۔ وہ یوں اتنی نظر میں داخل ہوتی تھی جیسے سمندری سفر کے بعد جہاز ہچکولے کھاتا ہوا ساحل کی طرف آتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بھاری کولھوں کے محور پر بالائی جسم چلتے وقت جھوم سا جاتا تھا جیسے پھلدار شاخ موٹے تنے پر لچک سی جائے۔ پھر اس کے کولھے پیش و پس ڈگمگا کے متانت سے آگے بڑھتے جاتے تھے۔ وہ داہنے ہاتھ سے ہلکا سا اشارہ کر کے ساری کے پلو میں تناؤ پیدا کرتی اور چھوڑ دیتی تھی۔ آنچل کی لہروں میں اس کے سینے ابھر آتے تھے اور پلو لہرانے لگتا تھا۔ کیتھرن عموماً متین سی رہتی تھی۔ مگر اچانک طور پر وہ شوخ و سحرکار بن جاتی تھی اور لہجہ سنجیدہ۔ بجلی کا چنچل پن اور اسٹیتے ہوئے کا۔ لے موج در موج بادل کی گمبھیرتا۔ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کو نمایاں کر کے قاتل تر بناتی تھیں۔ اس کی فطرت میں بحر الکاہل کی گہرائی تھی۔

ان دو کے علاوہ سات اور تھیں۔ ایک جوڑا تھا مارتھا اور فیبی۔ مارتھا مردانہ وار لانبی چپٹی سی عورت تھی۔ منہ سوجا اور بے جھجک۔ فیبی اس کے زیر حکومت تھی۔ نرس کوارٹر کے ایک ہی کمرے میں دونوں رہتی تھیں۔ وہاں دو پلنگ کے کمرے تھے۔ "فیبی تو فلاں مریض سے گھل مل کر کیوں ملی؟ فلاں نے تجھ سے چھیڑ چھاڑ کیوں کی؟" اس جوڑے کے نصف بہتر حصے پر ہر وقت پہرہ تھا۔ مارتھا ہالی معری سے خوش تھی۔ شرمیلے، اچھوت کنیا سے معری۔

ایک جوڑا تھا دو چچازاد بہنوں کا سلوچی اور فلورنس۔ دونوں گوری گوری، گداز گداز، مائل بہ فربہی عورتیں تھیں۔ مگر لڑکیاں کہے جانے پر مُصر۔ سلوچی اخلاقاً باعزوت تاثر کی کمی اور کبھی بھی جا سکتی تھی لیکن فلورنس تو بہت ہی بلند اخلاقی اور اشد ضرورت کے باوجود عورت ہونے سے لڑکی نہیں بن سکتی تھی۔

میگی اور ولاری ہاڑی کالی چپٹی ناکوں والی نرسیں تھیں۔ خوش اخلاق، کرم فرما، ہر دل عزیز، ایثار پسند۔ میگی ادھیڑ عمر کی تھی اور ولاری جوان۔ اس کے "چھوٹا اگھوس" صبیوں کی سنگیوں، ناک کے چپٹے پن کا اس حد تک کفارہ ضرور ادا کر دیتی تھی کہ اس کی پیشانی کے بیچ نسے نظریں پھسل کر صدری کٹھوس سہارے کے بل پر تھم جاتی تھیں۔

نویں تھی ڈولی۔ وہ سراپا ڈولی تھی۔ چھوٹا سا کھلونا، شریر آنکھیں مٹکانے اور چیں چیں کرنے والی گڑیا۔ گہرا سانولا رنگ، بڑی بڑی سیاہ ادھ پاؤ آنکھیں، کھلنڈری بے باک، لڑ پڑنے والی اور لڑ کر ہنس دینے والی۔ یہ سب سے کم عمر تھی۔ اٹھارہ انیس سال کی ہو گی۔ کبھی تو یہ بڑی معصوم سی لگتی تھی اور کبھی گود پا لا سرنگ بھولی۔

"صحت گاہ" ایک دیرانے میں تھی۔ سب سے نزدیک کا گاؤں ڈیڑھ میل پر تھا اور سب سے نزدیک کا شہر اٹھارہ میل پر۔ صحت گاہ کی بس اپنی ایک چھوٹی سی دنیا تھی۔ الگ تھلگ۔ دو ڈاکٹر، ایک کمپاؤنڈر، ایک ڈسپنسر، ایک ایکس رے بابو، دو کلرک۔ نو نرسیں، ایک میٹرن اور سسٹر، آٹھ وارڈ بوائے، چند مہترانیاں اور پچاس کے لگ بھگ سل و دق کے مریض مع اپنے بال بچوں اور چند تیمارداروں کے۔ وارڈوں کے چاروں طرف باغ، جنگل اور سرخ سرخ موروم کے بڑے بڑے ٹیلے تھے۔ کچھ دور پر چھوٹی چھوٹی مگر پرشور پہاڑی ندیاں تھیں۔ جاڑوں اور گرمیوں میں یہ ندیاں مریضوں کے آنسوؤں کی طرح خشک ہو جاتی تھیں۔

ایک روز میں اور نقی ایکس رے کے نئے نرس ڈولی کے ساتھ جا رہے تھے۔ ڈولی صبح سے گنگنا رہی اور چہچہا رہی تھی۔ بڑے صاحب نے اسے ڈانٹا تھا۔ راستے میں اس نے دور سے بڑے صاحب کو دیکھا۔ کہنے لگی:

"بڑا بنتا ہے۔ ایکس رے کروانے کے بہانے ڈارک روم میں خود جو چاہے کر گزرے۔ وہ دوسروں سے جلتا ہے۔"

ڈولی نے غصے کی بے خیالی میں یہ جملے ادا کئے۔ ہم لوگوں کی موجودگی کے احساس نے اسے چونکا دیا۔ پردہ داری کے بغیر نہ رومان رہتا ہے نہ کشش۔ وہ کہہ چلی۔

"نرسیں اگر ایسی ہو تیں تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔ خدا باپ ہم لوگوں کو بچا لیتا ہے۔"

بات یہ تھی کہ بڑے صاحب کے جذبۂ اجارہ داری کے باوجود نرسوں کی انفرادیت ہمیشہ سرکشی پر تلی رہتی تھی۔ مہینے میں ایک روز نرسوں کو "ڈے آف" ملتا تھا۔ وہ تنہا یا دو تین کی ٹولی بنا کر شہر چلی جاتی تھیں۔ مگر اجنبی شہر میں دل کی پیاس کا بجھنا بلاؤز یا پیٹی کوٹ کی لیس خریدنا تو ہے نہیں۔ نرسیں عموماً وہاں سے دل کا بوجھ اٹھائے ہوئے واپس آتیں بلکہ سینما دیکھنے کے بعد آرزوؤں کی خاکستر کے اندر چند چنگاریاں اور سلگ اٹھتیں۔

کوارٹر میں دو دو نرسوں کی ٹولیاں تھیں۔ یہ ٹولیاں زیادہ تر زندگی کی تلخ حقیقتوں اور مطالبوں پر جانبدارانہ تبصرہ کیا کرتی تھیں۔ فاش صداقتوں کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی تھیں۔ جب سب مل بیٹھتیں تو پھر مریضوں، ڈاکٹروں اور ٹرسٹ، آفیسر کی باتیں، طعنہ و طنز، چھیڑ چھاڑ اور کبھی جھوم کر کے گیت ؎

آگے آگے میں چلی اور پیچھے پیچھے سیاں
سروتا کاہے بھول آئے پیارے نندویا

اور غزلیں ؎

اے عشق عطا کر دے وہ کیف کا پیمانہ

سیاں تو خیر دور کی بات تھی مگر کیف کے پیمانے کی تلاش جاری رہتی۔ ہر نرس گو کئی کئی بار ... تھیں مگر ان سے ان کی طبیعت کبھی سیر نہ ہوتی جوانی، عورت، بیوی اور ماں ہمیشہ ان میں جاگتی رہتی تھیں اور نہ جانے کتنے ہونے اور نہ جانے روپ بدل بدل کر ان کے جذبوں پر چھا جاتی تھیں۔ مسیح کے پیچھے نا آسودگی اور بیزاری پوشیدہ رہتی تھی۔ ارادی اور غیر ارادی قوتوں نے انہیں زندگی کی اس منزل میں لا ڈالا تھا۔ لطافت مٹی نہ تھی، روپوش ہو گئی تھی۔

کچھ عجیب بات معلوم ہوگی مگر ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی نرس نے مریض کے بلغم میں سل کے کیڑوں کے پائے جانے کے باوجود اس کے لئے اپنے لب و رخسار ارزاں کر دیئے اور یہ سلیل سل کے کیڑوں کو ملل شیر پر اپنے دل و دماغ میں جذب کر جانے تھے۔ دق بخت مریض گھنا سانپ سے زیادہ خطرناک سمجھے جاتے ہیں مگر یہ دیویاں بس گھول کر پی جاتی تھیں۔ کون جانے محبت کے امرت میں ملا کے، یا آتش بداماں ہوس کی آگ میں بجھا کر۔ مریض تو جراثیم کو تمنائے حیات کی رو میں بہا دیتے تھے۔ وہ اتنی بار ٹی۔ بی۔ ٹی۔ بی کا ورد کرتے تھے کہ ٹی۔ بی بے حقیقت ہو جاتی تھی۔ جیسے مالا کی تسبیح پر گھومتے گھومتے خدا بے حقیقت ہو جاتا ہے۔ ایک بار بھائی حاذق نے اسپیوٹم فلاسک میں سخت کھانسی کے بعد بلغم پھینکتے ہوئے بے تکلفی سے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"بھائی تم بی۔ بی اور ٹی۔ بی (ٹی بی) دونوں سے لطف اٹھاتے ہو۔ میں صرف ٹی۔ بی سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔"

میں نے کہا تھا "بیگم بھی تو ہم قافیہ ہے۔ اپنی غزل کے لئے آپ اسے استعمال کیجئے۔" بھائی حاذق ہنسنے لگے اور انہیں زور سے تکلیف دہ کھانسی آگئی۔

ہم لوگ کرسمس، عید اور ہولی سب تہوار منایا کرتے تھے اور یوں مریضوں کے علاوہ ذی فراش مریض بھی اپنے دکھ درد کو بھلا کر غم غلط کر دیا کرتے تھے۔ نفی تو صحت گاہ میں آئے ہوئے ستمبر کا مہینہ تھا اور مجھے پانچواں کہ کرسمس آگیا۔ اس عرصے کے اندر میں اور نفی بہت

قریب ہو چکے تھے۔ عورتوں کے وارڈ والیاں ہمیں "سارس کا جوڑا" کہتی تھیں۔ زنانہ وارڈ ہم لوگوں کے وارڈ کے پہلو میں تھا۔ معصوم سے مدد ملتی گا ہے گا ہے وہاں برج یا کیرم کھیلنے کے لئے بلائے جاتے تھے۔ مسز شنکر اور مسز اکرام نے ایک دو دفعہ سارس کے جوڑے کو جدا بھی کرنا چاہا مگر ہم لوگوں نے تاب مقابلہ نہ پا کر بلاوے کو ٹال دیا۔ مگر جب ہم لوگ ڈرامے کھیلتے تھے تو پھر زیور اور کپڑے مانگنے کی تقریب سے ہمیں طبیعت سے ملاقاتیں ہو ہی جایا کرتی تھیں۔ کرسمس کے موقعہ پر ہم لوگوں نے ڈرامہ کھیلا۔ نرسوں نے بھی شرکت کی مگر یہ کرسمس نرسوں کے جذبات میں طوفان سا پیا کرتا ہوا آیا۔

نقی لورینسی وارڈ میں سب سے زیادہ خوبصورت اور زندہ دل نوجوان تھا۔ اس کی شوخ حسین آنکھیں چشمہ خضر کی طرح تھیں۔ صنف نازک کے تشنہ دل کی پیاس بجھانے کا نہایت ہی شاداب ذریعہ۔ ہر نرس نے اس کی لانبی اور گھنی پلکوں کے نخلستان میں پناہ لینی چاہی مگر ایلیشری کی جراتوں کے سامنے بقیہ سب نخفی زہن کی آرائش بن کر رہ گئیں۔ ہاں نخفی ڈولی اس طرح وابستہ رہی جیسے ہندوستان کے ساتھ لنکا۔ ڈولی گلہری تھی ہر درخت پر چڑھ کر پھل کترنے والی۔ مگر چوری چوری پھل لے اور وہ بھاگ۔

ایلیشری بے حد جذباتی تھی۔ اس کے جذبات کی رو میں ماضی، حال اور مستقبل سب بہہ جاتے تھے۔ اس پر محبت کے دورے پڑتے تھے۔ دو تین ماہ سے زیادہ وہ شدت کے ساتھ کسی کو نہیں چاہتی تھی مگر نقی نے اسے رام کر لیا تھا۔ محبت کے دورے کے وقت بھی وہ کسی کے جذباتی مطالبے کو رد نہیں کر سکتی تھی۔ اسے وارڈ کے منصف صاحب اس پر مرنے لگے تھے۔ ایلیشری نے ان کا دل بھی نہیں توڑا، اور دل دہی کے لئے وہ انتہائی بخششوں سے کام بھی لے لیا کرتی تھی۔ "مجھ سے کسی کا گڑ گڑانا دیکھا نہیں جاتا نقی اور ایک تم ہو؟"

ایلیشری نے میرے سامنے ایک بار جھوٹ کے سانچے میں کہا تھا۔

وہ اپنے سارے قصے ہم لوگوں سے کہہ دیتی تھی۔ اس کا کوئی راز نہ تھا۔

کیتھرن ایلیشری کی ضد تھی۔ وہ مجسم راز رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس کی فتوحات پس پردہ ہوا کرتی تھیں۔ اپنے کو وہ نہایت ہی پارسا ثابت کرنا چاہتی تھی مگر نقاب و حجاب کا اتنا گوشہ وہ چلمنوں سے ارادتاً ضرور اٹھا دیتی تھی کہ اس کی محبوبیت اور گراں مایگی ارمان انگیز طور پر ظاہر ہو جائیں۔ کیتھرن نے بھی نقی کو اپنا شکار بنانا چاہا مگر نقی اس کی آہستہ خرامی اور رندانہ دارانہ انداز کی فطرتاً تاب لا ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ محبت میں جری تھا۔ بیباک ایلیشری کی ذات میں اس کو وہ ساتھی مل گیا جو جذبات کے کھیل میں ہر رکاوٹ کو گناہ سمجھتا ہے۔

یہ سب کچھ ہو چکا تھا جب میں سینا ٹوریم آیا۔ ایک مہینے کے اندر ہی میں اور نقی گھل مل گئے تھے۔ ایلیشری میرے سامنے بھی نقی سے بے تکلف باتیں کرتی تھی مگر کیتھرن نے جب ایک روز میرا بستر درست کرتے ہوئے چپ چاپ اوڑھنے والی چادر کے اندر میرے ہاتھوں میں گلاب کا پھول دے کر آہستہ سے کہا "ڈارلنگ!" اور میں نے اس سانحہ کا تذکرہ نقی سے کر دیا تو کیتھرن نے مجھ سے شکوے کئے "آپ تو بڑے ناسمجھ ہیں۔ دیکھئے نقی مجھے بھابی کہنے لگا ہے۔ میں یہ باتیں پسند نہیں کرتی۔ میری بھی تو عزت ہے۔ وہ تو آپ ہے" کیتھرن نے اپنی سنجیدہ، شیریں، لوچدار آواز میں شکایت کی اور بات کو مکمل کرتے کرتے دانستہ جھک کر ہنسنے لگی۔

کرسمس کی تیاریاں خوب ہوئیں۔ ہم مریضوں نے رنگ برنگ کے کاغذوں کے زنجیرے اور جھنڈیاں بنائیں۔ ساری صحت گاہ کی آرائش کی گئی۔ چوبیس دسمبر کو ہر جگہ خوشی تھم تھم کر ابلنے کے لئے بے چین ہو رہی تھی۔ نرسیں نوخیز ہرنیوں کی طرح کلیلیں کرتی پھرتی تھیں۔ اسی روز بڑے صاحب نے بھی رقابت اور فرض کی زنجیریں ڈھیلی کر دی تھیں۔ شام کو نرسیں وارڈ میں جھرمٹ بنا کر صرف یہ پیام دینے آئیں کہ وہ لوگ کرسمس کا "نغمۂ شب" گاتی ہوئی صبح کاذب کے وقت ہی وارڈ میں آئیں گی۔ سب لوگ ان کی پذیرائی کے لئے تیار رہیں۔ وہ سب کی سب وردی اتار کر کئے حسین و گداز و عنبر ساریوں میں لپٹی، جذبات کے بوجھ سے لڑکھڑاتی فضا میں رقص مستانہ کرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ ایلیشری طوفان و سیلاب تھی۔

کیمپفر ان نے اپنی فطرت کا نقاب اُلٹ دیا تھا۔ وہ بھی کرسمس ایو میں بے محابا تھی اور کون اس شام کو متحرک سپردگی نہ تھا۔ وارڈ سی وارڈ میں کرپائی لہر دوڑ گئی۔ معتمد وکیل صاحب جنہیں ہم لوگ "پیر مغاں" کہتے تھے، سے لے کر غلام ربانی تک لوگ تمام محسوسات میں ڈانواں ڈول ہو رہے تھے۔ ہمارے ہاتھ اُٹھتے نہ تھے لیکن ہمارے جذبات آغوش وا کئے ہوئے تھے۔ اُف اسی وارڈ کے ممکنات اور مواقع کتنے محدود تھے! ہمارے دل میں اپنی جیبیں اور اسے وارڈ کی خلوتیں انفرادی شان میں آسودہ کشاکش رہی تھیں۔

"نرسیں بڑے صاحب کے یہاں "کرسمس ٹری" ہلانے جا رہی ہیں۔ جاگتے رہنا ـــــ ہاں!" ایک لوچدار آواز فضا میں لہرا کر دلوں میں اتر گئی۔

"اوہ......رے......رے انہیں سو کیسے جائیں گے۔ اندر تم بھی تو جان کے بیتی ہو۔ بھلا آج رات نیند ہی کب آئے گی ہمیں!
ذرا مصری کو تو دیکھو......"

ایک رہزن تمکین ہوش نے مرکشی ہوئی رگ چھو لی۔ پھر جلوۂ برقِ فنا قسم کا قہقہہ ترنم بار ہوا اور ہنسی کی پھلجھڑی ہوئی سب نرسیں یوں چلی گئیں، جیسے آتشبازی چھوٹ کے رہ گئی ہو۔

وہ رات قیامت خیز تھی۔ نرسوں کے چلے جانے کے بعد ہم سب لوگ یک ایک محزون ہو گئے۔ بیس دسمبر کو گیارہواں مریض ہم لوگوں کے وارڈ میں داخل ہوا۔ ہائیں کہ وہ بہت ہی درد و کرب کے عالم میں جاں بحق ہو گیا۔ اس کا پھیپھڑا پھٹ گیا تھا۔ ہم دوسروں کی نظریں خالی پلنگ پر جا کر جا کر ہم آغوش ہوتیں، خاموش ماتم کی حالت میں۔ پر جیتی آپ بیتی بن جا رہی تھی۔ کچھ دیر تک ہم سب ہمدردانہ انداز میں چپ چاپ سے رہے۔ ہم اس اندوہ و بلائے بے پناہ چار رہے تھے اور انتقاماً ہم سارے جہاں کی خوشیاں چھین کر اپنے دل میں جمع کر لینے کی تمنا کر رہے تھے۔ "پیر مغاں" مغرب کی نماز پڑھنے چلے گئے۔ وہاں سے انہوں نے کچھ سکون مستعار لیا اور سلام پھیرتے ہی آخر سب کی امیدوں کے تذکرے چھیڑ دیئے۔ ہم سب لوگ ڈیٹ کمان تصورات سے لطف لینے لگے۔ نمبر گیارہ کے جسم کو پھر سے جلا کر ہم نے ذرات فضا میں بکھیر دیئے اور اس کی روح خیالات کی انتہائی گہرائیوں میں دفن کر دی۔ اس شام کو ہم نے استراحت کے گھنٹے میں بھی بلند آواز سے گفتگو کی، بے ہنسی کی ہنسی ہنسے اور نرسوں کا اتنے پہلو اور زاویوں سے تجزیہ کیا کہ ان کے جسم تحلیل ہو کر ہم میں سما گئے اور ہم ان میں۔

نصف شب ہی سے نرس کوارٹر بیدار ہو گیا تھا۔ گیتوں اور ہنسیوں کی آوازیں ہماری مضطرب نیندوں کو اور بے کل کر رہی تھیں۔ ابھی رات ہی تھی کہ کرسمس کا حسین "نغمۂ شب" اچانک طور پر ٹی بی وارڈ کے بہت قریب سامعہ نواز ہوا۔ ہم غنودگی اور نیند کے درمیان سے آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ ہم میں سے اکثر نے جلد جلد اپنے الجھے ہوئے بال درست کئے۔ نرسیں باہر لان پر کرسمس کیرول گاتی، چہلیں کرتی اٹھلاتی چلی آ رہی تھیں۔ وہ آئیں، چیت کی سنکتی ہوئی ہواؤں کی طرح، شباب کی امنگوں کی مثال۔ کچھ دیر کے لئے نغمے رک گئے، خندۂ بے باک تھم گئے اور فضا سکر و مستی سے لبریز ہو کر چھلکنے لگی۔ ولولہ ہائے خاموشی کا ترنم، زندہ سکوت کی ابدیت لئے آغوشِ وجود میں مختصر ٹھہر رہی تھی اس کے قبل کہ بڑھ کر کوئی بجلی کا بٹن دبا دے بہت سی حسرتیں پوری ہو گئیں، بہت سی آرزوئیں جوان ہو گئیں، کئی ارمان پیدا ہوئے اور ان گنت ناکردہ گناہ حسرت کی داد لینے کے لئے درد ناک مضحکہ کا سامان بن گئے۔ آج انفعال خود جرأت رندانہ پر تلا جا رہا تھا۔ ہر سطح ترقی پر چلنے والی تیز ہوائیں سرد بوجھتے خاموش، گہرے نیلے آسمان کے سائے میں الم شدہ شہزادوں کی طرح مزید دکھتیں۔ پورب کے دروازے کھلتے ہوئے تھے میں نے تاروں کی چند آوارہ شعاعوں کی مدھم روشنی میں ماحول الخلاط فلورنس کو اپنے بہت قریب پایا اور جب کسی نے جھک سے روشنی جلا دی تو میں نے دیکھا کہ زندگی اور موت کے درمیان ایک۔ سینے میں تھرتھری سی دوری پیدا ہوئی اس کے علاوہ بھی کئی تماش بنے اور بکھرے تھے پھر بلند ہوئے۔ ہارمونیم ایشری بجا رہی تھی اور سالومی نے مادر کرسمس کا سوانگ بھرا تھا۔ سرخ پاجامہ، سرخ قبا، نیلی اونچی خوش رنگ ٹوپی اور سفید لانبی ڈاڑھی

ہم سب لوگ اسے دیکھ کر بے تحاشا قہقہے لگانے لگے۔ "پیرِ مغاں" نے بڑھ کر "فادر کرسمس" سے معانقہ کیا۔ اس پر ایک اور گونجتا ہوا قہقہہ لگا۔ دالان کے کھلے ہوئے حصے میں ایک حلقہ ڈال دیا گیا۔ رقص و نغمے شروع ہوئے۔ نرسیں اپنا بہترین لباس زیبِ تن کیے ہوئے مور کی طرح ناچ رہی تھیں۔ باری باری اور گاہ جھومر ڈال کر گا رہی تھیں۔ ان کی بے پناہ سپردگی ہم لوگوں کو مدہوش کر رہی تھی۔ گاتے گاتے ان کے حشر خیز اشارے، ناچتے ناچتے ان کا شانوں پر سر رکھ کر ذرا آسودگی حاصل کر لینا، موت اور حیات کی سرحدیں ملا رہا تھا۔ "پیرِ مغاں" نے ایشری کے گلے میں بندھا ہوا ہارمونیم اتار کر اپنے گلے میں ڈال لیا۔ میں نے اور نقی نے ہارمونیم کو سہارا دیا۔ ہمیں اس گھڑی بھی مجروح پھیپھڑوں پر وزن پڑ جانے کی مضرت بھولی رہتی۔ میٹرو کیل صاحب نے جھوم جھوم کر خوب ولولہ خیز گت بجائے اور رات کی پریاں مجسم غزل الغزلات بنی ہوئی خدائے محبت کے جلووں کے خیر مقدم میں عرضِ نغمہ اور گفتارِ رقص پیش کرتی رہیں۔

کرسمس کے بعد حجابات اٹھ گئے تھے۔ صبح کی شرمیلی سرخی بڑے دن کے بعد روزِ روشن کی تنویر بن گئی۔ ہم مریضوں کے جذبات کی جڑیں "صحت گاہ" کی زمین میں زیادہ پیوست ہو گئیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بڈھے کرسمس نے سینا توریم کی بالائی سطح کھرچ کر معجزانہ طور پر ایک نئی دنیا بنا دی ہے جس میں اسپتال کی تلخ حقیقتوں کے ساتھ گھریلو فضا کی لطافت اور ہمدردی بھی ہے۔ ہم لوگوں نے "پیرِ مغاں" کی شادی تفریحاً "فادر کرسمس" سے کر دی جو صبح ہوتے ہی چولا بدل کر "مدر کرسمس" بن گئی تھی۔ "پیرِ مغاں" اسے میری "گھر میں" کے اصول سے میری "وارڈ میں" کہنے لگے۔ ایشری باضابطہ طور پر میری "سالی" بن گئی اور کیتھرین نقی کی "بھابی"۔ اسی نوع کی اور بھی کچھ رشتہ داریاں قائم ہو گئی تھیں۔ ہم لوگ ان رشتہ داریوں کو یوں استعمال کرتے رہتے جیسے لنگڑے بیساکھیاں استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے یہ ذہنی سہارے فریب کی بنا پر قائم تھے مگر زندگی میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فریب حقیقت سے زیادہ حقیقی بن جاتا ہے۔ ہم لوگ کشتی شکستہ سند باد جہازی یا رابن سن کروسو کی طرح "صحت گاہ" کے "صحرائی جزیرے" میں بیٹھے، سنسار سے الگ تھلگ، انتظار کی دبی ہوئی آگ سینوں میں لیے، اپنی ایک چھوٹی سی دنیا بنا رہے تھے۔ انسانیت کے دل میں کتنی لا انتہا صورتِ تعمیر بھری ہوئی ہے۔

یوں تو پہلے بھی نرسیں ہم لوگوں کے لیے تحفے آم، میٹھے پھل اور میوے لے آتی تھیں مگر کرسمس کے تحفوں کی رنگینی و دلآویزی سے ایک نئے دور کی ابتدا ہوئی۔ تحفے پھل اور میووں سے رومانی لطافتوں کی شکل اختیار کی۔ جذبے کی حدت نے انہیں حریری رومالوں اور عطر و سینٹ میں تبدیل کر دیا۔ حقیقت کی ایک سیال صورت رومان ہے۔ جیسے برف سے پانی اور پانی سے بھاپ بن جاتا ہے۔ مگر کچھ دنوں کے بعد رومال اور سینٹ تنازع کے چکر میں پڑ کر بیسنی روٹی اور پڈنگ بن گئے۔ استمرارِ حیات کے لیے روزمرہ کی واقفیت کا وسیلہ لازمی ہے۔

گوپال بہت خوش تھا۔ اکثر کہتا "نقی بھائی! وارڈ میں بہت جی لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری بیماری اچھی ہو گئی...... تب بھائی الوریہ جا کر پھر اسکول میں نام لکھا سکیں گے نا؟" اس کی آنکھوں میں زندگی کی آرزوئیں جھلکنے لگتیں۔ وہ ذرا نڈھال ہو کر کہہ چلتا "مگر پوڈنگ اور بیسنی روٹی اور کٹو نواکے گمیت۔ طبیعت بہت گھبرا لیتی کی [illegible] پھر ہسپتال کے مریضوں سے کون گھل مل کرے گا؟ ساتھ بیٹھ کر کون کھیلے گا۔ ایشری بھابی اور کٹو نوا کا پریم کہاں ملے گا؟" نادان اور بیچارہ! گوپال پر رقت سی طاری ہو گئی۔

نوٹرس وارڈ کے تعلقات میں اجتماعیت کا رنگ چوکھا تھا۔ پربھو بابو اپنی صوفیت اور گوپال اپنے کومل ارمانوں کے باوجود [illegible] ہم سب لوگوں سے زیادہ رفاقت کرتے تھے۔ وہ پہلی دو تین کے ہلا کر نسائی لطافتوں کا امرت انڈیل کر میت کو گوارا بنانے کے لیے بے چین تھے۔ پربھو بابو کو اپنے بڑے کنبے کی ذمہ داریاں یاد آتی تھیں۔ بیوی بچے کی محبت، بہن اور برہم کے کھیل یا نرسوں کا لوچ بھی نہ جو پیار [illegible] کا پہاڑ رکھ دیے جس سے بھی غم غلط ہو جاتے۔ ایک روز گوپال پربھو برہم سا تھمل کر واپس آیا۔ اب اسے پہنڈر لگا۔ سے چلنے پھرنے

کی اجازت مل گئی تھی اور سیر کے بعد اس کی حرارت کا درجہ بڑھتا نہ تھا۔ ان دنوں وہ بہت مسرور تھا۔ اسے امید تھی کہ رفتہ رفتہ اسے بھائی عاشق کی طرح ایک میل سیر کی اجازت مل جائے گی۔ گوپال کو بیزار اور برہم دیکھ کر مجھے اور نقی کو سخت تعجب ہوا۔ ہم لوگ بھی دو میل کی سیر کے بعد پلنگ پر بیٹھ کر تھرما میٹر لگا رہے تھے۔ اس کے بعد فوراً شام کی استراحت کا گھنٹہ شروع ہو گیا۔ ڈولی کی ڈیوٹی تھی۔ اس ٹیک ٹیک کرنے والی لڑکی نے ہم لوگوں کو باتیں کرنے نہیں دیں۔ گوپال کا نازک سا چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ کچھ کہنے کے لئے بے چین تھا اور ہم لوگ سننے کے لئے مگر قہر درویش بر جان درویش۔ ایک گھنٹہ ہم لوگوں نے عجب الجھن میں گذارا۔ ٹن ٹن ٹن ٹن! گھنٹی بجی اور گوپال جھٹ اٹھ کر میرے اور نقی کے پلنگ کے درمیان آ کھڑا ہوا۔ ہم بھی اٹھ بیٹھے۔ "کشو بڑا آیا نرسوں والا وارڈ میں رہا ہے ...... " گوپال رک گیا۔ اس کا چہرہ اور سرخ ہو گیا۔ "مشٹا بابو نے کشو کے گال میں ...... " "اب کے اس نے تم نہیں کہا ...... " "انور بھائی کیتھرن سے ست بولئے۔" گوپال بہت خفا تھا اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔

ایک گھنٹے کے بعد ڈیوٹی سے فراغت ہو گئی تو کیتھرن ہم لوگوں کے وارڈ میں آئی۔ کچھ شرمائی ہوئی اور خفیف۔ وہ سیدھی میرے پاس آئی۔ "انور بابو! مجھے ساڑی باندھنی نہیں آتی۔ ڈرامے میں میرا مردانہ پارٹ ہے۔ میں آپ سے ہی ترشائی کا ناٹ بندھواؤں گی۔" یہ کہہ کر وہ مسکرائی جھکی اور دزدیدہ نگاہوں سے اس نے گوپال کو بھانپا۔ کیتھرن نے بھی کار خیر کرتے وقت غالباً گوپال کو دیکھتے دیکھ لیا تھا۔ یہ جملے آزمائشی تھے جن کے اندر احساس لغزش نے شکستہ بیانی کو امید افزا بنانے کے لئے نوازش اور شیرینی کی آمیزش کر دی تھی۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے کچھ اور چھیڑا تو میں ایک کتاب اٹھا کے پڑھنے لگا۔ کیتھرن چلی گئی۔ اس کے اندر نسائی پندار کافی تھا اور پھر راز کو رو شرمندہ عریانی کرنا کب گوارا کر سکتی۔

ہم لوگوں میں بات چیت بند ہو گئی۔ ایک روز ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ البشریٰ دوسرے وارڈ جاتے ہوئے میرے پاس آئی اور چپ چاپ سے صرف یہ کہہ گئی:

"کشو بڑا کا آج ملے آف ہے۔ وہ شہر نہیں گئیں۔ اپنے کمرے میں چادر سے منہ لپیٹے رو رہی ہیں۔"

ان دنوں البشریٰ بھی اے وارڈ کے منصف صاحب سے خوب پینگیں بڑھا رہی تھی۔ میں نے اور نقی نے یہ مشورہ کیا کہ کیتھرن اور البشریٰ ان دونوں لات اور منات کو کشیدگی کا مزا چکھایا جائے۔ اپنے فیصلے سے ہم نے اہل وارڈ کو بھی مطلع کر دیا۔ پربھو بابو اور میر میاں نے صاد کیا۔ طے یہ ہوا کہ میں صرف کیتھرن سے مراسم ترک کر دوں اور نقی صرف البشریٰ سے۔ دوسرے مریض حسب سابق میل جول جاری رکھیں دو مندہ ہیں وارڈ ہی سے گریز کر جائیں گی۔

یہ چپ چپ ایک ہفتے تک جاری رہی۔ ایک روز شام کی سیر سے پہلے اسٹور روم سے نقی مجذوب کی ہنسی ہنستا ہوا نکلا اور مجھے جلدی روٹھا جا کے کہنے لگا "سیلاب کو مضبوط پل روک سکتی ہے۔ مگر سیلاب کو سیلاب ہی کہیں روک پاتا ہے۔ چلو کشیدگی ہو چکی۔" البشریٰ کی شخصیت کی طوفان وشی نقی کی شعلہ مزاجی کو پگھلا چل گئی۔ میں نے اسے بہت برا بھلا کہا۔ وہ ایک قہقہہ لگاتے ہوئے بس اتنا بولا "منصف بھی کیا یاد کرے گا!"

میں نے جواب دیا ——— "مگر تم البشریٰ کو اپنا تو نہ سکے۔"

"تو کیا تم نے چپ رہ کر کیتھرن کو اپنا لیا؟" وہ تنک کر بولا اور پھر کامیاب ہنسی ہنسنے لگا۔ ہم نے واقفیت، کا خلوص پن اور جذبات پرستی کو نامرادی کا زہر محسوس کیا۔ بات یہ ہے کہ گوپال کی رپورٹ میرے احساس کی بالائی سطح سے کافی نیچے اتر گئی تھی۔ کرسمس نے ہم لوگوں کی توقعات کو بہت آگے بڑھا دیا تھا اور توقعات کا قیام قلعہ نامرادی میں بس بھر دیتا ہے۔ فرق یہ تھا کہ نقی حقیقتاً بیمار تھا اور میں ذرا حالی بلند پر آ کر

غیر معمولی لذت حاصل کرنے کا عادی۔

دو تین روز کے بعد میں اور نفی رات کے کھانے سے فارغ ہو کر وارڈ کے صحن کے ایک گوشے میں یوکلپٹس کے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ چاندنی رات تھی مگر ابر کے سفید سفید ٹکڑے چاند کو پیار کرتے ہوئے نیلے آسمان میں تیر جاتے تھے۔ بادِ شمال یوں چل رہی تھی جیسے آسودگی کے بعد خیالات ماضی کی رنگین و آباد وسعتوں میں لطف پرواز حاصل کرتے ہیں۔ ہم لوگ ذرا سنجیدہ حالات میں ایک دوسرے کے مستقبل کے متعلق بہ مدافعانہ سوچ بچار کر رہے تھے۔ کیف بار ماحول میں کبھی طبیعت بڑی سنجیدہ اور گداز ہو جاتی ہے۔

اچانک خوشگوار ہنسی کا نغمہ ہوا کے فرش پر رقص کر گیا۔

"پاگلوں کو دیکھو" کیتھرن کی لوچ دار آواز عین عقب سے آئی۔

"پاگلوں سے بھی بڑے پاگل۔ بالکل باؤنڈ۔ اچھا یہ سارس کا جوڑا کیا کر رہا ہے؟ چاند سے پریم ہو رہا ہے؟" یہ ایلشری کی شوخ بولی ٹھٹھولی تھی۔

میں نے کہا "آؤ ایلشری! تم سے پریم کریں!"

"واہ میں کیوں آؤں؟ اوہ...... ہے...... ہے! دیکھو نا کٹو! نمہیں منانے آئی ہیں۔"

میں خاموش رہا۔ کیتھرن میرے پاس گھاس پر بیٹھ گئی۔

"دیکھو! آج بڑے صاحب نے میرے بازو میں کوکیلسیم کا انجکشن دیا ہے۔ بھی! کتنا پھول گیا ہے۔ بہت پے رہا ہے! اور بابو...."

اس نے مترحم نظروں سے مجھے دیکھ کر کہا..... میں بیگانہ سا بنا رہا۔ وہ کہہ چلی:

"ارے ہم نرسوں کی زندگی کیا۔ غیروں کے لئے سب کچھ کرو۔ مگر کبھی کوئی اپنا نہ ہو اور اپنے۔ ہمارا اپنا کون بیٹھا ہوا ہے۔ نفی تو یتیم ہے نا اور میں...... میرا ایک بوڑھا باپ اور ایک سوتیلا بھائی ہے۔ ہو بھی جانے دو۔ بی مر جائیں گے تو کون دو آنسو بہانے والا آئے گا۔ بڑے صاحب کہتے تھے کہ کیتھرن کے لنگس بہت کمزور ہیں...... اسی لئے تو یہ نگوڑی سوئیاں چبھوتے ہیں۔ چل نفی کوارٹرا ذرا اسپنگ دے لے...."

وہ ایلشری سے مخاطب ہو کر اٹھنے لگی۔ نفی نے بڑھ کر کیتھرن کا بازو عیادتاً مس کیا۔ اس نے تازے سے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا:

"جس ڈالی پر میں گھائل پرندے کی طرح گھونسلا بنانے آئی تھی وہ اکھڑی ہوئی ہے تو پھر دوسری شاخ کیوں میری پوچھ کرے؟"

اب بیگانگی جرم تھی۔ تیر ہدف پر لگا۔ پرسش نے سکوت کی مہر توڑ دی۔ اس روز ہم لوگ کچھ دیر تک اپنی اور نرسوں کی زندگیوں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ میں نے کرپال والی اطلاع سے گریز ہی کرنا چاہا۔ لیکن چلتے چلتے کیتھرن نے ایلشری سے کہا:

"شگفتی ہے نفی؟ بس جھنڈر کے حلق میں "منڈلس ہیپنیٹ" لگا رہی تھی۔ نہ جانے اس نے کیا کیا انور بابو سے کہہ دیا۔ بڑا خراب ہے۔ میں تو اسی وقت ڈر رہی تھی۔ یہ مریض بھی عجیب ہوتے ہیں۔ نرسوں کی عزت ان کے نزدیک کوڑی کی بھی نہیں۔ بات کا بتنگڑ بنانا خوب جانتے ہیں۔"

ایلشری نے ہنستے ہوئے کہا:

"اتنا جلتے ہیں تو پھر شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" دونوں ہنستی ہوئی چل دیں۔ بادِ شمال ان کے جانے کے بعد دیر تک ان کی ہنسی کی لہریں ہم تک پہنچاتی رہی۔

اس واقعہ کے تیسرے روز "پیرِ مغاں" صحت گاہ سے چل دئیے۔ وہ صحت یاب ہو چکے تھے۔ ایک سال کے بعد بڑے صاحب نے انہیں پریکٹس کی اجازت بھی دے دی تھی۔ رخصت کے وقت نرس سلومی نے مذاقیہ طور پر رونے کی نقل کی۔ "پیرِ مغاں" بھی ہنستے ہوئے اپنی "سوا دوشین" سے رخصت ہوئے مگر جب وہ ہم لوگوں سے رخصت ہونے لگے تو ان کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے کتنے درد گیں

اور کتنے تفریحی دن ہم لوگوں نے ساتھ گزارے تھے۔ بڑے وکیل صاحب بڑے زندہ دل شخص تھے اور غمگسار، ہفتوں وارڈ سونا سونا سا رہا۔

ہم لوگوں نے چھوٹے وکیل صاحب کو "پیرِ مغاں" منتخب کیا اور "صحت گاہ" اپنے زخم و مرہم کے ساتھ اسی طرح چلتا رہا۔ ایک مہینے کے بعد پربھو بابو کو بھی جانے کا پروانہ مل گیا۔ وہ احتیاطاً ابھی سینا ٹوریم سے جانا نہیں چاہتے تھے مگر مریضوں کی کثرت ہو رہی تھی اور جگہ محدود۔ ان کو جانا ہی پڑا۔ ایسے اس گرفتار کا آزاد ہونا جس کے بازو ٹوٹے ہوئے ہوں! پربھو بابو ساڑھے تین سال کے بعد گھر جاتے ہوئے جھجک محسوس کر رہے تھے۔ جانے پھر وہاں پھیپھڑے کیسے رہیں۔ وہ رخصت کے روز بہت دیر تک بائیبل پڑھتے رہے اور روتے رہے۔ سیر کی انہیں اجازت تو تھی لیکن اسٹیشن جاتے ہوئے ان کے پاؤں ڈگمگانے لگتے۔ "صحت گاہ" میں صرف ایک ہی رکشا تھا۔ وہ صرف ذی فراش مریضوں کو وارڈ سے ایکس رے روم لے جایا کرتا تھا۔ پربھو بابو کی پژمردگی دیکھ کر نرس کو رکشا منگوانا پڑا۔ ان کو صحت گاہ سے اچھے ہو کر جانے کی مسرت تھی مگر اس مسرت کے آنسو کے ساتھ ان جانے مستقبل کا خوف بھی انہیں رلا رہا تھا۔ ایک دفعہ مجروح ہو کر گرفتار ہونے کے بعد وہ فضا میں پرواز کرنے سے ڈرتے تھے۔ ہم لوگ اسٹیشن تک انہیں پہنچانے گئے اور سہارا دے کر گاڑی پر چڑھایا۔ ہم سب لوگوں پر رقت طاری تھی۔ واپس آ کر ہم لوگوں نے دیکھا کہ نرس وارڈ میں رہ رہ کر رو دیتی ہے۔ وہ پربھو بابو کو باپ کی طرح چاہتی تھی۔

ہم لوگوں کے وارڈ کے سبھی پرانے مریض اچھے ہو گئے تھے مگر سینا ٹوریم کا اچھا ہونا بہت ہی لچکدار حالت ہے۔ کبھی غم دل کو کھاتا ہے اور کبھی دل غم کو۔ پہلے سل کے کیڑے ہمارے پھیپھڑوں کو کھا رہے تھے اور اب ہمارے پھیپھڑے ان کیڑوں کو کھا رہے تھے۔ محاذ کا رخ کب پلٹ جائے یہ کابوس ہم لوگوں کے خیالات پر سوار تھا۔ ہم لوگوں نے اس خلش سے نجات پانے کے لئے تواتر کے ساتھ تمثیل و ادا کاری کا سلسلہ جاری کیا۔ نرسوں نے اس کھیل میں بھی ہماری بہت مدد کی۔ کیتھرین اور ایلشری نے ان دنوں ہم لوگوں پر الطاف و کرم کی بارش کر دی اور ان دونوں کی سیرت کا ایک خاص پہلو اجاگر ہو کر ہمارے سامنے آیا۔ اس کی ابتدا تو اس چاندنی رات ہی کو ہو گئی تھی۔ میں نے کیتھرین سے زندگی کے سنجیدہ مسئلوں کے متعلق گفتگو کی طرح ڈالی۔ وہ اپنے ماضی سے بیزار مستقبل کی طرف سنبھل سنبھل کر قدم اٹھانا چاہتی تھی۔ "انور بابو! تیرہ سال کے سن سے میں مشن سکول میں پڑھنے لگی۔ وہاں کی لڑکیاں نرس بننے کو بہت اچھا سمجھتی نہیں۔ وہ آزادی کو پسند کرتی تھیں۔ میں نادان تھی۔ میں نے چمک دمک کی طرف رخ کیا۔ بہت برا ہوا انور بابو!" کیتھرین نے ایک بار کہا۔

"آپ نہ ہوتیں تو یہ مریض اچھے کیسے ہوتے؟" میں بولا۔

"تو کیا ہماری اپنی زندگی کوئی نہیں۔ دوسروں کے لئے اچھی بنو، پر دوسرے ہمیں اچھا نہ سمجھیں۔ انور بابو! ہم صرف نرسیں تو نہیں، عورت بھی تو ہیں، اور یہ مرد! بس جسم کے بھوکے ہیں۔ سب کچھ ان کے سامنے پیش کر دو، سب کچھ اور ادنیٰ سی عزت بھی نہ دیں۔" کیتھرین بیزاری سے کہہ اٹھی۔

"سب تو ایسے نہیں ہوتے۔"

"کون؟ سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ سب عورتیں ایک جیسی۔ مگر ہماری مٹھاس ہماری زندگیوں کو تلخ کر دیتی ہے۔ وہ مٹھاس کے لالچی مرد شہد کی مکھی کی طرح ڈنک مارتے ہیں اور اڑ جاتے ہیں۔ انور بابو! جب تک صحت ہے کام کرتی ہوں اور اس کے بعد کیا ہوگا؟ شادی کر لوں گی کر لوں؟" کیتھرین ہنسنے لگی۔

"ضرور کر لیجئے!"

"کمار دونا!"

اسے کمار دیجئے، کہنا تھا۔ اس نے مجھے ہمیشہ آپ کہا اور میں نے بھی اسے آپ ہی سے مخاطب کیا۔ اس "کمار دونا" کی بے تکلفی میں بہ تاؤ

کیا ہوتا؟ کی حسرت پوشیدہ تھی۔ "ہم سِل کے مریض آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟" میں نے پھُسپھُسا جواب دیا۔

"تم نرسوں کو نہیں سمجھے انور بابو۔" اب کے بھی 'تم' تھا۔

کیتھرین بڑی عمیق نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ زندگی اور تقدیر کی گتھیاں پر پیچ و خاردار راستوں کی طرح سامنے آگئیں۔

کیتھرین اس نوع کی دردآشنا بات چیت کی پیاسی تھی۔ لیکن ایلشری ان سنجیدہ باتوں کی تاب بھی نہیں لا سکتی تھی۔ جب اس طرح کی باتیں چھڑ جاتیں تو ایلشری اُکتا جاتی۔ عین اسی وقت وہ ہمارا منہ چڑا دیتی یا پہلو میں چٹکی بھر لیتی۔ وہ صرف گرم جوشی کی قائل تھی۔ حال اس کے لئے سب کچھ تھا۔ اپنی ناکامیوں اور محرومیوں کے ساتھ نقی نے ایک بار ایلشری سے کہا:

"تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟"

ایلشری نے جواب دیا:

"کتنے مردوں سے شادی کروں؟ سب ہی تو شکنجے ہیں جکڑ کر اپنی من مانی مرادیں جی بھر کر پوری کرنی چاہتے ہیں۔"

نرس سلومی کو تجسس اور اِدھر کی بات اُدھر کرنے کی بہت عادت تھی۔ اس نے ایک روز کیتھرین کے سارے پرست کندہ سالات مجھے سنائے اور رسال کے لگاؤ سے بھی آگاہ کیا۔ کیتھرین نے آج تک کسی کو کچھ تحفہ نہ دیا تھا۔ وہ صرف لینے کی عادی تھی۔ مہندر، گھوش، وہ ہڈیوں کی ٹی بی والا ڈی فراش مریض ہریش چندر سبھوں کو باری باری اس نے اپنا پروانہ بنایا تھا۔ کلرک، کمپاؤنڈر، ایکس رے بابو یہ سبھی اس کے گھائل رہ چکے تھے۔ پر وہ رازداری کی قائل تھی اور داد و ستد کے بعد ایسا کٹ کر جدا ہوتی تھی کہ کسی کو بھنک تک نہ لگے۔ مہندر سے اب تک کچھ سلسلہ تھا۔ وہ ایک صاحبِ ثروت تاجر کا لڑکا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ کیتھرین نے اپنا اصول بدل کیسے ڈالا۔ اس نے مجھے بہت سے تحفے دیئے تھے کبھی کسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا اور ایلشری کا تو یہ عالم تھا کہ نقی پر اپنا سارا مشاہرہ صرف کر سکتی تھی۔ اس نے مختلف اوقات میں اونی سوئٹر، جاپے کا ہنست، گرم پائجامہ، مفلر وغیرہ تحفے نقی کو دیئے تھے۔ ایک بار وہ نقی کا سوٹ بنوانے پر مُصر تھی مگر نقی نے انکار کر دیا۔ ایلشری کئی دنوں تک روٹھی رہی۔ اس نے شکایتاً کہا: "آخر نرس میگی سین گپتا کو اپنا نصف مشاہرہ کیسے دے دیتی ہے؟"

ہم لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ اڑتیس سالہ میگی اور سین گپتا۔ سین گپتا بیس سال کا ایک گورا چٹا بنگالی لڑکا تھا۔ بہت ہی غریب۔ وہ مریض دوستوں کی مدد سے اور نہ جانے کیسے سینا ٹوریم کا خرچ چلا رہا تھا۔ یہ نیا انکشاف تھا کہ میگی اس کی مدد کرتی ہے۔

میگی کی الفت میں ماں اور بیوی کی محبت کا امتزاج تھا۔ وہ سین گپتا کی مربی بننے میں اپنے مادرانہ جذبات کی تسکین چاہتی تھی۔ نیز حیات کی منزلیں طے کرتے ہوئے وہ کسی مرد کو اتنا قریب کر لینا چاہتی تھی کہ اسے اپنا سہارا، اپنا جذباتی ٹیک سمجھ سکے۔ ایلشری نے بتایا کہ جب نرسیں اسے سین گپتا کے بارے میں چھیڑتی ہیں تو وہ خوش ہوتی ہے۔ شاید اس کی نسائیت تذکرۂ التفات ہی سے وجد کرنے لگتی ہے۔ مگر اس کی جنسیت میں عجلت کا کوئی پہلو نہ تھا۔ اس نے سین گپتا کی حماقتوں کو ہمیشہ یوں روکا جیسے ماں بیمار بچے کو کھانے سے روکتی ہے۔ مگر ایلشری اور میگی میں آکاش اور پاتال کا فرق تھا۔ ایلشری مردوں سے اس طرح برتاؤ کرتی تھی جیسے وہ زندہ ساریاں اور بولتے ہوئے بلاؤز ہیں۔ آج اس کو سینے سے لگا لیا کل اُتار کر اپنے گھر دبیٹھ لیا۔ اسے سب ساریاں عزیز تھیں۔ نقی اس کی سب سے پیاری ساری کی طرح تھا۔ میگی گھریلو چکی کی طرح اٹل اور ایک محور کے گرد گھومنے والی تھی۔

مہینہ دو مہینہ پر سینا ٹوریم کا ڈاکٹر نرسوں کا ایکس رے اکسمین بھی کر لیا کرتا تھا۔ نرس ڈولی نے مجھے رازدارانہ طور پر بتایا کہ میگی اور نرس سو شیلا کے پھیپھڑوں میں داغ پائے گئے۔ یونہی نرس سوشیلا، سلومی کی جگہ پر بلائی گئی تھی۔ کیونکہ سلومی نوکری سے استعفا دے کر ایک موٹر ڈرائیور سے شادی کرنے والی جا رہی تھی۔ نئی نرس دوسرے صحت گاہوں میں بھی کام کر چکی تھی اور بیمار پڑ کر عرصے سے گھر پر تھی۔ لیکن مسز گھر پر اتنے گنے لوگ ہی وہ

سکتے ہیں۔ اونچے خاندانوں کے لوگ، بڑے لوگ۔ خلقت تو ہابیل کی بددعا کی شکار رہتی ہے، یہ تیرے لئے اس زمین پر لعنتیں ہیں۔ اپنی زندگی کے سارے دن تجھے غم و اندوہ کے ساتھ غذا ملے گی۔ اپنے چہرے کے پسینے میں شرابور ہو کر تو روٹیاں کھائے گا۔"

سلوتی چھوٹ گئی۔ اب پھروہ ڈرکی ٹوٹتیں۔ سوشیلا کو بھائی حاذق سے دلچسپی ہو چلی تھی۔ دونوں ہم رنگ تھے مگر بھائی حاذق اس سے پناہ مانگتے تھے تاہم ہم لوگوں کی شہ پر سوشیلا کو ایسے لیسے مغالطے ہوئے کہ کیا کہنے۔ سوشیلا کے اظہارِ خلوص کا انداز نرالا تھا۔ وہ اپنے محبوب کو پیٹنے کی عادی تھی بھائی حاذق ٹمپریچر چارٹ پر پٹا کرتے تھے، چپت کھاتے تھے۔ کبھی سوشیلا کی چٹکیوں کی مسلن سے بلبلا اٹھتے اور ہم لوگوں کے نام پر عبرت کرتے تھے وہ تو خیریت تھی کہ مریض تھے ورنہ وہ شہیدِ ناز ہو ہی چکے تھے۔ یہ حسن زنگار ترکِ ستمگار سے بہت آگے بڑھا ہوا تھا۔ بھائی حاذق ردِ بلا کی دعائیں پڑھا کرتے تھے مگر یہ بھوت ان کے سر پر سوار ہی رہا۔ آخر کار وہ خود ہی سیناٹوریم سے چل دیئے۔ لوئر سی وارڈ سے صرف وہی شخص تھے جو سکتے تھے ہوتے رخصت ہوئے۔ شاید ان کی نگاہیں ہمیشہ اپنی ڈاک خانے کی کلرکی پر جمی رہتی تھیں اور جو تھوڑا بہت وارڈ سے انہیں لگاؤ تھا وہ سوشیلا کی بے پناہ دلنوازیوں نے ہرن کر دیا تھا۔

بھائی حاذق کے بعد غلام ربانی بھی چلا گیا اور سعودی بھی۔ مگر مصری یوں گئے جیسے کوئی سفر پر جاتا ہو۔ وہ لوگوں سے رخصت بھی ہوئے تو سلام سے مل مل کر رہے بھی تو گمان کے انداز میں ایک ایسی بات تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ فرقت کے دن زیادہ نہیں۔

سیناٹوریم کا ڈاکٹر نسبتاً اچھے مریضوں کو لوئر سی وارڈ میں جگہ دیتا تھا۔ کچھ تو یہ وجہ تھی اور کچھ یہاں کی خوش باشانہ روایات کا اثر کہ ذی فراش بعض ایک دو ماہ میں چلتے پھرتے ہنستے کھیلتے آدمی بن جاتے تھے۔ زندگی سے دلچسپی ضامنِ حیات ہے۔ ارادۂ زیست بقا کا سب سے زبردست سامان ہے۔ بددل، اکتائے ہوئے، فکر مند مریض اپنی قبر خود کھودتے ہیں۔ اپر سی وارڈ کے پنڈت گنیش اور فصیح کی حالت کچھ ایسی خراب نہ تھی۔ لیکن ان میں حیات کی امنگ باقی نہ تھی۔ ان کا ارادہ تھا فکر مندیوں کی آغوش میں سجا ہوا تھا اور اس حسین کرہ کے نیرنگِ حیات نہ ان کی لیکیوں کو اکساتے تھے اور نہ بدیوں کو۔ ان کے لئے نہ ثواب میں لذت تھی اور نہ گناہ میں کیف۔ جب خدا اور شیطان دونوں مر جائیں تو پھر موت اور عدم بھی ایک ذہنی لاشے ہو جاتا ہے۔ زندگی کا پرتو تک کہاں!

وارڈ میں ہنستے مریض بھی آئے سوائے ایک کے سب صحت کی طرف قدم اٹھا رہے تھے۔ مگر ابھی وہ ہم لوگوں سے بہت گھلنے ملنے نہ تھے ہم لوگ صرف پانچ پرانے مریض رہ گئے تھے۔ نقی میں، چھوٹے وکیل صاحب، گوپال اور مارواڑی۔ ہم لوگوں میں اب اضطرابی کیفیت کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ صحت کی قربت نے زندگی کی توقعات اور مطالبوں کو بڑھا کر اپنی محرومیوں اور نامرادیوں کے احساس کو تلخ تر بنا دیا تھا۔ آپس میں تو نہیں مگر دوسرے وارڈوں سے ہم لوگوں کی رقابت بہت بڑھ گئی تھی اور نرسوں سے ہم لوگ بے جا طور پر الجھ پڑتے تھے۔ آج مار تھا سے لڑائی ہوتی، کل لیبی کو ڈانٹ بتائی گئی۔ آخر میں ان نرسوں کی باری آئی جو ہم لوگوں سے زیادہ قریب ہو گئی تھیں یا جنہیں قریب ہونے کا مغالطہ تھا۔ ان نرسوں کی آپس میں بڑی رقابتیں تھیں۔ ورنہ نوبت یہاں تک پہنچ جاتی کہ پوری "صحت گاہ" میں ہم لوگوں کا ایک ہمدرد بھی نہ رہ جاتا۔ ہاں ایلشی کو کسی سے رقابت نہ تھی۔ لیکن وہ کبھی اتنی سنجیدہ ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ اپنی یا دوسری نرسوں کی تضحیک کے بارے میں سوچنا گوارا بھی کرے۔ بس وقت کچھ "چپ چپ کردا" پھر چل دیتی اور سب کچھ بھول جاتی۔

سیناٹوریم میں بھی شہنشاہ معظم کی جوبلی منائی گئی۔ مٹی، پانی، آگ، ہوا اربعہ عناصر پر بادشاہ کی حکومت ہے۔ وارڈوں کے درمیان تزئین و آرائش کا مقابلہ ہوا۔ لوئر سی وارڈ اوّل آیا۔ ہم لوگوں کی خوشی مت پوچھئے۔ جب خوش ہونے کو بڑی بڑی باتیں نہ ہوں تو پھر کچھ تو خوش ہونے کو چاہئے کبھی انسان غم منا کر بھی غم غلط کرتا ہے اور یہ تو خوشی ہی تھی۔ نرسوں نے بھی خوشیاں منائیں اور نرس ڈولی تو اس روز کھلی جاتی تھی۔ نہ جانے کیوں چند ہفتوں سے ڈولی سب سے منہ موڑ اور چڑچڑی ہو گئی تھی۔ جوبلی کے قبل وہ ایک مہینہ کی رخصت پر گھر گئی۔ وہاں سے آئی تو اس کا عجیب حال تھا۔

ہنسی ہنسی میں وہ ناگفتنی باتوں کا تذکرہ کر ڈالتی تھی۔ اب کے اس نے اپنے گھر کی کرسچن کالونی کے قریب مویشیوں کا اختلاط دیکھا تھا۔ وہ اس بات بکب کا تذکرہ کرتی اور ہنس پڑتی تھی۔

عین جوبلی کے روز دس بجے دن کو کرن کے پھیپھڑوں سے شدت کے ساتھ خون آنے لگا۔ وہ ہمارے وارڈ کے پہلے کے وارڈ کا مریض تھا۔ بہت بلند پیشانی، لمبے لمبے بال اور وحشت ناک چھوٹی آنکھیں اور بیزار و باغی جذبات سے تلملایا ہوا چہرہ، لانبا قد، دوہرا بدن مگر بھاری سے ڈھیلا۔ وقفے وقفے سے اسے دن بھر خون آتا رہا۔ شام کو سارے سینا ٹوریم میں چراغاں کیا گیا۔ پارٹی ہوئی، ریڈیو بجا، کھیل کود ہوا۔ نرسوں نے گانے گائے، غرض خوب تفریح رہی اور یہ ہوا کہ کرن کی، اچانک علالت کے سبب ڈولی کی نائٹ ڈیوٹی ہو گئی۔ ہم لوگ شہنشاہ معظم سے وفاداری کا ثبوت دے کر اور اپنا جی بہلا کر وارڈ واپس آئے تو پہلوئے وارڈ سے اطلاع ملی کہ کرن اب تک خون تھوک رہا ہے۔ ہم سب لوگ افسردہ ہو گئے۔ مگر ڈولی ادھر سے ہنستی ہوئی آئی اور چھیڑ چھاڑ کرنے لگی۔ آج وہ مذاق پر تلی ہوئی تھی۔ ہم لوگوں نے بھی کرن کو بھول جانے کے خیال سے اس کی حسرتوں کی خوب داد دی اور ویسے بھی ہم لوگ ان جانفشار خوں فشانیوں کے عادی بھی ہو گئے تھے۔

ابھی اندھیرا ہی تھا کہ مسہری کے پردے کے اندر اپنا بالائی جسم داخل کر کے کسی نے مجھے جگایا۔ میں چونک اٹھا۔ ڈولی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں کچھ نیند کی غنودگی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ڈولی کی سانس تیز اور گرم تھی۔ وہ بیقرار سی معلوم ہوئی۔ اس نے میرے لب شرارت سے اپنی چٹکیوں میں مسل دیئے۔ میری نیند غائب ہو گئی۔ مجھے عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگی۔ میں نے یکا یک محسوس کیا کہ کرن کے سر کی بلا میرے سر سوار ہو رہی ہے۔ مگر ڈولی اس رات کو جذبات کی ایک سیاہ آندھی تھی۔ روح تاریکی تھی۔ اس آندھی میں کون جانے میرا کیا حشر ہوتا مگر ہوا یہ کہ بغل کے بیڈ پر شاید وکیل صاحب جاگ پڑے اور انہوں نے کچھ سمجھ کر مسلسل کروٹیں لینی شروع کیں۔ لوہے کا اسپرنگ دار بیڈ رو بلا کے لئے صدمہ کا بول ثابت ہوا۔

صبح کے آٹھ بجتے بجتے سینا ٹوریم بھر میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ بھور کوٹے وارڈ کے چوبے جی نے ڈولی کا سارا زہر دور کر دیا۔ برہمن تھے نا۔ بس پی کر بھی آنند ہی ہوئے۔ کتنی حریص دلچسپی سے ہم سب لوگوں نے اس کرامت کا تذکرہ سنا۔ بات یہ ہے کہ ناگن کی دُم پکڑ کر اسے فضا میں چرخ دینے کی گدگدی تو سب کو ہوتی ہے مگر ڈسے جانے کا خوف، اور نہ جانے کتنے قسم کے خیالی بچھو تصور میں رینگ رینگ کر سہا دیتے ہیں۔

ہم سب لوگوں نے اپنی نیتوں پر پردہ ڈالنے کے لئے چوبے جی اور ڈولی دونوں پر لعنتیں بھیجیں۔ اس واقعہ کے بعد سے ہمارے وارڈ کے اکثر مریض ڈولی سے لڑنے لگے۔ ان کے دلوں کا بھوت انہیں انتقام کے لئے اکساتا تھا۔ آخر ایک دن میری ٹڑ آئی۔ یہ منٹ لڑائی ہو گئی۔ اس نے ایک نئے مریض خان صاحب کو بس اتنا کہا تھا "کہاں چلا جاتا ہے خان؟ میں حلق میں پینٹ لگانے کے لئے کب سے کھڑی ہوں۔" خان بگڑ گیا تھا۔ میں نے خان کی پاسداری کی۔ بات بڑھ گئی۔ اور بڑھی تو اتنی کہ میں نے ڈولی کو کیا نہیں کہہ ڈالا۔ میں غصے سے کانپ رہا تھا اور وہ لڑتے لڑتے سسکیاں لے کر رونے لگی۔ ایک دوسرے کے خلاف رپورٹیں ہوئیں اور یہ ہوا کہ سلسلۂ کلام قطعی بند۔ الیشری اور کیتھرن نے بات کو سلجھانا چاہا لیکن گرہ نہ کھلی۔

مجھے گیارہ ماہ سینا ٹوریم میں ہو گئے تھے اور رنجی کو ایک سال سے کچھ زیادہ۔ ہم دونوں اکتا گئے تھے مگر گریباں و دبیش تھے اور اس موسم میں سینا ٹوریم سے جانا مناسب نہ تھا۔ کرن کے خون تھوکنے سے ہم لوگ اور گھبرا گئے تھے۔ وہ چلتا پھرتا مریض تھا کہ اچانک اس پر مرض نے حملے کا ارادہ کیا۔ کرن عجیب طرح ہماری زندگی میں داخل ہو گیا تھا۔ جوبلی کے بعد ایک ہفتے تک اسے خون آتا رہا۔ ایک ماہ ہوا تھا کہ وہ سینا ٹوریم میں آیا تھا۔ دو ہفتے صاحب فراش رہنے کے بعد اسے سیر کی اجازت مل گئی تھی۔ وہ کچھ پاگلوں کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ اکثر چپ رہتا تھا اور گاہے معمولی سی بات پر بے تحاشا ہنسنے لگتا۔ وہ اپنے لباس کی طرف سے بے پروا تھا۔ وہ کبھی کبھی ایسی باتوں سے چڑ جاتا جو پرستش دوستانہ کے تحت آتیں۔ اس کا کوئی ماحول ایسے

برماسے اسے روپے بھیجتا تھا۔ لیکن اس نے اپنے ماموں کو خط لکھنے سے منع کر دیا تھا۔ اس کا اور کوئی دنیا میں تھا بھی یا نہیں، یہ ایک راز تھا۔ وہ اپنے ماموں کو گالیاں دیتا تھا۔ کہتا ——— نے اس نے۔ مجھے مرنے کیوں نہ دیا۔ ناحق میرا علاج کرا کے مجھ میں زندگی کا لالچ پیدا کر دیا اور اب مسلسل خوف، مہینے کی مصیبت، اگر مرنے کا ڈر۔ بل کے مریضوں کا علاج! اسینا ٹوریم سے جا کر ہم لوگ کیا کریں گے؟ آرام اور غذا! ہونہہ! آرام! استراحت کے گھنٹے! اصول! پروگرام! انڈے! دودھ! مکھن! چوزے! اچھی! ہوادار مکان! اور کچھ فکر نہیں! گدھے کے بچے ڈاکٹر! جیسے بیماری سے پہلے ہمارے پیٹ بھرے ہی تو رہتے تھے۔ سب نوجوانوں کو ہماری کے کیڑے کا انجکشن دے کر مار ڈالنا، سماج اور حکومت کا فرض ہے نہ کر بیماری کا علاج کرنا۔"
اس کی آنکھیں شعلہ بار ہونے لگتیں اور وہ پاگلوں کی طرح بکنے لگتا۔ جب میں خون تھوک رہا تھا تو اسے روکا کیوں گیا؟ ہیں وہ گھنٹے میں مرچکا ہوتا اور اب کیسے مروں؟ خدا اور شیطان نے مل کر انسان کا جگر چھلنی کر دیا۔ یہ اکھٹ انسان خدا اور انسان کے درمیان بٹ گیا ہے اور زندگی نہ خدا کے پاس ہے نہ شیطان کے پاس۔ یہ ہے ٹاٹا کے پاس، فورڈ کے پاس، برلا کے پاس، جو خدا اور شیطان دونوں سے زیادہ طاقتور اور زیادہ خطرناک ہیں۔ مگر انسان اس قابل ہے کہ اس کے ہر فرد کو ہلاک کر دیا جائے۔

کرن کلکتہ یونیورسٹی کا ایم۔ اے تھا۔ وہ نہ زندگی کے ماضی پر ایمان رکھتا تھا نہ مستقبل پر۔ اس میں عدمیت کی روح حلول کر گئی تھی۔ وہ سب سے نفرت کرتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی غیر معمولی طور پر وہ بڑی محبت سے گفتگو کرتا۔ بچوں کی طرح اور باتیں کرتے کرتے اس پر رقت سی طاری ہو جاتی وہ حیات کی آغوش کے کسی کھوئے ہوئے سرچشمے کو ڈھونڈھتا تھا۔

اب کے جو کرن کو خون آنا شروع ہوا تو ہم لوگ اسکی بیمار پرسی کو گئے۔ ایسی حالت میں بولنے کی سخت ممانعت ہوتی ہے۔ مگر ہم لوگوں کو دیکھ کر وہ زور زور سے بولنے لگا اور پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ اصولاً زہر تھا۔ کہنے لگا:

"اب کے آسانی سے مر سکوں گا۔"

وہ دیر تک بکتا رہا۔ صبح کو نرس ولاری اور کیتھرن کی اس روز ڈیوٹی تھی۔ ولاری دوڑی ہوئی آئی کہ اسے ڈانٹے۔ ہم لوگوں نے بھی بہتیرا سمجھایا مگر وہ چیختا رہا۔ اسے ، دو دفعہ خون کی ابکائی بھی آئی۔ کرن نرسوں سے بہت چڑتا تھا مگر اس روز جب کیتھرن نے اسے آ کر اپنے خاص انداز سے کہا "کرن بابو!" تو وہ فوراً لیٹ گیا اور کیتھرن کو حسرت سے دیکھنے لگا۔ خدا جانے ان دو لفظوں میں نرس نے کتنی مٹھاس، شکایت، تادیب اور خلوص گھول دیا تھا کہ کرن رام ہو گیا۔

استراحت کے گھنٹوں کے علاوہ میں اور رفقی اس کی تیمارداری کرتے تھے۔ اسے برف کے ٹکڑے دینا، پھل کا عرق پلوانا اور چپ چاپ اس کے پاس بیٹھے رہنا۔ جب بار بار خون کے دورے کے وقت وہ باؤلا ہو جاتا اور اس پر بحرانی حالت سی طاری ہو جاتی۔ وہ اٹھ جاتا اور پلنگ چھوڑ کر دوڑنے کی کوشش کرنے لگتا۔ یہ عجیب بات تھی کہ وہ یا تو میری بات ایک حد تک سنتا یا کیتھرن کی مان لیتا۔ کیتھرن نے مجھ سے دوپہر کو آ کر کہا:
"تو یہ بابو میں ہر وقت تو نہیں رہوں گی۔ پاگل ہے بالکل۔ آپ کا کچھ خیال کرتا ہے۔ ریسٹ پیریڈ کے بعد کرن کو دیکھ لیا کیجئے گا۔" مجھے اسی وقت کرن سے بھو کے کروندے کی طرح کی رقابت محسوس ہوئی۔ میں نے کیتھرن کے لہجے اور تیور میں کچھ محسوس کیا۔ بہر حال میں وہی کرتا رہا جو کیتھرن نے کہا تھا۔ پتہ نہیں یہ کیتھرن کا پاس تھا یا کرن کا خیال۔ کیتھرن کرن کے لئے غیر معمولی توجہ کا عملی اظہار کر رہی تھی۔

تیسرے روز کرن پر بیماری کا شدید حملہ ہوا۔ بڑے ڈاکٹر نے اسے۔ پی۔ وی۔ ہارس سیرم، کیلسیم، ہیٹین، مورفیا، وہ کوگولر، ٹک انجکشن دیئے۔ مگر خون نہ تھما۔ رات کو حالت نازک ہو گئی۔ میں اور رفقی کرن کے پاس تھے۔ اس نے یک بیک، جیلی کھانے کی خواہش ظاہر کی۔ اسے سوائے قیمتی غذا دینے کے اور کسی چیز کی اجازت نہ تھی مگر ایسی رقت، اور بچا جیسے ہے۔ اس نے جیلی مانگی کہ ہم لوگ اسے منہ مانگی چیز دینے پر تیار ہو گئے۔ وارڈ میں جیلی نہ ملی۔ اسی درمیان میں پھر اس کے منہ سے خون آیا۔ میرے دل میں یہ خواہش سفید کاغذ پر سیاہ روشنائی کی طرح پھیل گئی کہ کرن کا خون نہ تھمے

اور وہ ختم ہو جائے۔ پھر یک بیک جیسے کسی نے اس روشنی کو جاذب سے اٹھا لیا ہو۔ اب بھی ایک کالا سا دھبہ موجود تھا۔ میں نے اس داغ
کو اپنی انسانیت کی نگاہوں سے چھپانے کے لئے فوراً اپنے پیسوں سے کرن کے لئے اسٹور سے جیلی منگوائی اور اپنے ہاتھوں سے اسے کھلائی
وہ بے پایاں ممنونیت کی نظر سے مجھے دیکھ کر بس اتنا کہہ کر لیٹ گئی: ذرا آنکھیں بند کر لیں "تم خدا سے بہت اچھے ہو"

ایک ہفتے کے بعد کرن اچھا ہو گیا۔ سبھوں کو حیرت ہوئی اور کیتھرن کو حیرت کے ساتھ ناقابل بیان اذیت کی مسرت بھی۔ وہ اپنے کو کرن کا فرشتہ حفاظت محسوس کرنے لگی تھی۔ مجھے کرن سے پوشیدہ نفرت ہونے لگی۔ میں کیتھرن پر فقرہ بھی کسنے لگا۔ وہ تمہیں کھاتی اور ورنہ اٹھاتی "وہ تو پاگل ہے بیچارہ کرن۔" اس بیچارہ سے مجھے چڑ تھی مگر حالات نے مجھ پر یہ ثابت کر دیا کہ وہ کرن کو یوں چاہتی ہے جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو پیار کرے۔ پھر بھی میرے دل میں عجیب سی کھٹک تھی۔ کرن اچھا ہو کر کیتھرن سے، مجھ سے، اور ڈاکٹر سے شدید نفرت کرنے لگا۔ پہلی کی یاد کر کے اب بھی وہ میرا مخلصانہ شکریہ ادا کرتا تھا۔ کہتا تھا "وہ میری جان بچانے کی کوشش نہ تھی، تمہاری خالص محبت تھی۔ جسمانی ہوس، غرض، آزاد و عیب مگر پیار اور اندھی محبت، پر میں تمہیں اس محبت کے طفیل بھی معاف نہیں کر سکتا۔ تم اور کیتھرن" اس نفرت کے ... وہ دیکھتی کرن کو چاہتی ہی رہی، وہ اس کے سامنے کڑھتی تھی۔ کہتی "ایسے پاگل مریض کہیں اچھے ہوئے ہیں؟"

نہ میں سمجھ سکا اور نہ کیتھرن کو اپنی اصلیت معلوم تھی کہ وہ کرن کی محبت یا نہ بے بسی کی وجہ سے اس کی طرف کھنچ گئی تھی یا اس کی بے پناہ پُرشور ذہنی قوت کے سبب۔ وہ اب بھی میرے پاس آ کر زندگی، مستقبل، محبت، ملازمت کی پریشانیاں اور اپنی خیالی شادی کے متعلق گفتگو کرتی تھی۔ اسے میری اور کرن دونوں کی جذباتی احتیاج تھی۔ پر وہ اس کا تجزیہ نہ کر پائی اور میں نفرت کے کیچڑ میں کیڑے کی طرح کلبلاتا رہا۔

گرمیوں میں سل کے مریضوں کی اور کثرت ہونے لگی۔ بہت سی درخواستیں سیٹ کی کمی کی بنا پر واپس کر دی گئیں۔ لیکن کچھ قرینے ایسے بھی ہیں جن کی درخواستیں رد نہیں کی جا سکتیں۔ یہاں ڈاکٹر کی سفارش دینے کا مسئلہ نہیں بلکہ خالص اثر و رسوخ اور زر کا مسئلہ تھا۔ ایسے طبقے کے چند لوگوں کو جگہ کی ضرورت تھی جس کے افراد دوسرے طبقات کے سر آنکھوں پر اٹھائے جاتے ہیں۔ اے وارڈ میں جگہ نہ تھی اور وہاں کسے ہٹایا جاتا۔ وہاں عاموں کی رگوں میں بھی تو خون تھا۔ طے یہ ہوا کہ فوری طور پر سی وارڈ میں جگہ خالی کی جائے اور پھر سرتوں سے پہلی بیش قیمت ہستیوں کو اے وارڈ میں منتقل کر دیا جائے۔ گوپال، رفیق اور رجنیز وکیل صاحب کو یک قلم ڈسچارج کر دیا گیا۔ میں نے کچھ ایسی گھبراہٹ محسوس کی۔ بس ارادہ ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ سے کہوں کہ میرا نام بھی کاٹ دے۔ مگر جون کے مہینے میں سیناٹوریم چھوڑنے کے خوف سے لرز گیا اور خود حفاظتی کی حس میرے دوسرے احساسات پر غالب آ گئی۔

گوپال اضطراب میں ڈاکٹر کے جانے کے بعد ٹہلنے لگا۔ وہ پہلے بہت خوش ہوا، پھر اس پر حیرانی اور تذبذب طاری ہوا۔ آخر کار وہ رونے لگا۔ وہ میرے پاس آیا اور مجھ سے لپٹ گیا "انور بھائی! تم کبھی چلو نہ۔ گھر جائیں ہم انور بھائی؟ اے بھائی کون ... گا؟ جانتے ہیں جاتے یہاں سے، ساڑھے تین برس اسی وارڈ میں رہے۔ ڈھائی سال تو اس بیڈ پر ہو گئے" گوپال نے اپنے نمبر، گوشہ کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں "پھر ہم سب لوگ نکلے بھاگ... آپ، پپو میاں، مسرور جی، بھائی حافظ، پروا بابا، انور بھائی! ہم پانچوں آدمی چند شہر سے کتنے کر دیے گا مکان سے گھر رہیں" اس نے اس پروگرام کی وقت کو محسوس کیا اور مجبوری کے احساس سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں، رفیق اور وکیل صاحب سب سہمے بیٹھے رہے۔ میری اور رفیق کی رفاقت سینٹوریم میں مثال کے طور پر مشہور تھی۔ میرا دل بھی بھر آیا۔ ہم سب لوگ ملے جلے، واضح اور مبہم جذبات کے فروغ اور فروغ اثرات ... کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے آنسو بہا رہے تھے جیسے کسی بھاری چٹان کے نیچے سے پانی کا سوتا ابل رہا ہو۔
نرسوں نے بھی اس خبر کو بے چینی سے سنا۔ البشری تو اس اچانک حادثے سے بدحواس ہو گئی۔ یہ تینوں مریض دوسرے روز جا رہے تھے ہم لوگ دن بھر باتیں کرتے رہے۔ ذکر، درد، امید و ناامیدی، خوشی اور موت، رفاقت، دل شکستگی، بیماری اور صحت کی باتیں۔ ہم لوگوں میں

وعدے وعید ہوئے کہ ایک دوسرے کو خط لکھیں گے۔ لوئری وارڈ کے خاندان کا بقیہ بھی بکھر رہا تھا۔ مریض صحت پا کر جا رہے تھے۔ مگر اس ناقابلِ بیان مسرت کے ساتھ شکستِ رفاقت کا عجیب غم بھی تھا۔ سینا ٹوریم کی رفاقت بھی میدانِ جنگ کی رفاقت سے کم نہیں۔ کیسے کیسے قاتل لمحات کا ہم لوگوں نے مل جل کر مقابلہ کیا تھا! کتنی ناامیدیوں کو ہم نے شکست دی تھی! کتنے ارمان، کتنی حسرتوں کو ہم سب نے ساتھ پالا تھا! مسرت اور فریب کی گھڑیاں! بے آسرا شامیں، تاریک صبحیں، دلداریاں، غمگساریاں، ہمدردیاں، سب یاد آ رہی تھیں۔ موت سے ہم لوگوں نے لڑائی جیتی تھی۔ وقتی ہی سہی، فتح کے احساس سے پائیدگی حاصل ہوتی ہے۔ کاش اس سیاہ بھیانک عفریت کے آئندہ حملوں کے وقت بھی ہم سب لوگ ایک ساتھ رہتے۔ آہ زمانہ ہر والے کو علیحدہ علیحدہ کر کے اکیلے پن میں پیس دیتا ہے۔

ڈیوٹی سے فارغ ہو کر ایشری نتی سے ملنے آئی۔ بھی نرسیں آئیں۔ ایشری سب کے چلے جانے کے بعد بھی دیر تک ٹھہری رہی۔ وارڈ کے صحن میں ہم لوگ ساتھ بیٹھے۔ وہ نتی کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لئے روتی جاتی اور باتیں کرتی جاتی تھی جیسے نتی کے ہاتھ کبوتر کا ایک جوڑا ہوں جسے کسی بچے کے ہاتھ سے چھین لئے جانے کی دھمکی دی جا رہی ہو، وہ ہاتھوں کو اس طرح دبائے ہوئے تھی کہ انہیں کبھی نہ چھوڑے گی۔ اس نے رخصت ہوتے وقت نہایت بیباک خلوص کے ساتھ کہا:

"اگر مجھے یہ خیال ہوتا کہ تم جون ہی میں چلے جاؤ گے تو میں دعا کرتی کہ ابھی بیمار ہی رہو۔ میں تمہیں بیمار دیکھ سکتی ہوں مگر تم سے بچھڑنے کی تاب نہیں لا سکتی۔"

وہ تینوں چلے گئے۔ مارواڑی اور میں رہ گئے۔ کو مریض اور بھی تھے۔ پھر بھی ہم لوگ سخت تنہائی محسوس کر رہے تھے۔ میرا جی تو بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ بیزار، اکتایا ہوا اور کچھ خائف۔ تنہائی میں بیماری کا بوجھ محسوس ہو رہا تھا اور اس کا خوف دامن گیر۔ کیتھرن نے میری بڑی دلدہی کی لیکن نہ جانے کیوں ان دنوں اسے دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ میں دنیا میں یکا و تنہا ہوں۔ مجھے یہ شدید احساس ہو رہا تھا کہ ہر فرد کی زندگی ایک علیحدہ کال کوٹھری ہے جس کے اندر کوئی دوسرا نہیں آ سکتا۔ دور سے وقتی طور پر اس کے اندر جھانک کر دیکھا جا سکتا ہے۔ دو قیدیوں کا مل جانا محال ہے۔ اتنی جھانکی دلچسپی ممکن ہے مگر اور زیادہ دردناک۔ ہم ایک دوسرے کی روح میں جھانک کر دیکھتے۔ اس سے نفرت یا محبت کرتے گزر جاتے ہیں۔ ہماری روحیں مل نہیں سکتیں۔ ایک ہو جانا فریب ہے سراسر فریب۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کیتھرن تے دو دن کے لئے میری باطنی زندگی میں جھانکا اور اب دوسری روح کی کھڑکیوں کے پٹ کھول رہی ہے۔ یہ ہے کوئی جنگلے سے لگا ہوا کوٹھری کے اندر کب تک جھانکتا رہے۔ وصالِ داخلی ناممکن ہے اور خارجی اتصال فریبِ احساس ہے۔ المناک طنز ہے اور مضحکہ خیز بھی۔

ایک روز میں نے کیتھرن کو صاف کہہ دیا "دھوکا دینے سے کیا فائدہ؟ آپ کسی کو چاہتی ہیں چاہیے۔"

وہ بگڑ گئی "چاہتی تو ہوں مگر .... اور آپ کتنے تنگ نظر، سنگدل، بدظن اور ناقابلِ اعتبار ہیں۔"

مجھے آگ ہی تو لگ گئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ میرا مقابلہ کرن سے کیا جا رہا ہے اور مجھے مردود قرار دے دیا گیا۔ اگر یہ جملے کبھی اور مجھ سے کہے جاتے تو میں صرف ہنس دیتا۔ مگر اس میں مقابلہ کا اشارہ پایا جاتا تھا۔ یہ میری خودی کا دم گھونٹ رہا تھا۔ میں تلملا اٹھا۔ کیتھرن نرس روم میں چلی گئی۔ میں نے اپنا بکس کھولا، کہ اس کی دی ہوئی بچی کچھی چیزیں نکالیں اور انہیں واپس کرنے ڈیوٹی روم میں گیا۔ میں نے انہیں کیتھرن کے ہاتھ میں تھما دینا چاہا، پر اس نے لیا نہیں اور تنک کر بھنبھناتی ہوئی دوسری جانب چلی گئی۔ میں نے سب چیزیں اس کے سامنے پٹک دیں اور لوٹ آیا۔ کیتھرن بپھر گئی اور میں نے واپس آتے ہوئے یہ جملے سنے:

"مجھے یہ باتیں بالکل پسند نہیں۔ کس پر ناز کرتے ہیں۔ مغرور آدمی! میں کسی کی بیاہتا نہیں ہوں۔ بڑے آئے ہیں کہیں کے ....."

نازک دھاگا ٹوٹ چکا تھا۔ میں اپنی تنہائیوں میں اور زیادہ تنہا ہو گیا تھا۔ کوئی سہارا نہیں، کوئی تسکین نہیں۔

کرشن کے بعد اب میری باری تھی۔ جون کے ایک دو دن باقی تھے کہ سوتے سوتے چار بجے صبح کو میرے منہ سے خون آ گیا۔ میں بستر سے اچھل پڑا۔ خوف کے مارے پسینے پسینے ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوا کہ یہ دنیا، یہ کرہ سارے سامانِ حیات کو لے کر میرے سامنے گولی کی طرح شش سے کائنات کی انجان وسعتوں میں دور نکل گیا اور میں خلا، تاریک و سرد خلا میں معلق ڈوب جانے کے لئے اکیلا رہ گیا۔ موت کی کالی کالی موجیں مجھے ڈھانپے جا رہی ہیں اور میں فنا کے غار میں غرق ہو رہا ہوں۔ آس اور یاس کے درمیان زندگی کے عنکبوتی تانے بانے کو ایک سال، مکمل ایک سال تک بنتا تھا۔ طوفان کے بعد پھر سے تنکے اکٹھا کر کے آنسو اور مسکراہٹوں کے بندھن سے باندھا تھا اور اب ایک نئی آندھی آشیانۂ حیات کو نوچ نوچ کر برباد کر رہی تھی۔ میں نے کتنی باتوں کو بھلایا تھا۔ کتنی یادوں کو تھپک تھپک کر سلا دیا تھا، کتنے ارمانوں کو بہلا کر خاموش کر دیا تھا اور پھر زندگی کی خشک شاخ پر نازک نازک ننھی ننھی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں، کلیاں بھی پھول بننے کا سندیسہ دے رہی تھیں اور آرزوؤں کی نئی بسنت بہارِ تازہ کا پیغام لا رہی تھی۔ مستقبل پھر فریبِ تمنا دے رہا تھا اور یہ اچانک موت کے ترکش کا ایک تیر آ لگا۔ ہر طرف خزاں تھی، ویرانیاں تھیں اور بے بس سکوت! زندگی کی نیرنگی ناامیدیوں میں بھی امید کے مجت تماشے دیتی ہے۔ یہ کیفیت گزر جانے کے بعد مجھے یہ خیال آیا۔ شاید کیمٹرن لیں۔ واپس آ جائے شاید رعایتی خون ٹوٹی ہوئی رگوں کو جوڑ دے۔ مجھے مسرت ہوئی۔ میں نے زہر سے امرت بنا لیا۔ انسان میں بھی کتنی الوہیت ہے۔ وہ ہر آن اپنے کو بچانا چاہتا ہے اور اس کے لئے اپنا اور دوسروں کا خون بھی بہا سکتا ہے، خدا تو صرف دوسروں کا خون بہاتا ہے۔ اپنا خون بہا کر لذتِ آزار حاصل کرنے کا اسے تجربہ کہاں۔ یہ انوکھا احساس اس کے بس سے باہر ہے۔

مجھے بھی پابستر کر دیا گیا۔ وہی باتیں ہوئیں جو کرشن کے ساتھ ہو چکی تھیں۔ ڈاکٹر نے مجھے تسکین دی کہ پھیپھڑے کی حالت بہت اچھی ہے۔ سل کے مریضوں کے ساتھ ایسے واقعات ہوتے ہی ہیں۔ جراثیم خفتہ حالت میں رہتے ہیں اور کبھی کبھی سوتے سوتے بھی پھیپھڑے کی رگوں کو چاٹتے رہتے ہیں کسی رگ کی دیوار پھٹ جاتی ہے اور خون آنے لگتا ہے۔ تمہارے پرانے زخم میں فائبروسس ہو چکی ہے۔ نئے ریشے نکل آئے ہیں اور مرض قبضے کے اندر آ گیا ہے۔ یہ گزر جانے والا دورہ ہے۔ گھبراؤ مت!" نرسوں نے بھی عیادت کی، جی بہلایا اور تشفی دی۔ مگر میں عجیب حالت میں تھا۔

گزشتہ سال جو میرے منہ سے ایک ماہ تک خون آ رہا تھا تو میں نے اپنے جذباتی سہارے کے لئے روحانی، مابعد الطبیعیاتی عالم کی طرف رخ کیا تھا۔ اب کے میرا دل بنجر تھا، بالکل بنجر۔ مگر بنجر زمین کو سب سے زیادہ پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے یہ ٹھنڈک عورت کے جسم میں نظر آئی۔ حیرت انگیز طور پر مجھے حواسی عشرت کی طلب ہوئی مگر محرومی نے دل میں جہنم سا بھڑکا دیا۔ عورت سے قربت ہو تو خدا یاد آتا ہے لیکن شاید مادہ کے بچھڑ جانے کے احساس نے مجھے مادہ، جسم اور دنیا کی شدید حریصانہ محبت پیدا کر دی تھی۔ جو چیزیں چھٹ جانے والی ہوں ان سے کتنا بیتاب عشق ہوتا ہے۔ پائدار اشیا تو اکثر اکتاہٹ پیدا کرتی ہیں۔ فنا کے سبب بقا سے محبت ہوتی ہے اور غیر فانی ہستی کبھی اتنی مستحکم، وزنی اور عظیم جلیل معلوم ہونے لگتی ہے کہ اس کے وزن اور باقی و حاضر ناظر ہونے کے تصور سے روح پسی جاتی ہے۔ خدا اتنی بڑی حقیقت ہے کہ دل اس کو بھول کر اپنے کو ہلکا کرنا چاہتا ہے۔ دنیا کا آنی جانی ہونا ہی کشش کا باعث ہے۔ اس مادی دنیا کی سب سے حسین ترکیبِ مادہ عورت ہے۔ مادہ کا نقطۂ کمال، جسم کے حسنِ تعمیر کا عروجِ جمیل۔ اس لئے مادی سہارے میں سب سے بڑا سہارا عورت ہے۔ میں بستر پر لیٹا لیٹا فنا کا خیال کر کے جب لرزنے لگتا تھا تو دل میں ایک ہوک اٹھتی تھی اور حیات کا ذرہ ذرہ جنسِ لطیف کو ڈھونڈھتا تھا۔ مجھے اٹھنے کی اجازت نہ تھی مگر جذبۂ دل ایسی حرکتوں پر اکساتا تھا جو سامانِ بقا ہیں۔ مجھے اپنی رومانی مثال پسندی سے نفرت ہونے لگی۔ میں سوچتا کہ نرا گاؤدی ہوں۔ بدن کی رومانیت مجسم اور حقیقت مثالی کو چھوڑ کر جذب و کشش کی لطافتوں کے جال میں الجھے رہنا بے بسی، بے عملی اور نامرادی کی دلیل ہے۔ مجھے فتح اور اس کی قوتِ انتقام و عمل یاد آتی اور میں انتہائی محرومی و ناکردگی کے غم میں غلطاں ہو جاتا۔ یہ فطرت کا کتنا المناک طنز تھا کہ اس بجھی ہوئی خاکستری حالت میں مجھے گل کے چراغ جلانے کی شدید تمنا ہو رہی تھی۔ میں نرسوں کو صرف دیکھنا نہیں چاہتا تھا بلکہ انہیں چھونا، سننا، دیکھنا، سونگھنا اور چکھنا چاہتا تھا۔

عورت ہی ایک ایسا عطر مجموعہ ہے جو سارے حواس کو بہ یک وقت شاد کام کرتا ہے۔ جس گھڑی میرے منہ سے خون آتا، میں مجبوری و محرومی کے احساس میں غرق ہو کر اپنے ہی جسم کو انتہائی پیار و محبت سے چھو کے رونے لگتا۔ مجھے اپنا ہاتھ، اپنی انگلیاں بہت ہی عزیز معلوم ہوتیں۔ میں نے ان سے اتنی شدید محبت کا احساس کبھی نہیں کیا تھا۔ اتنی بار میں نے کبھی ان کو اتنے انہماک سے دیکھا بھی نہیں تھا۔ میں نے جو امید قائم کی تھی کہ کیتھرین اس حال میں تو ضرور مجھ سے مل ہی جائے گی، ٹوٹ گئی۔ کیتھرین بس ڈیوٹی کے طور پر وارڈ میں آتی اور چلی جاتی۔ اس نے میرا حال تک دریافت نہ کیا۔ مصیبت تنہا نہیں آتی، غم کی گھٹائیں موج در موج ہوتی ہیں۔ کیتھرین کتنی خوددار و خود بیں تھی۔

مگر اس کے خلاف ڈولی جسے میں نے کیا نہیں کہہ ڈالا تھا۔ جس سے میری کوئی توقع وابستہ نہیں تھی، وہ ڈیوٹی نہ ہونے کے باوجود میری علالت کی خبر سنتے ہی بھاگی ہوئی آئی اور مضطرب مسکراہٹ کے ساتھ میری خیریت دریافت کی۔ میں چپ رہا۔ خفگی سے نہیں شرمندگی سے۔ اس وقت وہ چارٹ دیکھ کر چلی گئی۔ پھر وہ برابر آتی رہی۔ مجھے وارڈ کی بیگانگی سے وحشت ہوتی تھی لہٰذا مجھے معائنہ کے کمرے میں رکھ دیا گیا تھا۔ ایک دوپہر کو ڈولی مزاج پرسی کے لئے آئی۔ میں انتہائی ندامت میں گڑ گیا اور ہیجانی جذبات نے مجھے رو پڑنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے ڈولی کا ہاتھ پکڑ کے بصد منت معافی مانگی۔ وہ بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور صرف اتنا کہا "انور صاحب! آپ نہیں جانتے ..."

میں نے ان آنسوؤں میں ماضی کے کانٹوں کی چبھن محسوس کی اور زندگی کے کیاب حسن کی چند نورانی کلیاں کھلتی ہوئی دکھائی دیں۔ انوکھے طور پر میں نے یہ محسوس کیا کہ عورت ہی مرد کی ابدیت کا ذریعہ ہے۔ فانی انسان عورت ہی کی مدد اور ربوبیت سے چند قطروں کو ناپیدا کنار سمندر بنا دیتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ انسانیت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر عورت کی آغوش سے نکل کر ازل اور ابد کو گھیرے ہوئے ہے۔

آخر کار میں اچھا ہو گیا۔ چند ماہ اور سینی ٹوریم میں رہ کر مجھے گھر واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ میں بہت اکتا بھی گیا تھا۔ ادھر کیتھرین نے مجھ سے روٹھ کر اپنی زندگی ہی بدل لی تھی۔ وہ سب سے تعلقات توڑ چکی تھی۔ اگر وہ مجھ سے باتیں نہیں کرتی تھی تو اور لوگوں سے بھی گریزاں ہی رہتی تھی۔ شاید وہ اپنی زندگی کے تجربات تلخ و شیریں کے بعد شکست و فریب کی تلخیاں برداشت کر چکی تھی۔ اب وہ صرف کھیلنا نہیں، زندگی بسر کرنا چاہتی تھی۔

درخت کا اکھڑنا کچھ آسان نہیں ہوتا۔ درد زندگی میں سب سے بڑا دکھ انتقال ہے۔ جڑیں اصلی زمین سے محروم کئے جاتے وقت کراہنے لگتی ہیں۔ میری حیات کا درخت بھی صحت گاہ میں ڈیڑھ سال تک نصب رہا تھا اور اب علیحدگی کے وقت اعصاب کے سوتے دردناک ہو رہے تھے۔

میں رخصت سے پہلے نرسوں سے ملنے ان کی اقامت گاہ کو گیا۔ سب بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھیں۔ سبھوں نے بڑے انس اور خلوص سے میری پذیرائی کی اور بعض نے خوشی کا اظہار کیا کہ اب میں اچھا ہو کر اپنے گھر جا رہا تھا۔ مگر کیتھرین وہاں بھی خاموش رہی۔

رخصت کی صبح کو ایشری نے مجھ سے کہا: "کیتھرین رات بھر روتی رہی ہیں اور ڈولی بھی۔ آپ کو سبھی لوگ چاہتے ہیں۔"

میں نے کہا: "جو میری خطرناک حالت میں بھی بیگانہ رہا ہو وہ بلاوٹر کے پیرس ٹوٹ جانے پر تو رو سکتا ہے مگر میرے لئے اس کے آنسو کی ایک بوند بھی نہیں ہو سکتی۔ ہاں ڈولی سے میں بے حد شرمندہ ہوں۔"

ایشری مجھ سے باتیں کر رہی تھی کہ کیتھرین آئی اور اس نے ایشری کو ڈیوٹی روم میں بلا لیا۔ ذرا دیر میں وہ مسکراتی ہوئی لوٹ آئی اور ہنس کر کہنے لگی:

"چلئے مل لیجئے! بوا بلاتی ہیں۔"

نہ جانے کیوں میں ارادے کے خلاف اندر چلا گیا اور ایشری وارڈ میں مریضوں کا ٹمپریچر لینے چلی گئی۔

خوددار و خود بین کیتھرین کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا۔ میں اس کے قریب چلا گیا۔ اس نے میرا ہاتھ زور سے جذباتی انداز میں پکڑ لیا اور اسی حال میں میز پر ٹیک لگا کر آہستہ آہستہ سسکیاں بھرنے لگی۔ اسے اپنے آنسو دکھلانے میں بھی عار تھی۔ اچانک اس نے سر اٹھا کر کہا:

"انور بابو! آپ نے ہم نرسوں کو عورت نہ سمجھا۔ بس ایک گڑیا، ایک گڑیا، ایک گڑیا!"

جگّا

ماجھا کے علاقہ میں بھیکین ایک چھوٹا سا اور غیر معروف گاؤں تھا۔ مشکل سے سو گھر ہوں گے، زیادہ تر سکھوں کی آبادی تھی۔ یہاں کی ایک بات تھی۔ وہ یہ کہ بعض اوقات یہاں کوئی غیر معمولی طور پر حسین لڑکی وجود میں آتی جس کے ساتھ کسی نوجوان مرد کے عشق کی داستان اس قدر پر رومان ہوتی کہ سسّی پنوں، سوہنی مہینوال اور ہیر رانجھے کے قصّے بھی مات ہو جاتے تھے ——— اور اب کے قرعہ گورنام کور کے نام پڑا تھا۔

گورنام کے حسن نے آس پاس کی بستیوں کے نوجوانوں میں ایک ہلچل سی مچا دی تھی۔ وہ ایک گڑیا کی مانند تھی، چینی کی مورت، اچھلتی [illegible] شوخ رفتاری کے ساتھ کہ نقشِ قدم ہمدم، سرمگیں اور بدمست آنکھیں ایسے گناہ کی دعوت دیتی تھیں کہ جس سے بہتر ثواب کا تصور ذہن میں نہ آتا تھا۔ لیکن ابھی وہ معصوم تھی۔ شباب کی آمد آمد تھی اور وہ ایک بے فکر اور پرشباب دوشیزہ کی پرزور جسم کو ابھی اس طرح محسوس کرتی تھی جیسے خرا[illegible] سمے میں کہیں دور سے شہنائی کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دے جائے۔ ابھی وہ مردوں کے اشاروں اور کنایوں کا مطلب نہ سمجھتی تھی۔ وہ اپنی مسکراہٹ ہر کسی کو پیش کر دیتی، وہ سب سے ہنس کر بات کر لیتی، ابھی اس میں پندارِ حسن پیدا نہ ہوا تھا، اس لیے جو بھی شخص اس سے بات کر لیتا یہی سمجھتا کہ گورنام اس سے محبت کرتی ہے ——— ایک مرتبہ تو شنگارا سنگھ نے علانیہ نوجوانوں کے جمگھٹ میں کھڑے ہو کر کہہ دیا تھا کہ وہ گورنام کو بھگا لے جائے گا۔ اس وقت دلیپ سنگھ ادھر سے گذرا تو دوسروں نے اسے سمجھایا کہ دیکھو دلیپ سنگھ بھی گورنام کے عاشقوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس نے سن پایا تو حالات خطرناک صورت اختیار کر لیں گے۔ اس پر شنگارا سنگھ نے زبردست قہقہہ لگایا اور دلیپ کے پیچھے کھڑے ہو کر بکرا بلا دیا[1]۔ اس پر دلیپ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے خشمگیں نظروں سے شنگارے کی طرف دیکھا اور کڑک کر بولا "یہ تو نے بکرا کیوں بلایا ہے؟"

شنگارے نے تہبند کس لیا اور خم ٹھونک کر مقابلہ پر آن کھڑا ہوا۔ دلیپ کی آنکھیں قہر برسا رہی تھیں۔ قریب تھا کہ دونوں جوان باہم گتھ جاتے مگر سب نے بیچ بچاؤ کر دیا۔ —— آخر کمان کھنچ گئی؛ ایک دن خونی پل پر دونوں کا مقابلہ ہو گیا۔ دلیپ کا تخنہ اٹھ گیا اور دلیپ کی لاٹھی کی ایک ضرب سے

---

[1] کسی کی تضحیک کرنے کے لیے اپنے منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر بھق بھق کی آواز نکالنا۔

شنگارے کا جبڑا ٹوٹ گیا، جان تو بچ گئی مگر صورت بگڑ گئی۔ اس دن سے سب کو کان ہو گئے اور اب دلیپ کے جیتے جی گرنام کا دعوے دار پیدا ہونا ناممکن تھا۔

رات بھیگ رہی تھی، چاند جوبن پر تھا، گاؤں پر ایک پُراسرار خاموشی طاری تھی۔ کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آواز آ جاتی یا اس وقت رہٹ کی چرخی کے پاس ایک جنگلی بلا بیٹھا دُم ہلا رہا تھا اور نہایت انہماک کے ساتھ میاؤں میاؤں کر رہا تھا۔

یہ رہٹ اور کنوئیں گاؤں کے پاس گاؤں کے باہر کی طرف تھا۔ ساتھ ہی پیپل کا ایک بہت بڑا اور گھنا درخت، جس پر ایک بھولا پڑا تھا۔ چکر پیلوں کو ہانکنے والا کوئی تھا نہیں، جی چاہتا چل دیتے، جی چاہتا ٹھہر جاتے، اس وقت خاموشی سے کھڑے سینگ ہلا رہے تھے۔

اتنے میں سانڈنی سوار ایک سکھ مرد پیپل کے نیچے آکر رُکا، اس نے سانڈنی کو نیچے بٹھانا چاہا۔ سانڈنی بلبلا کر مچلی اور پھر دھپ سے بیٹھ گئی۔ پنجاب کے دیہات میں چھ فٹ اونچا نوجوان کوئی خلافِ معمول بات نہیں، مگر اس مرد کے کاندھے غیر معمولی طور پر چوڑے تھے۔ ہاتھوں اور چہرے کی رگیں اُبھری ہوئی، آنکھیں سُرخ انگارہ، ناک جیسے عقاب کی چونچ، رنگ سیاہ، چوڑے اور مضبوط جبڑے، سر ایسے دکھائی پڑتا تھا جیسے گردن میں سے تراش کر بنایا گیا ہو، جوڑے پر رنگ برنگ کی جالی، جس میں سے تین بڑے بڑے پھندنے نکل کر اس کی سیاہ داڑھی کے پاس لٹک رہے تھے، کانوں میں بڑے بڑے مُندرے، کلسے رنگ کی چھوٹی سی پگڑی کے دو تین بل سر پر، بدن پر لانبا کرتا اور مرگیا رنگ کا دھاری دار تہبند اس کی ایڑیوں تک لٹکتا ہوا گریبان کا تسمہ کھلا ہوا، اور اس کے سینے کے گھنے بال نمایاں، اور پھر اس کے ہاتھ میں ایک تیز اور چمکدار چھوی[2]۔

آتے ہی اس نے بیلوں کو دھتکارا اور وہ چلنے لگے، اس نے جوتے اتارے، تہبند کو اوپر اٹھایا اور اپنے موٹے کڑے[3] کو پیچھے ہٹا پانی کی چھال[4] کی طرف بڑھا۔ پہلے اس نے منہ ہاتھ دھویا، زور سے کھانسا اور پھر پانی پینے لگا۔

جب وہ پگڑی کے شملے سے منہ پونچھنے لگا تو ایک نوجوان دوشیزہ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ لڑکی نے پانی بھرنے کے لیے گھڑا اچھال کے نیچے کیا اس کی گوری کلائی پر کی کالی کالی چوڑیاں ایک چھن کی آواز کے ساتھ ایک جا ہو گئیں۔ گلابی رنگ کی شلوار، چھینٹ کا ٹخنوں تک کا کرتا، سر پر دھانی رنگ کی ہلکی پھلکی اوڑھنی، کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں، جب اس نے اپنا نازک ہونٹ دانتوں تلے دبایا، گھڑے کو ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھا کر ٹیلے پر رکھا تو اس کی کمر میں ایک دل نشیں خم سا پیدا ہو کر رہ گیا۔

مرد نے پہلے ایک پاؤں انگوٹھے سے باہر نکالا اور اسے جھٹک کر جوتا پہن لیا۔ پھر اس نے اپنے دوسرے پاؤں کو جھٹکا دیا اور دوسرا جوتا بھی پہن لیا۔ تب وہ اپنی چھوی ہاتھ میں لیے ہوئے روڑی[1] پر جہاں کہ ایک سفید مرغی کے بہت سے پر پڑے تھے، کھڑا ہو گیا۔ پاس ہی کسی کے گھر کی کچی دیوار تھی جس پر اُپلے رکھے تھے۔ جب لڑکی دیوار کے قریب سے گزرنے لگی تو مرد نے چھوی سے ایک اُپلا نیچے گرا دیا جو لڑکی کے پاؤں کے پاس جا کر گرا۔

اس وقت اجنبی مرد نے اس کے پاؤں دیکھے جیسے سپید سپید کبوتر، تلووں کی ہلکی گلابی رنگت ایسے معلوم ہوتی تھی جیسے وہ پاؤں ابھی ابھی گلاب کی کلیوں کو روند کر چلے آ رہے ہوں ـــــ لڑکی نے اپنی لانبی پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، شاید اس نے اسے محض ایک راہ گیر سمجھا تھا۔ مگر اس کی ڈراؤنی صورت دیکھ کر اس کی بڑی بڑی سرمگیں آنکھوں میں خوف کا سایہ دکھائی دینے لگا۔ مرد نے بھاری لہجہ اور کرخت آواز میں پوچھا "تو کون ہے؟"

لڑکی کی نظریں مرد کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں، یہ پہلا موقع تھا کہ کسی شخص نے اسے اس قدر بے مروتی کے ساتھ مخاطب کیا۔ اس کے سُرخ سُرخ نازک ہونٹ پھڑکنے لگے جیسے کسی نے لال مرچیں ان پر چھڑک دی ہوں۔ مگر مرد غیر معمولی طور پر بےباک تھا۔ مرد نے اسی لہجہ میں اپنا سوال دہرایا "تو کون ہے؟"

لڑکی سمجھ نہ سکی کہ اس بات کا کیا جواب دے۔ اس نے اپنی حنائی انگلی اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا "میں وہاں اس گھر میں رہتی ہوں"

---

۱ کوڑے کا ڈھیر ۲ ایک تیز خمدار ہتھیار، جو کہ لاٹھی کے سرے پر چڑھا لیا جاتا ہے ۳ آہنی کڑا جو کہ سکھ کلائی میں پہنے رہتے ہیں ۴ جہاں پانی گرتا ہے۔

مرد نے چبھتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اپنے چوڑے شانوں کو حرکت دے کر بولا "تیرا نام کیا ہے؟"

دوشیزہ کی آنکھیں پُر آب ہو گئیں۔ بولی "گرنام!"

"تو وہاں کس کے ساتھ رہتی ہے؟"

"میری ماں ہے، بے بے[1]، ویر[2]، چاچا[3]، باپو[4] سب ہی رہتے ہیں۔"

"مجھے اپنے گھر لے چل۔" مرد نے اس کے ساتھ ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے تجھ سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔"

مرد کی پیشانی پر بہت سی تیوریاں پڑ گئیں، اس نے اپنی دلہن کی طرح آراستہ سانڈنی کی مہار پکڑ کر اپنی دانست میں نودارنرم لہجہ میں پوچھا "کیوں؟ کیا تم لوگ سکھ نہیں ہو کیا؟"

لڑکی کا چہرہ کانوں تک سُرخ ہو گیا۔ "لیکن مجھے تم سے خوف معلوم ہوتا ہے۔"

"کیوں؟" مرد نے اجڈپن سے اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔

لڑکی نے ایک لمحہ کے لئے اس کی چمکدار آنکھوں کی طرف دیکھا "تم ہنستے کیوں نہیں؟"

"ارے یہ بات؟" یہ کہہ کر اجنبی نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا جیسے کوئی پانی سے لبریز مٹکا زمین پر انڈیل دے۔ اس کے قہقہہ کی آواز سن کر چمگادڑیں اپنی کمین گاہوں سے نکل کر پرواز کر گئیں۔

گرنام کا گھر گاؤں سے باہر دھریک[5] کے درختوں کے جھنڈ کے پاس تھا۔ اس کی ممٹی تو بہت دور سے نظر آتی تھی۔

دروازہ کے سامنے پہنچ کر اجنبی رُک گیا اور گرنام نے اندر سے اپنے باپو اور بھائی کو باہر بھیجا۔ ان کو دیکھتے ہی اجنبی نے بلند آواز میں کہا "واہ گورو جی کا خالصہ، سری واہ گورو جی کی فتح!"

"واہ گورو جی کا خالصہ سری واہ گورو جی کی فتح!"

اجنبی بلا کسی ہچکچاہٹ کے بولا "میں دور سے آ رہا ہوں، رات زیادہ گزر چکی ہے۔ میں آج یہیں ٹھہروں گا۔"

باپو درانتی اپنے پوتے کے ہاتھ میں دے کر اجنبی کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بہت خوش خلق اور ملنسار شخص تھا مگر اجنبی کی بھیانک شکل اسے شش و پنج میں ڈالے ہوئے تھی۔ خیر اس نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے جواب دیا "میں ہر طرح سے خدمت کے . . . . . ."

پیشتر اس کے کہ وہ اپنا فقرہ پورا کر سکے اجنبی سانڈنی لڑکے کے سپرد کر کے دروازہ کے اندر داخل ہو چکا تھا۔

اگرچہ گھر کا کل سامان غریبانہ تھا مگر گوبر سے لپی ہوئی کچی دیواریں اس کا ثبوت دے رہی تھیں کہ گھر کی عورتیں کاہل یا آرام طلب ہرگز نہ تھیں۔ گھر کے سب افراد بیاہ والے گھر گئے ہوئے تھے، سوائے چار کے۔

ڈیوڑھی سے نکل کر اجنبی صحن میں داخل ہو گیا۔ ایک بچہ سینہ سے تکیہ لگائے سو رہا تھا۔ صحن مویشیوں کے مُوت اور گوبر سے اٹا پڑا تھا۔ ایک طرف کھرلی[6] کے پاس ایک بھینس جگالی کر رہی تھی۔ بھس اور کھلی کی سانی کی بُو ہر چہار جانب پھیلی ہوئی تھی۔ رسی پر میلے کچیلے کپڑے لٹک رہے تھے ایک طرف خراس[7]،

---

[1] ماں [2] بھائی [3] باپ [4] دادا [5] نیم کے درخت سے ملتا جلتا ایک پیڑ [6] ناند جس میں سانی کی جاتی ہے۔
[7] بیلوں کے ذریعے چلنے والی چکی۔

دوسری طرف تنور اور اس کے پاس ہی دیوار سے ٹکا ہوا چھکڑے کا پہیہ، بڑے بڑے اُپلے، کونے میں کپاس کی چھڑیاں، چولہے کے پاس جھوٹے برتنوں کا انبار، ایک کمرہ میں سے سفید سفید چمکتے ہوئے برتن دکھائی دے رہے تھے۔ ساتھ ہی تاگے میں پروئے ہوئے شلغم کے قتلے سوکھنے کے واسطے لٹک رہے تھے۔

صحن سے گزر کر بوڑھا باپ اجنبی کو دروازہ سے باہر چھپر کے نیچے لے گیا تھوڑی سی جگہ کے تینوں طرف ایک کچی دیوار اٹھا دی گئی تھی۔ سوکھے ہوئے اُپلے جو جلانے کے کام میں آ سکتے تھے اسی جگہ رکھے جاتے تھے۔ یہاں پر ایک چارپائی ڈال دی گئی۔ چار خانوں والا ایک کھیس اور اجنبی کے دل کی طرح سخت ایک عدد تکیہ اس پر رکھ دیا گیا۔

گمنام نے کپاس کی چھڑیوں کا ایک گٹھا تنور میں پھینکا اور خود آٹا گوندھنے لگی۔ جس وقت وہ تنور میں روٹیاں لگانے لگی تو اس کی اوڑھنی سینہ سے کھسک کر گر گئی۔ اس کی لانبی چوٹی کے رنگ برنگ کے پھندنے اس کی پنڈلیوں تک لٹک رہے تھے۔ دہکتے ہوئے تنور کی روشنی اس کے حسین چہرہ پر پڑ رہی تھی ــــــ اور اجنبی چپکے چپکے اسے دیکھ رہا تھا۔

شلغم کی ترکاری، ایک کٹورے میں شکر گھی، ڈیلوں[1] کا اچار، دو بڑی بڑی پیاز کی گٹھیاں اور اٹھ چوڑی چوڑی روٹیاں تھال میں رکھ کر گمنام اس کو دے آئی۔

جب اجنبی نے اوپر نیچے تین چار ڈکاریں لیں اور بڑے زور شور کے ساتھ منہ میں انگلی پھیر کر گھی کی تو گمنام کو معلوم ہو گیا کہ وہ کھانا ختم کر چکا ہے۔

وہ برتن اٹھانے لگی تو اس نے دیکھا کہ اجنبی کپڑے اتار رہا ہے۔ جب اس نے تہبند اتارا اور اسے جھاڑ کر تکیہ کے قریب رکھنے لگا تو سونے کا ایک کنٹھا نیچے گر پڑا۔ گمنام ٹھٹک کر واپس چلنے لگی تو اجنبی نے آہستہ سے پوچھا "گمنام! بس جا رہی ہو کیا؟"

گمنام حسب معمول اپنے دلفریب طفلانہ انداز سے مسکرائی اور اوڑھنی سنبھالتے ہوئے آگے جھک کر آہستہ سے بولی "یہ سب لوگ سو جائیں تو میں آؤں گی۔"

اجنبی دور کھیتوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شیشم اور ببول کے پیڑ سیاہ دیووں کی طرح خاموش کھڑے تھے۔ ٹنڈ منڈ بیریوں پر بئیوں کے گھونسلے لٹک رہے تھے۔

ایسے سنسان وقت میں تاروں بھرے آسمان تلے، کسی دور افتادہ رہٹ سے کسی نوجوان کے مسرت انگیز گانے کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔

باگے وچ کیلا ای

نکل کے مل بالو!

ساڈا وچھنے دا ویلا ای

نکل کے مل بالو!

اتنے میں گمنام دبے پاؤں، شلوار کے پائنچے اٹھائے، نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے، چپکے چپکے قدم ناپتی ہوئی آ گئی۔

تھوڑی دیر بعد دونوں ہی گھل مل کر باتیں کرنے لگیں۔

اجنبی نے بہت سے سونے کے زیورات اور موتیوں کے ہار نکالے۔ قریب تھا کہ گمنام کے منہ سے حیرت اور مسرت کے مارے ایک چیخ

---

[1] بیر کی مانند ایک پھل

نکل جاتی مگر اجنبی نے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

گمنام بہت دیر تک مینا کی طرح چہکتی رہی، اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی مگر اس کا دھیان زیورات کی طرف تھا۔ آخر کار اس نے اپنی باتوں سے آپ ہی اُکتا کر ایک گہری سانس لی اور تکان زدہ آواز میں بولی۔

"کیوں تم یہ زیورات کہاں سے لائے ہو——؟ میرے خیال میں تم جیب کترے تو نہیں ہو۔ مجھے جیب کتروں، چوروں اور ٹھگوں سے سخت نفرت ہے۔ وہ جھٹ سے گلا دبا کر آدمی کو مار ڈالتے ہیں۔" یہ کہہ کر گمنام اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے خلا میں گھورنے لگی۔ جیسے کوئی سچ مچ کا قاتل اس کا گلا دابنے کو آ رہا ہو۔

"مت گھبراؤ۔ تم بھی کیسی بچوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ بھلا میرے ہوتے ہوئے تم کو کس بات کا خطرہ؟ اٹھو یہاں میرے پاس چارپائی پر بیٹھ جاؤ۔"

گمنام اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے اجنبی کے چوڑے شانوں کا جائزہ لیا اور پھر گویا تو دل سے مطمئن ہو کر کہنے لگی "تم کتنے اچھے ہو——یہ زیورات تو تم اپنی بیوی کے لئے لائے ہو گے نا؟"

"ہاں!"

"گمنام نے اپنی ہتھیلی پر رخسار رکھتے ہوئے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"تمہاری بیوی کیسی ہے؟"

"مگر میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔"

"اچھا تو ہونے والی بیوی کے لئے لائے ہو؟"

اجنبی نے اپنی ڈاڑھی کے کھردرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ابھی تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میری بیوی کون بنے گی۔ بنے گی بھی یا نہیں۔"

گمنام نے اپنی دونوں ہتھیلیوں پر ٹھوڑی رکھ کر اپنی آنکھوں کو جلد جلد جھپکاتے ہوئے، ناک ذرا سکیڑ کر بھولے پن سے کہا "ہاں تم کالے ہو ذرا!"

اجنبی کے سینہ میں جیسے کسی نے گھونسہ مار دیا۔

مگر گمنام نہایت سنجیدگی سے کسی گہری سوچ میں ڈوب چکی تھی۔ شاید وہ اجنبی کے لئے بیوی حاصل کرنے کی ترکیب سوچ رہی تھی۔

"یہ زیور تم لے لو۔"

گمنام نے چونک کر اجنبی کی طرف دیکھا "پھر تم اپنی بیوی کو کیا دو گے؟"

اجنبی کو کچھ جواب نہ سوجھا۔ لڑکھڑاتی زبان سے بولا "پھر میں تم سے لے لوں گا۔"

گمنام کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس کی باچھیں کھل گئیں۔ تالی بجا کر بولی "میں ان کو اُپلوں میں چھپا دوں گی۔ —— کبھی کبھی رات کو اچھے اچھے نیلے سات پہن کر کھیتوں میں ہنسا کروں گی۔"

کچھ دیر سکوت کے بعد اجنبی نے کہا "گمنام تم بھی تو مجھ کو کچھ دو۔"

گمنام نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا "میرے پاس کیا ہے؟"

"کچھ بھی ہو۔"

گمنام چہرہ سے ہاتھ ہٹا کر کچھ دیر تک سوچتی رہی۔ پھر اس نے اپنے گلے سے کوڈیوں اور خربوزہ کے رنگ برنگ کے بیجوں کا ہار اتار کر اجنبی کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اپنے اس حقیر تحفہ کو دیکھ کر جھینپ سی گئی اور اس کے رخسار دہکنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد گمنام نے ایک انگشتری اٹھا کر کہا "یہ میری انگلی میں پہنا دو۔ دیکھوں کیسی لگتی ہے۔"

اجنبی نے اپنے کالے کالے میلے کچیلے بھدے چوڑے ہاتھوں میں گمنام کا کنول سا ہاتھ لیا۔ گمنام نظریں جھکائے بچوں کی سی سادگی اور انہماک کے ساتھ انگوٹھی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی زلفوں نے اس کے رخساروں کا ایک بڑا حصہ ڈھانپ رکھا تھا۔ اجنبی وارفتگی کے عالم میں اس کے خوبصورت سیپوں جیسے پپوٹوں پر نظریں گاڑے ہوئے تھا۔ جب وہ اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنانے لگا تو اس کی اپنی انگلیاں لرزنے لگیں اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا، جیسے اس کی چار چار انگل چوڑی کلائیوں کی کل طاقت کشید کی جا رہی ہو۔

گمنام چونکی اور سہمی ہوئی ہرنی کی طرح اُٹھ کھڑی ہوئی "اماں کھانس رہی ہے ——— اب میں جاتی ہوں۔"

اجنبی اپنے خواب سے چونکا۔

گمنام نے آگے جھک کر نقرئی آواز میں پوچھا "جاؤں کیا؟"

اجنبی کی اجازت لے کر وہ زیورات کی پوٹلی بغل میں دبائے جھٹ اندر چلی گئی۔

علی الصبح گاؤں کے مویشی رات بھر کی گرمی سے گھبرا کر جوہڑ میں گھس پڑے۔

اجنبی جانے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ گمنام نے اسے ایک باسی روٹی پر مکھن اور چھناٹسی[1] کا دیا اور جب اجنبی کپڑے پہن کر تیار ہوا تو گمنام رونے لگی۔ اجنبی نے آہستہ سے کہا "روتی کیوں ہو؟"

"تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔ تم مت جاؤ۔"

اجنبی ہنس پڑا "میں پھر آؤں گا۔"

باپو کو آتے دیکھ کر اس نے آنسو پونچھ ڈالے۔

باپو اجنبی کو رخصت کرنے کے لئے کچھ دور تک اس کے ساتھ گیا۔ اس نے اجنبی سے پوچھا "کیا میں اپنے معزز مہمان کا نام دریافت کر سکتا ہوں؟"

"ہاں!" اجنبی نے اپنی تیز نظریں اس کے چہرہ پر گاڑ کر جواب دیا۔ پھر اس نے اپنی دھوپ میں چمکنے والی چھوی کی طرف فخریہ انداز سے دیکھتے ہوئے مزید کہا "اور تم کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اگر میرے نام کا ذکر اپنے یا بیگانے کسی سے بھی کیا تو تمہارے اور تمہارے خاندان کے سب افراد کے خون سے مجھے ہاتھ رنگنے پڑیں گے۔"

بوڑھے کا چہرہ فق ہو گیا

اجنبی سانڈنی پر سوار ہو گیا اور مہار کو جھٹکا دے کر اپنی بھاری آواز میں بولا "آج رات جگا ڈاکو تمہارا مہمان تھا۔"

جگا ڈاکو، اصلی نام سردار جگت سنگھ ورک[2] وہ خوفناک شخص تھا کہ جس کا نام سن کر بڑے بڑے بہادروں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے قتل، غارت گری، ظلم، لوٹ مار اس کے ہر روز کے مشاغل تھے۔ لڑکپن اور شباب خون کی ہولی کھیلنے میں ہی گزر گیا۔ بہت سی زمین کا مالک تھا۔ بڑوں بڑوں پر ہاتھ صاف کرتا تھا، غریب خوش تھے۔ اس کے خلاف گواہی دینے کا کوئی شخص حوصلہ نہ کر سکتا تھا۔ اب تیس برس سے اوپر سن تھا۔ موت کے ساتھ کھیلتا ہوا سو جاتا، اور موت کا مذاق اڑاتا ہوا جاگ اٹھتا۔ محبت، حسن، شفقت، نیکی وغیرہ کا اس کے نزدیک کچھ بھی مفہوم متعین نہ تھا۔ دور دور تک اس کی دھوم تھی۔ علاقہ بھر اس سے تھراتا تھا۔ اس کا دل پتھر، بازو آہن، غصہ قیامت، ذہن شعلہ ——— وہ قہر تھا۔

---

[1] چھاچھ لسی [2] جاٹوں کی ایک ذات

لوگوں نے اس کے نام پر کئی گانے بنا لئے تھے۔ نوجوان جھوم جھوم کر ان کو گایا کرتے تھے۔ ایک واقعہ کا ذکر یوں ہوتا تھا ۔

پکے پل تے لڑائیاں ہوئیاں، پکے پل تے
پکے پل تے لڑائیاں ہوئیاں تے چھویاں دے بل ٹٹ گئے .... جگیا

یا پھر لائل پور میں اس نے ایک زبردست ڈاکہ ڈالا تھا اور بچ کر واپس بھی آگیا تھا۔ اس کا ذکر یوں ہوتا تھا ۔

جگے ماریا لائل پور ڈاکہ، جگے ماریا
جگے ماریا لائل پور ڈاکہ تے تاراں کھڑک گیاں آپے

اس کی طویل، تاریک اور ہیبت ناک شب حیات میں ایک تارا طلوع ہوا جس نے اس کی نظروں کو خیرہ کر دیا' اور وہ تارا تھی ۔۔۔ گمنام، گمنام بیچاری نادان چھوکری' اسے عشق و محبت کا پتہ ہی نہ تھا۔ اسے لوگ کنکھیوں سے دیکھتے تو وہ ہنس دیتی' اس کے جذبۂ پندار حسن و شباب کو کسی نے بھی صحیح طور پر متحرک کرنے کی کوشش نہ کی تھی! ابھی اس کو اتنا ہوش ہی نہ تھا کہ وہ دیدہ دانستہ شکار کھیلے۔ بسملوں کا تڑپنا دیکھے' اور اس لذت سے محظوظ ہو جو صیادوں کے لئے مخصوص ہے۔ وہ بھولی بھالی سادہ لوح چھوکری یہ جانتی ہی نہ تھی کہ وہ شاہین جس کو زخمی کرنے کے لئے پنجاب کے شہزور نوجوانوں کی کمانیں ٹوٹ چکی تھیں' اور جس پر جو بھی تیر پھینکا جاتا تھا وہ اسے چُھو کر اور کند ہو کر زمین پر گر پڑتا تھا' وہی شاہین اس کے تیرِ غلط انداز کا شکار ہو کر نیم بسمل اس کے پیروں کے پاس پڑا تھا اور وہ تیر قدرت نے اس کی پلکوں میں پنہاں کر کے رکھ چھوڑا تھا۔

رات کی تاریکیوں میں جگا ان کے ہاں آتا اور سپیدۂ سحر کے نمودار ہونے سے پہلے ہی رخصت ہو جاتا۔ اس نے خود کو ایک متمول زمیندار ظاہر کیا۔ باپو کے علاوہ گھر کے سبھی افراد اس کو دھرم سنگھ کے نام سے جانتے تھے۔ گمنام کی کشش اسے کھینچ لاتی تھی۔ اس کے دل میں ایک خلش سی رہتی تھی کہ وہ اس فرشتہ کو اپنانے سے پہلے خود کو کیونکر اس کے قابل بنائے' اس نے کبھی بھی اس سے محبت جتلانے کی کوشش نہیں کی، وہ نہیں جانتا تھا کہ کیونکر اس کا آغاز کرے' وہ سوچتا تھا کہ نامعلوم اس کے اظہارِ محبت کرنے پر گمنام کیا رویہ اختیار کرے۔ وہ اس کے پاس بیٹھی چہکتی رہتی تھی اور وہ مبہوت سا بیٹھا سنا کرتا۔ کبھی کبھی اس کو خود سے نفرت ہونے لگتی۔ صورت تو اس کی پہلے ہی مکروہ تھی۔ مگر اس کی سیرت پر تو شیطان دامن میں منہ چھپاتا تھا۔ گمنام تھی کہ اس نے کبھی بھی اس سے اظہارِ نفرت نہ کیا۔ وہ نہایت مہر و محبت کے ساتھ اس سے پیش آتی۔ اگر وہ اسے اپنے قریب بیٹھنے کے لئے کہتا تو وہ اس کے قریب ہی بیٹھ جاتی' اگرچہ اس نے آج تک، اس کو چھونے کی جرأت نہ کی تھی۔ گمنام کی فرشتہ سیرتی اس کے دل میں دھڑکا پیدا کر دیتی تھی۔ اس کا ملکوتی جمال اس کا سرنگوں کر دیتا تھا۔ صرف اس کے دل کی بے چینی اور ضمیر کی ملامت بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ لوگوں نے نہایت حیرت سے سنا کہ: جگے نے ڈاکہ زنی ترک کر دی ہے ۔

ڈیڑھ برس کا عرصہ آنکھ جھپکتے میں گذر گیا۔

جگا صبح و شام پاٹھ کرتا' غریبوں کو کھلاتا پلاتا' دان کرتا' گوردواروں میں جا کر سیوا کرتا' ہر کسی کے ساتھ نرمی اور حلیمی سے گفتگو کرتا۔

اس نے باپو کی منت کی کہ گمنام کور کی شادی اس کے ساتھ کر دی جائے۔ اس نے ڈاکہ زنی ترک کر دی ہے' اور جو کچھ اس نے لوٹا وہ سب بڑی توندوالوں کا تھا۔ غریبوں کی کمائی کا ایک پیسہ اس کے پاس نہ تھا۔ وہ اپنی بہت سی زمین اور روپیہ ان کو دینے کو تیار تھا اور باپو کو وہ ہمیشہ بزرگ سمجھ کر اس کی خدمت کرے گا۔ لیکن گمنام کو یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ وہ جگا ڈاکو تھا۔ اور نہ ہی اسے فی الحال اس بات کا علم ہونے پائے کہ اس کی شادی کس سے

ۓ پکے پل پر اتنی سخت لڑائی ہوئی کہ چھویوں کے کیل ہی ٹوٹ گئے۔ ٹ جب جگے نے لائل پور میں ڈاکہ ڈالا تو ہر طرف برقی تاروں کے ذریعہ سے اس بات کی خبر کر دی گئی۔

ہونے والی ہے کیونکہ اس کو یقین تھا کہ وہ اس کو چاہتی تھی اور جب وہ اپنے پتیم کو یک بیک اپنا خاوند دیکھے گی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہے گی۔
نیک باپو نے سب کچھ منظور کر لیا۔

جگا بسیکن سے چودہ کوس پرے رہتا تھا۔ اس کی آمد و رفت کی خبر کسی کو کانوں کان نہ ہوتی تھی۔ لوگوں نے اس اجنبی کو کبھی کبھار ان کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر کسی نے کوئی خاص توجہ نہ دی کیونکہ اوّل تو وہ آتا ہی کبھی کبھار تھا اور دوسرے وہ راتوں رات واپس بھی چلا جاتا تھا وہ ہمیشہ اپنی بڑھی ہوئی مصروفیتوں کا بہانہ کر دیتا تھا۔ جگے کو دنیا جانتی تھی مگر اس کو کوئی نہ پہچانتا تھا۔
جگے کو شادی کی منظوری مل ہی چکی تھی، اب وہ چاہتا تھا کہ گمنام کی زبان سے بھی اس عشق کا اقرار کروا لے۔ خواہ اسے یہ نہ بتلائے کہ اس کا ہونے والا خاوند وہی تھا۔
ایک دن بعد از غروبِ آفتاب وہ بسیکن میں داخل ہوا۔ گھر پہنچ کر پتہ چلا کہ گمنام ساتھ والے گاؤں میں جولاہوں کو سوت دینے کے لئے گئی ہوئی تھی۔
جگے نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی۔ اس نے پگڑی کو ذرا کج کیا۔ شملہ کو ذرا اور بلند کیا اور پھر اس نے سب کی نظر بچا کر چراغ میں سے سرسوں کا تیل ہتھیلی پر الٹ لیا اور اسے اپنی گھنی اور گھنگھریالے بالوں والی گرد آلود داڑھی پر خوب اچھی طرح مل لیا۔ پھر وہ مونچھوں کو بل دیتا ہوا گھر سے باہر نکلا اور آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا پانچ چھ فرلانگ تک چلا گیا۔
ہر طرف دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ چاند کی دھیمی روشنی میں وہ ایک بھوت کی مانند دکھائی دیتا تھا۔
دور سے ایک صورت دکھائی دی۔ اسے غور سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا۔ کوئی عورت تھی اور یقیناً وہ تھی بھی گمنام۔
جگا اصیل مرغ کی طرح تن کر کھڑا ہو گیا۔
گمنام قریب آتے ہی مسکرا دی۔ لیکن مسکراہٹ میں کچھ متانت جھلکتی تھی۔ سر پر ایک بھاری گٹھڑی تھی "میری تو گردن ٹوٹ گئی ہے"
"اس گٹھڑی میں کیا بھر لائی ہو؟" یہ کہتے ہوئے جگے نے ایک ہاتھ سے یہ من بھر بوجھ اس کے سر پر سے یوں اٹھا لیا جیسے کوئی دو سال کے بچے کو ٹانگ پکڑ کر اٹھا دے۔
"اُپلے ——— اور رہا کیا؟" گمنام نے اپنی پتلی سی ناک سکیڑ کر کہا "آ رہی تھی راستے میں اُپلے چننے لگی۔ یہاں تک کہ شام اسی میں ہو گئی"
دونوں کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔
آج جگے نے گمنام کی طرف دیکھا تو اس کے دل میں عجیب عجیب خیالات پیدا ہونے لگے۔ وہ اپنی ہونے والی بیوی کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹیوں اور ساگ کا تصور اسے بے چین کئے دیتا تھا۔ کبھی تو اس کے دل میں آتی کہ سارا بھید کھول دے اور کبھی سوچتا کہ ہرگز نہ بتائے۔ آخر کار اس سے رہا نہ گیا۔ کیونکہ گمنام کچھ افسردہ سی ہو رہی تھی "گمنام!" یہ کہتے کہتے رال اس کی داڑھی پر ٹپک پڑی۔ اس نے اسے اپنی آستین سے پونچھا اور پھر بولا "گمنام! تم کو ایک خوشخبری سنانا چاہتا ہوں"
گمنام نے کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے میں مصروف تھی اور گہری سوچ میں تھی۔ اگرچہ وہ پہلے سی شوخ اور الھڑ نہ رہی تھی مگر چونکہ جگے سے کافی مانوس تھی۔ اس لئے اس سے زیادہ شرماتی بھی نہیں تھی۔
جگے کو کچھ الجھن سی ہونے لگی۔ اس نے اس کا شانہ ہلا کر پوچھا "کیوں گمنام کس سوچ میں ہو؟"
گمنام پہلے تو چونکی۔ پھر اس نے دھیرے سے کہا "میں بہت پریشان ہوں ——— میں بہت دنوں سے چاہتی تھی کہ تم کو سب حال سناؤں

"لیکن ......"

"لیکن کیا؟"

"شرم آتی تھی" گمنام نے جھینپ کر جواب دیا۔

جگا کچھ کچھ تاڑ گیا۔ زیرِ مونچھ مسکرایا "ارے مجھ سے شرم کیسی؟"

گمنام چپ رہی۔

جگا کھسک کر اس کے قریب ہو گیا۔ اس کے بار بار اصرار کرنے پر گمنام نے بتایا "وہ میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ شادی تو سبھی کی ہوتی ہے۔"

گمنام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "وہ کسی روپیہ پیسہ والے شخص سے میرا بیاہ کرنا چاہتے ہیں جسے میں نے دیکھا بھی نہیں۔ مگر میں اور کسی سے ......"

یہ کہہ کر وہ رو پڑی۔

جگے نے اپنے اوپر کی طرف اٹھے ہوئے شملہ کو چھو کر دیکھا کہ وہ نیچے تو نہیں جھک گیا۔ پھر اس نے سینہ پھلا کر کہا "نہیں گمنام، نہیں جس کو تم چاہو گی اسی سے تمہاری شادی ہو گی۔ میں باپو کو خود سمجھاؤں گا ...... ہاں تو ...... مگر وہ ہے کون؟"

جگے کی آنکھیں مارے خوشی کے چمک رہی تھیں۔

گمنام نے اس کے سینہ پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آج اسے اس کے چوڑے شانوں اور صندوق جیسے سینہ کو چھو کر گونہ تسکین حاصل ہو رہی تھی۔

جگا گھبرا گیا۔ اس نے اس کو چمکارا اور دلاسا دیا اور پھر اس شخص کا نام پوچھا۔

گمنام نے کچھ کہنا چاہا۔ پھر رک گئی ...... اور زور زور سے رونے لگی۔ جگے نے تسکین دی تو وہ بولی "تم ضرور میری مدد کرو گے۔ ان سب کے ہاتھوں سے سخت بیزار ہوں۔ تم بہت اچھے ہو۔ اس کا نام ......"

جگے کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

"اس کا نام ہے دلیپ ...... دلیپ سنگھ۔"

جگے کو سانپ نے ڈس لیا۔

اس کا چہرہ یکایک بھیانک ہو گیا۔

"دلیپ سنگھ اس کا نام ہے۔" گمنام نے دہرایا۔

جگے کی مونچھیں ڈھلکنے لگیں۔

اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ جسم کے رونگٹے کانٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ گردن کی رگیں پھول گئیں ......

گمنام نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"گھر جاؤ" اس نے بھاری آواز میں کہا۔

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم فوراً واپس چلی جاؤ" اس نے کرخت لہجہ میں گرج کر کہا۔ گمنام چپ چاپ حیرت کے ساتھ اٹھی اور گٹھڑی سر پر رکھ کر گھر کی طرف چل دی۔ جگا اسی طرح کھڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ لحظہ بہ لحظہ بھیانک ہوتا جا رہا تھا۔ عقاب کی چونچ نما ناک سُرخ ہو گئی، آنکھیں خون آلود ہو کر رہ گئیں اور چہرے سے بربریت ٹپکنے لگی —— معاً اس نے خنجر نکالا اور اسے مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ دانت پیستے ہوئے آہستہ سے بولا ——

"دلیپ سنگھ ؟ ——"

موت کا فرشتہ دلیپ سنگھ کے سر پر منڈلانے لگا۔

خونی پُل علاقہ بھر میں مشہور تھا۔

یہ پُل ایک چھوٹی سی نہر پر واقع تھا۔ نہر کے دونوں کناروں پر شیشم کے بہت ہی گھنے پیڑ تھے۔ وہاں نہ تو سورج کی دھوپ پہنچ سکتی اور نہ چاند کی چاندنی۔ پُل بڑے بڑے اور بھدے پتھروں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے نیچے صرف ایک کوٹھی تھی اور پانی دو حصوں میں تقسیم ہو کر بہتا تھا رات کے وقت یہ دو بڑے بڑے منہ ایسے دکھائی پڑتے تھے جیسے دو منہ والا کوئی دیو، انسانوں کو ہڑپ کر لینے کے لئے منہ کھولے بیٹھا ہو، یا جیسے کسی مُردے کی دو بڑی بڑی آنکھیں جن کی پتلیاں کوّے نوچ کر کھا گئے ہوں۔

پاس ہی ایک قبرستان تھا اور کچھ فاصلہ پر مرگھٹ۔ رات کے وقت کوئی شخص اُدھر سے گذرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس پُل پر اتنے قتل ہو چکے تھے کہ اس کا نام ہی "خونی پُل" رکھ دیا گیا تھا۔ نوجوان لڑکیاں اور بچے تو دن کے وقت بھی اکیلے اِدھر نہ آتے تھے۔ مشہور تھا کہ وہاں ایک سر کٹا سید رہتا تھا۔ کبھی کبھی اس کا سر تو پُل کے نیچے دلدوز چیخیں مارا کرتا اور وہ خود بلا سر کے نہایت اطمینان کے ساتھ قبرستان میں ٹہلا کرتا تھا۔

نصف رات گذر چکی تھی۔

دلیپ سنگھ شہر سے واپس آ رہا تھا۔ چھوٹے سے گدھے پر دو بوریوں میں سامان تھا۔ وہ سُنار کا کام بھی کرتا تھا اور پنساری کی دکان بھی اس کی اپنی تیار کردہ گلقند خوب بکتی تھی۔

وہ نوجوان تھا۔ خوش رو و خوش وضع، مسیں ابھی بھیگ ہی رہی تھیں، گالوں اور ٹھوڑی پر بالکل چھوٹے چھوٹے بال جیسے : عنابی، آنکھیں شربت سے لبریز کٹورے، سر پر اس وقت لنگی باندھے ہوئے تھا، اس کا ایک چھوٹا سا شملہ نیچے کی جانب لٹکتا ہوا اور دوسرا اوپر کی طرف اٹھا ہوا الغوزے خوب بجاتا تھا۔ جب رانجھا ہیر کی شادی کے بعد اس کے ہاں بھیک مانگنے کے لئے جاتا ہے، اس واقعہ کو وارث شاہ کی ہیر سے بڑی دردناک لے میں گایا کرتا تھا بلکہ اس میں تو دور دور تک اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔

دلیپ طاقتور اور دلیر نوجوان تھا۔ مگر خونی پُل کا نظارہ اور پھر اس کے ساتھ وابستہ خونی روایات اس جگہ کو اور بھی بھیانک بنا دیتی تھیں رات کی تاریکی میں شیشم کے گھنے درختوں کے تلے نہر کے سسک سسک کر بہنے والے پانی کی آواز سُن کر اس کے دل کو کوفت سی ہونے لگی —— اس نے ذرا بلند آواز میں "چھلّا"[1] گانا شروع کر دیا۔ تاریکی اور خاموشی میں اپنی آواز سُن کر اسے کچھ تسکین ہوئی۔

اس کا گدھا پُل سے پار ہو چکا تھا۔ وہ عین پُل کے درمیان میں تھا۔ دل میں شاداں تھا کہ کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ معاً پیچھے سے اسے اپنی گردن میں کسی تیز شے کی چبھن محسوس ہوئی اور جیسے کوئی اس کے کندھے کو پیچھے کی طرف کھینچ رہا ہو —— اس نے گھوم کر دیکھا۔ ایک دیوہیکل مرد پُل کی دیوار پر سے اُچکا ہوا تھا۔ اس نے اپنی پیٹھ پیچھے ۔۔۔ قمیص پر اڑس رکھی تھی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک

---

[1] پنجاب کا ایک مشہور گیت

ہی لقیں۔

"تم کون ہو؟" دلیپ نے ہمت کر کے بلند آواز میں پوچھا۔

"ادھر آ" بھاری اور تحکمانہ آواز آئی۔

دلیپ اس کی طرف بڑھا ـــــــ یکایک اس نے اجنبی کو پہچان لیا۔ بولا "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے تم کو کہیں دیکھا ضرور ہے۔ کیا تم وہی شخص نہیں جس نے تین سال پہلے چند اشخاص سے لڑتے وقت میرا ساتھ دیا تھا...... ہاں شاید وہ ننکانہ صاحب کا میلہ تھا تبھی کا واقعہ ہے..... اور تم نے دو آدمی جان سے بھی مار ڈالے تھے۔"

"بے شک میں وہی ہوں۔ لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ تیرا نام دلیپ سنگھ ہے۔ میں تجھے ایک اجنبی اور نو عمر چھوکرا سمجھ کر تیرا مددگار بنا ـــــ اور قتل تو میں نے بہت کئے ہیں، اسی پل پر گیارہ آدمی قتل کر چکا ہوں...... اور آج مجھ کو بارھواں قتل کرنا ہے۔"

دلیپ کو اس کے اجڈپن پر تعجب ہوا۔ بولا "میں نہیں جانتا تمہاری مجھ سے کیا دشمنی ہے۔ تم تو میرے محسن ہو۔"

"تو گرنام سے محبت کرتا ہے جو صرف میری ہے۔ مجھ کو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تو نے شنگارا سنگھ کو اسی پل پر سخت زخمی کیا تھا ـــ آج تیرا میرا فیصلہ ہوگا۔"

یہ کہہ کر اجنبی نے چھوی ہاتھ سے رکھ دی اور اس کی طرف بڑھا "..... اور میں چاہتا ہوں کہ تو ایک مرد کی طرح میرے مقابل آجائے۔"

دلیپ پس و پیش کر رہا تھا۔ اس نے کہا "میں اپنے محسن سے لڑنا پسند نہیں کرتا۔"

اجنبی نے گرج کر جواب دیا "تو بزدل ہے۔ یہ عورتوں کی طرح گلے میں ریشمی رومال لپیٹ کر گھومنا اور بات ہے اور کسی مرد کے ساتھ دست پنجہ لڑانا کچھ اور بات ہے۔ اگر تو واقعی اپنے باپ کے ہی تخم سے ہے تو میرے سامنے آ" یہ کہہ کر اس نے اس کے منہ پر تھوکا۔

دلیپ کو غیرت آگئی۔ وہ شیر کی طرح بپھر گیا۔ وہ ڈنڈا جو گدھے کو ہانکنے کے لئے ہاتھ میں لئے تھا اس سے اس کے منہ پر دے مارا۔ لیکن اجنبی نے وار روکنے کی کوشش نہیں کی۔ دلیپ نے دوسری ضرب اس کے کان پر رسید کی، ڈنڈا ٹوٹ گیا۔ اس کی پیشانی اور کان سے خون بہنے لگا۔ دلیپ جوش میں تھا، اس نے پوری قوت کے ساتھ ایک مکہ اس کے منہ پر رسید کیا جس سے اس کا جبڑا اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور منہ بگڑ گیا..... مگر اجنبی نہایت سکون کے ساتھ کھڑا رہا۔

اس وقت اس کی پیشانی سے خون بہہ بہہ کر اس کی ڈاڑھی کو تر کر رہا تھا۔ ایک کان کا اوپر والا حصہ ٹوٹ کر لٹک رہا تھا اور اس میں سے خون کی دھارا چھوٹ رہی تھی۔ منہ ٹیڑھا ہو جانے کی وجہ سے اس کی صورت اور بھی بھیانک ہو رہی تھی ـــــ مگر وہ حیرت انگیز طور پر مطمئن تھا۔

پھر اس نے دلیپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی گہری اور بھاری آواز میں کہا "یہ اس طرح نہیں، دلیپ! تم ابھی محض بچے ہو۔ لیکن جگا کوئی طفلانہ حرکت نہیں کرنا چاہتا۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک گھونسا اپنے منہ پر دیا اور اس کا جبڑا اپنی اصلی جگہ پر آگیا ـــــ دلیپ جگے کا نام سن کر کچھ خوفزدہ سا ہو گیا۔

اجنبی اپنی چھوی پکڑ کر بولا،

"تیرے پاس چھوی ہے؟"

"نہیں!"

"تلوار ہے؟"

"نہیں!"

"صفا جنگ ؟"

"نہیں !"

"مگر لاٹھی تو ہے وہ تیرے گدھے کی پیٹھ پر بوری میں ٹھنسی ہوئی ۔"

دلیپ مارے تعجب کے چپ چاپ کھڑا تھا۔

"جا !" اجنبی نے پکار کر کہا۔ " لاٹھی لے آ ——— میں نے سُنا ہے کہ تو علاقہ بھر میں سب سے زیادہ تیز و تُند لاٹھی والا جوان ہے۔ لیکن میں امید کرتا ہوں کہ تیری غیرت تجھے ایک بزدل کی موت ہرگز نہ مرنے دے گی۔"

دلیپ بہادر تھا مگر اس قسم کے شخص سے آج تک پالا نہ پڑا تھا۔

جگے نے چھری اتار کر علیٰحدہ رکھ دی اور صرف لاٹھی اٹھالی اور وہ دونوں ایک دوسرے کو للکارتے ہوئے میدان میں کود پڑے۔

ان کی للکار کی آواز سُن کر پرندے گھونسلوں میں پھڑپھڑانے لگے۔ گیدڑوں نے ہُو ہُو ہا ہُو کا شور بلند کیا۔ چاروں طرف گرد ہی گرد نظر آنے لگی۔

لاٹھی سے لاٹھی بج رہی تھی۔ دلیپ ہلکا پھلکا چست چالاک دُبلا پتلا اور نوجوان چھوکرا۔ بجلی کی طرح بے چین، جوڑ جوڑ میں پارہ۔ جگا بھاری بھرکم قوی ہیکل، کہنہ مشق ویو۔ باوجود موٹا ہونے کے اب بھی جس وقت سرک لگاتا تھا تو ایسے معلوم پڑتا جیسے سطح آب پر کشتی پھسلتی ہوئی چلی جا رہی ہو۔ دلیپ نے داؤ لگا کر پہلا وار کیا۔ جگا اسے خالی دے کر چلایا۔ "ایک !"

دلیپ نے پھر وار کیا۔ جگا اسے بچا کر گرجا "دو۔"

دلیپ نے تیسرا وار کیا۔ جگے نے اسے بھی روکا اور کڑکا۔ "تین !" یہ کہہ کر وہ آگے کی طرف لپکا۔ "او سنبھل بے چھوکرے اب جگا وار کرتا ہے۔" پسینہ کی وجہ سے دلیپ کے ہاتھ سے لاٹھی چھوٹ گئی۔ وہ فوراً چھرا لے کر جھپٹا۔ جگے نے ایک لات اس کے پیٹ میں رسید کی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا پُل کی دیوار سے ٹکرا کر گر پڑا۔

اب جگے کے لبوں پر خونی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے ایک وحشی بھیڑیئے کی مانند حلق سے ایک خوفناک آواز نکالی اور پھر دونوں ایڑیاں اٹھا کر آگے کی طرف اچک کر اس نے بھرپور وار کیا۔ دلیپ نے چھرا سنبھالا اور چیتے کی مانند تڑپ کر ہوا میں جست کر گیا۔ مگر کہنہ مشق استاد کا وار اپنا کام کر گیا۔ شاید پہلی صورت میں یہ وار اس کے سر کو توڑ دیتا اور لاٹھی اس کے سینہ تک پہنچ جاتی مگر اب بھی لاٹھی کافی زور کے ساتھ سر پر پڑی۔ سر پھٹ گیا اور وہ تڑپ کر بارہ سنگھے کی مانند نہر کے کنارہ پر جا گرا...... کچھ دیر تک تڑپتا رہا اور پھر سرد پڑ گیا۔

گرم گرم خون بہہ بہہ کر نہر میں ملنے لگا۔ نہر کے پانی کی کل کل کی آواز ایسے معلوم پڑتی تھی جیسے خونی ٹولی قہقہے لگا رہا ہو۔

قبرستان میں بوسیدہ قبروں کے روزنوں میں سے ہوا سسکیاں لیتی ہوئی چل رہی تھی۔

زرد چاند بدلی میں سے نکل آیا۔ مگر اس کی شعاعیں شیشم کے گھنے پتوں میں اُلجھ کر رہ گئیں۔

جگے نے نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی خون آلود پیشانی کو صاف کیا۔ منہ ہاتھ دھویا، کان پر پگڑی پھاڑ کر پٹی باندھی۔ اس نے دلیپ کے سینہ پر ہاتھ رکھ کر دل کی حرکت سُننے کی کوشش کی۔ پھر اس نے چھری اٹھائی اور دلیپ کو پیٹھ پر لاد کھیتوں کی طرف چل کھڑا ہوا۔

اس واقعہ کے بکیس دن بعد۔

دیہات میں شام ہوتے ہی خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ خصوصاً سردیوں میں تو لوگ فوراً اپنے گھروں میں گھس بیٹھتے ہیں۔

گمنام کے ہاں سب ہی لوگ اپنے اپنے کاموں سے فراغت پاکر بڑے کمرے میں بیٹھے تھے۔ عورتیں چرخہ کات رہی تھیں، بڑے بوڑھے باتوں میں مشغول تھے اور بچے شرارتوں میں مصروف۔

اتنے میں جگا اندر داخل ہوا۔

شاید ڈیڑھ برس کے بعد آج پھر اس کے مضبوط ہاتھ میں چھوی چمک رہی تھی۔ سب نے اس کو دیکھ کر اظہارِ مسرت کیا۔

گمنام حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔ بے بے نے اسے بیٹھنے کے لئے کہا مگر اس نے بتایا کہ اس کی ڈاچی باہر کھڑی ہے اور اسے جلد ہی واپس جانا ہے۔

چند لمحوں کے لئے اس نے سکوت کیا۔ پھر نہایت مختصر اور فیصلہ کن انداز سے کہنا شروع کیا "میں آپ لوگوں سے صرف اتنی بات کہنے کے لئے آیا ہوں کہ آپ گمنام کی شادی جس شخص سے کرنا چاہتے ہیں وہ ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتی ——— بلکہ اس کی شادی اس شخص سے ہوگی جس سے کہ میں چاہوں گا۔"

سب لوگ حیران تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ گمنام کا ہونے والا خاوند وہ خود ہی تھا۔ مگر چونکہ انہیں یہ راز پوشیدہ رکھنے کی سخت تاکید کی گئی تھی اس لئے وہ خاموش رہے۔

"...... اور وہ شخص یہ ہے" یہ کہہ کر اس نے دروازہ کی طرف دیکھا ——— اور دلیپ اندر داخل ہوا۔

ہر شخص پر حیرت زا خاموشی طاری ہو گئی۔

گمنام نامعلوم کس دنیا میں پہنچ گئی۔ اس کو شرما جانا چاہیے تھا مگر وہ اٹھ کر اس کے قریب آگئی۔

جگے نے دلیپ کے کان میں کہا "اگر گمنام کو مجھ سے محبت ہوتی تو تم آج زندہ نظر نہ آتے۔ دلیپ! تم مرد ہو۔ میں نے اچھی طرح سے تم کو آزما کر دیکھ لیا ہے۔ میں چاہتا تو تم کو قتل کر ڈالتا۔ مگر مردوں سے مجھ کو محبت ہے۔ اب جبکہ تمہاری گمنام تمہارے سپرد کر رہا ہوں امید کرتا ہوں کہ تم میرا راز ظاہر نہ کرو گے......"

دلیپ نے تشکر آمیز نظروں سے اپنے محسن کی طرف دیکھا۔

جگا بلند آواز میں بولا "باپو! ماں! بے بے!!! میں ان کی شادی کے لئے ضرورت سے بھی کہیں زیادہ روپیہ دوں گا اور ان کو بہت سی زمین دوں گا۔"

باپو اصل قصہ بھانپ گیا۔ لیکن سب کو زیادہ تعجب اس بات پر تھا کہ دلیپ زندہ کیونکر بچ گیا۔ مشہور ہو چکا تھا کہ دلیپ کو ڈاکوؤں نے خونی پل پر قتل کر دیا تھا۔

دلیپ نے قصہ گھڑ کر سنا دیا کہ خونی پل پر ڈاکوؤں نے اس کو گھیر لیا۔ اس لڑائی میں وہ سخت زخمی ہوا اور قریب تھا کہ ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل ہو جاتا کہ سردار وحرم سنگھ وہاں پہنچ گئے اور وہ اس قدر تندی سے لڑے کہ ڈاکوؤں کے چھکے چھوٹ گئے اور ان کو بھاگتے ہی بنی۔ پھر وہ اس کو اپنے گھر لے گئے اور تیمارداری کرتے رہے۔

جگے کی مونچھوں کے نیچے اس کے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

گمنام کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

وہ مسحور ہو کر آگے بڑھی۔ اس نے جگے کا بھدا ہاتھ اپنے کنول ایسے ہاتھوں میں لے لیا۔ پہلے اس نے جگے کے بلند سینے اور اس کے غیر معمولی لمبے

ٹ ساتھنی

چوڑے شانوں کا جائزہ لیا اور پھر گویا مطمئن ہو کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی "تم کتنے اچھے ہو۔۔۔۔۔ تم یہیں ہمارے پاس ہی رہا کرو" قریب تھا کہ جگا چیخیں مار مار کر رو پڑے۔ مگر جلدی سے پگڑی کے شملے میں منہ چھپا کر بگولے کی طرح دروازہ میں سے باہر نکل گیا۔

شادی ہوگئی ———

کچھ عرصہ بعد رات کے وقت گرنام باپو کے ساتھ گھر سے باہر کیلے کی بیل کے پاس کھڑی تھی۔ معاً دور سے غبار اٹھا، کچھ سانڈنی سوار نظر آئے، ان کی سجی سجائی سانڈنیاں، مردانہ اور دیوہیکر صورتیں، چمکتی ہوئی چھریاں ——— عجب منظر پیش کرتی تھیں ——— ان کا سالار تو غیر معمولی طور پر چوڑا چکلا شخص تھا۔ گرنام اسے دیکھتے ہی چلا اٹھی "باپو! وہ کون لوگ ہیں؟ ——— یہ سب سے آگے والا شخص تو دھرم سنگھ دکھائی دیتا ہے"
"نہیں بیٹی نہیں، وہ دھرم سنگھ نہیں" یہ کہہ کر اس نے اپنی پوتی کا سر سینے سے لگا لیا ——— اور پھر ببول کے درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوتے ہوئے سانڈنی سواروں کی طرف خواب ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑبڑایا "آج جگا ڈاکو ڈاکہ ڈالنے کے لئے جا رہا ہے۔"

ہاجرہ مسرور

بھالو

آج جمعرات تھی۔ ابھی چراغ بھی نہ جلے تھے ـــــــ اللہ رکھی گلابی چھینٹ کا لہنگا اور مہین ململ کا کرتہ اور سر پر ہرا دوپٹہ مجنوں کی طرح لپیٹے آج بھی ملیپر پہ گھسیٹتی درگاہ میں حاضری دینے نکلی لیکن ایسی بے تابی سے کہ انوری اس کی تیزی کا ساتھ نہ دے سکی۔ ٹکلی برابر پیٹ، اس پہ دل کی پیاس کا سوٹ، شلوار پیٹ پر ٹکتی ہی نہ تھی، پیروں پر وہ سوچیں کہ کبھی کبھار پاؤں میں پڑنے والی گرگابی سے ہیر تو جیسے گوشت کا بوٹا ہو کر ابلے پڑتے تھے۔ گھر سے دو قدم پر تو درگاہ تھی، مگر معلوم ہوتا کالے کوسوں کی بات ہے۔ مٹھی میں چرغی کے چار پیسے اور دوسری ہتھیلی پر ملیدے کی طشتری، یوں منوں کا بوجھ نہ معلوم ہوتی اگر اللہ رکھی کی چال پہ ایسی منہ زور جوانی نہ آئی ہوتی۔

انوری نے ہانپتے ہوئے سوچا: "سب اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ ذرا خیال نہیں کرتے اب جیسے اماں کو یہ معلوم ہی نہیں کہ میں بھی ساتھ ہوں۔" یہ سوچتے ہی اس کے رونئیں رونئیں سے کوئی شے کھول کھول کر سر تک آئی اور پھر وہ ننھے ننھے قطروں کی صورت میں آنکھوں میں پھیل گئی۔ لیکن یہ قطرے اس وقت بھاپ بن کر اڑ گئے جب اس نے دیکھا کہ اللہ رکھی مزار شریف کے پائینتی کھڑی تھا کر سے بیلی ہتھیلیاں پھیلا پھیلا کر روتے ہوئے کہہ رہی ہے ـــــــ "میاں ـــ اے میرے میاں ـــ پھر یاد شن لو میری۔ وہ حرامجادی پھر بھاگ گئی۔ میں تو تجھی سے لوں گی اس حرایو کو، میاں اے میاں۔" فرطِ احترام سے وہ چھانٹ چھانٹ کر کم سے کم "روزمرہ" میں اپنا دکھڑا میاں کے حضور کی درگاہ میں پیش کر رہی تھی۔ انوری کا دل ابھی غوطہ سا کھا گیا۔ مگر کھل کر روتی کیسے۔ درگاہ تو درگاہ ہے، کئی لوگ ادھر ادھر کھڑے تھے۔ یہی لوگ بعد میں آ کر چھیڑتے۔ نظر بچ گئے کٹے ملیدے کی طشتری اور چراغی کے پیسے مزار کے مجاور احسان اللہ میاں کے حوالے کئے جنہوں نے پھرتی سے مزار کے طاق پہ چڑھا دیئے۔ چڑھاوے کے ساتھ ہی اللہ رکھی اور بھی بکھر گئی۔ ایسا بکھر کر روئی کہ انوری کے آنسو بھی بہہ نکلے، سو بہے سے بچوں کی بھی تو لتی۔ صبح محمد قصائی بچے کچھے چھیچھڑے اور ہڈیاں کاغذ میں لپیٹ لایا تھا جو چک کر بھی نظر میں نہ سمائے۔ پھر پہلوان سے جو بچے وہ اللہ رکھی اور بچوں کے نیگ لگے۔ اسے بالشت بھر اوپنچے شوربے میں ایک بڑی ڈوبی ملی۔ وہ بھی چچوڑنے کو جی نہ چاہا۔ ان دنوں گوشت تو اسے یوں ہی اچھا نہ لگتا۔ سویرے سے کیسا کیسا جی ہو رہا تھا کہ ایک کھٹی نارنگی چوس لے مگر ان دنوں اس کی فرمائش آج کل پر ہی ٹلتی رہتی۔ حد تو یہ ہے کہ صبح چولہے کی مٹی کھانے کو جی مچلا، ایک ذرا سی

کھڑی تھی کہ اللہ رکھی دھاڑ کھا گئی: "اری ناس پیٹی چولہا ٹھنڈا لیتی ہے۔ تیرے یار آکر چولہا بنائیں گے؟"

انوری نے جلدی سے سسکتے ہوئے آنسو پونچھ ڈالے اور اللہ رکھی کی بانہہ پکڑ کر باہر لائی۔ میاں احسان اللہ ایک طویل ٹھنڈی سانس لے کر بولے "منہ زور بیٹی۔ زمانہ ہی بدل گیا ہے۔ اولاد ماں سے سرتابی کر کے کبھی سرخرو نہیں ہو سکتی۔ انوری اللہ رکھی کو سمجھاؤ نا! رپٹ لکھا دو تھانے میں! جہاں ہو گی نکل آئے گی سالی!"

خوب تو گویا اللہ رکھی اب میاں احسان اللہ سے عقل سیکھے گی ——— وہ اسی دن رپورٹ لکھا چکی تھی جس دن بھالو غائب ہوئی۔ داروغہ جی نے پہلے تو اللہ رکھی کو فراشی سنائیں، مگر جب اللہ رکھی نے ہاتھوں سے چاندی کے کڑے اتار کر ان کے قدموں پر رکھے تو کہیں جا کر کچھ دھیمے پڑے۔

داروغہ جی کا غصہ کم ہونے کی ایک اور وجہ بھی تھی جو اللہ رکھی کے علاوہ اور بہتوں کو بھی معلوم تھی لیکن کس کے سر پر اتنے بال تھے جو یہ بات زور سے کہہ سکتا؟

اس وقت جبکہ وہ جھولے سے اُجڑے مارے قصبے کے واحد کھلے بندوں طوائف گھرانے کی طرف سے رپورٹ سن رہے تھے اور گالیاں بک رہے تھے تو گھر سے ملازم چھپ کر آ نکلا اور کہا — اندر بلاتی ہیں۔

اندر پہنچے تو نازک بدن سنگار پٹارے سے لدی ہوئی بیگم تھانے کی طرف کھلنے والے دروازے سے لگی غصے سے تھر تھر کانپ رہی تھیں، سرمگیں آنکھوں میں آنسو، داروغہ جی کو دیکھتے ہی تڑپ کر بولیں "اللہ سے کچھ تو خوف کھاؤ۔ کیوں بے قصور نگوڑی بڑھیا کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ گئے — یہ نہیں سمجھتے کہ اپنے ہی دام کھوٹے تو پرکھنے والوں کا کیا دوش ——— کئی دن سے قدیر میاں جو رات رات بھر غائب رہتے ہیں۔ ایسے تنے بن گئے کہ سمجھ ہی میں نہیں آتا۔" یہ کہتے کہتے آواز بھرا گئی، رک رک کر آواز میں کہا: "کبھی واہ خوب، خاندان کا نام روشن ہو رہا ہے۔ بڑے بھائی ہو کر اتنے بھی نہیں کر سکتے کہ — آج تک ہمارے گھرانے کے لڑکے رنڈیوں پنڈیوں کے پیچھے بھاگے ہیں بھلا؟"

اس پر داروغہ جی گھبرا گئے، ہکلا گئے، کانپتے ہوئے کہنے لگے:

"ارے بھئی کیسے کہہ سکتی ہو کہ بھالو کے معاملے میں قدیر میاں ——— واہ مجھے تو یقین نہیں آتا۔"

"اچھا! ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ آج ہی قدیر میاں کا پیچھا کر کے دیکھ لو' ارے میں تو قدیر میاں کی آنکھیں پہچان لیتی ہوں' ہاں نہیں تو۔" اتنا کہہ کر بیگم جھاگ جیسی سفید چاندنیوں سے ڈھکے ہوئے تختوں والے کمرے میں کھسک لیں اور گاؤ تکیے سے ٹک کر بیٹھ رہیں۔ اس ادا سے داروغہ جی نے سمجھ لیا کہ بیگم اپنی بات سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر ہونے والی نہیں۔

اور وہ دل و جان سے ان کی بات تسلیم کرتے ہوئے تھانے میں پہنچ گئے۔

رپورٹ رجسٹر میں درج نہ ہوئی۔ اپنی عزت کا معاملہ تھا۔ داروغہ جی نے چپ چپاتے بھالو کو برآمد کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

لیکن بے چاری اللہ رکھی کو اس کا کیا علم ہوتا۔ اس کے کلیجے میں تو آگ بھڑک رہی تھی، دہکتی ہوئی سارسنی کی طرح ڈول رہی تھی، ہر طرف منہ اٹھا اٹھا کر پکار رہی تھی۔ "اری بھالو تجھے موت کیوں نہ آ گئی۔ کیسے دکھوں سے پالا، خود اچھا نہ کھایا تجھے کھلایا، پال پال کر سانڈ کر دیا۔ ارے ان بالشت بالشت بھر کی چھوکریوں کے سامنے کمائی کو کمائی نہیں سمجھا، آنے جانے والوں کی بغل سے اٹھا اٹھا کر دودھ پلایا اور باتیں سنیں، یہی تو زندگی کا آسرا تھیں اور اب جبکہ بڑھاپا آیا تو دنیا میں اندھیرا ہو گئی۔" انوری فرمانبرداری پر کتیا کا جنم لے کر آئی تھی۔ بچوں پر بچے، لاکھ لاکھ علاج کرو، پچاسوں روپے بنیا دائی کھا گئی گھمیات نہ بنی اور پھر بھالو، جو بڑے وقت میں ماں کا سہارا بنتی اس کا یہ حال کہ آئے دن کم بخت ماری لونڈوں، لاریوں کی طرح گھر سے بھاگ رہی ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اللہ رکھی کسی کے گھر برتن مانجھ کر پیٹ پالے؟ اپنا ہی پیٹ ہوتا تو خیر، مگر یہاں تو کھانے والے کتنے تھے۔

اللہ رکھی، پہلوان، انوری کے تین لڑکے اور پھر انوری بھی تو ——— اب ایسے وقتوں میں جبکہ اٹھتے بیٹھتے میں سب چارپائی کی سانس پھولتی تو اسے کوئی کہاں دھکیل دیتا۔ پورے وقتوں سے میٹھی تھی۔ چہرہ ایک دم سفید کھریا مٹی، ہونٹ نیلے، آنکھیں مارے نقاہت کے خالی خالی، اس پر سے اس کا چھوٹا بچہ ابھی تک خالی چھاتی نچوڑنے سے باز نہ آتا تھا۔ ساری جان کھنچنے لگتی۔ ابھی دو ایک مہینے پہلے تک وہ ہنس بول کر کسی نہ کسی سے اٹھتی چوتی تر جھٹک ہی لیتی۔ مگر اب تو اسے مارے بوجھ کے ہنسی تک نہ آتی تھی۔

اور اس زمانے میں لجالو پھر چلتی بنی۔

"ہائے سچ مچ بُرا زمانہ لگا ہے۔ نفسی نفسی ہے، یہ قرب قیامت نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ لجالو حرامزادی میری کمائی پر پل پل کر جوان ہوئی اور جب احسان چکانے کے لائق ہوئی تو حرافہ ہماری کٹی انگلی پر موتتی بھی نہیں، تگڑے تگڑے یاروں کے پیچھے بھاگتی ہے۔ ارے کیا ہم کبھی اس کی عمر نہیں تھے؟ کبھی پیسے کے سوا کسی سے کوئی لالچ نہیں کی، اور ایک یہ لجالو ہے۔ ارے کیا یہ لجالو جانتی نہیں کہ انوری کسی کی کمائی کھانے والی نہیں۔ بس یہ مجبوری کے دن سدا تھوڑی رہیں گے۔ یہ وقت نکل جاتا تو اپنی جوانی کا صدقہ اسے سال بھر بٹھا کر روٹی کھلا دیتی۔ پر اسے میرا خیال کہاں؟" انوری درگاہ سے واپسی پر رینگ رینگ کر چلتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ اُجڑے قصبے کا اُجڑا بازار اس وقت چراغوں اور لالٹینوں کی روشنی میں چمک گیا تھا۔ کئی لوگوں نے انوری کو یوں چلتے دیکھ کر آوازے بھی کسے اور انوری شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ اس نے چپکے سے آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ اللہ رکھی سلیپر پر گھسیٹتی گلابی چھینٹ کا لہنگا گھماتی گھر کے دروازے میں غائب ہو گئی ——— اور انوری پھر کھول اٹھی "سچ ہے کسی کو کسی کا خیال نہیں۔ اب اماں کو نہیں معلوم کہ میں بھی ساتھ ہوں اور یہ دل کی پیاس کی شلوار بھی تو مصیبت ہے۔" انوری کا جی چاہا کہ بیچ بازار میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اس بات پر خوب روئے۔ پر وہ رو نہ سکی۔ بس چکرا کر ایک دوکان کے پھٹے سے لگ کر آنکھیں بند کر لیں۔

"اے ہے انوری یہاں کیوں رک گئیں، گھر چلو۔" کسی نے دھیرے سے کہا۔ انوری نے پسینے میں ڈوبے ڈوبے ایک ذرا آنکھیں کھولیں۔ یہ غالباً حفیظ تھا۔ نہیں یہ یقیناً حفیظ تھا۔ یہ نرمی حفیظ کے ہاتھ کے سوا کس کے ہاتھ میں ہو سکتی ہے؟ اس نے کمر میں درد کی لہر محسوس کرتے ہوئے آنکھیں ٹھوڑی سی کھول کر سوچا اور پھر اپنا بازو حفیظ کے نرم ہاتھ میں پکڑاتے اپنے گھر میں داخل ہوئی ——— اور انگنائی میں پڑی ہوئی کھاٹ پر دھم سے گر پڑی ——— گھر میں بھی ذرا دیر کو سکون نہ ملا۔

اللہ رکھی اور پہلوان گھریلو اور بازاری سیاست پر زور شور سے تبادلہ خیال کر رہے تھے۔

"اے خالہ ذرا انوری کو دیکھیو۔ اس کا جی بگڑ رہا ہے۔" حفیظ غالباً زندگی میں پہلی مرتبہ کڑی آواز میں بولا۔

"اللہ خیر کریو، میاں تجور کا صدقہ۔" اللہ رکھی جھپٹ کر انوری کے قریب آئی اور جھلنگی کھاٹ میں انوری کے ڈوبے ہوئے جسم کو ٹٹولنے لگی۔ "جھینا دائی کو بلاؤں بیٹیا؟"

"اِیں نہیں، بس اب ٹھیک ہے جی۔" انوری نقاہت سے بولی اور اللہ رکھی لمحہ بھر رک کر پھر اپنے مورچے پر جا ڈٹی۔ چھپر تلے بنے ہوئے چولہے کے پاس لہنگا پھیلا کر بدستور بیٹھ گئی۔ چلم کو ہتھیلیوں میں ایک خاص زاویے سے دبا کر ایک دو زور کے کش لئے۔

حفیظ بیڑی سلگاتا چلا۔ "خالہ میں دوکان پر چلا، پھر آؤں گا۔"

اللہ رکھی نے جواباً ایک دو کش اور لئے۔

"اس بار لونڈیا آنی دکھائی پڑے ہے۔ پورے دن بھر رہے ہیں۔" اللہ رکھی نے روٹھے ہوئے پہلوان کو خوشخبری سنائی۔

"ہاں سالے لٹیا ڈبوئے گا۔ ہوتی نہ ہو لونڈیا۔ دیکھیو تو۔ پیشاب سے مرگئے مرے ہوئے سو دوں جو پھر لونڈا نہ جنے۔ چھاتی پر چڑھ کر کمائی کھائیں گے کتے کے بچے۔ تین کیا کم ہیں جو چوتھا بھی گھر دیکھ رہا ہے۔ پتریا جات شرم نہیں آتی۔ شریف جادیوں کی طرح لونڈے جنتے۔" پہلوان اپنی پنڈلیوں پر تیل کی مالش کرتے

ہوئے ڈکارا۔

"چل رہنے دے نگھٹو۔ لونڈے ہوں یا لونڈیا۔ تیری کمائی تھوڑی کھائیں گے۔" اللہ رکھی کا پارہ ایک دم چڑھ گیا: "اے ہاں کم بخت کی ناک پہ ہر وقت چڑھی رہتی ہے جیسے سچ مچ کا خاوند ہو۔ کھا کھا کے ساری کمائی اڑادی کم بخت نے۔ ہے دو کوڑی کا نہیں نخرے لاکھ روپے کے۔"

"ہوں، بڑی کمائی ہے تیرے گھر، خود تو دو کوڑی کی نہیں۔ ایک لونڈیا کتیا کی طرح سال پیچھے جننے بیٹھ جاتی ہے۔ دوسری مستانی ہاتھی ہو رہی ہے کمائی کے نام دھیلا نہیں، بھاگ بھاگ کر تبرک کی طرح بٹتی ہے۔ تو بھی جوانی میں ایسی ہی ہوگی۔ بیٹی ماں پر جاتی ہے۔" پہلوان نے چیخ کر کہا۔

"کہے دیتی ہوں زبان روک لے۔ تو بھلا میں کیوں ایسی ہوتی، جو ماں نے کہا وہ کیا۔ مجال ہے جو کبھی کسی سے ماں کی مرضی کے بغیر ہاتھ بھی چھوا لیا ہو۔ اب تو زمانہ ہی برا ہے، اس میں کسی کا کیا دوس؟"

"دوس (دوش) کیوں نہیں؟ اری تو نے کسی میرے جیسے کے پاس ایک بار رکھا ہوتا تو ساری منہ جوری (زوری) ـــــ اونٹ پہاڑ تلے آئے تو بلبلانا چھوڑ دے۔ میں نے کتنی بار کہا کہ ـــــ" پہلوان کے منہ پر دل کی بات آگئی۔

"بس بس سر م گھول کر پی گیا۔ لے بھلا کوئی دیکھو تو سہی، ہائے میری ماں!" اللہ رکھی چولہے میں اوندھا کر بے بسی سے رو پڑی۔

سچ مچ رونے کی تو بات تھی۔ جب لوگ سارے قاعدے قرینے پاؤں تلے روندنے کو تیار ہو جائیں تو پھر بے چاری اللہ رکھی اور کرے بھی کیا۔ دو دن سے پیسے کوڑی کی صورت نظر نہ آئی تھی۔ آج تو پنساری نے آٹا دال بھی اُدھار نہ دیا تھا۔ بھالو جو بھاگی ہوئی تھی۔ اب اس میں بے چارے پنساری کا بھی کیا قصور؟ جب گروی رکھنے کو چیز ہی نہ ہو تو پھر اُدھار کوئی کس بھروسے پر دے؟ اِدھر تو پیٹ کی ہائے دیا پڑی اُدھر پہلوان پر پہلوانی سوار۔ اللہ رکھی چھپر تلے بیٹھی بڑے درد سے آنسو بہا رہی تھی۔ اچھا خاصا اندھیرا ہو گیا تھا۔ ابھی تک گھر میں چراغ بھی نہ جلا تھا۔

پہلوان محاذ پر خاموشی دیکھ کر لال لنگوٹ پر تہبند باندھتا ہوا باہر نکل گیا۔ آج یہاں روٹی کا آسرا نہ تھا پھر بیٹھ کر کیا کرے؟ اس بے مروتی پر اللہ رکھی اور بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ایک وہ زمانہ تھا۔ ایک زمانہ یہ ہے۔" اللہ رکھی نے روتے ہوئے سوچا۔ اماں بوڑھی ہو چکی تھیں۔ دانت ٹوٹ رہے تھے، پر خیر وکا فی ٹاٹھا تھا۔ اس کی بیاہتا کے گھر دو سال پہلے ہی بچہ ہوا تھا ـــــ مگر اللہ اللہ کیا وضعداری تھی۔ اس زمانے میں اللہ رکھی کی جوانی پکے پھوٹ کی طرح کھل رہی تھی۔ مگر مجال ہے جو خیرو قصائی نے کبھی اللہ رکھی کی طرف ایسی ویسی نظر ڈالی ہو۔ بیٹی کہہ کر پکارا اور بیٹی ہی سمجھا۔ اور ایک یہ پہلوان ہے، کھانے چاٹنے کو آگے آگے۔ نام کرے اللہ رکھی سے یاری کا اور نظر رکھے اس کی بیٹی بھالو پر ـــــ آگ لگے ایسے زمانے کو۔ نیتیں سلامت نہیں رہیں۔ جبھی تو ہر چیز سونے کے بھاؤ ہو گئی۔ جوان جوان لڑکے قصبے سے بھاگ لیتے ہیں۔ کبھی برس دو برس میں فوجی سپاہی بن کر آتے ہیں۔ یا پھر کسی مل کے مزدور ناک بھوں چڑھاتے پھرتے ہیں۔ جو اس اُجڑے دیار میں رہ گئے تو سمجھو دور اندیش ہیں۔ اللہ رکھی کے گھر قدم رکھتے ہیں تو پیسے پیسے پر تکرار کرتے ہیں۔ نہ کوئی انعام نہ کوئی تحفہ۔ قصبے میں سچ پوچھو تو اب ایک اللہ رکھی کا گھر ہی مشکل کشائی اور حاجت روائی کا منبع نہ تھا۔ اب تو چوری چھپے ان کمینوں کے گھر فیض جاری تھا۔ ہائے دوسروں کے پیسے ہیں گھستے۔ دوسروں کے پیٹ پر لات مارتے شرم نہیں آتی لوگوں کو ـــــ اماں نانی کے زمانے کا بنا ہوا مکان جگہ جگہ سے نمک لگ لگ کر گر رہا ہے۔ اتنا نہیں کہ دو نئی اینٹیں لگ جائیں ـــــ ارے جس کے دو بیٹیاں پہلے زمانے میں ہوتیں تو سمجھو کہیں کی مہارانی ہو، اور اب دو بیٹیوں کے ہوتے بھکارن سے بدتر۔ آٹا روپے کا دو سیر نہیں جڑتا۔ اس پر ایک جنم جلی سہرے جلووں والی شریف زادی کی طرح سال پیچھے بچہ جنتی ہے اور دوسری آگ لگی دوسروں کے پیچھے چھچھوندر کی طرح چھپاتی پھرتی ہے ـــــ اور یہ پہلوان بس کم بخت روٹیاں ٹھونسنے میں مرا جاتا ہے۔ اس سے کیا کوئی عیش اٹھائے۔"

اللہ رکھی اٹھ کر دھڑ دھڑ آنسو برسانے لگی۔

ساری بھالو تو مر جائے۔ کسی کتے سکتے کی آئی تجھے آجائے، تو میرے کلیجے میں ٹھنڈک پڑ جائے۔ اری بھالو تیری چھاتی کھٹیا نکلے۔ اری تیا میری، اولاد تو میرے سٹے سانپ اچھو ہو گئی ری میا ——"

اور اسی لمحے تین عدد اولاد گھر کے اندھیرے میں چیں پیں کرتی گھسی۔ اللہ رکھی کا رونا پیٹنا ٹھن کر ٹھٹکی۔ کسی نے کپڑے سے دت پت کرتے سے ناک پونچھی۔ کسی نے آنکھ اور کسی نے ناک، اولاد بڑی آسانی سے سمجھ گئی کہ اس وقت کھانا ملنے کی امید نہیں۔

اور پھر سب نے اکٹھا رونا شروع کر دیا۔ چھوٹی چھوٹی پرانی اینٹوں کی گرتی ہوئی دیواریں ایک دم بھیانک سی لگنے لگیں۔ آسمان پر ایک تارہ چمک کر ٹوٹا۔ انوری ہول کر چیخی "ہائے ہے اماں، بچوں والے گھر میں شام کو نہ رو۔" اور اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر سب سے چھوٹے بچے کو گھسیٹ لیا جیسے وہ اسے کہیں بھاگنے سے روک رہی ہو۔

اللہ رکھی اس مداخلت بے جا پر سانپ کی طرح پھنپھنا کر اٹھی "کیا کہا تو نے؟ لو یہ اور آئی حرام جادی بچوں والی۔ اری یہ چونچلے تجھے نہیں سجتے۔ سرم ہوتی تو ڈوب مرتی کسی تیا میں۔ ایک تو حرامی بچوں کی پوچ کھڑی کر دی اس پر سے ——— صدکے کروں اس پوچ کو۔"

انوری غریب سدا کی نازک، کم سخن اور فرمانبردار، مگر اس وقت تو وہ بھی الجھ کر بیٹھ گئی۔

"بس بس اماں کمبر دار جو میرے بچوں کو کوسا۔ واہ جرا کھیال نہیں، میرے بچے کسی کی روٹی تھوڑی توڑیں گے۔ اپنی جوانی کا صدکہ تمہیں بہت کھلایا۔ اپنی جان کو جان نہیں سمجھا، بیماری دکھی میں بھی کمائی سے منہ نہیں موڑا اور تمہاری مٹھی گرم کی۔ کوسنا ہے تو اس حرامی پر کو کوسو۔ میرا نام لوگی تو میں اپنے بچوں کو لے کر کہیں منہ کالا کر جاؤں گی۔ اللہ کی جمین بہت بڑی ہے۔ جہاں بیٹھوں گی روکھی سوکھی کما کھاؤں گی۔ پھر دیکھیں گے کہ تم بھالو کو کیسے بیری طرح دبا لوگی۔"

انوری کی اس خوفناک دھمکی کے بعد خدا جانے اللہ رکھی کیا طوفان اٹھاتی۔ مگر خیر ہوئی کہ اس وقت بازار کے بہت سے لوگ ایک لال پگڑی کے پیچھے پیچھے اندر گھس آئے اور پھر کسی نے بڑھ کر چراغ روشن کر دیا۔ یہ حفیظ تھا، وہی سفید شلوار اور سرمئی ریشمی قمیص اور وہی تیل میں چپڑے ہوئے پٹے، سرمے سے بھری آنکھیں اور پان سے سرخ ہونٹ۔ انوری کو بے تکا سا خیال بجلی کی طرح کوند کر آیا "ارے یہ تو موا حفیظ دوستی دوستی میں ہمارے گھر گھس کر ہمارے گاہک اپنے واسطے پھنسانے آتا ہے ———" حفیظ کو انوری کے اس خیال کا پتہ لگتا تو اس کے خلوص کو کیسی ٹھیس لگتی ——— اسے یہی کرنا ہوتا تو کم بخت بنواڑی کی دوکان سے سر کیوں مارتا؟

"اے خالہ! بھالو آ گئی، مبارک!" حفیظ خوشی سے چہک کر بولا۔

اور اسی وقت مجمع میں گپ شپ شروع ہو گئی۔ بھالو کو مجمع کے بیچ میں سے دھکیل کر تھانے کا سپاہی سامنے لایا۔

ہاتھ رسی سے کس کر بندھے ہوئے۔ ململ کی وہی ساری جو بھاگنے کے دن پہنے ہوئے تھی۔ پیٹی کوٹ کے بجائے سرخ رنگ کا جانگیہ اور وہی چھوٹی سی کرتی، مگر ہر چیز کیچڑ میں لت پت اور پھٹی کچی، حبشیوں جیسے سخت گھنگھریالے بال، جھوجھو کی کھوپڑی پر چپکے ہوئے جیسے اس نے مسجدوں سے خوب ڈٹ کر ہاتھا پائی کی ہو۔ مگر اب ماں کے سامنے نظر نیچی کئے کھڑی جھوم رہی تھی ——— مارے تندرستی کے جھومتے رہنا اس کی عادت تھی جبھی تو سب اسے بھالو کہتے تھے۔

"آ گئی ———" اللہ رکھی نے اپنے اور بھالو کے درمیان ایک ایسی قطار سی لٹری مٹری گالیوں کی کھڑی کر دی ——— اور پھر ———

"چل اندر!" یہ کہہ کر اس نے بھالو کا ہاتھ پکڑا اور کوٹھڑی میں دھکیل کر کنڈی چڑھا دی۔ چلو قصہ ختم، مجمع بڑا مایوس ہوا، ڈرامہ بھی تو گرما گرمی نہ پیدا ہوئی۔

لیکن اللہ رکھی کی تجربہ کار نگاہیں سمجھ گئی تھیں کہ اس وقت لوگ باتیں کرنے اور سننے کے موڈ میں ہیں۔ ہاں بھئی کسی کا گھر جلے اور کوئی تاپے ———

اچھا تا پنے زدہا ہر بھلا۔ اللہ رکھی تیوری چڑھائے چولہے کے پاس گئی اور چلم بھرنے لگی۔

"جنگل میں مانک پور کی طرف جاتی ملی۔ میں نے پکڑ لیا؟" سپاہی مونچھوں پر تاؤ دے کر بولا۔

اللہ رکھی چلم بھرتی رہی۔

"اب باندھ کر رکھو اور ——— کو، اب کبھی چیں پیں کرے تو مجھے بتانا۔ ساری مستی مار مار کر نکال دوں گا۔"

پنساری ٹانگ کو کھجا کر بولا "یہ بھائی اللہ رکھی کم مارتی ہے؟ پچھلی دفعہ بھاگی تھی، تو تین دن کھانا نہیں دیا۔ زنجیر میں باندھ کر رکھا، پہلوان نے جوتے مارے سو الگ ——— بالکل سیدھی ہو گئی تھی مگر پھر تھوڑے دن میں بھاگ لی ——— کیوں اللہ رکھی؟"

اللہ رکھی اطمینان سے ٹھمکتی آئی اور چلم سپاہی کو پکڑا دی اور خود انوری کے بچوں کو لے کر سسکتی ہوئی چھپر تلے بیٹھ کر چولہا سلگانے لگی۔

مطلب یہ کہ دوبار برخاست، کھانے پکانے کا وقت ہے۔

لوگوں کو کیا پڑی تھی کہ اپنا حرج کرتے، ایک ایک کر کے کھسک لیے۔ سپاہی نے بیٹھ کر تمباکو کے دو ایک کش لگائے۔ انوری کا تو اب تک مٹی کے مادھو کی طرح بیٹھی تھی کہ سپاہی کو اپنی طرف دیکھتے پا کر دوبارہ جھلنگا کھاٹ میں ڈوب گئی۔ اس کا چھوٹا بچہ دودھ چھوڑے جا رہا تھا۔

سپاہی نے اکتا کر گڑ جیسی بے مزہ تمباکو کے دو ایک کش اور لیے۔ قلعی گھر لیو فضا تھی وہاں۔ وہ زیادہ دیر نہ ٹکا، چلتے چلتے سوچا۔ آہا بھالو ہے بڑی مزے دار۔ کل پرسوں اللہ رکھی سے بات کروں گا۔

سپاہی کے جانے کے بعد اللہ رکھی لہنگا جھاڑ کر اٹھی اور باہر نکل گئی اور جب چند منٹ بعد واپس آئی تو دوپٹے کے پلو میں ادھر کی کھچڑی بندھی ہوئی تھی۔ چولہے کے پاس بیٹھے ہوئے بچوں کی آنکھیں آگ کی روشنی میں چمک اٹھیں۔

انوری اور اللہ رکھی میں کوئی بات نہ ہوئی۔ انوری کو انگنائی میں ٹھنڈ لگ رہی تھی اور نیند بھی آ رہی تھی مگر وہ جاتے کہاں۔ چھپر تلے اللہ رکھی اور کوٹھڑی میں بھالو۔ اس وقت تو اسے سبھی سے نفرت ہو رہی تھی۔ وہ چپ چاپ پڑی اونگھتی رہی ——— رات کافی گزر چکی تھی۔

"او انوری اٹھ یہ کھا لے۔" اللہ رکھی تام چینی کی پلیٹ میں بڑے سلیقے سے کھچڑی لئے حاضر ہوئی۔

"نہیں کھانا انوری؟" انوری کی ناک میں گھی کی خوشبو آئی۔ اس نے جھر جھر کر کے کروٹ بدل لی۔

"کھا لو انوری۔" حفیظ عطر میں ہو کتا پٹی پر بیٹھ گیا "اے ہے بے چاری خالہ نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا۔ تم کھا لو تو ———"

مگر حفیظ کا صلح کا جھنڈا انوری نے پیروں تلے روند دیا۔

"نہیں مجھے دوسرے کی کمائی سور حرام ہے۔ اب تو میں اس گھر میں نہیں رہوں گی۔" انوری نے زور سے کہا۔ پلیٹ میں کھچڑی پر رکھی ہوئی آم کے اچار کی پھانک بھی کتنی ظالم ہوتی ہے۔ انوری نے منہ کا پانی نگل کر دوسری طرف کروٹ بدل لی۔

"اری تو کہیں نہیں جائے گی۔ اب چھوڑ، تجھے کھانا ہے سو کھنے سے کھا لے۔"

حفیظ اسے اٹھانے لگا، اور اس وقت اسے حفیظ زہر لگا۔ آخر یہ کیوں ہمارے پھٹے میں پاؤں اڑاتا ہے، موا پنواڑی اپنی دکان سنبھالے جا کر۔ انوری نے بگڑ کر سوچا۔ وہ حفیظ کے اور اپنے گھرانے کے گہرے ہمدردانہ تعلقات کو یکسر بھلا بیٹھی تھی۔

مگر حفیظ نے جو کہا وہ سچ ہی تھا۔ اسے کہیں نہیں جانا تھا اور کھانا تو بہر حال کھاتا ہی ہے انسان، پھر جبکہ آم کا اچار ہو۔ بالآخر وہ نیند کے جھونکوں میں پلیٹ صاف کر کے چھپر تلے بچھے ہوئے اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ پہلوان چولہے کے پاس اکڑوں بیٹھا کھچڑی کے بڑے بڑے نوالے نگل رہا تھا۔ انوری کو دیکھ کر اس نے بھالو کی جنسیت کے بارے میں کچھ گفتگو چھیڑی مگر انوری تو سو بھی چکی تھی۔ پہلوان کہتا تھا انوری تو لگتی ہی سدا کی مٹی، پتہ نہیں ایسی مٹی پر کون اپنے دام پھینک جاتا ہے۔

آدھی رات کے قریب جب آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے اور ماٹگناتی شبنم سے بھیگ رہی تھی تو بے چارہ حفیظ اللہ رکمی کے مشورے کے مطابق کھچڑی کی پلیٹ اور چراغ لے کر بھالو کی کوٹھڑی میں پہنچا۔

بھالو زمین پر پڑی مزے سے سو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ اب تک رسّی میں جکڑے ہوئے تھے۔ ململ کی ساری گھٹنوں سے اوپر تھی اور سرخ جانگیہ رانوں پر بالکل فٹ تھا۔

حفیظ کو ہنسی آگئی کیسی جنگلی ہے یہ بھی۔ رنڈی کو مردوں کی کیا کمی، پھر بھی مردوں کے پیچھے بھاگتی ہے، سچ کہتا ہے پہلوان، اس کے لئے تو سچ مچ بھالو ہی ہو۔ مگر بے چاری اس کی خاطر کتنی بدنام ہے، کتنے جوتے کھاتی ہے، کئی بار تھانے میں بھی پٹی، ہزار بار توبہ کی۔ مگر کیا پھر وہی۔ اللہ یہ کیسی آگ کی بنی ہوئی ہے؟

حفیظ کے دل میں ہمدردی اور حیرانگی کی ایک ملی جلی سی لہر اٹھی اور اس نے چراغ طاق پر رکھ کر بھالو کو جگایا۔

بھالو نے لال لال آنکھیں کھول دیں۔

"بھالو یہ کھالے، خالہ سے چرا کر لایا ہوں۔"

بھالو مٹی کیچڑ میں سنے ہوئے ہاتھوں سے کھچڑی کھانے لگی۔

حفیظ اپنی سفید شلوار سمیٹ کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ بیڑی پینے لگا اور گفتگو شروع کرنے کے لئے کوئی عمدہ فقرہ تلاش کرنے لگا۔

"بھالو تو جانتی ہے میرا تجھ سے کوئی میٹھا لالچ نہیں۔ نہ خالہ مجھے کچھ دے دیتی ہے نہ تو ——— پر کہوں گا سچی بات۔ بھلا بتا سہی اس طرح روز روز بھاگنے سے کیا فائدہ۔ وہ کوڑی کی نہیں رہے گی۔ اب تو ہی دیکھ لے یہ تو چھٹی دفعہ بھاگی ہے۔ اب کی کس کے پاس رہی تھی؟ بھلا مجھے دکھا اس نے تجھے کیا دیا؟"

بھالو نے ایک لمحے کو کھچڑی پر سے ہاتھ اٹھالیا۔ اپنی موٹی سیاہ روئیں سے ڈھکی ہوئی پنڈلی کھجا کر دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"سچ بتا قدیر بابو کے پاس رہی تھی نا؟ تو ملا کچھ نہیں، ارے یہ بابو لوگ تو مفت کام چلاتے ہیں۔ ٹھیک کہتا ہوں نا؟"

بھالو نے اثبات میں سر ہلا دیا اور کھچڑی کھاتی رہی۔

"اری سر تو ڈھائی سیر کا یوں ہلاتی ہے جیسے تجھے پہلے ہی سب پتہ تھا۔ پھر تو گئی کیوں تھی؟ بس سمجھ لے تھانے دار دشمن ہو گیا کہ تو اس کے بھائی کو پھنساتی ہے ——— اب یوں بھی اس نے تیرے منہ میں کون سا سونے کا نوالہ دیا؟"

"روٹی کا نوالہ بھی پیٹ بھر نہ دیا۔ ابرار کے گھر کوٹھڑی میں بند کر کے دن بھر کو چلا جاتا تھا اور شام کو ایک، دو روٹی لے کر آتا تھا۔ رات بھر سونے نہ دیتا تھا۔ پھر بھی صبر کیا۔" بھالو روہانسی ہو کر آنکھیں ملنے لگی۔

"اری دیوانی اس طرح بھلا رنڈیاں پنڈیاں کرتی ہیں۔ صبر کرے تیری جوتی۔ اس سے پہلے تو جن کے ساتھ بھاگی تھی انہوں نے بھی دو چار دن کے بعد گھر سے نکال باہر کیا۔ اچھا قدیر بابو کے پاس سے تو خود بھاگی یا ———؟" حفیظ کریدتا ہی گیا۔

"انہوں نے کہا اب جاؤ بھالو۔ بھابی ناگن کی طرح پھنپھنا رہی ہے ——— میں وہاں سے چل پڑی۔"

"اچھا یہ تو بتا تو اس کے ساتھ گئی کس لئے تھی؟" حفیظ اسے داؤں پر لا کر چاروں شانے چت قائل کرنے پر تلا ہوا تھا۔

"قدیر بابو کہتے تھے بھابی کے نخرے نہیں اٹھتے، سوکھی چھوہارا تو ہے پر نخرے گاڑی بھر دکھاتی ہے۔"

"یہ بات تھی بابو صاحب کو اپنے گھر بلاتی۔ ذرا بابو صاحب کی گرہ سے کچھ نکلتا۔ ارے بابا دو پیسے آنے سے کم میں نہیں ملتا ہے۔ مجھے تو تیری عقل پر غصہ آتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں اگر خالہ سے تیرا دل خوش نہیں تو الگ ہو جا۔ مکان والا نے کا میرا ذمہ۔ بس خالہ کا روزینہ باندھ دینا۔ اب بے چاری خالہ

کا بھی تیرے سوا کون بیٹھا ہے ؟" حفیظ نے اللہ رکھی کی پوری پوری وکالت کی ——— بھالو خاموشی سے کھاتی رہی۔

حفیظ کو اپنا جادو اثر کرتا معلوم ہو رہا تھا۔ اس لئے اس کی زبان بھی قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ قصبے بھر میں اس کا کوئی سنجیدگی سے نوٹس تک نہ لیتا تھا۔ اس گھر میں اس کی بات تو سُنی جاتی تھی۔ پھر وہ کیوں نہ اس کو گھر بنانے کی کوشش کرتا۔

"سارے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ کوئی سونے یا ہیرے کا بنا تھوڑی ہوتا ہے۔" حفیظ نے ہزار باتوں کو ایک بات میں سمو دیا۔

بھالو نے کھچڑی سے ہاتھ اٹھا کر اثبات میں سر ہلایا اور بڑی دیر تک ہلاتی رہی اور سیاہ طاق میں رکھے ہوئے چراغ کو گھورتی رہی ——— حفیظ سمجھا بھٹکا ہوا راہ پر لگ گیا۔

"چل اٹھ بھالو! خالہ کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ اور وعدہ کر پھر کبھی کسی مرد کے پیچھے نہیں بھاگے گی۔" حفیظ نے بھالو کا موٹا سا بازو پکڑ کر کھینچا۔

بھالو چپ رہی مگر وہ اٹھی بھی نہیں۔ بس چپ چاپ چراغ کو گھورتی رہی۔

"اب کس سوچ میں پڑ گئی ہو؟"

بھالو پھر بھی چپ رہی۔ حفیظ تنگ آ کر اپنے پٹے کھجانے لگا۔ یہ بھالو بھی بس سالی ———!

"حفیظ!" (حفیظ) بھالو نے دھیرے سے پکارا۔

"ہاں بھالو!" حفیظ نے بھالو کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

بھالو کی آنکھوں میں جانے کہاں سے ایک دم آنسو اُبل پڑے۔ تماشے میں ایک بار چودھریوں سے بدتر مار پڑی۔ جب تو ایک آنسو نہ گرا یا اور آج پتہ نہیں کیسی چوٹ لگی۔ حفیظ بوکھلا کر رہ گیا۔

"میں جس کے ساتھ بھاگی، اچھا کیا یا بُرا۔ اس بات کو جانے دے۔" بھالو نے جلدی جلدی آنسو خشک کیے۔

"پھر تو چاہتی کیا ہے؟" حفیظ کچیا گیا۔

"میں تو سوچتی تھی میرے بچے ہوں، میں بھی ٹاٹ کے پردے والے گھر میں رہوں، جیسے تیری ماں رہتی ہے۔" بھالو دھیرے سے بولی۔

"اچھا؟" حفیظ کو کچھ غصہ آیا اور پھر وہ کھسیا کر ہنس پڑا۔ وہ بھالو کے منہ سے اپنی بیوہ دکھیاری ماں کا ذکر نہیں سننا چاہتا تھا۔

"حفیظ!"

"ہاں!"

"تو سچ مچ مرد نہیں؟" بھالو نے بھولے پن سے منہ اٹھا کر پوچھا۔

حفیظ اس اچانک حملے سے لچک گیا۔ ایک لمحے کو اس نے سر اٹھایا اور پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ مرد نہیں تو اس میں اس کا کیا قصور۔ بقول اس کی ماں کے 'اللہ دینے والا ہے' جو چاہے دے دے۔

"میں تیری دوکان کے لئے چھالیہ کترا کروں گی۔ تیری ماں کی خدمت کروں گی حفیظ، میں بہو بن کر رہوں گی حفیظ! حفیظ!!"

اسی رات بھالو پھر بھاگ گئی۔

دوسرے دن حفیظ اکڑ اکڑ کر چلتا جو دوکان پر آیا تو لوگ وہ سارے گھسے پٹے فقرے بھول گئے جنہیں سن سن کر حفیظ کے کان پک گئے تھے۔

انور

خون

ساجا ایک اکیلے مسافر کی مخصوص خاموشی کے ساتھ جہاز سے اُتر کر جیٹی پر کھڑا ہو گیا۔ چودہ سال کے لمبے عرصے نے اُو ڑم گھاٹ میں بہت سی تبدیلیاں پیدا کر دی ہوں گی۔ وہ اِن تبدیلیوں پر غور کرنے کی بجائے اپنے لٹھے کی نئی شلوار پر جہاز کے گندے ڈیک سے لگے ہوئے تیل کے دھبوں کو دیکھنے لگا۔ ایک لمحے کے لئے اُس کے احساس کی چادر پر ملال کے بڑے بڑے دھبے آ گئے۔ ہگلی کی ہلکی ہلکی لہروں نے جہاز کی سیاہ کھُردری دیواروں سے ہولے ہولے ٹکرا کر اس کی شلوار کے سیاہ دھبوں کو مٹا دیا۔ اُس نے بغل سے اپنی ململ کی، کلف سے اکڑی ہوئی، نئی پگڑی کو نکال کر دیکھا۔ اُس کا دماغ اُس کو یہ نہ بتا سکا کہ کلف نے اس کی پگڑی میں بھی ہگلی کی لہریں پیدا کر دی ہیں، لیکن جب اُس نے اس پگڑی کو بھلے انداز میں اپنے سر پر باندھ لیا تو اُس کے دل نے محسوس کیا کہ وہ ہگلی کی نہروں میں نہا رہا ہے۔ ایک دفعہ پھر اُس کی طبیعت میں دبی دبی مسرت کا خاموش جیسا ساکن جیسا طوفان برپا ہو گیا اور اُس نے لانچوں پر اِدھر اُدھر حرکت کرنے والی اونچی اونچی کرینوں کی طرف دیکھنے کی بجائے پاس سے گذرنے والے تیل سے بھیگے ہوئے چیتھڑوں میں ملبوس ایک کالے مریاڑے، مریل مُردار بنگالی قلی کو کہا:

"جوان تم کو معلوم ہے، پنجاب کو گاڑی کتنے بجے جاتی ہے؟"

قُلی نے بیڑی کا ایک لمبا کش لے کر دھوئیں میں سے جواب دیا۔

"ہم کو نہیں مالوم۔"

ساجے نے قلی کو جانے سے روکنے کے لئے کندھے کے پاس سے اُس کی قمیص کا کپڑا پکڑ لیا۔

"اچھا یہ بتاؤ سٹیشن کو جانے والی سڑک کونسی ہے؟"

بوداکپڑا قلی کے معمولی جھٹکے سے بہرے تک پھٹ گیا۔ قلی کے کالے مُنہ پر زرد آنکھوں میں سُرخ خون اُتر آیا۔

"تمارے کو ایک دیچے بولا ہم نہیں جانتا۔ پھر کاہے کو پکڑتا؟"

ساجے کو غصّہ آ گیا۔ اُس نے چاہا ایک مُکّا جڑ کر کے پنجابی اردو میں کہا

"سؤر — کا — پتر۔"

قلی ملتی ہوئی بیڑی صاحب کے منہ پر مار کر رفوچکر ہو گیا۔

اگر صاجے کے پاؤں کے پاس اُس کا کالا ٹرنک نہ پڑا ہوتا تو وہ اُس قلی کے پیچھے بھاگ کر اُس کو دریا میں دھکا دے دیتا، یا پھر کم از کم کسٹم والوں میں سے تو ضرور وہ کسی ایک کو پیٹ ڈالتا اگر وہ جلدی سے اس کا چھٹکارا نہ کر دیتے، اچھا ہوا، سٹرینڈ روڈ کے موڑ تک اُس کو غصہ چڑھا رہا ورنہ سٹیشن تک جانے کے لئے کسی رکشا والے کو آواز دے دیتا ——— اور خواہ مخواہ روپے بارہ آنے کا نقصان ہو جاتا، وہ اپنی بغل میں ٹرنک دبائے جا رہا تھا۔

سٹرینڈ روڈ پر پہنچ کر اُس کو ایک بنگالی بابو نظر آیا۔ ایک ہاتھ میں سفید کھدر کی دھوتی کا ایک کنارہ، جسم چاولوں کی بادی سے پھولا ہوا، کندھوں پر سر کی بجائے فٹ بال، صاجا اُس کے پاس چلا گیا۔

"یہ سڑک کہاں جاتی ہے بابو جی؟"

"آپ کو کدھر جانے کو مانگتا مسٹر؟"

"سٹیشن۔"

"یہ سڑک تمہارے کو ہاوڑہ برج لے جائیگا برج کا دوسرا سائڈ ہاوڑا سٹیشن ملے گا۔"

صاجے نے سوچا کہ اگر وہ پانچ جماعتیں نہ پڑھا ہوتا تو اس بنگالی بابو کی طرح اُردو بولتا، اور نمبر ۸۴۹ کس طرح اردو کی ٹکھا پوٹا کرتا تھا۔ "ہم نے تمہارے کو بولیا ہمارے تاں بجر کُٹ کُٹ کے متھاں میں چھالے پڑ گئے سنے۔ اللہ نئے تیرے کو جمعداری دتی ہے۔ گر ڈیمیں ہو کے بھی آپ ہمارے لوگاں دا کھیال نہ رکھوں گا تاں ——"

نمبر ۸۴۹ بھی جہلم کے ضلع کا رہنے والا تھا۔ بے چارہ اَن پڑھ، صاجا بھی اگر اَن پڑھ ہوتا تو وہ قیدیوں کا جمعدار نہ بن سکتا۔ اور گرفتار ہونے پر اپنے آپ کو سراج الدین ولد معراج الدین نہ لکھواتا۔ بلکہ صاجا ولد ماجا لکھواتا وہ زہریلی ہنسی والا تھانیدار۔ صاجے کو کئی دفعہ خیال آیا کہ تھانیدار کا بھی خاتمہ کر ڈالے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر وہ انگریزی سے ڈر کر پانچویں جماعت سے نہ بھاگ اُٹھتا۔ جس طرح وہ قلی اس کے مکّے سے ڈر کر بھاگ گیا تھا۔ بھاگ گیا نہیں تو وہ اس کی ریڑھ کی ہڈی توڑ ڈالتا۔ اور پھر وہی پولس۔ پھر وہی چودہ سال یا شاید پھانسی لیکن پھانسی کیوں ہوتی اگر وہ پانچویں جماعت سے نہ بھاگا ہوتا۔ شاید وہ تھانیدار ہو جاتا۔ یا کم از کم سڑک کے دونوں طرف لگے ہوئے انگریزی کے ان اشتہاروں کو تو پڑھ سکتا۔ چودہ سال پہلے جب وہ قیدیوں کی بندلاری میں اس سڑک سے گذرا تھا تو اُسے یہ خیال نہ تھا کہ یہ سڑک اتنی لمبی اور وسیع ہوگی۔ اور ٹرم گھاٹ پر وہ جہازوں اور کرینوں کو دیکھ کر یہ بھول گیا تھا کہ وہ ایک طویل عرصے کے لئے اپنے عزیز وطن کو چھوڑ رہا ہے۔ جہاز، کرینیں، سمندر اور انڈمان۔

چاند پال گھاٹ کے سامنے پہنچ کر اُس نے دم لینے کے لئے اپنے ٹرنک کو فٹ پاتھ پر رکھ دیا۔ اپنی نئی سفید پگڑی سے اپنے مُنہ اور گردن سے پسینہ پونچھا۔ سامنے کی دوکان سے دو آنے کے چنے مول لئے۔ میونسپلٹی کے ایک نلکے پر پانی پینے کے لئے چلا گیا۔ جب وہ ہاتھ دھو کر پانی پینے کے لئے جھکا تو یکایک اُس کو کچھ فاصلے پر ایک رکشا جاتی دکھائی دی۔ وہ ہڑبڑا کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ رکشا والے کا پیچھے کی طرف سے تین چوتھائی حصہ نظر آ رہا تھا۔ صاجا پانی کو بھول کر رکشا والے کو غور سے دیکھنے کے لئے آگے بڑھا لیکن رکشا میڈر روڈ کی طرف مڑ گئی۔ اُس نے اپنے آپ کو کہا نہیں —— نہیں۔

پانی پینے کے بعد اُس کو معلوم ہوا کہ اسٹیشن ابھی دور ہے۔ اس کی دبی دبی مسرت پر بوجھ کا ایک ہلکا سا چھلکا آ گیا۔ اُس نے

محسوس کیا کہ اب وہ ٹرنک کے بوجھ کو نہیں اٹھا سکے گا۔ اُس نے ایک رکشا والے کو بلایا۔ اپنا ٹرنک اُس میں رکھ دیا اور خود اس میں بیٹھ کر بولا۔ "ہوڑا اسٹیشن"

تمام رستے اُس کو اپنے دل پر ایک غیر معلوم وزن کا احساس رہا۔

ہاوڑا برج پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ پنجاب میل روانہ ہو چکی ہے۔ ساجے نے ہگلی کی لہروں کی طرف دیکھا۔ ہگلی ساجے کی زندگی کے گھنے جنگل میں سے خاموشی کے ساتھ بہی جا رہی تھی۔

اُس نے رکشا والے کو کہا۔ "مجھے یہیں اتار دے"

رکشا والے نے ٹرنک پُل کے ایک کنارے رکھتے ہوئے پوچھا۔ "رات کو کدھر سونے گا، وادا؟" ساجے نے اُس کی بات کا کچھ جواب نہ دیا۔ رکشا والے نے رکشا کا کرایہ لیتے ہوئے رازدارانہ انداز میں پھر کہا "ہم بتائیں گا؟"

ساجے نے اندمان میں کلکتے کے رکشا والوں کی بابت بہت کچھ سنا ہوا تھا۔ اُس نے ایک دفعہ حقارت سے رکشا والے کی طرف دیکھا اور پھر اپنے ٹرنک پر جا کر بیٹھ گیا۔ رکشا والا چلا گیا۔

سامنے ہگلی پر نیا پُل بن رہا تھا۔ کتنا مشکل کام ہے پُل بنانا خصوصاً جب دریا کا پاٹ بہت چوڑا ہو۔ اس پانی میں ستونوں کی بنیادیں کھوکھلی کرتا رہے گا۔ پُل پُرانے ہو جایا کرینگے۔ اُن کی جگہ نئے پل بنا کرینگے۔ وہ سامنے ہگلی پر نیا پُل بھی پُرانا ہو جائیگا ——

پھر اس کی جگہ ایک اور نیا پل بنانا پڑے گا۔ کیا اس نئے پل پر بھی ساجا بیٹھے گا؟ لیکن ساجا اپنے لئے خود ایک نیا پل کیوں نہیں بناتا۔ اُس کی زندگی کی بنجر زمین میں سے بھی تو ہگلی گذرتی ہے۔ اس ہگلی نے اس کی زندگی کی بنجر زمین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے ان دو افتادہ حصوں کو ملانے کے لئے ایک نئے پُل کی ضرورت ہے اور ساجا ہگلی پر بننے والے نئے پل کی طرف دیکھتا رہا۔

آسمان پر شام کی شفق چھا گئی۔ بادلوں کی سُرخی نے ہگلی کے پانی پر سُرخی چھڑک دی۔ ساجے نے دیکھا کہ ہگلی میں خون بہا جا رہا ہے خالص انسانی خون۔ وہی خون جس نے آج سے پندرہ سال پہلے اس کے کنوئیں کی منڈیر کو رنگ دیا تھا۔ اور جس نے کنوئیں کی منڈیر سے بہہ کر کھیتوں کی طرف جانے والے پانی کو ہگلی کے پانی کی طرح سُرخ کر دیا تھا۔ گودو کا خون اور گودو کے باپ کا خون، گودو جو کلکتہ سے کبھی کبھی گاؤں میں آ کر، سُوٹ بوٹ پہن کر لوگوں کو کہا کرتا تھا کہ وہ اس کو گودو کی بجائے گوبند رام ورما کہا کریں۔ گودو جو گاؤں کی بھولی بھالی معصوم لڑکیوں کو کلکتہ کے خواب دکھا کر ان کو اکثر اپنے ساتھ بھگا لے جاتا تھا جو ساجے کے کنوئیں پر ہر روز اُس وقت نہانے کے لئے آیا کرتا تھا جب ساجے کی نوجوان خوبصورت بیوی، دارو، ساجے کے لئے کھانا لے کر آتی تھی۔ ساجا اُس کی حرکت کو خوب سمجھتا تھا۔ لیکن گاؤں میں کوئی کسی کو اپنے کنوئیں پر نہانے سے منع نہیں کر سکتا۔ پھر جب ایک دن دارو کپاس کے کھیت کے پاس غصّے اور گھبراہٹ سے ہانپتی ہوئی دوڑی دوڑی آئی اور ساجے کو کہنے لگی۔ "گودو مجھے کہتا ہے میرے ساتھ کلکتہ چلو" تو ساجے کے آتش فشاں پہاڑ کی دبی ہوئی آگ بھڑک اُٹھی۔ وہ اس وقت ایک کلہاڑی سے اپنے کھیت کی باڑ کے بھدے حصّوں میں کیکر کی جھنکیں لگا رہا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح کنوئیں کی طرف بھاگا۔ پہلا وار گودو کے سر کے پاس سے ہو کر اُس کے کندھے میں اُتر گیا۔ دوسرے وار کے وقت گودو ڈگمگا کر پیچھے کی طرف گر رہا تھا۔ اس لئے کلہاڑی اُس کے کولھے میں گڑ گئی۔ تیسرے وار کے وقت گودو کا باپ درمیان میں آ گیا۔ پہلی ہی ضرب اس پر اتنی کاری پڑی کہ اس کی گردن ایک طرف کو لٹک گئی اور وہ سیدھے گرتے ہوئے گودو پر اوندھا گر پڑا۔ اس کے بعد کی دو ضربیں بھی گودو کے بجائے گودو کے باپ پر ہی پڑیں۔ اس کے بعد گاؤں کے لوگ، وہ زہریلی ہنسی والا تھانیدار، مقدمہ اور پھر چودہ سال کی قید۔ کالے پانی کو جاتے وقت جب اس نے اپنے ماں باپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو اس نے کہا۔

"مجھے آپ لوگوں کے آنسوؤں کا افسوس نہیں۔ اس بات کا افسوس ہے کہ جس کو میں مارنا چاہتا تھا وہ بچ گیا اور جس کو میں مارنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ مر گیا۔ گودو بچ گیا۔ گودو کا باپ مر گیا" جب اُس نے دادو کی سسکیاں سنیں تو اُس نے کہا:-

"دادو! چودہ سال کوئی بڑی بات نہیں۔ میرا انتظار کرنا" اور پھر جب اپنی دو تین سال کی بہن نوری کی طرف دیکھا جو سب کو روتا دیکھ کر چیخیں مار مار کر رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ "میں بھی ساتھ جاؤں گی۔ میں بھی ساتھ جاؤں گی" تو اُس کے دل کے کسی کونے میں پہلی دفعہ یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید اُس نے غلطی کی ہے۔ اُس نے نوری کو اُٹھا کر گلے سے لگا لیا اور کہا "نوری — نوری — نوری" اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہچکی کی لہریں شاید اُن آنسوؤں کو نہ دیکھ سکی ہوں۔ کیونکہ شفق کی سُرخی سلیٹی ہو کر سیاہی مائل ہو گئی گودو اور گودو کے باپ کا خون بھی دیر تک کنوئیں کی منڈیر پہ جمع رہنے کی وجہ سے شام کے وقت سلیٹی ہو کر سیاہی مائل ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنی پگڑی کے شملے سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور جب اس نے قتلنے کے اُس حصّہ کو دیکھا، جہاں اُس نے آنسو پونچھے تھے تو اس نے دیکھا کہ اُس کا دل سلیٹی ہو کر سیاہی مائل ہو گیا ہے اور یہ سیاہی شام کی سیاہی کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ وہ ڈر گیا کہ کہیں رات نہ آ جائے۔ اُس نے اپنی طرف بڑھتے ہوئے سایوں کو اپنی پوری قوت سے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی اور ایک دفعہ تو وہ ان بڑھتی ہوئی بھیانک تاریکیوں کو چیر کر اپنے گاؤں میں پہنچ گیا جہاں اُس نے اپنے گھر کی دہلیز پہ دادو کو اپنی چودہ سال کے انتظار سے پتھرائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بیٹھے دیکھا۔ وہ پاگلوں کی طرح اُس کو چھونے کے لئے بڑھا لیکن یک بیک پُل پہ بجلی کے قمقموں کی قطار روشن ہو گئی۔ اُس نے ایک ہارے ہوئے سپاہی کی وارفتہ مایوسی کے ساتھ اوپر کو دیکھا اور اُس کو یقین ہو گیا کہ رات آ گئی۔

رکشا والے نے اُسی رازدارانہ لہجے میں کہیں سے آ کر کہا۔ "دادا!"

ساجا چونک گیا اور اس سے پہلے کہ اُس کا دماغ اُس کے معاملے میں دخل دے سکتا اُٹھ کے کھڑا ہو گیا "کہاں لے جاؤ گے؟"

"فسٹ کلاس پنجابن ہے — مس نیلم — کیا پیارا نام ہے —"

کرائے کی کچھ باتیں ہوئیں اور رکشا چل پڑی۔

ہریسن روڈ

گورے سٹریٹ

سوناگچی

تھوڑی دیر کے بعد رکشا والے نے آ کر کہا "ہم تمہارے کو کیا بولیگے دادا، تم ڑالکی ہے، وہ سالہ سنیما جانے کو دیکھتا تھا۔ آؤ — آؤ —" اور ٹرنک اٹھا کر آگے آگے چل پڑا۔

چودہ سال کے بعد ساجا پہلی دفعہ ایک ایسی رات کے دروازے پر آیا جس کے قفل کی چابیاں اُس کے ہاتھ میں تھیں۔ وہ رات اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ اُس کے پیروں پر پڑی تھی۔ وہ اس کو ٹھکرا سکتا تھا۔ اچھال سکتا تھا۔ جھنجوڑ سکتا تھا۔ چاہتا تو قمقموں کی زرد روشنی میں رنگ دیتا۔ چاہتا تو اُس کو اندھیرے کے اتھاہ غار میں دھکیل دیتا۔ اختیار کے اس احساس نے اُس کے جذبات میں آگ لگا دی۔

گندمی رنگ کی ایک پنجابی عورت جس کا سب سے بڑا حُسن اُس کی گدرائی ہوئی جوانی تھا۔ اپنے ہوش رُبا سینہ کے ساتھ، اپنی بڑی بڑی معصوم آنکھوں کے ساتھ گہرے سبز دوپٹے میں آسمانی رنگ کی ریشمی قمیص میں اور ساٹن کی سفید شلوار میں اُس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

"اندر آجاؤ — کیا سوچتے ہو؟ — اداس ہو؟" —

"نہیں تو۔"

وہ اُس کو بازو سے پکڑ کر اندر لے گئی۔ ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ کرسی کے بازو پر بیٹھ کر اُس کی پگڑی کے شملے سے کھیلنے لگی اور پھر ہنس کر اُس کی رانوں پر بیٹھ گئی۔ ساجے میں اختیار کا احساس جاگ اُٹھا۔ اختیار کے اس احساس نے اُس کے جذبات میں آگ لگا دی۔ اور جذبات کی اس آگ نے اس کو بے اختیار کر دیا۔ اُس نے نیلم کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا اور اپنے ہونٹوں کے انگاروں کو اُس کے گالوں پر رکھ دیا۔ ایک منٹ۔ دو منٹ۔ تین منٹ۔ وہ گھبرا گئی۔ اُس نے ایک دو دفعہ سی سی کی اور پھر لیکا یک اُوئی اُوئی کر کے اُس کے بازوؤں میں سے نکل گئی۔ وہ اُٹھ کر اُس کے پیچھے بھاگا۔ ایک ہاتھ نیلم کی کمر میں چلا گیا، دوسرے ہاتھ نے بجلی کا قمقمہ بجھا دیا۔

کپڑوں کی سرسراہٹ — اور — اور —

پھر روشنی ہو گئی۔ ساجا اپنی گیروں کی قمیص کے بٹن لگا رہا تھا۔ نیلم آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی اور پریشان بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ دوبارہ میک اَپ کرتے ہوئے اُس نے کہا:

"سنو — ہم سینما جا رہے ہیں — سیکنڈ شو۔"

"نہیں، نیلم، میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔"

"میری سہیلی آیا ہی چاہتی ہے۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔"

وہ اُس کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا اور اُس کی بنگالی فیشن میں گندھی ہوئی دو چوٹیوں کے ساتھ کھیلتا رہا۔ کچھ عرصہ آئینے کے سامنے وہ اُس کے جسم کے مختلف حصّوں کو سہلاتا رہا، پھر وہ دونوں بستر پر لیٹ گئے۔ اور امریکہ کے ایک رسالہ میں سے ننگی تصویریں دیکھنے لگے۔ ساجے نے انگڑائی لے کر کروٹ بدلی۔ اُس کا بازو بے خودی میں نیم عُریاں سینہ پر چلا گیا۔ رسالہ پلنگ سے نیچے گر پڑا۔ بجلی کا قمقمہ بجھ گیا اور پھر ایک عرصہ تک پُر اسرار خاموشی کے بعد دونوں بستر پر لیٹے لیٹے باتیں کرنے لگے۔

"مجھے اپنا نام بتا دو۔"

"نام پوچھ کر کیا لو گی کل شام کو جا رہا ہوں۔"

"کلکتہ میں کیا کرتے ہو؟"

"یہاں تو میں آج ہی آیا ہوں۔"

"کہاں سے؟"

"کالے پانی سے۔"

"تم کالے پانی سے آئے ہو؟" —

"ہاں"

"پھر تو تم ساجے کو جانتے ہو گے۔"

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ سوال ساجے کے دماغ پر پتھر کی طرح گرا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنے ارادے پر زور دے کر اپنی حیرت کو تجسّس میں تبدیل کر لیا اور کمرے کا بلب روشن کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"ہاں میں ساجے کو جانتا ہوں۔ وہ میرا دوست ہے۔"

روشنی میں بھی وہ بالوں اور کپڑوں کی پریشان حالت میں اُسی طرح بے حجابانہ بستر پہ لیٹی رہی۔ اُس نے اپنے جسم کے اُن حصّوں کو بھی جنھیں آدمیوں سے چھپایا جاتا ہے، چھپانے کی پروا نہیں کی اور کروٹ لے کر اپنی ہتھیلی میں اپنا سر رکھے ہوئے بے پروائی سے باتیں کرتی رہی۔

"پچھلے سال میں اپنے گاؤں میں گئی تھی۔ ساجے کی بہن نزدیک کے گاؤں سے میرے پاس آئی اور مجھے کہنے لگی۔ تم کلکتہ میں رہتی ہو۔ کلکتہ کالے پانی کے پاس ہے۔ کالے پانی میں میرا بھائی رہتا ہے۔ اُس نے پچھلے پانچ سال سے ہمیں کوئی خط نہیں لکھا۔ اگر تم کو وہ کہیں ملے تو اُس کو میرا پیغام دے دینا۔

ساجا بے چینی کے ساتھ اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

"ہاں، میں جانتا ہوں، وہ بڑا لاپروا ہے۔ اُس نے ضرور ایسا کیا ہوگا اُس نے ضرور کوئی خط نہیں لکھا ہوگا۔"

"اُس نے مجھے کہا کہ اگر تم کو ساجا ملے تو اُس کو بتانا کہ ہمارے ماں باپ غم سے نڈھال ہو کر مر گئے ہیں۔ ہماری ساری زمین بک گئی ہے اُس کی بیوی دارو اُسی گورو کے ساتھ جس کو ساجے نے قتل کرنے کی کوشش کی تھی، بھاگ گئی ہے —— گورو کی بابت معلوم ہوا۔ کہ وہ کلکتہ میں کوئی اچھا کاروبار نہیں کرتا۔ وہ وہاں رکشا چلاتا ہے اور بازاری عورتوں کا دھندا کرتا ہے۔ اُس نے دارو کو بھی بازار میں بٹھا دیا ہے ——"

ساجے پر غشی کی سی حالت طاری ہو گئی لیکن زہر کے ان گھونٹوں کو جو ساجے نے پیئے تھے اُس کے چہرے پر ظاہر نہیں ہونا چاہئے اس بازاری عورت کے سامنے اس کو یہ راز فاش نہیں کر دینا چاہئے کہ وہ بدکار عورت اُسی کی بیوی ہے۔ وہ دیوار پہ ایک تصویر کو دیکھنے لگا۔ لیکن اس کو اُس میں اصلی نقوش کی بجائے ریڈ روڈ کی طرف مڑنے والی رکشا دکھائی دی اور ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی اس کے کانوں میں کہہ رہا ہے "ہاں۔ ہاں ۔"

نیلم کی آواز مدھم ہو گئی۔ اُس کے الفاظ بھیگ گئے۔

"—— اُس نے کہا ساجے کو بتانا۔ اب میرا دنیا میں کوئی نہیں۔ نمبردار کے بچے کھلاتی ہوں۔ گوبر کوڑا اُٹھاتی ہوں۔ گالیاں سہتی ہوں مار کھاتی ہوں ——"

ساجا بڑبڑا اُٹھا۔

"نیلم میں جاتا ہوں۔"

"کہاں؟"

"میں ابھی ساجے کو یہ سب باتیں بتا دوں گا۔ میں اُس کو مجبور کروں گا کہ وہ ابھی، اپنے گاؤں کو چلا جائے۔ اُسے رات ہونے سے پہلے چلا جانا چاہئے تھا وہ مورکھ ہے۔ وہ نہیں جائے گا۔ وہ نہیں جائے گا۔"

نیلم حیران ہو کر بیٹھ گئی اور اپنے کپڑے سنبھالتے ہوئے بولی :

"تو کیا ساجا کلکتہ میں ہے؟"

"ہاں۔"

"تو اُس کو فوراً جا کر کہہ دو کہ وہ اپنے گاؤں کو نہ جائے۔"

ساجے نے ایک لمحہ خاموش حیرت سے نیلم کی طرف دیکھا اور پھر اُسی تیقّن کے انداز میں کہا۔

ساجا ضرور اپنے گاؤں کو جائے گا۔ کیا وہ اپنی بہن کی یہ حالت ــــ"

"بلکہ اس کو ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی نہ بتانا اور اس کو گاؤں تو ہرگز نہ جانے دینا۔"

"کیوں نہ جانے دوں آخر؟"

"اُس کا گاؤں کو جانا بے سود ہوگا۔ اُس کی بہن اُس کو وہاں نہیں ملے گی!"

"کیوں نہیں ملے گی؟"

"میں اس کی بہن ہوں!"

ساجے کی کنپٹیاں پھٹنے لگیں۔ اُس کا دماغ دُھواں بن کر کمرے میں پھیلنا شروع ہوگیا۔ بجلی کی روشنی چھوٹے چھوٹے دھبے بن کر اُڑنے لگی۔ اس رنگ برنگ دُھندلکے میں اس کو اپنے کالے ٹرنک کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ وہ کالے ٹرنک پر اپنے ہاتھوں میں اپنی کنپٹیاں لے کر بیٹھ گیا۔

نیلم پلنگ کے پاس کھڑی ساجے کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

سیڑھیوں میں سے پیروں کی آہٹ نے ساجے کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ جذبات کے غاروں میں سے نکلنے کی کوشش میں اُس کو کچھ راحت محسوس ہوئی۔

"نیلم ــــ جلدی ــــ جلدی ــــ نی ــــ لم"

اور دوسرے لمحے نیلم کی سہیلی دروازے پر آگئی۔ ساجے کے زخمی دماغ نے ایک اور تازہ زخم کھایا۔ درد کے رُکے ہوئے سیلاب میں بھیگی ہوئی آواز پھڑپھڑائی۔

"وارو ــــ"

اور وارو نے دروازے کی چوکھٹ کو مضبوطی سے پکڑ کر گرنے سے بچتے ہوئے حیرت آمیز مُردہ لہجے میں کہا۔

"ساجا!"

نیلم نوری بن کر تھرا گئی۔ اُس کے رونگٹے اُس کے جسم پر دوڑنے لگے۔ اُس کے جسم سے تارے ٹوٹ ٹوٹ کر گہرائیوں کی طرف بھاگنے لگے اور جب نوری کو یقین ہوگیا کہ وہ عنقریب کسی بھیانک چٹان سے ٹکرا کر فنا ہو جائے گی تو اس کے خشک گلے اور خشک ہونٹوں سے ایک دل ہلا دینے والی چیخ نکلی۔ اور پلنگ کے بیک سے ٹکرا کر فرش پر گر پڑی۔

"بھیّا ــــ بھیّا ــــ یہ کیا ــــ میرے اللہ ــــ میرے اللہ"

ساجا کالے ٹرنک پر پتھر بن گیا۔ اُس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں کے سامنے انڈمان کے قیدی انسانی دماغوں کے پتھروں کو ہتھوڑوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر رہے تھے۔ رنگ برنگے دُھندلکوں اور روشنی کے چھوٹے دھبوں کے درمیان ہگلی بہہ رہی تھی۔ ہگلی کی طوفانی لہروں پر ایک رکشا والا اپنی رکشا دوڑائے جا رہا تھا۔ نئے ہاوڑا برج کے پاس ایک سمندری جہاز اُس رکشا سے ٹکرا کر ڈوب گیا۔ خزاں دیدہ جنگل کے تمام پتے جھڑ کر ہگلی میں بہہ گئے۔

قرۃ العین حیدر

جلاوطن

سُندر لالہ ۔ سجے دُلالہ ۔ ناپے سری ہری کیرتن میں ۔

ناپے سری ہری کیرتن میں

ناپے

چوکھٹ پر اکڑوں بیٹھی رام رکھی نہایت انہماک سے چاول صاف کر رہی تھی ۔ اس کے گانے کی آواز دیر تک نیچے گئو والی سنسان گلی میں گونجا کی ۔ پھر ڈاکٹر آفتاب رائے صدر اعلیٰ کے چبوترے کی اور سے بڑے پھاٹک کی سمت آتے دکھلائی پڑے ۔

" بندگی بھیّن صاحب ــــــ " رام رکھی نے گھونگھٹ اور زیادہ طویل کر کے آواز لگائی ۔

" بندگی ــــــ بندگی ــــــ " ڈاکٹر آفتاب رائے نے زینے پر پہنچتے ہوئے بے خیالی سے جواب دیا ۔

" راجی کھُسی ہو بھیّن صاحب ــــــ " رام رکھی نے اخلاقاً دریافت کیا ۔

" اور کیا ــــــ مجھے کیا ہوا ہے جو راضی خوشی نہ ہونگا ۔ بےشوپ ہٹا بیچ ہی سے " انھوں نے جھنجھلا کر کہا ۔

" بھیّن صاحب ناج پھٹک رہی تھی ۔ "

" تو ناج پھٹکنے کے لئے تجھے گاڑی بھر راستہ چاہیئے ۔ چل ہٹا سب چیز ــــــ "

ڈاکٹر ... نے دنیا بھر کی ڈگریاں تو لے ڈالی تھیں ۔ لیکن حالت یہ تھی کہ ذرا ذرا سی بات

تھے ۔ رام رکھی پر برستے ہوئے وہ اوپر آئے اور مونڈھے پر پیر ٹکا کر انھوں نے اپنی بہن کو آواز دی ــــــ " بجی ، دولتی ، جگہوں سے متعلق اسے کافی

جی ای ای ــــــ (چھوڑا ہے اب تک مورا بھیّن ــــــ ہیم کرن پیار سے کہا کرتیں) دالان کے آگے کھلی چھت ان بہت عمدہ ملتی تھیں ۔

ہا ۔ جہاں اُسے بیٹھنے کا تذکرہ

پر جھکی پھیلی ہوا میں سرسرا رہی تھیں ۔ شام کی گہری کیفیت موسم کی اُداسی کے ساتھ ساتھ سارے میں بکھری تھی ۔ دن بھر نیچے ہوتی تھیں ۔ اور ماما جو اتنا بڑا

کی مکھیاں بھنبھنایا کرتیں ۔ اور ہر چیز پر غنودگی ایسی چھائی رہتی ۔ " آم اب پیلے ہو چلے تھے ۔ " ٹھکرائن کی بگیا میں صبح سے ۔

رودن کرتا رہٹ چلا کرتا۔

"آوت ہیں مجتیٰ صاحب ــــــ" ہیم کرن نے دالان کا پیتل کے نقش و نگار والا کواڑ کھولتے ہوئے غلے کے گودام میں سے باہر آکر جواب دیا۔ اور کنجیوں کا گچھا ساری کے پلو میں باندھ کر چمن سے پشت پر پھینکتی ہوئی منجھی میں آگئیں۔

"بے رام جی کی مجتیٰ صاحب ــــــ" رسوئیے نے چوکے میں سے آواز لگائی ــــــ "کٹھل کی ترکاری کھیہو مجتیٰ صاحب ــــــ؟"

"ہاں۔ ہاں۔ ضرور کھیبا بھابی ــــــ" ڈاکٹر آفتاب رائے مونڈھے پر سے ہٹ کر ٹہلتے ہوئے تلسی کے چبوترے کے پاس آگئے۔ منجھی میں رنگ برنگی مورتیاں الگ رام سے لے کر بجرنگ بلی مہاراج تک سیندور سے لپی پتی اور گنگا جل سے نہائی دھوئی قرینے سے سجی تھیں۔ ہیم کرن تھیں تو بڑی سخت رام بھگت لیکن باقی کے سبھی دیوی دیوتاؤں سے سمجھوتہ رکھتی تھیں کہ نہ جانے کون کس سمے آڑے آجائے۔ سب سے بنائے رکھنی چاہیئے ابھی سری رما کانت کھیل کے میدان سے لوٹیں گے۔ آٹھ بجے کتھا کتھک کے توڑے سیکھ کر جمنا مہراج کے ہاں سے واپس آئے گی۔ پھر چوکے میں کھانا پروسا جائے گا۔ دیتل کے برتن ٹھنڈی چاندنی میں جھلملائیں گے۔ نیچے آنگن میں رام رکھی کوئی کجری شروع کر دے گی) یہاں پر بالآخر امن تھا۔ اور سکون۔

اب کیم نیچے پکّے گلیارے میں سے چلتی ہوئی اُوپر آرہی تھی۔ ٹھکرائن کی بگیا میں سے ابھی اُس نے کرندے اور کمرکھیں اور مکرہ توڑ کر جلدی جلدی مُنہ میں ٹھونسے تھے۔ دھاکہ داوھی ناکت تا ــــــ دھاکر دا ــــــ ارے باپ رے۔۔ اس نے منڈیر پر سے اوپر جھانک کر دمینتی سے کہا ــــــ ماما آئے ہیں۔ بھاگ جا ورنہ ماما مجھے ماریں گے کہ ہر سمے کھیلتی ہے ــــــ دمینتی بھاگ گئی)

کیم جھپٹ پر آئی۔ لمبے سے ڈھیلے ڈھالے فراک میں ملبوس جس پر موتیوں سے خوب تتلیاں اور پھول پتے بنے تھے۔ خوب کھینچ کر بالوں کی مینڈھیاں گوندھے، ہاتھوں میں چھنا چھن چوڑیاں بجاتی کیم دتی رائے زادہ اپنے اتنے پیارے اور اتنے سندر ماما کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئی۔

"نمستے ماما ــــــ ابھی کتاب لاتی ہوں بس ذرا منہ ہاتھ دھو آؤں ــــــ"

"چل چڑیل ــــــ بہانے باز ــــــ سبق سُنا پہلے ــــــ" ڈاکٹر آفتاب رائے نے پیار سے کہا (لیکن یہ کچھ تجربہ انہیں تھا کہ اپنے سے کم عمر لوگوں سے اور کنبے برادری والوں سے یہ گھر گرہستی اور لاڈ پیار کے مکالمے وہ زیادہ کامیابی سے ادا نہ کر پاتے تھے)

"تجھے تو میں انٹرمیڈیٹ میں بھی حساب دلاؤں گا۔ دیکھتی جا ــــــ" (انھوں نے پھر ماما بننے کی سعی کی)

"ارے باپ رے ــــــ!!" کیم نے مصنوعی خوف کا اظہار کیا۔

"اور تو نے چوڑیاں تو بڑی خوبصورت خریدی ہیں ری ــــــ"

"ہی ہی ہی ــــــ ماما ــــــ" کیم نے دلی مسرت سے اپنی چوڑیوں کو دیکھا۔

"ساری بھی تو پہنا کر، کہ فراک ہی پہنے پھرے گی ــــــ باؤلی سی ــــــ" (انھوں نے اپنی بزرگی کا احساس خود اپنے اوپر کو ہتھوڑوں سے ٹھکڑے ٹکڑے

ہگلی کی طوفانی لہروں کے ہم کیہم ہیں وہ ساریاں جھما جھم کرتی کوند گئیں۔ جو ماں کے صندوقوں میں ٹھنسی تھیں۔ وہ تو خدا سے چاہتی تھی کہ کل سے ٹکرا کر ڈوب گریاں پہن ڈالے بلکہ ہیم کرن ہی پر انگریزیت سوار تھی۔ ایک تو وہ یہ تہیں بھولی تھیں کہ تھیں تو وہ جونپور کے اس ٹھیٹھ برا گھرانے کی بٹیا ــــــ پر ان کا بیاہ ہوا تھا۔ الہ آباد کے اتنے فیشن ایبل کنبے میں جس کے سارے افراد سول لائنز میں نے پہلے پہنے کھانا کھاتے تھے۔ اور مسلمانوں کے ساتھ بیٹھ کر چار پانی پیتے تھے۔ اور گو دھوا ہوئے ان کو اب سات

برس ہونے آئے تھے اور تب سے وہ میکے ہی میں رہتی تھیں۔ لیکن محلے پہ اُن کا رعب تھا۔ کیونکہ وہ الہ آباد کے رائے زادوں کی بہو تھیں —— دوسرے یہ کہ یہ فراک کا فیشن ڈاکٹر سین گپتا کے ہاں سے چلا تھا۔ ڈاکٹر سین گپتا ضلع کے سول ہسپتال کے اسسٹنٹ سرجن تھے۔ اور ہسپتال سے متصل ان کے پیلے رنگ کے احاطہ سے مکان کے سامنے ان کی پانچوں بیٹیاں رنگ برنگے فراک پہنے دن بھر اودھم مچایا کرتیں۔ شام ہوتی تو آگے آگے ڈاکٹر سین گپتا دھوتی کا پلا نہایت نفاست سے ایک انگلی میں سنبھالے، ذرا پیچھے اُن کی بی بی سُرخ کنارے والی سفید ساری پہنے، پھر پانچوں کی پانچوں لڑکیاں سیدھے سیدھے بال کندھوں پر بکھرائے چلی جا رہی ہیں۔ ہواخوری کرنے۔ اُفوہ۔ کیا ٹھکانہ تھا بھلا۔ بس سر بنگالی گھرانے میں یہ لڑکیوں کی فوج دیکھ لو۔ ہیم کرن کو ڈاکٹر سین گپتا سے بڑی ہمدردی تھی۔ کیمم کی ان سب سے بہت گھٹتی تھی خصوصاً مونیرا سے۔ اور اسکول کے ڈراما کے دنوں میں تو بس کیمم اور مونیرا ہی سب پہ چھائی رہتیں۔ کیا کیا ڈرامے مہادیوی کنیا پاٹھ شالہ نے نہ کر ڈالے —— نل دمینتی —— اور شکنتلا ہرِیش چندر" اور" راج رانی میرا ——" اور اوپر سے ڈانس الگ —— گر جا بھی ہو رہا ہے کر آ تیرے گنگا پار تیرے جمنا بیچ میں ٹھاڑے ہیں نند لال —— اور وہ آپ کا خدا بھلا کرے رادھا کرشنا ڈانس بھی یعنے کہ میں تو گر دھر آگے ناچوں گی —— جی ہاں۔ اور وہ گگری والا ناچ بھی موجود ہے کہ چلو چلو سکھی سکھیاری ری چلو پنگھٹ بھروا پانی —— اور ساتھ ساتھ مونیرا سین گپتا ہے کہ فراٹے سے ہارمونیم بجا رہی ہے۔

ایسے ہونے کو تو مسلمانوں کا بھی ایک اسکول تھا۔ انجمن اسلام گرلز اسکول —— وہاں یہ سب ٹھاٹھ کہاں۔ بس بارہ وفات کی بارہ وفات میلاد شریف ہو جایا کرتا اور اس میں کھڑے ہو کر لڑکیوں نے خاصی بے سُری آوازوں میں پڑھ دیا۔

تم ہی فخرِ انبیا ہو۔ یا نبی سلام علیکا —— چلیئے قصّہ ختم۔ ایک مرتبہ ایک سرپھری ہیڈ مسٹرس نے جو نئی نئی لکھنؤ سے آئی تھی۔ "روپ متی باز بہادر" خواتین کے سالانہ جلسے میں اسٹیج کروا دیا تو جناب عالی لوگوں نے اسکول کے پھاٹک پر پکٹنگ کر ڈالی —— اور روزنامہ صدائے حق نے پہلے صفحے پر جلی حروف میں شائع کیا۔

ملتِ اسلامیہ کی غیرت کا جنازہ ——

گرلز اسکول کے اسٹیج پر نکل گیا۔

مسلمانو! تم کو خدا کے آگے بھی جواب دینا ہوگا —— بنات اسلام کو رقص و سرود کی تعلیم —— اسکول کو بند کرو ——

(یہ سب قصّے کیمم کی مسلمان سہیلی کشوری اسے سنایا کرتی تھی جو پڑوس ہی میں رہتی تھی۔ صدرِ اعلیٰ کے چبوترے کے آگے والے مکان میں۔ وہ اسلامیہ گرلز اسکول میں پڑھتی تھی۔ اس کا بڑا بھائی اصغر عباس امرتین اور رماکانت کے ساتھ ہاکی کھیلنے آیا کرتا تھا۔ ویسے پڑھتے وہ لوگ بھی الگ الگ تھے۔ امرتین اور رماکانت ڈی اے وی کالج میں تھے۔ اصغر عباس فیض الاسلام کنگ جارج انٹر کالج میں۔

"کیوں رمی —— ایف اے کرنے کہاں جائے گی۔ جولائی آ رہی ہے۔ بنارس جائے گی یا لکھنؤ ——" ڈاکٹر آفتاب رائے نے چوک کے میں بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

اب یہ ایک ایسا ٹیڑھا اور اچانک سوال تھا جس کا جواب دینے کے لئے کیمم وقتی ہرگز تیار نہ تھی۔ دونوں جگہوں سے متعلق اسے کافی انفرمیشن حاصل تھی۔ لیکن دو ٹوک فیصلہ وہ فی الحال کسی ایک کے حق میں نہ کر سکتی تھی۔ بنارس میں ایک تو یہ کہ چوڑیاں بہت عمدہ ملتی تھیں۔ لیکن لکھنؤ کو بھی بہت سی باتوں میں فوقیت حاصل تھی۔ مثلاً سینما تھے۔ اور دس سینماؤں کا ایک سینما تو خود دھیلا دوالا تھا۔ جہاں اُسے بھیجنے کا تذکرہ ماما نے کیا تھا۔ پر وہ غالباً اسے بہرصورت ہر جگہ کرنا تھا۔ تانگے پر پردہ یہاں بھی ہیم کرن اپنے اور اس کے لئے بندھواتی تھیں۔ اور ماما جو اتنا بڑا ڈنڈا لئے سر پہ موجود تھے۔

یہ ماما اس کے آج تک پتے نہ پڑے۔ ولایت سے اَن گنت ڈگریاں لے آئے تھے۔ یونیورسٹی میں پروفیسری کرتے تھے۔ تاریخ پہ کتابیں لکھتے تھے۔ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ چوں چوں کا مربہ تھے کیسم کے ماما۔

رہے رما کانت اور بیرین۔ تو رما کانت تو شاعر آدمی تھا۔ سارے مقامی مشاعروں میں جاکر دو غزلے سہ غزلے پڑھ ڈالتا۔ اور حضرت ناشاد جونپوری کے نام نامی سے یاد کیا جاتا۔ بیرین اس کے برعکس بالکل انجینئر تھا اس سال وہ بھی انٹر کرکے بنارس انجینئرنگ کالج چلا جائے گا۔ باقی کے سارے کنبے برادری کے بہن بھائی یونہی بکواس تھے۔ اس سلسلے میں اس کی گوئیاں کشوری یعنی کشور آرا بیگم کے بڑے ٹھاٹھ تھے اس کے بےشمار رشتے کے بھائی تھے۔ اور سب ایک سے ایک سورما۔ یہاں کسی کے سورما پنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کسی نے آج تک اس سے یہ نہ کہا کہ چل کیسم تجھے سرکس یا نوٹنکی ہی دکھلا دیں ـــ ۔ (نوٹنکی کے دنوں میں رسوا تک لہک لہک کر گاتا ـــ اب ہی ہے ہیں نے ٹھانی ـــ لاؤں گا نوٹن کی رانی ـــ) کہاں کشوری کے ماجد بھائی ہیں تو اس کے لئے لکھنؤ سے چوڑیاں لئے چلے آتے ہیں۔ اکرام بھائی ہیں تو کشوری ان کے لئے جھپا جھپ پُل اوور بُن رہی ہے۔ اشفاق بھائی ہیں تو کشوری کو بیٹھے انگریزی شاعری پڑھا رہے ہیں۔ ان بھائیوں اور کیسم کے بھائیوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ کہاں کی چوڑیاں اور پل اوور۔ یہاں تو جوتیوں میں دال بٹتی تھی۔

ہیم کرن کو گھر کے کام دھندوں ہی سے فرصت نہ ملتی۔ آفتاب رائے ان کے لئے بڑا سہارا تھے۔ وہ ہر تیسرے چوتھے مہینے لکھنؤ سے آکر مل جاتے۔ رہنے والے ان کے بھتن صاحب جونپور ہی کے تھے۔ پر یہاں اُن کی کسی سے ملاقات نہ تھی۔ ضلع کے روسا اور مقامی عمائدین شہر میں ان کا شمار تھا۔ پر آپ کا خیال اگر یہ ہے کہ ڈاکٹر آفتاب رائے جونپور کے اُن معززین کے ساتھ اپنا وقت خراب کریں گے تو آپ غلطی پر ہیں۔ حکام سے اُن کی کبھی نہ بنی۔ انٹلکچوئیل آدمی تھے۔ ان سول سروس اور پولیس والوں سے کیا دماغ سوزی کرتے۔ جگن ناتھ جین آئی سی ایس جب نیا نیا حاکم ضلع ہوکر آیا تو اس نے کئی بار ان کو کلب میں بلا بھیجا۔ پر یہ ہرگز نہ گئے۔ رئیس الدین کاظمی ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج نے دعوت کی۔ اس میں بھی نہ پہنچے۔ اور تو اور ولایت واپس جاتے وقت مسٹر چارلس مارٹن نے کوئین وکٹوریہ گورنمنٹ انٹر کالج کی پرنسپل شپ پیش کی۔ لیکن کیسم کے ماما نے اسے بھی رد کر دیا۔ یوں تو خیر کانگریسی وانگریسی ہونا کوئی خاص بات نہیں۔ شہر اور قصبہ جات کا ہر ہندو جو سرکاری ملازم نہ تھا۔ گھر پہ ترنگا لگاتا تھا۔ اور ہر مسلمان کے اپنے درجنوں مشغلے تھے۔ احرار پارٹی تھی۔ شیعہ کانفرنس تھی۔ ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی میں مسلمان بھرے ہوئے تھے۔ مسلم لیگ کا تو خیر اس وقت کسی نے نام بھی نہ سنا تھا۔ پر بہت سے مسلمان اگر انصاف کی پوچھئے تو کچھ بھی نہ تھے یا تو شاعری کرتے تھے۔ یا مجلسیں پڑھتے تھے۔

تو کہنے کا مطلب یہ کہ کوئی ایسی تشویشناک بات نہ تھی۔ پر ڈاکٹر آفتاب رائے کی زیادہ تر لوگوں سے کبھی نہ پٹی۔ اے صاحب یہاں تک سُنا گیا ہے کہ تریپورہ کانگریس کے موقع پر انھوں نے سب کو کھری کھری سُنا دیں۔ گو یہ راوی کو یاد نہیں کہ انھوں نے کیا کہا تھا۔

ضلع کی سوسائٹی جن عناصر پر مشتمل تھی۔ انھیں سے ڈاکٹر آفتاب رائے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ وسط شہر میں مہاجنوں، ساہوکاروں اور زمینداروں کی اونچی حویلیاں تھیں۔ یہ لوگ سرکاری فنڈوں میں ہزاروں روپیہ چندہ دیتے۔ اسکول کھلواتے، مجرے اور مشاعرے اور دنگل کرواتے۔ جلسے جلوس اور سرپھٹول بھی ان ہی کی زیر سرپرستی منعقد ہوتے۔ ہندو مسلمانوں کا معاشرہ بالکل ایک تھا۔ وہی تیج تہوار۔ میلے ٹھیلے۔ محرم بالے میاں کی برات۔ پھر اس سے اونچی سطح پہ وہی مقدمے بازیاں۔ موکل۔ گواہ۔ پیشکار، سمّن۔ عدالتیں۔ صاحب لوگوں کے لئے ڈالیاں۔

شہر کے باہر ضلع کا ہسپتال تھا۔ لق و دق ہری گھاس کے میدانوں میں بکھری ہوئی اداس پیلے رنگ کی عمارتیں۔ کچے احاطے۔ نیم کے درختوں کی چھاؤں میں آؤٹ ڈور مریضوں کے ہجوم۔ گرد آلود یکوں کے اڈے۔ سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے دو دو آنے میں خط لکھ کر دینے والے بہت بوڑھے اور شکستہ حال منشی، جو دھاگوں والی عینکیں لگائے دھندلی آنکھوں سے راہگیروں کو دیکھتے۔ پھر گلیاں تھیں جن کے

گموں کے فرش پر پانی بہتا تھا۔ سیاہی مائل دیواروں پر کوئلے سے اشتہار لکھے تھے ——— حکیم مادر کہ دھاگہ خرید یے۔ پرتی برانڈ بیڑی پیو۔ ایک پیسہ باپ سے لو ——— چارہ جا کر ماں کو دو ——— آگیا۔ آگیا۔ آگیا ——— سال رواں کا سنسنی خیز فلم "لری راجہ ہر" آگیا۔ جس میں مس نیتا داھوری کام کرتی ہے ———

پھر سایہ دار سڑکوں کے پرے آم اور مولسری میں چھپی ہوئی حکام ضلع کی بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں۔ انگریزی کلب تھا۔ جس میں بے اندازہ خنکی ہوتی۔ چپ چاپ اور سائے کی طرح چلتے ہوئے مؤدب اور شائستہ "بیرے" انگریز اور کالے صاحب لوگوں کے لئے ٹھنڈے پانی کی بوتلیں اور برف کی بالٹیاں لا کر گھاس پر رکھتے، نیلے پردوں کی قناتوں کے پیچھے ٹینس کی گیندیں سبزے پر لڑھکتی رہتیں۔

(۲)

اور سول لائنز کی اس دُنیا میں اُوپر سے آئی کنول کماری جین جگن ناتھ جین آئی سی ایس کی بالوں کٹی بیوی جس نے لکھنؤ کے مشہور انگریزی کالج ازابلا تھوبرن میں پڑھا تھا اور جو گیند بلا کھیلتی تھی۔ کلب میں بڑی چہل پہل ہوگئی ——— گنتی کی کل تین تو میمیں ہی تھیں کلب میں۔ کوئین وکٹوریہ گورنمنٹ انٹر کالج کے انگریز پرنسپل کی میم ایک۔ زنانہ ہسپتال کی بڑی ڈاکٹرنی میم مس بک کنزی دو۔ اور اے پی مشن گرلز ہائی اسکول کی بڑی استانی مس سالفرڈ جو جُتی جتیا میم کہلاتی تھی کیونکہ وہ پیر جلاتی بہت تھی۔ ان تین کے علاوہ ڈاکٹرنی میم کی چھوٹی بہن مس اولیو مک کنزی تھی۔ جو اپنی بہن سے ملنے نینی تال سے آئی ہوئی تھی۔ اور ضلع کے غیر شادی شدہ حکام کے ساتھ ٹینس کھیلنا اس کا خاص مشغلہ تھا اور اس میں ایسا کچھ اس کا جی لگا تھا کہ اب واپس جانے کا نام نہ لیتی تھی۔ شام ہوتے ہی وہ کلب میں آن موجود ہوتی اور وہ مسٹر سکسینہ اور وہ مسٹر فرحت علی۔ اور وہ مسٹر پانڈے۔ سبھی تو اس کے چاروں طرف کھڑے دانت نکوسے ہنس رہے ہیں۔ اس ایک مس بانے بھائی لوگوں کو نگنی کا ناچ نچا رکھا تھا۔ باقیماندہ حضرات بھی کہتے تھے کہ میاں کیا مضائقہ ہے۔ جو نپور ایسی ڈل جگہ پر مس مک کنزی کا دم ہی غنیمت جانو۔ اب غور کرنے کا مقام ہے کہ مس شبیرہ حمایت علی جو دوسری لیڈی ڈاکٹر تھیں۔ ان کا تو نام سن کر ہی جی بیٹھ جاتا تھا۔ مگر وہ خود بیچاری بڑی اسپورٹنگ آدمی تھیں۔ برابر جی داری سے ٹینس کھیلنے آیا کرتیں۔ لکھنؤ کے کنگ جارجز کی پڑھی ہوئی تھیں۔ لندن جا کر ایک ڈبلیو ماسی مار لائی تھیں لیکن کیا مجال جو کبھی بد دماغی دکھلا جاویں۔ لوگ کہتے تھے۔ صاحب بڑی شریف ڈاکٹرنی ہے۔ بالکل گئے سمجھیے۔ گائے۔ جی ہاں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ آپ یہ توقع کریں کہ ہر لیڈی ڈاکٹر افسانوں اور ناولوں کی روایت کے مطابق بالکل حور شمائل، مہوش، پری پیکر ہو۔ اچھی آدمی کا بچہ تھیں۔ بلکہ ایک مرتبہ تو ڈسٹرکٹ جج مسٹر کاظمی کی بیگم صاحب نے مسٹر فرحت علی سے تجویز بھی کی تھی۔ کہ بھیا آزادی کا زمانہ ہے مس شبیرہ ہی سے بیاہ کر لو۔ یہ جو سال کے سال چھٹیوں میں تمہاری اماں تمہیں لڑکیاں دیکھنے کے لئے نینی تال، مسوری بھیجا کرتی ہیں۔ اس دردِ سر سے بھی نجات ملے گی ادھر کیا۔

راوی کہتا ہے کہ فرحت علی نے جو ان دنوں بڑے معرکے کا سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا۔ بیگم کاظمی کے سامنے کان پکڑ کر اٹھک بیٹھک کی تھی۔ اور تھر تھر کانپا تھا۔ اور دست بستہ یوں گویا ہوا تھا کہ آئندہ وہ مس شبیرہ حمایت سے جو گفتگو کرے گا۔ وہ صرف چار جملوں پر مشتمل ہوگی ———
آداب عرض۔ آپ اچھی طرح سے ہیں؟ جی ہاں میں بالکل اچھی طرح ہوں۔ شکریہ۔ آداب عرض۔

مصیبت یہ تھی کہ جہاں کسی شامت کے مارے نے کسی "غیر منسلک" خاتون محترم سے سوشل گفتگو کے دوران میں ان چار جملوں سے تجاوز کیا تو بس سمجھ لیجئے ایکیوٹ ہوگئی۔

تو عرضیکہ راوی دریا کو یوں کوزے میں بند کرتا ہے کہ کنول کماری کے میاں کا تقرر اس جگہ پر ہوا۔ انگریز حاکموں کی اصطلاح میں صوبے

کا ضلع "اسٹیشن" کہلاتا تھا)

اور نئے حاکمِ ضلع کے اعزاز میں کنور نرنجن داس رئیسِ اعظم جونپور نے (کہ یہ سارا کا سارا ایک نام تھا) اپنے باغ میں بڑی دھوم کی دعوت کی۔ چبوترے پر زرنگار شامیانہ تانا گیا۔ رات گئے تک جلسہ رہا۔ بیبیوں کے لئے اندر علیٰحدہ دعوت تھی۔ معززیوں نے کیا کیا کھانے نہ بنائے۔ مسلمان مہمانوں کے لئے باؤلے ڈپٹیوں کے وہاں سے باورچی بلوائے گئے تھے (باؤلے ڈپٹیوں کا ایک خاندان تھا۔ جس میں عرصہ ہوا ایک ڈپٹی صاحب کا دماغ چل گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ پورا خاندان باؤلے ڈپٹیوں کا گھرانہ کہلاتا تھا۔ کہار آواز لگاتے۔ اجی باؤلے ڈپٹیوں کے ہاں سے سواریاں آئی ہیں اترواؤ مہریوں سے کہا جاتا ارے باؤلے ڈپٹیوں کے ہاں نیوتہ دینے آتاری رام رکھی جھاڑو پیٹی)

ہیم کرنی ایسے تو کہیں آتی جاتی نہ تھیں۔ پر رانی نرنجن داس کی زبردستی پہ وہ بھی دعوت میں آگئی تھیں۔ کلکٹر کی بیوی، سے ملنے کیلئے، عمائدین شہر کی بیویوں نے کیا کیا جوڑے نہ پہنے تھے۔ لیکن جب خود کنول کماری کو دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ تو پوری میم ہے۔ غضب خدا کا ہاتھوں میں چوڑیاں تک نہ تھیں۔ ناک کی کیل تک نہ تھی چہرے بھاڑ میں ہلکے نیلے رنگ کی ساری سی پہنے گاؤ تکئے سے ذرا ہٹ کر بیٹھی وہ سب سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتی رہی۔

"اے بیٹیا تم نے تو سہاگ کی نشانی ہی کو جھاڑو پیٹے فیشن کی بھینٹ کر دیا" صدرِ اعلیٰ کی بیگم نے ناک پہ انگلی رکھ کر اس سے کہا۔

"اے ہاں سچ تو ہے۔ کیا ڈنڈا ایسے ہاتھ لئے بیٹھی ہو۔ دور پار رچھائیں بھوئیں دیکھے ہی سے ہول اٹھتا ہے" بیگم کاظمی نے بھی صاد کیا۔

کیمپ کی تو بہ حال، آج عید تھی۔ اس نے تیز جامنی رنگ کی بنارسی ساری باندھی تھی۔ پاؤں میں رام جھول پہنے تھے۔ سونے کی کردھنی اور دوسرے سارے گہنے بانتے علیٰحدہ گلے میں ان کا چمپکا اور منگ کشوری بھی پہن آئی تھی۔ لیکن کشوری کی اماں (جو محلے میں بڑی بھاوج کے نام سے یاد کی جاتی تھیں) بن بیاہی لڑکیوں کے زیادہ سنگار پٹار کی قطعی قائل نہ تھیں۔ ان کے یہاں تو لڑکیاں باکیاں مانگ تک بالوں میں نہ کاڑھ سکتی تھیں۔ پر اب زمانے کی ہوا کے زیرِ اثر نئی پود کی لڑکیوں نے سیدھی اور آڑی مانگیں کاڑھنی شروع کر دی تھیں۔ کیمپ دور سے بیٹھی کنول کماری کو دیکھتی رہیں۔ کتنی سندر ہے۔ اور پھر ایم اے پاس۔ ایم اے پاس لڑکی کیمپ اور کشوری کی نظروں میں بالکل دیوی دیوتا کا درجہ رکھتی تھی۔

کنول کماری جین ساری مہمان بیبیوں سے ہنس ہنس کر سخت خوش اخلاقی سے گفتگو کرنے میں مصروف تھی (اور ساری حاضرات محفل نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ لڑکی سابق کلکٹر کی بیوی اس چڑیل مسز بھارگو سے کہیں زیادہ اچھی اور ملنسار ہے۔ رانی بٹیا ہے بالکل)

دالان کے گملوں کی اوٹ میں کیمپ اور کشوری بیٹھی تھیں۔ اور منٹ منٹ پر ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوئی جاتی تھیں۔ اب ایک بات ہو تو بتلائی جائے۔ دسیوں تھیں۔ مثلاً موتی مصرانی کی چال ہی دیکھ لو۔ اور اوپر سے کنور نرنجن داس صاحب خانہ کی اسٹیٹ کے منیجر صاحب لالہ گنیش جہانے بار بار ڈیوڑھی میں آن کر للکارتے ۔۔۔ "اجی پردہ کر لو کہار اندر آ رہے ہیں" تو ان کے حلق میں ایسی آواز نکلتی جیسے ہارمونیم کے پردوں کو برساتی ہوا مار گئی ہو۔

اب کے سے جب ماما لکھنؤ سے گھر آئے تو کیمپ نے دعوت کی ساری داستان ان کے گوش گزار کر دی کنول کماری ایسی۔ اور کنول کماری ویسی! ماما چپکے بیٹھے سنتے رہے۔

(۳)

کیمپ جب رات کا کھانا کھا کر سونے چلی گئی۔ اور سارے گھر میں خاموشی چھا گئی تو ڈاکٹر آفتاب رائے چھت کی منڈیر پہ آکر کھڑے ہو گئے۔ باغ اب سنسان پڑے تھے۔ گرمیوں کا موسم نکلتا جا رہا تھا۔ اور گلابی جاڑے شروع ہو گئے تھے۔ پروائی ہوا آہستہ آہستہ بہہ رہی تھی۔ نیچے

شکرائن کی بگیا والی گلی کے برابر سے مسلمانوں کا محلہ شروع ہوتا تھا۔ اس کے بعد بازار تھا جس میں مدھم گیس اور لالٹین کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ پھر پولیس لائنز کے میدان تھے۔ اس کے بعد کچہری اور سول لائنز۔

سول لائنز میں حاکم ضلع کی بڑی کوٹھی تھی جس پر یونین جیک جھٹ پٹے کی نیم تاریکی میں بڑے سکون سے لہرا رہا تھا۔ سارے میں ہلکی ہلکی خاموشی چھائی تھی۔ سامنے سلطان حسین شرقی کے زمانے کے اونچے پھاٹک اور مسجدوں کے بلند مینار رات کے آسمان کے نیچے سات سو سال سے اسی طرح ساکت اور صامت کھڑے تھے۔ زندگی میں بے کیفی تھی۔ اور اداسی۔ اور ذلت تھی۔ اور شدید غلامی کا احساس تھا۔

عمر بھر آفتاب رائے نے یونہی سوچا تھا کہ اب وہ اور کچھ نہ کریں گے۔ لیکن دنیا موجود تھی۔ وہ کام بھی کرتے۔ کھانا بھی کھاتے۔ سال میں چار دفعہ جون پور آکر جی جی سے دماغ سوزی بھی کرتے۔ زندگی کے بھاری پن کے باوجود گاڑی تھی کہ چلے جا رہی تھی۔

کنول کماری اس منظر کے پیچھے، موسری کے جھنڈے کے دوسری طرف یونین جیک کے سائے میں براجتی تھی۔ بہت سے لوگ ہیں کہ جو رستہ سوچا اختیار کر لیا۔ آرام سے اس پر چلتے چلے گئے۔ یہاں کسی راستے کا تعین ہی نہ ہو پاتا تھا۔ ایک کے بعد ایک سب ادھر ادھر نکل گئے تھے۔ آفتاب رائے وہیں کے وہیں تھے۔

کنول کماری —— ؟ لاحول ولاقوۃ۔

"جب وہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کے لئے ولایت جا رہے تھے تو کنول نے اُن سے کہا تھا "آفتاب بہادر تم کو اپنے اوپر بڑا مان ہے۔ پر وہ مان ایک روز ٹوٹ جائے گا۔ جب میں بھی کہیں چلی جاؤں گی"۔

"تم کہاں چلی جاؤ گی۔؟"

"خوہ —— لڑکیاں کہاں چلی جاتی ہیں —— ؟!"

"گویا تمہارا مطلب ہے کہ تم بیاہ کر لو گی۔؟"

"میں خود تھوڑا ہی بیاہ کرتی پھروں گی۔ ارے عقلمند داس میرا بیاہ کر دیا جائے گا"۔ اس نے جھنجھلا کر جواب دیا تھا۔

"ارے جاؤ —— "آفتاب رائے خوب ہنسے تھے —— "میں اس جھانسے میں آنے والا نہیں ہوں۔ تم لڑکیوں کی پسند بھی کیا شے ہے۔ تم جیسی موڈرن لڑکیاں آخر میں پسند اسی کو کرتی ہیں جو ان کے سماجی اور معاشی معیار پر پورا اترتا ہے باقی سب بکواس ہے۔ پسند اضافی چیز ہے تمہارے لئے —— "

"ہاں —— بالکل اضافی چیز ہے۔ آفتاب بہادر —— " وہ غصے کے مارے بالکل خاموش ہو گئی تھی۔

وہ چاند باغ میں تھی۔ آپ بادشاہ باغ میں بڑی دھوم دھام سے براجتے تھے یونین کی پریذیڈنٹی کرتے تھے۔ تقریریں گھارتے تھے۔ ایک منٹ نچلے نہ بیٹھتے تھے۔ تاکہ کنول نوٹس نہ بھی لیتی ہو تو لے۔ وہ اے پی سین روڈ پہ رہتی تھی۔ اور سائیکل پہ روز چاند باغ آیا کرتی تھی۔ لکھنؤ کی بڑی نمائش ہوئی تو وہ بھی اپنے کنبے کے ساتھ میوزک کانفرنس میں گئی۔ وہاں یونیورسٹی والوں نے سہگل کو اپنے محاصرے میں لے رکھا تھا۔ جس گانے کی یونیورسٹی اور چاند باغ کا مجمع فرمائش کرتا۔ وہی سہگل کو بار بار گانا پڑتا۔ بھائی آفتاب بھی شور مچانے میں پیش پیش۔ لیکن اگلی صف میں کنول کو بیٹھا دیکھ کر فوراً گست ٹپا کر چپ ہو گئے۔ اور سنجیدگی سے دوستوں سے بولے کہ یار چھوڑو کیا ہڑ مچا رکھا ہے۔ اس پر عزت نے عسکری بلگرامی سے کہا (آج ان دونوں پیارے دوستوں کو مرے بھی اتنا عرصہ ہو گیا تھا، منڈیر پہ کھڑے ہوئے آفتاب رائے کو خیال آیا) عزت نے عسکری سے کہا: استادیہ اپنا آفتاب جو ہے یہ اس لونڈیا پہ اچھا امپریشن ڈالنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہے۔ اب خداوند تعالےٰ ہی اس پر رحم کرے ——

"بی اے کے بعد تم کیا کرو گی —— ؟" ایک روز آفتاب رائے نے کنول سے سوال کیا۔

"مجھے کچھ پتہ نہیں ———" کنول نے کہا تھا۔ اس میں گویا یہ اشارہ تھا کہ مجھے تو کچھ پتہ نہیں تم ہی کوئی پروگرام بتاؤ۔
لیکن کچھ عرصے بعد وہ سیدھے سیدھے ولایت نکل لئے۔ کیونکہ غالباً اُن کی زندگی ان کے لئے۔ ان کے گھر والوں کے لئے، کنول کے وجود سے کہیں زیادہ اہم تھی۔ پھر اُن کی آئیڈیالوجی تھی۔ "یار کیا بکواس لگا رکھی ہے۔ عزت نے ڈپٹ کر کہا تھا)

پھر ایک روز لندن میں، جب وہ سینٹ ہاؤس کی لائبریری سے گھر کی اور جا رہے تھے تو راہ میں انہیں حبیبؔل نظر آیا۔ جس نے دُور سے آواز لگائی ——— "جا ہر بیٹے چلو تو ایک واقعۂ فاجعہ گوش گزار کر دوں۔ کنول کماری کا جگن ناتھ جین سے بیاہ ہو گیا۔ وہی جو سن بلٹنیں کے بیچ کا ہے ———"

لڑکیوں کی عجب بے ہودہ قوم ہے۔ اس روز آفتاب رائے اس نتیجے پہ پہنچے" ان کو سمجھنا ہمارے تمہارے بس کا روگ نہیں۔ میاں وہ جو بڑی انٹیلکچوئیل کی ساس بنی پھرتی تھی۔ ہو گئی ہو گی۔ اب گلیڈ ——— جگن ناتھ جین مائی فٹ ——— کرن تھا یہ اُلّو ——— میں نے کبھی دیکھا ہے اسے۔؟" حبیبؔل کے کمرے میں پہنچ کر آتشدان سلگاتے ہوئے انہوں نے سوال کیا۔

حبیبؔل رائے زادہ کھڑکی میں جھکا باہر سڑک کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں ٹھیلے والے کو کئی دن بھر گلا پھاڑ کر چلاتے رہنے کے بعد اب اپنے اپنے ڈکاریوں کے ٹھیلے گھسیٹتے ہوئے سر جھکائے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ شام کا دھندلکا سارے میں بکھر گیا تھا زندگی بڑی اداس ہے اس نے خیال کیا تھا۔ ہاں۔ اس نے آفتاب رائے سے کہا تھا میں نے اسے پٹنے میں دیکھا تھا۔ کالا سا آدمی ہے۔ عینک لگاتا ہے۔ کچھ کچھ لومڑی سے ملتی جلتی اس کی شکل ہے۔

"بیوقوف بھی ہے ———" آفتاب رائے نے پوچھا تھا۔
"خاصا بیوقوف ہے ——— حبیبؔل رائے زادہ نے جواب دیا تھا۔
"——— پھر کنول اس کے ساتھ خوش کیسے رہ سکے گی ؟" آفتاب رائے نے حبیبؔل سے مطالبہ کیا۔
"میاں آفتاب بہادر ———" حبیبؔل نے مڑ کر ان کو مخاطب کیا ——— "یہ جتنی لڑکیاں ہیں نا ——— جو افلاطونِ زماں بنی پھرتی ہیں۔ یہ بیوقوفوں کے ساتھ ہی خوش رہتی ہیں آیا عقل میں تمہاری ——— ؟"
"کیا بکواس ہے ———" آفتاب رائے نے بڑی آزردگی سے کہا۔
اب حبیبؔل رائے زادہ کو صریحاً غصہ آ گیا۔ اس نے جھنجھلا کر کہا تھا ——— "تو میاں تم کو روکا کس نے تھا۔ اس سے بیاہ کرنے کو۔ جواب مجھے بور کر رہے ہو۔ کیا وہ تم سے خود آ کر کہتی کہ میاں آفتاب بہادر میں تم سے بیاہ کرنا چاہتی ہوں۔ اب ——— ؟ اور فرض کرو اگر وہ خود سے ہی انکار کر دیتی تو کیا قیامت آ جاتی۔ میاں لڑکی تھی یا ہوّا۔ کیا مارتی وہ تم کو جھاڑ دے کر ——— کیا کرتی ——— ؟ تم نے لیکن کہہ کے ہی نہیں دیکھی، خیر چلو ——— خیریت گذر گئی۔ اچھا ہی ہوا۔ کہاں کا جھگڑا مول لینے بیکار میں۔ کیونکہ میرا مقولہ ہے (اس نے انگلی اٹھا کر عالمانہ انداز میں کہا) کہ شادی کے چار سال بعد سب شادیاں ایک سی ہو جاتی ہیں ——— تم کو تو جگن ناتھ جین کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔ کہ اس نے تم کو ایک بارِ عظیم سے سبکدوش کیا۔ بلکہ وہ تمہارے حق میں بالکل دافع بلیات ثابت ہوا ———"
"بیہودہ ہیں آپ انتہا سے زیادہ ———" آفتاب رائے نے جھنجھلا کر کہا تھا۔

لکھنؤ لوٹ کر ایک روز آفتاب رائے اتفاقاً لے پی سین روڈ پر سے گذرے۔ سامنے کنول کے باپ کی سُرخ اینٹ کی بڑی سی کوٹھی تھی۔

جس کی برساتی پر کاسنی پھولوں کی بیل پھیلی تھی۔ یہاں ایک زمانے میں کتنا اودھم مچتا۔ کنول کے سارے بہن بھائیوں نے مل کر اپنا آرکیسٹرا بنا رکھا تھا۔ کوئی بانسری بجاتا۔ کوئی جل ترنگ۔ کنول طبلہ بجاتی۔ ایک بھائی وائلن کا استاد تھا۔ سب مل کر جے جے ونتی شروع کر دیتے۔ مورے مندر اب لوں نہیں آئے ——— کیسی چوک بھئی مو سے آئی ——— پھر ارچنا بیرجی آجاتی۔ اور کوئل ایسی آواز میں گاتی ——— آمی پُرو موڑی جھونو مانگر ٹکہ نُپو جوئے ——— نُپو جوئے ہر ——— اتوار کو دن بھر بیڈمنٹن ہوتا۔ ہر سمے تو آفتاب رائے ان لوگوں کے یہاں موجود رہتے تھے۔ اور جب ایک روز خود ہی چپکے سے ولایت کھسک لئے تو ان لوگوں کا کیا قصور۔ وہ لڑکی کو بنک کے سیف ڈپازٹ میں تو ان کے خیال سے رکھنے سے رہے اور جگن ناتھ جیسا ایسا رشتہ تو بھائی قسمت والوں ہی کو ملتا ہے۔

پھر ایک روز امین آباد میں انھوں نے کنول کو دیکھا۔ وہ کار سے اتر کر اپنی سسرال والوں کے ساتھ پارک کے مندر کی اور جا رہی تھی اور سُرخ ساری میں ملبوس تھی۔ اور ماتھا اس کے پیروں میں تھا (آئی ری ساجن کے مندر دیا بار آؤں۔ کر آؤں سولہ شرنگار ——— وہ گرمیوں کی شام تھی۔ امین آباد جگمگا رہا تھا۔ ہوا میں موتیا اور خس کی مہک تھی۔ اور مندر کا گھنٹہ یکسانیت سے بجے جا رہا تھا)۔

اب آفتاب رائے یونیورسٹی میں تاریخ کی چیئر سنبھالے ہوئے تھے۔ ساتھیوں کی محفل میں خوب اودھم مچاتے۔ ٹینس کھیلتے۔ اور صوفی ازم کی تاریخ پر ایک مقالہ لکھ رہے تھے۔ میں وہ نہیں ہوں جو میں ہوں۔ میں وہ ہوں جو میں نہیں ہوں۔ ہر چیز باقی ساری چیزیں ہیں۔ بھگوان کرشن جب ارجن سے کہتے ہیں ——— اور پرنس ارجنا ——— ڈارے جا ——— عسکری ڈانٹ بتاتا ہے: اگر تم اس جگہ بھی ہو کہ تم تنہا پروفیسر ڈی پی مکرجی کی طرح مہاگرو بن کے بیٹھ جاؤ گے تو تم غلطی پر ہو۔ ڈاکٹر آفتاب رائے۔ تمہارا تو ہم مارتے مارتے حلیہ ٹھیک کر دیں گے ——— جیپل اضافہ کرنا)۔

جونہی اگر وہ کھیم کو دیکھتے کہ تندی سے کپولو کھا رہی ہے۔ کنٹک سیکھ رہی ہے۔ جل بھرنے چلی ری گوریاں آن آن گاتی پھر رہی ہے۔ یہ بھی کنول کماری کی قوم سے ہے۔

"اری او باؤلی ——— بتا تو کیا کرنے والی ہے ———" وہ سوال کرتے۔

"پتہ نہیں ماما ———" وہ معصومیت سے جواب دیتی۔

پتہ نہیں کی بچی ——— وہ دل میں کہتے۔

چھت کی منڈیر پر ٹہلتے ٹہلتے آفتاب رائے نیم کی ڈالیوں کے نیچے آ گئے۔ سامنے بہت دور سول لائنز کے درختوں میں چھپی ہوئی حاکم ضلع کی کوٹھی میں گیس کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ پروائی ہوا بہے جا رہی تھی۔ یہ چاند رات تھی۔ اور مسلمانوں کے محلوں کی طرف سے محرم کے نقاروں کی آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

محرم آگیا ——— آفتاب رائے کو خیال آیا ——— شاید اب کے سے پھر سر پھٹول ہو۔ بہت دنوں سے نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے سوچا۔

ویسے انگریز کی پالیسی یہ تھی کہ جن ضلعوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ وہاں ہندو افسران کو تعینات کیا جاتا تھا۔ اور جہاں ہندو زیادہ ہوتے تھے۔ وہاں مسلمان حاکموں کو بھیجا جاتا تھا تاکہ توازن قائم رہے۔ یہ دوسری بات تھی کہ صوبے کی چھ کروڑ آبادی کا صرف ۱۳ فی صدی حصہ مسلمان تھے۔ لیکن اتنی شدید اقلیت میں ہونے کے باوجود تہذیبی اور سماجی طور پر مسلمان ہی سارے صوبے پر چھائے ہوئے تھے۔ جونپور، لکھنؤ، آگرہ، علیگڑھ، بریلی، مراد آباد، شاہجہان پور، وغیرہ جیسے ضلعوں میں تو مسلمانوں کی دھاک بیٹھی ہی ہوئی تھی۔ لیکن باقی کے سارے ضلعوں میں بھی

ان کا بول بالا تھا۔ صوبے کی تہذیب، اس سے مراد وہ کلچر تھا جس پہ مسلمانوں کا رنگ غالب تھا۔ گلی گلی محلے محلے گاؤں گاؤں سینکڑوں ہزاروں مسجدیں اور امام باڑے تھے۔ مکتب، مدرسے، درگاہیں، قلعے، حویلیاں۔ چپے چپے سے مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ پرانی روایات وابستہ تھیں اور لطف یہ کہ مسلمان اب تک نہیں مرے تھے۔ بڑے زور شور سے زندہ تھے۔

ہندو مسلمانوں میں سماجی سطح پہ کوئی واضح فرق نہ تھا۔ خصوصاً دیہاتوں اور قصبہ جات میں عورتیں زیادہ تر ساریاں اور ڈھیلے پاجامے پہنتیں۔ اودھ کے بہت سے پرانے خاندانوں میں بیگمات اب تک لہنگے بھی پہنتیں۔ بن بیاہی لڑکیاں ہندو اور مسلمان دونوں ساری کے بجائے کھڑے پائنچوں کا پائجامہ پہنتیں۔ ہندوؤں کے ہاں اسے "اجار" کہا جاتا۔ مشغلوں کی تقسیم بڑی دلچسپ تھی۔ پولس کا عملہ اسّی فی صدی مسلمان تھا محکمہ تعلیم میں ان کی اتنی ہی کمی تھی۔ تجارت تو خیر کبھی مسلمان بھائی نے ڈھنگ سے کر کے نہ دی۔ چند پیشے مگر خاص مسلمانوں کے تھے۔ جن کے دم سے صوبے کی مشہور صنعتیں قائم تھیں۔ لیکن خدا کے فضل و کرم سے کچھ ایسا مضبوط نظام تھا کہ سارا منافع تو بازار تک پہنچاتے پہنچاتے مڈل مین ہی مار لے جاتا تھا اور جو بھائی کے پاس بچتا تھا۔ اس میں قرضے چکانے تھے۔ بیٹی کا جہیز بنانا تھا۔ اور ہزاروں قصے تھے آپ جانئے۔

زبان اور محاورے ایک ہی تھے۔ مسلمان بچے برسات کی دعا مانگنے کے لئے منہ نیلا پیلا کئے گلی گلی ٹین بجاتے پھرتے اور چلّاتے ———— برسو رام دھڑاکے سے بڑھیا مر گئی فاقے سے۔ گڑیوں کی بارات نکلتی تو وظیفہ کیا جاتا ———— ہاتھی گھوڑا پالکی ———— جے کنہیّا لال کی۔ ذہنی اور نفسیاتی پس منظر چونکہ یکساں تھا۔ لہٰذا غیر شعوری طور پر ———— IMAGERY بھی ایک ہی تھی۔ جس میں رادھا اور سیتا اور پنگھٹ کی گوپیوں کا عمل دخل تھا۔ مسلمان پردہ دار عورتیں جنہوں نے ساری عمر کسی ہندو سے بات نہ کی تھی۔ رات کو جب ڈھولک لے کر بیٹھتیں تو ہنک ہنک کر الاپتیں ———— بھری گگری موری ڈھرکائی شام ———— کرشن کنہیا کے اس تصوّر سے ان لوگوں کے اسلام پہ کوئی حرف نہ آتا تھا۔ یہ سب چیزیں اس تمدن کی مظہر تھیں جنھیں پچھلی صدیوں میں مسلمانوں کی تہذیبی ہمہ گیری اور وسعت نظر اور ایک رچے ہوئے جمالیاتی حس نے جنم دیا تھا۔ یہ گیت اور کجریاں اور خیال، یہ محاورے، یہ زبان، ان سب کی بڑی پیاری اور دلآویز مشترکہ میراث تھی۔ یہ معاشرہ جس کا دائرہ مرزا پور اور جونپور سے لے کر لکھنؤ اور دلی تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک مکمل اور واضح تصویر تھا۔ جس میں آٹھ سو سال کے تہذیبی ارتقاء نے بڑے گمبھیر اور بڑے خوبصورت رنگ بھرے تھے۔

ڈاکٹر آفتاب رائے نے (کہ ان کا نام ہی اس مشترکہ تمدن کی لطافت کا ایک مظہر تھا) ایک بار سوچا تھا کہ وہ کبھی ایک کتاب لکھیں گے کہ کس طرح پندرھویں صدی میں بھگتی تحریک کے ذریعے ایک خوبصورت مستقبل کی بنیاد رکھی جارہی تھی۔ کس طرح نانک کا مذہب ہندوؤں کی فرقہ پرستی کے خلاف ایک پروگریسو ردِّ عمل ثابت ہو سکتا تھا۔ کس طرح انیسویں صدی کی دہابی تحریک کو غیر ملکی راج کے مقابلے میں ایک قومی محاذ بننے کے بجائے اس کا رُخ دوسری طرف موڑ دیا گیا۔ آریہ سماجیوں اور فرقہ پرستوں کو کیسے کیسے شہ دی گئی۔ یہ اور اس طرح کی سو باتیں ان کے ذہن میں آتیں۔ لیکن ذہن ہی کو مکمل سکون کہاں میسر تھا پہلے یہ کنول کماری کو دے پڑی۔ پھر ان کی معاشی مجبوریاں آڑے آئیں۔ اور ان کو ولایت سے لوٹ کر بنارس میں لیکچرر شپ سنبھالنی پڑی۔ جہاں دن رات ہندی انتھوا ہندوستانی کے گُن گائے جاتے اور رمالو یہ جی کی تصویر کے آگے آرتی اتاری جاتی ———— یہ میں تم سے کہتا ہوں ———— کہ شدھ ہندی اور گئو رکھشا، اور رام راجیہ یہ سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اس خطرے سے بچو۔ انھوں نے ایک دفعہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے پنڈال میں چلا کر کہا تھا ———— بھائی اگر یہی بات ہے تو سیدھے سیدھے مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے ———— ان سے کہا گیا ———— ہم تو ہندو پیدا ہوئے اور ہندو ہی مریں گے۔ تمہاری طرح سے تھوڑا ہی ہیں۔ ڈھلمل یقین ————

آفتاب رائے کے ساتھی مذاق میں انھیں جونپور کا قاضی کہا کرتے تھے " یہ جو کتاب تم لکھنے والے ہو اس کا نام رکھنا ———— "جونپور کا قاضی" ————

عرف "ہیں شہر کے اندیشے میں دُبلا کیوں ہُوا ———!

رات کی ہوا میں خنکی بڑھ چکی تھی۔ نیم کے پتے بڑے پُراسرار طریقے سے سائیں سائیں کر رہے تھے۔ ہاں زندگی میں بے پایاں اُداسی تھی اور ویرانہ اور تاریکی۔

محلے کے مکانوں میں مدھم روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ نیچے بڑی بھاوج کے مکان کے بڑے آنگن میں مجلس کے لئے جو گیس کا ہنڈا نصب کیا گیا تھا۔ اس کی روشنی رات کے اس ویرانے میں بڑی لرزہ خیز معلوم ہوتی تھی۔ جیسے جھوٹے کے جنگل میں اگیا بیتال اور مسان چپکے چپکے روتے ہوں۔

مجلسوں کے گریہ و بکا کی مدھم آوازیں پروائی کے جھونکوں میں رل مل کر وقفے وقفے کے بعد یک لخت بلند ہو جاتی تھیں۔ نکڑ پر کنونزتیجے کے ہاں کی محرم کی سبیل کے پاس رکھی ہوئی نوبت یکسانیت سے بجے جا رہی تھی۔

(۴)

"عاشور کی شب لیلیٰ اوے سرہانے شمع رکھ کر ——" بی مُدّن نے تکیہ پر کرم خوردہ کتاب رکھ کر پڑھنا شروع کیا ——

" ——— اے تکتی رہیں چہرۂ علی اکبر کا ——" بگن نے باریک تیز آواز میں ساتھ دینا شروع کیا۔

"اے لو دونوں کی دونوں سٹھیا گئی ہیں ——— اے بیوی چاند رات کو نویں تاریخ کے مرثیے نکال کر بیٹھ گئیں ——!" بڑی بھاوج نے باورچی خانے میں سے پکارا۔

"توبہ توبہ۔ کمبخت ایسی ساڑستی پڑی ہے کہ اب تو کچھ بھی یاد نہیں رہتا ——— اے لو میں تو عینک لانا ہی بھول گئی۔ اب مجھے کچھ سجھائی تھوڑی دے رہا تھا ——— میں نے تو اٹکل سے پڑھنا شروع کر دیا ——— اے بہن ——— اے نیازی بیگم ——— ذری اپنی عینک تو دینا ———" بُوا مُدّن نے طویل سانس بھر کے کہا۔

نیازی بیگم نے اپنی عینک اُتار کے دی جو بُوا مُدّن نے ناک کی پھننگ پر رکھ کر پھر سے بیاض کی ورق گردانی شروع کی۔

"اے بُوا مُدّن نجم الملت کی بیاض بھی لائی ہو کہ نہیں ——" بڑی بھاوج نے تخت کے پائے کے قریب آ کر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

"لڑکیوں سے پوچھئے ——— بڑی بھاوج —— نجم الملت کے نوحے تو یہی لوگ پڑھتی ہیں ——" بگن نے جواب دیا۔

"ہاں بھیا ہم تو پرانے فیشن کے آدمی ہیں۔ اب تو نوحوں میں بھی نئے راگ رنگ نکلے ہیں ———" بُوا مُدّن نے قدرے بے نیازی سے اضافہ کیا۔

یہ لڑکیوں پر صاف چوٹ تھی۔ بُوا مُدّن نے لڑکیوں کی نوحہ خوانی کو کبھی بھی بنظرِ استحسان نہ دیکھا تھا۔ کنبے اور محلے کی ساری لڑکیاں دیوار کے سہارے بڑے اسٹائل سے سیاہ جارجٹ کے دوپٹوں سے سر ڈھانپے خاموش بیٹھی تھیں۔ بُوا مُدّن کے اس طعنے کا انھوں نے ہرگز نوٹس نہیں لیا۔

"ڈولی اتروا لو ——" باہر سے رام بھروسے کی آواز آئی۔

"پردہ کر لو لوگو ——— کہار اندر آتے ہیں ———"

فیرینی کی سینی دھم سے گھڑونچی پر ٹکا کر ممولہ تیز آواز میں چلائی ——— چھمو بیگم آگئیں۔"

چھمو بیگم ڈولی میں سے اُتریں۔ اور پائینچے سمینٹ کے پانی سے لبریز نالی کو لانگنے کے ارادے سے آگے بڑھیں۔ "اللہ رکھے بڑی بھاوج کے ہاں تو ہر وقت بس بہیا سی آئی رہتی ہے۔" انھوں نے ذرا بیزاری سے کہا۔

کہیں ممولہ نے یہ سن لیا۔ "اے چھمو بیگم ——— ذری زبان سنبھال کے بات کیا کیجئے بڑی بھاوج کے دشمنوں کے گھر بہیا آوے بشیطان کے کان بہرے ——— ایسا تو میں نے آنگن کا سارا پانی سوکھتا ہے۔ اپنے ہاں نہیں دیکھتیں۔ ساری گلی کہ لیکے نوبت رائے کا تلاؤ بنا رکھا ہے۔ اِتا اِتا پانی آپکے گھر میں کھڑا رہتا ہے۔ ہاں۔" اس نے منہ در منہ جواب دیا۔

"اے بی ممولہ ——— ذری آپے میں رہنا ——— میں خود سے نہیں آگئی۔ بڑی بھاوج نے سو دفعہ بلایا کہ آکر مجلس پڑھ جاؤ ——— مجلس پڑھ جاؤ ——— میں اپنے گھر سے فالتو نہیں ہوں کہ ماری ماری پھروں۔ اور ٹکے کی ڈومنیوں کی باتیں سنوں۔ ہاں۔ لو بھائی ڈولی واپس کرو ———" چھمو بیگم نے بیچ آنگن کے کھڑے ہو کر رجز پڑھا۔

بڑی بھاوج جلدی سے اُٹھ کر باہر آئیں ——— "اے ہے ——— یہ کیا کوا نوچن مچی ہے ——— اماموں پر مصیبت کی گھڑی آن پہنچی اور تم ہو کہ کھڑی جھگڑ رہی ہو ——— چل نکل ممولہ یہاں سے ——— ڈومنی جب دیکھو تب ہی فضیحتا شروع کرتی ہے ——— آؤ چھمو بیگم جم جم آؤ ———"

ڈیوڑھی میں کہاروں نے زور سے ڈنڈا بجایا۔ "ذری پیسے تو بھجوائیے بیگم صاحب ———

رادے دیکھئے ——— ساری دیہہ دکھن لاگت ہے ——— رام بھروسے نے دیوار سے لگ کر ماتا دین کی بیڑی سلگاتے ہوئے اظہارِ خیال کیا۔ "بیسے محرم کی وجہ سے اب پیسے خوب ملیں گے۔ چہلم تک دس دس پھیرے ایک گلی کے ہوتے تھے اور ہر پھیرا تین تین پیسے۔ دور کے محلوں تک آنے جانے کے تو دو دو آنے تک ہو جاتے تھے۔ بس چاندی تھی آج کل بھائی رام بھروسے اور ان کی برادری کی۔ اور ریڑو ے جو چل رہے تھے وہ الگ۔ ریڑہ ایک طرح کا لکڑی کا کرسی نما ٹھیلہ ہوتا تھا۔ جس میں چاروں طرف پردہ باندھ دیا جاتا تھا۔ اندر دو دو تین تین سواریاں گھس پٹ کر بیٹھ جاتی تھیں۔ اور بچوں کی انگریزی پرام کی طرح پیچھے سے دھکیلا جاتا تھا۔ اور چرخ چوں کرتا ریڑہ گلیوں کے پتھریلے فرش پر بڑے ٹھاٹھ سے چلتا۔ پالکی کا کرایہ بہت زیادہ تھا۔ جیتی جھوٹ نے فی پھیرا۔ پرائیویٹ پالکی جو پہلے صدر اعلیٰ کے یہاں تھا۔

چھمو بیگم اس معرکے کے بعد ٹھمک ٹھمک چلتی آن کر چاندنی پر بیٹھ گئیں۔ اور عینک لگا کر بڑے ٹھسّے سے چاروں طرف نظر ڈالی۔ بوا مدن خود بڑی ہائی بھرو سوز خواں تھیں۔ انھوں نے کبھی چھمو بیگم کی پروا نہ کی۔

سوز ختم ہو چکا تھا۔ گوٹے کے پنکھے لگاتی بوا مدن طمانیت سے جا کر ایک کونے میں بیٹھ گئیں۔ چٹاپٹی کی گوٹ کا اودا پائجامہ اور طوطے کے پروں ایسے ہرے رنگ کا دوپٹہ اوڑھے وہ اس شان سے دیوار سے لگ کر بیٹھتی تھیں کہ دور سے معلوم ہو جاتا تھا۔ کہ ہاں یہ رام پور کی نیریاسن ہیں۔ مذاق نہیں ہے۔

چھمو بیگم ایک تو یہ کہ سیدانی تھیں۔ دوسرے یہ کہ گن منتھا کے بیاہ کے سلسلے میں ان سے جنگ ہو چکی تھی۔ لہٰذا وہ بوا مدن کو ہرگز خاطر میں نہ لاتیں۔ بوا مدن کو اگر یہ زعم تھا کہ مالکوس اور سوہنی بہاگ میں وہ سوز ایسے پڑھتی ہیں کہ مجلس میں پٹس پڑ جاتی ہے۔ تو چھمو بیگم کو بھی اپنے اوپر ناز بے جا نہ تھا کہ آٹھویں تاریخ والا میر انیس کا مرثیہ پوری راگ داری کے ساتھ ان جیسا کوئی اور نہ پڑھ سکتا تھا۔

چھمو بیگم نے تہ در تہ ریشمی غلافوں میں سے چاند رات کا بیان نکالا اور مجمع کو نہایت گھور کے دیکھا۔

لڑکیوں کا گروہ اپنی جگہ پر ذرا چوکنا ہو گیا۔ ان لڑکیوں پر فرض تھا کہ جب چھمو بیگم حدیث پڑھیں یا وعظ کریں تو یہ لوگ دوپٹے منہ میں ٹھونس کر

کھل کھل ہنسیں پہ بظاہر یہی معلوم ہوتا کہ زار و قطار رو رہی ہیں۔ اور چھمو بیگم کس قیامت کی حدیث پڑھتی تھیں کہ کہرام بپا ہو جاتا تھا۔

چھمو بیگم کے وعظ بہت موڈرن ہونے لگے تھے۔ کیا جناب کپتن صاحب بلکہ خود قبلہ جارچوی صاحب ایسے ایسے رموز و نکات، انگریزی فلسفے کے واقعۂ شہادت میں سے نہ نکال سکتے۔ جو چھمو بیگم پل کی پل دریا کو کوزے میں بند کر کے رکھ دیتی تھیں۔

"اے صاحبانِ مجلس ——— جب باری تعالیٰ نے اپنے نور کے دو حصے کیے ———" والی تمہید سے لے کر جب وہ اس کلائمکس تک پہنچتی تھیں کہ "اے بیبیو ——— جناب عباسؑ نے رو کر کہا بی بی سکینہ اٹھو ———" تو اس وقت مجلس میں نالہ و شیون سے قیامت بپا ہو چکی ہوتی تھی۔ اندر باہر سب کہتے تھے کہ ماشاءاللہ سے چھمو بیگم نے سماں باندھ دیا۔ ان کے زورِ خطابت کا یہ عالم تھا کہ منٹوں میں بات کہیں سے کہیں پہنچتی تھی۔ ابھی حضرت جبرئیل علیہ السلام کا بیان ہو رہا ہے۔ ابھی یزید ملعون کے خاندان کا ذکر آ گیا۔ جنگِ جمل کا واقعہ سنا رہی ہیں۔ سانحۂ سائنس کا موازنہ جرمن اور انگریز کی لڑائی سے بھی ہوتا جاتا ہے۔ رسالتمآبؐ کے بیان پہ جب آتیں تو کہتیں ——— بیبیو ——— میں کوئی مؤرخ کوئی تاریخ دان کوئی فلاسفہ نہیں ہوں۔ مگر اتنا جانتی ہوں اور کہے دیتی ہوں کہ ایک طرف عیسائیوں اور رومیوں کی دس لاکھ فوج تھی۔ ایک طرف جناب رسالتمآبؐ کے ساتھ صرف پندرہ آدمی تھے۔ مگر وہ گھمسان کا رن پڑا تھا کہ سارے فرشتے چرخِ اول پہ آ گئے تھے۔ اور نور کی جھاڑو سے رسالتمآبؐ کے لئے راستہ صاف کرتے جاتے تھے۔ خداوند تعالیٰ کے مسئلے پر فرماتیں ——— اے بیبیو ——— جو انگریزی داں دہریے خدا کے منکر ہیں۔ ان کا احوال مجھ سے سنو۔ اور کان کھول کے سنو ——— کہ خداوند کریم ان سب شیطانی وسوسوں اور چالوں سے واقف ہے۔ جو فرنگیوں کے علم کے ذریعے ابلیس ملعون نے تم مسلمانوں کے دلوں میں ڈال دی ہیں۔ بلکہ میں تم کو آج یہ بتانا چاہتی ہوں اے مومنو بیبیو ——— کہ قرآن حکیم کے اندر اللہ تعالیٰ نے خود انگریزی میں اپنی توحید کا ثبوت دیا ہے۔ فرماتا ہے وہ ربِ ذوالجلال کہ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ۔ اَللّٰہُ الصَّمَدُ۔ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ——— یہ وَن کیا ہے ——— ؟ وَن انگریزی میں ایک کو کہتے ہیں ——— مسئلۂ توحید سے سلسلہ کھینچ کر پھر واقعۂ کربلا اور شہادتِ علی اکبرؑ سے ملا دیا جاتا۔ یہ چھمو بیگم کے آرٹ کا کمال تھا۔

بڑی بھاوج کیا سارے محلّے کو معلوم تھا کہ چھمو بیگم خاصی فراڈ ہیں۔ لیکن ان کی شمولیت کے بغیر مجلس میں جان ہی نہ پڑ سکتی تھی۔ لہٰذا ان کی بد مزاجی کو بھی برداشت کیا جاتا۔

برسوں سے، جب سے بڑی بھاوج پیدا ہوئیں، بڑی ہوئیں، رخصت ہو کر بارہ بنکی سے جونپور آئیں۔ زندگی کا ایک چلن قائم تھا جس میں شادی بیاہ تیج تہوار، لڑائی جھگڑے، محرم، کونڈے جوگی رمپورے کی سالانہ زیارت، غرضیکہ ہر چیز کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم تھی۔ ڈپٹی جعفر صاحب سے بڑی دھوم دھام سے ان کا بیاہ رچایا گیا تھا۔ جب وہ پندرہ سال کی تھیں۔ کیا زمانے تھے۔ دو میل لمبا تو ماہی مراتب ہی تھا۔ براتیوں کو چاندی کی طشتریوں میں سندیلے کے لڈو بانٹے گئے تھے اور جناتیوں یعنی لڑکی کے گاؤں والوں کے یہاں ہفتوں مہینوں پہلے سے ڈھولک رکھ دی گئی تھی۔ ان کا میکہ و سسرال دونوں طرف سے ماشاءاللہ سے بھرا پرا کنبہ تھا۔ بس ایک چھوٹی اماں ہی سے ان کی نہ بنی۔ دیورانی جیٹھانی کا دیوار بیچ گھر تھا۔ لیکن مدتوں کھڑکی میں تالا پڑا رہا۔ مقدمہ کا قصہ دراصل امام باڑے والے آموں کے باغ سے چلا تھا بعد میں رفتہ رفتہ دونوں بھائیوں کے گھرانوں میں بول چال تک بند ہو گئی۔ سچ کہا ہے کہ بڑا کہ زر، زمین، زن، تین چیزیں گھر کا گھر وا کر دیتی ہیں۔ سگے بھائی غیر ہو جاتے ہیں۔ پر جب چھوٹی اماں بیمار پڑیں تو بڑی بھاوج نے وضعداری پہ حرف نہ آنے دیا اور مرنے سے پہلے دیورانی نے ساری اگلی پچھلی شکایتوں کو بھول کر کہا سنا معاف کروا لیا۔ اس پہ بھی کہنے والوں کا بھی منہ کس نے بند کیا ہے محلّے میں اڑ گئی کہ یہ چھوٹی اماں اپنے محلّے کی کوٹھڑی میں سونے کی مہریں دفن کئے بیٹھی تھیں۔ یہ ان کو حاصل کرنے کی ترکیبیں تھیں۔ پوچھو بڑی بھاوج کے پاس خدا کا دیا خود کیا کچھ نہ تھا۔ جو وہ ایسے کمینے خیالات دل میں لاتیں۔ اور اصلیت یہ ہے کہ چھوٹی اماں کی وہ سونے کی مہروں والی جھجھری جس پہ وہ عمر بھر مایا کا سانپ بنی بیٹھی

رہیں۔ اُودت کے مال سے بھی بدتر ثابت ہوئی۔ لڑکوں نے لے کر سارا پیسہ دو سال کے اندر اڑا دیا۔ بلکہ بڑا محمدؔن تو بیقین محکم کے ساتھ کہتی تھیں کہ چھوٹی اماں اور بڑی بھاوج کی لڑائی کروانے میں زیادہ ہاتھ چمو بیگم کا ہے۔ جو ادھر ادھر کی ادھر لگاتی تھی۔ اور پھر سال کے سال منبر پر مولن بن کر چڑھ بیٹھتی ہے۔ چڑیل۔

رونا بہرحال فرض تھا خواہ چمو بیگم جیسی گھٹیا ہی بیان کیوں نہ پڑھے۔ لہذا بوا قدری دیوار کے سہارے بیٹھی بڑے مشہدی رومال سے منہ ڈھانپے شائستگی سے سسکیاں بھرتی رہیں۔ لڑکیاں سہ میز پر بیٹھی بیٹھی اونگھ رہی تھیں اور منتظر تھیں کہ کب حدیث ختم ہو اور نوحہ خوانی کی باری آئے۔

نوحے پڑھنے میں بڑی بھاوج کی لڑکی کشوری کو ملکہ حاصل تھا۔ ہائے ہائے نتھے کیا کیا گل زہرا کو فدائی —— تو ماؤں نے دیکھی درخیمہ سے لڑائی —— ادے لڑتے ہوئے گرتے ہوئے مرتے ہوئے دیکھا —— اور جانے کون کون سے سانے جدید نوحے۔ جی ہاں ایسی پاٹ دار آواز میں آخری بند اٹھاتی کہ کیمپ کے گھر تک آواز پہنچ جاتی تھی۔

نوحوں کی طرزیں نکالنا لڑکیوں کا خاص مشغلہ تھا۔ جہاں کوئی چلتا چلتا لیکن غمگین سی دھن کا گیت ریکارڈ پہ سنا جھٹ ذرا سی تبدیلی کر کے نجم الملت کے کسی نوحے پر اس دھن کو چپکا دیا۔ طلعت آرا اس معاملے میں بڑی رجعت پسند واقع ہوئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ بھئی یہ غلط بات ہے۔ یہ کیا ساتویں کی رات کو معلوم ہو کہ کانن بالا کا ریکارڈ بج رہا ہے۔ توبہ توبہ۔ مگر کشوری کس کی سنتی تھی۔ ویسے بھی وہ بڑی آزاد خیال روشن دماغ انسان تھی۔ ہائی اسکول تو اس نے پاس کر لیا تھا۔ وہ تو لکھنؤ جا کر گئے ہاتھوں انٹر اور بی۔اے بھی کر لے لیکن چھوٹی اماں جب مرتے وقت بڑی بھاوج سے صلح صفائی کرنے پر تلیں تو یہاں تک طے کر گئیں، کہ ان کے بڑے لڑکے میاں اعزاز سے اس کا بیاہ بھی کر دیا جائے۔

اب یہاں سے مسلم سوشل کچھر بننا شروع ہوئی۔ کشوری کہاں ایک تیز لڑکی۔ سارے ڈھنگ کے نمونے اس کو آویں۔ جہاں پردہ باغ میں کوئی نیا نمونہ سوئٹر کا کسی کو پہنے دیکھ پاوے گھر آ کر فوراً تیار۔ افسانے پڑھنے کی وہ شوقین۔ فیاض علی کی انور و شمیم سے لے کر کرشن چندر کی "نظارے" اور حجاب امتیاز علی کی "ظالم محبت" تک اس کی الماری میں موجود۔ سینما بھی جب موقع ملتا ضرور دیکھ لیتی۔ میاں اعزاز ایک تو یہ کہ خاصے مولوی آدمی تھے۔ پی سی ایس میں آ گئے تھے۔ کیننگ کالج سے ایم۔اے ایل۔ایل۔بی کر رکھا تھا۔ لیکن اس کے روادار نہیں تھے کہ گھر کی لڑکیاں ذرا کی ذرا نمائش ہی میں ہو آئیں۔ خود وہ بڑی روشن خیالی کی لیتے تھے۔ کہ مس سکینہ سے یونین میں یوں بحث ہوئی اور مس صدیقی کے یہاں یوں چائے پہ گیا۔ لیکن اپنے کنبے کی لڑکیوں کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ لڑکیاں جہاں گھر سے باہر نکلیں میاں زمانہ خراب ہے۔ کسی کو بدنام ہونے کیا دیر لگتی ہے۔

بڑی بھاوج نے، لطیفہ یہ تھا، کہ کشوری کے لئے بڑی منتیں مرادیں مان رکھی تھیں عاشورہ کے روز جب ذوالجناح اندر لایا جاتا تو جلیبی کھلانے کے بعد اس کے کان سے منہ لگا کر ساری بیبیاں اور ساری لونڈی باندیاں دعا مانگتیں کہ یا مولا کشوری بٹیا کا نصیبہ اب کے سال ہی کھلے ——

اب یہ پوچھو کہ یہ میاں اعزاز کے پلے باندھنا نصیبے کا کھلنا سمجھا جا رہا تھا۔ لیکن کشوری نے بھی طے کر لیا تھا کہ عین بیاہ کے موقع پر وہ انکار کر دے گی۔ برات میں ایک ہڑبونگ مچ جائے گی۔ وہ جیسا کہ سوشل فلموں میں ہوتا ہے کہ عین وقت پر جب پھیرے پڑنے والے ہوں تو اصل ہیرو ہسپتال یا جیل سے چھٹ کر پہنچ جاتا ہے اور گرج کر کہتا ہے کہ ٹھہر جاؤ یہ شادی نہیں ہو سکتی ——

(۵)

کشوری کے بابا سید جعفر عباس ڈپٹی کلکٹر تھے۔ لیکن دل کے بڑے پکے قوم پرست مسلمان تھے۔ جب کانگریسی وزارت قائم ہوئی تو آپ نے بھی خوب خوب خوشیاں منائیں۔ حافظ ابراہیم ضلع میں آئے تو آپ مارے محبت کے جا کے ان سے لپٹ گئے۔ جب جنگ چھڑی اور کانگریسی وزارت نے استعفا دیا اور مسلم لیگ نے یوم نجات منایا تو کشوری کے بابا کو بڑا دکھ ہوا۔ اب وہ ریٹائر ہو چکے تھے۔ اور چبوترے پر بیٹھے بیٹھے پیچوان لگائے سوچا کرتے کہ دنیا ہی بدلتی جا رہی ہے۔ لڑکے جن کو نوکری نہ ملتی تھی۔ اب فوج میں چلے جا رہے تھے۔ اپنا اصغر عباس ہی اب لفٹننٹ تھا۔ مہنگائی شدید تھی۔ لیڈر جیل میں تھے۔ لیکن زندگی میں یک بیک ایک نیا رنگ آ گیا تھا۔ حافظ ابراہیم کے موقع پر ضلع کے اردو اخباروں نے لکھا تھا ——— کہاں گئی موٹر سرکاری بیچا کر سبزی ترکاری، یہ بھی دیکھا، وہ بھی دیکھ ——— کشوری کے بابا کو یہ سب پڑھ اور سن کر صدمہ ہوتا۔ وہ بڑے پکے مسلمان تھے۔ وہ اصل مسلمانوں کے معاشرے کا استحکام انھیں پرانے مدرسہ فکر کے ڈپٹی کلکٹروں کے دم قدم سے قائم تھا۔ پردے کے بڑے پابند۔ کیا مجال جو لڑکیاں بغیر قناتوں چادروں کے گھر سے قدم نکالیں (صوبے کے مشرقی ضلعوں میں برقعے کا رواج نہ تھا۔ "باعزت متوسط طبقے" کی مسلمان اور ہندو عورتیں چادریں اور دلائیاں اوڑھ کر باہر نکلتی تھیں ہندو عورتیں تو خیر گھونگٹ کاڑھ کر سڑک پر سے گزر جاتی تھیں۔ لیکن مسلمان بیبیوں کا دن دہاڑے باہر نکلنا سخت معیوب خیال کیا جاتا تھا)

اصغر عباس فوج میں رہ کر بالکل انگریز بنتا جا رہا تھا۔ اب کے سے جب وہ چھٹی پر گھر آیا تو چند شرائط بابا کے سامنے رکھیں:۔

(الف) وہ خود کنبے میں بیاہ نہ کرے گا۔

(ب) کشوری جب اس کے ساتھ رہنے کے لئے جبل پور جائے گی تو پردہ نہ کرے گی۔

(ج) اعزا ذمہاں سے بیاہ کا پروگرام منسوخ۔

(د) کشوری کو ایف۔ اے کے لئے مسلم گرلز کالج لکھنؤ بھیجا جائے گا۔

بڑے بحث مباحثے کے بعد بابا اور بڑی بھاوج دونوں نے ان شرائط کے بیشتر نکات منظور کر لئے۔

ہندوستان کے مسلمان متوسط اور اوپری متوسط طبقے کا کوئی ہی خاندان ایسا ہوگا جس کی لڑکیوں نے کبھی نہ کبھی علیگڈھ گرلز کالج یا لکھنؤ مسلم اسکول میں نہ پڑھا ہو۔ بیشتر لڑکیوں کو اس بات پر فخر ہوتا ہے کہ انھوں نے چاہے چند روز ہی کے لئے کیوں نہیں، لیکن پڑھا مسلم اسکول میں ہے۔

بعینہ یہی احوال عیسلا ودیالہ لکھنؤ کا تھا۔ حوبلے کے سامنے ٹھوس ہندو متوسط طبقے کی بیٹیاں اس ودش ودیالے کی دیوار تلے رہ چکی تھیں۔ سرکاری اور عیسائی اداروں کا ماحول مختلف تھا۔ وہاں انگریز کے اقبال کی وجہ سے شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔

اب کی جولائی میں کیتھیم اور کشوری اکٹھی ہی جونپور سے ٹرین میں سوار ہوئیں اور لکھنؤ آن پہنچیں۔ چارباغ پر ماما کیتھیم کو اتروانے کے لئے آگئے تھے۔ اور کشوری کو پہنچانے کے لئے تو ماجد بھائی بچارے مردانہ ڈبے میں موجود ہی تھے۔ اسٹیشن کی برساتی میں پہنچ کر کیتھیم اور کشوری نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور روئیں اور کبھی کبھی ملنے کی کوشش کرنے کا وعدہ کیا اور تانگوں میں بیٹھ کر اپنی اپنی راہ چلی گئیں۔

(۶)

" کیتھیم وقی رائے زادہ سے میری ملاقات اتنے برسوں بعد سنیٹ ہال کی سیڑھیوں پہ ہوئی ——— وہ چودھری سلطان کے لیکچر کے اوپر جا

رہی تھی۔ ہیں احتشام صاحب کی کلاس کے بعد یہ شبین تھیٹر سے اُتر رہی تھی ——— کشوری نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ——— اور پھر وہ خاموش ہوگئی ——— اور کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ جہاں برف کے گالے چپکے چپکے نیچے گر رہے تھے ———

"کیا تم نے کبھی سوچا ہے" اس نے ساتھیوں کو مخاطب کیا ——— "کہ ہم جو چھ سو سال تک ایک دیوار کے سائے میں رہے ہے، ایک مٹی سے ہماری اور اس کی تخلیق ہوئی تھی اس کے اور ہمارے گھر والوں کو اپنی مشترکہ کلچر پہ ناز تھا۔ اور ایک قسم کا احساس برتری ——— چار سال بعد جب اس وقت کیم نے مجھے دیکھا تو ایک لحظے کے لئے ذرا جھجکی پھر" بلو کشوری "کہتی ہوئی آگے چل گئی۔

"اور میں نے سوچا ٹھیک ہے۔ میں نے اور اس نے اسی دن کے لئے ساری تیاریاں کی تھیں۔ وہ جھیلا دریالہ کی لڑکی ہے۔ کانگریس میں یقین رکھتی ہے۔ میرے بابا بڑے نیشنلسٹ بنتے تھے۔ لیکن میں کٹر مسلم لیگی ہوں۔ یوم پاکستان کے جلسے کے موقع پر کیم کے ساتھیوں نے ہمارے اوپر اینٹیں پھینکی تھیں۔ اکھنڈ ہندوستان ویک کے دنوں میں ہمارے رفقا نے ان کے پنڈال پہ پکٹنگ کی تھی۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے یہی ٹھیک ہے اور بھائی زندگی نہ ہوئی شانتارام کا فلم ہو گئی۔ بنوا چھے پڑوسی کہ وہ بھائی چارہ نہیں کرتے بھائی چارہ میاں زبردستی ہے تمہارے یہی ایک مثال میری اور کیم کی دیکھ لو۔ جنم جنم کے پڑوسی تھے۔ اور کیا دوستی اور یگانگت کا عالم تھا۔ پر تھے ہم ان کے لئے ملیچھ۔ ان کے چوکے کے قریب نہ پھٹک سکتے تھے۔ اور ہماری اماں کا یہ سلسلہ تھا کہ اگر ہندو کی دکان سے کوئی چیز آئی تو اسے فوراً حوض میں غوطہ دے کر پاک کیا جاتا تھا۔ ایک قوم اس طرح بنتی ہے ؟ تقسیم کا مطالبہ ہند کی ساری تاریخ کا نہایت فطری اور نہایت منطقی نتیجہ ہے ——— "کشوری چپ ہو گئی۔

آتشدان میں آگ لہک رہی تھی۔ کسی نے آہستہ سے ایک انگارہ الاؤ میں سے نکال کر باہر گرا دیا۔ جہاں وہ چند لمحوں تک سلگتا رہا اور پھر بجھ گیا۔ نیچے سڑک پر کوئی بھکاری اکارڈین پہ "موجوں کے اوپر" کا راز بجاتا ہوا گذر رہا تھا۔

"آج میں کنول کماری کے ہاں چائے پر گئی تھی" ارملا نے کہا "وہاں بہت سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ ان سب سے میں نے کہا کہ ہمارے "مجلس میلے" کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں"

"کنول کماری" ——— ؟ کشوری نے کچھ یاد کرتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں۔ ہمارے نئے فرسٹ سکرٹری کی بیوی۔ اور میں نے سوچا کہ قابل عورت ہے اس سے میلے کے موقع پہ ہندوستانی آرٹ پر لگے ہاتھوں ایک تقریر بھی کروا لیں۔ پام ڈت وغیرہ بھی ہوں گے۔ بچاری نے وعدہ کر لیا ———"

سویرا است ہوگیا ——— سویرا است ہوگیا ——— دوسرے کمرے میں "میلے کے پروگرام کی ریہرسل کرتے ہوئے چند لڑکیوں نے ہربندرا ناتھ چٹوپادھیا کا کورس یک لخت زور زور سے الاپنا شروع کر دیا۔

"——— میں نے بہت کوشش کر کے سوچا کہ میں جب یونیورسٹی میں اور لوگوں سے ملتی ہوں ——— اٹلی کے لوگ ہیں۔ برازیل کے۔ عراق اور مصر کے۔ میں ان سے اس طرح کیوں نہیں باتیں کرنا چاہتی۔ پھر ہمارے پروفیسر ہیں۔ معصر فنون کی انجمن کے اراکین ہیں۔ انھوں نے ہمارے مسائل پر بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں۔ ہمارا بڑا دقیق مطالعہ کیا ہے۔ اخباروں میں وہ ہمارے متعلق اڈیٹوریل لکھتے ہیں۔ وار لعوام میں اور ریڈیو پہ بحثیں کرتے ہیں ———" کشوری نے کہا۔

چاروں اور آگ لگی ——— دل میں بھوک پیاس جگی ——— پگ پگ ہم گاتے ——— ہم گاتے ہم گاتے ——— لڑکیاں چلا رہی تھیں۔

"میرا جی چاہتا ہے۔ میں تم سے یہ سب باتیں کروں۔ تم کو یہ سارا قصہ یہ سارا گورکھ دھندا سمجھاؤں" ——— اس نے ساتھیوں کو اداس آواز میں مخاطب کیا ——— "تاکہ تم لوگ مجھے بھی ایک اور مضحکہ خیز کردار نہ سمجھو اور اس سارے پس منظر اس ساری کہانی کو اس فاصلے سے دیکھ کر

اپنی نئی راہ کا تعین کرو۔

سڑک پر کیرل گانے والوں کی ٹولیاں گذرنی شروع ہو گئی تھیں۔

"کرسمس کا زمانہ بھی اختتام پر ہے" روز ماری نے اظہارِ خیال کیا۔

ہاں، جونپور میں امیرے محلے ہیں، شاید تین چار بچے کھچے سوگوار جہلم کے تعزیوں کے سائے میں بیٹھے اپنی قسمت کو روتے ہوں گے نہیں شاید محرم کا زمانہ گذر گیا ہوگا۔ پرانے کیلنڈر بیکار ہو چکے ہیں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں ——— کشوری نے دل میں کہا۔

"برفباری شدید ہو گئی ہے۔ پھر بہار آئے گی۔ کیا سارے زمانے، سارے موسم اتنے بے مصرف ہیں ———؟" روز ماری نے اپنے آپ سے بات کی۔

نہیں ——— کشوری نے کہا۔

پگ پگ ہم گلنے چلیں ——— لڑکیوں کی آواز نے تکرار کی۔

(۷)

چار باغ اسٹیشن پر کیم کو آخری بار خدا حافظ کہنے کے بعد اب کشوری کو دم مارنے کی فرصت بھی کہاں تھی۔ پہلے مسلم اسکول۔ پھر چاند باغ پھر کیننگ کالج۔ زمانہ کہاں سے کہاں نکل گیا تھا ہر ہنگامے میں کشوری موجود۔ مباحثے ہو رہے ہیں۔ بیڈمنٹن ٹورنامنٹ ہیں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی مصروفیات ہیں۔ اِدھر ہندو اسٹوڈنٹس فیڈریشن تھا۔ مہاسبھائی طالبات کے جلسے جلوس تھے۔ جن میں کبھی کبھی کیسر رائے زادہ دور سے نظر آ جاتی۔ طالب علموں کی دنیا اچھی خاصی سیاسی اکھاڑہ بن گئی تھی۔ گھر پہ واپس جاؤ تو وہی سیاست۔ کل کی تشویش مستقبل کی فکر۔ ملک کی تقسیم ہوگی۔ نہیں ہوگی۔ ہوگی۔ نہیں ہوگی۔

یونیورسٹی میں لیکچرز کے دوران میں پروفیسروں سے جھڑپ ہو جاتی۔ سطحی طور پہ ابھی دوستی اور بھائی چارہ قائم تھا۔ لیکن آخری "شو ڈاؤن" کے لئے اسٹیج بالکل تیار تھا۔

ڈاکٹر آفتاب رائے ابھی تک ہسٹری ڈپارٹمنٹ میں موجود تھے۔ ایک روز ایک لیکچر کے دوران میں ان سے بھی کچھ تکرار ہو گئی۔ ایک ہندو طالب علم نے کہا۔ آزادی کا مطلب ڈاکٹر صاحب مکمل سوراج ہے۔ ہند کی دھرتی کو پھر سے شدھ کرنا ہے۔ ساری ان قوموں کے اثر سے آزاد ہونا ہے جنھوں نے باہر سے آ کر حملہ کیا۔ یہی تلک جی نے کہا تھا جی ہاں۔

اس پیریڈ میں شیواجی کے اوپر گفتگو ہو رہی تھی۔ لہٰذا خانہ جنگی ناگزیر تھی۔ شام تک ساری یونیورسٹی میں خبر پھیل گئی۔ کہ ڈاکٹر آفتاب رائے کی کلاس میں ہندو مسلم فساد ہو گیا۔

اگلی صبح کشوری پورا جلوس بنا کر ڈاکٹر آفتاب رائے کے دفتر میں پہنچی۔

"ڈاکٹر صاحب ———" اس نے نہایت رعب داب سے کہنا شروع کیا ——— کل جس طرح آپ نے حضرت اورنگ زیب علیہ الرحمۃ کے متعلق اظہارِ خیال کیا۔ اس کے لئے معافی مانگئے۔ ورنہ ہم اسٹرائیک کر دیں گے۔ بلکہ کر دیا ہے۔ اسٹرائیک ہم نے ——— آپ نے ہماری سخت دل آزاری کی ہے۔"

آفتاب رائے اچنبھے سے کشوری کو دیکھتے رہے ——— اری تو تو ڈپٹی جعفر عباس کی بٹیا ہے نا۔ اری باؤلی سی ——— وہ بے ساختہ کہنا چاہتے تھے۔ لیکن کشوری کے تیور دیکھ کر رک گئے۔ اور پہلو بدل کر سنجیدگی سے کھنکارے "بات یہ ہے مس عباس ——" انھوں نے کہنا

شروع کیا۔ سیاست اور حصولِ تعلیم کے درمیان ہو ۔۔۔۔۔"

"اجی ڈاکٹر صاحب بس اب رہنے دیجئے ۔۔۔۔۔" کسی نے آگے بڑھ کر کہا ۔۔۔۔۔ "ہم خوب اس ڈھونگ کو جانتے ہیں۔ معافی مانگئے فی الفور ۔۔۔۔۔"

"ڈاکٹر صاحب ہیں۔ سنے کہا بنارس کیوں نہیں واپس چلے جاتے ۔۔۔؟" دوسری آواز آئی۔

"دیکھو میاں صاحبزادے ۔۔۔۔۔" آفتاب رائے نے دھیان سے کہا ۔۔۔ "معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تاریخ کے متعلق میرے چند نظریے اور اصول ہیں۔ ہیں اور تمہاری دل آزاری کروں گا! کیا باتیں کرتے ہو ۔۔۔۔۔؟"

"ہم کچھ نہیں جانتے ۔۔۔" انھوں نے شور مچایا ۔۔۔ "معافی مانگئے۔ ورنہ ہم کل اور گنگ زیب ڈے منائیں گے۔"

"ضرور منائیے ۔۔۔۔۔" آفتاب رائے نے یک لخت بے حد اکتا کر کہا۔

"اور مکمل اسٹرائیک کریں گے۔"

"ضرور کرو ۔۔۔۔۔ خدا مبارک کرے ۔۔۔۔۔" انھوں نے آہستہ سے کہا۔ اور چق اٹھا کر اندر چلے گئے۔

"کٹر مہا سبھائی نکلا یہ بھی ۔۔۔۔۔" لڑکوں اور لڑکیوں نے آپس میں کہا اور برساتی سے باہر نکل آئے۔

وہ رات آفتاب رائے نے شدید بے چینی سے کاٹی۔ حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ مسلمان طالب علموں کو اچھے نمبر نہ ملتے۔ ہندوؤں کو بغیر بھی پاس کر دیا جاتا۔ ہوسٹلوں میں ہندو مسلمان اکٹھے رہتے تھے۔ لیکن جس ہوسٹل میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس پر سبز پرچم لہرانے لگا تھا۔ اس کے جواب میں عین مغرب کی نماز کے وقت ہندو اکثریت والے ہوسٹلوں میں لاؤڈ اسپیکر نصب کرکے گراموفون بجایا جاتا۔

چند روز بعد آفتاب رائے کے سر میں جانے کیا سمائی کہ استعفا دے دیا اور غائب ہو گئے۔ سارے میں ڈھنڈیا مچ گئی۔ مگر ڈاکٹر آفتاب رائے نہ اب ملتے ہیں نہ تب۔ لوگوں نے کہا ایک چول ہمیشہ سے ذرا ڈھیلی تھی۔ سنیاس لے لیا ہوگا۔ پھر تقسیم کا زمانہ آیا۔ اب کسے ہوش تھا کہ آفتاب رائے کی فکر کرتا۔ اپنی ہی جانوں کے لالے پڑے تھے۔

ملک آزاد ہو گیا۔ کھیم وتی کی شادی ہو گئی۔ کشوری کے گھر والے آدھے پاکستان چلے گئے۔ اس کے بابا اب بہت بوڑھے ہو گئے تھے۔ آنکھوں سے کم سجھائی دیتا تھا۔ ایک ٹانگ پر فالج کا اثر تھا۔ دن بھر وہ جونپور میں اپنے گھر کی بیٹھک میں پلنگڑی پر لیٹے نادِ علی کا ورد کیا کرتے۔ اور پولیس ہر مہینے ان کو تنگ کرتی۔ آپ کے بیٹے کا پاکستان سے آپ کے پاس کب خط آیا تھا؟ آپ نے کراچی میں کتنی جائداد خرید لی ہے؟ آپ خود کب جا رہے ہیں؟ اصغر عباس ان کا اکلوتا لڑکا تھا اور اب پاکستانی فوج میں میجر تھا۔ نہ وہ ان کو خط لکھ سکتا تھا اور اگر مر جائیں تو مرتے وقت وہ اس کو دیکھ بھی نہ سکتے تھے۔ وہ تو کشوری کے لئے مصر تھا کہ وہ اس کے پاس راولپنڈی چلی آئے۔ لیکن ڈپٹی صاحب ہی نہ راضی ہوئے کہ اتنی سی بٹیا کو بھی نظروں سے اوجھل کر دیں۔ وہی کشوری تھی۔ جس کی ایسے بسم اللہ کے گنبد میں پرورش ہوئی تھی۔ اور اب وقت نے ایسا پلٹا کھایا تھا کہ وہ جونپور کے گھر کی چار دیواری سے باہر مدتوں سے لکھنؤ کے کیلاش ہوسٹل میں رہ رہی تھی۔ ایم۔ اے میں پڑھتی تھی۔ اور اس فکر میں تھی کہ بس ایم اے کرتے ہی پاکستان پہنچ جائے گی۔ اور ملازمت کرے گی۔ ارے صاحب آزاد قوم کی لڑکیوں کے لئے ہزاروں باعزت راہیں کھلی ہیں۔ کالج میں پڑھائیے۔ نیشنل گارڈ میں بھرتی ہو جیئے۔ اخباروں میں مضمون لکھئے۔ ریڈیو پر بولیئے۔ کوئی ایک چیز ہے جی ہاں۔ وہ دن گن رہی تھی کہ کب دو سال ختم ہوں اور کب وہ پاکستان اڑ نچھو ہو ۔۔۔۔۔ لیکن پھر بابا کی محبت آڑے آ جاتی۔ دکھیا اتنے بوڑھے ہو گئے ہیں۔ آنکھوں سے سجھائی بھی نہیں دیتا۔ کہتے ہیں بٹیا کچھ دن اور باپ کا ساتھ دے دو۔ جب میں مر جاؤں تو جہاں چاہنا جانا۔ چاہے پاکستان چاہے انگلینڈ اور امریکہ میں۔ میں اب تمہیں کسی بات سے روکتا تھوڑا ہی ہوں۔ بٹیا تم بھی چلی گئیں تو میں کیا کروں گا۔ محرم میں میرے لئے سوز خوانی کون کرے گا۔ میرے لئے

دکی کا علاج کون بتائے گا۔ پوت پہلے ہی مجھے چھوڑ کر چل دیا پھر ان کی آنکھیں بھر آتیں اور وہ اپنی سفید داڑھی کو جلدی جلدی پونچھتے ہوئے یا علی کہہ کر دیوار کی طرف کروٹ کر لیتے۔

بڑی بھاوج ان سے کہتیں ——— دیوانے ہوئے ہو۔ بٹیا کو کب تک اپنے پاس بٹھلاؤ گے۔ آج نہ گئی کل گئی۔ جانا تو اسے ہے ہی ایک دن۔ یہاں اس کے لئے اب کون سے رشتے رکھے ہیں۔ سارے اچھے اچھے لڑکے ایک ایک پاکستان چلے گئے۔ اور وہاں ان کی شادیاں بھی دھڑا دھڑ ہو رہی ہیں۔ یہ اصغر عباس کے پاس پہنچ جاتی تو وہ اسے بھی کوئی ڈھنگ کا لڑکا دیکھ کر ٹھکانے لگا دیتا ——— بڑی بھاوج کی اس شدید حقیقت پسندی سے کشوری کو اور زیادہ کوفت ہوتی۔ اور یہ ایک واقعہ تھا کہ اس نے پاکستان کے مسئلے پر اس زاویے سے کبھی غور ہی نہ کیا تھا۔ ویسے وہ سوچتی کہ بابا ہندوستان میں ایسا کیا کھونٹا گاڑ کر بیٹھے ہیں۔ اچھے خاصے ہوائی جہاز سے چلے چلتے مگر نہیں۔ اور یہ جو بابا کی ساری قوم پرستی تھی۔ سارا جونپور عمر بھر سے واقف ہے کہ بابا کتنے بڑے نیشنلسٹ تھے۔ تب بھی پولیس پیچھا نہیں چھوڑتی۔ سارے حکام اور پولیس والے جن کے سنگ جنم بھر کا ساتھ کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ وہی اب جان کے لاگو ہیں۔ کل ہی عجائب سنگھ چوہان نے جو عمر بھر سے روزانہ بابا کے پاس بیٹھ کر شعر و شاعری کرتا تھا دوبارہ دوڑ بھجوا کر خانہ تلاشی لی۔ گویا ہم نے بندوقوں اور ہتھیاروں کا پورا میگزین دفن کر رکھا ہے۔ بیچارے بابا پر ترس آ جاتا۔ بیچارے بابا۔

اب ڈپٹی صاحب کی مالی حالت بھی ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ اصغر عباس پاکستان سے روپیہ نہ بھیج سکتا تھا۔ جو تھوڑی بہت زمینیں تھیں ان پر بنارہ و کاشتکار قابض ہو گئے تھے اور دیوانی کی عدالت میں ڈپٹی صاحب کی فریاد کی شنوائی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ چھوٹی اماں مرحومہ کی مقدمہ بازیوں کے بعد جو کچھ زیور بچ رہا تھا۔ وہ بڑی بھاوج نے سمیٹ کر بہو کے حوالے کر دیا تھا۔ جو وہ پاکستان لے گئی تھی۔ باقی روپیہ ڈپٹی صاحب کی پنشن کا کشوری کی تعلیم پہ خرچ ہو رہا تھا۔ ان کے علاج کے لئے کہاں سے آتا اور فالج تو لوا ایسا روگ ہے کہ جان لے کر ہی پیچھا چھوڑتا ہے۔ چنانچہ نوبت یہ پہنچی کہ چپکے چپکے بڑی بھاوج نے چھجو بیگم کے ذریعے چند ایک گہنے جو بچ رہے تھے فروخت کرا دیئے۔ ویسے اس ایسی شرم کی تو کوئی وجہ نہ تھی۔ وہ جو مثل ہے کہ مرگِ انبوہ جشنے دارد۔ ان گنت مسلمان گھرانے ایسے تھے جن کو ملازمتوں سے نکالا جا رہا تھا۔ یا جن کو نوکریاں نہ دی جاتی تھیں۔ وہ اپنے اپنے گہنے اور چاندی کے برتن بیچ بیچ کر گذارہ کر رہے تھے لیکن بڑی بھاوج ناک والی آدمی تھیں۔ اور ابھی ان کے بھلے وقتوں کو گذرے عرصہ ہی کتنا ہوا تھا۔ کشوری کو جب یہ معلوم ہوا تو اس کی تو رسٹی گم ہو گئی۔ اس نے پاکستان جانے کا خیال بالکل ترک کر دیا۔ اور سرگرمی سے ملازمت کی تلاش میں جٹ گئی۔

اسے یقین کامل تھا کہ اب ایسا بھی کیا اندھیر ہے کہ اچھے سیکنڈ ڈویژن والی اکنومکس کی ایم اے کو کہیں جونیئر لیکچرر شپ بھی نہ ملے گی۔ لیکن واقعہ یہ تھا کہ ایک جگہ تو اس سے صاف صاف کہہ دیا گیا کہ صاحب بات یہ ہے کہ جگہ تو خالی ہے۔ لیکن ہم پاکستان سے آئی ہوئی شرنارتھی لڑکیوں کو ترجیح دے رہے ہیں۔ اور ویسے ایمان کی یہ بات ہے کہ آپ مسلمان ہیں۔ ہمارے پاس آپ کی وفاداری کا کیا ثبوت ہے ظاہر ہے کہ آپ کسی خانگی مجبوری کی وجہ سے ہندوستان میں رکی ہوئی ہیں۔ پہلا موقع ملتے ہی آپ بھی پاکستان چلی جایئے گا۔ ہم موقع پرستی، مجبوری اور وفاداری کے مدارج الگ الگ پہچانتے ہیں۔

قدم قدم پہ اس کو یہی سننے کو ملتا۔ اور وہ گھوم پھر کے جوں کی توں لوٹ آتی۔ بڑی بھاوج نے اس سے کہا ——— وہ تمہاری گوئیاں کاظم کے ماموں آفتاب بہادر تھے۔ ان کو ہی جا کر پکڑو۔ وہ تو بڑے باثر آدمی ہیں۔ اور بڑے شریف۔ ضرور مدد کریں گے۔ اور کشوری کو خیال آیا۔ کس طرح وہ جلوس بنا کر ان کے پاس پہنچی تھی۔ اور ان کو سخت سست سنائی تھیں۔ اس کے اگلے ہفتے ہی وہ غائب ہو گئے تھے۔

آفتاب ہائے ——— اب پتہ نہیں وہ کہاں ہوں گے۔ اڑتی اڑتی سنی تھی۔ کہ بمبئی میں حکومت کے خلاف تقریر کرنے کے جرم میں

ان کو مرارجی ڈیسائی نے پکڑ کر احمد آباد جیل میں بند کر دیا تھا۔ جیل سے چھٹے تو کچھ اور گڑبڑ ہوئی اور غالباً ان کو ڈی پورٹ کر دیا گیا۔ اب شاید وہ روس میں ہیں اور سمرقند ریڈیو سے اردو میں خبریں سناتے ہیں۔ دوسری روایت تھی کہ نہیں صاحب ڈاکٹر آفتاب رائے تو آج کل پنڈت نہرو کی بالکل مونچھ کا بال بنے ہوئے ہیں۔ اور ان کو دمی پبلک ٹمی ڈورا میں ہند کا سفیر بنا کر بھیجا جا رہا ہے۔ بہر حال۔ ڈاکٹر صاحب تو عرصے سے گویا مستقل "دیدہ زمین" تھے۔

بچارے آفتاب رائے

آج چاند رات تھی۔ محلے میں نقارہ رکھا جا چکا تھا۔ مجلسیں اب بھی ہوتیں۔ لیکن وہ چہل پہل، رونق، اور بے فکری تو کب کی خواب و خیال ہو چکی تھی۔ ڈیوڑھی میں ڈولیاں اترنی شروع ہوئیں اور بیبیاں آ آ کر امام باڑے کے دالان میں بیٹھنے لگیں۔ کشوری بیدلی سے دہلیز پر اپنی پرانی جگہ پہ بیٹھی رہی۔ دالان کی چاندنی جس پر تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی تھی اب چھدری چھدری نظر آتی تھی۔ سارے خاندانوں میں سے دو دو تین تین افراد تو ضرور ہی ہجرت کر گئے تھے۔ بڑی بھاوج بہت مشکل سے پاؤں گھسیٹتی ادھر ادھر چل پھر رہی تھیں۔ اب وہ اللے تللے کہاں۔ ساری مہریاں اور کہاریں اور پاسنیں ایک ایک کر کے چھوڑ کر چلدیں۔ بس نگوڑی مولا رہ گئی تھی۔ سو اس کی آواز کو بھی پالا مار گیا تھا لیکن چھمو بیگم کو آتا دیکھ کر وہ پھر للکاری ——— "آگئیں چھمو بیگم ——— آؤ جم جم آؤ ———"

چھمو بیگم چپ چاپ آن کر منبر کے پاس کھڑی ہو گئیں۔ زیارت پڑھ کے تعزیوں کو جھک کر سلام کرنے اور کنپٹیوں پہ انگلیاں چٹخا کر جناب علی اصغرؑ کے سبز جارجٹ کے گہوارے کی بلائیں لینے کے بعد انھوں نے علموں کو مخاطب کر کے آہستہ سے کہا ——— "مولا یہ میرا آخری محرم ہے۔ ارے اب تمھاری مجلسیں یہاں کیسے کروں گی ——— اور یہ کہہ کر انھوں نے زور شور سے رونا شروع کر دیا۔

بوا مدن اپنی پرانی "دشمنا گی" فراموش کر کے سرک کر ان کے قریب آ بیٹھیں اور بولیں ——— "دلہا غم حسینؑ کو یاد کرو۔ اپنا غم ہلکا ہو جائیگا ——— مولا تو ہر جگہ ہیں۔ کیا پاکستان میں نہیں ہیں ———"

"ہاں ——— ہاں ———" باقی بیبیوں نے آنسو خشک کرتے ہوئے تائید کی ——— "مولاؑ کیا پاکستان میں نہیں ——— تم وہاں مولاؑ کی مجلسیں قائم کرنا۔"

"دلہا ——— ہم بھی چلدئیے پاکستان ———" جب محفل کی رقت ذرا کم ہوئی اور چھمو بیگم چاند رات کا بیان ختم کر چکیں تو بوا مدن نے اپنا اناؤنسمنٹ بھی کر ڈالا۔

"سچ کہو بوا مدن ———" بڑی بھاوج نے گوٹا پھانکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ہیری۔ ہم بھی چلدئیے ———" بوا مدن نے اعتراف کیا۔

"کیسے چل دیں ———" بڑی بھاوج کو ایک طرح سے رشک ہی آیا۔ اچھے خاصے لوگ نکلتے چلے جا رہے ہیں سب قضیوں سے الگ۔ سارے دلدر دور ہو جاویں گے وہاں پہنچ کر ———

"بس بڑی بھاوج دِدّا نہیں مانت ——— وہاں سے ہر بار خط میں لکھتا ہے کہ بس اماں آجاؤ ——— کوئی نگوڑی جگہ سکھر ہے۔ وہاں اس نے راشن کی ڈپو کھول لی ہے۔"

"اچھا ——— شکر ہے۔ مولا سب کی بگڑی بنائیں ———" بڑی بھاوج نے کہا۔

"عاشور کی شب کی لیلائے ———" بوا مدن نے جو حسبِ معمول عینک گھر بھول آئی تھیں دوبارہ غلط مرثیہ شروع کیا۔ لیکن سب پر ایسی اداسی

اور اکتاہٹ طاری تھی کہ کسی نے ان کی تصحیح کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ بگن نے آواز لگائی —— چراغوں کی روشنی دالان میں مدھم سا زرد اُجالا بکھیرتی رہی۔ آنگن کا گیس کا ہنڈہ پیلا پڑتا جا رہا تھا۔

اس تاریکی میں کستوری سیاہ دوپٹے سے سر ڈھانپے اپنی جگہ پہ اکڑوں بیٹھی سامنے رات کے آسمان کو دیکھتی رہی۔

۸

کنول کماری بہن نے مہمانوں کے جانے کے بعد نشست کے کمرے میں واپس آکر دریچوں کے پردے گرائے اور چار کا سامان میزوں پر سمیٹنے لگی۔ مدراسی آیا ایک ہی تھی جسے وہ ہمراہ لیتی آئی تھی اور پردیس میں ملازموں کے فقدان پہ اس نے ملٹری اڈوائزر بریگیڈیر کھنہ کی بیوی سے بڑا رقت انگیز تبادلہ خیالات کیا تھا۔ گھر کی صفائی اور بچے کی دیکھ بھال کے بعد جو اسے وقت ملتا اس میں وہ رائل اکیڈمی آف ڈرامٹک آرٹ جا کر ایڈ گری سیکھتی تھی۔ مسز لارنس اور لیڈی اولیویا ابجیتی ایسکوبیتھ کرسٹفر فرائی ان سب سے اس کی بڑی گہری دوستی تھی۔ یہ سب مل کر گھنٹوں فن اداکاری، جدید آرٹ اور ہندوستانی بیلے پہ گفتگو کرتے۔ جتین کے پاس ان سب بکھیڑوں کا وقت نہ تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے رات کے تو وہ دفتر سے نپٹ کر انڈیا ہاؤس سے لوٹتا۔ اور وہ تو صاف بات کہتا تھا کہ بھائی میں انٹلکچوئل وِنٹلکچوئل نہیں ہوں۔ سیدھا سیدھا آدمی ہوں اور جیبی ڈھرتے پرسن پینتیس سے چل رہا ہوں وہی میرے لئے ٹھیک ہے انگریز کے زمانے میں وہ ملک کے طبقاتی قطب مینار کی سب سے اونچی سیڑھی پر پہنچ چکا تھا۔ اور اب تو وہ اتنا اونچا تھا کہ بالکل بادلوں پہ براجمان تھا۔ انگریز کے زمانے میں ڈریس سوٹ پہنتا۔ اب سفید چوڑی دار پائجامے اور سیاہ شیروانی میں ملبوس سفارتی ضیافتوں میں کیا ہلکی پھلکی پتی تلی باتیں کرتا۔ خود کنول کیا کم معرکے کی "ڈپلومیٹک وائف" تھی۔ جہاں جاتی محفل جگمگا اٹھتی۔ واہ واہ۔ مثلاً آج ہی کی پارٹی میں اس نے کورٹیا کی کرشنامینن والی تجویز کے سلسلے میں "نیو اسٹیٹسمین اینڈ نیشن" کے ایڈیٹر کنگزلے مارٹن اور جدید شاعر لوئی مک نیس دونوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ سب کو قائل ہونا پڑا۔ چاند باغ کے اچھے پرانے سنہرے دنوں میں تو خیر وہ یونہی جیسٹ میں انٹلکچوئل بن گئی تھی کہ یہ یونیورسٹی کی زندگی کا ایک لازمی جزو تھا۔ پر یہ تو ان دنوں اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک روز وہ ان ساری جدید بین الاقوامی گلیمرس ہستیوں سے یوں بھائی چارے کے ساتھ ملا کرے گی جیسے وہ سب گاجر مولی ہیں۔

سویرا اسٹ ہوگیا —— سویرا اسٹ ہوگیا —— ادملا گنگناتی ہوئی اندر آئی۔

کنول دیدی —— جاتے جاتے مجھے خیال آیا کہ ایک بار آپ کو پھر یاد دلا دوں کہ آپ کو مجلس میں آنا ہے ——"

"ہاں ہاں بھئی —— "کنول نے جواب دیا" اور وہ میری کتاب تو دیتی جاؤ ——"

"ارے ہائے —— "ادملا نے رُک کر کہا" وہ تو ڈاکٹر آفتاب رائے نے مجھ سے لے لی۔ وہ مجھے انڈیا آفس لائبریری سے نکلتے ہوئے مل گئے۔ چھین کر لے گئے، کہنے لگے کل دے دیں گے ——"

"ڈاکٹر —— آفتاب —— رائے —— ؟" کنول نے دہرایا۔

"ہاں —— کنول دیدی —— "ادملا نے اسی طرح لاپروائی سے بات جاری رکھی" وہ تو دن بھر یونہی لائبریریوں میں گھسے رہتے ہیں۔ آج کل ایک نئی کتاب لکھ رہے ہیں آج مہینوں کے بعد اتفاقاً نظر آگئے۔ ان کا کوئی بھروسہ تھوڑا ہی ہے۔ لیکن کل وہ براڈکاسٹنگ ہاؤس آ رہے ہیں۔ وہاں کتاب مجھے لوٹا دیں گے۔ اچھا گڈ نائٹ کنول دیدی ——"

"گڈ نائٹ ادملا ——"

"ارے ہاں" اس نے جاتے جاتے رُک کر پھر کہا: "کل آپ رائل کمانڈ پرفورمنس میں جا رہی ہیں ——— ؟ آپ کو تو سر والٹر رچرڈسن نے خود ہی بلایا ہوگا ——— "

"ارے نہیں بھئی ——— " کنول نے پیشانی پر سے بال ہٹا کر تھکی تھکی ہوئی آواز میں کہا "یہ بھی اس کا ایک پوز ہے۔" ایک دل جلی مسز اچاریہ نے جو سکنڈ سکرٹری کی بیوی تھی۔ مارے حسد کے اپنی ایک سہیلی سے کہا تھا: "جانتی ہے کہ بکھرے ہوئے بال اس کے اوپر زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ چڑیل کہیں کی") نہیں بھئی اَدملا۔ مجھے یہ پارٹیوں اور سفارتی مصروفیتوں کا سلسلہ بعض دفعہ بالکل بور کر دیتا ہے۔ اس سے کہیں پناہ نہیں ——— "

"اچھا گڈ نائٹ ——— "

"اچھی طرح سوؤ ——— " کنول نے کہا۔ اَدملا ہر بندہ رنا نند چٹو پادھیا کا کورس گنگناتی ہوئی نچلی منزل میں اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

انڈیا آفس لائبریری سے نکلتے ہوئے مل گئے ——— ڈاکٹر آفتاب رائے مل گئے ——— اچھا ان کا کوئی بھروسہ تھوڑا ہی ہے۔ چھین کر لے گئے ——— کہنے لگے کل دیدیں گے ——— وہ صوفے پر بیٹھ گئی ——— داسنتی ——— اس نے چلّا کر آواز دی۔ کھانا گرم پر لگا دو ——— اس نے ٹیلی ویژن کھولا۔ بکواس ہے۔ بند کر دیا۔ پھر اس نے ریڈیو لگایا۔ بکواس تھا۔ اسے بھی بند کر دیا۔ کیا پتہ اس سمے لکھنؤ ریڈیو پار جتابر جگی گاتی ہو پُچ ہوڑی چھوڑ رنا ——— نکر نکر ہو جوبنے بر جوئے ہر ——— اور چاند باغ کی خاموش سڑکوں پر سے لڑکیاں لنٹیرن سروس کے بعد لوٹتی ہوں گی ———

میں نے کیا کیا تھا ——— ؟ اس نے سوال کیا۔ کچھ نہیں۔ میں اب دس سال سے کنول کماری جین ہوں۔ یہ تو کچھ بات نہ بنی۔ بات کس طرح بنتی ہے۔ کبھی نہیں بنتی ——— سال گذرتے جا رہے ہیں۔ میں کنول کماری جس نے یہ سب دیکھا۔ ایک روز یونہی ختم ہو جاؤں گی۔ اور تب بہت اچھا ہوگا۔

ایسا نہ ہونا چاہیئے تھا۔ پر ہو گیا۔

کنول ڈارلنگ ——— ثروت نے اُنگلی اُٹھا کر سخت صوفیانہ انداز میں اس سے کہا تھا ——— جن ڈھونڈھا تن پائیاں گہرے پانی پیٹھ ———

——— میں برہن ڈوبت ڈری رہی کنارے بیٹھ ——— ؟ کنول نے سوچا تھا۔

کنارا بھی تو نہیں ہے۔

پانے کے کیا معنی ہیں ؟ کیا ملتا ہے۔ ؟

باہر اندھیرا تھا۔ اور سردی۔ اور بیکراں خاموشی۔ میں زندہ ہوں۔

ارے بھئی آفتاب بہادر ——— اس نے غصّے سے مرہلا کر دل میں سوال کیا ——— تم کیوں چلے گئے تھے۔ میں نے تمہارا کچھ بگاڑ تھوڑا ہی تھا۔ تم اپنے آپ میں مگن رہتے میں وہیں کہیں تمہاری زندگی کے تانے بانے میں کسی کونے میں اگر چپکی بیٹھ جاتی اور بس تمہارے لئے پوریاں بنایا کرتی۔ تم اسی طرح رہتے۔ اس میں تمہاری شکست نہ تھی۔ تمہاری تکمیل تھی میاں آفتاب بہادر ——— ؟

نیچے کیرل گانے والے ہیتھ کی اور نکل گئے تھے۔

آفتاب بہادر ——— اب جو میں ہوں۔ اور جو تم ہو ——— کیا یہی بہت ٹھیک ہے۔ ؟

بہت زمانہ ہوا اس نے چاند باغ میں ایک لڑکی کو دیکھ کر جو آفتاب رائے کو بہت پہلے سے جانتی تھی۔ سوچا تھا کہ جنے آفتاب کی بیوی کیسی ہوگی (ایک بار خود اس کے لئے اس کی دوست ثروت نے ایک بڑے سے آدمی کی تصویر سامنے لاکر کہا تھا۔ آٹھ وائے ڈوکر کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ ——!! اور کمال یہ کہ عین میں اسی طرح کا آدمی عقبیٰ نکلا ——) آفتاب کی بیوی۔ یہ فقرہ کتنا عجیب لگتا تھا۔ کوئی ہوگی چڑیل۔ آخر میں یہ سب کچھ کہی کھاتے ہیں —— ثروت نے اضافہ کیا تھا۔ خوبصورت تو ضرور ہوگی اور ٹینس کھیلتی ہوگی۔ جس کا آفتاب کو اتنا شوق ہے۔ لیکن فراٹے بھرنے اور ہوا میں اُڑنے والی لڑکیاں تو وہ سخت ناپسند کرتا تھا۔ جس کو وہ پسند کرے گا وہ تو بہت ہی عمدہ ہوگی بس بالکل مجموعہ خوبی۔ چندے آفتاب چندے مہتاب۔ جی ہاں۔ اور مجھ میں کیا برائی تھی؟ اس نے سطے کرنا چاہا۔ کہ آفتاب کا رویہ یہ تھا کہ اس پر کنول کماری پر یہ وحی اترنی چاہیئے تھی کہ یہ مہاپُرش، آسمان پر سے خاص اس کے لئے بھیجا گیا ہے۔ لیکن یہ اس کی اپنی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ اس کنول کماری سے یا روزانہ آکر ملے یا کبھی نہ ملے۔ اس سے طبلہ اور جے جے ونتی سنے۔ پوریاں تلوا کر کھائے۔ پھر ایک روز اطمینان سے آگے چلا جائے۔ اور یہ کنول کماری بعد میں بیٹھ کر جھک مارتی رہے۔ اور کیا وہ اس کے پیچھے پیچھے ڈنڈا لے کر دوڑتی کہ اے میاں آفتاب بہادر ایک بات سنتے جاؤ —— ان دنوں ثروت نے ایک اور لطیفہ ایجاد کیا۔ چلتی کے بعد ایک روز اس نے "گینگ" کی باقی افراد سے کہا: —— بھئی نمبر ۲۹۔ اے پی سین روڈ پر آج کل یہ سلسلہ ہے کہ اگر جائی آفتاب چار پیتے پیتے رُک گئے۔ دفعتاً کنول رانی سے کہتے ہیں۔ بھئی کنول مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے تو ہماری کنول رانی کو فوراً یہ دھیان ہوتا ہے کہ اب شاید یہ پروپوز کرنے والا ہے۔ پر وہ بات محض اتنی ہوتی ہے کہ بھئی ذرا پہیل کو فون کر دو۔ کہ آم خربوزہ مالا لائے۔ یا اسی قسم کی کوئی اور شدید اینٹی کلائمیکس۔ ثروت اس قدر رنگین تھی —— وہ سارے مسخرے پن کے قصے یاد کر کے اب اُس نے دل ہی دل میں ہنسنا چاہا۔ لیکن سردی بڑھتی گئی۔ اور بیکراں تنہائی۔ اور زندگی کے ازلی اور ابدی پچھتاووں کا ویرانہ۔ آفتاب بہادر، تم کو پتہ ہے کہ میری کیسی جلاوطنی کی زندگی ہے۔ ذہنی طمانیت اور مکمل مسرت کی دُنیا جو ہو سکتی تھی۔ اس سے دیس نکالا جو مجھے ملا ہے اسے بھی اتنا عرصہ ہو گیا کہ اب میں اپنے متعلق کچھ سوچ بھی نہیں سکتی۔ اب میرے سامنے صرف رائل کمانڈ پرفورمنس ہیں۔ اور چین کے صبح کے ناشتے کی دیکھ بھال، اور یہ ہر دلعزیزی جو مجھ پر ٹھونس دی گئی ہے لیکن تم بھلا کیا سوچو گے (اس نے کہا تھا۔ ارے تم لوگ اسی کو پسند کرتی ہو جو ایک مخصوص معیار پر پورا اُترتا ہے۔ کیا اُلٹی منطق تھی۔ یعنی چیت بھی تمہاری پٹ بھی۔ آخر اس ساری لفاظی، اس ذہنی اور تصوراتی گورکھ دھندے سے تمہارا مطلب کیا نکلا۔ واہ وا۔ چغد آدمی کہیں کے۔

ثروت نے اس کی شادی کے بعد ایک اور سہیلی کے سامنے نہایت جامع و مانع اختصار کے ساتھ اس طرح تشریح کر دی تھی کہ قصہ کو یوں مختصر کرتی ہوں اے عزیزہ۔ کنول کی ٹریجڈی یہ ہوئی کہ ساری عمر تو کوئی ان کی سمجھ میں نہ آیا سب ہیرا میں میکھ نکالتی رہیں اور مارے بد دماغی کے کسی کو خاطر ہی میں نہ لاویں۔ اور جن بزرگوار کو آپ نے نہایت صدق دل سے پسند فرمایا وہ خود ہی ہری جھنڈی دکھا گئے —— بس اب کیا ہے پیاری بہن۔ جب آنکھ کھلی تو گاڑی نکل چکی تھی۔ پٹڑی چمک رہی تھی —— جی ہاں۔

اری ثروت —— کرڈک کہیں کی۔

مگر سوال یہ تھا کہ ہر چیز کے متعلق اس مذاق اور خوش دلی کا رویہ کہاں تک گھسیٹا جا سکتا تھا۔ (لیکن اس کے علاوہ وہ اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ ثروت نے کہا تھا) زندگی نہ ہوئی اسٹیفن لیکاک کا مسخرہ پن ہو گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تمہارا مذاق کہاں ہوتا ہے اور سنجیدگی کہاں سے شروع ہوتی ہے رہا —— VICE VERSA)

ڈاکٹر صاحب تو دن بھر لائبریریوں ہی میں گھسے بیٹھے ہیں۔ اور آج کل ایک اور کتاب لکھ رہے ہیں۔ بٹ از ملا نے مطلع کیا ہے۔ اب وہ کیا کر رہا ہے۔ ڈاکٹر ڈی پی مکرجی کی طرح مہاگرو بن چکا ہے۔ غالباً اس نے شادی کر لی ہوگی۔ یہاں پہنچ کر اسے عجیب و غریب اور انتہائی شدید

تکلیف کا احساس ہوا ——— وہ کون ہو گی ——— کیسی ہو گی ——— آفتاب کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی کیسی نظر آتی ہو گی۔ آفتاب اس سے کہاں ملا ہو گا؟ یا اب تک وہ کنفرمڈ بیچلر بن چکا ہو گا (بہت سے لوگوں کے لئے اس میں بھی سخت گلیمر تھا ——— کیا بات ہے صاحب ——— ان ساری حماقتوں سے علیحدہ اور برگزیدہ ——— اپنی نہایت شخصی دنیا، اپنے مشغلے، کتابیں، موسیقی، بیتھوون کے کونسرٹ، چند دلچسپ سے گنے چنے دوست۔ اتوار کے روز دن بھر کسی کنٹری کلب کی لاؤنج میں بیٹھے ٹائمز پڑھ رہے ہیں۔ تیسرے پہر کو رائیڈنگ کو چلے گئے۔ اور ٹینس کھیلا۔ اِدھر اُدھر خواتین سے بھی مل لئے۔ لیکن لڑکیوں کو ہمیشہ بڑے ترحم کی نگاہوں سے دیکھا گویا ——— بیچاریاں ——— !) اور اپنا بے نیازی اور سرپرستی کا رویہ قائم رکھا ——— یہ سب ثروت نے ایک دفعہ ارشاد کیا تھا) اچھا بھئی آفتاب بہادر ——— تم کتابیں لکھتے رہو میں ان پر ہنٹر ڈ پروگرام میں ریویو کر دوں گی۔ راستہ اسی طرح طے ہوتا رہے گا۔

صبح ہوئی شام ہوئی ——— زندگی تمام ہوئی ——— زندگی تمام ہوئی ——— نچلی منزل میں (بظاہر نیند رہنا تھہ چیڑھیا دحیا) کا وہ کمبخت کورس آہستہ آہستہ الاپے جا رہی تھی۔

وہ دروازہ کھول کر باہر آگئی۔ کہرا اب کم ہو گیا تھا۔ اور آسمان کا رنگ قرمزی تھا جس کے مقابل میں کیتھولک چرچ کے ہولناک گنبد کا سلہٹ نحوست سے اپنی جگہ پر قائم تھا۔

اونی لبادوں میں ملفوف، مشرقی یورپ سے بھاگے ہوئے لوگ، بھاری بھاری قدم اُٹھاتے ہاتھوں میں شمعیں لئے مڈنائٹ ماس کے لئے گرجا کی سمت بڑھ رہے تھے ———

صبح ہوئی، شام ہوئی
زندگی تمام ہوئی
زندگی تمام ہوئی
زندگی تمام ہوئی

(۹)

جب مجھے ملازمت نہ ملی تو میں نے سمندر پار کے وظیفوں کے لئے ہاتھ پاؤں مارے۔ وہاں بھی وہی نقشہ تھا۔ لیکن انگریز پھر آڑے آیا۔ اور برٹش کونسل نے مجھے یہاں آنے کا وظیفہ دے دیا۔ اور جب میں نے روانہ ہونے کی خبر بابا کو سنائی تو وہ بالکل چپ ہو گئے اور اس کے بعد ایک لفظ منہ سے نہ بولے۔ اور ابھی میں راستے ہی میں تھی جب مجھے اطلاع ملی کہ بابا مر گئے ——— " کشوری نے مدھم آواز میں بات ختم کی اور چمٹے سے آتشدان میں لکڑی کے کندوں کو ٹھیک کرنے میں منہمک ہو گئی۔

آج مڈنائٹ ماس منانے جائیں گے۔ روزماری نے اپنے برش اور کینوس سمیٹتے ہوئے کہا۔ چلو ہم بدمعاش اور ریڈی چلیں۔ جہاں ایک شام میں نے پیلے بالوں اور اداس چہرے والی ایک ہنگیرین پناہ گزین لڑکی کو دیکھا تھا۔ وہ سر پر سیاہ اسکارف باندھے تسبیح ہاتھ میں لئے گھٹنوں سے ساکت اور منجمد بیٹھی تھی۔ اس کا یہ انداز کتنا قابلِ رحم تھا۔ میں نے قربان گاہ کے ستونوں کے پیچھے چھپ کر اس کی تصویر بنائی۔ میں نے اس تصویر کا نام "آزادی سے فرار" رکھا تھا۔ لیکن جب اسے نمائش میں رکھا جانے لگا تو ہم عصر فنون کی انجمن نے اس کا نام بدل کے "آزادی کا شکرانہ" کر دیا ——— آج کی رات میں وہاں امید اور ناامیدی کی ان کربناک کیفیتوں کے چند اور اسکیچ تیار کروں گی۔

کتنی کیفیتیں ہیں جنھیں الفاظ اور رنگوں کے روپ میں ڈھالا ہی نہیں جا سکتا۔ جن کے اظہار سے ان کی بے وقعتی اور توہین ہوتی ہے ———

کشوری نے سوچا یہی بات اپنے لئے کتنی بار کنول نے محسوس کی تھی۔ لیکن کوئی کچھ نہ جانتا تھا۔

کیسی بے بسی ہے کہ سب اپنے اپنے داغوں میں محصور رہے جانے پر مجبور ہیں۔

تم کو معلوم ہے کہ میں یکلخت اس طرح تم سب سے یہ باتیں کیوں کر رہی ہوں۔ کشوری نے کہا۔

"سنتے ہیں کہ جب مدتوں کے بچھڑے ہوئے دوجنے دوبارہ ملتے ہیں تو ساری پرانی یگانگت یاد آجاتی ہے۔ پرانے دوستوں سے مل کر کیسی خوشی ہوتی ہے۔" اس نے بات آہستہ آہستہ جاری رکھی ——— "لیکن پرانے "دشمن" سے مل کر مجھے کیسی مسرت ہوئی ——— آج صبح مجھے بالکل اتفاقیہ کلیم وتی پھر سے نظر آ گئی۔ مجھے پتہ نہ تھا کہ وہ یہاں پر ہے وہ ایک دوکان سے نکل رہی تھی۔ "ارے کلیم ——— کلیما" ——— میں چلا کر اس کی اور دوڑی۔ اس نے مجھے واقعی نہ پہچانا۔ وہ بہت موٹی ہو گئی تھی۔ اور اس کے ساتھ غالباً اس کا شوہر تھا۔ "کلیما رانی تم ہم کا نا ہیں پہچنیہیں؟" میں نے بالکل بے ساختگی سے اپنی زبان میں اس سے کہا۔ جو اس کی اور میری مادری زبان تھی ——— ہلو کشوری ——— اس نے مطلق کسی گرمجوشی کا اظہار نہ کیا۔ نمستے۔ اس کے شوہر نے مسکرا کر سلام کیا۔ "یہ میرے پتی ہیں۔" کلیم نے اس سرد مہری کے انداز میں بات کی۔ نمستے بھائی صاحب ——— میں نے بیحد خوش دلی سے کہا۔

"تم تو پاکستانی ہو۔ تمہیں نمستے نہ کہنا چاہیئے" کلیم نے بڑی طنز کے ساتھ کہا۔ میرے اوپر جانو کسی نے برف ڈال دی۔ میں نے کھسیانی ہنسی ہنس کر دوسری اور دیکھا اس کے شوہر نے جو بہت سمجھدار معلوم ہوتا تھا۔ فوراً بات سنبھالی اور کہنے لگا ——— "اچھا بہن جی ——— اس سمے تو ہم بہت جلدی میں ہیں۔ آپ کسی روز ہمارے یہاں آیئے۔ ہم بھی ساؤتھ کینزنگٹن میں رہتے ہیں ——— "اچھا۔ ضرور آؤں گی۔ بائی بائی کلیم" ——— میں نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔ اور آگے چلی گئی۔ میں نے اسے یہ بھی نہ بتانا چاہا کہ میں پاکستانی نہیں ہوں۔ اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔

"میں اس وقت کوئی رقت انگیز تقریر نہ کروں گی۔ میں یہ نہ کہوں گی۔ کہ رفیقو۔ انسان نے خودکشی کر لی۔ پرانی اقدار تباہ ہو گئیں۔ اپنے پرائے ہو گئے۔ یہ سب پچھلے پانچ سال سے دہراتے دہراتے تم لوگ اکتا نہیں گئے۔ یہ جو کچھ ہوا یہی ہونا تھا۔ اور آپ تھیں کہ ایک نہایت رومینٹک تصور لئے بیٹھی تھیں۔ گویا زندگی نہ ہوئی شانتا رام کا فلم ہو گئی۔ میں نے اور کلیم نے جو کچھ کیا وہ ان سب باتوں کا نہایت منطقی نتیجہ تھا۔ اور باقی تم جو کہنا چاہتی ہو وہ جھک مارتی ہو۔ سمجھیں۔

"اس انداز سے میں نے اپنے آپ کو سمجھانا چاہا۔ لیکن چلو روز ماری۔ اب ہم نئی تصویریں بنائیں گے۔" اس نے روزماری کو مخاطب کیا۔ "تم اگر ہمارے اسکیچ تیار کرو تو تمہاری آرٹ کونسل اور ہم عصر فنون کی انجمن ان کے لئے کون سے عنوان منتخب کرے گی۔"

"ہم اپنے بدقسمت ملک کی وہ نوجوان نسل ہیں جو یورپ کی جنگ اور اپنے سیاسی انتشار کے زمانے میں پروان چڑھی۔ اپنی خانہ جنگی کے دور نے اس کی ذہنی تربیت کی اور اب اس ہولناک "سرد لڑائی" کے محاذ پر سے اپنے اور دنیا کے مستقبل کا تعین کرتا ہے۔

"ہم لوگ یونیورسٹی کی اونچی اونچی ڈگریاں حاصل کر رہے ہیں۔ تہذیبی میلے اور تہوار منعقد کرنے میں مصروف ہیں۔ ہے مارکیٹ کے مخصوص تھیٹروں میں اپنے بیلے کے پروگرام پیش کرتے ہیں۔ امن کانفرنسوں اور یوتھ فیسٹولز میں شامل ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں سے واپس لوٹ کر کیا ہوگا۔

"تم نے کبھی خیال کیا ہے کہ میں کہاں جاؤں گی ——— ؟ میرا گھر اب کہاں ہے ؟ کیا میں اور میری طرح دوسرے ہندوستانی مسلمان ایسے مضحکہ خیز اور قابلِ رحم کردار بننے کے مستحق تھے ——— ؟"

وہ خاموش ہو گئی۔ سب لوگ چپ چاپ بیٹھے آگ کے شعلوں کو دیکھتے رہے۔ سڑک کے دوسری طرف ایک مکان میں سوائٹ کرسمس "گائی جا رہی تھی۔

شاید میں نے تمہیں بتایا تھا ـــــــ ارملا نے نیچی آواز میں کہا ۔ کہ آج دفتر سے واپسی میں ڈاکٹر آفتاب راۓ مل گئے۔ میں نے اُن سے پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب۔ میں نے تو سُنا تھا کہ آپ ری پبلک لمبی ڈوڈا میں سفیر ہیں۔ تم نے غلط سُنا تھا ــــــ! انھوں نے رسان سے مسکرا کر کہا۔ میں نے گھبرا کر ان کو دیکھا۔ تو کیا آپ بھی ـــــــ میں نے سوال کرنا چاہا ہاں ـــــــ میں بھی ــــــ! اتنا کہہ کر وہ جلدی سے خدا حافظ کہتے ہوئے مجمع میں غائب ہو گئے۔ اور دوسرے لمحے اسٹیشن کی مہیب انڈر گراؤنڈ نے اُن کو نگل لیا۔ ان کے ہاتھوں میں کتابیں تھیں اور وہ کسی سے بات کرنا نہ چاہتے تھے ـــــــ بجانے وہ کہاں رہتے ہیں۔ کیا کرتے ہیں۔ اتنا عرصہ انھوں کیسے گذارا۔ وطن واپس جانے کی اجازت انھیں کب ملے گی ـــــ کیا ہو گا ـــــ؟

دور اگرجاؤں کے گھنٹے بجنے شروع ہو گئے تھے۔ وہ سب باہر سڑک پہ آ گئے۔

ہماری غلطیوں کا سایہ ہمارے آگے آگے چلتا ہے۔ اور رات ہمارے تعاقب میں ہے۔ انھوں نے سوچا ـــــ لیکن ہم رات کی وادی کو تیزی سے عبور کر رہے ہیں۔

ہمارے چاروں طرف یہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کا ہجوم یہ لوگ جو اپنی قسمتوں کو روتے ہیں۔ لیکن دیکھو۔ یہ راستے۔ یہ جھیلیں۔ یہ باغات۔ ہمارے منتظر ہیں۔ سناٹے میں صرف موت کے قدموں کی چاپ تھی۔ اجنبی موت جو یک لخت ہمارے سامنے آ گئی۔ لیکن ہم اسے چھوڑ کر ہنستے ہوئے آگے نکل جائیں گے۔ سنو۔ ہمارے پاس یقین ہے اور کامل اعتماد جسے اس محبت نے تخلیق کیا ہے جو غداری کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ یہ غداری محض یاسمین کے پھولوں کی آرزو ہے۔ وہ گرجا کی سمت بڑھتے رہے۔

سامنے راستے کی نیم تاریکی میں ایک الزبتھن وضع کے مینر ہاؤس میں دھندلی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ یہ ہندوستانی سفیر کے فرسٹ سکریٹری کا مکان تھا۔ اس کے آگے پھر اندھیرا تھا۔ یہ کون دیوانی روح اپنی تنہائی سے گھبرا کر باہر نکل آئی ہے۔ انھوں نے سوال کیا۔ اس سے کہو۔ یہ یہاں کیوں کھڑی ہے ان لیمپوں کے نیچے۔ گھاس کے ان راستوں پہ زمین کے ان پھولوں کے درمیان اسے کچھ نہ ملے گا ملنسان سیڑھیوں پہ یہ کون لوگ نظر آ رہے ہیں۔ ان سے کہو کہ واپس جائیں اور صبح کا انتظار کریں۔

ہمارے اور ان کے خیالوں کے بھٹکنے ـــــــ؟

لیکن پھر گھنٹوں نے پکارا ـــــــ آؤ ـــــــ آج کی رات تمہارے وجود کے گناہ کا کفارہ ادا کیا جائے گا۔ میں تمہارے خدا کی آواز ہوں۔ اور تمہاری ہر تباہی میں شریک ہوں۔ اور ہر موت کا محافظ ہوں۔ اور اب پادریوں اور راہبوں کا جلوس آگے بڑھا۔ جو اپنے اپنے ملکوں سے جلا وطن ہو کر اس سمے خدا وند خدا کی تقدیس کرتے تھے۔ اور گرجا کی مرمریں سیڑھیوں پہ سیاہ اسکارف سے سر ڈھانپے عورتیں اور بوڑھے اور جوان بڑے صبر سے بیٹھے تسبیحیں پھیر رہے تھے۔ اور ہولی کمیونین کے منتظر تھے۔

ایک راستہ یہیں پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔ پھر ایک دیوار ہے۔ لیکن ریشمی پردوں میں سے چھن چھن کر روشنی اِدھر بھی پہنچ رہی ہے۔ گو بہت سے سیاہ پوش مریض دیوانے نفسی[illegible] ہوا باشندان راستوں کے کھڑے ہیں۔

ہمیں تمہاری موت عزیز ہے۔ کیونکہ تمہاری موت میں نجات ہے۔ ماس کے گھنٹوں نے کہا۔

ہماری ماں۔ چٹانوں کی بہن۔ سمندر کے روشن تماشے ہمیں چپکا بیٹھنا سکھا۔ یہ ہمارا عہد نامہ ہے۔

یہ ہمارا پرانا عہد نامہ تھا۔ ان کے خیالات تباہ ہو چکے۔ اب ان کے پاس کیا باقی رہا ہے ـــــــ آرگن کے مدھم اور لرزہ خیز سروں کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے وہ سب آہستہ سے اپنے راستے پر واپس آ گئے۔

"کنولارانی" ـــــ کسی نے اندھیرے میں یک لخت پہچان کر چپکے سے پکارا۔ یہاں آ جاؤ۔

اور ہمارے ساتھ کھڑے ہو کہ اس خوب صورت روشنی کو دیکھو جو آسمان پر پھیل رہی ہے۔ اب کسی پچھتاوے۔ کسی افسوس کا وقت نہیں ہے۔

"پرانے عہد نامے منسوخ ہوئے!" کشوری نے آہستہ سے دہرایا۔ "ہم اس طرح زندہ نہ رہیں گے۔ ہم یوں اپنے آپ کو نہ مرنے دیں گے۔ ہماری جلاوطنی ختم ہوگی —— ہمارے سامنے آج کی صبح ہے مستقبل ہے۔ ساری دنیا کی نئی تخلیق ہے!"

لیکن کنول کماری —— تم اب بھی رو رہی ہو —— ؟

خدیجہ مستور

مینوں لے چلے بابلا لے چلے وے

پتلی سی نالی میں پانی کی دھار رینگ رہی تھی اور صابن کا پھولا پھولا جھاگ پانی پر غلاف کی طرح چڑھا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ ابھی ابھی اندھیرے غسل خانے سے نہا کر نکلا تھا اور تولیے سے بال خشک کرتا ہوا صحن میں پڑی ہوئی آرام کرسی کو دھوپ میں گھسیٹ کر سردی سے اکڑتے ہوئے جسم کو ذرا گرم کرنے کے لئے بیٹھ گیا تھا۔ تولیے سے بالوں کو رگڑتے ہوئے اس کی نظر نالی پر پڑ گئی۔ گندی کیچڑ بھری نالی میں پانی رک رک کر بہہ رہا تھا۔ ۔۔۔ اسے اچانک وہ واقعہ یاد آ گیا جس نے اس کے بے حد حساس دل و دماغ پر بری طرح اثر کیا تھا۔ کئی دن تک اس کی یہ حالت رہی تھی۔ جیسے وہ اس ایک واقعے کے علاوہ کچھ سوچ ہی نہ سکتا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ سب کچھ بھولتا گیا لیکن آج بہت دن بعد صابن کے جھاگ کے ساتھ بہتی ہوئی پانی کی دھار نے اس کے ذہن میں اس واقعے کی یاد پوری شدت سے ابھار دی۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں بے شمار آہیں گھٹنے لگیں۔ اس وقت اس کی کیفیت کچھ اس دن جیسی ہونے لگی جب وہ اس واقعے سے دوچار ہوا تھا۔ حالانکہ اس سے قبل ایسے ایسے دردناک منظر دیکھے تھے کہ پتھر بھی پگھل کر رہ جاتا۔ لیکن کبھی وہ اس حد تک متاثر نہ ہوا تھا۔

شہر کی گہما گہمی کو موت نے نگل لیا تھا۔ زندگی کونوں کھدروں میں منہ چھپائے سسک رہی تھی۔ ویرانی کہتی تھی کہ اب کبھی آباد نہ ہوں گے۔ موت کہتی تھی کہ ہمارے چنگل سے اب کوئی بھی نہ بچ سکے گا۔ مگر امدادی کیمپ کے دردمند دل کہتے تھے کہ زندگی اتنی ارزاں نہیں کہ ہم انہیں کیڑوں مکوڑوں کی طرح موت کے جال میں پھنس جانے دیں گے۔ وہ جہاں جہاں جا سکتے تھے، جہاں جہاں پہنچ سکتے تھے روتی سسکتی مایوس زندگیوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر چن چن کر پناہ گزینوں کے کیمپ میں پہنچا رہے تھے۔ اس روز بھی وہ سارا دن لاری پر ویران شہر کے گوشے گوشے کا چکر لگا کر پچاس فساد زدہ انسانوں کو کیمپ میں پہنچا کر محفوظ کر چکا تھا اور سارے دن کا تھکا ہارا پولیس چوکی پر لاری سے اتر کر گھر جانے کے لئے پیدل چل رہا تھا۔ شام کے پانچ بج رہے ہوں گے۔ وہ جلد سے جلد گھر پہنچ کر آرام کرنے کے لئے تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا کہ ایک دم اس کے پاؤں رک گئے۔ سڑک کے کنارے بارہ تیرہ آدمی کھڑے جھک جھک کر نالی میں نہ جانے کیا دیکھ رہے تھے۔ وہ ان سب کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔۔۔۔ بلڈنگ کے صدر دروازے میں بڑا سا تالا پڑا ہوا تھا اور وہ سب اسے توڑنے کے متعلق سوچ رہے تھے۔

"ہم لوگوں نے آج تین دن ہوئے کہ اس گھر کے بچے بچے کو پار لگا دیا پر یہ جانے کیسے بچ رہا۔" سرخ آنکھوں اور بھیانک چہرے والا آدمی چھرا لہرانے لگا۔

"پھر توڑ دو نا تالا ابھی!" دوسرے نے زمین پر ٹپکتے ہوئے کربند سے اپنا اُلجھتا ہوا پاؤں نکال کر کہا۔ "لیکن سوچو تو ——— تالا پڑا ہے بھلا گھر میں کون ہوگا؟" اس نے لوگوں کو سمجھانا چاہا۔ "کوئی نہیں ہوگا تو کیا یہ جادو کا کھیل ہو رہا ہے؟" تیسرا سُرخ سُرخ آنکھیں نکال کر نالی کی طرف اشارہ کرنے لگا ——— چوڑی اتھلی نالی میں بلڈنگ سے آتا ہوا صابن کا جھاگ ملا پانی کیچڑ میں رینگ رہا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ غسل فرمایا گیا ہے۔" چوتھا شخص اپنی قمیص سے چھرا صاف کرنے لگا اور وہ ایک لمحے کے لئے سوچ میں پڑ گیا کہ اب کیا کرے۔ اس وقت وہ سپاہیوں کو بہت دور پولیس چوکی پر چھوڑ کر آ رہا تھا اور پولیس کا کہیں دور دور پتہ نہ تھا۔

"تالا توڑ دو جی!" کئی آوازیں ایک ساتھ بھنبھنائیں۔

"لیکن دیکھو نا، انسانیت کا تو یہ تقاضا ہے ———" وہ انتقام کے جوش سے کھولتے ہوئے دماغوں پر انسانیت کے تقاضوں کے چھینٹے دینا چاہتا تھا لیکن اس کی بات بیچ ہی سے جھپٹ لی گئی۔

"جب ہماری ماؤں، بہنوں اور ہمارے بھائیوں کو خون میں نہلایا جا رہا تھا جب انسانیت کہاں تھی اور جب آپ کہاں تھے؟" کئی آدمیوں نے ایک ساتھ سوال کر دیا۔

"اپنی انسانیت کے ساتھ سو رہے ہوں گے۔" بھیانک صورت اور سرخ آنکھوں والے نے شیطانی قہقہہ لگایا۔

"لیکن دیکھو نا ———" اس کے دونوں ہاتھ بلند ہو کر جھک گئے۔

"تالا توڑا جائے گا۔ آپ کیوں منع کر رہے ہیں؟" لوگ اسے ایسی نظروں سے دیکھنے لگے جیسے وہ ان میں سے ایک نہیں۔

"میں منع نہیں کرتا تالا ضرور توڑ دو۔" اس نے بے بسی سے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت اس کی بات کوئی بھی نہ سُنے گا اور اگر زیادہ مخالفت کی تو اسے بھی چیر پھاڑ کر پھینک دیں گے۔ تالے کو تھوڑی ہی دیر میں کنڈے سے جُدا کر دیا گیا اور وہ سب اندر داخل ہو گئے۔ وہ سب کے پیچھے تھا اور جیسے اس کی روح پھڑک پھڑک کر رو رہی تھی ——— وہ چھپے ہوئے انسان کی جان بچانے کے لئے تیزی سے سوچنے لگا اور اچانک اس کے ذہن نے جان بچانے کی ایک موہوم سی ترکیب سوچ ہی لی۔

"دیکھو یوں اندھا دھند آگے مت بڑھو ممکن ہے کہ اس کے پاس بندوق ہو۔ میرے پاس رائفل ہے میں آگے چلتا ہوں تم سب دبے قدموں پیچھے پیچھے چلو۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ سب اس کا کہا مان کر اس کے پیچھے ہو لئے۔ وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کرنے لگا ——— ایک دو تین ——— سیڑھیاں جیسے نہ ختم ہونے والی کڑی ہو گئی تھیں۔ وہ سارا دن کام کرنے کی وجہ سے بہت تھکا ہوا تھا۔ اس کا جسم اور دل و دماغ سب ہی نڈھال ہو گئے تھے۔ لیکن اس وقت وہ ذرا بھی تھکان نہ محسوس کر رہا تھا۔ وہ سب سے آگے تھا اور برابر سوچ رہا تھا کہ جب پہلے اس اونچی بلڈنگ میں قتل و خون کا بازار گرم کر لیا گیا تھا، ایک کو بھی تو اپنے حساب میں نہ چھوڑا تھا۔ پھر بھی وہ چھپ کر اپنی جان بچا گیا۔ اس وقت بھی وہ جیسے ہی اسے نظر آئے گا اسے چھپ جانے کا اشارہ کر دے گا۔ اسے بتا دے گا کہ موت تم سے چند قدم کے فاصلے پر لپکی چلی آ رہی ہے۔ یقیناً اس گھر میں ایسی جگہ ضرور ہوگی جس میں وہ پہلے کی طرح چھپ سکتا ہے۔

پہلی منزل ——— دوسری ——— تیسری ——— ہر منزل کے ایک ایک کونے کو چھان مارا ہر کمرے میں سب سے پہلے وہ داخل ہوتا تھا۔ وہاں خاموشی اور ویرانی کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ الوؤں کا راج ہے۔ لیکن جب چوتھی منزل پر جانے کے لئے قدم اٹھ رہے تھے تو نہ جانے کیوں اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس کا دل پھڑک پھڑک کر دعائیں کر رہا تھا کہ وہاں بھی کوئی نہ ہو۔ کوئی نہیں۔ وہاں بھی الوؤں کا

راج ہو ـــــ وہ انسانی تماش خراش کے ایسے نمونے دیکھ چکا تھا کہ اب اپنے میں کوئی اور نمونہ دیکھنے کی سکت نہ پاتا تھا ـــــ اس کے قدم تیز ہو گئے تھے۔ اس نے پیچھے دبے دبے قدموں آنے والوں کو کئی گز پیچھے چھوڑ دیا تھا اور جب سیڑھیاں ختم ہوتے ہی سب سے پہلے سامنے پڑنے والے کمرے میں وہ داخل ہوا تو جیسے دم بخود رہ گیا۔ نیلے صاف ستھرے لباس میں ملبوس ایک بوٹے سے قد کی خوبصورت لڑکی اس کے سامنے زمین پر بیٹھی تھی۔ اس کی ناک تیر کی تھی۔ پپوٹے سرخ اور پھولے ہوئے، آنکھیں مندی مندی اور جسم نڈھال، اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور وہ ہاتھ میں کنگھا تھامے سامنے رکھے ہوئے آئینے میں نیم وا آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے پاس ہی زمین پر صابن دانی، تولیہ، کلپ اور بال پنیں پڑی ہوئی تھیں ـــــ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا تھا کہ اس کے سامنے کوئی جیتا جاگتا انسان ہے، وہ کوئی خوبصورت روح ہے، وہ کوئی پری ہے۔ لیکن جب لڑکی نے اپنی بوجھل آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا اور اس کے ہاتھ سے کنگھا چھوٹ کر زمین پر گر گیا تو اس کے جیتے جاگتے وجود کا احساس ہوا، اور پھر اسے بچانے کے لئے اس کی روح پھڑکی۔ اس نے اسے چھپ جانے کے لئے اشارہ کیا۔ آہستہ سے اسے بتایا کہ لوگ پیچھے آ رہے ہیں۔ مگر لڑکی جیسے اپنی جگہ پر جم کر رہ گئی تھی اسے ہلکی سی جنبش بھی نہ ہوئی۔ لڑکی نے بس ایک بار اسے بے بسی سے دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ سب لوگ کمرے میں گھس آئے۔ ان کے لہراتے ہوئے چھرے جھک گئے۔ وہ سب شیطانی ہنسی ہنسنے لگے۔

"پہاڑ کھودا تھا تو چوہیا نکلی؟" سرخ آنکھوں والا لڑکی کی طرف بڑھا اور اسے محسوس ہوا کہ زور سے زلزلہ آ گیا ہے۔ لڑکی کا چہرہ ایک دم سفید ہو رہا تھا۔

"رحم کرو۔ اسے مت چھونا۔" وہ لڑکی اور سرخ آنکھوں والے کے درمیان آ کر پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔

"ارے تو کیا بدن میلا ہو جائے گا۔ محنت کریں بی فاختہ، کوّے میوے کھائیں۔ اجی اپنی راہ لگئے؟" ایک نے کہا اور سب پھر ہنسنے لگے۔

وہ آدمیوں نے دھکے دے کر اسے لڑکی کے پاس سے ہٹا دیا۔

"نہیں، نہیں ـــ" وہ پھر لڑکی کے سامنے آ جانا چاہتا تھا کہ سرخ آنکھوں والے نے اپنا چھرا اس کے سینے پر رکھ دیا ـــ پھر ایک نے لڑکی کو اٹھا کر بھیڑ کی طرح کاندھے پر ڈال لیا۔ لڑکی کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی، اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ لیکن جب وہ لڑکی کو لے کر جانے لگے تو اس نے اپنی لٹکتی ہوئی باہیں اس کی طرف پھیلا دیں۔ اس کا جی چاہا کہ کاش اس وقت تو سچ مچ وہ چھرا اس کے سینے کے پار ہو جاتا۔ وہ بے چین ہو کر اس کی طرف بڑھا مگر اسے دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا گیا اور سرخ آنکھوں والے نے آگے بڑھ کر لڑکی کی پھیلی ہوئی باہیں اپنے گلے میں ڈال لیں۔ لڑکی کی آنکھیں جیسے بے انتہا کرب سے بند ہو گئیں۔

پھر آن کی آن میں کمرہ خالی تھا۔ پہلے سے زیادہ ویران اور خاموش۔ وہ سب جا چکے تھے اور وہ اسی جگہ زمین پر بیٹھا تھا جہاں لڑکی ذرا دیر پہلے کنگھی کر رہی تھی۔ وہ پھیلی ہوئی باہوں کا سہارا نہ بن سکا تھا۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کے سینے میں کوئی ضدی ساجذبہ مچل مچل کر اسے رلا رہا تھا۔ اس نے جانے کتنی جوان عورتوں کو اغوا ہوتے دیکھا۔ ان کی چیخیں، ان کی فریادیں سنی تھیں۔ مگر اس طرح کوئی بھی تو اس کے دل پر اثر نہ کر سکا تھا۔ مگر یہ گم سم سی لڑکی صرف باہیں پھیلا کر اسے کس قدر متاثر کر گئی تھی۔ اس کے دل جیسے نازک گوشت میں بھرپور چٹکی لے گئی تھی۔

جب وہ جی بھر کر رو چکا تو اس نے قدموں سے روندی ہوئی بال پنوں اور کلپوں کو سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیا۔ انہیں دیکھتا رہا، انہیں چھوتا رہا اور ہلکی سی نم تولیہ کو اٹھا کر سہلاتا رہا اور پھر اس بستر کو دیکھنے لگا جس پر اس قدر شکنیں پڑی ہوئی تھیں کہ جیسے اس پر مسلسل کئی دن تک کوئی پڑا کروٹیں بدلتا رہا ہو، پاؤں رگڑتا رہا ہو۔ وہ سوچنے لگا کہ اس خوبصورت اور عجیب لڑکی نے تین دن، تین راتیں اس بستر پر تڑپ کر گزاری ہیں، اور پھر وہ اٹھ کر آہستہ آہستہ بستر کی شکنیں درست کرنے لگا۔ تکیہ پر جگہ جگہ آنسوؤں کے بڑے بڑے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ تین دن، مسلسل تین دن تک روتی رہی اور پھر اس نے

تھکن سے نڈھال ہو کر منہ دھویا تھا۔ تاکہ اس میں پھر رونے کی سکت پیدا ہو جائے ——— اور پھر وہ اپنے بال سنوارنے بیٹھ گئی تھی۔ لیکن بال کیوں سنوار رہی تھی؟ اس نے صابن سے منہ کیوں دھویا ——— اگر تھک گئی تھی تو منہ پر یوں ہی پانی کے چھینٹے بھی تو دے سکتی تھی۔ مگر اس نے تو باقاعدہ صابن سے منہ دھویا تھا اور انہماک سے سنگھار کر رہی تھی ——— شہر میں سناٹا تھا، اس کی بلڈنگ میں سناٹا تھا، موت سب کچھ نگل گئی تھی۔ پوری بلڈنگ میں بھیانک ویرانی تھی۔ زندگی کا آس پاس کیا دور دور پتہ نہ تھا، اور وہ سنگھار کر رہی تھی۔ اس تنہا خاموش کمرے میں مسلسل تین دن رو چکنے کے بعد سنگھار کر رہی تھی۔ تھکن سے نڈھال اور چور، آخر وہ کس کے لئے سنگھار کر رہی تھی۔ کیوں ——— وہ کون سا جذبہ تھا۔ کتنی عجیب، کتنی حسین لڑکی ——— اور جب اسے اٹھا کر لے گئے تو وہ چپ چاپ چلی گئی ——— اور پھر اس کے دل دماغ کو دو پھیلی ہوئی باہوں نے جکڑ لیا۔ کاش وہ اس تھکی تھکی نڈھال لڑکی کا سر اپنے زانو پر رکھ سکتا، اس کے سرخ پھولے ہوئے پپوٹوں کو سہلا سکتا۔ وہ اس کے لئے وہ سب کچھ کر سکتا جو وہ چاہتی تھی اور پھر کچھ نہ کر سکنے کے جذبے نے اسے بے چین کر دیا۔ اس نے سرہانے سے تکیہ اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ تکیے کے نیچے ایک کاغذ پڑا تھا۔ میلا، بوسیدہ۔ وہ اسے کھول کر پڑھنے لگا۔ "میری جان!" ——— وہ پورا خط جلدی جلدی پڑھ گیا۔ لیکن آخر میں جب وہ پڑھ رہا تھا کہ "میں تم سے جلد ہی آ کر ملنے والا ہوں۔ میں تمہیں دیکھنے کے لئے بے حد بے چین ہوں۔ اتنا بے چین کہ اگر میری راہ میں کوئی بڑے سے بڑا طوفان بھی حائل ہو جائے تو وہ مجھے تم تک پہنچنے سے نہ روک سکے گا۔ میں تمہارے پاس سیدھا تمہارے کمرے میں پہنچوں گا جہاں تم بنی سنوری بیٹھی میری راہ دیکھ رہی ہو گی اور" ——— ہاتھ کانپے۔ خط چھوٹ کر زمین پر گر گیا ———

نیچے اچانک شور ہونے لگا۔ دھما دھم کی تیز آوازیں آنے لگیں۔ شاید قریب کی کسی بلڈنگ کا سامان لوٹا جا رہا تھا۔ اس نے بال پنیں اور کلپ اٹھا کر جیب میں ڈال لئے اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے سیڑھیاں طے کر کے چپ چاپ گھر کی طرف چل پڑا۔

سوچتے سوچتے اس نے ایک بار پھر نالی کی طرف دیکھا۔ پانی بہہ چکا تھا اور صابن کا جھاگ بجھ کر ختم ہو چکا تھا۔

شفیق الرحمٰن

جیلینی

ہوائی جہاز پر سوار ہوتے وقت مجھے کچھ شبہ سا ہوا۔ نیلے لباس والی لڑکی سے پوچھا تو اس نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔ جب ہم جہاز سے اترے تو مجھے یقین ہو گیا اور میں نے پائپ پیتے آکسفورڈ لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے پائیلٹ کو دبوچ لیا۔ ہم مدتوں کے بعد ملے تھے کالج میں دیر تک اکٹھے رہے کچھ عرصہ تک خط و کتابت بھی رہی۔ پھر ایک دوسرے کے لئے معدوم ہو گئے اتنے دنوں کے بعد اور اتنی دور اچانک ملاقات بڑی عجیب سی معلوم ہو رہی تھی۔

طے ہوا کہ یہ شام کسی اچھی جگہ گزاری جائے اور بیتے دنوں کی یاد میں جشن منایا جائے۔ میں نے اپنا سفر ایک روز کے لئے ملتوی کر دیا۔

جب باتیں ہو رہی تھیں تو میں نے دیکھا کہ وہ کافی حد تک بدل چکا تھا۔ مٹاپے نے اس کے تیکھے خد و خال کو مبہم بنا دیا تھا اس کی آنکھوں کا وہ تجسس نگاہوں کی وہ بے چینی، وہ ذہین گفتگو سب مفقود ہو چکے تھے وہ عامیانہ سی گفتگو کر رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنی زندگی اور ماحول سے اس قدر مطمئن ہے کہ اس نے سوچنا بالکل ترک کر دیا ہے۔ دیر تک ہم پرانی باتیں دوہراتے رہے۔

سہ پہر کو وہ مجھے ایک اینگلو انڈین لڑکی کے ہاں لے گیا جسے وہ شام کو مدعو کرنا چاہتا تھا لڑکی نے بتایا کہ شام کا وقت وہ کسی اور کے لئے وقف کر چکی ہے۔ ہم ایک اور لڑکی کے ہاں گئے اس نے بھی معذرت چاہی کیوں کہ اس کی طبیعت ناساز تھی۔ پھر تیسری کے گھر پہنچے اگرچہ دوسرے کمرے سے خوشبوئیں بھی آ رہی تھیں اور کبھی کبھار آہٹ بھی سنائی دے جاتی تھی لیکن دروازہ نہیں کھلا وہ ایک اور شناسا لڑکی کے ہاں جانا چاہتا تھا لیکن میں نے منع کر دیا تھا کہ کوئی ضرورت نہیں، اور پھر اگر کوئی اور ساتھ ہوا تو اچھی طرح باتیں نہ کر سکیں گے۔ واپس آ کر اس نے ٹیلیفون پر کوشش کی تیسری لڑکی گھر پہنچ چکی تھی لیکن شام کو اس کی آنٹی اسے نانی جان کے ہاں لے جا رہی تھیں۔

شام ہوئی تو ہم وہاں کے سب سے بڑے ہوٹل میں گئے رقص کا پروگرام بھی تھا۔ اس نے پینا شروع کر دی میرے لئے بھی انڈیلی اور اصرار کرنے لگا یہ اس کی پرانی عادت تھی۔

میں نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے چھوا، کچھ دیر گلاس سے کھیلتا رہا پھر ٹہلتا ٹہلتا دریچے تک گیا ایک بڑے سے گملے میں انڈیل کر واپس آ گیا۔

اس نے دوسری مرتبہ انڈیلی مجھے بھی دی میں پھر اٹھا اور اپنا حصہ کھڑکی سے باہر پھینک آیا۔

وہ اپنی روزانہ زندگی کی باتیں سنا رہا تھا کمپنی کی لڑکیوں کے متعلق جو نہایت طوطا چشم تھیں۔ شراب کے متعلق جو دن بدن مہنگی ہوتی جا رہی تھی۔ اپنے عاشقوں کے متعلق جو اسے بے حد پریشان رکھتے تھے۔ اس کی بیوی بھی اسی شہر میں رہتی تھی لیکن وہ اس سے ملتا نہ تھا جب کبھی بھولے سے گھر جاتا تو وہ اتنے سوال پوچھتی کہ عاجز آجاتا۔ وہ اتنا نہیں سمجھتی کہ ایک ہوا باز کی زندگی کس قدر خطرناک زندگی ہے۔ اگرچہ یہ زندگی اس نے خوب منتخب کی تھی۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دفعتاً ہم نے اس لڑکی کو رقص گاہ میں دیکھا جسے اس وقت گرجے میں ہونا چاہئے تھا وہ ایک لڑکے کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ لڑکی آگئی جس کی طبیعت ناساز تھی پھر معلوم ہوا کہ تیسری لڑکی بھی ہمارے سامنے رقص کر رہی ہے اپنی آنٹی یا نانی جان کے ساتھ نہیں، ایک دوسرے ہوا باز کے ساتھ۔

وہ اپنی قسمت کو کوسنے لگا نہ جانے یہ لڑکیاں ہمیشہ اسی کو کیوں دھوکہ دیتی ہیں۔ ہمیشہ دغا دیتی ہیں آج تک کسی لڑکی نے اسے دل سے نہیں چاہا۔ یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی ٹریجیڈی ہے۔

وہ گلاس پر گلاس خالی کئے جا رہا تھا میرے حصے کی ساری شراب گملوں اور پودوں کو سیراب کر رہی تھی۔ اسے حیرت تھی کہ مجھ جیسا لڑکا جو کالج کے دنوں میں باقاعدہ سگریٹ بھی نہ پیتا تھا اب ایسا شرابی ہو گیا کہ اتنی پی چکنے کے بعد بھی ہوش میں ہے۔ اس کے خیال میں ایسے شخص کو پلانا قیمتی شراب کا ستیاناس کرنا تھا۔

پھر ان اجنبی چہروں میں ایک جانا پہچانا مانوس چہرہ دکھائی دیا۔ یہ جینی تھی۔ جو رقص کا لباس پہنے ایک ادھیڑ عمر کے شخص کے ساتھ ابھی ابھی آئی تھی ہم دونوں اٹھے ہمیں دیکھ کر جینی کا مسکراتا ہوا چہرہ کھل گیا۔ وہ بڑے تپاک سے ملی تعارف ہوا ——— میرے خاوند سے ملئے ——— اور یہ دونوں میرے پرانے دوست ہیں ———

میں نے ہاتھ ملاتے وقت اس کے خاوند کو مبارکباد دی ——— اور کہا کہ وہ دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان ہے۔

میں نے اسے غور سے دیکھا وہ چالیس سے اوپر کا ہوگا۔ اچھا خاصا سیاہ رنگ، دھندلی دھندلی آنکھیں، بے حد معمولی شکل پستہ قد۔ اگر وہ جینی کا خاوند نہ ہوتا تو شاید ہم اس کی طرف دوسری مرتبہ نہ دیکھتے۔ لیکن جینی کی مسکراتی ہوئی آنکھیں اس کے سوا اور کسی کی طرف دیکھتی ہی نہ تھیں۔ وہ اس کی تعریفیں کر رہی تھی کہ وہ قریب کی بندرگاہ کا سب سے بڑا بیرسٹر ہے اس علاقے میں سب سے مشہور شخص ہے۔ میں نے جینی کو رقص کے لئے کہا اس نے محسوس کیا کہ وہ بے حد مسرور ہے۔ اس قدر مسرور شاید میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا اس کے چہرے کی چمک وہی ہے اس کے ہونٹوں کی وہ دلآویز اور مخمور مسکراہٹ جوں کی توں ہے وہ مسکراہٹ جو اس قدر مشہور تھی جسے مونالیزا کی مسکراہٹ سے تشبیہ دی جاتی تھی ——— نہایت پراسرار اور نافہم مسکراہٹ جس کی گہرائیوں کا کسی کو علم نہ ہو سکا۔ جو ہمیشہ راز رہی۔

اور یہی مسکراہٹ میں نے سالہا سال سے دیکھی تھی۔ اس مسکراہٹ سے میں خوب شناسا رہا۔ جینی کے خاوند کے دوست آگئے اور مقامی باتیں ہونے لگیں۔ کچھ دیر کے بعد میں اور میرا دوست اٹھ کر واپس اپنی جگہ چلے آئے، جہاں بوتل اس کی منتظر تھی۔

میں نے اس سے جینی کے متعلق باتیں کرنا چاہیں لیکن اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ ان تینوں لڑکیوں کے لئے اداس تھا جو اسے دھوکہ دے کر دوسروں کے ساتھ چلی آئیں۔ آج یہ پہلا مرتبہ نہیں ہوا پہلے بھی بارہا ہو چکا تھا اور یہ لڑکیاں اجنبی نہیں تھیں، پرانی دوست تھیں اس کے ساتھ باہر جا چکی تھیں۔ اس سے بیش قیمت تحائف لے چکی تھیں دراصل اب ایسی ٹھوکریں اسے ہر طرف سے لگ رہی تھیں رقص، برج، شاید ہر جگہ وہ ہار رہا تھا۔ ایک ادنیٰ فلم کمپنی کی ایکسٹرا لڑکی جس کے لئے اس نے سمندر کے کنارے مکان لیا اسے چھوڑ کر کسی بوڑھے سیٹھ کے ساتھ چلی گئی ——— اور میں دزدیدہ نگاہوں سے اس طرف دیکھ رہا تھا جہاں جینی تھی وفور مسرت سے اس کا چہرہ جگمگا رہا تھا، اس کی آنکھیں روشن تھیں ——— وہی آنکھیں جو کبھی غمگین اور نمناک رہا کرتی تھیں اب مسرور تھیں۔ رخسار جن پر دو آنسوؤں کی لڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتی رہیں اب تاباں تھے۔ وہ کھلی ہوئی مسکراہٹ شاہد تھی کہ دل سے اس شدید الم کا احساس جا چکا ہے جو جینی کی قسمت بن چکا تھا۔

اس خوشی میں اب غم کی رمق تک نہیں دکھائی دیتی تھی۔

لیکن اتنی زائد مسرت کیسی تھی؟ یہ انبساط کیسا تھا؟ اور اس پر اسرار مسکراہٹ کے پیچھے کیا تھا؟

میں صرف اس کے چہرے کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کی روح بہت دور تھی۔ وہاں تک میری نگاہیں نہیں پہنچ سکتی تھیں کیا وہاں کوئی عظیم طوفان بپا تھا؟ اذیت کن، کرب ناک شدید تلاطم۔ یا جلتے ہوئے شعلوں کی تپش نے بہت کچھ بھسم کر دیا تھا؟ یا وہاں سب کچھ یخ ہو چکا تھا؟ برف کے تودوں کے سوا کچھ بھی نہ رہا تھا؟

اس کا جواب میں نے اس کی مسکراہٹ سے مانگا۔

وہ لگاتار اپنے خاوند کے ساتھ رقص کرتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر۔ کئی مرتبہ وہ بالکل قریب سے گزرے اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرائی پھر جیسے وہ مسکراہٹ پھیلتی گئی۔ اس نے ماضی اور حال کی حدوں کو محیط کر لیا۔ وہ سب تصویریں سامنے آنے لگیں جو ذہن کے تاریک گوشوں میں مدفون تھیں۔

میں نے برسوں پہلے اسے یونیورسٹی کے مباحثے میں دیکھا! میرے ساتھ میرا پیارا رفیق اور ہم جماعت جی بی تھا۔ وہ ان دنوں بہترین مقرر تھا۔ سٹیج پر ہمیشہ فاتح کی طرح جاتا اور فاتح کی طرح لوٹتا۔ اس کی تقریر ختم ہوئی تو ایک لڑکی سٹیج پر آئی۔ گھنگھریالے بال، جھکی ہوئی آنکھیں، لبوں پر محجوب مسکراہٹ۔ ملا جلا انگریزی اور ہندوستانی لباس پہنے ـــ

ہال میں سرگوشیاں ہونے لگیں ہمیں بتایا گیا کہ یہ نئی نئی کہیں سے آئی ہے اس کا نام کچھ اور ہے لیکن اسے لیلے کہتے ہیں۔ شاید اس کی ملیح رنگت اور گھنگھریالی پریشان زلفوں کی وجہ سے۔

کچھ دیر وہ شرماتی رہی، بول ہی نہ سکی۔ پھر ذرا سنبھل کر اس نے جی بی کی تقریر کی مخالفت شروع کی۔ ایسے ایسے نکتے لائی کہ سب حیران رہ گئے۔ جی بی کی تقریر بالکل بے معنی معلوم ہونے لگی۔

جب وہ سٹیج سے اتری تو دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ پہلا انعام جی بی اور اس لڑکی میں تقسیم کیا جائے گا لیکن جی بی نے ججوں سے درخواست کی کہ انعام کی وہی حقدار ہے اور اسی کو ملنا چاہئے جی بی کے رویے کو سراہا گیا ہجوم میں ہیجان پھیل گیا۔ مدتوں کے بعد ایک لڑکی پہلا انعام جیت رہی تھی، وہ بھی ایسی لڑکی جو بالکل نووارد تھی۔

جب لیلی سٹیج پر چاندی کا بڑا سا وزنی کپ لینے آئی تو اس کی پریشان زلفیں اور پریشان ہو گئیں نگاہیں اور جھک گئیں جب اس سے اتنا بڑا کپ نہ سنبھالا گیا، تو جی بی نے لپک کر کپ کا چوبی حصہ خود اٹھا لیا۔ لیلے نے جی بی کو جھکی ہوئی نگاہوں سے ایک مرتبہ دیکھا۔

اس بھولی بھالی الھڑ لڑکی سے ہمارا تعارف یوں ہوا۔ اس کے بعد ملاقاتوں کا تانتا بندھ گیا۔ جی بی کالج کا ہیرو تھا۔ لڑکوں اور استادوں میں ہر دلعزیز کالج میں سب سے ذہین، چست، ہنس مکھ اور خوش پوشاک۔ بڑے امیر والدین کا اکلوتا بیٹا۔ اس کی کار پروفیسروں کی کاروں سے بھی بڑھیا تھی۔ جہاں کہیں ادبی تقریب ہوتی مجھے اور جی بی کو مدعو کیا جاتا۔ ہمارے کہنے پر لیلے کو بھی بلایا جاتا...... لیلے کے خدوخال حسین نہیں تھے۔ اگر اسے نقادانہ طور سے دیکھا جاتا تو وہ حسین ہرگز نہیں تھی ـــــــ لیکن اگر حسین خدوخال کے بغیر بھی کوئی خوبصورت ہو سکتا ہے تو وہ لیلی تھی۔ اس کی لہراتی ہوئی زلفیں جھکی ہوئی شرمیلی آنکھیں، مسکراتے ہوئے ننھے ننھے ہونٹ ملیح چمپئی رنگت ـــ اور نہایت معصوم باتیں ـــــ سب مل کر نرالی جاذبیت پیدا کر دیتے۔ بعض اوقات تو وہ بے حد پیاری معلوم ہوتی۔

وہ ہوسٹل میں رہتی تھی۔ سب سے الگ تھلگ کبھی ہم نے اسے کسی کے ساتھ نہیں دیکھا۔ اس کے والدین کے متعلق طرح طرح کی افواہیں سننے میں آتیں ان کے خاندان میں انگریزی اور پرتگالی خون کی آمیزش تھی۔ اس کی والدہ جنوبی ہندوستان کی تھی اس لئے نہ ان کا کوئی خاص مذہب تھا نہ کوئی نسل۔ لیلے کا نام بھی عجیب سا تھا، اس کا لباس بھی ملا جلا ہوتا وہ اپنے والدین کے ذکر سے احتراز کرتی۔ یہ مشہور تھا کہ ان کی خانگی زندگی نہایت ناخوشگوار

ہے وہ ہمیشہ جدا رہتے ہیں ایک وضوان کا تنازعہ عدالت تک پہنچ چکا ہے ۔

پھر کسی نے یونہی کہہ دیا کہ بیلے جی بی کی طرف دیکھتی رہتی ہے ۔ یہ افواہ بنی ، پھر عام ہو گئی ہر جگہ اس نئے معاشقے پر تبصرے ہونے لگے ۔ سب نے دیکھا کہ بیلے کے دل کا راز عیاں ہو چکا تھا وہ جی بی کو چاہتی ہے طرح طرح کے بہانوں سے وہ اسے ملتی ۔ جانے پہچانے راستوں سے ایسے وقت گزرتی کہ جی بی نظر آ جاتا جی بی کو دیکھ کر اسے دنیا بھر کی نعمتیں مل جاتیں یہ نوزائیدہ محبت اس کی زندگی میں طرح طرح کی تبدیلیاں لے آئی ۔ وہ مسرور رہنے لگی ۔ ادبی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لینے لگی اس کا اجنبی لہجہ درست ہوتا گیا ، اس کی گفتگو میں مٹھاس آ گئی ۔

لیکن جی بی کچھ اتنا متاثر نہیں ہوا ۔ اس کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کتنی ہی مرتبہ اسے محبت خراج کے طور پر ملی تھی ۔ وہ بیلے سے ملتا ، اسے ملنے کے موقعے دیتا ، خوب باتیں کرتا بڑی شوخ اور چنچل قسم کی گفتگو ، جس کا وہ عادی تھا ۔

چاندنی رات میں وہ ایک باغ میں تقریب ہوئی ۔ لڑکیوں کے ساتھ بیلے بھی آئی ۔ جی بی ہمارے ساتھ نہیں آیا ، معلوم ہوا کہ وہ ایک انگریز لڑکی کو لے کر آئے گا ۔ جس کا شہر بھر میں چرچا تھا جو نوجوانوں کی گفتگو کا محبوب ترین موضوع تھی ، یہ اس کی نئی محبوبہ تھی ۔

جی بی دیر میں آیا ، کار سے وہ اکیلا اترا ، ۔ وہ لڑکی اس کے ساتھ نہیں تھی ، وہ مایوس اور کھویا کھویا سا تھا ، اور فوراً واپس جانا چاہتا تھا لیکن اسے اجازت نہ ملی ، وہ تو ایسی محفلوں کی جان تھا ۔ جب وہ اپنا سانیٹ سنا رہا تھا تو بیلے اسے ایسی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جیسے آئینے میں خود اپنا عکس دیکھ رہی ہو جیسے خود اپنی روح کو کسی اور روپ میں دیکھ رہی ہو ۔ جی بی نے خلاف توقع غم آمیز اشعار سنائے جن میں شکوے تھے ، التجائیں تھیں اور وہ اشعار کسی خاص ہستی کے لئے تھے جو وہاں نہیں تھی ۔

بیلے نے کئی مرتبہ اس سے باتیں کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بدستور خاموش رہا میں نے اسے ٹوکا ، ایک طرف لے جا کر ڈانٹا بھی لیکن جیسے وہ وہاں تھا ہی نہیں ۔ ہم دونوں اکیلے کھڑے تھے کہ بیلے آ گئی ہم ۔ جی بی کچھ دیر اس کی طرف یونہی دیکھتا رہا پھر اس کا ہاتھ پکڑا اور ایک اونچے سرو کے پیچھے لے گیا وہ مبہوت سی چپ چاپ چلی گئی ۔ جی بی نے اسے بازوؤں میں لے کر چوم لیا پہلے بوسے پر وہ کانپ اٹھی ۔ ان جانی لذت سے مغلوب ہو کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور جی بی کے سینے سے سر لگا دیا وہ اسے پیاسے ہونٹوں سے چومتا رہا ایسے الفاظ اس کے لبوں سے نکلتے رہے جو بیلے کے لئے نہیں کسی اور کے لئے تھے ۔ اس کے بازوؤں میں بیلے نہیں تھی ، کوئی اور بے وفا حسینہ تھی جس کے لئے وہ بے تاب تھا ۔

بیلے شدت احساس سے آنکھیں بند کئے خاموش کھڑی رہی ، وہ جی بی اور اس کے بوسوں کی دنیا سے دور نکل گئی ۔ وہ شعر و نغمے کی وادیوں میں جا پہنچی جہاں اس کے بسے ہوئے خوابوں کی تعبیریں آباد تھیں جہاں فضاؤں میں اس کی معصوم امنگیں تحلیل ہو چکی تھیں ، جہاں کیف و خمار چھائے ہوئے تھے ۔ جہاں صرف رعنائیاں تھیں اور محبت پاشیاں !

اس کے بعد بیلے کی نئی زندگی شروع ہوئی ۔ اس کی دنیا میں ہر چیز پر نیا نکھار آ گیا جو پہلے محض تخیل تھا ، تخلیق ہو گیا ۔ غنچے چٹکے ، خوش الحان طیور چہچہانے لگے ۔ رنگ برنگے پھولوں کی خوشبوؤں نے ہوائیں بوجھل کر دیں ۔ زمین سے آسمان تک قوس قزح کے رنگ مچلنے لگے ، ہر شے کا خوابیدہ حسن جاگ اٹھا ، اس کے بعد نہ دنیا رہی اور نہ زندگی محض خواب تخیل اور حقیقت کی سرحدوں پر چھا گیا ۔

بہت دیر کے بعد بیلے اس خواب سے چونکی ۔ دفعتاً اس پر اس بھیانک حقیقت کا انکشاف ہوا کہ وہ جی بی کے لئے محض ایک کھلونا تھی ۔ جی بی کو اس سے محبت نہیں تھی وہ جی بی کے لئے ان متعدد لڑکیوں میں سے ایک تھی جو اس کا تعاقب کرتی تھیں ۔ بغیر کسی صلے کے اسے چاہتی تھیں ۔

جب بات بہت مشہور ہوئی تو جی بی کترانے لگا اس نے تقریبوں میں آنا بند کر دیا ، بیلے کو دیکھ کر کترا جاتا یا اس کی طرف سے منہ پھیر لیتا ۔

اپنی پہلی محبت کی شکست پر بیلے کو یقین نہ آیا اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یوں بھی ہو سکتا ہے ۔ اس صدمے کو اس نے اپنی روح کی گہرائیوں میں چھپا

گیا لیکن اس کی محبت جوں کی توں رہی۔ وہ اس سے ملنے کے بہانے تلاش کرتی اسے خط لکھتی، تحائف بھیجتی۔

وہ دوسرے کالج میں تھی۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح جی بی کو ہر روز دیکھ لیتی۔

ایک روز سب نے لیلےٰ کے خطوط کو نوٹس بورڈ پر دیکھا۔ یہ وہ محبت بھرے خطوط تھے جو اس نے جی بی کو لکھے۔ بہت سے لڑکے یہ خطوط دیکھنے گئے میں بھی گیا سب نے مزے لے لے کر خطوط کو پڑھا دلچسپ فقرے نقل کئے، خوب ہنسے بھی۔

بعد میں جب مجھے کچھ خیال آیا تو میں نے جی بی کو بُرا بھلا کہا، اسے یہ حرکت ہرگز نہیں کرنی چاہئے تھی۔ وہ کہنے لگا کہ لیلےٰ نے اسے اس قدر بدنام کر دیا ہے کہ اب وہ اس کے نام سے نفرت کرتا ہے۔ وہ اس سے ملتا ضرور رہا ہے لیکن کسے علم تھا کہ معمولی سا مذاق ایسی شکل اختیار کرے گا، اور وہ مفت میں بدنام ہو جائے گا۔

محض لیلیٰ کی وجہ سے بقیہ لڑکیاں اس سے دور دور رہنے لگی ہیں۔

جی بی میرا گہرا دوست تھا، ہم دونوں ہم عمر تھے، ہمارے خیالات یکساں تھے ——— میں خاموش ہو گیا۔ وہ بڑے تک خطوط کا چرچا رہا، لیلےٰ کئی دن کالج نہیں آئی تنہا گوشوں میں بیٹھ کر رویا کی۔ اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا ——— جو کچھ اسے کہا گیا اس نے خاموشی سے برداشت کیا۔

جی بی نے لیلیٰ کی سہیلیوں کی منتیں کیں کہ اسے سمجھائیں، کسی طرح اسے دور رکھیں اس نے ان راستوں سے گزرنا چھوڑ دیا جہاں لیلےٰ کے نظر آنے کا احتمال ہوتا، اپنے کمرے کی وہ کھڑکیاں مقفل کر دیں جو سڑک کی طرف کھلتی تھیں جن کی طرف لیلےٰ گزرتے ہوئے دیکھ لیا کرتی۔

ایک دن مجھے ترس آ گیا، میں جی بی سے خوب لڑا، جہاں ہم اتنی لڑکیوں سے ملتے رہتے ہیں وہاں کبھی کبھی لیلےٰ سے مل لینے میں کیا حرج ہے۔ وہ بولا ——— نہیں معصومیت اور سادگی پسند ہے مجھے نہیں۔ مجھے ناپختہ اور الھڑ لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر آنسو نکل آتے ہیں۔ خوش ہوئیں تو رونے لگیں، غمگیں ہوئیں تو آنسو بہنے لگے۔ دنیا کی کسی چیز کا بھی انہیں علم نہیں۔ ہر چیز خود بتانی پڑتی ہے اور میرے پاس اتنا وقت نہیں مجھے تجربہ کار اور کھیلی ہوئی لڑکیاں زیادہ پسند ہیں۔

جی بی کے اس رویے کا اثر یہ ہوا کہ لیلےٰ اس سے ڈرنے لگی، وہ اسے دور دور سے دیکھتی کبھی سامنا ہوتا تو راہ کترا جاتی۔ دوسروں سے جی بی کے متعلق پوچھتی رہی۔ کئی مرتبہ میں نے خود اسے جی بی کے بارے میں باتیں بتائیں اس کی تصویریں بھی دیں جس پر وہ مجھ سے خفا ہو گیا۔

پھر جی بی کو کچھ عرصے کے لئے اپنی تعلیم چھوڑ دینی پڑی۔ اس کے کچھ رشتہ دار دوسرے ملک میں بہت بڑے تاجر تھے۔ اسی سلسلے میں جی بی کے والد اسے باہر بھیجنا چاہتے تھے اور ان کے لئے تعلیم اتنی اہم نہ تھی ہم دونوں کو ایک دوسرے سے بچھڑنے کا بہت افسوس ہوا ایک شام کو ہم اداس بیٹھے تھے کہ میں نے اسے لیلےٰ سے آخری مرتبہ ملنے کو کہا، اس نے انکار کر دیا جب میں نے پرانی دوستی کا واسطہ دلایا۔ تو وہ راضی ہو گیا میں نے لیلیٰ کو بتایا تو اسے یقین نہ آیا اس نے آنسو خشک کئے اپنا بہترین لباس پہنا سہیلیوں سے مانگ کر زیور پہنے، ان کے مشورے سے سنگار کیا اپنے چہرے پر مسکراہٹ اور دل میں آرزوئیں لئے اپنے محبوب سے ملنے گئی۔ اس رات جی بی پیے ہوئے تھا، بعد میں اس نے بتایا کہ اس نے محض میری وجہ سے پی تھی تاکہ وہ لیلیٰ سے پیار بھری باتیں کر سکے۔

اس نے لیلیٰ سے بہت سی باتیں کیں، اسے ہمیشہ مسرور رہنے کو کہا، جلد لوٹنے کے وعدے کئے۔ لیلیٰ کو ایک بار پھر اس فردوس گمشدہ کی جھلک دکھائی دی جسے محبت کے پہلے بوسے نے تخلیق کیا تھا۔ لیلےٰ نے اقرار کیا کہ وہ ہمیشہ خوش رہے گی اور اس کا انتظار کرے گی اگر اس کی وجہ سے جی بی کو کوئی تکلیف پہنچی ہو تو وہ سزا کی طالب ہے اگر جی بی حکم دے تو وہ کہیں دور چلی جائے اگر وہ چاہے تو لیلےٰ مر جائے یہ دا ہوتے وقت اس نے اپنا رومال جی بی کو نشانی کے طور پر دیا۔ یہ رومال جی بی نے مجھے دے دیا کہنے لگا شاید تمہارے پاس محفوظ رہے ورنہ میں تو اسے کہیں ادھر ادھر پھینک دوں گا۔" رومال سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی ایک کونے میں سرخ دھاگے سے ننھا سا دل بنا ہوا تھا جسے لیلےٰ نے خود کاڑھا تھا۔

جی بی کے چلے جانے پر لیلےٰ زیادہ غمگین نہ ہوئی، اس کے وعدوں کو دل سے لگائے انتظار کرتی رہی یہ انتظار طویل ہوتا گیا۔

پتے زرد ہو کر گر پڑے، پھول مرجھا گئے ٹہنیاں ٹنڈ منڈ رہ گئیں، خزاں آگئی — وہ نہ آیا۔ جھکڑ چلے سوکھے پتے اڑنے لگے گرد و غبار نے آسمان پر چھا کر چاندنی اداس کر دی، تاروں کو بے نور کر دیا، وحشتیں پھیل گئیں — وہ نہ آیا۔
کونپلیں پھوٹیں، ہریالی میں پیلی پیلی سرسوں پھولی، رنگین تتلیاں اڑنے لگیں، غنچے مسکرانے لگے، پرندوں کے نغموں سے ویرانے گونج اٹھے، بہار آ گئی — لیکن وہ نہ آیا۔
دن لمبے ہوتے گئے، لمبی لمبی دوپہریاں گئیں۔ سفید بگلوں کی قطاریں سیاہ گھٹاؤں کو چیرتی ہوئی گزر گئیں۔ نیلے بادل اٹھے اور برس کر چلے گئے۔ جھیلوں کے کنارے قوس قزح سے رنگین ہو گئے — لیکن وہ پھر بھی نہ آیا۔
بہت دنوں تک لیلے کھوئی کھوئی سی رہی۔ بہت دیر کے بعد وہ سب کچھ سمجھ سکی۔ جب جی بی لوٹا تو وہ سنبھل چکی تھی۔ جی بی اکیلا نہیں آیا، اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی۔ گوری چٹی فربہ عورت جو کسی لکھ پتی کی بیٹی تھی جس کا گول سا چہرہ کسی قسم کے اظہار سے مبرا تھا جس کے دل میں جذبات کے لئے جگہ نہ تھی۔ جو اس ٹھوس اور مادی دنیا میں پیدا ہوئی اور اسی دنیا سے تعلق رکھتی تھی۔
ایسے اونچے اور امیر گھرانے میں شادی ہو جانے پر سب نے جی بی کو مبارکباد دی۔ اس کی قسمت پر رشک کیا۔

میں لیلے کو بھی جانتا تھا اور جی بی کو بھی یہ محض اتفاق تھا کہ وہ دونوں اس وقت رقص گاہ میں تھے۔ جی بی میرا وہ پرانا دوست تھا جو میرے ساتھ بیٹھا تھا اور پی رہا تھا اور یہ لیلی وہ جینی تھی جو میرے سامنے اپنے خاوند کے ساتھ رقص کر رہی تھی۔

لیلی کو بدستور چھیڑا جاتا۔ طعنے دیئے جاتے۔ سب اس کا مذاق اڑاتے۔ ایک روز ہم نے سنا کہ وہ کالج چھوڑ کر گھر چلی گئی۔ کچھ دنوں تک اس کا انتظار کیا گیا لیکن وہ واپس نہ آئی۔ آہستہ آہستہ اس کی باتیں بھولتی گئیں۔ کچھ عرصے کے بعد لیلی کا ذکر ایک پرانی بات ہو گئی۔
ایک دن وہ کہیں سے آ کر کالج میں داخل ہوئی۔ اب وہ بالکل بدلی ہوئی تھی اب وہ شرماتی لجاتی سہمی ہوئی لیلے نہیں، بلکہ شوخ و بے باک جینی تھی یہ نیا نام اس نے خود اپنے عیسائی نام سے چنا تھا وہ کالج کے قریب ہی ایک عیسائی کنبے میں رہتی۔ صبح صبح جب گردن اونچی کئے نگاہیں اٹھائے سائیکل پر آتی تو لڑکے ٹھٹک کر رہ جاتے۔ ہر وقت اس کے ہونٹوں پر نہایت بیباک مسکراہٹ ہوتی
یونین کا جلسہ ہے تو جینی تقریر کر رہی ہے۔ ڈراما ہے تو وہ ضرور حصہ لے گی۔ مباحثہ ہے تو جینی اچھے اچھوں کی دھجیاں اڑا دے گی۔ اس کی دلیری اور صاف گوئی سے لوگ ڈرتے تھے۔
جینی کی بے باکی کو سراہا جانے لگا۔ اور سب اسے عزت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔
ڈے یونین کا صدر تھا، وہ دبلا پتلا سا بنگالی لڑکا تھا اس میں صرف یہ خوبی تھی کہ وہ کئی سال سے یونین کا صدر تھا میری اس کی جان پہچان تب سے ہوئی جب وہ ہوسٹل میں میرا پڑوسی بنا۔ اس کی شاعرانہ باتیں اس کے انوکھے نظریئے، اس کا حساس پن وائلن پر غمناک نغمے — یہ سب مجھے اچھے معلوم ہوئے لیکن مجموعی طور پر بطور انسان کے میں نے اسے کبھی پسند نہیں کیا ویسے اس میں کوئی نمایاں عیب یا خامی نظر نہیں آتی شاید یہ اس کا انجانا سا عیب اس کی آنکھوں کی مجرمانہ بناوٹ، اس کے چہرے کا فاتحانہ وہ اظہار تھا جو مجھے ہمیشہ اس سے دور رکھتا۔
کبھی کبھی شام کو بھی اسے ہمراہ لے جاتا۔ اس طرح اس کی جینی سے ملاقات ہوئی۔
غالباً ڈے کی سب سے بڑی خوبی اس کا انکسار تھا اسے اپنی کمزوریوں کا ہمیشہ احساس رہتا بعض اوقات تو وہ اس قدر کسر نفسی سے کام لیتا کہ ترس آنے لگتا۔ یوں معلوم ہوتا جیسے وہ رحم کا طالب ہے۔ شروع شروع میں شاید جینی کو اس کی یہی ادا بھا گئی۔
وہ جینی میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینے لگا۔ پھر جیسے جینی بھی اس کی جانب ملتفت ہوتی گئی۔ جب وہ وائلن پر درد بھرے نغمے سناتا تو اس کی نگاہیں

جینی کے چہرے پر جم جاتیں نغمے کی پرواز نہایت مختصر ہوتی۔ ڈے کی انگلیوں سے لے کر جینی کے دل تک ۔۔ !

جب وہ دونوں فلسفے کی کتابیں ہاتھ میں لئے بحث میں مصروف ہوتے تو اکثر بہک بہک جاتے آنکھوں آنکھوں میں کچھ اور گفتگو ہونے لگتی۔

ان دونوں کی دوستی اشاروں اور کتابوں کی حدود سے نکل کر کھلم کھلا ملاقاتوں تک آ پہنچ چکی تھی۔ جینی کو بنگالی موسیقی سے لگاؤ ہو چلا تھا وہ بنگالی زبان سیکھ رہی تھی جب وہ بالوں میں پھول لگا کر ساڑی کو ایک خاص وضع سے پہن کر نکلتی تو بالکل بنگالی لڑکی معلوم ہوتی کالج کی کئی لڑکیاں، اسے دیکھ کر بالوں میں پھول لگانے لگیں۔

ان دونوں ہم ڈراما کھیل رہے تھے، دوپہر سے ری ہرسل شروع ہو جاتی شام بھی اکٹھے گذرتی۔ اکثر میں اسے گھر چھوڑنے جاتا، اس کے کمرے کی زیبائش خوب ہوتی، کسی روز تو یوں معلوم ہوتا جیسے کمرہ نہیں جنگل ہے۔ دیواروں پر گہرا سبز وال پیپر ہے جس پر درخت اور گھنی جھاڑیاں بنی ہوئی ہیں، گلدانوں میں لمبی لمبی گھاس اور بڑے بڑے پتے ہیں، سبز قمقمے روشن ہیں، فرش پر بچھے ہوئے قالینوں کے نقش و نگار، دیوار سے ٹنگی ہوئی تصویریں سبزی مائل پردے، گملوں میں رکھے ہوئے پودے۔۔ یوں معلوم ہوتا جیسے درندوں کی یہ تصویریں ابھی متحرک ہو جائیں گی۔ پھر کسی روز سب کچھ زرد ہوتا۔ دیواریں، پردے، غلاف، قالین، قمقموں کے شیڈ۔ گلدانوں میں صحرائی پھول اور خشک ٹہنیاں ہوتیں انگیٹھی کے سامنے ریت کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے۔ خیالات کہیں سے کہیں پہنچ جاتے۔ تصور میں لق و دق صحرا ابھرنے لگتا۔ تاروں کی چھت تلے حدی خوانوں کا نغمہ گونجنے لگتا۔

پھر کسی روز برف باری کے نظارے آنکھوں کے سامنے آ جاتے یہی آرائش کبھی طوفان زدہ سمندر کی یاد دلا دیتی۔ جھاگ اڑاتی ہوئی چنگھاڑتی لہریں، ہوا کے تند و تیز تھپیڑے اور آندھیوں میں پتے کی طرح کانپتا ہوا سفینہ ۔۔ !

اس کے کمرے میں کبھی ایک جیسا گلدستہ میں نے دو مرتبہ نہیں دیکھا۔ گلدان میں بڑے بڑے پھول بھی ہیں۔ شوخ پھول بھی ہیں، لیکن صرف ننھی منھی کلیاں نمایاں ہیں، باقی سب رنگ آپس میں گھل مل کر کھو گئے ہیں۔ کبھی غنچے، کلیاں، پھول سب کہیں جا چھپے ہیں، صرف خوشنما وضع کے پتے سامنے آ گئے ہیں، اس کے ترتیب دیئے ہوئے گلدستوں کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی کہ ایسے حسین و جمیل پھول بھی آسمان تلے کھلتے ہیں جنہیں گلشن میں نگاہ پہچانتی تک نہیں۔

ایک پروفیسر کی تبدیلی پر باغ میں پارٹی ہوئی طے ہوا کہ وہیں شام کو بارہ دری میں چھوٹا سا ڈرامہ بھی کھیلا جائے۔ جینی کو الیہ پارٹ ملا وہ دن اس نے اکیلے گزارا کسی سے بات نہیں کی دن بھر اداس رہی لیمپوں کی روشنی میں ڈراما شروع ہوا جینی نے اپنا گانا بالکل آخر میں رکھا۔ لیمپ بجھا دیئے گئے۔ سب نے دیکھا کہ درختوں کے جھنڈ سے چاند طلوع ہو رہا تھا وہ ایک بنگالی نظم گا رہی تھی، جس میں چودھویں کے چاند کو مخاطب کیا گیا تھا ڈے وائلن بجا رہا تھا۔ وہ سادہ سا گیت اور وائلن کا تھرتھراتا ہوا نغمہ اس کی انگلیوں کی جنبش۔ جسم کے لوچ اور گھنگھرو کی تال پر چاند تارے ناچنے لگے پھر جیسے مندروں میں گھنٹیاں بجنے لگیں دیوداسیاں سنگار کئے کنول کے پھول تھامے آ گئیں پجاریوں کے سر جھک گئے۔ فضاؤں میں تقدس برسنے لگا پھولوں سے دھواں اٹھا، دھند بن کر چھا گیا۔ سب کچھ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ صرف جینی رہ گئی اور اس کا محبوب ۔۔۔ پجاری اور دیوتا۔

یہ غنائیہ باغ کی اس چاندنی رات میں ختم نہیں ہوا۔ ساز اور سے دیر تک ہم آہنگ رہے۔ ڈے نے ان پیار بھرے جذبات کا اظہار کر دیا جنہیں وہ دیر سے چھپائے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی بے پایاں محبت کا یقین دلایا۔ یہ بھی کہا کہ مرتے دم تک وہ جینی سے اسی شدت کے ساتھ محبت کرتا رہے گا۔ اس نے اپنے والدین کو سب کچھ لکھ دیا ہے عنقریب اس کی والدہ آئیں گی اور جینی سے ملیں گی۔ پھر وہ جینی کو رسم کے مطابق سنہرا ہار دے گا جس میں دل کی شکل کا لاکٹ پرویا ہوا ہو گا۔ ان دونوں کو ایک بہت بڑی قوت نے آپس میں ملا دیا ہے۔ آرٹ نے۔ وہ دونوں آرٹسٹ ہیں انسان فنا ہو جاتے ہیں آرٹ فنا نہیں ہوتا۔ آرٹ جاوداں ہے ۔۔

میں نے اس کے کمرے میں ساز دیکھے، معلوم ہوا کہ وہ ہندوستانی موسیقی سیکھ رہی ہے مغربی موسیقی سے وہ شناسا تھی میں نے اسے جانتے پہچانتے نغمے

گنگناتے سنا تھا۔ پیانو پر اس کی انگلیاں خوب چلتیں کئی مرتبہ یوں ہوا کہ ریڈیو پر آرکسٹرا سمفنی بجا رہا ہے اور جینی مجھے سمجھا رہی ہے کہ سمفنی ایک نغمہ نہیں مختلف نغموں کا مرکب ہے۔ ایسے نغمے جو مختلف کیفیتوں کو ظاہر کرتے ہیں اور یہ کیفیتیں بغیر کسی تسلسل کے آتی ہیں رنج، مسرت، انبساط و حسرت، امنگیں، اشک اور سوز، امید و بیم، اعتراف غم۔ ہماری مسرتیں کبھی رنج کی آمیزش سے خالی نہیں ہوتیں، اسی طرح غم کی گھٹائیں بھی اکثر محبت کی کرنوں سے جگمگا اٹھتی ہیں۔ انسان کے دل میں کوئی جذبہ مکمل اور دیرپا نہیں ہوتا۔ یہ کیفیتیں بدلتی رہتی ہیں — سمفنی میں اتنے اتار چڑھاؤ آتے ہیں اور کئی کئی گتیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔

میں نے اسے ہندوستانی راگ راگنیوں کے کچھ ریکارڈ دیئے جنہیں اس نے بڑے شوق سے سنا اسے یہ نغمے نہایت دلکش معلوم ہوئے۔ اسے یہ بھی محسوس ہوا کہ یہ سب راگ مختلف جذبوں اور کیفیتوں کو ظاہر کرتے ہیں۔

میں نے درباری کی تشریح کی کہ جیسے ایک بہت بڑا ہال ہے، سامنے تخت پر بادشاہ بیٹھا ہے۔ قندیلیں روشن ہیں، فانوس جگمگا رہے ہیں دور دور تک امرا اور وزرا بیٹھے ہیں پر ہول خاموشی طاری ہے موسیقار کو بلایا جاتا ہے ایسے ماحول میں شوخ موسیقی بے ادبی میں شمار ہو گی غمگین موسیقی بھی موزوں نہیں ہلکی پھلکی چیزوں سے بھی موسیقار گریز کرے گا۔ وہ اپنے جوہر دکھانا چاہتا ہے — ان سب باتوں کو مدنظر رکھ کر وہ جو چیز چنے گا وہ درباری ہے۔

جینی سنتی رہی۔ پھر ایک روز اس نے مجھے چند تصویریں دکھائیں جو اس نے خود بنائی تھیں اسے مصوری کا شوق ضرور تھا لیکن یونہی معمولی سا۔ یہ اس کی پہلی کوشش تھی ان تصویروں میں اس نے ذہنی تاثرات برش کے ذریعے کاغذ پر منتقل کئے تھے وہ تاثرات جو مختلف راگنیاں سن کر اس نے محسوس کئے نغمے اس نے پہلے کبھی نہیں سنے تھے ہندوستانی موسیقی اس کے لئے بالکل نئی چیز تھی۔ جوگیا کی تصویر میں تاحد افق ننھے منھے خودرو پھول کھلے ہوئے تھے چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے پھول جن میں کلیاں بھی شامل تھیں اور ادھ کھلے ہوئے غنچے بھی۔ پتیوں پر شبنم کے قطرے چمک رہے تھے۔ پس منظر دور افق کے پرے برفانی چوٹیاں تھیں، اونچی اونچی برف سے لدی ہوئی چوٹیاں — جن سے نورانی شعاعیں منعکس تھیں۔ پودوں کے سائے شبنم کے چمکیلے قطرے اور جگمگاتی چوٹیاں — سب اس امر کے شاہد تھے کہ سورج ابھی ابھی نکلا ہے اور سارے نظارے پر ایک اداس سی دھند پھیلی ہوئی تھی۔ ہلکی ہلکی نوزائیدہ دھند جس نے فضا میں رنگ و بو کے اس طوفان کے باوجود ایک غمگین تاثر پیدا کر دیا تھا۔

دوسری تصویر مالکوس کی تھی، اس میں سمندر کی لہروں کو پیانو کے پردوں سے کھیلتے ہوئے دکھایا تھا سفید اور سیاہ پردوں کی قطاریں لہروں پر تیر رہی تھیں کبھی کبھی ایک اونچی سی لہر آتی تو سارے پردوں کو یک لخت بلند لہریں پڑنے جاتی۔ راگ کی روانی اور زیر و بم کو لہروں کے کھیل سے ظاہر کیا گیا تھا۔

چھایانٹ کی تصویر منظوم موسیقی کی تصویر تھی۔ جس میں مچلتے ہوئے شوخ نغمے مرتعش تھے چنچل رقاصائیں گھنگھرو باندھے ناچ رہی تھیں ہر جنبش میں بلا کا لوچ تھا مخمور کر دینے والی مستی تھی۔

جینی انکار کرتی رہی لیکن میں نے ان تصویروں کو نمائش میں رکھوا دیا۔ ایک روز ہم نمائش میں تھے کسی نے یونہی جینی کا نام لے دیا۔ چند لمحوں میں ہجوم اکٹھا ہو گیا یہ سب جینی کے مداح تھے جو اس کی تعریفیں کرنے لگے۔ اس روز معلوم ہوا کہ جینی مشہور ہوتی جا رہی تھی۔ قریب ہی بہت بھیڑ ہو رہی تھی ایک چینی پہلوان کی کشتی تھی۔ سانگ یا کچھ ایسا ہی نام تھا لوگ دور دور سے اسے دیکھنے آئے تھے اسے ہجوم نے گھیر رکھا تھا۔ جہاں وہ اس قدر ہر دلعزیز ثابت ہو رہا تھا وہاں اس کے حریف کو جو مقامی پہلوان تھا کوئی پوچھتا ہی نہ تھا۔ کشتی شروع ہوئی۔ غل مچ گیا۔ کچھ دیر برابر کا مقابلہ رہا۔ پھر دفعتاً مقامی پہلوان نے سانگ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر سر سے اونچا اٹھا لیا اور زمین پر دے مارا سانگ بے ہوش ہو گیا۔ اسی ہجوم نے جو اس کی تعریفیں کر رہا تھا اس پر آوازے کسنے شروع کر دیئے۔ اس پر اشتہار اور کاغذوں کے ٹکڑے پھینک کر اکھاڑے میں تنہا چھوڑ دیا سانگ ایک بنچ پر اکیلا بیٹھا تھا جینی مسکراتی ہوئی گئی اور اس سے باتیں کرنے لگی۔ اسے پسینہ پونچھنے کے لئے اپنا چھوٹا سا معطر رومال دیا جسے اس نے شکریے کے ساتھ لے لیا۔ جینی کی پیاری مسکراہٹ اور دلکش باتوں نے اسے موہ لیا، ان باتوں میں ایسی حلاوت تھی کہ سانگ کو اپنی زبوں حالت کا احساس نہ رہا۔ ساری شام ہم نے اکٹھے گزاری۔ جب وہ رخصت ہوا تو اس کے ہونٹ لرز رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو تھے۔

ڈے کے والدین آگئے وہ ہوسٹل سے چلا گیا اس کی والدہ نے جینی کو دیکھا۔ جینی کو ان کے گھر بلایا گیا لیکن یہ آنا جانا بہت جلد ختم ہو گیا۔ ایک روز شٹ جینی سے علاوہ جی بی کے متعلق پوچھنے لگا۔ جینی نے شروع سے آخیر تک ساری کہانی سناری سب کچھ بتا دیا۔ ڈے اس پر برس پڑا یہ باتیں اس سے پوشیدہ کیوں رکھی گئیں۔ اسے پہلے کیوں نہیں بتایا گیا۔ جی بی کے علاوہ اور بھی نہ جانے کتنے عاشق ہوں گے اب اسے کیوں کر یقین آ سکتا ہے کہ جینی کی محبت صادق ہے۔ یہ تو محض ڈھونگ تھا۔ کھیل تھا، اب اس کھیل کو فوراً ختم ہو جانا چاہئے۔

میں نے سنا تو ڈے کو سمجھایا کہ جن دنوں وہ جی بی سے ملا کرتی تھی ڈے بنگال سے آیا بھی نہ تھا۔ بھلا وہ ڈے پر اتنی دور کیوں کر عاشق ہو سکتی تھی اور وہ بھی بلا دیکھے بھالے۔ اور پھر وہ خود جینی کے علاوہ کئی لڑکیوں سے محبت جتا چکا تھا۔ جینی جانتی تھی پھر بھی اس نے باز پرس نہ کی لیکن ڈے نہیں مانا اس کے خیال میں ہر مرد کا فطری حق ہے کہ خود دنیا بھر کی لڑکیوں سے چہلیں کرتا پھرے، لیکن لڑکی سے یہ توقع رکھے کہ وہ زندگی بھر صرف اسی کو چاہے گی اس کی منتظر رہے گی بچپن ہی سے اسے الہام ہو جائے گا کہ فلاں مرد آج سے اتنے سال بعد اسے چاہنے آئے گا، جو خود ہرجائی ہو گا اور چاہنے سے پہلے لڑکی کی گزشتہ زندگی کو اچھی طرح کرید کر اپنی تسلی کرے گا۔

جینی نے اسے سارے وعدے دلائے جو اس نے قسمیں کھا کھا کر کئے تھے وہ محبت بھری باتیں یاد دلائیں جو ہزاروں بار دہرائی گئی تھیں۔ وہ خواب بتائے جو دونوں نے اکٹھے دیکھے تھے لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا، وہ تو جیسے کسی بہانے کی تلاش میں تھا دیکھتے دیکھتے جینی میں بے شمار نقص نکل آئے نہ اس کا کوئی خاندان تھا نہ مذہب۔ سوسائٹی میں اس کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اس کے خون میں آمیزش تھی۔ اس کی تربیت ایسے والدین کے زیر سایہ ہوئی جن کی زندگی ہمیشہ ناخوشگوار رہی ان میں سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ وہ غریب بھی تھے۔ اور پھر جینی کچھ اتنی خوبصورت بھی نہیں تھی۔ اس سے کہیں حسین اور بہتر لڑکیاں ڈے کو مل سکتی تھیں ایک حسین اور بہتر لڑکی تو ڈے کی والدہ نے ڈھونڈ بھی لی تھی۔ لڑکی کے والد رائے بہادر تھے لڑکی کے ساتھ لاکھوں کی جائیداد دے رہے تھے۔ انہوں نے ڈے کو انگلستان بھیجنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

شادی کی تاریخ مقرر ہوئی۔ میرے نام دعوتی رقعہ آیا میں خاموش رہا جب جینی کے نام رقعہ بھیجا گیا تو مجھے بہت غصہ آیا طیش میں آ کر میں نے کئی منصوبے باندھے۔ سب سے پہلا منصوبہ ڈے کی ہڈی پسلی ایک کر دینے کا تھا لیکن جینی کے کہنے پر میں خاموش رہا۔

شادی پر ہم دونوں گئے جینی شادی کا تحفہ لے گئی، سب کے سامنے یہ تحفہ کھولا گیا۔ ڈے کی بیوی کے لئے سنہرا ہار تھا جس میں دل کی شکل کا لاکٹ پڑا ہوا تھا۔

اگلے مہینے جینی نے کالج چھوڑ دیا اور گھر چلی گئی۔

ایک پارٹی میں میرا تعارف ڈے کی بیوی سے ہوا معلوم ہوا کہ اسے دنیا میں اگر کسی چیز سے نفرت تھی تو آرٹ سے۔ یہ سارے مصور، موسیقار، شاعر اسے زہر دکھائی دیتے تھے۔ اور سب سے زیادہ چڑ اسے ان امیر لوگوں سے تھی جو اس قسم کی فضولیات میں پڑ کر اپنا وقت ضائع کرتے تھے، بھلا ستار یا وائلن سیکھنے کی کیا ضرورت ہے جب صبح سے شام تک ریڈیو پر ساز بجتے رہتے ہیں۔ مصوری سیکھنے میں کیا تک ہے، جب بازار میں ہر قسم کی تصویریں آسانی سے مل جاتی ہیں۔ اگر کسی نے الفاظ کو توڑ مروڑ کر کچھ شعر گھڑ لئے تو اس پر آنسو بہانے یا بے قابو ہو جانے کی کیا ضرورت ہے۔

آخری امتحان پاس کر کے میں کالج سے چلا آیا مصروفیتوں نے آن دبوچا۔ ملک کے مختلف حصوں میں پھرتا رہا۔ مدتوں تک میں نے جینی کے متعلق نہیں سنا۔

پھر ایک دن ایک پرانا دوست ملا۔ میں نے جینی کا ذکر کیا تو اس نے باتیں سنائیں کہ وہ پہلے سے بالکل بدل چکی ہے۔ ہر جگہ یہی مشہور ہے کہ وہ

محبت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ایک معاشقہ ختم ہوا ہے تو دوسرا عنقریب شروع ہو گا۔ کالج چھوڑ کر اس نے ملازمت کر لی بالکل آزادانہ طور پر رہتی ہے ہر شام اس کے ہاں لوگوں کا جمگھٹا رہتا ہے قسم قسم کے لوگ آتے ہیں نہایت عجیب و غریب ہجوم ہوتا ہے۔ خوب افواہیں اڑتی ہیں، لوگ شیخیاں مارتے ہیں۔ ہم نے یہ کیا وہ کیا، میرے کوٹ کے کالر سے جو بال چپاں ہے وہ جینی کا ہے۔ یہ تصویر جینی نے مجھے دی تھی۔ میرے رومال پر جو سرخی ہے وہ جینی کے ہونٹوں کی ہے

پچھلے سال سیلاب آیا۔ لوگ بے گھر ہو گئے، قحط پڑا۔ جینی نے کچھ لڑکوں لڑکیوں کو ساتھ لیا گاؤں گاؤں پھر کر مصیبت زدہ مخلوق کی مدد کی، امیروں سے خیرات کر کے چندہ اکٹھا کیا۔ اپنی صحت اور آرام کا خیال نہ رکھا، رات دن محنت کی کئی مرتبہ بیمار ہوئی کچھ اوباش قسم کے لوگ محض جینی کی وجہ سے محتاجوں کی امداد پہ تیار ہو گئے۔ انہوں نے جینی کو چھیڑا، تنگ کیا۔ ایک شام کو بہانے سے اپنے ساتھ لے گئے اسے شراب پلانی چاہی جینی نے گروہ کے سرغنے کے بال نوچ لئے اس کا منہ طمانچوں سے لال کر دیا۔ وہ ایسے گھبرائے کہ اسی وقت جینی کو واپس چھوڑ گئے

پھر کسی نے جینی کی تصویر اخباروں میں نکلوا دی، ان کی تعریف بھی شامل تھی۔ سب نے یہی سمجھا کہ اس سستی شہرت کی غرض سے جینی نے لوگوں کی مدد کی تھی۔

پھر ایسا اتفاق ہوا کہ ایک تبادلے نے مجھے جینی کے قریب پہنچا دیا محض چند گھنٹوں کی مسافت تھی۔ ہر دوسرے تیسرے ہفتے میں اسے ملنے جاتا۔ سچ مچ اب وہ پرانی جینی نہیں رہی تھی پہلے سے کہیں تندرست اور چست معلوم ہوتی تھی۔ اس کے چہرے پہ تازگی تھی، نکھار تھا، ہونٹوں میں رسیلا پن اور رخساروں پر سرخی آ چکی تھی۔ اب وہ اک شعلہ فروزاں تھی۔ وہ طرح طرح سے میک اپ کرتی شوخ بھڑکیلے لباس پہنتی جگمگ جگمگ کرتے ہوئے زیور، قسم قسم کی خوشبوئیں۔ وہ ہر موضوع پہ بلا دھڑک گفتگو کر سکتی تھی۔ کلبوں اور رقص گاہوں میں اسے باقاعدگی کے ساتھ دیکھا جاتا۔ ہفتے بھر کی شامیں پہلے ہی مختلف مصروفیتوں کے لئے وقف ہو جاتیں۔ پرانی سیدھی سادی جینی کی جگہ اس شوخ و شنگ لڑکی کو دیکھ کر میں کچھ پریشان سا ہو گیا۔ یہ جذبہ محض حسد و رشک کا جذبہ تھا شاید میں برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ گفتگو کرتے وقت مجھے بار بار یہ احساس ہو کہ وہ مجھ سے زیادہ جانتی ہے۔ ہر بحث میں وہ ہرا دے۔ تاش کھیلتے وقت میں غلطیاں کرنے لگوں۔ رقص گاہ میں بعض دفعہ مجھے ایک لڑکی بھی نہ ملے، اور اس کے لئے بیسیوں لڑکے بے قرار ہوں۔ وہ ایسی چیزوں کا ذکر کرتی ہے جن کا مجھے شوق تو ہے لیکن ان تک پہنچ ذرا مشکل ہے۔

شام کو اس کے ہاں لوگوں کا ہجوم ہوتا۔ ان میں زیادہ تعداد عشاق کی ہوتی جو طرح طرح سے اپنی محبت کا اظہار کرتے شادی شدہ حضرات اپنی غمگین ازدواجی زندگی کا رونا رویا کرتے کہ کس طرح قدرت نے ان کو دغا دی اور نہایت بدمذاق اور پھس طبیعت کی رفیقہ پلے باندھ دی۔ اب ان کے لئے دنیا جہنم سے کم نہیں۔ اب یہ عذاب برداشت نہیں ہو سکتا۔ خودکشی کے سوا اور کوئی چارہ نہیں لیکن اس سیاہ خانے میں امید کی ایک نورانی کرن نظر آتی ہے —— وہ ہے جینی۔

پر مغز اور ذہین قسم کے لوگ اکثر سیاسیات اور ادب پہ بحث کرتے۔ کارل مارکس فرائیڈ اور مولانا روم کے تذکرے چھڑتے، سیاست دانوں کی غلطیاں گنواتے، مشاہیر پہ تنقیدیں کرتے، بے لوث اور سچی دوستی کا دم بھرتے لیکن موقعہ پا کر عشق بھی جتا دیتے۔

ایک طبقہ نفاست پسند اور نازک اندام لوگوں کا تھا۔ یہ لوگ ہر وقت اپنی کمزوریاں گنواتے، بتاتے، اپنی بیماریوں کا ذکر کرتے اپنے آپ کو بے حد ذلیل اور کمتر سمجھتے۔ بار بار جینی سے پوچھتے —— اگر تمہیں برا معلوم ہوتا ہو تو میں آئندہ نہ آیا کروں۔ اگرچہ ایسا کرنے سے مجھے قلبی، جگری اور روحانی صدمہ پہنچے گا —— مگر ہر شام کو آ دھمکتے۔

کئی ایسے شرمیلے بھی تھے جو چھپ چھپ کر خطوط لکھتے۔ جینی پر نظمیں کہہ کر اسے بدنام کرتے، سامنے آتے تو شرما شرما کر برا حال ہو جاتا۔

سب سے گھٹیا وہ عاشق تھے جو اپنے آپ کو جینی کا بھائی کہتے۔ بھائیوں کی سی دلچسپی لیتے۔ اس کی حفاظت اور بہبودگی کے خواہاں رہتے

لیکن دل میں کچھ اور سوچتے رہتے۔

مجھے یہ تماشا دیکھ کر غصّہ آتا۔ آخر یہ لڑکی چاہتی کیا ہے یہ سب کے سب تو اسے پسند آنے سے رہے، سارے ہجوم کو برخاست کر کے ان میں سے ایک دو سے ملتی رہا کرے۔ میرا ارادہ بھی ہُوا کہ اسے ٹوکوں پھر سوچا کہ بھلا میں اس کا کیا لگتا ہوں، دیکھا جائے تو میں خود اسی ہجوم میں سے ایک ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں اسے ذرا پہلے سے جانتا ہوں۔

پھر میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک شخص کی جانب ملتفت ہوتی جا رہی ہے یہ شخص بالکل عجیب تھا۔ پہلے پہل تو میں اسے سمجھ ہی نہ سکا یہی سوچتا کہ آخر اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ اسے قریب سے دیکھنے پر معلوم ہُوا کہ اس کی زندگی کا واقعی کوئی مقصد نہیں۔ اسے کسی چیز پر یقین نہیں تھا۔ محبت، نفرت، زندگی، موت، انسان، خدا — سب سے منکر تھا۔ بات بات پر بحث کرنے کے لئے تیار ہو جاتا۔ سب اس سے کتراتے تھے، اسے کامریڈ کے نام سے پکارا جاتا۔ محض جینی کی وجہ سے میں اس سے ملتا ورنہ میرے دل میں اس کے لئے نفرت تھی۔ یہ نفرت شاید اس دن پیدا ہوئی، جب ہم نے پہلی اور آخری بحث کی۔ کامریڈ عورتوں کو ہمیشہ برا بھلا کہتا۔ نکتہ چینیاں کرتا۔ ایک روز میں نے اختلاف کیا۔ عورت کی زندگی کی ان گنت مجبوریاں جتلائیں۔ لڑکی کی پیدائش کو نامبارک سمجھا جاتا ہے لڑکوں کے مقابلے میں اس کی پرورش میں کوتاہی برتی جاتی ہے۔ بھائی اسے ڈانٹتے دھمکاتے ہیں۔ اس کا حصّہ چھین لیتے ہیں۔ اس کے دل میں احساس کمتری پیدا کر دیتے ہیں۔ ذرا اچھی پہننے پر کنبے اور پڑوسیوں کی تنقید شروع ہو جاتی ہے وہ پٹے کا ذرا سر سے اترجانا خاندان کی ناک پر اثر انداز ہوتا ہے ذرا سی بھول اسے زندگی بھر کے لئے مجرم بنا دیتی ہے۔ کالج میں اسے فلسفہ سکھایا جاتا ہے مساوات اور آزادی کے سبق دیئے جاتے ہیں لیکن جب شادی کا سوال آتا ہے تو اس سے کوئی نہیں پوچھتا، اسے وہی کرنا پڑتا ہے جو چند خشک مزاج بزرگ چاہتے ہیں لیکن لڑکوں کی زندگی بالکل مختلف ہے وہ بڑی آسانی سے جھوٹی قسمیں کھا کر لڑکیوں کو دھوکا دے سکتے ہیں محبت کا واسطہ دلا کر سب کچھ منوا لیتے ہیں —— پھر چند خاندانی مجبوریوں کی بنا پر انہیں بڑی آسانی سے دھتکار سکتے ہیں اور سلیٹ کی طرح بار بار سب کچھ دھل جاتا ہے۔ ان کا ماضی کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔ ان کے لئے بیاہ شادی کھیل ہے۔ لیکن لڑکیوں کے لئے شادی نئی مصیبتوں کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ بیوی بن کر بچوں کی پرورش معاشی بے بسی، ذرا ذرا سی بات کے لئے خاوند کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ عمر رسیدہ ہو جانے پر اولاد بے مصرف سمجھتی ہے، مذاق اڑاتی ہے ——

کامریڈ کو میری باتیں بالکل فضول معلوم ہوئیں۔ وہ یہی کہتا رہا کہ ویسے عورت اور مرد برابر ہیں لیکن مرد کا رتبہ دماغی اور جسمانی لحاظ سے بلند ہے۔ اس نے دونوں کے دماغ کی بناوٹ اور وزن کا ذکر بھی کیا۔ مرد کے لمبے قد اور مضبوط بازوؤں کا حوالہ دیا۔

اس کے بعد میری اور اس کی کبھی بحث نہیں ہوئی۔

پتہ نہیں اس کا ذریعہ معاش کیا تھا، وہ رہتا کہاں تھا۔ اس کی گذشتہ زندگی کہاں اور کیسے گزری۔ بس یہ مشہور تھا کہ وہ جینی کا مداح ہے۔ جینی ان دنوں بڑی مخصوص قسم کی کتابیں پڑھتی۔ مشکل مضامین کی بے حد خشک اور سنجیدہ کتابیں جب وہ دونوں باتیں کرتے تو بہت کم لوگ سمجھ سکتے کہ کس موضوع پر گفتگو ہو رہی ہے۔ ان دونوں کی دوستی کا یہ پہلو مجھے بہت اچھا معلوم ہوتا جینی کی مدلل اور ذہین باتیں ظاہر کرتیں کہ وہ دماغی ارتقا کی منزلیں بڑی تیزی سے طے کر رہی ہے۔

ہم پل تاک پر گئے، اس تاریخی عمارت کو ہم نے بارہا دیکھا تھا۔ لیکن جب جینی نے ایک خاص زاویے سے ہمیں دیکھنے کو کہا تو یوں معلوم ہُوا جیسے اس باغ اور عمارت کو آج پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ کامریڈ اچھل پڑا بولا صرف ایک آرٹسٹ کی آنکھ اس زاویے کو دیکھ سکتی تھی۔ جب قصے کہانیاں ہو رہی تھیں تو ایک لڑکا اپنا رومان سنانے لگا۔ اسے ایک لڑکی دور دور سے دیکھا کرتی تھی اشارے ہوتے، پتھروں سے بندھے ہوئے خطوط آتے، عہد و پیمان

ہوتے۔ لیکن وہ فاصلہ اتنے کا اتنا تھا۔ نہ وہ خود قریب آتی نہ آنے دیتی۔ تنگ آکر اس نے چھت پر جانا چھوڑ دیا۔ کئی دنوں کے بعد گیا تو لڑکی نے بڑی منت سماجت کی، اس نے صاف کہہ دیا کہ اگر اب بھی قریب نہ آنے دو گی تو آئندہ کبھی چھت پر نہیں آؤں گا۔ بڑی مشکلوں کے بعد وہ رضامند ہوگئی بار بار یہی کہتی ——— آپ وعدہ کیجئے کہ مجھ سے نفرت تو نہیں کرنے لگیں گے۔ اس نے وعدہ کیا تو مانی۔ یہ اسے ملنے گیا لڑکی نہایت حسین تھی لیکن اس کی آنکھوں میں نقص تھا، وہ بھینگی تھی۔

اس پر بڑے قہقہے پڑے۔ ہنستے ہنستے لوگ دوہرے ہوگئے۔ لیکن جینی خاموش رہی اس کی آنکھیں نمناک ہوگئیں دیر تک وہ چپ چاپ رہی مجھے بھی اس کہانی نے اداس کر دیا۔ یہ کہانی ہرگز مضحکہ انگیز نہیں تھی۔

باغ کے گوشے میں ایک کنواں تھا جس کے متعلق مشہور تھا کہ اس میں جھانک کر جو خواہش کی جائے پوری ہو جاتی ہے سب نے کچھ مانگا جب جینی کی باری آئی تو اس نے کہا کہ مجھے کسی سے کچھ نہیں چاہئے، مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں، کوئی ارضی یا سماوی طاقت مجھے کچھ نہیں دے سکتی بس مجھے ایک زندگی ملی ہے اور مجھے زندہ رہنا ہے۔

کامریڈ عش عش کر اٹھا۔ کہنے لگا جینی کا یہ نظریہ صحیح ترین نظریہ ہے، ایسی دنیا میں جہاں لوگ اب تک بارش کے لئے دعا مانگتے ہیں اس سے بہتر نظریہ نہیں ہو سکتا۔ کوئی کسی کے لئے کچھ نہیں کر سکتا، تقدیر اور قسمت فضول چیزیں ہیں۔ ہر شخص اپنے گرد بچھے ہوئے جال میں گرفتار ہے اپنے حالات سے مجبور ہے زندگی کے اٹل ارادے، شدید جذبے سب حوادث کے غلام ہیں۔ ہم اس لئے ایک دوسرے کے دوست ہیں کہ اتفاق نے ہمیں ملا دیا۔ اسی طرح محض اتفاق سے ہم ان لوگوں کی رفاقت سے محروم ہیں جنہیں ملتے تو شاید گہرے دوست بن جاتے۔

پھر ایک روز وہی کامریڈ جو افلاطونی دوستی اور خلوص کے گن گایا کرتا تھا جینی کو اپنے ساتھ لے گیا۔ انہوں نے اکٹھے چائے پی پکچر دیکھی، چھوٹے موٹے تحفے خریدے جب ٹیکسی میں دونو واپس آ رہے تھے تو اس نے جینی کو چومنے کی کوشش کی۔ جینی نے ٹیکسی ٹھہرالی جتنے روپے کامریڈ نے اس شام صرف کئے تھے اس کے منہ پر مارے اور پیدل واپس چلی آئی۔

کامریڈ کئی روز تک غائب رہا پھر معافی مانگنے آیا۔ جینی نے کہا کہ مجھے طیش نہیں آیا مایوسی ہوئی ہے۔ میں تمہیں ان سب سے مختلف سمجھتی تھی، میرا خیال تھا کہ تم اس ہجوم میں سے نہیں ہو لیکن تم میں اور ایک عام انسان میں فرق نہیں۔

کامریڈ نادم تھا بولا "——— میرے نظریے خواہ کیسے ہوں میں انسان بھی ہوں۔ تم میں اتنی زبردست کشش ہے کہ میری جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو یہی کرتا۔ میں نے کبھی تمہارے چہرے کو غور سے نہیں دیکھا تمہاری بے چین روح کو دیکھا ہے اور یہی روح مجھے عزیز ہے۔ اگر تمہارے خدوخال بہتر ہوتے اور تم زیادہ خوبصورت ہوتیں تو تمہاری زندگی مختلف ہوتی۔ اگر تم کسی بہتر گھرانے میں پیدا ہوئی ہوتیں تو تمہاری زندگی مقابلتاً آسان ہوتی لیکن تم اتنی صلاحیتوں کی مالک نہ ہوتیں تمہاری روح اتنی حسین نہ ہوتی"

جینی عورت تھی۔ کامریڈ کے رنگین فقروں نے اسے موہ لیا اس کی آنکھیں جھک گئیں دل دھڑکنے لگا رخسار سرخ ہوگئے۔ جب کامریڈ نے بازو پھیلائے تو جینی نے مزاحمت نہ کی۔ اس کے بعد کامریڈ کی گفتگو کا انداز بدل گیا "محبت ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کا نام نہیں بلکہ دونوں کے ایک سمت میں دیکھتے رہنے کا نام ہے محبت میں، اگر رفاقت کی آمیزش ہو تو وہ بلندیوں تک جا پہنچتی ہے" ——— اسی قسم کی باتیں بار بار دوہراتا۔

کبھی کبھی وہ مجھے کافی دلچسپ معلوم ہوتا اس کی چند چیزیں مجھے پسند تھیں اس کی صحرا نوردیاں بے چین طبیعت، سیلانی پن ——— لیکن اس کے شکست خوردہ فلسفے، بلاوجہ کا حزن، تلخ خیالات برے معلوم ہوتے۔ وہ قنوطی تھا اور اذیت پسند۔ اس نے کبھی زندگی کا مقابلہ نہیں کیا۔ مصیبت کو آتے دیکھ کر وہ ہمیشہ راستہ کترا جاتا اپنے آپ کو مظلوم سمجھنا دنیا بھر کا ستایا ہوا۔ اس کا ارادہ تھا عمر بھر اسی طرح سرگرداں رہے گا، اس کی منزل کہیں نہیں ہے۔

میرا تبادلہ ہُوا تو جینی مجھے چھوڑنے سٹیشن پر آئی۔ حلا ہوتے وقت میں نے رومال مانگا، پوچھنے لگی "رومال سے کیا کرو گے؟" کہا "یہ رومال تمہاری شوخ مسکراہٹوں کی یاد دلاتا رہے گا۔" بولی "تم ہر مرتبہ رومال ہی کیوں مانگتے ہو؟" بتایا کہ اس کی مخمور کن خوشبو اور ننھے سے سرخ دل کی وجہ سے۔

اگلے سال مجھے کسی نے بتایا کہ کامریڈ جینی کو چھوڑ کر چلا گیا وہ بالکل ویسے کا ویسا رہا۔ جینی کی تمام کوششیں اس میں کوئی تبدیلی نہ لا سکیں۔ چلتے وقت اس نے جینی سے کہا کہ بے سرو سامانی اس کی تقدیر میں ہے اس کی منزل مفقود ہے۔ وہ جینی سے محبت کرتا رہے گا اس کی تصویر دل سے لگا کر رکھے گا، دوسرے ملکوں سے اسے خط لکھا کرے گا۔ اسے ہمیشہ یاد رکھے گا —— اور بس!

جینی نے اس کا تعاقب کرنا چاہا جو کچھ اس کے پاس تھا فروخت کر دیا۔ پتہ نہیں وہ اسے ملا یا نہیں جب وہ واپس آئی تو طرح طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ جینی کے والد نے جواب تنہا رہتا تھا اسے سخت سست کہا اور گھر سے نکال دیا۔ کچھ اوباش قسم کے لوگوں نے اس کی مدد کرنی چاہی لیکن جینی وہ شہر چھوڑ کر کہیں نکل گئی۔

کنیری سے میں سمندر پار ملا۔ وہ ہندوستانی تھا لوگ اس کی حرکتوں کی وجہ سے اسے کینیزانو دا کہتے اسی سے یہ نام پڑ گیا۔ پہلی ملاقات پہاڑوں میں ایک کیمپ میں ہوئی ہم نے قصبے سے کچھ شہریوں کو کھانے پر بلایا ہُوا تھا۔ خیمے میں باتیں ہو رہی تھیں کہ وہ ایک روسی افسر سے لڑ پڑا۔ لڑائی کی وجہ ایک روسی لڑکی تھی کینیری نے فوراً اسے ڈوئیل کی دعوت دی اپنے ریوالور سے چار گولیاں نکال لیں اور روسی سے بولا ہم اسے باری باری اپنے کان سے چھوا کر چلائیں گے۔ اس میں صرف دو گولیاں ہیں اب جس کی قسمت میں گولی لکھی ہوگی اس کے دماغ میں سے نکل جائے گی۔ روسی پیتے ہوئے تھا فوراً راضی ہو گیا۔ پہلا فائر کنیری نے اپنے آپ پر کیا، وہ خانہ خالی تھا۔ دوسرا فائر روسی نے کیا، کچھ نہ ہُوا۔ کنیری تیسرا فائر کر چکا تو ہم نے بڑی مشکلوں سے انہیں علیحدہ کیا روسی کو یقین نہ آتا تھا کہ ریوالور میں گولیاں ہیں اس نے یونہی لبلبی دبا دی، دھماکا ہُوا گولی خیمے کی دیوار چیر گئی۔

اس کا تبادلہ ہُوا، وہ ہمارے کیمپ میں آگیا ہم دونوں بہت جلد دوست بن گئے۔

شہر کے حاکم نے ہمیں دعوت دی، ہم دونوں گئے۔ نہایت دلچسپ پروگرام تھا۔ آغا نے کینیری کا تعارف ایک نہایت خوبصورت ایرانی لڑکی سے کرایا کینیری اس سے گھل مل کر باتیں کر رہا تھا محفل گرم ہوتی جا رہی تھی کہ یکایک گھڑی دیکھ کر کینیری اٹھ کھڑا ہُوا۔ اس نے مجھے بتایا کہ دور کیمپ میں اس نے کسی لڑکی سے رات کو ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ سردیوں کی اندھیری رات تھی کیمپ وہاں سے سو میل کے لگ بھگ تھا ہمیں سب نے منع کیا کینیری کا وعدہ تھا۔ کیوں کر پورا نہ ہوتا۔ ہم جیپ میں روانہ ہوئے تو ہلکی ہلکی برفباری ہو رہی تھی۔ پہاڑوں کی پیچیدہ و شوار گزار سڑک برف سے سفید ہو چکی تھی ہم اتنی تیزی سے جا رہے تھے کہ موڑوں پر جیپ ہوا میں اٹھ جاتی۔ راستے بھر وہ اپنی محبوبہ کے لافانی حسن کی تعریفیں کرتا رہا جب ہم وہاں پہنچے تو دعوت ختم ہو چکی تھی، شراب کا دور چل رہا تھا۔ لڑکی منتظر تھی، کینیری نے میرا تعارف کرایا۔ ان دنوں میں بے حد اداس تھا مہینوں سے مجھے کسی دوست یا عزیز کا خط نہیں ملا تھا۔ میں نے بڑی جذباتی قسم کی گفتگو شروع کر دی اسے یہ باتیں اچھی معلوم ہوئیں ہم ایک گوشے میں جا بیٹھے کینیری ایک دو بار ہمارے پاس آیا لیکن جلد اٹھ کر چلا گیا۔ جب لوگ جانے لگے تو اس نے مجھے ایک طرف بلا کر کہا —"میں کیمپ میں جا رہا ہوں، تھوڑی دیر تک تمہارے لئے جیپ بھجوا دوں گا۔"

"اور یہ لڑکی" —— میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہ اب تمہاری ہے —— میں یاروں کا یار ہوں۔ میں تمہارے چہروں کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ میں نے تم دونوں کی آنکھوں میں اس روشنی کی چمک بھی دیکھی ہے جو پہلی ملاقات پر بلاوجہ پیدا نہیں ہوتی۔ میں اسے چاہتا ضرور ہوں، لیکن تم بھی میرے دوست ہو —"

اس کی شخصیت عجیب تھی، نہ اسے کسی خطرے کا احساس تھا نہ کسی مصیبت کا ڈر۔ وہ ہمیشہ کام کر چکنے کے بعد یہ سوچتا کہ یہ کام اسے کس طرح کرنا چاہئے

تھا۔ اس کے مزاج میں بلا کی تندی اور گرمی تھی کیسی ہی آفت آن پڑے وہ کبھی نہ گھبراتا۔ ذرا ذرا سی باتوں پر پڑے سے بڑا خطرہ مول لینے کو تیار ہو جاتا۔ اسے سکون سے نفرت تھی اس سے لڑو۔ اس سے جھگڑو۔ محاذ سے واپس آیا ہے تو ڈوئل لڑ رہا ہے جوئے میں آج ہزاروں جیتے تو کل سب ہار دئیے۔

سب اس کے کامیاب معاشقوں پر رشک کرتے۔ اس کامیابی کا راز پوچھتے وہ مسکرا کر کہتا یہ تو کچھ بھی نہیں، ہزاروں محبتیں ایسی بھی تھیں جو ادھوری رہ گئیں، جو کبھی نہ پنپ سکیں جنہوں نے بار بار میرا دل توڑا۔

ہمارے قریب ایک چھوٹا سا خوش نما قصبہ تھا۔ گلشن — آس پاس کے باشندوں میں کینری شہنشاہ گلشن کے نام سے مشہور تھا۔

پہلے کبھی اس پر قتل کا مقدمہ بن گیا تھا، موت کی سزا یقینی تھی، پھر عجیب سے حالات میں وہ بری ہو گیا۔ آزاد ہو کر اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ بقیہ زندگی کو ایک تحفہ زندگی سمجھے گا جو اسے تحفتاً ملی ہے، اس زندگی کا گزشتہ زندگی سے کوئی واسطہ نہیں وہ ہمیشہ مسرور رہے گا، آزاد رہے گا۔ جو چیز ناپسند ہوئی اسے فنا کر دے گا، جو بھا گئی اس پر چھا جائے گا۔

محض اتفاق تھا کہ ایسا شخص زندگی کی شاہراہ میں جینی سے ملا۔

اس کا پیار آندھی کی طرح اٹھا، آناً فاناً میں چھا گیا اور طوفان کی طرح اتر گیا۔

وہ چھٹی پر ہندوستان آیا۔ شام کو کسی شناسا لڑکی سے ملاقات کا پروگرام تھا، اسے ملنے گیا، وہ نہیں ملی مگر وہاں ایک اور لڑکی سے ملاقات ہو گئی —

یہ لڑکی جینی تھی جو اپنی سہیلی سے ملنے آئی تھی۔ کینری نے جینی کو اپنی محبوبہ کا نعم البدل سمجھا جتنے دن وہ وہاں رہا اسے نعم البدل سمجھتا رہا اس نے قیمتی تحفوں کی بارش کر دی اپنی دلچسپ باتوں اور رنگین کہانیوں سے جینی پر جادو کر دیا۔ بھڑکیلی کاروں میں اسے لئے لئے پھرا ایک چاندنی رات میں جب وہ سمندر میں تیرنے گئے تو ریت پر بیٹھ کر اس نے محبت کا واسطہ دے کر جینی کو یقین دلایا کہ عمر بھر باوفا اور صادق رہنے کا حلف اٹھایا، ہمیشہ اکٹھے رہنے کے عہد و پیمان کئے یہ سب کچھ اس قدر پرخلوص تھا کہ جینی نے سچ مان لیا

اس آغاز کے بعد انجام وہی ہوا جس کی توقع کی جا سکتی تھی، جو ناگزیر تھا۔ جینی کی زندگی میں وہ جس طرح آیا تھا اسی طرح چلا گیا۔

لیکن جینی کی یاد اس کے دل سے مکمل طور پر نہ گئی۔ جب کبھی اسے کوئی ٹھکرا دیتا جب دیر تک تنہا رہنا پڑتا، کوئی بری خبر سننے میں آتی، اداسیاں عود کر آتیں تو اسے جینی کی معصومیت، اس کا خلوص اور پیار یاد آتا۔ رات کی تنہائی میں ہم دونوں دیر تک خیمے میں بیٹھے رہتے باہر سرد ہواؤں کے جھکڑ چلتے تو وہ جینی کو یاد کرتا۔ اپنے جھوٹے وعدوں کو یاد کر کے شرمندہ ہوتا، اپنے آپ کو گنہ گار سمجھتا بار بار کہتا کہ جینی ان سب لڑکیوں سے مختلف تھی جو اس کی زندگی میں آئیں اگر اس کی زندگی میں شادی کی کوئی گنجائش ہوتی تو وہ جینی سے ضرور شادی کرتا۔ وہ نہایت غیر معمولی لڑکی تھی، اسے کسی نے سمجھا نہیں — کسی کی نگاہیں اس کے خدوخال سے آگے نہیں پہنچیں۔ اس کی روح کی عظمت کو کسی نے نہیں پہچانا۔ اس میں کسی مصور کی روح تھی کسی عظیم شاعر اور بت تراش کی روح، اس میں اتنی صلاحیتیں تھیں کہ ان کی رفاقت کسی کی بھی زندگی چمکا سکتی تھی۔ اس میں بلا کی معصومیت تھی اس میں سیتا کا تقدس تھا۔ مریم کی پاکیزگی تھی۔ اس نے کئی مردوں سے محبت نہیں کی بلکہ صرف ایک ایک مرد سے محبت کی — ایک مرد جسے اس نے کلبلاتے رینگتے ہجوم سے چنا اور دوسروں سے مختلف سمجھا، لیکن اس مرد نے اسے ہمیشہ دھوکہ دیا۔ اس کی مسکراہٹ کیسی تھی — بالکل مونا لیزا کی مسکراہٹ معصوم، اتھاہ اور پراسرار، اس کی مسکراہٹ کے سامنے کینری جیسا انسان بھی کانپ اٹھتا تھا۔

لیکن ایسی باتیں وہ کبھی کبھی کہا کرتا، اور اگلی صبح اکثر بھول جاتا۔

اس کے بعد ایک طویل وقفہ آیا۔ یہ وقفہ ایسا تھا کہ اس نے سب کچھ بھلا دیا جینی بھی یاد نہ رہی۔ میں ہزاروں میل کے فاصلے سے واپس ملک میں آیا

تو پھر دور بھیج دیا گیا اس عرصے میں کبھی کوئی پرانی یاد تازہ ہو جاتی اور خیالات کے تسلسل میں جینی کا خیال آجاتا تو میں یہی سوچتا کہ غالباً اب اس سے کبھی ملاقات نہیں ہو گی۔

لگاتار تنہائی اور بہت سے کٹھن لمحوں کے بعد مجھے مختصری چھٹی ملی، میں قریب کی پہاڑیوں پر چلا گیا وہ علاقہ نہایت سرسبز و شاداب تھا دور دور تک چائے کے باغات تھے اور مالدار سوداگروں کی آبادیاں۔ جہاں میں مقیم تھا وہاں خوب رونق تھی میری طرح بہت سے اجنبی سکون کی تلاش میں آئے ہوئے تھے چند ہی دنوں کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ باوجود اتنی چہل پہل اور شور شغب کے وہ احساس تنہائی کم نہیں ہوا جو مجھے کھینچ کر لایا تھا۔ ایک روز میں یونہی کھویا کھویا سا پھر رہا تھا کہ مجھے جینی مل گئی ایسے دور دراز خطے میں اسے پا کر مجھے ازحد مسرت ہوئی اس مرتبہ تو وہ پہلے سے بالکل مختلف معلوم ہوئی اس کی باتوں میں حزن کی آمیزش تھی اس کے چہرے پر پژمردگی تھی لیکن ایسی پژمردگی جس میں عجیب جاذبیت تھی جو حسن و شباب کی تازگی سے کہیں دلفریب معلوم ہو رہی تھی، اس مسکراہٹ میں افسردگی کی رمق نے ایک عجیب وقار پیدا کر دیا تھا۔

وہ وہاں اپنے کسی عزیز کے ہاں رہتی تھی جو چائے کے سوداگر تھے وہ بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہی تھی۔ کلب، رقص، پارٹیاں سب حد اکتا دینے والی تھیں وہاں اس کا صرف ایک دوست تھا، اسی کمپنی کا ایک بوڑھا ملازم جو تنہا رہتا جس کی زندگی کا سب سے قیمتی خزانہ کتابیں تھیں کام سے نوٹ کر وہ بڑے اہتمام سے کتابیں نکالتا۔ وہ دونوں پڑھتے بحث کرتے، لڑتے، اب ہم تین ساتھی ہو گئے۔ چھٹی کے بقیہ دن یوں گزرے کہ پتہ بھی نہ چلا۔ واپس آکر میں نے تبادلہ کرا لیا اور جینی کے پاس چلا گیا ہم جنگلوں میں نکل جاتے، سیریں کرتے، کتابیں پڑھتے۔ بچوں کی طرح ہنستے کھیلتے، میں اسے جتنا قریب سے دیکھتا اتنی ہی نئی خوبیاں پاتا وہ بہترین رفیق تھی اکثر مجھے محسوس ہوتا جیسے میں اسے پہلے کبھی نہیں ملا اس کی بے پناہ جاذبیت سے آشنا نہیں ہوا ہم رقص پر جاتے تو وہ سارا وقت مجھے دیتی، میری جانب متوجہ رہتی اس کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی رہتیں، مجھے اس پر فخر ہونے لگتا۔

ہم ایک دوسرے کے قریب خاموش بیٹھے پڑھتے رہتے کئی کئی گھنٹوں تک ایک بات بھی نہ ہوتی، لیکن ہمارے خیالات ہم آہنگ ہو جاتے، دل کو اس میں طمانیت ہوتی، خاموشی اور تقریر کا فرق یوں مٹ جاتا جیسے ہم باتیں کر رہے ہوں۔ پتہ نہیں وہ کون سا رشتہ تھا جس نے ہم دونوں کو قریب رکھا غالباً دوستی کا جذبہ۔ یہ قرب اس قدر ضروری ہو گیا کہ ذرا سی جدائی شاق گزرنے لگتی۔

ایک روز میں نے اس کی کتابوں میں نظموں کی کاپی دیکھی، یہ نظمیں جینی نے لکھی تھیں، نظمیں کس قدر حزنیہ تھیں، کتنی کرب انگیز اور دردناک۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ اس نے کب اور کن حالات میں لکھیں یہ اس کی لکھی ہوئی ہرگز نہیں معلوم ہوتیں جسے میں جانتا ہوں، دلیر اور نڈر جینی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموش رہی۔

ایک سہ پہر کو ہم سیر سے واپس آ رہے تھے کہ بارش شروع ہو گئی پہلے تو درختوں کے نیچے چھپتے رہے جب موسلا دھار مینہ برسنے لگا تو بھاگ کر ایک شکستہ جھونپڑی میں پناہ لی۔ میں نے اپنا کوٹ سوکھی ہوئی گھاس پر بچھا دیا۔ ہم دونوں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر خاموشی رہی، میں نظموں کی باتیں کرنے لگا یونہی تنگ کرنے کو کہا کہ پہلے تو کبھی بھولے سے بھی کوئی شعر اس کی زبان پر نہ آتا تھا اب ہزاروں اشعار زبانی یاد ہیں کہیں اسے کوئی شاعر تو پسند نہیں آ گیا تھا۔ اس کا چہرہ اتر گیا آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے معافی مانگی شاید میں نے کوئی دکھتی ہوئی رگ چھیڑ دی تھی یا تلخ یادیں تازہ کرا دی تھیں میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دوبارہ معافی مانگی ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ گئی۔ جب وہ میرے شانے سے سر لگائے بیٹھی تھی، تو ایسی ننھی منی بچی معلوم ہو رہی تھی جو راستہ بھول گئی ہو، بالکل بے یار و مددگار۔ جو سہارے کی طالب ہو۔ میں نے اس کے آنسو خشک کئے دونوں ہاتھوں سے اس کے چہرے کو تھام کر اسے پیار کیا۔ ان بارہا چومے ہوئے ہونٹوں پر اب تک تازگی تھی ان آنکھوں میں اب تک معصومیت تھی ان رخساروں پر وہی ملاحت، یہ لڑکی اب تک وہی لڑکی تھی جسے میں نے برسوں پہلے جولی کے ساتھ مباحثے میں دیکھا تھا۔

اس کی زندگی کی ایک کہانی ویسی بھی رہ گئی تھی جو میں نے نہیں سنی تھی یہ کہانی اس نے خود سنائی یہ ایک شاعر کے متعلق تھی، جو شرابی تھا، جواری تھا، مفلس تھا، جھوٹا تھا، اپنی خودداری اور انفرادیت کو خیرباد کہہ چکا تھا، جس کی حرکتیں دیکھ کر افسوس کی بجائے غصہ آتا۔ جینی ہمیشہ اس پر ترس کھاتی ——— ہر ممکن طریقے سے اس کی مدد کرتی سفارشیں کر کر کے اس کا کلام چھپوایا، اسے ادھر ادھر متعارف کرایا اس کی حوصلہ افزائی کی کہ شاید یہ اسی طرح سدھر جائے۔ اس کی زندگی بہتر بن سکے اور وہ بیش بہا خزانہ جو اس کے دماغ میں محفوظ ہے کہیں ضائع نہ ہو جائے۔ ترس کا یہ جذبہ دن بدن بڑھتا گیا جینی غیر شعوری طور پر اس کے قریب ہوتی گئی پھر اس جذبے نے ایک اور شکل اختیار کی۔ جینی کو خود علم نہیں تھا کہ جسے وہ محض جذبۂ رحم سمجھ رہی ہے ایک دن محبت کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ جینی نے ایک آوارہ و بے خانماں کو پناہ دی، اپنی توجہ اور اپنا پیار ایسے انسان پر ضائع کیا جو ہرگز اس کا حق دار نہ تھا۔ وہ سدھرتا جا رہا تھا اس کی حالت پہلے سے بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ کہا کرتا کہ اسے جینی کی گزشتہ زندگی سے کوئی سروکار نہیں اب تو اسے اپنی گزشتہ زندگی سے بھی تعلق نہ رہا تھا اس کی زندگی تب سے شروع ہوئی جب اس نے جینی کو پہلی مرتبہ دیکھا پتہ نہیں اس سے پہلے وہ کیوں کر جیتا رہا لیکن اب وہ جینی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس نے اپنی نظموں میں بارہا جینی کو مخاطب کیا تھا ——— تمہارے دل میں خلوص کے چشمے ابلتے ہیں۔ محبت کا قلزم رواں ہے، تمہارے دل میں وہ جذبات ہیں جن پر رات دن کا تسلسل قائم ہے، زمین و آسمان کی گردش قائم ہے۔ یہ جذبات جس دن فنا ہو گئے انسانیت فنا ہو جائے گی دنیا چاند ستاروں کی طرح اجاڑ اور سنسان ہو جائے گی یہاں کچھ بھی نہ رہے گا۔

ایک روز اس نے جینی کو بتایا کہ وہ بیمار ہے اسے دق ہے کبھی کبھی یہ بیماری عود کر آتی ہے کاش کہ وہ تندرست ہوتا، تب کسی روز وہ دونوں شادی کر لیتے زندگی کتنی سہانی ہو سکتی تھی۔ کیسی کیسی راحتیں میسر ہوتیں۔ تب وہ سب اذیتیں بھول جاتیں جو دنیا کے جہنم میں اب تک برداشت کی تھیں۔

وہ یونہی آوارگی میں مرنا چاہتا تھا لیکن بڑی مشکلوں سے جینی نے اسے سینی ٹوریم بھجوایا۔ فالتو خرچ برداشت کرنے کے لئے وہ دن بھر دفتر میں کام کرتی، رات کو ٹیوشن پر لڑکیوں کو پڑھاتی لگاتار مشقت نے اسے کمزور کر دیا۔ وہ بیمار رہنے لگی وقت گزرتا گیا ایک دن اسے معلوم ہوا کہ شاعر صرف اسی کے لئے نظمیں نہیں کہتا اس کے تخیل میں کوئی اور بھی شریک ہے ——— یہ سینی ٹوریم کی ایک نرس تھی جسے وہ بعد میں ملا۔

جینی نے اس افواہ پر توجہ نہ دی، یونہی کسی نے اڑا دی ہوگی۔ وہ وہاں رات دن ایک سے ماحول میں رہ رہ کر تھک گیا ہوگا اسے تفریح بھی تو چاہئے کسی سے ہنسنے بولنے میں کوئی حرج نہیں۔ جب وہ اس سے ملنے جاتی تو نرس کے لئے بھی تحائف لے جاتی ان دونوں کی دوستی پر اس نے کبھی شبہ نہیں کیا لیکن یہ افواہ محض افواہ نہیں رہی۔ شاعر سینی ٹوریم سے تندرست ہو کر آیا تو اس نے شادی کر لی۔ نرس کے ساتھ۔ جینی پھر بھی اس سے ملتی رہی اسے روپے دیتی رہی۔ آخر نرس نے ان ملاقاتوں پر اعتراض کیا کہ جینی جیسی لڑکی سے ملنا بدنامی مول لینا ہے۔ شاعر نے اس اعتراض کو سر آنکھوں پر لیا اور جینی سے ملنا چھوڑ دیا۔ موقع ملنے پر وہ اسے بدنام بھی کرتا اپنے کارنامے سناتا جینی کے پرانے عاشقوں کے قصے لے بیٹھتا۔

وہ کہانی سنا چکی تو میں نے اسے بتایا کہ ہم پرانے دوست ہیں۔ دوستی عظیم ترین رشتہ ہے خلوص پر میرا ایمان ہے۔ میں انسانی کمزوریوں سے ہرگز منکر نہیں۔ شاید مجھے اچھے برے کی تمیز نہ ہو لیکن ان جذبات کی قدر کرتا ہوں، جن میں خلوص کارفرما ہو خواہ ان جذبات کا انجام کیسا ہی ہو۔ زندگی میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں ذہنی کیفیتیں بھی دیرپا نہیں ہوتیں لیکن وہ جذبات جو اپنے وقت پر صادق تھے ہمیشہ صادق رہتے ہیں۔ اس لئے وہ جذبے جو تمہاری زندگی میں آئے ناگزیر تھے تم سچی تھیں۔ تمہارے جذبات سچے تھے میں نے تمہیں بہت قریب سے دیکھا ہے تمہیں پسند کرنے کے علاوہ تمہاری عزت بھی کرتا ہوں۔

آہستہ آہستہ اس نے لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا باہر جانا بند کر دیا وہ ہر وقت میری منتظر رہتی لیکن اب وہ مضطرب نہیں تھی اب اسے ماضی یا

حال کا اتنا خیال نہیں رہا تھا جتنا مستقبل کا، وہ تنہا اور اداس تھی، کئی مرتبہ میں نے اسے قبرستان میں بیٹھے دیکھا۔ ایک روز میں بھی اس کے پاس چلا گیا وہ عجیب سی باتیں کرنے لگی کبھی ایسے پرسکون لمحات بھی آئیں گے جب میں بھی اسی طرح سو جاؤں گی۔ وہ خاموشی کتنی سہانی ہوگی موت کے بعد اگرچہ محض خلا ہوگا دل دوز تاریکی ہوگی لیکن وہ تاریکی اس کرب انگیز اجالے سے ہرگز بری نہیں ہوگی۔ اپنی نظم کا ایک بند اس نے کئی بار دہرایا ــــ "میں ان بدنصیبوں میں سے ہوں جنہیں ہر صبح نہایت قلیل روشنی ملتی ہے۔ امید کی اتنی سی جلا کہ صرف دن بھر زندہ رہ سکیں۔ جس روز یہ روشنی نہ مل سکی میں ظلمتوں میں کھو جاؤں گا۔"

میں نے رنگین اور خوش نما چیزوں کی باتیں کر کے موضوع بدلنا چاہا لیکن وہ بولی ــــ "کاش تم اندازہ لگا سکتے کہ میں کس قدر غمگین ہوں، کس قدر دل شکستہ ہوں، اگر اب مجھے سہارا نہ ملا تو میرے خواب تمام ہو جائیں گے اصول ختم ہو جائیں گے میں گم ہو جاؤں گی ــــ"

پھر ایک دن جب میں ان افواہوں کی تردید کرنا چاہتا تھا جو ہم دونوں نے بارہا اپنے متعلق سنی تھیں وہ کہنے لگی ــ تم مجھے جانتے ہو، سمجھتے ہو۔ میں بھی تمہاری سیاح روح سے آشنا ہوں، تمہارے ان گنت مشغلوں طرح طرح کے خوابوں کا مجھے احساس ہے، میں تم سے صرف ذرا سی توجہ مانگتی ہوں، بالکل ذرا سا سہارا اپنی زندگی کا قلیل سا حصہ مجھے دے دو، میں ہمیشہ قانع رہوں گی، میں کبھی تم پر بار نہیں ہوں گی تم میرا ساتھ نہ دینا میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔

میں اس اشارے کو سمجھ گیا، پہلے بھی کئی مرتبہ اس نے ایسی باتیں کی تھیں۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ عورت اور مرد کی دوستی نہایت محدود ہے اس پر کئی اخلاقی اور سماجی بندشیں عائد ہیں، یہ بندشیں ایک حد تک درست بھی ہیں آخر ایک مقام آتا ہے جہاں فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔

میں اس مقام سے لوٹ آیا۔

فیصلہ کرنے کا وقت آیا تو میں بزدل ثابت ہوا میں خاموش ہو گیا، خاموش ہو کر میں اس گروہ میں شامل ہو گیا جو جینی کی زندگی میں مجھ سے پہلے آیا وہ گروہ جو بظاہر اپنے آپ کو باغی ظاہر کرتا ہے لیکن دراصل سماجی روایات کا غلام تھا۔ جینی سمجھ گئی، پھر اس نے کبھی ایسی باتیں نہیں کیں ہم دونوں میں ایک معاہدہ سا ہو گیا اگرچہ یہ معاہدہ زبان پر نہیں آیا لیکن طے ہو گیا کہ جب تک ایک دوسرے کے قریب ہیں پرانے دوستوں کی طرح رہیں۔

میں نے تبادلے کے لئے کہا تو مجھے دوسری جگہ بھیج دیا گیا۔ چلتے وقت جینی مجھے چھوڑنے آئی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے پہلی مرتبہ میں نے اسے سب کے سامنے روتے دیکھا ان آنسوؤں کے باوجود وہ مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی بار بار وہ آنکھیں خشک کرتی، میں نے رومال مانگا، اس نے بالکل پہلی سی شوخی سے پوچھا کہ رومال لے کر کیا کرو گے ؟ میں نے کہا کہ اسے یاد کے طور پر رکھوں گا۔

"اور میرے آنسو کیوں کر خشک ہوں گے ــــ؟" اس نے گیلا رومال دیتے ہوئے پوچھا۔

چند مہینوں کے بعد میں نے سنا کہ اس نے کسی سے شادی کر لی۔

جو جواب میں نے اس کی مسکراہٹ سے مانگا تھا وہ نہیں ملا۔ پھر یک لخت معلوم ہوا کہ موسیقی ختم ہو چکی تھی، رقص ختم ہو چکا تھا، لوگ کھانے کے لئے دوسرے کمرے میں جا رہے تھے۔ میں اور رجی بھی چلے گئے۔ کچھ دیر کے بعد واپس آئے تو جینی جا چکی تھی۔ اس کا خاوند بھی وہاں نہیں تھا۔

مجھے یونہی خیال سا آیا کہ اس مرتبہ جینی سے بہت کم باتیں ہوئیں۔ میں اس سے دور دور رہا۔ نہ اس سے کچھ پوچھا نہ بتایا اس سے رومال بھی تو نہیں مانگا۔ نہ جانے کیوں، میں اس گوشے میں چلا گیا جہاں جینی اور اس کا خاوند بیٹھے رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ میز کے نیچے ایک مسلا ہوا رومال پڑا تھا جو رقص کرتے ہوئے لوگوں کے قدموں تلے آ چکا تھا۔ میں نے اسے اٹھا لیا جا بجا سلوٹیں وہ رکیں جانی پہچانی خوشبو سے فضا معطر ہو گئی۔

یہ رومال یہاں کیسے آیا، جینی جان بوجھ کر میرے لئے چھوڑ گئی، یا یونہی اتفاق سے رہ گیا۔

دیر تک میں اس رومال کو لئے وہیں کھڑا رہا۔ اس روندے ہوئے مسلے ہوئے سرخ دل کو دیکھتا رہا جو اب تک خمار انگیز خوشبو میں بسا ہوا تھا۔

جینی کا دل ـــ عورت کا دل۔

سہیل عظیم آبادی

الاؤ

گاؤں سے پورب کو ایک بڑا سا میدان ہے۔ کھیت کی سطح سے کچھ اونچا اور چورس۔ لوگ کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں کسی راجہ کا یہاں پر راج محل تھا۔ اسی کی مٹی اور اینٹ سے زمین اونچی ہو گئی ہے۔ میدان کے پوربی کنارے پر پیپل اور برگد کے پیڑ ہیں اور اس کے بعد کھیت۔ اتر کی طرف ناگ پھنی کی گھنی اور لمبی قطار ہے اس کے بیچ میں کہیں نیم یا پاکڑ کے پیڑ، اور اس کے بعد کھیت۔ دکھن میں ایک کنارے پر ایک پیپل کا پیڑ ہے۔ اس کے پاس ہی ایک کنواں اور اس کے بعد ایک کھیت۔ پورب دکھن کونے پر ایک بڑا سا گڑھا ہے جس میں برسات کا پانی جمع ہو کر کئی مہینے رہا کرتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ راج محل کا یہ پوکھر تھا۔ اس میں رانی اپنی سہیلیوں کے ساتھ نہایا کرتی تھی۔ نہانے سے پہلے پوکھر میں گلاب کا عرق ڈال دیا جاتا تھا جس کی مہک دور دور تک پھیل جاتی تھی۔ چاندنی راتوں میں راجہ اور رانی دونوں ناؤ پر اس پوکھر پر سیر کیا کرتے تھے۔ یہ پوکھر بہت بڑا تھا بھرتے بھرتے بھر گیا اور جو نشان باقی رہ گیا ہے۔ وہ بھی راجہ اور راج محل کی طرح مٹ جائے گا۔

گاؤں میں اب کسان ہی کسان رہتے ہیں۔ پرجا ہی پرجا ——— راجہ کو مرے' برباد ہوئے تو زمانہ بیت گیا' اس کا راج محل تو میدان ہے۔ یہ میدان گاؤں والوں کے لئے سب کچھ ہے۔ ہر روز سارے گاؤں کے ڈھور اس میدان میں جمع ہوتے ہیں۔ لوگ اپنی اپنی بھینسوں کو کنوئیں پر دھوتے ہیں پھر گھر لے جاتے ہیں۔ فصل کٹنے پر کھلیان لگاتے ہیں۔ روکھ پیڑنے کو کولہو بٹھاتے اور گڑ لہسار بناتے ہیں۔ گاؤں کے لڑکے صبح سے شام تک کھیلتے اور بڑے بوڑھے کسی پیڑ کے نیچے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔

کارتک کا مہینہ تھا۔ ٹھنڈک اچھی خاصی پڑنے لگی تھی اور میدان میں کئی دھان کا کھلیان لگایا جانے لگا تھا۔ گاؤں میں نئی زندگی پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ لڑکے میدان میں کبڈی کھیل رہے تھے۔ عورتیں کنوئیں سے پانی بھر کر اپنے گھروں کو لے جا رہی تھیں۔ جھگرا پورب کی طرف آگ جلا کر اپنی لاٹھی کو سینک سینک کر سیدھی کر رہا تھا۔ اسی دن وہ اپنی بہن کے گھر دھرم پور سے آیا تھا۔ بہنوئی نے چلتے وقت یہ لاٹھی اپنی بنسواڑی میں سے کاٹ کر دی تھی۔ لاٹھی نیچے کی طرف سے ذرا ٹیڑھی تھی اس کا سیدھا کرنا ضروری تھا۔

بھگوا نے لاٹھی سیدھی کرنے کو الاؤ جلا رکھا تھا۔ پہلے لاٹھی کو سینک کر پھر پیپل کی جڑ میں پھنسا کر اسے سیدھا کرتا۔ وہ اپنی بہن کے یہاں سے ایک گیت سیکھ کر آیا تھا۔ اس گیت کو ہلکے ہلکے سُروں میں گاتا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کے دماغ میں بہت باتیں گھوم رہی تھیں۔ سب سے زیادہ یہ کہ گاؤں میں ایک بہت بڑی سبھا ہونی چاہئے۔ ٹھیک ویسی ہی' یا اس سے بڑی جیسی اس کی بہن کی سسرال میں ہوئی تھی اور اس سبھا میں وہ کھڑا ہو کر کل لوگوں کو ساری باتیں سمجھائے۔ جیسے وہاں ایک آدمی نے سمجھایا تھا۔

بھگوا اپنے خیالوں میں گم تھا کہ اکلو آ گیا۔ یہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا اور گاؤں کے ناطے میں بھگوا کا چچا تھا۔ اکلو نے آتے ہی کہا:

"بیٹا لاٹھی تو اچھی ہے مگر اس میں گڑھا سا لگے تب۔"

بھگوا نے پلٹ کر دیکھا اور بولا:

"ہاں چچا! پر گڑھا سا اچھا سا مل جائے تب نا۔"

شام ہو چکی تھی، دھیرے دھیرے اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ لاٹھی سیدھی بھی ہو چکی تھی۔ اس نے خوب گھما گھما کر لاٹھی کو دیکھا۔ پھر پیپل کے پیڑ کے سہارے کھڑا کر کے دو قدم پیچھے ہٹ کر دیکھنے لگا۔ اکلو بھی لاٹھی کو ایک خاص نظر سے دیکھتا رہا جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ لاٹھی اچھی ہے اور اگر مل جائے تو بہت اچھا ہو۔

ابھی لاٹھی کو یہ دونوں دیکھ ہی رہے تھے کہ ساموا اور باڑھو بھی گھومتے پھرتے آ گئے۔ باڑھو نے آتے ہی کہا:

"ارے بھیا! ابھی اتنا جاڑا تو نہیں پڑا۔ ابھی سے الاؤ تاپنے لگے؟"

اکلو بولا:

"بھاگو اپنی لاٹھی سیدھی کر رہا تھا۔ الاؤ کون تاپے گا ابھی۔"

باڑھو بولا:

"مگر آگ بھلی معلوم ہوتی ہے بھائی۔"

وہ آگ کے پاس بیٹھ گیا اور آگ تاپنے لگا۔ اس کے بیٹھتے ہی اور لوگ بھی بیٹھ گئے۔ سانول اسی طرف آ رہا تھا اور ان لوگوں کی باتیں سُن چکا تھا۔ وہ آتے ہی بولا:

"واہ! باڑھو چچا پہلے تو دوسرے کو ٹوکا اور سب سے پہلے بیٹھے بھی آگ تاپنے' واہ!"

باڑھو بولا:

"ہاں بیٹا! اب آگ بھلی معلوم ہوتی ہے' اور ہم نے ٹوکا کب تھا۔ ارے ایسے ہی بول رہا تھا۔"

سب کے سب آگ تاپنے لگے۔ آگ ابھی زیادہ تھی اس لئے کچھ دور ہی دور بیٹھے۔ باڑھو نے پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا:

"اے یہ لونڈے سب اتنے بدمعاش ہوتے جا رہے ہیں کہ کیا کہا جائے۔"

سانول نے کہا:

"کیا چچا! ہم لوگوں نے تو کوئی بدمعاشی نہیں کی۔"

باڑھو بولا:

"نہیں۔ تم سب کی بات نہیں۔ یہی تو میرا کہنا ہے۔ تم سب جوان اور بال بچے والے ہوئے۔ کبھی کوئی اونچی نیچی بات دیکھنے میں نہ آئی۔ پر اب کی تو دنیا ہی بدلتی جا رہی ہے۔ دیکھو ابھی راستے میں آ رہے تھے تو دیکھا کہ چھیپی اور چھیدو کے دونوں لڑکے ریڑ (ارنڈ) کی ڈنٹھل جلا کر بیڑی کی طرح

بھک بھک کھینچ کر دھواں اُڑا رہے ہیں۔ مُرانشا تو دونوں کھانستے ہوئے بھاگے۔ سب کا کلیجہ جل جائے گا۔"

اتنے میں چھپی آگیا اور باڑھو نے اس سے بھی یہ بات دہرا دی لیکن چھپی نے کہا:

"بھیا۔ اب او جمانا ہی نہ رہا۔ ہم سب بھی کبھی لڑکے تھے۔ ایک دفعہ کا قصّہ سنو گے تو دنگ رہ جاؤ گے۔ ابھی کل کی بات ہے ہم میدان سے آ رہے تھے۔ میرے ہاتھ میں لوٹا تھا۔ خیال ہوا کہ بڑے کنوئیں پر لوٹا مانجھ کر پانی بھر لیں۔ جیسے ہی کنوئیں پر پہنچے تو دیکھا رتیو، کلوا کی عورت کا راستہ روکے کھڑا ہے۔ وہ کہہ رہی ہے، جانے دو رتیو، تو رتیو کہتا ہے ایسے نہیں بھوجی۔ ویسے کہو۔ ع

موری راہ چھوڑ دو گردھاری دیر بھئی

یاد ہے کرشن لیلا والا گانا۔ جب اس نے بالٹی اٹھا کر کہا کہ سارا پانی اچھل دوں گی تو راستے سے بھاگا۔"

"بچا! یہ بھی کوئی بات ہے۔ بھوجائی ہے وہ ہنسی ٹھٹھا کرتا ہوگا ——— جانتے ہی ہو رتیو کیسا ہنسوڑ ہے۔"

لیکن چھپی نے بزرگانہ انداز میں کہا:

"ہش! یہ بھی کیا ٹھٹھا ہے۔ ایسے ہی لڑکے خراب ہو جاتے ہیں۔ یہ تو ہم نے دیکھا تھا۔ کوئی دوسرا دیکھ لیتا تو نہ جانے کتنی باتیں جوڑ کر کہتا اور بدنامی ہوتی۔ گاؤں میں ایسی بات کبھی نہیں ہوئی۔"

سانول چپ ہو گیا اور باڑھو نہ جانے کب تک بولتا رہتا لیکن سامنے بیچ ہی میں روک کر کہا:

"ارے بھاگو تو نے تو کچھ کہا نہیں۔ سُنا ہے دھرمپور میں بڑی بڑی سبھا ہوئی۔ بڑے بڑے لوگ جمع ہوئے۔ کسانوں کے فائدہ کی بات ہوئی۔"

بھاگو نے اس انداز سے سب پر نگاہ ڈالی جیسے وہی اکیلا سب کچھ جانتا ہے۔ باقی سب کاٹھ کے اُلّو ہیں۔ پھر بولا:

"ہاں بہت بڑی سبھا ہوئی تھی۔ ایک سادھو جی بھی آئے تھے۔ وہ سب کو ایک بات کہہ گئے۔ سب کسان ایک ہو جائیں۔ آپس میں ہل مل کر رہیں۔ تب ہی زمیندار کے ظلم سے بچ سکتے ہیں۔"

سانول بولا:

"بھیا بات پتے کی ہے۔ ہم لوگوں پر جتنا ظلم ہوتا ہے اسے کون جانے۔ سال بھر محنت کر کے اپجاتے ہیں اور ہمارے ہی بال بچے بھوکوں مرتے ہیں۔"

آگ کچھ دھیمی ہو چلی تھی اس لئے باڑھو کچھ اور بھی آگ سے قریب ہو گیا اور بولا:

"بات تو ٹھیک ہے پر ہونا مشکل ہے نا۔"

بھاگو بولا:

"مشکل کیا ہے؟ آج سے ہم لوگ ٹھان لیں کہ آپس میں ہل مل کر رہیں گے۔ زمیندار کو بیگار نہیں دیں گے۔ کوئی ناجائز دباؤ نہیں سہیں گے۔ بس! دھرمپور میں تو ایسا ہی ہوا ہے۔ اب تو وہاں چین ہی چین ہے۔"

ابھی بات آگے نہیں بڑھی تھی کہ طوفانی میاں آگئے۔ یہ بوڑھے آدمی تھے اور تیس برس سے گاؤں میں کر گھہ چلاتے تھے۔ طوفانی میاں نے آتے ہی اپنا ٹھریا (معمولی قسم کا حقہ) ذرا الگ رکھ کر ایک دم لگایا اور اس انداز سے سب کی طرف متوجہ ہوئے جیسے ایک مجسٹریٹ وکیلوں کی بحث سننے کے لئے تیار ہو۔ لیکن طوفانی میاں کو متوجہ دیکھ کر سب چپ ہو گئے جیسے اب وہ کچھ کہنے والے تھے۔

"ارے سب چپ ہو گئے، بات کیا تھی؟"

ساتول نے جواب دیا:

"بچاگو دھر سپہ رگیا تھا طوفانی چچا۔ وہیں کی بات تھی۔"

"کیا بات تھی؟"

طوفانی میاں نے اس انداز میں سوال کیا جیسے اگر انہیں نہ بتایا گیا تو پھر کوئی بات ہوئی ہی نہیں۔ سب کا سننا بے کار ہوا۔ بچاگو نے پھر سے ساری بات دہرادی۔ طوفانی میاں نے حقے کا لمبا دم لگا کر بزرگانہ انداز میں کہا:

"بات تو ٹھیک ہے۔ مگر بھائی یہ کرم کی لکھی باتیں ہیں۔ آدمی کیا کر سکتا ہے۔ یہ سب خدائی کارخانہ ہے۔"

طوفانی میاں نے ایک ہی جملے میں سب کی ہمت توڑ دی۔ اب بھلا خدائی کارخانے میں بحث کرنے کا سوال کیسے پیدا ہوتا۔ جھگو تیلی نے کہا:

"طوفانی میاں نے سولہ آنے ٹھیک بات کہی ہے۔ پرماتما نے سدا کے لئے آدمی کو چھوٹا بڑا بنایا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اپنا کام ہی نہ چلتا۔"

چھیٹر دھوبی نے اور آگے بڑھ کر پاد دی اور کہا:

"ہونہہ اگر جمیندار نہ رہے گا تو کون رہے گا؟ سب جمیندار ہو جائیں تو پھر کھیتی کون کرے گا؟"

دلو چپ چاپ بیٹھا سن رہا تھا۔ وہ بڑا جوشیلا تھا۔ سب کی باتیں سن کر اس کا خون کھول رہا تھا۔ لیکن اس کا چچا طوفانی بیٹھا تھا۔ بات آ آ کر اس کے ہونٹوں پہ رک جاتی تھی لیکن اب اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ اس نے کہا:

"اپنے کئے سب کچھ ہو سکتا ہے۔"

طوفانی میاں نے اور ان کے ساتھ دوسروں نے اس کو آنکھیں نکال کر دیکھا۔ وہ حال ہی میں کلکتہ سے آیا تھا۔ کلکتہ میں وہ جہاز گھاٹ پر قلی کا کام کرتا تھا۔ دن رات محنت۔ چین، جاپان اور امریکہ سے آیا ہوا مال جہاز سے اتارا کرتا تھا۔ اس کو کمپنی سے روز جھگڑنا پڑتا تھا۔ وہ پہلے کئی ہڑتالوں میں شریک ہو چکا تھا اور وہ دیہات میں زمینداروں کے ظلم سے بھی واقف تھا۔ اس نے کہا:

"ہم لوگوں کو اب تیار ہونا ہی پڑے گا۔"

سانول نے کہا:

"ٹھیک کہتے ہو دلو ـــــ"

طوفانی میاں نے قہر آلود نگاہوں سے دلو کو دیکھا اور بڑبڑاتے ہوئے اٹھے: "سچ ہے کلکتہ جانے سے آدمی کا دماغ کھراب ہو جاتا ہے۔" اس کے ساتھ ہی چھیٹر اور جھگو اور ایک دو آدمی اٹھ کر چلے گئے اور اس انداز سے جیسے اس جگہ پر کوئی آفت آنے والی ہے۔ لیکن ان لوگوں کو اس کی پروا نہ ہوئی۔ بلکہ سانول نے کہا:

"جلم پر جلم ہے، پرسوں ہی کی بات ہے، منگھو کو پٹواری جی نے مارا ہے۔ بات یہ تھی کہ پٹواری جی چاہتے تھے منگھو کی عورت اگر ان کا چوکا کرے اور اس نے انکار کر دیا۔"

"یہ سب اب نہیں چل سکتا۔ کل منگھو کو کہا جائے کہ وہ بھی کام کرنے نہ جائے۔"

دلو نے رائے پیش کی اور سب نے ہاں کہی۔ پھر آگے چل کر کیا ہوگا؟ اس پر بھی بحث رہی لیکن سب نے نتیجے سے بے پروا ہو کر یہی فیصلہ کیا

کہ پٹواری جی کو رسید نہ دیا جائے۔ دباؤ ڈال کر دو دو گنی وصول کر لیتے ہیں، وہ بھی بند اور بیگار بھی آخری طور پر ختم ——"
"بیگار ختم" کہتے وقت دلو نے تھوڑا سا کوڑا کرکٹ اٹھا کر الاؤ میں ڈال دیا۔ الاؤ سے پھر ایک بار تھوڑی سی آگ بلند ہوئی اور بجھ گئی۔

ساتول نے کہا:

"تب دلو ٹھیک ہے نا؟"

دلو نے کہا:

"پکا بات ہے بھائی۔ مرد بات سے نہیں پلٹتا۔"

بھاگو نے کہا —— "بالکل ٹھیک۔"

پھر سیتل بولا:

"لیکن دلو بھیا۔ وہ جو پنڈت جی آتے ہیں نا۔ کہتے تھے کہ تم سب چپ چاپ بیٹھے رہو۔ یہ سب کام کانگریس کر دے گی۔"

سیتل کے بولنے سے جمن کو بھی ہمت ہوئی۔ وہ بھی اپنے ماموں کے گھر گیا تھا۔ وہاں مسلمانوں کا ایک بڑا جلسہ ہوا تھا جس میں کانگریس کی برائیاں وہ سن چکا تھا اس نے کہا:

"دلو بھائی —— کانگریس —— مولانا صاحب تو کہتے تھے ——"

دلو نے ذرا تیکھے انداز میں کہا:

"دھت۔ یہ سب بکتے ہیں۔ گریب کا کوئی سالا نہیں ہوتا۔ اپنے کرنا ہوگا جو ہو۔"

یہ کہتے ہوئے دلو اٹھ کھڑا ہوا۔ رات بھی کافی جا چکی تھی۔ الاؤ بھی بجھ چکا تھا اور فضا میں ٹھنڈک کافی پیدا ہو چکی تھی۔ دلو کے اٹھتے ہی سب کے سب اٹھ گئے۔

دوسرے دن صبح سے سارے گاؤں میں ہلچل تھی۔ بوڑھے بچے اور جوان سب کے سب کچھ نہ کچھ اسی قسم کی باتیں کرتے تھے۔ جوان تو ہر دروازے پہ کہتے پھرتے تھے "آج سبھا ہو گی" بچے تماشا سمجھ رہے تھے اور بوڑھے نتیجہ پر غور کر رہے تھے کہ بھُس میں چنگاری پڑ گئی۔ پٹواری نے اندر جھنوں اور طوطا رام کو بلا کر خوب ڈانٹا، گالیاں دیں اور صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اس سال تم لوگوں نے بقایا بے باق نہیں کر دیا تو کوئی کھلیان سے ایک دانہ بھی اٹھا کر نہ لے جا سکے گا —— اس سے جوش اور بھی بڑھ گیا۔

شام کو دو چار نوجوان میدان میں جمع ہوئے۔ مگر زیادہ لوگ کترا کر نکل گئے۔ سبھا کرنے والوں کو سخت غصّہ ہوا۔ وہ سب کے گھروں میں پھر گئے اور سب سے کہا یہ سب کا حشر طوطا رام اور اندر جھنوں کا ہو گا۔ تم سب چڑیوں کی ڈولی کی طرح چیں چیں کرتے رہ جاؤ گے اور پٹواری تمہیں باز کی طرح ہر روز شکار کرے گا۔ آج وہ کل وہ۔"

صبح اٹھ کر ساتول منہ دھونے بیٹھا تھا کہ پیادے نے آکر کہا:

"ساتول بھائی! تمہیں پٹواری جی نے بلایا ہے۔ کوئی ضروری بات ہے۔"

ساتول کا ماتھا ٹھنکا تو ضرور، لیکن وہ چور نہیں تھا جو منہ چھپاتا، منہ ہاتھ دھو کر اس نے کچھ کھایا پیا اور کچہری کی طرف چلا۔ راستے میں اسے خیال آیا کہ اس کی خبر دلو کو بھی کرتا جائے۔ جیسے ہی دلو کے گھر کی طرف مڑا، بھاگو اور دلو آتے دکھائی پڑے۔ بھاگو نے ساتول کو دیکھتے ہی کہا:

"بھیا جانتے ہو کچہری سے بلاوا آیا تھا۔ گماشتہ جی بھی آئے ہوئے ہیں، اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مالک سے کوئی خاص

حکم لے کر آئے ہیں ——— کیا رائے ہے ———؟"

سانول نے جواب دیا:

"چلو تمہارے دالان میں بیٹھ کر بات کریں گے۔"

تینوں گئے اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ بھاگو نے یہ بھی بتایا کہ ان کی ساری باتیں پٹواری کے کانوں تک چھٹو دھوبی پہنچاتا ہے۔ اس سے سانول کو بڑا غصہ آیا اور وہ بولا:

"دو سالے کو پکڑ کر چار لاٹھی۔ ہم لوگ سے کھچڑ کھود کھود کر بات پوچھتا ہے اور اپنے باوا کو کہہ آتا ہے۔ حرامی!"

دلو نے کہا:

"غصہ کرنے کی بات نہیں سانول۔ کام کرنا ہے۔ دھیرج سے کام کرنا ہوگا ——"

سانول نے کہا:

"ایسے سالوں کو سزا ضرور ملنی چاہیئے۔"

بھاگو نے پوچھا:

"تو اب کیا ہوگا؟"

سانول نے کہا:

"ڈرنے کی بات کیا ہے۔ ٹھہرو، پٹواری نے بلایا ہے وہاں سے ہو آؤں۔ دیکھوں بات کیا ہے؟"

سانول چلا گیا۔ دلو اور بھاگو کچہری سے ہو کر آئے تھے۔ ان دونوں پر ڈانٹ پڑ چکی تھی۔ لیکن ان دونوں نے سانول سے باتیں اس لئے نہیں کہیں کہ وہ اور بھی غصہ ہو جائے گا۔ ذرا سی بات ہی اس کو غصہ آ جاتا ہے اور روکنے کی کوشش اس لئے نہ کی کہ وہ ہرگز نہ رکتا۔ بلکہ بات اور بھی بڑھنے کا ڈر تھا۔ وہ دونوں دیر تک چپ رہے لیکن بھاگو نے کہا:

"دلو بھائی سانول کو وہاں نہ جانے دینا۔ گماشتہ جی اگر ٹیڑھے ہو کر بولیں گے تو سانول بھیا نہیں سہہ سکتے۔ وہ تیکھے مزاج کے آدمی ہیں۔"

دلو نے ایک لمبے سانس کے ساتھ کہا:

"یہ ٹھیک ہے۔ پر نہ جانے پر بھی تو بات بڑھتی ہے۔ اب جو بھی ہو دیکھا جائے گا۔"

بھاگو بولا:

"پھر بھی ......"

یکایک وہ چپ ہو گیا۔ سانول تیزی کے ساتھ سامنے سے آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا اور دھوتی پھٹی ہوئی تھی۔ ابھی وہ دلو سے کچھ کہہ بھی نہ سکا تھا کہ دلو آ گیا اور آتے ہی بولا:

"بھاگو لاٹھی تو دے ——"

دلو اور بھاگو دونوں کھڑے ہو گئے۔ دونوں نے سانول کو سمجھایا مگر وہ تنتنا جا رہا تھا ——— اس نے بتایا کہ وہاں پٹواری اور گماشتہ نے ڈانٹا۔ بات بڑھی۔ اس پر گماشتہ نے پھاٹک بند کروا دیا اور چاہتا تھا کہ مار پیٹ کرے مگر وہ اس طرف کی دیوار کو جو نیچی ہے، پھاند کر بھاگ آیا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ چھٹو اور جھبی حجام سارے فساد کی جڑ ہیں اور وہ ان دونوں سے بدلہ ضرور لے گا۔

دلو ہوشیار آدمی تھا اس نے سانول کو ایک کمرے میں بند کر دیا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔ بھاگو کچھ جوش میں تھا اور کچھ ڈر رہا تھا۔ دلو پر کوئی

خاص اثر نہ تھا۔ وہ ایسے جھگڑے کلکتہ میں بار بار دیکھ چکا تھا۔ بھاگو کے لئے بات نئی تھی۔ جوش تو ضرور تھا مگر ایک تو دل کا کچا تھا اور دوسرے سمجھ بھی زیادہ نہ تھی۔ وہ گھبرا کر دلو کا منہ دیکھنے لگا۔ پھر بولا:

"اب کیا ہوگا دلو بھائی؟"

دلو بولا:

"دیکھا جائے گا——"

اتنے میں گاؤں کے کچھ بڑے بوڑھے آ گئے اور لگے دونوں کو سمجھانے۔ دلو سب کی بات کا ٹھنڈے دل سے جواب دیتا گیا۔ سب نے یہ بھی کہہ دیا کہ اب کوئی بات نہ ہوگی۔ سانول چلا گیا لیکن جب کچھ جوان آدمی آئے تو ان سے بولا:

"بولو اب کیا ارادہ ہے؟ اب عزت چاہتے ہو یا ذلت؟"

ذلت کون چاہتا ہے؟ سب نے کہا کہ کچھ بھی ہو ہم ساتھ دیں گے۔ لیکن دلو نے سب کو سمجھایا کہ کوئی اونچی نیچی بات نہ ہونے پائے۔ اب صرف کام یہ کرنا ہے کہ آس پاس کے گاؤں میں لوگوں کو تیار کیا جائے۔ ابھی بات ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ کچہری سے زمیندار کے پیادے لاٹھیاں لے کر سانول کو پوچھنے آ گئے۔ دلو نے کہہ دیا کہ وہ کہیں چلا گیا۔ لیکن جھبی حجام نے دیکھ لیا تھا کہ وہ اسی مکان میں آیا ہے اور ان دونوں نے اس کو کمرے میں بند کر دیا ہے۔ جھبی نے پیادوں کو بتا دیا تھا اور پیادوں نے بات بات میں کہہ دیا کہ جھبی سے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ اسی مکان میں ہے۔ ایک دو نے یہ بھی کہا کہ وہ اسے پکڑ کر لے جائے بغیر نہیں رہیں گے۔

اب دلو کو تاب نہ رہی۔ اس کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔ ہونٹ کانپنے لگے۔ اس نے تن کر کہا:

"تم اسے نہیں لے جا سکتے۔ اگر تم زمین لال کرنا چاہتے ہو تو کنڈی کو ہاتھ لگاؤ۔"

پیادے آگے بڑھنا چاہتے تھے مگر پندرہ بیس آدمیوں کو دیکھ کر ان کی ہمت نہ پڑی، ان میں سے ایک دو نے یہ بھی رائے دی کہ چل کر مالک سے سارا حال کہہ سنانا چاہیے۔ بغیر حکم کے جھگڑا مول لینا ٹھیک نہیں۔

اس وقت سے شام تک ایک ہی خبر اڑتی رہی۔ گماشتہ جی دوسری جگہوں سے آدمی بلوا رہے ہیں کہ گاؤں کو لوٹ لیا جائے، کھلیان پر قبضہ کر لیا جائے۔ اب کھلم کھلا لڑائی کا اعلان تھا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے چپ تھے۔ اب کس کی طرف سے بولتے اور کس کو سمجھاتے—— اور ان کی سنتا بھی کون تھا۔ ایک طرف تھا حکومت کا غرور اور دوسری طرف عزت کا احساس۔ ان دونوں میں سمجھوتے کی گنجائش کہاں ہے۔

بات بڑھی تو کام بھی بڑھ گیا۔ آس پاس کے سارے گاؤں میں سنسنی پھیل گئی۔ ہر گاؤں کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ سب کے ساتھ ایک ہی جیسی بات تھی۔ ہر ایک کو ایک ہی قسم کی مصیبت کا سامنا تھا۔ اب سب کے سب ایک دوسرے کی مدد کرنے پر تیار تھے۔

زمیندار کے کارندے کسانوں سے زیادہ عقلمند ہوتے ہیں۔ ان کا کام ہی ہے کسانوں پر زمیندار کا رعب باقی رکھنا۔ ان کے لئے کام کرنا تحصیل وصول اور حکم نہ ماننے والوں کی سزا۔ سر اٹھانے والوں کا سر کچلنا۔ اسی لئے تو زمیندار انہیں رکھتا ہے۔ یہ لوگ سب کچھ جانتے ہیں کس وقت کیا کام کرنا چاہیے۔ فیل بان جانتا ہے کہ ہاتھی کس طرح قبضے میں رکھا جاتا ہے۔

پٹواری جی کچہری سے نکلے اور تھانہ پہنچے۔ ایک رپورٹ لکھوائی کہ گاؤں کے کسان کچہری کو لوٹنا اور کھلیان سے سارا غلہ اٹھا لینا چاہتے ہیں۔ گماشتہ جی گئے اور مالک کے کان بھرے اور بہکے ہوئے کسانوں کو راستے پر لانے کا سامان ہو گیا۔ یہ لوگ گاؤں میں چڑیوں کی طرح چیں چیں کرتے رہے۔

دو چار دن بھی نہ گزرے تھے کہ سانول، دلو اور بھاگو کے ساتھ کئی آدمیوں کو دفعہ ۱۴۴ کا نوٹس مل گیا۔ وہ نہ تو کھلیان کی طرف جا سکتے تھے اور

نہ کچہری کی طرف ——— گاؤں میں ایک بڑی سبھا بھی ہوئی تو یہ لوگ میدان میں نہ جا سکے ۔ وہاں کھلیان تھا ۔
سبھا ہونے کے بعد کچھ اور لوگ بھی سامنے آ گئے اور ان پر بھی نظر کڑی پڑنے لگی ۔ لیکن آگ جو سُلگی تھی ، وہ بجھی نہیں بڑھتی ہی گئی ۔
ساؤل صبح سویرے اپنی ضرورت سے کھیتوں کی طرف جا رہا تھا ۔ اس کے ایک ہاتھ میں پانی کا بھرا ہوا لوٹا تھا ۔ سامنے جھبی آتا ہوا دکھائی پڑا ۔ ساؤل ٹھہر گیا ۔ جھبی جیسے ہی پاس آیا ۔ ساؤل بولا :

" تم کو ہم سب سے بیر کا ہے کا جھبی بھائی ۔ تم کو سوچنا چاہئے کہ تم بھی کسان ہو ۔"

جھبی بولا ۔

" تم لوگ تو جھوٹ موٹ بدنام کرتے ہو ۔"

ساؤل کو اس کا یہ کہنا دھوکہ نہیں دے سکتا تھا ۔ وہ سب کچھ جانتا تھا ۔ بولا :

" دیکھو جھبی بھائی ، یہ سب کہنے سے ہم نہ مانیں گے ۔ یاد ہے تم کو ۔ اسی پٹواری نے تم کو مارا تھا ۔ بات ذرا سی تھی نا ۔ ایک دن بدلن میں نیل ملنے نہ گئے تھے ——— اپنی بے عزتی بھی بھول گئے ؟"

جھبی کترا کر نکل جانا چاہتا تھا ۔ بولا :

" بیکار باتیں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ۔"

ساؤل نے کہا :

" یہی تو کہتا ہوں ۔ ایسی بات کیوں کہتے ہو جس سے تمہارا کوئی فائدہ نہیں ہے ۔"

لیکن ساؤل اس بات کو بھول گیا تھا کہ پھاگو کا باپ گاؤں کا برا اہل تھا اور اسی زمانے میں بہت سا کھیت جھبی سے لے کر زمیندار نے پھاگو کے باپ کو دے دیا تھا ۔ اس سے اُس کا دل اب تک صاف نہیں ہوا تھا ۔ گو بات بہت پرانی ہو چکی تھی ۔ جھبی نے کہا :

" سنو ساؤل ! تم بیچ میں مت پڑو ۔ پھاگو کے باپ نے بڑا ظلم ڈھایا ہے ہم پر ......"

" وہ بات بڑی پرانی ہو چکی اسے بھول جاؤ ۔ یا کہو تو پھاگو سے کہہ کر تمہارا کھیت دلوا دوں ——— لیکن یہ تو سوچو کھیت تم سے باطرح چاچا نے تو لیا نہیں ۔ لیا تو تھا زمیندار ہی نے ۔ قصور کس کا ہے ؟"

مگر جھبی پر ان باتوں کا اثر کیا ہوتا ۔ اس نے کہا :

" ساؤل میں تم سے بحث کرنے نہیں آیا ہوں ———"

" سب ٹھیک ۔ پر یہ تو بتاؤ اس دن تم پیادے کیوں لائے تھے ۔ ان کو کیوں بتایا تھا کہ ساؤل پھاگو کے گھر پر ہے ۔ میرے باپ نے تو تمہارا کھیت نہیں لیا تھا ۔"

جھبی کھسیا گیا اور اس نے کہا :

" مجھے بحث کرنے کی فرصت نہیں ۔"

وہ دو قدم آگے بڑھا لیکن ساؤل نے اس کا راستہ روک لیا اور ذرا تیکھا ہو کر بولا :

" سنو جھبی بھائی ۔ تمہیں جواب دینا ہو گا ۔ کسی کی راہ میں کانٹے بچھانا اچھا نہیں ۔ یہ تمہارے حق میں بڑا برا ہو گا ۔"

جھبی جانتا تھا کہ ساؤل غصیل آدمی ہے ۔ اس لئے وہ کسی طرح بات کاٹ کر نکل جانا چاہتا تھا ۔ وہ خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ پھاگو کے باپ پر جو الزام رکھ رہا تھا ۔ وہ بھی غلط تھا ۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ گاؤں میں کسی نے کچھ اس کا بگاڑا نہیں تھا اور وہ صرف اپنے فائدے کے لئے

گاؤں بھر کے آدمیوں کو نقصان پہنچا رہا تھا اور پٹواری تک خبر پہنچانے کے بعد گاؤں کے سارے لوگوں سے الگ سا ہو گیا تھا مگر اب بُرے کے پھندے پڑ گیا تھا۔ سانول کو جواب دئے بغیر چلے جانا ممکن نہ تھا۔ اس نے کہا:

”سانول دیر ہو رہی ہے۔ ہمیں کام ہے راستہ چھوڑ دو۔“

اگر کھلا ہوا راستہ ہوتا تو شاید جھبی کسی دوسری طرف سے چلا جاتا مگر راستہ کے لئے ایک ہی پگڈنڈی تھی اور اس کے دونوں طرف اوکھ کے گھنے کھیت تھے جن میں آدمی سے زیادہ اونچے اوکھ لہلہا رہے تھے۔ راستہ بالکل نہ تھا۔ اس کے کہنے پر بھی سانول نے راستہ نہ دیا تو جھبی نے چاہا۔ اس کو ہٹا کر چلا جائے —— لیکن سانول نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جھبی نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا اور بولا:

”لڑنا چاہتے ہو کیا؟“

سانول بولا!

”ہم لڑنا نہیں چاہتے لیکن اس کی ضرورت پڑی تو باز بھی نہ آئیں گے۔ ہم تو تم سے یہی پوچھ رہے ہیں کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟“

جھبی کو غصہ آچکا تھا اس نے کہا:

”کیا تو اس میں کسی کے باپ کا کیا ——“

سانول کو ایسی باتوں کی تاب کہاں تھی۔ وہ دیر سے اپنے غصے کو دبائے ہوئے تھا۔ گالی جھبی کے منہ سے نکلی ہی تھی کہ پانی سے بھرا ہوا لوٹا اس نے جھبی کے سر پر دے مارا۔ جھبی کے سر سے خون اور لوٹے سے پانی بہنے لگا اور وہ چکرا کر گر گیا۔

بات اور زیادہ بڑھ گئی۔ شکار خود ہی پھنس گیا۔ پولیس آئی اور سانول گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ گواہ کہاں سے آئے؟ مقدمہ میں دوسرے لوگ کیسے پھنسیں۔ مگر روپیہ ہو تو یہ بھی مشکل نہیں۔ روپیہ خرچ کرنے والا ہونا چاہئے۔ کام کون سا ہے جو نہیں ہوتا۔ روپیہ ہو تو ایشور بھی خوش ہو سکتا ہے۔ مندر اور دھرم سالے بنا کر۔ اور کسی کو پھنسا لینا کیا مشکل ہے۔ زمیندار نے فیصلہ کر لیا کہ چاہے گاؤں اجڑ جائے لیکن سر اٹھانے والوں کا سر کچلا ضرور جانا چاہئے۔

ایک طرف سانول کا مقدمہ کھلا، دوسری طرف دلو اور بھاگو اور دوسروں کے خلاف دھڑا دھڑ رپورٹیں ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ جب پورا غلہ کھلیان میں آ گیا تو ان سب پر جن پر کسی طرح کا شک تھا دفعہ ۱۴۴ کے نوٹس کی تعمیل ہو گئی۔ سب کے سب ڈر سے کانپ رہے تھے زمینداری تھی زمیندار کی اور راج تھا پٹواری کا ——

آخر اس طرح کب تک چلتا لوگ اکتا گئے۔ غریبوں کے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آئے جو مقدمہ لڑیں۔ اس لئے چپ رہنا ہی بہتر لیکن چپ رہیں تو کب تک۔ دلو نے بھاگو کو ایک دن بلا کر کہا:

”اب کچھ کرنا چاہئے۔ اگر چپ رہے تو مطلب یہ کہ پٹواری جی من مانی کرتے جائیں گے۔ اب جو بھی ہو۔“

بھاگو اور دوسرے لوگوں نے بھی رائے کا ساتھ دیا اور بات طے پائی کہ جب تک کھلیان اٹھے دوسرے گاؤں میں جلسے کئے جائیں اور اسی پر عمل بھی کیا گیا۔ جب آس پاس کے سارے گاؤں میں تحریک چل پڑی تو دوسرے لوگ بھی جن پر اس کا اثر پڑ سکتا تھا، سر جوڑ کر بیٹھے اور سر پر آنے والی آفت سے بچنے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔

بات بڑھتی گئی اور اس کا اثر بھی بڑھتا گیا۔ دھنی رام بھی ایک کسان تھا جو ان لوگوں کے ساتھ پورے جوش سے کام کر رہا تھا جب سانول کی ضمانت نہیں ہوئی تو وہ کچھ نڈر پڑا اور سب کے ساتھ بدمعاشوں کی فہرست میں اس کا نام بھی آ گیا اور نشانہ بن گیا۔

ایک دن صبح ہونے سے پہلے ہی وہ کسی کام سے دوسرے گاؤں جا رہا تھا۔ بیچ میں راستہ تھا اور دونوں طرف اوکھ کا کھیت،

ہر طرف سناٹا اور اندھیرا تھا۔ وہ بہت دور جا بھی نہ سکا تھا کہ پیچھے سے کسی نے اس کے سر پر لاٹھی ماری۔ وہ گر پڑا۔ پھر ایک دو چار پانچ دس،
——— وہ ادھ مرا ہو گیا۔ سارے گاؤں میں اس سے کھلبلی مچ گئی۔

پولس آئی۔ بہت سے لوگ گرفتار ہوئے۔ گرفتار ہونے والوں میں ولو، پھاگو، جمن، ہرکھو سبھی تھے۔ یہ سب کے سب تھانے سدھارے ان پر کھیت کاٹنے، کھلیان لوٹنے اور دھنی رام پر حملہ کرنے کا الزام تھا۔ سب کا جیل جانا یقینی۔ پٹواری خوش تھا۔ سارے بدمعاش پکڑے جا چکے تھے ——— وہ اپنی کامیابی پر خوش تھا۔ لیکن آئندہ کیا ہو گا، یہ سوال لرزہ خیز طور پر اس کے دماغ میں پیدا ہو جایا کرتا تھا۔

کھلیان بھرتا جا رہا تھا لیکن اب کھلیان میں کسانوں سے زیادہ پولس کے سپاہی نظر آتے تھے۔ انہیں کھلیان کی حفاظت کرنا تھی۔ کسان سارے بے ایمان ہو چکے تھے اور اس کی سزا بھی پا چکے تھے مگر یہ بوڑھے اور بچے جو گاؤں میں بچ رہے تھے۔ وہ بھی تو آخر کسان ہی تھے۔

پوس کا مہینہ تھا۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ کھلیان کی حفاظت کرنے والے سپاہی اپنے گرم کوٹوں کے باوجود ٹھنڈک سے سکڑے جاتے تھے۔ سب نے مل کر بڑا سا الاؤ جلایا تھا۔ آگ تاپ رہے تھے اور کہانیاں کہی جا رہی تھیں۔ الاؤ بجھنے لگا، ایک سپاہی اٹھتے ہوئے بولا:

"ایک دن ساری چیز اسی طرح ختم ہو جائے گی۔"

دوسرا بولا:

"سالے پٹواری کا کیچڑ۔ اوہ لاش میں کیسے آرام سے رہتے ہیں اس وقت۔"

اس کے اٹھتے ہی دوسرے سپاہی بھی اٹھ کر جھونپڑے میں چلے گئے اور الاؤ بجھ گیا۔ کھلیان میں سپاہیوں کا شور گاؤں کے سناٹے میں مل گیا ———

———

ممتاز شیریں

آئینہ

میں ایک بڑے آئینہ کے سامنے کھڑی بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ میری توجہ بال بنانے پر نہ تھی۔ یونہی کنگھی کئے جا رہی تھی۔ دراصل میں اپنے چہرے پر طرح طرح کے جذبات کے اظہار کا مطالعہ کر رہی تھی۔ اور کیا کہنے بڑا ہی مزہ آ رہا تھا۔۔۔۔۔۔ بال بنانے میں ضرورت سے زیادہ دیر لگ رہی تھی۔ امی۔ کہیں گی "کچھ کام بھی کرو گی پڑی رہی ا تم ہو آئینہ ہے اور بس۔ جب دیکھو آئینہ کے سامنے"۔۔۔۔۔ نہیں آج امی بھی کچھ نہ کہیں گی۔ آج تو وہ مجھ سے بہت خوش ہیں۔ ابھی ابھی آج ہی میرا رزلٹ معلوم ہوا ہے نا؟ رزلٹ اور آئینہ نے خوشی کی تصویر پیش کر دی۔ سیکنڈ ڈویژن! اور تمتما رہے تھے۔۔۔۔۔ ہونہہ! سیکنڈ ڈویژن بھی کوئی بڑی بات ہوئی میرے لئے؟ میں تو ہمیشہ جماعت میں اوّل آیا کرتی تھی۔ مجھے تو فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہونا چاہیے تھا۔ ایک ہلکی سی تحقیر او۔ ناز۔۔۔۔۔۔ ارے میں یوں بھی بھلی معلوم ہوتی ہوں؟۔۔۔۔۔۔۔ پھر بھی اگر کسی دوسرے امتحان کا نتیجہ ہوتا تو کچھ پروا نہ تھی۔ بی اے! ان دو ننھے سے حرفوں میں کتنی شان ہے۔ کتنا دبدبہ! اب تو میں گریجویٹ ہوں۔ آئینہ کی تصویر پر رعب اور فخر چھا گیا۔۔۔۔۔۔ گویا میں اپنی صورت نہیں دیکھ رہی تھی، بلکہ پردۂ فلم کی کسی ہیروئن کے چہرہ پر بدلتے جذبات کو۔ یا کسی مصور کی بنائی ہوئی تصویروں کو جن میں مصور نے خاص خاص جذبے کو گویا فوراً اس پر کھینچا ہے۔۔۔۔۔۔ اب لڑکیاں میرا پیچھا نہ چھوڑیں گی خوب ستائیں گی "مٹھائی کھلاؤ، مٹھائی کھلاؤ" اور میں کہتی پھرتی تھی "ناکہ اس سال ہرگز کامیاب نہ ہوں گی۔ میں نے امتحان کے لئے ذرا بھر بھی تیاری نہ کی تھی۔ اور وہ کہتی تھیں "آخر تم کامیاب نہ ہو تو کسی اور کی کامیابی کی امید بھی ہو سکتی ہے۔" اور مجھ سے شرطوں پہ شرطیں بدھا کرتی تھیں۔ بھلا مٹھائی پر راضی ہو جائیں گی۔ شاید پارٹی بھی دینی پڑے۔ ہاں کیوں نہ آج ہی اپنی چند خاص سہیلیوں کو بلا کر پارٹی دوں، خوب لطف آئے گھر بیٹھے بیٹھے میرا جی اکتا گیا ہے۔۔۔۔۔۔۔ اوہ! امی بھی ادھر آ نکلیں "آج میں سہیلیوں کو چائے پر بلاؤں امی؟"

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں بیٹی۔ شوق سے بلاؤ۔ آخر ایسی خوشی کے موقع بار بار نہیں آتے" آہا! آج امی نے کتنی جلد اجازت دے دی۔ زینی کو ضرور بلاؤں گی۔ وہ تو پارٹی کی جان ہو گی پھر ۔او رصرف اسی کو معلوم ہے ناکہ۔۔۔۔ ۔۔۔۔ اوں۔۔۔۔۔۔۔ ں! بڑی شریر ہے وہ تو سب

سے کہہ دے گی۔ پروین کو ڈبل کنگریچولیشن دو۔ ایک تو اس کے گریجوٹ بننے پر اور دوسرا اس سے بڑھ کر اس کی اینگیجمنٹ (Engagement) پر۔ اور سب لڑکیاں مجھ پر ٹوٹ پڑیں گی۔ چھیڑتی چھیڑتی میرا ناک میں دم کر دیں گی۔ اور میں بناوٹی غصّہ سے یوں منہ بنا لوں گی...... ارے تو غصّہ بھی مجھے بھاتا ہے۔ منہ پھلائے ہوئے میں بھی میں اچھی لگتی ہوں۔ یہ تو آج ہی معلوم ہوا۔

ہاں ہاں لڑکیاں کہا کرتی تھیں نا جب غصّہ کا اظہار کرتی ہوئی تم تو بالکل مادھوری کی سی دکھائی دیتی ہو۔ لیکن میں نے آج تک توجہ سے نہ دیکھا تھا۔ واللہ یہ آئینہ بھی بڑی انوکھی ایجاد ہے۔ اپنی تصویر کو جس پوز میں، جس پہلو میں چاہو دیکھ لو جس طرح بھی چاہے دیکھ لو...... ہاں تو میں اپنے چہرے پر مصنوعی غصّہ پیدا کر دوں گی۔ گو جی تو یہی چاہتا ہوگا کہ وہ یونہی چھیڑتی جائیں۔ ہاں جتنوں یونہی چھیڑتی رہیں کیسا لطف آئے گا ان کی اس چھیڑ چھاڑ میں۔ ایک خاص لذّت ...... چائے کے اختتام پر زینی مجھ سے گانے کے لئے اصرار کرے گی تو کیا گاؤں؟ ...... ہاں وہ فلمی گیت گاؤں گی۔ وہ گیت ——

ساجنا جمنا پیچھے کھیلوں۔ کھیلوں اکیلی کیسے؟

اور جب میں یہ گیت گا رہی ہوں گی تو زینی ایسی معنی خیز۔ ایسی شرارت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی ہو گی...... اور پھر وہ برس ہی تو پڑے گی۔ ساتھ ہی گدگداتی ہوئی "اکیلی، اکیلی؟ ہم اتنی سکھیاں جو ہیں۔ ہونہہ! اب ہماری حقیقت ہی کیا ہے۔ اسے تو اپنا ساجن چاہیئے۔ اپنا —— نہ ہو تو"...... اُف —— میں —— کے خیال ہی سے کیسے شرما جاتی ہوں۔ میں نے ذرا سی نظریں اٹھا کر آئینہ میں پھر دیکھا۔ یہ تصویر تو سب سے دلکش تھی میں —— کے سامنے شرماتی ہوئی بھی ایسی ہی نظر آؤں گی نا۔

"چھوٹی بی بی!" "کیا ہے خیرن بی؟" "ایک خبر سنانے آئی تھی۔" "خبر"! میں نے مڑ کر پوچھا "ہاں ہاں کہو نا کیا خبر"

"ارے آج تو تم بہت خوش نظر آ رہی ہو۔ بی بی! ہاں یاد آیا۔ بڑی بیگم کہہ رہی تھیں۔ تم کسی بڑے امتحان میں کامیاب ہو گئی ہو۔ ایسی خوشی کے وقت تمہیں بری خبریں سنا کر رنجیدہ کروں اچھی جیبی۔ توبہ توبہ" وہ جانے لگی۔

"ارے ٹھہرو خیرن بی! آخر کچھ معلوم بھی ہو"

"کچھ نہیں بی بی۔ وہ جو ہمارے محلے میں نانی بی رہتی تھیں نا۔ وہی جو بچپن میں تمہیں کھلایا کرتی تھیں...... ارے تو یہ میرے منہ سے نکل ہی گیا نا بابا! بھی بھی خوشی کے وقت یہ خبر کیسے سناؤں"

"میری خوشی جائے بھاڑ میں۔ آخر کہتی کیوں نہیں ہو۔ اور یہ نانی بی کی بات ہے تو میں سنوں گی ہی۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے"

"اوئی میرے اللہ میں نے کیا کیا! بڑی بیگم مجھ پر خفا ہو جائیں تو؟ جس وقت تم چھوٹی تھیں۔ انہوں نے تاکید کی تھی کہ نانی بی، کا نام تمہارے سامنے نہ لیا کروں"

"امی تمہیں کچھ نہ کہیں گی۔ اس کا ذمہ میں لیتی ہوں"

"کل رات نانی بی جاتی رہیں۔ بیٹی ہم سب محلہ کی عورتیں ان کے پاس جمع تھیں" خیرن بی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "مرتے وقت تمہارا ہی نام زبان پر تھا"

گویا تصویروں کے سٹ کو مکمل کرنے میں ایک اور جذبہ کی کمی تھی —— اداسی کی جھلک —— اور میں بال گوندھتی ہوئی آئینہ کے سامنے سے چلی آئی۔

"نانی بی —— میری بوڑھی انّا وہی جس نے اتنے سال مجھے اپنی گود میں کھلایا تھا۔ اب اس دنیا میں نہیں ہے؟ کاش میں اپنی انّا کو مرنے

سے پہلے ایک بار دیکھ لینی میں کیا کچھ نہ دے دوں گی۔ پھر اپنی امّاں سے صرف ایک بار ملنے کے لئے! میری امّاں کیا تم میرے سہانے بچپن کی ان تمام یادوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئی ہو؟ ان ننھی ننھی دلچسپیوں کی یاد کو، ان خیالات کو جو تمہارے بڑھاپے اور میرے بچپن کے جوڑ سے پیدا ہو گئے تھے؟ آخر تم نے اس دنیا کو چھوڑا کیسے؟ تم جو اس دنیا کو اتنا عزیز رکھتی تھیں گو اس دنیا میں تمہارے لئے کوئی خوشی نہ تھی۔ ہاں میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ تاہم تمہیں زندگی سے محبت تھی۔ تم زندہ رہنا چاہتی تھیں۔ ایک بے بسی۔ ایک مایوسی کے ساتھ اس دنیا سے۔ چمٹی ہوئی تھیں۔ غم کے مارے بھی اس مصیبت بھری دنیا سے کیسے چمٹے رہتے ہیں! ...... اور تم تو، نانی بی! چھوٹی چھوٹی مصیبتوں کو بھی سہہ نہ سکتی تھیں۔ ستائی ہوئی تصویر کرتی تھیں۔ میں نے تمہیں کبھی ہنستے نہ دیکھا تھا۔ تمہارے لئے اس دکھ بھری دنیا میں اگر ذرا سی خوشی اور دلچسپی کا کوئی ذریعہ تھا تو وہ میں ہی تھی۔ تم مجھے گود میں لے کر سب کچھ بھول جاتی تھیں .... ہاں میری امّاں تم مصیبت زدہ تھیں۔ مگر دنیا کو تم سے ہمدردی نہ تھی۔ امّی۔ ابّا کو بھی نہیں۔ گو ان کے گھر میں تم اتنا کام کیا کرتی تھیں۔ آخر کیوں؟ اگر تمہارے چہرہ پر تمہارے دلی دکھ کا ذرا بھی اظہار ہوتا تو شاید لوگوں کو تم سے کچھ ہمدردی ہوتی۔ مگر تم یوں دکھائی دیتی تھیں۔ گویا تم میں جذبات ہی نہیں۔ ایک پتھر کی مورت سی ..... اور میری غریب امّاں! تمہارے چہرہ میں کچھ ایسی چیز بھی نہ تھی جو ذرا سی بھی کشش رکھتی جو لوگوں کے دلوں میں رحم کے جذبہ کو ابھار سکتی۔ سیاہ رنگ، ڈھلکے ہوئے گال، روکھے سفید بال، پوپلا منہ، لٹکتے ہوئے ہونٹ، بے نور، اندر کو دھنسی ہوئی، چھوٹی چھوٹی منکوں کی سی آنکھیں —— انسانی زندگی کی بوسیدگی کی مکمل تصویر تمہاری یہ ہیئت اور اس پر ظاہری بے حسی دلوں میں رحم کی بجائے ایک ہلکی سی نفرت ایک خوف سا پیدا کر دیتی تھی۔ گویا تم پرانے قصّوں کی کوئی جادوگرنی ہو۔ اور امّی تو تمہیں جادوگرنی ہی سمجھتی تھیں۔ جب کبھی وہ تمہیں ڈانٹ بتاتیں تو تم کچھ جواب دینے کی بجائے خاموش نگاہوں سے گھورنے لگتیں۔ شاید تمہارے یوں دیکھنے سے تمہارا مطلب رحم ہوتا۔ مگر تمہاری چیکی سی بے نور آنکھیں اس کو ظاہر نہ کر سکتی تھیں۔ اور امّی کسی خوف سے سہم جاتیں۔ گویا تم ان پر آنکھوں کے ذریعہ جادو اتار رہی ہو۔ ابّا بھی تم سے دور دور رہتے تھے۔ جب کبھی انہیں تم سے بات کرنے کی ضرورت ہوتی تو دوسری طرف منہ پھیر کر نہایت بے پروائی سے جواب دیتے ...... وہی خوف ملی ہوئی نفرت کا جذبہ ...... گھر میں کوئی بھی تمہیں چاہتا نہ تھا۔ مگر میری بوڑھی بے بس امّاں، میں تمہیں چاہتی تھی، ننھے دل سے۔ اس محبت نے مجھے ایک چھوٹی خلاسفر بنا دیا تھا۔ کیوں کہ میں ہی تمہیں سمجھ سکتی تھی۔ ابّا کا علم، ان کی عمر، امّی کا تجربہ تمہیں سمجھنے میں مدد نہ دے سکے تھے۔ میں گو ننھی سی تھی۔ تمہیں اچھی طرح سمجھتی تھی۔ کیوں کہ مجھے تم سے محبت تھی۔ ہمدردی تھی۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ تم میں کوئی جادو کی طاقت نہیں تھی۔ تم بے بس تھیں، کمزور تھیں۔

دس بارہ سال پہلے کی زندگی میری آنکھوں میں پھرنے لگی۔ بہت سی تصویریں میرے دماغ کے پردہ پر ابھرنے لگیں۔ اس وقت کی تصویریں جب میں ننھی سی تھی، ہر وقت نانی بی کے دامن سے چمٹی پھرتی تھی۔ نانی بی رسوئی میں کھانا پکا رہی ہوتیں (وہ مجھے کھلانے کے علاوہ گھر کا سب کام بھی کر دیتی تھیں) میں بھی دوڑی ہوئی وہاں جا پہنچتی۔ امّی روکنے کی کتنی ہی کوشش کرتیں طرح طرح کے کھلونے میرے سامنے لا رکھتیں۔ مٹھائیاں منگواتیں مگر میں مچلنے لگتی۔

"اوں! یہ مٹھائیاں نہیں کھاؤں گی۔ مجھے تو گھر کی مٹھائی پسند ہے۔ نانی بی دیں گی۔" امّی بڑبڑانے لگتیں یہ کمبخت بازار کی سستی مٹھائیاں بچی کی صحت خراب کرتی ہے۔" میں پھر بھی اپنی ہٹ سے باز نہ آتی تو ڑکے کو دوڑا کر وہی سستی مٹھائی منگا دیتیں مٹھائی ملتے ہی میں وہاں سے بھاگ نکلتی۔ "میں تو نانی بی کے ہاتھ سے مٹھائی کھاؤں گی۔" امّی جھلا اٹھتیں۔ "اری پرویں! کہاں بھاگ چلی۔ خدایا اس بوڑھی نے تو میری بچی پر جادو کر دیا ہے۔" ہاں امّی نانی بی نے سچ مچ مجھ پر جادو کر دیا تھا۔ محبت کا جادو، وہ مجھ سے کتنا پیار کرتی تھیں، میری ننھی پرین، ارے کیا نام ہے تمہارا۔ ہونہہ بابا کیسے کیسے نام نکل گئے ہیں اس زمانے میں۔ ہم پرانے زمانے کی بوڑھیاں کیسے بول سکیں۔ یہ جمانا ہی نیا میرا نام بھی بچوں نے کچھ ایسا ہی

دکھا ہے۔ بھاء را۔ جہرہ۔ مجھے کھود بولنے نہیں آتا۔ میں تمہیں شہزادی پکارا کروں گی۔ چھوٹی شہزادی ہاں تم ایک شہزادی کی طرح کھبصورت ہو۔ ہوں۔ تو میری چھوٹی شہزادی کو کیا چاہیئے" یہ مٹھائی تم اپنے ہاتھ سے کھلا دو نانی بی" میں اپنی مٹھی کھول کر ننھی سی ہتھیلی پسار دیتی نانی بی ذرا ذرا سی مٹھائی توڑ کر مجھے کھلانے لگتیں۔ اور یہ معمولی مٹھائی اس سوکھے ہاتھ سے کھاتے ہوئے مجھے ایسا مزہ آتا کہ امی کے پاس بیٹھ کر خوبصورت ننھی طشتریوں میں سجے ہوئے گلاب جامن برفی۔ لڈو پیڑے اور حلوہ سوہن کھاتے ہوئے کبھی نہ آتا تھا۔

میں نے ایک دن امی سے نانی بی کا نام پوچھا "نانی بی، اور کیا" انہوں نے بے پروائی سے جواب دیا "نہیں امی کچھ ایسا نام ہمارا" زہرہ" اور مجھے بڑا ہی تعجب ہوا۔ زہرہ! نانی بی کا نام زہرہ "ایسا پیارا نام ایک چھوٹی سی خوبصورت لڑکی کے نام کا سا! اور امی مجھے پروین کہہ کر بلاتیں تو مجھے خاک اچھا نہ لگتا۔ اوں —— امی مجھے شہزادی کہو۔ پروین نہیں" امی سر پیٹ لیتیں "اے کیا ہو گیا میری بچی کو؟ میرے اللہ اس بڑھی نے کچھ کھلا نہ دیا ہو" آخر امی کو نانی بی سے اتنی چڑ کیوں تھی؟ شاید اس نفرت کا سبب حسد بھی تھا۔ ان کی اپنی بچی انہیں چھوڑ کر کسی اور سے ایسی چمٹ جائے انہیں کیسا برا معلوم ہوتا ہو گا۔ پھر جب نسیم اور نسرین پیدا ہوئے تو امی نے یوں انتقام لینا شروع کیا۔ کہ ساری توجہ ان دونوں پر صرف کر دیتیں۔ ہر بات میں ان کی طرفداری کرتیں اور مجھے جھڑکتی رہتیں۔ جب کبھی امی مجھے جھڑک دیتیں تو میرے ننھے دل میں بہت دکھ بھر آتا اور میں نانی بی کے سینے سے چمٹ کر زور زور سے سسکیاں لینے لگتی "نانی بی میں تم ۔۔۔۔ تمہاری بیٹی ہوں۔ امی کی نہیں" "رونہ میری ننھی! میری شہزادی کو کس نے رلایا"۔ وہ اپنے لٹکے ہوئے نچلے ہونٹ کو اور سامنے لا کر میری تھوڑی پکڑ کر رونے لگتیں "میری بچی! نہ جانے بیگم کا دل اتنی پیاری بچی کو جھڑکنے کو کیسے چاہتا ہو گا۔ وہ ان دو چھوٹے بچوں پر ہی کیوں جان چھڑکتی ہیں؟ وہ میری شہزادی کے سے کھوبصورت بھی تو نہیں"

آخر امی یہ کب تک سہہ سکتی تھیں وہ صرف انتقام کے لئے مجھ سے بے توجہی برتا کرتیں۔ دل میں تو مجھی کو سب سے زیادہ پیار کرتی تھیں۔ مجھے یوں الگ ہوتی دیکھ کر کئی بار انہوں نے نانی بی کو ہمارے گھر کا کام چھوڑ دینے پر مجبور کرنا چاہا مگر یہ خیال کر کے کہ مجھے بہت ہی دکھ پہنچے گا۔ اور نانی بی اس سلیقے سے سب کام سنبھال لیتی تھیں کہ ان کے کام میں کوئی نقص نکالنا مشکل تھا۔ نئے نوکروں سے ایسے سلیقہ کی امید نہ تھی۔ پھر نانی بی کے جادو کا ڈر! امی چپ ہو رہتیں۔ مگر، آخر یہ ہو کر ہی رہا۔ ایک دن نسرین نے میری سب سے پیاری گڑیا توڑ ڈالی۔ اس پر میں نے اسے نوچا۔ وہ تھی ہی امی کی لاڈلی۔ منہ بسورتے ہوئے امی کے پاس دوڑی "ارے کیا ہوا میری بچی کو؟" —— ہونہہ ان کی بچی کو مجھ نے کاٹ کھایا تھا۔ امی کا یہ کہنا تھا کہ نسرین نے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا "آپا پروین نے میرا منہ۔ نوچ لیا۔ خون۔ نکل۔ آیا ہے۔ اوں۔ اوں۔ اوں" اُف ری مکاری گویا سچ مچ خون نکل آیا تھا۔ بس کیا تھا۔ امی نے مجھے گھسیٹ کر طمانچے پر طمانچے لگانے شروع کئے۔ میں نے سسکتے ہوئے کہا: "نہیں امی نسرین نے میری گڑیا توڑ دی ہے" میں نے خیال کیا کہ یہ کہہ کر بچ جاؤں گی۔ مگر امی کہیں سننے والی تھیں۔ میں نانی بی کی بیٹی جو ہوئی "اونہہ! گڑیا توڑ ڈالی تو دوسری منگوا دیں گے۔ گویا تیری موئی گڑیا میری بچی سے زیادہ ہے دیکھ تو میری بچی رو رو کر ہلکان ہوئے جا رہی ہے" اور ساتھ ہی ایک ایسا چانٹا رسید کیا کہ میں مارے درد کے بے حس ہو گئی۔ نانی بی میرے رونے کی آواز سن کر باورچی خانہ سے بھاگی بھاگی آئی تھیں۔ یہ دیکھتے ہی مجھے امی سے چھین لینا چاہا: "بیگم آخر کیوں بچی کو مارے دیتی ہو۔ کیا کھسر کیا تھا اس ننھی نے ننھی سی جان، ناجوں کی پلی، اتنی مار سہہ سکے گی"۔ امی کی آنکھوں سے گویا آگ برس رہی تھی۔ میں اپنی سسکیوں کو روکے سہمی سہمی کھڑی تھی "دور ہو جاؤ" امی نے مجھے کھینچ کر نانی بی سے الگ کرتے ہوئے گرج کر کہا "تم کون ہوتی ہو مجھے روکنے والی! کیا حق ہے تمہارا اس بچی پر۔ میں اس کی ماں ہوں جو چاہے کر سکتی ہوں"

"نہیں بی بی، سوچو تو ننھی سی جان ..... گستہ اترنے پر تمہیں خود رنج ہو گا"

"چلی جاؤ، میں ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتی۔ دور ہو جاؤ، میری نظروں کے سامنے سے" امی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ میں دوڑ کر نانی بی سے چمٹ گئی۔ پھر کیا تھا۔ امی آگ بگولہ ہو گئیں۔ مجھے بے تحاشا تڑ تڑ مارنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ خود مارتی مارتی تھک گئیں "اچھا ہے جاؤ، اس ڈائن کو

ابھی لے جاؤ میرے سامنے سے۔ یہ میری بچی نہیں۔" امّی نے ایک زور کا چانٹا رسید کر کے مجھے دھکیل دیا۔ نانی بی کی شکنوں کی سی آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔ "میرے اللہ! خدا جانے کیوں کچھ روز سے بیگم کا دل اس بچی سے پھر گیا ہے۔" نانی بی اپنے میلے آنچل سے آنسو خشک کرتی ہوئی مجھے گود میں لے کر چلی آئیں۔ روتے روتے میری ہچکی بندھ گئی تھی۔ کچھ دیر تک تو یہ حالت رہی گویا مجھے آس پاس کی چیزوں کا احساس ہی نہیں۔ اتنے میں نسرین میرے سامنے آ کھڑی ہوئی اس کے ایک ہاتھ میں میری ٹوٹی ہوئی گڑیا تھی اور دوسرے میں چاکلیٹ کا ڈبہ۔ وہ میری طرف شریر نظروں سے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ پھر اس نے وہ گڑیا زور سے صحن میں پھینک دی۔ میرا منہ چڑا چڑا کر بہت سے چاکلیٹ منہ میں بھر لئے اور "نوکرانی کی بیٹی" کہہ کر قہقہہ لگاتی ہوئی زور سے بھاگی۔ یہ میری برداشت سے باہر تھا۔ میری ہی گڑیا توڑے۔ میں خود ہی خوب پٹوں اور پھر نسرین میری ہنسی اڑائے، میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی "نانی بی میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ مجھے اپنے گھر لے چلو۔ تمہارا گھر کہاں ہے، نانی بی! میں امّی کے پاس جانے کے لئے کبھی ضد نہ کروں گی۔ تمہاری بیٹی بن کر رہوں گی۔"

"میری بھولی بچی! میرا گھر کہاں؟ گھر ہوتا تو یہاں تمہارے گھر میں رات دن کیوں پڑی رہتی؟" پھر نانی بی نے مجھے منانے کی بہت کوشش کی۔ مٹھائی لے آئیں ہنسانے والی کہانیاں سنائیں مگر اس دن مجھے اتنا دکھ پہنچا کہ کوئی چیز میرے آنسو کو تھما نہ سکتی تھی۔ میں دن بھر روتی رہی اور رات کو یونہی روتی روتی باورچی خانہ میں ہی نانی بی کے پہلو میں سو گئی۔ دوسری صبح امّی کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ امّی دروازے کے کواڑ سے لگی کھڑی تھیں۔ ان کا منہ سوجا ہوا تھا۔ اور آنکھیں سرخ تھیں۔ شاید وہ بھی روتی تھیں۔ وہ کچھ کہے بغیر نانی بی کی طرف گھور کر دیکھ رہی تھیں دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش گویا ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس ہی نہیں مگر جونہی امّی نے یہ دیکھ لیا کہ میں جاگ رہی ہوں یکلخت منظر ہی بدل گیا۔ میں سہمی ہوئی نظروں سے امّی کو تک رہی تھی۔ امّی نے لپک کر مجھے گود میں اٹھا لیا اور چومنے لگیں۔ "میری بچی! مجھ سے ڈرتی ہے کیوں ڈرتی ہو ننھی۔ میں تمہاری ماں نہیں ہوں؟ زہرہ بی! (امّی نے پہلی دفعہ نانی بی کو نام سے پکارا تھا ورنہ ہمیشہ نانی بی ہی کہا کرتیں) تم نے میری بچی کو ڈس لیا ہے۔ تم ناگن ہو! تم کون ہوتی ہو میری بچی کو مجھ سے چھیننے والی؟ تم نے میرے اپنے خون کو چھینا ہے۔ میرے جگر کے ٹکڑے کو چھینا ہے۔ تم ڈائن ہو۔ کہتی ہو میرا دل بچی سے پھر گیا ہے۔ اس کی ذمہ دار تم ہو۔ تمہاری طرف سے میں نے اپنی ننھی کو اتنا ستایا۔ میں حسد کی آگ میں بھن رہی تھی۔ سن رہی ہو اپنے ظلم کی داستان؟"

"بی بی، میں کیا کروں بچی کا دل مجھ سے لگ گیا ہے۔"

"بچی کا دل لگ گیا ہے! شرم نہیں آتی بوڑھے منہ سے جھوٹ بولتے۔ تمہیں اپنے سفید چونڈے کی لاج نہیں؟ خدا کی قسم تم نے بچی کو کچھ کھلا دیا ہے ورنہ وہ ایسی کہ یہ صورت بوڑھی سے مانوس ہو جاتی (میں دل ہی دل میں ملامت کر رہی تھی وہ غصہ میں کیسی کیسی باتیں کہے جا رہی تھیں) میں نے کلیجہ پر پتھر رکھ کر بہت دن تک یہ سہا ہے۔ اب میں ایک لمحہ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ ہونہہ! برداشت میں ایک موٹی نوکرانی کی خاطر یہ رنج سہوں؟ ہونہہ! میں بھی کتنی دیوانی ہوں! ادنیٰ نوکرانی سے دبوں؟" امّی جذبات کی شدت سے کانپ رہی تھیں "سنتی ہو، کان کھول کر سن لو۔ تم اب ایک لمحہ بھی اب اس گھر میں نہیں رہ سکتیں۔ چلی جاؤ اسی وقت۔ تمہاری یہ منحوس صورت ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ اٹھو، بوریا بستر باندھ لو...... بیٹھی کیا تک رہی ہو۔ مجھے پھٹے پھٹے دیدوں سے؟ کیا مجھ پر بھی جادو کرنے کا ارادہ ہے؟"

"بیگم میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں مجھے کبھی کبھی بچی کو آ کر دیکھنے کی اجازت دو۔ اس دکھ بھری دنیا میں یہ ننھی سی جان ہی میرے دل بہلانے کا جریعہ (ذریعہ) ہے بی بی۔ اس کو بھی نہ چھین لو۔ خدا واسطے اتنا جُلم (ظلم) نہ کرو۔ اللہ میاں تمہیں برکت دے۔ میں نے بہت دنوں تمہارا نمک کھایا ہے۔"

"بچی کو دیکھنے؟ بچی کو دیکھتے۔ اب تمہارا سایہ بھی اس پر پڑنے نہ دوں گی۔ اگر پھر کبھی تم نے اس گھر میں قدم رکھا۔ اپنی منحوس صورت

دکھائی! ..... میری بچی کو مجھ سے چھینئے ... میری ننھی، میں تمہاری ماں نہیں "۔ امی نے مجھے بھینچ لیا۔ اور رونے لگیں۔ اور میں حیرت سے کبھی ادھر دیکھ رہی تھی کبھی ادھر۔ ان دونوں عورتوں میں کتنا فرق تھا! ایک جذبات مجسم دوسری گویا پتھر کی مورت۔ امی کی خوبصورت آنکھیں سوجی ہوئی اور سرخ تھیں۔ ان کی لانبی گھنی پلکوں پر آنسو تھرتھرا رہے تھے۔ چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ پھول کی سی تراش کے ہونٹوں کے کونے کانپ رہے تھے۔ مرمریں گردن اور سینہ میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ غم اور حسن کا امتزاج۔

ادھر نانی بی بیٹھی بیٹھی آنکھوں سے امی کو تک رہی تھیں۔ خاموش نگاہوں سے۔ اگر ان پھیکی بے نور آنکھوں میں جذبات کے اظہار کی قوت ہوتی تو ان نگاہوں میں یاس اور رنج کی ایک دنیا ہوتی مگر بظاہر وہ جذبات سے عاری معلوم ہوتی تھیں۔ پتھرائی ہوئی، وہ بے حس بیٹھی ہوئی تھیں۔ جیسے سکتے کا عالم۔ گو میرا ننھا دل انصاف کرنا چاہتا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو ضرور امی کی طرفداری کرتا۔ آخر "غمگین حسن" اپنے اندر بہت اثر رکھتا ہے نا۔ مگر مجھ پر نہ تو اس حسن کا کوئی اثر تھا، نہ نانی بی کے پچکے ہوئے گالوں اور پوپلے منہ سے نفرت تھی۔ ہاں مجھے امی پر ترس آ رہا تھا، مگر اس دل کا کیا حال ہوگا جس سے ایک عزیز چیز چھین لی گئی ہو۔ امی کے پاس دولت تھی، عزت تھی، ہر طرح کا آرام تھا۔ چاند سے بچے تھے۔ اس قسمت کی ستائی ہوئی بڑھیا کے پاس کیا رکھا تھا۔ رہنے کے لئے ٹھکانہ بھی تو نہیں۔ ہاں امی کے چہرے سے بہت رنج ظاہر ہو رہا تھا۔ مگر میں اچھی طرح جانتی تھی۔ ان سادہ نگاہوں میں کتنی یاس چھپی ہوئی تھی۔ اور اس سوکھے سینے کے اندر رکا ہوا سیلاب تھا۔ کتنی دبی ہوئی ہلچل تھی۔ کیسا طوفان تھا۔

نسیمہ کے رونے کی آواز آئی اور امی مجھے گود سے اتار کر آنسو پونچھتی ہوئی اندر چلی گئیں۔ نانی بی خاموشی سے اپنا بستر اور کپڑے باندھ رہی تھیں۔ امی کے جاتے ہی میں دوڑی ہوئی ان کی گود میں جا بیٹھی۔ "نانی بی! مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی نانی بی؟" میں نے سسکتے ہوئے کہا۔ نانی بی نے بڑھ کے گلے لگا لیا۔ پھر کیا تھا۔ جیسے بند ٹوٹ گیا ہو۔ رکا ہوا سیلاب اُمڈ آیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ نانی بی کا دل پگھل کر آنکھوں کے ذریعہ بہہ رہا ہے۔ "میری بچی، میری ننھی شہزادی تمہیں چھوڑ کے کیسے جاؤں۔" "اچھی نانی بی اقرار کرو، تم مجھے دیکھنے کبھی کبھی آیا کرو گی نا؟" "نہیں بیٹی اب اس گھر میں قدم نہ رکھوں گی۔" "کیوں نانی بی! مجھ سے روٹھ تو نہیں گئیں" "میں تمہارے لئے سب کچھ کروں گی۔ تم جو کچھ کہو وہ سنوں گی۔" "نہ روٹھو نانی بی! آتی رہو مجھے دیکھنے۔"

"اچھا میں جو کچھ کہوں وہ سنو گی؟" "ضرور۔" "مجھے وہ آئینہ کا ٹکڑا دے دو نا بیٹی" نانی بی نے مجھے پیار کرتے ہوئے کہا۔ میں بھاگی بھاگی اپنے کمرے میں گئی اپنے چھوٹے ٹرنک میں سے ریشمی بٹوہ نکالا۔ اس بٹوے میں میں نے قارون کا خزانہ جمع کر رکھا تھا۔ بہت سی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں، رنگین منکے، سوتی کانچ کے ٹکڑے۔ گڑیوں کے ننھے زیور، نئے ڈھالے ہوئے تانبے کے پیسے، جسے میں "ساورن" کہا کرتی تھی۔ سفید چمکتی ہوئی چوبیاں، دونیاں .... اسی میں میں نے نانی بی کا آئینہ رکھا تھا۔ آئینہ کے ٹکڑے پر گرد کی تہ جمی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ چکنائی کے دھبے بھی تھے۔ پھر بھی کیسا پیارا لگتا تھا وہ آئینہ۔ کیسے خوبصورت کنارے ان پر رنگین شیشوں سے تراشے ہوئے خوبصورت پھول تھے۔ سنہری، عنابی، فیروزی، آسمانی۔ اس دن جب میں نے نانی بی سے یہ آئینہ مانگا تھا تو انہوں نے پیار سے چمکار کر کہا "میری اچھی بیٹی تمہیں مٹھائی لا دوں گی۔ یہ نہ لو" میں کوئی چیز مانگوں اور نانی بی نہ دیں۔ وہ کبھی نانہ کرتی تھیں۔ ہو نہ ہو اس میں کچھ ہوگا ہی اور میں آئینہ لینے پر مصر ہو گئی۔ "ہونہہ میں تو یہ آئینہ ہی لوں گی۔" بچپن کی ضد۔ میں نے ہٹ کر کے، رو رو کے آخر آئینہ چھین ہی لیا۔ آئینہ دیتے ہوئے نانی بی کی آنکھوں میں آنسو نکل آئے تھے۔ مگر میں تو چھوٹی تھی۔ ان آنسوؤں کے معنی کیسے جان سکتی؟ پھر وہ آئینہ میرے پاس رہا۔

کئی بار نانی بی نے ترستی ہوئی التجا بھری آواز میں مجھ سے وہ آئینہ واپس مانگا تھا۔ مگر میں ہر دفعہ رونے لگتی "میں ہوں! وہ غلیظ آئینہ کا ٹکڑا مجھ سے پیارا ہے؟" نانی بی ناچار چپ ہو جاتیں۔ مگر آج جب کہ وہ مجھ سے جدا ہو رہی تھیں، مجھے چھوڑ کر چلی جا رہی تھیں، میں وہ آئینہ تو کیا سب کچھ دینے کو تیار تھی۔ میں بٹوہ لئے نانی بی کے پاس واپس آئی اور سب خزانہ ان کے سامنے انڈیل دیا۔ میں اپنے دل میں ایک عجیب طرح کی مسرت محسوس کر رہی تھی گویا میں اپنی پیاری چیزیں دے کر بہت بڑا ایثار کر رہی ہوں۔

"یہ سب کچھ لے لو نانی بی۔ مگر ضرور آتی رہنا۔ نہیں تو میں خوب روؤں گی۔" "اچھا بیٹی اللہ نے مجھے جیتا رکھا تو جب تم اپنا گھر بساؤ گی وہیں آ کر جاؤں

دل سے تمہاری خدمت کروں گی. مرتے دم تک وہیں پڑی رہوں گی۔ پھر مجھ پہ دو مٹھی خاک ڈال دینا بیٹی" نانی بی نے ایک سرد آہ بھر کر اپنی چادر اوڑھ لی اور اپنے سامنے پھیلی ہوئی چیزوں سے صرف آئینہ اٹھا لیا۔ اسے آنکھوں سے لگا لیا اور اپنے میلے رومال میں لپیٹ کر کرتے میں چھپا لیا۔ پھر مجھے گود میں لے کر میری پیشانی پر بوسہ دیا۔ گلے سے لگایا۔ پیار کیا۔ اور مجھے آہستہ سے اتار کر اٹھ کھڑی ہوئیں کپڑوں کی گٹھڑی بغل میں دبائی اور سر جھکائے خاموشی سے چلی گئیں۔ اب میں وہ نہیں رہی تھی۔ کیوں کہ مجھے یقین تھا کہ نانی بی پھر آئیں گی۔ جب تم اپنا گھر بساؤ گی کی شرط کو تو میں سمجھ نہ سکی تھی! میں اپنے بکھرے ہوئے خزانہ کو سمیٹ کر بڑے میں رکھنے لگی کیسی پیاری چیزیں تھیں. نانی بی نے ان سب کو چھوڑ کر اس گرد آلود ٹوٹے پھوٹے آئینہ کو ہی کیوں اٹھا لیا تھا؟ اس وقت میں اس گتھی کو سلجھا نہ سکی۔ اس آئینہ کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے چند سال اور گذرنے تھے۔ اس کے بعد میں اس آئینہ کی یاد کے بغیر نانی بی کا تصور کر ہی نہ سکتی۔ اب اس وقت کی تمام یادوں میں جب نانی بی کا اور میرا ساتھ تھا اس آئینہ والے واقعہ کا نقش ہی سب سے گہرا ہے ہاں وہ نقش جو کبھی تحت الشعور میں چھپا پڑا تھا۔ اب کتنا صاف ہے! نانی بی کا ایک ایک لفظ ان کی ایک ایک حرکت، اس دن کی جب انہیں آئینہ ملا تھا۔ ان کی وہ آئینہ لینے کے لئے التجائیں وہ آخری بین جب انہوں نے آئینہ کو آنکھوں سے لگا کر سینہ میں چھپا لیا تھا۔ دل کے پاس۔ یہ تصویریں بارہا ابھرتی ہیں۔ یہ یادیں بارہا میرے دماغ میں گھومنے لگتی ہیں۔ اور میں سوچتی ہوں۔ بظاہر اس بے حس مجسمہ میں ایسے جذبات بھی تھے! اس بجھے ہوئے دل کی راکھ میں اتنی چنگاریاں دبی ہوئی تھیں۔ اس سوکھے سینے میں اتنی آگ سلگ رہی تھی۔ ایسی یاد چٹکیاں لے رہی تھی یہ آئینہ انہیں راستہ میں پڑا ہوا ملا تھا۔ جب ہم ہوا خوری کے لئے جا رہے تھے ہر شام مجھے نانی بی ہوا خوری کے لئے باہر لے جایا کرتی تھیں۔ ہم گھر سے دور نکل جاتے ایک کھلے میدان کی طرف جہاں بہت سی خود رو گھاس بے ترتیبی سے اگی ہوئی تھی۔ اور دور دور پر کہیں کہیں گھنے درخت تھے۔ شام ہوتے ہی میٹھی بولی بولتی ہوئی چڑیاں ان درختوں پر آ بیٹھتیں۔ ان کے چہچہوں سے ساری فضا شیریں نغموں سے معمور ہو جاتی مجھے یہ جگہ بہت پسند تھی اور میں ہر روز نانی بی کی چادر کھینچتی ہوئی انہیں اس طرف لے جاتی۔ راستہ میں ہمیں ایک چھوٹی سی دوکان ملتی تھی۔ جہاں صرف پان کی بیڑی بکتی تھی۔ نانی بی ہر روز وہاں جاتی تھیں۔ ایک پیسہ کے پان اور سپاری خرید لیتیں۔ وہیں سے ایک پان میں بہت سا چونا بھی مانگ لیتیں۔ دوکان کے سامنے کچھ تختے بچھے ہوئے تھے۔ نانی بی وہیں بیٹھ کر بڑے انہماک سے پان کی نسیں نکالنے لگتیں۔ بڈھا دوکاندار اندر جا کر "پان کوٹنی" لے آتا۔ اور نانی بی کے سامنے رکھ دیتا اتنے میں دو چار پوپلے منہ والی بڑھیاں اور آ جاتیں۔ سب کی سب پان خرید کر "پان کوٹنی" کا انتظار کرتی ہوئی نسیں نکالنے لگتیں۔ ایک بوڑھے میاں بھی چلم لئے آ بیٹھتے۔ اچھی خاصی محفل جم جاتی۔ مجھے اس بوڑھوں کی مجلس سے بڑی دلچسپی تھی۔ اپنی دونوں مٹھیوں میں نانی بی کی چادر تھامے ان سے لگ کر کھڑی ہو جاتی اور ان سب کی عجیب عجیب حرکتوں کو غور سے دیکھتی رہتی۔ بڑھیاں نسیں نکالتی ہوئی، پان کوٹتی ہوئی، اور بوڑھے میاں چلم بھر کر کش لگاتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ دیتے۔ کبھی اپنے بیٹا بیٹی۔ پوتے پوتوں کی، کبھی محلے والوں کی اور اکثر "ہمارے جمانے" اور "اب کے جمانے کی"۔ "اب کے جیور بھی کوئی جیور ہوئے! بابا! اب کی چھوکریوں کا دماغ تو آسمان پر پہنچ گیا ہے"۔ ایک بوڑھی منہ پر زور سے ہاتھ مار کر کہتی۔ "پرانے جیوروں کے نام ہی سے کان پکڑتے ہیں۔ موئے ہاتھوں میں دو دو چوڑیاں لگے ہیں باریک "سنگل" کانوں کی لو میں ایک باریک "کرن پھول" یا جو مراد ہے بھلا یہ بھی کوئی جیور ہوئے۔ ہمارے جمانے میں جو پہنتی تھیں کان بھر کر سونے کی پتیاں۔ ہاہا "نکشادوں" پر جھولتی ہوئی کیسی بھلی لگتی تھیں"۔

"اور یہ بھی دیکھا، ناک چھدوانا تو گویا عیب ہی ہو گیا۔ چھی چھی کیسی بری لگتی ہے ناک"۔ ایک بڑھیا، نتھنے چڑھا کر نفرت ظاہر کرتی۔

"نا نا یہ جمانے کی چھوکریاں بھی کیسے بال بناتی ہیں۔ تیل نام کو نہیں۔ روکھے بال سر سے دو انگل اوپر اٹھے ہوئے۔ موٹی موٹی لٹیں نکلی ہوئیں۔ سر کو اچھا خاصا کوڑے کا ڈھیر بنا لیتی ہیں۔ کمبختوں کی مار اوپر سے پسل پسل کر نہ پڑیں تو جب جانیں۔ کیا ہمارے بزرگوں نے جھوٹ کہا تھا "بیچ میں سیدھی مانگ نکالی تو پل بھر میں سیدھے پل صراط پر ہو گی"۔ اب تو اللہ ہی بچائے ان ٹیڑھی مانگ والوں کو۔ سیدھی مانگ نکالو چہرہ پر کیسا نور جھلکتا ہے۔ ٹیڑھی مانگ تو کیسی اچھی صورت بگاڑ دیتی ہے۔ اب اس لچی ہی کو دیکھو دیا۔ کیسا پھول سا مکھڑا، چاند سی پیشانی، سیدھی

مانگ نکالتی تو چہرہ پر کیسی رونق آ جاتی اب تو کرستان لگتی ہے کرستان" اور ایک بوڑھی بھویں چڑھا کر نفرت سے منہ پھیر لیتی۔

کوئی اور میرے ریشمی فراک کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگتی۔ "اماں اب کے کپڑے تو دیکھو کیسے کیسے فیشن"

"وہ بوا، وہ فیشن کی بھی تم نے ایک ہی کہی۔ ذرا دیکھو تو پنڈلیاں ننگی بازو ننگے، لعنت بھیج لعنت"

اور یہ رنگ تو دیکھو بوا، کیسا پھیکا پھیکا چھچھورا ہی کیا اب کے سب رنگ پھیکے۔ سچ پوچھو تو اجلے رنگ ہیں اور ان میں کوئی فرق ہی نہیں"

"اونہہ اجلا رنگ! اب کی چھوکریاں اجلے کپڑے پہننے کو عار نہیں سمجھتیں ابھی سے بوڑھیاں بنی پھرتی ہیں۔ بھلا ان نگوڑی چھوکریاں کو کہیں اجلا رنگ سجتا ہے"

"ان نگوڑی چھوکریاں کا۔ ارے بابا اب تو غضب ہو گیا غضب! سہاگنیں تک اجلے کپڑے بے دھڑک پہن لیتی ہیں، غضب ہو گیا غضب۔ توبہ توبہ کچھ سہاگ کا پاس بھی ہے انہیں"

کبھی شادی بیاہ کی باتیں ہونے لگتیں......

"ہمارے زمانے کی شادیاں، شادیاں تھیں کئی ہفتے لگتے تھے، کیسی کیسی رسمیں اب دیکھو جھٹ منگنی پٹ بیاہ، اور بیاہ بھی کیسا بیاہ، ادھر نکاح پڑھا گیا ادھر دلہن کی رخصتی ہو گئی۔ نہ کوئی رسم نہ ریت"

"اور اب کی دلہنیں تو خالہ! ہائے دی چھوریاں، توبہ توبہ آنکھ کا پانی مر گیا ہے کیسی ہنسی خوشی رخصت ہوتی ہیں۔ اپنے خصم کے گھر کو ہم تھے کہ تین تین روز تک آنکھ کا پانی نہ سوکھتا تھا۔ رو رو کر بے سدھ ہو جاتے تھے اللہ اللہ کیا زمانہ آیا؟"

"پرسوں میں ایک شادی میں گئی تھی۔ واہ اماں! کاہے کو بولوں اس دلہن کی بے شرمی" اور سب بوڑھیاں ٹھوڑیوں کو ہاتھ لگائے آنکھیں پھاڑے پھاڑے غور سے سننے لگتیں۔

"جب اس کی پھوپھیاں چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں تو ہنس رہی تھی بھری مجلس میں نوشہ کے گھر والے بھی پاس ہی بیٹھے تھے، توبہ توبہ ہم پر تو گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ماں بیچاری نے سر پیٹ لیا۔ کیا کرتی سمدھنوں کو منہ دکھانے سے رہی۔ جب رخصتی کا وقت آیا تو وہ تیار ہی بیٹھی تھی۔ اوئی، میرے اللہ ایک بوند بھی نہ تھی، اس چھوکری کی آنکھوں میں! نابابا ہم سے تو رہا نہ گیا۔ آخر بیٹی والوں کی لاج رکھنی تھی سمدھنوں کے سامنے۔ ہم دو چار بوڑھیوں نے مل کر کپڑے برابر کرنے کے بہانے سے اتنے دھوکے نوچا کہ اس کے چیخ نکل گئی۔ جب کہیں جا کر دو بوند پانی نکلا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ چھوکری ہم پر پلٹ نہ پڑی۔ ورنہ رہی سہی عزت بھی جاتی رہتی۔

"اچھا کیا بہت اچھا کیا۔ اس بے شرم کے ساتھ ویسا ہی کرنا چاہئے تھا" سب یک زبان ہو کر کہتیں۔ اور بوڑھے میاں بھی بڑے زور سے سر ہلا کر داد دیتے۔ یہ بوڑھے میاں سر کو ہاتھ لگائے ہمہ تن گوش ہو کر بوڑھیوں کی باتیں سنا کرتے۔ جب کبھی ان کے بات کرنے کی باری آتی تو پگڑی ذرا ہٹا کر (کیسی پگڑی ایک پٹکے سے رومال کو سر کے گرد لپیٹ لیا کرتے تھے) اپنے چمکتے ہوئے گنجے سر کو زور زور سے کھجلانے لگتے۔ اور بڑی ہی سوچ بچار کے بعد ایک جملہ نکالتے گویا انہیں کی رائے آخری اور فیصلہ کن ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں ہوتیں مگر یہاں بھی نانی بی خاموشی سے سب کی باتیں سنتیں "اب کے جانے" پرانے اعتراضات سن کر بھی کوئی رائے ظاہر نہ کرتی تھیں اور نہ ہی ان کے چہرہ سے کوئی جذبہ کا اظہار ہوتا۔ شاید ان باتوں سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا...... پھر جب یہ محفل برخاست ہو جاتی تو میں نانی بی کی چادر کھینچتی ہوئی انہیں اس میدان میں لے جاتی۔

یہاں ہم کسی گھنے درخت کے سائے میں بیٹھ جاتے۔ میں گرے ہوئے سرخ پھولوں سے کھیلنے لگتی۔ پھر انہیں سمیٹ کر اپنے دامن میں بھر لیتی اور نانی بی کی گود میں آ بیٹھتی۔

"ایک اچھی سی کہانی بولو نانی بی" "آج کرن سی کا فی کہانی، بولوں" اور ساتھ ہی اپنی نسوار کی ڈبیا نکال لیتیں۔ ایک چٹکی بھر کر نتھنوں میں چڑھا لیتیں پھر

ایک میلا سا رومال اپنی سوسی کے "بٹلے" کے نیفے سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر نکالتی ہوئی کہانی شروع کرتیں: "اچھا سنو ایک بادشاہ تھا۔ اس کی سات بیٹیاں تھیں" پھر ناس پونچھتی ہوئی آہستہ آہستہ کہتیں۔ "اس نے سب شہزادیوں کو باری باری اپنے دربار میں بلایا۔ پوچھا تمہیں کون پالتا ہے، سب بولیں "آپ" مگر چھوٹی شہزادی بولی" اور نانی بی اس میلے سے رومال کو پھر نیفے میں ٹھونس لیتیں۔ اس سے پونچھنے پر بھی کالی کالی دھول کی ایک تہ سی ان کے نتھنوں پر جمی رہتی۔ اتنی باتیں ایک ساتھ کہنے سے ان کے پوپلے منہ کے کناروں پر پان کی لال لال پیک بہہ آتی۔ اور وہ ایک طرف منہ پھیر کر پیک کو تھوکتی ہوئی اپنی کہانی کو جاری رکھتیں "چھوٹی شہزادی بولی "ہم سب کو اللہ میاں ہی پالتے ہیں بادشاہ حضور آپ کو بھی"۔ اس جواب کو سن کر بادشاہ.....

"کیسی چھوٹی شہزادی نانی بی؟" "مجھ جیسی؟" میں بیچ میں کہہ اٹھتی اور وہ لپک کر مجھے گود میں اٹھا لیتیں "ہاں بیٹی تمہاری جیسی شہزادی ایسی ہی خوبصورت شہزادی" میں خوشی سے پھول جاتی اور نانی بی کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگتی "ہنسی کیسا پیارا مکھڑا ہے تمہارا، ہا، چاند کا ٹکڑا" نانی بی میری بلائیں لینے لگتیں، "تٹ، تٹ، تٹ" "دیکھو تو سب انگلیاں ٹوٹیں۔ کتنا پیار ہے مجھے اپنی بچی سے" اور میں اپنی ننھی ننھی باہیں نانی بی کی گردن میں ڈال دیتی۔ اس وقت مجھے ان نتھنوں پر جمی راکھ دھول اور پوپلے منہ سے بہتی ہوئی پیک سے بھی نفرت محسوس نہ ہوتی۔

پھر نانی بی اپنی ہتھیلی پر ذرا سا چونا پھیلا کر پھونک پھونک کر خشک کر لیتیں اور اس میں تھوڑی سی نسوار انڈیل کر ملنے لگتیں۔ ساتھ ہی ساتھ آہستہ آہستہ کہانی بولتی جاتی تھیں۔ ناس گھس گھس کر چھوٹی چھوٹی گولیاں بناتیں۔ اور ایک پیاری بڑی سفید ڈبیا میں، بالکل میرے کریم کی ننھی سی ڈبیا کی سی، ڈالتی جاتی تھیں۔ یہ سب کرتی ہوئی وہ بڑی ہی دیسی کہانی سناتی تھیں۔ ایک ایک جملہ مزے لے لے کر۔ نانی بی کو کہانی سنانے میں بڑا ہی کمال حاصل تھا۔ بار بار کسی نہ کسی بہانہ سے ایسی جگہ ٹھہر جاتیں۔ جہاں میرا اشتیاق بڑھا ہوتا۔ پان کی پیک تھوکنے کے بہانے یا گولیاں بنانے میں بہت ہی منہمک ہو جاتیں اور میں سیلے تاب ہو جاتی۔

"اس کے بعد کیا ہوا نانی بی؟ جلدی جلدی کہو نا۔"

"نا بیٹی جلدی جلدی کہوں تو کھاک مزا آئے گا" اور یہ سچ تھا۔ ان کے یوں بیان کرنے میں کہانی کا دوگنا مزا آتا اور وہ واقعات کو ایسی تفصیل سے اتنی اچھی طرح بیان کرتیں کہ میں اپنے آپ کو اس ماحول میں تصور کرنے لگتی۔ مجھے نانی بی کی ہر کہانی کی شہزادی سے محبت ہو جاتی مگر نہ جانے کیوں ان کی ہر شہزادی پر کوئی نہ کوئی مصیبت آپڑتی۔ پھر کہیں سے ایک شہزادہ "آٹپکتا"۔ شکار کھیلتے ہوئے یا اور کچھ طریقے سے، اور اس شہزادی کو مصیبت سے نجات دلا کر اپنے محل لے جاتا۔ دونوں ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگتے۔ نانی بی کی ہر کہانی یوں ہی ختم ہوتی۔ یہ شہزادہ کتنا اچھا ہے۔ چھوٹی شہزادی کو بچانے والا۔ میں سوچا کرتی۔

"میں چھوٹی شہزادی ہوں، نانی بی! مجھے بھی ایک ایسا چھوٹا شہزادہ لے جائے گا" میں نہایت بھولے پن سے پوچھ بیٹھتی۔ اور نانی بی کی بے نور آنکھوں میں ایک لمحہ کے لیے چمک آ جاتی۔

"ہاں کیوں نہیں میری ننھی! جب تم بڑی ہو کر انگریزی پڑھو گی۔ خوب پڑھ کر بی۔ اے پاس ہو جاؤ گی تو...... اس پر تم ہو بھی خوبصورت تمہیں ضرور ایک بڑا آدمی بیاہ لے جائے گا۔ کوئی بہت بڑا افسر"

"ہوں، ہوں بڑا افسر نہیں چاہیے۔ چھوٹا شہزادہ" میں مچلنے لگتی

"ہاں ننھی، وہ شہزادہ ہی ہوگا۔ میری شہزادی وہ دن کب آئے گا۔ اللہ مجھے اس دن تک جیتا رکھے۔ تمہیں دلہن بنی دیکھ لوں۔ تو چین سے مر سکوں گی......" آہ نانی بی، شہزادہ تمہاری شہزادی کو لینے آ گیا ہے۔ مگر تم اس دنیا میں نہیں ہو۔ کاش تم چند ہی دن اور زندہ رہتیں وہ دن بھی دیکھ لیتیں جس کو دیکھنے کی تمہاری آخری آرزو تھی۔ کو دیکھ کر فرطِ خوشی سے پھولے نہ سماتیں۔ ان کے حسین چہرے کی کتنی ہی بلائیں لیتیں تم ضرور انہیں شہزادہ ہی سمجھتیں.......

ہاں تو یہ ہمارا معمول تھا۔ میں ہر روز نانی بی کے ساتھ اس میدان میں جاتی۔ کچھ دور پر ایک چھوٹا سا گدلے پانی کا تالاب تھا۔ کئی بار میں نانی بی سے کہنا چاہتی تھی کہ اس تالاب تک ہو آئیں۔ مگر نانی بی کے کہانی بولنے ہی میں اندھیرا ہو جاتا، اور ہم گھر لوٹ آتے۔ ایک دن جب نانی بی نے ابھی کہانی شروع نہیں کی تھی میں نے ایک آدمی کو بندریا ساتھ لئے آتے دیکھا۔ اس کے پیچھے بہت سے بچے شور مچاتے آ رہے تھے۔ تالاب کے پاس آ کر وہ بندر والا اکڑوں بیٹھ گیا اور اس نے تماشہ دکھانا شروع کیا۔ لڑکے اس کے گرد حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ چند لوگ بڑے مرد بھی جمع ہو گئے۔ "میں بندر کا تماشہ دیکھوں گی نانی بی تالاب کے پاس لے چلو۔" نانی بی میری ہر خواہش کو پورا کرتی تھیں۔ انہوں نے مجھے دور سے جا کر ایک اونچے ٹیلے پر کھڑا کیا۔ جہاں سے میں اچھی طرح دیکھ سکتی تھی۔ "یہاں نہیں اور بھی قریب سے چلو نانی بی۔" "نا بیٹی، یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ اتنے کیر مرد کھڑے ہیں اور پھر سامنے" اور نانی بی نے چادر کھینچ کر اپنے چہرے کو اور زیادہ ڈھانپ لیا۔ "اچھا تم نہیں آ ؤگی تو میں بھی یہیں رہوں گی۔" میں نانی کی چادر تھامے تماشہ دیکھنے لگی۔

"اچھا بیٹا اب اپنی ماں کے گھر کا کام کرو۔" بندر والے نے ڈگڈگی بجا کر حکم دیا۔

بندریا نے جلدی سے ایک چھڑی اٹھا لی اور اسے سر پہ رکھ کر اِدھر اُدھر پھرنے لگی۔ گویا بہت کام کر رہی ہے۔ "اچھا اب ساس کے گھر کا بھی کام کر دو بیٹا۔" بندریا نے زور سے چھڑی زمین پر پھینک دی اور منہ پھلائے ایک طرف جا کر بیٹھ رہی۔

"بندریا نے چھڑی کیوں پھینک دی نانی بی؟" کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے چادر کو ایک جھٹکا دے کر پھر وہی پوچھا۔ پھر بھی نانی بی نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو نانی بی ایک مٹی کے ڈھیر میں کرید کرید کر کوئی چیز نکال رہی تھیں۔

—————— انہوں نے میری بات سنی تھی۔ کچھ دیر بعد نانی بی نے وہ چیز نکال لی۔ ایک۔ آئینہ کا ٹکڑا ——— "کیسا آئینہ نانی بی مجھے بھی دکھاؤ نا۔" نانی بی نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بڑے غور سے آئینہ کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھیں۔ بہت دیر کے بعد انہوں نے دبی آواز میں کہا۔ "مجھ سے نہیں" پینہ آپ سے۔

"آہ! انہوں نے ایسا ہی آئینہ میرے لئے منگوایا تھا۔"

"ایسا آئینہ کس نے منگوایا تھا نانی بی؟" "وہی ہمارے گھر والے، ہمارے آدمی" "تمہارے گھر والے کون نانی بی" "وہی بزرگوں نے جن کے ساتھ میرا بیاہ کیا تھا۔" "تو تمہارا بیاہ ہوا تھا نانی بی۔ باجے بجے تھے، تمہارے بیاہ میں؟ اور تم نے اچھے اچھے کپڑے اور زیور پہنے تھے۔ اپنے بیاہ کا قصہ سناؤ نانی بی، آج کہانی کے لئے اصرار نہ کروں گی۔"

"میری بھولی بچی۔ ہاں میں نے اچھے اچھے زیور اور کپڑے پہنے تھے۔ مگر بیاہ کے معنی یہی نہیں۔ اچھا آج کا (کہانی) نہ سنو گی۔ مگر میری زندگی کہانی سے کیا کم ہے بیٹی۔ کیا بتاؤں کیسے دھوم دھام سے ہوا تھا میرا بیاہ! کہتے ہیں پانچ ہزار خرچ ہوئے تھے پانچ ہزار! برابر ایک مہینہ لگا تھا، پورا ایک مہینہ۔ کیا کہوں میں تو گہنوں سے گویا لد گئی تھی۔ گلے میں اتنا مال کہ بوجھ سے گردن جھکی پڑتی تھی۔ جھومر، مانگ میں موتی، پیشانی پر ٹیکہ جھومتا ہوا، ہاتھوں میں کنگن، پہنچیاں، انگوٹھے اور انگوٹھوں کے بیچ میں ہاتھ بھر کر ہری ریشم کی چوڑیاں" "اتنی بڑی سی نتھ، پاؤں میں چاند جوڑی، جھومر" کان بھر کے سونے کی پتیاں۔ اور مجھے کیسا سنوارا گیا تھا۔ بال پیشانی پر اتار کر ایسے صاف کئے گئے تھے ایسے صاف کہ اپنی صورت دیکھ لو۔ منہ پر چمکتا ہوا رنگ، ہتھیلیاں بھر کے مہندی، کاجل مسی سے سولہ سنگار۔ اور میں ایسی کا ہے کو تھی بیٹی ——— نانی بی نے پچکے ہوئے گالوں پر ہاتھ پھیر کر آئینہ میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "گول صورت، پھولے پھولے گال، کیسی رونق تھی چہرے پر۔ اب کیا دیکھتی ہو میٹی، بڈھی چہرا ہو کر رہ گئی ہوں۔ اس زمانے میں کیسی بھاری جوان لگتی تھی۔ ایک ایک بات جو بیچ میں نہ سماتی تھی".... "اور کپڑوں کی بھڑک کا کیا کہنا! لال دامنی پر بڑے بڑے طلائی بوٹوں والی" نانی بی نے بوٹوں کی چوڑائی بتانے کے لئے اپنی ہتھیلی پھیلا دی۔ "ہرا بنارسی لہنگا اور اطلس کا کرتہ کیسی بن سنور کر بیٹھی تھی میں۔" میں نانی بی کے قصہ کو بڑی دلچسپی سے سن رہی تھی اور تصور میں نانی بی کو دلہن بنی دیکھ رہی تھی چپکے ہوئے نہیں، "پھولے پھولے گالوں

والی" نانی بی کو -

"میں ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تھی۔ اور ہم تھے بھی کتنے، ایک بھائی، ایک بہن۔ بابا نے میرے بیاہ پر جی کھول کر روپیہ خرچ کیا۔ "ان کے ماں باپ تو ہم سے بھی زیادہ مال والے تھے۔ کیا مجال میرا دل کوئی چیز مانگے اور وہ نہ ملے بات ابھی جبان پر بھی نہیں آتی تھی وہ چیز میرے قدموں میں۔ کیا کہوں بیٹی میرے بیاہ کے بعد چند سال کیسے سکھ سے گزرے۔ ان کے بابا مجھ پر جان چھڑکتے تھے اور میں ساس کی آنکھ ہی کا تارا تھی۔ کیسے ارمانوں سے بہو کو بیاہ کر لائی تھیں، آخر ایک ہی تو بیٹا تھا جگر کا ٹکڑا۔ میں بھلوں پہ بیٹھی رہتی۔ کام کرنے کی بھی ایک بات تھی۔ میں تو ادھر کا تنکا ادھر اٹھا کر نہ رکھتی تھی اور وہ مجھ سے کتنا پیار کرتے تھے، مجھے گھر کی "پاچھا جادونی" کہا کرتے تھے، مجھ سے پوچھے بنا کوئی کام نہ کرتے ہر وقت کوئی نہ کوئی اچھی چیز میرے سامنے لے آتے، کیسے کیسے پیار کے ڈھنگ آتے تھے انہیں۔ نہ جانے کہاں سے سیکھ آئے تھے۔ ایک دن سہری پر بیٹھی اپنے دامن میں گوٹا ٹانک رہی تھی پیچھے سے آکر میری آنکھیں بند کر دیں۔" پھر جلدی کچھ شرماتے ہوئے نانی بی نے اپنی زبان دانتوں میں دبالی۔ مجھ بھی کیسی باتیں کر رہی ہوں بچی کے سامنے۔ خیر تم تو بڑی ہی بھولی بچی ہو۔ ان باتوں کو کیا سمجھو گی۔ ہاں آنکھیں بند کر دیں۔ اور چپ چپ میرے کانوں میں پہنا کر ہاتھ ہٹا لیا۔ اوئی میرے اللہ میں تو شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ انہوں نے دوسرے ہاتھ سے آئینہ میرے چہرے کے سامنے پکڑ رکھا تھا۔ کہنے لگے دیکھو کیسے بھلے لگتے ہیں۔ جھومر تمہارے کانوں میں۔" میں نے جلدی سے جھومر نکال ڈالے۔ مجھے تو بڑے برے لگتے تھے۔ اتنے لانبے لٹکتے ہوئے، اتا با مجھے تو کچھ اچھے نہیں لگتے۔ وہ ہنس کر بولے "تم تو پرانے فیشن پر چلتی ہو۔ آٹھ دن رات چار دیواری میں بند رہتی ہو نا۔ تم کیا جانو۔ جمانہ کیسے بدل رہا ہے۔ ارے بھئی یہ نیا فیشن ہے نیا فیشن۔ فیشن کیا جانوں مجھے تو انہیں پہنتے شرم لگتی ہے۔" "خیر جانے دو، یہ آئینہ تو تمہیں پسند ہے۔ دیکھو اسے بھی نہ کہنا۔ بڑی دور سے منگوایا ہے۔ چھتر روپے لگے ہیں چھتر" اہا آئینہ، آئینہ کیا کہیں۔ کیسا پیارا تھا۔ خیر یہ تو ایک ٹکڑا ہے۔ اس سے اس کی خوبصورتی کی کیا خبر ہے۔ کناروں پہ کیسے کیسے رنگا رنگ پھول کر یا ہیرے جواہرات جڑے تھے۔ دل میں تو بہت خوش تھی مگر یونہی گلہ کرنے لگی "سارے بھلے آدمی کاہے کو اتنا روپیہ خرچ کرتے ہو مجھ پر، تمہیں تو پیسوں کی قدر ہی نہیں۔ کیا ٹھیکریاں ہو گئی ہیں تمہاری نجر میں۔ چھتر روپے بابا۔" اور وہ میری طرف کیسے پیار سے دیکھ کر بولے تھے "یہ چہرہ تمہیں یوں خوش دیکھ کر قیمت ویمت سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ تمہاری خوشی پر چھتر روپیہ تو کیا سب کچھ صدقے ہیں"۔ آہ ! ان کی کونسی کونسی بات یاد کروں۔ ان باتوں کو یاد کروں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔" نانی بی نے آنسو پونچھے اور دبی آواز میں کہنے لگیں "آہ اس جمانے میں وہ مجھے کتنا چاہتے تھے، چھتر روپیہ دے کر اتنی دور سے، پرائے ملک سے میرے لئے آئینہ منگائے تھے۔ اللہ اللہ یہ آئینہ تو ان کی یادگار محبت ہے۔" اور انہوں نے اس آئینہ کے ٹکڑے کو آنکھوں سے لگا لیا۔" اور میں کیسے بھرے وہ آئینہ اپنی سہیلیوں کو دکھاتی پھرتی تھی۔ وہ کہتیں "اری چہرہ تو تو بڑے بھاگ والی ہے۔ کیسا اچھا میاں ملا ہے تجھے ....

آہ کسی کے بھاگ ہمیشہ ایک سے ہوتے ہیں یہ آسمان کا چکر! یہ جانا کسی کو کبھی نہیں دیکھ سکتا۔ اپنا دکھڑا کیا سناؤں بیٹی۔ میرا ستارہ بھی گردش میں آ گیا۔ میری قسمت ایسی پھوٹی ایسی پھوٹی خدا وہ دن دشمن کو بھی نہ دکھائے۔" نانی بی پھر رونے لگیں "میرے سسر جاتے رہے۔ اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔" نانی بی نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر اپنا آنچل پھیلا دیا۔ "میرے باپ سے بھی جیادہ تھے۔ اللہ کا دیا آنخ دمن دولت تھی۔ باپ کے مرنے پر انہیں کے ہاتھ آئی۔ انہوں نے دنیا ہی کیا دیکھی تھی۔ پیسہ ہاتھ لگا اور ان کا ہر کوئی دوست اور ہمدرد بن گیا۔ اتنے دوست پیدا ہو گئے ہر وقت انہیں گھیرے رہتے۔ وہ وہ تار پھول کے پل باندھتے اور یہ تھے سیدھے سادے آدمی۔ پھولے نہ سماتے اپنی تعریف سن کر سب کو سچے دوست جان کر خوب کھاطر کرتے۔ انہوں نے دنیا ہی کیا دیکھی تھی کہ اچھے برے کی تمیز کرتے اور پھر خدا نے انہیں ایسا نرم دل دیا تھا۔ کسی کو اپنے دروازے سے دھتکار کر نکالنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ تم جانو بہت سے لچے لفنگے غنڈے بھی جمع ہونے شروع ہوئے۔ بری صحبت (صحبت) سے اللہ ہر ایک کو بچائے۔ جب پیغمبر کا بیٹا تک خراب ہو گیا تھا تو ہم جیسوں کی کیا بساط۔ پیسہ تو ہر ایک کو خراب کرتا

ہی ہے۔ پھر بھری جوانی۔ ان شہدوں نے اپنی جیبیں بھرنے کے لئے ان کو شراب اور جوئے کا چسکا لگا دیا۔ خدا ان سب کو غارت کرے۔ میرے ہیرے ایسے آدمی کو خراب کیا۔ پھر کیا تھا بیٹی! باپ کی اتنی محنت سے کمائی ہوئی پونجی مہینوں میں اڑ گئی۔ پھر میرے جہیز کی چیزیں بھی ایک ایک کر کے بک گئیں۔ یہاں تک تو خیر تھی۔ جب کچھ نہ رہا، تو کیا کہوں بیٹی!" نانی بی زور زور سے سسکیاں لینے لگیں..... "تو میرے گہنے مانگنے لگے۔ شراب کے نشہ میں چور آدھی آدھی رات کو آتے اور زیور کے لئے تکرار کیا کرتے۔ کبھی ہاتھ روک لیتی تو بس میری شامت ہی آجاتی۔ اتنا مارتے، اتنا مارتے، لاتوں سے، گھونسوں سے لکڑی کہیں دیکھ پاتے تو اس سے بھی بے دھڑک پیٹتے۔ میرے ہاتھ پاؤں سوج جاتے اور ان پہ نیلے نیلے نشان ابھر آتے۔ سارے زیور کپڑے برتن سب ٹھکانے لگ گئے یہاں تک کہ میرے بدن پر ایک دامنی کے سوا کچھ نہیں رہا۔ چاکوں پہ چاکے کچار کے میرے دیدے اندر دھنس گئے۔ گالوں میں گڑھے پڑ گئے۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ ایک رات انہوں نے خوب شراب پی لی تھی۔ لڑکھڑاتے گرتے پڑتے آئے اور باہر دریچہ سے پکارا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دروازا کھولا۔ مگر وہ اندر نہیں آئے۔ مجھے وہیں پر بلا لیا گئی، تو کیا کہوں بیٹی انہیں برابر ہوش بھی نہ تھا۔ رہا سہا کپڑا بھی کھینچنے لگے، یا اللہ میں کیا کرتی۔ پوری طاقت لگائی بہت روئی بھی، مگر انہوں نے دامنی کھینچ ہی لی۔ وہ دامنی تھی ریشم کی۔ یوں چند پیسوں کی امید میں مجھے ننگ دھڑنگ چھوڑ کر چلے گئے۔ میں اس رات کیا سوتی بدن پر ایک کپڑا نہیں ٹھوکی، ٹھنڈ سے ٹھٹھری ہوئی، ایک کونے میں اوکڑی بیٹھی رہی۔ رات بھر اپنی پھوٹی قسمت پر روتی رہی۔ صبح رسوئی میں ادھر ادھر سے کچھ کوئلے جمع کر کے انہیں سلگا کر چولہے کے پاس بیٹھی آگ تاپ رہی تھی۔ ایسے میں کیا دیکھتی ہوں۔ میرا بھائی آ کھڑا ہوا ہے۔ خدایا مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ جبین میں گڑ جاتی ایسی حالت میں، اور جا دیتی، خدایا جبین سکھ (شق) ہو جاتی اور میں گڑ جاتی۔ آہ! ہم جیسی گنہگاروں کی دعا کہاں قبول ہوتی ہے۔ وہ تو اگلی نیک بی بیوں کا ہی دکھ تھا۔ ادھر دعا ہونٹ سے نکلی اور جبین سکھ ہو گئی۔ خیر کیا کرتی، ادھر ادھر دیکھا تو ہانڈیاں پکڑنے کا کالک سے بھرا کپڑا پڑا تھا۔ تن ڈھانکنے کو وہ بھی غنیمت تھا۔ جلدی سے اوڑھ کر کونے میں سمٹ کر بیٹھ رہی۔ بھائی، بیٹی بیٹی حیران نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ جہان سے ایک لفظ نہ بولا۔ میرے میکے والوں کو کچھ خبر نہ تھی کہ مجھ پر یہاں کیا گزر رہی ہے۔ ہاں ایک دو دفعہ میرا بھائی آیا تھا گھر میں ان کے کھلاپہ کیسے جبان کھولتی۔ اب میرا بھائی چند دنوں کے لئے مجھے میکے لے جانے آیا تھا۔ پچھلی دفعہ کہہ گیا تھا جیجی کتنے دن ہو گئے تمہیں میکے آئے۔ بچاری اماں بہت یاد کرتی ہیں۔ اب میں نوکری کی خاطر پرائی بستی جا رہا ہوں۔ وہاں سے لوٹ آؤں گا تو اب کی دفعہ تمہیں جرور بلا کر جاؤں گا۔ اور بیٹی جب وہ آیا تو میں ایسے حال میں تھی۔ ایسی لاچار ایسی بے بس اسے کتنا دکھ پہنچا ہوگا؟ آنکھوں سے کھون لگا تھا۔" اس کے بعد دیر تک نانی بی کچھ بول نہ سکیں۔ روتے روتے ان کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ کیسی بری حالت ہو رہی تھی ان کی۔ آواز ہی نہ نکلتی تھی۔ لٹکا ہوا نچلا ہونٹ اور زیادہ لٹک آتا اور آنسو ابل ابل آتے۔ نانی بی کو اس حالت میں دیکھ کر میرا ننھا دل بھر آیا۔ گو میں ان کی کہانی کو پورے طور پر سمجھ نہ سکی تھی۔ پھر بھی نانی بی کو یوں روتی دیکھ کر میں بھی رونے لگی۔ انہوں نے بہت مشکل سے اپنی حالت سنبھالی۔ آنسو پونچھے۔ اور مجھے سینے سے لگا لیا "تو نہ نہ ننھی، تم کا ہے کو روتی ہو ننھی شہزادی۔ اتنا نہ رو ہے میرا اچھی کو۔"

"اچھی نانی بی تمہیں کہانی سنانے سے اتنا دکھ ہوتا ہے تو نہ سناؤ۔ میں اچھی بچی ہوں۔ ضد نہیں کرتی۔ چلو گھر چلیں۔"

"نہیں بیٹی تمہیں اپنی دکھ بھری کہانی سنا کر میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو رہا ہے اب تک میں کسی سے نہ کہی تھی۔ کس سے بولتی۔ اس کھود غرجی (خود غرضی) دنیا میں میرا کوئی درد پہچاننے والا نہیں، مگر تم بیٹی ننھی ہو۔ پر کیسا درد بھرا دل رکھتی ہو۔ اب تم یہ سب کچھ نہیں سمجھ سکتیں۔ جب بڑی ہو گی تو سمجھو گی۔ نانی بی کی یاد کے ساتھ تمہیں آج کی باتیں یاد آئیں گی...... اور دکھ سکھ کا کہنا ہی کیا وہ اس جندگی میں لگا ہی رہتا ہے، پھر میں اتنا سکھ نہیں پاتی تو اتنا دکھ کاہے کو اٹھاتی۔ خیر تو تمہیں باقی کہانی بھی سنائے دیتی ہوں کم سے کم دل کا بوجھ تو ہلکا ہو جائے۔

"یہ تمہارا کیا حال ہوا ہے جیجی؟" میرے بھائی نے پوچھا۔ میں پھر بھی کچھ نہ بولی خدا جانتا ہے۔ ان کے کھلاف میری زبان نہ کھلی۔ مگر میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی۔ میرا بھائی روتا ہوا چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ آیا۔ ایک گٹھڑی پھینک کے وہ بولا "جیجی یہ پہن لو" اور آپ دوسری طرف منہ پھیر کر توشہ دان میں سے کچھ کھانے کی چیزیں نکالنے لگا۔ میں نے گٹھڑی کھولی کپڑے پہنے اور ہم دونوں کھانے پر بیٹھے، کھاتے ہوئے اس نے کوئی بات نہ کی۔

نظریں نیچی کئے بیٹھا رہا۔ کھانا چکنے کے بعد آہستہ سے دبی آواج میں بولا "چلو جہرہ گھر چلو۔ مجھے اس بدماس کے سب کرتوت ملوم ہو چکے ہیں۔ کھدا کی کسم میں تمہیں پھر اس نالائک کے گھر نہ بھیجوں۔ اس جالم کو اپنے گھر میں کھدم رکھنے دوں تو میں ایک باپ کی اولاد نہیں پھر بھی اس بے گیرت (بے غیرت) نے کھدم رکھا تو محلہ بھر میں پھبتی (فضیحت) کرا دوں گا" پھر وہ کچھ نہ بولا۔ کھاموسی سے مجھے گاڑی میں بٹھا کر گھر لے آیا۔ میں تبھی سمجھ گئی تھی کہ وہ ایسا جرور کرے گا۔ وہ بات میں تبھی سمجھ گئی تھی کہ وہ مجھے اُن سے پھر ملنے نہ دے گا۔ نانی بی بہت زور سے سسکیاں بھر کر رونے لگیں۔ "وہ گھصہ میں یہ باتیں کہتا تو اور بات تھی۔ گھصہ اتر ہی جاتا اور مجھے کچھ آس ہوتی۔ لیکن یہ کہتے وقت اس کے چہرہ پر کیسا سکون تھا۔ گھصہ نام کو نہیں...... میں تبھی جان گئی کہ اس کا ارادہ پکا ہے" نانی بی نے سرد آہ بھری۔ "میرا گمان صحیح نکلا۔ کچھ دن بعد وہ آئے۔ آہ بیٹی بیٹی" میں تعجب سے تکنے لگی۔ نانی بی کے سینے میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ "آہ! کیا کہوں... بے...... ٹی...... ان کے چہرہ پر پچھتاوا تھا۔ اداسی تھی۔ وہ جو در اپنے کئے پر رنجیدہ تھے اور بیٹی ان کے ہاتھ میں ایک نئی ساڑی بھی تھی۔ میں دروازہ کھولنے بھاگی۔ بہت جلد بھاگی۔ پھر بھی میرا بھائی آ ہی گیا...... آ ہی گیا۔ مجھے جور سے دھکیل کر آگے بڑھا۔ انہیں ایسی ایسی باتیں سنائیں۔ انہیں شہدا، لفنگا، بدماس کہا۔ بے سرم کہا۔ بے گیرت کہا۔ میرے اللہ! نہیں، کبھی نہیں، وہ بے گیرت نہیں تھے۔ ان میں سریفوں کا خون تھا۔ میں بھائی کے پاؤں پر گر پڑی۔ "اللہ واسطے ایسا نہ کہو بھائی" اس نے مجھے بھی بے گیرت کہا۔ اللہ اللہ یہ سن کر بھی وہ کھاموس کھڑے تھے۔ صرف اتنا بولے "میں تمہارے گھر لڑنے نہیں جہرہ کو لینے آیا ہوں"۔ اب اس کا تم سے کوئی تعلک نہیں۔ "سرم نہیں آتی اسے اتنا ستا کر" میرا بھائی دانت پیس کر برس پڑا "کیا میری بہن اتنی سستی ہے ہمارے پاس دو ٹکڑے روٹی بھی نہیں کہ اسے پال سکیں؟ کھدا کی کسم اگر میری بہن بھوکوں مرے۔ پڑا رہے، تم جیسے جالم کے پاس نہ بھیجوں گا۔ مار ہی تو دیا اسے" میرے بھائی نے ان کے ہاتھ سے ساڑی چھین کر نالی میں پھینک دی۔

"مجھے جہرہ سے تو پوچھ لینے دو۔ اگر وہ نہ کہے تو میں جرور چلا جاؤں گا۔ اگر راجی ہے تو تمہارا کوئی حکم نہیں اس پر وہ میری بیوی ہے میں اسے جرور لے جاؤں گا" "تو نہیں! کیوں نہ کہے گی؟ پھر آ جائے گی تمہارے ساتھ اپنا مردہ نکلوانے" ادھر میں پیچھے سے رو رو کر التجا کر رہی تھی "بھائی میں جاؤں گی بھائی مجھے جانے دو" اور بھائی نے مجھے آگ برساتی نظروں سے دیکھا۔ "چپ بے گیرت کہیں کی"

"نہیں میں جہرہ ہی سے پوچھوں گا" انہوں نے دہلیز پر کھدم رکھتے ہوئے کہا۔ کھریب تھا میرا بھائی انہیں دھکا دے کر باہر نکال دے۔ "بے سرم اندر کھدم رکھتا ہے؟ ویسا بے سرم نہ ہوتا تو عورت جات کے گہنے بیچتا۔ کیا پوچھتا ہے جہرہ سے۔ وہ تو رو رو کر کہہ رہی ہے میں اس جالم کے ساتھ نہ جاؤں گی" "آہ بھائی نے کیسا جھوٹ بولا..... کیسا جھوٹ بولا" "اگر تجھ میں جرا بھی گیرت ہے تو جا فوراً یہاں سے چلا جا پھر کبھی ادھر نہ بھٹکنا" پھر میرے بھائی نے اتنے زور سے کواڑ بند کیا۔ کچھ دیر بعد میں نے ڈرتے ڈرتے کھڑکی میں سے جا کر دیکھا۔ وہ ہمارے گھر سے کچھ دور پر کھڑے تھے۔ آہ بیٹی میں نے اچھی طرح دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں پانی کھڑا تھا..... ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پھر وہ چلے گئے۔ ہمیشہ کے لئے چلے گئے۔ وہ بڑے گیرت والے تھے۔ بیٹی اتنا ہونے کے بعد پھر اس گھر پر آتے؟...... آہ میرے بھائی نے مجھے کیوں جانے نہ دیا؟ نہ جانے دیا تو کیا ہوا۔ میں موکھا پا کر وہاں سے چلی آئی۔ وہاں سے نکل کر انہیں بہت ڈھونڈا بھی مگر کہاں ملتے۔ میرے ایسے نصیب کہاں۔ وہاں سے جو نکلی بیٹی، تو نوکری کے لئے ماری ماری پھری۔ مگر پھر اس گھر میں کھدم نہ رکھا..... میں ماں کے ہاں چین سے رہ سکتی تھی مگر میری گیرت کیسے کبول تھی کہ وہاں پڑی رہوں مجھے کسی کے گھر کی نوکری تو کیا کو لی، مجوری کرنا منجور تھا۔ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا بھیک مانگنا منجور تھا۔ مگر اس دروازے پر جانا منجور نہ تھا۔ جوان پر بند ہوا تھا..... اگر ہمارے بابا اس وقت پر جندہ ہوتے تو کبھی ایسا نہ کرتے۔ مجھے جرور بھیج دیتے۔ انہیں بیٹی کا لاکھ درد سہی۔ وہ میاں کا درجہ پہچانتے تھے۔ کہا کرتے۔ عورت کا مکھام سوہر کا گھر ہی ہے۔ بھائی نے جوش میں یہ نہ پہچانا۔ بابا ہوتے تو جرور بھیج دیتے... سبھی ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ ان کی تو بھری جوانی تھی۔ بعد میں سنبھل ہی جاتے اور مجھے تو ایسا معلوم پڑا کہ وہ تبھی ڈیڑھ دو مہینوں میں ہی بہت سنبھل گئے تھے پھر میری جندگی کیسے سکھ سے گجرتی! ایک دو

دن تکلیف سہہ ہی لیتی۔ اور پھر وہ مارتے تھے تو کیا کچھ جان کر مارا کرتے تھے۔ شراب پی کر انہیں ہوش تھوڑا ہی رہتا تھا۔ صبح جب ان کی حالت اچھی رہتی تو ان نیلے سوجے ہوئے حصّوں پر ہاتھ پھیرا کرتے۔ پھر ایک دو دیکھے تو انہوں نے گرم پانی میں روئی بھگو کر سینکا بھی تھا۔ ان دنوں بھی کبھی کبھی کیسی پیار بھری نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ میں سب کچھ بھول جاتی او خدا! لکھدایا! ان کی ایسی ایک نظر ہی بس تھی ...... ایک نظر ہی بس تھی۔" نانی بی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ میں تو ڈر ہی گئی ان کا سوکھا جسم ایسے ہل رہا تھا گویا اس کے اندر بھونچال آگیا ہو کچھ دیر تک نانی بی خاموش ہو گئیں۔ پھر جب طوفان آہستہ آہستہ تھمانے لگیں۔

" اور ان میں کوئی ایسی ویسی بات بھی نہ تھی۔ شراب جوئے کا کیا کہنا اگر یہ لت ہم شتوں کو بھی پڑے تو نہ چھوٹے۔ مگر کسی کی کیا مجال کہ دوسری باتوں میں ان کی طرف انگلی اٹھائے۔ ایسے تھے وہ۔ غیر عورت کی طرف کبھی نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے۔ اور بیٹی! جب مرد میں یہ گُن ہو۔ یہ بات ہو تو عورت کیا کچھ نہیں سہہ لیتی!"

نانی بی کی طویل کہانی ختم ہوئی۔ مگر اس کہانی کی بہت سی باتیں میرے دماغ کے کسی کونے میں جا گھسی تھیں۔ صرف ایک بات مجھے اہم معلوم ہو رہی تھی۔ " نانی بی کا آدمی انہیں مار کر ان کے زیور چھین لیا کرتا تھا۔" اور میں بڑی بے صبری سے انتظار کر رہی تھی کہ نانی بی اپنی کہانی ختم کریں۔ تو اپنی ننھی زبان سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں ہمدردی ظاہر کر کے انہیں تسلّی دوں۔ جب نانی بی نے رونا بند کیا اور آنسو پونچھ لئے تو میں بڑی ہمدرد صورت بنائے بولی۔

" نانی بی! تم سچ مچ کتنا دکھ اٹھائی ہو۔ کیسا خراب تھا تمہارا آدمی۔ تمہیں یوں مار کر تمہارے اچھے اچھے زیور چھین لیتا تھا۔ کیسا خراب آدمی۔ تمہیں اس کی صورت دیکھ کر نفرت ہوتی تھی نا؟"

" نفرت بیٹی؟ اس کی صورت سے نفرت؟ کیا بتاؤں تمہیں وہ کیسا تھا کیسا ہنس مکھ کیسا بانکا سجیلا جوان!! گٹھا ہوا بدن، چوڑا سینہ۔ اور صورت کا تو کیا کہنا، چوڑی صورت، یہ اونچی ناک، چوڑی پیشانی، موٹی موٹی کالی آنکھیں۔ میں تو گھنٹوں بیٹھی اس صورت کو تکا کرتی۔ پھر بھی جی نہ بھرتا، جب اُجلے اُجلے کپڑے پہنے لال کشمیری رومال کندھوں پر ڈالے باہر نکلتا تو دیکھنے کہ وہ آ کیسے نہیں تھیں۔ میں جلدی جلدی لول پیلا پانی لے آتی اور ڈیوڑھی کے باہر قدم رکھتے ہی، تاکہ پھینکتی کہ کہیں چاند سے مکھڑے کو نظر نہ لگ جائے۔ اس کی صورت سے نفرت بیٹی! وہ تو باچھاہوں کا باچھا تھا۔ شہزادوں کا شہزادہ!"

" لیکن یہی بہتر ہے نا! اگر تم نے اپنی سہیلیوں کے نام چٹھیاں لکھ دی ہیں تو لاؤ انہیں رحیم کے ہاتھ بھجوا دوں سب سامان آ گیا ہے، تم آؤ نا تیری بی کی کچھ مدد کرو۔ بیچاری اکیلی اتنی چیزیں کیسے تیار کر سکے گی۔ وہ ایک تم کرو۔ تم دیکھتی ہو تسنیم تو میری گود چھوڑتا ہی نہیں۔"

" نہیں امی آج پارٹی نہیں دوں گی۔"

" کیوں بیٹی؟ تم بھی عجیب ہو۔ آج خوشی کا دن ہے۔ جی بھر کے خوشیاں مناؤ۔"

" اس دنیا میں تو صرف خوشی ہی نہیں ہے امی! اس کے ساتھ غم بھی تو لگا ہوا ہے۔"

" ہونہہ" امی ذرا سے ہنس پڑیں۔ ابھی سے قنوطی ہوتی جا رہی ہو۔ اپنی زندگی کے سب سے رنگین زمانے میں ہی۔"

" امی! شاید آپ کو معلوم نہیں۔ کل نانی بی انتقال کر گئیں۔" میں نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

" پھر وہی نانی بی! سچ مچ اس بوڑھی نے تم پر جادو کر دیا تھا!"

امی تم اب بھی نانی بی کو نہ سمجھ سکیں۔

ابراہیم جلیس

زرد چہرے

آصف کی بہن جوان تھی اور پانچ سال سے اپنے دولھا کا انتظار کر رہی تھی۔ نہ جانے اس کا دولھا کون تھا، کیسا تھا۔ کہاں کا رہنے والا تھا اور کب آنے والا تھا ——— ؟ آصف کو کچھ ایسا محسوس ہوتا کہ جب تک اس کی بہن کے رخساروں پر گیندے کے پیلے پیلے پھول کھلے ہیں۔ اس کا دولھا کبھی نہ آئیگا۔ کیونکہ دولھے گیندے کے پھولوں کو مطلق پسند نہیں کرتے وہ تو گلاب کے سُرخ سُرخ پھولوں پر جان دیتے ہیں۔ اس کی سہیلیوں ناجرہ، پروفنا، زہرہ، شیلا اور سعیدہ کے گالوں میں کتنے بڑے بڑے سُرخ گلاب تھے۔ اور ان کے دولھے کتنی جلدی، کتنے اضطراب اور کتنی بے تابی سے آآ کر ان سُرخ سُرخ پھولوں کو توڑ توڑ کر لے گئے۔ اب سارے محلے میں صرف ایک ہی پھول رہ گیا تھا ——— گیندے کا پیلا پیلا پھول ——— اس کی بہن جو پورے پانچ سال سے خوابوں میں، تصوّر میں، خلاؤں میں اپنے دُولھا کو دیکھ رہی تھی۔ ممکن ہے خوابوں میں اس کا دُولھا دکھائی دیتا ہو۔ تصوّر میں چلا آتا ہو اور خلاؤں میں اس کی طرف بڑھتا ہو ——— لیکن وہ تو دھرتی پر رہتی تھی۔ خوابوں، خلاؤں اور تصوّر میں آنے والے دُولھے دھرتی پر کیسے اتر سکتے ہیں۔ وہ تو خوابوں کی نرم نرم سطح پر ہی چل پھر سکتے ہیں۔ دھرتی تو ان کے لئے بڑی سخت کھردری اور پتھریلی ہوتی ہے۔

سارے محلے میں مشہور تھا کہ اس کی بہن کو دق ہو گئی ہے۔ لیکن شہر کے بڑے بڑے ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ دق وق کچھ بھی نہیں۔ صرف ایک مرض ہے ——— طویل کنوارپن۔ جو بہت ممکن ہے۔ طویل ہوتے ہوتے دق کے گلے میں بھی بانہیں ڈال دے۔ جوں جوں اس کی بہن کا کنوارپن لمبا ہوتا جاتا تھا۔ وہ بھی اس کی فکر میں گھل گھل کر سوکھ کر لمبا ہوتا جا رہا تھا ——— ہڈیوں کا لمبا ہی لمبا ڈھانچہ۔

بہن کی مانگ میں افشاں چننے کے لئے اُس نے کیا کیا کچھ نہ کیا۔ جب باپ بغیر کسی بیماری کے اچانک مر گیا تو اس نے قانون کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر تیس روپیہ ماہوار کی کلرکی جیسی ادنیٰ غلامی بھی چار و ناچار قبول کر لی۔ اگر اس کی بہن نہ ہوتی۔ یا جوان نہ ہوتی یا وہ مفلس نہ ہوتا تو اپنے مشہور قوم پرست باپ کی طرح وکالت یا کوئی دوسرا آزاد پیشہ اختیار کرتا۔ دفتری غلامی کبھی نہ کرتا۔ اپنی رگوں میں دوڑتے ہوئے آشاونش باپ کے لہو کی توہین نہ کرتا بلکہ اسی طرح خود بھی حکومت سے ٹکریں لیتا رہتا۔ لیکن جس کا باپ مر گیا ہو۔ جس کی آمدنی تیس روپیہ ماہوار ہو۔ جس کی بہن کنواری ہو۔ اور جس کے بہن کے رخساروں پر گیندے کے زرد زرد پھول کھلے ہوں وہ کیا حکومت سے ٹکر لے سکتا ہے۔ وہ کیا وقت سے جیت سکتا ہے۔

مگراس کی بہن تو ابھی عورت بننے سے پہلے معتبر بن گئی تھی۔ وہ بے چارا تو اس کے لئے صبح سے شام تک دفتر کی میز پر جھکا رہتا۔ صاحبوں کی پھٹکاریں سنتا اور مہینے کے مہینے تیس روپے اپنی بہن کی ہتھیلی پہ رکھ دیتا۔ اور اس کے باوجود اس کے ہونٹوں پہ ایک مبہم سی مسکراہٹ تک نہ آتی۔ اس کے پیلے پیلے گالوں میں لہو کی ایک مدھم سی دھار ——— ایک ہلکی سی شہابی رو تک نہ رینگتی۔ اسی بات پہ وہ جھلا اٹھتا اور بات بے بات اسکو جھڑک دیتا۔ لیکن جب پیلے پیلے پھولوں پہ شبنم کی بوندیں رینگنے لگتیں تو وہ ان بھیگے ہوئے پھولوں کو اپنے میلے دبیز کوٹ کے لمبے لمبے کالروں میں چھپا کر خود بھی رونے لگتا ——— کیونکہ شبنم کی بوندوں سے دھل کر ان پھولوں کی زردی خطرناک حد تک نکھر جاتی۔

مگر وہ مایوس نہیں تھا۔ اس کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ اپنی بہن کے منگیتر کو خوابوں، تصورات اور خلاؤں سے گھسیٹ کر اسی دھرتی پہ لے آئیگا ——— کیونکہ دولھے بڑے لالچی ہوتے ہیں پھول خواہ کتنا ہی معمولی اور پیلا کیوں نہ ہو۔ اگر اس کو سونے اور چاندی کے گلدان میں رکھ کر پیش کر دو تو دولھا آنکھ بند کر کے وہ گلدان لے لیتے ہیں .... اسی لئے وہ کلرکی کے علاوہ اخباروں اور رسالوں کے دفاتر میں بھی آدھی آدھی رات تک کام کرنے لگا۔ اس کی آمدنی بڑھنے لگی۔ پچاس روپیہ۔ ساٹھ روپیہ۔ ستر روپیہ۔

صبح بالوں میں کنگھا کرتے وقت وہ آئینے میں اپنی صورت دیکھتا کہ آدھی آدھی رات تک کام کرنے سے اس کے اپنے گالوں کے سرخ ڈورے مدھم پڑ رہے ہیں۔ لیکن اب اس کو ان سرخ ڈوروں کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وہ تو چاہتا تھا کہ یہی سرخ ڈورے اس کی بہن کے رخساروں میں داخل ہو جائیں۔ اور بس ——— اور اگر یہ نہیں ہو سکا۔ تو وہ اپنی بہن کو سونے اور چاندی کے جگمگ جگمگ کرنے زیوروں سے ایسا سجائے گا کہ ہاجرہ، چمپا، زہرہ، شیلا اور سعیدہ کے دولھوں کی آنکھیں چندھیا جائیں گی۔ وہ اپنے بے معرف، فضول مسکرانے والے سرخ گالوں سے متنفر ہو جائیں گے۔ اور جب شہر کی سڑکوں پہ سے دولھا اس کی بہن کے گلے میں پڑے ہوئے جڑاؤ ہار کو بکٹ اسکو باجوں ڈھولوں اور تاشوں کے شور اور گیس لیمپوں کی سپید چمک دار روشنی میں فاتحانہ انداز میں کھینچے لئے جائے گا تو وہ ہاتھ مل مل کر اپنی جلد بازی، اپنی بیوقوفی اور اپنی حماقت پہ پچھتاتے رہیں گے۔

جس مہینے اس کی آمدنی پچاسی روپے ہو گئی۔ اس کے گالوں کے شفق بالکل ہی ڈوب گئی۔ اب اس کے چہرے کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی زرد رنگ کے شیشوں والی کھڑکی سے منعکس ہوتی ہوئی روشنی میں کھڑا ہے۔ اس کے دوست احباب جب اس کے پیلے مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھتے تو کٹھا کر مذاق کرتے۔

"علاج کراؤ اپنا۔ کوئی لڑکی تم سے شادی کرنا پسند نہ کرے گی"۔

"جوانی ساری عورت بغیر ہی گذر جائے گی"۔

وہ مسکرا دیتا۔ اب اس کے ہونٹ بہت مسکرانے لگے تھے۔ بار بار مسکراتے تھے۔ ایک مہینے میں اس کو پچاسی روپے ملتے تھے اور وہ پچاسی دفعہ مسکراتا تھا۔

"اور کوئی لڑکی شادی نہ کرے۔ اس کی بلا سے۔ جوانی صرف عورت کے آغوش میں گذارنے کے لئے تو نہیں ہے۔ جوانی حجلۂ عروسی اور عورت کی خلوتوں میں بسر کرنے کے لئے تو عطا نہیں ہوئی۔ جوانی تو الف لیلیٰ کے سوداگروں کی طرح اتال پتال چھاننے کے لئے ہے"۔

اور پھر بقیہ جملے وہ اپنے دل ہی دل میں چپکے چپکے کہتا۔

"جوانی، زندگی سے لڑنے کے لئے ہے۔ اپنی جوان بہنوں کی مانگ میں سہاگ کی افشاں بھرنے کے لئے ہے۔ ان کے شرمیلے، لالچی رنگ و بو پہ جان دینے والے دولھوں کو

آسمان سے دھرتی پر کہکشاں لانے کے لئے ہے ——— میں جو اپنی بہن
کا حجلۂ عروسی بناؤں گا - وہ تاج محل سے زیادہ شاندار ہوگا ۔"

چند ہی مہینوں بعد وہ سو سوا اور سوا سو روپے ایک ایک مہینے میں کمانے لگا۔ صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی۔ جانِ عزیز رونے بسورنے لگی تھی۔ لیکن وہ اندھا دھند دن کے اُجالے اور رات کے اندھیرے میں روپوں کے پیچھے دوڑتا رہا۔ اپنی نیندیں، اپنے تصور کے جزیرے، اپنے سپنے اور اپنی جوانی ——— یعنی مہ جبیں جہاں کو بھی بھول گیا۔ اس کی مہ جبیں جہاں۔ جس سے اس کو ایک دبی دبی ڈھکی چھپی اور چور محبت تھی —— جس کی بڑی بڑی آنکھوں سے نکلتے ہوئے تیروں نے اس کے ننھے سے دل میں بےشمار آنکھیں پیدا کر دی تھیں۔

ایک دن وہ بہت تھکا ہارا گھر لوٹا۔ اور چارپائی پر گر کر بُری طرح کھانسنے لگا۔ اس کی بہن نے اس کے جوتے کے تسمے کھولے اس کا میلا دبیز کوٹ اتارا اور اس کے سرہانے بیٹھ کر سنگتری کے تیل سے اس کے سینے کی مالش کرنے لگی ۔ اُس نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے اپنی بے زبان مجبور بہن کے پیلے پیلے، افسردگی سے کملائے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا ۔

"میری اچھی گڑیا ——— باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تو کیا ہوا میں اب اپنے سائے میں تیرے ہاتھوں کو ایسی لال لال مہندی سے رنگ دوں گا۔ کہ تو .... ہاں تو جا اسی بات پہ میرے لئے اچھی سی چائے بنا لا ۔"

بہن ایک حزن بھری مسکراہٹ سے منہ چھپا کر چلی گئی ۔ اپنے بھائی کی یہ حالت دیکھ کر اپنے ہاتھوں کو مہندی سے رنگا دیکھنے سے بالکل ہی مایوس ہو گئی تھی۔

مسرت کے موقع پر عقل کہاں چلی جاتی ہے! وہ اپنے سائے کا اپنے باپ کے سائے سے مقابلہ کر رہا تھا۔ اس کا باپ تو کھاتے پیتے پرانے ہندوستان کا ایک بھاری بھرکم انسان تھا۔ چھ فٹ لمبا تین فٹ چوڑا۔ اور اس کی آمدنی بیٹے کی آمدنی سے چھ گنی زیادہ تھی۔ اس کے سائے میں تو اٹھارہ انسانوں کا ایک خاندان پل رہا تھا۔ کئی غریب رشتہ دار عورتوں کے مانگوں میں سہاگ کی افشاں چنی گئی تھی ——— اب یہ ڈینگیں مارنے والا ہڈیوں کا لمبا ہی لمبا ڈھیر۔ میلا دبیز کوٹ اتار دینے پر اس کا سایہ ٹیلیفون کے کھمبے کی طرح اتنا پتلا اور منحنی تھا۔ کہ ایک ہی دبلی پتلی نرم و نازک بہن جوانی کی دھوپ اور حدت سے نہیں بچتی تھی۔ وہ تو اس دھوپ میں جیسے جل رہی تھی۔ اُبل رہی تھی۔ بالکل اس دیگچی کی طرح جس میں پکتے ہوئے چائے کے پانی کو اُبالی آ رہا ہو ——— ۔ ہاں جب وہ روپوں سے پھولی ہوئی جیبوں والا دبیز کوٹ پہن لیتا تو اس کے بڑے بڑے کالروں میں منہ چھپا کر جوانی، حدت، دھوپ سبھی کچھ بھول جاتی تھی۔

بھائی کی دن بہ دن گرتی ہوئی صحت اور سوکھتے ہوئے جسم کو دیکھ کر بہن نے آخر جی کڑا کر کے شرم کی کینچلی اتار کر پھینکتے ہوئے ایک دن کہہ دیا۔

"بھیا ——— آپ کی زندگی سے میری زندگی ہے ۔ آپ پر سے میری جیسی ہزار بہنیں وار کر کے پھینکی جا سکتی ہیں۔ آپ میرے لئے کیوں اپنی زندگی اپنی جوانی اس طرح برباد کر رہے ہیں۔ مجھے آپ جیسے پیارے بھائی کے قدموں میں بڑی آرام اور چین کی زندگی حاصل ہے۔ میں کہیں اور جانا نہیں چاہتی۔ میں .... میں شادی بھی نہیں کرنا چاہتی ——— ہاں آپ شادی کر لیجئے۔ گلاب کے پھول جیسی بھابھی بیاہ لائیے۔ میں آپ دونوں کی خدمت میں ہنستے مسکراتے زندگی گزار دوں گی ۔ بھی آپ دونوں کے ہوتے مجھے شادی کی کیا ضرورت ہے ۔"

اس نے اس کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے گالوں پر محبت کی لطافت سے گدگدایا ہوا ایک نرم طمانچہ لگاتے ہوئے کہا۔

"پگلی ——— میں جانتا ہوں کہ تو اتنی پگلی ہے ۔ کہ تیرے جسم میں لہو کی بہت تھوڑی بوندیں ہیں۔ ان بوندوں میں کبھی تلاطم پیدا نہ ہوگا ۔ تو چاہے یا نہ چاہے لیکن دنیا اور دنیا والوں کے لئے تیری شادی کرنا بہت ضروری ہے ۔ ورنہ اگر تو مصلے پر بیٹھ کر بھی قسم کھائے تو بھی کوئی تیری پاکدامنی کو یقین نہ کرے گا ۔"

اُس نے بھی جی کڑا کر کے شرم کو بالائے طاق رکھ کے کہہ دیا۔ اس وقت اس کے جی میں آئی کہ یہ بھی کہہ دے "تو جھوٹی ہے۔ تجھے شادی کی ضرورت ہے۔ میں خود ہر رات تیری چارپائی سے اٹھتی ہوئی دبی دبی بھیانک آہیں سنتا ہوں۔ بیشمار کروٹوں سے چرچراتی ہوئی چارپائی سے تیری پیاسی جوانی کی چیخیں سنتا ہوں۔ مجھے دھوکہ دینے کی کوشش نہ کر۔ تو نے صرف یہ گھر کی چار دیواری دیکھی۔ مگر میں نے تو بہت بڑی دنیا دیکھی ہے۔ اٹھائیسویں برس میں سر میں سپید بال گردن میں جھکاؤ۔ اور آنکھوں میں یاسیت کا دھندلکا . . . . یہ کیا ہے؟ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ تو تو صرف چوبیس برس کی ایک کنواری ہے۔"

پھر اس کی زندگی میں ایک بڑا ہی چمکیلا دن طلوع ہوا۔ اپنی بہن کو سر سے پاؤں تک سونے اور چاندی کے زیورات سے جگمگا دیا۔ اس کی مانگ کو کہکشاں سے زیادہ چمکیلا بنا کر سنوارا۔ اس کی ہتھیلیوں میں ایسی سرخ سُرخ مہندی لگائی کہ شفق تک شرما کر پہاڑیوں کے پیچھے چھُپ گئی۔ سبز رنگ کی سلمیٰ ستارا لگی ہوئی بنارسی ساڑھی اور سونے کے پیلے پیلے چمکتے زیور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سبز رنگ کے گلدان پہ پرانے ہندوستان کے کسی مشہور نقاش نے بڑے فن کارانہ انداز سے منبت کاری کی ہو۔ اور اس میں گیندے کا ایک پیلا پیلا پھول شرما رہا ہو . . . . اس پھول کی پتیاں شبنم کی لاتعداد بوندوں سے بھیگ رہی تھیں وہ خود بھی روتا ہوا مصنوعی خوشی سے مسکراتے ہوئے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے دلاسا دے رہا تھا "ارے ————— دلہنیں روتی ہیں ————— کہیں روتی ہیں — ؟ ہونہہ"

اور تاشوں، نفیریوں، ڈھولوں کا شور فضاؤں میں بلند ہو ہو کر اس پہ ٹھٹھے لگا رہا تھا۔ کہ دیکھو ————— یہ آنسو پونچھنے والا خود بھی تو آنسو بہا رہا ہے۔ ہا ہا ہا . . . . ڈھم ڈھم۔ پیں پیں۔ پیں پیں۔ ترررت۔ ترر ترر . . . .

بہن کے چلے جانے کے بعد اس کی زندگی اس کا گھر سبھی سنسان پڑ گیا تھا۔ اس کی بہن کی چارپائی اب چپ چاپ اکیلی پڑی رہتی۔ وہ اب آہیں نہیں بھرتی تھی۔ اور نہ اس سے کسی پیاسی جوانی کی چرچراتی ہوئی چیخیں سنائی دیتی تھیں۔ وہ اب ہوٹلوں میں کھانا کھا رہا تھا۔ کبھی دیگچی میں اُبال ہی نہ آتا تھا۔ مگر ہاں اس کی گردن اب پھر سے اونچی ہو گئی تھی۔ کتنے سال سے اس کی بہن کی وزنی جوانی اس کے گلے میں بانہیں ڈالے جھول رہی تھی۔ اب تو بوجھ اُتر گیا۔ تھا۔ وہ فخر سے گردن اٹھا کر سڑکوں پہ چلتا تھا۔ بات بات پر گردن پیچھے پھینک پھینک کر قہقہے لگاتا تھا۔ کتنے عرصے سے اس کے قہقہے اس کے حلق ہی میں رُکے ہوئے تھے۔ محفوظ تھے۔ اب وہ شاذ و نادر ہی زمین کی طرف دیکھتا۔ اب اس کو زمین کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جتنا سونا چاندی اور روپیہ پیسہ اس کی بہن کی شادی کے لئے ضروری تھا اُس نے زمین کے حلق میں انگلی ڈال کر سب اگلوا لیا تھا۔

اب وہ دن میں ایک بار ضرور اپنی بہن کو دیکھنے اس کی سسرال چلا جاتا۔ اور نہایت مسرور گھر لوٹتا۔ کہ بہن کے گالوں میں گلاب کی سُرخ سُرخ کلیاں نمودار ہو رہی ہیں۔ آج کل یا پرسوں یہ کلیاں کھِل کر بڑے بڑے لال لال پھول بن جائیں گی۔ اور اس کا دولہا ان پھولوں کے گرد مست مخمور اور مسرور بھنورے کی طرح منڈلایا کرے گا۔ اس مزیدار خیال سے خوش ہو کر سگریٹ کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے وہ آسمان کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتا جیسے وہ تنہا فاتح ہے۔ جیسے نہ آسمان شکست دے سکا اور نہ زندگی۔ البتہ اس کو ساری زندگی میں صرف ایک دُکھ تھا کہ وُہ بہ جبیں جہاں کو اپنا نہ بنا سکا۔ اگرچہ بہ جبیں جہاں ابھی تک کنواری تھی۔ لیکن اس کا کنوارپن ایک ٹرافی تھا جس کو جیتنے کے لئے چند خاص خاص شرائط مقرر تھے۔ آصف نے بہ جبیں جہاں کے باپ کو اس کے بے تکلف دوستوں اور عزیزوں سے کہلوا بھیجا۔ کہ وہ بہ جبیں سے محبت کرتا ہے۔ بہ جبیں کے باپ نے جواب دیا کہ شادی کے لئے محبت اتنی اہم نہیں بیوی کو اچھا مکان اچھی غذا! اچھے کپڑے زیادہ ضروری ہیں ————— آصف کے رقیب، نیلام کی بولی لگا رہے تھے۔

"میرے تین مکانات ہیں۔ وہ تینوں بہ جبیں کے نام لکھ دوں گا۔"

"میری آمدنی چار سو روپیہ ماہانہ ہے۔"

"میری جواہرات کی دکان ہے ۔ مہ جبیں ساری عمر جگمگاتی رہے گی"۔
"میری دو موٹریں ہیں ۔ مہ جبیں کو دنیا جہاں کی سیر کراؤں گا"۔
"میری پنشن پندرہ سو روپیہ ماہانہ ہے ۔ میں مہ جبیں کو کشمیر کی جنت میں لے جاؤں گا"۔
آصف ہار گیا۔ اسی کے دفتر میں ہیڈ کلرک نے وہ ٹھوڑی جیت لی آصف کی جان تمنا جیت لی۔

محبوبہ کے چھن جانے کے بعد آصف کو کسی دوسری محبوبہ کی ضرورت نہیں تھی ۔ البتہ اس کی جوانی کے خلاء میں اس کو اتنا سناٹا، سکوت اور ٹھنڈک محسوس ہوتا کہ اس کا جی چاہتا کہ اس مہیب سناٹے میں دفعتاً کانچ کی چوڑیاں بجنے لگیں۔ پازیب کی میٹھی میٹھی جھنکار پیدا ہو۔ دوپٹے سرسرانے لگیں۔ چھم چھم چھم چھم ٹاپ ٹپر ——— محبوبہ نہیں سہی کوئی عورت ہی سہی جو اس کی زندگی میں مہمان کی طرح ہی کیوں نہ آئے۔

اور جلد ہی ایک عورت اسے مل گئی۔ شہر میں عیسائیت کی تبلیغ کرنے کے لئے ایک مشن آیا ہوا تھا۔ اس میں بہت سی لال پریاں تھیں۔ ان کے جسم جیسے سپید سپید شیشوں سے بنائے گئے تھے اور اندر گہرا سرخ رنگ بھر دیا گیا تھا۔ ہندوستان کے بھوکوں ننگوں کی جان میں جان آئی۔ وہ اپنے اپنے ویران راستوں جیسے مذاہب کو چھوڑ کر اس شاہراہ پہ چلنے لگے۔ جہاں قدم قدم پہ ہوٹلیں اور سرائیں لگی ہوئی تھیں۔ کھانا پینا ——— روپیہ پیسہ عورتیں۔ آصف کو ان نعمتوں میں صرف ایک ہی نعمت چاہئے تھی .... مس فاکس۔

واللہ کیا عورت تھی مس فاکس! پہلی بار آصف نے اس کو امپیریل پوسٹ آفس سے نکلتے دیکھا تھا۔ بھرا بھرا جسم۔ لمبا قد۔ اور اس کے عضو ایسے اس کو لگتے ہیں جیسے سارا گلابی رنگ صرف کر دیا تھا۔ اس کے گالوں پہ میٹھے سیبوں کے بجائے پارک شاٹر کے کسیلے ٹماٹر تھے۔ پوسٹ آفس سے نکل کر جب وہ اپنی سائیکل پہ چڑھ رہی تھی تو اس کی پنڈلیوں کی تھرکتی ہوئی لال لال مچھلیوں کو دیکھ کر اس نے ایسے محسوس کیا جیسے وہ زندہ ہے۔ وہ مر گیا ہے وہ مر گیا ہے۔ وہ زندہ ہے ....

اس نے قومی نسلی تعصب کو دل ہی دل میں دھتکار بتائی اور ایک صاف دل سے اعتراف کرنے لگا کہ واقعی دنیا کے دوسرے ملکوں نے عورت کی اصلی قدر جانی پہچانی ہے۔ یہاں ہندوستان میں تو عورت کی مٹی پلید ہو گئی۔ اس مٹی کو تو صرف گیندے، زعفران، بنفشے اور سورج مکھی کے پھول ہی اگھو سکتے ہیں۔

دوسرے تیسرے ہی دن اس نے مس فاکس سے راہ و رسم بڑھالی اور جوانی پھر لوٹ آئی۔ وہ اب اپنی بہن کو بہت کم یاد کرنے لگا۔ گلاب کا پھول سامنے ہو تو گیندا کہاں یاد آتا ہے؟

ایک دن مس فاکس آرکسٹرا پہ ایک المیہ فراقیہ گیت الاپ رہی تھی۔ اور آصف اس شاعر کو جس نے ایسا گیت لکھا۔ دل ہی دل میں کوستا ہوا چپ چاپ سن رہا تھا کہ اچانک اس کو گیندے کا پھول یاد آ گیا ——— کیونکہ دروازے سے اس کی بہن کا لالچی شوہر داخل ہوا۔ اور پھر آصف کو دیکھ کر ٹھٹکا۔ رکا۔ جھجکا۔ لیکن جب مس فاکس مسکراتے ہوئے اس کو بلانے لگی۔ تو آصف صوفہ سے اٹھ کھڑا ہوا مس فاکس آصف کے بدلتے تیور دیکھ کر ہنس پڑی۔ یعنی"........... وہ تو روز یہاں آتا ہے"۔

اسی شام وہ اپنی بہن کے گھر گیا۔ اس نے اس سے ایک لفظ نہ پوچھا۔ سگریٹ پیتا رہا۔ اور اس کے بھینچے ہوئے ہونٹ جو بار بار ہلکی سی کپکپاہٹ سے کھل جاتے تھے۔ اس کی جھکی جھکی پلکیں اور پلکوں کی گھنیری چھاؤں میں کانپتے ہوئے تارے دیکھے۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے انہی گالوں پہ اس نے سرخ سرخ لکیروں کا ایک جال بنتے دیکھا تھا۔ آج وہ جال .... اُف! عورت کا رنگ بھی کیسا تغیر پذیر ہے کیسا بے اعتبار کیسا ناپائدار اور کیسا عارضی ہوتا ہے۔!

جب وہ گھر پہنچا تو اس کا دماغ ایک دم ساکت ہو گیا تھا۔ اس کو اب کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ ہنس رہا ہے تو کیوں ہنس رہا ہے۔ رو

رہا ہے تو کیوں رو رہا ہے۔ اب شاید اس احساس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ زندگی نے اس کے ہڈیاں نکلے ہوئے سینے پہ ایسا زبردست گھونسا لگایا تھا کہ وہ تین دن تک چارپائی سے نہ اٹھ سکا۔ کھانستا رہا۔ بال نوچ نوچ کر روتا رہا۔ کبھی ہنستا رہا۔ کبھی گاتا رہا۔ اور چوتھے دن جانے کیا اس کے جی میں سمائی اپنا پرانا رفیق، وہی میلا وبیز کوٹ پہنے باہر نکلا۔ اس کی آنکھوں میں سُرخ سُرخ شعلے لپک رہے تھے جیسے کسی کو بھسم ہی کر دیں گے۔

چینی ریستوراں کے چبوترے پر نکھری ہوئی شام اپنا سفید بھیگا ہوا دوپٹہ پھیلائے کھڑی تھی۔ وہ بس اسٹاپ کے ستون سے کندھا ٹیکے سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے بنا بنا کر توڑ رہا تھا۔ اور ہر آنے جانے والے کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا——— ایک بھاری بھرکم۔ پنجابی عورت کو اپنے دُبلے پتلے مُنحنی پستہ قد شوہر کے ساتھ جُھک جُھک کر باتیں کرتا دیکھ کر تو وہ بڑے زور سے ہنس پڑا۔ پنجابی عورت خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اپنے شوہر کا غصہ رفع کرنے لگی——— "کوئی پاگل معلوم ہوتا ہے۔ ہُوں" وہ ان کے قریب جا کر کہنے لگا۔

"نہیں نہیں——— میں پاگل نہیں ہوں پاگل تو گاندھی ہے۔ نہیں جناح پاگل ہے——— نہیں نفیرا ہی پاگل ہے۔ وہ مزدوری کرتا ہے۔ ہُو ہُو ہُو"

پنجابی عورت چبوترے پر کھڑے ہوئے پولیس مین کو دیکھنے لگی اور اس اثنا میں سامنے سے مس فاکس سائیکل پر آتی دکھائی دی اور وہ آصف لے ڈارلنگ حسینہ۔ تیرا انتظار کب سے تھا۔ کہتا ہوا اُس کی طرف بڑھا وہ بھی اس کو دیکھ کر مسکراتی ہوئی سائیکل پر سے اتر پڑی۔ پھر جانے کیا ہُوا۔۔۔ چینی ریستوراں کا سارا چوراہا غضب ناک چیخوں سے گونج رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ مار ڈالا۔ ہاں مار ڈالا۔ خون۔ دوڑو پکڑو۔ پکڑو۔ مارو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جب چیخیں مدھم ہو کر بھنبھنانے لگیں تو آسمان کے پہلے ستارے نے دیکھا کہ مس فاکس خون میں لتھڑی سمنٹ روڈ پہ پڑی ہوئی تھی۔ اور خون کی دھاریں اس کی مرمریں لمبی پتلی دلآویز گردن سے نکل نکل کر بہ رہی تھیں۔ آصف کو دو سپاہیوں نے پکڑ رکھا تھا۔ اور وہ اپنا خونی چھرا فضا میں اُٹھائے چیخ رہا تھا۔

"دیکھو! سارا چوسا ہُوا خون بہ رہا ہے۔ اب میری بہن کے رخساروں پہ گیندے کے پھول کبھی نہ کھلیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں اہلِ وطن۔ ہمارا چوسا ہُوا خون ۔ ۔ ۔ میں نے مس فاکس کو مار ڈالا ہے اپنی جوانی کو مار ڈالا ہے۔ ہاں اہلِ وطن"

پولیس انسپکٹر آصف کو گردنیاں دے رہا تھا۔ اور لوگوں کی چہ چہ——— چہ چہ زبانیں چل رہی تھیں۔

"واہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بڑا بہادر ہے ۔ ۔ ۔ عورت کو مار ڈالا"

"پاگل معلوم ہوتا ہے کوئی"

"ہائے رقابت —" شاید کوئی شاعر بولا۔

"ابی کوئی انقلابی معلوم ہوتا ہے" شاید کوئی کلرک بولا۔

"کمبخت ان نکرام انقلابیوں کی وجہ سے ہی دیس کو آزادی نہیں ملتی" شاید کوئی بنیا بولا۔

پولیس انسپکٹر غصے کے ریلے سے کانپتی ہوئی آواز میں اسے گردنی دیتے ہوئے بول رہا تھا "بدمعاش، ذلیل کیہ ۔ ۔ ۔"

آصف چیخ رہا تھا۔

مار ڈالا ہے۔ اپنی جوانی کو مار ڈالا ہے۔ سارا چوسا ہوا خون ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بس فاکس کو مار ڈالا ہے!

سپاہی گردنیاں دے دے کر اس کو اکسفورڈ اسٹریٹ پر دھکیلتے لے جانے لگے۔

"ہاں اہلِ وطن ۔ ۔ ۔"

قدرت اللہ شہاب

سردار جسونت سنگھ

راجہ بازار کے عقب میں گوردوارہ دمدمہ صاحب کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اندرونی دالان میں دسویں پادشاہ سری گورو گوبند سنگھ کلغی والے کا گورپرب منانے کے لئے دیوان لگا ہوا تھا، اور بیرونی صحن اور گوردوارہ کے آس پاس ساری کھلی جگہوں میں راولپنڈی اور راولپنڈی کے مضافات کی بیشتر خالصہ آبادی سنگھ سبھا منا رہی تھی۔ کہوٹہ، مری، گوجرخان، چکوال اور پنجاڑ تک سے لوگ جوق در جوق آئے ہوئے تھے اور صبح سے راولپنڈی کے کوچہ و بازار چوڑی چوڑی چھاتیوں والے کڑیل جوانوں اور رنگ برنگ دوپٹوں والی خوبصورت، صحت مند عورتوں کی ٹولیوں سے بھرے ہوئے تھے۔

ہر گاؤں کی اپنی اپنی الگ ٹولی تھی اور برادری کا کوئی بڑا بوڑھا اس کی قیادت کر رہا تھا۔ اسی ایک ٹولی میں ماں باپ تھے، بیری تھے بھائی بہن تھے، عاشق معشوق تھے ——— اور پھر بچے تھے۔ خوبصورت، صحت مند، چاق و چوبند بچے جو راہ چلتے چلتے چوکڑیاں بھرتے تھے، قلابازیاں لگاتے تھے، نگرے بجاتے تھے، جھیئی گاتے تھے اور اپنی چھوٹی چھوٹی لاٹھیاں ہوا میں اچھال کر "جو بولے سو نہال ——— ست سری اکال" کے نعرے لگاتے جاتے تھے۔

جوانوں نے سفید، نسواری اور نیلے لٹھے کے تہ بند پہنے ہوئے تھے، گھٹنوں تک لمبی لہریئے کی دھاری دار قمیص۔ اس پر مخملی، ریشمی یا گبرون کی شوخ واسکٹیں، سیپ کے بٹنوں کی قطاریں، جیبوں میں سے دو دو بالشت باہر لٹکتے ہوئے رومال، سر پہ رنگ برنگے صافے، آنکھوں میں سُرمہ، ہاتھوں میں لمبی لمبی چمکتی ہوئی سمدار لاٹھیاں، کسی نے تہ بند کی گانٹھ میں چھپائی ہوئی شراب کی بوتل یا ٹھرے کا ادھا۔ عورتوں نے اخروٹ کے چھلکے مل مل کر اپنے ہونٹ کبوترنہ کے خون کی طرح سُرخ کئے ہوئے تھے، ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں کاجل کی موٹی موٹی لکیریں اور دھوپ میں پاپیادہ چلنے کی وجہ سے گالوں میں تمتماتے ہوئے سُرخ سُرخ انگارے ان کے لباس کی زرق برق بھڑک کے ساتھ مل کر رنگ اور نور کی پھلجڑیاں سی پیدا کر رہے تھے۔

گوردوارہ دمدمہ صاحب کے باہر سنگھ سبھا میں پہنچ کر گاؤں کی ٹولیوں کی دستہ بندی قائم نہیں رہتی تھی۔ جھولے، چنڈول، کشتی کے اکھاڑے

دو پیسے میں بارہ من کی دھوبن اور بنگالے کا جادو دکھانے والے مداری، ایک آنے میں "جوان عاشق عرف بہرام" دکھانے والے تھیٹر، دو آنے میں تین تصویریں کھینچنے والے فوٹو گرافر، چار آنے میں بچھڑے ہوئے محبوب سے ملانے والے نجومی ——— کنگھیوں، آئینوں، رومالوں، حلوائیوں اور چاٹ والوں کی دکانیں ——— یہ سب اپنی کشش سے گاؤں کی بندھی بندھائی ٹولیوں کو تتر بتر کر دیتے تھے اور کچھ عرصہ کے لئے اس ہجوم میں سے پانی کی ہر پریشان لہر اپنی سطح کو پا لیتی تھی ——— اور پھر رفتہ رفتہ یہ ساری بکھری ہوئی لڑیاں اپنے مرکز پر اکٹھی ہو جاتی تھیں۔ ہر مرکز گوردوارہ صاحب کے اندرونی دالان میں تھا جہاں ایک زرکار شامیانہ کے نیچے گرنتھ صاحب مخملی غلافوں اور تکیوں کے درمیان رکھا ہوا تھا۔ گرنتھی الوپ سنگھ برابر کبھی دائیں کبھی بائیں ہاتھ سے سفید گھوڑے کی دم سے بنائی ہوئی چوری جھل رہا تھا اور سامنے ایک طرف مرد اور دوسری طرف عورتیں دیوان میں سنگت سجائے بیٹھی تھیں۔

عورتوں کی سنگت میں گاؤں کی بھری بھری، گدری گدری لڑکیاں بھی تھیں جن کے چہرے کچے ناریل کے گودے کی طرح نکھرے ہوئے تھے اور جن کے تن بدن سے سینٹ یا عطر کی جگہ صرف جوانی کی مہکار آتی تھی۔ کالجوں میں پڑھنے والی شہر کی چھوکریاں بھی تھیں جنہوں نے اپنے رخساروں پر غازے اور پاؤڈر، سرخی اور سرمے کی ڈوکرا پنسلوں کی مدد سے عجیب و غریب سنگار کئے ہوئے تھے۔ ان کے اجسام سے جوانی خون کی جگہ مصنوعی عطریات اور سینٹوں کی خوشبوئیں آ رہی تھیں اور انہوں نے اپنی زلفوں کی سیاہ ناگنیں کٹوا کسان کی جگہ مشینوں کے کاڑھے ہوئے کنڈل بنوائے ہوئے تھے، اسی شان میں حسن ابدال کی بڑی سردارنی آنند کور گھٹنوں سے لدی بیٹھی تھی۔ اس کے اردگرد اس کی چاروں لڑکیاں تھیں انہوں نے الگ الگ رنگ کی بنارسی ساڑھیاں پہنی ہوئی تھیں۔ ان کی انگوٹھیاں، کانوں کی بالیاں، کلائی گھڑیوں کی پٹیاں، سینڈل اور ہینڈ بیگ بھی ساڑھیوں کے ہم رنگ تھے۔ رات کے آٹھ بجے بھی انہوں نے آنکھوں پہ تازہ فیشن کے سیاہ چشمے آویزاں کئے ہوئے تھے تاکہ کالے شیشوں کے مقابلے میں ان کے گورے رنگ اور بھی زیادہ نکھرے ہوئے نظر آئیں اور پنڈال میں جگمگاتی ہوئی بجلیوں کی روشنی ان کی نازک آنکھوں پر گراں نہ گزرے۔ جب یہ لڑکیاں لاہور میں ہوں تو انہیں بلاناغہ گانے، ناچنے، بندوق کا نشانہ لگانے، تیرنے اور پڑھنے لکھنے کے سوا باقی تمام فنونِ لطیفہ کے مقابلوں میں اول انعام ملا کرتے تھے۔ جب وہ چھٹیاں گزارنے حسن ابدال آتیں تو راولپنڈی کوہ مری اور ایبٹ آباد سے سہیلیوں کو اکٹھا کر کے دیہات سدھار کے پروگرام بنتے تھے۔ کہیں نائٹ سکول کھل رہا ہے، کہیں بچوں کو نہلانے کا دن منایا جا رہا ہے، کہیں صفائی کا ہفتہ، کہیں پھولوں، پھلوں یا سبزیوں کی نمائش ہے، ان گوناگوں مشاغل سے تھک کر کبھی کبھی چاندنی راتوں میں مون لائٹ پک نک ہوتی تھی اور یہ نازک اندام خواتین سیاہ چشمے لگائے، ہلکی پھلکی خوبصورت چھتریاں تان کر اپنے جسم کو چاند کی کرنوں سے بچائے چہل قدمی کو نکلا کرتی تھیں ———

گوردوارہ صاحب کے دالان میں نہ تو لاہور کی رقص گاہوں کی نفاست تھی اور نہ ہی چاندنی رات میں حسن ابدال کے مرغزاروں کی پاکیزہ لطافت، بلکہ یہاں تو ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھے ہوئے اجسام سے بہتے ہوئے پسینے کی بو چھائی ہوئی تھی اور اس فضا میں حسن ابدال کی بڑی سردارنی کی چاروں بیٹیوں کا دم بری طرح گھٹ رہا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد بڑی سردارنی اپنے سامنے رکھے ہوئے چاندی کے بکس میں سے کبھی الائچی کبھی سپاری، کبھی پیپرمنٹ کی ٹکیاں اور کبھی روح کیوڑہ اور عرقِ گلاب میں بھگوئے ہوئے منقے نکال کر چاروں بیٹیوں میں تقسیم کرتی تھی۔ لیکن ان مفرح اشیاء سے کوئی چیز بھی ان کو تسکین پہنچانے میں کامیاب نہ ہوتی تھی۔ بڑی سردارنی خود اپنے ہاتھ سے باری باری ان کے چہروں پر صندل کے بنے ہوئے ہلکے پھلکے پنکھے سے ہوا کرتی تھی۔ یہ پنکھا میسور سے اس نے خاص طور پر بنوایا تھا اور اس کی ہر جنبش کے ساتھ فضا میں صندل کی مشام نواز مہک پھیل جاتی تھی۔ لیکن بڑی سردارنی کی نازک اندام بیٹیاں جس تکلیف میں مبتلا تھیں، اس میں صندل کی مسیحائی بھی کارگر ثابت نہیں ہو رہی تھی۔

عورتیں نوخیز نازک مزاجی کے اس مظاہرے پر ناک بھوں چڑھانے کے علاوہ اور کیا کرتیں لیکن مردوں کے دل اس تکلف کو دیکھ کر بہت بے چین تھے۔ گیانی ترلوچن سنگھ اور اس کے ساتھی بڑے سوز و گداز سے ایک المناک شبد الاپ رہے تھے جس کا مفہوم یہ تھا کہ "اے گرو کے بیٹیا اپنے سارے دکھ مجھے دو اور میرے سارے سکھ تم لے لو۔ اگر تمہیں کانٹا چبھے تو میرے سینے میں تلوار مار دو، اگر تمہیں ٹھوکر لگے تو مجھے زندہ زمین میں گاڑ دو۔ اگر تمہیں ذرا سی آنچ آئے تو مجھے آگ میں پھینک کر جلا ڈالو۔ اے گرو کے صاحبزادو۔۔۔۔۔"

عورتوں کی آنکھیں اس شبد کو گاتے گاتے نمناک تھیں۔ ان کے سینے میں عقیدت اور عبودیت اور قربانی کے جذبات بڑی شدت سے موجزن ہو رہے تھے۔ ایک ہاتھ سے وہ آنچل سے آنسو پونچھتی جا رہی تھیں اور دوسرے ہاتھ سے اپنے سینے کا تلاطم تھامے بڑی غم ناک لَے میں شبد کے بول گا رہی تھیں۔ مردوں پر بھی رقت طاری تھی لیکن ان میں سے اکثر گرو کے بیٹوں کی جگہ حسن ابدال کی بڑی سردارنی کی صاحبزادیوں کے حضور میں اپنی قربانیوں کی بھینٹ چڑھا رہے تھے۔

گاؤں کے لمبے لمبے چوڑے چوڑے کڑیل جوان ان شبدوں کی لَے میں اپنے دل پسند "ماہیا" کے دوہے گنگنا رہے تھے:

اے حسین دوشیزہ!
اگر اس چار دیواری میں تیرا دم گھٹتا ہے
تو میرے ساتھ بھاگ چل
میں تجھے اپنے کندھوں پر اٹھا کے
بہت دور لے جاؤں گا
کھجوروں کے جھنڈ میں
چنے کے سرسبز لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے پاس ۔۔۔۔
اے نازک اندام دوشیزہ ۔۔۔۔
اگر تیرے سینے کے کبوتر پھڑپھڑا رہے ہیں
تو رات کے وقت چوری چوری میرے کنوئیں پر آ جا
وہاں میں نے بڑے خوبصورت جال بچھائے ہوئے ہیں
جو جنگلی کبوتر ایک دفعہ زیرِ دام آیا
وہ پھر واپس نہیں گیا ۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔

شہر کے نوجوان بھی اپنے دل میں کچھ ایسے ہی ارادے رکھتے تھے لیکن کھجوروں کے جھنڈ، چنے کے سرسبز لہلہاتے ہوئے کھیت اور رات کے وقت "چوری چوری" چلتے ہوئے رہٹ ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لئے وہ بڑی سردارنی کی چاروں بیٹیوں کو ڈلہوزی روڈ، لال کرتی یا راجہ بازار کے کسی ریسٹوران میں لے جانے کی آرزو پر ہی قناعت کرتے تھے جہاں بجلی کے میزوں کے گرد بیٹھ کر وہ پنکھوں کی ہوا میں، لیمونیڈ، آئس کریم، سوڈا، روز اور وسکی کا آرڈر دیں اور برف سے بھرے ہوئے گلاسوں کا لمس ان خوبصورت ہونٹوں کو تازگی بخش دے، جو اس گرمی میں گلاب کی پتیوں کی طرح خشک ہو کر مرجھائے جا رہے تھے ——— البتہ سردار جسونت سنگھ کو یہ تشویش بھی تھی کہ اس کم بخت شہر راولپنڈی میں ایک بھی سلیقے کا ریسٹوران نہیں جس میں انسان لڑکیوں کو بلا پس و پیش لے جائے اور اگر اور نہیں تو کم از کم دو چار ڈانس ہی مار لے۔ ولایت سے آنے کے بعد وہ خالی شربت یا لیمونیڈ یا آئس کریم پر جشن منانے

کا قائل نہیں رہا تھا۔ اس معاملہ میں اب وہ ضرورت سے زیادہ ترقی پسند ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب کبھی اس کا کسی لڑکی سے سامنا ہوتا تو اس کے دل میں پہلی امنگ یہ اٹھتی کہ ہاتھ جوڑ کر "ست سری اکال" کہنے کی بجائے وہ اس کے ساتھ مسکرا کر ہاتھ ملائے، سینما لے جا کر شانہ سے شانہ بھڑا کر بیٹھے اور پھر کسی ریسٹوران میں کھانا کھلائے، ڈانس کرے .... راولپنڈی میں سینما تو تھے لیکن شائقوں کی کمی تھی اور ریسٹوران تو گویا نہ ہونے کے برابر تھے۔ ابھی چند برس کی بات ہے کہ جنگ کے زمانے میں یہی ریسٹوران پیرس کی نقل کرتے تھے۔ شراب، ڈنر اور تمبولا کے کوپنوں کے ساتھ ڈانس کے پارٹنر بھی مہیا ہوتے تھے اور ایک ایک کوپن کو حاصل کرنے کے لئے گھنٹوں 'کیو' میں کھڑا ہونا پڑتا تھا لیکن اب چاروں طرف الّو بول رہا تھا۔ شراب کی جگہ "سری رام مارکہ" لیمونیڈ اور جگادھر سنگھ کے کارخانے کی بنی ہوئی آئس کریم بک رہی تھی، آرکسٹرا کی جگہ فلمی گانوں کے گھسے ہوئے ریکارڈ بجتے تھے اور ناچ کا تو کہیں نام و نشان ہی نہ تھا۔

اس ذہنی اور اعصابی تشنگی کو بجھانے کی کوشش میں وہ کئی بار پٹتے پٹتے بچا تھا کیونکہ اس کے والد سردار گوردیال سنگھ پرانی وضع کے بزرگ تھے اور کسی حالت میں بھی اس بات کے روادار نہ تھے کہ ان کا بیٹا پرائی لڑکیوں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر "ست سری اکال" کہنے اور حیاداری سے آنکھیں جھکا لینے کی جگہ ہاتھ ملانے یا شانہ سے شانہ بھڑانے کی کوشش کرے اور ڈانس تو خیر بہت دور کی بات تھی۔

سردار جسونت سنگھ دل ہی دل میں پریشان ہو رہا تھا کہ ہائے اب کے بھی بہار یونہی بیت جائے گی! حسن ابدال کی بڑی سردارنی کی چاروں لڑکیاں کوئی ہر روز تو راولپنڈی آتی نہیں ہیں تو صد حیف کہ انہیں ایک ڈانس پر بھی نہ لے جا سکے۔ یہ احساس اس کے زخموں پر بڑی شدت سے نمکپاشی کر رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے راولپنڈی اور راولپنڈی کے بے کیف ریسٹورانوں کے مالکوں اور منیجروں کی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو بڑی بڑی ثقیل گالیوں سے نوازنا شروع کر دیا۔ غصے سے بل کھا کھا کر وہ اندر ہی اندر گالیاں دیتا تھا اور دایاں ہاتھ زور زور سے اپنی ران پر مارتا جاتا تھا۔

سردار جسونت سنگھ کے والد بزرگوار سردار گوردیال سنگھ قریب ہی بیٹھے شبد الاپ رہے تھے۔ بیٹے کی وارفتگی دیکھ کر ان کا جی باغ باغ ہو گیا اور دل ہی دل میں انہوں نے واہگورو جی مہاراج کو تعظیم دی کہ ولایت سے ہو آنے کے بعد بھی ان کا فرزند دلبند، مذہب کے جذبات سے بدستور سرشار ہے اور گورو کے صاحبزادوں کی شہادت کے شبد پر بھری محفل میں بے اختیار گریہ وزاری کر رہا ہے......

شبد ختم ہوا تو عورتوں اور مردوں نے اپنے اپنے تصورات کی بھول بھلیوں سے نکل کر زور زور سے ناک صاف کئے اور بلند آواز سے "جو بولے سو نہال ــــ ست سری اکال" کا نعرہ لگایا۔ شبد کے بعد گورو گرنتھ صاحب اور جپ جی کا پاٹھ ہوا۔ پھر ارداس ہوئی۔ ارداس کے بعد لانگری سنتوکھ سنگھ دو نہنگ سیوا کاریوں کے ساتھ نمودار ہوا اور سنگت میں پرشاد تقسیم ہونے لگا۔

نہنگ سیوا کاریوں نے سوجی کے حلوے کی بڑی بڑی بالٹیاں اٹھائی ہوئی تھیں، اور وہ خطِ مستقیم میں لانگری سنتوکھ سنگھ کے آگے پیچھے چل رہے تھے۔ لانگری سنتوکھ سنگھ نے آستینیں چڑھائی ہوئی تھیں اور وہ غڑاپ سے کہنیوں تک بازو بالٹی میں ڈبو ڈبو کر مٹھی بھر تر بتر حلوہ برآمد کرتا تھا اور بڑی چابکدستی سے اسے ہوا میں اچھال کر گیند کی صورت بنا بنا کر تقسیم کرتا جاتا تھا۔ اس عمل میں اس کا بازو سرگودھا کے گھی میں بری طرح لتھڑ جاتا تھا اور وہ دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے بازو پر لگا ہوا گھی اکٹھا کر کے واپس بالٹی میں نچوڑتا جاتا تھا اور پھر وہ اپنی گھنی داڑھی کو انگوچھے کی طرح رگڑ کے اپنے بازو، ہاتھ اور انگلیوں کی صفائی کر لیتا تھا۔ سالہا سال سرگودھے کا خالص گھی پی پی کر لانگری سنتوکھ سنگھ کی داڑھی پچاس برس کے سن میں بھی کاجل کی طرح سیاہ، ابرک کی طرح چمکیلی اور پرانے بڑ کے تنے کی طرح گھنی اور پیچ وار تھی۔ داڑھی میں جابجا بڑے بڑے پیچیدہ کنڈل تھے جیسے تالاب میں بانس گھما کر بھنور در بھنور پیدا کئے گئے ہوں۔ پرشاد بانٹتے وقت لانگری سنتوکھ سنگھ کے ہاتھ اور پاؤں یکساں برق رفتاری سے چلتے تھے۔ ہاتھوں سے تو وہ حلوے کی گولیاں بنا بنا کر تقسیم کرتا تھا لیکن پاؤں کے انگوٹھے کی داب سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑ جڑ کر بیٹھے ہوئے انسانوں کے ہجوم میں اپنا راستہ تلاش کرتا تھا۔ اس جستجو میں کبھی اس کے پاؤں کے انگوٹھے کسی کی رانوں میں گدگدی کرنے لگتے، کبھی ان کا تصادم پنڈلیوں

کے ساتھ ہوتا تھا اور کبھی وہ راستہ ٹٹولتے ٹٹولتے ایسی پگڈنڈیوں پر بھی جا بھٹکتے تھے جو شارع عام نہیں ہوتیں! خاص طور پر جب لانگری سنتوکہ سنگھ عورتوں کی سنگت میں پرشاد بانٹ رہا ہو تو بھولنے بھٹکنے کے یہ حادثات بڑی شدت سے رونما ہوا کرتے تھے۔

پرشاد ہو چکا تھا سب نے کھڑے ہو کر بڑے جوش و خروش سے "راج کرے گا خالصہ" کا ملّی ترانہ گایا اور پھر "ست سری اکال" کے نعروں کے درمیان دیوان برخاست ہوا' اس موقع پر ایک بار پھر بڑے زوروں کی ریل پیل ہوئی اور کچھ عرصہ کے لئے نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز ـــــ گوردوارہ دمدمہ صاحب کے اندرونی صحن سے بیرونی صحن تک آتے آتے بہت سے یارانِ تیزگام نے منزل کو جا لیا۔ لیکن سردار جسونت سنگھ کھڑے کا کھڑا ہی رہا۔ ولایت میں اس نے "لیڈیز فسٹ" کے آداب بڑی محنت سے سیکھے تھے۔ اب وہ ریل پیل اور دھکم دھکا میں شامل ہو کے عورتوں کی ٹانگوں، چھاتیوں اور کولہوں سے ٹکرا ٹکرا کر اپنے کلچر کو پراگندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ سلیقے سے ایک طرف کھڑا رہا اور اس کے سامنے سے عورتوں اور مردوں کے ہجوم سمندر کی لہروں کی طرح ایک دوسروں سے ٹکراتے' ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتے گذرتے رہے۔ جب بھیڑ چھٹ گئی تو سردار جسونت سنگھ گوردوارہ سے باہر آیا جہاں تین تانگے کھڑے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک تانگے میں اس کا باپ' اس کی ماں اور حسن ابدال کی بڑی سردارنی آنند کور سوار تھیں۔ دوسرے تانگے میں سردارنی کی تین بیٹیاں بیٹھی تھیں۔ تیسرے تانگے میں بڑی سردارنی کی چھوٹی بیٹی اور سردار جسونت سنگھ کی بہن کوشلیا تھیں، جسونت سنگھ کے پاس اپنا موٹر سائیکل تھا۔ اس نے سٹارٹر پر زور سے پاؤں مار کر انجن چلایا۔ پہلے تانگے والے نے جو حکیرال کا ہندو کھتری تھا "دیوی بھیرے والی تیری سدا ہی جے" کا نعرہ لگا کر گھوڑے کو چابک مارا' دوسرا تانگے والا کوہالے کا مسلمان سید تھا' جواب میں اس نے "پنج نعرے پنج تن کے ایک نعرہ حیدری ـــــ یا علی" کی صدا لگائی۔ تیسرا تانگے والا نسبتاً جوان تھا اس لئے وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی خوبصورت لڑکیوں میں زیادہ منہمک تھا۔ اپنی بغل والی خالی جگہ دیکھ کر اس کے سینے پر سانپ سا لوٹ گیا۔ اس نے گھوڑے کی لگام کھینچ کر اسے روکا اور کہا۔

"ایک بی بی آگے آ جائے"۔

"کیوں جی! ہم ٹھیک ٹھاک بیٹھے ہیں یہاں" کوشلیا نے جواب دیا۔

"پیچھے بوجھ زیادہ ہے۔ تانگہ ہلکا رہو رہا ہے۔ اس لئے ایک بی بی آگے آ جائے"۔

کوشلیا بڑی جز بز ہوئی لیکن بڑی سردارنی کی چھوٹی لڑکی نے ایک ہاتھ سے کوشلیا اور دوسرے ہاتھ سے تانگے والے کے کندھے کا سہارا لے کر بیٹھے بیٹھے چھلانگ لگائی اور اچک کر اگلی سیٹ پر آ بیٹھی۔ "گوری گوری۔ او بانکی چھوری۔ کبھی میری گلی آیا کرو . . . . . ." اب اس تانگے والے کے منہ سے بھی نغمے پھوٹنے لگے اس کا چابک بار بار ہوا میں لہراتا تھا اور وہ حسن و جوانی کے قرب سے سرشار ہو کر گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا دوسرے تانگوں سے آگے نکل آیا۔ سڑک پر لوگ ادھر اُدھر بھاگ کر اس کی زد سے بچ رہے تھے اور شور مچا رہے تھے کہ "پکڑنا' پکڑنا گھوڑا بے قابو ہو رہا ہے" لیکن رحمان تانگے والا اپنے گھوڑے سے واقف تھا۔ یہ اس کا گھوڑا نہیں بلکہ اس کا دل تھا جو بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ کوشلیا دونوں ہاتھوں سے چھت کو پکڑے سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ بڑی سردارنی کی چھوٹی بیٹی ڈر کر تانگے والے کے بالکل قریب آ گئی تھی۔ اس کی زلفیں تانگے والے کے شانے کے بالکل قریب لہرا رہی تھیں۔ اس کا نیلا دوپٹہ تانگے والے کے بائیں بازو پر شعلے سے برسا رہا تھا۔ گھوڑے کی برق رفتاری میں ہر نئی سرعت کے ساتھ وہ سہم کر تانگے والے کے اور بھی قریب آ رہی تھی جو کوئی فلمی دھنیں ختم کرنے کے بعد اب گا رہا تھا ـــــ

"ہاتھ سینے پہ جو رکھ دو تو قرار آ جائے"

خدا خدا کر کے محلہ موہن پورہ آیا اور محلے کے سرے پر سردار گوردیال سنگھ کی حویلی۔ سردار جسونت سنگھ باہر کھڑا تانگوں کا انتظار کر رہا تھا۔ جب سب پہنچ گئے تو سردار گوردیال سنگھ نے رحمان کو ڈانٹا۔ "کیوں بے اناڑی گھوڑا نہیں سنبھال سکتے تو ماں کے پاس گھر بیٹھو' تانگہ کیوں ہانکتے ہو؟"

رحمان نے اپنی ترچھی ٹوپی کا زاویہ بدلا " سردار جی یہ گھوڑا بجلی ہے بجلی، کبھی بے قابو نہیں ہوتا۔ جاوڑا اپنے ہیرے گن لو موتیوں کی طرح سنبھال کر لایا ہوں —— ہاں !"

"موتیوں کا بچہ !" سردار گوردیال زیر لب بڑبڑائے۔ وہ اس وقت خواہ مخواہ جھگڑے کو طول دینا نہیں چاہتے تھے۔ کیونکہ کھانا کھانے کے بعد حسن ابدال کی بڑی سردارنی اور اس کی بیٹیوں کو لاہور کی ساڑھے بارہ بجے کی گاڑی پکڑنی تھی۔ چنانچہ انہوں نے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر چکوال کے ہندو کھتری تانگے والے کو دیا۔ " جاؤ تینوں برابر برابر بانٹ لینا۔"

رحمان نے چکوال کے ہندو کھتری اور کوہاٹ کے مسلمان سید تانگے والوں کو کن انکھیوں سے دیکھا " جاؤ بیٹا دونوں بانٹ لو، تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کسی رئیس سے پالا پڑا تھا یاروں نے تو اپنی فیس وصول کر لی ہے —— چل میرے شیر چھم چھم چھم " اس نے گھوڑے کو اشارہ کیا اور چشم زدن میں یہ جا وہ جا۔

حویلی پہنچ کر گوردوارہ دمدمہ صاحب کے دیوان کی ریل پیل کی صدائے بازگشت ایک بار پھر بلند ہوئی۔ حسن ابدال کی سردارنی کی بڑی لڑکی نے دیکھا کہ اس کے بائیں کان کی بالی غائب ہے اور ساتھ والے رخسار پر ایک کھردری سی انگلی کا نشان یوں نمودار ہے جیسے قندھاری انار کو تیز ناخن سے چھیل دیا گیا ہو۔ دوسری کی گردن پر چٹکیوں کے سرخ سرخ دھبے خون کی طرح جھلک رہے تھے، تیسری کے سینے کا بروچ غائب تھا اور چوتھی کا بلاؤز تار تار ہو کر پس پردہ کے مریں اور مہتابی رموز کو افشا کر رہا تھا۔ پر خود بڑی سردارنی پر بھی کوئی من چلا کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچ گیا تھا اور اب ان کی کمر میں بڑی شدت کا درد ہو رہا تھا۔ سردار جسونت سنگھ نے دیکھا کہ اس کی بہن کوشلیا کی انگوٹھی بھی موجود نہیں، جو اس نے لندن سے خاص طور پر اس کے لئے بیس پونڈ میں خریدی تھی۔ اگر اس انگوٹھی پر بھیڑ میں کوئی جیب کترا ہاتھ صاف کر گیا ہے تو بے شک بڑے قلق کی بات ہو گی لیکن اگر خود کوشلیا نے آج چوری چھپے اپنی انگوٹھی ترلوچن سنگھ کی نذر کر دی ہے تو کوئی بات نہیں، سردار جسونت سنگھ کو کوشلیا اور ترلوچن سنگھ کے عشق کا حال معلوم تھا۔ وہ دونوں گورڈن کالج راولپنڈی میں تھرڈ ایر میں پڑھتے تھے اور آپس میں شدت سے محبت کرتے تھے۔ اگر دو تین برس پہلے سردار جسونت سنگھ پر یہ راز افشا ہوتا تو وہ گنڈاسا اٹھا کر کوشلیا اور ترلوچن سنگھ دونوں کے سر قلم کر دیتا۔ لیکن ولایت سے آ کر وہ کوشلیا کو بہن کے علاوہ ایک ہمدرد اور رفیق کی حیثیت سے بھی چاہنے لگا تھا۔

رفتہ رفتہ وہ ایک دوسرے کے گہرے ہمراز بن گئے تھے اور جب کبھی سردار جسونت سنگھ کے اعصاب پر راولپنڈی کے بے کیف ریسٹورانوں اور ویران ہوٹلوں کا احساس بری طرح حملہ آور ہوتا تو وہ اپنے کمرے کے دروازے بند کر کے مغربی موسیقی کے ریکارڈ لگا کر کوشلیا کو رمبا، والز اور فوکس ٹروٹ کے ڈانس سکھاتا تھا۔

سردار جسونت سنگھ کا اصرار تھا کہ حسن ابدال کی بڑی سردارنی اور اس کی چاروں بیٹیوں کے کھانے کا انتظام میز کرسی، کانٹے اور چھری کے ساتھ ہونا چاہئے۔ کوشلیا نے بھی حسب توفیق اس کی تائید کی لیکن دستور کے مطابق سردار گوردیال سنگھ کی رائے کا پلہ بھاری رہا، دالان میں دری بچھا کر اس پر مرزا پور کے دو قالین لگائے گئے تھے۔ مہمانوں میں محلہ موہن پورہ کے بہت سے سردار اور سردارنیاں شامل تھیں۔ لانگری سنتو کہ سنگھ بھی موجود تھا۔ گوردوارہ میں پرشاد بانٹ کر اس نے دن بھر کی تکان دور کرنے کے لئے بھنگ کے تین چار گلاس چڑھا لئے تھے اور اب وہ نشے کی ترنگ میں بڑی سردارنی کے گھٹنے کے ساتھ گھٹنا لگائے بیٹھا کلغی والے دسویں پادشاہ کے شجاعانہ کارناموں پر گورمکھی کے مجاز اشلوک سنا رہا تھا —— اس کے دو بہنگ سیوا کاری یہاں بھی بڑے بڑے مور چھل پنکھے اٹھائے مہمانوں کے درمیان گھوم رہے تھے اور حتی الوسع کوشش کرتے تھے کہ پنکھے کی ہر جنبش کے ساتھ بڑی سردارنی کی بیٹیوں کے بالوں اور کپڑوں کی ساری مہک ان کے پاس کھنچ کر آ جائے۔

کھانے کے بعد بڑی سردارنی کی بیٹیوں نے یکے بعد دیگرے سردار جسونت سنگھ کے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر تیسری بار اپنے چہروں کو

آراستہ کیا۔ جسونت سنگھ اور کوشلیا دونوں انہیں رات کے ساڑھے بارہ بجے والی گاڑی پر سوار کرانے پر مامور ہوئے۔ گاڑی روانہ ہونے کے بعد سردار جسونت سنگھ نے کوشلیا کو اپنے پیچھے موٹر سائیکل پر بٹھایا اور پوچھا:

"کوشلیا! تم نے آج اپنی انگوٹھی نہیں پہنی کیا بات ہے؟"

"کوئی بات نہیں بھراتا جی! پہنی تو تھی شاید کہیں بھیڑ بھاڑ میں گر گئی ہو۔" کوشلیا نے بات بنانے کی کوشش کی۔

"گرتی کیسے؟ تمہاری انگلی پر تو وہ بہت پھنس کے آتی تھی نا؟"

سردار جسونت سنگھ کا منہ سامنے کی طرف تھا اس لئے وہ قرمزی رنگ کے اس غبار کو نہ دیکھ سکا جو شفقِ شام کی طرح کوشلیا کی آنکھوں، ہونٹوں اور رخساروں پر چھایا جا رہا تھا۔

"بھراتا جی!" کوشلیا کی آواز کا تناؤ ڈھیلا پڑ گیا، جیسے تیر نکل جانے کے بعد کمان اپنی اصلی حالت پر آجاتی ہے۔

"چلو اس کی طرف چلیں میری بھی ملاقات ہو جائے گی۔"

"بھراتا جی!" کوشلیا حیرت اور احسان کے جذبوں میں گڈمڈ ہو گئی۔

"ذرا میں بھی دیکھوں کہ وہ جاتو رہے کس ڈھب کا۔ ولایت میں لڑکیاں اپنے چاہنے والوں کی بڑے فخر سے نمائش کیا کرتی ہیں۔ میں تمہیں مارگریٹ براؤنی کا قصہ سناتا ہوں جو میرے ساتھ ہندوستان آنے پر جان دے رہی تھی۔" سردار جسونت سنگھ یہ کہانی سنانے میں اس درجہ منہمک ہوئے کہ کئی جگہ راہگیروں، چھکڑوں، بگھیوں، کتوں اور بجلی کے کھمبوں سے ٹکراتے ٹکراتے بچے۔ "بھلا سوچو تو کوشلیا اگر میں اسے لے آتا تو بھائیا جی جوتے مار مار کر ہوش ٹھکانے لگا دیتے دونوں کے۔ معلوم نہیں بیچاری کس حال میں ہوگی۔ کل یاد دلانا میں اسے ضرور خط لکھوں گا۔"

کوشلیا نے نہ تو مارگریٹ براؤنی کے حالِ زار پر کوئی خاص توجہ دی، نہ ہی سردار جسونت سنگھ کے خط لکھنے کی یاد دہانی کرائی۔ کیونکہ اس کے دماغ میں اول تو ترلوچن سنگھ ہی ترلوچن سنگھ بسا ہوا تھا اور اب اس کے علاوہ بھائیا جی کے جوتوں کا خیال بھی دوش بدوش ابھر آیا تھا۔ یوں سردار گوردیال سنگھ بڑے شفیق اور ہنس مکھ باپ تھے لیکن جہاں بچوں کی تعلیم یا تربیت یا چلن میں کسی قسم کا رخنہ نظر آتے وہاں ان کا ہاتھ بے اختیار جوتوں کی طرف لپکتا تھا۔ تنبیہ و سرزنش کا یہ فن انہوں نے اپنے ایامِ تحصیلداری میں حاصل کیا تھا اور ان کے تجربہ کے مطابق یہ طریق کار بہت مؤثر تھا۔

گورڈن کالج کے ہوسٹل کے کمپاؤنڈ میں پہنچ کر کوشلیا موٹر سائیکل سے اتری اور ایک بجلی کے کھمبے کے پاس جا کر، اس نے ایک پتھر سے کئی بار اپنے مخصوص انداز میں ٹن ٹن کی، جیسے تار گھر کا بابو گر گٹ گٹ کے ذریعہ اپنے پیغامات دنیا بھر میں نشر کیا کرتا ہے، ٹن ٹن کی آواز سن کر اوپر والے ایک کمرے میں روشنی ہوئی اور بجھ گئی۔ کچھ عرصہ کے بعد ترلوچن سنگھ کھڑکی میں نمودار ہوا اور قریب لگے ہوئے پانی کے پائپ کو پکڑ کر اس نے ہاتھوں اور گھٹنوں کے سہارے نیچے پھسلنا شروع کیا۔ اس عمل میں اس کے دونوں ہاتھ اور گھٹنے زنگ آلودہ نل سے رگڑ کھا کر بری طرح شل ہو گئے تھے۔ نیچے پہنچ کر وہ لپکا کہ اپنی زخمی ہتھیلیوں کو کوشلیا کی خنک اور شام نواز زلفوں میں چھپا لے لیکن یکایک اس کی نظر سردار جسونت سنگھ پر پڑی جو اپنی موٹر سائیکل کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

ترلوچن سنگھ کے قدم من من جیسے بھاری ہو گئے۔ جہاں تھا وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ جیسے کسی نے اچانک اسے منجمد کر دیا ہو۔ حفظ ماتقدم کے طور پر اس کا دایاں ہاتھ اٹھا اور کرتے کے نیچے لگی ہوئی کرپان پر جا کے رک گیا۔

"ترلوچن! آجاؤ۔" کوشلیا نے اس کی ہچکچاہٹ دور کرنے کی کوشش کی۔ "یہ میرے بھراتا جی ہیں۔"

ترلوچن سنگھ بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ سردار جسونت سنگھ کوشلیا کے برادرِ بزرگوار ہیں لیکن جو چیز اس کے دل میں بری طرح کھٹک رہی تھی

وہ اس وقت ان کی یہاں موجودگی تھی۔ کیونکہ ترلوچن سنگھ کے وہم وگمان میں یہ بات نہ آسکتی تھی کہ کوئی بھائی رات کے ایک بجے اپنی بہن کو اس کے عاشق سے ملانا پھرے۔ ضرور دال میں کچھ کالا ہے، اس نے سوچا۔ چنانچہ کرپان پر اس کی گرفت اور بھی مضبوط ہوتی گئی۔

"گھبراؤ مت۔" اب سردار جسونت سنگھ نے ترلوچن سنگھ کو مخاطب کیا۔ "اگر تمہارے پاس چھ انچ کی کرپان ہے تو میرے پاس ۳۲ بور کا جرمن ریوالور ہے۔ لیکن میں تمہاری طرح بزدل یا گنوار نہیں ہوں۔ تم بے خوف وخطر یہاں آجاؤ۔"

ترلوچن سنگھ آگے بڑھنے لگا لیکن کرپان پر اپنی گرفت نہ چھوڑی۔

سردار جسونت سنگھ نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔ "میرا نام جسونت سنگھ ہے، ہاؤ ڈو یو ڈو مسٹر۔"

ترلوچن سنگھ حیرانی، پریشانی اور تذبذب کے جال میں ایسا گرفتار تھا کہ اس وقت اسے ان رسمی تکلفات کا ہوش نہ تھا۔

سردار جسونت سنگھ نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "مجھے تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میں کوشلیا کا بھائی ہوں۔ مجھے دیکھ کر شاید تمہیں پہلے یہ خیال آیا ہو کہ میں تمہارا سر قلم کرنے آیا ہوں۔ اب ہمارے جانے کے بعد شاید تم سوچو گے کہ میں آدھی رات میں بہن کی دلالی کرتا پھر رہا ہوں۔ دونوں خیال اس ملک میں بڑی آسانی سے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن میں نہیں چاہتا کہ کسی کے بھی ذہنی تانے بانے کو بدل کر رکھ دوں۔ ہاں اگر تم ایک شریف آدمی کی طرح واقعی میری بہن سے محبت کرتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ تم یہاں چاندنی میں جی کھول کر باتیں کر سکتے ہو۔ میں گیٹ کے باہر انتظار کروں گا۔" سردار جسونت سنگھ موٹر سائیکل کو گھسیٹتا گھسیٹتا باہر لے گیا۔

"ترلوچی!" کوشلیا نے کہا۔

"کوشل!" ترلوچن نے جواب دیا اور پھر دونوں خاموش ہو گئے۔

چاندنی بھی چھائی ہوئی تھی اور قریب ہی پیپل کا وہ دانائے راز درخت بھی تھا جس کی کہنہ سال آنکھ نے سال بہ سال نئی کوشلیاؤں اور نت نئے ترلوچنوں کے رومان پروان چڑھتے دیکھے تھے۔ اسی درخت کے سائے میں پیمان بندھتے اور ٹوٹتے تھے۔ یہیں حسن و محبت کی طلسماتی روایتیں اپنا سحر پھیلاتی تھیں۔ اسی کی چھاؤں میں شاعری جنم لیتی تھی۔ افسانوں کے جال بُنے جاتے تھے۔ شیریں فرہاد، ہیر رانجھا، لیلیٰ مجنوں کو حیات جاودانی نصیب ہوتی تھی ——— لیکن اس وقت کوشلیا اور ترلوچن کوئی اور بات نہ کر سکے۔ انہیں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سکول کے دو روٹھے ہوئے بچوں کو کمرے میں بند کر دیا گیا ہو کہ گھنٹے کے ختم ہونے سے پہلے پہلے آپس میں صلح کر لو ——— اور دروازے پر ماسٹر صاحب چھڑی لئے منتظر بیٹھے ہوں!

تسنیم سلیم چھتاری

ٹوٹ گیا اِک تارا

سائنس کا گھنٹہ تھا اور اسٹرانومی پڑھائی جا رہی تھی۔ ایک لڑکے نے پروفیسر سے پوچھا "تارے کیوں ٹوٹ جاتے ہیں؟" پروفیسر صاحب اس وقت لیکچر میں گم تھے۔ انہوں نے اس سوال پر دھیان نہیں دیا۔

اسی لڑکے نے پھر یہی سوال کیا اور پروفیسر صاحب نے دوبارہ بھی نہیں سُنا تو میرے قریب سے ایک دوسرے لڑکے نے آہستہ سے کہا:

"مجھ سے پوچھو...... جب کسی کی موت آتی ہے تو تارا ٹوٹتا ہے۔"

"جب کسی انسان کی موت آتی ہے تو آسمان سے ایک چمکتا ہوا تارا ٹوٹ کر تاریکیوں میں ڈوب جاتا ہے۔" اس نقرے سے سب کے کان آشنا تھے۔ یہ بات لاکھ مرتبہ چمکتے تارے کی طرح دل کے آسمان پر طلوع ہوئی تھی اور تکلیف کی اندھیری گہرائیوں میں کھو گئی تھی۔

مجھے اس جواب نے وہ ساری کہانی یاد دلا دی جس میں ایک تارہ نکلا، چمکا اور پھر اپنے پیچھے یاد کی گہری لکیر چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے غائب ہو گیا۔

پانچ برس پہلے کی بات! مگر کیا پچاس برس کے بعد بھی میں انجم کو بھول سکوں گا! نہیں! مگر کاش! ان دنوں میں آٹھویں کلاس میں تھا۔ شور و شغب کا عادی اور شرارت پسند! دنیا بھر کے کھیلوں میں حصّہ لیا کرتا تھا اور صبح سے شام تک نت نئی حرکتیں کیا کرتا....... روز کپڑے پھٹتے گھٹنے اور کہنیاں لہولہان رہتیں! اماں ابا کی ڈانٹ بھی پڑتی اور چوٹوں کی تکلیف بھی ہوتی، پر اس دکھ میں کیسا خوشی کا پہلو تھا۔ میں پھٹے ہوئے کپڑے اور مجروح جسم لے کر انجم کے پاس پہنچتا۔

"انجم خدا کے لئے...... دیکھئے آج اماں سے ضرور پٹ جاؤں گا۔"

"کیا ہو گیا؟" وہ پوچھتیں۔

"دیکھئے کیسی خراش لگی ہے..... اور یہ قمیص کی آستین مونڈھے پر سے الگ...... اور کوٹ کا بٹن غائب...... اُف

کتنا خون نکلا ہے؟"

"شکریہ؟" ایک ہلکا سا تھپڑ میرے بے ترتیب بالوں پر پھسلتا۔ "چلو اب خالہ کو دکھا کر لاؤں ..... لاڈلے کے ڈھنگ۔"

"ارے ارے ..... کیا جوتیاں کھلوائیے گا ..... قسم آپ کی چھپ کر آیا ہوں، اب یہاں منہ ہاتھ دھو کر جاؤں گا ..... اگر انہوں نے دیکھ لیا اس شان میں تو آپ سمجھ لیجئے کیا ہوگا؟"

"اچھا ہے مجھے تو خوشی ہوگی تم مہینے میں چار چھ جوڑے تو چیتھڑے کر لیتے ہو! اور یہ جو روزمرہ چوٹیں لگتی ہیں ..... مجھے تو ڈر ہے کسی دن ایک آدھ ہڈی نہ ٹوٹ جائے ......"

"میرا کیا بگڑے گا ..... آپ ہی تیمارداری کیجئے گا۔"

"ہاں جیسے تمہاری نوکر ہوں نا!"

پھر سچ مچ وہ نوکروں کی طرح سے ہاتھ منہ دھلاتیں، کپڑے سیتیں، زخموں پر ان کے پرانے دوپٹوں کی پٹیاں بندھتیں۔ جب میں درست ہو کر چلنے لگتا تو وہ ہنس کر کہتیں۔ "پرویز میں کہے دیتی ہوں اگر اب تم نے ..... " میں ہنستا ہوا بھاگ آتا اور دوسرے دن پھر اسی حالت میں پہنچتا۔

انجم مجھ سے کئی سال بڑی تھیں۔ پھر کوئی رشتہ ناطہ بھی نہیں ..... میں اپنی شرمیلی طبیعت کے باوجود ان سے کچھ اس طرح کھل گیا تھا جیسے چھوٹے بڑے اور اپنے پرائے کا فرق ہی باقی نہ رہا ہو۔ اپنی دلچسپی کی ساری باتیں ان کو سناتا اور ان کی ساری باتیں بڑے شوق سے سنتا ..... اور کبھی سوچنے لگتا کہ مجھے کشیدہ کاری اور کھانا پکانے کی ترکیبوں سے کیا تعلق! ____ انجم کو ہاکی اور فٹ بال سے کیا واسطہ! مگر یہ نہیں کہ ہم باتیں کرتے اکتاتے ہوں ..... ایک کہہ رہا ہے دوسرا محویت سے سن رہا ہے کچھ ایسی باتیں کہ تیسرا آ بیٹھے تو حشر تک نہ سمجھے کہ آخر گفتگو کا موضوع کیا ہے۔

ایک سال میں کیسی کایا پلٹ ہوگئی تھی جب شروع میں ہم ان کے یہاں کرایہ دار ہو کر آئے تو مجھے سخت کوفت ہوئی کہ یہ ایک عدد لمبی تڑنگی لڑکی یہاں موجود ہے۔ ان دنوں میں لڑکیوں سے بے حد گھبراتا تھا۔ آج بھی اسی قدر! مگر انجم کو شاید اشرف المخلوقات سے بھی کچھ بڑھ کر پایا اور وہ بہت جلد میرے خیالات اور احساسات کی شریک بن گئیں۔

دنیا میں کتنی تبدیلیاں ہو رہی تھیں مجھ میں لاکھوں باتیں نئی پیدا ہوئیں اور پرانی علیحدہ ہو گئیں۔ نئے کھیل سیکھے، نئے دوست بنائے۔ نئی باتیں سوچیں اور نئی باتیں سنیں ..... آنکھوں میں بھی شاید نئے نئے رنگ تیرتے رہتے۔ جب ہی تو جدھر نگاہ اٹھتی ہر چیز بدلی ہوئی نظر آتی مگر انجم! کیا اس ایک سال نے رتی بھر فرق بھی پیدا کیا تھا ان میں وہی لبوں کی خفیف سی لرزش پر دھیمی مسکراہٹ کا رقص! وہی ہلکے سے تھرتھراتی ہوئی پلکوں کے درمیان سے دو تاریک شعاعیں وہی سیاہ بالوں میں ڈوبتی ابھرتی لہریں ..... وہی ہاتھوں کی نرمی اور وہی آواز کا رس! وہ کہیں سے ذرہ برابر نہیں بدلیں اور میں اس یک رنگی سے کتنا مانوس ہو گیا تھا ..... کبھی کبھی سوچتا کہ اگر انجم اپنے مخصوص انداز کے بجائے ذرا اکڑ کر چلنا شروع کر دیں خوابیدہ سی آنکھوں کے بجائے اور لڑکیوں کی طرح دیدے پھاڑ کر باتیں کرنے لگیں تو کیسی عجیب لگیں گی! تجربہ! اور مجھے خیال آتا وہ ہلکے ہلکے رنگوں کے بجائے گہرے رنگ کے کپڑے پہننا شروع کر دیں یا شلوار قمیص کے بجائے ساڑھی باندھنے لگیں تو کیا میں انہیں بیک نظر پہچان لوں گا! اور کیا تب بھی ان کے چہرے پر یہی دلکشی ہوگی ..... شاید نہیں۔

ان کی باتیں کیسی اچھی اور کتنی مخصوص تھیں!

میں سونے کے معاملے میں بہت ماہر تھا مگر جب سے انہوں نے بتایا کہ وہ روز صبح کو باغ میں پھول چننے جاتی ہیں اور دیر تک وہاں ٹہلتی ہیں، تو آپ سے آپ میری آنکھ صبح سویرے کھل جاتی اور میں سلیپر گھسیٹتا ہوا باغ میں پہنچتا۔ وہ حوض کے کنارے کرسی لئے مجھ ہی کی منتظر ملتیں ..... سفید شلوار کے شبنم سے بھیگے ہوئے پائنچے ..... کسی ہلکے رنگ کے باریک سے دوپٹے میں شگفتہ چہرہ جیسے اوس میں بھیگا ہوا گلاب! اور ایک

مخصوص فقرہ!

"کہو...... کیا حال چال ہے؟"

"رات بھر گھٹنے میں درد رہا...... جانے آپ نے کیا منحوس دوا لگائی تھی؟"

"لو اب مجھے الزام دیتے ہو...... شریر...... اچھا اب میں پھول جمع کرتی ہوں...... شرط یہ ہے کہ تم کسی پھول کو ہاتھ نہ لگانا۔"

"واہ یہ کیا پابندی ہے؟" میں جل جاتا۔

"بھائی پرویز تم مرد ہو...... سُنا ہے کہ مردوں کے ہاتھ بہت سخت ہوتے ہیں...... پھول مرجھا جاتا ہے۔"

میں اس دلیل کو روز مان لیتا اور چپ چاپ بیٹھا انہیں تکتا رہتا۔ وہ پھول توڑ کر واپس جانے لگتیں تو میں ان سے ایک پھول مانگ لیتا۔

"میرا حصہ لائیے!"

وہ کوئی اچھا سا پھول لے کر میرے نائٹ ڈریس کے کوٹ میں اٹکا دیتیں۔ میں واپس آ کر کپڑے بدلتا اور ناشتہ کر کے اسکول چلا جاتا......

دن بھر دماغ میں میٹھی میٹھی سوچ کی بارش ہوتی رہتی اور جب شام کو کھیل سے واپسی پر سیدھا ان کے یہاں پہنچتا تو وہ پرانے دوپٹوں کی پٹیاں بنائے اور مختلف اقسام کے مرہم لئے میری راہ تک رہی ہوتیں۔

زندگی کا یہ دور بھی کتنا مطمئن اور پُرسکون تھا مجھے ہر صبح شام کا انتظار رہتا کہ اپنا زخم خوردہ جسم ان کی تیمارداری کے سپرد کر دوں اور شام گذرنے پر صبح کا رستہ تکتا کہ ان سے باغ میں جا کر ملوں! اسی چکر میں دن بھاگتے چلے گئے۔

رفتہ رفتہ میری یہ کیفیت ہو گئی کہ نہ کسی دوست سے دوستی اور نہ کسی کھیل سے دلچسپی! ہر دم یہی خواہش کہ بیٹھا ان سے باتیں کرتا رہوں خود بخود یہی خیال آتا کہ وہ مجھ سے گھبرا نہ جائیں یہ نہ پوچھیں کہ بلا ضرورت کیوں آئے ہو...... میں وہاں جانے کو لاکھوں بہانے ڈھونڈتا ایسا بھی ہوا کہ دانستہ ٹھوکر کھائی اور چوٹ ماری، جان بوجھ کر کپڑے پھاڑے اور پہنچ گیا۔ یہ بھی نہیں تو جا کر منہ بسورنے لگا۔

"خیر تو ہے کیا ہوا؟"

"بھوک کے مارے دم نکلا جاتا ہے۔"

"کیوں دوپہر کو کھانا نہیں ملا تھا؟"

"وہ سب ہضم ہو گیا۔"

"تو پھر؟" گہری مسکراہٹ سے آنکھوں کی لو بھڑک اٹھتی۔

"کچھ کھلائیے جلدی......"

"ایک شرط پر!"

"کہئے!"

"مجھے بازار سے اس رنگ کا اُون لا دو گے؟" وہ نمونہ دکھلاتیں۔

"ایک شرط پر!" مجھے بھی شرارت سوجھتی۔

"وہ کیا؟"

"اگر آپ اُون کے پیسے دیں۔"

ہم دونوں دیر تک ہنستے رہتے وہ مجھے اپنے ہاتھ سے کچھ بنا کر کھلاتیں اور میں بازار سے اُون لے آتا۔

پھر ایک ایسا احساس جو میرے لئے عجیب بھی تھا اور پریشان کن بھی! میں نے محسوس کیا کہ جب وہ میرے علاوہ کسی اور سے باتیں کرتی ہیں تو مجھے ناگوار ہوتا ہے۔ وہ اپنی سہیلیوں سے ملنے جاتی ہیں تو میرا جی اُلجھتا ہے، ان سے کوئی ملنے آتا ہے تو مجھے بُرا لگتا ہے...... خدا جانے کیوں کبھی ایسا بھی ہوا کہ میں ان کے یہاں پہنچا تو اور دو چار لڑکیوں کو بیٹھے پایا۔ میں لوٹنے لگتا تو انجم مجھے روک لیتیں۔

"ارے بھئی پرویز کہاں بھاگ رہے ہو؟"

میں ٹھہر جاتا تو........ "یہ تمہارے پسندیدہ ٹکڑے ہیں! کھاؤ، منہ کیا تک رہے ہو...... ارے بھئی ایسی بھی کیا شرم"۔

ایسے میں ان کی میٹھی میٹھی باتیں بھی کڑوی لگتیں...... سب تو جمع ہیں اور میں تماشہ بنا بیٹھا ہوں یہ کیا زبردستی ہے...... اٹھنے لگوں گا تو روکا جاؤں گا اور رُک جاؤں گا تو مجھ سے بے فکر ہو کر اِدھر اُدھر باتوں میں لگ جائیں گی! مجھے بھی اتنا غصہ آتا کہ بیان سے باہر...... مگر ان سے لڑنا تو ناممکن تھا...... ایک نامعلوم سی کشش!

اور ہاں مجھے ایک دکھ بھی تھا میں انھیں اپنا ساتھی اپنا دوست اپنا رفیق اپنا ہم راز سب کچھ سمجھتا ...... اور وہ مجھے ایک کمسن اور نادان بچہ! وہ مجھ سے عمر میں یقیناً بہت بڑی تھیں پانچ یا چھ سال! مگر میں ناسمجھ اور نادان بچہ نہیں میں محبت اور نفرت کو سمجھتا ہوں مجھے آنسو اور ہنسی کی حقیقت معلوم ہے...... بے تکلفی اور محبت کے علاوہ مجھے ان کے سلوک میں ایک طرح کا بزرگانہ اور ناصحانہ انداز دکھائی دیتا اور میں جھنجھلا سا جاتا ...... یا تو وہ مجھے اپنے برابر کا سمجھیں۔ میری نگاہوں میں کچھ دیکھیں میری باتوں میں کچھ پائیں...... اور میری کمسنی کا ان کو اسی قدر احساس ہے تو مجھے صحیح معنوں میں بچہ سمجھ لیں...... مجھے دیکھ کر لیٹے سے بیٹھ جاتی ہیں، پھسلا ہوا دوپٹہ گلے میں آلپٹتا ہے...... اور مجھے اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگتا ہے تو وہ کسی نہ کسی بات پر کہہ اٹھتی ہیں "تم نہیں سمجھتے پرویز تم ابھی بچے ہو...... اُفوہ بچپن سے عطر لگانے کا شوق!"

میں چِڑا جاتا ...... مگر خاموش!

پھر ایک دن.......

"انجم! انجم! کہاں ہیں آپ؟"

"یہ رہی!" وہ ہمیشہ کی طرح ایک آدھ بُنے سوئیٹر سے اُلجھ رہی تھیں۔

"آج تو ایسی بھوک لگی ہے کہ زندگی میں نہ لگی ہوگی"۔

"ارے تب تو کسی ثقیل غذا کی ضرورت ہے"۔

"ہاں بس جلدی کیجئے"۔

"بلا معاوضہ کے نہیں!"

"کیا چاہئے؟" میں نے شان کے ساتھ کہا۔

"دیکھو پرویز! یہ میں اپنی ایک سہیلی کا سوئیٹر بُن رہی ہوں اور بدقسمتی سے اس میں ایک لچھی اُون کم پڑے گا"۔

"میں تو نہیں لاؤں گا" سہیلی کے ذکر سے میں چڑ گیا۔

"کیوں بھئی یہ خفگی کیسی"۔

"جب دیکھو آپ سہیلیوں کے سوئیٹر بُنتی ہیں...... کبھی ہم کو بھی کچھ بُن کر دیا...... میں تو اب ہرگز ہی اُون لا کر نہ دوں گا"۔

"اچھا یہ بات ہے ...... ایمان سے کہنا کبھی تم نے فرمائش بھی کی؟"

"میں کیوں فرمائش کرتا جب آپ کو خود ہی خیال نہ آیا"۔

"میں چاہتی تھی کہ تم اپنے منہ سے کہو۔"

"میرا دل تھا کہ آپ کو اپنی طرف سے رحم آجائے۔"

وہ ہنسنے لگیں اور پھر بولیں: "مجھے یہ بات تسلیم ہے مگر دیکھو پرویز اگر تم نے اس کا شکوہ کیا تو یہ ہم دونوں کے لئے خوشی کی بات نہیں؟"

ان کا یہ سوال کرنے کا انداز! اور اپنی مسرت کی انتہا مجھے ہمیشہ ہمیشہ یاد رہے گی۔

ایک ہفتہ بعد جو گیا تو انہوں نے سفید رنگ کا بے حد خوبصورت اور نرم سوئیٹر مجھے پہنا دیا۔

"بولو پسند ہے؟"

"سوئیٹر تو پسند ہے مگر آپ کا یہ سوال کرنے کا انداز پسند نہیں آیا۔"

"کیوں؟"

"آپ کا خیال تھا کہ میں اسے ناپسند بھی کر سکتا ہوں؟"

جب اپنی طرف لوٹا تو زمین پر قدم نہیں پڑتے تھے اور آپ سے آپ ہنسنے کو دل چاہتا تھا۔

اماں نے دیکھ کر کہا: "ارے یہ نیا سوئیٹر!"

میں نے کہا: "جی ہاں انجم نے بُن کر دیا ہے۔"

وہ کہنے لگیں: "انجم بہت محبت کرتی ہے تجھ سے۔ . . . . . اگر تیری عمر کی ہوتی تو ہم شادی کر دیتے۔"

اماں نے یہ فقرہ یونہی سرسری طور پر ازراہِ مذاق کہا تھا۔ مگر میں اس حد تک حواس باختہ ہوا کہ دیر تک اسی کے متعلق سوچتا رہا۔

"انجم کی شادی اور میرے ساتھ. . . . . . کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے مگر نہیں! میں ایسا خواب بھی دیکھوں تو پھر آنکھ کھولنے کی نوبت نہ آئے! میں انجم سے محبت کرتا ہوں، ان کا احترام کرتا ہوں! وہ کہیں تو جان دینے سے بھی دریغ نہ کروں مگر شادی! ان کی تو محض پرستش کی جا سکتی ہے۔ . . . . . اگر کہیں یہ ممکنات سے ہوتا تو بھی میں اس کے لئے تیار نہ ہوتا. . . . . . میری نگاہ میں تو یہ ان کی توہین ہے. . . . . . اگر وہ سنیں تو شاید پھر مجھ سے بات بھی نہ کریں. . . . . . مجھے تو وہ بچہ سمجھتی ہیں. . . . . . چھوٹا سا بچہ جو چوٹ کھا کر بسورتا ہوا ان کے پاس پہنچ جاتا ہے. . . . . . جو بھوک کی حالت میں ان کے پاس جاتا ہے اور کچھ کھا کر مطمئن ہو جاتا ہے. . . . . . کمسن بچہ جسے ابھی سگرٹ نہیں پینا چاہیئے عطر نہیں لگانا چاہیئے. . . . . . اور شاید وہ یہ بھی سمجھتی ہوں کہ اس دودھ پیتے بچے کو ان سے محبت کرنے کا حق تک حاصل نہیں ہے. . . . .

اسی لئے انہوں نے میری حالت کو قابلِ غور نہیں سمجھا اور مجھے ان سے ان لاکھ باتوں میں سے ایک بھی بات کہنے کی جرأت نہیں ہوتی جو میں دن رات سوچا کرتا تھا. . . . . . میں انہیں ہر دم دیکھنا، بات کرنا، پاس بیٹھنا مزید چاہتا ہوں مگر شادی! اگر اس کی کوئی صورت ہوتی تو کیا میں اسے برداشت کر لیتا. . . . . . میری صرف یہ خواہش ہے کہ میں تا حیات ان کو باغ کے پھول چنتا ہوا دیکھتا رہوں ان کی میٹھی میٹھی باتیں سنتا رہوں! وہ سر جھکائے میرے ہاتھ پیروں کی چوٹوں کا معالجہ کرتی رہیں اور میں ٹکٹکی باندھے ان کے بالوں میں گھونگھر کی لہریں تکتا رہوں۔ وہ بڑے انہماک سے میرے لئے تکیہ نے تلتی رہیں اور میں پاس بیٹھا ان کے رخساروں پر جھکی ہوئی لمبی لمبی پلکوں کا سایہ لرزتا ہوا دیکھتا رہوں. . . . . . ایسی ہی ایک موہوم سی لرزش جیسے ان کے سامنے پہنچ کر میرے پیر ڈگمگا جاتے ہیں۔

میں جاؤں تو وہ مسکرا کر پوچھیں: "ہاں تو کیا حال چال ہے:" میں واپس آنے لگوں تو ہنس کر کہیں: "پرویز میں کیسے دیتی ہوں. . . . . .؟ شادی تو ان کی جلد ہی کسی نہ کسی کے ساتھ ہو جائے گی۔ کسی ایسے شخص کے ساتھ جو ان سے عمر میں دو چار سال بڑا ہوگا کہیں نوکر ہوگا. . . . اور پھر جسے وہ پسند کریں گی۔"

مجھے خیال آیا کہ اگر ان کی شادی ہوگئی تو کیا وہ یہاں سے چلی جائیں گی اور میری زندگی کا سہانا خواب بکھر کے رہ جائے گا۔ دل کو زبردست دھکا لگا ...... کیا اب میں ان سے جدا رہ کر کبھی خوش رہ سکتا ہوں ...... وہ میری زندگی کا ایک جزو بن چکی تھیں۔ ان کی مسکراہٹ، ان کی باتیں، ان کی گہری گہری آنکھیں ...... اور میں گہری گھاٹیوں میں ڈوب گیا ......

اماں نے کہا: "کل جاوید آرہا ہے۔"

میری محویت کا تسلسل ٹوٹ گیا ...... چلو اچھا ہے بھائی جان آرہے ہیں ڈیڑھ سال بعد ان سے ملاقات ہوگی۔ دیکھیں اب بھی پہلے کی طرح شعر و افسانے پسند کرتے ہیں یا نوکری نے کچھ تبدیل کر دیا۔

اُدھر بھائی جان بی اے کر کے نوکر ہوئے اُدھر ابا جان کا تبادلہ ہوا اور ہم یہاں آگئے۔ اماں بیچ میں ایک مہینہ کے لئے ان کے پاس ہو آئی تھیں اور ابا جان بھی اکثر دورے کے سلسلے میں ان سے مل لیتے بس میں نے ہی ڈیڑھ سال سے نہ دیکھا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں ابا جان کو بھائی جان نے لکھا بھی تھا کہ پرویز کو یہاں بھیج دیجئے۔ میں نیم راضی ہو چلا تھا جو انجم نے کہا کہ "تم ناحق جا رہے ہو گول کر جاؤ۔" میں نے جھٹ سے اکڑ اماں جان سے انکار کر دیا کہ میں نہ جاؤں گا۔ اب بھائی جان کو ایک مہینہ کی چھٹی ملی تو وہ یہاں خود ہی آرہے تھے!

میں بھائی جان کو لینے اسٹیشن گیا وہ حسب توقع خوب صاحب بہادر بنے ہوئے تھے۔ کہنے لگے: "کیسی جگہ ہے؟ ایک مہینہ خوب شاندار گزرے گا یا نہیں؟"

میں نے کہا: "اب جیسی بھی جگہ ہے آپ خود ہی دیکھ لیجئے گا۔"

"یوں نہیں ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں؟"

"یہی کہ سوسائٹی کیسی ہے؟ ...... سینما ہاؤس کیسے ہیں، کلب کتنے ہیں اور ہوٹل کہاں کہاں ہیں؟ ...... تفریح کا کیا پروگرام رہتا ہے؟"

میں نے کہا: "مجھے ہوٹل اور کلب کی تو خود خبر نہیں! سوسائٹی اچھی خاصی ہے، دو چار سینما ہاؤس بھی ہیں۔"

"انگلش فلم چلتی ہیں؟"

"کبھی کبھی ......"

"لاحول ولا قوۃ۔"

"کیوں؟"

"وقت ضائع ہوگا یہاں اور کیا ...... آخر تم چھٹیوں میں میرے پاس کیوں نہ آگئے ...... کیا کرتے رہتے ہو دن بھر؟ اسکول اور گھر؟ بس؟"

"ہاں بس اور کیا؟"

"دل نہیں گھبراتا؟ صحت ٹھیک ہے!"

"کمال کرتے ہیں آپ بھائی جان ......"

"بھئی کم از کم میں تو اس طرح نہیں رہ سکتا ...... سوچتا ہوں کہ مہینہ بھر کے بجائے دس پندرہ دن میں بھاگ جاؤں ...... تم بھی میرے ساتھ چلنا! سمجھے؟ وہیں اسکول میں داخل ہو جانا ...... انسان بن جاؤ گے! سمجھے؟"

اسٹیشن سے گھر تک وہ ایسی ہی باتیں کرتے رہے۔

اماں سے ملنے کے بعد انہوں نے مجھ سے سوالات کرنے شروع کئے!

"یہ کس کا بنگلہ ہے؟ وہ کس کی کوٹھی ہے؟ اُدھر کون رہتا ہے؟"

میں سب بتاتا رہا۔

"اور یہ برابر کا گھر......؟"

"انجم!"

"کون انجم؟ یہ کون صاحب ہیں؟"

اور مجھے محسوس ہوا کہ میں نے انتہائی مہمل قسم کا جواب دیا تھا۔

"ایک وکیل صاحب ہیں وہ مع فیملی رہتے ہیں۔"

"وکیل صاحب کا نام زوردار ہے! انجم!" بھائی جان نے زیرِ لب کہا۔

میں گھبرا گیا "یہ وکیل صاحب کا نہیں انجم تو ان کی لڑکی کا نام ہے۔"

"اوہ!" بھائی جان نے مجھے سر تا پا گھورا "تو کیا بہت دوستی ہے تم سے؟"

"دوستی کیا......بس۔" میں سٹپٹا گیا۔

"خوب! گویا کہ آپ بھی؟" انہوں نے معنی خیز طریقے پر ہنسنا شروع کیا۔

"تو پھر تفصیل بتاؤ کیسی لڑکی ہے؟"

"اچھی خاصی ہیں......آپ کی برابر ہوں گی۔" میں نے ان کا شبہ مٹانا چاہا۔

"میری برابر؟ اوہ! یوں کہو! میں تو سمجھا تھا کہ آپ!........"

میں سوچنے لگا کہ جو بات میں آج تک نہیں سمجھ سکا ہوں اسے بھائی جان یوں لمحوں میں کیسے سمجھے لے رہے تھے!

بھائی جان کرسی پر لیٹ کر کوئی انگریزی کا ناول پڑھنے لگے اور میں نے سوچا کہ دیر تو ہو گئی ہے مگر لاؤ انجم کے یہاں ہو آؤں......ان کو بتاؤں گا کہ ہمارے بھائی جان آئے ہیں۔ ......دفعتہً مجھے دروازے پر ان کی آواز سنائی دی "پرویز!"

میں نے چونک کر کہا "جی!"

"کیا ہوا آج تم......" وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی ٹھٹھک گئیں۔ بھائی جان بھی سر اٹھا کر گھورنے لگے۔

"یہ میرے بھائی جان ہیں۔" میں نے تعارف کی رسم ضروری سمجھی۔ "اور بھائی جان یہ انجم ہیں......میں نے آپ کو بتایا تھا۔"

بھائی جان نے مسکرا کر ان کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا:

انہوں نے عمداً بھائی جان کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظرانداز کر دیا اور کھڑکی سے باہر نگاہ جما کر بولیں "معاف کیجئے مجھے انگریزی نہیں آتی۔"

"اوہ!" بھائی جان نے سنبھل کر کہا "کوئی حرج نہیں مجھے تو اردو آتی ہے۔"

"اچھا تو میں چلتی ہوں۔" وہ مڑ کر جانے لگیں۔

"انجم ذرا تو بیٹھئے نا۔" میں نے سوچا کہ اب بھائی جان ان کو بد اخلاق اور پتہ نہیں کیا کیا کہیں گے اور میرا جی جلے گا۔

"جی ہاں آپ تشریف لائی ہیں تو بیٹھئے نا" بھائی جان نے بھی کہا۔

"بہت کام ہے . . . . . آج پرویز نہیں آئے تو میں سمجھی کہ نہ جانے کیا بات ہوئی . . . . . . اچھا آداب عرض!" اور وہ چلی گئیں۔

میں نے سہمی سہمی نظروں سے بھائی جان کی طرف دیکھا کہ کیا کہتے ہیں مگر وہ کسی سوچ میں گم تھے۔

دوسرے دن اسکول کی واپسی پر میں نے سوچا کہ اب ان کے یہاں چلنا چاہئے . . . . اور اٹھا ہی تھا جو بھائی جان نے کہا۔

"کہاں چلے؟"

"کہیں نہیں۔"

"انجم کے یہاں نہیں جاؤ گے؟"

"سوچ رہا ہوں۔"

"چلو! ہم بھی چلتے ہیں۔" وہ اٹھ کر میرے ساتھ چل دیئے۔ میرا دل چاہا کہ کاش وہ میرے ساتھ نہ جاتے میں انجم سے اچھی طرح بات بھی نہ کر سکوں گا اور کل کی سی وحشت پھیلے گی۔

وہاں پہنچے تو انجم کی والدہ سے بھی ملاقات ہوئی انہوں نے بھائی جان کو بہت پیار کیا، دعائیں دیں۔ وکیل صاحب آگئے چائے کا دور چلتا رہا اور میں چپ چاپ بیٹھا انجم کو دیکھتا رہا جو آج بالکل مہر بہ لب تھیں تھوڑی دیر بعد ہم لوٹ گئے! بھائی جان دیر تک اماں سے وکیل صاحب کی تعریف کرتے رہے۔

تیسرے روز میں اسکول کی واپسی پر اپنے معمول کے مطابق سیدھا انجم کے یہاں پہنچا۔ اول گھر جانے میں خطرہ تھا کہ پھر بھائی جان ساتھ چلیں گے اور انجم سے بات چیت نہ ہو سکے گی! میں انہیں یہ بتانے کے لئے مضطرب تھا کہ اس دفعہ مجھے کرکٹ میں کپ ملنے کی امید ہے پہنچا تو دیکھا کہ صوفے پر لیٹی ہوئی آہستہ آہستہ گنگنا رہی ہیں۔ میں چپ چاپ جا کر پیچھے کھڑا ہو گیا اور بمشکل یہ شعر سمجھ سکا۔

نہ جانے آج کیوں دھڑکن مرے دل کی نہیں رکتی
یہ آہٹ آپ کی تھی آپ گزرے تھے ابھی دل سے

کچھ دیر یونہی کھڑا رہا پھر شرارت سوجھی اور پانی کا گلاس میز پر سے اٹھا کر ان کے منہ پر چھینٹا دیا۔

تڑپ کر انہوں نے گردن موڑی اور مجھے دیکھ کر ہنس دیں۔ "اچھا ٹھہر جاؤ بدلہ نہ لیا ہو تو . . . . بہت شریر ہوتے جا رہے ہو۔"

"آہا آپ کتنا اچھا گاتی ہیں . . . . . . اوہ!"

"واقعی؟"

"ہاں میں ڈرا تھا کہ کہیں دھوبی گدھے کی تلاش میں ادھر نہ آ نکلے۔"

"تو ہماری آواز گدھے جیسی ہے؟" انہوں نے میرے منہ پر کشن دے مارا۔

"نہیں توبہ . . . . . . معاف کیجئے منہ سے سچی بات نکل گئی۔"

"ٹھہر جاؤ بدتمیز تمہارے لئے کھانے کی چیزیں رکھی تھیں اب ہرگز نہ دوں گی۔"

"کھل گئی قسمت . . . . . آپ بھی کتنی اچھی ہیں۔"

"جی ہاں تب ہی تو یہ قدر ہوتی ہے۔"

"کہہ تو رہا ہوں بھول کر منہ سے نکل گیا . . . . . . اب کھلائیے نا کیا ہے؟ . . . . . . پہلے آپ کبھی ایسی عمدہ نہ تھیں . . . . . کیسے

میرا خیال آیا؟"

"جاوید صاحب کے لئے بنائے تھے ..... چونکہ تمہاری پسند کے ٹکڑے تھے اس لئے رکھ لئے۔"

"تو کیا بھائی جان یہاں آئے تھے؟"

"ہاں ابھی تو گئے ہیں تمہارے آنے سے دس منٹ پہلے۔"

"آپ سے باتیں ہوئیں؟"

"ظاہر ہے آپا جان بھی یہاں موجود نہ تھے اور اماں کو تم جانتے ہو کہ وہ کتنی کم گو ہیں ..... بیچارے جاوید صاحب چپکے ہی بیٹھے رہتے۔"

"کیا کیا باتیں ہوئیں؟" میں یہ معلوم کرنے کے لئے بیتاب ہو گیا۔

"وہ اپنے دورانِ تعلیم کی کچھ دلچسپ باتیں سناتے رہے۔"

نہ جانے کیوں میرا دل اُداس ہو گیا ..... شاید میں یہ چاہتا تھا کہ انجم کو سوائے میرے اور کسی کی باتیں دلچسپ نہ لگیں۔

پھر کچھ ایسا ہوا کہ روز جب میں اسکول کی واپسی پر ان کے پاس جاتا تو وہ مجھے بتاتیں کہ ابھی جاوید صاحب یہاں سے گئے ہیں ... اور یہ بھی کہ ان کی باتیں بہت دلچسپ ہوتی ہیں ..... انجم کا میرے ساتھ وہی سلوک تھا اسی طرح باتیں، چوٹوں کا معالجہ، کپڑوں کی درستی، مگر نہ جانے کیوں مجھے لگتا کہ وہ مجھ سے دور ہوتی جا رہی ہیں ...... کوئی ہمارے درمیان حائل ہو گیا ہے! کون؟ بھائی جان! مگر ہم دونوں ایک دوسرے کے رقیب تو نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ باتیں اب سوچتا ہوں اس وقت تو ایک ہی خیال تھا کہ وہ مجھ سے نہ چھن جائیں ... اور بس!

اتوار کی صبح بھائی جان اور میں دونوں ایک ساتھ ان کے یہاں پہنچے باتوں باتوں میں گانے کا ذکر نکل آیا۔ میں نے کہا: "بھائی جان بہت اچھا گاتے ہیں۔" یہ بات سچ بھی تھی! انجم نے کہا کہ جاوید صاحب کو گانا سنانا پڑے گا۔ بھائی جان نے اوّل دو چار دفعہ معذرت کی، پھر تیار ہو گئے!

گانا شروع کیا: "کون سا گیت سنو گی انجم؟"

انجم نے کہا: "جو آپ سنائیں گے۔"

"کون سا گیت سنو گی انجم؟"

"کوئی سا بھی! گائیے تو آخر!"

"گا تو رہا ہوں۔" بھائی جان نے جواب دیا۔

"واہ یہ کوئی گانا ہے؟"

"ارے اور کیا ..... یہ تو جاں نثار اختر کی نظم ہے۔"

"ہم نہیں سنتے ..... کوئی ڈھنگ کی چیز سنائیے۔"

بھائی جان نے ایک غزل گائی جس کا ایک شعر مجھے آج تک یاد ہے ؎

شروعِ راہِ محبت ارے معاذ اللہ
یہ حال ہے کہ قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

انجم ساکت بیٹھی سنتی رہیں۔ بعد میں تعریف کچھ اس طرح سے کی کہ بھائی جان کو بہت سی چیزیں گانی پڑیں۔
انجم کو بھائی جان کی آواز اتنی پسند آئی کہ اب وہ ہر ملاقات میں گانے کی فرمائش کرتیں۔ ان بہت سی ملاقاتوں میں سے جن میں شریک ہونے کا مجھے بہت کم موقعہ ملتا تھا۔

بھائی جان ہمیشہ اسی سے شروع کرتے:
"کون سا گیت سنو گی انجم؟
گنگناتا سا فسانہ کوئی
یا محبت کا ترانہ کوئی
کیسے بنتا ہے نشانہ کوئی
کون سا گیت سنو گی انجم؟"

اور آخر کار سب ہی طرح کے گیت سنا ڈالتے...... میں کچھ کھویا کھویا سا رہنے لگا...... بھائی جان کو یہاں آئے ایک مہینہ گذر گیا...... پہلے دن ان کا خیال تھا کہ دس پندرہ دن بھی نہ رک سکیں گے اور اب انہوں نے بیماری کے نام سے ایک مہینے کی چھٹی بڑھوالی۔ حالانکہ یہ بہت چھوٹا شہر تھا جس میں نہ اچھے ہوٹل اور نہ عمدہ کلب! مگر بھائی جان خوش تھے اور انجم بھی...... اگر میں رنجیدہ تھا تو اس کی وجہ سے خود بھی باخبر نہ تھا پھر اس کا تذکرہ کس سے کرتا...... ہاں مگر دل پر ہر لمحہ ایک بوجھ سا رہتا اور روح جیسے تھک کر آنکھیں بند کرنا چاہتی ہو۔

وقت کی رفتار کو میں نہ روکنا چاہتا تھا اور بہر حیثیت کو ان کھیلوں سے کیا! ایسے نامکمل افسانوں کے نہ جانے کتنے بہت سے بکھرے پڑے رہتے ہیں...... اگر آنسو کسی لمحہ بھی نہ رکیں تو ان کا دل سے احترام ہی جاتا رہتا ہے۔

یونہی چپ چاپ وہ دوسرا مہینہ بھی بیت گیا۔
ابا جان نے کہا۔ "جاوید تم نوکری پر کب جا رہے ہو؟"
"سمجھ میں نہیں آتا ابا جان۔"
"کیوں؟ چھٹی کون سی تاریخ سے ختم ہوتی ہے؟"
"مجھے آج وہاں موجود ہونا چاہئے تھا۔"
"تو پھر تم کیوں نہیں گئے؟"
"سوچتا ہوں کہ اب خود جاؤں یا استعفا بھیج دوں۔"
"استعفا!" ابا جان نے چونک کر پوچھا "اب نوکری کا ارادہ نہیں ہے؟"
"یہ نوکری کچھ ٹھیک نہیں ہے ابا جان...... پھر ہمارا افسر بڑا سخت ہے۔ بس ذرا ذرا سی بات پر...... اور سب سے بڑی مشکل یہ کہ وہاں مجھے اچھا کھانا نہیں ملتا...... آپ نے محسوس کیا کہ یہاں آ کر میری صحت کتنی سنبھل گئی ہے۔ اب چاہتا ہوں کچھ دن یہاں رہ کر بے فکری کروں۔"

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ جہاں لے جا کر بھائی جان مجھے آدمی بنانا چاہتے تھے وہ جگہ ان کی نظر میں اب کیوں بے رنگ و بو ہو گئی ہے۔ جہاں اچھے اچھے ہوٹل ہیں وہاں کھانا بُرا کیوں ملتا ہے۔ جہاں اچھی انگلش فلمیں چلتی ہیں وہاں کیوں دل نہیں لگتا اور جس افسر کی وہ ہمیشہ تعریف

لکھا کرتے تھے وہ اب بڑا کیوں ہو گیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں یہ سب جانتا تھا اور مجھے بھائی جان سے ہمدردی بھی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ میرے رقیب تو نہیں ۔ انہوں نے انجم کو میری طرف سے تو نہیں موڑ ڈالا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر وہ کیا جانیں کہ میں اداس رہتا ہوں !

میرے دل میں شدید آرزو پیدا ہوتی کہ کاش انجم کی بھائی جان کے ساتھ شادی ہو جائے ! میں انہیں خود کوئی گیت نہ سنا سکا مگر زندگی بھر گیت سنتے تو دیکھتا رہوں گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور کیا یہ میرے لئے بہت نہیں !

بھائی جان نے نوکری چھوڑ دی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انجم سنتی رہتیں میں دیکھتا رہتا اور وہ گاتے رہتے ۔

کوئی فطرت کا بہاریں نغمہ ؟ چاند تاروں کا خماریں نغمہ ؟
یا شگوفوں کا نگاریں نغمہ ؟ کون سا گیت سنو گی انجم ؟

نغموں کا ایک تانا بانا سا بن کر ہمارے چاروں طرف پھیل گیا ۔ ایک طرف بھائی جان تھے مختار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دوسری طرف میں تھا مجبور ! بیچ میں انجم ! ہمیشہ کی طرح مسکراتی ہوئی ! ایک کے حال سے غافل اور دوسرے کی باتوں سے باخبر ! میں دن رات اس الجھن میں اپنے لئے سکون کی تلاش کرتا رہتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر میں چاہتا کیا تھا یہ مجھے آج بھی معلوم نہیں ہے ۔

ایک صبح جب ابا جان کسی ضروری کام سے ہفتہ بھر کے لئے باہر جا رہے تھے تو چچا جان کی علالت کا تار موصول ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابا جان کو انتہائی ضروری کام تھا ۔ انہوں نے بھائی جان سے کہا کہ تم آج ہی شام کو اپنے چچا کے پاس لکھنؤ چلے جاؤ اور ہفتہ بھر بعد جب میں وہاں پہنچوں تو تم واپس چلے آنا ۔ بھائی جان اس خبر سے مضطرب ہو گئے مگر لاچار تھے ۔ اسی شام کو جانا پڑا ۔ انجم سے ملنے گئے تو میں عمداً گھر پر رہ گیا ۔ میرا دل ہی نہ چاہتا تھا کہ ان کے ساتھ جاؤں ! واپس لوٹے تو کتنے افسردہ تھے ۔ مجھے رحم آنے لگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بھائی جان کو اسٹیشن پہنچا کر میں نے سوچا کہ انجم کے پاس چلتا ہوں ، ان سے کہوں گا کہ بھائی جان ایک ہفتہ بعد ضرور آ جائیں گے ۔

ان کے یہاں پہنچا وہ اپنے پلنگ پر آنکھیں بند کئے ہوئے لیٹی تھیں ۔ میری ہمت نہ ہوئی کہ ان کو آواز دوں ! چپ چاپ لوٹ آیا ۔

پھر دوسرے دن صبح کو باغ میں گیا ۔ نومبر کی شروع تاریخیں تھیں اور صبح کے وقت خاصی ٹھنڈ ہوتی تھی مگر میں صبح کو باغ میں ضرور جاتا تھا اور وہ مجھے وہاں ضرور ملتی تھیں ۔ سوچ رہا تھا کہ آج خدا جانے وہ موجود ہوں گی یا نہیں مگر پہلی نظر میں ان کو حوض کے کنارے بیٹھا ہوا دیکھ لیا ! حال چال پوچھنے کے بعد انہوں نے پہلا سوال کیا ۔

"جاوید ، ایک ہفتہ بعد ضرور واپس آ جائیں گے ؟"

"ہاں ضرور !"

"اچھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھولوں کو ہاتھ نہ لگانا ! سمجھے ؟"

"سمجھ گیا !"

انہوں نے پھول توڑے اور جب ایک گلاب کا پھول میرے کوٹ میں لگا کر واپس چلی گئیں تو میں نے سنگ مرمر کے چبوترہ پر بیٹھ کر محسوس کیا آج بہت دن بعد میری بے چین روح کو کسی نے لوریاں دے کر آرام کی نیند سلا دیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور میں بہت خوش ہوں !

ایک ہفتہ گذر گیا ۔

"آج تمہارے بھائی جان کے آنے کا دن ہے ؟"

"جی ہاں آج آ جائیں گے !"

"تم اسٹیشن جاؤ گے ؟"

"ضرور جاؤں گا۔"

"پھر ان کے ساتھ یہاں آؤ گے؟"

"ضرور آؤں گا۔"

میں شام کو گیا ضرور مگر بھائی جان کے ساتھ نہیں بلکہ تنہا! انجم کو یہ بتانے کہ چچا کی طبیعت بدستور خراب ہے بھائی جان ایک ہفتہ بعد آئیں گے۔

——اور ایک ہفتہ!

یہ دوسرا ہفتہ ان کے چہرہ پر اُداسی کا رنگ مل مل کر گذر گیا مگر بھائی جان پھر بھی نہیں آئے..... چچا کی طبیعت ابھی تک خراب تھی۔ آخرکار ابا جان اماں کو لے کر وہاں چلے گئے اور میں یہاں تنہا رہ گیا۔ زیادہ وقت اسکول کے علاوہ انجم کے پاس گزارتا وہ باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتیں اور ہنستے ہنستے آنکھوں میں آنسو امڈ آتے........ میرا دل ڈوب جاتا... میں اس آتش بداماں جنت سے کبھی باز آیا... بھائی جان لوٹ آئیں تو پھر بلا سے انجم کی یہ اداسی ساری کی ساری زندگی کے لئے مجھ پر مسلط ہو جائے اگر ان کے آنسو! جیسے یہ میرا گناہ ہو——

دو ڈھائی مہینے ایسے عجیب گزرے..... رُکے رُکے اور پھیکے پھیکے...... ابا جان لوٹ آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ چچا جان اچھی طرح سے ہیں اور اب میں جاؤں گا تو تمہاری ماں کو لے آؤں گا جاوید بھی تب ہی آئیں گے۔

میں نے انجم کو جا کر بتایا۔

"آ جائیں تب کی بات ہے۔" انجم نے کہا۔

اور میں نے سوچا کہ آخر کیوں نہیں آئیں گے..... ضرور آئیں گے۔

ابا جان دوبارہ گئے۔ واپسی کا جو دن بتا گئے تھے اس کا میں نے لمحہ لمحہ گن کر انتظار کیا۔ "آج بھائی جان ضرور آ جائیں گے۔"

"دیکھیو!"

"مذاق نہیں ڈٹ کر ناشتہ کھلانا پڑے گا آپ کو۔"

"اچھا!"

اسٹیشن پہنچا۔ گاڑی لیٹ تھی اور مجھے جو کھل رہی تھی خدا خدا کر کے ریل آئی تو ابا جان تنہا اُترے۔ میں گھٹ کر رہ گیا۔

"بھائی جان اور اماں کہاں ہیں؟"

"وہیں ہیں!" ابا جان نے جواب دیا۔

"وہ کیوں نہیں آئے؟"

"بس ہفتہ بھر بعد آنے والے ہیں....... جاوید تو انگلینڈ جا رہا ہے۔"

"ایں!" مجھے ابا جان کی بات کا اعتبار نہ آیا۔

"مذاق نہیں... سارا انتظام ہو چکا ہفتہ بھر بعد تو یہاں آئے گا اور دو دن ٹھہر کر اپنا سامان لے کر چلا جائے گا۔"

"یہ کیا سوجھا؟"

"اس کو تو ایسی ہی نئی نئی سوجھتی ہے پہلے کہا نوکری کروں گا میں نے کہا تمہاری مرضی پھر استعفیٰ دے دیا۔ میں نے اس پر اعتراض نہ کیا۔ اب بیٹھے بٹھائے تعلیم کا شوق ہوا تو ولایت چل دئے! مجھ کو تو اب خبر ہوئی جب ان کا پاسپورٹ تک بن چکا ہے۔"

"آپ نے روکا نہیں؟" میں نے ابا جان سے پوچھا۔

"میں کیا روکتا وہ اس قدر خود مختار ہیں ان کو چاہئے تھا کہ اوّل مجھ سے اجازت لیتے۔ ماں رو رو کر جان کا خون کر رہی تھی مگر صاحب زادے نے قسم کھائی ہے کہ ولایت جاکر پڑھوں گا۔"

میں سکتہ کے عالم میں گھر لوٹ آیا۔ انجم کے پاس جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ یہ ولایت کا قصہ اگر وہ سنیں گی تو کیا کہیں گی۔ ..... اُف توبہ! میں نے کوشش بھی کی تو وہاں نہ جا سکا۔ ..... صبح کو باغ میں گیا۔

"جاوید نہ آئے تو آپ بھی چھپ گئے!"

"ابا جان نے کچھ کام بتا دیا تھا۔"

"تمہارے بھائی جان تو خیر کیا آئیں گے مگر خالہ جان کیوں نہیں آئیں؟"

"جناب شرط ہے اگر اگلے ہفتہ سب نہ آجائیں۔"

"بس جاؤ بھی۔" انجم نے ہونٹوں کو دانت سے کاٹتے ہوئے بھیگی بھیگی پلکیں میری طرف اٹھائیں ..... میں سر سے پیر تک لرز گیا۔ اور لاکھ کوشش کی مگر بھائی جان کے ولایت جانے کی بات نہ سُنا سکا۔ جس دن پھر ان کے آنے کی خبر تھی اس دن مجھ کو علم تھا کہ وہ ضرور آجائیں گے۔ مگر اس یقین میں کتنا دُکھ اور غم تھا یہ میں جانتا ہوں۔ وہ آئیں گے اور تیسرے دن چلے جائیں گے ..... ایسی جگہ جہاں سے واپسی کے لئے ہفتے نہیں گنے جاتے بلکہ برسوں کا شمار ہوتا ہے۔

بھائی جان ریل سے اُترے۔

"آپ ولایت جا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں!"

"کیوں؟"

"پڑھنے!"

"کیا پڑھنے؟"

"بس کچھ ..... محض ایک ولایتی ڈگری چاہئے!" اور وہ ہنسنے لگے۔ گھر آکر انہوں نے سامان باندھنا شروع کر دیا۔ مجھ سے انجم کے متعلق ایک بھی سوال نہ کیا اور نہ وہاں گئے۔ میں بھی گم بخود بیٹھا رہا۔

اماں بہت دن کے بعد آئی تھیں اس لئے انجم کی والدہ ان سے ملنے کو آئیں۔ اماں نے انہیں بتا دیا کہ جاوید پرسوں ولایت جا رہا ہے۔ میں بوکھلا گیا کہ اب یہ انجم سے جاکر کہہ دیں گی اور پھر نہ جانے کیا ہوگا! مجھے رہ رہ کر بھائی جان پر غصہ آ رہا تھا۔ اس طرح بنتے تھے کہ جیسے ان کو انجم سے بہت محبت ہے اور اب بلا وجہ ولایت جا رہے ہیں تو ان سے ملنے تک نہیں ..... ان کی زندگی برباد کرنے کے یہ ذمہ دار ہیں۔ اِن کا کیا بگڑا؟ انجم بجھ کر رہ جائے گی اور میری زندگی پھیکی اور بے رس! کیا مجھے انجم سے محبت نہیں؟ اور میں ان کا دُکھ خوشی سے برداشت کر سکوں گا؟ اس گھرے سوچ نے دوسرے دن شام تک میرا پیچھا نہ چھوڑا اور میں ڈر کے مارے انجم کے پاس بھی تو نہ جا سکا۔ نہ جانے ان کی کیا حالت ہوگی۔ بھائی جان کے سامان کی مکمل فہرست بنا کر میں کمرے میں گیا جہاں وہ اِدھر اُدھر کی چھوٹی موٹی چیزیں ہینڈ بیگ میں بند کر رہے تھے! ——— دروازے پر پہنچا تو مجھے سسکیوں کی آواز سُنائی دی اور پھر کچھ اُلجھے ہوئے سے الفاظ! انجم وہاں موجود تھیں! میرے قدم رُک گئے ——— کچھ دیر بعد بھائی جان کی آواز آئی۔

"زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم"

بھائی جان کو اب بھی جاں نثار اختر کی کوئی نظم یاد آ گئی تھی۔ مگر انجم اس کا مطلب نہیں سمجھ سکیں۔

"تو پھر زندگی کیا ہے؟"

میں بھائی جان کا جواب سننے سے پہلے وہاں سے لوٹ آیا۔ انجم کے آنسو بہتی آگ کی طرح میری رگوں میں گھل کر مجھے جھلسے دے رہے تھے۔

دوسرے دن صبح کو بھائی جان نے مجھ سے کہا کہ اسٹیشن جا کر گاڑی کا صحیح وقت معلوم کر آؤ۔ میں نے بمبئی جانے والی گاڑی کا وقت معلوم کیا جو رات کو ساڑھے دس بجے یہاں سے جاتی تھی اور پھر گھر کی طرف لوٹا تو انجم مجھے اپنے باغ کے پھاٹک پر مل گئیں۔

"پرویز میرا ایک کام کرو گے؟"

"کہیے۔" میں نے ان کی متورم آنکھوں اور تمتماتے ہوئے چہرہ کو دیکھ کر بے بسی کے ساتھ کہا۔

"جاوید آج جا رہے ہیں؟"

"ہاں!"

"کتنے بجے؟"

"رات کو ساڑھے دس بجے!"

"اچھا..... تو ان سے کہنا کہ جانے سے پہلے میں ان سے ایک مرتبہ ملنا چاہتی ہوں۔"

"بہت اچھا۔"

"اور دیکھو کہنا کہ سات بجے شام کے بعد سے میں ان کا یہاں باغ میں انتظار کروں گی وہ مجھ سے کھڑے کھڑے مل لیں۔"

"مگر انجم یہاں باغ میں تو رات کو شدید سردی ہوتی ہے۔"

"کوئی حرج نہیں میں ان کو زیادہ دیر نہیں روکوں گی۔"

"لیکن آپ خود؟"

"میری پروا نہ کرو..... تو پرویز تم ان سے کہہ دو گے نا؟"

"ہاں ہاں ضرور!"

میں دیر تک کھڑا ہوا ان کو ڈگمگاتے قدموں سے واپس جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ گھر آ کر بھائی جان کو ان کا پیغام سنا دیا۔ وہ سن کر چپ ہو گئے اور پھر سے مہمانوں کا تانتا لگ گیا۔ ابا جان کے دوست اور اماں کی سہیلیاں سب جمع ہونے لگیں۔ کوئی امام ضامن لے کر آیا تھا اور کوئی صدقہ اتارتا تھا۔

شام گزری اور رات ہو گئی۔ "بھائی جان آپ انجم سے مل لیجیے۔"

"وہ خود یہاں کیوں نہیں آ جاتیں؟"

"باغ میں آپ کا انتظار کر رہی ہیں نا!"

"میں کس طرح جاؤں یہاں اتنے لوگ جمع ہیں؟"

"دس پندرہ منٹ کو ہو آتے اب آٹھ بج گئے اور وہ سات بجے سے وہاں آپ کی منتظر ہوں گی۔"

"اچھا، دیکھو موقع لگا تا ہوں۔"

نو بج گئے۔

"بھائی جان اب نو بج چکے ..... آپ گھنٹہ سوا گھنٹہ میں چلے جائیں گے۔"

"ہاں!"

"انجم سے مل لیجئے نا۔"

"دیکھو اماں کس قدر رو رہی ہیں۔ یہاں سے اٹھ کر گیا تو وہ کیا سوچیں گی؟"

"بس پانچ منٹ کے لئے۔"

"کوشش کرتا ہوں۔"

"بھائی جان دس بج گئے۔"

"کیا کروں پرویز سمجھ میں نہیں آتا۔"

"ایک لمحے کو ہو آئیے۔"

"کوئی اٹھنے دے تبھی نا۔"

سوا دس ہوتے تو ابا جان نے کہا۔ "بیٹا جاؤ۔ اب تمہاری روانگی کا وقت ہو گیا۔"

"چلتا ہوں ابا جان!"

میں نے مضطرب ہو کر بھائی جان سے کہا۔ "بھائی جان انجم!"

"مجبور ہوں پرویز۔"

اور جب موٹروں میں بیٹھ کر سب اسٹیشن چلنے لگے تو میرے کانوں میں آپ سے آپ انجم کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ کاش بھائی جان ان سے لمحہ بھر کو ہی جا کر مل لیتے وہ اس شدت کی سردی میں دھڑکتے دل سے منتظر ہوں گی۔ اسٹیشن پہنچے تو اماں کی روتے روتے بُری حالت ہو رہی تھی بھائی جان کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے۔ "خط لکھتے رہنا پرویز۔"

جب ریل نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو میں نے آنسو پونچھ کر اماں سے کہا۔ "اب واپس چلئے۔" ابا جان تو بھائی جان کو چھوڑنے بمبئی گئے تھے میں اور اماں لوٹ کر آئے اماں کے آنسو کسی طرح نہ تھمتے تھے ورنہ میں اسی وقت جا کر انجم سے ملتا میرے سینے میں آنسوؤں کا طوفان اُمنڈ رہا تھا اور میری خواہش تھی کہ یہ سارے آنسو میں انہی کے سامنے جا کر بہاؤں ...... ممکن ہے کہ ہم دونوں کو تسکین ہو جائے! رات بھر بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور سینے میں نامعلوم گھٹن ہوتی رہی۔

صبح کو چھ بجے کے قریب میں بستر سے اٹھ کر برآمدے میں نکل آیا۔ فروری کا شروع تھا اور گذشتہ رات غیر معمولی سردی رہ چکی تھی۔ کہر کے اثر سے آس پاس کچھ نظر نہ آتا تھا۔ خلا میں نظر جمائے خاموش کھڑا رہا۔ جب سے سردیاں شدت کی ہوئیں تو انجم نے صبح سویرے کے بجائے دن چڑھے باغ میں نکلنا شروع کر دیا تھا۔ میرے اسکول کے اوقات بھی بدل گئے تھے اس لئے میں بھی دیر سے جایا کرتا تھا۔ آج ایک عجیب سی خواہش پیدا ہوئی کہ اس کہرے اور ٹھنڈ میں نکل جاؤں اور باغ کا چکر کاٹوں اور کوٹ پہن کر میں باغ میں چلا گیا جہاں اوس سے ہر چیز تر تھی اور ٹھٹھری ہوئی نظر آتی تھی...

چکر لگا کر سنگِ مرمر کے چبوترے تک پہنچا اور دفعتہ ٹھٹھک کر رہ گیا...... کوئی لیٹا ہوا تھا! شاید انجم!

میں دوڑ کر قریب گیا...... وہی تو تھیں!

"انجم...... انجم!" وہ شاید سو رہی تھیں...... وہ اتنے سویرے بغیر کسی گرم کپڑے کے یہاں آگئی ہیں اور اس برف جیسے سنگِ مرمر پر لیٹی ہیں...... میں نے حیران ہو کر ان کا ہاتھ کھینچا۔ "انجم!"

مگر وہ بے حس و حرکت تھیں۔ کپڑے اوس کے اثر سے بالکل بھیگے ہوئے تھے! ہاتھ برف سے زیادہ ٹھنڈے اور چہرہ سنگ مرمر سے زیادہ سفید۔ کیا انہوں نے ساری رات یہاں گزاری ہے! اور یہ حالت!

بجلی کی طرح ایک وحشت ناک خیال میرے دماغ میں پیدا ہوا اور میں نے ان کو پاگلوں کی طرح جھنجھوڑ دیا: "انجم! انجم!"

انہوں نے آنکھیں کھول دیں چونک کر نہیں بلکہ سہم کر!

"پرویز!"

"یہ آپ کیا کر رہی تھیں؟" میں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں۔" انہوں نے گرد و پیش پر اپنی ویران نگاہیں دوڑا کر کہا۔

"کب سے یہاں لیٹی ہیں؟"

"کب سے؟ دس بجے تک تو مجھے یاد ہے کہ میں بیٹھی ہوئی تھی۔"

"تو آپ رات بھر یہاں رہی ہیں؟"

"ہاں!"

"اس شدید ٹھنڈ میں؟"

"نہیں زیادہ ٹھنڈ تو نہ تھی۔"

"وہ رات کو قیامت کی سردی تھی جب ہم اسٹیشن سے لوٹ رہے تھے تو دانت سے دانت بج رہا تھا۔"

"تمہارے بھائی جان گئے؟"

میں اس کا جواب نہ دے سکا۔

"تم نے میرا پیغام پہنچا دیا تھا؟"

میں اب بھی خاموش رہا۔

"اچھا یہ تو بتاؤ انہوں نے میرے لئے کوئی بات بھی نہیں کہلائی؟"

میں نے بیتاب ہو کر ان سے کہا: "انجم میں آپ سے یہاں بات نہ کروں گا۔ خدا کے لئے اندر چلئے آپ کو احساس نہیں آپ کا کیا حال ہے؟"

"چلو!" وہ چلنے لگیں مگر لڑکھڑا گئیں۔

"ٹھہریئے۔" میں نے ان کے بازو کو سہارا دیا ان کے چہرے پر شبنم کی بوندیں چمک رہی تھیں اور کپڑے تو اس قدر تر تھے کہ نچوڑے جا سکتے تھے۔

میں نے ان کو پکڑ کر ان کے کمرے تک پہنچا دیا اور واپس آتے ہوئے کہا کہ "میں اسکول سے واپسی پر آپ کے پاس آؤں گا۔ آپ جا کر آگ کے پاس بیٹھئے۔ خدا نہ کرے اگر سردی لگ گئی تو غضب ہو جائے گا۔"

اسکول گیا مگر مطلق کام نہ ہو سکا۔ ایسا اضمحلال تھا کہ جس کو بیان ہی نہیں کر سکتا...... واپس لوٹا تو سیدھا ان کے یہاں گیا اور برآمدے میں ہی حیران کھڑا رہ گیا۔ کمرے سے ڈاکٹر نکل رہا تھا وکیل صاحب بھی انتہائی پریشانی کے عالم میں ساتھ تھے۔

"کیا بات ہے؟" میں نے مضطرب ہو کر وکیل صاحب سے پوچھا۔

"انجم کی طبیعت خراب ہے!"

میں سمجھ گیا کہ یہ رات کی سردی کا نتیجہ ہے کمرے میں جا کر دیکھا تو بخار کی تیزی سے بیہوش تھیں اور گہرے گہرے سانس لے رہی تھیں! مجھ سے

ضبط نہ ہو سکا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے گھر آ کر اماں کو بتایا اور بستر پر گر پڑا۔

"خدایا اب کیا ہو گا؟"

پھر تھوڑی دیر بعد گیا وہی کیفیت تھی، دیکھتا رہا اور پھر لوٹ آیا۔ صبح کو اسکول سے پہلے گیا پتہ چلا رات بھر طبیعت سخت خراب رہی ہے اور اب بھی بیہوش ہیں......

اسکول جانے کی ہمت نہ تھی مگر کہیں سکون بھی نہ ملتا تھا لاچار چلا گیا اور پورے وقت کلاس میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ شام کو دھڑکتے دل سے جا کر دیکھا...... سارے گھر میں مُردنی چھا رہی تھی۔ برآمدے میں ڈاکٹر اور وکیل صاحب باتیں کر رہے تھے۔ ڈاکٹر نے کہا: "نمونیہ ہو گیا ہے دونوں پھیپھڑوں پر اثر ہے...... پوری احتیاط کیجئے آگے خدا مالک ہے۔"

میں وہیں سے بھاگ آیا اور باغ میں ایک تنے سے کمر لگا کر بیٹھ گیا۔ آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے اور دل کو کوئی دونوں ہاتھوں سے مسل رہا تھا۔

"اللہ کرے انجم اچھی ہو جائیں اور ان کے بدلے مجھے موت آ جائے۔"

رات کو گیا تو بیٹنگ پلنگ کے پاس کھڑا رہا۔ ان کی طبیعت بدستور خراب تھی اور بیہوش تھیں...... میں نے واپس آ کر ساری رات کرسی پر بیٹھے گذار دی...... اور تڑپ تڑپ کر دعا ورد!

ڈاکٹروں نے انجکشن دے دے کر ان کے دونوں بازو چھلنی کر دئے تھے مگر ان کو احساس نہ تھا۔

بیماری کے چار جان لیوا دن گزرنے کے بعد پانچویں دن صبح کو پتہ چلا کہ ان کی طبیعت بہتر ہے اور ہوش میں ہیں! میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا اماں اکثر وہیں رہتی تھیں۔ اس وقت بھی موجود تھیں میں نے کمرے میں جا کر دیکھا تو انجم آنکھیں کھولے ہوئے لیٹی تھیں۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا اور جواب میں ایک مدھم سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

وکیل صاحب کی بیوی بھی مطمئن تھیں انہوں نے اماں سے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔

"جاوید میاں کب لوٹیں گے؟"

اماں نے کہا: "دو سال کو کہہ گیا ہے۔"

"بہن تم نے ناحق جانے دیا ماشاءاللہ اچھے خاصے پڑھے لکھے تو ہیں۔"

"آج کل کے زمانہ میں اماں باوا کی کون سُنتا ہے جو جی میں آئے کرتے ہیں۔ میں نے تو بہتیرا روکا مگر وہ باز نہ آیا۔"

"پھر بھی آخر گئے کیوں ہیں؟"

"کیا بتاؤں بہن آج کل کی لڑکیوں میں شرم کا تو نام نہیں۔ دیدہ کا پانی ڈھل گیا ہے...... جاوید چچا کی بیماری میں گئے تھے ان کی لڑکی بہت فیشن ایبل ہے۔ بی۔ اے پاس ہے! وہ کہنے لگی کہ میں تو اس سے شادی کروں گی جس کے پاس ولایت کی ڈگری ہو گی! بس جاوید کو چڑ ہو گئی کہ ولایت جاؤں گا...... پھر کس کے کہنے سے رُکتا؟"

"تو چچا کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟"

"اور کیا یہی تو بات ہے۔"

وکیل صاحب کی بیوی اور اماں میں یہ گفتگو ہو رہی تھی اور میرا دم رُکا جا رہا تھا۔ مجھے خود بھی علم نہ تھا کہ بھائی جان کس وجہ سے دفعتہً ولایت جانے کو تیار ہو گئے ہیں! اب پتہ چلا کہ چچا کی لڑکی نے یہ فرمائش کی تھی! کاش اماں نے یہ سب انجم کے سامنے نہ کہا ہوتا

میں نے انجم کی طرف دیکھا تو انہوں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

وکیل صاحب نے آکر کہا کہ ڈاکٹر نے مریض کے کمرے میں زیادہ بیٹھنے کو منع کر دیا ہے۔ ہم واپس آ گئے۔

اماں کی گفتگو نے مجھے عجب الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ خدا خدا کر کے آج ان کی طبیعت سنبھلی تو یہ خبر سُنی اب اللہ جانے اس کا کیا اثر لیں گی۔

شام کو گھر سے نکل ہی رہا تھا جو ان کا نوکر بھاگتا ہوا آیا۔ میں نے گھبرا کر پوچھا "کیا بات ہے؟"

"بیگم صاحبہ کو جلدی بھیجئے انجم بی بی کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے۔"

میں ان کی بات ختم ہونے سے پہلے بھاگا اور سیدھا ان کے کمرے میں گیا.... یا اللہ کیا عجب عالم تھا۔ تین چار ڈاکٹر پلنگ کے پاس جمع تھے اور بار بار انجکشن دے رہے تھے! انجم بالکل غافل تھیں اور زور زور سے سانس آ رہا تھا۔ اتنی زور سے کہ باہر برآمدے میں بھی اس کی آواز صاف سنائی دے۔

وکیل صاحب نے روتے ہوئے کہا "اب کیا ہو گا؟"

ڈاکٹر نے مایوس لہجے میں جواب دیا "خدا بہتر جانتا ہے دعا کیجئے۔"

میں تیر کی طرح کمرے سے باہر نکلا اور بے خبری میں بھاگتا ہوا باغ میں پہنچ کر اسی سنگ مرمر کے چبوترہ پر گر پڑا جس پر انجم نے ایک رات گزاری تھی۔ دماغ میں کوئی خیال نہ تھا نہ دل کو صدمے کا احساس! میں پھوٹ پھوٹ کر روتا گیا یہاں تک کہ سر چکرانے لگا۔ ہاتھ پیر ڈھیلے ہوتے گئے..... اور میں بیہوش ہو گیا۔

پھر ہوش آیا رات کا وقت تھا اندھیرا جس میں پھیکی چاندنی کا بس نہ چل رہا تھا..... وہاں اب کچھ باقی بھی ہو گا یا سب کچھ ختم ہو چکا۔ میرے قدم گھر کی طرف اٹھنے لگے جہاں گہری خاموشی طاری تھی..... یا اللہ اب کیا سنوں گا! میں نے ستون کا سہارا لیتے ہوئے سوچا..... برابر سے ایک نوکر گزرا میں نے بمشکل کہا۔ "انجم!"

اس نے کہا۔ "اچھی ہیں!"

"اچھی ہیں!" میں پھر بھاگا اور کمرے کے پاس جا کر رک گیا انجم کی والدہ برآمدے میں بیٹھی تھیں۔

"انجم کیسی ہیں؟"

"خدا کا شکر ہے۔"

"میں جا کر دیکھ لوں؟"

"ڈاکٹر نے منع کر دیا ہے کہ بات چیت نہ کریں۔"

"میں بات نہ کروں گا۔"

"اچھا تو جا کر دیکھ لو۔"

میں آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا کمرے میں داخل ہوا وہ آنکھیں کھولے ہوئے دروازے کی طرف رُخ کئے لیٹی تھیں۔ مجھے دیکھ لیا۔

"کیا حال چال ہے؟" بے حد نحیف آواز آئی۔

میں بے قرار ہو کر پلنگ کے پاس دو زانو ہو گیا۔

"آپ اچھی ہیں تو میں بھی اچھا ہوں۔"

"آنکھیں سوج رہی ہیں! کیا روتے رہے؟"

میں نے بے قابو ہو کر ان کے ہاتھ کو تھام لیا اور کوشش کے باوجود آنسوؤں کو ضبط نہ کر سکا۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو ان کی آنکھوں میں بھی آنسو چمک رہے تھے۔

مسرت کے احساس نے مجھے بیخود کر دیا اور اپنے حواس سنبھالنے کو میں کھلی ہوئی کھڑکی کے باہر تکنے لگا جہاں آسمان پر تاروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک چمکتا ہوا بڑا سا تارا ٹوٹا اور اندھیرے میں ڈوب گیا۔ میں نے مڑ کر انجم کی طرف دیکھا تو وہ بھی آسمان کو تک رہی تھیں۔

"یہ تارے کیوں ٹوٹا کرتے ہیں؟" میں نے موضوع بدلنے کے خیال سے کہا۔

"جب کسی انسان کی موت آتی ہے تو آسمان سے ایک چمکتا ہوا تارا ٹوٹ کر تاریکیوں میں ڈوب جاتا ہے۔"

"میں نے کہا: "واہ یہ آپ نے نرالی منطق نکالی۔"

"نہیں سچ کہہ رہی ہوں۔"

"اچھا خیر ہو گا۔" میں نے چاہا کہ کسی طرح بات کو ٹال دوں۔

"پرویز تم کو میرا نام تو معلوم ہے؟"

"جی ہاں کیوں نہیں۔" میں اس سوال پر حیران ہو گیا۔

"جانتے ہو انجم کسے کہتے ہیں؟"

میں بات کا مطلب سمجھ گیا۔ "مجھے نہیں معلوم۔"

"تارے کو کہتے ہیں۔"

اس سے قبل کہ میں کچھ کہوں ان کی والدہ کمرے میں داخل ہوئیں۔

"پرویز تم نے وعدہ کیا تھا کہ بات نہیں کرو گے۔"

"معاف کیجئے...... چلتا ہوں۔" میں انجم کو خدا حافظ کہہ کر اطمینان اور خوشی کے سانس لیتے ہوئے گھر لوٹا۔ اب ان کی طبیعت بہتر ہے۔ خدا نے چاہا تو دو چار دن میں بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔

کئی دن کے بعد رات کو نیند آئی اور میں بے شدھ ہو کر سو گیا۔

صبح کو آنکھ کھلی، کمرے سے باہر نکلا تو اماں موجود نہ تھیں۔ میں نے نوکر سے پوچھا۔

"اماں کہاں ہیں؟"

"وکیل صاحب کے یہاں!"

میرا جی دھک سے ہو گیا...... پھر سے طبیعت خراب نہ ہو گئی ہو۔ ننگے پاؤں نکل کر دوڑا۔

بہت لوگ جمع تھے۔ میں دیوانوں کی طرح سب کے بیچ میں سے گزرتا ہوا اندر داخل ہوا۔ رونے کی آوازیں چاروں طرف سے سنائی دے رہی تھیں...... اور جب میں نے کمرے میں قدم رکھا تو میری نگاہیں انجم کے پلنگ سے ٹکرائیں۔ نہ وہ مسکراتی ہوئی آنکھیں تھیں۔ نہ ہنستے ہوئے لب...... صرف ایک سفید چادر...... جس نے ان کا آخری پیغام مجھ تک پہنچا دیا...... "تارہ ٹوٹ چکا تھا!"

مدھو سودن

سمندر اور تین کمرے

اپنے قریب اس کی موجودگی کے ایک شدید احساس کو لئے ہوئے وہ بینچ پر بیٹھی رہی۔ یہاں سے اٹھ جانا بے تکا معلوم ہوتا تھا۔ اور یہاں بیٹھے رہنا بھی بے ہنگم سا معلوم ہو رہا تھا۔ بینچ پر اس اجنبی نوجوان کے اس بیٹھے ہوئے اس کے اعصاب میں ایک عجیب سی حرکت پھیل گئی تھی۔ جسے نیم اختیاری طور پر روکنے کی کوشش میں وہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اپنی یہ سنجیدگی اسے پسند نہ تھی لیکن وہ خاموش بیٹھی رہی۔

سمندر کے کنارے پڑے ہوئے ان بنچوں پر دور دور تک لوگ بیٹھے ہوئے نظر آتے تھے لیکن خود کو اس نوجوان کے ساتھ تنہا سا محسوس کر رہی تھی جو اس کے پاس آ بیٹھا تھا۔ اس کے بھاری ہاتھ اس کے گھٹنوں پر رکھے ہوئے تھے اور وہ ٹھہر ٹھہر کر ایک پریشان تفکر کے سے انداز میں انگلیوں سے اپنے گھٹنوں پر تھپکی دینے لگتا تھا اور اس کی طرف سے بظاہر بالکل لاپروا سا تھا، جیسے اسے سیما جیسی مسز ورثن کی موجودگی کا احساس نہیں ہے۔ سیما کو محسوس ہوا تھا کہ اس کا یہ انداز استغنا مصنوعی ہے اور اس سے اسے ایک غیر شعوری تحقیر کا سا احساس ہو رہا تھا لیکن وہ بے توجہی سے سمندر کے افق کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں فاصلے پر خشکی کا ایک مختصر سا ٹکڑا سمندر میں گھستا چلا گیا تھا اور اس پر استادہ بلند و بالا عمارتوں کے عقب میں سورج غروب ہو چکا تھا۔ غروب آفتاب کی سرخی کا سایہ سمندر اور آسمان کے سنگم پر ساکن ہو گیا تھا۔ سمندر کی سطح کو چھوتا ہوا یہ سایہ سرمئی ہوتا گیا تھا اور تاریکی کا منبع سمندر کا نیلا پانی معلوم ہوتا تھا۔

سیما کی توجہ لہروں کی طرف منعطف ہو گئی تھی اور لہروں کے شور سے جو اس کے شعور سے فیڈ ہو گیا تھا وہ پھر سن رہی تھی سمندر اوج ساکن نہ تھا، ہوا تیز تھی۔ لہریں گرد رہ کا شور کرتی ہوئی کنارے کی طرف بھاگی آتی تھیں اور کنارے سے ٹکرا کر پھیل جاتی تھیں۔ اور پھر واپس سمندر میں چلی جاتی تھیں۔ لہروں کو دیکھتے ہوئے سیما ایک لمحہ کے لئے اس کی موجودگی سے غافل ہو گئی، وہ یہ چاہتی تھی اور وہ توجہ سے دیکھنے لگی کہ یہ لہریں کہاں سے شروع ہوتی ہیں۔ لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا، سمندر کی حرکت تھوڑے سے فاصلے پر آ کر لہر بن جاتی تھی۔ اور وہ لہر اپنے آگے ایک اندھیرا سا سایہ لئے کنارے کی طرف دوڑی آتی تھی اور اس کے پیچھے دوسری لہر، اور اس سے پہلے کہ پہلی لہر کنارے سے ٹکرا کر واپس جائے دوسری لہر اس سے آ کر ٹکرا جاتی تھی۔ لہروں کے تسلسل میں ایک شور ہوتا تھا جو ہر وقت پھیلا ہوا بھی ہوتا اور مجتمع بھی، اور مجموعی شور میں ڈوبا جاتا تھا جو ایک صوتی حرکت معلوم ہوتا تھا۔

وہ اس میں منہمک ہوگئی تھی کہ اچانک سیٹ پر نوجوان نے حرکت کی۔ وہ اپنی صورتِ نشست بدلنے کے لیے ایک ٹانگ کو دوسری ٹانگ پر رکھ رہا تھا، پھر ایک خفیف سی بے چینی سے اس نے اس ارادے کو ملتوی کر دیا اور پاؤں پھیلا کر بنچ کے سہارے پیچھے کو جھک گیا۔ سیما کے دل میں اُسے دیکھنے کا ایک مختصر سا تجسس پیدا ہوا اور اس نے دیکھ لیا، اس کی پیشانی پر بے چینی کی مختصر شکنیں تھیں اور —— اچانک اس نے چہرے کی ایک خفیف سی جنبش سے سیما کو دیکھا اور سیما کی نگاہیں اس کے وجود سے پرے پھسل گئیں۔ لیکن یہ خیال رہ گیا کہ نوجوان نے دیکھتا ہوا دیکھ لیا ہے اور اس خیال سے اُسے اپنے احساس میں ایک عدم آسانی سی محسوس ہونے لگی۔ وہ اٹھنا چاہتی تھی۔ لیکن اٹھی نہیں، جسم میں کچھ لہریں سی پیدا ہو رہی تھیں اور یہ لہریں اس کے جسم میں داخل ہو رہی تھیں، اُسے چھوڑ رہی تھیں۔

”میں آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کر رہا ہوں؟“ اس نے اچانک کہا۔

”نہیں“ سیما نے بغیر سوچے ہوئے جواب دیا، اور یکایک اُس کے جسم میں حرکت کرتی ہوئی لہریں رک گئیں، اور اس نے ایک آسانی سی محسوس کی جیسے سیما کی اور اس کی شخصیت کے درمیان سے ایک اسرار سا تفریق ہو گیا ہو۔

”تعجب ہے“ اس نے نیم طنزیہ سے لہجے میں کہا ”لیکن آپ کو اگر کسی دوسرے آدمی کے ساتھ بیٹھنا پسند نہ ہو تو میں یہ بینچ چھوڑ دوں گا۔“

”نہیں آپ بیٹھے رہیں“ سیما نے پھر ایک عدم آسانی سی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال تھا اس سمندر کے کنارے ایسی کوئی عورت نہ ہوگی جو کسی دوسرے آدمی کے ساتھ بیٹھنا پسند کرے۔“

سیما نے اس کی طرف دیکھا، یہ بات اُسے پسند نہ آئی لیکن اسے ایک مخصوص سے تعجب نے مس کیا۔

دہلی میں میرا خیال تھا کہ صرف وہیں کے لوگوں میں ملنساری کی اتنی کمی ہے اور شاید بمبئی میں ایسا نہیں ہوگا، لیکن یہاں ہر شخص کی اپنی الگ زندگی ہے اور وہ اس میں کسی کو شریک کرنا نہیں چاہتا۔“

”آپ دہلی سے آئے ہیں؟“ سیما نے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے پوچھا، اور اُسے اپنا یہ استفسار عجیب معلوم ہوا۔

”ہاں“ اُس نے جواب دیا ”اور یہاں معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک دور دراز جزیرہ ہے، جہاں ساتھ دینے کو کوئی نہیں اور انسان ہزاروں میں بیوقوفوں کی طرح چلتا ہے اور دکانیں بالکل اجنبی معلوم ہوتی ہیں اور سڑکیں پرائی اور وہ زبان سنائی نہیں دیتی اپنی جسے سننے کی عادت ہے۔“

وہ خاموش ہو گیا اور سیما کو تعجب ہوا کہ یہ شخص کچھ زیادہ بے تکلفی سے بات کر رہا ہے۔ یہ بے تکلفی اس نے اپنے لیے محسوس نہ کی اس کی گفتگو کا انداز کچھ ایسا تھا گویا وہ سیما سے زیادہ خود کو مخاطب کر رہا ہو، یا کسی کو بھی نہیں، یا سب کو، بغیر اس بات کی پروا کیے کہ اس کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ وہ سفید قمیص اور سفید پتلون پہنے ہوئے تھا اور اس کے سر کے ہلکے بال ماتھے پر سے پیچھے چلے گئے تھے، ماتھے پر خفیف سی شکنیں تھیں، اور اس سے سیما کو ایک پُراسرار سی دلچسپی ہو گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی گفتگو میں ایک صداقت سی ہے اور وہ اس کے جذبات کے متعلق متجسس ہو گئی۔ وہ خاموش ہو گیا تھا، اور پھر اچانک اس نے کہا۔ میرا خیال ہے آپ بمبئی کی رہنے والی نہیں؟“

”نہیں“ سیما نے جواب دیا ”لیکن مجھے بمبئی میں تین سال ہو گئے ہیں۔“

”اوہ۔ تین سال تو بہت ہوتے ہیں“ وہ رک گیا۔ پھر بولا — ”یہاں میرا اُن لوگوں سے گفتگو کرنے کو جی چاہتا ہے جو بمبئی کے نہیں ہیں، یا جو مجھے بمبئی کے معلوم نہیں ہوتے۔ آپ کو میری گفتگو ناگوار تو نہیں ہوئی؟“

سیما شاید کہنے لگی تھی۔ کہ نہیں، لیکن اس نے جواب کا انتظار نہیں کیا

بمبئی میں آکر میں نے صرف تین آدمیوں سے بات کی ہے اور ان لوگوں سے اکتا گیا ہوں انہیں چھوڑ نہیں سکتا اور ان سے نفرت کرنے

لگا ہوں"

"آپ یہاں اکیلے ہیں؟"

ہاں —" اور پھر ایک ملگجی مسکراہٹ میں جو مسکراہٹ سے زیادہ کچھ اور تھی، وہ کہنے لگا — "تین مہینے کی تنہائی کے بعد اب کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ پاس سے گزرتے ہوئے یا قریب بیٹھے ہوئے کسی آدمی کو مخاطب کروں لیکن میں ایسا کر نہیں سکتا .... یہ بات کہ انسان تنہائی سے اتنا پریشان ہو جاتا ہے کہ راہ چلتے آدمیوں سے تعارف پیدا کرنا چاہے، شاید آپ اسے صحیح نہ سمجھتی ہوں، لیکن یہ صحیح ہے۔ اور کبھی کبھی تعجب ہوتا ہے اور غصہ آتا ہے کہ میں اتنے آدمیوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی اپنے کو اکیلا محسوس کرتا ہوں۔"

سیما سمجھ نہ سکی کہ کیا جواب دے اور وہ خاموش رہی۔ اس شخص کی گفتگو اس پر ایک مثبت اثر کر رہی تھی، لیکن اسے اپنی زبان کے آگے ایک رکاوٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ درمیان میں ایک جھجک سی حائل تھی۔ دل کے اندر اسے محسوس ہوتا تھا کہ کچھ کہے لیکن جو کچھ کہنا تھا وہ باہر نہ آتا تھا۔ اور وہ خاموش بیٹھی رہی۔ سمندری افق پر سرخی غائب ہو چکی تھی اور مغرب کے سائے پر ایک بڑا سا ستارہ چمک رہا تھا اور روشنی کی ایک طویل لکیر سمندر کی سطح پر پڑ رہی تھی جو مدھم ہو گئی تھی۔ پانی کی نیلاہٹ میں اندھیرا گھل گیا تھا۔ ہوا میں ایک عجیب سی سمندری بو پھیل گئی تھی۔ اور وہ یہ جان نہ سکی کہ یہ بو سمندر کی سیپیوں کی ہے یا ریت کی، یا پانی کی یہ بو عجیب تھی، اس میں سمندر کی دلکشی اور ایک شامی برگشتگی دونوں پائی جاتی تھیں۔ وہ اس کے متعلق ایک مخصوص احساس کی عادی تھی۔ ہوا ہلکی پڑ گئی تھی اور اس کے سر پر ناریل کے درختوں کا جوش سرد ہو گیا تھا۔ اندھیرا ہو گیا تھا۔ ساحل پر ٹہلتے ہوئے لوگ واپس جا رہے تھے، واپس چلے گئے تھے۔ قریب کے بینچ خالی پڑے تھے۔ سیما نے پھر خود کو نوجوان کے ساتھ اکیلا محسوس کیا اور عادتی طور پر اسے خیال آیا کہ اب چلنا چاہئے۔ وہ چلنے کو تیار ہو گئی۔ نوجوان اپنی انگلیوں کو ایک موہوم سی بے چینی میں مسل رہا تھا اور سیما نے اٹھنے میں ایک تردد سا محسوس کیا۔ وہ ایک کشمکش میں پڑ گئی کہ اٹھنے سے پہلے اس سے کچھ کہے یا نہیں۔ کہے تو کیا کہے یہ سمجھ میں نہ آتا تھا اور پھر وہ تھوڑی دیر بیٹھی رہی۔ اندرونی طور پر وہ کچھ کہنے کے لئے محسوس کر رہی تھی لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہے اور سیما انتظار کرتی رہی کہ وہ خود ہی کچھ کہے لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ اس کی نگاہیں سمندر کی سطح پر روشنی کی لکیر کو دیکھ رہی تھی۔ سمندر کا کنارا سنسان ہو گیا تھا۔ سیما اٹھ کھڑی ہوئی۔ نوجوان نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا جیسے اسے برا لگا ہو کہ وہ جا رہی ہے وہ چلی گئی۔ اس کی نگاہ میں تعجب اور ناگواری کے اس جذبے سے سیما کو محسوس ہوا کہ اس نے اس کی توہین کی ہے اور آگے جا کر جب اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ اب بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر یکبارگی ہی دونوں نے منہ پھیر لیا۔ وہ ساحل پر خالی بینچوں کو دیکھتے ہوئے اور وہ آگے چلی گئی۔

ماہم سے دادر جاتی ہوئی بس میں بیٹھی ہوئی وہ سوچتی رہی۔ سیما کو معلوم ہو رہا تھا کہ اس نے اجنبی کی ہتک کی ہے، نہایت عجیب ڈھنگ سے وہ خود کو قصوروار سمجھ رہی تھی .... یاد کر رہی تھی کہ جب پیچھے مڑ کر اس نے دیکھا تھا تو جیسے اس نے برا مان کر منہ پھیر لیا تھا، برا مان کر۔ اور حقیقت میں وہ یہ نہیں چاہتی تھی۔ سیما کے دل کی عورت اس کی گفتگو سے متاثر ہوئی تھی اور وہ خود کو قصوروار سمجھ رہی تھی۔ اس تاثر کا وہ خود سے اعتراف کرنا نہ چاہتی تھی۔ اور اس نے اس احساس قصور کو اپنے اوپر سے ہٹانے کی کوشش کی۔ کتنی عجیب تھی اس کی یہ بات کہ یوں خواہ مخواہ اس سے باتیں کرنے لگا، اس نے سوچا، اسے یہ امید ہی کیوں تھی کہ وہ اسے اس طرح جواب دے گی لیکن —— سیما کے دل میں کوئی چیز اس کی حمایت کر رہی تھی، وہ اس ضد سے رہائی چاہتی تھی لیکن نوجوان کی سادی شخصیت ایک غیر عمومی تاثر کی شکل میں اس کے ذہن میں مجتمع ہو گئی تھی، یہ شخص —— اچانک بے ربط طور پر اسے اپنے شوہر کا خیال آگیا۔ اس نے سوچا وہ اس وقت گھر پر نہ ہوں گے۔ اپنے شوہر کے ساتھ وہ ایک غیر خوشگوار حالت میں رہ رہی تھی۔ وہ دن میں لڑکیوں کو پڑھاتی تھی اور ——

بس رک گئی تھی۔ سیما کے ساتھ والی عورت اتر گئی اور وہ کھڑکی کے قریب سرک گئی۔ بس اب دادر میں داخل ہو رہی تھی۔ مکانوں کے اندرونی حصوں

میں دھیمی روشنیاں تھیں اور بس اندھیرے میں سے گزر رہی تھی۔ بلیک آؤٹ میں دور دور کھمبوں سے لٹکتی ہوئی ڈھکی ہوئی روشنیوں کے دھبّے تھے اور اُن کے چاروں طرف اندھیرا۔ یہ اندھیرا اب اُس کے لئے اجنبی نہ رہا تھا۔ یہ بلیک آؤٹ اس سے بھی پہلے شروع ہوا تھا جب اُس نے ٹیوٹوریل سکول میں لڑکیوں کو پڑھانا شروع کیا تھا۔ اور وہ ـــــ، اسے پھر اپنے شوہر کا خیال آ گیا اور پھر اس اجنبی کا۔

اب شوہر کے ساتھ وہ خوش نہ تھی، اس شخص کی قربت وہ اب بھی بڑی یگانگت کے ساتھ محسوس کر رہی تھی۔ کیوں ــــ اور اُس نے اُس کے خیال سے دُور ہٹنے کی کوشش کی۔ بس اب دادر کے پل سے گزر رہی تھی، پانچ منٹ میں وہ گھر پہنچ جائے گی۔ وہ گھر پر نہیں ہوں گے، اپنے شوہر کا وہ اس وقت گھر پر موجود ہونا نہ چاہتی تھی۔

لیکن جب وہ گھر پہنچی تو ورمن موجود تھا۔

"سیر کر آئیں"۔ اس کے لہجے میں ایک طنز تھا۔

"ہاں" سیما نے لاپروائی سے جواب دیا۔ اس نے طنز کو محسوس کیا تھا لیکن اس کی پروا کرنا نہ چاہتی تھی۔ پچھلے دنوں سے وہ خود کو اپنے شوہر کے مقابلے میں مساوی سمجھنے لگی تھی، اور اس طنز کو ایک طنز کی طرح محسوس کر کے اس کی مخالفت کرنا ذلیل سا معلوم ہوتا تھا۔

"مجھے تمہارا یہ چوبیس گھنٹے گھومتے رہنا پسند نہیں"۔

مجھے معلوم ہے تمہیں پسند نہیں ہوگا" سیما نے جواب دیا۔ تم چاہتے ہو میں دن بھر ان تین کمروں میں قید رہوں"۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم اس طرح سڑکوں کی خاک نہ چھانو"۔

"کون چھانتا ہے سڑکوں کی خاک۔ جب تم رات کو دس دس بجے گھر آتے ہو تو میں شام کو سیر بھی نہیں کر سکتی"۔

ورمن چپ ہو گیا اور وہ کپڑے اتارنے کے لئے اندر کمرے میں چلی گئی۔ سیما جانتی تھی کہ ورمن اس کے ملازمت کرنے سے بھی برگشتہ ہے۔ اب وہ اسے اپنے شوہر کی خود غرضی پر محمول کرتی تھی۔ اس کی وجہ سے وہ خود کو بڑا آزاد محسوس کرنے لگی تھی۔ اور خود کو اپنے شوہر کا دست نگر نہ سمجھتی تھی، اور اس احساس سے اس کی اپنی مرضی کو تقویت مل گئی تھی، وہ اب وہی کرنا چاہتی تھی جسے خود ٹھیک سمجھتی ہو۔

کپڑے بدل کر جب وہ باہر آئی تو ورمن کھڑکی میں کھڑا ہوا باہر دیکھ رہا تھا۔

"سیما" اُس نے مڑ کر کہا "میرا خیال ہے تمہارا یہ رویہ ٹھیک نہیں ہے"۔

"کیوں؟" سیما نے استفسار کیا۔

"کیونکہ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا"۔

"کیوں برداشت نہیں کر سکتے، یوں کہو کہ تم سے میری ذرا سی آزادی دیکھی نہیں جاتی"۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم عورتوں کی طرح رہو"۔ ورمن نے بگڑ کر کہا۔

"میں بالکل عورتوں کی طرح رہتی ہوں۔ لیکن تم چاہتے ہو کہ مجھے اپنے رعب میں رکھو"۔ سیما نے جواب دیا۔

"مجھے تمہارا یہ سکول جانا بھی پسند نہیں۔ یہ میری توہین ہے"۔

"میں تو اسے توہین نہیں سمجھتی"۔ اس نے ورمن کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا "میں اپنا بوجھ خود اٹھانا چاہتی ہوں، اور میں اٹھا سکتی ہوں" ورمن نے غصے میں اس کی طرف دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ یہ جھگڑے عموماً اس سے آگے نہ بڑھتے تھے۔ سیما کہہ چکی تھی کہ تمہیں مجھ پر رعب جمانے کا کوئی حق نہیں ہے، اور ورمن نے اس پر رعب جمانا چھوڑ دیا تھا، اور بات سنجیدہ ہوتی جا رہی تھی۔

رات بستر پر وہ دیر تک جاگتی رہی کمرے میں وہ اکیلی نہ تھی، درمیان میں چند فٹ کا فاصلہ تھا اور پھر ورمن کا بستر۔ لیٹے ہوئے۔ سیما کو احساس تھا۔

کہ وہ جاگ رہے ہیں، یعنی ورمن جاگ رہا تھا۔ لیکن وہ سو رہی تھی۔ ورمن کے سامنے وہ جاگنا نہ چاہتی تھی، آنکھیں بند کئے وہ لیٹی رہی۔

تین سال پہلے سیما کی شادی ورمن سے ہوئی تھی، جیسے شادیاں ہوتی ہیں۔ آگ کے گرد گھوم کر منتر پڑھ کر شہنائیوں کی آوازوں کے درمیان، اور جب شادی ہو گئی تھی تو سیما نے اس کا بُرا نہ مانا تھا؛ ورمن ایم۔ اے تھا اور اسسٹنٹ پوسٹ آفیسر اور وہ مندر پرستھ گرلز کالج کی گریجویٹ تھی۔ جہاں ان لڑکیوں میں جنسی معاملات پر باتیں کر کر کے اس نے اپنے ذہن میں اپنی دوشیزگی کو کھو دیا تھا۔ کتنی حسرت تھی اُسے ——— !

ورمن نے یہ حسرت پوری کر دی تھی وہ یہ چاہتی تھی۔ اُن دنوں کئی کئی نصف گھنٹوں تک وہ لیٹے ہوئے ورمن کے پاس بیٹھی رہتی، اس کا بازو ورمن کے اوپر سے ہوتا ہوا فرش کا سہارا لئے رہتا۔ اس کا سینہ ورمن کے سینے سے چھوتا رہتا؛ اور وہ ورمن کے سینے پر اپنی انگلیوں سے بے معنی لکیریں کھینچتی رہتی اور وہ محبت کی باتیں کرتے رہتے۔ یا وہ ورمن کے بازوؤں میں؛ اس کے گھٹنوں پر بیٹھی رہتی اور اس کی قمیض کے بٹنوں کو کھولتی رہتی، بند کرتی رہتی۔ اور ورمن کے بازو اس کی کمر کے گرد حلقہ کئے رہتے۔ کتنی لذت تھی ایک مرد کے بازوؤں کو اس طرح اپنی کمر کے گرد محسوس کرنے میں، کتنی راحت تھی، اور وہ محبت کی باتیں کرتے رہتے اور بوسے، اور ——— اور، کتنا کیف تھا اس میں پہلے جاڑوں کی طویل راتوں میں وہ بستر پر اس کے جسم کی گرمی کو محسوس کرتی کتنی جنسی ہوتی تھی یہ گرمی اور کتنی راحت بخش، اور وہ محبت کی باتیں کرتے رہتے؛ اور ——— جسمانی ملاپ جن کے متعلق لیٹ پا کیورا، اور رود یا دتی اور شمع اور شبنم اتنے ہیجانی انداز میں باتیں کیا کرتیں تھیں؛ اور جن کے متعلق سوچ سوچ کر اُس نے اپنے ذہن میں اپنی دوشیزگی سے ہاتھ دھو لئے تھے۔ بے شک وہ اتنے لذیذ نہ تھے جتنا اس نے تصور کیا تھا، لیکن اُس نے خود کو ان بوسوں اور بازوؤں اور حرارت اور اِن سب چیزوں کے سپرد کر دیا تھا۔ جذبات کی شدت میں ان دونوں نے ایک دوسرے کی تقصیروں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اور وہ محبت کی باتیں کرتے رہتے تھے اور ایک سال گزر گیا اور محبت کی باتیں گویا ختم ہو گئیں، باتیں ہی تو تھیں اور سیما کا انہیں بار بار دہرانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ جی ہی تو تھا!

لیکن وہ جسمانی لمس وہ بوسے۔ وہ جسمانی ملاپ ———

اور دن گزرتے گئے اور وہ ان کی عادی ہوتی گئی اور اب یہ دیکھنے لگی کہ ورمن میں ایسی بہت سی باتیں ہیں جو اُسے پسند نہیں اس میں خود بھی ایسی باتیں تھیں جو ورمن کو پسند نہ تھیں اور سیما کو یہ سخت ناگوار معلوم ہوتا تھا کہ ورمن انہیں دیکھنے لگا ہے لیکن ورمن انہیں دیکھنے لگا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ سیما کو اُن کا احساس کرا دیتا تھا۔ سیما کو یہ بات پسند نہ آئی، پھر وہ اسے بُری لگنے لگی۔ لیکن ورمن باز نہ آیا اور وہ بھی باز نہ آتی اور اُسے ورمن کے نقص اجاگر معلوم ہونے لگے۔ پھر اچانک اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے اور ورمن کے خیالات نہیں ملتے، اور کہ ورمن کے ذہن میں ایم۔ اے کرنے کے باوجود بھی وہی روایاتی تنگ نظری ہے۔

——— لیکن تم اتنی اتنی دیر اس سے باتیں کیوں کرتی رہتی ہو؟"

"باتیں کرنے میں کوئی حرج ہے؟"

"وہ کیوں اتنی اتنی دیر یہاں بیٹھا رہتا ہے مجھے یہ بالکل پسند نہیں۔"

تمہیں تو کوئی چیز پسند نہیں۔ اوّل تو باتیں کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔ دوسرے وہ بالکل بچہ ہے، تمہیں تو ہر ایک کے متعلق بری بری باتیں سوچنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔"

"عادت نہیں، میں ان سب بچوں کو جانتا ہوں، یہ چودہ برس کے ہونے سے پہلے ہی جوان ہو جاتے ہیں۔

"وہ نہیں ہے۔"

"ہو یا نہ ہو" ورمن نے درشتی سے کہا۔ "لیکن میں تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا اپنے گھر تم ایسا کر سکتی تھیں؟"

"اپنے گھر میں آزاد نہ تھی؟"

"آزاد تم اب بھی نہیں ہو۔" ورمن نے گرتی سی آواز میں کہا۔

"کیا ——؟"

"میں کہتا ہوں تم نے یہ قسمیں ہیں۔ ٹین کیوں نہیں ٹانکے اگر تم سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا تو اس شادی کا سکھ ہی کیا ہے؟"

"تم نے مجھ سے ٹین ٹکوانے کے لئے شادی کی ہے؟" سیما خفگی سے بولی اس نے سن لیا تھا کہ وہ آزاد نہیں ہے، مندر پرستھ گرلز کالج کی گریجویٹ آزاد نہیں ہے، یعنی وہ کبھی آزاد نہیں رہے گی، اپنی شادی کے بعد بھی نہیں، تو پھر اس شادی کا سکھ ہی کیا ہے ملے سے ورمن کی اس بات سے کتنی نفرت تھی، ورمن کی اس بات میں، کتنی تنگ نظری تھی۔ اس کے خیالات نے ورمن سے ملنا چھوڑ دیا، اور دن گزرتے گئے۔ اور اپنے خیالات اس کے ساتھ روز بروز متضاد ہوتے گئے۔ اس کے اور ورمن کے درمیان خیالات کا اختلاف آ گیا حقیقت میں وہ اپنے اور ورمن کے درمیان اب کچھ چاہتی تھی۔ اور اس نے آسانی سے خیالات کے اختلاف کا سہارا لے لیا۔ اور اپنے خیالات اسے زیادہ عزیز ہو گئے اور پھر —— یعنی اگر خیالات میں اختلاف ہو تو جنسی ملاپ وہ لذت نہیں بخش سکتے۔ وہ اب پہلی نہ ہو کر میاں بیوی رہ گئے تھے، اور میاں بیوی کی طرح رہتے تھے اور اب سیما کو محسوس ہوتا تھا کہ اس نے آنند کو کھو دیا ہے، لیکن ایسا نہیں تھا آرزو موجود تھی۔ لیکن وہ اسی شدت سے پوری نہیں ہوتی تھی، اور وہ اس کے ردعمل کو محسوس کرتی تھی اور اسے معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اسے کھو دیا ہے۔ ان تعلقات میں اب وہ دلکشی نہ رہی تھی وہ اب ان کی کچھ ایسی خواہش مند نہ تھی اور کبھی کبھی اسے یہ بالکل پیشہ ورانہ سے معلوم ہوتے، اور ورمن اس سے ملنا چاہتا تھا جب وہ اس کی خواہش مند نہ ہوتی تھی۔ کتنی ذلیل بات تھی یہ کتنی ناپسند تھی اُسے۔

سیما نے دراصل محبت ورمن سے کبھی نہیں کی تھی، یہ اس کی جنسیت تھی۔ جس نے ورمن کے مرد سے محبت کی تھی: اپنے جذبے کی شدت میں اُس نے خود کو ورمن میں اس شے کے سپرد کر دیا تھا جو اسے تسکین دیتی تھی۔ اس وقت وہ ایسی تسکین چاہتی تھی جو ٹپ یا کبوترا اور دیا دیتی۔ سے باتیں کر کے حاصل نہ ہوتی تھی۔ وہ سچائی نہ چاہتی تھی اور سچائی مل گئی تھی اور اس نے اس سچائی سے محبت کی تھی، جس سے سب عورتیں کرتی ہیں۔

سیما کو اپنے احساسات پر اعتبار نہ تھا، اپنے ادراک سے بیچے وہ ان سے ڈرتی تھی اور اسے اب بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ورمن سے محبت کرتی ہے، جیسا سب عورتوں کو معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ محبت نہ تھی، اگر محبت کچھ اور ہوتی ہے۔ یہ صرف ایک احساس ملکیت تھا، ورمن اس کا شوہر تھا، اور ورمن کے علاوہ اس کا اور کچھ نہ تھا، اس کے لئے صرف وہ سب کچھ تھا اور سیما اُس سے ایک شوہر کے روپ میں محبت کرتی تھی اور رازدارانہ طور پر اپنی روح کے نہاں خانے میں ایک مرد کی حیثیت سے اب اس سے خوش نہ ہوتی تھی۔ یہ جنسی تعلقات ان کے درمیان ایسے ہو گئے تھے جیسے رات کے کھانے کے بعد کبھی تاش کھیلنے کو جی چاہتا ہو یا جیسے انسان کبھی اپنے اوپر سے کچھ اتار پھینکنا چاہتا ہے یہ تجربے ہمیشہ اسے ایک ناگوار سی حالت میں چھوڑ جاتے تھے اور وہ محسوس کرنا چاہتی تھی اور محسوس کرنے کو کچھ نہ تھا! اور ورمن جا کو جھڑ اتارنا چاہتا تھا جب وہ اس کی خواہش مند نہ ہوتی تھی۔ کبھی خواہش ہوتی بھی تھی تو یہ صرف اپنی آرزو ہوتی تھی، دوسرے کی جذباتی ضرورت نہیں، صرف اپنی خواہش کی تسکین کی آرزو، لیکن وہ پھر بھی خود کو ورمن کے لئے رزرو سمجھتی تھی، جس کے ساتھ اس نے آگ کے گرد پھیرے لئے تھے۔ اس رزرویشن سے وہ اپنی روح میں برگشتہ تھی لیکن اپنی ماتحتی کا ایک احساس جس سے وہ تقریباً ناواقف تھی۔ درمیان میں حائل تھا اور اس نے کبھی یہ سوچنے کی جسارت نہ کی تھی۔ خواہش اس کے اندر مردہ ہو گئی تھی۔ اور اکثر ان میں جھگڑے ہوتے تھے۔ ایک دوسرے کی تعصبوں کو برداشت کرنا انہوں نے چھوڑ دیا تھا۔

پھر وہ ایک ٹیوٹوریل اسکول میں پڑھانے لگی۔ مندر پرستھ کالج کی گریجویٹ ورمن نے اس کی مخالفت کی تھی لیکن وہ مانی نہ تھی اور

اُس نے ملازمت کر لی تھی۔ اپنی ماتحتی کو کبھی اس نے ادراکی طور پر محسوس نہیں کیا تھا۔ لیکن اس آزادی کو اس نے پورے طور سے پہچان لیا۔ وہ آزاد تھی اور ایک داخلی رہائی سی محسوس کرتی تھی۔ خود بخود ان دونوں کے درمیان اب جھگڑے کم ہو گئے تھے اور دوری بڑھ گئی تھی۔

"سیما ——" بستر پر لیٹے ہوئے اُس نے ورمن کی آواز سنی، لیکن وہ بولی نہیں، وہ جاگ نہیں رہی تھی، وہ سو بھی نہیں رہی تھی، وہ جواب دینا نہ چاہتی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ ورمن کیا کہے گا، وہی جو وہ شام کو کہہ چکا ہے اور اس سے پہلے کئی بار، مجھے تمہارا یہ رویہ پسند نہیں۔ آخر وہ ایسا کیا کرتی ہے، کیا پسند نہیں ہے انہیں؟ پسند، ان دونوں کی پسند جدا ہے، اُن کے خیالات نہیں ملتے —— وہ سوچتی رہی۔ ورمن نے کروٹ بدل لی اور اُس نے ایک آسانی سی محسوس کی۔ اب وہ اپنے جسم کو حرکت دے سکتی تھی، سوتے میں کیا آدمی ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتا اور اس نے اپنا بازو اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ مرد چاہتے ہیں کہ ان کی غرض پوری ہوتی رہے، عورتوں کا کوئی خیال نہیں، کیوں، خود غرض مرد، اچانک اُسے سمندر کے کنارے اس اجنبی کا خیال آگیا اور اس نے فوراً ہی اس خیال کو اپنے ذہن سے برخاست کر دیا، دیر تک وہ لیٹی رہی اور اُس کے اوپر ایک ویرانی کا احساس ابھرنے لگا جس میں چڑچڑے پن کا بڑا جزو شامل تھا۔ اُسے زندگی کی بے رنگی پر ہمیشہ غصہ آتا تھا۔ لیکن اس ویرانی کے بارے میں اُس نے سوچا کبھی نہ تھا۔

بہت دیر تک وہ جاگتی رہی، بہت دیر بعد وہ سو گئی۔

دوسرے دن۔

دیر تک وہ سمندر کے کنارے گھومتی رہی۔ ساحل پر آج بھیڑ زیادہ تھی۔ لیکن وہ ایک تنہائی سی محسوس کر رہی تھی۔ کسی چیز کی کمی محسوس ہو رہی تھی اور وہ یہ نہ جانتی تھی کہ یہ کیا ہے۔ سمندر کے کنارے بکھری ہوئی اس بھیڑ سے اُسے ایک علیحدگی کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ احساس خلا کا نہ تھا بلکہ جیسے وہ ایک وسیع مجمع میں اکیلی ہے اور مجمع کا دائرہ اس کے گرد تنگ ہے۔ سمندر کی وسعت بھی تنگ معلوم ہوتی تھی۔ جیسے بالکل اپنی ہی بسیط سمندر کو آسمان نے روک لیا ہو۔ آج مغربی افق پر شفق نہیں پھیلی تھی، دن ڈوب گیا تھا لیکن آسمان ویران تھا اور اس نے سمندر کو روک رکھا تھا۔ کسی چیز کی کمی تھی، یہ بھیڑ اور یہ تنہائی لیکن وہ بھیڑ سے الگ رہنا چاہتی تھی، اکیلی رہنا چاہتی تھی سمندر کے کنارے اکیلی آئی تھی، اور پھر یہ تنہائی، اسے کسی ضرورت کا نیم شعوری احساس تھا، کوئی چیز محسوس نہ تھی۔

کنارے پر کھڑی ہوئی وہ لہروں کو ساحل کی گیلی ریت پر پھیلتے ہوئے دیکھتی رہی، لوٹتی ہوئی لہر سے ٹکرا کر پانی کنارے پر پھیل جاتا تھا اور ساحل کی ریت اس کے جھاگوں سے چمک اٹھتی تھی اور پھر پانی واپس لوٹ جاتا اور ریت میں جذب ہو جاتا اور ریت کی چمک معدوم ہو جاتی۔ دیر تک وہ تماشا دیکھتی رہی پھر وہ چند قدم آگے بڑھ آئی تھی، اور وہ دیکھتی رہی، سمندر کی سطح سے اُبھر کر پانی کا ایک ڈھیر بڑھا آتا تھا، جیسے ایک وسیع چادر آپ سطح پر پھیلتی آ رہی ہو، سمندر کی سطح پر اس سے اونچی ایک اور سطح بہتی جا رہی تھی اور قریب آ رہی تھی، اور —— اور اچانک وہ ٹکرا گئی اور ایک شور میں بکھر گئی، اور پانی سیما کے قدموں میں پھیل گیا۔ سیما نے منہ سے تعجب کی ایک چھوٹی سی آواز نکالی اور وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ پانی غیر متوقع طور پر اس کے قدموں میں آگیا تھا اس کا شعور اس کے لئے تیار نہ تھا، وہ لہر سے چھو جانا چاہتی تھی لیکن ——

واپس جاتا ہوا پانی اب کنارے میں جذب ہو رہا تھا وہ بڑھی اور خشک ریت پر پاؤں رکھتی ہوئی اور بنچوں کی طرف چلی گئی، اوپر بنچوں کی طرف۔ ریت اس کی گیلی سینڈلوں اور پاؤں میں چمٹ گئی تھی۔ اور اپنے تصور میں اُسے اس کے کرکرے پن کا احساس ہوتا رہا۔

بنچ کوئی خالی نہ تھا وہ ان کے آگے سے گزرتی گئی، عورتیں اور مرد، اور صرف عورتیں اور صرف مرد۔ بنچوں پر بیٹھے تھے، اور وہ خالی جگہ کی تلاش میں آگے گزرتی گئی، یہ پارسی اپنی بوڑھی عورت کے ساتھ کسی نوجوان کی طرح بیٹھا تھا، یہ دو لڑکیاں آپس میں باتیں کر رہی تھیں، ان کے جوڑوں میں چنبیلی کے پھول تھے۔ یہ —— اوہ، اس بنچ پر وہی کل والا نوجوان بیٹھا تھا اور اس کے برابر کی دو سیٹیں خالی پڑی تھیں

لیکن وہ گزر گئی، قریب سے گزرتے ہوئے اُس نے سیما کو سر سے پاؤں تک دیکھا جیسے کہتا ہو کیا تم وہی نہیں ہو جو کل ٹھنڈے جزیرے تک میرے قریب بیٹھی رہی تھیں۔ اب سیما اسے پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ وہ یہ فیصلہ نہ کر سکی تھی کہ اس کے قریب نہ بیٹھے، ایک جھجک سی محسوس ہوئی تھی، لاشعوری طور میں اسے اس بات کا احساس یا شاید ڈر تھا کہ اس کے پاس بیٹھنا غیر اہم نہ ہوگا۔ وہ اس اہمیت سے خوف زدہ تھی۔

آخر تک کوئی بینچ خالی نہ تھا اور اب وہ واپس آ رہی تھی کہ آخر ایک خالی سیٹ پر بیٹھنے میں حرج ہی کیا ہے اور اُسے کوئی حرج نظر نہ آ رہا تھا۔ لیکن جب وہ اس کے قریب آئی تو وہاں رکتے ہوئے اُسے پھر ایک جھجک محسوس ہوئی، یہ نوجوان اس کی روح میں ایک اہمیت رکھتا تھا۔ اور اس کی نگاہ خالی سیٹوں میں اٹکتی ہوئی آگے بڑھ گئی، وہ پھر آگے جا رہی تھی، نوجوان بینچ پر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ بیٹھئے!" اس نے کہا۔ "میں تو بہت دیر سے بیٹھا ہوا ہوں!" اور غالباً وہ سیٹ چھوڑ کر جا رہا تھا۔ بغیر ارادہ کئے ہوئے سیما نے کہا۔

"آپ میری وجہ سے نہ جائیں۔ میں کوئی اور سیٹ تلاش کر لوں گی۔"

"خالی بینچ شاید آپ کو نہ ملے۔"

"لیکن میں یہ نہیں چاہتی کہ کسی کو اٹھا دوں!"

"اور نہ یہ برداشت کر سکتی ہیں کہ کسی کے قریب بیٹھیں۔"

سیما نے اس کی طرف دیکھا، اس کے ہونٹوں پر ایک بڑی نامعلوم سی مسکراہٹ تھی اور آنکھیں بالکل سنجیدہ تھیں۔

"دیکھئے!" اس نے کہا، اور پھر ——

"شکریہ"

سیما سیٹ کی طرف بڑھ چکی تھی، وہ بیٹھ گئی۔

چند لمحوں تک خاموش رہی۔ ایک منٹ دو منٹ —— یہ خاموشی سیما کو بے ہنگم سی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا یہ ارادہ نہ تھا کہ اس سے بات کرے، لیکن یہ خاموشی —— اور چند لمحوں تک خاموشی رہی، اور سیما کی توجہ ان حالات پر جمی رہی جن میں وہ خود کو محسوس کر رہی تھی، یکایک اُس نے کہا —— "میں دراصل بڑا ڈھیٹ آدمی ہوں کہ یہاں سے ہٹا نہیں۔ آپ کو شاید امید تو ہوگی کہ میں سیٹ خالی کر دوں گا۔" اس کے ہونٹوں پر سے ایک نامعلوم سی مسکراہٹ گزر گئی۔

"نہیں تو" سیما نے کہا۔

وہ —— اپنے خشک بالوں میں انگلیاں پھیرتا ہوا مسکرایا —— "میرا خیال ہے عورتوں کو اس بات کی امید ہوتی ہے کہ ہم ان کے لئے جگہ خالی کر دیں۔"

"شاید ——" سیما نے مختصر طور سے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ہوتی ہے" اُس نے شاید پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ کچھ سراہنے کے قابل بات نہیں۔ میں سمجھتا ہوں جب تک عورتوں کو یہ امید رہے گی وہ آزاد نہیں ہو سکتیں۔"

سیما نے اس کی طرف دیکھا، ظاہر تھا کہ وہ گفتگو کو جاری رکھنا چاہتا تھا۔

"کسی دوسرے آدمی سے کچھ امید کرنا ہمیشہ خود کو بالواسطہ اس کا ماتحت بنا دینا ہوتا ہے، اور عورتیں ہمیشہ امید کرتی رہتی ہیں اور خود کوشش نہیں کرتیں۔ ان کے ساتھ صدیوں سے خود کو passive سمجھنے کی ایک عادت بن گئی ہے۔ اور یہ عادت ان کی فطرت کا حصہ بنتی جا رہی ہے۔"

"میرا خیال ہے نیچر نے عورتوں کو Passive بنایا ہے۔" سیما نے کہا۔

"اوہ نہیں ——" اس نے نہیں کو طول دیتے ہوئے کہا۔ "قدرت اتنی بیوقوف نہیں ہو سکتی ہے بے شک صحیح ہے کہ بعض حالتوں میں عورتوں کا عملی پارٹ بعد میں شروع ہوتا ہے، لیکن قدرت نے عورتوں کو Passive بنایا ہے یہ غلط ہے۔ عورتوں کی اس حالت کی وجہ صرف یہ ہے۔ کہ بنیادی خواہشات میں سماج نے ایسا لازمی (جو حقیقت میں غیر ضروری ہے) تعلق پیدا کر دیا ہے کہ اس کی تسکین کا انحصار دوسرے پر ہے۔ اور یہ دوسری چیزیں عورتوں کو کرنے نہیں دی جاتیں، اور ایک عورت اس وقت تک کسی آدمی کے ساتھ نہیں رہ سکتی جب تک وہ اس کی بیوی نہ ہو۔"

سیما سمندر کی طرف دیکھنے لگی، لیکن اس کی توجہ کا مرکز گفتگو تھی، بلکہ گفتگو سے بھی زیادہ اپنی توجہ کا مرکز وہ خود تھی، اس کی بے تکلفی سے وہ ایک مخصوص قسم کا نسوانی حجاب محسوس کرنے لگی، لیکن یہ اُسے ناپسند نہ تھا، وہ کہہ رہا تھا۔

"بنیادی جذبات کے ساتھ ساتھ اگو نمک مسئلہ لگا رہا ہے اور عورتیں اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتیں جب تک وہ اقتصادی طور پر کسی دوسرے کی دست نگر رہیں گی۔" اور پھر یکایک رک کر وہ بولا۔ "آپ کو شاید عورتوں کی آزادی سے دلچسپی نہیں؟"

"جی؟"

میں پوچھ رہا تھا کیا آپ عورتوں کی آزادی میں دلچسپی نہیں لیتیں؟ دراصل آپ کو یہ بڑی عجیب بات معلوم ہوتی ہوگی۔ کہ میں چند منٹ کی ملاقات کے بعد آپ سے عورتوں کی آزادی کے بارے میں بات کرنے لگا ہوں حقیقت یہ ہے اور جس کا میں اقبال کرنا چاہتا ہوں کہ دراصل میں باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ بمبئی میں پچھلے تین مہینے سے میں نے کسی عورت سے بات نہیں کی اور اب میں اس سے اکتا سا گیا ہوں۔"

وہ ہنسا، لیکن اس کا قہقہہ مسکراہٹ سے کچھ ہی زیادہ تھا۔

"آپ کو میری بے تکلفی پر تعجب ہوا ہوگا، کم از کم ہونا چاہئے تھا" وہ بولا۔ "لیکن میں نے کہا کہ میں باتیں کرنا چاہتا ہوں اور عورتوں کی آزادی کے سوا اور بات ہی کیا کی جا سکتی ہے۔"

"آپ عورتوں کی آزادی کے بارے میں بڑے پریشان معلوم ہوتے ہیں۔"

"ہاں دیکھو نا عورتیں اپنی آزادی کے بارے میں پریشان نہیں ہیں۔"

سیما مسکرائی، وہ اب اس کی گفتگو میں براہِ راست دلچسپی لے رہی تھی۔ اس نے کہا "لیکن عورتیں کسی کا سہارا چاہتی ہیں۔"

"واقعی؟" اس نے ایک ہلکے سے طنز سے کہا، پھر وہ سنجیدہ ہو گیا۔ "یہ لیکن سوال جاننے کا آ جاتا ہے۔ چاہنا ایک دوسری بات ہے، خواہش ایک مقدس چیز ہے۔ میرا خیال ہے انسان اپنی روح سے جو چاہتا ہے وہ پورا ہونا چاہئے اگر کوئی شخص خود کو کسی دوسرے آدمی کے سپرد کرنا چاہتا ہے تو اس میں رکاوٹ نہیں ہونی چاہئے اس آدمی کو خوشی، مسرت اور راحت بخشتی ہے جو خود کو Submit کرتا ہے اور اس آدمی کو آرام اور سکھ پہنچاتی ہے جسے Submit کیا جاتا ہے، یہ صرف Submission ہے۔ جس پر ایک حسین زندگی کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے اور اس کے لئے روح کی آزادی کی ضرورت ہے۔ لیکن ہمارے پاس روحیں نہیں ہیں، ہماری روحوں کے دروازے اور کھڑکیاں تہذیب کے تلے دبے ہوئے ہیں۔"

اس کی گفتگو سیما کو متاثر کر رہی تھی، وہ اس سے متاثر ہوئی تھی جیسے اس کے الفاظ سیما کے اپنے ان سوچے خیالات کی گونج ہیں۔ اپنے ہی خیالات کے اظہار کی دلکشی نے اُسے رجھایا تھا، اور اس نے نوجوان کے لئے دل میں ایک خصوص سا محسوس کیا، اور اس کشش کی بھی وجہ واضح نہ تھی، جو یا اس کے خیالات کی طرف تھی یا اس کی شخصیت کی، یا اس کی آواز کی۔ یہ کشش بالکل عجیب تھی اور اس نے خود کو اس کے تاثر میں محسوس کیا۔

"لیکن موجودہ حالات میں عورتیں سہارا نہیں چاہتیں۔" وہ کہہ رہا تھا "یہ سہارا اپنا پڑتا ہے، ہر عورت خود کو Prostitute کرنے

پچیدہ ہوتی ہے۔ یہ صرف ایک غرض ہوتی ہے، مجبوری جس کی وجہ سے انہیں ایک سہارے کی ضرورت رہتی ہے۔ اس میں سچائی نہیں اور اپنی تہ میں یہ چاہت بڑا کمینہ پن لئے ہوتے ہے۔"

سیما اس بات سے متفق نہ تھی، لیکن وہ اس کی مخالفت نہ کر سکی اور بالکل ایک ہپناٹک اثر میں سنتی رہی۔

"اور اس کے لئے عورتیں ذمہ دار نہیں ہیں، مرد بھی نہیں۔ یا شاید اس کے لئے دونوں ہی ذمہ دار ہیں۔"

"یا کوئی بھی نہیں" سیما نے کہا۔

نہیں میرا خیال ہے عورتیں اس کے لئے اتنی ہی مجرم ہیں جتنے مرد، یا شاید مرد زیادہ ہیں، کیونکہ ان کے ہاتھ میں طاقت ہے، لیکن انہوں نے طاقت کو ذلیل کر دیا ہے۔ اور اس کی تقدیس کو کھو دیا ہے۔ عورتیں فطرتاً مرد کی حفاظت میں رہنا چاہتی ہیں، لیکن مرد انہیں اپنے قابو میں رکھنے کے لئے ذلیل اور کمینے اور غیر فطری ہتھیار استعمال کرتا ہے، اُسے ہر طرح اپنا دست نگر رکھنا چاہتا ہے، اپنی جائداد بنا کر، اور اس نے عورت کی روح کو کھو دیا ہے اور اس کے جسم سے مطلق ہے۔"

دیر تک وہ باتیں کرتا رہا، اور سیما کو محسوس ہوا کہ وہ ورمن سے کس قدر مختلف ہے! صرف ایک بار اُسے اس فرق کا ایک بہت مختصر سا احساس ہوا، وہ سنتی رہی۔ وہ زیادہ تر خود ہی بولتا رہا تھا۔ سیما کو کچھ کہنے کا موقعہ ہی نہ آتا تھا۔ وہ کچھ کہنا بھی نہ چاہتی تھی۔ سننا چاہتی تھی۔ اس کی گفتگو میں ایک مخصوص دلکشی تھی، اور اُسے سنتے ہوئے سیما کو ایک مخصوص سی ملائمت کا احساس ہو رہا تھا، یہ ملائمت اس کی گفتگو سے سیما کے احساس میں پھیل رہی تھی اور احساس سے نیچے اتر رہی تھی۔ ملائمت کا یہ تاثر ایک ہپناٹک سحر کے مانند تھا اور اس کے شعور پر قابو پا رہا تھا، وہ خود اپنے اوپر اس سحر کا اثر چاہ رہی تھی، یہ اتنا خوبصورت، اتنا ملائم اور پھر اتنا غالب تھا۔

دیر تک وہ باتیں کرتا رہا۔ اور اُس سے علیٰحدہ ہونے کے بعد بھی سیما نے اپنے اوپر اس سحر کی ملائمت کو محسوس کیا۔

اور اس کی گفتگو کی دلکشی نے سیما کو مغلوب کر لیا۔ ہر شام وہ سیما کو یہاں مل جاتا تھا اور باتوں کے دوران میں سیما پہ ایک ہپناٹک اثر رہتا۔ یہ اثر اس کی آواز میں قدرتی تھا اور سیما کے تصور نے اُسے پُر مبالغہ بنا لیا تھا۔ وہ خود کچھ کہے جاتا تھا اور سیما کے بولنے کا انتظار نہ کرتا تھا، اور وہ ایک نیم مسحور سی حالت میں سنتی تھی۔ گفتگو کے دوران میں وہ خود کو اس سحر کے تاثر کے سپرد کر دیتی تھی اور اس کے سامنے اپنی طاقت کو کھو دیتی۔ اُس کی موجودگی اور خصوصاً اس کی گفتگو سے سیما کو اپنے اندر ہپناٹک لہروں کا ایک تسلسل سا محسوس ہوتا تھا، جو کچھ کہتا تھا اس پہ وہ یقین نہ بھی کرتی ہو لیکن پھر بھی وہ خود کو اس کی آواز کے سامنے کمزور محسوس کرتی اور اس کی بات کاٹنا نہ چاہتی تھی۔ اس کے سامنے سیما کو اپنے وجود کا احساس کم رہتا تھا۔ اور اس کا زیادہ۔ اس کی توجہ نہایت عجیب ڈھنگ سے اس کی گفتگو میں مدغم رہتی، بلکہ اس کی گفتگو سے بھی زیادہ کسی اور شے میں، وہ بخوبی یہ سمجھنے کی کوشش نہ کرتی تھی کہ وہ کیا کہتا ہے۔ کسی دوسری شے کے قابو میں اس کا ذہن صرف اس بات پر مطلعت رہتا کہ وہ کچھ کہہ رہا ہے، یہ اس کی آواز تھی یا اس کے کہنے کا ڈھنگ، یا کچھ اور جسے وہ کبھی نہیں سمجھ پائی۔ اس سحر نے اس کے تحت الشعور پہ تسلط کر لیا تھا، اس سے دور ہونے پہ بھی وہ اُس کے اثر میں آنا چاہتی تھی۔ کبھی اس چاہت کی شکل خواہش کی ہوتی تھی، کبھی محض ایک کشش کی۔ تمام دن وہ شام کا انتظار کرتی اور اُسے کبھی یہ محسوس نہ ہوتا کہ وہ انتظار کر رہی ہے، صرف ایک بے چینی، ایک بے کلی سی محسوس ہوتی تھی۔ ورمن کی بیوی اس انتظار کو اپنی دانست کے دائرے میں داخل کرنا نہ چاہتی تھی۔

"اب یہ ہر وقت غائب رہنا کیا اختیار کیا ہے تم نے،" ورمن نے ایک دن سوال کیا۔

"غائب رہنا؟"

"اور کیا، صبح ہوتی ہے سکول چل دیتی ہو، شام کو تمہاری سیر ختم نہیں ہوتی معلوم ہوتا ہے گھر کو سرائے سمجھ رکھا ہے۔"

"میرے باہر جانے سے تمہارا کونسا کام حرج ہوتا ہے؟"

"کام — ورمن نے چڑ کر کہا: "کام تو بہت کرتی ہو تم!"

"تو میں صرف کام کرنے کے لئے ہوں؟" سیما نے لوٹاتے ہوئے کہا۔

"نہیں، تم صرف سیر کرنے کے لئے ہو؟"

"تمہیں میرے ذرا سی دیر شام کو باہر جانے سے کیوں جلن ہوتی ہے؟"

"میں پوچھتا ہوں تم یہ جاتی کہاں ہو؟" ورمن گستاخی سے بولا۔

"تم کیا سمجھتے ہو؟" سیما نے کہا۔

"مجھے کیا پتہ کہاں ماری پھرتی ہو، کیا جانے کہاں جاتی ہو؟"

"تمہیں مجھ پر کیا شبہ ہے؟" سیما نے جیسے چوٹ کھا کر پوچھا۔

"بحث مت کرو۔" ورمن نے کہا، "مجھے نہ تم پر شبہ ہے نہ تم پر اعتبار!"

"کیا؟ —" سیما نے روتی آواز میں کہا، لیکن ورمن کمرے کے باہر چلا گیا تھا۔

ایک لمحے تک سیما ایک عجیب سی ذہنی حالت میں کھڑی رہی۔ اپنے دل کی تہ میں اُسے خود اپنے اوپر اعتبار نہ تھا لیکن وہ اسے جاننا نہ چاہتی تھی اور اس وقت ورمن نے اس کی طرف اشارہ کر دیا تھا اور کتنے تحقیر آمیز انداز میں۔ لیکن ان الفاظ کو سیما نے سچا نہیں سمجھا، ورمن کے یہ لفظ اسے ذلیل معلوم ہوئے، ذلیل اور کمینے، اور ایک انتقامی سے جذبے میں اس نے سوچا کہ وہ گھر سے باہر نہیں جائے گی انہیں جائے گی۔

لیکن اس نے سکول جانا نہ چھوڑا، شام کو سیر کرنے جانا چھوڑ دیا، اور تین دن خاموشی میں کٹ گئے نہ وہ ورمن سے بولی، نہ ورمن اس سے بولا، وہ سوچتی رہی۔

اس نو متعارف نوجوان کے متعلق بظاہر اس کے ذہن میں یہ رشتہ بالکل افلاطونی قسم کا تھا اس نے کبھی اس کے لئے شعوری طور پر جنسی کشش محسوس نہ کی بھی ہو کشش تھی وہ اُسے جنسی نہ سمجھتی تھی۔ سیما نے کبھی اس نوجوان کو اس قسم کی مخصوص اہمیت نہ دی تھی لیکن حقیقت میں اب یہ نوجوان اس کے تمام احساسات کا ذمہ دار تھا اور سیما کی روح اس ممانعت کے خلاف بغاوت کر رہی تھی۔ وہ اسے ناحق سمجھتی تھی جیسے ورمن کو اس طرح منع کرنے کا ادھیکار نہیں ہے لیکن ورمن کا ادھیکار تھا اور وہ اس امر سے واقف تھی، نیم غیر شعوری طور پر پہلے بھی تھی اور اب اس ادھیکار کے خلاف باغی ہوتی جا رہی تھی۔ یہ حق کیوں ہے، وہ سوچتی تھی، کیا عورتوں کا جنم گھر کی دیواروں میں پیدا ہو کر وہیں مر جانے کے لئے ہوتا ہے، کیا انہیں دنیا میں کچھ دیکھنے کا حق نہیں، انہیں کیوں زندگی سے محروم رکھا جاتا ہے، کیوں — اس مخالفت کے بارے میں وہ ایک عمومی ڈھنگ سے سوچتی تھی لیکن حقیقت میں مرکز وہ خود تھی، اُسے ورمن کی شخصیت سے ایک رقابت سی ہو گئی، ورمن اور وہ — وہ کیا ہے، وہ کیا ہے؟ وہ خود کو اگتاب لذت کی محض ایک مشین تصور کرنے لگی، جو ورمن کو لذت بخشتی تھی، یعنی اس کا مطلب یہ ہے، وہ سوچتی تھی، کہ مرد تو ہر قسم کی آزادی کا لطف لیتے ہوئے اپنا دل خوش کرتا رہے اور عورت، عورت؟

اور تین دن خاموشی میں کٹ گئے، چوتھے دن۔

رات کو ورمن نے اُسے منانا چاہا تھا، ایک جسمانی اتصال سے وہ سیما کو اپنا غلام بنائے رکھنا چاہتا تھا؟ —— لیکن سیما نے کہہ دیا کہ اُن کے درمیان میاں بیوی کا تعلق نہیں ہے، کیا؟ ورمن کو یقین نہیں آیا، پھر ورمن کو یقین آگیا۔ اور وہ جیسے ایک غصّے اور توہین کو ضبط کر کے اس کے پاس سے ہٹ گیا۔ ان کے درمیان میاں بیوی کا تعلق نہیں ہے، یعنی، یعنی، تو پھر اس شادی کا مسکھ ہی کیا ہے! لیکن سیما نے

ایک رہائی سی محسوس کی، جیسے اُس نے ورمن سے کوئی چیز لے لی ہے، یا ورمن کو کسی چیز سے محروم کر دیا ہے! اُس نے سوچا کہ جب انہیں اپنی زندگی میں کوئی کمی محسوس ہوگی تو علم ہوگا کہ ـــ

خود اس کے لئے میاں بیوی کے اس تعلق میں کوئی دلچسپی نہ تھی، اور نہ وہ یہ نہ کر سکتی، لیکن اب کیوں وہ اُن کی خوشی کا آلہ بنے جب وہ اس کی خوشی کی پروا نہیں کرتے، وہ سوچتی تھی، مرد کا یہ فرض ہے کہ وہ عورت کی خوشی کا خیال رکھے۔ وہ خوشی چاہتی تھی اور خوشی ملتی نہ تھی اور وہ ان حالات کو چھوڑ نہ سکتی اور انہیں میں وہ ان سے ایک نسوانی انتقام لے رہی تھی، اور اپنی اقتصادی آزادی کا جذبہ غیر شعوری طور پر اسے سہارا دے رہا تھا۔

اور دن گزرنے لگے۔ اس نے ورمن کے بستر میں شرکت کرنا چھوڑ دیا تھا، وہ گھر میں indifferent آواز میں گفتگو کرنے، گفتگو جو لازمی ہوتی تھی، وہ اس سے بچنا بھی نہ چاہتی تھی، بلکہ چاہتی تھی کہ ان حالات میں اور جھگڑا نہ بڑھے۔ اور یہ گفتگو بالکل کاروباری قسم کی ہوتی تھی۔

اس نے سمندر کے کنارے جانا چھوڑ دیا تھا۔ اپنی حقیقی خواہشات کو دبا دیا تھا۔ ورمن نے اس دن وہ الفاظ کہہ کر اُس کے زیرِ نفسی احساسات پر جنہیں وہ جاننا نہ چاہتی تھی ایک ناگوار روشنی ڈال دی تھی اور اس نے انہیں sublimate کیا تھا اور سمندر کے کنارے جانا چھوڑ دیا تھا۔

لیکن اب اسے ایک ویرانی سی محسوس ہوتی تھی، ویرانی، ویرانی، ویرانی، وہ اسکول جاتی، لڑکیوں کو پڑھاتی اور ایک اکتاہٹ سی اُس پر اُمڈی چلی آتی۔ اس کے گرد ہر شئے بے خبر ہو گئی تھی، ہر شئے نے اپنی دلکشی کھو دی تھی۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ زندگی کے لئے ایک ناگوار شفقت کر رہی ہے۔ وہ گھر میں رہتی اور یہ تینوں کمرے اُسے بالکل تنہا معلوم ہوتے، یہ تین کمرے، ان کے مجسم وجود میں سے کوئی چیز زائل ہو گئی تھی، وہ چیز جو انہیں زندہ رکھتی تھی، وہ چیز جو ان کے اور سیتا کے درمیان رشتہ تھی۔ اس کی دلچسپی ان میں سے تفریق ہو گئی تھی۔ ورمن گھر میں ہوتا تو وہ اس سے الگ الگ رہتی، ورمن کا باہر جانا بھی اُسے پسند نہ آتا، ورمن سے رقابت بڑھ رہی تھی۔ لیکن اس کا اپنا وجود خود اُس میں اکتاہٹ پیدا کر رہا تھا۔

پچھلے دنوں وہ بے چینی اور بے کلی جو وہ محسوس کیا کرتی تھی، دب گئی تھی، اب وہ پھر اُبھرنے لگی۔ اُسے پھر وہی انتظار کا سا اضطراب ہوتا تھا۔ اپنے جذبات پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ دن طویل ہو گئے تھے اور دن ڈھلنے کے ساتھ ساتھ وہ پھر اپنے تصور میں خود کو اس سحر کے زیر اثر محسوس کرنے لگی تھی۔ نیچے اس کی روح کی تہہ میں خود کو اس سحر کے سپرد کر دینے کی آرزو تھی، وہ اس ویرانی سے اس سحر کے دھند میں پناہ چاہتی تھی ملائم، ڈھکتے ہوئے، غالب دھند میں۔

اپنے اوراک میں وہ خود اپنے خیالات سے جھگڑنے لگی۔ وہ کیوں ان تین کمروں میں محبوس ہے، تمام دنیا اور زندگی سے منقطع ہو کر ان تین کمروں میں۔ اور اب اس نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ اس کے گھر میں رہنے کا نتیجہ کچھ نہیں۔ اس کے باہر نہ جانے سے ورمن پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ جیسے اس کی ورمن کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ اس کی برداشت کا کوئی خیال نہیں، کیوں ـــ؟ وہ اسی کے لئے بنائی گئی ہے وہ عورت ہے۔ مگر عورت اس کے لئے کیوں بنائی گئی ہے، یہ مردوں کی خودغرضی ہے، یہ مردوں کی دنیا ہے، وہ گھر سے باہر جانا بند کر دیتی ہے لیکن "ان" پر کوئی اثر نہیں ہوتا، ان کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، اسے محسوس ہونے لگا کہ اس نے ورمن سے جنسی علیحدگی اختیار کر کے بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑا۔ اُسے اس بات کا تاسف نہ تھا، لیکن ـــ کتنی غیر اہم ہے وہ، وہ کیا کر سکتی ہے، وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ وہ صرف ایک عورت ہے۔

لیکن اس میں جو عورت تھی وہ ان حالات کے برخلاف ہو گئی۔ وہ کس بات میں اس سے کمتر ہے، اگر ہے بھی تو ورمن کو اسے زندگی سے علیحدہ

رکھنے کا کیا حق ہے، حق، وہ حق پر مصر تھی، ایک عورت کے حق پر، ایک انسان کے حق پر۔

اور اب یہ ویرانی، یہ کسی چیز کی آرزو جو نہیں ہے، کچھ بھی نہیں ہے، ہر ایک چیز کی دلکشی مُردہ پڑ چکی ہے، ہر شے ایک [illegible] ں پڑی ہے، ہر ایک شے پر سے خزاں گزر گئی ہے، اُسے اپنے اندر خزاں کا ایک مادی احساس ہوتا تھا، وہ اسے اپنے دل میں محسوس رتی تھی۔ خزاں۔

اور اپنے گرد خزاں کے اس دائرے سے باہر آنا چاہتی تھی۔ وہ باہر آ گئی۔

سمندر آج ساحل سے پیچھے گیا ہوا تھا، دھندلکا ہو چلا تھا، وہ دیر سے آئی تھی۔ سمندر کا شور فاصلے پر سنائی دیتا تھا اور زیادہ صاف اور زیادہ سنسان تھا۔ فضا میں سے دن کی روشنی غائب ہو چلی تھی۔ اور چاندنی واضح ہوتی جا رہی تھی۔ سیما بنچوں کے سہارے چلتی رہی، سمندر دور چلا گیا تھا، اور کنارے پر ٹہلنا بیکار تھا! اور وہ بینچوں کے قریب ٹہلتی رہی، اس کونے سے اُدھر تک اِدھر سے اس کونے تک۔ اکثر بنچ خالی پڑے تھے۔ ایک سناٹا سا تھا، جسے اس نے ایک مبالغہ آمیز حد تک گہرا محسوس کیا۔ یونہی اسے معمولی سا خیال آیا کہ شاید وہ یہاں پھر مل جائے۔ اپنے دل میں وہ اس سے ملنا چاہتی تھی، اپنی روح میں اُسے ڈھونڈھ رہی تھی۔ لیکن اکثر بنچ خالی پڑے تھے۔ سناٹا گہرا ہو رہا تھا، ہوا تھی، اور سمندر دور چلا گیا تھا۔ ہر شے خود کو اس سے چھپاتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، گھر سے باہر بھی ہر شے خالی تھی، اس نے گردوپیش سے علیحدہ ہونا چاہا۔ اور وہ بینچ پر بیٹھ گئی۔ دن کی روشنی چاندنی میں جذب ہو گئی تھی۔ اس کے قریب چاندنی روشن تھی لیکن اس سے دُور جاتی ہوئی ملگجی ہوتی گئی تھی، ایک سفید سی دھند چھائی ہوئی تھی، سمندر پر، ہر جگہ، اندھیرا نہ تھا، نہ روشنی تھی۔ چاند جیسے ایک مُردہ دنیا پر چمک رہا تھا۔ لیکن اس نے چاند کو نہیں دیکھا، اس کی روح پر ایک بار سا تھا، وہ نیچے جا رہی تھی۔ نیچے وہ ایک عجیب سی یاس سے ہم آغوش تھی اور ہر شے پر ویرانی چھائی ہوئی تھی۔

دیر تک وہ بینچ پر بیٹھی رہی، ایک خیالی دیوانے پن کی سی حالت میں اور غیر متوجہ شعور میں سمندر کا شور سنتی رہی۔ اب فاصلے پر سمندر کی سمت ایک روشنی چمک رہی تھی، سمندر کی موہوم سطح سے اُدھر ایک آدمی کا سلہوٹ اپنے ہاتھ میں لالٹین لئے اِدھر آ رہا تھا۔ اس نے سلہوٹ کی موجودگی نظر انداز کر دیا۔ اور لالٹین قریب آتی گئی۔ بیرونی تاریکی سے روشنی اس کے شعور میں گھستی آ رہی تھی، بیرونی تاریکی سے روشنی اس کے شعور میں گھستی آتی اور وہ ہوشیار سی ہوتی گئی۔ آنے والا سلہوٹ اُدھر خشکی پر آ گیا تھا، اس کے ہاتھ میں لٹکتی ہوئی لالٹین ہل رہی تھی روشنی کا سایہ کنارے کی ریت پر حرکت کر رہا تھا۔ اور وہ روشنی کا وجود ریت پر گزرتا ہوا سڑک پر چلا گیا اور سیما نے جانا کہ وہ یہاں ہے، دھندلکے میں، اور اسے جانا ہے، وہ اٹھ کھڑی ہوئی اُسے جانا ہے، وہ جانے لگی۔

سمندر سے بازار جاتی ہوئی سنسان سڑک پر برقی بتیوں کی قطار چلی گئی تھی۔ شیڈ میں روشنیاں منجمد ہو گئی تھیں۔ ساکت، غیر متحرک۔ جامد روشنیاں، سڑک پر لائٹ کے دھبے تھے! اور ان کے گرد تاریکی، اندھیرا روشنی سے زیادہ تھا، روشنی اندھیرے سے کم تھی۔ وہ جا رہی تھی۔ وہ آ رہا تھا۔ اور روشنی کے دو دھبوں کے درمیان اندھیرے میں وہ ایک دوسرے کے پاس سے گزرے۔

"سیما دیوی"

سیما کے سینے میں دل رک گیا، وہ کھڑی تھی۔

اب وہ قریب آ گیا تھا، اس نے پوچھا: "آپ واپس جا رہی ہیں؟"

سیما کہہ نہ سکی کہ وہ جا رہی ہے، صرف کہہ نہ سکی۔

"جاتے جاتے مجھے شبہ ہوا تھا کہ یہ آپ ہیں۔ آپ تھوڑی دیر ٹھہریں گی نہیں؟"

"چلیے" سیما نے کہا، ایک غیبی طاقت کے زیر اثر جو نہ اس کی اپنی تھی نہ اس نوجوان کی، اور وہ واپس ساحل پہ گئے۔

سمندر کتنی دور سے آگے گیا ہوا ہے؟" اس نے کہا، "میرا خیال ہے۔ ہم اس خشکی پر سے گزر کر کنارے پر چلے چلیں۔" اور اس نے سیما کے جواب کا انتظار نہ کیا جیسے اسے معلوم ہو کہ وہ انکار نہیں کر سکتی اور سیما اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ یہ یا اس کی اپنی طاقت کا فقدان تھا یا اس نوجوان کا اثر یا دونوں ہی تھے اور وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتی گئی۔

"جب سے چاند بڑا ہونا شروع ہوا ہے میں اب رات کو آتا ہوں۔" وہ کہہ رہا تھا "آپ نے تو اب آنا ہی چھوڑ دیا۔ ایک ہفتے تک مجھے محسوس ہوا تھا کہ میں روز آپ کا انتظار کرتا ہوں، اور مجھے اپنے اوپر تعجب ہوتا تھا کہ میں یہ انتظار کیوں کرتا ہوں۔ میں نے سوچا تھا کہ شاید آپ بمبئی میں نہیں ہیں، لیکن پھر بھی مجھے امید تھی کہ آپ یہیں ہیں اور مجھے پھر ملیں گی۔"

مبہوت سی سیما اس کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ وہ کیا کہے، اس کے اندر کہنے کو کچھ نہیں تھا، وہ خالی تھی، لیکن وہ کچھ کہتا رہا۔ اس کی موجودگی کا احساس سیما کو پھر سے متاثر کرتا جا رہا تھا، وہ پھر اپنی طاقت کو کھو کر کمزور ہو رہی تھی، وہی ایک نرمی کا تاثر اس کے ہوش ڈھک رہا تھا۔

"آج کل میں رات کو دیر تک یہیں بیٹھا رہتا ہوں، گھر میں خود کو اکیلا محسوس کرتا ہوں، لیکن یہاں اس سناٹے میں مجھے تنہائی محسوس بھلی سی ہوتی ہے۔ اس جگہ میں اکیلا ہونے پہ بھی وحشت نہیں ہوتی لیکن گھر میں ہمیشہ ایک جلاوطنی سی محسوس ہوتی ہے۔ کبھی کبھی مجھے تعجب ہوتا ہے کہ ساری عمر گھروں میں رہ کر گزار دیتی ہیں۔"

"نہیں گھروں میں رہنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔" سیما نے آہستہ سے کہا۔

وہ رک گیا اور سیما جیسے خاموشی میں گم ہونے لگی۔ پھر وہ بولا۔ "اگر انسان کی فطرت میں عادت نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔ شاید اس وقت زندگی ہی بدل جاتی، یا یوں کہئے کہ زندگی کی کوئی شکل ہی نہ ہوتی یا اتنی شکلیں ہوتیں اور وہ اتنی جلدی جلدی بدلتی رہتیں۔ عادت نے زندگی کو بالکل ساکت کر دیا ہے، ورنہ زندگی اتنی اکتا دینے والی نہ ہوتی، نہ اتنی یکساں۔ خیال کرو کہ اگر انسان کی فطرت میں عادت نہ ہوتی تو زندگی کی رفتار کتنی تیز ہو جاتی۔"

وہ ہنس پڑا لیکن بہت آہستہ سے، جیسے یا تو وہ خود اپنی آواز کے سحر میں ہو، یا اس سحر سے واقف ہو اور اس کے دائرے سے باہر نہ جانا چاہتا ہو۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ ایک اونچا قہقہہ سحر کے دائرے کی قوس کو توڑ دے گا۔ اس کے ہنسنے نے سیما کو متحرک سا کر دیا، جیسے پانی کی سطح پہ چند بوندیں پڑ جائیں، لیکن پانی کی سطح پھر ساکن ہو گئی تھی اور وہ چلتی رہی۔ وہ کنارے پر آ گئے تھے۔ یہاں زمین زیادہ نم دار تھی اور نرم زمین پہ پاؤں رکھتے ہوئے اسے وہی ایک گداز سا احساس ہو رہا تھا۔ اس کا ادراک چھن رہا تھا اور گردوپیش کا احساس ایک ملائمت کی سی کیفیت لے کر اس میں سمایا جا رہا تھا۔ سمندر کا شور گداز اور شفقت آمیز تھا، جیسے اس کا ذہن بہت ملائم ربڑ کا بنا ہوا ہو اور سمندر ربڑ کے ساحل سے ٹکرا رہا ہو۔
وہ کنارے پہ پہنچ گئی۔

یہاں تک آتے آتے وہ خاموش ہو گیا تھا لیکن اس کی خاموشی عجیب تھی کسی دوسری شے سے حاملہ تھی۔ چپ ہو کر وہ کنارے پر سمندر کے جھاگوں کو پھیلتے ہوئے دیکھتا رہا، جن کی سفیدی چاند کی روشنی میں بکھر جاتی تھی۔ اس کی آنکھیں آگے آگے، ساحل کے کنارے کنارے ان جھاگوں کو دیکھتی رہیں۔ لہر لہر سے ٹکراتی تھی اور کنارے پر جھاگ بکھر جاتی تھی۔ صرف ان سمندری جھاگوں کو چاندنی نے سفید کر دیا تھا اور باقی ہر شے دھندلی تھی۔ وہ ان جھاگوں سے الگ کچھ اور سوچ رہا تھا۔ اور سیما اپنی حالت سے ناواقف اس کے قریب کھڑی رہی۔ اس کے پاس تھی اور ہر شے سے کٹ گئی تھی۔ لیکن اس سکون سے پیچھے یا اس سکون کے پار ایک دوسرا متحرک احساس تھا۔ اور اس احساس نے سیما کو ڈھک لیا تھا۔ وہ اس

احساس کے تحت میں کھڑی رہی۔ جیسے عمیق ہمیق، روح کی عمیق گہرائی میں وہ کسی چیز کا انتظار کر رہی ہو، وہ کسی چیز کا انتظار کر رہی تھی۔

"آپ بیٹھیں گی؟" اس نے پوچھا اور کنارے سے ہٹ کر گیلی ریت پر اپنا کوٹ بچھا دیا۔

"بیٹھ جاؤ" اس نے کہا، اس کی آواز میں دور دراز تحکم کی ایک طاقت تھی۔ اور سیما بیٹھ گئی اور وہ خود بھی بیٹھ گیا۔ سیما اپنی آواز سے محروم تھی، وہ کچھ چاہ رہی تھی اور اپنی روح میں اس سے ڈر بھی رہی تھی اور بولنے کی طاقت سے محروم ہو گئی تھی۔ وہ عجیب ڈھنگ سے خاموش تھا، اس کی عالمہ خاموشی، خاموشی، کائنات میں جو صوتی حرکت تھی وہ سیما کی توجہ کے دائرے سے باہر ہو گئی تھی۔ پھر آہستہ سے اس نے سیما کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور سیما نے ایسا ہونے دیا وہ جیسے پیار سے سیما کی ہتھیلی پر اپنی انگلی سے لکیریں سی بنا رہا تھا صلیب کے سے نشان وہ اور زیر کہہ رہا تھا سیما سن رہی تھی، لیکن وہ سن نہیں رہی تھی، اسے معلوم نہ تھا وہ کیا کہہ رہا تھا۔ سیما کو صرف اس کی آواز کا احساس تھا بلکہ اس سے دور چلا گیا تھا صرف اس آواز کے تاثر کا، اور اس میں الفاظ نہیں تھے، الفاظ سے جدا وہ صرف اس سحر کے زیر اثر تھی اور ہاتھ کا یہ لمس ایک منزل تھی، جیسے خالی پڑے سحر کی ایک مادی صورت تھی جس کے سپرد وہ خود کو کر دینا چاہتی تھی، یہ لمس اس سحر اور سیما کے درمیان میں ایک رشتہ تھا۔ پھر اس کا بازو جانے اپنے دیے گرد آ گیا اور سیما نے روکا نہیں، وہ اپنی عملی طاقت سے مستعفی ہو گئی اور اس کے بازو کا دباؤ سیما کو قریب لاتا گیا، وہ سحر اسے چھو رہا تھا بند تھی اور سمندر وہ اپنے آغوش میں لے رہا تھا، وہ آغوش میں آ گئی اس کے جسم کا ہر عضو ڈھیلا ہوتا گیا۔ اس کے تمام وجود نے خود کو چھوڑ دیا اور سیما ہونا چاہا۔ اور وہ بیٹھی پڑی رہی۔ وہ اگر اسے چھوڑ دیتا تو وہ گر پڑتی۔ لیکن وہ سیما کو اپنے بازوؤں میں لئے رہا اور خاموشی کے لمحے اس Contact ہوتی گئی تھی، ایک رہتے گئے۔ اور سیما نے اس کے ہاتھ کو اپنے سینے پر محسوس کیا۔ جیسے وہ اپنے ہاتھ سے ایک بلی کی ملائم سمور کو برش کر رہا ہو۔ اور اس لیکن اس نے چاند کے نیچے سیما نے خود کو ایک بلی کے مانند محسوس کیا، ایک مسحور بلی کی مانند اس کی تمام توجہ اپنے سینے پر سمٹ آئی۔ وہ اپنے آپ سے غافل ویرانی چھاتی میں سے بھی غافل تھی، اُسے اپنے سینے کا احساس تھا، صرف اس لمس کا جو اس کے سینے اور اس سحر کے درمیان تھا، وہ آہستہ آہستہ اس کے سینے پر ہاتھ پھیر رہا تھا، اس کی چھاتی کو اپنی انگلیوں کے نرم دباؤ سے محسوس کر رہا تھا، وہ غافل تھی اور اس کے لب سیما کے لبوں پر رکھے تھے اور

وہ غافل تھی، اور ——

جب وہ گھر پہنچی تو اب تک اس سحر کے اثر میں مبتلا تھی۔ اس کی روح کو چھید کر کوئی چیز اس کے اندر داخل ہو گئی تھی۔ اور اس نے اُسے لاعمل اور (بے بس) کر دیا تھا۔ اس نے اپنے شعور کو اور اپنے عمل کو دوسرے ہاتھوں میں سونپ دیا تھا۔ اُن ہاتھوں کی طاقت، ان میں بہت بہت بہت زیادہ کچھ تھا جس کے خلاف وہ کھڑی رہ سکتی تھی اور اس نے خود کو نیل کر دیا تھا۔ اور ابھی تک اس سحر کے غالب اثر میں مبتلا تھی۔

لیکن اب مکان کا دروازہ بند تھا۔ بند دروازے کے آگے کھڑے ہوئے اُسے محسوس ہوا کہ دیر ہو گئی ہے، دیر ہو گئی تھی، اور دیر کا احساس اُسے پورے شعور کی ذلیل حالت میں لاتا گیا —— گرر، گرر، وہ گھنٹی بجا رہی تھی اور گھنٹی کی آواز اس کی روح کو جھنجھوڑ رہی تھی۔ ایک تقصیر کا سا احساس لیے ہوئے، خوف زدہ سی۔

گرر، گرر، گرر، گرر، گرر، گرر ——

کوئی آ رہا تھا۔

دروازہ کھل گیا۔ ورمن اندر کھڑا تھا۔ وہ ورمن کا سامنا نہ کر سکی، بالکل وہ ایک قصوروار کی طرح اندر آ گئی ورمن مڑ گیا تھا اور اندر آ کر سیما نے دروازہ بند کر لیا، بالکل آہستہ سے کہ شور نہ ہو، وہ آواز سے خوف زدہ تھی، اور اچانک کلاک نے گھنٹا بجایا اور وہ چونک پڑی۔ اور ایک، دو، تین...... کلاک گیارہ کے گھنٹے بجا رہا اور وہ گھنٹوں کی آواز پہ قدم رکھتی ہوئی اندر چلی گئی، گیارہ بج گئے تھے۔

"کہاں تھیں؟" ورمن نے سنجیدہ درشتی سے پوچھا۔

"سمندر کے کنارے" سیما نے آہستہ سے جواب دیا۔

"وہاں نہیں تھیں تم، میں خود تمہیں وہاں دیکھ آیا ہوں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم کہاں تھیں"

"وہیں تھی" اس کی آواز قصوروار تھی۔

"جھوٹ بولتی ہو۔ مجھے تم پر بالکل یقین نہیں، تمہارے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ جھوٹ ہے کہ تم —— کہاں تھیں تم، تمہیں اپنی عزت کا خیال ہے نہ میری یہ رات کے گیارہ بجے تم سمندر کے کنارے تھیں۔ شرم نہیں آتی جھوٹ بولتے ہوئے۔ کل سے تم نہ سمندر کے کنارے جا سکتی ہو نہ کہیں اور تمہیں جہاں جانا ہے میرے ساتھ جاؤ"

"کیوں؟" سیما نے حفاظت نفس کے سے جذبے سے کہا۔

کیوں کہ میں جانتا ہوں تم کیا کرنا چاہتی ہو اور میں تمہیں اپنے چہرے پر سیاہی نہیں پوتنے دوں گا۔ کل سے تمہارا اسکول جانا بھی بند ہے۔ تم کہیں اکیلی نہیں جا سکتیں"

لیکن میں خود اپنے آپ کو سپورٹ کرنا چاہتی ہوں، میں تم سے کچھ نہیں چاہتی، کچھ نہیں چاہتی"

"تم میری بیوی ہو" درمن نے زور سے کہا۔

اور الفاظ براہ راست سیما کے لاشعور سے آئے ——

لیکن میں اس سے محبت کرتی ہوں، محبت کرتی ہوں، محبت کرتی ہوں" ——

"سیما!"

اور اُس نے اپنے ہاتھوں میں منہ چھپا لیا اور رونے لگی۔

سیّد رفیق حسین

کلوا

منہ پہ پسینہ، گالوں پہ سُرخی، کوٹ کے بٹن کھُلے ہوئے، قمیص کے دامن اور ہاتھ پہ روشنائی کے دھبّے۔ ازاربند پیروں تک لٹکا ہوا، ایک بغل میں کالا بستہ اور دوسری بغل میں کالا کتّے کا پلّا۔ منّن گھر میں داخل ہوا۔ امّاں نے چیخ ماری "ہائے ہے میں مرگئی!" سنگر مشین نے گنگنانا بند کر دیا۔ ماں کا ایک ہاتھ مشین کے ہنڈل پہ تھا، دوسرا دھتے پر! وہ ساکت پلّے کو دیکھ رہی تھی۔ چہرے پر ہلکی مسکراہٹ اور گہری محبت نمایاں تھی۔ لڑکے نے چھوٹے سے گھر میں ایک طرف سے دوسری طرف گردن گھما کر دیکھا۔ "ارے ہماری آواز پا کر جو لا۔ ہاں ہم اسے پالیں گے۔"

ماں نے ماتھے سے ہاتھ ہٹا کر پلّے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اے خدا کے لئے گود سے تو پھینکو" کچھ خفگی کی آواز میں "سارے کپڑے نجس کر دئے پھینکو اسے۔ تمہارے ابّا آتے ہوں گے۔"

لڑکے نے جلدی سے پلّے کو زمین پر رکھ دیا۔ پلّا تین انچ کی دُم ہلا ہلا کر منّن کے جوتوں پر لوٹنے لگا۔ ماما نے باورچی خانہ سے گردن باہر نکال کر ناک پہ انگلی رکھ کر ہنستے ہوئے کہا "بیوی دیکھئے تو موا کیسا پیروں میں لوٹ رہا ہے!" وہ جلدی کی لکڑی تخت کے پاس سے صحن کی طرف بڑھی۔ ماں چلائی "ارے ہٹاؤ بھی۔ اب گھر بھر گندا ہوگا۔ منّن تو یہ کیا مصیبت لے آئے!"

منّن نے کہا "جو کارٹ کھاتے نکلا ادھر نہ آنا!"

ڈیڑھ گھنٹے بعد منّن منہ دھوئے، صاف کپڑے پہنے، اُجلے بنے اچار پائی پہ بیٹھے تھے۔ صرف سیدھے ہاتھ کی انگلیوں پہ ہلکے نیلی روشنائی کے نشان ابھی تھے۔ سامنے مُرادآبادی تھالی میں دو بسکٹ، تین جلیبیاں اور ایک پیالی دودھ تھا۔ جس پہ تین مکھیاں مشغول تھیں۔ خود منّن کتّے کی طرف مشغول تھے۔ کتّے کا پلّا صحن کے دروازے کے سامنے کھٹولے کے پائے میں رسّی سے بندھا ہوا ایک ہڈّی میں پوری طرح مشغول تھا۔ ماں نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے کہا "اب ناشتہ کر لو۔ یہی تو بات بُری ہے۔ مکھیاں بھنکا رہے ہو۔ دیکھو دودھ میں مکھی گر جائے گی۔"

"امّاں اس سے ہڈّی بچتی تو ہے نہیں بسکٹ دیدوں" یہ کہا اور لڑکا بسکٹ لیکر اُٹھنے لگا۔

ماں نے کہا "چلے پھر چھونے کو۔ اس سے تم کو تو لو ہیں اور......"

گھر میں آہستہ سے مالکِ خانہ داخل ہوئے۔ سیاہ ٹوپی، سیاہ فریم کی عینک۔ سیاہ تکونی داڑھی۔ سیاہ شیروانی۔ سیاہ چھڑی ہاتھ میں اور سیاہ جوتا پیر میں۔ کھٹولے کے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔ بیوی بچی ہوئی چائے کی ٹرے میں سے چائے دان لیکر باورچی خانہ کی طرف چلیں۔ لڑکا دبک کر بیٹھ گیا۔ سر جھکا کر دودھ میں بسکٹ توڑ توڑ کر ڈالنے لگا۔ میاں نے جھنجلائی ہوئی آواز میں کہا "یہ کیا ہے بی؟ کون لایا اسے؟"

بیوی چائے دان ہاتھ میں لئے باورچی خانے کے سامنے رک گئیں۔ مسکرا کر بولیں "اے ڈیوڑھی میں آگیا تھا۔ کوں کوں کر رہا تھا۔ دیکھ کر ترس آگیا۔ کیسا پیارا ہے۔ میں نے باندھ لیا۔"

میاں نے لاحول کو قرأت سے ادا کر کے کہا "بھِگے گا تو؟"

"دھبنگن اٹھائے گی۔"

"موتے گا جو؟"

"تو لوٹے سے دھویا جائیگا۔ آؤ چائے پی لو۔"

"بچے جو چھوئیں گے؟"

بیوی اب باورچی خانہ میں تھیں اس لئے کوئی جواب نہ ملا۔ منّی کا سر البتہ پیالے کی طرف اور جھک گیا۔ میاں نے کمرے میں جاکر اپنے سوا باقی تمام چیزیں ایک ہی کھونٹی پر لٹکا دیں۔ دوسرا قمیص اور پاجامہ پہن کر منہ دھویا۔ تولیہ سے رگڑ رگڑ کر داڑھی کو پونچھا۔ اور چائے پینے کر بیٹھ گئے۔ بیوی پاس بیٹھ کر مکھیاں جھلنے لگیں اب پھر میاں بولے "یہ کیا نجاست پھیلائی ہے پھکوا دو باہر!"

بیوی نے بگڑ کر کہا "بس تم کو تو ایک بات کی دھن ہو جاتی ہے۔ ہمارا کیا لیتا ہے۔ پڑا ہے بچے کھیلیں گے!"

"ہاں یہ انہی حضرت کا شوق ہو گا؟"

حضرت تینوں جلیبیاں، آدھا بسکٹ اور تھوڑا سا دودھ چھوڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور سیدھے زینے میں گھس چھت پر پہنچ گئے۔

کالا پِلّا آٹھ دن اس گھر میں مہمان رہا۔ دو دن صحن میں جہاں دو دفعہ میاں نے گود والی لڑکی کو اسے چھوتے دیکھا۔ پھر پانچ دن ڈیوڑھی میں، جہاں ایک دفعہ اس کی رسّی پیروں میں پھنسی اور دوسری دفعہ یہ خود انہی کے پیروں میں آگیا۔ آخری یعنی آٹھویں رات اس کو کوٹھے پر بسر کرنی پڑی۔ یہاں اسکو ماں کی یاد نے ستایا۔ یہ یادِ ماضی پر چیخیں مارتا رہا اور میاں بیوی کو بھنبھوڑتے رہے۔ اوپر اور نیچے دونوں جگہ رت جگا رہا۔

دوسرے دن گیارہ بجے کالا پلّا صدائے احتجاج بلند کرتا ہمیں بیاد رہا، کے پیچھے گھسٹتا ہوا نخاس کی چوڑی سڑک پر پہنچ گیا۔ اور سڑک کے سپرد کر دیا گیا۔ پانچ منٹ کے بعد ایک موٹر نے غیں۔ غیں کرنا شروع کی۔ ایک بڑے لڑکے نے ہنستے ہوئے لپک کر اُسے ایسی ٹھوکر ماری کہ یہ گیند کی طرح لڑھکتا ہوا پکی نالی میں جا گرا۔ موٹر ایک دفعہ اور غیں کر کے چل دیا۔ لیکن کالا پِلّا عرصے تک ٹیاؤں! ٹیاؤں کرتا رہا۔

نالی میں کیچڑ اور پانی صرف اتنا ہی تھا کہ اس کے پنجے ڈوبے ہوئے تھے۔ لیکن نالی اس کے واسطے کافی گہری تھی۔ جس میں سے وہ نکل نہ سکتا تھا۔ اس نے چار چھ زبان کے سڑاپوں سے کچھ پانی پیا۔ اور پھر نالی پر چڑھنے کو اگلے پیر اُٹھا کر نالی کی دیوار پر رکھے۔ تین دفعہ کوں کوں کی اور پھر پیر نیچے کر کے چلید آٹھ قدم چل کر پھر اس نے وہی کوشش کی اور کوں کوں کر کے پھر چل دیا۔ گلے کی رسّی پیچھے گھسٹ رہی تھی۔ یہ ایسی ہی کوششیں کرتا چلا جا رہا تھا کہ ایک قصائی کے لڑکے کی اس پر نگاہ پڑی۔ ایک ہاتھ میں بستہ اور بغل میں تختی تھی۔ دوسرے ہاتھ میں مٹی کی دوات اور سینٹھے کا قلم۔ صرف پیر آزاد تھے۔ چنانچہ اس نے ننگا پیر لٹکا کر اس کی مدد کرنا شروع کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی دیر میں پِلّا کیچڑ میں لت پت ہو گیا۔ اتنے میں قصائیوں کے دو لڑکے اور آ گئے۔ کچھ دیر وہ اسکا تماشہ دیکھتے رہے۔ پھر ان میں سے ایک نے جھک کر اس کی رسّی کا سرا پکڑ لیا اور ایک ہی جھٹکے میں اسے اور اس کی رسّی کو نالی سے باہر نکال دیا۔ رسّی پر

لپٹی ہوئی کیچڑ کے چھینٹے اُڑائے۔ ایک کی آنکھ میں اور دوسرے کے کُھلے ہوئے ہنستے مُنہ میں کیچڑ نے اپنا مزہ چکھایا۔ چنانچہ تینوں لڑکوں میں آپس میں ماں اور بہنوں کے متعلق شستہ گفتگو شروع ہوگئی۔ کالے پلّے نے محبت بھری نگاہوں سے اُس لڑکے کو دیکھا جو جھکا ہوا اپنے ہاتھ کی کیچڑ مٹرک پہ پھینک رہا تھا اور اپنے ساتھی کی گالی کے جواب میں گالی برابر لوٹا رہا تھا۔ پلّا دُم ہلاتا ہوا اس کی طرف چلا۔ اب اس نے پلّے کو غور سے دیکھ کر کہا "شیرا ہے شیرا!" پھر اس نے مٹی کے برے کو پیر سے زمین پہ رگڑا اور اٹھا لیا۔ "آ، شیرا آ، ڈ!" کر کے رسّی تانی۔ شیرا نے تین چار پُھدکیاں اس کی طرف بھریں۔ اب لڑکا بھاگنے لگا۔ دو چار قدم شیرا نے ساتھ دیا پھر گھسٹنے لگا۔ جب پیر چلنے لگے تو وہیں ہی کر کے چت ہو کر ہی گھسٹنا بہتر سمجھا۔ باقی دونوں لڑکے اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ گلی کے نکڑ پہ مونڈھا بچھائے پہلوان بیٹھے تھے۔ انہوں نے لونڈوں کو ڈانٹ بتائی "ابے تمہارا ایسا ویسا لونڈو کیا کہتے ہو۔ چھوڑ دو پلّے کو۔" لونڈے پلّے کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ پلّا تین انچ کی دُم ٹانگوں میں دبائے سر زمین سے لگائے پہلوان کی طرف بڑھا۔ پہلوان نے پیر سے دو تین دفعہ اسے لڑھکا کے گلی کے اندر کر دیا۔ اور خود بے فکر ہو کر پھر مونڈھے پہ جا بیٹھے۔ وہیں پہ چار دو کانوں میں کہار رہتے تھے۔ ایک کہاری بیٹھی لوہے کی کڑھائی مانجھ رہی تھی۔ پلّا اس کے پاس اسی حالت سے سر زمین سے لگا، دُم پیروں کے اندر، کوں کوں کرتا گیا۔ کہاری نے کہا: "دھوت، دھوت!"

ایک تیرہ برس کی دُبلی میلی کہاری کی لونڈیا نے برابر کی دوکان سے چھلانگ ماری اور پلّے کو اُٹھا لیا۔ لیکن فوراً ہی رام رام کہہ کر زمین پہ رکھ دیا۔ دونوں ہاتھ دیوار پہ رگڑ کر دوکان میں گئی۔ ایک ٹھلیا پانی لائی اور اسے غسل دیا۔ پلّے کا یہ پہلا غسل تھا۔ بہت ناپسند کیا۔ ہر طرف بھاگنے کی کوشش کی۔ ناک میں بھی پانی چلا گیا۔ بُری طرح چھینکیں آئیں۔ جب غسل ہو چکا تو وہ کانپ رہا تھا۔ لڑکی نے اس کا بدن ایک میلے چیتھڑے سے پونچھا۔ مٹھے میں بھگو کر بجھرے کی روٹی کھانے کو دی۔ اسی لڑکی نے اس کا نام کلوا رکھا۔ لڑکی کا خود نام چندو تھا۔

کلوا نے ڈھائی مہینے چندو کے ہاتھ اور پیر چاٹے۔ اس کا یہ زمانہ بڑے عیش میں کٹا۔ لیکن اسی قلیل عرصے میں مجوریا نامی قصائی کے لڑکے نے پہلے تو چندو سے عشق بڑھایا۔ لیکن جب چندو نے ایک دو مرتبہ بُری طرح جھڑک دیا تو پھر اُس نے بیر بڑھایا۔ اور اب بھی جب بس نہ چلا تو ایک رات جب یہ لوگ گلی میں سو رہے تھے تو کلوا کو کھٹیا کے پاس سے اُٹھا بھاگ گیا۔ پہلے کلوا نے کوں کوں کی پھر ناراضگی کے دانت دکھائے اور آخر میں جب کاٹنے کی کوشش کی تو بیچارے کی تھوتھنی پکڑ لی گئی۔ مجوریا نے اسے بہت دُور بجوپورہ کے ایک پرانے قبرستان میں لے جا کر قبروں کے بیچ میں ایک بیری سے باندھ دیا۔

کلوا تمام رات سینکڑوں قبروں پر اکیلا نوحہ خوانی کرتا رہا۔ صبح کو ایک لونڈا زمین سے صرف چار انچ اونچا کرتا پہنے قبروں میں کچھ ڈھونڈتا ہوا آیا۔ کلوا کو دیکھ کر بڑے زور سے چلایا "بابا رے بر دھر لسالا"۔ بابا، قبرستان کے تکیہ دار فقیر، مہندی کی کھپچی ہاتھ میں لئے آئے اور کلوا کی بہن کو یاد کر کے بولے۔ "رات بھر چلایا کیا۔" اور مہندی کی کھپچی سے کلوا کو دھنکنا شروع کر دیا۔ لمبے کرتے والا لڑکا کلوا کی واویلا سے بہت محظوظ ہوا۔ ہنسی کے مارے لوٹا جاتا تھا۔ یہاں کلوا کی یہ حالت کہ جب پیٹھ میں برداشت کی طاقت نہ رہی تو چت ہو گیا۔ اور پیروں پہ کھپچیوں کو روکنے لگا۔ خدا خدا کر کے کھپچی ٹوٹی تو اس کی جان بچی۔

کلوا دن بھر اسی بیری کے نیچے بھوکا پیاسا بندھا ہوا چندو کی یاد میں پڑا رہا۔ دن بھر کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ دُور کچھ عورتوں اور بچوں کے بولنے کی آوازیں آیا کیں۔ لیکن اس طرف ایک قبر کے لمبے چوڑے تکئے نے آڑ کر رکھی تھی۔ شام کو جب اندھیرا ہونے لگا تو اسی طرف سے کلوا کی تیز ناک نے بھنتے ہوئے گوشت کی خوشبو محسوس کی۔ صبر پہ جبر نہ ہو سکا۔ ایک مہین اور لمبی چیخ نکل گئی۔ جب تھوڑی دیر بعد ایک عورت اس کے پاس آئی تو کلوا ڈر کے مارے چت لیٹ گیا۔ دُم پیروں میں سکیڑ لی۔ زبان گو پیاس سے لٹکی پڑتی تھی لیکن جلدی جلدی اندر سمیٹ کر ہلکے ہلکے کوں کوں کرنے لگا۔ عورت نے اسے کھولا اور لے چلی۔ کلوا خاموشی سے ساتھ ہو لیا۔ قبرستان کے دُوسرے سرے پہ دو مختلف قسم کے مکان تھے۔ ایک کوٹھڑی اور ایک مقبرہ۔ ان ہی دونوں میں ان لوگوں کی رہائش تھی۔

وہاں ایک بکری بندھی تھی۔ چار کھٹیاں ایک لائن میں پڑی تھیں۔ ایک عورت اور چھ بچے چٹائی پر بیٹھے تھے۔ گیسو دراز فقیر صاحب مقبرہ کے چبوترے پر اکڑوں بیٹھے گانجے کے دم لگا رہے تھے۔ کلوا نے ناچتی ہوئی زبان اندر کر کے گانجے کی خوشبو پر غور کیا۔ غالباً بری معلوم ہوئی۔ ناک کی نوک کو ایک دفعہ دائیں اور پھر بائیں طرف جنبش دے کر زبان پھر لٹکا دی اور ہانپنے لگا۔ عورت نے اس کو بھی اسی کھونٹے سے باندھ دیا جس سے کہ بکری بندھی تھی۔ اس نے جاتے ہی بکری کے کونڈے میں سے پانی چاٹا۔ بکری کو اس دوہری ہتک عزت پر غصہ آگیا۔ اس نے تین چار دفعہ کھریاں جوڑ کر اور سینگ کی نوکیں کلوا کی طرف کر کے حملہ کرنے کی دھمکی دی۔ لیکن کلوا نے ظاہراً اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ اطمینان سے دونوں اگلے پیر آگے پھیلا کر اور پچھلے سمیٹ کر اس چٹائی کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ جب اس چٹائی پر کھانا ہونے لگا تو اس کی ہم کھونٹا بکری نے بھی جگالی شروع کر دی۔ پہلی بوٹی جب کلوا کے پاس آکر گری تو اس نے اپنی دُم کو شکریہ کے واسطے دو دفعہ زمین پر مارا۔ تہذیب سے وہیں بیٹھے بیٹھے گردن لمبی کر کے سر بڑھا کر بوٹی کو اٹھا لیا۔ چونکہ مرچ دار تھی وہ بھی ولنت مار کر نگل لی۔ زبان سے ناک اور ہونٹوں کو چاٹ کر صاف کر لیا۔ اور پھر انتظار کرنے لگا۔ دوسری بوٹی ہوا میں اڑتی ہوئی اس کے پھیلے ہوئے پیروں کے بیچ میں گردن کے نیچے آکر رک گئی۔ دُم کو تین جھٹکے شکریہ کے دے کر کھڑا ہو گیا۔ بوٹی نرم تھی، ویسے ہی نگل گیا۔ پھر جو ایک ہڈی اُچھلی تو بکری کے پاس گری، یہ جو اس طرف بڑھا تو بکری چونک پڑی۔ چابن نگل کر جگالی کے نئے لقمے کے گردن میں سے چل کر منہ میں آنے کے انتظار میں تھی، کوئی بھلا جانور ایسے موقعے کے دخل اندازی پسند نہیں کر سکتا۔ فوراً سر نیچا کر کے سینگوں کی نوکیں پیش کر، کھریاں جوڑ حملہ آور ہو گئی۔ معاملہ ہڈی کا تھا معمولی بات نہ تھی۔ کلوا نے بھی جواب دیا "ہڑی" اور پھر "ہم ہم" کر کے دو چھوٹے حملے کئے۔ بکری صاحبہ ڈٹ گئیں۔ اب جو بھاگیں تو رسی کو بھی بھول گئیں۔ بس بھاگ پڑیں۔ رسی تنی جھٹکا کھایا۔ دھم سے زمین پر دراز ہو گئیں۔ کلوا کی جان نے بلا۔ ہڈی اٹھا دوسری طرف چل دئے۔ جب رسی تن گئی بیٹھ کر مزے لینے لگے۔ گیسو دراز صاحب نے اٹھ کر ایک رسی کے ٹکڑے سے کلوا کو بڑی مار ماری۔

سات دن کلوا کو قبرستان میں پیٹ بھر مار اور آدھے پیٹ کھانے پر گذر کرنی پڑی۔ ایک رات خیال آیا کہ اگر دانتوں کو رسی پر ورزش دی جائے تو کیا حرج ہے۔ چنانچہ ایک گھنٹے کی متواتر محنت کے بعد ایک عجیب نتیجہ یہ ہوا کہ کلوا آزاد تھے۔

غلامی کا نشان صرف فٹ بھر کا ٹکڑا گلے میں باقی تھا۔ اس کی فکر کلوا کو مطلق نہ ہوئی۔ فوراً ایک طرف روانہ ہو گیا۔ چندو کی یاد اور پیٹ کی خواہش، ان دو اثرات کے تابع اس کے قدم اٹھنے لگے۔ نیم کا سایہ، نیم کی جڑ، تین کچّی قبریں، دو پکّی قبریں۔ ایک بہت اُونچی پکّی قبر وہی پت جھڑی بیری، وہ دھنسی قبریں! ایک چھوٹی قبر۔ اس کے برابر ایک بڑی قبر۔ ایک قبر کا خالی گڑھا، قبرستان کی دیوار کا ایک گرا ہوا حصّہ۔ سب کو دُم آسمان کی طرف اور ناک زمین کی طرف کئے ہوئے پار کر گیا۔ دوسری طرف دیوار سے ملا ایک نیولا کھڑا تھا۔ اس نے اس کو دیکھا اور لپکا۔ اس نے اسے دیکھا اور بھاگا۔ چار چھلانگوں میں یہ اس کے پاس پہنچ گیا۔ نیولا پلٹ پڑا۔ دُم پھول کر جھاڑو ہو گئی۔ پچھلے پیروں پر بیٹھ کر مقابلہ کو تیار ہو گیا۔ کلوا بھی اگلے دونوں پیر جوڑ کر بدن کو پیچھے تان کر رک گئے۔ اب غالباً اشاروں میں ایک نے دوسرے سے معافی مانگی۔ وہ اُدھر چل دیا اور یہ اِدھر روانہ ہو گئے۔ پھر وہی دُم آسمان کی طرف اور ناک زمین کی طرف۔ چندو یا غذا دونوں میں سے ایک جس کی قبر مل جائے۔

جاتے جاتے پکّی سڑک پر ہو لیا۔ عیش باغ کے سامنے پولیس کی چوکی پر پہنچا۔ ایک موٹے کتے نے لیٹے لیٹے غرّا کر کہا "ہوں" کلوا نے دُم دبائی اور ایک سپاٹا بھرا۔ ایسے ہی چلا جا رہا تھا کہ ایک ہڈی کی بو پائی۔ ٹھٹک کر رہ گیا۔ ناک زمین پر سُرسُر کر کے فوراً ڈھونڈ لی۔ دیکھا تو کچھ حصّہ اس میں کام کا تھا۔ کھایا اور پھر چل دیا۔ آر۔ کے۔ ریلوے کی چوکی آگئی۔ ایک بوڑھے کتے نے لپک کر ان کا راستہ روکا۔ ٹیڑھے ٹیڑھے کھڑے ہو کر کھیسیں دکھا شدّت سے کھینچ کر کہا "کھیسیں" کلوا نے بھی کچلیاں دکھا کر کہا "کھیسیں" بوڑھے نے اور گہری آواز گلے سے نکال کر کہا "دیکھیں" کلوا نے دانت نکال کر تین دفعہ جھٹکوں سے منہ بنا کر کہا "ہیں۔ ہیں۔ ہیں" ایک کتیا اور آگئی۔ اس نے کلوا کو باری باری دونوں سروں سے سونگھا، اور پھر بے پرواہی سے نہیں

چھوڑ کر چل دی۔ جس کے صاف معنی اس کی زبان میں یہ تھے۔ "جانے بھی دو، ڈھونڈتا ہے" مگر بگڑے دل بوچے کو کب گوارا تھا۔ ہم ہم کر کے اوپر چڑھ بیٹھا ناچار کلوا نے اطاعت قبول کی، چت لیٹ گیا۔

دو مہینے کلوا نے بوچا کی اطاعت میں عیش باغ اسٹیشن سے آغا میر کی ڈیوڑھی تک آر۔ کے آر لائن کے اوپر چکر لگائے۔ یہی بوچا کے دانتوں اور پنجوں کے زور سے حاصل کردہ جائداد تھی۔ کلوا نے بار بار چندو کی یاد میں اس جائداد کو چھوڑ کر ڈنڈوے کے سفر کے قصد کئے۔ لیکن ہر دفعہ اس کو ناکامیاب واپس آنا پڑا۔ کیونکہ زمین کا چپہ چپہ کتوں کی جائدادوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ جس پر کہ غیر کا قدم رکھنا کتوں کے قانون میں سخت جرم ہے۔ اگر کسی بڑی جائداد کے تنہا خونخوار مالک سے بچ کر نکل بھی گیا تو دوسری سرحد پہ وہاں کے حاکم اور ایک، دو یا تین جتنے بھی شاگرد ہوتے اُن سے تنہا مقابلہ کرنا پڑا۔ ان ناکامیاب کوششوں سے اسے ایک فائدہ ضرور ہوا۔ زخم کھا کھا کر اس کا جسم پکا پڑ گیا۔ اور آداب جنگ کی تمام باریکیوں سے واقف ہو گیا۔

ایک روز کلوا تنہا آغا میر کی ڈیوڑھی کی طرف سے واپس آ رہے تھے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ریلوے کراسنگ سے کچھ دور بوچا استاد کی لاش لائن پہ کٹی پڑی ہے۔ اُستانی پریشان کھڑی اس کو سونگھ رہی ہے۔ کیا کر سکتے تھے سوائے ہمدردی کے۔ خود بھی سونگھا۔ پاس کھڑے ہو کر اُستانی کا غم غلط کیا۔ وراثتاً جائداد کے مالک تھے۔ اس کا انتظام ہاتھ میں لیا۔ متعینہ غذا جو اس جائداد میں ریل سے گرتی تھی اور جیبوں کے پنجے سے ٹپکتی تھی۔ اب اس کے کھانے والے تین کی جگہ دو ہی رہ گئے۔ ایک ہی مہینے میں اُستانی چربیا گئیں۔ اور ان کے بھی ہاتھ پیروں پہ رونق آگئی۔ لیکن اب استانی کو اُن کا عشق لونڈھیا یا معلوم ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ایک دن کلوا کو اکیلا چھوڑ کر ایک کبرے کتے کے پیچھے نکل گئیں۔ اب یہ تنہا رہ گئے۔ اکیلے کھانے والے اور اکیلے جائداد کی حفاظت کرنے والے۔ پیٹ بھر ورزش تھی اور پیٹ بھر خوراک۔ ایک مہینہ جاڑوں گذرا تو اب کلوا کی شان ہی نرالی تھی۔ سیاہ چمکدار مخملی کوٹ، لہراتی ہوئی لمبی دم، گٹھا ہوا ابھارا ہی تھوتھنا، ہاتھ اور پیروں پر ابھرے ہوئے پٹھے۔ بل کھائے ہوئے۔ قد میں بڑے سے بڑا کتا ان کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ چور اور آوارہ گرد کتوں کا ان کو دیکھ کر دم نکلتا تھا۔ اس عرصے میں اس نے اپنی جائداد کو بھی اور وسعت دے لی تھی۔ آغا میر کی ڈیوڑھی کے پلیٹ فارم کی اپنی طرف کی آدھی لمبائی تک قبضہ بڑھا لیا تھا۔ ایک دن اس پلیٹ فارم پہ ایک جگہ ایک بو تھی............ کلوا کا محبت کا بھوکا دل تڑپ گیا یہیں چندو بیٹھی تھی۔

کلوا اس جگہ کو سونگھے اور منہ اونچا کر کے خاموش کھڑا ہو جائے۔ قدرت نے آنسو نہ دئے تھے کہ جاری ہوتے۔ بہت دیر تک یہی کیا کیا۔ پھر ایک دفعہ دم آسمان کی طرف اور ناک زمین پہ، یہ روانہ ہو گیا۔ سیکڑوں ہزاروں ہر طرح کی بوؤں میں چندو کی بو اس کے واسطے الگ تھی۔ بو لیتا بو ہی بو چل دیا۔ سکندر اعظم نے ہندوستان آنے تک اتنی مہموں کا سامنا نہ کیا ہوگا جتنی مصیبتوں اور رکاوٹوں کو اس نے بلوچپورے تک پہنچنے میں عبور کیا۔ بیسیوں کتوں کو زخمی کر کے خود زخموں سے چور جس وقت وہاں پہنچا رات کا ایک بج چکا تھا۔ گلی وہی تھی، مکان وہی تھا، دوکان وہی تھی مگر بند تھی۔ اب لوگ اس کے اندر سو رہے تھے۔ دروازے سونگھے۔ چندو کے ماں اور باپ دونوں کی بوئیں تازہ تھیں مگر چندو کی بو بہت خفیف تھی۔ کتے آتے اس پہ بھونکتے اور چلے جاتے۔ مگر یہ وہیں بیٹھا رہا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد چندو کی بو سونگھتا رہا جو برابر زائل ہوتی چلی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ صبح چار بجے چندو کی بو گم ہو گئی۔ اس نے دکان کے سامنے منہ اٹھا کر رونا شروع کر دیا۔ کاش کوئی انسان اس کو یہ بتا دیتا کہ چندو اپنے دولہا کے ساتھ دولہن بن کر بانس بریلی گئی۔ مگر کون بتاتا۔ چندو کا باپ ہاتھ میں لکڑیا لئے یہ کہتا ہوا نکلا "رومٹے جان دے کو کہ"

قصائیوں کے کتے نہ اس کے ایسے تندرست تھے نہ قدآور لیکن کچے گوشت کے کھانے والے بے انتہا خونخوار۔ کلوا کے بھی دانت کھٹے ہو گئے۔ تب کہیں جا کر ان کو گلی اور گلی کے پیچھے تھوڑے میدان پر قبضہ ملا۔ دن رات کا زیادہ تر حصہ یہ چندو کی دکان کے آگے ہی گذارتا۔ جہاں اب اس کا پہچاننے والا کوئی نہ تھا۔ کلوا چندو کے باپ اور ماں دونوں کی مار برابر کھاتا رہا لیکن اس نے دکان کا دامن نہ چھوڑا۔ یہاں کھانے کو کافی اور عمدہ چیزیں مل جایا کرتی تھیں لیکن افسوس دل کی لگی

محبت کے چھینٹوں کی طالب ہو گئی۔ کچھ عرصے بعد اُس نے ان دونوں کے علاوہ غیروں سے بھی اشارے کئے اور محبت کے لین دین کا خواستگار ہوا۔ مگر دل کا سودا کہیں نہ پٹا۔ ایک برس اسی طرح گزر گیا۔ مگر آخر چندا آ ہی گئی۔

بالکل وہی چندا، کچھ دبلی اور ہو گئی تھی۔ بچہ گود میں تھا لیکن کلوا کو بھول چکی تھی۔ وہ کلوا سے ڈر گئی۔ انسان کا کلیجہ پھٹ جاتا لیکن کلوا کتا تھا۔ زمین پر بچھ گیا۔ پیٹ کے بل زبان نکال کر پیر چاٹنے کو آگے بڑھا۔ پیر چلتے تو زمین چاٹی۔ کہاری کی جوتیاں جب پڑیں لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ کہار نے ڈنڈے جب مارے تو سمٹ سمٹ کر بلبلایا لیکن سب لاحاصل۔ اس بڑی چکی کے دونوں پاٹوں میں پتھر کم پستے ہیں۔ اور دل زیادہ۔ آٹھویں دن چندا پھر سسرال چلی گئی۔

آج کلوا کتا غیظ و غضب کی تصویر بنا ہوا آوارہ گرد ہے۔ کتے اس کو دیکھ کر ڈرتے ہیں۔ سامنے سے ہٹ جاتے ہیں۔ سیاہ منہ پر آنکھیں لال انگارہ ہیں۔ موٹی گردن پہ بال کھڑے ہیں اور دم بالکل سیدھی پھیلی ہوئی ہے۔

اور آج ہی وہی پیارا بچہ منّن، باپ کی بے جا سختی اور ماں کی اندھی محبت کے باعث آوارہ ہے۔ اسکول میں جھڑکیاں اُٹھانے اور مار کھانے کے بجائے آج کے دن اُس نے سُونی عید گاہ میں آزادی کی عید منائی ہے۔ اب چار بج چکے تھے۔ منّن عید گاہ کی چار فٹ اُونچی دیوار پہ بیٹھا سوچ میں تھا، وقت گزر گیا، اب کیا کرے۔ گھر جائے یا نہ جائے، وہاں خبر ضرور ہو گئی ہوگی۔ ننھے سے دل میں وحشت کے پنکھے چل رہے تھے۔ وارفتہ دل صحرا نورد کلوا کا گزر ادھر سے ہوا، اس کی نگاہ بچے پر پڑی۔

جس طرح انسانوں کے واسطے راتیں تاریک ہوتی ہیں لیکن کتوں کے لئے ان میں سہانی روشنی ہوتی ہے، اسی طرح انسانوں کے واسطے صورتیں، آنکھ، ناک، کان اور منہ کا صرف مجموعہ ہوتی ہیں لیکن کتوں کے لئے ان پر خوشی کی چمک، غم کی سیاہی اور محبت کی ارغوانی شعاعیں بھی عیاں ہوتی ہیں۔ کلوا نے دیکھا بچہ اداس بیٹھا ہے۔

لیکن وہ اپنی دھن میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ دیوار کے نیچے نیچے جہاں وہ جا رہا تھا بچے کی بو رواں دواں تھی۔ اس نے اس بو میں کچھ خصوصیت محسوس کی۔

خیال اور خیالوں کے تحت واقعات کی یادداشت اس کو قدرت نے عطا کی ہی نہ تھی۔ ٹھہر گیا، گھوم کر بچے کو دیکھنے لگا۔

چاروں طرف آگ کا ایک سمندر موجزن تھا جس میں سے لپلپاتے شعلے تا بہ فلک اُٹھ رہے تھے۔ ٹوکری بھر کے ایک بچے کو اس میں پھینکا گیا۔ تو کیا ہوا! پلک جھپکی بھی نہ تھی۔ اور وہاں سبزے میں پھولوں کا ایک تختہ تھا، جو خوشبوؤں سے مہکتا تھا۔ اس میں بچہ بیٹھا کھیل رہا تھا۔ یہ قصہ حضرت ابراہیمؑ کا ہے۔ اب جن دماغوں میں عقل کی زیادتی ہو گئی ہے اور اس قصے کو صحیح ماننے سے قاصر ہیں، آئیں ادھر آئیں میں ان کو دکھائے دیتا ہوں کہ یہی ہو سکتا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر آج کل اس میں پھنسا کتے کا معاملہ نہیں کر سکتا۔ استقلال میں پتھر کی سل کتے کے آگے گھس جائے گی۔ خونخواری اور دلیری میں جس وقت کتے سے مقابلہ پڑتا ہے تو شیر بھی پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ لیکن محبت کی ایک چھوٹی سی چنگاری میں کتا پیروں پہ گر پڑتا ہے، اور اس وقت وہ حلم، عاجزی، انکساری اور خاکساری ایسی رقیق چیزوں کی جیتی جاگتی تصویر ہوتا ہے۔

منّن اور کلوا میں ایک دفعہ پھر نئے سرے سے دوستی شروع ہوئی۔ اس کی جیب میں بچی ہوئی ایک روغنی ٹکیا اور تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے نوالوں میں کلوا کو پیش کی گئی۔ انتہا شناسانہ انڈے کی بو اس پر بھی ٹکیہ کلوا کو بڑی قیمتی معلوم ہوئی۔ منّن نے ڈرتے ڈرتے کلوا کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ کلوا نے منہ کھول کر محبت کے قصے میں 'عاؤں' کہہ کر انگڑائی لی۔ منّن کھیلتا کھیلتا کتے کو ڈھیلوں کے پیچھے بھگاتا بھگاتا گھر کی طرف آ گیا۔ یہ بھی تو امید تھی کہ گھر میں اسکول سے بھاگنے کی خبر نہ پہنچی ہو۔ ڈرتے ڈرتے گھر میں گھسا، کلوا باہر ہی رہ گیا۔

محبت کی دیوانی ماں نے منہ دھلایا، ناشتہ کھلایا، اکنی کلکتیا کے واسطے دی۔ دو پیسے کی برف کی قلفی لے دی۔ دو دفعہ باپ کے بے جا غصے اور منّن کے بیچ میں سدِ سکندری بن کے حائل ہو گئی۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ اور منّن سو گیا۔ افسوس اے جاہل ماں تو نے سب کچھ کیا لیکن بچے کے دل کی تمنا نہ لی۔ بچے کے دل میں بچہ بن کر گھسنا ہوتا ہے۔ وہاں اس کے چھوٹے چھوٹے رنج، ننھی منی خوشیاں، معصوم گلے اور شکوے ہوتے ہیں۔ اور ایسی ہی تو مائیں اس دنیا کو کس مپرسی میں چھوڑ دیتی ہیں۔

چھدن کلوا نے استقلال سے بیٹھے بیٹھے اسکول کے سب تماشے دیکھے۔ ساتویں دن ضبط برداشت سے باہر ہو گیا۔ سیاہ پینتیس سیر کا جسم ایک جست سے دروازے سے باہر نکلا اور ماسٹر سے تصادم ہوا۔ ماسٹر زمین پر گر پڑا ——————

——— کلوا اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ روتے ہوئے منن نے جلدی جلدی کتابیں اور بستہ سمیٹا اور سیدھا اسکول سے باہر بھاگا۔ سڑک پر جا کر "آؤ" "آؤ" کی آوازیں لگائیں اور دوڑ پڑا۔ تھوڑی دیر میں خون آلودہ کان کو جھٹکتا ہوا کلوا بھی منن سے آن ملا۔ سر اٹھا کر منن کا منہ چاٹنا چاہا۔ تو اس نے سر پر سلیٹ ماری کلوا خوش ہو گئے۔ اچھل کے آگے آگے ہو لئے۔

دوسرے دن بستہ بغل میں لیکر منن نے پھر عید گاہ کا رخ کیا۔ کلوا کو اس سے کیا مطلب تھا۔ جدھر وہ چلا اس کے پیچھے ہو لیا۔ واٹر ورکس کی دیوار کے نیچے پہنچ کر باہر لٹکی ہوئی املی کی شاخوں کے سایہ میں دونوں بیٹھے۔ منن نے کوٹ کی جیبوں میں سے چرائے ہوئے روٹی کے ٹکڑے، ہڈیاں اور بوٹیاں کلوا کو کھلائیں۔ اس کے بعد املی پر الجھی ہوئی پتنگ پھانسنے کے ڈھیلے کا لنگر اچھالنا شروع کیا۔ کلوا بھی ڈھیلے کی ہر اچھال پر اچھلتے تھے۔ لیکن فٹ سوا فٹ ان کی حد تھی۔ اس کے بعد عیدگاہ میں لبیارہ ڈھیلے بازی کے بعد ایک کچا کیتھا اٹھا کر تال کٹورے کا رخ کیا۔ راستہ میں منن نے کیتھے کے وہ چٹخارے لئے کہ کلوا کی بھی رال ٹپک پڑی۔ لیکن جب حصہ ملا تو سونگھ کر ہی چھوڑ دیا۔

آسماں بار امانت نتوانست کشید

قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند۔۔۔۔

جانوروں کو انسٹنکٹ (instinct) کا مادہ دیا گیا ہے جس میں غلطی کا احتمال ہی نہیں۔ اور ہم کو عقل! جو ہر قدم پر ٹھوکر کھاتی ہے۔

تیسرے دن شام کو جب آوارہ گردی کے مکتب سے منن گھر واپس ہوا تو اس نے دیکھا کہ مکان کے آگے اسکول کے تین لڑکے اور ایک ماسٹر کھڑے ہیں باپ دروازے پر کھڑے ان سے باتیں کر رہے ہیں۔ سر سے پیر تک کانپ گیا۔ اور فوراً واپس لوٹ پڑا۔ پھر عیدگاہ پہنچا، وہاں پھرتے پھرتے جب شام ہونے لگی تو قدم گھر کی طرف خود بخود اٹھنے لگے۔ واٹر ورکس کے پاس آ کر پھر دل میں ہچکچانے لگے۔ عقل نے قدم روک دیئے۔ واٹر ورکس کی دیوار پر چڑھا۔ اندر بالکل سنسان تھا۔ تھوڑی دور پکے تالاب تھے۔ دیوار سے کود ان کے کنارے پہنچا۔ کلوا بھی کود پھاند کے ساتھ تھا۔ تالاب کے چاروں طرف پکی دیوار تھی۔ جس سے ڈیڑھ فٹ نیچے شفاف پانی میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ منن اپنی فکریں بھول گئے۔ کنارے اکڑوں بیٹھ کر مچھلیوں کی سیر میں محو ہو گئے۔ ایک مچھلی دیوار کی جڑ تک آ گئی۔ منن نے جھک کر اسے پکڑنا چاہا۔ پوری جان سے اندر جھک گیا۔ کلوا کچھ دور تھا۔ اس کی ہلکی سی چیخ نکلی اور وہیں سے اس نے پانی میں جست ماری۔ لیکن قبل اس کے کہ یہ پاس پہنچے بچہ پانی کی تلی کی طرف روانہ تھا۔ پانی بہت گہرا تھا۔ کئی منٹ کے بعد بچے نے اچھالا کھایا۔ کلوا کے دھوکا نہ کھانے والے احساس نے اسے بتا دیا کہ بچہ کس جگہ ابھرے گا۔ وہیں پر موجود تھا۔ کلوا نے ڈھال کی طرح اپنا جسم بچے کے سینے کے نیچے کر دیا۔ بچے کے پیٹ میں کافی پانی جا چکا تھا۔ وہ قریب قریب بے ہوش تھا۔ لیکن قدرتاً اس کا ایک ہاتھ بچے کی گردن میں اور دوسرا پچھلے پیروں میں لپٹ گیا۔

افق کی سرخی گہری پڑتے پڑتے سیاہی میں تبدیل ہو گئی۔ سیاہ آسمان پر جھانک جھانک کر تارے نکل آئے۔ ایک چمگادڑ نے پانی کی سطح پر سراٹا مارا۔ دو بوند پانی منہ میں اٹھاتا ہوا نکلا چلا گیا۔ دو گھنٹے بعد ایک نیولے نے پچھلے پیروں پر کھڑے ہو کر تالاب کو دیکھا اور سمٹ کر سرسراتا ہوا جھاڑیوں میں گھس گیا۔ رات بڑھتی چلی گئی۔ ماہ عدم سے ایک تارہ ٹوٹا اور راہ عدم میں غائب ہو گیا۔ اب کلوا کا بھی پیٹ پھول چکا تھا۔ جسم میں طاقت نہ تھی۔ یا اپنی ناک سے پانی باہر رکھ سکتا تھا یا بچے کی۔ دل میں طاقت مر ہی باقی تھی۔ مالک کی ناک اوپر رہی اور تھکی ہوئی گردن نیچے جھک گئی۔ صبح کو کچھ لوگ جمع ہوئے۔ سسکتے ہوئے بچے کو نکال کر میڈیکل کالج کی طرف دوڑے۔ کلوا کی پھولی ہوئی لاش وہیں چھوڑ دی۔ جس کو تھوڑی دیر بعد دو بھنگیوں نے نکال کر احاطہ سے باہر میدان میں پھینک دیا۔

تین گدھ فضائے آسمانی سے سنسناتے اترے۔ چھ فٹ کے پھیلے بازو سمیٹ کر آہستہ آہستہ اس لاش کی طرف بڑھنے لگے۔

ابوالفضل صدیقی

بازگشت

تمام علاقہ میں سناٹا تھا ـــــ عورتیں خائف خائف نگاہوں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر ایک آدھ سرگوشی کر کے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کرتیں۔ پھر بھی بچے سب کچھ سمجھ کر سہم کر رہ جاتے، مرد الاؤ کے گرد چلموں کے دھوئیں میں چپکے چپکے افواہوں پر تبصرہ کرتے، اور ڈر کے مارے گھٹ گھٹ کر خاموش ہو جانے اور منٹ دو منٹ کی خاموشی کے بعد جب سکوت ٹوٹتا تو باوجود گریز کے بھی وہ کوئی اور موضوعِ گفتگو تلاش نہ کر پاتے۔ اور پھر یہی سلسلہ جاری ہو جاتا۔ جدید سے جدید تر افواہیں حرکت میں تھیں اور ادھر ادھر سے ہر آنے والا آدمی افواہوں کی زنجیر میں ایک نئی کڑی کا اضافہ کرتا۔ اور افواہوں کی زنجیر کا سلسلہ تمام ضلع کے اندر ملا ہوا تھا اور آئے دن یہ زنجیر مضبوط تر ہوتی جاتی اور ہراس در ہراس میں یہ مخصوص علاقہ لپٹا تھا اور کولو آکھار کے علاقہ کی جانب جانا تو در کنار نظر اٹھانے کی بھی کسی بڑے دیہات دلیر کی ہمت نہ پڑتی۔ دیہاتی ذہنیتیں یوں بھی بھوت پریت قسم کے خوفوں کو بڑی جلد قبول کرتی ہیں اور پھر یہ کولو آکھار والا بھوت کوئی سنی سنائی چیز تو تھا نہیں، کتنی ہی مرتبہ کا آنکھوں دیکھا ـــــ پھر کڑوا کریلا اور نیم چڑھا، علاقہ بھر میں بھیڑیوں ہی کا ہراس کیا کم تھا۔ اس کے ساتھ بھوت کے خوف نے اچھے اچھوں کے پتے پانی کر دئیے۔

کولو آکھار کا خشک غیر کاشتہ اونچا نیچا، سخت کنکریلی مٹی کا رقبہ میلوں کے گرد میں پھیلا ہوا تھا۔ پچھلی صدی کے وسط تک یہ ہرا بھرا زرخیز میدان تھا۔ رفتہ رفتہ برسات کے پانی کا رخ شدت کے ساتھ ادھر کو ہوا، اور یہ زرخیز میدان پانی کے بہاؤ نے کاٹ کر پھینک دیا، اور پندرہ بیس میل لمبا اور دس پندرہ میل چوڑا رقبہ اونچی نیچی اور گہری اور تنگ نالیوں کی شکل میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔ نشیب بڑھتا گیا۔ دور دراز کا برسات کا پانی ادھر کو رجوع ہوتا گیا اور کولو آکھار رفتہ رفتہ پھیلتا گیا۔ ہر سال نئی اراضیات نئے نئے گاؤں کے رقبے برسات کے پانی کے کٹاؤ کی تباہ کاری میں پٹتے گئے۔ برسات میں پانی کا تند بہاؤ کھیتیاں برباد کرتا گیا اور کنکریلے مٹی کے ٹیلوں اور گہری اور تنگ نالیوں کی تشکیل کرتا رہا۔ گاؤں ویران ہوتے رہے اور اس مخصوص علاقے کے سکان کھیتی کرنا بھولتے گئے اور پانی نہ معلوم زمین کی کتنی تہیں اڑاتا رہا اور بھانت بھانت کی مٹیاں ادھر سے ادھر کرتا رہا۔ ہر برسات کے اندر دو بارشوں کے درمیان چند روز دھوپ پڑتے ہی یکدم خشک ہو کر یہ علاقہ سنگلاخ کنکریلی شکل اختیار کر لیتا اور برسات ختم ہونے پر تو یہ اونچے نیچے پیلی مٹی کے ٹیلے اور نالیاں ایسی خشک ہو جاتیں کہ کہیں پر گھاس بھی نظر نہ آتی۔ جگہ جگہ پانی کی

دھارے بچے ہوئے ٹیلوں میں گز گز ڈیڑھ ڈیڑھ گز اونچی جنگلی جھاڑیاں جن کے تخم پانی کبھی کبھی چھوڑ جاتا یا کہیں سرکنڈے کے جھنڈ اُگ آتے جن کی عمر بالعموم اگلی برسات تک ہوتی اور یہ نمو آنے والی برسات کے پانی کی بے تکی رو میں خس و خاشاک کی طرح بہ جاتی۔

اور یہ لق و دق، اونچی نیچی خشک وادی بھیڑیوں، خرگوشوں، لومڑیوں کا مسکن تھی اور بھاگے ہوئے ہرنوں کی پناہ گاہ۔ جن کے زردی مائل خاکی رنگ عین اس کی مٹی کے مطابق تھے۔ اس علاقے کے تمام گاؤں تقریباً ویران تھے مگر جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی عارضی چھپروں کی جھونپڑیاں نظر آتیں۔ البتہ اس کے ملحقہ گاؤں معمولی گاؤں سے ذرا بڑے تھے۔ ان میں اس ویران علاقے کے کسان جا بسے تھے۔ کولوآکھار کا علاقہ یوں تو سب ہی جانوروں کا مسکن تھا، مگر خاص جولانگاہ بھیڑیوں کی تھی۔ اس علاقے اور اس کے ملحقہ دیہات کا مخصوص پیشہ بھیڑ بکریاں پالنا تھا۔ اور بھیڑیے دن دہاڑے چرتے ہوئے گلوں پر آ پڑتے اور بھیڑ بکریوں کو اٹھا کر لے جاتے۔ اچھلتے، کودتے ہرنوں پر داؤں کر کے دار کرتے اور خرگوشوں لومڑیوں کو لقمہ بناتے اور رات کو کولوآکھار کے اندر کی جھونپڑیوں اور گونٹھوں پر اور ملحقہ علاقے کے گاؤں پر چھاپے مارتے باڑھوں میں سے بھیڑ بکریاں لے کر ایک جست میں نو فٹ اونچی دیواریں پھاند کر مع بکری کے باہر آ پڑتے۔ سوتی ہوئی ماؤں کی بھری گودوں پر دندانِ آز تیز کرتے۔ بھیڑیا، چیتا، آدم خور، بز خور، آہو خور، غرض کہ جو کچھ بھی اس کے منہ میں پڑ جائے وہ سب کچھ خور واقع ہوا ہے۔ حتیٰ کہ اپنے ہم جنس بھیڑیے پر بھی بند نہیں ہوتا اور ذرا سی کمزوری پر بھیڑیا بھیڑیے کو چٹ کر جاتا ہے اور آدم خوری کے معاملہ میں آدم خور شیر سے زیادہ بے پناہ اور خطرناک ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی آدم خوری بچوں تک محدود ہوتی ہے۔ اور طریقہ چور جیسا ہے۔ یوں تو آدم خور درندہ بڑی خطرناک مخلوق ہے۔ مگر بھیڑیا سب سے زیادہ خطرناک یوں ہے کہ یہ رات کے شروع حصے میں پہلی نیند کے وقت سوتے ہوئے دیہاتیوں کے گھروں کی نیچی نیچی دیواریں پھاند کر یا دروازوں کی ٹٹیوں میں سے کھسک کر چور کی طرح گھر میں گھستا ہے اور ٹٹول کر سیدھا خورد سال یا شیر خوار بچوں کی باؤں کے بستر پر پہنچتا ہے۔ تمام دن کی کام کی تھکی ہاری، سوتی عورتوں کے پہلو سے چمٹے ہوئے بچوں کو لے بھاگتا ہے۔ نیند میں غلطاں ماحول کے اندر بھیڑیے کا یہ حملہ بڑا کامیاب ہوتا ہے۔ بچے کی چیخ پر بالعموم بدنصیب سوتی ہوئی ماں لوری دیتی ہے۔ اور اگر خطرے کا احساس ہو گیا تو شور مچاتی رہ جاتی ہے۔ بھیڑیا بچہ منہ میں دبا کر ایک جست میں باہر دکھائی دیتا ہے اور ماں پیچھے پکارتی ہوتی رہتی ہے۔ سال میں دو چار حادثے ایسے ہولناک بھی دیکھنے میں آجاتے ہیں کہ بچے کی چیخ پر ماں ہوشیار ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی بچے کی ٹانگیں ماں کے ہاتھ میں رہ جاتی ہیں اور سر اور گردن تو جبلت کے مطابق بھیڑیے کے جبڑوں میں ہوتی ہی ہے۔ اس رسہ کشی میں سو فیصدی ماں کی جیت ہوتی ہے اور بھیڑیا چبائی ہوئی کھوپڑی اور گردن کا بچہ ماں کے ہاتھ میں چھوڑ کر فرار ہو جاتا ہے۔ بھیڑیا ہمارے علاقے میں برسات بھر پریشان اور بے گھر سا رہتا ہے۔ برسات شروع ہونے سے پیشتر نئے بچے جوان ہو کر ماں باپ کے ساتھ اور کبھی کبھی تنہا شکار کھیلتے ہیں۔ یہ برسات میں منتشر ہو جاتے ہیں اور برسات ختم ہوتے ہی موقع موقع سے اپنے نئے بھٹ تیار کر لیتے ہیں جو ان کی جاڑے گرمی کی پناہ گاہ اور بچہ دینے کی جگہ کا کام مئی جون تک دیتے رہتے ہیں۔ ان بھٹوں میں آرامگاہ، مردانہ مکان وغیرہ تقسیم ہوتی ہے۔ اور بچہ دینے کے وقت بھٹ کو گہرا کر کے مادہ علیحدہ جگہ بنا لیتی ہے۔ یہ بھٹ بالعموم ایسی جگہ واقع ہوتے ہیں جہاں برسات کے سیلاب کا پانی نہ پہنچ سکے۔ ۳۴ء کی برسات ختم ہوتے ہی یکدم کولوآکھار کے علاقہ میں بھیڑیوں کی وارداتیں بڑھ گئیں۔ یو پی گورنمنٹ کی جانب سے بھیڑیا مارنے پر ہمیشہ سے دس روپیہ انعام ملتا آ رہا تھا۔ ۳۴ء اور ۳۵ء میں حکام ضلع کو ان کے استیصال کے لئے ہتھیار تقسیم کرنا پڑے اور بیسیوں غریب شکاریوں نے اسے پیشے کے طور پر اختیار کر لیا۔ اس کے باوجود وارداتیں بڑھتی گئیں اور ۳۶ء کے ستمبر میں یکدم تمام علاقے میں یہ خبر بڑے زور سے پھیل گئی کہ کولوآکھار پر بھوتوں نے قبضہ کر لیا ہے۔

بھیڑیے کا شکار یوں بھی تیسرے درجے کا اسپورٹ خیال کیا جاتا ہے۔ جس کو تقسیم انعام اور پیشہ ور شکاریوں کے لالچ کے سبب مخصوص طور پر ہمارے علاقے میں اچھے شکاری ذرا حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔ ضلع مجسٹریٹ نے انعام دگنا کر دیا اور مزید ہتھیار تقسیم کئے

مگر جب ان بھیڑیا مار شکاریوں نے بھوت اپنی آنکھ سے دیکھ لیا تو وہ بھی دست کش سے ہو گئے۔ دلبر شبان ناد وں نے اپنے ریوڑ کو لوآ گھاٹ کے علاقے میں لے جانا بند کر دئے۔ یہاں آبادی تو یوں بھی عارضی تھی، البتہ اس لق و دق اونچے نیچے بیابان سے کئی کچے دیہاتی راستے گزرتے تھے۔ اب یہ بھی بند ہو گئے۔ اور چھوٹی چھوٹی گونٹیاں اجڑ کر ملحقہ بڑے گاؤں میں جا بسیں اور دیکھتے دیکھتے یہ تمام علاقہ غیر آباد ہو کر بھیڑیوں کی خود مختار ریاست بن گیا۔ بھیڑیے ملحقہ گاؤں سے بھی آگے بڑھ بڑھ کر چھاپے مارنے لگے اور ضلع کے تین چار تھانے ان سے بری طرح متاثر ہوئے۔ اب کوڑھ میں کھاج یہ ہوئی کہ یکدم بھوت والی افواہ تیز تر ہو گئی۔ چاروں طرف پانچ پانچ دس دس میل تک دیہات میں شدید ہراس پھیل گیا۔ مدتوں سے بھیڑیوں کے مارے تمام تمام رات جاگتے گزرتی تھی۔ بھیڑیئے گھر گھر، باڑے باڑے پھاندتے، کتے بھونکتے رہ جاتے۔ مائیں مضبوطی کے ساتھ اپنے ننھے ننھے بچوں کو چمٹا کر آنکھوں ہی آنکھوں میں رات کاٹ دیتیں۔ پھر بھی چیرہ دستی سے جس کا بچہ منہ میں پڑتا چھین کر چمپت ہو جاتے اور کو لوآ گھاٹ کی گھاٹی میں گھس پڑتے اور ان حدود میں کسی کو جانے کی ہمت نہ پڑتی اور بدنصیب ماں باپ رات کے چھینے ہوئے بچوں کی ہڈیوں اور کپڑے کے چیتھڑوں کا سراغ لگانے نہ پہنچ سکتے کیونکہ اب وہاں بھوتوں کا قبضہ تھا۔

یہ اندھیر دیکھ کر حاکم ضلع نے انعام کی رقم پچیس روپیہ کر دی۔ جن شکاریوں کو بھیڑیئے مارنے کے لئے بندوقیں دی تھیں ان کو تنبیہ کرنی شروع کی مگر پیشہ ور شکاری ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ان میں سے اکثر اپنی آنکھوں سے بھوت دیکھ چکے تھے۔ حاکم ضلع نے اب مضافاتِ دیہات اور شہر کے مشہور شکاری جمع کئے اور اس انتظام میں مدد طلب کی۔

ہماری مخصوص چھ آدمیوں کی پارٹی اپنی نوعیت اور طرزِ شکار کے اعتبار سے ایک خاص انفرادیت کی حامل تھی۔ شہر کے شکاری ہمارے ساتھ نہ لگ سکتے تھے۔ سرکاری حکام اور شوقین شکاریوں کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ ہمارا ساتھ دے سکیں۔ جب مجسٹریٹ ضلع نے ہم کو بلا کر یہ استدعا کی تو ہماری توجہ ادھر ہوئی ورنہ ہم لوگ اس کو پیسہ پیدا کرنے والے شکاریوں، خانہ بدوش کنجروں اور پاسیوں کا کام سمجھ کر اب تک ذلیل سمجھے ہوئے تھے۔ میں تو خیر شہر کے قریب ترین مضافاتی مقام کا رہنے والا ہوں۔ بقیہ اور سب ساتھی دیہات کے رہنے والے تھے اور تین دن کے اندر میری دعوت پر استاد رضا خاں، سنگھ بابو، صابر خاں اور انوار خاں بھی جمع ہو گئے اور بڑے شوق کے ساتھ اسکیم بن گئی۔ استاد رضا خاں کی رائے ہوئی کہ شکار شروع کرنے اور کو لوآ گھاٹ کے علاقے میں داخل ہونے سے بیشتر ان پیشہ ور شکاریوں سے بات چیت کی جائے جو اس علاقے میں بھیڑیئے مارنے کا کام برسوں سے کر رہے ہیں۔ اور پھر کو لوآ گھاٹ کے چاروں طرف لگے ہوئے دیہات کا دورہ کر کے معلومات حاصل کی جائیں۔ اس کے بعد اچھی طرح تمام وادی کو پرتالا جائے اور بھیڑیوں کی جولانگاہیں، بھٹ اور ان کے راستے اور نقل و حرکت کا دن میں کھوج لگایا جائے۔ اور پھر بھیڑیئے کے مخصوص طریقۂ شکار کے مطابق راتوں میں شکار شروع کیا جائے۔ ویسے یہ علاقہ تھوڑا بہت ہمارا گھوما ہوا تھا۔ کبھی کبھی زخمی ہرن میدان سے چوٹ کھا کر اس میں پناہ لیتے تھے اور ہم تعاقب کرتے اس میں جا پہنچتے تھے۔ دو چار مرتبہ اس کے بعض ایسے حصوں میں جہاں جھاڑیاں اور جھنڈ تھے تیتروں کا شکار کیا تھا۔ دو ایک مرتبہ خرگوش مارے تھے۔ اور کبھی کبھی اس کے اندر سے جاتے ہوئے راستوں سے گزرے تھے۔

سب سے پہلے ہم نے بھیڑیئے مار شکاریوں سے رجوع کیا جو آج کل حکام ضلع کے معتوبوں میں تھے۔ غریب رونے سے لگے اور روزگار ہاتھ سے نکل جانے پر پریشانی کا اظہار کیا، ورنہ دو آنے کے کارتوس میں دس روپے ہاتھ آ جایا کرتے تھے اور تین بھیڑیوں میں مہینہ بھر سارے گھر کا پیٹ پلتا تھا۔ ان کی تقریر سن کر ہمیں بھیڑیئے کے شکار سے گھن سی آنے لگی، اور پھر ان میں سے بعض نے اپنے چشم دید بھوت کے واقعات بیان کئے۔ باتیں دونوں اچھے شکاریوں کے شایانِ شان نہ تھیں۔ شکار کے معاوضے میں روپیہ پیسہ لینے کا تذکرہ اور پھر بھوت کا حوالہ۔ مشہور بات ہے جہاں بندوق چلتی ہے وہاں جادو نہیں چلا کرتا۔ مگر پہلی چیز ہم میں رجعت پیدا کرتی تھی۔

تو دوسری دعوت دیتی تھی کہ یہ شکار جس میں بھوت کا واسطہ لگا ہے اور جس کے ڈر سے ہر آدمی میدان چھوڑ گیا ہے ضرور کیا جائے۔ ہم چار روز تمام دیہات میں طوفانی دورہ کرتے پھرے اور ہر جگہ بھوت والی روایت نہایت شدّت کے ساتھ ذہنوں میں راسخ پائی۔ "بھوت پریت کے لئے دیہاتی ذہنیتوں کی مٹی یوں بھی بہت زرخیز ہوا کرتی ہے۔" ہم نے آپس میں کہا، "آدم خور بھیڑیوں اور بھوتوں کے عمل میں بڑی حد تک یکسانیت بھی ہوتی ہے اور ہم شوق سے شکار کے لئے تیار ہو گئے۔ بھیڑئیے کے شکار کا مخصوص اور نہایت آسان طریقہ ہے۔ بھیڑیا رات میں شکار کرتا ہے اور علی الصبح بھٹ میں واپس آجاتا ہے۔ بالعموم رات کے نو دس بجے بھٹ سے برآمد ہوتا ہے اور رات کے شروع حصے ہی میں شکار کر لیتا ہے، ورنہ تمام رات داؤ گھات کرتا پھرتا ہے اور صبح کاذب کے وقت بالغہ مارتا ہے۔ یہ وقت بالعموم گاؤں کے اندر بکریوں کے باڑوں اور آدمی کے بچوں پر چھاپہ مارنے کا ہوتا ہے اور تمام دن بھٹ میں آرام کرتا ہے۔ سیدھے سادے اندھے دھندے شکاری رات کو بھیڑئیے کے نکلنے سے پیشتر بھٹ کے دروازے کے قریب چھپ کر جا بیٹھتے ہیں اور نکلتے ہی ٹھائیں سے مار دیتے ہیں۔ بالعموم بیس پچیس گز کے فاصلے سے فیر ہوتا ہے۔ خالی جانے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ چوٹ اتنی کاری پڑتی ہے کہ سانس بھی نہیں لیتا اور جہاں کا تہاں ڈھیر ہو جاتا ہے۔ ہر شکاری سمجھ سکتا ہے کہ اس قسم کے شکار میں اسپورٹ کی کتنی روح ہو سکتی ہے۔ اور کیا لطف آسکتا ہے۔

سب معلومات حاصل کر کے ایک دن دوپہر سے شام تک ہماری چھ آدمیوں کی مختصر سی پارٹی وادی کے اس مخصوص حصے میں گھومتی رہی جس میں بھیڑیوں کی کثرت کے ساتھ بھوتوں کی کارفرمائی بیان کی جاتی تھی۔ تمام گزرگاہیں اور مواقع دیکھ کر ہم اپنی جائے قیام پر واپس آگئے جو کولوا کھار کے عین وسط میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں تھی۔ ٹھنڈا سا کھانا کھا کر اور چائے پی کر دس بجے کے قریب ہم اپنی جائے قیام سے نکلے اور اپنی اپنی مقررہ جگہ پر پہنچ گئے۔ رات تو چاندنی تھی مگر آسمان پر ہلکی ابر کی چادر پھیلی ہوئی تھی جس نے جنگل کے سناٹے کو زیادہ بھیانک بنا دیا تھا۔ ایسے ہی بھیانک سناٹوں میں شکاری کی فطرت جلا پاتی ہے اور لطف دوچند ہو جاتا ہے۔ ہم نے اپنی نشستوں کے لئے تین بھٹ منتخب کئے تھے۔ ایسے بھٹ اور بھی تھے مگر ہم چھ کی مختصر پارٹی اس سے زیادہ گھیر نہ سکتی تھی۔ ایک بھٹ استاد رضا خاں اور میں نے پسند کیا تھا، اس سے پورب کی جانب تین سو گز کے فاصلے پر ٹیلوں کی آڑ میں ایک بھٹ پر انوار خاں اور صابر خاں تھے اور اوپر ایک ٹیلے کے اس پار تقریباً ایک فرلانگ کی مسافت پر سنگھ بابو اور مسلم براجمان تھے۔ سنگھ بابو شام ہی کے وقت سے کچھ سست سے ہو گئے تھے اور چپ چپ سے تھے۔ دراصل انہیں دیہات کی افواہوں نے قدرے متاثر کر دیا تھا، اور شاید وہ بھوت کے وجود پر پہلے سے بھی کچھ یقین رکھتے ہوں۔ دبی زبان سے ایک آدھ مرتبہ انہوں نے کچھ ایسے الفاظ بھی کھانا کھانے میں ادا کئے تھے جن سے مترشح ہوتا تھا کہ یہ پروگرام انہیں زیادہ پسند نہیں ہے —— تمام علاقہ دم بخود تھا کہ چند پٹھان اور ٹھاکر بچے، سر پھرے شکاری آج بھوتوں سے لڑنے کولوا کھار میں گھس پڑے ہیں۔ دیکھئے کیا انجام ہو۔ کہیں کہیں لوگ ڈر رہے تھے کہ مبادا کوئی مصیبت اردگرد کے گاؤں والوں پر آجائے اور کوئی پرانا تجربہ کار، بوڑھا یقین کئے ہوئے تھا کہ ان کا بچ کر آنا مشکل ہے۔ غرض تمام علاقے میں ہمارے اس اقدام کی شہرت تھی اور آنکھیں اسی طرف لگی ہوئی تھیں کہ کیا ہوتا ہے۔

ہر بھٹ کے تین تین دروازے تھے۔ ہم نے اپنی نشستوں کی تقسیم اس طرح کی تھی کہ دو شکاریوں میں سے ایک ایک کی کمان میں ایک ایک دروازہ تھا اور تیسرا دونوں کی کمان میں مشترک تھا۔ ہم قریب گیارہ بجے کے اپنی اپنی جگہ پہنچے اور چھپ کر بیٹھ گئے اور بھٹوں کے دروازوں پر ٹکٹکی باندھے انتظار کرنے لگے۔ نومبر کے شروع ہفتے کی خنکی اونچے نیچے ماحول میں پھیلی ہوئی تھی۔ وادی کے اندر نرم نرم ہوا کے سنکنے کی ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی اور جگہ جگہ جھینگر نغمہ ریزی سی کر رہے تھے۔ کسی کسی وقت کہیں دور کے گاؤں سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز

آتی اور پھر ہلکی ہلکی سائیں سائیں اور جھینگروں کی آوازیں جلترنگ سا بجانے لگتیں۔ ہم چھ کے سوا وادی کے طول و عرض میں کسی انسان کا پتہ نہ تھا۔ آسمان سے چاندنی چھن چھن کر آرہی تھی اور کل وادی میں صبح کاذب والی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔

پہنچنے کے گھنٹہ بھر کے اندر ہی ہمیں اندازہ ہوگیا کہ ہم بھٹ کے قریب آگئے ہیں اور بھیڑیئے اس قدر نڈر ہوگئے ہیں کہ اپنی جبلت کے خلاف وقت بے وقت بھٹ میں سے نکل پڑتے ہیں۔ سرشام کی وارداتوں کی افواہیں ہم لوگ تمام علاقے میں سن کر آرہے تھے۔ مگر تمام دیہات میں تو افواہیں ہی افواہیں تھیں اور پھر بھیڑیئے کے حادثے کی ہر حکایت کے ساتھ بھوت کا کردار کسی نہ کسی پہلو سے لگا ہوتا اور ہمارے لئے کسی قطعی نتیجہ پر پہنچنا مشکل تھا مگر اب یقین ہوگیا کہ بھیڑیئے بجائے پہر بھر رات گئے نکلنے کے سرشام ہی نکل پڑتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے والا بھٹ بھی خالی تھا اور بقیہ دو بھٹوں سے بھی کوئی آواز دھماکے کی سنائی نہ دی۔ استاد رضا محمد خاں مجھ سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر داہنی جانب ایک چھوٹے سے مٹی کے ٹیلے کی آڑ میں اپنی نشست لئے ہوئے تھے۔ اور میں ڈھلان سے اترتی ہوئی ایک نالی میں دبکا ہوا تھا۔ استاد رضا محمد خاں نے اشارے ہی اشارے میں مجھ سے کہہ دیا کہ بھٹ خالی ہے اور اب ساری رات بیٹھنا پڑے گا۔ کہیں صبح ہوتے امید ہو سکتی ہے جب بھیڑیئے شکار کر کے پلٹنے لگیں —— ان کا شکار بہت مشکل سے کامیاب رہتا ہے۔ بھیڑیا کھلے میدان میں ہوتا ہے۔ تمام رات شکار کرتے رہنے کے سبب وہ غیر معمولی ذکی الحس ہوتا ہے اور بہت دیکھ بھال، جانچ پڑتال کر کے بھٹ کے قریب آتا ہے۔ بھٹ سے نکلتے وقت خواہ کتنا ہی چوکنا ہو کر نکلے پھر بھی تمام دن کا سکون پائے ہوئے ہوتا ہے۔ بہرصورت بھٹ میں سے یکدم باہر کھلے میدان میں آن پڑتا ہے اور وہ دہانے کے ارد گرد چھپے ہوئے آدمی کا باہر نکل کر ہی اندازہ کر سکتا ہے۔ پہلی جھلک پر شکاری یکدم ایک دو فیر کر دیتا ہے۔ باہر سے اندر جاتے وقت پہلے تو تمام رات کا لتاڑا یوں بھی قدم قدم پھونک پھونک کر دھرتا ہے اور پھر کھلے میدان میں اچھی طرح ناک، کان اور آنکھ سے کام لے کر قریب آتا ہے۔ سب سے بڑی قباحت یہ ہوتی ہے کہ شکاری کو معلوم نہیں ہوتا کہ بھیڑیا اس کے دائیں بائیں آگے پیچھے کس سمت سے آئے گا۔

خیر ہم نے تھوڑی دیر اطمینان کے ساتھ نشستوں پر پہلو بدلے۔ شروع میں کچھ دیر ڈھیلے ڈھیلے بیٹھے رہے اور سمجھ گئے کہ شکار کا جو نقشہ بنا کر چلے تھے وہ بگڑ گیا۔ نصف شب گزرنے پر آگے پیچھے دائیں بائیں اور اوپر نیچے ہر طرف گہری توجہ شروع کی اور اس حد تک دبک کر بیٹھ گئے کہ مٹی کا تودہ معلوم ہونے لگے۔ اگرچہ اس شکار میں اس سے زیادہ لطف آرہا تھا جو بھٹ سے نکلتے ہی کتے کی موت مارنے کے طریقے میں آتا۔ کم سے کم کچھ کشش و پیچ، کچھ غیر یقینی صورت تو تھی۔ ورنہ وہ بھی کیا شکار کہ ایک سوراخ پر نگاہ جمی ہوئی ہے اور سر نکالتے ہی ٹھائیں سے شکار ختم۔

چاند کی حرکت کے ساتھ بادل کی سفید چادر میں سے چھن چھن کر گرتی ہوئی چاندنی کی کیفیات بدلتی رہیں۔ خنکی اور نمی بڑھتے بڑھتے کل منورات کی سیمیں رداتر ہو کر ٹپکنے سی لگی۔ تمام رات انتظار کے شکار اس سے پہلے بھی بہت کئے تھے مگر بھیڑیئے کے لئے آج پہلی مرتبہ بیٹھے تھے۔ آدھی رات گزرنے پر میں نے غور کیا کہ آغازِ شب سے ہی آج کچھ شکار کا جوش اور جذبہ شعور پر اچھی طرح طاری نہ ہوا تھا اور اس وقت کچھ طبیعت کند سی ہوگئی اور ایک مبہم سا اچاٹ پن جو ٹوٹ لینے پر ایک نامعلوم خوف کی حد تک پہنچتا محسوس ہوتا تھا میرے دماغ پر آہستہ آہستہ مسلط ہوتا جارہا تھا جیسے انتظار بار سا معلوم ہو رہا تھا۔ اگرچہ ہر قسم کے انتظاروں میں شکار کا انتظار خوشگوار ہوتا ہے اور شکار کا سارا لطف مشکل اور جد و جہد کی سختی میں مضمر ہے۔

دیکھتے دیکھتے جیسے کل فضا نے ایک لمبی انگڑائی سی لے اٹھی اور ابر آلود چاندنی کے ساتھ صبح کاذب کا اجالا مل کر عجیب رومانوی قسم کے انتظار سے ماحول کو درخشاں تر کرنے لگا۔ موتیا رنگ کی آبدار بھیگی ہوئی خاموش رات، پرسکوت اونچا نیچا ماحول اور ہمارے جسم اور ہمارے حسیات

سب تبند میں غلطاں ہوگئے۔ میں نے بندوق کی نال پر ہاتھ پھیرا۔ سردی میں یخ اور اوس میں بھیگا ہوا فولاد۔ پھر اپنے تر ہاتھ کپڑوں پر پھیر کر منہ پر پھیرے اور نشست پر پہلو بدل کر ایک گہری جماہی لی، پھر ایک لمبی انگڑائی کے ذریعے جیسے تمام رات کا کسل دور کرنے کی کوشش کی اور خیال کیا کہ ساری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی اور نہایت احتیاط کے ساتھ بدن کو پوری طرح چرا کر نالی میں چپٹ سا گیا اور میرے دائیں ہاتھ کی جانب سے آہستہ آہستہ چٹ چٹ کی آواز کان میں پڑی۔ اس وقت شکاری کے حواس خمسہ بھی بھیڑیے سے کم تیز نہیں ہوتے۔ یہ چٹ چٹ بھیڑیے کے چلنے کی مخصوص آواز تھی جس کو دیہاتی کہا کرتے ہیں کہ چلتے وقت بھیڑیے کے پاؤں کی نلیاں چٹختی ہیں۔ میں نے نہایت فن کارانہ انداز میں بندوق سنبھالی اور اپنی کمان والے دروازے پر پوری توجہ کے ساتھ ٹکٹکی باندھی۔ مگر تمام رات کے مجرم اور مفرور بھیڑیے کی شامہ، سامعہ اور باصرہ پوری قوت کے ساتھ بروئے کار تھی۔ تقریباً آدھ گھنٹے میں نے مٹی کے تودے کی طرح بے حس و حرکت پڑے انتظار کیا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ یا تو پلٹ گیا یا اور کسی جھاڑی یا نالی میں دبک کر میرے ہٹنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس کا بھٹ کی جانب نہ آنا اس امر کی قوی دلیل تھی کہ اس نے مجھ کو بھانپ لیا ہے۔ میں نے بہت ہی آہستہ سے گردن پھیر کر استاد رضا خاں کی جانب دیکھا جو اپنی نشست پر مجھے نظر آ رہے تھے اور دونوں بالکل ہی پیلی مٹی کا تودہ معلوم ہو رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ استاد کے ہاتھ پر بھی چاپ سنائی پڑی ہے۔ ہمیں مردہ سا پڑے ہوئے آدھ گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تھا ایک آدھ مرتبہ تھوڑی چاپ اور سنائی دی اور پھر سناٹا۔

نومبر کے شروع کی خوشگوار خنکی قدرے تیز سردی میں تبدیل ہو گئی۔ پچھم سے چلتی ہوئی سبک رفتار ٹھنڈی ہوائیں دھار جیسی کاٹتی کیفیت پیدا ہو گئی۔ تمام رات کے اوس میں تم کپڑے گیلے گیلے سے معلوم ہونے لگے۔ میری ناک اور کان برف سے ہو گئے۔ سر شام کا ابھرا چاند بادلوں کی سپیں ہوا کے اندر ہی اندر ضو فشانیاں کرتا افق کی پستیوں میں جا لٹکا اور ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک آسمان پر ایک خطِ نور بڑھتا چلا گیا۔ اور صبح کاذب کے سفیدے کے ساتھ مکر چاندنی کا نور مل کر تمام فضا کو پگھلی ہوئی چاندی کے آبشاروں میں تبدیل کرنے لگا۔ جگہ جگہ آسمان پر سپیدۂ صبح کی جھلک دکھائی دینے لگی اور نیچے جیسے ساری دنیا سچ مچ ہی کچی چاندی میں تبدیل ہونے لگی۔ میں نے وقت کا اندازہ لگانے کے لئے آسمان پر نظر کی۔ بادلوں کی کھڑکیوں سے پھیکی پھیکی چاندنی اور درخشاں سپیدۂ صبح جگہ جگہ افشاں کی پھواریں سی چھوڑ رہا تھا۔ میں ایک لمبی سانس لے کر استاد رضا خاں سے کچھ اشاروں میں بات کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ استاد میری جانب گھور کر دیکھ رہے تھے اور مائل بہ تکلم سے تھے۔

استاد نے اشارہ سے کہا کہ آج کا شکار بگڑ گیا۔ میں نے ہفتہ بھر کی محنت یوں رائیگاں جانے پر افسوس کیا۔ کیونکہ ہم لوگ اتنے تھکے ہوئے تھے کہ آنے والی شب میں شکار پر نہ بیٹھ سکتے تھے۔ آج تمام دن آرام کیا جائے۔ پھر ساری رات آرام کیا جائے اور پرسوں کے تمام دن۔ تو کہیں جا کر پرسوں شب میں شکار کے قابل ہو سکیں گے۔ دیکھتے دیکھتے موتی جیسی آبدار رات کے ڈانڈے درخشاں صبح سے آملے۔ مغرب سے روشنی کا ایک سیلاب پھٹ پڑا اور مشرقی افق قرمزی درخشانیوں سے چمکنا شروع ہوا۔ جھاڑیوں پر چھوٹی چھوٹی چڑیاں بھدکیں۔ مٹی میں سے جگہ جگہ ٹڈے اچھلے ایک ٹٹیری بار بار ہمارے سروں پر منڈلاتی ادھر سے ادھر اڑنے لگی۔ صبح صادق کے آثار زمین سے آسمان تک نمودار ہو گئے اور ایک مخصوص شور جیسے سناٹے کی آواز سے سارا ماحول سنسنانے لگا۔ اس مخصوص صبح والے سناٹے میں کسی کسی وقت دور سے آتی ہوئی کوؤں کی آوازیں کان میں آئیں۔

ہماری، سنگھ بابو اور مسلم کی نشستوں کے درمیان ایک اونچا خشک کنکریلی پیلی مٹی کا ٹیلا اور ادھر ادھر گہری گہری کٹی ہوئی نالیوں کا ایک جال تھا۔ دوسرا ٹیلا اس سے قدرے نیچا اور اس ٹیلے کے ڈھلان پر وہ بھٹ واقع تھا جس پر یہ لوگ داؤں کئے بیٹھے تھے یعنی ہمارے اور ان کے درمیان دو چوڑی نالیاں اور ایک اونچا ٹیلا حائل تھا۔ دوسرے برابر والے ٹیلے کا چند گز ڈھلان چڑھ کر یہ بھٹ آتا تھا۔ ناامیدی بڑھتی جا رہی تھی اور میرا اچاٹ پن اکتاہٹ میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا کہ یکدم سنگھ بابو کی نشست کی جانب سے ایک بھیانک آواز سنائی دی "گھیگھے۔ گھے

گھگھیے گئے! بھو، بھو! بھواوت!" اور باوجودیکہ حلق اور زبان کے بجائے یہ پیٹ سے بلند ہوئی تھی مگر میں نے پہچان لی کہ سنگھ بابو کی آواز ہے۔ اور پھر ہم نے دو منٹ دھماکے کا انتظار کیا مگر بجائے دھماکے کے بت بتاہٹ سنائی دی۔ ہم لوگ اپنی نشستوں سے اٹھ نہ سکتے تھے کیونکہ یہ قاعدہ کے خلاف تھا۔ چند منٹ اور انتظار کیا۔ اتنے میں سیٹی کی آواز سنائی دی اور پھر صاف صاف بلانے کی سیٹی ان کی جانب سے بھی۔ جس کا جواب صابر اور انوار کی نشست کی جانب سے آیا تو استاد رضا خاں نے بھی جوابی سیٹی بجائی۔ اور سیٹی کی مخصوص آوازوں کے تبادلہ میں طے ہوگیا کہ سنگھ بابو کی جانب چلنا چاہئے۔ ہم نے بندوقیں نیچی کئے تیز تیز نالے کے نشیب و فراز طے کئے اور ٹیلے کے ادھر والے ڈھلان پر چڑھ کر چوٹی پر سے کچھ دیکھنے کی کوشش کی۔ اور پھر سنگھ بابو کی جانب سے پیہم بلانے کی سیٹیوں پر بڑھے۔ دوسرے ڈھلان کی جانب اترے اور پھر تیز تیز ادھر والے نالے کی چھوٹی بڑی اونچی نیچی سطح پر جستیں سی لگاتے اس ٹیلے کی جانب بڑھنے لگے۔ ادھر والا ڈھلان ہم نے تیز تیز چڑھنا شروع کیا، اور جب ہم اس کی چوٹی پر پہنچے تو ہمیں اپنی داہنی جانب سے صابر خاں اور انوار خاں چڑھتے دکھائی دئے اور نیچے ادھر والے ڈھلان کی جانب سے اپنی نشست چھوڑ کر سنگھ بابو آگے آگے اور مسلم پیچھے پیچھے لپکتے دکھائی دیتے۔ چونکہ سب لوگ اتفاق سے براہ راست ہماری جانب بڑھ رہے تھے لہذا ہم وہیں چوٹی کی نوک پر ٹھٹک کر انتظار کرنے لگے اب ہم چھیوں ٹیلے کی نوک پر جمع تھے جس کے ڈھلان پہ ادھر والے نالے سے ذرا اوپر ڈھلان پر وہ بھٹ تھا جس پر سنگھ بابو اور مسلم واڈں کئے بیٹھے تھے۔ سنگھ بابو دوڑنے اور چلنے کی درمیانی چال چلتے ہمارے قریب آئے۔ مسلم پیچھے پیچھے لپک رہے تھے۔ میں "کیا ہے بھائی؟" سوال کرنے ہی والا تھا کہ استاد رضا خاں بول پڑے —

"کیوں جی، کیا غدر تھا بھائی؟" مگر کنور جی تو بہت بدحواس ہو رہے تھے۔ "وہ۔ وہ، بھوت، استاد بھو بھوت!" اور میں نے غور کیا کہ سنگھ بابو کی زبان لکنت کر رہی ہے اور جسم پسینہ پسینہ تھا۔ جب میں نے قریب جاکر ان کے چہرے پر غور کیا تو آنکھوں میں بلا کی دہشت اور پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ میں نے اور قریب جاکر ہمدردی کے ساتھ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تو اندازہ کیا کہ ان کے نہ صرف ہاتھ میں بلکہ تمام جسم پر رعشہ سا ہے۔ جیسے ان کی رگ رگ بکھری جا رہی ہے۔ سنگھ بابو جیسے پختہ کار اور بہادر راجپوت شکاری کو اس درجہ خائف دیکھ کر میرے شعور میں بھی یک گونہ خوف کا احساس بیدار ہوا۔ اتنے میں صابر خاں اور انوار خاں بھی لپک کر آ گئے۔ اور دونوں نے بے ساختہ یک منہ ہوکر کہا کہ "کیا ہے بھائی خیر تو ہے؟"

استاد رضا خاں تمسخرانہ سنجیدگی سے بولے "میاں ہوتا کیا، وہی بھوت تھا۔ ہمارے کنور جی کو دبوچ ہی لیا تھا۔ بے چارے بڑی مشکل سے جان بچا کر بندوق لٹکائے بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ خیر گزری!"

سنگھ بابو ہماری صحبت کا رکن تھا۔ اور ہماری پارٹی کا سب سے زیادہ چلتا پرزہ۔ امیری طرح وہ بھی استاد رضا خاں کا دوست قسم کا شاگرد تھا۔ استاد کے انداز پر ذرا سنبھلا اور نہایت سنجیدگی سے کہا —

"میاں ہم اپنی آنکھ سے دیکھ کر آ رہے ہیں۔ وہ واں ٹیلے کی آڑ میں سے یک دم پہلے دو ٹانگوں پر کھڑے ہو کر مڑ کا یا، پھر ایک مرتبہ دبکا، پھر اُچکا اور پھر لنگور کی سی جست لگا کر یک دم غپ سے بھٹ میں گھس گیا۔" یہ کہتے ہوئے مسلم سے اپنے بیان کی تصدیق چاہی۔

مسلم بھی خائف سے تھے مگر چہرہ سے سنجیدگی ظاہر ہو رہی تھی اور خوف کے آثار محض آنکھوں میں تھوڑے بہت نمایاں تھے۔ انہوں نے بیٹھ کر حلق صاف کیا اور پست آواز میں بولے "بھئی وہ ان کے ہاتھ پر آیا تھا، جو کچھ بھی تھا۔ اور مجھ سے وہ جگہ بالکل آڑ میں تھی۔ جہاں سے سنگھ بابو اس کا اچکنا اور پھر بھٹ کے اندر کو جست کرنا بیان کرتے ہیں۔ البتہ پھیکی چاندنی میں میں نے ٹیلے کی آڑ سے لمبا سا سایہ اپنی بائیں جانب متحرک ہونے کا احساس کیا۔ تیزی کے ساتھ قدرتی طور پر ادھر کو میری نظر مڑی تو ہر چیز غائب تھی۔ سایہ میں نے تیقن کے ساتھ دیکھا بھی نہیں۔ بلکہ یوں سمجھئے کنکھیوں سے کسی سایہ جیسی حرکت کا مبہم سا احساس کیا اور جہاں تک خیال ہے ایک نامانوس سی سرسراہٹ بھی کان میں گئی —

اور بھئی میں اس سے تو انکار نہیں کر سکتا کہ کوئی چیز نہیں تھی۔ اس میں شک نہیں کہ کوئی چیز تھی ضرور، یہ کیا تھی؟ - یہ یہ جانیں اور پھر یک دم گھگھیا پڑے "بھوت، بھوت"!

سب نے ایک قہقہہ لگایا مگر سنگھ بابو نے زیادہ درست ہو کر کہا "دیکھو بھیا مسلم! وہ جو کچھ بھی تھا مگر بھیڑیا نہیں تھا کیونکہ تمہارے کان میں سرسراہٹ کی آواز گئی چٹ چٹ نہیں گئی نا"

"ہاں صاحب چٹ چٹ نہیں گئی"

"اور بھیڑیے کی چاپ میں چٹ چٹ یقینی ہے" سنگھ بابو نے سنبھل کر کہا

"ہوں" مسلم نے کہا اور استاد رضا خاں بولے "تو بس بھوت تھا۔ اور تم بال بال بچے۔ میاں کنورجی کوئی بھیڑیا ویڑیا ہوگا۔ اور تم پر سرِ شام ہی سے بھوت کا خوف طاری تھا آج۔ ہم نے اندازہ کر لیا تھا کل ہی سے"

استاد کے جملہ پر سنگھ بابو کچھ تلخ سے ہو گئے اور بولے "استاد! بھوت، اور بھوت کے سوا کوئی اور چیز ہو تو۔ اور استاد ہم نے کبھی کسی زمانہ میں تھوڑا بہت بھیڑیے کے شکار کا شوق کیا ہے اور آپ کی عنایت سے ہر رنگ میں بھیڑیا جنگل کے اندر دیکھا مارا ہے۔ بھٹ کے اندر گھستے بھی دیکھا ہے اور اندر سے نکلتے بھی"

"اچھا، تم نے پہلے بھی کبھی بھوت دیکھا ہے؟" استاد نے کہا

"جی مگر آج ضرور بھوت ہی دیکھا، اور گاؤں والے سچے ہیں۔ ضرور اس جنگل میں بھوت رہتے ہیں"

"خیر جانے دیجئے، بھیڑیا ممکن ہے۔ بھیڑیا نہ ہو، اور کوئی اور چیز ہو، آخر اسے ہم بھوت ہی کیوں کہیں"

"تو کسی اور چیز کا نام آپ مجھے بتا دیجئے کہ کیا ہو سکتی ہے، آخر ساری عمر آپ کی بھی شکار میں کٹی ہے اور میں نے بھی آپ جیسے لوگوں کی جوتیاں سیدھی کی ہیں۔ آپ اس جنگل کے لحاظ سے کسی ایسی چیز کا تعین کیجئے جو اس حلیہ کی ہو۔ جناب اس کے سر پہ بالوں کا گچھا ہے۔ بلکہ مجھ کو تو جسم پر بھی بال معلوم ہوئے۔ اور جب اس نے اندر کو جست کی تو مجھے اس کے پاؤں بھی ایسے معلوم ہوئے کہ پنجے پیچھے کو پھرے ہوئے ہیں"

صابر خاں نے دخل در معقولات کیا "معلوم ہوتا ہے صبح کی نیند میں آنکھ جھپک گئی۔ کئی دن سے گاؤں والوں میں بھوت کی روایت سنے ہوئے تھے۔ کچھ خواب یا نظر بندی کا قصہ ہے بھیا، ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے"

سنگھ بابو چڑ سے گئے اور بولے "جی مجھے ہذیان ہو گیا تھا، میں پاگل ہوں۔ جاگتے میں خواب دیکھتا ہوں اور بڑاتا ہوں۔ شکار آپ ہی نے کھیلا ہے، اور میں نے تو تیس برس بھاڑ جھونکا ہے۔ گویا آپ کے نزدیک میں ایسا گدھا ہوں کہ واؤں پر سو گیا تھا! اور آپ جاگ رہے تھے"

صابر غریب قائل سا ہو گیا اور میں نے نیم سنجیدگی کے ساتھ ایک ایک لفظ چن چن کر کہا "جناب! ہم بھوت ووت نہیں جانتے، ہم تو صرف بندوق جانتے ہیں"

"خیر آپ مانیں یا نہ مانیں مگر آپ بھی میری جگہ ہوتے تو پھر بھوت کے سوا اور کچھ نہ کہتے"

"جی خیر، مگر شاید ہم کہتے پیچھے، پہلے دونوں نالیں دے بجاتے، پھر دیکھتے کہ سالا کیسے بچ کر نکل جاتا ہے سامنے سے" صابر نے کہا "چھیچھڑے اڑ جاتے"

"جی آپ تو بڑے تیس مار خاں ہیں!" سنگھ بابو نے خشمگیں انداز میں کہا "کل سے بندوق ہاتھ میں لی ہے، دس پانچ ہرن کبوتر مار کر شکاری بن گئے۔ میاں میں نے جتنے کارتوس پھونک دیئے اتنے چھرے بھی ابھی بندوق کی نال سے نہ نکال پائے ہوں گے، خاں صاحب بہادر!"

"خیر تیس مار خاں نہ سہی مگر کنورجی آپ کی طرح گھگھیا بھی نہ پڑتا" صابر خاں نے کچھ دریدہ دہنی سے کہا

"اجی صاحب زادہ صاحب! میں خیر گنگھیا تو پڑا، آپ کے حلق سے تو آواز بھی نہ نکلتی۔ دیکھتے ہی وہیں پر غش آ جاتا۔" سنگھ بابو نے کہا۔ سنگھ بابو نجیب الطرفین جوان راجپوت تھا اور اپنے وقت کا بڑا بہادر سپاہی قسم کا جوانمرد شکاری، جو جنگلی سور سے ایک برچھا لے کر جا بھڑتا تھا، اور دو تین شیر اور گلدار زمین پر کھڑے ہو کر رائفل سے شکار کر چکا تھا۔ بلا کا مضبوط اور جفاکش، پرانا تجربہ کار، چابک دست و قادر انداز اور صابر خاں نوجوان خام کار شکاری تھا۔ مجھے اور استاد رضا خاں کو سنگھ بابو کی آزردگی کا خیال ہوا اور میں نے کہا "بھیا صابر! گنگھیا ہٹ سے یاد رہ گئے اور تم کہتے ہو کہ بندوق چلاتے۔ یہ سب وقت پر اوسان بندھنے والی بات ہے ورنہ سنگھ بابو ہماری پارٹی کا سردار ہے اور ضلع کیا دور دور تک اپنا جواب نہیں رکھتا۔"

استاد سنگھ بابو کا انداز دیکھ کر بولے "ارے مردے آدمیوں اس میں بحث کیا ہے، اور بھئی تم بھی اُلجھتے ہو یار سنگھ بابو کل کے لونڈے سے۔ مٹی تو پولی ہو گی ہی۔ وہاں پر بھٹ کے اندر کی نکالی ہوئی، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ چلو جس دروازہ سے تم نے گھستے دیکھا وہاں پر کھوج (نشانات قدم) دیکھ لیں۔ چلئے چھٹی ہوئی۔ سب روشن ہو جائے گا۔"

ہماری مختصر سی پارٹی ایک اونچے ٹیلے کی نوک پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اور بحث استاد رضا خاں کے اخیر جملہ میں ختم ہو گئی تھی۔ مشرق سے سورج کی دمکتی ہوئی پیشانی چمکی اور بے آب و گیاہ خشک کنکریلی زرد مٹی کی اونچی نیچی وادی سنہری خیر گیوں سے منور ہو گئی۔ یوں تو ناکامی، تکان اور جاگنے کا کسل رگ رگ پر سوار تھا۔ مگر بھوت کے کھوج دیکھنے کا اشتیاق ہم سب پر سوار تھا۔ ہم بھٹ پر پہنچے، پہلے ماحول کا جائزہ لیا اور پھر اندر کی نکلی ہوئی نرم مٹی پر سنگھ بابو نے بھوت کے قدموں کے نشان دکھائے۔ یہ مٹی ڈھلوان کی صورت پنجوں سے کھود کر گھر بنانے والے جانوروں کے بھٹوں میں اندر جاتے ہوئے نرم راستہ کی طرح جمع رہتی ہے اور بھیڑیئے کے بھٹوں پر پنجوں کے پھینکنے سے پچاس پچاس گز تک لمبی پتلی سڑک سی بن جاتی ہے جو بھٹ کے اندر کو جاتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے چوہوں کے بلوں پر جمع رہتی ہے۔

دور سے نرم پیلی گہرائی کی نکلی ہوئی مٹی کے اوپر بھوت کے پنجوں کے نہایت واضح نشانات بنے ہوئے اندر کو چلے آ رہے تھے جتنا چوڑا پنجہ اتنی ہی چوڑی ایڑی۔ رُخ الٹا پھرا ہوا۔ اور سنگھ بابو بولے "یہ دیکھئے یہ الٹا پنجہ، آپ ہی بتایئے کس کا ہو سکتا ہے؟"

"مگر یہ کیسے سمجھ لیا جائے کہ یہ باہر کو نکلنے کے نشانات نہیں ہیں، اور یہ پنجہ پیچھے کو پھرا ہوا ہے۔" استاد رضا خاں نے سوچ میں پڑتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ یوں کہ میں سچ بول رہا ہوں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔" سنگھ بابو نے کہا۔

"مگر آپ ان نشانات کے بارے میں کیا کہیں گے؟" استاد نے چند اور نشانات کی جانب توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا جو ان نشانات سے بالکل خلاف رخ میں لگے ہوئے تھے، "اور پھر آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس ٹیلے کی آڑ سے اسے اچکتے ہوئے دیکھا اور اس ٹیلے سے براہ راست آتے ہوئے اس بل کے اندر کو بھی نشانات معلوم ہوتے ہیں۔"

"ہوں۔ خیر یہ کہا ضرور جا سکتا ہے۔ لیکن اگر آپ میرے پوائنٹ آؤٹ کے نشانات کو بھٹ کے اندر سے نکلنے کے گردانتے ہیں تو آپ سب تجربہ کار لوگ ہیں یہ اندازہ لگائیے کہ ان میں سے تازہ کون سے ہیں۔ یعنی شروع رات کے کون سے اور اخیر کے کون سے؟"

میں نے کہا کہ "اوس تو اب سب پر یکساں ہے اور چند گھنٹہ کے ان بل کے نشانات پر کوئی قطعی محاکمہ کرنا مشکل ہے۔"

"تو آپ یقین کیجئے کہ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا کہ وہ انہیں پنجوں اندر گیا ہے۔"

ہم تین میں بات ہو رہی تھی، صابر خاں قائل تھے اور مسلم اور انوار خاں متحیر۔ مسلم نے ہماری گفتگو کے درمیان نہایت سنجیدگی کے ساتھ دخل دیا اور کہا "دیکھئے بات بزرگوں اور استادوں کے درمیان ہو رہی ہے۔ لیکن آپ حضرات کی اس فنکارانہ بحث کی علت غائی میری

سمجھ میں نہیں آتی کہ پنجے پیچھے کو پھرے ہوئے ہیں یا آگے کو سیدھے ہیں۔ گستاخی معاف قبلہ! میں آپ حضرات سے یہ سوال کرتا ہوں کہ یہ پنجے ٹیڑھے کیسے ہیں؟

"نہیں" استاد رضا خاں اور میرے منہ سے یک دم نکلا۔

"پھر کسی اور ایسے جانور کے ہیں جس کا اس جنگل میں پایا جانا قرینِ قیاس ہو؟"

"نہیں ہمارے پندار میں یہ کھوج کسی جانور کی جانب منسوب ہی نہیں کئے جا سکتے۔ یہ تو عجیب ہی سے ہیں، اور سنگھ بابو کے قول کے مطابق بھوت کے ہی کہنا پڑیں گے۔"

"تو پھر قبلہ معاف کیجئے یہ بے کار بحث کیوں! اگر آپ بھوت کے وجود میں یقین نہیں رکھتے تو میرے اس سوال کا جواب دے دیجئے کہ ان کھوجوں پہ کیا چیز اندر گئی ہے اور کیا چیز نکلی تھی۔ اب بحث اس پر نہ کیجئے کہ یہ ہے کیا بلا، بلکہ آپ کو کرنا کیا ہے۔ اس پر سر جوڑ کر غور کیجئے یا پھر چپکے سے اپنے اپنے گھروں کو سرک جائیے اور پھر عمر بھر جنگل میں منہ نہ دکھائیے۔ ایک شکل تو یہ ہے، اور دوسری صورت یہ ہے کہ کم از کم اس معمہ کو اس حد تک حل کیجئے کہ یہ کس مخلوق کے نشاناتِ قدم ہیں۔"

"غرض کسی نتیجہ پہ پہنچنا تو ضروری ہے ہی، اوکھلی میں سر دیا ہے تو موسلوں کا کیا ڈر؟ اب میدان چھوڑ کر بھاگیں گے تو نہیں، بھوت نہ سہی بھوت کے ابا سہی۔"

سنگھ بابو نے پھر تفصیل کے ساتھ بھوت کے آنے، اچھلنے، جست کرنے اور اندر گھسنے کی تمام روئداد جگہ اور موقع کا حوالہ دے دے کر بیان کرنی شروع کر دی اور مسلم نے آہستہ سے پیشانی پر ہاتھ مار کر کہا "میرے اللہ! ٹھاکر جی وہ تو سب ٹھیک، مگر میری عرض یہ ہے کہ اب کرنا کیا چاہئے؟ اس کی بات کیجئے، وہ تو آپ کے قول کی تصدیق میں یہ نشان موجود ہیں۔"

اور یہ سوال بے جواب تھا، ہر شخص گومگو میں تھا، لیکن جائے استاد خالی است! بوڑھے استاد رضا خاں بول پڑے "اماں کرنا کیا، بھوت سالے کے بھی دو ہاتھ پاؤں ہیں۔" اور پھر تمام بھٹ کے منہ کا اوپر سے اندازہ لگایا، اور آہستہ سے مٹھار کر بولے "بہت بڑا لمبا چوڑا ہے پنار ہینگے، دو تین گھنٹہ بیٹری چلنے تو دو پانی ذرا نیچے ہے، چار پانچ مٹکے اور ٹھونکیاں لگیں گی۔" پھر نکلی ہوئی مٹی پر نظر کی اور بولے "بھٹ ذرا گہرا ہے اور جس پر ہم بیٹھے تھے اس سے ذرا لمبا چوڑا بھی۔ خیر بہر حال کچھ نہ کچھ تو ہمیں کرنا ہی ہے۔"

"کیا مطلب استاد؟ آپ اس بھٹ میں پانی بھر کر بھوت کو نکالیں گے؟ کیا بھوت کو پکڑنے کا ارادہ ہے؟" سنگھ بابو نے حیرت سے کہا "اب وہ جو کچھ بھی ہو، جب بھوت سالا مٹی پر نشاناتِ قدم چھوڑ سکتا ہے تو ہماری بندوق کی گولی بھی اس کے جسم میں گھس سکتی ہے اور اس کے جسم کو ہم پکڑ بھی سکتے ہیں۔"

"تو کیا یعنی۔ اوں۔ آں۔ گویا آپ بھوت کو بندوق سے ماریں گے؟"

"اجی ٹھاکر جی آپ نے سنا نہیں کہ مار کے آگے بھوت بھاگتے ہیں۔ ہمیں تو دیکھنا یہ ہے کہ یہ ہے کیا بلا؟" استاد رضا خاں نے کہا۔ اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ "آپ پچیس تیس آدمی ایسے فراہم کیجئے جو بیٹری سے نیچے گڈھے میں سے پانی اٹھا کر اس بھٹ میں بھر دیں۔"

یہ زیر زمین رہنے والے جانوروں کے شکار کا بڑا موٹا اور پرانا طریقہ ہے، بھٹ میں پانی بھر دیا جاتا ہے، اور جب اندر سے پوری کھنڈال بھر جاتی ہے تو مجبور ہو کر جانور نکل بھاگتے ہیں۔ اور باہر بندوقوں، کتوں، برچھوں اور کبھی کبھی جالوں سے شکار کرتے ہیں۔

مگر اتنی بلندی تک پانی اٹھانا بڑا طول امل تھا، حساب لگایا تو بیک وقت پچیس آدمی درکار تھے، مگر ابھی سویرا تھا اور تمام دن پڑا ہوا تھا۔ استاد رضا خاں کا خیال تھا کہ دو بجے تک بھٹ بہ آسانی لبریز ہو سکتا ہے۔ اور مزدوروں کی فراہمی کے سلسلے میں مجھے اور سنگھ بابو کو جانا پڑا کیونکہ

اس جنگل کے کنارے ہماری زمینداری کے چند گاؤں لگے ہوتے تھے۔ ہم پہلے اس گوننے ڈیں پہنچے جس میں ہم خیال کئے ہوئے تھے۔ یہ گڈریوں اور مزدوں کی چھوٹی سی بستی تھی۔ مگر ہماری کوشش کے باوجود خوف کے مارے ایک متنفس بھی ہمارے کام میں شریک ہونے کے لئے تیار نہ ہوا۔ یہاں سے اپنا بیل تانگا جتواکر دوسرے گاؤں میں پہنچے مگر یہاں بھی ہر ایک نے بھوت کے خوف سے اس کام میں ہمارا ہاتھ بٹانے سے انکار کیا تو سنگھ بابو نے کہا چلو پس گونوے چلیں۔ یہ پاسیوں کے گاؤں تھا اور میری اور سنگھ بابو کی مشترکہ زمینداری تھی۔ راستہ میں سنگھ بابو بار بار اپنی نبض پر ہاتھ لے جاتے اور دو ایک مرتبہ دوران سر کی شکایت کی۔ پس گونوے پہنچتے پہنچتے انہیں خوب اچھی طرح بخار چڑھ آیا تھا۔ اور میں نے کہا " وقت کی بات ہے۔ کتنے کتنے جاڑے پالے یہاں ہم شکار کر گئے۔ ٹھنڈے پانی اور دلدل میں سارا سارا دن اور پوری پوری راتیں گزاریں مگر یہ رات کی سردی نہیں نقصان کر گئی۔ اور کانٹھ کی سردی پہنچے سے آ دبوچتی ہے "

" ہاں۔ سر میں بڑا درد ہے "

اور جب میں نے غور کیا تو بری طرح جل رہے تھے۔ جتنی دیر میں پچیس تیس پاسیوں کے نوجوان پٹھے فراہم کئے اتنی دیر میں سنگھ بابو ڈیرہ میں پڑی ہوئی چارپائی پر بے ہوش ہو گئے۔ میں نے وہاں دو تین معتبر آدمی ان کی خدمت اور تیمارداری کے لئے مامور کئے اور بیل تانگے میں جوڑ چار بیڑیاں اور پیچھے پیچھے پچیس تیس آدمی ساتھ لے کر چل پڑا۔ تمام راستہ ان آدمیوں کے دل سے بھوت کا خوف اتارتا گیا اور جو انعام ہمیں گورنمنٹ کی طرف سے بھیڑیا مارنے پر ملے گا اس کو جوں کا توں ان کے اندر تقسیم کر دینے کا لالچ دیتا گیا۔ اس کے علاوہ آج کے دن کی مزدوری کا بھی وعدہ کیا۔

پھر ٹیلے پاسیوں نے کام پر جت کر ذرا دیر میں پیچھے اور پر تک نالیاں اور رندھے تیار کر لئے پانی گڈھے سے تقریباً بیس فٹ کی بلندی تک اٹھانا تھا۔ جتنی دیر میں میں نے مزدور فراہم کئے اتنی دیر میں استاد رضا خان اور بقیہ تین ساتھیوں نے بھٹ کے تمام مراتع بغور دیکھ لئے تھے اور جب مجھ کو تنہا واپس آتے دیکھا تو سنگھ بابو کے متعلق سوال کیا۔ میں نے بتایا کہ غریب رات سردی کھا گئے۔ پس گونوے کے ڈیرہ میں تیز بخار میں تقریباً بیہوش چھوڑ آیا ہوں اس پر استاد رضا خان نے افسوس کیا مگر صابر اور مسلم یک زبان ہو کر بولے " وہ ہم جانتے تھے اسی وقت جس وقت وہ گئے تھے کہ اب یہ گئے کام سے "

" نہیں جی کیا بکتے ہو۔ بڑا تیز بخار چڑھا "

" اجی بخار نہیں ان پر بھوت چڑھا ہے " صابر نے کہا: مگر اس پر کوئی ہنسا نہیں۔ جیسے بھوت کے خوف سے ہر ایک متاثر تھا:

اس بھٹ کے تین دروازے یا سوراخ یا مخل تھے۔ ایک ڈھال کے اوپری حصہ میں اور دوسرا نیچے پورے ٹیلے کو اندر ہی اندر کاٹتا ٹیلے کی اس ڈھال پر نکلا تھا جو دوسری سائڈ پر تھا۔ اور ایک اس ڈھال پر۔ بیڑیوں سے پاسیوں نے پانی چڑھایا اور اوپر والے دروازے سے پانی بڑے زور سے سوراخ کے اندر کو پرنالے کی طرح بہنے لگا۔ سنگھ بابو کے بے چارے بیمار ہی ہو گئے تھے۔ اب ہم پانچ تھے۔ نیچے کے دونوں سوراخوں پر استاد رضا خان اور مسلم، انوار اور صابر جوڑی جوڑی بنا کر اپنی اپنی سائڈ لئے تعینات تھے۔ اور میں سب سے اوپر ٹیلے کی نوک پر کھڑا تینوں سوراخوں کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ ایک جانب سے پانی داخل ہو رہا تھا اور دو سوراخوں پر چار بندوقیں پہرہ دے رہی تھیں۔ پانی بڑے تسلسل اور تیز رفتاری کے ساتھ اوپر چڑھ کر اندر داخل ہو رہا تھا۔ میں کچھ دیر تو اوپر کھڑا تماشہ دیکھتا رہا۔ پانی اندر گھستے ہی پہلے اندر سے ہلکی ہلکی گرد سوراخوں میں سے نکل پھر کچھ کیڑے، ٹڈے پید کے۔ ہم لوگ مطمئن اور جیسے اس معمہ کے حل ہو جانے کے شوق میں سرشار سے تھے۔ بھوت کا خوف تو دلوں سے بالکل ہی نکل گیا۔ شکار سے زیادہ اس تحقیق کا جذبہ کار فرما تھا کہ اندر کیا چیز ہے۔ ہم لوگ تھوڑی بہت بات چیت بھی کر لیتے۔ اور میں تینوں سوراخوں پر یکساں نظر ڈال لیتا۔ ورنہ جس سوراخ سے پانی داخل ہو رہا تھا اس سے ایک سوراخ تو نظر آ سکتا تھا اور تیسرا سوراخ ٹیلے کی آڑ میں ہونے کے سبب ان دونوں سوراخوں سے چھپا ہوا تھا۔

ایک گھنٹہ۔ دو گھنٹے۔ تین گھنٹے۔ چار گھنٹے پانی بھٹ کے اندر جاتے ہو گئے۔ مجھے اشارہ کر کے صابر خان نے بلایا اور سگریٹ دکھائی۔ سگریٹ دیکھ کر میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں سے وہ سوراخ جس میں پانی داخل ہو رہا تھا نظر آتا تھا۔ مگر ادھر والا سوراخ ٹیلے کی آڑ میں تھا۔ میں نے اس سوراخ پر غور کیا تو تھوڑی دور اندر تک پانی آتا اور اوپر کو بڑھ آیا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگا کر کہا: "بس اب بھری چکا ہے بھٹ" اور اپنی بندوق کا سیفٹی چڑھالیا۔ استاد رضا خان نے جو دیکھا کہ میں ٹیلے کی چوٹی خالی چھوڑ کر چلا گیا ہوں تو اپنے والے بھٹ پر صرف مسلم کو چھوڑ کر وہاں آ بیٹھے اور مجھے ہاتھ کے اشارے سے وہیں رہنے کو کہا۔

پانی اور بھرا۔ یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے اوپر بخوبی نظر آنے لگا۔ متحرک پانی کی سطح پر میں نے چند بلبلے دیکھے۔ اور پھر ایک بھیڑیئے کی ناک پانی سے اوپر دو انچ کے قریب باہر سانس لیتی نظر آئی جو بظاہر ایسی معلوم ہوتی تھی کہ ٹکڑا پانی پر تیر رہا ہے۔ میں نے صابر کو اشارے سے دکھانا چاہا! مگر وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔ اول تو ساتھ ہی خالی تھی۔ پھر میں بلندی پر تھا اور بہت ہی قریب۔ بڑے اطمینان کے ساتھ بھرپور نشست لے کر گراب کا فیر مارا پانی اور کیچڑ اچھل کر باہر آیا۔ اور جب اک ذرا دھواں ہٹا تو پانی سرخ ہو رہا تھا۔ ایک آواز پانی کے بلبلوں کے ساتھ بھیڑیئے کی جانکنی جیسی آئی کھوپڑی پاش پاش ہو گئی۔ اور اندر ہی اندر بھیڑیا ختم ہو گیا۔ اتنے میں اس سوراخ کی جانب سے جو ہم سے آڑ میں تھا ایک دم دو دھماکے سنائی دیئے اور اوپر سے استاد رضا خاں للکارے "بہت اچھے بہت اچھے۔ واہ! دوسرا بھیڑیا ادھر والے سوراخ سے نکل کر بھاگا اور مسلم نے نکلتے ہی مار دیا ابھی ہم شکاری حادثہ کی اچھی طرح رنگینی کا بھی اندازہ نہ کرنے پاتے تھے کہ یک دم اوپر والے دروازے سے جس میں سے لگاتار چار گھنٹے سے پانی داخل ہو رہا تھا ایک عجیب الخلقت مخلوق برآمد ہوتی جسے دیکھ کر بے ساختہ ہمارے منہ سے نکلا "بھوت! بھوت!!" اور وہ بھی کلام موضوع کی آواز میں زبان سے نہیں بلکہ سچ سچ سینہ اور پیٹ کی گہرائیوں سے پھاڑتی چیرتی سی چیخ میں! ——— یک دم بھوت نیم ایستادہ ہو کر اپنے سامنے والے پاسی سے دست وگریباں نظر آیا۔ جو بھٹ کے سامنے پانی کا راستہ اپنے پاؤں سے درست کر رہا تھا۔ پاسی اور بھوت میں بمشکل دو چار ہاتھ کا تبادلہ سا ہوا ہو گا کہ وہ دونوں گتھ گئے اور کیچڑ میں لت پت بھوت نے پاسی کو اور پاسی نے بھوت کو دبوچ لیا۔ بھیڑیئے سے ملتی جلتی دو چار غراہٹیں سنائی دیں۔ اوزار دبک گیا۔ صابر بے ہوش سا ہو کر ایک نشیب میں ہو گیا۔ میں نے بھی جھاڑی کی آڑ پکڑی۔ بھوت اور پاسی میں ایک پکڑ بھی اچھی طرح نہ ہونے پائی تھی۔ کہ کیچڑ میں چکنا بھوت گرفت سے پھسل کر بھاگا۔ سامنے دوسرا پاسی بیلچہ لئے کھڑا تھا۔ بھوت کو بڑھتے دیکھ کر اور کوئی راہ فرار نہ پا کر مرتا کیا نہ کرتا۔ بیلچہ لے کر جھپٹا۔ بھوت پلٹ پڑا۔ اتنی دیر میں بوڑھے استاد رضا خاں اوپر سے شیر کی سی دو تین جستیں لگا کر نیچے آ گرے تھے۔ میرے سامنے تھوڑا سا موقع تھا اور میں نے بھوت پر بندوق سیدھی کی مگر استاد نے بڑے زور سے ڈانٹ کر مجھ کو فیر کرنے سے روکا۔ ایک جست اور لگائی۔ ادھر بھوت جیسے کچھ راہ فرار کا اندازہ کرنے کے لئے چند سیکنڈ ٹھٹھکا سا۔ اتنے میں استاد نے جسے جالیدار بڑی پھرتی سے بنوٹ باز استاد نے اس کے سامنے اپنی پگڑی سر سے اتار کر پھینک دی۔ وہ کچھ پگڑی میں الجھا۔ کچھ لڑنے کا موڈ بنایا۔ اب کی جست میں استاد اس کے پیچھے جا پہنچے اور بڑی دلیری کے ساتھ بندوق پھینک کر اس کے سر پر ہاتھ ڈال دیا اور پیچھے سے بالوں کا گچھا پکڑ لیا۔ بھوت پھر دو پاؤں پر نیم ایستادہ ہو گیا۔ استاد نے اس کا سیدھا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اور پھر دوسرا ہاتھ اپنے دوسرے ہاتھ میں پکڑ کر گدی چڑھائی اور جکڑ لیا اور بھوت کو بے بس کر کے قابو میں کر لیا۔ ہمارے دل دہل اٹھے۔ بوڑھا پچاس سالہ تجربہ کار شکاری آج اپنے صید افگنی کے فن کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ گیا تھا۔ نادر انداز شکاری بندوق پھینک کر کلائیوں کے بل پر بھوت کو پکڑے ہمارے سامنے کھڑا تھا۔ بھوت بری طرح غرا رہا تھا۔

اس سنسنی خیز حادثہ میں بھٹ سے نکلنے سے استاد کے گدی چڑھانے تک بمشکل ڈیڑھ دو منٹ لگے ہوں گے۔ اور ابھی تک ہم حادثہ کی رنگینی لذت آفرینی کا بھی بھرپور اندازہ نہ کرنے پائے تھے کہ استاد نے اپنی مضبوط کلائیوں سے بھوت کا سامنے کا رخ ہماری جانب کو پھیرتے ہوئے

مسکرا کر بھرائی آواز میں کہا " دیکھو تو یہ کیا ہے ؟" اب جو کبوں کا کہ باقی تسلسل جو اتنا شدید تھا کہ آنکھ کی شعاعیں بھی تعاقب سے عاجز سی تھیں، استاد رضا خان کے مضبوط ہاتھوں میں بے بس کسمسا رہا تھا۔ اور یہ ہولناک مخلوق ان کے ہاتھوں میں اچھلنے کودنے کی کوشش کر رہی تھی ہم سب پر ہیبت کم اور تحیر زیادہ طاری تھا۔ جس وقت گدّی چڑھاتے ہی چوطلتے غراتے ہوئے کیچڑ میں لتھڑے بھوت کا سامنے کا رخ ہماری جانب کو ہوا تو اس بھیانک چہرہ اور اس پر بالوں کا گچھا دیکھ کر حیرت اور خوف کے ملے جلے احساس سے ہمارے منہ سے بیساختہ چیخ نکل گئی۔ بھوت غصہ میں غرا رہا تھا۔ بل کھا کھا کر ڈراؤنے دانت نکال رہا تھا۔ الامان الحفیظ! کیسا سنسنی خیز منظر تھا۔ شدت خوف سے ہماری آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ دونوں پاسی فرار ہو گئے تھے اور ہم سب جہاں کے تہاں مفلوج سے تھے۔ استاد رضا خان بھوت کو شکنجے میں کسے مسکرا رہے تھے۔ اور بولے "ارے بزدلو! تم نے تو عورتوں کو مات کر دیا! دیکھو تو ادھر چلو۔ یہ کیا بلا ہے ؟" اور بھوت نے پھر بل کھا کر دانت چمکاتے۔ بری طرح غرایا اور نکلنے کی کوشش کی مگر استاد نے اسکو اس بری طرح جلا رکھا تھا کہ تم کی طرح گانڑ سا دیا تھا۔ اور تم بالاتے ستم یہ کر رہے تھے کہ جب وہ کر جھکاتا تھا تو استاد گھٹنا مار کر کم بخت کو سیدھا کھڑا کر دیتے تھے۔ جب اس طرح بھوت کی نمائش کرتے ہوئے تقریباً دو تین منٹ ہو گئے اور ہماری رگ رگ پر حیرت نے قبضہ کر لیا تو ہم نے معاملہ پر غور کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کچھ نہ سمجھے البتہ اس دو تین منٹ کے اندر ہم نے عقل و حیرت و خوف سے جھڑایا اور میرا دماغ ادھر لگا کر آخر بھوت پکڑنے کے بعد استاد رضا خاں اس قدر مطمئن کیسے ہیں یا اللہ! یہ کیا طلسم ہے۔ میں نے ایک قدم ادھر بڑھایا اور شاید بقیہ اور ساتھیوں کے شعور بھی حادثہ کے عجوبہ پن سے مگو خلاصی کر کے معاملہ کی اصلیت معلوم کرنے کی جانب رجوع ہوئے۔ انہوں نے بھی بند و تیں سیدھی کر کے ایک ایک قدم بڑھایا۔ استنے میں استاد نے بھوت کو اور بھی زیادہ بے قابو کر کے اس کو اپنی گرفت میں کس لیا۔ میرا و نگمار و نگما اس ہیبت ناک شکل اور بھیانک سراپا دیکھ کر اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ میں ٹھٹھک گیا اور استاد مسکرا کر بولے "ارے گرو بھوت نہیں یہ آدمی کا بچہ ہے" مگر اس پر آدمی کے بچہ ہونے کا کسی پہلو سے اطلاق نہ ہوتا تھا کیچڑ میں لتھڑے ہونے کے سبب اسکی ہیئت بھوت کے اس حلیہ سے بھی زیادہ بھیانک تھی جو ہر ایک کے دماغ میں خیالی قسم کی شکل کے بھوت کی ہوا کرتی ہے۔ یا جو مخصوص صورت کی بیان کی جایا کرتی ہے۔

ہم تینوں استاد کے پاس دوڑ کر پہنچے۔ ادھر سے شور سن کر مسلم بھی بھاگتا ہوا آ گیا۔ بھوت کھڑا غرا رہا تھا۔ بل کھا رہا تھا۔ استاد اپنی قوی کلائیوں میں اسے سختی کے ساتھ جکڑے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ بولے اب دیکھتے کیا ہو کم بخت نے میرے کس بل توڑ دیئے۔ زور کرتے کراتے پگڑی اٹھا کر کس لو اسکے پنجے بڑے تیز ہیں۔ اس پاسی کو تو لہو لہان کر دیا "

صابر خاں نے پگڑی اٹھا کر بڑھائی۔ استاد نے کہا پہلے اس میں سے ایک پٹی پھاڑ کر ذرا اس کے منہ پر کس پیچھے کو گرہ تو لگا دو۔ اس کے دانت اور کچلیاں بڑی غضب کی ہیں۔ اگر کوئی پڑ گیا تو پارچے اڑا دے گا۔ پٹی پھاڑ کر اس کے ہونٹوں پر باندھی اور پیچھے لا کر گرہ لگا دی۔ بقیہ پگڑی سے پہلے گدّی چڑھے ہاتھ جوں کے توں گدّی چڑھے چڑھاتے مضبوطی کے ساتھ باندھ لئے اور احتیاطاً دونوں پنڈلیاں بھی کس لئے اور گٹھڑی سی بنا کر پا بدست دیگرے دست بدست دیگرے لٹکا کر، وہاں تک لاتے جہاں ہمارا بیل تانگہ کھڑا ہوا تھا۔ پاسی کے بھاگتے ہی مزدوروں میں بھاگڑ مچ گئی۔ حتیٰ کہ ہمارا گاڑیبان بھی تانگہ اور بیل چھوڑ کر فرار ہو گیا تھا۔ استاد نے بیل جوڑے اور بھوت کی گٹھڑی بنا کر تانگے میں ڈال لی۔ ہم چاروں پیدل ساتھ ہو گئے استاد نے گاڑی بانی کے فرائض انجام دیئے اور ہم اپنی جائے قیام کی جانب روانہ ہو گئے۔

جیوں ہی ہم بھیڑیا انسان لے کر گاؤں میں پہنچے بھاگڑ سی پڑ گئی۔ بڑی مشکل سے ہم لوگوں نے گاؤں کے سمجھدار آدمیوں کو اس بھوت کی حقیقت سے آگاہ کیا۔ پھر بھی افواہیں بہت رائج ہو چکی تھیں۔ استاد نے بہشتی کو بلوایا اور دو تین مشک پانی کی دھار سے اس کا غسل کرایا۔ غصہ بھی ٹھنڈا ہوا۔ اور بھیڑیئے انسان کی اصلی شکل بھی مٹی دھل کر نمودار ہوئی۔ حجام بلوا کر اور دو تین آدمی اس کے ساتھ لگا کر اس کے بال کٹوائے۔ سترہ اٹھارہ سولہ سترہ سال کی عمر کا نوجوان برآمد ہوا جس کے جسم کی تمام کھال گرہ کے چمڑے کی طرح کھردری اور سیاہی مائل مٹیالی تھی۔ ہاتھ پاؤں۔ پیٹ آدمی کے بجائے ریچھ۔ بندر سے مشابہ تھے۔ کچلیاں آدمی کی کچلیوں سے زیادہ بڑھی ہوئی اور نوک دار۔ منہ سے کف جاری اور آنکھوں میں بلا کی وحشت۔ ناخن ہنگے کر بڑھ کر

اور فرک دار ہو کر مڑ گئے تھے۔ اور اچھے خاصے درندے کے پنجوں کی شکل بن گئے تھے۔ جنھیں حجام بڑی مشکل سے تراش پایا۔ استاد نے عقیقہ کرا کر "اللہ دیا" نام رکھا۔ بھیڑیئے سے ملتی جلتی فوں نکالتا تھا۔ جس وقت کسی کسی وقت مبہم آواز نکالنے پر کلام کا دھوکہ ہو جاتا تھا اور گاؤں والے سمجھتے تھے آدمی کی بولی بول رہا ہے۔ شروع میں دو تین روز تو بڑے ہی غیظ میں رہا اور اگر اچھی طرح کس کر نہ بندھا ہوتا تو کود پھاند کر ہاتھ پاؤں توڑ لیتا یا پٹخ پٹخ کر سر پھوڑ لیتا۔ تیسرے روز جب چوپال کے نیچے سے بکریوں کا ریوڑ گزرا تو چپک سا گیا اور اچھل کر حملہ کرنا چاہا۔

اب ہم کو بھیڑیوں کے شکار میں مزہ آنے لگا تھا۔ ایک ایک آدمی رات کو ایک ایک گاؤں والے نوجوان کو ساتھ لے کر بھٹ پر جا بیٹھتا اور بالعموم شروع شب میں ہی ایک ایک دو دو بھیڑیئے مار کر آدھی رات تک پلٹ آتا۔ اور ہم چھ آدمیوں کی پارٹی آٹھ دس بھیڑیئے مار کر ہر شب پلٹتی تمام دن اللہ دیا سے کھیل کرتے۔ ہفتہ بھر کے اندر اللہ دیا اس حد تک مانوس ہو گیا کہ دونوں ہاتھوں اور دونوں پاؤں میں زنجیر ڈال دی گئی اور زنجیر کے اس گول کڑے پر کپڑا لپیٹ دیا گیا جو ہاتھوں اور پاؤں میں رہتا ہے۔ کودنا، اچھلنا، سر پٹخنا چھوڑ دیا جس کی وجہ سے ہر وقت نگرانی کرنی پڑتی تھی اور تمام جسم جکڑ کر رکھنا پڑتا تھا۔ پہلے روز کچھ پوریاں اور ترکاری سامنے رکھی مگر اس سے مکدر ہو کر منہ پھیر لیا اور تین چار دن تک کوئی چیز حتیٰ کہ گوشت بھی نہ کھایا پھر ہم نے ہرن اور خرگوش کا گوشت دیا تو تھوڑا سا کھانا شروع کیا۔

دیہات سے دور دراز کے لوگ تماشہ دیکھنے آتے رہے۔ تین روز گزر گئے مگر ابھی عورتوں کی آنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ حتیٰ کہ اس گاؤں کی بھی عورتیں نہ آتی تھیں۔ ہم نے دو روز آرام کیا۔ ان دو روز میں بھیڑیوں کے شکار کی نئی مہم کی اسکیم بنائی۔ کچھ پیشہ ور شکاری بھی دیکھنے آئے، اور ہماری سکیم میں شریک ہو گئے۔ تیسرے روز گاؤں کی لڑکیاں جمع ہو کر آئیں اور چند قدم کے فاصلے پر کھڑی ہو گئیں۔ چند منٹ کے بعد حسین چنچل، شوخ و شنگ چمپا جو گاؤں کی سب سے خوبصورت لڑکی سمجھی جاتی تھی غول سے نکل کر مسکراتی ہوئی آگے بڑھی۔ جب وہ قریب پہنچی تو اللہ دیا نے اوپر نگاہ اٹھائی اور ذرا سمٹ کر پاؤں پر پاؤں رکھا اور ستر پوشی کی۔ اور منہ پر بار بار ہاتھ پھیرا جیسے اپنا آپا سنبھالا۔ پھر چمپا کی جانب سلونے سلونے تیوروں سے دیکھا۔ بھیڑیئے انسان کی وحشی آنکھوں میں رس آ گیا اور محبت کے مرغولے ناچنے لگے۔ بڑی میٹھی نظروں سے چمپا کو بار بار سر سے پاؤں تک دیکھتا رہا۔ چمپا کھلکھلا کر ہنستی رہی اور لڑکیاں پیچھے سے مذاق کرتی رہیں۔ جب لڑکیاں چلنے لگیں تو جاتے وقت دور تک پیار بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

دوسرے روز پھر لڑکیاں جمع ہو کر آئیں۔ اور پھر بھیڑیئے انسان پر رومانی کیفیات طاری ہو گئیں۔ چمپا پھر آگے بڑھی اور دوپٹہ کی آڑ سے دودھ کی بالٹی نکال کر اس کی جانب بڑھائی۔ بالٹی کی جانب اللہ دیا لپکا۔ چمپا نے جھک کر بالٹی اور بڑھائی۔ ادھر سے اللہ دیا نے بالٹی کا کنڈا پکڑا اور چمپا کے نرم و نازک گداز ہاتھ سے اس کی کھردری موٹی انگلیاں چھو گئیں۔ اور جیسے اس کے جسم میں بجلی کی رو دوڑ گئی۔ آنکھوں میں نشہ سا آ گیا۔ اور چمپا پھر کھلکھلا کر ہنسی تو صریحاً اللہ دیا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی اور دودھ کی بالٹی اپنے ہاتھ سے سرکا کر غٹا غٹ پی گیا۔ اور پی کر بڑے محبت بھرے تیوروں سے چمپا کی جانب دیکھا۔

اس کی داخلی کیفیات کا اندازہ کر کے چمپا پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اللہ دیا کے تمام وجود کی درشتی اور وحشت ایک عجیب نرمی اور رومانٹک انداز میں بدل گئی۔ پھر بہت اہتمام کے ساتھ ستر پوشی کے لئے پاؤں پر پاؤں رکھا اور جیسے اپنے ارد گرد دیکھا گویا ستر پوشی کے لئے کپڑا تلاش کر رہا ہے۔

ہم کو بھیڑیوں کے استیصال کی مہم کے سلسلے میں ٹھہرے ہوئے تقریباً چھ ہفتے ہو چکے تھے۔ پیشہ ور شکاری بھی ہمارے ساتھ پوری طرح اشتراک کر رہے تھے اور مہم پوری تیزی سے جاری تھی۔ قریب دس بھیڑیئے روزانہ شکار کی اوسط تھی۔ اور اب تو ہمارا بھی جی لگ گیا تھا۔ تمام دن عورتیں مرد، بچے اللہ دیا سے کھیلتے اور چمپا سے تو اللہ دیا اس قدر مانوس ہو گیا تھا کہ وقتاً فوقتاً اس کی موجودگی میں زنجیریں کھول دی جاتیں مگر ہم کو قاعدہ کے مطابق بھیڑیا انسان کو گورنمنٹ کے حوالے کرنا تھا۔ چنانچہ ایک روز یہی کرنا پڑا۔

جسم پر اچھی طرح کڑوا تیل مل کر اور اپنے ہاتھوں سے چمپا نے بالوں میں کنگھی کر کے بیل تانگے پر سوار کر کے مجسٹریٹ ضلع کے پاس

یا۔ اور مجسٹریٹ ضلع نے اس کو پاگل خانے بھیج دیا۔ اللہ دسایا ہفتہ بھر پاگل خانے رہا اور وہاں ماہرین نے اس کی جبلت پر غور کرنے کے بعد یہ تجویز کیا کہ اس کی بہترین تربیت چمپا جیسی شبان زادی ہی کر سکتی ہے۔ اور پھر گاؤں واپس بھیج دیا۔

چھ مہینے بعد جب ہمارا گزر پیتی گنوے میں ہوا تو اللہ دیا کو دیکھ کر متحیر ہو گئے۔ اللہ دیا اس قدر شائستہ ہو گئے تھے کہ بکریوں کے ریوڑ اگو دیکھ کر قندیں نہ لگاتے تھے۔ اور گھنٹہ دو گھنٹے کے لئے زنجیر سے آزاد کر دیئے جاتے تھے۔ چمپا کا حکم تو اس شان سے مانتے تھے کہ کوئی سرکس کا گھوڑا اپنے رنگ ماسٹر کا کہنا بھی اس سے زیادہ قاعدہ کے ساتھ نہ مانتا ہو گا۔ اور اب چمپا نے اللہ دسایا کو تھوڑے بہت گھر کے اندر کے کام پر لگا لیا تھا۔ بھینسوں کا تھان صاف کرتے۔ گوبر تھاپتے۔ کبھی کبھی چکی پیتے اور جب چمپا قہقہہ لگاتی تو ہنسنے کی کوشش کرتے۔ وہ چمپا کی جانب دیکھ کر نشہ میں سرشار ہو جاتے اور کچھ مبہم سے الفاظ بھی نکالنے کی کوشش کرتے۔ ایک روز جب چمپا نے ایک لنگوٹی لگاتی تو چند منٹ تو پہنے رہے۔ مگر جب چمپا سامنے سے ہٹ گئی تو پھاڑ کر پھینک دی۔ اور جب وہ پھر آگئی تو جھینپ سے لپٹنے کی کوشش کرنے لگے۔

سال ختم ہوتے ہوتے چمپا نے اسے خوب اچھی طرح سدھا لیا۔ اور اپنے رومانٹک احساس سے زیادہ کام پر لگا لیا۔ اس طرح چمپا کے گھر والوں کو ایک بے تنخواہ کا ملازم یا بن داموں کا غلام مل گیا جو اپنی اجرت اس کی صورت دیکھ کر پوری کر لیا کرتا۔ چمپا اسے ایک فرمانبردار ٹٹو ایک وفادار کتے کی طرح چاہتی تھی۔ اس کے جذبات سے بھرپور فائدہ حاصل کرتی۔ اور اس کو زیادہ سے زیادہ کام پر لگاتی چلی جاتی۔

دیکھتے دیکھتے چمپا نے اللہ دیا کو بولی دی۔ اور پھر وہ زبان کی شکل اختیار کرنے لگی۔ ایک سیدھے سادے انسان کی طرح کام پر لگایا لباس کا شعور دیا۔ دو ٹانگوں پر چلنا سکھایا یہاں تک کہ گنڈاسا لے کر چارہ کاٹنا۔ بیلوں۔ بھینسوں۔ گایوں کی خدمت کرنا سکھایا۔ ایسا معلوم ہوا کہ بھیڑیا انسان بڑی تیزی سے ارتقا کی منازل طے کر کے دوش بدوش پہنچ جاتے گا اور مجھے تو ایسا محسوس ہوا کہ ایک وقت آئے گا جب چمپا اس کے متعلق سنجیدگی کے ساتھ سوچنے پر مجبور ہو گی اور شاید اس وحشی انسان کے رومان کا جواب دینے پر گی!

مہندر ناتھ

جہاں میں رہتا ہوں

میں دن رات یہی سوچتا رہتا ہوں کہ تمہیں کیا لکھوں؟ وہ کون سا مضمون ہے جس میں مصنفوں نے خامہ فرسائی نہ کی ہو۔ تم نے لکھا ہے کہ میں عورت کی محبت کے متعلق کیوں نہیں لکھتا؟ یہ قصّہ بہت پرانا ہو چکا ہے اور میں نے عورت کی محبت کے متعلق اتنا لکھا ہے کہ میرا جی خود ان باتوں سے اکتا گیا ہے لیکن خدا کے لئے مجھے اس طرف نہ دھکیلو۔ مجھے اپنے متعلق لکھنے دو ــــــ مجھے اپنی اُداسی، اپنے غم، اپنے دکھ کے متعلق لکھنے دو۔ شاید تم اس اداسی، اس غم، اس یاسیت میں ہندوستان کی اداس روح کی جھلک دیکھ سکو۔

یہ تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ میں کتنی دور سے چل کر آیا ہوں۔ کشمیر کی حسین وادیوں کا چکر کاٹ کر، پنجاب کے حسن سے مرعوب ہو کر، دہلی اور لکھنؤ کا چکر لگا کر اور پونا کے طریبے سے سیراب ہو کر بمبئی پہنچ گیا ہوں۔ آخر اتنا لمبا سفر کیوں؟ کیا اتنی پھیلی ہوئی دنیا میں میرے لئے کوئی جگہ نہ تھی کہ میں ہندوستان کے ایک کونے سے چل کر دوسرے کونے تک پہنچ گیا ہوں۔ لیکن پھر بھی مجھے سکون نہیں ملتا، راحت نصیب نہیں ہوتی، خوشی محسوس نہیں ہوتی ــــــ!

لوگوں نے بمبئی کی عمارتوں کی تعریف کی ہے۔ لوگوں نے سڑکوں، بسوں اور ریلوں کی تعریف کی ہے۔ مگر میں ان فلک بوس عمارتوں سے کبھی مرعوب نہیں ہُوا۔ مجھے ان ٹراموں اور بسوں میں بیٹھ کر کبھی خوشی محسوس نہیں ہوتی۔ ہاں! جب کبھی سمندر کے کنارے جاتا ہوں تو جی خوش ہو جاتا ہے یہ پھیلا ہوا وسیع سمندر، دور ــــــ بہت دور ــــــ ایک کشتی لہروں پر ہچکولے کھاتی ہوئی ایک نامعلوم منزل کی طرف رُخ کئے ہوئے چلی جاتی ہے اور پھر سمندر کے کنارے ناریل کے جھنڈ کے جھنڈ ــــــ ناریل کے درخت کافی لمبے ہوتے ہیں شاید سرو اور یوکلپٹس کے درختوں سے بھی لمبے اور اونچے ــــــ یہ درخت ہر وقت ہوا میں جھومتے ہیں۔ آپس میں ایک عجیب انداز سے سرگوشیاں کرتے ہیں اور رات کے وقت جب ہَوا ان درختوں میں سے ہو کر گزرتی ہے تو ایک عجیب سرسراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ پتے جھومتے ہیں۔ کسی جوان لڑکی کے پریشان بالوں کی طرح ــــــ چاند شرمائی ہوئی دلہن کی طرح ان درختوں کے پیچھے چھپا رہتا ہے۔ لیکن چاندنی میں کرنیں سمندر سے ہم آغوش ہوتی ہیں۔ لہروں کو چومتی ہیں۔ کھیلتی ہیں۔ لہریں بڑھتی ہیں۔ کھیلتی ہیں۔ ریت کے ذرّے بکھرتے ہیں۔ چمکتے ہیں۔ اور سمندر کی ٹھنڈی تازہ ہوا

ناریل کے درختوں میں سے گزرتی ہوتی ایک اداس نغمہ پیدا کرتی ہے۔ . . . . . .

بمبئی میں مجھے تین چیزیں پسند آتی ہیں۔ سمندر۔ ناریل کے درخت اور بمبئی کی ایکٹرس ——— اصل میں ان تینوں چیزوں سے بمبئی زندہ ہے۔ اگر ان تین چیزوں کو بمبئی سے نکال دیا جاتے تو بمبئی ——— بمبئی نہ رہے۔ شاید دہلی بن جائے یا لاہور یا ایک ایسا ہی معمولی سا شہر۔ میں یہاں کیوں آیا ہا؟ اس کی وجہ تم جانتے ہو۔ وہی روزگار کی تلاش۔ پیٹ کا مسئلہ بہت پرانا مسئلہ ہے مگر انسانوں نے ابھی تک اس مسئلے کا کوئی حل پیش نہیں کیا اور جب تک اس مسئلے کو حل نہ کیا جائے گا۔ یہ جنگ رہے گی۔ یہ بھوک رہے گی۔ اس وقت میری جیب میں صرف چار آنے ہیں لیکن مجھے روزی کی اتنی فکر نہیں۔ آخر کھانے کو تو کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتا ہے۔ کہیں نہ کہیں تمہارے جیسا دوست مل جاتا ہے اور پھر ہم کسی ہوٹل میں چلے جاتے ہیں اور کھانا کھاتے ہیں۔ میں کبھی کبھی اپنے دوستوں سے روپے اُدھار لیتا ہوں۔ لیکن یہ روپے کبھی واپس نہیں کرتا۔ کہو وہ یہ کمینگی ہے" ہوگی" بھوک ہی کمینگی سکھاتی ہے۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ سرمایہ دار مزدور کی روزی چھین کر عالی شان محل تیار کرتا ہے۔ کیا یہ کمینگی نہیں؟ جابر کمزور کو مار کر سلطنت کی بنیاد رکھتا ہے۔ کیا یہ کمینگی نہیں؟ حاکم محکوم کو کچل کر حکومت کرتا ہے' کیا یہ کمینگی نہیں؟ اور اگر میں اپنے مالدار دوستوں سے چند ٹکے قرض لیتا ہوں اور پھر واپس نہیں کرتا تو میں کمینہ ہو گیا؟ چھوڑو میاں تمہارے سماج کی عجیب قدریں ہیں۔ اور میں ہر گام' ہر قدم' ہر منٹ' ہر سکنڈ ان قدروں کو توڑنا چاہتا ہوں اور ان قدروں کا مضحکہ اڑانا چاہتا ہوں۔ چاہے تم مجھے کمینہ کہو یا گنوار۔

پہلے میں شیواجی پارک میں رہتا تھا۔ یہ جگہ ایکٹر اور ایکٹرسوں کی محبوب ترین جگہ ہے۔ شیواجی پارک کے چوک میں کھڑے ہو کر تم تمام ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو دیکھ سکتے ہو۔ سڑک کے ہر نکڑ پر کسی نہ کسی موڑ پر۔ حلوائی کی دکان پر یا ایرانی کی دکان پر تم ایکٹروں کو دیکھ لوگے۔ یہ لوگ اتنے عامیانہ انداز سے رہتے ہیں جتنا تم یا میں۔ یہاں آکر ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو دیکھنے کے لئے دل نہیں چاہتا۔ کیونکہ ہر روز تم انہیں دیکھ سکتے ہو اور جو چیز ہر روز دیکھی جاتے اس کی دلکشی جاتی رہتی ہے۔

تم نے یوں پرونا گیتا کی تصویر مانگی ہے۔ ارے بھئی چھوڑو ان ایکٹرسوں کو۔ کیوں درد سر مول لیتے ہو۔ بچاری اب بہت موٹی ہوگئی ہے کسی اور ایکٹرس کا نام لو۔ کوئی ہو بھی تو ——— شاید مہتاب تمہیں پسند آتے۔ میری نگاہوں میں وہی عورت ہے جسے ہیروئن کہا جا سکتا ہے باقی تو پھول کر کپا ہو گئی ہیں۔ دراصل ہندوستان میں ایکٹرسیں اپنے جسموں کا خیال نہیں رکھتیں۔ ایک بار ایکٹرس بن گئی اور ہیروئن کا رول مل گیا تو بس لگیں موٹا ہونے۔ نہ کمر رہی نہ لچک۔ نہ آنکھوں میں شوخی۔ چہرے پر گوشت چڑھنے لگا کولہے اتنے پھیلے کہ ٹانگیں غائب۔ اور آخر پھیلتے پھیلتے مجسم کپا بن گئیں۔ اور اب بتاؤ۔ کیا کرو گے تم ان کا فوٹو لے کر۔ کل ہی میں نے 'METRO' کے سامنے ایک اشتہار دیکھا جس میں مغربی ناچنے والی لڑکیوں کی ٹانگیں دکھائی گئی تھیں۔ آہ! کیا ٹانگیں تھیں۔ کتنی سڈول۔ جیسے سانچے میں ڈھلی ہوئی ——— کتنی خوبصورت ——— کتنی پُر فریب جیسے نگاہوں میں جذب ہو رہی ہیں۔ سارا ہندوستان چھان ڈالو۔ ایسی خوبصورت ٹانگیں نہ ملیں گی۔ یہاں ان لوگوں سے رہنا سہنا سیکھو۔ ان لوگوں سے پوچھو کہ خوبصورتی کس چیز کا نام ہے؟ ان لوگوں سے پوچھو کہ خوبصورت ٹانگیں کیسے تیار ہوتی ہیں؟ سڈول بازو کہاں سے ملتے ہیں؟ پر کروٹ CUTE یہ حسین۔ جوان۔ خوبصورت CUTE جو عورت کی خوبصورتی کی روح ہوتی ہے۔ کہاں سے آتی ہے؟ کس طرح بنتی ہے؟ اس میں شرمانے کی کوئی بات نہیں۔ تم کہو گے کہ ہندوستان ایک غریب ملک ہے۔ ان لوگوں میں اتنی توفیق کہاں جو وہ اپنے جسموں کا خیال رکھیں؟ لیکن ان ایکٹرسوں کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ یہ تو غریب نہیں یہ تو ہزاروں روپے کماتی ہیں۔ رونا تو اس بات کا ہے کہ انہیں بھی خوبصورتی کا احساس نہیں۔ ہماری عورتیں تو پھول کر کپا ہونا جانتی ہیں اور جب پھول کر کپا ہو گئیں تو سمجھ لو 'نروان' حاصل کر لیا۔

اور جہاں کہیں خوبصورت عورت نظر آتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو اپنی ٹانگوں کو اتنا چھپا کر رکھتی ہے کہ دنیا والوں کی نظریں اُدھر نہ جا سکیں ہمیں تو زندہ رہنے کی بھی تمیز نہیں۔ جمالیات کا پاس نہیں۔ ہمیں ان لوگوں سے کچھ سیکھنا چاہیئے۔

ارے بھائی "پردیتما" کا ذکر کرنے میں ادھر اُدھر بہک گیا اور ہالی وڈ کی خوبصورت ٹانگوں کا ذکر کرنے لگا۔ اگر تم واقعی ان خوبصورت ایکٹرسوں سے ملنے کے لئے اتنے بیتاب ہو رہے ہو تو سیدھے بمبئی چلے جاؤ۔ میں بمبئی کی مشہور ایکٹرسوں سے تمہارا تعارف کرا دوں گا۔ یہ لوگ بھی شہرت کے اتنے بھوکے ہیں جتنے ہم یا تم۔ یہ بھی ہماری طرح انسان ہیں۔ میں یوں ہی ایکٹرسوں کے جھمیلے میں پھنس گیا۔ کر رہا تھا ذکر اپنا۔ بیچ میں بچاری ایکٹرس آگئی تم نے میرے مکان کا پتہ پوچھا ہے۔ میں تمہیں کیا بتاؤں کہ کہاں رہتا ہوں؟ میں پہلے شیواجی پارک میں رہتا تھا۔ وہاں سے کیوں چلا آیا؟ اس کی وجہ تمہیں بتاتا ہوں۔ میں ایک دوست کے پاس قیام پذیر تھا۔ آج کل کسی کو دوست بنانا اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ دشمن ——— میرا دوست جس کا نام تم "R" رکھ لو۔ ایک نہایت ہی پہلوان قسم کا انسان ہے۔ جسم دیکھو تو جی پھڑک اٹھے۔ ورزش کا بہت شوقین ——— اکثر دن رات ورزش کرتا ہے۔ ہر وقت جسم کو مضبوط اور توانا بنانے کے خواب دیکھتا ہے۔ دراصل اس کا خواب حقیقت بن چکا ہے۔ بچارے میں صرف ایک خامی ہے کہ وہ عورت کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتا اور اگر میں کبھی کسی عورت کی طرف دیکھتا ہوں تو اکثر وہ اس فعل کو برا مانتا ہے کبھی کبھی میں خیال کرتا ہوں کہ میرے دوست کا نظریہ درست ہے۔ آخر یوں ہی اپنے دل و دماغ کو خراب کرنے سے کیا فائدہ؟ ہر وقت عورت کے متعلق سوچنے سے کیا حاصل؟ بہتر یہ ہے کہ ورزش کی جائے۔ ڈنڑ پیلے جائیں۔ من یا دو من پتھر ہر روز اٹھایا جائے اور جب انسان پتھر اٹھا اٹھا کر تھک جائے تو سمندر کے کنارے سیر کرنے چلا جائے اور سمندر کی لہروں کو تکتا رہے۔ جہاں تک نظر جاتی ہے پانی ہی پانی! یا لہریں ہی لہریں ——— دور ——— نظروں سے دور ——— سمندر اور آسمان آپس میں بغل گیر ہوتے ہیں۔ سورج اپنی کرنوں کو سمیٹ کر سمندر کو چومتا ہے اور آخر نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخی۔ آسمان پر بھاگتے ہوئے بادل۔ اور ٹھنڈی تازہ۔ زندہ ہوا فراٹے بھرتی ہوئی اور ناریل کے درخت اور ان کی سوندھی سوندھی خوشبو ——— ان کو چھوڑ کر عورت کے پیچھے بھاگنا حماقت ہے' سراسر حماقت ہے۔

اگر تم میرے دوست کو دیکھ لو تو یہی کہو گے کہ کتنا اچھا حسین تراشا ہوا بُت ہے۔ بالکل یونانی مجسمے کی طرح حسین اور خوبصورت۔ اس کی آنکھوں میں سرسبز گھاس کی نیلاہٹ اور اس کے رخساروں کی رنگت سیبوں کی طرح سُرخ۔ اگر تم اس کے قریب بیٹھو تو اس کے جسم سے ایک ہلکی ہلکی صحت مندانہ خوشبو نکلتی ہے جو مکھن' ٹماٹر دودھ دہی کھانے سے پیدا ہوتی ہے ——— عورتیں میرے دوست کی طرف دیکھتی ہیں ان کی نگاہوں میں تعریف ہوتی ہے۔ وہ سوچتی ہیں کہ یہ بازو اتنے مڈول کیوں ہیں؟ اس کی آنکھوں میں اتنی چمک کیوں ہے؟ اس کا جسم اتنا متناسب کیوں ہے؟ لیکن میرا دوست عورت کو دیکھنا نہیں چاہتا۔ نہ جانے اسے عورت سے کیوں چڑ ہے؟ اور جب عورت ایک حقیقت ہے تو حقیقت سے منہ موڑنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ صرف ورزش کرنا اور گھی کھانا اور ایک خوبصورت جسم بنانا ہی زندگی نہیں ہو سکتا۔

میری طرف دیکھو۔ میں ورزش بھی کرتا ہوں اور صحت مند بھی رہنا چاہتا ہوں۔ لیکن میں صرف ۳۵ × ۴۲ بنتا نہیں چاہتا۔ زندگی میں کچھ اور بھی کرنا چاہتا ہوں۔ مثال کے طور پر میں اس لڑکی کو دیکھنا چاہتا ہوں جو اس بالکونی میں کھڑی رہتی ہے۔ کیا تم نے اس لڑکی کی طرف دیکھا؟ دیکھا ہو گا' ضرور دیکھا ہو گا۔ میں نے تمہیں اکثر دیکھا ہے کہ تم اپنے باغ میں چلے جاتے ہو اور ریشمی شبنمی گھاس پر' ایک سفید چادر بچھا دیتے ہو اور اس چادر پر لیٹ جاتے ہو۔ چاند آکاش پر مسکراتا ہے اور اس کی روپہلی کرنوں میں تم نہاتے ہو۔ ٹھنڈی اور برفانی کرنیں۔ گھنٹوں تک تم ان کرنوں میں نہاتے رہتے ہو۔ پھولوں کی خوشبو سے اپنے جسم کو بھگو لیتے ہو اور بڑی بڑی گھاس کو چومتے رہتے ہو۔ یہ تم کیوں کرتے ہو؟ کیا تم نے اس لڑکی کی طرف نہیں دیکھا؟ وہ بھی تو چاند کا ٹکڑا ہے۔ اس کے جسم سے بھی خوشبو نکلتی ہے۔ بہت ہی پیاری اور بھینی بھینی بالکل اس چاند کی طرح خوبصورت اور حسین ——— کیا تمہارے دل میں چاند کو چھونے کی خواہش پیدا ہوئی ہو گی۔ چاند تو خوشی اور مسرت کا منبع اعظم ہے۔ میں بھی اپنے چاند کو چھونا چاہتا ہوں۔ اسی خوشی میں نہانا چاہتا ہوں۔ اس مسرت کو اپنانا چاہتا ہوں۔ اسی لڑکی کے قریب سے گزرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ اسے میرے وجود کا علم

ہو جائے، تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ جو شخص ہر روز اس کی بالکونی کے نیچے سے گذرتا ہے اسے پسند کرتا ہے۔ اس عمل میں برائی کی بات کوئی نہیں یہ تو بالکل ایک ذہنی خواہش ہے

اور پھر میرے دوست کو ایک لانبے بالوں والی لڑکی سے سخت نفرت ہے۔ اگر وہ تمہیں پسند کرتی تو اس میں کیا ہرج ہے۔ اور اگر وہ ایک دن تمہیں دیکھنے کے لئے تمہارے کمرے میں چلی آئی تو اس میں غصہ ہونے کی کونسی بات تھی؟ اسے گھر سے نکلنے میں کون سی دانشمندی تھی! کیا اس حرکت کی لوگ تعریف کریں گے؟ کیا یہ اخلاق کا بہترین نمونہ ہے؟ تم نے اس قسم کی حرکتیں کر کے اس کی خواہشوں کو کچل ڈالا، خوشی کے سرچشمے کو خشک کر دیا۔ وہ آج کل اُداس اور غمگین کیوں نظر آتی ہے؟ اس کے رخسار آج کل کیوں زرد ہیں؟ وہ کیوں کھوئی کھوئی اور مغموم سی رہتی ہے؟ تم نے ورزش کی اور مکھن لگی کھا کر آرام کی نیند سو گئے لیکن اس کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی اور بچاری سُوکھ کر کانٹا ہو گئی ہیں اس قسم کی اخلاقی قدروں کو پسند نہیں کرتا۔ میں جانتا ہوں جب تمہیں عورت کی ضرورت پڑتی ہے تو تم کیا کرتے ہو؟ تم ٹھنڈا پانی پیتے ہو اور ٹھنڈے پانی کے ٹب میں نہاتے ہو۔ یہ کب تک کرتے رہو گے؟ اور اگر دنیا کے سب لوگ اسی فارمولے پر عمل کرنے لگیں تو زندگی بے کیف اور بے رنگ ہو کر رہ جائے۔

تو ہاں! میرے کہنے کا یہ مطلب تھا کہ ایک دن ایک لڑکی میرے دوست کے کمرے میں آئی۔ میں بھی وہیں موجود تھا' لڑکی کو دیکھ کر میرے دوست کو غصہ آگیا۔ اس نے لڑکی کو گالی دی' بُرا بھلا کہا ——— کہ وہ طوائف ہے' وہ ایک بدمعاش عورت ہے۔ لڑکی بچاری تکتی رہ گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لڑکی نے نیا نیا دھندا شروع کیا تھا اور وہ ہم لوگوں سے دوستی کرنے آئی تھی اور چاہتی تھی کہ ہم لوگوں کو وہ اچھی لگے اور پسند آئے۔ اس سے پہلے وہ ایک لونڈے سے محبت کر چکی تھی اور اب وہ میری طرف جھک گئی مگر میرے دوست نے لڑکی کی بے عزتی کی اور گھر سے نکال دیا اور میں دیر تک اس واقعہ پر غور کرتا رہا۔ اگر میرا دوست ان پڑھ ہوتا تو شاید میں اسے معاف کر دیتا۔ لیکن جو شخص پڑھا لکھا ہو اور پھر ایک طوائف کو گالی دے کہ وہ کیوں پیشہ کراتی ہے' وہ کیوں اپنے جسم کو بیچتی ہے تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ شخص زندگی کے بنیادی مسئلوں کو نہیں سمجھتا' اور اگر سمجھتا ہے تو اپنے اصولوں کی خاطر' ایک ایسی عورت پر وار کرتا ہے جو نہتی ہے' اکیلی ہے' جس کا وارث کوئی نہیں' جس کی بے عزتی کی ذمہ دار سماج ہے' گورنمنٹ ہے' موجودہ سامراج ہے۔

طوائف کا مسئلہ ——— طوائفوں کو گالی دینے سے حل نہ ہو گا۔ بلکہ عورتوں کو تعلیم دینے سے' عورتوں کی بھوک مٹانے سے' عورتوں کو نوکری دینے سے' عورتوں کے لئے کام مہیا کرنے سے' عورتوں کو آزادی دینے سے اور عورت کے اقتصادی مسئلوں کو حل کرنے سے ہو گا۔ جب تک یہ کام حکومت نہ کرے گی طوائفیں رہیں گی۔ اور آج بھی وہ واقعہ مجھے نہیں بھولتا۔ مجھے معلوم ہوتا ہے اس دن اس لڑکی کی بے عزتی نہیں ہوئی تھی بلکہ میری بہن کی بے عزتی ہوئی تھی۔ اس میرے دوست نے اس لڑکی کی بے عزتی کر کے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ مجھے بھی اس گھر میں نہیں رہنا چاہئے۔ ہو سکتا ہے کہ میں بھی ایک دن اسی طرح اس گھر سے نکالا جاؤں۔ اس لڑکی نے جن قہر آلود نظروں سے میرے دوست کی طرف دیکھا' اس سے صاف عیاں تھا کہ اگر وہ مرد ہوتی تو اسے تھپڑ لگا کر اس کے ہوش ٹھکانے لگا دیتی۔ وہ کون شخص ہے جو اچھی زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا۔ آخر اس لڑکی کو کیا غرض تھی کہ وہ اپنا جسم راہگیروں کے ہاتھ بیچتی پھرے۔ کیا اس کے سینے کے ایک گوشے میں یہ تمنا نہ تھی کہ اسے ایک ایسا شوہر خاوند ملے جو خوبصورت ہو، جو نیک ہو، جو کماتا ہو اور جو اس سے محبت کرتا ہو۔ اور اگر زندگی میں یہ چیزیں میسر نہ ہو سکیں اور بھوک اور فاقوں سے نڈھال ہو کر اپنے آپ کو بیچنا پڑے تو اس لڑکی کا کیا قصور! وہ اداس شام مجھے کبھی نہیں بھولتی۔ وہ گالیاں ابھی تک میرے ذہن پر مرتسم ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ گالی میرے سینے میں ایک زخم پیدا کر گئی ہے۔ اس دن کے بعد میں اپنے دوست کے گھر سے چلا آیا۔

آج کل ماہم میں رہتا ہوں۔ سمرسٹ کا ماہیم نہیں، ہنٹر کا ماہیم نہیں بلکہ شیواجی پارک سے ایک اسٹیشن آگے۔ یہ جگہ مجھے بہت پسند ہے۔ اس جگہ نے میری اداسی میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ میرے گھر کے سامنے ناریل کے درخت ایستادہ ہیں۔ یہ درخت ہوا میں جھومتے ہیں۔ ہوا ناریل کے

بتوں سے کھیلتی ہوئی آگے نکل جاتی ہے۔ میں اکثر بالکونی میں کھڑا رہتا ہوں اور ادھر ادھر دیکھتا رہتا ہوں۔ اکثر لوگ میری طرف اشارہ کرکے کہتے ہیں کہ یہ لڑکا یہاں کیوں کھڑا رہتا ہے، کیا یہ پاگل ہے؟ کیا اس کا دماغ ٹھیک نہیں ہے؟ اور میں ان کی طرف اس طرح دیکھتا ہوں جیسے میں ان کی ہر بات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں، جیسے میں ان کے دل کی ویرانی، ان کی بے بسی، ان کی لاچاری کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ لیکن میں نے انہیں بتانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ میرے مکان کے سامنے ایک ایکٹر کا مکان ہے۔ میں اکثر ایک خوبصورت لڑکی کو کمرے میں ادھر ادھر پھرتے دیکھتا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ پہلے یہ لڑکی ایکسٹرا EXTRA وغیرہ کا کام کرتی تھی پھر اس ایکٹر کو پسند آگئی اور اب اس نے اسے گھر کی چار دیواری میں قید کر دیا ہے۔ بمبئی میں عام طور پر لوگ ایکٹرسوں سے شادیاں کرتے ہیں اور پھر اپنی بیویوں کو گھر کی چار دیواری میں بند کر دیتے ہیں۔ اکثر ان لڑکیوں نے آزاد زندگی بسر کی ہے۔ ایک انتہا سے گذر کر دوسری انتہا تک پہنچ جاتی ہیں۔ کہاں وہ پہلے کھلم کھلا ہر مرد سے مل سکتی تھیں لیکن اب وہ کسی غیر مرد کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتیں۔ نتیجہ بے بسی، ایک یاسیت ایک ڈر جو ہمیشہ ان کے اردگرد چکر لگاتا رہتا ہے۔ مبادا ان کا مرد انہیں کسی غیر مرد سے باتیں کرتے نہ دیکھ لے، اور ان کا پھر وہی حشر نہ ہو جائے جس سے اکتا کر انہوں نے اس زندگی کو قبول کیا تھا۔ لیکن ازدواجی زندگی کے چند سال بعد انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اس زندگی میں اتنا ہی زہر ہے، اتنی ہی تلخی ہے، اتنی ہی اداسی ہے جتنی کہ ان کی زندگی میں پہلے تھی۔ کبھی کبھی سامنے والے ایکٹر کی بیوی میری طرف جھانک کر دیکھتی ہے۔ آنکھوں میں بے پناہ اداسی ہے، چہرے پر ڈر کے آثار ہیں اور زندگی میں حسرت اور غم کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ہوا زور زور سے چلتی ہے، کھڑکی کے پردے ہلتے ہیں، آنکھیں جھکتی ہیں، لمحہ بھر کے لئے، اور پھر تاریکی چھا جاتی ہے۔ میرے مکان کے نیچے اکثر گندگی کا انبار لگا رہتا ہے۔ کہتے ہیں بمبئی نہایت صاف جگہ ہے۔ اگر کبھی ماہم آؤ تو تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ کہ ماہم لاہور کی طرح گندا ترین علاقہ ہے۔ مکان کے بائیں طرف دھوبی گھاٹ ہے جہاں دن بھر دھوبی کپڑے دھوتے ہیں۔ رسیوں پر طرح طرح کے فراک لٹکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ سرخ فراک دیکھو، کسی جوان لڑکی کا ہوگا۔ وہ سفید فراک دیکھو، یہ کتنا لمبا فراک ہے کسی بڑھیا کا ہوگا۔ رنگ برنگ کی ساڑھیاں، پاجامے، قمیصیں، دھوتیاں، ٹائیاں، انڈرویر، چادریں جا بجا لٹکی ہوئی نظر آئیں گی۔ گلی کے قریب ہی ناریل کا درخت گرا پڑا ہے۔ چند دن ہوئے ہوا بہت زور سے چلی تھی جس کی وجہ سے ناریل کا درخت گر گیا تھا۔ بالکونی کے سامنے ایک چھوٹا سا مندر دکھائی دیتا ہے، دراصل یہ مندر نہیں ہے۔ بمبئی میں بہت کم مندر ہیں۔ یہاں گوردوارے اور مسجدیں کم دکھائی دیتی ہیں۔ یہاں گرجے زیادہ نظر آتے ہیں۔ قربان! شاید یہاں کے ہندوؤں کو مندر کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی تو انہوں نے ایک گڑھا کھود کر اس میں ایک پتھر رکھ دیا ہے اور اردگرد ٹین کی چادریں لگا دی ہیں۔ عورتیں صبح سویرے آتی ہیں اور پتھر کی پوجا کرتی ہیں۔ چند دن ہوئے ناریل کا درخت اس پتھر پر گر پڑا تھا۔ میرا مطلب ہے اس خدا پر۔ لیکن درخت بھاری تھا خدا کچھ نہ کر سکا، بچارا درخت کے بوجھ تلے دب گیا۔ آج کل جنگ کا زمانہ ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو کھانے پینے کے لئے کافی مل جاتا ہے۔ نہیں تو اسی بات پر ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ ہندو کہہ سکتے تھے کہ مسلمانوں نے جان بوجھ کر درخت کو گرایا ہے تاکہ ہندوؤں کے پرماتما کی بے عزتی ہو۔ لیکن آج کل ان مسئلوں کو کون پوچھتا ہے ـــــ جب پیٹ بھرا ہو تو خدا بھی یاد نہیں آتا۔ مذہب ـــــ بچارا ـــــ!

میرا فلیٹ سیکنڈ فلور پر ہے اس لئے جب کبھی بالکونی میں کھڑا ہوتا ہوں تو اردگرد کے مکانوں کو اچھی طرح دیکھ سکتا ہوں۔ مکان کے دائیں طرف ایک گجراتی رہتا ہے۔ گجراتی بچارا بوڑھا ہے لیکن اس کی بیوی جوان ہے، اگر خوبصورت ہوتی تو میں ضرور اس سے عشق کرتا۔ بچاری نہایت ہی بدصورت ہے۔ کاش اس کے دانت باہر نکلے ہوئے نہ ہوتے تو شاید مجھے پسند آجاتی، اکثر وہ پھولوں کا گجرا اپنے جوڑے کے اردگرد باندھتی ہے یہاں کی عورتوں کو پھولوں سے بہت رغبت ہے۔ معلوم ہوتا ہے عورت جتنی زیادہ بدصورت ہوتی ہے اتنی ہی اسے پھولوں سے محبت ہوتی ہے۔ یہاں تم ہر لڑکی کو، ہر عورت کو پھولوں سے لدی ہوئی پاؤ گے۔ عورت بیاہی ہوئی ہو یا کنواری لیکن پھول اس کی جان ہے، بغیر پھولوں کے

تمہیں یہاں کوئی عورت دکھائی نہ دے گی لیکن یہاں کے لوگ بدصورت ہیں، عورتیں اس سے بھی زیادہ بدصورت ہیں۔ صحت اچھی ہے لیکن چہرے کے خطوط، ان کی چال ڈھال، ان کا رہنا سہنا بالکل عجیب ہے۔ کم از کم مجھے تو بالکل پسند نہیں آیا۔ کاش بمبئی کی عورتیں پھولوں سے کم محبت کرتیں تو شاید ان کی خوبصورتی میں کچھ اضافہ ہو جاتا۔ جب ایک خوبصورت پھول کو دیکھنے کے بعد ایک بدنما چہرے پر نظر پڑتی ہے تو جی چاہتا ہے کہ دونوں کو سمندر میں غرق کر دیا جائے۔ بہرحال اس گجراتی عورت کو پھولوں سے محبت ہے۔ بڈھا گجراتی اکثر باہر رہتا ہے اور شام ہونے کے بعد گھر آتا ہے۔ عورت دن بھر چارپائی پر پڑی رہتی ہے، بالکل اوندھی، اور سرہانے پر منہ رکھ کر ٹانگوں کو دن بھر ہلاتی رہتی ہے اور آج کل گجراتی نے ایک نوکر رکھ لیا ہے جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے کہ گجراتی خود تو باہر رہتا ہے اور نوکر دن بھر گھر میں رہتا ہے۔ آج میں نے نوکر کو گجراتن کو چومتے ہوئے دیکھا۔ اس نے گجراتن کی کمر میں ہاتھ ڈال کر بستر پر لٹایا اور پھر دروازے کی چٹخنی بند کر دی۔ شام کے وقت گجراتن پھر باہر نکلی۔ آج اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی، اس کے حسن میں ناریل کی سوندھی سوندھی خوشبو تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہزاروں پھول کھلے ہوئے تھے۔ لیکن یہ خوشی جلدی ہی فنا ہو گئی۔ بڈھے گجراتی کو اس عشق کا علم ہو گیا اور اس نے نوکر کو گھر سے نکال دیا۔ آج پھر گجراتن کے لب سوکھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں وہی یاسیت ابھر آئی ہے، اس کی ہنسی میں اُداسی ہے، اس کی باتوں میں غم کی جھلک ہے۔ وہ اکثر بستر پر اوندھے منہ لیٹی رہتی ہے اور اس کی ٹانگیں ہلتی رہتی ہیں۔

تم کہتے ہو گے کہ میں پھر محبت کا قصہ لے بیٹھا۔ سچ کہوں تو بُرا تو نہ مناؤ گے ——— میں ہر طریقے سے یہ کوشش کرتا ہوں کہ عورت کے متعلق کچھ نہ سوچوں، عورت کے متعلق کچھ نہ لکھوں لیکن ہر بار جب لکھنے بیٹھتا ہوں عورت سامنے آ جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے بغیر افسانہ پھیکا رہے گا۔

لیکن آؤ۔ عورت کی دنیا سے تمہیں دور لے چلتا ہوں۔ میں تمہیں اپنے دوستوں سے متعارف کراتا ہوں۔ جس جگہ میں رہتا ہوں، یعنی جس فلیٹ میں رہتا ہوں وہ فلیٹ صرف ایک انسان کے رہنے کے لئے ہے لیکن آج کل اس فلیٹ میں پانچ انسان رہتے ہیں۔

میرے ساتھ ایک بنگالی نوجوان رہتا ہے، اس کا نام چٹرجی ہے، یہ بنگال کے ایک دور افتادہ گاؤں سے چل کر بمبئی آیا ہے تاکہ روزگار مل سکے اور وہ امن اور چین کی زندگی بسر کر سکے۔ چٹرجی کا رنگ سیاہ ہے۔ وہ نہایت ہی دبلا اور پتلا ہے۔ اس کی ماں تپ دق سے مر گئی تھی۔ شاید اس کے پھیپھڑے جسم میں تپدق کے جراثیم موجود ہیں۔ اس کے گال پچکے ہوئے ہیں، اس کی آنکھوں میں پریشانی جھلک رہتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ کھویا کھویا سا رہتا ہے۔ لیکن چٹرجی نہایت چالاک آدمی ہے ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے میں نے اسے کبھی بے کار نہیں دیکھا۔ لیکن حالت یہ ہے کہ آج تک اسے کوئی کام نہیں ملا۔ وہ بمبئی میں اس لئے آیا تھا کہ ایک کامیاب کیمرہ مین بن سکے اس کا بھائی فوٹو گرافر ہے اور اس نے فوٹو کھینچنے کا کام بھائی کی دکان پر سیکھا تھا۔ اس کے بعد بمبئی کی طرف رُخ کیا۔ وہ اردو اچھی طرح بول سکتا ہے یہ عجیب بات ہے کہ بنگالی ہو کر اردو بول لیتا ہے۔ لیکن وہ ہندی بھی جانتا ہے، ٹوٹی پھوٹی انگلش بھی بول لیتا ہے۔ اس کے پاس کوئی ڈگری نہیں ہے لیکن ایک عام گریجویٹ سے بہتر انگریزی بول سکتا ہے۔ ایک بار اسے فلم میں جگہ ملی، لیکن کام اچھا نہ کرنے کی وجہ سے نکال دیا گیا۔ اب وہ ڈائریکٹر بننا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ ایک دن پروڈیوسر بن کر دکھلائے گا۔ اس کے پاس کھانے کے لئے پیسے نہیں ہوتے۔ اکثر وہ ایک وقت کھانا کھاتا ہے۔ اس لئے اس کی صحت دن بدن کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ ایک بار اسے زکام ہو گیا اور ساتھ ہی بخار بھی۔ آگے ہی کیا تو انا تھا کہ زکام اور بخار نے اسے اور لاغر کر دیا۔ دو دن سے اس نے کچھ نہیں کھایا اس کی آنکھیں دھنس چکی ہیں۔ چہرہ زرد ہو چکا ہے اور جب وہ چلتا ہے تو اس کی ٹانگیں کانپتی ہیں۔ باتیں کرتے وقت اس کا سانس پھول جاتا ہے لیکن اس نے ابھی تک ہمت نہیں ہاری۔ وہ اب بھی کہتا ہے کہ وہ ایک دن پروڈیوسر ضرور بنے گا۔ وہ ایک دن فلم ضرور ڈائریکٹ کرے گا۔ کیا ہوا کہ اس کے پاس

پیسہ نہیں ۔ کیا ہوا وہ دن میں صرف ایک بار کھانا کھا سکتا ہے ۔ وہ فاقے کرے گا، وہ زندگی سے لڑے گا ۔ وہ فلمی دنیا کے ہر شخص سے جنگ کرے گا ۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ لوگ کس طرح پروڈیوسر بن جاتے ہیں ۔ بمبئی میں اگر کوئی پروڈیوسر بننا چاہتا ہو تو اسے چاہئیے کہ وہ کسی حسین خاتون کو پھانس لے، یا کوئی حسین خاتون اسے پھانس لے ۔ بس چند دنوں کے اندر وہ شخص پروڈیوسر بن جائے گا ۔ لیکن چڑچی خوبصورت نہ ہونے کے باوجود بھی پروڈیوسر بننا چاہتا ہے ۔ میں جانتا ہوں کہ کوئی سمجھدار عورت اس پر عاشق نہیں ہو سکتی ۔ اس سے عشق نہیں کر سکتی لیکن وہ اپنی دُھن کا پکا ہے ۔ اس کا ارادہ چٹان کی طرح مضبوط ہے ۔ اکثر وہ بمبئی کے اسٹوڈیو کا چکر لگا کر تھک جاتا ہے اور پھر تھک کر کہتا ہے کہ وہ اس زندگی سے اکتا گیا ہے، وہ کب تک ہاتھ پاؤں مارتا رہے، وہ کب تک جدوجہد کرے، وہ کب تک لوگوں کی گھڑکیاں سُنے اسے لوگوں سے نفرت ہو گئی ہے، اسے زندگی سے نفرت ہو گئی ہے، وہ خودکشی کرے گا ۔ جب کبھی وہ کرسی پر بیٹھ کر خودکشی کے متعلق سوچتا ہے تو اس کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر ایک عجیب سی ہنسی ہوتی ہے، وہ پھانسی میں نے آج تک کہیں نہیں دیکھی ۔ اس ہنسی میں کتنی شکستیں پنہاں ہوتی ہیں جو زندہ ہو کر اس کے لبوں پر ناچتی ہیں ۔ کائنات کا ہر ذرہ خاموش ہے ۔ بمبئی کا ہر سیٹھ زندہ ہے ۔ بمبئی کے ہر ہوٹل میں روشنی کے قمقمے روشن ہیں ۔ بمبئی کے ہر ہوٹل میں لوگ شراب پیتے ہیں، ڈانس کرتے ہیں، ہزاروں لاکھوں قمقموں کی روشنی پھیلتی ہے اور ہر طرف پھیلتی رہتی ہے ۔ ٹراموں، بسوں اور موٹروں کی آوازیں مدھم نہیں پڑتیں ۔ لیکن یہ شخص اس بے نور کمرے میں بیٹھ کر کیوں اُداس دکھائی دیتا ہے، اس کی آنکھوں میں کیوں مرنے کی تمنا ہے ۔ آخر اس اندھی جدوجہد کا کیا مقصد —— ؟ آج کل وہ کبھی کبھی کھانستا ہے، کیا اس کو تپ دق ہو گئی ہے ؟ کیا وہ زندگی میں کبھی ڈائریکٹر بن سکے گا ؟ کیا اس کی خواہش کبھی پروان چڑھے گی ؟

میرے ساتھی اکثر چڑچی کو چھیڑتے ہیں، اس سے مذاق کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ کب ڈائریکٹر بنو گے ؟ کب پروڈیوسر بنو گے ؟ یہ وہی اس کے ساتھی ہیں جو خود بھی بھوکے مرتے ہیں، لیکن چڑچی پر فقرے کسنے سے باز نہیں آتے اور جب زندگی میں اور کچھ نہیں کر سکتے تو سب مل کر چڑچی کو گالیاں دیتے ہیں، اسے گھر سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ محض اس لئے کہ اس کا کوئی والی وارث نہیں، محض اس لئے کہ اسکے پاس اتنے روپے نہیں ہوتے کہ وہ فلیٹ کے کرائے میں اپنا حصہ ادا کر سکے ۔ وہ اکثر دوسروں کا دستِ نگر رہتا ہے اور چڑچی ان سب کی گالیاں خاموشی سے سنتا ہے، وہ جانتا ہے کہ اگر وہ یہاں سے نکال دیا جائے تو وہ کہاں رات بسر کرے گا ؟ اس کا اور کوئی ٹھکانا نہیں بن سکتا وہ غصے میں آ کر خط لکھنے لگتا ہے ۔ کس کو ؟ شاید اپنے باپ کو جس نے اسے پیدا کیا ۔ شاید اپنی ماں کو جو کب کی مر چکی تھی یا اپنے بھائی کو جو ایک دور افتادہ گاؤں میں زندگی کے دن کاٹ رہا تھا ۔ خط لکھو، لکھتے جاؤ ۔ دنیا کے ناخداؤں کو خط لکھو، چرچل کو خط لکھو، ٹرومین کو خط لکھو کہ وہ تمہیں روپے بھیجے، دنیا کے ہر بڑے انسان کو خط لکھو کہ وہ تمہیں اس زندگی سے نجات دلا دے، تم دنیا کے ہر بڑے انسان سے پوچھو کہ تم کیوں فاقے کرتے ہو ؟ تم کیوں بھوکے مرتے ہو ؟ تمہیں کیوں سونے کے لئے جگہ نہیں ملتی ۔ لیکن خدا کے لئے خاموش نہ رہو ۔ دوستوں کی گالیاں نہ سُنو، تم اس ذلت کو برداشت نہ کرو ۔ یہ ذلت میرے دل میں آگ لگا دیتی ہے ۔ یہ سلوک میں برداشت نہیں کر سکتا اور کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ان سب لوگوں کو بالکونی سے نیچے پھینک دوں ۔ دنیا میں ہر شخص ہٹلر ہے، مسولینی ہے، کمینہ ہے، رذیل ہے ....

دنیا میں ایک ایسے نظام کی ضرورت ہے —— ٹھہرو! میں کمیونزم کا پرچار نہیں کرنا چاہتا ۔ میں کسی ازم کا پرچار نہیں کرنا چاہتا ۔ میں کہانی نہیں لکھ رہا ہوں ۔ میں کہانی لکھنا نہیں جانتا ۔ میری کہانی میں نہ پلاٹ ہوتا ہے نہ ماحول ۔ میں کردار نگاری کے معجزے نہیں دکھانا چاہتا ۔ میں رنگین عبارت نہیں لکھ سکتا، میں اردو ادب کی خدمت نہیں کرنا چاہتا ۔ میری تشبیہیں نئی نہیں ہوتیں، میں غلط محاورے لکھتا ہوں، میری نثر میں خوبصورت اسٹائل کا مالک نہیں ہوں ۔ میں مولیساں اور زولا بننا نہیں چاہتا ۔ میں شہرت کا قائل نہیں —— میرے پاس اس وقت صرف چار آنے ہیں ۔ صرف چار آنے ۔ لیکن میں جو کچھ بھی کہوں گا صاف صاف کہوں گا ۔ میں وہ زبان لکھنا چاہتا ہوں جو ہر شخص کی سمجھ میں آ جائے،

میں وہ نظام چاہتا ہوں جس میں ہر شخص کو روٹی ملے۔ کپڑا ملے ایک گھر ملے۔ میں انسانیت کا قائل ہوں میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس دنیا میں اتنی کمینگی کیوں ہے۔ اتنی بے کاری کیوں ہے؟ اتنی بھوک کیوں ہے؟ اس کا جواب تم کیا دو گے، انسانی خداؤں کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔

خیر ——— ان سے ملو۔ ان کا نام ہری چند ہے۔ یو۔پی ان کا دیس ہے۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے، ہری چند اپنے مالدار چچا کے ساتھ سٹہ کھیلتا تھا لیکن جوں ہی جنگ شروع ہوئی اس کا چچا سب کچھ سٹے میں ہار گیا اور بچارے ہری چند کو نوکری کی تلاش میں بمبئی آنا پڑا۔ یہاں کچھ عرصہ سرکاری ڈپو میں کام کرتا رہا۔ لیکن ڈپو کی نوکری موافق نہ آئی۔ نوکری چھوڑ دی، کسی نے کہا کہ تم ایکٹر بن سکتے ہو۔ بس پھر کیا تھا، ایکٹر بننے کا جنون سر پر سوار ہو گیا۔ بمبئی کی آدھی آبادی ایکٹر بننے کی تمنا کرتے کرتے مر جاتی ہے۔ بچارے ہری کو بھی یہی جنون سوار ہے۔ کاش اسے اصلیت سے آگاہ کر دیا جاتا۔ مگر انسان اپنے آپ کو دھوکا دینا چاہتا ہے۔ وہ اصلیت کا کبھی سامنا کرنا نہیں چاہتا۔ آج کل دن بھر میں بیس بار کنگھی کرتا ہے۔ آئینہ ہر وقت اس کے سامنے رہتا ہے۔ غسل خانے میں دو دو گھنٹے صرف کرتا ہے اور جب نہا دھو کر نکلتا ہے تو کریم یا پاؤڈر کی آفت آتی ہے۔ تقریباً ایک ہفتہ میں AFGAN SNOW کی ایک شیشی ختم ہو جاتی ہے، وہ ہر روز دو گنی قیمت پر کپڑے دھلواتا ہے۔ آج کل وہ روپے گھر سے منگوا کر گزارہ کرتا ہے۔ لیکن کب تک ——— ؟ وہ پھر سٹہ کھیلنا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سرکاری نوکری کر کے کوئی انسان امیر نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک اچھے گھر میں رہنا چاہتا ہے، وہ ریڈیو خریدنا چاہتا ہے، وہ خوبصورت عورتوں سے محبت کرنا چاہتا ہے ——— بتاؤ ان سب باتوں میں کون سی بُری بات ہے؟ ہر عقلمند شخص ان ہی باتوں کی خواہش کرے گا۔ ہری چند جانتا ہے کہ ڈپو کی نوکری کر کے وہ ان چیزوں کو حاصل نہیں کر سکتا اس لئے وہ ایکٹر بننا چاہتا ہے کیونکہ آج کل ایک ایکٹر ہزاروں روپے کماتا ہے۔ وہ سٹہ کھیلنا چاہتا ہے کیونکہ سٹہ کھیلنے سے یا وہ امیر ہو جائے گا یا محض بھکاری۔ ہری چند زندگی سے جُوا کھیلنا چاہتا ہے۔ وہ جن حالات، جس ماحول میں رہتا ہے اس میں اسے رتی بھر خوشی نصیب نہیں ہوتی۔ دن بدن اس کا وزن کم ہو رہا ہے، سر کے بال جھڑ رہے ہیں، آنکھوں میں مایوسی کے آثار نمایاں ہیں۔ وہ کچھ تھکا تھکا سا معلوم پڑتا ہے۔ آج وہ طاقت کی دوا خرید کر لایا ہے۔ وہ دوائی کا استعمال کرے گا اور زندگی کی کشمکش جاری رکھے گا۔ دوائیوں کے استعمال سے انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ آخر کب تک؟ جس ہوٹل میں وہ کھانا کھاتا ہے، وہاں نہایت ہی خراب خوراک ملتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ ان مسلسل مصیبتوں کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ میں نے اس سے کئی بار کہا ہے کہ وہ پھر سے ڈپو میں نوکر ہو جائے مگر وہ ہمیشہ نفی میں جواب دیتا ہے اور شیشے کو سامنے رکھ کر مسکراتا ہے اور بے جان کھردرے بالوں میں کنگھی کرتا ہے اور زور زور سے چہرے پر کریم ملتا ہے اور کہتا ہے کہ میں آہستہ آہستہ مرنا نہیں چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ میں اب زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ روز رات کو بخار ہو جاتا ہے اور ہلکی ہلکی کھانسی ہو جاتی ہے لیکن میں ڈپو میں نوکری نہیں کر سکتا۔ وہ بامشقت قید ہے۔ میں اس قید کو برداشت نہیں کر سکتا۔ دیکھو! اس ٹرنک میں میری بی اے کی ڈگری ہے۔ اگر میں مر گیا تو (وہ پھر ہنستا ہے ایک کھسیانی ہنسی، جیسے وہ کبھی نہیں مرے گا) یہ ڈگری لکھنؤ یونیورسٹی کو واپس بھیج دینا۔ زیادہ عرصہ اپنے پاس نہ رکھنا ——— ڈگری کا کافی حصہ دیمک چاٹ گئی ہے اور باقی ——— ہے بھی کیا ———

میں اسے سمجھاتا ہوں کہ بھائی کوئی نوکری کر لو لیکن وہ بالکل نہیں سنتا اس دنیا میں عجیب انسانوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ہر طرف ابتری پھیلی ہوئی ہے اور ہر شخص ایک بہتر زندگی بسر کرنے کی فکر میں ہے۔ مگر وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں دنیا کی قسمت ہے، وہ چپ چاپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی شہرت، عزت اور عہدے کو برقرار رکھنے کے لئے انہیں پُرانے راستوں پر گامزن ہیں جن پر کئی صدیوں سے باپ دادا نے حکومت کی تھی۔

اور رگھبیر سے تعارف کرانا تو میں بھول ہی گیا۔ رگھبیر دن بھر باہر رہتا ہے اور رات کے تقریباً بارہ بجے گھر واپس آتا ہے۔ تم پوچھو گے

کہ وہ کیا کام کرتا ہے تو میں اس کا کچھ جواب نہیں دے سکتا۔ اس فلیٹ میں جو شخص رہتا ہے اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیا کام کرتا ہے بہر حال اس فلیٹ میں جو لوگ رہتے ہیں وہ کچھ کام نہیں کرتے، ہاں اوتار سنگھ کو چھوڑ کر۔ اس کا ذکر میں پھر کروں گا۔

رگھبیر کو تم نے نہیں دیکھا۔ نہایت ہی چھوٹے قد کا انسان ہے، دور سے دیکھو تو ایک کھلونے کی طرح دکھائی دے گا اور جب نزدیک سے دیکھو گے تو شاید تمہیں خوبصورت دکھائی نہ دے۔ اس کے بال بھورے ہیں۔ اس کا رنگ گورا ہے، اسے سفید کپڑے پہننے کا شوق ہے اور عورتیں اسے کھلونا سمجھ کر پیار کرتی ہیں۔ رگھبیر جب کبھی گھر آتا ہے تو اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ ہوتا ہے جس پر وہ شعر لکھتا رہتا ہے پہلے پہل کچھ گنگناتا ہے، پھر شعر لکھتا ہے۔ در اصل وہ شاعر نہیں ہے۔ وہ ایک فلمی شاعر ہے۔ شاعر اور فلمی شاعر میں جتنا فرق ہوتا ہے وہ تمہیں معلوم ہی ہوگا۔ رگھبیر ایک دلچسپ عاشق ہے، وہ ہر عورت سے عشق کر سکتا ہے بلکہ وہ ہر عورت سے عشق کرتا ہے اگر وہ کسی عورت کی طرف دیکھ لے اور اسے پسند آئے تو سمجھ لو رگھبیر کو اس لڑکی سے عشق ہو گیا۔ سڑک پر چلتے پھرتے، ٹرام یا بس میں چڑھتے اُترتے، گلی کے موڑ پر، ہوٹل، سینما، گارڈن ہر جگہ وہ لڑکیوں سے عشق کرتا ہے، وہ صرف لڑکی کی طرف دیکھتا ہے اور گنگناتا ہے "زندگی چاندسی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں"۔ آہ بھرتا ہے اپنی محبت کے قصے دوستوں کو سناتا ہے۔ من گھڑت فسانے سنانے میں وہ نہایت کامیاب انسان ہے۔ جس لڑکی سے وہ عشق کرتا ہے اس سے شادی کا وعدہ ضرور کرتا ہے۔ چند دنوں بعد عشق کا اُبال سرد پڑ جاتا ہے لیکن رگھبیر کی نگاہیں کسی اور لڑکی کو تلاش کر لیتی ہیں۔ آج کل اسے ایک بنگالن سے عشق ہو گیا ہے۔ رگھبیر کہتا ہے کہ وہ واقعی عشق کر رہا ہے، یہ سن کر ہم سب ہنس پڑتے ہیں۔ ہم سب اس کی محبت کی گہرائی کو جانتے ہیں۔ آج کل وہ ہر روز اپنی محبوبہ کو خط لکھتا ہے اور رات بھر جاگتا رہتا ہے۔ میں اکثر رگھبیر کی محبت کا مذاق اڑاتا ہوں لیکن وہ ہنس کر ٹال دیتا ہے۔ اس کی ہنسی میں واقعی کچھ یاسیت سی آگئی ہے۔ کیا واقعی رگھبیر بنگالن سے عشق کرتا ہے۔ رگھبیر کہتا ہے کہ بنگالن جس کا نام گیتا ہے شروع میں اس سے شادی کرنے پر تیار ہو گئی تھی۔ گیتا ایک نرتکی ہے، وہ ایک مشہور فلم اسٹار کے روپ میں کام کرتی ہے اور بیچارہ رگھبیر اس بار اس ٹروپ میں شامل ہو گیا اور بنگالن کے پیچھے ہندوستان کا چکر لگاتا رہا۔ لیکن جب یہ ٹروپ کلکتہ پہنچا تو اس بنگالن نے صاف جواب دے دیا۔ اس کے چاہنے والوں نے اصرار کیا کہ وہ کیوں ایک غریب آوارہ لونڈے سے عشق کر رہی ہے۔ ہماری طرف دیکھو، ان فلک بوس عمارتوں کو دیکھو، ان کاروں اور چمکتی ہوئی ہیرے کی مالاؤں کو دیکھو، وہ شاعر تمہیں کیا دے گا! فقط چند شعر اور کچھ نہیں۔ اگر تم اس سے شادی کروگی تو بھوکی مر جاؤگی، وہ کماتا ہی کیا ہے، وہ خود بھوکا ہے تمہیں کیا کھلائے گا؟ اور پھر وہ بنگالی نہیں ہے وہ پنجاب کی ایک نام نہاد ریاست کا باشندہ ہے، اپنے گھر رہو، اس کلکتہ میں رہو، یہاں ناچو گاؤ، لوگوں کو اُلّو بناؤ اور زندگی کے دن اس ہنسی خوشی میں بسر کرتی جاؤ۔ اور بیچارہ رگھبیر! جب سے وہ کلکتہ سے واپس آیا ہے اس کا حلیہ بگڑ گیا ہے، عورت کی بیوفائی نے اسے بُری طرح اُداس کر دیا ہے۔ اب وہ ہر روز شراب پیتا ہے اور رات کے بارہ بجے گھر آتا ہے اور اپنے مستقبل کے متعلق بہت پُر امید تھا لیکن آج کل اس کے حوصلے پست ہو گئے ہیں۔ اس کے دل کی ویرانی دن بدن بڑھتی جا رہی ہے آج وہ کہہ رہا تھا کہ وہ بمبئی میں نہیں رہ سکتا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ شہر کی لڑکیاں اتنی چالاک ہوتی ہیں۔ وہ شملہ کی خوبصورت وادی میں اپنا مسکن بنائے گا، وہ یہاں نہیں رہ سکتا۔ وہ شملہ کی ایک انجان، الھڑ لڑکی سے شادی کرے گا۔ تیل اور نمک کی دکان کھولے گا، اسے فلمی دنیا سے نفرت ہو گئی ہے، اسے شاعری سے نفرت ہو گئی ہے۔ وہ زندگی کو دوبارہ شملہ میں زندۂ جاوید کرے گا۔ وہ شملہ کے پہاڑوں کو بھول نہیں سکتا اور پہاڑوں پر پھیلی ہوئی دھند کو فراموش نہیں کر سکتا اور اس کے ذہن میں اس الھڑ لڑکی کے نقوش اُبھر آتے ہیں جس نے اسے شہر جانے سے ایک بار روکا تھا۔ لڑکی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور دھند چاروں طرف سے ان کی طرف بڑھ گئی تھی۔ لڑکی کافی عرصہ تک رگھبیر کی طرف دیکھتی رہی اور رگھبیر اسے بے یار و مددگار چھوڑ کر شہر چلا آیا اور اب وہ پھر واپس جانا چاہتا تھا۔ کیا وہ لڑکی اب بھی اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ شاید! کون کہہ سکتا ہے۔ کیا اس کی شادی نہ ہوگی

ہوگی کسی زمیندار کے ساتھ، کسی نمبردار کے ساتھ۔ ایسی حسین لڑکی کو کون کنواری رہنے دیتا ہے۔ شہری اور گاؤں کی زندگی میں کوئی فرق نہیں، دونوں میں جبر ہے، ہر جگہ ظلم ہے، ہر جگہ محبت کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے اور ظلم و استبداد کی پھیلی ہوئی سیاہی انسانوں کے دلوں کو اور سیاہ کر دیتی ہے۔ آج کل رگھبیر روتا ہے، شراب پیتا ہے اور شعر لکھتا ہے —— بچارہ رگھبیر ——!

اوتار سنگھ بڑی عجیب شخصیت کا مالک ہے۔ یہ ایک سرکاری ڈپو میں نوکر ہے۔ صبح ۶ بجے گھر سے نکل جاتا ہے اور شام کے ۸ بجے گھر آتا ہے۔ وہ ایک ایسے ڈپو میں نوکر ہے جہاں جتنا زیادہ کام کیا جائے اتنی زیادہ تنخواہ ملتی ہے۔ اور اس لئے اوتار سنگھ زیادہ سے زیادہ روپیہ کمانا چاہتا ہے۔ وہ پنجاب کے ایک مالدار جاٹ کا لڑکا ہے، وہ نہایت اچھا سوٹ پہنتا ہے، اور ہمیشہ ٹائی لگا کر دفتر جاتا ہے اوتار سنگھ کہتا ہے کہ اُسے آج کل ترقی ملنے والی ہے اور ترقی ملنے کی وجہ صرف اس کے صاف اور ستھرے کپڑے ہیں خاص کر اس کی نیلی ٹائی جو وہ عام طور سے پہنتا ہے۔ دفتر کا سپرنٹنڈنٹ اس سے بہت خوش ہے، اور ہمیشہ باقی کلرکوں کو لعنت ملامت کرتا ہے کہ تم کو بھی اس سردار کی طرح کپڑے پہن کر آنا چاہئے۔ اوتار سنگھ کو سکھ ازم پر یقین نہیں ہے وہ گوردوارے نہیں جاتا اور اکثر قینچی سے داڑھی بھی صاف کرتا ہے۔ لیکن اگر سکھوں کے متعلق کوئی مذاق کیا جائے تو وہ اسے بہت بُرا مانتا ہے۔ وہ سکھوں کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہیں کر سکتا۔ وہ آزاد خیال ہوتے ہوئے بھی سخت رجعت پسند ہے۔

آج کل وہ بھی زندگی سے تنگ آگیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسے ڈپو کی زندگی پسند نہیں، آخر کب تک آدمی دن رات کام کرے ڈپو کی کلرکی انسان کو غلام بنا دیتی ہے اور نوکری کتنی ذلیل ہے۔ پھاٹک سے اندر داخل ہونے کے لئے IDENTIFICATION CARD چاہئے۔ کارڈ دکھا کر اندر جانا پڑتا ہے، حاضری لگانی پڑتی ہے اور اگر کلرک کو —— اس کی تنخواہ سے پیسے کاٹ لئے جاتے ہیں یہ زندگی نہیں، دولت کی غلامی ہے، موت ہے اور پھر ان لمحوں میں کبھی بھی خوشی نصیب نہیں ہوتی۔ کبھی تو انسان جی بھر کر ہنس لے، کبھی کسی عورت کی طرف مسکرا کر دیکھ لے، یا عورت ہماری طرف ہنس کر دیکھ لے۔ میں کہتا ہوں کہ اس فلیٹ کے رہنے والوں میں اتنی جنسی بھوک ہے کہ تم ان کی باتیں سُن کر گھبرا جاؤ اور سوچتے رہو کہ یہ لوگ کس ملک کے باشندے ہیں؟ یہ انسان نہیں بھوت ہیں۔

تم نے بمبئی آنے کے لئے کہا ہے۔ آؤ بڑے شوق سے آؤ اور میرے پاس ٹھہرو۔ اگر بُرا نہ مانو تو میں تمہیں اپنے گھر کا نقشہ کھینچ دوں دوں تاکہ تمہیں میرے پاس پہنچنے میں کوئی تکلیف نہ ہو اور تم یونہی اِدھر اُدھر نہ بھٹکتے پھرو۔ اسٹیشن سے اترو تو بس میں بیٹھ کر شیواجی پارک کا ٹکٹ لو، اور پھر ماہم پوسٹ آفس کے سامنے ایک گلی ہے سیدھے اس گلی کی طرف مارچ کرو۔ جو دوسرا مکان ہے اس کی طرف نگاہ اٹھاؤ آشیانہ بلڈنگ کا نام پڑھ لینا، اور جوں ہی تم داخل ہوگے تمہیں ایک پاگل آدمی کا سامنا کرنا ہوگا۔ یہ انسان اکثر دروازے کے باہر پڑا رہتا ہے۔ لوگ اسے پاگل کہتے ہیں لیکن میں نے کبھی اسے کوئی ایسی حرکت کرتے نہیں دیکھا جس سے میں یہ سمجھ سکوں کہ یہ شخص پاگل ہے۔ اکثر یہ آوارہ پھرتا رہتا ہے، ایک پھٹی ہوئی قمیص پہنتا ہے۔ اس کے سر کے بال بکھرے رہتے ہیں اور ان میں مٹی کی تہہ جمی رہتی ہے۔ مسلسل فاقوں کی وجہ سے یہ انسان کافی دُبلا پتلا ہو گیا ہے۔ میں نے اسے کبھی بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اکثر یہ چپ چاپ لیٹا رہتا ہے اور جب لیٹے رہنے سے تنگ آجاتا ہے تو سر کو جھٹک کر چلنا شروع کر دیتا ہے کبھی پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے جیسے زندگی کا سرمایہ کہیں بھول آیا ہو۔ اس پاگل کے ساتھ تم ایک کتے کو دیکھو گے۔ کتا تمہیں دیکھ کر بھونکے گا اس کتے سے گھبرانا نہیں۔ یہ کتا ہر نووارد کو دیکھ کر بھونکتا ہے۔ اس کی سُرخ آنکھوں میں تم یاسیت کی جھلک پاؤ گے۔ اس کے جسم کو دیکھ کر آشیانہ بلڈنگ کے رہنے والوں کی بھوک کا اندازہ لگا سکو گے۔ صاف ظاہر ہے کہ جس گھر کا کتا بھوکا ہو وہاں کے رہنے والے خود کتنے بھوکے ہوں گے۔ یہ کتا ایک دو بار دیکھ کر تم سے گھل مل جائے گا اور پھر تمہیں دیکھ کر کبھی نہیں غرائے گا۔ پہلی منزل میں ایک میوزک ماسٹر رہتے ہیں، انہوں نے ایک طوائف کو پھانس رکھا ہے میں نے اس رنڈیا کو اکثر روتے ہوئے دیکھا ہے۔ اکثر یہ عورت سلاخوں والی کھڑکی میں بیٹھ کر اِدھر اُدھر جانے والے لوگوں کو پریشان نگاہوں سے دیکھتی رہتی ہے

مجھے معلوم نہیں کہ یہ میوزک ماسٹر اس لونڈیا کو کہاں سے لے آیا؟ میوزک ماسٹر کی شکل کسی بھٹیارے سے ملتی جلتی ہے، لیکن اس کے گھر کے باہر ایک موٹر کھڑی رہتی ہے۔ یہ موٹر اکثر بہر روز خراب ہو جاتی ہے۔ معلوم پڑتا ہے کہ موٹر اچھی طرح صاف نہیں کی جاتی، پٹرول کی کمی کی وجہ سے انجن خراب ہو گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود شام کے بعد میوزک ماسٹر اپنی خوبصورت بیوی کو کار میں بٹھا کر باہر لے جاتا ہے اور رات کے بارہ بجنے کے بعد دونوں واپس آتے ہیں۔ میں نے دونوں کو کبھی خوش نہیں دیکھا۔ وہ مسرت جو ازدواجی زندگی میں ہونا چاہئے، کبھی ان کے چہروں سے نمایاں نہ تھی، بلکہ ہر روز کمرے میں سے لڑائی جھگڑے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ میوزک ماسٹر کی بیوی زور زور سے چیختی ہے، چلاتی ہے، میوزک ماسٹر کو دھمکی دیتی ہے کہ یہاں سے چلی جائے گی، وہ یہاں نہ رہے گی۔ دونوں زور زور سے باتیں کرتے ہیں۔ لیکن دوسرے دن دونوں کو پھر اسی کمرے میں دیکھتا ہوں اور لڑکی پھر اسی کمرے کی کھڑکی میں بیٹھ کر لوگوں کی طرف دیکھتی ہے، معلوم نہیں کیوں ———؟

ذرا سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل آجائے گی۔ یہاں ذرا ٹھہر جاؤ۔ ذرا دم لے لو، یہاں ایک ہی آشیانے میں تمام ہندوستان نظر آئیگا۔ یہاں ایک کرسچین لڑکی رہتی ہے۔ یہ لڑکی ہے یا عورت ہے یا ماں یا کسی کی بیوی، اس کا مجھے علم نہیں۔ کہتے ہیں کہ اس کے تین بچے ہیں۔ یہ تینوں بچے سیڑھیوں پر کھیلتے رہتے ہیں اور یہ کرسچین لڑکی دروازے میں کھڑی ہو کر اپنے بچوں سے انگریزی میں باتیں کرتی ہے۔ اس لڑکی کا کیا نام ہے اس کا مجھے علم نہیں اور نام پوچھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بچاری کی بُری حالت ہے اگو رنگ سفید ہے لیکن جسم پہ گوشت نہیں، چہرے کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئی ہیں۔ اوپر والے جبڑے کے تین دانت آگے بڑھے ہوئے ہیں اور پنڈلیاں جو اکثر ننگی رہتی ہیں نہایت پتلی اور سڑی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ میں نے اس کے خاوند کو کبھی نہیں دیکھا یعنی میں نے اس گھر میں کسی مرد کو نہیں دیکھا۔ بہر حال کوئی مرد تو اس گھر میں آتا ہی ہو گا ورنہ یہ بچے کہاں سے آ گئے اور بچاری کرسچین لڑکی گذارہ کس طرح کرتی ہو گی۔ جب تم یہاں پہلی بار آؤ گے تو تم کرسچین لڑکی کو دروازے میں کھڑی پاؤ گے، وہ تمہاری طرف دیکھے گی اور پھر منہ موڑ لے گی وہ ہر روز کس کا انتظار کرتی ہے، اس کا مجھے علم نہیں لیکن اس کی آنکھوں میں اس کے آنے والے محبوب کا انتظار ضرور ہوتا ہے۔ وہ کب تک انتظار کرے گی میں کیا بتا سکتا ہوں۔ میں نے ہمیشہ اس لڑکی کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہے لیکن میں نے ہمیشہ اسے دروازے میں کھڑا دیکھا ہے۔

کرسچین لڑکی کے دروازے کے سامنے چند مدراسی عورتیں رہتی ہیں، یہاں ایک بیوہ عورت رہتی ہے جس کی بہت سی بدصورت لڑکیاں ہیں۔ لڑکیاں سب جوان ہیں، کاش ایسی لڑکیوں پر جوانی نہ آتی۔ وہ شباب ہی کیا جو تمہیں اپنی طرف نہ کھینچ سکے۔ وہ عورت ہی کیا جس کی طرف ایک نظر دیکھنے کے لئے جی نہ چاہے۔ عورت کے حسن میں کشش ہونا چاہئے۔ اگر تم اسے ایک بار دیکھ لو تو تمہیں یہ محسوس ہو جائے گا کہ تم ایک زندہ متحرک دائرے کے اندر کھڑے ہو۔ لیکن آشیانہ بلڈنگ میں حسن مردہ ہے، شباب عنقا ہے، زندگی جامد ہے، میں سمجھتا ہوں کہ زندگی حسن سے پیدا ہوتی ہے، خوبصورت چیز کو دیکھ کر خوبصورت بننے کو جی چاہتا ہے لیکن یہاں تو بدصورتی کا مقابلہ ہے، معلوم پڑتا ہے کہ لڑکیوں کی ماں بیوہ ہے اور اس نے اپنی بیوگی کے تمام قوانین اپنی لڑکیوں پر عائد کر رکھے ہیں۔ میں نے ان لڑکیوں کو کبھی مسکراتے نہیں دیکھا۔ گھر کے دروازے اکثر بند رہتے ہیں اور جب کبھی مدراسن کے گھر کا دروازہ کھلتا ہے تو اس میں ایک بیوہ کا چہرہ تمہیں گھورتا ہے۔ ایک چہرے پر نفرت کی جھریاں ہیں، لٹتے ہوئے شباب کے آخری لمحے، بیوگی کی تلخیاں، زندگی سے انتہائی نفرت اور ایک نہ مٹنے والی پیاس اور تشنگی کا اظہار جو مدراسن کی آنکھوں سے جھلکتا ہے۔ صرف مدراسن کی آنکھوں سے نہیں بلکہ اس کا پرتو تم ان جوان لڑکیوں کی آنکھوں میں بھی دیکھ سکتے ہو۔ صرف آنکھوں میں نہیں بلکہ اس نفرت، اس بھوک، اس تشنگی اور اس بیوگی کی تشکیل تم ان لڑکیوں میں دیکھ سکتے ہو۔ اکثر یہ لڑکیاں خاموش رہتی ہیں، اداس اور پریشان رہتی ہیں۔ ہم سب اکثر اپنے کمرے کی چابی ان مدراسنوں کو دے جاتے ہیں۔ اگر تم ان لڑکیوں کی جنسی بھوک کا اندازہ کرنا چاہو تو تم ایک دن کمرے کی چابی خود انہیں دینا تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ چابی لینے کے لئے کتنی بیقرار رہتی ہیں۔ اکثر وہ دروازے میں کھڑی رہتی ہیں اور جب تم سیڑھیاں طے کر کے نیچے اترو گے، تو ایک بدصورت چہرہ تمہاری طرف دیکھے گا، اور ایک میلا گندہ ہاتھ تمہاری طرف بڑھے گا۔ میری انگلیاں کئی بار غیر شعوری طور پر ان بُری انگلیوں سے ٹکرا گئیں لیکن ایک بار بھی ایسی دھڑکن پیدا نہ ہوئی۔

جو ایک جوان لڑکی کے جسم سے مس ہو کر پیدا ہوتی ہے، ان سب لڑکیوں کی شکلیں ایک جیسی ہیں، ان کے کام، ان کے چلنے پھرنے کا انداز، ان کے دیکھنے کا انداز ایک ہی ہے۔ وہ اکثر تمہاری طرف بار بار دیکھیں گی لیکن ان کی نگاہوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں جوانی میں شکست کا احساس ہو چکا ہے اگر ان لڑکیوں کی تربیت، ان کے ماحول، ان کے رہنے سہنے کے طریقوں کو ایک نئی ترتیب دی جائے تو ممکن ہو سکتا ہے کہ یہی لڑکیاں آفت کا پرکالہ بن جائیں۔ اس سوئی ہوئی زندگی میں شعلہ بن کر چمکیں۔ گو ان کا رنگ سیاہ ہے لیکن کیا ہوا۔ جوانی کو رنگ سے کیا نسبت ہے؟ وہ دیکھو جاؤ، چلے مجھے ہیں ایک لڑکی رہتی ہے جس کا رنگ ان مدراسنوں سے بالکل ملتا جلتا ہے لیکن اس کے حسن میں کتنی کشش ہے۔ اس کا اندازہ ہم ہی لگا سکتے ہیں یہ لڑکی اکثر سفید ساڑھی پہنتی ہے۔ کالی رنگت والی کو سفید ساڑھی بہت اچھی لگتی ہے۔ کالی رنگت اور سفید ساڑھی۔ سفید ساڑھی اور کالی رنگت۔ لڑکی کو ساڑھی پہننے کا سلیقہ آتا ہے۔ ساڑھی پہننے سے جسم کا ہر نقش ابھر آتا ہے اور ایسا معلوم پڑتا ہے کہ لڑکی ایک مصور ہے جو ساڑھی کو مصور کے برش کی طرح استعمال کرنا جانتی ہے ——— حسن بدلتا ہے، جوانی بدلتی ہے، ہر چیز بدل جاتی ہے لیکن لڑکی کا حسن اسی طرح قائم رہتا ہے۔

"آؤ میرے قریب آؤ۔ وہ لڑکی آ رہی ہے" لو وہ آ رہی ہے اور آشیانہ بلڈنگ کے سیکنڈ فلور کے رہنے والے بالکونی میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لڑکی کے ہر قدم کی آواز، ان کے دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ ہو رہی ہے، اور کبوتر ہواؤں میں پرواز کر رہے ہیں۔ ناریل کے پتے ہوا میں جھومتے ہیں، سورج کی سنہری کرنیں بالکونی پر ناچتی ہیں، ساڑھی جسم سے چپکی ہوئی ہے، جسم کا ہر خط واضح ہے، پنڈلیوں سے اوپر رانوں سے بڑھ کر کولہوں کا خم، کتنا دلفریب ہے، مصور کو داد دو، اس کی انگلیاں کر چوم لو اگر چوم سکتے ہو۔ نظر کمر تک جاتی ہے، کمر پر زیادہ گوشت نہیں اور سینے کا پھیلاؤ، چھاتیوں کا زیر و بم اور سمندر لہریں مار رہا ہے۔ لہریں آتی ہیں۔ ساحل سے ٹکراتی ہیں اور واپس چلی جاتی ہیں، اور اوپر ایک چھوٹا سا خوبصورت چہرہ چھوٹے چھوٹے پتلے ہونٹ اور کبھی کبھی زبان، ان مرمریں ہونٹوں پر پھرتی ہوگی — ہونٹ چمکتے ہیں جیسے سبز کنول پر شبنم کے قطرے، نچلا ہونٹ ذرا کچھ کھنچا ہوا، آنکھیں سیاہ، پلکیں جوانی کے بوجھ سے جھکی ہوئیں ——— یہ جانتے ہوئے کہ لوگ دیکھ رہے ہیں لڑکی شرماتی نہیں۔ آنکھوں میں فتح ہے، کامرانی ہے، لڑکی کو احساس ہے کہ وہ اپنے حسن سے لوگوں کو مسحور کر سکتی ہے۔ وہ آگے بڑھتی ہے سہری چند ایک آہ بھرتا ہے احمد پھر کہتا ہے "مار ڈالا، مار ڈالا" ہائے مار ڈالا" اور چٹرجی کی ہنسی ——— جیسے مردہ زندہ ہو گیا اور اوتار سنگھ کا جھک کر دیکھنا اور رگھبیر کا شعر پڑھنا "زندگی چاندی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں" اور پھر سب کا پیچھے ہٹ جانا اور کرسیوں پر بیٹھ کر گالیاں بکنا "خدا کو، تہذیب کو، سرمایہ داروں کو، گورنمنٹ کو، ماں باپ کو" اور کمرے میں پاگلوں کی طرح چکر لگانا، چٹرجی کا کرسی میں دھنس جانا، اوتار سنگھ کا اپنی پگڑی اتارنا اور میلے بدبودار بالوں میں کنگھی کرنا ——— اور میرا لڑکی کی طرف دیکھتے رہنا ——— حتیٰ کہ حسن آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے، اور شباب کی خوشبو ہوا میں گم ہو جاتی ہے اور صرف گالیوں کی آوازیں بھنبھناتی مکھیوں کی طرح دماغ سے ٹکراتی رہتی ہیں "ابے او حرام زادے، الّو کے پٹھے ——— تیری ماں کو لے جائیں ...."

راماننداسا گر

آبِ حیات

"ہیضہ ہوگیا ــــــــــــ"

اور پھر قے کرنے کی مسلسل اور پریشان کن آوازیں۔

میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ ساتھ والے کمرے سے کئی آوازیں آرہی تھیں۔ جنھیں میں بخوبی پہچان رہا تھا۔ کل سارا دن انہی لوگوں کے ساتھ ایک ہی لاری میں بیٹھ کر سفر کیا تھا۔ اس وقت یہ سب مسافر یہاں کیسے جمع ہو گئے ہیں ــــــــــــ" آدھی رات ادھر، آدھی رات اُدھر۔ مکان کی پچھلی طرف واقع ہزاروں فٹ گہری گھاٹی میں سے وہ آندھی جیسی سرد ہوا چلنی شروع ہو گئی تھی جسے یہاں کے لوگ "ڈھوڈو" کہتے ہیں۔ ہوا کی آمد پر چیل کا جنگل بھیانک آواز میں سیٹیاں بجانے لگ گیا تھا۔ دن کی روشنی میں نظر آنے والا وہ نیچے بہتا ہوا دریا اب جنگل کی سیاہی میں گم ہو چکا تھا۔ البتہ پتھروں سے ٹکراتے ہوئے پانی کا مسلسل شور اس کی موجودگی کا ضامن تھا یوں معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے کئی ہاتھی ایک ساتھ چنگھاڑ رہے ہوں اور پھر بغل والے کمرہ سے قے کرنے کی مسلسل آوازیں ....

میں جلدی سے اُٹھا۔ ماچس کی تیلی جلا کر چارپائی کے ساتھ پڑے ہوئے ٹرنک پر رکھی۔ ادھ جلی موم بتی کو جلایا اور تیلی بجھنے سے پہلے نہایت پھرتی اور کفایت کرتے ہوئے ...... سگریٹ بھی سلگالی۔ کمرے میں روشنی ہو جانے اور سگریٹ کا ایک لمبا کش لگانے کے بعد اس ماحول کا خوف اور تاثر کسی حد تک دُور ہوا۔

بڑی بڑی درزیں چھوڑ کر رکھے گئے تختوں کی دیوار کے اس پار سرگوشیوں میں باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

"صاف ظاہر ہے کہ ہیضہ ہی ہے"

"کس غریب الوطنی میں موت آئی ہے"

"کشمیر دیکھنے کے ارمان بھی دل ہی میں رہ جائیں گے"

"یہاں کوئی ڈاکٹر ...... "

ڈاکٹر کی بات کہنے والے پہ مجھے غصہ آیا اور ہنسی بھی۔ یہاں جنت میں ڈاکٹر ڈھونڈ رہا ہے۔ جہاں گنتی کے چار شکستہ سے مکان کشمیر جانے والی سڑک کے کنارے کھڑے ہوتے ہیں۔ رات کو اگر دو چار لاریاں یہاں پڑاؤ ڈال دیں تو کسبیوں کے "حجلۂ عروسی" کی مانند رات کی رات کے لئے یہ مکان بس جاتے ہیں۔ لیکن دن کے وقت اپنے خشیوں اور مالکوں کی طرح دھوپ میں اونگھتے ہوئے کشمیر یا جموں کی طرف جانے والی موٹروں اور لاریوں کو ارمان بھری نگاہوں سے دیکھتے رہتے ہیں اور اُن کی خاکِ پا ہی کو (جسے وہ کافی مقدار میں نہایت فیاضی کے ساتھ فضا میں معلق چھوڑ جاتی ہیں) اپنے دامن میں سمیٹے رہتے ہیں۔ یہاں پر ڈاکٹر ———— ؟ تم لوگ خود ڈاکٹر کیوں نہیں بن جاتے۔

مجھے اچانک کچھ یاد آیا اور میں سامنے کونے میں پڑے ہوئے سامان میں کچھ ڈھونڈنے لگا۔ سامان اس بے ترتیبی سے ایک دوسرے کے اوپر گڈمڈ کیا گیا تھا کہ مجھے کم بخت مرحوم پر غصہ آنے لگا۔ میں نے جلدی سے ایک چھوٹی سی صندوقچی اٹھائی اور ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔

"ہٹو۔ ہٹو۔ ایک طرف ہٹ جاؤ۔ کیوں گھیر رکھا ہے مریض کو"

سب لوگ چھٹ گئے۔ بے ترتیب کپڑوں۔ پریشان بالوں اور ایک ننھی سی صندوقچی کے ساتھ آتا ہوا اس وقت میں کوئی ایمرجنسی کیس کرنے والا ڈاکٹر نظر آرہا تھا۔

میں نے کلائی پہ ہاتھ رکھا۔ مخ ہو رہی تھی۔

"کتنی مرتبہ قے ہوئی"

"چار دفعہ"

"اور دست"

"یہی کوئی دو تین دفعہ"

"تو کوئی فکر کی بات نہیں۔ ابھی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی" میں نے طفل تسلی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ اور اس صندوقچی میں سے سوم رس نکال کر چند قطرے اسے پلا دئے۔ سُن رکھا تھا کہ ہر بیماری میں کارآمد شے ہے اور پھر اس کام کے لئے تھی بھی یہی ایک چیز میرے پاس۔ لمبے سفر اور خصوصاً پہاڑوں پر آتے جاتے وقت یہ صندوقچی ضرور ساتھ رکھتا ہوں جس میں برانڈی۔ سپرٹ۔ آئیوڈین۔ چورن۔ سوم رس وغیرہ چند معمولی دوائی کی شیشیاں اور پٹی کرنے کی روئی کے گالے دھرے رہتے ہیں۔ کئی مرتبہ میرے دوست اس کا مذاق اڑا چکے ہیں اور اسی لئے کبھی کبھی مجھے ڈاکٹر بھی کہنے لگتے ہیں۔ لیکن اس وقت تو اگر ایک ہزار بار بھی میں اس صندوقچی کو لمبے سفروں پر یونہی بیکار اُٹھائے گیا ہوتا تو اس کا صلہ مجھے اس ایک رات میں مل گیا ———— میں نے اُسے بچا لیا تھا۔

اس وقت وہ میرے سامنے چارپائی پر قریب بے سُدھ پڑی تھی۔ دوسرے تمام مسافروں کو میں نے کمرے سے نکال دیا تھا اور اُس کی ماں چارپائی کی پٹی پکڑے پرلی طرف بیٹھی مجھ پہ سے صدقے واری ہو رہی تھی۔

"تم نے جو احسان مجھ پہ کیا ہے۔ عمر بھر نہ بھولوں گی۔ میں اکیلی عورت ذات اس بیابان میں کیا کرتی۔ اور پھر صرف ایک مہینہ رہ گیا ہے اس کی شادی کو ———— اس کے سسرال والوں کو کونسا منہ دکھاتی۔ تم نے میری لاج رکھ لی بیٹا ————"

اور وہ اپنا پروگرام سناتی چلی گئی کہ کس طرح اُس نے سوچا تھا کہ "چلو شادی سے پہلے اُسے ایک بار کشمیر کی سیر ہی کرا لاؤں ———— ایک مدت سے کہہ رہی تھی۔ اور اس طرح سگے ہنستوں خود بھی امرناتھ کا تیرتھ کر آؤں گی" اور اُس نے آپ ہی آپ یہ طے بھی کر لیا کہ اب میں بھی کشمیر میں انہی کے ساتھ رہوں گا۔ وہ اپنی باتیں کہتے گئی اور شاید مجھ سے بھی اس نے چند سوال پوچھے۔ جن کے جواب میں میں نے بھی لاشعوری طور پر شم پشم کچھ نہ کچھ کہہ دیا۔ لیکن میرے تو حواس خمسہ کا اجتماع گویا صرف آنکھوں میں ہو گیا تھا...... آنکھیں جو اس حسین نیم خوابیدہ کے مرمریں مجسمے کو جیسے نگلے جا

رہی تھیں -

سارا دن میں لاری میں بیٹھے بیٹھے اس کی طرف نگاہ بھر کر ایک دفعہ بھی نہ دیکھ سکا تھا۔ اس کی ماں کا ڈر تھا۔ یوں بھی اگر ذرا سی کوئی بات ہو جاتی تو ساتھی مسافر کیا کہتے اور پھر میں اکیلا —————— ! وہ سب لوگ جو خود اُسے بار بار اِس طرح تاک رہے تھے۔ جیسے کچا ہی چبا جائیں گے۔ ادھیڑ عمر کے مسافر دل کو اسے دیکھ دیکھ کر کس طرح انگڑائیاں آ رہی تھیں۔ وہی سب لوگ ذرا سی بات اُٹھنے پر اپنی شرافت و نجابت کا ثبوت دینے کے لئے مجھے کس کس طرح نہ ڈانٹتے۔ اور — ! لیکن لاری ہی میں اس بجلی کے کوندے نے نہ صرف میری آنکھیں چندھیا دی تھیں۔ بلکہ ایک مرتبہ جب مجھے احساس ہوا تھا کہ میرے پاؤں کے نیچے کچھ نرم نرم سی شے مسلی جا رہی ہے اور جب میں نے جھک کر دیکھا تھا تو وہ اُسی کا پیر تھا۔ تو اس بجلی کی رو بھی ایک مرتبہ میری رگ و پے کو ایک زبردست دھچکا پہنچا چکی تھی —————— اور اس وقت تو اس کے جسم سے چھو جانے پر آنے والی جھرجھری کی لذت کو بار بار محسوس کرنے کیلئے میں گھڑی گھڑی اس کی نبض دیکھ رہا تھا۔ اُسے ہاتھ لگاتے ہی یوں محسوس ہوتا۔ گویا برقی رو کی مدد سے کوئی میرے خون کو بلو رہا ہے اس کی ماں ابھی تک پوری طرح شکریہ ادا نہ کر پائی تھی "تمہیں تو شاید بھگوان نے میرے لئے ہی ...."

میں نے ایک مرتبہ پھر صندوقچی کھولی اور سوم رس کے چند قطرے پانی میں ملا کر اسے پلا دیئے -

---

دوسرے دن ہم سب لوگ لاری میں بیٹھے ہوئے پہاڑوں اور پُرہول گھاٹیوں کے درمیان چکر کاٹتے چلے جا رہے تھے۔ وہ میرے سامنے والی سیٹ پر اپنی ماں کے ہمراہ بیٹھی ہوئی تھی۔ بعینہٖ اسی طرح جس طرح اس وقت بیٹھی ہوئی ہے۔ لیکن اس روز آپس میں اتنی بے تکلفی نہیں ہوئی تھی۔ جتنی آج ہے آج تو .... ! بس صرف دس دن کا فرق ہے اور ان دس دنوں میں کیا کچھ نہیں ہو گیا۔ اس روز کشمیر جانیوالی لاری میں بیٹھی ہوئی ایک جوان لڑکی اپنی جان بچانے والے محسن سے کوئی بات بھی کرتی تھی تو اپنی ماں کو مخاطب کر کے۔ اور آج — واپس جموں آتی ہوئی ایک لاری پر وہی لڑکی ماں کی آنکھ بچا کر کبھی اس کے چٹکی لے لیتی ہے۔ کبھی لاری کی کھڑکی میں سے باہر بازو نکال کر اس سے پنجہ لڑا لیتی ہے اور کبھی ایک لمحہ بھر کے لئے آنکھوں سے آنکھیں ملا کر مسکراتی ہوئی سر جھکا لیتی ہے۔ ہم کہاں سے کہاں تک پہنچ گئے ہیں محض دس دن میں ....

"ابھی کتنی دیر میں جموں پہنچیں گے ہم —————— ؟" اُس نے اچانک سوال کیا۔

"بس ۵۰ میل تو رہ گیا ہے کوئی ایک گھنٹہ لگے گا اور —————— " اور ساتھ ہی اسے چڑانے کے لئے کہہ دیا ——————

"اتنی سی دیر کے لئے اب اداس کیوں ہوئی جا رہی ہو۔ بس آیا ہی سمجھو گھر۔ پھر مل لینا سہیلیوں سے۔ جتنا جی چاہے ——————"

اُس نے منہ موڑ لیا اور توی کی گھاٹی کے اس پار سلیٹ پتھر کے نیلے نیلے سے پہاڑ کو دیکھنے لگ گئی۔ آنکھوں کے کونے بتا رہے تھے کہ کس بُری طرح چوٹ کھائی تھی اس فقرے سے —————— میں بھی باہر کی طرف دیکھنے لگا اور سڑک کے پیچ و خم میں اُلجھ کر میرے خیالات کا سلسلہ پھر سلجھ گیا: میں پھر سوچنے لگا کہ آج سے دس دن پہلے بھی تقریب قریب یہی وقت تھا۔ جب اُس نے ایسا ہی ایک سوال پوچھا تھا۔

"ابھی کتنی دیر میں کشمیر پہنچیں گے ہم —————— ؟"

لیکن اس دن یہ سوال اپنی ماں کو مخاطب کر کے پوچھا گیا تھا۔ گو جواب کی توقع مجھی سے تھی اور پھر ...... کشمیر پہنچ کر کس طرح آہستہ آہستہ یہ تکلف داریاں اُٹھ گئیں۔

"آپ کی بیوی تو بہت خوبصورت ہو گی" کس انداز سے پوچھا۔ گویا اس فقرہ میں لپیٹ کر مجھے یہ بات کہی ہو کہ آپ تو کسی کے لئے رہ بند ہو چکے ہیں چنانچہ ہم کو نہ ایسے پیار سے .... " کس نے بتا دیا اس کم بخت کو۔ اس کی ماں نے اس ہیضہ والی رات جانے کیا کیا باتیں مجھ سے سن کر دا

لی تھیں اور کیا اسی لئے مجھ سے پوچھی گئی تھیں کہ سب کچھ اسے بتا دے۔ کہاں گئی وہ خرافہ پوچھوں تو ذرا اس سے ......

لیکن وہ تو اس وقت امرناتھ کی یاترا کر رہی تھی۔ اس تسلی بخش خیال سے مطمئن ہو کر کہ لڑکی اور دوسرے بچے نہایت محفوظ اور معتبر ہاتھوں میں چھوڑ آئی ہوں اسے مجھ پر کتنی جلدی یقین ہو گیا تھا ———— جانے وہاں ہیضہ ہوا تھا بھی یا نہیں۔ لیکن اس وقت چند قطرے دوا کے پلا کر میں اس کے لئے بمنزلہ مسیحا کے ہو چکا تھا۔ چنانچہ کیا کیا واسطے دیکر مجھے اپنے ساتھ ہی ٹھہرنے پہ مجبور کر لیا گیا تھا۔ چلو، مجھے بھی تو آخر پردیس میں روٹی دال کی ضرورت تھی ہی۔ غنیمت سمجھا۔ لیکن اب اس پہ ستم یہ ......

"تمہیں بتاؤ بیٹا کہ میں اکیلی عورت ذات۔ ان بچوں کو ساتھ لئے ان پہاڑوں میں کہاں ٹکریں مارتی رہوں گی۔ تمہیں بھی جب یہیں ٹھہرنا ہے تو کیا حرج ہے بس چار دن تو مجھے لگیں گے گل ——"

"اچھا بچے چھوڑ جایئے۔ لیکن چندرو کو تو ساتھ لے جایئے۔ برف کے پہاڑ دیکھ آئے گی ——" میں نے بھی اُسے اسی نام سے بلانا شروع کر دیا تھا جو غالباً راجندر کماری کا مخفف تھا۔

"اوئی بیٹا! تو کیسی باتیں کرتا ہے۔ میں اکیلی عورت ذات۔ جوان لڑکی ساتھ لے کر کہاں ماری ماری پھروں گی۔ پھر سنا ہے کہ امرناتھ کے راستہ میں ایسی ایسی بوٹیاں بھی ہیں۔ جن کی خوشبو سے کمزور آدمی بیہوش بھی ہو جاتے ہیں۔ گھر سے تو یہی خیال تھا کہ ساتھ لے جاؤں گی۔ لیکن جب تم سا دیوتا مل گیا تو خیال بدل گیا۔ اب جان بوجھ کر خطرہ کیوں مول لوں۔"

عجب عورت تھی۔ جیسے میں دیوتا نظر آ رہا تھا۔ جو اس کی جوان لڑکی کی حفاظت کرے گا اور جس دیوتا کے درشن کرنے وہ جا رہی تھی۔ پھر وہ کیا تھا!؟ ہم ہندو لوگ اپنے ویدوں اور پرانوں کی کتھائیں سن کر انہیں سمجھتے کیوں نہیں۔ کیا وہاں صاف نہیں لکھا ہوا کہ اگر انکا جنسی تعلق منظور نہ ہو تو سگے بہن بھائی کو بھی کبھی خلوت میں یکجا نہ ہونے دو۔ ایک روایت کے مطابق تو خود دھرم راج یدھشٹر کا دل اپنی سگی ماں کے خوبصورت بال دیکھ کر میلا ہو گیا تھا ———— اور میں تھا دیوتا ————!

میری طرف سے جتنا انکار بڑھا۔ اتنا ہی اسکا اصرار بڑھ گیا۔ شاید میرے مبہم انکار کے باعث اس کا یقین اور پختہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ میری کوئی پیش نہ گئی۔

امرناتھ کے یاتریوں کے واپس آنے میں صرف ایک دن رہ گیا تھا میں نے بیری والے مذاق کا جواب ڈھونڈ لیا تھا۔

"تمہارا دولہا ہو گا کوئی بڈھا کھوسٹ۔ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ بڑے پوپلے پوپلے منہ سے باتیں کیا کرے گا تم سے ......"

میں اور بھی کتنی ہی باتیں کہتا۔ اور وہ خوب سٹپٹاتی۔ لیکن ارے ———— اس کی آنکھوں میں پانی ڈل ڈل چھلکنے لگا۔ اس سے پیشتر کہ میں کوئی کلمہ حیرت منہ سے نکالوں۔ اس نے جلدی سے دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا۔

"ارے سوئی آنکھوں میں اتر جائے گی ——"

میں نے گھبرا کر اس کی انگلیوں سے کشیدہ کی سوئی چھیننے کو ہاتھ بڑھایا۔ وہ پرس میں لگا ہوا میز پوش پھینک کر جلدی سے اُٹھی اور ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔ یہ ہو کیا گیا۔ مجھے کچھ پتہ نہ چلا۔ آخر میں نے ایسا کیا کہہ دیا۔ سسرال اور دولہا کے متعلق باتیں کرنے سے لڑکیاں شرماتی ہیں۔ روتی نہیں۔

میں نے اس کے قریب ہی بیٹھتے ہوئے اس کی پیٹھ کو تھپتھپایا۔

"کیا ہوا۔ آخر کچھ بولو بھی ———— بھئی یہ رونا ہمیں اچھا نہیں لگتا۔ کچھ ہو بھی۔ کوئی آدمی بات بے بات روئے جائے۔ اگر

کوئی غلطی ہو گئی ہو تو ہم معافی مانگ لیتے ہیں ۔ ادھر دیکھو۔ ہم ہاتھ جوڑ دیتے ہیں "

اور میں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے ایک ہاتھ بڑھایا اور میرے ہاتھوں کو علیحدہ کرنے کی کوشش کی۔ میں نے دُہی ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا لیا اور پھر بازو سے کھینچ کر اسے سیدھا بٹھا لیا۔

"آخر ہوا کیا —— کچھ کہو گی بھی —— کہ بس —— !" میں نے چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں ——" اُس نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔ اس کا رنگ اتنی ہی دیر میں سفید ہو گیا تھا اور چہرے پہ پھیلے ہوئے آنسوؤں کے نشان اس طرح تھے ۔ جیسے چنبیلی کا کوئی پھول شبنم کے کسی آوارہ قطرے سے نتھر جائے۔ میرے آجانے پہ وہ بڑی گھٹی گھٹی سی سسکیاں لے رہی تھی —— کس بُری طرح وہ طوفان کے سامنے بند لگانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی ۔

"نہیں ۔ کچھ تو ہے۔ مجھے تم پرایا سمجھتی ہو۔ تبھی چھپاتی ہو۔ میں آج ہی چلا جاؤں گا اور کہیں ——"

طوفان رُک نہ سکا۔ بند خشخاش کے پہاڑ کی طرح ڈھے گیا ۔ بے قابو ہو کر وہ مجھ سے لپٹ گئی اور آنسوؤں کا یہ عالم کہ ایک مسلسل دھار کی صورت میں ڈھلتے ہی چلے آتے تھے۔ آخر میں کہاں تک برداشت کرتا ......

وہ شام بڑی بے چینی سے کٹی ۔ بار بار اس کی بیان کردہ کہانی ذہن میں گھوم جاتی اور کہانی ہی کیا تھی ۔ اُسے ایک ایسے شخص سے بیاہا جا رہا تھا جس کے بچوں کے آگے بھی بچے تھے۔ ہونے والے خاوند کے نام کا تو اسے علم نہ تھا۔ لیکن وہ رہنے والا میرے شہر سے بیس میل کی دوری پہ واقع ایک قصبہ کا تھا۔ مگر اُسے خیال کیا یقین تھا کہ اُسے اس مقام کا پتہ بھی غلط بتایا گیا ہے اور کہ اس کی سسرال کہیں مہذب دنیا سے بہت دُور ہے۔ جہاں دن رات جھلسا دینے والی لُو ہی لُو چلتی ہو گی اور جہاں پیاس بجھانے کے لئے پانی کا ایک قطرہ بھی میسّر نہ ہو گا ۔ اور ....

اس کی بپتا نے میرے ذہن کو اپنے گھریلو واقعات کی طرف منتقل کر دیا تھا۔ ہمارے پڑوس میں رہنے والی وہ پتھر دل ۔ ظالم ۔ سوتیلی ماں اور پھر مجھے اپنے پچاس سالہ بڑے بھائی کا خیال آیا ۔ جنہوں نے والدین کی موت کے بعد مجھے اپنے لڑکوں کی طرح پالا تھا حتیٰ کہ میں مرنے والی بھابھی کو ماں کہا کرتا تھا اور جو اس وقت جبکہ انہیں میرے اور اپنے بچّوں سے دل بہلانا چاہیئے تھا۔ کسی نئی لڑکی کی تلاش میں تھے ۔ اس لڑکی کے جذبات بھی کیا چندرو ہی کے مانند نہ ہوں گے اگر انہیں دُوسری شادی ہی کرنا ہے تو کیوں نہیں وہ اپنی کسی ہم عمر اور بیوہ عورت سے شادی کرتے جبین کنواری لڑکیوں کے چہروں پر کیوں آنسو پھیلے جاتے ہیں اور پھر مجھے اپنے ننھے بھتیجوں کی ہونے والی سوتیلی ماں پر ترس آنے لگا ...... لیکن یہ سوتیلی مائیں تو روایتاً ظالم ثابت ہوتی ہیں ..... شاید اپنے اوپر کئے گئے ظلم کا انتقام وہ مرنے والی سوتن کے ننھے بچوں سے لیا کرتی ہیں انتقام کا انہیں حق ہے لیکن ...... مجھے اپنے پڑوسی کے ننھے ننھے بچوں کے بدن پر قمچیوں کی مار کے اُبھرے ہوئے نشانات یاد آنے لگے ۔ جنہیں میری مرحوم ماں آہستہ آہستہ سہلایا کرتی تھی اور میرے بسکٹ انہیں بہلا دیا کرتی تھی۔ گو ان دنوں میرا بچپن تھا لیکن انہیں دیکھ کر مرحومہ کی آنکھوں میں چھلک جانے والے آنسو مجھے ابھی تک یاد ہیں —— مجھے سوتیلی ماؤں سے نفرت ہے ۔ یہ چندرو، جو آج یوں بلک رہی ہے چند ہی دنوں میں یہ بھی ایک سوتیلی ماں بننے والی ہے —— دل میں چندرو کے تئیں نفرت کے جذبات پیدا ہونے لگے لیکن —— اس کا وہ بے اختیار لپٹ جانا —— بدن میں ایک جھرجھری سی سرایت کرتی محسوس ہوئی ۔

صبح اس کی ماں کو آنا تھا۔ رات بھر ہم سو نہ سکے اور باتیں تھیں کہ ختم ہی نہ ہو پاتی تھیں ۔

"لیکن چندرو۔ ایک بات ہے کہ ہم نے کچھ اچھا نہیں کیا :

"تو کیا ہوا" کس قدر بے باکی تھی —— اور کتنی طمانیت، پشیمانی کا شائبہ تک نہ تھا ۔

اور پھر ایک طاقت ور لنز کی طرح اس کے دل کی ایک ایک باریکی کو نمایاں کرنے والی اس کی باتیں ....

"دراصل میں تو یہاں امرت کی تلاش میں آئی تھی۔ وہ امرت جو کسی کی زندگی کے لئے آبِ حیات کا کام دے سکے۔ لیکن اس زندگی کی حسرتوں کے لئے آبِ حیات ہو۔ تاکہ وہ حسرتیں مرنے والی رُوح کے دل میں بھی کانٹا بن کر رہ جائیں ——— اب کے بیاہ کے سلسلہ میں میرے ماں باپ نے جو میرے سسرال والوں سے بہت سے روپے وصول کئے تو سالہاسال کی تنگدستی سے ایک دم کے لئے چھٹکارا ہوا مدت سے سُن رکھا تھا کہ کشمیر جنت نظیر ہے۔ دل نے کہا۔ چند ہی دنوں بعد جہنم میں جانا ہی ہے۔ کیوں نہ ایک مرتبہ جنت کا نظارہ کر لیا جائے! ایسے مقام میں دل پر حسرتوں کے جو نقش بیٹھیں گے وہ زیادہ گہرے اور پائندہ تر ہوں گے اور ماں بھی امرناتھ کے درشنوں کے لالچ سے چلی آئی ——— کیا پتہ تھا کہ اس وادی میں تم مجھے وہ آبِ حیات پلاؤ گے ——— اب میں اس اطمینان کے ساتھ تو شادی کی موت کے گھاٹ اُتر سکوں گی۔ کہ ایک رات ہی کے لئے سہی۔ مگر میں نے زندگی پائی تو.....

میرے دل نے چاہا تو تھا کہ اس کے ساتھ ابھی اسی وقت شادی کر لوں اور کہہ دوں کہ ——— چاہے تو اب نہا بھی لے آبِ حیات سے" پھر اسکا جوبن بھی کیا گدرایا ہوا ہے اس وقت ——— جوانی کے مارے حسن پھوٹا پڑتا ہے۔ لیکن میری بیوی ——— اس کا بھی تو یہی عالم تھا کسی دن۔ تین چار بچے کیا ہو گئے کہ بس یوں ہو گئی جیسے ——— اس کے بھی جب بچے ہو جائیں گے تو اس کی بھی وہی حالت نہ ہو جائے گی؟ اور یوں بھی ہمارے سماج میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں ایسی جوبن اور حسن سے مالا مال لڑکیاں ان ادھیڑ رنڈوے کھوسٹوں سے بیاہی جاتی ہیں جو مہذب دنیا سے دُور ان مقامات میں رہتے ہیں جہاں دن رات جھلسا دینے والی لُو ہی لُو چلتی ہے اور جہاں پیاس بجھانے کے لئے پانی کا ایک قطرہ بھی میسر نہیں آتا ——— تو اکیلا میں کس کس کو آبِ حیات پلاتا پھروں.........

اچانک ایک دھچکے کے ساتھ لاری کھڑی ہو گئی۔ گذشتہ دس دن کے واقعات کا جو فلم میرے ذہن میں چل رہا تھا۔ اس کا جیسے ایک دم سے فیتہ ٹوٹ گیا۔ فلم ٹوٹ جانے پر سینما حال میں جیسا بے ہنگم سا شور مچ جاتا ہے کچھ اسی طرح کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"کوئی محصول والی چیز تو نہیں آپ کے پاس" ——— کسی نے مجھے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں کوئی نہیں ——— یہ کون سی جگہ ہے" میں نے متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"جموں کی محصول چنگی ——— اور وہ شخص اگلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی سواریوں کی طرف متوجہ ہوا۔

"آپ تو ایسے سوئے ہیں ادھم پور سے کہ بس، یہاں تک تو کچھ ہوش ہی نہیں" چندر مسکراتی ہوئی کہنے لگی۔ میں نے مسکراہٹ کے سوا کوئی جواب نہ دیا۔

اتنے میں چنگی والوں کا ایک سواری سے جھگڑا ہو گیا۔ یہ لوگ محصول چنگی مانگ رہے تھے اور وہ بیچارا کہتا تھا کہ "میں نے اسی لاری میں جموں سے آگے نکل جانا ہے تو یہاں محصول چنگی دینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا"

"ہم کچھ نہیں جانتے۔ اگر آپ دوسرے راستہ سے نکلیں گے تو وہاں کے محرر چنگی سے رسید لے آئیے گا۔ ہم محصول واپس کر دیں گے"

"میں وہاں لاری چھوڑ کر پھر واپس آؤں۔ یہ کیسا ظلم ہے۔ کیا آپ کا یہی قانون ہے؟"

"ہم کچھ نہیں جانتے۔ محصول دیجئے جلدی سے" وہ بیچارا مدد طلب نگاہوں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔

"ریاست میں کیا کیا ظلم قانون کی آڑ میں نہیں ہوتے۔ چھوڑیئے اس قصّہ کو۔ یہ جرمانہ تو بھرنا ہی ہوگا" اس کے ساتھی نے کہا۔ اس نے مجبور ہو کر ایک روپیہ ادا کر دیا۔ جو غالباً ریاستی خزانہ کی بجائے محرر کی جیب میں داخل ہو گیا ہوگا۔

لاری پہاڑی علاقہ چھوڑ کر میدان میں داخل ہوئی۔ حدِ نظر تک پھیلے ہوئے چپے چپے کھیتوں میں ہریاول لہلہا رہی تھی۔ مغرب میں ایک چمکدار

سُرخ رنگ کے بادل کا ٹکڑا ڈوبے ہوئے سُورج کا پسماندہ نشان رہ گیا تھا۔ چندرو کی ماں اپنے بچوں کے کوٹ وغیرہ ٹھیک کرنے لگ گئی تھی اُن کا شہر نزدیک آرہا تھا۔ وہ کتنی خوش تھی۔ وہ امرناتھ کا تیرتھ کر آئی تھی۔ جہاں بھگوان شنکر نے پاربتی کو امر کتھا سُنائی تھی۔ یعنی ایک طرح کا آبِ حیات پلا دیا تھا جس کے چند چھینٹے دو کبوتروں کے حصّہ میں بھی آ گئے تھے۔ وہ ابھی تک وہاں رہتے ہیں۔ وہ بھی ان کبوتروں کے درشن کر آئی تھی۔ جن پر آبِ حیات نے اثر کیا تھا اور خود اس کی لڑکی .... تیرتھ میں تمام گذشتہ گناہوں کے دُھل جانے سے اس کی آتما کتنی ہلکی ہو گئی تھی اور اب وہ کس طمانیت قلب سے لڑکی کی شادی کا ثواب حاصل کرنے جا رہی تھی ....

لاری کو ایک اور دھچکہ لگا۔ سیالکوٹ آ گیا تھا ——— میں نے انہیں تانگے میں بٹھا دیا۔ اس کی ماں نے چندرو کی شادی پہ آنے کا جو وعدہ لیا تھا اُسے پھر پکا کرنے لگی۔

میں انہیں چھوڑ لاری میں قدم رکھنے ہی لگا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔

"منوہر ———"

مُڑ کر دیکھا تو چندرو تانگے سے اُتر کر میری طرف آ رہی تھی۔

"آپ کا فاؤنٹین پن رہ گیا ہے لیتے جائیے" اُس نے اونچی آواز میں کہا۔

مجھے یاد تھا اپنا قلم۔ میں نے جان بوجھ کر اس کے پاس چھوڑے جا رہا تھا۔ لیکن ——— فاؤنٹین پن کا تو محض بہانہ تھا۔

"شادی پر آنے کا وعدہ پھر پکّا ہے نا ———" اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"بالکل پکّا ———"

"میری آنکھوں کی طرف دیکھئے ———" میں نے دیکھا۔

"یہ تب تک راہ میں بچھی رہیں گی ———"

مگر پھر حالات نے ایک اور پلٹا کھایا۔ بیوی میری عدم موجودگی میں محسوس کرتی رہی تھی کہ بھیّا جنہیں میں بابو جی کہا کرتا تھا۔ کسی خاص تیاری میں منہمک ہیں۔ میں نے بھی تاڑا۔ غالباً وہ چوری چھپے کہیں شادی کی بات پکی کر رہے تھے اور یا پھر کر چکے تھے ——— مجھے سخت صدمہ پہنچا اور کوئی بہانہ کر کے اس موقعہ پہ گھر سے چلے جانے کی سوچنے لگا۔ اپنے افسر سے کہا کہ فرنٹیر میں کہیں تبدیلی کر دو۔ جنگ کے زمانہ میں کوئی کلرک خود ہی فرنٹیر جانے کے لئے کہے اور پھر فوجی محکمہ ——— افسر کو اور کیا چاہئے تھا۔ ہفتہ بھر کے اندر اندر تبدیلی کا حکم آ گیا۔

اس تبدیلی سے مجھے سب سے بڑا افسوس اس بات کا ہُوا کہ میں وعدہ کر کے بھی چندرو کے پاس نہ پہنچ سکا۔ اگر میں اپنے ہی شہر میں ہوتا تو کبھی وقت نکال کر اس کے سسرال ہو آیا کرتا۔ لیکن میں اپنے شہر میں بھی تو نہ رہ سکتا تھا۔ اگر بابو جی کو شادی کرنا ہی تھی تو ہولت کے موقعہ پہ اپنے بچّوں کی شکل تک دیکھنا اُن کے لئے بدشگونی ہوتا۔ یہ ظلم کیوں اپنی آنکھوں سے دیکھتا۔

کوہاٹ میں بھی میں اس روز کا منتظر رہا۔ جب گھر سے کوئی بلاوا آ جائے تاکہ اسی بہانے چندرو کے قصبہ تک جانے کا موقع ملے۔ پچھم اس روز صد شکر کیا۔ جب شادی کے ٹھیک نو ماہ بعد نئے بھتیجے کی آمد پہ گھر سے بلاوا آیا۔

واپس آتے وقت اپنے سٹیشن پہ گاڑی سے اترنے کو جی نہ چاہ رہا تھا۔ صرف ایک ہی سٹیشن آگے ——— اور چندرو کا قصبہ ——— لیکن بچّے جو ساتھ تھے اور پھر نئی بھابھی ——— بابو جی پہلے ہی لکھ چکے تھے کہ ہماری نئی بھابھی کے خیال میں

شادی کے موقع پر گھر بندہ کرمیں نے ہی اظہار نفرت کی ابتدا کی تھی ....

جلدی سے آگے بڑھ کر میں نے نئی بھابھی کے پیر چھو ئے۔

"خوب وقت پر آئے ——— "کتنا کٹیلا اور طعن آمیز تھا فقرہ۔" آخر بڑھوں کی ان نوجوان بیویوں کے دل اس طرح پتھر کے کیوں بنے ہوتے ہیں۔ پہلے بچوں کے لئے ان کی زبان پر دُعا یا اشیرباد کا لفظ کس مشکل سے آتا ہے۔ چلو میں شادی کے موقعہ پر پھسک ہی گیا تو کیا اس کے کُتے اتنا ....

میں نے نفرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا...... سامنے جندو کھڑی تھی۔

اُس کی نگاہیں ——— یوں معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے کسی کو ذبح کر کے اُس کی لاش کو آب حیات کے تالاب میں ڈال دیا گیا ہو...........

آغا بابر

باجی ولایت

"...... عورت اچھی بھلی حالت میں وہ کچھ کر سکتی ہے جو مرد نشے میں بھی نہیں کر سکتا۔ میں نے جو جو کچھ لاہور میں ہوتے دیکھا ہے بیان پر نہیں لا سکتا۔ اتنی بدمعاشی ہے وہاں کہ خدا بچائے۔" یہ الفاظ جیسے نواز کے خون میں سرایت کر گئے تھے۔ خون جب دل کے پاس سے گزرتا چپکے سے یہ الفاظ دل کے کان میں کہہ جاتا اور نواز سوچنے لگتا ——

دفتر والوں نے آج زیادہ وقت لاہور کی باتیں سننے میں صرف کیا تھا۔ ظہیر جو کہ ہیڈ سے ایک سال کے لئے ڈیپوٹیشن پر لاہور بھیجا گیا تھا، لاہور کی باتیں سناتا رہا تھا: "وہ تو ایک شہرستانِ حسن ہے۔ وہاں کی جلوہ افروزی اور نمائش کی فراوانی کا نظارہ کرنے کے بعد آنکھوں میں کوئی اور شہر نہیں جچ سکتا۔ پلے ہوئے گداز گداز سانولے بدن، بیمار بیمار زیتونی رنگ کے چہرے، جھکی جھکی آنکھیں اور سینے پر چڑھے ہوئے دوپٹے کا پٹا ہوا جھول لا دل کو سینے میں جکڑ لینے لگتا ہے اور پھر خود نمائی اور عریانی کی کئی بھلی حرکتیں اپنی بے عنانی اور بے تکلفی میں اتنی فزوں تر ہو جاتی ہیں کہ شباب کی للکار سن کر قدم تھم جاتے ہیں۔" اس نے مزے لے لے کر بہت کچھ کہا، احباب نے چٹخارے لے لے کر سنا۔ مگر نواز پر ان باتوں کا چنداں اثر نہ ہوا۔ ہاں ظہیر کچھ باتیں ایسی ضرور کہہ گیا تھا جو اس کے سینے پر بوجھل پتھر بن کر رہ گئی تھیں۔ مثلاً جب اس نے مولانا سے خطاب کر کے کہا تھا: "مولانا آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ عورت پر ابھی بندشیں ہیں۔ اس کی راہ میں رکاوٹیں ہیں۔ اسے بچپن سے کہا جاتا ہے سر پہ دوپٹہ لو، سینہ ڈھکو، یہ کرو یہ نہ کرو تو یہ عالم ہے۔ اگر یہ بندشیں بھی اٹھ جائیں تو عورت جسے مقدس کہتے کہتے آپ کا منہ سوکھتا ہے آپ کے سامنے ننگی ہو کر ناچے۔" کیا یہ ظہیر کی زیادتی نہ تھی؟ ——

نواز کروٹ بدل کر سیدھا لیٹ گیا۔ سمبل کا تکیہ سر کے نیچے سے کھسکا تو اس نے اسے اٹھا کر سر کے نیچے دے لیا۔ اس نرم مس کے احساس نے جیسے چند سوئی ہوئی یادوں کو جھنجھوڑ دیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے چھت کی ایک کڑی اس کے سینے پر آن گری ہے جس سے وہاں پڑی ہوئی بوجھل سل ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور وہ ایک ایک ٹکڑا اٹھا کر نیچے رکھتا جا رہا ہے۔ وہ خود بھی تو ایک سنگریزہ ہی تھا۔ کہیں ادھر اُدھر پڑا ہوا۔ جسے جو چاہے اٹھا لے اور جس کو پسند آیا تھا اس نے اٹھا لیا تھا۔ اس کا بچپن ماں باپ کے سایہ میں نہیں بلکہ اپنے بڑے بھائی کے گھر میں گزرا تھا جس نے اپنے دو چھوٹے بھائیوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ ہی نہیں کیا تھا بلکہ لوگوں کی خوشامدیں کر کے انہیں نوکر کرا دیا اور پھر شادیاں بھی کیں اور

خوب صورت، بیویاں ولوائیں۔ مہرِ مادری اور شفقتِ پدری کی محرومی کا اس کی ذہنی نشوونما پر اثر انداز ہونا ایک لازمی بات تھی۔ وہ بچپن میں اپنے ہمجولیوں سے بہت کم کھیلتا تھا۔ زیادہ تر اپنی بھابی کے گھٹنوں کے ساتھ لگ کر بیٹھا رہتا۔ بازار سے سودا سلف لا دیتا یا اپنے بھائی کے بچوں کو کھلاتا رہتا۔ بھائی اور بھابی دونوں اس کی اس برخورداری پر بہت خوش ہوتے تھے۔ وہ اور بھی پھولتا اور جب بھابی سے ملنے ملانے والیاں آتیں تو وہ سارا سارا دن ان کی خدمت میں بیٹھا رہتا۔ اسے عورتوں کی صحبت اچھی لگتی تھی گھر کی کیا اور باہر کی کیا کسی عورت کو بھی نواز کے سامنے کسی قسم کی بات کرنے میں جھجک نہ ہوتی تھی جیسے ان کو نواز پر ایک اعتماد سا تھا کہ وہ ہمیشہ اسی طرح بھولا بھالا سا رہے گا۔ اس کی اداس اداس آنکھوں میں کبھی تیزی نہ آئے گی اور اس کے چہرے پر پڑی ہوئی گردِ یتیمی کبھی دور نہ ہو گی۔

نواز پلنگ پر لیٹا ظہیر کی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ سمبل کا نرم نرم تکیہ چھونے پر اس کے دماغ میں اس بیتے ہوئے بچپن کے واقعات دوڑنے بھاگنے لگے جب وہ منہ بہت ڈھیلا چھوڑ کر بات کیا کرتا تھا۔ اس کے لب و لہجہ میں ابھی تک تسلیم و رضا اور عاجزی کی وہی آٹھویں جماعت والی ملائمت موجود تھی۔ اس وقت عورتوں میں زیادہ بیٹھنے کی وجہ سے اس کی زبان پر عورتوں کے کئی محاورے چڑھ گئے تھے۔ رجو میاں کی شادی پر عورتوں کو اس نے فرنی کی کتنی صحنکیں لا کر دی تھیں۔ مردانے میں سے چوری چھپے فرنی لانا کوئی آسان کام نہ تھا مگر عورتوں کا کام کر کے اسے کتنا اطمینان ہوتا تھا اور جب کوئی عورت اسے دعا دیتی تو اسے کتنی تسکین حاصل ہوتی تھی۔ رجو میاں کی برات چڑھنے سے پہلے اس کے ہمجولی چھپ چھپ کر سگریٹ پی رہے تھے۔ کئی باہر مردانے میں لونڈیوں پر ناچ رہے تھے۔ کئی پانی کی پچکاریاں مار رہے تھے اور وہ اندر عورتوں کو پھولوں کے گجرے پکڑا کر ان کی شلواروں میں ازار بند ڈال کر ڈبوں میں سے نئی نئی گورگابیاں نکال نکال کر ان سے دعائیں لے رہا تھا۔ "نا جی بیٹا! اب ازار تیلی ادھر دے جانا۔" وہ ایک دالان میں سے دوسرے میں جاتا کبھی ازار تیلی اس کے ہاتھ میں ہوتی کبھی پاندان۔ کسی دالان میں شلوار پہنی جا رہی ہوتی، کسی کوٹھڑی میں قمیص اتر رہی ہوتی۔ اسے اندر دیکھ کر کئی صورتیں پہلے جھجکتیں مگر پھر نانی جی کی مانوس صورت دیکھ کر ان کے چہرے کہنے لگتے "اچھا تم تھے ــــ کوئی بات نہیں۔" دلہن والوں کے گھر بھی وہ عورتوں میں جا گھسا تھا۔ وہاں بھی کئی بنی ٹھنی لڑکیوں پر اس کی نظر پڑی تھی۔ مگر اسے ان میں کوئی جاذبیت نظر نہ آتی تھی۔ بڑی عمر کی عورتوں کے مقابلہ میں وہ گم سم سی نظر آتی تھیں۔ ان کی گھٹی گھٹی ہنسی دبی دبی کھلکھلی اسے قطعاً نہ بھاتی تھی۔ کام کہنے کو وہ ان کا بھی کر دیتا تھا مگر وہ اسے دعائیں نہ دیتی تھیں۔ دلہن والوں کے گھر ایک عورت نے یہ کہہ کر "اچھا نا جی پھوپھی بتول کا بیٹا ہے؟" کتنے پیار اور محبت سے اسے گلے لگایا تھا اور کتنے پُرخلوص لہجہ میں دعائیں دی تھیں اور پاس کھڑی ہوئی باجی ولایت کی مسکراہٹ اسے کتنی اچھی لگی تھی۔ اس وقت باجی کے ڈھلے ہوئے سانولے جسم میں سے زندگی پھوٹ پھوٹ کر نکلتی معلوم ہو رہی تھی۔ باجی ولایت ان عورتوں میں سے تھیں جو نواز کو پسند تھیں اور باجی کی شکل اسے بے انتہا پسند تھی۔ باجی کے ماہتابی گال ہمیشہ چمکتے رہتے اور ان کی غلافی آنکھوں کی پلکوں میں سے ایک ساحرانہ گھلاوٹ جھانکتی رہتی۔ نواز کے لئے باجی کی شخصیت میں ایک گرفت تھی اور علاوہ اس کے وہ نواز سے پیار بھی بہت کرتی تھیں اور ان کا کام کر کے نواز کو بے حد خوشی ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ ماں کو کوئی کام کرتے ہوئے وہ گر پڑا تھا اور اس کی نکسیر پھوٹ پڑنے پر جس پیار سے باجی ولایت نے جھٹ اٹھا کر اپنی اوک سے اسے پانی پلایا تھا۔ اس دن سے نواز کو وہ اور بھی اچھی لگنے لگی تھیں۔ نواز کی بھابی کبھی بچوں کو نہلا دھلا کر نواز کے ساتھ باجی ولایت کے گھر بھیج دیتی اور نواز باجی کے قریب بیٹھ کر گھنٹوں سکول کا کام کرتا رہتا۔ ساتھ ساتھ بچوں کی خبر گیری بھی کرتا، انہیں جھاڑی والے سے کچھ لا بھی دیتا اور باجی کبھی کہہ دیتیں "نواز پکڑ تو یہ کپڑا ذرا۔ اس کنارے سے۔ کھینچو اپنی طرف ــــ اور ــــ اور ــــ بس نکل گئی شکن۔ اب یہ کنارا کھینچو۔" مشین پھر چلنے لگتی اور نواز سکول کا کام کرنے لگتا۔ باجی ولایت کے بال بادامی تھے۔ نواز کو یہ معلوم تھا کہ وہ ہیئر ڈائی استعمال کرتی ہے۔ بال ریشم معلوم ہوتے تھے۔ ایک روز باجی کا سر دکھتا تھا۔ ان کی لڑکی نجمی ان کے بالوں میں تیل جھس رہی تھی کہ سالن جلنے کی بو آئی۔ نجمی باورچی خانہ کو بھاگی۔ باجی نے سر دبا کر کہا "ہائے ہائے" ــــ "باجی میں تیل جھس دوں؟" جواب کا انتظار کئے بغیر وہ تیل

جھنے لگا۔ "جیتے رہو تاجی کتنے اچھے ہو تم۔" بس اتنی سے بات سے تاجی پھول گیا تھا۔

اسے ٹھنڈا ٹھنڈا تیل ڈال کر باجی کے بال سہلانے میں کتنا لطف آیا تھا۔ وہ اپنے سر میں بھی تیل لگاتا تھا بھائی کے بچوں کے سر میں بھی مگر باجی کے بادامی بالوں میں تیل لگانے سے اسے ایک عجیب طرح کا لطف آ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کبھی جلی ہوئی ہنڈیا سے ابھی اور کھچڑی رہے۔ سینے پرونے کے دوران میں باجی کو کئی مرتبہ اپنی قمیص اتار کر نئی قمیص سے ماپنے کی ضرورت پیش آتی تھی اور نواز نے قمیص اتارتے وقت بنیان کے ذرا تھوڑا اور پر اٹھ جانے سے کئی دفعہ باجی کی کسی ہوئی ابھری سی توند کو دیکھا تھا۔ باجی اپنی قمیص آپ بہت کم سیتی تھی زیادہ درزی سے سلواتی تھی۔ کہا کرتی تھی درزی قمیص میں جان ڈال دیتا ہے اور یہ بات نواز نے بھی محسوس کی تھی کہ جب باجی قمیص پہن کر سینہ چھلکاتی پھرتی تو اکثر عورتوں کی نظریں باجی کی قمیص پر جم جاتی تھیں اور کئی تو جل بھن کر کہتیں:

"سب ڈھل گئے یہ نہ ڈھلی۔"

دوسری ناک بھوں چڑھاتی: "ڈھلے کیونکر ——— دو بیٹیاں جن کر آرام سے بیٹھ گئی ہے۔"

تیسری کڑھتی: "ہم تو جن جن کر بوڑھی ہو گئیں بوا۔ ذرا سوچو ولایت مجھ سے دو سال بڑی ہے۔"

"دو سال بڑی! تمہاری بیٹی لگتی ہے وہ تو۔"

"وہی تو میں نے کہا۔ بیٹی کیوں نہ لگے۔ نخرا تھوڑا ہے اس کا جیسے نئی جوانی چڑھی ہو۔ کوئی پوچھے خاوند نے تو میم کر لی ہے۔ وہ اپنے گھر تمہیں رکھتا نہیں اور تم یہ کیا بالوں میں آگ لگا کر میم بن رہی ہے۔"

میں کہتی ہوں کیا یہ آن بان دکھاتے اس کا جی بُرا نہیں ہوتا؟"

نواز سوچتا واقعی باجی ولایت میں ایک آن بان تو ضرور ہے۔ عورتوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ آن بان رکھنے کے لیے باجی کو کیا کیا خوشبودار اُبٹنے کوٹنے پڑتے تھے۔ چنبیلی اور گلاب کی کلیاں اُبٹنے اور کیا کیا اور الابلا کوٹنے چھاننے میں نواز کو بھی کئی بار باجی کا ہاتھ بٹانا پڑتا تھا۔ دلی آنے سے پہلے اس کی بھابی نے اپنی ملنے والیوں سے کہا تھا: "ولایت بیگم میری ایک سہیلی ہیں۔ جیسی باڈی وہ بناتی ہیں کوئی نہیں بنا سکتا۔ کبھی دلی گئی تو ان سے سلوا کر لاؤں گی۔" نواز نے دلی آ کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ باجی ولایت باڈی سینے پر کتنی جان مارتی تھیں۔ کس طرح ادب سے کترنیں کاٹتیں پھر جوڑتیں۔ کئی باڈیاں آگے سے کھلتیں کئی پیچھے سے۔ کسی پر بٹن لگتے تھے کسی پر ڈوریاں اور کئی باڈیوں کو مختلف رنگ کے چھوٹے چھوٹے چوکور ٹکڑوں سے اس طرح جوڑ کر بنایا گیا تھا کہ دیکھنے پر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے طوطے کے رنگدار پروں سے بنی ہوئی ہیں۔ باجی کو بس باڈیاں سینے اور پہننے کا شوق تھا۔

ہاں تو جب وہ عورت اس کو گلے لگا کر دعائیں دے رہی تھی تو اس کی پیاسی روح کتنی سرشار ہوئی تھی اور پاس کھڑی ہوئی باجی ولایت کی مسکراہٹ اسے کتنی اچھی لگی تھی۔ نواز کے دل نے جیسے کوئی بٹن دبا دیا اور ذہن میں یہ دوڑتے بھاگتے واقعات وہیں رُک گئے۔

اس نے کہا: "میں نے تو باجی کو مسکراتے سینکڑوں بار پہلے دیکھا تھا مگر وہ مسکراہٹ مجھے کیوں اتنی اچھی لگی ہے ——— شاید اس لیے کہ اس وقت دعاؤں سے میری روح سرشار ہو کر مسکرا رہی تھی اور اس پس منظر پہ باجی کی مسکراہٹ نہایت موزوں اور مناسب نقش کا کام دے گئی۔ کتنی ہم آہنگی تھی کتنی مطابقت۔ میری روح مسکرا رہی تھی اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے ——— واقعات پھر دوڑنے لگے ——— باجی کے بدن پر سفید لباس کتنا کھلتا تھا اور اسے شاید اس بات کا علم تھا جبھی وہ اکثر سفید لباس ہی پہنا کرتی۔ نصرت، باجی ولایت، خالہ نفیسہ اور کتنی اور عورتیں تھیں جو ریو میاں کی دلہن کو سنوارنے میں لگی ہوئی تھیں۔ نصرت نے عطردان تھام رکھا تھا مگر جب وہ کھلکھلا کر ہنستی تو معلوم ہوتا کہ عطردان اب گرا اب گرا۔ ایک سرخ دوپٹہ پکڑے کھڑی تھی۔ باجی ولایت ہنس ہنس کر دلہن کے ہونٹوں پر سرخی جما رہی تھی۔ خالہ نفیسہ دلہن کی آنکھوں میں

بڑی احتیاط سے سرمے کی دھاریاں کھینچ کر بولی "دولہا کو ذرا مست نگاہوں سے دیکھنا" اس پر پھر کھلی مچی۔ دلہن اٹھ کر کھڑی ہوئی تو باجی ولایت نے عطر لگایا۔ ایک نے کہا "چشم بد دور خوب بجی ہے دلہن" باجی ولایت نے قمیص کو بغلوں کے نیچے سے کھینچ کر کہا "قمیص ذرا کھلی ہے۔ چنٹیں ٹھیک نہیں آئیں"۔

نصرت نے ہنس کر کہا "تو اپنی دے دو ایک باڑی دلہن کو۔ کیا ہرج ہے؟"

ایک عورت نے ایک پٹا ہاتھ میں تولتے ہوئے کہا "اری ولایت! دلہن کو ابٹنا ذرا زیادہ دیا ہوتا۔ ہاتھ منہ دھونے میں ہی آدھا رہ گیا ہے"۔
"کہاں تھوڑا ہے برا۔ اتنا ابٹنا ملنے کے بعد پندرہ دن تک خوشبو نہ چھوٹے گی بدن سے"

"ٹھیک کہا ہے باجی نے، جس چوکی پر باجی نہاتی ہیں اس میں سے بھی ابٹنے کی خوشبو آتی رہتی ہے" قہقہے، ہنسی اور کھلکھلاہٹ کے نقار خانے میں نواز کی آواز منمنائی۔

"ارے تو میرے ساتھ کب نہایا تھا؟" ہنستی ہنستی نصرت نے اپنی بانہیں پیٹ لیں۔

اس ہجوم میں گھسے ہوئے نواز کی طرف بعض عورتوں نے اس طرح دیکھا تھا جیسے اس کی موجودگی کا انہیں اب احساس ہوا ہو حالانکہ وہ جانتی تھیں کہ وہ ان کے پاس کھڑا تھا۔

ایک عورت نے کہا "ارے ناجی تو کہاں آن گھسا ہے؟"

خالہ نفیسہ نے اپنے ساتھ لپٹا کر کہا "رہنے دو اسے یہ تو سات بیٹیوں جیسا ایک بیٹا ہے۔ ہمیں تو ایسی چیزیں اللہ دیتا ہے ہم کسی سے منگا نہیں سکتیں، کیوں ناجی؟"

اس فقرے کا لہجہ شرارت اور طنز سے بھرا ہوا تھا کہ اسے منہ چھپانے کے لیے اپنا سر خالہ کے پیٹ میں دینا پڑا تھا۔ پھر یہ ہنستی کھیلتی عورتیں دلہن کو لے کر اس کمرے میں پہنچیں جو اس کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ وہاں بھی کچھ عورتیں پہلے سے موجود تھیں سکرے میں سلگتی ہوئی اگر بتیوں کی ہلکی ہلکی خوشبو پھیل رہی تھی۔ ایک تخت پوش پر منقّے بچھا تھا دوسرے پر کچھ چیزیں ڈھکی پڑی تھیں۔ سرخ لباس پہنی ہوئی دلہن کو چھپرکھٹ پر بٹھا دیا گیا۔ نصرت نے ڈھکی ہوئی چیزوں پر سے کپڑا اٹھا کر کہا تھا "دلہن یہ چیزیں پڑی ہیں، دیکھ لو" ایک چنگیر میں پھولوں کے ہار پڑے تھے، ایک میں چھوہارے، ایک ٹوکری مٹھائی سے بھری پڑی تھی۔ ان چیزوں پہ تولیہ دے کر نصرت نے پھر انہیں سرخ کپڑے سے ڈھک دیا۔

ہنستی ہوئی عورتیں سر جھکائی دلہن کو چھپر کھٹ پہ تنہا چھوڑ کر باہر آ گئیں۔ حویلی کے دوسرے حصے میں میراثنیں گا رہی تھیں۔ عورتوں کا یہ ریلا سید ھا ادھر پہنچا۔ نواز دبک کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ میراثنیں اس وقت کوئی نقل کر رہی تھیں۔ ایک سر پہ پگڑی باندھے تر ے کی سیاہی سے مونچھیں بنائے مرد بنی ہوئی تھی اور دوسری نے ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ دونوں ناچتی اور گاتی تھیں۔ پگڑی والی میراثن کبھی کبھی ساڑھی والی کا منہ چومنے کو بڑھتی تو وہ کمر میں لچک ڈال کر علیحدہ ہو جاتی تھی۔ ڈھولک تیز تیز بج رہی تھی۔ گانے کا کوئی سر پیر نہ تھا۔ کبھی کبھی پگڑی والی میراثن اپنے زیریں حصے کو اس طرح ہلاتی کہ مجلس دیوار قہقہہ بن جاتی تھی۔ عورتوں کے چہروں پہ شر پر مسکراہٹیں ناچ رہی تھیں نواز کو ان کے چہرے عجیب طرح کے معلوم ہو رہے تھے۔ اسے ہر طرف سے نفس ہی کی برات چڑھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اتنے میں ایک اور میراثن اپنی قمیص کے نیچے بہت سے کپڑے ٹھونسے بڑا سا پیٹ بنائے آ دھمکی اور آتے ہی اپنے پیٹ کو پگڑی والی میراثن کے ساتھ ٹکرا کر اوٹ پٹانگ سی باتیں کرنے لگی۔ نواز کو اچھی طرح یاد تھا کہ وہ اس نقل کے دوران میں سو گیا تھا۔ اس کی آنکھ جب کھلی تھی جب کوئی عورت اسے اٹھا رہی تھی۔ اس نے دیکھا تھا مجلس بہت مختصر سی رہ گئی تھی۔ کوئی عورت اس کا ہاتھ پکڑے ایک بستر میں لٹا گئی۔ اس کا جی ابھی اور جاگنے کو چاہتا تھا۔ اس نے لحاف میں سے منہ نکال کر ادھر ادھر دیکھا۔ کمرے میں دو پلنگ اور بچھے تھے جن پر کوئی لحاف اوڑھے سو رہا پڑا تھا۔ گانے والے کمرے میں سے ابھی تک ڈھولک کی آواز آ رہی تھی۔

وہ حیران سا ہو گیا کیونکہ میراسیں اس لچر گیت کے آخری بول گا رہی تھیں جو اس نے بازاری لوگوں کو اکثر گاتے سنا تھا۔ اس کی نیند چند لمحوں کے لئے اڑ گئی۔ ڈھولک پر تھاپ پڑنے کے ساتھ میراسنوں نے ایک اور فحش گانا شروع کر دیا تھا اور وہ حیرت میں ڈوبتا ڈوبتا نیند کے سمندر میں ڈوب گیا تھا۔ جب اسے اپنی ٹانگیں گھٹتی ہوئی محسوس ہوئیں تو اس نے آنکھیں کھول دیں ——— "باجی!" ——— "ہاں، ہاں سو جاؤ"۔ باجی نے اسے بھینچ کر کہا۔ اس کی ٹانگیں باجی کی رانوں میں دب رہی تھیں۔ اس نے ہاتھوں کی مدد سے علیحدہ ہونا چاہا مگر اس کا ہاتھ الجھا ہوا تھا۔ باجی نے تو اس کی ٹانگوں کو آزاد کرتے ہوئے مری ہوئی آواز سے کہا: "درد ہو رہا ہے۔" جب اس نے نواز کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پیٹ پر رکھ دیا تو نواز گھبرا سا گیا مگر اب اس کے لئے سوائے چکنی چکنی توند دبانے کے اور کوئی چارہ نہ تھا اور باجی نواز کا ہاتھ پکڑ کر پیٹ پر ادھر اُدھر رکھتی جا رہی تھی اور سوتا جاگتا نواز دباتا دباتا خواب سا دیکھنے لگا جیسے وہ رجو میاں کی پھولوں سے سجی موٹر کا ہارن بجا رہا ہے۔ ایکا ایکی ایک نئی سنسنی نے اسے بیدار کر دیا اور اس نے آنکھیں کھولتے ہی اپنا ہاتھ کھینچا مگر باجی نے زور سے اس کا منہ چوم کر بھینچ لیا تھا۔ اس نے گھبرا کر باجی کی طرف دیکھا۔ سڑک کے بلب کی کمرے میں پھیلی ہوئی ننھی ننھی روشنی دم توڑ رہی تھی۔ اس مدھم روشنی میں باجی لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ اس کی گہری گہری گرم گرم آنکھوں کے پپوٹے بوجھل ہو رہے تھے۔ نواز کو ایک نامعلوم ڈر سے وحشت ہونے لگی تھی۔ وہ سمجھا شاید پیٹ کا درد بڑھ رہا ہے۔ اس نے ہمدردی سے کہا "باجی!" مگر لفظ اس کے گلے میں پھنس گیا۔ باجی نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ باجی اٹھ کر غسل خانہ میں چلی گئی۔ وہ سوچ ہی رہا تھا——— باجی کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ بستر میں آن گھسی۔ نواز سمٹ کر ایک طرف ہو گیا مگر باجی اب لیٹ کر پھیکے اور بے رونق چہرے سے چھت کی طرف اسی طرح دیکھنے لگی تھی جس طرح اب نواز لیٹا ہوا چھت کی کڑیوں پر نظریں جما کر بچپن کے واقعات یاد کر رہا تھا۔

سیمبل کے تکیے کے نرم لمس نے آج اس کے ذہن میں کیا کیا پرانے نقشے نچانے شروع کر دئے تھے۔ اس نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا جیسے اس کی زندگی اسی ہاتھ میں منجمد ہو گئی تھی یا جیسے اس کی موجودہ زندگی کا ذمہ دار صرف یہی ہاتھ تھا۔ اس نے سگریٹ کے باقیماندہ حصے کو انگلیوں میں مسل کر پھینک دیا اور نیا سگریٹ سلگایا۔ یہ سگریٹ پینے کی عادت بھی اسے کالج میں خواہ مخواہ ہی پڑ گئی تھی۔ کالج کے لڑکے کتنے شریر تھے۔ اگر وہ سگریٹ پینے سے انکار کر دیتا تو وہ کہتے "یہ یہ گھگو ہے۔ یہ کہتا بھی کتاب ہے، پیتا بھی کتاب ہے۔ ہم نے اس کا نام یونہی تو نہیں رکھا ہوا 'نواز گھگو'"——— آخر اس نے مجبور ہو کر پیش کئے ہوئے سگریٹ قبول کر لینے میں ہی اپنی خیر سمجھی تھی۔ اس کی واقفیت معدودے چند لڑکوں سے تھی۔ جب وہ اپنی محبت کے کارنامے بیان کرتے تو وہ حیرت سے سنا کرتا اور جب وہ کسی لڑکی کو چھیڑتے تو وہ تھر تھر کانپنے لگتا۔ ایک کہتا: "ارے نواز تم بھی کوئی آپ بیتی سناؤ۔"

اس سوال پر وہ ہمیشہ خفیف سا ہو جاتا۔ "یہ تو بس گھگو ہے گھگو" دوسرا کہتا اور بات ٹل جاتی۔ اب جب وہ کالج میں تھا اسے اپنی آپ بیتی کے خاکے میں کچھ جان پڑی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ واقعات نے اس کے ایف۔ اے تک پہنچتے پہنچتے ایسی کروٹ لے لی تھی جس کی اسے کبھی توقع بھی نہ ہو سکتی تھی۔ بھابی کو خالق کے لئے باجی ولایت نے نجمی کا رشتہ دے دیا تھا اور سب سے بڑے بھائی نے اس پر صاد کیا۔ خالق نواز سے بڑا تھا۔ بی۔ اے پاس نوکر جا کر نجمی کو بیاہ کر لے اپنے گھر لے گیا۔ ایک مدت کے بعد اس شادی پر وطن جانا پڑا تھا۔ باجی کے خاوند کی اگرچہ اس سے اَن بن تھی مگر جب تک وہ آیا نہ تھا باجی کتنی اداس اداس نظر آتی تھی اور اس کا اداس چہرہ دیکھ کر نواز کا جی کتنا جلتا تھا۔ اس کو اب باجی ولایت کے ہونٹ بھی اچھے لگنے لگے تھے۔ ہونٹ بھی کیسے تھے۔ عجیب عجیب آگے کو بڑھ کر نیچے کو مڑے ہوئے جیسے ابھری ہوئی گلاب کی پتیاں سُرخ سُرخ شاداب سی۔ جب وہ خالق بھائی کو دعائیں دیتی اور اس کے وارے نیارے جاتی تو نواز کو یہ بات بُری سی لگتی جیسے ان دعاؤں پر پہلے اس کا قبضہ تھا اور اب خالق بھائی نے قبضہ جما لیا تھا۔ پھر یہ سوچ کر آپ ہی آپ نادم ہو جاتا کہ وہ اس کا داماد ہے۔ اس کی بلائیں نہ لے گی باجی تو اور کس کی لے گی۔ مگر اپنے آپ کو سمجھاتے ہوئے بھی وہ گوارا ہی نہ کر سکتا تھا یہ باتیں۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے باجی'

اپنے فرض سے کوتاہی کر رہی ہے جیسے اس گھٹنے کو بھرنا باجی کا فرض تھا جو وہ اپنی یتیم روح میں محسوس کر رہا تھا۔ بی۔ اے میں داخل ہوئے ابھی پورا سال بھی نہ ہوا تھا کہ اسے بھائی کی کوششوں سے ملازمت مل گئی۔ اس بے روزگاری کے زمانہ میں ملازمت کا ملنا معجزہ سے کم نہ تھا۔

اس نے دھوئیں کا مرغولہ چھوڑتے ہوئے سوچا۔ خلیفہ نے سچ کہا ہے لاہور کی جلوہ افروزی اور نمائش کی فراوانی دیکھ کر دل تڑپنے لگتا ہے اور شباب کی للکار سن کر واقعی قدم تھم جاتے ہیں۔ شباب۔ شباب بھی کیا بلا ہوتا ہے۔ ان دنوں اسے نامعلوم کیا ہو گیا تھا جیسے اس کی آنکھوں پر عینک لگ گئی تھی جس کے شیشوں میں سے ہر چیز اسے خوبصورت نظر آتی تھی۔ ہر نسوانی چہرہ اسے حسین و جمیل نظر آتا تھا اور کبھی کبھی تو بدصورتی بھی اسے حسن اور دلکشی کا پرتو لئے ہوئے معلوم ہوتی تھی۔ سانولے اور زیتونی چہروں کو چھونے اور سفید چہروں پر سگریٹ کے دھوئیں کی پھونکیں مارنے کی عجیب سی خواہش اس کے اندر پیدا ہو گئی تھی اور جب وہ کسی مرد اور عورت کو سگرٹ پیتے دیکھتا تو اس کا شدت کے ساتھ جی چاہنے لگتا کہ اس کے ساتھ بھی کوئی عورت ہو اور وہ بھی دیا سلائی جلا کر اس کے ہونٹوں تک لے جائے اور پھر عورت کے ہونٹ اس ہلکی سی لو میں سرخ سرخ شعلے نظر آئیں۔ سینما میں کبھی کبھی اس سے ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ اگر قریب بیٹھی ہوئی عورت کے منہ سے نکلا ہوا سگرہٹ کا دھواں اس کی طرف آتا تو وہ اپنے سانس کے زور سے اندر کھینچنے لگتا۔ اسے عجیب بے ہنگم سے خواب آتے تھے مثلاً اسے اپنی ہمسائی جنگل بیابان میں نظر آتی ہے۔ جب وہ اس کی طرف غور سے دیکھتا کہ یہ جنگل میں کیا لینے آئی ہے تو وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتی اور اس کے گذر چکنے کے بعد اسے پیچھے سے پکارتی رہتی۔ ایک روز اسے کسی کام کے سلسلہ میں ایک رئیس زادے کے ہاں جانا پڑا تھا جس کے بچھے ہوئے صاف ستھرے بستر پر چار تکیے دیکھ کر اسے تعجب ہوا تھا۔ دو سرہانے کی طرف پڑے تھے۔ ایک دائیں، ایک بائیں۔ اس نے انہیں چھو کر دیکھا۔ ان میں سمبل بھری تھی اور وہ نرم نرم لمس ایک عجیب طرح سرور انگیز تھا۔ اس نے وہیں تہیہ کر لیا اور وہ تنخواہ پاتے ہی بازار سے سمبل کے چار تکیے خرید لایا تھا۔ دونوں طرف کروٹ لینے پر وہ نرم نرم تکیوں کو اپنے ساتھ لپٹا لیا کرتا۔ اس کی انگلیاں کس طرح ان میں دھنس جاتی تھیں اور اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے بیقرار خون کی بڑھتی ہوئی حرارت کسی تسکین کی جویاں تھی۔ جب وہ خالی الذہن ہوتا تو رجو میاں کی شادی والی رات کا واقعہ کسی خفیہ کمین گاہ سے نکل کر اس کے دل پر ٹھونگیں سی مارنے لگتا تھا اور اسے یقین ہو جاتا کہ وہ واقعہ اس کے ذہن میں گرم لوہے کے داغ کی طرح محفوظ ہو چکا ہے اس کا جی چاہتا کہ باجی اب پھر کسی موقع پر اسے اپنے ساتھ لٹا کر اس کی ٹانگوں کو اپنی زندگی بھری رانوں میں دبا لے مگر اسے ان خیالوں سے شرم بھی آنے لگتی اور وہ سوچتا باجی اس کے بھائی کی خوشدامن بن چکی ہے۔ بھائی کو اگر ان خیالوں کا پتہ چل جائے تو کیا ہو۔ جتنا وہ ان خیالوں سے بچتا اتنا ہی یہ اس کے سر پر عصبہ بن کر سوار ہو جاتے اور جذبات کی فسوں کاری اسے دم نہ لینے دیتی۔ باجی کے سینے کی کامل گولائیاں اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگتیں جیسے باجی نے اس کی جوانی پر کوئی افسوں پھونک دیا تھا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ باجی اس کے اندر سے نہیں نکل سکتی وہ تو اس کی ہڈیوں میں نفوذ کر گئی تھی، تو اس نے ہتھیار ڈال دئے اور کھلم کھلا اوٹ پٹانگ خیالات کے دھندھ میں ہاتھ ڈال کر اس لطافت گریز کی تلاش میں سرگرداں پھرنے لگا جو اس کے نفس کے دروازے پر بیباک دستک دے کر کہیں فضا میں گم ہو گئی تھی اور جسے نہ پا کر اس کی ترستی ہوئی روح ایک پیاسا اور مصر درد محسوس کرنے لگی تھی۔ باجی کے چھریلے بدن کا گرم اور معطر دباؤ، اس کے کسے ہوئے چوڑے سے پیٹ کی چکناہٹ اور اس کی بے باکانہ اور سجیلی حرکات کی یاد اس کی جوانی کا محور تھی۔ اسے خیال آتا اگر باجی اسے کبھی ملی تو وہ اس سے کہہ دے گا۔ باجی تمہیں معلوم نہیں کہ تم میں کتنی طاقت ہے۔ وہ سوچتا باجی کو کیا شاید سب ہی عورتوں کو پتہ نہیں کہ ان میں کتنی طاقت ہے۔ دماغ کی بے بسیوں اور دل کی حکمرانیوں سے اس کا چہرہ پھیکا پڑنے لگا تھا۔ مسرت کے دروازے پر سے ترسی ہوئی روح ان دنوں اس کی آنکھوں میں سے جھانکتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ یہ جب کی بات ہے جب اسے خالق بھائی کا بمبئی سے خط آیا تھا کہ اگر تمہاری صحت ابھی تک اچھی نہیں ہوئی تو چھٹی لے کر بمبئی آ جاؤ۔ باجی اور زرینہ بھی آئی ہوئی ہیں۔ یہ خط پا کر اسے کتنی خوشی ہوئی تھی۔ خالق بھائی نے اگرچہ

پہلے بھی بمبئی آنے کے لئے اسے کئی بار لکھا تھا مگر اب کے تو اس نے ذرا دیر نہ کی اور دو مہینے کی رخصت لے کر بمبئی پہنچ گیا۔

خالق بھائی کے پاس چھوٹا سا فلیٹ تھا صرف دو کمرے اور ایک غسلخانہ، اور رہنے والے پانچ شخص۔ خالق، ان کی بیوی (باجی ولایت) زرینہ اور نواز۔ ایک کمرہ خالق اور نجمی کے دو پلنگوں سے ہی بھرا بھرا معلوم ہوتا تھا اور دوسرے میں سنگار میز اور چند کرسیاں بچھی تھیں۔ رات کو زرینہ نے اس کمرے کی کرسیاں تہ کر کے دیوار کے ساتھ لگا دیں اور کونے میں سے لپٹے ہوئے بستر نکال کر بچھانے لگی۔ موٹے موٹے دو گدے ان پر سفید چادریں اور تکیے۔ جب وہ اپنا اور باجی کا بستر بچھا چکی تو نواز کے ہولڈال کی طرف بڑھی "بڑے نفیس تکیے ہیں آپ کے نواز بھائی" اس نے نواز کے بستر پر تکیے رکھتے ہوئے "مگر ایں!! چار تکیے؟" اس نے مذاق اور حیرت کے ملے جلے تبسم سے اپنی ماں کی طرف دیکھا تھا اور باجی بھی مسکرا دی تھی "یہ سیمبل سر کے نیچے سے کھسک جاتی ہے اور مجھے نیچے تکیے پر نیند نہیں آتی ———"

"اچھا یہ بات ہے!" جھکی ہوئی زرینہ نے اپنا کھسکتا دوپٹہ سنبھال کر کہا۔ زرینہ اب خاصی جوان ہو چکی تھی۔ اس کی لمبی لمبی چٹیا کتنی موٹی تھی ساری گردن کو ڈھک رکھا تھا اس نے۔

بیچ میں باجی کا بستر تھا۔ دیوار کی طرف زرینہ کا اور دروازے کی طرف نواز کا۔ بستر فرش پر ساتھ ساتھ بچھے تھے۔ نواز لیٹا ہوا تھا اور باجی اس کی طرف پشت کئے سنگار میز کے سامنے کھڑی منہ پر کریم مل رہی تھی۔ اس وقت اس کی پیٹھ کا اتار کتنا خوبصورت لگا تھا نواز کو اور کہنی کے پاس جو ڈمپل پڑ رہا تھا خاکستری رنگ کا۔ اس کا جی چاہتا تھا باجی کی کلائی پر پنجے گاڑ دے اور اس داغ کو چوم لے ——— باجی جب اس کے پاس لیٹ گئی تھی تو وہ اسے اپنے ارمان کی طرح ایک نئی اور تازہ شے معلوم ہو رہی تھی۔

اگلے روز وہ تیار ہو کر سیر کے لئے نکلے تھے۔ باجی کی قمیص پر درزی نے کتنی اچھی چنٹیں دے رکھی تھیں جیسے خرگوش کے چھوٹے چھوٹے ننھے بچے پھدک رہے ہوں۔

"باجی آپ کو سفید لباس بہت اچھا لگتا ہے" یہ الفاظ اس کے منہ سے آپ ہی آپ نکل گئے۔

"فرخ نے بھی کل یہی کہا تھا، کیوں امی؟" زرینہ نے ٹانگ اڑائی۔

"فرخ کون ہے؟"

باجی بولی "فرخ زرینہ کی سہیلی ہے۔ ہمارے اوپر کے فلیٹ میں کوئی پنجابی رہتے ہیں۔ ان کی بیٹی کا نام فرخ ہے۔ اکیلی اولاد ہے بڑے چاؤ چونچلے ہوتے ہیں اس کے۔ زرینہ سے اس کا بڑا پیار ہو گیا ہے۔ یہ تو کئی کئی راتیں اور دن اس کے پاس گزارتی ہے۔"

"اس نے ہماری دعوت بھی کی تھی" زرینہ نے کہا تھا مگر نواز نے یہ بات اَن سُنی کر دی تھی۔

نواز کو چند دنوں کے بعد یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے اس کی آنکھوں میں ایک تکان ایک انوکھی بے کلی نے ڈیرے ڈال لئے ہوں مگر باجی کی غلافی آنکھوں میں وہی پرانی ساحرانہ گھلاوٹ موجود تھی بلکہ اب وہاں پلکوں کی چلمن میں ایک سحر رقیق کبھی اندر چھپتا اور کبھی باہر جھانکتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ایسی حالتوں میں اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ جب یہ نشے میں لپٹا ہوا جادو پلکوں کی چلمن سے جھانکتا تو وہ اپنی جرأتوں کو اکٹھا کر رہا ہوتا کہ وہ سحر رقیق پھر چلمن کے پیچھے جا چھپتا اور اسے باجی کی غلافی آنکھیں اسی طرح ٹھیک ٹھاک نظر آنے لگتیں جس طرح چوپاٹی کا ساحل پانی کا ریلا چلے جانے کے بعد نارمل حالت میں نظر آنے لگتا تھا ——— وہ غسل خانہ میں باجی کو دروازے کی اوٹ میں سے صابن ملتی بھی پکڑ چکا تھا۔ باجی اپنے جوڑے پر اس سے ہیئر پن بھی لگوا چکی تھی اور ایک شام جب وہ کرافورڈ مارکیٹ کے پاس کھڑے بس کا انتظار کر رہے تھے وہ جا کر جوڑے پر لٹکانے والے گندھے ہوئے پھول لے آیا تھا جو اس نے مرہٹہ عورتوں کو لگائے ہوئے دیکھا تھا۔ باجی نے پھول ہاتھ میں پکڑ کر اس کی طرف پیٹھ موڑ دی تھی۔ جب وہ باجی کے جوڑے پر پھول لگا چکا تھا تو زرینہ نے پھولوں کا دوسرا نصف حصہ باجی سے پکڑ کر خود اپنے

بالوں پر لگانا چاہا تھا مگر باجی نے پھول نواز کے ہاتھ میں دے کر کہا تھا "جو لایا ہے وہی لگائے گا۔" چنانچہ زرینہ کو بھی اپنے بالوں پر پھول نواز سے ہی لگوانے پڑے تھے۔ اس کو باجی کا کام کر کے اب بھی ویسی ہی خوشی ہوتی تھی مگر اس خوشی کے ساتھ اب اسے بے چینی سی بھی ہونے لگی تھی۔ ایک بار جب ان کی ٹریم بوری بندر کے پاس ٹھہری تھی تو نواز نے ایک گھاٹن کی طرف دو تین بار دیکھا تھا۔ اس کے سینے کی گولائیاں باجی کی چھاتیوں کی طرح سڈول تھیں اور باجی نے ایک دم پوچھ لیا تھا "بڑا دیکھ رہے ہو، کیا ہے اس عورت میں؟" اس بیباک سوال پر وہ گھبرا سا گیا تھا مگر اس نے ہمت کر کے کہہ دیا تھا "کچھ نہیں، دیکھئے باجی! کتنا متناسب بدن ہے اس کا۔" اس پر باجی نے شرارت سے مسکرا کر کہا تھا "کیا تمہیں ایسا بدن پسند ہے؟" یہ غیر متوقع جواب سن کر نواز کے بدن پر چیونٹیاں سی دوڑ گئی تھیں۔ اس نے ڈر کر کنکھیوں سے اُدھر دیکھا جدھر زرینہ اور نجمی بیٹھی تھیں مگر وہ دونوں باہر دیکھ رہی تھیں۔ پھر ایک روز باجی کہنے لگی "زرینہ تیری بچپن کی عادت نہ گئی۔ کس طرح سوتی ہے رات کو۔ ٹانگیں مار مار کے میرا بُرا حال کر دیتی ہے۔ جوں دھکیلنے لگتی ہے مجھے ہیں ناجی بچارے پہ جا چڑھتی ہوں۔" اگلی رات نواز کی آنکھ کھلی تو باجی واقعی نواز کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ نواز سوچنے لگا کیا کرے۔ اور آگے کھسکتا تو گدے سے نیچے فرش تھا۔ اس نے اپنے آپ کو سکیڑ کر کہا "باجی! باجی! دیکھئے آپ کھسک کر کہاں آ گئی ہیں۔" باجی نے نیند بھری آواز میں کہا "مجھے سردی لگ رہی ہے" اور نواز کی رضائی میں گھس آئیں ———— چند منٹ کے بعد باجی کے بازو پر نواز کا سر تھا اور اس کے دل میں یہ خیال، "باجی کتنی اچھی ماں بن سکتی ہے" عجیب عجیب نئی نئی صورتیں بدل رہا تھا۔

اگلے روز زرینہ کی سہیلی فرخ کا سر دکھ رہا تھا اور زرینہ سارا دن اس کے پائے کے ساتھ لگ کر بیٹھی رہی تھی۔ شام کا کھانا بھی اس نے اُدھر ہی کھایا تھا اور اپنی سہیلی کے پاس ہی سو گئی تھی۔ اس رات نواز نے محسوس کیا تھا کہ اس کے ارادوں اور جرأتوں نے ہکورے کھانے چھوڑ دئے تھے۔ نئی حوصلہ افزائیاں سینوں کے نئے ریلے پیدا کر رہی تھیں اور وہ باجی کے نرم جسم سے حرارت اور اس کے کانپتے ہوئے تنفس سے نشہ پا رہا تھا۔ کمرے کے گاڑھے اندھیرے میں باجی کی گھٹی گھٹی آوازیں تحلیل ہو رہی تھیں۔ نواز کے خشک ہونٹوں کے راستے اس کے سارے بدن میں رس اتر رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ قوس و قزح کے خوبصورت رنگوں میں سے گذرتا ہوا چاند کے پاس پہنچ رہا تھا۔ پھر ایک خوش آیند غنودگی اس پر چھانے لگی تھی اور وہ خوشبوؤں میں بسی ہوئی باجی کو اپنے ساتھ لگا کر سو گیا تھا۔

خالق بھائی تو اپنے کام پر جا کر شام کو لوٹتے تھے۔ نجمی کو ان کے آنے کا انتظار اور پھر گھر کا سو کام کاج۔ زرینہ کو پیار کرنے والی سہیلی مل گئی تھی اکثر شام کو نواز اور باجی ولایت ہی سیر کرنے جاتے تھے۔ نواز بمبئی اور ولایت دونوں کی سیر کرتا رہا اور ولایت کیسے کیسے عمدہ اور نفیس کپڑے پہن کر اس کے ساتھ پھرتی رہی۔ بمبئی کتنا اچھا شہر تھا۔ وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اپالو بندر پر گھومے یا چوپاٹی کی گیلی گیلی ریت پر پھریں کوئی ان کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ عورت کتنی محفوظ تھی وہاں اور پہلی بار جب دونوں نے جا کر ریسٹوران میں چائے پی تھی تو نواز نے کتنا اصرار کر کے باجی کو سگریٹ پلایا تھا اور وہ کتنی پیاری لگی تھی۔ اس کے ابھرے ہوئے مڑے مڑے ہونٹوں میں سگریٹ کتنا اچھا لگتا تھا اور ہونٹ سے ہونٹ لگنے پر کس طرح اس کی آنکھوں کی پلکوں کی چلمن سے سحر رقیق جھانکنے لگتا تھا اور وہ بے قابو ہو جاتی تھی۔ وہ اس کی ایسی ایسی رگوں اور پٹھوں کو گدگداتی تھی کہ اسے یوں معلوم ہونے لگتا تھا کہ زمین آسمان کے بیچ میں گدگدی ہی گدگدی بھری پڑی تھی۔ لاہور جا کر وہ کس قدر شدت کے ساتھ چاہتا رہا تھا کہ وہی سنسناہٹ پھر پھر اس کے خون میں دوڑتی چلی جائے اور اس کی پھریریاں اسے پھر بے چین کر دیں مگر اسے اطمینان تھا کہ اب باجی اس کی اپنی تھی اور اپنی ہی رہے گی کیونکہ اس نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ زرینہ سے شادی کر لے گا اور یہی ایک طریقہ تھا باجی کے ساتھ تعلق استوار رکھنے کا ———— اور جب اسے خالق بھائی نے لکھا تھا کہ تمہارا اس رشتہ کے متعلق کیا خیال ہے تو اس نے جھٹ رضامندی کا اظہار کر دیا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ زرینہ بھی کڑا کڑ بولتی ریوڑی ہو گی مگر جب دانتوں تلے آئی تو سیلی ہوئی۔ ماں کا بالکل عکس، سرد اور بے حس۔ مگر بے چاری اپنی نشانی چھوڑ کر خود چل بسی۔ تخیل کی سحر کاری کی ان سمٹتی ہوئی کرنوں میں نواز نے کروٹ لے کر ساتھ والے پلنگ پر نظر ڈالی۔ ڈھائی برس کی ننھی منی بچی

لحاف میں پڑی گڑیا معلوم ہو رہی تھی۔ نواز پھر سیدھا ہو کر لیٹ گیا مگر اب چھت کی کڑیوں سے اسے خوف سا محسوس ہونے لگا جیسے ان کڑیوں نے اس کے تمام رازوں کو اپنے اندر بھینچ رکھا ہو اور وہ جب چاہیں افشا کر دیں۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ایک لمبی جماہی بھر کم نعش کی طرح پھیلے ہوئے کوہ مُردار کی بلندیاں اسے فضا کی مٹی مٹی روشنی میں نظر آ رہی تھیں۔ ملازم لڑکا جو نیچے ڈیوڑھی میں ابٹنا کوٹ رہا تھا مدت سے دھماکوں کی آواز ختم کر کے سو چکا تھا۔ اس نے سوچا "بابر محلہ اتنی دور تو نہیں مگر عورتیں جب بیٹھ جائیں تو کب اٹھتی ہیں" وہ آ کر پھر لیٹ گیا۔ رازوں سے آگاہ چھت کی کڑیاں اسے پھر گھورنے لگیں جیسے وہ اگل دینا چاہتی تھیں، سب کچھ جو وہ دیکھتی رہی تھیں۔ اس نے کروٹ لے لی۔ سامنے کھونٹی پر دو باڈیاں ٹنگی تھیں ان کے پاس ہی تازہ اتری ہوئی سفید قمیص لٹکی تھی جس کی سطح پر چھوٹے چھوٹے ابھرے ہوئے شکن پہننے والی کے جسم کے کئی حصوں کی غمازی کر رہے تھے، وہ ہمیشہ بھینچی بھینچی فٹ قمیص پہنتی اور جب اتارتی تو اس پر سے سانپ کی اتری ہوئی کینچلی کی طرح اس کے گٹھیلے بدن کا ایک ایک پیچ گنا جا سکتا تھا۔ تخت پر علیحدہ علیحدہ کئے دھوبی کے دُھلے کپڑے پڑے تھے جن میں مختلف ڈیزائن کی باڈیوں کا ڈھیر ننھی بچی کے کرتوں کے برابر تھا۔ اس نے سوچا خیالوں کا اڑیل گھٹولا اسے آج کہاں کہاں لئے پھرا ہے اور جب اسے یاد آیا کہ وہ اڑا کہاں ہے تھا تو اس نے سوچا کہ اسے ظہیر کی باتوں کی تائید کرنی چاہئے تھی۔ اس نے دل سے کہا۔ آج تو اس نے کسی پارٹی کا ساتھ نہیں دیا۔ بالکل غیر جانبدار رہا تھا۔ ہاں اگر کل ظہیر نے یہی باتیں دہرائیں کہ عورت اچھی بھلی حالت میں وہ کچھ کر سکتی ہے جو مرد نشے میں بھی نہیں کر سکتا۔ . . . . . اور اگر بند شیں بھی اٹھ جائیں تو عورت جسے مقدس کہتے کہتے آپ کا منہ سوکھتا ہے . . . .

کمرے میں داخل ہوتے ہی ولایت نے میلاد شریف کی شیرینی کا لفافہ تخت پر رکھتے ہوئے اک انداز سے کہا "ابھی تک آپ جاگ رہے ہیں؟" سیمبل کے تکیوں کو سر کے نیچے سمیٹتا ہوا نواز یوں اٹھ بیٹھا گویا بالکل خالی الذہن تھا "تمہارے انتظار میں جاگ رہا تھا"

ولایت کی غلافی آنکھوں میں سے ایک گھلاوٹ نے جھانکا اور وہ مڑ کر آئینے میں اپنا آپ دیکھنے لگی۔

شکیلہ اختر

آنکھ مچولی

وہ بچپن ہی سے بہت شوخ و چنچل اور بڑی ہنس مکھ تھی، دیکھنے والے اسے دیکھ کر کہتے "ہنستے ہی ہنستے تو گھر بستے ہیں" اور جب اس کی زندگی کا دُوسرا اور سب سے اہم دَور شروع ہوا تو اس کے تبسم اور زیادہ رنگین ہو گئے اور ہنسی کی سُریلی جھنکاریں ستاروں کی طرح تابناک ہو گئیں۔ اسے تنہائی سے وحشت ہوتی تھی اسی لئے وہ رنگ و بو کی طرح ہر محفل پہ چھائی رہتی۔ اس سجی سجائی کوٹھی سے ہر گھڑی قہقہے بلند ہوتے رہتے تھے۔ اور احاطے میں سائکلوں کی قطاریں لگ جاتیں لیکن وقت اور بے وقت بھرے بھرے رکشوں اور آتے جاتے موٹروں سے وہ اُکتا گئی تھی۔ ایک ہی طرح کے ہنگاموں سے اب اس کا جی گھبرا گیا تھا۔ دن اور رات کے اکثر حصوں میں لوگوں کی طرح طرح کی ٹولیاں اس کے یہاں آتیں۔ کچھ اس کے بھائی کے دوست آتے جن کے آتے ہی ڈرائنگ روم کے پردے کھچ جاتے، برج کا دور چلنے لگتا۔ مونوپلی اور کیرم کے کھیل کھیلے جاتے۔ پھر اس کے دیور اور دوسرے بھائی کے ساتھی آتے۔ موٹی موٹی لال پیلی جلدوں کی کتابیں، رسالے، کبھی تو ان کے آتے ہی کمرے بند ہو کر پڑھائی شروع ہو جاتی اور کبھی وہ بلے اور گیند لئے ٹینس لان پر اچکنے لگتے۔ اور ہر روز شام ہوتے ہی گیارہ گیارہ بجے رات تک اس کے شوہر فیض کے ملنے والے آتے رہتے۔ ڈرائنگ روم برآمدہ اور کبھی کبھی سامنے کا احاطہ کرسیوں سے بھر جاتا۔ پھر تو شاعری اور فن شاعری کے جام چھلکتے اور ادب کی باریکیاں بیان ہوتیں۔ فیض کا ذوق ادب بہت بلند اور اس کا مشاہدہ بہت گہرا تھا۔ وہ ایک کامیاب ادیب تھا جس کے افسانے، ڈرامے، تنقید اور نظموں میں زندگی کی جاگتی ہوئی لہریں رواں اور دواں رہتی تھیں۔ کبھی زندگی کے اہم اصول اور دنیا کے نظام پر نگاہیں دَوڑائی جاتیں، گھریلو اور دقیق مسئلوں اور ان کی باریکیوں پر تبصرے ہوتے۔ قہقہے گونجتے، ہنسی کی لہریں اٹھتیں۔ اس کی کوٹھی میں زندگی لہراتی رہتی مگر یہ سب کے ہوتے ہوئے بھی وہ گھر کے اندر اپنے کو ایک بے تحاشہ وسیع خلا میں تنہا محسوس کرتی۔ ایک عرصہ تک انہی قہقہوں اور ہنسی کی انہی موجوں میں اپنے کو فریب دیتی رہی تھی، اور دیر دیر تک پردے کے پیچھے کمرے کے دریچے پہ بیٹھی اُن کی باتیں سنتی، ان کے تماشے دیکھتی۔ اور بیل کے شربت، انڈے کے حلوے، ناشتے اور چائے سے ان کی خاطریں کرتی رہتی تھی۔ پس پردہ اس نے ان رنگینیوں میں اپنے آپ کو بہلانا چاہا تھا، مگر اب اسے اس گھر سے وحشت ہونے لگی تھی۔ یہ اس کا گھر نہیں تھا۔ زندگی کی شاہراہ پہ ایک پُر رونق کلب تھا اور اس کا جی چاہتا کہ اس کا اپنا بھی کوئی گھر ہوتا۔ بارہ سال کا ایک طویل عرصہ وہ اس کلب میں گذار کر اب تھکی تھی۔ تاش کے پتے، کیرم کی کٹا کھٹ اور مونوپلی کی ہار جیت میں وہ اپنی زندگی کی شکست ہی شکست دیکھ رہی تھی، بلّے اور گیند کی ہر ایک

ضرب نے اس کے دل کو مجروح کر دیا تھا اعصاب، دنیا، اور نظامِ حیات کے گہرے گہرے تجربوں نے اس کی زندگی کے ہر تار و پود کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر بکھیر دیا تھا۔ گھر میں اتنے ہنگاموں کے ہوتے ہوئے بھی وہ خود ایک اجاڑ ویرانہ میں ایک اکیلی ٹھنڈ و درخت تھی۔ اور ڈرائنگ روم کی حسین آرائش سے وہ اکتا گئی تھی، اپنی تنہائیوں سے پریشان ہو کر وہ دن بھر میں کتنی کتنی دفعہ اپنے ہاتھوں سے گھر کی ایک ایک چیز جھاڑتی رہتی تھی۔ مگر ان ساری چیزوں سے اب اس کا دل بھر گیا تھا، ایک مدّت سے ان لٹکی ہوئی تصویروں کو دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ آتش دان پر رکھے ہوئے خوبصورت کھلونوں پہ مہین مہین گرد دیکھ کر بھی اب وہ بے پروا رہتی۔ کارنس پر سجائی ہوئی گڑیاں بارہ سال سے بس ایک ہی طرح سے بے حس پڑی تھیں رنگ برنگ کی کپڑے اور مٹی کی گڑیاں، جھلکے کپڑے ململ کی طرح گل کر اب پھٹتے جا رہے تھے اور ان کے چہرے پر جگہ جگہ سے خراشیں پڑ گئی تھیں مگر وہ بے حس و حرکت جھکے ہوئے انداز میں بارہ سال کی طویل مدّت سے مسکرائے جا رہی تھیں۔ اس کو محسوس ہوتا جیسے وہ خود بھی مٹی یا کپڑے کی ایک بے جان گڑیا ہے، اس پر بھی ایک جگہ بیٹھ گیا تھا اور وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی سرک نہ سکتی تھی۔ اس کی روح کی دھجیاں بھی تار تار ہو چکی تھیں، اور مٹی کی گڑیوں کے چہرے سے کہیں زیادہ ...... گہری چھینٹیں اس کے دل پہ پڑ گئی تھیں۔ انہی کی طرح اس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ پھیل جاتی تھی۔ وہی مردنی سی بے حس مسکراہٹ، اب تک وہ انجان طور پر ایک بچہ کی طرح ان کھلونوں سے کھیلتی رہی تھی، نقلی کھلونے، اور مٹی کی بے جان گڑیوں سے۔ مگر یک بیک اتنے دنوں کے بعد اب اس کا جی بے اختیار یہ چاہنے لگا تھا کہ کمرے کے ان ریشمی پردوں سے لپٹ لپٹ کر کوئی جھومتا رہے، اس کی روح کو ایک طوفان کا انتظار تھا اور وہ اس آندھی میں گھر کی ایک ایک چیز کو تتر بتر دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کا جی چاہتا کہ کوئی لمبا بانس لیے ان جھکتی ہوئی ساری نفیس تصویروں کو گرا کر چکنا چور کر دے اور اس کا منہ چڑاتی ان مسکراتی ہوئی بے حس گڑیوں کو توڑ توڑ کر کوئی اس کی نگاہوں سے انہیں دور کر دیتا۔ وہ چاہتی تھی کہ میز اور کرسیاں اوندھی رہتیں اور سنگھار دان کے شیشے پر بڑے بڑے دھبے پڑے رہتے۔ اس صاف ستھری اور جھلملاتی ہوئی کوٹھی سے اب اس کا جی اکتا گیا تھا۔ وہ کوئی تبدیلی چاہتی تھی۔ ایسی اہم تبدیلی جو گھر کے کونے کونے پر چھا جائے۔ لمبے بانسوں پر ریڈیو کے ایریل دیکھتے ہی بتایا نہ اس کا دل چاہتا کہ گھر کے ایک ایک [illegible] میں وہ رسّی کی بھدی الگنی ٹانگ کر ان پہ ننھے ننھے بے شمار کپڑے پھیلا دے عجیب عجیب طرح سے بے ڈھنگے کپڑے جو کبھی اس گھر میں [illegible] تھے۔ سب سے زیادہ اس کو اپنی بے [illegible] کھلتی رہتی۔ سارا کا سارا دن پڑا رہتا۔ وہ کتابیں پڑھتے پڑھتے تھک جاتی۔ ایک ہی طرح سے [illegible] معطّر جب اس کی نگاہوں کے سامنے ناچنے لگتیں تب وہ اٹھ کر اکیلی کوٹھی میں بے مقصد چکر لگاتی، باورچی خانہ کے در پہ کھڑی نوکروں کی باتیں سنتی، ملازمہ کی آواز سنتے ہی وہ خود ڈاک لینے چلی جاتی۔ ترکاری والی، دھوبن اور دودھ والیوں سے وہ خواہ مخواہ کی مہمل باتیں دیر دیر تک کرتی رہتی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی خودداری [illegible] وہ تلملا کر رہ جاتی۔ ایسی باتیں اس کی شان کے خلاف تھیں۔ پھر وہ کیا کرتی کچھ وقت تو جیسے تیسے کر کے گزر جاتا تھا۔ مگر آخر کب تک ایک ہی شاہراہ پہ کھڑی وہ اپنے کو فریب دے سکتی تھی ——— !

اس کی کوٹھی سے لگی ہوئی دوسری کوٹھی میں گھوش بابو تھے، خوبصورت نازک سے، خوش نظر اور خوش سلیقہ۔ ان کی کوٹھی اور احاطے کا ہر ہر کونا گلزارِ جنت بنا رہتا انھیں پھولوں سے فطری طور پر ایک مجنونانہ عشق تھا، وہ خود بھی اسی شاخ کے ایک شگفتہ سے پھول نظر آتے اور ان کی بیوی اس گلدستے کے سارے پھولوں میں سب سے زیادہ نمایاں اور حسین پھول تھیں، وہ سچ مچ میں ایک گلدستہ جیسے لگتے۔ شگفتہ، خوبصورت، رنگین اور خاموش ——— ایک گہرا سکون ان کی کوٹھی پر ہر وقت چھایا رہتا، مگر جب سے ننھا گلاب ان کے درمیان آگیا تھا تب سے ان نئے گھر میں زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی، وہ بلا پلا حسین سا بچہ جب خوش خاں کے بعد اپنے کمرے کے دریچہ پر کھڑا ہو کر "ماں، ماں" کہہ کر شور مچانے لگتا [illegible] اپنے دریچہ سے پکار کر بولی "گلاب! ماں نہیں امی بولو امی ——" اور یہ اس کا گلاب نام بھی اسی نے رکھا تھا۔ ننھی ننھی انگلیوں سے دریچہ کے [illegible] دو ایک روز تک تو چپ چاپ سے وہ پروین کی امی امی کہتی ہوئی آواز کو سنتا رہا اس کے بعد سے دریچہ کے سفید پردے کے اوپر سے اُچک اُچک کر چیخنے لگا "امی! امی!" پہلے تو پروین نے سمجھا کہ گلا بابا سبق یاد کر رہا ہے مگر یہیں ملن اُس نے یہ محسوس کیا کہ سارا سارا دن اور کبھی رات کو بھی امی امی کہہ کر وہ خود اسے پکارنے لگا ہے تو ایک عجیب سی تڑپ اسکے

دل میں پیدا ہوئی "امی" — امی کی یہی پیاری سی آواز سننے کی وہ کتنے دنوں سے منتظر تھی — اس سے پہلے بھی کئی دفعہ اس کی روح میں پُرخلش انگڑائیاں آچکی تھیں مگر اس آواز نے اسے ہولناک طور پہ بیدار کر دیا تھا۔ یاقوت کی طرح سُرخ لب اور پھٹی پھٹی سیاہ آنکھوں والا حسین سا بچہ جب اس سے لپٹ لپٹ کر کہتا "امی" تو وہ اکیلے میں اس کے سفید گالوں پہ اپنے بھیگے ہوئے رخسار رکھ کر کہتی — "میرا گلاب۔ میرا گلاب" وہ اس کے سارے گھر بھر میں ایک تتلی کی طرح منڈلاتا رہتا۔ اور جب گھوش بابو کی بیوی گلاب کو پروین کے پاس رکھ کر گھوش بابو کے ساتھ کبھی اچھی سی انگریزی فلم دیکھنے چلی جاتیں تو پروین تھوڑی دیر کے لئے یہ بھول جاتی تھی کہ گلاب کس کا بچہ تھا ——— ! امی گلاب اور گلاب کی مسلسل پکاروں نے اس کی روح میں ایک خلفشار مچا دیا تھا — !

یک بیک بارہ سال کی طویل مدت کے بعد پروین نے اپنے میں ایک مبہم سی تبدیلی محسوس کی اور یکایک اس کا دل نئی نئی کیفیتوں سے ہم آہنگ ہونے لگا اور سوتے ہوئے جذبات نے ایک دھارے کی طرح اس کی رگ رگ میں ہل چل مچا دی تھی۔ اور وہ اپنے خواب و خیال کے حسین تصورات میں کھوئی ہوئی سی رہنے لگی ——— "امی — امی" کہتا ہوا گلاب جب اس کی گود میں آنے کو مچلنے لگتا تو وہ اسے آہستہ سے تھپتھپا کر بہلا دیتی" ——— "گلاب! تم گلاب ہونا! اور تمہیں ایک ننھا چنبیلی کا پھول دُوں گی لو گے نا؟" ——— پھر اس کی نگاہیں چنبیلی کے اس حسین سے پھول کے تصور پر جم جاتیں۔ نازک خوبصورت ننھا سا چہرہ۔ بڑی بڑی معصوم سی آنکھیں، سر پہ اسی کی طرح گھنگریالے بال، چھوٹی چھوٹی انگلیوں والا مہندی لگا ہوا سا پاؤں کبھی ہنستا کبھی بلکتا ہوا پھول کی پنکھڑیوں جیسا یاقوتی ہونٹ" ——— یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ کیسے ہو رہا تھا۔ وہ ایک آرٹ کی تخلیق کر رہی تھی۔ اور اسے خود ہی معلوم نہیں تھا کہ وہ کیسا شاہکار بنا رہی ہے۔

فیض نے جب یہ خبر سُنی مسرت سے وہ جھوم گیا۔ پھر اس کی بڑی بڑی خاطریں ہونے لگیں اس کے سونے کے کمرے میں سُرخ سُرخ شاداب امریکن سیب خوش رنگ نارنگیاں اور بلور کی طرح چمکتے ہوئے دانوں والے انگور کے خوشے رکھے جانے لگے۔ فیض حُسن کا پرستار اور شعر و ادب کا ایک کامیاب آرٹسٹ تھا اسی لئے وہ چاہتا تھا کہ نیند سے بیدار ہوتی ہوئی پروین کی نگاہوں کا پہلا ٹھہراؤ حسین اور لطیف ہو اور انہی رنگینیوں اور شادابیوں کی آمیزش وہ پروین کے اس آرٹ میں دیکھنا چاہتا تھا ——— !

پروین اپنے دل و دماغ پر چھائے ہوئے کیف و سرور سے گھبرا کر کبھی کبھی سوچتی کہ دنیا کی اس پرانی روایت کو وہ اتنی اہمیت کیوں دے رہی ہے ایک ایک گلی میں کتنے کتنے بچے پڑے ہوئے تھے پیسے میں دو دو ملنے والی گڑ کی مٹھائی اور رینگنے بلبلاتے ہوئے بچوں کی اس دنیا میں کوئی کمی نہ تھی۔ اور ایک ہی وقت میں ان دونوں پر کتنی مکھیاں بھنکتی رہتی تھیں — شاید خود عرصہ ہی انتظار طویل ہو کر اپنی قدر کرانے لگتا ہے۔ اور اگر یہ بارہ سال کا ایک جگ نہ بیت جاتا تو چنبیلی کا نازک سا پھول اس کے لئے اتنا خوشبودار نہ ہوتا۔ اسی لئے بیچارہ گلاب چھوٹے چھوٹے سے قصور پر بھی اکثر پٹ جایا کرتا تھا۔ پھول کی ایک کلی اور ایک کانٹے سے بیگن توڑ لینے کے جرم میں گھوش بابو نے اسے کئی دفعہ مارا تھا۔ گلاب کے لئے صرف پروین کی ایک اکیلی گود ہی پُرسکون تھی وہ اپنی سزاؤں کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ کسی قصور پر بلا کہے سنے بھی اپنے ہاتھوں سے دونوں کان پکڑ کے وہ اپنے مخصوص کونے میں کھڑا ہو جاتا۔ مگر جب اس کو اکیلے کمرے میں بند ہونے کی سزا دی جاتی تو وہ دریچے پر چڑھ کر زور زور سے پکارتا ——— "امی! امی!" اور پروین اپنے سارے کام چھوڑ کر اپنے کمرے کے دریچے سے لگ کر گلاب کے سامنے کھڑی ہو جاتی ——— پھر گلاب اپنی زبان میں شکایت شروع کر دیتا ——— "امی! امی! ہم کو ماں۔ یں یں" — یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی پروین کو ایک لطیف انتظار تھا۔ وہ لیٹی لیٹی سوچتی رہتی اور بہت سے خوبصورت نازک نازک سے معصوم بچے اس کے پاس چکر لگاتے۔ کبھی نزدیک اور کبھی اس سے بہت دُور۔ اس کے گرد منڈلاتے ہوئے ننھے ننھے سے کلبلاتے ہوئے بچے کبھی کبھی اس کی روح سے سرگوشیاں کرتے "چنا پانی ہو" اسے ٹیگور کی کہانی یاد آ کر دکھلا دیتی پھر اسے لگتا جیسے بارہ سال سے چھپے ہوئے اس کے ہنستے پھول جیسے بچے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے اب اس سے بہت قریب آ رہے تھے "امی تا!" ——— ! اسے گھر کے کونے کونے سے یہی آواز آتی ہوئی محسوس ہوتی ——— "امی تا" ——— "امی تا" ——— لیکن اس آواز کے ساتھ اس کو افسانہ کی وہ بچی یاد آ جاتی جسے "تا" بولنا آتا تھا

اور وہ المارہی ہشلف، اور کونوں کے پیچھے چھپ چھپ کر اپنی ماں سے بس یہی ایک کھیل کھیلا کرتی "امی چیکو" ——— "امی چیکو"۔ اور اس کی ماں جان بوجھ کر اسے ڈھونڈتی پھرتی، مگر اس بچی کی آیا اس منحوس کھیل کھیلنے سے ان کو اکثر منع کرتی تھی اور آخر ایک دن بخار میں مرکو وہ جتی "امی چیکو" "امی چیکو" کہتی ہوئی وہ بچی اپنی ماں کی ڈھونڈتی ہوئی نگاہوں سے ہمیشہ کے لئے چھپ گئی تھی۔ اور اب یہی تکلیف دہ آواز پروین کو سنائی دے رہی تھی۔ سارے لوگ خوش تھے زندگی کی ایک مچلتی ہوئی لہر گھر بھر میں دوڑ گئی تھی ——— وہ کمزور ہوتی جا رہی تھی لیکن نقاہت کے اس پردے میں اس کی بیتابیاں مسرتیں چھپی ہوئی تھیں۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی کرنوں کی طرح اس کا چہرہ زرد ہوتا جا رہا تھا۔ فیض نے بار بار اسے ڈاکٹر کو دکھانا چاہا مگر پروین کو ڈاکٹر کے نام سے وحشت ہونے لگتی۔ ایک مبہم سا خوف اس کے سارے جسم کو کپکپا دیتا۔ شاید۔ شاید یہ اس کی روح کا ایک فریب ہو۔ اور اگر یہ صرف ایک خواب تھا تو وہ اسے ہمیشہ اپنی آنکھیں بند کئے دیکھتی رہنے کی آرزومند تھی ——— اس کی مسہری کے چاروں طرف دیواروں میں خوبصورت سے فریم میں کئی تصویریں فیض نے لا کر خاص طور پر اپنے ہاتھوں سے لگائی تھیں۔ کسی کے بال گھنگریالے تھے، کوئی پھولے پھولے گالوں والا بچہ منہ پھاڑے ہوئے ہنس رہا تھا اور کسی کا مسکراتا ہوا پیارا سا چہرہ کوئی جھک جھک کر اس کی گود میں آنے کو مچل رہا تھا اور کسی طرف سے بلکتا ہوا بچہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اسے بلا رہا تھا۔ پروین کو ان تصویروں سے شدید طور پر محبت ہو گئی تھی۔ یہ سارے بچے اسی کے تھے صرف اسی کے بارہ سال سے چھپے ہوئے یہ ہنستے، بلکتے اور ہمکتے ہوئے اتنے سارے بچے ایک ہی دفعہ اس کی خالی گود میں آنے کو مچل رہے تھے، پروین انہیں دیکھ کر کبھی کبھی تڑپ سی جاتی۔ وہ ان کے نزدیک جاتی پھولے پھولے گالوں اور بڑھاتی ہوئی ننھی ننھی انگلیوں کو دیوانہ وار چوم چوم کر کہتی "میرے بچے میرے لال میں کیسے تمہیں اپنے کلیجے میں بٹھا لوں" ——— سجے ہوئے کمروں کو دیکھتی ہوئی وہ انتقام سوچتی ——— تمہاری سفیدیاں میرے دل پر چھپکے لگاتی رہی ہیں، اب یہاں ہر ہر جگہ دھبے نظر آئیں گے، دودھ کی شیشی رہے گی، دودھ کی بوتلیں رہیں گی اور دہکتی ہوئی انگیٹھی اور ہر طرف اس کی راکھ بکھری پڑی رہے گی وہ اس کوٹھی کا منہ چڑا! چڑا! کر بہت سی الگنی ٹانگے گی اور ان کی رسیوں پر بھی بہت سے بے ہنگم سے کپڑے پھیلے رہیں گے۔ اس گھر کی ترتیب وار سناٹگی سے وہ تھک گئی تھی۔ اسی لئے ہر ہر طریقے سے وہ اپنی روح کی اس بیزاری کا اعلان کرے گی ——— گلاب بہت زیادہ نزدیک رہ کر اب اس سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ پروین کی نگاہیں پھولوں کے حسین ڈھیر میں اپنے لئے ایک انوکھے پھول کا انتخاب کر رہی تھیں۔ مگر اس کا وہ لوکتا ہوا پھول اس کے تخیل سے بھی بہت بلند تھا۔ اکیلے بیٹھے بیٹھے بہت سے خیالات اس کے دماغ میں چکر لگاتے رہتے کبھی تصویروں میں چھپلی کی نازک پنکھڑیوں کی طرح ننھے ننھے سے ہاتھوں کو بیتابانہ چومنے لگتی اور کہتی "امی! امی" کہتا ہوا اس کے کلیجے سے لپٹ جاتا مگر کبھی یاس کے ہیبت ناک جھونکے سے اس کا مضطرب دھڑکتا ہوا دل جھولنے لگتا "ہاں" "نہیں" ——— ! جھولے کی پرانی رسی ہر ایک پینگ لینے پر مچلا رہی تھی اور پروین یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ "ہاں اور "نہیں" کے کس کنارے پر گرے گی۔ کاش یہ مچلاتی ہوئی رسی کبھی نہ ٹوٹے اور وہ "نہیں" سے گذرتی ہوئی بھی "ہاں" کے وقتی کناروں سے ٹکرا کر جھولتی رہے ——— !

گلاب کی ایک ٹوٹی ہوئی ننھی سی کلی گھروش بابو نے گلاب کے ہاتھ میں دیکھ لی۔ باپ کی نگاہوں کو پہچان کر گلاب سہم گیا۔ گھروش بابو اپنا غصہ برداشت نہ کر سکے وہ زور سے چلائے! "نکلو یہاں سے، نکلو یہاں سے" گلاب اپنی آنسوؤں سے بھری ہوئی حسین آنکھوں کو اپنی ننھی ننھی انگلیوں سے ملتا ہوا اپنے گھر کے پھاٹک سے باہر نکل آیا اور روتا ہوا گلاب دوسرے پھاٹک سے ہو کر سیدھا پروین کے پاس چلا آیا اور اس کی گود میں منہ چھپا کر سسک سسک کر رونے لگا۔ پروین کی آنکھیں بھی پرنم ہو گئیں اور وہ فطرت کی اس غلط تقسیم کو اپنے سینے سے لگائے اسے زور زور سے بھینچ کر پیار کر رہی تھی گلاب پھر اپنے کھیل میں لگ گیا۔ وہ کمرے میں دوڑ دوڑ کر چوں چوں کر کے پھدکتی ہوئی گوریا کو پکڑنے لگا۔ اس نے گوریا کی دم پکڑنی ہی چاہی تھی کہ اس کے ہاتھ کی ٹھوکر سے میز پر رکھا ہوا گلاس چھن سے گر کر چور چور ہو گیا۔ گلاب اپنی جگہ پر سہم گیا۔ یک بیک اس کے ننھے ننھے ہاتھ اوپر اٹھے اور وہ اپنے کان کو پکڑ کے رونے میں کھڑا ہونے کو جا رہا تھا کہ پروین دوڑتی ہوئی آ کر اس سے لپٹ گئی اور بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔ "میرا بچہ! میرا لال!" پروین کو تو یہ "چھن" کی آواز بڑی پیاری لگی تھی اور کاش وہ اس پیاری سی آواز کو ہر روز سنتی رہتی۔ گلاب کے لئے اس کے فقرہ پر پروین کا اتنا بیتابانہ پیار

ایک نئی چیز تھی۔ وہ اسے حیرت سے تکتا ہوا اپنا سفید ہاتھ پروین کے گلے میں ڈال کر محبت بھری خوشامد سے کہنے لگا: "امّی! امّی!"

پروین کی صحت کی کمزوری سے گھبرا کر آخر نفیس نے لیڈی ڈاکٹر کو بلا ہی لیا۔ ذبح ہوتا ہوا بکرا جس طرح قصائی کی چمکتی ہوئی چھری کو دیکھ کر لرز جاتا ہے۔ اسی طرح پروین لیڈی ڈاکٹر کو دیکھ کر کانپ گئی۔ امیدوں کے جھوٹے میں زور زور سے پینگیں پڑنے لگیں اور جھولے کی وہ پرانی مچلتی ہوئی رسّی اس کے سامنے ٹوٹتی ہوئی سی لگ رہی تھی "ہاں"۔ "نہیں" دونوں کناروں سے اس کی روح زور زور سے لٹک کھا رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں کو بند کر لیا کہ وہ اپنا آخری انجام نہ دیکھ سکے۔ جھولے کی رسّی ٹوٹ رہی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لیڈی ڈاکٹر نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ اس کی روح میں ایک زبردست دھماکہ ہوا اور اس کو لگا جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھا گئے ہیں۔ کوٹھی کے سفید چوٹے اور کمروں کی سجاوٹیں اس طوفان میں بجلی کی طرح رہ رہ کے چمک رہی تھیں۔ مٹتی، بلکتی اور ہمکتی ہوئی تصویریں گہری تاریکیوں میں چھپتی جا رہی تھیں۔ ایسے اندھیرے اور ایسی آندھی میں اس کے کانوں میں ایک آواز آئی "امّی تا" اور اس کی دیوانہ وار روح بیتابانہ طور پر دوڑتی ہوئی اسے پکڑنا چاہ رہی تھی مگر اس بڑھتے ہوئے طوفان میں آواز کا فاصلہ دور ہٹتا جا رہا تھا "امّی تا" "امّی تا" اور پھر ہولناک اندھیرے میں یہ آواز ہلکی ہوتی ہوتی ڈوب کر رہ گئی ———— ! فطرت اتنے دنوں تک پروین سے ایک ہولناک آنکھ مچولی کھیلتی رہی تھی اور پروین کے بے بس ہاتھ "امّی تا"۔۔ کی اس آواز کو نہ پکڑ سکے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں تکیہ سے لپٹی ہوئی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی "میرے بچے میرے لال!"

ہنس راج رہبر

اب اور تب

شربتی کا سر ننگا تھا اور بال قدرے بکھرے ہوئے تھے۔ جنھیں وہ بائیں ہاتھ سے گاہے گاہے درست کر لیتی تھی۔ ورنہ اس کی تمام تر توجہ اپنے کام پر مرکوز تھی۔ ماحول سے بے نیاز وہ رضائیاں سینے میں منہمک تھی۔ وہ جانتی تھی کہ دن بھر محنت کر کے وہ جتنی رضائیوں میں دھاگے ڈال دیگی اتنے ہی پیسے اسے مل جائیں گے۔ پہلے روز وہ بمشکل ایک رضائی میں دھاگے ڈال سکی تھی۔ لیکن اب دو میں ڈال لیتی تھی۔ اور اپنے کام کی رفتار اس سے کم ہونے دینا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے اس کا ہاتھ جلدی جلدی چل رہا تھا۔ اسے تن کی سُدھ بُدھ بھول گئی تھی۔ وہ ایک قمیص اور شلوار پہنے ہوئے تھی۔ اور رضائی کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک گھوم رہی تھی۔ جہاں بیٹھ کر اس نے کام شروع کیا تھا۔ دوپٹہ وہیں زمین پر پڑا رہ گیا تھا۔ جس کی اسے مطلق پروا نہ تھی۔ کیونکہ سر کو ڈھانپنے کی فکر کرنے سے کام میں ہرج واقع ہوتا تھا۔ کام ادھورا رہنے سے ٹھیکیدار آدھی مزدوری کاٹ لیتا تھا۔

سرکار فوج کے لئے رضائیاں تیار کروا رہی تھی۔ کام ٹھیکے پر ہو رہا تھا۔ روئی بھرنے کے بعد انھیں سینا ورکار تھا۔ چنانچہ قرول باغ کے مغربی کونے پر جو نئی بستی آباد ہوئی ہے وہاں ایک کھلے میدان میں رضائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اور سینکڑوں عورتیں ان میں دھاگے ڈالنے کا کام کر رہی تھیں۔ ان میں سے اکثریت مزدور عورتوں کی تھی۔ جو برسوں اور پشتوں سے مزدوری کرتی چلی آ رہی تھیں اس لئے محنت مزدوری کرنا ان کی عادت بن چکی تھی۔ اس کام میں انھیں ذرا بھی جھجک یا شرم محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ اطمینان سے رضائیاں سی رہی تھیں۔ اور ان کے بچے قریب ہی کھیل رہے تھے۔

لیکن ان میں کافی تعداد ایسی عورتوں کی بھی تھی جنھوں نے پہلے پہل اس میدان میں قدم رکھا تھا۔ محنت کو اُجرت میں تبدیل کرنے کا ان کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا۔ انھیں اس جگہ تک پہنچنے میں بہت کچھ ذہنی تذبذب اور روحانی کش مکش کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اور جب آئی تھیں تو ان پر ایک غیر قدرتی احساس طاری تھا۔ سانس پھولی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ جیسے کوئی دیوار پھاندنا پڑی ہو۔ بہت سے اصول توڑے ہوں۔

شربتی بھی ایسی ہی عورت تھی اس نے بہت ہی ناسازگار حالات میں محنت مزدوری کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اور جب پہلے روز اپنے خاوند کرپارام سے کام پر آنے کی اجازت طلب کی تھی تو اس پر ایک دم سناٹا سا چھا گیا تھا۔ جیسے اس کی روح کو بجلی نے جھنجھوڑ دیا ہو۔ اس پر کافی دیر تک سکتے کا سا عالم طاری رہا۔ جب شربتی نے اپنی بات ایک بار پھر دہرائی تو اس نے بے بس اور مغموم نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور چپ رہ گیا۔ اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ جب شربتی چلی گئی تو وہ کافی دیر تک اسی حالت میں بیٹھا نہ معلوم کیا سوچتا رہا۔ اور دل ہی دل میں کڑھتا اور جھنجھلاتا رہا۔

کرپارام مغربی پنجاب سے اجڑ کر دہلی آیا تھا۔ کافی دیر تک وہ شرنارتھی کہلاتا رہا۔ لیکن اسے اور اس کے اکثر بھائیوں کو اس نام سے چڑ تھی۔ کیونکہ وہ کسی کی شرن میں نہیں آئے تھے۔ وقت کی ایک طوفانی اور خوفناک لہر نے انھیں یہاں لا پھینکا تھا۔ اس لئے حکومت نے ان کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے انھیں پرشارتھی کہنا شروع کر دیا۔ لیکن کرپارام کو یہ نام بھی پسند نہیں تھا۔ وہ اس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا۔ یہ نام اور الفاظ کیا اسے اپنی موجودہ زندگی تک سے کوئی انس نہیں تھا۔ وہ صرف کرپارام تھا۔ اور اسے اکثر اپنا ماضی یاد آتا تھا۔

میانوالی ضلع کے ایک گاؤں کلور کوٹ میں اس کی دوکان تھی۔ قصبہ کی آبادی دو ڈھائی ہزار کے لگ بھگ تھی۔ چار پانچ گھر ہندوؤں کے تھے باقی سب مسلمانوں کے لئے۔ کرپارام کا کاروبار خوب چلتا تھا۔ گھر کے مکان اور مویشی تھے۔ دوکان کے علاوہ وہ بنج کا بیوپاری تھا۔ وہ ٹھاٹھ سے رہتا تھا۔ یہ سارا کاروبار اسے اپنے باپ دادا سے ورثے میں ملا تھا۔ اور وہ ان کی دی ہوئی جائداد میں اضافہ کر رہا تھا۔

گاؤں کے مرکز میں اس کا پکا مکان تھا۔ جس میں متعدد کمرے تھے اور ایک تہہ خانہ تھا جس میں وہ نقد روپیہ اور زیورات چھپا کر رکھتا تھا۔ زیورات شربتی کے نہیں گاؤں کی عورتوں کے تھے۔ لوگ انھیں اس کے پاس گروی رکھ جاتے تھے۔ لیکن ایک بار اس تہہ خانے میں پہنچکر باہر کم نکلتے تھے۔ اپنے زیور اور قیمتی کپڑے رکھنے کے لئے شربتی کے پاس ایک آہنی صندوق تھا جو وہ مضبوط تالوں سے مقفل رہتا تھا۔

کرپارام کے نزدیک شربتی بذاتِ خود ایک ایسی شے تھی جسے روپے پیسے اور زیوروں کی طرح چھپا کر رکھنے کی ضرورت تھی۔ بلکہ روپے اور زیوروں سے کہیں زیادہ۔ کیونکہ اس کے ساتھ خاندان کی عزت منسوب تھی۔ اس لئے کرپارام نہایت مستعدی سے شربتی کی حفاظت کرتا تھا اور اس کی ہوا تک مکان سے باہر نہیں نکلنے دیتا تھا۔ کیا مجال غیر مرد کا سایہ تک اس پر پڑ جائے۔

جب تک گاؤں میں اسے اپنے مکان کے اندر رہنا نصیب تھا وہ شربتی کی یونہی حفاظت کرتا رہا۔ وہ اس کی بیوی تھی۔ اس کا کام خاوند کی خدمت کرنا تھا۔ جب سے وہ بیاہی آئی تھی کرپارام نے کبھی بھی اپنی دھوتی خود نہیں نچوڑی تھی۔ خانہ داری کا سب کام اسے کرنا ہوتا تھا۔ کرپارام کا فرض اس کے کام کی داد دینا نہیں بلکہ اس میں نقص نکال کر سو طرح برس پڑنا تھا۔

شربتی حسین تھی۔ درمیانہ قد۔ سڈول اور متناسب جسم، گول چہرہ، گورا رنگ اور موٹی موٹی آنکھیں۔ یہ اسے خود معلوم نہیں تھا کہ اس پر جوانی کب آئی۔ کیونکہ چھوٹی عمر ہی میں اس کی شادی کرپارام سے ہو گئی تھی جسے کسی طرح بھی قبول صورت نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اس کا جسم بھاری اور رنگ سیاہ تھا۔ چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ اور ہونٹ موٹے تھے اس کے علاوہ اسے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اس کی کھال بھینسے کی کھال کی طرح سخت اور کھردری ہو۔ اس کے اعضا میں گھلاوٹ اور ملائمیت کا نام تک نہیں تھا۔ روح تک بے حسی کے خول میں لپٹی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ اسے اپنی جائداد اور دھن دولت پر ناز تھا۔ اس کے بل بوتے پر وہ آسامیوں پر جبر کرتا تھا۔ اور خود شربتی پر جبر کرتا تھا وہ اپنے کاروبار کو توسیع دے کر بہت بڑا سیٹھ بن جانا چاہتا تھا۔ جس طرح ہر کھاتے پیتے خوشحال مرد کے گھر میں بیوی ہوتی ہے۔ اس کے گھر میں بھی شربتی موجود تھی۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس نے کبھی اس کی دلجوئی نہیں کی۔ اس کے حسن کی تعریف نہیں کی۔ اسے عورت بھی ماں باپ سے وراثت میں ملی تھی۔

لیکن جب ملک تقسیم ہوا تو اسے اپنا گاؤں چھوڑنا پڑا اور وہ جائداد بھی چھوڑنی پڑی جو اسے جان سے زیادہ عزیز تھی۔ بمشکل چند زیور اور کچھ روپیہ بچا کر لا سکا تھا۔ یا پھر شربتی اس کے ساتھ آ گئی تھی۔ جگہ جگہ کی ٹھوکریں کھاتا ہوا وہ دہلی پہنچ گیا۔ اور آخر وہیں رہنے لگا۔ کچھ دن رفیوجی کیمپ میں گذارے۔ وہاں سرکار کی طرف سے راشن مفت ملتا تھا۔ اور کرایہ وغیرہ بھی نہیں دینا پڑتا تھا۔ اس لئے گانٹھ کا پیسہ محفوظ رہا۔ مگر وہاں ایک مصیبت تھی۔ اور یہ مصیبت اسے اپنے اُجڑنے سے بھی زیادہ کھٹکتی تھی۔ یہاں شربتی کو پردے میں رکھنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ہر کس و ناکس کی نظر اس پر پڑتی تھی اور وہ بھی بے حیائی سے مڑ مڑ دوسروں کی طرف دیکھتی رہتی تھی، جیسے عجائب گھر میں آ گئی ہو۔ جیسے اس نے جب سے پیدا ہوئی ہے، لوگ نہ دیکھے ہوں۔

سامنے والے کیمپ میں شیخوپورہ کا جو ملکھراج رہتا تھا اسے دیکھ کر پارام بہت کڑھتا تھا۔ جی میں آتی تھی کہ اس پر کوئی الزام لگوا کر کیمپ سے نکلوا دے، اندیمان پہنچوا دے۔

ملکھراج کی مردانہ شبیہہ جاذبِ نظر تھی۔ وہ تندرست اور خوبصورت تھا اور پچیس چھبیس سال کا نوجوان تھا۔ ہنس مکھ اور ملنسار واقع ہوا تھا سب کے ساتھ گھل مل کے رہتا تھا۔ ہمدردی سے پیش آتا تھا۔ دوسروں کا چھوٹا موٹا کام کر دینے میں بھی اسے کوئی دریغ نہ تھا۔ کیمپ کے سب لوگ اس کی تعریف کرتے تھے۔ مرد، عورتیں اور بچے اس سے ہنس ہنس کر بولتے تھے۔ لیکن کرپارام کو وہ چالاک اور حیلہ باز نظر آتا تھا۔ ورنہ کیا مطلب کہ وہ یوں عورتوں سے چپڑ چپڑ باتیں کرے اور ہنسے۔ جب وہ شربتی سے باتیں کرتا تو کرپارام کی چھاتی پر سانپ لوٹ جاتا۔ اور آگے سے شربتی کا مسکرانا تو بہت ہی ناگوار گزرتا۔ اس کے نزدیک یہ بے حیائی کی انتہا تھی۔ وہ اس حرکت کے لئے شربتی کو کئی مرتبہ سخت سست کہہ چکا تھا۔ لیکن شربتی کو اس کی مطلق پروا نہ تھی۔ وہ اسے اکثر ملکھراج سے ہنستے اور باتیں کرتے دیکھتا تھا۔

ایک ملکھراج ہی کیا۔ وہ اسے کس کس سے باتیں کرتے سے روکے۔ طرح طرح کے لوگ اکٹھے ہوئے تھے۔ سبھی مل جل کے رہتے تھے۔ میدان میں کیمپ لگے ہوئے تھے۔ درمیان میں کوئی دیوار حائل نہیں تھی۔ پھر ایک دوسرے سے دُکھ سُکھ کہنا ہوتا تھا۔ عام طور پر چوکے چولہے کی چیزوں کی بھی کمی تھی۔ جو کچھ برتن بھانڈے بچا کر لا سکے تھے انہیں عورتیں آپس میں لے دے کر استعمال کرتی تھیں۔ شہر کے لوگ ربط ضبط بڑھانے میں خاص طور پر تیز واقع ہوئے تھے۔ بات کرتے ذرا نہیں جھجکتے تھے "بہن جی! تمہارے گھر والے کہاں ہیں؟ سب خیریت سے تو آ گئے؟" وغیرہ وغیرہ قسم کے سینکڑوں سوال پوچھتے اور جواب دینا ہی پڑتا۔ ان کی عورتیں بھی کتنی چونچال تھیں۔ پھرکی کی طرح اِدھر اُدھر گھومتی پھرتی تھیں۔ سر ننگے صرف بلاؤز اور پیٹی کوٹ پہنے ہوئے کھلے بندوں سامنے نل پر کپڑے دھوتیں اور مردوں کی طرح صرف ایک کپڑا زیب تن کر کے نہانے لگتیں۔ مرد چاہے تو نگاہ نیچی کر لے۔ مگر ان کی نگاہیں ذرا نہ جھکتیں۔

کرپارام شرم کے مارے زمین میں گڑا جاتا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ اس دلدل سے دُور بھاگ جائے۔ اس نے ہم کیمپوں سے بارہا شکایت کی تھی کہ عورتوں کو اس بے حیائی سے روکا جائے۔ یہ سب کچھ تہذیب کے خلاف ہے۔ ہم نے بڑوں کی مریادا چھوڑ دی ہے۔ تبھی تو یہاں تک پہنچے ہیں۔ لوگ اس کی باتوں پر مطلق دھیان نہ دیتے۔ لیکن وہ رٹ لگائے رکھتا۔ جس کو دُوا ہمار دیا تا۔ اُنہی کے پاس اپنا دُکھ رونے بیٹھتا۔ یہاں تک کہ جب رفیوجی ایکشن کمیٹی کے رضاکار یہ پرچار کرنے آتے کہ ہم کب تک یوں بیٹھے رہیں گے۔ حکومت سے مطالبہ کریں کہ وہ ہمیں بسانے کا اپنا وعدہ پُورا کرے تو کرپارام انہیں بھی اپنی رام کہانی سُنانے لگتا ——" اور تو سب کچھ پاکستان میں لُٹا آئے ہیں ایک عزت بچی ہے وہ بھی محفوظ نہیں۔ کوئی اوٹ نہیں۔ پردہ نہیں۔ بہو بیٹیوں کی آنکھ کا پانی اُترتا جا رہا ہے۔"

شربتی کو اس کی ہر وقت کی یہ کل کل اچھی نہیں لگتی تھی۔ وہ کئی مرتبہ اس سے اُلجھ پڑتی۔ اور تنگ کر کہتی ——" اور کسی کو تو اپنی بہو بیٹی کی فکر نہیں ایک صرف تمہاری ہی عزت لُٹی جا رہی ہے۔ بڑے ایسے آئے ہیں کہیں کے، مجھے مکھی بنا کے ڈبیا میں بند کر لو۔"

اسے شربتی کی یہ زبان درازی اچھی نہیں لگتی تھی۔ جب وہ گاؤں میں رہتا تھا تو اسے کبھی منہ کھولنے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ مگر یہاں دوسروں کو کیا تماشہ دکھائے۔ جب کبھی آپس کی کھاٹ میں ذرا اونچا بولنے کی نوبت آئی تھی تو لوگوں نے شربتی کو لعنت ملامت کرنے کی جگہ خود اسے برا بھلا کہا تھا۔ اور وہ خفیف سا ہو کر رہ گیا تھا۔

شربتی دن بدن بدلتی جا رہی تھی۔ دوسری عورتوں کی روش اپنا رہی تھی۔ پہلے پہل وہ مجبور ہو کر کسی غیر مرد سے بات کرتی تھی۔ لیکن اب بات کرنا اپنا حق سمجھتی تھی۔ پہلے وہ کسی کی نظر اپنی طرف اُٹھتے دیکھ کر چھاتیوں پر نہایت احتیاط سے کپڑا ڈھک لیتی تھی۔ لیکن اب وہ سمجھتی تھی کہ کوئی دیکھتا ہے تو دیکھتا رہے۔ اس کا کیا چھین لے گا نہ اس کا جسم شہد ہے اور نہ اس کی آنکھیں مکھیاں جو اُسے چاٹ جائیں گی۔ وہ نگاہ کی ہوس کاریوں سے بھی بے نیاز ہو گئی تھی۔ اپنے آپ کو چھپا کر رکھنے کے بجائے اسے اپنے ماضی پر غصہ آتا تھا۔ کرپارام پر غصہ آتا تھا جو دروازے سے باہر جھانکنے تک سے منع کر دیتا تھا۔ وہ کیوں اس پر اپنی اجارہ داری جتاتا تھا۔ وہ جتنا ہی ان باتوں کو سوچتی تھی اتنا ہی اسے کرپارام کریہہ اور بدصورت نظر آتا ——— وہ یہاں تک سوچنے لگتی۔ کہ اسے کیوں ناحق اس مرد سے باندھ دیا گیا؟

جب وہ دوسروں کے ساتھ بیٹھ کر فساد کی باتیں کرتا مسلمانوں کے فرضی اور حقیقی مظالم بیان کرتا تو اسے وہ مظالم یاد آیا کرتے جو کرپارام اس پر ڈھایا کرتا تھا۔

کرپارام دوکان پر کام میں مصروف رہتا۔ اور وہ گھر میں تنہا بیٹھی تنگ آ جاتی ——— گھر میں ساس نند یا چھوٹا بچہ تک نہیں تھا۔ جس سے باتیں کرے دل بہلائے۔ ایک دن وہ یونہی اُٹھ کر ڈیوڑھی کے دروازہ پر آ گئی اور کواڑ کی درز میں سے گلی میں جھانکنے لگی اچانک اس کھڑکی سے جو دوکان میں کھلتی تھی کرپارام اندر آ گیا۔ شربتی کو باہر جھانکتے دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ اسے چٹیا سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا اندر لے گیا اور فرش پر پٹک کر اِدھر اُدھر سے دو چار لاتیں جما دیں۔

اب اُسے محسوس ہوتا کہ وہ یہ سب مظالم ناحق برداشت کرتی رہی ہے۔ اسی لئے اب کرپارام اگر ایک بات کہتا تو وہ چار سُناتی۔ اور جس حرکت سے وہ ناراض ہوتا اُسے بار بار دہراتی۔ ملکھراج سے باتیں کرنے میں اُسے ایک گونہ تسکین حاصل ہوتی وہ کرپارام کو دکھا دکھا کر اس سے بولتی اور مسکراتی تھی۔ اب اُسے کیمپ کے کسی مرد سے بات کرتے جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔

کرپارام نے جب دیکھا کہ شربتی ہاتھ سے نکلتی جا رہی ہے۔ سیدھی بات کہنے سے منہ نوچنے آتی ہے تو اس نے دل پر جبر کر کے کیمپ چھوڑ دیا۔ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد اسے قرول باغ میں ایک کمرہ کرایہ پر مل گیا۔ اور وہ شربتی کو ساتھ لے کر اس میں رہنے لگا۔

لیکن اب روزی کی فکر سر پہ سوار ہوئی دو چار روز ہی میں اسے معلوم ہو گیا کہ پہلے ہی یہ بات کیوں نہ سوچی۔ راشن بازار سے خریدنا پڑتا اور مکان کا بیس روپلے ماہوار کرایہ بھی پیشگی دینا پڑتا تھا۔ اتنا کیا کم تھا کہ بنا پگڑی کے اسے یہ کمرہ تو مل گیا جوں جوں دن گذرتے تھے فکر بڑھتی جاتی تھی۔ پہلے خیال تھا کہ سرکار کچھ مدد کرے گی۔ پاکستان میں وہ جو اتنی جائداد چھوڑ آیا ہے۔ اس کا کچھ معاوضہ ملے گا۔ لیکن یہ سب کچھ نہ ہو سکا۔ اس نے اپنا کیس رجسٹرڈ کرا دیا تھا معاوضہ ملنے کی کچھ نہ کچھ اُمید بھی ضرور تھی۔ مگر جب تک کچھ نہیں ملتا اس وقت تک تو خرچ اُسے ہی چلانا پڑے گا۔

کرپارام نے معاش کی تلاش شروع کی۔ جان پہچان کے کئی آدمیوں نے کام کا چھوٹا موٹا سلسلہ شروع کیا تھا۔ مثلاً لڈنیدا رام نے لانڈری کی دوکان کھولی تھی اور لبھو کھتری نے حلوائی کی دوکان، وہ چاہتا تھا کہ ان میں سے کسی نہ کسی کے ساتھ ساجھا کرے۔ لیکن کوئی رضامند نہ ہوا۔ کام اتنا تھوڑا تھا کہ ان کے اپنے ٹکڑے مشکل سے چلتے تھے۔

آخر اس نے جس خاندانی وقار کو اتنا عرصہ سنبھال سنبھال کر رکھا تھا خیرباد کہہ دیا۔ اور پھلوں کا خوانچہ لگانے کا فیصلہ کیا۔ وہ ایک روز صبح

سویرے منڈی گیا۔ کیلے، سنگترے خرید لایا۔ اور بازار میں بیٹھ کر بیچنے لگا۔

اب کرپارام کے لئے یہ بالکل نیا کام تھا۔ اور یوں بھی بازار میں کیلے سنگترے بیچنے والوں کی کمی نہ تھی۔ ہزاروں مہاجرین دہلی میں آکر آباد ہوئے تھے۔ ان میں سے اکثر چھوٹے چھوٹے دوکاندار یا خوانچہ فروش تھے انھوں نے بہت پہلے یہ کام شروع کر دیا تھا اور ایسی جگہوں پر قبضہ کر لیا تھا جہاں پیٹ بھرنے لائق بکری ہو جاتی تھی۔ —

کرپارام ہزار کوشش کرنے کے باوجود آٹھ دس آنے روز انہ سے زیادہ نہ کما سکتا تھا۔ جس دن اُسے سوا تیرہ آنے بچت ہوئی اس دن وہ بہت ہی زیادہ خوش ہوا اور رات گئے تک بیٹھا پیسے گنتا رہا۔ کئی بار گن چکا تھا۔ پھر بھی طبیعت نہیں بھرتی تھی۔ جی میں آتی کہ ساری رات گنتا ہی رہے۔ جیسے وہ سوا تیرہ آنے نہیں، سوا تیرہ ہزار روپے ہوں۔ گاؤں میں رہتے اس نے ایک دن میں کتنے ہی سوا تیرہ آنے کمائے تھے لیکن اسے اتنی خوشی کبھی نہیں ہوئی تھی۔

کبھی کبھار بکری کم ہوتی تھی اس لئے ایک دو آنے کا خسارہ رہتا تھا۔ ہاں پھل ضرور بچ جاتے تھے۔ ان میں کچھ خاص کر کیلے ایسے ہوتے تھے۔ جنھیں دوسرے روز اٹھا کر رکھنے میں خراب ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے کرپارام انھیں کھا لینے میں مصلحت سمجھتا۔ جتنے پھل کھاتا۔ اتنی اناج کی کفایت ہو جاتی۔ بعض مرتبہ میاں بیوی شام کو روٹی ہی نہیں پکاتے تھے۔

بھی کے طور پر پھل کھانا اچھی بات ہے۔ لیکن مجبور ہو کر روٹی کی جگہ پھل کھانے پڑیں تو آدمی کی طبیعت جلد اُچاٹ ہو جاتی ہے اس لئے کرپارام کو من مار کر پھل کھانے پڑتے۔ اور کئی مرتبہ ضرورت سے زیادہ کھانے پڑتے۔ جس کی وجہ سے بدہضمی کی شکایت رہنے لگی۔ لیکن اس نے پھل کھانا جاری رکھا اور بدہضمی بڑھتی گئی جو آخر پیچش بن گئی۔ پھل بیچنا تو در کنار گھر سے باہر نکلنا مشکل ہو گیا۔

کرپارام مرتے مرتے بچا۔ دو مہینے چارپائی پر پڑا رہا۔ قریب ہی ایک وید کی دوکان تھی۔ شربتی اُسے بُلا لاتی۔ اور اس سے دوائی لے آتی۔ دوائی کے علاوہ ضرورت کی دوسری چیزیں بھی اُسے خود خرید کر لانا پڑتی تھیں۔ کرپارام کو یہ پسند نہیں تھا کہ وہ بازار جائے اور دوکانوں پر گھومتی پھرے مگر کیا کرے بیماری کے ہاتھوں مجبور تھا۔ اتنا کیا تھوڑا تھا کہ بیوی کی دوا دوش کے کارن جان بچ جائے۔

وہ بدستور چارپائی پہ پڑا تھا۔ مگر افاقہ ہو رہا تھا۔ اس دوران میں اس کے اندر ایک تبدیلی واقع ہوئی، کہ اسے اپنا جسم کچھ ہلکا پھلکا معلوم ہونے لگا۔ جیسے پیچش سے اندر کا میل دھل گیا ہو۔ اب شربتی کو دیکھنے کا انداز بھی بدل گیا تھا۔ نگاہیں اکثر اس کے چہرے پر گڑی رہتی تھیں۔ اور اس میں خاص جاذبیت تھی۔ ملائمت اور ملاحت تھی۔ اس کا لہجہ بھی پہلے کی طرح کرخت اور تحکم آمیز نہیں تھا۔ اس میں نرمی اور متانت تھی۔ وہ پیار سے بولتا تھا۔

شربتی نے بھی اس تبدیلی کو دیکھ لیا تھا۔ اسے بھی اب کرپارام کو دیکھ کر کراہت نہیں ہوتی تھی۔ تندی اور سختی سے پیش آنے کی بجائے وہ اس کی خدمت کرنا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگرچہ بیماری دُور ہو گئی ہے لیکن کرپارام ابھی پندرہ بیس روز اور کوئی کام نہ کر سکے گا۔ اس لئے وہ چاہتی تھی کہ خود کوئی کام کرے۔ ایک روز بولی۔

"منگو اور بسنتی رضائیاں سینے جاتی ہیں۔ میں بھی چلی جاؤں؟"

"تم —— تم مزدوری کرنے جاؤ گی؟" کرپارام تجویز سُن کر حیران رہ گیا۔

"جب سب جاتی ہیں تو مجھے کونسا سرخاب کا پَر لگا ہوا ہے؟"

کرپارام چُپ ہو گیا۔ اپنی حالت اور گھر کی کیفیت کا دل ہی دل میں جائزہ لیا۔ اور پھر دبی زبان میں کہا۔ "کوئی سُنے گا تو کیا کہے گا؟"

"کہنے کو کون اپنا بیٹھا ہے۔ سبھی پہ ولیسی ہیں۔" شربتی نے جواب دیا۔ اور مزید کہا "پھر کہنے سُننے کی بات ہی کہاں رہ گئی ہے۔ جس سے جیسے

بن پڑتا ہے۔ پیٹ کا دھندا چلا رہا ہے"۔

اس دن سے شربتی رضائیاں سینے کا کام کر رہی تھی۔ شروع شروع میں وہ مزدور عورتوں سے کتراتی تھی۔ دوسری شرنارتھی عورتوں کے ساتھ ان سے ذرا فاصلہ پر بیٹھتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ تمیز مٹ گئی۔ وہ ان سے ملنے جلنے اور باتیں کرنے لگی۔ ہم پیشہ کی ہم پیشہ سے نفرت کیا۔ وہ بھی تو محنت مزدوری کرتی ہیں۔ کوئی عیب تو نہیں کرتیں۔

کرپارام کی نگاہ اب اور بھی بدل گئی ہے۔ اسے شربتی کے چہرے پر ہمت اور استقلال کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس کے خدوخال ٹھوس اور مضبوط بنتے جا رہے ہیں۔ اگر کسی کارن ناراض ہو کر وہ اس کے ساتھ سختی سے پیش آنا بھی چاہے تو نہیں آسکتا۔ اور اس پر کسی قسم کا شک کرنا تو اسے خود اپنی حماقت نظر آتی ہے۔

صدیقہ بیگم

روپ چند

اگر ندی کے پاس سوکھے درخت کا تنا نہ ہوتا تو لوگ ضرور پوچھتے کہ آج تک بوڑھا روپ چند ندی کے کنارے کیسے بیٹھا رہ گیا تھا۔ یہ تیز و تند ہوا کے جھونکے اس کا کچھ بھی تو نہ بگاڑ سکے تھے، ریت کے ٹیلے بنتے اور بگڑتے رہے مگر وہ درخت نہ تو کبھی ہرا ہوا اور نہ اس پر کبھی پھل پھول ہی کھلے اور نہ پت جھڑ میں اس کے نیچے سوکھی پتیاں ہی نظر آئیں ——— وہ بوڑھا آج بھی ندی کی لہریں گن رہا تھا جب ندی کے دونوں طرف بستیوں میں خون کی چھوٹی چھوٹی ندیاں بہہ رہی تھیں اور یہ ندی شاید اسی لئے اور بھی کروٹ سے بہہ رہی تھی ——— کہ کہیں یہ ندیاں اس سے آ کر نہ مل جائیں ——— اور جب زمین کے شعلے آسمان کی طرف لپک رہے تھے تب بھی روپ چند ندی کے کنارے بیٹھا تھا اور کسی نے اس سے یہ نہ پوچھا کہ وہ کون ہے؟ ہندو یا مسلمان؟ ——— برس بیتے وہ اس ندی کے کنارے آیا تھا اور اس نے سوکھے پیڑ کا سہارا لے کر اپنی کٹیا بنائی تھی مگر دیکھنے والوں نے ہمیشہ ہی اسے لہریں گنتے ہی پایا۔ گویا وہ لہریں گننے ہی کے لئے پیدا ہوا تھا۔ اور لہریں گنتے گنتے ہی مر جائے گا۔ اس نے کبھی بھولے سے یہ بھی نہ سوچا کہ یہ ندی جو شام کو تاریکی اور روشنی کا سنگم نظر آتی ہے دراصل شہر کے بیچوں بیچ سے بہہ رہی ہے اور کس طرح شہر کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہوئی چلی جاتی ہے ——— بالکل بے خبر ——— اگر وہ لوہے کا سرخ پل نہ ہوتا تو شاید یہ ایک شہر پہلے ہی سے دو ہو چکا ہوتا، تاہم یہ تقسیم قدرتی نہ ہوتے ہوئے بھی قدرتی تقسیم کا درجہ رکھتی تھی اور شہر والوں کے نزدیک اس کی وقعت روزمرہ کی زندگی میں بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ حالانکہ وہ بہت چوڑی ندی بھی نہ تھی اور اس کا پل کوئی بڑا پل نہ تھا۔ تاہم دریا کا وجود ایسا بھی نہ تھا کہ اسے نظر انداز کیا جا سکے۔ ویسے تو گھاٹوں پر شہر کی بساط کے مطابق کشتیوں کا بھی بندوبست تھا، مگر تپ دق کے مریضوں نے ان کے نرخ میں کافی اضافہ کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ ایک طرف سے دوسری طرف ناؤ سے پار کرنا عیاشی کے مترادف سمجھا جاتا تھا اور پھر جب لوہے کا پل موجود ہے تو اب ناؤ پر سے جانا تو یقیناً فضول خرچی تھی، اور بھی ایک وجہ تھی جس نے لوگوں کو کشتیوں سے ذرا بدظن کر دیا تھا۔ اور یہ تھا ہندو مسلمانوں کا جھگڑا ——— کیوں کہ ایک عرصے سے شہر کی فضا میں نفرت گھلتی چلی جا رہی تھی اور اسی لئے یہ شہر روز بروز دو حصوں میں بٹتا جا رہا تھا اور ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا دو صفیں منظم ہو رہی ہیں اور پل کے اس پار اسلام پور

کی بستی بستے بستے بس گئی تھی۔ کہنے کو تو اس میں کچھ غیر مسلم بھی تھے۔ یہ تھے چمار جوڑے ہی جو کسی گنتی میں نہیں اس لئے کہ اچھوت تھے ان کو مار کر کون مسلمان اپنے جسم کو ناپاک کرتا۔

دریا کے پاس بیٹھا ہوا بوڑھا شہر کی تاریخ سے بخوبی واقف تھا۔ اس لئے کہ وہ خود بھی تو اسی شہر کا رہنے والا تھا۔ وہ خود بھی اس کی بستیوں میں کھیلا کرتا تھا اس نے زندگی کی کتنی المناک راتیں اور کتنی طربناک شامیں اس شہر کی نذر کر دی تھیں ——— ایک عرصہ سے وہ دریا کے کنارے الگ بیٹھ گیا تھا اور اسی لئے وہ شہر کی سیاست سے بے خبر تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ آج شہر کی زندگی میں مذہب سیاست بن چکا ہے اور اگر وہ جانتا تو شاید تھوڑی دیر کے لئے خوش ہو لیتا کہ اچھا ہی ہوا کہ جو وہ ندی کی لہروں کو گن رہا ہے۔

روپ چند اچھی طرح جانتا تھا کہ کس طرح دھرم پور کے بالمقابل اسلام پور کی یہ بستی ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل جل کر بسائی تھی اور وہ چمار جوڑے کس طرح وہیں اپنے آبائی گھروں میں رہتے چلے آ رہے تھے، اور ان کے آباؤ اجداد کی ہڈیاں کس طرح راکھ بن کر اس دھرتی کا جزو بن چکی تھیں۔ اور اسی لئے وہ شاید ڈھیٹھ بھی تھے۔ یہاں تک کہ شہر میں مشہور ہے کہ جب ۱۶ء میں ندی میں باڑھ آئی اور چمار ٹولی کے جھونپڑوں کے اوپر سے پانی بہہ رہا تھا تو دور سے صرف درختوں کی پھنگیاں نظر آتی تھیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ صرف یہ نیم کا درخت ہے جو چمار ٹولی کا سب سے اونچا پیڑ تھا۔ وہاں لہرا رہا ہے اور لوگوں کا خیال تھا کہ اب چمار ٹولی کبھی نہ بس سکے گی اور جہاں اس باڑھ سے ہزاروں اور لاکھوں کا نقصان ہوا، وہاں لوگوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اب چمار ٹولی تو کبھی نہ بس سکے گی۔ ہمارے شہر کا ناسور ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ ہمارے شہر کے درمیان سے یہ چمار ٹولی تو سدا کے لئے نیست و نابود ہو گئی۔

سیٹھ دھنی چند اور ملا دولت حسین دونوں خوش تھے کہ ان کی زمین واپس مل گئی جس کو ان چماروں نے موروثی کہہ کر غصب کر لیا تھا۔ اور اب وہ عالیشان عمارتیں بنا سکیں گے۔ اور اسی لئے وہ خوش تھے کہ بڑی عدالت نے ان کی سن لی اور جھونپڑوں کو زمین سے ملا دیا۔ مگر پھر کیا ہوا یہی نا کہ انہی دنوں اسی روپ چند نے ملا دولت حسین بھائی کے بیٹے اور بہو کو پانی کے ریلے میں سے نکالا تھا۔ جب آدھی رات گئے پانی ان کے مکان میں چڑھ آیا تھا اور سارا گھر پڑا بے خبر سو رہا تھا۔ اس وقت نوجوان روپ چند نے چیخ کر سارا گھر اپنے سر پر اٹھا لیا تھا۔ اور پھر جب سب لوگ گھر سے باہر نکل آئے تو بھی ملا دولت حسین کے بیٹے اور بہو اپنے کمرے سے باہر نہ نکل سکے۔ دولت حسین چلاتے رہ گئے اور کوئی سننے والا نہ تھا۔ تب روپ چند نے اندر گھس کر کمرے سے دونوں کو باہر نکالا اور بہت سامان بھی دریا برد ہونے سے بچا لیا۔ اور یہی وجہ تھی کہ باڑھ کے بعد جب دولت حسین نے خاندانی روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے روپ چند سے پوچھا کہ "مانگ کیا مانگتا ہے"! تو نوجوان روپ چند کی زبان سے بےساختہ نکلا۔

"حضور ٹولی کو بسا دیجئے، نہیں تو پھر ہم کدھر جائیں گے ——— آپ کی سیوا میں رہنا چاہتے ہیں۔ آپ اور سیٹھ دھنی چند چاہیں تو پانی اترتے ہی چمار ٹولی کو بسا دیں ———"

ملا دولت حسین بھائی تیار ہو گئے اور سیٹھ دھنی چند بھی کیسے انکار کرتے کیونکہ وہ تو وہی کرتے جو دولت حسین سوچتے تھے اور ان کی اس دوستی کا چرچا بھی شہر کے اندر ضرب المثل کی حیثیت رکھتا تھا۔ پھر کیا ہوا یہی نا کہ پانی اترتے ہی مہینہ بھر میں چمار ٹولی بس گئی۔ اور اس بار انھوں نے ایسی لکھا پڑھی کی کہ چمار ٹولی پھر موروثی نہ ہو سکے۔ وہ ناسور شہر کے سینہ پر بدستور قائم رہا۔ اس لئے کہ وہ چماروں کی ملکیت نہ تھا۔

روپ بھی چمار ٹولی کا ہیرو بن گیا۔ اور مائیں اپنے بچوں کو روپ چند بننے کی ترغیب دینے لگیں ——— آخر روپ چند نے ان سب کو برباد ہونے سے بچا لیا تھا ——— جبکہ وہ چاہتا تو دو چار ہزار روپیہ مانگ لیتا۔ جو دولت حسین کے ہاتھ کا میل تھا۔ لیکن ۱۶ء کا زمانہ کتنے دن رہتا۔ آخر ایک دن ایسا آیا کہ دولت حسین اس بات کو بھول گئے اور یہ قصہ صرف گاؤں کے بڑے بوڑھوں کو یاد رہ گیا۔ کیونکہ بیس برس کے بعد جب

روپ چند کی لڑکی جوان ہوگئی تو اس ندی کے کنارے وہ پانی بھرنے آئی اور دولت حسین کے لڑکے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ——— وہ چیختی رہ گئی مگر دریا کی لہروں کو کیا پڑی تھی کہ وہ اس کی مدد کرتیں، وہ تو اٹھ اٹھ کر دیکھتی ہی رہیں اور پھر اس کی چیخ بھی فضا میں دب کر رہ گئی اور شہر والوں نے اتنا سنا کہ دھنی چند نے خود اپنے ہاتھوں سے روپ چند کی لڑکی کو برے فعل میں پکڑا۔ چنانچہ اسی بدنامی کے خوف سے وہ ندی میں کود پڑی۔ چلو اچھا ہی ہوا جو اسلام پور کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگنے سے بچ گیا۔ مگر ندی کی لہروں کو بھی اس پہ ترس آگیا اور وہ اس کو بہا کر لے گئیں۔

وہ دن ہے اور آج کا دن کہ روپ چند اسی کنارے پر بیٹھا لہریں گن رہا ہے اور اپنی سرسوتی کو ڈھونڈ رہا ہے جو اس کے سامنے آتی ہوئی شرماتی ہے۔ اس لئے کہ اس نے پاپ کیا ہے اور سیٹھ دھنی چند کی موجودگی میں ان کے دوست کے پوتے کی عزت لی ہے۔

لیکن پھر اس کے گیارہ بارہ برس کے بعد شہر کی زندگی میں ایک اور زلزلہ آیا اور روپ نے وہیں ندی کے کنارے بیٹھے بیٹھے دیکھا کہ پل کے دونوں طرف کے لوگ گھبرائے ہوئے بھاگنے لگے اور دھرم پور اور اسلام پور آہستہ آہستہ الگ ہوگئے ——— کسی ہندو کی مجال نہ تھی جو اسلام پور میں داخل ہوسکے اور اسلام پور کے مسلمان ندی کے پار جاتے ہوئے جھجکتے تھے۔ شہر کی زندگی میں یہ زہر کچھ اس طرح سرایت کر چکا تھا کہ بچوں میں بھی یہ احساس پیدا ہوچلا تھا کہ ندی کے پاس دوسرے گھاٹ کے ہندو ملاح آتے ہیں اور بچوں کو اٹھا لے جاتے ہیں اور عرصہ تک اس قسم کے قصے سننے میں آتے تھے جو اسلام پور میں روایات کا درجہ رکھتے تھے۔ لیکن ابھی تک ندی کے دونوں طرف کوئی فساد نہ ہوا تھا۔ فساد سے میری مراد ہندو مسلم جھگڑا ہے۔ ورنہ یوں تو بہت سے ایسے واقعات ہوچکے تھے جس سے اسلام پور اور دھرم پور کو کبھی بھی شرمندگی نہ ہوتی تھی یعنی آزاد ہند فوج پر جب لال قلعے میں مقدمہ چل رہا تھا تو ایک مسلمان نوجوان نے دھرم پور کے انگریز جج کو مار ڈالا تھا اور راحت علی کی اس جوانمردی نے دھرم پور کی سطح کو بلند کر دیا تھا اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ دھرم پور کے پاس بہتی ہوئی ندی کا پانی بھی اچھل اچھل کر دھرم پور کے اس نوجوان کو دیکھنا چاہتا تھا اور راحت علی کے نعروں سے شہر کی فضا گونج رہی تھی۔ دھرم پور کے رہنے والے خوش تھے کہ ان کی دھرتی نے ایک ایسے دیر کو جنم دیا جس نے بھارت ماتا کی لاج رکھ لی اور برطانوی عدل و انصاف کو منہ توڑ جواب دیا ہے۔ اس وقت لال قلعے کے انصاف پسندوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں ——— چنانچہ جب راحت علی کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تو سارے شہر میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی تھی اور اس کے ساتھ دھرم پور کے ہندوؤں نے بھی مل جل کر جلوس نکالے تھے اور سارا دھرم پور ہل گیا تھا۔ دریا کے دونوں طرف جشن ہو رہا تھا اور مجھے یقین ہے کہ اگر کہیں اس وقت گولیاں چلتیں تو دھرم پور اور اسلام پور ایک ہوجاتے اور پھر ندی کے پانی کو بھی اپنا رخ بدلنا پڑتا اور شاید پھر اسی خوف سے سرکار کو اپنا حکم واپس لینا پڑا ——— حکم حاکم مرگ مفاجات نہ بن سکا۔ پھر ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل جل کر اپنے معبدوں کو سجایا۔ بھگوان اور خدا کے حضور میں شکر بجا لائے اور بیچارے سفید فام آقا منہ تکتے رہ گئے اور کم از کم اس وقت تو بدلہ نہ لے سکے مگر یہ خون ایسا تھا جس کو انگریز شاید کبھی نہ معاف کرسکیں، پھر انھوں نے اس کا ایسا بدلہ لیا ——— کیونکہ جب نیا کلکٹر آیا تو شہر میں چراغاں بھی نہ ہوا اور اس کے بعد بھی کلکٹر صاحب نے عام جلسہ میں وہاں کے لوگوں کی تعریف کی اور اس وقت شہر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں زمین سے اٹھتی ہوئی نظر آئیں۔

روپ چند ان تمام کھیل تماشوں کو بیٹھے بیٹھے دیکھتا رہا، اور کئی بار تو اس کے جی میں آیا کہ وہ اپنی لڑکی کے قاتل کو بھول جائے اور اپنی بستی میں جا کر رہے اور ان جلسوں جلوسوں میں حصہ لے، مگر وہ ایسا نہ کرسکا اور یوں ہی بیٹھا تکتا رہا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ بڈھا اپنی اکلوتی لڑکی کا انتظار کر رہا ہے، وہ پاگل ہوگیا ہے، یہاں تک کہ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ انھوں نے اسے رات کے سناٹے میں زور زور سے چیختے سنا ہے، جب وہ اپنے بھگوان سے پرارتھنا کرتا ہے کہ وہ اسے ملا دولت حسین اور اس کی سات نسلوں سے انتقام لینے کی شکتی دے۔ مگر بڈھے کی صورت دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ داڑھی والا درویش فقیر جو در اصل چمار ٹولی کا رہنے والا ہے اور جس نے کبھی اپنی جوانی میں دولت حسین کے

لڑکے اور بہو کی جان بچائی تھی، دولت حسین سے انتقام لے سکے گا۔ اور اس کی سات نسلوں سے اپنی لڑکی کے خون کا بدلہ لے گا ——
ہاں تو نئے کلکٹر والی بات رہ گئی۔ وہ نیا کلکٹر جو شہر میں آیا تھا اس نے بڑے صبر و استقلال سے اپنے عہدے کو سنبھالا اور شہر کے عمائدین کا خیال تھا کہ ایسا حاکم اس شہر میں کبھی نہیں آیا تھا۔ یہاں تک کہ بوڑھے دولت حسین کا بھی یہی خیال تھا۔ ہاں ہاں انھیں مُلّا دولت حسین کا۔ جن کی پلکیں جھڑ گئی تھیں اور بھویں سفید ہو گئی تھیں —— وہ بھی کہتے تھے کہ ہمارے ہوش سنبھالتے کوئی حاکم شہر اس مزاج کا نہیں آیا۔ یوں تو انگریز بہتیرے ہوں گے کی بات ہی کچھ اور ہے۔ ملکہ کے زمانے سے یہ وقت آ گیا ہے اور آتنے انگریز حکام سے اپنا واسطہ پڑا مگر ان جیسا حاکم شہر کبھی آیا نہیں۔ پھر ہندو مسلمان سب کے ساتھ اچھا سلوک اور رواداری بھی غضب کی۔

—— پھر اس کی وجہ بھی تھی۔ مُلّا دولت حسین کو بلانے کے لئے صاحب کلکٹر اپنی موٹر بھیجدیتے اور بڑے بڑے حکام اس وقت مُنہ تکتے رہ جاتے تھے۔ آخر یہ بات تو دو چار دن میں بنتی نہیں۔ اس کے لئے کتنا روپیہ پانی کی طرح بہانا پڑتا ہے۔ اور سیٹھ دھنی چند بھی ان کو موٹر میں بیٹھ کر جاتے دیکھ کر مُنہ تکتے رہ جاتے۔ حالانکہ ابھی تک کوئی ایسی بات نہ ہوئی تھی کہ مُلّا دولت حسین نے سیٹھ دھنی چند کی کوئی بات ٹالی ہو۔ کیونکہ وہ تو ایک جان دو قالب تھے ——

اب جو بات بگڑی تو ایسی کہ مُلّا دولت حسین اور سیٹھ دھنی چند صاحب کلکٹر کے پاس ایک ساتھ دکھائی نہ دیتے تھے۔ حالانکہ دونوں کا بڑھاپا تھا۔ اور صاحب کلکٹر کے یہاں حاضری ہوتی تھی۔ اور جب پاس پڑوس کے نوجوانوں میں اس پر چہ میگوئیاں شروع ہوئیں اور مُلّا دولت حسین کے بیٹے نے ان سے کہا کہ آپ کا صاحب کلکٹر کے یہاں روز روز کا جانا لوگوں کو ناگوار گذرتا ہے تو انھوں نے بڑی لاپروائی سے کہا کہ۔
" بیٹا ہمارا کیا ہے، آج مرے کل دوسرا دن، مگر وقت کی بات ہے۔ ہندوؤں کے تیور پہچانو، اگر ایسے وقت میں انگریزوں سے مل کر نہ رہے تو پھر چمار ٹولی کے کمینے ہماری اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دیں گے —— ان چماروں کو کم مت سمجھنا —— اور پھر آدھی چمار ٹولی تو سیٹھ دھنی چند کے قبضے میں ہے —— سیٹھ دھنی چند کو بھی کم مت سمجھنا —— میں تو ان سے اپنی عزت برقرار رکھنے کے لئے ملتا ہوں" مُلّا دولت حسین چمار ٹولی کا ذکر کر رہے تھے تو وہ روپ چند کو بھول گئے تھے، وہ ۱۹۱۶ء کو بھول گئے تھے، وہ سرسوتی کو بھول گئے تھے کہ وہ ندی میں ڈوب مری تھی۔ ہاں انھیں کچھ یاد تھا تو یہی کہ چمار ٹولی کے کمینوں سے بچ کر رہنا چاہیئے۔ وہ ہماری اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دیں گے اور مُلّا دولت حسین جب ہندوؤں کے تیور پہچان رہے تھے تو وہ بھول گئے تھے کہ ان کے اپنے تیور بھی بدل چکے ہیں —— آج وہ دھنی چند سے اپنی عزت برقرار رکھنے کے لئے ملتے ہیں —— یہ اور بات ہے کہ سرسوتی کو اپنی عزت برقرار رکھنے کے لئے ڈوب مرنا پڑا تھا۔
لیکن اپنے باپ سے یہ جملے سن کر ان کے لڑکے کا بھی ماتھا ٹھنکا تھا کہ اب دن اچھے نہیں بڈھے روپ چند کی لڑکی مرنے کے بعد بھی انتقام کی تیاری کر رہی ہے —— اور مُلّا کے چند جملوں نے اس کو سمجھا بجھا لیا۔
ادھر سیٹھ دھنی چند سے جب دھرم پور کے لوگوں نے پوچھا تو انھوں نے دبی زبان سے کہا ——
" صاحب کلکٹر کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ آخر یہ بال دھوپ میں تھوڑا ہی سفید کئے ہیں۔ ایسا ہندو نواز کلکٹر تو اس شہر میں کبھی آیا ہی نہیں۔ میں نے اس کو شیشے میں اُتار لیا ہے۔ مُلّا دولت حسین کتنا ہی اس کے دروازے کے چکر لگائیں مگر سیٹھ دھنی چند کی بات ہی کچھ اور ہے۔ دو چار اشارے ہی کافی ہیں۔ سارے اسلام پور کی بستی میرے اشارے پر موت کے گھاٹ اُتر سکتی ہے ——" اور دھرم پور کے وہ لوگ جو سیٹھ دھنی چند کی باتیں سن رہے تھے اس وقت کانپ ہی تو گئے، آخر اسلام پور بھی دھرم پور کا ایک حصہ ہی تو تھا مگر بعد میں ان کو یہ سوچ کر خوشی ہوئی چلو یہ مسلمان تباہ ہو جائیں تو کیا ہونا ہے۔ پہلے اسلام پور اور دھرم پور کو دریا نے الگ کر دیا تھا اور اب سیٹھ دھنی چند اور مُلّا دولت حسین کی نااتفاقیوں نے —— اور جو کچھ کسر رہ گئی تھی وہ صاحب کلکٹر نے پہلے ہی پوری کر دی تھی اور نفرت کا ایک

زہر سا گھول دیا تھا وہ زہر جو دھرم پور اور اسلام پور کی روح میں سرایت کرتا چلا جا رہا تھا۔

بڈھا روپ چند۔ آج کی اس کی سیاست سے بے خبر تھا۔ اس کو معلوم نہ تھا کہ دھرم پور اور اسلام پور کی بستی کس طرح ایک دوسرے سے الگ ہو گئی تھی اور منشی صاحب کلکٹر نے وہاں کون کون سے جال پھیلائے تھے۔

اور آج جبکہ شہر کی فضا میں اچانک ایک دھماکا ہوا — دونوں بستیوں کے دل دہل گئے۔ چاروں طرف سے مار دھاڑ کا شور سنائی دینے لگا اور روپ چند دریا کی لہریں گنتے گنتے چونک پڑا۔ جب گولیوں نے دونوں بستیوں کا سینہ چھلنی کر دیا تھا اور روپ چند کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے یہ گولیاں خود اس کے اپنے سینے پر پڑ رہی ہیں۔ ساری بستی میں آگ لگی ہوئی تھی اور دونوں طرف کی آگ کا عکس دن کی روشنی کے باوجود ندی میں پڑ رہا تھا، شعلے ہوا میں پرواز کر رہے تھے، بستی کے ساتھ وہاں کی تہذیب جل رہی تھی، روایات جل رہی تھیں، عورتیں جل رہی تھیں، بچے جل رہے تھے، حال جل رہا تھا، مستقبل جل رہا تھا، اور ندی کا پانی اٹھ اٹھ کر دیکھ رہا تھا —— روپ چند نے کئی بار اٹھنے کا ارادہ کیا —— وہ چمار ٹولی کے بارے میں سوچنے لگا کہ نہ جانے چمار ٹولی کا کیا حال ہو —— مُلّا دولت حسین نے چمار ٹولی کو جلا دیا یا اسے جلنے سے بچا لیا۔ سیٹھ دھنی چند نے نہ جانے اس کے آبائی گھر کے ساتھ کیا سلوک کیا، اور آج بے طرح اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ جا کر بڈھے دولت حسین سے ملے۔ سیٹھ دھنی چند سے جا کر پوچھے کہ دھن اور دولت کی بستی میں یہ آگ کے شعلے کیسے —— اس کے کانوں میں عورتوں کی چیخیں کیوں آ رہی ہیں، کیا انھیں اس عظیم سانحہ کی خبر ہو چکی ہے —— مگر فوراً ہی روپ چند کے چہرے پر اطمینان کی لہریں دکھائی دینے لگیں، بالکل ویسی ہی لہریں جیسے اس کے پاس بہتی ہوئی ندی کے سینے پر بہتی جا رہی تھی اور جو آس پاس کے ماحول سے بالکل بے خبر تھیں۔

روپ چند کو یہ نہ معلوم تھا کہ آج شہر کا نیک اور رحمدل نیا آقا کس طرح دونوں بستیوں پر گولیاں چلوا رہا ہے۔ شہر کے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے خون سے ہولی کھیل رہے ہیں اور کتنی لڑکیوں کی عصمتیں لوٹی جا رہی ہیں —— وہ ان سب واقعات سے بے خبر تھا۔ لیکن دریا کے پاس بیٹھے بیٹھے روپ چند سوچنے لگا کہ ضرور آج دھرم پور کی آخری شام ہے، آج اسلام پور میں آخری بار چراغاں ہو رہا ہے۔ اس کے بعد یہ بستی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی اور صبح کا سورج ندی کے دونوں طرف صرف راکھ کا ایک ڈھیر دیکھے گا۔ اس کی اپنی چمار ٹولی بھی ختم ہو جائے گی، اور ایک بار پھر اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ چلو اچھا ہی ہوا جو وہ دریا کے کنارے آ کر بس گیا وہ ان ہزاروں سے اچھا ہے جو شہر کی گھٹی گھٹی فضا میں سانس لیتے ہیں اور جبکہ وہ صبح سے بھوکا ہے کوئی اس کو روٹی دینے والا نہیں آیا ہے وہ اور شدت سے محسوس کرنے لگا کہ ضرور شہر میں کوئی ناشدنی واقعہ ہو گیا ہے۔ اور ابھی شام پورے طور پر نہ ہوئی تھی کہ اس نے دیکھا کہ لوگوں کا غول پل کے پاس چلا آ رہا ہے اور اتنی دوری کے باوجود وہ گھبرا گیا، اور جب وہ لوگ روپ چند کی طرف بڑھنے لگے تو اس کی گھبراہٹ اور زیادہ بڑھ گئی۔ مگر پھر اس نے اپنے حواس پر قابو پا لیا اور ندی کی خاموش لہروں کو دیکھنے میں محو ہو گیا، یہ اٹھتی ہوئی لہریں یہ سانس لیتی ہوئی ندی اور اس میں جھلملاتا ہوا پل کا عکس اور پھر ڈھلتے ہوئے دن میں پل کا ڈوبتا ہوا سایہ بھی ندی میں جھلملا رہا تھا اور آسمان کی لالی کا عکس بھی ندی میں مرغم ہوتا جا رہا تھا۔ اس جلتے ہوئے شہر کے آدمیوں کو دیکھنے کے بعد وہ کتنی دیر دریا کی بے مقصد لہروں کو دیکھتا رہا۔ مگر اپنی طبیعت کے اس تضاد کو زیادہ دیر برقرار نہ رکھ سکا اور اس بار جب روپ چند کی نظریں اس غول پر پڑیں تو اس نے دیکھا کہ سیٹھ دھنی چند آگے آگے چلے آ رہے تھے اور ان کے پیچھے ایک آدمی نیزے میں سر گڑوئے چلا آ رہا ہے اور روپ چند کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب اس نے پہچانا کہ وہ سر ملا دولت حسین کا تھا اس کے چہرے کی جھریاں لٹک گئی تھیں، جیسے وہ سر اپنے محسن کو تلاش کر رہا تھا اور معاً روپ چند کو اپنی لڑکی کا خیال آ گیا۔ جس کے بعد اس کی نسل ختم ہو گئی تھی اور روپ چند لاوارث مرنے والا تھا۔

ملا دولت حسین کا پوتا ـــــ وہی پوتا جس نے اس کے خاندان کو تباہ کیا تھا۔ جو ابھی پیدا بھی نہ ہوا تھا جس نے اس کی اکلوتی لڑکی کی نورس تمناؤں کو ختم کیا تھا۔ جس نے اس کی بھرپور اُمنگوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا ـــــ اس کی اپنی سرسوتی کا قاتل ـــــ اس کے سامنے کھڑا تھا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ملا دولت حسین کا سارا خاندان موجود تھا ـــــ عورتیں جھنجھوڑے بیٹے چلی آ رہی تھیں۔ جن کے آنچلوں کو بھی کسی نے آج تک نہ دیکھا تھا۔

"روپ چند لے لو اپنی لڑکی کا انتقام ان مسلمانوں سے، آج تمھاری تمنا پوری ہونے کا دن آ گیا۔"

روپ چند دیوانہ ہو گیا، وہ لوگوں کی طرف جھپٹا، اور لوگ سوچ رہے تھے کہ وہ مُلا دولت حسین کے لڑکے کو چبا ڈالے گا ـــــ راتوں کو جیجنے والا روپ چند آج اپنے دشمن کے مدِ مقابل کھڑا تھا اور اس کا بیر پُرانا دشمن بے دست دیا تھا ـــــ مگر روپ چند نے آناً فاناً سیٹھ دھنی چند پر ایک زور کا وار کیا کہ مجمع دیکھتا رہ گیا اور لوگوں کے دیکھتے دیکھتے اس کی لاش کو اس نے اپنے ہاتھوں سے اُٹھا کر ندی کی لہروں کے سپرد کر دیا۔

"کمینے کہیں کے پنڈت اور سیٹھ بنتے ہیں!" اس نے نیزہ چھین کر دُور پھینک دیا۔ اور مُلا دولت حسین کا سر لڑھکتا ہوا ندی کی طرف بڑھ رہا تھا ـــــ لیکن روپ چند مجمع کی طرف دیکھ کر بدحواسی سے چیخ رہا تھا۔

ـــــ "چھوڑ دو دولت حسین کے یتیموں کو ـــــ شرم نہیں آتی اپنی بستی کی عورتوں کی بے عزتی کرتے!" اور مجمع کے لوگ حیرانی سے اس کا مُنہ تک رہے تھے۔

"آخر ہے نہ چمار ٹولی کا، مسلمانوں کا نمک کھاتا ہے!"

اور بھیڑ میں سے ایک آدمی نے نکل کر روپ چند کے سینے پر چھری کا ایک وار کیا اور ذرا سی دیر میں روپ چند کی لاش زمین پر پڑی تھی۔ نفرت سے کسی نے اس کو دریا کی آغوش میں پھینک دیا۔ اور وہ لہریں اس کو اسی طرح بہا کر لے گئیں ـــــ جیسے چند برس پیشتر اس کی سرسوتی کو لے گئیں تھیں۔

پھر دولت حسین کا سارا خاندان ان لہروں میں بہا دیا گیا ـــــ اور تمام لاشیں یکے بعد دیگرے ندی کی آغوش میں پہنچ چکی تھیں۔ اور تھوڑی دیر بعد پھر وہی سناٹا فضا پر چھا گیا۔

سورج کب کا ڈوب چکا تھا اور اس کا عکس بھی یونہی تاریکی میں مدغم ہو گیا۔ گویا وہ سورج یوں ہی ندی کے نیچے دب گیا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا جیسے یہ لہریں بالکل ساکن و جامد ہیں جو کبھی سانس نہیں لیتیں، یوں ہی بے حس رہتی ہیں ابھی تھوڑی دیر پہلے جب ڈوبتا سورج اس میں ہولے ہولے اپنا عکس ڈال رہا تھا یہ لہریں جاندار معلوم ہو رہی تھیں گویا وہ آخری بار ہچکی لے رہی تھیں۔ جس نے سارے دریا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اور اب سورج کے ڈوبتے ہی بالکل بے جان ہو چکی تھیں۔ ایک بے حس و حرکت لاش کی طرح ـــــ بے بصر آنکھوں میں کوئی جھلک نظر نہیں آ رہی تھی۔ اور ندی بھی یوں ہی ساکت و جامد ہو گئی تھی۔ اس کے دونوں جانب سڑک کے قمقمے جھلملا رہے تھے اور ایک عجیب بے کیفی کے ساتھ جل رہے تھے۔ اور ان کا عکس بڑی مناسبت سے پانی میں جھلک رہا تھا۔ اور اگر ان کا عکس نہ پڑتا تو پھر شاید یہ رات کی تاریکی ندی کو بالکل ہی اپنی آغوش میں لپیٹ لیتی اور راہگیروں کی نظریں بھی کروٹ سے بہتی ہوئی ندی پر نہ پڑتیں لیکن روپ چند کی کٹیا کا عکس ہلکا ہلکا پڑ رہا تھا۔ گویا یہ کٹیا بھی ندی کی گہرائی میں روپ چند کی لاش کو ڈھونڈ رہی تھی۔

عبدالرحمٰن چغتائی

تجاوز

اس کی عمر بہتر سال سے تجاوز کر گئی تھی اور جب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اس کی عمر بہتر سال سے تجاوز کر گئی ہے تو اس کا چہرہ دہک رہا تھا اس وقت اس کے سرخ چہرے پر زندگی کا والہانہ پن موجود تھا۔ رگوں میں خون گرما رہا تھا۔ خلائی آنکھیں پپوٹوں سے ڈھکی ہوئی شاہیں کے مانند معلوم دے رہی تھیں۔ آنکھوں کی چمک اور سرخ ڈوروں سے ظاہر تھا کہ وہ جو کچھ سوچ رہا ہے اس کی کچھ حقیقت ہے۔ اسے اپنی تنہائی کا احساس نہ تھا۔ اپنے سے علاوہ بھی ہر چیز متحرک دکھائی دے رہی تھی۔ انتشار ابھر رہا تھا، پل کی پل میں بدن شدت سے کانپنے لگتا تھا ——— صبح اس نے بڑے چاؤ سے داڑھی اور مونچھوں پر حنا لگائی تھی۔ حنا کا سیاہی مائل سرخ رنگ اس تندرست اور دمکتے ہوئے چہرے پر حیات افروز معلوم دے رہا تھا۔ جہاں جہاں اس کی نگاہ اٹھتی تھی ہر چیز اسے اپنی عمر سے کہیں زیادہ نظر آتی تھی۔ آئینہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ میری ماں کا کہنا ہے جب وہ اس گھر میں آئی تھی تو یہ آئینہ جوں کا توں اسی دیوار پر لٹک رہا تھا۔ اٹھ کر آئینہ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کا بازو پکڑ لیا ہے۔ وہ جھکا رہا۔ آئینے کی سطح کے اندر اسے اپنا اور اپنے بالوں کا سرخ رنگ شام کی شعاعوں کے مانند بہت گہرا گہرا نظر آیا۔ اس نے کبھی اس آئینہ کی تاریخ پر غور نہ کیا تھا کہ یہ آئینہ کس کس نے دیکھا ہے اور کس کس عمر میں۔ اس نے آئینے کی سطح پر بڑی لجاجت سے ہاتھ پھیرا۔ آئینہ آئینہ ہی تو ہے۔ اس کی آب و تاب میں سر مو فرق نہیں آیا۔ اسے یاد تھا ایک بار اسے اس کی ماں نے بڑے پُر وقار طریق پر آئینہ کے سامنے کھڑے ہونے سے روکا تھا جیسے وہ گناہ کا مرتکب ہو رہا تھا۔ آج اسے خیال آیا وہ شروع شروع میں خود بھی کئی بار گھڑی پل کے لئے اسی آئینہ کے سامنے رکی ہوگی کھڑی ہوتی ہوگی۔ آنکھیں کتنی جھومتی ہیں آئینہ کے سامنے۔ پھر زندگی میں ایسے لمحے بھی آتے ہیں کہ برسوں آئینہ دیکھنے کی نوبت نہیں آتی۔ وہ سوچنے لگا۔ جہاں تک یادداشت کا تعلق ہے آہستہ آہستہ ماں کو آئینہ کی موجودگی کا احساس ہی جاتا رہا تھا اور جب اس نے راہ رو کو آئینہ کے سامنے کھڑے ہونے سے روکا تھا۔ وہ اپنے اندر گدگدیاں محسوس کرنے لگا۔ وہ مسکرایا، وہ ہنس پڑا۔ یہاں تک کہ قہقہہ بلند ہوا اور اس نے اپنے قہقہے کے ساتھ ایک اور قہقہہ سُنا۔ وہ ذرا پیچھے ہٹ گیا جیسے ماں نے بازو سے پکڑ کر اسے آئینہ کے سامنے سے ہٹا دیا ہو۔ وہ پیچھے ہٹتا چلا گیا مگر آنکھیں آئینہ پر لگی رہیں۔ اس کی نگاہوں میں انسان کی عزت دیوتا سے کم نہ تھی ——— کانسی کا کشیدہ پیاس بجھانے کی غرض سے اٹھا لیا۔ پیشتر اس کے کہ وہ اسے پانی سے بھرے پیاس بجھائے

اس کی بناوٹ پر غور کرنے لگا اور کہنے لگا اس کی سرگزشت بھی انسان سے کم نہیں ہے اس پر میرے دادا کا نام اور دادا کے باپ کا نام کندہ ہے" کتنا چمکیلا اور کتنا خوبصورت ہے۔ گھس گھس کر اس میں رس پیدا ہو گیا ہے۔ اس کی عمر کا کوئی کیا اندازہ لگائے گا۔ تیوری چڑھا کر بڑے اعتماد سے عمر کے سوال پر نکتہ چینی کرنے لگا۔ آخر یہ عمر کا سوال ہے کیا، اور پھر یہ کم بخت لوگ عمر کے سوال کو طول دے کر زندگی آدھی کم دیتے ہیں انسان کی۔ میں بہتر سال کا جوان اڑھائی سو سال سے کیا کم بوڑھا ہوں گا۔ سانپ کی طرح تن گیا اور انگوٹھی سے کھیلنے لگا جو اس کے باپ دادا کی نشانی تھی۔ اسے گھر میں ہر چیز کی عمر اپنی عمر سے کہیں زیادہ نظر آ رہی تھی۔ خود توانا توانا اور تازہ دم تھا۔

باہر سہانی سی ہوا چل رہی تھی۔ اس کا دل بے قابو ہو کر اچھلنے لگا۔ وہ پیر سے اچھل کر باہر نکل گیا جیسے بچہ ہی تو ہے' ابھی گیند کی طرح پھدکنے لگے گا۔ اور جہاں اس کا من بھائے گا منہ اٹھا کر چل دے گا۔ بظاہر کئی حرکتیں کرتا رہا مگر جو چاہتا تھا یا محسوس کر رہا تھا' ہلنے جلنے' چلنے پھرنے سے پورا ہوتا ہوا نظر نہ آتا تھا۔ بدن کے اندر تشنگی سی پیدا ہو رہی تھی۔ چاہتا تھا کوئی قوت راہ میں حائل نہ ہو۔ جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر ایک ایک کا جائزہ لیتا رہا۔ یوں معلوم دیتا تھا جیسے ان کی عمر کا بھی اندازہ لگا رہا ہے۔ جس ہاتھ میں چابیوں کا گچھا پکڑ رکھا تھا اس کی گرفت میں کچھ فرق آ گیا تھا مگر ضرورت کی چابی نگاہ میں تھی۔ اسے انگلیوں میں دبا کر سیف کی طرف بڑھا۔ لوہے کا بھاری اور مضبوط دروازہ ایک ہی جھٹکے سے پرے ہٹا دیا اور قدموں پر کھڑا کھڑا سیف کے اندر دیکھنے لگا۔ کرنسی نوٹ، سونے چاندی کے سکے آنکھوں کے سامنے تھے۔ زندگی کی ہر دھڑکن دولت کو چپ سادھے دیکھ کر اسے کہیں سے کہیں بہا کر لے گئی۔ سناٹا اور غنودگی کا عالم طاری تھا۔ پر اس کا فولادی پنجہ پھیلتا اور بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ جو کچھ بھی اس کی کشادہ مٹھی میں آیا کھینچ لیا۔ کچھ ادھر کچھ ادھر دونوں جیبیں بھر لیں اور خدا کی بخشش پر ایک زہر آلود طنزیہ مسکراتے ہوئے سیف کو پھر مقفل کر دیا۔

ایک کمرے سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے میں ہوتا ہوا صحن میں آ گیا اور ڈیوڑھی کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ مستعد اور بے فکر۔ نواسے' نواسیوں' پوتے پوتیوں کا شور' گھر کی گہما گہمی کانوں میں سمائی جا رہی تھی۔ صحن میں ایک بہت پرانا نیم کا درخت موجود تھا۔ اسے اس کی موجودگی کا احساس تھا۔ سب کچھ تھا مگر وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے سب کچھ پھاند گیا ——— باہر آیا تو سرد سرد ہوا سے دوچار ہونا پڑا۔ پیشانی پر گرم گرم پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔ شانوں کو جھٹکا اور سر بلند ہو کر تن گیا۔ نواسے نواسیوں، پوتے اور پوتیوں کو، نیم کے درخت کو' اپنی عمر کو کسی کو خاطر میں نہ لایا۔ رخساروں کی سرخی پیشانی کی چمک دمک' اقبال کا ساتھ سب کچھ تھا۔ بغیر کسی الجھن اور سوچ بچار کے دور نکل آیا تھا۔ ادھر ادھر سے کئی آوازیں کانوں میں پڑنے لگی تھیں۔ ایک کھونچے والے نے سامنے سے آواز دی "چمن کا ہے میرا انگور سونے کا کشتہ ہے" "تازہ ہے تازہ۔ تازہ دم بناتا ہے" ابھی کھونچے والا نظر سے اوجھل بھی ہونے نہ پایا تھا کہ ایکا ایکی اسے بچوں کا شور سنائی دیا۔ جانے پہچانے بچے تھے۔ رلدو بابا! بابا رلدو کہہ کر لپٹ گئے۔ وہ اس سے پیسہ چاہتے تھے۔ یہ عادت اس نے خود ہی بچوں کو ڈال رکھی تھی۔ کہتا تھا ایسا کرنے سے اسے زندگی ملتی ہے۔ وہ تازہ دم محسوس کرتا ہے۔ بچوں کے ساتھ بچہ اور داناؤں کے ساتھ دانا۔ رلدو کا ہر وصف دنیا کو اور اسے پسند تھا اور سب سے بڑی بات اس کی دولت اس کا دم بھرتی تھی۔ مگر اس وقت بچوں کو دیکھ کر بھی کھڑا نہ ہوا نہ ان سے مخاطب ہوا۔ دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈال دیئے اور جو ہاتھ آیا نکال کر بچوں کی طرف پھینک دیا۔ کچھ سکے ابھی مٹھی میں تھے۔ انہیں ٹٹولتا کھیلتا برابر چلتا رہا۔ موڑ کے قریب پہنچا جہاں ہمیشہ ایک اندھی بھکارن بیٹھی بھیک مانگا کرتی تھی۔ اس کی آواز پر کچھ سکے اس کی طرف بھی پھینک دیئے۔ مگر چلنے میں ذرا فرق نہ آیا۔ مڑ کر مڑا ہی تھا کہ سامنے سے حتا پہلوان میرا اپنے دونوں ڈنڈوں کے نظر آیا۔ حتا پہلوان ہمیشہ بازار سے بڑے انداز میں گزرتا تھا۔ اس کا یہ انداز ہی تھا جو وہ پہلوان کہلاتا تھا۔ کانوں میں مرکیاں' گلے میں سونے کا کنٹھا' کلائیوں پر جڑاؤ کڑے' سفید چکن کا کرتا' ملتانی وضع کا تہبند' طلائی گلدار جوتا' سر پر جے پوری مدین ٹوپی رہتی تھی۔ اس کا ایڑی اٹھا کر چلنا، بھاری بھر کم شانوں کو ہر سانس کے ساتھ جھٹکنا یہ حتے پہلوان کے خصوصی نشان تھے۔ شہر بھر میں حتے کا نام تھا۔ اس کے طمطراق اور ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ ایک بازار سے دوسرے بازار تک جاتے جاتے دن کٹ جاتا تھا پر ملاقاتیوں کا جی نہ بھرتا تھا۔ حتا تھا تو پہلوان مگر اس کی اخلاقی حالت

ابھی تھی۔ میڈھے جو اس نے پال رکھے تھے کہا کرتا بے لگام ہو رہے تھے۔ کہتا تھا ان کو سنوارنے اور بنانے میں جتنی ریاضت کی ہے یہ حسا ہی جانتا ہے۔ ان کی جسمی شوخیاں ہلکی ہلکی لہریں تھیں اور یہ لہریں حسے کے نزدیک اس کی محنت کا پھل تھا۔ نہایت نفاست سے تراشے ہوئے بال ہر سرا ہٹیں تھیں، انتشار تھا، ذرا سی حرکت پر تھرتھری اٹھا کر ہوا سونگھنے لگتے تھے۔ راہ گیروں کے پیچھے بھاگتے تھے۔ بچے اکثر ان کے نام سے کوسوں دور بھاگتے تھے اور وہ جونڈرا اور شرارتی تھے، میڈھوں کو چھوڑ پہلوان کو بھی تنگ کرتے تھے۔ حسا اس پر ان کو زبردست ڈانٹ بتاتا تھا اور میڈھوں کا رسا ڈھیلا چھوڑ دیتا تھا۔ بچے اس پر بڑے بڑے عجیب و غریب آوازے کستے تھے اور پہلوان کو بُرا بھلا کہتے اٹھ بھاگتے تھے۔ وہ غصے سے کانپتا تھا پر موٹے موٹے لبوں پر مسکراہٹ دکھائی دیتی تھی۔ حسے پہلوان کے میڈھے حسے کو پہچانتے تھے۔ وہ کسی حالت میں بھی ہوں جب وہ ان پر ہاتھ رکھ دیتا تھا تو وہ ایک اطمینان محسوس کرنے لگتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ اس کی شخصیت پر اتراتے تھے اور جب ایسا ہوتا تھا تو ان کا صحت مند جسم ہچکولے لینے لگتا تھا، رانوں کی مچھلیاں پھڑکنے لگتی تھیں۔ حسے کی بے کاری کا قصہ سلجھانے سے بھی نہ سلجھتا تھا۔ رلدو نے جب حسے کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو اس نے اس سے آنکھیں ملانے میں دریغ نہ کیا۔ حسا اس کا پروردہ تھا۔ اس نے رلدو بابا کو دیکھتے ہی بڑے احترام سے کہا۔ آج تو میرا دادا جوش جوانی میں حسے سے بھی بازی لے گیا ہے۔ یہ الفاظ وہ کہہ ہی رہا تھا کہ اس کے میڈھے رلدو پر پل پڑے پر رلدو نے بڑی بے پروائی سے دونوں کو پرے دھکیل دیا۔ حسا بابے رلدو کی اس حرکت پر ششدر سا ہو کر رہ گیا اور میڈھوں کو دوبارہ جرأت نہ ہوئی کہ وہ اس کی طرف جھکتے۔ حسا پہلوان آنے بہانے اس وقت رلدو سے چھٹکارا چاہتا تھا۔ اسے اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ وہ آج غیر معمولی طور پر پھرتا جا رہا ہے۔ جب تک حسا رلدو بابا کے سامنے کھڑا رہا نہ تو اس نے میڈھوں کو پکارا اور نہ قصداً کوئی ایسی حرکت کی کہ اسے جواب دینا پڑتا۔

رلدو نے حسے کی ملاقات کو کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ ویسے بھی اسے اس کی بے کاری نہ بھاتی تھی اور نہ اس نے اس بات پر غور کیا کہ پہلوان اس کی غیر معمولی شخصیت سے متاثر تھا۔ وہ اس کا سرپرست ضرور تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ اس سے خائف تھا۔ محض اس لئے کہ وہ شہر کا ایک نامی پہلوان تھا۔

بابا رلدو کہیں کا کہیں پہنچ گیا تھا اور حسا یہ محسوس ہی کرتا رہا کہ اس نے اسے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا رلدو بابا کے الفاظ دہرا رہا تھا ——— بڑے آئے جوان۔ جوانی نام ہی اور جنس کا ہے۔ بچو تم نے اتنا پانی نہیں پیا جتنا ہم نے گھی کھایا ہے۔ حسا وہ دھاور گھی کے چکر میں اتنا الجھا کہ رلدو اسے 'نامی پہلوان' بڑے پہلوان کہہ کر پکارتا تو وہ پھر بھی نہ سنتا۔ اسے اپنی بے کاری کے احساس کا صدمہ ہو رہا تھا۔ وہ سوچتا تھا دولت کس کے پاس نہیں ہوتی۔ خوشیاں کس نے نہیں دیکھیں۔ مگر یہ رلدو بابا کی خوشیاں اور امنگیں رلدو بابا ہی جانے۔ دولت و دولت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

رلدو بابا تھا۔ اس کی عمر بھی بہتر سال سے تجاوز کر گئی تھی۔ اس کی مصروفیتیں بھی دوسروں سے کہیں زیادہ تھیں۔ یہ تھا وہ تھا سب کچھ تھا۔ پر وہ ہفتہ میں ایک بار حنا ضرور لگاتا تھا۔ ہر دوسرے روز ایک پرتکلف جوڑا بدلتا، عطر لگاتا۔ فلم دیکھنا اس کا ایک من بھاتا شغل تھا۔ سیر تماشے، شکار، بندوق اور آٹے دن کی مجلسیں ناقابل فراموش تھیں۔ اس پر بھی تشنگی برجستی رہتی تھی اور وہ اسے کبھی نہ بھولتا تھا۔

ہوا ٹھنڈی اور تیز تھی۔ جوں جوں وہ بازار کو چیرتا بڑھتا چلا جاتا تھا اسے ٹھنڈی اور تیز ہوا نہایت خوشگوار اور بھلی معلوم دے رہی تھی۔ وہ ذرا اور ابھرا قدم تیز ہو گئے۔ جسم تن گیا۔ رگ رگ میں طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ بغیر ہچکچاہٹ کے جذبات کی رو میں بہتا گیا۔ جذبات کا تار نہ ٹوٹتا تھا۔ اس وقت جب رلدو مسجد کے سامنے سے گزر رہا تھا تو اذان ہو رہی تھی۔ اس کے قدم رک گئے۔ تقدس سے سر جھک گیا۔ اِدھر اُدھر مڑ کر آگے پیچھے دیکھا اور سوچ بچار میں بہت دور نکل گیا۔ طبیعت پر بوجھ محسوس ہوا تو واپس لوٹ آیا۔ غلبے کی صورت مسجد کی سیڑھیاں چڑھ گیا جیسے سارا بناؤ سنگار اس جذبے کا حل تھا۔

بازار میں پہنچا تو پھر ایک سرسراہٹ کروٹیں لینے لگی۔ وہی آرزوئیں وہی ارادے ساتھ تھے۔ چہرے پر وہی سرور وہی انبساط کے نشان تھے۔ بالکل ان تھک چلا جا رہا تھا۔ ایک رنگین تجسس ... کرتا رہا اور وہ ارادہ اس سے پیچھا نہ چھڑا سکا۔

چلتے چلتے بے وجہ ایک پان فروش کی دکان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ کبھی پان کی طرف ہاتھ بڑھاتا تھا اور کبھی سگریٹ کی طرف۔ پان کھاتا تھا نہ سگریٹ پیتا تھا۔ کچھ کہنا بھی چاہتا تھا اور جو چاہتا تھا حلق سے باہر نہ نکلتا تھا کہ ایکا ایکی بازار کے سرے پر سے ایک شور اٹھا۔ شور میں چیخنے اور چلانے کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ ایک بپھرا ہوا سانڈ بھاگا آ رہا تھا۔ راہ گیر مارے ڈر کے بھاگے جا رہے تھے۔ کیا بوڑھے کیا جوان عورتیں اور بچے دیواروں سے چپٹے کھڑے تھے۔ رلدو اپنے بل بوتے پر سانڈ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ سب کچھ بھول گیا اور چٹان کی طرح ڈٹ گیا۔ اس نے بغیر سوچ بچار اور ہچکچاہٹ کے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اسے سینگوں سے پکڑ کر ایک ہی جھٹکے میں ادھ مرا کر دے گا کہ سڑک کے درمیان اسے چند خوش پوش لڑکیاں بھاگتی، چلاتی اور بے دست و پا نظر آئیں۔ کسی کا پرس گر گیا تھا۔ کسی کی ساڑھی کا پلو الجھ گیا تھا۔ بابا رلدو پوری مردانگی سے بڑھا اور ڈٹ کر سڑک کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ ابھی وہ سانڈ سے دوچار نہ ہوا تھا کہ سانڈ راستہ چیر کر نکل گیا۔ اک اور شور بلند ہوا۔ سارے کا سارا بازار رلدو بابا کی یہ جرأت دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ لڑکیاں دیر تک اس کے ساتھ لگی کھڑی رہیں۔ انہوں نے جی بھر کر رلدو کا شکریہ ادا کیا۔ رلدو کی مسکراہٹ میں لڑکیوں کی سی چاشنی نہ ہو لیکن وہ مطمئن تھیں اور کہتی جا رہی تھیں، بپھرے ہوئے سانڈ کا مقابلہ آسان تھوڑا ہے۔

اب وہ گڈ بازار کے بہت قریب پہنچ گیا تھا۔ انبساط سے دیوانہ ہو رہا تھا کہ اس نے اپنے قرضدار مولو کو سامنے سے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ مولو رلدو بابا کا قرض دار تو تھا ہی مگر وہ ویسے بھی رلدو بابا سے ڈرتا تھا اور ہمیشہ کوشش کرتا تھا کہ اس کا اور رلدو کا سامنا نہ ہو۔ اگر اتفاقیہ کبھی سامنا ہو بھی جاتا تو وہ آنکھ بچا کر نکل جاتا تھا۔ آج بے وقت گڈ بازار میں بابے رلدو کا اسے نظر آنا اس کے لئے تعجب سے خالی نہ تھا اور جبکہ رلدو بابا اس کے چال چلن سے واقف بھی خوب تھا۔ مولو کو اس افراتفری میں اور تو کچھ نہ سوجھا وہ پاس کے ایک ہیئر کٹنگ سیلون میں داخل ہو گیا اور چھپ کر گدلے سے شیشے کے اندر سے بابے رلدو کو دیکھنے لگا جو ہیئر کٹنگ سیلون کے دروازے سے لگا ہوا تھا۔ اس کا سانس زور زور سے چل رہا تھا۔ اس نے خیال کیا یہ رلدو آج بے وقت اس جانب اس کی تلاش ہی میں آ نکلا ہے۔

گڈ بازار کا نام اصل میں کھڈ بازار تھا اور جب سے چھاؤنی والوں کی آمد و رفت اس بازار میں ہوئی ہے اس بازار کا حلیہ ہی بدل گیا ہے۔ مداری، گورکھے، چھاچھی تو دھندے کے لئے آتے ہی تھے مگر جب سے چھاؤنی کا زور بڑھا ہے گورے بھی منہ اٹھائے نجات تلاش کرنے چلے آتے ہیں اور یہ ان کی زبان دانی کا کمال ہے کہ انہوں نے کھڈ بازار کو گڈ بازار بنا دیا تھا اور وہ گڈ بازار کا مفہوم بھی خوب سمجھتے تھے۔ آتے جاتے تو اس نام پر پھبتیاں بھی کستے تھے۔

جوں جوں وہ بازار کی رونق میں پہنچتا گیا اس کی امنگیں بڑھتی گئیں اور وہ اپنے بھاری بھرکم جسم کی دھڑکنوں کا مزہ لیتا رہا ــــــ کوئی اس کے شانوں سے شانہ مار کر نکل جاتا تھا اور کوئی نہایت بے تکلفی سے نگاہیں اوپر اٹھائے چوباروں پر بیٹھنے والیوں کو گھور رہا تھا۔ اس ہما ہمی میں اگر کوئی اتفاقیہ اس سے ٹکرا بھی جاتا تو اسے کوئی صدمہ نہ ہوتا تھا اور نہ اس کے وقار میں فرق آتا تھا۔

ایک لذت ایک سرسراہٹ اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی تھی۔ اس طرح مچلتے اور سینہ تانے کسی نے تو کیا اس نے خود بھی اپنے تئیں محسوس نہ کیا تھا۔ روشنی کی زیادتی سے ایک چکا چوند سی پھیل گئی۔ بازار میں آنے جانے والوں کا تانتا بندھ رہا تھا۔ ہر کوئی انتشار اور جنسی لذتوں سے کھیلتا جا رہا تھا کہ دو رو دو شرابیوں میں جھگڑا ہو گیا۔ وہ ایک دوسرے کا سر بوتلوں سے توڑنے پھوڑنے پر تل گئے تھے۔ ایک کہرام مچ رہا تھا۔ تماشائیوں نے سارا بازار سر پر اٹھا رکھا تھا۔ ایک مجذوب جنسی لذتوں کا مارا وحشیانہ طور پر بھاگا آ رہا تھا۔ وہ پان والے کی دکان سے پان اٹھا لایا تھا۔ وہ بڑی بے نیازی سے رلدو کے سامنے آ کر رک گیا۔ رلدو نے بھی بڑی بے نیازی سے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالا اور سکے نکالے اور

بغیر کسی جانچ پڑتال کے مجذوب کی طرف بڑھا دیئے۔ مجذوب نے سکے آپس لئے مگر بڑی بے پروائی سے آسمان کی طرف منہ اٹھایا اور سکے بکھیر دیئے۔ جب زمین پر سکوں کے گرنے کی مختلف آوازیں پیدا ہوئیں تو ادھر اُدھر بیٹھی ہوئی کسبیوں اور رنڈیوں میں ایک قہقہہ بلند ہوا جیسے سب نے مل کر رلدو اور مجذوب دونوں کو داد دی ہو۔ اتنے میں مجذوب رلدو سے چمٹ گیا اور اس نے جی بھر کر رلدو کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ وہ لذتِ ارتعاش سے لطف اٹھا رہا تھا اور جب اسے کچھ ہوش آیا تو رلدو کو پکڑ کر گل فروش کے پاس لے گیا اور درخواست کی کہ وہ اس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈال دے۔ رلدو نے وہی کچھ کیا جو وہ چاہتا تھا۔ مجذوب کا دل اُمڈ آیا اور وہ جی سے دعائیں دیتا ہوا چل دیا۔

پان سگرٹ بیچنے والے کی دکان کے ایک پہلو میں ایک چنچل سی رنڈی بیٹھی انگڑائی لے رہی تھی۔ اس نے رلدو کو دور سے تاکا تھا۔ اس نے رلدو کو اشارہ کیا، اس نے ظاہر کیا وہ اس کی منتظر ہے مگر وہ منہ موڑ گیا۔ موڑ پر وہ ایک دوسری سے دوچار ہوا مگر وہ رلدو کی چمکیلی آنکھوں کی تاب نہ لا سکی۔ اپنی طرف سے ظاہر کرتی رہی وہ داشتہ ہے۔ وہ اپنے آپ کو فروخت کرنا چاہتی ہے مگر رلدو اس کی پیشکش کو خاطر میں نہ لایا اور نہایت اطمینان سے اپنے مقصد کا پیچھا کرتا رہا۔

اس نے مچوک میں نئی دنیا تھی۔ سب کچھ دیکھتا بھالتا۔ مگر توجہ نہ دی۔ اس خیال سے بھی کہ آخر ہر کوئی رلدو تھوڑا ہے ۔۔۔ گڑ بازار میں رلدو اب ایسی جگہ پہنچ گیا تھا جہاں گڑ بازار کے بسنے والے اپنے حقیقی رنگ میں لبسے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ واقعات کی سر مستیاں جنسی حدود سے بھی تجاوز کر رہی تھیں۔ قرینے سے بیٹھی ہوئی کسبیوں کی سج دھج اور ان کے زرق برق لباس نگاہوں کو خیرہ کر رہے تھے۔ وہ چاہتا تھا رک جائے۔ قدم قدم چلنے لگے۔ اپنا آپ بیچنے والیوں کو جی بھر کر دیکھے مگر قدم ایک پل کے لئے بھی نہ رکے اور نہ وہ تقدس سے جھکا۔ اس کی بائیں جانب ایک کسبی سر بازار کھڑی تھی۔ اس نے جرأت کر کے رلدو کو بازو سے پکڑا مگر جب آنکھیں چار ہوئیں تو وہ اس کے جلال و جمال کا مقابلہ نہ کر سکی۔ ایک اور کسبی جس کے گال کچھ پچک گئے تھے مگر آنکھوں میں زندگی تھی، حسن تھا، سب کچھ تھا۔ مگر ذرا سی مایوسی سے راہ گیروں کو اشارے کرنے پر اور بلانے پر اتر آتی تھی۔ اس نے بھی رلدو سے سودا کرنا چاہا مگر رلدو کی گاہکی کا طریقہ ابھی وضع نہ ہوا تھا۔

ایک تنگ سی گلی کے موڑ پر ایک سیاہ فام لڑکی بیٹھی تھی وہ مشکل سے پندرہ سولہ سال کی معلوم دیتی تھی۔ اس کی جلد باوجود سیاہ ہونے کے خون کی سی معلوم دیتی تھی۔ اس میں لطافت کچھ اس طرح نتھر آئی تھی جیسے برسات کے بعد پتے خود بخود چمکنے لگے ہوں۔ بدن سڈول اور تناؤ سے بھرپور۔ وہ خوش وضع تھی۔ شکل و صورت میں ملاحت پائی جاتی تھی۔ غازہ لگانے سے اس کا حسین چہرہ انڈ کھا اور سرخی مائل نیلا نیلا دکھائی دے رہا تھا اور اس نیلے رنگ نے روشنی میں ایک ایسا ملمچا پیدا کر دیا تھا کہ خواہ مخواہ نگاہ اس پر اٹھتی تھی۔ غالباً اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ جوانی اور خوبصورتی کے ساتھ اسے غازہ لگانے کا سلیقہ بھی خوب آتا تھا۔ رلدو کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ ملچا اٹھا۔ وہ فیصلہ کر بھی نہ پایا تھا کہ کوئی دوسرا جو بڑی جرأت رکھتا تھا بغیر سوچے سمجھے سیاہ ناگن کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس کا اپنا رنگ سفید تھا۔ عینک کے اندر سے آنکھوں کی چمک بہت بھلی معلوم دے رہی تھی۔ بارونق چہرے پر سنجیدگی کے آثار نمایاں تھے۔ بغل میں چند کتابیں تھیں۔ اوپر والی جیب میں فونٹین پن اور پنسل دونوں قرینے سے لگا رکھے تھے۔ اس سیاہ فام چھوٹی کسبی نے اس کا استقبال بڑے سلیقے سے کیا اور اپنی الگنی کا دروازہ بند کرتے ہوئے بازار پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ رلدو کو اس کے جی بھر کر نہ دیکھنے کا صدمہ تھا۔

ایک اور چلبلی سی بازار میں اِدھر اُدھر پھدکتی پھرتی تھی۔ نظر تو یہی آتا تھا کہ اس نے اپنی بے قدری کر رکھی ہے مگر فطرتاً وہ چالاک تھی۔ اپنے پیشے کی نوعیت کو خوب سمجھتی تھی اور اپنی برائی بھلائی کو کبھی نظر انداز نہ کرتی تھی۔ اگر کوئی اس کی بے تکلفی اور بے نیازی کو دیکھ کر اس سے دام پوچھ بیٹھتا تھا تو وہ منہ مانگی قیمت وصول کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ اس نے رلدو کو ایک سب بے بہا دینے والی شخصیت سمجھ کر اس کے دل کی

دھڑکنیں تھیں اور دو مردوں کی پرواہ نہ کی جو اس کے گرد دیر سے چکر کاٹ رہے تھے اور اسے ایک روح پرور محبوب سمجھ رہے تھے مگر رلدو اس کی گرفت سے نکل چکا تھا۔

کئی ایک کسبیوں نے رلدو کا راستہ بھی روکا۔ کئی ایک نے اسے بازوؤں سے پکڑا، اشارے کئے مگر وہ بغیر اپنی رفتار کو کم کئے اپنی دُھن میں چلتا گیا۔ اس کا بدن پسینہ سے تر تھا۔ اس کا اضطراب اب دم لینا چاہتا تھا۔ اس لئے جرأت والیوں کی دل ہی دل میں داد بھی دی مگر وہ یہ داؤ نہ ہارا تھا کہ وہ ابھی تک اپنے مقصد سے دور ہے ——— متانت سے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنے آپ سے کہنے لگا یہی تو جگہ ہے جہاں نہ چھوٹے بڑے کی تمیز ہے اور نہ اچھے بُرے کی پہچان۔ چند قدم ہی بڑھا ہو گا کہ دو نوجوانوں میں جھگڑا ہو گیا۔ ایک نے بڑے اعتماد سے کہا۔ میری نگاہ ہر گز ہر گز دھوکہ نہیں کھا رہی یہ بابا رلدو ہے۔ دوسرا بھی پورے اعتماد سے بولا دماغ تو نہیں پھر گیا تمہارا۔ کہاں یہ گندہ بازار اور کہاں بابا رلدو۔ دونوں میں شرط تک نوبت پہنچ گئی۔ وہ دونوں اس کا پیچھا کرتے رہے مگر رلدو نے بھی اپنے اعتماد کو ہاتھ سے نہ دیا اور ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

جب وہ اس کے سامنے جا کر بیٹھ گیا تو وہ بھونچکا سی ہو کر رہ گئی۔ مگر اندرونی طور پر اتنی خوش تھی کہ بازار بھر میں کوئی اس کی اس خوشی کا اندازہ نہ کر سکتا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ آج بن بلائے، بن مانگے رحمت چل کر اس کے پاس آ گئی ہے۔ رلدو روایات کا دیوتا مگن باوقار طریق سے بیٹھا اس کے انگ انگ کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ نہایت احترام سے جھکی چپ چاپ اپنا تعارف کرا رہی تھی۔ اگر اس کی روح میں کوئی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی تو جسم پر بھی نیکی اُبھر آئی تھی۔ وہ یوں محسوس کر رہی تھی جیسے اس کے رونگٹے رونگٹے میں سے کوئی خوابیدہ قوت بیدار ہو رہی ہے۔ وہ شدتِ ارتعاش سے لڑکھڑاتی ہوئی تقدس سے جھکی جھکی دروازے کے پاس پہنچی تو ملازم نیچے کھڑا آوازیں دے رہا تھا۔ "نازلی بی بی! نازلی بی بی!" اصل میں وہ رلدو کے آنے کی اطلاع دے رہا تھا۔ نازلی انہی قدموں پر نیچے اتر گئی اور جاتے ہی اس کا گلا دبا دیا اور بڑے نرم سے لہجے میں کہا دوبارہ آواز نہ نکالے۔ خود خوشی میں لڑکھڑاتی پھولے نہ سماتی تھی۔ ایک کمرے سے دوسرے اور پھر تیسرے کمرے میں چلی گئی۔ اول تو جرأت نہ ہوتی تھی کہ رلدو کے سامنے جا کر بیٹھ جاتی۔ دوسرے یہ بھی چاہتی تھی کہ آئی رحمت کو کوئی دیکھ نہ پائے، کوئی ٹھن نہ پائے۔ بے سوچے سمجھے غسل خانے میں جا پہنچی اور جاتے ہی ہونٹوں کی سُرخی اور رخساروں پر سے غازے کو دھو ڈالا۔ بال الٹے سیدھے کر کے صورت کو سیدھا سادہ بنا لیا۔ نہ سمجھ سکی اور نہ دیکھ سکی کہ وہ اس سادگی میں اتنے معصومانہ انداز سے کیا کی کیا بن گئی ہے۔

نازلی بازار والیوں سے ویسے بھی کچھ مختلف واقع ہوئی تھی۔ لٹکے ہوئے پردے کے پیچھے آدھی ڈھکی ہوئی اپنا توازن کھو بیٹھی تھی۔ اس نے جلدی جلدی سینے پر سے ساڑی کو نیچے کی طرف سرکا دیا تھا۔ رخساروں پر خوشی کے آنسو ٹھہرے تھے۔ اس خواب گاہ کی جہاں وہ اپنے گاہکوں سے ملتی تھی، روشنی بجھا دی تھی۔ زندگی کے بارے میں وہ لمحہ بھر کے اندر اندر اتنا کچھ سوچ گئی تھی شاید اس سے پہلے اس نے ساری زندگی میں اتنا نہ سوچا ہو گا۔ وہ تھر تھرا اٹھی۔ کبھی باہر آنے کی کوشش کرتی اور کبھی سامنے والے دریچے سے ادھر اُدھر جھانکتی اور پھر اندر چلی جاتی اور تخلیہ میں بیٹھ کر اپنے بھاگوں پر غور کرتی اور سوچتی آخر کرے تو کیا کرے ——— اس کے پاس خدا کی رحمت چل کر آ گئی تھی۔ وہ اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ اس کی تاب نہ لا سکی تھی، ہوش بھی بجا نہ رہے تھے۔ رلدو اس کی ان حرکات سے بوکھلا اٹھا۔ وہ سارا بازار چیرتا تیرتا اس تک پہنچا تھا۔ وہ جانتا تھا آخر رنڈی ہی تو ہے۔ وہ رنڈی کے پاس آیا ہے۔ اس کے آ جانے سے وہ اتنی خوش اور بے قابو کیوں ہوتی جا رہی ہے ——— پر وہ رلدو کی آمد کو قدرت کا کرشمہ اور معجزہ سمجھ رہی تھی اور کہتی تھی وہ انسانیت کا آئینہ دار ہے۔ آج اسے ایک انسان سے واسطہ پڑا ہے۔ جرأت ہوتی تھی اور نہ اسے کہہ سکتی تھی کہ وہ کس طرح اپنا دکھ درد کہنا چاہتی ہے کس طرح اپنی کیفیت کے اظہار کے لئے دل چیر کر سامنے رکھ دینا چاہتی ہے۔ وہ اپنے نازک احساسات اور جذبات کے اظہار کے لئے یہی چاہتی تھی کہ آنے والا خود ہی اس کے جذبات، اس کے احساسات کی ترجمانی کرنے لگے۔ وہ سمجھتی آئی رحمت میری کمزوریوں پر پردہ ڈال دے گی۔ اس کا

سیاہ وجلال میرا رازدار بن جائے گا اور کہے گا وہ اسے اچھی طرح سے سمجھ رہا ہے اور اس کی بخشش اور گناہوں کا کفارہ دینے میں اس کا مددگار ہے۔

رلدو چاہتا تھا وہ نازلی کر حتے پہلوان کی طرح ایک جھٹکا دے اور اس سے بے تکلف باتیں کرتا چلا جائے اور اپنے قرض دار مولو کی طرح اس کی عزت اتار کر ہاتھ میں دے دے لیکن نازلی کی بے کلی اور گردن کا جھکاؤ دیکھ کر سمٹ سا گیا —— نازلی آخر ایک کسبی تھی۔ اسے اپنے اندر کئی طوفان اٹھتے ہوئے محسوس ہوئے —— کسی ہمسائی کو آواز دی۔ ملازم کو پھل پھول اور چائے لانے کا اشارہ کیا اور یہ بھی سمجھا دیا کہ جو کچھ بھی وہ کرے بڑے عقیدے سے انجام دے۔ نازلی اپنی دوسری بہنوں سے کچھ زیادہ ہی توہمات کی قائل تھی۔ دل بلیوں اچھل رہا تھا اور رہ رہ کر دھیان اس طرف جاتا تھا کہ سارے بازار کو اپنے کوٹھے پر آنے کی دعوت دے اور سب کو زندہ کرامات، رحمت صورت رلدو دکھائے اور کہے بخشش کے طریق ہمیشہ ہی نرالے ہوتے ہیں۔

دہلیز سے آگے بڑھا ہی تھا تو اس نے یقین کر لیا تھا آنے والا زندگی کا تمام بوجھ ہلکا کر دے گا! اس کی برکت نازلی کو دنیا پر بھاری بنا دے گی۔ اس کا نورانی چہرہ، فرشتہ صورت، اٹھرخ داڑھی اسے وہ کچھ دے گی جو آج تک کسی نے کسی کسبی کو نہ دیا ہوگا۔ اس کا نامۂ اعمال جو مدتوں سے سیاہ ہو چکا ہے، دھل جائے گا۔ وہ نئے قالب اور نئی روح میں ڈھل جائے گی۔

اس نے اپنی دولت، حسن اور شیریں کلامی پر بھروسہ نہ کیا۔ صرف عقیدتمندی سے اپنے پاکیزہ اخلاق کا اظہار کرتی رہی اور سمجھتی رہی آنے والا بھی اس کے خوش کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے گا اور وہ دیکھتے دیکھتے دنیا کی ہر نعمت سے بے نیاز ہو جائے گی —— اس نے بڑھ کر جرأت سے اپنے پورے خلوص سے اس کی گردن میں پھولوں کے ہار ڈال دیئے اور خود تقدس سے اتنی جھک گئی کہ اس کا چہرہ بھی صاف طور پر دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس نے اپنی ہر کمزوری کو انتہائی طور پر چھپانے کی کوشش کی کہ رلدو اس کی معصومیت اور معصیت کے فرق کا اندازہ نہ کر سکا۔ اراد بے باندھتا رہا۔ للچائی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔

آخرکار سادہ دل نازلی اپنے گھر کی زینت بن مانگی رحمت کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔ اس وقت اس کے چہرے پر ایک انمول سی روشنی کھیل رہی تھی اور اس کے لب آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ یقیناً وہ اس وقت ایک عورت معلوم دے رہی تھی جس کے سینے میں گداز دل اور نیک آرزوئیں ناچ رہی ہوں۔ بار بار ایک ایک آرزو، ایک سوال اس کے ہونٹوں تک آتا مگر وہ رلدو کا جلال دیکھ کر رک جاتی اور حیا سے آنکھیں جھکا لیتی۔

دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے۔ نازلی جوں کی توں دوزانو بیٹھی رہی۔ بازار کی ہاؤ ہو میں کچھ فرق محسوس ہو رہا تھا۔ روشنیاں مدھم ہوتی جا رہی تھیں رلدو کہتا تھا۔ دنیا کچھ نہ کہتی تو وہ بہتر سال کا جوان اور اڑھائی سو سال کا بوڑھا ہوتا —— نازلی کا دل اب دھڑک رہا تھا۔ رلدو اب اور بھی اس کے قریب تھا۔ اس کا بازو ایک اجنبی سی مسکراہٹ کے ساتھ بڑھا اور اس کی کمر کے گرد حمائل ہو گیا۔ غمزدہ عورت سہم گئی۔ وہ آبدیدہ سی ہو گئی —— "تم عورتیں اپنی اپنی قیمت کے مطابق محبت کرتی ہو —— تم چپ ہو —— شرما گئی ہو؟ میں تمہارے پاس تمہاری قیمت ادا کر لے آیا ہوں۔ بھاری سے بھاری قیمت جو تم نے کبھی وصول نہ کی ہو۔" اس کا جسم سرد ہو گیا۔ گویا کسی نے اسے کسبی، حرامزادی، گشتی، دو کوڑی کی رنڈی کہہ دیا ہے —— رلدو نے اسے زور سے بازوؤں میں کھینچ لیا۔ نازلی کی آنکھوں میں غیر معمولی روشنی موجود تھی —— وہ کیا سوچ رہی تھی۔ کیا چاہتی تھی۔ ابھی تک واقعات نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا تھا۔

رلدو نے کھینچ کر نازلی کو اپنے سینے سے لگا لیا اور اپنے دہکتے ہوئے لب اس کے پھڑکتے ہوئے ہونٹوں پر رکھ دیئے اور جب اس کا مضبوط زبردست ہاتھ اس کے گریبان تک پہنچ گیا تو معاً اسے خیال آیا کہ وہ پیشے بیٹھی ہے۔ بکنے کے لئے، بار بار بکنے کے لئے۔ ہر آنے والا اس کا گاہک ہے۔

---

(۹)

اُردو افسانہ

چوتھا دور

اشفاق احمد

گڈریا

یہ سردیوں کی ایک یخ بستہ اور طویل رات کی بات ہے میں اپنے گرم گرم بستر میں سر ڈھانپے گہری نیند سو رہا تھا کہ کسی نے زور سے جھنجھوڑ کر مجھے جگا دیا۔

"کون ہے؟" میں نے چیخ کر پوچھا۔ اور اس کے جواب میں ایک بڑا سا ہاتھ میرے سر سے ٹکرایا اور گھپ اندھیرے سے آواز آئی "تھانے والوں نے رانو کو گرفتار کر لیا۔"

"کیا؟" میں نے لرزتے ہوئے ہاتھ کو پرے دھکیلنا چاہا۔ "کیا ہے؟"

اور تاریکی کا بھوت بولا "تھانے والوں نے رانو کو گرفتار کر لیا ——— اس کا فارسی میں ترجمہ کرو۔"

"داؤجی کے بچے" میں نے اونچے ہو کر کہا "آدھی آدھی رات تنگ کرنے ہو ——— دفع ہو جاؤ ——— میں نہیں ——— میں نہیں اپنے گھر رہتا۔ میں نہیں پڑھتا ——— داؤجی کے بچے ——— کتے!" اور میں رونے لگا۔

داؤجی نے چمکار کر کہا "اگر پڑھے گا نہیں تو پاس کیسے ہوگا! پاس نہیں ہوگا تو بڑا آدمی نہ بن سکے گا، پھر لوگ تیرے داؤ کو کیسے جانیں گے۔"

"اللہ کرے سب مر جائیں۔ آپ بھی آپ کو جاننے والے بھی . . . . اور میں بھی ——— میں بھی . . . . میں بھی" اپنی جوانا مرگی پر میں ایسا رویا کہ دو ہی لمحوں میں گھگی بندھ گئی۔

داؤجی بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرے جاتے تھے، اور کہہ رہے تھے "بس اب چُپ کو شاباش ——— میرا اچھا بیٹا۔ اس وقت یہ ترجمہ کر دے پھر نہیں جگاؤں گا۔"

آنسوؤں کا تار ٹوٹتا جا رہا تھا۔ میں نے جل کر کہا "آج حرامزادے رانو کو پکڑ کر لے گئے کل کسی اور کو پکڑ لیں گے۔ آپ کا ترجمہ تو . . . ."

"نہیں نہیں" انھوں نے بات کاٹ کر کہا "میرا تیرا وعدہ رہا آج کے بعد رات کو جگا کر کچھ نہ پوچھوں گا ——— شاباش اب بتا" تھانے والوں نے رانو کو گرفتار کر لیا۔"

میں نے روٹھ کر کہا۔ "مجھے نہیں آتا۔"

"فوراً نہیں کہہ دیتا ہے۔" انھوں نے سر سے ہاتھ اٹھا کر کہا "کوشش تو کرو۔"

"نہیں کہتا!" میں نے جل کر جواب دیا۔

اس پر وہ ذرا ہنسے اور بولے "کارکنانِ گزمہ خانہ را فوراً توقیف کردند —— کارکنان گزمہ خانہ، تھانے والے۔ بھولنا نہیں نیا لفظ ہے۔ نئی ترکیب ہے۔ دس مرتبہ کہو۔"

مجھے پتہ تھا کہ یہ بلا ٹلنے والی نہیں تا چار گزمہ خانہ والوں کا پہاڑہ شروع کر دیا۔ جب دس مرتبہ کہہ چکا تو دادا جی نے بڑی لجاجت سے کہا اب سارا فقرہ پانچ بار کہو۔ جب پنجگانہ مصیبت بھی ختم ہوئی تو انھوں نے مجھے آرام سے بستر میں لٹاتے ہوئے اور رضائی اوڑھاتے ہوئے کہا۔

"بھولنا نہیں! صبح اٹھتے ہی پوچھوں گا۔"

پھر وہ جدھر سے آئے تھے ادھر لوٹ گئے۔

شام کو جب میں ماتا جی سے سیپارے کا سبق لے کر لوٹتا تو خراسیوں والی گلی سے ہو کر اپنے گھر جایا کرتا۔ اس گلی میں طرح طرح کے لوگ بستے تھے۔ مگر میں صرف موٹے ماشکی سے واقف تھا جس کو ہم سب "کدو کریلا ڈھائی آنے" کہتے تھے۔ ماشکی کے گھر کے ساتھ بکریوں کا ایک باڑہ تھا۔ جس کے تین طرف کچے پکے مکانوں کی دیواریں اور سامنے رخ آڑی ترچھی لکڑیوں اور خاردار جھاڑیوں کا اونچا اونچا جنگلا تھا۔ اس کے بعد ایک چوکور میدان آتا تھا۔ پھر لنگڑے کمہار کی کوٹھڑی اور اس کے ساتھ گیرو رنگی کھڑکیوں اور پیتل کی کیلوں والے دروازے کا ایک چھوٹا سا پکا مکان۔ اس کے بعد گلی میں ذرا سا خم پیدا ہوتا۔ اور قدرے تنگ ہو جاتی پھر جوں جوں اس کی لمبائی بڑھتی توں توں اس کے دونوں بازو بھی ایک دوسرے کے قریب آتے جاتے۔ شاید وہ ہمارے قصبے میں سب سے لمبی گلی تھی۔ اور حد سے زیادہ سنسان! اس میں اکیلے چلتے ہوئے مجھے ہمیشہ یوں لگتا تھا جیسے میں بند وقت کی نالی میں چلا جا رہا ہوں۔ اور جونہی میں اس کے دہانے سے باہر نکلوں گا زور سے "ٹھائیں" ہوگا اور میں مر جاؤں گا۔ مگر شام کے وقت کوئی نہ کوئی راہگیر اس گلی میں ضرور مل جاتا اور میری جان بچ جاتی۔ ان آنے جانے والوں میں کبھی کبھار ایک سفید سی مونچھوں والا لمبا سا آدمی ہوتا جس کی شکل بارہ ماہ والے ملکی سے بہت ملتی تھی۔ سر پر ململ کی بڑی سی پگڑی۔ ذرا سی خمیدہ کمر پہ خاکی رنگ کا ڈھیلا اور لمبا کوٹ۔ کھدر کا تنگ پائجامہ اور پاؤں میں فلیٹ بوٹ۔ اکثر اس کے ساتھ میری ہی عمر کا ایک لڑکا بھی ہوتا۔ جس نے عین اسی طرح کے کپڑے پہنے ہوتے اور وہ آدمی سر جھکائے اور اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے آہستہ آہستہ اس سے باتیں کیا کرتا۔ جب وہ میرے برابر آتے تو لڑکا میری طرف دیکھتا اور میں اس کی طرف اور پھر ایک ثانیہ ٹھٹکے بغیر گردنوں کو ذرا ذرا موڑتے ہم اپنی اپنی راہ چلے جاتے۔

ایک دن میں اور میرا بھائی ٹھٹھیاں کے جوہڑ سے مچھلیاں پکڑنے کی ناکام کوشش کے بعد قصبے کو واپس آ رہے تھے تو نہر کے پل پر یہی آدمی اپنی پگڑی گود میں ڈالے بیٹھا تھا۔ اور اس کی سفید چٹیا میری مرغی کے پر کی طرح اس کے سر سے چپکی ہوئی تھی۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے میرے بھائی نے ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر زور سے سلام کیا "داؤ جی سلام"۔

اور داؤ جی نے سر ہلا کر جواب دیا "جیتے رہو"۔

یہ جان کر کہ میرا بھائی اس سے واقف ہے میں بے حد خوش ہوا۔ اور تھوڑی دیر بعد اپنی منحنی آواز میں چلایا "داؤ جی سلام"

"جیتے رہو۔ جیتے رہو!" انھوں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا اور میرے بھائی نے پٹاخ سے میرے زنّاٹے کا ایک تھپڑ دیا۔

"شیخی خورے، کتے، وہ چچا جب میں نے سلام کر دیا تو تیری کیا عزت رہ گئی تھی؟ ہر بات میں اپنی ٹانگ پھنساتا ہے کمینہ ـــــ

"بھلا کون ہے وہ؟"

"داؤ جی!" میں نے بسور کر کہا۔

"کون داؤ جی؟" میرے بھائی نے تنک کر پوچھا۔

"وہ جو بیٹھے ہیں" میں نے آنسو پی کر کہا۔

"بکواس نہ کر" میرا بھائی چڑ گیا اور آنکھیں نکال کر بولا "ہر بات میں میری نقل کرتا ہے کُتا ـــــ شیخی خورا!"

میں نہیں بولا اور خاموشی کے ساتھ راہ چلتا رہا۔ دراصل مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ داؤ جی سے تعارف ہو گیا۔ اس کا رنج نہ تھا کہ بھائی نے جیرے تھپڑ کیوں مارا۔ وہ تو اس کی عادت تھی۔ بڑا تھا اس لئے ہر بات میں اپنی شیخی گھمارتا تھا۔

داؤ جی سے علیک سلیک تو ہو ہی گئی تھی۔ اس لئے میں کوشش کر کے گلی میں سے اس وقت گذرنے لگا جب وہ آ جا رہے ہوں۔ انہیں سلام کر کے بڑا مزہ آتا تھا اور جواب پا کر اس سے بھی زیادہ۔ وہ "جیتے رہو" کچھ ایسی محبت سے کہتے کہ زندگی دو چند سی ہو جاتی اور آدمی زمین سے ذرا اوپر اٹھ کر ہوا میں چلنے لگتا ـــــ سلام کا یہ سلسلہ کوئی سال بھر یونہی چلتا رہا اور اس اثنا میں مجھے اس قدر معلوم ہو سکا کہ داؤ جی گیرو رنگی کھڑکیوں والے مکان میں رہتے ہیں۔ اور چھوٹا لڑکا ان کا بیٹا ہے۔ میں نے اپنے بھائی سے ان کے متعلق کچھ اور بھی پوچھنا چاہا مگر وہ بڑا سخت آدمی تھا اور میری چھوٹی سے چھوٹی بات پر چڑ جاتا تھا۔ میرے ہر سوال کے جواب میں اس کے پاس گھڑے گھڑائے دو فقرے ہوتے تھے۔ "تجھے کیا" اور "بکواس نہ کر"۔ مگر خدا کا شکر ہے میرے تجسس کا یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چلا۔ اسلامیہ پرائمری سکول سے چوتھی پاس کر کے میں ایم۔ بی۔ ہائی سکول کی پانچویں جماعت میں داخل ہوا، تو وہی داؤ جی کا لڑکا میرا ہم جماعت نکلا۔ اس کی مدد سے اور اپنے بھائی کا احسان اٹھائے بغیر میں یہ جان گیا کہ داؤ جی کھتری تھے اور قصبہ کی منصفی میں عرضی نویسی کا کام کرتے تھے لڑکے کا نام امی چند تھا اور وہ جماعت میں سب سے زیادہ ہشیار تھا۔ اس کی بگڑی کلاس بھر میں سب سے بڑی تھی۔ اور چہرہ بلی کی طرح چھوٹا۔ چند لڑکے اسے میاؤں کہتے تھے اور باقی نیولا کہہ کر پکارتے تھے۔ مگر میں داؤ جی کی وجہ سے اس کو اس کے اصلی نام ہی سے پکارتا تھا۔ اس لئے وہ میرا دوست بن گیا تھا۔ اور ہم نے ایک دوسرے کو نشانیاں دے کر پکے یار بننے کا وعدہ کر لیا تھا۔

گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہونے میں کوئی ایک ہفتہ ہو گا جب میں امی چند کے ساتھ پہلی مرتبہ اس کے گھر گیا۔ وہ گرمیوں کی ایک جھلسانے والی دوپہر تھی۔ لیکن شیخ چلی کی کہانیاں حاصل کرنے کا شوق مجھ پہ بھوت بن کر سوار تھا۔ اور میں بھوک اور دھوپ دونوں سے بے پروا ہو کر سکول سے سیدھا اس کے ساتھ چل دیا۔

امی چند کا گھر چھوٹا سا تھا لیکن بہت ہی صاف ستھرا اور روشن۔ پیتل کی کیلوں والے دروازے کے بعد ذرا سی ڈیوڑھی تھی۔ آگے مستطیل صحن۔ سامنے شرخ رنگ کا برآمدہ اور اس کے پیچھے اتنا ہی بڑا ایک کمرہ۔ صحن میں ایک طرف انار کا پیڑ۔ عشقین کے چند پودے اور دھنیا کی ایک چھوٹی سی کیاری تھی۔ دوسری طرف چوڑی سیڑھیوں کا ایک زینہ جس کی محراب تلے مختصر سی رسوئی تھی۔ گیرو رنگی کھڑکیاں ڈیوڑھی سے ملحقہ بیٹھک میں کھلتی تھیں، اور بیٹھک کا دروازہ نیلے رنگ کا تھا۔ جب ہم ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تو امی چند نے چلا کر "بے بے نمستے!" کہا اور مجھے صحن کے بیچوں بیچ چھوڑ کر بیٹھک میں گھس گیا۔ برآمدے میں بوریا بچھائے بے بے مشین چلا رہی تھی۔ اور اس کے پاس ہی ایک لڑکی بڑی سی قینچی سے کپڑے قطع کر رہی تھی۔ بے بے نے منہ ہی منہ میں کچھ جواب دیا اور ویسے ہی مشین چلاتی رہی۔ لڑکی نے نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور گردن موڑ کر کہا "بے بے شاید ڈاکٹر صاحب کا لڑکا ہے"۔

مشین رک گئی۔

"ہاں ہاں" بے بے نے مسکرا کر کہا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔ میں اپنے جزدان کی رسی مروڑتا اور ٹیڑھے میڑھے پاؤں دھرتا برآمدے کے ستون کے ساتھ آ لگا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" بے بے نے چمکار کر پوچھا اور میں نے نگاہیں جھکا کر آہستہ سے اپنا نام بتا دیا۔

"آفتاب سے بہت شکل ملتی ہے" اس لڑکی نے قینچی زمین پر رکھ کر کہا "ہے نا بے بے؟"

"کیوں نہیں بھائی جو ہوا۔"

"آفتاب کیا؟" اندر سے آواز آئی "آفتاب کی بیٹا؟"

"آفتاب کا بھائی ہے داؤ جی" لڑکی نے رکتے ہوئے کہا "امی جند کے ساتھ آیا ہے۔"

اندر سے داؤ جی برآمد ہوئے۔ انھوں نے گھٹنوں تک اپنا پائجامہ چڑھا رکھا اور کرتہ اتارا ہوا تھا۔ مگر سر پہ پگڑی بدستور تھی پانی کی ہلکی سی بالٹی اٹھائے وہ برآمدے میں آ گئے اور میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولے "ہاں بہت شکل ملتی ہے۔ مگر میرا آفتاب بہت دبلا ہے اور یہ گوتو موٹو سا ہے۔" پھر بالٹی فرش پر رکھ کے انھوں نے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا اور پاس کا ٹھ کا ایک اسٹول کھینچ کر اس پر بیٹھ گئے۔ زمین سے پاؤں اوپر اٹھا کر انھوں نے آہستہ سے انھیں جھاڑا اور پھر بالٹی میں ڈال دیئے۔

"آفتاب کا خط آتا ہے؟" انھوں نے بالٹی سے پانی کے چلو بھر بھر کر ٹانگوں پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"آتا ہے جی" میں نے ہولے سے کہا "پرسوں آیا تھا۔"

"کیا لکھتا ہے؟"

"پتہ نہیں جی ابا جی کو پتہ ہے۔"

"اچھا" انھوں نے سر ہلا کر کہا "تو ابا جی سے پوچھا کرنا! ——— جو پوچھتا نہیں اسے کسی بھی بات کا علم نہیں ہوتا۔"

میں چپ رہا۔

تھوڑی دیر انھوں نے ویسے ہی چلو ڈالتے ہوئے پوچھا "کونسا سیپارہ پڑھ رہے ہو؟"

"چوتھا" میں نے وثوق سے جواب دیا۔

"کیا نام ہے تیسرے سیپارے کا؟" انھوں نے پوچھا۔

"جی پتہ نہیں" میری آواز پھر ڈوب گئی۔

"تِلْکَ الرُّسُلُ" انھوں نے پانی سے ہاتھ باہر نکال کر کہا۔ پھر تھوڑی دیر وہ ہاتھ جھٹکتے اور ہوا میں لہراتے رہے۔ بے بے مشین چلاتی رہی۔ وہ لڑکی نعمت خانے سے روٹی نکال کر برآمدے کی چوکی پر لگانے لگی اور میں جزدان کی ڈوری کو کھولتا لپیٹتا رہا۔ امی جند ابھی تک بیٹھک کے اندر ہی تھا اور میں ستون کے ساتھ ساتھ جھینپ کی عمیق گہرائیوں میں اترتا جا رہا تھا، معاً داؤ جی نے نگاہیں میری طرف پھیر کر کہا ———

"سورہ فاتحہ سناؤ۔"

"مجھے نہیں آتی جی" میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔

انھوں نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور پوچھا "الحمد للّٰہ بھی نہیں جانتے؟"

"الحمد للّٰہ تو جانتا ہوں جی" میں نے جلدی سے کہا۔

وہ ذرا مسکرائے اور گویا اپنے آپ سے کہنے لگے "ایک ہی بات ہے ایک ہی بات ہے"! پھر انھوں نے سر کے اشارے سے کہا سناؤ۔ جب میں سنانے لگا تو انھوں نے اپنا پاجامہ گھٹنوں سے نیچے کر لیا۔ اور پگڑی کا شملہ جوڑ کر کے کندھوں پر ڈال لیا۔ اور جب میں نے وَلَا الضَّالِّین کہا تو میرے ساتھ ہی انھوں نے بھی آمین کہا۔ مجھے خیال ہوا کہ وہ ابھی اٹھ کر مجھے کچھ انعام دیں گے۔ کیونکہ پہلی مرتبہ جب میں نے اپنے تایا جی کو الحمد سنائی تھی تو انھوں نے بھی ایسے ہی آمین کہا تھا اور ساتھ ہی ایک روپیہ مجھے انعام بھی دیا تھا مگر داؤجی اسی طرح بیٹھے رہے۔ بلکہ اور بھی بیٹھ رہ گئے۔ اتنے میں امی چند کتاب تلاش کر کے لے آیا اور جب میں چلنے لگا تو میں نے عادت کے خلاف آہستہ سے کہا "داؤجی سلام" اور انھوں نے ویسے ہی ڈوبے ڈوبے ہوئے سے جواب دیا "جیتے رہو"

بے بے نے مشین روک کر کہا "کبھی کبھی امی چند کے ساتھ کھیلنے آ جایا کرو ......"

"ہاں ہاں آجایا کر" داؤجی چونک کر بولے "آفتاب بھی آیا کرتا تھا" پھر انھوں نے بالٹی پر جھکتے ہوئے کہا "ہمارا آفتاب تو ہم سے بہت دور ہو گیا اور فارسی کا شعر سا پڑھنے لگے۔"

یہ داؤجی سے میری باقاعدہ پہلی ملاقات تھی۔ اور اس ملاقات سے میں یہ نتائج اخذ کر کے چلا کہ داؤجی بڑے کنجوس ہیں، حد سے زیادہ چپ چپ سے ہیں اور کچھ بہرے سے ہیں۔ اسی دن شام کو میں نے اپنی اماں کو بتایا کہ میں داؤجی کے گھر گیا تھا اور وہ آفتاب بھائی کو بہت یاد کر رہے تھے۔

اماں نے قدرے تلخی سے کہا "تو مجھ سے پوچھ تو لیتا بے شک آفتاب ان سے پڑھتا رہا ہے۔ اور وہ ان کی بہت عزت کرتا ہے مگر تیرے اباجی ان سے بولتے نہیں ہیں۔ کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا سو اب تک ناراضی چلی آتی ہے۔ اگر انھیں پتہ چل گیا کہ تو ان کے ہاں گیا تھا تو وہ خفا ہوں گے" پھر اماں نے ہمدردی کر کہا "اپنے ابا سے اس کا ذکر نہ کرنا۔"

میں اباجی سے بھلا اس کا ذکر کیوں کرتا، مگر سچی بات تو یہ ہے کہ میں داؤجی کے ہاں جاتا رہا اور خوب خوب ان سے مسخری کی باتیں کرتا رہا۔ وہ چٹائی بچھائے کوئی کتاب پڑھ رہے ہوتے میں آہستہ سے ان کے پیچھے جا کر کھڑا ہو جاتا اور وہ کتاب بند کر کے کہتے "گولو آ گیا" پھر میری طرف مڑتے اور ہنس کر کہتے "کوئی گپ سنا" اور میں اپنی بساط اور اپنی سمجھ کے مطابق ڈھونڈ ڈھانڈ کے کوئی بات سناتا تو وہ خوب ہنستے بس یونہی میرے لئے ہنستے حالانکہ مجھے اب محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایسی دلچسپ باتیں بھی نہ ہوتی تھیں، پھر وہ اپنے رجسٹر سے کوئی کاغذ نکال کر کہتے لے ایک سوال نکال۔ اس بات سے میری جان جاتی تھی۔ لیکن ان کا وعدہ بڑا رسیلا ہوتا تھا کہ ایک سوال اور پندرہ منٹ باتیں۔ اس کے بعد ایک اور سوال اور پھر پندرہ منٹ گپیں۔ چنانچہ میں مان جاتا اور کاغذ لے کر بیٹھ جاتا۔ لیکن ان کے خود ساختہ سوال کچھ ایسا الجھے ہوتے کہ اگلی باتوں اور اگلے سوالوں کا وقت بھی نکل جاتا۔ اگر خوش قسمتی سے سوال جلد حل ہو جاتا تو وہ چٹائی کر ہاتھ لگا کر پوچھتے یہ کیا ہے؟ "چٹائی" میں منہ پھاڑ کر جواب دیتا "اوں ہوں" وہ سر ہلا کر کہتے "فارسی میں بتاؤ" تو میں تنگ کر جواب دیتا "تو جی ہمیں کوئی فارسی پڑھائی جاتی ہے" اس پر وہ پچکار کر کہتے "میں جو پڑھاتا ہوں گولو ——— میں جو سکھاتا ہوں ——— سنو! فارسی میں بوریا، عربی میں حصیر" میں شرارت سے ہاتھ جوڑ کر کہتا "بخشو جی بخشو، فارسی بھی اور عربی بھی میں نہیں پڑھتا جی معاف کرو" مگر وہ سُنی اَن سُنی ایک کر کے کہے جاتے فارسی بوریا، عربی حصیر۔ اور پھر کوئی چاہے اپنے کانوں میں سیسہ بھر لیتا داؤجی کے الفاظ گھستے چلے جاتے تھے ——— امی چند کتابوں کا کیڑا تھا۔ سارا دن بیٹھک میں بیٹھا لکھتا پڑھتا رہتا۔ داؤجی اس کے اوقات میں مخل نہ ہوتے تھے، لیکن ان کے وار امی چند پر بھی برابر ہوتے تھے وہ اپنی نشست سے اٹھ کر گھڑے سے پانی پینے آیا داؤجی نے کتاب سے نگاہیں اٹھا کر پوچھا "بیٹا ڈڈو کا ناؤں کیا ہے؟" اس نے گلاس کے ساتھ منہ لگائے لگائے "ڈیڈ" کہا اور پھر گلاس گھڑونچی تلے پھینک کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ داؤجی پھر پڑھنے میں

معروف ہوگئے۔ گھر میں ان کو اپنی بیٹی سے بڑا پیار تھا۔ ہم سب اسے بی بی کہہ کر پکارتے تھے اکیلے داؤ جی نے اس کا نام قرۃ رکھا ہوا تھا۔ اکثر بیٹھے بیٹھے ہانک لگا کر کہتے "قرۃ بیٹیا یہ قینچی تجھ سے کب چھوٹے گی؟" اور وہ اس کے جواب میں مسکرا کر خاموش ہو جاتی۔ بے بے کو اس نام سے بڑی چڑ تھی۔ وہ چیخ کر جواب دیتی "تم نے اس کا نام قرۃ رکھ کر اس کے بھاگ میں کڑتے بیلنے لکھوا دیئے ہیں۔ منہ اچھا نہ ہوتا شبد تو اچھے نکالنے چاہئیں" اور داؤ جی ایک لمبی سانس لے کر کہتے "جاہل اس کا مطلب کیا جانیں" اس پر بے بے کا غصہ چمک اٹھتا اور اس کے منہ میں جو کچھ آتا کہتی چلی جاتی۔ پہلے کوسنے، پھر بد دعائیں اور آخر میں گالیوں پہ اتر آتی۔ بی بی رکتی تو داؤ جی کہتے "ہوائیں جلنے کو ہوتی ہیں بیٹیا اور گالیاں برسنے کو، تم انھیں رو کو مت، انھیں ٹوکو مت۔ پھر وہ اپنی کتابیں سمیٹتے اور اپنا محبوب حصیرا اٹھا کر چپکے سے سیڑھیاں چڑھ جاتے۔

نویں جماعت کے شروع ہی میں مجھے ایک بری عادت پڑ گئی اور اس بری عادت نے عجیب گل کھلائے۔ حکیم علی احمد مرحوم ہمارے قصبے کے ایک ہی حکیم تھے۔ علاج معالجے سے تو ان کو کچھ ایسی دلچسپی نہ تھی۔ لیکن باتیں بڑی مزیدار سناتے تھے۔ اولیاؤں کے تذکرے۔ جنوں بھوتوں کی کہانیاں اور حضرت سلیمانؑ اور ملکہ سبا کی گھریلو زندگی کی داستانیں ان کے تیر بہدف ٹوٹکے تھے۔ ان کے تنگ و تاریک مطب میں معجون کے چند ڈبوں۔ شربت کی دس پندرہ بوتلوں اور دو آتشی شیشوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ دواؤں کے علاوہ وہ اپنی طلسماتی تقریر اور حضرت سلیمانؑ کے خاص صدری تعویذوں سے مریض کا علاج کیا کرتے تھے۔ انہی باتوں کے لئے دور دراز گاؤں کے مریض ان کے پاس کھنچے چلے آتے اور فیض یاب ہو کر جاتے، ہفتہ دو ہفتہ کی صحبت میں میرا ان کے ساتھ ایک معاہدہ ہو گیا۔ میں اپنے ہسپتال سے ان کے لئے خالی بوتلیں اور شیشیاں چرا کے لاتا اور اس کے بدلے وہ مجھے داستانِ امیر حمزہ کی جلدیں پڑھنے کے لئے دیا کرتے۔

یہ کتابیں کچھ ایسی دلچسپ تھیں کہ میں رات رات بھر اپنے بستر میں دبک کر انھیں پڑھا کرتا۔ اور صبح دیر تک سویا رہتا، اماں میرے اس رویّے سے سخت نالاں تھیں، اباجی کو میری صحت برباد ہونے کا خطرہ لاحق تھا، لیکن میں نے ان کو بتا دیا تھا کہ چاہے جان چلی جائے اب کے دسویں میں وظیفہ ضرور حاصل کروں گا۔ رات طلسم ہوشربا کے ایوانوں میں بسر ہوتی، اور دن کلاس میں بینچ پر کھڑے ہو کر، سہ ماہی امتحان میں فیل ہونے ہوتے بچا بششماہی میں بیمار پڑ گیا اور سالانہ امتحان کے موقعہ پر حکیم جی کی مدد سے ماسٹروں سے مل ملا کر پاس ہو گیا۔ دسویں میں سندبادنامہ، فسانۂ آزاد، اور الف لیلہ ساتھ ساتھ چلتے تھے، فسانۂ آزاد اور سندبادنامہ گھر پر رکھے تھے، لیکن الف لیلہ سکول کے ڈیسک میں بند رہتی۔ آخری بینچ پر جغرافیہ کی کتاب تلے سندباد جہازی کے ساتھ ساتھ چلتا اور اس طرح دنیا کی سیر کرتا۔ . . . بائیس مئی کا واقعہ ہے کہ صبح دس بجے یونیورسٹی سے نتیجہ کی کتاب ایم۔ بی ہائی سکول پہنچی۔ امی چند نہ صرف سکول میں بلکہ ضلع بھر میں اوّل آیا تھا۔ چھ لڑکے فیل تھے اور بائیس پاس۔ حکیم جی کا جادو یونیورسٹی پہ نہ چل سکا اور پنجاب کی جابر دانش گاہ نے میرا نام بھی ان چھیوں لڑکوں میں شامل کر دیا۔ اسی شام قبلہ گاہی نے بید سے میری پٹائی کی اور گھر سے باہر نکال دیا۔ میں ہسپتال کے رہٹ کی گدی پر آ بیٹھا اور رات گئے تک سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہیے اور اب کدھر جانا چاہیئے۔ خدا کا ملک تنگ نہیں تھا اور میں عمرو عیار کے ہتھکنڈوں اور سندباد جہازی کے تمام طریقوں سے واقف تھا مگر پھر بھی کوئی راہ سجھائی نہ دیتی تھی۔ کوئی دو تین گھنٹے اسی طرح ساکت و جامد اس گدی پر بیٹھا زیست کرنے کی راہیں سوچتا رہا۔ اتنے میں اماں سفید چادر اوڑھے مجھے ڈھونڈتی ڈھونڈتی ادھر آ گئیں اور اباجی سے معافی لے دینے کا وعدہ کر کے مجھے پھر گھر لے گئیں۔ مجھے معافی وافی سے کوئی دلچسپی نہ تھی، مجھے تو بس ایک رات اور ان کے یہاں گزارنی تھی۔ اور صبح سویرے اپنے سفر پہ روانہ ہونا تھا، چنانچہ میں آرام سے ان کے ساتھ جا کر حسبِ معمول اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔

اگلے دن میرے فیل ہونے والے ساتھیوں میں سے خوشیا کوڈو اور ولیم بیب مسجد کے پچھواڑے ٹال کے پاس بیٹھے مل گئے وہ لاہور جاکر بزنس کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ ولیم بیب نے مجھے بتایا کہ لاہور میں بہت بزنس ہے کیونکہ اس کے بھایا جی اکثر اپنے دوست نتھ چند کے ٹھیکوں کا ذکر کیا کرتے تھے۔ جس نے سال کے اندر اندر دو کاریں خرید لی تھیں، میں نے ان سے بزنس کی نوعیت کے بارے میں پوچھا تو بیب نے کہا لاہور میں ہر طرح کا بزنس مل جاتا ہے۔ بس ایک دفتر ہونا چاہیے اور اس کے سامنے بڑا سا سائن بورڈ۔ سائن بورڈ دیکھ کر لوگ خود ہی بزنس دے جاتے ہیں۔ اس وقت بزنس سے مراد وہ کرنسی نوٹ لے رہا تھا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر وضاحت چاہی تو کوڈو چمک کر بولا "یار ولیم سب جانتا ہے۔ یہ بتا تو تیار ہے یا نہیں؟"

پھر اس نے پلٹ کر ولیم سے پوچھا "انارکلی دفتر بنائیں گے نا؟"

ولیم نے ذرا سوچ کر کہا "انارکلی میں یا شاہ عالمی کے باہر دونوں ہی جگہیں ایک سی ہیں"

میں نے کہا انارکلی زیادہ مناسب ہے کیونکہ وہی زیادہ مشہور جگہ ہے اور اخباروں میں جتنے بھی اشتہار نکلتے ہیں ان میں انارکلی لاہور لکھا ہوتا ہے"

چنانچہ یہ طے پایا کہ اگلے دن دو بجے کی گاڑی سے ہم لاہور روانہ ہو جائیں!

گھر پہنچ کر میں سفر کی تیاری کرنے لگا۔ بوٹ پالش کر رہا تھا کہ نوکر نے آکر شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا "چلو جی ڈاکٹر صاحب بلاتے ہیں"

"کہاں ہیں؟" میں نے برش زمین پر رکھ دیا اور کھڑا ہو گیا۔

"ہسپتال میں" وہ بدستور مسکرا رہا تھا کیونکہ میری پٹائی کے روز حاضرین میں وہ بھی شامل تھا۔

میں ڈرتے ڈرتے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھا۔ پھر آہستہ سے جالی والا دروازہ کھول کر اباجی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں ان کے علاوہ داؤجی بھی بیٹھے تھے۔ میں نے سہمے سہمے داؤجی کو سلام کیا اور اس کے جواب میں بڑی دیر کے بعد جیتے رہو کی مانوس دعا سنی۔

"ان کو پہچانتے ہو؟" اباجی نے سختی سے پوچھا۔

"بے شک" میں نے ایک مہذب جینٹلمین کی طرح کہا۔

"بے شک کے بچے، حرامزادے، میں تیری یہ سب . . . . . . "

"نہ نہ ڈاکٹر صاحب" داؤجی نے ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا "یہ تو بہت ہی اچھا بچہ ہے اس کو تو . . . . . "

اور ڈاکٹر صاحب نے بات کاٹ کر تلخی سے کہا "آپ نہیں جانتے منشی جی اس کمینے نے میری عزت خاک میں ملا دی"

"آپ فکر نہ کریں" داؤجی نے سر جھکائے کہا "یہ ہمارے آفتاب سے بھی ذہین ہے اور ایک دن . . . . . "

اب کے ڈاکٹر صاحب کو غصہ آگیا اور انھوں نے میز پر ہاتھ مار کر کہا "کیسی بات کرتے ہو منشی جی! یہ آفتاب کے جوتے کی برابری نہیں کر سکتا!"

"کرے گا، کرے گا ـــ ڈاکٹر صاحب" داؤجی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "آپ خاطر جمع رکھیں"

پھر وہ اپنی کرسی سے اٹھے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے "میں سیر کو چلتا ہوں تم بھی میرے ساتھ آؤ راستے میں باتیں کریں گے"

اباجی اسی طرح کرسی پر بیٹھے غصے کے عالم میں اپنا رجسٹر الٹ پلٹ کرتے اور بڑبڑاتے رہے۔ میں نے آہستہ آہستہ چل کر جالی والا دروازہ کھولا تو داؤجی نے پیچھے مڑ کر کہا "ڈاکٹر صاحب بھول نہ جائیے ابھی بھجوا دیجئے گا"

داؤجی مجھے ادھر ادھر گھماتے اور مختلف درختوں کے نام فارسی میں بتاتے نہر کے اسی پل پر لے گئے جہاں پہلے پہل میرا ان سے تعارف ہوا تھا۔ اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ کر انھوں نے پگڑی اتار کر گود میں ڈال لی۔ سر پر ہاتھ پھیرا اور مجھے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر انھوں نے آنکھیں

بند کر لیں اور کہا آج سے میں نہیں پڑھاؤں گا اور اگر جماعت میں اوّل نہ لاسکا تو فرسٹ ڈویژن ضرور دلوادونگا۔ میرے ہر ارادے میں خداوند تعالیٰ کی مدد شامل ہوتی ہے اور اس ہستی نے مجھے اپنی رحمت سے کبھی مایوس نہیں کیا۔ . . "

" مجھ سے پڑھائی نہ ہوگی " میں نے گستاخی سے بات کاٹی۔

" تو اور کیا ہو گا گوتو ؟ " انھوں نے مسکرا کر پوچھا۔

میں نے کہا " میں بزنس کرونگا، روپیہ کماؤں گا اور اپنی کار لے کر یہاں آؤنگا پھر دیکھنا۔

اب کے داؤجی نے میری بات کاٹی اور بڑی محبت سے کہا " خدا ایک چھوڑ تجھے دس کاریں دے لیکن ایک اَن پڑھ کی کار میں نہ بیٹھونگا نہ ڈاکٹر صاحب "

میں نے جل کر کہا " مجھے کسی کی پرواہ نہیں ڈاکٹر صاحب اپنے گھر راضی ہیں اپنے یہاں خوش "

انھوں نے حیران ہوکر پوچھا " میری بھی پرواہ نہیں ؟ " میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ دُکھی سے ہو گئے اور بار بار پوچھنے لگے " میری بھی پرواہ نہیں ؟ "

" اوگوتو میری بھی پرواہ نہیں ؟ "

مجھے ان کے لہجے پر ترس آنے لگا اور میں نے آہستہ سے کہا " آپ کی تو ہے مگر . . . . . " مگر انھوں نے میری بات نہ سُنی اور کہنے لگے " اگر اپنے حضرت کے سامنے میرے منہ سے ایسی بات نکل جاتی ؟ اگر میں یہ کفر کا کلمہ کہہ جاتا . . . . . تو . . . . . تو . . . . . " انھوں نے فوراً پگڑی اُٹھا کر سر پہ رکھ لی اور ہاتھ جوڑ کہنے لگے " میں حضور کے دربار کا ایک ادنےٰ کتا۔ میں حضرت مولانا کی خاکِ اسے بدتر بندہ، ہوکر آقا سے یہ کہتا لعنت کا طوق نہ پہنتا ؟ خاندانِ ابوجہل کا خانوادہ اور آقا کی ایک نظرِ کرم۔ حضرت کا ایک اشارہ۔ حضور نے چغتو کو منشی حشمت رام بنا دیا۔ لوگ کہتے ہیں منشی جی، میں کہتا ہوں رحمتہ اللہ علیہ کا کفش بردار . . . لوگ سمجھتے ہیں . . . . " داؤجی کبھی ہاتھ جوڑتے، کبھی سر جھکاتے کبھی انگلیاں چوم کر آنکھوں کو لگاتے اور بیچ بیچ میں فارسی کے شعر پڑھتے جاتے۔ میں کچھ پریشان سا پشیمان سا ان کا زانو چھو کر آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا داؤجی، داؤجی! اور داؤجی " میرے آقا، میرے مولانا، میرے مرشد " کا وظیفہ کئے جاتے۔ جب جذب کا یہ عالم دُور ہوا تو نگاہیں اُوپر اُٹھا کر بولے " کیا اچھا موسم ہے دن بھر دھوپ پڑتی ہے تو خوشگوار شاموں کا نزول ہوتا ہے " پھر وہ پُل کی دیوار سے اُٹھے اور بولے " چلو اب چلیں بازار سے تھوڑا سودا خریدنا ہے "

میں جیسا سرکش و بدمزاج بن کر ان کے ساتھ آیا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ منفعل اور خجل ان کے ساتھ لوٹا۔ گھسے پنساری یعنی ولیویب بب کے باپ کی دوکان سے انھوں نے گھریلو ضروریات کی چند چیزیں خریدیں اور لفافے گود میں اُٹھا کر چل دیئے۔ میں بار بار ان سے لفافے لینے کی کوشش کرتا۔ مگر ہمت نہ پڑتی ایک عجیب سی شرم ایک انوکھی سی ہچکچاہٹ مانع تھی اور اسی تامّل اور جھجک میں ڈوبتا اُبھرتا میں ان کے گھر پہنچ گیا۔

وہاں پہنچ کر یہ بھید کھلا کہ اب میں انہی کے ہاں سویا کرونگا، اور وہیں پڑھا کرونگا۔ کیونکہ میرا بستر مجھ سے بھی پہلے وہاں بھیجا ہوا تھا۔ اور اس کے پاس ہی ہمارے یہاں سے بھیجی ہوئی ایک ہریکین لالٹین بھی رکھی تھی۔

بخلاف میں بہنا اور پاں ہاں کرتی بیکار ڈوار لئے پھرنا میرے مقدر میں نہ تھا گو میرے ساتھیوں کی روانگی کے تیسرے ہی روز بعد ان کے والدین بھی انھیں لاہور سے پکڑ لائے۔ لیکن اگر میں ان کے ساتھ ہوتا تو شاید اس وقت انار کلی میں ہمارا دفتر پتہ نہیں ترقی کے کونسے شاندار مرحلے میں داخل ہو چکا ہوتا۔

داؤجی نے میری زندگی اجیرن کر دی۔ مجھے تباہ کر دیا، مجھ پہ جینا حرام کر دیا، سارا دن سکول کی بکواس میں گذرتا، اور رات اگر میوں کی مختصر

رات، ان کے سوالوں کا جواب دیتے ہیں، کولٹے پہ ان کی کھاٹ میرے بستر کے ساتھ لگی ہے، اور وہ مونگ، رسول اور مرالہ کی نہروں کی بابت پوچھ رہے ہیں، مَیں نے بالکل ٹھیک بتا دیا ہے، تو وہ پھر اسی سوال کو دہرا رہے ہیں، میں نے پھر ٹھیک بتا دیا ہے، اور انھوں نے پھر انہی نہروں کو آگے لا کھڑا کیا ہے، مَیں جل جاتا اور جھڑک کر کہتا "مجھے نہیں پتہ میں نہیں بتاتا"، تو وہ خاموش ہو جاتے اور دم سادھ لیتے، میں آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرتا تو وہ شرمندگی لنگر بن کر پتلیوں میں اُتر جاتی۔

میں آہستہ سے کہتا "داؤجی"

"ہوں" ایک گمبھیر سی آواز آتی۔

"داؤجی کچھ اور پوچھو"

داؤجی نے کہا "بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے ——— اس کی ترکیب نحوی کرو"

میں نے سعادت مندی کے ساتھ کہا "جی یہ تو بہت لمبا فقرہ ہے صبح لکھ کر بتا دوں گا کوئی اور پوچھئے"

انھوں نے آسمان کی طرف نگاہیں اُٹھائے کہا "میرا گو بہت اچھا ہے"

میں نے ذرا سوچ کر کہنا شروع کیا بہت اچھا صفت، ہے حرفِ ربط مل کر بنا مسند . .

اور داؤجی اُٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گئے، ہاتھ اُٹھا کر بولے جانِ پدر تجھے پہلے بھی کہا ہے مسند الیہ پہلے بتایا کر"

میں نے ترکیب نحوی سے جان چھڑانے کے لئے پوچھا "آپ مجھے جانِ پدر کیوں کہتے ہیں جانِ داؤ کیوں نہیں کہتے"؟

"شاباش"، وہ خوش ہو کر کہتے "ایسی باتیں پوچھنے کی ہوتی ہیں۔ جان لفظ فارسی کا ہے اور داؤ بھاشا کا ان کے درمیان فارسی اضافت نہیں لگ سکتی۔ جو لوگ دن بدن لکھتے یا بولتے ہیں سخت غلطی کرتے ہیں، روز بروز کہو یا دن پہ دن اسی طرح سے . . ."

اور جب میں سوچتا کہ یہ تو ترکیب نحوی سے بھی زیادہ خطرناک معاملے میں اُلجھ گیا ہوں تو جمائی لے کر پیار سے کہتا "داؤجی اب تو نیند آ رہی ہے!"

"اور وہ ترکیب نحوی؟" وہ جھٹ سے پوچھتے۔

اس کے بعد چاہے میں لاکھ بہانے کرتا ادھر اُدھر کی ہزار باتیں کرتا، مگر وہ اپنی کھاٹ پر ایسے ہی بیٹھے رہتے، بلکہ اگر ذرا سی دیر ہو جاتی تو کرسی پہ رکھی ہوئی پگڑی اُٹھا کر سر پہ دھر لیتے۔ چنانچہ کچھ بھی ہوتا۔ ان کے ہر سوال کا خاطر خواہ جواب دینا پڑتا۔

امی چند کالج چلا گیا تو اس کی بیٹھک مجھے مل گئی۔ اور داؤجی کے دل میں اس کی محبت پر بھی میں نے قبضہ کر لیا۔ اب مجھے داؤجی بہت اچھے لگنے لگے تھے۔ لیکن ان کی باتیں جو اس وقت مجھے بُری لگتی تھیں۔ وہ اب بھی بُری لگتی ہیں بلکہ اب پہلے سے بھی کسی قدر زیادہ، شاید اس لئے کہ اب میں نفسیات کا ایک ہونہار طالب علم ہوں اور داؤجی پُرانے ملائی مکتب کے پروردہ تھے۔ سب سے بُری عادت ان کی اُٹھتے بیٹھتے سوال پوچھتے رہنے کی تھی اور دوسری کھیل کود سے منع کرنے کی۔ وہ تو بس یہ چاہتے تھے کہ آدمی پڑھتا رہے اور جب اس مدقوق کی موت کا دن قریب آئے تو کتابوں کے ڈھیر پر جان دے دے۔ صحتِ جسمانی قائم رکھنے کے لئے ان کے پاس بس ایک ہی نسخہ تھا، لمبی سیر اور وہ بھی صبح کی۔ تقریباً سورج نکلنے سے دو گھنٹے پیشتر وہ مجھے بیٹھک میں جگانے آتے اور میرا کندھا ہلا کر کہتے "اُٹھ گُو، موٹا ہو گیا بیٹا"۔ دُنیا جہان کے والدین صبح جگانے کیلئے کہا کرتے ہیں کہ اٹھو بیٹا صبح ہو گئی یا سورج نکل آیا مگر وہ "موٹا ہو گیا" کہہ کر میری تذلیل کیا کرتے، میں منمناتا تو چمکار کر کہتے "بڑا ہو جائے گا بیٹا تو گھوڑے پہ ضلع کا دورہ کیسے کیا کرے گا!" اور میں گرم گرم بستر سے ہاتھ جوڑ کر کہتا "داؤجی خدا کے لئے مجھے صبح نہ جگاؤ چاہے مجھے قتل کر دو، جان سے مار ڈالو!"

یہ فقرہ ان کی سب سے بڑی کمزوری تھی وہ فوراً میرے سر پر لحاف ڈال دیتے اور باہر نکل جاتے۔

بے بے کو ان دادو جی سے اللہ واسطے کا بیر تھا اور دادو جی ان سے بہت ڈرتے تھے، وہ سارا دن محلے والیوں کے کپڑے سیا کرتیں اور دادو جی کو کوسنے دیئے جاتیں۔ ان کی اس زبان درازی پہ مجھے بڑا غصہ آتا تھا مگر دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہ ہو سکتا تھا۔ کبھی کبھار جب وہ ناگفتنی گالیوں پہ اتر آتیں تو دادو جی میری بیٹھک میں آجاتے اور کانوں پہ ہاتھ رکھ کر کرسی پہ بیٹھ جاتے تھوڑی دیر بعد کہتے "غیبت کرنا بڑا گناہ ہے لیکن میرا خدا مجھے معاف کرے تیری بے بے بھٹیارن ہے اور اس کی سرائے میں، مَیں، میری قرۃ العین اور تھوڑا تھوڑا تو بھی، ہم تینوں بڑے عاجز مسافر ہیں" اور واقعی بے بے بھٹیارن سی تھی۔ اس کا سخت رنگ کالا تھا اور دانت بے حد سفید، ماتھا محراب دار اور آنکھیں چنیاں سی۔ چلتی تو ایسی گرو بہ پائی کے ساتھ جیسے (خدا مجھے بھی معاف کرے) کٹنی کنسوئیاں لیتی پھرتی ہے۔ بچاری بی بی کو ایسی ایسی بُری باتیں کہتی کہ وہ دونوں دن رو رو کر ہلکان ہُوا کرتی۔ ایک امی جند کے ساتھ اس کی ملنی تھی شاید اس وجہ سے کہ دونوں ہم شکل تھے یا شاید اس وجہ سے کہ اس کو بی بی کی طرح اپنے دلو جی سے پیار نہ تھا یوں تو بی بی بے چاری بہت اچھی لگتی تھی مگر اس سے میری بھی نہ بنتی تھی۔ میں کوٹھے پر بیٹھا سوال نکال رہا ہوں دادو جی نیچے بیٹھے ہیں اور بی بی اوپر برساتی سے ایندھن لینے آئی تو ذرا رُک کر مجھے دیکھا پھر منڈیر سے جھانک کر بولی "دادو جی پڑھ نہیں رہا، تنکوں کی چارپائیاں بنا رہا ہے"

میں غصیلی بچے کی طرح منہ چڑا کر کہتا۔ تجھے کیا، نہیں پڑھتا، تو کیوں بڑ بڑ کرتی ہے ــــ آئی بڑی تھانیدارنی"

اور دادو جی نیچے سے ہانک لگا کر کہتے۔ "نہ گڑ دمو لو بہنوں سے نہیں جھگڑا کرتے"

اور میں زور سے چلاتا "پڑھ رہا ہوں جی جھوٹ بولتی ہے"

دادو جی آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ جاتے اور کاپیوں کے نیچے نیم پوشیدہ چارپائی دیکھ کر کہتے "قرۃ بیٹا تو اس کو چڑایا نہ کر۔ یہ جن بڑی مشکل سے قابو کیا ہے۔ اگر ایک بار پھر بگڑ گیا تو مشکل سے سنبھلے گا"

بی بی کہتی "کاپی اُٹھا کر دیکھ تو دادو جی اس کے نیچے ہے وہ چارپائی جس سے کھیل رہا تھا"

میں قہر آلود نگاہوں سے بی بی کو دیکھتا اور وہ لکڑیاں اُٹھا کر نیچے اُتر جاتی۔ پھر دادو جی سمجھاتے کہ بی بی یہ سب کچھ تیرے فائدے کے لئے کہتی ہے۔ ورنہ اسے کیا پڑی کہ مجھے نبانی پھرے۔ تو فیل ہو یا پاس اس کی بلا سے، اگر وہ تیری بھلائی چاہتی ہے تیری بہتری چاہتی ہے" اور دادو جی کی یہ بات ہرگز سمجھ میں نہ آتی تھی۔ میری شکایتیں کرنے والی میری بھلائی کیونکر چاہ سکتی تھی!

ان دنوں معمول یہ تھا کہ صبح دس بجے سے پہلے دادو جی کے ہاں سے چل دیتا گھر جا کر ناشتہ کرتا اور پھر سکول پہنچ جاتا۔ آدھی چھٹی پر میرا کھانا سکول بھجوا دیا جاتا اور شام کو سکول بند ہونے پر گھر آ کے اپنی لالٹین تیل سے بھرتا اور دادو جی کے یہاں آجاتا۔ پھر رات کا کھانا بھی مجھے دادو جی کے گھر پر ہی بھجوا دیا جاتا۔ جن ایام میں منصفی بند ہوتی دادو جی سکول کی گراؤنڈ میں آ کر بیٹھ جاتے اور میرا انتظار کرنے لگتے۔ وہاں سے گھر تک سوالات کی بوچھاڑ رہتی سکول میں جو کچھ پڑھایا گیا ہوتا اس کی تفصیل پوچھتے، پھر مجھے گھر تک چھوڑ کر خود سیر کو چلے جاتے۔ ہمارے قصبہ میں منصفی کا کام مہینے میں دس دن ہوتا تھا اور بیس دن منصف صاحب بہادر کی کچہری ضلع میں رہتی تھی۔ یہ دس دن دادو جی باقاعدہ کچہری میں گذارتے تھے۔ ایک آدھ عرضی آجاتی تو دو چار روپے کی بن لیتے ورنہ فارغ اوقات میں وہاں بھی مطالعہ کا سلسلہ جاری رکھتے۔ بے بے کا کام اچھا تھا اس کی کتر بیونت اور محلے والیوں سے جوڑ توڑ اچھے مالی نتائج پیدا کرتی تھی۔ چونکہ پچھلے چند سالوں سے گھر کا بیشتر خرچ اس کی سلائی سے چلتا تھا۔ اس لئے وہ دادو جی پر اور بھی حاوی ہو گئی تھی ــــ ایک دن خلافِ معمول دادو جی کو لینے میں منصفی چلا گیا۔ اس وقت کچہری بند ہو گئی تھی اور دادو جی نانبائی کے چھپر تلے ایک بینچ پر میٹھے گڑ کی چائے پی رہے تھے۔ میں نے پرے سے جا کر ان کا بستہ اُٹھا لیا۔ اور ان کے گلے میں باہیں ڈال کر

"چلئے آج میں آپ کو لینے آیا ہوں" انھوں نے میری طرف دیکھے بغیر چائے کے بڑے بڑے گھونٹ بھرے ایک آنہ جیب سے نکال کر نانبائی کے حوالے کیا اور چپ چاپ میرے ساتھ چل دیئے۔

میں نے شرارت سے ناچ کر کہا "گھر چلئے بے بے کو بتاؤں گا کہ آپ چوری چوری یہاں چائے پیتے ہیں۔"

داداجی جیسے شرمندگی ٹالنے کو مسکرائے اور بولے "اس کی چائے بہت اچھی ہوتی ہے اور گڑ کی چائے سے تھکن بھی دور ہو جاتی ہے پھر یہ ایک آنہ میں گلاس بھر کے دیتا ہے، تم اپنی بے بے سے نہ کہنا خواہ مخواہ ہنگامہ کھڑا کرے گی" پھر انھوں نے خوفزدہ ہو کر کچھ مایوس ہو کر کہا "اسکی تو فطرت ہی ایسی ہے۔" اس دن مجھے داداجی پہ بڑا رحم آیا۔ میرا جی ان کے لئے بہت کچھ کرنے کو چاہنے لگا مگر اس میں میں نے بے بے سے نہ کہنے کا ہی وعدہ کر کے ان کے لئے بہت کچھ کیا۔ جب اس واقعہ کا ذکر میں نے اماں سے کیا تو وہ کبھی میرے ہاتھ اور کبھی نوکر کی معرفت داداجی کے ہاں دودھ، پھل، اور چینی وغیرہ بھیجنے لگیں مگر اس رسد سے داداجی کو کبھی بھی کچھ نصیب نہ ہوا۔ ہاں بے بے کی نگاہوں میں میری قدر بڑھ گئی اور اس نے کسی حد تک مجھ سے رعایتی برتاؤ کرنا شروع کر دیا۔

مجھے یاد ہے ایک صبح میں دودھ سے بھرا ملوٹ ان کے یہاں لے کر آیا تھا اور بے بے گھر پہ نہ تھی وہ اپنی سکھیوں کے ساتھ باباساون کے جوہڑ میں اشنان کرنے گئی تھی۔ اور گھر میں صرف داداجی اور بی بی تھے۔ وہ دودھ دیکھ کر داداجی نے کہا "چلو آج تینوں چائے پئیں گے۔ میں دوکان سے گڑ لے آتا ہوں، تم پانی چولہے پر رکھو" بی بی نے جلدی جلدی چولھا سلگایا۔ میں پتیلی میں پانی ڈال کر لایا اور پھر ہم دونوں وہیں چوکے پہ بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ داداجی گڑ لے کر آگئے تو انھوں نے کہا "تم دونوں اپنے اپنے کام پہ بیٹھو چائے میں بناتا ہوں" چنانچہ بی بی مشین چلانے لگی اور میں ڈائرکٹ ان ڈائرکٹ کی مشقیں لکھنے لگا۔ داداجی چولہا بھی جھونکتے جاتے تھے اور عادت کے مطابق مجھے بھی اونچے اونچے بتاتے جاتے تھے گلیلیو نے کہا "زمین سورج کے گرد گھومتی ہے" گلیلیو نے دریافت کیا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے یہ نہ لکھ دینا کہ سورج کے گرد گھومتی تھی، پانی ابل رہا تھا داداجی خوش ہو رہے تھے اسی خوشی میں جھوم جھوم کر وہ اپنا تازہ بنایا ہوا گیت گا رہے تھے۔ "او گورو! او گورو! گلیلیو کی بات مت بھولنا، گلیلیو کی بات مت بھولنا۔" انھوں نے چائے کی پتی کھولتے ہوئے پانی میں ڈال دی۔ برتن ابھی تک چولہے پہ ہی تھا اور داداجی ایک چھوٹے سے بچے کی طرح پانی کی کل بل کل بل کے ساتھ "گورو گلیلیو! گورو گلیلیو" کئے جا رہے تھے۔ میں ہنس رہا تھا اور اپنا کام کئے جا رہا تھا، بی بی مسکرا رہی تھی اور مشین چلائے جاتی تھی اور ہم تینوں اپنے چھوٹے سے گھر میں بڑے ہی خوش تھے گویا سارے محلے بلکہ سارے قصبہ کی خوشیاں بڑے بڑے رنگین پروں والی پریوں کی طرح ہمارے گھر میں اتر آئی ہوں۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور بے بے اندر داخل ہوئی۔ داداجی نے دروازہ کھلنے کی آواز پہ پیچھے مڑ کر دیکھا اور ان کا رنگ فق ہو گیا۔ چمکتی ہوئی پتیلی سے گرم گرم بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اس کے اندر چائے کے چھوٹے چھوٹے چھالے ایک دوسرے کے پیچھے شور مچاتے پھر رہے تھے اور ممنوعہ کھیل رچانے والا بڈھا موقع پہ پکڑا گیا تھا۔ بے بے نے آگے بڑھ کر چولہے کی طرف دیکھا اور داداجی نے چوکے سے اٹھتے ہوئے معذرت بھرے لہجہ میں کہا "چائے ہے؟"

بے بے نے ایک دوہتڑ داداجی کی کمر میں مارا اور کہا "بڈھے پردھا تجھے لاج نہیں آتی۔ تجھ پر بہار ہے رے تجھے یہ بیٹھے بٹھائے تیرے چائے پینے کے دن ہیں۔ میں بیوہ گھر میں نہ تھی تو تجھے کسی کا ڈر نہ رہا۔ تیرے بھاؤ میں کل کی مرتی آج مروں تیرا من راضی ہو۔ تیری آمیں پوری ہوں کس مرنے جوگی نے جنا اور کس لیکھ کی ریکھا نے میرے پلے باندھ دیا ... تجھے موت نہیں آتی ... اوں ہوں تجھے کیوں آئے گی" اسی فقرے کی گردان کرتے ہوئے بے بے نے بھیڑنی کی طرح چوکے پر چڑھی کپڑے سے پتیلی پکڑ کر چولہے سے اٹھائی اور زمین پہ دے ماری۔ گرم گرم چائے کے چھپاکے داداجی کی پنڈلیوں اور پاؤں پہ گرے اور وہ "او تیرا بھلا ہو جائے! او تیرا بھلا ہو جائے" کہتے وہاں سے ایک بچے کی طرح بھاگے اور بیٹھک میں گھس گئے ان کے اس فرار بلکہ انداز فرار کو دیکھ کر میں اور بی بی ہنسے بنا نہ رہ سکے اور ہماری ہنسی کی آواز ایک ثانیہ کے لئے چار دن دیواروں سے

ٹکرائی۔ میں تو خیر بچ گیا۔ لیکن بے بے نے سیدھے جا کر بی بی کو بالوں سے پکڑ لیا اور چیخ کر بولی۔ "میری سوت بنا بڈھے سے تیرا کیا ناطہ ہے۔ بتا نہیں تو ابھی جان لیتی ہوں۔ تو نے اس کو چائے کی کنجی کیوں دی؟"

بی بی بچاری پھِس پھِس رونے لگی تو میں بھی اٹھ کر اندر بیٹھک میں کھسک آیا۔ داؤ جی اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھے تھے اور اپنے پاؤں سہلا رہے تھے۔ پتہ نہیں انھیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے پھر کیوں گدگدی ہوئی کہ میں الماری کے اندر منہ کر کے ہنسنے لگا، انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے پاس بلایا اور بولے "شکر کردگار کنم کہ گرفتارم بہ مصیبتے نہ کہ معصیتے"

تھوڑی دیر رُک کر پھر کہا "میں اس کے کتوں کا بھی کتا ہوں جس کے سرِ مطہر پہ مکے کی ایک کم نصیب بڑھیا غلاظت پھینکا کرتی تھی۔"

میں نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا تو وہ بولے "آقائے نامدار کا ایک ادنیٰ حلقہ بگوش گرم پانی کے چند چھینٹے پڑنے پر نالہ و شیون کرے تو لعنت ہے اس کی زندگی پر۔ وہ اپنے محبوب کے طفیل نارِ جہنم سے بچائے۔ خدائے ابراہیمؑ مجھے جرأت عطا کرے، مولائے ایوبؑ مجھے صبر کی نعمت دے۔"

میں نے کہا "داؤ جی آقائے نامدار کون؟"

تو داؤ جی کو یہ سن کر بڑی تکلیف ہوئی۔ انھوں نے شفقت سے کہا "جانِ پدر یوں نہ پوچھا کر۔ میرے استاد میرے حضرت کی روح کو مجھ سے بیزار نہ کر، وہ میرے آقا بھی تھے، میرے باپ بھی، اور میرے استاد بھی وہ تیرے دادا استاد ہیں۔ دادا استاد . . . . ." اور انھوں نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے۔ آقائے نامدار کا لفظ اور کوتاہ قسمت مجذوبہ کی ترکیب میں نے پہلی بار داؤ جی سے سُنی۔ یہ واقعہ سنانے میں انھوں نے کتنی ہی دیر لگا دی کیونکہ ایک ایک فقرے کے بعد فارسی کے بے شمار نعتیہ اشعار پڑھتے تھے اور بار بار اپنے استاد کی روح کو ثواب پہنچاتے تھے۔

جب وہ یہ واقعہ بیان کر چکے تو میں نے بڑے ادب سے پوچھا "داؤ جی آپ کو اپنے استاد صاحب اس قدر اچھے کیوں لگتے تھے اور آپ ان کا نام لے کر ہاتھ کیوں جوڑتے ہیں اپنے آپ کو ان کا نوکر کیوں کہتے ہیں؟"

داؤ جی نے مسکرا کر کہا "جو طویلے کے ایک خر کو ایسا بنا دے کہ لوگ کہیں یہ منشی چنت رام جی ہیں وہ مسیحا نہ ہو آقا نہ ہو تو پھر کیا ہو؟"

میں چارپائی کے کونے سے آہستہ آہستہ پھسل کر بستر میں پہنچ گیا، اور چاروں طرف رضائی لپیٹ کر داؤ جی کی طرف دیکھنے لگا جو سر جھکا کر کبھی اپنے پاؤں کی طرف دیکھتے تھے اور کبھی پنڈلیاں سہلاتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے وقفوں کے بعد ذرا سا ہنستے اور پھر خاموش ہو جاتے —— کہنے لگے "میں کیا تھا اور کیا ہو گیا —— حضرت مولانا کی پہلی آواز کیا تھی! میری طرف سرِ مبارک اٹھا کر فرمایا "چوپالی لڑکے ہمارے پاس آؤ" میں لاٹھی ٹیکتا ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ چھتہ بٹھار، اور دیگر دیہات کے لڑکے نیم دائرہ بنائے ان کے سامنے بیٹھے سبق یاد کر رہے تھے۔ ایک دربار لگا تھا، اور کسی کو آنکھ اوپر اُٹھانے کی ہمت نہ تھی —— میں حضور کے قریب گیا تو فرمایا، بیٹے ہم تم کو روز یہاں بکریاں چراتے دیکھتے ہیں۔ انھیں چرنے چگنے کے لئے چھوڑ کر ہمارے پاس آجایا کرو اور کچھ پڑھ لیا کرو —— پھر حضور نے میری عرض سُنے بغیر پوچھا کیا نام ہے تمہارا؟ میں نے گنواروں کی طرح کہا چنتو —— حضرت مسکرائے —— تھوڑا سا ہنسے بھی —— فرمانے لگے پورا نام کیا ہے؟ پھر خود ہی بولے چنت رام ہوگا —— میں نے سر ہلا دیا —— حضور کے شاگرد کتاب سے نظریں چرا کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میرے گلے میں کھدر کا لمبا کرتہ تھا۔ پاجامہ کی بجائے صرف لنگوٹ بندھا تھا۔ پاؤں میں ادھوڑی کے موٹے جوتے اور سر پر سرخ رنگ کا جانگیہ لپیٹا ہوا تھا۔ کیہ یاں میرکا . . . .

میں نے بات کاٹ کر پوچھا "آپ بکریاں چَراتے تھے داؤجی ؟"

" ہاں ہاں " وہ فخر سے بولے " میں گڈریا تھا اور میرے باپ کی بارہ بکریاں تھیں "

حیرانی سے میرا مُنہ کھُلا رہ گیا اور میں نے معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کے لئے جلدی سے پوچھا " اور آپ سکول کے پاس بکریاں چرایا کرتے تھے " داؤجی نے کرسی چارپائی کے قریب کھینچ لی۔ اور اپنے پاؤں پائے پر رکھ کر بولے " جانِ پدر اس زمانے میں تو شہروں میں بھی سکول نہ ہوتے تھے میں گاؤں کی بات کر رہا ہوں۔ آج سے چہتّر برس پہلے بھلا کوئی تمہارے ایم۔ بی ہائی سکول کا نام بھی جانتا تھا ؟ وہ تو میرے آقا کو پڑھانے کا شوق تھا۔ اِدھر ادھر کے لوگ اپنے لڑکے چار حرف پڑھنے کو اِن کے پاس بھیج دیتے ——— ان کا سارا خاندان زیورِ تعلیم سے آراستہ اور دینی اور دُنیوی نعمتوں سے مالا مال تھا۔ والد ان کے ضلع بھر کے ایک ہی حکیم اور جوتش کے مبلغ تھے۔ جدِ امجد مہاراجہ کشمیر کے میر منشی۔ گھر میں علم کے دریا بہتے تھے، فارسی، عربی۔ جبرو مقابلہ۔ اقلیدس۔ حکمت اور علمِ ہیئت ان کے گھر کی لونڈیاں تھیں۔ حضور کے والد کو دیکھنا مجھے نصیب نہیں ہُوا۔ لیکن آپ کی زبانی ان کے تبحرِ علمی کی سب داستانیں سنیں، شیفتہ اور حکیم مومن خاں مومنؔ سے ان کے بڑے مراسم تھے۔ اور خود مولانا کی تعلیم دِلّی میں مفتی آزردہ مرحوم کی نگرانی میں ہوئی تھی . . .

مجھے داؤجی کے موضوع سے بھٹک جانے کا ڈر تھا اس لئے میں نے جلدی سے پوچھا " پھر آپ نے حضرت مولانا کے پاس پڑھنا شروع کر دیا "

" ہاں " داؤجی اپنے آپ سے باتیں کرنے لگے " ان کی باتیں ہی ایسی تھیں۔ ان کی نگاہیں ہی ایسی تھیں۔ جس کی طرف توجہ فرماتے تھے بندے سے مولا کر دیتے تھے۔ مٹی کے ذرّے کو اکسیر کی خاصیت دیتے تھے ——— میں تو اپنی لاٹھی زمین پہ ڈال کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ فرمایا، اپنے بھائیوں کے پاس بوریے پر بیٹھو۔ میں نے کہا جی اٹھارہ برس دھرتی پر بیٹھے گذر گئے اب کیا فرق پڑتا ہے۔ پھر مسکرا دیئے اپنے چوبی صندوقچے سے حروفِ ابجد کا ایک مقوا نکالا اور بولے الف۔ بے۔ پے۔ تے ——— سبحان اللہ کیا آواز تھی کس شفقت سے بولے تھے کس لہجہ سے فرما رہے تھے الف، بے، پے، تے " اور داؤجی ان حرفوں کا وِرد کرتے ہوئے اپنے ماضی میں کھو گئے۔

تھوڑی دیر بعد انھوں نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر کہا ادھر رہٹ تھا۔ اور اس کے ساتھ مچھلیوں کا حوض۔ پھر انھوں نے بایاں ہاتھ ہوا میں لہرا کر کہا " اور اس طرف مزارعین کے گھر تھے، دونوں کے درمیان حضور کا باغیچہ تھا اور سامنے ان کی عظیم الشان حویلی۔ اسی باغیچے میں ان کا مکتب تھا۔ درِ فیض کھلا تھا جس کا جی چاہے آئے نہ مذہب کی قید نہ ملک کی پابندی . . . . .

میں نے کافی دیر سوچنے کے بعد باادب بااحتشام قسم کا فقرہ تیار کر کے پوچھا " حضرت مولانا کا اسمِ گرامی کیا تھا " تو پہلے انھوں نے میرا فقرہ ٹھیک کیا اور پھر بولے " حضرت اسماعیل چشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ان کے والد ہمیشہ انھیں جانِ جاناں کہہ کر پکارتے تھے کبھی جانِ جاناں کی رعایت سے مظہر جانِ جاناں بھی کہہ دیتے تھے "

میں ایسی دلچسپ کہانی سننے کا ابھی اور خواہشمند تھا کہ داؤجی اچانک رُک گئے اور بولے " سب سنڈی ایرِی سسٹم کیا تھا ؟ ان انگریزوں کا بُرا ہو یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی صورت میں آئیں یا ملکہ وکٹوریہ کا فرمان لے کر سارے معاملے میں کھنڈت ڈال دیتے ہیں۔ سوئے کے بھاڑے کی طرح میں نے سب سنڈی ایری سسٹم کا ڈھانچہ ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ پھر انھوں نے میز سے گڑگڑی اٹھائی اور بولے " باہر جا کر دیکھ کے آ کہ تیری بے بے کا غصّہ کم ہُوا، یا نہیں " میں دوات میں پانی ڈالنے کے بہانے باہر گیا تو بے بے کو مشین چلاتے اور بی بی کو چوکا صاف کرتے پایا۔

داؤجی کی زندگی میں لے دے کے یہ ایک پہلو بڑا ہی کمزور تھا۔ جب وہ دیکھتے کہ گھر میں مطلع صاف ہے اور بے بے کے چہرے پر کوئی شکن نہیں ہے، تو وہ پکار کر کہتے " سب ایک ایک شعر سناؤ " پہلے مجھی سے تقاضا ہوتا اور میں چھوٹتے ہی کہتا ———

لازم تھا کہ دیکھو میرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

اس پر وہ تالی بجاتے اور کہتے "اولیں شعر نہ سنوں گا، اُردو کا کم سنوں گا اور مسلسل نظم کا ہرگز نہ سنوں گا۔"
میں کہتا مجھے سوچنے دیجیے۔ اتنے میں بی بی سنا دیتیں!!

بی بی بھی میری طرح اکثر اس شعر سے شروع کرتی۔

شنیدم کہ شاپور دم درکشید
چو خسرو بر اسمش قلم درکشید

اس پر داؤجی ایک مرتبہ پھر آرڈر آرڈر پکارتے۔
بی بی قینچی رکھ کر کہتی۔

"شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقی ست شبِ فتنہ غنودیم ——"

داؤجی شاباش تو ضرور کہہ دیتے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے "بٹیا یہ شعر تو کئی مرتبہ سنا چکی ہے۔"
پھر وہ ببلے کی طرف دیکھ کر کہتے "بھئی آج تمھاری بے بے بھی ایک سنائے گی"، مگر بے بے ایک روکھا سا جواب دیتی۔ "مجھے نہیں آتے شیر کبت۔"

اس پر داؤجی کہتے "گھوڑیاں ہی سنا دے۔ اپنے بیٹوں کے بیاہ کی گھوڑیاں ہی گا دے" اس پر ببلے کے ہونٹ مسکرانے کو کرتے لیکن وہ مسکرا نہ سکتی! اور داؤجی عین عورتوں کی طرح گھوڑیاں گانے لگتے۔ ان کے درمیان کبھی امی چند کا اور کبھی میرا نام ٹانک دیتے۔ پھر کہتے "میں اپنے اس گرو مونو کی شادی پر سُرخ پگڑی باندھوں گا۔ برات میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ساتھ چلوں گا اور نکاح نامے پر شہادت کے دستخط کروں گا۔ میں دستور کے مطابق شرما کر نگاہیں نیچی کر لیتا تو وہ کہتے، "پتہ نہیں اس ملک کے کسی شہر میں میری چھوٹی سی بہو پانچویں یا چھٹی جماعت میں پڑھ رہی ہو گی، ہفتہ میں ایک دن لڑکیوں کی خانہ داری ہوتی ہے۔ اس نے تو بہت سی چیزیں پکانی سیکھ لی ہوں گی۔ پڑھنے میں بھی ہوشیار ہو گی۔ اس بدھو کو تو یہ یاد نہیں رہتا کہ مادیاں گھوڑیاں ہوتی ہے یا مرغی۔ وہ تو فر فر سب کچھ سناتی ہو گی۔ میں تو اس کو فارسی پڑھاؤں گا پہلے اس کو خطاطی کی تعلیم دوں گا پھر خطِ شکستہ سکھاؤں گا۔ مستورات کو خطِ شکستہ نہیں آتا۔ میں تو اپنی بہو کو سکھا دوں گا —— بس گرو! پھر میں تیرے ہی پاس رہوں گا۔ میں اور میری بہو فارسی میں باتیں کریں گے۔ وہ بات بات پر بفرمائید بفرمائید کہے گی اور تو ؛ حمقوں کی طرح منہ دیکھا کرے گا" پھر وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے جھکتے خوب خوب کہتے۔ جانِ پدر جرا این قدر زحمت می کشی ...... خوب یاد دارم اور پتہ نہیں کیا کیا کچھ کہتے۔ بچارے داؤجی! چٹائی پر اپنی چھوٹی سی دُنیا بسا کر اس میں فارسی کے فرمان جاری کیے جاتے ——۔ ایک دن جب چھت پر دھوپ میں بیٹھے ہوئے وہ ایسی ہی دُنیا بسا چکے تھے تو مجھ سے کہنے لگے "جس طرح خدا نے تجھے ایک نیک سیرت بیوی اور مجھے سعادت مند بہو عطا کی ہے ویسے ہی وہ اپنے فضل سے میرے امی چند کو بھی دے۔

اس کے خیالات کچھ مجھے اچھے نہیں لگتے۔ یہ سوانگ یہ مسلم لیگ یہ بلکہ پارٹیاں مجھے پسند نہیں اور امی چند لاٹھی چلانا گتکا کھیلنا سیکھ رہا ہے۔ میری تو وہ کب مانے گا ہاں خدا کے بزرگ و برتر اس کو ایک نیک مومن سی بیوی دلا دے تو وہ اسے راہِ راست پر لے آئے گی۔

اس مومن کے لفظ پر مجھے بہت تکلیف ہوئی اور میں چپ سا ہو گیا۔ چپ محض اس لئے ہُوا تھا کہ اگر میں نے منہ کھولا تو یقیناً ایسی بات

نکلے گی جس سے دادی جی کو بڑا دکھ ہوگا —— میری اور امی چند کی تو خیر باتیں ہی تھیں، لیکن بارہ جنوری کو بی بی کی برات سچ مچ آگئی۔ جیجاجی رام پرتاب کے بارے میں دادی جی مجھے بہت کچھ بتا چکے تھے کہ وہ بہت اچھا لڑکا ہے اور اس شادی کے بارے میں انھوں نے جو استخارہ کیا تھا اس پر وہ پورا اُترا ہے۔ سب سے زیادہ خوشی دادی جی کو اس بات کی تھی کہ ان کے سمدھی فارسی کے اُستاد تھے اور کبیر پنتھی مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ بارہ تاریخ کی شام کو بی بی وداع ہونے لگی تو گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ بے بے زار و قطار رو رہی ہے، امی چند آنسو بہا رہا ہے۔ اور محلے کی عورتیں پھس پھس کر رہی ہیں۔ میں دیوار کے ساتھ لگا کھڑا ہوں اور دادی جی میرے کندھے پہ ہاتھ رکھے کھڑے ہیں اور بار بار کہہ رہے ہیں آج زمین کچھ میرے پاؤں نہیں پکڑتی۔ میں تو اذن قائم نہیں رکھ سکتا۔ جیجاجی کے باپ بولے "منشی جی اب ہمیں اجازت دیجئے" تو بی بی پچھاڑ کھا کر گر پڑی۔ اسے چارپائی پہ ڈالا، عورتیں ہوا کرنے لگیں اور دادی جی میرا سہارا لے کر اس کی چارپائی کی طرف چلے۔ انھوں نے بی بی کو کندھے سے پکڑ کر اُٹھایا اور کہا "یہ کیا ہوا بٹیا۔ اُٹھو! یہ تو تمھاری نئی اور خود مختار زندگی کی پہلی گھڑی ہے اسے یوں منحوس نہ بناؤ" بی بی اسی طرح دھاڑیں مارتے ہوئے دادی جی سے لپٹ گئی۔ انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "قرۃ العین میں تیرا گنہگار ہوں کہ تجھے پڑھا نہ سکا۔ تیرے سامنے شرمندہ ہوں کہ تجھے علم کا جہیز نہ دے سکا۔ تو مجھے معاف کر دے گی اور شاید بہ خوردار رام پرتاب بھی۔ لیکن میں اپنے کو معاف نہ کر سکوں گا۔ میں خطا کار ہوں اور میرا مجرم ضمیر میرے سامنے کھڑا ہے" یہ سُن کر بی بی اور بھی زور زور سے رونے لگی اور دادی جی کی آنکھوں سے گنتے سالے موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے ٹوٹ کر زمین پہ گرے۔ ان کے سمدھی نے آگے بڑھ کر کہا "منشی جی آپ فکر نہ کریں میں بیٹی کو کریما پڑھا دوں گا" دادی جی ادھر پلٹے اور ہاتھ جوڑ کر بولے "کریما تو یہ پڑھ چکی ہے، گلستاں، بوستاں بھی ختم کرا چکا ہوں، لیکن میری حسرت پوری نہیں ہوئی" اس پر وہ ہنس کر بولے "ساری گلستاں تو میں نے بھی نہیں پڑھی، جہاں عربی آتی تھی آگے گذر جاتا تھا" —— دادی جی اسی طرح ہاتھ جوڑے کتنی دیر خاموش کھڑے رہے، بی بی نے گوٹہ لگی سُرخ رنگ کی ریشمی چادر سے ہاتھ نکال کر پہلے امی چند اور پھر میرے سر پہ ہاتھ پھیرا اور سکھیوں کے بازوؤں میں ڈیوڑھی کی طرف چلدی۔ دادی جی میرا سہارا لے کر چلے تو انھوں نے مجھے اپنے ساتھ زور سے بھینچ کر کہا۔ تو یہ بھی لا رہا ہے۔ دیکھو یہ ہمارا سہارا بنا پھرتا ہے۔ او گولو۔ . . . او مردم دیدہ . . . . تجھے کیا ہو گیا . . . . جانِ پدر تو کیوں . . . ۔"

اس پہ ان کا گلا رندھ گیا اور میرے آنسو بھی تیز ہو گئے۔ برات والے تانگوں اور راتھوں پر سوار تھے۔ بی بی رتھ میں جا رہی تھی اور اس کے پیچھے امی چند اور میں اور ہمارے درمیان دادی جی پیدل چل رہے تھے۔ اگر بی بی کی چیخ ذرا زور سے نکل جاتی تو دادی جی آگے بڑھ کر رتھ کا پردہ اُٹھاتے اور کہتے "لاحول پڑھو بٹیا لاحول پڑھو"

اور خود آنکھوں پہ رکھے رکھے ان کی پگڑی کا شملہ بھیگ گیا تھا!

رانو ہمارے محلے کا بڑا ہی کثیف سا انسان تھا، بدی اور کینہ پروری اس کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ باڑہ جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ اسی کا تھا اس میں بیس تیس بکریاں اور گائیں تھیں جن کا دودھ صبح و شام رانو گلی کے نکلی میدان میں بیٹھ کر بیچا کرتا تھا۔ تقریباً سارے محلے والے اسی سے دودھ لیتے تھے اور اس کی شرارتوں کی وجہ سے دبتے بھی تھے۔ ہمارے گھر کے آگے سے گزرتے ہوئے وہ یونہی شوقیہ لاٹھی زمین پہ بجا کر دادی جی کو "پنڈتا جے رام جی کی" کہہ کر سلام کیا کرتا۔ دادی جی نے اسے کئی مرتبہ سمجھایا بھی کہ وہ پنڈت نہیں ہیں معمولی آدمی ہیں۔ کیونکہ پنڈت ان کے نزدیک بڑے پڑھے لکھے اور فاضل آدمی کو کہا جا سکتا تھا۔ لیکن رانو نہیں مانتا تھا وہ اپنی مونچھ کو چبا کر کہتا "اے بھئی جس کے سر پہ بودی (چٹیا) ہو وہی پنڈت ہوتا ہے"۔ —— چودھری یاروں سے اس کی آشنائی تھی شام کو اس کے باڑے میں جُوا بھی ہوتا اور گندی اور فحش بولیوں کا مشاعرہ۔ بی بی کے جانے کے ایک دن بعد جب میں اس سے دودھ لینے گیا تو اس نے شرارت سے آنکھ میچ کر کہا "مورنی تو چلی گئی باپو اب تو اس گھر میں رہ کر کیا سلے گا" میں چپ رہا تو اس نے جھاگ والے دودھ میں ڈبہ پھیرتے ہوئے کہا "گھر میں گنگا بہتی تھی سچ بتا کہ غوطہ

لگایا کہ نہیں"۔ مجھے اس بات پر غصہ آگیا اور میں نے تالوٹ گھما کر اس کے سر پہ دے مارا۔ اس ضربِ شدید سے خون وغیرہ تو برآمد نہ ہُوا۔ لیکن وہ چکرا کر تخت پہ گر پڑا اور میں گھر بھاگ گیا۔ داؤجی کو سارا واقعہ سُنا کر میں سیدھا اپنے گھر گیا اور اباجی سے ساری حکایت بیان کی۔ ان کی بدولت رانو کی تھانہ میں طلبی ہوئی اور حوالدار صاحب نے ہلکی سی گوشمالی کے بعد اسے سخت تنبیہ کر کے چھوڑ دیا۔ اس دن کے بعد سے رانو داؤجی پہ آتے جاتے طرح طرح کے فقرے کسنے لگا۔ وہ سب سے زیادہ مذاق ان کی بودی کا اُڑایا کرتا تھا۔ اور واقعی داؤجی کے فاضل سر پر وہ چھوٹی سی بودی ذرا بھی اچھی نہ لگتی تھی۔ مگر وہ کہتے تھے "یہ میری مرحوم ماں کی نشانی ہے اور مجھے اپنی زندگی کی طرح عزیز ہے۔ وہ اپنی آغوش میں میرا سر رکھ کر اسے دہی سے دھوتی تھی اور کڑوا تیل لگا کر چمکا دیتی تھی گو میں نے حضرت مولانا کے سامنے کبھی بھی پگڑی اُتارنے کی جسارت نہیں کی، لیکن وہ جانتے تھے اور جب میں دیال سنگھ میموریل ہائی سکول سے ایک سال کی ملازمت کے بعد چھٹیوں میں گاؤں آیا تو حضور نے پوچھا "شہر جا کر چوٹی تو نہیں کٹوا دی؟" تو میں نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا "تم سا سعادت مند بیٹا کم ماؤں کو نصیب ہوتا ہے۔ اور ہم سا خوش قسمت اُستاد بھی خال خال ہوگا۔ جسے تم جیسے شاگردوں کو پڑھانے کا فخر حاصل ہُوا ہو۔" میں نے ان کے پاؤں چھو کر کہا "حضور آپ مجھے شرمندہ کرتے ہیں یہ سب آپ کے قدموں کی برکت ہے۔" ہنس کر فرمانے لگے "چنت رام ہمارے پاؤں نہ چھوا کرو بھلا ایسے لمس سے کیا فائدہ جس کا ہمیں احساس نہ ہو۔" میری آنکھوں میں آنسو آگئے میں نے کہا "اگر کوئی مجھے بتا دے تو سمندر پھاڑ کر بھی آپ کے لئے دوائی نکال لاؤں۔ اپنی زندگی کی حرارت حضور کی ٹانگوں کے لئے نذر کر دوں لیکن میرا بس نہیں چلتا ——" خاموش ہو گئے اور نگاہیں اُوپر اُٹھا کر بولے "خدا کو یہی منظور ہے تو ایسے ہی سہی۔ تم سلامت رہو کہ تمہارے کندھوں پر میں نے کوئی دس سال بعد سارا گاؤں دیکھ لیا ہے" —— داؤجی گذرے ایام کی تہوں میں اُترتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"میں صبح سویرے حویلی کی ڈیوڑھی میں جا کر آواز دیتا "خادم آگیا" "مستورات ایک طرف ہو جائیں" تو حضور صحن سے آواز دے کر مجھے بلاتے اور میں اپنی قسمت کو سراہتا ہاتھ جوڑے جوڑے ان کی طرف بڑھتا۔ پاؤں چھوتا اور پھر حکم کا انتظار کرنے لگتا، وہ دعا دیتے میرے والدین کی خیریت پوچھتے گاؤں کا حال دریافت فرماتے اور پھر کہتے "لو بھئی چنت رام ان گناہوں کی گٹھڑی کو اُٹھا لو"، میں سید گل کی طرح انہیں اُٹھاتا اور کمر پہ لاد کر حویلی سے باہر آجاتا۔ کبھی فرماتے ہمیں باغ کا چکر دو کبھی حکم ہوتا مسجد سے رہٹ کے پاس لے چلو اور کبھی کبھار بڑی نرمی سے کہتے چنت رام تھک نہ جاؤ تو ہمیں مسجد تک لے چلو۔ میں نے کئی بار عرض کیا کہ حضور ہر روز مسجد لے جایا کروں گا مگر نہیں مانے یہی فرماتے رہے کہ جب جی چاہتا ہے تم سے کہہ دیتا ہوں۔ میں وضو کرنے والے چبوترے پر بٹھا کر ان کے ہلکے ہلکے جوتے اُتارتا اور انہیں جھولی میں رکھ کر دیوار سے لگ کر بیٹھ جاتا۔ چبوترے سے حضور خود گھسٹ کر صف کی جانب جاتے تھے۔ میں نے صرف ایک مرتبہ انہیں اس طرح جاتے دیکھا تھا اس کے بعد جرأت نہ ہوئی۔ ان کے جوتے اُتارنے کے بعد دامن میں منہ چھپا لیتا اور پھر اسی وقت سر اُٹھاتا جب وہ میرا نام لے کر یاد فرماتے۔ واپسی پر میں قصبے کی لمبی لمبی گلیوں کا چکر کاٹ کر حویلی کو لوٹتا۔ تو فرماتے ہم جانتے ہیں چنت رام تم ہماری خوشنودی کے لئے قصبہ کی سیر کراتے ہو لیکن ہمیں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ ایک تو تم پر لدا لدا پھرتا ہوں دوسرے تمہارا وقت ضائع کرتا ہوں۔ اور حضور سے کون کہہ سکتا کہ آقا یہ وقت ہی میری زندگی کا نقطۂ عروج ہے۔ اور یہ تکلیف ہی میری حیات کا مرکز ہے۔ آپ تو فرماتے تھے کہ لدا لدا پھرتا ہوں، اور مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ ایک ہما ہے جس نے اپنا سایہ محض میرے لئے وقف کر دیا ہے —— جس دن میں نے سکندر نامہ زبانی یاد کر کے انہیں سُنایا۔ اس قدر خوش ہو گئے گویا ہفت اقلیم کی بادشاہی نصیب ہوگئی۔ دین و دُنیا کی ہر دعا سے مجھے مالا مال کیا۔ دستِ شفقت میرے سر پر پھیرا اور جیب سے ایک روپیہ نکال کر انعام دیا۔ میں نے اسے حجرِ اسود جان کر بوسہ دیا، آنکھوں سے لگایا اور سکندر کا افسر سمجھ کر پگڑی میں رکھ لیا۔ دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا کر دعائیں دے رہے تھے اور فرما رہے تھے جو کام ہم سے نہ ہو سکا وہ تُو نے کر دکھایا۔ تو نیک ہے خدا نے تجھے یہ سعادت نصیب کی۔ چنت رام تیرا موسیٰ چولا

کا پیشہ ہے تو شاہِ بطحا کا پیرو ہے اس لئے خدائے عزّ و جل تجھے برکت دیتا ہے وہ تجھے اور بھی برکت دے گا تجھے اور کشائش میسر آئے گی۔

داؤجی یہ باتیں کرتے کرتے گھٹنوں پر سر رکھ کر خاموش ہو گئے۔

میرا امتحان قریب آ رہا تھا اور داؤجی سخت ہوتے جا رہے تھے۔ انھوں نے میرے ہر فارغ وقت پر کوئی نہ کوئی کام پھیلا رکھا تھا۔ ایک مضمون سے عہدہ برآ ہوتا تھا تو دوسرے کی کتابیں نکال کر سر پر سوار ہو جاتے تھے۔ پانی پینے اٹھتا تو سایہ کی طرح ساتھ ساتھ چلے آتے اور نہیں تو تاریخ کے سن ہی پوچھتے جاتے۔ شام کے وقت سکول پہنچنے کا انھوں نے وطیرہ بنا لیا تھا۔ ایک دن میں سکول کے بڑے دروازے سے نکلنے کے بجائے بورڈنگ کی راہ کھسک گیا تو انھوں نے جماعت کے کمرے کے سامنے آ کر بیٹھنا شروع کر دیا۔ میں چڑچڑا اور ضدی ہونے کے علاوہ بد زبان بھی ہو گیا تھا۔ داؤجی کے نیچے گویا میرا تکیہ کلام بن گیا تھا اور کبھی کبھی جب ان کی یا ان کے سوالات کی منتی بڑھ جاتی تو میں انھیں کتے کمینے سے بھی نہ چوکتا۔ ناراض ہو جاتے تو بس اس قدر کہتے "دیکھ لے ڈومنی تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ تیری بیوی بیاہ کر لاؤں گا تو پہلے اسے یہی بتاؤں گا کہ جانِ پدر یہ تیرے بڈھے باپ کو کتا کہتا تھا" میری گالیوں کے بدلے وہ مجھے ڈومنی کہا کرتے تھے۔ اگر انھیں زیادہ دکھ ہوتا تو منہ چڑھی ڈومنی کہتے۔ اس سے زیادہ نہ انھیں غصہ آتا تھا نہ دکھ ہوتا تھا۔ مجھے میرے اصلی نام سے انھوں نے کبھی نہیں پکارا۔ میرے بڑے بھائی کا ذکر آتا تو بیٹا آفتاب، برخوردار آفتاب کہہ کر انھیں یاد کرتے تھے لیکن میرے ہر روز نئے نئے نام رکھتے تھے۔ جن میں گو تو انھیں بہت مرغوب تھا طنبورا دوسرے درجہ پر۔ مسٹر مجنوں اور اخفش اسکوائر ان سب کے بعد آتے تھے اور ڈومنی صرف غصہ کی حالت میں۔ کبھی کبھی میں ان کو بہت دق کرتا۔ وہ اپنی چٹائی پہ بیٹھے کچھ پڑھ رہے ہیں مجھے الجبرے کا ایک سوال دے رکھا ہے اور میں سامنے جہان کی ابجد کو ضرب دے دے کر تنگ آ چکا ہوں تو میں کاپیوں اور کتابوں کے ڈھیر کو پاؤں سے پرے دھکیل کر اونچے اونچے گانے لگتا۔

تیرے سامنے بیٹھ کے رونا تے دکھ تینوں نیوں دسنا

داؤجی حیرانی سے میری طرف دیکھتے تو میں تالیاں بجانے لگتا اور قوالی شروع کر دیتا۔ نیوں نیوں نیوں دسنا۔ تے دکھ تینوں نیوں دسنا ـــــ دسنا دسنا دسنا دسنا . . . . تینوں تینوں تینوں تینوں۔ سارے گاما رونا رونا رونا سارے گاما رونا رونا ـــــ تے دکھ تینوں نیوں دسنا۔ وہ عینک کے اوپر سے مسکراتے۔ میرے پاس آ کر کاپی اٹھاتے صفحہ نکالتے اور میری تالیوں کے درمیان اپنا بڑا سا ہاتھ کھڑا کر دیتے۔

"سن بیٹا" وہ بڑی محبت سے کہتے "یہ کوئی مشکل سوال ہے!" جونہی وہ سوال سمجھانے کے لئے ہاتھ نیچے کرتے میں پھر تالیاں بجانے لگتا۔

"دیکھ بھئی میں تیرا داؤ نہیں ہوں؟" وہ بڑے مان سے پوچھتے۔

"نہیں" میں منہ پھاڑ کر کہتا۔

"تو اور کون ہے؟" وہ مایوس سے ہو جاتے۔

"وہ سچی سرکار" میں انگلی آسمان کی طرف کر کے شرارت سے کہتا "وہ سچی سرکار، وہ سب کا پالنے والا ـــــ بول بکرے سب کا والی کون؟"

وہ میرے پاس سے اٹھ کر جانے لگتے تو میں ان کی کمر میں ہاتھ ڈال دیتا "داؤجی خفا ہو گئے کیا؟"

وہ مسکرانے لگتے "چھوڑ طنبورے! چھوڑ بیٹا! میں تو پانی پینے جا رہا تھا ـــــ مجھے پانی تو پی آنے دے؟"

میں جھوٹ موٹ برا مان کر کہتا "لو جی جب مجھے سوال سمجھانا ہوا داؤجی کو پانی یاد آ گیا۔"

وہ آرام سے بیٹھ جاتے اور کاپی کھول کر کہتے "اخفش اسکوائر جب تجھے چار ایکس کا مربع نظر آ رہا تھا تو تو نے تیسرا فارمولا کیوں نہ لگایا اور اگر ایسا نہ بھی کرتا تو . . . . "

اور اس کے بعد پتہ نہیں داؤ جی کتنے دن پانی نہ پیتے۔

فروری کے دوسرے ہفتہ کی بات ہے۔ امتحان میں کل ڈیڑھ مہینہ رہ گیا تھا اور مجھ پہ آنے والے خطرناک وقت کا خوف بھوت بن کر سوار ہو گیا تھا۔ میں نے خود اپنی پڑھائی پہلے سے تیز کر دی تھی اور کافی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ لیکن جیومیٹری کے مسائل میری سمجھ میں نہ آتے تھے۔ داؤ جی نے بہت کوشش کی لیکن بات نہ بنی۔ آخر ایک دن انھوں نے کہا کل بادن پراپوزیشنیں ہیں زبانی یاد کر لے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ میں انھیں رٹنے میں مصروف ہو گیا۔ لیکن جو پراپوزیشن رات کو یاد کرتا صبح کو بھول جاتی۔ میں دل برداشتہ ہو کر ہمت چھوڑ سی بیٹھا۔ ایک رات داؤ جی مجھ سے جیومیٹری کی شکلیں بنوا کر اور مشقیں حل کرا اُٹھے تو وہ بھی کچھ پریشان سے ہو گئے تھے۔ میں بار بار اٹکتا تھا اور انھیں بہت کوفت ہوئی تھی۔ مجھے سونے کی تاکید کر کے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے تو میں کاپی پنسل لے کر پھر بیٹھ گیا اور رات کے ڈیڑھ بجے تک لکھ لکھ کر رٹا لگاتا رہا۔ مگر جب کتاب بند کر کے لکھنے لگتا تو چند فقروں کے بعد اٹک جاتا۔ مجھے داؤ جی کا مایوس چہرہ یاد کر کے اور اپنی حالت کا اندازہ کر کے رونا آ گیا، اور میں باہر صحن میں آ کر سیڑھیوں پر بیٹھ کے سچ مچ رونے لگا، گھٹنوں پر سر رکھے رو رہا تھا اور سردی کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ گذر گیا تو میں نے داؤ جی کی عزت بچانے کے لئے یہی ترکیب سوچی کہ ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر چپکے سے نکل جاؤں اور پھر واپس نہ آؤں۔ جب فیصلہ کر چکا اور عملی قدم آگے بڑھانے کے لئے سر اوپر اٹھایا تو داؤ جی کمبل اوڑھے میرے پاس کھڑے تھے۔ انھوں نے مجھے بڑے پیار سے اپنے ساتھ لگایا تو سسکیوں کا لامتناہی سلسلہ صحن میں پھیل گیا۔ داؤ جی نے میرا سر چوم کر کہا، "بے بُعتی طبعیئے میں تو یوں نہ سمجھتا تھا۔ تُو تو بہت ہی کم ہمت نکلا۔" پھر انھوں نے مجھے اپنے ساتھ کمبل میں لپیٹ لیا۔ اور بیٹھک میں لے آئے۔ بستر میں بٹھا کر انھوں نے میرے چاروں طرف رضائی لپیٹی اور خود پاؤں اوپر کر کے کرسی پہ بیٹھ گئے۔

انھوں نے کہا، "اقلیدس چیز ہی ایسی ہے۔ تو اس کے ہاتھوں یوں نالاں ہے میں اس سے اور طرح تنگ ہوا تھا حضرت مولانا کے پاس جبر و مقابلہ اور اقلیدس کی جس قدر کتابیں تھیں انھیں میں اچھی طرح پڑھ کر اپنی کاپیوں پہ اتار چکا تھا۔ کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے الجھن ہوتی۔ میں نے یہ جانا کہ ریاضی کا ماہر ہو گیا ہوں۔ لیکن ایک رات میں اپنی کھاٹ پر پڑا متساوی الساقین کے ایک مسئلہ پہ غور کر رہا تھا کہ بات الجھ گئی۔ میں نے دیا جلا کر شکل بنائی اور اس پہ غور کرنے لگا۔ جبر و مقابلہ کی رُو سے اس کا جواب ٹھیک آتا تھا۔ لیکن علم ہندسہ سے پایۂ ثبوت کو نہ پہنچتا تھا۔ میں ساری رات کاغذ سیاہ کرتا رہا لیکن تیری طرح سے رویا نہیں۔ علی الصبح میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے اپنے دستِ مبارک سے کاغذ پہ شکل کھینچ کر سمجھانا شروع کیا۔ لیکن جہاں مجھے الجھن ہوئی تھی وہیں حضرت مولانا کی طبع رسا کو بھی کوفت ہوئی۔ فرمانے لگے "میاں رحم اب ہم تم کو نہیں پڑھا سکتے۔ جب استاد اور شاگرد کا علم ایک سا ہو جائے تو شاگرد کو کسی اور معلم کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔" میں نے جرأت کر کے کہہ دیا کہ حضور اگر کوئی اور یہ جملہ کہتا تو میں اسے کفر کے مترادف سمجھتا۔ لیکن آپ کا ہر حرف اور ہر شوشہ میرے لئے حکم ربانی سے کم نہیں اس لئے خاموش ہوں بھلا آقائے غزنوی کے سامنے ایاز کی مجال! لیکن حضور مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔ فرمانے لگے تم بہجاد جذباتی آدمی ہو۔ بات تو سن لی ہوتی، میں نے سر جھکا کر کہا ارشاد! فرمایا۔ "دلی میں حکیم ناصر علی سیستانی علم ہندسہ کے بڑے ماہر ہیں اگر تم کو اس کا ایسا ہی شوق ہے تو ان کے پاس چلے جاؤ اور اکتساب علم کرو۔ ہم ان کے نام رقعہ لکھ دیں گے۔ میں نے رضامندی ظاہر کی تو فرمایا اپنی والدہ سے پوچھ لینا اگر وہ رضامند ہوں تو ہمارے پاس آنا ——— والدہ مرحومہ سے پوچھا اور ان سے اپنی مرضی کے مطابق جواب پانا ناممکن بات تھی۔ چنانچہ میں نے ان سے نہیں پوچھا۔ حضور پوچھتے تو میں دروغ بیانی سے کام لیتا کہ گھر کی لپائی تپائی کر رہا ہوں جب فارغ ہوں گا تو والدہ سے عرض کر دوں گا۔

چند ایام بڑے اضطرار کی حالت میں گذرے۔ میں دن رات اس شکل کو حل کرنے کی کوشش کرتا مگر صحیح جواب بر آمد نہ ہوتا۔ اس لاینحل مسئلہ

سے جمعیت میں اور انتشار پیدا ہوا۔ میں دِلّی جانا چاہتا تھا لیکن حضور سے اجازت مل سکتی تھی نہ رُقعہ، وہ والدہ کی رضامندی کے بغیر اجازت دینے والے نہ تھے۔ اور والدہ اس بڑھاپے میں کیسے آمادہ ہو سکتی تھیں ——— ایک رات جب سارا گاؤں سو رہا تھا اور میں تیری طرح پریشان تھا۔ تو میں نے اپنی والدہ کی پٹاری سے اس کی کُل پونجی دو روپے چُرائے اور نصف اس کے لئے چھوڑ کر گاؤں سے نکل گیا۔ خدا مجھے معاف کرے اور میرے دونوں بزرگوں کی روحوں کو مجھ پہ مہربان رکھے! واقعی میں نے بڑا گناہ کیا اور اب تک میرا سر ان دونوں کے مزاروں کے سامنے ندامت سے جھکا رہے گا ——— گاؤں سے نکل کر میں حضور کی حویلی کے پیچھے ان کے مسند کے پاس پہنچا جہاں بیٹھ کر آپ پڑھاتے تھے۔ گھٹنوں کے بل ہو کر میں نے زمین کو بوسہ دیا اور دل میں کہا "بد قسمت ہوں، بے اجازت جا رہا ہوں۔ لیکن آپ کی دعاؤں کا عمر بھر محتاج رہونگا۔ میرا قصور معاف نہ کیا تو آپ کے قدموں میں جان دے دونگا۔ اتنا کہہ کر اور لاٹھی کندھے پہ رکھ کر میں وہاں سے چل دیا ——— سُن رہا ہے؟

داؤ جی نے میری طرف غور سے دیکھ کر پوچھا۔

رضائی کے نیچے خارپشت بنے میں نے آنکھیں جھپکائیں اور ہولے سے کہا "جی؟"

داؤ جی نے پھر کہنا شروع کیا "قدرت نے میری کمال مدد کی۔ اُن دنوں جاکھل جنید براستہ حصار دوالی ریل کی پٹڑی بن رہی تھی۔ یہی سیدھا راستہ دِلّی کو جاتا تھا اور یہیں مزدوری ملتی تھی۔ ایک دن میں مزدوری کرتا اور دو دن چلتا، اس طرح تائیدِ غیبی کے سہارے سولہ دن میں دِلّی پہنچ گیا۔ منزلِ مقصود تو ہاتھ آ گئی تھی۔ لیکن گوہرِ مقصود کا سُراغ نہ ملتا تھا جس کسی سے پوچھتا حکیم ناصر علی سیستانی کا دولت خانہ کہاں ہے نفی میں جواب ملتا۔ دو دن ان کی تلاش جاری رہی لیکن پتہ نہ پا سکا۔ قسمت یاور تھی صحت اچھی تھی۔ انگریزوں کے لئے نئی کوٹھیاں بن رہی تھیں۔ وہاں کام پہ جانے لگا۔ شام کو فارغ ہو کر حکیم صاحب کا پتہ معلوم کرتا اور رات کے وقت ایک دھرم شالہ میں کھیس لپیٹ کر گہری نیند سو جاتا۔ مثل مشہور ہے جو ینده یابنده! آخر ایک دن مجھے حکیم صاحب کی جائے رہائش معلوم ہو گئی، وہ پتھر پھوڑوں کے محلہ کی ایک تیرہ و تاریک گلی میں رہتے تھے۔ شام کے وقت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں فروکش تھے۔ اور چند دوستوں سے اونچے اونچے گفتگو ہو رہی تھی۔ میں جوتے اتار کر دہلیز کے اندر کھڑا ہو گیا۔ ایک صاحب نے پوچھا "کون ہے؟" میں نے سلام کر کے کہا۔ "حکیم صاحب سے ملنا ہے"۔ حکیم صاحب دوستوں کے حلقہ میں سر جھکائے بیٹھے تھے اور ان کی پشت میری طرف تھی۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے بولے "اسمِ گرامی"۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا "پنجاب سے آیا ہوں اور . . . میں بات پوری بھی نہ کر پایا تھا کہ زور سے بولے "او ہو! چنت رام ہو؟" میں کچھ جواب نہ دے سکا فرمانے لگے "مجھے اسماعیل کا خط ملا ہے لکھتا ہے شاید چنت رام تمہارے پاس آئے۔ ہمیں بتائے بغیر گھر سے فرار ہو گیا ہے اس کی مدد کرنا۔ میں اسی طرح خاموش کھڑا رہا تو پاٹ دار آواز میں بولے "میاں اندر آ جاؤ کیا چُپ کا روزہ رکھا ہے؟" میں فوراً آگے بڑھا تو بھی میری طرف نہ دیکھا اور ویسے ہی عروسِ نو کی طرح بیٹھے رہے پھر قدرے تحکمانہ انداز میں کہا "برخوردار بیٹھ جاؤ" میں وہیں بیٹھ گیا تو اپنے دوستوں سے فرمایا، "بھئی ذرا ٹھہرو مجھے اس سے دو دو ہاتھ کر لینے دو۔ پھر حکم ہوا بتاؤ ہندسہ کا کونسا مسئلہ تمھاری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا تو انھوں نے اسی طرح کندھوں کی طرف اپنے ہاتھ بڑھائے اور آہستہ آہستہ کُرتہ یوں اُوپر کھینچ لیا کہ ان کی کمر ننگی ہو گئی۔ پھر فرمایا "بناؤ اپنی اُنگلی سے میری کمر پہ ایک متساوی الساقین۔ مجھ پہ سکتہ کا عالم طاری تھا۔ نہ آگے بڑھنے کی ہمت تھی نہ پیچھے ہٹنے کی طاقت۔ ایک لمحہ کے بعد بولے، "میاں جلدی کرو۔ نابینا ہوں۔ کاغذ قلم کچھ نہیں سمجھتا۔ میں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور ان کی چوڑی چکلی کمر پہ کانپتی ہوئی اُنگلی سے متساوی الساقین بنانے لگا۔ جب وہ غیر مرئی شکل بن چکی تو بولے اب اس نقطہ س سے خط ا ب ج پہ عمود گراؤ۔ ایک تو میں گھبرایا ہوا تھا دوسرے وہاں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ یونہی اٹکل سے میں نے ایک مقام پہ اُنگلی رکھ کر عمود گرانا چاہا۔ تو تیزی سے بولے

ہے ہے کیا کرتے ہو یہ نقطہ مس ہے کیا ؟ پھر خود ہی بولے آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤ گے ۔ بائیں کندھے سے کوئی چھ انگل نیچے نقطہ مس ہے وہاں خط کھینچو ——— اللہ اکبر اللہ اکبر کیا علم تھا۔ کیا آواز تھی اور کیسی تیز فہم تھی۔ وہ بول رہے تھے اور میں مبہوت بیٹھا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ ابھی ان کے آخری جملے کے ساتھ نور کی لکیریں متساوی الساقین بن کر ان کی کمر پہ اُبھر آئیں گی ۔" پھر داؤجی بتی کے دھوئیں میں ڈوب گئے۔ ان کی آنکھیں کھلی تھیں وہ میری طرف دیکھ رہے تھے۔ لیکن مجھے نہیں دیکھ رہے تھے۔ میں نے بے چین ہو کر پوچھا " پھر کیا ہوا داؤجی ؟" انھوں نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا " رات بہت گذر چکی ہے اب تو سو جا پھر بتاؤں گا" میں ضدی بچے کی طرح ان کے پیچھے پڑ گیا تو انھوں نے کہا " پہلے وعدہ کر کہ آئندہ مایوس نہیں ہو گا اور ان چھوٹی چھوٹی پہاپوزیشنوں کو پتاشے سمجھے گا" میں نے جواب دیا " حلوا سمجھوں گا آپ فکر نہ کریں " انھوں نے کھڑے کھڑے کمبل لپیٹتے ہوئے کہا " بس مختصر یہ کہ میں ایک سال حکیم صاحب کی حضوری میں رہا اور اس بحرِ علم سے چند قطرے حاصل کر کے اپنی کورا آنکھوں کو دھویا۔ واپسی پہ میں سیدھا اپنے آقا کی خدمت میں پہنچا اور ان کے قدموں پہ سر رکھ دیا۔ فرمانے لگے جنت دام اگر ہم میں قوت ہو تو ان پاؤں کو کھینچ لیں۔ اس پہ میں رو دیا تو دستِ مبارک محبت سے میرے سر پہ پھیر کر کہنے لگے ، ہم تم سے ناراض نہیں ہیں لیکن ایک سال کی فرقت بہت طویل ہے۔ آئندہ کہیں جانا تو ہمیں بھی ساتھ لے جانا، یہ کہتے ہوئے داؤجی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ مجھے اسی طرح گم سُم چھوڑ کر بیٹھک سے باہر نکل گئے ۔

امتحان کی قربت سے میرا خون خشک ہو رہا تھا لیکن جسم پھول رہا تھا۔ داؤجی کو میرے موٹاپے کی فکر رہنے لگی ۔ اکثر میرے بتس تھتنے ہاتھ لگا کر کہتے، اسپ تازی بن طویلہ خر نہ بن سمجھے۔ ان کا یہ فقرہ بہت ناگوار گذرتا اور میں احتجاجاً ان سے کلام بند کر دیتا۔ میرے مسلسل مون برت نے بھی ان پہ کوئی اثر نہ کیا اور ان کی فکر اندیشہ کی حد تک پہنچ گئی۔ ایک صبح سیر کو جانے سے پہلے انھوں نے مجھے آ جگایا اور میری منتوں، خوشامدوں، گالیوں اور جھڑکیوں کے باوجود بستر سے اُٹھا کوٹ پہنا کر کھڑا کر دیا۔ پھر وہ مجھے بازو سے پکڑ کر گویا گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ سردیوں کی صبح کوئی چار کا عمل ۔ گلی میں نہ آدم نہ آدم زاد، تاریکی سے کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا اور داؤجی مجھے اسی طرح سیر کو لے جا رہے تھے۔ میں کچھ بک رہا تھا اور وہ کہہ رہے تھے ابھی گراں خوابی دور نہیں ہوئی ابھی طلبوہ اٹھ پڑا رہا ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد کہتے کوئی سر نکال طنبورے کسی آہنگ پہ بج یہ کیا کر رہا ہے ! جب ہم بستی سے دور نکل گئے اور صبح کی یخ ہوا نے میری آنکھوں کو زبردستی کھول دیا تو داؤجی نے میرا بازو چھوڑ دیا۔ سرداروں کا رہٹ آیا اور نکل گیا: ندی آئی اور پیچھے رہ گئی ، قبرستان گذر گیا مگر داؤجی تھے کہ کچھ آیتیں سی پڑھتے چلے جا رہے تھے جب تھبہ پر پہنچے تو میری روح فنا ہو گئی۔ یہاں سے لوگ دوپہر کے وقت بھی نہ گذرتے تھے کیونکہ پرانے زمانے میں یہاں ایک شہر غرق ہوا تھا۔ مرنے والوں کی روحیں اسی ٹیلے پر رہتی تھیں۔ اور آنے جانے والوں کا کلیجہ چبا جاتی تھیں۔ میں خوف سے کانپنے لگا تو داؤجی نے میرے گلے کے گرد مفلر اچھی طرح لپیٹ کر کہا۔

سامنے ان دو کیکروں کے درمیان اپنی پوری رفتار سے دس چکر لگاؤ، پھر سو لمبی سانسیں کھینچ اور چھوڑ دو ، تب میرے پاس آؤ۔ میں یہاں بیٹھتا ہوں۔ میں تھبہ سے جان بچانے کے لئے سیدھا ان کیکروں کی طرف روانہ ہو گیا۔ پہلے ایک بڑے سے ڈھیلے پہ بیٹھ کر آرام کیا اور ساتھ ہی حساب لگایا کہ چھ چکروں کا وقت گزر چکا ہو گا ، اس کے بعد آہستہ آہستہ اونٹ کی طرح کیکروں کے درمیان دوڑنے لگا اور جب دس یعنی چار چکر پورے ہو گئے تو پھر اسی ڈھیلے پہ بیٹھ کر لمبی لمبی سانسیں کھینچنے لگا۔ ایک تو درختوں پر عجیب و غریب قسم کے جانور بولنے لگے تھے دوسرے بھری پسلی میں بلا کا درد شروع ہو گیا تھا۔ یہی مناسب سمجھا کہ تھبہ پر جا کر داؤجی کو سوئے ہوئے اُٹھاؤں اور گھر لے جا کر خوب خاطر کروں: غصہ سے بھرا اور دہشت سے لرزتا میں ٹیلے کے پاس پہنچا ۔ داؤجی تھبہ کی ٹھیکریوں پر گھٹنوں کے بل گرے ہوئے دیوانوں کی طرح سر مار رہے تھے اور اونچے اونچے اپنا محبوب شعر گا رہے تھے ...

جفا کم کن کہ فردا روزِ محشر
بہ پیشِ عاشقاں شرمندہ باشی!

کبھی دونوں ہتھیلیاں زور سے زمین پر مارتے اور سر اوپر اُٹھا کر انگشتِ شہادت فضا میں یوں ہلاتے جیسے کوئی ان کے سامنے کھڑا ہو اور اس سے کہہ رہے ہوں دیکھ لو، سوچ لو، میں تمھیں ...... میں تمھیں بتا رہا ہوں ... سُنا رہا ہوں ... ایک دھمکی دیئے جاتے تھے پھر تڑپ کر ٹھیکریوں پر گرتے اور "جفا کم کن جفا کم کن" کہتے ہوئے رونے سے لگتے۔ تھوڑی دیر میں ساکت و جامد وہاں کھڑا رہا اور پھر زور سے چیخ مار کر بجائے قصبہ کی طرف بھاگنے کے پھر کیکروں کی طرف دوڑ گیا۔ داؤجی ضرور اسمِ اعظم جانتے تھے اور وہ جن قابو کر رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک جن ان کے سامنے کھڑا دیکھا تھا۔ بالکل الف لیلہ بالتصویر والا جن تھا۔ جب داؤجی کا طلسم اس پر نہ چل سکا تو اس نے انھیں نیچے گرا لیا تھا۔ وہ چیخ رہے تھے جفا کم کن مگر وہ چھوڑتا نہیں تھا۔ میں اسی ڈھیلے پر بیٹھ کر رونے لگا ——— تھوڑی دیر بعد داؤجی آئے انھوں نے پہلے جیسا چہرہ بنا کر کہا "چل طنبورے" اور میں ڈرتا ڈرتا ان کے پیچھے ہو لیا۔ راستہ میں انھوں نے گلے میں لٹکتی ہوئی کھلی پگڑی کے دونوں کونے ہاتھ میں پکڑ لئے اور جھوم جھوم کر گانے لگے۔

تیرے لے لے وال فر ہیا اڑیا جا!

اس جادوگر کے پیچھے چلتے ہوئے میں نے ان آنکھوں سے واقعی ان آنکھوں سے دیکھا کہ اس کا سر تبدیل ہو گیا اس کی لمبی لمبی زلفیں کندھوں پر جھولنے لگیں اور اس کا سارا وجود جٹا دھاری ہو گیا ——— اس کے بعد چاہے کوئی مجھے بوٹی بوٹی اڑا دیتا میں ان کے ساتھ سیر کو ہرگز نہ جاتا!

اس واقعہ کے چند ہی دن بعد کا قصہ ہے کہ ہمارے گھر میں مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلے اور اینٹوں کے ٹکڑے آ آ کر گرنے لگے۔ بے بے نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ بچوں والی کُتیا کی طرح داؤجی سے چمٹ گئی۔ سچ مچ ان سے لپٹ گئی اور انھیں دھکا دے کر زمین پر گرا دیا۔ وہ چلا رہی تھی "بڈھے ٹونگی یہ سب تیرے منتر ہیں۔ یہ سب تیری خارسی ہے۔ تیرا کالا علم ہے جو اُلٹا ہمارے سر پہ آ گیا ہے۔ تیرے پربت میرے گھر میں اینٹیں پھینکتے ہیں۔ اُجاڑ مانگتے ہیں۔ موت چاہتے ہیں۔" پھر وہ زور زور سے چیخنے لگی "میں مر گئی، میں جل گئی، لوگو اس بڈھے نے میرے امی چند کی جان لینے کا بندھ کیا ہے۔ مجھ پہ جادو کیا ہے، میرا انگ انگ توڑ دیا ہے،" امی چند تو داؤجی کو اپنی زندگی کی طرح عزیز تھا اور اس کی جان کے دشمن بھلا وہ کیونکر ہو سکتے تھے لیکن جنوں کی خشت باری انھیں کی وجہ سے عمل میں آئی تھی۔ جب میں نے بھی بے بے کی تائید کی تو داؤجی نے زندگی میں پہلی بار مجھے جھڑک کر کہا "تو احمق ہے اور تیری بے بے اُم الجاہلین ——— میری ایک سال کی تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ تو جنوں بھوتوں میں اعتقاد کرنے لگا۔ افسوس تو نے مجھے مایوس کر دیا، اے وائے کہ تو شعور کی بجائے عورتوں کے اعتقاد کا غلام نکلا۔ افسوس ——— صد افسوس" بے بے کو اسی طرح چلاتے اور داؤجی کو یوں کراہتے چھوڑ کر میں اوپر کوٹھے پر دھوپ میں جا بیٹھا ——— اسی دن شام کو جب میں اپنے گھر سے آدھا تو را ستے میں دانو نے اپنے مخصوص انداز میں آنکھ کانی کر کے پوچھا "سنا بابو تیرے کوئی اینٹ ڈھیلا تو نہیں لگا؟ سنا ہے تمھارے پنڈت کے گھر میں روڑے گرتے ہیں!"

میں نے اس کمینہ کے منہ لگنا پسند نہ کیا اور چپ چاپ ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ رات کے وقت داؤجی مجھ سے جیومیٹری کی پراپوزیشن سنتے ہوئے پوچھنے لگے "بیٹا کیا تم سچ مچ جن، بھوت یا پری چڑیل کو کوئی مخلوق سمجھتے ہو؟" میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ ہنس پڑے اور بولے "واقعی تو بہت بھولا ہے اور میں نے خواہ مخواہ جھڑک دیا۔ بھلا تو نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا کہ جن ہوتے ہیں اور اس طرح سے اینٹیں پھینک سکتے ہیں ہم نے جو دلی اور پہلے مزدور کو بلا کر برساتی بنوائی ہے وہ تیرے کسی جن کو کہہ کر بنوا لیتے۔ لیکن یہ تو بتا کہ جن صرف اینٹیں پھینکنے کا کام

ہی کرتے ہیں کہ جناتی بھی کر لیتے ہیں؟" میں نے جل کر کہا۔ "جتنے مذاق چاہو کر لو مگر جس دن سر پھٹے گا اس دن پتہ چلے گا داؤ" داؤجی نے کہا۔ "تیرے جن کی پھینکی ہوئی اینٹ سے تو تا قیامت سر نہیں پھٹ سکتا اس لئے کہ نہ وہ ہے نہ اس سے اینٹ اٹھائی جا سکے گی اور نہ میرے تیرے یا تیرے بے بے کے سر میں لگے گی۔"

پھر بولے "سن! علم طبعی کا موٹا اصول ہے کہ کوئی مادی شے کسی غیر مادی وجود سے حرکت میں نہیں لائی جا سکتی ——— سمجھ گیا؟"

"سمجھ گیا" میں نے چڑ کر کہا۔

ہمارے قصبہ میں ہائی سکول ضرور تھا۔ لیکن میٹرک کے امتحان کا سنٹر نہ تھا۔ امتحان دینے کے لئے ہمیں ضلع جانا ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ صبح آ گئی جب ہماری جماعت امتحان دینے کے لئے ضلع جا رہی تھی اور لاری کے ارد گرد والدین قسم کے لوگوں کا ہجوم جمع تھا۔ اور اس ہجوم سے داؤجی کیسے پیچھے رہ سکتے تھے۔ اور سب لڑکوں کے گھر والے انہیں خیر و برکت کی دعاؤں سے نواز رہے تھے۔ اور داؤجی سارے سال کی پڑھائی کا خلاصہ تیار کر کے جلدی جلدی سوال پوچھ رہے تھے اور میرے ساتھ ساتھ خود ہی جواب دیتے جاتے تھے۔ اکبر کی اصلاحات سے اچھل کر موسم کے تغیر و تبدل پر پہنچ جاتے وہاں سے پلٹتے تو "اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا کہ اپنی وضع سے ہندو معلوم ہوتا تھا۔ وہ نشہ میں چور تھا ایک صاحب جمال اس کا ہاتھ پکڑے لے آئی تھی اور جدھر چاہتی تھی پھراتی تھی" کہہ کر پوچھتے یہ کون تھا؟

"جہانگیر" میں نے جواب دیا۔ "اور وہ عورت" "نور جہاں" ہم دونوں ایک ساتھ بولے ——— "صفت مشبہ اور اسم فاعل میں فرق؟"

میں نے دونوں کی تعریفیں بیان کیں۔ بولے مثالیں؟ میں نے مثالیں دیں۔ سب لڑکے لاری میں بیٹھ گئے۔ اور میں ان سے جان چھڑا کر جلدی سے داخل ہوا۔ تو گھوم کر کھڑکی کے پاس آ گئے اور پوچھنے لگے۔ بریک اِن اور بریک اِن ٹو کو فقروں میں استعمال کرو۔ ان کا استعمال بھی ہو گیا اور موٹر سٹارٹ ہو چکی تو اس کے ساتھ قدم اٹھا کر بولے طنبورے ماد یاں گھوڑی ماکیاں مرغی . . . . ماد یاں گھوڑی . . . ماکیاں . . . . . مرغی ——— ایک سال بعد غدا خدا کر کے یہ آواز دور ہوئی اور میں نے آزادی کا سانس لیا۔!

پہلے دن تاریخ کا پرچہ بہت اچھا ہوا۔ دوسرے دن جغرافیہ کا اس سے بھی بڑھ کر تیسرے دن اتوار تھا اور اس کے بعد حساب کی باری تھی اتوار کی صبح کو داؤجی کا کوئی بیس صفحہ لمبا خط ملا جس میں الجبرے کے فارمولوں اور حساب کے قاعدوں کے علاوہ اور کوئی بات نہ تھی۔

حساب کا پرچہ کرنے کے بعد برآمدے میں میں نے لڑکوں سے جوابات ملائے تو سو میں سے اسّی نمبر کا پرچہ ٹھیک تھا۔ میں خوشی سے پاگل ہو گیا۔ زمین پر پاؤں نہ پڑتا تھا اور میرے منہ سے مسرت کے نعرے نکل رہے تھے۔ جونہی میں نے برآمدے سے پاؤں باہر رکھا داؤجی کھیس کندھے پر ڈالے ایک لڑکے کا پرچہ دیکھ رہے تھے۔ میں چیخ مار کر ان سے لپٹ گیا اور "اسّی نمبر! اسّی نمبر" کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ انہوں نے پرچہ میرے ہاتھ سے چھین کر تلخی سے پوچھا "کون سوال غلط ہو گیا؟" میں نے جھوم کر کہا "چار دیواری والا" جھلا کر بولے "تو نے کھڑکیاں اور دروازے منفی نہ کئے ہوں گے" میں نے ان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر بیر کی طرح جھلاتے ہوئے کہا "ہاں جی ہاں جی ——— کھڑکیاں مار و کھڑکیوں کو" داؤجی ڈوبی ہوئی آواز میں بولے "تو نے مجھے برباد کر دیا طنبورے سال کے تین سو پینسٹھ دن میں پکار پکار کر کہتا رہا سطحات کا سوال آنکھیں کھول کر حل کرنا مگر تو نے میری بات نہ مانی۔ تو نے میری بات نہ مانی۔ بیس نمبر ضائع گئے۔ پورے بیس نمبر۔"

اور داؤجی کا چہرہ دیکھ کر میری اسّی فیصدی کامیابی بیس فیصدی ناکامی کے نیچے یوں دب گئی گویا اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ راستہ بھر وہ اپنے آپ سے کہتے رہے "اگر ممتحن اچھے دل کا ہوا تو وہ ایک نمبر تو ضرور دے گا۔ تیرا باقی حل تو ٹھیک ہے" اس پرچے کے بعد داؤجی

امتحان کے آخری دن تک میرے ساتھ رہے وہ رات کے بارہ بجے تک مجھے اس سرائے میں بیٹھ کر پڑھاتے جہاں ہماری کلاس مقیم تھی اور اس کے بعد بقول ان کے اپنے ایک دوست کے ہاں چلے جاتے۔ صبح آٹھ بجے پھر آجاتے اور کمرہ امتحان تک میرے ساتھ چلتے۔

امتحان ختم ہوتے ہی میں نے داؤجی کو یوں چھوڑ دیا گویا میری ان سے جان پہچان ہی نہ تھی۔ سارا دن دوستوں یاروں کے ساتھ گھومتا اور شام کو ناولیں پڑھا کرتا۔ اس دوران میں اگر کبھی فرصت ملتی تو داؤجی کو سلام کرنے بھی چلا جاتا۔ وہ اس بات پر مصر تھے کہ میں ہر روز کم از کم ایک گھنٹہ ان کے ساتھ گزارا کروں تاکہ وہ مجھے کالج کی پڑھائی کے لئے بھی تیار کر دیں۔ لیکن میں ان کے پھندے میں آنے والا نہ تھا۔ مجھے کالج میں سو بار فیل ہونا گوارا تھا اور ہے لیکن داؤجی سے پڑھنا منظور نہیں۔ پڑھنے کو چھوڑیے ان سے باتیں کرنا بھی مشکل تھا۔ میں نے کچھ پوچھا انھوں نے کہا اس کا فارسی میں ترجمہ کرو۔ میں نے کچھ جواب دیا فرمایا اس کی ترکیب نحوی کرو۔ حوالداروں کی گائے اندر گھس آئی۔ میں اسے لکڑی سے باہر نکال رہا ہوں اور داؤجی پوچھ رہے ہیں cow ناؤن ہے یا ورب۔ اب ہر عقل کا اندھا پانچویں جماعت تک پڑھا جانتا ہے کہ گائے اسم ہے مگر داؤجی فرما رہے ہیں کہ اسم بھی ہے اور فعل بھی cow to cow کا مطلب ہے ڈرانا۔ دھمکی دینا۔ اور یہ ان دنوں کی باتیں ہیں جب میں امتحان سے فارغ ہو کر نتیجہ کا انتظار کر رہا تھا ——— پھر ایک وہ دن بھی آیا جب ہم چند دوست شکار کھیلنے کے لئے نکلے تو میں نے ان سے درخواست کی کہ منصفی کے آگے سے نہ جائیں۔ کیونکہ وہاں داؤجی ہوں گے اور مجھے روک کر شکار۔ بندوق اور کارتوسوں کے محاورے پوچھنے لگیں گے۔ بازار میں دکھائی دیتے تو میں کسی بغلی گلی میں گھس جاتا۔ گھر پر رسماً ملنے جاتا تو بے بے سے زیادہ اور داؤجی سے کم باتیں کرتا۔ اکثر کہا کرتے۔ افسوس آفتاب کی طرح تو بھی ہمیں فراموش کر رہا ہے میں شرارتاً خیلے خوب خیلے خوب کہہ کر ہنسنے لگتا۔

جس دن نتیجہ نکلا اور اباجی لڈوں کی چھوٹی سی ٹوکری لیکر ان کے گھر گئے۔ داؤجی سر جھکائے اپنے حصیر پر بیٹھے تھے۔ اباجی کو دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے اندر سے کرسی اٹھالائے اور اپنے بوریئے کے پاس ڈال کر بولے "ڈاکٹر صاحب آپ کے سامنے شرمندہ ہوں لیکن اسے بھی مقسوم کی خوبی سمجھئے، میرا خیال تھا کہ اس کی فرسٹ ڈویژن آجائے گی لیکن نہ آسکی۔ فنیا دکنز درنتی . . . . . ."

"ایک ہی تو نمبر کم ہے" میں نے چمک کر بات کاٹی۔"

اور وہ میری طرف دیکھ کر بولے "تو نہیں جانتا اس ایک نمبر سے میرا دل دونیم ہو گیا ہے خیر میں اسے منجانب اللہ خیال کرتا ہوں۔"

پھر اباجی اور وہ باتیں کرنے لگے اور میں بے بے کے ساتھ گییں لڑانے میں مشغول ہو گیا۔

اوّل اوّل کالج سے میں داؤجی کے خطوں کا باقاعدہ جواب دیتا رہا۔ اس کے بعد بے قاعدگی سے لکھنے لگا، اور آہستہ آہستہ یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا چھٹیوں میں جب گھر آتا تو جیسے سکول کے دیگر ماسٹروں سے ملتا ویسے ہی داؤجی کو بھی سلام کر آتا۔ اب وہ مجھ سے سوال وغیرہ نہ پوچھتے تھے۔ کوٹ۔ پتلون۔ اور ٹائی دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ چارپائی پر بیٹھنے نہ دیتے۔ اگر مجھے اٹھانے نہیں دیتا تو خود کرسی لے لے اور میں کرسی کھینچ کر ان کے پاس ڈٹ جاتا۔ کالج لائبریری سے میں جو کتابیں ساتھ لایا کرتا انہیں دیکھنے کی تمنا ضرور کرتے اور میرے وعدے کے باوجود اگلے دن خود ہمارے گھر آکر کتابیں دیکھ جاتے۔ اتنی جب بوجوہ کالج چھوڑ کر بنک میں ملازم ہو گیا تھا۔ اور دلی چلا گیا تھا۔ بے بے کی سلائی کا کام بدستور تھا۔ داؤجی منصفی جاتے تھے۔ لیکن کچھ نہ لاتے تھے۔ بھائی کے خط آتے تھے وہ اپنے گھر میں بہت خوش تھی ——— کالج کی ایک سال کی زندگی نے مجھے داؤجی سے بہت دور کھینچ لیا۔ وہ لڑکیاں جو دو سال پہلے ہمارے ساتھ ہوٹا لو کھیلا کرتی تھیں بنت عم بن گئی تھیں۔ سیکنڈ ایئر کے زمانے کی ہر چھٹی میں، میں آپٹا پوہیں گزارنے کی کوشش کرتا اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوتا۔ گھر کی مختصر مسافت کے سامنے ایبٹ آباد کا طویل سفر زیادہ تسکین دہ اور سہانا بن گیا۔

انھی ایام میں میں نے پہلی مرتبہ ایک خوبصورت گلابی پیڈ اور ایسے ہی لفافوں کا ایک پیکٹ خریدا تھا۔ او رمان پر نہ آپاجی کو خط لکھے جا سکتے تھے نہ ہی داؤجی کو۔ نہ دسہرے کی چھٹیوں میں داؤجی سے ملاقات ہو سکی۔ نہ کرسمس کی تعطیلات میں۔ ایسے ہی ایسٹر گذر گیا اور یوں ہی ایام گزرتے رہے۔ ۔ ۔ ملک کو آزادی ملنے لگی تو کچھ بلوے ہوئے پھر لڑائیاں شروع ہو گئیں، ہر طرف سے فسادات کی خبریں آنے لگیں اور اماں نے ہم سب کو گھر بلوا لیا۔ ہمارے لئے یہ جگہ بہت محفوظ تھی۔ بنئے ساہوکار گھر بار چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ لیکن دوسرے لوگ خاموش تھے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد مہاجرین کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور وہی لوگ یہ خبر لائے کہ آزادی مل گئی! ایک دن ہمارے قصبے میں بھی چند گھروں کو آگ لگی، اور دوناکوں پر سخت لڑائی ہوگی۔ تھانے والے اور ملٹری کے سپاہیوں نے کرفیو لگا دیا۔ اور جب کرفیو ختم ہوا تو سب ہندو سکھ قصبہ چھوڑ کر چل دیئے، دوپہر کو اماں نے مجھے داؤجی کی خبر لینے کو بھیجا تو اس جانی پہچانی گلی میں عجیب و غریب صورتیں نظر آئیں۔ ہمارے گھر یعنی داؤجی کے گھر کی ڈیوڑھی میں ایک بیل بندھا تھا اور اس کے پیچھے بوری کا پردہ لٹک رہا تھا۔ میں نے گھر آ کر بتایا کہ داؤجی اور بے بے اپنا گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور یہ کہتے ہوئے میرا گلا رندھ گیا۔ اس دن مجھے یوں لگا جیسے داؤجی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلے گئے ہیں اور اب لوٹ کر نہ آئیں گے۔ داؤجی ایسے بے وفا تھے اب۔۔۔

کوئی تیسرے روز غروبِ آفتاب کے بہت بعد جب میں مسجد میں نئے پناہ گزینوں کے نام نوٹ کر کے اور کمبل بھجوانے کا وعدہ کر کے اس گلی سے گذرا تو کھلے میدان میں سو دو سو آدمیوں کی بھیڑ جمع دیکھی۔ مہاجر لڑکے لاٹھیاں پکڑے نعرے لگا رہے تھے اور گالیاں دے رہے تھے۔ میں نے تماشائیوں کو پھاڑ کر مرکز میں گھسنے کی کوشش کی مگر مہاجرین کی خونخوار آنکھیں دیکھ کر سہم گیا۔ ایک لڑکا کسی بزرگ سے کہہ رہا تھا۔

" ساتھ کے گاؤں میں گیا ہوا تھا جب لوٹا تو اپنے گھر میں گھستا چلا گیا۔"

" کونسے گھر میں؟" بزرگ نے پوچھا۔

" رنگی مہاجروں کے گھر میں" لڑکے نے کہا۔

" پھر کیا انھوں نے پکڑ لیا۔ دیکھا تو ہندو نکلا!"

اتنے میں بھیڑ میں سے کسی نے چلا کر کہا " اوے رانو جلدی آ اوے جلدی آ ——— تیری سامی ——— پنڈت ——— تیری سامی"

رانو گبریوں کا رپوڑ باڑے کی طرف سے جا رہا تھا۔ انہیں روک کر اور ایک لاٹھی والے لڑکے کو ان کے آگے کھڑا کر کے وہ بھیڑ میں گھس گیا۔ میرے دل کو ایک دھکا سا لگا جیسے انھوں نے داؤجی کو پکڑ لیا ہو۔ میں نے ملازم کو دیکھے بغیر اپنے قریبی لوگوں سے کہا۔ یہ بڑا اچھا آدمی ہے بڑا نیک آدمی ہے ——— اسے کچھ مت کہو۔ ۔ ۔ یہ تو۔ ۔ ۔ یہ تو " خون میں نہائی ہوئی چند آنکھوں نے میری طرف دیکھا اور ایک نوجوان گنڈاسی تول کر بولا۔

" بتاؤں تجھے بھی ——— آگیا بڑا حمائتی بن کر ——— تیرے ساتھ کچھ ہوا نہیں نا " اور لوگوں نے گالیاں بک کر کہا " انصار ہوگا شاید "

میں ڈر کر دوسری جانب بھیڑ میں گھس گیا۔ رانو کی قیادت میں اس کے دوست داؤجی کو گھیرے کھڑے تھے اور رانو داؤجی کی ٹھوڑی پکڑ کر ہلا رہا تھا اور پوچھ رہا تھا " اب بول بیٹا اب بول " اور داؤجی خاموش کھڑے تھے، ایک لڑکے نے پگڑی اتار کر کہا " پہلے بودی کاٹ بودی " اور رانو نے مسواکیں کاٹنے والی درانتی سے داؤجی کی بودی کاٹ دی۔ وہی لڑکا پھر بولا " بلاؤ میں جے ؟ " اور رانو

نے کہا "جانے وہ بڈھا ہے میرے ساتھ بکریاں چرایا کرے گا" پھر اس نے داؤجی کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا "کلمہ پڑھ پنڈتا"
اور داؤجی آہستہ سے بولے۔

"کون ؟"

ماتو نے ان کے ننگے سر پر ایسا تھپڑ مارا کہ وہ گرتے گرتے بچے اور بولا "سالے کلمے بھی کوئی پانچ سات ہیں ؟"
جب وہ کلمہ پڑھ چکے تو ماتو نے اپنی لاٹھی ان کے ہاتھ میں تھما کر کہا "چل بکریاں تیری انتظاری کرتی ہیں"
اور ننگے سر داؤجی بکریوں کے پیچھے یوں چلے جیسے لمبے لمبے بالوں والا فریدا چل رہا ہو !

اے حمید

راون کے دیس میں

ہمارا اسٹیمر بڑی ہموار رفتار کے ساتھ لنکا کی طرف بڑھ رہا تھا۔

آسمان پر اکا دکا تارے نمودار ہونے لگے تھے اور سمندر کا گہرا سبز رنگ سیاہی مائل ہو رہا تھا۔ آبی پرندے ہمارا ساتھ چھوڑ کر ساحل کی جانب اڑ گئے تھے۔ مرطوب ہواؤں میں رچی ہوئی خنکی، ہمارے کپڑوں سے موم بن کر چپک رہی تھی۔ تقریباً اڑھائی گھنٹے کے پرسکون سمندری سفر کے بعد ہمیں دور ــــ لنکا کے ساحل پر روشنی کے مینار کی جلتی بجھتی بتی نظر آئی۔ امی اور چھوٹا بھائی بے تابی سے اس روشنی کو دیکھنے لگے جو جگنو کی مانند پل بھر چمک کر پھر بجھ جاتی تھی۔ ڈیک سے جنگلے کے ساتھ لگے کھڑے اور مسافر بھی اسے اشتیاق بھری نگاہوں سے تک رہے تھے جوں جوں ساحل قریب آ رہا تھا، کئی اور جگہوں پر بھی دھندلی دھندلی روشنیاں ابھرنے لگی تھیں۔

کھاڑی میں پہنچ کر سٹیمر نے دو تین بار وسل دیا اور ڈیک پر لگی ہوئی مشین گڑگڑاہٹ کے ساتھ لنگر پھینکنے لگی۔ گودی پر بالکل تیار کھڑے ادھ ننگے مزدوروں نے موٹے موٹے رسے ڈیک کی طرف اچھالے اور تھوڑی دیر کے بعد ہمارا سٹیمر بڑے آرام سے کنارے آن لگا۔

یہ لنکا کی شمال مشرقی بندرگاہ تالی مینار تھی۔

گودی پر ایک طرف کولمبو ایکسپریس تیار کھڑی تھی۔ کسٹم والوں سے بمشکل تمام چھٹکارا پانے کے بعد جب ہم گاڑی میں سوار ہو گئے تو بائیں طرف ناریل اور سپاری کے درختوں تلے چھوٹے چھوٹے چائے خانوں میں گراموفون ریکارڈ بجنے لگے۔

"ساون کے بادلو ــــ اور رل کے بچھڑ گئیں اکھیاں۔"

ہمارے چہرے حیرت اور مسرت کے ملے جلے احساسات سے چمکنے لگے۔ اپنے وطن کے گلی کوچوں میں سنے ہوئے گیتوں کی ایک ہی لے نے پرانے دیس کی [illegible] رنگ و مزا ڈال دیا اور ہمیں یوں معلوم ہونے لگا، گویا ہم کسی طویل سمندری سفر کے بعد اپنے وطن میں داخل ہو رہے ہوں [illegible] بس رک [illegible] رفتار [illegible] ساتھ جزیرہ منگلا [illegible] کے مہیب جنگلات اور تاریک غاروں میں سے گذرتی ہوئی علی الصبح جب آنکھ کھلی تو گاڑی ایک چھوٹے سے پہاڑی اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ میں نے کھڑکی کا پٹ نیچے گرا کر باہر دیکھا۔

آسمان بھورے بھورے بادلوں کے لطیف نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ بارش ابھی ابھی رُکی تھی اور پلیٹ فارم پر بچھی ہوئی سُرخ بجری دُھل کر چمک رہی تھی۔ بانس اور صنوبر کے نوکیلے پتے نکھر کر گہرے سبز ہو گئے تھے اور فضا میں ان کی سوندھی سوندھی مرطوب مہک بسی ہوئی تھی سیلونی لڑکیاں، سفید ململ کے باریک کُرتوں پر خوب کس کر دھوتیاں باندھے، ننگے پاؤں، بالوں کے جُوڑوں میں رنگ برنگے پھولوں کے گچھے لگائے، پان، سگرٹ، سگار اور اناناس کے قتلے بیچ رہی تھیں۔ ان کے رنگ زیادہ تر زرد، قد چھوٹے اور جسم گٹھے ہوئے مضبوط اور صحت مند تھے۔

ایک لڑکی اناناس کے قتلے لے کر میری کھڑکی کے قریب آئی۔

"پائن ایپل سر — ویری سویٹ سر — فائیو سینٹ سر"

اس کا جسم بھی ایک چھوٹا سا پائن ایپل تھا، لیکن ابھی ویری سویٹ نہیں تھا، اس کی رنگت زرد زرد سنہری مائل تھی اور وہ ابھی پوری طرح پکا نہیں تھا۔ اس نے ابھی سورج کی کرنوں سے رس، پُرسکون ٹھنڈی راتوں سے مٹھاس اور نیلگوں چاندنی سے رنگ حاصل کرنا تھا۔

میں نے ایک قتلہ لے کر پانچ سینٹ ادا کر دیئے۔ سینٹ اپنی انگیا میں چھپا کر وہ جلدی سے دوسرے ڈبے کی طرف مُڑ گئی۔ یہ کام اس نے اتنی تیزی سے کیا کہ میں بالکل اندازہ نہ لگا سکا کہ پائن ایپل کتنا پک چکا ہے؟

گاڑی اس مضافاتی اسٹیشن سے چلی تو ایک دم بارش شروع ہو گئی اور دور دور تک سرسبز پہاڑیوں کی غیر ہموار چوٹیاں دھندلا گئیں، نچان کی وادیوں میں جہاں بانس کے گنجان جنگل کھڑے تھے، بارش کی دھواں دھار چادر سی تن گئی۔ گاڑی کی رفتار کافی تیز تھی اور وہ پے در پے معمولی اسٹیشن چھوڑتے جا رہی تھی۔ ہر بند پھاٹک پر ہمیں ناریلوں سے لدی ہوئی بیل گاڑیاں، نیم برہنہ عورتیں اور مرد، کیلوں کے گچھے یا پانوں کی ٹوکریاں اُٹھائے نظر آتے۔ ایک جگہ ایک زرد اور نیلے رنگ کی بس دکھائی دی، جس کی پیشانی پر انگریزی الفاظ میں کولمبو لکھا تھا، اور ہم سامان وغیرہ درست کرنے لگے، کولمبو قریب آ رہا تھا اور دائیں بائیں چھوٹی چھوٹی جھیلوں میں کھلے ہوئے کنول کے پھولوں اور بانس کے جنگلات کا قدرتی سلسلہ ختم ہو رہا تھا۔ ایک پتلی سی کالی چمکدار سڑک، ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ نمودار ہو گئی تھی اور کہیں کہیں کوٹھی نما پکے مکانات بھی دکھائی دینے لگے تھے۔ جب کولمبو کا پہلا بڑا جنکشن "مرادانہ" آیا تو گاڑی تقریباً آدھی خالی ہو گئی۔ یہاں بھائی جان اور صدیقی صاحب مل گئے۔ ہمیں تین میل پرے دوسرے بڑے جنکشن "فورٹ" اُترنا تھا۔ یہ لوگ ہمارے ڈبے میں گھس آئے۔ بھائی جان نے صدیقی صاحب سے میرا تعارف کرایا جو طرڈی ریڈیو پر اُن کے مددگار اناؤنسر تھے۔

فورٹ پر ہم لوگ بھی اُتر پڑے۔

گھر پہنچ کر تازہ دم ہونے کے بعد جب ہم صحن میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے تو میں نے دیکھا کہ برسات کی مرطوب ہوا میں ہمارے سامنے والی کوٹھی کے عقب میں ناریل اور پام کے چھریرے درخت سہمے ہوئے جھوم رہے ہیں اور ایک طرف دیوار پر چڑھی ہوئی گنجان بیل میں سُرخ سُرخ پھول روشن ہیں، ہمارے سروں پر کیلے کے درختوں کے جھاڑ ہیں قرمزی بور لٹک رہے تھے اور میرے پاس ہی بیٹھے ہوئے صدیقی صاحب کے بالوں میں سے بار بار ڈیسے ہیر کریم کی مدھم خوشبو اُٹھ رہی تھی۔

دوسرے روز صدیقی صاحب ماؤنٹ لیونیا لے گئے۔ اس مقام تک ریل سمندر کے کنارے کنارے چلی گئی ہے۔ ہم سہ پہر تک وہاں رہے شام کی چائے ہم نے صنوبر کے درختوں میں گھرے ہوئے لیونیا ہوٹل میں پی اور پھر کنارے والی گیلی ریت پر سگریٹ سلگائے گھومتے رہے۔ ہوا چل رہی تھی۔ اور اس پر مچھلیوں کی بُو تھی، جیسے وہ سمندر کی سطح پر منہ نکالے لمبے لمبے سانس لے رہی ہوں، تیز رفتار لہریں ساحل پر جا بجا بکھری ہوئی بھوسلے رنگ کی چھوٹی چھوٹی چٹانوں تک آتیں اور ان کے گرد حلقے کی صورت میں گھوم کر، جھاگ اُڑاتی، واپس چلی جاتیں۔

لیونیا کلب کے باہر دو تین انگریز عورتیں نہا رہی تھیں، لکھی ہوئی دھوپ میں ان کے گیلے اور سُرخ و سفید جسم چمک رہے تھے۔ ناریل کے لمبے لمبے، جھومتے ہوئے درختوں کی بے ڈھنگی قطاریں کنارے کنارے دُور تک چلی گئی تھیں۔ ان درختوں تلے سیلونی عورتیں، مدراسی عورتیں، اینگلو انڈین عورتیں، خوبصورت اور بدصورت عورتیں، اپنے مردوں، غیر مردوں، پچکے ہوئے گالوں اور سوکھی ہوئی ٹانگوں والے مردوں کے بازوؤں میں بازو ڈالے اٹھلاتی پھر رہی تھیں۔ گہرے سبز سمندر کے نیلگوں سینے پر دُور ایک مچھلی پکڑنے والی کشتی کے دو دھبا بادبان ہوا میں پھول رہے تھے۔

ہم سگریٹ پیتے لیونیا اسٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔

ہمارے قدم سیلی سیلی ریت پر نرمی سے پڑ رہے تھے، ہماری دائیں جانب چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں کا سلسلہ تھا، جہاں اکثر جگہوں سے دھواں اُٹھ رہا تھا، جھونپڑوں کے باہر، سیاہ گھنگھریالے بالوں والے پستہ قد آدمی، جن کے جسم کی کھال کروم لیدر سے ملتی جلتی تھی، اپنے بیٹھے ناریل کی رسیاں بٹ رہے تھے۔ کروم لیدر کے جوتے بڑے مضبوط ہوتے ہیں اور ان لوگوں کے جسم بھی بڑے مضبوط تھے، ان کی دُبلے پتلے گٹھے ہوئے جسموں والی عورتیں کام میں اُن کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔

صدیقی صاحب نے بتایا :-

" یہ لوگ لنکا کے اصلی باشندے ہیں، لیکن شہروں نے انھیں سمندر کے کنارے پھینک دیا ہے۔"

ان کے قریب سے گذرتے ہوئے ہمارے قدم خود بخود رُک گئے۔ بعض عورتوں کے سیاہی مائل سانولے جسم تنی ہوئی کمانوں ایسے تھے۔ سوائے ایک میلی سُرخ دھوتی کے اُن کے جسموں پر اور کچھ نہ تھا۔ دھوپ میں ان کے جسم سانپ کی کھال کی مانند چمک رہے تھے، اس چمک اور لیونیا کلب کے باہر نہانے والی انگریز عورتوں کے جسموں کی چمک میں رات دن کا فرق تھا، وہ جسم نیلے نیلے سمندروں کی شفاف جھاگ سے پیدا ہوئے تھے۔ اور ان جسموں نے کنجر انگلیوں کی سرانڈ اور تعفن میں جنم لیا تھا، اور اب یہ تعفن اور سرانڈ مسلسل بکھرے ساحلی علاقوں میں پھیل رہی تھی، شاید اسے لیونیا کلب تک پہنچنا تھا۔ لیونیا کلب ——— جہاں ریشمی پردوں والی کھلی کھڑکیوں میں سے نکلی ہوئی ارغنوان کی دلنواز موسیقی، بحرِ ہند اور خلیج بنگالہ کی پردیسی لہروں کو دُور دُور سے کھینچ لاتی تھی ——— جس کے بال روم میں ہر ماہ کی آخری رات کو پانچ منٹ کے لئے تمام روشنیاں بُجھ جاتی تھیں، پھر رقص کرتے ہوئے نیم عُریاں جوڑوں کے قدم خود بخود لڑکھڑانے لگتے اور پانچ منٹ کا مختصر وقفہ پومپیائی کی آخری رات میں تبدیل ہو جاتا، اور جب یہ قلیل عرصہ گذر جاتا اور پومپیائی کی آخری رات ختم ہو جاتی تو کوئی جوالا مکھی نہ پھٹتا۔ کسی طرف سے دہکتے ہوئے لاوے کا مہیب طوفان، لیونیا کلب کو اپنی آتشیں لپیٹ میں نہ لیتا، وہاں ہر ماہ کی آخری رات پومپیائی کی اوّلین رات تھی اور یہاں تاڑ اور ناریل کے درختوں تلے یہ کروم لیدر کے جسم، ناریل کی رسیاں بٹ رہے تھے، اور میلی کچیلی سُرخ دھوتیاں باندھے عورتیں ان کا ہاتھ بٹا رہی تھیں، ایک نوعمر لڑکی جس کے بال اُس کی پیٹھ سے بھی نیچے تک پہنچ رہے تھے، ایک ہاتھ میں بٹے ہوئے رسّوں کا گچھا سا لئے ہمارے قریب سے ہو کر گذری، اس کے سیاہ جسم میں سے کچّے ناریل کی دیسی خوشبو اُٹھ رہی تھی، اس نے جھونپڑی کے دروازے پر پہنچ کر گردن گھمائی اور ہمیں غور سے دیکھا اور پھر جلدی سے اندر داخل ہو گئی۔

اُس کی قنربنی آنکھوں میں وحشی ہرنیوں ایسا الھڑپن اور معصومیت تھی۔

اُس کا جسم کس قدر کھُردرا سا تھا ؟

اُس کی آنکھیں کس قدر نرم اور معصوم تھیں ؟ -

مجھے انناس کے رسیلے قتلے یاد آ گئے۔ صدیقی صاحب نے گھڑی میں وقت دیکھا، ریڈیو پروگرام کا وقت ہو رہا تھا، ہم تیز تیز قدم اُٹھاتے اسٹیشن

پہنچے، وہاں سے فورٹ اور فورٹ سے بس میں بیٹھ کر ریڈیو اسٹیشن پہنچ گئے۔

ریڈیو اسٹیشن کی دو منزلہ عمارت کولمبو کی بیشتر عمارتوں کی مانند بدھی مندروں سے ملتی جلتی تھی۔ عمارت کے اندر درمیان میں ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا، جہاں ناریل اور شریفے کے تین چار درخت تھے۔

برٹش سیکشن، ہندی سیکشن کے ساتھ ہی تھا، انگریز اناؤنسرز، نیوز ایڈیٹرز اور سکرپٹ رائٹرز، دن بھر خاکی نیکریں پہنے گھومتے رہتے تھے، ان کے جسموں پر بھورے بھورے بالوں کی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں، بعض جسموں پر چتکبرے داغ تھے، انھیں دیکھ کر مجھے گلے سڑے ٹماٹروں کا خیال آ جاتا تھا اور بڑی کراہت محسوس ہوتی تھی، ان میں دو لیڈی اناؤنسرز بھی تھیں۔ ایک انگریز لڑکی تھی جس کا نام فیلس ڈکنز تھا اور دوسری مسز کنداسوامی جو مدراس کی پیداوار تھی۔ فیلس ڈکنز کی آواز میں رس اور لوچ تھا اور اس کی سفید رنگت میں ہلکی سبزی کی جھلک تھی۔ کچی خوبانیوں کی مانند ———

اس کے لہریا بالوں کا رنگ بھوسلا تھا، خزاں نصیب پتوں ایسا اور اس کی آنکھوں میں نیلے اور سبز رنگ کا دلکش امتزاج تھا۔ یہ رنگ روم کے ساحلی سمندروں کا رنگ تھا اور ان آنکھوں میں بحیرۂ روم کی اتھاہ گہرائیاں چھپی ہوئی تھیں۔

مسز کنداسوامی کی آواز کافی اچھی تھی، مگر اس کا جامنی جسم دن بدن بے ڈول ہو رہا تھا۔ اس کے بال لمبے لمبے تھے جنھیں وہ دو چوٹیوں میں گوندھے رکھتی تھی۔ لیکن اس کا نام ان بالوں سے بھی زیادہ لمبا تھا اور جسے میں کبھی ایک سانس میں ادا نہیں کر سکا تھا۔ وہ ہر تیسرے روز نئی ساڑھی پہن کر آتی، اسے اپنی لوچدار آواز پر بڑا ناز تھا۔ اور یہ آواز ریڈیو پر بڑے بڑوں کو دھوکا دے جاتی تھی۔ کاش وہ خود بھی اپنی آواز کی مانند ہوتی ——— میرے ذہن میں اس کی آواز کا زندہ تصور، فیلس ڈکنز کا مدوّر شانوں، ریشمی گالوں اور بھرے بھرے بازوؤں والا جسم تھا اور مجھے ہمیشہ مسز کنداسوامی کی آواز پر فیلس کے جسم کا دھوکا ہوتا تھا۔

فیلس ڈکنز سے میری پہلی ملاقات سٹوڈیو نمبر "۳" ہوئی۔

میں اکیلا اندر بیٹھا چند پنجابی ڈسکیں (DISCS) ٹسٹ کر رہا تھا کہ فیلس کا نیم سبز آنکھوں والا! نیم سنہری بالوں والا چہرہ دروازے کے چوکور شیشے پر نمودار ہوا، وہ بالکل کسی فریم کی ہوئی تصویر کی طرح تھا۔ سٹوڈیو آف تھا وہ اندر آ گئی، ہلکے آسمانی رنگ کے مہین لباس میں اس کی سینہ شمیز کا ابھار کسی دودھیا بادل کے ٹکڑے کی مانند تھا، جو گہرآلود ذرات کے دھندلے آسمان پر چپ چاپ سو رہا ہو۔ ٹائپ کیا ہوا پروگرام چارٹ، دیوار سے لٹکا کر وہ لاؤڈ سپیکر پر قدرے جھک کر کھڑی ہو گئی اور بڑے غور سے پنجابی موسیقی سننے لگی، طمنچہ جان ہیر گا رہی تھیں۔

ہیر آکھدا ل جوگی جھوٹھ بولیں کون رٹھڑے یار مناوندا ای۔

ذرا سانس مدھم ہوئی تو وہ میرے قریب آ گئی۔

"یہ کیا گا رہی تھی۔؟"

فیلس میرے اس قدر قریب تھی کہ لونڈر کی خنک مہک میرے دماغ پر ایک خوشگوار کیفیت طاری کر رہی تھی۔

میں نے ڈسک لفافے میں ڈالتے ہوئے کہا: "یہ ہیر گا رہی تھی!"

"ہیر؟ ——— یہ کیا ہوتا ہے"؟ اس نے تعجب سے پوچھا۔

"یہ ہوتی ہے میڈم!"

"...کورٹ"

"ہاں، ہاں عورت ـــــ یہ پنجاب کی جیالی ہیر کی محبت کا گیت تھا اور ہیر چوہدری چوچک کی بیٹی تھی اور چوچک جھنگ سیال کا رہنے والا تھا..... میرا مطلب ہے، جھنگ مگھیانہ کا باشندہ تھا، اور بڑے غور سے اب پوچھا کہ جھنگ مگھیانہ کیا ہوتا ہے؟"

فیلس ہنسنے لگی بے اختیار ہنسنے لگی اس کی ہنسی ایک بچے کی ہنسی تھی جو سوتے میں اپنے آپ مسکرانے لگے معصوم، بے لوث، بے داغ۔ اس میں ایک خوابناک سرگوشی تھی، ایک والہانہ موسیقی تھی ـــــ وہ مجھ پر ذرا جھک کر بولی: "کیا تم شاعر ہو؟"

میں اب پونڈز کی خشک چمک کے علاوہ کچی خوبانیوں کی نیم گرم، نیم ترش خوشبو بھی سونگھ رہا تھا۔ میں اُسے کہنا چاہتا تھا: "مادام میں شاعر نہیں ہوں، مگر کچی خوبانی کے عنوان سے ایک بھرپور نظم لکھ سکتا ہوں، کئی بھرپور نظمیں، کئی مثنویاں اور کئی دیوان لکھ سکتا ہوں۔ لیکن میں نے کہا: "مادام میں شاعر نہیں ہوں...... BUT I FEEL POETIC" اور اچھوتے سیب کا منہ پھر کھل گیا اور انمول، آبدار اور کنوارے موتیوں کی لڑیاں جھلملانے لگیں، وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی اور میں سٹوڈیو میں بیٹھا دیر تک کچی خوبانیوں کی نیم گرم، نیم ترش خوشبو سونگھتا رہا۔ جیسے میرے آس پاس اُن کے ڈھیر لگے ہوں۔ میں نے برٹش پروگرام سننے کے لئے دوسرے سٹوڈیو کا بٹن دبا دیا۔ مسز کنڈا سوامی، انگریزی میں خبریں سنا رہی تھی، اس کی آواز میں کس قدر رس اور لوچ تھا ـــــ فیلس کے جسم کی مانند ـــــ اس کی آواز کا لوچ اور گداز فیلس کے جسم کی یاد دلانے لگا اور مجھے یوں محسوس ہوا گویا میں خوبانیوں کے ڈھیروں میں دبا جا رہا ہوں۔ میں نے جلدی سے سپیکر بند کر دیا اور سٹوڈیو سے باہر نکل آیا۔

ریڈیو گھر میں داخل ہوتے ہی مس گلیٹی کی صورت دیکھنا پڑتی تھی۔

یہ چالیس پینتالیس سال کی ڈھیلے ڈھالے، بدنما جسم والی عورت جس کے سر کے سفید بال خضاب کے مسلسل استعمال کی وجہ سے جامنی رنگ اختیار کر چکے تھے، صحن میں ٹیلیفون ایکس چینج کے سیٹ کے پاس بیٹھی تھی اور قریب سے گزرنے والے کو ایک بار اپنے پاس ضرور بلا لیتی تھی، تنگ وضع ڈھنگ کے مردوں سے باتیں کرتے ہوئے اُس کے بھدے چہرے پر کنواری لڑکیوں ایسا حجاب پھیل جاتا۔ میں اُس کے کنواری لڑکیوں ایسے حجاب سے بڑا گھبراتا تھا۔ اس کا نام ہمیشہ مجھے فرانس کی گلوٹین کی خوفناک یاد دلاتا، گلیٹی ـــــ گلیٹی...... اس نام میں گلے کو بڑے اطمینان سے کاٹ ڈالنے کی دھمکی تھی۔ اس سے باتیں کرتے وقت میرے جسم پر سر سے لیکر پاؤں تک کپکپی کا عالم طاری رہتا، جیسے لوگوں کا ہجوم مجھے گلوٹین کی طرف کھینچے لئے جا رہا ہو، صدیقی صاحب نے بتایا کہ ایک بار وہ گلا کٹوانے سے بال بال بچ گئے۔ وہ ایک ہاتھ کاؤنٹر پر رکھے مس گلیٹی سے کسی نمبر کی بابت گفتگو کر رہے تھے کہ اس نے صدیقی صاحب کی انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی دیکھ لی اور اس کا چہرہ کنواری لڑکیوں ایسے حجاب کے نقاب میں پہلے سے زیادہ بھدا ہو گیا۔

"مجھے یہ انگوٹھی بڑی پسند ہے مسٹر ڈکی"

وہ مسٹر ڈکی نے گلوٹین کا تیز پھل اپنی گردن کے بالکل قریب محسوس کیا: انھوں نے آہستہ سے پوچھا "تمہاری عمر کیا ہو گی میڈم؟"

"قریباً چالیس سال......"

یہ کہتے ہوئے میڈم "گلوٹین" مسکرانے لگی اور کانچ کے بناوٹی دانتوں کی نیلی لکیر چمک اُٹھی اور صدیقی صاحب تیزی سے کنٹرول روم کی طرف گھوم گئے۔

لنکا پہنچنے سے پہلے میں نے سونے کی اس سر زمین کے متعلق ایک خواب دیکھا تھا، ایک حسین اور پُراسرار خواب ـــ میں نے ... بسیلوں میں گھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے ... کو ... چپ چاپ، آرام پسند شہر دیکھے تھے جن کے ... بانس ... اور صنوبر ... گنجان جنگلات

کا عجیب سلسلہ حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا تھا، جہاں بدھی مندروں کے سنہری کلس نکھری ہوئی دھوپ میں چمک رہے تھے، اور ان مندروں کے نیم روشن ایوانوں میں، پُرجلال دیوتاؤں کے سنگین مجسموں کے روبرو، کالی آنکھوں والی، سیم تن دیو داسیاں عود و عنبر کے نیلگوں دھوئیں میں بیخود ہو کر والہانہ انداز میں رقص کر رہی تھیں۔ مومی روشنیوں کی ملائم دھند میں ان کے نیم عریاں جسم پُراسرار داہمے بن کر جاگ رہے تھے اور اُن مندروں کے باہر مرمریں سیڑھیوں کے کناروں پہ بیٹھی ہوئی بدھ کی کنواری بیٹیاں اندر جانے والے عقیدت مندوں کو گلِ صد برگ، موگرہ، چنبیلی اور شبو کے پھول پیش کر رہی تھیں، ان کے سیاہ بال پھولوں میں بسے ہوئے تھے اور کانوں میں مجوراکے مندر لٹک رہے تھے۔

میں نے عظیم الشان محلات کی مرمریں بارہ دریوں میں شاہی رقاصوں کو اناس کی شراب میں بدمست آسمانی ناچ ناچتے دیکھا۔ ان بارہ دریوں کے جالی دار جھروکوں میں لچکیلی بیلوں کی پھولوں بھری ڈالیاں داخل ہو رہی تھیں، باغوں میں صنوبر اور آم کے پیڑوں پر رنگین پرندے چہچہا رہے تھے جگہ جگہ کنول کی شکل ایسے دودھیا پتھر کے پیالوں میں چاندی کے فوارے اُبل رہے تھے اور گلاب کے جھاڑوں پر سیاہ بھونروں کی ٹولیاں منڈلا رہی تھیں۔

لیکن لنکا یعنی کولمبو پہنچ کر میرا یہ پُراسرار و حسین خواب جیسے اپنا منہ چھپا کر کہیں گم ہو گیا، مجھ سے روٹھ گیا، منتشر ہو گیا۔

کولمبو میں سوائے ایک دھوبی کے اور کوئی شخص لنکا کے نام سے واقف نہ تھا، اس دھوبی نے اس خبر گیری کے ثبوت میں، اپنی دوکان کی پیشانی پر "لنکا واشنگ فیکٹری" کا بورڈ لگا رکھا تھا۔ لوہے اور کنکریٹ سے بنے ہوئے اس عظیم الشان شہر کے سنگین ہوٹلوں میں ملکی اور غیر ملکی جوڑے شراب کے ہلکے ہلکے سرور میں ڈوب کر بے دلی سے ناچ رہے تھے اور بدھی مندروں کے ویران ایوانوں میں چمگادڑیں محوِ نگار رہی تھیں۔ عود و عنبر کی نیلگوں دھند میں والہانہ رقص کرنے والی سیم تن دیو داسیاں اور مندروں کی سیڑھیوں پر گلِ صد برگ، موگرہ، چنبیلی اور شبو کے پھول پیش کرنے والی، سیاہ بالوں اور چمکیلی آنکھوں والی، بدھ کی کنواری بیٹیاں اب کولمبو کی پتھریلی سڑکوں اور کارخانوں کی گھٹی ہوئی فضا میں دن بھر مشقت کرتی تھیں اور رات کو گندے تاڑی خانوں کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر تاڑی پیتی تھیں، لڑتی جھگڑتی تھیں۔ اور نشے میں دھت ہو کر وہیں پڑ رہتی تھیں اور سونے کی لنکا کے بیٹے، راون کے غیور سپاہی، شہر سے باہر نارمل کی رسیاں بٹ رہے تھے۔ شہروں نے انہیں کڑوی شے کی مانند تھوک دیا تھا۔ کوسنے کھدروں میں رینگنے والے کیڑے سمجھ کر انہیں دھرتی کے آخری کناروں پر پھینک دیا تھا اور یہ سنگلدیپ کے لال، لنکا کے راج دلارے، سمندر کے کنارے، چمکیلی ریت پر شام کے بعد الاؤ روشن کر کے اس کے گرد بیٹھ جاتے اور ناچ گانوں میں مگن ہو جاتے تھے۔ ڈھولک کی تیز تھاپ پر صدیوں کا پرانا غم، ان کے تاریک سینوں کی تہوں سے لمبی گہری اور دردانگیز تانوں میں ڈھل کر بہہ نکلتا، الاؤ کی تابناک روشنی میں ان کے نیم عریاں سیاہ جسم کسی ان دیکھے، انجانے کیف میں بھیگ کر آپ ہی آپ جھومنے لگتے اور ان کے سروں پہ ناریل کی ترچھی شاخوں میں چاند چمکنے لگتا۔ دودھیا چاندنی کے نقرئی خلاؤں میں لنکا کے بھوکے ننگے بیٹوں کے گیتوں کا طلسم مرمریں خواب بن کر پھیل جاتا۔ یہ خواب ایک خاموش اور پُرسکون جھیل تھی جس کی سطح پہ ان کے جسم، محبت، اخوت اور آزادی کے کنول بن کر تیر رہے تھے اور شہروں نے انہیں کڑوی اور گندی شے سمجھ کر سمندر کے پاس تھوک دیا تھا اور یہ اپنے وطن، اپنے گھر میں بے وطن، بے گھر اور پردیسی لوگ الاؤ بھڑکتے ہوئے شعلوں کے گرد دائرہ بنائے کسی نئی تہذیب کا گیت گا رہے تھے۔ شاید وہ نیم خوابیدہ حالت میں منتظر نگاہوں سے اس وقت کی راہ دیکھ رہے تھے جب اس تہذیب کا قافلہ سمندر کے بیکراں سینے پہ اپنی کشتیوں کے بادبان پھیلائے اُن کی سمت بڑھتا چلا آئے گا اور وہ آنکھوں میں مسرت کے آنسو لئے اس قافلے میں شامل ہو کر، محبت، خوشحالی اور آزادی کا سنہرا خواب دیکھیں گے۔

ان کی نگاہوں میں انتظار کی بے کلی تھی اور ان کے گیتوں میں پہاڑ کی اونچائیوں سے پھسلنے والی ندیوں ایسا اضطراب اور دفعتاً بھڑک اُٹھنے والے شعلوں ایسا ہیجان تھا، تڑپ تھی، درد تھا، میٹھا اور عزیز ترین درد، جو بیدپ کے پہلی بار منہ کھلنے سے پیدا ہوتا ہے اور جب

سیپ کا منہ کھل جاتا ہے تو فیلس ڈکنز مسکرانے لگتی اور اچھوتے موتیوں کی آبدار لڑیاں جھلملا اٹھتی ہیں اور یہ تبسم ایک چھوٹے سے آبشار کی مانند فیلس کے سرخ ہونٹوں سے گلپوش وادیوں میں گرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

فیلس ہوٹل گال فیس کے بال روم میں بیٹھی مسکرا رہی تھی اور کوئی خوبصورت پودا ہولے ہولے آویزے کی پھولوں بھری لمبی ڈالیوں کو ہلا رہا تھا اور سپید سپید، نرم نرم، کومل پتیاں گھاس پر گر رہی تھیں۔ آج فیلس کی سالگرہ تھی۔ روشنی میں اس کے بھورے بال سونے کے تاروں کی مانند چمک رہے تھے جیسے جنگل میں کسی مکڑی کے جال پہ ڈوبتے سورج کی نارنجی شعاعیں تھرک رہی ہوں۔ شیمپین کا سلگتا ہوا خمار اس کی آنکھوں کی نیم سبز جھیلوں پر صنوبر کا سایہ بن کر جھکا ہوا تھا اور جھیلوں کا رنگ گہرا اور پراسرار ہو رہا تھا۔

ڈانس پر موسیقی شروع تھی۔ ایک پھولے ہوئے سرخ گالوں والی موٹی سی لڑکی پورا منہ کھولے گا رہی تھی۔

" O! NIGHT IN JUNE

IF I WER NEVER TO SEE YOU AGAIN

اس کی تیز اور کرخت آواز میں بیابانی عقاب ایسی جھپٹ تھی اور یہ عقاب اپنے خوفناک پنجے پھیلائے ہر آدمی کو اپنی طرف بڑھتا محسوس ہو رہا تھا۔ چنانچہ لوگ گانا سننے کی بجائے عورتوں سے ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ میں مشغول تھے، اور عورتوں کی ٹانگیں رانوں تک ننگی تھیں، ان کے بازو شانوں تک کھلے تھے، اور سینے چھاتیوں تک عریاں تھے، ہال میں گداز اور خمار آلود جسموں کی نیم گرم خوشبو رچی ہوئی تھی اور فیلس اپنی سالگرہ کا پانچواں جام خالی کر رہی تھی اور جھیل کی سطح پر صنوبر کے سائے زیادہ گہرے اور گدلے ہو رہے تھے۔ اس کی دائیں جانب بیٹھا، ریڈیو اسٹیشن کا موسیقار وکٹر ڈول دسویں بار اس کے ریشمی گال چوم رہا تھا۔ بیونا ڈانسر ہربس، ہونٹوں میں بھیگا ہوا سگریٹ منہ میں دبائے، شراب میں تر انگلیاں اپنی کھوپڑی پہ رگڑ رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں شراب کے نشے میں گھٹ کر سکڑ گئی تھیں لفٹیننٹ گرفن نے جام ہوا میں لہرایا اور فیلس کی سالگرہ کا بارہواں جام بھی خالی ہو گیا۔ ہونٹوں پر زبان پھیر تا وہ فیلس پر جھکا اور اپنے شراب آلود لب اس کے نیم عریاں مرمریں سینے پر رکھ دیئے۔ وکٹر بڑبڑاتے ہوئے گلاس میں شیمپین انڈیلنے لگا اور ہربس نے اتنے زور سے کش کھینچا کہ گیلا سگریٹ ایک دم تڑک گیا۔ فیلس کا مخمور جسم ہولے ہولے جھوم رہا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ میری پنڈلیوں میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ ہم ایشیائی طبعاً شریف ہوتے ہیں۔ ہم ایسے مناظر برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم محبت کرنے سے پہلے روشنی بجھا دیتے ہیں۔ ہماری محبت تاریکی اور تنہائی کے غار میں جنم لیتی ہے اور اسی غار میں دم توڑ دیتی ہے۔ ہمیں غاروں سے محبت ہے، محبت کے غار، نفرت کے غار، ذلت کے غار اور شرافت کے غار۔ ہم فطرتاً غار پسند ہیں اور یہاں روشنی ہی روشنی، لوگ ہی لوگ . . .

اور لفٹیننٹ گرفن کے شرابی لب فیلس کے پتلے، ریشمی ہونٹوں سے پیوست تھے۔ پھولے ہوئے سرخ گالوں والی امریکن لڑکی بدستور چلا رہی تھی:-

" O! NIGHT IN JUNE .... "

اور بیابانی عقاب اپنے خوفناک پنجے کھولے ہمارے سروں پہ منڈلا رہا تھا۔ قریب ہی ایک میز پر کوئی نوعمر ملاح، نیلی اور سفید وردی میں ملبوس، کہنیاں گھٹنوں پر رکھے، ذرا آگے کو جھکا، ایک اینگلو انڈین دبلی پتلی بے زبان سی لڑکی سے اظہارِ محبت کر رہا تھا اور وہ لڑکی گائے کی زبان کے ٹھنڈے قتلوں پر ٹماٹر کی چٹنی لگائے انہیں چبا چبا کر کھا رہی تھی۔

ایک خالص سیلونی ادھیڑ عمر جوڑا بڑے دروازے پر نمودار ہوا۔ ویٹر نے ہاتھ پھیلا کر ایک خالی میز کی طرف اشارہ کیا۔ عورت کا تھل تھل پل پل بھدا جسم جامنی رنگ کی ساری میں لپٹا تھا۔ اس کے مریل سے خاوند کا مختصر ہاتھ بمشکل اپنی بیوی کی کمر تک پہنچ رہا تھا۔ عورت کے ہونٹ سرخ تھے، گہرے سرخ۔ خون کے رنگ لیے ——— گویا وہ ابھی ابھی کسی کا خون پی کر آ رہی ہو۔ اس کے بازوؤں پر، کلائیوں پر گلے

بیش قیمت ہیرے موتی جھلملا رہے تھے، اس کے خاوند کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور سوکھی گردن قمیص میں سے خشک ٹہنی کی مانند باہر نکلی ہوئی تھی۔ سیلونی عورت نے ڈانس پہ گاتی امریکن لڑکی کو دیکھا اور نفرت سے مُنہ پھیر لیا۔

لڑکی نے ایکدم گانا بند کر دیا اور عقاب نے اپنے پنجے سمیٹ لئے اور لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر دفعتاً ہال کے درمیانی حصّے کے سوا ہر طرف روشنیاں گل ہو گئیں اور سازوں پر جھکے سروں میں کوئی اور ہی دُھن شروع ہو گئی۔ اِدھر اُدھر میزوں پر سے نیم برہنہ عورتیں اور مرد ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے کنارے پر سے کھسکتی ہوئی کشتیوں کی مانند اُٹھے اور ان کے جسم موسیقی کی پُرسکون لہروں پر اپنے آپ ڈولنے لگے۔ سبز روشنی کے غبار میں اُن کے لہراتے ہوئے جسم خواب ایسا منظر پیش کر رہے تھے۔ ہمارے آس پاس پھیکے پھیکے اندھیرے کا غبار پھیلا ہُوا تھا۔ ہمیں ایک دوسرے کے چہرے بڑے پُراسرار دکھائی دے رہے تھے۔ نیم گرم سُلگتی ہوئی شرابی آنکھیں، مدھم اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔ وکٹر اپنے پیچھے کرسی گرتا ہُوا اُٹھا اور فیلس کو اپنے لمبے بازوؤں میں تھام کر محوِ رقص جوڑوں میں شامل ہو گیا۔ لفٹیننٹ گرفن شراب سے بھرے ہوئے گلاس میں سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر، ناک سکیڑ کر بولا: "بدمعاش کو یا ؟"

ہرلیس نے پانچوں انگلیاں شراب میں ڈبو کر انہیں اپنی کھمبڑی پر رگڑا، اور پھر کرسی کی پشت سے جا لگا۔ بازو لٹکائے بولا :-

"—— AND T'IS IS THE END OF THE NEWS !"

گھومتیں، لہراتیں، کبھی آگے بڑھتیں کبھی پیچھے سمٹتیں، سانولی، گندمی، زرد اور سپید سپید عُریاں پنڈلیوں کے ہجوم میں مجھے فیلس کی پکی چکنی پنڈلیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ وکٹر اسے اپنے ساتھ چپٹائے بڑے بھونڈے انداز میں ناچ رہا تھا اور فیلس کا شرابی جسم اس کے لمبے بازوؤں کی شاخوں پر پکی ہوئی انجیر کی مانند لٹک رہا تھا اور میرا سر بھاری ہو رہا تھا۔ میری آنکھوں میں سیناٹ اُٹھ رہا تھا۔ اِرد گرد میزوں پر اب صرف بوڑھے اور بدصورت چہرے ہی تھے، جھلملاتے، بیش قیمت ہیرے موتیوں والی، بھاری بھرکم سیلونی عورت کا مجھے دھُندلا سے خاکہ ہی نظر آ رہا تھا جو اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے مریل اور زیادہ پھیکے خاکے پر جُھکا ہُوا تھا۔ میری آنکھوں میں سُرخ سُرخ ہونٹ بھر گئے۔ گہرے سُرخ ہونٹ اور مجھے یُوں لگا جیسے پہلا خاکہ، دوسرے خاکہ پر جُھکا اُس کا خون پی رہا ہو۔

گلاسوں کے بوتلوں سے ٹکرانے کی کھنکاریں اور بوڑھے قہقہوں کی بے جان آوازیں، ڈانس کے لمبے لمبے سُروں میں مدغم ہو رہی تھیں اور نیوز اناؤنسر ہرلیس خبریں ختم کرنے کے بعد ٹانگیں پھیلائے مدہوش پڑا تھا۔ لفٹیننٹ گرفن پی رہا تھا اور بی بی سی کے نئے ریکارڈوں کی مختلف دُھنیں گنگنا رہا تھا۔ کسی وقت وہ اپنی گھٹی ہوئی آنکھیں اُٹھا کر، ہچکی روک کر مجھ سے پوچھتا :-

"DO YOU LIKE GYPSY SONGS ? "

اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر کوئی اور دُھن شروع کر دیتا۔ شیمپین کا جام میرے ہاتھ میں ختم ہو رہا تھا اور فیلس کا جسم وکٹر کے سینے سے چمٹا ہُوا تھا اور انجیر اپنی شاخ پر لٹک رہی تھی، وہ پک چکی تھی اور گرنے والی تھی، اور اس سے پیشتر کہ وہ اپنی شاخ سے ٹوٹ کر گرے، ہال کی تمام بتیاں ایک ساتھ روشن ہو گئیں، بوڑھے اور بدنصیب چہروں نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے رقص کے ٹوٹنے داروں کو دیکھا اور سرد آہیں بھرنے لگے۔ عورتیں اپنے ڈھیلے بلاؤز درست کرتیں، پریشان بال سنوارتیں، مردوں کے سہارے اپنی اپنی میزوں کی سمت بڑھنے لگیں۔ وکٹر کے بالوں کی ایک لٹ اس کی چوڑی پیشانی پر جھُول رہی تھی۔ فیلس کے قدم ڈگمگا رہے تھے اور وکٹر اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا اور یُوں اسے اپنے بازوؤں میں تھام رہا تھا جیسے فیلس کوئی مجسمہ ہو جس کے پاؤں تلے سے چبوترہ کھسک گیا ہو اور وہ بے قابو ہوئی جا رہی تھی اور بے اختیار سینے سے جا رہی تھی۔ اس کی شراب میں ڈوبی ہوئی نگاہیں کسی جگہ نہ ٹھہرتی تھیں وہ کبھی ہرلیس کو دیکھتی، کبھی گرفن کو، کبھی مجھے۔ جیسے ہمیں پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ لفٹیننٹ گرفن پرانا شرابی تھا، چنانچہ اس نے اُٹھ کر فیلس کو تھام لیا۔ وکٹر نے ہرلیس کو

بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا، وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور بلند آواز میں بولا :-

" HERE IS THE NEWS ! "

ہم سب ایک دوسرے کا سہارا لئے، لڑکھڑاتے، ڈگمگاتے، باہر نکل کر ایک ٹیکسی میں ڈھیر ہو گئے۔ پرائیویٹ ہوسٹل کے احاطے میں آ کر ہم نے ہیریس اور فیلیس کو بمشکل برآمدے تک پہنچایا۔ ڈرائنگ روم میں پہنچتے ہی فیلیس صوفے پر گر پڑی اور لفٹیننٹ گرفن اس کا سر دبانے لگا۔ ہیریس کا نشہ جیسے سو کر بالکل ہی اُڑ گیا تھا۔ اس نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے گرفن کو فیلیس پر جھکے دیکھا، وہ گالیاں بکتا ہوا اُٹھا اور اندر سے وائٹ ہارس کی ایک اور بوتل لے آیا۔ وکٹر پول آرام کرسی میں لیٹا، ٹانگیں قالین پر پھیلائے بڑے مزے میں گا رہا تھا :-

" I KNOW

WHERE YOU SING O SEA ! "

میری آنکھیں جل رہی تھیں اور بند بند ٹوٹ رہا تھا۔ میرے ارد گرد ہر شے دھندلا رہی تھی۔ وکٹر پول کے گانے کی نرم آواز جیسے کسی ویران اور اندھیرے کنوئیں میں سے نکل رہی تھی۔ یہ آواز مجھ سے دُور ہوتی جا رہی تھی۔ دُور ـــــ اور دُور ـــــ یہاں تک کہ وہ بالکل ڈوب گئی اور میں سو گیا۔

جانے میں کتنی دیر تک سویا ہوں گا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ وکٹر پول مجھے دوسرے کمرے میں کھینچے لئے جا رہا تھا۔ مجھے اندر دھکیل کر اس نے دروازہ باہر سے بند کر دیا۔

" اِن جوائے یُو ایلیفینٹ بوائے "

میں نے بمشکل تمام اپنے آپ کو سنبھالا اور آنکھیں ملتے ہوئے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمزور لیمپ کی مدھم روشنی میں فیلیس ڈکنز پلنگ پر بھورے رنگ کا ریشمی کمبل اوڑھے بے سُدھ پڑی تھی۔ میں اس کے پاس پہنچ کر آہستہ سے اس پر جھک گیا۔ فیلیس کا رنگ زرد ہو رہا تھا، پتلے ہونٹوں پر پسینے کے ننھے ننھے موتی چمک رہے تھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بالکل بے سُدھ پڑی تھی۔ میں نے اسے شانے سے پکڑ کر نرمی سے ہلایا: "فیلیس، فیلیس"!

فیلیس کی مخمور پلکیں آہستگی سے اُوپر اٹھیں جن میں شراب کا سُرور دھند بن کر چھایا ہوا تھا، وہ ہولے سے مسکرائی، میں نے اپنے ہونٹ اس کے نیم وا ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ شراب اور پسینے کے نمکین ذائقے نے میرا منہ بدمزہ کر دیا۔ میں نے کمبل منہ پر کر لیا، کیونکہ کمرے میں روشنی تھی اور ہم ایشیائی اندھیرے سے محبت کرتے ہیں۔ ہمیں روشنی راس نہیں آتی، لیکن کمبل پر منہ کرنے سے ایک عجیب قسم کی بُو میرے نتھنوں میں گھسنے لگی، جیسے میں نے گندے ٹماٹروں سے بھری ہوئی بوری میں منہ ڈال دیا ہو، یا جیسے میں کسی مچھلی مارکیٹ میں داخل ہو گیا ہوں، وہ خوبانیوں کی میٹھی خوشبو کہاں گئی تھی، وہ پاؤڈر کریم کی ٹھنڈی مہک کہاں غائب ہو گئی تھی؟ میرا دماغ پھٹنے لگا، میں نے جلدی سے منہ باہر نکال لیا لیکن باہر وہی روشنی تھی اور ہم ایشیائی . . . . .

میں جلدی سے مچھلی مارکیٹ میں داخل ہو گیا اور تمام رات وہاں بغیر ناک پر رومال رکھے گھومتا رہا۔ پچھلے پہر جب میں مچھلی مارکیٹ سے باہر نکلا تو ڈرائنگ روم میں لفٹیننٹ گرفن، ہیریس اور وکٹر پول نیم برہنہ حالت میں، قالین پر اُلٹے سیدھے پڑے تھے۔ میں نے میز پوش اُٹھا کر ان پر ڈال دیا اور ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ سڑک پر پہنچ کر مجھے فیلیس ڈکنز کا خیال آ گیا اور یوں محسوس ہوا جیسے کسی نائی نے شیو کے بعد بالوں بھرا جھاگ میرے منہ پر پھینک دیا ہو، میں نے زور سے تھوک دیا۔

"مُرغی صاحب؟ ——— ایکدم "اچھاوالا" صاحب؟"

"اچھاوالا" سے اس کی مراد ایسی عورت سے ہوتی تھی جو پیشہ ور نہ ہو، بلکہ عطائی ہو۔

ایک روز میں بھی ایک "اچھاوالا" کے پاس چلا گیا۔

اس رات ہلکی ہلکی بوندیں برس رہی تھیں، میں برساتی اوڑھے فٹ پاتھ پر درختوں کے نیچے سے ہو کر گذر رہا تھا، فضا میں درختوں کے گیلے تنوں کی مرطوب خوشبو رچی ہوئی تھی۔ سڑک پر کبھی کوئی موٹر روشنی کا سیلاب لئے گذر جاتی تو گرتی بارش کی لڑیاں، کانچ کے ریزوں کی مانند چمک اٹھتیں۔ فٹ پاتھ کے ساتھ کھائی میں جھینگر، مینڈک اور پپیہے چوک میں پہنچ کر میں ٹمپل روڈ کی طرف گھوم گیا، سڑک پر حسبِ معمول اندھیرا تھا کہیں کہیں مکانوں اور تاڑی خانوں میں سے روشنی جھانک رہی تھی، ایک جگہ اچانک مجھ پر حملہ کر دیا گیا:-

"مُرغی صاحب ——— ؟"

اور وہ میرے "اچھاوالا" کہنے سے پیشتر ہی میں اس کے ساتھ ہو لیا، جیسے سودا پہلے ہی سے طے تھا، اپنی فوری کامیابی پر وہ پستہ قد دلال اینٹھ اینٹھ کر میرے آگے چلنے لگا، کچھ دور چل کر ہم ایک تنگ گلی میں گھس گئے، یہاں کچے ناریلوں اور سڑے تیسے پیازوں کی بو پھیلی ہوئی تھی، دلال نے دھوتی میں اڑسی ہوئی ٹارچ جلائی اور اس کی کمزور روشنی میں مجھے ایک مکان میں لے گیا، مکان بالکل ڈربہ معلوم ہو رہا تھا، مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے واقعی میں وہاں مرغیاں خریدنے آیا ہوں۔ ایک کمرے میں پھیکی سی روشنی ہو رہی تھی اور کھڑکیوں پر زرد رنگ کے پرانے پردے کھنچے ہوئے تھے، وہ مجھے اس کمرہ میں چھوڑ کر چلا گیا، کمرہ اگرچہ چھوٹا تھا مگر سلیقے سے سجا ہوا تھا، فرش پر ایک مٹیالی دری بچھی تھی اور قریب ہی تپائی پر کانسی کے تھال میں مہاتما بدھ کی سیاہ پتھر کی مورتی رکھی تھی جس کے قدموں میں کچھ سپید پھول مرجھا رہے تھے، فضا میں ایک مانوس قسم کی گھریلو کیفیت تھی، مجھے وہاں کی ہر شے پیاری اور خوبصورت لگ رہی تھی، میں نے برساتی ایک طرف رکھ کر سگریٹ سلگایا اور پلنگ پر نیم دراز ہو گیا۔ ابھی میرا سر دیوار سے لگا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک تیلی دُبلی لڑکی اندر داخل ہوئی اور مسکراتی ہوئی میرے قریب ہی پلنگ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے بال اس کی لمبی پلکوں والی آنکھوں کی مانند گہرے سیاہ تھے۔ جنھیں اکٹھا کر کے جوڑے کی شکل میں اس نے گردن پر باندھ رکھا تھا۔ جوڑے میں ننھی ننھی زرد کلیوں کا گچھا لگا ہوا تھا۔ اس کا رنگ مونگرہ کی کلی ایسا زردی مائل سپید اور کومل تھا۔ وہ ٹکے عنابی رنگ کی ساری میں ملبوس تھی اور اس کے ادھ ننگے بازو گداز اور گول تھے، پیشانی پر سُرخ بندی خون کا داغ معلوم ہو رہی تھی۔ میری نظروں میں ایکا ایکی وہ مقدس معبد پھر گئے جن کے نیم روشن تہہ خانوں میں کالی کالی آنکھوں والی دیو داسیاں؛ عود و عنبر کی مرغولوں، دھند میں والہانہ رقص کیا کرتی ہیں۔ وہ مجھے اپنی روشن اور چمکیلی آنکھوں سے دیکھتی ہوئی مسکرا رہی تھی۔ میں بھی اپنے آپ مسکرا رہا تھا اور مجھے خواہ مخواہ اپنے ہمسائے ——— بیرسٹر صاحب اور اسکی بیوی کا خیال آ رہا تھا۔

"آپ ذرا کھسک کے بیٹھ جائیں" اس نے بڑی صاف انگریزی میں کہا۔ اس کی آواز نرم اور خواب آلود تھی۔

"تم انگریزی جانتی ہو؟"

"کیوں نہیں، ہمیں سیکھنا ہی پڑتی ہے، آپ تو جانتے ہی ہیں سیلون میں عیسائی زیادہ ہیں"

"ہاں، ہاں، ٹھیک ہے"

وہ ہنس پڑی اور اس کے گدرائے ہوئے گالوں میں ننھے ننھے گڑھے پڑ گئے، میں نے سگریٹ راکھدان میں بجھا کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پیار سے دبانے لگا۔ اور دیو داسی کی سیاہ آنکھوں میں پر نور اجالا جھلکنے لگا، وہ جلدی سے اُٹھ کر گوتم بدھ کی مورتی کے پاس گئی اور کانسی کے تھال میں اپنے جوڑے کی زرد کلیاں رکھ کر واپس چلی آئی، اب اس کے لمبے بال اس کے شانوں پر بکھر گئے تھے، پلنگ پر بیٹھ کر

اس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا اور اس کے سیاہ بال میرے بازوؤں پر بکھر گئے اور مجھے غالب کا مشہور شعر یاد آگیا، میں نے ان بالوں کی بھینی بھینی خوشبو سونگھتے ہوئے پوچھا :-

" تمھارا نام کیا ہے ؟"

وہ میرا ہاتھ نرمی سے سہلاتے ہوئے خواب آلود آواز میں بولی: "یشودھرا! —— اور تمھارا نام؟"

میں اُن آنکھوں کی سیاہ جھیلوں پر جھک گیا: "سدھارتھ"

وہ چونک اُٹھی: "سدھارتھ؟"

" ہاں!"

" یہ تو ہمارے مقدس بدھا کا نام تھا"

" ہاں!"

" اور یشودھرا اس کی بیوی تھی"

" ہاں!"

" کیا تم بدھی ہو؟"

" ہاں!"

اور اس نے کسی پُراسرار طاقت سے مغلوب ہو کر اپنے آبنوسی بازو میری گردن میں حمائل کر دیئے اور مجھے اپنی طرف کھینچ لیا، مجھے اپنا جسم لطیف ہو کر کسی آفاقی رقص میں ڈھلتا محسوس ہو رہا تھا، جیسے ملایا کی طرف سے آنے والی مشرقی ہواؤں کے مہربان جھونکے مجھے ان مندروں میں اُڑا لے گئے ہوں جن کے دھندلے نہ خانوں میں نیم عریاں دیوداسیاں، بدھ کی کنواری بیٹیاں، گجرے پہنے، عنبر و لوبان کی خوشبو میں مقدس بدھا کے روبرو تھرک تھرک کر رقص کر رہی ہوں - دھیمی روشنی میں ان کے دلدار اعضا دمک رہے ہوں۔ رقص، نغمے، گل صد برگ، مونگرہ کلی، چمپا کلی، گومتی، اندر منڈی اور یشودھرا —— صندلیں، نیم عریاں، کنوارے جسم اور سیاہ بالوں والی یشودھرا —— حسین سا کیہ شہزادی!

اور یشودھرا کا جسم کانپ رہا تھا، لرز رہا تھا، کسے ہوئے تار کی طرح، جسے زور سے جھنجھنا دیا گیا ہو۔

یشودھرا نے دراز پلکیں اُٹھا کر مجھے دیکھا، ان آنکھوں میں دن کا اُجالا، شفق کا زرّیں سونا پگھل رہا تھا، صبح ہو رہی تھی، شام ہو رہی تھی۔ اس کے جسم کے ہر بن مُو سے شیریں مہک کی لہریں اُمڈ رہی تھیں، اس کے ہونٹوں میں شراب اور پسینے کے کسیلے ذائقے کی بجائے، سنگلدیپ کے جزیرے کے جنگلی شہد ایسی مٹھاس تھی۔ اس کے گداز جسم کی ریشمی سطح پر ایک کنواری اور لذیذ تھرتھراہٹ تھی جیسے وہ اپنی دوشیزگی کا مرطوب پہلی بار کسی کو سونپ رہی ہو۔

یہ ایک شرمیلی دلہن کا اچھوتا اور بے داغ جسم تھا۔

اس میں نرمل خون کی حدت اور پاکیزگی تھی۔

" تم سدھارتھ ہو، میں یشودھرا ہوں۔ ساکیہ شہزادی، میں تمھاری بیوی ہوں، میرے جسم کی سیج پر تم زندگی کے آخری لمحات تک آرام کر سکتے ہو۔ اس سیج کے پھول تمھارے انتظار میں سوکھ رہے تھے، تم کہاں تھے؟ کدھر تھے؟"

یشودھرا جیسے خواب میں بول رہی تھی، اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں، اس کے بازوؤں کی گرفت میری گردن میں زیادہ مضبوط

ہو رہی تھی ، مجھے ایک طرح کا خوف سا محسوس ہونے لگا تھا ، جیسے میں کوئی شرمیلی دلہن ہوں اور کسی اکھڑ مرد کا کھردرا ہاتھ میری طرف بڑھ رہا ہو ۔

میرے دل پر ہاتھ رکھو میرے شہزادے ، مجھے اپنے سینے سے لگا لو ، تاکہ میری سانس تمھاری سانس میں ڈوب جائے اور میرا دل ، تمھارے دل کی تال پر دھڑکنے لگے ، اور قریب آجاؤ ساکیہ ---- میرے ساتھ لگ جاؤ ، آج میں تمہیں ان سرحدوں تک لے جاؤں گی جہاں پہنچ کر عورت کی مملکت ختم ہو جاتی ہے ، میرے ساتھ رہنا میرے سدھارتھ ! ہم زمین کی نچلی تہوں میں اترتے رہیں ، نیچے نیچے ، اور نیچے ، یہاں تک کہ زمین اپنی ٹھنڈک کھو بیٹھے گی ، اور گرم سے گرم تر ہوتی جائے گی ، ہم ایک انجانے علاقے میں پہنچ جائیں گے ۔ غیر مرئی ، نورانی ، ان دیکھا ، انوکھا ، نیم روشن ، نیم تاریک ، جہاں بے شمار چاند ستارے چکر لگا رہے ہوں گے اور ہم ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ، سینہ بسینہ بڑھتے چلے جائیں گے ، آگے ہی آگے . . .

یشودھرا کی آواز بتدریج جیسے کسی تاریک غار میں ڈوب گئی ، اور ہماری سانس ایک دوسرے سے مل گئی ، اور ہمارے دل ایک ہی تال پر دھڑکنے لگے زمین کی تہیں ہمارے قدموں تلے سرکتی چلی گئیں اور ہم نیم روشن ، نیم تاریک گہرائیوں میں اترتے چلے گئے ، نیچے نیچے اور نیچے ---- یہاں تک کہ زمین اپنی ٹھنڈک کھو بیٹھی ، وہ گرم سے گرم تر ہوتی چلی گئی اور پھر ----

پھر ---- جب ہمارے دل اپنی اپنی تال پر دھڑکنے لگے اور ہم ایک بار پھر زمین کی اصلی سطح پر آگئے تو میں نے برساتی کا ندھے پر رکھی ، بال درست کئے ، سگریٹ سلگایا اور بستر پہ بے سدھ پڑی ہوئی ، اپنی رات بھر کی بیوی ، ساکیہ شہزادی کو جھک کر دیکھنے لگا ، بجلی کی پھیکی روشنی میں اس کا چور چور جسم یوں نڈھال پڑا تھا جیسے کئے بعد دیگرے اس نے کئی بچوں کو جنم دیا ہو ، اس کی آنکھیں بند تھیں اور پیشانی پر سرخ بندی کا خون پسینے میں گھل مل رہا تھا ، ہونٹ ذرا سے کھلے تھے اور ہموار دانتوں کی سپید لکیر چمک رہی تھی ، تنفس کے ساتھ اس کا سینہ آہستہ آہستہ ڈوب ابھر رہا تھا ، سیاہ لانبے بال گول گول ٹھوڑی کی حملیں ڈھلوانوں پہ بکھرے ہوئے تھے ۔

یہ صندل کے سایوں میں چھپے ہوئے بدھی مندروں کے دودھیا گنبد ، یہ آندھیرا اولش کے نیلے نیلے تالوں میں کھلنے والے کنول کے پھول ---- انہی گنبدوں کے مقدس سایوں میں بیٹھ کر کالیداس نے شکنتلا لکھی تھی اور یہی وہ کنول کے پھول تھے جن کی کومل پتیوں پر شکنتلا نے راجہ دشمنت کو اپنا پریم سندیسہ لکھ کر بھیجا تھا ۔

یہ متعفن اور کچلا ہوا غلیظ جسم نہیں تھا ۔ یہ فیل روڈ کی بازاری عورت نہیں تھی ۔

یہ مجوراہا ، راہمیشورم اور ملایا کے معبدوں کی سبز جیبوں پہ عظیم ستونوں کے سایوں میں بیٹھ کر پھول بیچنے والی دوشیزہ تھی ---- یہ مس ایلی گلیڈی اور فیلس ڈکنز نہیں تھی ---- یہ سیتا تھی ، رام کی سیتا ۔ جسے بھوک ، غریبی اور افلاس کا راون اس کے وطن سے اٹھا کر یہاں لے آیا تھا ، اور جسے کسی رام اور لچھمن کا انتظار ---- ۔

یہ یشودھرا تھی ، ساکیہ شہزادی ، جس نے جنوبی ہند کے نیلے پانیوں کے جھاگ سے جنم لیا تھا ۔

یہ سنگلدیپ کی اُڑاؤ دیبی تھی ، یہ لنکا کی لاڈلی تھی ۔

یہ مچھلی مارکیٹ نہ تھی ، پھول مارکیٹ تھی ، لوگ اس کے قریب سے ہو کر گذرتے تھے ۔ یہ پاؤڈر کی نقلی مہک نہ تھی ، بلکہ جنگلی پھولوں کی قدرتی خوشبو تھی یہ دھوپ میں چمکنے والا سنہری کلس تھا ۔

یہ لنکا تھی ، زندہ لنکا ---- سیتا کی لنکا ، سونے کی لنکا ۔

میں نے سونے کی لنکا پہ الوداعی نظر ڈالی ، جیسے شہزادہ سدھارتھ نے زنا گری کے مہیب جنگلوں میں نکل جانے سے پیشتر اپنی بیوی یشودھرا کو آخری مرتبہ دیکھا ہو ، اور باہر نکل آیا ---- باہر چوک والی خانقاہ میں پچھلے پہر کا گجر بج رہا تھا ، اور اس کے چمکیلے کلس کے اوپر ایک بڑا سا نیلا ستارہ پھوٹتی سحر کی کافوری جھلکیوں میں ماند پڑ رہا تھا ۔

میں یوں مطمئن اور پرسکون تھا ، جیسے میں سچ مچ گوتم بدھ ہوں ، اور مجھے ابھی ابھی گیان حاصل ہوا ہے ۔

شوکت صدیقی

تیسرا آدمی

دونوں ٹرک سنسان سڑک پر تیزی سے گزرتے رہے!

پتھر پیپر روڈ مشرق کی طرف مڑتے ہی ایک دم سے نشیب میں چلی گئی ہے۔ اور جھکے ہوئے ٹیلوں کے درمیان کسی زخمی پرندے کی طرح ہانپتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ رات اب گہری ہو چکی ہے اور آغازِ سرما کی بپھری ہوئی ہوائیں چل رہی ہیں۔ دونوں ٹرک ڈھلوانوں پر کھڑکھڑاتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ ان کا بے ہنگم شور پتھریلی چٹانوں میں دھڑک رہا ہے۔ ایکا ایکی اندھیرے میں سے کسی نے چیخ کر کہا ——

"اے، کون جا رہا ہے ٹرک روک لو!"

رات کے سناٹے میں یہ آواز بڑی پُراسرار معلوم ہوئی۔ لیکن ٹرکوں کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی، وہ اسی طرح بیٹھے رہے اور دونوں ٹرک جھکی ہوئی چٹانوں کی گہرائی میں تیزی سے گزرتے رہے۔ اس دفعہ زیادہ دور سے آواز سنائی دی ——

"روکو، روک لو ٹرکوں کو!" اور اس کے ساتھ ہی موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کی گڑگڑاہٹ اُبھرنے لگی۔ اس کی تیز روشنی کبھی کبھی دھوپ چھاؤں کی طرح ٹرکوں کے پچھلے حصوں پر لہرا جاتی ہے۔ لیکن ٹرک رک نہیں سکتے، اس لئے کہ بڑے خطرے کا الارم ہے۔ ان کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ سڑک بالکل ویران ہے۔ اور دونوں ڈرائیور بڑے اکسپرٹ ہیں۔

موٹر سائیکل کی روشنی قریب ہوتی جا رہی ہے، اور قریب! اور قریب!! اور اس کا شور ٹرکوں کے نزدیک ہی دھڑکنے لگا ہے۔ ان کی رفتار اب زیادہ نہیں بڑھ سکتی ہے، اس لئے کہ ڈھلوان پر ٹرکوں کے بے قابو ہو جانے کا پورا اندیشہ ہے۔ دونوں ڈرائیوروں کے سہمے ہوئے چہرے خوف زدہ ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن نیلی آنکھوں والا وانچو خاموشی سے بیٹھا ہوا سگریٹ پیتا رہا اور برابر سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ پھر ایک بارگی کوہستانی ٹیلوں کی گہرائی میں ریوالور چلنے کی آواز بڑے بھیانک انداز سے گرجنے لگی اور گولی ٹرک کے پچھلے پہیوں کے پاس سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ ایک بار پھر کسی نے اونچی آواز میں کہا ——

"روک لو ٹرک کو نہیں تو میں ٹائر برسٹ کر دوں گا۔"

اور اس وارننگ کے ساتھ ہی دونوں ٹرک ٹھہر گئے۔ ٹرک کے اندر سے عزت وانچو اُتر کر نیچے آیا۔ باہر بہت جھکڑ کی شوریدہ سر ہوائیں چل رہی تھیں۔ اور ان کی تیز خنکی جسم میں چبھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ وانچو نے اپنے لمبے اوورکوٹ کے کالروں کو درست کیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا موٹر سائیکل کے قریب پہنچ گیا۔ پھر اس نے جلتی ہوئی سگریٹ کو جھنجلاہٹ کے سے انداز میں سڑک پر پھینک کر جوتے سے مسل ڈالا اور بڑے تیکھے لہجہ میں پوچھنے لگا

"اس طرح ٹرکس کو رکوا لینے کا مطلب، کیا چاہتے ہیں آپ؟"

لیکن موٹر سائیکل پر بیٹھا ہوا بھاری بھرکم جسم والا انسپکٹر وانچو کے اس انداز سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا بلکہ بڑی بے نیازی سے کہنے لگا "میں انٹی کرپشن کا انسپکٹر ہوں اور دونوں ٹرکوں کی تلاشی لینا چاہتا ہوں"

وانچو نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ دھندلی روشنی میں اس کا چہرہ بڑا کرخت معلوم ہو رہا تھا، اور ریوالور ابھی تک اس کی انگلیوں میں دبا ہوا تھا۔ وانچو نے پہلی ہی نظر میں، اندازہ لگا لیا کہ بھاری بھرکم جسم والا انسپکٹر پوری طرح دہشت زدہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس نے جھٹ سے کاروباری پینترا بدلا اور ذرا بے تکلفی سے کہنے لگا "اچھا تو آپ ہیں" اور پھر وہ مسکرا دیا۔ "اگر آپ آفشلی پوچھتے ہیں تو، پھر دونوں ٹرکوں پر آلو کے بورے لدے ہوئے ہیں۔ میں ثبوت میں ڈسٹرکٹ اکسائز آفس کی رسید پیش کر سکتا ہوں۔ چونگی کا محصول ابھی پچھلے ہی ناکہ پر ادا کیا ہے۔ اور جو کچھ اصلیت ہے وہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔ اس لئے کہ آئرن شیٹ کو اس طرح لے جانے کا یہ کوئی پہلا اتفاق تو ہے نہیں یہ سلسلہ تو ایک مدت سے چل رہا ہے۔"

انسپکٹر گردن ہلا کر بولا۔

"جی ہاں سنا تو کچھ میں نے بھی یہی ہے اور اسی لئے کئی گھنٹوں سے اس سڑک پر ٹہلتا رہا تھا۔"

وانچو ہنسنے لگا "یہ تپسیا تو آپ نے خواہ مخواہ اپنے سر مول لی۔ میں نے آپ کو دو مرتبہ ٹیلیفون کیا۔ اگر آپ دفتر میں مل جاتے تو آپ کو اس طرح کیوں پریشانی اٹھانا پڑتی اور نہ خود مجھے بھی یہاں سردی میں نہ آنا پڑتا۔ مگر چلئے یہ بھی ٹھیک ہی رہا۔ اس بہانے آپ کے درشن تو ہو گئے!"

اور وہ تین سو روپے جو احمد پور کے اس ٹرپ میں وہ بچا لینا چاہتا تھا۔ آخر اس نے ان کرنسی نوٹوں کو اندرونی جیب میں سے نکالا اور انسپکٹر کی طرف ان کو بڑھا کر کہنے لگا۔

"آپ سے پہلی بار ملاقات ہوئی ہے۔ اس لئے کچھ نہ کچھ نذرانہ تو دینا ہی پڑے گا۔ لیجئے ان کو رکھ لیجئے۔ فرمائیے اور کیا سیوا کی جائے!"

انٹی کرپشن کا انسپکٹر روکھے پن سے بولا۔

"اس مہربانی کا شکریہ! اب اتنی اور مہربانی کیجئے کہ ان کو اپنے ہی پاس رہنے دیجئے۔"

وانچو ذرا سنجیدہ ہو کر خاموش ہو گیا دونوں اندھیرے میں چپ چاپ کھڑے رہے۔ اور کوہستانی چٹانوں میں پت جھڑ کی بپھری ہوئی ہوائیں چیختی رہیں۔ آگے کھڑے ہوئے ٹرکوں کے اندر سرگوشیوں کی دبی دبی آوازیں بھنبھنا رہی تھیں۔

وانچو غور کرنے لگا کہ یہ آسانی سے ماننے والی آسامی نہیں ہے۔ اس سالے کو ابھی کچھ اور بھی دکشنا دینا پڑے گی۔ اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ ہر کامیاب جرم کی سازش پہلے پولیس اسٹیشن کے اندر ہوتی ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ سودا بعد میں بھی طے ہو سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ سب مایا کے کھیل ہیں اور مایا کے روپ نیارے ہیں۔ اسی لئے جرائم کی نوعیتیں جداگانہ ہیں۔ جیب کاٹنے والا زیادہ سے زیادہ ہسٹری شیٹر بن سکتا ہے۔ اور کارہائے نمایاں انجام دینے والا سرمایہ دار ہو جاتا ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ ہسٹری شیٹر بننے کے لئے پولیس کی سرپرستی درکار ہوتی ہے اور سرمایہ داری کے لئے گورنمنٹ سے سازباز کئے بغیر کام نہیں چلتا۔ وانچو نے جیب کے اندر سے کچھ اور کرنسی نوٹ نکالے اور آہستہ سے کہنے لگا

"انسپکٹر تیواری جب تک اس سرکل میں تعینات رہے ہماری انڈسٹری کی طرف سے ان کو اسی حساب سے ان کا حق برابر پہنچتا رہا۔" پھر خوشامد کے سے انداز میں وہ مسکرا کر بولا "لیکن آپ کو اس طرح جاڑے پالے میں اگر پریشان ہونا پڑا ہے، اب اس پریشانی کا بھی کچھ خیال کرنا پڑے گا۔ لیجئے یہ

دو سوا دو ہیں۔ دیکھئے اب کچھ نہ کہئے گا اور اپنا یہ ریوالور تو آپ اب اندر رکھ لیجئے۔ خواہ مخواہ آپ سے خوف معلوم ہو رہا ہے۔"

مگر بھاری بھرکم جسم والا انسپکٹر اسی طرح ناراضگی کے سے انداز میں بولا۔۔۔

"دیکھئے آپ مجھے غلط سمجھنے کی کوشش نہ کیجئے۔ میں ان دونوں ٹرکوں کو پولیس اسٹیشن لے جائے بغیر باز نہ آؤں گا۔ آپ خواہ مخواہ میرا بھی وقت خراب کر رہے ہیں اور خود بھی پریشانی اٹھا رہے ہیں۔" اور وہ موٹر سائیکل کی اسٹارٹ کرنے لگا۔

اس دفعہ وانچو کی مسکراہٹ نے دم توڑ دیا۔ اس نے بڑی تیکھی نظروں سے۔ انسپکٹر کو گھور کر دیکھا۔ اس عرصہ میں پہلی بار اس کو خطرے کی نوعیت کا احساس ہوا تھا۔ اس لئے کہ دونوں ٹرک کسی طرح بھی پولیس اسٹیشن نہیں جا سکتے تھے۔ کمپنی کا یہی حکم تھا یہی ہدایت تھی۔ اور اس ذمہ داری کے لئے کمپنی سے اس کو نو سو روپے ماہوار تنخواہ کے علاوہ مینجنگ ڈائرکٹر کی طرف سے چھ سو روپے اکسٹرا الائنس بھی ملتا تھا۔ وانچو کئی ماہ سے اپنی اس ڈیوٹی کو بڑی مستعدی سے انجام دے رہا تھا۔ کمپنی اس کی کارگزاریوں کو سراہتی رہی ہے۔ اور بورڈ آف ڈائرکٹرز کی میٹنگ میں بہت سی باتوں کے لئے اس کو جواب دہ بھی ہونا پڑتا ہے۔ اور اکثر ایسے بے تکے سوالوں سے اس کو سابقہ پڑتا کہ وہ بدحواس سا ہو جاتا۔ اس لئے وہ پانچسو روپے سے زیادہ دو ٹرکوں کے لئے رشوت نہیں دے سکتا۔ ورنہ آئندہ میٹنگ میں اگر کوئی ڈائرکٹر الجھ گیا تو بہت ممکن ہے کہ زائد رقم اس کو اپنی تنخواہ سے ادا کرنا پڑے۔ اور بات بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ دراصل ابھی تک فیکٹری کی تعمیر کے لئے کمپنی اپنے پاس سے صرف روپیہ ہی لگا رہی ہے۔ شوگر پلانٹ کی تعمیر ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ البتہ کمپنی کے وہ فارم جن میں الجھ کی کاشت ہو گی، ان میں ٹریکٹر چلنے لگے ہیں اور آلو کی فصلیں تیار کی جا رہی ہیں۔ اور یہ آلو گنی بیگس میں بھر کر قصباتی بازاروں میں فروخت ہونے کے لئے بھیج دئے جاتے ہیں۔ آلوؤں کے ساتھ سیمنٹ کی بوریاں اور آئرن شیٹس بھی ٹرکوں میں لاد کر پوشیدہ طور پر بلیک مارکیٹ میں جاتے ہیں۔ کمپنی کو اپنی انڈسٹری کی تعمیر کے لئے سیمنٹ اور آئرن کا بہت بڑا سرپلس کوٹا مل گیا ہے جس کی سمگلنگ سنسان راتوں میں بڑے پُراسرار طریقے پر ہوتی ہے، اور اس سازش میں پولیس کے علاوہ دوسرے محکمے بھی کمپنی کے شریک ہیں۔

وانچو غور کرنے کے سے انداز میں خاموش کھڑا رہا۔ اس کی گھنی بھنویں آنکھوں پر جھکی ہوئی معلوم ہو رہی ہیں۔ اور چہرے کے تیکھے نقوش مجسموں کی طرح ٹھوس نظر آ رہے ہیں۔ پھر ایک بارگی اس نے طے کر لیا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ انہیں وحشت ناک موقعوں کے لئے وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ جو کچھ کرنا ہے اس کے فیصلے کے لئے منٹ بھر کا عرصہ بہت ہے۔ اور جو لوگ صرف انجام ہی پر غور کرتے ہیں وہ کبھی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے۔ اور پھر بوجھل قدموں سے چلتا ہوا وہ آگے والے ٹرک کے پاس پہنچ گیا اور سرگوشی کے سے انداز میں آہستہ آہستہ پکارنے لگا۔۔۔

"نیل کنٹھ، اے نیل کنٹھ مہاراج۔"

اور ٹرک کے اندر سے مضبوط پٹھوں والا نیل کنٹھ دھنسی ہوئی آواز میں بولا۔۔۔

"کیا ہے سکرٹری صاب؟"

پھر وہ اُز کر نیچے آ گیا۔ اس کا آبنوسی جسم رات کے گہرے اندھیرے میں پرچھائیوں کی طرح دھندلا نظر آ رہا تھا۔

وانچو کہنے لگا۔ "دیکھو نیل کنٹھ یہ سالا انسپکٹر تو مانتا ہی نہیں۔ اور تم جانتے ہو کہ دونوں ٹرک تھانے پر بھی نہیں جا سکتے۔"

وہ سینہ تان کر بولا۔

"تو جو حکم ہو!"

گہری نیلی آنکھوں والے وانچو نے اس کو بھرپور نظروں سے دیکھا اور پھر سازش کرنے کے سے انداز میں اس نے ایک آنکھ دبا کر آہستہ سے کہا "مجھ کو تو صرف لائن کلیئر کی ضرورت ہے زیادہ جھنجھٹ نہیں چاہئے۔" پھر مڑتے ہوئے بولا "اور کہا میں جا کر اس سے باتیں کرتا ہوں۔ تم ٹرکوں کی پشت پر سے گھوم کر آ جانا۔ سمجھ گئے نا!"

"اور نیل کنٹھ جیسے سب کچھ سمجھ گیا۔ اُس کی آنکھیں جرائم پیشہ لوگوں کی طرح خونخوار نظر آنے لگیں۔ وانچو وہاں سے سیدھا انٹی کرپشن کے انسپکٹر کے پاس چلا گیا۔ وہ اس کو آتے ہوئے دیکھ کر تیزی سے بولا

"آپ نے ٹرکوں کو سٹارٹ نہیں کروایا، بلا وجہ دیر ہو رہی ہے۔"

وانچو بڑی سنجیدگی سے بولا "آپ تلاشی لیں گے یا ٹرکس اسی طرح چلیں گے؟"

وہ کہنے لگا "بظاہر تو اب کوئی ایسی ضرورت نہیں، یوں جیسے آپ کی مرضی!"

وانچو ایک بار پھر کاروباری انداز سے مسکرا دیا "انسپکٹر صاحب مرضی ہماری کہاں، مرضی تو آپ کی ہے۔ ہم نے تو اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، مگر آپ کی ناراضگی ختم ہی نہیں ہوتی۔"

وہ بے نیازی سے بولا "دیکھئے ان بے کار باتوں سے کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ آپ کو جو کچھ کہنا ہو آپ تھانے پر چل کر کہہ لیجئے گا۔"

وانچو سنجیدہ ہو گیا۔ "بہت اچھی بات ہے۔ لیکن اتنا میں آپ کو ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ جو لوگ آڈٹ سٹیٹس اور بیمنٹ کا نر بیس کو ٹال سکتے ہیں۔ اور جو اس کو سمگل بھی کرا سکتے ہیں وہ اپنے بچاؤ کے طریقے بھی جانتے ہی ہوں گے۔ چور چوری کرنے جاتا ہے تو باہر نکلنے کا رستہ بھی پہلے دیکھ لیتا ہے۔"

اور اس میں شک نہیں کہ وانچو ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اس بیسے کہ "یونائیٹڈ انڈسٹریز لمیٹڈ" کے دو ڈائرکٹر ایم، ایل، اے ہیں اور ان میں سے ایک تو ریونیو منسٹر کا داماد بھی ہے۔ اور اسی لئے سرکاری محکموں میں کمپنی کا اثر بھی ہے اور زور بھی ہے۔ لیکن بھاری بھر کم جسم والا انسپکٹر ان تمام باتوں کو نہیں جانتا تھا۔ اس سرکل میں ابھی اس کا نیا نیا ٹرانسفر ہوا ہے۔ اس لئے پورے علاقہ میں وہ اپنی دھاک بٹھا دینا چاہتا ہے۔ اور اس کے لئے ایک آدھ بڑا کیس بنائے بغیر بات نہیں بنتی۔ اور پولیس کی ٹکنیک کے مطابق ایک بار جہاں ہوا بندھ گئی پھر تو لکشمی آ کر خود قدم چومتی ہے۔ اور اسی لئے وہ کسی طرح باز نہیں آ سکتا۔ وانچو کی باتوں پر جھنجھلا کر اس نے جواب دیا ——

"ممکن ہے آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں۔ ابھی تو آپ چل کر ذرا حوالات میں ٹھہریئے۔ پھر دیکھیں گے کہ آپ لوگ اپنے بچاؤ کا کون سا طریقہ جانتے ہیں۔"

اس دفعہ وانچو بھی بپھر گیا۔ اس نے تیزی سے کہا جیتا جیسے اب

"انسپکٹر صاحب مجھے کیلاش ناتھ وانچو کہتے ہیں۔ میں تھانہ تک جانے سے پہلے بات کو یہاں بھی نمٹا کر سکتا ہوں۔ آپ کے ایسی پڑ رہی ہے۔ کے انسپکٹروں سے یہاں اکثر سابقہ پڑا کرتا ہے۔ اگر ان میں سے آپ کو کوئی مل گیا ہوتا تو اس طرح مونچھ اونچی کر کے آپ کو بات کرتے۔" کمپنی کی غیر قانونی انسپکٹر کے چہرے پر اور بھی خشونت آگئی۔ وہ اس کو کڑی تیکھی نظروں سے گھورنے لگا۔ اور اسی وقت آبنوسی جسم والے نیلو کو بھی معلوم ہے، جس کو سر پر آہنی راڈ اٹھا کر زور سے دے مارا۔ انسپکٹر نے دبی ہوئی کراہ کے ساتھ ہائے کر کے پھٹی ہوئی بھیانک آواز نکالی تکنیک۔ سے زیادہ گھوڑوں کی گر پڑا۔ اس کی انگلیوں میں دبا ہوا ریوالور ابھی تک کانپ رہا تھا۔ وانچو نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ کو اپنے بوجھل بوٹ دوڑائے ہیں۔ اور عورت کے کو چھین کر ٹیلوں کی طرف پھینک دیا۔ اور اس کی ریڑھ کی ہڈی پر ایک بھرپور لات مار کر بڑبڑانے لگا —— سرکاری حلقوں میں گشت کرنے لگی ہیں اس نے

"دھت تیرے کی، سالا کسی طرح مانتا ہی نہ تھا۔" اور پھر وہ نیل کنٹھ سے کہنے لگا "مہاراج ڈال دو" اس دور اندیشی نے اس کو کنور شیو راج سنگھ سے اطمینان سے ایک سگریٹ سلگا کر پوچھنے لگا "ہاں یہ دیکھ لو کہ زخم گہرا تو نہیں، ورنہ ملا وجہ کی باتوں سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا۔ بلکہ اس نے بڑی نیل کنٹھ کہنے لگا "ہاتھ بھرپور نہیں پڑا ہے۔ کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے۔"

پھر نیل کنٹھ نے سڑک پر بے سدھ پڑے ہوئے بھاری بھر کم جسم والے انسان کا چہرا خون میں ڈوب کر بڑا بھیانک نظر آ رہا تھا۔ اور سانس سہمی ہوئی سی چل رہی تھی۔

کی طرح بے جان پڑا رہا۔ اور آغازِ سرما کی تیکھی ہوائیں پتھریلی چٹانوں میں ہانپتی رہیں۔ اور ایک بارگی کہیں نزدیک ہی گیدڑوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔
دونوں ٹرکوں کے اسٹارٹ ہونے کی گڑگڑاہٹ سنسان رات میں اُبھرنے لگی۔ اور وہ موٹر سائیکل کو بُری طرح روندتے ہوئے ٹریک پر پھر چلنے لگے۔ لیکن احمد پور جانے کے بجائے اب وہ جنوبی ٹیلوں کی طرف مڑ رہے تھے۔ اور کوئی سترہ میل کا چکر کاٹنے کے بعد دونوں ٹرک پھر اسی چوراہے پر پہنچ گئے جہاں لوہے کے کھمبے پر لگے ہوئے بورڈوں پر لکھا تھا۔

بلیر گھاٹ اکیاون میل۔
سجنواں کلاں، اٹھارہ میل
شیام باڑہ۔ چوراسی میل
احمد پور ایک سو باون میل

قریب ہی ڈسٹرکٹ آکٹرائے ٹیکس آفس تھا جس کے جھکے ہوئے سائبان کے نیچے ایک دھندلا سا لیمپ جل رہا تھا۔ اور بوڑھا محرر رجسٹروں کو کھوئے ہوئے کھانس رہا تھا۔ ابھی کچھ عرصہ قبل یہاں پر دونوں ٹرکوں کی چونگی کا محصول ادا کیا گیا تھا۔ وانچو ٹرک پر سے اُترا اور سیدھا سائبان کے نیچے چلا گیا اور سرگوشی کے لہجے میں آہستہ سے بولا۔
"منشی جی میرے خیال میں آپ کے رجسٹروں میں ٹائم تو درج نہ ہوتا ہوگا" اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے چوکنا نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور تیس روپے کے کرنسی نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دئے۔ "لیجئے ان کو رکھ لیجئے، اگر کوئی دریافت کرنے آئے تو کہہ دیجئے گا کہ دونوں ٹرک کوئی ساڑھے آٹھ بجے کے قریب یہاں آئے تھے۔ سمجھ گئے نہ آپ"
اور بوڑھے محرر نے اپنی گردن ہلا دی" ایسا ہی ہو جائے گا۔ پر کوئی گھبرانے کی بات تو نہیں؟
وانچو ڈرامائی انداز میں قہقہہ لگا کر کہنے لگا
"جب تک ہم موجود ہیں اس وقت تک بھلا آپ پر کوئی آنچ آسکتی ہے"
وہ بھی ہنسنے لگا" سو تو ہے۔ پر بات اتنی ہے سرکار کہ اب زمانہ بڑا خراب لگ گیا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر سسرے بال کی کھال نکالنے اس
چلتا ہوا۔
نیلی پتھر چونگی کے بوڑھے محرر کو مطمئن کر کے وہ مسکراتا ہوا ٹرک کے اندر جاکر بیٹھ گیا۔ دونوں ٹرک پھر روانہ ہو گئے۔ سامنے تمبر پور روڈ اور ٹرک ۔ کھاتی ہوئی چلی گئی ہے۔ مگر دونوں ٹرک پھر اس پر جانے کی بجائے راہیل روڈ کی طرف مڑ گئے۔ وانچو نے گھڑی میں وقت دیکھا ہے سکڑی رہا تھا، اور پھر دو بجنے سے پہلے ہی دونوں ٹرک لیر گڑھ پولیس سٹیشن کے قریب جاکر ٹھہر گئے۔ وانچو تھانہ کے اندر چلا گیا۔
پھر وہ اُدھر کو نیچے آگیا سو روپے دے کر اس نے ایک ٹرک کا چالان کرا دیا۔ روزنامچہ میں درج کر دیا گیا۔
وانچو کہنے لگا۔" دیکھو نیل نمبر ۲۱۲۹، نو بجے شب کو راہیل روڈ پر سے گزرتے ہوئے بغیر ہیڈ لائٹس کے پایا گیا۔ تفتیش
وہ سینہ تان کر بولا ۔ کہ اس کی بیٹری خراب تھی۔ ٹرک مذکور یونائیٹڈ انڈسٹریز لمیٹڈ کی ملکیت ہے۔ اور پاس
"تو جو حکم ہو!"
ے تھے"
گہری نیلی آنکھوں والے وانچو نے اس کو پھر سو روپے رشوت دے کر دوسرے ٹرک کا بھی چالان کرا دیا، اور ہیڈ کانسٹیبل سرکاری
مجھ کو تو صرف لائن کلیر کی ضرورت ہے زیادہ جھنجھٹ
کی پشت پر سے گھوم کر آجانا۔ سمجھ گئے نا!" ۶۲۲۸ راہیل روڈ پہ اتنی تیز رفتار سے گزر رہا تھا کہ کسی حادثہ

کے ہو جانے کا خطرہ تھا۔ ڈیوٹی انسپکٹر ہرنام سنگھ نے اس کو رکوا کر تحقیقات کی تو یہ بھی معلوم ہوا
کہ ڈرائیور مسمی نذر محمد کے پاس ڈرائیونگ لائسنس بھی موجود نہ تھا۔

اس کے بعد دونوں ٹرک پھر ابیل روڈ پر تیزی سے گزرنے لگے اور صبح کاذب کی گہری دھند میں دونوں ٹرک بلیر گھاٹ پہنچ گئے۔ پھر چھ بجے سے پیشتر ہی وانچو بھارت انجینئرنگ ورکس کی نئی اسٹوڈی بیکر پر واپس لوٹ پڑا۔ اور ابھی دھوپ اچھی طرح پھیلنے بھی نہ پائی تھی کہ اس کی کار فیکٹری کے پھاٹک کے اندر داخل ہو گئی۔

وانچو اپنے دفتر میں جا کر حسب معمول کمپنی کے کاموں میں اُلجھ گیا اور رات کے حادثہ کی اہمیت سنیچر کے روز ہونے والے اس ڈرامے سے زیادہ نہ رہی، جس میں ریلوے کی ایک بیگرج فیکٹری کے یارڈ کے اندر ڈیچ ہو گئی تھی۔ اور اس نقصان کے لئے ریلوے نے کوئی چار ہزار روپے کا کلیم کیا تھا۔ اور عدالتی کارروائیوں کے لئے ہیرندر پرشاد ایڈووکیٹ کمپنی کے مشیر قانونی موجود ہی تھے۔

پولیس تحقیقات کرتی رہی۔ تفتیش برابر ہوتی رہی اور اینٹی کرپشن کا بھاری بھرکم جسم والا انسپکٹر ہسپتال میں پڑا کراہتا رہا۔ اور مضبوط پٹھوں والا نیل کنٹھ بھنگ چڑھا کر بڑھاپے سے گالیاں بکتا اور اپنے کوارٹر کے اندر لیٹا ہوا رات گئے تک اونچی آواز میں آلہا گاتا رہا۔

"اور اگر تمہاری بات نہ مانی جائے تو؟"
"پھر تو کنور صاحب اس کا نتیجہ کچھ اچھا نہیں نکلے گا۔"
"لیکن دلیپ چند تمہیں معلوم ہے کہ میں کمپنی کا منیجنگ ڈائریکٹر ہوں؟"

کمرے کے اندر اسی طرح تیز لہجے میں باتیں ہوتی رہیں۔ آتشدان میں کوئلے چٹخ رہے تھے۔ دہکتے ہوئے سرخ انگاروں کی روشنی میں وانچو کا گنجا سر چمکنے لگا تھا۔ مگر وہ خاموش بیٹھا ہوا اپنا بجھا سا پائپ پیتا رہا۔ دریچے سے ہوا کے یخ بستہ جھونکے اندر آ رہے تھے اور فیکٹری کے ورکشاپ میں دھڑکتی ہوئی لوہے کی جھنکاروں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ باہر ہلکی نیلگوں کہر کے لچھے منڈلا رہے تھے، اور اس دھند میں لپٹی ہوئی منیجنگ ڈائریکٹر کی خوبصورت کوٹھی اونگھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ جس کے باہری برآمدے میں نیل کنٹھ دیوار سے پیٹھ کو لگائے چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا۔ برآمدے میں بالکل اندھیرا تھا اور اس گہری تاریکی میں نیل کنٹھ کا سیاہ آبنوسی جسم آسیب زدہ سایہ کی طرح ڈراؤنا معلوم ہو رہا تھا۔

نیل کنٹھ اس طرح اندھیرے میں خاموش بیٹھا رہا اور جب کبھی دیپ چند تیزی سے بولتا تو وہ چونک کر کمرے کے دروازے کی طرف گھبرا کر دیکھتا جیسے اب کچھ نہ کچھ ہونے ہی والا ہے۔ لیکن دیپ چند اندر بیٹھا ہوا اطمینان سے باتیں کرتا رہا۔ اس کے چہرے پر ٹیبل لیمپ کے "شیڈ" کی پرچھائیں پڑ رہی ہے۔ اور اس دھندلی روشنی میں اس کا ننھا جسم ناٹک کے کسی مسخرے کی طرح حقیر نظر آ رہا ہے۔ مگر دیپ چند کمپنی کا چیف اکاؤنٹنٹ ہے۔ کمپنی کی غیر قانونی سازشوں میں اس کا کردار بہت اہم ہے۔ یہ بات نیلی آنکھوں والا وانچو بھی جانتا ہے اور اس کی اہمیت منیجنگ ڈائریکٹر کو بھی معلوم ہے، جس کو فیکٹری کے اندر سب لوگ کنور صاحب کہتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ رانی بازار کے علاقہ کا جاگیردار ہے۔ وہ کاروباری تکنیک سے زیادہ گھوڑوں کی نسلوں اور عورتوں کی مختلف قسموں کے متعلق بہت کچھ جانتا ہے۔ اس لئے کہ اس نے زندگی بھر ریس میں گھوڑے دوڑائے ہیں۔ اور عورت کے جسم پر کسی کیمیاگر کی طرح کوک شاستری تجربے کئے ہیں، اور جب سے جاگیرداری پر زوال آنے کی افواہیں سرکاری حلقوں میں گشت کرنے لگی ہیں اس نے بھی اپنے سرمائے کو محفوظ کرنے کے لئے کسی انڈسٹری میں داخل ہو جانا ہی اپنے حق میں بہتر سمجھا۔ اور اس دور اندیشی نے اس کو کنور شیو راج سنگھ سے ایکایک یونائیٹڈ انڈسٹریز کا منیجنگ ڈائریکٹر بنا دیا ہے۔ لیکن کمپنی کا چیف اکاؤنٹنٹ اس کی باتوں سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا۔ بلکہ اس نے بڑی بے نیازی سے کہہ دیا ——

"اور آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ میں کمپنی کا چیف اکاؤنٹنٹ ہوں۔ سارے رجسٹر میرے ہی پاس رہتے ہیں"

مینجنگ ڈائریکٹر یک بارگی برافروختہ ہو کر بولا ــــ

"ٹھیک ہے کہ تمام رجسٹر تمہاری نگرانی میں رہتے ہیں۔ مگر اس بات سے تمہارا مطلب؟"

وہ کہنے لگا "چوٹ کھایا ہوا انسان بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ کنور صاحب آپ میرے ساتھ حق تلفی کریں گے تو میں بھی سارے رجسٹروں کو کل ڈائرکٹروں کی میٹنگ میں پیش کر سکتا ہوں"

مینجنگ ڈائرکٹر کے سانس کی رفتار ایک دم سے تیز ہو گئی اور وہ منحنی جسم والے دیپ چند کو عقابی نظروں سے گھورنے لگا لیکن دیپ چند بیٹھا مزے سے اپنی کنپٹی کھجاتا رہا۔ اس لئے کہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ مینجنگ ڈائرکٹر اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ پوری طرح اس کے قابو میں ہے۔

دیپ چند اس کی سازش کے اتنے بڑے راز کا محافظ ہے کہ وہ جس وقت بھی چاہے اس کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ سیمنٹ اور آئرن جن داموں میں چور بازار میں فروخت ہوتا ہے کمپنی کے رجسٹروں میں اس کی قیمت بہت کم درج کی جاتی ہے۔ اور اس طرح اب تک مینجنگ ڈائرکٹر نے پوشیدہ طور پر کوئی دو لاکھ روپیہ غبن کر لیا ہے۔ لیکن دیپ چند کو اپنے اعتماد میں رکھنے کے لئے اس نے دس فیصد کا شرکت دار بنایا تھا اور اس بیس ہزار روپے کی ادائیگی کے لئے اس کی نیت بدل گئی اور دیپ چند کے اکثر توجہ دلانے پر بھی وہ برابر ٹالتا رہا۔ لیکن دیپ چند یہ طے کر کے آیا تھا کہ آج وہ کچھ نہ کچھ فیصلہ کر کے جائے گا۔ اس لئے کہ اس کی بڑی لڑکی کرشنا وتی کے بیاہ کی بات ایک ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر کے لڑکے سے طے پا چکی ہے۔ گھر اچھا ہے اس کے لئے کوئی شبھ گھڑی دیکھ کر لگن ہو جانا چاہئے۔ لیکن اس کے لئے کاشتکوں کے رواج کے مطابق ابھی اس کو دس ہزار روپیہ تلک میں دینا ہے۔ ورنہ یہ سگائی نہیں ہو سکتی۔ لیکن مینجنگ ڈائرکٹر چاہتا ہے کہ بورڈ آف ڈائرکٹرز سے سفارش کر کے اس کی تنخواہ ڈھائی سو روپے ماہانہ سے ساڑھے تین سو کروا دے۔ مگر دیپ چند کو یہ رشوت منظور نہیں ہے۔ اسے بیس ہزار روپیہ چاہئے ــــ اس لئے کہ وہ اپنی لڑکی کا بیاہ جلد ہی کر دینا چاہتا ہے۔

مینجنگ ڈائرکٹر کا چہرہ جھنجھلاہٹ کے اثر سے برابر غضبناک ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی کاروباری زندگی پر جاگیرداری کا روپ برابر حاوی ہوتا جا رہا ہے۔ پھر یک بارگی وہ کمپنی کے مینجنگ ڈائرکٹر سے صرف رانی بازار کے علاقہ کا کنور شیو راج سنگھ رہ گیا۔ اس نے میز پر زور سے گھونسہ مار کر کہا "تم میرے کمرے سے باہر نکل جاؤ" اور پھر وہ چیخ کر زور سے بولا "جاؤ جو تمہارے جی میں آئے کرو"

اور منحنی جسم والا ناملک کا مسخرہ مسکین سی شکل بناتے ہوئے خاموشی سے اٹھ کر دروازے سے باہر چلا گیا۔ کمرے کے اندر گہری خاموشی چھا گئی۔ آتش دان میں دہکتے ہوئے کوئلے کبھی کبھی چٹخنے لگتے ہیں اور باہر لان میں دیپ چند کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔ پھر وانچو نے اپنا پائپ میز پر رکھ دیا اور مینجنگ ڈائرکٹر سے کہنے لگا ــــ

"کنور صاحب یہ آپ نے کیا کر دیا؟"

"کچھ نہیں سب ٹھیک ہے۔ کل سویرے ہی اس کو نوٹس دے کر نوکری سے علیحدہ کر دو"

وانچو گھبرا کر بولا

"لیکن اس طرح سے کام تو نہیں چلے گا۔ بلکہ اب تو وہ اور بھی آسانی سے ہم کو بلیک میل کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے پاس ہمارے خلاف بہت سے ڈاکومینٹری ثبوت موجود ہیں"

کنور شیو راج سنگھ گہری خاموشی میں کھو گیا، اور خود کو بڑا بے بس محسوس کرنے لگا۔ پھر اس نے بڑی بے چارگی سے کہا ــــ

"اچھا تو اب کچھ تم ہی کرو"

وانچو کہنے لگا " آپ ذرا اندر کوٹھی میں تشریف لے جائیں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے ہوتے ہوئے بھلا آپ پر کوئی حرف آ سکتا ہے ۔"

کنور شیوراج سنگھ نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا اور پھر کرسی پر سے اٹھ کر وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد وانچو نے نیل کنٹھ کو اندر کمرے میں بلایا اور اس سے کہنے لگا ——

" نیل کنٹھ مہاراج " دیکھو دیپ چند ابھی زیادہ دور نہ گیا ہوگا۔ تم جا کر اس کو بلا لاؤ۔ کہنا کہ سیکرٹری صاحب نے بلایا ہے " اور نیل کنٹھ تیز تیز قدموں سے کوٹھی کے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ لوٹا تو اس کے ہمراہ دیپ چند بھی تھا۔ نیل کنٹھ پھر جا کر ورانڈے میں ٹھہر گیا اور وانچو دیپ چند سے کہنے لگا

" اکاؤنٹنٹ صاحب آپ بھی خوب آدمی ہیں بوڑھے ہونے کو آ گئے مگر مزاج پہچاننا آپ کو ابھی تک نہیں آیا۔ بھلا اس طرح بھی کوئی بات طے ہوتی ہے "

لیکن دیپ چند بھی کم سیانا نہ تھا۔ وہ پہلے ہی بھانپ گیا تھا کہ اس کا " تیر " ٹھیک پڑا ہے، اور اب وہ اس کے قابو سے نکل کر جا نہیں سکتے۔ اس دفعہ وہ بھی ذرا نرمی سے بولا ——

مگر سیکرٹری صاحب یہ تو دیکھئے کہ کنور صاحب تو میرا گلا کاٹنے پر تلے ہوئے ہیں۔ آپ ہی بتائیے کہ میں کرتا بھی کیا ؟"

وانچو اپنے خاص انداز میں ہنسنے لگا ——

" کمال کر دیا آپ نے، آتنا تو آپ جانتے ہی ہیں کہ زندگی میں پہلی بار وہ اس کاروباری بکھیڑے میں آ کر پھنسے ہیں۔ انہوں نے تو ہمیشہ حکم چلائے ہیں اور اپنی جاگیر میں من مانی حکومت کی ہے۔ دیکھئے رئیسوں سے بات کرنے کا اور ہی گر ہوتا ہے۔ ان کے سامنے تو ہر بات پر بس ہاں کرتے جائیے پھر جو کام جی چاہے ان سے کرا لیجئے "

اور دیپ چند نے جیسے اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا۔ ذرا پشیمانی کے سے انداز میں کہنے لگا

" اب کیا عرض کروں سیکرٹری صاحب مجھے بھی اس وقت نا معلوم کیا سوجھی کہ ان کے سامنے ذرا تیزی سے بات کرنے لگا۔ دراصل میں اپنی لڑکی کی منگنائی کے سلسلے میں ادھر بڑا پریشان ہوں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ میں بواسیر کا پرانا مریض ہوں۔ روز بروز تندرستی گرتی جا رہی ہے۔ اپنی زندگی میں ہی اس کے ہاتھ پیلے کر دوں۔ بس اب تو یہی لگن ہے "

وانچو ہمدردی کرنے لگا

" جی ہاں لڑکی کا ہونا بھی اس سوسائٹی میں اچھی خاصی مصیبت ہی ہے۔ لیکن بات کے اسی پہلو پر آپ نے زور دیا ہوتا تو بھلا کنور صاحب انکار کر سکتے تھے۔ انہوں نے لاکھوں روپیہ رئیس بازی پر تباہ کیا ہے۔ کیا اس کنیا دان کے لئے وہ کچھ نہ کرتے "

" اچھا تو آپ ہی بتائیے کہ میں کیا کروں ؟"

وانچو کہنے لگا " کیجئے گا کیا ! کنور صاحب نے جب آپ سے وعدہ کیا ہے تو آپ کو اپنا روپیہ ملے گا "

نحیف جسم والے دیپ چند کے روکھے چہرے پر یک بارگی زندگی کی رمق ہویدا ہو گئی۔ وہ مسکرا کر بولا " تو پھر اس کام کو اب نرا ہی دیجئے سیکرٹری صاحب ! آپ کا بہت بڑا احسان ہوگا "

وانچو جلدی سے بولا ——

" آپ خواہ مخواہ مجھ کو شرمندہ کر رہے ہیں " پھر اس نے میز کی دراز سے کنجی نکالی اور دیپ چند کے سامنے اس کو ڈال کر کہنے لگا " لیجئے ذرا سیف میں سے چیک بک نکال لیجئے۔ میں آپ کے لئے ابھی چیک تیار کئے دیتا ہوں۔ اس وقت تو کنور صاحب کا موڈ بگڑا ہوا ہے۔ سویرے آفس بھیجنے سے پہلے ہی میں ان سے دستخط کروا کے آپ کو چیک دے دوں گا۔ آپ بالکل اطمینان رکھیں "

اور دیپ چند جیسے واقعی مطمئن ہوگیا۔ اُس نے کچھ بھی نہ کہا۔ اور چپ چاپ گھبرائے ہوئے انداز میں کنجی اٹھائی اور دیوار کے پاس کھڑے ہوئے آہنی سیف کے پاس پہنچ گیا۔ پھر دیپ چند نے اس کے اوپر لگے ہوئے گہرے سبزی مائل چھوٹے سے بلب کو دیکھا جو اپنی ایک آنکھ سے اس کی طرف گھور رہا تھا۔ گویا خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس نے تالے کو کھول کر دروازے کو باہر کی طرف کھینچ لیا۔ آہنی سیف کا اندرونی حصہ منہ پھاڑے ہوئے نظر آنے لگا۔ اور وانچو گردن موڑے ہوئے مجرمانہ نظروں سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اور جیسے ہی دیپ چند نے آہنی سیف کے نچلے خانے کا ہینڈل مضبوطی سے پکڑ کر اس کو کھولنا چاہا اسی وقت وانچو نے دیوار میں لگے ہوئے سوچ کو دبا دیا۔ دیپ چند ایکا ایکی بڑی بھیانک آواز سے چیخا۔ پھر اس کے کراہنے کی دبی دبی آوازیں گہری خاموشی میں ہانپنے لگیں۔ اور وانچو نے جھٹ سے کمرے کے اندر اندھیرا کر دیا۔ آتش دان کی گہری سُرخ روشنی میں اس کا بے ہنگم سایہ سامنے والی دیوار پر بڑا مہیب نظر آنے لگا۔ دیپ چند کے حلق کے اندر سے بلیوں کے غرانے کی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اور باہر فیکٹری کے ورکشاپ میں لوہے کے ٹکرانے کی جھنکاریں دھڑک رہی تھیں۔ ہر طرف کہر بار دھندلکا چھایا ہوا تھا اور کمرے کی آسیب زدہ تاریکی میں کھڑا ہوا وانچو بڑا پُراسرار معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت تھی اور اس کے گنجے سر پر پسینہ کی نمی آگئی تھی۔ پھر وہ خواب میں بھٹکنے والے سایوں کی طرح آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا آہنی سیف کے قریب جاکر ٹھہر گیا اور ذرا دیر تک بالکل ساکت کھڑے رہنے کے بعد اس نے دیپ چند کی طرف دیکھا جس کا ہاتھ ابھی تک ہینڈل سے اُلجھا ہوا تھا۔ اور وہ فرش پر خاموش پڑا ہوا تھا۔ دھندلی روشنی میں اس کی پھٹی ہوئی آنکھیں بڑی ڈراؤنی معلوم ہو رہی تھیں۔ لیکن وانچو خونخوار نگاہوں سے کھڑا ہوا اس کو چپ چاپ دیکھتا رہا۔ پھر اس نے نیل کنٹھ کو آواز دی۔ اور نیل کنٹھ سہمی ہوئی آواز میں بولا ـــــ

"کیا حکم ہے سیکرٹری صاحب؟"

وانچو کہنے لگا "جاؤ ورانڈے میں لگے ہوئے مین سوچ کو آف کر دو۔ اور اس کے بعد کمرے کے اندر چلے آنا"

باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ پھر آہنی سیف پر جلتا ہوا سرخ رنگ کا چھوٹا سا بلب بھی بجھ گیا۔ اب خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی دیپ چند کا ہاتھ ہینڈل پر سے چھوٹ گیا اور اس کا بے جان جسم فرش پر ایک طرف لڑھک گیا۔ پھر ذرا دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور نیل کنٹھ اندر آگیا۔ وانچو اس سے کہنے لگا ـــــ

"اس کو اٹھا کر باہر لان میں لے جاؤ۔ میں ابھی ذرا دیر میں آتا ہوں" اس کی آواز میں دبی ہوئی تھرتھراہٹ تھی۔

نیل کنٹھ نے ایک بار بھرپور نظروں سے وانچو کو دیکھا۔ جیسے وہ پوچھ رہا ہو کہ کیا یہ مر گیا؟ پھر اس نے دیپ چند کی لاش کو اٹھا کر اپنی چوڑی چکلی پیٹھ پر لاد لیا اور کسی کبڑے کی طرح کمر کو جھکائے ہوئے سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ وانچو نے دیوار پر لگے ہوئے آہنی سیف کے سوچ کو احتیاطاً دبا کر آف کر دیا اور پھر اپنی کوٹ کی جیب میں سے ٹارچ نکال کر اس کو روشن کیا۔ اس تیز روشنی میں وہ سیف کے پاس پہنچا اور اس کی پشت پر لگے ہوئے فلکس ایبل وائر کو علیحدہ کر دیا اور دیوار پر لگے ہوئے برہنہ الیکٹرک وائر پر لڈ ٹیپ چڑھا کر دونوں اسکرو اچھی طرح کس دئیے۔ لیکن ابھی تک آہنی سیف کا اندرونی حصہ منہ پھاڑے ہوئے نظر آرہا تھا۔ اور جب وہ اس کے دروازے کو بند کرنے لگا تو یک بارگی اس کو دیپ چند کی پھٹی ہوئی آنکھیں یاد آگئیں۔ اس کا سارا جسم لرز اٹھا اور آتشدان کے اندر دہکتے ہوئے انگارے کسی جلتی ہوئی چتا کی طرح چٹخنے لگے۔ وانچو کی سانس اب تیزی سے چلنے لگی اور بدحواس سا کمرے کے باہر چلا گیا۔ کوٹھی کے اندر بالکل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے جلدی سے مین سوچ آن کر دیا اور ایک دم سے دریچوں پر روشنی کی ہلکی ہلکی لہریں جھلملانے لگیں۔ اس وقت کوٹھی کے اندر سے کنور صاحب کے کھانسنے کی آواز سنائی دی مگر اس نے ادھر کوئی توجہ نہ دی اور تیزی سے ورانڈے کی سیڑھیوں پر سے اترتا ہوا باہر لان میں چلا گیا جہاں نیل کنٹھ کھڑا ہوا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وانچو نے سرگوشی کے سے انداز میں اس کو دھیرے سے آواز دی۔ اور دونوں گہری دھند میں کھوئے ہوئے آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ ان کے

قدموں کی دبی دبی آہٹ سنسان راستہ پہ دور تک سنائی دیتی رہی ——!!

رات گئے جب نیل کنٹھ اپنے کوارٹر پر واپس آیا تو دھندلی روشنی میں اس نے ایک دُبلے پتلے بچے کو دیکھا جو سردی سے سکڑا ہوا کھڑا تھا۔ اس نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا کہ وہ دیپ چند اکاؤنٹنٹ کا لڑکا منا تھا اور تھرتھراتی ہوئی آواز میں بوڑھے چوکیدار کو پکار رہا تھا۔

"پربھو بابا، اے پربھو بابا!" اور جب پربھو بابا اندر سے کھانستا ہوا باہر نکلا اور اس کو دیکھتے ہی حیرت سے بولا

"ارے تم اس سمے کہاں نکل پڑے، ہائے رام کتنے زوروں کا جاڑا پڑ رہا ہے"

سردی سے سکڑا ہوا منا کہنے لگا ——

"بابو جی ابھی تک گھر نہیں گئے۔ ماں جی گھبراتی ہیں۔ سو انہوں نے مجھ کو پوچھنے کے لئے بھیجا ہے۔ اور کرشنا دیوی تو رات کو نکلتی ہی نہیں۔"

بوڑھا چوکیدار کہنے لگا کہ "وہ کنور صاحب کی کوٹھی پر گئے ہوں گے۔ میں ابھی جاکر ان سے کہہ دوں گا۔ چلو چلے تم کو کوارٹر تک چھوڑ آؤں"۔ اور وہ لڑکے کو اپنے ہمراہ لے کر چل دیا۔ نیل کنٹھ اندھیرے میں کھڑا ہوا یہ سب کچھ دیکھتا۔ پھر یک بارگی اس نے منا کو مخاطب کر کہنے لگا تھا۔

"پربھو دادا تم جاکر بابو جی کو ملے آؤ" میں کوارٹر چلا جاؤں گا۔ تم جلدی سے آ جانا۔ وہ ننھی بٹو ہے نا بابو جی کے بنا اس کو نیند نہیں آتی۔ خوب زور زور سے روتی ہے"

اور جیسے نیل کنٹھ کے کان کے پاس کوئی سرگوشی کے سے انداز میں کہنے لگا "جاؤ منا اب تمہارے بابو جی کبھی نہیں آئیں گے۔ اور ننھی بٹو روتے روتے اُن کے بغیر ہی سو جائے گی۔ وہ فیکٹری کے پاور ہاؤس کے اندر چپ چاپ پڑے ہیں۔ نہ کچھ بولتے ہیں نہ کسی کی کچھ سن سکتے ہیں۔ تمہاری آواز اب ان تک نہیں پہنچ سکتی"

اور نیل کنٹھ محسوس کرنے لگا کہ جیسے وہ بہت تھک گیا ہے۔ اس کا مضبوط پٹھوں والا جسم موم بتی کی طرح پگھلنے لگا ہے۔ اور اس کے چاروں طرف جیسے دبی دبی سسکیاں دھڑک رہی ہیں۔ پھر وہ خواب کے سے عالم میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے کوارٹر کے دروازے پر پہنچا اور اس کو کھٹکھٹانے لگا۔ لیکن اس شور سے وہ اچانک چونک پڑا اور اس کو یاد آیا کہ دروازہ تو اندر سے بند ہے۔ پھر کوارٹر کی پشت پر جاکر صحن کی پچھلی دیوار کو پھاند کر وہ اندر آگیا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ ڈسٹرکٹ جیل کی پتھروں والی اونچی دیوار کو پھاند کر رات کے سناٹے میں فرار ہوا تھا۔ اس کے پیچھے گشت کرنے والے پہرے داروں کی بھیانک سیٹیاں دیر تک چیختی رہیں۔ اور پھر اپنے کمرے کے اندر لیٹا ہوا وہ بڑی رات تک نہ جانے کیا اوٹ پٹانگ قسم کی باتیں سوچتا رہا۔

دوسرے دن فیکٹری کے تمام ڈیپارٹمنٹ بند رہے۔ اس لئے کہ چیف اکاؤنٹنٹ دیپ چند کی اچانک موت ہو گئی تھی۔ اس کی لاش پاور ہاؤس کے اندر پائی گئی۔ اس نے الیکٹرک جنریٹر کے "سوئچ بار" کو غلطی سے چھو لیا تھا، اور اس حادثہ سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔

اس اطلاع کے ساتھ ہی فیکٹری کے یارڈ میں یہ بھی سرگوشیاں ہو رہی تھیں کہ دیپ چند نے خودکشی کر لی ہے۔ اور اس کی وجہ جاننے کے لئے کتنی ہی قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ لیکن سہ پہر کو پروگرام کے مطابق ڈائریکٹرز کی میٹنگ ہوئی اور کنور شیوراج سنگھ کی سفارش پر دیپ چند کے بے سہارا خاندان کے لئے پانچ ہزار کی رقم گزارے کے لئے منظور کر دی گئی۔

فیکٹری کی تعمیر ایکا ایکی سست پڑتی جا رہی ہے —!

پھاگن کی مہکتی ہوئی ہوائیں چلنے لگی ہیں اور ان تیز ہواؤں میں سرسوں کے گہرے زرد پھولوں کی ڈالیاں جھومنے لگی ہیں۔ اور کھیتوں میں جیسے بسنتی آنچل لہرا جاتے ہیں۔ کھیتوں میں رات گئے تک ڈھولک اور جھانجھیں بجا کرتی ہیں اور ہولی کے راگ اونچے سروں میں گائے جاتے ہیں۔ پھر

گاؤں کے اندر بڈھے بچے الاؤ دیکھنے لگیں گے اور عبیر و گلال اڑنے لگے گا۔ پھاگن کی ہوائیں چیختی پھر رہی ہیں کہ ہولی آرہی ہے، ہولی آرہی ہے۔ پھر گیہوں کی لہلاتی ہوئی کھیتیاں کٹنا شروع ہو جائیں گی اور دور کے شہروں میں کام کرنے والے گاؤں کے لوگ موسم سرما میں جھیلوں پر اکٹھے ہونے والے آبی پرندوں کی طرح اپنی بستیوں میں آنا شروع ہو جائیں گے۔ یونائیٹڈ انڈسٹریز لمیٹڈ کی فیکٹری کے یارڈ میں مزدوروں کا شور روز بروز مدھم پڑتا جا رہا ہے۔ فصلوں کی کٹائی کرنے کے لئے کمپنی کے سارے قلی دھیرے دھیرے فیکٹری کا کام چھوڑ کر بھاگنے لگے ہیں۔ کمپنی نے گھبرا کر ان کی کئی ہفتہ کی مزدوری روک لی ہے۔ اس بات سے قلیوں کے روکھے چہرے پر ہر وقت جھنجلاہٹ چھائی رہتی ہے۔ وہ ٹائم کیپر آفس میں اکٹھے ہو کر زور زور سے چلاتے ہیں ——

"یہ مزدوری کیوں نہیں ملتی، ایسا کیوں ہو رہا ہے؟"

"یہ سب کیا ہے؟ ہولی کا تہوار آرہا ہے۔ ہم کو پیسہ چاہئے ہے"

"ہاں، ہم کو اپنی مزدوری چاہئے ہے۔ ہم کو اپنی مزدوری چاہئے ہے"

لیکن مزدوری ابھی نہیں مل سکتی، اس لئے کہ کمپنی چاہتی ہے کہ شوگر کا پلانٹ جلد ہی تعمیر ہو جائے۔ نہیں تو کمپنی کا بہت نقصان ہو جائے گا۔ مگر مزدور لوگ اس کے باوجود بھی نہیں ٹھہرتے۔ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختے ہیں۔ سب کو گالیاں دیتے ہیں۔ پھر کسی روز ناروں کی چھاؤں میں اللہ کر اپنی بستی کو چل دیتے ہیں۔ ان باتوں کو دیکھ کر بورڈ آف ڈائرکٹرز کی ایمرجنسی میٹنگ بلائی گئی اور یہ طے ہوا کہ قلی لوگوں کا ریٹ بڑھا دیا جائے۔ اس لئے کہ فیکٹری کی تعمیر میں کسی قسم کی تاخیر نہیں ہونا چاہئے۔ پھر اس کے بعد مزدوری کے ریٹ بڑھنا شروع ہو گئے ——

ایک روپیہ چھ آنے یومیہ!

ایک روپیہ دس آنے یومیہ!

ایک روپیہ چودہ آنے یومیہ!

مگر ان تین ہفتوں میں ریٹ بڑھانے کا تجربہ بھی کچھ کارگر ثابت نہ ہوا۔ بلکہ ہولی کا الاؤ دیکھتے ہی مزدوروں نے اور بھی تیزی سے کام پر سے فرار ہونا شروع کر دیا۔ ہر روز ٹائم کیپر رجسٹر لے کر مینیجنگ ڈائرکٹر کے آفس میں جاتا اور سہمی ہوئی سی آواز میں رپورٹ سناتا۔ مینیجنگ ڈائرکٹر جھنجلا کر مزدوروں کے ساتھ سہمے ہوئے ٹائم کیپر کو بھی گالیاں دینے لگتا۔ پھر ایک روز اس نے وانچو کو اپنے دفتر میں بلایا اور پریشانی کے عالم میں اس کو کہنے لگا ——

"مسٹر وانچو آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ یہ ریٹ اس طرح کب تک بڑھایا جائے گا؟"

مگر وانچو بھی کچھ گھبرایا ہوا نظر آرہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کہنے لگا ——

"کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کنور صاحب، بات یہ ہے کہ یہ ترائی کا علاقہ ہے۔ یہاں کی زمین بڑی زرخیز ہے۔ اس دفعہ یہی سن رہا ہوں کہ فصلیں بہت اچھی رہی ہیں۔ راشن کا زمانہ ہے کسانوں کے ٹھاٹھ ہو گئے ہیں۔ اب انہیں یہ فیکٹری کی نوکری کیا اچھی لگے گی۔ اور زمینداری ابالیشن کی خبروں نے تو ان کا اور بھی دماغ خراب کر دیا ہے"

وہ اور بھی پریشان ہو کر بولا ——

"تم نے تو پوری کتھا سنانا شروع کر دی۔ اس طرح کیسے کام چلے گا۔ یہ بتاؤ کہ لیبر کا کیسے بندوبست ہو"

وانچو ذرا دیر تک مینیجنگ ڈائرکٹر کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر وہ بڑے اعتماد سے بولا

"میری سمجھ میں تو ایک ہی بات آتی ہے۔ لیکن اس میں خطرہ بھی ہے اور روپیہ بھی اچھا خاصا خرچ ہو گا"

مینجنگ ڈائریکٹر جلدی جلدی کہنے لگا

"ذرا اپنے کو بچا کر کام کرنا، اور روپیہ کی تم فکر نہ کرو۔ میں ڈائریکٹروں سے نپٹ لوں گا۔ اور یوں بھی کچھ کم خرچ نہیں ہو رہا ہے۔ اگر آئندہ سیزن تک فیکٹری اسٹارٹ نہ ہوئی تو یہ سمجھ لو کمپنی دیوالیہ ہو جائے گی۔"

وانچو پوچھنے لگا "آپ کے خیال میں یہ بنگالی کیمسٹ سانیال کیسا آدمی ہے۔ اس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے؟"

وہ گردن ہلا کر بولا

"میں سمجھتا ہوں کہ آدمی تو وہ کام کا ہے۔ انارکسٹ پارٹی میں کئی سال تک رہ چکا ہے۔ انہی دنوں پولیس نے ایک بار گرفتار کر لیا تھا۔ بہت بری طرح اس کو ٹارچر کیا مگر اس نے ذرا سا بھی سراغ نہ دیا تم اس پر اعتبار کر سکتے ہو۔"

پھر وانچو نے چپڑاسی کو آواز دی اور اس کو سانیال کے بلانے کے لئے بھیج دیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بھدے چہرے والا کیمسٹ دفتر کے اندر آ گیا۔

وانچو نے خاموشی کے ساتھ اس کا گہری نظروں سے جائزہ لیا اور پھر پوچھنے لگا

"مسٹر سانیال، نومبر کے مہینے میں آپ کمپنی کے کام سے بمبئی گئے تھے اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے وہاں آپ نے گورنمنٹ لیبارٹری سے بھی کچھ مشورہ کیا تھا۔ وہاں کوئی آپ کا جاننے والا تو نہیں ہے؟"

بھدے چہرے والا سانیال ذرا دیر تک غور کرنے کے بعد بولا۔

"جی ہاں، میری وائف کے ایک رشتہ دار اس میں کام کر رہے ہیں۔ جن کے فلیٹ میں میں دو روز تک ٹھہرا بھی تھا۔"

اور وانچو کا گھبرایا ہوا چہرہ یک بارگی جیسے دمک اٹھا۔ وہ چٹکی بجا کر بولا "پھر تو سب کچھ ٹھیک ہے۔ دیکھئے آج رات کی گاڑی سے آپ دہلی چلے جائیں اور وہاں سے ہوائی جہاز کے ذریعے بمبئی پہنچ جائیے۔ آپ کو گورنمنٹ لیبارٹری کے ذریعے ایک بڑا اہم کام کرنا ہے۔"

اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے ٹیلیفون اٹھا کر دہلی کے واسطے سیٹ کی ریزرویشن کے لئے اسٹیشن ماسٹر سے گفتگو کی اور سہ پہر تک دس ہزار روپے کا ڈرافٹ بنوا کر اس کو دے دیا۔ پھر شام کے وقت مینجنگ ڈائریکٹر کی کوٹھی پر سانیال وانچو کے ساتھ بند کمرے کے اندر دیر تک رازدارانہ باتیں کرتا رہا اور پروگرام کے مطابق شب کی ٹرین سے دہلی روانہ ہو گیا۔

پانچویں دن فیکٹری میں سانیال کا بمبئی سے ٹیلیگرام آیا، لکھا تھا

"ہارڈ ویئر کا بازار بہت خراب ہے۔ کرشنگ سلنڈر ابھی تک نہیں ملا۔"

وانچو نے تار کو کئی بار پڑھا اور اپنے دفتر میں خاموش بیٹھا ہوا اس "کوڈ ورڈز" پر غور کرتا رہا۔

پھر کئی روز اور گزر گئے کوئی اطلاع نہ آئی اور وانچو کی بے چینی بڑھنے لگی۔ اس پریشانی میں اس کے رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیاں اور بدنما معلوم ہونے لگی تھیں۔ پھر ایک روز فیکٹری کا کیمسٹ سراسیمگی کے عالم میں اس کے دفتر میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے کے بھدے نقوش گھبراہٹ سے دھندلے معلوم ہو رہے تھے۔

وانچو کرسی پر خاموش بیٹھا ہوا اس کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے پوچھا

"کیا خبر لائے ہو؟"

"کام تو بن گیا!"

وانچو مسکرانے لگا "تو پھر تم اتنے پریشان کیوں ہو؟"

سانیال دروازے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھنے لگا۔ پھر اس کے قریب جھک کر کہنے لگا۔

"مجھے ایک شخص پر شبہ ہوا ہے کہ وہ بمبئی سے میرا پیچھا کر رہا ہے۔"

وانچو لحظہ بھر کے لئے گہری خاموشی میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا

"اچھا آپ جا کر ذرا نہا دھو کر آرام کیجئے۔ اس قدر گھبرانے کی کوئی بات نہیں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

سانیال ذرا دیر تک خاموش کھڑا رہا۔ پھر دفتر سے باہر چلا گیا، اور وانچو آہستہ آہستہ چلتا ہوا کھڑکی کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ بھدے چہرے والا کیمسٹ فیکٹری کے پھاٹک سے نکل کر اپنے کوارٹر کی طرف جا رہا تھا۔

وانچو چپ چاپ کھڑا ہوا اس کو دیکھتا رہا، اور جب ایک موڑ پر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ پھر اپنی میز پر آ گیا اور ٹیلیفون اٹھا کر مینجنگ ڈائریکٹر کو رنگ کیا۔ وہ کوٹھی پر موجود تھا۔ وانچو نے بنگالی کیمسٹ کے آنے کی اس کو اطلاع دی، اور خود بھی دفتر سے نکل کر کنور صاحب کی کوٹھی کی طرف چل دیا۔

اور جب رات ذرا ڈھل گئی اور گہرے سناٹے میں ہواؤں کا شور تیز ہو گیا تو وانچو نے فیکٹری کی جیپ اسٹارٹ کی۔ جس کی پچھلی سیٹ پر آبنوسی جسم والا نیل کنٹھ خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ فیکٹری کے احاطے سے نکل کر جیپ روشن نگر روڈ کی طرف مڑ گئی۔ تیرہ میل تک پختہ سڑک ہے، اس لئے جیپ سنسناتی ہوئی تیزی کے ساتھ گزرتی رہی۔ مگر جب ناہموار پتھریلی سڑک آ گئی تو جیپ کو جھٹکے لگنے لگے اور وہ کھڑکھڑانے لگی۔ لیکن وانچو خاموشی سے بیٹھا ہوا اس کو ڈرائیو کرتا رہا۔ اس کے چہرے پر بڑا پُر اسرار سکوت چھایا ہوا تھا، اور نیل کنٹھ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا سوچتا رہا کہ جھٹکوں سے اس کا سر بوجھل ہوتا جا رہا ہے۔ باہر پھاگن کی ہوائیں چل رہی ہیں۔ پھاگن کی ہوائیں جو ہولی کا سندیسہ لاتی ہیں، اور ہولی جو اب ختم ہو چکی ہے۔ اب تو گیہوں کی فصلیں کٹ رہی ہیں اور ہنسیا کی تیز باڑھ سے لہلہاتی ہوئی گیہوں کی بالیاں کھیتوں میں ڈھیر ہو جاتی ہیں۔ جانے اٹھیر گڑھ کے خوبصورت گاؤں میں اب بھی نیل کنٹھ مہاراج کو کوئی یاد کرتا ہے جس کی کتھا نی کا چوپال پر بڑا چرچا رہا کرتا تھا۔ اور ایکا ایکی بانسری کی لَے پر جھومنے والے ناگ کی طرح وہ بے ہوشی کے عالم میں بڑبڑانے لگا۔

"میں ایک کسان ہوں، ہاں میں کسان ہوں۔"

پھر کسی نے فوراً ہی اس کا گلا دبوچ لیا۔ نہیں تو مجرم ہے تو مجرم ہے۔ پولیس تیرا وارنٹ لئے ابھی تک تلاش کر رہی ہے۔

نیل کنٹھ نے چونک کر دیکھا۔ سامنے وانچو اطمینان سے اسٹیرنگ پر بیٹھا ہوا تھا۔ جیپ پتھریلی سڑک پر ہچکولے کھا رہی تھی اور ستاروں کی مدھم روشنی میں کوہستانی چٹانیں سایوں کی طرح کوسوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ پھر یک بارگی وانچو نے جیپ کو نیچے ڈھلوان پر گھما دیا۔ نیل کنٹھ گھبرا کر اپنی سیٹ سے چمٹ گیا۔ لیکن جیپ ڈگمگاتی ہوئی آہستہ آہستہ گنجان درختوں کے نیچے کچھ دور تک چلتی رہی اور پھر گہرے اندھیرے میں جا کر ٹھہر گئی۔ اور دونوں اتر کر نیچے آ گئے۔

وانچو نے آگے والی سیٹ کے نیچے سے ڈائنامیٹ کے بھاری کیس کو باہر نکالا۔ یہ ڈائنامیٹ جس کو فیکٹری کا کیمسٹ بمبئی سے اپنے ہمراہ لایا تھا جس کو گورنمنٹ لیباریٹری سے سمگل کیا گیا تھا۔ اور جس پر کمپنی کا نو ہزار سے زائد روپیہ خرچ ہوا تھا۔ پھر نیل کنٹھ نے اسے اپنے مضبوط ہاتھوں میں سنبھال لیا اور دونوں اندھیرے میں چلنے لگے۔ ان کے قدموں کے نیچے خشک پتے کھڑکھڑا رہے تھے۔ اور درختوں سے الجھتی ہوئی گونجتی ہوائیں ہانپتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ اندھیرا البتہ گہرا تھا، اور پتھریلی چٹانوں میں بہنے والی کوکیلا ندی کا شور سنائی دینے لگا تھا۔ دونوں اسی طرح کئی فرلانگ تک چلتے رہے۔ پھر ایک جھکے ہوئے ٹیلے پر سے گزر کر جب وہ نشیب میں پہنچے تو پتھروں سے ٹکراتا ہوا دریا کا شور بڑا ہیبت ناک معلوم ہونے لگا تھا۔ اس وادی میں کوکیلا ندی کا بہاؤ بہت تیز ہے۔ دونوں طرف سربلند کوہسار ہیں۔ اور جہاں پر دریا کا دھارا بہت تیز ہو گیا ہے۔ اس مقام پر سرکاری ڈیم بنا ہوا ہے۔ گورنمنٹ نے ہائیڈرو الیکٹرک پیدا کرنے کے لئے اس کو تعمیر کروایا ہے۔ اس باندھ کے پاس پانی گرجتا ہوا اونچائی پر سے گرتا ہے اور قریب ہی میں پتھروں کی بنی ہوئی چھوٹی سی عمارت ہے۔ جس کے سامنے دو پہرے دار سنگینوں کو

سنبھالے ہوئے مستعدی سے کھڑے رہتے ہیں۔

پھر وانچو کی ہدایات کے مطابق نیل کنٹھ ڈائنامیٹ کو سنبھالے ہوئے آہستہ آہستہ بکھرے ہوئے پتھروں پہ چلنے لگا۔ اور پھر وانچو اس کے وارڈ کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے پتھریلی چٹانوں کے اندھیرے میں چھپا رہا۔ اس کی تیکھی نظریں سامنے پتھروں پر جاتے ہوئے نیل کنٹھ کا پیچھا کرتی رہیں۔ ڈیم کے پاس پہنچ کر اچانک وہ اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ اور دریائے کوکیلا کا تیز دھارا ڈیم کے نیچے گرجتا رہا۔ اور مہیب شور میں بھاگن کی ہوائیں جیسے سو گئی تھیں اور سربلند کوہسار خوابوں میں ڈھکے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ پھر ایکا ایکی ڈیم کے اوپر دھندلی روشنی میں ایک انسانی سایہ لہرایا اور اسی وقت پتھریلی عمارت کے نزدیک کھڑے ہوئے پہرے دار نے چیخ کر کہا۔۔۔

"ہالٹ!"

"کون ہے۔ ٹھہر جاؤ۔"

اور اس کے ساتھ ہی بندوق کی تیز آواز وادی کے اندر دھڑکنے لگی۔ لیکن نیل کنٹھ آہنی گارڈر سے چمٹا ہوا ڈائنامیٹ کو "فٹ" کرتا رہا۔ گولی اس کی کنپٹی کے پاس سے ایک بار زن سے گزر گئی۔ وانچو اندھیرے میں بیٹھا ہوا سہمی ہوئی نظروں سے ڈیم کی طرف دیکھتا رہا۔ ایک دفعہ پھر بندوق کی آواز کوہستانی چٹانوں میں گونجنے لگی۔ اور اس کی دھڑکن کوہساروں کی گہرائی میں دیر تک ہانپتی رہی۔ وانچو کا جسم تھرتھرا کر رہ گیا۔ پھر ایک دم سے ڈائنامیٹ کا دائرہ زور زور سے ہلنے لگا۔ گویا اسے اب اپنا کام شروع کر دینا چاہئے۔ مگر نیل کنٹھ ابھی تک کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

کوئی ایک منٹ اس کے انتظار میں گزر گیا۔

پھر کئی منٹ بڑی بے چینی کے عالم میں گزر گئے!!

وانچو نے یک بارگی جھنجلا کر سوچا کہ وہ ڈیم کو اڑا دے۔ اس لئے کہ اب زیادہ تاخیر کرنا بہت خطرناک تھا۔ لیکن خطرے کے شدید احساس کے باوجود بھی وہ کچھ طے نہ کر سکا۔ اس لئے کہ اگر نیل کنٹھ ڈیم کی تباہی کے ساتھ ہی مر گیا اور بعد میں اس کی لاش شناخت کر لی گئی۔ تب تو بہت خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ اور یہی سوچ کر وہ بڑے اذیت ناک لمحوں سے گزرتا رہا اور سامنے ڈیم کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر رات کی مدھم روشنی میں نیل کنٹھ کا کبڑا جسم نظر آیا۔ وہ پتھروں پہ جھکا ہوا آہستہ آہستہ آ رہا تھا جب وہ بالکل قریب آ گیا تو وانچو نے آہستہ سے صرف اس قدر پوچھا "سب ٹھیک ہے" اور نیل کنٹھ نے اثبات میں اپنی گردن ہلا دی۔ وانچو نے مزید تاخیر کئے بغیر یک بارگی ڈائنامیٹ کو "آن" کر دیا۔ اور پھر کوہستانی وادی میں بڑی ہیبت ناک گھڑگھڑاہٹ پیدا ہوئی اور خوابوں میں ڈھکی ہوئی سربلند پہاڑیاں لرزنے لگیں۔ سرکاری ڈیم چیتھڑوں کی طرح بکھر کر رہ گیا اور دریائے کوکیلا کا دھارا بڑی تیزی کے ساتھ نشیب میں بہنے لگا۔

نیلی آنکھوں والا وانچو، نیل کنٹھ کو اپنے ہمراہ لے کر درختوں کے گہرے اندھیرے میں تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ مگر نیل کنٹھ ہر قدم پر لڑکھڑا جاتا۔ اس کے کندھے پر سے برابر خون بہہ رہا تھا جو گولی سے بُری طرح زخمی ہو گیا تھا۔ اور جب وہ جیپ کے پاس پہنچا تو اس کے پیر بالکل بے قابو ہو چکے تھے۔ وہ ڈگمگاتا ہوا بے جان ہو کر پچھلی سیٹ پہ گر پڑا اور جیپ اسٹارٹ ہو گئی۔ راستہ بھر وہ کراہتا رہا اور اس کے زخم سے خون بہتا رہا۔ جیپ ہچکولے کھاتی تیزی سے گزرتی رہی۔ اور جب وہ فیکٹری کے اندر پہنچی تو نیل کنٹھ پر بے ہوشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس کا آبنوسی جسم چھپکلی کی طرح زردی مائل ہو گیا تھا، اور اسی لئے کوارٹر پر بھیجنے کی بجائے اسے مینجنگ ڈائریکٹر کی کوٹھی پر ٹھہرا دیا گیا۔

دریائے کوکیلا پر بنے ہوئے ڈیم کے اس طرح تباہ ہو جانے پر ترائی کے علاقہ میں بڑی سنسنی پھیل گئی ہے اور سرکاری حلقوں میں ایک تہلکہ مچ گیا ہے۔ اس لئے کہ اس باندھ کی تعمیر پر گورنمنٹ کا کئی کروڑ روپیہ خرچ ہوا تھا۔ تحقیقات کرنے کے لئے تمام سرکاری افسروں نے بڑی دوڑ دھوپ شروع کر دی ہے۔ ڈاک بنگلہ کی مرمت ہو رہی تھی، اس لئے فیکٹری کے "گیسٹ ہاؤس" میں مشتبہ آدمی کو حراست میں لے کر

پولیس بری طرح ٹارچر کر رہی ہے۔ اور انہیں دنوں اچانک ریونیو منسٹر کا داماد زائن ولبھ فیکٹری میں آگیا۔ وہ کمپنی کا سب سے اہم ڈائریکٹر ہے۔ رات کو مینجنگ ڈائریکٹر کے پرائیویٹ کمرے میں جب وہ اس کے پاس پہنچا تو ایک دم سے اس پر برس پڑا۔

"کنور صاحب یہ آپ نے سب کیا کر کے رکھ دیا ہے۔ مجھے تو ایسا جان پڑتا ہے کہ یہ فیکٹری اب برباد ہونے والی ہے۔"

مینجنگ ڈائریکٹر پہلے ہی سرکاری افسروں کی آمد سے بوکھلایا ہوا تھا۔ زائن ولبھ کی باتوں پر وہ اور بھی بدحواس ہو گیا۔ آہستہ سے بولا "بھئی میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے۔ میں تو یہاں سے بڑا عاجز آگیا ہوں۔"

مگر وہ کہتا ہی رہا۔ "اب تو آپ ایسا کہیں گے ہی۔ مگر آپ کو کم سے کم یہ تو سوچنا چاہیئے تھا کہ گورنمنٹ کا انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ اتنا احمق تو نہیں کہ اتنی بڑی بات کو بھی نہیں سمجھ سکتا۔ ہوم سیکرٹری کے پاس جو رپورٹ پہنچی ہے اس میں فیکٹری پر بھی شبہ ظاہر کیا گیا ہے، اس لئے کہ ادھر جو لیبر کی بالکل کمی پڑ گئی تھی اور جس طرح یہ مشکل خود بخود ختم ہو گئی ہے اس بات پر کون نہیں شبہ کر سکتا ہے۔ دراصل ہوا بھی ایسا ہی ہے، اس لئے کہ اب کمپنی کو قلیوں کی تلاش میں اپنے ایجنٹ گرد و نواح کی بستیوں میں نہیں بھیجنا پڑتے۔ بلکہ اب تو فیکٹری کے بڑے پھاٹک کے سامنے آدمیوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ کمپنی کا لیبر آفیسر ہر روز سویرے صرف پچاس آدمیوں کو اندر بلاتا ہے، اور وہ اس کے سامنے قطار بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ ہر ایک کا جسم ٹٹول کر گوشت کے مضبوط پٹھوں کا اندازہ لگاتا ہے۔ اور جس آدمی کو وہ فٹ سمجھتا ہے اس کی چوڑی چکلی چھاتی پر کھریا سے سفید نشان بنا دیتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اب اس فیکٹری میں کام مل گیا ہے اور جو وہ آئے، روز مزدوری ملے گی۔ اس کا نام اور پتہ ٹائم کیپر کے رجسٹر میں درج کر دیا جاتا ہے۔ پھاٹک سے باہر کھڑے ہوئے لوگ جانوروں کی طرح گردن اٹھا اٹھا کر یہ سب کچھ دیکھتے ہیں اور سہمے ہوئے لہجے میں آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہیں۔!!

مینجنگ ڈائریکٹر اور بھی گھبرا گیا۔ وہ بڑے شکست خوردہ لہجہ میں کہنے لگا۔

- مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ سب کچھ ہو جائے گا۔ وانچو تو مجھے یہی کہتا رہا کہ کوئی خطرے کی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس طرح وانچو پر سارا الزام رکھ کر جیسے وہ کسی قدر مطمئن ہو گیا اور اس کی بات کا اثر بھی ٹھیک ہی ہوا۔ یوں بھی کمپنی کا مینجنگ ڈائریکٹر ہونے کے علاوہ وہ رانی باناڑ کے علاقہ کا جاگیردار بھی تھا۔ اس لئے زائن ولبھ ایک دم سے وانچو پر بگڑنے لگا۔

"وہ تو میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ وانچو مجھ کو بڑا خطرناک آدمی معلوم پڑتا ہے۔ آپ اس کی سازشوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ دیکھئے اب یہی بہتر طریقہ ہے کہ وانچو کو اسی طرح پہ فیکٹری سے فوراً علیحدہ کر دیا جائے۔ ورنہ جب تک وہ یہاں موجود ہے ہر وقت خطرہ سامنے ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔"

مینجنگ ڈائریکٹر گہری خاموشی میں کھو گیا اس لئے کہ وہ کسی طرح یہ نہیں چاہتا کہ وانچو اس کے خلاف ہو جائے۔ وہ اس کے ہر خطرناک راز کو جانتا ہے۔ اس طرح نوکری سے برطرف ہو جانے پر اس کے برگشتہ ہو جانے کا پورا خوف تھا۔ تھوڑی دیر تک اسی طرح چپ رہنے کے بعد وہ کہنے لگا۔

"میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس بات پر اگر وہ کمپنی کا مخالف ہو گیا تو سرکاری گواہ بن کر بہت بڑی مصیبت بن سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کسی اور طریقہ سے اس کو یہاں سے ابھی ہٹا دیا جائے۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔" اور یہ بات زائن ولبھ ایم، ایل، اے کی سمجھ میں بھی آگئی اور پھر دونوں کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے دیر تک کمرے کے اندر بیٹھے ہوئے باتیں کرتے رہے۔

اور جب زائن ولبھ کمرے سے باہر چلا گیا تو کنور صاحب نے وانچو کو بلوا لیا اور ساری باتیں اس کو بتا دیں۔ پھر یہ طے ہوا کہ وہ نیپال کی راجدھانی کھٹمنڈو چلا جائے۔ سرحد کو پار کرنے میں کوئی مشکل نہ ہوگی۔ اس لئے کہ رانا دلیر جنگ جو ریاست کے ایک اہم رکن تھے وہ کنور صاحب

کی شکارگاہوں میں اکثر شکار کھیل چکے تھے۔ اور دونوں کے آپس میں اچھے مراسم تھے۔ اور جب تک وہ کمشنر دیں رہے گا اس کو برابر ایک ہزار روپیہ مینجنگ ڈائرکٹر کی طرف سے ملتا رہے گا۔ پھر ایک روز فیکٹری کی کار میں بیٹھ کر وہ اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ دفتر میں کام کرنے والے صرف اس قدر جانتے ہیں کہ وہ کمپنی کے کسی ضروری کام کے سلسلے میں کلکتہ جا رہا ہے۔ اور وہ اپنی کار میں خاموش بیٹھا ہوا دور ہوتی ہوئی فیکٹری کی عمارت کو دیکھتا رہا جس کی تعمیر کے لئے اس نے خطرناک سازشیں کی تھیں۔ اور وہ فیکٹری اس کی آنکھوں سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی گہری نیلی آنکھیں بڑی پُراسرار معلوم ہوتی تھیں۔

سرکاری ڈیم کے تباہ ہو جانے سے گوکیلانڈی میں بڑا بھیانک طوفان آگیا ہے۔ بپھری ہوئی لہریں ترائی کے میدانی علاقوں میں شب خون مارنے والے غنیم کی طرح پھیلتی جا رہی ہیں۔ گیہوں کی لہلہاتی ہوئی فصلیں پانی کے بہاؤ میں بہہ گئی ہیں۔ ساری بستیاں ویران ہوتی جا رہی ہیں اور تباہ حال کسان اپنے گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔ اور راجیل روڈ پر مرتے انسانوں کے قافلے گزرا کرتے ہیں۔ اس لئے کہ سیلاب زدگان کے لئے امیر گڑھ میں سرکار نے ریلیف کیمپ بنا دیا ہے۔ اس سلسلہ میں گورنمنٹ کا جو پریس نوٹ شائع ہوا ہے اس میں اعلان کیا گیا ہے کہ اس تباہی میں کمیونسٹوں کی دہشت پسندی کو دخل ہے جو اپنے سیاسی مفاد کے لئے ملک میں بے اطمینانی اور ہیجان پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اور اسی لئے پولیس نے کسان سبھا کے دفتر پر چھاپہ مار کر کتنے ہی کسان ورکروں کو حراست میں لے لیا ہے۔

نیل کنٹھ کنور صاحب کی کوٹھی کے ایک مختصر سے کمرے میں لیٹا ہوا آہستہ آہستہ کراہ رہا ہے۔ اس کے کندھے پر سفید پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ اور اس کا مضبوط پٹھوں والا آہنی جسم چھپکلی کی طرح زردی مائل ہو گیا ہے۔ خون کے زیادہ بہہ جانے سے اس پر بار بار غشی کے دورے پڑتے ہیں اور کنور صاحب نے کمپنی کی طرف سے کمشنر کے اعزاز میں اپنی خوبصورت کوٹھی پر ایک شاندار ڈنر کا انتظام کیا ہے۔ جس کا ہنگامہ رات گئے تک فیکٹری کے اندر گونجتا رہا۔

انتظار حسین

اجودھیا

وہ آج بھی چلتے چلاتے روتی کی ریوڑیاں خرید لایا تھا۔ کتے کی دم اور انسان کی عادت یہ دو چیزیں تو ایسی ہیں جیسی ہو گئیں ہو گئیں۔ بدلنی بدلانی نہیں ہیں۔ دودھ کا جلا چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کے پیتا ہے۔ لیکن اسے تو اتنے پیسے پھونکنے کے بعد بھی عقل نہ آئی تھی۔ کسی خوانچہ والے کے پاس اُجلی ریوڑیاں نظر آئیں اور وہ پھسلا۔ لیکن جب خرید کر وہ ایک ریوڑی منہ میں ڈالتا تھا تو اس کی صورت اس خان کی سی بن جاتی تھی جس نے صابونی کے چکر میں صابن خرید لیا تھا۔ لیکن اگر ایمان کی پوچھو تو اس بے چارے کی بھی بڑی مشکل تھی۔ وہ نہ تو شراب پیتا تھا اور نہ سگریٹ۔ وہ تو ریوڑیوں سے ہی اک گونہ بے خودی پیدا کرنے کا عادی تھا۔ کفر جس چیز میں بھی ہو وہ پھر ایسی منہ کو لگتی ہے کہ چھٹنے کا نام نہیں لیتی۔ اب یہ دیکھو کہ اسے گھر چھوڑے ہوئے ایک ڈیڑھ سال تو ہو ہی گیا ہوگا۔ لیکن وہی مرغ کی ایک ٹانگ والی بات تھی۔ وہ جب انارکلی بازار سے گزرتا تھا تو جا کر چار چھ پیسے کی ریوڑیاں خرید ڈالتا تھا اور ہر مرتبہ انہیں منہ میں ڈالتے ہی اس پر وہی ایک قسم کی کیفیت گزرتی تھی۔ آج وہ خوانچہ میں سجے ہوئے رنگین پتنگیا کاغذوں پر لٹو ہو گیا تھا۔ ان کی زرق برق کو دیکھ کر اسے یہ امید بندھ گئی کہ ریوڑیاں کچھ اچھی ہوں گی لیکن جب اس نے ایک ریوڑی منہ میں ڈالی تو حسب معمول وہی تمباکو میں بسا ہوا سا گڑ منہ میں گھل گیا۔ اس کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ شاید اگر خوانچہ والا اس وقت سامنے ہوتا تو وہ انہیں اس کے منہ پر دے مارتا۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ اس وقت تو وہ لحاف میں لپٹا لپٹایا پڑا تھا اور پھر کسی نہ کسی بہانے منہ چلانا بھی ضروری تھا۔ یوں بھی وہ صابون خریدنے والے خان کے اصول کا قائل تھا بلکہ شاید اس سے چار قدم آگے ہی تھا کیونکہ پٹھان نے تو ایک دفعہ ہی اپنا پیسہ کھایا تھا لیکن وہ بار بار ریوڑی خریدتا تھا اور پیسہ کھاتا تھا۔ اس نے ہاتھ روکا تو نہیں۔ ہاں یہ سوچ کر اس کا خون ضرور کھولتا رہا کہ یہاں والوں کو ریوڑیاں بنانی بھی نہیں آتیں۔ اس نے سوچا یار یہ تو کچھ نہ ہوا۔ میرٹھ سے ریوڑیوں کی فرمائش کرنی چاہئے۔ اس میں شرم کی بات بھی نہیں ہے۔ تحفے تحائف کا سلسلہ چلتا ہی ہے۔ آموں کی ہی مثال لے لو۔ لوگ منہ سے کہہ کہہ کر آموں کی فصل میں آموں کے تحفے قریب و دور سے منگاتے ہیں۔ چچا غالب کی بھی عادت تھی۔ دنیا بھر سے فرمائش کرتے تھے۔ برسات میں جس کو خط لکھا آموں کا مطالبہ کیا جا رہا ہے اور خود ریوڑیوں کے سلسلے میں یہی نکتہ چلتا ہے۔ رامچندی ریوڑی والے کے زیادہ

گاہک تو تحفہ تحائف بھیجنے والے ہی ہوتے تھے۔ تو اگر رمیش بھی اسے تھوڑی سی ریوڑیاں تحفتاً بھیج دے گا تو ایسا غضب تو نہ ہو جائے گا۔ لیکن پھر اس کی قومی غیرت نے یکایک جوش مارا۔ نہیں جی گولی مارو۔ رمیش سوچے گا کہ سالا بڑا گیا تھا پاکستان۔ روٹی کپڑا الگ رہا، ریوڑی کے دانے تک کو محتاج ہو گیا۔ ابھی دیکھا کیا ہے۔ ابھی تو معلوم پڑے گی۔ بڈیا کی طبیعت ہری ہو جائے گی اور اس خیال نے اسے جواز پیدا کرنے کی کوشش پر مائل کر دیا ——— آخر ریوڑی بنانا ایسے کون سے کمال کی بات ہے۔ یوں کہو کہ یار لوگوں نے ہاتھ پیر ڈال رکھے تھے اور ہندو سکھ حلوائیوں سے ساری چیزیں خریدتے تھے۔ کیا اگر وہاں پر دو سر لیں تو اچھی ریوڑیاں نہیں بنا سکتے۔ اور پھر وہاں بھی اور سب جگہ کون سی کمال کی ریوڑیاں بنتی تھیں۔ بس ایک میرٹھ ہی تو تھا۔ رہا لکھنؤ اور علی گڑھ کا معاملہ تو وہاں والوں نے خواہ مخواہ جھک مارا ہے۔ لکھنؤ تو ہر بات میں نفاست کی ٹانگ توڑتا ہے اور اسی میں مارا جاتا ہے۔ ہر چیز اپنی مقدار میں اچھی ہوتی ہے۔ جسے حسن کہتے ہیں وہ نام ہی تناسب کا ہے اور یہ علی گڑھ کے حلوائی تو خواہ مخواہ منہ چڑاتے تھے۔ ریوڑیاں تھوڑا ہی بناتے تھے مکھیاں مارتے تھے۔ مختصر یہ کہ ریوڑیاں اگر کہیں بنتی تھیں تو میرٹھ میں بنتی تھیں۔ باقی سب جھرنا جھگڑا تھا۔

رمچندی ریوڑی والے کی دکان ——— اس کے ذہن میں ایک تصویر ابھرنے لگی ——— جاڑوں میں کیسی رونق رہتی تھی اس پہ۔ شیشے کے صاف شفاف مرتبانوں میں ریوڑیاں اور مختلف قسم کی گزک رکھی رہتی تھی۔ پینڈے کی دھلی نجھی تھالوں میں حلوا سوہن اور تل بھگا رکھا رہتا تھا۔ کبھی کبھی تو اس دکان پر اتنی بھیڑ ہوتی کہ کھڑے کھڑے پاؤں دکھ جاتے اور باری نہیں آتی تھی۔ حق یہ ہے کہ بی۔ اے کا امتحان تو اس نے رمچندی کی ریوڑیوں کے بل پر ہی دیا تھا ورنہ ایک ڈیڑھ بجے رات تک کتابوں سے مغز پچی کرنا کس کے بس کا تھا۔ ایک دفعہ تو وہ کوئی بارہ بجے رات کو اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اس کی دکان پر جا پہنچا۔ اس کی دکان پہ بالکل دن پھیل رہا تھا اور وہ ڈھائی من کی لاش رمچندی گاہکوں کے بھیڑ بھڑکے کو نبٹا کر اب ذرا اطمینان کا سانس لیتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ رمچندی کی دکان کی ساری ریوڑیاں باندھ لاتا اور پاکستان کی ہر ریوڑی کی دکان کو رمچندی ریوڑی والے کی دکان بنا دیتا۔ لیکن اسے بھلا کون ایسا کرنے دیتا اور پھر اس وقت اتنی فرصت اسے تھی ہی کہاں۔ ورنہ چلتے چلتے کیا جیسے اس نے گیارہ آنے کے سنترے اور سات آنے کے کیلے خریدے تھے، بارہ چودہ آنے کی وہ ریوڑیاں نہ خرید سکتا تھا۔ شاید اسے یہ معلوم ہی نہ تھا کہ ہندوستان سے پاکستان آنے کے معنے کیا ہوتے ہیں، اس نے معنے سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی تھی۔ وہ تو بس دھرا سا اٹھ کھڑا ہوا تھا اپنے ایک بستر اور صندوق کے ساتھ اسٹیشن پر دھرا تھا۔ اسٹیشن ——— اس کی آنکھوں میں پھر وہی سارا نقشہ پھر گیا۔ وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ اس نقشہ کو وہ اس نقشہ سے کیسے الگ رکھے جو اس نے بچپنے میں مذہبی کتابوں میں عرصۂ محشر کے متعلق پڑھ رکھا تھا۔ یہ وہی اسٹیشن تھا جہاں عام طور پر سناٹا سا چھایا رہتا تھا۔ بھلا کنٹونمنٹ اسٹیشن کا کون رخ کرتا تھا۔ کوئی مارا پڑا مسافر پہنچ گیا تو پہنچ گیا۔ ورنہ وہاں تو ہمیشہ خاک ہی اڑتی لیکن اس روز وہاں آدمی پھٹا پڑا تھا۔ ایسے ایسے وضعدار آدمی بھی وہاں نظر آتے تھے جن کا تصور ان کی ڈیوڑھی یا گلی کو نظر انداز کر کے کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ آج اپنی ڈیوڑھیوں اور گلیوں سے رسہ تڑا کر نکل بھاگے تھے اور ایسے لگتے تھے جیسے کوئی شرعی قسم کا آدمی بڑھاپے میں یکایک ایک دن اپنی داڑھی منڈا ڈالے۔ ہر طرف سامان کے اٹنگ لگے ہوئے تھے اور اسٹیشن کے گیٹ اور ٹکٹ گھر پر کیفیت یہ تھی کہ آدمی پہ آدمی گرتا تھا ایک دفعہ تو کوتوال کو بھی غصہ آ ہی گیا اور اس نے ٹکٹ گھر پر کھڑے ہو کر ہنٹر برسا دیا۔ ..... ایک کھدر پوش داڑھی والے صاحب نے مجمع لگا رکھا تھا اور فرما رہے تھے "مسلمانوں کا یہ برا حشر مسلم لیگ نے کرایا۔ میں کہتا ہوں کہ جہاں یہ لوگ جنت سمجھ کر جا رہے ہیں وہ جہنم ہے" ——— "اور جسے جہنم سمجھ کر چھوڑ رہے ہیں وہ جنت ہے" کسی صاحب نے پیچھے سے فقرہ کسا اور توفیق نے اسے یکایک پیچھے سے آ کر جھنجھوڑا تھا کہ "ابے مسخرے باتیں بنا رہا ہے ذرا سامان پہ لگ" اور وہ ہڑبڑا کر ——— مگر خیالات کی زنجیر الجھ کر ٹوٹ گئی اور اسے یاد آیا کہ وہ ریوڑیاں کھانا تو بھول ہی گیا ہے۔

اس نے جیب میں سے چھ سات ریوڑیاں ایک ساتھ نکال لیں اور چبانے لگا۔ ریوڑی کا گڑ بار بار دانتوں کے درمیان چپک کر رہ جاتا۔ وہ سوچنے لگا

عجب چم چیچڑ قسم کی ریوڑیاں ہیں۔ یہ سالے ریگل کے سامنے والے خوانچہ والے آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں۔ انار کلی میں کم از کم اس سے بہتر تو ریوڑیاں ہوتی ہیں ——— یہ انار کلی بھی خوب بازار ہے ——— بچھڑے ہوؤں کے ملنے کی جگہ ——— ایک زمانہ میں تو اچھا خاصا مہاجروں کے ملنے کا اڈا بن گئی تھی۔ رشید صاحب اسے ایک روز یہیں تو ملے تھے۔ دیکھتے ہی لپٹ گئے تھے۔ "ارے بھئی کب آئے۔ میں کہتا ہوں تم نے بہت اچھا کیا کہ چلے آئے۔ ابھی یہاں کچھ نہ سہی مگر میں کہتا ہوں صاحب کہ ایمان تو محفوظ رہے گا ———" اس کی پیشانی پر پسینہ آ گیا تھا۔ شاید رشید صاحب طنز کر رہے تھے۔ لیکن اس نے تو ان کا چہرہ بڑے غور سے دیکھا تھا۔ ان کے تیوروں سے تو بڑا خلوص ٹپک رہا تھا۔ تاہم اگر یہ طنز نہیں تھا تو کیا تھا وہ تو ایمان بچا لایا مگر ——— اچانک ایک کتابی قنوطیت کی رو آئی اور اسے بہا کر ایک ادبی طرف لے گئی ——— یہ ایمان کیا ہوتا ہے کچھ بھی نہیں محض ایک واہمہ ہے۔ بے ایمانی بھی تو ایک طرح سے ایمان ہی ہوتی ہے۔ نہ ٹوٹنے والا کفر سب سے زیادہ پختہ ایمان ہوتا ہے اور پھر ایمان کا ہجرت سے کیا ناطہ؟ یہ ہجرت کا لفظ اس کے حلق سے اتر نہ سکا پھر وہ کرن ہے ——— مہاجر، مفرور، بھگوڑا، پناہ گزین؟ اسے ہلکا پھلکا سیدھا سچا لفظ بھگوڑا بہت پسند آیا ویسے بھی وہ ٹھیٹھ اردو لفظ تھا۔ لیکن ان مترادفات میں بھٹکتے بھٹکتے اس کا ذہن ایک اور لفظ کی طرف جا لپکا ——— بن باس! اس لفظ میں اسے بڑی مٹھاس معلوم ہوئی تو وہ بن باسی ہے۔ اپنے وقت کا راجہ رامچندر ——— وہ پھر اپنے فعل کو آدرشی جامہ پہنا رہا تھا۔ خیال آیا کہ جرمن اپنے وطن کو باپ تصور کرتے ہیں لیکن اس نے ان کی تقلید کرنا مناسب نہ سمجھی۔ ماں بھی تو آخر بن باس دے سکتی ہے۔ راجہ دسرتھ نے سوتیلی ماں کے کہنے سے راجہ رام چندر جی کو بن باس دے دیا۔ اس کی ماں نے اسے اس کے سوتیلے بھائی کے بہکانے میں آ کر بن باس دے دیا۔ یہ بھائی کا رشتہ بھی خوب ہے۔ اس نے ہمیشہ فساد پیدا کیا۔ اسے برادرانِ یوسف کا قصہ یاد آیا اور پھر وہ سوچنے لگا کہ یہ سارا فساد ہندو مسلم بھائی بھائی کے نعرے کا پیدا کیا ہوا ہے۔ آج کوئی نئی بات تھوڑا ہی ہے۔ بھائی نے بھائی کا ہمیشہ یہی حشر کیا ہابیل قابیل کے وقت سے یہی ہوتا چلا آیا ہے۔ لیکن رام چندر جی کے بھی تو بھائی تھے ——— اور یہاں آ کر اس کا ذہن دوسرے رستہ پر پڑ گیا۔ رام لیلا کے بہت سے مناظر اس کی نگاہوں میں پھر گئے۔ اجودھیا رام چندر جی کے جانے کے بعد کیسا ویران ہو گیا تھا۔ ساری رونق تو راجہ رام چندر کے دم سے تھی۔ راجہ دسرتھ خود انہی کو دیکھ دیکھ کے جیتے تھے۔ رامچندر جی بن کو سدھارے۔ راجہ دسرتھ دنیا سے چل بسے۔ وہ تو من کا سانپ تھے من پہ ناند ڈھک دو سانپ اندھا ہو جائے گا اور ناند سے ٹکریں مار مار کے مر جائے گا۔ دسرتھ جی اکیلے ڈھنڈار میں ٹکریں مار مار کے مر گئے۔ اس کے اجودھیا میں بھی اب خاک اڑتی ہو گی اور من کا سانپ ناند سے ٹکرا ٹکرا کے دم توڑ چکا ہو گا۔ من بھی کیا چیز ہوتا ہے جب رات کو من کا سانپ نکلتا ہے تو سارے جنگل میں اجالا ہو جاتا ہے۔ من اگر کسی کے ہاتھ پڑ جائے تو اس کے تو بس وارے کے نیارے ہیں۔ وہ سالا نتھی سنار گپ ہانکا کرتا تھا کہ اسے من مل گیا تھا۔ لیکن ایک چوٹا اسے چوٹ دے گیا۔ وہ کبھی بلے بلے کی اڑاتا تھا۔ ویسے ایک بات ہے۔ آدمی خوب تھا۔ اس کی دکان پہ ہر وقت چوکڑی جمی رہتی تھی اور وہ آلھا اودل کا بھی موقعہ رکھتا تھا۔ دوپہر ہوئی اور وہ جھلنگا چارپائی دوکان کے نیچے نالی کے قریب بچھ گئی۔ گھنٹوں گذر جاتے تھے اور آلھا اودل گھسٹتی رہتی تھی۔ اس کے دل میں اک گدگدی سی اٹھی کہ وہ آلھا اودل کے شعر گنگنانے۔ وہ شعر یاد کرنے لگا لیکن اس کے حافظہ کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ کسی مصرع کا کوئی ٹکڑا یاد آتا تھا اور اٹک کے رہ جاتا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے ایک مصرع یاد آیا ؏

آلھا اودل بڑے لڑیا!

اس نے بہت زور مارا لیکن دوسرا مصرع اسے یاد ہی نہیں آیا۔ اسے پسینہ آ گیا۔ وہ یادوں کے سہارے جیون بتانا چاہتا تھا اور یادیں دھندلی پڑتی جا رہی تھیں ساتھ چھوڑتی جا رہی تھیں۔ اسے محسوس ہوا گویا اس کے پیروں تلے کی زمین کھسکتی جا رہی ہے اور اب تھوڑی دیر میں وہ خلا میں گر پڑے گا۔ وہ

بہت دیر تک چپکا پڑا رہا۔ اس چپکے پن میں ایک مبہم خوف کی بھی جھلک تھی۔ رفتہ رفتہ اس کا ذہن پھر اپنے کام سے لگ گیا۔ اسے خیال آیا کہ آلہا اودل کے پڑھے جانے کا زمانہ برسات کا ہوا کرتا تھا اور برسات کے خیال کے ساتھ ساتھ اس کے کانوں میں ایک سُریلی آواز گونجنے لگی —— باغ میں پپیا بولا، میں جانوں بیرا بھیا بولا۔ پپیہا کو وہ ہمیشہ پپیا کہتی تھی اور خود بھی وہ کچھ پپیا سی ہی تھی جب دیکھو ہٹ ہٹ کرتی رہتی تھی۔ اس روز جب وہ بڑی یکسوئی کے ساتھ پپیا بجانے میں مصروف تھی تو اس نے پیچھے سے آ کے چپت جما دی تھی "کیوں ری تو نے میرا پپیا کیوں توڑا ہے"...... وہ آم کی گٹھلیاں کتنی محنت اور خلوص سے جمع کرتا تھا۔ ان پر راکھ ڈالتا تھا۔ انہیں روز پانی دیتا تھا۔ پھر ان میں سُرخ زرد کلّے پھوٹتے تھے۔ پھر ہلکے عنابی پتوں کی ایک شاداب چھتری سی بن جاتی تھی۔ کس کی مجال تھی کہ اس کے پپیوں کو ہاتھ لگا جائے لیکن وہ خسیس بھی نہیں تھا۔ ترنگ میں جب وہ آجاتا تھا تو ایک ایک ڈیڑھ کئی کئی پپیے وہ لڑکوں کو بخش ڈالتا تھا۔ جب بادل گھر گھر کر آ رہے ہوتے تھے اور ننھی ننھی بوندیاں پڑنے لگتی تھیں تو پپیے کی پیں پیں کیسی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ برسات بھی خوب موسم ہوتا ہے۔ چیزوں کا رنگ روپ ہی بدل جاتا ہے۔ پھر روز سر پر ایک تیوہار کھڑا رہتا ہے۔ آج جھڑیوں کا میلہ ہے کل رکھشا بندھن ہے۔ پرسوں جنم اشٹمی ہے اور ہر تیوہار پہ بارش ہونی ضروری۔ جنم اشٹمی پر اگر مینہ نہ برسا کرتا تو کنہیا جی کے پوتڑے کیسے دھلا کرتے۔ اور رکھشا بندھن پر مینہ پڑے اور پھر پڑے۔ خواہ ایک بوند ہی پڑے۔ رکھشا بندھن کے ساتھ ساتھ اسے پھر رمیش کا خیال آگیا۔ رکھشا بندھن پر وہ رمیش کو ضرور ڈیڑھ دو روپے سے کٹوا دیا کرتا تھا۔ رمیش ذات کا برہمن سہی لیکن دل کا بنیا تھا۔ اس لئے بات اٹھنی سے شروع کرتا تھا لیکن جب وہ ایک دفعہ حلوائی کی دکان پر آجاتا تھا تو پھر وہ رمیش کو ایسے اڑنگے پہ لا کے مارتا تھا کہ ڈیڑھ دو روپے پر بھی مشکل سے ہی چھوٹتا تھا۔ جب وہ اس کے گھر پہنچتا تھا تو بملا اس کی کلائی میں راکھی باندھ دیا کرتی تھی۔ ویسے راکھی ہوتی ہی کیا ہے۔ چند ریشمی دھاگے اور سنہری پنیاں۔ لیکن جب وہ کلائی پر بندھ جاتی ہے تو پھر دیکھو آدمی کیا سے کیا بن جاتا ہے۔ اس نے اس رکھشا بندھن والے دن کا تصور کیا۔ جب وہ گاڑی سے اتر کر سیدھا رمیش کے گھر پہنچا تھا۔ بملا نے اس کے راکھی باندھی تھی۔ پھر وہ اور رمیش شام تک سجے ہوئے بازاروں اور گلیوں کے چکر کاٹتے رہے اور مختلف دکانوں پر رک رک کے مٹھائی بھی اڑائی تھی لیکن وہ اس دن کا کوئی چمکتا ہوا تصور قائم نہ کر سکا۔ اسے وہ دن خواب آلود دھندلکوں میں لپٹا ہوا سا دکھائی دیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا گویا وہ کوئی شیریں خواب ہے جسے وہ ہزار کوشش کے باوجود بھولا چلا جا رہا ہے یا پچھلے جنم کے کسی واقعہ کا ایک خیال ہے جس کی خوشبو اڑتی جا رہی ہے۔ اس کی زندگی کا سہارا لے دے کے چند ایک یادیں رہ گئی تھیں اور یہ یادیں چپ چاپ ایک ایک کر کے کھسکتی جا رہی تھیں۔ شاید اسے واضح طور پر یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ میرٹھ کی ریوڑیوں کا مزا کیسا ہوتا ہے۔ بس ایک خیال سا تھا۔ اس خیال کے بل پر وہ اظہار خیال کرتا تھا۔ اسے یاد آیا کہ خود اس کے قصبے کے حلوائی تو علی گڑھ اسکول کے حلقۂ اثر میں تھے۔ وہی علی گڑھ کی طرز کی چھوٹی چھوٹی گول گول بھربھری ریوڑیاں بنائے تھے۔ لیکن وہ خود میرٹھ کی ریوڑیوں کا رسیا تھا اور اس اسکول کے سب سے بڑے نمائندے رمچندی کی ریوڑیوں پر جان دیتا تھا۔ ان ریوڑیوں سے رمیش کی نہ معلوم کتنی یادیں وابستہ تھیں —— وہ، رمیش، ریوڑیاں —— لیکن اب یہ تثلیث بکھر گئی تھی۔ اس سے رمیش اور ریوڑیاں دونوں چھوٹ گئے تھے۔ رمیش کے پاس ریوڑیاں رہ گئی تھیں اور وہ الگ ہو گیا تھا۔ اب وہ ریوڑیاں نہیں کھاتا اپنا بھیجہ کھاتا ہے۔ رمیش اب ریوڑیاں کھاتا نہیں ہوگا، زہر مار کرتا ہوگا۔ رمیش کے ساتھ مل کر وہ بھی کیسی عجیب عجیب حرکتیں کر ڈالتا تھا۔ ویسے تو ہمیشہ اس کی رونی صورت بنی رہتی تھی لیکن جب رمیش ایک دو دن کی چھٹی لے کر دلی سے آجاتا تھا تو وہ بالکل کینچلی بدل لیتا تھا۔ اس کے ساتھ تو وہ اس روز ریوڑیاں کھاتا ہوا ماتا محلہ میں سے گذر رہا تھا۔ ایک لڑکی گوکھ میں کھڑی انہیں بڑی دیر سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک ریوڑی

اسے دکھا کر گپ سے منہ میں ڈال لی تھی ——— اس کے سٹ پٹا کر بھاگ جانے کی تصویر اس کی آنکھوں میں پھر گئی اور وہ بے ساختہ ٹھٹھا مار کے ہنس پڑا۔ پھر یہ ہنسی رفتہ رفتہ ایک اداسی کی کیفیت میں بدل گئی۔ کیا زمانہ تھا وہ بھی ——— وہ سوچنے لگا ——— اب وہ دن کاہے کو لوٹ کر آئیں گے۔ یہ زمانہ بھی عجیب بے ہنگم قسم کی چیز ہے۔ اس کا سر پیر تو ہے ہی نہیں۔ اسے تو بس بے پیندی کا لوٹا سمجھو۔ کسی طرف بھی لڑھک جاتا ہے اور ساتھ میں ساری چیزوں کو بھی لڑھکائے جاتا ہے۔ گزری ہوئی باتیں خواب و خیال بن کر رہ جاتی ہیں۔

رمیش کی باتیں سوچتے سوچتے اسے محسوس ہوا کہ گویا وہ کسی بادشاہ کی بھولی بسری کہانی ہے جو اس نے بچپن میں نانی اماں سے سُنی تھی اور جسے یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کسی زمانہ میں ایک بادشاہ تھا۔ اس بادشاہ کے دو شہزادے تھے۔ ایک دفعہ وہ شکار کو گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ہرن چوکڑیاں بھرتا ہوا جا رہا ہے۔ بڑے شہزادے نے اس کے پیچھے گھوڑا ڈال دیا۔ دوسرا شہزادہ بھی پیچھے چلا لیکن وہ کسی اور راستہ پر نکل گیا۔ وہ دونوں راستہ بھول گئے اور ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے .... یہاں آ کر اس کے حافظہ نے دم دے دیا۔ اسے اتنا تو یاد تھا کہ بہت سی مصیبتوں کے بعد وہ بالآخر آپس میں مل جاتے ہیں اور اندھے راجہ کی آنکھوں میں نور آ جاتا ہے لیکن کب ملے، کیسے ملے یہ اسے بالکل یاد نہیں آیا۔ اسے کہانی کا آغاز یاد تھا انجام وہ بھول گیا تھا۔ انجام یاد رکھنے کی ضرورت بھی کیا ہے ——— وہ سوچنے لگا ——— آج کل کہانیوں کا انجام بھی نرالا ہوتا ہے۔ اب شہزادے بچھڑ جاتے ہیں ملتے نہیں ہیں۔ پہلے بادشاہ روتے روتے اندھے ہو جایا کرتے تھے اور پھر ان کے کھوئے ہوئے لال مل جایا کرتے تھے اور ان کی آنکھوں میں نور آ جایا کرتا تھا۔ اب شہزادے گھر سے نکل جاتے ہیں اور بادشاہ روتے روتے اندھے ہو جاتے ہیں اور پھر مر جاتے ہیں اور شہزادے نہیں پلٹتے اور محل کھنڈر بن جاتے ہیں اور کھنڈروں میں جن بھوت رہنے لگتے ہیں ——— اور پھر رام چندر جی کی کہانی یاد آ گئی۔ اس کا ذہن عجیب اینڈی بینڈی پگڈنڈیوں پر بھٹکنے لگا۔ اسے ایسے لگا گویا اجودھیا پھر ویران ہو گیا ہے۔ رام چندر جی بن کو نکل گئے ہیں اور راجہ دسرتھ اس غم میں دنیا سے سدھار گئے ہیں اور سارے اُجودھیا میں اندھیرا پڑا ہے۔ لیکن ——— اس کے خیال نے پٹڑی بدلی ——— اجودھیا کے دن چودہ برس بعد پھرے تھے اور اب .... اس کا تصور دھندلا گیا۔ گویا ایک لاری تیزی سے اس کے پاس سے گذر گئی اور وہ گرد میں اس بُری طرح اَٹ گیا کہ سوائے ایک مٹیالے پن کے اسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔

اس کا ہاتھ پھر ریوڑیوں کی طرف بڑھنا چاہتا تھا لیکن جنبش نہ کر سکا۔ اس کا ہاتھ ایک جگہ رکھے رکھے سو گیا تھا۔ اس نے ایک تھوڑی سی کوشش سے اسے جنبش دی اور ایک میٹھی میٹھی گدگدی پیدا کر دینے والی سرسراہٹ اس کی رگوں نسوں میں تیرنے لگی۔ سوچتے سوچتے وہ کچھ تھک سا گیا تھا۔ اس نے ٹانگوں کو سیدھا کر کے اکڑا لیا اور پھر کروٹ لیتے ہوئے ایک لمبی سی جمائی لی۔ اس کی زندگی میں ——— اس نے سوچا ——— اب رہ ہی کیا گیا ہے ——— یادیں اور جمائیاں۔ یادیں دھندلی پڑتی جا رہی ہیں اور جمائیاں طویل ہوتی جا رہی ہیں۔ اس کے دل میں وہ جو ایک بوند لہو کی نظر آتی تھی وہ سکڑ رہی تھی، معدوم ہو رہی تھی۔ اسے ایسا معلوم ہوا گویا اس کا مستقبل ایک طویل بے کیف جمائی ہے۔ اس احساس سے سہم کر اس نے پھر ایک بار اپنے حافظہ کو جھنجھوڑا۔ کئی تصویریں ایک ساتھ ابھریں اور آپس میں متصادم ہو کر گڈمڈ ہو گئیں۔ اس نے کسی شام کا تصور کرنا چاہا جو اس نے رمیش کے ساتھ گذاری ہو۔ لیکن یہ شامیں ایک تو تھیں بہت کثیر تعداد میں اور پھر تپتنگ کے مانجھے کو سلجھانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن وہ تو بے طرح الجھا ہوا تھا اور تو اور خود رمیش کے چہرے کے خطوط اب اس کے تصور میں ایسے بہت واضح نہیں رہے تھے۔ اسے یہ وسوسہ ستانے لگا کہ رمیش اب اس سے چپ چاپ دور ہوتا چلا جا رہا ہے پہلے وہ کتنی جلدی جلدی خط بھیجتا تھا اور بعض دفعہ تو وہ خطوں کی ریل گاڑی چھوڑ دیتا

تھا۔ لیکن اب تو اس کے پاس کوئی ڈیڑھ دو مہینہ سے اس کا خط نہیں آیا تھا۔ شروع میں وہ اپنے خطوں میں اس پر کس بری طرح برستا تھا لیکن اب تو اس کا لہجہ بہت دھیما پڑ گیا تھا۔ یہ دھیما پن کسی دوری کی علامت تو نہیں ہے —— اس کے دل میں ایک سوال دھیرے سے اُبھرا اور مبہم سی کپکپی پیدا کر کے ڈوب گیا۔ اسے رمیش کا وہ پاکستان آنے پر پہلا خط یاد آ گیا جس میں اس نے اسے بڑی جلی کٹی سنائی تھیں۔ اسے بھی خاصا جوش آ گیا تھا اور ترکی بہ ترکی جواب دینے کی نیت سے اس نے قلم اٹھا کے بے تکان لکھنا شروع کر دیا تھا۔

"تم پوچھتے ہو کہ یہ تیرا دامن سیاست میں کیسے سن گیا۔ یہ بات بالکل ایسی ہی ہے کہ کسی شہر میں زوروں کا طاعون پھیل جائے اور کوئی شخص طاعون کے کسی مریض کے پاس پہنچے اور کہے کہ میاں تم تو اپنی تندرستی کی بڑی بڑائیاں کیا کرتے تھے۔ یہ تمہارے گلٹی کیسے نکل آئی۔ رہا تمہارا یو۔پی چھوڑ دینے کا طعنہ تو میں یہ پوچھتا ہوں کہ یو۔پی کہاں ہے، کدھر ہے؟ لے تو میں مٹی دے کر آیا ہوں . . . ." اور یہاں آ کے اس کا قلم رک گیا تھا۔ یہ بات نہیں ہے کہ اس قسم کے طعن آمیز فقرے وہ اور نہیں لکھ سکتا تھا۔ مانگے تانگے کر وہ ایک وقت کی ہنڈیا کا تو انتظام کر ہی سکتا تھا۔ لیکن وہ کسی بات پر جم کب سکتا تھا وہ تو نرا تھالی کا بینگن تھا۔ لیکن وہ جواز پیش کرنے میں تو بہت مرد تھا —— آدمی ہے ہی تھالی کا بینگن۔ ہو گی زمین گول، ویسے وہ دکھائی تو تھالی کی طرح چپٹی ہی پڑتی ہے۔ کوئی ایک بات پکڑ لینا اور اسے عقیدہ بنا لینا تو ذہنی جمود کی نشانی ہے۔ یہ تو گویا زمین کی گردش سے کشتم کشتا کرنا ہے لیکن —— ایک مخالف لہر اُبھری —— یہ بات بھی تو ایک عقیدہ ہی ہوئی۔ اس کا ذہن مناظرہ کا میدان بنتا جا رہا تھا۔ لیکن وہ رسہ تڑا کر بھاگ چھوٹا۔ اس نے ہٹ دھرمی کے انداز میں سوچا کہ مارو گولی۔ جو لوگ لٹھے کر کھڑا کیا کھرا بے قسم کی چیز بننا چاہتے ہیں شوق سے بنیں۔ لٹھ چھوڑ قطب مینار بنیں اس کی بلا سے۔ وہ تو تھالی کا بینگن ہے۔ عقیدہ والوں کو عقیدہ کی دم مبارک۔ وہ تو لنڈورا ہی بھلا ہے اور اس بحث سے چھٹکارا پا کے اس نے سوچنا شروع کیا کہ وہ کیا سوچ رہا تھا۔ آخر بات کہاں سے چلی تھی اور یہ تھالی کا بینگن بیچ میں کیسے لڑھک آیا۔ سوچتے سوچتے اسے یاد آیا کہ بات کچھ رمیش کے متعلق تھی۔ لیکن رمیش کا تھالی کے بینگن سے کیا واسطہ۔ یہ تو وہ بات ہوئی کہ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا۔ بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ کوئی تک بھی ہے۔ رمیش، تھالی کا بینگن —— آخر کیا ربط ہے ان دونوں باتوں میں . . . اسے یکایک خیال آیا کہ وہ جو خود تھالی کا بینگن ہے اس لئے رمیش کا تھالی کے بینگن سے تعلق ہوا —— اور اب اسے یاد آیا کہ وہ درحقیقت اسی تعلق کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ رمیش سے اس کا کیا تعلق رہ گیا ہے۔ رمیش اسے مہینوں خط کے پرزے سے بھی یاد نہیں کرتا، اور خود اسے اب رمیش کی صورت بھی شاید اچھی طرح یاد نہیں رہی ہے۔ غلط —— اس نے فتویٰ لگایا —— اور کوئی ہوتا تو —— خیر مان بھی لیا جاتا لیکن رمیش کو وہ کیسے بھول سکتا تھا۔ آخر کون سی بات ہے جو اسے یاد نہیں ہے اور اپنی بات کی پچ میں وہ ایک دفعہ پھر اپنے حافظہ سے کشتم کشتا کرنے لگا۔ دھند میں لپٹی ہوئی کئی تصویریں اس کی نگاہوں کے سامنے آئیں اور گم ہو گئیں۔ اس کی کیفیت کچھ ایسی ہو رہی تھی گویا کوئی بل میں اُدھ گھسے سانپ کی دم پکڑ لے اور وہ دم پھسل کر سٹاک سے غائب ہو جائے۔ اس پر پھر افسردگی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ آخر یادوں کا کیا اعتبار، وقت پڑنے پر تو ایسی سٹکتی ہیں کہ دور دور تک ان کی صورت نظر نہیں آتی۔ یادیں تو چار دن کی چاندنی ہوتی ہیں پھر غائب ہو جاتی ہیں۔ آدمی کا پھر اپنی روح کی اس بھائیں بھائیں کرتی ہوئی اندھیری رات سے پالا پڑتا ہے۔ رام چندر جی بن کو سدھارتے ہیں اور اجودھیا میں اندھیر ہو جاتا ہے۔ آدمی کی روح تو اجودھیا ہوتی ہے۔ اس کی رونق تو دوسرے کے ہاتھ ہے اور یہ دوسرے وفا نہیں کرتے —— اجودھیا کی تقریب سے اسے رام لیلا کے دن یاد آ گئے۔ اس کا ذہن اس دسہرے کی طرف منتقل ہو گیا جو اس نے آخری بار رمیش کے ساتھ گذارا تھا۔ وہ دسہرہ بھی —— اس کے ذہن میں پوری تصویر اُبھر آئی تھی —— عجب رنگ کا گیا تھا اس کا طور ہی بے طور تھا۔ ساری فضا میں ایک وحشت ایک ڈراؤنے پن کی

کیفیت بسی ہوئی تھی ویسے آدمی اس مرتبہ بھی کچھ کم نہ تھے۔ بازار سے لے کر میلہ تک تانگوں، بگھیوں، اور چھکڑوں کی لین ڈوری لگی ہوئی تھی لیکن پھر بھی جھمیوں کے اس اونچے دروازے میں گھستے ہوئے اس نے واضح طور پر یہ محسوس کر لیا تھا کہ یہ وہ پچھلے سال والا میلہ نہیں ہے اس میں سے کوئی چیز گم ہو گئی ہے۔ میلہ کا ایک چکر کاٹنے کے بعد اسے اس بات کا بھی پتہ چل گیا تھا کہ پورے میلے میں وہ اکیلا اس کھوئی ہوئی چیز کی نمائندگی کر رہا ہے۔ چکر کاٹتے کاٹتے وہ یکایک چونک پڑا تھا۔ "یہ کشن کہاں گیا؟" اور پھر وہ لیے شامیانہ کے نیچے کھڑا کہ کے ڈھونڈھتا ڈھونڈھتا نہ معلوم کدھر نکل گیا تھا۔ وہ وہاں کافی دیر تک کھڑا رہا تھا۔ دور جھمیوں کے نیچے دیو قامت ڈھلانچے کھڑے تھے۔ گردن تک کالے سیاہ کانوں میں تچے تچے پنی میں منڈھے ہوئے بالے۔ کالی لمبی لمبی مونچھیں۔ ایک ہاتھ میں تلوار دوسرے میں ڈھال۔ یہ وہی رسمی قسم کے ڈھانچے تھے جنہیں وہ بچپن سے دیکھتا چلا آیا تھا اور جنہیں دیکھ کر اس کا تخیل ماضی کی پُر اسرار خواب میں ڈوبی ہوئی پگڈنڈیوں پر بھٹک نکلتا تھا لیکن آج خوف کی ایک مبہم سی سی لہر اس کے دل میں سرسرا رہی تھی بھیڑ اتنی تھی کہ کئی چکر کاٹنے کے باوجود انہیں وہ زرد پوش زرد رو زندہ شبیہیں نظر نہ آئیں جو ان بھیانک ڈھانچوں سے پیدا ہونے والے تاثر کو اپنی حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتیں اور یہاں لڑتے لڑتے جب اسے کشن کے کھو جانے کا خیال آیا تو وہ سوچنے لگا کہ اگر یہ بھیڑ اسے بھی نگل جائے تو ... اور اتنے میں رمیش آ گیا تھا۔ "چل بھئی کشن تو ملا نہیں" ——— وہ خاموش سر نیہوڑائے گھر پہنچے تھے لیکن گھر پہ کشن موجود تھا اور اپنے تاؤ کی گود میں بیٹھا پوچھ رہا تھا۔ "تاؤ رے راجہ نے تنجاوے کی آنکھوں سے رومال چھوایا تا تو اس میں کیا تھا جو راجہ کو ٹیپنے لگا؟" اور اب وہ خود سوچ رہا تھا کہ اس رومال میں کیا تھا۔ یہ سوال اس کے خیالات کی زنجیر کچھ اس اٹرے ترچھے طریقہ سے اٹکا کہ وہ زنجیر ہی ٹوٹ گئی وہ سوچتے سوچتے اب تقریباً بالکل تھک گیا تھا۔ اس کا ہاتھ سر کے نیچے رکھے رکھے بیہر سو گیا تھا اور جب اس نے اسے ذرا جنبش دی تو پھر بڑی ننھی منی لہریں اس کی رگوں نسوں میں تیرنے لگیں۔ اس کا دماغ خالی ہو گیا تھا۔ شاید سوچنے کے لئے فی الحال اس کے پاس کچھ باقی نہ رہا تھا۔ لیکن ایک خیال دھند کی پرچھائیں کی طرح اب بھی اس کے ذہن پر منڈلائے جا رہا تھا۔ "گویا رام چندر جی بن کو چلے گئے ہیں۔ اجودھیا میں اندھیرا پڑا ہے اور راجہ دسرتھ اس غم میں دنیا سے سدھار گئے ہیں۔"

پرکاش پنڈت

سمجھوتہ

وہ چھت سے نیچے اتر آئی اور چوبارے میں بچھے ہوئے پلنگ پر آبیٹھی لیکن خیالات کا وہ لاانتہا طوفان بدستور اس کے ذہن میں مدوجزر بنا رہا۔ رفتہ رفتہ وہی مہمل سے خیالات نئے سرے سے اس کے ذہن میں اجاگر ہونے لگے کہ جن کی وجہ سے وہ تمام رات ایک لمحہ کے لئے بھی نہ سو سکی تھی۔ رت جگے کے سبب اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا اور چہرے پر خاص قسم کی تھکن کے آثار ابھر آئے تھے۔

وہ اس قسم کی ذہنی الجھنوں اور بے قراریوں سے بخوبی واقف تھی۔ ایک مدت ہی سے تو اس کا دل اس قسم کے سوچ بچار میں پنپ رہا تھا۔ وہ بے ہنگم، غیر واضح سے خیالات تو جیسے اس کی زندگی کا ایک اہم ترین جزو بن کر رہ گئے تھے لیکن آج نہ جانے کیوں اسے کچھ محسوس ہو رہا تھا گویا زندگی میں پہلی بار اس کے احساسات درد کی ٹیسوں میں الجھ رہے ہوں اور جیسے پہلی ہی مرتبہ اس کا دل اس قسم کے دکھوں کی وحشت سے آشنا ہو رہا ہو۔

اس کی آنکھوں کے ڈورے دھندلا ہو آئے تھے اور ڈلوں سے کچھ ایسے ہی پھوٹ پھوٹ کر نکلتا ہوا سیاہ و سپید لادے کی قسم کا مادہ ان کے کونوں پر ہلکے خاکستری رنگ میں جم چکا تھا۔ ہونٹوں پر کل کی مِسّی کے چمکیلے رنگ نے بھی ادھر اُدھر سے سمٹ کر پپڑیوں کی صورت اختیار کر لی تھی اور جگہ بہ جگہ ان پپڑیوں کے اکھڑ جانے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ نہایت شدت سے اپنے ہونٹ کاٹتی رہی تھی۔

اس کی عمر یہی پندرہ برس کی تھی، شہروں کی تنگ اور غلیظ گلیوں میں بسنے والی عام لڑکیوں کی طرح دُبلی پتلی، اور زرد رو لیکن کھٹی میٹھی چیزیں، چٹنی، اچار وغیرہ کی دلدادہ ہونے سے جو شے شاید اس میں دو برس بعد پیدا ہوتی اس نے قبل از وقت ہی اپنا رنگ نکھار دیا تھا۔ اس عمر میں جو بھولپن کسی بھی کنواری کے چہرے سے جھلک سکتا ہے وہ گویا کسی نے بُری طرح سے کھرچ لیا تھا۔ اس کی ہنسی میں عجب قسم کی درشتی اور تلخی گھُلی رہتی جیسے ہنسنے پر اس کی روح کھلکھلانے کے بجائے مرجھا جاتی ہو۔ جیسے وہ ہنسنا تو چاہتی ہے لیکن کسی نامعلوم طاقت نے اس سے یہ حق چھین لیا ہے۔

اس کا دل ہر وقت ایک ناقابلِ برداشت بوجھ تلے دبا رہتا تھا۔ عرصے سے ایک غیر معمولی خلا ہر وقت اس کے ذہن میں پھیلتا سمٹتا چلا آ رہا تھا

ہر لمحے اسے شدید تنہائی کا احساس ہوتا۔ ایک طرح کی بھڑک اس کی آنکھوں میں بلبلاتی۔ یہ غیر معمولی خلا کس طرح پُر ہو۔ یہ خیال آٹھوں پہر اسے مضطرب رکھتا جسے اپنی انتہائی کوششوں کے باوجود وہ ذہن کی گہرائیوں میں خلط ملط کر سکنے کے ناقابل ہو چکی تھی۔ وہ آتشیں جذبہ کسی نہ کسی طور اُبھری آتا کہ اس کے انگ انگ میں ایک ہیزاری کیفیت برپا ہو جاتی۔

اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی بے باکی، خلوص اور التجا ایک ساتھ بھری رہتی۔ ہر جذبہ دوسرے پر سبقت لے جانے کی سعی کرتا۔ کبھی کوئی طاقت عود کر آتی، کبھی کوئی جذبہ غالب آجاتا۔ اس کش مکش کے ردّ عمل سے یہ نتیجہ اخذ کرنا ناممکن تھا کہ دراصل ان آنکھوں میں کیا ہے؟ وہ نگاہیں کیا کہنا چاہتی ہیں؟ بعض اوقات یوں معلوم ہوتا گویا التجا کا جذبہ دوسرے ساتھیوں کو پچھاڑ کر کے نمایاں صورت اختیار کر گیا ہے اور نہایت ہی دردمندانہ انداز میں گڑگڑا رہا ہے —— "کچھ ہو، واضح غیر واضح بس کچھ نظر آجائے"۔

اسے کائنات کی ہر چیز سے نفرت تھی۔ اپنے آپ سے، اپنے ان غیر اختیاری اضطراری کیفیات برپا کرنے والے اوٹ پٹانگ خیالوں سے، اپنی سہیلیوں سے جو بڑی چنچلائی اور دل جمعی سے اپنی محبت کے قصے سُنا سُنا کر اس کے دل میں بھی کچھ اسی طرح اترانے اور فخر سے باتیں بنانے کا احساس پیدا کرتی تھیں۔ گھر کے کام کاج سے، کیا وہ اسی لئے پیدا ہوئی ہے کہ صبح سے شام تک کولھو کے بیل کی طرح گھر کے کام میں جتی رہے، اپنے ماں باپ کے اس جھوٹے پیار سے بھی بے انداز نفرت تھی جو خواہ مخواہ اس کے تئیں جتایا جاتا تھا۔ ماں باپ کی میٹھی میٹھی باتیں بھی اسے بالکل ہی بے سروپا معلوم ہوتیں۔ بلکہ اسے غصہ آتا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ ان کے لاڈ پیار میں محبت کی نہیں، ہمدردی کی آمیزش ہے۔ ہمدردی جو کسی بھی بیگانے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ رات کے دس بجتے ہی وہ چار بچوں کو اس کے سپرد کر کے علیحدہ کمرے میں سونے کو چل دیتے تھے اور بچے آدھی آدھی رات تک ریں ریں کرتے ہوئے اس کے لیے وبالِ جان بنے رہتے تھے۔ پھر وہ طویل، بھیانک اور تاریک راتیں، وہ تو ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھیں۔ ایک ایک رات میں وہ کئی کئی بار ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی اور گم سم لیٹی ہوئی پہروں کمرے کی تاریک فضا میں اِدھر اُدھر آنکھیں بھٹکاتی رہتی۔ کبھی کبھی انتہائی کوشش کے باوجود سو نہ سکنے سے وہ کمرے کی کھڑکی کھول کر باہر آسمان کی طرف ایک ٹک دیکھنے لگ جاتی جیسے کسی آسمانی طاقت کی راہ دیکھ رہی ہو۔ لیکن دوسرے ہی لمحے جیسے ٹمٹماتے ہوئے ستارے اس کا مذاق اڑانے لگتے۔ خاموش فضا، وحشیانہ قہقہے لگا کر اسے چڑانا شروع کر دیتی کہ وہ جھنجھلا اٹھتی۔ کچھ یونہی دیوانوں کی طرح اس کا دل چیخنے چلانے کو چاہتا۔ یہ ستارے مجھے کیوں اچھے نہیں لگتے۔ یہ چاند کیوں چاندنی بکھیر رہا ہے۔ یہ موت کا سا سکوت کیوں؟ یہ سب کیا ہے، یہ سب کیوں ہے؟ لیکن کوئی پھانس اس کے حلق میں پھنس کر رہ جاتی اور وہ پھر اپنے تئیں چارپائی پر گرا دیتی ——

دن تو کسی نہ کسی حیلے کٹ ہی جاتا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں میں، گھر کے کام کاج میں، اور اسے اس قسم کے خیالات سے قدرے نجات مل رہتی لیکن جونہی شام ہونے کو آتی اس کا دل پھر بیٹھنے لگتا۔ اس وقت اسے کچھ اچھا نہ لگتا۔ ساری رات انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں رہنے کے احساس سے ایک جان لیوا سی افسردگی اس کے چہرے پر دھرنا دے بیٹھتی اور اُداس مضمحل سی وہ یہاں وہاں گرنے پڑنے لگتی۔ یہ دن کب ختم ہوں گے یہ راتیں کب ختم ہوں گی؟ اسے یقین ہو چکا تھا کہ جو وہ چاہتی تھی ایک آرزو ہے، ناتمام ہی تھی۔

اس ذہنی انتشار اور اس قسم کی بیقراریوں کو اندر ہی اندر دبائے رہنے سے اس کا ذہن ایک طرح کی دلدل بن چکا تھا جس میں کئی طرح کی امنگیں، امیدیں اور تشنہ کامیاں اور حسرتیں دھنس کر رہ گئی تھیں۔ ہر لحظہ وہ کئی کئی ڈھنگوں سے اُبھر اُبھر پڑتیں اور تڑپ تڑپ کر اس کی تمام تر توجہ اپنی طرف کھینچ لیتیں —— سوچ ہمارے لئے، ہماری رہائی کے لئے کچھ سوچ ——

مگر وہ سوچ سوچ کر عاجز آچکی تھی۔

بسا اوقات سوچتے ہی سے وہ اپنے خیالوں کی زندگی کو بھی پالتی تھی گوناگوں مسرتوں سے لبریز زندگی۔ زندگی کہ جس میں اسے سوچنا نہ ہوگا۔ اس وقت

اس کا ذہن کئی قسم کے ہوائی قلعے تعمیر کرنے لگتا۔ اسے اپنے چاروں طرف سینکڑوں پیار بھری نگاہیں سرگوشیانہ انداز میں کچھ کہتی ہوئی دکھائی دینے لگتیں۔ اس احساس سے معاً پیاری پیاری لہریں اس کے جسم میں سرسرا اٹھتیں۔ اس کی رگوں میں ایک کپکپاہٹ سی دوڑنے لگتی جیسے وہ کسی نئے ولولے کسی نئی امنگ سے آشنا ہو رہی ہو۔ اس کا دل کسی نامعلوم خواہش کے زیر اثر جگمگا سا اٹھتا اور خواہ مخواہ اس کا جی چاہتا کہ وہ ایک اٹ پٹ قہقہہ فضا میں بکھیر دے کہ اسے گرد و پیش کی ہر شے ہنستی ہوئی نظر آنے لگے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے بجلی کے کوندے کی سی تیزی کے ساتھ کوئی دل شکن احساس اس کے قلب کی گہرائیوں سے ابھر آتا اور کہرے کی صورت میں ہر گوشے پر چھا جاتا۔ اس پر ایک ہیبت سی طاری ہو جاتی ———— پھر وہی بھیانک طویل راتوں کی گمنامیاں، پھیکے اُداس دن ———— جھنجھلاہٹ اور وہی اس کا وجود۔

کسی رات اسے کوئی سہانا شیریں خواب بھی دکھائی دے جاتا جو بعد میں کئی کئی دن تک اس کے دل میں لذت انگیز گدگدی کرتا رہتا۔ پھر وہ ہر رات اسی قسم کے کسی خواب کی توقع میں اپنے دل میں رنگینی لانے کی کوشش کرتی۔ بارہا اسے محسوس ہوتا کہ کمرے کی فضا میں میٹھے سپنے منڈلا رہے ہیں لیکن وہ ان تک کیونکر پہنچے۔ پوری کوشش کے باوجود بھی وہ انہیں پا سکنے میں کامیاب نہ ہوتی ————

سورج کافی اونچا اٹھ چکا تھا اور پچھواڑے کی جانب کھلنے والی کھڑکی میں لٹکتی ہوئی بھاری بھرکم کاٹھ کاٹنے کی چق سے ہلکی ہلکی دھوپ کی اداس لہریں فرش پر جال سا بن رہی تھیں۔ اس جال پر اچٹتی سی نگاہ ڈال کر اس نے لیٹے لیٹے پورے زور سے ایک انگڑائی لی۔ اس کا انگ انگ چٹخ اٹھا۔ اسی دوران میں اس کی ماں نے رسوئی گھر سے اسے نیچے آنے کو آواز دی لیکن وہ اَن سُنی سی کر کے اسی طرح لیٹی رہی۔ اس کا ذہن ایک ماہ پہلے کی طرف پلٹ رہا تھا۔ وہ عجیب سی بات ابھی تک اس کے ذہن پر مرتسم تھی اور اکثر وہ بات اسے یاد آ جاتی تھی۔ اس وقت بھی اپنے دل میں اسے دہرانے سے وہ طنزاً ہلکا سا مسکرا دی۔ وہ بھاری بھرکم کاٹھ کاٹنے کی چق خود اسی نے ماں سے یہ کہہ کر یہاں لگوائی تھی کہ وہ موٹا درزی یوں دیدے پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھتا ہے ———— "بھینگا کلموہا" ———— طنزیہ حقارت سے وہ بڑبڑائی "یوں دیدے مٹکا مٹکا کر دیکھتا تھا گویا اسے اپنی آنکھ کے پھولے کا احساس ہی نہ ہو ———— بڑا سجیلا بنتا ہے۔ اونہہ! کوئی اس سے کہے کہ تمہیں تو کوئی چڑیل بھی دیکھنا گوارا نہیں کر سکتی۔"

جب کبھی وہ کھڑکی میں جاتی۔ درزی یوں تیزی سے مشین چلانے لگتا گویا دکھانا چاہتا ہو۔ میں دن بھر اسی رفتار سے مشین چلاتا ہوں اور میری باہوں کے پٹھے تھکتے نہیں ———— یونہی اسے خیال آیا کہ وہ فوراً اٹھ کر دیکھے کہ کیا وہ دکان کھول چکا ہے۔ لیکن پھر نہ جانے کس خیال سے وہ اسی طرح لیٹی رہی ———— وہ ایک اور ہی حیران کن بات سوچنے لگی ———— آخر وہ کیوں اس شدت سے میری طرف تاکتا ہے جبکہ اسے اچھی طرح علم ہے کہ میں لنگڑی ہوں۔

وہ لنگڑی تھی۔ یہی غم اسے گھن کی طرح کھائے جاتا تھا اس کی ماں کے کہنے کے مطابق بچپن میں کہیں وہ گھر کی سیڑھیوں سے لڑھک پڑی تھی جس سے دائیں ٹانگ کا ٹخنہ اتر گیا تھا۔ بہتیرے حیلے کئے گئے مگر اصلی حالت پر نہ آ سکا۔ یہ قصہ اکثر اس کی ماں سارے ڈھلے گلی کی عورتوں میں بیٹھ کر چھٹی سے خربوزے تربوز کے بیج نکالتی ہوئی دہراتی اور جب وہ سب عورتیں اس کے بڑے نصیب پر چچ چچ کرنے لگتیں تو اس کے دل میں کئی قسم کے اضطراری شعلے ایک ساتھ بھڑک اٹھتے۔ اس وقت اس کا جی چاہتا کہ وہ جان بوجھ کر ایک بار پھر سیڑھیوں پر سے لڑھک پڑے اور اپنی دوسری ٹانگ کو بھی ناکارہ کر لے کہ وہ چل پھر تو نہ سکے گی۔ نہ کوئی اسے دیکھے گا نہ اس کی حالت زار پر افسوس کرے گا اس کے وقار کی ہیٹی تو نہ ہو گی۔

یوں وہ بناؤ سنگھار کی بڑی دلدادہ تھی۔ گھنٹوں آئینے کے سامنے کنگھی لئے وہ بال سنوارتی رہتی۔ اس کے بال گو چھوٹے اور چھدرے تھے لیکن وہ ایک ایک لٹ کو چن کر اس طرح جما لیتی کہ ان میں ایک عجیب قسم کی پھبن پیدا ہو اٹھتی۔ وہ اپنے ابروؤں کے بال بڑی محنت کے ساتھ

مونچنے سے تراشتی کہ قدرتی بے ترتیبی ناپید ہو کر سہانا تناؤ آ سکے۔ آنکھوں کی پلکوں پہ کریم مل مل کر وہ انہیں دہراکستی اور کاجل سرمے کی سلائیوں کو اس ہنرمندی سے آنکھوں میں پھیرتی کہ چھوٹی ہونے کے باوجود آنکھیں کنپٹیوں تک لانبی دکھائی دینے لگتیں۔ پھر وہ ہونٹوں پر مسّی گھستی رہتی جس سے ہونٹوں میں غضب کی دل آویزی اور رسیلی چمک پیدا ہو اٹھتی تھی۔

کپڑے پہننے میں بھی وہ بڑی احتیاط برتتی۔ کس جمپر کے ساتھ کون سی شلوار کا میل ہے۔ چنری کے کون سے رنگ میں وہ زیادہ جاذبِ نظر دکھائی دے گی۔ آنچل کس طرح لہرائے کس ڈھنگ اوڑھنے سے لہریئے زیادہ چمک سکتے ہیں۔ ان سب باتوں میں اسے کمال حاصل تھا لیکن یہ سبھی جادو تو جیسے کسی بہت بڑے آسیب کے زیرِ اثر ہر دم رہتے ہی رہتے۔ وہ غیر مطمئن تھی۔ وہ یہ نہ چاہتی تھی کہ کوئی اسے دیکھ کر اس کی حالتِ زار پر افسوس کرنا شروع کر دے، اس سے ہمدردی جتانے لگے۔ بلکہ وہ تو کچھ اور ہی چاہتی تھی۔ اس کی تسکین کا محض ایک ہی ذریعہ تھا کہ کوئی بھی نوجوان اسے کسی اور ہی جذبے کے زیرِ اثر دیکھے —— وہ سحر طراز جانا پہچانا جذبہ جو صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی سہیلیوں کی طرح لڑکوں سے چھپ چھپ کر ملنا بھی نہیں چاہتی۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتی کہ کسی خوبرو نوجوان کے ساتھ پہروں میٹھی پیار و محبت کی باتیں کرتی رہے، کوئی اس کی تعریفوں کے پل باندھے۔ وہ تو صرف یہ چاہتی ہے کہ کوئی اسے ان نگاہوں سے دیکھے جن نگاہوں کا تصور ایک مدت سے اس کے خیالوں میں رچ چکا ہے۔

دھوپ لمحہ بہ لمحہ گرمی پکڑ رہی تھی۔ اس کی ماں نے نیچے سے ایک اور آواز دی لیکن اس نے کروٹ بدل لی۔ سامنے گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں شربتی رنگ کا پھولدار پردہ ہوا کے دوش پر لہرا رہا تھا اس کی طرف نظر جاتے ہی بیک لخت نہ جانے کیوں اسے محسوس ہوا کہ وہ پردہ پھبتی آمیز قہقہے لگاتا ہوا اس پر نہایت ذلیل فقرے کس رہا ہے، وہ چھٹپٹا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کا سانس قدرے زور سے چلنے لگا۔ ایک بار اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ لپک کر اس پردے کو کھینچ لے اور چیتھڑا چیتھڑا کر کے ہوا میں اچھال دے لیکن دوسرے ہی لمحے اسے اس پردے سے ایک طرح کی وحشت آنے لگی گویا سچ مچ ہی وہ اس سے مخاطب ہو —— "سنہری سپنوں کا جال ٹوٹ چکا۔ مجھے ہی نہیں تم نے اپنے آپ کو بھی دھوکا دیا ہے۔ اب تڑپو، تلملاؤ کہ یہی انصاف ہے ——"

اس پھولدار شربتی رنگ کے پردے سے اس کی کس قدر رنگین اور پیاری گھڑیاں چمٹی ہوئی تھیں۔ ایک ہی ہفتہ پہلے اس نے خود اپنے ہاتھوں اپنی ذرا سی پھٹی ہوئی ساڑھی پھاڑ کر کے یہ پردہ یہاں لٹکایا تھا گو اس میں اس کی ماں کا بھی ہاتھ تھا۔ تاہم اس پردے کے ساتھ ایک اور بھی پردہ پڑا رہے گا، اس نے اپنی ذرا سی پھٹی ہوئی ساڑھی پھاڑ دی تھی —— ایک ہفتہ —— یعنی کل سات دن —— وہ سوچنے لگی۔ کتنا مختصر وقت ہے لیکن اس نے اس دوران میں کیا کچھ نہیں پایا —— اس سنہری دور کا وہ پہلا دن جب اس نے مہندر کو سامنے کے مکان کے چھجے پر آرام کرسی پر لیٹے پڑھتے دیکھا تھا۔ صبح ہی صبح جب وہ چوبارے کی اس کھڑکی میں آ کر کھڑی ہوئی تو ایک دم جیسے اس کا دل بول اٹھا تھا۔ ہاں جس کی تلاش میں تم برسوں سے سرگرداں ہو آج وہی تمہارے سامنے آ موجود ہوا ہے۔ یہ ہے ستار تمہارے دل کے تاروں پر وجد آور نغمے گائے گا —— یہ مسیحا تمہاری صدیوں کی تڑپ ہرنے آیا ہے اور واقعی مہندر کی ایک ہی میٹھی نظر نے اس کی تڑپ ہر لی۔ صدیوں کا روگ مٹ گیا۔ اسے دنیا کی ہر شے مسکراتی اور خوشی سے ناچتی ہوئی دکھائی دینے لگی۔

مہندر اٹھ کر اندر چلا گیا لیکن وہ کتنی ہی دیر تک وہاں کھڑی رہی تھی۔ کس قدر تعجب کی بات ہے، اس نے سوچا گھر کے بالکل مقابل کے مکان کو اس سے پہلے اس نے غور سے نہیں دیکھا —— وہ تو جب بھی اپنی کسی نئی سہیلی کو اپنے مکان کا پتہ بتایا کرتی تھی تو محض اتنا ہی کہ فلاں گلی میں ہے۔ دائیں ہاتھ کے تین چار مکانوں کے بعد پیلے رنگ کے چھجے والے مکان کے ٹھیک سامنے ہی اس کا گھر ہے۔ بھلا وہ یوں کیوں نہ کہتی تھی کہ اس پیلے مکان کے چھجے کے جنگلے میں انیس سلاخیں ہیں جن میں سے تیرہ سلاخیں تو شاید دھوپ اور بارش میں رہنے کے سبب زنگ آلود

ہو چکی ہیں لیکن باقی چھت پر لگا ہوا تار کول ابھی اپنی پوری آب پر ہے اس مکان کے دروازوں پر نہایت ہی چمکیلا سبز روغن کیا ہوا ہے لیکن آتے جاتے ٹخنوں کو چھوتے رہنے سے ان کے درمیانی حصے کی کچھ جگہ مٹیلی بھی ہو گئی ہے یا یہ کہ چھجہ کافی کھلا ہے اور وہاں بخوبی انسانی سے آرام کرسی بچھا کر کوئی پڑھ سکتا ہے۔

اس واقعہ نے اسے یکسر بدل دیا۔ اس کے قلب کی گہرائیوں سے نکلتی ہوئی درد و کرب کی چیخیں جانے کہاں دفن ہو گئیں اور ان کی بجائے نہایت لطیف تسکین دہ احساسات نے جگہ پالی جیسے کسی لق و دق صحرا میں بھٹکتی ہوئی یکایک وہ کسی سرسبز رنگین وادی میں پہنچ گئی ہو۔ ایسی وادی جو اس کے خیالوں کی وادی سے بھی کہیں زیادہ خوشنما تھی جہاں کل کل کرتے ہوئے ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشمے اس کی تڑپ اور تشنگی مٹانے کو محو انتظار تھے۔ اس میں ایک غیر معمولی پھرتی آ گئی۔ گھر کے کام کاج میں بھی وہ بڑی مستعدی دکھانے لگی۔ اس سے پہلے برتن مانجھنے سے وہ اکثر کنی کترا جاتی تھی اور اس وجہ سے اسے ماں کے سینکڑوں کوسنے سننے پڑتے تھے لیکن اب وہ خود بخود ہی چمکیلے برتن چمکا کر الماری میں جوڑ دیتی اور منٹوں میں دوسرے رسوئی کے کاموں سے بھی نبٹ جاتی۔ اپنے بہن بھائیوں اور ماں کے تئیں بھی وہ بڑی محبت جتانے لگ گئی تھی۔

لیکن اس کی ماں بڑی جہاں دیدہ عورت تھی۔ پہلے ایک دو دن تو اس نے اس اچانک تبدیلی کو کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ عمر کا تقاضا سمجھ کر درگزر کرتی رہی لیکن جب پانی سر سے گزرتا ہوا دکھائی دیا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ سامنے کے مکان میں آ کر بسے ہوئے نئے کرایہ دار کے لڑکے مہندر کو بھی وہ اکثر چھجے پر بیٹھے اور ادھر کھڑکی کی طرف بار بار دیکھتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔ لہٰذا کسی قسم کی انگشت نمائی کے ڈر سے اس نے کھلے طور پر تو کوئی قدم نہ اٹھایا۔ صرف اپنی لڑکی کو طرح طرح کی دلیلیں دے کر اور باتوں باتوں میں بات لگا کر سمجھانے کی کوشش کی اور اسی کے کہنے پر ہی کھڑکی میں یہ پردہ لٹکا دیا گیا تھا لیکن وہ ماں کی آنکھ بچا کر دن میں بیسیوں مرتبہ کھڑکی میں چلی آتی تھی۔

چوبارے کی یہ کھڑکی سامنے کے چھجے سے قدرے اونچائی پر تھی۔ اس طرح چھجے پر سے کھڑکی میں کھڑے کسی شخص کی کمر تک ہی کا حصہ دکھائی دے سکتا تھا۔ پھر بھی وہ وہاں کھڑی ہو کر پردے کو اس انداز سے سرکائے رکھتی کہ مہندر صرف اس کا منہ یا زیادہ سے زیادہ چھاتیاں ہی دیکھ سکے۔ دن کو تو زیادہ تر ماں اسے نیچے اپنے پاس بٹھائے رکھتی تھی۔ لیکن رات کو کسی قسم کی روک ٹوک نہ ہونے سے وہ اپنے تہن چھا بیل کو پچکار کر سلا کر کھڑکی میں چلی جاتی۔ گو اس کی ماں ایک بار سونے کے لئے جا چکنے کے بعد پھر کبھی اس کے پاس نہ آتی تھی۔ پھر بھی احتیاط کے طور پر وہ چوبارے کی بتی بجھائے ہی رکھتی۔

چھجے کے اندر کی طرف دروازہ مہندر کے کمرے میں کھلتا تھا جسے شاید وہ ہوا آنے کی غرض سے کھولے رکھتا تھا۔ کھڑکی میں سے وہ بخوبی اسے پڑھتا ہوا دیکھ سکتی تھی۔ پہروں وہ اندھیرے میں کھڑی سے تاکے جاتی۔ مہندر کو شاید اس بات کا علم نہ تھا وہ بے خبر اپنی پڑھائی میں مگن رہتا اور جونہی گھڑیاں بارہ بجاتیں اس کے کمرے کی بجلی بجھ جاتی۔ کئی بار اس کے دل نے بغاوت بھی کی کہ وہ کسی طرح اسے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے اور التجا کرے۔۔۔ دیکھو دیر تے لئے اور رد جاؤ ــــــ تم اتنی جلدی کس طرح سو جاتے ہو ــــــ لیکن وہ بے دلی سے کھڑکی سے ہٹ جاتی۔

لیکن تیسرے دن کے بعد مہندر نے بجی کمرے میں بیٹھنے کی بجائے باہر چھجے پر آ کر ٹہلنا اپنا معمول بنا لیا۔ کبھی کبھی وہ سیدھا کھڑا ہو کر اس کی طرف ٹکٹکی بھی باندھ لیتا۔ کوئی اشارہ یا بات تو نہ ہوتی لیکن اس دن کے بعد دونوں ہی اس دھن میں رہنے لگے کہ ایک دوسرے سے پہلے مخصوص جگہ پر پہنچ جائیں۔ اسے گھر کے کام کاج میں اکثر دیر ہو جاتی۔ ماں کوئی بیگار ڈال دیتی یا بچے ہی سونے کا نام نہ لیتے تو وہ جھنجھلا جھنجھلا کر اس اونچی آواز میں انہیں ڈانٹتی کہ مہندر اگر چھجے پر پہنچ چکا ہے تو اس کی آواز اس تک پہنچ سکے یا اگر ماں جاگ رہی ہے تو اسے کسی قسم کا شبہ نہ ہو اور جونہی سب ٹھیک ٹھاک دیکھ کر وہ کھڑکی میں آ کر مہندر کو انتظار کرتا ہوا پاتی تو اس کا رواں رواں خوشی سے کھل اٹھتا۔

اب اس کی سہیلیاں جب اسے ملنے آتیں اور حسب معمول اپنے کسی محبت کے قصے کو نمک مرچ لگا کر بیان کرتیں تو خلاف معمول وہ ان میں

زیادہ دلچسپی لینے لگتی۔ بات بات پر وہ کھلکھلا اٹھتی مگر یا ان کی محبت کا مذاق اڑا رہی ہو ——— "اچھا کل اس نے تمہاری گلی میں بارہ چکّر لگائے "۔ اور یہ کہتے ہوئے وہ قہقہے لگا کر ہنسنا شروع کر دیتی۔ ہنستے ہنستے اسے اُتھو آنے لگتا۔ کئی بار اسے بھی خیال آیا کہ وہ ان سے کہے آخر میں بھی تو محبت کرتی ہوں، ہماری طرف دیکھو۔ وہ میری بابت سوچتا ہے میں اس کی بابت سوچتی ہوں اور بس! اور یہ جو تم گلیوں کے چکّر کاٹنے والی باتیں سُنا رہی ہو یہ سب لغویات ہیں ——— فضول ——— واہیات ———

مگر وہ اپنے تصوّر کی کلی یکسوئی کے باوجود کچھ بھی کہنا پسند نہ کرتی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی سہیلیاں اس کا مذاق اڑانے لگیں گی۔ ایسے ایسے دل شکن فقرے دہرائیں گی کہ اس کی روح کا ہر ذرّہ رو اٹھے گا۔ کسی کو بھی اس کی باتوں پر یقین نہ آئے گا۔ وہ سب تو شاید یہی سمجھتی ہیں کہ دنیا بھر کے کسی بھی شخص کی دلچسپیوں کا مرکز اگر کوئی ہو سکتا ہے تو محض انہی کی ذات۔ ہونہہ! وہ سوچتی 'یہ خود اعتمادی دراصل کس قدر بے وقعت ہے' اسے یاد تھا کہ اسی شانتی کا چاہنے والا جس کے متعلق وہ بڑی بڑی ڈینگیں مارا کرتی تھی اور جس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے تک ملاتے نہ چوکتی تھی، پچھلے دنوں گھر کی نوکرانی کے ساتھ پکڑا گیا تھا۔

سُرمئی رنگ کا پھولدار پردہ بدستور ہوا سے پھڑپھڑا رہا تھا اور کائی کانے کی بیل، گم سم حق سے چھن کر آتی ہوئی دھوپ کمرے میں گُھسی بھر رہی تھی ——— پردے کی طرف دیکھنے سے پھر اس کے سینے میں کسک سی ہوئی اور اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتما اٹھا۔ کسی غیر معلوم خواہش کے زیرِ اثر ایک دم اس کے ذہن میں خیال ابھرا کہ وہ ایک لمحہ کے لئے پردے کی اوٹ میں جا کر کھڑی ہو جائے۔ یونہی ——— لیکن فوراً ہی بعد پھر اسے اپنے اس احساس سے بھی وحشت سی ہونے لگی۔ پردہ جیسے پھر کچھ کہنے کو دکھائی دیا ———

وہ تن کر سیدھی لیٹ گئی۔ اس کی پیشانی عرق آلودہ ہو چکی تھی۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئی تھیں اور اس کا ذہن کسی فیصلہ کن راہ پر چلنے کے بجائے اِدھر اُدھر بھٹکنے سے جواب دینے لگا۔ نڈھال سی ہو کر وہ چھت کی کڑیاں گننے لگی لیکن اس سمت بھی اس کا دھیان زیادہ دیر نہ جم سکا۔ سینے کی آگ اور زور سے بھڑکنے لگی۔ آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے اور وہ سسک سسک کر رونے لگی۔

ماضی کی اس کے تئیں سرد مہری اور مستقبل میں بھی روشنی کی کسی ہلکی سی کرن کے لئے نا امیدی نے اس کے چہرے پر مُردنی سی چھا گئی ——— بیاہ ——— یکایک یہ خیال نہ جانے اس کے ذہن کے کس گوشے سے اُمڈا اور تھوڑی دیر کے لئے اس خیال نے اسے ذرا سی قوت بخشی۔ اس نے آنسو پونچھ ڈالے لیکن پھر جب وہ اپنی گذشتہ زندگی کا تجزیہ کرنے لگی تو اسے یہ خیال بھی محض دل بہلاوے ہی کا ایک سامان معلوم ہونے لگا۔ کئی بار اس کی سگائی کا چرچا اٹھا تھا۔ جس دن لڑکے والوں کی طرف سے کسی عورت کی آمد آمد ہوتی وہ لگاتار کئی کئی گھنٹے ٹک پلک درست کرنے میں گذار دیتی لیکن جونہی اس عورت کا سامنا ہوتا ساری سحر انگیزی ٹوٹ جاتی۔ خود نمائی کا جادو اپنے ہی سر چڑھ کر بول اٹھتا۔ اسے انتہائی یقین ہو چکا تھا کہ کسی بھی حالت میں وہ شادی کے قابل نہیں سمجھی جا سکتی۔ کبھی کبھی اسے یہ خیال بھی گذرتا کہ یہ جو چہرے پر چیچک کے بدنما داغ، پھلبہری کے نشان چھیٹے موٹی، بھدّی، کالی، بھدنگی، سینکڑوں عورتیں گھروں کی رانیاں بنی بیٹھی ہیں۔ یہ بھلا کیونکر قبول کی گئی ہوں گی؟ اور اس خیال سے اس کے دل کو ذرا دیر کے لئے ڈھارس بندھ جاتی کہ شاید ——— شاید ——— لیکن جونہی یہ پیوند لگتا کہ ممکن ہے یہ سب کچھ شادی کے بعد ظہور میں آیا ہو تو وہ اپنی ہی قسمت پر لعنت ملامت کر کے خاموش ہو جاتی۔ کاش کہ قدرت نے اسے لنگڑی ہی نہ کیا ہوتا۔ شادی ہو جانے کے بعد چاہے اس کے کل جسم کو فالج مار جاتا ——— وہ کوڑھی ہو جاتی ———

نیچے سے ماں کی ایک زوردار آواز نے اس کے خیالات کے تسلسل کو توڑا۔ اسے خیال آیا کہ اٹھ کر نیچے چلی جائے۔ ماں جانے اس کے متعلق کس واہمے میں مبتلا ہو گی۔ لیکن پھر اسے اپنی ماں پر بھی غصہ آنے لگا۔ وہ سوچنے لگی آخر یہ سب اسی کی تو لگائی ہوئی ہے۔ اگر وہ کل پڑوسن کے ہاں نہ گئی ہوتی تو ....

کل کے واقعے کی تصویر آنکھوں کے سامنے آتے ہی اس کی آنکھیں پھر نمناک ہو اٹھیں۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ ماں پڑوسن کے یہاں

گئی ہوئی تھی کہ سرتیع ہاتھ آتے ہی وہ بھی کھڑکی سے جا لگی۔ سامنے مہندر بھی کرسی بچھائے پڑھ رہا تھا۔ آج پہلی مرتبہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔۔۔۔ وہ کس قدر چالاکی سے کتاب کو منہ تک سرکائے بظاہر پڑھنے میں منہمک نظر آتا تھا مگر اس کی آنکھوں کی آسیبی چمک سورج کے سامنے رکھے ہوئے آئینے کے شکارے کی طرح اس کی آنکھوں میں پیوست ہوتی جا رہی تھی۔ ان آنکھوں میں کیا کچھ نہیں ۔۔۔۔؟ وہ سوچ ہی رہی تھی کہ یکایک پڑوسن کی لڑکی نے جو اس کی سہیلی بھی تھی اسے نیچے گلی سے پکارا۔ انہی کے ہاں سے ماں نے اس کو بلانے کے لئے اسے بھیجا تھا۔ دفعتہً بجلی کے جھٹکے سے جس طرح کوئی سر سے پاؤں تک لرز اٹھتا ہے وہی کیفیت اس پر طاری ہو گئی۔ وہ کیونکر گلی میں جائے گی؟ یہ خیال اسے کسی غیر معمولی طوفان کا پرتو معلوم ہونے لگا۔ اس کے جسم کے ہر حصے میں ایک ہیجان امنڈ پڑا۔ اسے محسوس ہوا گویا ماں اس سے پچھلے جنم کا انتقام لینا چاہتی ہے۔

اس کی سہیلی اب اوپر اس کے پاس آ چکی تھی اور ساتھ چلنے کو کہہ رہی تھی۔ اس نے سر درد کا بہانہ کیا پھر پیٹ درد حتی کہ ہر درد گن ڈالا۔ کئی اور بھی بہانے بنائے مگر اس نے ایک نہ سنی اور آخر اسے کھینچتی ہوئی نیچے لے ہی گئی۔ اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ سارا جسم کانپ رہا تھا۔ ڈیوڑھی میں پہنچ کر ایک بار اسے خیال آیا کہ وہ ذرا سی دیر میں آنے کو کہہ کر اوپر کھڑکی میں چلی جائے اور بے باکانہ انداز میں گڑگڑا کر مہندر سے التجا کرے کہ اے میری روح کے نور، میرے مسیحا! آج تک میں نے تجھ سے بات تک نہیں کی۔ چاہت بھری نگاہوں کی دین کے علاوہ کچھ نہیں چاہا۔ آج میں جھولی پھیلا کر تجھ سے ایک بھیک مانگتی ہوں۔ خدارا تھوڑی دیر کے لئے اندر کمرے میں چلے آؤ۔ مگر وہ ابھی تک پوری طرح یہ سب سوچ بھی نہ پائی تھی کہ اس کی سہیلی گھسیٹ کر اسے باہر لے گئی۔

اس پر غشی کا سا عالم طاری تھا۔ کل جسم سے پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ کاش اس وقت زمین پھٹ سکتی کہ وہ اس میں سما جاتی۔ اپنی سہیلی کا کندھا تھامے رہنے اور ٹانگ کو پوری قوت سے اکڑانے کے باوجود اس کا پاؤں گھوم کر لڑکھڑا ہی جاتا۔ ہر قدم پر اسے محسوس ہوتا گویا سینکڑوں بچھو ایک ساتھ اس کے جسم پر ڈنک چلا رہے ہوں۔

ماں کی باتوں پر وہ پوری طرح سے توجہ نہ دے سکی۔ ہر لحظہ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ صرف اتنی ہی بات اس کی سمجھ میں آ سکی کہ تمہارے پتا جی کے آنے کا وقت ہو گیا ہے چولہے پر چائے کے لئے پانی رکھ دو اور نیچے اپنے بہن بھائیوں کے پاس بیٹھو۔

وہ جلدی ہی واپس لوٹ آئی۔ آتے ہوئے اس نے اوپر چھجے کی طرف دیکھا۔ مہندر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گرتی پڑتی سیڑھیاں طے کر کے جب وہ چوبارے کی کھڑکی میں پہنچی تو مہندر چھجے پر موجود نہ تھا۔ چھجے اور کمرے کو ملاتا ہوا آٹھ دن کھلا رہنے والا دروازہ بھی بند ہو چکا تھا۔

شام تک وہ کھڑکی سے نہ ہٹی۔ ماں نے جب اوپر آ کر چوٹی سے پکڑ کر کھینچا، گالیوں اور دھول دھپوں کی بوچھاڑ کی تب کہیں وہ نیچے اتری۔ باپ الگ خفا ہو رہا تھا لیکن اسے تو اب جیسے کسی کی پرواہ ہی نہ تھی۔ جیسے وہ کچھ سن ہی نہ رہی تھی۔

رات بھی وہ آدھی رات تک کھڑکی میں کھڑی رہی لیکن اس کے دل کی طرح سامنے کا چھجہ بھی ویران ہی رہا۔

وہ جانتی تھی کہ اب وہ دروازہ کبھی نہ کھلے گا۔ پھر جانے اس خیال سے وہ وہاں جمی رہی کہ گزشتہ سات دنوں کی اس زندگی کو وہاں سے کھرچ کر اپنے دل میں سنبھال کر رکھ لے۔ ماضی کی طرح پھر جب خیالات کا تصادم ہو گا تو اسے اپنی اس زندگی سے تھوڑی بہت تو تسکین مل سکے گی۔

چھجے کے دروازے کی درزوں میں سے تیز دھار کٹاریوں کی صورت میں اس کے کلیجے کو چھلنی کرتی ہوئی بجلی کی روشنی اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ وہ پڑھ رہا تھا۔ "یقیناً وہ پڑھ رہا ہو گا" اس نے سوچا۔ اسے تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ اتنے بڑے انقلاب کا اثر کائنات کی کسی بھی چیز پر تو نہیں ہوا۔ ستارے اسی طرح جھلملا رہے ہیں۔ چاند چاندنی بکھیر رہا ہے۔ لوگ نیند میں گھوک سو رہے ہیں ۔۔۔۔۔ یہ خوفناک طویل بھیانک رات۔ یہ تنہائی۔ یہ خلا ۔۔۔۔۔۔

اس کی حالت پیاس سے مرتے ہوئے اس انسان کی سی تھی جس کے ہاتھوں میں ٹھنڈے پانی سے لبالب پیالہ دے کر پھر اسی دم چھین لیا گیا ہو۔ جس نے صدیوں کی تشنگی کو دبا کر اس ساعتِ خوش کن کا انتظار کیا ہو اور جو ناکام ہونے کی صورت میں بجھتے ہوئے دیئے کی لو کی مانند بھڑک اٹھے۔

اس کا دھیان پھر پردے کی طرف گھوم گیا۔ ہوا کے زور سے پردہ بدستور پھڑپھڑا رہا تھا ——— ان تھک زبان سے کہے جا رہے وہ فقرے اس کی روح کو تڑپانے لگے ——— سنہری سپنوں کا جال ٹوٹ چکا۔ مجھے ہی نہیں تم نے اپنے آپ کو دھوکا دیا ہے۔ اب تڑپو، تلملاؤ کہ یہی انصاف ہے۔ کسی غم یا غصے کے بجائے وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگی گویا گرد و پیش کی ہر شے سے پوچھ رہی ہو۔ "کیا سچ مچ یہ انصاف ہی ہے؟"

پھر غیر ارادی طور پر اس کی آنکھیں چپ چاپ لٹکتی ہوئی کانٹے کی بوجھل چق کی طرف اٹھ گئیں اور ایسے ہی وہ سوچنے بھی لگی۔ آخر اس چق پر ہوا کے جھونکے کیوں اثر انداز نہیں ہوتے۔ یہ کیوں خاموش ہے؟ ——— کہ یکایک اس چق پر تیز تیز دھڑکنوں سے مشین چلاتا ہوا درزی اُبھر آیا اور جیسے اس کی آواز بھی واضح طور پر سنائی دینے لگی۔ "میں سب انقلابوں سے بے نیاز ہوں ——— میں سب انقلابوں سے بے نیاز ہوں۔"

وہ دونوں کھڑکیوں کے درمیانی فاصلے کا جائزہ لینے لگی۔ صرف ایک ثانیہ کے لئے اس کے ذہن کے کسی گوشے سے کوئی جذبہ پکارا ——— ایک خلیج ہی تو ہے، گہری، ناقابلِ عبور" ——— لیکن دوسرے ہی لمحے کسی خوفناک عزم کے دبدبے سے گویا وہ جذبہ پھر ذہن کی گہرائیوں میں اٹھک گیا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو چکی تھی۔

چند ہی لمحوں کے بعد گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی کانٹے کی بوجھل چق سے ڈھک گئی اور پچھواڑے کی کھڑکی میں پھولدار پردہ ہوا کی لہروں پر ناچنے لگا۔

سرلا دیوی

چاند بجھ گیا

جب سے ڈاکٹر ہو کر گیا تھا گھر میں ایک منحوس سی خاموشی چھا گئی تھی۔ سب غیر معمولی طور پہ چپ ہو گئے تھے۔ ان کے ہونٹوں سے ہنسی یکسر غائب ہو گئی تھی۔ وہ چل پھر رہے تھے، مگر سایوں کی طرح خاموش۔ ان کے چہرے ایک ساتھ لمبے لمبے ہو گئے۔ ان کی آنکھوں کی سفیدی ضرورت سے زیادہ نمایاں ہو گئی تھی اور چیزوں کو پکڑتے اور اٹھاتے وقت ان کی انگلیاں کانپ کانپ جاتی تھیں۔ گھر کے لوگوں میں اس تبدیلی کو موہنی نے بخوبی محسوس کیا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ کمرے میں جو شخص بھی داخل ہوتا ہے، اس سے آنکھیں نہیں ملاتا بلکہ جلد سے جلد باہر چلے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس نے ایک دو بار دریافت بھی کیا کہ ڈاکٹر کیا مرض بتا گیا ہے۔ مگر کسی نے تسلی بخش جواب نہ دیا تھا۔ سب لوگ اس سے کچھ چھپانا چاہتے تھے۔ وہ اس کی آواز سن کر چونک پڑتے تھے اور ایک بار آنکھیں ملا کر فوراً نظریں چرا جاتے تھے۔ موہنی کو کسی نے کچھ نہ بتایا لیکن وہ سب کچھ جان گئی۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا تجربہ نہ تھا۔ اس قسم کے تجربہ سے وہ پہلے بھی ایک بار دوچار ہو چکی تھی۔

لیکن پہلے تجربہ میں اور دوسرے تجربہ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اس دفعہ موہنی چارپائی پر نہیں پڑی تھی۔ ان دنوں وہ تندرست تھی۔ خوبصورت تھی۔ اس کے رخساروں کی رنگت گلابی۔ اور ہونٹوں کی سرخی تازہ تھی۔ چارپائی پر اس کے پتا پڑے تھے۔ بخار نے ان کا خون اور گوشت گھلا ڈالا تھا۔ اور ہڈیاں پیلی مردہ کھال کے نیچے بے ڈھنگے سے انداز میں پڑی رہ گئی تھیں۔ وہ چار مہینے سے بیمار تھے۔ پہلے ڈاکٹروں نے معمولی بخار بتایا۔ پھر ملیریا۔ ٹائیفائڈ اور پھر ایک دن سارے گھر میں آج کی طرح سناٹا چھا گیا۔ خوف و ہراس سے سب کانپ اٹھے۔ ہمت اور حوصلہ جواب دے گیا۔ گھر میں موت کے سیاہ پروں کا سایہ پھیلتا دکھائی دیا۔ ڈاکٹروں نے اس کے پتا کو تپ دق کا مریض قرار دے دیا تھا۔ آج پھر موہنی کی آنکھوں کے آگے اس کے بیمار پتا کی تصویر گھومنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد یہ تصویر دھندلی پڑنے لگی اور اس میں سے ایک نئی تصویر ابھرنے لگی ——— یہ دوسری تصویر موہنی کی تھی ——— موہنی کو سمجھنے میں کچھ دیر نہ لگی کہ اس نے اپنے پتا کی چارپائی سنبھال لی ہے۔

دق۔ ٹی بی ——— موہنی کی چھاتی میں برچھیاں سی اتر گئیں۔ وہ لرز اٹھی۔ اس کا سارا بدن پسینہ سے شرابور ہو گیا۔ کیا اسے واقعی دق ہو گئی ہے؟ کیا اس کی زندگی میں واقعی گھن لگ گیا ہے؟ موت!

موت کا خیال آتے ہی موہنی کا سر چکرا گیا۔ موت کے خوف نے اس کی روح کو جکڑ لیا ـــــ لیکن دوسرے لمحے یہ خوف کافور ہو گیا۔ اس کی جگہ چنتا نے لے لی۔ میں مر جاؤں گی تو میرے بعد میرے بچوں کا کیا ہوگا؟ میری سویٹ کا اور میرے اس مُنّے کا جس کا میں ابھی نام بھی نہ رکھ پائی ہوں؟ اور گویا موہنی کے لئے زندگی اور موت کے تمام مسائل سمٹ کر اس مسئلہ میں سما گئے ـــــ میرے بچوں کا کیا ہوگا۔ میرے بچوں کا کیا ہوگا؟

اس کا تخیل تصویر پیش کرنے لگا ـــــ وہ موت کا شکار ہو گئی ہے ـــــ مر گئی ہے۔ اس کے بچے بھوک کے پیاسے بلک رہے ہیں۔ کسی نے ان کے بالوں کو نہیں سنوارا۔ کسی نے ان کے کپڑے نہیں بدلے۔ کسی نے ان کے ماتھوں پر نظر سے بچنے کے ٹیکے نہیں لگائے۔ یکایک اس کا پتی ایک غیر عورت کو لے کر گھر میں آیا۔ وہ عورت بہت خوبصورت ہے۔ اُس نے اُس کے کپڑے اور زیور پہنے ہوئے ہیں۔ لیکن جونہی وہ اس کے بچوں کو دیکھتی ہے اس کی تیوریاں چڑھ جاتی ہیں۔ چہرے کے خطوط بگڑ جاتے ہیں۔ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگتے ہیں ...... اور پھر ـــــ پھر وہ بچوں سے دن بھر گھر کا کام کراتی ہے اور شام کو ان کی جھوٹی جھوٹی شکایتیں کر کے اپنے شوہر سے پٹواتی ہے اور رات کے تاریک سناٹے میں بچے اپنی ماں کو یاد کر کر کے روتے رہتے ہیں۔ بلکتے رہتے ہیں اور پھر تھک کر سو جاتے ہیں۔ کیا میرے بعد میرے بچوں کا یہ حال ہوگا؟ ـــــ موہنی پریشان ہو اٹھی۔ نہیں، نہیں میں جیوں گی۔ میں اپنے بچوں کی خاطر مرض سے لڑوں گی۔ مرض کو شکست دوں گی۔

موہنی زندہ رہنا چاہتی تھی، اس نے سدا زندوں کی طرح رہنا چاہا تھا۔ اس نے غریب شیکھر سے اپنی ماں کی مرضی کے خلاف صرف اس لئے شادی کی تھی کہ شیکھر سے جُدا رہ کر وہ جیتے جی مر جاتی۔ مُردوں کی طرح جینا اسے پسند نہ تھا۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ غریب ہوتے ہوئے بھی اس کے لئے اچھے گھرانوں کے رشتے آئے تھے۔ وہ اگر چاہتی تو کسی امیر گھرانے میں شادی کر کے زندگی عیش سے گزارتی۔ لیکن اس نے ہر قسم کے بوجھ اور لالچ کو تیاگ کر شیکھر سے پریم وواہ کر لیا ـــــ شیکھر جو ۱۲۵ روپیہ ماہوار کا کلرک تھا۔

شادی کے بعد ایک سال اُنہوں نے بڑے سکھ اور شانتی میں بتایا تھا۔ جیون مسکراہٹوں اور قہقہوں کی لڑی بن گیا تھا۔ ان کی صبحیں روشن، شامیں سلونی اور راتیں گجراری تھیں۔ گھر میں فرنیچر نہ تھا۔ ٹرنک میں ریشمی کپڑوں کے ڈھیر نہ تھے۔ مخملی ڈبیوں میں زیور نہ تھے۔ سیر کے لئے کار، اور تفریح کے لئے روپے نہ تھے۔ مگر محبت تھی۔ خوشی تھی۔ شانتی تھی۔ گھر میں دو پرانی تھے۔ جو تنخواہ ملتی اس میں گزر کر لیتے اور زندگی کی دوسری آسائشوں کی کمی کو اُن خوابوں سے پورا کرتے جو دونوں مل کر اس وقت دیکھا کرتے جب رات کا کاجل رچ جاتا۔ ستارے بڑے بڑے ہیروں کی طرح آسمان کی گہری نیلی مخمل پر جگ مگ کرنے لگتے اور چاند آسمان کی پیشانی پر جھومر کی طرح جھمکنے لگتا۔ وہ خواب دیکھا کرتے ـــــ ہمارے بچہ ہوگا۔ ہم اُسے بڑے پیار سے پالیں گے۔ پڑھائیں گے۔ لکھائیں گے۔ وہ بڑا ہو کر ایک خوبصورت جوان نکلے گا۔ اور ہم بوڑھے ہو کر آرام کی زندگی گزاریں گے۔ سچا سادہ معصوم خواب۔ زندگی سے اپنے لئے نہیں بلکہ اپنے بچے کے لئے ایک درخشاں مستقبل کی آس۔ جس دن ان کو اپنے اس خواب کے پورا ہونے کی آس بندھی، وہ کس قدر خوش تھے۔ ان کی آنکھوں میں ستارے ناچ رہے تھے اور ان کے کانوں میں اُن کے ہونے والے بچے کی کلکاریاں گونج رہی تھیں۔ انہوں نے بڑے شوق اور بے قراری سے اُس دن کا انتظار کرنا شروع کیا جب ان کا بچہ ان کی گود میں آئے گا۔

لیکن موہنی کو جوں جوں دن چڑھنے لگے۔ یہ شوق، یہ بے قراری مرجھاتی گئی۔ موہنی کی صحت گرنے لگی۔ وہ تھکی تھکی سی رہنے لگی۔ اس کے گالوں کا گلابی پن اور ہونٹوں کی سُرخی غائب ہونے لگی۔ ناچتی ہوئی پتلیوں پر تھکی ہوئی پلکیں پڑی رہنے لگیں۔ شیکھر اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا اور بتایا کہ جسم میں خون کی بہت کمی ہے۔ اسے وٹامن چاہئیں، لیور ایکسٹریکٹ چاہئے۔ خوراک میں مکھن، گھی، دودھ پھل زیادہ ملنے چاہئیں، اور پورا آرام دیا جائے۔ وہ دونوں وہاں سے لوٹ آئے لیکن اب ان کے درمیان ایک پیارا سندر بالک ہی نہ تھا۔ ان کے درمیان دوائیں تھیں۔ دودھ تھی اور ایک فکر بھی تھا۔ موہنی سوچ رہی تھی کہ بناسپتی کی بجائے اسے اصلی گھی کھانا چاہئے۔ صحت اچھی ہونے پر ہی بچہ تندرست پیدا ہو سکے گا۔ مگر ان سب چیزوں کے لئے روپیہ چاہئے، روپیہ۔ اور پہلی بار اس کی زندگی میں روپے کی اہمیت اُبھر کر سامنے آئی۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ شیکھر

کی تنخواہ بہت تھوڑی ہے۔ پہلی بار اسے خواہش پیدا ہوئی کہ شیکھر کے پاس بہت سی دولت ہو، اس کی تنخواہ زیادہ ہو ——— عیش کرنے کے لئے نہیں بلکہ ایک صحت مند زندگی گزارنے کے لئے۔ ایک صحت مند بچے کی ماں بننے کے لئے۔ ایک جیو آتما کو جنم دینے کے لئے۔

لیکن شیکھر ایک کلرک تھا۔ اس کی تنخواہ بندھی ہوئی تھی اور بندھی ہوئی آمدنی میں بناسپتی گھی اور چائے کے بھورے پانی کے علاوہ کسی اور چیز کی آشا کرنا پاگل پن تھا۔ موہنی کا چہرہ مرجھا گیا۔

اب ہر لمحہ اور ہر قدم پر موہنی کے سامنے تلخ حقیقت آکھڑی ہوتی۔ زندگی کے متعلق جو رومان انگیز تصور اس نے باندھے تھے وہ اب منہ چڑاتے ہوئے بھاگنے لگے۔ موہنی کو محسوس ہونے لگا کہ وہ اپنے کو دھوکا دے رہی تھی۔ وہ ایک خیالی دنیا میں رہ رہی تھی۔ جن چیزوں کی ضرورت کو اس نے شیکھر کی محبت میں فراموش کر دیا تھا وہ اب کانٹوں کی طرح اس کی زندگی کے دامنے میں آن کھڑی ہوئی ہیں۔ اب موہنی کے دن شیکھر کے دفتر سے آنے کی آس میں، اور راتیں چاندنا ہوں کے رومان کی تلاش میں گزرنے کی بجائے الجھنوں، تشنگیوں اور محرومیوں کے لمحہ بہ لمحہ گہرے ہوتے ہوئے احساس میں بیتنے لگیں۔ ہر لمحہ ایک نئی محرومی کا احساس ہوتا ——— اور یہ احساس اس کے اور شیکھر کے درمیان جھنجلاہٹ کی ایک دیوار کھڑی کرنے لگا۔ لیکن یہ سب کچھ صرف ایسے لمحوں میں ہوتا جب موہنی تھکی ہوتی۔ اس کی طبیعت گری ہوتی۔ کوئی کام کرنے کو جی نہ کرتا اور کام کا اونچا پہاڑ اس کے سامنے ہوتا۔ موہنی کے لئے کچھ طاقت کی دوائیاں لانے اور دودھ وغیرہ منگانے کی وجہ سے تنخواہ ضرورت سے زیادہ ناکافی معلوم ہونے لگی ——— اور اس کا نتیجہ ہوا کہ دوائیں پیتے وقت یا غذا کھاتے وقت موہنی کے ذہن میں حساب کی گردان سی ہوتی رہتی ——— یہ چار روپے کی وٹامن کی گولیاں ہیں۔ یہ ایکسٹریکٹ کی گولیاں، گیارہ روپے کی آتی ہیں۔ اور دودھ کا بل اب کے تیس روپے آئے گا۔ اور اسے محسوس ہوتا ہے جیسے اگلے مہینے گھر کی گاڑی کسی صورت میں نہ چل سکے گی۔ اور کھایا پیا اُسے کچھ نہ لگتا۔ تکان، کمزوری، پریشانی، جھنجلاہٹ ——— اور جیسے موہنی کے مزاج میں ایک غیر معمولی تبدیلی آنے لگی ——— ہونٹ بھینچے رہتے اور ماتھے پر ایک شکن ہر وقت پڑی رہتی۔ مگر ایسے لمحے بھی آتے جب ایک لمحے کے لئے گھٹائیں چھٹ جاتیں اور چاند اپنی پوری آب و تاب سے نکل آتا۔ انہیں حالات میں موہنی نے ایک بچی کو جنم دیا۔

بچی بہت خوبصورت تھی۔ اس کا گورا گول مٹول معصوم چہرہ دیکھ کر دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی۔ وہ اُسے گود میں لے کر کھلاتے تو ان کے ماتھے سے پریشانی اور تردد کی لکیریں تھوڑی دیر کے لئے مٹ جاتیں۔ وہ بے شعوری کشیدگی جو موہنی اور شیکھر کے درمیان پچھلے چار پانچ مہینے میں پیدا ہو گئی تھی ایک حد تک دور ہو جاتی۔

اب ان کی زندگی میں پھر ایک ایسی چیز آگئی تھی جسے وہ مشترک طور پر پیار کر سکتے تھے۔ جس کے متعلق ہم آہنگی سے باتیں کر سکتے اور جس میں دونوں اپنے غموں کو بھلا سکتے تھے۔ ماحول کی کشیدگی کم ہو گئی تھی۔ مگر یہ سب کچھ جذبات کی سطح پر تھا۔ حقیقت کی سطح پر حالات زیادہ خراب ہو گئے تھے۔ بچی کے ہونے سے دس طرح کے خرچ بڑھ گئے تھے۔ آمدنی کسی طرح نہ بڑھی تھی۔ تنخواہ آتی اور پچھلے مہینے کا حساب چکاتے چکاتے ختم ہو جاتی اور پورے اکتیس دن کاٹنے کے لئے صرف پندرہ روپے ہاتھ میں رہ جاتے۔ وہ تمام خواہشیں اور وہ تمام منصوبے جو وہ اگلے مہینے پورا کرنے کی امید سے باندھتے خاک میں مل جاتے۔ اور پھر تنگی اور کفایت شعاری اور من مارنے کا دور شروع ہو جاتا۔ اس تنگ حالی کے نشانات گھر میں بھی دکھائی دینے لگے۔ کالروں، پتلونوں، ساڑیوں اور پلنگ کی چادروں میں جوڑ اور پیوند نظر آنے لگے۔ جو گلاس یا پیالے ٹوٹ جاتے ان کی جگہ نئے نہ آپاتے۔ بچی کے کپڑے بنانے کی آرزو پرانی ساڑیوں کو پھاڑ کر اور ان میں سے بنا پھٹے کپڑے نکال کر پوری کی جاتی۔ آنہ دو آنہ کے خرچ پر میاں بیوی میں کھینچا تانی ہوتی۔ سنیما اور سیر کرنا یکسر بند ہو گئے۔ پیسے پیسے کا حساب رکھا جانے لگا۔ دونوں میں سے جس کا رشتہ دار یا مہمان آجاتا اس کی گویا شامت آجاتی ——— دونوں ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے کو دوڑتے۔ بدمزاجی اور چڑچڑاپن ان کے سبھاؤ میں رچ گیا ——— ہر وقت گھر میں یہی سنائی دیتا ——— کھانا ضائع نہ کرو، کپڑے نہ بنواؤ، کپڑے ہاتھ سے دھوؤ، کوئلہ کم خرچ کرو۔ غرض یہ کہ ذرا ذرا سی چیز پر روک ٹوک شروع ہو گئی۔ اب جب کبھی وہ ساتھ ساتھ بازار جاتے تو ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر مسکرانے اور ایک دوسرے میں مگن رہنے کی بجائے ان کی آنکھوں میں دوسرے مرد عورتوں کے سوٹ، ساڑیاں، بلاؤز، اوور کوٹ، زیور، بالوں کے جوڑے کھٹکتے۔ زندگی کا سکون

غائب ہوگیا۔ محرومی کا احساس ہر لمحہ زیادہ شدید اور گہرا ہونے لگا۔ اور پیار کی وہ دنیا جس میں شادی کے بعد ایک سال تک وہ مسکراہٹ اور پیار کے دن گزارتے رہے تھے اب مکمل طور پر برباد ہوگئی تھی۔

شاید اس حد تک بھی موہنی زندگی کے مقابلے میں ڈٹی رہ سکتی تھی۔ لیکن زندگی نے اس کی صحت کو بھی کھانا شروع کر دیا تھا۔ وہ ہر وقت تھکی تھکی رہتی۔ اس کی کمر اور گھٹنوں میں جان نہ رہی۔ اٹھتے بیٹھتے اس کی آنکھوں کے آگے سیاہی کے دائرے سے پھیلتے اور سمٹتے۔ اس کی جلد کی سفیدی میں سرخی کے بجائے ہلدی جیسی زردی جھلکنے لگی۔ رخسار جو کبھی مسکراہٹ کی وجہ سے سدا دمکتے رہتے تھے اب مرجھائے مرجھائے رہتے اور ہونٹ کنیر کی باسی کلیوں کی طرح بے رنگ ہوگئے۔

شیکھر کو موہنی کی گرتی ہوئی صحت کا احساس تھا۔ وہ جب دیکھتا کہ بلاؤز جو کبھی موہنی کے انگ انگ کو اجاگر کر دیتے تھے اب ڈھیلے ڈھیلے لٹکتے رہتے ہیں۔ اور چوڑیاں جو کبھی موہنی کی کلائیوں میں چندن کی۔ بکھاؤں کی طرح نظر آتی تھیں اب پونچیوں میں پڑی رہتی ہیں تو اس کی چھاتی میں گھونسا سا لگتا۔ وہ اس کو آرام پہنچانے کا پورا خیال رکھتا۔ وہ اپنا پیٹ کاٹ کے اور من مار کے اس کے لئے کچھ نہ کچھ لاتا رہتا۔ مگر مہنگائی اسے مات پہ مات دے رہی تھی۔ تنگی کر کے وہ جتنا خرچ کم کرتا تھا اتنا ہی چیزوں کے مہنگا ہو جانے سے بڑھ جاتا تھا۔ اب وہ ہاتھ پاؤں سے بھی موہنی کی مدد کرتا اور اسے زیادہ سے آرام دیتا۔ کپڑے خود دھوتا بستر خود بچھاتا۔ دفتر سے آ کر بچی کو کھلاتا اور جب کبھی موہنی کی کمر یا اس کے سر میں درد ہوتا تو اپنی تھکن بھول کر گھنٹوں اس کا سر دباتا ——— لیکن اس کے قدموں کے نیچے کی زمین سرکتی جا رہی تھی۔ گھر کی حالت سنبھلنے میں نہ آتی تھی اور موہنی کے جسم کی ہڈیاں نمایاں ہوتی چلی جا رہی تھیں۔

اسی طرح آرام اور خوشی کے لئے چھینا جھپٹی کرتے کرتے زندگی کے دو سال گزر گئے۔ اب ان کی حالت اس قدر تنگ ہوگئی تھی کہ کھانے میں تنگی کرنے کی نوبت آ گئی۔ گوشت کی بجائے اب ان کے ہاں دونوں وقت دال پکنے لگی۔ کوئی مہمان آ جاتا یا کچھ لینا دینا پڑ جاتا تو قرض سر پہ سوار ہو جاتا ——— زندگی کی چکی میں پستے پستے ان کے جذبات بھی سرد پڑ گئے۔ اب کئی کئی دن تک وہ ایک دوسرے سے بات نہ کرتے۔ انہیں خیال بھی نہ ہوتا کہ انہوں نے کئی دنوں سے ایک دوسرے سے باتیں نہیں کی ہیں۔ موہنی اپنے حلقہ میں گھومتی رہتی۔ شیکھر اپنے دائرہ میں گردش کرتا رہتا ——— رات کو دونوں اپنے اپنے جوئے سے کھلی پا کر نیم جان سے چارپائی پر پڑ رہتے۔ پیار کرنے کو، چاؤ سے باتیں کرنے کو، دیکھ کر مسکرانے کو، زندگی میں کچھ نہ رہا تھا۔ چاند ان کے لئے بجھ گیا تھا اور تارے ان کے لئے چیچک کے سوکھے ہوئے داغ بن گئے تھے۔ اب ان کے دل میں ایک دوسرے کے لئے کوئی جذبہ پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ چپ چاپ گھر میں چلتے پھرتے، کام کرتے، پڑ کر سو جاتے۔ کبھی کبھار ایک آدھ لفظ منہ سے نکل جاتا۔ چونک کر نگاہیں مل جاتیں مگر راکھ کی چنگاری کی طرح صرف ایک لمحہ کے لئے ——— پھر وہی بیزاریت ——— بے حسی ——— مٹیالی مُردنی۔

اسی بیزاریت، بے حسی، مٹیالی مُردنی کے سائے میں موہنی دوبارہ حاملہ ہوگئی ——— زندگی کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی گئی۔ موہنی کے جسم میں بچہ جوں جوں پرورش پانے لگا موہنی کے ہونٹوں کی خشکی، آنکھوں کا پھیکا پن اور رگوں کا نیلا پن زیادہ نمایاں ہوتا گیا۔ جسم نے اس دوسری جان کو سینچنے سے انکار کر دیا۔ موہنی نے کھاٹ پکڑ لی۔ بچہ ہونے سے پہلے ہی حرارت رہنے لگی۔ بچہ ہوا تو بخار نے آ دبوچا۔ بخار چڑھ کر ٹک گیا۔ اور موہنی کی زندگی کی جڑ کھوکھلی ہوگئی۔ اور ایک دن ڈاکٹر نے کہہ ہی دیا "موہنی کو دق ہوگئی ہے"۔

موہنی کمرے میں پڑی تھی۔ شیکھر اور اس کی بہن جو تیمارداری کے لئے آئی ہوئی تھیں نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ کمرے ہی میں نہیں بلکہ سارے گھر میں سناٹا تھا۔ پاس ہی پالنے میں بچہ پڑا سو رہا تھا ——— میرا لال، میرا چاند ——— کیا میں اپنے چاند کو اپنی گود میں لے کر نہ کھلا سکوں گی؟ جس کو میں نے اپنے خون سے سینچا ہے۔ کیا اسے بے سہارا چھوڑ کر چلی جاؤں گی؟ نہیں نہیں! میں نہیں مروں گی۔ میں جیوں گی ——— میں نے اس دنیا میں ایک نئی زندگی کو جنم دیا ہے۔ کیا دنیا اس کے بدلے مجھے میری زندگی کا دان نہیں دیگی؟ مجھے میری زندگی کا دان دیا جا سکتا ہے میرا علاج کر کے مجھے اچھی غذا دے کر، ہوا اور روشنی دے کر۔ یہ میرا حق ہے۔ میرا حق مجھے ملنا چاہئے۔

——— میرا حق مجھے ملنا چاہئے! اس کی آتما پکار اٹھی۔

لیکن اس کی آتما کی پکار کسی نے نہ سنی کیونکہ کمرے میں کوئی نہ تھا، در، کھڑکیاں اور روشندان بند تھے۔

جیلانی بانو

موم کی مریم

آج بھی اندھیرے کمرے میں بیٹھا میں خیالی ہیولوں سے کھیل رہا تھا۔

اور جب بھی اندھیرا چھا جاتا ہے تم نہ جانے کہاں سے نکل آتی ہو جیسے تم نے تاریکی کی کوکھ سے ہی جنم لیا ہو اور مجبوراً مجھے جلے ہوئے سگریٹ کی راکھ کی طرح تمہیں بھی زمین پر جھٹک دینا پڑتا ہے۔

میں نے کبھی تمہارے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے۔ کبھی تمہارے اوپر نظمیں نہیں لکھیں۔ کبھی تمہاری یاد میں تارے نہیں گنے۔ پھر کیوں میں تمہیں یاد کیے جاؤں ———؟

زندگی میں تم سے اتنی دور رہا کہ کبھی اس رنگ و بو کے سیلاب میں غرق نہ ہو سکا جو تمہارے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ ہمارے بیچ میں جھوٹی عقیدت اور مضحکہ خیز احترام کی خلیج حائل رہی۔ پھر آج تم اپنی آہوں اور سسکیوں سے کون سے مرے ہوئے جذبے جگانا چاہتی ہو ———؟

آج صبح عائشہ کے خط سے مجھے تمہاری موت کی خبر مل چکی ہے۔ مگر میں اس موت پر اظہارِ افسوس نہ کر سکا۔ روز نہ جانے بنا برسے کتنے بادل گذر جاتے ہیں۔ کتنے ننھے ساز کے اندر ہی دم توڑ دیتے ہیں، کتنے انسان ایک لمحہ کی خوشی ڈھونڈتے ڈھونڈتے مر جاتے ہیں۔ پھر تمہاری موت تو میرے سامنے کتنی ہی بار ہو چکی ہے، اگرچہ مادی طور پر تم چلتی پھرتی نظر آتی تھیں بالکل اسی طرح جیسے آج میرے کمرے میں تم بیٹھی ہو۔

جب سے میں نے عائشہ کا خط پڑھا ہے میرے خیالات کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈولتے پھرتے ہیں اور نہ جانے کیوں بہت سی دھندلی دھندلی یادیں جھلملانے لگی ہیں اور اس اندھیرے اُجالے میں بہت سے چہرے، خلط ملط ہو گئے ہیں۔

مگر میں اس وقت تمہارے خیالی وجود سے باتیں نہیں کر رہا ہوں۔ کیونکہ تمہاری جانی پہچانی سسکیاں مجھے تمہاری موجودگی کا یقین دلا رہی ہیں تو میں اسے واہمہ کیسے تصور کر سکتا ہوں ———؟

تمہارا اور اندھیرے کا ہمیشہ ساتھ رہا ہے۔ تم زندگی بھر جہاں جہاں گئیں چراغ گل ہوتے گئے۔ تاریکی کے حلقے تمہیں اپنے گھیرے میں اسیر کیے رہے۔ جس طرح مریم کی تصویر کے گرد مصور نے نور کا ہالہ کھینچ دیا ہے۔ عصمت، تقدس اور معصومیت کی لکیریں، جن کے اندر پاک مریم کی روح کو

محصور کر دیا گیا ہے۔

اس وقت بھی جب تمہارے مستقبل کی طرح کمرے میں تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ تمہارے آنسو یوں چمک رہے ہیں جیسے پرامید مچھیرن نے دریا کی سطح پر چراغوں کی قطار چھوڑ دی ہو۔ میرے کمرے میں تمہارے آنسوؤں نے اُجالے کی امید قائم رکھی ہے ——— ہم مشرق کے مرد صدیوں سے اپنی عیش گاہوں میں تمہارے اشکوں سے جشنِ چراغاں مناتے آئے ہیں ———

تمہارے متعلق لوگوں نے کہانیاں مشہور کر رکھی ہیں وہ بالکل سطحی تھیں اور اسی لئے میں نے حقیقت کی سطح پر اتر کر تمہیں سمجھنا چاہا تھا۔

تم کیا تھیں! اماوس کی رات کو ٹوٹنے والا ایک ستارہ جو اپنی آخری جھلک سے بہت سے دلوں میں امید کی کرن چمکا کر غائب ہو جائے ——— ایک تند لہر جو اپنے زعم میں ساحل کے پرخچے اڑا دینے کے ساتھ خود بھی مٹ گئی ہو۔

آج جب تم اپنے گناہوں کی لمبی فہرست سمیت خود ہی میرے کمرے میں آ گئی ہو تو مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ تم ایک عام سی لڑکی ہونے کے باوجود دوسروں سے اس قدر مختلف تھیں۔ تم ایک مسحور کرنے والا جادو بن گئی تھیں جو کتنے ہی خریداروں کو کھینچ لایا۔ مگر سونگھا ہوا پھول سمجھ کر سب واپس چلے گئے۔

دوکاندار کے نزدیک وہ چیز کتنی حقیر ہو جاتی ہے جسے گاہک الٹ پلٹ کر پھر دکان پر رکھ جائے ——— شیشے کے کیس میں بند بے دالی گڑیا ——— آج تم اتنی صاف صاف باتیں سن کر حیران ہو رہی ہو۔ جبکہ تم نے اپنے آس پاس کے شیشمحل چکنا چور کر ڈالے تھے اور سماج کی کھینچی ہوئی لکیروں پر چلنے سے انکار کر دیا تھا۔ ایک بار تم سب لڑکیوں کو آنگن میں دھما چوکڑی مچاتے دیکھ کر امی نے کہا تھا۔

"ہائے ہائے مت روکو نگوڑی ماریوں کو ——— کنواری لڑکیاں برساتی چڑیاں ہوتی ہیں۔ کون جانے کل کس کا ڈولا دروازے پر کھڑا ہوگا۔" اس وقت اخبار پڑھتے پڑھتے میں نے تمہاری زندگی کا پورا فلم دیکھ ڈالا تھا۔

جب تم کسی ناصر یا شاہد کلرک سے بیاہی جاؤ گی اور آنسو پونچھتے ڈولے میں سوار کرائی جاؤ گی۔ پھر ہر سال ایک ننھے منے کی پیدائش میں اضافہ ہوتا رہے گا اور ساتویں یا آٹھویں ننھے کی پیدائش پر تپ دق کا شکار ہو کر مر جاؤ گی۔ ہر لڑکی انہی لکیروں پر دوڑتی آئی ہے۔ مگر تم نے اپنی انفرادیت سے ایک دوسرا راستہ ڈھونڈنا چاہا جس کی سزا میں موت و زندگی تم پر حرام ہو گئی۔

تم منجھلے چچا کی دسویں یا گیارہویں اولاد تھیں ——— پھر نامراد لڑکی ——— "او نہہ لڑکی ہے تو کیا ہوا۔ نصیب اچھے ہوں ——— لڑکے کون سا فیض پہنچاتے ہیں ——— ماں باپ کی موت پر آنسو بہانے والی تو بیٹی ہوتی ہے۔"

اور اپنی موت کی نوحہ گر کے پیدا ہوتے ہی کسی نے تمہیں خوش آمدید نہ کہا۔

اپنے ارد گرد کے ماحول نے تمہیں زیادہ حساس بنا دیا۔ حقارت کی نظروں نے خودی کا احساس بیدار کیا اور تم نے کچھ کرنے اور کچھ پانے کی قسم کھا لی۔ تمہارے متعلق بدنامیاں اور سرگوشیاں بڑھتی گئیں۔ جاہل، بد دماغ، بدصورت اور مغرور ——— دن بھر تمہیں انہی خطابوں سے یاد کیا جاتا۔ مگر تم ایک ننھی سی چڑیا کی طرح اترا اترا کر کہتی رہیں ——— جو میرے پاس ہے وہ رانی کے محل میں بھی نہیں۔

اسی انانیت پسندی سے تم ایک ایسا شعر بن گئی جس کے غالب کے شارحین کی طرح ہر ایک نے الگ معنی نکالنا چاہے۔ مگر پھر بھی بہت کم حقیقت کی تہ تک پہنچ سکے۔

اور میں نے بہت دور رہ کر ہی تمہیں سمجھنا چاہا۔ یہ سچ ہے کہ میں نے دوسرے مردوں کی طرح تمہاری دوشیزگی کی جانب ہاتھ نہیں بڑھایا۔ کبھی اس قدر نزدیک نہیں آیا کہ تمہارے تنفس کی رفتار سے کوئی راز پا سکوں۔ پھر بھی میں نے اس شعر پر کافی ریسرچ کی، دماغ کی لیبارٹری میں دو سال تک تجربے کئے مگر کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔

ایک بار مجھے اپنی جانب جھکتے دیکھ کر تم نے کہا تھا:

"احمد بھائی! میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں، اور یہ نہیں چاہتی کہ کوئلوں کی دلالی میں آپ بھی اپنے ہاتھ کالے کر بیٹھیں ——" مگر یہ کتنا بڑا حزنیہ ہے کہ تم نے بہت سوں کو کوئلوں کی دلالی سے بچانے کی خاطر اپنے منہ پر کالک مل لی تھی تاکہ ان کے سفید دامن سیاہی سے ملوث نہ ہوں —— تم میری بہت عزت کرتی تھیں —— ایک نوجوان مرد کی —— جو تمہارے نوزائیدہ سہارے پر آگے بڑھنا چاہتا تھا —— جس نے تمہاری اٹھارہ سالہ زندگی میں مسلسل فریب دیئے تھے، جس نے تمہیں منزل کے قریب لا کر بھٹکا دیا تھا۔ بدنامی کی کوٹھڑی میں دھکیل کر ہر دروازہ بند کر دیا تھا۔ پھر تم نے اپنی رہی سہی عزت کی دھجیاں بکھیر ڈالیں اور بیچ چوراہے اپنے سب ظاہری لباس اتار ڈالے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ تم میری عزت کرتی رہیں اور میں تمہیں سمجھنے میں اتنا تیز ہو گیا کہ جذبات کے انگشن قطعی بے اثر ہو گئے ورنہ ممکن تھا ایک دن میری خودداری اور عزت تمہارے قدموں میں پڑی بخشش کی طلبگار ہوتی اور تم اٹھہر کی طرح مجھے ایک چٹان پر چھوڑ کر کہتیں:

"میں نے تمہیں پانے کے لئے بہت سی ٹھوکریں کھائیں مگر تمہارے چھونے سے پہلے اتنی بلندی پر پہنچ گئی کہ جب تم وہاں پہنچے میں سراب بن چکی تھی۔"

گھبراؤ نہیں۔ تم نے یہ الفاظ اظہار یا آٹھ سے خود نہیں کہے مگر آج تک تم نے کون کون سی باتیں زبان سے کی ہیں تم تو اس گونگی کی طرح ہو جسے اپنا مفہوم ہمیشہ عملی طور پر سمجھانا پڑتا ہے۔

صرف اٹھارہ سال کی زندگی میں تم نے اتنی ساری باتیں کیسے کہہ دیں۔

بظاہر تم کتنی معمولی تھیں —— چھوٹے چھوٹے کاندھوں تک لہرائے ہوئے بال جن کی باریک باریک آوارہ لٹیں چہرے کے گرد بالہ سا بنائے کانپتی رہتیں۔ معمولی سا قد —— دبلا پتلا، دھان پان جسم جیسے تیز ہوا کے جھونکے بھی تمہیں اڑا کر لے جائیں گے، جیسے تمہاری جانب ہاتھ بھی بڑھایا تو چھوئی موئی کی طرح کملا جاؤ گی —— ایک واہمہ سی —— ایک ادھورا خاکہ —— کتنے ہلکے ہلکے تھے تمہارے خدوخال پتلے خمیدہ لب جو ہمیشہ سرد مہری سے بند رہتے، ہر چیز کو تجسس سے دیکھنے والی ہمدرد آنکھیں جو اپنے سارے گناہ آشکار کرنے کو تیار نہیں اور اسی خیال سے بات کرتے وقت بار بار بند ہو جاتیں، تاکہ ان کی گہرائیوں کا کوئی پتہ نہ لگا سکے۔ اور ہر لمحہ بدلنے والا رنگ، جو کبھی شعلے کی طرح دہکنے لگتا، کبھی راکھ کی طرح میلا پڑ جاتا۔

اور جب باتیں کرتیں تو تمہارے خدوخال میں کوئی تبدیلی نہ آتی۔ کتنی مشکل بات تھی تمہارے چہرے سے کسی بات کا اندازہ لگانا۔

اس معمولی سی شکل و صورت ہی نے تمہیں گھر میں ایک ناقابلِ التفات چیز بنا دیا تھا۔ اپنی خوبصورت سعادت مند بہنوں کے مقابلے میں تمہاری کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ خرید و فروخت کے اس بازار میں صرف اچھی صورت والی لڑکی ہی فائدہ اٹھاتی ہے —— اور یہ خیال چچا اور چچی کے لئے سوہانِ روح تھا۔

مجھے آج سے تین سال پہلے والی جاڑوں کی ایک صبح یاد آ رہی ہے۔

تم اس وقت نہا کر آئی تھیں۔ نسرین اور عائشہ کے ساتھ صحن میں بیٹھی، سویٹر کا ایک نمونہ بنا بنا کر ادھیڑ رہی تھیں۔ نومبر کی لطیف دھوپ آنگن میں بکھری ہوئی تھی۔ چچی نیچے بیٹھی نئے لحافوں میں دھاگے پرو رہی تھی۔ اس وقت تمہارے گلابی دوپٹے، بھیگے بال اور نکھرے ہوئے رنگ کو دیکھ کر بھی مجھے کوئی شعر یاد نہیں آیا۔ کوئی تشبیہہ دماغ میں نہیں ابھری۔ عائشہ، نسرین اور فرزانہ کے فروزاں حسن نے وہاں تمہارے چراغ کو ٹمٹمانے نہیں دیا —— کتنی کمتر تھیں تم اپنی مغرور اور اپنے حسن پر خود ہی مر مٹنے والی بہنوں کے حلقے میں —— اس وقت میں نے سوچا تھا کہ حسن کے اس جمگھٹے میں تمہاری کہانی کتنی مختصر اور پھیکی ہو گی۔

ان ہی دنوں مسلسل بیکاری نے مجھے نئی نئی راہوں سے واقف کر دیا تھا اور گھر سے بہت دور ایک ہڑتال کے سلسلے میں گرفتار رہا تھا تو عائشہ کا خط پڑھ کر پہلی بار تمہاری جانب متوجہ ہوا تھا ——— تم لڑکیوں کو خط لکھنے کی بھی تو کوئی بات نہیں ملتی۔ عائشہ کے خط بھی اسی کی طرح خوبصورت اور معصوم ہوتے تھے جن میں وہ ابا کی ناراضگی سے لے کر خاندان کی اہم تقریبوں میں آنے والی عورتوں کے کپڑے، زیوروں کے ڈیزائن اور اسکول کی ہیڈمسٹریس کے رومان تک ——— سب کا تفصیل کے ساتھ ذکر کرتی۔ ساتھ ہی وہ مجھے بھی ایسا ہی مزے دار لمبا خط لکھنے کی ہدایت کرتی ——— میری بے وقوف بہن نہیں جانتی تھی کہ میں رومانوں، سرگوشیوں اور رنگینیوں کی دنیا سے کتنی دور تھا مگر وہ میری مسلسل خاموشی کے باوجود ایک ہنگامہ پرور گھر کے کمرے میں بیٹھی بار بار منہ پر جھک آنے والی لٹوں کو پیچھے جھٹک کر لکھتی رہی ——— "آپ نے ایک اور خبر سُنی بھائی جان؟ قدسیہ کے یہاں چھوٹی خالہ امجد بھائی کا پیغام لے کر گئیں تو قدسیہ نے خود اُگسان سے کہہ دیا کہ وہ امجد سے شادی نہیں کرے گی۔

سُنا ہے چچا ابا زہر کھانے والے ہیں اور سارے خاندان میں تھُوتھُو ہو رہی ہے۔"

اس دن بہت دنوں کے بعد میں جیل کی تنہا کوٹھڑی میں مسکرا سکا۔ اس دلیرانہ جرأت پر میں نے غائبانہ طور پر تمہاری پیٹھ ٹھونکی تھی اور محسوس کیا تھا کہ جس خول میں ہم اپنے آپ کو لپیٹے ہوئے ہیں وہ جگہ جگہ سے ٹوٹ رہا ہے۔ جی چاہا کہ فوراً چچا ابا کو زہر کی ایک شیشی بھیج دوں تاکہ وہ صرف ارادہ کر کے ہی نہ رہ جائیں۔ تم پھر ایک بار میرے سامنے آ گئی تھیں۔ جھنجھلا کر سر پٹختی اور ہیسٹیریا ہوتی ہوئی۔

پھر میں اس واقعے کو بھول گیا۔ عائشہ اپنے خطوں میں لکھتی رہی کہ تمہارا اور ریاض کا رومان چل رہا ہے ——— اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی کوشش مت کرو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم نے محبت کو کامیاب بنانے کی کتنی کوشش کی۔ لیکن ریاض تمہارے ہاں کا لے پالک تھا۔ تمہارے دسترخوان کے جھوٹے ٹکڑوں پر پلا تھا۔ پھر چچا ابا کو اس کی سُن گُن ملی تو ریاض گھر ہی سے نہیں شہر ہی سے نکال دیا گیا اور تم نے بڑے تحمل سے محبت کی اس لاش کو دل کے قبرستان میں دفن کر دینا چاہا ——— لیکن شاید ایسا نہ ہو سکا۔ کیونکہ مردار کھانے والے گدھ جو ایسے موقعوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں، اس لاش کو باہر کھینچ لائے، جی بھر کے اس سے لطف اٹھایا اور پھر اسے چیر پھاڑ کے پھینک دیا۔ تمہاری بیماری کو بڑے خوفناک معنی پہنائے گئے۔ یعنی یہ سب ریاض کی امانت کو ٹھکانے لگانے کے بہانے ہیں اور تم اپنے کمرے ہی میں نہیں پڑی رہتیں بلکہ ریاض کے ساتھ فرار ہو چکی ہو۔

یہ باتیں میں نے بہت دور بیٹھ کر سُنیں اور ہر بات کو یقین کے خانے میں ڈالتا گیا۔ یہ کوئی ناقابلِ یقین بات بھی تو نہ تھی۔ بقول عائشہ کے تم اپنی اہمیت کا احساس دلانے کا فیصلہ کر چکی تھیں اور تم نے ساری دنیا کو ٹھکرا کے اپنی من مانی کرنے کا عزم کر لیا تھا ——— پھر تم جیسی محبت کی ہاری لڑکیاں اس سے زیادہ اپنی اہمیت کا کیا ثبوت دے سکتی ہیں ———؟

اس کے بعد جب میں رہا ہو کر گھر آیا تو تم وقت کا ایک اہم موضوع بن چکی تھیں یا عائشہ کے الفاظ میں کچھ کر دکھانے کی دھن میں اپنا رہا سہا وقار بھی کھو بیٹھی تھیں۔

اس دوران میں تم اپنے ماسٹر سے بھی محبت کر چکی تھیں جو تمہیں پڑھانے آتا تھا۔ ایک سیدھا سادھا، خطرناک حد تک شریف انسان، جو اپنی مظلومی اور بے چارگی ظاہر کر کے دوسروں سے رحم کی بھیک مانگتا تھا۔

پہلے اس نے تمہیں شرافت اور عزت کے سبق پڑھائے۔ اپنی بے چارگی، اور دُکھ کے افسانے سُنائے، اس کی محبوبہ نے اسے دھوکا دیا تھا محض غربت کی وجہ سے ٹھکرا دیا تھا (یہ محبوباؤں کے دھوکا دینے کا دُکھڑا بھی کتنا فرسودہ ہو چکا ہے؟) پھر اس کی پیاسی دنیا میں تم نے اپنی ہمدردی کے چند قطرے برسانا چاہے۔ اپنے طرزِ عمل سے اس کا دُکھ کم کرنا چاہا، اپنے غم کی کہانی بھی اسے سُنا ڈالی ——— پھر کورس کی کتابوں کو ایک جانب سمیٹ کر تسلی اور تسکین کے سبق پڑھائے جانے لگے۔

پھر تمہارا ماسٹر بیمار ہو گیا اور چچا ابا نے دوسرا ماسٹر رکھنا چاہا تو تم نے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ تم اسی ماسٹر سے پڑھنا چاہتی تھیں اور اس کی مزاج پرسی کے لئے اس کے گھر جانے پر مُصر تھیں۔

یہ ساری باتیں گھر کے چھوٹے بچوں تک نے مجھے سُنائیں۔ میں کیسے یقین کر لوں کہ تمہیں اس ماسٹر سے محبت نہیں تھی، صرف ہمدردی تھی۔ یہ "انسانیت" جذبہ ہی تھا جو تمہیں ایک رات چپکے سے اٹھا کر ماسٹر کے گھر لے گیا اور جب تم ابھی دروازہ ہی کھٹکھٹا رہی تھیں کہ چچا ابا کے ڈنڈے کی ضرب سے بے ہوش ہو گئیں۔

پھر مہینوں گھر والے تمہارے سائے سے اچھوتوں کی طرح بچتے پھرے۔ گھر کی لمبی لمبی ناک والی عورتوں نے خاندان میں نکلنا چھوڑ دیا۔ چچا ابا نے وقت سے پہلے پنشن لے لی اور سارے خاندان کے ماتھے پر تم کلنک کا جھومر بن کر لہرانے لگیں اور بیچ آنگن میں کھڑی ہو کر تم نے اپنی اماں سے کہا کہ امی جو میرا جی چاہے گا کروں گی یا پھر آپ لوگ مجھے مار ڈالیے۔ پھر سب نے دوسری بات سے اتفاق کر لیا۔ یعنی تم مار ڈالی گئیں۔

سب نے تم پر فاتحہ پڑھا۔ لیکن شمیم ماموں اس فاتحہ میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ دوسرا زخم بھی بھرنے لگا تھا پھر شمیم ماموں کی ناز برداریوں نے اسے مٹا ڈالا تھا ——— وہ تم پر بہت مہربان تھے۔ عائشہ کہتی تھی،

"شمیم ماموں کی عذرا تو قدسیہ کی کلاس فیلو ہے جیسی ان کی لڑکی ویسی قدسیہ" پھر کیسے ایک لڑکی کو گھل گھل کر مر جانے دیں" شمیم ماموں، مدتوں سے اپنی بیوی بچوں سے قطع تعلق کر کے اکیلی زندگی گزار رہے تھے۔ صرف اتنی سی بات پر کہ ان کی بیوی کبھی اچھی ساڑھی نہ باندھ سکیں۔ ایک بار مجھے عائشہ نے لکھا تھا کہ تم بہترین ساڑی باندھنے پر اسکول سے انعام لے چکی ہو۔ وہ اپنے بچوں کو چھوڑ کر تمہیں سیر کرانے لے جاتے۔ تمہارے صدقے میں سارا گھر سینما دیکھتا، پکنک پر جاتا۔ تم کوئی اعلیٰ ڈگری لینا چاہتی تھیں اور چچا ابا تمہیں تنہا ہوسٹل میں چھوڑنے پر تیار نہ تھے اس لئے بچارے شمیم ماموں، اپنی وکالت کے بے شمار اہم کام چھوڑ کے، بارہ بارہ بجے رات تک فارسی اور اردو شاعروں کا کلام پڑھاتے اور عشق و تصوف میں ڈوبے ہوئے اشعار کا مطلب تم سے پوچھتے۔

سب کے ٹھکرائے جانے سے پہلے تم خود ہی کسی سے بات کرنا پسند نہ کرتی تھیں۔ دن بھر پلنگ پر اوندھی پڑی نہ جانے کیا سوچا کرتیں۔ کوئی بات نہ کرتا تو شکایت نہ کرتیں۔ شمیم ماموں سر پر ہاتھ پھیرتے تو منع نہ کرتیں۔ ہاتھ پکڑ کے موٹر میں بٹھا دیتے تو بیٹھ جاتیں۔ ممکن ہے تم سے ان کی ویران زندگی دیکھی نہ گئی ہو اور انسانیت کے تقاضے نے مجبور کر دیا ہو۔ مگر تمہاری روش کتنی تعجب خیز تھی۔ ممانی کو اپنا مستقبل خطرے میں نظر آنے لگا اور سب کی سوالیہ نگاہیں پھر تمہارے چہرے پر گڑ گئیں ——— ایک رات جب شمیم ماموں تمہیں پڑھا رہے تھے۔ کمرے میں کچھ شور سا ہوا۔ پھر تم بغیر دوپٹے کے بھاگتی ہوئی کمرے میں آئیں اور پلنگ پر گر کے رونے لگیں۔

پیچھے پیچھے گھر کے سب لوگوں کی لمبی قطار تھی۔ میں بڑی دلچسپی سے یہ تماشہ دیکھنے لگا۔

چچی نے تمہارے کمزور جسم پر اپنی دانست میں بڑے زوردار دھما کے رسید کئے اور بہت سی گالیاں کڑکڑانے لگیں۔ جواب میں سسکیاں روک کے تم نے بڑی مشکل سے کہا،

"میں جدھر بھی جاؤں سب مجھی کو بُرا کہتے ہیں۔ مجھے کیا معلوم تھا وہ اتنا کمینہ ہے"

اور مجھے ہنسی آ گئی ——— کوئی مرد ماموں نہیں ہوتا، ماسٹر نہیں ہوتا، شریف نہیں ہوتا، صرف کمینہ ہوتا ہے جو عورت سے سب کچھ لینے کے بعد بھی اسے جھلملاتے آنسوؤں کے علاوہ کچھ نہیں دے سکتا۔

شمیم ماموں۔ سوچا ہو گا کہ اگر ریاض یا ماسٹر تمہیں کوئی امانت نہ دے سکا تو وہ کیوں نہ اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لیں۔ جبکہ وہ کسی غلط رشتے سے تمہارے فرضی ماموں بھی بنے ہوئے تھے۔

پھر تو ان کی بیوی نے شہر بھر میں یہ خبر عام کر دی کہ تم چاہو تو بیوی بچوں والے بوڑھے مردوں کو بھی بھٹکا سکتی ہو۔ پھر کسی میوزیم میں رکھی ہوئی لاکھوں سال پرانی ممی کی طرح تم ایک نمائش کی چیز بن گئیں۔ لمبی لمبی چھتوں کو پھلانگتی ہوئی یہ بات سارے شہر کا گشت لگا کر تمہارے ماتھے پر چپک گئی۔ عورتیں اور لڑکیاں دور دور سے بچے کولھوں پر ٹکائے، ناک پر انگلیاں رکھے تمہیں دیکھنے کو آتیں، مردوں کی محفلوں میں بلند قہقہوں اور فحش گالیوں کے درمیان تمہارا نام آجاتا تو خود بھی اس کھلنے والے باغ میں جانے کو طبیعت مچل اٹھتی۔

اطہر اسی مالِ غنیمت کی امید میں آیا تھا۔

میرا چھوٹا بھائی جو اپنی آوارگی کے سبب حوالات تک ہو آیا تھا، کالج سے نکال دیا گیا تھا اور متفقہ طور پر یہ طے ہو گیا تھا کہ اسے کوئی اپنی بیٹی نہ دے گا۔ متوسط طبقے کا ایک بیکار نوجوان جس سے سب لوگ مایوس ہو گئے تھے۔

باہر کی تفریحوں کے علاوہ اور بھی کئی لڑکیوں کو جھانسا دے چکا تھا بلکہ راحت کے متعلق تو مشہور ہے کہ صرف اطہر کی وجہ سے اس کے شوہر نے اسے چھوڑ دیا ہے اور وہ میکے میں دن گذار رہی ہے۔

مگر اتنے سیاہ کارناموں کے باوجود وہ تمہاری جانب سے مایوس نہ لوٹا۔

ساری دنیا سے دھتکارا ہوا بے رحم، منہ پھٹ، چیخ چیخ کر باتیں کرنے والا اطہر جسے ابّا روز گھر سے نکال دیتے، امی کوسنے دیتیں اور عائشہ اپنی قسمت پر صبر کر کے بیٹھ جاتی ——— اگر بہنوں کے بھائی قابلِ فخر نہ ہوں تو وہ کتنی بدنصیب نظر آتی ہیں۔ خوبصورت کماؤ بھائیوں کے بھروسے پر ہی تو وہ کتنی ہی ناکوں کو اپنے سامنے رگڑوا سکتی ہیں اور عائشہ کی ساری توجہ مجھ پر مرکوز ہو گئی تھی۔ لڑکیوں کے لئے میری خشک اور بے ربط زندگی میں بھی کوئی کشش نہ تھی۔ مگر پھر بھی میری شخصیت کو گھر میں کافی اہمیت دی جاتی تھی۔

تمہاری بارگاہ میں اطہر کو کیسے شرفِ نیاز بخشا گیا، یہ بات سب کے لئے حیران کن تھی۔ وہ تو صرف اپنے خوبصورت جسم اور بے باک لہجے سے معرکے سر کرتا تھا اور تم نے ہمیشہ بجھے ہوئے دل اور بیدار ذہن تلاش کئے تھے۔

یہاں پر مجھے اپنی پچھلی ریسرچ بیکار معلوم ہوئی اور اسے اٹھا کر پھینکنے سے پہلے میں نے تم سے راہ و رسم بڑھانا چاہی۔ مجھے گھر میں رہنے کا اتفاق بہت کم ہوتا خصوصاً تم سے تو کبھی بے تکلفی سے بات بھی نہ کر سکا تھا۔ اس لئے ایک گھر میں رہنے کے باوجود ہم بہت دور رہتے۔ تم ہمیشہ مجھ سے چھپنا چاہتیں۔ کیونکہ پہلے دن ہماری ملاقات نے بڑی تلخ فضا پیدا کر دی تھی۔ اس دن ہماری ملاقات ناشتے کی میز پر ہوئی تھی۔ تم شاید میری سنجیدگی کی بابت عائشہ سے پہلے ہی سُن چکی تھیں اور مجھ تک اپنے کارنامے پہنچانے سے گریز کر رہی تھیں۔ احتیاط سے سر پر پلّو ڈالے نظریں جھکائے یوں بیٹھی تھیں جیسے کسی پادری کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے آئی ہو۔ عائشہ نے میری جانب بڑی بامعنی نظروں سے دیکھ کر کہا تھا:

"بھائی جان! دیکھئے یہ ہیں قدسیہ" ——— عائشہ کی طنزیہ نظروں کو تم نے بیچ میں سے ہی پکڑ لیا اور ہونٹوں پر زبان پھیر کر شکستہ لہجے میں کہا ——— "تو احمد بھائی بھی مجھے پہلے سے جانتے ہیں؟"

اور تم چائے کی پیالی رکھ کر اٹھ گئی تھیں۔

پھر برسات کی ایک شام کو ہلکی ہلکی رم جھم نے موسم بڑا پرکیف بنا دیا تھا۔ بہت دیر تک فیض کی "نقشِ فریادی" پڑھنے کے بعد میں حسب عادت سگریٹ کے دھوئیں سے خیالی ہیولے بنا رہا تھا۔

عائشہ، پروین، چھوٹی بھابی اور فرزانہ قریب بیٹھی کیرم کھیل رہی تھیں اور کسی فلم پر زوردار بحث کر رہی تھیں جس میں ایک ہیرو دو لڑکیوں سے محبت کرتا ہے اور ڈائرکٹر ہر بار اس محبت کو سچی محبت بنانے پر مُصر ہے۔ عائشہ کے خیال میں یہ محبت کی توہین تھی یا ہیرو کی بوالہوسی۔

تم ان کے قریب والی کرسی پر بیٹھی سیاہ ساٹن کے ایک ٹکڑے پر ننھے ننھے آئینے ٹانک رہی تھیں جن کی بہت سی شعاعیں مل کر تمہارے چہرے پر

مشعلیں سی جلا رہی تھیں۔

اپنی رسٹ کو زیادہ وزنی بنانے کے لیے عائشہ نے مجھ سے پوچھا:

"آپ بتائیے بھائی جان! کیا محبت ایک بار سے زیادہ کی جاسکتی ہے؟"

اور میں نے بلا سوچے سمجھے کہہ دیا۔ "قدسیہ سے پوچھو"

تمہارے ہاتھ کام کرتے کرتے رُک گئے۔ چہرے پر جلتی ہوئی مشعلیں بجھ گئیں اور تم گہری شکایت آمیز نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں۔ بھابھی اور پروین آہستہ آہستہ ہنسنے لگیں، فرزانہ بات ٹالنے کو گنگنانے لگی اور عائشہ نے داد طلب نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ پھر میں نے اس خوبصورت شام کا زرتار لباس نوچ کر پھینک دیا۔ رم جھم کا شور مچانے والی بوندیں آنسوؤں کے دھارے بن گئیں۔ فیض کے دلنشیں شعر ہاتھ ملا کر مجھ سے رخصت ہو گئے اور کمرے میں اندھیرا بڑھنے لگا۔

"آج موسم کتنا خوشگوار ہو رہا ہے!"

"ہونہہ!"

"جی چاہ رہا ہے کہیں باہر گھومنے جاؤں۔"

"تو جائیے۔" تم حسبِ عادت مختصر جواب دے رہی تھیں۔

"مگر کوئی ساتھ چلنے والا جو نہیں۔ اطہر نے وعدہ کیا تھا مگر نہیں آیا۔ کتنا غیر ذمہ دار اور جھوٹا ہو گیا ہے یہ لڑکا ——"

جان بوجھ کر اطہر کی برائی کر کے میں نے تمہارے چہرے پر کچھ ڈھونڈا۔ تمہاری آنکھیں سامنے کھلی ہوئی کتاب پر تھیں اور ہاتھ ٹیبل کلاتھ کی شکنیں درست کرنے میں مصروف۔ پھر بڑے طنز سے تم نے کہا:

"اتنے سہانے موسم میں تو وہ کسی بار میں بے ہوش پڑے ہوں گے۔ آپ لوگ تو انہیں اچھی طرح جانتے ہیں نا۔"

یہ تم کہہ رہی تھیں۔ تم! جس کے متعلق مشہور تھا کہ سارے خاندان کی عزت جوتے کی نوک پر اچھال کر تم اطہر سے شادی کرو گی۔ سب سے چھپا کر اسے روپے دیتی ہو۔ وہ شراب پی کر آتا ہے تو اس کی پردہ پوشی کرتی ہو۔ اتنے بُرے انسان پر تمہاری یہ عنایتیں کیوں تھیں جبکہ پچھلی زندگی میں کئی ناقابلِ اعتبار مرد تمہیں دھوکا دے چکے تھے۔

تمہارے متعلق پھیلی ہوئی بدنامیوں کے درمیان مجھے اپنی اچھی رائے بڑی مضحکہ خیز لگی۔ اسے میں نے اپنے دماغ سے کھرچ دیا۔ تم سب کے لیے ناقابلِ فہم بن گئی تھیں۔ بھول بھلیوں کے پیچیدہ راستوں کی طرح تم نے اپنے مکر و فریب کے جو جال بچھا رکھے تھے انہیں دیکھ کر مجھے تم سے نفرت ہو گئی۔

پھر ایک دن بڑی سوچ بچار کے بعد میں کچھ حواس باختہ سا تمہارے کمرے میں آیا۔

"میں تمہارے متعلق کچھ جاننا چاہتا ہوں قدسیہ! اگر تم مجھے اجازت دو تو —— تو" —— اپنی گھبراہٹ پر میں خود متعجب تھا۔ اس دن تمہارے چہرے پر میں نے پہلی بار ڈر کی پرچھائیاں دیکھیں جن پر حیرانی غالب تھی۔ تم یوں کھڑی ہو گئیں جیسے شیم ہاموں تم پر جھپٹنا چاہتے ہیں۔ تم نے دوپٹے کو سینے پر سنبھال کے کہا:

"آپ بھی مجھے جاننا چاہتے ہیں احمد بھائی! میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں۔ پھر آپ کیوں کوئلوں کی دلالی میں اپنے ہاتھ کالے کرنا چاہتے ہیں۔"

اور تم پیچھے دیکھے بغیر باہر بھاگ گئی تھیں۔

ان ہی دنوں اتفاق سے مجھے تمہارا ایک خط ہاتھ لگا جو تم نے ریاض کو لکھا تھا مگر اسے بھیج نہ سکی تھیں، یا شاید اسے بھیجنے کو لکھا ہی نہ ہو کیونکہ یہ صرف تمہاری روح کی پکار تھی جس کو ریاض جیسا بے وقوف انسان کبھی نہ سمجھ سکتا۔ اس کی محبت میں تمہاری برتری اور پرستش کا جذبہ غالب تھا اور

تم اسے روح کی بلندی کبھی نہ دے سکتی تھیں۔ بارش بہت زور کی ہو رہی تھی اور درختوں سے نیچے گرنے والے قطروں کو بچے ہاتھوں میں روک کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ اتنے میں بھابی کا چھوٹا بچہ راشد تاؤ بنوانے کو ایک کاغذ لے کر آیا۔ یہ نیلے کاغذ پر لکھا ہوا ایک لمبا چوڑا خط تھا۔ نیچے تمہارے بہت ہی بگڑے ہوئے دستخط۔ وہ خط راشد تمہاری الماری سے نکال کر لایا تھا۔ اپنی شرافت کا ثبوت دینے کے لئے میں نے اسے واپس رکھوانا چاہا مگر ایک بار پڑھنے سے باز نہ رہ سکا۔

میری جانب ملامت آمیز نظروں سے نہ دیکھو۔ ان دنوں میں تم پر ریسرچ کر رہا تھا۔ بیسویں صدی کا ایک نکما انٹلکچوئیل ——— تمہارا یہ خط بہت سی ڈھکی چھپی باتوں کو سامنے لے آیا اور میری رائے پھر ڈگمگانے لگی۔

اس خط میں ریاض کو لکھا تھا کہ بچپن سے تم نے ہر دل میں اپنے لئے حقارت اور نفرت پائی اور صرف کسی کی نظر میں برتری حاصل کرنے کا یہ جذبہ ہی تمہیں ریاض کی جانب لے گیا جو تمہاری طرح سب کی جانب سے دھتکارا ہوا و سرافرد تھا۔ ریاض کی نیازمندی اور احساسِ کمتری نے اسے اور گھبرا کر دیا اور گھر والوں کی مخالفت نے اسے جنگل میں لگی ہوئی آگ کی طرح بھڑکا دیا۔ پھر تم نے ہر قیمت ادا کر کے ریاض کو پانے کا تہیہ کر لیا مگر ریاض کے قدم اس دشوار راستے پر لڑکھڑا گئے۔ ابا کی ایک ڈانٹ پر محبت اچھل کر دور جا پڑی اور وہ اپنا بوریا بستر سمیٹ کر بھاگ گیا۔

خط کے آخر میں تم نے اسے خوب ذلیل کیا تھا ——— بزدل تو سمجھتا ہے اس طرح تو نے اپنی محبت کو رسوائی سے بچا کر میری لاج رکھ لی۔ مگر ابھی ہماری محبت شروع ہی کہاں ہوئی تھی۔ پہلے ہی میری عزت کو (ا) سے جھنڈے پر چڑھی بیٹھی تھی۔ میں تجھے وہ دے ہی نہ سکی جو میری زندگی کا بلند آدرش ہے ——— کاش میں تجھے اس بلندی پر پہنچا سکتی، جہاں تک خود میرا ہاتھ بھی نہ جا سکتا۔ اب میری روح اس وسیع سمندر میں اس تنکے کو تلاش کرتی پھرے گی۔

تو اب تم اس تنکے کی تلاش میں خوفناک چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ تم ——— جو موم کی مورتی کی طرح اپنے خالق کے تخیل کی گرمی سے پگھل سکتی تھیں۔ کسی کی تیز نگاہوں سے سلگ سکتی تھیں۔ پھر اپنے چاروں طرف چھائی ہوئی اس بھیانک آگ میں تمہارے قدم کیسے نہیں ڈگمگاتے ———؟

دوسرے دن میں نے اطہر کو تمہارے سامنے خوب ڈانٹا۔

"کل تم مجھ سے وعدہ کرنے کے بعد کیوں نہیں آئے؟ کبھی تو تمہیں اپنے وعدے کا خیال کرنا چاہئے۔ میں یہاں انتظار میں بیٹھا رہا اور نقول اقدسیہ کے جناب کسی بار میں پڑے رہے۔"

اطہر کے بے ساختہ قہقہے رک گئے اور وہ یوں خاموش ہو گیا جیسے میں نے اسے پھانسی کا حکم سنایا ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بڑا پشیمان میرے پاس آیا۔

"اور اس نے میرے متعلق کیا کہا ——— ؟ اسے میری عادتوں کی خبر ہے؟ کیا اس نے میری شکایت کی تھی۔ وہ بہت رنجیدہ ہو گی ———؟" زندگی میں آج پہلی بار میں نے اطہر کو شرمندہ دیکھا تھا۔ وہ بھی کسی کی شکایت سننے کو تیار تھا، اس سے متاثر ہو سکتا تھا۔

"یہ تو نئی بات ہے۔ جبکہ تم ہمیشہ سے فریب دیتے آئے ہو اور قدسیہ ہمیشہ فریب کھاتی آئی ہے۔"

"آپ بھی اسے ایسا سمجھتے ہیں بھائی جان!" اس نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"قدسیہ کے بگڑنے میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ بڑی بدنصیب لڑکی ہے لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر اسے کچھ دے نہ سکوں تو اس کی بدنامی میں اضافے کا سبب بھی نہ بنوں۔ میں سچ مچ بہت برا ہوں اور قدسیہ کو فریب دے کر بھی نقصان ہی میں رہوں گا۔"

وہ باہر چلا گیا اور ایک بار پھر تم میرے سامنے نئی گتھیاں لئے آ گئیں۔ اطہر کونسا راستہ اختیار کر رہا تھا!

وہ بے رحم انسان جو اپنے اور کے آگے کسی پر رحم نہ کر سکتا تھا ——— تم مجھے ایک کسوٹی نظر آئیں جس پر سونا اور پیتل دونوں واضح شکل میں

چمک اٹھتے ہیں۔

"گناہوں کے اتصال سے اتنا پاک جذبہ بھی وجود میں آتا ہے؟"

پھر تمہاری کہانی کا باقی حصہ میں خود نہ دیکھ سکا۔ میری مصروفیتیں مجھے کلکتہ کھینچ کر لے گئیں اور وہاں سے مجھے آندھرا کے علاقوں میں جانا پڑا اور آندھرا کی بیدار زندگی اور پُرجوش سرگرمیوں نے تمہاری محبت کی نیم مردہ رینگتی ہوئی کہانی بھلا دی اور گھر میں ہونے والے یہ چھوٹے چھوٹے حادثے ذہن کے کسی کونے میں تھک کر سو گئے۔

ایک بار عائشہ نے لکھا کہ اطہر کی مسلسل نافرمانیوں کے سبب ابا نے اسے عاق کر دیا ہے اور وہ گھر سے چلا گیا ہے اور معلوم ہوا کہ تم اپنا گھر سے غائب ہو گئیں اور کسی نے ایک بار مجھے بتایا کہ تم دونوں اب لکھنؤ میں رہتے ہو چچا ابا اب تمہیں گھر بلانے پر تیار نہیں ہیں۔

اس سے آگے کی کہانی مجھے کسی نے نہیں سنائی، مگر میں اس بات کا منتظر رہا کہ اب اطہر اپنا اگو سیدھا کرنے کو تمہیں بمبئی لے جائے گا۔ جہاں کئی برس تک ٹھوکریں کھانے کے بعد میں تمہیں ایک دن کسی فلم میں دیکھوں گا۔ ہیروئن کے پیچھے ایکسٹراؤں میں کولہے مٹکاتے ہوئے کوئی آوارہ سا گیت تمہارے لبوں پر ہوگا، جو تمہارے مصنوعی بھرے بھرے چھاتیوں، پنڈلیوں اور کمر کی نمائش کرے گا۔ تم ایک جھوٹ کا خول ہوگی، "مولانا ہیٹ کی گڑیا" جس کی ہر جنبش دوسروں کی تابع ہوتی ہے، اور تم اپنی خودداری کی لاش پر ناچ رہی ہوگی۔

ایک حد سے زیادہ جذباتی لڑکی کے تخیل کی اڑان ہمیشہ یوں ہی کھائیوں میں گر کے دم توڑ دیتی ہے ـــ مجھے تم دونوں کے نام سے نفرت ہو گئی۔ عائشہ نے ایک بار لکھا بھی کہ قدسیہ وہاں کسی پرائیویٹ اسکول میں نوکر ہو گئی ہے، اطہر بیکار ہے اور وہ دونوں بڑی تکلیف کے دن گذار رہے ہیں۔

لیکن میں نے بڑی سختی سے اسے لکھ دیا کہ میں اب قدسیہ کے متعلق کچھ سننا نہیں چاہتا۔ اطہر کی یہ تبدیلی جتنی نفرت انگیز تھی اتنی ہی تعجب خیز بھی تھی۔ وہ کسی کی شادی کی خبر سن کر بھی مذاق اڑایا کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا "ایک ہی راگ مسلسل لوگ کیسے سُنے جاتے ہیں۔ میں تو دو ہی دن میں پاگل ہو جاؤں۔"

پھر اس نے دو سال تک اس راگ کو کیسے سنا؟

امی اپنی قسمت کو رو کر بیٹھ رہیں، ان کی زندگی کے دونوں کڑوے پھل گئے۔ میں تو خیر اپنی خطرناک زندگی سے انہیں کوئی فیض نہ پہنچا سکتا تھا گویا یہ بھی برداشت نہ کر سکے کہ اطہر کی قسمت اچانک پلٹا کھائے، وہ کوئی اچھی ملازمت حاصل کر لے۔

پھر امی کے آنسوؤں نے ابا سے خط لکھوا دئے جس میں اطہر کو اپنی خاندانی عزت اور بے شمار دولت کا واسطہ دیا گیا تھا اور تمہیں اطہر کی محبت کا اور آج عائشہ نے لکھا ہے ـــ "بھائی جان! آپ قدسیہ سے نفرت کرتے رہئے کیونکہ آئندہ اس کے متعلق کوئی بات نہیں ہوگی جو میں آپ کو سناؤں گی آج اطہر بھائی کو ابا تنہا گھر لے آئے ہیں، قدسیہ کسی معمولی سی بیماری سے مر چکی ہے۔"

تم زندگی بھر میری عزت کرتی رہیں اور میں تم سے نفرت کرتا رہا۔ یہ ہم دونوں کی اپنی اپنی ذہنیت کا قصور ہے، ادھر منہ کرو ـــ تمہاری آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسو کیا کہہ رہے ہیں؟

کیا سچ مچ تم کسی معمولی سی بیماری سے مر گئیں؟ اس چھوٹی سی بیماری کو اپنے نازک جسم پر نہ سہہ سکیں اور اس بیماری کا علاج کسی سے نہ ہو سکا ـــ اطہر سے بھی نہیں۔ مجھ سے بھی نہیں جو تم سے نفرت کرتا رہا۔

تمہیں اپنی شکست پر آنسو نہیں بہانا چاہئیں کیونکہ تم نے اطہر کو وہ تحفہ دے دیا جس کے لئے تم زندگی بھر سرگرداں رہیں اور چپ چاپ اندھیرے میں کھو گئیں۔ اب تمہاری روندی ہوئی سسکیاں اور جھلملاتے آنسو، مجھے تمہاری موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔

تم آج گھٹی گھٹی آہوں اور بہتے ہوئے آنسوؤں سے اس کمرے میں میرے لئے اپنی عزت کا تحفہ لے کر آئی ہو مگر میں اس کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا کہ بیٹھ کر سگریٹ کو ایش ٹرے میں پھینک کر تمہارے خیال کو بھی ذہن سے جھٹک دوں۔

انور عظیم

لڑھکتی چٹان

رات بھر بادلوں کے گرجنے کی آواز آتی رہی۔ جیسے اونچی اونچی پہاڑی چوٹیوں سے مسلسل بڑی بڑی چٹانیں پھسل رہی ہوں، لڑھک رہی ہوں۔ تنگ کمرہ بالکل تاریک تھا۔ اس اندھیرے میں تمام رات چمگادڑ پھڑپھڑاتے اور دیواروں سے سر ٹکراتے رہے تھے۔ شاہد اپنی بیوی کے لچھے دار نرم بالوں میں اپنا منہ پیٹے پڑا تھا۔ بالوں سے تل کے تیل کی ناگوار خوشبو نکل کر اس کے نتھنوں سے ہوتی ہوئی اُس کی بے خواب کلاتی ہوئی روح میں تیرتی، گھلتی اور رچتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی ناک سے چھوٹتی ہوئی زہریلی سانسیں بالوں کے گھونسلے میں گرمی بھر رہی تھیں۔ اور اس کا تمتایا ہوا چہرہ اس گھونسلے میں ایک سہمی ہوئی چڑیا کی طرح چھپا ہوا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اور جب پہلی بار اس کی نظریں دریچے کے کھلے ہوئے حصے سے باہر گئیں تو اندھیرے کا رنگ پھیکا ہوتا ہوا نظر آیا۔ مدھم مدھم، جیسے ہر چیز دھواں دھواں ہو رہی ہو۔ کمرے نے دستوں میں اڑتی ہوئی بھاپ کا طوفان سا اٹھا رکھا تھا۔ اسے ہر چیز خواب میں کھوئی ہوئی، دبی دبی معلوم ہو رہی تھی۔ اُس نے اپنی آنکھیں پھر بند کر لیں۔ اُس کے حلق میں کھٹی کھٹی کوئی چیز رقیق سی پسیجتی ہوئی محسوس ہوئی۔ جیسے وہ جلے ہوئے پیاز اور سرکے کو چاٹ رہا ہو۔ اُس کی طبیعت میں مالش سی ہوئی۔ اس نے اپنا ذہن دوسری طرف پھیرنا چاہا۔ لحاف کے اندر سر گھسیڑ کر اُس نے ایک کرب کے سے عالم میں ثروت کے بالوں میں چھپے ہوئے چہرے کو اپنے چہرے سے قریب کیا اور اس کے ٹھنڈے لبوں کو چوس کر آہستہ سے بولا ...... جیسے نشے میں ہو، جیسے اُس کا تیزابی نشتر ٹوٹ رہا ہو۔

"میری جان، میری ثروت، صبح ہو رہی ہے، آخر صبح ہو ہی گئی۔ آخر صبح ہو ہی جاتی ہے۔ یار خاں کا باپ بھی صبح کو نہیں روک سکتا ..... میری ثروت، میری جان ......"

ثروت کے ہونٹ شاہد کے تھوک سے گیلے ہو گئے تھے، اور وہ شبنم میں نہائے گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح ٹھنڈے تھے۔ زندگی اور سپردگی کی آگ سے خالی، شاہد کے لب ..... جن سے سڑے ہوئے سرکے اور جلے ہوئے پیاز کی بو آ رہی تھی، بے طرح جل رہے تھے۔ آنکھیں بند تھیں، اور بند آنکھوں میں بجھتے ہوئے انگاروں کی راکھ کسمسا رہی تھی۔ ثروت کا جسم گرم تھا۔ پالتو بلی کے جسم کی طرح نرم۔ آنکھیں بند تھیں۔ ہونٹ پھر بھی شل تھے۔ شاہد کو محسوس ہوا کہ وہ شعلوں کے دریا میں بہتے بہتے ڈوبنے لگا ہے، شعلوں کا دریا جم کر برف بن گیا ہے۔ اور اُس کے منہ میں برف کی دو قاشیں ایک

دوسرے میں چپکی ہوئی، چھپی ہوئی تھیں۔ کیا وہ ثروت ہی کے ہونٹ تھے۔ پھر ان میں وہ آگ کیوں نہ تھی جس میں اُس نے اپنی ساری زندگی کو، زندگی کے سارے رس کو اشعور کے تمام آدرشوں کو جھلس کر رکھ دیا تھا۔

منّی جاگ پڑی۔ ثروت نے اُس کی طرف کروٹ لے لی اور منّی کے پوپلے منہ میں اپنی ٹھنڈی چھاتی ڈال کر اُسے تھپکنے لگی۔

شاہد کو اپنی بیٹی کا یہ دخل در معقولات بہت بُرا معلوم ہوا۔ اس کو اپنی تنہائی اور محرومی کے احساس نے آدبوچا۔ نیم غنودگی کے عالم میں وہ ایک خواب کے ریلے سے گزر گیا، ٹائپ رائٹروں کی آواز، سپرنٹنڈنٹ کی منحوس گھنکتی ہوئی ڈانٹیں۔ عینک کے شیشے کو توڑ کر جھپٹتی ہوئی آنکھیں، آنکھوں کی کمین گاہ میں چھپے ہوئے کتنے گدھ، کتنی چیلیں، دوسری طرف ہیڈ اسسٹنٹ کا رعب، اس کے سڑے ہوئے دانت، سڑتی ہوئی بدبودار مسکراہٹ مسکراہٹ کی جھریوں میں کُلبلاتا ہوا، رینگتا ہوا رحم، اچھوپن، زعم برتری ـــــ "تم اب تک دفتر کا کام نہیں سمجھ سکے۔ ان فائلوں کو دیکھ کر ریکارڈ ٹھیک کر لو، ہاں، مسٹر معشوق کے وہ پیٹے اور سرکاری کام میں بڑا فرق ہے۔ نوکری نوکری ہے۔ دعوت کی میز پہ رکھا ہوا کیک مکھن لیک نہیں ہے۔ ملائی، ملائی، اوں، اوں ـــــ ہو ہو ہو ـــــ" سپرنٹنڈنٹ اسے اسی طرح دھمکایا کرتا تھا۔ اور وہ اپنی سانسیں پھیپھڑوں میں لے کر زینے پر سے اُترتے ہوئے اپنے آفس کے کمرے میں پہنچتے پہنچتے دانت پیس کر کہتا "معشوق کا بچہ، دوپٹے کی اولاد، کیک کا سالا" ـــــ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ وہ بے بسی سے اپنے چاروں طرف بکھری ہوئی فائلوں کو دیکھتا۔ ان پر رینگتے ہوئے اعداد کے کچھوؤں کو دیکھتا جو خرگوش سے بازی لگا کر تیرتے چلے جا رہے تھے۔ ٹائپ رائٹروں کے منقروں سے کھٹ کھٹا کھٹ کا نغمہ چھنتا رہتا اور اس کی روح کے پرخچے اڑتے رہتے۔

گزشتہ شام کو ہی سپرنٹنڈنٹ نے اس سے کہا تھا "مسٹر تم دیکھنے میں آدمی انٹیلی جنٹ معلوم ہوتے ہو لیکن تمہارے کام سے ایسا معلوم نہیں ہوتا تم ٹمپریری کلرک ہو۔ اگر تم نے کام اچھا نہیں کیا تو تم ہی بتاؤ ـــــ"

وہ پوری بات سنے بغیر بھنّاتا ہوا نکل آیا تھا۔ فائلوں کو میز پہ ٹپک کر اور صراحی سے ایک گلاس پانی انڈیل کر غٹاغٹ اُس سر چڑھا گیا تھا۔ روز کی دھمکی، روز کی دھونس، نوکری کی ایسی تیسی۔ چپراسی اُسے گھور رہا تھا۔ اور مسکرا رہا تھا۔ وہ اس کے قریب آیا "بابو جی یہ کالا صاحب بڑا کائیاں ہے۔ نذرانہ مانگتا ہے۔ مچھلی، کھلونے، مٹھائیاں۔"

شاہد نے بڈھے چپراسی کا منہ دیکھا۔ دو تین بار اپنے پھٹے ہوئے گرم کوٹ اور دیمک کھائے ہوئے مفلر کو مٹھیوں میں بھینچا اور سکریٹریٹ کی تندرو زرد عمارت سے نکل کر باہر چلا آیا۔

ابھی سڑک پر ہی پہنچا تھا اور بڑے پھاٹک سے باہر نکلنے ہی والا تھا کہ ایک وزیر کی خاصی کار پھڑ پھڑاتی ہوئی نکل گئی۔ یکہ رُکا اور اُس میں سے قربان ہوٹل کا مالک نکل پڑا۔

"سلامتی شاہد صاحب! آپ نے تو نہ ملنے کی قسم کھا رکھی ہے۔"

شاہد کا دم گھٹنے لگا۔ یہ بجلی کہاں سے گر پڑی۔ "آخر آپ کا ارادہ کیا ہے۔ کب تک میں یکے کا کرایہ بھرتا رہوں گا۔؟"

"بس اب کے ضرور دے دوں گا۔ میں تو خود ہی آپ کے یہاں آنے والا تھا۔ اور کہیے سب خیریت ہے نا؟"

"آپ کی دعا ہے۔ مگر دیکھیے اب کے وعدہ خلافی۔"

"توبہ کیجیے ـــــ" اس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ اور دوسرے ہاتھ سے اپنے مفلر کو سلجھا رہا۔ اُسے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اپنی موت سے ہاتھ ملا رہا ہے۔

اس سے جان چھوٹی تو اس کے ماتھے پر پسینہ تھا۔ وہ کئی مہینے سے اس ہوٹل والے کو جُل دے رہا تھا۔ اُس نے اس سڑک پہ چلنا چھوڑ دیا تھا جس پر وہ ہوٹل تھا۔ اسی لئے وہ بس سے نہیں جاتا تھا۔ بس ہوٹل کے سامنے رُکتی تھی۔ اور روز خطرے کے منہ میں سے گزرنا اس جیسے مرد میدان کا کام نہ تھا۔

وہ پرانے شہر سے پیسنجر سے روانہ ہوتا اور وقت سے کافی پہلے روانہ ہوتا اور یہاں آکر اِدھر اُدھر ٹہلتا رہتا۔ اس کی اس مصیبت کی وجہ سے اس کی ..... بیوی کو سویرے سویرے اس کا کھانا پکانا پڑتا۔ وہ اسے بار بار کہتی تم بس سے کیوں نہیں جاتے۔ لیکن وہ اس کے مشورے کی اہمیت کو حسبِ معمول بہت ہی مرعوب کرنے والی باتیں کرکے دبا دیتا تھا۔ بس کیا ٹھکانا تھا۔ اکثر پٹرول ختم ہو جاتا ہے! اور بس راستے میں پچھ جھنے لگتی ہے۔ اب ایسے میں؟ —— خیر چھوڑو۔ بات یہ ہے کہ آفس میں میری دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ میں کام بڑا پختہ کرتا ہوں اور اب کے چانس ہے۔ سپرنٹنڈنٹ ہونے کا۔ میں کسی طرح آفس دیر سے پہنچ کر بدنام ہونا نہیں چاہتا۔ اچھا ذرا کبھی کبھار پودینے کی چٹنی تو بنا لیا کرو —— بڑا روکھا کھلاتی ہو۔" ثروت کا ذہن بس سے ہٹ کر روکھے کھانے اور پودینے کی چٹنی کی طرف چل دیتا۔

ہوٹل کا قرض تو اس پر اخبار کی نوکری کے زمانے سے چلا آرہا تھا۔ اخبار کی نوکری بھی خوب تھی۔ ایڈیٹر نے ایک وزیر کے اشتہار کا ٹھیکہ لے رکھا تھا وہ روپے دیتا تھا۔ زیادہ بڑا حصّہ تو خود ایڈیٹر کے پیٹ میں چلا جاتا تھا۔ تھوڑے سے حصّے میں کاتب، چپراسی، کلرک اور شاہد جیسے مترجموں کی روٹی کا انتظام ہوتا تھا۔ ایک کا پیٹ بھرتا تو دوسرے کا خالی رہتا۔ اور پھر شاہد پر ایڈیٹر کا احسان ہی تھا۔ وہ تو کہتا تھا محض مروّت میں اس نے اس جیسے ہونہار نوجوان کی فاقہ کشی دیکھی نہ جاتی تھی۔ اور اسی لئے ترجمہ اور اداریہ سے لے کر کاپی جوڑنے کا کام تک اس کے سپرد کر رکھا تھا۔ وہ اپنی میلی قمیص اور بوسیدہ پاجامے میں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کرتا۔ ریڈیو سے خبریں اٹھاتا، ترجمے کرتا، دو کالمی تین کالمی سرخیاں لگاتا جاتا۔ ناراض کاتبوں کی خوشامدیں کرتا جاتا اور جب رات کے دو بجے آخری کاپی جوڑ کر پریس بھیجتا تو اُسے محسوس ہوتا کہ اس کا دماغ چھچھوندر کی طرح غرارے اُگلتا ہوا ناچ رہا ہے۔ وہ چکرا کر دری پر گر جاتا جس پر مسطر، اخبار، گوند اور دواتیں بکھری ہوتیں۔ وہ کئی کئی دن نہ نہا پاتا تھا۔ اس کے جسم پر میل کی پھٹی پھٹی سی تہیں جمی رہتی تھیں جب لوگ اس سے نہانے کا مطالبہ کرتے تو وہ جھلا کر کہتا "یہ سالے نہانے کو سب کہتے ہیں۔ مگر یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ نہانے کا مطلب ہوتا ہے کپڑا، صابن، تیل ——

اسے جو کچھ بھی پیسہ چھین جھپٹ میں ہاتھ لگ جاتا ثروت کو بھیج دیتا۔ اس نے اپنی بیوی کو اپنے ڈاکٹر ہم زلف کے یہاں بھیج دیا تھا۔ وہ ان دنوں پاکستان میں تھی۔ وہ اسے پیسے بھجوانے کے لئے بے قرار رہتا تھا۔ کلکتے میں اپنے ایک دوست کے ذریعے پاکستانی سکوں میں ہندوستانی سکے تبدیل کرواتا۔ اور اس طرح اُس کی بیوی کا ہر ماہ ایک شکریہ کا خط آجاتا۔ اور اس کی جان میں جان آجاتی۔ ثروت اس کی قربانیوں کو سمجھتی ہے۔ اس کی مصیبت کو سمجھتی ہے۔ ثروت اس سے بے حد محبت کرتی ہے۔

وہ لکھتا —— میری پیاری ثروت، زندگی کا یہ اندھیرا دور ہونے والا ہے۔ بہت جلد میں ایڈیٹر ہو جاؤں گا۔ میرا ایڈیٹر ہندوستانی سفارت خانے کے ساتھ ایران جانے والا ہے۔ اس کے بعد میں بھی کہیں باہر چلا جاؤں گا۔ تم میرے ساتھ ہوگی۔ پھر سمندر ہوگا۔ سمندر سے نکلتا ہوا نیا نیا سورج ہوگا۔ سروں پر گاتے ہوئے پرندے ہوں گے —— گھبراؤ نہیں گھبراؤ نہیں —— یہ دن ہمیشہ ایسے ہی نہیں رہیں گے —— کبھی کے دن بڑے ہوتے ہیں۔ کبھی کی راتیں۔ نہیں سمجھیں —— جاڑے کی راتیں بڑی ہوتی ہیں اور گرمی کے دن۔ یہی حال زندگی کا ہے —— جاڑے کی راتیں بھی آئیں اور گرمی کے دن بھی۔ لیکن اس کے دن جیسے تھے ویسے ہی رہے۔ اس کی زندگی سکڑتی گئی۔ گھٹتی گئی۔ اس کے کپڑے میلے ہوتے گئے۔ ہوٹل کا قرض چڑھتا گیا۔ ہوٹل والے نے تو انتظار سے گھبرا کر اب سیکرٹریٹ کا پھیرا لگانا شروع کر دیا تھا۔ دو مہینے وہ ٹال گیا تھا۔ لیکن اب کے ٹالنا مشکل تھا۔ اب کے تو اس نے حلق میں انگلی ڈال کر نکلوا لینے کا عہد کر رکھا تھا۔

سبزی منڈی کے پاس ہی پہنچا تھا کہ زوروں کی بارش ہونے لگی۔ سامنے پیڑ ہلم میں موبل آئل کے کنستروں پر اولے برسنے لگے! ورچیپ نے سے بنگلے کے سبزہ زار میں برف روئی کی طرح بچھ گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہر طرف روئی دھن دھن کر اُڑ رہی ہے اس کی جیب میں پیسے بہت کم تھے مشکل سے وہ واپسی کا ٹکٹ خرید سکتا تھا۔ اگر وہ تھوڑی دیر اور وہاں پر کھڑا رہتا تو یقیناً بھیگ جاتا۔ اُس نے دوڑ کر سامنے کے

پیرا ڈائیز بار میں پناہ لی۔ وہاں یار خاں، اس کے مکان کا مالک کھڑا تھا۔ اس کی تیلی تیلی مونچھیں پھڑک رہی تھیں۔ اور وہ سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ شاہد وہاں سے بچ کر نکل جانا چاہتا تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ کہیں مکان کے کرائے کا تقاضا نہ کر دے۔ کہیں کیا یہ تو یقینی تھا۔

"کہاں شاہد صاحب! دفتر سے آ رہے ہیں کیا؟" اس کے ایک ہاتھ میں بنڈل تھا جس میں ایک ریشمی ساڑھی جھانک رہی تھی۔

"آداب عرض ہے۔ جی ہاں! اُف کتنی خوفناک بارش ہو رہی ہے میں تو پانی سے بچنے کے لئے یہاں چلا آیا۔"

"آئیے اندر آ جائیے۔ باہر کب تک کھڑے رہیں گے؟"

وہ دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ دروازہ خود بخود اسپرنگ سے بند ہو گیا۔ اندر جتنے چہرے تھے۔ اس کے چہرے سے مختلف تھے۔ اس کے چہرے کی سی تھکن، اضمحلال، شکست اور گھبراہٹ کسی کے چہرے پر نہ تھی۔

ایک طرف کونے میں ایک سُرخ میز خالی تھی۔ باہر بجلی چمکتی تھی تو شیشے کا رنگین دریچہ جھلک اُٹھتا تھا۔ سگار، سگریٹ اور پائپ کے دھوئیں سے اندر کی نم آلود فضا بسی ہوئی تھی۔

میز پر بیٹھتے ہی یار خاں کا لہجہ بہت دوستانہ ہو گیا۔ وہ ایک ہی جست میں آپ سے تم پر چلا آیا۔ "کہو تم کیا پسند کرو گے؟"

"جی؟"

"کیا پیو گے؟" اور اس کی آنکھوں میں ایسی عیاش اور مکار چمک پیدا ہوئی کہ اس کی آنکھیں لومڑی کی آنکھوں کی طرح چمک اُٹھیں۔

"میں نہیں پیتا۔" شاہد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"بکواس" جب بیرا اس کے سامنے آ کر جھکا تو اس نے کہا۔ "سولن وسکی، ایک بوتل۔"

بیرا نے پہلے سولن کی بوتل کھولی پھر دو گلاس لا کر رکھے۔ اور دو پلیٹ میں کباب۔ سوڈے کی بوتلیں پھک سے کھلیں اور بیرے دوسری طرف چلے گئے۔

یار خاں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم بہت تکلف کرتے ہو بھئی پینے کے لئے ایک ساتھ بیٹھے ہیں تو فرق کیا ہے۔ پینے والوں کی ایک ذات ہوتی ہے۔"

ٹھیک اسی وقت دروازہ کھلا ہوا کا ایک ٹھنڈا جھونکا اندر چلا آیا۔ شاہد کا پورا بدن جھرجھرا گیا۔ کار کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی بجلی چمکی اور اولے برسے۔ ایک کھدر پوش تنومند بابو جی اندر داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک اینگلو انڈین عورت تھی۔ اور پیچھے پیچھے ایک بڑا سا بھورے رنگ کا کتا تھا۔ جسے وہ عورت "ہلو ٹائیگر، ٹائیگر ——" کہتی ہوئی چمکارتی رہی۔ وہ کھدر پوش بابو جی کے ساتھ کیبن میں داخل ہو گئی۔ اور کتا اپنی دم پر بیٹھ کر کاؤنٹر کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں آئینے۔ کے پس منظر میں ایک بلند شوکیس میں طرح طرح کی شراب کی بوتلیں چمک رہی تھیں۔ دُلہنوں کی طرح۔

یار خاں نے سنہری شراب گلاسوں میں انڈیلی۔ ماچس سے دونوں کی مقدار کا اندازہ لگایا۔ اپنی نیلی ٹائی کی گانٹھ کو چھو کر دیکھا۔ دور بیٹھی ہوئی چھوکریوں کے پاس بیٹھے ہوئے دو تین کالج کے لڑکوں کو دیکھا جو بڑے لوگوں کے سپوت تھے اور فضا کی رنگینی کا لطف اٹھا رہے تھے۔ اس نے شاہد کو گلاس اٹھانے کا اشارہ کیا۔ شاہد نے گلاس اٹھا لیا۔ اُس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ شراب لرز رہی تھی۔ سوڈا کی وجہ سے اس کا رنگ ہلکا ہو گیا تھا۔ یار خاں نے اپنا گلاس اس کے گلاس سے ٹکرایا —— "سرما کی اس حسین شام کے نام" شاہد نے شراب کا گھونٹ پیٹ میں انڈیل لیا۔ اس کے جسم میں ایک تلخ سی حدت دوڑ گئی۔ وہ اپنے لب چوستے ہوئے یار خاں کو دیکھنے لگا۔ جو اپنے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال رہا تھا۔

شاہد نے اس کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اس کی میخواری کا بڑا چرچا تھا۔ وہ روز شام کے بعد کسی نہ کسی بار میں پہنچ جاتا تھا اور کسی نہ کسی نئے آدمی کو پھانس لیتا تھا۔ اور اُسے اپنی جیب سے شراب پلاتا تھا۔ جب سیر ہو جاتا تھا تو نشے میں اُسے چھوڑ کر روانہ ہو جاتا تھا۔ اس کا کہنا تھا۔ کہ نئے آدمی کو نشے میں گالیاں دینے اور اس کی زندگی کا حال سننے اور سنانے میں بڑا مزا آتا ہے۔ پرانے لوگوں کے ساتھ شراب پینے سے شراب بھی پرانی ہو جاتی ہے۔

دو تین گھونٹ حلق میں اُترنے کے بعد شاہد کی سراسیمگی مٹنے لگی۔ اُس نے اپنی ہتھیلیاں ملیں، آنکھیں جلدی جلدی جھپکیں۔ جیسے اب کسی پرندے پر بندوق سے نشانہ باندھنے کا ارادہ کر رہا ہو۔ "لاؤ آج اس خناس مالک مکان کو بھی جھیل لوں۔ اور اس طرح جھیلوں کہ یہ سالا بھی کیا یاد کرے گا۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تم ایک شریف آدمی ہو۔ کئی بار میرے منشی نے تمہاری شکایت کی کہ تم وقت پر کرایہ نہیں دیتے۔ خیر یہ تو ایسی بات ہے جسے بار میں چھیڑنا غلط ہے۔ کیوں؟"

"آپ کا خیال درست ہے۔" شاہد نے جھلا کر اور ایک حد تک بیزار ہو کر کہا۔

"ہا ہا ہا۔ تمہاری بچی بہت شور مچاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اسے دودھ نہیں ملتا۔ تم ماما کیوں نہیں رکھ لیتے۔ لیکن جب تم کرایہ وقت پر نہیں دے سکتے تو پھر — خیر چھوڑو۔"

شاہد کے کان جل اٹھے اور اُس نے اپنے مفلر کو اتنی سختی سے مروڑنا شروع کیا کہ وہ اس کے لئے پھانسی کا پھندا بن گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سور مجھے چھیڑنا چاہتا ہے۔ ستانا چاہتا ہے۔ سمجھتا ہے اس طرح کچھ کہہ کے لگا کر اپنا کرایہ وصول کر لے گا۔ بڑا خبیث ہے۔ ذلیل کرتا ہے۔ حالانکہ اب میں جس منزل پر ہوں وہاں ذلت اور عزت ایک ہی انڈے کے چھلکے ہیں زردی اور سفیدی کی طرح جذب ہو جاتی ہے۔ اُس نے مسکراتے ہوئے گلاس اٹھایا اور ایک بڑا سا جلتا ہوا شراب کا گھونٹ مزا لے لے کر حلق کے پار اتار دیا۔ گلاس کو ہاتھ میں پکڑے گھورتا رہا۔ پھر مسکرایا اور پھر ایک گھونٹ حلق میں انڈیل لیا۔ یہاں تک کہ گلاس خالی ہو گیا۔ اُس نے جھٹکے سے گلاس کو میز پر رکھ دیا۔ اتنے زور سے کہ یار خاں چونک گیا۔ اور قریب کی میزوں پر بیٹھے ہوئے کچھ لوگ بھی متوجہ ہو گئے۔

"شاہد تم آدمی سمجھدار معلوم ہوتے ہو۔"

"یہ تو واقعہ ہے۔"

"بہت خوب۔"

شاہد نے جیبج میس کے ٹین سے ایک سگریٹ نکالی، سلگائی اور رئیسانہ ٹھاٹھ سے دھواں پھینکنے لگا۔ اور پھر اس خود پرست نظر سے اُس نے یار خاں کو دیکھا کہ وہ بھی گھبرا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود یار خاں اُس کی میز پر بیٹھا اس کی عطا کی ہوئی شراب پی رہا ہو۔

"اچھا بتاؤ تم کتنے اسٹیشن تک چلتے ہو؟"

"میں یہاں سے دہلی تک جا سکتا ہوں۔ یہاں سے لندن تک کتنے اسٹیشن ہیں۔ تم ہی بتاؤ، بتاؤ، ہاں بتاؤ، بڑے آدمی بنتے ہو۔ بنگلے میں رہتے ہو — ہو ہو ہا ہیں؟" وہ پورا گلاس پی گیا۔ اُس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ اور ان میں نشاط انگیز چمک پیدا ہو گئی تھی۔

"میرا مطلب ہے تم کتنے پیگ پی سکتے ہو؟" یار خاں نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں پوچھا۔

"تو پھر سیدھی طرح کیوں نہیں پوچھتے؟ کتنے اسٹیشن، کتنے اسٹیشن — تم پیگ کو اسٹیشن کہتے ہو۔ کچھ لوگ ایک پیگ کو ایک زینہ کہتے ہیں۔ اب پوچھو گے تم کتنے زینے چڑھ سکتے ہو۔ میں قطب مینار پر چڑھ سکتا ہوں — تمہارے سر پر چڑھ سکتا ہوں۔" وہ ایک پیگ اور چڑھا گیا۔ اب وہ خود ہی پیالہ پیگ بنا رہا تھا۔ اور یار خاں کو پیچھے چھوڑتا ہوا پیتا چلا جا رہا تھا۔

یار خاں کا منہ لال ہو گیا۔ اُس نے اپنے ہونٹ چباتے اور ارد گرد نظر دوڑائی۔ کبھی کبھی لوگ ان کی میز کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ بغل میں ایک میز پر ایک حسین سی سکھ عورت فر کا لانگ کوٹ پہنے میٹھی بیئر سپ کر رہی تھی۔ ادھیڑ داڑھی مونچھ میں آکر قہقہہ لگاتے اور ایک آدھ دھول بڑے پیار سے اس کے کندھے پر جماتے۔ اس کا موٹا ہاتھ بلی کے رویں کی طرح نرم کوٹ میں چھپ جاتا۔ پھر دونوں قہقہہ لگاتے۔

شاہد کو زور سے ہچکی آئی۔

"تم بہت پی گئے ہو۔ اب تم گھر چلے جاؤ۔"

"تم گھر جاؤ۔ میں تو ابھی اور پیوں گا۔ میں دہلی اسٹیشن تک جاؤں گا۔" شاہد نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"بیکار بات ہے۔ اب مت پیو۔ میں سمجھتا تھا۔ تم ڈھنگ کے آدمی ہو۔ تم شراب ہضم بھی نہیں کر سکتے۔"

"کیا کہا ——؟" اُس نے اپنے کان پکڑ لئے۔ "لو معافی مانگتا ہوں۔ اب گستاخی نہیں کروں گا۔ بس پینے دو مجھے —— بس جینے دو مجھے۔" اُس نے گانے کی سی آواز میں ایک ایک لفظ کو کھینچ کر ادا کیا۔

تھوڑی دیر شاہد بڑی متانت سے بیٹھا رہا۔ وہ خرگوش کی آنکھوں کی طرح اپنی سُرخ آنکھوں کو ادھر اُدھر گھماتا رہا۔ دھوئیں سے بھرا ہوا ہال ٹھنڈا تھا۔ برف کے سے قہقہے، برف کے سے گلاس، برف کے سے سفید بیروں کے ساتے۔ کھدر پوش بابو کا برف کی طرح خاموش طمانچہ سب کچھ برف تھا۔ شراب برف، بوتلیں برف، اسکاچ ہیں برف، تمنائیں برف۔ برف حیات، برف موت —— صرف اسے اپنا وجود آتشیں معلوم ہو رہا تھا۔ وہ ہنستا اور گویا اس کی روح کا منہ توڑ کر لاوے پھوٹ رہے تھے۔ لیکن برف ہال کے باہر برس رہی تھی۔ اور برف ہال کے اندر جم رہی تھی۔

اب یار خاں سرور میں آ گیا تھا۔ یکایک اُس کی گنگناہٹ ختم ہو گئی۔ اس کی آنکھیں مونچھوں کے اوپر سُلگ اٹھی تھیں۔ اور باہر نکل آئی تھیں۔ اس نے بھی پورا گلاس حلق میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

"اب گلپ کا وقت آ گیا ہے۔ رات پُر اسرار ہو گئی ہے۔ خون چیخ رہا ہے۔ کیا چیخ رہا ہے —— بتاؤ —— بتاؤں —— بتاؤں —— عورت، عورت" —— اُس نے بوتل کی تہ میں چمکتی ہوئی زیتون کے رنگ کی شراب اپنے گلاس میں انڈیل لی اور بغیر سوڈا ملائے اسے اپنے منہ سے لگا لیا۔

"شاہد تم سے ملاقات ہو گئی اچھا ہوا۔ میں اکیلا نہیں پیتا۔ یہ میری شان کے خلاف ہے لیکن عام طور پر مجھے اونچے درجے کے لوگ مل جاتے ہیں۔ تم ذلیل آدمی ہو۔ تمہارا لباس بھی ذلیل ہے۔ تم میرے مکان میں رہتے ہو۔ مجھے کرایہ بھی نہیں دیتے۔ تمہاری تنخواہ کے میرے ملازم ہیں۔ تمہاری بیوی عشق لڑاتی ہے تو تمہاری روح جلتی ہے۔"

"چپ سؤر کے بچے۔ چپ۔ چپ، چپ" شاہد کے منہ سے جھاگ نکلنے لگی۔ اُس نے گلاس کو دبوچ لیا۔ یار خاں چپ ہو گیا۔ "تم نے مجھے شراب پلائی ہے تو کیا تم گالیاں بکو گے؟"

یار خاں نے بیرے کو بلا کر دو گلاس رم کے منگائے اور شاہد سے کہا "پی لو" شاہد پی گیا۔ شاہد کی آنکھیں جھک گئیں۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

جانتے ہو شاہد، میرا بھتیجا ہی میرا منشی ہے۔ میں اس کی پرورش کر رہا ہوں۔ جاہل ہے، آوارہ ہے۔ خاندان کا شریف ہے جیسے تم خاندان کے شریف ہو۔ پہلے تمہاری شکایت کرتا تھا۔ اب وہ شکایت نہیں کرتا۔ اور یہ بری بات ہے۔ سوال کرائے کا ہے۔"

"یار خاں تمہارا کرایہ تمہیں مل جائے گا۔ مگر مجھے گالی نہ دو۔ میری ثروت بہت پیاری عورت ہے۔ وہ گاتی ہے وہ شہید ہے ——

اور اب میں جاتا ہوں۔ تم اپنے بھائی کو امریکہ بھیجنا چاہتے ہو بھیجو۔ تم تیسری جنگ کا انتظار کر رہے ہو کر و۔ تم نفع کمانا چاہتے ہو کماؤ۔ مجھے گالی نہ دو۔"

"بیٹھو بیٹھو ــــ یہ سب میرے بھتیجے نے بتایا ہوگا۔ اُلّو کا پٹھا بہت حرامی ہے۔ لیکن اس میں حرج بھی کیا ہے۔ پچھلی لڑائی میں کتنے رئیس بن گئے۔ میں بھی ــــ"

"میں اب جاتا ہوں۔" شاہد کھڑا ہو گیا۔

جب وہ بھیگتا ہوا بس سے اتر کر گھر پہنچا تو اُس کے گھر کا دروازہ بند تھا۔ اُس نے آواز دے کر دروازہ کھلوایا۔ ثروت کی آنکھیں خواب سے بھری ہوئی تھیں۔ اس نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ شاہد نے اپنی نشہ سے بھری ہوئی آنکھوں سے اُسے گھور کر دیکھا۔ "ثروت یار خاں بہت برا آدمی ہے۔ وہ خبیث ہے۔ اُس نے مجھے شراب پلائی ہے۔ میرا کوئی قصور نہیں۔ مجھے معاف کر دو۔" اُس نے اپنا منہ ثروت کی گود میں ڈال دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

دیر تک چارپائی میں ثروت کے پاس سویا ہوا وہ اپنی زندگی کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ ثروت کے لئے ہی اپنی زندگی کی بلندی سے کود پڑا تھا۔ اس کے دوست، اُس کے ساتھی، اُس کی عملی سیاسی زندگی اُس سے چھوٹ گئی تھی۔ وہ بڑا خطرناک زمانہ تھا۔ اُس کے خلاف گرفتاری کا وارنٹ تھا۔ وہ ایک اندھیری کوٹھڑی میں بند تھا۔ اسے مچھر کاٹے کھا رہے تھے۔ وہ بار بار موم بتی جلاتا تھا۔ اور کوئی ہوا کا تیز جھونکا آتا تھا۔ اور موم بتی بجھ جاتی تھی۔ پولیس مزدوروں کے علاقے میں دورے لگا رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے اور اس وقت اسے اپنی بیوی کے خیال نے آ جھپٹا تھا۔ ثروت کی بڑی بڑی بیتاب پلکیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ ابھی چند دن پہلے ہی جب وہ اس سے ملا تھا تو اس نے اس کے کان میں کہا تھا۔ "آپ کچھ نہیں سمجھتے۔ آپ کچھ تو سمجھئے۔"

"کیا؟ کچھ کہو بھی تو۔ تم کہتیں تو کچھ نہیں اور مجھے کند ذہن کہتی ہو۔"

"کچھ پیسے جمع کر رکھئے۔ ہم تین ہونے والے ہیں۔"

شاہد کی سانسیں رُک گئیں۔ اُس نے ثروت کے گھنے بالوں کو اس کے چہرے پر بکھیر دیا تھا۔ اور بڑی سرگوشی کے سے انداز میں بولا تھا۔ "ہو جائے گا سب ہو جائے گا۔"

شاہد کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ اس کا وہ جھوٹ تھا جو وہ ثروت کے سامنے ایک خوبصورت زندگی کا عینی نقشہ کھینچتا چلا جاتا تھا۔ اس میں اس کی کبھی ہمت ہی نہ ہوئی۔ کہ وہ اسے اِن تمام تلخ حقیقتوں سے آگاہ کر دے۔ بتا دے کہ اس کے گھر کی چھتیں کبھی مرمت نہیں ہوں گی۔ یہ چھتیں گر جائیں گی۔ کمرے برسات میں مٹی کے گھڑے کی طرح پگھل کر بہہ جائیں گے۔ چھتوں کی مرمت اس وقت تک نہیں ہوگی جب تک کہ ایک نئی زندگی، کھیتوں میں، گاؤں میں، شہروں میں جنم نہ لے۔ اور ابھی اس میں دیر تھی۔ ابھی ہزاروں چھتیں اور بیٹھنا تھیں۔ ابھی ہزاروں دل اور خون ہو نا تھے۔ یہ سب اس کی زبان سے کبھی نہ نکلا۔ وہ ثروت کے گھر کے کھوکھلے، روایتی اور بے ڈھنگ جاگیردارانہ ماحول میں اپنے آپ کو بے بس پاتا تھا۔ اس کا سارا شعور باہر کے لئے وقف تھا۔ وہ ثروت کے پاس پہنچ کر تیزی سے جھکتا تھا اور جھکتا چلا جاتا تھا۔

"آپ جب بڑی تنخواہ پانے لگیں گے تو بڑا اچھا رہے گا۔ ایک چھوٹا سا سفید مکان بنوائیں گے۔ باورچی خانے کا حصہ الگ ہوگا جس کی چمنی سفید رنگ کی ہوگی۔ باغ میں جوہی، بیلا اور موتیا لگائیں گے۔"

"ضرور لگائیں گے اور میں پھول توڑ کر تمہارے بالوں میں لگاؤں گا۔ اب؟" وہ چاندنی میں چمکتے، او نگھتے کسانوں کے جھونپڑوں کو دیکھتے ہوئے کہتا۔ الاؤ کی چمک اس کی سسرال کی پچھلی دیوار تک پہنچتی تھی۔

"ریڈیو کتنے دام میں آتا ہے؟"

"ریڈیو۔ لاحول ولا ——— ریڈیو کی فکر نہ کرو۔ وہ آج کے ہر شریف گھر میں ہوگا۔ میں کوئی معمولی آدمی ہوں۔ میں بڑا اشتراکی ہوں۔ لیکن تم اشتراکیوں کے معنی نہیں جانتیں؟"

ثروت بمشکل سے خط لکھ سکتی تھی۔ وہ البتہ سٹرک گنتی ضرور جانتی تھی۔ اس کا سارا جادو اس کی آنکھوں میں تھا۔ اس کے ہونٹوں کی خواب آور مسکراہٹوں میں تھا۔ جیسے کسی شاخ گل پر کوئی روپہلی چڑیا پر تول رہی ہو۔ جیسے بہار کی صبح گا رہی ہو۔ اس کی بے خودی نے شاہد کو ایسی تمناؤں کا شکار بنا دیا تھا۔ جو اس کی موجودہ زندگی کبھی پوری نہیں کر سکتی تھیں۔

شاہد اس جھونپڑی میں بیٹھا اپنے تمام وعدوں کو یاد کر رہا تھا جو اس نے شہد کے بلبلوں کی طرح ثروت کے کانوں میں اس کے خون میں اتار دیے تھے۔ جب دوبارہ موم بتی جلی تو اسے گوپا کی تیز تیر کی طرح چبھتی ہوئی آنکھوں ——— سے بڑا ڈر معلوم ہوا۔ یہ کامریڈ اس طرح کیوں گھور رہا ہے۔

"کامریڈ تم بہت گھبرا گئے ہو۔ روپوشی کا پہلا تجربہ ہے نا؟"

"ہاں!"

"ڈٹے رہو۔ سب خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی ہتھکڑی اور پھانسی کی بہت منزلیں آئیں گی۔ اس موڑ سے گزرنا مشکل ہے۔ لیکن گزر جاؤ گے تم۔ مجھے یقین ہے۔"

"آخر تم مجھے اتنی نصیحت کیوں کر رہے ہو؟"

"یونہی۔ اس لئے کہ میں اس کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔"

وہ رات بھر نہیں سو پایا تھا۔ کروٹیں بدلتا رہا تھا۔ ثروت کی آنکھیں اسے پکارتی رہی تھیں۔ وہ اس کا گاؤں کا مکان جو اس کے سسر نے اپنے آقا کو زہر دے کر حاصل کیا تھا اور خود اس کی بیوی کو بیاہ لیا تھا۔ پھر بڑی خاصی زمینداری اس کی ہو گئی تھی۔ اس کے زمیندار سسر کے چہرے پر ہمیشہ محرم کی دسویں تاریخ لکھی رہتی تھی۔ اور یہ کیلنڈر کبھی نہیں بدلتا تھا۔ وہ ثروت کو اپنی قہر بھری نظروں سے دیکھ رہا ہوگا۔ ثروت اس پر بوجھ بن کر نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اور وہ اس کٹیا میں بند تھا۔ اس کے پرانے مکان کی چھت پر ثروت بال کھولے کھڑی تھی۔ چاند بادلوں میں تیر رہا تھا۔ اور اس کے پیٹ میں خون ایک زندگی کی گردش کھا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ اور وہ اسے پکار رہی تھی۔ اور وہ اس اندھیری کٹیا میں بند تھا۔ جہاں موم بتی جلتی تھی اور بجھ جاتی تھی۔ جہاں گوپا اسے نصیحت کر رہا تھا اور اس کی ہمت بڑھا رہا تھا۔ لیکن اس کی ہمت تنکے کی طرح ثروت کے آنسوؤں میں بہتی چلی جا رہی تھی۔

شاہد صبح سویرے کٹیا سے غائب ہو گیا۔ گوپا گرفتار ہو گیا اور اس کے گھر پر جاسوسوں کی آمد و رفت بے تکلف شروع ہو گئی۔ اس کا رشتہ، اس کے پیارے اصولوں سے قربانیوں سے، ساتھیوں سے کٹ گیا۔ اور وہ زندگی سے بھاگ کر ثروت کی آغوش میں چھپ گیا۔

اس رات کو جب یار خاں کے پاس سے شراب پی کر آیا اور ثروت کے پاس سو گیا تو وہ دیر تک نیند سے محروم رہا۔ زندگی کے واقعات اس کے سینے میں چبھتے رہے اور اسے ایسا لگا کہ اس کے سینے سے ثروت نہیں لگی ہوئی تھی۔ بلکہ اس کی شکست کا کانٹا تھا۔ جو اندر اور اندر چبھتا چلا جا رہا تھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ثروت بھی اس کی وحشت سے ڈر رہی تھی۔ وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"تم ڈر رہی ہو۔ آج یار خاں نے مجھے گالی دی ہے۔ میں اس کی کھال ادھیڑ دوں گا۔"

"تم سو رہو، تم نے بہت پی لی ہے۔"

"ہاں میں سو رہوں گا۔ تم بھی سو رہو۔ منّی بھی سو رہے گی۔ ساری دنیا سو رہے گی۔ سالا یار خاں جاگتا رہے گا۔ اُس نے مجھے شراب دی — اُس نے مجھے گالی دی۔ اُس کی ایسی تیسی — تمہاری ایسی تیسی۔" تھوڑی دیر تک وہ اسی طرح بکتا رہا اور پھر سو گیا۔

جب اس کی آنکھیں دوبارہ کھلیں تو وہ میلی کی پھنگ پر میلی دھوپ اپنے اجلے پر سکھاتی ہوئی نظر آئی۔ اُس کے منہ میں ابھی تک جلے ہوئے پیاز اور سڑے ہوئے سر کے کا مزا باقی تھا۔ اس نے اپنا منہ بگاڑ کر ایک انگڑائی لی۔ کمرے کے باہر سے کسی کے بات کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ ثروت کا قہقہہ آہستہ سے گونجا۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ سلاخوں سے بگڑی ہوئی چھت کی طرف دیکھا۔ چولھے سے ہلکا ہلکا دھواں نکل رہا تھا۔ کبھی آنچ لہرا کر نکلتی تھی۔ دھوئیں کے لچھوں میں سونا سا گھلتا ہوا نظر آتا تھا۔

ثروت چولھے کے پاس سے اٹھی اور رات کا بھیگا ہوا شاہد کا پاجامہ نچوڑنے لگی۔ اس کی آستین اوپر چڑھی ہوئی تھی۔ اور اس کی پتلی کلائی میں چوڑیاں چھنک رہی تھیں۔ چوڑیاں دھانی رنگ کی تھیں اور نئی ہونے کی وجہ سے چمک رہی تھیں۔ جب دوبارہ کسی کے بولنے کی آواز آئی تو شاہد باہر نکل آیا۔ یار خاں کا منشی اسٹول پر بیٹھا کش لگا رہا تھا۔

"کیوں شاہد صاحب کب تک کرائے کا انتظار کرائیں گے آپ؟"

"اب زیادہ انتظار نہیں کرنا ہوگا۔ اطمینان رکھئے۔"

"یار خاں نے آج صبح ہی صبح ٹوکا تو میں چلا آیا۔ مجھ سے آپ کی بیوی کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی۔"

"تکلیف وکلیف چھوڑیئے۔ آج ہی تنخواہ ملے گی۔ اور آج ہی آپ کا حساب صاف ہو جائے گا۔ کہہ دیجئے گا یار خاں سے۔ ہاں —"

"اچھا تو یہ بات ہے۔ بڑے زور پہ ہے مزاج۔ اچھا بھائی یہی سہی۔" جاتے جاتے منشی نے ایک خاص نظر سے اپنے کالروں کو اوپر کھینچتے ہوئے اور پتلون کی کریز سیدھی کرتے ہوئے ثروت کی طرف دیکھا۔

جب منشی چلا گیا تو ثروت نے طیش میں آ کر کہا: "آپ کرائے کے پیسے بھی ادا نہیں کرتے اور اوپر سے رعب گانٹھتے ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ منّی کو لے کر میں سڑک پہ ماری ماری پھروں۔"

"کیا مطلب! — اچھا تو یہ بات ہے؟"

اب جو اس نے اپنا حلیہ دیکھا تو شرما گیا۔ وہ اپنی بیوی کا میٹی کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ رات اسے کچھ خبر ہی نہ تھی۔ وہ جلدی سے کمرے میں گیا۔ اور سوٹ کیس میں اپنے کپڑے تلاش کرنے لگا۔ اس کا پھٹا ہوا پاجامہ نکل آیا۔ ساتھ ہی اس کے ایک نیا دوپٹہ، ایک خوبصورت سی ریشمی شلوار اور جمپر بھی سلا رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ سے پاجامہ گر گیا۔ وہ ان اجنبی کپڑوں کو دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے دریچے سے باہر بھیگی ہوئی دیوار کو دیکھا۔ چھوٹے چھوٹے غریب اور گھٹے ہوئے مکانوں کو، اور اس کے آگے یار خاں کے بڑے سے مکان کو جس کی کھڑکیوں پہ نیلے دھاری دار پردے ہل رہے تھے۔ اور اس کے باغ میں پھولوں کے نہ جانے کتنے کنول کھل اُٹھے تھے۔

وہ خاموشی سے اپنے کمرے سے نکلا۔ سر جھکائے ہوئے اُس نے کھانا کھایا۔ جب جانے لگا تو ثروت نے کہا "آج آلو اور چاول ختم ہے۔ تنخواہ کے روپے میں سے منّی کا گرم کپڑا ضرور لیتے آئیے گا۔"

"کہاں سے آنا چاہئے گرم کپڑا؟"

"بازار اور کہاں سے؟"

"اور کرایہ کہاں سے دیا جائے گا؟"

"کرائے کا بعد میں دیکھا جائے گا۔ ہماری بچی سردی میں — خدا نہ کرے کچھ ہو گیا تو؟"

وہ جب اپنی سڑک کے موڑ پر پہنچا۔ تو اس کی ملاقات گپتا سے ہو گئی۔ وہ بہت دبلا اور کالا ہو گیا تھا، وہ اسی طرح مسکرا رہا تھا۔ وہ بیڑی پیئے جا رہا تھا۔

"کیوں شاہد صاحب اب تم کیسے ہو؛ تمہارے بارے میں میں نے بہت بُری بُری خبریں سُنی ہیں۔"

شاہد کی آنکھیں جھکی جا رہی تھیں۔ اور صرف کھسیانی سی ہنسی ہنسے جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد گپتا کسان سبھا کے دفتر میں چلا گیا جاتے ہوئے اس نے شاہد کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور کہتا گیا — "شاہد انسان کمزور ہو کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے تم ہار گئے۔ میں جیل سے ہو آیا۔ زندہ ہوں۔ تم جیل سے باہر ہو — میں نہیں جانتا تم اپنے آپ کو زندہ محسوس کرتے ہو۔ کیا تمہارے مسئلے حل ہو گئے؛ تم خوش ہو؛ اچھے ہو؟"

شاہد ایک مجرم کی طرح سر جھکائے ہوئے آگے چلا گیا۔ اس دن بار بار اس کے ذہن میں گپتا کا کالا، طنز کرتا ہوا، بیڑی کا دھواں پھینکتا ہوا چہرہ اُبھرتا ڈوبتا رہا۔

شام کے وقت اسے تنخواہ ملی۔ اس کے ساتھ ہی اُسے سپرنٹنڈنٹ کا وارننگ لیٹر ملا۔ "ایک مہینہ اور موقع دیا جاتا ہے۔ اگر کام میں ترقی نہیں ہو سکی تو تمہارا شمار ان لوگوں میں ہو گا جو چھانٹی کی فہرست میں ہیں۔"

ہوٹل کا مالک بھوت کی طرح آ موجود ہوا۔ اُس نے بہت جُل دینا چاہا۔ لیکن وہ پیچھے لگا رہا۔ یہاں تک کہ وہ آخر پچھلے دروازے سے ہو کر نکل بھاگا۔ دوڑ کر رکشے پر بیٹھا اور اسٹیشن کی راہ لی۔ گاڑی چلنے ہی والی تھی۔ کہ ہوٹل کا مالک ڈبے میں داخل ہو گیا اور اسے کھینچ کر باہر نکال لایا۔

"شرافت سے روپے دے دو۔ چرکا دیتے ہو۔ شریف بنتے ہو۔ آج میں چھٹی کا دودھ اُگلوا دوں گا۔"

اور جب شاہد نے اپنی جیب سے چالیس روپے نکال کر اُس کی ہتھیلی میں رکھے تو واقعی اُسے محسوس ہوا کہ اُس نے چھٹی کا دودھ اُگل دیا ہے اس کی آنکھوں میں تیزاب سا بھر گیا تھا۔

وہ لڑکھڑاتا ہوا اپنے ڈبے میں واپس آیا۔ تماشائیوں کی آنکھیں اُسے ملامت کرتی ہوئی نظر آئیں۔ آنکھیں اُس کے چاروں طرف ناچ رہی تھیں۔ لیکن ایک آنکھ سے بھی ہمدردی کا نور نہیں چھن رہا تھا۔ انسان انسان کی ذلتوں، غلاظتوں اور پسپائیوں سے اپنے لئے کتنی تسکین پیدا کر لیتا ہے۔ وہ گھبرا کر ڈبے سے اُتر گیا۔ گاڑی چل دی۔ چھک چھک۔ اور اُسے معلوم ہوا کہ اس کے ہاتھوں سے دس دس کے نوٹ اُڑے چلے جا رہے تھے۔ چھک چھک۔ اور مسافر جو چلے گئے تھے۔ وہ بھی کمینے تھے۔ شام ہو گئی تھی۔ اس کے دل سے غم اور اداسی کے سیاہ سوتے پھوٹ رہے تھے جیسے رات کا میل اس کی آنکھوں میں جل رہا ہو۔ اس کی روح میں ٹپک رہا ہو۔

جب اندھیرا ہو گیا تو پھر گزشتہ شام کی طرح اسی بار میں گھس گیا — بیرا ڈائیز بار کے دروازے پر اوردی میں بیٹھا ہوا تھا اور جس کے لمبے سفید کوٹ میں پیتل کے بٹن چمک رہے تھے۔

اُس نے اپنی جیب سے روپے نکالے۔ تیس ٹھو روپے۔ اُس نے اِدھر اُدھر نظریں نچائیں بار بھرا ہوا تھا۔ کچا کچ۔ فضا صاف تھی۔ کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ اور آسمان ننگا نظر آ رہا تھا۔ تارے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ کاریں گزر رہی تھیں، اور امپیریل بنک کی عالی شان عمارت کے پیچھے چاند سونے کی روٹی کی طرح تھرتھرا رہا تھا۔ اور ایروڈرم سے فلیش لائٹ کی شعاعیں گندگی جھاڑو کی طرح آسمان کا منہ جھاڑنے کے لئے اُٹھتی تھیں۔ لپکتی تھیں اور ناچتی تھیں۔

"بیرا آج میں سب سے قیمتی شراب پیوں گا۔ اسکاچ ہے؟"

بیرے نے سر ہلاتے ہوئے اپنے دانت نکال دیئے۔

اس نے اسکاچ کو گلاس میں انڈیلا سوڈا ملایا۔ چاروں طرف دیکھا۔ دل میں زور سے چیخا۔ "دیکھو یار خاں کے بچے، عیش کرنے والے کس طرح عیش کرتے ہیں" اور جب شراب کا سونا طلوع ہوتے ہوئے سورج کی کرنوں کی طرح اس کے پیٹ میں اُتر گیا تو اس نے بیرے کو قریب بلایا۔

"انڈے لاؤ۔ ہاف فرائیڈ ——"

جب بیرا انڈے لے کر آیا تو وہ اپنا گلاس خالی کر چکا تھا۔ اُس نے دل میں کہا، "اسکاچ شراب صبح کی طرح سبک، عورت کے سینے کی طرح گرم اور حسین ہوتی ہے"

"بھئی مجھے لوہے کا پرمٹ مل گیا ہے"

"تمہاری گپتا تو غضب کرتی ہے۔ ٹینس میں اُس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا"

"تم شادی کیوں نہیں کر لیتے"

"یار میں ایک کا ہو کر نہیں رہ سکتا"

"ڈارلنگ کشمیر کب چلیں گے۔ دہلی سے ایرلفٹ اچھا رہے گا"

"دیکھو وہ لونڈیا کی کمر ہے یا بید مجنوں"

"تم گھاس کھا گئے ہو۔ ارے یہ تو مصنوعی کمر ہے۔ اصلی کمر تو وہ گھر چھوڑ آئی ہے"

"اور تم اپنی عقل نیلام گھر میں چھوڑ آئے ہو بیٹا"

"دیکھو سالا کیا پھٹے حال میں ہے۔ چہرے پر پھٹکار ہے مگر اسکاچ سپ کر رہا ہے۔ ہوگا یار کوئی پاکٹ مار"

وہ ان جملوں کی آندھی میں تناور درخت کی طرح جھومتا رہا۔ گلاس پر گلاس خالی ہوتے رہے۔ "بیرا یار خاں آئے تو اُسے دھکے دے کر نکال دو۔ اس سے کہو اس کا باپ آج اسکاچ پی رہا ہے۔ کل اُس نے مجھے گالی دی تھی۔ آج میں اُسے ٹھیک کروں گا"

وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور میز پر کھڑا ہو گیا۔ ڈر کر اور دوسرے لوگوں نے اپنے گلاسوں کو ہاتھ میں لے لیا اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"ارے اس کو نکالو۔ اس کو روکو۔ بھگاؤ"

"مجھے کوئی نہیں بھگا سکتا۔ مجھے کائی نائی بھگا سکتا —— سیاں بھئے کوتوال" وہ گانے لگا۔

ایک لڑکی نے اپنے عاشق کے کان میں کہا —— "سنک"

بیروں نے اُسے آ کر سمجھایا۔ لیکن وہ گمن تھا۔ اس کی بکواس جاری تھی: "میں یار خاں سے انتقام لوں گا۔ میں سپرنٹنڈنٹ کو زینوں پر سے دھکیل دوں گا۔ میں کرایہ نہیں دوں گا۔ میں ثروت کو —— میں ثاروت" اس کی زبان لڑکھڑا گئی اور منہ سے کف نکلنے لگا۔

بیروں نے اسے بار سے باہر کر دیا۔ اس کی جیب سے پیسے نکال کر اپنے بل کا حساب چکایا۔ اور اُسے رکشے پر بٹھا کر چلتا کیا۔ شاہد کی ہچکیاں جاری تھیں اور وہ بکے جا رہا تھا۔

"سب لے لو۔ میری ساری دولت لے لو۔ ہوٹل والے کی ایسی تیسی، یار خاں کی ایسی تیسی۔ اس کے منشی کی ایسی تیسی ——"

جب وہ نشے کے عالم میں گرتا پڑتا کیچڑ میں لتھڑتا اپنی گلی کے موڑ پر پہنچا تو اس کی ٹکر ایک سائیکل سے ہو گئی۔ اور وہ گر گیا۔ کسان سبھا کے آفس سے نکل کر گپتا نے اُسے اُٹھایا ——

—— اس نے لیمپ کی روشنی میں ایک آنکھ مشکل سے کھول کر گپتا کو دیکھا —— اس کے دماغ میں بم سے پھٹنے لگے اور اس نے اپنے آپ کو چھڑا کر وہ اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ "گپتا تم زندہ ہو۔ میں مر گیا ہوں۔ میں مر گیا ہوں۔ مجھے اب کوئی نہیں بچا سکتا ——"

وہ اندھیری گلی میں گرتا پڑتا لڑکھڑاتا ڈگمگاتا اپنے مکان سے قریب ہو رہا تھا۔ گپتا کا دبلا پتلا چہرہ اس کی آنکھوں میں انگارے کی طرح جل رہا تھا۔ "میں نے تمہیں جیل بھجوا دیا۔ میں نے اپنے مخبر کو مار ڈالا۔ میں۔ میں"

"ارے شاہد میاں ——— یہ کیا حال ہے۔ میں تو کرایہ لینے آیا تھا۔ اور تمہارا منہ تو بھٹی کی طرح مہک رہا ہے ——— جاؤ جاؤ ثروت تمہارا انتظار کر رہی ہے۔" منشی جلدی جلدی ناک پر رومال ملتا ہوا یاد خاں کے مکان کی طرف چلا گیا۔

وہ ہانپتا ہوا زینے پر چڑھا۔ اوپر کمرے کے دروازے پر کھڑا رہا۔ پھر اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ہوائی اڈے کی طرف فلیش لائٹ چمک رہی تھی۔ ستارے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ چاند سونے کی روٹی معلوم ہوتا تھا۔

ثروت لیمپ کی دھیمی روشنی میں آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔ لیمپ کی ٹوٹی ہوئی چمنی سے دھوئیں کا ایک تار اوپر اٹھ رہا تھا۔ کرو سنیل کی بو کمرے میں بسی ہوئی تھی۔

"کتنا اچھا کمرہ ہے یہ" شاہد زور سے گرجا۔ کونے کے پاس تھرتھراتے ہوئے جالے والی دیوار سے چمگادڑ زور سے ٹکرایا۔ شاہد نے زور سے ہاتھ بڑھایا۔ لحاف کھینچ لیا۔ منی صرف بنیان پہنے سوئی ہوئی تھی۔ ثروت صرف پیٹی کوٹ پہنے پڑی ہوئی تھی۔ اس نے پھر بھی اپنی آنکھیں کھولیں۔ شاہد کو اس کے گھلتے ہوئے جسم پر بہت رحم آیا۔ اُس کا جسم کبھی کتنا تندرست تھا۔ اس کے ہونٹ کیسے صحت مند تھے۔ سنگترے کی قاش کی طرح۔ اور آج ——— اسی کے لئے اس نے کیا نہیں کیا تھا۔ اُسے اچانک یاد خاں یاد آیا۔ منشی اور پھر گپتا کا مسکراتا ہوا چہرہ رحم اور طنز سے بھرا ہوا۔

"ثروت ——— " وہ اتنے زور سے چیخا کہ کمرہ گونج اٹھا۔

ثروت اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "آج پھر شراب پی لی ہے کیا؟"

"ہاں پی ہے۔ اپنی پی ہے۔ تمہارے باپ کی نہیں پی ہے" ثروت سہم گئی۔ "ڈرو نہیں میں آج بے حد خوش ہوں۔ آج پہلی بار میں تمہیں سچ بتاؤں گا۔ دیکھو میں تمہیں ریڈیو نہیں دے سکتا۔ میں تمہیں سلکن سوٹ نہیں دے سکتا ———!! ——— میں تو تمہیں اس ماہ کی تنخواہ بھی نہیں دے سکتا" ہچکی لیتے ہوئے اس نے چند آنے پیسے اس کی گود میں پھینک دیئے۔

"آپ نے کیا کیا؟ اب ہمارا کیا ہوگا؟"

"ڈرو نہیں۔ میں وحشی نہیں ہوں۔ میں تمہاری گردن نہیں دباؤں گا۔ اسی گردن کے لئے تو ———" اس نے اپنی انگلی سے اس کی گردن کو چھوا۔ اور ایک خباثت سے بھری ہوئی ہنسی ہنسا۔

"خدا کے لئے" ثروت گڑگڑائی۔

"خدا تمہارا دیکھو اس بڑے مکان میں رہتا ہے۔ ہے نا؟ وہ اس وقت کسی رنڈی کے ساتھ سویا ہوا ہوگا ہے نا؟"

اُسے زور سے ہچکی آئی اور ایک زبردست ابکائی کے ساتھ اس نے سب کچھ ثروت کی گود میں اگلنا شروع کر دیا۔ ثروت مبہوت بنی بیٹھی رہی۔ اس کا تو جیسے دم ہی نکل گیا تھا۔

"تم سمجھتی ہو میں نشے میں ہوں۔ بالکل نہیں"۔ وہ چارپائی پر پڑی ہوئی منی کو دیکھتے ہوئے بولا "میں اب کچھ نہیں کہوں گا۔ اب میں شراب پیوں گا۔ تم اپنے راستے پر چلتی رہو۔ منشی سالا کبھی کرایہ نہیں مانگے گا ———"

"کیا مطلب؟"

"مطلب ——— تم پرسوں صبح کے شو میں ریشمی سوٹ پہن کر گئی تھیں یا نہیں۔ وہاں سے تم دریا کی سیر کو گئی تھیں ——— غلط؟ ڈرو نہیں۔ ——— میں تم سے مجبور کرنے کو تیار ہوں ———"

وہ چپ ہوگیا اور جھومتا رہا۔ "گپتا نے ٹھیک کہا تھا۔ چٹان جب ایک بار پہاڑ کی چوٹی سے پھسلتی ہے تو کوئی نہیں جانتا ——"

ثروت اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ وہ وہاں سے بھاگ نکلے گی۔ شاہد نے سوٹ کیس سے ریشمی شلوار اور جمپر نکال کر زمین پر پھینک دیا۔ اور وہ پٹہ خود اوڑھ کر ناچنے لگا۔ ناچتے ناچتے رکا۔ ثروت کو اپنے سینے سے چمٹا لیا —— اس کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے ——

"ثروت، میری جان —— چٹان کو لڑھکنے دو۔ مجھے سمجھوتہ پسند ہے ——"

اتنا کہہ کر وہ آندھی میں اکھڑے ہوئے درخت کی طرح چارپائی پر گر پڑا۔ منی جاگ پڑی اور زور زور سے رونے لگی۔

---

(۱۰)

مضامین

وقار عظیم

داستان سے افسانے تک

کہانی سے انسان کی دلچسپی اور اس مشغلے سے اس کا لگاؤ، اس کی اجتماعی زندگی کی ایسی حقیقت ہے جسے تاریخ کی سنجیدگی اور اس کے فکر کی منطق نے بھی پورے وثوق کے ساتھ تسلیم کیا ہے۔ انسان اپنی حیاتِ اجتماعی کے بالکل ابتدائی دور میں فطرت کی جن قوتوں سے نبرد آزما اور برسرِ پیکار رہتا اس پیکار اور کشمکش میں اسے سختی کی جن منزلوں سے گزر کر فتح و ظفر کا روئے تاباں دیکھنے کی مسرت حاصل ہوتی تھی اس کی روداد میں اس کے لئے تند مکرّر کی چاشنی تھی۔ کام و دہن کو اسی چاشنی سے آشنا کرنے کی خواہش نے اسے آپ بیتی دہرانے کا عادی بنایا۔ یہی کہانی کہنے یا داستان سرائی کا آغاز ہے۔ تھکے ہارے انسان کو اپنے سارے دن کی تھکن دور کرنے کے لئے فطرتاً کسی ایسے مشغلے کی جستجو ہوتی تھی جو اس کے فطری احساسِ برتری کو بھی تسکین دے سکے اور اس پر عارضی طور پر ایسی خود فراموشی بھی طاری کر سکے کہ اس ماحول میں حقائق کی سختیاں اور تلخیاں اسے نہ ستائیں۔ انسانی زندگی میں یہی رومانی لذتوں کی ابتدا ہے۔ اپنی ان کشمکش کو دہرانے اور رومان کی لذتوں میں گم ہونے کے علاوہ اس مشغلہ میں ایک اور بڑی بات یہ تھی کہ یہ ساری کہانیاں ایک دوسرے کو سمجھنے اور اس طرح ایک دوسرے سے قریب آنے کا بھی وسیلہ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی وہ زندگی جس کا پس منظر کوہ و بیاباں کی سنگینیاں اور پہنائیاں ہیں، اس کی داستان سرائیوں سے گونج رہی ہے —— اس کی ساری رنگینیاں اور اس کا سارا رومان انہیں کہانیوں اور داستانوں کی بدولت ہے۔

انسان نے کوہ و بیاباں سے نکل کر، اور سنگ و خارا کی سختیوں سے اپنا رشتہ توڑ کر، لہلہاتی کھیتیوں سے اپنا ناطہ جوڑا اور اس ناطے کے ساتھ اس کے جسم کو راحت و آسائش میں زیادہ لطف محسوس ہونے لگا تو اس کی کہانیوں کا انداز ذرا بدلا لیکن اس بدلے ہوئے انداز میں بھی کہانی کے وہ بنیادی محرکات قائم رہے جو اس کی حیاتِ اجتماعی کے ابتدائی دور کی خصوصیت تھے —— وہ اب بھی کہانیوں میں اپنے کارناموں کی روداد سن کر خوش ہوتا تھا، اب بھی کہانیاں اس کے جذبۂ برتری کی تسکین کا باعث تھیں اور اب بھی کہانیوں میں اسے حقیقت سے الگ ہٹ کر رومان، تصور اور تخیل کی ایک ایسی دنیا نظر آتی تھی جس میں اسے حقیقت کی آزمائشوں سے مکمل نجات حاصل ہو جاتی تھی۔ انسانی زندگی کی ذہنیت کی پیچیدگیوں اور تہذیب کی شائستگیوں نے بھی کہانی کی کشش میں کوئی کمی نہیں ہونے دی۔ یہاں تک کہ جب اس نے تجربات، مشاہدات اور محسوسات کو ضبطِ تحریر میں لانا شروع کیا

تو کہانی کے ساتھ ہی ابتدائی تصورات وابستہ رکھے ——— کہانی دلچسپی کا ایک مشغلہ ہے، کہانی انسان کے ان کارناموں کی روداد ہے جس میں اس نے اپنے ماحول کی کسی متصادم قوت کے مقابل آکر اس پر فتح حاصل کی ہے، کہانی انسان کے احساسِ برتری کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ کہانی حقائق کی دنیا سے دور، تخیل، تصور اور رومان کی ایک جہانِ تازہ کی تصویر ہے ——— کہانی کا یہی تصور ہماری داستانوں کا بنیادی تصور ہے۔

ہماری داستانوں کی تاریخ انیسویں صدی کے نصف آخر میں شروع ہوتی ہے اور جن تصانیف کو ہم باقاعدہ داستان کہہ سکتے ہیں ان میں سب سے پہلی تحسین کی نوطرزِ مرصع ہے[۲]۔ اس کے چند ہی سال بعد فورٹ ولیم کالج کا دور شروع ہو جاتا ہے اور نثر کی نوطرزِ مرصع یا باغ و بہار (تالیف ۱۸۰۱ء) اور انشا کی رانی کیتکی کی کہانی" (تصنیف ۱۸۰۳ء)، کو چھوڑ کر بیسویں صدی میں جتنی داستانیں لکھی گئیں وہ سب کی سب فورٹ ولیم کے منصوبہ کے ماتحت لکھی گئیں۔ اس دور کی داستانوں میں باغ و بہار (میرامن) حیدر بخش حیدری کی آرائشِ محفل اور طوطا کہانی، خلیل علی خاں اشک کی داستانِ امیر حمزہ، بہادر علی حسینی کی نثرِ بے نظیر، مظہر علی ولا اور للو لال کی بیتال پچیسی، کاظم علی جواں اور للو لال کوی کی سنگھاسن بتیسی زیادہ معروف و مقبول ہیں اور ۱۸۰۱ء اور ۱۸۰۳ء کے درمیان لکھی گئیں۔ فورٹ ولیم کالج کے دور کے بعد انیسویں صدی کے آخر تک بے شمار داستانیں تصنیف ہوئیں[۳]۔ ان میں محمد بخش مہجور کی نورتن (۱۸۱۴ء) سرور کی فسانۂ عجائب، نیم چند کشمیری کی گل صنوبر (۱۸۳۷ء) الف لیلہ (۱۸۴۲ء، ۱۸۴۴ء) بوستانِ خیال، طلسم ہوش ربا، سحر دہلوی کی سروشِ سخن (۱۸۶۰ء) شیون کی طلسمِ حیرت (۱۸۷۲ء) اور الف لیلہ (مرزا حیرت اور رتن ناتھ سرشار) زیادہ مشہور ہوئیں۔ ان مشہور و معروف داستانوں کے علاوہ جن کا حجم کئی ہزار صفحے ہے، اسی دوران میں سینکڑوں داستانیں لکھی گئیں۔ ان میں سے بہت سی چھپیں اور بہت سی اب بھی کتب خانوں میں غیر مطبوعہ کتب کے خزانوں میں شامل ہیں۔

ان سب داستانوں کے مطالعہ کے بعد پڑھنے والا (ایسا پڑھنے والا جو کتابوں کو طالب علم کی طرح پڑھتا ہے) بڑی آسانی سے کچھ ایسی باتیں تلاش کر لیتا ہے جن سے یہ سب تصانیف ایک خاص صنف کے دائرے میں آجاتی ہیں۔ ان سب داستانوں میں بوستانِ خیال اور داستانِ امیر حمزہ (اور طلسم ہوش ربا) جیسی ضخیم و حجیم اور نیم ضخیم داستانیں بھی شامل ہیں اور بیتال پچیسی، سنگھاسن بتیسی، طوطا کہانی اور انشائے نورتن میں چھپی ہوئی ایک ایک دو دو صفحوں کی کہانیاں بھی، اور ان دونوں کے بیچ میں الف لیلہ کے نسبتاً بڑے اور رانی کیتکی کی کہانی جیسے متوسط قد و قامت کے قصے بھی۔ لیکن ضخامت اور حجم سے قطع نظر ان سب میں کچھ مشترک باتیں ایسی ہیں جو انہیں ترتیب، ساخت اور اصل سے بھی بڑھ کر دلچسپی کے نقطۂ نظر سے ایک ہی زنجیر کی کڑیاں بناتی ہیں۔ ایک خاص قسم کا قاری، ان کی تفصیلات کے فرق کے باوجود ان سب میں ایک ہی قسم کی دلچسپی محسوس کرتا ہے۔ ایک ہی طرح کا تاثر قبول کرتا ہے اور ایک ہی قسم کے ردِ عمل سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ سب داستانیں پڑھنے والوں کے لئے ایسی تفریح، دلچسپی اور ذہنی انبساط کا سرمایہ مہیا کرتی ہیں جس میں منطق اور استدلال کی کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ ان سب داستانوں اور کہانیوں کا مقصد بنیادی طور پر صرف یہ ہے کہ وہ پڑھنے والے کی دلچسپی کا ذریعہ بن سکیں۔ اس دلچسپی کے حصول کے لئے لکھنے والوں نے عموماً ایک ہی سے نسخے استعمال کئے ہیں۔

ان چھوٹی بڑی سب داستانوں میں دلچسپی پیدا کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ قصہ کو جہاں تک ممکن ہو طول دیا جائے تاکہ پڑھنے والا زیادہ

---

[۱] میں نے وجہی کی سب رس، کو جو بعض نقادوں کے نزدیک اردو کی پہلی داستان ہے اس خیال سے اپنے بیان کا جزو نہیں بنایا کہ وہاں مصنف کا مقصود کہانی سنانا نہیں۔

[۲] نوطرزِ مرصع کا سنہ تصنیف (یا تالیف) ۱۷۷۵ء اور ۱۷۸۱ء کے درمیان ہے۔

[۳] و ۴ ان دو کتابوں کے ساتھ میں نے مصنفوں کے نام اور کتابوں کے سنہ تصنیف اس لئے نہیں لکھے کہ ان کتابوں کے حصے مختلف مصنفوں نے مختلف سنوں میں دہلی اور لکھنؤ میں تالیف کئے۔

سے زیادہ عرصہ تک حقیقت کی دنیا کو بھول کر رومان اور تخیل کی دنیا کی سیر کر سکے۔ کہانی کو طویل بنانے کے لئے ہمارے داستان نویسوں نے عموماً یہ انداز اختیار کیا ہے کہ وہ اصل قصہ کے ساتھ ضمنی قصّے بڑھا کر پڑھنے والے کی توجہ اور انہماک کے لئے نئی نئی راہیں نکالتے رہتے ہیں۔ باغ و بہار جیسی متوازن اور فسانۂ عجائب جیسی ادبی داستان میں بھی یہ خصوصیت موجود ہے اور سنگھاسن بتیسی، بیتال پچیسی اور طوطا کہانی جیسی کہانی نما داستانوں میں بھی ایک کہانی سے دوسری کہانی پیدا ہوتی ہے۔ آرائشِ محفل، بوستانِ خیال اور طلسم ہوش ربا اور داستانِ امیر حمزہ کی تو یہ امتیازی خصوصیت ہے۔ اردو کی سب داستانوں میں رانی کیتکی کی کہانی اور انشائے نورتن صرف دو مستثنیات ہیں۔ اصل کہانی میں ضمنی کہانیوں کا اضافہ کر کے انہیں طول دینے کی کوشش میں کہانی کی وحدت، اس کے تناسب و توازن اور مجموعی تاثر میں جو کمی آتی ہے (اور جسے اب کہانی کے فن کا ایک ناگزیر عنصر سمجھا جاتا ہے) اس کا احساس ہمارے داستان گویوں کو بالکل نہیں تھا۔ کہانی کی ابتدا کے بعد اس منزل کا آنا جب مسئلہ ایک واضح شکل اختیار کرتا ہے اور کہانی ایک خاص راستہ پر چل کر ارتقا کے مختلف مرحلے طے کر کے نقطۂ عروج اور خاتمہ تک پہنچتی ہے، داستان کے فن کی روایت میں شامل نہیں تھا۔ کہانی میں اٹھان بھی کوئی چیز ہے، اس کا تصور سید انشا نے رانی کیتکی میں البتہ پیش کیا ہے[1]۔ کہانی میں جس چیز کو SUSPENSE کہتے ہیں اور جو کہانی کی دلچسپی کا لازمی عنصر ہے داستانوں میں ہے ضرور، لیکن عموماً اس پر ایک طرح کا تصنع غالب ہے۔ اسی مصنوعی تصنع کی وجہ سے داستان پڑھنے والے کو پوری طرح اپنی گرفت میں لینے سے قاصر رہتی ہے ——— لیکن داستان گو کے پاس داستان میں دلچسپی پیدا کرنے اور قاری کو اپنا ہم نوا بنانے کے اور بہت سے وسیلے ہیں۔

ان بہت سے وسیلوں میں ایک وسیلہ یہ ہے کہ وہ حقیقت کی دنیا سے الگ، پڑھنے والے کے لئے رومان کا ایک جہان دلکش آباد کرتا ہے۔ اس دنیا میں ان لوگوں کی کثرت و فراوانی ہے جنہیں خدا نے تاج داری و جہاں بانی کا شرف بخشا ہے۔ بادشاہ، وزیر، امیر، تاجر اس دنیا کی رونق اور آبادی ہے۔ بادشاہوں، وزیروں، امیروں اور تاجروں کی اس دنیا کی رونق، اس کے شان و شکوہ، اس کی شان جلال و جمال میں ہی قاری کے لئے وہ کشش ہے جس سے وہ اپنی سیدھی سادی حقیقت کی دنیا میں محروم رہتا ہے۔ اس رنگین، حسین و جمیل اور پرشکوہ دنیا کی تشکیل و تعمیر داستان گو کے فن کی روایت کا حصہ ہے اور اپنی روایت کی اس دلکشی سے وہ قاری کے دل کو موہتا ہے۔

بادشاہوں، وزیروں، امیروں کی اس دنیا پر پریوں کا سایہ بھی ہے۔ پریاں، جن، دیو، ساحر اور نجومی رومان کی اس عجیب و غریب دنیا کے باسیوں کے مسرت و غم میں ان کے شریک ہیں اور اس لئے پڑھنے والے کو اس دنیا میں ایسی ایسی باتیں نظر آتی ہیں جو عقل و فہم کی رسائی سے باہر ہیں۔ ان غیر معمولی اور مافوق الفطرت باتوں کو عقل کسی صورت میں بھی قبول نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ انسانی تجربہ اور مشاہدہ کے لئے یہ سب کچھ انوکھا اور نرالا ہے۔ لیکن داستان گو کا دائرۂ عمل دنیائے حقائق کے بجائے عالمِ سحر اور جہانِ نظر کے بجائے عالمِ تخیل و تصوّر ہے اس لئے داستان کا قاری اسی دنیا کی سیر سے مطمئن و مسرور ہوتا ہے اور یوں داستان گو کے اس فنی منصب کی تکمیل ہو جاتی ہے کہ وہ قاری کے لئے سرور و انبساط کا سرمایہ مہیا کرے۔

تخیل و تصوّر کی اس دنیا کے باشندے یوں دیکھنے میں ہماری دنیا کے انسانوں سے ملتے جلتے ہوتے ہیں لیکن اپنے غیر معمولی عمل اور قوتوں کی بنا پر ان کی سیرت اور شخصیت مثالی بن جاتی ہے ——— جو نیک ہے وہ نیکیوں کی ان سب خصوصیات کا حامل ہے جو انسان کے تصوّر میں آسکتی ہیں، جو بد ہے وہ بدی کا ایسا مجسمہ ہے کہ شیطان بھی اس سے پناہ مانگتا ہے۔ نیکی اور بدی کی قوتوں کے حامل اور علم بردار ان مثالی کرداروں کی شناسائی

---

[1] انشا نے اسے اُبھار کے لفظ سے ظاہر کیا ہے۔ تمہید کے بعد رانی کیتکی کی کہانی میں یہ عنوان ہے:
"کہانی کا اُبھار اور بول چال کی دولہن کا سنگار"

پڑھنے والوں کو اس لئے مطمئن کرتی ہے کہ یہاں انہیں وہ اہم اقدار بر سرِ عمل دکھائی دیتی ہیں جن کا حقیقت کی دنیا میں وہ صرف تصوّر کر سکتے ہیں۔ وہ بدی جو اسے زندگی میں ہمیشہ سختیوں اور آزمائشوں میں مبتلا رکھتی ہے، یہاں نیکی سے متصادم ہوتی ہے تو ہمیشہ شکست کھاتی ہے اور یہی چیز اس کی خوشی کا سرچشمہ ہے۔ داستان گو نے اپنی داستانوں کے ذریعہ انسان کو یہی خوشی دی ہے اس لئے عقل و منطق سے عاری ہونے پر بھی وہ اس کی دلچسپی کا وسیلہ ہے۔

داستانوں نے انسان کے لئے عملی زندگی کا ایک ایسا ضابطہ مرتب کیا ہے جس میں عیش و عشرت کی فراوانی ہے، جرأت، ہمت، شجاعت اور مردانگی کے بدلے ابدی سکون و راحت کا انعام ہے، مروّت، محبت اور دردمندی کے بدلے جاہ و ثروت ہے۔ عارضی سخت کوشی کے بدلے دائمی راحت ہے۔ یہ دنیا مشاہدہ اور فکر نے نہیں تصوّر و تخیّل نے آباد کی ہے اور اس کی تزئین میں ادبیت و شعریت نے اپنی پوری قوتیں صرف کی ہیں اس لئے ہر طرف حُسن و جمال کے جلوے ہیں اور یہی بات قاری کے لئے کشش کی ہے۔

ہماری داستانوں نے کہانی میں دلچسپی و دل فریبی کی، تخیّل و تصوّر کی، کشمکش اور جدوجہد کی اور پھر شادمانی و مسرت کی، سکون و راحت کی، باطل پر حق کی فتح کی، انسان اور فطرت کے تصادم اور ہم آہنگی کی، مادہ، روح اور سحر و فسوں کی نیرنگی عمل کی فضا بنائی اور اس طرح ایک ایسی دنیا بسائی جو کبھی کبھی حقیقت کی دنیا سے بھی زیادہ سچی اور قابلِ یقین نظر آتی ہے۔ جو کچھ فطری نہیں وہ یہاں فطری اور جو نا قابلِ یقین ہے وہ یقینی اور قابلِ قبول بن جاتا ہے۔ یہاں فن کی ساری روایت دل کے تقاضوں پر قائم ہے کہ اسی تقاضے کی منطق یہ واحد منطق ہے جس میں مخاطب کی دلچسپی اور اس کی خوشنودی کا مقام سب سے پہلا بھی ہے اور سب سے اونچا بھی۔

ابھی اُردو میں داستان گوئی کا عہدِ شباب ختم نہیں ہوا تھا کہ کہانی کی ایک نئی صنف نے جنم لیا[1] اور اس طرح کہانی کی روایت نے ایک دوسری طرف رُخ موڑا۔ نذیر احمد کے ناولوں نے کہانی کو تخیّل اور تصوّر کی دنیا بسانے کے بجائے حقیقت کی دنیا میں قدم رکھنا سکھایا۔ کہانی کو محض دلچسپی اور تفریح کی چیز سمجھنے کے بجائے اسے معاشرتی زندگی کے مقاصد کا حامل اور علم بردار بنانے کی تعلیم دی۔ رومانیت کو کہانی کے لئے جنسِ غریب قرار دے کر حقیقت کو اس کی بنیاد بنایا۔ خیر اور حق کے عالمگیر تصورات کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص معاشرے کے مسائل کو کہانی کے رگ و پے میں جذب و سرایت کیا۔ اور بیان میں شعریت، ادبیت اور رنگینی کو مقصود بالذات سمجھ لینے کے بجائے اسے زندگی کے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا اور تکلّف و تصنّع کی جگہ سادگی کو (ایسی سادگی کو جس پر تصنّع کا سایہ نہ پڑا ہو) حُسنِ بیان کا زیور جانا اور سادگیٔ بیان کی معنوی وسعتیں اور اس کے امکانات واضح کئے، پھر بھی داستان کی قائم کی ہوئی اس روایت کو اپنا رہنما بنایا کہ کہانی کے کردار حقیقی سے زیادہ مثالی ہوں اور ان سے ایسے غیر معمولی افعال و اعمال وجود میں آئیں کہ دنیا محوِ حیرت رہ جائے۔ وہ نیکی کے جس راستے پر گامزن ہوں وہی راستہ زندگی کا سب سے پسندیدہ راستہ معلوم ہو اور اس راستے پر چلنے والے کو بہر صورت کامیاب و کامران دکھایا جائے اس لئے کہ ناظر کی خوشنودی اسی طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ نیکی کے ساتھ داستان گویوں کو جو جذباتی اور مبالغہ کی حد تک غیر منطقی لگاؤ ہوتا تھا اسے نذیر احمد نے بھی اسی طرح قائم رکھا اور اس کی خاطر فن کی ہر نزاکت و لطافت کی قربانی دی۔ ابتدائی دور کے ناول نگاروں میں شرر اور سرشار نے بھی داستان کی روایت کے ساتھ کسی نہ کسی طرح اپنا رشتہ قائم رکھا۔ سرشار کی ٹھوس حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ فسانۂ آزاد میں واقعہ نگاری کی رنگینی، طرزِ بیان کی صنعت گری اور کرداروں کے عمل میں حد درجہ کی سنجیدگی کے ساتھ، مبالغہ اور مضحکہ کا امتزاج اور قدم قدم پر

---

[1] اردو کا پہلا ناول مراۃ العروس ۱۸۶۹ء میں تصنیف ہوا اور ذیل کی داستانیں اس سنہ کے بعد تصنیف، تالیف و ترجمہ ہوئیں:
داستان امیر حمزہ ــــ سید محمد عبداللہ بلگرامی (۱۸۷۱ء) طلسم حیرت ــــ جعفر علی شیون (۱۸۷۲ء) بوستان خیال ــــ محمد عسکری و آغا جو (۱۸۸۲ء تا ۱۸۹۱ء) داستان امیر حمزہ ــــ تصدق حسین، محمد حسین جاہ، احمد حسین قمر (۱۸۸۳ء تا ۱۹۰۱ء) ہزار داستان ــــ حامد علی خان (۱۸۹۰ء) شبستان حیرت ــــ مرزا حیرت دہلوی (۱۸۹۲ء) الف لیلہ ــــ رتن ناتھ سرشار (۱۹۰۱ء)

معمولی سے فعل کو مہم کا رنگ دینے کا رجحان داستان کی روایت کے باقیات الصالحات ہیں۔ اسی طرح شرر کے ناولوں میں (خصوصاً تاریخی ناولوں میں) بہادری اور جاں بازی کے مبالغہ آمیز کارناموں کی کثرت، ہیرو کی تاریخی شخصیت کی صداقت میں تخیل کی رنگ آمیزی، مناظرِ فطرت کے بیان میں واقعہ نگاری کے بجائے شاعرانہ تصور آفرینی کا غلبہ اور منطق کے احساس کو بھلا کر کہانی کو طرب انگیز انجام دینے کی کوشش اور ان سب باتوں میں فن کے مطالبات کی پیروی کے بجائے قاری کی خوشنودیٔ مزاج کی تسکین کا خیال داستان کی روایت کے عناصر ہیں۔ ناول اپنے ابتدائی دور میں، یا یوں کہنا چاہیئے کہ نذیر احمد، شرر، اور سرشار کے ہاتھوں حقیقت کی زندگی کا مصور، ترجمان، مفسّر، نقاد اور خدمت گذار بن کر بھی اپنے آپ کو تخیل، تصور اور شعریت کی ان قدروں سے جُدا نہیں کر سکا جن کی مدد سے داستان نے ایک جہان نو بنانے کی روش کو اپنا شیوہ بنایا تھا۔ نذیر احمد، شرر اور سرشار نے داستان کی روایت کو عزیز رکھتے ہوئے بھی کہانی کو حقیقت نگاری اور احترام فن کا جو انداز سکھایا تھا اسے ان کے بعد آنے والوں نے تکمیل کی راہ دکھائی۔ ہماری ناول نگاری کا دوسرا دور تکمیلِ راہ کی مختلف منزلوں کی نشان دہی کرتا ہے۔

اس دور کے لکھنے والوں میں سجاد حسین کے علاوہ مرزا رسوا اور مرزا محمد سعید کے ناول بعض حیثیتوں سے کہانی کے فن کے ارتقا میں ایسے مدارج طے کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جن کے طے کئے بغیر فن کے نصب العین تک رسائی ناممکن ہے۔

سجاد حسین نے لکھنوی معاشرے کو اپنے ناولوں کا پس منظر بنا کر مرقع کشی اور اصلاحِ معاشرت کے جو مطالبات پورے کرنے کی کوشش کی ہے اس میں ان کے سامنے ہمیشہ یہ بات بھی رہی ہے کہ قاری اصلاحی مقصد میں ان کا ہم نوا ہونے کے ساتھ ساتھ کہانی میں دلچسپی بھی محسوس کرے کہانی میں دلچسپی کے عناصر کا وجود کہانی کی روایت کے تسلسل کا مظہر ہے اور روایت کے اس پہلو کو ہمارے کہانی کہنے والوں نے (جن میں ناول نگار اور افسانہ نگار بھی شامل ہیں) اکثر یاد رکھا ہے۔ یہاں تک کہ مرزا رسوا اور مرزا محمد سعید بھی، جو فلسفیانہ فکر، منطقی ترتیب اور نفسیاتی تجزیہ کو ناول کے ضروری اجزا مانتے ہیں۔ اس حقیقت کو فراموش نہیں کرتے کہ فلسفہ، منطق اور نفسیات میں جب تک ایسے عناصر شامل نہ کئے جائیں کہ وہ قاری کے لئے قابلِ قبول بن سکیں۔ کہانی میں ان کی کوئی جگہ نہیں۔ اس طرح کہانی نے جو سفر داستان کی رنگین، رومانی اور تخئیلی سرزمینوں میں شروع کیا تھا اور پھر نذیر احمد کی رہنمائی میں محض تخیل و تصور کو چھوڑ کر حقیقت کی سادہ دنیا میں قدم رکھا تھا۔ رسوا اور مرزا محمد سعید کی رہبری نے اسے نفسیات کی پُرپیچ وادیوں سے آشنا کیا۔

نذیر احمد نے کہانی کو محض نشاطِ خاطر کا ایک ذریعہ سمجھنے کے بجائے اس سے معاشرتی اور اخلاقی اصلاح کا اہم کام لیا۔ شرر نے اصلاح کے اس مقصد و منصب کو اور زیادہ واضح شکل دے کر اسے وسیع تر قومی مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ سرشار نے بھی، گو ایک مصنوعی انداز میں سہی، زمانہ کی روش سے متاثر ہو کر اپنے ناولوں میں تزئینِ اخلاق کی طرف اشارے کئے۔ رسوا اور مرزا محمد سعید کے ناولوں (امراؤ جان ادا اور خوابِ ہستی) میں مقصدیت کی بنیادیں اور زیادہ مضبوط اور اس کی جڑیں اور زیادہ گہری ہو گئیں۔ نذیر احمد کے یہاں زندگی کے پس منظر کے باوجود مصنف کی اصلاح کا جذبہ اور مقصدیت قاری کی خوشنودی کے احساس پر غالب ہے۔ شرر کے یہاں کم تر اور سرشار کے یہاں نسبتاً زیادہ قاری کو اپنے آپ سے قریب لانے کا احساس نمایاں ہے لیکن اس احساس کو شرر اور سرشار دونوں نے جو عملی شکل دی ہے اس میں ہر جگہ تصنّع نمایاں ہے کہیں شاعرانہ منظر نگاری کی شکل میں، کہیں سستے اور جذباتی رومان کے پیرایہ میں، کہیں جوشیلے اور ولولہ انگیز واقعات کے ذکر میں اور کہیں کہانی کے ایسے انجام میں جو کہانی کے اٹھان، ارتقا اور نقطۂ عروج کے ساتھ منطقی مطابقت نہیں رکھتا بلکہ قاری کے تصورات کی ہمنوائی کرانا اپنا مقصد جانتا ہے۔

مرزا محمد سعید اور مرزا رسوا کے ناولوں میں قاری کی خوشنودی کے پرتصنع اور جذباتی وسیلے اعتدال و توازن کا قرب حاصل کرتے ہیں اور لکھنے والے فکر، تخیل اور مقصدیت میں مناسب امتزاج پیدا کر کے فن کی اس روش کا آغاز کرتے ہیں جو واضح طور پر ناول کے فن کی روش ہے۔ کہانی کے مختلف اصناف میں، اس رشتہ کی بنا پر کہ انسان کی یہ فطرت اس کی محرک ہے کہ وہ انسانی زندگی کے متعلق زیادہ سے زیادہ جاننے اور اس کے

احساسِ برتری کو زیادہ سے زیادہ تسکین کا سامان میسر آئے۔ ایک خاص طرح کا ربط اور تسلسل ہے اور اس لئے داستان اور ناول کی بنیادوں میں یہ مشترک محرکات پھلتے اور تڑپتے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ان مشترک عناصر کے علاوہ جنہیں فنی تسلسل کا لازمی اور منطقی تقاضا کہنا چاہیے، ناول نے ایک منفرد صنفِ ادب کی طرح جنم لیا اور اس کے باوجود کہ دیکھنے والی نظر فن کے پردوں کو اٹھا کر داستان اور ناول کے ادبی رشتے کو آسانی سے محسوس کر لیتی ہے، اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ناول کا ایک علیحدہ فن ہے۔ اس فن کی ابتدا نذیر احمد سے ہوئی۔ شرر اور سرشار نے اس فن میں بعض چیزوں کا اضافہ کیا لیکن داستان اور ناول کو ایک دوسرے سے پوری طرح الگ نہ کر سکے۔ یہ صورت سب سے پہلے امراؤ جان ادا اور خوابِ ہستی میں پیدا ہوئی۔ اس کے بعد تقلید کا ایک ایسا دور آیا جس میں محمد علی طبیب اور راشد الخیری نے بنی بنائی روشوں کی تزئین و ترتیب کی اور پھر ناول کا فن ایک ایسی منزل پر پہنچا جسے پریم چند کی منزل کہنا چاہئے۔

پریم چند کی ناول نگاری کئی حیثیتوں سے اردو میں ناول نگاری کے فن کی تکمیل کی منزل ہے۔ پریم چند کے معاشرتی اور سیاسی زندگی کے گہرے مشاہدے، اس مشاہدے کے ساتھ فرد اور جماعت کی زندگی کے اہم مسائل کے مطالعے، اس مشاہدے اور مطالعے کے بعد فکر، تخیل اور جذبات کی صحیح آمیزش اور پھر ان سب چیزوں کو فن کے سانچے میں ڈھالنے کے واضح احساس اور احساس کو پوری ذمہ داری کے ساتھ عملی شکل دینے کی کوشش نے پریم چند کے ناولوں کو اردو ناول نگاری میں فن کا معیار بنا دیا ہے۔ پریم چند کے ناولوں کا قائم کیا ہوا معیار واقعہ نگاری کی تفصیلات و جزئیات، کردار نگاری کی جذباتی و نفسیاتی بنیاد اور فن کی ترتیب و توازن کی کسوٹی بھی ہے اور ایک سوچنے اور محسوس کرنے والے انسان کے تجربات و محسوسات کی ایسی تصویر بھی جس میں زندگی کی صداقتوں اور فن کی نزاکتوں کا یکساں احترام کیا گیا ہے۔ پریم چند کی ناول نگاری کا ابتدائی دور تو یقیناً ایک شدید قسم کی جذباتی اصلاح پسندی کا دور ہے لیکن اس کے آخری ایام یقیناً زندگی اور فن کے امتزاج کا بے حد دلکش نمونہ ہیں۔ اس نمونے کو کہیں کہیں مغرب کے بلند ترین معیاروں کا ہمسر تسلیم کرنے میں ضرور تامل ہوتا ہے لیکن اس میں یقیناً کوئی شبہ نہیں کہ اردو میں ناول نگاری کے فن کی معراج وہی ہے جہاں پریم چند نے اسے پہنچایا تھا۔ گئودان اور میدانِ عمل پریم چند کے ایسے ناول ہیں جن میں کہانی کی روایت کے بہترین عناصر مجتمع ہیں۔ ہماری داستان نے کہانی کو حسنِ تہذیب کا نقش، رنگینیِ رومان و تخیل کا مرقع اور جذباتی اور ذہنی تسکین و لطف اندوزی کا وسیلہ بنا کر کہانی کے فن میں ایک مخصوص صنف کا اضافہ کیا، اسے ہمارے ناول نے پوری طرح اپنے اندر سمو کر کہانی کو ایک صنف دی جس میں بھرپور زندگی بھی ہے اور بھرپور فن بھی، ایک کا پھیلاؤ، دوسرے کی گہرائی، ایک کی پیچیدگیاں، دوسرے کی نزاکتیں، ایک کا حسن و جمال اور دوسرے کی اثر انگیزی۔

لیکن جس طرح زندگی ایک جگہ نہیں ٹھہرتی فن بھی اس کی بے چینی اور بے قراری کا ساتھ دیتا رہتا ہے۔ زندگی آگے بڑھتی ہے، فن بھی آگے بڑھتا ہے، اس لئے کہ زندگی فن سے اسی بات کی طالب اور متقاضی ہے اور فن زندگی کی اس طلب اور تقاضے کا ساتھ نہ دے سکے تو زندہ نہیں رہ سکتا۔

زمانے نے ادیب اور فن کار سے کہانی کی ایک ایسی صنف کا تقاضا کیا تھا جو رومان کی رنگینیوں کے بجائے زندگی کی سادہ و پرپیچ حقیقتوں کی حامل ہو —— ایک ایسی صنف جس میں فن کار کے تخیل اور تصور کی جدت پسندی نہیں بلکہ تفکر کی گہرائی شامل ہو، جس میں انسان زندگی کی تلخیوں سے گھبرا کر ایک ان دیکھی دنیا کی سیر کرنے کی جگہ اس کی کشمکشوں سے دوچار اور نبرد آزما ہو، جہاں اسے زندگی سے فرار کی نہیں اس سے الجھنے اور اس کی الجھنوں کو سلجھانے کی تعلیم ملے —— جہاں فن کار محض مصور نہیں، مبصر، نقاد اور معلم کے فرائض اور منصب پورے کرنے کی خدمت انجام دے، جہاں جذبات اور احساسات پر فن کی منطق حاوی اور غالب نظر آئے۔ زمانے کی اسی طلب اور تقاضے نے ناول کی تخلیق کی اور آہستہ آہستہ اس نے داستان کی جگہ لے لی۔

ناول شروع ہوا، اس نے ارتقا کے مختلف مدارج و مراحل طے کئے لیکن زمانہ بدلا تو اس کے تغیر پسند مزاج نے ایک دوسری طرح کی کہانی کا مطالبہ کیا، ایسی کہانی جو زندگی کی ساری وسعتوں پر حاوی اور اس کی گہرائیوں کی ترجمان ہوتے ہوئے بھی ایک ایسے فن کی علمبردار ہو جہاں ایجاز و اختصار کی حکمرانی ہو۔ جاگیردارانہ نظام اور عشرت پسند تہذیب کے تقاضوں نے داستان جیسی صنف کی تخلیق کی تھی۔ حقائق کے تلخ احساس اور زندگی کے مسائل کو کہانی کے ذریعہ حل کرنے کی خواہش نے ناول کو جنم دیا۔ لیکن وقت میں پہلا سا پھیلاؤ باقی نہیں رہا اور انسان کو اپنے تفریحی مشاغل میں کتر بیونت اور کانٹ چھانٹ کرنی پڑی تو اس کا وہ مزاج جسے کہانی سننے کا چسکا ہمیشہ سے ہے افسانہ کی ایک ایسی صنف کا طلبگار ہوا جو زندگی اور فن کو اس طرح سموئے کہ انسان کو اس سے ذہنی سرور و مسرت کا سرمایہ بھی ہاتھ لگے، زندگی کے مسائل کو حل کرنے اور اپنے ماحول کو حسین تر بنانے کی آرزو بھی پوری ہو اور اس کے باوجود اتنی مختصر ہو کہ وقت پر اس کی گرفت مضبوط رہے، وہ اپنے بے شمار مشاغل میں سے بھی کہانی پڑھنے کا وقت نکال سکے، زمانے کے یہ سب تقاضے اور انسان کی یہ سب ضرورتیں مختصر افسانہ کی تخلیق کی بنیاد بنیں۔

اردو میں جس طرح ناول کی ابتدا ہو جانے کے بعد بھی داستان پوری آب و تاب کے ساتھ زندہ رہی۔ اسی طرح ناول کے عین فنی عروج کے زمانہ میں مختصر افسانہ پیدا ہوا اور پروان چڑھنا شروع ہوا۔ افسانہ کی پیدائش کے دن وہ ہیں جب ہمارا ناول آہستہ آہستہ فلسفہ، منطق اور نفسیات کی دنیا میں قدم رکھ رہا تھا۔ امراؤ جان ادا اور خواب ہستی کی تخلیق کا دور افسانہ کی پیدائش کا زمانہ ہے ——— پھر ایک بات اور بھی ہے کہ ناول کہانی کی ایک منفرد اور ممتاز صنف ہونے کے باوجود مدتوں اپنے آپ کو داستان کے سحر و افسوں سے آزاد نہ کر سکا اور ہمارے ابتدائی ناول نگاروں میں سے ہر ایک کے یہاں داستان کے رنگ کی جھلکیاں اور اس کے نور کی کرنیں برابر اپنا جلوہ دکھاتی رہیں۔ یہی صورت مختصر افسانہ کے ساتھ پیش آئی۔ ہمارے مختصر افسانہ کے ابتدائی دور میں واضح طور پر داستان کی دل کش روایت کا عکس جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

اردو کے سب سے پہلے افسانہ نگار پریم چند کے مختصر افسانوں کے کئی ابتدائی مجموعے، سوزِ وطن، پریم پچیسی اور پریم بتیسی اور ان میں بھی نمایاں طور پر سوزِ وطن، ان کے ہم عصروں میں سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں میں خارستان و گلستان، سلطان حیدر جوش کے اکثر اصلاحی افسانے اور نیاز فتح پوری کے افسانوں کا مجموعہ نگارستان اور اس میں بھی بالخصوص کیوپڈ اور سائکی اور الحمرا کا گلاب وغیرہ اس رنگین روایت کی نشانیاں اور یادگاریں ہیں۔

سوزِ وطن کے افسانوں میں "دنیا کا سب سے انمول رتن" اور "شیخ مخمور" کی فضا اور ماحول سرتاسر رومانی ہے، اس رنگین اور رومان انگیز فضا میں کرداروں کا مزاج، ان کا جذباتی اندازِ فکر و نظر، گفتگو کا شاعرانہ اور پرتصنع اسلوب، افسانے کے انجام میں حق کی اقدار کی فتح یہ سب داستانی رنگ کی باقیات ہیں اسی طرح پریم پچیسی اور پریم بتیسی کی کہانیوں میں تاریخ و روایت کا افسانوی اسلوب، کرداروں کی دلیرانہ اور حق پرستانہ سیرت، ان کے افعال و کردار پر غیر فطری جوش کا غلبہ، حق کی حمایت میں عمل کے جذباتی اور بعض صورتوں میں غیر منطقی حدود ——— یہ سب کچھ بھی افسانہ نے داستان کی روایت سے حاصل کیا اور اسے برقرار رکھا ہے۔ یلدرم کے افسانوں میں افسانوی فن کے مزاج اور اس کی نظرت کے احترام اور انہیں فکر و عمل کے منطقی حدود میں رکھنے کی عام روش کے ساتھ ساتھ مناظرِ فطرت کی رنگینیوں اور بہار آفرینیوں کو جذبۂ محبت اور رومان کا پس منظر بنانے اور انسانی جذبات اور حسنِ فطرت میں باہمی ربط و ہم آہنگی پیدا کرنے کا رجحان داستانی فن کی روایات سے لگاؤ کا نتیجہ ہے۔ نیاز فتح پوری کے افسانوں میں موضوع سے لے کر اس کی ہیجان انگیز و نشاط آفریں ترتیب و تشکیل اور کرداروں کے پرجوش رومانی عمل اور ردِ عمل تک ساری چیزیں داستانوں کے تخیلی اور نشاط انگیز اسلوب سے مستعار ہیں۔ ان افسانوں کے

واقعات اور کرداروں میں حقیقت کی رنگ آمیزی کے باوجود رومانی جذباتیت اور تکلف ترتیب کے باوجود شاعرانہ حسن بیان کا غلبہ بھی داستان کی قائم کی ہوئی روایت کی پیروی ہے اور پھر سلطان حیدر جوش کے معاشرتی اور اصلاحی افسانوں میں ایک خاص وضع اور انداز کے سوچنے والوں اور اخلاق کی بعض مخصوص اقدار کو پسندیدہ سمجھنے والوں کو مسرور و مطمئن کرنے کی کوشش بھی داستان کی اس روایت کا عکس ہے جس میں قاری کی خوشنودی کو فن کی سب سے اہم قدر سمجھا جاتا ہے۔

ہمارے ابتدائی دور کے ان افسانہ نگاروں کی تخلیقات میں مختلف حیثیتوں سے داستان کی قائم کی ہوئی فنی روایت کا جو گہرا عکس ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ سب تخلیقات کہانی کی ایک نئی صنف کے نقش اول بھی ہیں ——— ایسا نقش جس سے زمانہ کے تقاضوں کی تکمیل بھی ہوتی ہے اور افسانوی فن کی روایت میں ایک نئے اسلوب کا اضافہ بھی ہوتا ہے۔ افسانہ نگاروں نے کہانی سنانے اور قاری و سامع کی دلچسپی کا سامان مہیا کرنے کی قدیم روش پر قائم رہ کر بھی کہانی کو فن کی حیثیت سے بعض نئی چیزیں دیں۔ داستان اور ناول میں اب تک تخیل اور تصور کی پیدا کی ہوئی عالم و فلاں کی پہنائیاں اور مشاہدے اور تجربہ کی دی ہوئی دنیائے حقیقت کی پیچیدگیاں اور گہرائیاں کہانی کا پس منظر بنتی تھیں اور اس پس منظر میں واقعات، کردار، زندگی کے مسائل کی کثرت و فراوانی اور فطرت اور اس کے حسن کی رنگینی اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ و وابستہ ہوتی تھی کہ پڑھنے اور سننے والے کے لئے (داستان کی روایت میں پڑھنے اور سننے کی جگہ ایک سی ہے) ایک چیز کو دوسری سے الگ کرنا ناممکن تھا۔ افسانہ کہانی میں پہلی مرتبہ وحدت کی اہمیت کا مظہر بنا۔ کسی ایک واقعے، ایک جذبے، ایک احساس، ایک تاثر، ایک اصلاحی مقصد، ایک رومانی کیفیت کو اس طرح کہانی میں بیان کرنا کہ وہ دوسری چیزوں سے الگ اور نمایاں ہو کر پڑھنے والے کے جذبات و احساسات پر اثر انداز ہو افسانہ کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جس نے اسے داستان اور ناول سے الگ کیا ہے۔ مختصر افسانہ میں اختصار اور ایجاز کی دوسری امتیازی خصوصیت نے اس کے فن میں سادگی، حسن ترتیب و توازن کی ضرورت پیدا کی اور یہ سب چیزیں ہمیں پریم چند، سلطان حیدر جوش، سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری کے ان افسانوں کے ذریعہ ملیں جنھوں نے داستان کی روایت کو بھی زندہ رکھا اور کہانی کی ایک نئی صنف کی بنیاد بھی ڈالی۔

پریم چند، سلطان حیدر جوش، سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری کی رکھی ہوئی بنیاد پر اگلے ۲۰، ۲۵ برسوں میں علی عباس حسینی، مجنوں گورکھپوری، اعظم کریوی، ل۔ احمد اکبر آبادی، حامد اللہ افسر، محشر عابدی، مسعود علی ذوقی، طالب، باغپتی، کوثر چاند پوری اور فضل حق قریشی نے افسانوی فن کی ایک ایسی عمارت کی تعمیر کی، جس میں زندگی کی حقیقتیں اور فن کی رعنائیاں دست بدست ایک دوسرے کو سہارا دیتی دکھائی دیتی ہیں۔ ہمارے ابتدائی افسانہ نگاروں نے افسانہ کو حقیقت و شعریت، صداقت و تخیل اور زندگی و فن کے امتزاج کا جو نقش اول بنایا تھا، ان افسانہ نگاروں نے زیادہ ابھارا، چمکایا اور رنگین بنایا۔ ان سب نے تخیل کے بجائے مشاہدہ کو اور شعریت کی جگہ غور و فکر کو اپنا رہنما بنایا ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر نے یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال لینے کو کافی جانا ہے۔ تجربات میں گھر کر اس کے تلاطم کا مقابلہ کرنے کی عادت ان میں ابھی پیدا نہیں ہوئی زندگی کے ایوان میں داخل ہو کر اس کے رازہائے درون سے واقف ہونے کی خواہش اور طلب انہیں بے چین اور بے قرار نہیں کرتی اور اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ ان افسانہ نگاروں کی کہانیوں میں زندگی کا رنگ نسبتاً زیادہ شوخ ہونے پر بھی اتنا تیکھا نہیں کہ دیکھنے والے کی نظر کو مسحور کر سکے۔ ان میں فن کی ترتیب پہلے کے مقابلہ میں زیادہ متوازن ہونے کے باوجود اب بھی اتنی منطقی نہیں کہ کہانی کا انجام اس کے چھوٹے بڑے اجزاء کا منطقی، لازمی اور ناگزیر نتیجہ معلوم ہو۔ اخلاقی اور اصلاحی نقطہ نظر اور قاری کے نقطۂ نظر سے دل خوش کن انجام اب بھی عموماً ان کا فنی مطمح نظر اور نصب العین ہے۔ اب بھی اتفاقات کو ایسے اتفاقات کو جو پیچیدہ سے پیچیدہ صورت حال کو منصفانہ اور اس طرح قاری کی پسند کے سانچے میں ڈھال سکیں ان افسانوں کے فن میں خاصا دخل ہے۔ اب بھی جذباتیت اور شائستگی فن کے توازن و اعتدال کے راستہ میں حائل ہیں۔

۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۶ء کے بعد سے ہمارے افسانوں میں زندگی کے نقش نسبتاً زیادہ گہرے ہوتے نظر آتے ہیں۔ اس زمانہ کے شدید معاشی اور سیاسی

ہیجان و اضطراب نے ہر حساس انسان کے دل میں انسان اور انسانیت کی خدمت کا جو جذبہ پیدا کیا تھا اسے ہمارے افسانہ نگاروں نے اپنا فنی منصب سمجھنے کی طرف پہلی مرتبہ قدم بڑھایا۔ پریم چند نے اس معاملہ میں اپنے ہم عصروں کی رہنمائی کی اور زندگی کے گھمسان میں کود کر ایک سپاہی کی طرح ان قوتوں کو مٹانے کا تہیہ کیا جن کے ہاتھوں انسانیت درد میں مبتلا تھی۔ یہ خدمت فن کار اس وقت تک انجام نہیں دے سکتا جب تک زندگی اور اس کے مسائل پر اس کی گرفت پوری طرح مضبوط نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک ہمیں افسانہ نگاری ایک ایسے دور سے گزرتی دکھائی دیتی ہے جس میں افسانہ نگاروں نے زندگی کے صرف ان پہلوؤں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے جن پر وہ پوری طرح حاوی ہیں افسانہ نگاروں نے زندگی کو گہری نظر سے دیکھنے اور اس کے بھیدوں سے پوری طرح واقف ہونے کو اپنے فنی نصب العین کی پہلی منزل بنایا ہے۔ پریم چند کے علاوہ علی عباس حسینی، اعظم کریوی، مجنوں گورکھپوری، سدرشن، ل۔ احمد اکبر آبادی، راشد الخیری، عظیم بیگ چغتائی ——— سب کے افسانے صرف اس ماحول کے مصور ہیں جس پر ان کی نظر گہری ہے، اور صرف اس مقصد کے ترجمان جس سے انہیں پورا جذباتی لگاؤ ہے زندگی سے اس قرب کے ساتھ فن کا احساس بھی ان سب افسانہ نگاروں کے یہاں اب تیز تر ہے۔

اسی فنی احساس کی ایک دوسری نمایاں صورت یہ ہے کہ ہمارے افسانہ نگاروں نے دوسری زبانوں کے افسانے اردو میں منتقل کر کے اردو افسانہ کو فن کی ان نزاکتوں اور لطافتوں سے روشناس کرایا جن تک ہنوز اس کی رسائی نہیں ہوئی تھی۔ ایسے ترجمہ کرنے والوں میں محمد مجیب، خواجہ منظور، منصور احمد، ربیبں قدوائی کے نام اہم ہیں۔ ان ترجمہ کرنے والوں کے ساتھ لکھنے والوں کا ایک گروہ بھی نظر کے سامنے آتا ہے جس نے مغربی شاہکاروں سے متاثر ہو کر ایسے طبع زاد افسانے لکھے جو زندگی اور فن کے امتزاج کے موثر اور دلکش نمونے ہیں ——— حیات اللہ انصاری، اختر انصاری، سجاد ظہیر، اختر حسین رائے پوری، احمد علی اور فیاض محمود اس گروہ کے ایسے نمائندے ہیں جنہیں مختصر افسانے کے فن کی تاریخ میں اس لئے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا کہ ان کی تخلیقات نے افسانے کو مغرب کے بلند ترین معیاروں سے قریب لانے کی مہم کو آسان بنایا۔

مختصر افسانے کی تاریخ میں ۱۹۳۵ء کا سال ایک اہم سنگ میل ہے۔ اول تو اس لئے کہ اس سال تک مختصر افسانے نے فنی ارتقا کی جتنی منزلیں طے کیں ان کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ افسانہ جس کا آغاز اردو میں ایک ایسی صنعت کی طرح ہوا جس پر فن اور اسلوب کے اعتبار سے داستان کا خاصا گہرا اثر تھا سادگی اور رنگینی کی اس فضا سے نکل کر ایسی ایسی راہوں سے گزرا جن پر اسے زندگی کے قرب اور فن کے احساس نے برابر نئی نئی چیزوں سے آشنا کیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۵ء تک پہنچتے پہنچتے اس نے فن کے بے شمار مراحل طے کر کے ایسی صورت اختیار کی، جس میں تکمیل فن کے سراغ موجود ہیں۔ پھر یہ کہ اس منزل پر پہنچ کر ہمارے بعض افسانہ نگاروں نے ایسے افسانے لکھے جو ایک طرف تو اس لئے اہم ہیں کہ ان میں مشرقی زندگی کی روایتوں اور فن کی نزاکتوں کی بڑی لطیف آمیزش ہے اور دوسرے اس لئے کہ مغرب کا جو فن آہستہ آہستہ ہمارے مختصر افسانے کے اسلوب کو متاثر کرتا اور اسے تکمیل کی راہیں دکھاتا رہا تھا وہ ان افسانوں کے ذریعہ ایک باغیانہ انداز میں اردو افسانے کی روایت میں داخل ہوا۔ پہلی قسم کے افسانوں کی سب سے نمایاں مثال پریم چند کا افسانہ "کفن" ہے اور دوسری طرح کے افسانوں کا نمونہ افسانوں کا وہ بدنام مجموعہ جو "انگارے" کے نام سے چھپا۔ "کفن" زندگی کے گہرے اور ہمدردانہ مشاہدے اور مطالعے، تخیل اور فکر کی متوازن آمیزش اور فن کے مخلصانہ احساس کے ربط و آہنگ کا مثالی نمونہ ہے اور "انگارے" کے افسانے اس ذہنی اور باغیانہ روش کے علم بردار جس کے بغیر فن میں نئی راہوں کا کھلنا بند ہو جاتا ہے اور اس لئے فن کے سے ہر ترقی کے مدارج مسدود و ممنوع ٹھہرتے ہیں۔ "کفن" اور "انگارے" کے بعد اور اسی کے ساتھ وجود میں آنے والی ترقی پسندی کی تحریک نے مختصر افسانے کو بڑی تیزی سے ایسا بننے میں مدد دی کہ اگلے دس برسوں کے اندر اس کی بعض تخلیقات دنیا کی بہترین افسانوی تخلیقات کی ہمسری کے قابل ہو گئیں۔

۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک ہمارے مختصر افسانوں کی زندگی کے شباب اور اس کے فنی عروج کا بہترین زمانہ ہے۔ افسانہ کے اس عروج و شباب

کے آغاز تک داستان اپنی زندگی پوری کر چکی تھی اور میر باقر علی داستان گو کی وفات نے اس بزم کی آخری شمع کو گل کر دیا تھا۔ ناول نے البتہ اس کی ترقی کے ساتھ ساتھ ارتقا کے بہت سے مراحل طے کئے اور پریم چند کی وفات کے وقت تک (انہی کے ہاتھوں) ناول اس بام عروج تک پہنچ چکا تھا جس سے اونچا پریم چند کے پیشرو اسے نہیں لے جا سکے اور اس طرح گویا ۱۹۳۶ء تک فن کی حیثیت سے داستان کا وجود باقی نہیں رہا اور ناول کو جو کچھ بننا تھا وہ بن چکا اور اس طرح اب افسانوی ادب کی صرف ایک صنف (یعنی مختصر افسانہ) پر یہ ذمہ داری آپڑی کہ وہ زندگی کی خدمت گزاری اور فن کی ناز برداری کے دوہرے منصب کو پورا کرے اور اس میں شبہ نہیں کہ ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک ہمارے مختصر افسانے نے یہ دونوں منصب اس طرح پورے کئے کہ زندگی اور فن دونوں کے لئے باعث ناز و افتخار ہیں۔

اس دور کے افسانہ نگاروں میں علی عباس حسینی، کرشن چندر، اپندر ناتھ اشک، احمد علی، سہیل عظیم آبادی، اختر اورینوی، اختر انصاری، حیات اللہ انصاری، منٹو، حجاب، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور ان کے ذرا بعد غلام عباس، دیوندر ستیارتھی، احمد ندیم قاسمی، حسن عسکری، بلونت سنگھ، ممتاز مفتی، ابراہیم جلیس، ممتاز شیریں، ہاجرہ مسرور، شفیق الرحمٰن، قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور اور تسنیم سلیم چھتاری اس دور کے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے پڑھنے والوں کے ایک وسیع حلقے میں مقبولیت بھی حاصل کی اور اپنے اپنے مخصوص انداز میں افسانے کے فن کو کوئی نہ کوئی نئی چیز بھی دی۔ اس دور کی افسانہ نگاری میں مجموعی حیثیت سے تین خصوصیتیں نمایاں ہیں۔ پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ ان میں سے ہر افسانہ نگار نے اس چیز کے شدید احساس کے ساتھ کہ افسانہ اور زندگی کی حقیقتوں میں بڑا گہرا اور ناگزیر ربط ہے اپنے افسانوں کے لئے زندگی کے اس مخصوص پہلو کا انتخاب کیا ہے جس کی جزئیات کا علم اسے سب سے زیادہ ہے۔ اسی لئے علی عباس حسینی، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، احمد ندیم قاسمی اور دیوندر ستیارتھی کے افسانے دیہاتی زندگی کے افسانے ہونے کے باوجود ہندوستان کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے الگ الگ دیہاتیوں کے مصور اور ترجمان ہیں۔ اشک، بیدی، حیات اللہ انصاری، اختر انصاری، غلام عباس، عصمت، تسنیم سلیم، ہاجرہ، خدیجہ، قرۃ العین حیدر، حسن عسکری وغیرہ شہری زندگی کے افسانہ نگار ہوتے ہوئے بھی زندگی کے ایسے پہلوؤں کو اپنا موضوع بناتے ہیں جو ان کے مشاہدہ سے سب سے زیادہ قریب ہیں۔ کرشن چندر نے بہت کچھ لکھا ہے پھر بھی کشمیر کے متعلق سب سے زیادہ لکھا ہے۔ منٹو کی نظر سینکڑوں چیزوں پر سے پھر بھی بمبئی ان کا سب سے عزیز موضوع ہے۔ ان چند مثالوں سے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ مشاہدہ اور مطالعہ میں زندگی کے کسی خاص پہلو کی تخصیص کو اس دور کے افسانہ نگاروں نے اپنی خصوصیت بنا لیا ہے۔

اس دور کے افسانوں کی دوسری امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ لکھنے والوں کے مزاج اور شخصیت کا بہت گہرا پر تو ان کے افسانوں میں نظر آتا ہے۔ ان افسانہ نگاروں نے جس موضوع پر بھی افسانہ لکھا ہے اس پر اپنے انداز فکر، اپنے طرز تخیل اور اپنے جذبات و احساس کی بڑی گہری مہر ثبت کی ہے اور اس طرح ماحول کی تخصیص کے ساتھ ساتھ مصنفوں کی انفرادی شخصیتوں کی گوناگونی نے اس دور کے افسانے کو ہزار رنگ دے دیے ہیں۔

اور پھر تیسری بات یہ کہ اس دور کے افسانہ نگار اسلوب اور فن میں نئے تجربے کرنے سے نہیں گھبراتے۔ ان میں دوسروں کی اچھی چیزوں کو اپنا لینے کا حوصلہ بھی ہے اور نئے اسلوب تلاش کرنے اور انہیں بے جھجک سامنے لانے کی جرأت بھی، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ماحول کے صد گونہ تنوع اور شخصیتوں اور مزاجوں کے رنگا رنگ فرق نے ہمارے افسانے کو جو نئے سے نئے انداز دے گئے ان میں نئے تجربوں کی شوخی اور جرأت نے اور چار چاند لگائے اور اس طرح اس نئے دور کا افسانہ موضوع کے تنوع کے اعتبار سے، اسلوب کے نئے پن کے لحاظ سے اور فکر، تخیل اور احساس کی گوناگونی کے نقطۂ نظر سے پچھلے دور کے افسانوں سے بہت مختلف نظر آتا ہے۔ اس میں جدت اور روایت کا بڑا شیریں اور لطیف امتزاج ہے اس میں ایک خاص عہد کی سیاسی زندگی اور اس سیاسی زندگی کے پیدا کئے ہوئے خاص

اور معاشرتی نتائج کی بڑی واضح اور مکمل تصویریں ہیں اور خارجی حقائق کی تصویروں کے ساتھ ساتھ انسان کے جذبات، احساسات، افکار اور نفسیاتی ردِ عمل کا بڑا صحیح عکس بھی۔ اجتماعی زندگی کے مسائل فرد کے ذہن اور اعصاب پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں اس کا مطالعہ اس دور کے افسانہ نگاروں نے بڑی باریک بینی سے کیا ہے اور اپنے اپنے دائرہ عمل میں فرد کے فکری اور جذباتی ردِ عمل کی جو صورتیں دیکھی ہیں انہیں بڑے سجے علمی اور فنی انداز میں اپنے افسانہ میں جگہ دی ہے اور مشاہدہ کی اس وسعت اور دقتِ نظر نے اسے جو نئے نئے موضوع دیئے، ان کے اظہار کے لئے اس نے فن کے نئے نئے تجربے کرنے کی طرف قدم بڑھایا اور اس طرح اس دور کے افسانوں میں زندگی کی پوری گہماگہمی اور فن کے نئے سے نئے اسالیب نے ایک دوسرے کو آگے بڑھانے میں مدد دی ہے۔ فن زندگی کا خدمت گزار اور معاون ہے اور اس کے بدلے میں زندگی فن کو نئی راہیں سجھاتی اور اس خدمت گزاری کا حق ادا کرتی ہے۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی زندگی میں ایک زبردست سیاسی اور معاشرتی انقلاب رونما ہوا۔ اس انقلاب کے ظاہر ہونے سے پہلے ہمارا افسانہ فن کی اس منزل پر پہنچ چکا تھا جہاں زندگی کے حقائق، فن کار کی شخصیت اور فن کا حسن ایک دوسرے میں جذب اور مدغم ہو جاتے ہیں۔

تقسیم ملک کے بعد خاصے عرصے تک معاشرتی اور اخلاقی زندگی پر انتشار اور اضطراب کی کیفیت طاری رہی۔ انسان ایک ناقابلِ بیان بحران میں مبتلا رہا اور اس کے جذبات، احساسات اور افکار، اعتدال و توازن کی اقدار سے عاری و بیگانہ ہو گئے اور اس طرح فن کار کے لئے متوازن فنی تخلیق کی راہیں مسدود ہو گئیں۔ ان حالات میں اکثر افسانہ نگاروں نے کچھ نہیں لکھا اور پھر جب آہستہ آہستہ انہوں نے لکھنا شروع کیا تو ان کے افسانوں کا موضوع یہ زبردست انقلاب اور اس انقلاب کے سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی شاخسانے تھے۔ ان موضوعات پر قلم اٹھاتے وقت اکثر لکھنے والے اپنے آپ کو جذباتی ہیجان سے محفوظ نہیں رکھ سکے اور جنہوں نے اپنے جذبات و اعصاب پر قابو پا کر کوئی متوازن افسانہ لکھا اس میں واقعات کی عکاسی اور اصلاح پسندی کا رجحان اس درجہ غالب ہے کہ فنی اقدار کو پوری طرح ابھرنے کا موقع بہت ہی کم ملا ہے۔

تقسیم سے پہلے جن افسانہ نگاروں نے اس فن میں رہنمائی کا شرف حاصل کیا تھا یا جنہوں نے زندگی اور فن پر پوری گرفت حاصل کر کے اپنے لئے کوئی امتیازی جگہ بنائی تھی انہوں نے بھی تقسیم کے بعد کے زمانہ میں جو کچھ لکھا اس میں فن کا شعلہ کچھ بجھا بجھا سا دکھائی دیتا ہے ــــــ کم و بیش یہی حال علی عباس حسینی، مجنوں گورکھپوری، حجاب امتیاز علی، اپندر ناتھ اشک، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی اور حیات اللہ انصاری کا بھی حال ہے۔ یہ بات البتہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے اسلوبِ خاص کی جھلکیاں ان کے افسانوں میں کہیں کہیں ضرور نظر آ جاتی ہیں۔ کرشن چندر اور منٹو نے تقسیم کے بعد بھی حسبِ معمول کثرت سے لکھا اور تیر کی طرح کبھی بہت اچھا اور کبھی بہت برا لکھنے کی روش قائم رکھی۔ فن کو ان دونوں فن کاروں کے ہاتھوں انحطاط اور زوال سے زیادہ آشنا ہونا پڑا ــــــ ترقی کا روئے زیبا اسے کم دیکھنا نصیب ہوا۔ لیکن اس دور کے جن افسانوں کو "حسن و زیبائی" کی سند ملی ہے ان میں موضوع، شخصیت اور فن کا رچاؤ موجود ہے۔ یہ رچاؤ، ٹھہراؤ اور استقلال احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ اور غلام عباس کے اکثر افسانوں میں نمایاں ہے اور ہاجرہ مسرور، خواجہ احمد عباس، خدیجہ مستور، قرۃ العین حیدر، ممتاز مفتی، مہندر ناتھ، دیوندر ستیارتھی، تسنیم سلیم، قدرت اللہ شہاب اور شفیق الرحمٰن کی جستہ جستہ کہانیوں میں۔ ایک چیز البتہ ان سب لکھنے والوں کی یہاں صاف نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ ان میں سے ہر ایک کا وہ اسلوبِ فن جس کی تخلیق میں ان کے مخصوص ماحول، ان کے منفرد اندازِ فکر و تخیل، ان کے جذباتی میلان اور شخصیت کے مختلف اجزاء نے پورا حصہ لیا تھا اب بھی قائم ہے اور اس اسلوب کی بدولت ہر ایک کا افسانہ دوسرے سے الگ ایک ایسے رنگ کا حامل نظر آتا ہے جس میں ایک مخصوص دلکشی اور تاثیر ہے۔

ان افسانہ نگاروں کی ان اکا دُکا فنی تخلیقات کے علاوہ جن میں فن کا رچاؤ موجود ہے یا ان دو چار افسانہ نگاروں کے علاوہ جن کا ابھی ذکر آیا (ندیم، غلام عباس، بلونت سنگھ اور کبھی کبھی منٹو اور کرشن چندر) اس دور کے پورے فن پر انحطاط کی اقدار کا سایہ ہے۔ فن کار جیسے یا تو تھک گیا ہے یا سیاسی اور اقتصادی حالات کے بوجھ نے اس کی ساری تخلیقی قوتیں سلب کر لی ہیں یا ماحول میں اسے ایسے محرکات میسر نہیں ہیں جن میں ادب اور فن پوری آزادی سے پروان چڑھتے ہیں۔

یہ حال تو پرانے لکھنے والوں کا ہے ———— لیکن ان پرانے لکھنے والوں کے علاوہ تقسیم کے بعد بعض نئے لکھنے والے افسانوی ادب اور فن کے ایوان میں داخل ہوئے اور پڑھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے ———— ان نئے آنے والوں میں انتظار حسین، اے حمید، دیوندر اسّر، انور عظیم، ضمیر الدین، خلیل احمد، ابن الحسن اور اشفاق احمد کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان نئے لکھنے والوں میں سے ہر ایک نے موضوع کے انتخاب اور اسے پیش کرنے کے فنی اسلوب میں اپنے ذہنی و جذباتی رجحانات کو دخل دیا ہے اور اس لئے ہر ایک کے افسانے ماحول کے بعض مشترک تاثرات و رجحانات کے حامل ہونے کے باوجود اس کے مخصوص فکری، تخیلی اور جذباتی میلانات کا عکس ہیں۔

ان نئے افسانہ نگاروں نے عموماً اپنے مشاہدہ کے لئے ایک خاص میدان منتخب کر کے اسے اپنی کہانی کا پس منظر بنایا ہے، اس مخصوص اور محدود ماحول سے الگ ان سب نے عموماً بین الاقوامی سیاست اور معیشت کے بدلتے ہوئے حالات پر بھی نظر رکھی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ انہیں ماحول اور فرد کے رشتے کا پوری شدّت سے احساس ہے اور اس لئے ان سب نئے لکھنے والوں کی کہانیاں ایک مخصوص اور محدود ماحول کی کہانیاں ہوتے ہوئے بھی بین الاقوامی زندگی کے رجحانات کا عکس اور فرد کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیتوں کی آئینہ دار ہیں۔

موضوع کے ان مشترک پہلوؤں سے قطع نظر، اندازِ بیان میں بھی ان سب لکھنے والوں نے تفصیل و تشریح کے بجائے ایجاز و اختصار اور اشاریت و ایمائیت کو اپنے مقصد کے لئے زیادہ پسندیدہ جانا ہے۔ ان لکھنے والوں نے ادبیت و شعریت، طنز و مزاح اور بیان کی جدّتوں کو اظہار کا موثر وسیلہ سمجھ کر اپنے اسالیب میں انہیں پوری آزادی سے جگہ دی ہے ———— اور پھر ان وسائل سے کام لے کر افسانوں میں صرف اس موضوع کو جگہ دی ہے جو ان کی پسند اور مزاج سے مطابقت رکھتا ہے ———— مثلاً خلیل احمد کے افسانے انسان کی اس ذہنی کیفیت کی مصوری کرتے ہیں جو زندگی اور ماحول سے بیزاری کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے ———— ابن الحسن کی کہانیاں عموماً ایسے کرداروں کی کہانیاں ہیں جنہیں ماحول کا رنگ اتنا پختہ کرتا ہے کہ کوئی طوفان، کوئی انقلاب اسے ہلکا اور پھیکا نہیں کر سکتا۔ ضمیر الدین نے اپنی کہانیوں کے ذریعہ انسان کے ظاہری عمل اور باطنی کیفیت کے ربط و تعلق کی وضاحت کی ہے۔ انور عظیم کے افسانے بھی ذرا تیکھے انداز میں کرداروں کے ماحول اور مزاج کے اسی رشتہ کی تصویریں کھینچتے ہیں ———— شوکت صدیقی کے افسانوں میں ایسے کردار چلتے پھرتے نظر آتے ہیں جنہیں ماحول کی ستم ظریفیوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے ماضی کی یادوں میں پناہ لینی پڑتی ہے۔ دیوندر اسّر نے تصوّر و تخیّل کی دنیا میں پناہ لینے کے بجائے آزادی کے نغمے گانے اور حقیقت کی ایک ایسی دنیا آباد کرنے کو اپنا مطمحِ نظر بنایا ہے جس میں زندگی دکھوں سے آزاد ہو سکے ———— اے حمید کے افسانوں کا پسندیدہ موضوع زندگی کی تلخیوں کے ساتھ ساتھ حسین مناظرِ فطرت ہیں ———— انتظار حسین کی کہانیاں ایک مخصوص معاشرے اور اس معاشرے کے کرداروں کی کہانیاں ہیں اور اشفاق احمد کی کہانیاں کسی مخصوص ماحول کی پابندی کے بغیر اس محبت کی کہانیاں ہیں جس کا فور ہر دل میں موجود ہے۔

موضوع کی ندرت کی یہ راہیں افسانہ نگاروں کو ان کے مخصوص مزاج اور ذاتی پسند و ناپسندیدگی نے دکھائی ہیں اور ان راہوں پر چل کر ان نئے لکھنے والوں نے کبھی کبھی ایسی کہانیاں لکھی ہیں کہ وہ فنی انحطاط کے اس دور میں بھی ہلکی مایوسی کے احساس سے بچاتی ہیں لیکن یہ احساس اب بھی ہر ایک کے دل میں کھٹک پیدا کرتا ہے کہ یہ کارنامے اس سطح تک کبھی نہیں پہنچتے جس تک وہ اپنے دورِ عروج رعینی کرشن چندر، بیدی، عصمت، منٹو وغیرہ کا عہد، میں پہنچتے تھے۔ لیکن اس کھٹک اور خلش کے ساتھ ایک بات تسکین کی بھی ہے اور وہ یہ کہ ان نئے لکھنے والوں میں سے اکثر میں وہ صلاحیتیں موجود ہیں جن سے فن کو عظمت ملتی ہے —— شرط صرف یہی ہے کہ فن کار فکر، تخیل اور احساس کی گہرائیوں میں جذب ہو کر اپنے کام کو پورے خلوص، پوری دیانت اور پوری مشقت سے انجام دینے کے عادی بنیں کہ افسانہ نگاری کی جوئے شیر بھی کوہ کنی کے بغیر ممکن نہیں بنتی۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی

مختصر افسانے کا فن

مختصر افسانہ وہ افسانہ ہی نہیں ہوتا جو صرف مختصر ہو۔ وہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے ——— اختصار اس کی بنیادی خصوصیت ضرور ہے لیکن اس اختصار کے ساتھ ساتھ جب تک اس میں دوسری خصوصیات موجود نہ ہوں، اس کو مختصر افسانہ نہیں کہا جا سکتا۔—— مختصر افسانہ تو ایک فن ہے جس کے اپنے جمالیاتی اصول اور فنی مقتضیات ہیں ——— افسانہ جب تک ان اصول اور مقتضیات کو پورا نہیں کرتا، اس وقت تک اس کو مختصر افسانے سے تعبیر کرنا مشکل ہے۔ ایسے افسانے جن میں محض اختصار ہوتا ہے اور جو ان جمالیاتی اصول اور فنی مقتضیات سے کوئی سروکار نہیں رکھتے وہ تو ابتدائے آفرینش سے لے کر اس وقت تک تاریخ کے مختلف ادوار میں برابر تخلیق کئے جاتے رہے ہیں لیکن ان جمالیاتی اور فنی مقتضیات نے مختصر افسانے کو جو مخصوص شکل دی ہے وہ دورِ جدید کی پیداوار ہے ——— ویسے کہیں کہیں ان اصول اور مقتضیات کی جھلک ان افسانوں میں بھی جگہ جگہ نظر آ جاتی ہے جو ہمیں محض اختصار ہے اور جو ہر ملک اور ہر قوم کی زندگی میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں ——— مختلف ملکوں کے علم الاصنام اور دیو مالا میں ان کہانیوں کا پتہ چلتا ہے۔ بائبل اور دوسری مذہبی کتابوں میں ایسی بے شمار کہانیاں موجود ہیں ——— ان کہانیوں اور داستانوں کو مختصر افسانہ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ان میں کہیں کہیں مختصر افسانے کی سی بات پیدا ضرور ہو جاتی ہے اس لئے مختصر افسانے کی روایت یوں زندگی اور ادب میں بہت پرانی ہے لیکن اس نے ایک مستقل فن کی صورت موجودہ دور ہی میں اختیار کی ہے اور اس کی بنیاد جدید دور کے جمالیاتی تقاضوں پر استوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر وہ افسانہ جو صرف مختصر ہو مختصر افسانہ نہیں ہے بلکہ مختصر افسانہ وہ صنفِ ادب ہے جس کے فن کی اپنی ایک دنیا ہے، اور اس دنیا کے اپنے اصول ہیں، اپنی قدریں ہیں، اپنے معیار ہیں، اپنے قواعد و ضوابط ہیں ——— مختصر افسانہ انہی اصولوں، قدروں اور معیاروں سے پہچانا جاتا ہے۔ وہ انہی سے عبارت ہے۔

یہ اصول، قدریں اور معیار کیا ہیں؟ ان کا وجود کب ہوا؟ کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟ کون سے حالات تھے جن میں ان کی تخلیق ہوئی؟ اور وہ کون لوگ تھے جنہوں نے ان کو پروان چڑھایا اور اس طرح ان کو فروغ دینے کا باعث بنے؟ ——— یہ سوالات مختصر افسانے کے فن کو سمجھنے میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں ——— اور ان سوالات کو حل کرنے ہی میں مختصر افسانے کے فن کو سمجھنے کا راز مضمر ہے۔

مختصر افسانے کا فن انیسویں صدی کے دورِ آخر کی پیداوار ہے۔ اس سے قبل یہ فن کسی مستقل صورت میں نظر نہیں آتا۔ ویسے اس سے قبل بھی افسانے لکھے ضرور جاتے تھے۔ ان افسانوں میں اختصار بھی ہوتا تھا لیکن اس اختصار کے باوجود وہ داستانوں اور ناول سے زیادہ قریب تھے ان میں ایک پھیلاؤ ہوتا تھا، ایک وسعت ہوتی تھی۔ پلاٹ کی پیچیدگی اور کرداروں کی رنگارنگی کے سہارے وہ آگے بڑھتے تھے۔ اسی لئے مجموعی طور پر ان کا میدان رنگینیوں بھی وسیع ہوتا تھا۔ وحدت اور ہم آہنگی کی طرف ان میں بہت کم توجہ دی جاتی تھی ——— بیسویں صدی کے آغاز سے قبل ہر زبان میں ایسے افسانوں کی خاصی تعداد نظر آتی ہے۔ انگریزی میں ڈکنس نے ایسے بہت سے افسانے لکھے ہیں۔ فرانس میں بالزاک ایسے افسانے لکھنے میں پیش پیش رہا ہے۔ روس میں ٹالسٹائی کے یہاں اس قسم کے افسانے موجود ہیں ——— اردو میں سرشار، شرر، نذیر احمد، راشد الخیری وغیرہ کے یہاں ایسے افسانوں کی فراوانی نظر آتی ہے ——— غرض مختصر افسانے کی تخلیق سے قبل کوئی ملک بھی ایسے افسانوں سے خالی نہیں رہا ——— لیکن یہ افسانے فنی اعتبار سے اپنا کوئی انفرادی شان پیدا نہ کرسکے ——— اور اسی لئے ان افسانوں کی کوئی فنی اور جمالیاتی اہمیت نہیں ہے۔ صرف کہانی کا نشیب و فراز انہیں دلچسپ بنا تا ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان افسانوں میں دلچسپی کا محور ہیئت اور فن کے مقابلے میں موضوع اور مواد زیادہ ہوتا تھا اور اسی کے سہارے وہ زندہ رہتے تھے۔

انیسویں صدی کے آخر میں مختصر افسانے کے جس فن کا آغاز ہوا اس کو ان افسانوں سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ وہ ان افسانوں سے موضوع اور مواد فن اور ہیئت دونوں اعتبار سے مختلف تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انیسویں صدی کے آخر تک آتے آتے حالات بڑی حد تک بدل چکے تھے۔ زندگی ایک نئے موڑ پر آگئی تھی اور اس کے نتیجے میں معاملات و مسائل میں تغیر ہوا تھا۔ افراد کے مذاق میں تبدیلی ہوئی تھی۔ ان کے فنی شعور نے نیا رخ اختیار کر لیا تھا اس لئے ان کے جمالیاتی تقاضے بھی کچھ اور تھے ——— مختصر افسانے کو اسی بدلتے ہوئے فنی شعور اور نئے جمالیاتی تقاضوں نے پیدا کیا ——— ایک عام خیال یہ ہے کہ انیسویں صدی کے آخر میں صنعتی انقلاب کے زیر اثر انسانی زندگی کو جس صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا اس نے مختصر افسانے کی تخلیق کی۔ اس خیال کو بنیاد بنا کر بعضوں نے اس رائے کا اظہار کیا کہ انیسویں صدی تک آتے آتے چونکہ انسان بہت مصروف ہو چکا تھا۔ اس کے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ بڑی تخلیقات سے دلچسپی لے سکے۔ اس لئے اس نے ناول کی جگہ مختصر افسانے کو پیدا کیا ——— اس خیال میں ایک حد تک تو صداقت ضرور ہے لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس میں بڑی ہی سطحیت کا احساس ہوتا ہے ——— یہ بات تو صحیح ہے اور اس میں ذرا بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ انیسویں صدی کے آخر تک آتے آتے انسان صنعتی انقلاب کے باعث خاصا مصروف ہو گیا تھا۔ اس کے پاس فرصت کے لمحات بہت کم رہ گئے تھے اس لئے وہ اپنی جمالیاتی تسکین کی خاطر ادب اور فن کی ایسی اصناف کو تخلیق کرنا چاہتا تھا جن سے دلچسپی لینے میں زیادہ وقت صرف نہ ہو۔ اسی صورتِ حال نے مختصر افسانے کی بنیاد رکھی لیکن اس سے کہیں زیادہ صحیح یہ بات ہے کہ صنعتی انقلاب نے جو حالات پیدا کئے تھے۔ انہوں نے انسانی مزاج کو تبدیل کیا تھا۔ ان کے مذاق میں ایک بدلی ہوئی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ وہ ہر چیز کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے لگے تھے۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں اپنی جمالیاتی تسکین کے لئے نئے اصناف کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ انہوں نے ادب کے ہر شعبے میں نئے اصناف کی تخلیق کا سلسلہ شروع کیا۔ شاعری میں ہیئت اور اسالیب کے نئے تجربے کئے۔ ناول کو نئے سانچوں میں ڈھالا ——— مختصر افسانہ ان بدلتے ہوئے حالات کے زیر اثر نئے تجربات کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس مختصر افسانے نے ایک نئی صنفِ ادب کی حیثیت سے موجودہ دور میں ان گنت افراد کی جمالیاتی تسکین کا سامان فراہم کیا ہے اور موجودہ دور میں اس کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز یہی ہے۔ لیکن اس کی بنیاد تمام تر مختصر افسانے کے اختصار ہی پر نہیں ہے ——— اگر ایسا ہوتا تو مختصر افسانے کے ساتھ ساتھ ناول کے فن کا ارتقائی تسلسل جاری نہ رہتا اور مختصر افسانے کے فن میں طویل مختصر افسانے کے نت نئے تجربے نہ ہوتے۔ ناول کا فن مختصر افسانے کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا رہا ہے لیکن نئے جمالیاتی احساس نے اس میں نئے تجربے کئے ہیں اور اس طرح اس کی ہیئت بھی بدلی ہے۔ بہت سے نئے ناول نگاروں کے یہاں اس صورتِ حال کا

احساس ہوتا ہے ——— اور ناول کے ان تجربات میں بڑی حد تک ان ایمائی، اشاراتی اور کنایاتی پہلوؤں کو دخل ہے جو موجودہ دور کے تمام اصنافِ ادب میں نمایاں نظر آتے ہیں اور اس کا احساس نہ صرف ان ناولوں میں ہوتا ہے جن کو نئے تجربات نے مختصر کر دیا ہے بلکہ طویل ناولوں میں بھی یہ خصوصیت نمایاں نظر آتی ہے ——— وہ ناول جو اختصار کے ساتھ لکھے گئے ہیں ان میں ورجینیا وولف کے بعض ناول خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر (THE LIGT HOUSE) اور THE WAVES مختصر ناولوں کے ان تجربات کے بہت اچھے نمونے ہیں۔ ان میں اشاراتی اور کنایاتی انداز کے ساتھ ساتھ ایک غنائی کیفیت کا احساس ہوتا ہے جس نے انہیں شاعری اور نظم سے زیادہ قریب کر دیا ہے ——— اور طویل ناولوں میں جیمس جوائس کا ناول یولائی سیز (ULYSSES) اس کی بہت اچھی مثال ہے ——— ہر چند کہ اس ناول میں تفصیل اور جزئیات کا بیان ہے لیکن اس تفصیل اور جزئیات میں بھی مجموعی طور پر جو چیز سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ اس کا اشاراتی اور کنایاتی پہلو ہے ——— بلکہ جیمس جوائس کے فن کا کمال ہی یہ ہے کہ اس نے ان دونوں کا ایک سنگم بنایا ہے ——— اور ورجینیا وولف اور جیمس جوائس ہی پر منحصر نہیں جدید دور کے ہر اچھے ناول نگار کے یہاں اسی قسم کے تجربات نظر آتے ہیں ——— اور اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ نئے دور کا انسان بڑی حد تک بدل گیا ہے ——— بدلتے ہوئے حالات نے اس کے مزاج اور اس کے جمالیاتی احساس میں بڑی تبدیلیاں کی ہیں اور ناول میں ہیئت کے یہ تجربے جن میں اشاراتی اور کنایاتی انداز کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، درحقیقت اسی بدلتے ہوئے جمالیاتی احساس کا نتیجہ ہیں ——— صنعتی انقلاب کے بعد جو حالات پیدا ہوئے ہیں انہوں نے زندگی کو زیادہ پیچیدہ بنا دیا ہے اور زندگی کی اس پیچیدگی سے افراد کچھ مانوس سے ہو گئے ہیں۔ انہوں نے اس کے ساتھ کچھ مطابقت سی پیدا کر لی ہے۔ چنانچہ سیدھی سادی باتوں میں انہیں لطف نہیں آتا ——— سامنے کی باتوں سے ان کی تسکین نہیں ہوتی۔ ان کا ذہن تو زندگی کی تہوں کو کھولنا چاہتا ہے اس لئے وہ زندگی کے ساتھ ساتھ فن میں بھی تہوں کا تقاضا کرتے ہیں۔ اس کے بغیر ان کی جمالیاتی تسکین کا سامان فراہم نہیں ہوتا ——— جدید دور کے پیچیدہ ماحول نے افراد کے ذہنوں کو تیز کیا ہے، ان کے احساس میں شدت پیدا کی ہے اور ان کے تخیل کو بلند پرواز بنایا ہے ——— یہ سب باتیں اس کا تقاضا کرتی ہیں کہ موجودہ دور کے افراد فن میں اشاراتی اور کنایاتی انداز سے دلچسپی لیں کیونکہ اس طرح اشاروں اور کنایوں کی تہوں کو کھولنے کا موقع ملتا ہے اور وہ اس طرح اپنی جمالیاتی تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں ——— ان کے نزدیک اسی اشاراتی اور کنایاتی انداز سے فن میں حسن کی قدر پیدا ہوتی ہے۔ ——— مختصر افسانہ موجودہ دور کی اسی بدلتی ہوئی صورت حال کی پیداوار ہے۔ اس کے پیچھے اس نئے جمالیاتی احساس کے تقاضے ہیں جو اس بدلتی ہوئی صورت حال کے زیر اثر ایک نیا روپ اختیار کر رہا تھا اور جس نے ادب اور فن کی اقدار میں بعض اہم تبدیلیاں رونما کر دی تھیں۔ مختصر افسانے کا فن ان تبدیلیوں کی پوری طرح نمائندگی کرتا ہے۔

ناول اور مختصر افسانہ یوں بظاہر دیکھنے میں ایک دوسرے سے بہت قریب معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اصنافِ ادب کی حیثیت سے ان کا ایک دوسرے سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ ناول بہر حال ناول ہے اور مختصر افسانہ بہر حال مختصر افسانہ ہے۔ موجودہ دور میں مختصر افسانے کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس نے ناول کی جگہ لے لی ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ مختصر افسانہ ناول کی کوئی ارتقائی صورت ہے۔ ناول اور افسانہ چونکہ دو مختلف اصناف ہیں اس لئے ان میں کسی آویزش کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہی سبب ہے کہ جدید دور میں افسانے کے ساتھ ناول کے فن میں بھی ایک ارتقائی کیفیت نظر آتی ہے ——— مختلف زبانوں میں بہت اچھے افسانوں کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کے ناول بھی لکھے گئے ہیں اور اپنی اپنی جگہ ان دونوں کو مقبولیت حاصل ہوئی ہے ——— وجہ اس کی یہ ہے کہ ناول اور مختصر افسانہ دونوں کے میدان مختلف ہیں۔ ناول زندگی کی وسعت اور اس کے پھیلاؤ کی عکاسی کرتا ہے اور مختصر افسانے کے پیشِ نظر زندگی کے ایسے پہلو ہوتے ہیں جن کا وسعت اور پھیلاؤ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مختصر افسانہ تو زندگی کی کسی وقتی اور لمحاتی کیفیت کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس لئے اس میں کسی قسم کی وسعت اور کسی طرح کے پھیلاؤ کی ترجمانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ناول میں انسان کی زندگی کے سامنے

نشیب و فراز کی تصویریں ہوتی ہیں، بچپن سے لے کر مرتے دم تک افراد کو جو واقعات پیش آتے ہیں، جن معاملات و مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے وہ سب ناول کے فن کا موضوع بنتے ہیں۔ اسی لئے ناول میں تفصیل و جزئیات ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے مختصر افسانہ زندگی کے کسی ایک پہلو کو پیش کرتا ہے، کسی ایک فرد پہ بیتا ہوا کوئی ایک واقعہ، اس کی کوئی ایک مخصوص وقتی کیفیت، کوئی ایک ذہنی الجھن افسانے کا موضوع بن سکتی ہے۔ ظاہر ہے کسی وقتی کیفیت کو پیش کرتے ہوئے تفصیل و جزئیات سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ اسی لئے مختصر افسانے میں اختصار اور اجمال ہوتا ہے —— لیکن مختصر افسانے کا فن کار اس اجمال و اختصار میں بھی معنویت کی دنیا سمو دیتا ہے —— کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہنا اس کے فن کی بنیادی خصوصیت ہے —— لیکن افسانہ نگار کے اس اظہار میں انتشار نہیں ہونا چاہئے۔ اس کے اس اظہار کے لئے ایک محور ضروری ہے۔ یہ محور خیال کی وحدت کے سہارے پیدا ہوتا ہے اور اس خیال کی وحدت سے تاثر کی وحدت پیدا ہوتی ہے —— اس وحدتِ خیال اور وحدتِ تاثر کے بغیر مختصر افسانے کو فنی طور پہ مختصر افسانہ نہیں کہہ سکتے۔

ویسے ناول کی طرح مختصر افسانے میں بھی ان عناصر کا ہونا ضروری ہے جن کے بغیر اس کو افسانے کے تحت شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے بھی پلاٹ ضروری ہے، کردار یا کردار کا کوئی پہلو ضروری ہے، کوئی نقطۂ نظر یا نظریۂ حیات ضروری ہے، ایک مخصوص اسلوب اور اندازِ بیان ضروری ہے —— ان کے بغیر نہ تو اس میں وہ ایمائی اور اشاراتی انداز پیدا ہو سکتا ہے، نہ وحدتِ خیال اور وحدتِ تاثر! —— کیونکہ ان سب پہلوؤں کو برتنے ہی کی صورت میں یہ خصوصیات پیدا ہو سکتی ہیں —— ان کی بنیاد تو وہی افسانے کے بنیادی عناصر ہیں جن سے اس کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

مختصر افسانے میں آج کل جو نئے تجربات ہوئے ہیں، انہوں نے اس کو بہت سی پابندیوں سے آزاد کر دیا ہے —— چنانچہ بعض ایسے افسانے بھی موجودہ دور میں لکھے گئے ہیں جن میں پلاٹ نہیں ہے حالانکہ پلاٹ افسانے میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے —— پلاٹ کہانی کی ترتیب کا نام ہے اور اس ترتیب کے بغیر افسانے میں افسانویت نہیں رہتی —— اس لئے مختصر افسانے میں پلاٹ کا وجود لازمی ہے۔ کیونکہ مختصر افسانہ سب سے پہلے افسانہ ہوتا ہے —— اور افسانہ ہونے کے لئے اس میں کسی نہ کسی حد تک کہانی کے عنصر کا ہونا ضروری ہے —— اس عنصر کی اہمیت کا احساس ہی پلاٹ کا وجود بخشتا ہے، اور اس پلاٹ کو مختصر افسانے میں بڑی اہمیت حاصل ہے —— ناول میں بھی پلاٹ کی وہ اہمیت نہیں جو مختصر افسانے میں ہے۔ ناول میں تو کردار بڑا کام کرتے ہیں لیکن مختصر افسانے میں کرداروں کی ارتقائی کیفیت کی تفصیل نہیں ہوتی —— اس لئے ظاہر ہے اس کا پلاٹ کسی نہ کسی صورت میں ضرور ہونا چاہئے —— ناول میں تو اس پلاٹ کا کینوس بہت وسیع ہوتا ہے اور کرداروں کے فطری ارتقاء کے ساتھ اس کی ارتقائی رفتار ہم آہنگ ہوتی ہے —— لیکن مختصر افسانے میں ایسا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس میں کرداروں کی ارتقائی کیفیت پیش نہیں کی جاتی۔ اس لئے کہانی اور پلاٹ سے اس کے ہم آہنگ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا —— برخلاف اس کے مختصر افسانے میں ہوتا یہ ہے کہ بعض اوقات کوئی ایک معمولی سا واقعہ ہی پلاٹ کی صورت اختیار کر لیتا ہے —— اس واقعے میں چونکہ بظاہر کوئی پیچیدگی نہیں ہوتی اس لئے اس کے بیان میں کسی پیچیدہ اور پرپیچ انداز کو دخل نہیں ہوتا —— اس واقعے کے بیان میں ناول کی سی تفصیل ممکن نہیں کیونکہ یہ واقعہ بذاتِ خود زندگی کے کسی ایک لمحے سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس واقعے سے مختصر افسانے میں پلاٹ کی جو ترتیب عمل میں آتی ہے اس میں سادگی کا احساس ہوتا ہے —— لیکن اس سادگی میں پرکاری کا رنگ، وہ رمزیت اور ایمائیت بھرتی ہے جس کو مختصر افسانے کا فن کار کسی حال میں بھی اپنے آپ سے جدا نہیں کرتا۔ اس سے پلاٹ میں دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ پلاٹ کو پیش کرنے کا یہ رمزیاتی اور ایمائی انداز مختصر افسانے کو سپاٹ ہونے سے بچا لیتا ہے۔ کیونکہ پڑھنے والے کے فکری تقاضے اس سے پورے ہوتے ہیں —— ایک ایک فقرے اور ایک ایک لفظ سے اس کی تخئیل کو تحریک ہوتی ہے اور وہ خود اس میں اس تفصیل کو تلاش کر لیتا ہے جو ان الفاظ اور فقروں کے پردوں میں چھپی ہوتی ہے —— اس مختصر اور سادہ پلاٹ کی بنیاد حقیقت اور صداقت پہ

استوار ہونا یقینی ہے کیونکہ وہ واقعہ ذہن پر کسی گہرے اثر کے نتیجے میں مختصر افسانے کے فن کار کو متوجہ کرتا ہے اور پھر چونکہ اس کے حدود وسیع نہیں ہوتے اس لئے اس میں غیر فطری باتوں کے راہ پانے کا امکان ذرا کم ہی ہوتا ہے ——— پلاٹ کے محدود ہونے کے باعث اس کے نشیب و فراز پر فن کار کی توجہ زیادہ رہتی ہے ——— اس لئے وہ اس کی اہمیت کو ذہن نشین کرانے کے خیال کو پس پشت نہیں ڈالتا ——— یہی اس کا تخلیقی عمل ہے جو مختصر افسانے کے پلاٹ کو ان خصوصیات سے مالا مال کرتا ہے جو اس کے لئے کیا ناول اور کیا مختصر افسانہ ہر جگہ ضروری ہوتی ہیں ——— پلاٹ میں وحدت اور تسلسل ایک بنیادی چیز ہے۔ مختصر افسانے کے پلاٹ میں یہ وحدت اور تسلسل کی خصوصیت کچھ اور بھی نمایاں ہوتی ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ موضوع اور مواد محدود ہوتا ہے اور دوسرے ایک بات یہ بھی ہے کہ سادگی اور اختصار اس کو پیش کرنے کی بنیاد ہوتا ہے ——— ان حالات میں وحدت اور تسلسل کا باقی رکھنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ اسی لئے مختصر افسانے کے پلاٹ کی تشکیل میں فن کار سے اس کے تقاضے زیادہ ہوتے ہیں ——— بظاہر مختصر افسانے کے پلاٹ میں اس SUSPENSE کی گنجائش نسبتاً کم ہوتی ہے جو ناول کے پلاٹ میں واقعات یا کرداروں کے حرکات و سکنات سے پیدا ہوتا ہے۔ مختصر افسانے کے پلاٹ میں نہ تو واقعات زیادہ ہوتے ہیں اور نہ کرداروں کے حرکات و سکنات ہی کا ایسا کچھ زیادہ پتہ چلتا ہے۔ ناول کے برخلاف مختصر افسانے کے سارے پلاٹ ہی میں ایک SUSPENSE کی کیفیت ہوتی ہے ——— وہ SUSPENSE سے شروع ہو کر SUSPENSE ہی پر ختم ہوتا ہے ——— اور یہی مختصر افسانے کے پلاٹ کی نمایاں ترین خصوصیت ہے۔

اس پلاٹ میں کردار نمایاں نہیں ہوتے۔ زیادہ سے زیادہ کردار کا کوئی پہلو نمایاں ہوتا ہے ——— کسی کردار کی کوئی حرکت نمایاں ہوتی ہے ——— اسی لئے مختصر افسانے کے فن میں کردار نگاری کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے ——— بات یہ ہے کہ مختصر افسانے میں کردار تو محض چند لمحوں کے لئے منظر عام پر آتے ہیں۔ اس لئے ان کی صرف ایک جھلک دکھائی دیتی ہے ——— لیکن اس جھلک سے بھی ان کو پہچانا جا سکتا ہے۔ ان کے بارے میں ایک رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کردار میں کونسی خصوصیات ہیں ——— لیکن ظاہر ہے اس کی ساری تفصیل مختصر افسانے میں نہیں سما سکتی۔ اسی لئے مختصر افسانے میں کردار تو ملتے ہیں۔ ان کے کرداروں کی بنیادی خصوصیات کی وضاحت بھی ہوتی ہے لیکن ان کی ترجمانی میں بھی پلاٹ کی طرح تفصیل اور جزئیات کو دخل نہیں ہوتا ——— یہاں بھی کردار کی طرف کچھ اشارے ہوتے ہیں ——— ان اشاروں ہی کے سہارے کردار کی تصویر سامنے آتی ہے ——— یہاں تک کہ بعض ان افسانوں میں بھی جن کا موضوع ہی کوئی ایک مخصوص کردار یا اس کردار کی کوئی مخصوص ذہنی کیفیت ہوتی ہے، یہی اشاراتی کیفیت نمایاں نظر آتی ہے ——— یہی وجہ ہے کہ مختصر افسانے میں کردار نگاری کا انداز ناول سے بالکل مختلف ہے ——— ناول میں اشاراتی انداز کے بجائے توضیحی انداز ہوتا ہے جس سے کردار کی بہت واضح اور نمایاں تصویر ابھرتی ہے ——— مختصر افسانے میں ایسا نہیں ہوتا ——— وہاں تصویر ابھرتی نہیں۔ وہ سامنے آنے کے باوجود نظروں سے اوجھل رہتی ہے ——— ویسے جہاں بھی مختصر افسانے میں کرداروں کی خصوصیات پر روشنی ڈالی جاتی ہے وہاں کچھ ڈرامائی سا انداز ضرور پیدا ہو جاتا ہے اور کردار کی بنیادی خصوصیت کی طرف توجہ کو مرکوز کرنے کے لئے اس ڈرامائی انداز کا پیدا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ اس سے تخیل کو تحریک ہو اور اس طرح کردار کی وہ خصوصیات جو نظر سے اوجھل ہیں سامنے آسکیں ——— بہر حال مختصر افسانے میں کردار نگاری مقصد نہیں ذریعہ ہے ——— مختصر افسانے کا فن کار اپنے بنیادی خیال کی وضاحت کے لئے ان کو ذریعہ بناتا ہے ——— یہ حرکت افسانے کا بنیادی موضوع بھی ہو سکتی ہے لیکن اس کا مقصد کردار نگاری نہیں ہوتا۔ اسی لئے مختصر افسانوں میں ایسی کردار نگاری نظر نہیں آتی جس کی بنیاد تفصیل اور جزئیات ہو ——— لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ کردار کے افسانے لکھے ہی نہیں گئے ہیں ——— ایسا نہیں ہے ——— ہر چند مختصر افسانے میں ناول کی طرح کردار نگاری کوئی بنیادی حیثیت نہ رکھتی ہو لیکن ایسے افسانے

موجودہ دور میں ضرور لکھے گئے ہیں جن کی بنیاد بعض کرداروں کے مطالعے پر قائم ہے۔ محمد حسن عسکری کا افسانہ 'چائے کی پیالی'، قمر کا 'مونوبل' اور ممتاز مفتی کے بیشتر افسانے اس قسم کے افسانوں کے بہت اچھے نمونے ہیں ——— یہ افسانے اور ایسے ہی بہت سے دوسرے افسانے کرداروں کے نفسیاتی مطالعے پر مبنی ضرور ہیں — لیکن ان میں بھی ان کرداروں کی زندگی کی ساری تفصیل نہیں ہوتی۔ صرف زندگی کے کسی ایک پہلو کا بیان ہوتا ہے جس سے ان پر روشنی پڑتی ہے — یا ان کی زندگی کے کچھ معاملات ان کے کردار کی بنیادی خصوصیات کو واضح کرتے ہیں ——— افسانے کا فن کار ان کو پیش کرتے ہوئے اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا ——— ان کرداروں کی زندگی کا جو پہلو پیش کیا جاتا ہے وہ خود انہیں بے نقاب کر دیتا ہے ——— جس بات کی طرف اشارے کئے جاتے ہیں وہ انہیں سامنے لاکر کھڑا کر دیتی ہے ——— اس لئے مختصر افسانے میں کردار نگاری کا بھی ایک مخصوص انداز ہے جس میں تمثیلی انداز اور اشاراتی زاویہ نظر بنیادی حیثیت رکھتا ہے ——— موجودہ دور کے بڑھتے ہوئے نفسیاتی شعور نے اس انداز کو مختصر افسانے کے فن میں کچھ اور بھی ابھارا ہے ——— اور آج جو مختصر افسانے کے فن میں کرداروں کی تصویر کشی نیا سے نیا انداز اختیار کر رہی ہے وہ اسی کا بنیادی نتیجہ ہے۔

پلاٹ اور کردار مختصر افسانے میں اپنی اپنی جگہ تو ایک حیثیت رکھتے ہیں لیکن ویسے ان دونوں کی کوئی بڑی فنی اہمیت نہیں ہے ——— ان کی بنیاد کسی نہ کسی مرکزی خیال پر استوار ہوتی ہے ——— یہ کسی نہ کسی بنیادی نقطۂ نظر کے گرد گھومتے ہیں ——— بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ مختصر افسانے کے فن کار کا نقطۂ نظر ہی پلاٹ اور کردار کی عمارتوں کو کھڑا کرتا ہے ——— اسی لئے مختصر افسانے کے فن میں نقطۂ نظر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ نقطۂ نظر ہی درحقیقت افسانے کا موضوع ہوتا ہے ——— پلاٹ اور کردار وغیرہ کی حیثیت تو اس میں ضمنی ہوتی ہے ——— زندگی میں ان گنت واقعات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں لیکن افسانے کا فن کار ان میں سے ہر ایک کو اپنے فن کا موضوع نہیں بناتا۔ وہ تو اسی واقعے کو اپنا موضوع بناتا ہے جس کو اس کے بنیادی نقطۂ نظر کے ساتھ مطابقت ہوتی ہے جو اس کے نظریۂ حیات کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے ——— اس کا سبب یہ ہے کہ پلاٹ اور کرداروں میں بذاتِ خود اس کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی ——— کیونکہ اس کا فن اس بات کی اجازت ہی نہیں دیتا ——— اس کا فن تو اپنے محدود ہونے کے پیش نظر اس سے صرف اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ زندگی کے کسی اہم پہلو کی طرف توجہ کرے اور اہم پہلو اس کے نزدیک اپنے بنیادی خیال، نقطۂ نظر اور نظریۂ حیات سے زیادہ کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی۔ اس لئے مختصر افسانے کو اسی نقطے سے اپنے فن کا ارتقائی سفر شروع کرنا پڑتا ہے اور یہی اس کے سفر کی آخری منزل بھی ہوتی ہے ——— ناول کے فن کار کی طرح مختصر افسانے کے فن کار کو یہ موقع نہیں ملتا کہ وہ کرداروں کے ذریعے یا کہانی کے نشیب و فراز کے توسط سے اپنے مقصد کی وضاحت کرے کیونکہ اس محدود میدان میں اس کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ اپنے نقطۂ نظر کی طرف سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا اور یہی سبب ہے کہ اس کے ہر فقرے اور ہر لفظ میں ایسی تہیں ہوتی ہیں جن میں سے اس کا نقطۂ نظر اپنے آپ کو رونما کرتا رہتا ہے ——— ناول میں نقطۂ نظر کی وضاحت مختلف طریقوں سے ہو جاتی ہے ——— کہیں کردار اس کو واضح کر دیتے ہیں، کہیں خود ناول کا فن کار اس پر اظہارِ خیال کرنے لگتا ہے۔ مختصر افسانے کا فن اس کو سہار نہیں سکتا ——— مختصر افسانے میں اس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس میں نقطۂ نظر پر بحث نہیں ہو سکتی ——— اس پر وعظ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے اس پہلو کی طرف جگہ جگہ اشارے ہوتے ہیں ——— اور ان اشاروں کا سلسلہ شروع سے آخر تک جاری رہتا ہے ——— مختصر افسانہ اسی لئے تو کچھ نہ کہنے کے باوجود بہت کچھ کہتا ہے اور اس سے دلچسپی لینے والے کچھ نہ سمجھنے کے باوجود بہت کچھ سمجھتے ہیں۔

مختصر افسانے میں بظاہر تو فضا اور ماحول کا بیان بہت ہی کم ہونا چاہئے۔ کیونکہ اس میں بیانیہ انداز اختیار کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ لیکن چونکہ جس بنیادی نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر اس کی تخلیق کی جاتی ہے وہ کوئی نہ کوئی پس منظر ضرور رکھتا ہے۔ اس کی کوئی نہ کوئی بنیاد ضرور ہوتی ہے ——— اور انہی کے سہارے اس میں فضا اور ماحول کے نقوش ابھرتے ہیں ——— اس فضا اور ماحول میں حد درجہ موانست پیدا کرنا اور پڑھنے والے کے لئے ان کو قابلِ قبول بنانا فن کار کا ایک بہت ہی اہم کام ہے ——— مختصر افسانے کے فن نے اس کام کو انجام تو دیا ہے لیکن چونکہ ناول کے مقابلے میں اس کا

میدان محدود ہے اس لئے فضا اور ماحول کی ترجمانی میں ناول کی سی بات افسانے میں پیدا نہیں ہو پاتی ——— ویسے مختصر افسانے کا فن کار اپنے مخصوص انداز سے فضا اور ماحول کا احساس ضرور دلاتا ہے، اس کی طرف متوجہ ضرور کرتا ہے ——— یہاں بھی چونکہ اس کے پاس تفصیل اور جزئیات کی گنجائش نہیں ہوتی اس لئے وہ صرف اشاروں کے ذریعے فضا اور ماحول کی تصویر کشی کرتا ہے لیکن یہ تصویر کشی بڑی ہی موثر ہوتی ہے۔ کیونکہ پڑھنے والے کا ذہن اور شعور برابر اس سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔ لیکن مختصر افسانے میں اس فضا اور ماحول کی ترجمانی بذاتِ خود اہمیت نہیں رکھتی ——— کیونکہ وہ تو فن کار کے بنیادی نقطۂ نظر کو اُبھارتی ہے۔ اس کے نقوش کو نمایاں کرتی ہے۔ اس لئے خود اس کا کوئی مقصد نہیں ہوتا ——— چنانچہ مختصر افسانوں میں جہاں جہاں فضا اور ماحول کی ترجمانی ملتی ہے وہاں فن کار بعض بنیادی خیالات کو اشاروں میں واضح کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے ——— لیکن یہ فضا اور ماحول ناول کی طرح مختصر افسانے کا بنیادی جزو نہیں ہوتے ——— یہ بھی کرداروں کی طرح ایک ذریعہ ہیں ——— ویسے موجودہ دور میں ایسے مختصر افسانے لکھے ضرور گئے ہیں جن میں ماحول کی ترجمانی اور فضا کی عکاسی نمایاں نظر آتی ہے ——— لیکن ان میں بھی فن کار کے پیشِ نظر کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ کسی نہ کسی بنیادی خیال کی ترجمانی ضرور ہوتی ہے ——— بہر حال مختصر افسانے میں فضا اور ماحول کی ترجمانی سے احساس اور تاثر میں اضافہ ہوتا ہے ——— اور اس طرح پلاٹ، کردار اور نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ یہ ترجمانی بھی مختصر افسانے کے فن کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔

پلاٹ، کردار، نقطۂ نظر، فضا اور ماحول، ان تمام عناصر کی اہمیت مختصر افسانے کے فن میں مسلّم ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس میں سارا کھیل اسلوب، اندازِ بیان اور طرزِ ادا کا ہوتا ہے ——— یوں تو ہر صنفِ ادب میں اسلوب، اندازِ بیان اور طرزِ ادا کو نمایاں جگہ حاصل ہے لیکن مختصر افسانے کے فن میں اس پہلو کو کچھ زیادہ ہی اہمیت حاصل ہے ——— بات یہ ہے کہ مختصر افسانے کا میدان بہت محدود ہوتا ہے اس لئے اس سے عہدہ برآ ہونے کی خاطر فن کار کو ایک ایسا اندازِ بیان اختیار کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے جو اس اختصار سے مطابقت رکھتا ہو لیکن جس سے اظہار و ابلاغ میں کسی قسم کی اُلجھن پیدا نہ ہو۔ گویا مختصر افسانے کا فن کار ایک ایسے اسلوب کی تشکیل کرتا ہے جس میں محدود ہونے کے باوجود ایک وسعت ہو۔ اسی لئے مختصر افسانے میں شاعری کی طرح الفاظ کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے ——— ایک ایک لفظ اور اس کے استعمال سے مختصر افسانے کا فن کار بڑے بڑے کام لیتا ہے ——— بعض اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ صرف ایک لفظ ہی پر سارے افسانے کی بنیاد ہوتی ہے۔ اگر اسی ایک لفظ کو ہٹا لیا جائے تو افسانے کا وجود ہی قائم نہیں رہتا ——— کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ الفاظ افسانے میں اپنا اصل مفہوم بدل دیتے ہیں اور فن کار کا سحر کار قلم اس میں نئی معنویت پیدا کر دیتا ہے ——— یہی حال جملوں کی ساخت اور فقروں کی دروبست کا ہوتا ہے ——— اس کی بھی مختلف صورتیں مختصر افسانے میں نظر آتی ہیں ——— فن کار ان سب سے اپنے مقصد کے پیشِ نظر کام لینے کی کوشش کرتا ہے ——— اسی لئے زبان و بیان پر پوری قدرت مختصر افسانے کے فن کار کے لئے از بس ضروری ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو ساری تکنیک اس سے متاثر ہوتی ہے ——— لیکن مختصر افسانے میں زبان و بیان کی اس قدرت کا مطلب محض انشا پردازی کا خیال ہی نہیں ہوتا، کیونکہ مختصر افسانے کے فن میں انشا پردازی کی گنجائش نسبتاً کم ہوتی ہے۔ وہاں تو ہر لفظ خیال سے تعلق رکھتا ہے۔ ہر فقرے کو موضوع کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے۔ ہر جملہ مراد کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے ——— اسی لئے تو مختصر افسانے میں ایک لفظ بھی بیکار استعمال نہیں ہوتا ——— صرف انشا پردازی کے خیال سے اگر کوئی فن کار ایک لفظ بھی زیادہ استعمال کرے تو وہ افسانے میں بُری طرح کھٹکتا ہے ——— چنانچہ مختصر افسانے میں شاعری کی طرح الفاظ اپنی بہترین ترتیب کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں ——— ان الفاظ میں تہیں ہوتی ہیں ——— یہ پہلو دار ہوتے ہیں ——— ان میں جب تک ہیرے کی سی تراشی ہوئی کیفیت نہ ہو، یہ خاطر خواہ اثر نہیں کرتے۔ یہی سبب ہے کہ مختصر افسانے کے فن کار کو ایسا کرنے میں بڑی ہی چابکدستی سے کام لینا پڑتا ہے ——— لیکن اس میں کسی کاوش کو دخل نہیں ہوتا ——— اس کی یہ کوشش شعوری نہیں ہوتی ——— موضوع کی مناسبت سے اس کا فن کارانہ شعور اس صورتِ حال کو پیدا کر لیتا ہے ——— موضوع اور مراد کی بنیادی خصوصیات مختصر افسانے میں اسلوب اور اندازِ بیان کو پیدا کرتی ہیں ——— اور اسی لئے وہ افسانے کے ہر فن کار کے یہاں ایک مخصوص سانچے میں ڈھلا ہوا نظر آتا ہے۔

ان تمام عناصر کی بنیادی خصوصیات جب یکجا ہوتی ہیں تب مختصر افسانے کے فن کی تشکیل ہوتی ہے اور وہ ایک مخصوص ہیئت اختیار کرتا ہے۔ اس ہیئت میں بنیادی طور پر اختصار ہے جو مختصر افسانے کے ساتھ مخصوص ہے اور جس کی وجہ سے پلاٹ، کردار اور اسلوب سب کے سب اس میں ایک نیا روپ اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ——— یہ نیا روپ اس فن میں ایک انفرادیت کو پیدا کرتا ہے ——— اس انفرادیت کے سہارے وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہوتا ہے اور اسے کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی ——— بقول لیوکس مختصر افسانے کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے اور اس کے لئے یہ ضروری بھی ہے کہ وہ اپنی ایک دنیا پیدا کرے "——— چنانچہ وہ اپنی دنیا پیدا کرتا ہے اور بذاتِ خود ایک دنیا بن جاتا ہے۔

مختصر افسانے کی اس دنیا میں جو چیز سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ اس کے تاثر کی وحدت ہے۔ اس کی ہیئت چونکہ فروعی یا ضمنی باتوں کے اظہار کی اجازت نہیں دیتی اس لئے صرف مرکزی خیال کو پیشِ نظر رکھنا اور مختلف زاویوں سے اس پر روشنی ڈالنا اس کے پیشِ نظر ہوتا ہے طور پر مرکزی خیال بھی پیچیدہ نہیں ہوتا۔ اس میں بھی وسعت اور ہمہ گیری نہیں ہوتی اس لئے مختصر افسانہ اس محدود دائرے سے باہر نہیں نکلتا۔ فن کار اسی بنیادی خیال پر اپنی توجہ مرکوز رکھتا ہے ——— چونکہ خیال ایک سے زیادہ نہیں ہوتا اس لئے اس میں بذاتِ خود بھی ایک وحدت ہوتی ہے۔ اور جب فن کار اس کو ایک وحدت سمجھ کر اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو خود اس کے اظہار میں بھی ایک وحدت کی خصوصیت نمایاں ہونے لگتی ہے ——— بلکہ شعوری طور پر وہ اس حقیقت کو محسوس کرتا ہے کہ یہ وحدت پڑھنے والے پر خاطر خواہ اثر کرے۔ چنانچہ تاثر کی یہ وحدت مختصر افسانے کا بڑا اہم جزو بن جاتی ہے ——— مختصر افسانے کے تمام نقاد اس خیال پر متفق ہیں کہ اس میں شروع سے آخر تک تاثر کی یہ وحدت کارفرما ہونی چاہیئے ——— ایڈگر ایلن پو جو مختصر افسانے کا نقاد بھی تھا اور جس نے خود بھی مختصر افسانے میں تجربے کئے ہیں۔ اس نے تو اس حد تک کہہ دیا ہے کہ مختصر افسانے میں سب سے زیادہ جس چیز کو اہمیت حاصل ہے وہ تاثر کی وحدت ہے ——— اور اس کا یہ خیال ایسا کچھ غلط نہیں ہے ——— کیونکہ تاثر کی اس وحدت کے بغیر اس کا مقصد پورا نہیں ہوتا ——— اس کے بغیر اس کی ہیئت خاطر خواہ اثر نہیں کرتی۔ چنانچہ اگر یہ خصوصیت مختصر افسانے کے فن میں نہ ہو تو وہ مختصر افسانے کے فنی حدود سے باہر نکل جاتا ہے ——— اور جمالیاتی احساس کی تسکین کا باعث نہیں بنتا۔ لیکن مختصر افسانہ چونکہ کسی ایک واحد مقصد کو سامنے رکھ کر تخلیق کیا جاتا ہے ——— اس لئے اس مقصد کی وحدت اس میں تاثر کی وحدت کو خود بخود پیدا کر دیتی ہے ——— یہی وجہ ہے کہ تاثر کی اس وحدت کا خیال شعوری نہیں ہوتا ——— وہ موضوع اور صورت، مواد اور ہیئت کی ہم آہنگی کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔

تاثر کی اس وحدت کے ساتھ ساتھ مختصر افسانے کے فن میں اس کی رمزیت اور ایمائیت بھی کچھ کم اہم نہیں ہوتی۔ ابتدا سے لے کر آخر تک اس میں ایک ایمائی انداز کا ہونا ضروری ہے ——— اس کا آغاز کسی ایسے واقعے سے ہوتا ہے جو حقیقت پر مبنی ہوتا ہے لیکن جس کو زندگی کے درمیان سے لے لیا جاتا ہے اور پھر اس پر جس طرح روشنی ڈالی جاتی ہے وہ شروع سے آخر تک اس کو پوری طرح واضح نہیں ہونے دیتا ——— فن کار اس کو واضح کرنے کے لئے صرف اشاروں سے کام لیتا ہے ——— اور خاتمے پر یہ پُراسرار ایمائی کیفیت کچھ اور بھی بڑھ جاتی ہے اور پڑھنے والا سوچتا رہ جاتا ہے ——— بے شمار پہلو غور کرنے کے لئے اس کے سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں ——— اگر افسانے میں یہ خصوصیت نہ ہو تو اس کو فنی اعتبار سے مختصر افسانہ نہیں کہا جا سکتا۔ انگریزی کے مشہور افسانہ نگار اور انشا پرداز اسٹیونسن نے اس کو بڑی خوبی سے اپنے ایک خط میں واضح کیا ہے ——— سر سڈنی کالون نے اس کے ایک افسانے پر یہ رائے ظاہر کی تھی کہ اس کا اختتام ٹھیک نہیں ہے اس لئے اس کو بدل دینا چاہیئے چاہیئے ——— اس کے جواب میں اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ یہ ہے کہ:

"میں اس طرح نہیں لکھتا۔ میرے لکھنے کا یہ انداز نہیں ہے کہ ہر بات کو پوری طرح واضح کر دوں ——— میں تو کہانی میں ایک اثر سے بہت سے اثرات پیدا کرتا ہوں ——— اگر میں اپنے اس افسانے کے خاتمے کو تبدیل کر دوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ از سر نو اس کا آغاز کروں ——— افسانہ تو

ایک مستقل وحدت ہوتا ہے ——— اس لئے مجھے تو اس کا خیال بھی نہیں ہو سکتا کہ میں اس کے اختتام میں کوئی تبدیلی کروں گا ——— کیونکہ میرے خیال میں تو افسانے کی ابتدا اور اس کے خاتمے میں وہی تعلق ہے جو گوشت اور ہڈی میں ہوتا ہے ——— اس لئے ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" اس کے ساتھ ہی ساتھ اسی خط میں اس نے اس بات پر خاص طور پر زور دیا ہے کہ افسانے کو مجموعی طور پر بہت واضح نہیں ہونا چاہئے۔ اس میں تو ایک رمز و ایما کی کیفیت سب سے زیادہ ضروری ہے ——— اور یہ خیال صحیح ہے کیونکہ جب تک افسانے میں یہ ایمائی کیفیت نہ ہو وہ اپنی طرف متوجہ نہیں کرتا۔ اس ایمائی انداز سے ایک طرف تو دلچسپی برقرار رہتی ہے اور دوسرے افسانے کے معنوی پہلو دل میں وسعت کا احساس بڑھتا ہے ——— لیکن اس رمز و ایمائیت میں جو پہلو سب سے زیادہ اہم ہے وہ جمالیاتی ہے ——— ہر فن میں کسی نہ کسی حد تک یہ ایمائی انداز احساسِ جمال کی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے۔ مختصر افسانے کے فن میں بھی اس کا مقصد یہی ہے ——— اسی لئے تو مختصر افسانے کے فن میں اس کو اس درجہ اہمیت دی جاتی ہے۔ ایک مصنف نے تو اپنی کتاب میں مختصر افسانے کے اختصار کا سبب اسی ایمائی اور رمزیاتی کیفیت کو بتایا ہے ——— اس کے خیال میں وہ مختصر افسانہ جو واقعی فن کاری کا اعلیٰ نمونہ ہو' اس میں تو یہ خصوصیت اپنے شباب پر نظر آتی ہے ——— اس خصوصیت کو وہ VERY CURIOUS HUNTING AND SUGGESTIVE QUALITY سے تعبیر کرتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس کا یہ خیال صداقت پر مبنی ہے۔

اس ایمائی کیفیت اور رمزیاتی انداز کا اثر مختصر افسانے میں یہ ہوتا ہے کہ اس میں شروع سے آخر تک ایک احساسِ تحیّر کی لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے ——— اور یہ احساسِ تحیّر مختصر افسانے کے فن کے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ اس سے پڑھنے والا اس کی طرف پوری طرح متوجہ رہتا ہے ——— اور ساتھ ہی افسانے میں اس کی دلچسپی قائم رہتی ہے ——— یہ احساسِ تحیّر پڑھنے والے کے شعور میں تحریک پیدا کرتا ہے۔ اس کے تخیل کی رو اس سے تیز ہوتی ہے ——— اور وہ افسانے میں زیادہ دلچسپی لیتا اور اس سے زیادہ متاثر ہوتا ہے ——— اس طرح یہ احساسِ تحیّر ان تقاضوں کو پورا کرتا ہے جو مختصر افسانے کے فن کار کو اپنے پڑھنے والوں سے ہوتے ہیں ——— یہی وجہ ہے کہ افسانے کے پہلے جملے سے یہ تحیّر کا احساس پڑھنے والے پر چھانے لگتا ہے اور جیسے جیسے افسانے میں ارتقائی کیفیت پیدا ہوتی جاتی ہے یہ احساسِ تحیّر تیز سے تیز تر ہوتا جاتا ہے ——— اور اس کا منتہا افسانے کا اختتام ہوتا ہے ——— گویا افسانہ احساسِ تحیّر سے شروع ہو کر احساسِ تحیّر ہی پر ختم ہوتا ہے ——— اور آخر تک پہنچتے پہنچتے اس میں حد درجہ شدت پیدا ہو جاتی ہے ——— لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مختصر افسانے کی تکنیک اس میں پیش کئے ہوئے کسی مسئلے کو حل نہیں ہونے دیتی اور ہر بات کو زیادہ سے زیادہ الجھا دیتی ہے۔ ایسا نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مختصر افسانہ تخیل پر پہرے نہیں بٹھاتا۔ جو مسائل اس کا موضوع ہوتے ہیں وہ پڑھنے والے کے ذہن میں حل ہوتے ہیں ——— اس کا تخیل انہیں حل کرتا ہے ——— ان کو حل کرنے ہی کے لئے تو اس میں احساسِ تحیّر کی تکنیک، استعمال کی جاتی ہے ——— ایک نقاد نے بڑی عمدہ بات کہی ہے کہ مختصر افسانے کا فن کار اپنی طرف سے بہت کم دیتا ہے لیکن اپنے پڑھنے والوں سے بہت زیادہ کا تقاضا کرتا ہے۔

یہ عناصر جب تک موجود نہ ہوں مختصر افسانہ فن کے حدود میں داخل نہیں ہوتا ——— یہی عناصر تو اس فن کی بنیاد ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مختصر افسانے کا فن جامد اور غیر متحرک ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ——— بس ان عناصر کو یکجا کر دینے ہی سے اس کی فنی تشکیل عمل میں آجاتی ہے ——— یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ مختصر افسانے کے فن کی مختصر سی تاریخ بتاتی ہے کہ اس میں شروع ہی سے تغیرات کا ایک سلسلہ جاری رہا ہے اور اس نے وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے حالات کے زیرِ اثر نئے نئے رنگ بدلے ہیں ——— وہ اس طرح کہ اس فن میں ہمیشہ سے رنگا رنگ تجربات کا سلسلہ جاری رہا ہے ——— اپنی محدود دنیا میں رہ کر اس نے

ان تجربات کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے — لیکن ان تجربات نے اس کی بنیادی فنی خصوصیات پر پانی نہیں پھیرا ہے —— ان کو ختم نہیں کیا بلکہ اس فن میں نئے نئے گل کھلائے ہیں اور اس کے نتیجے میں یہ فن ترقی کے نئے امکانات سے آشنا ہوا ہے۔ مختصر افسانہ جو اوّل اوّل صرف کسی واقعہ اور کسی خاص جذبے کا بیان ہوتا تھا، وہ وقت کے ساتھ ساتھ اس طرح بدلا کہ اس میں کردار کی طرف بھی توجہ کی جانے لگی۔ کسی حد تک تفصیل و جزئیات کو بھی دخل ہونے لگا —— اور اس کے نتیجے میں مختصر افسانے نے کہیں کہیں طویل مختصر افسانے کی صورت بھی پیدا کر لی۔ کہیں کہیں وہ محض کرداروں کا ایک خاکہ بھی بن کر رہ گیا —— کہیں کہیں واقعات کے فن کارانہ بیان نے اسے "رپورتاژ" بھی بنا دیا۔ اور کہیں کہیں زندگی سے گہری دلچسپی اور اس کے اظہار نے اسے مضمون اور انشائیہ کی شکل بھی دے دی —— غرض یہ کہ بدلتے ہوئے حالات کے زیرِ اثر اس نے بہت سی شکلیں بدلیں لیکن اس کے باوجود وہ مختصر افسانہ رہا۔ کیونکہ ان تجربات کے باوجود اس نے ان خصوصیات کو خیرباد نہیں کہا جو مختصر افسانے کے فن کا بنیادی حصّہ ہوتی ہیں —— اس میں وہ تمام عناصر ان حالات میں بھی برقرار رہے۔ جب وہ مختصر افسانے سے بڑھ کر "طویل مختصر افسانہ" ہو گیا تب بھی وحدتِ تاثر باقی رہی، رمزیاتی اور ایمائی انداز باقی رہا۔ جب اس نے خاکے کی صورت اختیار کر لی تب بھی یہ عناصر اس کے دم کے ساتھ رہے اور جب وہ "رپورتاژ" ہو گیا تب بھی ان عناصر کو اس نے نظر انداز نہیں کیا —— اسی لئے اس میں فنی اعتبار سے کوئی ایسی انقلابی تبدیلی نہیں ہوئی جو اس فن کی صورت ہی کو بدل دیتی —— تجربات کا سلسلہ جاری رہا لیکن اس کی فنی اقدار کو ان سے ٹھیس نہیں لگی —— اور یہ فن ان تجربات کے باوجود ترقی کی راہوں پر گامزن رہا۔

مختصر افسانے کے فن کی بنیادی خصوصیات جو تجربات کے ہوتے ہوئے بھی اس کے دم کے ساتھ رہتی ہیں ان کو سمجھنے اور ان کی اہمیت کو محسوس کرنے کے لئے ایک مخصوص ذہنی تربیت کی ضرورت ہے اور یہ ذہنی تربیت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک نئے حالات سے مطابقت پیدا نہ کی جائے —— نئے حالات سے مطابقت نئے جمالیاتی احساس کا شعور عام کرتی ہے —— بدلتی ہوئی فنی قدروں کی پاسداری سکھاتی ہے اور مختصر افسانے کا فن ان سب کا تقاضا کرتا ہے —— وہی لوگ اس سے دلچسپی لے سکتے ہیں جن کے پاس بدلتے ہوئے حالات کے زیرِ اثر بدلتے ہوئے مذاق کا شعور ہے —— جو یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی آج حد درجہ پیچیدہ ہو گئی ہے اور اس کو برتنے اور بسر کرنے کے لئے بلند تخیل کی ضرورت ہے تاکہ اس کے نشیب و فراز کو صحیح طور پر سمجھا جا سکے —— جن کے پاس اس حقیقت کا شعور ہے کہ موجودہ دور کے پیچیدہ ماحول میں بیانیہ انداز سے کہیں زیادہ اشاروں اور کنایوں کی ضرورت ہے —— مختصر افسانے کا فن ایسے ہی افراد کا متقاضی ہے اور موجودہ چونکہ ایسے ہی افراد کا دور ہے اس لئے اس دور کو مختصر افسانے سے خاص مناسبت ہے —— زندگی کا آج جو عام انداز ہے اس میں اس صورتِ حال کے بدلنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا —— یہی وجہ ہے کہ مختصر افسانے کے لئے ترقی کی بہت سی راہیں کھلی ہوئی نظر آتی ہیں —— مختصر افسانے کے فن کو آج جس حسّاس ذہن اور تیز پڑھنے والے کی ضرورت ہے موجودہ زندگی میں اس کی فراوانی ہے —— اور اسی لئے اس کا مستقبل روشن اور تابناک ہے۔

اس مستقبل کو روشن اور تابناک بنانے میں ان فن کاروں کا ہاتھ بھی کچھ کم نہیں ہے جنھوں نے مختصر افسانے کے اس فن کو پروان چڑھانے میں نمایاں حصّہ لیا ہے اور جن کی تخلیقات نے افسانے کے ان فنی اصول اور مقتضیات کو برت کر اس سے دلچسپی لینے کی ایک فضا قائم کی ہے —— ان فن کاروں میں گوگل، ایڈگرایلن پو، ملویل، برٹ ہارٹے، او ہنری، چیخوف، موپاساں، ٹالسٹائی، گورکی، کیتھرین مینسفیلڈ وغیرہ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں —— روس میں گوگل اور امریکہ میں ایڈگرایلن پو سے مختصر افسانے کے اس فن کا آغاز ہوتا ہے —— گورکی نے یہ بات غلط نہیں کہی ہے کہ ہم سب (یعنی مختصر افسانے کے فنکار) گوگل ہی سے پیدا ہیں (WE ALL SPRING FROM GOGOL'S OVER)

COAT ——— گوگل نے افسانے کے فن کو آسمان سے اتارا اور اس کی بنیاد زمین پر رکھی ——— اسی لئے اس کے یہاں مختصر افسانے کے مخصوص انداز میں عمومی زندگی کی تصویریں ملتی ہیں ——— ایڈگر ایلن پو نے اس فن کو عوامی زندگی سے قریب تو نہیں کیا لیکن افسانے کے فن کو ٹیکنک سے درست کرنے کی کوشش ضرور کی ——— اور اس میں شک نہیں کہ اس کی یہ کوشش مختصر افسانے کے فن کے لئے ایک بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے ——— امریکہ میں اس کے بعد جو افسانے لکھے گئے ہیں ان سب پر اس کا اثر ہے ——— امریکی زندگی اس عرصے میں بدلی ہے اور اس میں تیزی پیدا ہوئی ہے ——— اس بدلتی ہوئی کیفیت نے وہاں ایڈگر ایلن پو کے بعد بہت سے افسانہ نگاروں کو پیدا کیا اور اس طرح فن کی روایت طویل، بہٹ ہارٹ اور او ہنری وغیرہ کے ہاتھوں میں نئی سے نئی شکلیں اختیار کر کے ترقی کی منزلیں طے کرتی رہی۔ پھر روس میں چیخوف نے اور فرانس میں موپاساں نے مختصر افسانے کی فنی روایت کو اپنی تخلیقی کاوشوں سے چار چاند لگا دئے ——— مختصر افسانے کے فن میں چیخوف اور موپاساں کے سے بلند مرتبہ فن کار ذرا مشکل ہی سے مل سکتے ہیں ——— چیخوف نے روسی عوام کی زندگی کو افسانے کا موضوع بنایا ہے اور ان کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی ایک ایسے انداز میں کی ہے جو بظاہر تو سیدھا سادہ ہے لیکن ذرا غور سے دیکھئے تو اس میں بہت سی تہیں نظر آتی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کہانیوں کے پیچھے چیخوف کی اپنی شخصیت زیادہ کام کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے ——— موپاساں کو اس کی فکر نہیں ہوتی ——— وہ تو جو کچھ دیکھتا ہے اس کو بیان کرتا ہے ——— اسے اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ اس کے کردار کیا کر رہے ہیں اور اس کے واقعات کا رخ کس طرف ہے ——— وہ جس طرف بھی جانا چاہتے ہیں وہ انہیں جانے دیتا ہے ——— اس لئے انسانی نفسیات کے ایسے اسرار و رموز اس کے افسانوں میں بغیر کسی کاوش کے کھلتے ہیں جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے ——— بہرحال چیخوف اور موپاساں نے ان پہلوؤں کو اس طرح افسانے میں سمویا ہے کہ اس سے فن کے لئے نئی راہیں نکلی ہیں ——— روس میں چیخوف کے بعد یہ فن ٹالسٹائی، تیر جنیف اور گورکی کے ہاتھوں میں پہنچا ہے ——— اور فرانس میں موپاساں کے بعد فلابیر، داؤدے اور اناطول فرانس وغیرہ فن کی اس روایت کو آگے بڑھاتے ہیں ——— ان سب میں اکثر ناول نگار ہیں لیکن ان میں سے بیشتر نے فنی اعتبار سے مختصر افسانے میں بھی اضافہ کیا ہے ——— گورکی ان سب میں سب سے بڑا فن کار ہے ——— وہ انقلابی تھا اور اس کی زندگی کے انقلابی انداز نے اس کے فن میں بھی انقلابی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ گورکی کے مختصر افسانوں کا کمال یہ ہے کہ مجموعی طور پر تو وہ زندگی کے اہم پہلوؤں کو پیش کرتے ہی ہیں لیکن ویسے اس کے افسانوں کا ایک ایک لفظ منہ سے بولتا ہوا نظر آتا ہے ——— اس کے فقروں کی ایک ایک بندش کچھ کہتی ہوئی سنائی دیتی ہے ——— انگلستان میں مختصر افسانے کو ایسا کچھ زیادہ فروغ نصیب نہیں ہوا لیکن انگریزی زبان میں ایک افسانہ نگار ایسی ضرور پیدا ہوئی ہے جس کو چیخوف کا معنوی شاگرد کہا جا سکتا ہے ——— انگریزی افسانے میں نیوزی لینڈ کی کیتھرین مینسفیلڈ کی ویسے اپنی ایک انفرادی حیثیت ہے لیکن اس کا مزاج چیخوف کے فن سے مناسبت رکھتا ہے اس لئے اس کے یہاں چیخوف کے فن کے سے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں ——— غرض افسانے کے فن نے ان فن کاروں کے ہاتھوں ترقی کی ان گنت منزلیں طے کی ہیں اور ان کے بعد ایسے ہی بہت سے فن کاروں نے اس کو ترقی سے ہمکنار کرنے میں بڑا کام کیا ہے ——— ہر ملک کے ادب میں ایسے فن کاروں کے سلسلے ملتے ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک فن کار کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح مختصر افسانے کے ان فن کاروں سے ضرور ملتا ہے جو صحیح معنوں میں اس فن کے معمار ہیں ——— مختصر افسانے کے فن کار، چاہے وہ کسی نظریے سے تعلق رکھتے ہوں، ان فن کاروں میں سے ہر ایک کو مختصر افسانے کے فن کا امام تسلیم کرتے ہیں ——— اس لئے افسانے کا ہر فن کار، خواہ وہ کسی ملک کا کیوں نہ ہو، ان سے اکتساب فیض کرنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتا ہے ——— یہی وجہ ہے کہ ان کے فنوں نے مختصر افسانے کے فن پر جو اثرات چھوڑے ہیں ان میں ایک ہمہ گیری ہے۔ کوئی شعوری طور پر چاہے بھی تو ان اثرات سے دامن نہیں بچا سکتا ———

یہ دور مختصر افسانے کا دور ہے کیونکہ آج کل کی زندگی کے حالات اس فن سے مطابقت رکھتے ہیں ——— بدلتے ہوئے ماحول کی رفتار اس فن سے پوری طرح ہم آہنگ ہے ——— اس لئے مختصر افسانے کا فن، اور جن فن کاروں نے اس فن کو صحیح معنوں میں فن بنایا، نئی تہذیب میں اتنی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں کہ تہذیب، معاشرت، ادب اور فن، فلسفہ اور جمالیات سے دلچسپی رکھنے والا کسی حال میں بھی ان سے چشم پوشی نہیں کر سکتا ——— کیونکہ مختصر افسانے کا فن بہرصورت ایک نئی تہذیب اور معاشرت کا نقیب، ادب اور فن کے نئے میلانات کا عکاس اور فلسفہ و جمالیات کی نئی قدروں کا ترجمان ہے ——— اور اس فن کو اسی زاویے سے دیکھنے کی ضرورت ہے، ورنہ اس کے خط و خال کا صحیح اندازہ جوئے شیر لانے سے کم مشکل نہیں!

مغربی افسانہ کا اثر اُردو افسانہ پر

ممتاز شیریں

چیخوف اور موپاساں! ــــــــــ مغربی افسانہ کے ذکر کے ساتھ فوراً یہ دو بڑے نام ہمارے ذہن میں آتے ہیں۔ یہ دو نام جو آج بھی مختصر افسانہ کی تاریخ میں سب سے اہم مانے جاتے ہیں۔ اور سچ پوچھئے تو صحیح معنوں میں جدید مختصر افسانہ کا آغاز چیخوف اور موپاساں ہی سے ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے ٹولسٹائے نے ایک مرتبہ چیخوف کو داد دیتے ہوئے کہا تھا؛

"چیخوف روسی موپاساں ہے"

ٹولسٹائے نے تو یہ لقب ازراہ تحسین عطا کیا تھا۔ لیکن آج نصف صدی بعد، دونوں فن کاروں کو پہلو بہ پہلو رکھ کر، ان کی ادبی حیثیت کو جانچا جائے، تو بہت ممکن ہے ہمیں یہ شبہ ہو کہ آیا چیخوف کے لئے روسی موپاساں کہلانا باعث تحسین ہے یا موپاساں کے لئے یہ زیادہ باعث فخر ہوگا۔ کہ موپاساں کو فرانسیسی چیخوف کہا جائے۔

بہرحال وقت کے اعتبار سے موپاساں کو چیخوف پر تھوڑی سی اولیت حاصل ہے۔ اور خود چیخوف کو موپاساں اور موپاساں کی حقیقت نگاری پسند تھی۔ اپنے ایک افسانے " A WOMAN'S KINGDOM " میں انھوں نے موپاساں کا ذکر یوں کیا ہے۔ اس افسانے کا ایک کردار ایک دوسری کردار اَینا سے کہتا ہے؛

"موپاساں، عزیز من، موپاساں کو پڑھو۔ اس کے ایک ایک صفحے میں روئے زمین کی ساری دولت سے زیادہ تمول ہے۔ اس کی ہر سطر میں ایک نیا افق ہے .... نرم و نازک روحانی محسوسات کے ساتھ ساتھ شدید طوفانی سنسنی خیز جذبات۔ شیطانی شہوت ..... نازک ریشموں کا جال ....."

اور اَینا اس لفاظی کی دھند کے پرے صرف ایک چیز دیکھ رہی تھی "زندگی! زندگی، زندگی، زندگی موپاساں کے ان زندگی ہے زندگی موپاساں کے ہاتھوں ڈھل کر افسانے بن جاتی ہے[1]"

---

[1] FAGNET نے یہ بات موپاساں کی اہمیت کو نظرانداز کرتے ہوئے کہی ہے۔ اور ان معنوں میں کہ زندگی اور حقیقت کو جیسی کچھ وہ نظر آتی ہے، بالکل اسی طرح پیش کر دینا سہل انگاری ہے۔ اور موپاساں کا اپنا کوئی فلسفہ، کوئی تصور حیات نہیں تھا، جو حقیقت میں اور معنی پیدا کر سکے۔ لیکن اسی بات کو ہم تعریفی معنوں میں بھی لے سکتے ہیں کہ زندگی موپاساں کے ہاتھوں ڈھل کر افسانے بن جاتی تھی۔

"چیخوف زندگی سے بھی بڑھ کر ہے۔"[1]

موپاساں براہِ راست بات کہنے کا عادی ہے۔ صاف سیدھے تیز تند انداز میں، موپاساں نے یوں افسانے تخلیق کئے جیسے صفائی سے زندگی کے ٹکڑے کاٹ لئے جائیں۔ چیخوف نے جیسے زندگی سے پرے ہٹ کر، کہیں دُور رہ کے، ایک ترچھے زاویے سے زندگی کو دیکھا، یونہی بظاہر بے خیالی میں غیر اہم، سیدھے سادے واقعات سمیٹ لئے اور انہیں بغیر کسی شعوری قرینے اور ترتیب کے اپنے افسانوں میں پیش کر دیا لیکن ان افسانوں میں زندگی یوں سمٹ آئی، جیسے ان میں زندگی کا عطر نچڑ گیا ہو۔

موپاساں کے افسانوں میں تیز بھڑکیلے جذبے ہیں، عمل ہے، تیزی ہے۔ آگ ہے۔ چیخوف کے افسانے ایک مدھم شبنمی فضا میں ملفوف ہوتے ہیں۔ ان میں عمل کے ساتھ ساتھ کیفیات اور احساسات ہیں۔ نازک گہرا احساس اور سارے افسانے پہ کہرے کی طرح چھایا ہوا دھیما دھیما غم اور لطیف مایوسی۔

موپاساں کے پاس "جسم" ہے۔ چیخوف کے پاس "رُوح"۔ یعنی موپاساں کے ہاں وہ فطری ہیجانی جذبات اور PASSIONS ہیں جن کا تعلق جسم سے ہے۔ اور چیخوف کے ہاں انسانی رُوح کی ٹیسیں۔

موپاساں کے ہاں حقیقت سخت ٹھوس شکل میں ملتی ہے۔ چیخوف کے ہاں یہ ایک روشن، سیال بہتی ہوئی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

موپاساں نے گویا تیز گاڑھے رنگوں میں زندگی کی مصوری کی، چیخوف کے رنگ، ہلکے، نرم اور لطیف ہوتے ہیں۔ SUBTILITY چیخوف کے فن کا کمال ہے۔

چیخوف اور موپاساں، ایک رُوسی دوسرا فرانسیسی، یہ دو بڑی قوتیں ہیں جو مغربی افسانے پر، لہٰذا ہمارے افسانے پہ بھی اثر انداز ہوئیں۔ دونوں برابر کے قد کے تھے۔ اگر ایک طرف چیخوف کے اچھے افسانوں ——————— WARD NO.6 ' THE STEPPE ' THE PARTY ' THE DARLING اور THE SCHOOL MISTRESS کو رکھا جائے اور دوسری طرف موپاساں کے اچھے افسانوں مثلاً DONLE DE SAIF ' MADEMOISELLE FIFI MAISON TELLER وغیرہ کو رکھا جائے تو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کس کا پلڑا بھاری ہے۔ دونوں افسانہ نویسی میں نئے اور نرالے طرز کے بانی اور موجد تھے۔ بر اعظم کے افسانوی ادب پہ دونوں کا اثر برابر کا تھا مگر دونوں کا اثر اپنی نوعیت میں متوازی نہیں مختلف بلکہ بڑی حد تک متضاد تھا کیونکہ دونوں صاحب طرز ادیب تھے، اور مختلف طرز کے ادیب۔

چیخوف اور موپاساں کا ہمارے افسانوی ادب پر بھی زبردست اثر پڑا ہے۔ افسانے کے یہ دونوں طرز، جن کے یہ دو استادانِ فن موجد تھے، اور جنہیں انہوں نے تکمیل تک پہنچایا بھی تھا، شروع ہی سے ہمارے افسانوی ادب میں رواج پائے، بلکہ ان دو مختلف طرز کے افسانوں کے سر فہرست نظر دوڑائیں تو ہم اپنے ادب میں بھی ایک موپاساں اور ایک چیخوف کو ڈھونڈ ہی نکالیں گے۔

موپاساں کو پہچاننے میں تو ہمیں چنداں وقت نہ ہوگی کیونکہ بھلا موپاساں کے طرز کا افسانہ نگار ہمارے ہاں منٹو کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟

چیخوف کی البتہ جھلکیاں کئی ایک ادیبوں میں ملتی ہیں۔ مثلاً بیدی، حیات اللہ انصاری، محمد حسن عسکری، غلام عباس۔ خصوصیت سے چیخوف کے افسانوں کی فضا، رنگ اور لہجہ (TONE) بیدی کے ہاں پائے جاتے ہیں۔

منٹو اور بیدی جو ہمارے دو صفِ اوّل کے افسانہ نگار ہیں، ان دونوں کی تحریروں میں ہم وہ فرق واضح پائیں گے جو چیخوف اور موپاساں کا فرق ہے۔ فن شخصیت کا اظہار ہے موپاساں اور چیخوف (اسی طرح منٹو اور بیدی) انسان کی حیثیت سے ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ چنانچہ فنکار چیخوف اور

---

[1] ولیم جیرارڈی: "چیخوف"۔

فن کار موپاساں کا فرق اسی فرق کا پرتو ہے۔

منٹو اور بیدی کا فرق چیخوف اور موپاساں کی طرح رویہ کا فرق ہے۔ منٹو کا رویہ اگر سنکی نہیں تو اپنے دوسرے دور کے افسانوں میں منٹو کا انسان کی انسانیت پر مکمل اعتماد نہ تھا وہ سنکی بالکل نہیں رہا، ایک حد تک سادی ضرور ہے۔ زندگی اور انسان کو اور انسان کے وحشیانہ ہیجانی جذبات عریاں کرنے میں اور اپنی تحریروں میں شوک (SHOCK) دھچکا پہنچانے میں منٹو کا رویہ موپاساں کی طرح تقریباً سادی ہے۔ اس کے برخلاف بیدی کا نہایت ہی ہمدردانہ اور مشفقانہ جیسے چیخوف کا۔

گو چیخوف کی نظر میں بھی زندگی میں اتنی ہی قنوطیت ہے کہ کوئی ادب قنوطیت میں زندگی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ چیخوف نے کہا تھا:-

"NO LITERATURE COULD OUTDO REAL LIFE IN CYNICISM"

لیکن چیخوف کی نظر ایک معالج کی نظر تھی۔ ایک معالج کے لئے دنیا میں کوئی چیز گندی نہیں۔ ایک ادیب کو چاہئے کہ اپنے داخلی ذاتی نقطۂ نظر کو چھوڑ کر ایک معالج کی سی معروضیت برتے اور یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ کوڑے کے ڈھیر بھی لینڈ سکیپ میں اتنی ہی اہمیت رکھتے ہیں اور انسان کے بڑے وحشی، ہیجانی جذبات بھی اتنے ہی فطری ہیں جتنے اچھے اور نیک جذبات"

موپاساں کی نظر زندگی اور انسانی سیرت کو جانچنے میں بہت تیز تھی لیکن موپاساں کی پیش کش میں خارجیت، علیحدگی اور معروضیت ہے۔ ایک فن کار کی علیحدگی اور معروضیت چیخوف میں بھی تھی۔ وہ لکھتے ہوئے اپنے موضوع میں ڈوب ڈوب جاتا تھا۔ اپنے کرداروں کے جذبات و احساسات، اور کیفیات کو اپنے آپ پر اس طرح طاری کر سکتا تھا جیسے وہ خود اسی تجربہ سے گزر رہا ہو۔ انسان کی حیثیت سے وہ اپنے کرداروں میں گھل مل جاتا تھا لیکن ایک فن کار کی حیثیت میں وہ علیحدگی برابر قائم رکھتا تھا جو ایک بڑے فن کار میں ہونی چاہئے۔ معالج کے رویہ میں ہمدردی کے ساتھ وہ سائنسی معروضیت بھی درکار ہے جو اسے مرض کا صحیح تجزیہ کرنے اور اس کے علاج کرنے میں مدد دیتی ہے۔ چیخوف کی ہمدردی نے کبھی رقت اور جذباتیت کی شکل اختیار نہیں کی۔ چیخوف اور موپاساں میں وہ دونوں باتیں ایک ساتھ موجود نہیں جو ای۔ ایم فارسٹر کی رائے میں ایک ادیب میں ایک ساتھ ہونی چاہئیں۔ یعنی احذبہ (PASSION) اور علیحدگی اور معروضیت (DETATCHMENT)-

زندگی کو دونوں نے سمجھا تھا۔ انسانی ذہنیت اور انسانی سیرت کی پیچیدگی تنوع اور رنگا رنگی دونوں کے حیطۂ نظر میں تھی۔

چیخوف نے زندگی کو بڑی آگاہی سے سمجھا۔ ان میں انسانوں کو سمجھنے کی بے پایاں صلاحیت تھی، انسانی مسرت کا عکس اتارنے کی نادر قدرت اور ہمدردی اور رحم کا بے پناہ جذبہ۔

موپاساں کو پڑھنے کے بعد بھی، مجموعی طور پر انسان کی یہ تصویر مرتب ہوتی ہے کہ انسان میں بدی ہے، بدصورتی ہے، غلاظت اور حیوانیت ہے، لیکن انسانیت پھر بھی خوبصورت ہے۔

منٹو کے ہاں بھی، خصوصیت سے منٹو کے دوسرے دور کے افسانوں میں، انسان کی یہی تصویر مرتب ہوتی ہے۔

منٹو کے موضوعات بھی موپاساں کی طرح انسان کے وحشیانہ، ہیجانی جذبات سے تعلق رکھتے ہیں۔ جنس، شہوانیت، ظلم، ایذا دہی قتل و خون۔ تیز ہیجانی جذبات۔ غیر معمولی واقعات اور غیر معمولی انوکھے کرداروں کے ساتھ منٹو نے چونکا دینے والے افسانے تخلیق کئے۔ بیدی کے ہاں تیز جذبات، غیر معمولی واقعات طوفانی حادثات شاذ ہی ملتے ہیں۔ روزمرہ کے معمولی سے معمولی واقعات، عام جذبات و احساسات، اور سیدھی سادھی حقیقت کو نرمی، لطافت اور پاکیزگی سے پیش کرنے کا ان میں چیخوف کا سا سلیقہ ہے۔ اور ان کے افسانوں کو یہ سیدھی سادھی حقیقت ہی لطیف اور دلکش بنا دیتی ہے۔

چنانچہ ان کے مشہور افسانے 'گرم کوٹ' کو لیجئے۔ اس افسانہ کے متعلق یہ افواہ پھیلائی گئی کہ یہ گوگول کے 'اوور کوٹ' کا چربہ ہے۔ مجھے تو اس میں گوگول والی کوئی بات نہ نظر آئی البتہ نچلے متوسط طبقے کے ایک معمولی گھر اور اس کے افراد کی، ان کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں، الجھنوں، دکھ درد اور مصیبتوں کی بے حد لطیف

ہمدردانہ پیش کش میں چیخوف کا رنگ چھایا نظر آتا ہے۔

یا پھر "لاجونتی" میں عورت کی شبیہہ دیکھئے۔ اس افسانہ میں جو فسادات سے متعلق اپنے انداز کا یکتا افسانہ ہے، عورت کی رُوح کے نازک تاروں کو کس طرح چھیڑا گیا ہے۔ لاجونتی کا شوہر ایک سیوک ہے اور اغوا شدہ عورتوں کو واپس لے آنے اور ان کے رشتہ داروں سے اچھا سلوک کروانے کی مہم اٹھا رکھی ہے۔ انسانی ہمدردی سے اس کا دل معمور ہے، وہ دل جو خود چوٹ کھایا ہوا ہے کیونکہ اس کی بیوی بھی اغوا کر لی گئی ہے۔ وہ جب اسے واپس مل جاتی ہے وہ اس سے آتنا نرم سلوک کرتا ہے جیسے وہ کانچ کی بنی ہوئی ہو اور ٹوٹ نہ جائے جیسے وہ لاجونتی ہو، اس کے پہلے ہی چوٹ کھائے ہوئے دل کو ٹھیس نہ پہنچے اور اس کی زخمی روح تڑپ نہ اٹھے۔ اس کے واپس ملنے کے بعد وہ اپنی بیوی کو دیوی پکارتا ہے اور دیوی ہی سمجھتا ہے۔ اور لاجونتی چاہتی ہے وہ اسے دیوی نہ سمجھے ایک کمزور عورت ہی سمجھے۔ اغوا کے دوران میں اس پر جو کچھ بیتی تھی اسے سننے سے یوں گریز نہ کرے۔ اسے سُن کر اس کے دل کا بوجھ ہلکا کرے اور اس کی زخمی روح پر مرہم رکھے۔

بیدی کے لاجونتی میں بھی وہی چیخوفی کیفیت پائی جاتی ہے۔ چیخوف کا فن ایک طرح سے انسانی نفسیات کا فن ہے، لیکن نفسیاتی اُن معنوں میں نہیں جن میں پروست کا فن نفسیاتی کہا جاتا ہے۔ بلکہ رُوح پر چھایا ہوا ہلکا سا غبار، درد کی ہلکی ہلکی ٹیسیں، وہ ناقابل عبور خلیج جو انسان انسان کے درمیان حائل ہے۔ ساتھ ساتھ رہتے ہوئے بھی وہ دُوری وہ بیگانگی، وُہ ناقابل بیان تنہائی جو انسان اپنے وجود اپنی روح میں محسوس کرتا ہے۔

لاجونتی بھی یہی تنہائی اپنی روح میں محسوس کرتی ہے۔

بیدی کے ہاں عورت یا لاجونتی ہے یا گرم کوٹ کی محبت کرنے والی بیوی شمی یا گرہن کی ستائی ہوئی ہندوستانی عورت ہو گی۔

منٹو کے ہاں وہ سوگندھی ہے، نیم ہے، کلونت کور ہے، موذیل ہے۔ اپنے تیز جذبات کے ساتھ جاندار پھڑکتی ہوئی، جس کے بیان میں وہی موپاساں والی کیفیت پائی جاتی ہے کہ اس تجربہ کا خاتمہ تک جس پر اس کا ذکر ہو، تازہ وگرم گوشت کی طرح پھڑکنے لگتا ہے:

"ہتک" کی سوگندھی میں منٹو نے بھی طوائف کے اندر چھپی ہوئی عورت کو پایا ہے اور اس کی روح کو چھوا ہے۔ لیکن سوگندھی بھی ایک فطری عورت ہے۔ تیز جذبات والی جو سیٹھ کی "او نہہ" کی توہین کا بدلہ مادھو کی توہین کر کے لیتی ہے۔ اپنے جذبات کا بخار اس پر نکالتی ہے۔ اور آخر میں سارے مردوں سے نفرت کے اظہار کے طور پر اپنے خارش زدہ کتے کو پہلو میں لپٹائے سو جاتی ہے۔

منٹو کے ایک تازہ افسانے "سڑک کے کنارے" میں البتہ عورت کی رُوح ہی رُوح ہے۔ ایک عورت اور ایک ماں کی زخمی تڑپتی ہوئی روح! لیکن منٹو نے اس افسانے میں بھی ایسا SITUATION پیدا کیا ہے کہ اس رُوح میں ایک طوفان ہے ایک ہلچل مچی ہوئی ہے۔ اس کے برخلاف لاجونتی کی رُوح میں ہلکی ہلکی ٹیسیں ہیں جنہیں وہ خاموشی سے چپ چاپ برداشت کر لیتی ہے۔

چیخوف کی ڈارلنگ بھی منٹو کے ہاں جانکی بن جاتی ہے۔

اور نچلے طبقے کا وہ سیدھا سادا کردار جو بیدی کے رحمٰن کے جوتے میں ہے، منٹو کے ہاں نیا قانون کا اُستاد منگو بن جاتا ہے۔

موضوع اور بنیادی رویہ کے فرق کے علاوہ انداز پیش کش اور افسانے کی تکنیک میں بھی موپاساں اور چیخوف کے طرز الگ الگ ہیں۔

موپاساں کے افسانے زندگی سے کاٹے ہوئے ایسے ٹکڑے ہیں جو بذات خود مکمل ہیں، ان میں ایک پلاٹ ہوتا ہے ایک آغاز ایک وسط، ایک منتہٰی، ایک ایسا منتہٰی جو افسانے کو واقعی اختتام تک پہنچائے یا ایک ایسا چونکا دینے والا موڑ جس سے ایک ضربہ کے ساتھ داستان کے ٹوٹ جانے کا احساس ہو۔ موپاساں کا افسانہ مناسب تراش خراش، تعمیر اور فنش کے ساتھ مکمل مختصر افسانہ ہے۔

چیخوف کی حقیقت نگاری، جیسا کہ ولیم جیرارڈی نے لکھا ہے، گوگول، ترگنیف، دستائوسکی اور ٹالسٹائے کی حقیقت نگاری کی ارتقائی صورت ہے۔ حقیقت نگاری دراصل زندگی کے خاص خاص اور نمایاں خدوخال کو اخذ کرنے سے عبارت ہے۔ ورنہ آرٹ کے فوکس کے باہر زندگی ایک بیکراں سمندر ہے۔ مبہم، دھندلی بغیر کسی شکل بغیر کسی ہیئت کے ایک بے پایاں وسعت۔ چیخوف کے افسانوں میں زندگی ایک خاص ہیئت کی قیدو بند میں

جکڑی نہیں جاتی۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ چیخوف کے افسانے تکنیک اور ہیئت سے بالکل بے نیاز ہوتے ہیں بلکہ یہ کہ ان میں ہیئت ہوتے ہوئے بھی محسوس نہیں کی جاسکتی۔

چیخوف کا فن اشارہ (IMPLICATION) کا فن ہے۔ چیخوف کے افسانوں کے اختتام کسی بات کو انجام تک نہیں پہنچاتے۔ افسانے کے آخر میں چیخوف جیسے کچھ کہتے کہتے رک سا جاتا ہے اور ہمیں حیران چھوڑ کے، ہم سے رخصت ہو جاتا ہے۔ بات ادھوری دیکھ کر پہلے تو ہم کچھ سمجھ نہیں پاتے لیکن پھر ہمیں کوئی اہم معنی خیز اشارہ، کوئی گہری حقیقت چھپی ہوئی مل جاتی ہے۔ جس سے افسانے کا انجام خود بخود ہمارے ذہن میں تشکیل پا جاتا ہے چیخوف کے افسانوں میں یہ ادھورے رہ جانے اور تکمیل نہ پانے کا احساس ہمیں ایک اور شدید احساس دلاتا ہے کہ یہ خارجی واقعات جو پیش آتے ہیں، دراصل بہت معمولی، غیر اہم اور چھوٹے چھوٹے ذرے ہیں اور اس حقیقت کا جسے زندگی کہتے ہیں محض ایک چھوٹا سا جزو ہیں۔ کوئی چیز بذات خود مکمل نہیں۔

چیخوف کے افسانوں میں شعریت بلکہ تغزل کی سی کیفیت پائی جاتی ہے، اور چیخوف کے افسانوں میں ترتیب اور تشکیل کا انداز موسیقی کا سا ہے۔

موپاساں کا افسانہ ہمارے ادب میں اپنی مکمل ارتقائی صورت میں (اسی طرز کا افسانہ اعظم کریوی جیسے افسانہ نگاروں کے ہاں اپنی خام معمولی صورت میں ملتا ہے) منٹو کا افسانہ ہے۔ ہمارے ہاں منٹو کے سوا کسی اور ادیب نے موپاساں کے طرز کو اس کامیابی سے نہیں اپنایا ہے۔

نہیں معلوم منٹو نے موپاساں کے اثر کو شعوری طور پر قبول کیا ہے یا نہیں۔ منٹو کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ منٹو کو بذات خود موپاساں یا کسی بھی مغربی ادیب کے اثر سے انکار تھا۔ یہ منٹو کی 'انا' تھی (اور یہ 'انا' منٹو کو بھاتی بھی تھی) جو کسی کے اثر سے سراسر منکر تھی۔ ورنہ یہ قرین قیاس ہے کہ منٹو نے پہلے پہل رسالوں کے روسی اور فرانسیسی نمبر مرتب کرتے ہوئے مغربی افسانہ کے اثر کو قبول کیا ہوگا۔ چنانچہ منٹو کے ایک آدھ افسانے میں گورکی کا اثر بھی ملتا ہے۔ دیوندر ستیارتھی نے اپنے منٹو پر طنزیہ افسانے "نئے دیوتا" میں یہ ظاہر کیا ہے کہ منٹو پر سامرسٹ ماہم کا بہت زیادہ اثر تھا۔ بلکہ ماہم سے زبردست ادبی عقیدت تھی۔ ممکن ہے موپاساں کا اثر بالواسطہ ماہم کے ذریعہ پڑا ہو کیونکہ سامرسٹ ماہم موپاساں کے عقیدتمندوں اور مقلدوں میں سے ہیں، بہرحال منٹو پر موپاساں کا اثر شعوری ہو یا غیر شعوری، براہ راست یا بالواسطہ منٹو موپاساں کے اس قدر قریب پہنچ گیا، جہاں تک سامرسٹ ماہم کی بھی رسائی نہ ہوئی۔

منٹو نے بھی موپاساں کی طرح زندگی کا زہر اس طرح چکھا تھا کہ اس کی تلخی کام و دہن سے اتر کر قلب و روح تک پہنچ گئی۔ لیکن پھر بھی منٹو نے موپاساں کی طرح ہمیں یہ احساس دلایا کہ انسان میں بدی ہے، بدصورتی ہے، گندگی ہے، حیوانیت ہے، لیکن انسانیت پھر بھی خوبصورت ہے۔

منٹو کو پڑھتے ہوئے بھی ہمیں وہی احساس ہوتا ہے جیسے موپاساں کے متعلق چیخوف کے ایک کردار کو ہوا تھا (جسے 'اپنا' صرف ایک ہی چیز دیکھ رہی تھی)

زندگی، زندگی، زندگی۔ منٹو کے ہاں زندگی سب ہے!
زندگی منٹو کے ہاتھوں ڈھل کر افسانے بن جاتی ہے!

چیخوف کا اثر بھی ہمارے افسانہ نگاروں نے شعوری طور پر قبول کیا ہے یا نہیں یہ اندازہ لگانا مشکل ہے۔ چیخوف کا اثر سارے مغربی افسانہ پر اتنا زبردست تھا کہ JAMES T. FARREL اپنے مضمون THE LEAGUE OF FRIGHTENED PHILISTINE میں لکھتے ہیں کہ چیخوف کی کہانیوں کا انگریزی میں ترجمہ مختصر افسانے کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اگر کوئی ایک واحد اور زبردست اثر امریکہ، انگلستان اور سارے براعظم کے افسانوی ادب پر پڑا ہے تو وہ چیخوف کا اثر ہے۔ ہمارے ہاں چیخوف کا اثر نمایاں اور واضح طور پر کسی ایک افسانہ نگار میں ظاہر نہیں ہوا (جیسا کہ موپاساں کا منٹو میں) لیکن یہ زیادہ وسیع اور گہرا ہے۔ اور ایک UNDECURRENT کی طرح بہتا ہے۔

بیدی کے افسانوں کا رنگ اور لب و لہجہ چیخوف کا سا ہے۔ خواہ یہ اثر شعوری ہو یا غیر شعوری۔ اور محمد حسن عسکری نے جو ہمارے ان معدودے چند ادیبوں میں سے ہیں جنھوں نے مغربی ادب کو پوری آگاہی سے سمجھا ہے، چیخوف کے شعوری اثر کا اعتراف کیا ہے۔

حسن عسکری اپنے مجموعے "جزیرے" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"ایک چیز کے حسن کو میں نے واقعی اپنی رُوح کی گہرائیوں میں محسوس کیا ہے اور اتنے شدید طور پر کہ اس احساس کی لرزش جب چاہوں اپنے اندر پا سکتا ہوں اور وہ چیخوف کا افسانہ "اسکول مسٹرس" ہے۔ یہ خالص موسیقی ہے۔ اور میں اس کوشش میں رہا ہوں کہ یہی نغمگی اپنے افسانوں میں پیدا کر سکوں۔ میرا افسانہ "حرامجادی" چیخوف کے اسی افسانہ سے متاثر ہے۔ اگر اس میں کچھ ہے تو اسے جمال ہمنشیں کا عکس ہی سمجھئے۔ اور اسی طرح "چائے کی پیالی" کا خیال بھی مجھے چیخوف کے "اسٹیپ" سے پیدا ہوا تھا۔ .... لیکن حقیقت یہ ہے کہ حسنِ معنوی ہو یا حسنِ صوری سب رُوح کے سانچے میں ڈھلتا ہے۔"

یوں تو کرشن چندر کا "حسن و حیوان" بھی چیخوف کے THE STEPPE کی طرز پر لکھا گیا ہے اور کافی کامیاب کوشش ہے۔ اس زمانے میں جب کرشن چندر نے پہلے پہل لکھنا شروع کیا تھا، اور جو ہمارے نئے ادب کا اور افسانہ کا ابتدائی زمانہ تھا، کرشن چندر نے مغربی افسانہ سے متاثر ہو کر کئی ایک نئے تجربے کئے۔ بلکہ ان کا ہر افسانہ ایک نیا تجربہ ہوتا تھا اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دَور میں کرشن چندر نے بعض بہت اچھے افسانے لکھے۔ چنانچہ "حسن و حیوان"، "پورب دیس ہے دلی"، "دو فرلانگ لمبی سڑک"، "زندگی کے موڑ پر"، "گرجن کی ایک شام"، "ان داتا"، "بالکونی" اور سچ پوچھئے تو آج بھی کرشن چندر کے یہی بہترین افسانے ہیں۔

کرشن چندر کے پاس ذہانت تھی، کسی چیز کا فوری اثر قبول کر لینے والا مزاج، ایک زود نویس، تیز رفتار قلم، چلتی ہوئی رنگین زبان۔ جس سے انہیں اظہار میں کوئی مشکل نہ ہوتی تھی۔ لہٰذا جس مغربی افسانے سے بھی متاثر ہوئے، اسی طرز کے افسانے کو فوراً اردو میں منتقل کیا۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ کرشن چندر کے افسانے مغربی افسانوں کے چربے ہوتے تھے۔ بلکہ یہ کہ ان میں یہ صلاحیت تھی کہ مختلف طرز کے مغربی افسانوں سے بہ یک وقت اثر قبول کریں اور فوری طور پر انہیں اُردو میں تخلیق کریں۔ اور یہی وجہ تھی کہ شروع شروع میں ہر افسانہ ایک نئے طرز کا لکھ کر انہوں نے فوراً پڑھنے والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ لیکن کرشن چندر کا رویہ ان دنوں بھی جب انہوں نے اپنے آپ کو کسی مخصوص سیاسی آئیڈیالوجی سے وابستہ نہیں کر لیا تھا ہمیشہ ایک صحافی کا سا رہا ہے۔ وہ کسی چیز کا اثر فوری لیکن وقتی طور پہ قبول کرتے ہیں۔ فوری اظہار بھی ان کے لئے آسان ہے۔ چنانچہ کرشن چندر سے یہ شاذ ہی توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی چیز کی تخلیق کرتے ہوئے اس کرب سے گزرے ہوں گے جسے CREATIVE AGONY کہتے ہیں۔ یا انہوں نے جس "حسن" کی تخلیق کی ہے وہ رُوح کے سانچے میں ڈھلا ہے۔ گو یہ حسیات (SENSES) اور جذبات (SENTIMINTS) کو ضرور متاثر کرتا ہے۔

کرشن چندر نے کسی ایک مغربی ادیب یا کسی خاص تحریک کا اثر یوں قبول نہیں کیا کہ وہ ان کی رُوح کی گہرائیوں میں اتر گئی ہو۔ بلکہ انہوں نے وقتی طور پہ مختلف طرزِ تحریر اور مختلف مغربی رجحانات سے دلچسپی لی۔ حتیٰ کہ کوئی نیا ٹیکنیک یا کسی اور طرح کا تجربہ کرنا ان کے لئے کھیل سا ہو گیا۔ اور انہوں نے ایک سرریئل تصویر (SURREALISTIC) بھی کھینچی اور ایک افسانہ میں الفاظ بدل کر نئی زبان بنانے کا صوتی تجربہ بھی کیا۔ یہ نہیں کہ ہم میں کوئی جیمس جوائس ہوگا جو ایرویکر (EARWICKER) کے خواب میں آفاقی اور کائناتی اصولوں کی تحویل کرے گا۔ اور کسی FINNEGANS WAKE کے لئے ایک نئی زبان کی تخلیق کرے گا۔ لیکن کرشن چندر کی یہ کوشش تو بس ایک مذاق کی بات تھی۔ اور یہ اپنی جگہ کوئی سنجیدہ کوشش ہی نہیں تھی۔ اسی طرح انہوں نے "غالیچہ" میں ایک پراسراری رمزیت پیدا کرنے کی کوشش کی، جس میں کچھ تو ایڈگر ایلن پو کے پراسرار افسانوں مثلاً PIT AND THE PENDULUM کی سی ذہنی اذیت کی پیش کش تھی اور کچھ کافکا کے انداز کو اپنانے کی کوشش۔

کافکا کی گہری رمزیت اور کافکا کا انداز اگر ہمارے اِن کسی ادیب میں ہے تو وہ احمد علی میں ہے۔ ممکن ہے احمد علی کافکا سے شعوری طور پہ

متاثر نہ ہوئے ہوں، اور اظہار کی مطابقت ادبی مزاج کی مطابقت کا نتیجہ ہو۔ چنانچہ ایک نئے فرانسیسی ادیب AMINDAB کی تخلیق کا کافکا کی تخلیقات سے موازنہ کرتے ہوئے ژاں پال سارتر نے لکھا ہے کہ مصنف کو خود کافکا کے اثر سے انکار ہے۔ بلکہ اس کا یہ کہنا ہے کہ جن دنوں یہ تحریر ہوئی اس نے کافکا کو پڑھا تک نہیں تھا۔ تو پھر ژاں پال سارتر کی رائے میں یہ مطابقت اور بھی حیرت انگیز ہے[51]۔

کافکا کی حیثیت کچھ ایسی غیر معمولی اور یکتا UNIQUE تھی کہ وہ ایک MYTH ہی بنا رہا۔ عام ادیبوں کی رسائی سے بہت دور، ایک مبہم کشش اور ترغیب ——— ژاں پال سارتر کے الفاظ میں ———

"HE REMAINED ON THE HORIZON A PERPETUAL TEMPTATION. KAFKA COULD NOT BE IMITATED."

لہٰذا کافکا کی فکر سے مناسبت اور کافکا کا سا رمزی طریقۂ اظہار خواہ وہ شعوری ہو یا غیر شعوری، بہت بڑی بات ہے اور ایک مشابہ جینیس کا تقاضا کرتی ہے۔

ہمارے افسانہ نگاروں میں احمد علی کی حیثیت غیر معمولی ہے اور وہ ہمارے وقیع ترین (SIGNIFICANT) افسانہ نگار ہیں گو وہ منٹو یا کرشن چندر کی طرح مقبول عام نہیں۔ منٹو کی تحریروں کی اپیل خاص و عام کے لئے یکساں تھی۔ لیکن احمد علی کی تحریریں اپنی نوعیت میں ESOTERIC ہیں جنہیں معدودے چند، ادب کا صحیح ذوق رکھنے والے ہی APPRECIATE کر سکتے ہیں۔

احمد علی کی رمزی تحریروں کے علاوہ دوسری تحریریں بھی ایک خاص پایہ اور مقام رکھتی ہیں (چنانچہ "ہماری گلی" "استاد شمو خاں" اور مارچ کی ایک رات وغیرہ) لیکن احمد علی کا مخصوص لب و لہجہ اور رنگ رمزی اور فلسفیانہ ہے۔ رمزیت[52] کا انہوں نے شروع ہی سے اپنایا تھا۔ نئے ادب کی سب سے پہلی کتاب "انگارے" میں بھی ان کے افسانے سرریلزم اور آزاد تلازم خیال کے مظہر تھے۔ "پریم کہانی" میں انہوں نے محبت کا فلسفہ پیش کیا۔ "قلعہ" میں سیاست کو بھی فلسفیانہ رنگ دیا۔ گزرے دنوں کی یاد" میں انہیں وقت کی، ماضی کی، پراسرار حیران کن آواز آئی۔ یہ افسانے سب کے سب بڑی شدت (INTENSITY) اور گہرائیوں کے حامل ہیں۔

احمد علی کی جن تحریروں میں خاص طور پر کافکا کی رمزیت اور طریقۂ اظہار پایا جاتا ہے وہ "قید خانہ" "تیسرا کمرہ" اور موت سے پہلے" ہیں) جن میں کافکا کے افسانوں سے نہیں بلکہ "THE TRIAL" اور "THE CASKE" سے مناسبت پائی جاتی ہے جو فکشن میں رمزیت کے پیشرو ہیں، اگرچہ امریکی کلاسیکی ناول نگار ہرمن میلول ہیں (موبی ڈک) جن کے نزدیک ساری دنیا ہی ایک سمبل تھی۔ لیکن جدید رمزیت کا سرچشمہ کافکا ہی سے پھوٹا ہے۔ کافکا میں ایک حقیقت نگار کے مشاہدہ کی گہرائی اور باریک بینی بھی ہے اور ایک شاعر کی قوت تخیل بھی۔ وہ اشاریت کو ایک طرح کی الہامی بے خودی (DELIRIUM) کی حد تک لے جاتا ہے جس میں تصورات ایسے ہو جاتے ہیں، جو ظاہری حقیقت سے دور ہوتے ہوئے بھی ان چیزوں کی اندرونی تہوں اور ان کی اصلی فطرت کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان میں ہمیں سطحی نہیں بلکہ عمیق گہری حقیقت ملتی ہے۔

"کاسل" (CASTLE) تک سفر کائنات کے اسرار و رموز کی کرب ناک جستجو بن جاتا ہے، ایک وجودِ مطلق کی جستجو، خدا اور انسان کے درمیان ایک صحیح رشتہ کی جستجو، ایک صحیح طرزِ زندگی کی جستجو۔ کافکا کے ان تلاش کی راہیں بظاہر آسان ہونے کے باوجود اتنی دشوار گزار ہیں کہ انسان جیسے بھول بھلیوں میں کھو کر رہ جاتا ہے۔

احمد علی کے "قید خانہ" میں ایک انسانی روح جکڑی ہوئی ہے۔ ایک قید کے اندر دوسری قید، دائرے تنگ ہوتے جاتے ہیں۔ گھٹن بڑھتی

---

[51] JEAN PAUL SARTRE : LITERARY AND PHILOSOPHICAL ESSAYS.
[52] SYMBOLISM.

جاتی ہے۔ حتیٰ کہ انسان کا جسمانی وجود ہی ایک قید ہے۔ "قید خانہ" میں احساس مجسم بن گیا ہے۔ اس افسانہ کا کردار ہی ایک حساس آدمی کا ذہن ہے۔ احساس کے زیر اثر نہ صرف ذہن سوچتا ہے اور آنکھ دیکھتی ہے بلکہ احساس جسم کے رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے۔ ذہن جسم و روح سب اس کرب، گھٹن اور قید میں جکڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور "موت سے پہلے" ایک طرح کا بھیانک رمزیہ خواب (SYMBOLIC NIGHTMARE) ہے۔ اس میں "THE TRIAL" کی کیفیت ہے۔

کافکا کا ایک "ماورائے ادراک حقیقت" TRANSCENDENTAL REALITY پر ایمان تھا۔ یہ حقیقت جس کی جستجو میں انسانی ذہن و روح بھٹکتے ہیں، لیکن جو انسان کی رسائی سے بہت دور ہے۔

اس حقیقت کی تلاش میں میلول نے بحر بیکراں کی وسعتوں میں سفر کیا اور عمیق، وسیع و عریض سمندر کو گنج معانی اور ان رازہائے سربستہ کا سمبل بنایا جن کی تلاش میں انسانی عقل بھٹکتی پھرتی ہے۔ موبی ڈک کے کپتان اہب کو اس بحر بیکراں میں اتنی دور جانے کی سوجھی جہاں کسی اور سیاح کی رسائی نہ ہو۔ اور وہ ایک ناقابلِ شکست، ناقابلِ فہم UNSCRUTIBILITY ایک OPAQUE دبیز سفیدی؛ جس کی سفید وہیل مچھلی سمبل ہے، سے ٹکرا کر فنا ہو گیا۔ میلول کی PROPHECY میں ایک حقیقت مطلق کی جستجو اور زندگی کے معانی پانے کی کوشش انسان کی فنا تک لے جاتی ہے۔

اسی FATALITY کا احساس کافکا کے ہاں بھی ہے۔

جہاں احمد علی کے ادبی مزاج نے کافکا کی گہری رمزیت میں یگانگت محسوس کی؛ وہاں عزیز احمد نے ایمیل زولا کی نیچریت (NATURALISM) اور غیر مشروط حقیقت نگاری میں کشش پائی۔ لیکن زولا کی یہ نیچریت اور "ریلزم" "NANA" میں کچھ اور ہے۔ "EARTH" میں کچھ اور۔ جب زولا نے NANA کے لئے ایک ایسی موت تجویز کی جس سے اس کے شفاف، بے داغ حسن پر اس کے گناہ کی گندگی اور باطن کی سڑاند ابل پڑے تو زولا نے ایک سپیشلسٹ کے پاس سے چیچک کی کیس ہسٹری منگائی، اور ایک ایسے کیس کا خصوصیت سے بغور مطالعہ کیا جس میں بدترین قسم کی چیچک سے موت واقع ہوئی تھی اور اس کیس کی ساری تفصیلات سے نانا کی موت کی تصویر کھینچی۔ ظاہر ہے کہ جب حقیقت نگاری اس حد تک STUDIED ہو تو اس میں فطرت کی وہ بے پناہ، غیر ارادی سی بے ساختگی کہاں پائی جا سکتی ہے؟ لیکن زولا کے EARTH میں فطرت نگاری اس بلا کی ہے کہ اس میں زندگی دھڑکتی، زرخیز دھرتی FECUND EARTH کی کوکھ سے پھوٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

عزیز احمد فطرت نگاری کے قائل ہیں۔ واقعات اور کردار زندگی میں جیسے ہیں، جیسے گزر رہے ہیں، انہیں اسی طرح پیش کرنے کی انہوں نے کوشش کی ہے۔ وقت کے سلسلے، واقعات کے تسلسل اور افسانے کی تعمیر میں بھی ان کا انداز فطری ہے۔ گو کبھی کبھی ان کی یہ حقیقت نگاری STUDIED معلوم ہوتی ہے۔

عزیز احمد کا اپنا کہنا ہے کہ وہ آلڈس ہکسلی سے بھی متاثر ہیں۔

ہکسلی ..... سائنٹیفک علوم سے واقف، ذہین، سنجیدہ اور انٹلکچول ..... ہکسلی کا رویہ ایک فن کار سے زیادہ ایک انٹلکچول کا ہے۔ فکشن ان کے لئے بعض خاص IDEAS اور اصولوں کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ ان کی تحریریں یا تو ALLEGORIES ہیں جیسے "THE BRAVE NEW WORLD" یا APE AND ESSENCE یا ان کے ناول "NOVEL OF IEAS" کے تحت آتے ہیں اور ان کے کردار مختلف خیالات اور تصورات (CONCEPTIONS) کے مظہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کے "پوائنٹ کاؤنٹر پوائنٹ" میں مارکس ریمپین اور فلپ کوارلس خود مصنف کی شخصیت کے دو رخ ہیں، جو مجسم کر دئے گئے ہیں۔ ان کی منقسم انا (DIVIDED EGO) کے دو مظاہر ——— ALTER-EGO، دو اصلی کرداروں میں اتنی تفاوت نہیں ہوتی، دو کردار

ایک دوسرے سے اتنے آزاد نہیں ہوتے، اتنے مکمل طور پر ایک دوسرے کی ضد نہیں ہو سکتے۔ جیسے کہ فلپ کوارلس اور مارکس ریمپئن ہیں۔ یہاں دو مختلف اور متضاد میلانات کو بڑھا چڑھا کر انہیں مجسم کر دیا گیا ہے۔ فلپ کوارلس کی عقلیت اور منطق حد سے تجاوز کر گئی ہے حتیٰ کہ اس کے فطری جذبات اور حسّیں بھی عقل و دماغ کے تابع ہیں اس کے برخلاف ریمپئن آزاد فطری جبلتوں اور بے لگام ہیجانی جذبات کا نمائندہ ہے۔

اپنے تازہ ترین ناول THE GENIUS AND THE GODESS میں ہکسلی نے اسی SPLIT CHARACTOR کی تقسیم کو ایک اور ہی پس منظر میں پیش کیا ہے " INTELLECT " اور " INSTINCT " کی وہی تکرار اور تضاد ہے۔ لیکن یہاں "عقلیت" کا نمائندہ مرد ہے اور "جبلت" کی نمائندہ عورت یعنی "پوائنٹ کاونٹر پوائنٹ" کی وہ محبت کی پیاسی ملینا جو اپنے شوہر کی جذبات سے عاری نری عقلیت اور منطق سے تنگ آگئی تھی اب محض SENSULITY کی نمائندہ بنا دی گئی ہے۔ یہاں جینئس ایک PHYSICIST ہے اور " GODESS " اس کی حسین بیوی، جو اس کی جینئس کے لئے وجدان کی محرک ہے۔ یہ دونوں ایک نوجوان معصوم، آئیڈیلسٹک رومانی لڑکے کے زاویۂ نظر سے دکھائے گئے ہیں جو مرد کو اپنی INTELLGT کے ساتھ ایک جینئس اور ہیرو سمجھتا ہے اور عورت کو اپنے حسن کے ساتھ ایک دیوی! وہ PHYSICIST کی "ہیرو ورشپ" کرتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کی خوبصورت بیوی کی محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ دونوں کی ایک ساتھ پرستش کرتا ہے لیکن آخر میں اُسے دونوں سے ڈِزالوژن ہوتا ہے کیونکہ یہ دونوں نامکمل تھے۔

آلڈس ہکسلی نے ان دو حدوں " INTELLECT " اور INSTINCT " کو مجسم پیش کرکے گویا دونوں قسم کی افراط تفریط میں اعتدال اور توازن کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ عزیز احمد نے اسی طرح دو حدوں کے درمیان اعتدال اور توازن کی ضرورت کو " اور بستی نہیں یہ ..... " میں ALTER-EGOS اور SPLIT CHAPACTOR کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ اور ہکسلی کی طرز پر ایک تجربہ کیا ہے۔ چنانچہ اس افسانہ میں الف خاں اور بے خاں دو الگ الگ میلانات کے مجسم مظہر ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی پوری ضد تو نہیں، لیکن ایک ہی کردار کے دو رُخ ضرور ہیں۔ ایک میں جبلت کی بے لگام تیزی اور افراط ہے، دوسرے میں اعتدال اور توازن۔ اگر کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے اور ذہنی اور قلبی کشمکش میں دو آوازیں حصہ لیتی ہیں۔ ب خاں، الف خاں کی دوسری آواز ہے۔ چنانچہ الف خاں گویا " جبلت ہے " (INSTINCT) اور بے خاں ضمیر (CONSCIENCE)۔

ہکسلی کے ہاں تو خیر بڑے کھلے طریقے پر ایک کردار کو دو کرداروں میں بانٹا گیا ہے۔ ورنہ یوں دیکھا جائے تو واقعی بڑے ادب میں کئی ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں یہ فرق ایک زیریں حقیقت ہے۔ اور ایک کردار دراصل ایک پیچیدہ مکمل اور بڑے کردار ہی کا ایک جزو ہوتا ہے۔ چنانچہ پرومیتھیوس اور ایپیمیتھیوس دراصل ایک ہی ہیں یہ دونوں ایک ہی بڑی شخصیت کے INTROVERT اور EXTRAVERT پہلو ہیں۔ (JUNG) میفسٹوفلس دراصل فاؤسٹ ہی کی شخصیت کا دوسرا یعنی " EVIL " رُخ ہے جو اس پر حاوی ہو جاتا ہے اور یہ اوتھیلو کی شکّی طبیعت ہی تو ہے جو IAGO بن کر اُسے اکساتی ہے اور اس کی آتشِ رقابت کو بھڑکاتی ہے!

ہکسلی کے شعوری اثر کے تحت اس خاص تجربہ کے علاوہ عزیز احمد ہکسلی سے یوں بھی متاثر ہیں کہ ان کے ناول اور افسانوں کے STRUCTURE بھی " IDEAS " کے گرد کھڑے کئے جاتے ہیں۔ جو کبھی کرداروں کی بحث کے ذریعہ پیش ہوتے ہیں یا کبھی کسی اور طریقہ پر۔

اوپر میں نے چند ایسے انفرادی اثرات کا جائزہ لیا ہے جس میں بعض خاص خاص مغربی ادیبوں کا اثر ہمارے افسانہ نگاروں پر انفرادی طور پر ہوا ہے۔ لیکن ہمارے صفِ اول کے افسانہ نگاروں میں بعض ایسے ہیں جن میں کسی خاص مغربی ادیب یا کسی خاص مغربی رجحان یا کسی خاص تحریک کا اثر واضح طور پر نمایاں نہیں ہے لیکن ان کے افسانے پڑھ کر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے مغربی ادب کو سمجھ کر پڑھا ہے اور اسے غیر محسوس طور پر اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ چنانچہ غلام عباس کے افسانوں میں کسی کا واضح اثر نظر نہیں آئے گا۔ لیکن ان کا ہر افسانہ پڑھتے ہوئے ہمیں

یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم کوئی بہت اچھا مغربی افسانہ پڑھ رہے ہیں۔ "آنندی" "حمام میں" "ہمسائے" "تجاری" اور "سایہ" جیسے افسانے کسی بھی مغربی ملک کے افسانوی ادب کی بہترین کوششوں کے ساتھ شمار ہو سکتے ہیں۔

مغربی ادب کا اثر ہمارے افسانے پر دو طرح سے ہوا ہے۔ ایک تو انفرادی اثر یعنی بعض انفرادی مغربی ادیبوں کا اثر ہمارے خاص خاص لکھنے والوں پر، دوسرا مجموعی اثر یعنی مجموعی طور پر مغرب کے ادبی مزاج، مغرب میں نئے نئے رجحانات اور نئی نئی تحریکوں کا اثر۔

افسانہ مغرب میں بھی سب سے نئی اور کم عمر صنفِ ادب ہے۔ اردو افسانے کی عمر تو مشکل سے بیس پچیس برس کی ہوگی۔ ہمارے ہاں افسانہ کی پیدائش بھی اُس وقت ہوئی جب ہمارے ادیب مغربی ادب کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنے اور اس سے مستفیض ہونے لگے تھے۔ اور یہ مغربی ادب کا مطالعہ، نیا شعور اور آگاہی سب سے زیادہ اسی صنف یعنی افسانہ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ کیونکہ مغربی ادب سے نئی نئی تحریکوں، رجحانوں، تکنیکوں اور نئے نئے طرز اپنانے کا شعور افسانے کے ساتھ ساتھ ہی پیدا ہوا اور ہمارے افسانے نے بھی مغربی افسانے کے دوش بدوش ہی ترقی کی منزلیں طے کیں۔

افسانے کے لیے ہمارے اپنے ادب میں کوئی روایات نہ تھے۔ افسانہ کا ازلی ماخذ روایتیں اور حکایتیں ہیں جو سب سے پہلے عبرانی (HEBREW) عربی اور یونانی میں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح کی الف لیلوی حکایتیں ہمارے ہاں "قصۂ چہار درویش" اور "حاتم طائی" کے سے حکایاتی (EPISODIC) اور PICAREQUE قسم کی کتابوں میں نمودار ہوئیں۔ لیکن یہ الگ الگ مختصر کہانیوں کی بجائے سفرناموں اور ناولوں کی صورت میں پیش ہوتی تھیں۔

افسانہ یوں پریم چند سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن پریم چند اور ان کے سرکل کے افسانہ نگاروں مثلاً سدرشن، اعظم کریوی، علی عباس حسینی وغیرہ کے ہاں ناول اور افسانہ کا فرق ابھی واضح نہیں ہوا تھا۔ اور ان دو صنفوں کے درمیان حدِ فاصل قائم نہیں ہوئی تھی۔ فرق صرف طوالت کا تھا یعنی افسانہ ناول کے مقابلے میں مختصر کہانی ہوتا تھا، لیکن ایسی ہی بھرپور کہانی۔

پرانی صنف ناول اور نئی صنف افسانہ کا یہ درمیانی وقفہ (TRANSITIONAL STAGE) دوسرے ملکوں کے ادب میں بھی پایا جاتا ہے۔ ان دنوں افسانے، مختصر افسانے (SHORT STORIES) نہیں کہانیاں (TALS) کہلائے جاتے تھے۔ چنانچہ امریکی ادب ہی کی مثال لیجئے۔ میلول نے اپنی کہانیوں کے مجموعے کو PIAZZA TALES کا نام دیا اور ہاتھارن کی کہانیاں "دہرائی گئی کہانیاں" TWICE TOLD TALES کے نام سے مشہور ہوئیں۔

پریم چند کے آخری دَور کے بعض افسانوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں جدید مختصر افسانے کی تکنیک اور مواد سے پوری آگاہی تھی۔ چنانچہ ان کا مشہور افسانہ "کفن" جدید افسانے کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ یا شکوہ شکایت جو سارا ایک "مانولاگ" ہے۔

لیکن صحیح معنوں میں مختصر افسانے کا آغاز نئے ادب کی تحریک کے ساتھ ہی ہوا اور اسی تحریک کے ساتھ ایک خاص آرٹ فارم کی حیثیت سے مختصر افسانے نے عروج پایا۔ نئے ادب کی سب سے پہلی ضبط شدہ کتاب "انگارے" گویا روایت سے بغاوت تھی۔ رشید جہاں نے اس میں عورت کی آزادی اور عورت کے حقوق کی پاسبانی کا مسئلہ پیش کیا۔ احمد علی نے آزاد خیالی کو سرریلزم کے ذریعہ پیش کیا۔ یعنی خیال اپنی اصلی شکل میں، جب کہ وہ کسی عقلی یا جمالیاتی یا اخلاقی پابندی یا رکاوٹ کے بغیر انسانی دماغ میں اپنا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔ چنانچہ سرریلزم کی اس تحریک سے جو مغرب میں ۱۹۱۹ء میں شروع ہوئی تھی، اردو افسانہ کے آغاز ہی میں احمد علی نے روشناس کرایا۔

اردو افسانہ پر گو کئی مختلف مغربی تحریکیں اور ادبی رجحانات بہ یک وقت اثر انداز ہوئے، نئے ادب کی یعنی ۱۹۳۶ء کی تحریک میں "سوشل ریلزم" سماجی حقیقت نگاری سب سے نمایاں رجحان بن کر آئی۔ اس دَور کی حقیقت نگاری میں معاشرتی مسائل کے علاوہ سیاسی

مسائل کو بھی نمایاں دخل تھا۔ کیونکہ ہمارے ہاں کی ترقی پسند تحریک اسی کا حصہ تھی جو ایک آفاقی تحریک بن چکی تھی۔

سیاست اس دور میں زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ بن چکی تھی۔ یہ دو عظیم جنگوں کا درمیانی وقفہ تھا، ایک طرف فاشیت سر اٹھا رہی تھی دوسری طرف ادیبوں کے سامنے روس کا انقلاب اور نیا نظام تھا جس کے متعلق انہیں یہ الزام تھا۔

BLISS WAS IT IN THAT DAWN TO BE ALIVE
AND TO BE YOUNG WAS VERY HEAVEN !

"POPULAR FRONT" بن چکا تھا۔ سپین کی خانہ جنگی میں ادیب بہ نفسِ نفیس حصہ لے کر جمہوریوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب ژید کے پایہ کے ادیب بھی سیاست کا ساتھ دینے پر تیار تھے!

ترقی پسند تحریک کے لئے وجدان کا سرچشمہ روس اور روسی ادب تھا۔ لیکن ہمارے ادیبوں نے عام طور پر ٹولسٹائے، ترگنیف، دستاوسکی یا چیخوف کی بجائے گورکی اور گورکی کے بعد کے ادیبوں سے زیادہ اثر لیا۔ ان دنوں ہمارے افسانہ نگار خصوصیت سے ۳۵ء کے انگریزی ادیبوں کے نیو رائٹنگ والے، یعنی آڈن، سپینڈر، اشروڈ، جارج آرول، پہ نجٹ گروپ سے بھی متاثر تھے۔ ۳۵ء کے یہ ادیب جوئس، لارنس اور ورجینیا وولف کے رد عمل میں "خارجی" حقیقت نگاری کی تحریک لے کر آئے تھے۔ ہمارے ہاں نئے ادب کی حقیقت نگاری بھی ایک طرح سے نیاز فتح پوری، سجاد حیدر یلدرم، مجنوں گورکھ پوری وغیرہ کی رومان نگاری کا رد عمل تھی۔ نیاز فتحپوری گروپ کے رومانی رجحان کا اس وسیع تحریک سے کوئی خاص اور گہرا تعلق نہ تھا، جیسے مغربی ادب میں ROMANTICISM کہتے ہیں۔ چنانچہ انگریزی ادب میں انیسویں صدی کی رومانٹزم یا فرانسیسی ادب میں CHVALRY کا رومان۔

نئے ادب ۳۶-۴۷ء کی تحریک کے ساتھ ادب برائے زندگی اور "ادب اور انقلاب" کی آواز اٹھی۔ یہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری جیسے نقادوں کی بھی آواز تھی اور زندگی کو اپنی ساری حقیقتوں میں پیش کرنے کا رجحان اردو افسانہ پر اس طرح چھایا رہا کہ ہمارے بہت سے اچھے افسانہ نگاروں کو "REALISTS" کے اسی گروہ میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ منٹو، بیدی، حیات اللہ انصاری، رشید جہاں، عصمت چغتائی، اوپندر ناتھ اشک، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، خواجہ احمد عباس، بلونت سنگھ، قدرت اللہ شہاب، انور، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور ...... ابوالفضل صدیقی شوکت صدیقی ...... یوں یہ طویل فہرست کبھی ختم نہ ہو گی۔

اپنے دور کے سیاسی اور سماجی مسائل کے علاوہ سماجی حقیقت نگاری کے جس خاص جزو پر ہمارے ادیبوں نے توجہ دی وہ جنسی حقیقت نگاری تھی۔ ہمارے بعض اچھے اچھے افسانہ نگار جنسی حقیقت نگاری ("SEX REALISM") سے اس طرح وابستہ ہو گئے کہ جنس کا موضوع ان کے لئے ایک OBSESSION سا بن گیا۔ چنانچہ منٹو۔ عصمت چغتائی۔ ممتاز مفتی۔ عزیز احمد وغیرہ

عزیز احمد کی رائے میں ترقی پسند ادب (ہمارے جنس نگار) ڈی، ایچ لارنس سے متاثر ہوئے ہیں۔ بلکہ یہ کہ ان کی جنس نگاری ڈی ایچ لارنس کو ہضم نہ کر کے ایک کھٹے ڈکار کی صورت میں نمودار ہوئی ہے۔ مجھے عزیز احمد کی اس رائے سے اختلاف ہے۔ یہ نہیں کہ ہمارے ادیبوں نے ڈی۔ ایچ لارنس کو پڑھ کر ہضم نہیں کیا بلکہ ہمارے ادیبوں کا رویہ ڈی۔ ایچ لارنس سے قطعی مختلف تھا۔ ہمارے ادیبوں نے سماج کو یوں عریاں کرنا چاہا کہ ساری ڈھکی چھپی گندگی باہر آ گئی۔ ان کی تحریریں سماج کی اخلاقی قدروں اور پابندیوں اور ان سے ملتج سماج کی گری ہوئی جنسی حالت پر بھرپور طنز تھیں۔

ڈی۔ ایچ لارنس نے بھی سماج کی اخلاقی قدروں پر حملہ کیا تھا اور انہیں ان بے جا پابندیوں اور مصنوعی قدروں اور سماجی انسان کی ریاکاریوں کی سے بے پناہ نفرت تھی وہ ان کی گمراہ روی پر تنقید سے ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن لارنس کا مقصد جنسی بے راہ روی اور گناہ کی زندگی پر تنقید نہیں تھی بلکہ

ایک صحت مند جنسی توازن کی تبلیغ۔ لارنس کی جنسی تحریروں میں جسمانی مظاہروں کے ساتھ ساتھ، لطیف سے لطیف، نازک سے نازک احساس کی عکاسی ہے اور جنس کی پیش کش میں، جوائی نظر میں "زندگی کی قوت" ہے۔ لارنس جسمانی لذت کے ساتھ حسن، مسرت، روشنی، قوت اور امن کا احساس وابستے ہیں۔ لارنس نے جنس کو ایک فلسفہ بنا لیا تھا، بلکہ ایک مذہب کا درجہ دے دیا تھا۔ انہوں نے خود کو اس کا پیغامبر گردانا اور آخر میں اس کے، جیسا کہ مڈلٹن مرے نے اپنی کتاب SONE OF WOMAN میں لکھا ہے۔

"اس کے صلیب زدہ شمار ہوئے۔"

فطری جبلت اور فطری زندگی کے PURITAN PROPHET کی حیثیت سے شاید لارنس اور منٹو میں تھوڑی سی مناسبت ہو اپنے آخری ڈرامے "اس منجدھار میں" میں منٹو نے لارنس کی لیڈی چیٹرلیس لور والی تھیم کا استعمال کیا ہے۔ لیکن یہاں بھی منٹو کا رویہ اور پیشکش لارنس سے مختلف ہے۔

عزیز احمد کی جنس نگاری فرانسیسی جنس نگاروں سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ ممتاز مفتی نے مغرب کے جنسی ادب سے اثر نہیں لیا بلکہ وہ براہ راست جنسی نفسیات کی طرف رجوع ہوئے۔ فرائڈ کی علم نفسیات میں جنسی تحریلیں، ہیولاک ایلس، کرافٹ ایبنگ، سٹیکل وغیرہ نے جو مثالی واقعات (CASE HISTORIES) دئے ہیں جنسی نفسیات کے ایسے ہی (CASES) سے ممتاز مفتی نے اپنا افسانوں کے لئے مواد حاصل کیا اس طرح کا خالص نفسیاتی افسانہ ہمارے ادب میں ایک انفرادی رجحان تھا، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ممتاز مفتی نے بعض کامیاب نفسیاتی افسانے لکھے اور تحت الشعور کی بہت سی ڈھکی چھپی، ان کہی حقیقتیں اُجاگر کیں۔ لیکن ان کے بعض افسانوں خصوصیت سے بعد کے افسانوں میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ افسانہ ایک نفسیاتی کیس کے گرد بنا گیا ہے۔ ان کے بہترین افسانے وہی ہیں جن میں نفسیات ایک زیریں حقیقت ہے اور جن میں ہلکے ہلکے نفسیاتی ٹچس کے ساتھ ہماری معاشرتی زندگی کی نازک اور سچی تصویریں کھینچی گئی ہیں۔ چنانچہ "آپا" "ماتھے کا تل" "دو مورا" "یہ دیوی"۔

یوں انسانی نفسیات کی پیش کش ہمارے کئی ایک افسانوں میں ہوئی ہے اور جنسی تقضیات کو منٹو اور عصمت چغتائی نے بھی کامیابی سے پیش کیا ہے۔ چنانچہ منٹو کے افسانوں میں "دھواں" "بلاؤز" "ٹھنڈا گوشت" وغیرہ جنسی نفسیات کی کامیاب مثالیں ہیں۔ اور عورت کے جنسی جذبہ، جنسی امتحان اور ارتقا اور تقضیات کو تو عصمت چغتائی سے بہتر کوئی ترجمان شاذ ہی مل سکے۔ عصمت نے بے باکانہ جرأت سے عورت کو پہلی دفعہ اصلی روپ میں پیش کیا تھا۔ اور اس لئے عصمت کو ہمارے ادب میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔

عصمت پر کسی مغربی ادیب کا اثر پڑا ہے یا نہیں، یہ اندازہ لگانا مشکل ہے۔ غالباً پطرس یا مجنوں گورکھپوری نے لکھا ہے کہ عصمت اپنے ڈراموں میں برنارڈ شا سے بہت متاثر ہیں اور اسی طرح کا WITTY طنزیہ ڈائلاگ انہوں نے استعمال بھی کیا ہے۔ لیکن جہاں تک ان کے افسانوں کا تعلق ہے، اور عصمت سب سے پہلے افسانہ نگار ہی ہیں، کسی خاص اثر کا ان میں اظہار نہیں ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ مغربی ادب میں جنسی حقیقت نگاری سے مجموعی طور پر متاثر ہوئی ہیں۔

آگے چل کر ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور نے بھی عصمت کی طرز اختیار کی، اور گو ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور اور قرۃ العین حیدر کا ادبی پایہ عصمت چغتائی کے برابر نہیں ہے۔ لیکن ان دونوں بہنوں نے عصمت کی طرز کے افسانوں میں بہت سے اضافے کئے اور جنسی حقیقت نگاری سے ہٹ کر بھی انہوں نے اپنے موضوعات کو وسعت دی اور معاشرتی حقیقت نگاری کے اور پہلوؤں کی بھی اپنے افسانوں میں ترجمانی کی۔

جس طرح ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور نے عصمت چغتائی کی طرز اختیار کی۔ قرۃ العین حیدر نے حجاب امتیاز علی سے مطابقت محسوس کی۔ اور پہلے پہل انہوں نے حجاب امتیاز علی کے رنگ میں افسانے لکھنے شروع کئے۔ حجاب امتیاز علی کے افسانے کچھ GOTHIC قسم کے پراسرار رومان

پڑھا کرتے تھے، اور فینٹیسیاں / فینٹیسی FANTASY کا عنصر اب بھی قرۃ العین کی تحریروں میں پایا جاتا ہے۔ لیکن بعد میں انھوں نے ورجینیا وولف کا انداز اختیار کر لیا ہے۔ وجہ گو یہ بات کہ قرۃ العین کا انداز ورجینیا وولف کا ہے سب سے پہلے میں نے ہی کہی تھی، میں یہاں واضح کر دوں کہ یہاں قرۃ العین کا ورجینیا وولف یا ورجینیا وولف کی ادبی حیثیت سے تقابل مقصود نہیں۔ اور نہ یہ مناسبت ان معنوں میں لی گئی ہے جیسے منٹو کے متعلق کہا جائے کہ منٹو موپاساں ہے یا احمد ندیم کے متعلق کہ ان کے ہاں گورکی کی سی گہری رمزیت پائی جاتی ہے میرا مطلب صرف یہ ہے کہ قرۃ العین نے شعوری طور پر ورجینیا وولف کا اثر قبول کیا ہے۔

ظاہری فارم کی حد تک قرۃ العین کی ورجینیا وولف سے مناسبت ہے، "مافیہ" کی نہیں۔ ورجینیا وولف کے نزدیک زندگی کی قدریں کچھ اور ہیں۔ اور ورجینیا وولف میں وہ "ادبی قابو" اور توازن بدرجہ اتم موجود ہے جو وقت اور جگہ اور ہیئت کی پابندیوں کو توڑنے کے بعد لازمی ہے۔ قرۃ العین حیدر کی تحریروں میں یہ مکمل ادبی قابو اور توازن نہیں ہے۔

ای ایم فارسٹر نے کہا ہے کہ زندگی فکشن میں دو شکلوں میں پیش ہوتی ہے ایک LIFE IN TIME دوسری LIFE IN VALUES جب وقت کے تسلسل کو توڑا جائے تو VALUES بڑے اور وزنی ہونے چاہئیں۔ جیمس جوائس نے جب وقت اور زمانے کی حدیں توڑ دی تھیں تو کئی علوم اور کائناتی اصول اپنی تخلیقات میں سمیٹ لئے تھے۔ قدیم کلاسیکی ادب اور قدیم تہذیبوں کی MYTHOLOGY کو موجودہ زمانے میں ڈھالا تھا۔ پروست نے اپنے کھوئے ہوئے اور پھر پائے ہوئے وقت میں موجودہ زمانے کا شعور MODERN CONCSIOUS-NESS سمیٹ لیا۔ اور ورجینیا وولف نے وقت کے ایک ایک لمحے کو وسعت اور تکمیل بخشی۔

قرۃ العین کے ہاں زندگی کی بڑی حقیقتوں اور اقدار کا اور زمانے کا کوئی گہرا شعور نہیں ہے۔ بلکہ ایک ADOLESCENCE کی سی رومانی آئیڈیلزم اور اس سے منتج ڈزالوژن اور رومانی شکست خوردگی۔ یہی وجہ ہے کہ قرۃ العین کی اگر کسی نے نقل کی تو وہ عموماً جذباتی قسم کی ADOLESCENT لڑکیوں نے جنھوں نے قرۃ العین کی طرز تحریر کی بعض خاص خوبیوں کو چھوڑ کر قرۃ العین کے افسانے کو اپنی بالکل BARE شکل میں اپنایا جس میں ایک ہی طرح کے رومانی ماحول میں ازلی رومانی تثلیث ہوتی ہے۔ (سوائے جیلانی بانو کے جو آجکل کی لکھنے والیوں میں ایک ہی ہیں جو ایک اچھی افسانہ نگار کی حیثیت سے ابھری ہیں، اور جنھوں نے ایک افسانہ اس طرز میں اتنا ہی اچھا لکھا ہے جتنا کہ قرۃ العین کا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس افسانے میں بھی جیلانی بانو کا رویہ قرۃ العین کے برخلاف ترقی پسند ہے اور جیلانی بانو اپنی دوسری تحریروں میں ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور سے زیادہ قریب ہیں)

قرۃ العین کا طرز گو مغربی ادب سے مستعار تھا، لیکن اردو کے لئے نیا تھا اور اس نئے انداز میں ایک شگفتگی اور جاذبیت تھی۔ لیکن اس انداز کے اردو افسانہ میں ارتقا کے جو امکانات تھے، انھیں یا تو بعض نئی لکھنے والیوں کی اس سستی تقلید نے ختم کر دیا۔ لیکن اس سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ قرۃ العین خود ایک سطح پر آ کر رک گئیں اور اپنے آپ کو یوں دہرانے لگیں کہ ان کے بیشتر افسانے اور ناول بھی ایک دوسرے کے REBASH معلوم ہونے لگے۔ ایک ہی سی فضا، ایک ہی سا ماحول، ایک ہی سے کردار جو ایک ہی طرح کی باتیں کرتے اور ایک ہی انداز میں سوچتے بھی ہیں۔ ورجینیا وولف کے ہاں یہ ہمیشہ کی یکسانیت کا احساس نہیں ہے۔ وہ اپنے کرداروں کا فرق احساسات اور موڈس کے نازک فرق کے ذریعہ واضح کر دیتی ہیں۔ ورجینیا وولف کا اسلوب ایک ایسا شفاف اور ذی حس ادبی آلہ ہے جو حس کے ہلکے سے ہلکے ارتعاش کو پکڑ سکتا ہے۔ اسی طرح ان کی تخلیقات میں بھی تنوع ہے۔ چنانچہ ان کی دو بہترین اور نمائندہ تخلیقات کا واضح فرق دیکھئے "THE LIGHT HOUSE" "THE WAVES" سے بالکل الگ چیز ہے۔

بہرحال، اردو افسانہ میں ایک نیا طرز لے آنا بجائے خود قابل قدر ہے اور قرۃ العین کے طرز کی اہمیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ گو وہ خود

ایک محدود دائرے میں گھری رہ کر اس کی وسعت اور امکانات کا پورا فائدہ نہیں اُٹھا سکی ہیں اور کوئی بڑی تخلیق انھوں نے پیش نہیں کی ہے۔ انھوں نے دوسروں کے آگے ایک نئی راہ کھول دی ہے۔ اور ممکن ہے کوئی زیادہ پڑھا لکھا ادیب جس نے بڑے ادب اور کلاسکس کو پوری آگاہی سے سمجھا ہو اور اپنے اندر جذب کئے ہوئے ہو اور جس کی INTELLECT زیادہ پختہ MATURE اور گہری ہو، اس طرز میں کوئی بڑی تخلیق پیش کر سکے۔

گو مغرب کے کئی ادبی رُجحان اور تحریکیں ہمارے نئے ادب اور خصوصیت سے افسانے پر اثر انداز ہوئیں، لیکن ہمارے ادب میں یہ مختلف رجحان الگ الگ مجموعی تحریکوں کے طور پر نہیں اُبھرے بلکہ ہمارے چند منفرد شعوری فنکاروں نے انھیں اپنانے کی کوشش کی۔ یا کم از کم ان رجحانوں کے زیرِ اثر چند تجربے کئے۔ یہ بات خصوصیت سے داخلی رجحانات کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ چنانچہ "رمزیت" SYMBOLISM ہمارے ہاں کوئی مجموعی تحریک نہیں بنی اور اس کے واحد اور رفیع نمائندہ احمد علی ہی رہے۔ شعور کی رو FLOW OF CONCIOUSNESS عسکری ہی سے وابستہ ہوگئی۔ اور "سرریلزم" میں احمد علی کی پہلی کوششوں کے بعد شاذ ہی کسی نے کوئی تجربہ کیا۔

"اظہاریت" EXPRESSIONISM میں البتہ دو تین ادیبوں نے خاصے تجربے کئے۔ "ایکسپریشنزم" ــــ اظہاریت یا باطن نگاری ایک قسم کی ذہنی کیفیات اور تصورات کا اظہار ہے۔ یہ جوائس یا پروست کے شعوری تسلسل STREAM OF CONCIOUSNESS سے مختلف چیز ہے۔ "اظہاریت" میں ذہن خاص قسم کے تصورات دیکھتا ہے جو دیکھنے والے کو دُنیا کے حقائق سے دُور لے جاتے ہیں۔ اس سکول کا نظریہ یہ ہے کہ فن کار کو اپنے انفرادی محسوسات کا اظہار کسی ظاہری وسیلے سے کرنا چاہیئے۔ اطالوی مصنف لوئی جی پیرانڈلو اس سکول کا سب سے بڑا نمائندہ ہے۔ اس سکول کے متعلق کہتے ہیں کہ کروچے کے اصول اور نظریئے ان کے آرٹ کی صحیح تشریح کرتے ہیں۔ لیکن کروچے نے "ایکسپریشنزم" کا لفظ الگ معنوں میں استعمال کیا ہے۔ کروچے کے لئے ایکسپریشن فن کار کے ذہن میں آمد ہے۔ آرٹسٹ کی نظر جب کسی چیز یا واقعہ کو دیکھتی ہے تو اس کا تاثر ذہن میں قائم ہو جاتا ہے۔ اس تاثر کو احساس، وجدان اور تخیل ذہن ہی میں ایک خوبصورت شکل دے دیتے ہیں۔ اور یہی "اندرونی اظہار" ہے۔ لیکن خود فن کار تو اس خوبصورت ذہنی تخلیق کو جسمانی شکل دے کر دائمی بنانا چاہتا ہے۔

"ایکسپریشنزم" ایک غیر معمولی ذہنی کیفیت کی عکاسی ہے۔ جس میں ذہن ایسی عجیب تصویریں دیکھتا ہے جو حقیقت میں موجود نہ ہوں بلکہ سے ایک خواب سحر DAY-DREAMING میں نظر آتی ہوں۔ چنانچہ عزیز احمد کے "جھوٹا خواب" میں اظہاریت ہے، نفسیاتی تجزیہ میں خواب بڑی اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ خواب ایک خالص نفسی کیفیت ہے جس میں ہمارے تحت الشعور کو بیدار کر کے واقعات دکھلائے جاتے ہیں، ایسے واقعات جو بیداری میں دکھائی نہیں دیتے۔ عزیز احمد کے جھوٹے خواب کے علاوہ فسادات پر ان کے افسانے "کالی رات" میں شدید بیماری کی حالت میں ایک ہذیانی تصوریہ اور HALUCINATION ہے جس کے ذریعہ انسان کی افتاد دکھائی گئی ہے۔ منٹو کے ایک تازہ افسانے "فرشتہ" میں شدید بھوک، ذہنی پریشانیوں اور بیماری کے دوران میں، جب وہ موت سے قریب پہنچ جاتا ہے ایک بھیانک "ذہنی تصوریہ" ہے۔ ایک

حیات اللہ انصاری نے جنھوں نے "حقیقت نگاری" میں آخری کوشش کا سا شاہکار پیش کیا تھا، اپنی دو ایک تازہ تحریروں میں اظہاری اور رمزی طرز اختیار کیا ہے۔ چنانچہ "ماں بیٹا" اور "شکر گذار آنکھیں" میں۔ "ماں بیٹا" میں تو خارجی حقیقت نگاری کے ذریعہ ہی ایک رمزی SYMBOLIC SIGNIFICANCE پیدا کی گئی ہے۔ لیکن "شکر گذار آنکھیں" میں ایک شدید باطنی انفعالی کیفیت ہے جس میں ایک قاتل اس کی طرف اُٹھتی ہوئی دو شکر گذار آنکھوں کو اپنے جسم اور گوشت پر کھاتا رہتا ہے۔ یہ شکر گذار آنکھیں اس کے جسم پر

بے شمار زخم بن کر اُسے اذیت دیتی ہیں۔ اپنے سینے پہ یہ زخم کاڑھ کر اور اپنے آپ پر کاری ضربیں لگا کر وہ اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرتا ہے۔ یہ سُرخ نشان، اس کی رُوح میں اسی طرح گڑ گئے ہیں جیسے" ہاتھورن " کے" سکارلٹ لیٹر" کے پادری کی روح میں۔ اور ان زخموں سے اس کی رُوح کو ایک سکون ملتا ہے۔

ہمارے ہاں اظہاریت کی سب سے کامیاب پیش کش جاوید اقبال کے تمثیلچوں میں ہوئی ہے۔ خصوصیت سے" پیغمبر" میں معصوم گناہ اور گناہ کے امکان اور ترغیب کے باوجود انسان کی ازلی معصومیت اور ملائکانہ پاکیزگی کی بڑی مکمل اظہاری تصویر ہے۔

" خود وجودیت" EXISTENTIALISTS مابعد جنگ کی سب سے تہلکہ مچا دینے والی تحریک ثابت ہوئی، گو یہ فرانسیسی ادیبوں تک ہی محدود رہی۔ اس تحریک کا منبع بھی فلسفہ تھا۔ کیر کے گارد کے فلسفہ سے شروع ہو کر وہ ادب میں سارتر کے ذریعہ آئی لیکن سارتر کا خود بھی فلسفہ اور ادب دونوں سے تعلق تھا، لہٰذا انھوں نے بڑی کامیابی سے اس فلسفہ کو ادب میں پیش کیا خصوصیت سے اپنے ڈراموں میں۔ جہاں تک فکشن کا سوال ہے، میرے خیال میں دوسرے EXISTENTIALISM مثلاً کامو CAMUS اور سیمون دی بووا نے خود وجودیت کے فلسفہ کو کہیں زیادہ بہتر طریقہ پہ اپنے ناولوں میں سمو دیا ہے۔

ہمارے ہاں ژاں پال سارتر اور ادب میں ان کے فلسفۂ" خود وجودیت" پہ تنقید میں تو خوب نظریاتی بحث چلی، لیکن تخلیقی ادب پہ اس تحریک کا کوئی خاص اثر نظر نہیں آتا۔ انتظار حسین نے البتہ" چاند گہن" میں ایک ایسی انفعالی کیفیت کی عکاسی کی ہے، جو سارتر کے NAUSEA سے بہت مشابہ ہے۔ LA NAUSEA اب بھی سارتر کا بہترین ناول تصوّر کیا جاتا ہے۔ لیکن اس انفعالی کیفیت سے نکل کر ایک" نیا وجود" کیسے اپنے آپ کو ASSERT کرتا ہے، یہ اس ناول میں اتنا واضح نہیں ہے جتنا کہ سارتر کے ڈراموں میں، مثلاً ان کے شاندار ڈرامے THE FLIES میں جس کی تھیم مشہور یونانی اوریسٹس والی تھیم ہے۔ سارتر کا اوریسٹس ORESTES ایک نرم طبیعت، نازک، اخلاقی پابندیوں کے ماحول میں پلا لڑکا ہے، (یہ گویا اس کا ESSENCE ہے) لیکن جب وہ ایک عزم" کر لیتا ہے تو ایک دوسری ہی ہستی بن جاتا ہے۔ اور صحیح معنوں میں اس کا وجود (EXISTENCE) اس وقت قائم ہوتا ہے۔ اوریسٹس کا نیا وجود وہ ہے جسے دیکھ کر خود ذیوس ZEUS پکار اٹھتا ہے۔

" ایک وقت کے پورا ہونے کے بعد ایک انسان آنے والا ہے، ایک ایسا انسان جو میری (یعنی خدا کی) انحطاط کا اعلان کرتا اور تم اوریسٹس، ایسا معلوم ہوتا ہے، تم وہ انسان ہو"

" چاند گہن" کا مرکزی کردار LA NAUSEA کے کردار کی طرح آخر تک بس انفعالیت کے بوجھ تلے دبا رہتا ہے۔ اس کے سامنے ایسا کوئی واضح CHOICE نہیں ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے آپ کو کچھ اور بنا سکے۔ ایک مثبت، نیا وجود بن جائے۔ اور موجودہ دور کے انسان کے لئے جس کے سامنے ابہام، شکوک و شبہات اور UNCERTAINITIES کے سوا کچھ نہیں، کوئی واضح انتخاب شاید ممکن بھی نہیں۔

انتظار حسین کی حال میں لکھی" رزمیہ" بھی جو تقسیم کے بعد لکھی گئی ساری چیزوں میں ایک خاص وقیع تخلیق کی حیثیت رکھتی ہے۔ انسانی شخصیت کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش ہے۔ یہاں انتظار حسین آندرے ژید سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔

ہمارے ہاں ایک اور طرح کا افسانہ جو کسی تحریک یا رجحان کے تحت نہیں آتا لیکن جو افسانہ کی ترقی یافتہ اور بالکل نئی شکل ہے تینوں بُعد کا (THREE DIMENSIONAL) افسانہ ہے۔ اس طرز کے چند ہی افسانے لکھے گئے ہیں۔ چنانچہ" ان داتا" (کرشن چندر) " مدن سینا اور صدیاں" " زرین تاج" (عزیز احمد) " وہ پک داگ" اور" میگھ ملہار" (ممتاز شیریں)۔ تینوں بُعد کے معنی ہیں لمبائی،

چوڑائی اور گہرائی یعنی وہ بات جو بڑے سے بڑے کینوس پر تصویر میں بھی پیدا نہیں ہو سکتی، ایک ایسی تراشیدہ شبیہہ کے ذریعہ ظاہر ہو سکتی ہے جسے کئی زاویوں سے دیکھا جا سکے۔ چنانچہ کرشن چندر کے "ان داتا" میں ایک موضوع یعنی بنگال کے قحط پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک غیر ملکی سفیر کی اس المیہ سے بے اعتنائی، طوفان سے دُور ساحل پر کھڑے طبقوں کی جھوٹی ہمدردی اور آخر میں خود اس انسان کا المیہ جو اس طوفان سے گذر رہا ہے۔ سارے پہلوؤں کو مکمل طور پر EXHAUSTIVE بنانا تقریباً ناممکن ہے۔ کیونکہ ہر پہلو سے کوئی اور پہلو نکل آتا ہے۔ لیکن یہاں یہ بات کہ ایک ہمہ گیر اور وسیع سے وسیع تر دائرے میں ایک مسئلہ کو گھیرا جا سکتا ہے "دیپک راگ" میں جنس و محبت سے متعلق کئی مختلف رویے (ATTITUDES) ہیں، جو متوازی بھی ہیں اور متضاد بھی۔ اور یہ رویے اتنے ہی مختلف اور متنوع ہو سکتے ہیں جتنی کہ انسانی سیرت پیچیدہ ہے۔ "ان داتا" اور "دیپک راگ" میں زاویے مختلف ہیں لیکن زمانہ ایک ہے۔ "زریں تاج" میں زمانے مختلف ہیں، جن میں ایرانی عورت کو مختلف شبیہوں میں پیش کیا گیا ہے، لیکن مکان ایک ہے۔ "مدن سینا اور صدیاں" اور "میگھ ملہار" میں زمان اور مکان دونوں کی وسعتوں کو سمیٹنے کی کوشش ہے۔ قدیم سے قدیم زمانے سے لے کر موجودہ زمانے تک یعنی صدیوں کا فاصلہ۔ اور دُنیا کے مختلف ملکوں اور قوموں اور بڑی بڑی قدیم تہذیبوں اور مذہبوں کے مشترکہ اور متضاد عناصر کو یکجا کرنے کی سعی۔

عزیز احمد کے افسانے میں (مدن سینا اور صدیاں) جس کی مرکزی تھیم "عاشق، معشوق اور رقیب" کی تثلیث ہے اور وہ ہی تال کا وہ ازلی سوال "ان تینوں میں فیاض کون ہے"؟ اس میں مختلف ملکوں کی پُرانی مشہور داستانیں ہیں، ہندوستانی، یونانی، ایرانی، مدن سینا، شیریں فرہاد، ٹوری گن آدرے لیس وغیرہ اور داستان گوئی کے ساتھ اس میں تاریخ اور تحقیق کا امتزاج ہے۔

"میگھ ملہار" کی، جس کی مرکزی تھیم موسیقی کا سحر اور فن کار کی حیات جاودانی ہے، بنیادی دُنیا کی قدیم تہذیبوں کی MYTHOLOGY پر رکھی گئی ہے۔ ہندو دیو مالا اور یونانی اساطیر جن میں کئی باتیں مشترک ہیں۔ اور جہاں MYTHOLOGY سے تھوڑا سا گریز کیا ہے وہاں ہیں نئے انجیلی، عیسائی رمزیت CHRISTIAN SYMBOLISM اور ہومر، درجل، ملٹن کے بلکے سے ٹچز دیئے ہیں، جن کی داستان سے مناسبت ہے۔ اور آخر میں آرفیوس، یوریڈیس اور تار ساٹیس کی یونانی MYTH ایک ایرانی رومان میں دہرائی گئی ہے جو اسی زمانے کا ہے، لیکن افسانے کے دوسرے حصوں سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے اسے بھی اسطوری MYTHICAL ٹون دیا ہے۔

روایاتی تصور کے مطابق اسطوری حقیقت مادّی حقیقت سے کہیں گہری ہوتی ہے گو یہ مبہم ہوتی ہے اور MYTH میں ہمیشہ کوئی گہرے معانی پوشیدہ ہوتے ہیں اور بظاہر سادہ اور حسین LEGENDS کسی آفاقی UNIVERSAL حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ہمارے افسانے کی رینج ہر لحاظ سے وسیع ہے۔ تکنیک، رجحان، موضوع، مواد، ہر اعتبار سے ہمارا افسانہ متمول اور متنوع ہے۔ چنانچہ اگر معاشرتی حقیقت نگاری میں "آخری کوشش" (حیات اللہ انصاری) "کلیاں اور کانٹے" (اختر اورینوی) اور "زندگی کے موڑ پر" (کرشن چندر) کے سے شاہکار ہیں تو "رمزیت" میں "قید خانہ" (احمد علی) کا سا نہایت گہرا اور مکمل افسانہ۔ ایک طرف "بابو گوپی ناتھ" (منٹو) اور "حرامجادی" (عسکری) کے سے انفرادی افسانے ہیں تو دوسری طرف "آنندی" (غلام عباس) کا سا اجتماعی افسانہ ایک طرف بلونت سنگھ کے "رنگ" کا سا ہلکا پھلکا نازک افسانہ ہے، جس میں محض رنگوں کے امتزاج اور تبدیلی کے ذریعہ مختلف چھوٹے چھوٹے تاثرات یکجا کئے گئے ہیں یا قدرت اللہ شہاب کا "تلاش" جس میں صرف ایک "موڈ" کی گرفت ہے، یہ نازک، مرصّع زیورات کے سے ترشے ہوئے افسانے، تو دوسری طرف یہ تینوں بُعد THRE DIMENSIONAL کے افسانے "ان داتا" "مدن سینا اور صدیاں" "میگھ ملہار" جو ایک وسعت و گیرائی، عظمت و شان، اور ایک COLASSUS کا احساس دلاتے ہیں۔

ان افسانوں کو پڑھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ ہمارا افسانہ کسی بھی لحاظ سے مغربی افسانہ سے پیچھے رہ گیا ہے ؟

امریکہ کے اس دور کی ایک بہت ذہین اور ہونہار افسانہ نگار یوڈورا ویلٹی افسانہ پر اپنے ذاتی انفرادی تاثرات بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ ہر افسانہ میں ایک "جستجو" ہوتی ہے۔ ہر افسانہ کی اپنی ایک "فضا" ہوتی ہے۔ افسانے آسمان پر بکھرے ہوئے تاروں کی طرح ہیں جن پہ اپنے ذہن کو اگر الگ الگ مرکوز کیا جائے تو ہمیں یہ احساس ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک کی اپنی ایک الگ دنیا ہے۔ اور ہر ایک کی اپنی ایک الگ روشنی۔ ان میں سے بعض ستاروں کی طرح ساکت و جامد ہوتے ہیں، بعض سیاروں کی طرح اپنے اپنے دائروں میں گھومتے ہیں۔ بعض شہاب ثاقب کی طرح اچانک شعلہ زن ہوتے ہیں اور اپنے پیچھے روشنی کی ایک لکیر چھوڑ کر غائب ہوجاتے ہیں۔ اور بعض دمدار سیاروں کی طرح ہیں جو حمل ستارے کی مرکزی روشنی کے علاوہ ایک اور ہی کہانی اپنے جلو میں لئے ہوتے ہیں جو دمدار سیارے کی دم کی طرح بہت پیچھے تک اپنی روشنی چھوڑتی ہے۔

ہمارے افسانوں میں بھی یہی تنوع ہے۔ ہمارا افسانہ مغربی ادب سے ضرور متاثر ہوا ہے لیکن ہمارے افسانے نے نہ صرف مغربی افسانہ کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے بلکہ اپنی آپ اپنی انفرادیت کا بھی مظہر ہے۔ یہ ہماری اپنی قومی زندگی کا نمائندہ ہے۔ اس میں ہمارے اپنے مسائل پیش ہوگئے ہیں خواہ وہ معاشرتی ہوں یا معاشی یا جنسی یا سیاسی مسائل۔ اور آج ہمارا افسانہ اتنا ترقی یافتہ ہے کہ وہ مجموعی طور پہ کسی بھی مغربی ملک کے افسانوی ادب کے مقابلے میں فخر سے پیش کیا جا سکتا ہے۔

چوڑائی اور گہرائی۔ یعنی وہ بات جو بڑے سے بڑے کینوس پر تصویر میں بھی پیدا نہیں ہو سکتی، ایک ایسی تراشیدہ شبیہہ کے ذریعہ ظاہر ہو سکتی ہے جسے کئی زاویوں سے دیکھا جا سکے۔ چنانچہ کرشن چندر کے "ان داتا" میں ایک موضوع یعنی بنگال کے قحط پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک غیر ملکی سفیر کی اس المیہ سے بے اعتنائی، طوفان سے دور ساحل پر کھڑے طبقوں کی جھوٹی ہمدردی اور آخر میں خود اس انسان کا المیہ جو اس طوفان سے گذر رہا ہے سارے پہلوؤں کو مکمل طور پر EXHAUSTIVE بنانا تقریباً ناممکن ہے۔ کیونکہ ہر پہلو سے کوئی اور پہلو نکل آتا ہے۔ لیکن یہاں یہ بات کہ ایک ہمہ گیر اور وسیع سے وسیع تر دائرے میں ایک مسئلہ کو گھیرا جا سکتا ہے "دیپک راگ" میں جنس و محبت سے متعلق کئی مختلف رویے (ATTITUDES) ہیں، جو متوازی بھی ہیں اور متضاد بھی۔ اور یہ رویے اتنے ہی مختلف اور متنوع ہو سکتے ہیں جتنی کہ انسانی سیرت پیچیدہ ہے۔ "ان داتا" اور "دیپک راگ" میں زاویے مختلف ہیں لیکن زمانہ ایک ہے۔ "زریں تاج" میں زمانے مختلف ہیں، جن میں ایرانی عورت کو مختلف شبیہوں میں پیش کیا گیا ہے، لیکن مکان ایک ہے۔ "مدن سینا اور صدیاں" اور "میگھ ملہار" میں زمان اور مکان دونوں کی وسعتوں کو سمیٹنے کی کوشش ہے۔ قدیم سے قدیم زمانے سے لے کر موجودہ زمانے تک یعنی صدیوں کا فاصلہ۔ اور دنیا کے مختلف ملکوں اور قوموں اور بڑی بڑی قدیم تہذیبوں اور مذہبوں کے مشترکہ اور متضاد عناصر کو یکجا کرنے کی سعی۔

عزیز احمد کے افسانے میں (مدن سینا اور صدیاں) جس کی مرکزی تھیم "عاشق، معشوق اور رقیب" کی تثلیث ہے اور وہ تاثر کا وہ ازلی سوال "ان تینوں میں حیاض کون ہے؟" اس میں مختلف ملکوں کی پرانی مشہور داستانیں ہیں، ہندوستانی، یونانی، ایرانی، مدن سینا، شیریں فرہاد، ٹدری گن آرسے لیس وغیرہ اور داستان گوئی کے ساتھ اس میں تاریخ اور تخلیق کا امتزاج ہے۔

"میگھ ملہار" کی، جس کی مرکزی تھیم موسیقی کا سحر اور فنکار کی حیات جاودانی ہے، بنیادی دنیا کی قدیم تہذیبوں کی MYTHOLOGY پر لکھی گئی ہے۔ ہند دیومالا اور یونانی اساطیر جن میں کئی باتیں مشترک ہیں۔ اور جہاں MYTHOLOGY سے تھوڑا سا گریز کیا ہے وہاں ہیں نے انجیل، عیسائی رمزیت CHRISTIAN SYMBOLISM اور ہومر، ورجل، ملٹن کے ہلکے سے ٹچ دیئے ہیں، جن کی داستان سے مناسبت ہے۔ اور آخر میں آرفیوس، یوریڈیس اور نارسسئیس کی یونانی MYTH ایک ایرانی رومان میں دہرائی گئی ہے جو اسی زمانے کا ہے، لیکن افسانے کے دوسرے حصوں سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے اسے بھی اسطوری MYTHICAL ٹون دیا ہے۔

روایاتی تصور کے مطابق اسطوری حقیقت مادی حقیقت سے کہیں گہری ہوتی ہے گو مبہم ہوتی ہے اور MYTH میں ہمیشہ کوئی گہرے معانی پوشیدہ ہوتے ہیں اور بظاہر سادہ اور حسین LEGENDS کسی آفاقی UNIVERSAL حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ہمارے افسانے کی پرنج ہر لحاظ سے وسیع ہے۔ تکنیک، رجحان، موضوع، مواد، ہر اعتبار سے ہمارا افسانہ متمول اور متنوع ہے۔ چنانچہ اگر معاشرتی حقیقت نگاری میں "آخری کوشش" (حیات اللہ انصاری) "کلیاں اور کانٹے" (اختر اورینوی) اور "زندگی کے موڑ پر" (کرشن چندر) کے سے شاہکار ہیں تو "رمزیت" میں "قید خانہ" (احمد علی) کا سا نہایت گہرا اور مکمل افسانہ۔ ایک طرف "بابو گوپی ناتھ" (منٹو) اور "حرام جادی" (عسکری) کے سے انفرادی افسانے ہیں تو دوسری طرف "آنندی" (غلام عباس) کا سا اجتماعی افسانہ ایک طرف بلونت سنگھ کے "رنگ" کا سا ہلکا پھلکا نازک افسانہ ہے، جس میں محض رنگوں کے امتزاج اور تبدیلی کے ذریعہ مختلف چھوٹے چھوٹے تاثرات یکجا کئے گئے ہیں یا قدرت اللہ شہاب کا "تلاش" جس میں صرف ایک "موڈ" کی گرفت ہے، یہ نازک، مرصع زیورات کے سے ترشے ہوئے افسانے، تو دوسری طرف یہ تینوں بُعد THRE DIMENSIONAL کے افسانے "ان داتا" "مدن سینا اور صدیاں" "میگھ ملہار" جو ایک وسعت و گیرائی، عظمت و شان، اور ایک COLASSUS کا احساس دلاتے ہیں۔

ان افسانوں کو پڑھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ ہمارا افسانہ کسی بھی لحاظ سے مغربی افسانہ سے پیچھے رہ گیا ہے؟

امریکہ کے اس دور کی ایک بہت ذہین اور ہونہار افسانہ نگار یوڈورا ویلٹی افسانہ پر اپنے ذاتی انفرادی تأثرات بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ ہر افسانہ میں ایک "جستجو" ہوتی ہے۔ ہر افسانہ کی اپنی ایک "فضا" ہوتی ہے۔ افسانے آسمان پر بکھرے ہوئے تاروں کی طرح ہیں جن پر اپنے وزن کو الگ الگ مرکوز کیا جائے تو ہمیں یہ احساس ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک کی اپنی ایک الگ دنیا ہے۔ اور ہر ایک کی اپنی ایک الگ روشنی۔ ان میں سے بعض ستاروں کی طرح ساکت و جامد ہوتے ہیں، بعض سیاروں کی طرح اپنے اپنے دائروں میں گھومتے ہیں۔ بعض شہاب ثاقب کی طرح اچانک شعلہ زن ہوتے ہیں اور اپنے پیچھے روشنی کی ایک لکیر چھوڑ کر غائب ہو جاتے ہیں۔ اور بعض دمدار سیاروں کی طرح ہیں جو اصل ستارے کی مرکزی روشنی کے علاوہ ایک اور ہی کہانی اپنے جلو میں لئے ہوتے ہیں جو دمدار سیارے کی دُم کی طرح بہت پیچھے تک اپنی روشنی چھوڑتی ہے۔

ہمارے افسانوں میں بھی یہی تنوع ہے۔ ہمارا افسانہ مغربی ادب سے ضرور متأثر ہوا ہے لیکن ہمارے افسانے نے نہ صرف مغربی افسانہ کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے بلکہ اپنی آپج اور انفرادیت کا بھی مظہر ہے۔ یہ ہماری اپنی قومی زندگی کا نمائندہ ہے۔ اس میں ہمارے اپنے مسائل پیش ہوئے ہیں خواہ وہ معاشرتی ہوں یا معاشی یا جنسی یا سیاسی مسائل۔ اور آج ہمارا افسانہ اتنا ترقی یافتہ ہے کہ وہ مجموعی طور پر کسی بھی مغربی ملک کے افسانوی ادب کے مقابلے میں فخر سے پیش کیا جا سکتا ہے۔

محمد حسن عسکری

اردو افسانے کا مستقبل

ہمارے ادب پر جمود طاری ہے یا نہیں؟ ہمارے ادیبوں کی تخلیقات میں کمی واقع ہوئی ہے یا نہیں؟ پچھلے پانچ سال میں جو کچھ لکھا گیا ہے اسکی ادبی حیثیت کیا ہے؟ اس کا کتنا حصہ قابلِ قدر ہے؟ ان سوالوں کے مختلف جواب ہو سکتے ہیں بعض لوگ ممکن ہے ضرورت سے زیادہ مایوس ہوں اور بعض ممکن ہے ابھی تک خوش فہمی میں مبتلا ہوں۔ بہرصورت ادبی قدر و قیمت کے سوال سے الگ ہٹ کر بھی پچھلے پانچ سال کے ادب پر غور کیا جا سکتا ہے اور اسکی بحث سے بعض ایسے نتائج مرتب ہو سکتے ہیں جنکا تعلق صرف ادب ہی سے نہیں بلکہ پورے معاشرے کی حالت اور خصوصاً ملک کی ذہنی فضا سے بھی ہوگا۔ اسکے ساتھ موجودہ ادب کی نوعیت بھی کسی نہ کسی حد تک متعین ہو سکیگی۔ فی الحال میں اپنی بحث کو محض افسانوی ادب تک محدود رکھنا چاہتا ہوں، خصوصیت کیساتھ ان افسانوں تک جو پچھلے ڈھائی تین سال میں ہمارے سامنے آئے ہیں یعنی مجھے دیکھنا یہ ہے کہ جب فسادات سے متعلق افسانوں کا زور کم ہو گیا تو پھر افسانہ نگاروں نے اپنا مواد زندگی کے کن حصوں سے حاصل کیا، اور اپنے موضوع کے بارے میں انکا رویہ کیا رہا۔ اس عرصے میں جتنے افسانے لکھے گئے ہیں میں نے سب کے سب نہیں پڑھے نہ مجھے اس وقت اس سارے افسانوی ادب کا جائزہ لینا ہے۔ جو رجحانات پچھلے پندرہ سال سے ہمارے ادب میں حاوی ہیں، وہ تو بہرحال اپنی جگہ ہیں ہی مجھے تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ پچھلے تین سال میں کوئی نئے رجحانات نظر آئے ہیں یا نہیں۔ وہ رجحانات کس قسم کے ہیں اور اُن کا مجموعی سماجی حالات سے کیا تعلق ہے؟ یہاں بھی میں اپنی تفتیش کا دائرہ محدود رکھوں گا۔ نئے ادب کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ اس تحریک نے سیاست اور جنس کے بارے میں بہت صاف گوئی سے کام لیا۔ فی الحال میں یہ دیکھوں گا کہ آج کل کے افسانوں میں جنس کے بارے میں کیا نیا رویہ پیدا ہوا ہے۔ اور ملک کی سیاسی حالت سے اس رویے کا کتنا تعلق ہے۔ یہ بات واضح کر دینا بہتر ہے کہ انفرادی حیثیت سے میں کسی افسانہ نگار پر بحث نہیں کر رہا ہوں اور نہ ان افسانوں کی ادبی حیثیت پرکھنی مقصود ہے بلکہ دراصل اس وقت میرا موضوعِ بحث افسانوی ادب سے زیادہ ملک کی ذہنی فضا ہے۔ جو افسانوں میں جھلکتی ہے۔

اردو افسانوں کے جنسی رویے پر کچھ کہنے سے پہلے یہ سوچنا چاہئے کہ ادب میں جنسی موضوعات کو کس طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ کچھ دنوں سے ایک بڑی خطرناک اصطلاح چل نکلی ہے جو ظاہر میں تو بے ضرر سی ہے لیکن اسکے مبہم استعمال سے ادبی بحثیں اور اُلجھ جاتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ادب کو صحت مند ہونا چاہئے۔ دراصل یہ توصیفی فقرہ بالکل غیر ضروری سا ہے۔ اگر کوئی تحریر ادب کی حدود میں آتی ہے تو اپنے آپ سے اپنے آپ صحت مند ہو گی۔ کیونکہ ادب کی تخلیق بذاتِ خود جمالیاتی اور جذباتی توازن کی کاوش ہے۔ عام طور سے اس فقرے کا مطلب لوگ یہ لیتے ہیں کہ ادب میں جنسی کج روی اور جنس کے تخریبی پہلوؤں کا ذکر نہیں ہونا چاہئے

لیکن اگر ایسی پابندیاں عائد کر دی جائیں تو دنیا کے ادب کا بہت بڑا حصہ قربان کر دینا پڑے گا۔ سوفوکلیز نکل جائیگا۔ راسین نکل جائیگا۔ مارلو نکل جائیگا اور شیکسپیر کے بہت سے حصے خارج کرنے پڑینگے۔ اس طرح ادب کے نقصان کے باوجود اگر اس میں عوام الناس کی بھلائی ہو تو چلئے یہ بھی سہی لیکن اجتماعی زندگی کی صحت کیلئے لازمی ہے کہ جنسی تحریکات براہ راست اور وسیع پیمانے پہ بروئے کار نہ آئیں بلکہ ادب اور فن میں ان کا اظہار کر کے ان پر قابو پا لیا جائے مثلاً ایڈیپس کے خیال میں ہر قدیم یونانی اپنے اندر ایک ای۔ ڈی پس لئے پھرتا ہے۔ اور واقعی ای۔ ڈی۔ پس بن جانے سے بچنے کا واحد طریقہ یہی تھا کہ تھیٹر میں یہ سارا قصہ دیکھ لیا جاتے چنانچہ یہ ناٹک محض تماشا نہیں تھا بلکہ پوری یونانی قوم کا ایک ذہنی علاج تھا۔ اگر جنس کے تخریبی پہلوؤں کو ادب سے بالکل خارج کر دیا جائے اور انہیں شعور میں آنے سے پہلے بالکل روک دیا جائے تو اس سے سماج کا ذہنی توازن متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لئے یہ کلیہ تو کسی طرح بھی مناسب نہیں ہوگا کہ ادب میں صرف غیر صحت مندانہ افعال اور جذبات کا بیان ہو۔ جس طرح یہ ضروری ہے کہ جو غیر صحت مندانہ عناصر افراد میں اور سماج میں موجود ہیں۔ وہ ادب اور فن کے ذریعے شعور میں آجائیں اور یوں کسی حد تک ان کا ازالہ ہو جائے۔ اسی طرح یہ بھی لازمی ہے کہ متوازن اور تندرست شخصیت کی جسمانی اور نفسیاتی ضرورتوں کو بھی اظہار کا موقع ملتا رہے۔ غیر صحت مندانہ عناصر کے ادب میں ظاہر ہو جانے کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ سماج میں غیر شعوری طور پر کس قسم کے رجحان پرورش پا رہے ہیں مثلاً پچھلے سو سال کا مغربی ادب اور آرٹ دیکھ کر دو بڑی جنگوں سے پہلے ہی پیشین گوئی کی جا سکتی تھی کہ یورپ میں کس قسم کے ہولناک واقعات رونما ہونے والے ہیں۔ اسی طرح ہمارے برصغیر میں فسادات کے دوران میں جو کچھ ہوا اس کا پرتو پچھلے پندرہ برس کے ادب میں موجود ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری ادب اور آرٹ پر ہے۔ بعض لوگ چند سیاسی اور اجتماعی نظریات کے ماتحت اس قسم کے نتیجے نکالتے ہیں مگر وہ یہ بات نظر انداز کر جاتے ہیں کہ فن تو بذات خود ایسے تخریبی رجحانات سے نبرد آزمائی کرنے کا ایک ذریعہ ہے بلکہ زیادہ خطرے کی بات تو یہ ہے کہ ادب میں تخریبات کا ذکر آنے ہی نہ پائے اور ادب سہانے خوابوں اور نیک ارادوں کا مجموعہ بن کر رہ جائے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ سماج کے لاشعور میں تخریبی رجحانات اندر ہی اندر پل رہے ہیں اور ایسی جڑ پکڑ گئے ہیں کہ انہیں شعور میں لانا بھی مشکل ہے۔ لہٰذا تخریبات کے بیان سے گھبرانا اور اس پر پابندیاں عائد کرنا جسمانی اور ذہنی تندرستی کی ہرگز دلیل نہیں ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر صحت مند اور پختہ شخصیت کی ضرورتیں ادب میں بالکل ظاہر ہی نہ ہوں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ سماجی شخصیت اندرونی ہم آہنگی اور توازن حاصل کرنے کے لئے پوری جدوجہد نہیں کر رہی۔ مختصر یہ کہ ادب کو جنسی کجروی اور اس قبیل کے موضوعات اختیار کرنے سے ڈرنا تو نہیں چاہئے کیونکہ ادب انسانی وجود کی حقیقتوں سے پہلو بچائے تو وہ ادب ہی کیا ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ متوازن اجتماعی زندگی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ادب صحت مندی کی تلاش سے خالی نہ ہو۔

اس کے بعد یہ سوال آتا ہے کہ جنس کے معاملے میں صحت مند اور پختہ شخصیت کے مطالبات کیا ہوتے ہیں جنس کی اعلیٰ ترین اقدار کیا ہیں۔ اور ادب میں کہاں کہاں ملتی ہیں؟ یہ بحث تو فی الحال چھوڑ دیجیے۔ جہاں تک عام انسانوں کا تعلق ہے۔ انکی صحیح جنسی تسکین کے لئے دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک تو خالص جسمانی تسکین ہے جس میں انسان اور حیوان برابر کے شریک ہیں۔ اس جبلت کی شرکت کے بغیر محبت میں قوت اور گیرائی آہی نہیں سکتی۔ لیکن اس حیوانی خواہش کی تسکین انسان کیلئے کافی نہیں ہے۔ اس میں ان لطیف جذبات کی آمیزش بھی ہونی چاہئے جو انسان نے اپنی انفرادی اور اجتماعی نشوونما کے دوران میں پیدا کئے ہیں۔ جبلی خواہش کی شدت اور انسانی جذبات کی نرمی، ان دو کے بغیر صحت مندانہ اور متوازن جنسی رویہ مکمل نہیں ہوتا ہم اس رویے کو معیار سمجھ کر اردو کے افسانوی ادب کا جائزہ لیں گے۔

۱۹۳۶ء سے پہلے اردو میں وہ صنف بہت مقبول تھی جسے رومانی افسانہ کہتے ہیں۔ ان افسانوں میں محبت کے جنسی اور جبلی پہلو کا اعتراف قطعاً نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ محبت کو روحانیت بنانے سے بھی گریز کیا جاتا تھا۔ اس دور میں محبت ہلکے سے جذباتی تلاطم کا نام تھا۔ یعنی اس دور کے ادیبوں کی ذہنیت پندرہ سولہ سال کے لڑکوں کی سی تھی۔ جب جنس مخالف کی طرف کشش تو ہونے لگتی ہے مگر اس کشش کی جنسی نوعیت کو تسلیم کرنے سے گھبراہٹ ہوتی ہے اس لئے آدمی اس جذباتی ہیجان کی اصلیت پر غور نہیں کرتا، کیونکہ ڈر یہ ہوتا ہے کہ اگر ان جذبات کی جنسی آلودگی کو قبول کر لیا تو یہ جذبات قابل قبول نہیں رہیں گے۔ جو ادب کسی جذبے کی تہہ تک پہنچنے سے گھبرائے اس میں ہلکا پن اور سطحیت ہونی ہی چاہئے۔ ان رومانی افسانوں کے ساتھ ساتھ ٹیگوری نثر بھی خوب چلتی تھی۔ وہ بھی بلوغت کی

زندگی کا ایک نمونہ ہے۔ اس عمر میں انسان جنسی خواہش محسوس بھی کرتا ہے اور اسے گندی چیز سمجھ کر اس سے بھاگتا بھی ہے۔ چنانچہ جنسی جذبہ بڑی آسانی سے عبودیت اور مذہبیت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یونگ نے سچی مذہبیت کی تعریف یوں کی ہے کہ آدمی شعوری طور پہ جانتا ہو کہ میں اپنی فطرت کے کن فاسد عناصر کو قابو میں رکھنے کے لئے مذہب کا اخلاقی نظام قبول کر رہا ہوں اور جھوٹی مذہبیت یہ ہے کہ آدمی ان فاسد عناصر کا اعتراف کئے بغیر کسی اخلاقی نظام میں پناہ لینا چاہے۔ یہ جھوٹی مذہبیت بلوغت کے زمانے میں ہر لڑکے اور لڑکی کو اپنی پناہ میں لینے کے لئے موجود رہتی ہے۔ وہی اس زمانے میں ہمارے ادیبوں نے اختیار کر رکھی تھی۔ پھر ایک تیسری چیز تھی۔ نیاز فتح پوری اور ان کے ساتھیوں کی جمال پرستی۔ اُن لوگوں کو دعویٰ تھا کہ ہم میں ذرا ریاکاری نہیں ہے۔ اپنی خواہش کا اظہار بے لاگ کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی مزعومہ لذت پرستی بس یہ تھی کہ عورتوں کے اعضا کا نام بار بار چٹخارے کے ساتھ لیتے تھے۔ یہ بھی بلوغت کے اس دور کی خصوصیت ہے جب جنسی حس تو بیدار ہو گئی ہو مگر عملاً اس کی تکمیل کی اہلیت نہ آئی ہو اور آدمی کی ساری جنسی لذت دوسروں کو یہ جتانے پر منحصر ہو کہ لو، خیر سے ہم بھی جوان ہو گئے ...... غرض اردو ادب کے اس دور میں جنسیات کا ہر اظہار کھوکھلا اور بے تہ تھا۔ پھر اس قسم کے ادب کو ذرا وسیع پس منظر میں دیکھئے۔

۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۶ء تک مسلمانوں کی حالت بھی ایسی تھی جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ انہیں ملک کی سیاست میں اپنی کوئی جگہ نظر نہ آتی تھی۔ زندگی کی ذمہ داریوں اور فرضیوں سے انہوں نے اپنے آپ کو الگ کر لیا تھا۔ اجتماعی حیثیت سے ان کے لئے کوئی کشمکش اور جدوجہد باقی نہ رہی تھی۔ ان کا ایمان یہ رہ گیا تھا کہ "ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا"۔ ...... انفرادی حیثیت سے ایک عام مسلمان کا مطمح نظر اتنا تھا کہ کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر، خوشی سے پھول جا۔ جو بچکانہ پن اس زمانے میں مسلمانوں کی سیاست میں تھا وہی ادب میں بھی تھا ...... پھر ایک قابل غور بات یہ ہے کہ افسانوں میں زن مریدوں کے کردار کتنے عام ہو گئے تھے۔ غرض مسلمانوں پر ایک عجب مجہولیت اور مفعولیت طاری تھی۔ وہی رویہ جنس کے متعلق افسانوں میں بھی ملتا ہے۔

۱۹۳۶ء میں نئے ادب کی تحریک شروع ہوئی۔ جس کے ساتھ سیاست کے متعلق زیادہ دلیرانہ رویہ اور جنس کے بارے میں زیادہ حقیقت پرستانہ رویہ ابھرا ...... لیکن ۱۹۳۶ء سے لیکر ۱۹۴۷ء تک افسانوں میں جنس کے متعلق جو انداز نظر ملتا ہے۔ اُسے بھی متذکرہ بالا معیار کے مطابق مکمل طور پہ صحت مندانہ اور متوازن نہیں کہہ سکتے۔ ۱۹۳۶ء سے پہلے عشقیہ افسانوں میں محض جذباتی گداز اور نرمی ہی تھی، جسمانی پہلو کا اعتراف نہ تھا۔ اب وہ نرمی غائب ہو گئی، محض جسمانی بلکہ حیوانی پہلو پر زور دیا گیا۔ یہ رجحان اُس دَور کی نمائندگی کرتا ہے جب لڑکا جنسی تفتیش کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اس وقت جذبات کا سوز و گداز اُس کے لئے کوئی معنے نہیں رکھتا اور وہ ہر جنسی مظہر کو خالص جسمانی معاملہ سمجھتا ہے۔ اس عمر میں لڑکے کے لئے یہ انداز نظر انتہائی حقیقت پرستانہ ہوتا ہے، اور وہ اس پر فخر بھی کرتا ہے پھر جنسی جذبات کو خالص جسمانیت تک محدود کر دینے کے بعد لڑکے میں جنس اور جسم سے بیزاری پیدا ہو جاتی ہے اور گھن آنے لگتی ہے۔ چنانچہ اس دَور کے افسانوں میں یہی جنسی خصائص ملتے ہیں۔ لیکن یہ ذہنیت متوازن اور پختہ نہ سہی، مریضانہ ہرگز نہیں ہے۔ یہ جنسی تفتیش ہر قسم کے عملی اور روحانی تجسس کی بنیاد بن سکتی ہے۔ یہ رویہ اختیار کر کے ہمارے افسانوی ادب نے کم سے کم آنکھ تو کھولی تھی، خواب خرگوش سے تو بیدار ہوا تھا۔ اب سے سات آٹھ سال پہلے بعض حضرات نے نئے ادیبوں کو بلوغت بانگی کا طعنہ دیا تھا۔ یہ طعنہ بالکل درست ہے لیکن اسی بلوغت بانگی کے طفیل ادیبوں میں اتنی جان آئی تھی۔ کہ زندگی کے ہر پہلو سے دلچسپی لیں۔ خوش آئند خواب نہ دیکھیں، بلکہ ہر چیز کی حقیقت سمجھنے کی کوشش کریں، سیاست میں دلیری اور جرأت سے کام لیں، اپنے سیاسی مسائل کو ساری دنیا کے معاشی اور سیاسی پس منظر میں دیکھیں۔ اس بلوغت بانگی نے ہمارے ادیبوں کو دو بڑی باتیں سکھائیں، حقیقت بینی اور صاف گوئی۔ یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے ان سے کام کتنا لیا۔ بہرحال یہ دو رجحانات ایسے پیدا تو ہوئے جن کے بغیر جاندار ادب کی تخلیق ممکن نہیں۔ پھر اجتماعی زندگی میں بھی ایسی تحریکات پیدا ہو گئیں جو ان رجحانات کو تقویت پہنچا رہی تھیں۔ مسلمانوں نے بھی مجہولیت چھوڑ کر ایک واضح رویہ اختیار کر لیا۔ یہ رویہ غلط ہو یا صحیح، بہر صورت مسلمانوں نے بعض حقیقتوں کو بالکل حتمی طور پر قبول کر لیا اور ان کے بارے میں پوری صاف گوئی سے کام لیا جو نئی قوت مسلمان قوم میں نظر آتی ہے وہی اس دور کے اردو ادب میں دکھائی دیتی ہے مگر سیاسی اور ادبی تحریکیں دونوں کی دونوں نرمی سے خالی ہیں۔ اگر ادیب اپنے ادبی فرائض کے بارے میں واقعی سنجیدہ ہوتے تو یہ ممکن تھا کہ پختہ شخصیت کے تقاضے پورے کرنے کی صلاحیت ان میں آ جاتی، اور وہ جنس کے جسمانی پہلو اور انسانی محبت کے سوز و گداز کو سمو سکتے۔ لیکن بہت سے اسباب ایسے پیدا ہو گئے جن کی

وجہ سے ادیبوں کی صحیح نشو و نما نہ ہو سکی۔

بنگال کے قحط اور فسادات کے دوران میں ادیب حقیقت بینی چھوڑ کر نیک بینی پر آ رہے۔ اس نیک بینی کے پیچھے کتنی اذیت پسندی چھپی ہوئی تھی اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ کیونکہ ادیب زندگی کی حقیقتوں سے کیا دوچار ہوں گے۔ اب تو وہ خود اپنی حقیقت سے آنکھیں چار کرتے گھبراتے ہیں۔ بہر صورت نیک بینی کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ حقائق کو تسلیم نہ کیا جائے۔ لیکن حقائق سے بچنے کے لئے بعض دفاعی انتظامات بھی کرنے پڑتے ہیں۔ ان کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا غرض حقیقت بینی کے بعد نیک بینی آئی اور اس کے بعد خواب آلودگی۔ یہ ہے سنہ ۳۶ء سے لیکر اب تک ہمارے افسانوی ادب کی داستان۔

اگر ہمارا ادب صحیح معنوں میں ترقی کرتا تو جنس کے متعلق اتنی حقیقت بیانی کے بعد یہ ہونا چاہئے تھا کہ انسانی تہذیب میں جنسی اقدار نے جو نشو و نما حاصل کی ہے ادیب اُسے سمجھنے کی کوشش کرتے، اور اپنے جنسی رویئے میں قوت، توانائی، نرمی، ملائمت، نفاست، عظمت کے عناصر لاتے۔ لیکن ہمارے افسانے نے ایک بالکل دوسرا رُخ اختیار کیا ہے۔ سنہ ۳۶ء سے سنہ ۴۰ء تک عام طور پر جو افسانے لکھے گئے ہیں انہیں عشقیہ نہیں کہا جا سکتا، گو ان میں جنسی معاملات کا ذکر نمایاں حیثیت رکھتا ہے لیکن اب پچھلے دو ڈھائی سال سے عشقیہ افسانے پھر نمودار ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ عشقیہ سے مراد وہی لڑکوں والا دھیما دھیما سا جذباتی ہیجان ہے جس میں اس ہیجان کی جنسی نوعیت کا اقرار کرنے سے پہلو بچایا جاتا ہے۔ یعنی نئے ادب کی تحریک افسانے کو جہاں تک لے آئی تھی وہاں سے آگے بڑھنے کے بجائے ہمارا افسانہ پھر پیچھے کی طرف لوٹ رہا ہے مگر سنہ ۳۶ء سے پہلے کی جذبات پرستی تو لڑکوں کی سی تھی آج کل افسانے اس طرح کے لکھے جا رہے ہیں جیسے چودہ پندرہ سال کی لڑکیاں بیداری میں خواب دیکھتی ہیں۔ ہمارے بیشتر افسانے نہ صرف معاشرے کی حقیقت سے دور ہوتے جا رہے ہیں بلکہ جنسی حقائق سے بھی گریز کرتے ہیں جو افسانے ترقی پسندانہ اثرات کے ماتحت لکھے جاتے ہیں ان کی ادبی حیثیت کچھ بھی سہی ان میں حقیقت کو کتنا ہی مسخ کیوں نہ کیا گیا ہو۔ بہر حال ان میں زندگی کے بعض پہلوؤں کو سمجھنے اور زندگی میں چند تبدیلیاں پیدا کرنے کی دعوت تو ہوتی ہے۔ ترقی پسند افسانے کم سے کم حقیقت سے ٹکر لینے کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر یہ نئی عشقیہ افسانہ نگاری سیاسی، سماجی، نفسیاتی، جنسی، ہر قسم کی حقیقت سے آنکھیں چراتی ہے۔ اگر ترقی پسند افسانہ ادب نہیں ہے تو یہ افسانہ بھی ادب نہیں ہے۔ ترقی پسند افسانہ کم سے کم اس بات میں بہتر ہے کہ اتنی مجہول انفعالیت تو پیدا نہیں کرتا۔ ان عشقیہ افسانوں میں اور جنس کی گندگی سے گھبرا کر رومانیت میں پناہ لینے والی لڑکیوں کے تخیلات میں کتنی مماثلت ہے اس کا اندازہ اس سے کر لیجئے کہ ان کہانیوں کا پس منظر عموماً کوئی غیر ملک ہوتا ہے اور یہ عشق عجیب و غریب ناموں والے درختوں کے سائے میں یا امریکی گانوں کی تال پر پروان چڑھتا ہے۔ انجام ہمیشہ عشق کی شکست اور آنسوؤں پر ہوتا ہے۔ یہ ذہنیت سو فی صدی اسکول کی لڑکیوں کی ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھئے کہ ہمارے ادب میں یا ہمارے مزاج میں نرمی اور نفاست بڑھتی جا رہی ہے۔ کوئی سماجی مظہر اپنی جگہ اکیلا نہیں ہوتا، اس کا تعلق دوسرے مظاہر سے بھی ہوتا ہے۔ اور انہی کے ساتھ مل کر اس میں پورے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو افسانوں میں یہ رونا دھونا اور سوز و گداز ہے۔ دُوسری طرف جو فلمیں مقبول ہو رہی ہیں ان کی کیفیت ہی اور ہے۔ ایسی فلمیں لوگوں کو بہت پسند آتی ہیں جن میں ہیرو ہیروئن سے بدسلوکی کرے اور اُسے اپنا غلام بنا کر رکھے۔ بلکہ بعض فلموں کا اشتہار تو اس طرح دیا جاتا ہے کہ اس میں ہیرو ہیروئن کو پیٹتا ہے۔ ان فلموں اور متذکرہ بالا افسانوں سے اثر لینے والے تقریباً ایک ہی ہیں۔ ان دو چیزوں کو ساتھ ملا کر دیکھئے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمارے متوسط طبقے میں فاعلی اور مفعولی دونوں قسم کی ایذا پرستی بڑھ رہی ہے، لیکن وہ اس سے واقف نہیں ہونا چاہتا۔ یہ عشقیہ افسانے اس ایذا پرستی پر پردے کا کام دیتے ہیں۔ لیکن ایسے خطرناک رجحانات اندھیرے میں اور تیزی سے پلتے ہیں۔ اگر ہمارے ادب میں پہلے کی طرح حقیقت بینی اور صاف گوئی کا مادہ ہوتا تو کم سے کم ہمارا شعور ان رجحانات سے واقف تو ہو سکتا لیکن اب یہ زہر اندر ہی اندر پک رہا ہے اور خدا جانے ہمارے معاشرے کے لئے اس سے کیا نتیجے نکلیں گے۔ اگر اور کچھ نہ ہوا تو بھی یہ کیا کم ہے کہ ایسے ادب کے زیر اثر آنے والا طبقہ صحیح قسم کی جنسی تسکین کا تصور اپنے ادب سے اخذ نہ کر سکے، اور یا تو لڑکپن کی جذبات پرستی میں پڑا رہے یا جنسی اذیت پسندی کی طرف مائل ہو جائے۔

ہمارے افسانے میں یہ ترقی معکوس کیوں ہو رہی ہے؟ ہماری شخصیت میں پختگی آنے کی بجائے لڑکپن کیوں آتا جا رہا ہے؟ اس کی نفسیاتی وجوہ

تو بہت کچھ ہوں گی مگر ان کی تفتیش کی اہلیت مجھ میں نہیں۔ بہر صورت سماجی اسباب کا سمجھنا کچھ ایسا مشکل نہیں۔ ہم نے ابھی آزادی حاصل کی ہے، بلکہ ایک نیا ملک اور نئی قوم بنائی ہے۔ ایسی صورت میں ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ ہماری ذہنی دلچسپیاں اور سنجیدہ تفکر کی عادت بڑھے، ہم اپنے معاشرے کو معاشی انصاف اور سماجی مساوات کی بنیادوں پر تشکیل دینے کی تجویزیں سوچیں لیکن ہوا یہ ہے کہ ہم نے آزاد ملک کے باشندوں کی ذمہ داریاں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ دوسری طرف حکومت کو یہ پسند نہیں کہ عام آدمی رموز مملکت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ملک کی سیاسی حالت کے متعلق رائے قائم کرتے ہی آدمی کمیونسٹ بن جاتا ہے آئینی طور پر ملک میں آزادی رائے ہو یا نہ ہو، مگر عملی اعتبار سے عموماً لوگ اس جمہوری حق کو استعمال کرتے ہوئے گھبرانے لگتے ہیں کیونکہ ہمارے یہاں حب الوطنی کی ایسی شدت ہے کہ غداری کی بو دور سے آجاتی ہے۔ جب سماجی حقیقتوں کے سمجھنے سمجھانے میں ایسی دشواریاں ہوں تو ذہن جنسی تصورات میں پناہ لیتا ہے۔ لیکن یہاں بھی یہ حال ہے کہ ذرا کسی جنسی فعل کا ذکر کر دیجئے اور فحاشی کے جرم میں کھنچے کھنچے پھریئے۔ غرض نہ سیاست کے متعلق صاف گوئی سے کام لے سکتے ہیں نہ جنس کے متعلق۔ بالغ نظر کے انسانوں کی جتنی دلچسپیاں ہیں ان سب کو ڈر کے مارے ادب سے خارج کرنا پڑتا ہے ظاہر ہے کہ ادیب بے چارے سکرڈ ہمٹ کے اسکول کی لڑکیاں نہ بنتے چلے جائیں تو اور کیا ہو ......

لیکن کیا بالغ انسان اطمینان کے ساتھ لڑکیاں بنے رہ سکتے ہیں؟ اگر وہ اس پہ قانع نہیں رہ سکتے تو پھر اس کا انجام کیا ہوگا؟ یہ بسوز دیرم کا معاملہ ہے۔ بہر حال اگر اس میں نفسیاتی رجعت کا نتیجہ ناخوشگوار نہ نکلے تب بھی یہ سوچنے کی بات ہے کہ ایک نئے نئے آزاد اور جمہوری ملک کے تعلیم یافتہ طبقے کا اس طرح بچوں کی سطح پہ اترنا ملک کے لئے اور اس کے مستقبل کے لئے کس حد تک فائدہ مند ہے؟ ایک ادبی بحث ہمیں اس جگہ لے آئی ہے۔ جہاں بات ادب سے بہت دور نکل گئی ایک معمولی مضمون نگار اتنے بڑے سوال کا کیا جواب دے۔ یہ تو ان لوگوں کے سوچنے کی بات ہے جو ملک اور قوم کے مستقبل کے لئے خاکے تیار کرتے ہیں۔

(نقوش ۲۵، ۲۶)

اُردو افسانے میں روایت اور تجربے

(سمپوزیم)

حصہ لینے والے:

سعادت حسن منٹو   احمد ندیم قاسمی   سید وقار عظیم   ڈاکٹر عبادت بریلوی

ہاجرہ مسرور   خدیجہ مستور   انتظار حسین   شوکت تھانوی   حمید اختر

یہ سمپوزیم اس سے پہلے بھی نقوش کے ایک افسانہ نمبر میں چھپ چکا ہے۔ اس نمبر میں اسے دوبارہ پیش کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ اس نمبر میں اس کی شمولیت بعض کوتاہیوں کے باوجود ناگزیر تھی۔

آخر میں تین چار افسانہ نگاروں پر قدوے تفصیلی تبصرہ اضافہ کر دیا گیا ہے۔

مدیر نقوش نے کہا۔ آج کی نشست کا مقصد یہ ہے کہ ہم اردو افسانہ میں روایت اور تجربے کے عنوان کے ماتحت گفتگو کریں۔

احمد ندیم قاسمی ۔ پہلے وہ صاحب بولیں جنہیں اس کا تجربہ ہو۔

سعادت حسن منٹو ۔ پہلے یہ بتلائیے کہ آپ کو افسانے سے بحث ہے یا افسانہ نگار سے، دوسری بات یہ کہ افسانے کی روایت کو بہت دور سے TRACE کرنا پڑے گا۔

عبادت بریلوی ۔ ہم ان افسانوں کی روایت سے بحث کریں گے جو اردو میں لکھے گئے۔

ندیم ۔ منٹو صاحب کا یہ کہنا کہ ہر افسانہ نگار کی ایک روایت ہے، صحیح ہے لیکن یہی روایت آگے چل کر افسانے کی روایت بن جاتی ہے۔ موجودہ دور کے افسانوں سے پہلے جو اردو افسانے لکھے گئے ہیں ان کی ہیئت کے اعتبار سے جو صورت مرتب ہوتی ہے ہم اسی کو بنیاد بنا کر بحث کریں گے۔ ذاتی اسٹائل کو ہم اسلوب اور روایت کہہ سکتے ہیں۔

وقار عظیم ۔ بنیادی طور پر ہر صنف ادب کے کچھ فنی لوازم ہوتے ہیں۔ یہی لوازم اس صنف اور دوسری اصناف میں فرق و امتیاز پیدا کرتے ہیں۔ یہی صورت افسانے کی ہے۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ جب ہمارے پہلے افسانہ نگار نے افسانہ لکھا تو کن چیزوں کو بنیاد بنایا اور پھر آگے چل کر نئے تجربوں کے ذریعہ اس میں کیا اضافے ہوئے؟

منٹو ۔ لیکن پرانے زمانے میں جو لوگ افسانے لکھتے تھے کیا وہ ان روایات پر قائم رہتے تھے۔ میرے خیال میں تو ان کے درمیان حد فاصل قائم کرنا مشکل ہے۔

وقار عظیم ۔ ہر تجربہ آگے چل کر روایت کا جزو بن جاتا ہے اور جب وہ روایت بن جاتا ہے تو آگے آنے والے وقت کے تقاضوں کی بنا پر نئے تجربے کرتے ہیں اور ہوتے ہوتے یہ بھی روایت کا حصہ بن جاتے ہیں۔

ندیم ۔ سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اردو افسانے کی ابتدا کہاں سے ہوئی، اور کیا اردو افسانے کی روایت اتنی وسیع ہے کہ ہم اس پر بحث کر سکیں۔ غالباً اردو افسانے کی ابتدا اسی صدی میں ہوئی ہے اور ہمارے ابتدائی افسانہ نگاروں میں سلطان حیدر جوش، پریم چند، سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری شامل ہیں۔ اور ہمیں ان کے ساتھ آج کے افسانہ نگاروں کا تعلق قائم کرنا ہے۔

وقار عظیم ۔ اس طرح بات یہاں آکر ٹھہری کہ ہمارے ابتدائی افسانہ نگار سلطان حیدر جوش، سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری ہیں۔

منٹو ۔ سجاد حیدر کو میں افسانہ نگار نہیں مانتا کیونکہ وہ سب ترجمے کرتے رہے ہیں۔

وقار عظیم ۔ انہوں نے ترجمے ضرور کئے ہیں لیکن طبعزاد افسانے بھی لکھے ہیں۔

ندیم ۔ تو سب سے پہلے ہمیں یہ تعین کر لینا چاہئے کہ اردو افسانے کی روایت وہیں سے شروع ہوتی ہے یا اس سے بھی پہلے۔

منٹو۔ افسانے کی روایت تو وہیں سے شروع ہوتی ہے جہاں سے قصّے کہانیاں شروع ہوتیں۔

وقار عظیم۔ لیکن ہماری بحث کا تعلق اردو افسانے سے اور خاص کر مختصر افسانے سے ہے۔

منٹو۔ پھر میں یہ جاننا چاہوں گا کہ افسانہ ہوتا کیا ہے؟......

انتظار حسین۔ غالباً پریم چند سے افسانے کی باقاعدہ روایت قائم ہوتی ہے۔ اس لئے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ ان کے زمانے میں افسانے کا کیا تصور تھا ـــ اور پھر اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ بعد کے لکھنے والوں نے اس سے کیا انحراف کیا۔

عبادت۔ یوں تو افسانہ ہر کہانی کو کہتے ہیں لیکن مختصر افسانے کے چند فنی لوازم ہوتے ہیں۔ مثلاً وحدت تاثر، رمزیت، ایمائیت اور مواد کی فنکارانہ ترتیب وغیرہ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ افسانے کی یہ روایت کب سے قائم ہوئی۔ پریم چند سے یا اس سے پہلے۔ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ مختصر افسانہ خود یورپ میں بھی بہت بعد کی پیداوار ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے دورِ آخر سے قبل اس کا وجود باقاعدہ ایک صنف کی صورت میں نہیں تھا۔ البتہ اس کی روایات دوسری اصنافِ ادب میں نظر آتی ہیں ـــ مثال کے طور پر انگریزی شاعری میں BALLAD کی جو صنف ہے اس میں مختصر افسانے کا سا انداز مل جاتا ہے۔ اسی طرح اردو میں جو داستانیں لکھی گئی ہیں ان میں بھی جگہ جگہ ایسے حصّے ہیں جن میں مختصر افسانے کی روایات تلاش کی جا سکتی ہیں مثلاً سرشار کے فسانہ آزاد میں اور میر امن کی باغ و بہار میں یہ چیز ضرور موجود تھی۔ بعد میں اس پر مغرب کا اثر پڑا جس کی وجہ سے مختصر افسانے نے تیزی سے ترقی کی اور موجودہ ہیئت تک پہنچ گیا۔ اس عرصے میں مختصر افسانہ بیسیوں تجربات کی منزلوں سے گزرتا گیا اور اس طرح اس میں روایات صورت پذیر ہوتی گئیں۔ آج یہی روایات اردو مختصر افسانے کا سرمایہ ہیں ـــ انہی کو سامنے رکھ کر ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مختصر افسانہ کیا ہے، اور اس کی بنیادیں کن اصولوں پر قائم ہیں؟

منٹو۔ میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ مختصر افسانہ کے دو بڑے اصول کیا ہیں؟

وقار عظیم۔ ہمارے افسانے نے موجودہ ہیئت مغرب کے اثر کے تحت حاصل کی لیکن اس میں ہماری قدیم کہانیوں اور داستانوں کی خصوصیات بھی شامل ہیں اور ان دونوں کے امتزاج سے ہمارا افسانہ بنا ہے۔ مغرب کا افسانہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ افسانہ میں ایک چیز کے متعلق کوئی بات کہی جائے اور اس کا ایسا تاثر ہو کہ اس میں انتشار نہ ہو۔ یہ چیز ہم نے مغرب سے لی ہے۔ ایک واحد تجربہ یا تاثر افسانہ کا اصل موضوع ہے۔

منٹو۔ ایک تاثر کو خواہ وہ کسی کا ہو اپنے اوپر مسلط کر کے اسے اس انداز سے بیان کر دینا کہ وہ سننے والے پر بھی وہی اثر کرے، یہ افسانہ ہے۔

وقار عظیم۔ جی ہاں! ـــ جب افسانے کی ایک تعریف متعین ہو گئی تو اسے سامنے رکھ کر یہ دیکھنا ہے کہ ابتدائی افسانہ نگار کس حد تک اس بنیادی بات کو پورا کرتے ہیں اور کس حد تک داستانوں سے متاثر ہیں۔

عبادت۔ پریم چند کے یہاں افسانے کی جو روایت ملتی ہے اس میں ابتداً داستانوں کا اثر غالب نظر آتا ہے۔ پریم پچیسی، پریم بتیسی اور پریم چالیسی کے بیشتر افسانے اسی انداز میں لکھے گئے ہیں اور مختصر افسانے کی تکنیک کے بنیادی اصولوں کا پوری طرح لحاظ نہ رکھنا انہی داستانوں کی تکنیک سے متاثر ہونے کا ثبوت ہے۔ ان کے بعد کے افسانوں میں یہ بات نہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ مختصر افسانے کی خصوصیات کو برتنے لگتے ہیں۔

وقار عظیم لیکن پریم پچیسی اور پریم بتیسی کے افسانے پریم چند کے ابتدائی افسانے نہیں۔ حقیقت میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "سوزِ وطن" نہ صرف ان کی افسانہ نگاری کی بلکہ ہمارے افسانے کی بنیاد ہے۔ اس میں پانچ افسانے ہیں جو تمام کے تمام داستانوں کے رنگ میں گہری مقصدیت کے حامل ہیں۔ کرداروں کے ناموں تک میں یہی رنگ موجود ہے ہیرو اور ہیروئن کا وہی تصور ہے جو داستانوں میں تھا، اندازِ بیان شروع سے آخر تک شاعرانہ ہے لیکن اس کے باوجود ان کے ہر افسانے میں ایک واحد مقصد ہے جسے بڑی کامیابی سے داستانی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ دیس منظر بالکل داستانوں کا سا ہے۔ افسانہ نگار کے پیشِ نظر ایک خاص مقصد ہے جسے وہ ناظر تک پہنچانا چاہتا ہے وہ بار بار اس کی تکرار کرتا ہے۔ کبھی یہ اعادہ بُرا معلوم ہوتا ہے اور کبھی اس میں لطف آجاتا ہے۔ لیکن افسانہ نگار کو اپنا مقصد اتنا عزیز ہے کہ وہ تکرار کے بوجھ کو محسوس بھی نہیں کرتا۔

عبادت۔ لیکن یہ بات تو یقینی ہے کہ پریم چند کی یہ مقصدیت جو "سوزِ وطن" کے افسانوں میں ملتی ہے وہ مغرب کے اثرات کا نتیجہ نہیں تھی اس میں ایک انفرادیت ہے۔ بہرحال ان افسانوں کی تکنیک پر بھی داستانوں کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔

ندیم۔ میرے خیال میں اردو افسانہ جو داستانوں سے الگ ہوا ہے تو اس میں افسانہ نگاروں کے دو گروہ تھے ـــ ایک وہ جو رومانی اور ہندوستانی ماحول کو پیش کرتے تھے دوسرے وہ جو پریم چند کی طرح سوسائٹی کی خرابی کی طرف اشارہ کرتے اور ان کے اصلاحی پہلو پیش کرتے تھے۔ ہمیں اس اصلاحی پہلو کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہئے کیونکہ یہ اس دور کے سیاسی اور سماجی حالات کا نتیجہ تھے۔

وقار عظیم - سلطان حیدر جوش اور پریم چند دونوں کا سیاسی ماحول ایک سا تھا۔ لیکن مسلمانوں پر سرسید کی تحریک کا ردعمل یہ تھا کہ وہ انگریزی تعلیم اور مغربی معاشرت سے متنفر نظر آتے تھے اور ہندوؤں کا زاویۂ نظر خالص سیاسی تھا۔ مثلاً پریم چند کا پہلا افسانہ "دنیا کا سب سے انمول رتن" اسی سیاسی رجحان کا حامل ہے۔ اس افسانہ کی ابتدا، خاتمے اور اس کے دوسرے حصوں کا انداز بالکل داستانوں کا سا ہے یہی رنگ اس مجموعہ کے دوسرے افسانوں کا ہے ——

اس کے برعکس سلطان حیدر جوش کے افسانوں میں مسلمان تعلیم یافتہ لڑکیوں اور مغرب زدہ نوجوانوں کی معاشرتی اور اخلاقی زبوں حالی کا کوئی نہ کوئی پہلو پیش کیا گیا ہے۔ پریم چند اور سلطان حیدر جوش دونوں کے افسانے مقصدی ہیں لیکن دونوں میں یہی بنیادی فرق ہے۔

عبادت - اب ایک سوال یہ ہے کہ پریم چند نے جو روایت قائم کی اس میں انہوں نے مغرب سے اثر لیا ہے یا نہیں۔

وقار عظیم - پریم چند نے خود بھی لکھا ہے کہ ان کے ابتدائی افسانوں میں داستانوں کا رنگ ہے —— وہ بچپن میں چھپ چھپ کر طلسم ہوشربا پڑھتے تھے۔ بڑے ہو کر ٹالسٹائی کا مطالعہ کیا اور اس کی سادگی اور سلاست کو برتنے کی کوشش کی ہے۔ دوسروں نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے زیادہ تر قیاس آرائی پر مبنی ہے۔

عبادت - ان کے افسانوں کے مطالعہ سے بھی یہی بات ظاہر ہوتی ہے۔

منٹو - کیا طلسم ہوشربا میں مقصدیت اور افادیت نہیں تھی؟

وقار عظیم - ضرور تھی۔

منٹو - ایچ۔ جی۔ ویلز اور طلسم ہوش ربا میں کیا فرق ہے؟

عبادت - یہ الگ سوال ہے۔

منٹو - ہم مقصدیت پر زور دیتے ہیں اور دوسری چیزوں کو بکواس کہتے ہیں لیکن ایچ۔ جی۔ ویلز نے سائنس کی بڑی خدمت کی ہے۔ اس کا جھوٹ تخلیقی جھوٹ تھا۔ اور افسانے سے جھوٹ نکالا نہیں جا سکتا۔

ندیم - ایچ۔ جی۔ ویلز اور طلسم ہوش ربا میں FANTASY ایک قدر مشترک ہے صرف دور کا فرق ہے۔

وقار عظیم - یہ بحث ہے تو بڑی دلچسپ لیکن ہمارے دائرہ گفتگو سے باہر ہے میں نے جو طلسم ہوش ربا کا نام لیا وہ محض اس لئے لیا کہ پریم چند نے اس سے اثر قبول کیا۔

ندیم - اب ہمیں پریم چند کے "سوزِ وطن" سے افسانے "کفن" تک یہ طے کرنا ہے کہ اس سے کیا اثرات مرتب ہوئے۔

وقار عظیم - پہلے مقصد اصلاحی تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس سے انحراف کس نے کیا اور اس کے کیا اثرات ہوئے اور مقصدیت کے نقطۂ نظر سے سجاد حیدر یلدرم، جوش اور پریم چند میں کچھ فرق ہے یا نہیں۔

ندیم - سجاد حیدر ان سے الگ ہیں۔

عبادت - خود پریم چند کے افسانوں میں یہ بات ہے کہ وہ خالص مقصدیت کے حامل نہیں بلکہ ان کے ہر دور کے افسانوں میں زندگی کو سمجھنے، اس کو برتنے اور اس کو بہتر بنانے کا خیال بھی ملتا ہے خصوصاً ان کے بعد کے افسانوں میں یہ سماجی اور اصلاحی پہلو کچھ اور بھی نمایاں ہونے لگتے ہیں۔

وقار عظیم - یہ چیز بعد کے افسانوں میں آتی ہے۔

عبادت - البتہ انسانی زندگی کے بنیادی تقاضوں کو سب سے پہلے سجاد حیدر یلدرم نے پیش کیا ہے۔ مثلاً "خیالستان" کے بعض افسانوں میں بھی یہ بات ملتی ہے۔ خارا اور نسرین نوش کی کہانی اگرچہ ایک رومانی فضا رکھتی ہے لیکن اس کا موضوع انسانی زندگی کی ایک نفسیاتی حقیقت ہے —— یعنی مرد اور عورت کا جذباتی اور جسمانی رشتہ!

وقار عظیم - سجاد حیدر پہلے شخص ہیں جنہوں نے یہ خیال عام کیا کہ اصلاحی مقصد افسانے کے فن کو مجروح کرتا ہے۔ آگے چل کر پریم چند نے بھی مقصدیت اور اصلاح کے ساتھ فن پر پوری توجہ دی۔

عبادت - شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ سجاد حیدر یلدرم کے افسانے انقلاب سے قبل کے ترکی افسانے کے زیر اثر لکھے گئے ہیں۔ اس دور کے ترکی ادب اور خصوصاً افسانے پر جذباتیت اور رومانیت کا دور دورہ تھا۔ یہ رومانیت یلدرم کے یہاں بھی ملتی ہے۔ تقریباً ہر افسانے میں انہوں نے ایک رومانی فضا قائم کی ہے جو ان کی تکنیک کا ایک بنیادی جزو بن گئی ہے —— اس کو نکال لیجئے تو سجاد حیدر یلدرم کے یہاں کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔

وقار عظیم - کیا نیاز فتح پوری اور یلدرم کی رومانیت میں کوئی مماثلت ہے؟

ندیم - یلدرم نے افسانے کی ہیئت میں بڑی تبدیلی کی ہے اس وقت تک افسانے میں پلاٹ کا التزام تھا لیکن انہوں نے کردار نگاری کی طرف لوگوں کا رجحان بڑھایا اور ایسے SKETCHES کھینچے جن میں صرف ایک کردار ہے۔

وقار عظیم - یہ صحیح ہے —— موضوع کے اعتبار سے جو سب سے اہم چیز ہے وہ یہ کہ سلطان حیدر جوش اور پریم چند نے معاشرتی اور سیاسی پہلو لئے ہیں لیکن یلدرم نے ایسے موضوع اپنائے جو زندگی سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے زیادہ تر عورت اور مرد کی محبت پر افسانے لکھے ہیں، اور

اس طرح موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے نئے تجربے کئے۔

انتظار حسین - بہر حال ان میں ایک بات مشترک تھی کہ وہ زندگی کے تسلسل کے قائل تھے اور موجودہ مختصر افسانے کی ابتدا وہاں سے ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے تسلسل کی منکر ہے۔ اس میں ایک الگ حادثہ ہے جسے زندگی سے کوئی ربط نہیں۔

عبادت - سوال یہ ہے کہ یہ جو روایت یلدرم نے قائم کی اس کے بعد نیاز فتحپوری اور ل احمد نے اس میں کوئی اضافہ کیا یا نہیں؟

وقار عظیم - نہیں ــــ ان لوگوں نے اور مجنوں گورکھپوری نے افسانہ کسی مقصد کی خاطر نہیں بلکہ اسے کہانی سمجھ کر لکھا۔

ندیم - لیکن اس سے پہلے پریم چند کے آخری افسانے کامیاب تکنیک پر کیسے پہنچے میرے خیال میں انہوں نے مغربی افسانوں سے اثر قبول کیا۔

عبادت - پریم چند کی کہانی 'کفن' میں ان کے ابتدائی افسانوں کی تکنیک سے بڑا انحراف ہے اور اس میں مغربی افسانوں کی تکنیک کا اثر پایا جاتا ہے۔

وقار عظیم - 'کفن' افسانہ نگار کے مخصوص رجحانات کے ذہنی ارتقا کی ایک شکل ہے اس لئے ہمیں اس کے بعد کے افسانوں پر غور کرنا چاہئے۔

عبادت - "انگارے" ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی ہے اور اس میں شامل ہونے والے افسانہ نگاروں پر بھی پریم چند کا خاصا اثر معلوم ہوتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت تک خود پریم چند جہاں تک تکنیک کا تعلق ہے بڑی حد تک بدل چکے تھے۔

ندیم - اثر کیوں نہ ہو ــــ اگر ہم اس سے انکار کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمیں روایت کے تسلسل سے انکار ہے۔

انتظار حسین - ہمیں یہ نہیں دیکھنا ہے کہ انہوں نے پریم چند سے کتنا اثر قبول کیا بلکہ یہ کہ اس سے انحراف کس طرح کیا۔

وقار عظیم - "انگارے" کے افسانوں میں ہندوستانی زندگی کی مسلمہ قدروں کو توڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ چیز پریم چند کے یہاں نہیں۔

عبادت - "انگارے" کے افسانوں میں جو شدت ہے وہ انقلابی ہے لیکن اس میں کسی نہ کسی حد تک پریم چند کا اثر ضرور ہے۔ ویسے ایک بات یہ بھی ہے کہ انگارے کے افسانہ نگار نوجوان تھے۔ ان کے خون میں گرمی تھی۔ بغاوت ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔

اس لئے انہوں نے اپنے فن میں ایک شدت کو پیدا کیا ــــ لیکن ان کی اس انتہا پسندی نے فن کو ٹھیس پہنچائی۔

وقار عظیم - لیکن یہ ایک تجربہ تھا اور خود اس کے مصنف آگے چل کر بہت کچھ سنبھل گئے۔

ندیم - جی ہاں! بعض تو بالکل ہی بدل گئے۔

وقار عظیم - پھر بھی "انگارے" کے ان مصنفوں نے جہاں جہاں روایت سے شدت کے ساتھ انحراف کیا وہ آگے چل کر فن کے لئے مضر ثابت ہوئی۔

عبادت - لیکن یہ بات تو ماننی پڑے گی کہ "انگارے" کے لکھنے والوں نے اردو کے افسانہ نگاروں کو بے جھجک نشتر زنی کا انداز سکھایا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ بعد کے افسانہ نگاروں نے اپنے فن میں شدت اور بے باکی پیدا کی۔ شاید ہی سوسائٹی کا کوئی ایسا پہلو ہو جس پر انہوں نے شدت اور بے باکی کے ساتھ قلم نہ اٹھایا ہو۔ مثال کے طور پر ہم اس سلسلے میں سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کو پیش کر سکتے ہیں۔

وقار عظیم - لیکن منٹو 'انگارے' کی شدت سے متاثر نہیں ہوئے۔

منٹو - میں نے 'انگارے' پڑھی بھی نہیں۔

انتظار حسین - 'انگارے' نے ایک غلط روایت کی طرح ڈالی۔ بعد میں آنے والوں نے یہ سمجھا کہ افسانہ میں سنسنی کی ضرورت ہے۔

عبادت - بات یہ ہے کہ وہ زمانہ سیاسی دہشت پسندی کا زمانہ تھا اور ان افسانوں میں جو شدت پیدا ہوئی اس میں ماحول کی اس کیفیت کا بھی اثر ہے۔ ویسے ہر تجربے میں شروع شروع شدت اور انتہا پسندی ہوتی ہے ــــ بعد کے لکھنے والوں نے اس شدت اور انتہا پسندی میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی۔

ندیم - میرے خیال میں انگارے کی سنسنی کی روایت غلط ہے کیونکہ بعد میں لکھنے والوں نے اسے روایت کا جزو نہیں بنایا اور اس سے انکار کیا۔ ممکن ہے اکا دکا مثالیں مل جائیں لیکن بہ حیثیت مجموعی نہیں 'عصمت' 'منٹو' وغیرہ کسی نے بھی شعوری طور پر یہ کوشش نہیں کی۔

انتظار حسین - لیکن ہم افسانے میں آج بھی شدت INTENSITY ڈھونڈتے ہیں جو مختصر افسانے کی خرابی نہیں۔

منٹو - شدت کس چیز کی؟

وقار عظیم - شدت احساس کی۔

منٹو۔ یہ تو افسانے کی بنیادی چیز ہے۔

عبادت۔ غالباً انتظار صاحب کا مقصد یہ ہے کہ "انگارے" میں سماجی موضوعات پر جارحانہ انداز میں جو روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کو پیش کرتے ہوئے طنز اور نشتر زنی کا جو انداز اختیار کیا گیا ہے وہ کچھ زیادہ مناسب نہیں ہے۔

وقار عظیم۔ جی ہاں —— یہ سوچے سمجھے بغیر کہ کن باتوں کا ذکر ضروری ہے اور کن کا نہیں —— مثلاً جنس کے بارے میں خاصی بے اعتدالی کا ثبوت دیا گیا ہے۔

منٹو۔ جنس کے بارے میں تو اس سے پہلے بھی کافی کچھ لکھا جا چکا تھا مثلاً داستانوں میں۔

عبادت۔ لیکن داستانوں میں جن جنسی موضوعات کا تذکرہ ہے ان کی نوعیت مختلف ہے یہاں تو وہ ایک طرح کی لذت پرستی اور تعیش پسندی کا نتیجہ ہیں۔ "انگارے" کے افسانوں میں یہ بات نہیں۔ ان میں جنسی موضوعات کا ذکر زیادہ ہے لیکن 'انگارے' کے افسانوں کے موضوعات صرف اسی حد تک محدود نہیں ہیں۔ ان میں سماجی زندگی کے بہت سے دوسرے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے آگے چل کر تنوع کے اس رجحان کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔

وقار عظیم۔ ایک طرف 'کفن'، دوسری طرف 'انگارے' —— دونوں کو سامنے رکھ کر ہمیں آگے بڑھنا ہے —— پریم چند نے ہمیں یہ بتایا کہ ہمیں زندگی کے متعلق کس طرح لکھنا چاہئے اہمیت کے اعتبار سے اس مجموعہ نے ہمیں یہ سبق دیا کہ فرسودہ طریقوں کو چھوڑ کر نئی راہوں کو اپنانا چاہئے اور یہ کہ زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے موضوع پر بڑے سے بڑا افسانہ لکھا جا سکتا ہے۔ اس طرح ہم ۳۶-۱۹۳۵ء تک پہنچ چکے ہیں۔ بعد میں یہی رجحان منٹو کرشن چندر اور ندیم میں پیدا ہوا کہ وہ جس معاشرے میں رہتے بستے ہیں اسی کے متعلق لکھیں۔

ندیم۔ روایت کی بحث یہاں ختم تو نہیں ہو جاتی۔

وقار عظیم۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔

عبادت۔ نئے لکھنے والوں نے خاصے تجربے کئے ہیں ہیئت اور موضوع دونوں کے اعتبار سے نئے لکھنے والوں نے اپنے ذہنوں میں کشادگی پیدا کی ہے اور زندگی کی کشمکش کو نئے زاویوں سے دیکھا ہے۔ فنی اعتبار سے بھی انہوں نے تکنیک کو نکھار دیا ہے اور یہ چیز پڑھنے والوں پر زیادہ اثر کرتی ہے۔ "انگارے" کا کینوس زیادہ وسیع نہیں اور اس میں ایک قسم کی جھنجھلاہٹ پائی جاتی ہے بعد میں آنے والوں نے "انگارے" کے افسانوں کے مقابلے میں اپنے ماحول کی زیادہ وسیع اور باشعور ترجمانی کی ہے۔ جذباتی رومانیت کی تحریک نے جو رجحان پیدا کیا تھا وہ اور زندگی کی باشعور ترجمانی کا رجحان دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ رومانیت کی اہمیت سے بھی ہم انکار نہیں کر سکتے۔ خصوصیت کے ساتھ جب یہ رومانیت ہمارے یہاں جذباتیت کی حدود سے باہر نکلتی ہے تب تو اس کی اہمیت کچھ اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کرشن چندر اور احمد ندیم قاسمی کے ابتدائی افسانے رومانیت کے اس نئے رجحان کو پیش کرتے ہیں۔

ندیم۔ اردو افسانہ ۱۹۴۵ء تک جو تھا اس میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان میں دو لکھنے والے بہت نمایاں ہیں۔ عصمت اور منٹو۔

وقار عظیم۔ اس میں احمد علی، حیات اللہ انصاری، بیدی اور ندیم بھی شامل ہیں۔

ندیم۔ ان پر اگر ایک نظر ڈال لی جائے تو یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ اس دور تک افسانہ کہاں پہنچ چکا ہے۔

عبادت۔ حیات اللہ انصاری اور احمد علی کے ہاں ایک خاص قسم کی واقعیت اور حقیقت نگاری REALISM ہے۔

وقار عظیم۔ یہ رجحان تو ہر افسانہ نگار کے ہاں ہے کہ وہ زندگی کو ایک خاص قسم کی حقیقت پسندی کی نظر سے دیکھتا ہے —— مثلاً کرشن چندر کے افسانے کشمیر اور بمبئی سے متعلق ہیں —— منٹو بمبئی کے متعلق لکھتے ہیں —— ندیم پنجاب کی عکاسی کرتے ہیں۔ بیدی کے افسانوں کے کردار لاہور میں سانس لیتے ہیں۔

انتظار حسین۔ اس طرح دو گروہ پیدا ہو جاتے ہیں کرشن، ندیم جن کا انداز تحریر شاعرانہ ہے۔ دوسرے احمد علی، منٹو۔

ندیم۔ مجھے احمد علی اور منٹو میں بڑا فرق نظر آتا ہے۔ مثلاً احمد علی کے "ہماری گلی" اور "قید خانہ" میں بڑی مجرد قسم کی انفرادیت ہے

وقار عظیم۔ لیکن ان سب نے ایک محدود دائرے میں رہ کر یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ بین الاقوامی حالات کا اثر ہمارے ماحول پر کیا ہے خصوصاً منٹو اور کرشن نے —— یہ بات پہلے نہیں تھی۔

عبادت ۔ احمد علی اور حیات اللہ انصاری کی حقیقت نگاری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

وقار عظیم ۔ وہ ایک خاص ماحول سے باہر نہیں نکلتے، عصمت بھی ایک خاص ماحول کی عکاسی کرتی ہیں ——— وہ ماحول جس کی تفصیلات کا انہیں اچھی طرح علم ہے۔

عبادت ۔ لیکن منٹو اور ندیم کے ابتدائی افسانوں میں بین الاقوامی حالات اور سیاسی شعور کا کوئی گہرا اثر نہیں ہے۔

وقار عظیم ۔ یہ ممکن ہے۔ ندیم کے اندازِ بیان میں شعریت گھلی ملی ہے اور وہ دیہاتی فضا کو سیدھے سادے رنگ میں پیش کرتے ہیں لیکن جہاں وہ سپاہی کا ذکر کرتے ہیں وہاں اسیرِ جنگ کے اثرات ضرور واضح ہیں۔

ندیم ۔ سوال یہ ہے کہ منٹو کے ابتدائی افسانوں میں بھی جو وسعت اور بین الاقوامیت کی فضا ہے اس کا وجود کیسے ہوا۔ ان کے فن کے ابتدائی زمانہ میں موضوع اور مواد کے اعتبار سے وسعت کیسے پیدا ہوتی ؟

منٹو ۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو افسانہ نگار سمجھا ہے، میں نے بہت سے تجربے کئے ہیں جن میں سے کچھ میں تو ناکام رہا ہوں اور کچھ میں کامیاب ———

ندیم ۔ میرے خیال میں اس کے کچھ مادی وجوہ بھی ہیں، مثلاً مطالعہ ——— مغربی افسانوں کے تراجم ——— وغیرہ۔

عبادت ۔ اصل بات تو یہ ہے کہ انھوں نے زندگی کے متنوع پہلوؤں سے قریبی تعلق بھی رکھا ہے اور ان میں گھل مل کر انہیں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ یہی زندگی سے قرب ہے اور اس کی ترجمانی کا سبب بھی یہی ہو سکتا ہے۔

منٹو ۔ لیکن میں زندگی کو جیسے دیکھتا ہوں اس کا ویسا اظہار نہیں کرتا بلکہ میں زندگی کو جیسے دیکھنا چاہتا ہوں اس کا اظہار کرتا ہوں ——— اور یہی آرٹسٹ کا نقطۂ نظر ہونا چاہئے۔ میں نے اپنے افسانے "خوشیا" میں ایک بھڑوے کی کہانی لکھی ہے۔ اشک نے کہا بھڑوا ایسا نہیں ہوتا۔ میں نے اسے جواب دیا کہ ممکن ہے ایسا نہ ہو۔ لیکن یہ ضرور ممکن ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد تم بھڑوے بن جاؤ ——— یا یہ بھی ممکن ہے کہ بھڑوا میں ہی ہوں ———

افسانہ نگار کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ ایک چیز لکھے اور وہی آپ کو زندگی میں بھی مل جائے ——— وہ ہر کمی کو ”...“ ۱۹۴۷ء کرتا چلا جاتا ہے ———

وقار عظیم ۔ اب تک ہم نے اپنے افسانہ کے ارتقا کی ان ابتدائی منازل کا جائزہ لیا ہے جن سے اردو افسانہ گزرا ہے اس وقت تک بعض رجحانات واضح طور پر نمایاں ہو چکے تھے مثلاً واقعیت کی طرف توجہ، اور یہ چیز سب سے پہلے پریم چند نے شروع کی۔ پریم چند کے اثر سے لکھنے والوں نے اس اسلوب کو اپنایا ——— اس کی مثالیں ہمیں اعظم کریوی، علی عباس حسینی اور پھر احمد ندیم قاسمی کے ابتدائی افسانوں میں نمایاں طور پر ملتی ہیں۔

اس کے علاوہ انہی میں کچھ لوگ ایسے ہوتے جنھوں نے دیہات کو چھوڑ کر شہروں کو اپنا موضوع بنایا۔ مثلاً حامد اللہ افسر اور راشد الخیری وغیرہ لیکن ان میں سب سے نمایاں نام عظیم بیگ چغتائی کا ہے۔ ان سب افسانہ نگاروں کے یہاں ہمیں زندگی سے گہرا رابطہ نظر آتا ہے۔

دوسرا گروہ سجاد حیدر یلدرم اور ان کے متبعین کا ہے، ان کے افسانے زندگی سے متعلق ضرور ہیں لیکن زیادہ تر رومانی کیفیات کے ترجمان ہیں ——— مثلاً حجاب امتیاز علی اور ل۔ احمد اکبر آبادی۔ یہ زندگی اور رومان دونوں کو سنبھالے کر چلتے ہیں۔

بعض لوگ ان دونوں گروہوں سے متاثر ہوئے۔ مثلاً سدرشن کے ہاں پریم چند اور یلدرم دونوں کا اثر ہے۔

تیسرا گروہ جو ان سے الگ ہے ترجمہ کرنے والوں کا ہے ان لوگوں نے رومانی رجحان کو دور کرنے کی کوشش کی یہ زندگی کو فن کے ساتھ لے چلنے کے قائل تھے، مثلاً خواجہ منظور وان کا کوئی مجموعہ نہیں چھپا، اس اثر کے تحت بعض لوگوں نے مرلیساں کے اور بعض نے چینی افسانوں کے ترجمے کئے ——— ان میں مولانا ظفر علی خاں، منشی حامد علی خاں، منصور احمد جیسے لوگ شامل ہیں۔

اس طرح یہ بات واضح ہوتی ہے کہ موجودہ روایت پر پریم چند کی روایت، یلدرم کی روایت اور ترجمے کرنے والوں کا انداز مجموعی طور پر اثر انداز ہوا۔

پریم چند اور یلدرم کے بعد والے دور میں اعظم کریوی اور علی عباس حسینی کے نام بہت نمایاں ہیں اس لئے ہمیں انہی سے بحث

کا آغاز کرنا چاہئے۔

عبادت ۔ علی عباس حسینی اور اعظم کریوی نے پریم چند کے انداز کو اپنایا ہے۔ لیکن حسینی کے افسانوں میں انسانی نفسیات کے نمونے بھی ملتے ہیں۔

وقار عظیم ۔ پریم چند اور حسینی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پریم چند کا نقطۂ نظر سیاسی تھا۔ حسینی کی راہ اس سے مختلف ہے۔

عبادت ۔ اسی طرح اعظم کریوی کے ہاں زندگی کی ترجمانی میں نفسیات کی گہرائی شامل نہیں۔ ان کے پاس ایک سیدھا سادا بیان ہے۔

حمید اختر ۔ پریم چند کا انداز فکر ایک خاص قسم کا تھا۔ حسینی کے یہاں بعض ایسی چیزیں بھی ملتی ہیں مثلاً محبت کی FRUSTRATION اور ازدواجی زندگی کی ناکامی۔

عبادت ۔ حسینی نے وقت کے بدلتے ہوئے رجحانات کا بڑا ساتھ دیا ہے۔ موجودہ دور میں بھی وہ افسانے لکھ رہے ہیں اور ان کے مسائل کو برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں خالص رومانی نقطۂ نظر کے علاوہ واقعیت اور حقیقت نگاری کے رجحان نمایاں ہیں۔ ان کے افسانوں میں جو شدت ہے (گو یہ بعد میں پیدا ہوئی ہے) سیاسی نہیں لیکن اس میں سماجی درد اور کسک ضرور ہے۔

وقار عظیم ۔ ایک چیز اور بھی ہے اور وہ یہ کہ پریم چند نے اپنے فن کم و بیش ہر راہ نما کی حیثیت قائم رکھی۔ علی عباس حسینی ایسا نہیں کر سکے لیکن یہ بات بھی بڑی اہم ہے کہ وہ ہر عہد کا ساتھ دیتے رہے۔

عبادت ۔ ایک بات اور علی عباس حسینی کے ہاں یہ محسوس ہوتی ہے کہ ان کے پاس زندگی کے بارے میں کوئی بہت واضح اور قطعی نقطۂ نظر نہیں ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ ایک طرح کے انسانیت پرست (HUMANIST) اور اصلاح پسند ہیں۔

وقار عظیم ۔ اصل میں ان کی نظر ان مسائل پر ہے جو بالکل ان سے قریب ہیں۔ وہ یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ ان حالات کے پیچھے کیا حقائق کام کر رہے ہیں۔

عبادت ۔ حسینی صاحب کو میں ذاتی طور پر بھی جانتا ہوں۔ وہ چونکہ سرکاری ملازم رہے ہیں اس لئے کوئی ایسی بات نہیں کہہ سکتے جو قابلِ گرفت ہو۔ شاید اسی وجہ سے ان کے افسانوں میں وہ شدت نظر نہیں آتی اور وہ جارحانہ انداز نہیں ملتا جس کی تخلیق انقلابی شعور کے ہاتھوں ہوتی ہے۔

حمید اختر ۔ حسینی اور پریم چند میں فنی اعتبار سے بھی بڑا فرق موجود ہے۔ حسینی کے پاس قاری کو ساتھ MOVE کرنے کی اپیل نہیں ہے پریم چند کے ہاں یہ بات پائی جاتی ہے۔

عبادت ۔ حسینی صاحب کے بعض افسانے ہیئت اور تکنیک کے اعتبار سے بڑے مکمل ہیں مثلاً "انسپکٹر کی عید" بڑا نرشا ہوا افسانہ ہے اور اس طرح کے بہت سے افسانے انہوں نے لکھے ہیں۔

ندیم ۔ یہی بات "میلہ گھومنی" میں ہے۔

وقار عظیم ۔ ایک اور افسانہ "رفیق تنہائی" بھی مجھے پسند ہے۔ غالباً اردو میں جانوروں کے بارے میں بالکل نئی چیز ہے۔ اس میں بیان، ادبیت اور شعریت ہے —— اس کے مقابلے میں پریم چند فن کے معاملے میں شروع شروع میں تھرے اکھڑے ہیں۔ پھر انہیں بیان پر بھی اتنی قدرت نہیں تھی۔ اس معاملے میں علی عباس ان سے بہت آگے ہیں۔

عبادت ۔ حسینی صاحب کو ہیئت پر پوری قدرت ہے۔ وہ تکنیک اور دوسرے فنی لوازمات کو سمجھتے ہیں اور میرے خیال میں تو وہ ایک باشعور لکھنے والے ہیں۔ شاید اس کی وجہ ان کا گہرا مطالعہ ہے۔ اسی مطالعہ نے انہیں افسانے کا نقاد بھی بنا دیا ہے۔ مغربی افسانے کی روایات کو اسی وجہ سے وہ پوری طرح سمجھتے ہیں اس کا اثر ان کے افسانوں کی تکنیک میں بھی جھلکتا ہے۔

وقار عظیم ۔ حسینی صاحب کو ہر پرانی چیز سے محبت ہے اور انہوں نے زندگی کے آداب اور آپس کے تعلقات کو افسانوں میں بڑی خوبی سے نبھایا ہے۔

عبادت ۔ ایک اور بات یہ ہے کہ ساری تکنیک کو سمجھنے کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ہر ایک کی بات سنتے اور مانتے ہیں۔ تکنیک کے تنوع کا جو شعور ان کے ہاں ملتا ہے وہ اسی صورت حال کا نتیجہ ہے۔

وقار عظیم ۔ اس وقت فن کا واضح شعور لکھنے والوں میں پیدا ہو گیا تھا اور اس وقت افراد کی طرف توجہ شروع ہو گئی تھی۔

عبادت ۔ حسینی صاحب کے ساتھ ہی دوسرا نام اعظم کریوی کا آتا ہے ہمیں ان کے فن کا بھی جائزہ لینا چاہئے۔

وقار عظیم ۔ ان کے افسانوں میں رومانی کیفیت زیادہ غالب ہے۔ مثلاً وہ دیہات کے متعلق لکھتے ہیں تو انہیں زیادہ کشش اس چیز میں معلوم ہوتی ہے کہ ساون میں عورتیں گیا ہیں

پھنتی ہیں۔ گھن سے گھنے لگتی ہیں وغیرہ۔

ندیم ۔ انہوں نے تاریخی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔

وقار عظیم ۔ اس کی وجہ پریم چند کا اثر ہے۔

عبادت ۔ اعظم کریوی کے ہاں فن کے ارتقاء کا پتہ نہیں چلتا ——— وہ زندگی کو جس طرح دیکھتے ہیں اسی طرح بیان کر دیتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک فطرت نگار NATURALIST کہے جا سکتے ہیں۔

حمید اختر ۔ زندگی کے بارے میں پریم چند کا جو نقطۂ نظر ہے وہ نہ سدرشن کے پاس ہے نہ اعظم کریوی کے پاس۔ پریم چند اکثر اوقات انقلابی مصنفین کی طرح لکھتے ہیں۔

وقار عظیم ۔ اور یہ چیز نئے لکھنے والوں کو روایت کی طرح ورثہ میں ملی ہے۔ یہ نئے لکھنے والوں کو مغربی ادب سے بڑا تعلق ہے۔ مثلاً احمد علی اور کرشن چندر کے افسانوں میں مشرقی روایت اور مغربی ادب دونوں کا نمایاں اثر نظر آتا ہے۔

عبادت ۔ اس دور کے لکھنے والوں میں ہم نے ابھی تک عظیم بیگ چغتائی کا مرتبہ معین نہیں کیا۔ حالانکہ اردو افسانے کو جذباتی رومانیت سے نکالنے اور حقیقت و واقعیت سے ہم کنار کرنے میں وہ بہت نمایاں رہے ہیں۔

حمید اختر ۔ چغتائی نے افسانوں میں سے رومانیت پسندی کو کم کیا ہے۔

وقار عظیم ۔ ایک خاص بات جو طرز بیان سے متعلق ہے وہ ہمارے ہاں ہمیشہ سے بڑی اہم روایت رہی ہے یہ ہے کہ کہانی کو کہانی سمجھنا چاہیے اس روایت کو نئے دور میں عظیم بیگ نے زندہ کیا ہے۔

عبادت ۔ مجموعی طور پر ان کے پاس مختصر افسانہ کے فنی لوازم پوری طرح نہیں ہیں۔ ان کے بیشتر افسانے بہت واضح ہیں۔ ان میں وحدت تاثر کا احساس بھی کم ہوتا ہے لیکن سماجی حالات کی ترجمانی میں انھوں نے اپنے طنزیہ انداز سے جو ایک جارحانہ انداز پیدا کیا ہے وہ بالکل نیا ہے اور اس نے اردو افسانے میں نئی راہیں کھولی ہیں۔

وقار عظیم ۔ ٹھیک ہے ہم انہیں فن کار کی حیثیت سے بڑا افسانہ نگار نہیں سمجھتے لیکن عظیم بیگ کا یہ بڑا احسان ہے کہ انھوں نے لکھنے والوں کو محض اصلاح کے راستے سے ہٹا کر نئے طریقے سے سوچنے کا اسلوب دیا۔ بعد کے افسانہ نگاروں کے ہاں ظرافت اور طنز کا جو عنصر ہے وہ چغتائی کے اثر کا نتیجہ ہے۔

عبادت ۔ اس کا مطلب یہ نکلا کر عظیم بیگ کے اثرات دانستہ یا نادانستہ طور پر ہمارے نئے لکھنے والوں پر نمایاں ہیں ——— عظیم بیگ کے بعد جو نئے افسانہ نگار آئے وہ سب کے سب کسی نہ کسی حد تک چغتائی کی فن کاری کے جارحانہ انداز سے متاثر نظر آتے ہیں۔

وقار عظیم ۔ اب ہمیں بات کو آگے بڑھانا چاہیے۔

عبادت ۔ جی ہاں، اب تو ہمیں منٹو، عصمت، بیدی، اشک، کرشن چندر، احمد علی اور حیات اللہ انصاری میں سے ہر ایک کی خصوصیات کے ساتھ یہ دیکھنا چاہیے کہ انھوں نے نئے تجربوں سے ہماری روایت میں کیا اضافے کئے۔ مثلاً سب سے پہلے منٹو کو لیجئے۔ ان کے یہاں موضوعات میں تنوع ہے لیکن اس کے باوجود وہ صرف دو تین موضوعات پر پوری طرح حاوی ہیں۔ دوسرے موضوعات پر وہ شدت نہیں۔

مثلاً طوائف کی زندگی کی انہوں نے ایسی جزئیات پیش کی ہیں جن سے گھن آتی ہے اور یہ ایک سماجی خدمت ہے لیکن بعض جگہ جنسی موضوعات پر لکھتے لکھتے وہ بھٹک گئے ہیں۔ مثلاً ٹھنڈا گوشت ———

وقار عظیم ۔ یہ بعد کا ہے اس لئے ابھی اس کا ذکر بے محل ہے۔

ندیم ۔ میرے خیال میں ان کی تخلیقات اتنی ہیں کہ انہیں بھی دو ادوار میں تقسیم کر لیا جائے تو بہتر ہے۔

حمید اختر ۔ اختر حسین رائے پوری کس دور میں آتے ہیں؟

وقار عظیم ۔ وہ عبوری دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

عبادت ۔ افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کا کوئی بڑا مرتبہ نہیں۔ ان کے بیشتر افسانے یا تو ترجمے ہیں یا مغربی افسانوں سے ماخوذ ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے اپنے افسانوں میں ایک رومانی سی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اس سے قبل بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔ انہوں نے اس میں کوئی جدت نہیں کی۔

ہاجرہ مسرور ۔ میرزا ادیب کس دور میں رکھے جائیں گے؟

وقار عظیم ۔ ان کا انداز یلدرم اور حجاب امتیاز علی کا ہے۔ ان میں ایسی رومانیت ہے جو کھوکھلی ہے بلکہ اس رومانیت کو بجائے آگے لے جانے کی بجائے پیچھے لے گئے ہیں۔

ہاجرہ مسرور ۔ کرشن چندر کے کون سے افسانے ہیں جن میں ذہنی انفرادیت ہے؟

عبادت۔ ابھی ہم ان کا ذکر نہیں کر رہے ہیں۔

انتظار حسین۔ میرے خیال میں منٹو صاحب اور قاسمی صاحب کے تقسیم کے بعد کے افسانوں پر ہمیں الگ بحث کرنی ہوگی۔

ندیم۔ انتظار صاحب کی بات ٹھیک ہے۔ تقسیم کے بعد لکھنے والوں میں بعض بڑی نمایاں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اس لئے پہلے یہ تعین کر لینا چاہئے کہ ۱۹۴۷ء تک افسانے میں کیا تجربے ہوئے اور اس وقت روایت نے کیا شکل اختیار کی تھی۔

عبادت۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جو کچھ ہوا اس کا جائزہ بعد میں لیں گے۔ اس وقت تو صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ ۱۹۳۶ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان اردو افسانہ کن منزلوں سے گزرا اور اس میں کون کون سے تجربے ہوئے؟ (ہاجرہ مسرور سے مخاطب ہو کر) آپ کی منٹو کے بارے میں کیا رائے ہے؟

ہاجرہ مسرور۔ آپ حضرات فرمائیں۔ مجھے تو ان کے بارے میں سوچتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔

وقار عظیم۔ مجھے منٹو کی تکنیک میں جو چیز شروع سے کھٹکتی ہے وہ یہ کہ وہ ہمارے سیاسی اور سماجی عقائد اور ہماری اخلاقی قدروں کے خلاف ایسی بات کہنا چاہتے ہیں جو پڑھنے والے کو SHOCK دے۔ وہ نئی بات کے بجائے غیر متوقع بات کہتے ہیں اور چونکہ آدمی ذہین ہیں اس لئے وہ بات پیدا بھی کر لیتے ہیں لیکن کبھی کبھی یہ بات اتنی غیر متوقع ہوتی ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن اس سے بغاوت کرتا ہے۔

انتظار حسین۔ ان کی تخلیق کا تصور یہ ہے کہ جو چیز ہے اسے کہا جائے کہ نہیں ہے ——— یہ رویہ تخلیق کے لئے بہت مہلک ہے چیزوں سے انکار کرنے سے بات نہیں بنتی۔

ندیم۔ وہ FANTASY اور جھوٹ دونوں کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔

حمید اختر۔ یہاں تک کہ اب ان کا مقصد صرف چونکانا رہ گیا ہے شروع کے افسانوں میں یہ بات نہیں ہے۔ پہلے انہوں نے بڑے پیارے رومانی افسانے بھی لکھے ہیں۔ یہ چیز انہوں نے آہستہ آہستہ DEVELOP کی ہے۔

وقار عظیم۔ یہاں مجھے ایک لطیفہ یاد آیا ——— ایک بار منٹو اور اشک اپنے اپنے فن پر بحث کر رہے تھے۔ ایک صاحب ثالث بنے اور انہوں نے بتایا کہ یوں تو دونوں میز پر رکھی ہوئی دیا سلائی کے متعلق لکھتے ہیں لیکن اشک کی نظر دیا سلائی پر سیدھی جاتی ہے اور منٹو میز کے نیچے سے نظر گھما کر دیا سلائی کو دیکھتا اور اس پر لکھتا ہے۔

اصل میں منٹو پڑھنے والے کو حیرت زدہ کرنا چاہتا ہے۔

حمید اختر۔ یہ بات کبھی بہت بڑی ہو جاتی ہے اور کبھی کچھ نہیں رہتی۔

عبادت۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ منٹو کے ہاں زندگی کی کشمکش کا کوئی صحیح اور واضح شعور نہیں۔

ندیم۔ میرے خیال میں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ شدید قسم کے انفرادیت پسند ہیں اور ایسے شخص میں غصہ، ضد اور جھنجھلاہٹ ہوتی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ ضد میں لکھا ہے اور مقدمے چلائے جانے کی وجہ سے لکھا ہے اور کہتے ہیں کہ تم اگر "کالی شلوار" سے چڑتے ہو تو میں تمہیں "دھواں" لکھ کر پریشان کروں گا۔

وقار عظیم۔ انہوں نے یہ محسوس نہیں کیا کہ زندگی طرح طرح کی الجھنوں میں پھنسی ہوئی ہے، انہیں گردوپیش کی زندگی کا صحیح احساس نہیں ہے، وہ فرد سے آگے بڑھ کر سوچنا نہیں چاہتے۔

عبادت۔ ان کے افسانوں میں دو چیزیں خاص طور سے نمایاں ہیں۔ ایک تو افراد کی معتری دوسرے سماج کے بعض خاص پہلوؤں کا ذکر۔ لیکن ایسے نقطۂ نظر سے جس کے اندر زندگی کا کوئی طبقاتی اور تجزیاتی شعور نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ان کے افسانوں میں ایک ایسی حقیقت نگاری ملتی ہے جس میں فوٹو گرافی نظر آتی ہے مصوری نہیں۔

وقار عظیم۔ یہ رجحان اس دور میں عام ہے کہ کردار کی ذہنی کیفیت اور جزئیات کے ذریعے فضا پیدا کی جائے مثلاً اشک خاصی تفصیل سے لکھتے ہیں اور افسانے کو خوبی کے ساتھ ختم کر دیتے ہیں۔ منٹو ماحول سے پوری طرح واقف ہیں اور ان جزئیات سے وہ خاص چیزیں نکال لیتے ہیں جو قاری کو متاثر کر سکتی ہیں۔

ہاجرہ مسرور۔ آخر وہ قاری کو تاثر کیا دیتے ہیں؟

عبادت۔ انسانی زندگی کی بدحالی اور سماجی ذہنیت کا تاثر! ان کے افسانوں میں بڑا گہرا اثر ہوتا ہے ——— مثلاً طوائف کی زندگی کا دوسرا رخ ——— اس سے قبل تو طوائف کو صرف تعیش کے زاویے سے دیکھا جاتا تھا۔ منٹو اس کے انسانی پہلو کو پیش کرتے ہیں اور اس سے پڑھنے والے کو نفرت نہیں پیدا ہوتی۔

بلکہ ہمدردی کا جذبہ جاگتا ہے اور یہ صورتِ حال اسے ایک ایک غلط سماجی نظام کی پیداوار نظر آتی ہے۔

وقار عظیم۔ یہ سارے نودر کی کیفیت ہے۔ اس میں دو طبقے ہیں EXPLOITED اور EXPLOITER طوائف اول اول ایک مظلوم کی حیثیت سے پیش کی گئی ہے۔

حمید اختر۔ آپ دس سال کا عرصہ ملا رہے ہیں۔ ان کے ابتدائی افسانوں کے پڑھنے سے جو ہمدردی کا اظہار ہوتا ہے CONVINCING ہے لیکن آخری کہانیوں میں ضد وغیرہ کی وجہ سے گھن پیدا ہوتی ہے۔

عبادت۔ گھن پیدا کرنا مقصد یاری ہے۔ یہاں منٹو مقصدی ہو جاتا ہے۔ یہ اس کا بڑا CONTRIBUTION ہے اگر اس سماجی شعور کے ساتھ طبقاتی احساس بھی پیدا ہو جاتا تو وہ اس دور کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہوتا لیکن وہ ان مسائل کا کوئی حل نہیں پیش کر سکا۔ وہ اس کا شعور بھی پوری طرح نہیں رکھتا یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں ان مسائل پر جھنجھلاہٹ تو ہے لیکن سائنٹیفک زاویۂ نظر نہیں ہے۔

حمید اختر۔ منٹو گندگی کو اچھالتے ہیں لیکن اس کا کوئی مداوا انہیں پیش کرتے۔

وقار عظیم۔ ان کا تعلق موضوع کے ساتھ جذباتی نہیں ذہنی ہے۔

شوکت تھانوی۔ کیا ان کے افسانوں کو پڑھ کر یہ تاثر نہیں ہوتا کہ ایک سرجن نے آپریشن کر کے چھوڑ دیا ہے۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار بیدرد ہو گیا ہو۔

عبادت۔ یہ تو ان کی بڑائی ہے اس طرح وہ پڑھنے والے کو اپنی طرف زیادہ متوجہ کرتے ہیں اور اس سے ان کا مقصد بھی پورا ہوتا ہے۔

ہاجرہ مسرور۔ طوائف کے بارے میں تو ہوا لیکن "بو" اور اسی قبیل کے دوسرے افسانوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟

وقار عظیم۔ یہ ایک ذہنی تعیش اور بے بسی کی نشانی ہے۔

ندیم۔ ان کی کہانی "پھاہا" کیا اس صف میں آتی ہے؟

انتظار حسین۔ "پھاہا" ان کا ابتدائی افسانہ ہے اور اس کے رجحان کی مذمت نہیں کی جا سکتی۔

عبادت۔ اس طرح اندازہ ہوتا ہے کہ منٹو کا فن دو رجحانات کا حامل ہے۔ ایک رجحان تو وہ ہے جس میں سماجی محرمات کا بیان ہے لیکن ذہنی تعیش نہیں ——— دوسرا وہ جس کی نوعیت نفسیاتی ہے اور جس میں وہ جنسی موضوعات کو پیش کرتے ہیں ——— دوسرے رجحان میں صحت مندانہ کیفیت نہیں ہے۔

وقار عظیم۔ یہ چیزیں شروع میں ہیں لیکن آگے چل کر ختم ہو جاتی ہیں۔

عبادت۔ منٹو صاحب "ٹھنڈا گوشت" وغیرہ نہ لکھتے تو یہ ان کی بڑائی ہوتی۔

ہاجرہ مسرور۔ یہ تو تقسیم کے بعد کا افسانہ ہے۔

وقار عظیم۔ ایک بات منٹو میں مستقل ہے۔ وہ یہ کہ انہوں نے افسانے کو ہمیشہ اس طرح کیا ہے کہ ہر جگہ فن کے لوازمات کا خیال رکھا ہے۔ تکنیک کی پابندی، افسانہ کے مختلف اجزا کا ربط اور مجموعی تاثر ہر منزل پر اس کا احساس ان کے ہاں ملتا ہے فن کے لحاظ سے یہ بڑی کامیابی ہے۔

انتظار حسین۔ مختصر افسانے کی تکنیک پر منٹو پوری طرح حاوی ہیں لیکن ادب محض تکنیک بھی تو نہیں اس سے باہر نکل کر دیکھیں تو ان کے افسانوں کو اتنی وقعت نہیں رہتی۔

وقار عظیم۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اچھی فنی تخلیق کے لئے جس انہماک، کاوش اور جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے وہ منٹو کے پاس نہیں ہے۔

محمد طفیل۔ اب تو وہ کہتے ہیں کہ آپ ایک فقرہ لکھ دیجیے میں افسانہ آگے چلا کر مکمل کر دوں گا۔ اس طرح ایک افسانہ تو لکھا جا سکتا ہے لیکن فن کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکتا۔

عبادت۔ ہاں وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ انہیں زندگی کا بڑا گہرا تجربہ ہے وہ خود کہتے ہیں کہ میری زندگی میں افسانے بھرے پڑے ہیں۔ یہ خود اعتمادی زندگی کے وسیع تجربے ہی کا نتیجہ ہے۔

ندیم۔ اس دور کے افسانوں کے تین CONTRIBUTION ہیں:-

۱۔ اچھوتے موضوعات کو فن کا موضوع بنانا۔

۲۔ افسانے کی تکنیک

۳۔ سلاست بیان

میں منٹو کے ساتھ بیدی کو بھی اس زمرے میں رکھتا ہوں۔

وقار عظیم۔ بیدی بعض حیثیتوں سے منٹو سے آگے ہے۔ بیدی فن کار کی حیثیت سے لغزش کرنا گناہ سمجھتا ہے۔

انتظار حسین - ایک اور فرق بھی ہے، منٹو نے روسی افسانوں سے زیادہ اثر نہیں لیا، امریکی افسانوں سے لیا ہے۔ مثلاً O HENRY بیدی نے روسی افسانوں سے اثر لیا ہے روسی افسانہ امریکی افسانے سے بہت آگے ہے اسی طرح بیدی کی ادبی وقعت منٹو سے بڑھ جاتی ہے۔

عبادت - منٹو بعض وقت زندگی کے حقائق کا مضحکہ بھی اڑاتے ہیں۔ اس کا اثر اچھا نہیں ہوتا۔ اگر وہ سماجی نظام کو سمجھتے اور اس کی بنیاد طبقاتی شعور پر ہوتی تو شاید وہ ایسا نہ کر سکتے۔

وقار عظیم - یہ تو وہی ضد والی بات ہے۔

ہاجرہ مسرور - لوگ بیدی کی طرف بہت کم توجہ کرتے ہیں حالانکہ وہ بہت بڑے افسانہ نگار ہیں۔

وقار عظیم - نہیں صاحب یہ نہ کہئے کم از کم میں نے تو مختلف وقتوں میں جتنی ان کی تعریف کی ہے کسی مسلمان نے کسی سکھ کی کم ہی کی ہوگی۔

(قہقہہ)

عبادت - ایم اسلم کا بھی افسانہ میں کوئی مقام ہے یا نہیں۔

انتظار حسین - اس کا مطلب ہے کہ ہم آگے سے پیچھے کی طرف چلیں۔

وقار عظیم - اگر ایم اسلم کا ذکر کرنے لگیں تو بہت سے اور لوگوں کا ذکر کرنا پڑے گا۔ ایم اسلم اصل میں بنیادی طور پہ ناول نگار ہیں۔

محمد طفیل - لیکن انہوں نے تقسیم سے پہلے زیادہ تر افسانے لکھے ہیں۔ ناول بعد میں لکھے ہیں۔

شوکت تھانوی - صاحب میرے خیال میں تو پارٹیشن کی وجہ یہی ہے۔

(قہقہہ)

عبادت - ایم اسلم کے ساتھ یہ بہت زیادتی ہے کہ ہم افسانوں میں ان کا ذکر نہیں کرتے۔ ہم ان کے رطب و یابس کو رد کر دیں پھر بھی ان کے کلام میں بھی ہے، نکال دیں تو ان کے پاس بھی ایسے افسانے ملیں گے جو تکنیک کے اعتبار سے اور فطرت نگاری کے اعتبار سے خاصے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ بسیار نویس اور زود نویس ہیں اور اسی نے انہیں نقصان پہنچایا ہے۔

انتظار حسین - لیکن روایت اور تجربے کی بحث میں ان کا ذکر غالباً بے محل ہے۔

ندیم - اگر اردو کی مختصر افسانہ نگاری کا جائزہ پیش نظر ہوتا تو ایم اسلم کا نام ضرور ہوتا لیکن روایت اور تجربہ کے سلسلہ میں ان کا ذکر بر محل نہیں۔

وقار عظیم - انہوں نے ایسے وقت کہ روایت بہت آگے بڑھ چکی ہے پرانی روایت کو برتا اس لئے آج کی گفتگو میں ان کا تذکرہ بے محل ہے۔

شوکت تھانوی - ان کی حیثیت اس گھڑی کی ہے جو پچھلی صدی میں بند ہو گئی۔

(قہقہہ)

محمد طفیل - عبادت صاحب اس بند گھڑی کو پھر چالو کرنے کی کوشش میں ہیں معلوم ہوتا ہے تحریری گناہ بخشوائے جا رہے ہیں۔

وقار عظیم - میرے خیال میں اب ہمیں بیدی کی طرف رجوع کرنا چاہئے مجھے خود بیدی اتنا پسند ہے کہ اگر میں اردو کے پانچ چھ افسانوں کا انتخاب کروں تو اس میں بیدی کا افسانہ ضرور آئے گا۔ ان کے پاس بڑی تعداد ایسے افسانوں کی ہے جنہیں عظیم کہا جا سکتا ہے۔

عبادت - وہ ہمارے اندر گھل مل کر ہماری جذباتی اور ذہنی الجھنوں کی اعلیٰ درجہ کی تصویریں پیش کرتا ہے۔ اس کے پاس انقلابی رجحان نہیں ہے۔ لیکن وہ ان چھوٹے چھوٹے موضوعات کو لیتا ہے جنہیں ہم نظر انداز کر دیتے ہیں اور اس کے افسانوں میں HUMAN TOUCH بھی بڑا شدید ہے۔

وقار عظیم - اس کے یہاں فنی اعتبار سے بڑی بلندی ہے منٹو تخیل اور فکر کو موضوع میں رچاتا نہیں، یہ چیز بیدی کے یہاں بدرجہ اتم ہے۔ وہ اس غور و فکر کے ساتھ دل نشین زاویے اور شکلیں پیش کرتا ہے کہ صرف بیان کی قدرت کے علاوہ اس کے پاس کوئی خامی نظر نہیں آتی۔

عبادت - اس کے پاس نکھرا ہوا انداز اور منجھا ہوا فن ہے بیان پر قدرت نہ ہونے کے باوجود وہ اپنے موضوع میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس موضوع کو مختصر افسانے کے سانچے میں ڈھالنا اس کے لئے مشکل نہیں ہوتا۔

خدیجہ مستور - بیدی کا فن یہ ہے کہ وہ چھوٹے سے چھوٹا موضوع اس چابکدستی اور گہرائی سے پیش کرتا ہے کہ قاری چونک اٹھتا ہے۔

وقار عظیم - مجیب صاحب جو روسی ادب کے بہت اچھے طالب علم اور افسانہ نگار بھی ہیں، جب بیدی کے افسانوں کا مجموعہ "دانہ و دام" چھپا تو بغل میں دبائے پھرتے تھے اور کہتے تھے کہ میں نے آج تک اردو میں اتنا اچھا مجموعہ نہیں دیکھا۔ روسی افسانہ نگاروں کا جتنا گہرا اثر بیدی کے ہاں ہے اور کسی کے یہاں نہیں۔

انتظار حسین۔ اس کے لہجے کی آہنگی بہت متاثر کرتی ہے۔ منٹو کا افسانہ پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نقارہ بج رہا ہے۔ بیدی کے افسانے میں عام اپیل کم ہے اور منجھے ہوئے ادبی ذوق کی ضرورت زیادہ ہے۔

ہاجرہ مسرور۔ یہ عجیب بات ہے کہ بیدی سے زیادہ مقبولیت کرشن چندر نے حاصل کی۔

خدیجہ مستور۔ یوں تو ایم اسلم کرشن چندر سے زیادہ مقبول ہیں۔

انتظار حسین۔ کرشن چندر اور منٹو کا انداز ایک سا ہے وہ عام قاری کو زیادہ متاثر کر سکتے ہیں۔

عبادت۔ بیدی کے مقابلے میں کرشن چندر کی مقبولیت کا سبب اور بھی ہے۔ اگرچہ بیدی کا انداز اور لہجہ کی آہنگی ہے لیکن گہرے سماجی روابط کا شعور بیدی کو کم ہے۔ ان کے ہاں زندگی کی عکاسی ضرور ہے لیکن زندگی کی تنقید کم۔ کرشن چندر کے یہاں باوجود رومانیت کے یہ شعور زیادہ ہے۔

ہاجرہ مسرور۔ سوال یہ ہے کہ کیا مختصر افسانہ زندگی پر تنقید ہے؟

حمید اختر۔ ایک چیز اور بھی ہے کہ کرشن چندر اور منٹو نے بیدی سے بہت زیادہ لکھا ہے۔

عبادت۔ یہ تو ایم اسلم کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے۔

انتظار حسین۔ "یہ سماجی روابط کے شعور" کا فقرہ ذرا گمراہ کن ہے۔ بیدی کے پاس سماجی روابط کا تانا بانا زیادہ مضبوط ہے۔

حمید اختر۔ کرشن چندر واضح بات کرتا ہے جس سے تھوڑا پڑھے ہوئے بھی متاثر ہو جاتے ہیں اس طرح اس کے قارئین کا حلقہ بڑھ جاتا ہے اعلیٰ ادبی ذوق والے کم ہیں جو بیدی سے متاثر ہو سکیں۔

عبادت۔ بیدی کے ہاں انداز بیان میں الجھن ہے اور ان کے افسانوں میں زیادہ حرکت نہیں ہے بلکہ ایک سست روی ہے۔ یہ حرکت کرشن چندر کے یہاں بہت زیادہ ہے اس لئے اس کے افسانوں کا اثر بیدی کے مقابلے میں گہرا ہوتا ہے۔

انتظار حسین۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی ——— او ہنری بڑا سادہ نگار ہے چیخوف نہیں ہے۔ لیکن چیخوف زیادہ بڑا فن کار ہے۔

عبادت۔ شگفتگی اور روانی تاثر کو گہرا کرتی ہے۔ بیدی کے افسانوں کی مقبولیت میں شگفتگی اور روانی کی یہ کمی حائل نظر آتی ہے۔

وقار عظیم۔ اس کے بجائے بیان کی قدرت کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

انتظار حسین۔ کرشن چندر کے ہاں صحافتی انداز پیدا ہو گیا ہے اس لئے وہ قاری کے ذہن کو جلدی گرفت میں لے لیتا ہے۔

عبادت۔ یہ بات غلط ہے۔ کرشن چندر کے پاس بڑا خوب صورت اندازِ بیان ہے۔ اس اعتبار سے وہ علی عباس حسینی کو چھوڑ کر اردو کے باقی تمام افسانہ نگاروں سے آگے ہے۔ اس کے پاس صحافت کو بھی ادب بنا دینے کا جادو ہے۔

وقار عظیم۔ بیدی کے موضوع اتنے متنوع نہیں جتنے کہ کرشن چندر کے ہیں۔ لیکن جتنا کچھ انہوں نے لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس مشاہدہ کی گہرائی ضرور ہے۔ کرشن چندر کی مقبولیت میں ان کے طرزِ بیان اور طرزِ بیان کی شاعری کو بڑا دخل ہے۔ اس سے قطع نظر بیدی بڑا افسانہ نگار ہے۔

عبادت۔ میرا مطلب یہ ہے کہ بیدی محدود ہو کر سوچتے ہیں، ان کے یہاں احساس کی شدت ہوتی ہے لیکن گہرائی نہیں ہوتی۔ وہ جن مسائل کے بارے میں لکھتے ہیں ان کے افسانوں میں ان کا کوئی حل نہیں ملتا۔

وقار عظیم۔ کرشن چندر باتیں زیادہ کہتے ہیں۔ پھیل کر کہتے ہیں۔ گہرائی تو بیدی کے پاس ہے البتہ وسعت نہیں۔ انہوں نے اپنے گرد و پیش کی زندگی کو دیکھا ہے اور اسی کو اتنا کافی سمجھا ہے کہ وہ اور چیزوں کے محتاج نہیں۔ کرشن چندر جس چیز کو سماجی شعور کہتے ہیں وہ کہیں کہیں پروپیگنڈا بن گئی ہے۔

انتظار حسین۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک خاص تحریک کی طرف سے اپنے اوپر ایک فرض عائد کر لیا ہے۔

ندیم۔ یوں تو ہر افسانہ نگار نے اپنے اوپر کچھ نہ کچھ فرائض عائد کر لئے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ آواز اس کے دل کی آواز ہے یا خارجی تحریک کا اثر۔

عبادت۔ کرشن چندر کا خلوص اس سے ظاہر ہے کہ وہ رومانی ہے اگر پراپیگنڈسٹ ہوتا تو ایسا نہ ہوتا

انتظار حسین۔ یہ بحث ختم کیسے ہوگی؟

شوکت تھانوی۔ مزید بحث سے پہلے مجھے اجازت دیجئے۔

عبادت۔ کچھ اشک کے بارے میں۔

وقار عظیم۔ وہ پریم چند کے مقلد ہیں۔ تفصیلات اور جزئیات میں زیادہ جاتے ہیں۔

خدیجہ مستور۔ ان کے افسانوں میں بڑی ناپختگی ہے۔

وقار عظیم ۔ انہیں یہ اندازہ نہیں کہ تفصیلات میں سے کون سی چیزیں منتخب کر کے کام میں لانی چاہئیں۔ ONE ACT PLAYS اچھے لکھتے ہیں۔

محمد طفیل ۔ اتنے اچھے کہ اردو کا کوئی بڑے سے بڑا افسانہ نگار بھی ان کے مقابل کھڑا ہوتے ہوئے ہچکچائے گا۔

عبادت ۔ اس دور کے لکھنے والوں میں تیسرا نام عصمت چغتائی کا ہے ان کے افسانوں میں دو رجحان ملتے ہیں۔ ایک تو جنسی زندگی کے ایسے پہلو جن کی کوئی سماجی اہمیت نہیں مثلاً نوجوان لڑکیوں کے ایسے مسائل جو ذہنی الجھنوں کے پیدا کردہ ہیں اور جن کو پیش کرتے ہوئے کہیں کہیں خالص رومانی اور جذباتی سی فضا بھی پیدا کرتی ہیں ۔۔ دوسرے وہ افسانے جن میں انہوں نے متوسط طبقے کی نوجوان لڑکیوں کے جنسی اور جذباتی مسائل کو موضوع بنانے کی کوشش کی ہے ۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں رجحانات نے اردو افسانے میں کیا اضافے کئے ہیں۔

وقار عظیم عصمت کا فن اس لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے کہ صرف ایک عورت ہی اسے پیش کر سکتی ہے۔ عصمت کا بڑا اضافہ یہ ہے کہ انہوں نے ہمیں بتایا کہ عورت کے بھی اپنے مسائل ہیں دوسری بڑی بات سماجی شعور ہے ۔ انہوں نے یو۔ پی کے متوسط طبقے کے خاندانوں کی زندگی کو قریب سے دیکھا ہے اور اس میں جو پیچیدگی اور گھٹن ہے اسے بڑے لطیف اور نشتر زنی کے انداز میں پیش کیا ہے۔

عبادت ۔ لیکن انہوں نے بعض ایسی کہانیاں بھی لکھی ہیں جن میں ایک سستی قسم کی رومانیت پیدا ہو گئی ہے ۔

وقار عظیم ۔ اس کی وجہ کچھ یہ بھی ہے کہ ان کے مزاج میں تمسخر کا رنگ ہے۔

عبادت ۔ اس میں ان کا اپنا جذبہ اور خواہش بھی شریک دکھائی دیتی ہے اور یہ اس معاشرہ کا تمسخر معلوم ہوتا ہے جس نے انہیں گھٹن اور جبر میں رکھا۔ لیکن ان باتوں کو موضوع بنانے میں کیا ان پر رشید جہاں کے افسانوں کا اثر نہیں ہے ؟

وقار عظیم ۔ رشید جہاں اور عصمت میں بڑا فرق یہ ہے کہ رشید جہاں نے ماحول کی عکاسی زیادہ نہیں کی۔

انتظار حسین ۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ افسانہ نگار خواتین کا گروپ جس نے زیر کر چھوڑ کر یو۔ پی میں پیدا ہوا اور یہ بغاوت یو۔ پی میں ہی پیدا ہو سکتی ہے ۔ انہیں اپنے معاشرتی ماحول کا پورا احساس ہے ۔ ہاجرہ مسرور خدیجہ مستور اور قرۃ العین اسی کڑی میں آتی ہیں ۔

عبادت ۔ قرۃ العین حیدر کا مزاج ان سب سے الگ ہے ان کا نام ان کے ساتھ نہ لیجئے۔

انتظار حسین ۔ ہاں ان کی کچھ دوسری شکل ہے۔

محمد طفیل ۔ بھیا تم کس پھیر میں پڑ گئے یہاں بات شکلوں کی نہیں افسانوی تخلیقات کی ہو رہی ہے۔

(قہقہہ)

عبادت ۔ عصمت چغتائی نے مختصر افسانے کی تکنیک کو اچھی طرح سمجھا اور اسے توازن اور ہم آہنگی سے پیش کیا۔ اس سلسلے میں ان کا اندازِ بیان خاصے کی چیز ہے ۔ انہیں زبان پر بڑی قدرت ہے ۔ بے ساختگی اور روانی نے ان کی تکنیک پر بڑا اچھا اثر ڈالا ہے ۔ وہ تصویریں جو انہوں نے پیش کی ہیں بڑی واضح ہیں ۔ ان میں معنویت اور مقصدیت بھی ہے اور وہ بڑی دل آویز اور دل نشین بھی ہیں ۔

وقار عظیم ۔ ایک اور بات یہ کہ وہ بڑی بے جھجک ہیں۔ انہیں کسی کے عتاب یا تعزیر کا خوف نہیں ۔

عبادت ۔ لیکن ان کی یہ شدت، تیزی، جارحانہ کیفیت اور بیباکی کہیں کہیں حد سے گزر جاتی ہے اور متوازن قسم کے انسان پر اچھا اثر نہیں کرتی۔

وقار عظیم ۔ یہ تو عمر کا تقاضا بھی ہوتا ہے ۔ سنجیدگی کی کمی توازن کی کمی کا سبب بن جاتی ہے ۔

ہاجرہ مسرور ۔ عبادت صاحب نے جو حد سے گذرنے کی بات کی ہے تو میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ وہ حدود کیا ہیں ؟

وقار عظیم ۔ حدود تو کوئی نہیں لیکن لکھنے والے کے پاس ایک مقصد ہوتا ہے ۔ اب اگر وہ بیان میں اتنی شدت پیدا کرے کہ ہمدردی کے بجائے جھنجلاہٹ پیدا کرنے لگے تو ٹھیک نہیں ۔

انتظار حسین ۔ غالباً عبادت صاحب کے ذہن میں یو۔ پی کا قاری ہے۔

ندیم ۔ میرے خیال میں عبادت صاحب کا مطلب یہ ہے کہ ہر گھرانے اور ملک میں چند سماجی قدریں ہوتی ہیں جن کا توڑنا گوارا نہیں کیا جاسکتا۔

ہاجرہ مسرور ۔ میں نے یہ بات اس لئے کی کہ ہم نے پہلے منٹو پر بحث کی تھی۔ ان کا انداز کہیں زیادہ خطرناک اور پھسلواں ہے ۔

عبادت ۔ منٹو کا انداز مختلف ہے ۔ سماجی مذمومات کے بیان میں ان کی اپنی ذہنی کیفیت شامل نہیں لیکن عصمت کے ہاں ان کی اپنی

انتظار حسین ۔ میرے خیال میں تو عصمت نے صحیح انداز اختیار کیا۔ NARRATOR بالغ ہوتا تو یہ بات زیادہ گھناؤنی ہوتی۔ یہ INDIRECT ہے۔ بچے کے بیان سے یہ بات ہم تک پہنچ گئی اور اس میں عریانی نہیں رہی۔

عبادت ۔ عریانی بالکل نہ سہی لیکن مجموعی تاثر میں مذموم کیفیت کا اظہار نہیں ہو سکا اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پڑھنے والا اس میں خود لذت محسوس کرنے لگتا ہے اور یہ خصوصیت اس افسانے کو خاصا خطرناک بنا دیتی ہے۔

ہاجرہ مسرور ۔ اس میں لذت نہیں محسوس ہوتی۔

ندیم ۔ قاری لذت محسوس کرتا ہے ۔ اگر وہ بچے کے بجائے بالغ NARRATOR کے ذریعے پیش کرتیں تو افسانہ کامیاب ہوتا۔

خدیجہ مستور ۔ اور جس عورت کے ساتھ یہ واقعات ہو رہے ہیں اس سے ہمیں ہمدردی نہیں ہوتی۔ افسانے میں چٹخارا ہے ۔ یقین نہیں آتا کہ "چوتھی کا جوڑا" کا افسانہ نگار ایسا افسانہ بھی لکھ سکتا ہے ۔

ہاجرہ مسرور ۔ میں نے تو موضوع سے بحث کی تھی۔

عبادت ۔ اس افسانے کے موضوع کی اہمیت سے تو کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ یہ خرابی ہماری معاشرت میں موجود ہے کاش عصمت اس اہم موضوع کو اس طرح پیش کرتیں کہ اس کا اثر اس سے نفرت کی صورت میں نمایاں ہوتا لیکن اس افسانے نے تو اس موضوع سے دلچسپی لینے کی ترغیب دی ہے عصمت کا وار اس طرح خالی جاتا ہے ۔ وہ خود اس کا شکار ہو جاتی ہیں۔

انتظار حسین ۔ احمد ندیم قاسمی کے ذریعے اردو افسانے میں ایک نئی چیز آئی اب تک یو۔پی کے علاقے کی ترجمانی ہوتی تھی لیکن اُردو والے حلقہ پنجاب کے کرداروں سے واقف نہیں تھا۔ اب یہ بات اور ہے کہ ندیم صاحب نے اسے DEAL کیسے کیا۔ ان میں خامی یہ ہے کہ وہ پنجاب کی فضا پر شاعری کا پردہ ڈال لیتے ہیں۔ وہ حقائق کو رنگین عینک سے دیکھتے ہیں۔

عبادت ۔ جس چیز کو انتظار صاحب خامی گنتے ہیں میں اسے ان کے فن کا ضروری جزو سمجھتا ہوں ۔ یو۔پی اور پنجاب کی فضا میں جتنا فرق ہے ۔ پنجاب کے دیہات کی فضا رومانی ہے ۔ یہاں کے پہاڑوں میں رومان ہے ۔ دریاؤں میں رومان ہے ، کھیتوں میں رومان ہے ۔ غرض یہ کہ ساری فضا پر رومانی کیفیت

کیفیت شامل ہو جاتی ہے ۔ عصمت کے فن کا جو مجموعی تصور ہمارے سامنے ہے اس میں اگرچہ زندگی کی بڑی اچھی عکاسی ہے لیکن کہیں کہیں ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ راستہ سے ہٹ کر ایک والہانہ جوش اور جذبے میں انہوں نے جگہ جگہ ایسی باتیں بھی کہہ دی ہیں جس سے فن کے کارگہ شیشہ گری کو ٹھیس لگتی ہے ۔ شاید اس کی وجہ ان کی نوجوانی اور نوجوانی کی ذہنی جذباتی کیفیات ہیں جن کو ایک مخصوص ماحول نے دبا کر ابھرنے کے لئے مجبور کر دیا ہے ۔

انتظار حسین ۔ یہ بات تو کرشن چندر اور اس دور کے دوسرے لکھنے والوں پر بھی عائد ہو سکتی ہے ۔

وقار عظیم ۔ بچہ فطری طور پر شرارت پسند ہوتا ہے ، آپ اسے روکتے ہیں تو وہ اور راستے ڈھونڈھ لیتا ہے ۔ چیخنے سے منع کئے جانے پر وہ دیواریں سیاہ کرنے لگتا ہے ۔

عبادت ۔ عصمت باشعور انقلابی نہیں ہیں ۔ ان کے یہاں ایک باغی کی جھنجھلاہٹ ہے ۔ یہ خصوصیت ان کے ہر افسانے میں جھلکتی ہے ۔

وقار عظیم ۔ بہر حال آپ انہیں رو کتے ہیں تو وہ چٹکیاں لینے لگتی ہیں۔

ندیم ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اردو افسانہ کی جوش ملیح آبادی ہیں۔

(قہقہہ)

ہاجرہ مسرور ۔ عصمت چغتائی نے جن مسائل پر لکھا ہے ان کے لئے یہ انداز لازمی ہے ، مثلاً انہوں نے مردوں کے رانیں کھجانے کا ذکر کیا ہے ۔ اب اس کے لئے وہ اور کیا لکھ سکتی ہیں اور یہ بات تہذیب کے دائرے میں کس طرح لائی جا سکتی ہے ۔

عبادت ۔ اسے جانے دیجئے اور ان کی فقرہ بازی اور چھینٹے اچھالنے کو پیش نظر رکھئے ۔

وقار عظیم ۔ ان کی فقرہ بازی میں بڑی تلخی محسوس ہوتی ہے ۔

ہاجرہ مسرور ۔ اس سلسلے میں "لحاف" کا ذکر ضرور ہونا چاہئے عصمت نے اس میں بنیادی غلطی یہ کی ہے کہ اسے بچے کی زبان سے پیش کیا ہے اسی لئے وہ گھناؤنا سا ہو گیا ہے ۔ انداز بیان غلط تھا لیکن موضوع ضروری تھا ۔

عبادت ۔ اس کا مجموعی تاثر فنکار کی اپنی دلچسپی اس معاملے میں حدود ظاہر کرتا ہے اور یہ اس افسانے کی سب سے بڑی خامی ہے اور اس کا بنیادی مقصد اس طرح فوت ہو جاتا ہے ۔

چھائی ہوئی ہے ندیم صاحب جب اس فضا کو پیش کرتے ہیں تو رومان کا رنگین پردہ از خود ان کے فن پر پڑ جاتا ہے۔ یہ شعوری نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکھڑی اکھڑی سی نہیں معلوم ہوتی۔ اس رومانی فضا میں تو وہ پنجاب کی روح کو بے نقاب کر دیتے ہیں۔ اس لئے ان کی یہ رومانیت فن کو حقیقت سے قریب کرتی ہے۔

انتظار حسین۔ لیکن خود ندیم صاحب کے بعض افسانے ایسے ہیں جن میں یہ پردہ نہیں ہے۔ بلونت سنگھ کے افسانے بھی ایسے ہیں اور اس پردہ کے بغیر ہم چیزوں کو زیادہ قریب سے دیکھ سکتے ہیں۔

عبادت۔ ابتدائی دور میں ان کے افسانوں کی خاصی تعداد ایسی ہے جن کا نقطۂ نظر تمام تر رومانی ہے۔ شاید ان کی نوجوانی نے اس خصوصیت کو پیدا کیا ہے، بعد میں حقیقت نگاری کی طرف ان کا رجحان بڑھنے لگا ہے۔

ہاجرہ مسرور۔ ابتدائی دور سے آپ کی کیا مراد ہے۔ ان کے مجموعے "بگولے" کے افسانے "خربوزے" میں تو کوئی رومان نہیں۔

محمد طفیل۔ یہ افسانہ "بگولے" میں نہیں "آنچل" میں ہے۔

عبادت۔ ان کا پہلا مجموعہ "چوپال" ہے۔ اس کے بیشتر افسانوں میں رومانی فضا ہے۔

وقار عظیم۔ یہ دو ہی حقیقت نگاری اور رومانی ادوار کے بین بین ہے اس وقت یہ دونوں چیزیں ہماری روایت کا جزو بن چکی ہیں۔ بعد میں ندیم صاحب کے افسانوں میں واقعیت رومان پر غالب آگئی ہے۔ وہ ایک خاص حد تک اس فضا کا ذکر کرتے ہیں اس کے بعد نہیں۔

عبادت۔ ان کے شعور میں ارتقائی کیفیت ہے۔ اب ان کے پاس حقیقت نگاری REALISM کا بڑا رچا ہوا انداز ملتا ہے جس کو ان کے بڑھتے ہوئے سماجی شعور نے پیدا کیا ہے۔

وقار عظیم۔ لیکن اس سماجی نوعیت کے باوجود وہ اس رومانی فضا کو نظر انداز نہیں کرتے۔

عبادت۔ آج سے سات آٹھ سال پہلے وہ یہ فضا قائم کرتے تو ان کے یہ افسانے اُجڑے اُجڑے سے نظر آتے۔ اس فضا نے ان کے فن میں بڑی جان پیدا کی ہے۔ اس فضا نے ان کے افسانوں کو واقعیت سے قریب کیا ہے۔

انتظار حسین۔ لیکن احمد علی نے اسی زمانے میں اور قسم کے رنگ میں افسانے لکھے ہیں۔

محمد طفیل۔ کیا ہم اسے خرابی کے بجائے ایک اسلوب کا درجہ نہیں دے سکتے؟

ندیم۔ اس سلسلے میں میں انتظار صاحب اور وقار صاحب سے متفق ہوں۔ ابتدا میں رومانیت اتنی شدت اختیار کر گئی کہ واقعیت دب گئی ہے۔

وقار عظیم۔ اس میں لطف ضرور آتا ہے لیکن مجموعی تاثر دب گیا ہے۔ دوسرے لکھنے والوں نے زندگی سے گہرا ربط ضرور رکھا ہے لیکن فن سے شاید نہیں۔ ندیم صاحب اس دور کے واحد افسانہ نگار ہیں جنہوں نے فن اور زندگی کو ساتھ ساتھ چلایا ہے۔

عبادت۔ ان کے ہاں بڑا توازن اور مسلسل ارتقائی کیفیت پائی جاتی ہے۔ وہ کہیں بہکے نہیں ہیں۔ انہوں نے زندگی اور فن کے امتزاج کی ایک صحت مند روایت قائم کی ہے۔

ندیم۔ اردو افسانے کی ساری روایت مجھ پر بیت چکی ہے۔ میں نے ابتدا داستانوں سے کی ہے۔ فنی حیثیت متعین کرنا آپ لوگوں کا کام ہے۔

انتظار حسین۔ قاسمی صاحب کے فسادات کے بارے میں افسانوں میں خامی یہ ہے کہ وہ بڑے جذباتی ہو گئے ہیں۔

وقار عظیم۔ یہ بات تو فسادات کے بارے میں جتنے لوگوں نے لکھا ہے سب میں موجود ہے۔ وقت گذرنے پر ہی اس میں اعتدال پیدا ہو سکا۔ یہ خرابی کرشن چندر، بیدی، عصمت اور حیات اللہ انصاری میں بھی ہے۔

عبادت۔ ندیم صاحب نے تفصیل اور جزئیات کو مختصر افسانے میں بڑی خوبی سے سمویا ہے۔ اس سے ایک فضا بھی پیدا ہوئی ہے۔ ایک ماحول بھی وجود میں آیا ہے۔ ندیم صاحب اسی فضا اور ماحول کے افسانہ نگار ہیں۔

وقار عظیم۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ افسانہ نگار کو قدرت ہے کہ وہ دس جملوں کی بات کو ایک جملے میں ادا کر سکتا ہے۔

محمد طفیل۔ اور یہ بھی کہ ایک جملے کی بات کو دس جملوں میں بھی ادا کر سکتا ہے۔

وقار عظیم۔ خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور دونوں کے ابتدائی دور میں عصمت چغتائی کا اثر ضرور ہے شعوری یا غیر شعوری طور پر۔ یہ شاید احساسِ کمتری کا نتیجہ ہو لیکن عصمت کا ماحول ان سے مختلف ہے۔

عصمت کا ماحول علی گڑھ کے آس پاس ہے اور ان کے پاس لکھنؤ کا ماحول ہے۔ عصمت میں جو انتقام کا جذبہ ہے وہ ان کے یہاں نہیں ہے۔

عبادت ۔ ابتدائی دور کے افسانوں میں ان کے یہاں ایک طرح کا احساس شکست بھی ہے اور اس میں عصمت والی بلندی نہیں ہے۔

وقار عظیم ۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ عصمت نے اپنے آپ کو گھریلو شکنجوں سے نکال لیا تھا اور یہ ایسا نہیں کر سکی تھیں۔

ہاجرہ مسرور ۔ میرے خیال میں اگر ہم دونوں بہنوں پر صرف اس لئے ایک ساتھ بات کی جاتی ہے کہ ہم بہنیں ہیں تو بڑی زیادتی ہے۔

ندیم ۔ ان دونوں کے فن میں بھی بڑا فرق ہے، خدیجہ کے افسانوں میں آہستہ روی اور سہج سہج قدم رکھنے کا انداز ہے، ہاجرہ کے افسانوں میں عصمت کی تیزی اور شوخی بھی ہے۔

وقار عظیم ۔ یہ تو مزاجوں کا فرق ہے۔

انتظار حسین ۔ خدیجہ کے یہاں مرثیہ کی فضا ہے لیکن ہاجرہ کے یہاں طنز ہے۔

عبادت ۔ ان دونوں کو زبان پر بڑی قدرت ہے۔ ان کے بیان کی روانی اور طرز ادا کی بے باکی نے ان کے افسانوں میں زندگی پیدا کی ہے۔

وقار عظیم ۔ قرۃ العین میں اور ان میں یہ فرق ہے کہ اس نے مسوری میں زبان سیکھی ہے اور انہوں نے لکھنؤ میں۔

انتظار حسین ۔ قرۃ العین کے پاس امام باڑے کی زبان نہیں بلکہ نئے لکھنؤ اور وہ بھی کافی ہاؤس کی زبان ہے۔

عبادت ۔ لیکن اب مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہاجرہ اور خدیجہ کے پاس موضوعات ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے انداز میں بھی اب وہ شگفتگی نہیں رہی۔

ندیم ۔ میرے خیال میں موجودہ دور میں ان کا فن زیادہ وسیع اور بلند ہو گیا ہے۔

عبادت ۔ میں بالکل ابتدائی دور سے مقابلہ نہیں کر رہا ہوں بلکہ کچھ عرصہ پہلے کی بات کر رہا ہوں۔

وقار عظیم ۔ بیان وغیرہ کی حد تک تو آپ کی بات ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن زندگی کی باشعور ترجمانی تو اب ہی ہے۔ ایک کمی ضرور ہے کہ پہلے بیان کا انداز بے ساختہ تھا۔ اب اسے بنانے سنوارنے کی کوشش میں روانی میں کمی آگئی ہے اور تھوڑا سا تصنع پیدا ہو گیا ہے۔

عبادت ۔ میرے خیال میں اب ان کے یہاں لکھنے کی URGE اس شدت کے ساتھ نہیں ہے۔ زندگی کا شعور ضرور ہے لیکن جب URGE ہی نہیں ہوگی تو شعور تخلیق میں کس طرح معاونت کر سکے گا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے موضوعات ختم ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

انتظار حسین ۔ ہر دور میں ایک مزاج ہوتا ہے، پہلے وہ INNER URGE کے تحت لکھتی تھیں اب ایک خاص تحریک کے ماتحت لکھتی ہیں تو وہ بات پیدا نہیں ہو سکتی۔

ندیم ۔ ہاجرہ مسرور کے دو افسانے "صدمہ" اور "بھالو" تازہ ترین اور بڑے کامیاب افسانے ہیں۔

عبادت ۔ انتظار صاحب نے یہ بات ایک تعصب کے تحت کہی ہے۔ کسی تحریک کے ماتحت ہو کر لکھنا تو بڑی اچھی بات ہے بشرطیکہ اس تحریک کا ذہن و شعور پر خاطر خواہ اثر ہو۔

ندیم ۔ خدیجہ مستور کا افسانہ "بھیّوں لے چلے بابلا" مختصر اور بڑے DISPASSIONATE انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد ان دونوں کی تخلیق کی رفتار میں کمی آگئی اور شاید اسی کے باعث خامیاں پیدا ہو گئیں۔

عبادت ۔ میرا خیال یہ ہے کہ زندگی میں اگر فنکار کو سکون مل جائے تو تخلیقی صلاحیتیں سوکھنے لگتی ہیں —— ہاجرہ اور خدیجہ آج اسی سکون سے دوچار ہیں۔ ان کے موضوعات ختم ہو گئے ہیں اسی لئے ان کے افسانوں میں جان نظر نہیں آتی۔ اب ان کے فن کو زندہ کرنے کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ وہ بچوں کے بارے میں لکھیں۔ کیونکہ آج وہ زندگی کی انہی منزلوں سے دوچار ہیں۔

ہاجرہ مسرور ۔ صاحب بڑی مشکل یہ ہے کہ آپ لوگ ہماری گھریلو زندگی دیکھ لیتے ہیں اور پھر نسخہ تجویز کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔

وقار عظیم ۔ اس سے پہلے جو نام ہم نے لئے ہیں ان میں دیوندر ستیارتھی اور خواجہ احمد عباس کے نام رہ گئے ہیں۔ ہمیں ایک نظر ان پر بھی ڈال لینی چاہئے۔ دیوندر ستیارتھی میں ایک بات ہے جو کسی افسانہ نگار میں نہیں۔ دوسرے افسانہ نگار فضا سے متاثر ہیں یا انہوں نے پریم چند کی پیروی کی ہے لیکن ستیارتھی نے لوک گیتوں کے

سلسلے میں سارے ہندوستان کا دورہ کیا اور ان گیتوں کے تانے بانے سے کہانیاں تیار کی ہیں اس طرح ان کی کہانیوں میں بڑی رنگا رنگی ملتی ہے۔ انہوں نے اس رنگینی کو بڑے تنوع کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑا موضوع افسانے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ البتہ انہوں نے فنی لوازمات کا زیادہ خیال نہیں رکھا ہے۔

عبادت ۔ "لال دھرتی" افسانہ انہوں نے کافی چابکدستی سے لکھا ہے۔

ہاجرہ مسرور میرے خیال میں تو اس میں بڑا تصنع ہے انہوں نے خواہ مخواہ لال رنگ سے لڑکی کی بلوغت کو تعبیر کیا ہے۔ یہ چیز غیر قدرتی سی لگتی ہے۔ فنی حیثیت سے یہ کامیاب افسانہ نہیں ہے۔

وقار عظیم ۔ جی ہاں فنی نقطۂ نظر سے ان کا انداز عموماً بڑا لاابالی ہوتا ہے۔

عبادت ۔ وہ جس پس منظر کے متعلق لکھ رہے ہیں شاید اسے ہم یہاں بیٹھ کر اچھی طرح محسوس نہیں کر سکتے لیکن انہوں نے جس ماحول کے بارے میں لکھا ہے اس پس منظر میں وہ خاصا مؤثر نظر آتا ہے۔

ہاجرہ مسرور ۔ لیکن وہ اسے کسی اور انداز سے بیان کر سکتے تھے انہوں نے ایک جگہ لڑکی کے کھڑاؤں پر گھوم جانے کا ذکر کیا ہے۔ یہ بات بڑی مصنوعی ہے۔

عبادت ۔ یہ اصل میں اس بات کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ماحول سے یہ ماحول قدرے مختلف ہے۔

انتظار حسین ۔ لیکن ہم ایسے افسانے بھی تو پڑھتے ہیں جن کا ماحول ہم نے نہیں دیکھا لیکن افسانہ نگار ہمیں پوری طرح CONVINCE ضرور کرتا ہے مثلاً ڈی۔ ایچ۔ لارنس کے میکسیکو کے بارے میں افسانے۔

عبادت ۔ مجھے اس سے اختلاف نہیں لیکن یہاں بات فن کی نہیں رہ جاتی یہ تو ماحول کی عکاسی کی بات ہے۔ ستیارتھی اس عکاسی میں کامیاب ہیں۔

وقار عظیم ۔ لکھنے والے کا کمال یہی ہے کہ وہ ایسی فضا پیدا کرے کہ پڑھنے والا اجنبیت محسوس نہ کرے اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو یہ اس کی کمزوری ہے۔ ہاں یہ ستیارتھی کی خصوصیت ہے کہ انہوں نے مختلف دیہات کی فضا کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے افسانے میں رنگوں کی بڑی اہمیت ہے۔ جہاں کہیں انہوں نے بسنت میں یو۔ پی کے دیہات کا ذکر کیا ہے تو زردی کا ذکر بڑے فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے اور رنگ ہی سے پس منظر بنایا ہے۔

ان کے انداز بیان اور سوچنے پر ٹیگور کا گہرا اثر ہے اور وہ اپنے کرداروں سے بڑی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ ان میں ہر ایک کو اپنانے کی خواہش بدرجۂ اتم ہے۔

خواجہ احمد عباس کے افسانوں میں مجھے بڑا تصنع محسوس ہوتا ہے۔ دوسرے افسانہ نگاروں کے ہاں انداز بدلتا رہتا ہے مثلاً کرشن چندر پہلے رومانی تھے پھر بدل گئے۔ لیکن احمد عباس کا زندگی کے متعلق ایک خاص قسم کا نقطۂ نظر ہے جو سیاسی ہے وہ ایک خاص قسم کی قومیت کے حامی ہیں اور اس طرح وہ جو فضا بناتے ہیں اس میں تصنع کا احساس ہوتا ہے۔

ہاجرہ مسرور ۔ قومی احساس بُری بات نہیں؛ ہاں اسے پیش کرنے میں خامی رہ سکتی ہے۔

وقار عظیم ۔ فن کا اصل مقصد یہ نہیں کہ آپ اس کے محاسن سے لطف اندوز ہوں۔ فن کا اصل مقصد یہ ہے کہ ہمارا احساس دوسرے کا احساس بن جائے۔ اگر یہ تصنع معلوم ہونے لگے تو مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

عبادت ۔ خواجہ احمد عباس اپنے افسانوں میں زیادہ حقیقت نگار ہو جاتے ہیں اور اسی وجہ سے ہم شاید اسے محسوس کرتے ہیں کہ وہ کافی بیباک ہیں۔ انہوں نے افسانے کے بنیادی اصولوں کا کم خیال رکھا ہے ـــــ شاید اس لئے بھی کہ وہ صحافی ہیں اور ان کی تحریر پر صحافت کا خاصا اثر ہے۔ اسے ہم تصنع نہیں کہہ سکتے جان کر کہہ سکتے ہیں، بیباکی کہہ سکتے ہیں، سیدھا سادا انداز کہہ سکتے ہیں۔

وقار عظیم ۔ ہم کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے ایک منطق قائم کرتے ہیں جب تک یہ بات نہ ہو ہماری بات سے کوئی متاثر نہ ہوگا۔ افسانہ کی منطق اس سے کچھ مختلف ہے جو چیز زندگی میں حقیقت ہے وہ افسانے میں تصنع بن جاتی ہے۔ افسانوی حقیقت کے لئے ہمیں بڑے جوڑ توڑ کرنے پڑتے ہیں۔ احمد عباس اس میں پورے نہیں اترتے شاید اس لئے کہ صحافی ہیں۔

محمد طفیل ۔ ان کا صحافی ہونا کوئی عیب نہیں ہونا چاہیے بعض افسانہ نگار صحافی نہیں ہیں لیکن ان کی تحریروں میں صحافتی رنگ جھلکتا ہے۔ اس سلسلے میں کسی حد تک کرشن چندر کا نام لیا جا سکتا ہے۔

ہاجرہ مسرور ۔ مجھے ان کا ایک افسانہ یاد آتا ہے۔ ایک آدمی یادداشت کھو چکا ہے اور ریل میں سفر کر رہا ہے۔ ہندو اس سے پوچھتے ہیں کہ وہ کون ہے مسلمان بھی یہی پوچھتے ہیں ـــــ یہ بڑا مصنوعی لگ

کیونکہ اس زمانے میں تو لوگوں نے قومیت اور مذہب معلوم کرنے کے بڑے انوکھے ڈھنگ ایجاد کر رکھے تھے۔

وقار عظیم ۔ اصل میں اس وقت یہ رجحان تھا کہ فسادات کے بارے میں جو لکھا جائے اس میں ہندو اور مسلمان دونوں کے ساتھ پورا انصاف کیا جائے۔ کرشن چندر نے بھی ایسا کیا ہے لیکن ان کے بیان کا لوچ اس پر پردہ ڈال دیتا ہے۔

محمد طفیل ۔ میرے خیال میں اس موقع پر اختر اورینوی کا بھی ذکر ہونا چاہیئے۔

عبادت ۔ ان کے ساتھ اختر انصاری کا بھی۔

وقار عظیم ۔ ان کا ذکر شروع میں ہونا چاہیئے تھا۔ یہ دونوں افسانہ نگار مظلوموں کی حمایت کرتے ہیں۔ اختر اورینوی کے ہاں کسانوں اور شہروں کے متعلق افسانے ہیں۔ یہ افسانے انہوں نے ایسے دور میں لکھے ہیں جب لوگ فیشن کے طور پر ان کا ذکر کرتے تھے۔ ان کے پاس صحیح ہمدردی اور محبت ہے۔

عبادت ۔ اختر انصاری کے افسانوں کو بڑے غور سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ان کے افسانے اردو میں نفسیاتی تجزیے کی بنیاد رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں ایک فضا کا قیام اور ایک سماں بندی ملتی ہے ان کے پاس عوام سے ہمدردی کا عنصر تو نہیں ہے البتہ متوسط طبقہ کی ذہنی الجھنوں کا خاص طور پر ذکر ہے۔ اس سے جو نتائج نکل سکتے ہیں اس کو انہوں نے بڑی مہارت سے لکھا ہے۔

وقار عظیم ۔ اختر انصاری نے ایسی کہانیاں لکھی ہیں جن میں افراد کی ذہنی کیفیتوں کی عکاسی ہے (مثلاً ان کے مجموعہ "نازو" میں) انہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ حالات سے ان پر کیا اثر پڑتا ہے اور اس کا کیا ردِعمل ہوتا ہے۔ یہ بات اس دور کے لکھنے والوں میں نہیں ملتی۔

عبادت ۔ ان کے کردار پریشان، سراسیمہ اور کٹھ پتلیوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں کے ہاتھوں وہ ایک فضا قائم کرتے ہیں لیکن یہ فضا پڑھنے والے پر کس انداز میں اثر انداز ہوتی ہے۔ کاش انہیں اس کا بھی اندازہ ہوتا۔ ان کی قائم کی ہوئی فضا بیمار اور تھکی ہوئی سی نظر آتی ہے اور اس بات کا احساس وہ اتنی شدت سے دلاتے ہیں کہ پڑھنے والا اس میں پھنس جاتا ہے۔

وقار عظیم ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ جب سے انہوں نے زندگی کی گما گھمی میں قدم رکھا ہے FRUSTRATED رہے ہیں۔ چونکہ ان کی اپنی زندگی میں مایوسی ہے اس لئے یہی مایوسی ان کے کرداروں پر حاوی ہے۔ وہ کسی مصیبت سے نکلنے کی کوشش نہیں کرتے ہاں اس طرح کی زندگی میں انسان کو جن کیفیتوں سے سابقہ پڑتا ہے ان کی عکاسی بڑی صفائی سے کرتے ہیں۔

ندیم ۔ اردو افسانے کی تکنیک میں اختر انصاری کی CONTRIBUTION اتنی ہے کہ ان کا نثر لکھنے کا انداز بڑا خوبصورت، سلیس اور سادہ ہے نثر کے مقابلے میں ان کا اندازِ بیان بڑا دلکش ہے۔ ان کے چند افسانے (مجموعہ نازو) خاصے مشہور اور کامیاب ہیں لیکن ان کا کوئی اسلوب DEVELOP نہیں ہو سکا اور مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ صرف متوسط طبقے کے نوجوان کی زندگی ہی پیش نہیں کرتے، بلکہ ایسے موضوعات پر لکھتے ہیں جن کے بارے میں انہیں علم نہیں ہوتا۔ ایسا کرشن چندر نے بھی کیا ہے۔

عبادت ۔ جس ترقی پسندی کی طرف انہوں نے پلٹا کھایا ہے وہ اصل میں ان کا مزاج نہیں ہے۔

وقار عظیم ۔ یہ لبعد کا دور ہے ترقی پسندی کا CRAZE اس کی وجہ ہے۔

عبادت ۔ ان کے افسانہ "دریا کی سیر" میں کئی کردار ہیں۔ اس میں انہوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے اور یہ ان کا مخصوص انداز ہے۔

وقار عظیم ۔ یہ وہ زمانہ ہے جب پریم چند کا اثر بہت گہرا ہے حتیٰ کہ حسینی بھی اس سے متاثر ہیں۔ اس زمانے میں اختر انصاری نے انفرادیت پسندی کا ثبوت دیا اور اپنا رنگ الگ رکھا۔

عبادت ۔ ہر چند کہ ان کا نقطۂ نظر صحت مندانہ نہیں ہے لیکن انہوں نے ایک نئے انداز کی بنیاد ضرور رکھی ہے۔ اختر اورینوی نے زندگی اور معاشی کشمکش پر بڑے عمدہ افسانے لکھے ہیں مثلاً "کلیاں اور کانٹے"۔ لیکن یہ بات افسوس ہے کہ وہ نتیجہ کوئی نہیں نکال پاتے۔ اس معاملہ میں اگر اسی دور کے دوسرے افسانہ نگاروں کو دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ بہت آگے بڑھ گئے ہیں لیکن اختر اورینوی جس فلسفۂ حیات کے قائل ہیں وہ انہیں آگے بڑھنے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ ان پر بلا مقصد مذہب کا اثر ہے۔

ندیم ۔ اختر اورینوی کے افسانوں میں حقیقت پسندی اور تصنع کا بڑا عجیب امتزاج ہے۔

عبادت ۔ جب تک انسان کے پاس زندگی کی کشمکش کا صحیح شعور نہ ہو وہ اسی طرح بھٹکتا ہے۔ اختر اورینوی اس سے محروم نہیں۔

اگر طبقاتی آویزش کا شعور ان کے پاس ہوتا تو ان کے فن میں یہ خامی نہ باقی رہتی۔

وقار عظیم ۔ لیکن اس کے باوجود طویل مختصر افسانے کی روایت کو آگے بڑھانے میں اختر اورینوی کا بڑا حصہ ہے۔

عبادت ۔ اب ہم اس منزل پر پہنچ چکے ہیں جہاں یہ پتہ لگانے کی ضرورت ہے کہ ان افسانہ نگاروں نے کون کون سے نئے تجربے کئے اور کون کون سی نئی روایات قائم کیں۔

نئے افسانہ نگار پریم چند سے کچھ آگے بڑھتے ہیں۔ ان کی حقیقت نگاری انقلابی رجحان کی طرف بڑھ رہی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کا شعور بھی بڑھتا ہے۔ اس میں ترقی پسند تحریک کا اثر بھی شامل ہے۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے حقیقت نگاری اور واقعیت کے اس رجحان کے ساتھ ساتھ اپنے افسانوں میں حقیقت و رومان کا ایک سنگم بنانے کی کوشش بھی کی ہے۔ اس کی بہترین مثال کرشن چندر کا فن ہے۔ کرشن چندر نے اپنے تقریباً تمام افسانوں میں حقیقت و رومان کا یہ سنگم بنایا ہے اور اس طرح اس نے جنت اور جہنم کو یکجا کر دیا ہے۔ اس اعتبار سے وہ منفرد ہے۔

ندیم ۔ پریم چند کے زمانے میں افسانہ زیادہ تر عکسِ حیات تک محدود رہا ہے لیکن اب عکاسی میں تنقیدِ حیات بھی شامل ہو جاتی ہے۔ محبت کے بارے میں بھی جو کہانیاں لکھی گئی ہیں ان میں بھی سماجی عوامل کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔

عبادت ۔ پریم چند کے یہاں محبت کا جو تصور ہے وہ خدمت کا تصور ہے۔ بلدرم اور نیاز اس محبت کو حسن و ناز کا مجسمہ بنا کر پیش کرتے ہیں لیکن موجودہ دور میں محبت کی نفسیاتی نوعیت کو پیش کرنے کا رجحان عام ہے۔ اس سماجی کشمکش میں محبت کا کیا رخ ہو سکتا ہے ان چیزوں کے متعلق بھی افسانے لکھے گئے ہیں اس طرح گویا محبت کو وسیع مفہوم میں پیش کیا گیا ہے جو پہلے محبت جذباتی یا اصلاحی تھی اب اس کا ایک پس منظر ہے جو اس کا محرک بنتا ہے۔

وقار عظیم ۔ یہ بات صرف محبت کے لئے مخصوص نہیں حقیقت یہ ہے کہ اب عام اندازِ بیان جذباتی نہیں رہا اور افسانہ نگار کسی شئے کو زندگی سے الگ کر کے نہیں دیکھتے۔

ندیم ۔ محبت ہمارے شعری اور افسانوی ادب کا بہت بڑا موضوع رہا ہے، اس لئے اس میں تبدیلی بھی واضح ہے۔ تیسری چیز جو اردو افسانوں میں موجود ہے بین الاقوامیت ہے۔

وقار عظیم ۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس دور میں ہمارے افسانہ نگاروں کی نظر ساری دنیا کے ادب پر ہے۔

عبادت ۔ بین الاقوامیت کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں زندگی کے متعلق ایک خاص نقطۂ نظر ہے جس کو ایک سائنٹیفک تجربے کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ تجزیہ ہمیں بین الاقوامیت کی طرف لے جاتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کے قیام سے ایک خاص بات یہ پیدا ہو گئی ہے کہ اب ہم چیزوں کو تاریخی شعور کے تحت دیکھتے ہیں۔ یہ شعور جذباتی نہیں۔ اس میں زندگی سے دلچسپی اور اس کا گہرا احساس ہے۔ اس سے پہلے انسانیت پرستی یا انسان دوستی (HUMANISM) کے جو تصورات تھے اس میں چیزوں کو ایک محدود دائرے میں رہ کر دیکھا اور سمجھا جاتا تھا لیکن اب ایک عالمگیر انسانی برادری کا خیال پیدا ہوا ہے اور میں تو یہ کہوں گا کہ ہمارے افسانے میں یہ کرشن چندر کا پیدا کردہ ہے۔ اس عالم میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔

ندیم ۔ بین الاقوامیت اور آفاقیت دو الگ الگ چیزیں ہیں انہیں ملانا نہیں چاہئے۔

عبادت ۔ بین الاقوامیت کی بنیاد آفاقیت پر ہے۔

وقار عظیم ۔ سوچنے کا یہ انداز اس وجہ سے ہے کہ ہم چھوٹے چھوٹے مسائل کا تجزیہ کر کے ان کی حقیقت سے واقف ہوتے ہیں اور جب ان چھوٹے چھوٹے مسائل کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے پیچھے بین الاقوامی مسائل ہیں۔

عبادت ۔ چھوٹے چھوٹے مسائل کے بارے میں بھی جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں بھی آج کے افسانہ نگاروں کا تصور بدل گیا ہے۔ بیدی کے ہاں اس کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ زندگی سے گہری دلچسپی اور اس دلچسپی کا احساس پہلے اتنا شدید نہیں تھا۔ پہلے ان مسائل کو پیش کرتے ہوئے ماحول سے جھنجھلاہٹ اور بیزاری پیدا ہو جاتی تھی۔ اب اس میں اس زندگی کی دلکشی کا خیال شامل ہو گیا ہے۔

وقار عظیم ۔ یہ چیز ایک خاص شکل میں پریم چند کے ہاں بھی موجود تھی۔

ندیم ۔ اس زمانے میں مثالی تھی اب REALISTIC ہے۔

عبادت ۔ زیر بحث دور کے لکھنے والوں کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ ان لوگوں نے تکنیک اور فن کے اعتبار سے بھی اضافے کئے ہیں

اور افسانے کی روایت کو بعض نئے پہلوؤں سے آشنا کیا ہے۔ انہوں نے اظہار و بیان، سماں بندی، کردار نگاری اور نفسیاتی تجزیے کے نئے میدان تلاش کئے ہیں۔ اس لحاظ سے میں کرشن چندر کو بہت بڑا صناع سمجھتا ہوں۔ انہوں نے شعوری طور پر اردو مختصر افسانے کی تکنیک کو فن کی نئی راہوں سے آشنا کیا ہے۔ مثلاً "ان داتا" کو لے لیجئے۔ اس میں فن کا انداز ہی بدلا ہوا نظر آتا ہے اور اس سے پہلے ہم افسانے میں اس طرح کی ہیئت کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

وقار عظیم۔ لیکن کرشن چندر کے ہاں ایسے نمونے بھی ہیں، جنہیں دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ افسانے کو پیچھے لے گئے ہیں لیکن مجموعی طور پر اس کی ناکامیاں کم ہیں اور نیا لکھنے والا ان سے بچ سکتا ہے۔

عبادت۔ ہر تجربہ اپنے اندر شدت اور کسی حد تک انتہا پسندی ضرور رکھتا ہے، یہ نئے فن کے لئے بڑی کٹھن ہوتی ہیں۔ اس لئے خامیاں اور فروگزاشتیں اس دور کے فن کاروں میں بھی موجود ہیں۔ کرشن چندر اور بیدی تک ان سے اپنا دامن نہیں بچا سکے ہیں۔

ایک اور بات۔ اس زمانے میں طویل مختصر افسانے کی تکنیک کا تجربہ بھی کیا جاتا ہے۔ ندیم۔ کرشن اور اختر انصاری نے اس کی بنیاد ڈالی ہے۔ پھر دوسرے لوگ بھی میدان میں آئے جنہوں نے اسے آگے بڑھایا۔

ندیم۔ اس بحث کو سمیٹنے سے پہلے یہ دیکھ لیجئے کہ کوئی بات رہ تو نہیں گئی۔

وقار عظیم۔ ناول کی طرح کینوس کی وسعت اور وہ بھی اس طرح کہ بوجھ نہ بن جائے اس دور کے افسانوں کی خصوصیت ہے۔ یہ لوگ تفصیلات کو زیادہ بہتر طریقے سے استعمال کرتے ہیں کردار کا تصور گہرا کرتے ہیں۔ ان کے افسانے میں کینوس کے پھیلاؤ کے باوجود وحدت تاثر قائم رہتی ہے۔ حیات اللہ انصاری کا افسانہ "آخری کوشش" اس دور میں اس کی نمایاں مثال ہے۔ اس کے پیچھے ایک وسیع دنیا ہے۔ اس کی ساری ہنگامہ آرائیاں ہیں جو پڑھنے والے پر خود فراموشی کی کیفیت طاری کر دیتی ہیں۔

ندیم۔ ان لکھنے والوں کا ایک CONTRIBUTION یہ بھی ہے کہ انہوں نے FANTASY کے انداز کو نکھارا ہے مثلاً غلام عباس کا افسانہ "آنندی"۔

انتظار حسین۔ یہ بعد کی بات ہے ابھی ہم وہاں تک نہیں پہنچے۔

عبادت۔ میں سمجھتا ہوں کہ داستانوں کا اثر بتدریج کم ہوتا گیا۔

وقار عظیم۔ حقیقت نگاری کے رجحان کے پھیلنے کے بعد کمی لازمی تھی اب شاعرانہ ماحول اور فضا سے مدد ضرور لی جاتی ہے، لیکن محض تخیل اور تصور ہی پر افسانہ کی بنیاد نہیں رکھی جاتی۔

انتظار حسین۔ عبادت صاحب نے داستانوں کے اثر کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس سے مجھے اختلاف ہے۔ داستانوں میں صرف FANTASY ہی نہیں بلکہ جہاں کہیں ان میں حقیقت پسندی کا اظہار ہوا ہے وہ آج کل کے افسانوں سے بہت قریب ہے "قصہ چہار درویش" میں جہاں کھانے، لباس اور دوسری چیزوں کی تفصیل ہے وہ بالکل آج کے سے افسانوں کی ہے۔

عبادت۔ اس سے مجھے اتفاق ہے، لیکن رومانی فضا جو داستانوں نے دی ہے اس کو ان لوگوں نے اس انداز میں پیش نہیں کیا بلکہ ان کا انداز اس کی نفی کرتا ہے ــــــ پریم چند کے ہاں جو بات ہے وہ آج کے افسانوں میں نہیں ملتی۔ اب افسانہ نگار رومانی فضا بھی قائم کرتے ہیں تو اس میں نری جذباتیت نہیں ہوتی ہے۔

وقار عظیم۔ یہ رنگ تو خود پریم چند کے آخری افسانوں میں بھی نہیں ملتا۔ لیکن داستانوں کے اثر سے انکار ممکن نہیں۔ یہ اصل میں مشرقی مزاج کی ایک کیفیت ہے۔

عبادت۔ غالباً کرشن چندر پر مغربی رومانیت کا اثر زیادہ ہے۔

وقار عظیم۔ اگر غور کیجئے تو یہ انداز داستانوں میں مغرب کے رنگ سے بھی زیادہ ہے۔

عبادت۔ لیکن داستانوں میں جو رومانیت ہے اس میں تصنع کی فضا قائم رہتی ہے لیکن نئے افسانہ نگاروں کے رومانی انداز میں بڑی زندگی کا احساس ہوتا ہے اسی لئے اس میں زیادہ جان ہے۔

تب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اب تک جو روایات قائم ہوئی ہیں ان کی روشنی میں نئے لکھنے والوں نے کیا کیا تجربے کئے۔ حسن عسکری، بلونت سنگھ، ممتاز مفتی، قرۃ العین حیدر اور ممتاز شیریں وغیرہ اس دور میں آتے ہیں۔

حسن عسکری نے اردو افسانے کو بعض نئی چیزیں اس اعتبار سے دی ہیں کہ انہوں نے نفسیاتی تجزیے کے رجحان پر زیادہ زور دیا ہے۔ اس کے علاوہ افسانے کی تکنیک میں اسکیچ کا تجربہ بھی کیا ہے مثلاً "کالج سے گھر تک" وغیرہ وغیرہ۔

نفسیاتی تجزیے کے رجحان کو ان کا افسانہ "چائے کی پیالی" بڑی خوبی سے پیش کرتا ہے۔

وقار عظیم - اس طرح کا سب سے پہلا افسانہ "دو فرلانگ لمبی سڑک" کرشن چندر نے لکھا ہے۔

عبادت - یہ تو ماخوذ ہے جس کا حوالہ نہیں دیا گیا اور اس طرح انہوں نے ادبی دیانت داری کا خیال پوری طرح نہیں رکھا۔

وقار عظیم - یہ صحیح ہے کہ افسانہ نگار نے اعتراف نہ کر کے ایک اخلاقی غلطی کی ہے لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جو کچھ اس نے اُردو میں لکھا ہے اس سے افسانہ کی روایت میں ایک اضافہ ضرور ہوا۔

انتظار حسین - اس نقطۂ نظر سے یہ اعتراض تو بیدی پر بھی کیا جا سکتا ہے ان کا افسانہ "ہم کوٹ" غیر زبان سے لیا گیا ہے۔

عبادت - حوالہ دیئے بغیر ایسا کرنا ایک معیوب بات ہے۔

وقار عظیم - میں اخلاقی پہلو سے آپ سے بھی زیادہ اس کی مذمت کرتا ہوں لیکن اس سے انکار کرنا ممکن نہیں کہ اس ترجمہ سے ہماری افسانوی روایت میں ایک مفید اضافہ ہوا ہے۔

عبادت - عسکری کے افسانے "کالج سے گھر تک" میں ایک اپج ہے۔ اس میں سماجی شعور بھی ملتا ہے۔ یہاں وہ اپنی یا فرد کی ذات میں گم ہونے کی کوشش نہیں کرتے دوسری چیز ان کے افسانوں میں یہ ہے کہ وہ سماں یا فضا پیدا کرتے ہیں اور اس سلسلے میں نفسیاتی تجزیہ کرتے ہیں۔ "چائے کی پیالی" بڑا خوبصورت افسانہ ہے۔ یہ رجحان ان کے یہاں دور استقلال سے آیا ہے۔ جوائس اور پروست کا ان پر اثر ہے۔ انھوں نے ان دونوں کا مطالعہ کیا ہے اور ان کے انداز کو برتنے کی کوشش کی ہے۔

تیسری چیز عسکری کے ہاں وہ ہے "پھسلن" میں ہے۔ یہ عصمت کے "لحاف" کی ایک دوسری شکل ہے' اس سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ خواہ مخواہ لکھا گیا ہے۔

وقار عظیم - تجزیے کے سلسلے میں جو چیز عسکری کی خصوصیت ہے اس کا اندازہ ان کے مجموعے "جزیرے" کے عنوان سے ہوتا ہے اس میں ایک الگ دنیا آباد کرنے کا رجحان ملتا ہے۔ ہر شخص اپنی ذات کو فکر کا محور و مرکز سمجھتا ہے۔ یہ رجحان اس روش کا ترجمان ہے کہ جب افسانہ نگار کو اجتماعی زندگی میں موضوع نہیں ملتے تو وہ فرد کو افسانہ کا موضوع بناتا ہے اور اس کی ذہنی کیفیت کی مصوری کرتا ہے — اس رجحان کی بدولت "شعور کی رو" کی تکنیک ہمارے افسانہ میں داخل ہوئی۔

ندیم - جب "چائے کی پیالی" اور "حرام جادی" چھپے تو بعض حلقوں کی طرف سے یہ کہا گیا تھا کہ یہ مغربی افسانوں سے ماخوذ ہیں۔

انتظار حسین - یہ بات تو عسکری صاحب نے "جزیرے" کے دیباچہ میں لکھی ہے کہ انہوں نے کون کون سا افسانہ کس کس افسانہ سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔

عبادت - اس کے باوجود عسکری کے فن میں بڑی انفرادیت ہے انہوں نے زیادہ سے زیادہ دس بارہ افسانے لکھے ہیں لیکن اپنا مقام پیدا کر لیا ہے۔ ان کی بڑائی تو اس میں ہے کہ انہوں نے مغربی اثرات کے باوجود اپنے فن میں ایک اُپج پیدا کی ہے۔ ان کے ہر افسانے میں ایک اچھوتا پن نظر آتا ہے۔

وقار عظیم - حسن عسکری نے جس خاص ماحول کو اپنے افسانوں کا پس منظر بنایا ہے وہ بھی ان کے لیے مخصوص ہے۔

عبادت - اور وہ اس تمام زندگی میں گھلے ملے معلوم ہوتے ہیں۔ اس زندگی کا کتنا گہرا احساس ان کے فن میں نظر آتا ہے۔

انتظار حسین - وہ بلند شہر کے علاقے کی زندگی کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔

وقار عظیم - فن کے نقطۂ نظر سے یہ بات بڑی اہم ہے کہ افسانہ نگار جس ماحول سے پوری طرح واقف ہو اسی کی عکاسی کرے۔

انتظار حسین - حقیقت میں حسن عسکری اور اس طرح کے دوسرے لوگ افسانہ نگار نہیں تھے، مختصر افسانے کی مجمل تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ کوئی ایسا واقعہ یا تاثر دیا جائے جو فرد کی زندگی پر پوری طرح سے اثر انداز ہو۔ لیکن حسن عسکری کے افسانوں میں مسلسل واقعات ملتے ہیں وہ DETERMING FACTOR ہوتے ہیں۔ ان کا انداز طویل مختصر افسانوں کا سا ہے۔

عبادت - عسکری صاحب نے طویل مختصر افسانے لکھنے کا بہت اچھا تجربہ کیا ہے لیکن یہ کہنا کہ انہوں نے مختصر افسانے نہیں لکھے ٹھیک نہیں ہے۔ انہوں نے بعض بڑے اچھے مختصر افسانے بھی لکھے ہیں۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ ان کے جوہر طویل مختصر افسانے ہی میں کھلتے ہیں۔ شاید یہ مزاج اور ذہنیت کی ہم آہنگی کے شعور کا نتیجہ ہے۔

انتظار حسین - میرا کہنا یہ ہے کہ مختصر افسانے کی تکنیک اس کی متحمل نہیں ہو سکتی کہ آپ تفصیل تلاش کریں۔

عبادت - آپ "چائے کی پیالی" کو لیجئے۔ اس میں وہ تمام واقعات کو بڑی خوبی سے یکجا کرتے ہیں۔ اس میں ایک شخص کی ذہنی کیفیت کی ساری تفصیل موجود ہے لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس افسانے میں ایک مکمل وحدت نظر آتی ہے اور یہ مختصر افسانے کی تکنیک ہے۔

انتظار حسین - مختصر افسانے کے تصور میں صرف وحدت شامل نہیں ان کے افسانوں میں بہت سے واقعات کو ملا کر ایک شکل مرتب ہوتی ہے جو فرد کی شکل کو بدل دیتی ہے۔

وقار عظیم - مختصر افسانہ کی جو تعریف آپ نے کی وہ بہت محدود ہے۔ افسانہ کے فن میں جو بے شمار نئے نئے تجربے ہوتے ہیں انہوں نے افسانہ کی ہیئت ہی بدل دی ہے اور اب جس چیز میں آپ کو اجنبیت محسوس ہوتی ہے وہ حقیقت میں فن کی روایت بن چکی ہے افسانہ کے نئے فن میں بڑی تبدیلی یہ ہوتی ہے کہ ہمارا مرکزی تصور اب واقعات کے بجائے کرداروں کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔

عبادت - ساری دنیا میں مختصر افسانہ میں تجربے کا تسلسل نظر آتا ہے تکنیک کا جتنا تنوع اس صنفِ ادب میں ملتا ہے شاید ہی کسی اور صنف میں ملے۔ اردو میں عسکری نے اس تسلسل کو باقی رکھا ہے اور اسی وجہ سے وہ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے وہ ایک امتیازی حیثیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے ہمارے مختصر افسانے کی تکنیک میں بڑی تبدیلی پیدا کی ہے۔ البتہ ایک بات ہے وہ یہ کہ عسکری صاحب ان نفسیاتی تجزیوں کے ساتھ سماجی شعور کا اظہار بھی کرتے تو افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا اس کمی نے ان کے یہاں ایک گھٹن سی پیدا کر دی ہے۔

وقار عظیم - لیکن جس چیز کو ہمارا جی چاہتا ہے اس کا مطالبہ ہر افسانہ نگار سے کرنا زیادتی ہے۔

عبادت - لیکن صرف زندگی کی عکاسی ہی میں تو عظمت نہیں ہے عظمت تو زندگی کے مسائل کی گہرائی تک پہنچنے میں ہے۔ ہم ذاتی یا انفرادی طور پر اس کا تقاضا نہیں کرتے۔ خود زندگی اس کی متقاضی ہے۔

وقار عظیم - مگر جب کوئی فن کار صرف عکاسی کو اپنا مطمحِ نظر بناتا ہے تو آپ اس کا مسلک کیسے بدل سکتے ہیں۔ لیکن اس کمی کے باوجود عسکری نے فن کی حیثیت سے افسانہ کو آگے بڑھانے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔

ندیم - عسکری صاحب کے افسانے ایک فرد کے تاثرات کی عکاسی کرتے ہیں لیکن انہوں نے ایک فرد کے اتنے بہت سے تاثرات یکجا کر دئیے ہیں کہ مختصر افسانہ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

عبادت - مجھے اس سے اختلاف ہے، میرا خیال تو یہ ہے کہ جزئیات سے اثر زیادہ گہرا ہوتا ہے اور بات زیادہ دلکشی سے ذہن نشیں ہوتی ہے عسکری صاحب نے یہی تکنیک استعمال کی ہے اور اس میں وہ پوری طرح کامیاب ہیں۔

وقار عظیم - ایک بات البتہ ہے کہ اس طرح کہانی پن باقی نہیں رہتا۔

عبادت - ان کا نقطۂ نظر صرف فضا کو پیش کرنا ہے۔ مختصر افسانے کی تکنیک میں جو لچک ہے وہ اس کی اجازت دیتی ہے۔

وقار عظیم - یہ صحیح ہے لیکن اس کے باوجود فن کے ارتقار کا جب ذکر آئے گا تو عسکری کا نام نمایاں طور پر لیا جائے گا۔

عبادت - عسکری صاحب کا نقطۂ نظر انفرادی ہے۔ ممتاز مفتی کا نقطۂ نظر بھی انفرادی ہے لیکن وہ لاشعور اور تحلیلِ نفسی کی گہرائیوں میں چلے جاتے ہیں۔ "آپا" اور "بڑھیا" ان کے بڑے اچھے افسانے ہیں جو مختصر افسانے کی تکنیک کو بڑی اچھی طرح سے پیش کرتے ہیں لیکن عسکری صاحب کی طرح وہ بھی ایک بیمار سی فضا پیدا کرتے ہیں۔

وقار عظیم - انہوں نے جنس کو محض لذت کی خاطر نہیں بلکہ علمی نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔

عبادت - مجھے اس میں شبہ ہے۔ ان کے سارے کردار بیمار معلوم ہوتے ہیں۔ یہ سب لاشعور کی بھول بھلیوں میں کھوئے ہوئے ہیں اور خارجی اثرات کا احساس نہیں رکھتے۔ سماجی محرکات کا ان کے یہاں کوئی شعور نہیں اس لئے جو شخص ان کے قریب رہتا ہے وہ بھی بیمار ہو جاتا ہے۔ لاشعور کی دنیا میں رہنے والا انسان آخر کب تک ذہنی اور جذباتی طور پر صحت مند رہ سکتا ہے۔

ندیم - لیکن یہ ان کا اپنا زاویۂ نظر ہو سکتا ہے۔ وہ خارجی حقیقت کے تو قائل ہی نہیں۔

عبادت - لیکن افسانے کے جائزے میں ہم ماحول کے اثرات کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مفتی نے اپنے آپ کو بہت محدود کر رکھا ہے ان کے افسانوں میں بڑی گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔ وہ قاری کو ایک ایسی جگہ پھنسا دیتے ہیں جہاں دنیا کی تہہ گیری اور دلکشی کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں اور اعصاب مفلوج معلوم ہوتے ہیں۔

ندیم ۔ اس نقطۂ نظر میں بے لبسی تو قدرتی ہے ۔ وہ خارجی حُسن کا احساس نہیں رکھتے اور میرے خیال میں وہ محض اس لئے اپنے لاشعور کی عکاسی کرتے ہیں کہ خود خارجی دنیا میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے اور اب تو ان کے افسانوں میں تکرار یا تھکن کا احساس بھی ہونے لگا ہے ۔

عبادت ۔ وہ فرائڈ کو اپنا امام مانتے ہیں اسی لئے ان کے افسانوں میں یکسانیت اور تھکن پیدا ہو گئی ہے ۔۔۔ فرائڈ کے سہارے افسانہ آخر کب تک چل سکتا ہے ؟

ندیم ۔ لاشعور کی تمام گہرائیوں اور بھول بھلیوں کا جائزہ لیتے ہوئے فن کار کو زبان پر پورا عبور ہونا چاہیے ۔ یہ قدرت مفتی میں نہیں ہے ۔

عبادت ۔ فرائڈ کے لکچر پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا ادبی مطالعہ بہت وسیع ہے لیکن ممتاز مفتی کے ہاں یہ بات بھی نہیں ۔ انہوں نے فرائڈ کو ضرور پڑھا ہے لیکن اس کے بعد اس سلسلے میں جو کام ہوا ہے اسے نہیں دیکھا ۔۔۔ شاید اسی وجہ سے وہ ان موضوعات پر بھی مفصل نہیں لکھ سکتے ۔

ندیم ۔ اب تو وہ خارجی حقیقتوں کے بھی سرے سے قائل نہیں ۔

عبادت ۔ ان کے علاوہ اس دور کے دو اور افسانہ نگار اہم ہیں ۔ بلونت سنگھ اور غلام عباس ۔

بلونت سنگھ نے ہمیں بہت سی نئی چیزیں دی ہیں ۔ بظاہر وہ دیہات کے ترجمان ہیں لیکن وہ اس ترجمانی سے آگے بڑھ کر دیہاتی زندگی میں جو حُسن اور توانائی ہے اس کو بھی محسوس کرتے ہیں ۔ مولانا صلاح الدین نے انہیں "پنجاب نگار" کہا ہے میں انہیں "حیات نگار" کہتا ہوں ۔ وہ پنجاب پر اس لئے نہیں لکھتے کہ پنجابی ہیں بلکہ اس لئے کہ انہیں پنجاب میں زندگی نظر آتی ہے ۔ اسی زندگی میں جو حُسن اور توانائی ہے اس نے بلونت سنگھ کو متاثر کیا ہے وہ اس زندگی میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ انہیں اس زندگی سے ایک والہانہ دلچسپی ہے ۔۔۔ جو افسانے انہوں نے فسادات پر لکھے ہیں ان میں بھی اسی زندگی کا احساس ہے ۔ مثلاً "کالے کوس" میں یہ بات نظر آتی ہے ۔ یہ ایک بڑی معرکۃ الآرا کہانی ہے تقسیم [illegible] ہیجان انگیز چیزیں لکھی گئیں بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہو کہ ہیجان انگیز [illegible] لکھی گئی ہیں ۔ بلونت سنگھ نے یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ [illegible] کے وقت لوگ کس طرح محسوس کر رہے تھے ۔ کس طرح زندگی بسر کر رہے تھے ۔ ہجرت کے بارے میں ان کا کیا خیال تھا ۔

"کالے کوس" میں ایک ماں اور اس کا بیٹا مشرقی پنجاب سے ہجرت کی غرض سے پاکستان کی طرف چل دیتے ہیں اور چلتے چلتے جب منزل پر پہنچتے ہیں تو ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ کیا ہم پہنچ گئے ۔ یہاں بھی زندگی ویسی ہے جیسی کہ وہاں تھی ۔ وہی سبزہ ہے وہی محبت ہے ، ہر چیز ویسی ہی ہے ۔۔۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ بلونت سنگھ ہر موضوع پر لکھتے ہوئے انسانی زندگی کی دلکشی اور دلآویزی کو اپنے پیشِ نظر رکھتے ہیں ۔ وہ اسی کے افسانہ نگار ہیں ۔

انتظار حسین ۔ ان کے وہ افسانے جو پنجاب کے فسادات کے بارے میں لکھے گئے ہیں مختصر افسانے کی حدود سے باہر نکل جاتے ہیں ۔ ان کے افسانوں میں ایک ایسا ربط ہے جو یکسانی کی حد تک پہنچ جاتا ہے ، یہ تکنیک ناول کی ہے ۔

عبادت ۔ جس چیز کی طرف انتظار صاحب نے اشارہ کیا ہے وہ بلونت سنگھ کی خامی نہیں ہے ۔ بلکہ یہ تو ان کی خوبی ہے ۔ ان کے ایسے افسانے فنی اعتبار سے مربوط ہیں ۔۔۔ ان میں وحدت ہے ، تسلسل ہے ۔۔۔ اور یہ وحدت اور تسلسل درحقیقت زندگی کے شدید احساس کا نتیجہ ہے ۔ ناول کی تکنیک اس میں نہیں ہے ۔۔۔ ان افسانوں میں تفصیل ضرور ہے لیکن اس کے باوجود وہ COMPACT ہیں اور یہی ان کی خوبی ہے ۔

وقار عظیم ۔ یہ بات ہر اس افسانہ نگار میں ہوتی ہے جو زندگی کو جامد نہیں سمجھتا اور اس کے تسلسل کا قائل ہوتا ہے ۔

انتظار حسین ۔ ایسے لوگوں کے افسانے ناول اور طویل مختصر افسانے کے تحت آتے ہیں ۔ یہ ان کی کاہلی ہے کہ مختصر افسانہ لکھتے ہیں ۔

ندیم ۔ میرے خیال میں یہ بحث تکنیک کی ہے ۔

عبادت ۔ مختصر افسانے کی تکنیک کو اتنا محدود نہیں کیا جا سکتا کہ جس افسانے میں تفصیل ہو اس کو افسانہ ہی نہ کہا جائے ۔ یہ تفصیل اور پھیلاؤ اگر وحدت کے روپ میں سامنے آئے تو اس کو مختصر افسانہ کیوں نہ کہا جائے ۔۔۔ پھر افسانے کی تکنیک اس وقت تجربے کے دور سے گزر رہی ہے ۔ طویل مختصر افسانہ ، مختصر افسانے کی تکنیک میں ایک اہم تجربہ ہے ۔ بلونت سنگھ نے بھی ایسا ہی ایک تجربہ کیا ہے ۔

وقار عظیم ۔ اس دور میں سوائے منٹو کے تمام اچھے لکھنے والوں کے ہاں افسانے کا آخری حصہ تفکر کی طرف مائل کرتا ہے ۔ اس سے قبل یہ عیب ہو سکتا تھا ۔ لیکن ۔۔۔ یہ عیب نہیں رہا ۔

انتظار حسین ۔ بلونت سنگھ کا وہ [illegible]

زندگی میں سکھوں کے طبقے کی ترجمانی کی، ندیم صاحب نے پنجاب کے دیہات کی ترجمانی کی ہی لیکن سکھوں کو پیشِ نظر نہیں رکھا تھا۔

عبادت ۔ بلونت سنگھ ہی کی طرح اس دور میں ایک اور چابکدست فنکار غلام عباس نظر آتے ہیں۔ غلام عباس بڑے ہوشیار افسانہ نگار ہیں وہ افسانہ نگاری کے فن اور اس کی تکنیک کا بڑا گہرا شعور رکھتے ہیں ——— فن کی لطافتوں اور نزاکتوں کا احساس ایک لمحے کو بھی ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ ان کے موضوعات مختلف ہیں لیکن ان موضوعات میں جو چیز سب سے زیادہ متوجہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ موضوع کی تہ تک پہنچتے ہیں، اس کی تمام باریکیاں تلاش کرتے ہیں اور ان تمام پہلوؤں پر ان کی نظر بڑی گہری پڑتی ہے ——— انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی جس لطیف انداز میں انہوں نے کی ہے، اردو افسانے میں اس کی صرف چند مثالیں مل سکتی ہیں ——— البتہ وہ ان تمام باتوں کو تفصیل اور وضاحت سے بیان نہیں کرتے۔ ان کے انداز میں رمزیت ہے ——— اور یہ رمزیت ان کے افسانوں میں بڑی گہرائی اور گیرائی پیدا کر دیتی ہے ——— مختصر افسانے کی یہی خصوصیت ہے۔ غلام عباس نے اپنے فن میں اس کو بڑی خوبی سے برتا ہے۔

وقار عظیم ۔ غلام عباس نے فن سے بڑی وفاداری برتی ہے۔ ان کے فن میں مستعدی نظر آتی ہے۔ اکثر افسانہ نگار سہل انگاری دکھاتے ہیں اور یہ بات افسانہ نگاری کے فن کو بڑا نقصان پہنچاتی ہے غلام عباس سہل انگار نہیں ہیں۔ وہ دس سطروں کے افسانوں میں ناول کی سی جگہ گادی کرتے ہیں۔ ایک ایک لفظ پر غور کرنا، چول پر چول بٹھانا اور سوچنا، فن کے لوازم ہیں اور یہ لوازم غلام عباس کے پاس موجود ہیں۔

انتظار حسین ۔ راجندر سنگھ بیدی نے افسانے کو جہاں چھوڑا تھا۔ غلام عباس افسانے کو اس سے آگے لے گئے ہیں۔ ان کا اسٹائل بڑا منجھا ہوا ہے۔ لفظوں کی دروبست اور فقروں کی چستی جو مختصر افسانے کے لئے ضروری ہے وہ غلام عباس کے پاس موجود ہے۔ وہ افسانے کا TEMPO متوازن رکھتے ہیں۔ نقارہ نہیں بجاتے۔

عبادت ۔ ان کے فن کی یہ آہستہ روی اور متوازن کیفیت درحقیقت ان کی شخصیت کا پرتو ہے۔ وہ بڑے دھیمے آدمی ہیں۔ ان کی شخصیت میں بڑا ٹھہراؤ ہے اور یہی چیز ان کے فن پر اثر انداز ہوتی ہے۔

ندیم ۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ خاصے معمر ہیں اور انہوں نے بہت بعد میں افسانے لکھنے شروع کئے ہیں۔

وقار عظیم ۔ شروع میں انہوں نے بچوں کے لئے بھی کہانیاں لکھی ہیں جن کے لئے بڑی احتیاط اور سنبھلی ہوئی کیفیت کی ضرورت ہوتی ہے اس چیز نے بھی ان کے فن کو متاثر کیا ہے۔

محمد طفیل ۔ یہاں قرۃ العین اور شفیق الرحمٰن کا ذکر ہونا چاہیے۔

عبادت ۔ شفیق الرحمٰن اور قرۃ العین حیدر نے اونچے طبقے کی زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ شفیق الرحمٰن کے یہاں کوئی سنجیدہ فضا نہیں ہے۔ وہ زندگی کے ہلکے پھلکے پہلوؤں کو دیکھتے ہیں۔ ان کا فن ایک خوش وقتی کے احساس کی پیداوار ہے۔ زندگی ان کے نزدیک ایک سنہرا خواب ہے۔ جس میں قہقہے ہیں، شوخیاں ہیں، اٹھکیلیاں ہیں، چہلیں ہیں ——— ظاہر ہے زندگی کے ان پہلوؤں میں گہرائی اور گیرائی نہیں ہے لیکن یہ زندگی کے کچھ پہلو ہیں ضرور۔ یہی وجہ ہے کہ شفیق الرحمٰن کو لوگ دل خوش کرنے کے لئے پڑھتے ہیں ——— ان کا تاثر گہرا نہیں ہوتا ——— لیکن قرۃ العین اس زندگی کو نسبتاً زیادہ قریب سے دیکھتی ہیں ——— ان کے یہاں زندگی صرف ایک سنہرا خواب ہی نہیں ہے ——— وہ مسرتوں کے ساتھ اونچے طبقے کی تلخیوں کو بھی شدت کے ساتھ محسوس کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں قہقہوں کے ساتھ آنسو بھی ملے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مسرتوں کے ساتھ غموں کا احساس بھی ہوتا ہے۔ مسوری اور نینی تال کی فضاؤں میں زندگی کی تلخیاں محسوس ہوتی ہیں اور وہ ان سب کی بڑی فن کارانہ تصویر پیش کرتی ہیں۔ اس اعتبار سے وہ شفیق الرحمٰن کے مقابلے میں ایک بڑی فن کار ہیں۔

انتظار حسین ۔ شفیق الرحمٰن گُڑ نہیں دیتے، گُڑ کی سی بات کر دیتے ہیں ——— قرۃ العین تھوڑا سا گُڑ بھی دے دیتی ہیں۔

وقار عظیم ۔ دونوں نے زندگی کے ایک ہی طبقے کی عکاسی کی ہے لیکن شفیق الرحمٰن کے مقابلے میں قرۃ العین کے یہاں اس طبقے کی زندگی کا شعور زیادہ ہے۔

عبادت ۔ قرۃ العین کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ اونچے طبقے کی ساری تفصیل پیش کرتی ہیں اور اگرچہ ان کی قائم کی ہوئی فضا تمام تر رومانی ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود یہ افسانے ہمیں متاثر کرتے ہیں۔ رومانی فضا میں اس زندگی کا کھوکھلا پن کچھ زیادہ ہی واضح

ہوتا ہے ——— اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں آپس میں ایک ہم آہنگی رکھتے ہیں۔

وقار عظیم ۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اس طبقے کی زندگی کے گھناؤنے پن پر پردہ نہیں ڈالتیں، بلکہ اس کو اجاگر کرتی ہیں۔

ندیم ۔ انہوں نے زندگی کی خوبیاں اور خامیاں بغیر کسی تعصب کے پیش کر دی ہیں۔ البتہ ان کے پاس سماجی رشتوں کا شعور نہیں ہے لیکن جہاں ان کے افسانوں میں دوسرے طبقوں کا ذکر آیا ہے وہاں ان کے ساتھ ایک ہمدردی کا احساس ضرور ہوتا ہے۔

عبادت ۔ قرۃ العین کے فن میں سب سے زیادہ جو چیز اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ ان کی تخیل ہے ——— وہ اس تخیل کے سہارے بہت اونچا اڑتی ہیں ——— یہ پرواز تمام رومانی ہوتی ہے۔ ان کے ساتھ اڑنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ لیکن اس اڑان میں کبھی کبھی ایسی منزلیں بھی آتی ہیں جہاں ان کے ساتھ اڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں ان کا پڑھنے والا ایک لمحے میں زمین پر آجاتا ہے ——— اسی جگہ جہاں سے اس نے اڑنا شروع کیا تھا۔

وقار عظیم ۔ جس طرح عصمت نے بعض افسانہ نگار خواتین کو متاثر کیا ہے اسی طرح قرۃ العین حجاب امتیاز علی سے ایک حد تک متاثر ہوتی ہیں ——— البتہ حجاب کی طرح ان کے یہاں زندگی سے بے تعلقی باقی نہیں رہتی۔

عبادت ۔ لیکن اس کے باوجود ان کی رومانی پرواز انہیں زندگی سے کسی حد تک دور ضرور لے جاتی ہے۔ بعض اوقات تو ان کی یہ رومانی پرواز اس حد کو پہنچ جاتی ہے کہ ہم ان کا ساتھ نہیں دے سکتے اور وہ کہیں مبہم معلوم ہونے لگتی ہیں ——— یہ ابہام ان کی تکنیک میں بہت واضح ہے ——— درحقیقت اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی تخیل کو پوری طرح اپنے قابو میں رکھنے پر قادر نہیں ہیں۔ تخیل کی یہ گرفت جس جگہ بھی ان کے یہاں ڈھیلی ہو جاتی ہے۔ ان کا فن ایسی اَن جان گھاٹیوں میں بہہ نکلتا ہے جہاں ہم اجنبی ہو جاتے ہیں۔

وقار عظیم ۔ ان کی فطرت میں مشرقیت اور مغربیت کا اتنا میل ہے کہ ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے والدین سے مشرقی روایت کا احترام اور مغربیت کا اثر بھی لیا اور یہ تصادم ان کی تحریر میں بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ وہ کبھی اُردو میں سوچتی ہیں اور کبھی انگریزی میں اور اس طرح ابہام پیدا ہو جاتا ہے۔

ندیم ۔ قرۃ العین نے منظر نگاری کے سلسلے میں کرشن چندر کی طرح بڑے گہرے مشاہدے کا ثبوت دیا ہے۔

عبادت ۔ قرۃ العین کے یہاں مناظر کا بڑا شدید احساس ہے۔ اس کا بیان وہ دل نشیں انداز میں کرتی ہیں لیکن کرشن چندر کا احساس ان سے کہیں زیادہ شدید اور اس کا مشاہدہ کہیں زیادہ تیز ہے اس کا انداز بھی پختہ ہے۔ اس لئے وہ بڑا فن کار ہے۔

انتظار حسین ۔ بہرحال قرۃ العین نے اُردو افسانے میں کچھ نہ کچھ اضافے ضرور کئے ہیں۔

عبادت ۔ ایک اور بات جو اس دور کے لکھنے والوں میں نئی ہے وہ یہ کہ اس زمانے میں گھریلو ماحول کی عکاسی کا شعور بھی خصوصاً بعض خواتین افسانہ نگاروں میں پیدا ہوا ہے۔ گھریلو ماحول میں جو دلکشی ہوتی ہے اس کو ہماری افسانہ نگار خواتین نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ اس زمانے میں ممتاز شیریں نے اس کی اہمیت کو محسوس کیا۔ اس سے قبل افسانہ نگار خواتین کے موضوعات ایک FRUSTRATION سے تعلق رکھتے تھے یہ افسانہ نگار خواتین نارمل نہیں تھیں۔ انہیں گھریلو ماحول کی دلکشی نصیب ہی نہیں ہوتی تھی۔ پھر وہ اس کو موضوع کس طرح بناتیں۔ ان کا موضوع تو چند ناآسودہ خواہشات کے سوا اور کچھ نہیں تھا ——— ممتاز شیریں نے ان کے برخلاف گھریلو ماحول کی ترجمانی بڑی کامیابی سے کی۔ ان کے مجموعے "اپنی نگریا" میں اس موضوع پر اچھے افسانے ملتے ہیں۔

وقار عظیم ۔ ممتاز شیریں نے جنوبی ہند کی زبانوں کے افسانوں سے ... کیا ہے۔ ان زبانوں کے افسانوں میں فن اور زندگی کا جو امتزاج ہے اس سے بعض اچھی باتیں لی ہیں۔ انہوں نے ان زبانوں سے بعض افسانوں کے ترجمے بھی کئے ہیں۔

عبادت ۔ ممتاز شیریں کے افسانوں سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ان کے پاس مختصر افسانے کی تکنیک کا بڑا گہرا شعور ہے افسانے میں تکنیک کا جو تنوع ہے اس کو انہوں نے بڑی خوبی سے برتا ہے لیکن تنوع کا یہ شعور ان کے یہاں تکنیک کے ایک SYNTHESIS کی صورت میں نمایاں ہے۔ ان کی شخصیت میں یہ شعور رچا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

انتظار حسین ۔ خواتین افسانہ نگاروں نے جو روایت قائم کی تھی،

اس کو کسی حد تک ممتاز شیریں نے اپنایا ہے اور کسی حد تک توڑا ہے۔

عبادت ۔ میرے خیال میں ممتاز شیریں نے ہماری دوسری خواتین افسانہ نگاروں کے مقابلے میں زندگی کے صحت مندانہ پہلوؤں کی ترجمانی کی۔ دوسری افسانہ نگار خواتین نے ان صحت مندانہ پہلوؤں کو نظر انداز کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان پہلوؤں سے انہیں تعلق ہی نہیں تھا۔ وہ تو ایک گھٹن کی پیداوار تھیں۔ ممتاز شیریں کے حالات مختلف تھے اس لئے وہ اس ڈگر پہ نہ چل سکیں جو ان سے قبل کی افسانہ نگار خواتین نے بنائی تھی۔ بہرحال ممتاز شیریں کے ہاں دوسری خواتین افسانہ نگاروں سے ایک انحراف ملتا ہے۔

انتظار حسین ۔ اس میں صحت مند اور غیر صحت مند ہونے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ عصمت وغیرہ زندگی کو ایک اور زاویے سے دیکھتی ہیں اور ممتاز شیریں کا زاویۂ نظر مختلف ہے۔

عبادت ۔ درحقیقت بات یہ ہے کہ عصمت کے ابتدائی دور کے افسانوں میں وہ آسودگی کا احساس نہیں جو ممتاز شیریں کے یہاں ملتا ہے —— عصمت وغیرہ کے یہاں ایک تشنج کی سی کیفیت نظر آتی ہے۔ میں ان کے فن کی حقیقت و واقعیت سے انکار نہیں کرتا۔ نہ ان کے فن کو کم مرتبہ سمجھتا ہوں۔ البتہ یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس میں ایک نارمل کیفیت کم ہے۔

انتظار حسین ۔ تعجب ہے عبادت صاحب کو یہ احساس کیسے ہوا؟ ہاجرہ اور خدیجہ کے افسانوں میں بھی تو زندگی ہنستی کھیلتی نظر آتی ہے۔ ہاجرہ، خدیجہ اور عصمت نے ہندوستان کی عورتوں کی اکثریت کی ترجمانی کی ہے اور شیریں نے آسودہ طبقے کی۔

عبادت ۔ یہ شاید صحیح نہیں، ممتاز شیریں نے ایک خاصے بڑے طبقے کی نمائندگی کی ہے۔ پھر انھوں نے متوسط طبقے کی گھریلو زندگی پیش کی ہے جس کو خواتین افسانہ نگار نے اس سے قبل اہمیت نہیں دی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری خواتین افسانہ نگار کو اس سے قبل گھریلو زندگی کا صحیح احساس ہی نہیں تھا۔ ممتاز شیریں نے اس کی ابتدا کی۔

وقار عظیم ۔ اصل میں دونوں کے ماحول کا فرق ہے۔ ہاجرہ اور عصمت وغیرہ نے یو۔ پی کی مسلمان عورت کو دیکھا ہے جہاں تعلیم کا چرچا ابھی ہوا ہے اور وہاں ماحول سے بغاوت زیادہ نمایاں ہے۔ شیریں کے افسانوں کی عورت ان منزلوں سے گذر چکی ہے۔ اس نے اپنے ماحول سے پوری طرح مطابقت پیدا کر لی ہے۔ اس نے آزاد ہو کر بھی گھر کو جنت بنانا سیکھا ہے

عبادت ۔ آزاد ہونے کے باوجود گھریلو زندگی کا احساس تو بڑا مستحسن ہے

اس میں ایک صحت مندانہ کیفیت ہے۔ ہماری افسانہ نگار خواتین نے اس کو اہمیت نہیں دی۔

وقار عظیم ۔ یقیناً حقیقت نگاری دونوں طرح کی لکھنے والیوں کے یہاں ہے۔ عصمت، شیریں کے ماحول میں ہوتیں تو غالباً اس سے زیادہ اچھے افسانے لکھتیں اور شیریں لکھنؤ میں ہوتیں تو شاید اس سے کہیں تلخ لکھتیں۔

انتظار حسین ۔ غالباً اب تقسیم کی لائن آگئی ہے۔

عبادت ۔ تقسیم کے بعد افسانے میں ایک طرح کا انحطاط پیدا ہوتا ہے میرا خیال ہے کہ اس وقت تک لکھنے والوں میں سے بیشتر اپنا کام کر چکے تھے، تقسیم کے بعد ان کے موضوعات ختم ہو گئے —— بات یہ ہے کہ جن راہوں پر یہ چل رہے تھے وہ سب تاریکی میں گم ہو گئیں۔ انہوں نے جو کچھ چاہا تھا وہ نہ ہو سکا۔ جس چیز کی تمنا تھی وہ نہ ملی۔ اس لئے ایک احساس شکست FRUSTRATION عام ہوا۔ ان پر ایک مایوسی طاری ہو گئی۔ مایوسی کبھی کبھی انتہا پسند بھی بنا دیتی ہے۔ مثال کے طور پر کرشن چندر جو بہت بڑا فنکار ہے اسے تقسیم نے بڑا نقصان پہنچایا۔ اسے اپنے مقام کا احساس تک نہیں رہا۔ مثلاً اس نے اپنے اوپر مقصدیت اور افادیت کو اتنا طاری کر لیا ہے اور ایک تحریک کے ساتھ ایسی جذباتی وابستگی کا اظہار کیا ہے کہ کہیں کہیں اس کا فن لڑکھڑا جاتا ہے۔

ندیم ۔ یہ کیفیت تو تقسیم کے بعد دونوں قسم کے افسانہ نگاروں کے ہاں موجود ہے۔ ترقی پسند اور غیر ترقی پسند۔ ترقی پسند اگر زوال پر آتے ہیں تو داخلیت پسند بھی اچھا ادب نہیں پیش کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ترقی پسند کچھ اور توقعات رکھتے تھے لیکن FRUSTRATION ہونے کی وجہ سے وہ فن کو سنبھال نہ سکے۔ دوسرے افسانہ نگاروں نے ان حالات سے فرار کا اشارہ لیا اور موجودہ حالات کا ذکر نہ کرنے میں ہی بھلائی سمجھنے لگے۔ اکثر اوقات انہوں نے انسانیت کا مذاق اڑایا۔ اس طرح دونوں افراط و تفریط کا شکار ہوئے۔

انتظار حسین ۔ یہ گروہ ایک خاص سیاسی ماحول میں پیدا ہوا تھا جب تقسیم ہوتی ہے تو ایک بریک سا آجاتا ہے، نیا دور آتا ہے تو وہ یہ نہیں سمجھ پاتے کہ اب کیا ہو اور چیزوں کو کس انداز سے لکھا جائے؟

عبادت ۔ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ ہمارے افسانہ نگاروں نے جو نقطۂ نظر قائم کیا تھا بڑا باشعور تھا۔ وہ انگریز کے خلاف صرف جذباتی ردِ عمل نہیں تھا بلکہ اس میں طبقاتی آویزش اور سماجی شعور کا صحیح احساس

بھی تھا اور یہ شعور تقسیم کے بعد بھی قائم رہا ہے۔ انگریز چلا گیا تو ہمارے افسانہ نگاروں نے سمجھا کہ ہمارا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا ہے۔ یہ احساس زیادہ بڑھا، یہاں تک کہ لوگ اسے پیش کرنے میں انتہا پسند ہو گئے اور اس طرح فن کا خون ہوا۔

ندیم – ڈاکٹر تاثیر نے بھی یہی بات کہی تھی جو انتظار صاحب نے ابھی بیان کی ہے کہ ترقی پسند تحریک کا ایک خاص نقطۂ نظر تھا جو تقسیم کے ساتھ ختم ہو گیا۔ یہ تحریک BRITISH IMPERIALISM کی تاخت کے خلاف ایک ہتھیار کی حیثیت رکھتی تھی۔ انگریز چلا گیا، اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ تحریک بہتر زندگی کی قائل تھی اس لئے نقطۂ نظر اب بھی اپنی جگہ پر قائم ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ توقعات کے مطابق نتیجہ نہیں نکلا اور لیڈروں نے اسے جس طریقے سے نظر انداز کیا ہے اس سے لکھنے والے کچھ مبہوت سے ہو گئے ہیں۔

انتظار حسین – تقسیم کا اثر ہمارے ذہنوں پر بہت گہرا پڑا ہے۔ سماجی فضا اور سیاسی ماحول یکلخت بدل گیا۔ انگریزوں کا اثر ضرور رہا لیکن انگریز حاکم سامنے سے ہٹ گئے۔ ادھر ہمیں یہ احساس دلایا گیا کہ اب قومی حکومت ہے۔ اس طرح ہم اپنے طریق کار متعین نہیں کر پائے۔ پہلے ہندو، سکھ اور مسلمان اکٹھے رہتے۔ سماجی تانا بانا تھا، استحکام تھا زندگی میں تسلسل تھا۔ اب یہ لوگ بٹ گئے اور ایک طرح کا SOCIAL DISINTEGRATION کا دور آ گیا اور ان نئے حالات میں لکھنے والوں کو بڑی دقت پیش آتی ہے۔

عبادت – یہ بات بڑے پتے کی ہے۔ طبقاتی کشمکش میں کوئی فرق نہیں پڑا لیکن سماجی انتشار کا اثر ذہنوں پر بہت گہرا ہے اس لئے ہماری جو روایت تھی اور جس کا ہم نے تجزیہ کیا ہے اس پر اس رد و بدل کا اثر یقیناً ضرور ہوا ہے۔ بعض افسانہ نگاروں کا ماحول یکسر بدل گیا۔ ان کے لئے یہ دشواری پیدا ہو گئی ہے کہ برسوں سے وہ جس ماحول کا گہرا اثر رکھتے تھے اب اس کے متعلق وہ صرف تصور سے کام لیتے ہیں۔ اس طرح بہت سوں نے تو لکھنا ہی چھوڑ دیا۔ مثلاً حسن عسکری۔ انہوں نے پاکستان آنے کے بعد یہ کہا کہ اب میں آخر کس چیز کے بارے میں لکھوں۔ میرا لوس ملحول جس سے میں جذباتی ربط رکھتا تھا اب پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں نے لکھنا ترک کر دیا ہے۔

وقار عظیم – تخصیص خاص طرح کے سوچنے والے کی نہیں ہے۔

انتظار حسین – خاص ماحول میں پرورش پانے والے کی ضرور ہے۔ آپ تصور کیجئے دِلّی کے کوچۂ چیلان میں ایک لڑکی رسم و رواج کی کتنی پابند ہوتی تھی، لیکن وہ کراچی پہنچنے کے بعد ضابطہ اخلاق اور روایات کو توڑ دیتی ہے تو احمد علی، جو اسے کوچۂ چیلان میں جانتے تھے، اب اس کے متعلق کیا لکھیں، کیسے لکھیں۔

عبادت – میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ جو اتنی بڑی رد و بدل ہوئی ہے اس کے متعلق ہمارے افسانہ نگاروں نے کیوں کم سوچا ہے۔ اس پر تو بڑی EPIC لکھی جا سکتی ہے۔ یہ ہماری تاریخ کا کتنا بڑا سانحہ ہے۔

ندیم – اس کی وجہ وہی ہے جو انتظار صاحب نے بتائی کہ وہاں کے لکھنے والے نئے حالات سے ناواقف ہیں اور یہاں کے رہنے والے آزادوں سے اجنبی ہیں۔

عبادت – تو ہمارے لکھنے والے ان VALUES کو متعین کیوں نہیں کرتے شاید یہ وجہ ہے کہ یہ ایک بحرانی دور ہے اور ابھی اتنا ٹھہراؤ پیدا نہیں ہوا کہ اس پر سوچا جا سکے۔ سوائے انتظار حسین کے کسی نوجوان افسانہ نگار نے اس موضوع پر توجہ نہیں کی، حالانکہ یہ تمام کیفیات اکثر پر بیت چکی ہیں۔

انتظار حسین – پہلے یہ متعین کیجئے کہ اس کے متعلق کون لکھے۔

وقار عظیم – ہمیں تو اس وقت ان نئے حالات میں افسانہ نگاری شروع کرنے والوں کا جائزہ لینا ہے اور دیکھنا ہے کہ اس کی ادبی قدر و قیمت کیا ہے۔

عبادت – پرانے لکھنے والوں میں بھی بعض ایسے ہیں جنہوں نے اس دور میں بہت اچھے افسانے لکھے ہیں مثلاً ندیم اور ان میں بڑھتا ہوا منظم زاویۂ نظر ہے لیکن اب چونکہ CONCENTRATION نہیں اس لئے اچھی تخلیقات نہیں ہو سکیں، اس سے ہم مجموعی کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ہاں یہ دیکھنا ہے کہ تقسیم کے بعد جو افسانہ نگار پیدا ہوئے ہیں انہوں نے کونسے نئے تجربے کئے ہیں جن سے افسانے کی روایت آگے بڑھی ہے۔

اس نقطۂ نظر سے انتظار حسین کے افسانوں کو میں خاص اہمیت دیتا ہوں انہوں نے زندگی کی متزلزل اقدار اور تقسیم کے اثرات کا بیان بڑی خوبی سے کیا ہے۔ اس میں ایک انسانی نقطۂ نظر ملتا ہے انہوں نے زندگی کے منتشر پہلوؤں کو بڑی اچھی طرح پیش کیا ہے۔

محمد طفیل – ان کے افسانوں کی یکسانیت عیب بن گئی ہے۔

عبادت – اس یکسانیت کو میں ان کی خوبی سمجھتا ہوں، ان پر روسی حقیقت پسندی کا بڑا گہرا اثر ہے خصوصاً ٹالسٹائی اور ترگنیف کا۔ یہ یکسانیت اصل میں تکنیک کا دھیما پن ہے۔ یہ زندگی کو ایک خاص طرح سے محسوس کرنے کا انداز ہے۔

ندیم – میرے خیال میں انہوں نے موضوع کی تخصیص کر لی ہے جو ہر بڑے افسانہ نگار کو کر لینی چاہئے۔ انہوں نے جس خاص ماحول اور خاص طبقے

کو دکھایا ہے اسی کی عکاسی کی ہے۔

عبادت۔ طبقے کی وضاحت کیجئے۔

ندیم۔ نچلا درمیانی طبقہ، چھوٹے دکاندار، ملازمت پیشہ لوگ وغیرہ۔ ان کے ہاں ایک عجیب و غریب چیز یہ ہے کہ سماجی شعور تو ہے لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس کے بھرپور اظہار سے کترا کر نکلنا چاہتے ہیں۔

عبادت۔ طبقے کے بارے میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے صرف معمولی دکانداروں کی نہیں بلکہ یو۔پی کے خاص اضلاع کے متوسط طبقے کی ترجمانی کی ہے یعنی بلند شہر کے آس پاس کا علاقہ۔ انتظار کے ہاں درحقیقت دو قسم کے ماحول ہیں، ایک تو وہ جو وہاں موجود تھا۔ دوسرا اس تبدیلی کے بعد جسے وہ سوچ سکتے ہیں۔ رہا سماجی شعور تو وہ اس کے قائل نہیں۔ ان کا تعلق درحقیقت اسی سکول سے ہے جس کے تحت ہم نے بیدی اور غلام عباس کو رکھا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ انہوں نے اپنے موضوع کی تخصیص کر لی ہے، ان کے پاس ماحول کے المیے کا اظہار زیادہ ہے اور ان مسائل پر ان سے اچھے افسانے کسی نے نہیں لکھے۔

ندیم۔ ان کا نام بیدی اور غلام عباس کے ساتھ لینا زیادتی ہے لیکن ایک چیز انتظار کے بارے میں اور ہے وہ یہ کہ یہ چیخوف کی طرح جزئیات کو پیش کرنے میں مہارت رکھتے ہیں لیکن تکنیکی طور پر ان کے افسانوں میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ پلاٹ کو بالکل ثانوی حیثیت دی گئی ہے۔

وقار عظیم۔ اس حد تک اس دور کے کسی افسانہ نگار نے اس اصول کی پابندی نہیں کی۔ رہی موضوع کی تخصیص جس سے تکرار کا احساس ہوتا ہے تو اس کا احساس انہیں خود ہوا ہے۔ اب وہ اپنے مانوس کردار کو نئے ماحول میں چھوڑ دیتے ہیں اور اس بدلے ہوئے ماحول میں اس کے احساس کی شدت کو بیان کرتے ہیں۔ اس طرح اب تکرار کا احساس کم ہو گیا ہے۔ یہ چیز آگے بڑھی تو ان کے افسانوں میں یقیناً وسعت پیدا ہو گی۔ اس طرح یہ ایک نئی راہ ہے جو انہوں نے نئے لکھنے والوں کو سجھائی ہے۔

عبادت۔ اس نے ان کی تکنیک اور انداز بیان میں شدت پیدا کی ہے یا اسے شدت کہنے کے بجائے صحیح طور پر خلوص کے ساتھ پیش کرنا کہا جا سکتا ہے مثلاً "سائجھ بھئی چودیس" میں ایک شخص پاکستان سے ہندوستان واپس جاتا ہے تو ریل میں جمنا کے پل پر سے گزرتے ہوئے جب وہ ہندوؤں کو پیسے پھینکتے نہیں دیکھتا تو خود بے اختیار ہو کر پیسے پھینکنے لگتا ہے۔ یہ اور اس طرح کے چھوٹے چھوٹے واقعات کے جذباتی بیان سے ان کے افسانوں میں بڑا گہرا اور مستقل تاثر پیدا ہوتا ہے۔

ندیم۔ فسادات کے بعد جو افسانے لکھے گئے ہیں ان میں سے اکثر ناکام ہیں۔ موجودہ تبدیلیوں کے بارے میں سب سے پہلے انتظار حسین نے لکھا ہے اور ان کے افسانے کافی اچھے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ پلاٹ اور کردار کی روایتی ہم آہنگی سے انہوں نے بڑا انحراف کیا ہے۔

عبادت۔ انہیں معاشرت کی اہمیت کا احساس زیادہ ہے اور یہ چیز قارئین پر اسی طرح زیادہ واضح کی جا سکتی ہے۔ اگر کردار کے مدوجزر حرکات و سکنات سے واضح کئے جا سکیں تو یہ کامیابی کی دلیل ہے۔

وقار عظیم۔ اس پورے ماحول میں صرف نچلے طبقے کی عکاسی نہیں بلکہ متوسط طبقے کی بھی ہے۔ ان چیزوں سے انتظار کو بڑا گہرا لگاؤ ہے۔ لیکن اس میں جب کوئی خامی نظر آتی ہے تو وہ اتنی تلخی سے اس کا ذکر کرتے ہیں کہ ماحول سے الگ معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ کہیں کہیں تو ایک بڑے cynic کا سا انداز ہو جاتا ہے۔ یہ نشتر کی کیفیت معلوم نہیں کس وجہ سے ہے۔

ندیم۔ انتظار حسین نئے لکھنے والوں میں نمایاں ترین ہیں۔

عبادت۔ ان کی تمام چیزوں میں وہی کیفیت ہے جو بلونت سنگھ کے یہاں ہے، وہی جان نگاہی ہے، ان کو پڑھنے کے بعد اس زمانے کی زندگی کا بڑا شدید احساس ہوتا ہے۔ اس معاشرت کے ساتھ ان کا انداز بیان پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ محاوروں اور لہجے کا استعمال کرداروں کی ذہنی سطح کے مطابق ہونا بڑی خوبی ہے۔ ان کے یہاں محاورہ ڈپٹی نذیر احمد کی طرح ٹھونسا ہوا نہیں ہے۔ وہ خیال کی روانی کے ساتھ آتا ہے۔ ماحول کی وضاحت میں بھی اس سے مدد ملتی ہے۔ لیکن انہیں یہ بھی محسوس کرنا چاہئے کہ اس زندگی کو باقی رکھنے کے لئے جس سے انہیں اتنی دلچسپی ہے، اب کون سی راہ اختیار کرنی چاہئے۔ انہیں لہجے کے دھیمے پن میں ذرا سی شدت پیدا کرنی چاہئے۔

وقار عظیم۔ میں اس سے متفق نہیں۔ اس میں مزاج کو دخل ہے اور اگر اس سلسلے میں کوئی شعوری کوشش کی گئی تو تصنع پیدا ہو جائے گا۔

محمد طفیل۔ اگر یہ بقدر ضرورت پلاٹ پر بھی توجہ دینے لگیں تو ان کے افسانے زیادہ جاندار ہو جائیں گے۔ پھر ان کے افسانوں میں محاوروں کی

جو ابھر رہا ہوتی ہے وہ بری طرح کھلتی ہے۔

وقار عظیم۔ ان کے افسانوں میں جو محاورے آتے ہیں وہ ضرورت کے تحت آتے ہیں۔ چنانچہ ان کے حال کے افسانوں میں محاورے نہیں ہیں۔

محمد طفیل۔ اگر ان کے حال کے افسانوں میں محاورے نہیں ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہاں انہوں نے ضرورت نہیں سمجھی بلکہ یہ کہ ان کے ہاں محاوروں کا اسٹاک ختم ہو گیا ہے۔

عبادت۔ اب نئے لکھنے والوں میں اشفاق احمد رہ جاتے ہیں۔ یہ بہت ذہین افسانہ نگار ہیں اور اسی سکول کے نمائندہ ہیں جس سے بلونت سنگھ اور انتظار حسین متعلق ہیں۔

وقار عظیم۔ مجھے اس سے اختلاف ہے، بلونت سنگھ اور انتظار حسین نے موضوع کی تخصیص کر لی ہے لیکن اشفاق احمد نے ایسا نہیں کیا۔ ان کے کئی افسانے بچوں کے متعلق ہیں جن میں انہوں نے ان کے نرم و نازک احساسات کی بڑی فن کارانہ ترجمانی کی ہے۔ بعض افسانوں میں وہ رومان پیش کرتے ہیں، ان کی یہ نمایاں خوبی ہے کہ وہ زندگی کے ہر پہلو کو بڑی شگفتگی سے پیش کرتے ہیں۔

بچوں کے لئے ان کے دل میں بڑی محبت ہے اور وہ انہیں انسانیت کے مستقبل کی امانت سمجھتے ہیں۔ ان کا احترام کرتے ہیں اور یہ پوری انسانیت کی خدمت ہے۔ ہمارے اور کسی افسانہ نگار کے یہاں یہ بات نہیں۔

ندیم۔ اشفاق کے تمام افسانوں کا ایک فنی معیار ہوتا ہے، وہ باشعور افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے پاکستان کی ثقافتی تبدیلی پر بھی کہانی لکھی ہے۔

وقار عظیم۔ ان کی نظر ایک جگہ ٹھہری ہوئی نہیں ہے لیکن جہاں ٹھہرتی ہے وہاں تمام جزئیات کا جائزہ لیتی ہے۔ انہوں نے پرانے ادب اور شعر کو بڑے حسن سے اپنے افسانوں میں رچایا ہے۔ غالب، حافظ اور میر درد ان سب کا کلام ان کے سامنے ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باقی طرزِ بیان میں بھی اس کی مطابقت کا خیال رکھنا پڑتا ہے جس سے ان کے افسانوں میں بڑی ہمواری اور روانی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ مخلص فن کار ہیں اور ماحول کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔

انتظار حسین۔ پنجاب کے افسانہ نگار دانستہ طور پر پنجابی الفاظ لاتے ہیں لیکن اشفاق احمد اس امر کی شعوری کوشش اور اہتمام کرتے ہیں۔ اس سے تاثر کہیں بڑھ جاتا ہے۔

عبادت۔ اس سے انتظار حسین، بلونت سنگھ اور اشفاق سب کام لیتے ہیں۔

وقار عظیم۔ ایک فرق البتہ ہے۔ انتظار حسین کو اس خاص طرح کے انداز سے فطری لگاؤ ہے۔ اشفاق اور بلونت سنگھ کے یہاں ہر جگہ اس کا انداز شعوری ہے۔ اس سے بعض اوقات خرابیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے لیکن اشفاق احمد کی اس شعوری کوشش میں ہر جگہ یہ احساس موجود ہے کہ بیان کو فنی تخلیقات کے حسن و تاثیر میں بڑا دخل ہے اور اس لئے وہ ہمیشہ اس کے بنانے سنوارنے پر پوری توجہ صرف کرتے ہیں۔

محمد طفیل۔ انہوں نے پنجاب کی دیہاتی زندگی کے بارے میں بھی کئی کامیاب افسانے لکھے ہیں۔

وقار عظیم۔ وہ تو میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو ایک خاص قسم کے افسانے لکھنے کے لئے نہیں چنا۔

عبادت۔ نئے لکھنے والوں میں اے حمید کا نام بھی رہ گیا۔

وقار عظیم۔ نام تو کئی اور ہیں، مثلاً ولیعہد اختر کا ذکر ضرور ہونا چاہئے کیونکہ ہماری موجودہ زندگی میں جو انتشار پیدا ہوا ہے اس کا ذکر تو افسانہ نگاروں نے کیا ہے لیکن اس کی ذمہ داری کس پر ہے، اس کے اظہار میں عموماً جھجک محسوس کی ہے۔ اختر نے عام انداز کے خلاف اس معاملہ میں پوری جرأت کے ساتھ اس کی ذمہ داری اربابِ سیاست پر رکھی ہے۔

عبادت۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ زندگی کے متعلق ایک واضح نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔

وقار عظیم۔ ایک وجہ یہ ہے اور دوسری یہ کہ جس ماحول میں اختر رہتے ہیں وہاں اظہار پر اتنی پابندیاں نہیں ہیں۔ ہمارے لکھنے والوں کو غالباً یہ اندیشہ بھی ہے کہ پڑھنے والے اتنے جذباتی ہیں کہ وہ لکھنے والے کے نقطۂ نظر کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔

——جی ہاں میں ولیعہد اختر کا ذکر کر رہا تھا اور بتانا مقصود یہ تھا کہ نئے لکھنے والوں میں صرف دو ہی نام نہیں بلکہ کئی نام توجہ کے مستحق ہیں لیکن ابھی ان کے کارناموں پر انفرادی حیثیت سے گفتگو شاید قبل از وقت ہے اس لئے بہتر ہے کہ ہم ان لکھنے والوں کی ایسی خصوصیات کا ذکر کر لیں جو سب میں مشترک ہیں۔ اس سلسلہ میں بعض چیزیں نمایاں ہیں مثلاً ایک عام رجحان یہ ملتا ہے کہ کسی افسانہ نگار نے اپنے آپ کو فسادات کے موضوع سے ملوث کرنے

کی کوشش نہیں کی۔ اس کی وجہ غالباً ان لکھنے والوں کے نزدیک یہ تھی کہ اگر اپنے لئے جگہ پیدا کرنی ہے تو نئے موضوع تلاش کرنے چاہئیں۔ پھر یہ کہ یہ سب نئے لکھنے والے فن کی روایات کی پابندیوں کو بے حد ضروری سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس انتشار کے دور میں بھی روایت کو ٹھیس نہیں پہنچی اور نہ دھیچے کی طرف گئی۔ موجودہ حالات میں یہ بھی فن کی بڑی خدمت تھی۔ دوسری چیز جو ان سب افسانہ نگاروں میں مشترک ہے، وہ زندگی کا احساس ہے۔ ہر ایک نے اپنے آپ کو کسی نہ کسی خاص زندگی سے وابستہ کیا ہے اور اسی کو موضوع بنایا ہے مثلاً شوکت صدیقی کے وہ افسانے زیادہ کامیاب ہیں جن میں انہوں نے لکھنؤ کے نوابوں اور بیگموں وغیرہ کی زندگی کی مصوری کی ہے ـــــ نئے لکھنے والوں میں صرف انہی نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور اسے ایک نئے رنگ سے پیش کیا ہے۔ ان کے اس طرح کے افسانوں میں زندگی کے مسائل کا احساس نچلے طبقے کے لوگوں کو بھی ہے اور نوابوں اور بیگموں کو بھی۔

ندیم ۔ شوکت صدیقی بالکل نئے لکھنے والے نہیں ہیں۔ وہ کافی عرصے سے لکھ رہے ہیں شروع میں معمولی درجے کے افسانے لکھے ہیں لیکن اس دور میں اچھے افسانے بھی لکھے ہیں۔

عبادت ۔ نئے افسانہ نگاروں نے جو روایت قائم رکھی ہے اس میں ان افسانہ نگاروں کی کوششوں کے علاوہ اس روایت کی عظمت کو بھی بڑا دخل ہے، ہمارے افسانے نے بڑی عظیم روایت قائم کی ہے، اسے برقرار رکھنا ان لوگوں کے لئے ضروری تھا۔ نئے لکھنے والوں میں کوئی بھی ایسے CALIBRE کا نہیں ہے جیسے ان کے پیش رو تھے۔ ان کی سطح اپنے پیش روؤں سے بہت نیچی ہے۔ ان کے احساس میں بھی وہ شدت نہیں جو پہلے افسانہ نگاروں میں تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے زندگی کو نسبتہً کم دیکھا ہے۔ ان کے احساس میں شدت بھی نہیں ہے شعور میں بیداری بھی نہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں وہ عظمت نہیں ہے جو ان کے پیشروؤں کے فن میں نمایاں نظر آتی ہے۔

وقار عظیم ۔ ابھی یہ افسانہ نگار اپنی تخلیقی زندگی کی اس منزل تک نہیں پہنچے کہ ہم ان کے کارناموں پر کوئی قطعی حکم لگا سکیں لیکن ان کی تحریروں میں اس عظیم روایت کی موجودگی اور اس کی پابندی کا احترام ایسی چیزیں ہیں جنہیں مستقبل کے لئے نیک فال کہا جا سکتا ہے۔

عبادت ۔ ان سب کے یہاں اس رجحان کا احساس بھی ہوتا ہے کہ ان میں سے بیشتر رومانیت بلکہ کہیں کہیں سستی جذباتیت کی طرف مائل ہیں۔

وقار عظیم ۔ یہ صحیح ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی ہمارے پورے ماحول میں وہ ہمواری پیدا نہیں ہوئی کہ کسی چھوٹے سے واقعے کو موضوع بنا کر اس پر کچھ لکھا جا سکے، اور اس لئے لکھنے والے رومانیت کے سہارے ہی آگے بڑھ رہے ہیں۔

عبادت ۔ ان میں سے بیشتر کے مزاجوں میں ایک فراری کیفیت ہے زندگی کا کوئی بہت واضح نقطۂ نظر بھی ان کے یہاں نہیں ہے اور جب تک کوئی واضح نقطۂ نظر سامنے نہ ہو فن یونہی بھٹکتا ہے۔ اس کو منزل سے ہمکنار ہونا نصیب ہوتا۔ ہمارے نئے افسانہ نگاروں میں سے بیشتر کے فن کا یہی حال ہے۔

وقار عظیم ۔ اس فرار کی ایک شکل بعض لکھنے والوں کے ہاں نمایاں ہے اور وہ اس طرح کہ ان کے تقریباً آدھے افسانے ایسے ہیں جن میں قہوہ خانوں کا ماحول ہے۔ یہ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے آنکھ چراتے ہیں۔ ان میں اس کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں اور اس لئے تلخیوں سے بھاگ کر ایسی جگہ جانا چاہتے ہیں جہاں وہ چھپ کر تلخیوں کا مذاق اڑا سکیں۔

عبادت ۔ اے حمید ایسے افسانہ نگار ہیں جن کے یہاں یہ رجحان ملتا ہے۔ ان کے افسانوں کی جذباتی اور رومانی فضا اس کو ظاہر کرتی ہے۔ انہیں زندگی کی تلخیوں کا احساس ضرور ہے لیکن وہ ان تلخیوں کو برداشت کرنے کی سکت نہیں رکھتے اگر یہ سکت ان کے ہاں ہوتی تو ان کے فن میں بڑی توانائی پیدا ہو سکتی تھی۔

وقار عظیم ۔ ایک وجہ اور بھی ہے کہ ان لوگوں نے اشتعال اور انتشار کو الگ کر کے، جہاں زندگی کا مشاہدہ نہیں کیا وہ دوسری طرف ادب اور فلسفہ کا بھی مطالعہ نہیں کیا کہ خیال میں وسعت پیدا ہوتی۔

عبادت ۔ لیکن اے حمید کے ہاں ایک چیز ہے یعنی زندگی کے مظاہر سے دلچسپی ـــــ ہر چند کہ اس دلچسپی میں بچپن کی سادگی اور معصومیت کو دخل ہے لیکن یہی ان کے فن کی جان ہے۔ زندگی کی سنگین حقیقتوں سے دامن بچا کر چلنے کے باوجود ان کے ہاں زندگی سے دلچسپی کا رجحان ضرور ملتا ہے جس کا اظہار وہ موسموں، پہاڑوں اور دریاؤں کے بیان میں کرتے ہیں۔

نئی پود کے افسانہ نگاروں میں اے حمید کا فن اس اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتا ہے۔

ندیم - لیکن خرابی یہ ہے کہ وہ اس میں توازن قائم نہیں رکھتے، بجائے اس کے کہ وہ حقیقت پسندی کی راہ پہ چلتے انہوں نے رومانیت کا سہارا لیا۔

انتظار حسین - اصل میں ان کے ہاں COMMON MAN کا زاویۂ نظر ملتا ہے۔ مصنف عام آدمی سے الگ نہیں دکھائی دیتا۔

عبادت - ان کے یہاں مطالعہ کا فقدان اور شعور کی سطحیت ہے اس لیے وہ ہر چیز کو رومان کی عینک سے ضرور دیکھتے ہیں لیکن ان کی قباحت ہیں جو سادگی اور معصومیت ہے وہ اپنے اندر بلا کی دلکشی رکھتی ہے۔

محمد طفیل - آپ حضرات مذاکرہ ختم کر چکے لیکن میری ناچیز رائے ہے کہ اگر ہم تین چار افسانہ نگاروں کا ذکر اور کر دیتے تو اچھا تھا۔ میری مراد چودھری محمد علی ردولوی، قدرت اللہ شہاب، نسیم اور ابوالفضل صدیقی سے ہے۔

عبادت - اس میں شبہ نہیں کہ ہم نے اپنی گفتگو میں بے شمار نام لئے ہیں لیکن یہ نام محض اس لئے نہیں لئے گئے کہ ہم انفرادی طور پر ان کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کرنا چاہتے تھے۔ اصل مقصود یہ تھا کہ ہم ناموں کے ساتھ ساتھ یہ دیکھتے چلیں کہ ان کے انفرادی فن نے ہمارے افسانہ کی روایت کو آگے بڑھانے میں کیا حصہ لیا ہے۔

وقار عظیم - عبادت صاحب کا خیال بالکل صحیح ہے لیکن طفیل صاحب کا مقصد بھی غالباً یہی ہے کہ ان افسانہ نگاروں نے بھی ہمارے افسانہ کی روایت کو کوئی نہ کوئی چیز دی ہے اس لئے روایت اور جدت کے تسلسل کے تذکرہ میں ان کا ذکر آنا ضروری ہے۔

محمد طفیل - جی ہاں! میرا یہی خیال ہے۔

وقار عظیم - تو پھر آئیے ان افسانہ نگاروں کے فن کے ان پہلوؤں پر گفتگو کریں جن کی بدولت ہماری افسانوی روایت کسی نہ کسی جدت سے آشنا ہوئی ہے۔ سب سے پہلے چودھری صاحب کے افسانوں کو لیجئے۔

عبادت - چودھری صاحب خاصے پرانے افسانہ نگار ہیں اور بڑی مدت سے خاموشی کے ساتھ لکھ رہے ہیں اور اسی خاموشی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جو خدمت ہمارے افسانے کی انہوں نے کی، اس کی داد بعد میں آنے والوں کو ملی۔

وقار عظیم - آپ کا اشارہ شاید ان خاص طرح کے افسانوں کی طرف ہے جن میں چودھری صاحب نے جنسی مسائل کو بڑے لطیف اور نازک فنی انداز میں پیش کیا ہے۔

عبادت - جی ہاں! بالکل انہی افسانوں کی طرف۔ جنسی مسائل کو افسانہ کا موضوع بنانے کی جو روش متوسط دور کے لکھنے والوں میں نظر آتی ہے اور جس کی مختلف صورتیں ہمیں منٹو، عصمت اور ممتاز مفتی کے افسانوں میں نظر آتی ہیں اس کی ایک نکھری ہوئی شکل چودھری محمد علی کے افسانوں میں ہے۔

وقار عظیم - جو بات ممتاز مفتی کا ذکر کرتے وقت ندیم صاحب نے فرمائی تھی وہ اس وقت یاد آ رہی ہے۔

ندیم - مجھے یاد نہیں رہی وہ بات۔

وقار عظیم - آپ نے فرمایا تھا کہ جنسی مسائل اور خاص کر ان مسائل کے نفسیاتی پہلو کی عکاسی کرنے کے لئے بیان پر جس قدرت کی ضرورت ہے وہ مفتی کو میسر نہیں —— چودھری محمد علی کا امتیاز بیان کی یہی قدرت ہے۔

ندیم - اور اس کے ساتھ ساتھ ایک خاص طرح کے ماحول اور اس کے کرداروں سے پوری طرح واقفیت اور بے تکلفی۔

وقار عظیم - چودھری صاحب کے بعض افسانے پڑھ کر تو مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ موضوع سے پوری واقفیت اور بیان پر پوری قدرت ہو تو سیدھی سادی کہانی میں بھی ایک طلسم کا سا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔

انتظار حسین - یوں اس طرح کے طلسم تو قدرت اللہ شہاب نے بھی بہت باندھے ہیں۔

وقار عظیم - آپ کی اجازت سے میں آپ کے بیان میں تھوڑی سی ترمیم کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ قدرت اللہ شہاب نے طلسم باندھنے کی کوشش تو ضرور کی ہے لیکن طلسم باندھنے میں انہیں کامیابی ذرا کم ہی ہوئی ہے۔

انتظار حسین - مجھے اس معاملہ میں آپ سے اتفاق نہیں "یا خدا" ایک مکمل طلسم ہے۔

وقار عظیم - "یا خدا" کی حد تک تو سب آپ سے متفق ہوں گے لیکن یہاں ذکر مختصر افسانوں کا ہے اور شہاب کے مختصر افسانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ جب جنسی پہلو کے متعلق کچھ لکھتے ہیں تو ایک پست قسم کی لذتیت ان کے پورے افسانے پر چھا جاتی ہے۔

محمد طفیل - لیکن انہوں نے سارے افسانے جنسی پہلوؤں ہی پر تو نہیں

لکھے۔ پھر ان کے ہاں اظہار کی جرأت بھی ہے۔ جرأت کے بجائے شدید جرأت کا لفظ مناسب ہے۔ بعض اوقات تو حیرانی ہوتی ہے کہ ایک گزیٹڈ آفیسر اس طرح بھی سوچ سکتا ہے۔

وقار عظیم ۔ جی ہاں! یہ صحیح ہے۔ شہاب کے موضوع متنوع ہیں اور ان متنوع موضوعات میں نفسِ مضمون اور طرزِ بیان کے اعتبار سے دو چیزیں مشترک ہیں۔ نفسِ مضمون کے اعتبار سے تو یہ کہ وہ ہماری معاشرتی زندگی کے کسی ایسے پہلو کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں (اور اس میں ان کے جنسی افسانے بھی شامل ہیں) جس میں بھرپور طنز اور بے پروا تنقید کی گنجائش ہو اور اظہار کے نقطۂ نظر سے یہ کہ اس بات کو وہ پوری دلیری سے بیان کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس میں پستی یا سوقیت کے پیدا ہو جانے کی بھی پروا نہیں کرتے۔

عبادت ۔ اور اس طرح وہ توازن ختم ہو جاتا ہے جسے ہم فن اور تاثیر سے تعبیر کرتے ہیں۔

وقار عظیم ۔ اس کے باوجود ہمارے افسانہ میں جرأتِ اظہار کی روایت بہت عام نہیں ہے اور عصمت، منٹو اور حجاب کے علاوہ بہت کم کہیں دکھائی دیتی ہے اسے شہاب نے ایک نئی شکل دے کر اس روایت کو وسعت دی ہے اور یہ ان کی خدمت ہے۔

محمد طفیل ۔ تسنیم صاحب کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

وقار عظیم ۔ یہ بات پہلے ندیم صاحب بتائیں گے۔

ندیم ۔ صاحب! میں تسنیم کو کئی حیثیتوں سے مکمل افسانہ نگار سمجھتا ہوں ——— پہلی تو یہ کہ وہ موضوع کے انتخاب کے لئے اِدھر اُدھر کبھی نہیں بھٹکی۔ اب آس پاس کی زندگی میں اس نے ایسے بے شمار موضوع تلاش کر لئے ہیں جن میں اچھا افسانہ بننے کی صلاحیت ہے۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ تسنیم کا کوئی افسانہ پڑھ کر پڑھنے والا اپنے ذہن پر کسی طرح کا بوجھ نہیں محسوس کرتا، ہلکی پھلکی، سیدھی سادی شگفتہ فضا ہے اور اسے ہلکے پھلکے، سیدھے سادے شگفتہ انداز میں پیش کر دیا گیا ہے ——— نہ اس افسانہ کی رفتار میں بوجھل پن ہے، نہ اس کے طرزِ بیان میں۔

عبادت ۔ لیکن اس کی وجہ آخر کیا ہے؟

وقار عظیم ۔ صاحب مجھے تو ان ساری باتوں کی ایک ہی وجہ معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ہماری دوسری افسانہ نگار خواتین کی طرح تسنیم کسی طرح کے COMPLEX میں مبتلا نہیں ہیں عصمت، ہاجرہ، خدیجہ، قرۃ العین حیدر سب کے ذہن بظاہر کسی نہ کسی نفسیاتی الجھن میں پھنسے ہوئے ہیں اور ان الجھنوں سے ان کے فن میں جابجا صاف گرہیں پڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔ تسنیم کا ذہن ان الجھنوں سے خالی ہے اور اس لئے اس کا فن ہموار اور مصفا ہے ——— اس کے ہاں زندگی کے مسائل آتے ضرور ہیں لیکن وہ پڑھنے والے کے پیر میں بیڑیاں ڈال کر نہیں بیٹھ رہتے اور اس طرح ہمیں ان کہانیوں سے فن کا ایک بڑا اچھا سبق یہ ملتا ہے کہ افسانہ نگار کچھ بھی لکھے، اگر وہ خلوص اور سادگی سے لکھتا ہے تو اس میں تاثیر ضرور ہوگی۔

ندیم ۔ تسنیم کو اپنے ماحول اور کرداروں سے جو لگاؤ ہے اس نے بھی افسانوں میں بے تکلف روانی کی یہ فضا پیدا کی ہے۔

محمد طفیل ۔ ان کے ہاں جتنا خلوص ہے وہ کسی افسانہ نگار میں نہیں ہے وہ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں، قاری پر اثر انداز ہوتا ہے۔

وقار عظیم ۔ ہاں صاحب یہ تو حقیقت میں ہماری افسانہ نگاری کا ایک اہم رجحان بن گیا ہے کہ ہمارے اکثر افسانہ نگار اسی ماحول اور انہی کرداروں کے متعلق لکھتے ہیں جن سے وہ اچھی طرح مانوس ہیں۔

محمد طفیل ۔ اور اس لحاظ سے مجھے ابوالفضل صدیقی میں جو بات نظر آتی ہے کسی اور میں نہیں دکھائی دیتی۔ جس خاص طرح کے ماحول کی عکاسی اس نے اپنے افسانوں میں کی ہے کسی اور افسانہ نگار نے نہیں کی۔ اس کی زبان اور بیان بھی اپنا ہے۔ اسے اس ماحول کی جزئیات کا اتنا علم ہے اور وہ اس علم کو اس نئے انداز میں اس بے تکلفی اور خوبصورتی سے بیان کرتا ہے کہ وہ چھوٹے سے چھوٹے موضوع پر خاصا طویل افسانہ لکھ سکتا ہے۔

عبادت ۔ اور اس طرح پڑھنے والوں کو بور بھی کر سکتا ہے۔

وقار عظیم ۔ طوالت اور بوریت میں ایک قریبی تعلق ہے اور اس لئے اگر ابوالفضل صدیقی کسی طرح اپنے آپ کو اختصار اور اعتدال کی طرف مائل کر سکیں تو ان کی وہ خوبیاں جن کا طفیل صاحب نے ذکر کیا، انہیں بڑا کامیاب افسانہ نگار بنا دیں۔

محمد طفیل ۔ ہم نے بزعمِ خود تمام افسانہ نگاروں کا ذکر کر لیا، پھر بھی کئی ایک افسانہ نگار چھوٹے جا رہے ہیں۔ ان میں سے کم از کم اکبر اور حبیس کا ذکر یہاں ضرور ہونا چاہئے۔

عبادت ۔ ابراہیم جلیس کے بارے میں گفتگو ہو چکی ہے۔ انہوں نے

افسانے میں کوئی خاص تجربہ نہیں کیا۔ کم و بیش انہی موضوعات پر انہوں نے افسانے لکھے ہیں جن پر اس دور کے بیشتر افسانہ نگار لکھتے رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے متوسط طبقے کے افراد کی زندگی، ان کی معاشی الجھنیں، ان کی اقتصادی پریشانیاں ——— جلیس نے زندگی کو قریب سے دیکھا ہے۔ طبقاتی سماج پر جو کچھ گزرتی ہے اس کا وہ گہرا شعور رکھتے ہیں ——— اسی کیفیت کے مختلف پہلوؤں کو انہوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ جلیس کی تکنیک میں ویسے کوئی ایسی بات نہیں جس کو اہم تجربہ کہا جا سکے۔ لیکن انہیں واقعات کو کہانی کا روپ دینے کا گر آتا ہے اور وہ اس کو خوبی کے ساتھ برتتے ہیں ——— البتہ خاکے کی طرف انہوں نے خاص طور پر توجہ کی ہے اور اس میں شک نہیں کہ بعض بہت اچھے خاکے انہوں نے لکھے ہیں۔

وقار عظیم ۔ انہیں زندگی کا شدید احساس ہے اور اس شدید احساس ہی کا یہ اثر ہے کہ انہوں نے بعض اچھے افسانے لکھے ہیں۔

محمد طفیل ۔ ان پر کرشن چندر کا اثر معلوم ہوتا ہے۔

عبادت ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ کرشن چندر جو کچھ اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں اور جس طرح پیش کرتے ہیں اس میں ہمارے نوجوانوں کی ذہنی اور جذباتی کیفیات کی ترجمانی ہوتی ہے اس لئے اس کے فن کا رنگ نوجوان افسانہ نگاروں پر بہت جلد چڑھ جاتا ہے۔ جلیس کرشن چندر کے انداز میں سوچتے ہیں اور اس لئے اسی طرح اس کو پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تدیم ۔ ان کے اندازِ بیان میں خاصی روانی پائی جاتی ہے اور اس خصوصیت نے ان کے افسانوں میں دلآویزی پیدا کی ہے۔

عبادت ۔ ابراہیم جلیس کی طرح انور نے بھی افسانے میں کوئی اہم تجربہ نہیں کیا۔ لیکن زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احساس ان کے یہاں بھی شدید ہے۔ اسی لئے وہ ڈوب کر لکھتے ہیں۔ ان کے موضوعات متنوع ہیں لیکن ان متنوع موضوعات میں یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ وہ ان سب پر ایک مخصوص زاویۂ نظر سے روشنی ڈال رہے ہیں۔ اس زاویۂ نظر کی نوعیت سماجی ہے، البتہ اس میں بڑی گہرائی نہیں ہے۔

محمد طفیل ۔ انور کے یہاں جو چیز سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ پڑھنے والے کی توجہ پوری طرح اپنی طرف مبذول کر لیتے ہیں۔

عبادت ۔ جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں وہ ڈوب کر لکھتے ہیں۔ ان کے فن میں موضوع کے ساتھ ایک خلوص نظر آتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کے فن میں احساس و تاثر کی شدت ہے جو اسی خلوص ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

محمد طفیل ۔ اب وہ اسٹیج آ گئی ہے کہ ہم اپنی ساری گفتگو کا ایک جائزہ لے سکیں کہ اب تک کے افسانہ نگاروں نے کہاں تک روایت کا ساتھ دیا اور کیا کیا نئے تجربے کئے۔ اب اگر وقار صاحب اس ساری گفتگو کا ماحصل بیان فرما دیں تو یہ گفتگو مکمل ہو جائے۔

وقار عظیم ۔ ہم نے "روایت اور تجربے" کے موضوع پر خاصی طویل گفتگو کی اور اس طویل گفتگو میں ایک خاص نقطۂ نظر سے اپنے مختصر افسانہ کی تقریباً پچاس برس کی تاریخ کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ اس جائزے کے سلسلے میں اُردو کے بے شمار افسانہ نگاروں کی فنی تخلیقات اور ان کی اہم خصوصیات کا تذکرہ آیا۔ بعض لکھنے والوں کا تذکرہ بار بار کیا گیا اور خاصی تفصیل سے کیا گیا، بعض کا ذکر محض سرسری انداز سے ہوا۔ بعض لکھنے والے شاید ایسے بھی ہوں جن کا ذکر بالکل نہیں آیا۔ لیکن چونکہ فرداً فرداً سب افسانہ نگاروں کے فنی مرتبہ اور حیثیت کا تعین اس گفتگو کا مقصد نہیں تھا اس لئے کسی نام کا ہونا یا نہ ہونا اس کے بڑے یا چھوٹے ہونے کی دلیل ہرگز نہیں۔ گفتگو کا مقصد تو صرف یہ دیکھنا تھا کہ جب ہمارا افسانہ شروع ہوا تو اس کی اساس کون کون سی ایسی چیزیں تھیں جنہیں ہم اس کی روایت کہہ سکیں۔ اس اساس میں وقت کے ساتھ ساتھ کیا اضافے ہوئے اور کس طرح افسانہ کی روایت ایک سیدھی سادی روایت سے بڑھ کر اس بلند مقام تک پہنچی جہاں ہم اسے آج دیکھ رہے ہیں یا اب سے چند برس پہلے دیکھ چکے ہیں۔ افسانوی روایت کے ارتقا کی اس تاریخ میں بعض ناموں کی اہمیت یقیناً دوسروں سے زیادہ ہے ——— کچھ کی اس لئے کہ انہوں نے افسانہ کو اس کی اساسی حیثیت بخشی، کچھ کی اس لئے کہ انہوں نے اس اساس پر بلند تعمیریں کیں، اور کچھ کی اس لئے کہ انہوں نے کبھی کبھی ایسے مشکل حالات میں جب بڑی سے بڑی اور پختہ سے پختہ روایت کے قدم بھی ڈگمگا جاتے ہیں، اس عمارت کو گرنے اور مسمار ہونے سے بچایا ہے۔ مثلاً ان ناموں میں سب سے اہم نام پریم چند کا ہے ——— ایسا کئی وجوہ سے ہے۔ ایک تو اس لئے کہ پریم چند ہمارے افسانہ کی

روایت کے بانی ہیں، دوسرے اس لیے کہ اپنی افسانہ نگاری کے تیس برس کی عمر میں انھوں نے اس روایت میں طرح طرح کی جدتوں اور تجربوں سے بے شمار اضافے کیے۔ افسانہ اپنی زندگی کے ابتدائی تیس برسوں میں روایت اور تجربہ کی جن جن منزلوں سے گزرا ہے وہ ساری منزلیں ہمیں پریم چند کے افسانوں میں نظر آتی ہیں اور اس طرح "دنیا کا سب سے انمول رتن" سے "کفن" تک افسانہ کی روایت کی ابتدا، ارتقا اور عروج کی ساری داستان درج ہے۔ روایت نے ابتدا سے عروج تک پہنچتے پہنچتے جو راہیں طے کی ہیں ان سب راہوں میں پریم چند کی حیثیت محض راہرو کی نہیں رہنما کی ہے اور یہ چیز ان کی اہمیت کا تیسرا نمایاں پہلو ہے۔

پریم چند کا افسانہ روایت اور تجربہ کی جن مختلف منزلوں سے گزرا ہے انھیں چھ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس کی ابتدا تو وہ ہے جب ان کے "سوزِ وطن" کے افسانوں میں ہمیں گہری مقصدیت، شدید قسم کی جذباتیت اور فضا اور طرزِ بیان پر داستانوں کی شعریت، رنگینی اور فوق الفطرت مبالغہ آرائی چھائی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ "پریم پچیسی" اور "پریم بتیسی" کے تاریخی، نیم تاریخی اور روایتی افسانوں میں مقصدیت اور جذباتیت تو موجود ہے لیکن داستانوں کا فوق الفطرت بہت کم ہو گیا ہے۔ ذرا اور آگے چل کر تاریخ کے بجائے زندگی افسانوں کا موضوع بن گئی ہے۔ مقصدیت میں پھیلاؤ پیدا ہو گیا ہے اور اس نے معاشرتی اور اخلاقی اصلاح پسندی کی صورت اختیار کر لی ہے۔ بیان میں داستانی عناصر اب بالکل نہیں رہے لیکن شعریت اور خطابت اب بھی ہے۔ اس سے اگلے دور میں ماحول اور مسائل کی تخصیص پیدا ہو گئی ہے۔ بیان کی شعریت میں اب بھی دھیما پن ہے۔ پانچویں دور میں ماحول کی تخصیص کے ساتھ نقطۂ نظر میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔ اب نظر سماجی اور اخلاقی مسائل سے بڑھ کر سیاست پر بھی جاتی ہے اور باتوں کو دھیمے انداز میں کہنے کی طرف پوری توجہ ہے۔ آخری دور وہ ہے کہ افسانہ نگار واقعہ سے زیادہ اشخاص کو اپنے افسانہ کا موضوع بناتا ہے، اس کے خارجی ماحول سے زیادہ اس کی داخلی کیفیتوں کی عکاسی کرتا ہے، اس نے اس دور میں حقیقت اور فن کا مکمل امتزاج بھی کیا ہے اور اپنے فن کو اپنی شخصیت کا مکمل مظہر بھی بنایا ہے۔ پریم چند کی افسانہ نگاری کے یہ مختلف دور حقیقت میں اردو افسانہ کی روایت کے ارتقا کی مختلف منزلیں ہیں۔ ان مختلف منزلوں میں پریم چند نے ایک تنہا مسافر کی طرح کبھی سفر نہیں کیا۔ ہر دور میں ان کے ساتھ ایسے لکھنے والوں کا ایک کارواں رہا ہے جس کے ہر فرد نے ان کی بنائی ہوئی روایتوں کو اختیار کر کے ان کی پیروی کی ہے۔ پہلے اور دوسرے دور میں سدرشن ان کے ساتھ ہیں۔ تیسرے دور میں علی عباس حسینی اور اعظم کریوی ہیں۔ چوتھے اور پانچویں دور میں بے شمار لکھنے والے ان کے رنگ میں ڈوبے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ حامد اللہ افسر، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، اختر انصاری ان میں سے چند ہیں۔

پریم چند نے افسانہ کے بالکل ابتدائی دور میں اسے مقصدیت اور داستانی رنگ کی روایت دی۔ تقریباً اسی زمانہ میں سلطان حیدر جوش نے ایک خاص ماحول کی زندگی کے پس منظر میں اصلاحی مقصدی افسانے لکھے اور اس طرح داستانی رنگ سے بچ کر حقیقت نگاری اور مقصد نگاری کے امتزاج کی روایت شروع کی۔ تقریباً اسی زمانہ میں سجاد حیدر یلدرم نے افسانہ کو رومانیت کی روایت سے آشنا کیا اور اس طرح اساس کی حیثیت سے روایت کے تین پہلو افسانہ کا جزوِ خاص بنے — مقصدیت اور داستانی رنگ، مقصدیت اور حقیقت نگاری، رومانیت اور فنی لطافت کا احساس۔ آنے والے ہر دور میں افسانہ کی روایت انھیں تین راستوں پر چل کر موجودہ دور تک پہنچی ہے۔ حقیقت نگاری کی روایت کو پریم چند کے علاوہ حسینی، حامد اللہ افسر، عظیم بیگ چغتائی، منٹو، بیدی، حیات اللہ انصاری، احمد علی، اختر انصاری، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، عصمت چغتائی، بلونت سنگھ، غلام عباس، ہاجرہ مسرور اور انتظار حسین نے زندہ رکھا، ترقی کی نئی راہیں دکھائیں اور فن کی بلندیوں تک پہنچایا۔ رومانیت کی روایت سجاد حیدر کے علاوہ نیاز فتح پوری، ل احمد اکبرآبادی، مجنوں گورکھپوری، حجاب امتیاز علی کے ہاتھوں پلی، بڑھی اور پروان چڑھی۔ سدرشن، اعظم کریوی، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی اور قرۃ العین حیدر نے حقیقت اور رومانیت کے امتزاج سے اس روایت کو چار چاند لگائے۔

فن کے جس رجحان کا احساس سجاد حیدر یلدرم کے ترجموں نے پیدا کیا تھا اسے خواجہ منظور، بشیر الدین، منصور احمد، جلیل قدوائی کے روسی افسانوں کے ترجموں اور محمد مجیب کے روسی انداز کے افسانوں نے ہوا دی — یہاں تک کہ ۳۵ء، ۳۶ء تک ہمارے افسانہ میں حقیقت، رومانیت اور فنی احساس نے ایک عظیم المرتبہ روایت کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ پریم چند کے فن، ترقی پسندی کی تحریک اور "انگارے" کے باغیانہ انداز نے تجربوں کی بے شمار راہیں کھول دیں اور تقسیم سے بہت پہلے علی عباس حسینی، کرشن چندر، بیدی، حیات اللہ انصاری، عصمت، اختر انصاری، احمد علی اور اختر اورینوی نے اور اس کے ذرا بعد حسن عسکری، بلونت سنگھ، غلام عباس، ممتاز مفتی، تسنیم سلیم، دیوندر ستیارتھی، ہاجرہ مسرور اور قدرت اللہ شہاب

نے جو کچھ لکھا اس سے حقیقت نگاری میں نئے نئے باب کھلے ——— افسانہ کے لئے کسی خاص ماحول کی تخصیص، ایک محدود ماحول کی زندگی میں بین الاقوامی حالات کا عکس، زندگی کے پیچیدہ رشتوں کا احساس، وسیع انسانیت کا تصور، واقعات کے بجائے کرداروں پر اہمیت، زندگی کے خارجی مظاہر کے ساتھ ساتھ انسان کی داخلی زندگی کا مطالعہ، فرد کے جذبات کے علاوہ اس کی لاشعوری کیفیتوں کا تجزیہ، ذہنی گتھیاں اور تحلیل نفسی، زندگی سے متعلق کسی مخصوص زاویۂ نظر کی موجودگی، اس کے مسائل کا اجتماعی شعور ——— یہ سب کچھ حقیقت نگاری کے زمرہ میں شامل ہو گیا اور یہ ساری چیزیں مختلف لکھنے والوں کی شخصیتوں کا جزو بن کر افسانہ میں اس طرح گھل مل گئیں کہ نہ اس میں موضوعات کی کمی رہی اور نہ اس کی وسعتوں کا ٹھکانہ ہو رومانیت کبھی محض ایک شاعرانہ یا جذباتی کیفیت تھی۔ آہستہ آہستہ اپنے سارے خارجی حسن و مظاہر اور داخلی و نفسیاتی لوازم کے ساتھ حقیقت میں شیر و شکر ہو گئی اور اس نے فرد کی بیزاری کا لباس پہن کر فن کو نئی سے نئی شکلیں دیں۔ اظہار و بیان میں بھی نت نئے تجربے ہوتے، کچھ روسی حقیقت نگاروں کے اثر، کچھ فرانسیسی رومانیت کے اثر کے ماتحت اور کچھ فرانس اور انگلستان کے لکھنے والوں کے نئے نفسیاتی فن کی بدولت یہاں تک کہ تقسیم تک ہمارے افسانہ میں وہ سب کچھ آ گیا جو مغرب میں افسانہ کی روایت کا بہترین عنصر سمجھا جاتا ہے۔ لکھنے والوں نے اسے کبھی کبھی جوں کا توں اختیار کر کے اور کبھی مشرقی مزاج کے رنگ میں سمو کر اپنے افسانہ کی روایت کو مالا مال کیا اور تقسیم کے بعد لکھنے والوں نے ایک ایسے دور میں جب ہر چیز انتشار کی سخت زد میں تھی اس عظیم روایت کو اپنا کر اسے زندہ و برقرار رکھا۔ وہ اب تک بظاہر اس میں کوئی اضافہ تو نہ کر سکے لیکن جس دشوار دور میں انہوں نے اس کی حفاظت کی ہے وہ اس لئے بہت اہم اور غنیمت ہے کہ اس طرح روایت کا تسلسل درہم برہم نہیں ہوا۔ ایک سیدھی سادی روایت کو بے شمار فنکاروں نے نئے نئے تجربوں نے، ان کی ذہنی کاوشوں نے، ان کے خونِ جگر نے جو عظیم بالشان شکل دی تھی، وہ بگڑنے نہیں پائی۔ حالات ساز گار رہیں گے تو یقین ہے کہ اس کے بننے سنورنے کی صورت بھی پیدا ہو گی ——— اور نئے تجربے ہماری عظیم روایت کو عظیم تر بنائیں گے۔

تصریحات

نامور افسانہ نگاروں اور نقادوں کے درمیان "اردو افسانے میں روایت اور تجربہ" کے بارے میں جو یہ گفتگو ہوئی اس کے متعلق مجھے بجز اس کے کچھ نہیں کہنا ہے کہ یہ گفتگو بڑی کارآمد اور افسانوی ادب کے مخلصانہ مطالعہ کا نتیجہ ہے لیکن ہماری اس گفتگو میں جن اچھے افسانہ نگاروں کا ذکر ایک آدھ ہی فقرے میں ہوا ہے میں چاہتا ہوں ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ عرض کر دوں۔ مقصود فیصلوں کو جھٹلانا نہیں ہے، اپنی رائے کا اظہار کرنا ہے۔

میں نے اس سمپوزیم کی پہلی اشاعت پر بھی عرض کیا تھا کہ "اس بحث میں جن دوستوں کی ضرورت سے زیادہ تعریف ہو گئی ہے یا جن کی تعریف خاطر خواہ بھی نہیں ہوتی ان سے مجھے بحث میں حصہ لینے والے احباب کے خلوص نیت کی خاطر معذرت کرنا ہے"۔

ان تمام باتوں کے باوجود میں چاہتا ہوں کہ زیادہ نہیں تو کم از کم اختر حسین رائے پوری، 'میرزا ادیب'، اوپندر ناتھ اشک اور شفیق الرحمٰن کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کروں۔

ہر دور میں (مسئلہ خواہ کسی صنف ادب کا ہو) دو ایک ہی بڑے لکھنے والے ہوتے ہیں لیکن ہر دور میں ایسے لکھنے والے بھی ہوتے ہیں جن کے دم قدم سے ادب میں بہار رہی۔ مندرجہ بالا افسانہ نگاروں کا میرے نزدیک یہی درجہ ہے۔

اس ساری بحث میں اختر حسین رائے پوری کا ذکر صرف اسی ایک فقرے میں آیا ہے کہ "افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کا کوئی بڑا مرتبہ نہیں، ان کے بیشتر افسانے یا تو ترجمہ ہیں یا مغربی افسانوں سے ماخوذ"۔

انہوں نے جس دور میں افسانے لکھے، اس دور کی تمام افسانوی تخلیقات پر رومان ہی رومان چھایا ہوا تھا۔ وہ اس سے الگ ہو کر سوچ ہی نہیں سکتے تھے اور یہ بھی کہ اس وقت مغربی افسانوں کا ایک ایسا طلسم بندھا ہوا تھا جس نے ہمارے پورے افسانوی ادب کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور ساتھ ہی سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتحپوری کا نوجوان افسانہ نگاروں پر بڑا اثر تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے بعد میں سہی اکثر ایک مسائل کو بڑے ترقی پسندانہ انداز میں پیش کیا اور اپنی سابقہ روش کو جس میں محض رومان ہی رومان تھا، ترک کر دیا اور کئی ایک ترقی پسند افسانہ نگار ان کی تحریروں سے متاثر بھی ہوئے۔

یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے اس وصف کی چیزیں کم لکھیں۔ اگر ان کا قلم رواں رہتا اور وہ ایک سرکاری منصب پر فائز نہ ہوتے تو ہمیں امید تھی کہ ایک بہت اچھے

لکھنے والے گروپ کو برابر متاثر کرتے رہتے۔ بہرحال ان کا جتنا بھی افسانوی سرمایہ موجود ہے وہ قطعی طور پر نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں ہے۔ انھوں نے روایت سے اپنا ناطہ جوڑ کر کچھ نہ کچھ تجربے بھی کیے ہیں جو میرے نزدیک قابلِ احترام ہیں۔

آگے چل کر مرزا ادیب کی بیس سالہ ادبی زندگی کو ایک ہی فقرے میں جھٹلا گیا ہے۔ وہ یوں کہ "ان کا انداز یلدرم اور حجاب امتیاز علی کا سا ہے اور ان میں ایسی رومانیت ہے جو کھوکھلی ہے بلکہ اس رومانیت کو آگے لے جانے کی بجائے پیچھے لے گئے ہیں۔"

مرزا ادیب کی ابتدائی تحریروں میں رومانیت کا غلبہ ضرور ہے اگر ہم ذرا سا اس دور کو بھی پیشِ نظر رکھیں تو ان کا زیادہ قصور بھی نہیں ہے۔ جیسے جیسے ان کا شعور پختہ ہوتا گیا۔ ان کے ہاں رومانیت بھی بتدریج کم ہوتی گئی۔ اگر کم نہ بھی ہوتی تو کیا رومان نگار ہونا عیب میں شامل ہے؟ اگر ایسا ہے تو ہمارا کلاسیکل لٹریچر سارے کا سارا نہیں تو آدھے سے زیادہ بیکار ہو جاتا ہے۔ دیکھنا تو یہ چاہیے تھا کہ انھوں نے اپنی تحریروں میں کوئی نئی بات کہی ہے یا نہیں۔ اگر ہم ان کی صرف ابتدائی چیزوں کو پیشِ نظر رکھیں تو ان کا ایک منفرد رنگ تھا جس کے یہ واحد مالک تھے اور موجودہ دور کے افسانوں میں بھی وہ تمام چیزیں مل جاتی ہیں جن کی ہم ایک اچھے افسانہ نگار سے توقع رکھ سکتے ہیں۔ اب مرزا صاحب کے افسانوں میں زندگی کے عام مسائل کا فنکارانہ تجزیہ ملتا ہے۔ معاشرت کی اچھائیوں اور برائیوں پر ان کی گہری نظر ہے۔ ان کے افسانے اب ایک تماشائی کی روداد نہیں ہیں بلکہ ان میں ایک سچے افسانہ نگار کا بھرا پُرا خلوص اور ایک اچھے فن کار کی چابکدستی موجود ہے۔

مرزا ادیب بیک وقت افسانہ نگار بھی ہیں اور ڈرامہ نگار بھی۔ جہاں تک میرا خیال ہے وہ خود کو ڈرامہ نویس کی حیثیت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

اوپندر ناتھ اشک کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ "وہ ڈرامے اچھے لکھتے ہیں اور افسانے میں اس چیز کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ تفصیلات میں سے کون کون سی چیزیں منتخب کر کے کام میں لانی چاہئیں۔"

اشک صاحب عموماً اوریجنلیٹی (ORIGINALITY) میں مارے جاتے ہیں۔ ان کے تمام افسانے اور ان کے افسانوں کے تمام کردار اس بات کے شاہد ہیں کہ ان کا افسانہ بڑا افسانہ بنے یا نہ بنے مگر اس میں کہیں بھی غیر فطری اور خواہ مخواہ کی سنسنی پیدا کرنے والی بات راہ نہیں پاتی۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں منٹو کے افسانوں پر یہ اعتراض ہے کہ وہ افسانہ نگار کی حیثیت سے بعض غیر ضروری باتوں کو لا کر بھی خواہ مخواہ حیرت ناک قسم کا تاثر پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم افسانے کے فن اور اس کی نازک سی جزئیات کا پورا پورا احترام کریں تو اشک کے افسانے (خواہ وہ بڑے افسانے نہ ہوں) ایک بڑے فنکار کی تخلیقات کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ یہ اشک کی بدقسمتی ہے یا خوش قسمتی کہ ان کے فن پر بھی ڈرامہ کچھ اس طرح چھا کر رہ گیا ہے کہ اردو افسانے کے ضمن میں ان سے پورا پورا انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ پھر یہ بات بھی کچھ کم ہی سمجھ میں آتی ہے کہ جو ڈرامہ لکھتے وقت ڈرامے کی دو ذرا سی جزئیات کو پیشِ نظر رکھتا ہو اور اس کی کوئی بھی چول ڈھیلی نہ ہونے دیتا ہو۔ وہ افسانے میں غیر ضروری باتیں لکھ دے۔ میرے خیال میں تو وہ تمام ضروری ہی باتیں لکھتے ہیں اور غیر ضروری بات لکھتے ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ان کی کہانی افسانہ نہیں بنتی۔ پھر بھی چھ سات بڑے افسانہ نگاروں کو چھوڑ کر ان کی افسانوی تخلیقات کو بلا تامل پیش کیا جا سکتا ہے۔

فنکار کی حیثیت سے شفیق الرحمٰن اور قرۃ العین حیدر کی راہیں بالکل الگ الگ ہیں۔ ان دونوں کے فن کا مقابلہ کرنا یا ان کے بارے میں ایک ہی انداز میں سوچنا مناسب نہیں ہے۔ اگر ان دونوں نے اونچے طبقے کی زندگی کو پیش کیا ہے تو کیا ان تمام افسانہ نگاروں کے فن کے بارے میں ایک سا نہ سوچنا ہوگا جنھوں نے نچلے طبقے سے متعلق افسانے لکھے ہیں۔ اگر یوں سوچنا صحیح نہیں ہے تو شفیق الرحمٰن کے فن کا تجزیہ کرتے ہوئے کچھ مختلف انداز میں سوچنا ہوگا۔

شفیق الرحمٰن نے دو طرح کی چیزیں لکھی ہیں۔ ایک تو خالصتاً رومانی افسانے، دوسرے ہلکے پھلکے مزاحیہ مضامین، اور یہ ان دونوں قسم کی تحریروں میں برابر کامیاب ہیں۔ جن میں ان کا اپنا ایک اسٹائل ہے۔ یہ اسٹائل اپنے اندر کشش اور ستھرا پن رکھتا ہے۔ نہ ان کے رومانی افسانے محض ذہنی تعیش کے نمونہ ہیں اور نہ ان کی مزاحیہ تحریریں محض تفریح ہی تفریح ہیں بلکہ ان میں پورے رکھ رکھاؤ کے ساتھ حُسن ہے، نفاست ہے، ادب ہے اور اپنا ایک قطعی منفرد رنگ۔

اب رہا یہ سوال کہ ان کا ادب کس درجے کا ہے تو یہ بات سوچنے والی ضرور ہے مگر کوئی فیصلہ روا روی میں نہیں ہونا چاہیے۔ اگر کوئی رومانی افسانوں میں ایک منفرد اسٹائل اور شگفتہ نگاری کی راہ پائی میں شفیق الرحمٰن کی تحریروں پر غور کرے گا تو انہیں ایک بڑا فن کار ماننا پڑے گا۔

میں نے ان چند سطروں میں بات کو طول پکڑنے کی اجازت نہیں دی۔ نہ ہی مثالوں سے بھاری بھر کم بنا لینے پر راضی ہوا۔ یہ تو صرف اس حقیقت کا اظہار ہے کہ میں آپ سے اتنا عرض کر سکوں کہ ان حضرات نے بھی افسانوی ادب میں اپنے اپنے رنگ میں کچھ خدمت ہی کی ہے۔

محمد طفیل

زنداں نامہ

فیض احمد فیضؔ

کا

تیسرا مجموعۂ کلام

اس میں وہ تمام نظمیں اور غزلیں شامل ہیں جو اب تک
ان کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں اور زنداں کی یادگار ہیں ۔

مکتبۂ کارواں
ایبک روڈ (انارکلی) لاہور